داستانِ حیات

اردو ادب کے مشاہیر کی

ختم نبوت ﷺ زندہ باد

عظمت صحابہ زندہ باد

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ:

معزز ممبران: آپ کا وٹس ایپ گروپ ایڈ من "**اردو بکس**" آپ سے مخاطب ہے۔

آپ تمام ممبران سے گزارش ہے کہ:

- گروپ میں صرف کتب پوسٹ کی جاتی ہیں لہذا کتب کے متعلق اپنے کمنٹس وریویوز ضرور دیں۔ گروپ میں بغیر ایڈ من کی اجازت کے کسی بھی قسم کی (اسلامی وغیر اسلامی، اخلاقی، تحریری) پوسٹ کرنا سختی سے منع ہے۔
- گروپ میں معزز، پڑھے لکھے، سلجھے ہوئے ممبرز موجود ہیں اخلاقیات کی پابندی کریں اور گروپ رولز کو فالو کریں بصورت دیگر معزز ممبرز کی بہتری کی خاطر ریموو کر دیا جائے گا۔
- سب سے اہم بات:

گروپ میں کسی بھی قادیانی، مرزائی، احمدی، گستاخِ رسول، گستاخِ امہات المؤمنین، گستاخِ صحابہ و خلفائے راشدین حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی المرتضیٰ، حضرت حسنین کریمین رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین، گستاخ اہلبیت یا ایسے غیر مسلم جو اسلام کے خلاف پراپیگنڈا میں مصروف ہیں یا ان کے روحانی وذہنی سپورٹرز کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے لہذا ایسے اشخاص بالکل بھی گروپ جوائن کرنے کی زحمت نہ کریں۔ معلوم ہونے پر فوراً ریموو کر دیا جائے گا۔

- تمام کتب انٹرنیٹ سے تلاش / ڈاؤنلوڈ کر کے فری آف کاسٹ وٹس ایپ گروپ میں شیئر کی جاتی ہیں۔ جو کتاب نہیں ملتی اس کے لئے معذرت کر لی جاتی ہے۔ جس میں محنت بھی صرف ہوتی ہے لیکن ہمیں آپ سے صرف دعاؤں کی درخواست ہے۔
- ہمارا اردو کتب کا وٹس گروپ جوائن کرنے کے لئے درج ذیل لنکس پر کلک کریں ہر دو کیٹیگری میں صرف ایک ہی گروپ جوائن کریں اگر پہلے سے جوائن ہیں تو اس کو سکپ کر دیں۔ عمران سیریز کے شوقین عمران سیریز گروپ جوائن کر سکتے ہیں۔

اردو بکس 1	https://chat.whatsapp.com/EFrs3uGTgEm2319kK0wfu2
اردو بکس 2	https://chat.whatsapp.com/Ke9odWnuu7T9zRUGgYEcYV
اردو بکس 3	https://chat.whatsapp.com/IEl5cejf7Xc0b1HjApSyxI
اردو بکس 4	https://chat.whatsapp.com/J2HwtCI39spKjifu3aC61i
1 New ❤ Books	https://chat.whatsapp.com/EFrs3uGTgEm2319kK0wfu2
2 New ❤ Books	https://chat.whatsapp.com/D9yLIpv8dLVJHLjuVNIAtk
3 New ❤ Books	https://chat.whatsapp.com/I5dFInQasVTLcmKrbpa1bv
عمران سیریز 1	https://chat.whatsapp.com/Ggokw9DndA68GCuURnNA2H
عمران سیریز 2	https://chat.whatsapp.com/C11xpIXfws3JRqn8gSt3LZ

گروپ فل ہونے کی صورت میں ایڈ من سے وٹس ایپ پر میسج کریں۔ برائے مہربانی اخلاقیات کا خیال رکھتے ہوئے موبائل پر کال یا ایم ایس کرنے کی کوشش ہر گز نہ کریں۔ ورنہ گروپس سے ریموو کر دیا جائے گا اور بلاک بھی کیا جائے گا۔

0306-7163117	0343-7008883	0333-8033313
محمد سلمان سلیم	پاکستان زندہ باد	راؤ ایاز

پاکستان زندہ باد

پاکستان پائندہ باد

اللہ تبارک تعالیٰ ہم سب کا حامی وناصر ہو

احمد فراز

ساجد امجد

جو دلوں کے تار چھیڑے' فکر کے دریچے کھولے' جذبوں کی آنچ تیز کرے' خیال کی صورت گری کرے' احساس کو اظہار کے سانچے میں ڈھالے' ان کہی زبان دے' آرزو کو لفظ کا پیکر دے' درد سے لذتیں کشید کر کے دکھوں کو فریاد کی لے دے' وہ کبھی نہیں مرسکتا' اسے اس کی فکر کا پرتو زندہ رکھتا ہے۔ احمد فراز بھی انھی میں سے ایک ہے۔

اس صدی کے مقبول شعراء میں سے ایک شاعر کا مختصر سا احوال زیست

وہ لڑکی بہت دیر سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''میں نے تم سے کچھ پوچھا تھا۔ اتنی دیر ہوگئی' تم کچھ بولتے ہی نہیں۔''

''بول تو رہا ہوں۔ کتاب کے بہت سے شعر یاد ہیں۔''

''غضب خدا کا' ابھی بولے ہو۔ اس سے پہلے کب بتایا کہ تمہیں شعر آتے ہیں۔'' اس لڑکی نے چہکتے ہوئے کہا۔ ''ایک تو مصیبت یہ ہے کہ تم بولتے بہت کم ہو۔ بالکل لڑکیوں کی طرح شرماتے ہو۔ خود سے باتیں کرتے ہو اور سمجھتے ہو' دوسروں سے بول رہے ہو۔''

''مجھے کیوں شعر نہیں آتے ہوں گے۔ میرے والد تو خود شاعر ہیں۔ ان کے پاس کئی شاعر آتے ہیں۔ ایک دوسرے کو شعر بھی سناتے ہیں۔''

''اچھا' مان لیا کہ تمہیں شعر آتے ہیں۔ اب یہ بتاؤ ''بیت بازی'' جانتے ہو؟''

''نہیں' یہ تو مجھے نہیں معلوم۔''

''میں تمہیں بتاتی ہوں۔'' وہ یکدم اس کی استانی بن گئی۔ ''دیکھو! ایک شعر پڑھا جاتا ہے۔ یہ شعر جس لفظ پر ختم ہوتا ہے' اس لفظ کے آخری حرف سے شعر کا جواب دینا ہوتا ہے یعنی دوسرا شعر اسی حرف سے شروع ہونا چاہیے۔'' اس لڑکی نے اسے مختلف مثالوں سے سمجھایا اور وہ بظاہر سمجھ گیا کہ بیت بازی کیا ہوتی ہے بلکہ یہ کھیل تو اسے بہت آسان معلوم ہوا۔

''آؤ ادھر چل کر بیٹھتے ہیں۔ میں تمہیں اس کھیل کے کچھ اور اصول سکھاتی ہوں۔''

وہ اب اس کی علمیت سے مرعوب ہو چکا تھا۔ چپ چاپ اٹھا اور اس کے ساتھ چلتا ہوا کمرے سے دور برآمدوں میں آ کر بیٹھ گیا۔ گھر کے دوسرے لوگ بڑی بڑی کرسیاں ڈالے ایک جگہ بیٹھے تھے اور باتوں میں مصروف تھے۔

اس لڑکی نے ایک شعر پڑھا جو ''ن'' پر ختم ہو رہا تھا۔ اب لڑکے کو ایسا شعر پڑھنا تھا جو ''ن'' سے شروع ہو رہا ہو۔ اس نے کچھ دیر سوچا اور ایک شعر تلاش کر لیا۔ یہ شعر ''ب'' پر ختم ہوتا تھا۔ لڑکی نے فوراً ''ب'' سے شروع ہونے والا شعر پڑھ دیا۔

یہ سلسلہ چار پانچ اشعار تک ہی چلا تھا کہ لڑکے کو شکست ماننی پڑی۔ اسے تسلیم کرنا پڑا کہ شعر یاد ہونا الگ بات ہے اور موقع پر شعر کا یاد آ جانا دوسری بات ہے۔ لڑکی فاتحانہ ہنسی ہنس رہی تھی اور لڑکے کی مردانہ غیرت پیچ و تاب کھا رہی تھی۔

''اب کے میں آؤں گی تو بہت سارے شعر یاد کر کے

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں
تو خدا ہے نہ مرا عشق فرشتوں جیسا!
دونوں انساں ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں
اب نہ وہ میں نہ وہ تو ہے نہ وہ ماضی ہے فرازؔ
جیسے دو شخص تمنا کے سرابوں میں ملیں

رکھنا۔ جتنے شعر زیادہ یاد ہوں گے‘ اس کھیل میں اتنا ہی زیادہ مزہ آئے گا۔‘‘ لڑکی نے کہا اور لڑکا کھسیانی ہنسی ہنس کر رہ گیا۔

یہ لڑکا سید احمد شاہ تھا اور لڑکی اس کے والد کے دوست کی بیٹی تھی۔ دونوں گھرانوں میں قریبی تعلق تھا۔ ایک دوسرے کے گھر آنا جانا تھا۔ احمد شاہ اور وہ لڑکی چونکہ ہم عمر تھے لہٰذا بڑوں کی موجودگی میں یہ دونوں کھیل کود میں مشغول رہتے۔ بیت بازی بھی اسی کھیل کا ایک حصہ تھا۔

اس روز وہ لڑکی رخصت ہوئی تو احمد شاہ کچھ بجھا بجھا سا دکھائی دے رہا تھا۔ اسے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ وہ بیت بازی میں اس لڑکی سے مات کھا گیا ہے۔ اگر اسے اشعار یاد ہوتے تو وہ ضرور سرخرو ہوتا۔ وہ ایک عزم کے ساتھ اٹھا اور گھر میں رکھی ہوئی باپ کی کتابوں کا جائزہ لینے لگا۔

اس کے والد اردو اور فارسی کے بہت اچھے شاعر تھے اور برق کوہاٹی کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔ انہوں نے اپنے ذوق کے مطابق کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع کر لیا تھا۔ گھر میں ہندکو زبان بولی جاتی تھی۔ کسی اور کو ادبی ذوق تھا بھی نہیں لہٰذا اردو کی یہ کتابیں کسی مہمان کی منتظر ہی رہتی تھیں۔ احمد شاہ نے بھی کبھی انہیں ہاتھ نہیں لگایا تھا لیکن آج اس کی معصوم ضرورت اسے اس دسترخوان تک لے آئی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھایا۔ پہلے ایک پھول توڑا پھر دوسرا۔ ایک کونے میں بیٹھ گیا اور اپنے مطلب کے شعر یاد کرنے لگا۔

وہ آرزو کیا کرتا تھا کہ وہ لڑکی اس کے گھر آ جائے یا وہ خود وہاں چلا جائے لیکن اب دعا کر رہا تھا کہ جب تک یہ سارے شعر اسے یاد نہ ہو جائیں‘ اس لڑکی سے آمنا سامنا نہ ہو۔

اس کے والد اسے آتے جاتے کئی مرتبہ دیکھ چکے تھے۔ دوپہر سے شام ہو گئی تھی‘ وہ برابر ایک کتاب لیے بیٹھا تھا۔ انہیں تعجب ہو رہا تھا کہ احمد شاہ تو پڑھنے کا ایسا شائق نہیں‘ یہ اسے آج ہو کیا گیا ہے؟ وہ اس کے قریب آ کر بیٹھ گئے۔

’’احمد شاہ‘ کیا پڑھ رہے ہو؟‘‘

’’کسی شاعر کا دیوان ہے‘ اسے پڑھ رہا ہوں۔‘‘

’’یہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں لیکن اسکول کی کتابیں چھوڑ کر یہ دیوان پڑھ رہے ہو اور وہ بھی اس محویت سے؟‘‘

’’کچھ شعر یاد کرنے تھے۔‘‘

’’اسکول میں کوئی جلسہ وغیرہ ہے؟‘‘

اس سوال کا جواب نفی میں ملا اور جب یہ معلوم ہوا کہ تیاری کسی بیت بازی کی ہے تو برق کوہاٹی کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ ان کا ورثہ آخر کہیں تو منتقل ہوا۔ احمد شاہ میں یہ ذوق پیدا ہوا ہے تو اچھا ہی ہے۔ انہوں نے احمد شاہ کی پیٹھ تھپتھپائی اور اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

برق کوہاٹی کا گھرانا‘ کوہاٹ کے چند علمی گھرانوں میں سے ایک تھا۔ احمد شاہ کی پیدائش پر جشنِ مسرت مناتے ہوئے اور ہندکو زبان میں مبارک بادوں کا شور مچاتے ہوئے یہ تو سب نے دیکھا تھا کہ پیدا ہونے والا بچہ نہایت خوبصورت ہے لیکن یہ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ جب باتیں کرے گا تو منہ سے پھول جھڑیں گے۔ جب یہ سوچنے کی عمر کو پہنچے گا تو خیالوں کے جگنو اس کے اردگرد منڈلائیں گے۔ یہ جب خواب دیکھے گا تو روشنی اس کی حفاظت کرے گی۔ یہ جب خواب دکھائے گا تو دلوں کو منور کر دے گا۔ خامشی باتیں کرے گی‘ اظہار راز کھولے گا۔ باتیں سخن بنیں گی اور پھر یہ احمد شاہ سے احمد فراز بن جائے گا۔ پریاں جھولا جھلائیں گی۔ خلوت کدوں کے دروازے کھل جائیں گے۔ ہر دل کی دھڑکن ہوگا‘ ہر آنکھ کا درپن ہوگا۔ مقبولیت کی ہر انتہا کو چھو لے گا۔ خوش قسمتی کا ہر تالا اس کے لیے کھلتا چلا جائے گا۔

اس کے بارے میں کوئی اتنی باتیں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ خوبصورت ہونے کے علاوہ کوئی اور غیر معمولی بات اس میں نظر بھی نہیں آتی تھی۔ اوسط درجے کا طالب علم تھا‘ شرمیلا اور اپنے کام سے کام رکھنے والا۔

پرائمری تک کی ابتدائی تعلیم کوہاٹ میں حاصل کرنے کے بعد وہ پشاور آ گیا اور ایڈورڈ اسکول میں داخلہ لے لیا۔ یہیں اس کی ملاقات اس لڑکی سے ہوئی جس نے اسے بیت بازی سکھائی اور وہ شعر یاد کرنے کے شوق میں شعرا کے دواوین کھول کر بیٹھ گیا۔

ایک دن پھر بہار آئی‘ پھر پھول کھلے۔ وہ لڑکی اس کے گھر آئی ہوئی تھی۔ اسے اپنی شکست کا بدلہ لینے کا موقع مل رہا تھا۔ اسے بہت سے شعر یاد ہو گئے تھے۔ اسے یقین تھا کہ اس مرتبہ وہ ضرور کامیاب ہوگا۔

’’آؤ بیت بازی کھیلتے ہیں۔‘‘

’’معلوم ہوتا ہے بہت تیاری کر لی ہے؟‘‘

’’مجھے تو پہلے بھی بہت شعر یاد تھے۔ اس روز تو بس کچھ بھول گیا تھا۔‘‘

’’چلو آج پھر کھیل لیتے ہیں۔‘‘

بیت بازی شروع ہو گئی۔ وہ بڑے یقین سے شعر پڑھ رہا تھا۔ اس کی یادداشت اس کا ساتھ دے رہی تھی لیکن کچھ دیر بعد وہ اٹکنے لگا۔ شعروں کے درمیان وقفہ آنے لگا اور ایک جگہ پہنچ کر وہ خاموش ہو گیا۔ اسے اندازہ ہوا کہ اس لڑکی

کو بہت شعر آتے ہیں۔ اسے پھر مات ہوگئی تھی۔

اب اسے ایک جنون سا ہوگیا تھا۔ دن دن بھر وہ اشعار یاد کرتا تھا۔ لاشعوری طور پر قافیے' ردیف' اور اوزان کا نظام بھی اس کے ذہن نشین ہوتا چلا گیا۔ شاعری نے اس کے ذہن کو کتنا متاثر کیا ہے اس کا اندازہ اس روز ہوا جب وہ ایک شعر پر آ کر اٹک گیا۔ کوشش کے باوجود کوئی شعر یاد نہیں آ رہا تھا۔ اس نے سوچا اپنا کوئی شعر گھڑ کر اس مشکل سے چھٹکارا پالے۔

اس نے ذہن پر زور دیا اور یہ شعر پیش کر دیا۔

رات کو ایک خواب دیکھا تھا
جس میں تیرا شباب دیکھا تھا

شعر اعلیٰ درجے کا نہ سہی لیکن اس میں ردیف بھی تھی' قافیہ بھی تھا اور وزن بھی درست تھا۔ اس شعر نے اسے مشکل سے نکال دیا اور اس نے اس لڑکی کو مات دے دی۔

یہ ترکیب ایسی کارگر ہوئی کہ جب بھی ایسا موقع آتا وہ اپنا شعر بنا کر اس مشکل سے نکل جاتا۔ وہ شعر بھی کہہ سکتا ہے۔ اس انکشاف نے اسے حیرت میں ڈال دیا۔ اس انکشاف کے بعد وہ دن بھر کی شرارتوں کو شعروں میں منتقل کرتا اور خوش ہوتا رہا۔

اس کے والد کسی کام سے گھر سے اور شہر سے دور گئے ہوئے تھے۔ واپس آئے تو بچوں کے لیے تحفے بھی ساتھ تھے۔ اس کے بڑے بھائی کے لیے سوٹ آیا تھا اور اس کے لیے کوٹ کا کپڑا تھا۔ وہ اس کپڑے کو دیکھ کر خوش ہوگیا لیکن جب کپڑا ہاتھ میں لے کر ہاتھ پھیرا تو اسے سخت مایوسی ہوئی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی کمبل ہے جو اس کے ہاتھ میں آ گیا ہے۔ بے اختیار اس کی زبان سے نکلا۔

جبکہ سب کے واسطے لائے ہیں کپڑے سیل سے
لائے ہیں میرے لیے قیدی کا کمبل جیل سے

تک بندیوں کے اسی مشغلے میں وہ اس لڑکی کے ساتھ بیت بازی کے معرکے فتح میں بدلتا رہا اور خود شکست کھاتا رہا۔ وہ لڑکی فاتح بن کر اسے فتح کرتی رہی۔ کھیل' کھیل کی قربت میں وہ سنجیدہ ہوگیا۔ اسے یوں لگنے لگا جیسے وہ لڑکی اس کی کمزوری بن گئی ہے۔ جیسے وہ اسے اچھی لگنے لگی ہے...... اچھی بہت ہی اچھی۔ وہ اس وقت اس جذبے کو کسی نام سے نہیں پکار سکتا تھا۔ عمر ہی ایسی تھی۔ اسے ایک ایسے کمرے میں چھوڑ دیا گیا تھا جہاں رکھی ہوئی چیزوں کے ناموں سے وہ واقف نہیں تھا لیکن چیزیں اچھی بہت تھیں۔ پھر اچانک اس کمرے کی ایک دیوار شکستہ ہوگئی۔

سوانحی خاکہ

نام......سید احمد شاہ
والد......آغا سید محمد شاہ (برق کوہاٹی)
تعلیم......ایم اے (فارسی)
ایم اے (اردو)
ملازمت......ریڈیو پاکستان کراچی
اسلامیہ کالج پشاور
ڈائریکٹر اکادمی ادبیات
نیشنل بک فاؤنڈیشن
اعزازات......آدم جی ادبی ایوار، اباسین ایوارڈ
فراق گورکھپوری ایوارڈ
ٹاٹا ایوارڈ
ہلال امتیاز
تاریخ پیدائش......1931ء
تاریخ وفات......26 اگست 2008ء

وہ نویں جماعت میں تھا اور وہ لڑکی دسویں میں کہ اس لڑکی کا رشتہ آیا اور اس کی شادی ہوگئی۔ یہ عمر احتجاج کی تھی نہ بغاوت کی۔ اس نے بہت کچھ کہنا چاہا لیکن "بہت کچھ" بچا کر رکھ لیا کہ کبھی شاعری کرنی پڑی تو یہ درد شعروں کے حوالے کر دے گا۔

بیت بازی' اس لڑکی کی رخصتی کے ساتھ ہی رخصت ہوگئی۔ اس کے ساتھ کھیلنے والا کوئی نہیں رہا تو وہ شاعری سے کھیلنے لگا۔ (اگر اسے شاعری کہا جا سکتا تھا)

وہ نویں پاس کر کے دسویں کلاس میں آ گیا تھا۔ اب اسے یاد آیا کہ شاعروں کا کوئی تخلص بھی ہوتا ہے۔ اس نے فراز تخلص رکھ لیا اور احمد شاہ سے احمد فراز بن گیا۔

اس کی اردو کمزور تھی۔ اردو بولنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا لہٰذا اس نے اس کمی کو پورا کرنے کے لیے کثرت سے مطالعہ شروع کر دیا۔ گھر میں اساتذہ کے دیوان رکھے ہوئے تھے۔ وہ ان کا مطالعہ کرتا رہا۔ جو غزل پسند آتی اس پر طبع آزمائی بھی کر لیتا۔ وہ اساتذہ کی غزلوں پر غزلیں لکھتا رہا اور پھاڑتا رہا۔ اس مشقِ سخن نے اس میں اعتماد پیدا کر دیا۔ اسے یقین آ گیا کہ وہ شاعری کر سکتا ہے۔ جو سوچ سکتا ہے اس کا اظہار کر سکتا ہے۔ اس کی تربیت چونکہ اساتذہ کے دواوین کے ذریعے ہو رہی تھی اس لیے اس کا دائرہ کار غزل تک محدود تھا اور غزل بھی رومانوی غزل کیونکہ اساتذہ کے دواوین میں عشقیہ اشعار ہی اسے پڑھنے کو ملا کرتے تھے۔ خود اس کی عمر کا

تقاضا بھی یہی تھا۔

پشاور میں کئی ادبی تنظیمیں قائم تھیں۔ شاعری کا شوق ہوا تو اس نے بھی ان تنظیموں میں شرکت کرنا شروع کردی۔ یہ ادارے اس کی تربیت میں بھی حصہ لیتے رہے اور اس کے شوق کو بھی مہمیز لگاتے رہے۔

زمیندارہ کالج، گجرات میں مشاعرہ تھا۔ اس نے بھی اسکول کی طرف سے اپنا نام بھیج دیا۔ اسکول کے اساتذہ اس کی صلاحیتوں سے واقف ہوچکے تھے لہٰذا اسے اس مشاعرے میں شرکت کا موقع مل گیا۔ اس نے آنکھیں جلائیں اور اس مشاعرے کے لیے ایک غزل تیار کرلی۔ نئی اور توانا آواز تھی۔ رومانوی لہجہ، ہجر و وصال کی مثبت کیفیت۔ پڑھنے کا انداز ایسا کہ دل میں اتر جائے۔ اسے پہلا انعام ملا۔ اب کسی کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ شاعر ہے۔

اس نے ایڈورڈ اسکول سے نکلنے کے بعد ایڈورڈ کالج میں داخلہ بھی لے لیا تھا کہ وہ گھر کے حالات کو دیکھتے ہوئے نوکری کی تلاش میں کراچی کی طرف نکل گیا۔ اس سفر کے لیے ممکن ہے اس کو اس عزم نے بھی اکسایا ہو کہ وہ کسی ایسے مرکز میں رہے جہاں اسے اردو سیکھنے کا موقع ملے۔ ایسے لوگوں سے واسطہ پڑے جو اردو داں ہوں۔

کراچی آکر اس نے ایک کالج میں داخلہ لے لیا اور ریڈیو اسٹیشن کے چکر کاٹنے لگا۔ ایک دو مشاعرے اسے ملے اور لوگ اس کی شاعرانہ صلاحیتوں کے معترف ہوئے تو اسے اسکرپٹ رائٹر کے طور پر ملازمت کی پیش کش ہوئی جو اس نے فوراً قبول کرلی۔

ریڈیو اسٹیشن ادیبوں اور شاعروں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ دہلی منجھی اردو کے شاہکار نشر ہو رہے تھے۔ شاہد احمد دہلوی اور ارم لکھنوی جیسے زبان داں یہاں موجود تھے۔ فراز کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ اردو لکھ تو لیتا تھا لیکن بول نہیں سکتا تھا۔ کبھی ہاں جی کہہ کر کام چلالیتا کبھی ناجی۔ پشاور میں رہتے ہوئے اسے اپنی اس کمی کا کبھی احساس نہیں ہوا تھا لیکن اب وہ کراچی میں تھا اور وہ بھی ریڈیو اسٹیشن پر۔ اسے رہ رہ کر اس محرومی کا احساس ہوتا تھا پھر کسی نے مزاحاً اس سے کہا ''طلسم ہوش رُبا پڑھو یا دہلی کی کسی لڑکی سے شادی کرلو، اردو سیکھ جاؤ گے۔'' شادی تو اس کے بس میں نہیں تھی، وہ طلسم ہوش رُبا کھول کر بیٹھ گیا۔ سخت مطالعہ کیا اکیلے میں بولنے کی کوشش کی۔ ریڈیو پر آنے والے ادیبوں کے قریب رہنے کی کوشش کی۔ شاہد احمد دہلوی بڑے شفیق سرپرست تھے۔ اس کی حوصلہ افزائی کرتے رہے اور اس کی اردو صاف ہوتی چلی گئی۔

اس جاں فشانی کا پسینا پونچھنے کے بعد اس نے پلٹ کر دیکھا تو پشاور بہت دور نظر آیا۔ اسے اپنی ماں کی یاد آنے لگی۔ وہ اپنی ماں سے بہت محبت کرتا تھا۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ اکیلا رہ گیا ہے۔ رات کو کبھی آنکھ کھل جاتی تو گھنٹوں جاگتا رہتا۔ اب وہ اس فکر میں تھا کہ کسی طرح اس کا تبادلہ پشاور ریڈیو پر ہوجائے۔ ملازمت بھی قائم رہے اور وہ اپنوں میں بھی پہنچ جائے۔ بالآخر وہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہوکر پشاور ریڈیو پر آگیا۔

اب تک اس کی شاعری اتنے کل پرزے ضرور نکال چکی تھی کہ اس کے ناز اٹھائے جائیں۔ اس کے علاوہ انتظامیہ کو یہ احساس بھی تھا کہ وہ دوسرے نوجوان شعرا کی طرح اپنا وقت ضائع نہیں کر رہا ہے بلکہ اسے پڑھنے کا شوق ہے اور کالج جانا چاہتا ہے۔ اسے یہ اجازت مل گئی کہ وہ گھر بیٹھ کر اسکرپٹ لکھ سکتا ہے۔ اس اجازت کے بعد اس نے ایک مرتبہ پھر کالج میں داخلہ لے لیا۔ ان دنوں وہ سخت محنت کر رہا تھا۔ صبح کالج جاتا، کالج کے بعد ریڈیو کے جس اسکرپٹ کو تیار کرنا ہوتا اسے لے کر بیٹھ جاتا۔ اسکرپٹ تیار ہوجاتا تو اسے ریڈیو پہنچا کر دوستوں میں نکل جاتا یا کسی مشاعرے کا رخ کرتا۔

اس نہج پر چلتے ہوئے ابھی ایک ہی سال گزرا تھا کہ 1951ء میں ریڈیو پاکستان کراچی سے قومی پروگرام کا آغاز ہوا۔ اس پروگرام کے لیے لکھنے والوں کو جمع کیا جا رہا تھا۔ لاہور سے چراغ حسن حسرت کو کراچی بلایا گیا۔ اب ان کے مددگار لکھنے والوں کی ضرورت پوری کرنے کے لیے احمد بشیر، یونس احمر، رفیع پیرزادہ، سلیم احمد وغیرہ کو ان کے سپرد کیا گیا۔ قرعہ فال احمد فراز کے نام بھی نکلا۔ اسے ایک مرتبہ پھر کراچی طلب کرلیا گیا۔ اس کی پڑھائی پھر درمیان میں رہ گئی۔ کالج چھوڑ کر کراچی چلا گیا۔ یہاں عجیب بہار آئی ہوئی تھی۔ چراغ حسن حسرت جیسی باغ و بہار شخصیت انچارج کی حیثیت سے رہنمائی کے لیے موجود تھی۔ فقرے بازیوں اور لطیفہ گوئی میں دن گزرتا۔ ساتھ ساتھ کام بھی ہوتا رہتا۔ چراغ حسن حسرت یار باش قسم کے آدمی تھے۔ افسری ماتحتی کا تصور ہی نہیں تھا۔ کام ختم کرنے کے بعد مختلف ہوٹلوں پر آدھی آدھی رات گزر جاتی۔ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا اور ایک سال گزر گیا۔

ایک سال بعد یہ پروگرام ختم ہوگیا۔ دوسری طرف چراغ حسن حسرت کی زیڈ اے بخاری سے نبھ نہ سکی لہٰذا انہوں نے ملازمت چھوڑ دی۔ فراز بھی پشاور واپس چلا آیا

اور دوبارہ کالج جوائن کرلیا۔ پشاور ریڈیو کی ملازمت بھی جاری رہی۔

اس کی شاعری کی خوشبو اب اردگرد پھیلنے لگی تھی۔ اس کے مداحوں نے اسے یہ یقین بھی دلا دیا تھا کہ اس کی غزلوں کے ذریعے ایک نئی آواز کا اضافہ ہو رہا ہے۔ رومانوی انداز کی شاعری میں اس سے بہتر شاعری اب تک نہیں ہوئی۔ اس وقت فیض کی شاعری کا شہرہ تھا۔ خود فراز بھی اس سے متاثر تھا لیکن فیض کی شاعری غم روزگار اور غم جاناں کے اشتراک سے تکمیل پاتی تھی۔ فراز نے غم جاناں کو الگ کر کے خالص عشقیہ شاعری کو اپنا موضوع بنایا تھا لہٰذا اس عمر میں ہی اس کی انفرادیت قائم ہوگئی تھی۔ اس کے مداح چاہتے تھے کہ وہ اس شاعری کو دنیا کے سامنے لائے۔ اس نے جو کچھ اب تک کہا تھا' اسے مرتب کرنے بیٹھ گیا۔ اس نے ابھی بی اے نہیں کیا تھا کہ اس کا مجموعۂ کلام ''تنہا تنہا'' بازار میں آ گیا۔

کتاب کے شائع ہوتے ہی وہی ہوا جس کا اندازہ تھا۔ ایوان شاعری میں ایک نئی' توانا' منفرد آواز گونج اٹھی۔ پہلا مجموعۂ کلام تھا لیکن حاصلِ کلام بن گیا۔

اس کتاب میں نادر موتیوں کا ایسا ذخیرہ ایک جگہ جمع ہو گیا تھا کہ اس کی شہرت راتوں رات پورے ملک میں پھیل گئی۔ خصوصاً صنفِ نازک کے لیے وہ خوابوں کے شہزادے کا روپ دھار گیا۔ اس کے کلام کی مٹھاس اور ہلکی ہلکی سی کسک دلوں کو متاثر کیے بغیر نہ رہ سکی۔ خواتین میں اس کی پذیرائی نے مجاز کی یاد دلا دی۔ اس کی رومانی غزلیں تختے میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے لگیں۔ اس پذیرائی نے مشاعروں کے دروازے اس پر کھول دیے۔ وہ جس مشاعرے میں پہنچ جاتا' ہلچل مچ جاتی۔ لڑکیاں اسے گھیر لیتیں۔ اس کے سامنے اچھے اچھے شاعروں کا چراغ جلنا مشکل نظر آنے لگتا۔

اس پذیرائی کے موسم میں حاسدوں کا لب کشا ہونا لازمی تھا۔ اس کی شاعری کو محض عشقیہ شاعری کہہ کر بے وقعت ثابت کیا جانے لگا حالانکہ عشق ایک بہت بڑی حقیقت ہے۔ وہ عشقیہ اشعار کہہ ضرور رہا تھا لیکن اس کی شاعری میں دکھوں کا انفعالی احساس نہیں تھا بلکہ ہجر و وصال دونوں میں اس کا رویّہ نہایت مثبت' توانا اور حیات پرور تھا۔ سیاسی و معاشرتی صورتِ حال بھی اپنی جگہ بنا لیتی تھی۔

ہر گھر کا دیا گل نہ کرو تم کہ نہ جانے
کس بام سے خورشید قیامت نکل آئے

اسی طرح بعض لوگوں نے یہ الزام لگایا کہ وہ فیض کی تقلید کرتا ہے۔ یہ الزام بھی محض الزام ہی تھا کیونکہ اپنے پیش

شعری مجموعے

تنہا تنہا' دردِ آشوب' شب خون' نایافت' مرے خواب ریزہ ریزہ' بے آواز گلی کوچوں میں' نابینا شہر میں آئینہ' پس انداز موسم' سب آوازیں میری ہیں' خوابِ گل پریشاں' خود اک غزل بہانہ کروں' جاناں جاناں' اے عشق جنوں پیشہ اور کلیات (شہرِ سخن آراستہ)

روؤں سے کچھ نہ کچھ اثر قبول کرنا ایک فطری عمل ہے۔ اس نے بھی اثر قبول کیا ہوگا لیکن یہ عمل تقلیدی نہیں بلکہ تخلیقی تھا۔ فراز اگر تخلیقی آدمی نہ ہوتا تو آگے چل کر وہ اپنا لہجہ تشکیل نہ کر پاتا۔

وہ انہی شہرتوں اور مخالفتوں کے درمیان اپنا راستہ بناتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ بی اے کرنے کے بعد اس نے پشاور یونیورسٹی سے اردو اور فارسی میں ایم اے کیا۔ اس کی یہ تگ و دو غالباً اسی لیے تھی کہ اردو اس کی مادری زبان نہیں تھی جبکہ وہ اردو میں شاعری کر رہا تھا۔ وہ یقیناً یہ چاہتا ہوگا کہ اردو میں زیادہ سے زیادہ دسترس حاصل کرے۔ ان ڈگریوں نے اس کے شوق کی تکمیل بھی کی اور اس کے روزگار کا سبب بھی بنیں۔

اس کا ارادہ تو یہی تھا کہ وہ ریڈیو کی ملازمت کو برقرار رکھے۔ اس کی تعلیمی قابلیت کے بعد یہاں ترقی کے مواقع بھی بہت تھے لیکن اس کی قابلیت اور شہرت یونیورسٹی کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوئی تھی۔ وہ ریڈیو پر دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا کہ یونیورسٹی کی طرف سے اسے ایک خط ملا جس میں اسے لیکچرر شپ کی پیشکش کی گئی تھی۔ ملازمت کی یہ پیشکش بری نہیں تھی۔ اسے موقع مل رہا تھا کہ وہ اپنے علم کو دوسروں تک پہنچائے۔ طالب علموں کے ذریعے اس کی شاعری کے فروغ کے سامان بھی مہیا ہو سکتے تھے۔ یہ سب تو تھا لیکن ایک وقت میں دو ملازمتیں نہیں کی جا سکتی تھیں۔ اگر وہ لیکچرر شپ قبول کرتا تو اسے ریڈیو کی نوکری چھوڑنی پڑتی۔ اس نے دوستوں سے مشورہ کیا۔ کچھ نے ریڈیو کی ملازمت نہ چھوڑنے کا مشورہ دیا لیکن زیادہ تر کا خیال تھا کہ وہ لیکچرر شپ قبول کرلے۔ ریڈیو پر اسے پروگرام تو یوں بھی مل سکتے ہیں۔ دوستوں سے ملاقات کے لیے جب جی چاہے ریڈیو آ سکتا ہے۔ اس کے لیے ملازمت کی شرط نہیں۔

وہ اس قدر سوچنے کا عادی نہیں تھا لیکن معاملہ ریڈیو کا تھا اس لیے اسے سوچنا پڑ رہا تھا اور پھر بالآخر اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ ریڈیو کی ملازمت ترک کردے گا۔ اس نے اسلامیہ

غزل

ہم تو یوں خوش ؟؟ تھے کہ اک تار گریبان میں ہے
کیا خبر تھی کہ بہار اس کے بھی ارمان میں ہے
میں تجھے کھو کے بھی زندہ ہوں یہ دیکھا تو نے
کس قدر حوصلہ ہارے ہوئے انسان میں ہے
ایک ضرب اور بھی اے زندگی تیشہ بدست
سانس لینے کی سکت اب بھی مری جان میں ہے
فاصلے قرب کے شعلوں کو ہوا دیتے ہیں
میں ترے شہر سے دور اور تو میرے دھیان میں ہے
خلقت شہر کے ہر ظلم کے باوصف فراز
ہائے وہ ہاتھ کہ اپنے ہی گریبان میں ہے

کالج جوائن کرلیا۔

اس نے پہلے دن کالج میں قدم رکھا اور کلاس لینے کے لیے اپنے شاگردوں کے سامنے پیش ہوا تو اس پر ایک نئی دنیا کا انکشاف ہوا۔ وہ کلاس میں موجود لڑکوں میں سے کسی کے لیے بھی اجنبی نہیں تھا۔ وہ بہ حیثیت شاعر اسے بہت پہلے سے جانتے تھے۔ لڑکوں کے لیے بھی یہ بالکل نیا تجربہ تھا۔ ان کا پسندیدہ شاعر انہیں اشعار کا مفہوم سمجھا رہا تھا۔ ایسے نکتے بتا رہا تھا جو عام اردو کا استاد نہیں بتا سکتا تھا۔ پوری کلاس میں خاموشی پہرا دے رہی تھی صرف فراز کی آواز تھی جو دھیمی دھیمی بہہ رہی تھی اور سب کو اپنے ساتھ بہائے لیے جا رہی تھی۔

یہ پہلا دن ہی اس کے لیے خوشگوار تجربہ ثابت ہوا۔ اسے یقین ہوگیا کہ وہ اس ملازمت میں بہت زیادہ دن گزار سکے گا۔ اپنی بات کہنے اور منوانے کا جو نشہ اس ملازمت میں ہے کسی اور جگہ میسر نہیں آ سکتا۔

اس ملازمت میں آنے کے بعد اسے فرصت کے اوقات بھی میسر آنے لگے تھے کیونکہ فرائض کا دورانیہ زیادہ نہیں تھا۔ اس فرصت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے اپنا دوسرا مجموعۂ کلام ''دردِ آشوب'' اپنے پڑھنے والوں کو دیا۔ اس کتاب میں اس کی شاعری کے امکانات مزید روشن ہوتے ہوئے نظر آئے۔ اس پر یہ الزام تھا کہ وہ ٹین ایجر کا شاعر ہے حالانکہ یہ کوئی الزام نہیں، اس کے باوجود اس مجموعے کے ذریعے اس نے اس الزام کو دھونے کی کوشش کی۔ اب اس کا کینوس وسیع ہونے لگا تھا۔

اس مجموعے کی یہی خوبی تھی کہ اہلِ نظر نے اسے آنکھوں پر رکھا اور اہلِ ادب و نقد نے اسے آدم جی ادبی ایوارڈ سے نوازا۔

کالج کی ملازمت میں یوں تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا لیکن اس کے خواب ریزہ ریزہ ہو رہے تھے۔ وہ تو یہ سوچ کر یہاں آیا تھا کہ اتنے اہلِ علم جب اسٹاف روم میں ایک ساتھ جمع ہوا کریں گے تو ستاروں کی کہکشاں کا منظر پیش ہوا کرے گا۔ ہر ستارہ ایک سے بڑھ کر ایک ہوگا۔ وہ صدف کے ان موتیوں سے اپنا دامن بھرلیا کرے گا۔ اس کے یہ خواب شیشے کے ظروف ثابت ہوئے۔ سلسلے وار ٹوٹتے چلے گئے۔ اس کے ساتھی اساتذہ اپنے مضامین میں مہارت رکھتے ہوں لیکن دنیا میں ان کے مضمون کے سوا بھی کچھ ہے اس کا انہیں علم ہی نہیں تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ ڈگری حاصل کرنے کے بعد انہوں نے مطالعہ کیا ہی نہیں تھا۔ اس نے جن صحبتوں میں وقت گزارا تھا' اس کے مقابلے میں یہ اسٹاف روم بہت کم علم لوگوں پر مشتمل تھا۔ یہاں کوئی چراغ حسن حسرت' کوئی شاہد احمد دہلوی اور کوئی ارم لکھنوی نہیں تھا اور ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ جلد ہی اس کا دم گھٹنے لگا۔ وہ اپنی کلاس لینے کے بعد اسٹاف روم میں آ کر بیٹھتا تو جلد ہی اکتا جاتا۔ اول تو کسی کے پاس کوئی علمی بات کرنے کے لیے موضوع ہی نہیں ہوتا اور اگر فراز کوئی مسئلہ چھیڑ دیتا تو کسی کے پاس بحث کرنے کے لیے خاطر خواہ الفاظ نہ ہوتے۔

فراز یہ نوکری چھوڑ بھی سکتا تھا لیکن پڑھانے کے کام سے اسے دلچسپی تھی۔ وہ ایک لذتِ نایاب سے مستفید ہو رہا تھا۔ نوکری چھوڑنا اسے گوارا نہیں تھا۔ اس کا حل اس نے یہ نکالا کہ اسٹاف روم میں بیٹھنا ہی چھوڑ دیا۔ اپنے پیریڈ لیتا اور ریڈیو اسٹیشن چلا جاتا۔ دوستوں کے ساتھ گپ شپ کرتا اور پھر کسی مشاعرے کا رخ کرتا یا گھر چلا جاتا۔ اسی نہج پر اس نے آٹھ نو برس گزار دیے۔ اس دوران ملک میں کئی سیاسی تبدیلیاں آئیں۔ اس نے جنرل ایوب خان کے مارشل لا میں سفر شروع کیا تھا اور اب اس کے محبوب لیڈر جناب ذوالفقار علی بھٹو' ملک میں سوشلزم کا نعرہ لگا کر ایوب خان کے خلاف صف آرا ہوگئے تھے۔ احمد فراز کا شمار ترقی پسند لکھنے والوں میں ہوتا تھا۔ سوشلزم کا نعرہ اس کے لیے بڑی جاذبیت رکھتا تھا۔ وہ خود انہی خیالوں کا حامل تھا اس لیے بھٹو سے اس کی عقیدت بڑھتی جا رہی تھی۔ بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں کہ ایک شاعر کو کھل کر سیاسی نظریات میں نہیں الجھنا چاہیے ورنہ شاعر اور واعظ میں کیا فرق رہ جائے گا لیکن فراز ان دنوں اٹھتے بیٹھتے بھٹو اور سوشلزم کے حق میں مباحث کرتا پھر رہا تھا۔ بھٹو کی عقیدت نے اسے منہ پھٹ بنا دیا تھا۔ اس کا پٹھان خون کسی مصلحت کو خاطر میں نہیں لا رہا تھا۔ اس کے

تیکھے فقرے مخالفوں کے دلوں کے آر پار ہو رہے تھے۔
جب مارشل لا سے نجات ملی، آدھا ملک گنوا کر ہی سہی، جمہوریت آئی اور ملک میں پیپلز پارٹی کی حکومت قائم ہوگئی تو گویا یہ فراز کے نظریات کی جیت تھی۔
ملک میں انتخابات ہوئے تو کالجوں میں طلبہ تنظیموں کے بھی انتخابات ہوئے۔ اسلامیہ کالج میں بھی جہاں فراز پڑھاتا تھا، انتخابات کا اعلان ہوا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی طلبہ کی سیاسی سرگرمیوں نے سر اٹھایا۔ بینر آویزاں ہوگئے، دھواں دھار تقریریں ہونے لگیں۔ فراز خوش تھا کہ جمہوریت کا یہ سفر تعلیمی اداروں تک آ گیا ہے۔
ان سیاسی سرگرمیوں نے ایک دن ہنگامے کی صورت اختیار کرلی۔ طلبہ کا ایک گروپ پرنسپل کے آفس میں گھس گیا۔ پرنسپل کو فحش گالیاں دیں، ان کی بے عزتی کی، دھمکیاں دیں۔ غرض اس بوڑھے استاد کے ساتھ جو کر سکتے تھے، کیا۔
فراز یہ تمام مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اور حیران تھا کہ یہ اس کے شاگرد ہیں؟ استاد کے پاس دولت تو ہوتی نہیں صرف عزت ہوتی ہے۔ اب یہ عزتِ سادات بھی گئی۔ وہ کس منہ سے لڑکوں کو پڑھائے اور کیوں پڑھائے۔ اس نے زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا۔ کالج سے نکلا اور ریڈیو اسٹیشن پہنچ گیا۔ دوسرے دن اس نے استعفیٰ لکھ کر بھیج دیا۔ یوں یہ نوکری بھی گئی۔
بے روزگاری کے یہ دن گزر رہے تھے بلکہ وہ تو انہیں آزادی کے دن کہہ رہا تھا۔ نوکری سے آزاد ہوگیا تھا لیکن نوکری نہ کرنے کی قسم بھی نہیں کھائی تھی لیکن اب اس نے سوچ لیا تھا کہ اپنے معیار اور اپنی پسند کی نوکری کی طرف ہاتھ بڑھائے گا لہٰذا جب کونسل برائے قومی یک جہتی نیشنل سینٹر میں ڈائریکٹر کی اسامی کے لیے درخواستیں طلب کی گئیں تو اس نے بھی درخواست دے دی۔ اس وقت تک اس کی شہرت ملک کی دیواریں پھلانگ کر بیرونِ ملک تک پہنچ چکی تھی۔ ادبی مقبولیت سے قطع نظر ریڈیو سے گائی جانے والی غزلوں نے اسے عوامی سطح پر پسندیدہ شاعر بنا دیا تھا۔

رنجش ہی سہی، دل ہی دکھانے کے لیے آ
آ پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لیے آ

اور

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں

مہدی حسن کی آواز کے ذریعے یہ غزلیں ہر گھر میں پہنچ گئی تھیں۔ وہ محفلوں کی جان اور دل کی زمینوں کا آسمان بنا

خواب مرتے نہیں

خواب مرتے نہیں
خواب تو روشنی ہیں، نوا ہیں، ہوا ہیں
جو کالے پہاڑوں سے رکتے نہیں
ظلم کے دوزخوں سے بھی؟؟ نہیں
روشنی اور نور اور ہوا کے علم
مشعلوں میں پہنچ کر بھی جھکتے نہیں
خواب تو حرف ہیں
خواب تو نور ہیں
خواب سقراط ہیں
خواب منصور ہیں۔

ہوا تھا۔ اس عہدے کے لیے اس سے بہتر امیدوار اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔ خیالات کے اعتبار سے بھی وہ پروگریسو تھا۔ بھٹو صاحب کا دورِ حکومت تھا لہٰذا اس عہدے کے لیے پروگریسو رائٹر سے بڑھ کر اور کون حق دار ہوسکتا تھا۔ اس لیے اسے امید تھی کہ اس کا تقرر ہو جائے گا۔
ابھی اس درخواست کے بارے میں ضابطے کی کارروائی جاری تھی کہ پشاور سے لاہور جاتے ہوئے جہاز میں اس کی ملاقات فیض احمد فیض سے ہوگئی۔ علیک سلیک کے بعد فراز نے اپنی نئی ملازمت کے لیے ان سے ذکر کیا۔
"فیض صاحب، میں نے تہیہ کرلیا تھا کہ سرکاری ملازمت نہیں کروں گا کیونکہ افسرانِ بالا کی تابعداری میرے مزاج کا حصہ نہیں ہے لیکن یہ ملازمت درمیان میں آگئی ہے۔ میں درخواست بھی دے چکا ہوں لیکن تذبذب میں ہوں۔ آپ بتائیے، مجھے یہ ملازمت کرنی چاہیے یا نہیں؟"
"دیکھیے صاحب!" فیض صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں کہا "آپ کے نوکری نہ کرنے سے یہ اسامی خالی نہیں پڑی رہے گی۔ تم نہیں کروگے تو کوئی جماعت کا بندہ آجائے گا۔ دل پر جبر کرو اور یہ نوکری کرلو بلکہ میں تو یہ کہوں گا، جہاں تک ممکن ہو اپنے لوگوں کو سرکاری ملازمتیں کرنی چاہئیں تاکہ ترقی پسند خیالات کو زیادہ سے زیادہ فروغ ملے۔"
انہوں نے اس دل سوزی سے اسے نصیحت کی کہ اس کے ارادے کی شکستگی دور ہوگئی۔ اس نے تہیہ کرلیا کہ اگر خفیہ اداروں نے اسے کلیئرنس دے دی اور اسے اس ملازمت کی پیش کش ہوئی تو وہ ضرور اسے قبول کرلے گا۔
چند مہینوں کے انتظار کے بعد اسے اس ملازمت کا پروانہ تقرری مل گیا اور اسے اسلام آباد آنا پڑا۔ یہ ملازمت

غزل

ایسے چپ ہیں کہ یہ منزل ہی کڑی ہو جیسے
تیرا ملنا بھی جدائی کی گھڑی ہو جیسے
اپنے ہی سائے سے ہر گام لرز جاتا ہوں
راستے میں کوئی دیوار کھڑی ہو جیسے
کتنے ناداں ہیں ترے بھولنے والے کہ تجھے
یاد کرنے کے لیے عمر پڑی ہو جیسے
تیرے ماتھے کی شکن پہلے بھی دیکھی تھی مگر
یہ گرہ اب کے مرے دل میں پڑی ہو جیسے
منزلیں دور بھی ہیں، منزلیں نزدیک بھی ہیں
اپنے ہی پاؤں میں زنجیر پڑی ہو جیسے

ہر اعتبار سے اس کے مزاج کے مطابق تھی لیکن اس کا مزاج اس کے مطابق نہیں تھا۔ اس کا اندیشہ درست تھا کہ اس کا مزاج سرکاری ملازمت سے میل نہیں کھاتا۔ مولانا کوثر نیازی وزیرِ اطلاعات تھے۔ اس کا براہِ راست واسطہ انہی سے تھا۔ یوں تو کوثر نیازی بھی دقیانوسی نہیں تھے، جوش جیسے آزاد خیال سے ان کی نبھتی چلی آرہی تھی لیکن نہ جانے کیا ہوا کہ فراز کی آزاد خیالی یا پھر حاضر جوابی ان سے برداشت نہ ہوئی۔ کچھ دن سرد جنگ کا عالم طاری رہا اور موقع دیکھ کر انہوں نے فراز کو ملازمت سے برخاست کر دیا۔ فراز اس وقت اپنے بھائی سے ملنے لندن گیا ہوا تھا۔ وہیں اس نے اپنے ایک دوست کے ذریعے اپنی برطرفی کی خبر سنی۔ وہ واپس آیا تو خبر سچ نکلی۔ اس کا دکھ اپنی جگہ تھا۔ یہ حکومت اس کے نظریات کی حامل بھی تھی اور وہ اس کے ساتھ مخلص بھی تھا۔ پھر ادب کے لیے جو اس کی خدمات تھیں، اسے ان کا ادراک بھی تھا۔ یہ احساس الگ تھا کہ ایک جمہوری حکومت میں اس کے ساتھ غیر جمہوری طرزِ عمل ہوا ہے۔ کسی معمولی سی نوکری میں بھی کوئی چارج شیٹ دی جاتی ہے، جواب داخل کرنے کا موقع دیا جاتا ہے، اسے تو ذاتی دشمنی کی بھینٹ چڑھا دیا گیا ہے۔ خاموش ہو کر بیٹھ جانا اس کے لیے مناسب نہیں تھا۔ اس کے تعلقات کے کشکول میں بہت سے کھرے سکے تھے جن سے وہ اپنی بحالی خرید سکتا تھا۔ وہ گھر سے نکلا تو کئی دوست اس کے منتظر تھے۔ اس نے ان دوستوں کو زحمت دی اور اپنا کیس آگے بڑھا دیا۔ اگر کوثر نیازی وزیر تھے تو وہ شاعری کا بادشاہ تھا۔ کیس چلتا رہا۔ اِس دفتر سے اُس دفتر۔ اِس وزارت سے اُس وزارت۔ اس نے تو یہ تک سوچ لیا تھا کہ وہ بھٹو صاحب سے ملے گا اور اس کے لیے یہ مشکل بھی نہیں تھا لیکن اس کی نوبت نہیں آئی۔ وہی کوثر نیازی اسے بحال کرنے پر مجبور ہو گئے۔

یہ مرحلہ بہ خیروخوبی نمٹ گیا تھا کہ 1976ء میں اکیڈمی آف لیٹرز (اکادمی ادبیات) قائم ہوئی تو اسے اس پروجیکٹ کا پہلا ڈائریکٹر جنرل بنایا گیا۔ یہاں اور بھی زیادہ مواقع تھے کہ وہ ادیبوں کی خدمت کر سکتا تھا۔ ان کی کتابیں شائع کرا سکتا تھا، ان کے وظائف مقرر کرا سکتا تھا۔ اس نے اس عہدے کو خوش دلی سے قبول کر لیا لیکن یہ خوشی بڑی مختصر ثابت ہوئی۔ ملک میں الیکشن ہوئے لیکن بھٹو صاحب پر دھاندلی کا الزام لگا اور اس کے نتیجے میں تحریک شروع ہو گئی۔ ملک کی نو سیاسی جماعتوں کا اتحاد قائم ہوا اور بھٹو صاحب کے خلاف صف آرا ہو گیا۔ یہ تحریک دیکھتے ہی دیکھتے اتنا زور پکڑ گئی کہ خیمے کی طنابوں کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ وہ ان حالات کو بہ غور دیکھ رہا تھا لیکن پُرامید تھا کہ یہ آندھی گزر جائے گی۔ وہ تو اسے بھی آندھیوں کا زور نہیں جمہوری قوتوں کا شور سمجھ رہا تھا لیکن اس آندھی کے پیچھے زلزلے بھی چھپے ہوئے ہیں، یہ اسے معلوم نہیں تھا۔ ایک دن وہ دفتر جانے کے لیے تیار ہوا تو جنرل ضیاالحق کا مارشل لا اس کا منتظر تھا۔ اسلام آباد کی سڑکوں پر فوجی گاڑیاں دوڑتی پھر رہی تھیں۔ رات ہی میں کسی وقت اس کے محبوب لیڈر ذوالفقار علی بھٹو کو گرفتار کیا جا چکا تھا۔

جب مشرقی پاکستان کا المیہ ہوا تھا، اس وقت بھی اس نے فوجی آمروں کو للکارا تھا۔

اب کس کا جشن مناتے ہو
اس دیس کا جو تقسیم ہوا
اب کس کا گیت سناتے ہو
اس تن کا جو دونیم ہوا
اس خواب کا جو ریزہ ریزہ
ان آنکھوں کی تقدیر ہوا
اس نام کا جو ٹکڑے ٹکڑے
گلیوں میں بے توقیر ہوا
اس پرچم کا جس کی حرمت
بازاروں میں نیلام ہوئی
اس مٹی کا جس کی حرمت
منسوب عدو کے نام ہوئی...... (سحر کا سورج)

......☆......

میں ترا قاتل ہوں
اے مرے مشرق مجھے مصلوب کر
میں جو عیسیٰ کے لبادے میں

ترے بیمار فرزندوں کے گھر
آیا تھا
کل چارہ گری کے واسطے
میں نے ان سے کیا کہا
میں کہ درماں بن کے آیا تھا
ترے ناسور زخموں کے لیے
بارود کا مرہم لیے
بندوق کا پرچم لیے
میرے بوجھل بوٹ
جن کی بوجھل چاپ
ترے چوب داروں کی سی تھی
اب کی بار ایسے زلزلے لائے
کہ مرے ہنستے بستے شہر ملبے بن گئے
خاک و خوں کے اس گلاب سے
میں اپنے بھاری بوٹ نکالوں کس طرح
یہ مری بندوق مرے دوش پر ایک بوجھ ہے
......(میں ترا قاتل)

......☆......

اس نے بڑے دکھ سے کہا تھا
میں اپنے پیکر کی نصف تصویر ہوگیا ہوں
میں آپ ہی آج اپنی تحقیر ہوگیا ہوں
میں اسم تصغیر ہوگیا ہوں

میں اپنا آدھا بدن لیے کس طرف کو جاؤں
سحر کے سورج
میں اپنی وحدت کہاں سے لاؤں

......☆......

اس کا کہنا یہی تھا کہ وہ فوج کے نہیں فوجی جنرلوں کے خلاف ہے جو طالع آزمائی کرتے رہتے ہیں۔ اس کے خیال میں ایک مرتبہ پھر جمہوریت پر شب خون مارا گیا ہے۔ اس نے ایک مرتبہ پھر اپنا قلم' بندوق کے مقابل اٹھالیا۔

ملک میں مارشل لا لگا تو اسے اکیڈمی آف لیٹرز سے سبک دوش کرکے ٹرانسفرز کے گورکھ دھندوں میں پھنسا دیا گیا۔ اس کی خدمات مختلف اداروں کے لیے مستعار لی جاتی رہیں۔ وہ ایک شہر سے دوسرے شہر' ایک ادارے سے دوسرے ادارے کی میزیں سجاتا رہا۔ اس کے قدموں کو کسی جگہ ٹھہرنے کی اجازت نہیں تھی۔ غالباً خفیہ اداروں کی

غزل

جز ترے کوئی بھی دن رات نہ جانے میرے
تو کہاں ہے مگر اے دوست پرانے میرے
شمع کی لو تھی کہ وہ تو تھا مگر ہجر کی رات
دیر تک روتا رہا کوئی سرہانے میرے
آج اک اور برس بیت گیا اس کے بغیر
جس کے ہوتے ہوئے ہوتے تھے زمانے میرے
لٹ کے بھی خوش ہوں کہ اشکوں سے بھرا ہے دامن
دیکھ غارت گر دل یہ بھی خزانے میرے
چارہ گر یوں تو بہت ہیں مگر اے جان فراز
جز ترے اور کوئی زخم نہ جانے میرے

رپورٹیں یہ بتا رہی تھیں کہ وہ ایک خطرناک آدمی ہے' اسے پریشان رکھا جائے۔

ایک طرف وہ اپنی پریشانیوں کے دریا میں غوطے کھا رہا تھا دوسری طرف بھٹو صاحب پر قتل کا مقدمہ چل چکا تھا۔ اخباروں میں چھپنے والی خبریں اسے بے چین کیے ہوئے تھیں۔ وہ اپنی آگ بجھانے میں مصروف تھا اور دوسری طرف ملک میں شعلے بلند ہو رہے تھے۔ وہ نہ ایک آگ پر قادر تھا نہ دوسری آگ پر۔ اس کے تعلقات کا کشکول خالی پڑا تھا۔ مصیبت ایسی تھی کہ کوئی کام نہیں آسکتا تھا۔ بوٹوں کی دھمک میں کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

وہ سمجھ رہا تھا ہر طوفان کی طرح یہ طوفان بھی گزر جائے گا لیکن اسے تو ہوش جب آیا جب اس کے ہیرو کو پھانسی کا حکم سنا دیا گیا۔ بہت سے دوسروں کی طرح اسے بھی یقین تھا کہ عین وقت پر کوئی معجزہ ظہور پذیر ہوگا لیکن سب آنکھیں دیکھتی رہ گئیں۔

ستم کا آشنا تھا وہ سبھی کے دل دکھا گیا
کہ شام غم تو کاٹ لی سحر ہوئی چلا گیا
ہوائے ظلم سوچتی ہے کس بھنور میں آگئی
وہ اک دیا بجھا تو سیکڑوں دیے جلا گیا
سکوت میں بھی اس کے اک ادائے دلنواز تھی
وہ یار کم سخن کئی حکایتیں سنا گیا
اب اک ہجوم عاشقاں ہے ہر طرف رواں دواں
وہ ایک رہ نورد خود کو قافلہ بنا گیا
دلوں سے وہ گزر گیا شعاع مہر کی طرح

خراج

احمد فراز کا مجموعہ ''تنہا تنہا'' شاعری ہے۔ شعر کی تلاش نہیں۔ ان کے کلام میں خیال اور جذبے کا قالب اور شعر اور لباس الگ الگ دکھائی نہیں دیتے' آپس میں پیوست ہیں۔ شاعر کو یہ بات تب نصیب ہوتی ہے جب اس کا جذبہ اور اس کا فن دونوں یکساں پرخلوص اور سچے ہوں۔ یہی خلوص' گداز اور سچائی احمد فراز کے کام کی امتیازی خصوصیات ہیں۔

(فیض احمد فیض)

دوشعر

سلسلے توڑ گیا وہ سبھی جاتے جاتے
ورنہ اتنے تو مراسم تھے کہ آتے جاتے
شکوۂ ظلمت شب سے تو یہ بہتر تھا فراز
اپنے حصے کی کوئی شمع جلاتے جاتے

گھنے اداس جنگلوں میں راستہ بنا گیا
کبھی کبھی تو یوں ہوا ہے اس ریاض دہر میں
کہ ایک پھول گلستاں کی آبرو بچا گیا
شریک بزم دل بھی ہے چراغ بھی ہیں پھول بھی
مگر جو جانِ انجمن تھا' وہ کہاں چلا گیا
اٹھو ستم زدہ چلیں' یہ دکھ کڑا سہی مگر
وہ خوش نصیب ہے یہ زخم جس کو راس آ گیا
یہ آنسوؤں کے ہار خوں بہا نہیں ہیں دوستو
کہ وہ تو جان دے کے قرض دوستاں چکا گیا

وہ اپنے ہیرو کا مرثیہ لکھ چکا تو اس کے طیش نے اسے آواز دی۔ اندھیری رات کے ایک روشن لمحے میں اس نے کاغذ پر دل کا زہر اتار دیا۔ ایک نظم وجود میں آ گئی جس میں ایک مصرع یہ بھی تھا۔

''پیشہ ور قاتلو' تم سپاہی نہیں''

اس پر غضب یہ ہوا کہ اس نے یہ نظم دوستوں کو سنا بھی دی۔ کسی کے ذریعے یہ سرکاری حلقوں تک پہنچ گئی۔ ایک روز ایک فوجی جیپ اس کے گھر کے سامنے آ کر رکی۔ صدیق سالک اور کرنل محمد خان اس سے ملنے آئے تھے۔ اس کا دل تو دھڑکا لیکن یہ دونوں ادیب بھی تھے اور اس کے شناسا بھی۔ تپاک سے ملے' کچھ دیر کی باتوں کے بعد وہ دونوں اصل مطلب پر آ گئے۔

''آپ نے ان دنوں ایک نظم لکھی ہے۔''

''میں تو روز ہی لکھتا ہوں۔ آپ کس نظم کی بات کر رہے ہیں؟''

''وہ جس کا عنوان آپ نے ''پاک فوج کو سلام'' رکھا ہے۔''

''جی جہاں لکھی تو ہے اور جہاں تک یاد آتا ہے ایک آدھ جگہ پڑھ بھی دی ہے۔''

''اس نظم کی ایک نقل اگر آپ ہمیں فراہم کر دیں تو مہربانی ہوگی۔''

''خیریت تو ہے' کیا جی ایچ کیو میں کوئی مشاعرہ ہو رہا ہے؟''

''ہماری منسٹری اس نظم کا جائزہ لے گی کہ اس میں کیا کہا گیا ہے؟''

''ایک شاعر کیا کہہ سکتا ہے' حق کے سوا۔''

''فراز صاحب' ہمیں اوپر سے حکم ہوا ہے۔ ہم مجبور ہیں۔ ایک رسمی سی کارروائی ہے' ہم کوشش کریں گے کہ آپ سے باز پرس نہ کی جائے۔''

فراز نے وہ نظم ان کے حوالے کر دی اور وہ دونوں حضرات چلے گئے۔ ان کے چلے جانے کے بعد کچھ دیر وہ اس پوری کارروائی پر غور کرتا رہا اور یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا کہ جو ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا' پریشان ہونے سے کیا فائدہ! اسے اس وقت قتیل شفائی کی طرف جانا تھا۔ وہ تیار ہوا اور گھر سے نکل گیا۔

اس واقعے کو کئی دن گزر گئے تھے کہ ایک روز اس کے ایک دوست ایوب مرزا اس کے پاس آئے۔ وہ صرف آئے نہیں تھے بلکہ ایک اطلاع بھی اپنے ساتھ لائے تھے۔

''فراز' تم محتاط رہو۔ اپنی سرگرمیاں بھی کچھ کم کر دو۔ ملٹری انٹیلی جنس تمہارے پیچھے لگی ہوئی ہے۔''

''میرے پیچھے کیوں لگی ہوئی ہے' میں کیا کرتا پھر رہا ہوں؟''

''تم جو نظمیں لکھ رہے ہو' وہ جرم کیا کم ہے؟''

''یار' یہ مارشل لا والے کیا ذہنوں کو بھی پابند کریں گے؟''

''وہ تو جو کریں گے' وہ کریں گے' تم کچھ دنوں محفلوں سے گریز کرو۔ لوگ تم سے فرمائش کرتے ہیں اور تم وہ نظمیں سنا ڈالتے ہو' جو اہلِ اقتدار کو ناپسند ہیں۔''

''چلو' کچھ دنوں کے لیے اپنی زبان سی لیتے ہیں۔''

کچھ دن اور گزر گئے۔

ایک دن وہ اور سیف الدین سیف شالیمار ریکارڈنگ کمپنی گئے ہوئے تھے۔ واپسی میں گاڑی سے اتر رہے تھے کہ

کہیں چھپی ہوئی پولیس نے چاروں طرف سے گاڑی کو گھیر لیا۔ فوجی حکومت ہو اور صرف پولیس آئے، یہ کیسے ہوسکتا تھا۔ تعاقب میں ایک فوجی جیپ بھی تھی۔ اس کے رکتے ہی کھٹاک سے ایک میجر رینک کا افسر نیچے اترا اور فراز کے سامنے آگیا۔

''آپ احمد فراز ہیں؟''

''جی، میرا ہی نام احمد فراز ہے۔''

''آپ زیرِ حراست ہیں۔''

''کوئی وارنٹ ہے آپ کے پاس؟''

''جی، یہ آپ کی گرفتاری کا وارنٹ ہے۔'' اس نے دور سے ایک کاغذ دکھایا۔

''مجھے کیا کرنا ہوگا میجر صاحب؟''

''آپ گاڑی میں بیٹھ جائیں باقی کام ہم خود کرلیں گے۔''

سیف الدین سیف الگ کھڑے یہ تماشا دیکھ رہے تھے لیکن ظاہر ہے کچھ بول نہیں سکتے تھے۔ وہ یہی کرسکتے تھے کہ فراز کے گھر والوں اور دوسرے احباب کو اس گرفتاری سے آگاہ کردیں۔

فراز کو ایک گاڑی میں بٹھادیا گیا۔ اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی تاکہ وہ یہ نہ دیکھ سکے کہ اسے کہاں لے جایا جارہا ہے۔ یہ گاڑی چلی اور مختلف سڑکوں پر سے ہوتی ہوئی گزری تو کسے معلوم تھا، اس گاڑی میں ملک کا بہت بڑا شاعر احمد فراز جارہا ہے اور وہ بھی ایک قیدی کی صورت میں۔

اس کی آنکھوں کی پٹی کھلی تو اس نے خود کو ایک چھوٹے سے تہ خانے میں دیکھا۔ آنکھیں کچھ دیکھنے کے قابل ہوئیں تو اس نے دیکھا۔ ایک طرف چبھنے والی تاروں کا بستر پڑا ہے۔ کچھ ایسے آلات ہیں جن سے مجرموں پر تشدد کیا جاتا ہوگا۔ ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پڑی تھی۔ اس کے محافظ اسے یہاں چھوڑ کر کمرا باہر سے بند کرکے چلے گئے تھے۔ کمرے میں تعفن اور تنہائی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہ سوچ رہا تھا، اسے یہاں کیوں لایا گیا ہے۔ اگر اس نے کوئی نظم لکھی بھی ہے تو وہ کوئی غیر ملکی جاسوس تو نہیں ہے۔ کوئی عام جیل بھی اس کا مقدر بن سکتی تھی۔ پھر اس نے سوچا، شاید ان لوگوں کو کوئی غلط فہمی ہوگی لیکن نہیں، میجر نے اس کا نام پوچھ کر تصدیق کرلی تھی۔ اس تصدیق کے بعد کسی غلط فہمی کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ یہ لوگ حضور احمد فراز ہی کو یہاں لائے ہیں اور وجہِ گرفتاری وہی نظم بنی ہے۔

اندھیرا ہوگیا تھا۔ رات آگئی۔ بستر کو ہاتھ نہیں لگایا جارہا تھا۔ نکلے ہوئے تار بدن کو چھید ڈالتے۔ وہ آنکھوں سے اندھیرے میں دراڑیں ڈالتا ہوا کرسی تک پہنچا اور یہ یقین کرنے کے بعد کہ وہ گرے گی نہیں، اس پر بیٹھ گیا۔ ذہن طرح طرح کے اندیشوں میں مبتلا تھا۔ یہ کون سی جگہ ہے؟ مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟ آئندہ میرے ساتھ کیا سلوک ہونے والا ہے؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کبھی اونگھ آجاتی تھی، کبھی آنکھ کھل جاتی تھی۔ اسی عالم میں رات گزرگئی۔ رات گزرگئی ہے اس کا علم اس وقت ہوا جب کسی نے باہر سے دروازہ کھولا۔ فراز یہ سمجھنے میں حق بہ جانب تھا کہ اب اسے تہ خانے سے باہر لے جاکر کسی تشدد سے گزارا جائے گا۔ دو آدمی اندر آئے اور اسے کرسی سے اٹھ جانے کا حکم دیا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ایک نے ایک طرف سے پکڑا، دوسرے نے دوسری طرف سے۔ کمرے سے باہر لائے اور سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ ''یا خدا! کیا یہ لوگ چھت پر لے جاکر نیچے گرائیں گے؟'' لاتعداد سیڑھیاں چڑھ کر وہ چھت پر آگئے۔

رات بھر کی گھٹن کے بعد کھلی فضا ملی تھی۔ طبیعت کچھ بحال ہوئی۔ یہاں نل لگا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ منہ دھویا اور کچھ اوسان بحال ہوئے۔ سامنے ایک درخت تھا جس پر فاختہ بول رہی تھی۔ رات بھر کے بعد یہ پہلی آواز تھی جو اس نے سنی تھی۔ اس نے اس آواز کو بعد میں اپنے ایک شعر میں قلم بند بھی کیا (اس وقت جب وہ کال کوٹھری میں تھا)

ایسا سناٹا کہ جیسے ہو سکوت صحرا

غزل

اب کے تجدید وفا کا نہیں امکاں جاناں
یاد کیا تجھ کو دلائیں ترا پیماں جاناں
یونہی موسم کی ادا دیکھ کے یاد آیا ہے
کس قدر جلد بدل جاتے ہیں انساں جاناں
دل یہ کہتا ہے کہ شاید ہو فسردہ تو بھی
دل کی کیا بات کریں دل تو ہے ناداں جاناں
اول اول کی محبت کے نشے یاد تو کر
بے پیئے بھی ترا چہرہ تھا گلستاں جاناں
مدتوں سے یہی عالم نہ توقع نہ امید
دل پکارے ہی چلا جاتا ہے جاناں جاناں
اب ترا ذکر بھی شاید ہی غزل میں آئے
اور سے اور ہوئے درد کے عنواں جاناں
ہوش آیا تو سبھی خواب تھے ریزہ ریزہ
جیسے اڑتے ہوئے اوراق پریشاں جاناں

اتنی تاریکی کہ آنکھوں نے دہائی دی ہے
درِ زنداں سے پرے کون سے منظر ہوں گے
مجھ کو دیوار ہی دیوار دکھائی دی ہے
دور اک فاختہ بولی ہے سرِ شاخِ شجر
پہلی آواز محبت کی سنائی دی ہے

ان دو آدمیوں میں سے ایک اس کے قریب آیا اور اِدھر اُدھر دیکھ کر سرگوشی کے انداز میں اس سے مخاطب ہوا۔

''اب تمہیں یہاں سے لے جایا جائے گا۔ کسی کو پیغام وغیرہ دینا ہے تو دے دیں، پہنچا دوں گا۔''

''میرا کوئی ہے ہی نہیں۔ مجھے کس کو پیغام دینا ہے مگر یہ تو بتاؤ مجھے کہاں لے جایا جائے گا؟''

''بس جی، کہیں لے جا رہے ہیں۔'' اس نے کہا اور دور ہٹ گیا۔

تھوڑی دیر بعد دو آدمی اور آ گئے۔ انہوں نے تلاشی لی۔ بٹوا لے لیا البتہ گھڑی اور سگریٹ کا پیکٹ رہنے دیا۔ اس وقت دن کے بارہ بج رہے تھے۔ اس کی آنکھوں پر ایک مرتبہ پھر پٹی باندھ دی گئی۔ انہی سیڑھیوں سے نیچے لایا گیا اور ایک ٹرک پر بٹھا دیا گیا۔ ٹرک اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔

وقت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ تقریباً ڈھائی گھنٹے گزر چکے ہیں کہ ٹرک کے رکنے کا احساس ہوا۔ پھر کچھ لوگوں نے اسے نیچے اترنے میں مدد دی۔ آنکھوں پر پٹی اب بھی بندھی ہوئی تھی۔ اسے ایک جگہ پہنچا دیا گیا۔ یہاں سلاخیں تو تھیں لیکن تازہ ہوا آ رہی تھی۔ اس نے موقع دیکھ کر ایک گارڈ سے پوچھا کہ یہ کون سی جگہ ہے۔ اسے معلوم ہوا کہ یہ اٹک کے قریب فوجی مرکز میں واقع مانسر کیمپ ہے اور یہاں اسے قیدِ تنہائی میں رہنا ہے۔ وہ گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا تھا کہ ایک میجر آیا اور کچھ دیر اسے عجیب نظروں سے دیکھتا رہا۔

''آپ احمد فراز ہیں؟''

''کیا آپ کو نہیں بتایا گیا کہ نیا مہمان کون ہے؟''

''مجھے کہا گیا ہے کہ ہندوستان کا ایجنٹ بھیج رہے ہیں۔''

''آپ خود دیکھ لیں کہ میں ہندوستان کا ایجنٹ ہوں یا اس ملک کا شاعر۔''

''واقعی۔'' اس کے لہجے میں افسوس تھا۔

''آپ شاعر ہیں۔ وقت گزاری کے لیے کتابوں کی خواہش ہو گی۔ میں آپ کے لیے کتابوں کا بندوبست کرتا ہوں۔ ریڈیو درکار ہو تو وہ بھی بتائیے۔''

''بس کتابیں اور کچھ کاغذ لا دو۔ ریڈیو کی ضرورت نہیں، قلم میری جیب میں ہے۔''

وہ چلا گیا۔ اس نے وعدے کے مطابق کچھ کتابیں لا کر دیں۔ وہ میجر اچھا ادبی ذوق رکھتا تھا لہٰذا کبھی کبھی چلا آتا تھا اور ادب پر گفتگو کرتا تھا۔ اس کی مہربانی کو دیکھتے ہوئے گارڈ وغیرہ بھی نرم پڑ گئے تھے ورنہ یہ قیدِ تنہائی مزید زہر بن جاتی۔

سب کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ ہندوستان کا ایجنٹ نہیں، احمد فراز ہے اس لیے اسے کچھ رعایتیں ملنے لگی تھیں۔ گارڈز اور دوسرے لوگوں کو قیدیوں سے بات کرنے کی ممانعت تھی لیکن اس کے ساتھ یہ پابندی بھی روا نہیں رکھی گئی۔ اس کے علاوہ کوئی ایسی چیز جس سے قیدی خود کو نقصان پہنچا سکے، رکھنے پر پابندی تھی۔ شیو کرنے نائی استرا لے کر آتا تھا لیکن اسے کیمپ کمانڈنٹ نے اپنی شیونگ کٹ دی ہوئی تھی۔ یہ سہولتیں اپنی جگہ تھیں لیکن وہ اس قیدِ تنہائی میں اپنے مستقبل کے انتظار میں تھا۔ یہ لوگ کب تک مجھے یہاں رکھیں گے؟ میری شنوائی ہو گی بھی یا نہیں؟ کسی کو نہیں معلوم کہ میں کہاں ہوں۔ میری رہائی کا بندوبست کیا ہو گا؟ صرف سیف الدین سیف تھے جو اس کی گرفتاری کے واحد گواہ تھے۔ اس کو انہی سے کچھ امید تھی کہ انہوں نے احباب میں ذکر کیا ہو گا۔ شاید وہی کوئی کارروائی کریں۔ ایک موہوم سی امید تھی یا پھر اس کی فطری بذلہ سنجی جو اسے تر و تازہ رکھے ہوئے تھی۔

سیف الدین سیف نے اس موقع پر دوست ہونے کا حق ادا کر دیا۔ انہوں نے تمام قابلِ ذکر اور بااثر دوستوں کو اطلاع کر دی تھی۔ ان لوگوں نے اپنے اپنے طور پر فراز کو تلاش کرنے اور اس سے ملنے کی کوشش کی۔ انہیں یہ تو معلوم ہو گیا کہ اسے مانسر کیمپ میں رکھا گیا ہے لیکن اس سے ملاقات کی کوشش میں کوئی بھی کامیاب نہیں ہوا۔ قیدِ تنہائی کے قیدی کو کسی سے ملنے کی اجازت نہیں ہوتی۔

جب یہ احباب اس سے ملنے کی کوششوں میں ناکام ہو گئے تو سیف الدین سیف نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا اور ملزم احمد فراز کو گرفتار کرنے اور عدالت میں پیش کیے بغیر حبس بے جا میں رکھنے کے خلاف حکومت پر مقدمہ کر دیا۔

جسٹس افضال ظلہ کی عدالت میں اس مقدمے کی سماعت شروع ہو گئی اور جب فراز کے بیان کی ضرورت پڑی تو اسے اٹک سے لاہور لایا گیا۔ بند کمرے میں سماعت ہوئی۔ سماعت کے موقع پر احمد ندیم قاسمی، کشور ناہید، یوسف کامران، سیف الدین سیف سمیت اور کئی احباب موجود تھے۔

ملزم کوئی اور نہیں احمد فراز تھا۔ جسٹس افضل ظلہ کے لیے بھی وہ اجنبی نہیں تھا۔ لاہور شہر جہاں اس کا بیان ریکارڈ ہو رہا تھا، اس کی شاعری کا گواہ تھا اور پھر اس کا جرم بھی اتنا بڑا نہیں تھا جتنی بڑی اسے سزا مل رہی تھی۔ جسٹس افضل ظلہ، اس سے بڑے احترام سے ملے۔ اس کا بیان ریکارڈ کیا۔ کچھ سوال جواب کیے۔

"مقدمے کی سماعت تک آپ کو ان لوگوں کی حراست میں رہنا ہوگا۔" بیان کے بعد جسٹس افضل ظلہ نے کہا۔

"میں تو یہ سوچنے لگا تھا کہ مجھے ہمیشہ ان لوگوں کی حراست میں رہنا ہوگا۔"

"آپ وہاں رہے تو ہماری غزل کا کیا ہوگا؟"

اس خوش گوار جملے کے بعد اسے یقین ہو گیا تھا کہ اس کی رہائی قریب ہے۔ وہاں موجود احباب نے بھی اسے تسلی دی لیکن کھٹکا پھر بھی تھا کہ دیکھیے سرکار کی طرف سے مزید کیا احکام آتے ہیں۔ اسے پھر ٹرک میں بٹھایا گیا اور اٹک کے مانسر کیمپ میں بھیج دیا گیا۔

جیل میں کیمپ کمانڈنٹ یا کسی اور ذریعے سے اسے اخبار مل جاتا تھا۔ اخبار کے ذریعے اسے معلوم ہو جاتا تھا کہ اس کے کیس کی سماعت ہو رہی ہے۔ اسے فیصلے کا انتظار تھا اور خبریں صرف یہ چھپ رہی تھیں "احمد فراز کیس کی سماعت ہوئی۔"

اسے اخبار سے معلوم ہو گیا تھا کہ اس کے مقدمے کا فیصلہ ہونے والا ہے لیکن دوسرے دن کا اخبار ہی اسے نہیں ملا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اگر رہائی کا فیصلہ ہو گیا ہوتا تو یہ لوگ مجھے یہاں سے نکال دیتے، یقیناً کوئی گڑبڑ ہے۔ وہ سلاخوں سے آنکھیں لگائے بیٹھا تھا کہ اسے جیل میں اخبار لانے والا ہاکر نظر آیا۔ اس نے آواز دے کر اسے بلایا۔ کوئی اور قیدی اگر آواز دیتا تو ہاکر اس کی پروا بھی نہیں کرتا لیکن ہاکر کو معلوم تھا کہ وہ احمد فراز ہے اور اخبار اسے ملتا بھی ہے۔ اس نے اخبار اسے دے دیا۔ فراز نے اخبار دیکھنا شروع کیا۔ اس میں اس کی رہائی کی خبر چھپی تھی۔ "فراز کو عدالت نے رہا کرنے کا حکم دے دیا۔" اس خبر کو پڑھتے ہی اس نے کیمپ کمانڈنٹ کو بلایا۔

"میری رہائی کا حکم صادر ہو چکا ہے اور آپ لوگوں نے مجھے بتایا ہی نہیں۔ آپ توہینِ عدالت کے مرتکب ہوئے ہیں۔"

"ہم جی ایچ کیو کے حکم کے منتظر ہیں۔ وہاں سے جو آرڈر آئے گا اس پر عمل ہوگا۔"

غزل

سنا ہے لوگ اسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں
سو اس کے شہر میں کچھ دن ٹھہر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے درد کی گاہک ہے چشم ناز اس کی
سو ہم بھی اس کی گلی سے گزر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے ربط ہے اس کو خراب حالوں سے
سو اپنے آپ کو برباد کرکے دیکھتے ہیں
سنا ہے اس کو بھی ہے شعر و شاعری سے شغف
سو ہم بھی معجزے اپنے ہنر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے بولے تو باتوں سے پھول جھڑتے ہیں
یہ بات ہے تو چلو بات کرکے دیکھتے ہیں
سنا ہے دن کو اسے تتلیاں ستاتی ہیں
سنا ہے رات کو جگنو ٹھہر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے حشر ہیں اس کی غزال سی آنکھیں
سنا ہے اس کو ہرن دشت بھر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے اس کی سیہ چشمگی قیامت ہے
سو اس کو سرمہ فروش آہ بھر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے آئینہ تمثال ہے جبیں اس کی
جو سادہ دل ہیں اسے بن سنور کے دیکھتے ہیں
سنا ہے اس کے لبوں سے گلاب جلتے ہیں
سو ہم بہار پہ الزام دھر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے اس کے بدن کی تراش ایسی ہے
کہ پھول اپنی قبائیں کتر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے اس کے شبستاں سے متصل ہے بہشت
مکیں ادھر کے بھی جلوے ادھر کے دیکھتے ہیں
رکے تو گردشیں اس کا طواف کرتی ہیں
چلے تو اس کو زمانے ٹھہر کے دیکھتے ہیں
کہانیاں ہی سہی سب مبالغے ہی سہی
اگر وہ خواب ہے، تعبیر کرکے دیکھتے ہیں
اب اس کے شہر میں ٹھہریں کہ کوچ کر جائیں
فراز آؤ ستارے سفر کے دیکھتے ہیں

"جی ایچ کیو کیا عدالت کے حکم کے بغیر مجھے یہاں رکھے گا؟"

"دیکھیے، کیا ہوتا ہے؟"

کمانڈنٹ چلا گیا۔ سناٹا پھر پھیل گیا لیکن جلد ہی تالے کھل گئے۔ اسے چند فوجیوں نے پھر ٹرک پر بٹھا دیا۔ اسے کچھ نہیں بتایا گیا تھا کہ اسے کہاں لے جایا جا رہا ہے۔ کہیں ایک جیل سے دوسری جیل تو نہیں؟ اس کا دل پھر دھڑکا لیکن

نہیں، یہ ٹرک اسے راولپنڈی کے جی ایچ کیو لایا تھا۔ اس کے سامنے کاغذ پر لکھی ایک عبارت رکھ دی گئی۔

"عدالتی حکم کے مطابق میں ضرورت پڑنے پر فوجی حکام کو دستیاب ہوں گا۔"

اس اقرار نامے پر دستخط کر دیجیے۔ اس نے اسے پڑھا اور دستخط کر دیے۔ اب وہ آزاد تھا۔ اس نے اجازت لی اور جنرل ہیڈ کوارٹر سے باہر نکل آیا۔

اس واقعے کے کچھ عرصے بعد اسے کراچی کے ایک مشاعرے میں بلایا گیا۔ یاروں نے کہا بھی کہ وہ اس مشاعرے میں غزل تک محدود رہے کوئی سیاسی نظم نہ پڑھے۔ اس نے وعدہ بھی کرلیا تھا۔ گرفتاری کے بعد وہ نوجوانوں کے لیے ہیرو بن چکا تھا لہٰذا جیسے ہی یہ معلوم ہوا کہ احمد فراز آرہے ہیں، نوجوان لڑکے اور لڑکیوں سے مشاعرہ گاہ بھر گئی۔ مشاعرہ شروع ہوا تو بار بار اس کے نام کے نعرے گونجتے رہے۔ لوگ کسی شاعر کو سننے کے موڈ میں نہیں تھے۔

مجبور ہوکر منتظمین کو اس کے مقام سے پہلے اسے بلانا پڑا۔ اسے دوستوں کی نصیحت یاد تھی۔ اس نے ہلکی پھلکی غزل شروع کی۔ اس کا احترام تھا کہ سامعین نے یہ غزل سن لی لیکن جیسے ہی غزل ختم ہوئی "پاک فوج کو سلام" کے نعرے لگنے لگے۔ یہ وہ نظم تھی جس کی پاداش میں وہ قید کاٹ کر آیا تھا۔ وہ یہ نظم کیسے پڑھ سکتا تھا۔ وہ انکار کرتا رہا، سامعین اصرار کرتے رہے بالآخر اسے مجبور ہونا پڑا۔

"ایک نظم سنیے۔ عنوان ہے "محاصرہ"۔" اس نے نظم شروع کی۔

مرے غنیم نے مجھ کو پیام بھیجا ہے
کہ حلقہ زن ہیں مرے گرد لشکری اس کے
فصیلِ شہر کے ہر برج ہر منارے پر
کماں بدست ستادہ ہیں عسکری اس کے
وہ برق لہر بجھا دی گئی ہے جس کی تپش
وجودِ خاک میں آتش فشاں جگاتی تھی
بچھا دیا گیا بارود اس کے پانی میں
وہ جوئے آب جو میری گلی کو آتی تھی
سبھی دریدہ دہن اب بدن دریدہ ہوئے
سپردِ دار و رسن سارے سر کشیدہ ہوئے
تمام صوفی و سالک سبھی شیوخ و امام
امیدِ لطف پہ ایوانِ کج کلاہ میں ہیں
معززینِ عدالت بھی حلف اٹھانے کو
مثالِ سائلِ مبرم نشستہ راہ میں ہیں
تم اہلِ حرف کہ پندار کے ثنا گر تھے
وہ آسمانِ ہنر کے نجوم سامنے ہیں
بس اس قدر تھا کہ دربار سے بلاوا تھا
گداگرانِ سخن کے ہجوم سامنے ہیں
قلندرانِ وفا کی اساس تو دیکھو
تمہارے ساتھ ہے کون آس پاس تو دیکھو
سو شرط یہ ہے، کہ جو جان کی امان چاہتے ہو
تو اپنے لوح و قلم قتل گاہ میں رکھ دو
وگرنہ اب کے نشانہ کمانداروں کا
بس ایک تم ہو سو غیرت کو راہ میں رکھ دو
یہ شرط نامہ جو دیکھا تو ایلچی سے کہا
اسے خبر نہیں تاریخ کیا سکھاتی ہے
کہ رات جب کسی خورشید کو شہید کرے
تو صبح اک نیا سورج تراش لاتی ہے
سو یہ جواب ہے میرا مرے عدو کے لیے
کہ مجھ کو حرصِ کرم ہے نہ خوفِ خمیازہ
اسے ہے سطوتِ شمشیر پر گھمنڈ بہت
اسے شکوہِ قلم کا نہیں ہے اندازہ
مرا قلم نہیں کردار اس محافظ کا
جو اپنے شہر کو محصور کر کے ناز کرے
مرا قلم نہیں اوزار اس نقب زن کا
جو اپنے گھر ہی کی چھت میں شگاف ڈالتا ہے
مرا قلم نہیں اس دزدِ نیم شب کا رفیق
جو بے چراغ گھروں پر کمند ڈالتا ہے
مرا قلم نہیں میزان ایسے عادل کی
جو اپنے چہرے پہ دہرا نقاب ڈالتا ہے
مرا قلم نہیں تسبیح اس مبلغ کی
جو بندگی کا بھی ہر دم حساب رکھتا ہے
مرا قلم تو عدالت مرے ضمیر کی ہے
اسی لیے تو جو لکھا تپاکِ جاں سے لکھا
جبھی تو لوچ کماں کا زبان تیر کی ہے
میں کٹ گروں کہ سلامت رہوں یقیں ہے مجھے
کہ یہ حصارِ ستم کوئی تو گرائے گا
تمام عمر کی ایذا نصیبوں کی قسم
مرے قلم کا سفر رائگاں نہ جائے گا

......☆......

مشاعرہ ختم ہونے کے بعد وہ اپنے ہوٹل پہنچ کر سونے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ ہوٹل کی انتظامیہ نے اسے نیچے بلایا۔ صبح کی سپیدی نمودار ہوچکی تھی۔ وہ حیران تھا کہ اسے نیچے کیوں بلایا گیا ہے۔ اس کی یہ حیرانی نیچے پہنچتے ہی دور ہوگئی۔ سرکاری اہلکار اس کے منتظر تھے اور اسے یہ اطلاع دے رہے تھے کہ اس کے صوبہ بدری کے احکامات جاری ہوچکے ہیں۔ اسے یہ احکامات دکھائے بھی گئے اور اسے حکم دیا گیا کہ وہ فوری طور پر یہاں سے نکل جائے۔ اس نے پھر شکر بھیجا کہ اس کی گرفتاری کے احکام نہیں آئے، صرف صوبہ بدر کیا جارہا ہے۔ اسے یہاں کون سا عمر بھر رہنا تھا۔ کچھ مشاعرے اور تھے جو پڑھنے تھے۔ دو چار دن احباب کے ساتھ گزارنے تھے، نہ سہی۔ اس نے اپنا سامان باندھ ضرور لیا لیکن اسے افسوس تھا کہ اس کے اپنے ہی ملک کے ایک صوبے کے دروازے اس پر بند کیے جارہے ہیں۔ وہ تو محض شاعر ہے اور وہ بھی محبت بانٹنے والا شاعر۔ نہ وہ سیاست داں ہے نہ کرسی و اقتدار اس کی طلب۔ پھر یہ حکومت اس سے اتنی خائف کیوں ہے؟

وہ جو کہتے ہیں، بلاؤں نے گھر دیکھ لیا ہے۔ یہی اس کے ساتھ ہورہا تھا۔ اس کے گرد شکنجہ کسا جانے لگا۔ کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو ہر حکومت کے ساتھ ہوتے ہیں اور اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔ انہوں نے حکومت کا رخ اس کی طرف سے بدلا ہوا دیکھا تو اس کے نظریات کے خلاف آواز اٹھانے لگے۔ اس کے ایسے اشعار ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے جانے لگے جن کی تشریح میں مذہب پر کوئی چوٹ پڑتی تھی یا ان کی تشریح اس طرح کی گئی کہ وہ مذہب کے خلاف نظر آنے لگے۔ اس طرح ایک محاذ اس کے خلاف اور کھل گیا۔ ایک ایسی فضا بنادی گئی جس میں یہ نظر آنے لگا کہ احمد فراز شعائر دین کا مذاق اڑاتا ہے۔ پاکستان میں رہ کر اسلامی آئیڈیالوجی کے خلاف باتیں کرتا ہے۔ اس پر ہر طرف سے تیروں کی بوچھار ہونے لگی۔ اس میں اپنے بھی شامل تھے، پرائے بھی۔ اس پر ذرائع ابلاغ کے دروازے بند ہوگئے۔

اب وہ سنجیدگی سے اپنے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ وہ اول و آخر غزل کا شاعر تھا لیکن اسے زبردستی مزاحمتی شاعری کی طرف دھکیلا جارہا تھا۔ وہ سمجھنے لگا تھا کہ اسے دیوار سے لگایا جارہا ہے۔ اس کے گرد مخالفتوں کی گرفت سخت ہوتی جارہی ہے۔ اس کے دشمن کسی ایسے موقع کے انتظار میں ہیں جب کوئی سخن کڑوا اس کے لبوں تک آئے اور اسے حوالۂ زنداں کردیا جائے۔ اگر ایسا نہ بھی ہوا تو اظہار رائے پر پابندی تو یقینی ہے۔ یہ بھی سانس بند کردینے کے مترادف

غزل

قربتوں میں بھی جدائی کے زمانے مانگے
دل وہ بے مہر کہ رونے کے بہانے مانگے

ہم نہ ہوتے تو کسی اور کے چرچے ہوتے
خلقت شہر تو کہنے کو فسانے مانگے

یہی دل تھا کہ ترستا تھا مراسم کے لیے
اب یہی ترک تعلق کے بہانے مانگے

اپنا یہ حال کہ جی ہار چکے لٹ بھی چکے
اور محبت وہی انداز پرانے مانگے

زندگی ہم ترے داغوں سے رہے شرمندہ
اور تو ہے کہ سدا آئینہ خانے مانگے

ہوگا۔ اس سے پہلے کہ ایک صوبے کی طرح مجھے ملک بدر کردیا جائے، میں خود ہی یہاں سے نکل جاؤں۔ جو میری قدر نہیں کرتے، میں ان کی پروا کیوں کروں؟

اس نے خود ساختہ جلاوطنی کا فیصلہ کرلیا تھا لیکن یہ فیصلہ اتنا آسان نہیں تھا۔ اپنا ملک چھوڑنا اور وہ بھی بے بسی اور مجبوری میں کوئی مذاق نہیں۔ اس مجبوری کا اظہار اس نے اپنی کئی نظموں میں کیا۔

اور ترے شہر سے جب رخت سفر باندھا تھا
در و دیوار پہ حسرت کی نظر کیا کرتے
چاند کجلائی ہوئی شام کی دہلیز پہ تھا
اس گھڑی بھی ترے مجبور سفر کیا کرتے
دل ٹھہر جانے کو کہتا تھا مگر کیا کرتے

......☆......

یہ آخری ساعت شام کی ہے
یہ شام جو ہے مہجوری کی
یہ شام اپنوں سے دوری کی
اس شام افق کے ہونٹوں پر
جو لالی ہے، زہریلی ہے
اس شام نے میری آنکھوں سے
(صہبائے طرب
سب پی لی ہے
یہ شام غضب تنہائی کی
پت جھڑ کی ہوا برفیلی ہے
اس شام کی رنگت پیلی ہے

......☆......

اس پہلی شام میں وہ برطانیہ پہنچ گیا۔ وہاں اس کے

نکلنا اک اخبار کا

مولانا ان دنوں بالی گنج میں رہتے تھے۔ بڑی خوش قطع کوٹھی تھی۔ بیچ میں گھاس کا ایک قطعہ ایک طرف البلاغ پریس دوسری طرف مولانا کا سکونتی مکان۔ پریس مدت سے بند پڑا تھا لیکن اس کے عملے کے بہت سے لوگ ابھی تک مولانا کے ساتھ تھے۔ مولوی عبدالحق ملیح آبادی بھی ان دنوں انہی کے پاس رہتے تھے اور شاید جب سے وہ مصر سے آئے تھے ان کا قیام وہیں تھا۔ میرے ساتھ غلام احمد جامعی بھی تھے جو کلکتہ کے کئی اخباروں میں کام کر چکے تھے۔ ہم دونوں اپنے بعض مضامین ساتھ لے گئے تھے۔ مولانا نے انہیں دیکھنے کے لیے رکھ لیا پھر دیر تک ہم دونوں کے حالات پوچھتے رہے۔

دوسرے تیسرے دن پھر بلایا اور کہنے لگے "میرے بھائی دس پندرہ دن تک اخبار نکال لینا چاہتا ہوں۔ تم سے یہ تو نہیں ہوسکتا کہ تم تمام اطراف سے انقطاع کر کے اپنے اوقات اسی ایک کام کے لیے وقف کردو کیونکہ تمہاری دوسری مصروفیات بھی ہیں اور انہیں بھی بہر حال جاری رہنا چاہیے البتہ تمہیں ہر صبح کو اڑھائی تین گھنٹے یہاں کام کرنا ہوگا۔ خیر اوقات کا تعین بعد میں ہو جائے گا۔ فی الحال میں چاہتا ہوں کہ معاوضے کا فیصلہ ہو جائے۔"

ہم دونوں مولانا کے پرانے عقیدت مند تھے۔ "الہلال" کی اکثر عبارتیں ہمیں زبانی یاد تھیں۔ تذکرہ کے جستہ جستہ فقرے زبان پر چڑھے ہوئے تھے۔ غزل گو شاعروں میں حسرت موہانی کا کلام پسند تھا اور نثر نگاروں میں ابوالکلام کے سوا کسی کا انداز جچتا نہیں تھا۔ تذکرہ پڑھتے پڑھتے تھک جاتے تو حسرت کا کلام پڑھنا شروع کر دیتے تھے اور حسرت کے کلام سے طبیعت اکتا جاتی تھی تو یہ شعر پڑھ کر تذکرہ اٹھا لیتے تھے۔

عزیزوں نے اس کی میزبانی کی۔ اس نے وہاں جا کر سیاسی پناہ حاصل نہیں کی تھی اس لیے تقریباً ایک سال بڑی مشکل سے گزارا۔ رفتہ رفتہ اس کی جلاوطنی کی خبریں عام ہونے لگیں اور اس کے پاس مشاعروں کے دعوت نامے آنے لگے جو اس کی آمدنی کا ذریعہ بھی بنے، اس کی شہرت کا بھی اور تحصیلِ علم کا بھی۔

وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ ہوا کس رخ سے آتی ہے اس کے نام امریکا سے دعوت نامہ آیا۔ کئی شہروں میں مشاعرے تھے جن میں اسے بلایا گیا تھا۔ وہ امریکا پہنچ گیا۔ ہندوستان اور پاکستان کے کئی شعرا مدعو تھے۔ اس کو تو دیارِ غیر میں وطن میسر آ گیا۔ آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں۔ وطن کے دوست ملے تو وطن کی یادیں تازہ ہو گئیں، حالات کا علم ہوا۔ دوستوں کی موجودگی میں کچھ دیر کو اپنا غم بھول گیا۔ یہاں سے وہ افریقا کے کئی شہروں میں گیا۔ افریقی شاعروں سے ملنے کا موقع ملا۔ ان شاعروں سے مل کر اسے محسوس ہوا کہ وہ بھی اسی جیسے کرب سے گزر رہے ہیں۔ وہی نفسیاتی الجھنیں ان کے سامنے ہیں۔ وہ ان کی شاعری سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے ان کی شاعری کو اردو کے قالب میں ڈھالا۔ یہ ترجمے "سب آوازیں میری ہیں" کے نام سے سوئیڈن سے شائع ہوئے

اور اس کی تصنیفات میں ایک اور تصنیف کا اضافہ کر گئے۔ یہ اس کی دربدری کا پہلا تحفہ تھا جو کتاب کی شکل میں اسے ملا۔ اس کے بعد تو جیسے اس کی شہرت کو پر لگ گئے۔ پورے یورپ اور مشرقِ وسطیٰ تک کے ممالک اس کی آواز سے گونج گئے۔ دنیا بھر کے ادیبوں اور شاعروں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ اس کی ذہنی دنیا متنوع خیالات سے آباد ہو گئی۔ سفر وسیلۂ ظفر ہوتا ہے۔ وہ اگر یہ جلاوطنی اختیار نہ کرتا تو خیالات کو یہ وسعت نصیب نہ ہوتی۔ اس کی شاعری اب نئے ذائقوں سے واقف ہوتی جا رہی تھی۔ ان موتیوں سے اس کی کتابوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ برطانیہ کے قیام کے دوران اس نے اپنی کتاب "بے آواز گلی کوچوں میں" اپنے پڑھنے والوں کے حوالے کی۔ اسی طرح "نابینا شہر میں آئینہ" مانٹریال سے شائع ہوئی۔ وطن سے دوری کے تجربے نے اس کے رُوبرو نئے نئے دریچے کھول دیے۔ اس کی مسحور شخصیت اور شاعری نے بیرونی شعرا کو ایسا متاثر کیا کہ دنیا کی کئی زبانوں میں اس کی شاعری کے تراجم ہوئے۔ وہ قومی سے بین الاقوامی شاعر بن گیا۔

اسے یہ تمام فتوحات حاصل ہو رہی تھیں۔ وطن کے دوستوں سے رابطہ بھی رہتا تھا۔ بیرونِ ملک آنے والے

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظم حسرت میں بھی مزہ نہ رہا

اب جو مولانا نے معاوضے کا ذکر کیا تو ہم بگڑ گئے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کہیں۔ آخر مولانا نے ہمیں اس زحمت سے بچالیا یعنی خود معاوضہ متعین کر کے فرمایا ''آپ کو اتنے روپے پر کام کرنا منظور ہے۔'' یہاں قیل وقال کی جرأت کس میں تھی، ہم نے کہا ''بسروچشم!''

مولانا نے فرمایا تھا کہ اخبار دس پندرہ دن میں نکلے گا لیکن یہ دس پندرہ دن پورے ڈیڑھ مہینے میں ختم ہوئے۔ پہلے ابتدائی انتظامات مکمل ہونے میں نہ آتے تھے۔ انتظامات مکمل ہوئے تو اچھے خوشنویس نہ مل سکے۔ خوش نویس مہیا ہوئے تو کئی اور رخنے نکل آئے۔ ایک دفعہ گھبرا کے مولانا سے پوچھا کہ آخر اخبار کب تک نکلے گا؟ فرمانے لگے ''میرے بھائی' میں تو جلد نکالنا چاہتا تھا لیکن چند مراحل درپیش ہیں جو طے ہونے میں نہیں آتے 'خیر عرفت ربی بفسخ العزائم!''

مولانا نے انگریزی کے چند مضامین ترجمہ کے لیے دیے تھے۔ جب تک اخبار نہ نکلا ان مضامین کا ترجمہ ہوتا رہا۔ غلام احمد کے متعلق تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا البتہ میں نے بڑی کاوش سے ترجمہ کیا تھا اور اس میں کہیں کہیں مولانا کے اندازِ خاص کا چربا اتارنے کی کوشش کی تھی۔ اب تو یاد نہیں رہا کہ ترجمہ کیسا تھا' تتبع کامیاب تھا یا صرف ان کے طرزِ تحریر کا منہ چڑایا گیا تھا۔ ہاں مولانا کے فیض واثر سے اتنا ضرور ہوا کہ ہم دونوں کا انداز گفتگو کسی قدر بدل گیا یعنی کوئی بات ہو ہم اسے ہمیشہ ''میرے بھائی'' سے شروع کرتے ''اور تو خیر' پر ختم کر دیتے تھے۔

چراغ حسن حسرت کی کتاب ''مردہ دیدہ'' سے اقتباس

شاعروں سے ملاقاتیں بھی رہتی تھیں لیکن وطن سے دوری کا ملال اس کی رگ وپے میں طاری تھا جس کا اظہار مختلف انداز سے ہوتا رہتا تھا۔ یہ اس کی زندگی کا ایسا باب تھا جو بڑی خاموشی سے مرتب ہوتا جارہا تھا۔

اس در پہ ٹھکانا کبھی اس در پہ ہے ڈیرا
ہم خانہ بدوشوں کا یہی شام سویرا
اکیلے پن کی اذیت کا اب گلہ کیسا
فراز خود ہی تو اپنوں سے ہو گئے تھے الگ
روم کا حسن بہت دامنِ دل کھینچتا ہے
اے مری خاکِ پشاور تری یاد آئی بہت
کبھی کبھی دوریوں سے کوئی پکارتا ہے
فراز جانی' فراز پیارے' وطن میں آؤ
یہ بھی کیا کم ہے غریب الوطنی میں کہ فراز
ہم کو بے مہریِ اربابِ وطن یاد نہیں

......☆......

وہ تتلیوں کے تعاقب میں بڑی دور نکل آیا تھا لیکن ایسا نہیں تھا کہ گھر کا راستہ ہی بھول گیا ہو۔ بس ذرا رُت بدلنے کے انتظار میں تھا۔ موسم تھا کہ بدلنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ ''پڑے چھینٹا تو ہم اے داغ کلکتہ چلے جائیں'' کے مصداق وہ بھی کسی جمہوری حکومت کے انتظار میں تھا۔

برج الٹے' مہرے بدلے' بازی پلٹی۔ موسم صاف ہوا' نسیم بہار کے جھونکے رواں ہوئے تو اس نے بھی رختِ سفر باندھا اور سینہ چاکانِ چمن سے آن ملا۔

اس کے تجربے سے اس وقت کی حکومت نے فائدہ اٹھایا اور اسے نیشنل بک فاؤنڈیشن کا سربراہ بنادیا گیا۔ اب اس کے سامنے اپنی محنت کے ثمر بٹورنے کے دن تھے۔ اسے اس کی محنت کے صلے میں مختلف اوقات میں مختلف ایوارڈز سے نوازا گیا۔ 1988 میں آدم جی ادبی ایوارڈ ملا۔ اسی سال اسے بھارت میں ''فراق گورکھپوری ایوارڈ'' سے نوازا گیا۔ 1990ء میں اباسین ایوارڈ حصے میں آیا۔ اکیڈمی آف اردو لٹریچر (کینیڈا) نے اسے 1991ء میں ایوارڈ دیا۔

دو جمہوری حکومتیں یکے بعد دیگرے آئیں اور چلی گئیں اور ایک مرتبہ پھر جنرل پرویز مشرف کی صورت میں فوجی حکومت آ گئی۔ یاروں کا دل پھر دھڑکا کہ فراز کی شاعری کا رخ ایک مرتبہ پھر پلٹ جائے گا لیکن غیر متوقع طور پر وہ جنرل پرویز مشرف کی تعریف کرتا نظر آیا۔ محفلِ یاراں میں اس کا یہ قول بہت دن تک گونجتا رہا کہ پاکستان کو پرویز

مشرف جیسے حکمراں کی ضرورت تھی۔ اس کے ہم خیال اسے ضیاالحق کا دور یاد دلاتے تھے کہ جب وہ گرفتار ہوا تھا اور جلاوطنی اختیار کی تھی۔ اپنے دفاع میں اس کے پاس اس کی بھی دلیلیں تھیں۔

''میں ضیاالحق کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ جنرلوں' جنرلوں میں بھی فرق ہوتا ہے۔ پرویز مشرف فوجی ضرور ہیں لیکن فوجی ہونا بری بات نہیں۔''

''تم تو کہتے تھے جرنیل سب ایک طرح کے ہوتے ہیں؟''

''میں غلطی پر تھا۔ اچھے برے سب جگہ ہوتے ہیں۔''

وہ باقاعدہ حمایت پر اتر آتا اور ایسی ایسی دلیلیں پیش کرتا کہ سب کولا جواب کر دیتا۔

روٹھنے اور منانے کی عادتیں اس میں ہمیشہ سے تھیں۔ اب ان میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔ وہ خود ہی دوستوں سے جھگڑتا' کچھ دن روٹھا رہتا اور پھر خود ہی انہیں منانے پہنچ جاتا ہے۔ عشق میں بھی اس کا یہی احوال تھا۔ اس کے عشق فلرٹ کی حد تک پہنچ گئے تھے۔ کچھ دن ایک عشق میں مبتلا رہتا اور پھر دوسری طرف اس تیزی سے لپک جاتا کہ پچھلا عشق دھیان میں بھی نہ رہتا۔ وہ دوستوں سے اکثر کہتا' تخلیقی کام کے لیے عشق بڑا ضروری ہے۔ یہ انسان کو متحرک رکھتا ہے۔ اس میں حقیقت بھی تھی کہ بڑھاپے میں بھی اس کے شعر نوجوان تجربوں سے عبارت نظر آتے تھے۔ اس کی غزلیں اسی طرح رومان پرور تھیں جیسی جوانی میں ہوا کرتی تھیں۔ یہ وہ بہار تھی جس نے خزاں کا منہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔

2004ء میں اسے مشرف حکومت نے ہلالِ امتیاز سے نوازا اور اس نے اسے قبول بھی کیا۔ دوستوں نے اسے پھر طنز کا نشانہ بنایا۔

''یار فراز! تم اپنے موقف سے بالکل ہٹ گئے ہو۔ تم نے ایک جرنیل سے ہلالِ امتیاز قبول کرلیا؟''

''میں نے تو ایک فوجی کی دی ہوئی سزا بھی قبول کرلی تھی' یہ تو ایوارڈ ہے۔''

''تمہاری جدوجہد تو جمہوری قوتوں کے لیے تھی؟''

''یار اس جرنیل نے بہت اچھے کام کیے ہیں۔'' وہ پھر دلیلوں پر اتر آیا۔

پھر اچانک اس کی پسندیدگی نے کروٹ بدلی۔ اس کا لب ولہجہ تبدیل ہونے لگا۔ دبے لفظوں میں پرویز مشرف کی برائیاں کرنے لگا۔ رفتہ' رفتہ اختلاف کی لے تیز ہونے لگی۔ حکومت کے بعض آئینی اقدامات ایسے تھے جن سے اسے اختلاف ہوا اور وہ مخالفت کے رستے پر آگے بڑھنے لگا۔ ایک انٹرویو کی پاداش میں اسے نیشنل بک فاؤنڈیشن سے فارغ کر دیا گیا۔ مخالفت کا ایک بہانہ اور مل گیا۔ اس نے پرویز مشرف کو خط لکھا جس میں اپنی رنجشوں کا ذکر کیا اور محبت بھرے لہجے میں حمایت واپس لینے کی دھمکی بھی دے دی۔ اس خط کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ روٹھے ہوئے محبوب کی طرح پرویز مشرف کے خلاف ہوگیا اور ان کے دور میں ملنے والا ہلالِ امتیاز واپس کر دیا۔

ملک میں عدلیہ کی آزادی کی تحریک چلی تو وہ اس تحریک کا حصہ بن کر اپنا غصہ اتارتا رہا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ وہ وکلا اور سول سوسائٹی کے افراد کے ساتھ شاہ راہ دستور اسلام آباد پر جون کے گرم مہینے میں ستّر سال سے اوپر کی عمر میں نعرہ زن ہے' اس کے پرستار اس کے ارد گرد جمع ہیں۔

عدلیہ کی آزادی کی تحریک طول پکڑتی گئی لیکن شاید اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ وہ شکاگو میں تھا کہ اس کی بیماری نے طول پکڑا۔ اس کے گردے فیل ہوگئے تھے۔ وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں ایک اسپتال میں داخل ہوگیا۔ وہ ایک مرتبہ پھر وطن سے دور تھا۔ خبریں تشویش ناک تھیں۔ دوستوں کو فکر تھی کہ وہ کہیں ان سے ملے بغیر ہی رخصت نہ ہوجائے۔ شاید وہ یہاں آنا پسند ہی نہ کرے۔ ایک مرتبہ پھر وہ خود ساختہ جلاوطنی پر نہ چلا جائے لیکن وہ یاروں کا یار ملے بغیر کیسے چلا جاتا جبکہ اس کے ملک میں اب جمہوری حکومت تھی۔ اس کے بقول اس کا غنیم شکست کھا چکا تھا۔ اس کی حالت سنبھلتے ہی اس کے عزیزوں نے اسے پاکستان واپس لانے کا بندوبست کیا اور وہ اسلام آباد آ گیا۔ بیماری کا کرب اس کے چہرے پر لکھا ہوا تھا۔

سلوٹیں ہیں مرے چہرے پہ تو حیرت کیوں ہے
زندگی نے مجھے کچھ تجھ سے زیادہ پہنا

اس کی حالت سنبھلتی بگڑتی رہی۔ پھر ایک لطیفہ یہ ہوا کہ تحقیق کیے بغیر ٹی وی چینل پر اس کی موت کی خبر چلی گئی۔ بعد میں معلوم ہوا ابھی نہیں' ابھی کسی خبر کا انتظار ہے۔

جنرل پرویز مشرف نے اپنے عہدۂ صدارت سے استعفیٰ دے دیا۔ شاید اسے یہی انتظار ہو۔ اس نے سنبھالا لیا لیکن زندگی کا چراغ بھڑکنے کے بعد بجھ گیا۔ 26 اگست 2008ء کو وہ خالقِ حقیقی سے جاملا۔

ہم نہ ہوں گے تو کسی اور کے چرچے ہوں گے
خلقتِ شہر تو کہنے کو فسانے مانگے

❄

عصمت چغتائی

سعادت حسن منٹو

جانے کیا بات ہے کہ اردو افسانے کی بات جب بھی چھڑے، تان جا کر منٹو اور عصمت چغتائی پر ٹوٹتی ہے۔ ذکر سب ہی بڑے افسانہ نگاروں کا چلتا ہے مگر منٹو اور عصمت ایسے دو لیکھک ہیں کہ جن کے مداحین ان کی تعریف کرتے ہوئے اچانک محتاط ہو جاتے ہیں۔ ان دونوں کے سلسلے میں جو احتیاط برتی جاتی ہے، وہی ان دونوں کی اُردو افسانے میں شناخت ہے۔ جتنی بے باکی جُرأت اور صاف گوئی سے اپنا قلم ان دونوں نے استعمال کیا وہ کچھ یہ دونوں ہی جانتے ہیں اور اس کے نتیجے میں جتنا یہ دونوں معتوب ہوئے اتنا عتاب بھی کسی اور کے حصے میں نہیں آیا اور پھر پڑھنے والوں کی جو توجہ اور محبّت انھیں حاصل ہوئی، اُس میں بھی یہ ممتاز ہی رہے۔

عصمت کو منٹو پر یہ فوقیت ہے کہ اُنہوں نے عورت ہوتے ہوئے انسانی نفسیات کی پیچیدگی کو بے دھڑک انداز میں لکھا۔ مرد اور عورت کے وہ جذبات جو برِصغیر میں گُنگ تھے، اُنہیں سب سے پہلے زبان عصمت چغتائی نے دی۔ گزشتہ دنوں بمبئی میں عصمت چغتائی انتقال کر گئیں۔ اُن سے وابستہ اُردو افسانے کا ایک پورا دَور اُن کے ساتھ ختم ہو گیا۔ کسی کو یاد کرنے کا احسن طریقہ یہ ہے کہ اُسے اُس کے کام سے یاد کیا جائے۔ سرگزشت کے موجودہ شمارے میں ہم مرحومہ کی ایک تحریر کے ساتھ ساتھ اُن پر لکھا ہوا سعادت حسن منٹو کا ایک خاکہ پیش کر رہے ہیں جس میں عصمت کا وجود سانس لیتا ہوا نظر آتا ہے۔ بلاء کی افسانہ نگار پر قیامت ہی کا کوئی لکھنے والا ایسا لکھ سکتا تھا۔ یہ تحریر اسی لیے دوآتشہ ہو گئی کہ پڑھنے والوں کو ایک جسم میں دو دل دھڑکتے محسوس ہوں گے۔

اُردو زبان کی پہلی اور آخری باغی افسانہ نگار کا انتہائی شاندار خاکہ

آج سے تقریباً ڈیڑھ برس پہلے جب میں بمبئی میں تھا۔ حیدر آباد سے ایک صاحب کا ڈاک کارڈ موصول ہوا۔ مضمون کچھ اس قسم کا تھا۔

"یہ کیا بات ہے کہ عصمت چغتائی نے آپ سے شادی نہ کی؟ منٹو اور عصمت اگر یہ دو ہستیاں مل جاتیں تو کتنا اچھا ہوتا مگر افسوس کہ عصمت نے شاہد سے شادی کر لی اور منٹو..."

انہی دنوں حیدر آباد میں ترقی پسند مصنفوں کی ایک کانفرنس ہوئی۔ میں اس میں شریک نہیں تھا۔ لیکن حیدر آباد کے ایک پرچے میں اس کی روداد دیکھی۔ جس میں یہ لکھا تھا کہ وہاں بہت سی لڑکیوں نے عصمت کو گھیر کر یہ سوال کیا "آپ نے منٹو سے ... شادی کیوں نہ کی؟"

مجھے معلوم نہیں کہ یہ بات درست ہے یا غلط لیکن جب عصمت چغتائی واپس آئی تو اس نے میری بیوی سے کہا کہ حیدر آباد میں جب ایک لڑکی نے اس سے سوال کیا "کیا منٹو کنوارا ہے؟" تو اس نے ذرا طنز کے ساتھ جواب دیا "جی نہیں" اس پر وہ محترمہ عصمت کے بیان کے مطابق کچھ کھسیانی سی ہو کر خاموش ہو گئیں۔

واقعات کچھ بھی ہوں لیکن یہ بات غیر معمولی طور پر دلچسپ ہے کہ سارے ہندوستان میں ایک صرف حیدر آباد ہی ایسی جگہ ہے۔ جہاں مرد اور عورتیں میری اور عصمت کی شادی کے متعلق فکر مند رہے ہیں۔

اس وقت تو میں نے غور نہیں کیا تھا لیکن اب سوچتا ہوں اگر میں اور عصمت واقعی میاں بیوی بن جاتے تو کیا

ہوتا؟ یہ "اگر" بھی کچھ اسی قسم کی اگر ہے۔ اگر کہا جائے کہ اگر قلوپطرہ کی ناک ایک انچ کا اٹھارھواں حصہ بڑی ہوتی تو اس کا اثر وادی نیل کی تاریخ پر کیا پڑتا لیکن یہاں عصمت قلوپطرہ ہے اور نہ منٹو انتھونی لیکن اتنا ضرور ہے کہ اگر منٹو اور عصمت کی شادی ہوجاتی تو اس حادثے کا اثر عہد حاضر کے افسانوی ادب کی تاریخ پر ایٹمی حیثیت رکھتا۔ افسانے افسانے بن جاتے۔ کہانیاں مڑ تڑ کر پہیلیاں ہوجاتیں۔ انشاء کی چھاتیوں میں سارا دودھ خشک ہو کر یا تو ایک سفوف کی شکل اختیار کرلیتا یا بھسم ہو کر راکھ بن جاتا اور یہ بھی ممکن ہے کہ نکاح نامے پر ان کے دستخط ان کے قلم کی آخری تحریر ہوتے لیکن سینے پر ہاتھ رکھ کر یہ بھی کون کہہ سکتا ہے کہ نکاح نامہ ہوتا۔ زیادہ قرین قیاس تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ نکاح نامے پر دونوں افسانے لکھتے اور قاضی صاحب کی پیشانی پر دستخط کردیتے تاکہ سند رہے۔ نکاح کے دوران میں کچھ ایسی باتیں بھی ہوسکتی تھیں۔

"عصمت، قاضی صاحب کی پیشانی ایسا لگتا ہے تختی ہے۔"

"کیا کہا؟"

"تمہارے کانوں کو کیا ہوگیا ہے؟"

"میرے کانوں کو تو کچھ نہیں ہوا۔ تمہاری اپنی آواز حلق سے باہر نہیں نکلتی۔"

"حد ہوگئی۔ لو اب سنو۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ قاضی صاحب کی پیشانی بالکل تختی سے ملتی جلتی ہے۔"

"تختی تو بالکل سپاٹ ہوتی ہے۔"

"یہ پیشانی سپاٹ نہیں؟"
"تم سپاٹ کا مطلب بھی سمجھتے ہو؟"
"جی نہیں۔"
"سپاٹ ماتھا تمہارا ہے۔ قاضی جی کا ماتھا تو......"
"بڑا خوبصورت ہے۔"
"خوبصورت تو ہے۔"
"تم محض چڑا رہی ہو مجھے۔"
"چڑا تم رہے ہو مجھے۔"
"میں کہتا ہوں تم چڑا رہی ہو مجھے۔"
"میں کہتی ہوں تم چڑا رہے ہو مجھے۔"
"تمہیں ماننا پڑے گا کہ تم چڑا رہی ہو مجھے۔"
"اجی واہ۔ تم تو ابھی سے شوہر بن بیٹھے۔"
"قاضی صاحب، میں اس عورت سے شادی نہیں کروں گا۔ اگر آپ کی بیٹی کا ماتھا بھی آپ ہی کے ماتھے کی طرح ہے تو میرا نکاح اس سے پڑھوا دیجئے۔"
"قاضی صاحب، میں اس مردود سے شادی نہیں کروں گی۔ اگر آپ کی چار بیویاں نہیں ہیں تو مجھ سے شادی کر لیجئے۔ مجھے آپ کا ماتھا بہت پسند ہے۔"
اگر ہم دونوں کو شادی کا خیال آتا تو دوسروں کو حیرت و اضطراب میں گم کرنے کے بجائے ہم خود اس میں غرق ہو جاتے۔ اور جب ایک دم چونکتے تو یہ حیرت اور اضطراب جہاں تک میں سمجھتا ہوں۔ مسرت کے بجائے ایک بہت بڑے فکاہیہ میں تبدیل ہو جاتا۔ عصمت اور منٹو، نکاح اور شادی کتنی مضحکہ خیز چیز ہے۔

عصمت لکھتی ہے۔

ایک ذرا سی محبت کی دنیا میں کتنے شوکت کتنے محمود، عباس عسکری، یونس اور نہ جانے کون کون تاش کی گڈی کی طرح پھینٹ کر بکھیر دئے گئے ہیں۔ کوئی بتاؤ۔ ان میں سے چور پتا کون سا ہے؟ شوکت کی بھوکی بھوکی کہانیوں سے لبریز آنکھیں، محمود کے سانپوں کی طرح رینگتے ہوئے اعضاء عسکری کے بے رحم ہاتھ، یونس کے نچلے ہونٹ کا سیاہ تل عباس کی کھوئی ہوئی مسکراہٹیں اور ہزاروں چوڑے چکلے سینے، کشادہ پیشانیاں، گھنے گھنے بال، سڈول پنڈلیاں، مضبوط بازو، سب ایک ساتھ مل کر کے سوت کے ڈوروں کی طرح الجھ کر رہ گئے ہیں۔ پریشان ہو کر اس ڈھیر کو دیکھتی ہوں۔ مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ کون سا سرا پکڑ کر کھینچوں کہ کھنچتا ہی چلا آئے اور میں اس کے سہارے دور افق سے بھی اوپر ایک پتنگ کی طرح تن جاؤں۔

(چھوٹی آپا)

منٹو لکھتا ہے

میں صرف اتنا سمجھا ہوں کہ عورت سے عشق کرنا اور زمینیں خریدنا تمہارے لئے ایک ہی بات ہے۔ سو تم محبت کرنے کے بجائے ایک دو بیگھے زمین خرید لو اور اس پر ساری عمر قابض رہو۔ زندگی میں صرف ایک عورت۔ اور یہ دنیا اس قدر بھری ہوئی کیوں ہے؟ کیوں اس میں اتنے تماشے جمع ہیں؟ میری سنو اور اس زندگی کو جو کہ تمہیں دی گئی ہے اچھی طرح استعمال کرو۔ تم ایسے گاہک ہو جو عورت حاصل کرنے کے لئے ساری عمر سرمایہ جمع کرتے رہو گے مگر اسے ناکافی سمجھو گے۔ میں ایسا خریدار ہوں، جو زندگی میں کئی عورتوں سے سودے کرے گا۔ تم ایسا عشق کرنا چاہتے ہو کہ اس کی ناکامی پر کوئی ادنیٰ درجے کا مصنف ایک کتاب لکھے جسے نرائن دت سہگل پیلے کاغذوں پر چھاپے اور دہلی بازار میں اسے ردی کے بھاؤ بیچے۔ میں اپنی کتاب حیات کے تمام اوراق دیمک بن کر چاٹ جانا چاہتا ہوں تاکہ اس کا کوئی نشان باقی نہ رہے۔ تم محبت میں زندگی چاہتے ہو میں زندگی میں محبت چاہتا ہوں۔"

(تکلیف)

عصمت کو اگر الجھے ہوئے سوت کے ڈھیر میں سے ایک سرا مل جاتا، کھینچنے پر جو کھنچتا ہی چلا آتا اور وہ اس کے سہارے دور افق سے اوپر ایک پتنگ کی طرح تن جاتی اور منٹو اگر اپنی کتاب حیات کے آدھے اوراق بھی دیمک بن کر چاٹنے میں کامیاب ہو جاتا تو آج ادب کی لوح پر ان کے فن کے نقوش اتنے گہرے کبھی نہ ہوتے۔ وہ دور افق سے بھی اوپر ہوا میں تنی رہتی اور منٹو کے پیٹ میں اس کی کتاب حیات کے باقی اوراق بھس کی طرح بھر کے اس کے ہمدرد اسے شیشے کی الماری میں بند کر دیتے۔

"چوٹیں" کے دیباچے میں کرشن چندر لکھتا ہے۔
"عصمت کا نام آتے ہی مرد افسانہ نگاروں کو دورے پڑنے لگتے ہیں۔ شرمندہ ہو رہے ہیں۔ آپ ہی آپ خفیف ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ دیباچہ بھی اسی خفت کو مٹانے کا ایک نتیجہ ہے۔"

عصمت کے متعلق جو کچھ میں لکھ رہا ہوں۔ کسی بھی [illegible] کی خفت مٹانے کا نتیجہ نہیں ایک قرض تھا جو سود کی بہت [illegible] ہلکی شرح کے ساتھ ادا کر رہا ہوں۔

سب سے پہلے میں نے عصمت کا کون سا افسانہ پڑھا تھا۔ مجھے بالکل یاد نہیں یہ سطور لکھنے سے پہلے میں نے حافظے کو بہت کھرچا لیکن اس نے میری رہبری نہیں کی۔ ایسا

محسوس ہوتا ہے کہ میں عصمت کے افسانے کاغذ پر منتقل ہونے سے پہلے ہی پڑھ چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مجھ پر کوئی دورہ نہیں پڑا۔ لیکن جب میں نے اس کو پہلی بار دیکھا تو مجھے سخت ناامیدی ہوئی۔

اڈلفی چیمبرز کیررو ڈ بمبئی کے ۱۷ نمبر فلیٹ میں جہاں "مصور" ہفتہ وار کا دفتر تھا۔ شاہد لطیف اپنی بیوی کے ساتھ داخل ہوا۔ یہ اگست ۱۹۴۲ء کی بات ہے۔ تمام کانگریسی لیڈر مہاتما گاندھی سمیت گرفتار ہو چکے تھے اور شہر میں کافی گڑبڑ تھی۔ فضا سیاسیات میں بسی ہوئی تھی۔ اس لئے کچھ دیر گفتگو کا موضوع تحریک آزادی رہا۔ اس کے بعد رُخ بدلا اور افسانوی باتیں شروع ہوئیں۔

ایک مہینہ پہلے جب کہ میں آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ملازم تھا ادب لطیف میں عصمت کا "لحاف" شائع ہوا تھا۔ اسے پڑھ کر مجھے یاد ہے۔ میں نے کرشن چندر سے کہا تھا افسانہ بہت اچھا ہے۔ لیکن آخری جملہ بہت غیر صناعانہ ہے احمد ندیم قاسمی کی جگہ اگر میں ایڈیٹر ہوتا تو اسے یقیناً حذف کر دیتا" چنانچہ جب افسانوں پر باتیں شروع ہوئیں تو میں نے عصمت چغتائی سے کہا "آپ کا افسانہ 'لحاف' مجھے بہت پسند آیا۔ بیان میں الفاظ کو بقدر کفایت استعمال کرنا آپ کی نمایاں خصوصیت رہی ہے لیکن مجھے تعجب ہے کہ اس افسانے کے آخر میں آپ نے بے کار سا جملہ لکھ دیا۔"

عصمت نے کہا "کیا عیب ہے اس جملے میں؟"

میں جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ مجھے عصمت کے چہرے پر وہی سمٹا ہوا حجاب نظر آیا جو عام گھریلو لڑکیوں کے چہرے پر ناگفتنی شے کا نام سن کر نمودار ہوا کرتا ہے۔ مجھے سخت ناامیدی ہوئی اس لئے کہ میں "لحاف" کے تمام جزئیات کے متعلق اس سے باتیں کرنا چاہتا تھا جب عصمت چلی گئی تو میں نے دل میں کہا "یہ تو کم بخت بالکل عورت نکلی۔"

مجھے یاد ہے اس ملاقات کے دوسرے ہی روز میں نے اپنی بیوی کو دہلی خط لکھا "عصمت سے ملا۔ تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ وہ بالکل ایسی ہی عورت ہے جیسی تم ہو۔ میرا [illegible]ا تو بالکل کرکرا ہوگیا لیکن تم اسے یقیناً پسند کرو گی۔ میں نے جب اس سے 'لحاف' کا ذکر کیا تو نالائق اس کا تصور کرتے ہی جھینپ گئی۔"

ایک عرصے کے بعد میں نے اپنے اس پہلے رد عمل پر سنجیدگی سے غور کیا اور مجھے اس امر کا شدید احساس ہوا کہ فن کی بقاء کے لئے انسان کو اپنی فطرت کی حدود میں

> مولانا شوکت علی ایک جلسہ عام سے خطاب کر رہے تھے۔ دوران تقریر انہوں نے فرمایا "برطانوی وزیراعظم گلیڈاسٹون کہا کرتا تھا کہ ہم ترکوں کو یورپ سے بوریا بستر سمیت نکال دیں گے لیکن میں آپ سے کہتا ہوں کہ ہم ہندوستان سے انگریزوں کو نکالتے وقت بوریا بستر یہیں رکھوالیں گے یہ چیزیں ہماری ہیں۔"

رہنا از بس لازم ہے۔ ڈاکٹر رشید جہاں کا فن آج کہاں ہے۔ کچھ تو گیسوؤں کے ساتھ کٹ کر علیحدہ ہوگیا اور کچھ پتلونوں کی جیبوں میں ٹھُس ہو کر رہ گیا۔ فرانس میں جارج ساں نے نسوانیت کا حسین ملبوس اتار کر تصنع کی زندگی اختیار کی پولستانی موسیقار شوپیں سے لہو تھکوا تھکوا کر اس نے لعل و گہر ضرور پیدا کرائے لیکن اس کا اپنا جوہر اس کے بطن میں دم گھٹ کر مر گیا۔

میں نے سوچا عورت جنگ کے میدانوں میں مردوں کے دوش بدوش لڑنے کا پہاڑ کاٹے۔ افسانہ نگاری کرتے کرتے عصمت چغتائی بن جائے لیکن اس کے ہاتھوں میں کبھی کبھی مہندی رچنی ہی چاہئے۔ اس کی بانہوں سے چوڑی کی کھنک آنی ہی چاہئے مجھے افسوس ہے جو میں نے اس وقت اپنے دل میں کہا "یہ تو کمبخت بالکل عورت نکلی۔"

عصمت اگر بالکل عورت نہ ہوتی تو اس کے مجموعوں میں بھول بھلیاں، تل، لحاف، اور گیندا جیسے نازک اور ملائم افسانے کبھی بھی نظر نہ آتے یہ افسانے عورت کی مختلف ادائیں ہیں۔ صاف، شفاف، ہر قسم کے تصنع سے پاک۔ یہ ادائیں۔ وہ عشوے، وہ غمزے نہیں جن کے تیر بنا کر مردوں کے دل اور کلیجے چھلنی کیے جاتے ہیں۔ جسم کی بھونڈی حرکتوں سے ان اداؤں کا کوئی تعلق نہیں۔ ان روحانی اشاروں کی منزل مقصود انسان کا ضمیر ہے۔ جس کے ساتھ وہ عورت ہی کی ان جانی۔ ان بوجھی مگر مخملیں فطرت لئے بغل گیر ہو جاتے ہیں۔

"ساقی" میں "دوزخی" چھپا۔ میری بہن نے پڑھا اور مجھ سے کہا "سعادت! یہ عصمت کتنی بے ہودہ ہے۔ اپنے منے بھائی کو بھی نہیں چھوڑا کم بخت نے کیسی کیسی فضول باتیں لکھی ہیں۔"

میں نے کہا "اقبال اگر میری موت پر تم ایسا ہی مضمون لکھنے کا وعدہ کرو تو خدا کی قسم میں آج ہی مرنے کے لئے تیار ہوں۔"

شاہ جہاں نے اپنی محبوبہ کی یاد قائم رکھنے کے لئے تاج محل بنوایا۔ عصمت نے اپنے محبوب بھائی کی یاد میں "دوزخی" لکھا۔ شاہ جہاں نے دوسروں سے پتھر اٹھوائے انہیں ترشوایا اور اپنی محبوبہ کی لاش پر عظیم الشان عمارت تعمیر کرائی۔ عصمت نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنے خواہرانہ جذبات چن چن کر ایک اونچا مچان تیار کیا اور اس پر نرم نرم ہاتھوں سے اپنے بھائی کی نعش رکھ دی۔ تاج شاہ جہاں کی محبت کا برہنہ مرمریں اشتہار معلوم ہوتا ہے۔ لیکن "دوزخی" عصمت کی محبت کا نہایت ہی لطیف اور حسین اشارہ ہے وہ جنت جو اس مضمون میں آباد ہے۔ عنوان اس کا اشتہار نہیں دیتا۔

میری بیوی نے یہ مضمون پڑھا تو عصمت سے کہا "یہ تم نے کیا خرافات لکھی ہے۔"

"بکو نہیں۔ لاؤ وہ برف کہاں ہے؟"

عصمت کو برف کھانے کا بہت شوق ہے بالکل بچوں کی طرح ڈلی ہاتھ میں لئے دانتوں سے کٹاکٹ کاٹتی رہتی ہے۔ اس نے اپنے بعض افسانے بھی برف کھا کھا کر لکھے ہیں۔ چارپائی پر کہنیوں کے بل اوندھی لیٹی ہے۔ سامنے تکیے پر کاپی رکھی ہے ایک ہاتھ میں فاؤنٹین پین ہے اور دوسرے ہاتھ میں برف کی ڈلی' ریڈیو اونچے سُروں میں چلا رہا ہے مگر اس کا قلم اور منہ دونوں کھٹا کھٹ چل رہے ہیں۔

عصمت پر لکھنے کے دورے پڑتے ہیں۔ نہ لکھے تو مہینوں گزر جاتے ہیں۔ پر جب دورہ پڑے تو سیکڑوں صفحے اس کے قلم کے نیچے سے گزر جاتے ہیں۔ کھانے پینے' نہانے دھونے کا کوئی ہوش نہیں رہتا۔ بس ہر وقت چارپائی پر کہنیوں کے بل اوندھی لیٹی اپنے ٹیڑھے میڑھے اعراب اور املا سے بے نیاز خط میں کاغذوں پر اپنے خیالات منتقل کرتی رہتی ہے۔

"ٹیڑھی لکیر" جیسا طول طویل ناول میرا خیال ہے عصمت نے سات آٹھ نشستوں میں ختم کیا تھا۔

کرشن چندر عصمت کے بیان کی رفتار کے متعلق لکھتا ہے۔

"افسانوں کے مطالعہ سے ایک اور بات جو ذہن میں آتی ہے وہ ہے گھڑدوڑ یعنی رفتار' حرکت' سبک خرامی (میرا خیال ہے کہ اس سے کرشن چندر کی مراد برق رفتاری تھی) اور تیزگامی۔ نہ صرف افسانہ دوڑتا ہوا معلوم ہوتا ہے بلکہ فقرے کنائے اور اشارے اور آوازیں اور کردار اور جذبات اور احساسات ایک طوفان کی سی بلاخیزی کے ساتھ چلتے اور آگے بڑھتے نظر آتے ہیں۔"

عصمت کا قلم اور اس کی زبان دونوں بہت تیز ہیں۔ لکھنا شروع کرے گی تو کئی مرتبہ اس کا دماغ آگے نکل جائے گا اور الفاظ بہت پیچھے ہانپتے رہ جائیں گے۔ شیخی بگھارنے کی خاطر اگر کبھی باورچی خانے میں چلی جائے گی تو معاملہ بالکل چوپٹ ہو جائے گا۔ طبیعت میں چونکہ بہت ہی عجلت ہے اس لئے آٹے کا پیڑا بناتے ہی سکی سنکائی روٹی کی شکل دیکھنا شروع کر دیتی ہے۔ آلو ابھی چھیلے نہیں گئے لیکن ان کا سالن اس کے دماغ میں پہلے ہی تیار ہو جاتا ہے اور میرا خیال ہے۔ بعض اوقات وہ باورچی خانے میں قدم رکھ کر خیال خیال میں شکم سیر ہو کر لوٹ آتی ہوگی لیکن اس حد سے بڑھی ہوئی عجلت کے مقابلے میں اس کو میں نے بڑے ٹھنڈے اطمینان اور سکون کے ساتھ اپنی بچی کے فراک سیتے دیکھا ہے۔ اس کا قلم لکھتے وقت املا کی غلطیاں کرتا جاتا ہے لیکن ننھی کے فراک سیتے وقت اس کی سوئی سے ہلکی سی لغزش بھی نہیں ہوتی۔ نپے تلے ٹانکے ہوتے ہیں اور مجال ہے جو کہیں جھول ہو۔

"اف رے بچے" میں عصمت لکھتی ہے۔

اودھم کیا ہے محلے کا محلہ ہے۔ مرض پھیلے وبا آئے دُنیا کے بچے پٹاپٹ مریں مگر کیا مجال جو یہاں ایک بھی ٹس سے مس ہو جائے۔ ہر سال ماشاء اللہ گھر ہسپتال بن جاتا ہے۔ سنتے ہیں دُنیا میں بچے بھی مرا کرتے ہیں مرتے ہوں گے۔ کیا خبر؟"

اور پچھلے دنوں بمبئی میں جب اس کی بچی سیما کو کالی کھانسی ہوئی تو وہ راتیں جاگتی تھی' ہر وقت کھوئی کھوئی رہتی' ممتا ماں بننے کے ساتھ ہی کوکھ سے باہر نکلتی ہے۔

عصمت پرلے درجے کی ہٹ دھرم ہے۔ طبیعت میں ضد ہے بالکل بچوں کی سی' زندگی کے کسی نظریے کو' فطرت کے کسی قانون کو پہلے ہی سابقہ میں کبھی قبول نہیں کرے گی۔ پہلے شادی سے انکار کرتی رہی۔ جب آمادہ ہوئی تو بیوی بننے سے انکار کر دیا۔ بیوی بننے پر جوں توں رضامند ہوئی تو ماں بننے سے منکر ہو گئی۔ تکلیفیں اٹھائے گی۔ صعوبتیں برداشت کرے گی۔ مگر ضد سے کبھی باز نہیں آئے گی۔ میں سمجھتا ہوں یہ بھی اس کا ایک طریقہ ہے جس کے ذریعے وہ زندگی کے حقائق سے دوچار ہو کر بلکہ ٹکرا ٹکرا کر ان کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کی ہر بات نرالی ہے۔

عصمت کے زنانہ اور مردانہ کرداروں میں بھی یہ عجیب و غریب ضد یا انکار عام پایا جاتا ہے۔ محبت میں بری طرح مبتلا ہیں۔ لیکن نفرت کا اظہار کئے چلے جا رہے ہیں۔ جی گال

چومنے کو چاہتا ہے لیکن اس میں سوئی کھبودیں گے۔ ہولے سے تھپکانا ہوتا تو ایسی دھول جمائیں گے کہ دوسرا بلبلا اٹھے۔ یہ جارحانہ قسم کی منفی محبت جو محض ایک کھیل کی صورت میں شروع ہوتی ہے عام طور پر عصمت کے افسانوں میں ایک نہایت رحم انگیز صورت میں انجام پذیر ہوتی ہے۔

عصمت کا اپنا انجام بھی اگر کچھ اسی طور پر ہوا اور میں اسے دیکھنے کے لئے زندہ رہا تو مجھے کوئی تعجب نہ ہوگا۔

عصمت سے ملتے جلتے مجھے پانچ چھ برس ہوگئے ہیں۔ دونوں کی آتش گیر اور بھک سے اڑ جانے والی طبیعت کے پیش نظر احتمال تو اسی بات کا تھا کہ سیکڑوں لڑائیاں ہوتیں مگر تعجب ہے کہ اس دوران میں صرف ایک بار چخ ہوئی اور وہ بھی ہلکی سی۔

شاہد اور عصمت کے مدعو کرنے پر میں اور میری بیوی صفیہ دونوں ملاڈ (بمبئی کے مضافات میں ایک جگہ جہاں شاہد بمبئی ٹاکیز کی ملازمت کے دوران میں مقیم تھا) گئے ہوئے تھے۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد باتوں باتوں میں شاہد نے کہا "منٹو، تم سے اب بھی زبان کی غلطیاں ہوجاتی ہیں۔"

ڈیڑھ بجے تک میں نے تسلیم نہ کیا کہ میری تحریر میں زبان کی غلطیاں ہوتی ہیں۔ شاہد تھک گیا۔ دو بجے تک عصمت نے اپنے شوہر کی پیروی کی میں پھر بھی نہ مانا۔ دفعتاً کوئی بات کہتے ہوئے عصمت نے لفظ "دست درازی" استعمال کیا میں نے جھٹ سے کہا "صحیح لفظ دراز دستی ہے" تین بج گئے، عصمت نے اپنی غلطی تسلیم نہ کی۔ میری بیوی سو گئی۔ شاہد قصہ ختم کرنے کے لئے دوسرے کمرے سے لغت اٹھا لایا "د" کی تختی میں لفظ دست درازی موجود ہی نہیں تھا۔ البتہ دراز دستی اور اس کے معنی درج تھے۔ شاہد نے کہا "عصمت! اب تمہیں ماننا پڑے گا" اب میاں بیوی میں چخ شروع ہوگئی۔ مرغ اذانیں دینے لگا۔ عصمت نے لغت اٹھا کر ایک طرف پھینکی اور کہا "جب میں لغت بناؤں گی تو اس میں صحیح لفظ دست درازی ہوگا۔ یہ کیا ہوا دراز دستی۔ دراز دستی۔"

کج بحثی کا یہ سلسلہ دراز بہرحال ختم ہوا۔ اس کے بعد ہم ایک دوسرے سے کبھی نہیں لڑے بلکہ یوں کہئے کہ ہم نے اس کا کبھی موقع ہی نہیں آنے دیا۔ گفتگو کرتے کرتے جب بھی کوئی خطرناک موڑ آیا تو عصمت نے رُخ بدل لیا یا میں راستہ کاٹ کر ایک طرف ہوگیا۔

عصمت کو میں پسند کرتا ہوں۔ وہ مجھے پسند کرتی ہے لیکن اگر کوئی دفعتاً پوچھ بیٹھے "تم دونوں ایک دوسرے کی کیا چیز پسند کرتے ہو" تو میرا خیال ہے کہ میں اور عصمت دونوں کچھ عرصے کے لئے بالکل خالی الذہن ہوجائیں۔

عصمت کی شکل و صورت دلفریب نہیں لیکن دل نشین ضرور ہے۔ اس سے پہلی ملاقات کے نقش ابھی تک میرے دل و دماغ میں محفوظ ہیں۔ بہت ہی سادہ لباس میں تھی۔ چھوٹی کنی کی سفید ساڑھی، سفید زمین کا کالی کھڑی لکیروں والا چست بلاؤز، ہاتھ میں چھوٹا پرس، پاؤں میں بغیر ایڑی کی براؤن چپل، چھوٹی چھوٹی مگر تیز اور متجسس آنکھوں پر موٹے موٹے شیشوں والی عینک چھوٹے مگر گھنگھریالے بال۔

میں عصمت پر عاشق نہ ہوا لیکن میری بیوی اس کی محبت میں گرفتار ہوگئی۔ عصمت سے اگر صفیہ اس کا ذکر کرے تو وہ ضرور کچھ یوں کہے گی "بڑی آئی ہو میری محبت میں گرفتار ہونے والی۔ تمہاری عمر کی لڑکیوں کے باپ تک قید ہوتے رہے ہیں میری محبت میں۔"

ایک بزرگوار اہل قلم کو تو میں بھی جانتا ہوں۔ جو بہت دیر تک عصمت کے پریم پجاری رہے۔ خط و کتابت کے ذریعے سے آپ نے عشق فرمانا شروع کیا۔ عصمت شہ دیتی رہی لیکن آخر میں ایسا اڑنگا دیا کہ ثریا ہی دکھادی غریب کو۔ یہ سچی کہانی میرا خیال ہے وہ کبھی قلم بند نہیں کریں گے۔

باہم متصادم ہوجانے کے خوف سے میرے اور عصمت کے درمیان بہت ہی کم باتیں ہوتی تھیں۔ میرا افسانہ کبھی شائع ہو تو پڑھ کر داد دے دیا کرتی تھی "نیلم" کی اشاعت پر اس نے غیر معمولی جوش و خروش سے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا "واقعی یہ بہن بنانا کیا ہے۔ آپ نے بالکل ٹھیک کہا ہے کسی عورت کو بہن کہنا اس کی توہین ہے۔"

اور میں سوچتا رہ گیا۔ وہ مجھے منٹو بھائی کہتی ہے اور میں اسے عصمت بہن کہتا ہوں۔ دونوں کو خدا سمجھے۔

ہماری پانچ چھ برس کی دوستی کے زمانے میں ایسا کوئی واقعہ نہیں جو قابل ذکر ہو۔ فحاشی کے الزام میں ایک بار ہم دونوں گرفتار ہوئے۔ مجھے تو پہلے دو دفعہ تجربہ ہوچکا ہے لیکن عصمت کا پہلا موقع تھا۔ اس لئے بہت بھنائی۔ اتفاق سے گرفتاری غیر قانونی نکلی۔ کیوں کہ پنجاب پولیس نے ہمیں بغیر وارنٹ پکڑ لیا تھا۔ عصمت بہت خوش ہوئی لیکن بکرے کی ماں کب تک خیر مناتی۔ آخر اسے لاہور کی عدالت میں حاضر ہونا ہی پڑا۔

بمبئی سے لاہور تک کافی لمبا سفر ہے لیکن شاہد اور میری بیوی ساتھ تھے۔ سارا وقت خوب ہنگامہ رہا۔ صفیہ اور شاہد ایک طرف ہوگئے اور چڑانے کی خاطر ہم دونوں کی فحش

نگاری پر حملے کرتے رہے۔ قید کی صعوبتوں کا نقشہ کھینچا۔ جیل کی زندگی کی جھلکیاں دکھائیں۔ عصمت نے آخر میں جھلا کر کہا ”سولی پر بھی چڑھا دیں لیکن یہاں حلق سے انا لحق ہی نکلے گا۔“

اس مقدمے کے سلسلے میں ہم دو دفعہ لاہور گئے۔ دونوں مرتبہ کالجوں کے تماشائی طالب علم مجھے اور عصمت کو دیکھنے کے لئے ٹولیاں باندھ باندھ کر عدالت میں آتے رہے۔ عصمت نے مجھ سے کہا ”منٹو بھائی، چوہدری نذیر سے کہئے کہ ٹکٹ لگا دے کہ یہاں آنے جانے کا کرایہ ہی نکل آئے گا۔“

ہم دو دفعہ لاہور گئے اور دو ہی دفعہ ہم دونوں نے کرنال شاپ سے مختلف ڈیزائنوں کے دس دس بارہ بارہ جوڑے سینڈلوں اور جوتیوں کے خریدے۔ بمبئی میں کسی نے عصمت سے پوچھا، لاہور آپ کیا مقدمے کے سلسلے میں گئے تھے؟ عصمت نے جواب دیا ”جی نہیں جوتے خریدنے گئے تھے۔“

غالباً ساڑھے تین برس پہلے کی بات ہے۔ ہولی کا تہوار تھا۔ ملاڈ میں شاہد اور میں بالکنی میں بیٹھے پی رہے تھے۔ عصمت میری بیوی کو اکسا رہی تھی ”صفیہ یہ لوگ اتنا روپیہ اڑائیں، ہم کیوں نہ اس عیش میں شریک ہوں.....“

دونوں ایک گھنٹے تک دل کڑا کرتی رہیں۔ اتنے میں ایک دم ہلڑ سا مچا اور فلمستان سے پروڈیوسر مکرجی، ان کی بھاری بھرکم بیوی اور دوسرے لوگ ہم پر حملہ آور ہو گئے۔ چند منٹوں ہی میں ہمارا حلیہ ناقابل شناخت تھا۔ عصمت کی توجہ وسکی سے ہٹی اور رنگ پر مرکوز ہو گئی ”آؤ صفیہ ہم بھی ان کے رنگ لگائیں۔“

ہم سب بازار میں نکل آئے۔ چناں چہ گھوڑ بندر روڈ پر باقاعدہ ہولی شروع ہو گئی ”نیلے پیلے سبز اور کالے رنگوں کا چھڑکاؤ سا شروع ہو گیا۔ عصمت پیش پیش تھی۔ ایک موٹی بنگالن کے چہرے پر تو اس نے تارکول کا لیپ کر دیا۔ اس وقت مجھے اس کے بھائی عظیم بیگ چغتائی کا خیال آیا ایک دم عصمت نے جرنیلوں کے سے انداز میں کہا ”آؤ، پری چہرہ کی گھر پر دھاوا بولیں۔“

ان دنوں نسیم بانو ہماری فلم ”چل چل رے نوجوان“ میں کام کر رہی تھی۔ اس کا بنگلہ پاس ہی گھوڑ بندر روڈ پر تھا۔ عصمت کی تجویز سب کو پسند آئی۔ چناں چہ چند منٹوں میں ہم سب بنگلے کے اندر تھے۔ نسیم حسب عادت پورے میک اپ میں تھی اور نہایت نفیس ریشمی جارجٹ کی ساڑھی میں ملبوس تھی وہ اور اس کا خاوند احسان ہمارا شور سن کر باہر نکلے۔ عصمت نے جو رنگوں میں لتھڑی ہوئی بھتنی سی لگتی تھی میری بیوی سے جس پر مزید رنگ لگانے سے میرا خیال ہے کوئی فرق نہ پڑتا۔ نسیم کی تعریف کرتے ہوئے کہا ”صفیہ، نسیم واقعی حسین عورت ہے۔“

میں نے نسیم کی طرف دیکھا اور کہا ”حسن ہے لیکن بہت ٹھنڈا۔“

عینک کے رنگ آلود شیشوں کے پیچھے عصمت کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں گھومیں اور اس نے آہستہ سے کہا ”صفراوی طبیعتوں کے لیے ٹھنڈی چیزیں مفید ہوتی ہیں۔“

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھی اور ایک سیکنڈ کے بعد پری چہرہ نسیم سرکس کا مسخرہ بنی ہوئی تھی۔

عصمت اور میں بعض اوقات عجیب عجیب باتیں سوچا کرتے ہیں ”منٹو بھائی جی چاہتا ہے اب مرغ اور مرغیوں کے رومانس کے متعلق کچھ لکھوں“ یا ”میں تو فوج میں بھرتی ہو جاؤں گی اور ہوائی جہاز اڑانا سیکھوں گی۔“

عصمت کی افسانہ نگاری پر کافی مضمون لکھے گئے ہیں، حق میں کم، خلاف زیادہ کچھ تو بالکل مجذوب کی بڑ ہیں۔ چند ایسے ہیں جن میں زمین آسمان کے قلابے ملائے گئے ہیں۔

پطرس صاحب نے بھی جن کو لاہور کے ادبی ٹھیکیداروں نے ڈبیا میں بند کر رکھا تھا اپنا ہاتھ باہر نکالا اور قلم پکڑ کر عصمت پر ایک مضمون لکھ دیا آدمی ذہین ہیں طبیعت میں شوخی اور مزاح ہے اس لئے مضمون کافی دلچسپ اور سلجھا ہوا ہے۔ آپ عورت کے لیبل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

”ایک مقتدر و پختہ کار دیباچہ نویس (آپ کی مراد صلاح الدین صاحب سے ہے) نے بھی معلوم ہوتا ہے۔ انشاپردازوں کے ریوڑ میں نر اور مادہ الگ الگ کر رکھے ہیں عصمت کے متعلق فرماتے ہیں کہ جنس کے اعتبار سے اردو میں کم و بیش انہیں بھی وہی مرتبہ حاصل ہے جو ایک زمانے میں انگریزی ادب میں جارج ایلیٹ کو نصیب ہوا۔ گویا ادب کوئی ٹینس ٹورنامنٹ ہے۔ جس میں عورتوں اور مردوں کے میچ علیحدہ ہوتے ہیں۔“

”جارج ایلیٹ کا رتبہ مسلم۔ لیکن یوں اس کا نام لے دینے سے تک ہی ملا اور بوجھوں تو کیا مرے گا۔ اب یہ امر ایک علیحدہ بحث کا محتاج ہے کہ کیا کوئی مابہ الامتیاز ایسا ہے جو خارجی اور ہنگامی اور اتفاقی نہیں بلکہ داخلی اور جبلی اور بنیادی، جو انشاپرداز عورتوں کے ادب کو انشاپرداز مردوں کے ادب سے ممیز کرتا ہے اور اگر ہے تو وہ کیا ہے؟ ان

سوالوں کا جواب کچھ ہو بہر حال اس نوع کا ہرگز نہیں کہ اس کی بنیاد پر مصنفین کو "جنس کے اعتبار سے" الگ الگ دو قطاروں میں کھڑا کر دیا جائے۔"

ان سوالوں کا جواب بہت ممکن ہے ایسا نہ ہو جس کی بنیاد پر مصنفین کو جنس کے اعتبار سے دو قطاروں میں کھڑا کر دیا جائے لیکن جواب دیتے وقت لوگ یہ ضرور سوچیں گے کہ سوال کرنے والا کون ہے...... مرد یا عورت؟ کیوں کہ صنف معلوم ہونے پر سوال کرنے والے کا جبلی اور بنیادی زاویہ نگاہ بہت حد تک واضح ہو جائے گا۔

پطرس صاحب کا یہ کہنا کہ "گویا ادب بھی کوئی ٹینس ٹورنامنٹ ہے جس میں عورتوں اور مردوں کے میچ علیحدہ ہوتے ہیں" ٹھیٹ پطرسی فقرے بازی ہے ٹینس ٹورنامنٹ ادب نہیں۔ لیکن عورتوں اور مردوں کے میچ علیحدہ ہونا بے ادبی بھی نہیں۔

پطرس صاحب کلاس میں لیکچر دیتے ہیں تو طلبہ اور طالبات سے ان کا خطاب جداگانہ نہیں ہوتا لیکن جب انہیں کسی شاگرد لڑکے یا شاگرد لڑکی کے دماغی نشو و نما پر غور کرنا پڑے گا تو ماہر تعلیم ہونے کی حیثیت میں وہ ان کی جنس سے غافل نہیں ہو جائیں گے۔

عورت اگر جارج ایلیٹ یا عصمت چغتائی بن جائے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے ادب پر اس کے عورت ہونے کے اثر کی طرف غور نہ کیا جائے ہیجڑے کے ادب کے متعلق بھی کیا پطرس صاحب یہی استفسار فرمائیں گے کہ کیا کوئی مابہ الامتیاز ایسا ہے۔ داخلی اور جبلی اور بنیادی جو انشا پرداز ہیجڑوں کے ادب کو انشاء پرداز مردوں اور عورتوں کے ادب سے ممیز کرتا ہے۔

میں عورت پر عورت اور مرد پر مرد کے نام کا لیبل لگانا بھونڈے پن کی دلیل سمجھتا ہوں۔ مسجدوں اور مندروں پر یہ بورڈ لگانا کہ یہ عبادت اور بندگی کی جگہیں ہیں بہت ہی مضحکہ خیز ہے لیکن جب کسی مسجد اور مندر کے مقابلے میں کسی عام رہائش گاہ کو رکھ کر ہم فن تعمیر کا جائزہ لیں گے تو اس پر مندر اور مسجد کی تقدیس کا اثر اپنے ذہن سے محو نہیں کر دیں گے۔

عصمت کے عورت ہونے کا اثر اس کے ادب کے ہر ہر نقطے میں موجود ہے۔ جو اس کو سمجھنے میں ہر ہر قدم پر ہماری رہبری کرتا ہے۔ اس کے ادب کی خوبیوں اور کمیوں سے جن کو پطرس صاحب نے اپنے مضمون میں غیر جانب داری سے بیان کیا ہے۔ ہم مصنف کی جنس سے علیحدہ نہیں کر سکتے اور نہ ایسا کرنے کے لئے کوئی تنقیدی' ادبی یا کیمیائی طریقہ ہی موجود ہے۔

"سرد آہوں اور بھینی خوشبو تک کو رنگ میں سمو کر رکھ دیا تھا۔" (تل)

"پسینے سے گل چکے تھے اور ان میں مرگھٹ جیسی چراند...... آنے لگی تھی۔" (جال)

"مردانہ قمیص۔ سگریٹ کی بو میں غرق ملگجی سی۔" (ہیرو)

"نیچے کیاریوں میں سے دھنیے کی ننھی ننھی پتیاں توڑ کر سونگھنے لگی" (میرا بچہ)

عصمت کی سب حسیں وقت پڑنے پر اپنی اپنی جگہ کام کرتی ہیں اور ٹھیک طور سے کرتی ہیں۔ عزیز احمد صاحب کا یہ کہنا کہ جنس ایک مرض کی طرح عصمت کے اعصاب پر چھائی ہوئی ہے۔ ممکن ہے ان کی تشخیص کے مطابق درست ہو۔ مگر وہ اس مرض کے لئے نسخے تجویز نہ فرمائیں۔ یوں تو لکھنا بھی ایک مرض ہے۔ کامل طور پر صحت مند آدمی جس کا درجہ حرارت ہمیشہ ساڑھے اٹھانوے ہی رہے۔ ساری عمر اپنی زندگی کی ٹھنڈی سلیٹ ہاتھ میں لئے بیٹھا رہے گا۔

عزیز احمد صاحب لکھتے ہیں۔

"عصمت کی ہیروئن کی سب سے بڑی ٹریجڈی یہ ہے کہ دل سے نہ اسے کسی مرد نے چاہا اور نہ اس نے کسی مرد کو۔ عشق ایک ایسی چیز ہے جس کا جسم سے وہی تعلق ہے جو

صنعت کار

سویڈن کا صنعت کار آئیور کریو جر "ماچس کا بادشاہ" کہلاتا تھا۔ وہ اپنی ۳۴ ملکوں میں چلنے والی فیکٹریوں سے ساری دنیا میں ماچس کی ۶۵ فی صد مانگ پوری کرتا تھا۔ اس نے اپنی انڈسٹری کی اجارہ داری کے لئے ۱۵ ملکوں کو قرضے دیئے تھے۔ اسے عالمی سطح کا فنانسر تسلیم کیا گیا تھا۔ اس نے خریدنے کی کوئی چیز نہیں چھوڑی۔ سونے کی کانیں' جنگلات' ریلوے' ٹیلیفون کمپنیوں اور فلم کمپنیوں سے بینک تک۔ ۱۹۲۹ء میں ملک میں اقتصادی بحران آیا تو وہ بھی اس کی لپیٹ میں آگیا۔ اس نے قرضے کے کاغذات پر جعلی دستخط کرنے شروع کیئے' حساب کتاب میں ہیرا پھیری کرنے لگا۔ فرضی بینک قائم کیئے اور کاروبار میں ہر قسم کے فراڈ کرنے لگا۔ اس کا دیوالیہ پن اور مجرمانہ فعل چھپا نہ رہ سکا۔ نتیجتاً ۱۲ر مارچ ۳۲ء کو اس نے خود کو گولی مار لی۔

بجلی کا تار سے ہے۔ لیکن کھٹکا دیا تو یہی عشق ہزاروں قندیلوں کے برابر روشنی کرتا ہے۔ دوپہر کی جھلتی لو میں پنکھا جھلتا ہے۔ ہزاروں دیوؤں کی طاقت سے زندگی کی عظیم الشان مشینوں کے پہیے گھماتا ہے اور کبھی کبھی زلفوں کو سنوارتا اور کپڑوں پر استری کرتا ہے ایسے عشق سے عصمت چغتائی بحیثیت مصنفہ واقف نہیں۔"

ظاہر ہے کہ عزیز احمد صاحب کو اس کا افسوس ہے۔ مگر یہ عشق جس سے عزیز احمد صاحب واقف معلوم ہوتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے پنج سالہ اسکیموں کے ماتحت تیار کیا ہے اور اب وہ اسے ہر انسان پر عائد کر دینا چاہتے ہیں۔

عزیز احمد صاحب کو خوش کرنے کے لئے میں فرض کر لیتا ہوں کہ عصمت کی ہیروئن کی ٹریجڈی کیسے وقوع پذیر ہوتی کہ دل سے نہ اسے کسی مرد نے چاہا اور نہ اس نے کسی مرد کو۔

عصمت واقعی عزیز احمد کے تصنیف کردہ عشق سے نا آشنا ہے اور اس کی یہ نا آشنائی ہی اس کے ادب کا باعث ہے اگر آج اس کی زندگی کے تاروں کے ساتھ اس عشق کی بجلی جوڑ دی جائے اور کھٹکا دبا دیا جائے تو بہت ممکن ہے ایک اور عزیز احمد پیدا ہو جائے۔ لیکن "دل" "گیندا" "بھول بھلیاں" اور "جال" تصنیف کرنے والی عصمت یقیناً مر جائے گی۔

عصمت کے ڈرامے کمزور ہیں۔ جگہ جگہ ان میں جھول ہے۔ عصمت پلاٹ کو مناظر میں تقسیم کرتی ہے تو ناپ کر قینچی سے نہیں کرتی۔ یوں ہی دانتوں سے چیر پھاڑ کر چیتھڑا بنا ڈالتی ہے۔ پارٹیوں کی دنیا عصمت کی دنیا نہیں اس میں وہ بالکل اجنبی رہتی ہے۔ جنس عصمت کے اعصاب پر ایک مرض کی طرح سوار ہے۔ عصمت کا بچپن بڑا غیر صحت بخش رہا ہے پردے کے اس پار کی تفصیلات بیان کرنے میں عصمت کو ید طولیٰ حاصل ہے۔ عصمت کو سماج سے نہیں شخصیتوں سے شغف ہے۔ شخصیتوں سے نہیں اشخاص سے ہے، عصمت کے پاس جسم کے احتساب کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ مساس..... عصمت کے افسانوں کی کوئی سمت ہی نہیں..... عصمت کی غیر معمولی قوتِ مشاہدہ حیرت میں غرق کر دیتی ہے..... عصمت فحش نگار ہے..... ہلکا ہلکا طنز اور مزاح عصمت کے اسٹائل کی ممتاز خوبیاں ہیں..... عصمت تلوار کی دھار پر چلتی ہے۔

عصمت پر بہت کچھ کہا گیا ہے اور کہا جاتا رہے گا۔ کوئی اسے پسند کرے گا۔ کوئی ناپسند۔ لیکن لوگوں کی پسندیدگی اور نا پسندیدگی سے زیادہ اہم چیز عصمت کی تخلیقی قوت ہے۔ بری بھلی، عریاں، مستور جیسی بھی ہے قائم رہنی چاہئے۔ ادب کا کوئی جغرافیہ نہیں۔ اسے نقشوں اور خاکوں کی قید سے جہاں تک ممکن ہو بچانا چاہئے۔

عرصہ ہوا دہلی کے ایک ذات شریف درویش نے عجیب و غریب حرکت کی آپ نے "اوروں کی کہانی سن میری زبانی، اس کے پڑھنے سے بہنوں کا بھلا ہوگا" جیسے عنوان سے شائع کی۔ اس میں میرا، عصمت، مفتی، پریم چند، خواجہ محمد شفیع اور عظیم بیگ چغتائی کا ایک ایک افسانہ شامل تھا۔ دیباچے میں ترقی پسند ادب پر ایک تنقیدی چوٹ ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ کے مصداق فرمائی گئی تھی اور اس کارنامے کو اپنے دو ننھے ننھے بچوں کے نام سے معنون کیا گیا تھا۔ اس کی ایک کاپی آپ نے عصمت کو اور مجھے روانہ کی۔ عصمت کو درویش کی یہ ناشائستہ اور بھونڈی حرکت سخت ناپسند آئی۔ چناں چہ بہت بھنا کر مجھے ایک خط لکھا۔

"منٹو بھائی آپ نے وہ کتاب جو درویش نے چھاپی ہے دیکھی؟ ذرا اسے پھٹکاریے اور ایک نوٹس دیجئے۔ نجی طور پر کہ ہر مضمون کا جرمانہ دو سو روپے دو ورنہ دعویٰ ٹھونک دیں گے۔ کچھ ہونا چاہئے۔ آپ بتائیے کیا کیا جائے۔ یہ خوب ہے کہ جس کا دل چاہتا ہے اٹھا کر ہمیں کیچڑ میں لتھیڑ دیتا ہے اور ہم کچھ نہیں کہتے ذرا مزہ رہے گا۔ اس شخص کو خوب رگڑیے ڈانٹئے کہ الٹا علم بردار کیوں بن رہا ہے عریاں ادب کا اس نے ہمارے افسانے صرف کتاب فروخت کرنے کے لئے چھاپے ہیں۔ ہماری ہتک ہے کہ ہرا یرے غیرے نتھو خیرے، کم عقلوں کی ڈانٹیں سننا پڑیں۔ جو کچھ میں نے لکھا ہے اس کو سامنے رکھ کر ایک مضمون لکھئے۔ آپ کہیں گے میں کیوں نہیں لکھتی تو جواب ہے کہ آپ پہلے ہیں۔"

جب عصمت سے ملاقات ہوئی تو اس خط کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا "سب سے پہلے لاہور کے چوہدری محمد حسین صاحب ہیں ان سے ہم درخواست کریں تو وہ ضرور مسٹر درویش پر مقدمہ چلوا دیں گے۔"

عصمت مسکرائی "تجویز تو ٹھیک ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ ہم بھی ساتھ دھر لئے جائیں گے۔"

میں نے کہا "کیا ہوا..... عدالت خشک جگہ سہی لیکن کرنال شاپ تو کافی دلچسپ جگہ ہے..... مسٹر درویش کو وہاں لے جائیں گے" اور..... عصمت کے گالوں کے گڑھے گہرے ہو گئے۔

★

دوزخی

عصمت چغتائی

"لحاف" کے بعد "دوزخی" عصمت چغتائی کی ایک نمائندہ اور یادگار تحریر ہے۔ اس کہانی کی اہمیت یوں بھی دوچند ہو جاتی ہے کہ اس کا مرکزی کردار کوئی خیالی شخصیت نہیں بلکہ مصنفہ کے حقیقی بھائی مشہور مزاح نگار عظیم بیگ چغتائی ہیں۔ ان کی زندگی اور فکر وفن پر جس کھرے اور کھرّے انداز میں عصمت چغتائی نے قلم اُٹھایا، اس سے اندازہ کیجیے کہ انھیں اپنے قلم کی آبرو کا کس قدر پاس تھا۔ اپنے ماں جائے کے لیے ایسی حقیقت بیانی ایک بہن کے قلم سے بڑے حوصلے اور جرأت کا کام ہے اور یہی کام وہ زندگی بھر کرتی رہیں۔ معاشرے کی منافقتوں کے خلاف اُن کی جنگ ہمیشہ جاری رہی۔ سچ کی صلیب پر اپنی ہر تحریر میں وہ مصلوب ہونے کے کرب سہتی رہیں۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد "مرد" تھیں

جب تک کالج سر پر سوار رہا، پڑھنے لکھنے سے فرصت ہی نہ ملی جو ادب کی طرف توجہ کی جاتی اور کالج سے نکل کر اس دل میں یہی بات بیٹھ گئی کہ ہر وہ چیز جو دو سال پہلے لکھی گئی بوسیدہ، بدمذاق اور جھوٹی ہے۔ نیا ادب صرف آج اور کل میں ملے گا۔ اس نئے ادب نے اس قدر گڑبڑایا کہ نہ جانے کتنی کتابیں صرف نام دیکھ کر ہی واہیات سمجھ کر پھینک

دیں اور سب سے زیادہ بیکار کتابیں وہ عظیم بیگ چغتائی کی تھیں "گھر کی مرغی دال برابر" والا مضمون۔ گھر کے ہر کونے میں ان کی کتابیں رلتی پھرتیں مگر سوائے اماں اور دو ایک پرانے فیشن کی بھابیوں کے کسی نے اٹھا کر بھی نہ دیکھیں۔ یہی خیال ہوتا بھلا ان میں ہوگا ہی کیا۔ یہ ادب نہیں پھکڑ مذاق' پرانے عشق کے سڑیل قصے اور جی بہلانے والی باتیں ہوں گی یعنی بے پڑھے رائے قائم' مجھے خود یقین نہیں آیا کہ میں نے عظیم بھائی کی کتابیں کیوں نہ پڑھیں' شاید اس میں تھوڑا سا غرور بھی شامل تھا اور خود ستائی بھی۔ یہ خیال ہوتا تھا یہ پرانے ہیں' ہم نئے۔

ایک دن یونہی لیٹے لیٹے ان کا ایک مضمون "یکہ" نظر آیا۔ میں اور قسیم (چھوٹے بھائی) پڑھنے لگے۔ نہ جانے کس دھن میں تھے کہ ہنسی آنے لگی اور اس قدر آئی کہ پڑھنا دشوار ہوگیا۔ ہم پڑھ ہی رہے تھے عظیم بھائی آگئے اور اپنی کتاب پڑھتے دیکھ کر کھل گئے۔ مگر ہم جیسے چڑ گئے اور منہ بنانے لگے وہ ایک ہوشیار تھے' بولے "لاؤ میں تمہیں سناؤں" اور یہ کہہ کر دو ایک مضمون جو ہمیں سنائے تو صحیح معنوں میں ہم زمین پر لوٹنے لگے۔ ساری بناوٹ غائب ہوگئی' ایک تو ان کے مضمون اور پھر ان ہی کی زبانی' یہ معلوم ہوتا تھا ہنسی کی چنگاریاں اڑ رہی ہیں' جب وہ خوب احمق بنا چکے تو بولے۔

"تم لوگ تو کہتے ہو میرے مضمونوں میں کچھ نہیں"

انہوں نے چھیڑا۔ ہمارے منہ اتر کر ذرا ذرا سے نکل آئے اور بے طرح چڑ گئے۔ جھنجلا کر الٹی سیدھی باتیں کرنے لگے جی جل گیا اور پھر اس کے بعد اور بھی ان کی کتابوں سے نفرت ہوگئی۔

میں نے ان کے مضامین کی ان کی زندگی میں کبھی تعریف نہ کی حالانکہ وہ میرے مضمون دیکھ کر ایسے خوش ہوتے تھے کہ بیان نہیں۔ اس قدر پیار سے تعریف کرتے تھے مگر یہاں تو ان کی ہر بات سے چڑنے کی عادت تھی۔ میں سمجھتی تھی کہ وہ میرا مذاق اڑاتے ہیں' اور بخدا جب وہ شخص کسی کا مذاق اڑاتا تھا تو جی چاہتا تھا' بچوں کی طرح زمین پر مچل جائیں اور روئیں۔ کس قدر طنز' کیسی کڑوی مسکراہٹ اور کٹتے ہوئے جملے۔ میں تو ہر وقت ڈرتی تھی کہ میرا مذاق اڑایا اور میں نے بدزبانی کی۔

کبھی کہتے تھے کہ "مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں تم مجھ سے اچھا نہ لکھنے لگو" اور میں نے صرف چند مضمون لکھے تھے۔ اس لئے جی جلتا تھا کہ یہ میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔

ان کے انتقال کے بعد نہ جانے کیوں مرنے والے کی چیزیں پیاری ہوگئیں۔ ان کا ایک ایک لفظ چبھنے لگا اور میں نے عمر میں پہلی دفعہ ان کی کتابیں دل لگا کر پڑھیں' دل لگا کر پڑھنے کی بھی خوب رہی گویا دل لگانے کی بھی ضرورت تھی' دل خود بخود کھنچنے لگا۔ افوہ! یہ کچھ لکھا ہے' ان رلنے والی کتابوں میں ایک ایک لفظ پر ان کی تصویر آنکھوں میں کھنچ جاتی ہے اور پل بھر میں وہ غم اور دکھ میں ڈوبی ہوئی مسکرانے کی کوشش کرتی ہوئی آنکھیں' وہ اندوہناک سیاہ گھٹاؤں کی طرح مرجھائے ہوئے چہرے پر پڑے ہوئے گھنے بال' وہ پیلی نیلاہٹ لئے ہوئے بلند پیشانی' پژمردہ اودے ہونٹ جن کے اندر قبل ازوقت توڑے ہوئے ناہموار دانت اور وہ لاغر سوکھے سوکھے ہاتھ اور عورتوں جیسے نازک دواؤں میں بسی ہوئی لمبی انگلیوں والے ہاتھ اور پھر ان ہاتھوں پر ورم آگیا تھا۔ پتلی پتلی کھپچی جیسی ٹانگیں جن کے سرے پر ورم سے سوجے ہوئے بدوضع پیر جن کے دیکھنے کے ڈر کی وجہ سے ہم لوگ ان کے سرہانے ہی کی طرف جایا کرتے تھے اور سوکھے ہوئے پنجرے جیسے سینے پر دھونکنی کا شبہ ہوتا تھا۔ کلیجے پر ہزاروں کپڑوں بنیانوں کی تہیں اور اس سینے میں ایسا پھڑکتا ہوا چلبلا دل! یا اللہ یہ شخص کیونکر ہنستا تھا۔ معلوم ہوتا تھا' کوئی بھوت ہے یا جن جو ہر خدائی طاقت سے کشتی لڑ رہا ہے۔ نہیں مانتا' مسکرائے جاتا ہے۔ خدائے قہار و جبار بڑھ چڑھ کر کھانسی اور دمے کا عذاب نازل کر رہا ہے اور یہ دل قہقہے نہیں چھوڑتا۔ کون سا دنیا و دین کا دکھ تھا جو قدرت نے بچا رکھا تھا مگر پھر بھی نہ رلا سکا۔ اس دکھ میں جلن' ہنستے نہیں ہنساتے رہنا' کسی انسان کا کام نہیں' ماموں کہتے تھے "زندہ لاش" خدایا اگر لاشیں بھی اس قدر جاندار بے چین اور پھڑکنے والی ہوتی ہیں تو پھر دنیا ایک لاش کیوں نہیں بن جاتی۔

میں ایک بہن کی حیثیت سے نہیں' ایک عورت بن کر ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتی تو دل لرز اٹھتا تھا۔ کس قدر ڈھیٹ تھا ان کا دل۔ اس میں کتنی جان تھی۔ منہ پر گوشت نام کو نہ تھا مگر کچھ دن پہلے چہرے پر ورم آجانے سے چہرہ خوب صورت ہوگیا تھا' کنپٹیاں بھر گئی تھیں۔ پچکے ہوئے گال دبیز ہوگئے تھے۔ ایک موت کی سی جلا چہرے پر آئی تھی اور رنگت میں کچھ عجیب طلسمی سبزی سی آگئی تھی جیسے حنوط کی ہوئی ممی! مگر آنکھیں معلوم ہوتا تھا کسی بچے کی شریر آنکھیں جو ذرا سی بات پر ناچ اٹھتی تھیں اور پھر کبھی ان میں نوجوان لڑکوں کی سی شوخی جاگ اٹھتی تھی اور یہی آنکھیں کبھی دورے کی شدت سے گھبرا کر چیخ اٹھتیں۔ ان کی صاف شفاف نیلی سطح

گدلی زرد ہوجاتی اور بے کس ہاتھ لرزنے لگتے۔ سینہ پھٹنے پر آجاتا۔ دورہ ختم ہوا کہ پھر وہی روشنی پھر وہی رقص پھر وہی چمک۔

ابھی چند دن ہوئے میں نے پہلی مرتبہ "خانم" پڑھی۔ ہیرو وہ خود نہیں' ان میں اتنی جان ہی کب تھی مگر ان کا ہیرو ان کے تخیل کا ہیرو ہے۔ وہ ان کے دبے ہوئے جذبات کا تخیلی مجسمہ ہے جیسے ایک لنگڑا خوابوں میں خود کو ناچتا' کودتا' دوڑتا ہوا دیکھتا ہے' ایسے ہی وہ مرض میں گرفتار نڈھال پڑے اپنے ہمزاد کو شرارتیں کرتا دیکھتے تھے۔ کاش ایک دفعہ اور صرف ایک دفعہ ان کی خانم اس ہیرو کو دیکھ لیتی۔

شاید اوروں کے لئے خانم کچھ بھی نہیں لیکن سوائے لکھنے والے کے اور باقی کے سارے کیریکٹر درست اور زندہ ہیں۔ بھائی صاحب' بھابی جان' نانی اماں' شیخانی' والد صاحب بھتیجے' بھتیجی' بہشتی۔ یہ سب کے سب ہیں اور رہیں گے۔ یہی ہوتا تھا' بالکل یہی اور اب بھی سب گھروں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ کم از کم میرے گھر میں تو تھا اور ایک ایک لفظ گھر کی سچی تصویر ہے۔ جب عظیم بیگ لکھتے تھے تو سارا گھر اور ہم سب ان کے لئے ایکٹنگ کیا کرتے تھے' ہم ہلتے جلتے کھلونے تھے۔ اور وہ ایک نقاش جس نے بالکل اصل کی نقل کردی۔ جتنی دفعہ خانم کو پڑھتی ہوں یہی معلوم ہوتا ہے' خاندان کا گروپ دیکھتی ہوں۔ وہ بھابی جان اور خانم جھگڑ رہی ہیں' وہ بھائی صاحب شرارتیں ایجاد کررہے ہیں اور مصنف خود؟ سر جھکائے خاموش تصویر کشی میں مشغول ہے۔

"کھرپا بہادر" جس کا پہلا ٹکڑا "روح لطافت" میں چھپا ہے۔ یہ سب تخیلی ہے۔ لاچار و مجبور انسان اپنے ہمزاد سے دنیا جہان کی شرارتیں کروالیتا ہے۔ وہ خود تو دو قدم نہیں چل سکتا لیکن ہمزاد چوریاں کرتا شرارتیں کرتا ہے۔ خود تو ایک انگلی کا بوجھ نہیں سہار سکتا۔ مگر ہمزاد جی بھر کر مار کھاتا ہے اور ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ مصنف کو ارمان تھا کہ کاش وہ بھی اتنا مضبوط ہوتا کہ دوسرے بھائیوں کی طرح ڈیڑھ ڈیڑھ سو جوتے کھا کر کمر جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوتا۔ تندرست لوگ کیا جانیں' ایک بیمار کے دل میں کیا کیا ارمان ہوتے ہیں۔ پر کٹا پرندہ ویسے نہیں تو خوابوں میں تو دنیا بھر کی سیر کر آتا ہے۔ یہی حال ان کا تھا وہ جو کچھ نہ تھے' افسانے میں وہی بن کر دل کی آگ بجھالیتے تھے' کچھ تو چاہئے نا جینے کے لئے۔

شروع ہی سے روتے دھوتے پیدا ہوئے' روئی کے گالوں پر رکھ کر پالے گئے۔ کمزور دیکھ کر ہر ایک معاف کردیتا۔ قوی ہیکل بھائی سر جھکا کر پٹ لیتے۔ کچھ بھی کریں' والد صاحب کمزور جان کر معاف کردیتے۔ ہر ایک دلجوئی میں لگا رہتا۔ مگر بیمار کو بیمار کہو تو اسے خوشی کب ہوگی۔ ان مہربانیوں سے احساسِ کمزوری اور بڑھتا' بغاوت اور بڑھتی' غصہ اور بڑھتا۔ مگر بے بس' سب نے ان کے ساتھ گاندھی جی والی نان وائلنس شروع کردی تھی۔ وہ چاہتے تھے کوئی انہیں بھی انسان سمجھے۔ انہیں بھی کوئی ڈانٹے انہیں بھی کوئی زندہ لوگوں میں شمار کرے۔ لہٰذا ایک ترکیب نکالی' وہ یہ کہ فسادی بن گئے جہاں چاہا دو آدمیوں کو لڑا دیا۔ اللہ نے دماغ دیا تھا اور پھر اس کے ساتھ بلا کا تخیل اور تیز زبان' چٹخارے لے کر کچھ ایسی ترکیبیں چلتے کہ جھگڑا ضرور ہوتا۔ بہن بھائی' ماں باپ سب کو نفرت ہوگئی۔ اچھا خاصا گھر میدانِ جنگ بن گیا اور سب مصیبتوں کے ذمے دار خود' بس ساری خود پرستی کے جذبات مطمئن ہوگئے اور کمزور' لاچار' ہردم کار کردگی' تھیٹر کا ولن ہیرو بن گیا اور کیا چاہئے ساری کمزوریاں ہتھیار بن گئیں' زبان بد سے بدتر ہوگئی۔ دنیا میں ہر کوئی نفرت کرنے لگا۔ صورت سے جی متلانے لگا۔ ہنستے بولتے لوگوں کو دم بھر میں دشمن بنالینا بائیں ہاتھ کا کام ہوگیا۔

لیکن مقصد یہ تو نہ تھا کہ واقعی دنیا انہیں چھوڑ دے۔ گھر والوں نے جتنا ان سے کھنچنا شروع کیا' اتنا ہی وہ لپٹے' آخر میں تو خدا معاف کرے ان کی صورت دیکھ کر نفرت آتی تھی۔ وہ لاکھ کہتے مگر دشمن نظر آتے تھے۔ بیوی' شوہر نہ سمجھتی' بچے باپ نہ سمجھتے۔ بہن نے کہہ دیا "تم میرے بھائی نہیں" اور بھائی آواز سن کر نفرت سے منہ موڑ لیتے۔ ماں کہتی "سانپ جنا تھا میں نے۔"

مرنے سے پہلے قابلِ رحم حالت تھی۔ بہن ہو کر نہیں' انسان ہو کر کہتی ہوں۔ جی چاہتا تھا کہ جلدی سے مر چکیں' آنکھوں میں دم ہے مگر دل دکھانے سے نہیں چوکتے' عذابِ دوزخ بن گئے ہیں' ہزاروں کہانیوں اور افسانوں کا ہیرو ایک ولن بن کر مطمئن ہوچکا تھا۔ وہ چاہتا تھا' اب بھی کوئی اسے پیار کرے' بیوی پوجا کرے' بچے محبت سے دیکھیں' بہنیں واری جائیں اور ماں کلیجے سے لگائے۔

ماں نے تو واقعی کلیجے سے لگالیا۔ بھولا بھٹکا راستے پر آن لگا۔ آخر کو ماں تھی مگر اوروں کے دل سے نفرت نہ گئی یہاں تک کہ پھیپھڑے ختم ہوگئے' ورم بڑھ گیا' آنکھیں چندھیا گئیں اور اندھوں کی طرح ٹٹولنے پر بھی راستہ نہ ملا۔ ہیرو بن کر بھی ہار ان کی ہی رہی جو چاہا نہ ملا۔ اس کے بدلے نفرت' حقارت' کراہت ملی' انسان کس قدر پُرہوس ہوتا ہے۔ اتنی

شہرت اور نام ہونے کے باوجود حقارت کی ٹھوکریں کھا کر جان دی، صبح چار بجے آج سے ۴۲ برس پہلے جو ننھا سا کمزور بچہ پیدا ہوا تھا وہ زندگی کا کھیل کھیل چکا تھا۔

۲۰ اگست کو صبح چھ بجے شمیم نے آکر کہا "منے بھائی ختم ہو رہے ہیں اٹھو۔"

"وہ کبھی بھی ختم نہ ہوں گے۔۔ بیکار مجھے جگا رہے ہو" میں نے بگڑ کر صبح کی ٹھنڈی ہوا میں پھر سو جانے کا ارادہ کیا۔

"ارے کم بخت تجھے یاد کر رہے ہیں" شمیم نے کچھ پریشان ہو کر بلایا۔

"ان سے کہہ دو اب حشر کے دن ملیں گے۔ ارے شمیم وہ کبھی نہیں مر سکتے" میں نے وثوق سے کہا۔

مگر جب میں نیچے آئی تو ان کی زبان بند ہو چکی تھی۔ کمرا سامان سے خالی کر دیا گیا تھا۔ سارا کوڑا کرکٹ، کتابیں ہٹا دی گئی تھیں، دوا کی بوتلیں لاچاری کی تصویر بنی لڑھک رہی تھیں۔ ننھے بچے پریشان ہو ہو کر دروازے کو تک رہے تھے۔ بھابی انہیں زبردستی چائے پلا رہی تھیں۔ ماں پلنگ کی چادر بدل رہی تھیں۔ سوکھی سوکھی آہیں ان کے کلیجے سے نکل رہی تھیں، آنسو بند تھے۔

"منے بھائی" میں نے ان پر جھک کر کہا ایک لمحہ کو آنکھیں اپنے محور پر رکیں، ہونٹ سکڑے اور پھر وہی نزع کی حالت طاری ہو گئی۔ ہم سب باہر بیٹھ کر چار گھنٹے تک سوکھے بے جان ہاتھوں کی جنگ دیکھتے رہے، معلوم ہوتا تھا، عزرائیل بھی پست ہو رہے ہیں، جنگ تھی کہ ختم ہی نہ ہوتی تھی۔

"ختم ہو گئے منے بھائی" نہ جانے کس نے کہا۔

"وہ کبھی ختم نہیں ہو سکتے" مجھے خیال آیا۔

اور آج میں ان کی کتابیں دیکھ کر کہتی ہوں، ناممکن وہ کبھی نہیں مر سکتے۔ ان کی جنگ اب بھی جاری ہے۔ مرنے سے کیا ہوتا ہے۔ میرے لئے تو وہ مر کر ہی جیے اور نہ جانے کتنوں کے لئے وہ مرنے کے بعد پیدا ہوں گے اور برابر پیدا ہوتے رہیں گے، ان کا پیغام دکھ سے لڑو، نفرت سے لڑو اور مر کر بھی لڑتے رہو، یہ پیغام کبھی نہ مر سکے گا۔ ان کی باغیانہ روح کو کوئی نہیں مار سکتا وہ نیک نہیں تھے۔ پارسا نہ ہوتے اگر ان کی صحت اچھی ہوتی۔ وہ جھوٹے تھے، ان کی زندگی جھوٹی تھی، سب سے بڑا جھوٹ تھی، ان کا رونا جھوٹا، ہنسنا جھوٹا۔ لوگ کہتے ہیں، ماں باپ کو دکھ دیا، بیوی کو دکھ دیا، بچوں کو دکھ دیا۔ اور سارے جگ کو دکھ دیا۔ وہ ایک عفریت تھے جو عذابِ دُنیا بن کر نازل ہوئے تھے اور اب دوزخ کے

سوا ان کا کہیں ٹھکانا نہیں۔ اگر دوزخ میں ایسے ہی لوگوں کا ٹھکانا ہے تو ایک بار تو ضرور اس دوزخ میں جانا پڑے گا۔ صرف یہ دیکھنے کہ جس شخص نے دُنیا کی دوزخ میں یوں ہنس ہنس کر تیر کھائے اور تیراندازوں کو کڑوے تیل میں تلا' وہ دوزخ میں عذاب نازل کرنے والوں کو کیا کچھ نہ چڑاچڑا کر ہنس رہا ہوگا۔ بس وہ تلخ طنز سے بھری ہنسی دیکھنا چاہتی ہوں جسے دیکھ کر دوزخ کا داروغہ بھی جل اٹھتا ہوگا۔

مجھے یقین ہے وہ اب بھی ہنس رہا ہوگا۔ کیڑے اس کو کھا رہے ہوں گے۔ ہڈیاں مٹی میں مل رہی ہوں گی۔ زمانے کے فتوؤں سے اس کی گردن دب رہی ہوگی۔ آروں سے اس کا جسم چیرا جارہا ہوگا۔ مگر وہ ہنس رہا ہوگا۔ آنکھیں شرارت سے ناچ رہی ہوں گی' نیلے مردہ ہونٹ تلخی سے ہل رہے ہوں گے' مگر کوئی اسے رلا نہیں سکتا۔

وہ شخص جس کے پھیپھڑوں میں ناسور' ٹانگیں عرصے سے اکڑی ہوئی' بانہیں انجکشنوں سے لدی ہوئی' کولھے میں امرود برابر پھوڑا۔ آخر دم اور چیونٹیاں جسم میں لگنا شروع ہوگئیں۔ کیا ہنس کر کہتا ہے "یہ چیونٹی صاحبہ بھی کس قدر بے صبر ہیں۔ یعنی قبل از وقت اپنا حصہ لینے آپہنچیں....." یہ مرنے سے دو دن پہلے کہا' دل چاہیے' پتھر کا کلیجہ ہو' مرتے وقت جملے کسنے کے لئے۔

ان کا ایک جملہ ہو تو لکھا جائے ایک لفظ ہو جو یاد آئے۔ پوری کی پوری کتابیں ایسے ایسے چٹکلوں سے بھری پڑی ہیں۔ دماغ تھا کہ انجن بنا آگ پانی کے ہر وقت چلتا رہتا تھا۔ اور زبان تھی کہ قینچی' اس قدر نپے تلے جملے نکالتی تھی کہ جم کر رہ جاتے تھے۔

نئے لکھنے والوں کے آگے ان کی گاڑی نہیں چلی۔ دُنیا بدل گئی ہے۔ خیالات بدل گئے ہیں ہم نئے لوگ بدزبان ہیں اور منہ پھٹ' ہم دل دکھتا ہے تو رو دیتے ہیں۔ سرمایہ داری' سوشلزم اور بیکاری نے ہم لوگوں کو جھلسا دیا ہے۔ ہم جو کچھ لکھتے ہیں۔ دانت پیس پیس کر لکھتے ہیں۔ اپنے پوشیدہ دکھوں' کچلے ہوئے جذبات کو زہر بنا کر اگلتے ہیں۔ وہ بھی دکھی تھے۔ نادار' بیمار اور مفلس تھے۔ سرمایہ داری سے عاجز۔ مگر پھر بھی اتنی ہمت تھی کہ زندگی کا منہ چڑا دیتے تھے۔ دکھ میں ٹھٹھا لگا لیتے تھے۔ وہ افسانوں ہی میں نہیں ہنستے تھے' زندگی کے ہر معاملے میں ہنس ہنس کر دکھ کو نیچا کر دیتے تھے۔

باتوں کے اس قدر شوقین کہ دُنیا کا کوئی انسان ہو۔ اس سے دوستی' کھرپا بہادر' میں جو شاہ لنگر ان کے حالات ہیں وہ ایک میراثن سے معلوم ہوئے۔ اس سے ایسی دوستی تھی کہ بس بیٹھے ہیں اور گھنٹوں بکواس ہو رہی ہے۔ لوگ متحیر ہیں کہ یا اللہ! یہ بڑھیا میراثن سے کیا باتیں ہو رہی ہیں مگر جو کچھ انہوں نے لکھا ہے اسی میراثن نے بتایا ہے۔

اور تو اور بھنگن' بہشتن' راہ چلتوں کو روک کر باتیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ کچھ دن اسپتال میں رہے' وہاں رات کو جب خاموشی ہو جاتی' آپ چپکے سے سارے مریضوں کو سمیٹ کر گپیں اڑایا کرتے۔ ہزاروں قصے سنتے اور سناتے۔ وہی قصے سوانہ کی روحیں' مہارانی کا خواب' چمکی اور بڑبڑے بن گئے۔ وہ ہر چیز زندگی سے لیتے تھے۔ اور زندگی میں کتنے جھوٹ ہیں' یہی بات ہے کہ ان کہانیوں میں بہت سی باتیں بعید از قیاس معلوم ہوتی ہیں چونکہ ان کا شاعرانہ تخیل ہر بات پر یقین کرتا تھا۔

ان کی ناولیں بعض جگہ واہیات ہیں' فضول سی۔ خصوصاً کولتار تو بالکل ہی ردی ہے مگر اس میں بھی حقیقت کو اصلی صورت میں گڑبڑ کر کے لکھ دیا ہے "شریر بیوی" تو بالکل فضول ہے مگر اپنے زمانے میں بڑی چلتی چیز تھی۔

"چمکی" ایک دہکتا ہوا شعلہ ہے' یقین نہیں آتا کہ اس قدر سوکھا مارا انسان جس نے اپنی بیوی کے علاوہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ تخیل میں کس قدر عیاش بن جاتا ہے۔ افوہ "چمکی" کی خاموش نگاہوں کے پیغام' وہ ہیرو کا اس کی حرکتوں سے مسحور ہو جانا۔ اور پھر خود مصنف کی زندگی..... کس قدر مکمل جھوٹ۔ یہ عظیم بھائی نہیں' ان کا ہمزاد ہوتا تھا جو ان کے جسم سے دور ہو کر حسن و عشق کی عیاشیاں کراتا ہے۔

عظیم بھائی کی مقبولیت یوں بھی موجودہ ادب میں یعنی بالکل نئے ادب میں نہ تھی کہ وہ کھلی باتیں نہیں لکھتے تھے۔ وہ عورت کا حسن دیکھتے تھے مگر اس کا جسم بہت کم دیکھتے تھے۔ جسم کی بناوٹ کی داستانیں پرانی مثنویوں گل بکاؤلی' زہر عشق وغیرہ میں بہت نمایاں تھیں اور پھر انہیں پرانی کہہ دیا گیا تھا لیکن اب یہ فیشن اکلا ہے کہ وہی پرانا سینے کا اتار چڑھاؤ۔ پنڈلیوں کی گاؤدی' رانوں کا گداز نیا ادب بن گیا ہے۔ وہ اسے عریانی سمجھتے تھے اور عریانی سے ڈرتے تھے۔ گو جذبات کی عریانی ان کے یہاں عام ہے اور بہت غلیظ باتیں بھی لکھنے میں نہیں جھجکتے تھے۔ وہ عورت کے جذبات تو عریاں دیکھتے تھے مگر خود اسے کپڑے پہنے دیکھتے تھے وہ زیادہ بے تکلفی سے مجھ سے بات نہیں کرتے تھے اور بہت بچہ سمجھتے تھے۔ کبھی کسی جنسی مسئلہ پر تو وہ کسی سے بحث کرتے ہی نہ تھے۔ ایک دوست سے صرف اتنا کہا کہ نئے ادیب بڑے جوشیلے ہیں لیکن بھوکے ہیں اور اوپر سے ان پر جنسی اثر بہت

ہے۔ جو کچھ لکھتے ہیں "اماں کھانا" معلوم ہوتا ہے۔ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ ہندوستانی ادب میں ہر زمانہ میں جنس بہت نمایاں رہتی ہیں۔ یہاں کے لوگ جنس سے بہت متاثر ہیں۔ ہماری شاعری، مصوری اور قدیم پرستش سے بھی جنسی بھوک کا پتا چلتا ہے۔ اگر ذرا دیر عشق و محبت کو بھول جائیں تو مقبول عام نہیں رہ سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت جلد ادب میں ان کا رنگ غائب ہو کر وہی "الف لیلہ" کا رنگ غالب آگیا۔

انہیں حجاب امتیاز علی سے خاص لگاؤ تھا (میں محترمہ سے معافی مانگ کر کہوں گی کہ مرنے والے کا راز ہے) کہا کرتے تھے "یہ عورت بہت پیار سے جھوٹ بولتی ہے۔"

انہیں شکایت تھی کہ میں بہت ہی الٹے سیدھے جھوٹ بولتی ہوں۔ میرے جھوٹ بھوکے کی پکار ہیں اور ان کے جھوٹ بھوکے کی مسکراہٹیں۔ اللہ جانے ان کا کیا مطلب ہوتا تھا۔

ہم ان کے افسانوں کو عموماً جھوٹ کہا کرتے تھے، جہاں انہوں نے کوئی بات شروع کی اور والد صاحب مرحوم ہنسے پھر "قصر صحرا" کہنے لگے۔ وہ ان کی گپوں کو قصر صحرا کہتے تھے۔

عظیم بھائی کہتے "سرکار! دنیا میں جھوٹ کے بغیر کوئی رنگینی نہیں۔ بات کو دلچسپ بنانا چاہو تو جھوٹ اس میں ملا دو۔"

وہ یہ بھی کہتے تھے کہ "جنت اور دوزخ کا بیان بھی تو قصر صحرا ہے۔"

اس پر ماموں کہتے "ارے اس زندہ لاش کو منع کرو کہ یہ کفر ہے" اس پر وہ ماموں کے توہم پرست سسرال والوں کا تمسخر اڑاتے تھے۔

انہیں پیری مریدی ڈھونگ معلوم ہوتا تھا لیکن کہتے تھے "دنیا کا ہر ڈھونگ ایک مزیدار جھوٹ ہے اور جھوٹ ہی مزیدار ہے۔"

کہتے تھے "میری صحت اجازت دیتی تو میں اپنے باپ کی قبر بنوا دیتا۔ بس دو سال قوالی کرا دیتا اور چادر چڑھاتا، مزے سے آمدنی ہوتی۔"

انہیں دھوکا باز اور مکار آدمی سے مل کر بڑی خوشی ہوتی تھی کہتے تھے 'دھوکا اور مکاری مذاق نہیں، عقل چاہیئے ان چیزوں کے لئے۔

انہیں ناچ گانے سے بڑا شوق تھا مگر کس ناچ سے؟ یہ جو فقیر بچے آتے ہیں ان کو عموماً پیسے دے کر ڈھول پر ناچتے ہوئے اس شوق سے دیکھا کرتے تھے کہ ان کا انہماک دیکھ کر ہول آتا تھا۔ نہ جانے انہیں اس ننگے بھوکے ناچ میں کیا کچھ نظر آتا تھا۔

میں نے انہیں کبھی نماز پڑھتے نہ دیکھا۔ قرآن شریف لیٹ کر پڑھتے تھے اور بے ادبی سے اس کے ساتھ ساتھ سو جاتے تھے۔ لوگوں نے ملامت کی تو اس پر کاغذ چڑھا کر کہہ دیا کرتے تھے 'کچھ نہیں' قانونی کتاب ہے۔ جھوٹ تو خوب نبھاتے تھے۔

حدیث بہت پڑھتے تھے اور لوگوں سے بحث کرنے کے لئے عجیب عجیب حدیثیں ڈھونڈ کر حفظ کر لیتے تھے اور سنا کر لڑا کرتے تھے۔ ان کی حدیثوں سے لوگ بڑے عاجز تھے۔ قرآن کی آیات بھی یاد تھیں اور بے تکان حوالہ دیتے تھے۔ شک کرو تو سرہانے سے قرآن نکال کر دکھا دیتے تھے۔

سیاست سے کم دلچسپی تھی کہتے تھے "بابا ہم لیڈر بن نہیں سکتے تو پھر کیا کہیں 'لوگ کہیں گے تم ہی کچھ کر کے دکھاؤ اور یہاں کمبخت کھانسی اور دمہ نہیں چھوڑتا۔" بہت سال ہوئے کچھ مضامین "ریاست" میں سیاسیات اور اکنامکس پر لکھے تھے' وہ نہ جانے کیا ہوئے۔ مذہب کا جنون سا تھا مگر آخر میں آکر بحث کم کر دی تھی اور کہتے تھے۔

"بھئی تم لوگ تو ہٹے کٹے اور میں مرنے والا ہوں اور جو کہیں دوزخ جنت سب نکل آئیں تو کیا کروں گا۔ لہٰذا چپ ہی رہو۔"

پردہ کے خلاف تو ابتدا سے تھے مگر آخر میں کہتے تھے "یہ پرانی بات ہوگئی، اب پردہ روکے سے نہیں رک سکتا۔ اس معاملے میں ہم کر چکے جو کرنا تھا اب تو نئی پریشانیاں ہیں۔"

لوگ کہتے تھے "دوزخ میں جاؤ گے" تو فرماتے "یہاں کونسی اللہ میاں نے جنت دے دی جو وہاں دوزخ کی دھمکیاں ہیں۔ کچھ پروا نہیں، ہم تو عادی ہیں۔ اللہ میاں اگر ہمیں دوزخ میں جلائیں گے تو ان کی لکڑی اور کوئلہ بیکار جائے گا کیونکہ ہم تو ہر عذاب کے عادی ہیں۔"

کبھی کہتے "اگر دوزخ میں رہے تو ہمارے جراثیم مر جائیں گے۔ جنت میں تو ہم سارے مولویوں کو دق میں لپیٹ لیں گے۔"

یہی وجہ ہے کہ سب انہیں باغی اور دوزخی کہتے ہیں۔ وہ کہیں پر بھی جائیں۔ میں انہیں دیکھنا چاہتی ہوں کیا وہاں بھی ان کی وہی قینچی جیسی زبان چل رہی ہے؟ کیا وہاں وہ حوروں سے عشق لڑا رہے ہیں یا دوزخ کے فرشتوں کو پتا کر مسکرا رہے ہیں، مولویوں سے الجھ رہے ہیں یا دوزخ کے بھڑکتے شعلوں میں ان کی کھانسی گونج رہی ہے۔ پھیپھڑے پھول رہے ہیں اور فرشتے ان کے انجکشن گھونپ رہے ہیں۔ فرق ہی کیا ہے، ایک دوزخ سے دوسری دوزخ میں۔ دوزخی کا کیا ٹھکانا۔

اصغر گونڈوی

موجِ عرفان

تحریر و تحقیق: ڈاکٹر ساجد امجد

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کی ابتدا میں جن شعرا نے اردو غزل کی آبیاری کی ان میں اس کا نام کسی سے پیچھے نہیں ہے- اس کا قلم نظم و نثر کسی میدان میں بند نہیں تھا- برسوں پہلے گلہائے غزل کو تصوّف کی جس خوشبو سے خواجہ میر دردؒ اور مرزا مظہر جانِ جاناںؒ نے روشناس کرایا تھا' اس نے اسی خوشبو سے مہکادیا- ساری زندگی درویشانہ انداز میں بسر کرنے والے اس اہلِ دل نے زمانے کی کیسی کیسی ستم ظریفیاں برداشت کیں اور کیسے کیسے نشترِ زہر آلود نزدیکِ رگِ جاں برداشت کئے' یہ ماجرا آج بھی قابلِ غور ہے کہ دنیا کی ازل سے یہی ریت چلی آرہی ہے-

راہِ سلوک کے مسافر مشہور شاعر اصغؔر گونڈوی کی سرگزشت

دہلی پر زوال آیا تو فیض آباد کی بن آئی۔ شہر کیا تھا ایک میلہ تھا۔ میلہ تو دو چار دن کے لیے اپنی بہار دکھاتا ہے' آنکھیں سجاتا ہے پھر دکانیں سمٹ جاتی ہیں۔ میدان میں دھول اڑتی ہے لیکن یہ میلہ ایسا تھا کہ بس گیا تو بس گیا۔ خالی میدان کو بھرنے قافلے کے قافلے اُتر رہے تھے۔ شہرپناہ کی دیوار شروع نہیں ہوتی تھی کہ شہر کے آثار شروع ہوجاتے تھے۔

نواب شجاع الدولہ کی زندگی تک یہ میلہ ایک شہر بنا رہا لیکن ان کی آنکھ بند ہوتے ہی معلوم ہوا یہ تو میلہ ہی تھا۔ ان کے جانشین آصف الدولہ نے اس میلے کو لکھنؤ پہنچادیا۔ فیض آباد ویران ہوا لیکن لکھنؤ میں خوب رنگ جما۔ رنگینیوں کو زبان ملی تو شاعری کا خوب چرچا ہوا۔ لکھنؤ تو خیر مرکزِ شاعری تھا' دور افتادہ قصبات و دیہات بھی اس شریفانہ مشغلے کا گہوارہ بن گئے۔

فیض آباد سے ۳۲ میل شمال کی جانب دریائے گھاگرا کے اس پار گونڈا کی بستی بسی ہوئی تھی۔ آسمانِ اودھ سے اترنے والی روشنی سے یہاں بھی روشنی تھی۔ اودھ اس وقت علم و فضل' شعر و ادب اور رقص و موسیقی کا گہوارہ تھا۔ دور دراز کے قصبات بھی اسی تہذیب سے منّور تھے۔ شعر و ادب سے شغف' شاعروں کا قیام و اہتمام' رقص کی محفلوں کا انعقاد' اربابِ نشاط سے دل بستگی کے سامان گونڈا میں بھی فراہم تھے۔ کچھ دور کے تماشائی تھے کچھ قریب کے شناسا۔ خاص طور پر شاعری کے چرچے نے ہر چرچے کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ گونڈا شہر میں وجد بلگرامی اور پنڈت کیف جیسے نامور شعرا نے شاعری کی محفلوں کو رشکِ لکھنؤ بنادیا تھا۔ وہ اور ان کے شاگرد ہر ستارے کو مہتاب بنارہے تھے۔

گونڈا ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر کے کمرے میں ایک صاحب ابھی ابھی آکر بیٹھے تھے۔ کشیدہ قامت' خوش رو' چہرے پر فرنچ وضع کی خوش نما گھنی داڑھی' بڑی بڑی روشن غلافی آنکھیں اور سر پر لمبے بالوں کے پٹے۔ وہ اپنے بیٹے کو داخل کرانے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ ان کا بیٹا بھی ان کے ساتھ تھا جو انہی کی طرح کم سخن اور خوش شکل تھا۔ اس وقت باپ کے ساتھ اور ہیڈ ماسٹر کے سامنے تھا اس لیے اور بھی چپ چاپ تھا۔

"میرا نام منشی تفضل حسین ہے۔ یہ میرا بیٹا ہے اصغر حسین۔ میں بسلسلۂ ملازمت شہروں شہروں کی خاک چھان کر دوبارہ گونڈا آگیا ہوں اور اب میرا خیال ہے کہیں اور جانا نہیں ہوگا۔ میں اصغر کی تعلیم کی طرف سے بہت

فکر مند ہوں اسی کے سلسلے میں حاضر ہوا تھا۔"

"اب! میرا مطلب ہے اب تک آپ نے ان کی تعلیم کی طرف پیش رفت کیوں نہیں فرمائی۔ صاحب زادے کی عمر چودہ پندرہ کی تو ہو گی" ہیڈ ماسٹر نے کہا۔

"آپ نے غلط سمجھا" منشی تفضل حسین نے ہیڈ ماسٹر سے کہا "فارسی، عربی، اردو میں یہ طاق ہے۔ مکتب کی تعلیم سے فارغ ہو چکا ہے۔ گھر میں فارسی اور دینیات کی کتابوں کا جتنا ذخیرہ تھا، یہ سب ختم کر چکا ہے۔ میں تو اب یہ چاہتا ہوں کہ یہ انگریزی تعلیم سے بھی آشنا ہو جائے۔ اسی لیے آپ کے پاس حاضر ہوا تھا۔"

ہیڈ ماسٹر صاحب اس وضاحت سے مطمئن ہو گئے اور اصغر کو انگریزی کی ابتدائی جماعتوں میں داخلہ مل گیا۔

منشی تفضل حسین مطالعے کے شائق، داستانی دنیا کے سیاح، مذہبیات و دینیات کے دلدادہ، متوسط درجے کے ایک نستعلیق سفید پوش بزرگ تھے۔ ہر باپ کی طرح انہوں نے بھی اصغر میں اپنی ظاہری و باطنی صفات پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اصغر نے بھی چپکے چپکے باپ کی شخصیت کو اپنے لیے نمونہ بنا لیا تھا۔ صورت شکل میں تو باپ سے ملتا ہی تھا، وضع قطع بھی وہی اپنائی۔ کوئی دیکھتا تو یہی کہتا کہ منشی تفضل حسین کا بچپن آنگن میں کھیل رہا ہے۔ وہی لباس، وہی مسحور کن آنکھیں، وہی زیر لب تبسم۔

باپ کے کتب خانے میں تین قسم کی کتابوں کا نایاب ذخیرہ موجود تھا۔ فارسی، دینیات اور طویل داستانیں۔ اصغر نے ان کتابوں کی ورق گردانی کی تو فارسی سے شغف اور اس کا ذوق پروان چڑھا جو اس کے عہد کی تہذیبی ضرورت تھی۔ دینیات کے مطالعے نے اس کو مذہب اور تصوف کی طرف راغب کیا اور طلسماتی داستانوں کے مطالعے سے اس کے مزاج میں تخیل پرستی اور رومانیت آئی۔

گھر سے باہر جو تہذیب اسے دیکھنے کو ملی، اس کا جزو اعظم مذہب سے شغف، حفظِ مراتب کا لحاظ اور معاشرتی اقدار کی پاسداری تھا۔ گھر میں اور گھر سے باہر ایک ہی رنگ کی برسات تھی لہٰذا اس کی شخصیت ایک ہی رنگ میں رنگتی چلی گئی اور یہ رنگ اتنا پختہ ہو گیا کہ کسی اور رنگ کا اس پر چڑھنا دشوار تھا۔

اودھ کے دوسرے علاقوں کی طرح گونڈا کی مجلسی زندگی میں بھی مشاعروں کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ اس کا مطالعہ اس قدر ہو گیا تھا کہ شاعری کا طلسم اس کے لیے اجنبی نہیں رہا تھا۔ اچھے شعر سے متاثر ہونے اور اس کے عیب و ہنر سے واقف ہو جانے کی صلاحیت اس میں پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اپنی تنہائیوں میں اساتذۂ فارسی کے اشعار اکثر گنگناتا تھا۔

اس کا بچپن، شباب کی حدوں میں قدم رکھ رہا تھا۔ گھریلو تربیت نے اس پر یہ پابندی تو عائد کر دی تھی کہ خرافات میں شریک نہ ہو لیکن شاعری کی محفلیں تو گہوارۂ تہذیب تھیں۔ وہ ان محفلوں میں شریک ہونے لگا۔ ان محفلوں میں پڑھے جانے والے اشعار، نوجوانوں کے لیے چٹخارا تھے لیکن اس کی علمی استطاعت کے لیے سنجیدہ ذہنی عمل۔

چند مشاعروں میں شرکت کے بعد ہی اس پر یہ عقدہ کھل گیا کہ اس کی طبیعت کو شعر و سخن سے فطری مناسبت ہے۔ جو غزلیں وہ مشاعرے میں سنتا، گھر پہنچ کر ان پر طبع آزمائی کرتا۔ شعر ہو جاتے لیکن ابھی اتنی قدرت نہیں تھی کہ سنگریزوں کو جواہر ریزے بنا سکتا۔

وقت دبے پاؤں گزرتا رہا۔ یہاں تک کہ ۱۹۰۴ء میں اس نے مڈل کا امتحان پاس کر لیا۔

وہ اس دن دوستوں کی مبارک بادیں وصول کرتا ہوا خوش خوش گھر آیا تھا۔ مڈل کی سند حاصل کر لینا کوئی مذاق نہیں تھا۔ یہ اتنی تعلیم تھی کہ اس کے بل پر سرکاری نوکری کی جا سکتی تھی۔

"برخوردار، کہاں تھے اتنی رات گئے تک؟" اس کے والد نے اسے گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر کہا۔

"بس ذرا دوستوں میں بیٹھ گیا تھا، دیر ہو گئی۔"

"کوئی آج پر منحصر نہیں ہے۔ آج کل آپ کو اکثر دیر ہو جاتی ہے" اصغر کے والد نے کہا۔

اسے یہ تعجب تو خیر تھا ہی کہ ابا ابھی تک جاگ رہے ہیں، اس سے زیادہ حیرت اس بات پر ہو رہی تھی کہ اماں بھی اس کی منتظر ہیں۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ کوئی خاص بات ہوئی ہے۔

"آئندہ ایسا نہیں ہوگا" اصغر نے اسی سعادت مندی سے کہا۔

"میاں، اس لیے کہہ رہا ہوں کہ گونڈا میں جہاں شرفا کی محفلیں سجتی ہیں وہیں ایسے کوچے بھی ہیں جہاں پہنچتے ہی آدمی کو بگڑتے دیر نہیں لگتی۔"

وہ تو اب بھی خاموش تھا لیکن اس کی ماں کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔

"آپ تو آتے ہی بچے کے پیچھے پڑ گئے" انہوں نے پاندان کو ایک طرف کھسکاتے ہوئے کہا "مطلب کی بات کیجیے۔ وہ کیا اپنا اچھا برا سمجھتا نہیں ہے۔"

"مطلب کی بات یہ ہے برخوردار کہ ہم نے تمہاری شادی طے کردی ہے۔ تمہاری ماں جاکر لڑکی دیکھ آئی ہیں۔ نواب گنج کے موضع شاہ پور میں تمہاری سسرال ہے۔"

اصغر کو یہ بات بڑی عجیب سی لگی۔ اس کی تو ابھی تعلیم بھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔ وہ شادی کرنے کے حق میں نہیں تھا لیکن باپ کے سامنے بولنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔

تفضل حسین نے اسے خاموش دیکھا تو نیم رضامند سمجھتے ہوئے لڑکی اور اس کے گھر والوں کی مدح سرائی میں زمین و آسمان ایک کرڈالے۔

اصغر کو معلوم تھا کہ موضع شاہ پور، دریائے سرجو کے کنارے چھوٹا سا ایک گاؤں ہے۔ اس گاؤں میں پرورش پانے والی لڑکی کیسی ہوگی۔ تعلیم سے نابلد، شہری ماحول سے ناواقف۔ صورت شکل خدا معلوم۔

یہ سب کچھ تو تھا لیکن باپ کے سامنے ان اندیشوں کا اظہار بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے خاموشی ہی میں عافیت سمجھی اور اپنے بستر کی طرف بڑھ گیا۔

وہ بہت دیر تک اس نئی افتاد پر غور کرتا رہا۔ دل کہیں اٹکا ہوا بھی نہیں تھا اور طبیعت میں بغاوت بھی نہیں تھی لہٰذا وہ دل ہی دل میں اس بے جوڑ شادی پر رضامند ہوگیا۔

گھر والوں کو اس کی اجازت کی ضرورت نہیں تھی، صرف اس کے کان میں بات ڈالنی تھی۔

شادی کی تیاریاں نہ جانے کب سے شروع ہوچکی تھیں۔ اس کی رضامندی ملتے ہی شادی کی تاریخ طے ہوگئی اور وہ دولھا بن کر موضع شاہ پور پہنچ گیا۔ دیہاتیوں کا پوربی لب ولہجہ اور ان کے معمولی لباس دیکھ کر نفاست پسند اصغر کو وحشت ہورہی تھی لیکن وہ یہ سوچ کر مطمئن تھا کہ اسے یہاں رہنا تو ہے نہیں۔ یہاں سے لڑکی لے کر جائے گا اور اسے اپنے رنگ میں رنگ لے گا۔

ایک رات وہاں رہ کر دوسرے دن جب وہ گونڈا آیا تو اس کی دنیا ہی بدل چکی تھی۔ ذمے داری کے بوجھ تلے دبا ہوا اصغر اس حال میں گونڈا پہنچا کہ اس کے اخراجات کی ذمّے داری اب بھی اس کے والد کے کاندھوں پر تھی۔ وہ اب بھی گونڈا ہائی اسکول کا طالبِ علم تھا۔

اسے کچھ دنوں بعد ہی اندازہ ہوگیا کہ اس کی بیوی اور اس کے مزاجوں میں کوئی مطابقت نہیں۔ اس کی قوتِ برداشت اور مذہبی تعلیم نے اسے سہارا دیا اور وہ لشتم پشتم گزارا کرتا رہا۔

اگلے سال اس کے گھر میں بیٹی پیدا ہوگئی۔ اخراجات

سوانحی خاکہ

نام......اصغر حسین
تخلص......اصغر
والد......منشی تفضل حسین
وطن......گونڈا۔ یوپی، بھارت
تعلیم......میٹرک تک
ملازمت، مشاغل......ریلوے، دکان بساط خانہ، عینک کا کارخانہ......مہتمم اردو مرکز لاہور۔ مشیر ادبی انڈین پریس الہ آباد......مدیر "ہندستانی"۔
ازواج پہلی شادی......موضع شاہ پور
دوسری شادی......چھٹن
تیسری شادی......نسیم خاتون
اولاد......اولادِ نرینہ کوئی نہیں ہوئی۔ پہلی بیوی سے سات بیٹیاں ہوئیں۔ صرف دو شادی کی عمر کو پہنچیں۔
شعر گوئی کا آغاز......۷-۱۹۰۶ء
مشورۂ سخن......وجد بلگرامی، تسلیم لکھنوی
رندی و سرشاری......اواخر ۱۹۰۷ء تا ۱۹۱۳ء
توبہ......اواخر ۱۹۱۲ء یا اوائل ۱۹۱۳ء
بیعت......عبدالغنی منگلوری
ولادت......یکم مارچ ۱۸۸۴ء
وفات......۲۹ اور ۳۰ نومبر ۱۹۳۶ء کی درمیانی شب
مزار......پائنتی شاہ محب اللہ۔ الہ آباد
عمر......۵۲ سال ۹ ماہ بہ حساب انگریزی۔

اب کچھ اور بڑھ گئے۔ ایک سال بعد ایک اور بیٹی پیدا ہوگئی۔ وہ اب بھی باپ کے رحم وکرم پر تھا۔

یکے بعد دیگرے دو بیٹیوں کی پیدائش اور بیوی سے عدم مطابقت نے اسے پریشان کردیا تھا۔ اس کا زیادہ تر وقت گھر سے باہر دوستوں میں گزرنے لگا۔

شاعری نے ایک مرتبہ پھر اس کے دل کے دروازے پر دستک دی۔ اس مرتبہ یہ دستک اتنی شدید تھی کہ اس کے سنگ ریزے، جواہر ریزوں میں بدلنے لگے۔ جب یہ بارش مسلسل ہونے لگی تو اسے کسی استاد کی ضرورت محسوس ہوئی۔ گونڈا کے اکثر نوجوان خلیل احمد وجد بلگرامی کے شاگرد تھے۔ وہ بھی ان کی خدمت میں پہنچ گیا اور اصغر سے اصغر گونڈوی بن گیا۔

بیوی سے کوئی دلی تعلق تھا نہیں، ایک قول تھا جسے وہ نبھار ہا تھا۔ شاعری کا سہارا ملا تو وہ گھر کی طرف سے اور بھی غافل ہو گیا۔ یارباشی اور گپ بازی میں دن سے رات ہو جاتی۔ رات گئے کسی مشاعرے سے پلٹتا تو گھر کی دیواریں تک سو چکی ہوتیں۔

منشی تفضل حسین اس کی مصروفیات کو بہ غور دیکھ رہے تھے۔ وہ تو یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ شادی کے بعد اس کے مزاج میں ٹھہراؤ آجائے گا لیکن دو بچیوں کا باپ بن کر بھی گھر سے لاتعلقی میں کمی نہ آسکی۔ اب ایک ہی صورت تھی کہ اسے روزگار کی چکی میں پیسنے پر لگا دیا جائے۔

وہ دسویں درجے میں تھا کہ باپ کی ایما پر اس نے تعلیم ترک کر دی۔

مڈل تک تعلیم ملازمت کے حصول کے لیے کافی سمجھی جاتی تھی چنانچہ اس نے بھی اس تعلیم کے سہارے ملازمت کی تلاش شروع کر دی۔

کئی دروازوں سے ناکام لوٹنے کے بعد ملازمت کی تلاش اسے بابوراج بہادر کے عالی شان مکان تک لے گئی۔

بابوراج ذات کے کائستھ اور سلطان پور کے رہنے والے تھے۔ علاقۂ اودھ کی بگڑی ہوئی تہذیب ان کے دروازے پر آکر رک گئی تھی۔ شیشے کی لال پری اور اربابِ نشاط سے دل لگی ان کا تفریحی مشغلہ تھا۔ یہاں آنے والے بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ ان کا دولت کدہ رنگین طبع شرفا کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

اصغر اس کوچے کا راہی نہیں تھا۔ وہ بابو راج کے گھر سے واقف ضرور تھا لیکن کبھی ان کے گھر جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ بس اتنا تھا کہ کسی مشاعرے میں علیک سلیک ہو گئی تھی۔ اس کچی پکی شناسائی کے باوجود اسے امید تھی کہ بابوراج اس کی ملازمت کا ضرور کوئی نہ کوئی بندوبست کر دیں گے۔

وہ بابوراج سے ملنے ان کے گھر پہنچا تو حسبِ معمول شہر کے کئی نامور رئیس اور خوش فکر شاعر جمع تھے۔ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں عروج پر تھیں۔ کنور وشوناتھ وکیل بھی موجود تھے جنہیں شعروشاعری کا چسکا تھا اور اسی نسبت سے وہ اصغر کے قدرداں تھے۔ انہیں وہاں دیکھ کر اصغر کی ہمت بندھ گئی۔

جس وقت اصغر وہاں پہنچا، عشقِ مجازی اور عشقِ حقیقی کے نظریے پر زوردار بحث چھڑی ہوئی تھی۔

”معاملہ عشق کا ہو اور محفل میں کوئی نوجوان آجائے تو محفل اور عشق دونوں میں جان پڑ جاتی ہے۔“ بابو راج نے کہا اور کئی دوستانہ قہقہوں نے اصغر کا سواگت کیا۔

اصغر کو تھوڑی دیر میں ہی اندازہ ہو گیا کہ بحث کا رخ عشقِ حقیقی کی مخالفت کی جانب ہے۔

”عشقِ حقیقی سرے ہی سے غیر فطری اور غلط معلوم ہوتا ہے۔ حسنِ نسوانی کی ادائیں تو ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں لیکن حسنِ مطلق اور حسنِ حقیقی سے عشق کا دم بھرنا ایک اندھی تقلید کے سوا کچھ نہیں۔“

عشقِ حقیقی پر مسلسل اعتراضات ہو رہے تھے۔ اصغر نووارد بھی تھا اور فطری طور پر خاموش طبع بھی اس لیے خاموش بیٹھا تھا۔

کنور وشوناتھ نے اسے خاموش دیکھ کر، اسے بھی دعوتِ تقریر دے ڈالی۔

”آپ بھی تو کچھ فرمائیں۔ آپ تو ابھرتے ہوئے شاعر ہیں۔ حسن اور عشق کی باریکیوں سے بھی واقف ہیں۔“

اصغر تو شاید اسی انتظار میں تھا کہ کوئی کہے اور وہ اپنا غصہ اتارے۔

”آپ حضرات کے خیالات سے یہ ظاہر ہوا کہ آپ سب حضرات حسنِ نسوانی کے قائل ہیں جو حسن کی ایک ادنیٰ شکل ہے اور حسنِ حقیقی سے ناواقف ہیں جو حسن مکمل ہے۔“

”لیجیے صاحب، یہ تو جوانی میں مولوی نکلے“ اہلِ محفل میں سے کسی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”یہ موقع طنز کا نہیں ہے، سنجیدگی سے غور کرنے کا ہے“ اصغر نے کہا ”نسوانیت کی کشش اور اس کی قوت سے کسی کو انکار نہیں لیکن کیا ہماری انسانیت چند خاص جذبات تک محدود ہے؟“

یہ سوال ہی ایسا تھا کہ سناٹا چھا گیا۔ اصغر نے کچھ دیر توقف کرنے کے بعد پھر کہنا شروع کیا ”اگر آبشار کی آواز اور مغنی کا نغمہ ہمیں بے خود بنا دیتا ہے لیکن شفق کی سرخی ہم میں کوئی کیفیت پیدا نہیں کرتی تو اس کے صرف یہ معنی ہیں کہ ہمارا سامعہ تو صحیح ہے مگر ہماری بصارت و بینائی میں یقیناً نقص ہے۔ اب آپ لوگ خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اگر کوئی شخص بہرا تو نہ ہو لیکن اندھا ہو تو حسن مکمل کا احاطہ کیسے کر سکتا ہے۔ وہ کسی ایک پہلو تک محدود رہے گا۔ حسنِ مطلق سے سرشار ہونے کے لیے صلاحیت درکار ہے۔ یہ انسانیت کی توہین ہے کہ وہ حسن کے صرف ایک پہلو تک محدود رہے۔ بس جو لوگ اس محدود کو لامحدود میں بدل لیتے ہیں، وہ عشقِ حقیقی سے سرشار ہوتے ہیں۔ حسنِ نسوانی وقتی ہے اور حسن

مطلق دائمی۔ اسی اعتبار سے عشقِ مجازی کم رتبہ ہے اور عشقِ حقیقی بلند رتبہ۔ عشقِ حقیقی سے وہی شخص انکار کرسکتا ہے جو حسنِ نسوانی کے سوا کچھ نہیں دیکھتا۔"

اس کی تقریر ایسی مدلل اور اندازِ تقریر ایسا دل کش تھا کہ بابو راج نے نشے کی ترنگ میں اس کا منہ چوم لیا۔

"تم سب جھک مارتے ہو۔ کتابیں تو اس نے پڑھی ہیں۔ ارے حسن تو اس کائنات کے ریشے ریشے میں ہے۔"

"بابو راج جی، آپ تو بڑی جلدی پگھل گئے" وشوناتھ وکیل نے کہا "یہ بھی سوچا کہ اگر سب عشقِ حقیقی کے متوالے ہوگئے تو عورتیں بے چاری کیا کریں گی۔ ان کا تو اپمان ہوجائے گا۔"

وشوناتھ کی اس دلیل پر زوردار قہقہہ پڑا لیکن اصغر پہلے سے بھی زیادہ سنجیدہ ہوگیا۔

"یہی تو آپ لوگوں کی غلطی ہے۔ عشقِ حقیقی سے متعارف ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ انسان دنیا چھوڑ دے۔ انسان اللہ کی دی ہوئی سب نعمتوں سے فائدہ اٹھائے۔ اس کائنات کی ایک ایک چیز سے مستفید ہو لیکن اس طرح کہ دنیا کی محبت اس کے دل کو آلودہ نہ کرے۔ یہ ہے عشقِ حقیقی۔ دنیا بذاتِ خود محبوب نہیں بلکہ محبوب کے حسن کے مظاہر ہیں۔ مجاز ہی سے ہم حقیقت تک پہنچتے ہیں۔

دہر ہی نے مجھ پہ کھولی راہ بے پایانِ عشق
راہبر کو اک فریبِ راہ گزر سمجھا تھا میں

اب آپ مجاز تک ہی رک جانا چاہتے ہیں تو کوئی کیا کرسکتا ہے۔"

اس مرتبہ سناٹا زیادہ گہرا ہوگیا۔ ماتھوں پر وہ لکیریں ابھر آئیں جو سوچتے وقت ابھرتی ہیں۔ اس کی ذہانت اور نکتہ سنجی کے سبھی قائل ہوگئے۔ بابو راج اس فکر میں غلطاں تھے کہ اس ہونہار لڑکے سے وہ اب تک کیوں دور رہے۔

ایک دو ملاقاتیں اور ہوئیں تو بابو راج تو جیسے اس پر فدا ہوگئے اور جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ وہ نوکری کی تلاش میں ہے تو انہوں نے اس سے نوکری دلانے کا وعدہ کرلیا۔

یہ وعدہ محض وعدہ بن کر نہیں رہ گیا بلکہ بابو راج نے حکامِ بالا سے کہہ سن کے اصغر کو بیس روپے ماہوار پر ریلوے میں ٹائم کیپر مقرر کرادیا۔

بابو راج نے اس کے ساتھ وہ حسنِ سلوک کیا تھا کہ ان کے لیے نیازمندی کے سوا اس کے پاس کوئی جذبہ نہیں تھا۔ اس کا ازالہ اسی طرح ہوسکتا تھا کہ وہ ان کے حاضر باشوں میں شامل ہوکر حسنِ اخلاق کا مظاہرہ کرے۔ اس نے ان کے

شعری مجموعے

نشاطِ روح، سرودِ زندگی

نثری تصانیف

۱۔ اردو شاعری کی ذہنی تاریخ (غیر مطبوعہ)
۲۔ سلسلۂ تحائف
تحفۂ لندن، تحفۂ جاپان، تحفۂ مصر، تحفۂ فرانس
تحفۂ چین، تحفۂ آسٹریلیا، تحفۂ امریکا۔
۳۔ یادگارِ نسیم، مقدمہ
۴۔ دیوانِ مظہر جانِ جاناں (غیر مطبوعہ)

گھر باقاعدگی سے آنا جانا شروع کردیا۔

بابو راج سے تشکر کا جذبہ ہی اسے یہاں لے کر نہیں آیا تھا بلکہ یہ جگہ اس کی دلچسپیوں کا محور بھی تھی۔ بابو راج کو خود شاعری سے لگاؤ تھا اور پھر یہاں آنے والے بھی اس نشے سے شغف رکھتے تھے۔ اصغر کو شراب سے غرض نہیں تھی۔ یہاں ہونے والی ادبی بحثیں اس کے لیے سرمایۂ نشاط تھیں۔ وہ یہ بھول گیا تھا کہ کچھ نہ ہونے پر بھی صحبت کا اثر کچھ نہ کچھ ہوتا ضرور ہے۔

بابو راج نے اسے شیشے میں اتارنے کی کوششیں شروع کردیں۔ اتنے پینے والوں میں وہ اکیلا یوں بھی عجیب سا لگتا تھا اور پھر بابو راج کے تقاضوں کی توہین بھی اس سے برداشت نہیں ہورہی تھی۔ اس کی گھریلو تربیت تھی جو اسے روکے ہوئے تھی ورنہ وہ کب کا بہک چکا ہوتا۔ بچپن سے مذہب کے جو نقوش دل کے ورق پر ثبت ہوگئے تھے وہ کسی اور تحریر کو جمنے نہیں دیتے تھے۔ وہ بار بار ہاتھ بڑھاتا تھا لیکن اس کی جھجک اس کا ہاتھ پکڑلیتی تھی۔ اصغر یہ گناہ ہے۔ اس کا دل اس سے کہتا۔ پی لو یار، تم تو شاعر ہو اور شاعر بھی غزل کے۔ راج بہادر اسے اکساتے۔ افیون ہوتی تو دوسری بات تھی لیکن یہ تو شراب ہے۔ وہ پھر جھجک جاتا۔ افیون کی شرط کیوں... جو یاروں کا مذہب وہ تمہارا۔

وہ اسی کشمکش میں تھا کہ شیطان کا داؤ چل گیا۔ مزاج میں غصہ بے انتہا تھا۔ ایک روز بیوی سے کسی بات پر تکرار ہوئی۔ بات معمولی تھی لیکن غصے نے چنگاری کو شعلہ بنادیا۔ وہ گھر سے نکلا اور بابو راج کے گھر پہنچ گیا۔

"لالہ، آج مجھے بھی پلاؤ۔"

"سچ! تم مذاق تو نہیں کررہے ہو؟"

"جب میں بُرا ہوں تو بُرا بن کر ہی دکھاؤں گا۔ اسے بھی تو معلوم ہو کہ ناقدری کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟"

"کسے معلوم ہو۔ کیا کہہ رہے ہو، کیا کسی سے لڑ کر آ رہے ہو؟"

"ہاں یہی سمجھو۔"

"میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ شاعر ہو کر تم شراب سے دور رہ ہی نہیں سکتے" بابو راج نے کہا اور جلدی جلدی اس کے لیے گلاس بنا کر اس کے سامنے رکھ دیا "پہلی مرتبہ پی رہے ہو اس لیے ذرا ہلکا رکھا ہے۔"

اصغر نے ان کی بات سنی بھی نہیں اور ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا۔

"شاید زیادہ ہلکا ہو گیا" بابو راج نے دوسرا گلاس بناتے ہوئے کہا۔

اصغر نے یہ گلاس بھی اُتار لیا۔ بابو راج نے ایک گلاس اور بنا دیا۔

چند گلاس پینے کے بعد جب نشہ گہرا ہوا تو اس کے ذہن کی کھڑکیاں کھلنے لگیں۔

اس نے گلاس سامنے رکھا اور بابو راج کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

"کائنات میں صرف ایک ذات موجود ہے، صرف ایک ذات۔ شراب پی رہا ہوں اس لیے اس کا نام نہیں لوں گا۔ تو بابو راج جی، اس ذات نے چاہا کہ اپنے جلال و جمال کو دیکھے تو آئینۂ کائنات میں خود کو منعکس کیا۔ یہ جو ہم کائنات میں کثرت دیکھتے ہیں یہ اسی انعکاس کی وجہ سے ہے۔ کائنات کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وجودِ مطلق کا عکس ہے۔

جو نقش ہے ہستی کا دھوکا نظر آتا ہے
پردے پہ مصور ہی تنہا نظر آتا ہے
لو شمعِ حقیقت کی اپنی ہی جگہ پر ہے
فانوس کی گردش سے کیا کیا نظر آتا ہے

شراب کی بھی یہ عجیب طرفہ کاری ہے۔ کسی کو ننگا کر دیتی ہے اور کسی پر سنجیدگی اور روشن خیالی کے دروازے کھول دیتی ہے۔ بات یہ ہے کہ اگر اندر کوڑا کرکٹ ہو تو اس کی روشنی میں تمام چیزیں سامنے آجاتی ہیں۔ اس کے برخلاف اگر اندر شرافت و نجابت کے جوہر ہوں تو اس کے اثر سے مزید جگمگا اٹھتے ہیں۔ اصغر کے ساتھ یہی ہوا۔ شراب نے اس کے اندر چھپے ہوئے شریف، متین، فلسفی اور ثقہ اصغر کو پیش کیا۔

شراب کے گھونٹ حلق میں اترتے ہی اس کے شعور کی لو تیز ہو گئی، قوتیں بیدار ہوئیں، ضمیر روشن ہوا۔ یہ معلوم ہوا جیسے علومِ باطنی کے دروازے کھل گئے۔

"آپ کو معلوم ہے، عبودیت کسے کہتے ہیں؟ آپ کو کہاں معلوم ہوگا۔ مجھ سے سنئے 'اقرارِ خالق اور انکارِ ذات' یہ ہے عبودیت۔ خدا کے سوا تمام خود ساختہ خداؤں سے انکار یہ ہے عبودیت۔ ان خود ساختہ خداؤں میں سب سے بڑا خدا خود ہمارا نفس ہے۔"

اصغر اس وقت ایک بڑا فلسفی اور صوفی معلوم ہو رہا تھا۔ بابو راج نے ایسی گفتگو کبھی نہیں سنی تھی۔ وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے اور اس کے مطالعے کی کثرت پر رشک کر رہے تھے۔ وہ اپنی گفتگو کے دوران میں فارسی کے اشعار بکثرت پڑھ رہا تھا جس سے معلوم ہوتا تھا' اس نے تصوف کے موضوع پر کثرت سے کتابیں پڑھی ہیں۔ بابو راج کو یہ حیرت بھی تھی کہ پہلی مرتبہ شراب پینے والا کس طرح اپنے ہوش و حواس پر قابو رکھے ہوئے ہے۔

تھوڑی دیر میں احباب آنا شروع ہو گئے۔ انہوں نے اصغر کو اس حال میں دیکھا تو خوشی سے نعرے بلند کرنے لگے۔ ان کی برادری میں ایک اور فرد کا اضافہ ہو گیا تھا۔

کسی معقول گھرانے میں ایک بیوی کا شوہر اور دو بچوں کا باپ اچانک شراب پی کر گھر پہنچے تو قیامت برپا نہ ہو تو کیا ہو۔ بیوی نادان ہو تو پھر ہنگامہ کھڑے ہوتے دیر ہی نہیں لگتی۔

بہت ممکن ہے وہ اس راستے پر تھوڑی دور جا کر لوٹ آتا یا اس تیزی سے آگے نہ بڑھتا لیکن بیوی نے اسے جتنا روکا وہ ضد میں آکر اسی قدر تیزی سے آگے بڑھا اور جب بیوی ہی کی بدولت اس کی مے نوشی کی خبر منشی تفضل تک پہنچ گئی تو رہا سہا خوف بھی جاتا رہا۔ اس نے سوچا جب باپ کو معلوم ہو گیا ہے تو پھر اب کس کا ڈر۔

نئی جوانی، کفر خیز و ایمان شکن ماحول، عیش سامانیوں کی سہولتیں اور بابو راج جیسے پیرِ مغاں کی رہنمائی پھر کیا تھا' اصغر بہک گیا اور ایسا بہکا کہ ساتھیوں کو پیچھے چھوڑ گیا۔

ماحول اور ضد نے مل جل کر ایسا سماں باندھا کہ اس نے اپنے آپ کو بادۂ شبینہ کی سرمستیوں میں ہمہ تن غرق کر لیا۔

شراب ہو اور شباب نہ ہو' یہ کیسے ممکن ہے۔ رنگین مزاجوں کی صحبت نے اسے اربابِ نشاط کے کوچے کا رہ نورد بھی بنا دیا۔

شباب کا نشہ شراب سے بھی تیز ہوتا ہے۔ جس نے ایک مرتبہ اس کوچے میں قدم رکھ دیا' پھر یہیں کا ہو کر رہ جاتا ہے۔

اسے پہلی مرتبہ یہ احساس ہوا کہ وہ شاعر بھی ہے۔ دوسروں کے مقابلے میں اس کی پذیرائی اسی لیے ہو رہی تھی۔ حسن اپنے مداح کا خیال کیوں نہ رکھے۔ سامنے بیٹھی ہوئی طوائف اس پر نثار ہو رہی تھی۔

"اللہ کچھ بولیئے نا۔ آپ نے تو چپ شاہ میاں کا روزہ رکھ لیا ہے" طوائف نے کہا۔

"ہم تو دیکھنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ آپ بولتی رہیے۔"

"آپ شاعر ہیں۔ لفظوں سے آپ کھیلتے ہیں۔ ہم کیا بولیں؟"

"کچھ سنائیے۔"

"آپ کے حکم کی تکمیل کیے دیتی ہوں ورنہ جی تو یہی چاہتا تھا کہ بیٹھی آپ کو دیکھتی رہوں۔"

طوائف کھڑی ہو گئی۔ سازندوں نے ساز جوڑے اور آواز نے نشے کا روپ دھار لیا۔

اصغر ایسا بے خود کبھی نہیں ہوا تھا۔ موسیقی اس کی روح کی پکار تھی۔ یہاں تو حسن بھی تھا، خوب صورت آواز بھی اور اچھا کلام بھی۔ سب نے مل جل کر قیامت کو زمین پر اتار دیا۔

طوفان تھما تو نشہ اتر چکا تھا۔ اب ہوش ہی ہوش تھا۔ اس کا احساسِ گناہ اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔

"ہمارا بس چلے تو آپ کو دل کی ڈبیا میں بند کر کے رکھیں لیکن ظاہر ہے، آپ یہاں رہ تو نہیں سکتے۔ اتنی گزارش ضرور ہے کہ تشریف لائیے گا، ہم منتظر رہیں گے۔"

وہ وہاں سے اٹھا تو کسی اور ہی ہوا میں اڑتا ہوا آیا۔ پہلا ہی تیر نشانے پر لگ گیا۔ اب تو شاید کوئی رات بھی گھر میں بسر نہ ہو۔ اس نے سوچا اور دو نشوں کا خمار اتارنے کے لیے اکہری چادر سر سے پاؤں تک اوڑھ لی۔

دوسرے دن کی دھوپ ڈھلی اور رات آئی تو اس کے کانوں میں گھنگھرو بجنے لگے۔ طاقِ سماعت میں وہی آواز روشنی بن کر سنائی دینے لگی۔ دو چار ہم راز دوستوں کو لے کر وہ پھر فردوسِ نگاہ کی سیر کو نکل گیا۔

یہ وہ نہیں کسی اور طوائف کا کوٹھا تھا۔ وہی کافر ادائیں وہی دل افروز تانیں، وہی پذیرائی۔ چلتے وقت وہی اصرار کہ تشریف لائیے گا۔ ہم منتظر رہیں گے۔

جب وہ اسی طرح چند کوٹھے اور چڑھ اتر چکا تو اس کی تربیت نے اسے جھنجوڑا۔ "تم انسان ہو اصغر، شہد کی مکھی نہیں کہ کبھی اس پھول پر کبھی اس پھول پر۔ جذبہ اسی وقت قابلِ قدر ہو سکتا ہے جب اس میں وحدت ہو۔ یہ صورتیں بھی

نقلی، یہ پذیرائی بھی جھوٹی۔ یہ کوٹھے والیاں سب سے اسی طرح پیش آتی ہوں گی پھر میری خصوصیت کیا ہوئی۔"

اس رنگ نشاط سے اس کا دل گھبرانے لگا تھا کہ اس کی ملاقات چھٹن بیگم سے ہو گئی۔

چھٹن کا گھرانا بھی اسی طبقے کا حصہ رہ چکا تھا جس کے وہ ان دنوں چکر کاٹ رہا تھا۔

چھٹن کی ماں تائب ہو کر گھر میں بیٹھ گئی تھیں لیکن پچھلی زندگی کے نقوش مٹتے مٹتے بھی کچھ نہ کچھ باقی رہ گئے تھے۔ اودھ کی مجلسی زندگی کے آثار اب بھی اس گھر میں باقی تھے۔ مخصوص لوگوں سے آزادانہ میل جول اب بھی باقی تھا۔

یہ دو بہنیں تھیں۔ چھٹن اور نسیم۔ چھٹن تیکھے نقوش اور گورے رنگ کی لڑکی تھی اور نسیم کی رنگت کالی تھی۔ چھٹن بڑی، نسیم چھوٹی تھی۔

پہلی نظر ہی میں چھٹن اس کے دل میں اتر گئی اور جب اس نے دیکھا کہ چھٹن کی آنکھوں میں بھی اس کے لیے پسندیدگی کے جذبات ہیں تو اس نے ہر دروازے پر دستک دینے کے بجائے اس ایک دروازے کو منزل بنا لیا۔ اصغر کی بڑی بڑی مسحور کن آنکھوں میں چھٹن کی تصویر سما گئی۔

آوارگی میں بھی اس نے اپنی انفرادیت قائم رکھی۔ وہ بھونرا نہیں پروانہ بن کر ایک ہی زلف کا اسیر ہو گیا۔

زنان بازاری کے گھروں میں جانے کو کسی نے اتنی اہمیت نہیں دی تھی۔ اسے وقتی تفریح سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا لیکن چھٹن طوائف نہیں تھیں۔ اصغر نے ان کے گھر جانا شروع کیا تو کسی نے اس کی سادگی کا مذاق اڑایا، کسی چشم و ابرو سے

ناگواری کا اظہار کیا۔

اسی معاشقے کی خبر اصغر کی بیوی کو بھی ہوئی۔ باپ تو اس کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے لیکن بیوی نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ وہ سخت شرمندہ تھا۔ بیوی حق بجانب تھیں اس لیے جو کہتی رہیں، وہ سنتا رہا۔ وعدہ بھی کرلیا کہ اب وہ چھٹن کے گھر نہیں جائے گا لیکن شام ہوتے ہی دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔

سفید لٹھے کا تیلی مہری کا پاجامہ، ململ کا کرتہ، سیاہ چمک دار پمپ پیروں میں، ریشمی موزے، سر پر گول ٹوپی۔ سلیقے سے تیار ہو کر، شیروانی پہنتا ہوا وہ کمرے سے باہر نکلا تو بیوی کی نگاہیں اس پر جم گئیں۔

"یہ اب تیار ہو کر کہاں چلے۔ جا رہے ہوں گے اس کلموہی کی طرف۔"

"ارے نہیں بھئی۔ ایک دوست کی طرف جا رہا ہوں۔ وہاں سے ایک مشاعرے میں چلا جاؤں گا۔"

"یہ بہانے تو آپ مجھ سے کیا نہ کریں۔ تین تین بیٹیوں کے باپ ہو کر۔"

"یہی تو افسوس ہے کہ بیٹیوں کا باپ ہوں، بیٹوں کا نہیں۔"

"اب اس میں بھی میرا ہی قصور ہے۔"

"اولاد ہو نہ ہو، اولادِ نرینہ سب کی خواہش ہوتی ہے۔" اصغر نے کہا اور گھر سے نکل گیا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے جواب میں اسے کیا سننے کو ملے گا۔

چھٹن اس کی راہ میں آنکھیں بچھائے بیٹھی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی پان اور شربت لا کر رکھ دیے۔

"ہم تو یہ سوچ سوچ کے ہلکان ہوتے ہیں کہ کیا خبر آپ کب آنا بند کردیں۔ ذرا سی دیر ہو جاتی ہے تو دل ہولنے لگتا ہے۔" چھٹن نے کہا۔

"چھٹن، اب ہم پر کوئی راستہ کھلا کہاں رہ گیا ہے جو یہاں آنا بھی بند کردیں گے۔"

"سچ کہیے، یہ بات آپ دل سے کہہ رہے ہیں؟"

"افسوس! انہیں اب تک یقین نہیں آیا۔"

"یقین تو ہے لیکن بار بار سننے کو جی چاہتا ہے۔"

"تم سنتی رہو، ہم کہتے رہیں گے۔"

"اچھا، یہ بتایئے کہ آپ کی بیگم ہمارے بارے میں کیا کہتی ہیں؟"

"وہ کچھ بھی کہے مجھے اس کی پروا نہیں۔ والدین نے شادی کرادی، میں اس کے ساتھ رہنے لگا۔ اس کے سوا میں کچھ نہیں جانتا۔ اسے میرے مزاج کا پاس نہیں، مجھے اس کی مرضی کا خیال نہیں۔ مجھے تو اب تم سے غرض ہے۔

اب نہ کہیں نگاہ ہے اب نہ کوئی نگاہ میں
محو کھڑا ہوا ہوں میں حسن کی جلوہ گاہ میں
در پہ جو تیرے آگیا اب نہ کہیں اٹھا مجھے
گردشِ مہر و ماہ بھی دیکھ چکا ہوں میں راہ میں
اب وہ زماں نہ وہ مکاں اب وہ زمیں نہ آسماں
تم نے جہاں بدل دیا آکے مری نگاہ میں

"اللہ ان اشعار کے مخاطب ہم ہیں تو ہم کتنے خوش قسمت ہیں۔"

"تم تو خوش قسمت ٹھہریں مگر ہم؟"

"آپ کو کوئی ہماری نظر سے دیکھے۔"

"آپ کی نگاہ بھی تو ہماری نہیں ہے؟"

"آپ نے خود ہی تو کہا ہے۔

سارا حصول عشق کی ناکامیوں میں ہے
جو عمر رائگاں ہے وہی رائگاں نہیں

"ہاں، لیکن یہ حقیقت کی باتیں ہیں۔ مجاز میں تو تمہارا حصول ہی ہماری منزل ہے۔"

"ہم آپ کے ہیں۔ آپ ہمیں غیر کیوں سمجھتے ہیں؟"

یہ بھی فریب سے ہیں کچھ درد عاشقی کے
ہم مر کے کیا کریں گے کیا کرلیا ہے جی کے

اصغر نے اپنا ہی ایک شعر پڑھا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رات بہت ہو گئی تھی اور اب اسے گھر بھی جانا تھا۔

چھٹن سے اس کا عشق رسوائی کی منزل تک آگیا تھا۔ بیوی سے تعلقات یوں بھی خوش گوار نہیں تھے، اس عشق نے ان تعلقات میں مزید دوری کردی۔ چھٹن کی خدمت گزاری نے بیوی کی طرف سے اس کے دل میں کدورت پیدا کردی۔ دوسری طرف اس کی بیوی کے دل میں جو رہی سہی محبت تھی، وہ بھی ختم ہو گئی۔ اس غریب نے سب کچھ کر کے دیکھ لیا لیکن اصغر نے چھٹن کے گھر جانا نہیں چھوڑا۔

یہ سرد جنگ ابھی جاری تھی کہ اس کی تعیناتی جرول ضلع بہرائچ میں ہو گئی۔ اسے وقتی طور پر چھٹن سے دور جانا پڑا۔

اس تعیناتی پر جتنی خوشی اس کی بیوی کو ہوئی، کسی کو نہیں ہوئی ہوگی۔ اسے یہ گمان تھا کہ اصغر وہاں جا کر چھٹن کو بھول جائے گا جبکہ جرول پہنچ کر بھی اصغر کا حال یہ رہا۔

سما گئے مری نظروں میں چھا گئے دل پر
خیال کرتا ہوں ان کو کہ دیکھتا ہوں میں

اصغر کا ہیڈ کوارٹر جرول روڈ اسٹیشن تھا جو گونڈا سے بارہ بنکی کو جانے والی ریلوے لائن پر دریائے سرجو کے کنارے واقع

غزل

آلامِ روزگار کو آساں بنادیا
جو غم ہوا اسے غمِ جاناں بنادیا

یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑگئی
یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنادیا

مجبوریِ حیات میں رازِ حیات ہے
زنداں کو میں نے روزنِ زنداں بنادیا

وہ شورشیں نظامِ جہاں جن کے دم سے تھا
جب مختصر کیا انہیں انساں بنادیا

ہم اس نگاہِ ناز کو سمجھے تھے نیشتر
تم نے تو مسکراکے رگِ جاں بنادیا

کہتے ہیں اک فریبِ مسلسل ہے زندگی
اس کو بھی وقفِ حسرت واراماں بنادیا

عالم سے بے خبر بھی ہوں عالم میں بھی ہوں میں
ساقی نے اس مقام کو آساں بنادیا

اس حسنِ کاروبار کو مستوں سے پوچھیے
جس کو فریبِ ہوش نے عصیاں بنادیا

تھا۔ یہ اسٹیشن قصبہ جرول سے چار میل کے فاصلے پر بنا ہوا تھا۔ اس دور افتادہ علاقے کے عوام معاشرت وتہذیب کے رنگ وروغن سے ناآشنا تھے۔ اس کا دن رات کا سابقہ اجڈ اور گنوار بارہ ماسیوں سے تھا لیکن اس نے وہاں پہنچتے ہی اپنے حسنِ سلوک سے ان کے دل جیت لیے۔ وہ پہلے کے ٹائم کیپر کی طرح ان کی مزدوری میں نہ تو کٹوتی کرتا' نہ اپنا حصہ طلب کرتا بلکہ اس کے برعکس معمولی دیر سویر کو نظرانداز کردیتا۔ ان مزدوروں کے لیے یہ باتیں بالکل نئی تھیں۔ وہ پیار سے اسے بابو کہنے لگے۔

اس کی دیانت داری اور فرض شناسی سے اس کے افسران بھی بہت خوش تھے۔ انہی افسران میں ایک اینگلو انڈین بھی تھا جو اس کی بے حد قدر کرتا تھا۔

اس دور افتادہ جگہ پر دلچسپی کا کوئی سامان نہیں تھا۔ کوئی ایسا آدمی نہیں تھا جس کے پاس دو گھڑی بیٹھ سکے۔ معمول کے فرائض تین چار گھنٹے میں تمام ہوجاتے تھے۔ اس کے بعد وہ کیا کرے۔ کتابیں بھی نہیں جو اس کا ساتھ دے سکتی تھیں۔ وہ گونڈا آتا ہی رہتا تھا' اس مرتبہ آیا تو بہت سی کتابیں اپنے ساتھ لے گیا۔

کام نمٹانے کے بعد جو وقت بچ جاتا تھا' اس میں وہ کتابیں پڑھ کر دل بہلانے لگا۔ مثنوی مولانا روم' دیوانِ حافظ' عرفی' جامی' امیر خسرو۔ عربی میں خصوص الحکم اور بہت سی کتابیں اس نے کھنگال ڈالیں۔ اثر پذیری کا مادہ اس کی طبیعت میں بے حد تھا۔ وہ جو کچھ پڑھتا رہا' اس سے متاثر بھی ہوتا رہا۔ خاص طور پر تصوف کی کتابوں نے اس پر خاص اثرات مرتب کیے۔ وہ نقش جو گھریلو تربیت نے اس پر ثبت کیے تھے اور جو جوانی کے تقاضوں کی وجہ سے دب گئے تھے' پھر سے ابھرنے لگے۔

ایک روز وہ مطالعے میں غرق تھا کہ اس کا اینگلو انڈین افسر ٹہلتا ہوا اس کے پاس آگیا۔

"ہیلو ینگ مین! کیا پڑھا جارہا ہے؟"

"ایسے ہی وقت گزاری کے لیے۔"

"پھر بھی۔" اس نے اصغر کے ہاتھ سے کتاب لے لی۔ صوفیہ کے احوال واقوال پر ایک کتاب تھی۔

"تو تمہیں تصوف سے دلچسپی ہے؟" افسر نے کہا۔

"جی!"

"تم نے آسکر وائلڈ کو پڑھا ہے؟"

"نہیں۔"

"اسے پڑھو۔ وہ انگریزی کا صوفی ہے۔ وہ حسن پرست تھا' تنہائی پسند تھا۔ عام لوگوں سے الگ تھلگ۔ تمہیں اس کی شاعری میں بڑا لطف آئے گا۔ اس کے لفظوں میں موسیقی ہے' زبان میں سلاست۔ اس کا لہجہ بہت میٹھا ہے۔"

"میری انگریزی اتنی اچھی نہیں ہے کہ انگریزی ادبیات سے لطف اندوز ہوسکوں۔"

"اوہ' آئی سی۔ تم فکر مت کرو' میں تمہاری مدد کروں گا۔"

کچھ دیر کی گفتگو کے بعد معلوم ہوا وہ اینگلو انڈین عام افسروں کی طرح نہیں ہے بلکہ ادبیات پر اس کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔

اس افسر نے اصغر کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور انگریزی کتابیں اسے فراہم کرنا شروع کردیں۔ اس کی استعداد واقعی اتنی نہیں تھی کہ انہیں سمجھ سکتا لیکن اپنے افسر کی مدد سے اس نے ان کتابوں کو پڑھنا شروع کردیا۔

آسکر وائلڈ کو پڑھ کر اسے واقعی لطف آیا۔ آسکر وائلڈ جمالیاتی تحریک کا سب سے بڑا مبلغ تھا۔ اصغر بھی جمالیات کا

پرستار تھا۔ آسکر وائلڈ کی دوسری خصوصیات ذہانت اور بزلہ سنجی تھی۔ اصغر میں بھی یہ صفت موجود تھی بلکہ اس کے مطالعے کے بعد اس نے یہ صفت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ آسکر وائلڈ کے بعد اس نے برنارڈ شا کو پڑھنا شروع کردیا۔ اس کے بعد تو نثر و نظم کی جو کتاب اسے ملی' اس نے پڑھ ڈالی۔

اقبال و غالب کے مطالعے سے فلسفیانہ طرزِ بیان کا شعور حاصل کرنے کی کوشش کی' مہدی افادی کے مطالعے سے اسے یہ معلوم ہوا کہ شاعرانہ نثر کیا ہوتی ہے' حسرت و مومن سے تغزل کی چاشنی کا عرفان ہوا۔

اس کی تعلیمی زندگی میں جو کمی رہ گئی تھی' وہ جرول آکر پوری کرلی۔ مطالعے کی کثرت نے اس کے خیالات کو آمادۂ انقلاب کرنا چاہا لیکن اس کی شراب نوشی نے اس کے پیروں میں بیڑیاں ڈال رکھی تھیں۔ وہ موجودہ حالت سے بھاگتا ضرور تھا لیکن کچھ دور جاکر رکنا بھی پڑتا تھا۔ اب تو وہ شراب کے ساتھ ساتھ افیون بھی کھانے لگا تھا لیکن کمال یہ تھا کہ شراب اور افیون کے بہ کثرت استعمال کے باوجود نہ اپنے فرائض سے غافل تھا نہ مطالعے سے۔ اس کی یہ غفلت قابلِ تعریف ضرور تھی لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جو بُری چیز نقصان نہ دے وہ بری نہیں رہتی۔ اصغر کو بھی اس کا احساس تھا لیکن اسے اتنی قدرت میسر نہیں تھی کہ ترکِ شراب کی منزلوں پر فائز ہوسکتا۔

عہدِ قدیم میں جرول مسلم شرفا کا ایک مردم خیز قصبہ تھا۔ جہاں شعر و سخن کا چرچا رہتا تھا۔ یہاں بڑے بڑے صاحبانِ علم و فن پیدا ہوئے۔ انہی کی باقیات میں سید علی حیدر' تعلقہ دار تھے۔ وہ شاعر تھے اس لیے نہ اصغر ان سے چھپا رہا اور نہ وہ اصغر سے۔

اصغر جب پہلے پہل ان سے ملنے پہنچا تو شاعری کو تماشا بنتے ہوئے دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ تعلقہ دار صاحب حقے سے شغل فرمارہے تھے۔ کسی نے مصرعہ طرح پیش کیا۔ انہوں نے حقے کا کش لیا اور آنکھیں بند کرلیں۔ آنکھیں بند ہوئیں اور کھل گئیں۔ ایک شعر حاضر تھا پھر اسی طرح ہر کش پر ایک ایک شعر کہتے چلے جارہے تھے۔

اصغر حیران تھا کہ شاعری یوں بھی ہوسکتی ہے؟ ان شعروں میں کوئی انوکھی بات نہیں لیکن دو مصرعے وزن میں تو ہیں۔ جب غور کیا تو معلوم ہوا' ان شعروں میں بلند خیالی نہیں لیکن زبان و بیان کے ایسے ایسے نکتے چھپے ہوئے ہیں جن پر دل قربان ہو۔ قادر الکلامی اسی کو کہتے ہیں۔ تعلقہ دار کی ہم نشینی میں اس نے شاعری کو ہنر بنانے کا ہنر سیکھا۔ ان کی صحبتوں کے فیض سے زبان و بیان پر اس کی گرفت مضبوط ہوگئی۔

ابھی اس کی شاعری کی شہرت اس کے دوستوں سے آگے نہیں بڑھی تھی لیکن جس طرح وہ اپنے علم اور علمِ بیان کی قوت میں اضافہ کررہا تھا' اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کی شاعری کسی قابلِ قدر کارنامے کی صورت میں ظاہر ہوگی۔

○☆○

اصغر کی تربیت جس گھریلو ماحول میں ہوئی تھی' اس کا تقاضا تھا کہ گناہ و معصیت کا اندھیرا جلد چھٹ جائے۔ اس کی بنیاد پختہ و محکم تھی۔ کچھ دنوں کے لیے اس کی شخصیت کی فلک بوس عمارت پر گناہ کا رنگ و روغن چڑھ گیا تھا لیکن مسلسل مطالعے اور غور و فکر کے زلزلے نے اس عمارت کو زمیں بوس کردیا لیکن بنیادی شخصیت بدستور قائم رہی۔ وہ پھر پیچھے کی طرف لوٹنے لگا۔ تصوف کے مطالعے نے اس کی ذہنی دنیا کو بدل دیا۔

باطن کی یہی صفائی تھی جس نے اس پر ایک روز ماورائیت طاری کردی اور عین اس وقت جب پوری محفل کیف و سرور میں ڈوبی ہوئی تھی اور خود اس کے ہاتھ میں جامِ شراب تھا' اس کی آنکھیں چھلک پڑیں پھر وہ بلک بلک کر رونے لگا۔ لوگ یہی سمجھے کہ نشے کی شدت کا شاخسانہ ہے۔

"لوگو! گواہ رہنا۔ اصغر کا یہ آخری جامِ شراب ہے۔ آج سے وہ مے نوشی سے توبہ کرتا ہے۔ خدا اسے معاف کرے اور اپنے عہد پر استقامت کی توفیق عطا فرمائے۔"

لوگوں نے اس اعلان کو بھی نشے کی ترنگ سمجھا۔ پینے والے اکثر ایسی باتیں کہا کرتے ہیں۔ نشہ اترتا ہے تو یاد بھی نہیں رہتا کہ کہا کیا تھا۔

کڑاکے کی سردی پڑرہی تھی لیکن آخری جامِ شراب اور توبہ کی گرمی سے اس کا بدن پسینے میں نہا رہا تھا۔

"مجھے گھر پہنچادو۔ اب تم مجھے یہاں کبھی نہیں دیکھوگے۔"

اسے گھر پہنچانا واقعی ضروری ہوگیا تھا۔ دوستوں کا خیال تھا' اسے نشہ زیادہ ہوگیا ہے اس لیے اول فول بک رہا ہے۔ بابو راج نے اشارہ کیا اور چند دوست اسے گھر چھوڑ کر آگئے۔

دوستوں کا اندازہ اس وقت غلط ثابت ہوگیا جب اصغر نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور بابو راج کی رفاقت سے علیحدگی کا اعلان کردیا۔ ملازمت اور شرابِ ناب کو ایک ساتھ ترک کردیا۔ بابو راج بہادر ملازمت کا وسیلہ بنے تھے' ترکِ ملازمت کا بھی وہی ذریعہ بنے۔

سات آٹھ سال کی رفاقتِ دیرینہ کا خاتمہ اور بادۂ ناب کی

مستیوں کو ترک کردینا مذاق نہیں تھا۔

اس نے نوکری چھوڑ تو دی تھی لیکن بیوی اور بچیوں کا ساتھ تھا۔ اسے یہ فکر کھائے جارہی تھی کہ ان کا کیا ہوگا۔ بوڑھے والدین کا کیا ہوگا۔

اتنی کڑی آزمائش تھی کہ کئی مرتبہ اس کے قدم ڈگمگائے لیکن اس کے صبر نے پائے استقامت میں لغزش نہیں آنے دی۔

ایک ڈیڑھ سال گزر گیا تھا لیکن دورِ ابتلا تھا کہ ختم ہونے میں نہیں آتا تھا۔ شاید قدرت اس کی توبہ کا امتحان لے رہی تھی۔ وہ اس امتحان میں سرخرو تھا۔

ترکِ مے نوشی کے بعد اس کے حلقۂ احباب میں بھی تبدیلی آئی تھی۔ نئے دوستوں میں ایک ذی علم بزرگ حکیم عبدالباری انصاری بھی تھے جنہیں تصوف سے خاص شغف تھا۔ یہ بزرگ، قاضی عبدالغنی منگلوری کے مرید تھے اور اپنے پیر کی مدح سرائی میں وقت گزارا کرتے تھے۔ انہی کی صحبت میں رہ کر اسے یہ خیال ہوا کہ روح کی تشنگی دور کرنے کے لیے کسی مرشدِ حق کی بیعت بڑی ضروری ہے۔ وہ کوئی عام سائل نہیں تھا کہ ہر ہاتھ اسے سہارا دے سکتا یا دروازے سے اسے سکون کی بھیک مل سکتی۔ اس کے دل میں دبی ہوئی تلاشِ حق کی وہ خواہش جس پر حالات کی گرد پڑگئی تھی، رفتہ رفتہ صاف ہونے لگی۔ کسی کامل رہبر کی تلاش نے اسے بے کل کردیا۔ وہ کیا چاہتا تھا، اس کی مراد کون پوری کرے گا، اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

ایک دن جب اصغر نے محسوس کیا کہ جسمانی آسودگی روح کی تشنگی کو ناقابلِ برداشت حد تک تیز کرچکی ہے تو وہ سب کو چھوڑ چھاڑ کر بلا اطلاع شیخ کی تلاش میں روانہ ہوگیا۔

وہ کہاں جارہا ہے، اسے خود بھی معلوم نہیں تھا۔ بس ایک خیال سے ٹرین میں بیٹھ گیا۔

بیٹھا ہے ایک خاک نشیں محوِ بے خودی
کچھ حسن سے غرض ہے نہ پروائے عشق ہے

اچانک ایک روشنی سی ہوئی۔ اس نے شیخ محمد عمر صاحب کا نام سنا تھا جو تھانہ بھون میں رہتے تھے۔ اس کی رہنمائی وہی کرسکتے تھے لیکن ان کا پتا؟ تھانہ بھون تو پہنچ جاؤں، ان کا پتا تو کوئی بھی بتادے گا۔

مراد آباد کا اسٹیشن تھا۔ وہ کھڑکی کے پاس بیٹھا ریزگاری گن رہا تھا کہ کچھ ریزگاری ہاتھ سے چھوٹ کر پلیٹ فارم پر گر پڑی۔ اس وقت ایک بزرگ ادھر سے گزرے۔

"سنیے! یہ میرے پیسے گر گئے ہیں ذرا اٹھادیجیے" اس نے

انتخابِ کلام

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہوجائے

بنا لیتا ہوں موجِ خونِ دل سے اک چمن اپنا
وہ پابندِ قفس جو فطرتاً آزاد ہوتا ہے

اس جہانِ غیر میں آرام کیا، راحت کہاں
لطف جب ہے اپنی دنیا آپ پیدا کیجیے

زخم آپ لیتا ہوں، لذتیں اٹھاتا ہوں
تم کو یاد کرتا ہوں درد کے بہانے سے

خستگی نے کردیا اس کو رگِ جاں کے قریب
جستجو ظالم کہے جاتی ہے منزل دور ہے

میری فغانِ درد کو اس سروِ ناز کو
ایسا سکوت ہے کہ تقاضا کہیں جسے

اے پیکرِ محبوبی میں کس سے تجھے پوچھوں
جس نے تجھے دیکھا ہے وہ دیدۂ حیراں ہے

داستاں ان کی اداؤں کی ہے رنگیں لیکن
اس میں کچھ خونِ تمنا بھی ہے شامل میرا

کچھ نہ ہم سے ہوسکا اس اضطرابِ شوق میں
ان کے دامن کو مگر اپنا گریباں کردیا

پہلی نظر بھی آپ کی اُف، کس بلا کی تھی
ہم آج تک وہ چوٹ ہیں دل پر لیے ہوئے

اصغر سے ملے لیکن اصغر کو نہیں دیکھا
اشعار میں سنتے ہیں کچھ کچھ وہ نمایاں ہے

ان بزرگ کو آواز دی۔
ان بزرگ نے نہایت فراخ دلی سے یہ خدمت انجام دی اور خود بھی آکر اسی ڈبے میں بیٹھ گئے۔
گول سر، گھونگھریالے بال، سر پر پٹے اور فراخ چہرہ، کشادہ پیشانی، گھنی خوش قطع داڑھی، میانہ قد، گٹھا ہوا بدن، ململ کا لانبا کرتہ، دوپلی ٹوپی، مغلئی پاجامہ۔ اس کے سامنے وہی بزرگ بیٹھے تھے جنہوں نے ابھی ریزگاری اٹھا کر دی تھی۔ اصغر نے اس وقت تو غور نہیں کیا تھا لیکن اب جو دیکھا تو حسن، جمال اور نفاست مجسم ہو کر اس کے سامنے آگئے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ بزرگ اصغر کی دلی کیفیت سے آگاہ ہوں۔
"کہاں کا قصد ہے؟" انہوں نے اصغر سے پوچھا۔
"تھانہ بھون!"
"تھانہ بھون جا رہے ہو۔ پوچھ سکتا ہوں کس سلسلے میں؟"
"شیخ محمد عمر صاحب کی تلاش میں" اصغر نے یہ سوچ کر بتا دیا کہ نیک آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ شاید ان کے بارے میں کچھ جانتے ہوں۔
"وہ تو تمہیں نہیں مل سکتے۔"
"کیوں نہیں مل سکتے؟"
"اس لیے کہ ان کا وصال ہو چکا۔"
"آپ ان سے واقف ہیں؟"
"وہ میرے پیر بھائی تھے۔"
"جناب کا اسم شریف؟"
"قاضی عبدالغنی۔"
"قاضی عبدالغنی منگلوری؟" اصغر نے تصدیق چاہی۔
"جی۔"
اصغر کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ آنکھوں میں اشتیاق کے ڈورے تیرنے لگے۔ اسے وہ سب تعریفیں یاد آنے لگیں جو حکیم عبدالباری انصاری سے سن چکا تھا۔ انہیں دیکھ کر یہ تعریفیں چھوٹی لگتی تھیں۔ اصغر کی حسن پرست طبیعت نے ان کی حسین اور دلکش شخصیت کو دل سے قبول کر لیا۔ میں مرشد کی تلاش سے نکلا تھا، مرشد تو خود میرے پاس آگیا۔ اب میں ان کا دامن نہیں چھوڑوں گا۔ شیخ محمد عمر تو اس دنیا میں رہے نہیں۔
ان کے حسنِ اخلاق سے وہ پہلے ہی متاثر ہو چکا تھا، ظاہری شخصیت نے تو اسے خرید ہی لیا اور جب دورانِ سفر گفتگو کا سلسلہ چلا تو ان کی طرزِ گفتگو نے اس کا دل موہ لیا۔
گاڑی جب رڑکی پہنچی تو قاضی صاحب کی منزل آگئی۔ انہوں نے اجازت لی اور گاڑی سے اتر گئے، اصغر بھی اسی اسٹیشن پر اُتر گیا اور ان کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا ان کے گھر پہنچ گیا۔
"آپ کو تو آگے جانا تھا" قاضی صاحب نے اسے دیکھ کر کہا۔
"آپ کی رہنمائی کے بغیر آگے کیسے جا سکتا ہوں۔ میں نے بہت ٹھوکریں کھائی ہیں۔ اب تو آپ ہی مجھے سنبھال سکتے ہیں، میرا ہاتھ تھام لیجیے۔"
قاضی صاحب نے اس کے شوق کو دیکھتے ہوئے اسے سینے سے لگا لیا۔
بیعت سے سرفراز ہوتے ہی اصغر کی دنیا جاگ اٹھی۔ وہ گونڈا واپس آیا تو اس حال میں کہ چہرے پر زندگی کی حرارت کا غازہ، دل و دماغ پر ایک کیف سرمدی، ہونٹوں پر دلآویز تبسم تھا۔
قاضی عبدالغنی کی توجہ نے اس کی ذات کو روشن کر کے اس میں ایسا ذوق، ایک ایسا جوش و خروش، ایسا سوز و گداز بھر دیا جس نے اس کی روح کو بیدار کر دیا۔
وہ جب ملازمت چھوڑ کر گونڈا میں بے کاری کے دن گزار رہا تھا، چھٹن نے اس سے پھر تعلق قائم کرنا چاہا تھا لیکن اب وہ ہر ایسے تعلق کو معصیت سمجھنے لگا تھا۔ چھٹن بیگم اس وقت سے اب تک اس کی تمنائی تھیں۔
بیعت کر کے وہ گونڈا واپس ہوا تو اس کا دامن پھر پکڑا گیا۔ ترغیبیں پھر اسے کھینچنے کو تیار تھیں۔ وہ انکار نہیں کر سکا، راہِ ثواب تلاش کر لی۔
"اگر یہ تعلق قید شریعت میں آجائے تو میں تمہیں اپنانے کو تیار ہوں" اصغر نے کہا۔
چھٹن کو ہر قیمت پر اس کی رفاقت گوارا تھی۔ وہ تیار ہو گئیں اور اصغر نے ان سے نکاح کر لیا۔
اس کی پہلی بیوی کے لیے یہ فیصلہ ہرگز قابلِ قبول نہیں تھا۔ وہ اصغر سے خفا ہو کر اپنے سسر کے ساتھ رہنے لگیں۔ اصغر نے انہیں طلاق نہیں دی اور نہ انہوں نے مانگی لیکن بظاہر علیحدگی ہو گئی۔ وہ محض اخراجات تک اصغر کی ذمے داری تھیں۔
چھٹن نہایت کامیاب بیوی ثابت ہوئیں۔ انہوں نے چند دنوں میں یہ ثابت کر دیا کہ اصغر کا انتخاب غلط نہیں تھا۔ پہلی بیوی سے جتنے گلے تھے، چھٹن کی شکل میں ان سب کا ازالہ ہو گیا۔
بے روزگاری اب تک چلی آ رہی تھی۔ وہ خدا پر توکل کیے حوصلہ شکن دن گزار رہا تھا۔ اس کے بعض دوستوں سے یہ حالت دیکھی نہیں گئی۔ انہوں نے بڑی مشکل سے اصغر کو تیار

کیا اور چوک بازار گونڈا میں بساط خانے کی دکان رکھوادی۔
یہ دکان اس کے روزگار کا وسیلہ بھی بن گئی اور تفریحِ طبع کا سامان بھی۔ ایک ٹھکانا مل گیا تو دوست احباب یہیں جمع ہونے لگے۔ شعروشاعری، علمی مذاکرات اور نقد و تبصرے کی محفلیں گرم ہونے لگیں۔
قاضی صاحب سے ان کی شیفتگی روز بروز بڑھتی جارہی تھی۔ ان کے فیض سے اصغر کی زندگی آہستہ آہستہ تبدیل ہورہی تھی۔ اگر روحانیت نام ہے اپنی رفتارو گفتار سے دوسروں کو گرویدہ بنانے کا تو مرشد کے فیض سے یہ صفت اصغر میں پیدا ہوگئی تھی۔ وہ اپنے اخلاق و عمل سے دوسروں پر ایسا خاموش اثر ڈالتے کہ دوسروں کی تربیت اور تہذیبِ نفس غیر محسوس طریقے پر ہوتی جاتی۔ ان کے پاس آنے والوں میں کتنے ہی بے نمازی تھے جو نمازی بن گئے، کتنے ہی دہریوں کو انہوں نے خدا کا قائل کردیا۔ کسی کرشمے سے نہیں بلکہ علمی دلائل اور روحانی تصرف سے۔
اس دوران میں وہ عبدالغنی منگلوری سے برابر ملتے رہے اور اکتسابِ فیض کرتے رہے۔ عبدالغنی منگلوری بھی ان پر خاص توجہ رکھتے تھے۔ جب وہ پہنچ جاتے تو ان کی دلداری کے لیے شاعری کی محفل ضرور آراستہ کرتے۔
عبدالغنی منگلوری انہیں صرف سلوک و معرفت کی منزلیں طے نہیں کرا رہے تھے، ان کی شعری تربیت بھی کررہے تھے۔ جب دیکھا کہ وقت آگیا ہے تو انہوں نے اصغر کو نصیحت کی۔
"ہمارے رنگ میں شعر کہو گے تو ہماری سمجھ میں آئیں گے اور واقعی شاعر کہلاؤ گے۔"
اصغر کئی دن تک پیرو مرشد کے اس بلیغ جملے کی معنویت پر غور کرتے رہے کہ "ہمارے رنگ" سے کیا مراد ہوسکتی ہے اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچے کہ اس سے مراد معرفت کی شاعری ہے۔ اشارہ یہ ہے کہ میں سلوک و معرفت کی جن منازل سے گزر رہا ہوں اپنی شاعری میں انہی مضامین کو قلم بند کروں۔ اسی جملے میں یہ اشارہ ہے کہ اس طرز کی شاعری میری مقبولیت کا سبب بنے گی۔
عبدالغنی منگلوری نے یہ نصیحت یونہی یا قبل از وقت نہیں کردی تھی۔ پہلے اصغر کے قلب کو معرفت کا خزینہ بنایا، اس کے بعد ہدایت کی تاکہ مضامین معرفت کے حصول کے لیے انہیں کہیں دور جانا نہ پڑے۔
اصغر نے ایک لائق مرید کی طرح مرشد کے عشق میں اپنے ہاتھوں اپنے توہمات کا نشیمن پھونک ڈالا اور اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہوگئے۔ اسلام کے گہرے مطالعے اور شیخ کی توجہ نے ان کی شخصیت میں زبردست انقلاب برپا کردیا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ روحِ انسانی ایک جوہرِ لطیف ہے۔ خدا کے ساتھ محبت اسی جوہر کا خلاصہ ہے۔ اس جسدِ عنصری میں پہنچ کر اپنی دیرینہ عظمت کی تلاش فطری تقاضا ہے۔ مذہب حقیقی معنوں میں اسی جستجو کا نام ہے۔ دوسرے لفظوں میں محبوب حقیقی کی تلاش و جستجو کا نام مذہب ہے۔ اس جستجو میں سالک کو جن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے، ان کا بیان شاعری میں کرنا معرفت کی شاعری ہے۔
اس نتیجے پر پہنچتے ہی اس کے عقائدِ شعری بدل گئے۔ اس نے اپنی پچھلی زندگی کی طرح پچھلی شاعری بھی بھلادی۔
پیر عبدالغنی نے اپنے تصرفِ روحانی سے اصغر کے قلب میں عشقِ حقیقی کا جو الاؤ روشن کردیا تھا، اصغر کی شاعری اسی عشق اور اس کی کیفیات کا شفاف آئینہ بن گئی۔
اس کی غزل "حسن و عشق" کا والہانہ بیان تھی لیکن حسن وعشق کے عام معانی سے مختلف۔
شاعری کا عام موضوع حسن ہے لیکن اصغر نے ایک صوفی کی حیثیت سے حسنِ ازلی کو بیان کیا۔ کائنات سراپا حسن ہے اور اس کے خالق سے محبت کرنا انسان کی زندگی کا مقصد ہے۔
حسن محبوب کے اس اعلیٰ تصور نے اس کی شاعری کو ارفع اور پاکیزہ بنادیا اور وہ ایسے اشعار کہنے پر قادر ہوسکا۔

اب تو یہ تمنا ہے کسی کو بھی نہ دیکھوں
صورت جو دکھا دی ہے تو لے جاؤ نظر بھی

سحر لائے گی کیا پیغام بیداری شبستاں میں
نقاب رخ الٹ دو خود سحر بیدار ہوجائے

اس عارضِ رنگیں پر عالم وہ نگاہوں کا
معلوم یہ ہوتا ہے پھولوں میں صبا آئی

حسنِ دوست ہے اور التجائے جاں بازی
تجھے یہ وہم کہ یہ کائنات عالم ہے

تو بہت سمجھا تو کہہ گزرا فریبِ رنگ وبو
یہ چمن لیکن اسی کی جلوہ گاہِ ناز ہے

یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑگئی
یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنادیا

بے محابا ہو اگر حسن تو وہ بات کہاں
چھپ کے جس شان سے ہوتا ہے نمایاں کوئی

انہوں نے اپنی شاعری کو محض حسن و عشق تک محدود نہیں رہنے دیا بلکہ مذہب کا مطالعہ کرکے ان نکتوں کی وضاحت کی جن کو قبول کرکے ایک انسان عاشق صادق بن سکتا ہے۔
عبودیت یہ ہے کہ اللہ کی رضا کے لیے اپنی رضا کو بھول جا۔

ترکِ مدعا کردے عین مدعا ہوجا
شانِ عبد پیدا کر، مظہرِ خدا ہوجا

اطاعت روحِ انسانی کا خلاصہ ازلی ہے۔

مرنا بھی آگیا مجھے جینا بھی آگیا
پہچاننے لگا ہوں تمہاری نظر کو میں

جب اطاعت اس درجے پر پہنچ جاتی ہے تو پھر خدا کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔

جو نقش ہے ہستی کا دھوکا نظر آتا ہے
پردے پہ مصور ہی تنہا نظر آتا ہے

تلقینِ عمل۔

آدمی نہیں سنتا آدمی کی باتوں کو
پیکرِ عمل بن کر غیب کی صدا ہوجا

خود آگہی کی تلقین۔

قطرۂ تنک مایہ، بحرِ بے کراں ہے تو
اپنی ابتدا ہوکر اپنی انتہا ہو جا

انسان رونقِ کائنات ہے۔

شورش عندلیب نے روحِ چمن میں پھونک دی
ورنہ یہاں کلی کلی مست تھی خوابِ ناز میں

انقلاب نئی زندگی کی بشارت ہوتا ہے۔

کیوں شکوہ سنج گردشِ لیل و نہار ہوں
اک تازہ زندگی ہے ہر اک انقلاب میں

ان عارفانہ حقائق سے ہٹ کر انہوں نے اگر مجاز یعنی انسانی حسن کو بھی موضوع بنایا تو کمال فنکاری سے پاکیزگی و طہارت کی ایسی روح پھونک دی کہ یہ تصویریں معصومیت کا مرقع بن گئیں۔

تبسم:

یہ حسن کی موجیں ہیں یا جوشِ تبسم ہے
اسی شوخ کے ہونٹوں پر اک برق سی لرزاں ہے

رفتار:

غزل

کوئی محمل نشیں کیوں شاد یا ناشاد ہوتا ہے
غبارِ قیس خود اٹھتا ہے خود برباد ہوتا ہے
قفس کیا حلقہ ہائے دام کیا رنجِ اسیری کیا
چمن پر مٹ گیا جو ہر طرح آزاد ہوتا ہے
بہار انجام سمجھوں اس چمن کا یا اسے سمجھوں
زبانِ برگِ گل سے مجھ کو کیا ارشاد ہوتا ہے
سمائے جارہے ہیں اب وہ جلوے دیدہ و دل میں
یہ نظارے ہیں یا ذوقِ نظر برباد ہوتا ہے
یہاں کوتاہیِ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے
یہاں مستوں کے سر الزام ہستی ہے مگر اصغر
پھر اس کے بعد ہر الزام بے بنیاد ہوتا ہے

ع کوثر کی موج ہے تری [illegible] خرام

قد:

اس کا وہ قد رعنا اس [illegible] وہ رہنا رنگیں
نازک سا سر شاخ اک [illegible] گلِ تر دیکھا

چھیڑ چھاڑ:

عارضِ نازک پہ ان کے رنگ سا کچھ آگیا
ان گلوں کو چھیڑ کر میں نے گلستاں کردیا

دنیا میں رہو لیکن دنیاوی لذتوں سے سروکار نہ رکھو۔

بلبل و گل میں جو گزری اس سے ہم کو کیا غرض
ہم تو گلشن میں فقط رنگ چمن دیکھا کیے

چمن میں چھیڑتی ہے کس مزے سے غنچہ و گل کو
مگر موجِ صبا کی پاک دامانی نہیں جاتی

زندگی بے قراری کے لیے نہیں، حصولِ لذت کے لیے ہے۔

مری نگاہ نے جھک جھک کے کر لیے سجدے
جہاں جہاں سے تقاضائے حسنِ یار ہوا

حیا انسانی شرف ہے۔

بے محابا ہو اگر حسن تو وہ بات کہاں
چھپ کے جس شان سے ہوتا ہے نمایاں کوئی

بے غرض محبت۔

یہ ننگِ عاشقی ہے سود حاصل دیکھنے والے
یہاں گمراہ کہلاتے ہیں منزل دیکھنے والے

طمانیتِ قلب۔

غرض نشاط و الم سے فقط تماشا ہے
کہ یہ مناظر رہ اور میں ہوں رہ گزری

ان کے اندر چھپا ہوا محبت کا جذبہ خود زندگی سے محبت کا جذبہ بن گیا۔ عشقِ خداوندی میں سر سے پاؤں تک ڈوبنے کے باوجود، تلاش و جستجو میں ٹھوکریں کھانے کے باوجود وہ غم پسند نہیں بن سکے۔ زندگی کے لیے ایک خاص تڑپ ان کے اندر بیدار ہوئی۔ انہوں نے اس زندگی کو محبوب کا عطیہ سمجھا۔ زندگی کے غم بھی ان کے لیے محبوب کا تحفہ بن گئے۔

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ہوا اسے غمِ جاناں بنا دیا

اس احساسِ فکر نے صوفی ہونے کے باوجود مادی چیزوں سے دلچسپی، خوش طبعی اور زندہ دلی کو ان کے مزاج کا حصہ بنا دیا۔ اس مزاج نے ان کی شاعری کے دامن کو رنگینیٔ طبع کے پھولوں سے بھر دیا اور انہیں زاہدِ خشک نہیں رہنے دیا۔ رجائیت کا وہ انداز پیدا کیا جو اب تک خاص طور پر صوفیانہ شاعری میں ناپید تھا۔

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

آغوش میں ساحل کے کیا لطفِ سکوں اس کو
یہ جان ازل ہی سے پروردۂ طوفاں ہے

اردو شاعری میں تصوف اس لیے بدنام تھا کہ یہ بے عملی سکھاتا ہے۔ اصغر نے اس خیال کو غلط ثابت کر دیا۔ اس کی شاعری جہد و عمل سکھاتی تھی۔

یہاں کوتاہیٔ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

زندگی کے متعلق اسی رجائی نقطۂ نظر نے اصغر کو زندگی سے اور انسانوں سے محبت کرنا سکھایا۔ اپنی شخصیت کو نکھارا۔ یہاں تک کہ جو بھی اس سے مس کر گیا کندن بن گیا۔

ابھی تک معرفت کی شاعری سے یہ مراد لی جاتی تھی کہ صوفیانہ مسائل بیان کیے گئے ہوں گے لیکن اصغر نے جس طرح پوری زندگی کو اپنی شاعری میں سمو دیا، اس سے اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔

ان مضامین کو بیان کر دینا اتنا اہم نہیں تھا۔ اصغر نے کمال یہ کیا کہ ان مضامین کو ایسی نادر تشبیہات اور استعاروں کے ذریعے ادا کیا کہ اشعار چلتی پھرتی تصویریں بن گئے۔ انہوں نے تشبیہات کا بڑا خزانہ فطری مناظر سے حاصل کیا جس سے گلستاں سا کھل گیا اور ان تشبیہات سے اپنے مفہوم کی حقیقت تک پہنچے۔

"گل" جو نکہت و لطافت سے عبارت ہے جب اصغر کے یہاں تشبیہ کے طور پر آیا تو معرفت کا خزانہ بن گیا۔

محبت ابتدا سے تھی مجھے گل ہائے رنگیں سے
رہا ہوں آشیاں میں لے کے برقِ آشیاں برسوں

انہوں نے تشبیہات کے ایسے باغ کھلائے کہ ان کی شاعری کی شہرت دور دور تک پھیلنے لگی۔

روشنی ہو جگنو کی جیسے شبنمستاں میں
وہ نقاب کا عالم اس کے مسکرانے سے

یہی حال استعاروں کا ہے۔ جدت اور لطافت یہاں بھی پیشِ نظر رہی۔

دل یہ لیا ہے داغِ عشق کھو کے بہارِ زندگی
اک گلِ تر کے واسطے میں نے چمن لٹا دیا

اصغر کی شخصیت جس پاکیزگی، نفاست پسندی، حسن پرستی، باعملی، شگفتگی، ادب، احترام، حوصلہ مندی اور خوش اخلاقی کا مظہر تھی، اس کی شاعری بھی ان اوصاف کی حامل بنتی گئی۔

اصغر کے اردگرد جو شاعرانہ ماحول تھا، وہ لکھنؤ کے دبستانِ شاعری کا پروردہ تھا جس میں ہوسناکی اور ابتذال کی کثرت تھی۔ لکھنؤ کی غزل عورتوں کی کنگھی چوٹی تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ اصغر نے اس سے بغاوت کی اور غزل میں پاکیزگی اور متانت کو رواج دیا۔ توازن اور اعتدال پیدا کیا اور یہ ثابت کیا کہ شاعری حکمت کا نام ہے۔

اسی دور میں جگر اور فانی کی غزلوں کی بڑی دھوم تھی۔ فانی کی غزلیں مایوسی اور بیزاری کا سبق سکھاتی تھیں، اصغر نے جہد و عمل کا پیغام دیا۔ جگر کی غزلیں رندی و سرمستی کا شاہکار تھیں لیکن نفسانی اور ہوسناکی کا مرقع بھی تھیں۔ وہ داغ کی طرح کبھی کبھی بہت کھل جاتے تھے۔ اصغر کی غزلیں متین و مہذب ذہن کی ترجمانی تھیں۔

عبدالغنی منگلوری نے اصغر کے باطن کو بدل ڈالا اور اصغر نے اردو غزل کے باطن کو بدل دیا۔

ان غزلوں کی موجودگی میں اب وہ معمولی درجے کا شاعر نہیں رہا تھا۔ وہ غزل کی عمارت کا ایک اہم ستون بن گیا تھا۔

اس کی بساط خانے کی دکان رشد و ہدایت کے ساتھ ساتھ مرکزِ شاعری بھی تھی۔ علمی مذاکرات ہوتے اور نقد و تبصرہ کی محفلیں منعقد ہوتیں۔ کوئی اجنبی جب گونڈا شہر میں داخل ہوتا تو اس دکان کو دیکھنے اور حضرت اصغر کو دیکھنے چوک بازار کا رخ

ضرور کرتا۔ اصغر کی شاعری سے زیادہ ان کی پاکبازی کا چرچا تھا۔ لوگ انہیں صاحب کشف و کرامات سمجھتے تھے۔ ان میں کوئی کرامت ہو یا نہ ہو یہ کرامت ضرور تھی کہ جو ان سے ایک مرتبہ مل لیتا تھا پھر ان سے جدا نہ ہو سکتا تھا۔ ان کے عقیدت مندوں میں ہندو اور عیسائی بھی تھے اور سب ایسے خوش جیسے وہ انہی کا ہو۔

○☆○

جگر مراد آبادی پر وہ دن بہت سخت تھے۔ گردشِ زمانہ اسے اڑائے پھر رہی تھی۔ حالت، حالتِ عبرت بنی ہوئی تھی۔ شراب میں غرق، آنسوؤں میں تر۔ مختلف شہروں کی خاک چھانتا ہوا گونڈا پہنچ گیا۔ کوئی گونڈا آئے اور حضرت اصغر سے نہ ملے اور وہ تو شاعر بھی تھا۔ آنکھ والے کو سورج دیکھنا کیا مشکل۔ لوگوں نے تو بعد میں یہ بھی کہا کہ جگر خود نہیں آئے تھے، بلائے گئے تھے۔ اصغر کے روحانی تصرف نے انہیں گونڈا بلا لیا تھا۔

اصغر اپنی دکان پر بیٹھے کسی صاحب سے بحث کر رہے تھے۔ جگر اتنے فاصلے پر رک گیا کہ ان کی آواز اسے آتی رہے۔ اتفاق سے موضوع وہی تھا جس پر بات کرنے وہ یہاں آیا تھا۔ یہ اتفاق ہو سکتا تھا لیکن یہ ہرگز اتفاق نہیں تھا کہ اس گفتگو کو سن کر جو سوال جگر کے ذہن میں ابھر رہے تھے، اصغر اس شخص کو ان سوالوں کے جواب دیتے رہے۔ جگر کے ہر سوال کا جواب مل رہا تھا اور اس طرح کہ اصغر کو معلوم بھی نہیں ہو پایا تھا کہ کوئی سن رہا ہے۔

جگر نے ابھی ملاقات بھی نہیں کی تھی کہ اصغر کی روحانیت کا قائل ہو گیا۔

ان صاحب کے جاتے ہی وہ اصغر کے سامنے پہنچ گیا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ جگر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ کبھی ان کے قدموں پر پیشانی رگڑتا تھا، کبھی ہاتھ چومتا تھا۔

"میں رند ہوں۔ شراب مجھ سے نہیں چھوٹتی۔"

"ہر چیز کا وقت مقرر ہے۔"

"وقت کب آئے گا؟"

"انتظار کرو۔"

"کربِ انتظار میں ہوں۔"

"یہی راہِ نجات ہے۔"

"میں قابلِ نفرت ہوں۔"

"تم کیا ہو، تمہیں کیا معلوم۔"

جگر کو حیرت ہو رہی تھی کہ کتنا اعلیٰ ظرف ہے یہ شخص۔ مجھ سے اس طرح مل رہا ہے جیسے میں خزانہ، یہ ضرورت مند ہے۔ نہ غرور نہ اعلانِ پارسائی۔

غزل

زاہد نے مرا حاصل ایماں نہیں دیکھا
رخ پر تری زلفوں کو پریشاں نہیں دیکھا
آئے تھے سبھی طرح کے جلوے مرے آگے
میں نے مگر اے دیدۂ حیراں نہیں دیکھا
اس طرح زمانہ کبھی ہوتا نہ پُر آشوب
فتنوں نے ترا گوشۂ داماں نہیں دیکھا
رودادِ چمن سنتا ہوں اس طرح قفس میں
جیسے کبھی آنکھوں سے گلستاں نہیں دیکھا
کیا کیا ہوا ہنگامِ جنوں یہ نہیں معلوم
کچھ ہوش جو آیا تو گریباں نہیں دیکھا
شائستہ صحبت کوئی ان میں نہیں اصغر
ہندو نہیں دیکھے کہ مسلماں نہیں دیکھا

غزل

ترے جلووں کے آگے ہمتِ شرح و بیاں رکھ دی
زبانِ بے نگاہ رکھ دی نگاہِ بے زباں رکھ دی
مٹی جاتی تھی بلبل جلوہ گل ہائے رنگیں پر
چھپا کر کس نے ان پردوں میں برقِ آشیاں رکھ دی
نیازِ عشق کو سمجھا ہے کیا اے واعظِ ناداں
ہزاروں بن گئے کعبے جبیں میں نے جہاں رکھ دی
کرشمے حسن کے پنہاں تھے شاید رقصِ بسمل کے
بہت کچھ سوچ کر ظالم نے تیغِ خوں فشاں رکھ دی
الٰہی کیا کیا تو نے کہ عالم میں تلاطم ہے
غضب کی ایک مشتِ خاک زیرِ آسماں رکھ دی

ایک مرتبہ پھر اصغر نے قیمت دیے بغیر اسے خرید لیا۔ ایک مرتبہ پھر وہ اصغر کی روحانیت کا قائل ہو گیا۔

"چلو گھر چلتے ہیں۔ سفر سے آئے ہو، تھک گئے ہو گے۔ کچھ دیر آرام کرلو، پھر باتیں ہوں گی۔"

عجیب پشیمانی کا عالم تھا۔ کیا میں ان کے گھر کے پاک بستروں پر بیٹھنے کا اہل ہوں؟ گھر جاؤں گا تو یہ کھانا بھی کھلائیں گے۔ ان کے برتنوں کو ہاتھ لگانے کا میں اہل ہوں۔ یہ تو مروت میں سب کچھ کر رہے ہیں لیکن میں تو مجبور نہیں۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" اصغر نے کہا پھر خود ہی جواب دیا "سوچتے ہو گے جگر کی رندی اور اصغر کی پارسائی کیسے یک جا

ہو گئی۔ بھائی، یک جائی تو روحوں کی ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے تمہاری روح پارسا ہو۔"

گھر پہنچ کر انہوں نے جگر کی ایسی خدمت کی، ایسا خیال رکھا کہ جگر ان کے حسنِ اخلاق کے ہاتھوں بے دام بک گیا۔ وہ عمر میں بھی ان سے چھوٹا تھا، رتبے میں بھی، شاعرانہ مرتبہ بھی ان ہی کا بلند تھا لیکن وہ اس خوش دلی سے اس کی دیکھ بھال کر رہے تھے کہ جگر کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"اگر چھوڑی نہیں ہے تو پی لو۔ یہ خیال مت کرنا کہ یہ اصغر کا گھر ہے۔ اصغر خود بھی اس مصیبت کا شکار رہا ہے۔"

جگر پریشان ہو گیا تھا۔ ایسی عاجزی! ایسا انکسار! وہ جواب کیا دیتا بس اصغر کی صورت تک رہا تھا پھر یہ صورت بھی تکی نہیں گئی۔ آنکھیں جھکیں تو جھکی ہی رہ گئیں۔ میں مرشد کی تلاش میں نکلا تھا۔ مرشد تو میرے سامنے بیٹھے ہیں۔

"مجھے سنبھالو۔ مجھے اپنے دامن میں پناہ دے دو۔ میرا ہاتھ تھام لو۔"

اصغر کچھ دیر اس کی بدلتی ہوئی حالت کو دیکھتے رہے پھر اس سے مخاطب ہوئے۔

"میرے مرشد عبدالغنی منگلوری ہیں۔ ان کے در پر جاؤ، وہ تمہاری رہنمائی کریں گے۔"

وہ ضد کرتا رہا لیکن اصغر نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ عبدالغنی منگلوری کے پاس جائے۔

جگر اسی وقت روانہ ہو گیا۔

کئی مہینے گزر گئے۔ اس کی کوئی خیر خبر نہیں تھی۔ اصغر کو صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ اس نے منگلور پہنچ کر عبدالغنی منگلوری سے بیعت کر لی اور پھر کسی طرف نکل گیا۔ کسی نے کہا ہم نے اسے مین پوری میں دیکھا۔ کوئی کہتا بدایوں میں نظر آیا تھا۔ اصغر مسکرا کر کہتا "وہ کہیں جائے، لوٹ کر یہیں آئے گا۔"

یادوں کے ہجوم میں، احباب کی بھیڑ میں، خود سے غافل، زمانے سے بے خبر، ایک شہر سے دوسرے شہر میں گھومتے پھرتے جب دل بھر گیا تو پھر گونڈا آ گیا۔

بساط خانے کی دکان پر احباب جمع تھے۔ کسی نے نگاہ اٹھائی تو اپنے آپ سے بے خبر جھومتا جھامتا، نشے میں ڈولتا جگر چلا آ رہا ہے۔

"لو، وہ آ گئے۔"

وہ مؤدب، سر جھکائے بیٹھا تھا اور اصغر کبھی مسکرا کر کبھی ڈانٹ کر اسے نصیحت کر رہے تھے۔

"تم تو بیعت ہونے گئے تھے۔ یہ کیا حال بنا رکھا ہے؟"

"میں نے بیعت کر لی تھی۔ توبہ بھی کر لی تھی لیکن دوستوں نے مجبور کر دیا۔ اب آپ ہی بتائیے، میں مرشد کے سامنے کس منہ سے جاتا۔ پہلے یہ فکر تھی کہ اللہ کو کیا منہ دکھاؤں گا، اب یہ فکر ہے کہ مرشد کے سامنے کیسے جاؤں گا۔"

وہ خود بھی رویا اصغر کو بھی رلایا۔ کچھ دل ہلکا ہوا تو اٹھ کر کھڑا ہو گیا جیسے کسی مہم پر جانے کی تیاری ہو۔

"اب کہاں چلے۔"

"دل گھبراتا ہے۔"

"جاؤ مگر ہم نے کچھ اور سوچا ہے۔" اصغر نے کہا۔

انہوں نے یہ سوچا تھا کہ اگر جگر کی شادی کرا دی جائے تو اس کے مزاج میں ٹھہراؤ آ جائے گا۔ اس کی آوارگی ختم ہو جائے گی۔ اکثر بزرگ یہی سوچتے ہیں۔ انہوں نے بھی یہی علاج سوچا۔

ان کی دوسری بیوی چھٹن کی بہن نسیم تھی جس کی اب تک شادی نہیں ہوئی تھی۔ اصغر کا خیال تھا، نسیم کی شادی جگر سے کرا دی جائے۔ اس طرح جگر کا گھر بھی بس جائے گا اور وہ ان کی نگرانی میں بھی رہے گا۔

دراصل اصغر اور جگر میں کئی باتیں مشترک تھیں۔ دونوں شاہد و شراب کے خوگر رہ چکے تھے۔ دونوں شعر و شاعری کے دلدادہ اور سب سے بڑھ کر دونوں محبت کے بھوکے، خلوص کے پیکر، انسان دوست اور اعلیٰ اقدار کے قدرداں تھے۔ اس طبعی مناسبت نے دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت پیدا کر دی۔ اصغر نے بجا طور پر چاہا کہ یہ دوستی رشتے داری میں تبدیل ہو جائے۔

جگر کی شادی میں سب سے بڑی رکاوٹ اس کی رندی اور آوارگی تھی۔

اصغر نے اپنی سسرال والوں سے بات کی۔ ان کی توقع کے مطابق سخت مخالفت ہوئی لیکن انہوں نے کسی نہ کسی طرح سب کو تیار کر ہی لیا۔

اب انہیں جگر کا انتظار تھا کہ دیکھو وہ کب پھیرا لگاتا ہے۔ ایک دن ایک تانگے والا اسے اصغر کے گھر چھوڑ کر چلا گیا۔

"میں تمہارے لیے کیا کیا جتن کر رہا ہوں اور تم ہو کہ اپنی حرکتوں سے باز ہی نہیں آتے۔" جگر حسبِ معمول سر جھکائے بیٹھے تھے "میں نے تمہارا رشتہ طے کر دیا ہے۔"

"اچھا!" جگر نے کہا۔

"کیا اچھا، تم تیار بھی ہو یا نہیں؟"

"آپ کیا کہتے ہیں؟"

"میں تو یہی بہتر سمجھتا ہوں۔"
"جیسا حکم۔"
"تمہیں اپنی عادتیں بدلنی ہوں گی۔"
"ٹھیک ہے۔"
"شراب پیتے رہے تو گھر نہیں چلے گا۔"
"چھوڑ دوں گا۔"

ان عہد و پیمان کے بعد جگر کی شادی ہو گئی اور وہ نسیم کے ساتھ اصغر کے پاس ہی رہنے لگا۔

اصغر کی دکان بس برائے نام ہی چل رہی تھی۔ انہیں وہ کاروباری گُر آتے ہی نہیں تھے جن سے دکان چمک اٹھتی۔ روایتی دکانداری کے جو گُر ہیں اور گاہکوں کی نفسیات کا جائزہ لے کر، ان کو جس طرح خریداری پر مائل کیا جاتا ہے، یہ دروغ بیانی اصغر کے بس کی بات نہ تھی۔ اس لیے ان کی دکان میں گھاٹے کے سوا رکھا ہی کیا تھا۔ مال آہستہ آہستہ کم ہونے لگا تھا اور احباب کی بھیڑ بڑھنے لگی تھی۔

اصغر کسی نہ کسی طرح یہ نقصان برداشت کر رہے تھے لیکن جب نقصان اٹھانے کو بھی کچھ نہیں رہا تو انہیں خاندان کی کفالت کی فکر ہونے لگی۔

جگر کو عینک کے کاروبار کا خاصا تجربہ تھا۔ ان کے مشورے اور تحریک سے اصغر نے عینکوں کا کارخانہ قائم کیا اور جگر بطور ایجنٹ کام کرنے لگے۔

شادی کے بعد کچھ دن تو یہ معلوم ہوا جیسے وہ بدل گیا ہے لیکن جلد ہی اپنی دنیا میں واپس لوٹ گیا۔ کئی کئی دن گھر سے غائب رہنا اس کا معمول بن گیا۔ جو کچھ کماتا، پیمانے میں غرق کر دیتا۔ وہ روتا بھی تھا، دعائیں بھی مانگتا تھا لیکن اسے خود پر اختیار نہیں تھا۔ وہ خود پر قابو پا بھی لیتا تو اس کے دوست اسے مجبور کر دیتے۔

جگر کی رندی اور سیاحت نے نسیم کو پریشان کر دیا تھا۔ وہ جب گونڈا سے نکلتا تو کئی کئی مہینے گھر کی خبر نہ لیتا اور جب گھر میں داخل ہوتا تو ظالم شراب ہے ارے ظالم شراب ہے کی مکمل تصویر بنا ہوتا۔

نسیم اپنا دکھڑا بہن کے سامنے روتی۔ وہ اصغر سے کہتیں۔ اصغر اپنے آپ کو مجرم سمجھنے لگے تھے۔ وہ سمجھ رہے تھے، شادی کے بعد جگر شراب چھوڑ دے گا لیکن جگر نے انہیں مایوس کر دیا۔

ہوتے ہوتے یہ ہوا کہ نسیم نے جگر کے برتن الگ کر دیے۔ اس کا بستر الگ ہو گیا۔ اسے پھر بھی شکایت نہیں تھی بلکہ الٹا یہ کہتا تھا کہ میں ہوں اسی قابل۔ میرے ساتھ

"انتخاب"

سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا
جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں تھا

چمن میں چھیڑتی ہے کس مزے سے غنچہ و گل کو
مگر موجِ صبا کی پاک دامانی نہیں جاتی

بارِ الم اٹھایا، رنگِ نشاط دیکھا
آئے نہیں ہیں یونہی انداز بے حسی کے

دل ہی لیا ہے داغِ عشق کھو کے بہارِ زندگی
اک گلِ تر کے واسطے میں نے چمن لٹا دیا

یہی سلوک ہونا چاہیے۔

یہ کشیدگی اتنی بڑھی کہ نباہ کا کوئی راستہ باقی نہیں رہا۔ نسیم اب صرف اسی شرط پر جگر کے ساتھ رہنے پر تیار تھیں کہ وہ شراب چھوڑ دیں اور یہ ممکن نہیں تھا۔

اصغر نے نسیم کو بھی سمجھایا، جگر کو بھی لیکن بے سود۔ نوبت یہ پہنچی کہ نسیم کے کہنے پر اصغر نے جگر کو حکم دیا کہ وہ نسیم کو طلاق دے دے۔ وہاں وہی جواب تھا کہ اچھا۔

جگر نے نسیم کو طلاق دے دی اور ایک ناقابلِ بیان آوارگی کے لیے گونڈا سے نکل گیا۔

○☆○

اصغر کی فطرت نمود و نمائش سے خالی تھی اور یہ صفت اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ بعض اوقات الجھن ہونے لگتی تھی۔ اول تو وہ مشاعروں میں جانے ہی سے گریز کرتے تھے لیکن جب پکڑ دھکڑ ہوتی اور مجبوراً مشاعرے میں پہنچ جاتے تو اپنی غزل کسی شاعر کو پکڑا دیتے اور خود ڈائس کے پیچھے یا کسی اور چیز کی آڑ لے کر بیٹھ جاتے لیکن جلد ہی راز کھل جاتا اور انہیں مجبوراً اپنا کلام خود پڑھنا پڑتا۔

مسلم بورڈنگ ہاؤس الہ آباد میں مشاعرہ تھا۔ اصغر بادلِ ناخواستہ تیار ہو گئے لیکن محفل میں آ کر ڈائس کے پیچھے ایک بینچ پر بے پروائی سے بیٹھ گئے۔ جب ان کی باری آئی، غزل حفیظ جالندھری کو پکڑا دی۔ انہوں نے مطلع پڑھا۔

وہ نغمۂ بلبلِ رنگیں تو اک بار ہو جائے
کلی کی آنکھ کھل جائے چمن بیدار ہو جائے

اک شورِ تحسین و آفریں بلند ہوا تو حفیظ جالندھری نے

اس داد کو جو انہیں مخاطب کر کے دی جا رہی تھی، دونوں ہاتھوں سے سمیٹ کر اصغر صاحب کی طرف پھینکنا شروع کیا۔ لوگوں پر کھل گیا کہ وہ تشریف فرما ہیں۔ اصرار ہونے لگا کہ وہ خود آ کر پڑھیں۔ کشاں کشاں لائے گئے۔ چہرے پر خفیف سا تبسم لیے کچھ دیر بیٹھے رہے پھر غزل مکمل کی۔

نظر وہ ہے جو اس کون و مکاں سے پار ہوجائے
مگر جب روئے تاباں پر پڑے بے کار ہوجائے
تم اس کافر کا ذوقِ بندگی اب پوچھتے کیا ہو
جسے طاقِ حرم بھی ابروئے خمدار ہوجائے
سحر لائے گی کیا پیغام بیداری شبستاں میں
نقابِ رخ الٹ دو خود سحر بیدار ہوجائے
نظر اس حسن پر ٹھہرے تو آخر کس طرح ٹھہرے
کبھی خود پھول بن جائے کبھی رخسار ہوجائے

داد و تحسین کا شور بلند ہوتا رہا۔ وہ خفیف سا تبسم لیے بیٹھے رہے۔ کبھی کبھی تسلیم کر لیتے مگر اس میں بھی ایک شرم کا انداز تھا۔

ایک اسی مشاعرے پر منحصر نہیں۔ وہ اتنے خوش فکر شاعر تھے کہ جس مشاعرے میں جاتے مشاعرہ لوٹ لیتے لیکن مشاعروں سے دامن بچاتے رہتے جبکہ یہ مشاعرے آمدنی کا ذریعہ بھی تھے۔

یہی حال صاحبِ ثروت اور اجنبی لوگوں سے ملنے کا تھا۔ ان کے ایک دوست نے ایک مشہور یورپین فاضل ڈیوہرسٹ کو جو گونڈا میں ڈسٹرکٹ سیشن جج تھے، ان کی کچھ غزلیں سنائیں، وہ سن کر جھوم گئے اور اصرار کیا کہ وہ اصغر کو ان کے پاس لے کر آئیں۔ اس دوست نے اصغر سے کہا لیکن وہ ٹال گئے بلکہ جب بھی کہا وہ کسی نہ کسی بہانے ٹال دیتے۔ ایک مرتبہ کہا بھی تو یہ کہ بھئی، کچھ غزلیں انہیں اور سنا دو۔ کوئی میرے سامنے میری تعریف کرے مجھے اچھا نہیں لگتا۔

اس افتادِ طبع کا شاعر کبھی مشہور نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ اس میں غیر معمولی صلاحیتیں نہ ہوں۔ اصغر نام و نمود سے بھاگتے تھے لیکن وہ ایسی غزلیں لکھ رہے تھے جو منفرد تھیں۔ یہ غزلیں جب ادبی پرچوں میں شائع ہوتی تھیں تو لوگوں کو اصغر سے ملنے اور انہیں دیکھنے کا اشتیاق ہوتا تھا۔

ان کی غزلیں صرف اہلِ دل ہی کے لیے نہیں اہلِ دماغ کے لیے بھی تھیں لہٰذا علمی حلقوں میں ان کے نام کی گونج سنائی دینے لگی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب وہ شبلی سے متعارف ہوئے اور انہوں نے اعظم گڑھ کا راستہ دیکھ لیا۔ اعظم گڑھ پورب کا غرناطہ و بغداد بنا ہوا تھا۔ شبلی پیرِ مغاں بنے ہوئے تھے۔ علم کے پیاسے جوق در جوق یہاں پہنچ رہے تھے۔ شبلی منزل، میخانۂ علم بنی ہوئی تھی جہاں پینے والے آتے تھے اور علومِ مشرق کے جام لنڈھائے جاتے تھے۔ شبلی سے ملاقات نے اصغر کی تربیت میں ایک اور باب کا اضافہ کر دیا۔ اصغر یہیں مولانا اقبال سہیل، مرزا احسان احمد، سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی اور مولانا عبدالماجد دریابادی جیسے اکابرین سے ملے اور ان سے اکتسابِ فیض کیا۔

ایک طرف ان اہلِ علم کی گواہی نے انہیں معتبر بنا دیا، دوسری طرف جگر کی ان سے عقیدت نے انہیں ہندوستان کے ہر شہر میں مشہور کر دیا۔ جگر جس مشاعرے میں شریک ہوتے، اپنے کلام سے پہلے اصغر کے اشعار برکت کے طور پر پڑھتے۔ اس طرح اصغر، گھر بیٹھے پورے ہندوستان کے مشاعرے پڑھتے رہے۔

اعظم گڑھ کے توسط ہی سے وہ علی گڑھ سے متعارف ہوئے اور رشید احمد صدیقی نے اس گوہر کو پلکوں سے اٹھا لیا۔

علی گڑھ محض تعلیمی ادارہ نہیں تھا، تہذیبی درس گاہ بھی تھی۔ یہاں صرف طالب علم ہی امتحان پاس کرنے نہیں آتے تھے بلکہ اہلِ علم کا امتحان بھی ہوتا تھا۔ جو شاعر علی گڑھ یونیورسٹی میں اپنی جگہ بنا لیتا تھا، مقبولیت کی سند اس کے ہاتھ آ جاتی تھی۔

اصغر کی خوش قسمتی تھی کہ ہر دور میں اسے اہلِ علم کی صحبتیں میسر آتی رہی تھیں۔ اب یہی اہلِ علم اسے علی گڑھ یونیورسٹی لے کر پہنچے تھے جہاں اسے مشاعرہ پڑھنا تھا۔ ہوسٹل میں جہاں شعرا کا قیام تھا، جگر کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ اس کی شراب نوشی ان دنوں عروج پر تھی۔ یونیورسٹی کے طلبہ بقول شخصے اسے شراب سے نہلا رہے تھے۔ جگر کی نازبرداریوں میں انہیں ہرگز یہ ہوش نہیں تھا کہ اس مشاعرے میں جگر کے علاوہ کوئی اور شاعر بھی مدعو ہے۔ جگر کے ترنم میں گنگنایا جا رہا تھا۔ جگر کے چلنے پھرنے کی نقلیں اتاری جا رہی تھیں۔

کچھ طلبہ اصغر سے ملنے بھی پہنچ گئے اور یہ سوچ کر گئے کہ زاہد خشک سے ملنے جا رہے ہیں۔ عجیب حلیے اور وضع قطع کا آدمی انہیں دیکھنے کو ملے گا جو ان کی نوعمری اور شرارتوں پر فوراً کوئی تقریر شروع کر دے گا۔

ان طلبہ نے ڈرتے ڈرتے کمرے میں قدم رکھا۔ اصغر اپنے بستر پر نیم دراز کوئی رسالہ پڑھ رہے تھے۔ طلبہ کو دیکھتے ہی اٹھ کر بیٹھ گئے اور نہایت نرم مسکراہٹ سے ان کا

استقبال کیا۔ اب طلبہ نے ان کی طرف غور سے دیکھا۔ دراز قد، متوسط جسم، سر پر پٹے۔ بھری بھری فرنچ کٹ داڑھی۔ چہرے پر اُجالا، آنکھوں میں خلوص کی گہرائی اور ذہانت کی شگفتگی۔ میز پر پانوں کی ڈبیا اور نہایت قیمتی سگریٹوں کا ڈبا رکھا تھا۔

گفتگو ہوئی تو لڑکوں کو مزید حیرت ہوئی۔ وہ نہایت شستہ انگریزی بول رہے تھے۔ اردو میں بات کی تو لگتا تھا کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی زبان بول رہے ہیں۔ جن مسائل کی طرف گفتگو نکل آئی تھی اور اصغر جس خوب صورتی سے ان مسائل کے حل پیش کررہے تھے، طلبہ کے لیے بالکل نئی بات تھی۔ جدید دور کے ایک جدید صوفی کو وہ اپنے سامنے دیکھ رہے تھے۔

"اصغر صاحب معمولی قابلیت کے آدمی نہیں ہیں۔"

"انگریزی بہت اعلیٰ ہے۔"

"عربی، فارسی تو خیر جانتے ہی ہیں۔"

"شاعری کی پوری تاریخ سے واقف ہیں۔"

"شاعر بھی اچھے ہیں لیکن جگر صاحب کی بات اور ہے۔"

طلبہ کے درمیان یہ باتیں اس وقت تک ہوتی رہیں جب تک مشاعرہ شروع نہیں ہوگیا۔

مشاعرہ شروع ہونے کے بعد بھی ہر طرف سے جگر، جگر کی آوازیں آرہی تھیں۔

جب جگر پڑھ چکے اور بڑی مشکلوں سے داد و تحسین کا ہنگامہ تھم چکا تو اب کون تھا جو جم سکے۔ یوں لگتا تھا جیسے مشاعرہ ختم ہوچکا۔

ایسے میں اصغر کا نام پکارا گیا۔ وہ بڑی باوقار چال چلتے ہوئے نہایت متانت سے اسٹیج پر آئے۔ ایک نظر مجمع پر ڈالی، مجمع ابھی تک جگر کی آواز کے سحر میں کھویا ہوا تھا۔ ہلکی ہلکی باتیں ہورہی تھیں۔ انتشار کی کیفیت طاری تھی، اصغر نے مطلع پڑھا۔

صحنِ حرم نہیں ہے یہ کوئے بتاں نہیں
اب کچھ نہ پوچھیے کہ کہاں ہوں کہاں نہیں

کچھ تو یہ کہ مطلع میں کوئی خاص بات نہیں تھی، کچھ یہ کہ ابھی لوگ سننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ کسی پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اصغر نے دوسرا شعر پڑھا۔

سارا حصول عشق کی ناکامیوں میں ہے
جو عمر رائگاں ہے وہی رائگاں نہیں

اس شعر نے کام دکھایا اور شور و تحسین بلند ہوا۔ وہ سامعین کو جگر کے سحر سے آزاد کرانے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ اب انہوں نے داد و تحسین کے بے پناہ شور میں اپنی غزل مکمل کی۔

اب ہو تو سنگ و خشت سے سر کو سکون ہو
وہ آستاں نہیں تو کوئی آستاں نہیں
مدت ہوئی کہ چشمِ تحیر کو ہے سکوت
اب جنبشِ نظر میں کوئی داستاں نہیں
کسبِ حیاتِ نو، تری ہر ہر ادا سے ہے
مرنا پسند خاطرِ اربابِ جاں نہیں
تسلیم مجھ کو خانۂ کعبہ کی منزلت
سب کچھ سہی مگر وہ ترا آستاں نہیں
فطرت سنا رہی ہے ازل سے اسی طرح
لیکن ہنوز ختم مری داستاں نہیں
اب اس نگاہِ ناز سے ربطِ لطیف ہے
مجھ کو دماغِ صحبتِ روحانیاں نہیں

وہ بات تو حاصل نہیں ہوسکتی تھی جو فضا جگر کی غزل نے بنادی تھی کیونکہ جگر کی غزل، طلبہ کی ذہنی سطح کے عین مطابق تھی لیکن پھر بھی اصغر نے خوب سماں باندھا۔

احوال

"ایک روز میں حضرت اصغر گونڈوی کے پاس ان سے ملنے گیا۔ میری ٹرین ٹھیک اس وقت پہنچی جب اسٹیشن کے قریب مسجد میں اذان ہو رہی تھی چنانچہ میں نے سواری روک کر صبح کی نماز ادا کی اور اس کے بعد اصغر صاحب کے مکان کی طرف روانہ ہوگیا۔ محض اتفاقی طور پر درود شریف کا ورد کرتا ہوا ان کے مکان پر پہنچا اور دستک دی۔ جب اصغر صاحب باہر تشریف لائے تو ان پر ایک غیر معمولی کیفیت طاری تھی۔ ان کے پٹے منتشر اور چہرے پر ایک عجیب قسم کی چمک تھی جس کو بیان کرنا میرے لیے بڑا دشوار ہے۔ جلوے برس رہے تھے۔ میں اس کیفیت کو نہ سمجھ سکا۔ بات گئی گزری ہوگئی۔ بہت عرصے کے بعد میں اپنے چچا سے تصوف پر رسائل پڑھ رہا تھا تو ایک جگہ میں نے یہ پڑھا کہ اگر کوئی شخص صاحبِ دل ہے اور اس سے ملنے کے لیے کوئی شخص درود پڑھتا ہوا آئے تو ناممکن ہے کہ اس کے چہرے سے اس کے اثرات نمایاں نہ ہوں۔ میرا خیال فوراً حضرت اصغر کی طرف گیا۔ وہ بھی صاحبِ دل تھے۔"

(نواب سید شمس الحسن)

اصغر جس خاص قسم کی شاعری کا خوگر تھا' وہ خواص کے لیے لائقِ توجہ بنتی جا رہی تھی۔ اس نے غزل کو پاکیزہ و معصوم بنایا تھا۔ اس میں نزہت' لطافت اور رنگینی پیدا کی تھی۔ صوفیانہ تجربات کو جمالیات سے ہم آہنگ کیا تھا۔ اس کی غزلیں عاشقی' عبدیت' حسنِ نظر' حسنِ اخلاق' جہد و عمل اور جمال و زیبائی کی ترجمان تھیں۔

علی گڑھ یونیورسٹی کے مشاعروں میں متعارف ہونے کے بعد اس کی شہرت کو پر لگ گئے تھے۔ یوپی سے لے کر پنجاب تک اہلِ علم کا حلقہ ان کا گرویدہ تھا۔

انہی دنوں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی پنجاہ سالہ طلائی جوبلی (دسمبر ۱۹۲۵ء) کے موقع پر ایک مشاعرہ ہوا۔ اصغر کی غزل کو مشاعرے کی بہترین غزل قرار دیا گیا۔ اسے اس کے صلے میں طلائی تمغا تو خیر ملا ہی لیکن ایک اور طلائی تمغا بھی نصیب ہوا۔

اردو مرکز کے نام سے ایک ادارہ لاہور میں نیا نیا قائم ہوا تھا۔ مولانا تاجور نجیب آبادی اس کے چیف ایڈیٹر اور روحِ رواں تھے۔ اس ادارے کا مقصد مصنفین سے کتابیں لکھوا کر یا تراجم کی صورت میں اس ادارے کے تحت شائع کرنا تھا۔

مولانا تاجور' اہلِ پنجاب سے زیادہ خوش نہیں تھے اس لیے انہوں نے اس ادارے کے لیے ارکین کا انتخاب کرتے ہوئے یوپی کے ادیب و شعرا کو اہمیت دی اور انہیں نہایت اعزاز کے ساتھ لاہور لے کر آئے۔ علامہ تاجور کی نگاہِ انتخاب ایسی معمولی نہیں تھی کہ ہر ہما شا پر پڑتی۔ سیماب' جگر' فانی' یگانہ چنگیزی' روش صدیقی جیسے شعرا اس مرکز سے وابستہ ہوئے۔ علامہ تاجور بطور خاص گونڈا آئے اور اصغر کو اس اردو مرکز سے وابستہ ہونے کی دعوت دی۔

اس وقت تک وہ چشموں کا کاروبار کر رہے تھے لیکن جگر نے دلچسپی لینی چھوڑ دی تھی۔ خود ان کی دلچسپیاں کاروبار سے زیادہ اب ادب کی طرف ہو گئی تھیں لہٰذا انہوں نے علامہ تاجور کی دعوت قبول کر لی۔ کارخانہ بند کر دیا اور لاہور پہنچ گئے۔ یہاں ان کا تقرر بطور ناظم ہوا تھا۔ مقامی لوگوں میں بھی بہت سے ادیب شامل تھے جن میں سر شیخ عبدالقادر اور پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی خصوصیت کے حامل تھے۔

اصغر کا تو قاعدہ ہی یہ تھا کہ جو کام کرتے تھے' پوری دیانت داری اور دل جمعی سے کرتے تھے اور پھر یہاں جو کام ان کے سپرد تھا وہ تو ان کے حسبِ منشا تھا۔ یوپی کے بیشتر شعرا یہ معلوم ہوتا تھا جیسے یہاں مشاعرے پڑھنے یا ادبی گروہ بندیاں کرنے آئے ہیں لیکن اصغر سب سے بے نیاز اپنے کام میں مصروف تھے۔ انہوں نے بعض نہایت نادر انتخاب (شعری انتخاب) کیے۔ مقالات و مضامین لکھے' مقدمے اور دیباچے تحریر کیے۔ تمام کتابچوں کے شروع میں بیس صفحات کا تعارف نامہ شائع ہوتا تھا' یہ تعارف نامہ لکھنا بھی اصغر کی ذمّے داری تھی جو تاجور نجیب آبادی کے نام سے شائع ہوتا تھا۔

اس ادارے کے تحت شائع ہونے والی کتابوں کے لیے یہ پالیسی طے کی گئی تھی کہ ان پر مصنف کا نہیں بلکہ ادارے کا نام تحریر ہوگا۔ بعض لوگوں کو یہ طریقہ پسند نہیں آیا لیکن اصغر کو تو نام و نمود سے کوئی غرض تھی ہی نہیں لہٰذا وہ سر جھکا کر کام کرتے رہے۔

○☆○

چھٹن بیگم نے بڑے چاؤ سے اصغر سے شادی کی تھی۔ اصغر نے بھی انہیں کبھی مایوس نہیں کیا تھا۔ دونوں ایک قابلِ رشک زندگی گزار رہے تھے لیکن ایک کمی تھی کہ قدرت نے چھٹن کو اولاد سے محروم رکھا تھا۔

پہلی بیوی سے اصغر کی اولادیں تو تھیں لیکن اولادِ نرینہ کوئی نہیں تھی۔ چھٹن بیگم بھی اولاد سے محروم رہیں جبکہ اصغر کو ایک بیٹے کی شدید خواہش تھی۔ اصغر کا یہ مزاج نہیں تھا کہ بیوی کو طعنے دیتے لیکن چھٹن کو یہ دکھ گھن کی طرح کھائے جا رہا تھا کہ وہ اصغر کی خواہش پوری نہ کر سکیں۔

چھوٹی بہن نسیم کو جس بے کسی کی حالت میں طلاق ہوئی' اس کا بھی انہیں بڑا قلق تھا۔ وہ نسیم کی تباہی کا ذمے دار خود کو سمجھتی تھیں کیونکہ انہی کے ضد کرنے پر نسیم' جگر سے شادی پر رضامند ہوئی تھیں۔

ان مسائل کا حل چھٹن نے یہ سوچا کہ خود اصغر سے طلاق لے لیں اور نسیم سے ان کی شادی کرا دیں۔ اس طرح نسیم کا گھر بھی آباد ہو جائے گا اور اصغر کو اولاد بھی مل جائے گی۔ وہ تو بانجھ ہیں لیکن ممکن ہے نسیم سے اصغر کو بیٹا مل جائے۔

جگر سے طلاق ہو جانے کے بعد سے ہی چھٹن نے اس تجویز پر عمل پیرا ہونے کے لیے اصغر پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا تھا لیکن وہ تیار نہیں ہوتے تھے۔

لاہور آنے کے بعد یہ قضیہ پھر تازہ ہو گیا۔ چھٹن نے اب پھر اصرار شروع کر دیا اور اس شدّ و مدّ سے کہ اصغر پریشان ہو گئے۔

"میں اپنا گھر برباد کروں تو اولاد ملے اور وہ بھی کیا خبر ملے نہ ملے۔" اصغر نے کہا۔

"نسیم کا گھر تو آباد ہو جائے گا" چھٹن نے کہا۔
"کسی کی خاطر اپنا گھر اجاڑنا کہاں کی عقل مندی ہے؟"
"اسے آپ بہن کی خاطر میرا ایثار بھی کہہ سکتے ہیں۔"
"میں اپنی خوشی کی خاطر تمہیں برباد نہیں کر سکتا۔"
"میری بربادی کہاں سے آگئی" چھٹن نے کہا "میں تو گزار چکی، میں نے بہت عیش دیکھ لیے آپ کے گھر میں۔"
"کچھ بھی ہو، میں اس کے لیے تیار نہیں۔"
"طلاق مانگنا میرا حق ہے۔ میں خود طلاق مانگ رہی ہوں۔"
"میں طلاق نہیں دوں گا۔"
"آپ شریعت سے انحراف کریں گے؟ جب میں طلاق مانگ رہی ہوں تو آپ مجھے آزاد کردیں۔"

چھٹن کی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ وہ اصغر سے طلاق نہیں چاہتیں، بس مانگ رہی ہیں۔ ایک ایثار ہے جو وہ کرنا چاہتی ہیں۔ نسیم کی طلاق کا انہیں اتنا صدمہ تھا کہ لاشعوری طور پر خود کو بھی اسی کا حق دار سمجھنے لگی تھیں۔

اصغر جب دلیلوں اور ضد سے قائل نہیں ہوئے تو چھٹن نے خالص عورتوں والا حربہ اختیار کیا۔ انہوں نے کھانا پینا چھوڑ دیا، اصغر سے بولنا ترک کردیا اور بستر پر پڑ گئیں۔

اصغر کو اب ان کے ساتھ رہنا ان کے ساتھ ظلم معلوم ہونے لگا۔ جب وہ ساتھ نہیں رہنا چاہتیں تو ساتھ نہیں رہنا چاہیے۔

"تم اپنے والد کو لکھ دو کہ وہ نسیم کو لے کر یہاں آجائیں۔ میں تمہیں طلاق دے کر نسیم سے شادی کرنے کو تیار ہوں۔"

چھٹن نے اپنے والد کو لکھ دیا اور وہ نسیم کو لے کر لاہور آگئے۔ اصغر نے بادلِ ناخواستہ چھٹن کو طلاق دے کر نسیم سے شادی کرلی۔

○☆○

اصغر کے مزاج کا یہ پہلو نہایت شاندار تھا کہ وہ ہر دور میں طالبِ علم بنے رہے۔ جس علمی شخصیت سے ملتے اس سے کچھ سیکھتے ضرور۔ لاہور میں ایسی قد آور شخصیات کی کمی نہیں تھی۔ مولانا سالک، غلام رسول مہر اور سب سے بڑھ کر خود علامہ اقبال۔

مولانا سالک سے ان کی بڑی دوستی تھی۔ اصغر اکثر ان کے گھر جاتے اور علمی و ادبی مذاکرات میں حصہ لیتے۔

اقبال سے ملنے کی تڑپ ابتدا ہی سے ان کے دل میں تھی۔ قیامِ لاہور نے یہ مشکل آسان کردی تھی لہٰذا چند دوستوں کی موجودگی میں اقبال سے ملنے کی ہمت ہوگئی۔ اصغر اپنی اسلام دوستی کی وجہ سے اقبال کو ایک خاص اہمیت دیتے تھے۔ ملے تو نیازمندانہ ملے۔ ولی را ولی می شناسم کے تحت اقبال بھی ان سے گرم جوشی سے ملے۔ اقبال رہبانیت اور تصوف کے خلاف تھے جو انسان کو بے عملی سکھاتا ہے لیکن اصغر تو اس کے برعکس تھے۔ ان کا لباس ان کی وضع قطع، ان کی محنت و جستجو، ان کی پوری زندگی اسلامی تصوف کی روح سے عبارت تھی۔

اصغر نے بطور نذرانہ اپنی ایک فارسی غزل ان کی خدمت میں پیش کی۔ اقبال نے بے حد پسند کی۔ یہ پسندیدگی رسمی نہیں تھی بلکہ اسی زمین میں، اسی وقت خود بھی دو شعر موزوں کیے۔

چشم آدم آں سوئے افلاک نورش ہم نیافت
از خیال مہرومہ اندیشہ گرد آلود بود
من درونِ سینہ خود سومناتے ساختم
آستانِ کعبہ را دیدم جبیں فرسود بود
(اقبال)

"انہیں بھی اپنی غزل کے ساتھ رکھنا۔"

یہ پذیرائی بھی تھی اور عنایت بھی۔ اصغر نے یہ دونوں اشعار پلکوں سے اٹھائے، آنکھوں سے لگائے اور دل میں رکھ لیے۔ اقبال کی ہدایت کے مطابق اپنی غزل میں شامل بھی کیے۔

اصغر کو نہ یوپی اور پنجاب کے جھگڑوں سے غرض تھی، نہ اپنے ہم عصروں سے خود کو بہتر ثابت کرنے کی دُھن۔ معمولی سے معمولی شاعر سے بھی وہ اس طرح ملتے کہ دل میں جگہ کرلیتے لہٰذا ان کی دیانت اور شرافت سے سب ہی متاثر تھے۔

ان کے مزاج میں نظم و ضبط بہت تھا لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ کسی بات کا احساس ہی نہ ہوتا ہو۔ ایک ادارے میں اتنی نادر الوجود ہستیاں جمع ہوگئی تھیں لہٰذا چشمکیں بھی چلتی رہتی تھیں۔ سب سے پہلے تو خود تاجور صاحب ہی حشر سامانیوں کے لیے کچھ کم نہیں تھے۔ اپنی تمام تر علم دوستی اور علم پروری کے باوجود مزاج کے بہت تیز تھے۔ اپنی رائے کو ہمیشہ فوقیت دیتے تھے۔ دوسرے لفظوں حکمرانی ان کی فطرتِ ثانیہ تھی۔ بہت سے لوگ ان کی اس فطرت کی وجہ سے ادارے سے الگ ہوگئے تھے۔

اردو مرکز کی اس پالیسی کو کہ وہ افراد کی کوشش و کاوش

کو ان کے نام سے شائع کرنے کے بجائے ادارے کے نام سے شائع کرتا تھا' بعض لوگوں نے پسند نہیں کیا تھا۔ تاجور اس پالیسی کو کسی صورت بدلنے پر تیار نہیں تھے لہٰذا بعض لوگ علیحدہ بھی ہوگئے۔ اصغر نے شروع شروع اس قضیے کو اہمیت نہیں دی لیکن جب بعض نہایت معرکہ آرا مضامین ان کے قلم سے نکلے اور ادارے کے سپرد ہوگئے تو انہیں بھی احساس ہونے لگا لیکن وہ دوسروں کی طرح نہیں تھے کہ الگ ہوجاتے۔ ان کے مزاج کا آدمی آخری وقت تک نباہ کی کوشش کرتا ہے۔

یاس یگانہ چنگیزی تو لوگوں سے شوقیہ لڑا کرتے تھے۔ ان کی یہ شہرت یوپی سے پنجاب تک پھیلی ہوئی تھی۔ اصغر جیسے مذہبی آدمی سے تو ان کی چھیڑ چھاڑ ہونا یوں بھی لازمی تھی۔ اصغر کا مزاج یہاں بھی آڑے آیا۔ یہ جھگڑے تکرار تک رہے لیکن مرکز سے علیحدگی کا سبب نہ بن سکے۔

مقامی شعرا بھی بوجوہ یوپی کے شعرا سے کچھ زیادہ خوش نہیں تھے۔ اصغر اپنی شرافت اور سنجیدگی کی وجہ سے براہِ راست تو نشانہ نہیں بنے لیکن اس رویے سے شاکی ضرور تھے۔ رفتہ رفتہ وہ قیام لاہور کو تکلیف دہ تجربہ سمجھنے لگے تھے۔ لاہور سے نکلنا انہیں اس لیے گوارا نہیں تھا کہ جا کر کریں گے کیا۔ دوسرے یہ کہ لڑنا جھگڑنا انہیں آتا ہی نہیں تھا۔ یہ باتیں ان کی طبیعت کو مکدر ضرور کر رہی تھیں لیکن ابھی وقت نہیں آیا تھا۔

اردو مرکز تجارتی اغراض و مقاصد کے تحت قائم کیا گیا تھا۔ خدمتِ زبان و ادب کی حیثیت ثانوی تھی لہٰذا جب مالکانِ ادارہ نے یہ محسوس کیا کہ یہ تجارت منافع بخش نہیں ہے تو انہوں نے ہاتھ کھینچ لیا۔ کتابوں کے انبار لگ گئے تھے لیکن جو کتابیں چھپ گئی تھیں اور ان پر جو زرِ کثیر خرچ ہو رہا تھا اسی کی واپسی مشکل ہو رہی تھی' مزید کتابوں کی اشاعت کی ذمّے داری کون لیتا۔

اُردو مرکز کے مالی کفیل عطر چند کپور اینڈ سنز' لاہور نے دست کشی کرلی۔

جگر اور یاس پہلے چلے گئے۔ اصغر نے بعد میں سامان باندھا۔ وہ بھی اس یقین دہانی کے بعد کہ انہیں انڈین پریس' الہ آباد کے شعبۂ ترجمہ و تالیف میں نوکری مل جائے گی۔

گونڈا پہنچ کر "زمیندار" اخبار کا کالم "افکار و حوادث" اصغر کی نظر سے گزرا۔ یہ کالم مولانا سالک لکھتے تھے۔ پیشِ نظر کالم کسی سید محمد صدیق بجنوری کے مقالے کے جواب میں لکھا گیا تھا جو اصغر کی شاعری کے متعلق لکھا گیا تھا۔ مولانا

مولوی عبدالحق کی رائے

"حضرت اصغر' اردو کے ان چند زندہ شاعروں میں سے ہیں جنہوں نے اُردو غزل میں ایک خاص رنگ پیدا کیا ہے۔ وہ کائنات کو حکیمانہ نظر سے دیکھتے ہیں اور اسی میں ان کا تخیل اور ان کے جذبات پنہاں ہیں۔ نظر بلند اور خیال وسیع ہے۔ اسلوبِ بیان بھی پختہ ہے لیکن ان کی شاعری خواص کے لیے ہے عوام کے لیے نہیں۔"

مولانا ابوالکلام کا تاثّر

"مجھے اس اعتراف میں کوئی تامل نہیں کہ جونہی دو چار شعر نظر سے گزرے' میں چونک اٹھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وقت کی عام مایوسیاں مستثنیات سے خالی نہیں۔ میں نے ان کا مجموعہ بے دلی کے ساتھ اٹھایا تھا لیکن جب رکھا تو اس اعتراف کے ساتھ کہ اردو میں ایک شاعر موجود ہے جس کی موجودگی سے میں اس وقت تک بے خبر تھا۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اصغر کی شاعری بحث و اثبات کی محتاج نہیں ہوسکتی۔ محاسن کا حق ہے کہ ان کی شہادت دی جائے۔"

○☆○

"مرحوم (اصغر) کا ذکر چھیڑتا ہوں تو بار بار ان کا کلام سامنے آجاتا ہے۔ اور ان کے کلام کی طرف رجوع ہوتا ہوں تو اصغر صاحب جیتے جاگتے مسکراتے سامنے موجود ہوتے ہیں۔ ان کے کلام کو جسم و جاں میں منتقل کیجیے تو اصغر صاحب اور اصغر کو الفاظ و عبارت میں تحلیل کیجیے تو ان کا کلام۔"

(رشید احمد صدیقی)

○☆○

"اصغر نے شاعری میں مرصّع کاری کی ہے۔ سبک رو تجزیاتی اسلوبِ بیاں اردو کے حسین ترین الفاظ کا استعمال' ایسے نازک اور خوب صورت الفاظ جو اردو کیا کسی بھی زبان کی شاعری میں کم شاعروں کو نصیب ہوتے ہوں گے۔ الفاظ کو الفاظ سے ٹکرا کر موسیقی کی جھنکار پیدا کرنے کی تیکنیک اور ان سب پر چھایا ہوا ایک گہرا اور باوقار ترنم۔"

(ڈاکٹر عابد رضا بیدار)

سالک نے محمد صدیق کے ساتھ ساتھ اصغر کی ذات کو نشانۂ طنز بنایا تھا۔ تحریر سے یہ ظاہر ہوتا تھا جیسے اصغر اپنا مقابلہ اقبال سے کرتے ہیں۔

اصغر اپنے خلاف تحریروں کو اہمیت نہیں دیتے تھے لیکن انہیں دکھ یہ ہوا کہ یہ خیالات اس شخص کے قلم سے نکلے جس سے ان کا تعلق نیازمندانہ تھا۔ لاہور کے قیام کے دوران میں جن باتوں کو برداشت کرتے رہے تھے' ایک ایک کرکے یاد آنے لگیں۔ اصغر لاہور میں خوش نہیں تھے اور جب مولانا سالک جیسے رفیق سے ان کے جذبات کو ٹھیس لگی تو دل کا کانٹا زبان سے نکل پڑا۔ انہوں نے جوابی مضمون لکھا۔

"اس سلسلے میں علامہ اقبال کا نام نامی کئی بار آچکا اور اب اس باب میں میرا مزید سکوت ایک قسم کی تائید اور اس لیے اعانتِ جرم سے کم نہیں...... رہی علامہ اقبال کی ذات۔ اس بارے میں صرف اسی قدر عرض کرنے پر اکتفا کروں گا کہ اگر میں صحیح طور پر ان کا قدر شناس ہوسکوں اور وہ میرا شمار اپنے مداحوں اور نیازمندوں میں کرنے لگیں تو یہی چیز میرے لیے انتہائی فخرو عزت کا باعث ہوگی چہ جائے کہ موازنہ، مقابلہ استغفراللہ....لاہور کے قیام میں جو لمحے استفادے کے موصوف کی صحبت میں بسر ہوئے' انہیں حاصلِ زندگی اور معصیتِ قیام کا کفارہ سمجھتا ہوں۔"

"معصیت قیام" کہہ کر انہوں نے ادبی دنیا کو بتادیا کہ قیامِ لاہور ان کے لیے کوئی اچھا تجربہ نہیں رہا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ محض ڈیڑھ دو سال بعد ہی اردو مرکز لاہور سے انڈین پریس الہ آباد آگئے۔

بیشتر لوگ اصغر کو صرف شاعر کی حیثیت سے جانتے تھے لیکن وہ بلند پایہ نثرنگار اور ادیب بھی تھے۔ ایک دوران یہ وہ بھی آیا تھا جب وہ صحافت سے وابستہ ہوئے تھے۔ اردو مرکز کی ملازمت کے دوران میں انہوں نے کئی بلند پایہ مقالے لکھ کر اپنی نثرنگاری کے جوہر دکھائے تھے۔ انہوں نے اپنے عہد کے تمام اہم نثرنگاروں کے اسلوب کا خصوصی مطالعہ کیا تھا اور اپنے مزاج کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنا ایک منفرد اسلوب تیار کیا تھا جس میں مدلل انداز بھی تھا' سنجیدگی بھی' مزاح اور شوخی بھی۔ تنقیدی اندازِ نظر بھی اور محققانہ شان بھی۔ حالی کی سادگی بھی شبلی کا علمی وقار بھی۔

انڈین ایکسپریس کی ملازمت میں انہیں اپنے نثری جوہر دکھانے کا خوب موقع ملا۔ ان کی ذمے داریوں میں اسکول کے نصابی کورس تیار کرنا اور معلوماتِ عامہ کے کتابچے انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرنا شامل تھا۔

انہوں نے یہ انفرادیت پیدا کی کہ انگریزی سے براہِ راست ترجمے نہیں کیے بلکہ انگریزی مواد کو سامنے رکھ کر بچوں کے مذاق' دلچسپی اور نفسیات کے مطابق چھوٹے چھوٹے کتابچے تحریر کیے۔ ان کتابچوں میں مختلف ممالک کے سماجی اور معاشرتی حالات' تفریحی مشاغل اور دیگر سرگرمیاں کتابچوں کی صورت میں پیش کیں تاکہ بچے ممالک غیر کے لوگوں کے حالات سے متعارف ہوں۔ یہ سب کتابچے تحفے کے نام سے لکھے مثلاً تحفۂ لندن' تحفۂ جاپان وغیرہ۔

جب وہ کئی سلسلے تحریر کرچکے تو ان کے ایک دوست نے ان سے اس کی وضاحت چاہی کہ ان کی ہر کتاب "تحفہ" سے کیوں شروع ہورہی ہے۔

"چونکہ مجھے تحفۂ اثنائے عشریہ' شاہ عبدالعزیز سے بہت فیض ملا ہے۔ اس لیے میں نے اس کے اعتراف و تشکر میں اس سلسلۂ معلومات کے نام بھی "تحفہ" سے شروع کرکے رکھے۔"

اصغر اصلاح پسند تھے۔ انہوں نے اس سلسلۂ تحائف سے بچوں کی اصلاح کا کام اسی طرح لینا چاہا جیسے تحفہ اثنائے عشریہ سے شاہ عبدالعزیز نے لیا ہے۔

یہ کتابچے تالیفات کا درجہ رکھتے تھے لیکن اسلوب بیان نے ان میں تصنیفات کی شان پیدا کردی۔

اصغر شعروادب کا ایک مخصوص نظریہ رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک قاری میں بلند نظری' بصیرت اور صالح ادبی ذہنیت پیدا کرنا تھا۔ اس خیال کے پیش نظر اسی ملازمت کے دوران میں انہوں نے طلبہ کے شعری ذوق کی تسکین کے لیے مثنوی گلزار نسیم کا ایک انتخاب بھی شائع کیا۔

انتخاب کوئی بھی کرسکتا ہے لیکن اس کتاب کا جو مقدمہ اصغر نے تحریر کیا وہ لاجواب تھا۔ ایک ایسے زمانے میں جبکہ اردو میں تنقید کا کوئی واضح تصور و معیار قائم نہیں ہوا تھا۔ زیادہ سے زیادہ تاثراتی اور جمالیاتی انداز کی تنقید ہورہی تھی' اصغر نے مغرب کے معیارِ تنقید کو اختیار کرتے ہوئے اجتماعی ذہنیت کے اثرات اور شاعر کی مخصوص انفرادی شخصیت کو برابر کی اہمیت دی اور یہ نظریہ پیش کیا کہ اچھا شاعر اجتماعی ذہنیت سے اثر پذیر ہونے کے باوجود اپنی انفرادی شخصیت کو برقرار رکھتا ہے۔

یہ کتاب بچوں کے لیے مرتب کی گئی تھی لیکن اس کے مقدمے میں انہوں نے جس ناقدانہ بصیرت کا مظاہرہ کیا' اسے ان کے بیشتر معاصرین نے سراہا اور اس کا اعتراف کیا۔

اسی زمانے میں انہوں نے ایک اور کتاب اردو شاعری کی ذہنی تاریخ کے عنوان سے لکھنی شروع کی۔
اس کتاب کا نقشہ ان کے ذہن میں برسوں سے ترتیب پا رہا تھا۔ اس نقشے کا اظہار انہوں نے اپنی ایک کتاب کے مقدمے میں کر بھی دیا تھا۔
"اردو شاعری اور اس کے ارتقائی مدارج کی کوئی فلسفیانہ تاریخ اگر مدون کی گئی تو یہ موضوع اپنی بحث کے لحاظ سے نہایت ہی عجیب ہوگا۔ میری مراد یہاں زبانِ اردو کی ارتقائی تاریخ سے نہیں، شعرائے اردو کے ارتقائے دماغی کی تاریخ سے ہے۔"
انڈین پریس کی ملازمت کے دوران میں جب انہیں نثر لکھنے کی طرف توجہ ہوئی تو اس نقشے کا بھی خیال آیا اور انہوں نے کتاب لکھنے کا آغاز کردیا۔
اب تک اردو کی تاریخ ہی مرتب نہیں ہوئی تھی، کجا ذہنی تاریخ۔ یہ خیال بالکل نیا تھا۔ یہ خیال اہم تھا لیکن اتنا مشکل بھی کہ اس میں کئی سال لگ سکتے تھے۔ انہوں نے اللہ کا نام لے کر کتاب کا آغاز کردیا۔
اس کتاب میں یہ دکھانا مقصود تھا کہ ماحول کے اثرات سے کس طرح قومی و اجتماعی مزاج کی تشکیل ہوتی ہے اور یہ اجتماعی ذہنیت یا روحِ عصر شاعری میں کس طرح در آتی ہے۔
یہی زمانہ تھا جب صوبہ جات متحدہ میں ورنا کیولر زبانوں کی پرداخت و نشوونما کے لیے گورنر مع اپنے وزرا کے غور کر رہے تھے آخر کار ایک ریزولیشن منظور کیا گیا جس میں جدید سائنس اور علم کی دیگر کار آمد کتابوں کو دیسی زبانوں میں ترجمے کے لیے ایک ادارے کے قیام پر زور دیا گیا۔
مختلف دفتری کارروائیوں، لیت و لعل، منظوری نامنظوری۔ غرض کئی منازل سے گزرنے کے بعد تقریباً ڈیڑھ سال کی گرما گرم بحث کے بعد مارچ ۱۹۲۷ء میں "ہندوستانی اکیڈمی" کے نام سے ایک ادارہ قائم ہوا۔
اس اکیڈمی نے یہ طے کیا کہ اردو اور ہندی زبانوں میں علیحدہ علیحدہ دو سہ ماہی رسالے شائع کیے جائیں۔
رسائل کے ایڈیٹروں کے لیے مختلف اخبارات میں اشتہار دیے گئے اور درخواستیں طلب کی گئیں۔
اصغر گونڈوی پچھلے کئی برس سے الہ آباد میں تھے جو مغربی علم و ادب کا آکسفورڈ کہلاتا تھا جہاں ہندو مسلم تہذیب کے گنگا جمنی دھارے ساتھ ساتھ بہہ رہے تھے۔ دیوتاؤں اور اہل اللہ کی سرزمین پر مولوی اور پنڈت ساتھ ساتھ جمع تھے۔ اصغر نے یہاں سے خوشہ چینی بھی کی تھی اور اس

ماخذات

اصغر گونڈوی، آثار و افکار
محمد اقبال احمد خاں
اصغر ــــ عبدالشکور

سرزمین کو بہت کچھ دیا بھی تھا۔ اپنی تحریروں اور اپنے اخلاق سے ایسی شمع روشن کی تھی جس کے پروانے بہت سے تھے۔ وہ علمی حلقوں میں ایسا اعتبار پا گئے تھے کہ انہیں اس اسامی پر منتخب ہوجانا چاہیے تھا۔ دوستوں کے مشورے سے انہوں نے بھی درخواست دے دی۔
سیکڑوں بیرونی اور مقامی امیدواروں میں الہ آباد ہی کے ایک صاحب سید حامد علی سرکوب الہ آبادی بھی تھے جو انڈین پریس الہ آباد میں اصغر کے رفیق کار رہ چکے تھے۔
گورنمنٹ کالج الہ آباد کے صدرِ شعبہ اردو پروفیسر سید ضامن علی، سرکوب الہ آبادی کے چھوٹے بھائی تھے۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ ان کے بڑے بھائی نے اس اسامی کے لیے درخواست دی ہے اور ان کے مقابلے میں اصغر گونڈوی بھی امیدوار ہیں تو انہوں نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لینا چاہا۔ وہ سب سے پہلے اسی کالج کے وائس پرنسپل قاضی خورشید احمد کے پاس گئے۔ یہ ریاضی کے استاد تھے لیکن نہایت پُرگو شاعر تھے۔ ایک نشست میں سوڈیڑھ سو اشعار کہہ لینا ان کے لیے کوئی بات ہی نہیں تھی۔ اصغر کے سخت مخالف تھے اس لیے وہ کام آسکتے تھے۔
"قاضی صاحب، کچھ سنا آپ نے؟ ہندوستانی اکیڈمی کے تحت جو رسالہ نکل رہا ہے، اس کی ایڈیٹرشپ کے لیے اصغر گونڈوی نے بھی درخواست دائر کی ہے۔"
"بھائی، یہ شخص جو نہ کرے تھوڑا ہے" قاضی صاحب نے کہا "جو شخص چار شعر کہہ کر شاعر بن سکتا ہے، وہ ایڈیٹر کیوں نہیں بن سکتا۔"
"یہ تو ہم الہ آباد والوں کے لیے بڑی تہمت بن جائے گی۔ گونڈا سے آیا ہوا ایک غیر ملکی ایڈیٹر بن رہا ہے، ایک ایسے رسالے کا جو الہ آباد سے نکلے گا" ضامن علی نے کہا۔
"یہ تو الہ آباد والوں کے سوچنے کا مقام ہے۔ ہم، تم تو درخواست دینے سے رہے کہ سرکاری ملازم ہیں لیکن اور لوگوں کو تو چاہیے۔"

"میرے برادرِ بزرگ حضرت سرکوب الہ آبادی نے بھی درخواست دے رکھی ہے۔"

"بس، پھر ٹھیک ہے۔"

"ٹھیک کیسے ہے۔ اصغر کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ قابلیت تو کچھ ہے نہیں لیکن تعلقات سے فائدہ اٹھالے گا۔"

"ارے، ہمارے تعلقات کیا کم ہیں" قاضی خورشید نے ترنگ میں آکر کہا "یہ تو الہ آباد کی عزت کا سوال ہے، میں ابھی معلوم کرتا ہوں انٹرویو بورڈ میں کون کون لوگ شامل ہیں۔ تقرر سرکوب صاحب ہی کا ہوگا۔ آپ فکر نہ کریں۔"

خورشید صاحب اور ضامن صاحب دونوں نے اپنے اپنے تعلقات سے کام لیا اور دونوں کو یہ امید ہوگئی یا دلادی گئی کہ اصغر کے مقابلے میں سید حامد علی سرکوب الہ آبادی کا تقرر عمل میں آئے گا۔

ان دونوں نے سرکوب الہ آبادی کو بھی اتنی امید دلادی کہ تقرری سے پہلے ہی مختلف محفلوں میں اپنی تقرری کا اعلان کرنے لگے۔ اس اعلان کے پیچھے اصغر کی تضحیک خاص طور پر چھپی ہوتی۔

"مجھ سے زیادہ ان حضرت کو کون جانتا ہوگا۔ میں تو ان کا رفیقِ کار رہا ہوں۔ ان کی شاعری کو بھی جانتا ہوں، ان کی علمی قابلیت کو بھی اور ان کی پیری مریدی کو بھی۔ کام میں کرتا تھا، نام ان کا ہوتا تھا۔ اب بورڈ کے سامنے پیش ہوں گے تو سارا پول کھل جائے گا۔"

اصغر کے کانوں تک بھی یہ باتیں آتی تھیں لیکن اپنی عادت کے مطابق وہ ہنس کر ٹالتے رہتے تھے۔

اصغر کی شہرت ہی ان کی سفارش تھی۔ قیصرِہند اخبار میں ان کا صحافتی تجربہ، اردو مرکز لاہور کی نوکری کے دوران میں ان کی شاندار کارکردگی، انڈین پریس کے تحت شائع ہونے والی کتابیں اور سب سے بڑی یہ شہرت کہ انہوں نے اردو غزل کو پاکیزگی اور بلند فکری کی راہ دکھائی۔ ان سے پہلے یا ان کے عصر میں کسی اور شاعر کے ہاں نظر نہیں آتی اور یہ شہرت بھی کہ وہ جس ادارے میں رہے، دیانت داری ان کا طرۂ امتیاز رہی۔ یہی ان کی سفارشات تھیں۔

وہ اس وقت شہرت کی اس منزل پر تھے کہ جس بڑی سے بڑی علمی شخصیت کی سفارش چاہتے لے آتے لیکن انہیں اپنی قابلیت و کارکردگی پر اعتماد تھا۔

وہ اپنے مجموعۂ کلام روحِ نشاط کی چند کاپیاں اور چند مسودات لے کر انٹرویو کے لیے پہنچ گئے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ سرکوب الہ آبادی کے چھوٹے بھائی ضامن علی اس رسالے کی انتظامیہ کے رکن تھے لیکن اصغر کی تقرری کو نہیں روک سکے۔

وہ اتنے اجنبی نہیں تھے کہ ان کے کام سے متعلق سوالات پوچھے جاتے۔ پوچھا بھی گیا تو یہ کہ آئندہ عزائم کیا ہیں؟ روحِ نشاط کا دوسرا ایڈیشن کب نکل رہا ہے؟ وہ جو آپ اردو شاعری کی ذہنی تاریخ کے نام سے کتاب لکھ رہے تھے، وہ کس منزل پر ہے وغیرہ وغیرہ۔

"سوچتا ہوں اپنی درخواست واپس لے لوں" اصغر نے گھر پہنچتے ہی بیوی سے کہا۔

"اے ہے کیوں۔ اتنی اچھی نوکری ہے اور پھر تنخواہ بھی اچھی خاصی ہے۔"

"صرف تنخواہ ہی تو سب کچھ نہیں ہوتی۔ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ نوکری میرے لیے پریشانی کا باعث بن جائے گی۔"

"کیوں، کیا کام بہت ہے؟"

"کام نہیں، امیدوار بہت ہیں۔ اگر میں کامیاب ہوگیا تو سب کا نزلہ مجھ پر گرے گا۔"

"آپ پر کیوں نزلہ گرے گا۔ کسی نہ کسی کو تو کامیاب ہونا ہی ہے۔"

"کوئی بھی کامیاب ہوجائے لیکن مجھے نہیں ہونا چاہیے۔"

"وہ کیوں؟"

"تم نہیں سمجھوگی۔ کچھ لوگ ابھی سے اس نوکری کو اپنا حق سمجھے ہوئے ہیں۔ وہ شرارت کیے بغیر نہیں مانیں گے۔"

"لیکن یہ بھی تو کوئی بات نہیں ہوئی کہ ان کے لیے میدان خالی کردو۔"

"کہہ تو تم بھی ٹھیک رہی ہو۔ اردو کی خدمت کا یہ موقع میں کیوں ہاتھ سے جانے دوں۔"

انہوں نے درخواست واپس نہیں لی اور نتیجے کا انتظار کرتے رہے۔

اس اسامی پر سیکڑوں درخواستوں کے جواب میں اصغر کی تقرری ہوگئی۔

اس تقرری کو سرکوب الہ آبادی نے اپنی انا کا مسئلہ بنالیا۔ ان کے ساتھ چونکہ ان کے بھائی اور قاضی خورشید بھی شامل تھے اور اصغر کی تقرری سے ان کو بھی شکست ہوئی تھی اس لیے انہوں نے بھی سرکوب کے ساتھ مل کر مجلس

اصلاح احوال

"انصاف یہ ہے کہ انہوں نے میری اصلاح میں واقعی شیخ کا سا کام کیا۔ واقعی وہ غیر محسوس شیخ تھے اور میں ان کا غیر ارادی مرید۔ اعمالِ دین کی طرف رغبت، معلومات دین میں وسعت، نظر و حوصلہ میں رفعت مجھے اصغر ہی کے طفیل ملی۔ میری بے راہ روی اور موجود احساسِ دینداری کے برزخ اصغر ہی تھے۔ میں اصغر سے نہ ملتا تو یہ تو معلوم نہیں کیا بنتا اور کیا ہوتا مگر اتنا یقینی ہے کہ یہ نہ ہوتا جو ہوں۔ پھر تو شاید میں عالمانِ ربانی کی طرف بھی نہ جھکتا۔ جس کی اب توفیق ہوگئی ہے۔

(مولانا سراج الحق)

نتیجہ کا غصہ اصغر پر اتارنا شروع کردیا۔

اس کام کے لیے باقاعدہ ایک جماعت بنائی گئی جو اصغر کی ذات اور ان کے کلام کو نکتہ چینی کا نشانہ بنائے۔ اس جماعت کے روحِ رواں ظاہر ہے یہی دو حضرات (حضرت ضامن اور قاضی خورشید) تھے۔

سب سے پہلے تو رسالے کے نام ہی کو نشانہ بنایا گیا کہ تماہی کی ترکیب غلط ہے۔

مقصد اس اعتراض کا اصغر کی ذات کو مطعون کرنا تھا کہ وہ اتنے بڑے اہلِ زبان بنے پھرتے ہیں لیکن انہیں یہ معلوم نہیں کہ یہ غلط ہے۔

یہ مطالبہ اصغر سے کرنا درست نہیں تھا کیونکہ یہ فیصلہ ان کا نہیں، بورڈ کا تھا۔

یہاں تو اصغر کو مطعون کرنا مقصود تھا اس لیے اس بحث کو خواہ مخواہ طول دیا گیا۔ اخبارات میں کئی مہینے تک رسالے کا نام اور اصغر کی قابلیت کا مضحکہ اڑایا جاتا رہا۔ آخر اصغر کو جواب دینا پڑا۔

جنوری ۱۹۳۱ء میں "ہندستانی" کا پہلا شمارہ شائع ہوا۔ جولائی کے شمارے میں اصغر نے قلم اٹھایا۔

"تماہی اصولی حیثیت سے صحیح ہو لیکن سہ ماہی کے ہوتے ہوئے اس کا استعمال ایک غیر ضروری اجتہاد ہے۔"

اس کے بعد انہوں نے اپنی پوزیشن صاف کرتے ہوئے اس نام کے انتخاب کی ذمّے داری بورڈ پر ڈالتے ہوئے لکھا۔

"اردو اور ہندی بورڈوں نے تماہی کے لفظ کو رسالے کے سرورق کے لیے قبول کرلیا۔ ان تمام حالات کے بعد ہم نہیں سمجھتے کہ تماہی کے متعلق کسی منصف مزاج شخص کو اعتراض کی گنجائش باقی رہ سکے۔"

اس وضاحت کے بعد بھی بحث کا دروازہ بند نہیں ہوا۔ کوئی مضمون کسی عنوان سے لکھا جاتا لیکن اس رسالے کا ذکر جہاں آجاتا، یہ بحث پھر سے چھڑ جاتی۔ یہ بحث کسی تعمیری مقصد کے لیے شروع ہی نہیں کی گئی تھی۔ مقصد تو شور مچانا تھا جو مچایا جا رہا تھا۔

یہ بحث پرانی ہوگئی تو بعض ذاتی اور قابلِ افسوس باتیں اخباروں کے سپرد کردیں۔ کالم کے کالم اس دعوے میں ثابت کردیے گئے کہ اصغر اور جگر کی بیویاں طوائفیں تھیں جبکہ حقیقت صرف اتنی تھی کہ ان کی ماں طوائف تھیں جن سے ایک صاحب نے شادی کرلی۔ یہ بہنیں ہرگز طوائف نہیں تھیں۔

کسی کی عزت یوں سربازار اچھالنا اخلاق سے گری ہوئی بات تھی لیکن یہ جماعت بنائی ہی اسی لیے گئی تھی کہ اصغر کے خلاف پروپیگنڈا کیا جائے۔ یہ بحث اٹھائی اسی لیے گئی تھی۔

جگر کی طلاق اور ان کی بیوی سے اصغر کی شادی کا قصہ پھر سے زندہ کیا گیا اور اس کو نئے نئے معنی پہنائے گئے جن کا مقصد یہ بتانا تھا کہ شاید اصغر کی نیت میں پہلے ہی سے کھوٹ تھا۔ وہ نسیم سے عشق کرتے تھے۔ انہوں نے جگر سے ان کی شادی کرا تو دی لیکن ان سے برداشت نہ ہوسکا اور پھر طلاق دلوادی۔ اپنی بیوی کو زبردستی طلاق دی اور سالی سے شادی کرلی۔ اس طلاق اور شادی کے پیچھے جو حقائق تھے ان کا تجزیہ کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔

اصغر ان افسانہ طرازیوں سے سخت پریشان تھے۔ اگر ان پر علمی اعتراض ہوتے تو بات سمجھ میں آتی لیکن یہ کوششیں صرف ان کی شخصیت کو مسخ کرنے کی ناپاک کوششیں تھیں۔ ان کا اصغر کے ایڈیٹر ہونے سے کیا تعلق!

جاہلوں کے جواب میں خاموشی اختیار کرنا ہی عقل مندی ہے کہ مصداق انہوں نے بھی خاموشی اختیار کی۔ وہ یوں بھی جھگڑے کے آدمی نہیں تھے اور یہاں تو وہ معترضین کی نیت سے بھی واقف تھے۔

ادبی دنیا میں بعض ایسے لوگ بھی موجود تھے جو اصغر کی طرف سے دل میں کدورت رکھتے تھے لیکن ان کے خلاف لکھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ اس جماعت نے پروپیگنڈا مہم

شروع کی تو وہ بھی ان کے ساتھ آملے۔ انہوں نے اپنے مضامین لکھے اور یوں بلاواسطہ اسی جماعت کے ہاتھ مضبوط کیے۔

یہ وہ لوگ تھے جو قدیم طرزِ شاعری کے دلدادہ اور خصوصاً لکھنوی طرز کی مخرب اخلاق غزلوں کے شائق تھے جبکہ اصغر نے ایسی شاعری پر وقتاً فوقتاً بڑی سخت تنقید کی تھی۔

اس تنقید کو وہ لوگ قطعی برداشت نہیں کر سکتے تھے جنہوں نے شاعری کو صرف زبان و بیان کے پینترے اور کرتب دکھانے تک محدود کر رکھا تھا اور خود کو ایک خاص مرکزِ شاعری یعنی لکھنؤ سے منسوب کر کے عظیم شاعر ہونے پر فخر کرتے تھے۔ لکھنؤ کے باہر کے کسی شاعر کو شاعر ماننے پر تیار ہی نہیں تھے۔

انہوں نے اصغر کے خلاف مخالفت کا محاذ تیار دیکھا تو وہ بھی میدان میں کود پڑے۔

ایک مضمون میں لکھا گیا ''اصغر خود شعر نہیں کہتے کسی سے کہلواتے ہیں.... جن اشخاص نے ان کو غزلیں کہہ کہہ کے دیں وہ خود اقرار کرتے ہیں کہ ہم نے عمداً غلط اور مہمل شعر.... کہہ کے دیے تھے۔''

کسی نے یہ تان اڑائی ''اصغر کو نہ زبان آتی ہے نہ شاعری۔ اگر وہ شعر کہہ سکتے ہیں تو دنگل میں آکر شعر کہیں۔''

''اصغر صاحب کا دیوان کشکولِ گدا ہے جو بھیک کے ٹکڑوں سے بھر دیا گیا ہے۔''

کسی نے ان کی شاعری کو محض جھاڑ پھونک کی شاعری کہہ کر نظرانداز کرنے کی کوشش کی۔ کسی نے الفاظ و بیان کی غلطیوں کے سوا ان کے کلام کو کچھ اور نہیں پایا۔

اصغر کے موافقین نے ان ہرزہ سرائیوں کا جواب دینا شروع کیا تو بات اور بڑھ گئی۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے اصغر سے بُرا اس دنیا میں کوئی شاعر نہیں ہے اور اس برائی کو روکنا ازحد ضروری ہے۔ اس کے خلاف مضامین کے انبار لگائے جا رہے تھے جن میں تعصبات کے سوا کچھ نہیں تھا۔

اصغر کا کلام، کلامِ ربانی نہیں تھا۔ اس میں غلطیاں تھیں اور بہت تھیں اور ہونی چاہیے تھیں۔ تنقید کا حق بھی سب کو ہے۔ ان کی نشاندہی جائز تھی لیکن ان غلطیوں کی وجہ سے اسے شاعر تسلیم نہ کرنا اور یہ ثابت کرنا کہ اصغر کے پردے میں کوئی اور ہے جو اسے غزلیں لکھ کر دیتا ہے، ایسی دھاندلی تھی جسے دشمنی برائے دشمنی کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

اصغر کی ایڈیٹرشپ میں نکلنے والا تماہی ہندستانی، اردو کے بہترین پرچوں میں شمار ہونے لگا تھا۔ اخبارات میں جو تبصرے اس پرچے کے بارے میں شائع ہو رہے تھے، ان کا انداز یہ تھا۔

''پچھلے سال سے.... تماہی رسالہ مولانا اصغر اور مسٹر رام چندر ٹنڈن کی ایڈیٹری میں شائع ہو رہا ہے۔ گو اس کے بعض پہلوؤں کے متعلق ملک کے ادبی حلقوں میں بہت کچھ مباحثہ ہو رہا ہے لیکن بہ حیثیت مجموعی دونوں رسالوں کا شمار بہترین پرچوں میں ہونے لگا ہے۔ ان کی کامیابی پر ہم فاضل ایڈیٹروں کو مبارک باد دیتے ہیں۔''

یہ کامیابی اپنی جگہ لیکن انہیں بدنام کرنے کی جو مہم شروع کر دی گئی تھی، اس نے ہندستان بھر میں ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا۔

اصغر پر براہِ راست حملے ہو رہے تھے لیکن اس کے باوجود انہوں نے کوئی غیر سنجیدہ اور اخلاق سے گرا ہوا رویہ اختیار نہیں کیا۔ اس کے برعکس تحمل، بردباری اور متانت کے ساتھ ان تمام طوفانوں کا مقابلہ کرتے رہے حالانکہ ایک رسالے کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ان شرانگیزیوں کا جواب دینے کے لیے ان کے پاس بہت مواقع تھے۔ انہوں نے نہ صرف خود اس کیچڑ میں پتھر پھینکنے سے گریز کیا بلکہ موافقین کو بھی روک دیا۔ موافقین تو رک گئے لیکن بعض مخالفین کو کیسے روکتے؟

○☆○

ان کا پہلا مجموعۂ کلام ''نشاطِ روح'' جب شائع ہوا تھا تو اس پر بڑی سخت تنقید کی گئی تھی۔ جب ان کے خلاف پروپیگنڈا مہم شروع ہوئی تو مخالفوں نے اس تنقید کو تنقیص کا رنگ دے کر غلطیوں کو خوب اچھالا۔ اعتراضات کی بوچھار میں کچھ اعتراضات درست بھی تھے چنانچہ نشاطِ روح کا دوسرا ایڈیشن بہتر شکل میں شائع کرنے کا خیال اصغر صاحب کے بعض مخلص دوستوں کو ہوا۔ اس کے برخلاف رشید احمد صدیقی کا خیال تھا کہ ''نشاطِ روح'' کا انتخاب شائع کیا جائے جس میں کچھ تازہ کلام بھی شائع کر دیا جائے۔

اصغر نے اپنے کلام کا جائزہ لیا تو اس کی مقدار دیکھ کر مایوس ہو گیا۔ یہ اتنا قلیل ہے، انتخاب ہونے کے بعد اس میں رہ کیا جائے گا۔ انتخاب کرے گا کون؟ انتخاب ہو بھی گیا تو دل میں یہ کھٹک ہمیشہ رہے گی کہ اس میں فلاں شعر بھی ہونا چاہیے تھا، فلاں شعر بھی۔

اس نے یہی بہتر سمجھا کہ انتخاب کے بجائے ضروری ترمیم و تنسیخ کے بعد ''نشاطِ روح'' کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا

جائے۔ وہ حریفوں کی ہرزہ سرائیوں سے توجہ ہٹانے کے لیے نشاطِ روح پر نظرثانی میں مصروف ہو گئے۔

جگر کی بیماری کی خبریں بہت دن سے آرہی تھیں۔ ایک دن وہ خود آگیا۔ کثرتِ شراب نوشی نے اس کی صحت کو تباہ کر دیا تھا۔ اب حالت بہت سنبھلی ہوئی تھی لیکن پوری طرح شفایاب نہیں ہوا تھا۔

"تمہاری غزل 'لہرا کے پی گیا' بل کھا کے پی گیا مجھ تک پہنچی۔ یہ اپنی نوعیت کی بے مثال غزل ہے۔ میں تمہیں مبارک باد دیتا ہوں" اصغر نے کہا۔

"میں نے تو اقرارِ گناہ کیا ہے۔"

"گناہ اور اتنے روشن! جگر، تمہاری توبہ قبول نہیں ہوئی لیکن اس غزل پر شکستِ توبہ ضرور معاف ہو گئی ہوگی۔"

جگر آب دیدہ ہو گیا "آپ دعا کیوں نہیں کرتے کہ مجھے اس بلا سے نجات مل جائے۔"

"اس کا بھی وقت آئے گا۔ ابھی کچھ سفر باقی ہے۔ تھک گئے ہو گے آرام کرو۔"

"آپ کے خلاف اتنے مضامین پڑھ رہا ہوں کہ آرام کا خیال ہی جاتا رہا ہے۔"

"تم تو میرے مزاج کو جانتے ہو۔ جب مجھے پروا نہیں تو تم کیوں فکر کرتے ہو؟"

"آپ کی بات اور ہے، میرے دکھوں میں تو ایک اور دکھ کا اضافہ ہو گیا ہے۔"

"مومن کے دل کو پہنچنے والی ہر تکلیف اس کے درجات کو بلند کرتی ہے۔ میں بھی صبر کر رہا ہوں، تم بھی صبر کرو۔"

اسی گفتگو کے دوران میں نشاطِ روح اور اس کے انتخاب کا ذکر نکل آیا۔

"رشید صاحب، میرے مجموعے کا انتخاب شائع کرنے پر بضد ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

"حضرت، آپ کا کلام تو خود انتخاب ہے۔ اس کا مزید انتخاب کیا ہوگا۔"

"یہ تمہارا حسنِ ظن ہے جو ایسا کہتے ہو۔"

"میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ انتخاب ہوتا ہے ابتدائی کلام کا۔ آپ نے تو کمال یہ کیا کہ ابتدائی کلام کی ہوا تک کسی کو نہیں لگنے دی۔ اپنے ہاتھوں خود ضائع کر دیا۔"

"اب تو میں دنیا سے یہی کہتا ہوں کہ وہ پوری بیاض ہی کہیں گم ہو گئی۔ جب میں نے زندگی کا وہ حصہ ہی بھلا دیا تو وہ کلام کیوں یاد رکھتا۔"

"جتنا کلام رہ گیا ہے، اب اس کا بھی انتخاب ہو تا کہ جو

حلیہ اصغر

لانبا قد، کھلتا ہوا سانولا رنگ، پٹے سر پر، چہرے پر فرنچ کٹ داڑھی، آنکھوں میں غیر معمولی چمک، لانبا کرتہ، چوڑی دار پاجامہ۔ روشن روشن، صاف۔ صاف، نکھرے نکھرے۔ گردن اور شانے میں ایک خفیف سا خم جو بقول رشید احمد صدیقی معلوم ہوتا تھا کہ نیکی اور شرافت کے بوجھ سے پیدا ہو گیا ہے۔ متانت اور وقار کے ساتھ چہرے پر ایک تبسم ذوقِ پذیرائی لیے ہوئے۔

انتخاب ہونے سے رہ جائے وہ بھی ضائع ہو جائے؟"

"مجھے اس معاملے میں ایک خطرہ اور بھی ہے۔ رشید صاحب کا خط آیا تھا۔ وہ چاہتے ہیں یا تو انتخاب میں کروں یا وہ خود کریں گے۔ بھئی، مجھے ان کے مذاقِ شعری پر اتنا اعتقاد نہیں جتنا ان کی نثر پر ہے۔ اب تمہاری رائے بھی یہی ہے کہ انتخاب شائع نہ ہو۔"

"کچھ ردّوبدل کے بعد دوسرا ایڈیشن شائع کرا دیجیے۔ یہی بہتر رہے گا۔"

"میں نے خود بھی یہی فیصلہ کر لیا تھا۔ تم بھی یہی کہتے ہو لہٰذا اب یہی کروں گا۔"

رات کا وقت ہے۔ گھر کے ایک کمرے میں جگر کا بستر لگ گیا ہے جس پر وہ لیٹا ہے۔ ابھی ابھی اصغر اس کے پاس سے اٹھ کر گئے ہیں۔ وہ جب بھی الٰہ آباد آتا ہے، اصغر کے پاس ہی ٹھہرتا ہے لیکن آج بہت بے چینی ہے۔ کچھ دیر کروٹیں بدلنے کے بعد اسے نسیم کا خیال آگیا۔ اسی گھر میں وہ بھی موجود ہے۔ اس کا خیال آتے ہی اس کی نیند اچٹ گئی۔ کروٹ پر کروٹ بدل رہا تھا لیکن نیند کا کوسوں تک پتا نہیں تھا پھر اچانک اس کی طبیعت بگڑنے لگی۔ اس کے سینے میں درد اٹھا تھا۔ وہ ہلکے ہلکے کراہ رہا تھا۔ اس احتیاط کے ساتھ کہ کہیں اصغر یا نسیم نہ سن لیں۔ خواہ مخواہ انہیں زحمت ہوگی۔

دوسرے کمرے میں اصغر اور نسیم کا بستر لگا ہوا تھا۔ نسیم بھی کروٹ پر کروٹ بدل رہی تھیں۔ اصغر بہت دیر سے ان کی یہ حالت مشاہدہ کر رہے تھے۔ آخر ان سے رہا نہیں گیا۔

"جاگ رہی ہو؟" اصغر نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"کیوں۔"

"جگر کی کراہوں کی آواز سن رہے ہو؟ اس آدمی نے اپنی زندگی تباہ کر لی موئی شراب کے پیچھے۔"

"کیا تمہیں اب بھی جگر سے ہمدردی ہے؟"
"اگر وہ شراب نہ پئیں تو ان سے اچھے آدمی کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔"
"نسیم، مجھے خوشی ہوئی کہ تم نے سچ کہہ دیا۔ اب ایک بات غور سے سنو۔"
"کہیے۔"
"اگر میں جگر سے پہلے مرجاؤں اور جگر شراب چھوڑدیں تو یہ میری وصیت ہے کہ تم ان سے شادی کرلینا۔"
اس کے بعد نہ اصغر کے پاس کچھ کہنے کو تھا نہ نسیم کے پاس۔ اب کمرے میں سناٹا تھا۔ کبھی کبھی جگر کے کراہنے کی آواز نسیم کے کانوں میں آجاتی تھی۔
اصغر نے یہ بات یونہی نہیں کہہ دی تھی۔ سال دو سال پہلے ان پر فالج کا معمولی سا حملہ ہوا تھا۔ حملہ معمولی تھا۔ جلد افاقہ ہوگیا لیکن وہ بلڈ پریشر کے مریض ہوگئے تھے۔ ان دنوں جن حالات سے وہ گزر رہے تھے، اس مرض میں اضافہ ہوگیا تھا۔ انہیں اپنی بیماری کی طرف سے فکر رہنے لگی تھی۔
صبح ہوئی۔ اصغر سوکر اٹھے۔ نماز اور وظائف سے فارغ ہونے کے بعد وہ جگر کے کمرے میں گئے۔ کمرا خالی پڑا تھا۔ جگر نہ جانے کس وقت اٹھ کر چلا گیا تھا۔ وہ ایسا ہی تھا۔ اس کے نہ آنے کی خبر ہوتی تھی نہ جانے کی۔ سرہانے رکھی میز پر ایک پرچہ رکھا تھا جس پر وہ یہ شعر لکھ کر چلا گیا تھا۔

یوں تو ہونے کو جگر اور بھی ہیں اہلِ کمال
خاص ہے حضرت اصغر سے ارادت مجھ کو

اب بھی یہ جتانے کی ضرورت ہے؟ اصغر نے اپنے آپ سے کہا اور دفتر جانے کے لیے تیار ہونے لگے۔
دفتر پہنچ کر انہوں نے کام شروع ہی کیا تھا کہ اخبار میں چھپی ایک خبر پر ان کی آنکھیں جم گئیں۔ برکات اکبر پریس الہ آباد سے ایک کتاب شائع ہوئی تھی۔ اصغر گونڈوی کی شاعری۔ یہ کون میرا خیرخواہ ہوسکتا ہے جس نے میری شاعری پر پوری کتاب لکھ ڈالی۔ جلد ہی ان پر یہ راز بھی کھل گیا۔ یہ کتاب سرکوب الہ آبادی نے مرتب کی تھی۔ اب پوری بات سمجھ میں آگئی تھی کہ یہ کتاب کس قسم کی ہوگی۔
وہ کچھ دیر تک نیرنگیِ زمانہ پر غور کرتے رہے اور پھر مسکرا کر نئے پرچے کے لیے اداریہ تحریر کرنے بیٹھ گئے۔
وہ غیراہم سے غیراہم تحریر بھی روا روی میں لکھنے کے قائل نہیں تھے۔ بہت غوروخوض کے بعد لکھتے تھے۔ اس کے باوجود بھی وہ ایک جملے کو کئی کئی بار کاٹتے تھے۔ ان کے مسودے کو پڑھنا یا صاف کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔ کاٹ کاٹ کر لکھنا ان کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی لیکن آج تو ہر جملے کو صرف کاٹ رہے تھے۔ کوئی صحیح جملہ سوجھ ہی نہیں رہا تھا۔ ان دنوں بلڈ پریشر کی وُجہ سے سگریٹ کم کردیے تھے لیکن اس وقت اضطراب ایسا تھا کہ تھوڑی دیر میں کئی سگریٹ پھونک ڈالے۔ ذہن پھر بھی حاضر نہ ہوا تو اٹھ کر ٹہلنے لگے۔
روز کے آنے والوں میں سراج الحق مچھلی شہری تھے جو ان کے شاگرد تھے، ادبی بھی روحانی بھی۔ اصغر کو اُس وقت شدت سے ان کا انتظار تھا۔
اصغر کے اضطراب نے طول نہیں کھینچا تھا کہ سراج الحق دروازے پر پڑی چق اٹھا کر اندر آگئے۔
"آؤ سراج، میں تمہارا ہی انتظار کررہا تھا۔ تم نے یہ خبر پڑھی؟" انہوں نے اخبار دکھاتے ہوئے کہا۔
"جی ہاں، پڑھ لی۔"
"یہ لوگ کیوں نہیں سمجھتے کہ میں ایک انسان بھی ہوں۔ مجھے تکلیف بھی پہنچتی ہوگی۔"
"تکلیف پہنچانے ہی کے لیے تو سب کچھ کرتے ہیں۔"
"مجھے تکلیف پہنچالیں گے لیکن بندگانِ خدا یہ کیوں نہیں سوچتے کہ ایسی چیزیں ہمیشہ رہنے والی نہیں ہوتیں۔ بھائی، اگر میرا تقرر اس عہدے پر غلط ہوا ہے تو عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائیں، ان کا گریبان پکڑیں جنہوں نے میرا تقرر کیا ہے۔"
"یہ لوگ صرف آپ کی تقرری پر غصہ نہیں اتار رہے ہیں، اس میں آپ کی شہرت کا بھی دخل ہے۔ آپ کے ساتھ جگر صاحب کا نام بھی جڑا ہوا ہے لہٰذا ان لوگوں کو ایک تیر سے دو شکار کرنے کا موقع مل گیا ہے۔"
"یہ شہرت بھی تو خداداد ہے، خدا سے لڑو" اصغر نے کہا۔ "ان لوگوں کے پاس تو ایسے کاموں کے لیے وقت بہت ہے کیونکہ انہیں کچھ کرنا نہیں ہے ورنہ میں بھی انہیں رسوا کرسکتا ہوں۔"
"آپ نے تو دوستوں کو بھی جواب لکھنے سے روک دیا ورنہ ایک جوابی کتاب ادھر سے بھی تیار ہوجاتی۔"
"پھر کیا ہوتا۔ کچھ لوگ انہیں برا کہتے کچھ ہمیں۔"
"کوئی نہیں کہتا کسی کو بُرا۔"
"ابھی انصاف سے دنیا خالی نہیں ہوئی۔ اس کتاب کو سامنے آنے دو۔ لکھنے والے لکھیں گے۔"
اصغر تعمیری تنقید سے گھبرانے والے نہیں تھے چنانچہ جب ان کے مجموعۂ کلام پر تنقید ہوئی تو انہوں نے اس تنقید کو

قبول کیا اور بڑی فراخ دلی سے اپنے شعروں میں وہ تبدیلیاں کیں جن کی طرف نشاندہی کی گئی تھی۔ ان میں اپنی اصلاح کا جذبہ تھا لیکن جہاں صرف مذاق اڑانا مقصود ہو' انہیں شاعر تسلیم نہ کرنے پر زور دیا جارہا ہو' وہاں وہ اپنی اصلاح کرنے کے بجائے دوسروں کی اصلاح کی دعا کرسکتے تھے۔

ان کا اندازہ ٹھیک تھا۔ چاند پر خاک اڑانے والوں کو اس کے سوا کچھ نہ ملا کہ خود ان کے منہ میلے ہوگئے۔ اس کتاب کے شائع ہوتے ہی "زمانہ" کانپور میں جو تبصرہ شائع ہوا اس نے دودھ کا دودھ 'پانی کا پانی کردیا۔

"قبولیت عام اور شہرت دوام خداداد چیزیں ہیں۔ اس میں کسی کا اجارہ نہیں لیکن بعض لوگوں کو دوسروں کی شہرت و نیک نامی گوارا نہیں ہوتی۔ دنیا ایسے لوگوں سے کبھی خالی تھی نہ اب ہے۔ اصغر گونڈوی کو تغزل میں جو شہرت حاصل ہے' وہ محتاج بیان نہیں لیکن بعض حضرات ان کے خلاف پروپیگنڈا کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ انہی حضرات میں سے وہ بھی ہیں جنہوں نے یہ کتاب مرتب کی ہے۔ اس کتاب سے ذاتیات کے سوا کوئی فائدہ نہیں۔"

اصغر کو یہ تبصرہ پڑھ کر تقویت حاصل ہوئی۔ اصغر کے پاس ایسے خطوط بھی آئے جنہیں پڑھ کر انہیں احساس ہوا کہ یہ کتاب وہ اثرات مرتب نہ کرسکی جو اس کے مرتبین نے سوچا ہوگا۔

مخالفین کوئی اور ہتھکنڈا اختیار کرتے لیکن سرکوب الہ آبادی کا انتقال ہوگیا اور ان کے ساتھ ہی اس ہنگامے نے بھی دم توڑ دیا۔ اصغر اپنے تحمل اور بردباری سے 'اس طوفان سے صحیح سلامت گزر گئے۔

اس طرف سے بے فکری ہوئی تو انہیں اپنی کتاب "اردو شاعری کی ذہنی تاریخ" کا مسودہ یاد آیا جو انہوں نے انڈین پریس کی ملازمت کے دوران میں لکھنا شروع کیا تھا۔ کہیں سے دبا دبایا مسودہ نکلا تو اس قابل نہیں رہا تھا کہ پڑھا جاتا۔ دن رات محنت کرکے اسے صاف کیا۔ اس مسودے میں دہلی کے زمانۂ شاعری تک کا ذکر آیا تھا۔ اب انہوں نے نہایت کاوش سے مواد جمع کرکے اودھ کی شاعری یعنی دبستان لکھنؤ پر کام کرنا شروع کیا۔ یہ ایک مشکل اور تخلیقی کام تھا کیونکہ اس قسم کی تنقید کی اب تک کوئی مثال کسی کے سامنے نہیں تھی۔ ان دنوں بس ایک ہی کام تھا کہ ہر ملنے والے کو اقتباسات سناتے تھے اور داد لیتے تھے۔ اردو' فارسی اور ہندی کے ایسے عالم معلوم ہوتے تھے جس کی معلومات وسیع' علم گہرا اور نگاہ دوررس ہے۔

ابھی یہ کتاب مکمل نہیں ہوئی تھی کہ فالج کا دوسرا حملہ ہوا اور وہ صاحب فراش ہوگئے۔

جگر در در کی خاک چھاننے کے بعد ان دنوں بھوپال میں مقیم تھا۔ یہ دور اس کی کاہلی' شہرت اور بے خبری کا دور تھا۔ قیدی کئی زنجیریں ایک ساتھ توڑ کر بھاگا۔ بھاگتے بھاگتے تھک گیا تھا اور اب بھوپال میں آرام کررہا تھا۔ کئی ایسے بے فکروں کو اکٹھا کرلیا تھا جن کے پاس وقت ہی وقت تھا۔ ان سب نے مل کر ایک عجیب وغریب ادارہ بنایا تھا جس کا نام دارالکاہلا رکھا تھا۔ اس ادارے کی رکنیت کے لیے یہ شرط تھی کہ جو جتنا بڑا کاہل ہوگا اتنی ہی اہمیت کا حامل ہوگا۔ جگر ظاہر ہے سب کاہلوں کا صدر تھا۔ اس کاہلی کے دور میں ایک جگہ پڑے رہنے اور غزلیں کہنے کے سوا کچھ کام نہیں تھا۔ کبھی کبھی اصغر کی یاد آجاتی تھی۔

کیا دن تھے جگر وہ بھی جب صحبتِ اصغر میں
مسرور طبیعت تھی مسرور مرا دل تھا

کچھ دن نہیں گزرے تھے کہ ایک غزل میں یہ شعر ہوگیا۔

تجھ سے وحشی ترے غافل نہیں ہونے پاتے
روز ہر کوئی زنجیر ہلا جاتا ہے

اچانک حضرت اصغر کی یاد کیوں آنے لگی۔ وہ چونک پڑا۔ یہ اشارے ہیں۔ مجھے حضرت اصغر کی خدمت میں حاضر ہونا چاہیے۔ وہ بھوپال سے نکلا اور الہ آباد پہنچ گیا۔ یہاں پہنچتے ہی وہ اصغر کی روحانیت کا قائل ہوگیا۔ میں یہاں آیا نہیں ہوں' مجھے بلایا گیا ہے۔ اصغر صاحب فراش ہیں۔ اس وقت مجھے ان کے پاس ہونا چاہیے تھا۔

"خوب سیاحت ہورہی ہے" اصغر نے نحیف آواز میں کہا۔

"ہوں۔"

"جگر' کچھ بولا کرو۔ دوستوں میں تو خوب چہکتے ہو۔"

جگر کیا بولتا' مؤدب آنکھیں نیچی کیے' سر جھکائے اپنے مرشد کے حضور بیٹھا تھا۔

"بلڈ پریشر کا کیا حال ہے؟" جگر نے پوچھا۔

"بلڈ پریشر اور تمہاری محبت ایک ساتھ ترقی کررہے ہیں۔"

چند باتیں کرنے میں ہی اصغر کا سانس پھولنے لگا تھا۔ اس سے اس کی گرتی ہوئی صحت کا علم ہوتا تھا۔

"آپ آرام فرمائیں" جگر نے کہا۔

"میرے آنکھ بند کرتے ہی تمہیں کسی طرف کا خیال

آگیا اور اٹھ کر چلے گئے تو میں کیا کرلوں گا؟ کبھی کبھی تو آتے ہو۔"

"اب نہیں جاؤں گا۔"

اصغر نے کچھ کہا نہیں لیکن یہ اشعار اس کی زبان سے جاری ہوگئے۔

وہ سامنے ہیں نظامِ حواس برہم ہے
نہ آرزو میں سکت ہے نہ عشق میں دم ہے
خوشا حوادثِ پیہم خوشا یہ اشکِ رواں
جو غم کے ساتھ ہو تم بھی تو غم کا کیا غم ہے
یہ ذوقِ سیر یہ دیدارِ جلوہ خورشید
بلا سے قطرۂ شبنم کی زندگی کم ہے
کسی طرح بھی تری یاد اب نہیں جاتی
یہ کیا ہے روزِ مسرت ہے یا شبِ غم ہے
کہاں زمان و مکاں پھر کہاں یہ ارض و سما
جہاں تم آئے یہ ساری بساط برہم ہے

"یہ اشعار اس وقت اس لیے نوکِ زباں پر آگئے کہ پچھلے دنوں ذرا فرصت تھی تو اپنی کچھ غزلیں صاف کرنے بیٹھ گیا تھا۔ تم اس وقت آگئے تو ان غزلوں میں سے یہ غزل ذہن میں تازہ ہوگئی۔"

جگر آنکھوں میں آنسو لیے بیٹھے تھے "بہت دنوں بعد آپ کا کلام آپ کی آواز میں سننے کو ملا۔"

"ہم تو اب بھی محروم ہیں۔ تمہارا کلام کسی پرچے میں پڑھ لیتے ہیں اور بس۔"

"میں کیا اور میرا کلام کیا۔"

"اچھا ایسا کرو جگر، ہماری کوئی غزل آج اپنے ترنم میں ہمیں سنادو۔"

جگر نے حافظے پر زور دیا اور اسے نشاطِ روح کی ایک غزل یاد آگئی۔

آنکھوں میں تیری بزمِ تماشا لیے ہوئے
جنت میں بھی ہوں جنتِ دنیا لیے ہوئے
پاسِ ادب میں جوشِ تمنا لیے ہوئے
میں بھی ہوں اک حباب میں دریا لیے ہوئے
پھر ان لبوں پہ برقِ تبسم ہوئی عیاں
سامانِ جوشِ رقصِ تمنا لیے ہوئے
صدہا تو لطفِ مے سے بھی محروم رہ گئے
تھے امتیازِ ساغر و مینا لیے ہوئے
رگ رگ میں اور کچھ نہ رہا جز خیالِ دوست
اس شوخ کو ہوں آج سراپا لیے ہوئے
اصغر ہجومِ دردِ غریبی میں اس کی یاد
آئی ہے اک طلسمِ تمنا لیے ہوئے

اس مرتبہ اصغر کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔

"شاہ عبدالغنی قدس سرہ کی طرف گئے تھے؟" اصغر نے پوچھا۔

"کیا جاؤں، شراب تو چھوٹتی ہی نہیں۔"

"تم اتنے بے اختیار کیوں ہو۔"

"آپ بھی تو میرے لیے دعا نہیں کرتے۔ آپ چاہتے ہی نہیں۔ آپ کو میری فکر ہی نہیں۔"

"ابھی وقت نہیں آیا ہے۔"

جگر نے چند روز الہ آباد میں رہ کر اصغر کی تیمارداری کی اور پھر چلا گیا۔ دراصل وہ زیادہ دن تک اصغر کے پاس رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ جس ڈھب کی زندگی گزار رہا تھا، اصغر کے پاس رہ کر نہیں گزاری جاسکتی تھی۔

○☆○

جب جناب رشید احمد صدیقی اور حامد سعید خاں کے اصرار کے باوجود انتخاب نشاط روح شائع نہ ہوسکا تو وہ دونوں اصحاب خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔

اصغر اپنی بیماری کی طرف سے فکر مند رہنے لگے تھے اس لیے انہوں نے قصد کیا کہ اپنا کلام وہ خود چھپوائیں گے۔ اس تازہ کلام کے مجموعے کا نام "روح نشاط" تجویز بھی کرلیا۔ ارادہ یہ تھا کہ اس کتاب کو دو حصوں میں شائع کیا جائے گا۔ پہلے حصے کا نام "نشاطِ روح" اور دوسرے کا "سرودِ زندگی" ہو اور کتاب کا نام نشاط روح۔ اس طرح اس کتاب میں نشاط روح (پہلا مجموعۂ کلام) اور اس کے بعد کا کلام یکجا ہوجائے گا۔ انہوں نے دوستوں کی مدد سے تازہ کلام کو یکجا کیا۔ یہ کلام اتنا ہوگیا تھا کہ ایک کتاب میں سماسکتا تھا اس لیے پرانا کلام اس میں شامل کرنے کا ارادہ ترک کردیا اور نئے مجموعے کا نام سرودِ زندگی تجویز کیا۔

وہ بلڈ پریشر سے بے حال بسترِ علالت پر پڑے ہوئے تھے اور ان کی کتاب کتابت کے مرحلے سے گزرنے کے بعد پریس میں جارہی تھی۔

فالج کا دوسرا حملہ زیادہ شدید۔ بستر سے اٹھتے اٹھتے تین چار ماہ لگ گئے۔ اس کے بعد بھی طبیعت پوری طرح بحال نہ ہوسکی۔ خون کا دباؤ کم ہونے کے بجائے مسلسل بڑھتا رہا۔ بظاہر صحت مند نظر آتے تھے لیکن بلڈ پریشر کی زیادتی نے بے حال

کردیا تھا۔
اپنی کتاب "سرودِ زندگی" انہوں نے چھاپ تو لی تھی لیکن تجارتی معاملات میں وہ اتنے ہی کورے تھے جتنا ایک شاعر ہو سکتا ہے۔ انہوں نے اس کتاب کی ایک ہزار جلدیں چھپوائی تھیں۔ بہ مشکل دو سو جلدیں دوستوں وغیرہ میں تقسیم ہو گئیں باقی آٹھ سو پڑی ہوئی تھیں۔ اصغر اپنی علالت اور اس سے بھی بڑھ کر اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے ان کی فروخت کا کوئی بندوبست نہیں کر سکتے تھے۔
"بھئی، ایک طریقہ یہ بھی تو ہوتا ہے کہ میں ان کتابوں کے لیے کسی کو اپنا ایجنٹ مقرر کردوں" انہوں نے اپنے شاگرد صغیر احمد صدیقی سے کہا۔
"ہوتا تو ہے لیکن یہ لوگ بہت تیز ہوتے ہیں۔ ان سے سودا کرتے ہوئے کسی ایسے آدمی کو بھی ساتھ رکھیے گا جو ان معاملات کو جانتا ہو۔"
"ارے بھائی، معاملات کیسے۔ یہ کتاب یہاں پڑی ہوئی ہے ایجنٹ کے حوالے کردوں گا تو لوگوں تک پہنچ تو جائے گا۔"
"آپ کو کچھ مالی فائدہ بھی تو ہونا چاہیے۔"
"وہ بھی ہو جائے گا۔"
کہنے کو تو انہوں نے کہہ دیا لیکن مالی فائدے کا انہیں اس وقت خیال تک نہیں آیا جب انہوں نے یہ کتابیں تاج کمپنی کے حوالے کیں اور اس کو دوبارہ چھاپنے کی اجازت بھی لکھ کر دے دی، یہ کہتے ہوئے کہ آپ جو مناسب سمجھیں کریں۔ میں ان معاملات میں کوئی دخل نہیں رکھتا۔
دوست یہ کہہ کر رہ گئے کہ آپ نے درست فیصلہ کیا۔ سادگی کا نتیجہ بعد میں ظاہر ہوگا۔
اصغر کی بیماری کا سلسلہ طویل سے طویل تر ہوتا چلا گیا۔ کبھی حالت خراب کبھی قدرے بہتر ہو جاتی، مکمل افاقہ نہ ہوتا تھا۔ ان کا بدن قدرے فربہی کی طرف مائل تھا جس سے دیکھنے والے کو یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ٹھیک ٹھاک ہیں۔ فالج کے دو حملے انہوں نے برداشت کرلیے تھے لیکن خون کے دباؤ میں کمی نہیں آئی تھی۔
ڈاکٹروں نے ان پر بہت سی پابندیاں عائد کردی تھیں۔ ان پابندیوں کے سہارے وہ اپنی صحت کو برقرار رکھے ہوئے تھے لیکن وہ ان پابندیوں کو ذہنی کاوشوں تک نہیں پھیلا سکتے تھے۔ لکھنے پڑھنے کا عمل اسی طرح جاری تھا۔
۱۹۳۶ء میں جب وہ چھٹیاں گزارنے گونڈا گئے ہوئے تھے، کچھ سفر کی تھکن کچھ بے احتیاطی کی وجہ سے بلڈ پریشر بہت بڑھ گیا۔ اسی حالت میں الہ آباد واپس آگئے۔ آتے ہی پھر چارپائی

پکڑلی۔

دو تین مہینے اور گزر گئے۔

کئی مہینے سے غیر ضروری گھر سے نکلنا موقوف ہو گیا تھا۔ جو احباب ملنے آجاتے تھے' ان سے باتوں میں دل بہل جاتا تھا۔ مشاعرے تو درکنار' زیادہ دیر تک گھر میں بھی جاگنے سے گریز کرتے تھے۔

اس روز طبیعت زیادہ گھبرائی تو ایک دوست سے ملنے چلے گئے۔ وہاں کچھ ایسی باتیں نکل آئیں کہ گھر آتے آتے رات کے گیارہ بج گئے۔

"نسیم آج کچھ بے چینی ہے۔ نیند نہیں آتی" اصغر نے بیوی سے کہا۔

"سونے کا وقت نکل جائے تو نیند اسی طرح اڑ جاتی ہے۔ کوشش کریں گے تو نیند آجائے گی۔"

"نہیں' آج تو کچھ اور ہی ماجرا ہے طبیعت بہت مضطرب ہے۔"

"آپ آنکھیں بند کریں اور سونے کی کوشش کریں۔"

"تم بیٹھی رہو۔ باتیں کرتی رہو۔ شاید اسی طرح کچھ دل بہلے۔"

کچھ وقت اِدھر اُدھر کی باتوں میں کٹ گیا لیکن بے چینی تھی کہ بڑھتی جارہی تھی۔

سرہانے ایک کتاب رکھی تھی' اسے اٹھا کر پڑھنا شروع کردیا۔ نسیم بھی یہ سوچ کر اپنے بستر پر چلی گئیں کہ اب وہ پڑھنے میں مصروف ہو گئے ہیں۔

گھڑی دیکھنے کا وقت کس کو تھا۔ نہ جانے رات کتنی گزر گئی تھی' کتنی رہ گئی تھی کہ وہ کسی ضرورت سے بستر سے اٹھے۔

فالج کا تیسرا حملہ ہوا۔ اس مرتبہ نشانہ قلب تھا۔ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ گھر والوں نے بہ مشکل تمام چارپائی پر لا کر لٹایا۔

کوئی تین گھنٹے نیم بے ہوشی کے عالم میں رہنے کے بعد' تین بجے صبح' ٹھیک تہجد کے وقت ان کی روح خالقِ حقیقی سے جا ملی۔

کیا جانوں میں حباب تھا یا عین بحر تھا
موجوں سے کھیلتا ہوا موجوں میں مل گیا

سہمی سہمی صبح طلوع ہوئی۔ دن چڑھا تو تدفین کا معاملہ زیرِ غور آیا۔ مختلف تجویزیں زیرِ غور تھیں کہ اصغر کے ایک شاگرد سراج الحق نے تجویز پیش کی۔

"اکبر الہ آبادی کے پہلو میں دفن کیا جائے اور مشترک لوحِ مزار پر یہ عبارت کندہ کی جائے "دو بڑے شاعر اصغر و اکبر۔"

کچھ نے اس رائے کو پسند کیا کچھ سن کر چپ ہو گئے۔ ابھی یہ بحث جاری تھی کہ اصغر کے داماد صدیق احمد گھر سے نکلے۔

"اصغر صاحب نے وصیت کی تھی کہ میرے مرنے کے بعد تم خود حضرت حکیم شاہ نعمت اللہ صاحب سجادہ نشین درگاہ حضرت شیخ محب اللہ الہ آبادی کے پاس جانا اور نہایت عاجزی سے میری آخری تمنا یہ ظاہر کرنا کہ حضرت شیخ کے احاطۂ مزار میں دفن کرنے کی اجازت دے دیجیے۔ اگر وہاں سے ناکامی ہو تو کہیں اور دفن کرنا۔"

اس واضح وصیت کے انکشاف کے بعد کسی تجویز کی گنجائش نہیں تھی۔

خواہش کے مطابق بہ آسانی اجازت مل گئی اور مرزا شاہ محب اللہ الہ آبادی کے پائنتی دفن کردیا گیا۔

میں سمجھتا تھا مجھے ان کی طلب ہے اصغر
کیا خبر تھی وہی لے لیں گے سراپا مجھ کو

اصغر کے انتقال کا دکھ ان کے ہر عقیدت مند کو ہوا لیکن جگر کا معاملہ سب سے مختلف تھا۔ زندگی بھر وہ ان کے سایۂ تربیت میں رہا تھا۔ ابھی تربیت ختم نہیں ہوئی تھی کہ سایہ اٹھ گیا۔ ایسی تیز دھوپ سے اسے کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا۔

وہ اصغر کے جنازے سے اٹھا تو شیرازن کے حضور محوِ طواف ہو گیا۔ اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ تن بدن کا ہوش نہیں تھا۔ وہ اتنی شدت سے پی رہا تھا کہ لگتا تھا دنیا کی شراب کم پڑ جائے گی۔ ہندوستان اس کے لیے صحرا بنا ہوا تھا جس میں قیس کی طرح گھومتا پھر رہا تھا۔ چلتے چلتے تھک جاتا تو شیرازن کے حضور پل دو پل کے لیے بیٹھ جاتا۔ پاؤں میں کانٹے بہت تھے' نکالنے والا کوئی نہیں تھا۔ شیرازن اس کے آبلوں پر مرہم رکھنا چاہتی تھی' اس سے شادی کی خواہش مند تھی لیکن وہ کہہ چکا تھا' ہمارا تمہارا وصول کا رشتہ نہیں۔

شیرازن اس کی طرف سے کیا مایوس ہوئی' ہر طرف سے مایوس ہو گئی۔ اس نے اپنے پیشے کو خیرباد کہا اور حج پر جانے کی تیاری کرنے لگی۔ اس خبر نے جگر کی بے قراری میں اور اضافہ کردیا۔ کیا وہ شیرازن سے بھی گیا گزرا ہو گیا۔ بلانے والے نے اسے بلالیا۔ اس کے دکھوں میں ایک دکھ کا اضافہ اور ہو گیا۔ اس نے اس دکھ کو بھی شراب میں گھول دیا۔ اس نے تو اب جیسے قسم کھالی کہ ہوش میں نہیں آئے گا۔ اسے تو

اب مایوسی کا ہوش بھی نہیں تھا لیکن احباب اس کی طرف سے مایوس ہو چلے تھے۔

وہ ہندوستان کے نہ جانے کس شہر میں تھا کہ اسے خبر ملی، شیرازن حج سے واپس آچکی ہے۔ وہ گھومتا گھامتا مین پوری آیا اور شیرازن سے ملنے چلا گیا۔ نشے میں قدم بہکے ہوئے، آنکھوں میں سرخ ڈورے، چہرے پر رت جگوں کی گرد۔

"سرکار، کیا زمانے کی طرح تم بھی ہم سے روٹھ گئیں؟"

وہ ہمیشہ کی طرح جگر کو دیکھ کر بے قرار ہو کر اس کے سامنے نہیں آگئی تھی اس لیے جگر کو خفگی کا احساس ہو رہا تھا۔

"میں اب آپ کے سامنے نہیں آسکتی۔ میں پردہ کرنے لگی ہوں۔"

"کیا ہم سے بھی؟ ہم تو محبت کرتے ہیں۔"

"محبت تو دلوں میں ہوتی ہے۔"

"ہمیں حج کے تبرکات سے بھی نہیں نوازو گی؟"

"قطعی نہیں، آپ شراب پیتے ہیں۔"

"اگر میں شراب چھوڑ دوں؟"

"پھر بے شک۔"

"میں آپ سے عہد کرتا ہوں۔"

"میں کون ہوتی ہوں۔ آپ اپنے اللہ سے عہد کیجئے۔"

"آپ کو گواہ بنا کر عہد کرتا ہوں۔"

اصغر کی دعا قبول ہوگئی۔ جگر نے شراب چھوڑ دی، اس نے کہا اور اٹھ کر چلا آیا۔

شیرازن تو یہی سمجھی ہوگی کہ ناراض ہو کر گئے ہیں، اب کبھی نہیں آئیں گے۔ اس نے اپنی آنکھوں کے گوشے میں ابھرنے والی نمی کو دوپٹے کے گوشے سے صاف کیا اور اس کی طرف سے مایوس ہوگئی۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ کہیں لالہ دھرم داس نہیں ہیں؟ میں نے انہیں سختی سے منع کردیا تھا لیکن یہ شوقین مزاج یوں ماننے والے کب ہیں۔

"جگر صاحب تشریف لائے ہیں" ملازم نے بتایا۔

"کیا! وہ پھر آئے ہیں، انہیں بٹھاؤ۔"

"وہ تشریف فرما ہو چکے ہیں" ملازم نے کہا۔

وہ دروازے سے لگ کر کھڑی ہوگئی "یا اللہ، یہ کیا بے قراری ہے۔ اب کیوں چلے آئے۔"

"میں غسل کرکے آگیا ہوں۔ شراب سے تو توبہ کر ہی چکا ہوں۔ اب تو تمہارے لائے ہوئے تبرک کو ہاتھ لگا سکتا ہوں۔"

شیرازن نے تبرک بھجوا دیا۔

"کیا اب بھی ہمارے سامنے نہیں آؤگی؟"

"یہ ضد نہ کیجئے۔ آپ میرے لیے نامحرم ہیں۔"

"اچھا شیرازن، میں اب چلتا ہوں۔"

"اب میں یہ نہیں کہہ سکتی کہ پھر آیئے گا لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ مجھے بھول جایئے گا۔"

ہندوستان بھر میں دھوم مچ گئی کہ جگر نے شراب چھوڑ دی۔ جس نے سنا ہنس کر چپ ہوگیا۔ ایسی خبریں بارہا اڑ چکی تھیں لیکن ہر مرتبہ گھبرا کے پی گیا، شرما کے پی گیا کا معاملہ ہوتا تھا۔

اس نے چودہ پندرہ سال کی عمر سے شراب پینی شروع کی تھی۔ اس کا لہو شراب بن چکا تھا۔ اعصاب کمزور ہوگئے تھے، قوت ارادی ناپید ہوگئی تھی۔ یکلخت شراب چھوڑ دینا اب اس کے لیے ممکن ہی نہیں رہا تھا۔ کسی کو یقین آتا تو کیسے آتا۔

شیرازن سے وہ اب بھی شادی کرسکتا تھا۔ اس نے تماش بینوں پر پابندی لگائی تھی، رشتوں پر نہیں اور پھر جگر! اشارہ کرتے تو وہ تیار ہو جاتی لیکن وہ اب بھی یہی کہہ رہا تھا کہ ہمارا تمہارا رشتہ وصال کا نہیں۔

جذبات کا عجیب بھنور تھا جس میں وہ گھرا ہوا تھا۔ شیرازن سے مل نہیں سکتا تھا، نسیم اب اس کی نہیں رہی تھی اور حال یہ کہ شراب چھوڑتے ہی نسیم کی یاد نے بے قرار کردیا تھا۔

اصغر کا انتقال ہو چکا تھا اور نسیم بیوگی کے دن کاٹ رہی تھیں۔ "اب نسیم آزاد ہے۔ اب تو وہ میری ہوسکتی ہے۔ اسے مجھ سے نہیں میری شراب نوشی سے شکایت تھی۔ میں نے شراب چھوڑ دی۔ جھگڑا ختم ہوگیا۔ اب کیسا اختلاف۔ میری محبت اس کے دل میں اب بھی ہوگی لیکن اب وہ میرے لیے غیر ہے۔" وہ یہاں تک سوچ کر رک گیا لیکن یہ غیریت ختم بھی تو ہوسکتی ہے۔ میں اگر نسیم سے شادی کرلوں تو غیریت ختم ہوسکتی ہے۔

اس خیال کے آتے ہی وہ گونڈا پہنچ گیا۔ گونڈا پہنچتے ہی اس کے قدم جم گئے۔ میں اس کے گھر کی طرف کیسے بڑھوں۔ یہ سوال کس طرح ہونٹوں پر لاؤں لیکن لانا تو ہوگا۔

اس نے اپنے اور اصغر کے کچھ مشترکہ دوستوں سے ذکر کیا۔

اس کی بے تابی کہیں وقتی ابال تو نہیں؟ دوستوں میں کئی دن تک یہ بحث جاری رہی لیکن جب اس کی باتوں میں

صداقت نظر آئی تو دوستوں نے اس کی خواہش نسیم کے گھر والوں تک پہنچادی۔

جگر کی توبہ کا کوئی اعتبار نہیں تھا۔ نسیم کے گھر والوں نے انکار کردیا۔

جگر برابر ضد کررہا تھا، بالآخر نسیم نے فیصلہ کن بات کہہ دی۔

"اگر جگر نے ایک سال تک شراب کو ہاتھ نہیں لگایا تو میں ان سے شادی کرلوں گی۔"

نسیم کیا، کسی کو بھی یقین نہیں تھا کہ وہ اپنی توبہ پر قائم رہے گا لیکن جگر نے ایک سال گزارلیا اور نسیم اس کے عقد میں آگئیں۔

اصغر کی دعا بھی قبول ہوگئی کہ جگر نے شراب چھوڑدی، وصیت بھی پوری ہوگئی کہ نسیم نے جگر سے شادی کرلی۔

ایک بڑا صندوق تھا جس میں اصغر کے کاغذات بھرے ہوئے تھے۔ اس میں کوئی ایسی کام کی چیز تھی نہیں اس لیے کسی نے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ جگر نے ان کاغذات کو تبرکات سمجھ کر دیکھنا شروع کیا۔ ان کاغذات میں اسے وہ مسودہ مل گیا جو اصغر نے "اردو شاعری کی ذہنی تاریخ" کے نام سے لکھنا شروع کیا تھا لیکن بیماری کی وجہ سے مکمل نہیں کرسکے تھے۔

اصغر کے دوستوں کا خیال تھا کہ یہ کتاب اگر مکمل ہوگئی تو اردو ادب کی تاریخ پر ایک نادر اور بے مثال تصنیف ہوگی۔ اب اس کا مسودہ جگر کی تحویل میں تھا۔

جگر علمی آدمی نہیں تھا اور پھر یہ مسودہ اس حد تک خستہ اور شکستہ بھی ہوچکا تھا کہ اس کا پڑھنا مشکل تھا۔

جگر ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اس مسودے کو کسے دکھائے کہ الہ آباد سے سراج الحق گونڈا پہنچ گئے۔ گویا قدرت نے انتظام کردیا۔ جگر نے یہ مسودہ انہیں دکھایا۔ انہوں نے امید دلائی کہ وہ اسے پڑھ بھی لیں گے اور صاف خط میں لکھ بھی دیں گے تاکہ اس کی اشاعت کا بندوبست ہوسکے۔

سراج الحق عربی، فارسی کے عالم تھے اور پھر اصغر کی صحبت سے فیض یافتہ تھے۔ ان کے خط کو خوب پہچانتے تھے۔ بہ ہزار دقت انہوں نے مسودے کو صاف بھی کردیا اور اس کے ابواب وغیرہ ترتیب دے کر اس حالت میں بنادیا کہ شائع ہوسکے۔

اتفاق سے الہ آباد میں ایک صاحب ایسے بھی مل گئے جو اسے شائع کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے جگر کو خط لکھا کہ وہ اس کتاب کو شائع کرنے کی اجازت مرحمت فرمادیں۔ جگر اسے خود چھاپنا چاہتے تھے اس لیے اجازت نہیں دی۔

جگر مطمئن ہوگیا کہ مسودہ سراج الحق صاحب کے پاس ہوگا۔

کچھ دنوں بعد ایک مشاعرے کے سلسلے میں جگر کا الہ آباد جانا ہوا۔ سراج الحق صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہیں وہ مسودہ یاد آگیا۔ انہوں نے مسودہ طلب کیا۔

"مسودہ تو وہ صاحب مجھ سے لے گئے جو اسے چھاپنا چاہتے ہیں" سراج الحق نے کہا۔

"میں نے اسے چھاپنے کی اجازت تو نہیں دی تھی۔"

"کوئی بات نہیں، میں ان سے واپس لے کر آپ کو روانہ کردوں گا۔"

جگر واپس آگئے۔ ان کی مصروفیات ہی ایسی تھیں کہ شراب چھوڑنے کے بعد بھی انہیں اپنا ہوش کم ہی رہتا تھا۔ مسودہ بھی ذہن سے اتر گیا۔ کبھی خیال آیا بھی تو یہی معلوم ہوا کہ مسودہ سراج صاحب کو ابھی مل نہیں سکا ہے۔ غالباً جو صاحب اسے لے گئے تھے، اسے لوٹانے میں لیت و لعل سے کام لے رہے تھے۔

عرصہ دراز کے بعد جگر کو ایک خط ملا۔ یہ خط کانپور سے پرنسپل اسلامیہ کالج کی طرف سے لکھا گیا تھا۔ خط میں اس مسودے کو چھاپنے کے لیے اجازت طلب کی گئی تھی۔

یہ مسودہ نہ جانے ان کے پاس کیسے پہنچ گیا تھا۔ اس طرح پُراسرار طریقے سے اس مسودے کے وہاں پہنچ جانے کی وجہ سے جگر کے ذہن میں اندیشوں نے سر ابھارا۔ دوسرے وہ ان صاحب کے بارے میں اچھی رائے بھی نہیں رکھتا تھا۔

جگر نے گھبرا کر اپنے دوست تسکین قریشی کو خط لکھا جو کانپور میں تھے۔

"آپ کے دوست بشیر صاحب (کوتوال کانپور) غالباً اس معاملے میں میری مدد کرسکتے ہیں۔ آپ انہیں تفصیلاً ان حالات سے مطلع کردیں۔"

تسکین قریشی نے اپنے دوست کے نام تمام حالات لکھ دیئے اور جگر کو لکھ دیا کہ وہ ان سے مل لیں لیکن جگر مل نہیں سکے اور یہ مہم کامیاب نہیں ہوسکی۔

بعد میں یہ کتاب خود بخود جگر کو مل گئی۔ غالباً جب انہوں نے اجازت نہیں دی ہوگی تو کتاب انہیں واپس کردی گئی ہوگی یا ممکن ہے بشیر صاحب کوتوال نے اپنے طور پر کوشش کی ہو۔

جگر کی لاابالی طبیعت نے کتاب واپس تو لے لی لیکن اس کی اشاعت کا کوئی بندوبست نہ ہوسکا۔

جگر کی غفلت سے ایک اعلیٰ تصنیف منظر عام پر نہ آسکی۔ آج اس کا سراغ بھی نہیں ملتا۔

❀

مولوی عبدالحق

بابائے اردو

تحریر و تحقیق، ڈاکٹر ساجد امجد

یہ ممکن نہیں کہ اردو زبان کی ترویج و ترقی کی بات ہو اور مولوی عبدالحق کا نام درمیان میں نہ آئے۔ کیونکہ تن تنہا اس راستے میں جتنا طویل اور کٹھن سفر انہوں نے طے کیا، وہ کسی اور کے بس کی بات نظر نہیں آتی۔ مولوی صاحب اردو زبان کے ان چاہنے والوں میں سے تھے جنہوں نے اپنا اوڑھنا بچھونا ہی اردو کی ترقی کو بنا لیا تھا۔ ساری زندگی اس کے سوا اور کوئی کام نہ کیا۔ بقول مولانا غلام رسول مہر "مولوی عبدالحق کے کارنامے اس درجہ بلند، گراں مایہ اور پائیدار ہیں کہ آج پاک و ہند کے آسمان کے نیچے کوئی دوسرا شخص علم و ادب اور زبان کے دائرے میں ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا" یہی امتیازی خصوصیات انہیں "بابائے اردو" کا خطاب دلا گئیں

محسن اردو، عاشق اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی سرگزشت

اٹکن بٹکن ڈھائی چکوتا
اگلے پھولے، بگلے پھولے
پھول پھول کی باڑیاں
راجا گیا دلی۔ وہاں سے لایا سات کٹوری
ایک کٹوری ٹوٹ گئی
راجا کی ماں روٹھ گئی۔

بچوں نے اس کے آنگن کے چاروں کونے اپنی آوازوں کے شور سے آباد کیے ہوئے تھے لیکن وہ خود اپنی ماں کے پہلو سے لگا بیٹھا تھا۔

"بیٹا، جاؤ تم بھی کھیل لو۔ دیکھو، سب بچے کھیل رہے ہیں" اس کی ماں کے پاس آئی ہوئی محلے کی ایک عورت نے کہا۔

اس تقاضے کا اثر یہ ہوا کہ ابھی تک تو وہ صرف بیٹھا ہوا تھا اب اس نے ماں کے دوپٹے کو بھی زور سے پکڑ لیا کہ کہیں یہ خاتون اسے زبردستی یہاں سے نہ اٹھا دیں۔

"نہیں بھئی، عبدی کو کچھ نہ کہو۔ اس کا دل کسی کھیل میں نہیں لگتا۔" اس کی ماں نے کہا۔

"بہن، لڑکا ذات ہے۔ کھیلنے کودنے سے ہاتھ پاؤں سیدھے ہوتے ہیں۔ کوئی لڑکی ہے جو تمہارے کولھے سے لگی بیٹھی رہے گی۔"

"کیا کروں بہن! اپنا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ اس کا دل نہیں لگتا کسی کھیل میں۔ مجھے تو حیرت ہے یہ مکتب کیسے چلا جاتا ہے۔"

"اسے پڑھنے میں کیسا ہے؟"

"میں کیا جانوں مگر اتنا ہے کہ مکتب پابندی سے جاتا ہے۔ گھر میں بھی کچھ نہ کچھ پڑھتا ہی رہتا ہے۔"

"چلو، اس طرف سے تو کان ٹھنڈے ہیں۔ ہمارا والا تو پڑھنے کا چور ہے۔"

"نہیں بہن! میرا عبدی پڑھنے میں بڑا تیز ہے۔"

"مری چکی میں کالا کالا دانا
چکی گھمر گھمر۔
چکی گھمر گھمر"

بچوں کی آوازیں بڑھتی ہی جا رہی تھیں لیکن وہ اب بھی ہر شور سے بے نیاز کسی سوچ میں گم تھا۔

گلیوں میں کھیلنا معیوب سمجھا جاتا تھا اور خصوصاً چراغ جلنے کے بعد اس لیے بچے گھروں میں کھیلتے تھے۔ کبھی ایک گھر میں چوکڑی جمتی کبھی دوسرے گھر میں۔ عبدالحق کی ماں ذرا نرم طبیعت کی تھیں اس لیے بچے اکثر یہیں آ کر شور مچاتے

تھے۔

اس کی ماں کو کتنا ارمان ہوتا تھا کہ وہ اپنے عبدی کو کھیلتے ہوئے دیکھے لیکن اسے کھیلوں سے کوئی رغبت ہی نہیں تھی۔

شروع شروع میں بچوں نے اسے بہت تنگ کیا۔ اسے لڑکی ہونے کے طعنے دیے لیکن اسے ان کھیلنے والوں سے کوئی واسطہ ہی نہیں تھا۔ والدین اپنے بچوں کو کھیلنے سے روکتے ہیں۔ اس کے ساتھ معاملہ اس کے برعکس تھا پھر آہستہ آہستہ وہ بھی چپ ہوگئے۔ وہ ماں کے آنچل میں چھپ کر بڑا ہونے لگا۔

اس کا نام اس کے باپ نے عبدالحق رکھا تھا لیکن وہ اپنے بھولپن کی وجہ سے عبدی بن کر رہ گیا تھا۔

○☆○

شیخ علی حسین سرکاری ملازم تھے اور میرٹھ کے قریب ہاپوڑ میں مقیم تھے۔ عبدالحق کی پیدائش بھی یہیں ہوئی تھی۔ اس خاندان میں تمام بچوں کے نام "حسن" پر رکھے جاتے تھے لیکن شیخ علی حسین کے پیرومرشد نے انہیں ہدایت کی تھی اپنے بچوں کے نام "حق" پر رکھیں چنانچہ انہوں نے بڑے بیٹے کا نام ضیاءالحق رکھا اور دوسرے بیٹے کا نام عبدالحق۔

سرکاری ملازمت کی وجہ سے شیخ علی حسین کے تبادلے ہوتے رہتے تھے۔ جب ان کا تبادلہ پنجاب ہوا تو انہوں نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ اکیلے نہ جائیں بلکہ بیوی بچوں کو بھی اپنے ساتھ ہی لے جائیں۔

"اس کا ذہن اچھا ہے۔ پنجاب میں تعلیمی ماحول ملے گا اور پھر میری نگرانی بھی رہے گی" شیخ علی حسین نے کہا۔

"سوچ لیں۔ آپ وہاں رہ بھی سکیں گے۔ میں تو کہتی ہوں یہ تبادلہ منسوخ کرالیں۔" ان کی بیوی نے کہا۔

"میں نے کوشش کی تھی لیکن عبدی کی ماں تم تو جانتی ہو نوکری آخر نوکری ہوتی ہے۔ مجھے جانا پڑے گا اور اتنی دور میں تم لوگوں کو چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔"

سب تیاری مکمل ہوگئی اور عبدالحق کو والدین کے ساتھ فیروزپور آنا پڑا۔ اس کے بعد گوجرانوالہ تبادلہ ہوگیا جہاں اس نے مشن ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا۔

اب اس کی عمر ایسی نہیں رہی تھی کہ گھر میں بند ہو کر رہے یا ماں کا آنچل تھام کر چلتا رہے۔ کم از کم اس کے والدیہ ضرور چاہتے تھے کہ وہ گھر سے باہر نکلے۔ اس کے لیے انہوں نے یہ ترکیب نکالی کہ اسے ساتھ لے کر اپنے دوستوں کے پاس جانے لگے تاکہ اس کا حجاب دور ہو اور اسے لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے کا سلیقہ آجائے۔ عبدالحق کو بھی یہ تفریح اچھی لگی۔ نئے نئے لوگوں سے سابقہ پڑنے لگا اور پھر ہر جگہ اس کی خاطر مدارات بھی ہوتی تھی۔

ایک روز وہ کسی وکیل صاحب کے دیوان خانے میں بیٹھا ہوا تھا۔ سیاست پر گفتگو ہو رہی تھی۔ کچھ دیر کی گرما گرمی کے بعد اس بحث نے ایک نیا رخ اختیار کرلیا۔ اب جو باتیں ہو رہی تھیں، وہ اس کے لیے بڑی دلچسپ تھیں۔

"جناب، وہ اب مسلمان کہاں ہے۔ وہ تو نیچری ہیں نیچری۔"

"یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ مسلمان نہیں رہے۔"

"گردن مروڑی مرغی کھاتے ہیں اور انگریزوں کے برتن میں کھاتے ہیں۔ کیا اب بھی آپ انہیں مسلمان کہیں گے۔"

"انہوں نے رسالہ لکھ کر ثابت کردیا ہے کہ انگریزوں کے ساتھ کھایا جاسکتا ہے۔"

"ان کے لکھنے سے کیا ہوتا ہے۔ ان کے کفر کے فتوے تو عرب شریف کے علما تک نے دے دیے۔ اب کیا گنجائش رہتی ہے۔"

"کچھ بھی ہو، چاہے وہ خود مسلمان نہ ہوں لیکن ان کے دل میں مسلمانوں کے لیے درد بہت ہے۔ علی گڑھ میں مدرسہ اور کالج کھولا ہے تاکہ مسلمان بچے انگریزی تعلیم حاصل کریں۔"

"یہی تو خرابی کی سب سے بڑی جڑ ہے۔ اب مسلمان بچوں کو انگریز بنایا جائے گا۔ ان کے دین میں خرابی پیدا کی جائے گی۔ غضب خدا کا! اب مسلمان بچے کوٹ پتلون پہننے لگے۔"

"کمال کرتے ہیں آپ۔ وہ مسلمانوں کی ترقی کے لیے دن رات ایک کررہا ہے اور آپ ہیں کہ اسے مسلمان ماننے کو تیار نہیں۔"

"کیسے مان لوں۔ وہ حج کرنے نہیں گئے، انگلستان چلے گئے۔ یہ ہے ان کا اسلام۔"

"وہ اگر انگلستان گئے تو وہ بھی مسلمانوں کے لیے گئے۔"

"آپ پر تو سرسید کا بھوت سوار ہے۔ آپ تو یہی کہیں گے۔"

"اس کا لوہا تو انگریز بھی مانتے ہیں۔ سنا ہے ان کے مرنے کے بعد ان کا سر انگریز لے جائیں گے کہ بھئی، اس سے عقل مند آدمی ہم نے نہیں دیکھا۔"

"مرنے کا انتظار کیوں کر رہے ہیں۔ ابھی لے جائیں۔ ہماری جان تو چھوٹے۔"

یہ بحث کبھی ختم ہونے والی نہیں تھی اس لیے جب تلخی بہت بڑھنے لگی تو صاحبِ خانہ نے مداخلت کر کے اس گفتگو کو روک دیا۔

یہ پہلا موقع تھا جب عبدالحق نے سرسید احمد خان کا نام سنا تھا۔ وہ ان کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا لیکن جو گفتگو اس نے سنی تھی، اس کے بعد اسے ان کی شخصیت میں دلچسپی ہو گئی تھی۔ وہ سوچنے لگا تھا کہ وہ ضرور کوئی عظیم شخصیت ہوگی اسی لیے اتنے لوگ اس کے خلاف ہیں۔

اس وقت ہندوستان کی قومی زندگی اس بیمار کی طرح آنکھیں جھپک رہی تھی جو موت کے منہ سے نکل آیا ہو لیکن اس نئی زندگی کو اپنے مسیحاؤں کا کمال سمجھنے کے بجائے تقدیر کا تماشا سمجھ رہا ہو۔ جنگِ آزادی کی شکست کے زخم ابھی مندمل نہیں ہوئے تھے۔ کہنے کو دو دہائیاں گزر گئی تھیں لیکن زخم اتنے گہرے تھے کہ بھرنے ہی میں نہیں آتے تھے۔ ہر وہ شخص جو انگریزوں کا دوست تھا انہیں اپنا دشمن نظر آتا تھا۔ سرسید کی انگریز دوستی نے سب کو ان کا دشمن بنا دیا تھا۔ مسلمانوں کے ہر طبقے میں سرسید کا نام موضوعِ بحث بنا ہوا تھا۔ ان کی نسبت کفر و الحاد کے فتوے عام تھے۔

ایک مرتبہ اس نے سرسید کا نام سن لیا تو بار بار یہ نام سامنے آنے لگا۔ کہیں تعریفوں کی صورت میں، کہیں برائی کی شکل میں۔ وہ اس نام کو جتنا جتنا سنتا جاتا تھا، اتنی ہی عقیدت بڑھتی جاتی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ خود اس کے والد سرسید کے حق میں تھے، خلاف نہیں تھے۔ خاص طور پر سرسید کی تعلیمی خدمات کے وہ بہت معترف تھے۔

وہ دن اس کی زندگی میں ایک نیا سورج طلوع کرنے آیا تھا جب وہ اپنے ایک ہم جماعت کے گھر گیا۔

"تم بہت پڑھاکو ہو نا۔ آؤ تمہیں ایک چیز دکھاؤں" اس کے دوست نے کہا اور اسے اپنے ساتھ ایک کمرے میں لے گیا "یہ میرے والد کا کتب خانہ ہے۔ دیکھو، کتنی کتابیں ہیں یہاں۔"

عبدالحق کی آنکھیں فرطِ مسرت سے چمکنے لگیں۔ اتنی کتابیں ایک جگہ رکھی ہوئی اس نے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ اس کا جی چاہا کہ یہ سب کتابیں اٹھا کر وہ اپنے گھر لے جائے۔ اتنی کتابیں پڑھنے کے بعد وہ کتنا بڑا آدمی بن جائے گا۔

حیرت کے حصار سے باہر آیا تو اس نے ان کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنا شروع کیا۔ ایک الماری میں کچھ رسائل رکھے تھے جن پر بنے ہوئے بیل بوٹوں نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ایک رسالہ اٹھا لیا۔ بیل بوٹوں کے درمیان جب اس کی نظر تحریر پر پڑی تو وہ چونک اٹھا۔ جلی حروف میں لکھا ہوا تھا "تہذیب الاخلاق۔"

"یہ تو سرسید احمد خان کا رسالہ ہے جو وہ علی گڑھ سے نکالتے ہیں" عبدالحق نے اپنے دوست سے کہا۔

"ہوگا۔ مجھے کیا، یہ سب تو ابا کے ہیں۔"

"کمال ہے۔ تمہارے گھر میں ہیں اور تم انہیں پڑھتے نہیں۔ تم نے تو سرسید کا نام بھی نہیں سنا ہوگا۔"

"نام تو سنا ہے۔"

"میں نے بھی بس نام ہی سنا ہے۔ کبھی انہیں دیکھا نہیں" عبدالحق نے بڑی ندامت کے ساتھ کہا اور ساتھ ہی ساتھ رسالے کے اوراق بھی پلٹتا رہا۔ "یار، یہ ایک رسالہ میں لے جاؤں؟"

"نہ بابا نہ۔ ابا تو میری کھال کھینچ لیں گے۔"

"میں پڑھ کر واپس کردوں گا۔ پھر تم اسے یہیں رکھ دینا۔"

وہ لڑکا کچھ دیر کے لیے سوچ میں پڑ گیا پھر اسے عبدالحق

"سوانحی خاکہ"

نام — عبدالحق
والد — شیخ علی حسین
بھائی — شیخ ضیاء الحق، شیخ احمد حسن
مولد — ہاپوڑ، ضلع میرٹھ
تعلیم — علی گڑھ (بی اے) ۱۸۹۴ء
اعزازی ڈگری — ڈی لٹ الہ آباد یونیورسٹی
ڈی لٹ، علی گڑھ یونیورسٹی
ملازمتیں — ہیڈ ماسٹر، مدرسہ آصفیہ
ہوم سیکریٹریٹ میں مترجم
مددگار، ڈائریکٹر تعلیم
ڈائریکٹر سررشتہ تالیف و ترجمہ
پرنسپل عثمانیہ کالج، اورنگ آباد
صدر شعبہ اردو، جامعہ عثمانیہ
سیکریٹری انجمن ترقی اردو ۱۹۱۲ء تا ۱۹۴۹ء
صدر انجمن ترقی اردو ۱۹۵۰ء تا ۱۹۶۱ء
پیدائش — ۲۰ اگست ۱۸۷۰ء
وفات — ۱۶ اگست ۱۹۶۱ء، کراچی

کی معصوم صورت پر رحم آگیا۔

"واپس کردو گے نا؟"

"ہاں بھئی۔ واپس نہیں کروں گا تو دوسرا رسالہ کیسے ملے گا۔"

اس لڑکے نے اِدھراُدھر دیکھا اور ایک ساتھ دو رسالے چپکے سے اس کے حوالے کردیے "اس میں کیا لکھا ہے' ذرا مجھے بھی بتانا۔"

اب وہ وہاں نہیں رک سکتا تھا۔ اس نے رسالے بغل میں دبائے اور اس خزانے کو لے کر گھر پہنچ گیا۔ اس کے لیے یہ خزانہ ہی تو تھا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ جس شخص کے لوگ اتنے خلاف ہیں' وہ اپنی تحریروں میں کیا لکھتا ہے۔

پہلے ہی رسالے میں سرسید کے دو مضامین شامل تھے۔ اس کی تو دونوں مٹھیاں چاندی کے روپوں سے بھر گئیں۔ اس نے جلدی جلدی دونوں مضامین پڑھ ڈالے۔ یہ دنیا ہی اور تھی۔ یہ جہان ہی دوسرا تھا۔ جو کچھ کہنے والے کے دل میں تھا' وہ اب اس کے دل میں اُتر رہا تھا۔ اس نے اب تک جو دو چار کتابیں پڑھی تھیں' ان مضامین کی زبان ان سے بالکل مختلف تھی۔ سادہ اور عام فہم الفاظ تھے۔ طرزِ ادا ایسی کہ پڑھتے رہیے اور جی نہ بھرے۔ لفظوں کے طوطا مینا نہیں بنائے گئے تھے۔ سارا زور اظہارِ مطلب پر تھا۔ کہیں کہیں شوخی اور ظرافت بھی اپنے پَر پھیلائے بیٹھی تھی۔ خیالی جادوگری نہیں' حقیقت کا طلسم تھا جس کے حصار میں اس مضمون کا ایک ایک لفظ تھا۔ عقلی دلائل سے ایک ایک بات کو سمجھایا گیا تھا۔

اس مضمون کو ختم کرنے کے بعد وہ کچھ دیر تک گہرے گہرے سانس لیتا رہا۔ آنکھیں کھولیں تو یوں لگتا تھا جیسے اندھیرے سے روشنی میں آگیا ہو۔ اچھا تو اس لیے لوگ ان کی برائی کرتے ہیں۔ نئی باتیں بڑی دیر میں حلق سے نیچے اترتی ہیں۔ یہ بڑی عمر کے لوگ ان نئی باتوں کو کہاں قبول کرنے والے۔

اس کے بعد اس نے ایک مضمون مولوی چراغ علی کا پڑھا۔ یہ مذہبی نوعیت کا مضمون تھا۔ زبان قدرے مشکل تھی لیکن پھر بھی اس نے جیسے تیسے اس مضمون کو ختم کر ہی لیا۔

اس دن کے بعد سے اسے چسکا سا پڑ گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے جتنے پرچے' اسے ملے اس نے پڑھ ڈالے۔ اس پر حیرت کے دروازے کھلتے جارہے تھے۔ یہ کیسا آدمی ہے جو کبھی تاریخ پر لکھتا ہے کبھی مذہب پر۔ کبھی ادب پر کبھی سماجی مسئلے پر قلم اٹھاتا ہے اور ہر جگہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ معلومات کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ سب سے زیادہ جس بات نے اسے متاثر کیا' وہ ان مضامین کا تحقیقی مواد تھا۔ وہ اس بات کا قائل ہوگیا کہ سرسید کوئی بات تحقیق کیے بغیر نہیں لکھتے۔ اسے یقین آگیا کہ تحقیق' تلاش اور جستجو کے بعد ہی وہ اعتماد پیدا ہوتا ہے جو لکھنے والے کے قلم میں طاقت پیدا کردیتا ہے۔ کسی چھپی ہوئی بات کو ظاہر کرنے ہی میں نیاپن ہے اور یہ تحقیق کے بغیر نہیں ہوسکتا۔

ان رسالوں کو پڑھ پڑھ کر اسے بھی شوق ہونے لگا تھا کہ وہ بھی کچھ لکھے۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ جب بھی کچھ لکھے گا پوری تحقیق اور چھان بین کے بعد لکھے گا جس طرح سرسید اور ان کے ساتھی لکھتے ہیں۔

ان پرچوں کے ذریعے اسے یہ بھی معلوم ہوگیا تھا کہ علی گڑھ میں سرسید نے ایک اسکول اور کالج قائم کیا ہے۔ اس کا بہت جی چاہتا تھا کہ وہ سرسید کے اسکول میں تعلیم حاصل کرے لیکن باپ سے کہنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ علی گڑھ ہے کہاں۔ اگر دور ہے تو وہ وہاں کس طرح جاسکے گا۔

اس نے گوجرانوالہ مشن اسکول سے مڈل کا امتحان پاس کیا تھا کہ شیخ علی حسین کا تبادلہ دوبارہ ہاپوڑ ہوگیا۔ اب انہیں عبدالحق کی تعلیم کی فکر ہوئی۔ ان کی اس پریشانی کو خود عبدالحق نے دور کردیا۔

"آپ مجھے علی گڑھ کے مدرسے میں داخل کرادیجیے۔ کالج بھی وہیں ہے۔ اسکول سے نکل کر کالج میں پہنچ جاؤں گا۔ آج کل سب لوگ وہیں پڑھنے جارہے ہیں۔ سنا ہے وہاں کے طالب علم کو نوکری بھی آسانی سے مل جاتی ہے۔"

اس نے ایک لمبی چوڑی تقریر کر ڈالی تاکہ والد پر زیادہ سے زیادہ اثر ہو اور وہ داخلے کے لیے رضامند ہوجائیں۔

"تم نے وہاں کے متعلق اتنی معلومات کہاں سے جمع کرلیں" والد نے پوچھا۔

"میں نے تہذیب الاخلاق کے کچھ پرچے پڑھے تھے۔ یہ معلومات وہیں سے حاصل کی ہیں۔"

"کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو۔ نئے زمانے کی تعلیم تمہیں وہیں سے مل سکتی ہے لیکن علی گڑھ دور بہت ہے۔ تمہیں گھر سے دور' بورڈنگ میں رہنا ہوگا۔ بس چھٹیوں میں گھر آیا کروگے۔"

"کیا مضائقہ ہے۔ آدمی تو کام کا بن جاؤں گا۔"

"ہاں' یہ تو ہے۔ دیکھو' میں چند دوستوں سے مشورہ کرکے کوئی فیصلہ کرتا ہوں۔"

عبدالحق دل ہی دل میں ڈر رہا تھا کہ کہیں ابا کے دوست انہیں بہکا نہ دیں۔

شیخ علی حسین فیصلہ کر چکے تھے۔ چند دوستوں نے مخالفت بھی کی لیکن وہ عبدالحق کو لے کر علی گڑھ پہنچ گئے۔ داخلہ بھی ہو گیا اور انگریز ہیڈ ماسٹر مسٹر ہورسٹ کی عنایت سے بورڈنگ ہاؤس میں کمرا بھی مل گیا۔

شیخ علی حسین اسے وہاں چھوڑ کر ہاپوڑ واپس آ گئے اور وہ اس طلسم خانے میں گم ہو کر رہ گیا۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کسی نئی دنیا میں آ گیا ہو۔ یہاں کے طالب علم ان کی عادات اور شرارتیں اور مصروفیات۔ اساتذہ' ڈائننگ ہال اور اس کے کھانے۔ اس کے لیے یہ سب کچھ ایک حسین خواب کی طرح تھا۔ سب سے خاص بات جو اسے یہاں نظر آئی' قومیت کا احساس تھا۔ یہاں ہندوستان کے ہر علاقے اور ہر صوبے کے طالب علم تھے۔ سب اردو بولتے تھے اور خوب بے تکلف بولتے تھے۔ کسی کو یہ خیال تک نہیں تھا کہ وہ کس علاقے اور کس صوبے کا ہے۔ ہندو ہے یا مسلمان۔ سب بھائیوں کی طرح تھے۔

استادوں کا رویہ ہر طالب علم کے ساتھ ایسا برادرانہ اور مشفقانہ تھا کہ کمزور سے کمزور طالب علم میں پڑھنے کا حوصلہ بیدار ہو جاتا تھا۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا جیسے ایک بڑا خاندان ہے جو ایک عمارت میں رہ رہا ہے۔

سب سے پہلے اس کا سابقہ سیکنڈ ہیڈ ماسٹر ولایت حسین سے پڑا۔ چونکہ بورڈنگ ہاؤس کی نگرانی انہی کے ذمے تھی اس لیے بورڈنگ ہاؤس میں مقیم لڑکوں کے ساتھ وہ خاص شفقت سے پیش آتے تھے۔ چند ہی دنوں میں عبدالحق کی سنجیدگی اور طالب علمانہ روش نے انہیں اچھا خاصا متاثر کر دیا۔

وہ ریاضی کے استاد تھے۔ ایک دن عبدالحق کسی وجہ سے ان کا کام کر کے نہیں لایا۔ بہت خفا ہوئے۔

"میں تو تمہارا بھاٹ بنا ہوا ہوں اور جگہ جگہ تمہاری تعریف کرتا پھرتا ہوں۔ اور تم میرا ہی کام کر کے نہیں لاتے۔"

یہ سمجھانے کا ایسا طریقہ تھا کہ عبدالحق آئندہ شکایت کا موقع ہی نہ دے سکا۔ اسے یہ غیرت آتی تھی کہ وہ استاد ہو کر میری تعریف کرتے ہیں۔ میں اگر خود کو اس تعریف کا اہل ثابت نہ کر سکوں تو یہ کتنے شرم کی بات ہے۔

دوسرے معلم جن سے وہ متاثر ہوا مولوی خلیل اللہ تھے۔ وہ عربی کے استاد تھے۔ چھوٹا قد۔ ٹخنوں سے اونچا شرعی پاجاما۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی کتاب ہاتھ میں رہتی۔ مطالعے کے بے حد شائق۔ ان کی یہی ادا عبدالحق کے دل میں اتر گئی۔ اسے خود بھی پڑھنے کے سوا کوئی دوسرا کام نہ تھا۔ ان کی جوہر شناس آنکھوں نے بہت جلد عبدالحق کا انتخاب کر لیا۔

"تم نے فارسی کا مضمون کیوں لیا۔ عربی کیوں نہیں لی؟" ایک دن انہوں نے پوچھا۔ "عربی پڑھ لو۔ یہ تمہارے کام آئے گی۔"

"مڈل تک تو میں نے عربی پڑھی ہے لیکن اب فارسی لے لی۔ عربی کیسے پڑھ سکتا ہوں۔"

"پڑھ کیوں نہیں سکتے۔ میں تمہیں پڑھاؤں گا۔ تم میرے پاس آ جایا کرو۔"

وہ بورڈنگ ہاؤس ہی میں رہتے تھے اس لیے ان کے پاس جانا مشکل نہیں تھا۔ ان کا کمرا پکی بارک اور کچی بارک کے درمیان تھا۔

وہ اس وقت کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ کمرے کے باہر قدموں کی آہٹ سنی تو انہوں نے کتاب آنکھوں سے ہٹائی۔

"کون ہے بھائی۔ کوئی ملازم ہے تو ذرا چلم بھر کر لا دو۔ طالب علم ہو تو اندر چلے آؤ۔"

عبدالحق نے جھانکنے کے انداز میں اندر دیکھا۔ ان کی

چند قابلِ ذکر تصانیف۔

1. مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر
2. مرحوم دلی کالج
3. سرسید احمد خاں حالات و افکار
4. چند ہم عصر
5. اردو کی نشوونما میں صوفیائے کرام کا حصہ
6. نصرتی
7. مقدماتِ عبدالحق۔
8. پاکستان میں اردو کا المیہ
9. تنقیداتِ عبدالحق۔
10. خطباتِ عبدالحق۔

○☆○

نظر کچھ کمزور تھی اس لیے پہچان نہیں پا رہے تھے۔

"بھئی، کیا چوروں کی طرح جھانک رہے ہو۔ کون ہو بولتے کیوں نہیں۔"

"میں ہوں عبدالحق!" اس نے کہا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔

"ارے، یہ تو تم ہو۔ آؤ بیٹھو، ادھر آجاؤ۔" انہوں نے کتابیں سمیٹ دیں اور وہ دری پر بیٹھ گیا۔

"میاں عبدالحق، یہ لڑکے بڑے شریر ہو گئے ہیں۔ میں نے کچھ آم منگائے تھے۔ کمرے میں رکھ کر چلا گیا تھا۔ واپس آیا تو سب آم غائب ہیں۔ کم بختوں نے آم کھائے تو کھائے گٹھلیاں بھی اپنے ساتھ ہی لے گئے۔ میں نے یہ آم باغ میں بونے کے لیے منگائے تھے۔"

عبدالحق کو ہنسی تو بہت آئی لیکن ان کے سامنے ہنسنا بے ہودگی تھی اس لیے چپ بیٹھا رہا۔

"بھئی تم کیسے لڑکے ہو۔ اتنی اچھی بات سن کر بھی تمہیں ہنسی نہیں آئی۔ اتنی سی عمر میں فلسفی ہو گئے ہو یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔"

"آپ کا نقصان ہو گیا۔ میں ہنس کیسے سکتا ہوں۔"

"نقصان کیسا۔ لڑکوں کی شرارت تھی۔ میں تو خود بہت دیر تک ہنستا تھا۔ اس عمر میں شرارت کرتے ہوئے لڑکے مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ ٹھہرو! میں تمہارے لیے کھیر لاتا ہوں۔ کل ہی گھر سے آئی ہے۔"

انہوں نے کھیر کا پیالہ اس کے سامنے رکھ دیا اور اس کی پڑھائی کے متعلق پوچھنے لگے۔

"آپ نے کہا تھا عربی پڑھوں۔ اسی کے لیے حاضر ہوا تھا۔" عبدالحق نے کہا۔

"ارے ہاں، وہ تو ہم بھول ہی گئے تھے۔ چلو الف لیلہ سے شروع کرتے ہیں۔ اس کی زبان سادہ ہے اور قصے دلچسپ ہیں۔ تمہارا خوب دل لگے گا۔"

اس دن کے بعد سے وہ ان کے پاس پڑھنے کے لیے جانے لگا۔ ان کے پڑھانے کا انداز ایسا دل نشین تھا کہ بہت جلد وہ اردو سے عربی اور عربی سے اردو میں ترجمہ کرنے لگا۔

اسکول کے بعد جب وہ کالج میں آیا تو قابلیت کے اعتبار سے عام طالب علموں سے کہیں آگے تھا۔ کالج میں پہنچتے ہی استادوں کی آنکھ کا تارا بن گیا۔

اسکول کے برعکس، کالج کے تمام اساتذہ ایک دو کو چھوڑ کر انگریز تھے لیکن سب پر مشرقی رنگ چڑھا ہوا تھا۔ پروفیسر آرنلڈ ہمیشہ عربی لباس میں آتے تھے۔ سر پر عمامہ، بدن پر عبا و قبا اور پیروں میں سلیم شاہی جوتا۔

کالج کے ہنگامے، اسکول سے بالکل مختلف تھے۔ وہ ان ہنگاموں سے بے خبر اپنی کتابوں میں گم تھا۔ کالج یونین کے جلسے اور ہنگامے طلبہ کی توجہ کو تقسیم کرنے کے نہایت دل نشین ہتھیار تھے۔ بڑے بڑے پڑھاکو لڑکے ان جلسوں میں شریک ہوتے تھے لیکن اسے کوئی جلسہ اپنی طرف نہ کھینچ سکا حتیٰ کہ کالج میں قائم ادبی انجمنوں سے بھی وہ دور ہی دور رہا۔ البتہ جب پروفیسر آرنلڈ نے ایک انجمن "اخوان الصفا" قائم کی تو اس نے ایک مضمون "سینٹ پال" پر پڑھا۔ یہ مضمون اتنا کامیاب ہوا کہ اس دن کے بعد سے لڑکے اسے سینٹ پال کہنے لگے۔ وہ اس خطاب کا حق دار بھی تھا۔ کالج کی ہر رنگین صحبت سے بے نیاز، ہر وقت اپنی کتابوں میں غرق۔

اس نے "اخوان الصفا" میں دو ایک مضامین اور پڑھے تو اس کے قلم کی دھاک بیٹھ گئی۔ یہ مضامین ہرگز کسی طالب علم کی کاوش معلوم نہ ہوتے تھے۔ پروفیسر آرنلڈ تو اس جوہر قابل کے پرستاروں میں شامل ہو گئے۔ اس دن تو وہ حیران رہ گیا جب وہ خود چل کر اس کے کمرے میں آئے۔

"میں شام کی سیر کے لیے جا رہا تھا۔ سوچا تمہیں بھی ساتھ لیتا چلوں۔ شام کے وقت چہل قدمی کیا کرو۔ صحت کے لیے مفید ہوتا ہے۔"

وہ جیسا بیٹھا تھا اسی طرح ان کے ساتھ ہو لیا۔ سیر کیا تھی یہ بھی تدریس کا ایک ذریعہ تھا۔ راستے بھر علم و ادب پر باتیں ہوتی رہی تھیں۔

"آج کل کیا کر رہے ہو؟ کچھ لکھ رہے ہو؟" پروفیسر آرنلڈ نے پوچھا۔

"ان دنوں بابیوں کے مذہب پر کچھ لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"بڑا تحقیقی مزاج پایا ہے۔ بھئی، تمہیں اس کا خیال کیسے آیا اور پھر اس پر کتابیں کہاں سے مل گئیں؟"

"کچھ مسالا اِدھر اُدھر سے جمع کیا ہے۔ کچھ چیزیں اور ملنے کی امید ہے۔ پھر لکھنا شروع کردوں گا۔"

"کچھ چیزیں میرے پاس بھی ہیں۔ وہ میں تمہیں فراہم کردوں گا۔"

دوسرے دن پروفیسر آرنلڈ نے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے چند نمبر اسے بھیجے جن میں آرنلڈ نے بابی مذہب پر چند مضامین لکھے تھے۔

اس کے تحقیقی شوق نے ایسی شدت اختیار کی کہ جب کالج کا کتب خانہ کم پڑ گیا تو اس نے دوسرے کتب خانوں کا

رخ کیا۔ اس نے کہیں سے اورنگ آباد کے پن چکی والے کتب خانے کا ذکر سنا تھا۔ اسے دھن سوار ہوگئی کہ کسی نہ کسی طرح اس کتب خانے تک پہنچ جائے۔ یہ سفر آسان نہیں تھا۔ اورنگ آباد تک ریل بھی جاری نہیں ہوئی تھی۔ اس نے یہ سفر احمد نگر کے راستے سے طے کیا لیکن افسوس! اس نے کتب خانے کا ذکر تو کہیں پڑھ یا سن لیا تھا لیکن یہ خبر اس تک نہیں پہنچی تھی کہ یہ عظیم کتب خانہ کب کا لٹ چکا۔ چند دکنی مخطوطات کے سوا کچھ بھی اسے دیکھنے کو نہیں ملا۔

تحقیق کے اس شوق نے اسے اپنی عمر سے کہیں زیادہ سنجیدہ بنا دیا تھا۔ علی گڑھ کالج، صرف مسلمانوں کی تعلیم ہی کا مرکز نہیں تھا، کھیلوں میں سب سے آگے تھا۔ شام کے وقت کھیل کے میدان لڑکوں سے بھرے ہوتے تھے۔ کچھ کھیلتے تھے کچھ صرف دیکھنے کے لیے آتے تھے۔ طلبہ کی حوصلہ افزائی کے لیے اساتذہ بھی یہاں جمع ہوتے تھے۔ کئی مرتبہ اس کے ساتھیوں نے اسے بھی مجبور کیا لیکن کھیلوں سے نفرت اس کے بچپن کا شوق تھا جو اب تک قائم تھا۔ اس کی تو دنیا ہی اور تھی۔

مسٹر تھیوڈر بیک کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے نئے نئے آئے تھے۔ نوجوان تھے اس لیے طلبہ میں جلد ہی گھل مل گئے۔ عبدالحق پر ان کی خاص نظرِ عنایت تھی لیکن وہ اس کی اس بات سے بہت نالاں تھے کہ وہ کوئی کھیل نہیں کھیلتا۔ وہ اس سے کئی مرتبہ کہہ چکے تھے کہ کوئی کھیل کھیلا کرے لیکن یہ اس کے بس کا نہیں تھا۔ بالآخر ایک دن وہ پکڑا گیا۔ مسٹر بیک خود اسے لینے اس کے کمرے میں آگئے۔

"کمال ہے! اس وقت تم اپنے کمرے میں بند بیٹھے ہو۔ چلو میرے ساتھ فیلڈ میں چلو۔"

"سر! مجھے کھیلوں سے کوئی رغبت نہیں ہے۔"

"رغبت ہوگی کیسے۔ کبھی تم وہاں گئے ہی نہیں۔ یاد رکھو، ذہنی صحت کے لیے کھیل بھی بڑے ضروری ہیں۔"

"میرے پاس اتنا وقت ہی نہیں بچتا کہ کھیل کے میدان کا رخ کروں۔"

"وقت نکالنا پڑتا ہے، چلو میرے ساتھ۔"

"اچھا سر، کل ضرور وقت نکال لوں گا۔"

"تم یہ سنہری اصول تو جانتے ہوگے کہ آج کا کام کل پر نہیں ٹالنا چاہیے۔ آج ہی چلنا ہوگا۔"

اب مزید بحث کرنا گستاخی ہوتا۔ وہ پرنسپل ہو کر اسے بلانے آئے تھے۔ اسے جانا پڑا۔ وہ گراؤنڈ میں چلا تو گیا تھا لیکن برابر اس فکر میں تھا کہ موقع ملے اور وہ یہاں سے فرار ہو۔ آخر اسے موقع مل گیا۔ مسٹر بیک کسی سے گفتگو میں مصروف ہوئے اور وہ وہاں سے کھسک لیا پھر یہ سلسلہ ہمیشہ چلتا رہا کہ مسٹر بیک اسے لے جاتے اور وہ انہیں غچا دے کر وہاں سے بھاگ کھڑا ہوتا۔

چھٹیوں کے دن آئے تو وہ بڑا پریشان ہوا کہ ہاپوڑ جا کر اتنے دن تک کیا کرے گا۔ اس پریشانی کا حل کسی نے اسے یہ بتایا کہ لائبریری سے کتابیں مستعار لے لے اور گھر بیٹھ کر پڑھے۔ یہ کام پروفیسر آرنلڈ کے سپرد تھا اس لیے اس کی ہمت ہوگئی۔ اکثر طالب علم کتابیں مستعار لے جاتے تھے۔ اس نے مطلوبہ کتابوں کی فہرست تیار کی اور پروفیسر آرنلڈ کے پاس پہنچ گیا۔

"تمہیں بڑی ہوس ہے۔ اتنی ساری کتابیں کیسے پڑھو گے؟" انہوں نے لمبی چوڑی فہرست دیکھ کر اس سے کہا۔

انہوں نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ جب وہ واپس آیا تو بہت ساری کتابیں ایسی تھیں جو وہ پڑھ نہیں سکا تھا۔ وہ کتابیں دیکھ کر خود پر قابو رکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کا جی تو بس یہ چاہتا تھا کہ کتابوں ہی میں رہے۔ کتابوں ہی میں سوئے، کتابوں ہی میں اٹھے۔

سرسید احمد خان کو دیکھنے اور ملنے کے مواقع بھی اسے اسی کالج میں میسر آئے۔ کالج نیا نیا قائم ہوا تھا۔ بہت سے کمروں کی ابھی بنیادیں ہی پڑی تھیں۔ باغ وغیرہ لگائے جا رہے تھے۔ سرسید کا معمول تھا کہ صبح کو کالج کی عمارت، باغ وغیرہ دیکھنے آتے تھے۔ وہ انہیں بڑے اشتیاق سے دیکھتا تھا اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا تھا کہ وہ اپنے بھاری بدن اور بڑھاپے کے باوجود پودوں کو پانی دیتے تھے۔ دھوپ میں کھڑے ہو کر مزدوروں کو ہدایات دیتے تھے۔ انہیں دیکھ کر یہ عقیدہ اس کے دل میں راسخ ہوگیا تھا کہ بڑا آدمی بننے کے لیے سخت محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ کام کام اور صرف کام۔ یہ ہے کامیابی کا راز۔

کانفرنس ہال میں ہونے والے جلسے بھی اس کے سمندِ شوق کے لیے تازیانے کا کام کرتے تھے۔ ان جلسوں میں مسلم اکابرین شریک ہوتے تھے جنہیں قریب سے دیکھنے اور ملنے کے مواقع اسے حاصل ہوئے۔ انہی جلسوں کے طفیل اسے سرسید کی قربت حاصل ہوئی۔ یہیں اس نے حالی کو دیکھا۔ انہی جلسوں کی بدولت وہ ہندوستان کی سیاسی حالت سے واقف ہوا۔

علی گڑھ صرف تعلیمی درس گاہ نہیں تھی، تہذیبی مرکز

بھی تھا اور تربیتی ادارہ بھی۔ وہ نہایت خاموشی سے یہاں کی ایک ایک بات اپنے لہو میں اتار رہا تھا۔

سرسید سے ابھی دور دور کی ملاقات تھی لیکن سرسید کی عقابی نگاہوں نے اس کا انتخاب کرلیا تھا۔ گرمیوں کی چھٹیاں ہوچکی تھیں۔ وہ اس مرتبہ گھر نہیں گیا تھا۔ کالج ہی میں رہ کر کتب خانے کی کتابیں چاٹ رہا تھا۔ ایک دن سرسید نے اسے حکم دیا کہ ان کے کتب خانے کی کتابیں بہت بے ترتیب رکھی ہیں، انہیں آکر کسی وقت ترتیب سے لگادو۔ ایک تو کتابیں اور وہ بھی سرسید کے کتب خانے کی۔ اس کے تو من کی مراد پوری ہوگئی۔ اس بہانے وہ سرسید کے کتب خانے کو بھی دیکھ لے گا۔ وہ اپنے لڑکپن کے اس دور کو یاد کررہا تھا جب اس نے اس عظیم ہستی کا صرف نام سنا تھا اور وہ بھی اچھے لفظوں میں نہیں۔ اس نے فوراً ایک اور لڑکے کو ساتھ لیا اور ان کے کتب خانے میں پہنچ گیا۔ اتنا وقت تو نہیں تھا کہ وہ ان کتابوں کو پڑھنے بیٹھ جاتا لیکن انہیں ترتیب سے رکھتے ہوئے وہ ایک ایک کتاب کو نظروں میں رکھتا جارہا تھا کہ کبھی ضرورت پڑی تو یہاں سے لے لے گا۔

گرمیوں کی دوپہر تھی۔ سرسید اسی کمرے میں ایک طرف تخت پر لیٹے ہوئے تھے۔ ان کی بغل میں ان کا پوتا مسعود (سر راس مسعود) لیٹا تھا۔

وہ اسے سلانے کی کوشش کررہے تھے لیکن وہ تھا کہ سونے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔ اتنے میں انہوں نے اپنی بھاری آواز میں اسے لوری سنانی شروع کی۔ ان کی آواز ایسی گرج دار اور بے ہنگم تھی کہ عبدالحق کو اپنی ہنسی ضبط کرنا مشکل ہوگیا۔ دونوں لڑکے دوسرے دروازے سے باہر بھاگے اور ہنسی کا خزانہ باہر جاکر لٹادیا۔ یہ محض ہنسی کی بات تھی لیکن جب عبدالحق نے غور کیا تو سرسید کی شخصیت کا ایک دوسرا روپ سامنے آیا۔ ان کے سینے میں کیسا نرم اور مخلص دل چھپا ہوا ہے۔ ایک بچے کو خوش کرنے کے لیے انہوں نے اپنی حیثیت کا بھی خیال نہیں کیا۔ شاید یہی درد پوری قوم کے بچوں کے لیے ان کے دل میں تھا۔

گرمیوں کی چند دوپہروں میں یہ کام نمٹ گیا۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ سرسید سے اس کی قربت بڑھ گئی۔ وہ کام میں مصروف ہوتا اور بیچ بیچ میں سرسید اس سے باتیں بھی کرتے جاتے۔ اس کے علمی ذوق نے سرسید کے دل میں جگہ بنالی۔ اب وہ اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوجاتا۔ انہیں اٹھتے بیٹھتے، لکھتے پڑھتے دیکھتا۔ ان سے ہم کلام ہوتا۔ لکھنے پڑھنے میں ان کا ہاتھ بٹاتا۔ ان سے سیکھتا۔

یہ سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ سید محمود (سرسید کے بیٹے) ہائی کورٹ الہ آباد سے استعفیٰ دے کر علی گڑھ آگئے۔ معلوم ہوا چیف جسٹس، ہائی کورٹ الہ آباد سے ان بن ہوگئی تھی۔ لہٰذا ملازمت چھوڑ دی۔ ایک دن عبدالحق، سرسید احمد خان سے ملنے ان کی کوٹھی پر پہنچا تو سید محمود سے ملاقات ہوگئی۔ وہ اسے اپنے کمرے میں لے گئے۔ یہ اس کوٹھی کا سب سے بڑا کمرا تھا۔ لیکن نہایت بے ترتیب۔ ہر طرف کاغذات اور کتابیں پھیلی ہوئی تھیں۔

"تمہاری قابلیت کے بہت چرچے ہونے لگے ہیں۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ کیا کہتا۔ ہنس کر چپ ہوگیا۔ سید محمود نے اسے بیٹھنے کو کہا۔

"جانتے ہو، یہ کاغذات کیوں بکھرے ہوئے ہیں۔ اور میں کیا لکھ رہا ہوں۔"

"یقیناً کوئی اہم تالیف ہوگی جو آپ اتنے مستغرق ہیں۔"

"چیف جسٹس، الہ آباد نے گورنمنٹ کو میرے خلاف ۷۵ صفحے کی رپورٹ لکھ کر بھیجی ہے۔ میں اس کا جواب لکھ رہا ہوں۔ کم از کم پانچ سو صفحے لکھوں گا۔"

"میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ آپ کوئی اہم تالیف سپرد قلم کررہے ہیں۔"

"کئی اور کام بھی پیش نظر ہیں جنہیں مکمل کرنا ہے" کچھ دیر توقف کرنے کے بعد انہوں نے کہا "تمہیں میرا ہاتھ بٹانا ہوگا۔"

"میں ان قانونی پیچیدگیوں کو کیا سمجھوں گا۔"

"تم حوالے تلاش کرسکتے ہو۔ اقتباسات کی نقل کرسکتے ہو۔"

"ہاں، یہ کام تو میری طبیعت کے ہیں۔"

"سہ پہر کو آجایا کرو۔ میرا کچھ کام ہلکا ہوجائے گا۔"

وہ ہر شام ان کے ساتھ گزارنے لگا۔ کام کرتے کرتے رات ہوجاتی تو وہ اسے رات کے کھانے کے لیے روک لیتے۔ کھانے پر سرسید بھی ہوتے۔ کسی نہ کسی موضوع پر گفتگو بھی چلتی رہتی۔

یہ کالج کی کلاسوں سے الگ ایک درس گاہ تھی جہاں وہ تعلیم حاصل کررہا تھا۔ باتوں باتوں میں اس نے وہ کچھ سیکھ لیا تھا جو بڑی بڑی کتابوں سے حاصل نہیں ہوسکتا تھا۔

ان صحبتوں کی بدولت اسے سرسید اور سید محمود کو نہایت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ان کے کام کرنے کے طریقوں سے واقفیت ہوئی اور اس نے اپنے مستقبل کے لیے

اپنے ذہن میں ایک خاکہ تیار کرلیا۔

انہی صحبتوں میں اسے ان تمام لوگوں سے ملنے کا موقع ملا جو سرسید کے رفقا میں تھے۔ یہیں اس کی ملاقات مولانا الطاف حسین حالی سے ہوئی۔ یہ ملاقات اس طرح ہوئی جیسے دو یکساں روحیں آپس میں ملتی ہیں۔ انہیں دیکھ کر اسے اپنا بچپن یاد آنے لگا۔ وہ کسی تقریب میں شریک تھا۔ اس تقریب میں مجرا بھی ہونا تھا۔ اسے مجرے کا مفہوم بھی معلوم نہیں تھا لیکن جب سب بزرگ بیٹھ چکے اور طوائف ناچنے کے لیے کھڑی ہوئی تو اس نے جانا کہ مجرا یہ ہوتا ہے۔

فجر کی اذان میں کچھ دیر باقی تھی۔ صبح صادق کا سماں تھا کہ طوائف نے ایک عجیب و غریب چیز چھیڑ دی۔

ان اشعار کا جادو تھا یا طوائف کی درد بھری آواز یا پھر صبح کی ہلکی ہلکی روشنی کا اثر۔ ہر آنکھ سے آنسو رواں ہوگئے جیسے رات بھر کی غفلت کے بعد کسی نے عاقبت یاد دلادی ہو۔

اس وقت اسے معلوم بھی نہیں تھا کہ یہ کلام کس کا ہے۔ بعد میں جب اس نے دو چار کتابیں پڑھ لیں تو اسے معلوم ہوا کہ وہ مسدس حالی کے بند تھے جو اس طوائف کے ہونٹوں سے ادا ہورہے تھے اور سننے والوں کے دلوں میں اتر رہے تھے۔ آج اس کلام کا خالق اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

وہ سرسید کی کوٹھی میں بہت سے اکابرین سے ملا تھا لیکن حالی کو دیکھ کر اسے یوں لگا جیسے یہ شخص اس کے اندر جذب ہوتا جارہا ہے۔ اس وقت جتنے ستارے آسمانِ ادب پر فروزاں تھے، اس نے سب سے زیادہ روشنی اس ستارے میں دیکھی۔ سرسید ادیب سے زیادہ مصلح تھے۔ ڈپٹی نذیر احمد کی شخصیت میں زیادہ جاذبیت نہیں تھی۔ آزاد کی ادبی شخصیت میں دل کشی تھی مگر تابناکی نہ تھی۔ شبلی کے مزاج میں بڑی حد تک انانیت کا دخل تھا۔ ان کی خود پرستی عبدالحق کے مزاج کے برخلاف تھی۔ حالی کو دیکھ کر اسے محسوس ہوا کہ اس کا اپنا مزاج مجسم ہوکر سامنے آگیا ہے۔ وہ ان سے متاثر نہیں ہوا بلکہ گرویدہ ہوگیا۔

حالی نہایت سادہ طبیعت تھے۔ عبدالحق بھی سادہ مزاج اور نیک سرشت تھا۔ حالی کی سرشت میں غرور کا شائبہ تک نہیں تھا۔ فراخ دل تھے اور اپنے سے چھوٹوں کی تعریف کرنے میں بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔ عبدالحق بھی منکسرالمزاج اور کشادہ دل واقع ہوا تھا۔ حالی شہرت کے طلب گار نہیں تھے۔ عبدالحق بھی یہی چاہتا تھا کہ شہرت سے دور رہ کر بس سر جھکا کر کام کرتا رہے۔ پھر اس میں اور سرسید میں سب سے بڑا اتحاد یہ تھا کہ حالی بھی سرسید کے عقیدت مند تھے اور خود وہ بھی۔ پہلی ہی ملاقات میں حالی کا احترام جو اس کے دل میں تھا، محبت میں تبدیل ہوگیا۔

حالی ان دنوں کالج کی عمارت ہی میں مقیم تھے۔ لہٰذا وہ ان کے پاس جانے لگا۔ حالی ان دنوں "حیاتِ جاوید" کی تالیف میں مصروف تھے۔ اور ساتھ ہی "یادگارِ غالب" کو بھی ترتیب دے رہے تھے۔

وہ جب حالی کے پاس پہنچا تو ان کے دل پر بھی یقیناً وہی اثر ہوا جو اس نے محسوس کیا تھا۔ انہوں نے کچھ اپنے مزاج اور کچھ اس کی پیاس کے مطابق اس کے ساتھ ایسا مشفقانہ رویہ اختیار کیا کہ اس کی گرویدگی شیفتگی میں تبدیل ہوتی گئی۔ وہ کام کرتے ہوئے ان کے انہماک کو دیکھتا۔ ایک ایک حوالے کے لیے وہ جتنی محنت اور چھان پھٹک کرتے، اسے ملاحظہ کرتا۔ ان کے طرزِ اسلوب کو بار بار ذہن میں بٹھاتا۔ ایک خاموش تربیت تھی جس سے وہ گزر رہا تھا۔

حالی سے ملاقات کے بعد اس کی دنیا ہی بدل گئی۔ لاشعوری طور پر اس کے اندازِ تحریر پر حالی کی پرچھائیاں پڑنے لگیں۔ اس نے بھی حالی کی طرح سادگی، سلاست، روانی اور صفائی کو اپنی نثر کا خاصہ بنالیا۔ عربی اور فارسی کے مشکل الفاظ کی جگہ ہندی الفاظ نے لے لی۔

"جس میں سنورنے کی صلاحیت ہوتی ہے، اس میں بگڑنے کے بھی لچھن ہوتے ہیں۔"

(زبانِ اردو پر سرسری نظر)

حالی کی طرح اس نے بھی محاورات کے فطری استعمال پر زور دینا شروع کردیا جس سے اس کی نثر میں ایک نئی شان پیدا ہونے لگی۔ متانت اور سنجیدگی کی فضا خود بخود اس کی نثر میں پاؤں پھیلانے لگی۔ حالی کی طرح اس کا مزاج بھی سائنسی ہوتا چلا گیا۔ عبارت آرائی اور رنگینیٔ کلام سے کام لینے کے بجائے اپنے نظریات کو صحیح اور جچے تلے الفاظ میں پیش کرنے کا عادی ہوگیا۔ غرض یہ کہ جب وہ مولانا حالی کی بزم سے اٹھا تو بہت کچھ لے کر اٹھا۔

اردو کے بہترین مضمون پر ایک تمغا لارڈ لیس ڈاؤن ملا کرتا تھا۔ جب یہ تمغا اسے ملا تو صاف ظاہر ہونے لگا کہ اردو کی تاریخ میں ایک بڑے ادیب کا اضافہ ہونے والا ہے۔ سرسید احمد خان نے اس کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے اپنے پرچے "تہذیب الاخلاق" میں بھی کام لینا شروع کردیا تھا۔

علی گڑھ کالج کہنے کو ایک محدود عمارت تھی لیکن اس محدود دنیا میں ایک لامحدود دنیا آباد تھی۔ اس دنیا میں تعلیم، تہذیب اور سیاست کے پھول کھلتے تھے۔ یہاں سے اٹھنے والی

آواز تمام مسلمانوں کی آواز بن جاتی تھی۔ ہندوستان بھر کے مسلمانوں کی جولانگاہ تھی یہ عمارت۔ بیدار ذہنوں کی پرورش گاہ تھی یہ عمارت۔ یہاں پہنچ کر مٹی، سونا اور سونا کندن بنتا تھا۔

عبدالحق نے اس دانش کدے میں اپنی زندگی کے چھ سال بسر کیے اور چھ صدیوں کا تجربہ لے کر گھر لوٹ آیا۔

سرسید احمد خان جیسا مصلح اعظم اور ہمہ گیر انسان، ہندوستان تو ہندوستان دنیا میں اپنی مثال آپ تھا۔ عبدالحق نے اسی عظیم انسان کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ اس کو اٹھتے بیٹھتے، لکھتے پڑھتے دیکھا تھا۔ کس طرح ممکن تھا کہ نوجوان عبدالحق کے دل میں کام کرنے کی لگن، پابندیٔ وقت کا خیال، نفاست پسندی، اعلانِ حق میں بے باکی اور جرأت کا خیال پیدا نہ ہوتا۔

اس کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو چکی تھی کہ مسلمانوں کی بقا، اردو کی ترقی میں مضمر ہے۔ کوئی زبان محض زبان نہیں ہوتی بلکہ اس قوم کی تاریخ، اس کا کلچر اور اس کی تہذیب ہوتی ہے۔ اگر اردو زبان ہاتھ سے گئی تو کچھ بھی باقی نہیں بچے گا۔ ہندی، اردو کا جھگڑا ۱۸۶۷ء ہی میں سر اٹھا چکا تھا۔ سرسید نے اسے دبانے کی حتی الامکان کوشش کی تھی لیکن اب بھی یہ جھگڑا مختلف صورتوں میں سر اٹھاتا رہتا تھا۔ نوجوان عبدالحق کو احساس تھا کہ یہ جھگڑا وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا جائے گا۔ اس طوفان کے سامنے بند باندھنے کی ضرورت ہے۔ ادب محض عیاشی نہیں، قومی خدمت بھی ہے۔ سرسید کے بعد ایک سپاہی کی ضرورت ہے جو اردو کے دفاع کا سپاہی ہو۔

وہ ان خیالوں کو اپنے ذہن میں سجائے اپنے وطن ہاپوڑ میں بی اے کے رزلٹ کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ ہاپوڑ کا پہلا نوجوان تھا جس نے انگریزی تعلیم حاصل کی تھی اور سراپا اردو بن کر زندہ رہنا چاہتا تھا۔

یہ زمانہ اس کے لیے نہایت جذباتی تھا۔ خیالوں کے ہجوم اسے گھیرے ہوئے تھے اور وہ اس بھیڑ میں اپنے لیے راستہ بنانے کی تگ و دو کر رہا تھا۔

اس کے والدین اس کا مستقبل اس کی شادی میں تلاش کر رہے تھے۔ خیال یہی تھا کہ وہ شادی سے کیوں انکار کرے گا۔ اس لیے اس سے پوچھنے کی کسی نے ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔

اس کی بہن کی شادی ہاپوڑ کے ایک زمیندار گھرانے میں ہوئی تھی۔ اس کی ماں نے اسی گھرانے کی ایک لڑکی اس کے لیے پسند کر لی۔

"ہم چاہتے ہیں، اب تمہاری شادی کر دی جائے۔" اس کے والد نے کہا۔

وہ باپ کے سامنے تو زبان نہیں کھول سکا لیکن ماں کے سامنے پہنچ کر اس نے صاف انکار کر دیا۔

"مجھے ابھی زندگی میں بہت کچھ کرنا ہے۔ ابھی میں شادی نہیں کر سکتا۔"

"اوئی بچے، شادی کے علاوہ بھی زندگی میں کچھ کرنے کو ہوتا ہے؟"

"ابھی تو میری نوکری کا بندوبست بھی نہیں ہوا ہے۔" اس نے دوسرا بہانہ کیا۔

"گھر میں کیا کھانے کو نہیں ہے۔ بس تو شادی کر لے۔ نوکری ہوتی رہے گی۔"

"اماں، تم سمجھتی کیوں نہیں ہو۔ میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا۔"

"یہ تمہارے باپ کا حکم ہے۔ انہیں منع کرنے کی مجھ میں تو ہمت ہے نہیں۔"

ان میں منع کرنے کی ہمت نہیں تھی لیکن وہ انہیں بتا تو سکتی تھیں کہ عبدالحق تیار نہیں ہے۔

دوسرے ہی دن اس کے باپ نے اسے اپنے حضور طلب کر لیا۔

"سنا ہے، آپ شادی کرنا نہیں چاہتے۔"

"فی الحال نہیں کرنا چاہتا۔"

"کیوں؟"

"میری زندگی کسی ڈھب پر تو آ جائے۔"

"صاف کیوں نہیں کہتے کہ تم ہمیں یہ خوشی دینا ہی نہیں چاہتے۔ جب ہماری آنکھیں بند ہو جائیں گی، اس وقت کرو گے شادی۔"

"یہ بات نہیں ہے۔"

"یہی بات ہے۔"

"دوسری بات یہ بھی ہے کہ اس گھر میں میری بہن بیاہی گئی ہے۔ اسی خاندان کی لڑکی سے میرا شادی کرنا مناسب نہیں۔"

"اچھا جی، تو اب آپ چار کتابیں پڑھ کر یہ بھی سمجھنے لگے کہ جو کچھ ہم سوچتے ہیں وہ نامناسب ہے۔ شادی ابھی ہوگی اور جہاں ہم کہتے ہیں وہیں ہوگی۔"

اب مزید بحث کی گنجائش نہیں تھی۔ اس نے سر جھکا لیا۔ نہ انکار کیا نہ اقرار، بس خاموش ہو گیا۔ ماں خوش

ہوگئی کہ بیٹا مان گیا۔ عبدی بھائی کی شادی ہو رہی ہے‘ دوسرے کہتے رہے‘ وہ سنتا رہا۔

جیسے جیسے شادی کا دن قریب آ رہا تھا‘ اس پر گھبراہٹ طاری ہوتی جارہی تھی۔ کیا میں اسی لیے علی گڑھ گیا تھا کہ واپس آکر شادی کے بندھن میں جکڑ دیا جاؤں۔ پھر اسی طرح زندگی گزارنے لگوں جس طرح ہندوستان کے لاکھوں لوگ گزار رہے ہیں۔ سیکڑوں عزائم اس کے سینے میں مچل رہے تھے جنہیں وہ ایک ایک کرکے مرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

اب جبکہ شادی ہو ہی رہی ہے تو بیوی کو دینے کے لیے کوئی تحفہ بھی تو ہو۔ وہ تحفہ خریدنے کے لیے میرٹھ چلا گیا۔ واپس آیا تو چاندی کی کٹاؤ دار ڈبیا اس کی شیروانی کی جیب میں پڑی تھی۔ اس ڈبیا میں سچے آب دار موتی چم چم چمک رہے تھے۔

روایتی گھرانوں کی طرح روایتی دھوم دھام سے برات روانہ ہوئی۔ گیس کے ہنڈوں کی جگ مگ کرتی روشنی میں طوائفیں خوب ناچیں۔

دلہن گھر آگئی۔ عبدی بھائی کی شادی ہوگئی۔ دوسرے دن ولیمہ تھا۔ ولیمے کی تیاریاں ہونے لگیں۔

رات آگئی۔ دلہن اپنے کمرے میں بیٹھی‘ اس کے قدموں کی آہٹ پر کان لگائے ہوئے تھی۔ اس کے جی میں جانے کیا آئی کہ موتیوں کی ڈبیا شیروانی کی جیب میں ڈالی اور غسل خانے کے دروازے سے نکل کر فرار ہوگیا۔

پکڑے جانے کے خوف نے اسے گھر سے بہت دور بمبئی پہنچادیا۔

وہ کسی منزل اور ارادے کے بغیر بمبئی آگیا تھا۔ ایک چھوٹے سے ہوٹل میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ کچھ پیسے جیب میں ہیں۔ اگر کوئی چھوٹی موٹی تجارت کی جائے تو اس بڑے شہر میں کاروبار خوب چمکے گا۔ اس ارادے کے بعد وہ کاروبار کے انتخاب کے لیے بمبئی کے بازاروں کا گشت کرنے لگا۔

ایک دن اس کی ملاقات محسن الملک سے ہوگئی۔ جو سرسید کے ساتھیوں میں تھے اور اب ریاست حیدر آباد میں معتمدِ مال تھے۔ تبدیلی آب و ہوا کے لیے بمبئی آئے ہوئے تھے۔ علی گڑھ میں عبدالحق سے ان کی کئی ملاقاتیں ہو چکی تھیں لہٰذا دیکھتے ہی پہچان لیا اور اپنے ساتھ اپنی قیام گاہ پر لے گئے۔

محسن الملک کو ہنسی آگئی جب انہیں اس کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ وہ تجارت کرنا چاہتا ہے۔

”تجارت تمہارے بس کا روگ نہیں۔ ہر نوکری تم کر نہیں سکتے۔ کر بھی لی تو دفتر کے بابو ہو کر رہ جاؤ گے۔ نوکری ایسی ہونی چاہیے جہاں تمہارے جوہر چمکیں۔“

”ایسی نوکری مجھے کون دے گا؟“

”ریاستِ حیدر آباد میں آج کل اہلِ علم کی بے حد قدردانی ہو رہی ہے۔ تم فوراً حیدر آباد چلے جاؤ۔“

”یہ آپ نے اور اچھی کہی۔ وہاں کون ہے جو مجھے جانتا ہے۔“

”میں تو جانتا ہوں۔ بھئی‘ تم میرا رقعہ لے کر جاؤ گے۔ جاتے ہی نوکری مل جائے گی۔“

محسن الملک نے ایک خط وقار الملک مولوی مشتاق کے نام لکھ کر انہیں دے دیا۔ وہ اس سفر کی طرف روانہ ہوگیا جہاں آبلوں کا امکان تو تھا لیکن انہی آبلوں میں باغِ اردو کی زندگی پوشیدہ بھی تھی۔

محسن الملک کی سفارش ہو اور نوکری نہ ملے‘ یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ مدرسۂ آصفیہ میں بطور ہیڈ ماسٹر ان کا تقرر ہوگیا۔

یہ نوکری اس اعتبار سے تو جاذبِ نظر نہیں تھی کہ لکھنے پڑھنے یا تحقیق و تنقید کے مواقع ملتے لیکن قدم جمانے کے لیے کسی کاروبار یا تجارت سے بہتر سہارا تھا۔ انہیں اس وقت ایسے ہی کسی سہارے کی ضرورت تھی۔

حیدر آباد کی علمی فضا اور قدردانی نے اس کے پاؤں پکڑ لیے۔ معمولی سی ہیڈ ماسٹری کی توقیر ہی کیا لیکن جس طرح حیدر آباد کے علمی حلقوں اور اہلِ اقتدار نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اس سے اسے اندازہ ہوگیا کہ اس ریاست میں آگے بڑھنے کے بہت مواقع ملیں گے۔

وہ ایک دن اپنے سامان کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا کہ اسے وہ ڈبیا نظر آگئی جس میں موتی رکھے تھے۔ وہ بہت دیر تک اس ڈبیا کو دیکھتا رہا۔ کئی منظر آنکھوں کے سامنے آئے اور اوجھل ہوگئے۔ میرے گھر والوں کو تو یہ بھی معلوم نہ ہوگا کہ میں کہاں ہوں اور کس حال میں ہوں۔ اس کے ساتھ ہی اسے وہ دلہن یاد آگئی جسے وہ چھوڑ کر آیا تھا۔ وہ اب تک میرے انتظار میں بیٹھی ہوگی۔ اس کے تو پاؤں سُن ہوگئے ہوں گے۔ اس کا انتظار اب ختم ہو جانا چاہیے۔ اس نے طلاق نامہ لکھا اور گھر کے پتے پر روانہ کردیا۔

یہ ملازمت کرتے ہوئے اسے چار سال ہوگئے تھے۔ یہ مدت اس جیسے لائق آدمی کے لیے‘ اعلیٰ حلقوں میں اپنی جگہ بنانے کے لیے کم نہیں ہوتی۔ پھر نہ گھر بار کی فکر تھی نہ بال

بچوں کی۔ اسے اپنی اہمیت منوانے کی فرصت خوب مل رہی تھی۔

وہ ایک دن اپنے دفتر میں بیٹھا تھا کہ افسر یار جنگ' افواجِ آصفیہ کے سپہ سالار اس سے ملاقات کے لیے آئے۔ جلد ہی یہ بھی معلوم ہوگیا کہ وہ کیوں آئے ہیں۔ وہ ایک ماہ نامہ "افسر" نکالنا چاہتے تھے۔

"بڑی خوشی کی بات ہے۔ اردو میں رسائل کی بہت کمی ہے۔ اُردو کی ترقی کے لیے رسائل کا ہونا بہت ضروری ہے۔ ان کے ذریعے لکھنے والوں کو تحریک ملے گی۔ اردو کے ادبی ذخیرے میں اضافہ ہوگا لیکن یہ چونکہ بھاری پتھر ہے اس لیے لوگ چوم کر چھوڑ دیتے ہیں۔" عبدالحق نے اچھی خاصی تقریر کر ڈالی۔

"یہ بھاری پتھر آپ کو اٹھانا ہوگا۔"

"مجھے؟"

"جی ہاں' اس کے مدیر آپ ہوں گے۔ اس کے لیے مجھے آپ سے زیادہ مناسب آدمی اور کوئی نظر نہیں آتا۔"

"میں اپنی مصروفیت کا بہانہ کر سکتا تھا لیکن یہ اردو کا معاملہ ہے اس لیے انکار نہیں کروں گا۔"

اب وہ ملازمت کے ساتھ ساتھ رسالہ "افسر" کو بھی ایڈٹ کرنے لگا۔ پیاسے کو چند قطرے پانی کے مل گئے۔ اس کام سے اسے ذہنی مناسبت تھی۔

اس کی محنت سے یہ رسالہ ایک معیاری رسالے کے روپ میں ظاہر ہوا۔ خود اس کے لیے بھی مفید ثابت ہوا۔ اس کی ابتدائی نگارشات اسی پرچے میں شائع ہوئیں۔ چیزوں کو جانچنے اور ان پر تبصرے کرنے کی صلاحیت بھی پیدا ہوئی۔

اس پرچے میں کام کرتے ہوئے اسے بہ مشکل ایک سال گزرا ہوگا کہ اسے ہوم سیکریٹری عزیز مرزا نے طلب کرلیا۔ انہیں اپنے دفتر کے لیے ایک مترجم کی ضرورت تھی۔ عبدالحق سے بہتر آدمی اس کام کے لیے بھی کوئی دوسرا نہیں تھا۔

اسی دفتر میں وہ دس سال تک کام کرتا رہا۔ ایک مرتبہ پھر محکمۂ تعلیم کو یاد آگیا۔ ۱۹۱۱ء میں اسے ڈائریکٹر تعلیم کے مددگار کے طور پر بلالیا گیا۔ ایک سال بعد اسے صوبہ اورنگ آباد کا انسپکٹر آف اسکولز بنادیا گیا لہٰذا اسے اورنگ آباد جانا پڑا۔

○☆○

۱۹۰۲ء میں دلی میں شاہی دربار ہوا تھا۔ اس وقت لارڈ کرزن وائسرائے تھے۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے بھی اپنا

سالانہ جلسہ کیا۔ اس کانفرنس نے اپنی قرارداد میں چار ذیلی شعبے قائم کیے۔ ایک مدارس کا، دوسرا اصلاحِ تمدن کا۔ تیسرا تعلیمِ نسواں کا اور چوتھا اردو کا جو انجمن ترقیِ اردو سے موسوم ہوا۔ پروفیسر آرنلڈ اس کے صدر اور مولانا شبلی پہلے سیکریٹری منتخب ہوئے۔

مولانا شبلی نے استعفیٰ دے دیا تو دسمبر ۱۹۰۵ء میں ان کی جگہ مولوی حبیب الرحمٰن خاں شیروانی سیکریٹری منتخب ہوئے۔ جلد ہی پروفیسر آرنلڈ انگلستان واپس چلے گئے۔ ارکانِ انتظامی بھی تقریباً سب کے سب حیدر آباد دکن میں تھے اس لیے انجمن کا تمام نظام درہم برہم ہو کر رہ گیا تھا۔ اس صورتِ حال میں مولوی حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کوئی قابلِ ذکر کام انجام نہ دے سکے۔ انجمن صرف کاغذ تک محدود ہو کر رہ گئی۔ بالآخر وہ اپنے عہدے سے دست بردار ہو گئے۔ ان کی جگہ مولوی عزیز مرزا کو نیا سیکریٹری بنایا گیا۔ ان سے بڑی امیدیں تھیں لیکن ان کی زندگی نے وفا نہ کی۔

۱۹۱۲ء میں علی گڑھ کی تعلیمی کانفرنس کا سالانہ اجلاس دہلی میں ہوا۔ اس اجلاس میں یہ بات سب نے محسوس کی کہ ترقیِ اردو کا شعبہ لاوارث بچے کی طرح کسی سرپرست کی تلاش میں ہے۔

کانفرنس کے سربراہ صاحب زادہ آفتاب احمد خاں نے سیکریٹری کے عہدے کے لیے مولوی عبدالحق کا نام پیش کیا۔ ان کی خدمات اور صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے بالاتفاق ان کے نام کی منظوری دے دی گئی۔

عبدالحق چونکہ ملازمت کے سلسلے میں اورنگ آباد میں مقیم تھے اس لیے انہوں نے اپنا صدر دفتر وہیں قائم کیا۔

وہ اس انتظار میں تھے کہ جب دفتر منتقل ہو گا تو نہ جانے کتنا بھاری سامان اترے۔ گھر میں جگہ بھی ہو گی کہ نہیں۔

"دفتر کا سامان آگیا ہے" قاصد نے اطلاع دی اور وہ بھاگم بھاگ مکان کی طرف گئے۔

"کہاں ہے سامان؟"

"یہ کیا پڑا ہے۔"

ایک پرانا صندوق تھا جو بوسیدگی کی وجہ سے رسی سے کسا ہوا تھا۔ اسے کھولا تو اس میں ایک رجسٹر، چند پرانے اور غیر مرتب مسودات، ایک قلم دوات اور باقی اللہ کا نام۔ یہ تھی کل کائنات جس کے سہارے انہیں اردو کی جنگ لڑنی تھی۔ بہرحال جو بھی تھا یہی تھا۔ اسی میں گزارہ کرنا تھا۔ انہوں نے صندوق ایک کونے میں رکھا اور سوچنے بیٹھ گئے کہ اب انہیں کیا کرنا ہو گا۔

کئی مشکلیں ایک ساتھ آگئی تھیں لیکن سب سے بڑی مشکل سرمائے کی فراہمی کی تھی۔ انہیں سرسید یاد آگئے جو بات بات پر چندہ جمع کرنے نکل کھڑے ہوتے تھے اور آخر اتنے بڑے کالج کی عمارت کھڑی کر لی۔ مجھے بھی چندے کی مہم شروع کرنی چاہیے۔ انہوں نے سوچا لیکن یہ سوچتے ہی خود سے شرم آنے لگی۔ کسی کے سامنے ہاتھ کیونکر پھیلاؤں گا۔ چندہ مانگنے کے لیے ایک خاص طبیعت کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں جہاں جاؤں گا، مروت غالب آجائے گی۔ وہ ڈھٹائی کہاں سے لاؤں گا جو چندہ مانگنے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔

ان میں ساری صلاحیتیں تھیں لیکن چندہ مانگنے کی صلاحیت خود میں نہیں پاتے تھے لیکن معاملہ انجمن کا اور اردو کی بقا کا تھا۔ دو ہی راستے تھے۔ وہ دفتر بند کر دیں یا چندہ مانگنے نکل کھڑے ہوں۔ آخر انہوں نے دوسرے راستے کا انتخاب کیا۔ سنت گھر سے چلتی ہے۔ انہوں نے اپنا کل سرمایہ انجمن کی نذر کر دیا۔ ہمدردوں کی صدائیں آنے لگیں۔

"مولوی صاحب نے اپنے مستقبل کے بارے میں کیا سوچا ہے۔ آخر وہ اپنا ذاتی سرمایہ اس قدر بے دردی سے کیوں خرچ کر رہے ہیں۔"

مولوی صاحب دنیا کی اس ہمدردی سے قطعی خوش نہیں ہوئے بلکہ جھنجلا اٹھے اور پھر جو جواب انہوں نے دیا صرف وہی دے سکتے تھے۔

"یہ تم نے کیا کہا، میں اپنا ذاتی روپیا بے دردی سے کیوں خرچ کر رہا ہوں، تمہارے بھائی یا بچے پر خدانخواستہ کوئی آفت پڑے تو کیا تم اس کی مدد نہ کرو گے اور کیا ایسے وقت میں تم روپے کا منہ دیکھو گے۔ میرا تعلق انجمن سے ایسا ہی ہو گیا ہے کہ میں اسے اپنی ذات سے جدا نہیں سمجھتا اور انشاء اللہ یہ تعلق جب تک دم میں دم ہے ایسا ہی قائم رہے گا خواہ میں سیکریٹری رہوں یا نہ رہوں۔"

اس عزم اور ہمت سے کام کیا جائے تو ناکامی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ ایک ایک دروازے پر گئے۔ ہر دروازہ کھٹکھٹایا۔ ان لوگوں کے آگے بھی ہاتھ پھیلایا جن سے ملنا بھی وہ عار سمجھتے تھے۔ کہیں سے صاف جواب ملا، کہیں سے جھولی بھر گئی۔

ان کی محنت اور جاں فشانی سے انجمن کے مرجھائے ہوئے پودے میں جان پڑنی شروع ہو گئی۔ عبدالحق کے ذاتی مراسم اور نیک نامی کی بدولت مملکتِ آصفیہ نے فیاضانہ مدد کی۔ اعلیٰ حضرت نظام نے انجمن کی سرپرستی قبول کی اور بارہ سو روپے سالانہ منظور ہوئے۔ ۱۹۱۶ء میں یہ رقم پانچ ہزار سالانہ ہو گئی۔ فرماں روائے بھوپال نے پچاس روپے ماہانہ منظور کیے۔ مستقل ارکانِ اعانت کی تعداد ۹۴ تک پہنچ گئی۔

کلکتہ، جالندھر اور بمبئی میں انجمن کی شاخیں اور کتب خانے قائم ہوگئے۔ انجمن کا دفتر ایک پرانے صندوق سے نکل کر میز، کرسی پر آگیا۔

○☆○

کسی زبان کی خدمت کرنے کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ علمی و ادبی سرمائے میں اضافہ کیا جائے۔ یہ کام شاعروں اور ادیبوں کا ہے۔ دوسرا کام یہ ہے کہ زبان کی نشرواشاعت اور ترقی کے لیے لوگوں کو آمادہ کیا جائے۔ یہ کام ان لوگوں کا ہے جو زبان کی ثقافتی اہمیت سے واقف ہوں جو یہ جانتے ہیں کہ زبان کے آئینے میں ان گنت تجربات، نئے نئے جلوے نظر آتے ہیں۔ قوم کی ترقی کا اندازہ اس قوم کی ترقی سے کیا جاتا ہے۔

پہلی صورت پر عمل کرنے والے تو بہت تھے مگر دوسری صورت سے سامنے آنے والا کوئی نہیں تھا۔ قدرت نے عبدالحق کی صورت میں ایک آدمی انجمن کے سپرد کردیا جس نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس زبان کی ترویج و اشاعت میں وقف کردیا۔ نہ دشمنوں کی پروا کی نہ پاؤں کے آبلوں کی۔ اس کا پیغام گھر گھر پہنچایا۔ خطابت کے سہارے دلوں کو گرمایا۔ انشاپردازی کے ذریعے ذہنوں کو جلا بخشی۔ اپنی فوج کے لیے مزید سپاہی تیار کیے۔ الغرض وہ سب کچھ کیا جو ایک رہنما کو کرنا چاہیے۔ یہ کام ہرگز اکیلے آدمی کے بس کا نہیں لیکن جب تک وہ اکیلا تھا، سب کام اکیلے ہی کیے۔ پھر یہ ہوا کہ لوگ آتے گئے اور قافلہ بنتا گیا۔

ترقی یافتہ زبان کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ اس میں اعلیٰ درجے کا ادب موجود ہو۔ اس زبان نے زمانے کے سرد گرم زیادہ سے زیادہ دیکھے ہوں اور اس میں ہر موضوع پر کتابیں وافر مقدار میں ہوں۔ اردو کے پاس یہ سب کچھ تھا لیکن پردۂ حجاب میں تھا۔ تاریخ ادب کے کئی سو سال گمنامی کی مٹی میں دفن ہوگئے تھے۔ عبدالحق برسوں سے اس شہر میں آباد تھے جہاں یہ خزانے دفن تھے۔ انہیں اس کا شعور تھا لیکن وہ ان کی دسترس میں نہیں تھے۔ یہ کام ایک دو دن کا تھا بھی نہیں کہ چٹ منگنی پٹ بیاہ والا معاملہ ہوجاتا۔ اس کے لیے بڑے صبرواستقلال کی ضرورت تھی۔ وہ بھی انتظامی اور مالی امداد ہی میں الجھے ہوئے تھے۔ ذرا فراغت ملی تو انہوں نے ذاتی رسوخ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حیدر آباد دکن کے علمی خزانوں کو اپنے قبضے میں کرلیا۔ قدیم اردو کے مخطوطات نہ جانے کہاں کہاں دبے پڑے تھے۔ انہیں تلاش کیا۔ دولت خرچ کی، خوشامدیں کیں۔ تعلقات استعمال کیے اور قلمی نسخے حاصل کرلیے۔

◊◊◊◊◊◊◊◊◊◊◊◊◊◊◊◊◊◊◊◊

”ہمیں صرف اپنے اسلاف کی پونجی ہی پر قانع نہیں رہنا چاہیے بلکہ ہمیں خود بھی اپنے زمانے کے حالات کی رو سے ترقی اور اصلاح کی... لگاتار اور بے دریغ کوشش کرتے رہنا چاہیے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے لیے گزشتہ زمانے میں بہت کچھ ہے لیکن سب کچھ نہیں۔ اس لیے اصلاح کی طرف سے کبھی غافل نہیں رہنا چاہیے۔ جو چیزیں فرسودہ اور بے کار ہوگئی ہیں اس کے بدلنے اور ترک کرنے میں اور جو کار آمد اور مفید ہیں، ان کے اختیار کرنے میں کبھی نہیں چوکنا چاہیے۔“

(اقتباس خطبات)

”تصویر جس قدر بڑی شاندار اور نفیس ہوتی ہے، اسی قدر اسے پیچھے ہٹ کر دیکھنا پڑتا ہے تاکہ اس کے خط و خال واضح طور پر نمایاں ہوسکیں اور صانع کے کمال اور تصویر کے حسن و قبح کا صحیح اندازہ ہوسکے۔ یہی حال بڑے لوگوں کا ہے، ہم عصر بے لاگ رائے دینے سے قاصر رہتے ہیں۔ ان میں موافق بھی ہوتے ہیں۔ موافق مخالف دونوں مبالغہ کرتے ہیں۔ ان میں مخلص بھی ہوتے ہیں اور ریاکار بھی اور بے نفس بھی۔ ایک مدت کے بعد جب مخالفتوں اور حمایتوں کا غبار چھٹ جاتا ہے تو اصل حقیقت آشکارا ہوجاتی ہے۔“

(تمہید، سوانح سرسید
از مولوی عبدالحق

”قومی زبان کی اہمیت اور قوت کو بہت کم لوگوں نے سمجھا ہے۔ اس کا ہر لفظ، ہر جملہ، ہر محاورہ اور روزمرہ۔ اس کی ہر ترکیب ہماری تہذیب ہمارے ادب اور ہماری معاشرت کی جڑوں اور ریشوں تک پہنچی ہوئی ہے اور اس کے ایک ایک لفظ کے پیچھے ہماری تاریخ و تہذیب کا ایک بڑا سلسلہ ہے جس کی تہ میں ہماری زندگی کے نقوش کا ایک جال سا پھیلا ہوا ہے۔“

(عبدالحق)

◊◊◊◊◊◊◊◊◊◊◊◊◊◊◊◊◊◊◊◊

ان مخطوطات کو پڑھنا، سمجھنا اور مصنفوں کے حالات کی چھان بین کرنا ایک اور دقت طلب مسئلہ ہے۔ اس کے لیے صبرِ ایوب کی ضرورت ہوتی ہے۔ مخطوطات کے رسم خط سے آگاہی بھی ایک خاص فن ہے۔ مصنّفین کی عمر اور مخطوطات کے زمانہ، تصنیف و کتابت کا تعین بڑی تحقیق اور

علمی بصیرت چاہتا ہے۔

مولوی عبدالحق نے نہایت جاں فشانی سے ان قلمی نسخوں کو جمع کیا اور نہایت کاوش سے ان کا مطالعہ شروع کردیا۔ یہ سوچے بغیر کہ ساون کب آیا، سردی کب گزر گئی۔ انہیں اب یہ احساس ہوتا تھا کہ قدرت نے انہیں شادی کے بکھیڑے سے دور کیوں رکھا۔ گھرداری میں گھر کر یہ کام پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔

اب سوال یہ تھا کہ ان پوشیدہ کارناموں کو ظاہر کیسے کیا جائے۔ باقاعدہ تصنیفات شائع کرنے کے لیے وقت اور پیسا درکار تھا اور اس وقت مقصود صرف اتنا تھا کہ ان قدیم ادب پاروں کی طرف اہلِ ادب کی توجہ دلائی جائے۔ بہت سوچ سمجھ کر انہوں نے ایک رسالہ نکالنے کی ٹھانی۔ اس کے ذریعے ان کی نگارشات بھی شائع ہوسکتی تھیں اور انجمن کے لیے آمدنی کا ذریعہ بھی بن سکتا تھا۔

رسالے کا نام کیا ہو؟ اس میں سوچنے کی بات ہی نہیں تھی۔ انہوں نے غور کیے بغیر اس کا نام ”اردو“ رکھ دیا۔ وہ یہ سب کچھ اُردو کے لیے ہی تو کر رہے تھے۔ ان کے تو کوئی اولاد بھی ہوتی تو ہر اولاد کا نام وہ اردو ہی رکھتے۔

رسالہ اردو کا پہلا شمارہ جنوری ۱۹۲۱ء کو شائع ہوا۔ اس شمارے میں انہوں نے اس عزم کا اظہار کردیا کہ انہیں آئندہ کیا کرنا ہے۔

”بہت سے ایسے مصنف اور شاعر ہیں جن کا کلام ابھی تک بساطِ قدردانی تک نہیں پہنچا۔ بہت سی کتابیں ہیں جو لکھنے کے بعد ہی گوشۂ گمنامی میں رہ گئیں یا شائع ہوتے ہی ناپید ہوگئیں۔“

”قلم کا مسافر آبلہ پا نہ ہو تو یہاں وہ منظر نظر آئیں گے جن کا لطف اٹھانے اور بیان کرنے کو اک عمر چاہیے۔ بہت سے خزانے ایسے ہیں جو ابھی تک پردہ خفا میں ہیں اور جنہیں ہوا تک نہیں لگی۔ ہمت جی نہ چرائے تو بہت سی کانیں ہیں جو ابھی کھودنی ہیں۔“

”میں چاہتا ہوں یہ رسالہ اردو زبان اور ادب کی ایسی مفید اور محققانہ بحثوں سے مالا مال ہو کہ شائقینِ ادب اسے غور اور شوق سے پڑھیں اور فائدہ اٹھائیں۔“

ان کی یہ تمنا پوری ہوئی۔ ان کی چشم تحقیق نے نایاب گنج ہائے گراں مایہ ’پردۂ خفا سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے جس سے بلاشبہ اردو زبان و ادب کی تاریخ میں کئی صدی کا اضافہ ہوگیا۔ انہوں نے اردو زبان کی نشوونما‘ رسم الخط‘ زبان و ادب پر خود بھی عالمانہ مضامین لکھے اور دوسروں سے بھی لکھوائے۔

اب رسالہ اردو کے ذریعے ایک ایسا میدان ان کے ہاتھ لگ گیا تھا جہاں ان کا تحقیقی شوق پاؤں پھیلا سکتا تھا۔

جنوری ۱۹۲۲ء میں انہوں نے رسالہ اردو میں سلطان محمد قلی قطب شاہ کی کلیات پر ایک مقالہ شائع کیا۔ محمد علی کی کلیات پر سیر حاصل بحث کی۔ اس کے علاوہ نمونۂ کلام بھی شائع کیا خوبیوں کو گنوایا اور محاسن اجاگر کیے۔

اس مضمون کے شائع ہوتے ہی اردو زبان و ادب سے شغف رکھنے والے حیرت زدہ رہ گئے۔ انہیں پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ اکبر و جہانگیر کے اس ہم عصر نے پچاس ہزار کے قریب اشعار چھوڑے ہیں۔

اب تک محمد حسین آزاد کے کہنے کے مطابق ولی دکنی کو اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر قرار دیا جاتا تھا۔ اس تحقیقی مقالے نے نہ صرف یہ سہرا ولی کے سر سے اتار دیا بلکہ اردو شاعری کی تاریخ کو دو سو سال آگے بڑھا دیا۔ یہ زبانِ اردو کے سلسلے میں ایک انقلاب انگیز انکشاف تھا۔

اسی طرح انہوں نے سلطان قلی قطب شاہ کے دور کے ایک نثر نگار اور شاعر ملا وجہی کی کتاب ”سب رس“ کا تعارف کرایا اور اس پر شاندار مقدمہ تحریر کیا۔

اس مقالے کی اشاعت سے قبل یہ سمجھا جاتا تھا کہ شاہ فضل اللہ فضلی کی ”دہ مجلس“ اردو نثر کی پہلی کتاب ہے۔

رسالہ اردو جولائی ۱۹۲۵ء میں ”سب رس منظوم“ کے عنوان سے ان کا ایک مضمون شائع ہوا جس میں یہ واضح کیا گیا تھا کہ وجہی کی ”سب رس“ اتنی مقبول ہوئی کہ شاہ حسین ذوقی اور بحری نے سب رس کے قصے کو منظوم کیا۔ اسی بہانے انہوں نے ان دونوں مصنفین کے بارے میں نہایت تحقیقی معلومات فراہم کیں۔

قدیم اردو پر ایک لامتناہی سلسلہ تھا جو رسالہ اردو کے ذریعے پڑھنے والوں تک پہنچ رہا تھا اور اردو کے ادبی و علمی سرمائے میں اضافے کا سبب بن رہا تھا۔

سیکڑوں ایسے شاعر و ادیب جو گمنامی میں تھے ان کی کوششوں سے منظرِ عام پر آتے چلے گئے۔ قدیم اردو کا پورا خزانہ انہوں نے کھنگال ڈالا۔

ان کی سعی و تلاش نے نہ صرف اردو ادب کی تاریخ کو کئی صدی اُدھر تک وسیع کردیا‘ گیارھویں صدی ہجری کے بجائے ساتویں صدی ہجری میں اسے بولتے ہوئے سنا دیا۔

انہوں نے انجمن اور دوسرے اداروں یا اشخاص کی طرف سے شائع ہونے والی کتابوں پر بلند پایہ مقدمات لکھے۔ ان مقدمات کے ذریعے دنیا کو یہ معلوم ہوا کہ وہ صرف ایک محقق ہی نہیں‘ تنقید نگار بھی ہیں۔

حالی اردو کے پہلے سوانح نگار تھے اور عبدالحق ان کے تربیت یافتہ لہٰذا انہوں نے بھی سیرت نگاری کے کئی نمونے پیش کیے۔ ان افراد کے بارے میں لکھا جو ان کے مشاہدے میں آئے تھے اور اس خوبی سے لکھا کہ ان کے یہ خاکے اردو ادب کا مستقل حصہ بن گئے۔ جو کچھ کہا بے لاگ انداز میں کہا۔ اپنی ذاتی پسند اور ناپسندیدگی کو حق اور سچ کا پردہ نہیں بننے دیا۔ ان خاکوں میں بھی ان کا تحقیقی مزاج کارفرما نظر آتا ہے۔ شخصیت کے ہر اچھے' بُرے پہلو تک ان کی نظر جاتی ہے۔ مرعوب ہونا ان کی فطرت ہی میں نہیں تھا لہٰذا ان کے یہ خاکے قصیدے کی شکل اختیار نہیں کرتے۔ آدمی کتنا ہی بڑا ہو ان کے خاکوں میں آدمی ہی نظر آتا ہے۔

ان خاکوں کی زبان بھی تنقیدی مضامین سے مختلف تھی۔ لفظ' ترکیبیں اور محاورے ان کے تابع فرمان نظر آتے تھے۔ عبارت میں متین' باوقار' پُرشکوہ فارسی اور عربی لفظوں کے شانہ بشانہ ایسے لفظ بھی صف بستہ نظر آتے تھے جنہیں دوسرے ادیب محض بولی ٹھولی سمجھ کر نظرانداز کردیتے ہیں۔ ان خاکوں نے انہیں محقق اور تنقید نگار سے ہٹ کر تخلیقی ادیب کی صف میں لاکھڑا کیا۔

غرضیکہ ان کی کاوشوں نے انہیں محقق' مؤرخ' ناقد' ماہرِ تعلیم' ماہرلسانیات' ادیب کے روپ میں پیش کیا لیکن ان سب پر حاوی اُن کی وہ خدمات تھیں جو وہ اردو کے فروغ کے لیے کررہے تھے۔

انجمن کا کام اب اتنا بڑھ گیا تھا کہ اس کے لیے اب علیحدہ مکان کی ضرورت تھی۔ لہٰذا وہ دفتر سمیت "نادر منزل" منتقل ہوگیے۔

یہ ایک پہاڑی نما ٹیکری پر بنی ہوئی نہایت شاندار کوٹھی تھی۔ گیٹ اور کوٹھی میں آدھ فرلانگ کا فاصلہ تھا۔ سڑک ایک بہت بڑے لان کے ساتھ گھومتی ہوئی پورچ تک آتی تھی۔ پھولوں کی کیاریاں پھولوں سے بھری ہوئی۔ لان کے اوپر ایک طرف بہت بڑا گھنا برگد کا درخت جس کے چاروں طرف چڑیوں کا پنجرہ۔

اندر داخل ہوجایئے تو پہلے بڑا ڈرائنگ روم پھر ایک بڑا ہال کمرا جس میں دیوار کے چاروں طرف کتابوں کی بہت اونچی اونچی الماریاں۔ درمیان میں ایک لمبی میز اور بہت سی کرسیاں۔ اس کے ساتھ ایک اور کمرا جو ان کا اپنا دفتر تھا۔ ہر طرف کتابوں کی اونچی الماریاں۔ ایک طرف لکھنے کا ڈیسک۔ کچھ فاصلے پر ایک آرام دہ کرسی جس کے قریب پیچوان (حقہ) رکھا ہوا۔ ایک طرف چھوٹی سی میز پر چائے کی پتی کے ڈبے پیالیاں اور چائے دان۔

تین کمرے کاتبوں کے لیے مخصوص تھے۔ فرش پر جاجم بچھی ہوئی۔ پیلے رنگ کے کاغذ ہر طرف بکھرے ہوئے۔

ایک کمرا ان کے سونے کے لیے مخصوص تھا۔ ایک مسہری اور لوہے کی کیبنٹ کے علاوہ یہاں بھی کتابوں کی چھوٹی چھوٹی الماریاں تھیں۔

اسی طرح چند اور کمرے تھے جو انجمن میں کام کرنے والوں کے تھے۔ مثلاً عابد حسین' احتشام الحق' اختر حسین رائے پوری وغیرہ۔

یہ کوٹھی واقعی انجمن اردو کے شایانِ شان تھی جس میں کام کے وقت صرف کام ہوتا تھا۔ دفتری اوقات کے بعد ملنے والے آجاتے تھے لیکن دراصل یہ بھی ایک قسم کا کام ہی تھا کیونکہ یہ دوست بھی کسی نہ کسی ادبی نکتے پر بحث کرنے کے لیے ہی جمع ہوتے تھے۔

"چند اقتباسات"

"جو نہ سمجھنا چاہے' اسے کون سمجھا سکتا ہے۔"

(خطبات)

"آنکھوں کے اندھے کو انگلی پکڑ کر رستہ دکھا سکتے ہیں لیکن عقل کے اندھے کے لیے رہنمائی کی کوئی تدبیر نہیں ہوسکتی۔"

(خطبات)

"زندگی بسر کرنا اور اسے صحیح طور سے برتنا ہی خود ایک بڑی نیکی ہے اور یہ تعلیم ادب کی اصل غرض وغایت ہے۔"

(خطبات)

"عقیدت اور محبت آدمی کو اندھا کردیتی ہے۔ تنقید نظر نیچی کرلیتی ہے اور انصاف ادھر منہ پھیرلیتا ہے۔"

(تنقیداتِ عبدالحق)

"اپنے سہارے آپ کھڑا ہونا خدا کی بڑی نعمت ہے اور بڑے پن کی علامت ہے جو دوسروں کا سہارا تکتا ہے وہ خود کبھی نہیں بڑھتا جو بڑھتا ہے تو جتنا پاتا ہے اس سے زیادہ کھوتا ہے۔"

(چند ہم عصر)

"ہر دور کا ایک تقاضا ہوتا ہے۔ اس تقاضے کو سمجھنا اور سمجھ کر اپنے ماحول اور حالات کی رو سے اپنی تنظیم کرنا اس کارزارِ حیات میں سنبھلے رہنے اور کامیاب ہونے کے لیے ضروری ہے۔"

(چند ہم عصر)

مولوی عبدالحق نے ہر بڑے آدمی کی طرح ایسے لوگ تیار کرلیے تھے جو ادبی کاموں میں ان کی معاونت کرسکیں۔ خود بھی سخت محنت کرتے تھے اور اپنے ساتھیوں سے بھی یہی توقع کرتے تھے۔ کسی رورعایت کے قائل نہیں تھے۔ اس لیے غصہ ور اور اکل کھرے مشہور ہوگئے تھے حالانکہ اندر سے بہت نرم بھی تھے۔

مولوی صاحب کی نگرانی میں انجمن نے ترقی کے کئی زینے طے کرلیے۔ ہندوستان کے ہر حصے میں انجمن کی شاخیں قائم کردی گئیں۔ ان شاخوں کے زیرِ نگرانی اردو مکتب اور کتب خانے کھولے گئے۔ اس ذریعے سے بہت سے ناخواندہ لوگوں نے اردو زبان سیکھی اور بعض ایسے علاقوں میں اردو کو پہنچایا گیا جہاں اس سے بہت کم لوگ واقف تھے۔

سرمائے کی فراہمی ہوتے ہی عبدالحق نے انجمن کی مطبوعات کا سلسلہ شروع کردیا۔ اہم ادبی کتابوں کو مرتب کرواکے شائع کیا۔ بہت سی اہم اور نادر کتابیں منظرِ عام پر آئیں۔ اس طرح معلوم ہوا کہ اردو زبان ہندوستان کی علاقائی زبان کی طرح کم مایہ نہیں۔ انجمن کے اس اقدام کی وجہ سے اردو ادب اور زبان کی تاریخ میں نمایاں تبدیلی بلکہ انقلاب رونما ہوا۔

انجمن نے اردو زبان کی تہی دامنی کو ختم کرنے کے لیے علمی وفنی کتابوں اور عالمی ادبیاتِ عالیہ کے تراجم کی طرف بھی توجہ کی۔ ایک ایسا انگریزی، اردو لغت بھی تیار کیا جس نے مترجمین کی مشکل کو آسان کردیا۔ مختلف علوم کی اصطلاحات کو وضع کیا گیا۔

ان کی کامیابیوں کو دیکھتے ہوئے حکومتِ حیدرآباد نے اردو زبان کی جدید و مکمل لغت کی تالیف ان کے سپرد کی۔ یہ کام اتنا بڑا تھا کہ برسوں کی محنت درکار تھی کیونکہ مولوی صاحب کے الفاظ میں۔

"ہر لفظ کے متعلق یہ بتانا ہوگا کہ وہ کب، کس وقت اور کس شکل میں اردو زبان میں آیا اور اس کے بعد سے اس کی شکل وصورت اور معانی میں کیا کیا تغیر ہوئے اور اس کے کون کون سے معانی متروک ہوئے اور اس میں اب تک کون کون سے نئے معنی پیدا ہوئے۔ ان تمام امور کی توضیح کے لیے ادیبوں کے کلام سے نظائر پیش کرنے ہوں گے۔ ہر لفظ کی تحقیق کرکے یہ بتانا ہوگا کہ یہ کس زبان کا لفظ ہے اور اس کی صورت وہی ہے یا بدل گئی۔"

ظاہر ہے ان خطوط پر ایک جامع لغت کی ترتیب کس قدر دشوار اور محنت طلب امر تھا مگر مولوی عبدالحق نے بڑی حوصلہ مندی سے اس کام میں ہاتھ ڈالا۔ ہندی اور سنسکرت کے ماہرین کا تقرر عمل میں آیا۔ نظم ونثر کی مستند کتابوں سے اسناد ڈھونڈنے کے لیے کئی اصحاب کو مقرر کیا۔

اب تک دنیا انہیں ایک محنتی کارکن اور محقق کے طور پر جانتی تھی لیکن اس لغت کی تیاری کے مرحلوں کے دوران میں یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ بہت بڑے ماہرِ لسانیات بھی ہیں۔ الفاظ کی ساخت، ارتقائی تغیرات مرکبات ومحاورات، لفظوں کے خاندان اور ان کے سفر پر ان کی نگاہ بہت گہری ہے۔ بات یہ تھی کہ وہ اردو کے عاشق تھے اور عاشقوں کے لیے پہاڑ کھود کر نہر نکالنا ناممکن نہیں ہوتا۔

انہوں نے معالج کا نہیں مسیحا کا کام انجام دیا۔ وہ مصنف جو معنوی طور پر مرچکے تھے، انہیں زندگی عطا کی۔ متعدد قدیم ونایاب تذکروں کا کھوج لگا کر انہیں ترتیب دیا۔ بیسیوں دکنی مخطوطات کو گم نامی کے عمیق غاروں سے نکال کر زندگی کی دھوپ سے آشنا کیا۔

ان کی ان کاوشوں نے اس عام نظریے کو باطل کردیا کہ اردو لشکری زبان ہے اور جس نے مغل سلاطین خاص کر شاہجہاں کے عہد میں جنم لیا۔ انہوں نے بابر کی آمد سے بھی سو برس پہلے کی کتابیں دریافت کیں۔

ان کا ایمان تھا کہ مسلمانوں کی بہبود و ترقی کا دارومدار اردو کی ترقی اور ترویج پر ہے۔ ملک کے سیاسی حالات بھی اس طرف جارہے تھے کہ آئندہ اردو پر برا وقت آنے والا تھا۔ اس صورتِ حال میں ضروری تھا کہ ذریعہ تعلیم اردو ہو تاکہ اردو ایک زبان نہیں، مجبوری بن جائے لیکن یہ اس وقت ہوسکتا تھا جب کوئی ادارۂ تعلیم ایسا بنایا جائے جہاں اردو میں اعلیٰ تعلیم کا انتظام ہو۔ اس کام کی توقع غیروں سے رکھنا فضول تھا اور یہ کام تھا بھی ایسا کہ حکومتی امداد کے بغیر ممکن ہی نہیں تھا۔ وہ ایک ایسی یونیورسٹی کا خواب دیکھ رہے تھے جہاں ہر مضمون کی تعلیم اردو میں دی جائے۔ یہ کام حکومت ہند نہیں کرسکتی تھی۔ البتہ انہیں.... حکومت حیدرآباد کی ادب نوازی سے امید تھی کہ وہ یہ بارِ گراں اٹھا سکتی ہے۔ انہوں نے اپنی خواہش کا اظہار مختلف حلقوں میں کرنا شروع کردیا۔ وہ اس وقت انسپکٹر آف اسکولز تھے اور تعلیم کا وسیع تجربہ رکھنے کی وجہ سے ان کی بات میں وزن ضرور تھا۔

سراکبر حیدری نواب حیدر نواز جنگ وزیر تھے۔ سیاہ سفید کے مالک تھے۔ ریاست کے مالک تھے اور سب سے بڑی بات یہ کہ علم وادب کے شائق تھے۔ عبدالحق نے یہ

ہٹلر کے عقائد اور نظریات

معاشرتی اصلاح کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ قوم کی تہذیب اور مالی انتظام میں جو بنیادی خلل ہے اسے دور کیا جائے۔ جب تک یہ خلل باقی ہے' انسان کا تنزل لازمی نتیجہ ہے۔ خود یہ خلل اگر انسان کو ذلیل نہیں کرتا تو کم از کم ذلت کے راستے پر ضرور ڈال دیتا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ حکومت سے مزدور طبقے کی دشمنی دور نہیں کی جا سکتی؟ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ حکومت مزدور کی زبوں حالی کے اسباب شناخت کرنے میں ڈگمگاتی ہے۔ جب تک حکومت کو پہلے یہ سمجھ نہ آجائے کہ مزدور کیوں اس کے دشمن ہیں' اس دشمنی کے اسباب کو پوری سختی کے ساتھ جڑ سے اکھاڑ پھینکنا کیونکر ممکن ہو سکتا ہے۔ اختیار کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں رکھنے والے اگر یہ نکتہ سمجھ لیں کہ قوم کو خیرات کی نہیں' مساوات کی ضرورت ہے تو سارا جھگڑا ہی ختم ہو جائے۔ قوم کی زبوں حالی دو طرح سے دور کی جا سکتی ہے۔ اوّل تو یہ کہ قوم میں باہمی ذمے داری کا شدید احساس پیدا کر کے ان بنیادوں کی اصلاح کی جائے جن پر سوشل ترقی کا دارومدار ہے۔ دوسرے یہ احساس پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ بغیر کوئی رحم کیے قوم کے جسم سے وہ تمام پھوڑے پھنسیاں کاٹ کر پھینک دینی چاہئیں جن کا علاج ناممکن ہے۔

آفتاب احمد نصیر' کورنگی کراچی

منصوبہ ان کے سامنے رکھا۔ انہیں بھی اسی طرح تعجب ہوا جس طرح دوسروں کو ہوتا تھا۔

"میں نہیں سمجھتا کہ یہ ممکن ہو گا۔ اردو سے محبت الگ بات ہے لیکن اس محبت کو اندھا نہیں ہونا چاہیے۔"

"نواب صاحب' میں نے اچھی طرح سوچ لیا ہے۔ آپ کی ریاست اگر مالی معاونت کرتی ہے تو پھر یہ کسی طرح مشکل نہیں۔"

"مولوی صاحب! کسی مدرسے میں بچوں کو اُردو میں سبق یاد کرا دینا الگ بات ہے اور اس زبان میں اعلیٰ تعلیم دینا دوسری بات ہے۔"

"جناب' اردو کے ساتھ ہمیشہ یہی ہوا ہے۔ اب سے کچھ ہی برس پہلے تک یہ کہا جاتا تھا کہ اُردو کے پاس اتنا سرمایۂ الفاظ نہیں کہ اس میں ہر قسم کے موضوعات کو بیان کرنے کی طاقت ہو لیکن آپ نے دیکھا سرسید مرحوم نے اس خیال کو باطل کر دیا۔ اب کوئی یہ نہیں کہتا۔ اب یہ کہا جا رہا ہے کہ اردو میں تعلیم نہیں دی جا سکتی۔"

"اگر یہ اتنا آسان ہوتا تو سرسید یہ کام پہلے ہی کر چکے ہوتے۔"

"ان کے زمانے کی ضرورت دوسری تھی۔ ویسے ایک ورنیکلر یونیورسٹی قائم کرنے کا منصوبہ ان کے ذہن میں تھا ضرور۔ میری ان سے کئی مرتبہ اس موضوع پر بات ہوئی تھی۔"

"میں آپ جیسا لائق تو نہیں کہ بحث میں آپ سے جیت سکوں لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ ہر مضمون پر اردو میں کتابیں موجود نہیں۔ خاص طور پر سائنس کا میدان تو بالکل خالی ہے۔"

"میں آپ سے صد فیصد اتفاق کرتا ہوں لیکن کتابیں مہیا کی جا سکتی ہیں۔"

"وہ کس طرح؟"

"ہم دوسری زبانوں سے تراجم کر سکتے ہیں۔ لائق لوگوں سے نئی کتابیں لکھوا سکتے ہیں۔"

"اس میں تو بہت دیر لگ جائے گی۔"

"میں بھی یہ نہیں کہتا کہ یہ کام کل ہی ہو جائے گا۔ آپ ڈول تو ڈالیں' ابتدا تو کریں۔"

"اساتذہ کہاں سے لائیں گے؟"

"اساتذہ کو بے شک دہری محنت کرنی پڑے گی۔ ان کی تربیت کسی دوسری زبان کے ذریعے ہوئی ہے لیکن یہ وقت تھوڑے دن رہے گی۔ ان کے پڑھائے ہوئے طالب علم جب فارغ التحصیل ہوں گے تو ہمیں اساتذہ کی کمی قطعی محسوس نہیں ہو گی۔"

"اگر ابتدا میں کالج قائم کریں اور پھر یونیورسٹی تک پہنچیں؟" سر اکبر حیدری نے کہا۔

"یہ بھی ہو سکتا ہے بلکہ یہی ہونا چاہیے۔"

"محسن الملک ہیں۔ سر راس مسعود ہیں۔ ذرا ان لوگوں سے بھی مشورہ کر دیکھیے۔"

"میں ان حضرات سے بات کر چکا ہوں۔ انہیں بھی ابتدا میں کئی شبہات تھے لیکن میں سب رفع کر چکا۔ ویسے ان سے اور بات کر لی جائے گی۔ سرکاری منظوری کے بغیر یہ کام نہیں ہو سکتا اور یہ کام آپ ہی کر سکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں حضور نظام کے روبرو یہ منصوبہ رکھ دوں گا۔ آگے ہماری قسمت۔"

"منصوبہ ان کے سامنے رکھنا نہیں ہے، سفارش کرنی ہے۔ میں انکار نہیں سن سکوں گا۔"

"مولوی صاحب، آپ ہیں بڑے ضدی۔ سمجھئے یہ کام ہوگیا۔"

ریاستی کاموں میں دیر تو لگتی ہے۔ بہت دن بیت گئے لیکن نتائج اچھے ہی نکلے۔ جامعہ عثمانیہ کی تیاری اور کتب کی فراہمی کے لیے ان ہی کے مشورے سے دارالترجمہ کا قیام عمل میں آگیا۔ ہندوستان بھر سے مشہور اہلِ قلم کو مدعو کیا گیا۔ ہندوستان بھر سے مشہور اہلِ قلم کو مدعو کیا گیا۔ مولوی صاحب اس کے ناظم مقرر ہوئے۔ جوش ملیح آبادی، جلیل مانک پوری، مرزا ہادی رسوا، فرحت اللہ بیگ اور ایسے ہی بہت سے دوسرے باکمال حیدر آباد میں آبسے۔

کتب کی فراہمی آسان کام نہیں تھا لیکن دو سال کی قلیل مدت میں نصابی کتابیں تیار ہوگئیں۔

جامعہ عثمانیہ کے افتتاح کے بعد ان کا کام ختم ہوگیا تھا لہٰذا وہ اورنگ آباد واپس چلے گئے۔ وہاں پہنچتے ہی انہیں عثمانیہ کالج کا پرنسپل مقرر کردیا گیا۔

انجمن کا کام بڑھتا جارہا تھا۔ لغت کی تیاری کے لیے بھی انہیں بہت سارا وقت پس انداز کرنا ہوتا تھا۔ ایسے میں ملازمت کا بار اس کے لیے سوہانِ روح بنا ہوا تھا لیکن اردو کی خدمت کے ساتھ ساتھ حکومت حیدر آباد بھی ان کی اہلیت سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔ اس لیے فراغت کی کوئی صورت نہیں تھی۔ اس نے کئی مرتبہ ملازمت کو خیرباد کہنے کا ارادہ کیا لیکن ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی ہتھ کڑی ان کے ہاتھ میں ڈال دی گئی۔ بالآخر انہوں نے ۱۹۳۰ء میں پنشن لے لی۔ اب وہ آزاد تھے۔ اپنا تمام وقت انجمن کے سپرد کرسکتے تھے لیکن یہ آزادی زیادہ دن نہیں چل سکی۔ سر اکبر حیدری ایک مرتبہ پھر اس کے سامنے آگئے۔

"جامعہ عثمانیہ کو آپ کی ضرورت ہے۔"

"آپ دیکھ رہے ہیں حالات کیا رخ اختیار کررہے ہیں۔ اردو کو ہندو دشمنی کا سامنا ہے۔ مجھے اس کا دفاع کرنا ہے۔ اس کے لیے وقت درکار ہے۔ اس لیے میں نے ملازمت ترک کی ہے۔ آپ پھر مجھے اسی خارزار میں لے جانا چاہتے ہیں۔"

"میں آپ کو جہاں لے جانا چاہتا ہوں وہ آپ ہی کا لگایا ہوا پودا ہے۔ اس کی سیرابی بھی آپ ہی کی ذمے داری ہے۔"

"اس کے لیے اب بہت سے لوگ ہیں لیکن جو کام میں کررہا ہوں، وہ میں ہی کرسکتا ہوں۔"

"میں نے کب کہا کہ آپ اپنا کام چھوڑ دیں۔"

"بے شک آپ نے نہیں کہا لیکن میں بقیہ عمر اورنگ آباد میں گزارنا چاہتا ہوں۔ یہاں کی آب و ہوا مجھے راس آگئی ہے۔"

"دیکھ لیجئے مولوی صاحب! ایک مرتبہ آپ نے مجھ سے کچھ کہا تھا۔ میں نے آپ کی بات فوراً مان لی تھی۔ اب آپ کی باری ہے۔ جامعہ عثمانیہ کا شعبۂ اردو ایک عدد صدر کا انتظار کررہا ہے اور وہ آپ ہیں۔"

اس کے بعد کوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی کہ وہ انکار کرتے۔ وہ صدرِ شعبہ اردو ہو کر حیدر آباد آگئے۔

○☆○

ہندی، اُردو کا جھگڑا سرسید کی زندگی ہی میں سر اٹھا چکا تھا۔ حالات بدلے تو اس جھگڑے نے ایک مرتبہ پھر سر اٹھایا۔ اب اس کے سیاسی مقاصد بھی تھے۔ واردھا اسکیم کے نام پر اردو اور اسلامی ثقافت کے خلاف سازشیں تیار کی جارہی تھیں۔ گاندھی جی کی حمایت اور اردو دشمنی نے عام ہندوؤں کو بہت پُرجوش بنادیا تھا۔ رسم الخط بدل دینے کی باتیں ہورہی تھیں۔ اردو کو محض مسلمانوں کی زبان سمجھ کر اسے مٹادینے کی باتیں ہورہی تھیں۔ مسلمانوں میں اس کا شدید ردِعمل تھا۔ چنگاریاں بھڑکنے کے لیے تیار تھیں۔ انہی دنوں عثمانیہ کالج میں کالج ڈے منایا گیا۔ عبدالحق نے اس موقع پر ایسی جذباتی اور دل سوز تقریر کی کہ طلبہ میں کھلبلی مچ گئی۔ ایک جوشیلے نوجوان یوسف نے نعرہ لگایا۔

"بابائے اردو، زندہ باد۔"

اس نعرے کے لگتے ہی ہزاروں آوازیں گونجنے لگیں۔

"بابائے اردو زندہ باد۔"

اس موقع کی خبر اورنگ آباد کے ایک ہفتہ وار میں شائع ہوئی، سرخی تھی۔

"بابائے اردو کا، کالج کے طلبہ سے خطاب۔"

اس خبر کا لگنا تھا کہ یہ خطاب پورے برصغیر میں پھیل گیا۔ اب وہ جہاں جاتے اسی نام سے پکارے جاتے۔

یہ خطاب محض جذباتی نعرہ نہیں تھا۔ عبدالحق اس کے بجا طور پر اہل تھے۔ دنیا کی کسی زبان کی تاریخ میں کوئی ایسی شخصیت پیدا نہیں ہوئی جس نے اپنی تمام زندگی زبان کی خاطر معرکہ آرائیوں میں گزاردی ہو۔ عبدالحق یہی کررہے تھے لہٰذا یہ لقب ان پر جچنے لگا۔ اب وہ بابائے اردو تھے۔ بڑوں کے لیے بھی چھوٹوں کے لیے بھی۔

۱۹۳۵ء میں اردو کے خلاف باقاعدہ مورچا قائم کیا گیا۔

بھارتیہ ساہتیہ پرشد اور ودیا مندر اسکیم کے تحت ہندی کو فروغ دینے کی مہم کا آغاز ہوا۔ یہ ایسی سازش تھی کہ اگر بروقت اس کے خلاف جوابی مورچا قائم نہ کیا جاتا تو اردو کا وجود ہی خطرے میں پڑجاتا۔ یہ مسئلہ نہ تو بظاہر سیاسی تھا نہ مذہبی اس لیے رہنمایانِ ہند خاموش تھے جبکہ گاندھی جی ان کوششوں میں برابر کے شریک ہورہے تھے۔ گاندھی جی نے سیاست اور لسانیات کو ہم رشتہ کرنے کی کوشش کی تو سارا ملک دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ ایک طرف اردو کے حامی تو دوسری جانب اردو کے طرف دار پیدا ہوگئے۔ ہندی کے طرف دار زیادہ طاقت ور تھے کیونکہ گاندھی جیسی بڑی شخصیت ان کی رہنمائی کررہی تھی۔

اب مولوی عبدالحق کی باری تھی۔ اب تک انہوں نے کرم خوردہ کتابوں پر نظریں جمائی ہوئی تھیں، اب ایک دوسری قسم کی جنگ سے سابقہ تھا۔ اب تک بے جان حروف ان کے سامنے تھے لیکن اب شعلے اگلتی ہوئی زبانوں سے واسطہ تھا۔ اب ملک گیر دورے کرکے اردو کی اہمیت کو ثابت کرنا تھا۔ انہیں یہ بتانا تھا کہ ہندوستان میں انگریزی راج کے استحکام کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی کہ انگریزوں نے ہندوستانیوں کو انگریزی زبان میں تعلیم دے کر ان کی قومی اور تہذیبی خصوصیات کو ختم کردیا۔ اب یہی کھیل ہندو ہمارے ساتھ کھیلنا چاہتا ہے۔

انہوں نے کمرِہمت باندھی اور ایک ایک شہر میں جاکر اردو کی اہمیت پر تقریریں کیں۔

"کچھ لوگ یہ خیال کرتے ہیں جیسا کہ گاندھی وغیرہ نے فرمایا کہ اردو زبان مسلمان بادشاہوں نے پھیلائی اور حکومت کے زور سے پھیلی، وہ نہ صرف اس زبان کی تاریخ سے ناواقف ہیں بلکہ اصولِ لسانیات سے بھی ناآشنا ہیں۔ مسلمان بادشاہوں نے کبھی اس طرف توجہ نہیں کی۔ ان کی سرکاری اور درباری اور دفتری زبان آخر تک فارسی رہی۔"

"یہ امر خاص مسرت کا باعث ہے کہ تقریباً ہر صوبہ اس بات کا مدعی ہے کہ اردو زبان نے وہیں جنم لیا۔ اہلِ پنجاب کو یہ دعویٰ ہے کہ اردو کا بیج اس خطے میں اپجا، اہلِ دہلی کا خیال ہے کہ یہ دہلی اور اس کے قرب وجوار کی زبان تھی جو بن سنور کر اردو کہلائی۔ صوبہ متحدہ والے کہتے ہیں کہ میرٹھ اور اس کے پاس کے دیہات کی بولی پر فارسی کی قلم لگائی گئی اور اس سے اردو پیدا ہوئی۔ اہلِ گجرات کہتے ہیں یہ کچی دھات تھی۔ ہم نے اسے نکھارا، سنوارا اور بنایا۔ اہلِ دکن کا

"چند آرا"

"مولوی عبدالحق کا اصل کارنامہ لسانی حیثیت کا ہے۔ اردو کے قدیم تذکرے، دواوین اور نثر کی اہم کتابیں جو ناپید تھیں، وہ مولوی صاحب کی بدولت سامنے آئیں۔"

(ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی)

"اردو کے محسنوں اور مخلص خادموں کی فہرست مختصر نہیں، اچھی خاصی طویل ہے۔ سیکڑوں ناموں سے متجاوز اور خدمات کے لحاظ سے ایک سے بڑھ کر ایک۔ پھر بھی اگر مجموعی طور پر کسی ایک کو محسن اعظم کا لقب دیا جاسکتا ہے تو وہ ذات بلااختلاف بابائے اردو مولوی عبدالحق ہی کی ہوسکتی ہے۔"

(مولانا عبدالماجد دریابادی)

"ملک کے پورے طول وعرض میں، جس میں اردو زبان بولنے والوں کی تعداد کروڑوں سے بڑھی ہوئی ہے۔ اس کی خدمت کرنے والوں کی تعداد اگر مولوی عبدالحق نہ ہوتے تو صفر ہوتی۔ انہوں نے اردو کی تاریخ کئی سو سال آگے بڑھادی۔ ادب اور تاریخ ادب پر تحقیقی مضمون لکھے۔ اردو کے قواعد کو نئے سرے سے مرتب کیا۔ اردو لغت، اردو تذکرے، اردو کے پرانے دیوان اور اردو میں نئے علوم کی عمدہ کتابیں چھپوائیں۔"

(سید سلیمان ندوی)

"مولوی عبدالحق کے کارنامے اس درجہ بلند، گراں مایہ اور پائدار ہیں کہ آج پاک وہند کے آسمان کے نیچے کوئی دوسرا شخص علم وادب اور زبان کے دائرے میں ان کی ہم سری کا دعویٰ نہیں کرسکتا اور جس دور سے ہم گزر رہے ہیں، اس میں مولانا جیسے کسی دوسرے فرد کا پیدا ہونا بظاہر مشکل نظر آتا ہے۔"

(غلام رسول مہر)

"مولوی صاحب کی اردو نثر بہت حد تک سرسید اور حالی کے طرزِ تحریر کی نمائندگی کرتی ہے۔ ان دونوں بزرگوں کی طرح وہ بھی سادگی اور سلاست کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ان کی نثر میں ایک خاص قسم کی پختگی پائی جاتی ہے۔ جس میں دلی کی ٹکسالی زبان کا خاص طور سے رنگ جھلکتا ہے۔"

(ڈاکٹر ابوسعید نورالدین)

○☆○

دعویٰ ہے کہ اس زبان نے ادبی شان یہاں پیدا کی۔ بہار والے چاہیں تو وہ بھی دکن کی طرح اس بات کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ اس سے اردو کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور قبول عام ہی سب سے قوی دلیل اور سب سے بڑی پسند ہے۔"

"قومیت کے لیے یک رنگی کے لیے ہم خیالی کی اور ہم خیالی کے لیے ہم لسانی کی سخت ضرورت ہے۔ جہاں زبان ایک نہیں وہاں خیال کا رنگ ایک نہیں۔ جہاں خیال ایک نہیں وہاں دل بھی ایک نہیں۔ یہ دلوں کو جوڑتی ہے اور بے گانوں کو یگانہ بنا دیتی ہے۔ اردو نے بہ درجۂ کمال یہ خدمت انجام دی ہے۔"

مولوی صاحب نے اپنی تقریروں کے ذریعے اردو کی فضیلت کو ثابت کیا۔ متنازع مسائل کو اس خوبی سے سلجھایا کہ دودھ اور پانی الگ الگ نظر آنے لگا۔ انہوں نے یہ پیغام گھر گھر پہنچا دیا کہ اردو ایک مخلوط زبان ہے۔ اس پر ہر قوم کا برابر کا حق ہے لیکن بعض لوگ محض مسلمان دشمنی میں اردو کی مخالفت کر کے ہندی کا ڈھونگ رچا رہے ہیں۔

ان تقریروں سے مخالف صفوں میں ہلچل مچ گئی۔ نتیجے کے طور پر انہوں نے بھی اپنی کوششیں تیز کر دیں۔ اسی حساب سے عبدالحق کو بھی پینترے بدل بدل کر حملے کرنے پڑے۔

انجمن کی جب بنیاد رکھی گئی تھی تو اس کا مقصد ادبی اور علمی قرار دیا گیا تھا۔ یعنی ترجمے، ترتیب و تالیف کے ذریعے اردو زبان کے ادبی و علمی سرمائے میں اضافہ کرنا۔ اس مقصد کی پابندی کی جا رہی تھی۔ کبھی ہندی یا کسی دوسری زبان کی مخالفت نہیں کی گئی لیکن جب اردو کی ترقی، مخالفوں کو ایک آنکھ نہیں بھائی اور اس کی راہ میں روڑے اٹکائے جانے لگے تو مجبوراً مدافعت کرنی پڑی۔ اردو کی محبت میں وہ بڑی سے بڑی طاقت سے ٹکرا گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ترقی اردو کی تحریک آگ کی طرح پھیل گئی۔ بنگال، بہار، یوپی، سندھ، کشمیر، گوالیار، رانچی، جنوبی بہار، مدراس، آندھرا، ارکاٹ، ملیبار، تامل ناڈو، ٹرانکور تک اپنے خطبات اور تقریروں کا جال پھیلا دیا اور راس کماری تک جا کر دم لیا۔ لوگ محاورے کے طور پر کشمیر تا راس کماری تک کا فقرہ کہا کرتے تھے، عبدالحق نے اسے حقیقت کر دکھایا۔

○☆○

اختر حسین رائے پوری کی شادی کا سلسلہ چل نکلا تھا۔ وہ اپنے طور پر لڑکی کے والد کو خط لکھ چکے تھے۔ لڑکا خود پیغام بھیجے۔ یہ عجیب سی بات ضرور تھی لیکن جرأت مندانہ تھی۔ لڑکی کے والد نے اس جرأت کو پسند ضرور کیا لیکن صاحب زادے کس خاندان سے ہیں، کیسے ہیں یہ بھی تو معلوم ہو۔ جب معلوم ہوا کہ موصوف عبدالحق کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ وہیں رہتے ہیں۔ وہی ان کے سب کچھ ہیں تو انہوں نے بھی ایک خط مولوی عبدالحق کے نام لکھ دیا۔

کچھ دن بعد مولوی صاحب کا خط لڑکی کے والد کو موصول ہوا۔ جس کا خلاصہ کچھ یوں تھا۔

"ان تمام نوجوانوں میں جن سے زندگی بھر میرا سابقہ رہا، ان میں یہ قابل ترین ہیں۔ یہ صرف انگریزی اور اردو ہی کے اچھے عالم نہیں بلکہ سنسکرت، ہندی، بنگلہ اور گجراتی زبانوں کا بھی علم رکھتے ہیں۔ انتہائی مہذب، شائستہ اور روشن خیال ہیں۔ فی الحال وہ میرے ساتھ اردو لغت کے کام میں مصروف ہیں۔

میں ان کے خاندان کے متعلق صرف اتنا جانتا ہوں کہ والد سے کوئی تعلق نہیں مگر اس میں ان کا اپنا کوئی قصور نہیں بلکہ سوتیلی والدہ کا ہاتھ ہے۔

میری رائے تو یہ ہے کہ آپ کو اس معاملے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے۔"

○☆○

لڑکی کے والد نے واقعی کوئی تامل نہیں کیا۔ بابائے اردو کی گواہی بہت تھی۔ انہوں نے پہلی فرصت میں رضامندی کا خط لکھ دیا۔

مزید خطوں کے تبادلے کے بعد شادی کی تاریخ ۲۹ دسمبر ۳۵ء قرار پا گئی۔

اس شادی کی خبر سنتے ہی مولوی صاحب کا ایک نیا روپ سامنے آیا۔ عموماً انہیں جھگڑالو اور غصہ ور سمجھا جاتا تھا لیکن جب اختر رائے پوری کی برات لے کر علی گڑھ گئے تو اسٹیشن پر اترتے ہی اختر کے دوستوں کے ساتھ مل کر ان کی تک بندیوں کے ہم نوا ہو گئے۔

للا روپیہ لائیو ہے
للا کی شادی کردیں گے
کردیں بھئی کردیں گے

مجاز کی شوخیاں مشہور تھیں۔ ممکن ہے مولوی صاحب ان شوخیوں کو پسند بھی نہ کرتے ہوں لیکن اس وقت وہ متانت بھول کر لڑکوں میں لڑکے بنے ہوئے تھے۔

دلہن کے گھر پہنچے تو براتیوں کے لیے خیمے لگے ہوئے تھے۔ سب کے خیمے الگ الگ تھے۔ قریب ہی امرود کا باغ

تھا۔ غالباً یہ مجاز ہی کی شرارت ہوگی کہ خیموں میں ٹھہرنے کے بجائے امرود کے باغ میں بسیرا کیا۔ مولوی صاحب یہاں بھی ان کے ساتھ ساتھ۔ سب نے طرح طرح کے بول گھڑ کر گانا شروع کردیا اور مولوی صاحب انہیں ڈانٹنے کے بجائے ہنس ہنس کر دہرے ہوئے جارہے تھے۔ آخر ڈھونڈ پڑی کہ براتی کہاں گئے۔ گانے کی آواز سے معلوم ہوا کہ براتی تو باغ میں ہیں۔ انہیں وہاں سے بلایا گیا کہ مہمانوں سے ملاقات تو ہوجائے۔

ایک بجے کہا گیا کہ کھانے کے کمرے میں تشریف لے چلیں۔ کھانے کا کمرا بہت بڑا تھا۔ چوبیس آدمیوں کی میز لگی ہوئی تھی۔ بیرے سفید وردی اور اونچی کلاہ میں کھانے کی ڈشیں پیش کرنے لگے۔ سرخ وردی میں بینڈ والے منتظر کھڑے تھے کہ کھانا شروع ہو تو وہ دھن چھیڑیں۔ جیسے ہی مہمانوں نے کھانا پلیٹوں میں نکالا نفیری بجنے لگی۔ مولوی صاحب کو پھر شرارت سوجھی۔

"بھئی اس توں توں پی پی میں کھایا تو کچھ جائے گا نہیں تو چلو پی ہی لیں۔" یہ کہہ کر سامنے رکھی ٹماٹر ساس کی بوتل کھول کر غٹ غٹ پینے لگے۔ ان کو دیکھ کر ان کے ساتھ آئے ہوئے دوستوں نے بھی یہی کیا۔ آخر بینڈ والوں کو باہر بھیجا گیا تب جاکر انہوں نے کھانا شروع کیا۔

یہ معلوم ہوتا تھا جیسے مولوی صاحب تھوڑی دیر کے لیے بچے بن گئے ہیں۔ یہ ان کی خوشی کی انتہا تھی۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے ساتھ کام کرنے والوں کا کتنا خیال رکھتے ہیں اور ان کی خوشیوں میں کس طرح شریک ہوتے ہیں۔

مغرب کے بعد نکاح تھا۔ نکاح کے دوران میں بھی وہ اسی طرح شرارتیں کرتے رہے۔ آخر اللہ اللہ کرکے ایجاب و قبول کا مرحلہ طے ہوا۔

"میں ایک سہرا لکھ کرلایا ہوں۔ پیشِ خدمت ہے" کسی صاحب نے کھڑے ہوکر کہا۔

"سہرا آپ کس خوشی میں پڑھیں گے" مولوی صاحب نے اپنی کراری آواز میں کہا "خوش ہونے کے حق دار ہم ہیں کہ دلہن لے جارہے ہیں۔ ہم سہرا خود لکھ کر لائے ہیں" انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجاز اور ساغر نظامی کو اپنے پاس بلالیا۔ سب ایک ساتھ کھڑے ہوگئے اور سہرا گانا شروع کردیا مولوی صاحب تال دیتے جارہے تھے۔

اک بنجارا یار ہمارا
پھرتا تھا یوں مارا مارا
جیسے ہو اک مرغ بے چارا
ڈھونڈے سہارا دڑبے کا
یہ کیا تم نے دل میں ٹھانی
لکھ ڈالی سب رام کہانی
مندر کی مندر کی
بہن کھلونا بھائی تماشا
آگے تانگا پیچھے گھوڑا
خاکی وردی ہاتھ میں ڈنڈا
تن کے چلے ہے دلہن کا باوا

یہ سب بابائے اردو کی تک بندی تھی۔ کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ ایسا متین بوڑھا' سب کے ہنسنے کا ایسا سامان کرے گا۔ اپنے رعب اپنے وقار تک کو داؤ پر لگادے گا۔

یہ ہنسی نہیں تھی' ان کے اندر چھپے ہوئے وہ ارمان تھے جو وہ اردو کو پالنے پوسنے میں فراموش کرچکے تھے۔ وہ ایک شادی سے بھاگ چکے تھے لیکن کہیں اور شادی کرسکتے تھے لیکن انہوں نے تو انجمن سے شادی کرلی تھی۔ اسی کو تکیہ بنائے بیٹھے تھے۔ اب جو ایک موقع ملا تو مولوی صاحب پھٹ پڑے۔ انہیں بزرگ بنا کرلایا گیا تھا لیکن ان کے اندر چھپا ہوا لڑکا ان کے ساتھ آگیا تھا۔

ان کا ڈنکا اس وقت پورے ہندوستان میں بجتا تھا۔ ہر طرف ان کی شہرت پھیلی ہوئی تھی۔ رعب و دبدبہ طاری تھا لیکن اس وقت وہ بالکل بچے بنے ہوئے تھے۔ ہائے انسان کو اس کی مصروفیات اور اس کے عہدے کا بھرم کیا سے کیا بنادیتا ہے کہ ہنسنے کے لیے بھی اسے وقت نہیں ملتا اور جب ہنستا ہے تو لوگ اسے اس طرح دیکھتے ہیں جیسے کوئی عجوبہ۔ یہ نہیں دیکھتے کہ بال سفید ہیں تو کیا ہوا' روشن آنکھوں میں شفقت کے دیے تو جل رہے ہیں۔

کئی دن کی مہمان داری کے بعد حیدر آباد کے لیے روانگی کا وقت آگیا۔ اسٹیشن پہنچے۔ ریل آکر رکی۔ چار سیٹر ایک ڈبا بک کرایا گیا تھا لیکن جب اندر گئے تو یہ چھ سیٹر نکلا۔ ایک بنگالی جوڑا اپنے دو عدد بچوں کے ساتھ پہلے ہی سے براجمان تھا۔ یہ دیکھ کر مولوی صاحب کا پارا چڑھ گیا۔

"یہ ہاشمی فرید آبادی بھی فضول سے آدمی ہیں۔ بکنگ ان کے ذمّے کی تھی۔ حضرت نے یہ بکنگ کرائی ہے۔"

ہاشمی صاحب نے بکنگ کرائی تھی للٰذا انہی پر غصہ اتارا جارہا تھا۔ بہرحال اب کیا ہوسکتا تھا سامان رکھ دیا گیا۔

تین سیٹیں نیچے کی ان کے پاس تھیں۔ چوتھے پر وہ دو

بنگالی بچے اور اوپر کی دو سیٹوں پر دونوں میاں بیوی۔

ریل اسپیڈ پکڑ چکی تھی' اچانک حمیدہ (دلہن) کو یہ احساس ہوا کہ وہ اپنے میکے سے کتنی دور جا رہی ہے۔ ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ وہ کھڑکی سے سر باہر نکال کر رونے لگی۔ مولوی صاحب کی مشفق آنکھوں سے یہ منظر چھپا نہ رہ سکا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور حمیدہ کے پاس آکر کھڑے ہوگئے۔

"سنو! ہم کو سمندر' دریا اور جھرنوں کا پانی بہت اچھا لگتا ہے مگر یہ آنکھوں کا بہتا پانی قطعی پسند نہیں۔ سر اندر کرو اور اپنے ڈبے کی آب و ہوا اور دیگر ہم سفروں پر غور کرو۔ اب ہمیں ان سے نمٹنا ہے۔"

وہ بے چاری کچھ بھی نہیں سمجھ سکی کہ نمٹنے سے کیا مطلب ہے۔ کیا جھگڑا کریں گے؟ اس نے آنسو پونچھے اور سر اندر کرلیا۔ مولوی صاحب نے چپکے سے اختر کے کان میں کچھ کہا اور دونوں ہنسنے لگے۔ اس کے بعد مولوی صاحب اپنی سیٹ پر آکر بیٹھ گئے۔ اچانک دونوں بچوں کی زوردار چیخیں نکلیں۔ اوپر سے بچوں کے باپ نے بنگالی میں کچھ پوچھا۔ بچوں نے بنگالی ہی میں جواب دیا اور ساتھ ہی مولوی صاحب کی طرف اشارہ کیا۔ مولوی صاحب مزے سے اخبار پڑھ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد بچے پھر زور سے چیخے۔ اس مرتبہ وہ اختر کی طرف اشارہ کررہے تھے۔ حمیدہ نے دیکھا' وہ دونوں ہاتھ کی چونچ بنائے' منہ ٹیڑھا ترچھا کرکے بچوں کو ڈرا رہے تھے۔ حمیدہ حیران تھی کہ وہ ایسا کیوں کررہے ہیں؟

"برا شاب! آپ کیا کرتا ہے۔ بچوں کو کیوں ڈراتا ہے۔ کیا آپ پاگل آدمی ہے؟" اوپر سے اس بنگالی نے پوچھا۔

"اور کیا۔ باہر ڈبے پر لکھا نہیں دیکھا کہ اس ڈبے میں دو پاگل بھی سفر کریں گے" مولوی صاحب نے کہا اور اب وہ بچوں کے بجائے ماں' باپ کو ڈرانے لگے۔ اس کے ساتھ ہی اختر اور مولوی صاحب ہولناک آوازیں بھی نکالنے لگے۔

وہ بنگالی جوڑا جھٹ نیچے اترا' دونوں بچوں کو سینے سے لگایا' سامان سمیٹا اور دروازے کے پاس جاکر بیٹھ گئے۔

ریل رکی۔ وہ دونوں دروازہ کھول کھٹاک سے' بچوں کو لے کر اتر گئے۔

اختر اور مولوی صاحب بچوں کی طرح ہنس رہے تھے۔ اب حمیدہ کی سمجھ میں آیا ورنہ وہ تو خود انہیں پاگل سمجھنے لگی تھی۔

ڈبا خالی ہوتے ہی مولوی صاحب کو اپنا حقہ یاد آگیا۔ تمباکو کی خوشبو پورے ڈبے میں پھیل گئی۔

بڑے چاؤ سے بیاہ کرلائے۔ بزرگوں کی طرح کوٹھی کا ایک ایک کمرا دکھایا۔ اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر پلائی۔ گھر کی بڑی بوڑھیوں کی طرح چابیاں بہو کے ہاتھوں میں تھمادیں۔

"سب نوکروں کی تنخواہیں دینا اور بشیر کو کھانا پکانے کو بتادیا کرنا۔"

انہوں نے اپنی دانست میں گھرداری نئی آنے والی کے سپرد کردی اور اپنے کام میں مصروف ہوگئے۔

کام کے وقت کام' کھیل کے وقت کھیل۔ یہ اصول ان کا ہمیشہ سے تھا۔ نئی آنے والی سے پہلے کھیل کے وقت بھی کام ہی ہوتا تھا لیکن اب انہیں یہ احساس بھی تھا کہ حمیدہ دن بھر کے سناٹے سے بور ہوجاتی ہوگی لہٰذا کچھ کھیل بھی ہونا چاہیے۔ ایک دن جو آئے تو تین بڑے چھوٹے بنڈل ہاتھوں میں۔ ایک میں تین عدد بیڈ منٹن کے بلے' ایک میں دو گڈی تاش اور ایک میں پچیسی کی بساط اور کوڑیاں۔

"یہ بیڈ منٹن تین آدمی کیسے کھیل سکتے ہیں؟ ہاں تاش کھیلے جاسکتے ہیں" حمیدہ نے کہا۔

"لیکن ہمیں تو تاش آتے نہیں۔ چلو تم مجھے اور اختر کو سکھاؤ۔"

"کیا آپ دونوں تاش کھیلنا نہیں جانتے؟"

"جن کے پاس فاضل وقت ہوتا ہے وہی ایسے کھیل کھیلا کرتے ہیں۔"

بہرحال عقل و فکر کی یہاں کیا کمی تھی۔ چند ہی ہاتھ کھیلے ہوں گے کہ کھیل پر حاوی ہوگئے۔ جتنا کھیلا گیا' کھیلے پھر دامن جھاڑ کر کھڑے ہوگئے۔

"بھئی' ایک بات کا خیال رہے۔ کسی کے سامنے بھول کر بھی مت کہہ بیٹھنا ورنہ پورے شہر میں مشہور ہوجائے گا کہ مولوی عبدالحق تاش کھیلتے ہیں۔"

حمیدہ کے آجانے کے بعد رات کا مطالعہ ہی موقوف ہوگیا تھا۔ غصہ یہاں بھی اپنا کام دکھا رہا تھا۔ کھیل کھیل میں ایسے غصے میں آتے کہ روز تاش کی ایک گڈی پرزوں میں تبدیل ہوجاتی۔

حمیدہ کی ایک ایک ضرورت کا خیال رکھتے۔ جو وعدہ کرتے اسے پابندی سے پورا کرتے جیسے پوری عمر گھرداری میں گزری ہے۔

ایک مرتبہ حمیدہ اختر سے کسی بات پر خوش ہوئے۔ ناشتے کے بعد اپنے کمرے کی کیبنٹ سے ایک ڈبیا نکال کر لائے۔ پرانی ہوگئی تھی لیکن پھر بھی نہایت خوب صورت لگ رہی تھی۔

حمیدہ نے اسے کھولا تو اس میں بارہ عدد مٹر کے دانوں

کے برابر سچے آب دار موتی تھے۔

"سچ سچ بتایئے۔ آپ نے کس کے لیے یہ ڈبیا اور موتی لیے تھے؟" حمیدہ نے انہیں چھیڑنے کے لیے پوچھا۔

"تم نے یہ کیوں پوچھا؟" ان کی آنکھوں میں اداسی صاف دکھائی دے رہی تھی۔

"ڈبیا بہت پرانی جو ہے۔"

"تم نے سچ کہا۔ کسی کو دینے کے لیے بہت عرصہ پہلے لیے تھے، لیکن دیے نہیں۔"

"کیوں؟"

"اس کو اس قابل نہ سمجھا۔ جب سے یہ ڈبیا یونہی پڑی رہی۔ کچھ خیال ہی نہیں آیا۔"

انہیں انجمن کے عشق میں بہت سی باتوں کا خیال نہیں آسکا تھا اور زندگی گزرتی جا رہی تھی۔

اس ڈبیا نے شاید ان کا کوئی زخم تازہ کردیا تھا کیونکہ اس روز وہ شام کی سیر کو بھی نہیں گئے۔ ان کے معمول میں فرق آجائے، یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

۱۹۳۵ء ہی کا سال تھا کہ کنہیا لال منشی (غذائی وزیر) مولوی عبدالحق سے ملنے حیدرآباد آئے۔

"مولوی صاحب! زبانوں کا جھگڑا بہت ہو چکا۔ اب کوئی ایسی صورت ہونی چاہیے کہ سب مل کر بیٹھ جائیں۔" کنہیا لال نے باتوں باتوں میں کہا۔

"میں تو ہمیشہ سے کہتا آیا ہوں کہ زبانوں کے مسئلے جھگڑوں سے طے نہیں ہوتے۔ زبانیں تو محبتوں کی سفیر ہوتی ہیں" عبدالحق نے کہا۔

"بھگوان آپ کا بھلا کرے۔ بس اسی لیے میں آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں۔ ہم ایک ایسی انجمن بنانا چاہتے ہیں جس میں ہر زبان کے ادیب شریک ہوں تاکہ ایک دوسرے کے ادب کے حالات اور معلومات سے واقف ہوسکیں۔"

"بڑا اچھا خیال ہے آپ کا۔ اس طرح ساری غلط فہمیاں دور ہوجائیں گی۔ ویسے ایک بات بتادوں کنہیا لال جی۔ یہ جھگڑا ادیبوں کا ہے بھی نہیں۔ سب ایک دوسرے کے ادب کا احترام کرتے ہیں۔ یہ تو اب سیاسی مسئلہ بن گیا ہے۔"

"برابر کہا آپ نے۔ اسی لیے ہم نے سوچا ہے کہ اس کے سالانہ جلسے میں صدارت گاندھی جی کی رکھیں گے۔ دیکھیں وہ کیا کہتے ہیں؟"

"چلیے، یہ بھی کر دیکھیے۔"

"آپ کے پاس میں اس لیے آیا ہوں کہ آپ اس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر بن جایئے۔"

"میری جان کو ویسے ہی بہت آزار لگے ہوئے ہیں۔"

"یہ ایک ادبی معاملہ ہے اور پھر آپ کی موجودگی میں جو چیز طے ہوگئی اسے سب مسلمان مان لیں گے اس لیے آپ کا ہونا ضروری ہے۔"

"لیکن یہ بھی تو سوچیے کہ میں جس بات کو نہیں مانوں گا پھر آپ کتنا ہی زور لگائیں کوئی نہیں مانے گا۔"

کنہیا لال یہ سن کر خفیف سی ہنسی ہنسنے لگے۔ عبدالحق نے اس کا رکن بننا منظور کرلیا۔

وہ کنہیا لال کو رخصت کرکے واپس آئے تو اچھے خاصے پریشان نظر آرہے تھے۔ ان کی پریشانی کا اظہار اس سے ہو رہا تھا کہ کوٹھی سے پھاٹک تک جانے والی سڑک پر بے قراری سے ٹہل رہے تھے۔

"آپ کے مہمان تو رخصت ہوگئے۔ اب آپ کو کس کا انتظار ہے" ان کے ایک دوست نے ان سے پوچھا جو ابھی ابھی ان سے ملنے آئے تھے۔

"آنے والے وقت کا انتظار ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"اردو کے خلاف ایک اور سازش کی جا رہی ہے۔ نام یہ ہے کہ ہر زبان کے ادیب مل کر بیٹھیں گے لیکن دراصل یہ ہمیں رام کرنے اور الجھانے کی ایک ترکیب ہے۔ گاندھی بڑا عیار ہے بالکل لومڑی کی طرح۔ اس انجمن کے ذریعے یہ بتایا جائے گا کہ اردو کی طرح ہر زبان کا ادب اہم ہے۔ سب برابر ہیں۔ بھئی، کسی کا اردو سے کیا مقابلہ۔ خیر دیکھا جائے گا۔"

تھوڑی ہی دیر میں ان کی پریشانی دور ہوگئی۔ وہ پہلے کی طرح نارمل ہوگئے، لیکن اتنا غصہ پھر بھی رہا کہ آتے ہی دفتر والوں پر برس پڑے۔

"بس بہت وقت ضائع ہو چکا ہے۔ کام کی پوری پابندی ہونی چاہیے۔ جس بات کے اوقات ہیں اس میں فرق نہ آئے۔"

○☆○

اس نئی انجمن کا نام اکھل بھارتیہ ساہتیہ پرشد تھا۔ نام ہی سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ کن لوگوں کی انجمن ہے اور اس کے کیا عزائم ہوسکتے ہیں۔ اس انجمن نے اپنا اجلاس ناگپور میں منعقد کیا۔ وہ چونکہ ورکنگ کمیٹی کا ممبر تھا لہٰذا وہ بھی اس میں شریک ہوا۔

گاندھی جی اپنی مخصوص وضع قطع میں لپٹے لپٹائے

صدارت کی کرسی پر رونق افروز ہوئے۔ عبدالحق کو گاندھی سے کسی بھلائی کی توقع نہیں تھی۔ وہ ۱۸۶۷ء سے ہندی کو پھیلانے کی کوششیں کر رہے تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ جب تک مسلمانوں کے تمدن کی سب سے بڑی علامت اردو کو ختم نہیں کیا جائے گا، قدیم ویدک تمدن کا فروغ پانا مشکل ہے۔ سرسید کی زندگی سے لےکر اب تک یہ مسئلہ کل ہند سیاسی مسئلہ بن چکا تھا۔ اس کا مظاہرہ اس اجلاس میں بھی ہو رہا تھا۔

انجمن کا نام چونکہ "اکھل بھارتیہ پرشد تھا" اس لیے اجلاس میں سب سے پہلے تو یہی مسئلہ اٹھا کہ "پرشد" کی زبان کیا ہوگی؟

مختلف تجویزیں سامنے آئیں۔ پھر گاندھی جی نے کہا۔ "مولوی جی سے پوچھو۔ یہی اردو کے بہت بڑے نیتا ہیں۔"

"ا[illegible] چننے کی کیا بات ہے۔ ہندوستانی ہوگی" مولوی عبدالحق نے اردو کا نام براہِ راست لینے کے بجائے کہا۔

"آپ ہندوستانی کیوں تجویز کرتے ہیں؟" گاندھی جی نے پوچھا۔

"اس لیے کہ کانگریس کا یہ ریزولوشن ہے کہ کانگریس کی اور ملک کی زبان ہندوستانی ہوگی۔ نیز کانگریس کے آئین کی دفعہ ۲۱ میں صاف طور پر یہی درج ہے۔"

"اس کا مطلب یہ نہیں ہے" گاندھی نے لاجواب ہوتے ہوئے پینترا بدلا۔

"آپ کے نزدیک کیا مطلب ہے؟"

"ہندی!" گاندھی نے دوٹوک الفاظ میں کہا۔

"ہر دس سال کے بعد مطلب بدلتا گیا تو کام کیسے چلے گا۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ہندوستانی کا مطلب وہ زبان جو پورے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہو۔ اور وہ اردو ہے۔ اس کو ہم نئے نام ہندوستانی سے بھی پکار سکتے ہیں۔"

"آپ جو بھی مطلب لیں۔ میں اس کا مطلب ہندی لیتا ہوں۔"

"اس طرح تو آپ ہندی کو اردو کے مقابل کھڑا کر دینا چاہتے ہیں جو جھگڑے کا باعث بنے گا۔"

"جھگڑے کی بات ہی نہیں ہے۔ ہندوستان میں ہندی چلے گی۔"

"ہندوستانی بھی چل سکتی ہے۔"

"تو پھر یوں کیے لیتے ہیں کہ اس کا نام ہندی ہندوستانی رکھے دیتے ہیں۔"

"اچھا یہ بتائیے، ہندی سے آپ کی کیا مراد ہے؟" عبدالحق نے پوچھا۔

"وہ زبان جو کتابوں میں ہے بول چال میں نہیں۔"

"بہت خوب! اور ہندوستانی سے آپ کا کیا مطلب ہے؟"

"وہ زبان جو بول چال میں ہے کتابوں میں نہیں۔"

"تو پھر ہندی ہندوستانی زبان کیا ہوئی؟"

"وہ زبان جو آگے چل کر ہندوستانی ہو جائے گی۔" گاندھی نے کہا۔

"جب ہندوستانی پہلے سے موجود ہے تو پھر پچاس سال اور انتظار کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

اس سوال پر گاندھی جھنجلا گئے "میں ہندوستانی نہیں چھوڑ سکتا" انہوں نے نہایت غصے سے کہا۔

"جب آپ ہندی نہیں چھوڑ سکتے تو ہم اردو کیوں چھوڑ دیں؟"

"مسلمان چاہیں تو اردو رکھ لیں" گاندھی نے کہا "یہ ان کی مذہبی زبان ہے۔ قرآن کے حرفوں میں لکھی جاتی ہے۔ مسلمان بادشاہوں نے پھیلائی۔"

بحث اتنی تلخ ہو گئی تھی کہ تمام ارکان حیرت سے عبدالحق کا منہ تک رہے تھے۔ گاندھی سے ٹکرانے کا حوصلہ بڑے بڑے لیڈروں کو نہیں تھا اور عبدالحق کے تیور یہ بتا رہے تھے کہ ابھی تو کچھ نہیں ٹکرانے کا مرحلہ تو آئے گا۔

"آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟ کیا یہ چاہتے ہیں کہ ہر مسلمان یہ لکھ کر دے دے کہ میری زبان ہندی ہوگی، میرا رسم الخط ناگری۔ میں اپنی زبان اور کلچر کا بھی مطالبہ نہیں کروں گا۔"

"ہم کچھ نہیں چاہتے لیکن پرشد کی زبان ہندی ہندوستانی ہوگی۔"

"یہ انجمن اس لیے بنائی گئی تھی کہ ہر زبان کے ادیب مل کر بیٹھیں گے لیکن ہندوستان کی سب سے بڑی زبان کے خلاف زہر اگلا جا رہا ہے، لہٰذا میں استعفیٰ دیتا ہوں۔"

ان کا یہ استعفیٰ محض ساہتیہ پرشد سے علیحدگی نہیں تھی بلکہ گاندھی سے نبرد آزما ہونے کا اعلان تھا۔ اس اعلان کی گونج بڑی دور تک سنائی دی۔

ہندی ہندوستانی کا نعرہ چل نکلا تھا۔ اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان کہہ کر گاندھی نے نفرت کا بیج بو دیا تھا۔ جہاں جہاں کانگریسی حکومتیں تھیں، اردو کی مخالفت سرکاری سطح پر کی جا رہی تھی۔ اس نئی صورتِ حال پر غور کرنے کے لیے علی گڑھ میں ایک کُل ہند اردو کانفرنس منعقد کی گئی۔ اس

کانفرنس میں دوسرے مسئلوں کے علاوہ ایک مسئلہ یہ قابلِ غور تھا کہ انجمن کا مرکزی دفتر کہاں قائم کیا جائے؟ کیونکہ حیدر آباد میں رہ کر اردو کی مدافعانہ جنگ نہیں لڑی جاسکتی تھی۔ آخر یہ طے پایا کہ دہلی موزوں ترین مقام ہے۔

○☆○

"مولوی صاحب' آپ کی طرف سے بڑے پریشان ہیں۔ ان کو ایسا لگ رہا ہے جیسے آپ پریشان ہیں" ایک دن حمیدہ نے اپنے شوہر اختر حسین رائے پوری سے پوچھا۔

"پریشان اس لیے ہوں کہ انہیں کیسے بتاؤں۔ میں دہلی جاکر اپنا اخبار نکالنا چاہتا ہوں اور مجھے خبر ہے وہ اجازت نہیں دیں گے۔ ان کی تنہائی کا خیال بھی آتا ہے۔ ہمارے جانے کے بعد وہ بالکل اکیلے رہ جائیں گے۔"

"پہلے بھی تو......"

"اس وقت کی بات اور تھی۔ تمہارے آنے کے بعد وہ بہت مگن رہنے لگے ہیں۔"

"یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ پہلے میں بات کروں گی۔ ان کو جو ایک دھکا سا لگے گا اور غصہ بھی آئے گا۔ اس کو آپ نہ دیکھ سکیں گے۔ پھر دو ایک روز بعد آپ بات کر لیجیے گا۔"

"ہاں' یہ ٹھیک ہے۔"

اختر مطمئن ہو گیا۔ حمیدہ نے وعدے کے مطابق مولوی صاحب سے ذکر چھیڑ دیا۔

"ہمارے دہلی جانے سے آپ کو رنج ہوگا۔ اختر اس لیے پریشان ہیں۔"

"میرے رنجیدہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں تو خود انجمن کو دہلی منتقل کرنے کے مراحل میں ہوں۔ ساری کارروائیاں ہو جائیں پھر تینوں ساتھ چلیں گے۔"

"آپ کو تو ابھی سال سوا سال لگ جائے گا۔ اتنے عرصے میں ہم اخبار جمالیں گے۔ پھر آپ کے پاس ہوں گے۔"

"اور اتنے عرصے میں یہاں کیا جھک مارتا رہوں گا" انہوں نے جھلّا کر کہا۔

ان کی محبت تھی جو اختر اور حمیدہ کو یہاں سے جانے نہیں دے رہی تھی لیکن بالآخر نم آنکھوں کے ساتھ انہیں اجازت دینی پڑی۔

○☆○

کُل ہند اردو کانفرنس منعقدہ علی گڑھ کے فیصلے کے مطابق انجمن کے دفتر کو دہلی منتقل کرنا تھا۔ اس مقصد کے لیے نئی دہلی کی ایک کوٹھی القریش کرائے پر لی گئی اور پھر چند ماہ بعد ہی ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی (نمبر ایک دریا گنج) کرائے پر لے لی گئی۔

اس دوران میں کانگریس کی عبوری وزارتوں نے اپنے عمل سے اردو کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچانا شروع کر دیا۔ کانگریسی رہنماؤں نے اردو کی مخالفت بہار سے شروع کی تھی لیکن سی پی کی زمین اردو' ہندی' تنازعے کا مرکز بن گئی۔ سی پی میں کانگریسی عبوری حکومت نے ودیا مندر اسکیم کا زبردستی نفاذ چاہا۔ عبدالحق نے شدید مخالفت کی۔ فوری طور پر اپنے دست راست حکیم اسرار کی قیادت میں ناگپور سیکریٹریٹ میں ایک وفد روانہ کیا۔ اس وفد کے مندرجہ ذیل مطالبات تھے۔

۱۔ ودیا مندر کا نام تبدیل کیا جائے۔ اگر نام رکھنا ہی چاہتے ہیں تو پڑھائی گھر رکھ لیں۔

۲۔ مسلمان بچوں کے لیے اردو تعلیم کا انتظام۔

۳۔ سی پی میں جو کتابیں رائج ہیں ان میں ہندو سورماؤں اور بزرگوں کا حال درج ہے۔ مسلم تہذیب اور بزرگوں کا نام تک نہیں۔ اس کمی کو پورا کیا جائے۔

۴۔ ودیا مندر اسکیم کی رو سے مدرسہ کھولنے کے لیے چالیس لڑکوں کی شرط ختم کی جائے۔ جہاں پانچ بچے بھی اردو پڑھنے والے ہیں' وہاں اردو رسم الخط میں بندوبست کیا جائے۔

گاندھی کے نام کھلا خط لکھا۔ "اگر مسلمانوں کی شکایات رفع نہ ہوئیں تو ان پر ان ہی کے حربے استعمال ہوں گے۔"

سی پی میں انجمن کے رضاکاروں اور کارکنوں نے سارے صوبے کا دورہ کیا۔ شہر شہر قصبہ قصبہ انجمن کی شاخیں' کتب خانے قائم کیے' مدارس قائم کیے۔ چھوٹا ناگپور میں عیسائیوں کا زور تھا۔ عبدالحق نے انہیں اعتماد میں لے کر عیسائی بچوں کے لیے اردو مدرسے کھولے۔ اچھوتوں کے لیے بھی اردو مدرسے کھولے گئے۔ سی پی کے تمام کالجوں کے لیے اردو کی تدریس کے لیے لیکچرار مقرر کیے۔ ڈاک خانوں کے فارموں اور ریل کے ڈبوں پر اردو تحریر کی جانے لگی۔ عبدالحق ہی کی کوششوں سے سی پی اسمبلی میں اردو میں تقاریر کا آغاز ہوا۔ یہ شور اتنا مچا' مرہٹے اردو بولنے لگے۔ ناگپور اردو کا مرکز بن گیا۔

بنگال میں اردو تدریس کا انتظام نہیں تھا۔ وہ طلبہ جو دینی تعلیم کے لیے دلی میں مقیم تھے ان کے لیے عبدالحق نے مسجد فتح پوری میں دو کمرے کرائے پر لے کر شبینہ مدرسہ قائم کیا تاکہ یہ طالب علم اردو پڑھیں۔

مالابار میں تقریباً آٹھ لاکھ عربی النسل مسلمان آباد تھے۔ عبدالحق نے وہاں بھی مدرسے قائم کرائے۔

صوبوں کے ساتھ ساتھ ریاستوں میں بھی اردو کے خلاف جال بچھایا گیا تھا۔ عبدالحق نے اپنی تدبیروں سے اس جال کو کاٹ کر رکھ دیا۔ ہر طرف اُردو کا ڈنکا بجنے لگا۔

یہ کام یونہی نہیں ہوگئے۔ اردو کا یہ سپاہی ہر جگہ سینہ سپر ہوکر لڑا۔ کہیں کامیابی ہوئی کہیں ناکامی لیکن اس نے آس نہ توڑی۔ وہ برابر کام میں لگا رہا۔ عمر ایسی تھی کہ آسائش کی ضرورت تھی۔ بہت سے علمی و ادبی کام ایسے تھے جنہیں بیٹھ کر کرنے کی ضرورت تھی لیکن وہ پورے ہندوستان میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ ہمدردوں کی ہمدردی اپنی جگہ لیکن اس کا ایک ہی جواب تھا۔

"عربی کی ایک مشہور مثال ہے کہ کسی چیز کی محبت انسان کو اندھا کردیتی ہے۔ مجھے اردو سے محبت ہے اور مجھے اعتراف ہے کہ یہ محبت جنوں کی حد تک ہے لیکن اس کے ساتھ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اردو سے میری وابستگی کا یہ سلسلہ پوری قوم کی تہذیب وثقافت، تصورات ونظریات اور اس کے عزائم اور حوصلوں سے ملتا ہے اور کون ایسا بدبخت ہے جسے اپنی قومی روایات اور تہذیبی اقدار سے محبت نہ ہوگی۔"

اب وقت آگیا تھا کہ انجمن ترقی اردو کے اہتمام و انتظام میں برطانوی ہند کے کسی موزوں مقام پر ایک اردو یونیورسٹی قائم کی جائے چنانچہ ۱۹۴۰ء میں ناگ پور کے کھلے اجلاس میں اردو یونیورسٹی کے قیام کے سلسلے میں اتفاقِ رائے سے اس کی تجویز پاس ہوئی۔

اردو یونیورسٹی کے قیام کی اس اہم اور تاریخی تجویز کا ملک کے طول وعرض میں بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا گیا۔

وہ اس کانفرنس کے کامیاب انعقاد کے بعد دلی واپس آگئے۔ اب انہیں اردو یونیورسٹی کے لیے معتبر اصحاب کو اعتماد میں لینا تھا۔ انہوں نے اس کا آغاز قائداعظم محمد علی جناح سے کیا۔ انہوں نے قائداعظم کو اپنے ساتھ دوپہر کا کھانا کھانے کی زحمت دی۔

کھانے پر جہاں ہندوستان کی عمومی سیاست اور دیگر مسائل پر بات ہوئی، وہیں مجوزہ یونیورسٹی کا بھی ذکر آیا۔ قائداعظم نے اس سے بڑی دلچسپی اور ہمدردی کا اظہار فرمایا۔

اردو یونیورسٹی ایک بڑا منصوبہ تھا۔ سب سے بڑا مسئلہ سرمائے کی فراہمی کا تھا۔ وہ اس سلسلے میں کوششیں کرتے رہے لیکن مصیبت یہ تھی کہ اردو کے کام میں قدم قدم پر روڑے اٹکائے جا رہے تھے اور انہیں ہر اس جگہ پہنچنا ہوتا تھا جہاں ان کی ضرورت ہو۔ آئے دن دوروں پر رہنا پڑتا تھا۔ ایک چومکھی لڑائی تھی جسے وہ لڑ رہے تھے۔ تصنیف و تالیف کے شغل کو بھی بالائے طاق نہیں رکھ سکتے تھے۔ اس پُر آشوب دور میں بھی "ہماری زبان" جاری کیا۔ اب کام کرنے والے بہت تھے لیکن نگرانی تو انہی کو کرنی تھی۔ ان سب کاموں کی بدولت یونیورسٹی کا کام بہت سست روی سے چل رہا تھا۔

اسی دوران میں یہ خیال آیا کہ دلی میں انجمن کی اپنی عمارت ہو۔ اس کام کے لیے انہوں نے چندہ اکٹھا کرنا شروع کیا۔ ایک مرتبہ اپنی کل پونجی ۵۶ ہزار روپے چندے میں دے دیے اور قطعۂ زمین حاصل بھی کرلیا۔

انجمن کے دفتر (دریا گنج) میں بڑی رونق رہنے لگی تھی۔ ہر وقت مہمانوں سے کمرے بھرے رہتے تھے۔ ان میں مسلم لیگی بھی تھے، کانگریسی بھی۔ خلافت کمیٹی والے بھی تھے اور کمیونسٹ بھی۔ کونسلوں کے ممبر بھی تھے اور لیڈر بھی۔ اہلِ علم بھی تھے اور طالب علم بھی۔ گاندھی جی کے معتقد بھی اور ان کے مخالف بھی تھے۔ یہ گرم بازاری نتیجہ تھی بابائے اردو کی مقبولیت اور ان کے خلوص کا۔ ان کی مخالفت کرنے والے بھی ان کے خلوص سے انکار نہیں کرسکتے تھے۔ حتیٰ کہ گاندھی جی تک یہ کہنے پر مجبور ہوگئے کہ "مولوی عبدالحق نے اردو زبان کی بڑی خدمت کی ہے۔"

اتنی بھیڑ اور چہل پہل میں کام کرتے رہنا کچھ انہی کا حصہ تھا۔ سچ ہے محبت انسان کو اندھا ہی نہیں بہرا بھی کردیتی ہے۔ وہ اسی بھیڑ میں بیٹھے بڑے اطمینان سے کام کرتے رہتے تھے۔

وقت بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ آزادی کے دن قریب آرہے تھے۔ گاندھی جی کے سامنے اب اردو سے بھی بڑے مسائل تھے لیکن زبان کے نام پر نفرت کے جو بیج انہوں نے بُو دیے تھے، ان کی فصل تیار ہونے لگی تھی۔

چودھویں جولائی ۱۹۴۷ء کا دن تھا۔ وہ حسبِ معمول اپنے کمرے میں حسبِ معمول کام کررہے تھے کہ اُن کے ایک مہمان جو کئی روز سے انجمن کے دفتر میں ٹھہرے ہوئے تھے، کمرے میں داخل ہوئے۔

"تیار ہوجایئے۔ آپ کو میرے ساتھ حیدر آباد چلنا ہے۔"

"ایسی کیا وحشت ہے؟"

"میں آپ کا ٹکٹ خرید چکا ہوں۔ کل صبح کی فلائٹ ہے۔"

ان کی قسمت میں بھلائی تھی کہ جی میں آگئی۔ حیدر آباد کا نام سن کر جی للچا گیا۔ رضامندی ظاہر کردی اور دوسرے دن کی فلائٹ سے وہ حیدر آباد' دلی سے دور چلے گئے یا قدرت نے انہیں وہاں سے ہٹا دیا۔

حیدر آباد میں کچھ کام تھے انہیں نمٹاتے نمٹاتے آخر اگست آگیا۔ ۳۰ ستمبر کی شام کو وہ بھوپال کے لیے روانہ ہوگئے۔ وہاں سے بذریعہ جہاز دلی جانے کا ارادہ تھا۔

بھوپال پہنچ کر معلوم ہوا کہ دلی کے حالات بہت خراب ہیں۔ ابھی وہاں جانا خلافِ مصلحت ہوگا۔ آخر یہ طے پایا کہ بھوپال میں قیام کرکے کچھ دن انتظار کیا جائے اور اسے رکنا پڑا۔

تین چار روز کے بعد ہی جو خبریں آئیں وہ بے حد پریشان کن تھیں۔ محلے کے محلے اجڑ گئے تھے۔ خون پانی کی طرح ارزاں تھا۔ پاکستان بنانے کی پاداش میں مسلمانوں کو تہ تیغ کیا جارہا تھا۔ اب اسے یقین ہوگیا کہ کسی غیبی طاقت نے اسے دلی سے حیدر آباد بھیج دیا تھا ورنہ اس پر تو پاکستان سے ہمدردی ہی کا نہیں اردو کی حفاظت کا الزام بھی آتا۔

میری انجمن! اپنی ذات کا خیال آتے ہی اسے انجمن کا خیال آگیا۔ میرے دفتر پر کیا بیتی ہوگی۔ اردو سے میری محبت کا بدلہ انجمن کے بے جان درودیوار سے نہ لیا گیا ہو۔ میں یہاں ہوں لیکن میرے اہل کار تو دفتر ہی میں ہوں گے۔ الٰہی خیر کیجیو۔

کہیں سے اڑتا ہوا ایک خط بھوپال پہنچ گیا "بلوائیوں نے انجمن کے مکان پر حملہ کیا۔ تمام سامان اور مال واسباب لوٹ لیا۔ مکان کھلا پڑا ہے اور اللہ کی امان میں ہے۔ ظالم بلوائیوں نے ایک کاتب اور اس کے بیوی بچوں کو قتل کر ڈالا۔ باقی ملازمین اِدھر اُدھر بھاگ گئے۔"

خط کیا تھا' کرب وبلا کا اطلاع نامہ تھا۔ انسانی جانوں سے بھی زیادہ وہ قیمتی اور نادر کتابیں تھیں جو اس نے برسوں کی محنت کے بعد جمع کی تھیں۔ انسان تو ایک مرتا ہے لیکن ایک نایاب کتاب کا مٹ جانا' پورے دور کا فنا ہوجانا ہے۔ اس نے چاہا کہ وہ خود جائے اور دیکھے کہ کیا رہا' کیا کھویا' کیا بچا لیکن احباب پھر مانع آئے کہ یہ وقت دلی جانے کا نہیں۔ دلی میں کسی کو خط لکھا۔ وہاں سے بھی یہی جواب آیا کہ یہ وقت اس مقتل میں آنے کا نہیں خصوصاً بابائے اردو کا۔ قوم پرست ہندو' اردو کے حوالے سے اس کے خون کے پیاسے ہیں۔ ناچار دل مسوس کر رہ گیا۔

کتب خانہ لٹ جانے کا ایسا صدمہ ہوا کہ وہ صاحبِ فراش ہوگیا۔ غصہ تھا کہ بخار کی شکل اختیار کرگیا۔ انگلیاں لکھنے کی عادی تھیں اور اب لکھنے کو کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ بجز اس کے کہ اِدھر اُدھر خط لکھ کر حالات دریافت کرتا رہے۔ پھر اسے کچھ کام یاد آگئے۔ بھوپال میں خالی پڑے پڑے دل ڈوبنے لگا تھا۔ بخار سے نجات پاتے ہی وہ حیدر آباد چلے گئے۔ وہاں جو کام باقی رہ گیا تھا' اسے سمیٹنے میں لگ گئے۔

دلی بدستور مصائب کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ خوں ریزی کا بازار گرم تھا۔ ایسا بازار جس کے سامنے نادر شاہ کا قتل عام اور غدر کے مظالم ہیچ تھے۔ گاندھی جی کے جلسوں میں نہ عبادت کا تقدس باقی رہ گیا تھا نہ روحانیت کی روشنی۔ گاندھی جی ہر اس جگہ پہنچتے تھے جہاں درندگی برہنہ ہوکر ناچ رہی تھی لیکن اس وقت جب سب کچھ لٹ چکا ہوتا تھا۔ ان کے یہ دورے سیاسی چال سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے۔

آخر کار نو نومبر ۱۹۴۷ء کو انہیں ابوالکلام آزاد کی وساطت سے دلی جانا نصیب ہوا۔ دوسرے ہی دن وہ انجمن کا مکان دیکھنے دریا گنج پہنچ گئے۔

"کس دل سے آئے ہیں ہم کچھ دل ہی جانتا ہے۔"

وہ سب سے پہلے اس کمرے میں گئے جہاں وہ کام کرتے تھے یہاں کا نقشہ ہی دوسرا تھا۔ کبھی یہاں کتابوں کی متعدد الماریاں ہوتی تھیں۔ کھلی الماریوں کے علاوہ دو بڑی فولادی الماریاں تھیں جن میں خاص خاص نادر قلمی نسخے اور قدیم فرامین اور کاغذات اور بعض نامور اشخاص مثلاً ناسک' غالب' سرسید' حالی' اقبال' سرتیج بہادر سپرو وغیرہ کے خطوط اور اسی قسم کی بیشتر نادر اشیا تھیں۔ اس کے علاوہ کئی بڑے صندوق تھے جن میں ان کے تیار کردہ نوٹس اور واقعات سے متعلق یادداشتیں' اردو' ہندی تنازعے سے متعلق بہت سے قدیم کاغذات اور بہت بڑا حصہ اردو لغات کے صاف کیے ہوئے مسودوں کا تھا۔

اب ان الماریوں اور صندوقوں کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ کچھ صندوق جو نئے اور اچھے تھے' غائب تھے۔ غالباً لٹیرے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ کتابوں کے صفحات کچھ پھٹے کچھ ثابت اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔ وہ انہی صفحات پر پاؤں رکھتا' بچاتا کھانے کے کمرے میں گیا کیونکہ دو مقفل الماریاں وہاں بھی تھیں۔ شاید وہ بچ گئی ہوں؟ لیکن یہ محض اس کی خوش فہمی تھی۔ ان الماریوں کا بھی وہی حشر ہوا تھا۔ ان الماریوں میں قلمی بیاضیں تھیں لیکن اب ان کے پھٹے

ہوئے صفحات اس طرح بکھرے پڑے تھے جیسے پت جھڑ کے موسم میں درختوں کے پتے۔

مالک مکان نے کرائے کے لالچ میں یہ مکان بھارت انشورنس کمپنی کو دے دیا تھا لہٰذا کمرے خالی کرنے کے لیے انہوں نے متعدد کمروں کی بیش قیمت کتابیں اور کاغذات کوڑے کرکٹ کی طرح صحن میں پھینک دیے تھے بہت سے کاغذ ہوا میں اڑ گئے اور کچھ آنے جانے والوں کی روندن میں آ گئے جو کتاب یا کوئی چیز کسی کو پسند آئی' وہ اٹھا کر چل دیا۔

نیچے کے کمرے رسالوں اور اخباروں سے پٹے پڑے تھے۔ مالک مکان نے ان کمروں کو خالی کرنے کے لیے یہ اخبار اور رسائل باورچی خانے' غسل خانوں اور گودام میں پھنکوا دیے۔

کتب خانے کو کھول کر دیکھا تو معلوم ہوا یہاں بھی لٹیروں کے قدم آئے تھے۔ الماریوں کی کتابیں درہم برہم تھیں۔ کچھ زمین پر پڑی ہوئی تھیں۔ الماریوں کے تالے ٹوٹے ہوئے تھے۔

وہ جب انجمن کا دفتر لے کر حیدر آباد سے دہلی آئے تھے تو مال گاڑی کے کئی ڈبے سامان سے بھر گئے تھے۔ اور اب اسی سامان کا جو حشر ہوا تھا اس کے سامنے تھا۔ میرا قصور؟ قصور تو ان لاکھوں عزیز جانوں کا بھی نہیں تھا جو ظلم و جبر کا شکار ہو گئیں۔ قصور تو ان عورتوں کا بھی نہیں تھا جن کی بے حرمتی ہوئی۔ ان معصوم بچوں کا بھی نہیں تھا جن کے ٹکڑے کر دیے گئے۔ جب ان بے قصوروں کا یہ حشر ہوا تو پھر اس سامان کے لٹ جانے کا کیا افسوس! وہ یہی سوچتے ہوئے' راستے بھر ادھ جلے مکانوں کو دیکھتے ہوئے اپنی قیام گاہ پر لوٹ آئے۔

چودھری رحم علی' محمد یعقوب' رفیق الدین احمد اور ایسے ہی چند ہمدرد ان کے ساتھ تھے۔ ان سب نے یہ طے کیا کہ جو ہو گیا اس پر افسوس کرنا اور حوصلہ ہارنا بے کار ہے۔ اب یہ کیا جائے کہ جو کتابیں بچ گئی ہیں' انہیں یکجا کیا جائے۔ ردی سمیٹ لی جائے۔ شاید کچھ کام کی چیزیں بچ گئی ہوں۔

وہ دوسرے دن پھر انجمن کے دفتر پہنچ گئے۔ ردی کے ڈھیروں کا ایک ایک کاغذ دیکھنا شروع کیا۔ کسی کتاب کا کوئی کاغذ ایک جگہ' کوئی دوسری جگہ ملا۔

پہلے ہی دن اندازہ ہو گیا کہ اس کام میں تو کئی مہینے لگ جائیں گے۔ اتنے عرصے تک مولانا ابوالکلام آزاد کے گھر مہمان رہنا ٹھیک نہیں تھا لہٰذا وہ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ نظام پیلس کے گیسٹ ہاؤس میں اٹھ گئے۔

ردی کی چھٹائی کا کام جاری تھا۔ بعض نسخوں کے کاغذات مختلف جگہوں سے ملے مگر پھر بھی ناقص رہے۔ بعض کے حصے پھٹے ہوئے ملے۔

ایک ایک کاغذ کو دیکھنا' اسے پڑھنا۔ پھر جوڑ سے جوڑ ملانا۔ یہ کام آسان نہیں تھا۔ صبح سے شام تک کرنے کے بعد کپڑے اور صورتیں گرد سے اٹ جاتی تھیں۔ پھر بھی ایک کونا صاف نہیں ہوتا تھا۔

نظام پیلس میں گئے ہوئے ابھی چار ہی روز ہوئے تھے کہ معلوم ہوا۔ حیدر آباد سے کوئی وفد آ رہا ہے اس لیے گیسٹ ہاؤس خالی کرنا پڑے گا۔ انہوں نے بہت کوشش کی کہ کوئی مکان مل جائے یا کوئی اور صورت ٹھہرنے کی نکل آئے لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔

انجمن کی شاخیں سارے ملک میں تھیں۔ تقسیم کے بعد پاکستان کی شاخوں کا الحاق ہندوستان سے قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ اس لیے ضروری تھا کہ پاکستان کے لیے نیا مرکز قائم کیا جائے۔

نظام پیلس سے اٹھنا پڑا تو انہوں نے یہ سوچا کہ کراچی جا کر وہاں کے لیے نئے مرکزی دفتر کا انتظام کر لیا جائے۔

دہلی کے دفتر میں ردی کی چھٹائی کا کام جاری تھا کہ وہ کراچی کے لیے روانہ ہو گئے۔

کراچی میں پیر الٰہی بخش ان کے شفیق کرم فرما تھے لہٰذا ان کے ہاں قیام کیا۔

۱۹۳۶ء میں جب علی گڑھ میں کل ہند اردو کانفرنس ہوئی تھی اور انجمن کے مرکزی دفتر کے لیے نام تجویز کیے گئے تھے تو علامہ اقبال نے لاہور کا نام پیش کیا تھا لیکن اس وقت یہ دفتر دہلی میں قائم کیا گیا تھا۔ کراچی پہنچنے کے بعد عبدالحق کو اقبال کی یہ تجویز یاد آئی۔ انہوں نے شاعر مشرق کے اس خواب کو تعبیر عطا کرنے کا فیصلہ کیا اور چاہا کہ مرکزی دفتر لاہور میں ہونا چاہیے۔ انہوں نے وزیر مہاجرین میاں افتخار الدین احمد کو خط لکھا۔

"ہم سب کی رائے یہ ہے کہ اب انجمن کا صدر مقام لاہور ہونا چاہیے۔ میں نے سنا ہے ہندوؤں نے جو عمارتیں اور پریس وغیرہ چھوڑے ہیں' ان کی تقسیم عمل میں آ رہی ہے۔ اگر آپ کے توسط سے ہمیں کوئی اچھا پریس اور مکان مل سکتا ہے ہم بہ خوشی اسے خریدنے کے لیے تیار رہیں۔"

اس خط کا جب انہیں کوئی جواب نہیں ملا تو وہ خود لاہور گئے اور میاں بشیر احمد کو یاددہانی کرائی۔ انہوں نے لاہور کے ممتاز اور بااثر ادیبوں کو مدعو کیا۔ یہاں کچھ ایسی باتیں ہوئیں

جن سے تاثر ملتا تھا کہ یہ حضرات نہیں چاہتے کہ انجمن یہاں آئے۔

اس طرف سے مایوس ہوجانے کے بعد کراچی ہی ایک ایسا شہر تھا جو انجمن کے دفتر کے لیے مناسب تھا۔ اب یہاں کوئی موزوں مکان ڈھونڈنے کی ضرورت تھی۔ مکان کی تلاش سید بشیر علی کے ذمے تھی۔ وہ کئی روز تک کراچی کی سڑکیں ناپتے رہے۔ دن بھر میں جو مکان دیکھتے رات کو بیٹھ کر اس پر تبصرے ہوئے۔ ہر مکان میں کوئی نہ کوئی کمی نظر آتی تھی۔ بالآخر ایک سہ منزلہ مکان کا انتخاب ہوگیا لیکن مصیبت یہ تھی کہ اس پر مہاجرین کا قبضہ تھا۔

جب اس کا ذکر کراچی کے میئر حکیم محمد احسن سے ہوا تو انہوں نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ یہ عمارت مہاجروں سے خالی کروائی جائے۔

"شاردا مندر کی عمارت خالی پڑی ہے۔ آپ اسے الاٹ کرالیں۔"

شاردا مندر گجراتیوں کا سب سے بڑا ادارہ تھا۔ یہاں بارہ سو کے قریب طلبہ تعلیم حاصل کرتے تھے۔ دفتر کے لیے اس سے بہتر عمارت دوسری نہیں ہوسکتی تھی۔ عبدالحق نے اس کے معائنے کے بعد رضامندی ظاہر کردی اور یہ عمارت انجمن ترقیِ اردو کے نام الاٹ ہوگئی۔

احباب کا اصرار تھا کہ وہ یہیں رک جائیں۔ ہندوستان میں اب اردو کا کوئی مستقبل نہیں لیکن وہ دلی جانے کے لیے بے چین تھے۔

"ہندوستان میں ہمارے لاکھوں، کروڑوں بھائی اس زبان کے بولنے والے ہیں۔ ان کی خدمت کرنا بھی ہمارا فرض ہے۔"

آخر وہ نہ مانے اور جنوری ۱۹۴۸ء میں بذریعہ ہوائی جہاز دلی روانہ ہوگئے۔ انہیں یہ اطمینان ہوچکا تھا کہ کراچی میں مرکزی دفتر کا انتظام تو ہو ہی چکا ہے۔

دلی میں ان کے دفتر میں ردی کی چھانٹائی کا کام ابھی تک جاری تھا لیکن اتنا کام ہوچکا تھا کہ نقصان کا اندازہ ہوسکتا تھا۔ اب جو غور کیا تو بہت سے مسودے تلف ہوچکے تھے۔ کچھ نامکمل رہ گئے تھے۔ دل پر ایک چوٹ سی لگی لیکن کس کس چوٹ پر کتنی دیر رویا جاتا۔ ابھی انہیں اپنے کام کو پھر سے جاری کرنا تھا "یعنی آگے چلیں گے دم لے کر۔"

وہ گاندھی سے مل کر اپنے آئندہ عزائم بیان کرنا چاہتے تھے۔ ان سے تحفظات کی ضمانت لینی تھی۔ انہیں یہ بتانا تھا کہ ہندی اردو تنازعہ اب ختم ہوچکا۔ اردو والوں نے پاکستان حاصل کرلیا، ہندی والوں نے ہندوستان۔ اب جھگڑا ہی ختم ہوگیا۔ وہ یہیں رہ کر ادبی کام کرتے رہیں گے لیکن اسی روز انہوں نے برت (بھوک ہڑتال) رکھ لیا۔ پانچ روز بعد برت توڑ دیا لیکن کسی سے مل نہیں رہے تھے۔

وہ اپنے دیرینہ ساتھی کے ساتھ علی گڑھ چلے گئے کہ گاندھی سے ملاقات واپسی میں ہوجائے گی۔ جو گلے شکوے ہیں، دور ہوجائیں گے۔

حالات نے ایک سال میں ایک صدی کی کروٹیں بدل لی تھیں۔ انقلاباتِ زمانہ نے کیا سے کیا رنگ اختیار کرلیا تھا۔ عبدالحق کے نزدیک اب پہلے سے بھی زیادہ اس بات کی ضرورت تھی کہ اردو کا تحفظ کیا جائے اور اس کی حفاظت کا شعور بیدار کیا جائے لیکن یہ کام اب پہلے سے بھی زیادہ مشکل ہوگیا تھا۔ کانگریس نے اپنی چند وزارتوں کے بل بوتے پر کیسا طوفان برپا کیا تھا۔ اب تو پورے ملک پر ان کی حکومت تھی۔ اب یہ جنگ شاید چند صوبوں تک محدود نہ رہے۔

ان نئے حالات میں نئی حکمتِ عملی اختیار کرنے کی ضرورت تھی۔ اس کے ساتھ ہی یہ دیکھنا تھا کہ انجمن کا صدر دفتر کہاں مناسب رہے گا؟ ۱۹۳۶ء میں حیدر آباد دکن کے مقابلے میں اس کے لیے دہلی کو مناسب سمجھا گیا تھا، اب اسے کہاں لے جایا جائے؟

ان مسائل پر غور کرنے کے لیے انہیں مشاورت کی ضرورت تھی۔ ان کی درخواست پر اولڈ بوائز لاج میں ہمدردانِ اردو کا اجتماع ہوا۔ اس اجتماع میں کل پچیس حضرات تشریف لائے۔ یہ حضرات موجودہ حالات سے اتنے خوف زدہ اور سہمے ہوئے تھے کہ اپنی رائے دیتے ہوئے جھجکتے تھے۔ کوئی شخص قطعی رائے دینے کو تیار نہیں تھا۔ ہمدردی سب کو تھی لیکن ان سب نے آگ اور خون کے وہ تماشے دیکھے تھے کہ اردو کی بات کرنے ہی کو حکومت کی مخالفت تصور کررہے تھے۔ ابھی حکومت کی پالیسی کا بھی ٹھیک طرح اندازہ نہیں ہوسکا تھا اس لیے بھی کوئی رائے قائم نہیں ہوسکتی تھی۔ اجتماع کے سامنے دونوں مسئلے رکھے گئے لیکن دونوں مسئلے تشنہ بحث کا شکار ہوگئے۔ گول مول لفظوں میں سب کا خیال یہی تھا کہ صدر دفتر دہلی ہی میں ہونا چاہیے۔ انجمن کا لائحۂ عمل کیا ہو؟ اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔ حکومت کی نیت کا علم تو ہو۔

اب جو کچھ کرنا تھا خود عبدالحق کو کرنا تھا۔ انہوں نے سوچ لیا تھا کہ واپس جاکر وہ گاندھی سے ملیں گے۔ ان کی غلط فہمیاں دور کریں گے اور اپنا لائحۂ عمل ان کے سامنے رکھیں

گے۔ اب اس مسئلے کو سیاست سے الگ کرنا ہوگا۔ انجمن کو اب پھر پرانے لائحہ عمل پر عمل کرتے ہوئے ادبی کاموں تک خود کو محدود کرنا ہوگا۔ انہیں امید تھی کہ گاندھی کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا اور انہیں کام کرنے کی اجازت مل جائے گی۔ رفتہ رفتہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ ہندوستان میں لاکھوں لوگ ہیں جو اردو بولتے ہیں۔ انجمن کی ضرورت تو بہرحال رہے گی۔

۲۸ جنوری کو وہ الہ آباد کے لیے روانہ ہوگئے۔ وہاں کچھ کام تھا۔ اس کے بعد انہیں دلی جاکر گاندھی سے ملاقات کرنی تھی۔

الہ آباد میں انہوں نے اپنے دوست ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے مکان پر قیام کیا۔

"مولوی صاحب' اب کیا سوچا" عبدالستار صدیقی نے ان سے پوچھا۔

"نقصان تو بہت ہوگیا ہے۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو کمر ٹوٹ چکی ہوتی لیکن میں انجمن کو نہیں چھوڑ سکتا' میں چھوڑ بھی دوں تو انجمن مجھے نہیں چھوڑے گی۔ زندگی بھر کا عشق ہے ڈاکٹر صاحب!"

"وہ تو ہے لیکن آپ نے اپنے لیے کیا سوچا۔ اب ایک نہیں دو انجمنیں ہیں۔"

"میں مستقل ایک جگہ کا ہوکر نہیں رہنا چاہتا۔ میں دونوں جگہوں پر اردو کی ترویج کا عزم کیے ہوئے ہوں۔ اسی سلسلے میں گاندھی سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"تو پھر دیر کیا ہے؟"

"بس دو دن یہاں ٹھہروں گا۔ یکم فروری کو گاندھی جی سے مڈبھیڑ ہوگی۔"

انہوں نے پیر حسام الدین راشدی کو بھی لکھ دیا تھا "جب کوئی مناسب مکان مل گیا تو دفتر و کتب خانہ اس میں منتقل کرکے کراچی چلا آؤں گا۔ وہاں مجھے کسی علیحدہ مکان کی ضرورت نہیں۔ شاردا مندر میں رہ کر کام کروں گا اور رات کو وہیں پڑا رہوں گا۔ میرے پاس اب کیا ہے جو مکان کی ضرورت ہو۔ ایک بچھونا اور دو چار کپڑے ہیں اور بس۔ دوسرے مجھے تو دونوں ملکوں میں رہنا ہے۔"

۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو وہ اپنے کمرے میں بیٹھے تھے۔ مغرب کا وقت ہوچکا تھا کہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے فرزند زبیر صدیقی گھبرائے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔

"کسی نے گاندھی جی کو گولی مار کر ہلاک کردیا۔"

"یاالٰہی خیر! اب مسلمانوں کا کیا ہوگا۔ کیا انہیں ایک اور خون کا دریا پار کرنا ہوگا۔ اس قتل کا الزام بھی مسلمانوں ہی کے سر جائے گا۔" مولوی صاحب کی زبان سے بے اختیار یہ کلمات نکلے۔

جلد ہی یہ خبر آگئی کہ یہ کارنامہ کسی مسلمان کا نہیں۔ قاتل انہی کا ہم قوم تھا۔ ہندوستان کے مسلمان ایک بڑی آزمائش سے بچ گئے۔ مسلمان گھروں کے بجھے ہوئے چراغ پھر سے جل گئے لیکن عبدالحق کے دل کا اندھیرا پہلے سے بھی بڑھ گیا۔ گاندھی سے ملاقات کی حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ گاندھی ان کے مخالف ضرور تھے لیکن ان کے کام کی قدر بھی کرتے تھے۔ انہیں امید تھی کہ ان سے مل کر انجمن کے بہت سے مسئلے حل ہوجائیں گے لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!

وہ ایک مرتبہ پھر دلی چلے گئے۔ یہاں انہیں انجمن کے لیے مکان تلاش کرنا تھا۔ کوچہ گردی آبلہ پائی بن گئی لیکن مکان کا انتظام نہ ہوسکا۔ کوئی ڈر کے مارے مکان دینے کو تیار ہی نہیں تھا۔

پنڈت کیفی' سر تیج بہادر سپرو' پنڈت کشن پرشاد کول' ڈاکٹر تارا چند جیسی ہستیاں زبان کے مسئلے پر ان کی ہم نوا تھیں لیکن مکان کے حصول میں کسی کی کوششیں بار آور نہیں ہو رہی تھیں۔

زاہد حسین صاحب کا جن کے پاس ان کا قیام تھا' دلی سے کراچی تبادلہ ہوگیا۔ اب خود ان کے قیام کی کوئی صورت نہ رہی تھی لہٰذا انہیں بھی کراچی واپس آنا پڑا۔

یہاں آتے ہی وہ اپنے کام میں مصروف ہوگئے اور انجمن ترقی اردو پاکستان کا ڈول ڈالنا شروع کیا۔

انہوں نے بڑی امنگوں کے ساتھ قائداعظم محمد علی جناح کو خط لکھا کہ وہ انجمن کا افتتاح اپنے دستِ مبارک سے فرمائیں۔ جس محبت سے انہوں نے خط لکھا' اسی محبت سے جواب آیا۔ قائداعظم نے بڑی مسرت کا اظہار کیا اور لکھا کہ آج کل بہت مصروف ہوں۔ سرحد کے دورے سے واپسی پر ۱۵ اپریل کے بعد کسی روز بڑی خوشی سے انجمنِ ترقیِ اردو پاکستان کا افتتاح کروں گا۔

کراچی میں انجمن کا کام آہستہ آہستہ جم رہا تھا لیکن ان کے دل کو دلی بے چین کیے ہوئے تھی۔ سوتے جاگتے وہیں کے خواب دیکھتے تھے۔ خاص کر اپنے کتب خانے کا خیال ستاتا تھا کہ کیسی کیسی کتابیں برباد ہوکر رہ گئیں۔

عمر کے آخری حصے میں اپنی علمی اور عملی سرگرمیوں کے بہترین مرکزوں سے جدائی۔ دلی کی ادبی محفلوں کا اجڑنا اور

سب سے بڑھ کر دریا گنج دہلی میں انجمن کے دفتر اور بیش قیمت کتب خانے کی تباہی ایسے صدمات نہیں تھے جو آسانی سے برداشت کیے جاسکتے۔ ان مستقل صدموں نے ان کی صحت پر نہایت ناگوار اثرات ڈالے۔ احباب کی یہ رائے قرار پائی کہ وہ تبدیلی آب وہوا کے لیے کوئٹہ چلے جائیں جہاں کی آب وہوا صحت کے لیے بے نظیر ہے۔

مستقل کام کرتے رہنے ہی میں ان کی زندگی کا دارومدار تھا۔ طبیعت کیسی ہی ناساز ہو، کام کیے بغیر رہ نہیں سکتے تھے۔ ان کی نبض کتابوں کے ساتھ چلتی تھی۔ محض سیرو تفریح کے مواقع ان کی زندگی میں بہت کم آئے ہوں گے۔ ڈاکٹر لاکھ کہتے تھے کہ کام کی زیادتی سے گریز کریں لیکن بچپن سے اب تک کی عادت چھوٹ ہی نہیں سکتی۔ وہ کوئٹہ تبدیلی آب وہوا کے لیے جا رہے تھے لیکن کتابوں اور کاغذات کا انبار ان کے ہمراہ تھا۔

کوئٹہ میں ان کے لیے ایک نہایت عظیم الشان چنار کے درخت سے متصل کہ جس کی بلندی اور پھیلاؤ کو دیکھ کر قدرت کا تماشا نظر آتا تھا، ایک ڈیرا لگا دیا گیا۔ وہ دن بھر اس درخت کے زیر سایہ بیٹھے کام کرتے رہتے اور اس شاندار درخت کی شوکت، عظمت اور گھنے سائے کا لطف اٹھاتے۔

ابھی کوئٹہ کی آب وہوا سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بہ مشکل سولہ سترہ دن گزرے ہوں گے کہ کراچی سے یہ وحشت ناک خبر ان تک پہنچی کہ اگر وہ فوری طور پر دلی نہ پہنچے تو حکومت "انجمن ترقی اردو" ہند کو امداد بھی نہیں دے گی (جس کی منظوری ہوچکی تھی) زمین بھی ضبط کرلے گی اور کتب خانے سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ یہ خبر بعض نہایت معتبر اشخاص دلی سے لائے تھے۔ اس لیے یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ ہی نہیں تھی۔ طبیعت کی ناسازی میں پریشانی کا عنصر بھی شامل ہوگیا۔ وہ دوسرے ہی دن یعنی ۱۰ اگست ۱۹۴۸ء کو کراچی روانہ ہوگئے۔ تاکہ احباب سے مشورہ کرنے کے بعد کسی نتیجے پر پہنچا جائے۔ احباب کا مشورہ یہ تھا کہ پہلے کوئی دلی جاکر تمام حالات معلوم کرے اس کے بعد وہ جائیں۔ اسے احباب کے مشوروں کے سامنے سر جھکانا پڑا۔

۱۱ ستمبر کی شب کو قائداعظم رحلت فرماگئے۔ ان کے ہاتھوں انجمن کے افتتاح کی حسرت ہی رہ گئی۔

ابھی وہ اس خبر سے سنبھلنے نہیں پائے تھے کہ یہ خبر پہنچی کہ بھارت کی فوج حیدر آباد پر چڑھ آئی ہے۔ حیدر آباد میں انہوں نے اپنی عمر کے چالیس برس گزارے تھے۔ یہی وہ سرزمین تھی جہاں ان کی جوانی نے دن گزارے تھے اور پھر انہیں بوڑھا ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہی وہ سرزمین تھی جہاں انجمن ترقی اردو نے اپنے عروج کی منزلیں طے کی تھیں۔ پھر یہ خبر بھی آگئی کہ ہندی فوجیں حیدر آباد میں داخل ہوگئیں۔

یہ خبریں ان کے لیے صدمے سے کم نہیں تھیں لیکن اب تو وہ جیسے ہر صدمے کے عادی ہوگئے تھے۔ یہ صدمہ بھی بہت سے صدموں میں گھل مل گیا۔

وہ آخری کوشش کے طور پر ۱۳ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو دہلی گئے۔

پانچ اکتوبر کو وہ ابوالکلام آزاد سے ملنے ان کی قیام گاہ پر گئے۔ بڑے تپاک سے ملے لیکن بشرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ کچھ فکر مند ہیں یا انہیں توقع نہیں تھی کہ عبدالحق ان سے ملنے آسکتے ہیں۔ ان کی مشہور زمانہ لب سوز چائے آگئی۔

"جی مولوی صاحب، کیسی گزر رہی ہے۔ پاکستان میں۔"

"جس کی ایک اولاد یہاں اور ایک وہاں ہو۔ اس کا دل ایک جگہ کیسے لگ سکتا ہے؟"

"دل تو لگانا پڑے گا" ابوالکلام آزاد نے کہا "یہ ٹھیک نہیں ہے کہ آپ کی ایک ٹانگ یہاں ہے اور ایک وہاں۔"

"میں دونوں جگہ کام کرنا چاہتا ہوں بلکہ اس سے بھی آگے افغانستان، ایران، چین، عرب اور انڈونیشیا وغیرہ میں۔"

"اور ملکوں کا تو میں کہہ نہیں سکتا لیکن یہاں آپ کے بارے میں بہت سی بدگمانیاں ہیں۔ یہاں آپ کا رہنا دوبھر ہوجائے گا۔"

"ان بدگمانیوں کو دور کرنے کی یہی ایک صورت ہے کہ زبان اور کلچر جو پاکستان اور بھارت کی اکثر آبادی میں مشترک ہے، اس کے لیے پوری آزادی ہو خاص طور پر اردو کے لیے جو یہاں کے کروڑوں انسانوں کی زبان ہے۔"

"آپ کے کہہ دینے اور میرے مان لینے سے کوئی فائدہ نہیں۔ آپ خود ہی دیکھ چکے ہوں گے کہ انجمن کے لیے کوئی مکان تک دینے کو تیار نہیں۔ لوگ کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں۔ حکومت کے نزدیک آپ ایک مشکوک آدمی ہیں۔"

غرض کچھ ایسی باتیں ہوئیں کہ وہ ان کی طرف سے مایوس ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

اب انہیں بعض دوسرے دوست یاد آئے جو ان کے قدرداں بھی تھے۔ ان کے ہم نوا بھی اور بااثر بھی تھے۔ وہ ڈاکٹر تارا چند سے ملے، ڈاکٹر ذاکر حسین سے ملاقات کی۔ سب نے انہیں یہی مشورہ دیا کہ مستقل طور پر پاکستان چلے جائیں۔

ان کی یہ کوششیں حکومت کی نظروں سے پوشیدہ نہیں تھیں۔ خفیہ پولیس ان کی باقاعدہ نگرانی کررہی تھی۔

ایک روز ایک باریش بزرگ ان سے ملنے آئے۔ نہایت دُکھے دل سے ہندوستان میں اردو کی حالتِ زار کا تذکرہ کیا۔ پھر پاکستان میں اردو کی بابت پوچھا۔ مولوی عبدالحق کا ہر وہ شخص دوست بن جاتا تھا جو اردو کا دوست ہو۔ یہ صاحب بھی مستقل آنے لگے۔ کرید کرید کر مولوی صاحب کے عزائم دریافت کرتے۔ اب ان سے کون ملنے کے لیے آنے والا ہے۔ اب وہ کس سے ملنے جارہے ہیں۔ اگر وہاں سے یہ جواب ملا تو وہ کیا کریں گے؟ اگر وہ جواب ملا تو ان کا طرزِ عمل کیا ہوگا۔ مولوی صاحب اپنی سادگی میں سب کچھ بتاتے رہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ سی آئی ڈی کا آدمی تھا۔

بابائے اردو کو یقین تھا کہ حکومتِ ہندوستان اگر تعاون کرے تو وہ دہلی میں رہ کر بھی کام کرسکیں گے۔ وہ اب تک یہی سمجھ رہے تھے کہ چونکہ اردو، ہندو اور مسلمانوں دونوں کی مشترکہ زبان اور قومی اثاثہ ہے اس لیے دہلی میں بیٹھ کر کام کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن حکومتِ ہند انہیں کسی قیمت پر برداشت کرنے کو تیار نہیں ہورہی تھی۔ انہیں مجبور کیا جارہا تھا کہ وہ انجمن سمیت اپنا بوریا بستر سنبھالیں اور پاکستان کی راہ لیں۔

انہیں اس مرتبہ کے دہلی کے قیام میں طرح طرح سے تنگ کیا جارہا تھا۔ انہیں یہ محسوس ہونے لگا تھا جیسے وہ کسی دشمن ملک کے جاسوس ہوں۔

کہیں نجات کی کوئی صورت نہیں تھی۔ جن پہ تکیہ تھا جب وہ پتے بھی ہوا دینے لگے تو وہ ایک مرتبہ پھر ابوالکلام آزاد سے ملے۔

"میں انجمن کو کراچی لے جانے پر مجبور ہوں۔ بشرطیکہ کتب خانہ لے جانے کے ساتھ ساتھ مجھے وہ رقم بھی لوٹادی جائے جو انجمن نے حکومتِ ہند کو زمین کی قیمت میں ادا کی تھی۔"

ابوالکلام نے یقین دہانی کرائی لیکن اس کے برعکس ہوا یہ کہ انجمن کا دفتر سربہ مُہر کردیا گیا اور رقم لوٹادینے کا وعدہ بھی وعدۂ معشوق ہوگیا۔

وہ بے یارومددگار دلی میں پڑا رہا کہ اپنا دفتر واگزار کرالے۔ ہر کوشش بے سود، ہر تدبیر بے کار گئی بلکہ اب تو انہیں یہ خدشہ ہونے لگا کہ کہیں اور کوئی الزام نہ لگ جائے۔ وہ تنگ آکر بھوپال چلے گئے۔ وہاں بھی تقریباً ایک ماہ گزاردیا اور بالآخر ناکام ونامراد ۲۴ جنوری کو بمبئی پہنچ گئے۔ کچھ کام تھے، وہ نمٹائے اور ۲۸ دسمبر کو بمبئی سے کراچی کے لیے جہاز میں سوار ہوگئے۔

رخصت اے ہندوستاں، اے بوستانِ بے خزاں
رہ چکے تیرے بہت دن ہم بدیسی مہماں

○☆○

ہندوستان میں رہ کر جتنا کام کیا تھا، ساری محنت اکارت گئی۔ کتب خانے کی ضبطی کا داغ الگ دل پر لگا پھر بھی دل کو یہ تسلی تھی کہ اپنوں میں آگئے۔ یہاں اردو کے لیے جھگڑنا نہیں پڑے گا۔ یہاں کی زبان اردو ہوگی۔ انہیں ہر مشورے میں شریک کیا جائے گا، ان کی قدرومنزلت ہوگی۔

نئے سرے سے کام کا آغاز کرنا تھا لیکن سرمائے کی شدید کمی تھی۔ حکومتِ ہند نے انجمن کے سرمائے منجمد کردیے تھے۔

بہت بھاگ دوڑ کرنے کے بعد وہ کچھ سرمایہ اکٹھا کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ بیس ہزار حکومت پاکستان نے پچیس ہزار سالانہ ریاست خیرپور سے، پانچ ہزار کا عطیہ حکومت پنجاب نے اپنے بجٹ سے پچاس ہزار روپے انجمن کو دیے اور کام چل پڑا۔

انجمن کے ترجمان "قومی زبان، معاشیات، سائنس" وغیرہ کا اجرا ہوا۔ مطبوعات کا سلسلہ ازسرِنو شروع ہوا۔ دس ہزار کتابوں کے ذخیرے سے لائبریری کھولی گئی۔

ان کا اب بھی یہی ایمان تھا کہ مسلمانوں کی ترقی کا دارومدار اردو کی ترقی پر ہے۔ وہ جلد سے جلد پاکستان میں اردو کو انگریزی کا مقام دلوانا چاہتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ عدالتوں کی زبان اردو ہو، اسمبلیوں کی زبان اردو ہو، دفتروں کی زبان اردو ہو۔ اسکولوں اور کالجوں میں ذریعۂ تعلیم اردو ہو تاکہ ایسے نوجوان تیار ہوں جو انگریزی کے محتاج نہ ہوتے ہوئے ملک کی باگ ڈور سنبھال سکیں۔ اس کے لیے انہوں نے اردو کالج کھولا جس میں یونیورسٹی کے مضامین کی تعلیم اردو کے ذریعے دینے کا انتظام کیا گیا تھا۔

جامعہ عثمانیہ کا تجربہ ان کے سامنے تھا۔ اسی طرز کی یونیورسٹی وہ کراچی میں قائم کرنا چاہتے تھے جس کا پہلا زینہ یہ کالج تھا۔

اس کالج کے کھلنے کے بعد پہلی مرتبہ انہیں احساس ہوا کہ یہاں نہ کوئی خود کام کرنا چاہتا ہے نہ دوسرے کو کام کرتے ہوئے دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ یہ احساس اس وقت ہوا جب اس کالج کے الحاق کا مسئلہ آیا۔

کوئی یونیورسٹی اس کے الحاق کے لیے آمادہ نہیں تھی۔ بڑی مشکل میں جان تھی۔ وہ تو سمجھ رہے تھے، حکومتی حلقوں میں ان کے اس کام کی بڑی پذیرائی ہوگی لیکن یہاں کا تو عالم ہی دوسرا تھا۔ محکمہ تعلیم کے دفاتر کے چکر وہ اس طرح کاٹ رہا تھا جیسے کوئی اسے یہاں جانتا ہی نہ ہو۔ اس کا ماضی اور حال کسی کے سامنے ہی نہ ہو۔ سندھ یونیورسٹی نے نہ جانے کن مصالح کی بنا پر انکار کردیا۔ ایک طویل خط وکتابت کے بعد انکار ہوگیا۔ اب انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے خط وکتابت شروع کی۔ ان کا جواب یہ آیا کہ یہ کالج پنجاب یونیورسٹی کی حدود ارضی سے باہر ہے اس لیے الحاق ممکن نہیں۔

بہت ممکن تھا کہ وہ مایوس ہوکر اس منصوبے سے ہاتھ اٹھا لیتے لیکن مایوس ہونا تو انہوں نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ ایک مرتبہ پھر کوششوں میں جُت گئے۔ آخر ایک طویل تگ ودو کے بعد وزیر خزانہ غلام محمد اور وزیر تعلیم فضل الرحمن کی مدد سے سندھ یونیورسٹی نے الحاق منظور کرلیا۔

انجمن کے پہلے صدر سر شیخ عبدالقادر تھے۔ ان کے انتقال کے بعد (۱۹۵۰ء) عبدالحق صدر بنے۔

پاکستان کے شب وروز سیاسی کمزوریوں میں بسر ہو رہے تھے۔ ہندوستان میں اردو، ہندی تنازع روبرو تھا۔ اب قومی زبان کا مسئلہ کھڑا ہوا تھا۔ ہرچند کہ بابائے قوم حضرت قائداعظم نے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا۔

"اگر تم پاکستان کو قائم رکھنا چاہتے ہو تو یاد رکھو کہ پاکستان کی زبان صرف اردو ہوسکتی ہے۔ کوئی اور زبان نہیں۔"

اس فرمان کے باوجود بنگالیوں نے بنگالی کے حق میں آواز بلند کی۔ بدقسمتی سے یہ مسئلہ جو خالص لسانی اور ثقافتی تھا، سیاسی گتھیوں میں الجھا دیا گیا۔

اب مولوی عبدالحق کا سب سے بڑا مشن اردو کو پاکستان کی قومی اور سرکاری زبان کا درجہ دلانا تھا۔ اس کا ثبوت وہ اردو کالج قائم کرکے دے چکے تھے کہ اردو میں ذریعہ تعلیم بننے کی پوری صلاحیت ہے لیکن اہلِ اقتدار انگریزی سے گلوخلاصی کے لیے تیار نہیں تھے۔

انہوں نے اکابرین کی توجہ اس طرف دلانے کے لیے کراچی میں ایک اردو کانفرنس بلائی۔ اس کی صدارت عبدالرب نشتر نے کی۔ گورنر جنرل ناظم الدین نے اپنے خطبے میں مشرقی پاکستان میں اردو کی ترویج کے لیے تجاویز پیش کیں۔

اس کانفرنس میں عبدالحق نے جن خیالات کا اظہار کیا ان سے ان کے عزائم کا پتا چلتا تھا کہ وہ تھکے نہیں ہیں۔ اس معاملے میں کتنے آگے جاسکتے ہیں۔

"کسی تحریک کو ہمدردوں کی ہمدردی اور مربیوں کی سرپرستی سے تقویت نہیں پہنچتی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس تقویت کا راز بہت کچھ مخالفت میں ہے۔ مخالفت بیدار کرتی ہے۔ عملی قوت کو ابھارتی ہے۔ انسان کے ان جوہروں کو جلا دیتی ہے جو پہلے مدھم پڑے تھے۔ مخالفت درپردہ امتحان ہے۔ تحریک اگر حق پر ہے اور کام کرنے والوں میں خلوص اور استقلال ہے تو مخالفت دب جائے گی۔ اور تحریک سوبسوے کامیاب ہوگی۔ مخالفت نے پاکستان بنادیا ورنہ کیا اتنی جلد بن جاتا اور مخالفت کے طفیل ہی اردو کو ترقی نصیب ہوئی۔"

انہوں نے مخالفت طلب کی تھی۔ مخالفت ملی اور خوب ملی۔

اس کے بعد سے وہ مسلسل اردو کا مقدمہ لڑتے رہے۔ ہندوستان میں اگر غیروں کا سامنا تھا تو یہاں اپنوں سے سابقہ پڑا جو زیادہ تکلیف دہ تھا۔ انہیں دکھ تھا تو یہ کہ یہاں بھی اردو کی اہمیت بتانی پڑ رہی ہے۔

"قومیت کے لیے یک رنگی کے لیے ہم خیالی کی اور ہم خیالی کے لیے ہم لسانی کی سخت ضرورت ہے جہاں زبان ایک نہیں وہاں خیال کا رنگ ایک نہیں۔ جہاں خیال ایک نہیں وہاں دل بھی ایک نہیں۔"

انہوں نے کبھی کی کہی ہوئی باتوں کو دہرانا شروع کیا کہ وہی مسئلے اب یہاں بھی درپیش تھے۔ کہی ہوئی باتوں کو دوبارہ کہنے میں کیسی بے دلی ہوتی ہے یہ وہی سمجھ سکتے ہیں جو اس مرحلے سے گزرے ہیں لیکن وہ اس بے دلی میں بھی حوصلے اور عزم کا چمن کھلائے بیٹھے تھے۔ کبھی کنونشن بلاتے کبھی کانفرنس منعقد کرتے۔ کبھی سرکاری افسروں سے ملتے۔ ہر تقریر، ہر تحریر میں یہی کہتے رہے کہ اردو کو سرکاری زبان بناؤ۔

جب کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھا تو کام کون کرتا۔ مالی امداد کی سخت ضرورت تھی لیکن ذرائع محدود سے محدود تر۔

ایک دن عجیب اتفاق ہوا۔ شام کی سیر ان کا معمول تھی۔ ایک دن وہ ٹہلنے کے لیے نکلے۔ سڑک کے کنارے کنارے پیدل چل رہے تھے۔ ادھر سے گورنر جنرل غلام محمد کی سواری آگے پیچھے جیپوں کے درمیان سڑک سے نکلی اور یکایک رک گئی۔ گورنر جنرل کار سے اترے اور ان کے پاس

آ گئے۔

"آیئے" انہوں نے مولوی عبدالحق کا ہاتھ پکڑا اور انہیں لے کر اپنی کار میں آ گئے۔

انہوں نے راستے میں خود ہی انجمن کا ذکر چھیڑا۔ عبدالحق نے اپنی مشکلات سے انہیں آگاہ کیا اور اس حقیقت کے قائل ہوئے کہ اردو کے بڑے بڑے کام بغیر حکومت کی امداد کے نہیں ہو سکتے۔ انہوں نے یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ وزیرِ تعلیم فضل الرحمٰن کو بلا کر اس کے متعلق کچھ کہیں گے۔

غلام محمد نے اپنے وعدے کا اتنا پاس تو کیا کہ فضل الرحمٰن سے بات کی اور ان کی سفارش پر حکومت پاکستان نے 'پانچ سو روپے ماہانہ کی پنشن منظور کی اور لکھا کہ یہ پنشن اردو کی لائق توصیف' خدمت کے سلسلے میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کو دی جاتی ہے۔

وہ یہ پنشن لینے کو تیار نہیں تھے۔ وہ یہاں پاکستان کی خدمت کرنے کے لیے آئے تھے اس لیے نہیں آئے تھے کہ پاکستان پر بار بنیں لیکن بار بار کے تقاضوں کے بعد انہوں نے یہ کیا کہ اپنی اس ذاتی پنشن کو انجمن کے نام منتقل کر دیا۔

"حکومت نے جو پنشن میرے لیے عطا فرمائی تھی وہ میں نے انجمن کو منتقل کر دی۔ میں یا مجھ جیسے دوسرے افراد رہیں نہ رہیں' انجمن کا رہنا لازمی ہے۔ میں نے حقہ چائے وغیرہ ترک کر دیے ہیں۔ اپنی ضرورتیں بہت کم کر دی ہیں۔ کھانے کے لیے میں ۶۳ روپے ماہانہ رکھے ہوئے ہیں۔ چند روپے دھوبی حجام کے سمجھ لیجیے کپڑوں کی ضرورت ہے نہ جوتوں کی البتہ دو تین طالب علموں کو مدد دیتا ہوں' دیتا رہوں گا۔"

(خط بنام عبادت بریلوی)

اس طرح کوئی انجمنیں چلتی ہیں۔ وہ اپنی ضرورتوں میں کٹوتی کر کے بھی کتنا بچا سکتے تھے۔ ان کے پاس علم و ادب اصطلاحات و لغات کا ڈھیر رکھا تھا لیکن اشاعت کے لیے روپیا نہیں تھا۔ انہوں نے حکومت سے کچھ رقمی امداد طلب کی تا کہ تمام دفاتر اور عدالتی الفاظ و اصطلاحات کی ڈکشنری تیار ہو سکے لیکن اہلِ اقتدار کو اردو رائج ہی نہیں کرنی تھی تو ان اصطلاحات کی پروا کیوں ہوتی۔

۱۹۵۴ء میں ایک مرتبہ پھر انہیں اپنی محنت اکارت جاتی ہوئی نظر آئی۔ بابائے قوم کے فرمان کے برعکس یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک ملک میں دو قومی زبانیں ہوں گی۔

جس روز مجلس دستور ساز میں زبان کا مسئلہ پیش ہونے والا تھا' وہ انجمن کے دفتر سے پیدل روانہ ہوئے' ایک لاکھ کا مجمع ساتھ تھا۔ مئی کی گرمی میں تین میل کا فاصلہ طے کر کے یہ جلوس اس مقام تک پہنچ گیا جہاں بلا اجازت داخل ہونا ممنوع ہے۔ پولیس اور مسلح فوج مشین گنیں اور ٹینک لیے کھڑی تھی۔ سارے شہر میں کامل ہڑتال تھی۔ لوگوں میں سخت اشتعال پھیلا ہوا تھا۔ یہ سب مولوی عبدالحق کی تحریری کاوشوں کا نتیجہ تھا کہ عوام کو اسمبلی میں پیش ہونے والے دو لسانی بل کے بارے میں معلوم ہو سکا اور وہ بابائے اردو کی سربراہی میں اپنے گھروں سے اسمبلی تک آ گئے۔

ہزاروں افراد ممنوعہ علاقے میں زبردستی داخل ہو گئے۔

اب اس میں کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ نہایت خون خرابہ ہوگا لیکن محمد علی بوگرہ کی دانش مندی یا سیاسی چال نے اس خطرے کو ٹال دیا۔ وہ اسمبلی سے باہر آ کر مولوی صاحب سے ملے۔

"آپ ان سب لوگوں کو لے کر کیوں آئے ہیں؟"

"انہیں میں نہیں لایا' اردو کی محبت انہیں لے کر آئی ہے۔ حکومت کے ایک غلط فیصلے سے اختلاف انہیں یہاں لے کر آیا ہے۔ اب آپ کو ہوا کا رخ پہچان لینا چاہیے۔ اس ملک میں صرف اردو کو قومی زبان کا درجہ ملنا چاہیے۔"

"یہ ایک سنجیدہ مسئلہ ہے جو گفت و شنید سے طے ہو سکتا ہے' احتجاج سے نہیں۔"

"کاش! یہ بات آپ پہلے سوچ لیتے۔ آپ نے تو اجلاس بلا لیا۔"

"دیکھیے تو اجلاس میں کیا طے ہوتا ہے۔ کیا خبر یہ بل پاس ہی نہ ہو سکے۔"

"اور اگر پاس ہو گیا؟"

"پھر ہمیں اور آپ کو اسمبلی کی رائے کا احترام کرنا ہوگا۔"

"ایسا بل پیش ہی کیوں کیا جائے' پہلے معاملہ صاف ہونا چاہیے۔"

ماخذات: بابائے اردو' ڈاکٹر معراج نیر۔

ذکرِ عبدالحق' سید معین الرحمٰن

نقدِ عبدالحق

نقوش

نایاب ہیں ہم' حمیدہ اختر۔

○☆○

”آپ ان لوگوں سے کہئے کہ پُرامن طور پر اپنے گھروں کو چلے جائیں۔“

”کس ضمانت پر؟“

”ہم آپ سے مذاکرات کرنے کو تیار ہیں۔“

”تو پھر آج کا اسمبلی کا اجلاس برخاست کیجئے۔“

محمد علی بوگرہ اب بے بس ہو گئے۔ انہوں نے اجلاس ملتوی کرنے کا وعدہ کرلیا اور دوسرا دن عبدالحق سے گفتگو کرنے کا ٹھہرا۔

بابائے اردو نے اسی وقت مجمع کو اس فیصلے سے آگاہ کیا اور مجمع پُرامن طور پر منتشر ہو گیا۔

دوسرے دن وعدے کے مطابق گفتگو بھی ہوئی۔ معاہدہ بھی لیکن عمل اس کے خلاف ہوا۔

○☆○

بہت دنوں سے ان کا ایک خواب تھا اور وہ یہ کہ جس طرح دنیا کی بڑی زبانوں میں یہ دستور ہے کہ ہر موضوع پر لکھی جانے والی مطبوعہ و غیر مطبوعہ کتابوں کی فہرست کتابی شکل میں شائع کی جاتی ہے' اسی طرح اردو کی کتابوں کی بھی ایک جامع فہرست ہونی چاہیے۔ ریسرچ کرنے والوں کو مختلف لائبریریوں کی خاک چھاننے کے بجائے محض ”قاموس الکتب“ کی ورق گردانی سے معلوم ہو جائے گا کہ فلاں موضوع پر کتنی کتابیں کس کس مصنف کی موجود ہیں۔

اردو جیسی بڑی زبان میں جس میں ہر موضوع پر ہزاروں کتابیں لکھی گئی ہوں' ایسی فہرست کی تیاری آسان بات نہیں۔ اس کے لیے بڑے وسائل کی ضرورت ہے۔

عبدالحق نے اس منصوبے سے حکومت کو آگاہ کیا۔ وزارت تعلیم نے اس طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ وہ پھر دل مسوس کر رہ گئے۔ البتہ انجمن میں اس فہرست کا کام چلتا ضرور رہا۔

انہی دنوں (۱۹۵۶ء) یونیسکو نے حکومت سے دریافت کیا کہ آپ کے پاس اپنی زبان کی کوئی ببلوگرافی ہے؟ اگر نہیں ہے تو کیا تیار ہو سکتی ہے؟

اب وزارتِ تعلیم کو ان کی یاد آئی۔ وہی منصوبہ جو انہوں نے پیش کیا تھا' اب بیش قیمت نظر آنے لگا۔

”ہمارے تعلیم یافتہ لوگ عربی فارسی کتابوں کو مطلق قابلِ التفات نہیں سمجھتے۔ ہاں' اگر کوئی یورپین یا امریکی کسی کتاب یا ہمارے کسی قدیم نظریئے کے متعلق کوئی تعریفی کلمہ کہہ دے تو وہ ان کے لیے وحی والہام ہو جاتا ہے۔“

اب وزارت تعلیم والے بھاگے ہوئے آئے۔ امداد دینے پر تیار ہو گئے اور رقم دے دی۔

ان ناقدریوں میں گھرا ہوا آدمی' اپنے مقاصد کے سامنے چٹان کی طرح کھڑا ہوا تھا' البتہ ان تجربوں نے اسے تلخ اور غصیلا ضرور کر دیا تھا۔ بات بات پر بھڑک جانا ان کا مزاج بن گیا تھا۔ ان کے احباب اور ساتھ کام کرنے والے رفیق ان کے مزاج کو سمجھتے تھے اس لیے تمام کام خوش اسلوبی سے چل رہے تھے۔

انہوں نے اس خیال سے کہ روز مرہ کے انتظامی جھگڑوں' حسابات اور پریس وغیرہ کی نگرانی سے نجات مل جائے اور وہ اپنی توجہ صرف ادبی کاموں کی طرف مبذول کر سکیں' جدید سیکریٹری' جوائنٹ سیکریٹری کا انتخاب کرایا۔ نئے خازن کا بھی انتخاب ہوا۔

وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ اب کام اطمینان سے چلے گا مگر معاملہ برعکس نکلا۔ ان نئے آنے والوں نے غلط پروپیگنڈا اور سازش سے مجلس منتظمہ میں اپنی اکثریت بنالی اور تخریبی کارروائیاں شروع کر دیں۔ الٹی سیدھی جو چاہتے' کرتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حالات ابتر ہو گئے۔ انجمن پانچ رسالے نکالتی تھی ان میں سے تین رسالے بند ہو گئے۔ مالی حالت اس حد تک ابتر ہو گئی کہ ملازمین کی تنخواہیں تک ادا کرنی مشکل ہو گئیں۔ انجمن چالیس ہزار کی مقروض ہو گئی۔

ادھر یہ بحرانی اور ادھر مجلس ناظمین اور عبدالحق کے درمیان اتنے اختلاف بڑھے کہ معاملہ الزام تراشیوں تک پہنچ گیا۔ انجمن کے وہ کارکن جن سے مولوی صاحب کو بڑی امیدیں تھیں' ان کے خلاف سازشوں میں شریک ہو گئے۔ ان کے خلاف پوسٹر چسپاں ہونے لگے' رکیک الزامات شائع ہونے لگے۔

ان کے قدیم ساتھی اور رفیق ایک ایک کرکے رخصت ہو گئے اور وہ اکیلے ان کا ماتم کرنے اور پاکستان میں ٹھوکریں کھانے کے لیے رہ گئے۔

یہ ان کے لیے بڑی آزمائش کا دور تھا۔ ایک وقت وہ تھا کہ وہ گاندھی سے ٹکرا گئے تھے لیکن اب چھیاسی سال کی عمر میں وہ ایسے قضیوں کا بار اٹھانے کے لائق نہیں رہے تھے۔ ان کے حریف تازہ دم تھے اور بہت تھے۔ ان کے دماغ تخریبی جدتوں سے مالا مال۔ وہ بے دست و پا ہو کر رہ گئے۔ انجمن ان لوگوں کے تصرف میں آ گئی جو حقیقی معنوں میں مولوی صاحب کے رفیق و مددگار نہیں تھے۔

مولوی صاحب کو یہاں تک اذیت پہنچائی گئی کہ ان پر کتب خانے کے دروازے بند کر دیے۔ وہ تیسری منزل پر

قیدیوں کی سی زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ بیمار تھے، بوڑھے تھے اردو کے محسن تھے لیکن سازشیں یہ کب دیکھتی ہیں۔

اس دور کے بابائے اردو کو دیکھ کر اکثر لوگ کہتے تھے، سرسید کے آخری ایام کی تاریخ دہرائی جارہی ہے۔

○☆○

وہ لڑکی جسے وہ بڑے چاؤ سے کبھی اختر حسین رائے پوری کی دلہن بناکر حیدرآباد لائے تھے اور اس کے آجانے سے نادر منزل میں خوشیاں اتر آئی تھیں، ان سے ملنے آئی۔

اس لڑکی نے اس شیر جیسے انسان کو بے بسی کے ساتھ سرجھکائے بیٹھے دیکھا تو اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"بس آپ میرے ساتھ چلیں۔"

"بھلا میں کہاں جاسکتا ہوں۔ میں تو ایک قیدی ہوں۔ پھر اگر انجمن کو چھوڑ کر جاؤں تو جو میری نادر کتابیں اور قلمی نسخے باقی رہ گئے ہیں، وہ بھی شاید نہ رہیں۔"

وہ لڑکی سوچ میں پڑگئی کہ یہ عظیم انسان، محسنِ قوم و زبانِ اردو کسی کے قیدی ہوسکتے ہیں؟ ان کے چہرے پر تو میں نے ہمیشہ ہنسی دیکھی تھی۔

یہ والا چہرہ اور یہ دھندلی اور پپوٹے پھولی آنکھیں تو میرے تصور میں بھی نہیں تھیں۔

اس لڑکی نے انہیں ہنسانے کے لیے حیدرآباد کی باتیں چھیڑدیں جب وہ بیاہ کر آئی تھی اور مولوی صاحب اس کے لیے شفقت کا پیکر بن گئے تھے۔

جب وہ لڑکی چائے پی چکی تو مولوی صاحب نے کہا
"اب جاؤ۔"

وہ لڑکی یہ سوچتی ہوئی ان کے کمرے سے نیچے اترنے والی سیڑھیاں اتر کر نیچے آگئی کہ آخر وہ کون لوگ ہیں جنہوں نے ایسے عظیم اور قوم کے محسن کو قیدی ہونے کا احساس دلایا ہوا ہے۔

○☆○

جس انجمن کو وہ دنیا کی نظر بچاکر لائے تھے اپنے ہی وطن میں تماشا بنی ہوئی تھی۔

ایک بھی ڈھنگ کا رفیق اس وقت ان کے ساتھ نہیں تھا جو حریفوں کو جواب دیتا جبکہ حریفوں میں کئی بڑے زوروں کے آدمی تھے۔ انہوں نے بعض سرکاری عمال کو بھی اپنے ساتھ ملایا ہوا تھا۔

ابن انشا اس صورتِ حال سے پوری طرح باخبر تھے اور اس محاذ پر انہوں نے اپنی ہمت سے بڑھ کر مولوی صاحب کا ساتھ دیا بھی لیکن جب حریفوں نے ان کی خبر لینی شروع کردی

قطعہ تاریخ وفات

جدا ہم سے بابائے اُردو ہوئے
ہم اب فیض سے ان کے محروم ہیں
انہوں نے جو اُردو کی خدمتیں
وہ سب قوم کے دل پر مرقوم ہیں
یہ اللہ کے فضل سے ہے اُمید
کہ باغِ جناں میں وہ مرحوم ہیں
لکھا قادری نے یہ سالِ وفات
کہ تھے خادمِ قوم، مخدوم ہیں

۱۹۶۱ء

تو وہ اپنی سرکاری ملازمت بچانے کے لیے اس سے الگ ہوگئے لیکن اس کا دکھ انہیں ہمیشہ رہا۔

"حریفوں نے ہمارے مولوی صاحب کو اتنی اذیت دی ہے کہ اگر دس سال جینا تھا تو دو سال جئیں گے غضب خدا کا انہیں لائبریری تک سے نکال رکھا ہے۔ مولوی صاحب کی طبیعت میں اگر کوئی نقص کی بات ہے بھی تب بھی ان کی خدمات، عمر اور عظمت کو دیکھتے ہوئے ایسا کرنا سخت زیادتی ہے۔"

(خط بنام خلیل الرحمٰن اعظمی)

یہ قضیہ شاید یوں ہی چلتا رہتا اور مولوی صاحب کی عمر تمام ہوجاتی کہ ملک میں جنرل ایوب خاں کا مارشل لا آگیا۔

قدرت اللہ شہاب ایوانِ صدر میں تعینات تھے۔ گلڈ وغیرہ کے سلسلے میں ابنِ انشا کی ملاقات جمیل الدین عالی کے توسط سے قدرت اللہ شہاب سے ہوئی۔

ملک میں مارشل لا تھا۔ مختلف اداروں کی چھان بین ہورہی تھی۔ موقع غنیمت دیکھ کر ابنِ انشا نے قدرت اللہ شہاب کی توجہ انجمن کے معاملات اور بابائے اردو کی حالت کی طرف دلائی۔ ان کی کوششوں سے وفاقی وزارتِ تعلیم نے انجمن کے معاملے پر انکوائری کمیٹی بٹھادی۔

صدر ایوب کی ذاتی توجہ بھی اس طرف مبذول کرائی گئی۔ تمام حالات ان کے گوش گزار ہوئے۔ وہ خود بابائے اردو سے ملنے آئے۔ تمام روداد ان کی زبانی سنی۔

"مولوی صاحب تو اردو کے قائداعظم ہوئے نا؟"

یہ ایسا تاریخی جملہ تھا کہ مولوی صاحب کے تمام آنسوؤں کی قیمت ادا ہوگئی۔

انجمن کے پرانے اراکینِ منتظمہ میں سے بیشتر انتقال

کر چکے تھے۔ چند بوڑھے اور غیر فعال' ایک دو' مولوی صاحب سے شدید اختلاف کے حامل چنانچہ صدر ایوب نے وہ پرانی برائے نام منتظمہ توڑ دی اور ایک دستوری کمیٹی بنا کر مولوی صاحب کو صدر و نگراں نامزد کر دیا۔

مولوی صاحب کو ان کی انجمن واپس مل گئی۔ دوستوں نے مبارک بادیں دیں لیکن اب تو وہ اس کشتی کی طرح تھے جسے سنبھلنے کی خوشی بھی نہیں تھی۔

اسی سال انہیں نشانِ قائداعظم اور دس ہزار روپے نقد ملے جو انہوں نے انجمن کے فنڈ میں جمع کرا دیے۔

حکومت نے اردو ترقی بورڈ قائم کیا اور لغت کی ترتیب کے لیے ان سے درخواست کی۔ لغت سازی تو ان کا برسوں کا خواب تھا لہٰذا بخوشی اس کام کو اپنے ذمے لے لیا۔ یہ بھی اجازت ملی کہ اپنی پسند کے مددگار وغیرہ انتخاب کر لوں۔

اللہ نے ان کو ان کے صبر کا پھل نہایت شیریں عطا کیا اور وہ جی جان سے لغت سازی میں مشغول ہو گئے۔

○☆○

ایک خواب اور تھا جو انہیں رہ رہ کر یاد آتا تھا۔ یہ خواب تھا ''اردو یونیورسٹی۔''

عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کے بعد انہیں پورا یقین تھا کہ شمالی ہندوستان میں یہ یونیورسٹی قائم ہو کر رہے گی لیکن ہندوستان کے بدلتے ہوئے سیاسی حالات نے اس خواب کو شرمندۂ تعبیر نہ ہونے دیا۔ نوبت تقسیمِ ملک تک پہنچ گئی۔ بہت سوں کے بہت سے خواب پورے نہ ہو سکے تو یہ خواب کس گنتی میں تھا۔

پاکستان آنے کے بعد یہ قوی امید تھی کہ یہ تو اپنا ملک ہے۔ یہاں تو اسے عمل میں لانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی لیکن یہاں تو ہوا ہی دوسری چلنے لگی۔ قائداعظم بہت جلدی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ پھر اردو زبان کا طے شدہ مسئلہ ہی نزاعی مسئلہ بن گیا۔ ان کی ساری توانائیاں اس فتنۂ بیدار کو کسی نتیجے تک پہنچانے میں صرف ہونے لگیں۔ پھر خود انجمن کے اندرونی جھگڑوں نے انہیں ہلکان کر دیا۔

وہ عمر کے آخری حصے میں بھی اپنی صحت سے بے پروا ہو کر اردو یونیورسٹی کے لیے عملی جدوجہد میں مصروف تھے لیکن حسبِ دل خواہ تعاون نصیب نہ ہوا۔

طلبہ کی ایک تنظیم ''بزمِ افروز'' کی افتتاحی تقریب میں وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے۔

''لوگ مجھے بابائے اردو کہتے ہیں لیکن پاکستان میں آ کر تو میں طفلِ اردو ہوں۔ وہ کام اب تم پورا کرو گے جسے میں پورا نہ کر سکا۔''

یہ کہتے کہتے ان کی آواز رندھ گئی اور وہ بڑی مشکل سے اپنی تقریر جاری رکھ سکے۔

اس کے ایک سال بعد ۱۹۶۰ء میں اسی بزم کے طلبہ نے بابائے اردو کی اپیل پر یونیورسٹی فنڈ کے لیے ۲۷۰ روپے کا نذرانہ پیش کیا تو رقم لیتے ہوئے ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ پھر متعدد مقامات پر طلبہ نے اس فنڈ کے لیے رقم جمع کی اور بابائے اردو کے حضور پیش کی لیکن محض نذرانوں سے تو یونیورسٹیاں نہیں بنا کرتیں۔ صرف امیدوں سے تو چراغ روشن نہیں ہوا کرتے۔

وہ ہر چند یہ کہتے رہے کہ میں اب زندگی کی اس منزل میں ہوں جہاں کام سے زیادہ آرام کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اردو یونیورسٹی کا قیام اب میری زندگی کا مشن ہے اور اس مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں چاہے مجھے اس سے کتنی ہی تکلیف پہنچے لیکن اب عمر کی نقدی ختم ہونے کو تھی۔ نوے سال کی عمر ہو چکی تھی۔ بیماریاں ساتھ لگی ہوئی تھیں۔

اس مرتبہ ایسے بیمار ہوئے کہ سنبھلنے ہی میں نہیں آتے تھے۔ ان کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ اپنا علاج کرا سکتے۔ ۵ مئی ۱۹۶۱ء کو جناح اسپتال میں داخل ہو گئے۔

قاموس الکتب کی پہلی جلد مکمل ہو گئی تھی۔ اس میں ۱۷۶۷ کتب کی فہرست تھی۔ اسی بیماری کی حالت میں بستر پر لیٹے لیٹے اس پر مقدمہ تحریر کیا۔

جب حالت نہ سنبھلی تو ایوب خاں نے کمبائنڈ ملٹری اسپتال میں علاج کی پیش کش کی۔ ۲۳ جون کو وہ پنڈی روانہ ہو گئے۔ دو ماہ کے مکمل علاج کے بعد ڈاکٹروں نے جگر کا سرطان بتایا۔

کراچی کے نیول اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔

۱۵ اگست ۱۹۶۱ء کو اچانک طبیعت بہت زیادہ بگڑ گئی۔

۱۶ اگست کو صبح آٹھ بج کر ۴۵ منٹ پر آخری ہچکی کے ساتھ ان کی زبان سے ''انجمن'' کا نام ادا ہوا اور ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔

انجمن ترقیِ اردو کے قدیم دفتر۔ شاردا مندر کی عمارت میں وہ آج بھی ابدی نیند سو رہے ہیں۔

زمانہ جب بھی لکھے گا زبان کی تاریخ
ترا خلوص ترا نام جگمگائے گا

■■■

مولانا حالی

احوالِ حال

تحریر و تحقیق: ڈاکٹر ساجد امجد

اُردو زبان میں جدید نظم کی تحریک ابھی ابتدائی مرحلے میں تھی جب ایک نام پوری آب و تاب سے اُبھر کر سامنے آیا۔ اُردو زبان کو ایک نہایت مضبوط کاندھا اور مسلمانانِ ہند کو ایک نہایت غم خوار مل گیا تھا۔ غالب کا شاگردِ رشید، سرسید احمد خان کا ہم قدم، شبلی و محمد حسین آزاد کا ہم سفر اور ساتھی، خواجہ الطاف حسین حالی، کہا جاتا ہے کہ اردو ادب میں فنِ تنقید کی باضابطہ ابتدا ان کے "مقدمہ شعر و شاعری" اور "موازنۂ انیس و دبیر" سے ہوئی۔ ان کی شہ کار نظم "مسدس حالی" نے ہندوستان بھر میں وہ شہرت حاصل کی جو شاید ہی کسی کے کلام کو نصیب ہوئی ہو۔

اپنے وقت کے نابغۂ روزگار "حیاتِ جاوید" کے مصنف الطاف حسین حالی کی سرگزشت

دن بھر راج کرنے کے بعد دھوپ گھر سے نکلی تھی کہ خواجہ ایزد بخش گھر میں داخل ہوئے۔ ان کی دونوں بڑی بیٹیاں اپنے سب سے چھوٹے بھائی الطاف حسین کے ساتھ کھیلنے میں مصروف تھیں۔ باپ کو دیکھتے ہی وہ دونوں اُٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ ننھے الطاف نے بھی اپنے دونوں ہاتھ باپ کی طرف بڑھا دیئے۔ ایزد بخش نے دونوں بچیوں کے سروں پر دستِ شفقت پھیرا اور معصوم الطاف کو گود میں اٹھا کر ایک تخت پر بیٹھ گئے جہاں سامنے چارپائی پر ان کی بیوی حسرت و یاس کی تصویر بنی، خاموش بیٹھی تھیں۔

"بندی خدا کی! کچھ تو بولو۔ تمہاری خاموشی نے پورے گھر کو اُداسی کی تصویر بنا دیا ہے۔ معصوم بچیاں تم سے بات کرنے کو ترس گئی ہیں۔ اس معصوم نے تو ماں کی آواز تک نہیں سنی" انہوں نے اپنی گود میں بیٹھے ہوئے الطاف حسین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "مائیں تو اپنے بچوں کو لوریاں سنا کر سلاتی ہیں۔ تم تو اسے ڈانٹ بھی نہیں سکتیں۔ ہم سے ایسی کیا خطا ہو گئی کہ تم نے سب سے منہ پھیر لیا۔"

بہت دنوں سے ان کی بیوی کا یہی حال تھا۔ نہ کسی سے کچھ کہتی تھیں نہ کسی کی سنتی تھیں۔ دماغ میں کچھ ایسا خلل ہو گیا تھا کہ بس چپ بیٹھی رہتی تھیں۔ گھر میں کیا ہو رہا ہے، انہیں کوئی سروکار نہیں تھا۔ ایزد بخش کو سب سے زیادہ فکر الطاف حسین کی تھی۔ ماں کی شفقت سے محروم اس بچے کا مستقبل کیا ہوگا۔ اس کی تربیت میں کوئی ایسی کجی نہ رہ جائے جسے صرف ماں کی شفقت ہی درست کر سکتی ہے۔

خواجہ ایزد بخش کے بزرگوں کا وطن ہرات تھا جہاں سے ان کے جدِ اعلیٰ ہندوستان آئے۔ سلطان غیاث الدین بلبن نے انہیں علاقہ پانی پت میں معاش کے لیے چند گاؤں بطور جاگیر عطا کیے۔ علم و فضل اور جاہ و ثروت دونوں چیزیں اس گھرانے کا مقدر تھیں لیکن وقت کی گردش نے یہ بیل منڈھے باقی نہیں رہنے دیے۔ ادبار کی گھٹا گہری سے گہری ہوتی چلی گئی۔ خواجہ ایزد بخش تک آتے آتے معاش کا ذریعہ بھی باقی نہ رہا اور انہیں قلیل تنخواہ پر سرکارِ انگریزی کی ملازمت کرنی پڑ رہی تھی۔

پانی پت کا میدان اپنے سینے پر تین بڑی جنگوں کا بوجھ اٹھا چکا تھا۔ یہی وہ دروازہ تھا جس سے گزر کر بابر کو ہندوستان میں داخلے کا موقع ملا۔ ان فوجی معرکوں کے بعد ہی مغلوں کو ہندوستان پر حکومت کرنے کا موقع ملا تھا اور اب پانی پت کا یہی میدان اپنی محنت کو اکارت جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ مغرب کی تجارتی کمپنیوں کا تسلط پورے طور پر ہو چکا تھا۔

مرکزی سلطنت کی کمزوریوں، جاگیرداروں کی باہمی رقابتوں اور ملک کی زرعی اور صنعتی قوتوں کے قدیم طریق کار سے فائدہ اٹھا کر یہ تجارتی کمپنیاں ملک کی سیاست میں ایک فیصلہ کن طاقت بن گئی تھیں۔ کس کا پلہ بھاری ہوتا ہے، اس کے لیے ایک اور جنگ کا انتظار تھا لیکن صاف ظاہر ہوتا تھا کہ یہ جنگ پانی پت کے میدان میں نہیں ہوگی۔

جاگیری سماج کا انحطاط شروع ہوچکا تھا۔ جاگیریں دھیرے دھیرے سکڑنے لگی تھیں۔ خواجہ ایزد بخش کے بزرگ بھی زمیندار تھے لیکن وہ خود تو بس "ذمّے دار" رہ گئے تھے۔ ایک دیوانی بیوی کی ذمّے داری، چار بچوں کی ذمے داری۔ نوکری کے بکھیڑے بھی تھے اور بچوں کی دیکھ بھال کی ذمّے داری بھی کہ بیوی تو ذہنی اختلال کے باعث ہر ذمّے داری سے ہاتھ اٹھا چکی تھیں۔

وقت آہستہ آہستہ آگے کی طرف سرکتا رہا۔ شفقتِ مادری سے محروم الطاف حسین کو اس کی بہنوں نے اپنے آنچلوں کے سائے میں لیا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ وہ پڑھنے کی عمر کو پہنچ گیا۔ وہ اپنی عمر سے زیادہ سنجیدہ تھا۔ شاید ماں کی آغوش تحفظ ہی کے لیے نہیں، رو رو کر اپنے وجود کا احساس دلانے کے لیے بھی ہوتی ہے۔ اس بچے کو ماں کی آغوش ملی ہی نہیں تھی۔ اس لیے وہ رونا تو بھول ہی گیا تھا۔ شرارتوں کی جگہ صبر نے لے لی تھی۔ جو کہہ دو مان لیتا تھا جس کام سے روکو رک جاتا تھا اس کے مزاج کو دیکھتے ہوئے اس کے بڑوں کو یقین تھا کہ وہ تعلیم کی منزلیں بڑی تیزی سے طے کرے گا۔

پانی پت کا پرانا دستور تھا کہ بچے کی بسم اللہ کی تقریب کے بعد قرآن کا کچھ حصہ اسے حفظ کرایا جاتا تھا۔ اس کے بعد اس کی تعلیم کا آغاز ہوتا تھا۔ اسی لیے پانی پت میں حفاظ اور قاری حضرات کی کثرت تھی۔

پانی پت میں قاری حافظ ممتاز حسین کا بڑا شہرہ تھا۔ اسے بھی انہی کی خدمت میں پہنچا دیا گیا۔

جب وہ سج بن کے پہلے دن مدرسے جانے لگا تو سلام کرنے ماں کی خدمت میں پہنچا۔ وہ اس وقت بھی خاموش تھیں۔ یہ دن ایسا ہوتا ہے کہ ہر ماں گلے لگا کر، دعاؤں کے سائے میں بچے کو رخصت کرتی ہے لیکن اس کی قسمت میں یہ بھی نہیں تھا۔ وہ تو یہی سمجھا ہوگا کہ ہر بچہ اسی طرح گھر سے نکلتا ہوگا۔

اسے قرآن کا کچھ حصہ حفظ کرانے کے لیے بٹھایا گیا تھا لیکن حافظہ اتنا اچھا تھا کہ خود استاد کو رشک آنے لگا۔ انہوں نے ایک دن خواجہ ایزد بخش کو بلایا اور الطاف حسین کی تعریف کی۔

"بچے کا حافظہ بھی اچھا ہے۔ شوق بھی بہت ہے۔ خوش الحانی ایسی ہے کہ میرے پاس جو علما مجھ سے ملنے آتے ہیں، اس کی قرأت نہایت شوق سے سنتے ہیں۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ اسے حافظ بنائیں۔ یہ انشاء اللہ میرا اور آپ کا نام روشن کرے گا۔ دنیا و آخرت کی بھلائی اس کا نصیب ہوگا۔"

انہیں کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ گواہی اتنی مضبوط تھی کہ وہ اسے حافظ بنانے کا ارادہ کرکے لوٹے۔ انہیں ایک مرتبہ پھر اپنے بزرگ یاد آگئے جن میں بڑے بڑے عالم دین اور خطیب گزرے تھے۔ انہیں یقین ہوگیا کہ تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔ آج اسی خاندان کے ایک بچے کی تعریف اس کے استاد کی زبان سے ادا ہورہی ہے۔

اب الطاف حسین دن بھر مدرسے میں گزارنے کے بعد گھر لوٹتا اور رات کو سبق یاد کرتا تو قرآن کی روح پرور آیات اس کی دل نشیں آواز میں گھل مل کر وہ سماں باندھتیں کہ پورا گھر ساکت ہوکر سنتا۔ محلے کی عورتیں آکر بیٹھ جاتیں کہ بھیا کوئی رکوع سناؤ۔ اس کی خوش الحانی کی ایسی تعریف پھیلی کہ دور دور سے لوگ سننے کے لیے آنے لگے۔ اس کی بہنیں آتے جاتے نظر اتارتی تھیں کہ اتنی سی عمر میں ایسی خیروبرکت، اتنی شہرت۔

قدرت جس سے کوئی بڑا کام لینا چاہتی ہے اسے، اکثر بچپن ہی میں ماں یا باپ کی آغوشِ شفقت سے محروم کردیتی ہے تاکہ صدموں کی آنچ اسے پگھلا کر کندن بنا دے۔ اس کا دل نرم، گداز اور حساس ہوجائے، محنت اور جستجو اس کی عادت بن جائے، تجربے اور مشاہدے کی دولت سے اس کا دامن بھر جائے۔ وہ ماں جو خاموش تھیں مگر گھر میں تو تھیں، چند روز کی علالت کے بعد اچانک رخصت ہوگئیں۔

ان کا ہونا نہ ہونا برابر تھا لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ کچھ دن گزرے تھے کہ شفیق باپ بھی رخصت ہوگیا۔ اب وہ اتنا بڑا ہوگیا تھا کہ موت کے مفہوم سے واقف ہوسکے اور پھر باپ ہی تو واحد سہارا تھا جس نے اسے ماں بن کر پالا تھا۔ اس کا ننھا سا دل مچل کر رہ گیا۔ دنیا اس کے سامنے اندھیری گلی بن کر رہ گئی۔

وہ قرآن حفظ کرچکا تھا۔ باپ کی بے وقت موت نے ایسا دل اچاٹ کیا کہ تعلیم کا سلسلہ رک گیا۔ وہ دن بھر اداسی کی تصویر بنا پھرتا رہتا۔ بے قراری حد سے بڑھتی تو قرآن لے کر بیٹھ جاتا۔

باپ کی رحلت کے بعد اب بڑے بھائی خواجہ امداد

حسین تھے جو اس کی پرورش کے ذمے دار تھے۔ بہنوں کے لیے وہ ایک مرتبہ پھر گھٹنوں چلتا ہوا بچہ بن گیا تھا۔

والد کی موت کا صدمہ کم ہوا اور گھر میں کچھ رونق سی آئی تو بڑے بھائی کو اس کی تعلیم کا خیال آیا۔

سید جعفر علی جو دہلی کے رہنے والے تھے لیکن پانی پت میں مقیم تھے۔ فارسی کے بہت اچھے ادیب اور سخن فہم سمجھے جاتے تھے۔ خواجہ امداد حسین نے اسے ان کے حوالے کردیا کہ فارسی پڑھادیں۔

فارسی پڑھانے والے ناپید نہیں تھے۔ وہ کسی سے بھی پڑھ سکتا تھا لیکن سید جعفر علی سے اسے یہ فائدہ پہنچا کہ ان کی صحبت میں فارسی لٹریچر سے ایک نوع کی مناسبت پیدا ہوگئی۔ انہوں نے اسے صرف کتابیں نہیں پڑھائیں بلکہ فارسی شاعری کی تاریخ اس کے ذہن کے حوالے کردی۔ فارسی شاعری کی نزاکتیں اسے ازبر کرادیں۔ اس کے دل میں یہ جذبہ سرابھارنے لگا کہ وہ بھی اسی قسم کے دو چار اشعار کہے۔

ابھی اس نے فارسی کی چند ابتدائی کتابیں ہی پڑھی تھیں کہ اسے عربی پڑھنے کا شوق ہوا۔ اس شوق نے اس کے دل میں اس لیے بھی جڑ پکڑلی کہ پانی پت کے ایک نوجوان ابراہیم حسین لکھنؤ سے مجتہد کی سند لے کر آئے تھے۔ اس بات کا پانی پت میں بہت چرچا ہو رہا تھا۔ اس مرتبہ اس نے بھائی کا سہارا بھی نہیں لیا' ان کی خدمت میں خود ہی پہنچ گیا اور اپنا مدّعا بیان کیا۔ انہوں نے خوش آمدید کہا اور وہ عربی پڑھنے بیٹھ گیا۔

اس طرح کبھی باقاعدہ کبھی بے قاعدہ تعلیم کا سلسلہ چلتا رہا۔ اِدھر اُدھر سے خوشہ چینی میں دن گزر رہے تھے۔ علم وہ واحد پیاس ہے جسے جتنا بجھاؤ' اتنی ہی بڑھتی ہے۔ وہ بھی جب کچھ سیکھ گیا تو اسے مزید سیکھنے کی خواہش نے بے قرار کردیا۔

ابھی وہ پرواز کے لیے کسی آسمان کا انتخاب کرہی رہا تھا کہ بہنوں کو اس کی شادی کا ارمان ہوا حالانکہ اس کی عمر صرف سترہ سال تھی۔ بہنوں نے بڑے بھائی کو بھی ساتھ ملالیا۔ انہوں نے ماموں زاد بہن اسلام النساء سے ان کا بیاہ ٹھہرادیا۔

اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ افتاد آن پڑے گی۔ اس نے تو ابھی دریائے علم کے محض چند گھونٹ پیئے تھے۔ ابھی جی بھر کے سیراب ہونے کی منزل دور تھی۔ اسے معلوم تھا کہ شادی کے بعد تعلیم ترک کرکے روزی کمانے کی فکر ہوگی لیکن بھائی کے سامنے دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ بہنوں سے اپنی شادی کے بارے میں بات کرتے ہوئے شرم مانع تھی

"سوانحی خاکہ"

نام	خواجہ الطاف حسین
تخلص	حالی
والد	خواجہ ایزد بخش
اہلیہ	اسلام النساء
پیدائش	۱۸۳۷ء پانی پت
وفات	۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء
تدفین	پانی پت۔

خواہ وہ انکار ہی کی بات کیوں نہ ہو۔ دبے لفظوں میں انکار کیا بھی تو بہنوں نے اسے اس کے مزاج کا حصہ سمجھ کر نظرانداز کردیا۔ بھائی نے اسے اطلاع دی کہ اس کی شادی ہو رہی ہے اور وہ سر جھکائے سنتا رہا۔

اس کی ہر خواہش سعادت مندی کی نذر ہوگئی اور اسلام النساء بیاہ کر اس کے گھر آگئیں۔ مزاج کی تیز تھیں لیکن وہ ایسا حلیم اور صابر تھا کہ کسی بات کا جواب دینا ہی نہیں جانتا تھا للذا خوب نبھتی رہی۔

اس کی ضرورتیں بھی محدود تھیں اور خواہشیں بھی کم البتہ تحصیلِ علم کی ہوس اسے بے چین کیے ہوئے تھی۔ وہ جب سوچتا تھا کہ اس شادی کی وجہ سے اس پر علم کے دروازے بند ہوگئے ہیں تو اسے یہ شادی ایک زنجیر معلوم ہونے لگتی تھی جس میں اسے جکڑدیا گیا تھا۔

پانی پت اتنی چھوٹی جگہ تھی کہ معمولی درجے کی تعلیم ہی حاصل کی جاسکتی تھی جو وہ حاصل کرچکا تھا۔ دلی اس گئی گزری حالت میں بھی علوم وفنون کا مرکز تھی۔ پانی پت سے صرف بچپن میل کے فاصلے پر تھی لیکن یہ بچپن میل بھی کالے کوسوں کے برابر تھے۔ پیدل یا بیل گاڑیوں پر سفر کرنا پڑتا تھا۔ اس نے ان مشکلات پر غور کیا۔ یہ بھی سوچا کہ نہ وہاں کوئی عزیز یا دوست کس کے پاس رہے گا' کیسے وقت گزارے گا لیکن علم کے شوق نے اسے کچھ سوچنے کا موقع نہیں دیا اور اس نے دلی جانے کا فیصلہ کرلیا۔

ایک روز جب اس کی بیوی اپنے میکے گئی ہوئی تھی' وہ بغیر کسی سے کچھ کہے' بغیر کسی سامان کے پاپیادہ دلی کی طرف روانہ ہوگیا۔ راستے میں کوئی گاؤں ملتا تو کچھ دیر کے لیے ستا لیتا' پھر آگے بڑھ جاتا۔ کئی دن کے بعد بالآخر وہ دلی پہنچ گیا۔

یہاں وہ پہلی مرتبہ آیا تھا۔ اسے تو کچھ بھی معلوم نہیں تھا کہ کس طرف جائے۔ کسی سے معلوم بھی کرے تو کیا معلوم کرے۔ اس کی تو کوئی منزل بھی نہیں تھی۔ بس ایک جامع مسجد کا نام سنا تھا‘ اسی کا پتا معلوم کرلیا۔

وہ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ نیچے سڑک پر دلی کے بے فکرے گھوم پھر رہے تھے مگر وہ سب سے بے خبر اپنے خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ دھرا۔ اس نے چونک کر گردن اٹھائی۔

”میاں صاحب زادے! کچھ پریشان معلوم ہوتے ہو۔ کیا بات ہے؟“ ایک بزرگ اس کے پاس کھڑے تھے اور پوچھ رہے تھے۔

”جی ہاں‘ پریشان تو ہوں لیکن بھکاری ہرگز نہیں ہوں۔“

”توبہ توبہ! میں نے یہ کب کہا۔ آپ تو صورت شکل سے کسی شریف گھرانے کے فرزند ارجمند معلوم ہوتے ہیں۔“

”جی ہاں‘ یہی سمجھ لیجیے۔“

”دلی کے تو معلوم نہیں ہوتے۔“

”میں پانی پت سے حاضر ہوا ہوں۔ تحصیلِ علم کی غرض سے آیا ہوں۔ کسی مدرسے کی تلاش میں ہوں۔“

”اماں واللہ۔ حد کردی۔ یہاں سے قدموں کے فاصلے پر حسین بخش کا مدرسہ ہے۔ شہر کے مشہور فاضل مولوی نوازش علی وہاں درس دیتے ہیں۔ قسم خدا کی پڑھنے کا لطف آجائے گا۔ ویسے تو اب انگریزی کا زمانہ ہے۔ دہلی کالج بڑے زوروں پر ہے۔ میں تو کہتا ہوں‘ وہاں داخلہ لے لو۔“

”جی نہیں‘ مجھے انگریزی سے کوئی شغف نہیں۔“

”مولوی بننا چاہتے ہو؟“

”علم حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“

”جیسی تمہاری مرضی۔ آؤ‘ میں تمہیں مدرسہ دکھادوں۔“

الطاف حسین نے ان صاحب کو اپنے لیے رحمت کا فرشتہ سمجھا اور ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

”میاں‘ جب اس شہر میں تمہارا کوئی شناسا نہیں ہے تو رہو گے کہاں؟“

”بزرگوار‘ اس بابت میں نے ابھی سوچا ہی نہیں ہے۔ سونا ہی تو ہے‘ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر آکر پڑجایا کروں گا۔“

”شاباش! بھئی علم کا ایسا سچا شیدائی ہم نے نہیں دیکھا۔ مولوی نوازش سے بات کرلینا۔ شاید مدرسے ہی میں جگہ مل جائے۔ پردیسی طالب علموں کے لیے کھانے کا انتظام تو وہاں ہوتا ہی ہے۔“

ابھی ان بزرگ کی اطلاعات یہیں تک پہنچی تھیں کہ مدرسہ آگیا۔

”لو میاں‘ تمہاری منزل آگئی۔ کہو تو مولوی نوازش سے ملاقات بھی کرادوں ورنہ کہو گے کیسے چچا تھے کہ رستے میں چھوڑ کر چلے گئے۔“

”صرف داخلے کی بات ہوتی تو میں آپ کو کبھی زحمت نہ دیتا۔ بات رہائش کی بھی ہے اس لیے آپ کا چلنا ضروری ہے۔ یہ بات مجھ سے کہی نہیں جائے گی۔“

”ارے میاں‘ بہت ہی شرمیلے ہو۔ چلو ہم یہ بات بھی کرلیں گے۔“

اب الطاف حسین کو پورا یقین ہوگیا کہ یہ بزرگ نہیں کوئی فرشتہ ہے جو میری مدد کو آگیا ہے ورنہ میں کہاں ٹھوکریں کھاتا پھرتا۔

ان بزرگ نے اسے مولوی نوازش علی کے سامنے لے جاکر کھڑا کردیا۔

داخلے کی کارروائی کے لیے الگ کچھ لوگ تھے لیکن غالباً ان بزرگ کی مولوی نوازش سے شناسائی تھی اس لیے وہ براہِ راست ان کے پاس پہنچے۔

مولوی نوازش بھی اس کی داستانِ سفر سن کر اور اس کا شوقِ علمی دیکھ کر متاثر ہوئے۔ جو تعلیم وہ حاصل کرچکا تھا‘ اس سے متعلق کچھ سوال کیے اور اسے مدرسے میں بیٹھنے کی جگہ مل گئی۔

”ہم تمہیں صرف و نحو پڑھائیں گے اور اس کے بعد منطق کی باری آئے گی۔“

”آپ جو میرے لیے بہتر سمجھیں گے وہی بہتر ہوگا۔“

”طالب علم کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔“

ان بزرگ کی سفارش سے یہ انتظام بھی ہوگیا کہ وہ مدرسے ہی میں سوجایا کرے۔ اندھا کیا چاہے‘ دو آنکھیں۔ اسے تو جیسے کائنات مل گئی۔

اس نے کتابوں کی ورق گردانی شروع کردی۔ گلدستۂ علم کی پتی پتی کو چھان مارا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اپنے صحرا سے اس شہر میں تھوڑے ہی دن کے لیے آیا ہے۔ نہ جانے کب اس کا سراغ لگ جائے اور اس کے عزیز اسے لینے آجائیں اس لیے وہ قطروں کی جگہ گھونٹ اپنے حلق سے اتار رہا تھا۔ صرف و نحو پر عبور ہوتے ہی اس نے منطق کی

کتابیں پڑھنی شروع کردیں۔ استاد بھی اس کی محنت دیکھ کر حیران تھے۔ انہوں نے ایسا طالب علم اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ جو نہ تھکتا تھا' نہ اسے تفریح کے لیے وقت درکار تھا۔ وہ سوتا بھی ہے یا نہیں' یہ سوال اپنی جگہ تھا۔

وہ منطق کی گتھیوں کو سلجھانے میں مصروف تھا کہ اسے نواب صدیق حسن خاں کا ایک رسالہ ملا جس میں ایک منطقی مسئلے پر بحث کی گئی تھی۔ اس رسالے کو دیکھ کر اس کے خیال نے رہنمائی کی اور وہ اس کا جواب لکھنے بیٹھ گیا۔ کسی حوالے کے بغیر' محض اپنے حافظے کے بل پر اس نے چند ہی روز میں ایک شاندار عربی رسالہ تصنیف کرلیا۔ اس کی دلی خوشی نے اس کے سامنے آنکھیں بچھادیں۔ یہ اس کی پہلی تصنیف تھی اور پہلی اولاد کی طرح عزیز تھی۔ یہی نشہ کیا کم تھا کہ وہ صاحبِ تصنیف ہوگیا۔ عربی زبان میں اس نے ایک رسالہ لکھ دیا اور وہ بھی صرف اٹھارہ سال کی عمر میں۔ اس نے اس مسودے پر شاندار کور چڑھایا۔ جلی حروف میں اپنا نام لکھا اور اپنے آپ کو شاباش دیتا ہوا' دادو تحسین کے پھول سمیٹنے استاد کی خدمت میں پہنچ گیا۔

"یہ کیا ہے؟" استاد نے پوچھا۔

"نواب صدیق حسن خاں کے ایک رسالے کے جواب میں میری طبع آزمائی ہے۔ آپ کی خدمت میں لایا ہوں کہ آپ بھی اسے ملاحظہ فرمالیں۔"

"وہ تو وہابی ہیں۔"

"میں تو وہابی نہیں ہوں۔ آپ کا حقیر سا شاگرد ہوں۔ آپ ہی کے مسلک کا پیروکار ہوں۔"

"ٹھیک ہے' اسے میرے پاس چھوڑ دو۔ تفصیل سے پڑھ کر دیکھوں گا تم نے کیا لکھا ہے۔"

دوسرے دن .... وہ اسی نشے میں استاد کے پاس گیا کہ اب اسے اس کی محنت کی داد ملے گی۔ وہ اسی کا مسودہ سامنے رکھے بیٹھے تھے۔

"یہ رسالہ اگرچہ نہایت لیاقت سے لکھا گیا ہے لیکن چونکہ اس سے ایک وہابی مولوی کی تائید ہوتی ہے اس لیے میں اسے آپ کے سامنے چاک کررہا ہوں۔"

مولوی نوازش نے اس کے سامنے اس کی محنت کے پُرزے کردیے۔

وہ دل تھام کر رہ گیا۔ بڑوں کے سامنے بولنے کی عادت نہیں تھی' لہٰذا چپ ہوگیا۔

پہلی تصنیف کے بڑے چاؤ چونچلے ہوتے ہیں لیکن اس کی تصنیف کا یہ حشر ہوا۔

چند کتابیں

رسالہ مولود' اصولِ فارسی' تریاق سموم' طبقات الارض (عربی سے ترجمہ) تاریخ محمدی' شواہد الہام' مجالس النساء' سوانح حکیم ناصر خسرو' حیاتِ سعدی' مقدمۂ شعروشاعری' یادگارِ غالب' حیاتِ جاوید۔

"چند مشہور نظمیں"

مسدس مدوجزر اسلام۔ شکوہ ہند۔ مناجاتِ بیوہ۔ چپ کی داد۔ حبِ وطن' مرثیۂ غالب' کلمۃ الحق۔

"سفروسیاحت"

میرٹھ' آگرہ' فتح پور سیکری' غازی آباد' الہ آباد' جبل پور' بھوپال' اٹاوہ' جھانسی' کانپور' رام پور' پھپوند' لکھنؤ' متھرا' بندرابن' حیدر آباد' کراچی' بمبئی' شملہ' کنڈا گھاٹ' علی گڑھ وغیرہ۔

○☆○

استاد نے اس کا مسودہ چاک ضرور کردیا لیکن اس کی قابلیت کے قائل ضرور ہوگئے۔ اس کی سعادت مندی دیکھ کر اسے مزید عزیز رکھنے لگے۔

اتنے دنوں کی صحبت نے مولوی نوازش کو اس کی اس صلاحیت کا قائل بھی کردیا تھا کہ وہ اشعار کا نہ صرف ذوق رکھتا ہے بلکہ ایسے نئے نئے معانی تلاش کرتا ہے جو فنِ شعر سے واقفیت کی وجہ سے نہیں' فطری ذوق کے باعث ہی ڈھونڈے جاسکتے ہیں۔

"میاں کچھ شعروغیرہ بھی کہتے ہو؟"

"جی نہیں۔ شاعری میں تو دخل نہیں ہے۔"

"کمال ہے! تم جیسا آدمی اور شاعری سے دور۔"

"شاعری سے دور کہاں ہوں۔ ایک نہ ایک دیوان میرے مطالعے میں ضرور رہتا ہے۔ ہاں اتنا ہے کہ خود کچھ نہیں کہتا۔"

"آج تمہیں ایک مشاعرے میں لے کر چلتے ہیں۔ سنا ہے مرزا غالب بھی وہاں آئیں گے۔"

عروسِ دہلی کے تمام زیور ایک ایک کرکے اتر چکے تھے لیکن اس تباہی کے باوجود یہ شہر مرکزِ علم وادب تھا۔

خصوصاً شاعری اور دلی تو لازم و ملزوم تھے۔ ابھی میر و سودا کے نغمے گونج رہے تھے اور ان کے شاگرد شاعری کے تنِ بے جاں میں دم ڈال رہے تھے۔ کوئی قصیدے میں بے مثال تھا۔ کسی نے غزل سرائی کو شعار بنالیا تھا۔ کوئی خیالات کی بلندی میں بے نظیر' کوئی محاورہ بندی کا استاد۔ غرض جو تھا لاجواب' بے مثال۔ امرا کی ڈیوڑھیوں میں محفلیں سجتیں۔ اہلِ ذوق جمع ہوتے اور واہ واہ کی دھومیں مچ جاتیں۔

چتلی قبر کے قریب حویلی عزیز آبادی کے سامنے مفتی صدرالدین کا مکان تھا۔ مشاعرہ اسی کوٹھی نما مکان میں تھا۔

الطاف حسین اپنے استاد کے ساتھ یہاں پہنچا تو پہلے تو حویلی کی سج دھج دیکھ کر ہی حیران رہ گیا۔ صحن میں مختصر سی نہر بہہ رہی تھی جسے روشنیوں سے منور کردیا گیا تھا۔ سامنے دالان در دالان اور پہلو میں انگریزی وضع کے کمرے۔ دالانوں سے ملا ہوا اونچا صحن تھا جس پر تخت بچھے ہوئے تھے۔ تختوں پر دری چاندنی کا فرش اس پر قالینوں کا حاشیہ۔ پیچھے دو طرفہ گاؤ تکیوں کی قطار۔ قمقموں' چینی قندیلوں اور گلاسوں کی بہتات۔

کچھ شعرا آچکے تھے۔ کچھ اس کے سامنے آئے۔ کچھ وہ تھے جن کے وہ نام سن چکا تھا' کچھ اس کے لیے اجنبی تھے لیکن وہ ان سب کو پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا۔

شمع نے گردش کی۔ دیکھتے ہی دیکھتے پامال مضامین کے ڈھیر لگ گئے۔ لفظوں کی بازی گری کے کھیل دکھائے جانے لگے۔ اسے فارسی شاعری کا دورِ آخر یاد آگیا۔ مومن کی غزل پر وہ کچھ چونکا لیکن یہاں بھی عاشقانہ رموز کے سوا کچھ نہیں تھا۔

اب شمع مرزا غالب کے سامنے تھی۔ انہوں نے دو زانو ہو کر مطلع پڑھا۔ چاروں طرف سکوت کا پہرا لگ گیا۔ غالب کی مشکل گوئی کے جتنے افسانے مشہور تھے' سب سچ ثابت ہو رہے تھے لیکن عجیب بات تھی کہ الطاف حسین اسی شاعری پر فدا ہو گیا۔ اسے یہ شاعر سب سے منفرد نظر آیا۔

مشاعرے کا اختتام ہوا تو وہ خاص طور پر اُٹھ کر غالب کے پاس گیا۔ اس کے کلام کی تعریف کی اور اپنا تعارف کرایا۔ غالب کی مشکل گوئی کی طرح اس کی بے نیازی اور حد سے بڑھا ہوا احساسِ برتری بھی مشہور تھا۔ وہ اٹھارہ سال کے اس نوجوان کو کیا خاطر میں لاتا جو کسی بڑے خاندان کا چشم و چراغ بھی نہیں تھا۔ اس نے بے نیازی سے الطاف حسین کی باتیں سنیں اور جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ وہاں سے واپس آنے کے بعد بھی اس کی شاعری پر غور کرتا رہا۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ ایسے اعلیٰ خیالات کے لوگ داد کیوں نہیں دے رہے تھے۔ پھر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ لوگ سطحی باتوں کے عادی ہو گئے ہیں۔ غالب کی شاعری آنے والے زمانے کی شاعری ہے۔

اس کے بعد وہ چند اور مشاعروں میں گیا جہاں غالب سے ملاقات کی اُمید تھی۔

اس کی طبیعت کو شاعری سے فطری مناسبت تھی۔ ان مشاعروں نے اسے شعر کہنے پر اکسایا۔ اس نے ذرا طبیعت پر زور ڈالا تو ایک غزل کہہ لی۔ وہی عاشقانہ غزل جو اس کے دور میں رائج تھی لیکن سادگی اور حقیقت سے قریب تر' تخیل کی بے جا بلند پروازی اور مبالغے سے کوسوں دور۔

مقطع کہنے کے لیے ایک عدد تخلص کی بھی ضرورت تھی۔ اس نے اپنا تخلص خستہ رکھ لیا۔ شاید اس لیے کہ خود اس کی حالت ان دنوں نہایت خستہ تھی۔

غزل کی تکمیل ہوئی تو دل نے صلاح دی کہ اس پر اصلاح ہو تو غالب کی ہو۔ غالب بڑے سخت نقاد تھے اور اس بات پر سخت خفا ہوتے تھے کہ ہر کس و ناکس شعر کہنا شروع کردیتا ہے۔

الطاف حسین اپنا شمار ہر کس و ناکس میں نہیں کرتا تھا اس لیے ہمت کرکے غالب کے مکان پر پہنچ گیا۔

گلی قاسم جان میں پہنچ کر غالب کا مکان تلاش کرنا کون سا دشوار تھا۔ آسمان کی طرف دیکھ کر آفتاب کو کیا ڈھونڈنا۔

"مرزا صاحب تشریف رکھتے ہیں؟" اس نے غالب کے ملازم سے پوچھا۔

"جی ہاں۔ اوپر بالاخانے پر ہیں' کیا نام بتاؤں؟"

"کہنا الطاف حسین آیا ہے پانی پت سے۔"

"آپ شاعر ہیں؟"

"نہیں تو۔"

"پھر تو بہت مشکل ہے۔ وہ آپ سے نہیں ملیں گے۔ ایسا کرتا ہوں' میں ان سے کہہ دوں گا کہ آپ شاعر ہیں۔ آخر آپ اتنی دور سے آئے ہیں۔ ملاقات تو ہونی چاہیے۔"

تھوڑی دیر بعد ملازم باہر آیا۔ اذنِ ملاقات مل چکا تھا۔ الطاف حسین نے سر پر رکھی گول ٹوپی کو درست کیا۔ ملازم کے ساتھ گھر میں داخل ہو گیا۔ بالاخانے کی سمت جانے والی سیڑھیاں سامنے تھیں۔ اس نے آنکھیں اوپر کیں۔ غالب اس کے استقبال کے لیے آدھی سیڑھیاں اتر چکے تھے۔ فرطِ حیرت سے الطاف حسین کی آنکھیں پھیل گئیں۔ مشاعروں کے غالب اور اس غالب میں بہت فرق تھا۔ مشاعروں میں

لیے دیے رہنے والا غالب اس کے استقبال کے لیے ہاتھ پھیلائے کھڑا تھا۔ گویا وہ اس وقت شاعر غالب نہیں، صاحبِ خانہ میزبان تھا۔

وہ بڑے تپاک سے حالی کو لے کر اوپر آئے۔ ملازم نے چھوٹے طشت میں بادام لا کر رکھ دیے۔ تھوڑی دیر میں حقہ بھی تازہ ہو کر آ گیا۔

"آپ سے چند مشاعروں میں ملاقات تو ہوئی ہے۔ آپ کی طلبِ علمی بھی مجھ پر واضح ہے لیکن یہ امید نہیں تھی کہ میرے تعاقب میں آپ گھر تک آجائیں گے" غالب نے کہا۔

"جب آپ میری طلب سے واقف ہیں تو آپ کو امید رکھنی چاہیے تھی کہ پیاسا ضرور دریا کی طرف آئے گا۔"

"اس شہر میں میری کوئی بات سمجھنے والا نہیں ہے۔ سب کا خیال ہے غالب مہمل بکتا ہے اور آپ میری باتوں میں معنی تلاش کرنے آگئے۔"

"ضروری تو نہیں کہ جو بات ہماری سمجھ میں نہ آئے وہ مہمل ہو۔ ہمیں اس کے معنی تلاش کرنے چاہئیں۔ خوش قسمتی ہے کہ شعر کا خالق موجود ہے۔ تفہیم کا ذریعہ سامنے ہے۔ مجھے یہی خواہش یہاں لے کر آئی ہے۔"

غالب نے چونک کر حقے کی نے پر ہاتھ ڈال دیا "آپ شعر کہتے ہیں؟"

غزل اس کی جیب میں پڑی تھی لیکن طبیعت میں انکسار ایسا تھا کہ وہ یہ بھی نہ کہہ سکا' میں شاعر ہوں۔

"جب آپ شاعر نہیں ہیں تو پھر میرے اشعار کیسے سمجھ سکتے ہیں۔"

"ادب کا ادنیٰ سا طالبِ علم ہوں۔ فارسی سے واقفیت ہے اور اپنے طور پر یہ سمجھتا ہوں کہ فنِ شعر سے واقف ہوں۔"

"ذرا اس شعر کا مطلب تو ہمیں سمجھائیے۔"

غالب نے اپنا ایک شعر اسے سنایا۔ اس نے ذرا دیر غور کرنے کے بعد اس شعر کے دو مطالب بیان کر دیئے۔

"معانی کے اس پہلو پر آپ کی نگاہ نہیں پڑی" غالب نے کہا اور شعر کے ایک تیسرے معنی اس کے سامنے کھول کر رکھ دیئے۔

"شعر کی تفہیم کا یہی ہنر تو آپ سے سیکھنے آیا ہوں۔"

"میں آپ کے جذبے کی قدر کرتا ہوں اور پھر آپ پردیسی ہیں۔ میں آپ کو مایوس نہیں کر سکتا۔ آپ کسی بھی فارسی شاعر کا دیوان لے آیئے گا' مل جل کر پڑھ لیں گے۔"

"ماخذات"

یادگارِ حالی۔۔۔ صالحہ عابد حسین

حالی کا ذہنی ارتقاء۔۔۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں

حالی نمبر۔ علامہ اقبال گورنمنٹ کالج۔

"میں تو آپ کے اشعار آپ کی زبان سے سمجھنا چاہتا ہوں۔ یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ آپ کی مشکل پسندی کے افسانے کہاں تک درست ہیں؟"

الطاف حسین کو اپنے تعلیمی مشاغل سے فرصت کم ہی ملتی تھی لیکن جب بھی وقت ملتا' غالب کی خدمت میں حاضر ہو جاتا اور ان کے مشکل کلام کا مطلب خود ان کی زبان سے سمجھتا۔

اس صحبت نے ایسا کمال دکھایا کہ اس نے چند غزلیں اور کہہ لیں۔ اب اس کے لیے مشکل ہو گیا کہ وہ یہ جگنو زیادہ دیر تک اپنی مٹھی میں بند رکھے۔ آخر ایک دن اس نے اپنی غزلیں غالب کے سامنے رکھ دیں۔

سترہ اٹھارہ سال کے اس لڑکے کے ابتدائی کلام کو دیکھ کر وہ پھڑک اٹھے۔

"میں کسی کو فکرِ شعر کی اصلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمہاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے۔"

ایک بہت بڑے شاعر کی طرف سے یہ ایسا خراجِ تحسین تھا جس نے اس کی روح کو توانا کر دیا۔ وہ سنجیدگی سے شعر گوئی کی طرف مائل ہو گیا۔

مدرسے کی تعلیم میں وہ شرح مسلم ملا حسن تک پہنچا تھا اور ساتھ ہی شعر و سخن کی محفلوں سے بھی لطف اندوز ہو رہا تھا کہ دلی میں اس کی موجودگی کی خبر پانی پت پہنچ گئی۔

ایک دن اس نے دیکھا کہ بڑے بھائی اور کئی دوسرے عزیز اسے ڈھونڈتے ہوئے مدرسے میں آگئے۔ وہ بیوی کو چھوڑ کر یہاں بھاگ آیا تھا۔ بس یہی طعنہ بہت تھا۔ مجنوں کو صحرا پسند آگیا تھا لیکن بھائی کا اصرار تھا کہ وہ واپس چلے۔ اسے اپنی تعلیم ادھوری چھوڑنے کا دکھ تھا لیکن بھائی کا حکم بھی نہیں ٹال سکتا تھا۔ اسے اس حال میں دلی چھوڑنی پڑی کہ استاد غالب کو اپنے جانے کی اطلاع بھی نہ دے سکا۔

پانی پت آنے کے بعد اس سے مدرسہ چھوٹ گیا لیکن کتابیں نہیں چھوٹ سکیں۔ کسی ملازمت کے بکھیڑے میں پڑنے کے بجائے اپنے آپ کو کتابوں کے سپرد کر دیا۔ پانی پت

میں جتنے اہلِ علم تھے، ان کی صحبت میں دن گزرتا اور رات مطالعے میں گزر جاتی۔

پانی پت آئے ہوئے ڈیڑھ برس گزر گیا تھا۔ وہ تحصیلِ علم میں مصروف تھا اور گھر والوں کا اصرار تھا کہ فکرِ معاش کرو۔ جب بیوی کا اصرار خفگی میں بدلنے لگا تو اس نے کتابیں سمیٹ کر رکھ دیں۔

"کب تک اپنے بھائی کی کمائی پر پڑے رہو گے اور کب تک میں اپنے میکے کی محتاج رہوں گی۔"

"میں نے تو ابھی دریائے علم کا ایک قطرہ بھی نہیں پیا۔"

"بس بن چکے عالم فاضل۔ کچھ کمانے کی فکر کرو۔"

"کہتی تو تم ٹھیک ہو لیکن کوئی نوکری ہو بھی۔"

"ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔"

"مجھے پھر پانی پت سے باہر جانا پڑے گا۔"

"کچھ بھی کیجیے۔ مجھے دنیا کے طعنوں سے بچا لیجیے۔"

ایک بچہ بھی ہو چکا تھا۔ ذمے داریاں روز بروز بڑھتی جا رہی تھیں۔ خود اسے بھی فکر ہوئی کہ کب تک بے کار بیٹھا رہے گا۔ مجبوراً اپنی تعلیم کو چھوڑ کر ۱۸۵۶ء میں تلاشِ معاش میں گھر سے نکلا اور آخرکار "حصار" میں تھوڑی سی تنخواہ پر ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں جگہ مل گئی۔

اسے یہ نوکری اس وقت ملی جب اطمینان، ہندوستان کی قسمت سے رخصت ہو چکا تھا۔ ہر طرف انتشار اور پریشانی تھی۔ ملک میں انگریزوں کا تسلط رفتہ رفتہ بڑھ رہا تھا۔ دوسری طرف لوگوں کے دلوں میں بغاوت کے جذبات اندر ہی اندر نشوونما پا رہے تھے۔

اسے اس دفتر میں آئے ایک سال ہوا تھا کہ ہندوستانیوں کے جذبات آتش فشاں مادے کی طرح پھٹ پڑے اور ۱۸۵۷ء میں وہ ہنگامہ شروع ہو گیا جسے غدر کے نام سے پکارا گیا۔ حصار پر بھی باغیوں کا قبضہ ہو گیا۔ پورے شمالی ہند میں قیامت برپا تھی۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب انسان کو اپنے عزیزوں کی یاد شدت سے آتی ہے۔ وہ یہاں اکیلا تھا اور موت کے سائے اس کے اردگرد منڈلا رہے تھے۔ اسے پردیس میں بے یار و مددگار مرنے سے خوف آنے لگا۔ اس نے قرآن گلے میں ڈالا، گھوڑے پر سوار ہوا اور پانی پت کی طرف دوڑ پڑا۔

شہروں میں باغی سپاہ قتل و غارت گری میں مشغول تھی، ویرانوں میں لٹیروں نے ڈیرے جما لیے تھے کہ زندہ نکل بھاگنے والوں کا مال و اسباب لوٹ لیں۔ قانون کی حکمرانی اٹھ گئی تھی لہٰذا بھیڑیئے شیر بنے ہوئے تھے۔

ابھی وہ حصار سے باہر نکلا ہی تھا کہ لٹیروں کے ہتھے چڑھ گیا۔ گھوڑا بھی ہاتھ سے گیا اور جو تھوڑی بہت رقم ساتھ تھی، وہ بھی جاتی رہی۔ لوٹنے والے لوٹ کر چلے گئے اور وہ کبھی آسمان کو دیکھتا تھا اور کبھی دور تک پھیلی ہوئی پتھریلی زمین کو۔

اس نے پیدل چلنا شروع کر دیا۔ اسے وہ سفر یاد آ گیا جب وہ پانی پت سے دہلی گیا تھا لیکن جب میں اور اب میں بہت فرق تھا۔ اس وقت راستے پُرامن تھے لیکن اب راستے تک خوف سے سہمے ہوئے تھے۔ وہ قرآن کی تلاوت کرتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ رستے میں کئی چھوٹے چھوٹے گاؤں پڑتے تھے۔ جہاں اسے مانگ مانگ کر روٹی کھانی پڑی۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح وہ پانی پت تک پہنچ گیا لیکن اس حال میں کہ سفر کی تھکن اور ناموافق غذا سے بیمار پڑ چکا تھا۔ گھر پہنچنے کی دھن میں وہ چلتا رہا تھا لیکن گھر پہنچتے ہی بستر پکڑ لیا۔ گھر والوں کو اس کی یہ حالت دیکھ کر بھی خوشی تھی کہ وہ زندہ بچ کر تو آ گیا۔

علاج معالجے کے بعد اس نے کچھ جان پکڑی۔ دلی کے تباہ حال خاندان کے بہت سے افراد پانی پت کا رخ کر رہے تھے۔ ان کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ وہ اس وقت بیس سال کا نوجوان تھا۔ حساس اور دردمند دل رکھتا تھا۔ ان لٹے پٹے لوگوں کی مدد کے لیے اس نے دن رات ایک کر دیے۔ کتنوں کو اپنے گھر میں پناہ دی۔ دوسروں کو صلاح دی کہ وہ اپنے گھروں کے دروازے ان مصیبت زدوں کے لیے کھول دیں۔ وہ اپنی صحت کی طرف سے بے پروا ہو کر اس فلاحی کام میں مشغول ہو گیا۔

غدر کا ہنگامہ فرو ہونے کے بعد انتقام کا دور شروع ہو گیا۔ ہر شخص گھر سے نکلنے اور باہر جاتے ہوئے گھبراتا تھا۔ اب کون اس سے کہہ سکتا تھا کہ نوکری کی تلاش میں گھر سے نکلے۔ اس نے اس فرصت کو غنیمت جانا اور پوری توجہ اپنی تعلیم کی تکمیل کی طرف مبذول کر دی۔ پانی پت کے مشہور فضلا سے بغیر کسی ترتیب اور نظام کے کبھی منطق، کبھی حدیث، کبھی تفسیر پڑھتا رہا۔ کبھی خود بغیر پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا۔

شاعری کا شغل بھی جاری رہا۔ ابھی تک وہ خستہ تخلص کرتا تھا لیکن اب اسے اس تخلص میں قدامت نظر آنے لگی۔ اسے احساس ہونے لگا تھا کہ اب پرانے درختوں میں نئی کونپلیں پھوٹنے کا زمانہ آ گیا ہے۔ اس نے اپنے تخلص کو پرانی یادگار کی طرح مٹا کر نیا تخلص حالی اختیار کر لیا۔

غدر کے بعد کئی برس بیت گئے۔ بھائی کی قلیل تنخواہ پر

پورے گھر کا خرچ تھا۔ خاندانی جائداد بہت تھوڑی تھی۔ بیٹھے بیٹھے تو قارون کا خزانہ بھی ختم ہوجاتا ہے۔ وہ ایک مرتبہ پھر رزق کی تلاش میں گھر سے نکلا اور دہلی پہنچ گیا۔ دلی میں اب امن ہوگیا تھا۔ ادب و شعر کی محفلیں پھر جمنے لگی تھیں۔

دلی پہنچتے ہی اس نے اپنے استاد غالب کی چوکھٹ پر حاضری دی۔ وہی گلی قاسم جان تھی لیکن اب در و دیوار پر حسرت پہرا دے رہی تھی۔ ہنگامہ گزر گیا تھا لیکن نشانات اب بھی باقی تھے۔ غالب اس سے بغل گیر ہوئے تو انہیں غدر سے پہلے کی دلی یاد آگئی۔ ان کی بوڑھی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں۔

”یہ دن تو دیکھنا ہی تھا۔ ہم پیچھے کی طرف چلنا شروع ہوگئے تھے۔ زمانے نے ہمارا قبلہ درست کردیا۔ بس افسوس ہے تو یہ کہ کیسے کیسے عالی دماغ ہم سے چھن گئے۔ اب ایسے لوگ کاہے کو پیدا ہوں گے۔“

”آپ ہیں، بس دلی بھی ہے۔“

”پٹیالہ کی فوج آگئی تھی۔ ریاست پٹیالہ کے درباری حکیم یہاں رہتے ہیں۔ ان کی حفاظت مقصود تھی۔ فوج کی موجودگی میں باغیوں کا بس نہیں چلا ورنہ میں تمہیں کہاں ملتا۔“

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ڈیوڑھی پر ہوادار آکر رکا۔ ملازم نے اطلاع دی کہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ تشریف لائے ہیں۔

نواب مصطفیٰ خاں رئیس دہلی و تعلقہ دار جہانگیر آباد ضلع بلند شہر کے تھے۔ غدر کے بعد جہانگیر آباد کو مسکن بنالیا تھا۔ غالب کے شاگرد تھے اس لیے کبھی کبھی ملاقات کو آتے تھے۔

غالب سراپا اشتیاق تھے کہ نواب صاحب تشریف لائے۔ حالی کو دیکھ کر ان کا چونکنا لازمی تھا۔ غالب نے اس کا تعارف کرایا۔

”اس کم سنی میں انہوں نے علم و فضل میں غیر معمولی قابلیت پیدا کرلی ہے۔ ذوق سخن نہایت پاکیزہ ہے۔“

”کچھ ارشاد ہو۔ ہم بھی تو دیکھیں۔“ شیفتہ نے کہا۔

غالب نے بھی خواہش کا اظہار کیا تو حالی نے پانی پت کے قیام کے دوران میں کہی گئی ایک غزل سنائی۔

مرے دل میں ہو گو مجھ سے نہاں ہو
مجھے بھی ڈھونڈلینا تم جہاں ہو
نہ چھیڑوں تذکرہ حاصل عدو کا
اگر سمعِ مبارک پر گراں ہو
تقاضائے محبت ہے وگرنہ
مجھے اور جھوٹ کا تم پر گماں ہو
مجھے ڈالا ہے سو وہم و گمان میں
بہت کیوں آج مجھ پر مہرباں ہو
کمر خوں پر ہمارے باندھ رکھے
جسے سنئے ہماری داستاں ہو
مؤثر ہے بہت حالی ترا وعظ
کل اس کے سامنے بھی کچھ بیاں ہو

”یہ تو ہمارا انداز ہے۔ وہی سادگی، حقیقت سے قریب تر حالات، مبالغے سے پاک“ شیفتہ نے تعریف کی۔

اس کے بعد غالب کی کسی فارسی غزل کا تذکرہ چھڑ گیا۔ شیفتہ فارسی میں بھی شاعری کرتے تھے۔ فارسی شعروں کی خوب سمجھ رکھتے تھے لیکن جب حالی نے اس بحث میں حصہ لیا تو شیفتہ اس کے حافظے کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکے۔ انہیں اس نوجوان سے اس اعلیٰ بحث کی توقع نہیں تھی۔

اب انہوں نے حالی کے متعلق کچھ اور جاننے کی کوشش کی۔ جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ وہ ملازمت کی تلاش میں دلی آیا ہے تو انہوں نے فوراً ملازمت کی پیش کش کردی۔

”آپ میرے ساتھ جہانگیر آباد چلئے۔ مجھے اپنے بچوں کے لیے ایک اتالیق کی ضرورت ہے۔ آپ سے بہتر اور کون ہوگا۔ آپ کم عمر بھی ہیں۔ بچے آپ سے مانوس بھی ہوجائیں گے۔ آپ شاعر بھی ہیں اس لیے خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔“

ان دنوں ملازمتوں کے کال پڑے ہوئے تھے اس نے اس پیشکش کو غنیمت جانا اور رضامندی ظاہر کردی۔

پچھلے زمانوں میں لوگ درباری شاعر ہوا کرتے تھے۔ وہ درباری اتالیق بن کر جہانگیر آباد چلا گیا۔

جہانگیر آباد چھوٹی سی جگہ تھی۔ اہل سخن کی کمیابی تھی۔ نواب صاحب کا ذوق شعری اس ماحول میں افسردہ سا تھا۔ حالی وہاں پہنچا تو جیسے گونگے کو زبان مل گئی۔ کبھی نواب صاحب کوئی مصرع دیتے اور وہ اس پر طبع آزمائی کرتا۔ کبھی وہ کوئی زمین بتاتا اور نواب صاحب غزل لکھتے۔ دن رات یہی صحبتیں گرم رہنے لگیں۔ نواب صاحب غالب کے شاگرد تھے۔ اصلاح کے لیے اپنا کلام غالب کو بھیجا کرتے تھے۔ ان کے ساتھ حالی بھی اپنا کلام بھیجنے لگا۔ غزلیں ہوتی رہیں اور اصلاح کے صیقل سے گزرتی رہیں۔

نواب صاحب مبالغے کو ناپسند کرتے تھے۔ حقائق و

واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی باتوں کو محض حسنِ بیان سے دلفریب بنانا اسی کو منتہائے کمال شاعری سمجھتے تھے۔ ان کی صحبت کا اثر اس پر بھی پڑنے لگا اور رفتہ رفتہ ایک خاص قسم کا مذاق پیدا ہو گیا۔

اس دورِ تنزلی میں عشق و عاشقی کے اصلی یا فرضی ترانے کا نام ہی شاعری سمجھا جاتا تھا۔ وہ لاکھ پاک باز سہی مگر شعر گوئی کے لیے رند شاہد باز بننا ضروری تھا۔ وہ بھی اسی داخلی و انفرادی شاعری کے راستے پر چل پڑا اور دیگر ہم سخنوں کی طرح غزل ہی کو اپنا میدانِ سخن قرار دیا لیکن فطری صلاحیت، میر اور سعدی جیسے شاعروں کے روحانی فیض اور غالب و شیفتہ جیسے صاحب ذوق شعرا کی صحبت و تربیت نے اسے سنبھالے رکھا۔ فرضی عاشقانہ مضامین بیان بھی کیے تو ان پر اصلی کا گمان ہوتا تھا۔

دل سے خیالِ دوست بھلایا نہ جائے گا
سینے میں داغ ہے کہ مٹایا نہ جائے گا
ہم کو ہزار ضبط سہی مجھ کو لاکھ شرم
الفت وہ راز ہے جو چھپایا نہ جائے گا
بگڑیں نہ بات بات پہ کیوں جانتے ہیں وہ
ہم وہ نہیں کہ ہم کو منایا نہ جائے گا

قلق اور دل کا سوا ہو گیا
دلاسا تمہارا بلا ہو گیا
دکھانا پڑے گا ہمیں داغِ دل
اگر تیر ان کا خطا ہو گیا
وہ اُمید کیا جس کی ہو انتہا
وہ وعدہ نہیں جو وفا ہو گیا
سماں کل کا رہ رہ کے آتا ہے یاد
ابھی کیا تھا اور کیا سے کیا ہو گیا
ٹپکتا ہے اشعارِ حالی سے حال
کہیں سادہ دل مبتلا ہو گیا

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں
قفس میں جی نہیں لگتا کسی طرح
لگا دو آگ کوئی آشیاں میں
کہیں انجام آ پہنچا وفا کا
گھلا جاتا ہوں اب کے امتحاں میں
نیا ہے لیجیے جب نام اس کا
بہت وسعت ہے میری داستاں میں

بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

جہانگیر آباد کا قیام اس کی طبیعت سے مناسبت رکھتا تھا۔ یہاں فرصت بھی تھی اور شیفتہ جیسا قدر داں بھی ملا ہوا تھا لہٰذا اس نے یہاں "غزل" سے ہٹ کر بھی کچھ کام اپنی مرضی کے مطابق کیے۔ ایک مولود شریف لکھا۔ اس میں مناجات اس طرح شروع ہوتی تھی۔

"الٰہی تیرا کرم وسیع، تیری عنایت شامل، تیرا فیض عام، تیرے ہاتھ کشادہ، تیرا ملک لازوال، تیرے خزانے بے حساب، تیری نعمتیں سرمدی۔ تجھ سے کیا کیا مانگیے اور کہاں تک مانگیے۔"

اس مولود شریف کی تکمیل کے بعد اس نے ایک نعتیہ قصیدہ نہایت جوش و عقیدت سے تصنیف کیا۔

بنے ہیں مدحتِ سلطانِ دوجہاں کے لیے
سخن زباں کے لیے اور زباں دہاں کے لیے

غدر کے بعد عیسائی مبلغین نے سیاسی اقتدار کے بل بوتے پر بہت بڑا فتنہ پھیلا رکھا تھا۔ کچھ لوگ ان فتنوں کے جال میں پھنس بھی گئے تھے۔ خود حالی کے ایک ہم وطن عماد الدین پانی پتی نے عیسائی مذہب اختیار کرلیا تھا۔ اس نے ایک کتاب مسلمانوں کے خلاف "ہدایت المسلمین" کے نام سے لکھی تھی۔ حالی کے سامنے یہ کتاب آئی تو اس کی حمیت نے جوش مارا اور اس کے جواب میں اس نے رسالہ "تریاق مسموم" لکھا۔

حالی نے دینی تعلیم حاصل کی تھی اور یوں بھی وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے مذہبی تھا۔ جوانی کی عمر تھی مذہبی جذبہ حد سے بڑھا ہوا تھا۔ عیسائیوں کی فتنہ انگیزیوں نے اس جذبے کو اور بھی بڑھا دیا تھا۔ نوجوانی کا تصور تھا کہ عقائد میں سختی بھی حد سے زیادہ تھی۔ اسی کا اثر تھا کہ اس نے اپنے استاد غالب کو بھی ٹوک دیا۔ اس نے غالب کو ایک لمبا چوڑا خط لکھا جس میں انہیں نماز پڑھنے کی تاکید کی، فرض کا احساس دلایا اور درخواست کی کہ آپ کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر یا اشارے سے... غرض جس طرح ہو سکے نماز پنج گانہ کی پابندی اختیار کریں۔ اگر وضو نہ ہو سکے تو تیمم ہی سہی مگر نماز ترک نہ کرو۔

غالب کے پاس بہت سے خط آیا کرتے تھے جن میں ان کو بے دین، ملحد اور کافر لکھا ہوتا تھا۔ غالب ان کو بکواس سمجھتے اور پروانہ کرتے لیکن حالی کے خط سے انہیں بے حد صدمہ پہنچا۔ انہوں نے ایک غزل بھیجی جس میں حالی کے طرزِ عمل کا شکوہ کیا

گیا تھا۔ حالی نے اس کے جواب میں معذرت کے طور پر ایک قطعہ لکھ بھیجا۔ اس کے جواب میں غالب نے یہ قطعہ لکھ کر شیفتہ کے پاس بھیجا۔ اس وقت شیفتہ دلی آئے ہوئے تھے اور حالی ان کے ساتھ ہی ٹھہرا ہوا تھا۔

چو حالی از منِ آشفتہ بے سبب رنجید
تو گر شفیع نہ گردی بگو، چہ کار کنم
دوبارہ عمر دہندم اگر بفرضِ محال
بر آں سرم کہ دراں عمر ایں دو کار کنم
یکے ادائے عبادات عمر پیشینہ
دگر بہ پیشگہِ حالی اعتذار کنم

بڑے لطیف پیرائے میں انہوں نے کہہ دیا تھا کہ اگر دوبارہ زندگی ملی تو گزری عمر کی عبادت پوری کریں گے۔

حالی کو سخت ندامت ہوئی کہ اس نے چھوٹا منہ بڑی بات کے قول کو زندہ کردیا۔ اسے یہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس نے پھر ایک قطعہ لکھا اور غالب کو روانہ کردیا جس میں اس نے شکوے کو دوستی کی اساس قرار دیا تھا اور بہت کچھ معذرت کی تھی۔

آخر غالب نے کہا "بس اب بیت بخش" موقوف یہ بحث ختم ہوگئی لیکن حالی کو اس کا افسوس بہت دن تک رہا۔

یہ افسوس اس لیے اور بھی بڑھ گیا کہ اس کے بعد ہی ۱۸۶۹ء میں غالب کا انتقال ہوگیا۔ جس پر اس کی جان نثار تھی، وہ مرگیا۔ وہ ایسا رویا کہ دوسرے شعرا بھی اس رونے پر رشک کرنے لگے۔ اس نے غالب کا ایسا مرثیہ لکھا کہ نئے مرثیے کی بنیاد رکھ دی۔ انیس نے مرثیے کے لیے مسدس کا میدان اختیار کیا تھا۔ حالی نے مثنوی کی وہ بحر اختیار کی جو سب سے زیادہ پُراثر اور دل نشیں ہے۔ غالب کی سیرت کا وہ نقشہ کھینچا کہ اس سے بہتر تصویر نظم و نثر میں نہیں ملتی۔ کمالِ شاعری کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ جس نے اسے صفِ اول کے شعرا میں شامل کردیا۔

بلبلِ ہند مرگیا ہیہات
جس کی تھی بات بات میں ایک بات
نکتہ داں، نکتہ سنج، نکتہ شناس
پاک دل، پاک ذات، پاک صفات
ہوگیا نقشِ دل پہ جو لکھا
قلم اس کا تھا اور اس کی دوات
اس کے مرنے سے مرگئی دلی
خواجہ نوشہ تھا اور شہر برات

غزل

اس کے جاتے ہی یہ کیا ہوگئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت
کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل
کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت
اپنی جیبوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار
اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت
شوق میں اس کے مزا، درد میں اس کی لذت
ناصحو، اس سے نہیں کوئی مفر کی صورت
میں بچا تیرِ حوادث سے نشانہ بن کر
آڑے آئی مرے تسلیم سپر کی صورت
ان کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہمان
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

یاں اگر بزم تھی تو اس کی بزم
یاں اگر ذات تھی تو اس کی ذات

دل کو باتیں جب اس کی یاد آئیں
کس کی باتوں سے دل کو بہلائیں
مرثیہ اس کا لکھتے ہیں احباب
کس سے اصلاح لیں کدھر جائیں
کس کو جاکر سنائیں شعر و غزل
کس سے دادِ سخنوری پائیں
لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں
اہلِ میت جنازہ ٹھہرائیں
لائیں گے پھر کہاں سے غالب کو
سوئے مدفن ابھی نہ لے جائیں
ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے
ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں
غالبِ نکتہ داں سے کیا نسبت
خاک کو آسماں سے کیا نسبت

شاعری کا کیا حق اس نے ادا
پر کوئی اس کا حق گزار نہ تھا
بے صلہ مدح، شعر بے تحسین
سخن اس کا کسی پہ بار نہ تھا

خاکساروں سے خاکساری تھی
سربلندوں سے انکسار نہ تھا

ہند میں نام پائے گا اب کون
سکہ اپنا جمائے گا اب کون
اس سے ملنے کو یاں ہم آتے تھے
جا کے دلی سے آئے گا اب کون
مرگیا قدرداں فہم سخن
شعر ہم کو سنائے گا اب کون
شعر میں ناتمام ہے حالی
غزل اس کی بنائے گا اب کون

ایسی غضب کی فصاحت، ایسی قیامت کی بلاغت، صحیح جذبات کی صحیح ترجمانی ایک نئی شاعری کا پتا دے رہی تھی۔

ابھی آنسو خشک نہیں ہوئے تھے کہ اسی سال اس کے مربی شیفتہ کا انتقال ہوگیا۔ وہ ایک مرتبہ پھر چھاؤں سے دھوپ میں آگیا۔ آٹھ سال سے وہ جس دسترخوان پر بیٹھا تھا وہ دسترخوان ہی اٹھ گیا۔ اسے پھر فکرِ معاش نے ستایا اور وہ دلی آگیا۔

اب وہ دلی والوں کے لیے نیا نہیں تھا۔ غالب کے مرثیے نے اس کی شہرت کو چار چاند لگادیے تھے۔ دلی پہنچتے ہی وہ یہاں کی ادبی مجلسوں کا رکن عظیم بن گیا۔

ایک طرحی مشاعرہ ہوا جس میں داغ بھی شریک ہوئے اور حالی کو بھی مدعو کیا گیا۔ داغ کی موجودگی میں غزل پڑھنا، سورج کو چراغ دکھانا تھا۔ اس نے نہایت محنت سے غزل تیار کی اور نہایت انکسار سے پیش کردی۔

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جاکر نظر کہاں
اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذت زخمِ جگر کہاں
حالی نشاطِ نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اب
آئے ہو وقتِ صبح، رہے رات بھر کہاں

دادو تحسین کا ایسا شور بلند ہوا کہ تھمنے میں نہیں آتا تھا۔ لوگوں نے خیال کیا کہ اب داغ کے لیے کچھ نہیں رہا۔

سب سے بڑی داد خود داغ کا بیان تھا۔ شمع ان کے سامنے پہنچی تو انہوں نے کہا "حالی کی غزل سننے کے بعد میری غزل خود میری نگاہ سے گرگئی۔ جی چاہتا ہے پرچہ چاک کردوں۔"

داغ کی تعریف اور وہ بھی ایسے حوصلہ افزا الفاظ میں۔ کوئی اور ہوتا تو خوشی سے پھولے نہ سماتا۔ غرور کے ہنڈولے میں جھولتا۔ اس تعریف کو اپنی زبان سے کئی کئی مرتبہ دہراتا لیکن وہ تو مجسم انکسار تھا۔ جو لوگ اس مشاعرے میں موجود نہیں تھے انہوں نے اس سے پوچھا اور وہ اس کے سوا کچھ نہ کہہ سکا "جی ہاں، بس غزل پڑھی گئی اور اس کے بعد مشاعرہ ختم ہوگیا۔"

"داغ نے کیا خیال ظاہر کیا تھا؟"

"جی ہاں، کیا کہا جائے۔"

"جی ہاں، کیا کہا جائے" کے سوا کوئی لفظ اس کی زبان پر نہ آسکا۔

○☆○

۱۸۶۸ء میں وہ نواب شیفتہ کی ہمراہی میں سرسید سے ملاقات کو گیا تھا۔ ملاقات سے پہلے اس کے دل میں ان کی طرف سے بہت سی غلط فہمیاں تھیں لیکن اس ملاقات کے بعد وہ ان کے خلوصِ دلی کا قائل ہوچکا تھا۔ اب جو دلی آیا تو سرسید کی مخالفت اور حمایت کی ہزار باتیں اس کے کانوں میں پڑیں۔

سرسید کی تحریک ان دنوں اپنے عروج پر تھی۔ قوم کی اصلاح کا جو مشن انہوں نے شروع کیا تھا، حالی کا ذہن اسے قبول کرنے کو تیار ہوگیا۔ وہ اس تحریک میں شامل نہیں تھا لیکن جیسے جیسے غور کرتا جاتا تھا، قائل ہوتا جاتا تھا۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ اس وقت ایک ایسے ہی ہادی کی ضرورت تھی، قوم کو پستی سے نکالنے کیلئے خود اس نے انگریزی تعلیم حاصل نہیں کی تھی بلکہ طویل عرصے تک وہ اس تعلیم کا مخالف رہا تھا لیکن اب وہ سرسید کی تعلیمی کوششوں کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اسے ان مشکلات کا بھی اندازہ تھا جن سے سرسید کو گزرنا پڑ رہا تھا۔

اس کا قلم بے اختیار اٹھا اور ایک مضمون "سید احمد خاں اور ان کے کام" تحریر میں آیا جو اس نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ میں شائع کرادیا۔

"۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے مجھ کو مولوی سید احمد خاں کو خوش کرنا منظور نہیں۔ نہ ان کے مخالفوں سے بحث کرنی مقصود ہے بلکہ اس کا منشا وہ ضرورت اور وہ مصلحت ہے جس کے سبب سے بھولے کو راہ بتائی جاتی ہے اور مریض کو دوائے تلخ کی ترغیب دی جاتی ہے۔"

ابھی وہ ایک بالغ نظر کی طرح سرسید کے کاموں کا قائل ہوا تھا۔ محبت کا رنگ جمنے نہیں پایا تھا کہ ملازمت کی کشش اسے لاہور لے گئی۔

پنجاب بکڈپو (لاہور) میں ایک اسامی اسے مل گئی۔ جو کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی جاتی تھیں، اس کی عبارت کی درستی اس کے کام میں شامل تھی۔

دلی سے جدا ہونا ہی کچھ کم آفت نہیں تھی۔ طرفہ ستم یہ ہوا کہ یہاں پہنچتے ہی نہایت سخت وبا آئی۔ ہیضہ پھیل گیا اور مدت تک چیچک اور بخار کا زور رہا۔ خود وہ بھی اس کی لپیٹ میں آگیا۔ احباب دلی میں چھوڑ آیا تھا۔ یہاں اس کی پرسش کو کون آتا، تنہائی میں جی کون بہلاتا۔ بے اختیار نوکِ قلم نے ان اشعار کو غزل کی شکل دے دی۔

رہے لاہور میں آکر، سو جانے
یہی دنیا ہے جو دارالمحن ہے
نہیں آتی کہیں یاں بوئے یوسف
مگر جو گھر ہے وہ بیت الحزن ہے
یہاں بے گانگی ہے اس قدر عام
کہ بلبل ناشناسائے چمن ہے
نہ کچھ مجنوں کو ہے پروائے لیلیٰ
نہ کچھ شیریں کو دردِ کوہ کن ہے
مجھے تنہا نہ سمجھیں اہلِ لاہور
تصور میں مرے اک انجمن ہے

اس کے لیے یہاں کی آب و ہوا ناموافق تھی لیکن اس ملازمت نے اس کی ذہنی صحت پر نہایت خوش گوار اثرات مرتب کیے۔ سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ انگریزی نہ پڑھ سکنے کی کمی پوری ہوگئی۔ وہ تراجم کے ذریعے انگریزی زبان وادب کے بہت سے مطالب سے واقف ہوگیا۔ انگریزی شاعری سے واقفیت بڑھی تو اردو اور فارسی شاعری کے بہت سے عیوب اس پر ظاہر ہونے لگے۔ انگریزی ادب کی تنقیدیں پڑھ کر اسے معلوم ہوا کہ شاعری کو کیسا ہونا چاہیے۔ اسے پہلی مرتبہ یہ عرفان ہوا کہ ادب کے ذریعے انسانوں کی خدمت کی جاسکتی ہے۔ شاعری اور سماج کے درمیان کوئی رشتہ ہونا چاہیے۔

عجیب بات یہ تھی کہ انگریزی کی یہ تنقیدیں اور سرسید کے ادب کے بارے میں خیالات بہت ملتے جلتے تھے۔ سرسید کے پرچے تہذیب الاخلاق میں جو مضامین شائع ہو رہے تھے، ان میں ادب و شعر کی اصلاح پر خصوصی توجہ دی جا رہی تھی۔

وہ ابھی اس تذبذب میں تھا کہ نئے خیالات کو کس صنف میں قید کرے، پرانی ڈگر پر چلنے والے شعرا کے نزدیک اس کی قدر و قیمت کیا ہوگی کہ حکومت پنجاب، ہالرائیڈ اور محمد حسین آزاد کی کوششوں سے ایسے مشاعروں کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا جس میں غزلوں کے بجائے نظمیں پڑھی جائیں۔

حالی تو اس موقع کے انتظار میں تھا کہ بے مصرف غزل گوئی کو چھوڑ کر شاعری کی کوئی راہ انتخاب کرے۔ اس نے بڑی گرم جوشی اور خوشی سے اس نئی وضع کے مشاعرے کا خیر مقدم کیا۔

پہلے مشاعرے میں اس نے "برکھارت" کے عنوان سے نظم پڑھی۔

برسات کا بج رہا ہے ڈنکا
اک شور ہے آسماں پہ برپا
ہے ابر کی فوج آگے آگے
اور پیچھے ہیں دل کے دل ہوا کے
ہیں رنگ برنگ کے رسالے
گورے ہیں کہیں، کہیں ہیں کالے
ہے چرخ پہ چھاؤنی سی چھاتی
اک آتی ہے فوج ایک جاتی
جاتے ہیں مہم پہ کوئی جائے
ہمراہ ہیں لاکھوں توپ خانے
توپوں کی ہے جبکہ باڑھ چلتی
چھاتی ہے زمین کی دہلتی
مینہ کا ہے زمین پر دڑیڑا
گرمی کا ڈبو دیا ہے بیڑا

۱۴۳ اشعار کی اس نظم میں کوئی خوبی ایسی نہیں تھی جو قدامت پسندوں کی نظروں میں قابلِ قدر ٹھہرتی۔ اس کے ساتھ ہی مغربی شاعری کی بھی پوری خوبیاں موجود نہیں تھیں لیکن یہ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ یہ طرزِ جدید کی شاعری کی طرف پہلا قدم

حالی کی طبیعت میں حیا کا مادہ بہت تھا۔ مولانا عبدالحق ایک دفعہ کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ حیدر آباد میں سرسید کی برسی کا جلسہ تھا جس میں حالی نے سرسید پر ایک مضمون پڑھا۔ مضمون کافی لمبا تھا اور ان کی ضعیفی تھی۔ پڑھتے پڑھتے گلا خشک ہوگیا۔ حلق میں کانٹے پڑ گئے لیکن پانی نہیں مانگا۔

جب بعد میں اس کا ذکر آیا اور مولوی صاحب نے ان سے کہا، وہاں پانی، شربت سب کچھ موجود تھا، آپ نے کہا ہوتا تو فوراً حاضر کیا جاتا۔ حالی نے کہا "اتنے بڑے مجمع میں پانی مانگتے ہوئے شرم معلوم ہوئی۔"

ہے۔

اخبارات میں اس نظم اور اس مشاعرے میں پڑھی جانے والی دوسری نظموں کے خلاف نہایت سخت تنقید کی گئی۔ لکھنؤ سے پنجاب تک مخالفت کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا لیکن حالی کو اپنے کام سے کام تھا۔ اس نے کسی اعتراض کا کوئی جواب نہیں دیا اور اگلے مشاعرے کے لیے نظم لکھنے میں مصروف ہوگیا۔

اگلے مشاعرے میں اس نے اپنی نظم "نشاطِ امید" کے عنوان سے پڑھی۔

اے مری اُمید مری جاں نواز
اے مری دل سوز مری کارساز
میری سپر اور مرے دل کی پناہ
درد و مصیبت میں مری تکیہ گاہ
عیش میں اور رنج میں میری شفیق
کوہ میں اور دشت میں میری رفیق

اس سے اگلے مشاعرے میں نظم "حبِ وطن" پڑھی جسے اس طرح شروع کیا۔

اے سپہرِ بریں کے سیارو
اے فضائے زمیں کے گلزارو
اے پہاڑوں کی دلفریب فضا
اے لبِ جو کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا
اے عنادل کے نغمۂ سحری
اے شبِ ماہ تاب تاروں بھری
اے نسیمِ بہار کے جھونکو
دہرِ ناپائیدار کے دھوکو
تم ہر اک حال میں ہو یوں تو عزیز
تھے وطن میں مگر کچھ اور ہی چیز

اس نظم کے ذریعے حالی نے ہندوستان کے ادب میں پہلی مرتبہ حبِ وطن کے صحیح تصور کی تلقین کی اور انفرادی اغراض بندگی کے ظلمت کدے میں بے لوث جماعتی خدمت کا دیا روشن کیا۔

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو
اٹھو اہلِ وطن کے دوست بنو
مرد ہو تو کسی کے کام آؤ
ورنہ کھاؤ پیو چلے جاؤ
جب کوئی زندگی کا لطف اٹھاؤ
دل کو دکھ بھائیوں کے یاد دلاؤ
پہنو جب عمدہ تم کوئی پوشاک
کرو دامن سے تاگریباں چاک
کتنے بھائی تمہارے ہیں نادار
زندگی سے ہے جن کا دل بیزار
کھاؤ تو پہلے لو خبر ان کی
جن پہ پڑتا ہے نیستی کی پڑی
پہنو تو پہلے بھائیوں کو پہناؤ
کہ ہے اترن تمہاری جن کا بناؤ

ان ہی مشاعروں کے لیے اس نے نظم "رحم و انصاف" لکھی جس میں پہلے رحم کے اوصاف بیان کیے پھر انصاف کی زبان سے رحم جیسی خوبی کی برائی بتائی اور شاعرانہ انداز میں رحم اور ہمدردی کے معائب پیش کیے۔

رحم کہلائی جو مظلوم کی فریاد سنی
عدل ٹھہری جو سزا ظالمِ بے رحم کو دی

پرانی زبانیں نئے ذائقے کو بڑی مشکل سے قبول کرتی ہیں۔ ان نظموں پر تنقیدی مضامین مسلسل شائع ہو رہے تھے۔ حالی کی ہمت عالی کسی مخالفت سے دبنے والی نہیں تھی۔ وہ سب کی سنتا اپنی کرتا رہا۔

آخر کار اس کی کاوشوں کو تہذیب الاخلاق کے ایک شمارے میں سرسید نے سراہا اور اس کی محنت وصول ہوگئی۔

"مولوی خواجہ الطاف حسین حالی کی مثنویوں نے ہمارے دلوں کے حال کو بدل دیا ہے۔ ان کی مثنوی "حبِ وطن اور مناظرہ رحم و انصاف" درحقیقت ہمارے زمانے کے علم و ادب کا ایک کارنامہ ہے۔ ان کی سادگی الفاظ، صفائی بیان، عمدگیٔ خیال ہمارے دلوں کو بے اختیار کھینچتی ہے۔ زبان میں، بیان میں، الفاظ کی ترکیب میں، سادگی و صفائی میں کیسی عمدہ ہیں کہ دل میں بیٹھی جاتی ہیں۔"

ان خیالات کو پڑھ کر سرسید کی انصاف پسندی کا سکہ اس کے دل پر جم گیا۔ اسے یقین ہوگیا کہ قوم کی اصلاح کا جیسا سچا جذبہ اس شخص کے دل میں ہے، کسی اور کے دل میں نہیں ہوسکتا۔

حالی صرف چار مشاعروں کی آب و تاب دیکھ سکے تھے کہ دلی کی واپسی کی صورت نکل آئی۔ وہ اینگلو عربک اسکول میں مدرس ہو کر یہاں آگیا۔ دیوانہ پھر اپنے صحرا میں تھا۔

دلی آکر بھی اس کے دل کو سکون نصیب نہ ہوا۔ اب وہ ایک نئی الجھن اور ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا۔ نوجوانی کا دور

گزر چکا تھا۔ عشقیہ شاعری کا ولولہ سرد ہو گیا تھا۔ گل و بلبل کی داستان سے جی سیر ہو چکا تھا۔ اس محدود دنیا سے قدم باہر نکالنے کو جی چاہتا تھا لیکن کوئی راہ نظر نہ آتی تھی۔

عزیز ذلیل ہو گئے تھے۔ شریف خاک میں مل گئے تھے۔ علم کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ افلاس کی گھر گھر پکار تھی۔ اخلاق بگڑتے جا رہے تھے۔ زمانے کا یہ احوال دیکھ کر پرانی شاعری سے دل سیر ہو گیا۔ جھوٹے ڈھکوسلے باندھتے شرم آنے لگی۔ سرسید کے اصلاحی خیالات کا دل پر غلبہ تھا۔ وہ کوئی ایسا کام کرنا چاہتا تھا جو قوم کو بیدار کرنے میں معاون ثابت ہو۔

وہ ابھی اسی اُدھیڑبن میں تھا کہ ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ کے مدرسے کی رسمِ افتتاح عمل میں آئی۔ حالی نے مبارک باد کی نظم لکھ کر سرسید کی خدمت میں بھیجی اور قومی شاعری کی بنیاد رکھ دی۔

مژدہ کہ وقفِ جہاں گنجِ سعادت ہے آج
فتنۂ ایام سے سب کو فراغت ہے آج
آج کی ایک ایک گھڑی سارے برس کا ہے مول
ملک کی مخدومہ کا روزِ ولادت ہے آج
مدرسۂ علم و دیں کرتے ہیں قائم ثقات
مزرعۂ قوم پر بارشِ رحمت ہے آج
دولتِ برطانیہ روز فزوں ہو جیو
قوم کو یہ دن نصیب جس کی بدولت ہے آج

اس نظم کے ساتھ ہی اس نے مختلف قومی موضوعات پر رسالہ تہذیب الاخلاق میں مضامین لکھنے شروع کر دیے۔

اب وہ بھی سرسید کے دوش بہ دوش قوم کو غفلت سے چونکا کر اہلِ یورپ کے علوم و فنون کے لیے ترغیب دلانے لگا۔

"بارخدایا! ہماری قوم کو تقلیدِ بے جا اور وضع داری بے سروپا سے نجات دے اور ان کو دینی و دنیوی ترقیات پر آمادہ کر۔ ان کا ادب ان کو قدما سے آگے نہیں بڑھنے دیتا اور ان کی وضع داری پستی سے بلندی کی طرف نہیں جانے دیتی۔۔۔"

(مضمون "جب زمانہ بدلے تم بھی بدل جاؤ")

"ایک اعلیٰ درجے کی شائستہ قوم جو ہماری خوش قسمتی سے ہم پر حکمراں ہے، اس کا چال چلن، اس کے اخلاق، اس کا طریق معاشرت، اس کے علوم و فنون، اس کی دانش مندی، اس کی تہذیب، اس کی نئی نئی ایجادات جو ہر وقت ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں، جب ان باتوں کو ملک کی موجودہ صورت کے ساتھ مقابلہ کریں تو ضرور ہے کہ ہم کو اپنے ہم وطنوں کی نہایت وحشیانہ حالت پر افسوس آئے اور ہمدردی کا جوش ہمارے دلوں میں موجزن ہو۔"

(لیکچر۔ ہمدردی)

یہ وہی خیالات تھے جو سرسید کے قلم سے ادا ہو رہے تھے۔ اس لیے لامحالہ سرسید کے ساتھ اس کا نام بھی لیا جانے لگا۔ سرسید کا نام اچھے لفظوں میں نہیں لیا جاتا تھا لہٰذا اس کا نام بھی اچھلنے لگا۔

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے
میدانِ پانی پت کی طرح پائمال ہے

دلّی دلّی کیسی دلّی
پانی پت کی بھیگی بلّی

سید کی سرگزشت کو حالی سے پوچھیے
غازی میاں کا حال ڈفالی سے پوچھیے

حالی اس حقیقت سے واقف تھا کہ جو کام اس نے اپنے ذمّے لیے ہیں ان کا انعام بدنامی اور مخالفت کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ قوم کو غفلت کی نیند سے جگانا اور سچی، کڑوی باتیں سنانے کا نتیجہ یہی ہونا تھا۔

کہہ دو جنہیں اصلاح کا ہے قوم کی چاؤ
طعنے جھیلو، برا سنو، گالیاں کھاؤ

غزل

یاروں کو تجھ سے حالی اب سرگرانیاں ہیں
نیندیں اچاٹ دیتی تیری کہانیاں ہیں
بنتے ہیں غیر اپنے، ہوتے ہیں رام وحشی
الفت کی بھی جہاں میں کیا حکمرانیاں ہیں
کہتے ہیں جس کو جنت وہ اک جھلک ہے تیری
سب واعظوں کی باقی رنگیں بیانیاں ہیں
کھیتوں کو دے لو پانی، اب بہہ رہی ہے گنگا
کچھ کرلو نوجوانو! اٹھتی جوانیاں ہیں
فضل و ہنر بڑوں کے گر تم میں ہوں تو جانیں
گر یہ نہیں تو بابا وہ سب کہانیاں ہیں
رونے میں تیرے حالی لذت ہے کچھ نرالی
یہ خوں فشانیاں ہیں یا گل فشانیاں ہیں

یہ قوم کی خدمت کا صلہ ہے سرِدست
گر اس پہ قناعت کا ارادہ ہے تو آؤ

زمانے کی مخالفت نے اسے بددل کرنے کے بجائے زیادہ شدومد سے اپنے فیصلے پر ڈٹے رہنے کا حوصلہ دے دیا۔ اب تک وہ سرسید کی ہم نوائی کررہا تھا۔ اب اس نے کھلے لفظوں میں اس کا قصیدہ سنا دیا۔

اس دورِ آخری میں جب یوں بگڑ چلے تم
اک ہاشمی تمہارا مصلح کھڑا کیا ہے
سرسبز چاہتا ہے جو قوم کو جہاں میں
فتووں سے قوم کے گو کافر ٹھہر چکا ہے
وقت اپنا کام اپنا جان اپنی مال اپنا
یاروں پہ جس نے سب کچھ قربان کردیا ہے
وار اس پہ قوم کے ہیں وہ قوم کی سپر ہے
قوم اس سے بدگماں ہے وہ قوم پر فدا ہے

وہ اپنی شاعری کے لیے کوئی راہ تلاش کررہا تھا کہ سرسید نے اسے ایک ایسی طویل نظم لکھنے کا مشورہ دیا جس میں قوم کو اس کی پستی کا احساس دلایا جائے۔ ان تمام امراض کی نشاندہی کی جو قوم کے دل میں گھر کرچکے ہیں۔

ناصح کی جادو بھری تقریر جی میں گھر کرگئی۔ دل ہی سے نکلی تھی دل میں جاکر ٹھہری۔ باوجود ساری فکروں اور پریشانیوں کے حالی نے اپنے دماغ کی بہترین قوتوں سے کام لے کر مسدس مدوجزر اسلام کی بنیاد رکھ دی۔

بیماریوں، پریشانیوں، مشکلوں، سب نے رخنہ کیا لیکن اس کی ہمت کو مغلوب نہ کرسکیں۔ اب اسے وہ مقصدِ حیات معلوم ہوچکا تھا جس کی خاطر وہ سب کچھ کرسکتا تھا۔

سرسید جب بھی قوم کو لعن طعن کرتے تھے، اس کا مقابلہ انگریزوں سے کرتے تھے اور قوم کے روبرو بدنام ہوتے تھے۔ حالی نے ایک زبردست نفسیاتی حربہ استعمال کیا۔ اس نے موجودہ مسلمانوں کی پستی کا موازنہ مسلمانوں کے دورِ عروج سے کیا اور اس پستی کا سبب ان کی دین کی دوری اور تعلیماتِ نبویؐ کو بھلا دینا قرار دیا۔

یہ گدلا ہوا جب کہ چشمہ صفا کا
گیا چھوٹ سررشتہ دینِ ہدیٰ کا
رہا سر پہ باقی نہ سایہ ہما کا
تو پورا ہوا عہد تھا جو خدا کا

کہ ہم نے بگاڑا نہیں کوئی اب تک
وہ بگڑا نہیں آپ دنیا میں جب تک

اور پھر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کے دل میں جو پھوڑا مدت سے پک رہا تھا، پھوٹ بہا ہے۔ قوم کی بدحالی، پستی، اخلاقی گراوٹ، جہالت اور بےعملی کا وہ عبرت انگیز منظر دکھایا کہ ہر غیرت مند دل شرم سے پانی پانی ہوگیا۔

قوم کے ایک ایک طبقے کی زبوں حالی کی تصویر کشی کی۔

گنہ گار واں چھوٹ جائیں گے سارے
جہنم کو بھردیں گے شاعر ہمارے

ہوا علم و دیں جس سے تاراج سارا
وہ ہے ہدف نظر علم و انشا ہمارا

یہ بوسیدہ گھر اب گرا کا گرا ہے
ستوں مرکز ثقل سے ہٹ چکا ہے

ہر طبقے کی حالتِ زار بیان کرنے کے بعد انہیں ہوش کے ناخن لینے کی تلقین کی۔

کوئی ان سے پوچھے کہ اے ہوش والو
کس امید پر تم کھڑے ہنس رہے ہو
برا وقت بیڑے پہ آنے کو ہے جو
نہ چھوڑے گا سوتوں کو اور جاگتے کو
بچوگے نہ تم اور نہ ساتھی تمہارے
اگر ناؤ ڈوبی تو ڈوبیں گے سارے

نظم کیا تھی ایک دریا تھا کہ اُمڈا چلا آتا تھا۔ ایک تسلسل تھا جس کا تار کہیں ٹوٹتا نہ تھا۔ جوش کی فراوانی تھی اور وہ بھی نہایت سادگی کے ساتھ جیسے کوئی باتیں کرتا ہے۔ جو لفظ جہاں بٹھا دیا نگینے کی طرح جڑ گیا۔ جو خیال جس طرح پیش کیا، حرفِ آخر ہوگیا۔ ایک الہامی نظم تھی جو تہذیب الاخلاق میں قسط وار شائع ہوتی رہی اور پھر کتابی شکل میں آگئی۔

جب یہ انقلاب آفریں نظم قوم کے ہاتھوں میں آئی تو پورے ملک میں ہلچل پیدا ہوگئی۔ ایک طبقہ ایسا تھا جسے اس میں عیب ہی عیب نظر آئے تھے۔ نکتہ چینیوں کا ایسا بازار گرم ہوا کہ معلوم ہوتا تھا کہ چند اوراق کا یہ مجموعہ اس سیلاب میں تنکے کی طرح بہہ جائے گا لیکن تھوڑے ہی عرصے میں یہ طوفان سمندر کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ کوئی طاقت اس کی مقبولیت

کو روک نہیں سکی۔ طوائفوں کے کوٹھوں سے لے کر خانقاہوں تک میں اس کی عمل داری ہوگئی۔ عورت، مرد، امیر، غریب سب اسے پڑھتے اور سر دھنتے اور اپنی حالت پر افسوس کرتے۔ میلادوں میں اس کے بند پڑھے جاتے تو محفل جھوم اٹھتی۔

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا، ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی، غلاموں کا مولا

خطا کار سے درگزر کرنے والا
بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کا زیرو زبر کرنے والا
قبائل کو شیروشکر کرنے والا
اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

واعظ اس نظم کے اخلاقی بند پڑھ کر اپنے وعظ میں اثر پیدا کرتے۔

وہی ایک ہے جس کو دائم بقا ہے
جہاں کی وراثت اسی کی سزا ہے
سوا اس کے انجام سب کا فنا ہے
نہ کوئی رہے گا نہ کوئی رہا ہے
مسافر یہاں ہیں فقیر اور غنی سب
غلام اور آزاد ہیں رفتنی سب

سماع کی محفلوں میں مسدس گایا جاتا تو کچھ دیر کے لیے من کی دنیا حقیقت کی دنیا میں بدل جاتی۔

سرسید نے یہ کہہ کر خراج پیش کیا "خدا مجھ سے پوچھے گا کہ تو کیا لایا تو میں کہہ دوں گا، حالی سے مسدس لکھوالایا ہوں اور کچھ نہیں۔"

اس روکھی پھیکی نظم کی یہ مقبولیت دیکھ کر وہ خود حیران تھا۔ اس کی مقبولیت ہی نے اسے یہ حوصلہ دیا کہ اس نے آئندہ زندگی قوم کے نام وقف کرنے کا عزم کرلیا۔

○☆○

قوم کی خدمت کے اس جذبے نے اسے صرف قومی نظمیں لکھنے تک محدود نہیں رکھا بلکہ یہ اثر اس کی غزلوں میں بھی ظاہر ہونے لگا۔ یہ ایک خطرناک اقدام تھا۔ اس سے غزل کی انفرادیت بھی مجروح ہوتی تھی اور اس کی شہرت بھی متاثر ہوسکتی تھی لیکن اسے اپنی شہرت سے زیادہ قوم کا مفاد عزیز تھا۔ اردو غزل پر سوچتے ہوئے وہ اس فیصلے پر پہنچ چکا تھا کہ اگر اسے موجودہ ڈگر سے نہیں ہٹایا گیا تو یہ ختم ہوجائے گی یا مطعون ہوکر رہ جائے گی اور اپنی آبرو کھو بیٹھے گی۔ نئی صورتِ حال سے نمٹنے اور نئے سماجی اور سیاسی شعور کو گرفت میں لینے کے لیے غزل اپنی رائج حیثیت میں ناکافی ہے۔ اس میں تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ یہ تبدیلی موضوعات میں بھی ہونی چاہیے اور اندازِ بیان میں بھی۔

سخن میں پیروی کی گر سلف کی
انہی باتوں کو دہرانا پڑے گا

اس خیال کو عصا بنا کر، اندھیرے کو ٹٹولتا ہوا وہ آگے بڑھا اور ایک نئے انداز کی راگنی چھیڑی جس میں تشبیہات اور تلمیحات کا جہان بھی دوسرا تھا اور باتیں بھی ایسی تھیں جن سے ابھی کان آشنا نہیں ہوئے تھے۔

تبدیلی کے اس رجحان میں کوئی حرج نہیں تھا لیکن اصلاح کے جوش میں اس نے غزل میں نئے مضامین کو داخل کرنا شروع کیا تو وہ غزل کے مزاج کو ملحوظ نہ رکھ سکا۔ غزل کا مزاج یہ ہے کہ جب وہ کسی موضوع کی طرف پیش قدمی کرتی ہے تو رمزیہ انداز اختیار کرتی ہے۔ اشارے کرتی ہے، کھلتی نہیں۔ ہر شعر کی مخصوص انفرادیت ہوتی ہے۔ وہ ان نزاکتوں کا خیال نہ رکھ

ایک مرتبہ مولانا حالی سہارن پور گئے اور ایک معزز زمیندار کے پاس ٹھہرے۔ گرمی کے دن تھے۔ مولانا کمرے میں لیٹے ہوئے تھے۔ اسی وقت اتفاق سے ایک کسان آگیا۔

زمیندار نے کہا "یہ بزرگ ہے جو آرام کررہے ہیں، ان کو پنکھا جھل۔"

وہ بے چارہ پنکھا جھلنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے آہستہ سے زمیندار سے پوچھا "یہ بزرگ کون ہیں؟"

"کم بخت تو ان بزرگ کو نہیں جانتا حالانکہ سارے ہندوستان میں ان کا شہرہ ہے۔ بے وقوف! یہ مولوی حالی ہیں۔"

حالی لیٹے لیٹے یہ باتیں سن رہے تھے۔ پھڑک کر اٹھ بیٹھے۔

"حضرت! اس تخلص کی داد آج ملی ہے" انہوں نے زمیندار سے کہا اور دیر تک ہنستے رہے۔

سکا اور اس کی یہ غزلیں نظموں کی صورت اختیار کر گئیں۔

اے عشق تونے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا
جس گھر سے سر اٹھایا اس کو بٹھا کے چھوڑا
ابرار تجھ سے ترساں، احرار تجھ سے لرزاں
جو زد پہ تیری آیا اس کو گرا کے چھوڑا
فرہاد کوہکن کی لی تونے جانِ شیریں
اور قیس عامری کو مجنوں بنا کے چھوڑا
اک دسترس سے تیری حالی بچا ہوا تھا
اس کے بھی دل پہ آخر چرکا لگا کے چھوڑا

یہی حال ان اخلاقی مضامین کا بھی تھا جنہیں حالی نے غزل میں سمونے کی کوشش کی۔ یہ بھی کوئی بری بات نہیں تھی لیکن چونکہ وہ باقاعدہ شعوری کوشش کے تحت ان مضامین کو بیان کر رہا تھا اس لیے یہ اشعار غزل کے ہوتے ہوئے بھی وعظ، تلقین اور خطاب بن گئے۔

ہو ناپید جس ملک میں اتفاق
ہیں آبادیاں واں کی ویرانیاں

بڑھاؤ نہ آپس میں ملت زیادہ
مبادا نہ ہوجائے نفرت زیادہ

خود بڑا بن کر دکھاؤ آپ کو
باپ دادا کی بڑھائی ہوچکی

ان اشعار کا سپاٹ پن اپنی جگہ لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ اس طرح حالی اپنے ہم عصروں کو یہ بتانے کی کوشش کر رہا تھا کہ غزل کی دنیا محدود نہیں ہے۔ اس نے تبدیلی کا شعور پیدا کیا۔ نئی علامتیں وضع کرنے اور پرانی علامتوں کو نئے مفہوم میں استعمال کرنے کا رجحان پیدا کیا۔

انہی اشعار میں اس سے ایسے اشعار بھی سرزد ہوگئے جو غزل کے نئے لہجے کی نشاندہی کر رہے تھے ان میں پرانی غزل کی لطافت بھی تھی اور نئی غزل کی آب و ہوا بھی۔

یارانِ تیز گام نے منزل کو جا لیا
ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

اب بھاگتے ہیں سایۂ عشقِ بتاں سے ہم
کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم

باغ و صحرا میں رہے جو تنگ دل
جی قفس میں اس کا کیا گھبرائے گا

میں بچا تیرِ حوادث سے نشانہ بن کر
آڑے آئی مرے تسلیم سپر کی صورت

۱۸۷۹ء میں وہ پہلی بار علی گڑھ گیا۔ اس سفر کا مقصد مدرستہ العلوم اور اس کے حامیوں کو قریب سے دیکھنا تھا۔ ہرچند کہ مدرسہ ان دنوں تعطیل کے سبب بند تھا لیکن اس کے در و دیوار ہی سے اس نے وہ روشنی پھوٹتی ہوئی دیکھ لی جو آئندہ پورے ہندوستان میں پھیلنے والی تھی۔ ان لوگوں سے ملاقات نصیب ہوئی جو سرسید کے یار و مددگار تھے۔ خاص طور پر نواب وقار الملک سے وہ بہت متاثر ہوا جنہوں نے اپنا گھربار چھوڑ کر علی گڑھ ہی میں ملاقات کرلی تھی۔ سرسید سے ملاقاتیں رہیں۔ ان کے ارادوں اور منصوبوں سے واقفیت کا موقع ملا۔

وہاں سے واپس آکر اس نے ایک ترکیب بند اس مدرسے کی شان میں لکھا۔

جھٹ پٹے کے وقت گھر سے ایک مٹی کا دیا
ایک بڑھیا نے سرِ رہ لا کے روشن کر دیا
تاکہ رہگیر اور پردیسی کہیں ٹھوکر نہ کھائیں
راہ سے آساں گزر جائے ہر ایک چھوٹا بڑا
یہ دیا بہتر ہے ان جھاڑوں سے اور اس لیمپ سے
روشنی محلوں کے اندر ہی رہی جن کی سدا
گر نکل کر اک ذرا محلوں سے باہر دیکھیے
ہے اندھیرا گھپ در و دیوار پر چھایا ہوا
سرخ رو آفاق میں وہ رہ نما مینار ہیں
روشنی سے جن کی ملاحوں کے بیڑے پار ہیں

دور سے اُمید نے جھلکی سی اک دکھلائی ہے
ایک کشتی ڈوبتے بیڑے کو لینے آئی ہے
قوم کے پیرو جواں سب ہوگئے تھے مردہ دل
درد مندی جوش میں چند اہلِ دل کو لائی ہے

اب اس کا قلم یا تو سرسید تحریک کی حمایت کے لیے اٹھ رہا تھا یا اس تحریک کی روشنی میں اپنے ادبی نظریات کو آگے بڑھانے میں۔ چنانچہ اس نے اسی سال "کیا مسلمان ترقی کر سکتے ہیں" کے عنوان سے تہذیب الاخلاق میں ایک مضمون لکھا اور سرسید کے خیالات گویا اپنی زبان سے ادا کر دیے۔

”مسلمانوں کی مذہبی تعلیم دنیوی ترقی کے لیے مانع ہے۔ پس تاوقتیکہ مسلمان مذہب سے دستبردار نہ ہوں ترقی نہیں کرسکتے۔“

تہذیب الاخلاق اسی قسم کے خیالات کی وجہ سے لوگوں میں مطعون تھا اور اس کے خلاف تحریکیں چلنے لگی تھیں۔ اب خود اس کا شمار بھی سرسید کے انہی ساتھیوں میں ہونے لگا جو بعض لوگوں کے مطابق مذہب کے خلاف گمراہ کن مضامین لکھ رہے تھے۔

یہ اسی سرسید تحریک سے شیفتگی کی دین تھی کہ حالی کو ”مناجات بیوہ“ لکھنے کا خیال آیا۔ ہندو مذہب کے اثر سے مسلمان گھرانوں میں بھی بیوہ عورت کی زندگی موت سے بد تر تھی۔ دوسری شادی کو معیوب سمجھا جاتا تھا اور اس کی وجہ سے طرح طرح کے مفاسد پیدا ہو رہے تھے۔ سرسید کے اثر سے حالی نے جس اصلاح کا بیڑا اٹھایا تھا، اس کا تقاضا تھا کہ وہ اس اہم موضوع کی طرف لوگوں کی توجہ دلائیں۔ حالی کی فطرت میں دوسروں کے دکھوں سے متاثر ہونے کا جذبہ بہت زیادہ تھا۔ اسی فطرت نے ایک ایسی نظم اس سے لکھوا دی کہ کم از کم اردو شاعری میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

سماج کی ٹھکرائی، مصیبت کی ماری، ستم زدہ بیوہ اپنے پالن ہار کے سوا کس سے شکوہ کرسکتی ہے۔

اے مرے زور اور قدرت والے
حکمت اور حکومت والے
میں لونڈی تیری دکھیاری
دروازے کی تیری بھکاری
موت کی خواہاں جان کی دشمن
جان پہ اپنی آپ اجیرن
سہہ کے بہت آزار چلی ہوں
دنیا سے بیزار چلی ہوں
دل پر میرے داغ ہیں جتنے
منہ میں بول نہیں ہیں اتنے

سیلانی جب باغ میں آئے
پھول نہ تھے کھلنے ابھی پائے
پھول کھلے جس وقت چمن میں
جا سوئے سیلانی بن میں

گھر برکھا اور پیا بدیسی
آئیو برکھا کہیں نہ ایسی

غزل

بُری اور بھلی سب گزر جائے گی
یہ کشتی یونہی پار اتر جائے گی
ملے گا نہ گل چیں کو گل کا پتا
ہر اک پنکھڑی یوں بکھر جائے گی
رہیں گے نہ ملاح یہ دن سدا
کوئی دن میں گنگا اتر جائے گی
ادھر ایک ہم اور زمانہ ادھر
یہ بازی تو سو بسوے ہر جائے گی
نہ پوری ہوئی ہیں امیدیں نہ ہوں
یونہی عمر ساری گزر جائے گی
سنیں گے نہ حالی کی کب تک صدا
یہی ایک دن کام کر جائے گی

شرط سے پہلے بازی ہاری
بیاہ ہوا اور رہی کنواری

میں نہیں آخر پاک بدی سے
بنی ہوں پانی اور مٹی سے
کان اور آنکھیں، ہاتھ اور بازو
جن جن پر تھا، یاں مجھے قابو
سب کو بدی سے میں نے بچایا
سب کو خودی سے میں نے ہٹایا
اٹھتے بیٹھتے روکا سب کو
سوتے جاگتے ٹوکا سب کو
ہاتھ کو ہلنے دیا نہ بے جا
پاؤں کو چلنے دیا نہ ٹیڑھا
روک کے یوں اور تھام کے آپا
میں نے کاٹا اپنا رنڈاپا

ایک نہ سنبھلا میرا سنبھالا
تھا بے تاب جو اندر والا
حال کروں میں دل کا بیاں کیا
حال ہے دل کا تجھ سے نہاں کیا
دھوپ تھی تیز اور ریت تھی تپتی
مچھلی تھی اک اس میں تڑپتی
جان نہ مچھلی کی تھی نکلتی
اور نہ سر سے دھوپ تھی ٹلتی

اپنے لیے کچھ کہہ نہیں سکتی
پر یہ کیسے بن رہ نہیں سکتی
میں ہی اکیلی نہیں ہوں دکھیا
پڑی ہے لاکھوں پر یہی بپتا

کوئی نہیں جو غور کرے اب
نبض پہ ان کی ہاتھ دھرے اب
چوٹ نہ جن کے جی کو لگی
وہ کیا جانیں دل کی لگی کو

اصلاح کے جوش میں حالی کی حالت اس آدمی کی طرح تھی جس کے گھر میں آگ لگی ہو اور وہ ہر قیمت پر اسے بجھانے کا خواہاں ہو۔ وہ اپنی شاعری، اپنی نثر یہاں تک کہ خود اپنے آپ کو وہ اسی مقصد کے تابع کرچکا تھا۔ اس کی فطرت میں نمائش اور ظاہرداری کا جذبہ نہیں تھا۔ بس سر جھکا کر کام کیے جارہا تھا۔ سرسید تحریک کو جتنا فائدہ اس کے قلم سے پہنچ رہا تھا کسی اور طرح نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس نے اپنی پوری شاعری اس مقصد کے حوالے کردی تھی۔ مسدس جیسی نظم لکھنے کے بعد بھی وہ مسلسل اس دھن میں لگا ہوا تھا کہ قوم کے جہاز کو بھنور سے نکالنے کے لیے اور کیا تدبیر اختیار کرے۔ پھر ایک دن اس کے ذہن میں عجیب وغریب خیال آیا۔ اگر وہ کسی ایسی تاریخ ساز شخصیت کی سوانح عمری قوم کے سامنے پیش کرے جس کی زندگی کارناموں سے بھری ہو اور میری قوم کو اس سے عقیدت بھی ہو تو اسے پڑھ کر قوم کے حوصلے بلند ہوسکتے ہیں۔ جو قوم علمی ترقیات کے بعد پستی اور تنزلی کے درجے کو پہنچ جاتی ہے، اس کی سوانح عمریاں ایک تازیانہ ہوتی ہیں جو ان کو خواب غفلت سے بیدار کرتی ہیں۔ یہ لوگ جب اکابرواسلاف کی زندگی کے حالات وواقعات دریافت کرتے ہیں تو ان کی غیرت کی رگ حرکت میں آتی ہے اور اپنی کھوئی ہوئی عزت اور برتری کے دوبارہ حاصل کرنے کا خیال ان کے دلوں میں پیدا ہوتا ہے۔

احیائے قومی کے اسی جذبے نے اسے کسی ہیرو کی سوانح عمری لکھنے کی طرف ملتفت کیا۔ ناموں کی ایک طویل فہرست اس کے ذہن میں گھومنے لگی اور پھر وہ شیخ سعدیؒ کے نام پر رک گیا۔ اس نے سوچا، ہندوستان کے لوگ اس نام سے خوب واقف ہیں۔ کوئی پڑھا لکھا شخص ایسا نہیں جس نے شیخ سعدی کی گلستاں اور بوستاں نہ پڑھی ہو۔ اس مقبولیت کے باوجود سعدی کی ذاتی زندگی اور حالات سے عام طور پر ناواقفیت ہے۔

یہ خیال اس کے لیے تازیانہ شوق بن گیا۔

حالی اپنی شخصیت، ادبی مذاق اور علمی رجحان کے اعتبار سے سعدی کے ساتھ کئی باتوں میں مماثلت رکھتا تھا۔ دونوں جامع نظم ونثر تھے۔ دونوں نظم اور نثر میں ایک طرز نو کے موجد تھے۔ دونوں کی چند سادہ طرز کی لکھی ہوئی کتابیں ان کی شہرت کی ضامن ہوئیں۔ دونوں کا مقصد اصلاح قوم تھا۔

اردو میں سوانح نگاری کا کوئی نمونہ اس کے سامنے نہیں تھا بلکہ ایک لحاظ سے تو سوانح لکھی ہی نہیں گئی تھی حتیٰ کہ فارسی میں بھی فنی اعتبار سے کوئی لائق قدر سوانح نہیں تھی۔

یہ کام سرسید کے قلم سے بھی دور ہی رہا تھا البتہ تحقیق و توفیق میں جتنی محنت سرسید کرتے تھے، وہ حالی کے سامنے تھے۔ اس نے بھی تہیہ کرلیا کہ وہ سعدی کی لائف کو روایتوں کا پلندا نہیں بنائے گا بلکہ ہر واقعہ چھان بین کے بعد لکھے گا۔

حالی نے کوشش کی کہ واقعات کی صحت برقرار رہے اور انداز بیان ایسا ہو کہ جسے پڑھ کر دلوں میں تحریک پیدا ہو۔

اس کتاب کی اشاعت نے حالی کو ایک اور اعزاز سے نوازا۔ وہ اردو کا پہلا سوانح نگار کہلایا۔

یہ ایسی تصنیف تھی کہ اگر وہ اس کے حقوق اپنے نام کرتا تو اس کی اشاعت سے اسے اچھی خاصی آمدنی ہوتی لیکن اس معاملے میں بھی اس کا طریق کار منفرد تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ ہر تصنیف قوم کی بھلائی کے لیے رقم کرتا ہے۔ یہ جتنی شائع ہو، جو بھی اسے شائع کرے اتنا ہی اچھا ہے۔ ملازمت کی قلیل تنخواہ میں قناعت کے ساتھ گزارہ کرتا رہا لیکن مسدس جیسی کثیرالاشاعت تصنیف کے حقوق بھی محفوظ نہیں کیے اور "حیات سعدی" کے حقوق سے بھی دستبردار ہوگیا۔ دوسرے لوگوں نے اس کی فروخت سے فائدہ اٹھایا اور وہ سر جھکا کر کام کرتا رہا۔

اس کے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین سخت بیمار تھے۔ ان کے حالی پر بڑے احسانات تھے۔ باپ کے مرنے کے بعد انہوں نے ہی حالی کی کفالت کی تھی اور اب بھی اس کے کنبے کو لیے بیٹھے تھے۔ اب وقت آیا تھا کہ وہ ان کی خدمت کرے۔ اس نے انہیں علاج کے لیے دہلی بلوالیا۔ دہلی بڑا شہر تھا۔ یہاں علاج معالجے کی سہولتیں موجود تھیں۔ پانچ چھ مہینے تک ان کا علاج ہوتا رہا لیکن ساری کوششیں بے کار گئیں۔ بھائی کی جدائی کا داغ سہنا پڑا۔ یہ صدمہ ایسا نہیں تھا جسے حالی جیسا حساس شاعر بہ آسانی برداشت کرسکتا۔ اس کے آنسو شعروں میں ڈھل گئے۔

آئے ہیں سدا بھائیوں سے بھائی بچھڑتے

موت ایک کے آگے ہے ضرور ایک کو آنی
پر بھائی ہو جس شخص کا حالی کا سا بھائی
غم بھائی کا، مرجانے کی ہے اس کی نشانی
جس بھائی نے بیٹوں کی طرح بھائی کو پالا
سوکھی ہوئی کھیتی میں دیا باپ کی پانی
جس بھائی کی آغوش میں ہوش اس نے سنبھالا
جس بھائی کے سائے میں کٹی اس کی جوانی

اس صدمے کا اثر ایسا ہوا کہ عرصہ دراز تک کے لیے وہ خاموش ہوگیا۔ کسی علمی کام کی طرف طبیعت آتی ہی نہیں تھی۔ ایک ملازمت تھی جس سے اسے مفر نہیں تھا۔ کبھی چھٹی لے کر پانی پت چلا جاتا کبھی واپس دلی چلا آتا۔ اسی لوٹ پھیر میں پورا ایک سال گزر گیا۔

۱۸۸۷ء میں اس کا تبادلہ ایچی سن کالج لاہور میں ہوگیا۔

اسے لاہور کے قیام کا ایک تلخ تجربہ پہلے بھی ہو چکا تھا جب وہ انجمن پنجاب میں بطور مترجم ملازم ہو کر لاہور گیا تھا۔ اس تجربے کی روشنی میں وہ انکار کر دیتا لیکن یہ سوچ کر تیار ہوگیا کہ دہلی سے دور ہو کر بھائی کی موت کے صدمے سے کچھ دن کے لیے دور ہو جائے گا۔

انجمن اسلامیہ لاہور کا جشنِ جوبلی منایا جا رہا تھا۔ اس کا قلم بہت دن سے اس کے ہاتھوں سے دور تھا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اس نے ایک قصیدہ لکھا جو سراسر انگریزوں کی شان میں تھا۔

یہ عہد کہ گزرے ہیں برس جس کو پچاس اب
ست جگ سے ہے یہ ہند کے حق میں کہیں بہتر
وہ دورِ تعصب تھا یہ ہے دورۂ انصاف
وہ جنگ کا موجد تھا یہ ہے صلح کا رہبر

اس نے انگریزوں سے پہلے کے دور کو "دورِ تعصب" کہا اور پھر وکٹوریہ عہد کی تعریف کی۔ انگریزوں کی خوشامد کا یہ وہی طریقۂ کار تھا جسے سرسید حکمتِ عملی کا نام دیتے چلے آرہے تھے۔

سرسید کی وہ جانیں لیکن حالی کا خلوص یہ تھا کہ اس حکمتِ عملی کے باوجود وہ اپنے لیے کوئی رعایت حاصل نہ کر سکا۔ ساٹھ روپے ماہوار کی قلیل تنخواہ پر کام کرتا رہا جبکہ وہ چاہتا تو اعلیٰ سے اعلیٰ ملازمت اسے مل سکتی تھی۔ وہ تو سرسید سے بھی یہ نہ کہہ سکا کہ علی گڑھ کالج ہی میں اسے پروفیسر مقرر کر دیا جائے۔

لاہور کی آب و ہوا کو اس کے ساتھ نہ جانے کیا مخاصمت

"انتخاب"

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفید ہوں
شاگرد میرزا کا مقلد ہوں میر کا

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں حالی نے کھولی ہے دکاں سب سے الگ

یارانِ تیز گام نے منزل کو جالیا
ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

کیا پوچھتے ہو کیونکر سب نکتہ چیں ہوئے چپ
سب کچھ کہا انہوں نے پر ہم نے دم نہ مارا

اتنی ہی دشوار اپنے عیب کی پہچان ہے
جس قدر کرنی ملامت اور کو آسان ہے

گو جوانی میں تھی کج رائی بہت
پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت

جی ڈھونڈتا ہے بزمِ طرب میں انہیں مگر
وہ آئے انجمن میں تو پھر انجمن کہاں

جو کہیے تو جھوٹی جو سنیے تو سچی
خوشامد بھی ہم نے عجب چیز پائی

شہسواروں پہ بند ہے جو راہ
وقف ہے یا شکستہ پاؤں پر

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

تھی کہ اس مرتبہ وہ پھر بیمار پڑگیا اور چھ مہینے بعد ہی اس نے اپنا تبادلہ دہلی کرالیا' وہ پھر اینگلو عربک اسکول میں تھا۔

اب اس کی مصروفیات بہت بڑھ گئی تھیں۔ علی گڑھ کالج کا کوئی جلسہ' ایجوکیشنل کانفرنس کی کوئی محفل ایسی نہیں تھی جہاں اس کے نغمے نہ گونجتے ہوں۔ اس کی دل سوز آواز خود بھی روتی تھی دوسروں کو بھی رلاتی تھی۔ سرسید اس کی اس اہلیت کا پورا فائدہ اٹھا رہے تھے۔ اس کی نظمیں تبلیغ تحریکِ سرسید کا مؤثر ترین ذریعہ بنی ہوئی تھیں۔ یہ نظمیں علی گڑھ تک محدود نہیں رہ سکتی تھیں' پورے ملک میں گونج رہی تھیں۔ حالی کا نام شہرت و عظمت کی بلندیوں پر تھا۔ اس میں سرسید کی طرح انتظامی قابلیت نہیں تھی لیکن ادب و شعر میں وہ سرسید سے بڑھا ہوا تھا۔ صاف نظر آتا تھا کہ اس تحریک کا سب سے بڑا مجاہد وہی ہے۔

ان جلسوں میں شریک ہونے کے لیے اب اسے بار بار سفر کرنا پڑتا تھا جس سے ملازمت متاثر ہورہی تھی۔ یوں بھی نوکری سے اس کی طبیعت کو ذرا سی بھی مناسبت نہیں تھی۔ اس کے باوجود وہ ملازمت کرنے پر مجبور تھا کہ محض قلم کی خدمت سے وہ روٹی نہیں کما سکتا تھا۔

وہ ایسے ہی ایک جلسے میں شرکت کرنے علی گڑھ گیا ہوا تھا۔ ان دنوں سر آسماں جاہ' وزیراعظم حیدرآباد بھی علی گڑھ آئے ہوئے تھے۔

سرسید کی کوٹھی میں' کھانے کی میز پر وہ بھی موجود تھا اور سر آسماں جاہ بھی تشریف فرما تھے۔ سرسید نے حالی سے ان کا تعارف کرایا۔

"آپ مولوی الطاف حسین حالی ہیں۔ ان کی نظموں نے تحریکِ قومی میں ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ آپ نے ان کی مسدس مدوجزر اسلام تو ملاحظہ کی ہوگی۔ کیسے سچے خیالات' کیسی سادہ زبان میں بیان کیے ہیں۔"

"وہی مسدس جسے آپ اپنی نجات کا ذریعہ بتاتے ہیں" سر آسماں جاہ نے مسکراتے ہوئے سرسید سے کہا۔

"جی ہاں' اور اس قول پر اب میں اور بھی سختی سے قائم ہوں۔"

"میں نے بھی وہ نظم پڑھی ہے۔ واقعی' لاجواب ہے" انہوں نے کہا اور پھر حالی سے مخاطب ہوئے "ملازمت کے بکھیڑوں میں رہتے ہوئے آپ یہ سب کام کس طرح کرلیتے ہیں؟"

"محنت کرنے کی عادت سی پڑگئی ہے" حالی نے چپکے سے کہا۔ اور کھانے میں مصروف ہوگیا۔

حالی کی عادت تھی کہ اپنی تعریف سن کر اسے سخت کوفت ہوتی تھی۔ اس وقت بھی چونکہ موضوع بحث اسی کی ذات تھی اس لیے وہ بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو اپنے لیے خود سفارش کرتا۔ بڑے لوگوں سے ملاقات کے تو لوگ متمنی رہتے ہیں لیکن وہ ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا۔

سر آسماں جاہ اس کا نام پہلے ہی سن چکے تھے۔ اس سے مل کر اس کی شخصیت سے بھی متاثر ہوئے۔ دوسرے دن سرسید ان کی ملاقات کو گئے تو انہوں نے پھر حالی کا تذکرہ چھیڑ دیا۔

"ایسی غیر معمولی قابلیت کے آدمی کا فکرِ معاش میں پریشان رہنا زبردست قومی نقصان ہے۔ ہم چاہتے ہیں ریاست کی جانب سے اس شخص کا وظیفہ جاری ہونا چاہیے۔"

سرسید نے حالی سے تذکرہ کیا اور ان سے پوچھا کہ کتنا وظیفہ مقرر ہونا چاہیے۔ یہاں بھی حالی کے انکسار نے عجیب کمال دکھایا۔ اس نے وہی رقم بتائی جو اسے عربک اسکول سے ملتی تھی چنانچہ وزیراعظم صاحب پچھتر روپے ماہوار کا وعدہ کرکے رخصت ہوگئے۔

حالی پر فرض ہوگیا کہ وہ شکریئے کے طور پر ان کی شان میں قصیدہ رقم کرے۔

نہ کوئی مجھ میں ہنر ایسا کہ ہو لائقِ قدر
اور نہ ایسا کوئی جوہر کہ ہو قیمت میں گراں
حق نہ تھا دولتِ عالی پہ کوئی حالی کا
جس کے جلدو میں وہ اس لطف کا ہوتا شایاں
ہاں مگر ذات میں ہے فیض رسانی جن کی
ڈھونڈ لیتے ہیں کوئی حیلہ برائے احساں
ہیں مربی ہنرو بے ہنری کے' جس طرح
خار و گل دونوں کو کرتا ہے نہال آبِ رواں
آسماں جاہ کا اک میں ہی نہیں شکر گزار
ملک ہیں اس کا ثنا خواں ہے ہر اک پیرو جواں

وظیفے کا وعدہ محبوب کا وعدہ بن کر رہ گیا تھا۔ کئی مہینے گزر گئے لیکن وظیفہ جاری نہ ہوسکا۔ وہ اس طرف سے مایوس ہوکر پھر اپنے کاموں میں مصروف ہوگیا۔

اب سرسید اور ان کے ساتھیوں کے سامنے اصلاح کے علاوہ سیاست کا میدان بھی تھا۔ سیاست ان کی اصلاح کا نہیں' بقا کا مسئلہ تھا۔ نیشنل کانگریس بن چکی تھی اور یہ صاف ظاہر ہوچکا تھا کہ یہ جماعت ہندوؤں کے حقوق کی حفاظت کرتی ہے۔ مسلمانوں کے مسائل سے اسے کوئی سروکار نہیں اسی لیے سرسید نے مسلمانوں کو اس جماعت میں شریک ہونے سے

روک دیا تھا۔

ہندی، اردو کا قضیہ زور شور سے جاری تھا۔ سرسید ۱۸۶۷ء میں کہہ چکے تھے۔

"اب مجھ کو یقین ہوگیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہیں ہوسکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے۔ آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب سے جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں، بڑھتا نظر آتا ہے۔ جو زندہ رہے گا، دیکھے گا۔"

یہی بیان دو قومی نظریئے کی اساس بن کر حالی کے سامنے تھا۔ حالی اس دو قومی نظریئے کے سخت حامی اور طرف دار تھے۔

برہمو سماج اور آریہ سماج سمیت ہندوؤں نے اپنے احیا کے لیے متعدد مذہبی اور سماجی انجمنیں بنالی تھیں۔ ان انجمنوں کی کوششوں سے اور اپنی اکثریت کے حوالے سے ہندوؤں میں ایسا احساس پیدا ہوگیا تھا جس میں ان کے سیاسی عزائم کی جھلکیاں صاف سنائی دیتی تھیں۔ مسلمانوں کی حیثیت ثانوی ہوکر رہ گئی تھی۔ صاف نظر آتا تھا کہ وہ ایک الگ قوم ہیں اور اس بڑی قوم (ہندو) کے ساتھ مل کر رہنا دوبھر ہے۔

حالی کی سیاسی بصیرت نے بھانپ لیا تھا کہ ہندوستان میں مسلمان زیادہ دن نہیں رہ سکیں گے۔ جس طرح وہ اصفہان اور بدخشاں چھوڑ کر یہاں آئے تھے، یہاں سے بھی جانا پڑے گا۔ جو خدمات مسلمانوں نے یہاں آکر انجام دیں، ہندوستان نے اس کا کوئی پاس نہیں کیا۔ اس نے بے وفا محبوب کی طرح آنکھیں پھیرلیں۔ اس موقع پر مسلمانوں کو یہ احساس دلانا ضروری تھا کہ وہ ایک الگ قوم ہیں۔ ایک مرتبہ پھر وقت امتحان تھا۔ اس نے مسدس کی طرح ایک اور عظیم نظم لکھ کر، مسلمانوں کے اولین قومی شاعر کی حیثیت سے تاریخ میں اپنا نام درج کرالیا۔

اس کی یہ نظم آنسوؤں سے تحریر ہوئی اور سب کو رلاگئی اور اس کے بعد مسلمانوں کی جتنی تحریکات چلیں، یہ نظم ہر تحریک کی بنیاد بنی۔

"شکوۂ ہند" کے عنوان سے اس نے تیرہ بند تحریر کیے۔

نظم کی ابتدا اس نے اس شعر سے کی۔

رخصت اے ہندوستان اے بوستان بے خزاں
رہ چکے تیرے بہت دن ہم بدیسی مہماں

بات یہیں مکمل ہوگئی تھی لیکن پس منظر کے لیے ضروری تھا کہ اس مدارات کا ذکر کیا جاتا جو ہندوستان نے اولین دنوں میں کی تھی۔

آج گو شکووں سے ہیں لبریز ہم اے خاکِ ہند
ہیں مگر احسان اگلے تیرے سب خاطر نشاں
تونے بیگانوں کی خاطر کی یگانوں سے سوا
مہماں تھے پر بنایا تونے ہم کو میزباں
دعوتیں بھولیں سمرقندی و شیرازی تمام
اس قدر ایوان نعمت کے لگائے تونے خواں
نقش ہیں دل پر ہمارے سب مداراتیں تری
ہم نہ بھولیں گے کبھی دن تیرے اور راتیں تری

دوسرے بند میں ہندوستان کی نظرِ التفات کا مزید ذکر کرنے کے بعد اس کی بے وفائی اور بدلی ہوئی آنکھوں کا ذکر کیا۔

نبھ سکیں لیکن نہ آخر تک یہ خاطرداریاں
جو دیا تھا تونے وہ آخر کو سب رکھوالیا
پر گلہ یہ ہے کہ جو کچھ اپنا ہم لائے تھے ساتھ
وہ بھی تونے ہم سے لے کر کردیا بالکل گدا
آدمیت کے تھے جو ہر جو ہماری ذات میں
خاک میں آخر دیے اے ہند سب تونے ملا
ضربِ کراری و حربِ خالدی رکھتے تھے ہم
سطوت حمزی و فاروقی عدالت ہم میں تھی
آج خاور تھا مقام اپنا توکل تھا باختر
عیش و عشرت کی نہ فرصت تھی نہ عادت ہم میں تھی
ہم شتربانی سے پہنچے تھے جہاں بانی تلک
اس لیے باقی شتربانوں کی خصلت ہم میں تھی

چھین لی سب ہم سے یاں شانِ عرب شانِ عجم
تونے اے غارت گر اقوام واکال الامم

چوتھے بند میں وہ اپنی بدلی ہوئی حالت کے بارے میں خود ہندوستان سے سوال کرتا ہے۔

مولوی وحیدالدین سلیم پانی پتی، حالی سے ملنے آئے ہوئے تھے۔ مولانا نے رات کو کوئی غزل کہی تھی، وہ ان کو سنائی۔

وحیدالدین سلیم پھڑک اٹھے اور بے اختیار ہوکر چلا اٹھے

"مولانا، واللہ! جادو ہے۔"

حالی کے بالا خانے کے نیچے کوٹھری تھی۔ وہ مولانا نے ایک مجذوب فقیر کو رہنے کے لیے دے دی تھی۔ وہ مجذوب اس وقت باہر گلی میں بیٹھا دھوپ سینک رہا تھا۔ جب اس نے جادو کا لفظ سنا تو بے اختیار چلا اٹھا۔

"جادو برحق۔ کرنے والا کافر۔"

حالی نے سلیم صاحب سے کہا "لیجیے، سرٹیفکیٹ مل گیا۔"

آئے تھے اے ہندیاں ایسے ہی ہم زار ونزار
ہے عرب کو جس سے ننگ اور ہے عجم کو جس سے عار

اور پھر اس تبدیلی کا ذمّے دار اس نے ہندوستان کو ٹھہرایا۔

سیرتیں تونے بدل دیں مسخ کردیں صورتیں
آبرو تونے ڈبودی کھودیا تونے وقار
کردیا شیروں کو تونے گوسفند اے خاک ہند
جو شکار افگن تھے آکر ہوگئے یاں خود شکار
تھا یقیں ہم کو کہ شامت رفتہ رفتہ آئے گی
ہم کو تو اے خاکِ ہند آخر یونہی کھاجائے گی

توڑ ڈالے جلد تونے عہد اور پیمان سب
بے وفا سنتے تھے سچ اے ہند تیرا نام ہم
شکوہ قسمت کا ہے جو یاں کھینچ کر لائی ہمیں
تجھ کو اے ہندوستاں کس منہ سے دیں الزام ہم
پھر گئی سرحد سے تیری' فوج یوناں جس طرح
کاش پھر جاتے یونہی در سے ترے ناکام ہم
حال اپنا سخت عبرت ناک تونے کردیا
آگ تھے اے ہند ہم کو خاک تونے کردیا

آخری بند میں اس نے وہ پیش گوئی کی جو آگے چل کر حرف بہ حرف درست ثابت ہونے والی تھی۔

گو یقین ہے رفتہ رفتہ یاد ایامِ سلف
دل سے چھوڑے گی مٹاکر گردشِ دورِ زماں
پر زمانے میں رہیں گے تاقیامت یادگار
جو کیے برتاؤ تونے ہم سے اے ہندوستاں
ماجرا ہوگا ہمارا عبرت اوروں کے لیے
برکتیں یاں چھوڑ کر ہم اپنی جائیں گے بہت
ہم نہ ہوں گے پر نصیحت ہم سے پائیں گے بہت

کم وبیش ڈیڑھ سو اشعار کی اس طویل نظم میں اس نے ہندوستان کی شکایت جس انداز میں کی تھی' وہ صرف یہی نہیں کہ سرسید کے تیار کردہ دو قومی نظریئے کا پس منظر بیان کرتی تھی بلکہ یہ بتاتی تھی کہ دو قومی نظریئے کی بنیاد صرف مذہب پر نہیں اس میں اور باتیں بھی شامل ہیں۔

اس نظم کی تخلیق کے بعد اس کا منصب صرف شاعر اور نقاد تک محدود نہیں رہ گیا بلکہ اب وہ ایک صاحبِ نظر مصر اور سیاسی راہ نما بھی قرار پایا اور سرسید کا سب سے بڑا مددگار بھی۔

وہ بے چینی سے وظیفے کا انتظار کررہا تھا لیکن دستِ حاتم تو جیسے وعدہ کرکے بھول گیا تھا۔ آخر گیارہ مہینے کے طویل انتظار کے بعد وظیفے کی رقم یک مشت ادا ہوگئی۔ قناعت نے آنکھیں دکھائیں کہ جس ملازمت کو تو بوجھ سمجھتا تھا' وظیفہ بحال ہوجانے کے بعد تو اسے خیرباد کیوں نہیں کہہ دیتا۔ اس نے ان آنکھوں کا مفہوم سمجھا اور ملازمت سے استعفا دے دیا تاکہ اطمینان سے علمی وادبی کاموں میں مصروف ہوسکے۔

اینگلو عربک اسکول کی ملازمت ترک کردینے کے بعد بھی وہ دلی ہی میں رہتا کیونکہ اپنے وطن سے زیادہ اسے شہر سے محبت تھی لیکن اب دلی اس کے لیے ویرانے سے کم نہیں تھی۔ دوست' رفیق' سخن فہم سب ایک ایک کرکے رخصت ہوچکے تھے۔

غالب ہے نہ شیفتہ نہ نیر باقی
وحشت ہے نہ سالک ہے نہ انور باقی
حالی اب اسی کو بزمِ یاراں سمجھو
یاروں کے جو کچھ داغ ہیں دل پر باقی

اس نے دلی کو الوداع کہا اور اپنے وطن پانی پت' مستقل قیام کے لیے روانہ ہوگیا۔

کوچ سب کرگئے دلی سے ترے قدر شناس
قدر یاں رہ کے اب اپنی نہ گنوانا ہرگز

○☆○

جوانی کے جتنے دن تھے اس نے پردیس میں گزار دیے تھے۔ اپنے گھر تو وہ مسافروں کی طرح آتا تھا۔ اس کی بیوی ایسی سلیقہ مند تھی کہ اسے ہر ذمّے داری سے آزاد کردیا تھا اور بچوں کی پرورش سے لے کر ان کی شادی بیاہ تک کے معاملے عجب حسنِ خوبی سے سرانجام دے لیے تھے۔

وہ گھر اور خاندان کی طرف سے بے پروا نہیں تھا۔ جب بھی کسی سفر سے واپس آتا تو اسے یاد رہتا کہ خاندان کے کس فرد کو کون سی چیز پسند ہے۔ وہ اس کے لیے وہی کچھ لے کر آتا۔ اپنے ہاتھ سے ایک ایک کو تحفے دیتا۔ کہیں ہوتا' خطوں کے ذریعے خیریت پوچھتا اور مشورے دیتا۔ چھٹیاں گزارنے جب بھی پانی پت آتا' اپنی سنجیدگی بھول کر بچوں کے ساتھ بچہ بن جاتا لیکن اس کی مصروفیات ایسی تھیں کہ پانی پت میں رہ نہیں سکتا تھا۔ کہاں کہاں کی خاک اس نے نہیں چھانی۔ جوانی اس طرح گزر گئی جیسے کبھی آئی ہی نہیں تھی۔ اب پچاس سال کی عمر میں مستقل رہنے کے لیے اپنے گھر آیا تھا۔

اس کا خاندان بہت بڑا تھا۔ سب کی ضرورتوں کا اسے خیال تھا۔ آمدنی کم تھی مگر قناعت کی انمول دولت اس کے پاس

تھی۔ بیٹی عنایت فاطمہ کی اس کے شوہر سے نہیں بنتی تھی اور نواسہ مرگی کے مرض میں مبتلا تھا۔ اس بیٹی کا بوجھ بھی اس ہی کے سر پر تھا لیکن قوم کے اس سچے خادم کو قوم کے سوا کوئی پریشانی نہیں تھی۔

پانی پت والوں کو یہ فخر تھا کہ ان کے شہر کا ایک رہنے والا اتنا بڑا آدمی بن کر لوٹا ہے کہ جس کی شہرت پورے ملک میں ہے۔ اسے شہر کا سب سے عقل مند آدمی سمجھ کر ہر کوئی مشورے کے لیے اس کے پاس آنے لگا۔ وہ بھی ایسا بامروت کہ کیسا ہی اہم کام کر رہا ہوتا ملاقات کے لیے اپنے کمرے سے نکل آتا۔ گھر کا آنگن ہر وقت محلے کی عورتوں سے بھرا رہتا۔

اس نے جب یہاں مستقل رہنا شروع کیا تو اس کی شہرت کے علاوہ بھی کچھ جوہر لوگوں پر کھلے۔ ایک دن تو کمال ہی ہوگیا۔ وہ تانگے میں بیٹھا کسی جگہ سے گزر رہا تھا کہ دیکھا ایک بھنگی کا چھوٹا سا لڑکا نالی میں گر پڑا ہے اور کیچڑ میں لت پت پڑا چلا رہا ہے۔ بہت سے لوگ جمع ہوگئے تھے لیکن کوئی اسے نہیں نکال رہا تھا۔ اس نے بھیڑ دیکھ کر تانگا ٹھہرالیا۔ تانگے سے اتر کر نالی کے قریب گیا۔ لوگ رام رام کر رہے تھے اور بچہ چلا رہا تھا۔ اس نے کیچڑ اور گندگی کی پروا کیے بغیر ہاتھ بڑھا کر بچے کو باہر نکال لیا۔ اس میں اس کے اپنے کپڑے بھی خراب ہوگئے۔ لوگ دم بخود تھے کہ مسلمان ہو کر ایک بھنگی کے بچے کو باہر نکالا۔

"جس رام کا نام آپ جپ رہے ہیں اگر چاہتے تو اسی رام کا جلوہ اس ننھے بچے میں آپ کو نظر آسکتا تھا۔" اس نے لوگوں کی طرف دیکھا اور بچے کے گندے کپڑے اتارنے لگا۔ اس کے گھر کا پتا پوچھا اور اسے اس کے گھر چھوڑ کر آیا۔

اس واقعے کی پورے پانی پت میں دھوم مچ گئی۔ پھر ایسے ہی کئی واقعات اس کے ملازم نے لوگوں کو بتائے۔

مٹی کا تیل نیا نیا چلا تھا۔ اس کے ملازم نے گھی کے دھوکے میں اسے پی لیا۔ بدبو آئی تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ روتا ہوا اس کے پاس آیا۔

"بس میاں، ہم تو اب مرلیے۔"

"کیا ہوگیا؟ اچانک مرنے کا پیغام کیسے آگیا؟"

"دھوکے سے مٹی کا تیل پی لیا۔ پیٹ میں بڑا سخت درد ہو رہا ہے۔"

اب تو وہ بھی گھبرا گیا۔ مٹی کا تیل پینے سے کیا ہوتا ہے اسے بھی نہیں معلوم تھا۔ ملازم کو آرام سے اپنے بستر پر لٹایا اور فوراً حکیم کو بلالیا۔

اسی دن حالی کو نواب لوہارو کی دعوت پر جانا تھا۔ حکیم نے لاکھ کہا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں لیکن اسے کہاں قرار تھا۔ نوکر کی تیمارداری نوکر بن کر کرنے لگا۔ نواب لوہارو کو خط لکھ کر بھیج دیا۔

"افسوس ہے حاضر نہیں ہوسکتا۔ نانوں خاں، میرے ملازم نے مٹی کا تیل پی لیا ہے۔ میں اس کی تیمارداری میں لگا ہوا ہوں۔"

نانوں خاں نے لاکھ کہا کہ میری تیمارداری کوئی بھی کرلے گا۔ آپ جائیں لیکن اس نے ایک نوکر کی خاطر نواب کی دعوت چھوڑ دی۔

سردی کا زمانہ تھا۔ نانوں خاں پرانے کپڑوں میں اکڑتا پھر رہا تھا۔

"نانوں خاں، کوئی گرم کپڑا نہیں بنایا؟" اس نے پوچھا۔

"گنجائش نہیں، بناؤں کہاں سے۔"

یہ سنتے ہی حالی نے روئی کی جو نئی مرزئی پہنی ہوئی تھی اتار کر اسے دے دی۔

اس کا دوسرا چہیتا ملازم عطاءاللہ تھا۔ کانوں سے اس قدر اونچا سنتا تھا کہ چیختے چیختے گلا پھٹ جاتا۔ اس کا سننا محض حسنِ اتفاق تھا۔ ایک ٹانگ بالکل بے کار تھی۔ ہاتھوں میں بھی نقص تھا۔ مزاج نہایت خراب تھا۔ ذرا سی بات پر آپے سے باہر ہوجاتا تھا۔ سنانے پر آتا تو حالی کو بھی بری طرح سناتا۔ اس کے جسمانی نقائص کی وجہ سے حالی کو اس سے نہایت ہمدردی تھی۔ کوئی اور ہوتا تو اسے اپنی ملازمت میں ہرگز نہ رکھتا لیکن حالی

"جب تک تمام قوم میں علم کی روشنی نہیں پھیلتی، علم کا سلسلہ قائم نہیں رہ سکتا۔ جب تک تمام قوم کے اخلاق درست نہیں ہوتے کوئی شخص خاندان کے اخلاق کی حفاظت نہیں کرسکتا۔ جب تک تمام قوم مرفہ الحال نہیں ہوتی۔ کوئی شخص دولت و حشمت سے اصلی خوشی حاصل نہیں کرسکتا۔"

(حالی)

"جدید اردو شاعری کے لیے مولانا حالی کی شخصیت ایک انقلابی حیثیت رکھتی ہے۔ انہوں نے قصیدہ، غزل، مثنوی، رباعی وغیرہ مختلف اصناف سخن میں تجدید و تخلیق سے کام لیا ہے اور روایات کو قائم رکھتے ہوئے ان روایات سے بغاوت بھی کی ہے۔ ان کی غزل میں بھی تقلیدی اور تخلیقی دونوں عناصر موجود ہیں۔"

(ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں)

نے نہ صرف اسے رکھا ہوا تھا بلکہ اس کی ہر بات خندہ پیشانی سے سہہ بھی لیتا تھا۔ کوئی اگر کہتا بھی تو یہ کہہ کر ٹال دیتا۔

"کبھی ہم اس پر ناراض ہو لیتے ہیں کبھی وہ ہم پر۔ آج اس کی باری ہے۔"

جب ملازموں کے ساتھ اس کے حسنِ سلوک کا یہ حال تھا تو عزیز رشتے داروں کا کس قدر خیال رکھتا ہوگا۔

اس کا نواسہ عبدالولی مسلسل بیمار رہنے کی وجہ سے بہت چڑچڑا ہو گیا تھا۔ جب اس پر جنون طاری ہوتا تو ہر بدتمیزی کی اس سے توقع کی جاسکتی تھی۔ ایک مرتبہ جو اسے غصہ آیا تو اس نے حالی کو اس زور سے دھکا دیا کہ وہ گر پڑے۔ اس نے اس بدتمیزی پر بھانجے کو ڈانٹا اور ایک طمانچہ بھی مار دیا۔ حالی کو بیٹے کی یہ سرزنش سخت ناگوار گزری۔ سجاد حسین سے اس وقت تک بات نہیں کی جب تک انہوں نے بھانجے کو منا نہیں لیا۔

"ہم یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ وہ جو کچھ کرتا ہے معذوری میں کرتا ہے۔ بیمار ہے۔ وہ بیماری برداشت کررہا ہے، ہم اس کی گستاخیاں برداشت نہیں کرسکتے۔ ارے اس معصوم نے دیکھا ہی کیا ہے سوائے بیماریوں کے اور ہم ہیں کہ اسے خوش بھی نہیں رکھ سکتے۔"

یہی صبر اور خوش اخلاقی ان کی زندگی کے ہر گوشے میں اپنا رنگ دکھا رہی تھی۔

خواجہ سجاد حسین کی بیوی ان کے ماموں کی بیٹی تھی اور تیز مزاج تھی۔ ادھر حالی کی بیوی بھی غصے کی تیز تھیں۔ ساس بہو میں اکثر نوک جھوک ہوتی رہتی تھی۔ وہ اوپر کے کمرے میں بیٹھا لکھتا رہتا ساری باتیں سنتا رہتا مگر ایک لفظ نہ بولتا۔ اکثر ان جھگڑوں میں شام ہوجاتی۔ وہ اپنا کام ختم کرکے اٹھتا اور کھڑکی سے گردن نکال کر ہنستے ہوئے کہتا۔

"بس بی بس... اب تو شام بھی ہوگئی اب تو لڑائی تغاری (مٹی کا کونڈا) کے نیچے دبادو اس وقت تو بھٹیاریاں بھی نہیں لڑتیں۔"

یہی حال اس کے مذہبی خیالات کا تھا۔ کبھی جوانی میں وہ بہت کٹر ہوتا تھا لیکن اب تو ہر فرقے میں اسے خدا کے جلوے نظر آتے تھے۔ وسیع مطالعے اور حق کی جستجو نے اسے بے تعصبی کی روح سے واقف کردیا تھا جس میں رسم پرستی، تنگ نظری اور تعصب کا گزر نہیں تھا۔ وہ ہر مذہب والوں کا احترام کرتا تھا۔ اس کے دوستوں میں ہندو اور عیسائی دونوں شامل تھے۔ عام مسلمانوں کی طرح اسے ہندوؤں سے میل جول رکھنے میں کوئی قباحت نہیں ہوتی تھی۔

اس کی انہی سب باتوں نے غریب لوگوں کے دلوں میں اس کی عقیدت پیدا کردی تھی۔ جب وہ دیکھتے تھے کہ اتنا بڑا آدمی ان سے برابری سے مل رہا ہے تو انہیں حیرت ہوتی تھی اور وہ اس کے گرویدہ ہوجاتے تھے۔ یہاں تک کہ لوگ اسے ولی اور اوتار سمجھنے لگے۔ اس کے پاس دعائیں کرانے کے لیے آنے لگے۔ بعض بعض لوگ تعویذ گنڈوں کی بھی فرمائش کردیا کرتے تھے۔

وہ نائی جو اس کی حجامت کرنے آتا تھا۔ ایک روز سخت اداس تھا۔

"مولانا جی، آپ تمام دنیا کے کام کرتے ہیں۔ ایک کام ہمارا بھی کردیں۔"

"بول بھائی، تو بھی بتا کیا کام ہے تیرا۔"

"مجھے ایک لڑکی سے عشق ہوگیا ہے لیکن اس کے ماں باپ مجھ سے اس کی شادی نہیں کررہے ہیں۔ آپ کوئی ایسا تعویذ دے دیں کہ وہ لوگ جھٹ تیار ہوجائیں۔"

اسے اس عجیب و غریب فرمائش پر بے اختیار ہنسی آگئی۔

"تجھ سے کس نے کہہ دیا کہ میں تعویذ لکھتا ہوں۔"

"مجھے سب معلوم ہے۔ آپ کمرا بند کرکے چلے ہی تو کھینچتے ہیں۔ سب لوگ کہتے ہیں آپ بہت پہنچے ہوئے ہیں۔ میں آپ کی اتنی خدمت کرتا ہوں اور آپ میرا یہ کام نہیں کرسکتے۔"

"کون ہے وہ لڑکی؟ اس کا نام، پتا، باپ کا نام بھی تو معلوم ہو۔ جبھی تو تعویذ اثر کرے گا۔"

"محلے ہی کی لڑکی ہے جی!" نائی نے کہا اور اسے لڑکی کا نام پتا وغیرہ بتادیا۔

وہ اسی دن شام کو اچکن گلے میں ڈالے، سر پر صافہ باندھا اور تیار ہوکر اس لڑکی کے گھر پہنچ گیا اور اس کے ماں، باپ سے سفارش کی اور کچھ اس طرح انہیں سمجھایا کہ وہ شادی پر تیار ہوگئے۔

بے چارہ نائی بہت دنوں تک یہی سمجھتا رہا کہ انہوں نے کوئی چلّہ کاٹا ہے کہ وہ لوگ شادی پر تیار ہوگئے۔

ایک سر تھا اور ہزار سودے تھے۔ خاندان میں کسی کا لڑکا بگڑ جاتا تو اس سے کہا جاتا کہ وہ سمجھائے۔ خاندانی جھگڑوں میں اسے پنچ بنایا جاتا۔ شادی بیاہ کے انتظامات میں اس سے مشورے لیے جاتے۔ سفارشوں کے لیے لوگ بہت ستاتے تھے۔ انکار اس کی عادت نہیں تھی اور سفارش کو دل سے برا سمجھتا تھا۔ گھر میں آئے دن کی مہمان داری الگ تھی جو اس کے کام میں حارج ہوتی تھی۔

جب سے وہ پانی پت آیا تھا، سکون کا ایک لمحہ نہیں مل سکا تھا۔ مکان بھی وسطِ شہر میں تھا جہاں ملنے جلنے والے بہ آسانی

آسکتے تھے۔ بہت تنگ آکر اس نے یہ فیصلہ کیا کہ اپنے رہنے کے لیے الگ مکان بنوایا جائے۔ محلہ سادات میں جو شہر سے دور تھا زمین موجود تھی جس پر ایک چھوٹا سا مکان بھی تھا۔ بس اسے تڑوا کر اپنے آرام کے مطابق بنوانا تھا۔ اس تاجدار کے پاس روپیا کہاں۔ آخر یہ طے ہوا کہ تھوڑا تھوڑا کر کے مکان بنوالیا جائے اور جب تک بن نہیں جاتا' اسی بے سکونی میں سکون تلاش کیا جائے۔

○☆○

جیسے جیسے شہرت بڑھتی جا رہی تھی' اس کی مصروفیات بڑھتی جا رہی تھیں۔ ان مصروفیات سے بچنے ہی کے لیے وہ پانی پت آیا تھا لیکن فرصت یہاں بھی نہیں تھی۔ لمبے لمبے سفر کرنا۔ تعلیمی کانفرنسوں میں شرکت کے لیے جانا۔ علمی و ادبی جلسوں میں شرکت کرنا۔ اس پر مستزاد لکھنے پڑھنے کی مصروفیات' عقیدت مندوں' دوستوں' عزیزوں سے ملاقاتیں۔ ایک سفر کی تھکن اترتی نہیں تھی کہ دوسرے سفر پر جانا پڑتا تھا۔ صحت پہلے ہی خراب تھی۔ چند بیماریاں تھیں کہ دم کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔

وہ کئی مرتبہ بیمار پڑ چکا تھا لیکن اس مرتبہ بیماری نے کچھ زیادہ ہی طول کھینچ لیا تھا۔ ۱۸۹۰ء کا پورا سال بیماریوں سے لڑتے ہوئے گزر گیا۔

طبیعت کچھ سنبھل گئی تھی لیکن ایک بازو میں شدید درد تھا۔ جب ٹیس اٹھتی تھی تو برداشت کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ وہ ہمت کر کے دہلی آیا۔ یہاں سے علی گڑھ چلا گیا تاکہ علاج کرا سکے۔ ڈاکٹر سے پلستر لگوایا۔ قدرے افاقہ ہوا تو پانی پت چلا آیا۔

وہ پانی پت پہنچا ہی تھا کہ سرسید کا خط آگیا۔ وہ کالج کی امداد میں اضافے کے لیے حیدر آباد ایک وفد لے جا رہے تھے۔ اس وفد میں انہوں نے اور لوگوں کے ساتھ شبلی اور حالی کو بھی شامل کیا تھا۔ اس خط میں حالی کو تاکید کی گئی تھی کہ وہ حیدر آباد ضرور چلے۔ وہ بیمار تھا لیکن سرسید کے حکم کو ٹال نہیں سکتا تھا اور پھر یہ ایک قومی کام تھا۔ اسی حالت میں وہ حیدر آباد روانہ ہوگیا ۲۳ اگست ۱۸۹۱ء کو وہ علی گڑھ پہنچا اور اسی رات وفد کے ساتھ حیدر آباد روانہ ہوگیا۔

سرسید پہلے بھی ایک وفد لے کر چندے کے لیے یہاں آچکے تھے لیکن اس مرتبہ شبلی اور حالی بھی اس وفد میں شامل تھے۔ اہالیانِ حیدر آباد ان دونوں کو دیکھنے کے سخت مشتاق تھے۔ سرکاری حلقوں میں بھی ان کی ناموری کے افسانے پہنچ چکے تھے لہٰذا جیسی پذیرائی اس مرتبہ ہوئی' کبھی نہیں ہوئی تھی۔

''ان کے جتنے رفیق اور ہم عصر تھے' سب صاحبِ طرز تھے لیکن زندگی صرف حالی کے طرز کو نصیب ہوئی۔ باقی یا تو ختم ہوگئے یا ان کی کارفرمائی محدود ہوگئی۔ آزاد کی صناعی' نذیر احمد کا زور بیان' سرسید کی سادگی' شبلی کی رنگینی سب اپنی اپنی جگہ خوب ہیں لیکن آج نثر کا کیا رجحان ہے۔۔۔''

(آلِ احمد سرور)

○☆○

نواب الامرا نے ایک جلسہ عام کا اہتمام کیا تاکہ اہالیانِ شہران کے خیالات سے آگاہ ہوسکیں۔

ریاست کی جانب سے تقریباً ڈیڑھ لاکھ نقد وصول ہونے کی امید تھی اس لیے سرسید کی تجویز پر شبلی نے فارسی میں اور حالی نے اردو میں قصیدہ لکھا تاکہ جلسہ عام میں پڑھا جاسکے۔

سب کی نگاہیں شبلی اور حالی پر لگی ہوئی تھیں۔ دونوں کی تصنیفات نے حیدر آباد میں دھوم مچائی ہوئی تھی۔

مختلف تقریروں کے بعد پہلے شبلی نے فارسی قصیدہ پیش کیا' اس کے بعد حالی ڈائس پر آئے۔

ہم نے رکھا آکے جب بلدہ کی سرحد میں قدم
پھر گیا آنکھوں کے آگے اپنی اک عالم نیا
عزتِ قومی ترستی تھیں سدا آنکھیں جنہیں
اس کے کچھ آثار دیکھے ہم نے یاں شکرِ خدا
کھوج میں جس فخر کے پھرتے تھے اک مدت سے ہم
آکے بلدہ کے سوانہ میں ملا اس کا پتا
بھیک کو نکلے تھے گھر سے کچھ بھکاری قوم کے
جھولیاں ڈالے گلے میں دربدر دیتے صدا
پہنچے لینے ان کو وہ اعیانِ دارالملک سے
دولتِ عالی کو جن کی ذات پر ہے اتکا

ہم غریبوں کو سمجھ کر اک سفارت قوم کی
دی وہ عزت شکر جس کا ہو نہیں سکتا ادا

اس قصیدے میں دکن والوں کی تعریف کی گئی تھی۔ پھر والیِ ملک میر محبوب علی خاں کی اور پھر سرسید کی خدمات کا ذکر کیا تھا۔ اس کے بعد حیدر آباد کی سخاوت کے جذبات کو ابھارا گیا تھا۔

اس کی پُردرد آواز' پُرخلوص لہجے اور سادہ اشعار نے ایسا

رنگ جمایا کہ یہ استقبالیہ مشاعرہ گاہ بن گیا۔

نواب وقارالامرا نے یہ عزت بخشی کہ حالی اور شبلی کو خاص طور پر اپنے دولت کدے پر مدعو کیا اور جلسے میں پڑھے جانے والے قصیدوں کو دوبارہ سنا۔

اس کے بعد دعوتوں اور تقریبات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اہلِ شہر نے ایک مشاعرے کا اہتمام بھی کرلیا اور یہ طے ہوا کہ کسی خاص طرح کی پابندی نہ کی جائے بلکہ ہر شخص اپنا منتخب کلام پیش کرے۔ بلبلِ ہند مرزا داغ دہلوی بھی ان دنوں حیدر آباد میں مقیم تھے۔ استاد شہ تھے۔ اپنی چلبلی شاعری اور صحتِ زبان سے دلوں کو مسخر کر چکے تھے۔ مشاعرے میں سب کی آنکھیں ان پر لگی ہوئی تھیں۔

مشاعرہ اپنی رفتار سے سفر طے کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ داغ کا نام پکارا گیا۔ داغ نے اپنی مشہور اور آزمودہ غزل چھیڑی۔

نکلی، نہ دل کی چور زلفِ عنبریں نکلی
ادھر لا ہاتھ، مٹھی کھول، یہ چوری یہیں نکلی

داغ کی زبان، منتخب غزل اور پھر ان کے پڑھنے کا ہنگامہ خیز انداز۔ سارا مشاعرہ بے خود ہو گیا۔ تعریف کرتے کرتے لوگوں کے گلے بیٹھ گئے۔ صاف معلوم ہو تا تھا کہ اب کسی شاعر کا جمنا دشوار ہے۔ شمع حالی کے سامنے لائی گئی۔

"آپ اپنے قدیم کلام میں سے کوئی چیز سنائیں۔ نئی شاعری کا یہ موقع نہیں" شبلی نے کہا جو ان کے پہلو میں بیٹھے تھے۔

"جو کچھ ہو مگر" "از قاعدہ نہ باید گزشت" حالی نے کہا اور اپنی نئی غزلوں میں سے ایک پڑھنی شروع کی۔

کامل ہے جو ازل سے وہ ہے کمال تیرا
باقی ہے جو ابد تک وہ ہے جمال تیرا
ہے عارفوں کو حیرت اور منکروں کو سکتہ
ہر دل پہ چھا رہا ہے رعبِ جمال تیرا
گو حکم تیرے لاکھوں یاں ٹالتے رہے ہیں
لیکن ٹلا نہ ہرگز دل سے خیال تیرا
ان کی نظر میں شوکت جچتی نہیں کسی کی
آنکھوں میں بس رہا ہے جن کی جلال تیرا
دل ہو کہ جان تجھ سے کیونکر عزیز رکھیے
دل ہے سو چیز تیری جاں ہے سو مال تیرا
بیگانگی میں حالی یہ رنگِ آشنائی
سن سن کے سر دھنیں گے قال اہلِ حال تیرا

اس کے باوجود کہ ابھی ابھی داغ کی شوخ عاشقانہ غزل تہلکہ مچا چکی تھی مگر ایسا معلوم ہوا جیسے جوشِ مدح و تحسین کی ایک نئی سرگرمی لوگوں میں ابھر آئی ہو۔ داغ تک یہ کہنے پر مجبور ہو گئے۔

"یہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ اس رنگ میں آپ کا کوئی شریک نہیں۔"

اکتوبر کے مہینے میں یہ قافلہ شاد و بامراد حیدر آباد سے واپس ہوا۔

ایک مہینہ بیچ میں گزرا تھا کہ دسمبر میں پھر اس کا بلاوا آگیا۔ علی گڑھ میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا چھٹا اجلاس تھا اور اسے وہاں نظم پڑھنی تھی۔ وہ پانی پت سے نکلا اور علی گڑھ پہنچ گیا۔

ان اجلاسوں کی عجیب شان تھی۔ علی گڑھ میں عید کا سماں ہو تا تھا۔ علما، فضلا، اہلِ ثروت کا مجمع ہو تا تھا۔ قوم کے یہ درد مند قومی اور تعلیمی مسائل پر گفتگو کرتے تھے۔ حالی کی نظمیں ان اجلاسوں کی جان بن گئی تھیں۔ کسی نہ کسی قومی مسئلے پر وہ ایسی نظم پڑھتا کہ چند اشعار پر ہزاروں لیکچر قربان ہوں۔

اس نے اس چھٹے اجلاس میں ایک عجیب و غریب نظم پڑھی۔ انسانوں کے تین طبقوں، اعلیٰ، متوسط، ادنیٰ کی بالکل نئی تشریح کی۔ اعلیٰ درجے سے مراد وہ لوگ ہیں جو ایک ممتاز حالت میں پیدا ہوئے مگر اس حالت سے ترقی کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ ادنیٰ درجہ ان لوگوں کا ہے جو پستی میں ہیں اور اس سے نکلنا نہیں چاہتے۔ متوسط درجے میں وہ لوگ ہیں جو اپنی ذاتی کوشش سے ترقی کرتے ہیں۔ اس حالت کو اس نے فقرا اور اغنیا دونوں کی حالت سے بہتر بتایا اور اس طرح اس نے قوم کو اپنی کوششوں سے ترقی کرنے پر ابھارا۔

ہے عجب دنیا میں نعمت درمیانی زندگی
فقر کی ذلت سے اور ثروت کے فتنے سے بری

اس کانفرنس میں شرکت کے بعد وہ پانی پت کے لیے روانہ ہو گیا لیکن علی گڑھ جلد واپس آنا تھا اس لیے واپسی کا ٹکٹ بھی لے لیا تھا۔

اس کا نواسہ عبدالولی سخت بیمار تھا۔ حالی کو اس سے اتنی محبت تھی کہ اگر قومی کام اس کی جان کو نہ لگے ہوتے تو وہ ایک پل کے لیے اس سے جدا نہ ہوتا۔

وہ عبدالولی کی تیمارداری میں مصروف ہو گیا اور واپسی کا ارادہ ترک کر دیا۔

پانی پت میں انفلوئنزا پھیلا ہوا تھا۔ گھر کے کئی لوگ اس کا شکار ہو چکے تھے۔

عبدالولی کی تیمارداری کرتے کرتے خود اسے تیمارداروں کی

ضرورت پڑگئی۔ بیماری کا حملہ اس پر بھی ہوا۔ مسلسل بخار نے اسے نہایت کمزور کردیا۔ ذرا طبیعت سنبھلی تو وہ آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے کوہ ناہن چلا گیا۔ اس کی صحت تو کتابوں کے مطالعے سے وابستہ تھی۔ یہاں بھی وہ کتابوں کے ذخیرے کے ساتھ آیا تھا۔ وہ اپنا دیوان مفصل مقدمے کے ساتھ شائع کرانا چاہتا تھا۔ اسی پہاڑی مقام پر اسی ارادے سے آیا تھا کہ یہاں کے پُرسکون ماحول میں بیٹھ کر مقدمہ لکھے گا۔

عربی، فارسی ادب پر اس کی گہری نظر تھی۔ ترجموں کے ذریعے اس نے یورپ کے اصولِ تنقید بھی دریافت کرلیے تھے۔ یونانی اور لاطینی کے فنِ شعر و تنقید سے بھی بالواسطہ آگاہ ہوچکا تھا۔ خیالات اور قلم میں بھی پختہ کاری پیدا ہوچکی تھی۔ اب وہ اس کا اہل بن چکا تھا کہ اپنے عہد کے ادب و شعر کا جائزہ لے کر تنقیدی خیالات کا اظہار کرسکے اور اصلاحِ شعر کے لیے مشورے دے سکے۔ وہ اس سلسلے میں ماخذات اور حوالے جمع کراتا رہا تھا۔ کوہ ناہن پر اس نے زندگی بھر کی کمائی اپنے سامنے رکھی اور مقدمہ لکھنے بیٹھ گیا۔

وہ اس مقدمے کا کچھ حصہ لکھ پایا تھا کہ بعض اعزہ کی بیماریوں کی خبریں آنے لگیں۔ اس کی غیرت نے گوارا نہیں کیا کہ وہ یہاں بیٹھ کر مقدمہ لکھتا رہے اور گھر والے پریشانیاں جھیلتے رہیں۔ اس نے سامان باندھا اور پانی پت آگیا۔

۱۸۹۲ء کا آدھا سال گزر گیا تھا۔ مقدمے کا کام ادھورا پڑا تھا۔ خانگی پریشانیوں نے سب کچھ بھلا دیا تھا۔ وہ خود بھی کبھی بیمار ہوتا کبھی اچھا ہوجاتا۔ ضعفِ معدہ کا پرانا مریض تھا۔ کھانسی اور زکام بھی اکثر ستاتے رہتے تھے۔ عمر بھی اب چھیاسٹھ سال سے تجاوز کرچکی تھی۔

۱۸۹۳ء میں وہ پوری طرح صحت یاب نہیں ہوا تھا لیکن اتنی ہمت آگئی تھی کہ وہ سفر کرسکے۔ اس نے "مقدمے" کا مسودہ اپنے سامان میں باندھا اور دہلی ہوتا ہوا علی گڑھ پہنچ گیا۔ یونین کلب کے پاس ایک چھوٹی سی بنگلیا تھی جس میں وہ قیام کرتا تھا۔

دنیا کی طرف سے منہ پھیر کر وہ لکھنے بیٹھ گیا۔ باوجود نقاہت اور کمزوری کے لکھتا رہا۔

مئی کے مہینے میں اس کا دیوان چھپنا شروع ہوگیا۔ مقدمے کا کچھ حصہ باقی رہ گیا تھا۔ اگست میں وہ بھی ختم ہوگیا۔ مقدمہ کیا تھا۔ اردو کی پہلی تنقیدی کتاب بن گیا تھا۔ اس سے پہلے جدید تنقیدی اصولوں کے مطابق ایسی تنقیدی

کتاب کسی نے نہیں لکھی تھی۔ اردو کے پہلے تنقید نگار کا اعزاز بھی اس کی قسمت میں تھا۔

اس مقدمے کو اس نے دو حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ پہلے حصے میں اس نے شعر کی تعریف اور اس کی خصوصیات پر بحث کی تھی اور دوسرے حصے میں اردو شاعری اور شاعروں کا جائزہ لیا تھا۔ اردو کی تمام اصناف پر مفصل بحث کی تھی اور ان کی خامیوں کو اجاگر کیا تھا۔ خصوصاً غزل کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا تھا اور یہ بتایا تھا کہ ان اصناف میں کیونکر حقیقت، وسعت اور جدت پیدا کی جائے۔ غلط الفاظ کا رواج، مختلف الفاظ کی اصل اور تنقید کے نظریات وغیرہ بھی بیان کیے تھے اور اپنی وسعت معلومات کا ثبوت دیا تھا۔ مشورے بھی دیے تھے کہ ایک ہی مضمون کو مختلف پیرایوں میں کیونکر بیان کیا جائے۔ غزل کی زبان کیسی ہو۔ سنگلاخ زمینوں سے کیا نقصانات ہیں اور اصنافِ سخن میں کن اصلاحات کی ضرورت ہے۔

"مقدمہ شعر و شاعری" کا شائع ہونا تھا کہ مخالفت کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ لکھنوی شاعری کے ایوان میں تو جیسے آگ لگ گئی کیونکہ اس مقدمے نے فنِ تنقید کی جو نئی راہ نکالی تھی، اس کی کسوٹی پر کسے جانے کے بعد اس زمانے کے بیشتر شعرا کا کلام نکما ثابت ہوتا تھا۔ لکھنوی شعرا نے غزل کو رعایت لفظی اور نازک خیالی میں محدود کردیا تھا۔ خیالی طلسم باندھنا، جھوٹ مبالغے سے کام لینا معراجِ شاعری سمجھا جاتا تھا۔ حالی نے شعر کا رشتہ سماج سے جوڑا اور اصلاح اس کا بنیادی فریضہ قرار دیا۔ اصلیت، سادگی اور جوش کو شعر کے بنیادی اصول قرار دیے۔ شعر کے جمالی پہلو سے زیادہ اس کے افادی اور اخلاقی پہلو پر زور دیا۔

"غل تو بہت یاروں نے مچایا پر گئے اکثر مان ہمیں" کے مصداق مخالفت کا یہ طوفان کچھ دنوں چل کر ختم ہوگیا اور وہ نئے سرے سے پھر اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔

اب اس کے سامنے دو بڑے مشن تھے، ایک اس شخص کی سوانح لکھنا جس نے چالیس برس برابر تعصب اور جہالت کا مقابلہ کیا، تقلید کی جڑ کاٹی۔ اماموں اور مجتہدوں سے اختلاف کیا۔ جس کو مذہب کے لحاظ سے ایک گروہ نے صدیق کہا تو دوسرے نے زندیق کا خطاب دیا۔ یعنی سرسید احمد خان۔ دوسرا خیال اپنے استاد غالب کی سوانح عمری لکھنے کا تھا۔

عرصہ دراز سے اس کا زیادہ تر قیام علی گڑھ میں رہتا تھا۔ اس نے سرسید کی سوانح "حیاتِ جاوید" کے نام سے لکھنی شروع بھی کردی تھی لیکن صاحب زادی کی علالت کی خبریں اسے پریشان کررہی تھیں۔ عنایت فاطمہ کی ازدواجی پریشانیوں نے اسے ذہنی مریض بنادیا تھا۔ اس نے رختِ سفر باندھا اور پانی پت آگیا۔ بیٹی کی حالت ایسی پریشان کن تھی کہ اسے دیکھ کر وہ بھی مریض بن گیا۔ اس پریشانی نے اسے کسی کام کا نہیں رکھا۔ اسے یہ فکر تھی کہ سرسید کی لائف اور یادگارِ غالب کے لیے جو حوالے بڑی محنت کے بعد جمع کیے ہیں کہیں ضائع نہ ہوجائیں۔ یادداشتیں ذہن سے فراموش نہ ہوجائیں۔ اسی فکر اور پریشانی نے اسے بھی بیمار ڈال دیا۔ پرانی بیماریاں تازہ ہونے لگیں، نئی پیدا ہونے لگیں۔

اس بیماری میں "حیات جاوید" کے پہاڑ جیسے کام کو نمٹانا مشکل ہورہا تھا لہٰذا اسے چھوڑ کر وہ یادگارِ غالب مرتب کرنے بیٹھ گیا۔

خانگی پریشانیاں اور اپنی بیماری بھی چلتی رہی اور اس کا قلم بھی۔

اب اس کا نیا مکان تعمیر ہوچکا تھا۔ اس میں نیچے پرانی قسم کا زنانہ مکان تھا یعنی دالان، سہ دری، کوٹھریاں، صحن اور چبوترا۔ اوپر کا حصہ دیوان خانہ تھا۔ آنے جانے کے لیے ایک زینہ گھر میں جاتا تھا، دوسرا باہر دروازے میں نکلتا تھا۔ وہ اپنے دونوں ملازموں کے ساتھ اوپر رہتا تھا۔ وہیں اس کے حقہ بھرنے اور چائے بنانے کا انتظام تھا۔ کھانے کے وقت نیچے زنان خانے میں آتا تھا جہاں اس کی بیوی، بیٹی اور نواسہ رہتے تھے اور یہیں خاندان بھر کی عورتیں اس سے ملنے آتی تھیں۔

اس مکان میں آنے کے بعد اسے قدرے آرام ہوگیا تھا۔ لہٰذا خوب جم کر کام کیا اور "یادگارِ غالب" مکمل کرلی۔

اس کتاب کی چونکہ کوئی متنازعہ حیثیت نہیں تھی اور پھر یہاں اس کا قلم بھی خوب چلا تھا۔ نثر میں داستان کا رنگ پیدا ہوگیا تھا لہٰذا چھپتے ہی لوگوں میں مقبول بھی ہوگئی۔

اس کام سے نمٹنے کے بعد اسے پھر "حیات سرسید" کی یاد آئی۔ اسے اپنی گرتی ہوئی صحت کی فکر رہنے لگی تھی اور چاہتا تھا کہ جلد از جلد اس کام کو مکمل کرلے۔

دم لینے کی فرصت کوئی کب پاتا ہے
آتا ہے اگر آج تو کل جاتا ہے
جو کرنے کے ہیں کام ان کو جلدی بھگتاؤ
طلبی کا پیام وہ چلا آتا ہے

وہ یادگارِ غالب سے نمٹنے کے بعد ۱۸۹۷ء کے آخر میں علی

گڑھ چلا گیا۔ ایک تو علی گڑھ کی فضا اسے بہت راس آتی تھی۔ دوسرے یہ کام وہاں رہ کر آسانی سے ہو سکتا تھا۔ سرسید زندہ تھے۔ ان کی ابتدائی زندگی لکھتے ہوئے بہت سی باتیں ان سے پوچھی جاسکتی تھیں۔ سرسید کے بیٹے جسٹس محمود اس کا بہت ادب کرتے تھے۔ جسٹس محمود کی بددماغی مشہور تھی لیکن حالی کے سامنے مجسم ادب بن کر کھڑے ہوجاتے تھے۔ ان سے بھی بہت سی باتیں پوچھی جاسکتی تھیں۔

بہت کچھ کام کرنا تھا۔ بہت کچھ ہوچکا تھا۔ بہرحال علی گڑھ پہنچتے ہی وہ سرگرمی سے لکھنے بیٹھ گیا۔

یہ زمانہ سرسید کے لیے بڑا نازک تھا۔ کالج کے اندرونی اختلافات بہت زیادہ بڑھ گئے تھے۔ جسٹس محمود کی بادہ نوشی نے بھی انہیں بڑھاپے کا آخری صدمہ دیا تھا۔ حالی کی موجودگی ہی میں وہ بیمار پڑ گئے۔ ان کا یہ آخری وقت جس کس مپرسی میں گزر رہا تھا، وہ بڑا عبرت ناک تھا اور پھر سرسید کا انتقال ہوگیا۔
ان کا جنازہ اٹھا اور خلقتِ شہر، کالج میں کام کرنے والے نچلے درجے کے ملازم، راج مزدور بلک بلک کر روئے تو حالی بھی ایک طرف خاموش کھڑا ہوا اس گزرتی ہوئی تاریخ کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا سب سے بڑا دوست، مرشد، ساتھی اور سب سے بڑا قدرداں اپنی آخری آرام گاہ کی طرف جارہا تھا۔

اس کے دل پر جو کچھ گزری وہ گزری لیکن اس نے مایوس ہونا نہیں سیکھا تھا۔ وہ اور زیادہ لگن اور محنت کے ساتھ اپنے کام میں لگ گیا تاکہ دنیا کو دکھا سکے کہ اس بے مثل انسان نے کس طرح قوم کی ڈوبتی کشتی کو پار لگانے میں اپنی زندگی صرف کی اور اس مقصد کے لیے ہر قسم کا ایثار خوشی کے ساتھ گوارا کیا۔

اب علی گڑھ میں اس کے لیے کیا رہ گیا تھا۔ تعزیتی جلسوں سے نمٹنے کے بعد وہ پانی پت آگیا۔

احباب کا اصرار بڑھتا جارہا تھا کہ حیاتِ جاوید جلد سے جلد شائع ہوجائے لیکن وہ اتنی اہم کتاب میں جلد بازی سے کام نہیں لے سکتا تھا۔ نہایت قریب کی شخصیت تھی اس لیے ہر بات نہایت احتیاط سے لکھنی پڑ رہی تھی۔ سرسید کے بہت سے خیالات سے لوگوں کو اختلاف بھی تھا۔ اسے ایسے مقامات پر کمال احتیاط دکھانی تھی۔ اس پُل صراط سے گزرنے کے لیے اسے وقت درکار تھا۔

وہ نہایت انہماک سے سرسید کی حیات لکھنے میں مصروف تھا۔ چھوٹی موٹی تکلیفیں اسی بے خودی میں بہہ گئیں۔ وہ اپنی ہر تکلیف کو بھول کر اس کتاب کو مکمل کر رہا تھا۔ جو صفحات لکھتا جارہا تھا، اس کی طباعت بھی ساتھ ساتھ ہوتی جارہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ یہ کام بہت جلد پورا ہوجائے گا۔ ایک رات

انتخاب

ٹوٹتی ہے جب کوئی تازہ مصیبت اے خدا
ایک عادت ہے کہ تجھ کو یاد کرلیتا ہوں میں

قیس ہو، کوہکن ہو یا حالی
عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

گو کہ حالی اگلے استادوں کے آگے ہیچ ہے
کاش ہوتے ملک میں ایسے ہی اب دو چار ہیچ

ہوتی نہیں قبول دعا ترکِ عشق کی
دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں

اس کی بیوی کو سخت بدہضمی ہوگئی۔ قے اور دست جاری ہوگئے۔ جوں توں کرکے دن نکلا۔ صبح ہوتے ہی حکیم بلالیا گیا۔ حکیم نے ہیضہ تجویز کیا۔ دوائیں بھی تجویز کردیں۔ وہ بیوی کے پلنگ سے لگ کر بیٹھ گیا۔ نصف صدی کا ساتھ اور وہ بھی ایسی وفاشعار بیوی کے ساتھ جو اس کی علمی اور قومی زندگی میں کبھی رکاوٹ نہیں بنی۔ کبھی روک ٹوک نہیں کی۔ وہ شہر شہر گھومتا رہا مگر اس کے ماتھے پر بل نہیں آیا۔

دن بھر دوا دارو ہوتی رہی لیکن رات تک حالت بگڑ گئی اور نو بجے کے قریب وہ ہمیشہ کے لیے اسے چھوڑ کر چلی گئی۔

وہ پوری زندگی گھومتا رہا تھا۔ اب سکون سے گھر بیٹھنے کے دن آئے تھے تو وہ اکیلا رہ گیا۔ بڑھاپے کے اس صدمے نے اس کی آدھی جان نکال لی تھی لیکن اور وہ خود روتا تو صبر کی تلقین کسے کرتا۔ اس نے یہ صدمہ اتنی ہمت سے برداشت کیا کہ غم سے نڈھال بیٹیوں کے لیے مثال بن گیا۔ تصنیفی کام پھر رک گیا۔ بالآخر اس نے ماتم سے ہاتھ اٹھائے اور لکھنے بیٹھ گیا۔

۱۹۰۱ء میں اس نے چھ سال کی مشقت کے بعد ایک ہزار صفحات پر مشتمل حیاتِ جاوید مکمل کرکے شائع کرادی۔

اس دن اسے سرسید کی بہت یاد آئی۔ اس نے کبھی ایک صفحہ بھی سرسید کو نہیں دکھایا تھا اور نہ انہوں نے دیکھنے کی خواہش کی تھی۔ وہ یہی سوچے بیٹھا تھا کہ جب چھپ کر آئے گی تو وہ بڑے ادب سے ایک جلد ان کی خدمت میں پیش کرے گا۔ اب کتاب اس کے ہاتھ میں تھی لیکن سرسید نہیں تھے۔

حالی کو اس قلق کے علاوہ یہ صدمہ بھی رہا کہ اس کتاب کو

وہ پذیرائی حاصل نہیں ہوئی جو اس کی دوسری کتابوں کو ہوئی تھی۔ اس ناقدری کی وجہ سے جو غلط فہمیاں تھیں، اس کی وجہ سے ان کی شخصیت میں دلچسپی پیدا نہ ہو سکی لہٰذا ان کی سیرت کو پڑھنے اور ان کے کارناموں کو سمجھنے کی طلب بھی نہیں تھی۔ بعض لوگ انہیں انگریزوں کا ساتھی اور خیر خواہ سمجھتے تھے۔ بعض کو ان کے مذہبی خیالات سے بغض تھا۔ کتاب چونکہ انہی کے ایک ساتھی حالی نے لکھی تھی اس لیے پہلے ہی یہ طے کر لیا کہ اس میں مداحی اور عقیدت مندی کے سوا کیا ہوگا۔ شبلی جیسے ناقد نے بھی اسے بغیر پڑھے "مدلل مداحی" کے خطاب سے نواز دیا تھا تو عام لوگوں کا کیا ذکر۔

ناشروں اور کتب فروشوں نے بھی اس کی طرف سے بے اعتنائی برتی۔ کچھ قصور اس کتاب کی ضخامت کا بھی تھا۔ ایک ہزار صفحات پڑھنے کی فرصت کسے تھی؟

حالی کو عام لوگوں کا اتنا دکھ نہ ہوتا۔ کتاب کی فروخت بھی اس کا مسئلہ نہیں تھا۔ اسے دکھ یہ تھا کہ سرسید کے کسی قریبی دوست نے بھی اس کا نوٹس نہیں لیا۔ اس کو بھی چھوڑیئے۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ تک میں ایک حرف نہیں لکھا گیا۔

حالی کا انکسار یہ کہ اس نے اس میں بھی اپنا ہی قصور تلاش کر لیا۔

"میں صدقِ دل سے اقرار کرتا ہوں کہ سرسید کی لائف جیسی کہ چاہیے تھی ویسی مجھ سے نہیں لکھی گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، مصنف کی بے وقعتی نے ہیرو کی قدر بھی گھٹا دی۔"

○☆○

سرسید کے انتقال کے بعد کالج کے اندرونی جھگڑے زور پکڑنے لگے تھے۔ ٹرسٹیوں کے آپس کے اختلافات نے سیاست کو بہت چمکا دیا تھا۔ حالی بھی ٹرسٹی تھا لیکن بہت نرم اور خاموش۔ اس نے اس سیاست میں پڑے بغیر سرسید کے مشن کو آگے بڑھایا۔ وہ مایوس نہیں ہوا بلکہ اسی سرگرمی سے تعمیری کاموں کو سرانجام دیتا رہا۔ شبلی کی طرح کالج چھوڑ کر چلا نہیں گیا۔ ندوۃ العلما کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ حالی کے دل میں بھی اس نئے مدرسے کی بہت قدر تھی۔ وہ اگر چاہتا تو وہاں اس کی پذیرائی ہو سکتی تھی لیکن اس نے تجاویز اور مشورے دینے تک ہی اکتفا کیا۔ اسے ابھی سرسید کے کام کو مزید آگے بڑھانا تھا۔

۱۹۰۱ء میں ملکہ وکٹوریہ کی وفات ہوئی تو اس نے کالج کے ٹرسٹی کی حیثیت سے ایک نظم لکھی اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ میں اسے شائع کرایا۔ یہ سوچے بغیر کہ سرسید انگریز نوازی ہی کی وجہ سے بدنام تھے۔ اس نے ملکہ کو ان الفاظ میں خراج پیش کیا۔

شاہ ہوں یا ہوں گے گدا، محکوم ہوں یا حکمراں
وہ نہیں مرتے کبھی، جیتی ہیں جن کی نیکیاں
جاگتا ہے ان کا تا روز قیامت نام نیک
گو کہ ہیں وہ بے خبر سوتے لحد کے درمیاں

اسی سال ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس رام پور میں ہوا۔ وہ اپنی بیماری کے باوجود نہ صرف اس میں شرکت کی بلکہ حسبِ روایت نظم بھی پڑھی جس میں والیِ رام پور کی مدح کی گئی تھی۔

جان و دل ہزہائنس حامد علی خان پر نثار
آج سے وہ سب مسلمانوں کے سر کا تاج ہے
دے رہی ہے یہ شہادت قوم کی مجلس بھری

اب اس کا حال یہ ہو گیا تھا کہ ملک میں کوئی مجلس ہو، کسی مدرسے کا افتتاح ہو، چندے کی کوئی مہم ہو، اس سے تقاضا ہوتا تھا کہ وہ نظم پڑھے۔ صحت جواب دینے لگی تھی لیکن انکار اس کے بس میں نہیں تھا۔ آئے دن دور دراز کے سفر درپیش ہوتے تھے جو اس کی بیماریوں میں مزید اضافہ کر رہے تھے۔

وہ گوشہ نشین نہیں تھا لیکن شہرت سے گھبراتا تھا اور شہرت تھی کہ اس کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ ۱۹۰۴ء میں اسے برطانوی حکومت کی جانب سے شمس العلما کا خطاب عطا ہوا۔ یہ ایسا خطاب تھا جس کی لوگ آرزو کرتے تھے، سفارشیں کراتے تھے لیکن اسے اس خطاب نے الجھن میں ڈال دیا۔ اس نے اپنے بیٹے کو ایک خط میں لکھا۔

"تم جانتے ہو کہ میں کسی حاکم یا افسر سے بھی نہیں ملتا تھا اور ایسے مواقع سے ہمیشہ الگ تھلگ رہتا تھا لیکن اب جب کوئی حاکم ضلع پانی پت میں آئے گا یا کوئی نیا ڈپٹی کلکٹر کرنال میں بدل کر آئے گا لامحالہ وہاں جانا پڑے گا۔ بھلا میں کہاں اور یہ دردِ سر کہاں۔"

مولانا حسرت موہانی علی گڑھ سے "اردوئے معلیٰ" نکالتے تھے۔ اس پرچے میں ان کی طرف سے حالی پر اعتراضات کی بھرمار ہوتی تھی۔ حالی کے پاس یہ رسالہ باقاعدگی سے آتا تھا۔ وہ اس رسالے کو پڑھتے تھے مگر کبھی جواب نہیں دیا۔

ایک مرتبہ وہ علی گڑھ میں تھا اور سید زین العابدین کے مکان پر فروکش تھا۔ ایک صبح حسرت موہانی، دو دوستوں کے ہمراہ اس سے ملنے آئے۔ پہلے تو حسرت کو یہی دیکھ کر تعجب ہوا کہ وہ اس طرح ملے جیسے کہ چھوٹا اپنے بڑوں سے ملتا ہے۔ گفتگو کے دوران میں بھی اس نے یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ ان

اعتراضات کو پڑھ چکا ہے۔

سید زین العابدین اپنے کمرے میں تھے۔ انہوں نے جو دیکھا کہ حسرت موہانی آئے ہیں اور ان کے سامنے حالی بیٹھے ہیں تو انہیں شرارت سوجھی۔ جھٹ اپنے کتب خانے میں گئے اور اردوئے معلٰی کے دو تین پرچے اٹھا کر لے آئے۔ حسرت کا ماتھا ٹھنکا۔ انہوں نے کسی بدمزگی میں پڑنے کے بجائے یہی بہتر سمجھا کہ اٹھ کر چلے جائیں لیکن زین العابدین کب جانے دیتے تھے۔ ان کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔ ترکیب یہ نکالی کہ اردوئے معلٰی کی تعریفوں کے پل باندھ دیئے۔ کسی کسی مضمون کی دو چار سطریں پڑھتے اور داد دیتے۔ حسرت نے جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ وہ یہی سمجھے کہ زین العابدین ان کے پرچے کے معترف ہیں۔

"ارے! مولانا' یہ دیکھیے آپ کی نسبت کیا لکھا ہے؟" سید زین العابدین نے اس سادگی سے کہا جیسے ان سطروں کو وہ آج ہی پڑھ رہے ہوں۔

"لکھا ہوگا' چھوڑیئے" حالی نے کہا۔

"ارے نہیں۔ دیکھیے تو لکھتے ہیں' سچ تو یہ ہے کہ حالی سے بڑھ کر مخرب زبان کوئی نہیں ہو سکتا اور وہ جتنی جلدی اپنے قلم کو اردو کی خدمت سے روک لیں اتنا ہی اچھا ہے۔"

حالی ذرا بھی مکدر نہیں ہوئے بلکہ مسکراتے ہوئے مضمون نگار کی تعریف کی۔

"نکتہ چینی اصلاحِ زبان کا بہترین ذریعہ ہے اور کچھ عیب میں داخل نہیں۔"

سب کو بے حد تعجب ہوا خصوصاً حسرت کو بے حد شرمندگی ہوئی۔

کئی روز بعد ایک دوست نے حسرت سے پوچھا' اب بھی حالی کے خلاف کچھ لکھو گے؟

"جو کچھ لکھ چکا اسی کا ملال اب تک دل پر ہے۔ ایسے فرشتہ نفس پر اب کچھ نہیں لکھوں گا۔"

اس کا یہی وقار اور عالی ظرفی تھی جس نے اس کے بڑے بڑے مخالفوں کو اس کا مطیع بنا دیا تھا۔

اپنے بارے میں وہ ایسا بے پروا تھا کہ بڑی سے بڑی بات سن کر بھی چپ رہ سکتا تھا لیکن جہاں معاملہ ملک و قوم کا ہو وہاں اس کی حق گوئی کسی کا لحاظ نہیں کرتی تھی۔ سرسید کی زندگی میں جب انہوں نے سید محمود کو اپنا جانشین بنانا چاہا تھا' اس سے قطع نظر کہ سید محمود ان کی بے حد عزت کرتے تھے اور وہ سرسید کو اپنا مرشد سمجھتے تھے' انہوں نے سرسید کے بجائے ان لوگوں کا ساتھ دیا تھا جو سید محمود کی جانشینی کی مخالفت کر رہے تھے۔

○☆○

"حالی کی طرزِ نگارش اور اسلوبِ بیان مصنوعی آرائش اور تصنع سے مبرا ہے۔ وہ کسی قدر پھیکا اور ناہموار ضرور ہے لیکن زور اور صحت سے معمور ہوتا ہے خصوصاً اس وقت جب وہ سائنٹیفک موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں۔"

(پروفیسر گراہم بیلی)

پانی پت ایک معمولی سا قصبہ تھا جس میں نہ نئی طرز کے انگریزی اسکول تھے اور نہ کوئی لائبریری۔ حالی نے اس کمی کو محسوس کیا اور اسکول کھولنے کے لیے شہر کے لوگوں سے چندہ جمع کیا مگر چندہ بہت کم یعنی صرف دو ہزار ہو سکا۔ اس رقم سے کسی اسکول کا قیام ناممکن تھا۔ اس لیے اس نے اس سے ایک لائبریری قائم کی اور پانی پت کے وسط میں ایک پُر فضا ٹیلے کے اوپر یہ لائبریری بنائی اور بہت سی عمدہ عمدہ کتابیں منگا کر اس میں جمع کیں۔ وکٹوریہ میموریل لائبریری اس کا نام رکھا۔

اس لائبریری کے قیام اور اس کی دیکھ بھال میں اتنی محنت کرنی پڑی کہ ایک مرتبہ وہ پھر بیمار پڑ گیا۔ اس مرتبہ ایک نئے قسم کے مرض کی ابتدا ہوئی تھی۔ پسلی' کمر بازو میں سخت درد تھا اور پیٹ پھولنے لگا تھا۔

حیدر آباد میں نظام حیدر آباد کا جشن چہل سالہ بڑی دھوم دھام سے منایا جا رہا تھا اور ایک ایسے آدمی کی ضرورت تھی جو اس جشن کا احوال اپنی مخصوص نثر میں لکھ سکے۔ قرعۂ فال حالی کے نام نکلا۔ ادھر اس کا یہ حال کہ بیماری پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھی' ادھر حیدر آباد سے بلاوا آ گیا۔

نواب وقار الامرا جو اس کے نہایت قدرداں تھے' مستعفی ہو گئے تھے۔ ان کی جگہ مہاراجا سرکشن پرشاد دارالمہام ریاست قرار پائے تھے۔ اس وجہ سے حالی وہاں جانے سے گریز کر رہا تھا لیکن وہ اس ریاست کا وظیفہ خوار تھا انکار کیسے کرتا۔ طبیعت کچھ سنبھلی تو وہ حیدر آباد کے لیے روانہ ہو گیا۔

نئے دارالمہام توقع سے زیادہ عنایت کے ساتھ ملے۔ اسے سرکاری مہمان کی حیثیت سے نظام کلب میں ٹھہرایا۔ سفر کے لیے گاڑی عنایت کی۔ مولوی عبدالحق اور ایک کاتب اس کی معاونت کے لیے تھا۔

وہ حیدر آباد ہی میں تھا کہ سرسید کی آٹھویں برسی آ گئی۔ اس نے ایک طویل مضمون سرسید کے کارناموں اور واقعات پر لکھا۔

اسی قیام سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے ایک نظم

"چپ کی داد" لکھی اور ایک بہت بڑے جلسے میں جس کی صدارت مہاراجا کشن پرشاد کر رہے تھے' سنائی۔

یہ نظم عورتوں کے فضائل اور فرائضِ منصبی سے متعلق تھی۔ اس میں ان کے حقوق کی حمایت اور تعلیم سے محروم رکھنے کی مخالفت کی گئی تھی۔ اس نظم نے اس کو ایک اور اعزاز سے نوازا۔

اب تک اردو شاعری میں عورت کا کوئی خاص مقام نہیں تھا۔ اس کا ذکر آتا بھی تھا تو محض محبوب کی حیثیت سے' کردار کے اعتبار سے وہ بے وفا' سنگدل اور ہرجائی تھی۔ وہ عورت سے زیادہ طوائف نظر آتی تھی۔ اس کی اصلی صفات کا کہیں ذکر ہی نہیں تھا۔ ماں' بہن' بیٹی اور بیوی کی حیثیت سے اس کا کہیں ذکر ہی نہیں تھا۔ صرف انیس کی شاعری میں یہ کردار ملتے تھے لیکن وہاں بھی عام عورت کا ذکر نہیں تھا۔ صرف ان عورتوں کا ذکر تھا جو خاندانِ رسولؐ کی عورتیں تھیں۔ غرض ہندوستانی عورت کا روپ پوری اردو شاعری میں نہیں تھا۔ حالی اردو کا وہ پہلا شاعر بن گیا جس نے عورت کے اس روپ کو تلاش کیا اور بیان کیا۔

اے ماؤ' بہنو' بیٹیو' دنیا کی زینت تم سے ہے

ملکوں کی بستی ہو تمہی قوموں کی عزت تم سے ہے

نیکی کی تم تصویر ہو' عفت کی تم تدبیر ہو

ہو دین کی تم پاسباں' ایماں سلامت تم سے ہے

فطرت تمہاری ہے حیا' طینت میں ہے مہرو وفا

گھٹی میں ہے صبرو رضا انساں عبارت تم سے ہے

بیٹی کی حیثیت سے اس کا کردار یہ ہے۔

میکے میں سارے گھر کی تھیں گو مالک و مختار تم

پر سارے کنبے کی رہیں بچپن سے خدمت گار تم

ماں باپ کے حکموں پہ پتلی کی طرح پھرتی رہیں

غم خوار باپوں کی رہیں' ماؤں کی تابعدار تم

شادی کے بعد لڑکی کو سسرال میں جو کچھ جھیلنا پڑتا ہے' اس کو وہ کس خوبی اور صبر سے سہارتی ہے۔

واں فکر تھی ہردم یہی ناخوش نہ ہو تم سے کوئی

اپنے سے رنجش کے کبھی پاؤ نہ واں آثار تم

بدلے نہ شوہر کی نظر سسرے کا دل میلا نہ ہو

آنکھوں میں ساس اور نند کی کھٹکو نہ مثلِ خار تم

اور جب ماں بننے کا اعزاز حاصل ہوتا ہے تو:

کھانا پہننا اوڑھنا اپنا گئیں سب بھول تم

بچوں کے دھندوں میں تمہیں اپنی نہ کچھ سُدھ بُدھ رہی

تب تک بھی سمجھو خیر تھی جب تک بھلے چنگے تھے سب

پر سامنا آفت کا تھا گر ہوگیا ماندہ کوئی

سولی پہ دن کٹنے لگے' راتوں کی نیندیں اڑ گئیں

اک اک برس کا ہوگیا ایک ایک پل اک اک گھڑی

پھر ایک بند میں اس نے ماں کا وہ بلند درجہ دکھایا جو اولیا اور انبیا سے بھی بڑھ گیا ہے۔

لیتیں خبر اولاد کی مائیں نہ بچپن میں اگر

خالی کبھی کا نسل سے آدم کی ہوجاتا جہاں

سرکار سے مالک کی جتنے پاک بندے ہیں بڑھے

وہ ماؤں کی گودوں کے زینے تھے ہیں سب اوپر چڑھے

کی تم نے اس دارالمحن میں جس تحمل سے بسر

زیبا ہے گر کہیئے تمہیں فخرِ نبی' نوعِ بشر

لیکن عورت کو ان خوبیوں کا صلہ کیا ملا؟

جب تک جیو تم علم ودانش سے رہو محروم یاں

آئی ہو جیسی بے خبر ویسی ہی جاؤ بے خبر

جو علم مردوں کے لیے سمجھا گیا آبِ حیات

ٹھہرا تمہارے حق میں وہ زہرِ ہلاہل سربسر

آتا ہے وقت انصاف کا نزدیک ہے یوم الحساب

دنیا کو دینا ہوگا ان حق تلفیوں کا واں جواب

واقعہ یہ ہے کہ اس زمانے میں ہندوستانی عورت کے حقوق کی حفاظت میں سب سے پہلی آواز جس شخص نے اٹھائی وہ حالی ہی تھا۔

حالی کی سیرت کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ جو ایک مرتبہ اس سے ملتا تھا' ہمیشہ کے لیے اس کا گرویدہ ہوجاتا تھا۔ اس مرتبہ اس نے کامل چھ ماہ حیدر آباد میں گزار کر اہلِ شہر کے دل جیت لیے چنانچہ جب وہ وہاں سے رخصت ہونے لگا تو اہلِ حیدر آباد نے ایک سپاس نامہ اس کی خدمت میں پیش کیا۔

"اہلِ حیدر آباد کے لیے یہ کچھ کم باعثِ فخروعزت نہیں کہ آپ جیسا فاضل' صاحبِ دل اور ہمدردِ بنی نوعِ انسان اس شہر میں آئے' چندے قیام کرے اور لوگوں کو اپنی صحبت سے مستفیض کرے۔ آپ کے احسانات ہمارے ملک وقوم پر ایسے نہیں کہ وہ ہمارے شکریئے کے محتاج ہوں بلکہ وہ ہم پر ایسے چھائے ہوئے ہیں کہ ان کے شکریئے سے عہدہ بر آہونا ہماری طاقت سے باہر ہے۔ اس میں ذرا مبالغہ نہیں کہ سرسید کے مشن کو آپ سے زیادہ کسی سے مدد نہیں ملی۔ آپ زیادہ تر

ہمارے شکریے کے اس لیے بھی مستحق ہیں کہ جب سے آپ نے قلم اٹھایا کبھی کوئی تصنیف اپنی ذاتی منفعت کے لیے نہیں بلکہ ملک کی بہبودی اور فلاح کے لیے۔ مسدسِ حالی سے لے کر چپ کی داد تک آپ کی کل تصانیف حبِ وطن اور فلاح قوم سے بھری ہوئی ہیں۔"

پورا سپاس نامہ ایسے ہی الفاظ سے مزین تھا۔ حیدر آباد میں کتنے ہی لوگ آئے اور چلے گئے لیکن اہل شہر نے جن شاندار الفاظ میں اسے خراجِ تحسین پیش کیا' کسی اور کو یہ سعادت نصیب نہیں ہوئی۔

اس کی طبیعت حیدر آباد ہی میں بگڑنے لگی تھی۔ پانی پت پہنچنے کے بعد بیماری نے مزید سر اٹھایا۔ ان بیماریوں سے تو وہ کسی نہ کسی طرح لڑتا رہا تھا لیکن اس مرتبہ غضب ہی ہوگیا۔ داہنی آنکھ میں پانی اتر آیا۔ روشنی برائے نام رہ گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لکھنے پڑھنے کا کام بالکل رک گیا۔

ان کی پوتی مشتاق فاطمہ اور نواسے غلام السبطین لکھنؤ میں تھے۔ انہیں معلوم ہوا تو فوراً خط لکھا کہ لکھنؤ چلے آئیں۔ یہاں آنکھ کا آپریشن ہوجائے گا۔ اس کی بیٹی نے بھی زور دیا لیکن اسے تامل تھا۔

"آخر آپ اتنے سفر کرتے ہیں۔ لکھنؤ جانے میں کیا ہے۔ جبکہ وہاں اپنا گھر بھی ہے۔ آپ کو رہنے کی بھی دشواری نہیں ہوگی۔"

"اسی لیے تو گریز کررہا ہوں۔ مشتاق فاطمہ پر بہت بوجھ پڑجائے گا۔ لوگ مجھے دیکھنے آئیں گے اور مہمانداری کا بوجھ اس پر پڑے گا۔"

ابھی دوسری آنکھ میں روشنی باقی تھی اس لیے اس نے زیادہ فکر بھی نہیں کی۔ یہ غور کرنے ہی میں دن گزرنے لگے وہ آپریشن کرانے لکھنؤ جائے یا کہیں اور۔

کوئی سنجیدہ ادبی کام کرنے کے لیے آنکھوں میں دم نہیں تھا۔ لیٹے لیٹے ایک دن خیال آیا کوئی دلچسپ چیز تحریر کی جائے۔ اس نے "آل نامہ فارسی" لکھنا شروع کردیا۔ جدید دور میں قدیم لفظوں کے جو معنی مراد لیے جارہے ہیں ان کا طنزاً ذکر تھا۔

۱۔ المذہب = اعلانِ جنگ

۲۔ الدین = تقلید آباؤ اجداد

۳۔ العلم = تسمے از جہل مرکب

۴۔ الیونیورسٹی = کارخانہ کلرک سازی

۵۔ الشکار = بہانۂ آدم کشی

پچاس ساٹھ جملوں کا یہ "ال نامہ" اس زمانے کے رجحانات پر ایسا طنز آمیز تبصرہ تھا کہ اگر یہ مکمل ہوجاتا اور شائع

غزل

آگے بڑھے نہ قصۂ عشقِ بتاں سے ہم
سب کچھ کہا مگر نہ کھلے رازداں سے ہم
اب بھاگتے ہیں سایۂ عشقِ بتاں سے ہم
کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم
ہنستے ہیں اس کے گریۂ بے اختیار پر
بھولے ہیں بات کہہ کے کوئی رازداں سے ہم
اب شوق سے بگاڑ کی باتیں کیا کرو
کچھ پاگئے ہیں آپ کے طرزِ ادا سے ہم
دلکش ہر ایک قطعۂ صحرا ہے راہ میں
ملتے ہیں جاکے دیکھیے کب کارواں سے ہم
لذت تیرے کلام میں آئی کہاں سے یہ
پوچھیں گے جاکے حالیِ جادو بیاں سے ہم

بھی ہوجاتا تو قوم کی کچھ اور گالیاں بھی اس کے حصے میں آجاتیں۔

لکھنے پڑھنے کا کام موقوف تھا لیکن نواب محسن الملک کا خط آگیا کہ امیر افغانستان امیر حبیب اللہ خاں جو ہندوستان آئے ہوئے ہیں' علی گڑھ آرہے ہیں۔ کچھ اشعار فارسی کے ان کی شان میں لکھو اور فوراً علی گڑھ آجاؤ۔

بات شاعری کی تھی اس لیے آنکھوں پر زور دیے بغیر ایک قصیدہ لکھ لیا اور ایک آنکھ کے سہارے پر علی گڑھ پہنچ گیا۔

مولوی وحید الدین سلیم اس کے ساتھ تھے۔ رات پونے دس بجے کی میل سے روانہ ہوئے۔ تین بجے رات کو اس گاڑی نے انہیں علی گڑھ پہنچادیا۔

امیر صاحب کے ہمراہیوں کے علاوہ تقریباً آٹھ سو مہمان فروکش تھے۔ ایک بڑے جلسہ عام میں اس نے صرف انیس اشعار کا قصیدہ امیر کی خدمت میں پڑھا۔

وہ پانی پت واپس آیا تو آنکھ نے بالکل ہی جواب دے دیا۔ یہ فکر الگ تھی کہ اگر زیادہ دن گزر گئے تو آنکھ بالکل ہی بیٹھ جائے گی۔ مجبور ہوکر وہ آنکھ کا آپریشن کرانے کے لیے پٹیالہ چلا گیا۔

آپریشن سے اتنا فائدہ تو ضرور ہوگیا کہ کچھ نظر آنے لگا لیکن آپریشن پوری طرح کامیاب نہ ہوسکا۔ اسے ایک مرتبہ پھر پٹیالہ کا سفر کرنا پڑا اور عینک بنواکر لے آیا۔ عینک کی مدد سے کچھ پڑھنے لکھنے لگا۔

دسمبر ۱۹۰۷ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس کراچی میں

رکھا گیا اور حالی کو اس کی صدارت کے لیے منتخب کیا گیا۔

اب اس کی عمر ۷۳ برس کی ہو چکی تھی۔ مسلسل بیماریوں نے اسے اس عمر سے بھی زیادہ نحیف کر دیا تھا۔ اس عالم میں کراچی کا طویل سفر طے کرنا پڑا۔ وہ پہلے علی گڑھ گیا اور وہاں سے تقریباً بیس آدمیوں کے قافلے کے ساتھ کراچی پہنچا۔

اس کانفرنس میں اس کا خطبۂ صدارت ایک تاریخی دستاویز بن گیا۔ کانفرنس کے قیام، سرسید اور محسن الملک کی خدمات کا ذکر کرنے کے بعد سندھ اور عرب کے تعلقات کا مختصر ذکر کیا گیا تھا۔ اس کے بعد ان مسلمان حکمرانوں کا ذکر تھا جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے تسلط سے پہلے سندھ پر گیارہ سو برس سے زیادہ حکومت کر چکے تھے۔

اس کے بعد یہاں کی تعلیمی حالت کا جائزہ لیا گیا تھا۔ تعلیمی حالت سب صوبوں سے زیادہ خراب حالت میں تھی۔ پھر کراچی، لاڑکانہ، حیدرآباد، سکھر وغیرہ کے مدرسوں کا ذکر تھا جو ابھی کھولے گئے تھے۔

"بہرحال مسلمانوں کی قومی ترقی کے لیے محض یونیورسٹی کی موجودہ تعلیم کافی نہیں بلکہ ضروری ہے کہ تعلیم کے ہر شعبے میں دست گاہ حاصل کریں اور اس دوڑ میں جس میں ان کے ہم وطن ان سے بہت آگے نکل گئے ہیں جہاں تک ممکن ہو، شریک ہوں ورنہ وہ زمانہ بہت قریب ہے کہ ان کو نہ صرف اپنی عزت وتوقیر سے بلکہ اپنی بقا اور اپنی ہستی سے بھی ہمیشہ کے لیے دست بردار ہونا پڑے گا۔"

زمانہ دیر سے چلا رہا ہے اے مسلمانو
کہ ہے گردش میں میری غیب کی آواز پہچانو
وہ ناصح اور ہوں گے جن کا کہنا ٹل بھی جاتا ہے
اگر میری نہ مانو گے تو پچھتاؤ گے نادانو

ایک آنکھ پوری طرح صحیح نہیں ہوئی تھی کہ دوسری آنکھ میں پانی اتر آیا۔ ڈاکٹروں کا مشورہ تھا کہ فوراً آپریشن کرایا جائے۔ اس مرتبہ وہ پٹیالہ کے بجائے لکھنؤ گیا۔

یہ آپریشن کامیاب رہا اور عینک کی مدد سے کام چلنے لگا۔

اس کی دونوں آنکھوں نے اسے خوف زدہ کر دیا تھا۔ وہ یہ سوچ کر لرز جاتا تھا کہ اگر روشنی بالکل ہی چلی گئی تو کیا ہوگا۔ کئی مفید کام اس کے ذہن میں تھے لیکن بڑھاپا، کمزوری اور دیگر تفکرات اس کا موقع نہیں دیتے تھے کہ اطمینان سے کام کر سکے۔ وہ اپنا عربی و فارسی کلام مرتب کرنا چاہتا تھا۔ اردو زبان کی تذکیر و تانیث کے اصول مرتب کر کے اس کے متعلق ایک کتاب لکھنے کا بھی خیال تھا۔ اس کے علاوہ یہ خواہش بھی تھی کہ اردو میں اعلیٰ درجے کے ڈرامے اور ناول لکھے جائیں اور دوسری زبانوں کے بلند پایہ ناول اور ڈرامے ترجمہ کیے جائیں جو اردو میں نمونے کا کام دے سکیں۔

وہ اپنی ان خواہشات کا اظہار خطوں کے ذریعے اپنے دوستوں سے بھی کرتا رہتا تھا۔ مولوی عبدالحق اس کے پرستار، عقیدت مند، دوست، بہت کچھ تھے۔ انہیں حالی کی بیماری اور اس خواہش کا علم ہوا کہ وہ اطمینان اور سکون چاہتے ہیں تو عبدالحق نے اسے خط لکھ کر اورنگ آباد بلانا چاہا۔

"یہاں کا موسم خوش گوار ہے، آب و ہوا معتدل ہے، پانی لطیف ہے اور یہ بہت پُرفضا مقام ہے، آپ یہاں آئیے۔ آپ کی صحت کو بھی فائدہ ہوگا اور اطمینان سے کام کرنے کا موقع بھی ملے گا۔"

مولوی عبدالحق ملازمت کے سلسلے میں اورنگ آباد میں مقیم تھے۔ انجمن ترقی اردو کا دفتر بھی وہیں تھا جس کے وہ سیکریٹری تھے۔ دفتر کی عظیم الشان کوٹھی میں حالی کے لیے بہت جگہ تھی۔ انجمن کا کتب خانہ اس کے ذہنی سکون کے لیے موجود تھا۔ یہاں رہ کر بہت سارا علمی کام ہو سکتا تھا۔

اس نے مولوی عبدالحق کی دعوت قبول کی اور سفر کی تیاری کرنے لگا لیکن بیٹوں اور بیٹیوں کو معلوم ہوا دوسرے اعزہ کے علم میں آیا تو انہوں نے اس ضعیفی اور کمزوری کی حالت میں اتنے دور کے سفر کو خلافِ مصلحت سمجھا۔ نواسوں اور پوتوں نے ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا کہ خدانخواستہ آپ کو وہاں جا کر کچھ ہو گیا تو ہم تو صورت دیکھنے کو ترس جائیں گے۔ بات کسی حد تک تھی بھی درست۔ اس کا احساس خود حالی کو بھی تھا۔

"تم لوگ ٹھیک ہی کہتے ہو۔ اگر چلا گیا تو واپسی کا کیا بھروسا۔ خواہ مخواہ غیروں کو میری تجہیز و تکفین کا بار برداشت کرنا پڑے گا۔"

اسی مضمون کا خط اس نے عبدالحق کے نام لکھ کر اورنگ آباد روانہ کر دیا۔

"آپ اورنگ آباد میں خوش ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ خوش و خرم رکھے۔ میرا بھی بے اختیار جی چاہتا ہے کہ چند روز وہاں آ کر رہوں مگر پیرانہ سالی میں اس قدر دور دراز کی مسافت پر کسی دوست کے پاس جا کر رہنا یا تو اس کو بیمارداری کی تکلیف دینی ہے یا اس پر تجہیز و تکفین کا بار ڈالنا ہے۔"

مولوی عبدالحق نے اگلے خط میں لکھا کہ اگر آپ نہیں آتے تو میں عنقریب پانی پت آ کر آپ سے ملاقات کی سعادت حاصل کروں گا۔

حالی نے پھر خط لکھا۔

13 کا خوف

یورپ میں ۱۳ کا خوف زمانۂ قدیم سے ہی پایا جاتا ہے بلکہ اس کی دیکھا دیکھی اب ہمارے ہاں کے ماڈرن طبقے نے بھی "شوقیہ طور پر" اس خوف کو جگہ دینی شروع کردی ہے۔ اس عدد کو قدیم زمانے سے ہی خاصی اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس عدد سے وابستہ سیکڑوں توہمات کی وجہ سے اس عدد سے یوں خوف کھایا جاتا ہے جیسے یہ کوئی انتہائی منحوس عدد ہو اور اس عدد کے حامل کا انتہائی بری حالت میں خاتمہ یقینی ہو۔ اس عدد کا صحیح مفہوم پانے کے لیے ضروری ہے کہ مفرد عدد ۴ پر بھی کچھ غور و فکر کیا جائے کیونکہ ۴ ہی وہ مفرد عدد ہے جو مرکب عدد ۱۳ کا حاصل ہے۔

عدد ۴ کے حاملین کو عام طور پر غلط سمجھ لیا جاتا ہے اس وجہ سے وہ تنِ تنہا زندگی گزارنے کے عادی ہوتے ہیں اور ملکوں کی حکومتوں کے تختے الٹنے میں یا انقلاب پیدا کرنے میں ہمیشہ پیش پیش ہوتے ہیں' یہ لوگ ہر قسم کی سماجی اقدار سے بغاوت میں پیش پیش ہوتے ہیں۔ ۱۳ کے عدد کی یہ خصوصیات بڑے اونچے پیمانے پر ظاہر ہوتی ہیں اور ان میں بڑا زور پایا جاتا ہے۔ یہ راستے میں آئی ہر رکاوٹ کو ہٹا کر ہر شے کو بدل دیتے ہیں۔ زمانۂ قدیم میں ۱۳ کے عدد کو ایک ڈھانچے کے ہاتھ پاؤں سے ظاہر کیا گیا ہے جو گھاس میں موجود ہے اور اس کی درانتی کی نوک کٹے ہوئے سر کی تصویر سے نسوانی چہرے سے سماجی اصلاح کا اظہار ہو رہا ہے یعنی جدید اصلاحات۔ اس تصویر کو ڈھانچے اور درانتی کی وجہ سے غلط مضمون میں لیا گیا اور سمجھنے والوں نے اسے موت کے تاثر سے ملا دیا اور غالباً یہی وجہ تھی کہ اس عدد کو انتہائی خوفناک عدد سمجھا جانے لگا۔ اگر آپ غور سے دیکھیں تو ۱۳ کا مرکب عدد ۴ کے مفرد عدد کے اسی سلسلے کی کڑی ہے جس میں ۱۳ اور ۲۲ کے علاوہ ۳۱ کے اعداد بھی آتے ہیں۔ اگر کوئی شخص حساب لگائے تو اسے معلوم ہوگا کہ اس قسم کے اعداد اس کی زندگی میں بار بار آرہے ہیں۔ ڈورو پولیس فورس کے پولیس سارجنٹ جان فگ نے ڈیلی ایکسپریس میں یہ انکشاف کیا تھا کہ ۱۳ کے عدد سے وابستہ تمام خطرات محض واہمے ہیں اور ان کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ اس نے بتایا کہ اس کے خاندان کے افراد کی تعداد ۱۳ ہے۔ وہ اپنے خاندان کا تیرھواں آدمی ہے۔ اس نے ۱۳ سال کی عمر میں ملازمت اختیار کی اور ۱۳ اپریل کو پولیس میں ملازمت کی۔ مسٹر روڈ کے خاندان میں ۱۳ افراد تھے اور ان میں سب سے چھوٹا بیٹا بھی شامل تھا۔ اس کا عدد ۱۳ تھا اور اس کی ملازمت تیرھویں جہاز پر تھی۔ مسٹر روڈ کی موت پر ٹیلی گراف آفس سے ۱۳ عدد تار دے کر اس کی موت کی اطلاع دی گئی۔

مرسلہ۔ بشریٰ افضل' سیٹلائٹ ٹاؤن بہاولپور۔

"آپ نے بہت جلد تشریف لانے کا وعدہ کیا ہے مگر میں اپنی حالت کے لحاظ سے کسی کا یہ شعر پڑھتا ہوں۔"

خدا ہی جانے سحر ہو' نہ ہو' جئیں نہ جئیں
شبِ فراق کئی احتمال رکھتی ہے

میں اپنی طرف سے اس وقت تک زندہ رہنے کی کوشش کروں گا۔

اس نے واقعی خوب کوشش کی۔ بعض تکلیفیں تو اپنی جگہ تھیں لیکن طبیعت کسی حد تک سنبھل گئی۔ وقت گزاری کے لیے لالہ سری رام کی کتاب "خم خانۂ جاوید" پر تبصرہ لکھنے بیٹھ گیا۔ درمیان میں ایسے مکروہات پیش آتے رہے کہ اطمینان سے لکھنا نصیب نہیں ہوا لیکن تبصرہ مکمل کرلیا۔

ستمبر ۱۹۱۱ء میں میر عثمان علی خاں کی مسند نشینی پر ایک قطعۂ تہنیت ۲۹ اشعار کا لکھا جس میں ان کی اہم ذمے داریاں بتائی تھیں لیکن کوئی مدحیہ شعر نہیں تھا۔

فلک مرتبت میر عثمان علی خاں
مبارک تمہیں مسند شہریاری
مبارک اب و جد کی تم کو خلافت
مبارک دکن کی تمہیں تاجداری
مبارک تمہیں ملک کی گلہ بانی
مبارک رعیّت کی خدمت گزاری

یہ سال یونہی ہلکے پھلکے کام کرتے ہوئے گزر گیا۔ طبیعت کچھ سنبھل گئی تھی لہٰذا تبدیلی آب و ہوا کے لیے وہ شملہ چلا گیا۔ اندازہ یہ تھا کہ یہاں کی آب و ہوا مفید ثابت ہوگی لیکن کھانسی بہت بڑھ گئی۔ یہاں کی مرطوب ہوا اسے نقصان پہنچا رہی تھی۔ وہ الٹے قدموں دہلی آگیا۔

یہاں کی آب و ہوا میں کچھ ایسی جاذبیت تھی کہ آتے ہی جی بہل گیا۔ یہاں رہ کر اس نے اپنا اردو دیوان دوبارہ مرتب

کیا۔ اس مرتبہ اس نے نئے اڈیشن میں رباعیاں بھی شامل کیں جو پچھلے کئی مہینوں سے وہ لکھ رہا تھا۔ یہ رباعیاں کچھ تو اخلاقی نوعیت کی تھیں اور کچھ اس کا اپنا احوال تھیں۔

اپنے دوست اور ہم وطن ڈاکٹر لیاقت حسین کے بلاوے پر وہ دہلی سے فرید آباد (گوڑ گانوہ) چلا گیا۔

یہاں پہنچ کر قدرے اطمینان نصیب ہوا تو اس نے اپنے عربی، فارسی کلام کو مرتب کرنا شروع کر دیا۔

اسے اب زیادہ دن زندہ رہنے کی امید نہیں تھی۔ جو کام باقی تھے وہ جلد از جلد نمٹا لینا چاہتا تھا۔

"عمر کے دن ختم ہوتے چلے جاتے ہیں اور کوئی کام ضروری و غیر ضروری سرانجام نہیں دے سکتا۔ سب سے ضروری کام اس وقت یہ تھا کہ دنیا کے تمام تعلقات قطع کر کے جو چند سانس زندگی کے باقی ہیں ان میں خدا کی یاد کی جائے مگر اپنا کلام چھپوانا میرے حق میں شیطانی وسوسہ ہو گیا ہے۔ ہرگز طبیعت گوارا نہیں کرتی کہ جو کلام اب تک شائع نہیں ہوا، اس کے چھپوانے اور شائع کرنے کی میرے بعد کسی سے امید نہیں ہے اس کو یونہی چھوڑ کر چلا جاؤں۔"

فرید آباد میں بھی اسے اطمینان سے کام کرنے کا موقع نہ ملا۔ وہاں بھی لوگ دن رات ملنے آیا کرتے تھے اور ان کا بیشتر وقت ان لوگوں کی نذر ہو جاتا تھا۔ بیماریاں اس پر مستزاد۔

وہ یہاں سے بھی اکتا گیا اور پھر پانی پت آ گیا۔ اس کے دونوں ملازم اس کی دیکھ بھال میں لگ گئے۔ لیکن بڑھاپے کا کوئی علاج نہیں۔ اس نے جیسے تیسے عربی، فارسی کلام اور نثر کو ترتیب دیا۔ دیباچہ تحریر کیا اور چھپنے کے لیے تیار کر لیا۔

ابھی یہ کلام چھپنے کا منتظر تھا کہ اس نے کبھی نہ اٹھنے کے لیے بستر پکڑ لیا۔ نزلہ، زکام تو عمر بھر کا ساتھی تھا۔ اب دمے نے بھی اس کے گھر کا رستہ دیکھ لیا۔ بواسیر کا بھی مرض تھا جس نے اب جان نہ چھوڑنے کی قسم کھا لی۔ دانتوں کی تکلیف نے الگ پریشان کر رکھا تھا۔

اس عالم میں بھی وہ کچھ نہ کچھ کام کرتا رہا۔ افتخار عالم مارہروی نے حیات النذیر تیار کر لی تھی اور چھپنے سے پہلے حالی کی خدمت میں بھیج دی تھی۔ اس نے ہر تکلیف بھلا کر نہ صرف اسے پڑھا بلکہ تبصرہ بھی تحریر کیا۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ترجمۂ قرآن پاک کی خوبیاں بیان کیں اور ان ہنگاموں کی طرف اشارہ کیا جو اس ترجمے کے عام محاورات اور زبان کو غیر سنجیدہ کہہ کر کھڑے کیے گئے تھے۔ مصنف سے جہاں کہیں لغزشیں ہوئی تھیں، ان کی نشاندہی کی۔

یہ تبصرہ اس نے محمد علی جوہر کے اخبار ہمدرد کے لیے تیار کیا تھا لہٰذا ہمدرد کے مناسب دو رباعیاں بھی تحریر کیں۔

تمغوں کی ہوس نہ یاں خطابوں کی طلب
اک ملک کی خدمت کا ہے سودا یارب
ہمدرد کو اسم بامسمیٰ سمجھو
اس نام کی لاج تیرے ہی ہاتھ ہے یارب

اقوام میں زندگی کی ہے روح جہاں
چونک اٹھتے ہیں اک ہاں پہ واں پیر و جواں
کرتی نہیں وہ مردہ قوموں میں وہ کام
جو کام اک کارٹون کرتا ہے وہاں

اس کے بعد وہ طوطی مقال چپ ہو گیا۔ دماغ کے اعصاب پر کچھ ایسا اثر ہو گیا تھا کہ بات نہیں کر سکتا تھا۔ کوئی بات کرتا تو سمجھ جاتا، چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ اور آنکھوں میں چمک آ جاتی لیکن جب تک جواب دماغ سے زبان تک آتے، اعصاب جواب دے دیتے اور مسکراہٹ بے بسی میں بدل جاتی۔

وہ دماغ جو چار سال کی عمر سے اسی سال تک تقریباً چھہتر سال دن رات کام کرتا رہا ہو۔ جس نے ساری عمر طلب علم میں بسر کی ہو اور ساٹھ سال تک ٹھوس علمی کام کرتا رہا ہو۔ جس نے ستر سال تک ہر قسم کی فکریں، پریشانیاں، رنج، مصائب خاموشی سے جھیلے ہوں۔ جو دوسروں کے لیے خود جلتا رہا ہو۔ اس دماغ کو اب یہ حق پہنچتا تھا کہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو جائے۔

۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو اس نے اسی بے بسی کے عالم میں مولانا شبلی کے انتقال کی خبر سنی اور ۳۱ دسمبر کو وہ خود خبر بن گیا۔ علم و ادب کا یہ گوہر گراں مایہ جس نے اردو میں جدید شاعری کی بنیاد ڈالی اور تنقید میں امامت کا مقام حاصل کیا، جس کی مسدس نے سوئی ہوئی قوم کو جھنجوڑ کر اٹھا دیا، اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گیا۔

پانی پت میں درگاہِ قلندر صاحب کے صحن میں مسجد کے حوض کے کنارے، سنگ مرمر کی خوبصورت قبر اس کا مقام خواب بنی۔

شبلی کو رو رہے تھے ابھی اہلِ گلستاں
حالی بھی ہو گیا سوئے فردوس رہ نورد
(اقبال)

مرزا ہادی رسوا

امراؤ جان ادا کے تخلیق کار مرزا محمد ہادی رُسوا کے سوز و ساز اور پیچ و تاب کی سرگزشت

داستانِ رُسوا

ڈاکٹر ساجد امجد

یہ عروجِ آدمِ خاکی کی وہ داستان ہے جس کے مطالعہ سے عقل حیران اور دل رشک کے جذبات سے معمور ہوتا ہے۔ ایک انسان اور اس قدر ہمہ جہت، ایسا بحرالعلوم!
لسانیات، منطق و فلسفہ، تاریخ و مذہب، ہیئت و کیمیا، افسانہ و شعر ساتھ ہی درس و تدریس کا سلسلہ بھی۔ غرض جس سمت اُس نے رُخ کیا، صفیں اُلٹ دیں اور اپنی فتوحات کے جھنڈے گاڑتا چلا گیا اور اس انداز میں جیسے کوئی نٹ کھٹ شریر بچہ اپنے کسی پسندیدہ کھیل میں مصروف ہو۔۔۔ اِرد گرد کے ماحول سے بے خبر۔
اس دَور کا قصّہ جب علم و ہُنر کے چرچے ہوتے تھے، اہلِ علم کا شمار معزّزین میں کیا جاتا تھا۔
ماضی قریب کی اُس چمکتی دھوپ کا نظارہ جو اپنے آفتابی عہد کے ساتھ رُخصت ہو گئی۔

لکھنؤی تمدن کی عیش پرستیاں میر محمدؐ امین سعادت خان برہان الملک بانی سلطنت اودھ کے دورِ تکلّف آمیز سے گزرتی ہوئی واجد علی شاہ کے عہد جمال آفریں تک کا سفر طے کر چکی تھیں اور اس حالت میں کہ ہر اُٹھنے والا قدم ایک نئی منزلِ عروج کی طرف اُٹھتا تھا۔ تعیش، آزادی اور ادب و شعر میں بے راہ روی اپنے کمال پر پہنچ چکی تھی۔ کبوتر بازی، بٹیر بازی، پتنگ بازی، رقص و موسیقی کے ہزاروں میلے برپا ہو رہے تھے جن میں عوام و خواص یکساں جوش و خروش سے حصہ لیتے۔ نہ صرف یہ بلکہ بادشاہ تک قیصر باغ کے میلوں میں جاتا، اور کنھیا کا روپ بھر کر ان میں شریک ہوتا، خوبصورت عورتیں اس کی گوپیاں بنتیں۔

شجاع الدولہ کے زمانے ہی سے بازاری عورتیں اس سوسائٹی کی جان بن چکی تھیں۔ واجد علی شاہ کے دور میں تو اس طبقے کو خوب ترقی ملی۔ اسے احترام کی نظر سے بے شک نہ دیکھا جاتا ہو لیکن رئیسوں کی ریاست انہی طوائفوں سے ظاہر ہوتی تھی۔ تنخواہ دار طوائفیں، امارت و ریاست کا بہترین اظہار تھیں۔ جو انہیں ملازم نہیں رکھ سکتے تھے، وہ بھی تماش بینی کا لطف ضرور اُٹھاتے تھے۔

اس تعیش کا لازمی نتیجہ تھا کہ طبیعت میں تکلّف و تصنع پیدا ہو چنانچہ زندگی کے تمام لوازم، کھانا پینا، آدابِ نشست و برخاست، طرزِ گفتگو غرض ہر چیز میں ایک تصنع پیدا ہو گیا تھا۔

عیش و عشرت کے یہ جلسے تھے کہ وقت نے پلٹا کھایا۔ انگریزوں کے ہاتھوں سے سلطنت کا خاتمہ ہوا اور واجد علی شاہ کو مٹیا برج بھیج دیا گیا۔

در و دیوار پہ حسرت کی نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

لکھنؤ کی یہ محفل تتر بتر ہو گئی۔ رہی سہی کسر ہنگامۂ غدر نے پوری کر دی۔ اس انقلاب نے مسلمانوں کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر جگا دیا ہر ایک اپنی اپنی جگہ آنکھیں ملتا ہوا جاگ اُٹھا۔

اس ماحول میں بھی کچھ جانیں ایسی تھیں جو پہلے ہی سے جاگ رہی تھیں اور بزرگوں کی عزت کو سینے سے لگائے زندہ تھیں۔ انہی میں آغا محمدؐ تقی کا خاندان تھا۔

آغا تقی کا خاندان سپاہی پیشہ تھا۔ ان کے جدِّ امجد ذوالفقار علی بیگ کو آصف الدولہ نے جاگیریں دی تھیں۔ ان جاگیروں کا ترکہ آغا تقی کو بھی ملا تھا لیکن انہیں سپہ گری سے شغف نہیں تھا انہوں نے زمانے کے رنگ ڈھنگ کو دیکھ کر کتابوں سے دل لگا لیا تھا۔ اور اس میں ایسا انہماک ہوا کہ جائیداد کی طرف سے بھی بے نیاز ہو گئے۔ ان کی بیوی بھی جہیز

زُلف بکھرائے ہوئے تا سرِ دوش
چشم بدمست نگہ آفت ہوش
سانولا رنگ نشیلی آنکھیں
شوخ طرار، رسیلی آنکھیں
خاک میں تو نے ملایا ہے کہاں مرزا کو
حیف اتنا بھی نہ پوچھے گا زمیں سے کوئی

میں کافی جائیداد لائی تھیں۔ انہی جاگیروں کی آمدنی سے ان کا گھر چلتا تھا لیکن خود ان کا عالم یہ تھا کہ علمی مشاغل کی وجہ سے جائیداد کے جھگڑوں میں گرفتار نہ ہوتے تھے بلکہ زیادہ درست بات یہ تھی کہ ان باتوں کا انہیں شعور ہی نہ تھا۔ بیوی نے گھونگٹ اُٹھاتے ہی جب ان کے یہ رنگ ڈھنگ دیکھے تو اپنی بہن اور رشتے کے ایک بھائی کو اپنی جائیداد کا نگراں بنادیا۔ زیور اور نقدی بہن کی مٹھی میں تھی اور تحصیل وصول کا کام بھائی کے سپرد تھا۔

ہنگامۂ غدر کو بہ مشکل ایک سال گزرا ہوگا کہ آغا تقی کے گھر جائیداد کا وارث پیدا ہوا۔ اس بچّے کا نام انہوں نے مرزا محمد ہادی رکھا۔ یہ بچّہ ہو بہو باپ کی تصویر تھا۔ رنگ گندمی، پیشانی بلند، گداز ہونٹ، دہانہ فراخ، بڑی بڑی روشن آنکھیں کسی قدر اُبھری ہوئیں۔ چوڑی ہڈی کے اس بچّے کے بشرے سے ذہانت صاف ٹپکتی تھی۔

جتنی رسمیں متمول گھرانوں میں مروج تھیں، وہ سب ادا کی گئیں۔ ماں اور خالہ نے خوب ارمان نکالے۔ ذرا ہوش سنبھالا تو ناز و نعم میں پرورش ہونے لگی۔ باپ کی آنکھیں اس کی طرف بڑی اُمید سے دیکھ رہی تھیں۔ گھر میں کیا نہیں تھا۔ خاندانی جاگیریں تھیں جو اب تک ساتھ دے رہی تھیں۔ اولاد کی اچھی پرورش کس کی تمنا نہیں ہوتی، گھر میں خوش حالی ہو تو یہ تمنا پھل بھی دینے لگتی ہے۔ خوش حالی تو ایسی تھی کہ محمّد ہادی کی ماں گھر میں بھی ہاتھ گلے کا زیور پہنے ہی رہتی تھیں۔ سو پچاس روپے وقت بے وقت صندوقچے سے نکل آتے تھے۔ گھر میں وہ اثاثہ بھی موجود تھا جو باعزت گھرانوں میں ہوتا ہے۔ کوئی تقریب بھی ایسی نہ ہوئی ہوگی جس میں دس بیس ڈومنیاں نہ آئی ہوں۔

آغا تقی کے تو جیسے ایک ہونہار شاگرد ہاتھ لگ گیا۔ مرزا ابھی پڑھنے کی عمر کو پہنچا بھی نہیں تھا کہ پڑھنے بیٹھ گیا۔ چکن کا کرتہ اور ایرانی ٹوپی میں سج دھج کے پہلی مرتبہ وہ اپنے باپ کے سامنے پڑھنے بیٹھا تو ماں کا تولہ بھر خون بڑھ گیا۔

”ذرا ٹھہریے، میں اپنے لال کی پہلے نظر اُتارلوں، پھر پڑھانا شروع کیجیے گا۔“

”ہادی کی ماں، نظر کا ٹیکہ تو اس کے ساتھ رہتا ہے، ناد علی اس کے گلے میں پڑی ہوئی۔ یاد نہیں ہے، تعویذ بنوا کر لایا تھا۔“

”نہیں بھئی، ہمیں کل نہیں پڑے گی جب تک ہم نظر نہ اُتارلیں۔“

”چلیے آپ یہ وہم بھی دور کرلیں۔“

مرزا کی ماں سفید کپڑے کی دھجی میں مرچیں رکھ کر لے آئی اور سات مرتبہ مرزا کے اوپر سے گھما کر چولھے میں جھونک آئی۔

”دیکھا! ذرا سی دھانس نہیں آئی۔“

”ہاں دھانس تو نہیں آئی۔ اب آپ کہیں تو ہم پڑھانا شروع کریں۔“

”آپ تو ہمارا مذاق ہی بنالیتے ہیں۔ ایک ذری نظر اُتارنی تھی، اب بے شک پڑھائیے۔“

آغا تقی، فارسی اور حساب میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ حساب کی گتھیوں کو سمجھنے کی تو ابھی عمر ہی نہیں تھی البتہ فارسی پڑھائی جاسکتی تھی۔ آغاز قواعد سے ہوا۔ آغا تقی کو یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ مرزا ہادی کا حافظہ بڑا قوی ہے۔ چند ہی دن میں اسے گردانیں زبان زد ہوگئیں۔ سبق چاہے سمجھ میں نہ آتا ہو لیکن دوسرے دن اس طرح فر فر سُنادیا کرتا تھا کہ حیرت ہوتی تھی۔

”اب ہم حساب بھی پڑھا کریں گے۔“ ایک روز مرزا ہادی نے کہا۔

باپ کو اس کا یہ شوق دیکھ کر تعجب بھی ہوا اور خوشی بھی۔ جس عمر میں بچّے پڑھنے سے بھاگتے ہیں، وہ اپنے لیے نئے شعبے تلاش کر رہا تھا۔ باپ کو یہ خوشی تھی کہ اس کا بیٹا اس کا صحیح جانشین بنتا جارہا ہے۔ ان کے بعد ان کی حساب دانی کو زندہ رکھنے والا کوئی تو ہوگا۔

اس فرمائش کے بعد مرزا ہادی، حساب کی تعلیم بھی حاصل کرنے لگا۔ اس کا قوی حافظہ یہاں بھی اس کا معاون ثابت ہوا۔ اسے حساب کے فارمولے ازبر ہوگئے تھے۔ پلک جھپکتے سوال حل کرلیا کرتا تھا۔

آغا تقی یوں تو دنیا داری کے جھگڑوں سے آزاد تھے۔ گھر داری میں بہت کم حصہ لیتے تھے لیکن بیٹے کی تعلیم کی طرف سے بہت چوکس تھے۔

اب مرزا ہادی مکتب جانے لگا تھا اور گھر میں باپ اس پر علم و فضل کے رنگ چڑھانے میں مصروف تھے۔ بارہ برس کی عمر تک پہنچتے پہنچتے وہ فارسی، حساب، اقلیدس اور نجوم پڑھ چکا تھا۔

اب وہ عمر کے اس حصے میں تھا جب انسانی جسم میں بہت سی کھڑکیاں کھل جاتی ہیں۔ وہ گھر کی تربیت کے ساتھ ساتھ باہر کے ماحول سے بھی متاثر ہونے لگتا ہے۔ لکھنؤ کا ماحول اس وقت انتزاع سلطنت کے بعد کی افسردگی سے گزر رہا تھا لیکن رسّی جل گئی تھی بل نہ گئے کے مناظر بھی دیکھے جارہے

تھے۔ اس تنزلی کے باوجود شاعری کی محفلیں اسی طرح جمی ہوئی تھیں۔ شاعری اب بھی شرفا کا پیشہ سمجھی جاتی تھی۔ شرفا کی ڈیوڑھیوں سے لے کر عام گھروں تک میں مشاعروں کی واہ واہ کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ ممکن ہی نہیں تھا کہ مرزا ہادی اس ماحول سے متاثر نہ ہوتا۔ اس کے دل میں بھی اس شوق نے چٹکیاں لیں کہ وہ شاعری کرے۔ باپ کو شاعری سے شغف نہیں تھا' اس لیے وہ کھل کر اس شوق کا اظہار نہیں کرسکتا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اس کے اس شوق کی حوصلہ شکنی کی جائے گی۔ وہ چھپ چھپ کر شاعری کرتا اور کنجوس کے مال کی طرح ان شعروں کو چھپا چھپا کر رکھتا۔ لیکن شاید عشق اور مشک کی طرح شاعری بھی چھپنے والی چیز نہیں۔ شاید اس لیے کہ عشق اور مشک کی طرح شاعری بھی ایک لطیف فن ہے۔ مرزا کا راز بھی زیادہ دن راز نہ رہ سکا۔

گرمیوں کے دن تھے۔ صحن میں چھڑکاؤ ہو چکا تھا۔ مونڈھے کرسیاں لگ گئی تھیں۔ ملازم نے پیچوان لا کر رکھ دیا تھا۔ اس کا مطلب تھا اب مرزا ہادی کے پڑھنے کا وقت ہوگیا ہے۔ آغا تقی پیچوان سے شغل کر رہے تھے لیکن مرزا ہادی' ابھی نہیں پہنچا تھا۔

"محمد ہادی اب تک نہیں آئے۔ کوئی جائے اور انہیں بلا لائے۔" آغا تقی نے پیچوان کی منہال کو ہونٹوں سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

"سرکار' ان سے کہہ دیا گیا ہے' بس تشریف لاتے ہی ہوں گے۔" ملازم نے کہا۔ "اے لو وہ آگئے۔"

مرزا ہادی نے تیز قدموں سے دالان پار کیا اور صحن عبور کرتا ہوا کرسیوں کے قریب آکر رک گیا۔

"آداب۔"

"آداب۔ لیکن یہ آپ کا سانس کیوں پھولا ہوا ہے۔"

"وہ۔ ذرا جلدی میں آیا ہوں نا۔ اس لیے۔"

"آپ کو معلوم ہے' جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے۔"

"جی۔"

"معلوم ہے تو پھر اس سے گریز ضروری ہے۔ آئندہ اطمینان سے آیا کیجئے۔"

"جی بہتر۔"

"بیٹھئے اور آموختہ سنائیے۔"

وہ آموختہ سنانے لگا اور آغا تقی حقے سے شغل کرنے لگے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اس کی کاپیوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتے جا رہے تھے۔ ایک کاپی پر ان کی نظریں ٹھہر گئیں۔

"ہادی میاں' آپ شاعری بھی کرتے ہیں؟"

وہ جلدی میں اس کاپی کو بھی اٹھا لایا تھا جس پر وہ اشعار لکھتا تھا۔ وہ اس وقت کسی غزل کو صاف کرکے کاپی پر اتار رہا تھا کہ پڑھنے کا وقت آگیا اور وہ دوسری کتابوں کے ساتھ اس کاپی کو بھی ساتھ لیتا آیا۔

"جی' کبھی کبھی کچھ کہہ لیتا ہوں۔" اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"یہ کبھی کبھی کی حرکت تو معلوم نہیں ہوتی۔ اچھا خاصا کلام جمع ہوگیا ہے۔"

"جی' یہ تو ہے۔"

"اس میں تو غزلیں غزلیں بھری ہوئی ہیں' نہ سلام نہ مرثیہ' کچھ اس طرف بھی توجہ کیجئے۔"

"اس کے لیے تو بڑی قدرتِ کلام کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"تو پیدا کیجئے قدرتِ کلام۔ انسان کو چاہیے کہ جو کام بھی کرے ڈھنگ سے کرے۔ ہر کام کو سیکھنے کے لیے استاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ رہنما نہ ہو تو آدمی راستہ بھٹک سکتا ہے۔ شاعری کا شوق ہے تو کوئی استاد بھی بنائیے۔ آج کا پڑھنا موقوف۔ ہمارے دوست ہیں مرزا سلامت علی دبیر لکھنوی۔ ان کے پاس آپ کو لیے چلتے ہیں۔ وہی فیصلہ کریں گے کہ آپ نے شعر کہے ہیں یا بھاڑ جھونکا ہے۔"

مرزا تو یہ سمجھ رہا تھا' وہ جھاڑ پڑے گی کہ طبیعت صاف ہو جائے گی لیکن حوصلہ افزائی دیکھ کر باغ باغ ہوگیا۔ اب اسے فکر تھی تو یہ کہ اس کے شعر سن کر مرزا دبیر جانے کیا کہیں۔ انہیں یہ اشعار پسند بھی آتے ہیں یا نہیں۔ وہ مرزا دبیر سے واقف تو نہیں تھا لیکن اس نے ان کا نام ضرور سنا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ بہت بڑے مرثیہ گو ہیں۔

آغا تقی نے گلے میں اچکن ڈالی اور چلنے کے لیے تیار ہوگئے۔ وہ بھی تیار ہی بیٹھا تھا۔

میر انیس اور مرزا دبیر دو ہی تو اس وقت شاعر تھے جن کی لکھنؤ میں دھوم مچی ہوئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے دوست بھی تھے اور حریف بھی۔ اہل لکھنؤ بھی دو حصوں میں بٹے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ دبیر کے ساتھ تھے کچھ انیس کے۔ آغا تقی کسی کے ساتھ بھی نہیں تھے لیکن دبیر سے ان کی صاحب سلامت تھی اس لیے وہ اپنے بیٹے کو ان کے پاس لے جا رہے تھے۔

اس وقت شام کا وقت تھا۔ مرزا دبیر ملاقاتیوں کے درمیان گھرے بیٹھے تھے۔ سفید کڑھا ہوا کرتہ۔ سر پر سفید گول ٹوپی' چہرے پر بہت ہلکی داڑھی' وہ یوں بیٹھے تھے جیسے ابھی اٹھ کر کہیں چلے جائیں گے۔

"حضت آداب"
"تسلیمات۔ کہئے آغا تقی۔ آج آپ کو آپ کی کتابوں نے کیسے چھوڑ دیا کہ ہم شاعروں کی یاد آگئی۔"
"کتابوں کا علم ہی تو اہلِ علم کی یاد دلاتا ہے۔"
"بھئی بہت خوب۔ زہے نصیب، تشریف رکھیئے۔ اور یہ صاحب زادے؟"
"حضور کا خانہ زاد ہے۔ بیٹا ہے میرا۔ مرزا محمد ہادی۔"
"کیا پڑھتے ہیں صاحب زادے"
"پڑھتے تو بہت کچھ ہیں لیکن لکھنے کا وقت آیا تو غزلیں لکھنے لگے ہیں۔ اسی لیے آپ کے پاس لے کر حاضر ہوا ہوں۔"
حاضرین نے بڑے غور سے مرزا ہادی کی طرف دیکھا۔ دو ایک نے کلماتِ تحسین بھی بلند کیے۔
"بھئی خوب! تو صاحبزادے کچھ سنائیے۔ ہم بھی تو سنیں آپ کیا کہتے ہیں۔"
ہادی نے ایسی فرمائش پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ اس کا رنگ فق ہو گیا۔ اتنے لوگوں کے سامنے غزل پڑھنا اور وہ بھی والد کی موجودگی میں لیکن جب باپ نے بھی اصرار کیا تو اس کی ہمت بندھ گئی۔
"جو غزل آج ہی لکھی ہے، اس کے کچھ شعر سناتا ہوں۔"

مرتے مرتے نہ قضا یاد آئی
اسی کافر کی ادا یاد آئی
تم کو الفت نہ ادا یاد آئی
یاد آئی تو جفا یاد آئی
ہجر کی رات گزر ہی جاتی
کیوں تری زلفِ رسا یاد آئی
لذتِ معصیتِ عشق نہ پوچھ
خلد میں بھی یہ بلا یاد آئی

ابھی تک اہلِ محفل خاموشی سے سن رہے تھے جیسے کہہ رہے ہوں، ایک بچے۔ سے اور کن مضامین کی توقع ہو سکتی ہے لیکن جب وہ اس شعر پر پہنچا تو اس کے سونے جیسے کلام پر داد کی روپہلی کرنیں بے اختیارانہ برسیں۔

چارہ گر زہر منگا دے تھوڑا
لے مجھے اپنی دوا یاد آئی

"میاں نظرِ بد سے بچو۔ شاباش۔" مرزا دبیر نے کہا اور اس نے یہ مقطع پڑھ کر غزل ختم کر دی۔

کیا غزل کوئی کہے ہے مرزا
آج کیوں بادِ صبا یاد آئی

"اچھا تو گویا مرزا تخلص کرتے ہیں جناب۔" دبیر نے کہا۔
"جی"
"بھئی آغا تقی۔ تمہارا بیٹا تو تمام ضروری ہتھیاروں سے لیس ہے۔ تخلص تک موجود ہے۔ اب شاعر بننے میں کون سی کسر باقی رہ گئی ہے۔ بس اسے لکھنؤ کے مشاعروں سے دور رکھیے گا۔ ابھی اس کا کلام حقیقت سے قریب ہے، شاعروں سے صحبت بڑھے گی تو دور دور کی ایسی ایسی کوڑیاں لائے گا کہ ہنسی آئے گی۔"
"اسی لیے تو اسے آپ کے پاس لایا ہوں۔ اب یہ آپ کی تربیت میں رہے گا۔"
"ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ لیکن ابھی یہ طالب علم ہیں۔ ان سے کہیئے پڑھنے میں دل لگائیں، شاعری کم کریں"
"اب تو جو کچھ کہنا ہے، آپ ہی کہیں۔"
مرزا ہادی اس دن کے بعد سے مرزا دبیر کے دامنِ تربیت سے وابستہ ہو گیا۔
اس وقت لکھنؤ ایک انقلابی دور سے گزر رہا تھا۔ یہ غدر کے انقلاب کا اثر تھا جس نے اودھ کے سیکڑوں سالہ تمدن، ادب اور شاعری پر بھرپور ضرب لگائی تھی۔ اب واجد علی شاہ کے دور کی شاعری کا اثر زائل ہونے لگا تھا۔ حالی و سرسید جیسے مصلحین سامنے آچکے تھے جنہوں نے قدیم شاعری کو بدل کر رکھ دیا تھا۔ لکھنؤ میں حالی کی تحریک سے بیزاری کا اظہار کیا جا رہا تھا لیکن گرد و پیش کے اثرات سے بے تعلق رہنا بھی آسان نہ تھا۔ یہ اثرات چپکے چپکے لکھنؤی شاعری میں داخل ہو رہے تھے۔ بعض شعرا نے رعایتِ لفظی، عریانی اور فحاشی کے عام مذاق کی بڑی حد تک اصلاح کرلی تھی لیکن اب بھی بڑے انقلاب کی ضرورت تھی۔
مرزا دبیر مرثیہ گو تھے اس لیے لکھنؤ کی عامیانہ شاعری سے یوں بھی بد دل تھے۔ ان اصلاحات کا ان پر اور بھی اثر ہوا تھا۔ مرزا کا حال بھی یہ تھا کہ وہ لکھنؤ میں رہ کر دہلی کے شاعر غالب کی پیروی کر رہا تھا، غالب کی غزلوں کو سامنے رکھ کر غزلیں لکھ رہا تھا۔ اس لیے دہلویت کا رنگ غالب تھا۔
اس نے جب بحر بدل کر غالب کی زمین میں غزل لکھی اور استاد کے سامنے رکھی تو استاد نے ماتھا چوم لیا۔

حیرانیِ نگہ کا تماشا کرے کوئی

صورت وہ روبرو ہے کہ دیکھا کرے کوئی
مشکل ہے ضبط گریۂ بے اختیار کا
کب تک نگاہ بانی دریا کرے کوئی
ہاں اے نگاہِ شوق مناسب ہے احتیاط
ایسا نہ ہو کہ بزم میں چرچا کرے کوئی
دل بے نیاز اور طبیعت حیا پسند
وہ کیا کریں جو خواہش بے جا کرے کوئی
گو ادعائے شوق کے بالکل خلاف ہو
لیکن یہ مصلحت ہے کہ پردہ کرے کوئی

○☆○

وہ ابھی چند غزلوں پر ہی اصلاح لینے پایا تھا کہ دبیر کا انتقال ہوگیا۔ اسے اب یہ گوارا نہیں تھا کہ کسی اور دروازے پر جائے۔ مرزا دبیر کے صاحب زادے مرزا جعفر اوج تھے جن کی شاعری کا دور دور چرچا تھا' مرزا ہادی نے ان سے اصلاح لینی شروع کردی۔ مرزا اوج کو عروض کے فن میں مکمل دستگاہ تھی۔ مرزا ہادی کو اس شاگردی کا یہ فائدہ ہوا کہ اس نے بھی فن عروض میں کمال حاصل کرلیا۔

اسے اتنی فرصت تھی ہی نہیں کہ اپنی عمر کے دوسرے لڑکوں کی طرح کھیل کود میں وقت ضائع کرتا۔ اس کی شاعری ہی اس کا کھیل تھا۔ پڑھائی کے بعد جو وقت بچ رہتا' شاعری کی نذر ہوجاتا۔ اب وہ فارسی' حساب' اقلیدس اور نجوم پر عبور حاصل کرچکا تھا اور منطق پڑھنے کے لیے مشہور منطقی کمال الدین کے حلقۂ درس میں شامل ہوگیا تھا۔

وقت کا بہاؤ اسے اپنے سائے میں اس طرح حفاظت سے لے کر چل رہا تھا کہ حالات کی دھوپ اس سے دور تھی لیکن تعاقب میں ضرور تھی آخر اس کا داؤ چل گیا۔

وہ مکتب سے لوٹا تھا کہ وہ آہ و بکا کی آوازیں سُن کر ٹھٹک گیا۔

یہ آوازیں اس کے گھر سے آرہی تھیں۔ ابھی وہ سمجھنے کی کوشش ہی کررہا تھا کہ حیدر بخش خوش نویس گھر سے باہر آئے۔

"بیٹا تم یتیم ہوگئے۔ ہمارا دوست آغا تقی ہم سے روٹھ کر وہاں چلا گیا جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔"

مرزا انہی کے ہاتھوں میں بکھر کر رہ گیا۔ جب ذرا آنکھوں تلے کا اندھیرا رخصت ہوا' اس نے باپ کی لاش کو آنگن میں رکھا دیکھا۔

یہ حادثہ ایسا نہیں تھا جسے وہ آسانی سے بھول جاتا۔ آغا تقی اس کے لیے باپ بھی تھے' استاد بھی اور دوست بھی۔

سوانحی خاکہ

نام	مرزا محمد ہادی
تخلص	مرزا' رسوا
ولدیت	آغا محمد تقی
تعلیم	بی اے' پی ایچ ڈی (اعزازی)
اولاد	دو بیٹے' ایک بیٹی
پیدائش	لکھنؤ
تاریخ پیدائش	۱۸۵۷ء
وفات	۲۱ اکتوبر ۱۹۳۱ء
مدفن	مرلی دھر باغ' حیدر آباد (دکن) کے قریب قبرستان میں۔

اس کے لیے تین موتیں ایک ساتھ ہوئی تھیں۔ باپ کے مرتے ہی گھرداری کا بار بھی اسی پر آن پڑا تھا۔ ماں کی حالت ایسی تھی کہ دیکھی نہ جاتی تھی۔ باپ کا صدمہ ذرا کم ہوا تھا کہ ماں نے پلنگ پکڑ لیا۔ ماں کی تیمارداری میں ایسا مصروف ہوا کہ پڑھنا لکھنا سب جاتا رہا۔ کون سی کتاب کہاں پڑی ہے' اسے تو یہ ہوش بھی نہیں رہا۔ ایک شاعری تھی جو اسے سہارا دے رہی تھی۔ رات کو وہ ماں کی تیمارداری کے لیے جاگتا تو وقت گزاری کے لیے غزلوں سے باتیں کرتا رہتا۔ اس بہانے غزلوں کا اچھا خاصا سرمایہ اس کے پاس جمع ہوگیا البتہ گھر کا سرمایہ کم ہوتا جارہا تھا۔ ماموں اور خالہ نے کچھ دن تو ساتھ دیا' پھر انہوں نے بھی ہاتھ کھینچ لیا۔ اتنی آمدنی کہاں ہے جتنے اخراجات اور ہورہے ہیں۔

ماں کے علاج کے لیے رقم کی ضرورت تھی اور رشتے داروں نے منہ پھیر لیا تھا۔ ماں کو یہ حالات بتانا مناسب نہیں تھا۔ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے غیرت آتی تھی۔ وہ صبر کیے بیٹھا تھا لیکن جب باہر کی آمدنی بالکل موقوف ہوگئی تو گھر کا اثاثہ فروخت کرنے کی نوبت آگئی۔ یہاں تک کہ سونے چاندی کا اسباب سب بک گیا۔ تانبے کے برتنوں کی باری آگئی۔ وہ بھی ایک ایک کرکے بک گئے۔ یہاں تک کہ سوائے دو تین پتیلیوں اور دو لوٹوں کے کچھ باقی نہ رہا۔ ایک دن ماں کی طبیعت کچھ سنبھلی تو بھرا گھر خالی دیکھا۔ وہ تو ڈر ہی گئی کہ ذری آنکھ لگی تھی شاید چوری ہوگئی۔

"محمد ہادی' یہ سب سامان کہاں گیا؟"

"کہیں نہیں گیا۔ یہاں حفاظت کون کرتا' میں نے سارا سامان اسٹور میں بند کردیا ہے۔ بس آپ اچھی ہوجائیں سب سامان آجائے گا۔"

"ادھر دیکھ' میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر۔ بیٹا جھوٹ بولنے کے لیے بڑی مشق کی ضرورت ہوتی ہے اور تمہیں ابھی اتنی مشق نہیں ہوئی۔ ذرا مجھے اسٹور تک تو لے چلو میں بھی تو دیکھوں اس چھوٹی سی کوٹھری میں کتنا سامان آگیا۔"

"ڈاکٹر نے منع کیا ہے۔ بس آپ آرام سے لیٹی رہیں۔"

"میں کیا بیمار پڑی' تمہاری عادتیں ہی بدل گئیں.... اور اب تو تمہیں حکم ٹالنا بھی آگیا۔ میں کہتی ہوں مجھے اسٹور تک لے کر چلو۔"

"امی جان' کیا کریں گی وہاں جاکر' وہاں کوئی سامان نہیں ہے۔"

"کوئی سامان نہیں ہے؟ کیا ہوا میرے بھرے ہوئے گھر کو۔ کیا چوری ہوگئی؟"

مرزا کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ اب وہ کیا بتاتا کہ ہاں چوری ہوگئی۔ اور چور کوئی غیر نہیں' اس کے اپنے ہیں۔ اس کی خالہ' اس کا ماموں ہے' جنہوں نے اس نازک وقت میں آنکھیں پھیرلیں۔ چور وہ خود ہے جو تمہاری نظریں بچا بچا کر ایک ایک چیز کوڑیوں کے دام بیچتا رہا ہے۔ یہ چوری نہیں تو اور کیا ہے کہ آپ سے اجازت تک نہ لی... چور بھی تو یہی کرتا ہے' جب مالک سو جاتا ہے وہ کوئی چیز لے بھاگتا ہے۔ چوری کھلنے کے بعد جو حالت چور کی ہوتی ہے وہی اس کی تھی۔

"بول میرے لال' بولتا کیوں نہیں۔ تجھے حضرت علی اصغرؓ کا واسطہ سچ سچ بتادے بات کیا ہے۔ کیا بیت گئی تجھ پر۔"

"امی جان آپ کی حالت ایسی ہے کہ میں آپ کو کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا لیکن آپ نے ایسی ہستی کا واسطہ دے دیا ہے کہ اب میں کچھ بھی نہیں چھپا سکتا۔ آپ کی بیماری میں گھر کا سارا سامان بک گیا۔"

"کیا؟ سارا سامان بک گیا؟ تیری خالہ اور ماموں کے پاس ہمارا اتنا اثاثہ ہے' ان سے کیوں طلب نہ کیا۔"

"گیا تھا۔ ان کے پاس بھی گیا تھا مگر وہ کہتے ہیں' جب وصولی ہوگی تب دیں گے' ابھی ہمارے پاس کیا ہے۔"

"اپنی خالہ کے پاس گئے ہوتے۔ میرا تمام گہنا انہی کے پاس تو ہے۔ گھر کے برتن نہ بکتے' گہنا بک جاتا۔ جب سہاگ ہی نہ رہا تو کیسا گہنا پاتا۔ آج ہی جاؤ اور انہیں بُلا کر لاؤ' میں خود بات کروں گی۔ اب بھی کچھ نہیں گیا۔ اس غریب کو معلوم ہی نہیں ہوگا کہ گھر کے برتن بکنے کی نوبت آگئی ہے۔"

"معلوم کیسے ہوتا۔ وہ تو آکر نہیں کھڑی ہوئیں۔"

"ارے اس کی اپنی مصروفیات ہیں' نہیں آنا ہوا ہوگا۔ تم جاکر بُلا لاؤ۔ بہن ہے میری دوڑی چلی آئے گی۔"

مرزا کو اُمید تو نہیں تھی کہ وہ آئیں گی لیکن خالہ زاد بہن سے اس کی منگنی بھی ہوئی تھی اور وہ اسے پسند بھی کرتا تھا۔ یہ سوچ کر وہ خالہ کے گھر جانے کے لیے تیار ہوگیا کہ اس سے ملاقات بھی ہوجائے گی۔

خالہ کے گھر جانا اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہاں اس کی نسبت ٹھہری تھی اور پھر خالہ کا گھر تھا لیکن ادھر وہ بہت دن سے نہیں گیا تھا۔ ماں کی بیماری نے اسے کچھ یاد ہی نہیں رہنے دیا تھا لیکن اسے یہ غصہ ضرور تھا کہ اگر وہ نہیں گیا تو اسے بھی یاد نہیں آئی۔ ماں کو ساتھ لے کر آسکتی تھی۔ آخر ابّا جان کی زندگی میں آتی ہی تھی۔ انہی خیالوں سے کھیلتا ہوا وہ خالہ کے گھر تک پہنچ گیا۔ یہ گھر نہ تو اجنبی تھا اور نہ نیا۔ ہزار مرتبہ آیا گیا ہوگا لیکن آج بُری طرح دل دھڑک رہا تھا جیسے کچھ ہونے کو ہے جیسے کوئی چیز ہے جو کلیجے کو کاٹے دے رہی ہے۔ مہری نے دروازہ کھولا اور مرزا کو دیکھتے ہی پھول کی طرح کھل گئی۔

"اے میاں آؤ' اندر آجاؤ۔ آنکھیں ترس رہی تھیں تمہیں دیکھنے کو۔"

"خالہ امی ہیں۔"

"اللہ رکھے سب ہیں۔ بیگم صاحبہ بھی' چھوٹی بی بی بھی۔"

وہ ایک مختصر مگر صاف ستھری انگنائی سے گزر کر ایک ہوادار کمرے میں پہنچا۔ خالہ ایک نواڑی پلنگ پر لیٹی تھیں' قدم کی آہٹ کے ساتھ ہی اُٹھ بیٹھیں۔

"اے ہے' کلیجا دہلا دیا۔ کوئی ایسے بھی آتا ہے چور قدموں سے۔"

اس سے نمٹنے کے بعد وہ مہری پر برس پڑیں۔ "کلمو ہی' آکے خبر تو کرتی۔ کون کس حال میں لیٹا ہے۔ دل اورے پورے ہوگیا۔ ایک گلاس ٹھنڈا پانی لے کر آ۔"

خالہ کو اس نے اس رنگ میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے جان بوجھ کر غصہ طاری کررہی ہیں۔

"آؤ میاں بیٹھو۔ تم کیوں اونٹ کی طرح کھڑے ہو۔"

"میں بیٹھنے نہیں آیا۔ امی جان نے آپ کو بُلایا ہے۔"

"ارے۔ بچے' میں اس لائق ہوتی تو پہلے ہی نہ آگئی ہوتی۔ کئی دنوں سے پیٹ میں ایسی مروڑ ہے کہ نگوڑی کہیں جانے کے قابل ہی نہیں رہ گئی۔ میرے بچے تو ان کو یہیں لے آ۔"

"وہ اگر آسکتیں تو بات ہی کیا تھی۔ آپ کو تو معلوم ہے وہ کب سے صاحب فراش ہیں۔"

"ہاں یہ تو ہے لیکن آپا شروع ہی سے کم ہمت ہیں۔ ذرا سی بیماری کو بہت سمجھ لیتی ہیں۔ پھانس کو بانس سمجھنا ان کی پرانی عادت ہے۔ جلدی کیا ہے' جب ٹھیک ہوجائیں اس وقت لے آنا۔"

"نہیں' انہوں نے ابھی آپ کو بلایا ہے۔ کوئی بات کرنی ہے۔"

"لیجئے جناب' اب ہم بھی اتنے اہم ہوگئے کہ ہم سے بات کرنی ہے۔ خیر چلتی ہوں۔ ذرا مہری سے کہو' کسی سے کہہ کر یکہ منگوا دے۔"

"اچھا جی' میں چلتا ہوں' آپ آتی رہیے گا۔"

"ٹھیک ہے میں آپی آجاؤں گی۔ تم مہری سے یکے کا کہتے جانا۔"

مرزا کو خالہ کے رویے پر حیرت بھی ہورہی تھی پریشانی بھی۔ اسے وہ دن یاد آرہے تھے جب وہ اس کی ماں سے گھنٹوں سر جوڑ کر باتیں کیا کرتی تھیں۔ دانت کاٹی روٹی کھاتی تھیں' چچہ بھر خون بہانے کو ہر وقت تیار رہتی تھیں۔ یہ خالہ کو ہو کیا گیا ہے۔ انہوں نے آنکھیں کیوں بدل لیں۔ آج ایک کٹورے پانی تک کو نہیں پوچھا۔ وہ یہی سوچتا ہوا مختصر سا صحن پھر پار کرنے لگا۔ اسے یاد آیا' مہری کو یکے کے لیے تو کہا ہی نہیں۔ وہ الٹے قدموں لوٹ آیا۔ مہری نے سوچا ہوگا' وہ آیا ہے تو کچھ دیر تو بیٹھے گا لہٰذا اسے کمرے میں چھوڑ کر کام دھندے میں جٹ گئی ہوگی۔ آج منی بھی نظر نہیں آئی۔ وہ اپنی منگیتر کو اسی نام سے پکارتا تھا۔ اس کا خیال آتے ہی وہ اس کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ یہ اس کا اپنا گھر تھا' اس کی خالہ کا گھر تھا۔ اسے نہ کسی کی اجازت کی ضرورت تھی' نہ اس پر روک ٹوک تھی۔

"ہادی بھائی آپ آئے ہیں؟" منی اسے دیکھتے ہی کھل اٹھی۔

"مجھے آئے ہوئے تو بہت دیر ہوگئی۔ اب تو میں جانے والا تھا۔"

"ارے' مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں۔ مجھے کچھ شک ہوا تھا۔ میں نے مہری سے پوچھا بھی تھا مگر وہ کان بلائی کر گئی' آئیے بیٹھیے۔"

تصانیف

۱۔ معذرت سقراط ۲۔ کوائیٹو ۳۔ فیدو ۴۔ سوفسطائی ۵۔ مینو۔ تحفتہ السنّہ (پندرہ جلدیں) ۶۔ فطرۃ الاسلام ۷۔ فصوص الحکم در بحث اصول اخبار ۸۔ ایطال ریفارم ۹۔ منطق استقرائی (فارسی) ۱۰۔ مبادی علم النفس ۱۱۔ مصباح المنطقیہ ۱۲۔ حکمتہ الاشراق ۱۳۔ معاشرتی نفسیات ۱۴۔ مفتاح الفلسفہ ۱۵۔ فیدر لائیس ۱۶۔ برمانیدس ۱۷۔ اخلاق نقوماجس۔ غورجیاس۔ مرقع لیلیٰ (منظوم ڈراما)

"بیٹھ تو جاتا لیکن خالہ امی نہیں چاہتیں کہ بیٹھوں۔ ویسے بھی میں جلدی میں ہوں۔ امی جان نے خالہ امی کو بلایا تھا۔ یہی کہنے آیا تھا۔"

"یہ آپ نے اچھی کہی کہ خالہ امی نہیں چاہتیں کہ آپ بیٹھیں۔"

"ہاں' ان کے رویے سے یہی ظاہر ہوتا تھا۔"

"ارے نہیں۔ آج کل آپ پریشان ہیں' اس لیے دل ذرا چھوٹا ہوگیا ہے۔"

"تم تو مجھ سے خفا نہیں ہو؟"

"میں تو یہ تصور بھی نہیں کر سکتی۔"

"تو پھر خالہ امی کے ساتھ تم بھی آنا۔ وہ امی سے باتیں کریں گی' ہم آپ سے۔"

"بہت شریر ہیں آپ؟"

"آپ کی ملازمہ کدھر ہے؟"

"یہیں کہیں ہوگی۔"

"وہ آئے تو اس سے کہہ کر یکہ منگوالینا۔ خالہ امی نے مجھ سے یہی کہا تھا۔ اچھا' اب میں چلتا ہوں۔"

اس نے ایک مرتبہ پھر صحن پار کیا اور گھر سے نکل آیا۔

وہ ابھی گھر آکر بیٹھا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اسے یقین تھا' خالہ کے ساتھ منی بھی آئی ہوگی اس لیے تیزی سے دروازے کی طرف بھاگا لیکن فوراً ہی اس کے پھول جیسے گال مرجھا گئے۔ خالہ امی اکیلی' یکے سے اتر رہی تھیں۔ اس نے سوچا ضرور لیکن ہمت نہیں ہوئی کہ کچھ پوچھتا۔ کچھ باتیں پوچھے بغیر بھی سمجھ میں آجاتی ہیں۔

"توبہ آپا۔ بھائی صاحب کے مرتے ہی گھر میں نحوست برسنے لگی۔" خالہ نے آتے ہی نہایت بے باکی سے کہا۔

"کیا کہہ رہی ہو بہن۔ نہ دعا نہ سلام۔ آتے ہی نشتر برسانے شروع کر دیے۔ جس گھر میں ایک بیمار عورت اور ایک بچّہ ہو۔ رشتے داروں کو توفیق نہ ہو کہ کھڑے کھڑے جھانک جایا کریں‘ اس گھر میں نحوست نہیں تو کیا ہُن برسے گا۔"

"رشتے داروں کو تو الزام دو مت۔ سیدھی سیدھی مجھے ہی سُناؤ کہ میں تمہیں جھانکنے نہیں آئی۔"

"چور کی داڑھی میں تنکا ہو تو میں کیا کر سکتی ہوں۔"

"اے لو‘ اب ہم چور بھی ہو گئے۔ ہم نے تو خالی بھنڈار سے گھر کو دیکھ کر یونہی ایک بات کہہ دی تھی۔"

"ہم نے بھی تو بزرگوں کی کہاوت کو دُہرایا تھا‘ کون سا تمہیں کچھ کہہ دیا۔"

"اور کیسے کہو گی۔ پتھر پڑیں ہماری عقل پر۔ ہمیں تو تمہاری محبت کھینچ لائی اور تم ہو کہ بھگو بھگو کر جوتیاں مار رہی ہو۔"

"تم آئی نہیں ہو‘ ہم نے تمہیں بُلایا ہے۔"

"چلیے یوں ہی سہی۔ تم نے حکم کیا ہم حاضر ہو گئے۔ حکم کے غلام جو ٹھہرے۔"

"کیوں لڑنے پر تُلی بیٹھی ہو‘ میں نے تو ایک کام سے تمہیں بُلایا تھا۔"

"اب وہ کام بھی فرما دیجیے تاکہ ہم اپنے گھر کو سدھاریں آپ بھلے اپنا گھر بھلا۔ اور نہیں تو۔"

"یہ گھر کا حشر دیکھ رہی ہو"

"دیکھ تو رہی ہوں" خالہ نے بھویں چلاتے ہوئے کہا۔

"میری بیماری میں مرزا گھر کا سارا سامان بیچ چکا ہے۔"

"لکھنؤ میں جنے کتنے مرزا ہیں جنہوں نے گھر کا سامان بیچ کر کوٹھوں پر چڑھا دیا‘ ایک تمہارے ہی پوت سے کیا ہے۔"

"بس اس سے آگے ایک لفظ نہ کہنا۔ میرا بچّہ ایسا نہیں ہے۔ جانتی ہو اس نے یہ سامان کیوں بیچا۔"

"بھئی ہمیں کیا ضرورت پڑی ہے جاننے کی۔"

"لیکن ہمیں ضرورت ہے بتانے کی۔ میرا زیور میرے پاس ہوتا تو اسے بیچ کر میں اپنا علاج کرا لیتی‘ گھر کا سامان تو بچ جاتا۔ اب تم سے یہی کہنا ہے‘ میرا زیور واپس کر دو۔ بچنے کی امید تو نہیں لیکن انہیں بیچ کر میرا بچّہ میرا کفن دفن تو کر دے گا۔"

"اب کون سا زیور ہے میرے پاس؟"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ بھائی صاحب کی زندگی ہی میں‘ تم کسی شادی میں جا رہی تھیں۔ سارا زیور میں خود تمہیں دے کر گئی تھی۔"

"کیا؟"

"سچی کہہ رہی ہوں۔ اب تو ایک چھلّا بھی میرے پاس نہیں۔"

"ایسا نہ کہو بہن۔ تمہیں پنجتن کا واسطہ ایسا نہ کہو۔ وہ زیور تمہارے ہی پاس ہے لیکن اب موا ابلیس تمہیں بہکا رہا ہے۔ اس کے بہکاوے میں آ کر اپنا ایمان مت خراب کرو۔"

"اچھا تو ہم جھوٹ بول رہے ہیں۔ جب نہیں بول رہے تھے تو چلو اب بول رہے ہیں۔ ہے ہمارے پاس مگر نہیں دیتے۔"

"کیوں مجھ دُکھیا کا صبر سمیٹتی ہو۔ میں نے تم پر بھروسا کیا‘ تمہیں مختارِ کل بنایا اور تم یہ صلہ دے رہی ہو۔"

"واہ! اچھی زبردستی ہے۔ ہم نے سب لوٹا دیا تھا‘ خود ہی کہیں رکھ کر بھولی ہو گی۔"

"اب تو گھر میں کوئی ایسی چیز بھی نہیں رہ گئی جس میں چُھپا سکتی۔"

"پھر بیچ آیا ہو گا‘ وہ بھی تمہارا لاڈلا۔"

"بس کرو بہن۔ میری تقدیر کا ہوتا تو مل جاتا۔ میرے معصوم بچّے پر تو تہمت نہ لگاؤ۔"

"تم چوری کا الزام لگاؤ‘ ہم تہمت بھی نہ لگائیں۔"

"بہن‘ یہ تو خیال کرو جس پر تم تہمت لگا رہی ہو اس سے تمہاری بیٹی کی نسبت طے ہوئی ہے۔"

"اس ہوا میں نہ رہنا۔ کالے چور کو بیاہ دوں گی مگر اب یہ نہیں ہو گا۔"

"میرے بچّے نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔"

"ہمیں چور کہہ کر کیا اچھی لگو گی ہمارے دروازے پر بارات لاتی۔ بس اب اس قصے کو یہیں ختم سمجھو۔"

"نہیں بہن‘ ایسا نہ کہو۔ میری زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔ میرے بعد تم ہی میرے بچّے کی دیکھ بھال کرو گی۔ اس کا گھر بس جائے گا‘ تمہاری سرپرستی مل جائے گی‘ میری روح خوش ہو جائے گی۔ میں زیور کا تقاضا نہیں کرتی لیکن یہ نسبت ختم نہ کرو۔"

"نہیں بابا..... ہم بھر پائے۔ توبہ‘ توبہ۔ ایسا الزام۔ اس عمر میں یہ ذلت لکھی تھی سو مل گئی اور وہ بھی اپنوں کے ہاتھوں۔"

انہوں نے برقع سنبھالا اور یہ جا وہ جا۔ مرزا کی ماں اسے روکتی رہ گئی لیکن وہ کہاں رُکنے والی تھی۔ زیور بھی گیا اور

نسبت بھی ٹوٹی ہی سمجھو۔

مرزا کی ماں اس صدمے سے ایسی بیمار پڑی کہ چارپائی پر بچھ کر رہ گئی۔ پندرہ دن بھی نہیں گزرے تھے کہ بیٹے کی شادی کا ارمان دل میں لے کر دنیا سے رخصت ہو گئی۔

والدین کی زندگی ہی میں تحصیل وصول کا کام رشتے کے ماموں کے سپرد تھا۔ گاؤں مشترکہ تھے، کارگزاروں نے سرکاری بندوبست کے وقت پہلے ہی سے اپنے نام کروا لیے تھے۔ قبضے کا ثبوت ہی نہیں تھا۔ نقد اور زیورات جو بطور امانت خالہ کے پاس تھے وہ پہلے ہی جا چکے تھے البتہ خواجہ باسط کے ٹیلے پر بنے ہوئے چند مکان اور ایک باغ اس کے ہاتھ لگا۔

وہ ابھی کم عمر تھا۔ نہ اپنا بوجھ خود اُٹھا سکتا تھا اور نہ قانون کی گتھیوں میں اُلجھ سکتا تھا۔ اس اندھیرے میں اسے روشنی کی ایک کرن دکھائی دی۔ اس کرن کا نام تھا حیدر بخش جو خوش نویس تھے اور مرزا کے باپ کے دوست تھے۔ وہ ان سے ملنے میں نہ جانے کتنے دن لگا دیتا کہ حیدر بخش اس سے ملنے خود آپہنچے۔

ماں کو مرے آج چار دن ہو گئے تھے۔ دور پرے کے رشتے دار تین دن اس کا غم بانٹ کر جا چکے تھے۔ وہ اکیلے گھر میں اکیلا بیٹھا بہت سی باتوں پر ایک ساتھ سوچ رہا تھا کہ کسی نے اس کا نام لے کر اسے پکارا۔ گھر میں تھا کیا جس کی حفاظت کے لیے وہ دروازے بند کرتا۔ اس وقت بھی دروازے چوپٹ کھلے ہوئے تھے۔

"آجاؤ بھائی۔ کون صاحب ہیں۔"

جواب میں حیدر بخش اندر آگئے۔ مرزا کے لیے وہ اجنبی نہیں تھے۔ اسے وہ وقت یاد آگیا جب اس کے والد کا انتقال ہوا تھا تو حیدر بخش نے اسے گلے لگایا تھا۔ اس کے بعد بھی وہ اسے ڈھارس دینے آتے رہے تھے۔

"میاں ہم تو اسی دن آتے جب بھابی صاحبہ رخصت ہوئی تھیں لیکن بُرا ہو ہمارے کاروباری معاملوں کا۔ ہم بریلی گئے ہوئے تھے۔ آج ہی لکھنؤ پہنچے اور آج ہی اپنے بھتیجے کے پاس آگئے۔ اب تمہارا چچا تمہارے پاس ہے۔ فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

ان لفظوں میں تو کسی نے بھی اس سے ہمدردی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ ان لفظوں میں ایسا اعتماد اور ایسی اپنائیت تھی کہ مرزا کا صبر، آنسو بن کر بہنے لگا۔

"نہیں بھتیجے نہیں۔ مردوں پہ ایسے پیغمبری وقت آتے ہی رہتے ہیں۔ تم تو پھر بھی پندرہ سولہ کے ہو گئے ہو، ہم نے تو

طبع زاد ناول

۱۔ انشائے راز ۲۔ امراؤ جان ادا ۳۔ ذاتِ شریف ۴۔ شریف زادہ ۵۔ اختری بیگم

ماخوذ و ترجمہ

۱۔ خونی شہزادہ ۲۔ خونی بھید ۳۔ خونی عاشق ۴۔ خونی جورو ۵۔ خونی مصور ۶۔ بہرام کی رہائی ۷۔ طلسمات

اپنے ماں باپ کو دیکھا تک نہیں۔ اپنی زندگی خود بنائی ہے۔ تم بھی یہ آنسو پونچھو اور آئندہ کیا کرنا ہے، یہ سوچو۔"

"یہی تو سوچ رہا تھا۔"

"تو کیا سوچا؟"

"مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔"

"میاں تم ہمیں جانتے ہی نہیں۔ ہمارا تو کام ہی دوسروں کی مدد کرنا ہے۔ ہم تو غیروں کی مدد کرتے ہیں، تم تو پھر اپنے ہو۔ کہو کیا مدد درکار ہے۔"

"آپ کو معلوم ہے میری والدہ کی بہت جائیداد تھی لیکن مجھے اس میں سے کچھ نہیں ملا۔"

"کیوں بھئی کیوں نہیں ملی وہ جائداد تمہیں۔ تمہاری ہے، تمہیں ملنا چاہیے۔"

"والدہ نے جائیداد کا انتظام ہمارے ماموں کے سپرد کر دیا تھا۔ سیاہ، سپید کے مالک تھے اور اب دینے سے انکاری ہیں۔"

"ایں۔ انکاری ہیں؟ ڈگری کر دو ان پر۔"

"مگر میں کیا کر سکتا ہوں۔"

"ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔ تو میاں یوں کرتے ہیں کہ ہمارے ایک دوست وکیل ہیں۔ ان کے پاس چلے چلتے ہیں۔ دیکھیے کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی۔"

حیدر بخش مرزا کو ساتھ لے کر گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ وکیل صاحب نواب گنج میں کہیں رہتے تھے۔ ان کے گھر پہنچے تو چراغ جلنے میں کچھ ہی دیر رہ گئی تھی۔

وکیل صاحب جس انداز میں حیدر بخش سے ملے، وہ انداز بتاتا تھا کہ وکیل صاحب انہیں کوئی اچھا آدمی نہیں سمجھتے۔ مرزا کو یہ سمجھنے میں کچھ زیادہ دیر نہیں لگی۔

"اچھا تو اس کا مطلب ہے، لکھنؤ میں کوئی تم سے بڑا جعل ساز بھی پیدا ہو گیا ہے۔" وکیل صاحب نے پوری روداد سننے کے بعد کہا۔
"اللہ کی زمین بہت بڑی ہے وکیل صاحب۔"
"اپنی حرکتوں میں اللہ کو شامل کیوں کرتے ہو۔"
"بھتیجے کے سامنے تو ایسی باتیں نہ کریں۔"
"اس میں بھی تمہارا کوئی جعل ہے۔ سچ سچ بتاؤ حیدر، معاملہ کیا ہے۔"
"معاملہ وہی ہے جو میں بتا چکا۔ یتیم بچّے کی جائیداد ہے، اسے ملنی چاہیے۔"
"اس میں تمہارا کتنا حصہ ہے؟"
"بخدا میرا کوئی حصہ نہیں۔"
لیکن یہ تمہارا بھتیجا کیسے ہو گیا؟"
"کیا آپ نہیں جانتے کہ آغا تقی مجھے بھائیوں کی طرح رکھتے تھے۔"
"تو یہ آغا تقی کے صاحب زادے ہیں؟"
"تو اور کیا۔"
"بھئی وہ ایسے بھول بھکڑ آدمی تھے کہ ان کے پاس تو کاغذات بھی نہیں ہوں گے۔"
"ان کے پاس نہ سہی لیکن اس کے پاس تو ہوں گے جس نے قبضہ کیا ہے۔ عدالت اسے بلا تو سکتی ہے۔ نہ ملے جائیداد۔ سسرا کھنچا کھنچا تو پھرے۔"
"لیکن اس مقدمے کے اخراجات وغیرہ کے لیے رقم تو چاہیے ہوگی۔"
"اس کی فکر نہ کریں۔ بندوبست ہو جائے گا۔"
اس تمام گفتگو میں مرزا گونگا بنا بیٹھا رہا۔ وہ بس اتنا سمجھ سکا کہ یا تو حیدر بخش کی وکیل صاحب سے بے انتہا بے تکلفی ہے یا وہ واقعی جعل ساز ہیں جیسا کہ وکیل صاحب نے کہا۔
حیدر بخش اس کا ہاتھ پکڑ کر اس طرح وہاں سے اُٹھے جیسے ابھی پیسوں کا انتظام کرکے واپس آئیں گے۔
"لو میاں یہ مرحلہ تو طے ہوا" انہوں نے گھر سے باہر آکر کہا۔ اور ساتھ ہی قریب سے گزرتے ہوئے تانگے کو پکارا۔
"میاں، آپ ہمیں چوک تک چھوڑ آیئے گا۔"
تانگے والے نے پہلے ان کی طرف اور پھر مرزا کی طرف دیکھا اور ہاتھ کے اشارے سے تشریف رکھنے کو کہا۔
"کہاں قیام کیجیے گا؟"
"بس تم ہمیں چوک تک لے چلو، منزل ہم خود ڈھونڈ لیں گے۔"

مرزا اب اتنا بچّہ بھی نہیں تھا کہ نخاس اور پھر چوک کا مطلب بھی نہ سمجھتا ہو۔ اسے خوب اچھی طرح معلوم تھا کہ چوک کس بازار کا نام ہے۔
"چچا آپ وہاں کیوں جا رہے ہیں۔ کیا وہاں بھی کوئی وکیل رہتے ہیں۔"
"اصل وکیل تو وہیں رہتے ہیں۔ بڑے بڑوں کے گھر بک جاتے ہیں ان کی فیس ادا کرتے ہوئے البتہ تمہارے چچا کی وہاں بڑی بات ہے۔"
"لیکن وہاں تو بُرے لوگ جاتے ہیں۔"
"ارے یہ کس نے کہہ دیا۔" انہوں نے کہا۔ "بس بھائی یہیں روک دو۔"
اس سے پہلے کہ مرزا کچھ کہتا، تانگے والے نے تانگا روک دیا۔ وہ شاید بازار سے کچھ پہلے ہی اُتر گئے تھے۔ کچھ دیر ایک تنگ گلی میں چلتے رہے۔ اس کے بعد وہ بازار آگیا جس میں دن سوتے ہیں، راتیں جاگتی ہیں۔ اس وقت روشنیاں جل چکی تھیں۔ بازار میں کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ ٹیڑھے، بانکے، ترچھے، سیدھے، شہدے، مہذب، غیر مہذب، ایک دوسرے سے بے نیاز منہ اُٹھائے اس طرح چل رہے تھے جیسے چاند دیکھ رہے ہوں۔ اسی بھیڑ میں جب اس نے تام جھام پر بیٹھے کئی نامور لوگوں کو گزرتے ہوئے دیکھا تو اس کی ہمت بندھی۔ اس کا مطلب ہے یہ زیادہ بُری جگہ نہیں اور چچا جان بھی کوئی زیادہ بُرے آدمی نہیں۔ ان سے زیادہ باعزت لوگ یہاں آتے ہیں، وہ آگئے تو کیا بُرائی ہے۔
"بس میاں، یہ آگئی ہے ہماری منزل۔"
"مگر آپ یہاں کیوں آئے ہیں۔ یہ تو طوائفوں کا بازار ہے۔" مرزا نے کہا۔
"ہمیشہ کے لیے تھوڑی آگئے ہیں۔ بس ذری کی ذری رُکیں گے جب دماغ کچھ سوچنے کے قابل ہوگا تو پھر کچھ سوچیں گے۔"
دروازہ کُھلا ہوا تھا۔ تھوڑی دور پر زینہ تھا۔ وہ حیدر بخش کے ساتھ ساتھ زینہ چڑھ کر اوپر پہنچ گیا۔
"میاں جلدی قدم اٹھاؤ، تمہیں ایک چیز سے ملوائیں گے ابھی مجرا شروع نہیں ہوا، مجرا شروع ہو گیا تو ملاقات مشکل ہو جائے گی۔"
چچا جان کی ہدایت پر وہ تیز تیز چلنے لگا۔ مکان کے صحن میں سے ہو کر صدر دالان کے داہنی طرف ایک وسیع کمرا بنا ہوا تھا۔ حیدر بخش بغیر اجازت ہی مرزا کا ہاتھ پکڑ کر کمرے

مرزا کے چند احباب

جسٹس سید محمود، شبلی نعمانی، حالی، مولانا ابوالکلام آزاد، منشی سجاد حسین (ایڈیٹر اودھ پنچ) عبدالحلیم شرر، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، ڈاکٹر ضیاء الدین وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ممتاز حسین عثمانی، مرزا جعفر حسین، چکبست، ناطق لکھنوی، صفی، ثاقب فانی، جلال لکھنوی، نفیس۔

مثنویاں

مثنوی امید و بیم۔ مثنوی نالۂ رسوا۔
مثنوی نو بہار۔ مثنوی لذتِ فنا۔

میں داخل ہوگئے۔ کمرے میں نہایت شاندار بڑھیا بیٹھی تھی۔ رنگ تو سانولا تھا لیکن ایسی جامہ زیب کہ کم از کم مرزا نے تو ایسی عورت نہیں دیکھی تھی۔ بالوں کے آگے کی لٹیں سفید ہوگئی تھیں لیکن اس کے سانولے رنگ پر یہ بھی بڑی بھلی معلوم ہو رہی تھیں۔ ململ کا باریک، چُنا ہوا سفید دوپٹا، اودے مشروع کا پاجامہ بڑے بڑے پائینچے۔ ہاتھوں میں موٹے موٹے سونے کے کڑے کلائیوں میں پھنسے ہوئے۔ کنول روشن تھے، بڑا سا نقشی پاندان آگے کھلا ہوا رکھا تھا۔ وہ عورت پیچوان پی رہی تھی، سامنے ایک لڑکی ناچ رہی تھی۔ ان کے جاتے ہی ناچ موقوف ہوگیا۔ عورت نے غلافی آنکھوں سے پہلے مرزا کی طرف دیکھا پھر حیدر بخش کی طرف اور بے اختیار ہنسنے لگی۔ اس بے حجابی سے کسی عورت کو ہنستے ہوئے مرزا نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔

"حیدر بخش تمہیں کیا ہوگیا ہے۔ یہاں لوگ کم سن چھوکریوں کو...... اُٹھا کر لاتے ہیں، تمہیں یہ لڑکا ملا۔ کیا ہمارے حقے کی چلم بھرنے کے لیے ہمارے عاشق زار حکیم تانگے کم ہیں کہ انہیں بھی......" اس نے ہنستے ہنستے کہا اور پھر ہنسنے لگی۔

"تم غلط سمجھیں خانم جان، یہ ہمارے بھتیجے ہیں مرزا محمد ہادی۔"

"ارے غضب ہوگیا۔ میں نہ جانے کیا کچھ کہہ گئی۔ آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ آتے ہی کیوں نہ بتادیا۔ صاحب زادے کیا سوچتے ہوں گے۔"

"سوچنا کیا ہے، ہمارے ساتھ لگے چلے آئے۔ اب جو بھی سُنیں۔"

"پھر بھی۔ ابھی بچّہ ہے لانا ہی تھا تو دن میں لاتے۔ اب تو مجرے کا وقت ہونے کو ہے۔"

"اسی لیے تو اس وقت لائے ہیں۔ برخوردار شاعری کرتے ہیں، مجرا بھی تو سُنیں۔"

"ارے جم جم سُنیں۔ آپ چل کر بیٹھیں۔ مہمان آنا شروع ہوگئے ہوں گے، میں لڑکیوں کو لے کر وہیں آتی ہوں۔"

حیدر بخش نے خانم جان کی دی ہوئی گلوری منہ میں رکھی اور مرزا کو لے کر کمرے سے باہر نکل آیا۔

مکان نہایت وسیع تھا جس میں بہت سے کمرے تھے۔ یہ کمرے خانم جان کی نوچیوں کے لیے تھے۔ ہر کمرے سے ہنسی مذاق، گانے بجانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ مکان کیا تھا پرستان تھا۔ مرزا گھبرا بھی رہا تھا اور یہاں سے جانے کو جی بھی نہیں چاہتا تھا۔

پورا مکان پھلانگنے کے بعد وہ بارہ دری میں پہنچے۔ صاف ستھرا فرش، ایرانی قالین، زربفت کے مسند اور تکیے۔ بیش قیمت شیشہ آلات کی روشنی سے رات میں دن نکلا ہوا تھا۔ یہاں مجرا ہونا تھا۔ عطر اور پھولوں کی خوشبو سے تمام بارہ دری بسی ہوئی تھی۔ مہمان آچکے تھے، سازندے ساز جوڑ رہے تھے۔ مرزا ڈرا سہا، حیدر بخش سے لگا ہوا ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ وہ سمجھ رہا تھا، یہ جو بڈھے کھوسٹ ساز بجا رہے ہیں، یہی مجرا ہے۔ اس کا دل گھبرانے لگا۔ اس سے تو وہ عورت ہی اچھی تھی جس کے پاس چچا جان مجھے لے کر گئے تھے۔ وہ ابھی پوری طرح گھبرانے بھی نہیں پایا تھا کہ خانم جان محفل کی جان بن کر داخل ہوئی۔ ابھی تسلیمات کی چاندی بکھیر کر بیٹھی ہی تھی کہ جیسے سونے کے تھال میں اشرفیاں سج کر آگئیں۔ بوٹا سا قد چھریرا بدن، نازک نازک ہاتھ پاؤں، ایک لڑکی ہوا کے جھونکے کی طرح اندر آئی اور خوشبو کی طرح خانم جان کے پہلو میں سماگئی۔ یہ مرزا کی ہم عمر ہوگی اس لیے مرزا کی دلچسپی لازمی تھی لیکن اہلِ محفل بھی جیسے لوٹ پوٹ تھے۔

"خانم جان اب کیا دیر ہے۔" کسی نے تقاضا کیا۔

"نواب صاحب، اتنی جلدی تو موئے انگریز بھی لکھنؤ میں نہیں آگئے تھے جتنی جلدی آپ کو ہے۔" خانم جان نے کہا۔

"خانم جان، ان کے سامنے نواب واجد علی شاہ تھے، یہ آپ کی نواسی اختری بیگم نہیں تھیں ورنہ وہ بھی جلدی کرتے۔"

"چلیئے ہم آپ کو زیادہ انتظار نہیں کراتے۔ بچّی نے سانس لے لی۔ گھنگرو کس لیے بس اب بجلی کوندنے ہی والی ہے۔"

اور واقعی بجلی کوندنے لگی۔ وہ رقص کرنے کھڑی ہوئی تو یہ معلوم ہوا جیسے پوری محفل اس کے احترام میں کھڑی ہوگئی ہو۔ رقص میں کوئی خاص بات نہیں تھی، جو خوبی تھی اس کی کم سنی میں تھی۔ وہ تلوار کی طرح لہرا رہی تھی لیکن اسے تلوار کہنا اس کی عمر پر سجتا نہیں تھا۔

"میاں، یہ جو رقص کررہی ہے اس رقص کو گت کہتے ہیں، رنگ پہ محفل تو اس کے بعد آئے گی جب یہ غزل گائے گی۔" حیدر بخش نے سرگوشی کی۔ مرزا رقص کرنے والی کو آنکھوں سے دل میں اُتار رہا تھا۔ گھونٹ گھونٹ پی رہا تھا کہ حیدر بخش کی اس سرگوشی نے اسے اس طرح چونکا دیا جیسے پیتے پیتے کسی کو پھندا لگ جائے۔ گت ختم ہوئی اور ناچنے والی نے غزل چھیڑدی۔ یہ معلوم ہوا جیسے گھٹا گھر کر آئی تھی اور اب بوندیں برسنے لگیں۔

آج اس بزم میں وہ جلوہ نما ہوتا ہے
دیکھیے دیکھیے اِک آن میں کیا ہوتا ہے

مرزا کو یوں لگا جیسے اس نے یہ مطلع اسی کے لیے پڑھا ہے۔ آج اس بزم میں وہی جلوہ نما ہوا تھا۔ پھر تو جیسے پوری غزل ہی اس کے لیے بنی تھی۔ غزل ختم ہوگئی اور وہ ابھی تک مطلع میں اُلجھا ہوا تھا۔

"آؤ میاں، اب چلیں" حیدر بخش نے دو تین چیزیں سُننے کے بعد کہا۔

اس کا جی تو نہیں چاہتا تھا لیکن ضد کرکے ٹھہرنا بھی خلافِ تہذیب تھا۔ اسے بادل ناخواستہ اُٹھنا پڑا۔

"بھائی اب جاکر دماغ کام کرنے کے لائق ہوا ہے لیکن اب وقت بہت ہوگیا ہے، میں کل تمہیں تفصیل بتاؤں گا۔ اس وقت آرام کرو۔" حیدر بخش نے اسے گھر چھوڑنے کے بعد کہا اور مرزا دوسرے دن کے انتظار میں جاگنے لگا۔

مرزا رات بھر اختری بیگم کو اپنے سامنے ناچتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس کا گدرایا ہوا بدن، نازک نازک پاؤں جن میں گھنگرو بندھے ہوئے۔ آواز کا لوچ اور پھر شاعری کا ستھرا ذوق صبح تک اس کے تصور میں مسکراتا رہا۔

صبح ہوتے ہی حیدر بخش پھر آگئے۔ وہ اپنے خیالوں کی راج سبھا میں براجمان تھا لیکن حیدر بخش کو دیکھتے ہی اسے اپنی جائیداد کا خیال آگیا۔

"چچا کوئی ترکیب سوچی؟"

"سوچنا کیا ہے، وہ تو کل ہی طے ہوگیا تھا۔ تم یہ بتاؤ کچھ جمع پونجی ہے؟"

"جمع پونجی؟ مگر وہ کیوں"

"بھئی تمہارے ماموں پر مقدمہ کرنا ہے۔ اس کے لیے رقم تو چاہیے ہوگی۔"

"جمع پونجی کہاں، اب تو گھر میں برتن بھی نہیں ہیں۔"

"پھر تو بہت مشکل ہے۔ آج کل میرا ہاتھ بھی تنگ ہے۔"

"چچا، ایک ترکیب ہے۔ خواجہ باسط کے ٹیلے پر ہمارے کچھ مکان ہیں جو ہم نے کرائے پر دے رکھے ہیں۔ ان میں سے ایک مکان اگر بیچ دیا جائے تو مقدمے کا خرچ نکل سکتا ہے۔"

حیدر بخش کچھ دیر سر جھکا کر اس نئی ترکیب پر سوچتے رہے لیکن شاید وہ بھی کچھ اس قسم کا خیال دل میں لے کر آئے تھے۔ رسمی تکلّف کے بعد وہ تیار ہوگئے۔ مرزا کو بھی امید تھی کہ ایک مکان بکے گا لیکن وہ گاؤں جو ماموں کے قبضے میں ہیں واگزاشت ہوجائیں گے، پھر ایک کیا ایسے ایسے دس مکان خریدے جاسکتے ہیں۔

ایک مکان خالی پڑا تھا۔ حیدر بخش کی کوششوں سے مرزا نے اسے فروخت کردیا۔ اور مقدمہ قائم ہوگیا۔ مقدمے میں جان ہی نہیں تھی۔ کارگزاروں نے سرکاری بندوبست کے وقت پہلے ہی سے اپنے نام پر تمام جائیداد منتقل کروالی تھی۔ والدہ کا قبضہ ہی ثابت نہ ہوسکا۔ کچھ دن وہ حیدر بخش کے ساتھ عدالت کے چکر کاٹتا رہا، پھر مایوس ہوکے گھر بیٹھ گیا۔ مقدمے کا کوئی فائدہ تو خیر کیا ہوتا، البتہ نقصان ہوا کہ رہے سہے رشتے داروں نے بھی آنکھیں پھیرلیں۔

اسے ایک مرتبہ پھر خانم جان کا گھر یاد آیا۔ اختری بیگم کی تصویر آنکھوں میں پھر گئی۔ حیدر بخش کے توسط سے وہ دو ایک مرتبہ اختری بیگم کے دیدار سے فیض یاب بھی ہو آیا لیکن پھر یہ محفل اُجڑ گئی۔ حیدر بخش جعل ساز تو تھے ہی، کسی کے ساتھ فراڈ کیا اور دھر لیے گئے۔ مرزا کا یہ سہارا بھی چھن گیا۔

سر پہ کوئی سرپرست تو تھا نہیں اور پھر لکھنؤ کا آزادانہ ماحول۔ حیدر بخش نے ایک زینہ دکھا ہی دیا تھا۔ حیدر بخش کے جیل جاتے ہی، وہ یہ زینہ پھر چڑھ گیا۔

"آپ کی اداؤں نے تو مجھے ایسا فریفتہ کردیا ہے کہ آپ کو دیکھے بغیر چین ہی نہیں آتا۔" مرزا نے پہلی ہی ملاقات میں اختری بیگم کے سامنے گویا دل کھول کر رکھ دیا۔

"بندی کس قابل ہے۔" اختری بیگم نے تسلیم کرتے ہوئے کہا۔

"ایاز کی قدر تو محمود کو معلوم ہے۔"

"لیکن ابھی تو آپ کم عمر ہیں۔"

"آپ سے سال دو سال بڑا ہی ہوں گا۔"

"میری بات تو رہنے دیجئے۔ میں جہاں ہوں وہاں بچے پیدا ہوتے ہی جوان ہو جاتے ہیں۔"

"میں بھی بے سہارا ہوں۔ ایسے بچے بھی جلدی جوان ہو جاتے ہیں۔"

"شاید خانم آ رہی ہیں۔" اختری نے گھبرا کر کہا۔

خوشبو کے جھونکے کی طرح خانم اندر داخل ہوئی... اور ٹھنک کر ایک جگہ جم گئی۔

"اوئی' بھری دوپہر میں تمہارے پاس کون صاحبزادے آئے ہیں۔"

"یہ وہی ہیں جو چچا حیدر بخش کے ساتھ آیا کرتے تھے۔"

"اے ہاں' یہ تو میں کہوں انہیں میں نے کہاں دیکھا ہے۔"

"آپ ہمارے عشق کا دعویٰ لے کر آئے ہیں۔" اختری بیگم نے اٹھلاتے ہوئے کہا۔

"میں صدقے' میں قربان۔ اس عمر میں اور یہ تیور۔ میاں کون سی ریاست کے نواب ہو۔" خانم نے کہا۔

"یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ میں نواب ہوں۔"

"تو پھر یہاں کیا لینے آئے ہیں آپ۔"

"جب چچا حیدر بخش کے ساتھ آیا تھا' اس وقت تو آپ نے یہ نہیں کہا تھا۔"

"وہ مجرا سننے آئے تھے' اختری کو نوکر رکھنے نہیں آئے تھے۔ آپ بھی مجرے میں آ جایئے گا اور جو دو چار روپے ہوں نچھاور کر دیجئے گا بلکہ ہمارا مشورہ تو یہ ہے کہ مجرے میں بھی نہ آیئے گا۔ ابھی آپ کی عمر اس قابل نہیں۔ اب آپ جا سکتے ہیں۔ جایئے اور پڑھنے لکھنے میں دل لگایئے۔"

اس کے بعد وہاں ٹھہرنے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ اس نے ایک نظر اختری بیگم کو دیکھا جیسے کہہ رہا ہو اب بھی روک لو' چلا گیا تو پھر نہیں آؤں گا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

اس روز اس نے اپنی حالت پر بہت غور کیا۔ خانم جان کا یہ جملہ اسے بار بار یاد آ رہا تھا' جایئے اور پڑھنے لکھنے میں دل لگایئے۔ اسے یاد آیا' باپ کے مرنے کے بعد وہ تعلیم کی طرف سے بالکل غافل ہو گیا ہے۔ ایک طوائف تک اسے طعنہ دے رہی ہے۔ اسے پھر سے تعلیم کی طرف متوجہ ہونا

غزل

اور تو سب تری محفل میں جے بیٹھے ہیں
بار بار اٹھنے کو کہتا ہے ہمیں سے کوئی
سائلوں کے لیے اب کوئی سزا ہو تجویز
جانتے ہو کہ نہ مانے گا نہیں سے کوئی
بے خودی میں یہی ہر ایک سے کہہ دیتا ہوں
پوچھ لے جا کے مرا حال انہی سے کوئی
خاک میں تو نے ملایا ہے کہاں مرزا کو
حیف اتنا بھی نہ پوچھے گا زمیں سے کوئی

چاہیے۔ وہ اسی روز اپنے چچا کے گھر منتقل ہو گیا تاکہ سکون سے اپنا تعلیمی سفر جاری رکھ سکے۔ مکانوں کا جو کرایہ آتا تھا' وہ اس کے تعلیمی اخراجات کے لیے کافی تھا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر انہی اساتذہ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ جن سے وہ باپ کی زندگی میں تعلیم حاصل کرتا رہا تھا۔

مولانا محمد یحییٰ لکھنوی عربی کے بڑے عالم تھے۔ مرزا باپ کی زندگی میں ان کے درس میں شامل رہ چکا تھا۔ اب جو پڑھنے کی طرف مائل ہوا تو اسے یحییٰ لکھنوی کی یاد آئی۔ وہ ان کے پاس پہنچ گیا۔ اس دریا دل عالم کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا جب کہ وہ اس کے شوق اور حافظے کی قوت سے واقف تھے۔ قوی حافظہ عربی کی تعلیم میں بے حد مفید ثابت ہوتا ہے۔ یحییٰ لکھنوی اسے دیکھتے ہی کھل اٹھے۔

"مجھے معلوم تھا' تم ضرور آؤ گے۔ آخر کس باپ کے بیٹے ہو۔ علم ہی تمہاری منزل ہے۔" انہوں نے کہا اور اسے حلقۂ درس میں شامل کر لیا۔

اب اس کی زندگی اک نئی ڈگر پر چل نکلی تھی۔ وہ حصولِ علم میں ایسا مصروف تھا کہ اختری بیگم کی یاد سے بھی غافل ہو گیا تھا۔ اس کی محویت پر یحییٰ لکھنوی کو ناز تھا۔

"تمہارا مزاج منطق سے بہت مطابقت رکھتا ہے۔ تم ایسا کرو خالی اوقات میں مولانا کمال الدین موہانی سے منطق پڑھ لیا کرو۔ وہ اس علم میں مہارتِ کامل رکھتے ہیں۔" یحییٰ لکھنوی نے اسے مشورہ دیا۔

اب وہ مولانا کمال الدین سے منطق پڑھ رہا تھا۔ تھوڑے ہی دن میں وہ ایسے ایسے نکتے تلاش کرنے لگا کہ خود استاد کو عاجز کر دیا کرتا تھا۔ کوئی مسئلہ ہوتا' وہ اس طرح دلائل کا جال بُنتا کہ فیصلہ اپنے حق میں کر لیتا۔

"چلیے ہم آپ کو زیادہ انتظار نہیں کراتے۔ بچّی نے سانس لے لی۔ گھنگرو کس لیے بس اب بجلی کوندنے ہی والی ہے۔"

اور واقعی بجلی کوندنے لگی۔ وہ رقص کرنے کھڑی ہوئی تو یہ معلوم ہوا جیسے پوری محفل اس کے احترام میں کھڑی ہوگئی ہو۔ رقص میں کوئی خاص بات نہیں تھی' جو خوبی تھی اس کی کم سنی میں تھی۔ وہ تلوار کی طرح لہرا رہی تھی لیکن اسے تلوار کہنا اس کی عمر پر سجتا نہیں تھا۔

"میاں' یہ جو رقص کررہی ہے اس رقص کو گت کہتے ہیں' رنگ پہ محفل تو اس کے بعد آئے گی جب یہ غزل گائے گی۔" حیدر بخش نے سرگوشی کی۔ مرزا رقص کرنے والی کو آنکھوں سے دل میں اُتار رہا تھا۔ گھونٹ گھونٹ پی رہا تھا کہ حیدر بخش کی اس سرگوشی نے اسے اس طرح چونکا دیا جیسے پیتے پیتے کسی کو پھندا لگ جائے۔ گت ختم ہوئی اور ناچنے والی نے غزل چھیڑ دی۔ یہ معلوم ہوا جیسے گھٹا گھر کر آئی تھی اور اب بوندیں برسنے لگیں۔

آج اس بزم میں وہ جلوہ نما ہوتا ہے
دیکھیے دیکھیے اِک آن میں کیا ہوتا ہے

مرزا کو یوں لگا جیسے اس نے یہ مطلع اسی کے لیے پڑھا ہے۔ آج اس بزم میں وہی جلوہ نما ہوا تھا۔ پھر تو جیسے پوری غزل ہی اس کے لیے بنی تھی۔ غزل ختم ہوگئی اور وہ ابھی تک مطلع میں اُلجھا ہوا تھا۔

"آؤ میاں' اب چلیں" حیدر بخش نے دو تین چیزیں سُننے کے بعد کہا۔

اس کا جی تو نہیں چاہتا تھا لیکن ضد کر کے ٹھہرنا بھی خلافِ تہذیب تھا۔ اسے بادل ناخواستہ اُٹھنا پڑا۔

"بھائی اب جاکر دماغ کام کرنے کے لائق ہوا ہے لیکن اب وقت بہت ہوگیا ہے' میں کل تمہیں تفصیل بتاؤں گا۔ اس وقت آرام کرو۔" حیدر بخش نے اسے گھر چھوڑنے کے بعد کہا اور مرزا دوسرے دن کے انتظار میں جاگنے لگا۔

مرزا رات بھر اختری بیگم کو اپنے سامنے ناچتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس کا گدرایا ہوا بدن' نازک نازک پاؤں جن میں گھنگرو بندھے ہوئے۔ آواز کا لوچ اور پھر شاعری کا ستھرا ذوق صبح تک اس کے تصور میں مسکراتا رہا۔

صبح ہوتے ہی حیدر بخش پھر آگئے۔ وہ اپنے خیالوں کی راج سبھا میں براجمان تھا لیکن حیدر بخش کو دیکھتے ہی اسے اپنی جائیداد کا خیال آگیا۔

"چچا کوئی ترکیب سوچی؟"

"سوچنا کیا ہے' وہ تو کل ہی طے ہوگیا تھا۔ تم یہ بتاؤ کچھ جمع پونجی ہے؟"

"جمع پونجی؟ مگر وہ کیوں"

"بھئی تمہارے ماموں پر مقدمہ کرنا ہے۔ اس کے لیے رقم تو چاہیے ہوگی۔"

"جمع پونجی کہاں' اب تو گھر میں برتن بھی نہیں ہیں۔"

"پھر تو بہت مشکل ہے۔ آج کل میرا ہاتھ بھی تنگ ہے۔"

"چچا' ایک ترکیب ہے۔ خواجہ باسط کے ٹیلے پر ہمارے کچھ مکان ہیں جو ہم نے کرائے پر دے رکھے ہیں۔ ان میں سے ایک مکان اگر بیچ دیا جائے تو مقدمے کا خرچ نکل سکتا ہے۔"

حیدر بخش کچھ دیر سر جھکا کر اس نئی ترکیب پر سوچتے رہے لیکن شاید وہ بھی کچھ اسی قسم کا خیال دل میں لے کر آئے تھے۔ رسمی تکلّف کے بعد وہ تیار ہوگئے۔ مرزا کو بھی امید تھی کہ ایک مکان بکے گا لیکن وہ گاؤں جو ماموں کے قبضے میں ہیں واگزاشت ہوجائیں گے' پھر ایک کیا ایسے ایسے دس مکان خریدے جاسکتے ہیں۔

ایک مکان خالی پڑا تھا۔ حیدر بخش کی کوششوں سے مرزا نے اسے فروخت کردیا۔ اور مقدمہ قائم ہوگیا۔ مقدمے میں جان ہی نہیں تھی۔ کارگزاروں نے سرکاری بندوبست کے وقت پہلے ہی سے اپنے نام پر تمام جائیداد منتقل کروالی تھی۔ والدہ کا قبضہ ہی ثابت نہ ہوسکا۔ کچھ دن وہ حیدر بخش کے ساتھ عدالت کے چکر کاٹتا رہا' پھر مایوس ہوکے گھر بیٹھ گیا۔ مقدمے کا کوئی فائدہ تو خیر کیا ہوتا' الٹا یہ نقصان ہوا کہ رہے سہے رشتے داروں نے بھی آنکھیں پھیر لیں۔

اسے ایک مرتبہ پھر خانم جان کا گھر یاد آیا۔ اختری بیگم کی تصویر آنکھوں میں پھر گئی۔ حیدر بخش کے توسط سے وہ دو ایک مرتبہ اختری بیگم کے دیدار سے فیض یاب بھی ہو آیا لیکن پھر یہ محفل اُجڑ گئی۔ حیدر بخش جعل سازیے تو تھے ہی' کسی کے ساتھ فراڈ کیا اور دھر لیے گئے۔ مرزا کا یہ سہارا بھی چھن گیا۔

سر پہ کوئی سرپرست تو تھا نہیں اور پھر لکھنؤ کا آزادانہ ماحول۔ حیدر بخش نے ایک زینہ دکھا ہی دیا تھا۔ حیدر بخش کے جیل جاتے ہی' وہ یہ زینہ پھر چڑھ گیا۔

"آپ کی اداؤں نے تو مجھے ایسا فریفتہ کردیا ہے کہ آپ کو دیکھے بغیر چین ہی نہیں آتا۔" مرزا نے پہلی ہی ملاقات میں اختری بیگم کے سامنے گویا دل کھول کر رکھ دیا۔

"بندی کس قابل ہے۔" اختری بیگم نے تسلیم کرتے ہوئے کہا۔

"ایاز کی قدر تو محمود کو معلوم ہے۔"

"لیکن ابھی تو آپ کم عمر ہیں۔"

"آپ سے سال دو سال بڑا ہی ہوں گا۔"

"میری بات تو رہنے دیجئے۔ میں جہاں ہوں وہاں بچے پیدا ہوتے ہی جوان ہو جاتے ہیں۔"

"میں بھی بے سہارا ہوں۔ ایسے بچے بھی جلدی جوان ہو جاتے ہیں۔"

"شاید خانم آرہی ہیں۔" اختری نے گھبرا کر کہا۔

خوشبو کے جھونکے کی طرح خانم اندر داخل ہوئی۔۔۔اور ٹھٹک کر ایک جگہ جم گئی۔

"اوئی، بھری دوپہر میں تمہارے پاس کون صاحبزادے آئے ہیں۔"

"یہ وہی ہیں جو چچا حیدر بخش کے ساتھ آیا کرتے تھے۔"

"اے ہاں، یہ تو میں کہوں انہیں میں نے کہاں دیکھا ہے۔"

"آپ ہمارے عشق کا دعویٰ لے کر آئے ہیں۔" اختری بیگم نے اٹھلاتے ہوئے کہا۔

"میں صدقے، میں قربان۔ اس عمر میں اور یہ تیور۔ میاں کون سی ریاست کے نواب ہو۔" خانم نے کہا۔

"یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ میں نواب ہوں۔"

"تو پھر یہاں کیا لینے آئے ہیں آپ۔"

"جب چچا حیدر بخش کے ساتھ آیا تھا، اس وقت تو آپ نے یہ نہیں کہا تھا۔"

"وہ مجرا سننے آئے تھے، اختری کو نوکر رکھنے نہیں آئے تھے۔ آپ بھی مجرے میں آجایئے گا اور جو دو چار روپے ہوں نچھاور کر دیجئے گا بلکہ ہمارا مشورہ تو یہ ہے کہ مجرے میں بھی نہ آیئے گا۔ ابھی آپ کی عمر اس قابل نہیں۔ اب آپ جا سکتے ہیں۔ جایئے اور پڑھنے لکھنے میں دل لگایئے۔"

اس کے بعد وہاں ٹھہرنے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ اس نے ایک نظر اختری بیگم کو دیکھا جیسے کہہ رہا ہو اب بھی روک لو، چلا گیا تو پھر نہیں آؤں گا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

اس روز اس نے اپنی حالت پر بہت غور کیا۔ خانم جان کا یہ جملہ اسے بار بار یاد آرہا تھا، جایئے اور پڑھنے لکھنے میں دل لگایئے۔ اسے یاد آیا، باپ کے مرنے کے بعد وہ تعلیم کی طرف سے بالکل غافل ہو گیا ہے۔ ایک طوائف تک اسے طعنہ دے رہی ہے۔ اسے پھر سے تعلیم کی طرف متوجہ ہونا

غزل

اور تو سب تری محفل میں جمے بیٹھے ہیں
بار بار اُٹھنے کو کہتا ہے ہمیں سے کوئی
سائلوں کے لیے اب کوئی سزا ہو تجویز
جانتے ہو کہ نہ مانے گا نہیں سے کوئی
بے خودی میں یہی ہر ایک سے کہہ دیتا ہوں
پوچھ لے جا کے مرا حال انہی سے کوئی
خاک میں تو نے ملایا ہے کہاں مرزا کو
حیف اتنا بھی نہ پوچھے گا زمیں سے کوئی

چاہیے۔ وہ اسی روز اپنے چچا کے گھر منتقل ہو گیا تاکہ سکون سے اپنا تعلیمی سفر جاری رکھ سکے۔ مکانوں کا جو کرایہ آتا تھا، وہ اس کے تعلیمی اخراجات کے لیے کافی تھا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر انہی اساتذہ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ جن سے وہ باپ کی زندگی میں تعلیم حاصل کرتا رہا تھا۔

مولانا محمد یحییٰ لکھنوی عربی کے بڑے عالم تھے۔ مرزا باپ کی زندگی میں ان کے درس میں شامل رہ چکا تھا۔ اب جو پڑھنے کی طرف مائل ہوا تو اسے یحییٰ لکھنوی کی یاد آئی۔ وہ ان کے پاس پہنچ گیا۔ اس دریا دل عالم کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا جب کہ وہ اس کے شوق اور حافظے کی قوت سے واقف تھے۔ قوی حافظہ عربی کی تعلیم میں بے حد مفید ثابت ہوتا ہے۔ یحییٰ لکھنوی اسے دیکھتے ہی کھل اٹھے۔

"مجھے معلوم تھا، تم ضرور آؤ گے۔ آخر کس باپ کے بیٹے ہو۔ علم ہی تمہاری منزل ہے۔" انہوں نے کہا اور اسے حلقۂ درس میں شامل کر لیا۔

اب اس کی زندگی اک نئی ڈگر پر چل نکلی تھی۔ وہ حصولِ علم میں ایسا مصروف تھا کہ اختری بیگم کی یاد سے بھی غافل ہو گیا تھا۔ اس کی محویت پر یحییٰ لکھنوی کو ناز تھا۔

"تمہارا مزاج منطق سے بہت مطابقت رکھتا ہے۔ تم ایسا کرو خالی اوقات میں مولانا کمال الدین موہانی سے منطق پڑھ لیا کرو۔ وہ اس علم میں مہارتِ کامل رکھتے ہیں۔" یحییٰ لکھنوی نے اسے مشورہ دیا۔

اب وہ مولانا کمال الدین سے منطق پڑھ رہا تھا۔

تھوڑے ہی دن میں وہ ایسے ایسے نکتے تلاش کرنے لگا کہ خود استاد کو عاجز کر دیا کرتا تھا۔ کوئی مسئلہ ہوتا، وہ اس طرح دلائل کا جال بُنتا کہ فیصلہ اپنے حق میں کر لیتا۔

ہر ذہین آدمی کی طرح اس کی طبیعت کو بھی قرار کہاں تھا۔ ابھی وہ منطق کی بھول بھلیوں سے نکلنے بھی نہیں پایا تھا کہ اسے طب پڑھنے کا شوق ہوگیا۔ طب کے اساتذہ کی لکھنؤ شہر میں کیا کمی۔ تھوڑی سی تگ و دو کے بعد اس نے مولانا غلام الحسنین کنتوری کو آمادہ کرلیا کہ وہ اسے شاگردی میں قبول کرلیں۔

مولانا کو شاعری سے بھی شغف تھا۔ لکھنؤ میں کون تھا جو شاعری کا رسیا نہیں تھا لیکن مرزا کو ان میں دلچسپی اس لیے ہوئی کہ وہ غالب کے عاشق زار تھے۔ مرزا جو خود بھی غالب کے رنگ میں شاعری کرتا تھا۔ مولانا کی صحبت نے اسے اور بھی اُکسایا۔ اب اس نے غالب کی غزلوں کو سامنے رکھ کر غزلیں کہنا شروع کردیں۔ روز ایک نئی غزل مولانا کی خدمت میں پیش ہوجاتی اور وہ اپنے ہونٹ کاٹ کر رہ جاتے۔ روزانہ ایک غزل وہ خود کہہ لیں' یہ ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ اور ایک دن جب مرزا نے قافیہ بدل کر غالب کی زمین میں یہ غزل لکھی تو مولانا اُچھل گئے۔

دردِ دل کی لذتیں صرفِ شبِ غم ہوگئیں
طولِ فرقت سے بہت بے تابیاں کم ہوگئیں
ہم نشیں دیکھی نحوست داستانِ ہجر کی
محفلیں جمنے نہ پائی تھیں کہ برہم ہوگئیں
ہم کو بھی کیا کیا مزے کی داستانیں یاد تھیں
لیکن اب تمہید ذکرِ دردِ ماتم ہوگئیں
دل یہ کہتا ہے فراقِ ماہ و انجم دیکھ کر
ہائے کیا کیا صحبتیں راتوں کو برہم ہوگئیں

○☆○

"میاں کس بے وقوف نے کہا' تم مجھ سے حکمت پڑھتے پھرو۔ جی لگا کر شاعری کرو اور لکھنؤ کے مشاعرے لوٹ لو۔"

مولانا اسے اس سے اچھی داد اور کیا دے سکتے تھے۔ انہوں نے جوشِ جذبات میں ایک بڑی حقیقت بیان کردی۔

وہ جب مطب سے گھر کی طرف آرہا تھا تو مولانا کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا' میری طبیعت میں ٹھہراؤ کیوں نہیں ہے۔ مجھ پر تھوڑے تھوڑے دن بعد ایک نیا دورہ کیوں پڑتا ہے۔ میں ایک جگہ ٹھہر کر راستے کے کانٹے کیوں نہیں چُن لیتا۔ اگر میں شاعر ہوں تو صرف شاعری کیوں نہیں کرتا۔ یہ منطق' عربی' حکمت یہ سب کیا ہے۔ وہ شاعری کی شاہ راہ پر سرپٹ دوڑنے لگا لیکن یہاں بھی اس کی لاابالی فطرت نے اس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ اس نے سیکڑوں غزلیں کہیں لیکن ایک غزل بھی اس کے پاس محفوظ نہیں تھی۔ وہ جس مشاعرے میں شریک ہوتا' غزل پڑھتا اور کاغذ کا پُرزہ وہیں چھوڑ کر اٹھ جاتا ہے۔ اب یہ صاحبِ خانہ کی مرضی پر منحصر ہوتا کہ وہ اس پرچے کو سنبھال کر رکھتے' ضائع کردیتے یا کہیں شائع کرادیتے۔

دراصل کسی کام کو اہمیت دینا مرزا کی فطرت ہی میں داخل نہیں تھا۔ وہ تو شاعری بھی اس طرح کررہا تھا جیسے کوئی روٹی کھاتا ہے۔ اہمیت دیے بغیر' محض ضرورت کے تحت۔

اس شاعری سے اتنا ہوا کہ شہر بھر کے بے فکرے شاعر اس کے دوست بن گئے۔ ان میں سے ہر ایک کو کسی نہ کسی نشے کی لت تھی' کوئی شراب کا رسیا تھا تو کوئی افیون کا عادی۔ مرزا نے بھی کچھ دن ان اڑن کھٹولوں کی سیر کی۔ انہی دوستوں کی مہربانی سے اس کے قدم ایک بار پھر طوائفوں کے رنگین مجروں کی طرف اٹھ گئے۔ اب اس کے احباب اس کی کمر تھپک رہے تھے اس لیے کسی خانم جان کی نصیحت بھی اثر انداز نہیں ہوسکتی تھی۔ اندھیرے زینوں کے اوپر روشنیوں کے کئی جھرمٹ تھے اور وہ باری باری ہر روشنی کو اپنے اندر اُتار رہا تھا۔ وہ فطرتاً طالب علم تھا' محض تماش بین نہیں تھا۔ اس نے اس مدرسے کو بھی اپنی تعلیم کا ذریعہ بنالیا۔ کہیں ستار بجانا سیکھ لیا' کہیں کسی راگ کو سیکھا کہیں کسی راگنی سے دوستی بڑھائی۔ اب وہ ایسا مشاق ہوچکا تھا کہ جس کوٹھے پر قدم رکھتا' ناچنے والیاں قدم سنبھال کر اُٹھاتیں کہ اگر ایک گھنگرو کی آواز بھی کم نکلی تو یہ شخص ٹوک دے گا۔ گانے والیاں اس کی موجودگی کو اعزاز سمجھتی تھیں۔

اس شوق میں اس کے جتنے مکان تھے سب بک بکا گئے۔ اب ایک اس کا اپنا مکان اور ایک باغ باقی بچا تھا کہ اس دورے میں کمی آگئی۔

ایک دن اچانک اسے اپنی اس خالہ زاد بہن کی یاد آگئی جس سے اس کی منگنی ہوئی تھی۔ خالہ کا رویہ اسے ابھی تک یاد تھا ان کی تلخ باتوں کی کڑواہٹ وہ آج تک محسوس کررہا تھا لیکن اس نے سوچا خالہ سے اسے کیا لینا' اور پھر اب تو اتنے دن گزر گئے ہیں کہ خالہ سب کچھ بھول بھال چکی ہوں گی۔ اگر میں اب رشتہ مانگوں گا تو وہ ہرگز انکار نہیں کریں گی۔

برسوں بعد آج وہ پھر خالہ کی دہلیز پر کھڑا تھا۔ دروازہ وہی تھا' اس کے ہاتھ وہی تھے' وقت البتہ بدل گیا تھا۔ وہ آخری وقت یہاں ماں کے انتقال کے وقت آیا تھا۔ ایک ایک منظر اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ ماں کی آنکھوں میں لرزتی ہوئی بے بسی' آج اس کی آنکھوں میں لرز رہی تھی۔ کوئی بار بار اسے روک رہا تھا۔ واپس چل مرزا'

یہی وہ گھر ہے جہاں سے تیری ماں کی موت کا پروانہ جاری ہوا تھا۔ کوئی اسے آواز دے رہا تھا۔ پھر ایک دوسری آواز آئی۔ یہ اس کی منگیتر کی آواز تھی۔ بڑوں کی لڑائی میں تم مجھے کیوں زخمی کرتے ہو۔ اس نے بھی دل ہی دل میں خالہ کو معاف کردیا۔ وقت جیسے پھر لوٹ آیا ہو۔ مہری نے دروازہ کھولا اور ہونقوں کی طرح اس کا منہ تکنے لگی۔ پھر فوراً ہی پہچان گئی۔

"میاں تم۔ اتنے دن بعد آئے ہو۔ میں نگوڑی تو پہچان ہی نہیں سکی۔"

"خالہ ہیں؟"

"خیر سے سب ہیں۔ آؤ اندر آجاؤ۔"

وہی انگنائی تھی، وہی کمرا تھا، اسی نواڑی پلنگ پر خالہ لیٹی ہوئی تھیں۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا البتہ خالہ کچھ کمزور ہوگئی تھیں۔

"بیگم صاحبہ ہادی میاں آئے ہیں۔" مہری نے اطلاع کی۔

"ہادی آیا ہے۔" خالہ نے کروٹ بدلی۔

"آداب"

"آداب۔ بھیا کیسے رستہ بھول گئے۔" خالہ نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔

وہ جواب کیا دیتا، بس جھینپ کے رہ گیا۔ کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے ایک طرف سمٹ کے بیٹھ گیا۔ اسی وقت منّی کمرے میں داخل ہوئی۔ شوق آمیز نگاہوں میں ایک سایہ سا لہرایا۔ وہ چند برسوں میں کتنی بڑی ہوگئی ہے۔ اس نے اپنے دل میں یادوں کی چہل پہل محسوس کی اور گھبرا کر اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ دو حنائی انگلیاں اُٹھیں اور پیشانی تک پہنچ کر رُک گئیں۔

"ہادی بھائی تسلیم"

"تسلیم۔"

"اری بچّی تو یہاں کہاں آگئی۔ جا، بھائی کے لیے شربت بنا۔" خالہ نے کہا۔

"جی امّی۔" وہ جیسی کھڑی تھی ویسی واپس پلٹ گئی۔ اس نے جاتے جاتے اس طرح ہادی کی طرف دیکھا جیسے کوئی دمِ واپسیں حسرت بھری نظروں سے دیکھتا ہے۔

خالہ کے رویّے سے ہادی کو بہت تقویت ملی تھی۔ ابھی تک انہوں نے کوئی ایسی بات نہیں کی تھی جس سے ان کے دل میں چھپی ہوئی کدورت ظاہر ہوتی۔ ان کے اس رویّے کو دیکھ کر اس کی ہمت ہوئی کہ بات کرسکے۔

"خالہ امّی میں آپ سے کچھ مانگنے آیا ہوں۔"

انتخاب کلام

وہ بھی دن ہوں گے کہ ہم باغوں میں پینے جائیں گے
دیکھیے فصلِ خزاں کے کب مہینے جائیں گے
حضرت ناصح نہیں ممکن مری وحشت کا ساتھ
دشت میں چاکِ گریباں آپ سینے جائیں گے
زندگی، دولت، جوانی، بے خودی، شوقِ وصال
پھر ملیں گے بھی جو یہ سامان چھینے جائیں گے
موت ہی کو زندگی کہنا اگر ہے رسمِ عشق
مرنے والے آپ کے، قبروں میں جینے جائیں گے
اپنی قسمت راہ پر آئے تو مرزا دیکھنا
کربلا ہوتے ہوئے اب کے مدینے جائیں گے

"کیا اب بھی تمہاری ماں کی کوئی چیز میرے پاس رہ گئی ہے۔"

"ہاں"

خالہ کی بھویں تن گئیں۔ وہ ابھی تک لیٹی ہوئی تھیں، گھبرا کر اُٹھ گئیں۔

"کیا کہہ رہا ہے بچّے۔ کون سی چیز ہے جو رہ گئی ہے۔"

"میری ماں کی آخری خواہش"

"میں تمہاری مرحوم والدہ کی طرح عقل مند تو ہوں نہیں کہ اشارے سمجھ لوں۔ جو کچھ کہنا ہے صاف صاف کہو۔"

"امّی جان کی آرزو تھی کہ وہ منّی کو اپنی بہو بنائیں۔"

"بس میں سمجھ گئی اور تم بھی اچھی طرح سمجھ لو کہ یہ آخری خواہش انہی کے ساتھ دفن ہوگئی۔"

"لیکن میری خواہش بھی یہی ہے۔"

"تم بھی یہ خواہش دل سے نکال دو۔ میرے بھائی پر مقدمہ چلوادیا، پھر بھی کلیجے میں ٹھنڈک نہیں پڑی اور وہ بھی دو ٹکے کے موئے جعل ساز حیدر بخش کے ہاتھوں، خاندان کی عزت تو سربازار اُچھال دی، اب ہم بے عزتوں سے کیا لینے آئے ہو۔"

"چھوٹوں سے غلطیاں ہوجاتی ہیں اور بڑے انہیں معاف کردیتے ہیں۔"

"میں نے تمہیں معاف کیا، میرے فرشتوں نے معاف کیا۔ بس ہم پر رحم کھاؤ اور جان چھوڑو۔"

"جب معاف کر ہی دیا ہے تو یہ عنایت بھی کردیں۔"

"بس میاں منہ نہ کھلواؤ۔ جو پردے پڑے ہیں پڑے ہی

رہنے دو۔ ہمیں سب خبر ہے، خواجہ باسط کے ٹیلے والے مکان کہاں جاکر پھونکے۔ نہ نوکر نہ چاکر چلے ہیں میری بچی کا ہاتھ تھامنے۔"

"کچھ جائیداد اب بھی باقی ہے۔ میں کہیں نوکری بھی کرلوں گا مگر آپ ہاں تو کریں۔"

"میری طرف سے تم سونے کے بن کر بھی آجاؤ تو مجھے منظور نہیں۔ تمہارا گھر ہے ہزار بار آؤ مگر آئندہ اس ارادے سے نہ آنا۔"

اسی وقت ملازمہ شربت لے کر کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے نظر اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھا۔ ایک سایہ تیزی سے دروازے کے سامنے سے ہٹ گیا۔ یہ یقیناً منی تھی جو شاید چھپ کر باتیں سن رہی تھی۔ اس نے سوچا اور اٹھ گیا۔

"میں شربت پینے نہیں آیا تھا۔ اب میں چلتا ہوں۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔"

انہوں نے یہ اصرار بھی نہیں کیا کہ شربت آ ہی گیا ہے تو اسے پی لو پھر چلے جانا۔

"صاحب زادے کو دروازے تک چھوڑ آؤ۔" انہوں نے ملازمہ سے کہا اور نواڑی پلنگ پر پھر سے دراز ہوگئیں۔

"آیئے میاں" ملازمہ نے کہا اور وہ اس کے ساتھ ساتھ کمرے سے باہر نکل آیا۔

"ان سے نہیں ملیں گے۔" ملازمہ نے کہا۔

"نہیں۔ شاید اب یہ مناسب نہیں۔ اس سے کہنا ہم نے بہت کوشش کی لیکن خالہ نہیں مانتیں۔ اس سے یہ بھی کہنا کہ اب ہم شاید اس گھر میں کبھی نہ آئیں۔"

خالہ کے گھر سے آنے کے بعد وہ کچھ دن پریشان رہا لیکن کسی ایک چیز کا ہو کر رہ جانا اس کے مزاج ہی میں شامل نہیں تھا چاہے یہ غم ہی کیوں نہ ہو۔ چند دن گزرے تھے کہ اس نے فیض آباد کے ایک شریف گھرانے میں شادی کرلی۔

نوکری چاکری تو کوئی تھی نہیں۔ ارادہ یہی تھا کہ شادی ہوجائے پھر ملازمت بھی کہیں نہ کہیں مل ہی جائے گی۔ کچھ دن تو اسی فراغت سے گزر گئے جس فراغت سے ہر نئے شادی شدہ جوڑے کے گزرتے ہیں لیکن جب ایک بچی بھی ہوگئی تو اس کی نیندیں اڑ گئیں۔ مکانات تو کب کے اونے پونے بک گئے تھے، ایک باغ جو ککڑیوں والا باغ کہلاتا تھا، اب وہ بھی بک گیا۔ بس ایک مکان رہ گیا تھا جس میں وہ اپنی بیوی کے ساتھ رہ رہا تھا۔ تھک ہار کر اس نے ٹیوشن پڑھانا شروع کردی۔ یہ ٹیوشن بھی ہمیشہ کہاں ملتی تھی۔ کبھی تو کئی کئی ٹیوشنیں ہاتھ میں ہوتیں، کبھی ٹیوشن ڈھونڈنے میں پاؤں تھک جاتے۔

ان دنوں اس کے پاس کوئی ٹیوشن نہیں تھی۔ گھر میں فاقوں کی نوبت آگئی تو وہ گھر سے نکلا۔

"مرزا صاحب، حضرت گنج چلیے گا۔" تانگے والے نے جو شاید اسے جانتا تھا۔ پیدل چلتے دیکھ کر کہا۔

وہ اس وقت حضرت گنج ہی کی طرف جارہا تھا، جہاں اسے ایک ٹیوشن ملنے کی امید تھی۔ لیکن جیب میں پیسے کہاں تھے جو تانگے میں بیٹھتا! ایک روپیا پڑا ضرور تھا لیکن وہ کسی اور وقت کام آسکتا تھا۔ وہ پیدل ہی حضرت گنج کی طرف روانہ ہوگیا۔ ابھی وہ کچھ ہی دور گیا ہوگا کہ ایک گنوار سا آدمی، مرزئی پہنے دھوتی باندھے.... اس ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

"میاں کچھ پھارسی وارسی پڑھے ہو" اس نے دانت نکال کر کہا۔

"ہاں۔ مگر کیوں؟"

"ایک کھت (خط) پڑھوانا تھا۔ پڑھ دیو تو مہربانی۔"

مرزا کو کیا تکلف ہوسکتا تھا، اس نے خط مانگا کہ لاؤ پڑھ دوں اور ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگا کہ کہیں بیٹھنے کی جگہ ہو تو آرام سے بیٹھ کر خط پڑھ سکے۔

"کا دیکھت رہے ہو۔"

"سڑک پر کھڑے ہو کر خط پڑھتے کیا اچھا لگوں گا۔ کہیں بیٹھنے کی جگہ ہوتی تو......"

"وہ کا رہی بیٹھنے کی جگہ۔ سامنے ہی کارخانہ ہے میرا۔"

"چلو پھر وہیں چلتے ہیں۔"

"کارخانہ کیا تھا ایک بڑا سا احاطہ تھا۔ چاروں طرف کھپریلیں پڑی تھیں اور ہر طرف لوہے اور پتھر کے کوئلے کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ جابجا لوہے کی بھٹیاں بنی ہوئی تھیں۔ دھونکنی چل رہی تھی، ہتھوڑے چل رہے تھے۔ مرزا کی تو عادت تھی کہ ہر نئی چیز میں فوراً دلچسپی لینے لگتا تھا۔ اس کے لیے یہ تماشا بڑا دلچسپ تھا۔ وہ ان چیزوں کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔

"منشی جی، آپ ادھر بیٹھ جاؤ" دیہاتی نے لکڑی کے ایک صندوق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"لاؤ تمہارا خط پڑھ دوں، پھر مجھے جانا بھی ہے۔ نوکری کی تلاش میں جاتا ہوں شاید کام بن جائے۔"

دیہاتی نے جیب سے خط نکالا، مرزا نے خط پڑھ دیا۔ دیہاتی فارسی نہیں جانتا تھا اس لیے مرزا کو ترجمہ بھی کرنا پڑا۔

"ایک مہربانی اور کردیو' اس کا جواب بھی تم ہی لکھ دیو"
"کاغذ قلم تو یہاں ہوگا نہیں۔"
"کاہے نہیں ہوگا۔ میرا لڑکا مڈل کلاس میں پڑھت ہے۔"

اس نے لڑکے کو آواز دی اور پہلی ہی آواز میں چودہ پندرہ برس کا ایک لڑکا اس کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ "منشی جی کو قلم دوات لاکردے۔"

لڑکا بھاگا بھاگا گیا اور کاغذ قلم لے کر آگیا۔ مرزا نے خط لکھ کر دیہاتی کے حوالے کیا۔ گفتگو کے دوران دیہاتی معلوم کرچکا تھا کہ مرزا ٹیوشن پڑھاتا ہے لہٰذا جونہی وہ خط لکھنے سے فارغ ہوا' دیہاتی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھالیا۔

"آپ تو بڑے قابل دکھت ہو۔ ہمرے بیٹے کو پڑھا دیو تو اس کی زندگی بن جائے۔ پورے پانچ روپے مہینہ دے سکت ہوں جو پچھلے ماسٹر کو دیتا تھا۔"

پانچ روپے کوئی بڑی رقم نہیں تھی۔ پورے ایک مہینے کے تیس دن گزارنے کے بعد پانچ روپے ملنے کی اُمید تھی لیکن یہ سہارا ابھی بہت تھا۔ اس نے فوراً ہامی بھرلی۔

دوسرے دن سے وہ لوہار کے بیٹے کو باقاعدگی سے ٹیوشن پڑھانے لگا۔ ایک آدھ ٹیوشن اور مل گئی۔ زندگی پھر رواں دواں ہوگئی۔

ٹیوشنوں سے جو وقت بچتا' وہ شاعری کی نذر ہوجاتا۔ کبھی کبھی کسی مشاعرے میں بھی رات کٹ جاتی۔ بیوی بہت صابر تھی ورنہ ایسی کم آمدنی میں ایسی پُرسکون زندگی گزارنا مشکل تھا۔

اسے یہ ٹیوشن پڑھاتے ہوئے ابھی ایک مہینہ گزرا ہوگا کہ اسے لوہار کے کام میں دلچسپی پیدا ہوگئی' اس نے سوچا وہ یہاں آتا تو ہے' اگر دو چار چیزیں بنانا آجائے تو شوق بھی پورا ہوجائے گا اور ممکن ہے آمدنی کا بھی کچھ ذریعہ نکل آئے۔

"مستری یہ کام مجھے سکھا دو گے؟" ایک دن اس نے مستری پر اپنا شوق ظاہر کردیا۔

"کیوں مذاق کرت ہو۔"

"میں مذاق نہیں کررہا ہوں۔ آدمی کو ہر کام آنا چاہیے۔"

مستری نے اسے اپنے ملازم کے سپرد کردیا۔ کچھ دن تو وہ اسے ہنس کے ٹالتا رہا۔ مگر اس نے جب یہ دیکھا کہ یہ شخص پیچھا چھوڑنے والا نہیں تو اس نے سکھانا شروع کردیا۔

کہاں اس کی فارسی دانی اور کہاں لوہار کا کام مگر مرزا عجیب مٹی کا بنا تھا۔ اسے کسی کام میں عار ہی نہیں تھی۔ اور پھر جس کام میں مصروف ہوتا' اس کا ہوکر رہ جاتا۔ چند ہی دن میں اس نے کام پر عبور حاصل کرلیا۔ اس نے اپنے گھر پر بھٹی بنائی' ایک دھونکنی مول لی۔ نخاس سے بہت سے اوزار خریدے۔ کاٹھ کباڑ کا ایک بکس خریدا اور جوڑ توڑ میں مصروف ہوگیا۔ کہیں سے برف بنانے کی ایک مشین مل گئی جس کا کوئی پُرزہ خراب ہوگیا تھا۔ اس نے ویسا ہی ایک پُرزہ بنایا اور مشین بالکل نئی ہوگئی۔ کوڑیوں میں خریدی تھی اور دس روپے میں فروخت ہوئی۔

اب اسے یہ اُمید ہوچلی تھی کہ اس کام میں اگر برکت ہوئی تو اتنی فراغت ضرور حاصل ہوجائے گی کہ وہ گھریلو پریشانیوں سے بے فکر ہوکر تعلیمی سفر کو پھر جاری کرسکے گا۔

لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ شادی کو ابھی دو ہی برس گزرے ہوں گے کہ بیوی اور لڑکی دونوں چل بسیں۔ مرزا پھر تنہا رہ گیا۔ اس ناگہانی افتاد نے اس کے ہوش اُڑا دیئے' یہ غم ایسا نہیں تھا کہ آسانی سے فراموش ہوجاتا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر بے خودی کا سہارا لیا۔ طوائفوں کے کوٹھے بہت دن سے آباد نہیں کیے تھے۔ شادی کے بعد بے فکرے دوست بھی اِدھر اُدھر ہوگئے تھے۔ گھر خالی ہوتے ہی یہ پرندے ایک ایک کرکے اس کے آنگن میں اُترنے لگے۔ دن بھر بھٹی سلگتی' دھونکنی چلتی' افیون گھٹتی' ستار بجائے جاتے اور شاعری ہوتی۔ شام ہوتے ہی کچھ تو نشے میں دھت ہوکر وہیں پڑے رہتے' کچھ گانا سننے بازارِ حسن کا رخ کرتے۔ مرزا اسی ٹکڑی میں شامل ہوتا۔

اسے نہ جانے کب تک اسی حال میں رہنا منظور تھا کہ نخاس سے گزرتے ہوئے اس کی ملاقات سیّد جعفر حسین سے ہوگئی۔ جعفر حسین اس کے زمانۂ طالب علمی کے دوست تھے۔ رڑکی کالج سے اوور سیئری کا امتحان پاس کرآئے تھے اور محکمۂ نہر میں ملازم تھے۔ ان کے حالات سن کر مرزا کو بھی شوق ہوا کہ وہ یہ امتحان پاس کرلے۔

"یار جعفر حسین' کیا میں یہ امتحان نہیں دے سکتا۔"
"کیوں نہیں دے سکتے۔"
"میرا مطلب ہے عمر کی تو کوئی قید نہیں۔"
"نہیں ایسی کوئی شرط نہیں۔"

"تو پھر سمجھو ہم نے یہ امتحان پاس کرلیا۔ بس یہ بتادو' ہمیں کن مضامین کی تیاری کرنی ہوگی۔"

"کوئی خاص نہیں۔ انجینئرنگ کی اصطلاحات کی دو کتابیں رڑکی کالج میں چھپی ہیں' انہیں دیکھ لیجئے گا۔ رہی انجینئرنگ اس کی کتابیں میرے پاس ہیں' انہیں پڑھ لیجئے گا

اور جہاں سمجھ میں نہ آئے میں اچھی طرح سمجھا دوں گا۔"

"امتحان کب ہوگا؟"

"مئی میں۔ ابھی نو مہینے ہیں، آپ کے لیے کافی ہیں۔ بسم اللہ کرکے محنت شروع کردیجیے۔"

دوستوں کی آمدورفت بند ہوگئی۔ سیّد جعفر حسین نے اسے کتابیں مہیا کردیں اور وہ امتحان کی تیاری کرنے لگا۔ دن بھر مستری کے کارخانے میں تجربات کرتا، رات کو کتابیں لے کر بیٹھ جاتا۔ حافظہ ایسا قوی تھا کہ جو پڑھتا یاد رکھتا، جو دیکھتا یاد رہتا۔ محنتی ایسا کہ پڑھنے بیٹھ جاتا تو اٹھنا بھول جاتا۔ وہ امتحان میں بیٹھا اور اوورسیئری کا امتحان پاس کرلیا۔ اس کامیابی کے بعد اس کے لیے ملازمتوں کی کمی نہیں تھی۔ امتحان سے فراغت ملتے ہی اسے رائے بریلی میں سب اوورسیئر کی حیثیت سے ملازمت مل گئی۔ ملازمت اس کی مرضی کے مطابق تھی اور وہ ضرورت مند بھی تھا لہٰذا خوب دل لگا کر کام کرتا رہا۔ ایک روز اس کے ایک انگریز افسر نے اسے بڑھئی کا کام اپنے ہاتھوں سے کرتے ہوئے دیکھا۔ حیرت تو ہونا ہی تھی۔

"یہ کام تو بڑھئی کا ہے" انگریز انجینئر نے کہا۔

"وہ آج چھٹی پر ہے۔ اگر اس کا انتظار کرتا تو کام میں دیر ہوتی۔"

"آپ یہ کام بھی جانتے ہیں؟"

"میں تو لوہار کا کام بھی جانتا ہوں۔"

"ویل، تم تو بڑے کام کا آدمی ہے۔"

اس دن کے بعد سے وہ افسران کی بہت قدر کرنے لگا اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ وہ شاعر بھی ہیں تو وہ مرعوب بھی ہوگیا۔

مرزا اس کے بنائے ہوئے نقشوں میں اکثر ترمیم کردیا کرتا تھا۔ اسے اتنا اعتماد تھا کہ وہ یہ تبدیلی بخوشی منظور کرلیتا تھا۔

ایک مرتبہ یہ افسر کہیں چھٹی پر چلا گیا۔ اس کی جگہ دوسرا افسر آگیا۔ مرزا نے حسبِ معمول اس کے بنائے ہوئے نقشے میں ترمیم کردی۔ مرزا کو معلوم نہیں تھا کہ یہ تبدیلی اسے کتنی ناگوار گزرے گی۔ وہ افسر تو آگ بگولہ ہوگیا۔

"میرے بنائے ہوئے نقشے میں ترمیم کی جرأت کس نے کی ہے۔"

"ہم نے کی ہے" مرزا نے کہا۔

"کس کی اجازت سے؟"

"غلطی کی اصلاح تو ہر شخص کا فرض ہے، پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔" مرزا نے بے خوف ہوکر کہا۔

"آئندہ میرے نقشوں میں ترمیم نہ کرنا۔"

"اچھا، غلط رہنے دوں گا۔"

بات آئی گئی ہوگئی لیکن افسر کے دل میں ان کا طنز پھانس بن کر رہ گیا۔

ایک روز وہ دفتر دیر سے پہنچا۔ بہت سے لوگ دیر سے آتے تھے لیکن افسر کی کدورت نے اسے خاص طور پر نشانہ بنایا۔

"آپ دیر سے کیوں آئے ؟"

"اشراق کو ایڈٹ کررہا تھا۔"

"یہ اشراق کیا بلا ہے؟"

"ایک پرچہ ہے جو ہم نکالتے ہیں۔ اس میں فلسفے پر مضامین چھپتے ہیں جو آپ کی سمجھ میں نہیں آئیں گے۔"

"یہ رسالہ ضروری ہے یا نوکری؟"

"اس پرچے کو ایڈٹ کرنا زیادہ ضروری ہے" وہ غصے میں تو تھا ہی اس نے پلٹ کر جواب دیا۔

"تو پھر ملازمت سے استعفیٰ دے دیجیے۔"

"ابھی لیجیے۔"

اس نے استعفیٰ لکھا، صاحب کے حوالے کیا اور رائے بریلی سے لکھنؤ کی گاڑی میں سوار ہوگیا۔

لکھنؤ اس کے جینے مرنے کا محل۔ ملازمت کی مجبوری نہ ہوتی تو وہ رائے بریلی کیوں جاتا۔ اب جو پروانۂ رہائی ملا تو سیدھا اپنے آشیانے میں آکر دم لیا۔ یکّہ چوک کی طرف سے گزرا تو اسے ڈیڑھ برس کی صحبتیں یاد آگئیں۔ دن کا وقت تھا لیکن بانکے اور بے فکرے اس وقت بھی گلوریاں چباتے، منہ لال کیے آنکھیں سینک رہے تھے۔ وہ بھیڑ بھاڑ تو اس وقت نہیں تھی لیکن ایسی تنہائی بھی نہیں تھی کہ ہٹو بچو کیے بغیر کوئی سواری یہاں سے گزرتی۔ وہ یکے کی پچھلی نشست پر تقریباً نیم دراز تھا۔ ایک پرانا سا صندوق اس کے قدموں میں رکھا تھا جس میں اس کی کتابیں اور چند جوڑی کپڑے تھے۔ وہ اس وقت کسی گہری سوچ میں تھا۔ سوچنا کیا تھا، لکھنؤ پہنچتے ہی اسے یہ فکر لاحق ہوگئی تھی کہ وہ رہے گا کہاں۔ اپنا مکان تو وہ کب کا فروخت کرچکا تھا۔ خیر کوئی سرائے سہی۔ اس نے آنکھیں بند کیے کیے اپنے دل میں کہا۔ اسے محسوس ہوا جیسے یکہ چلتے چلتے اچانک رک گیا ہو۔

"میاں کوچوان کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں میاں جی۔ کسی اچھے گھر کے معلوم ہوتے

ہیں۔ افیون کے نشے میں بیچ سڑک پر کھڑے ہوئے ہیں۔"

مرزا نے آنکھیں کھولیں اور گردن گھما کر سامنے کی طرف دیکھا اب تک وہاں بھیڑ لگی ہوئی تھی۔

"ایسے تماشے تو یہاں ہوتے ہی رہتے ہیں۔"

"ٹھیک فرمایا آپ نے۔ لوگ اس افیون میں حویلیاں گھول کر پی گئے ہیں۔" تانگے والے نے کہا۔

مرزا نے یونہی، غیرارادی طور پر بالا خانوں کی طرف دیکھا اور پھر اس کی... بڑی بڑی، ابھری ہوئی آنکھیں جھپکنا بھول گئیں۔ کھڑکی سے ایک چہرہ اسے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اوّل تو یہی اس کے لیے عجیب بات تھی کہ وہ بھیڑ کے بجائے اسے دیکھ رہی تھی اور اس سے بھی عجیب بات یہ ہوئی کہ اس نے اک ادائے محبوبی سے آداب کیا اور کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ مرزا نے بھی گویا اس کی پیروی کی۔ دیکھنے والی نے اسے اشارہ کر کے بُلایا۔

"بھائی کوچوان، بس یہیں اُتار دو۔"

"مگر آپ کو تو شاہ گنج جانا تھا۔"

"جانا تھا مگر اب یہیں اُتار دو۔"

"جناب کی مرضی۔ آپ پتا بتا دیں، میں سامان آپ کے گھر پہنچا دوں گا۔ آپ بے شک یہاں اُتر جائیں۔"

"نہیں، سامان میرے ساتھ رہے گا۔"

یکّے والے نے اس کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور مرزا کرایہ ادا کر کے نیچے اُتر گیا۔ اس وقت تک راستہ بھی صاف ہو چکا تھا۔ یکّہ آگے بڑھ گیا، مرزا نے ایک مرتبہ پھر اوپر کی جانب دیکھا۔ اس لڑکی نے ایک مرتبہ پھر اشارہ کیا۔ دن کا وقت تھا اس لیے مرزا نے اِدھر اُدھر دیکھ کر جائزہ لیا کہ کوئی شناسا تو ارد گرد نہیں اور جب اسے یقین ہو گیا کہ کوئی آنکھ اس کی نگرانی پہ مامور نہیں تو اس نے اپنا صندوق اٹھایا اور سیڑھیاں چڑھ کے اوپر پہنچ گیا۔ مغلیہ طرز کی کٹاؤ دار جالیوں کے پیچھے ایک لڑکی اس کے انتظار میں تصویر بنی کھڑی تھی مگر ایسی تصویر جو سانسوں کے ارتعاش سے کانپ رہی تھی۔ پلکوں کے جھروکوں کے پیچھے دو شوخ ستارے مرزا کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔

"آپ سوچتے ہوں گے، ہم نے آپ کو یکّے سے اُتار لیا" اس نے کہا اور آواز کے جگنو چمک کر رہ گئے۔

"آپ آسمان سے زمین پر اُتر آئی ہیں تو ہم یکّے سے زمین پر کیسے نہ اُترتے۔"

"کیا خبر آپ کہاں جاتے ہوں گے، ہم نے یہیں روک لیا۔"

"کیا خبر ہم کہاں جا رہے تھے پھر ہم یہیں رُک گئے۔" مرزا نے اسی کے الفاظ کو نئے مفہوم میں ادا کیا۔

"واللہ آپ تو بلا کے حاضر جواب ہیں۔"

"واللہ آپ کے ہر سوال پر بندہ حاضر ہے۔"

"آپ تشریف تو رکھیں کیوں گنہ گار کرتے ہیں۔"

"آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہم نہ کہیں کے نواب ہیں نہ جاگیردار۔"

"ہمیں خود نہیں معلوم کہ ہم نے کس جذبے کے تحت آپ کو پکارا ہے۔"

اب وہ جالیوں سے نکل کر قد آدم اس کے سامنے کھڑی تھی۔ پھولوں سے لدی اک شاخ تھی جو اس کے ضبط کا امتحان لے رہی تھی۔ بے اختیار اس کا جی چاہا کہ شاخ کا کوئی پھول چرا کر یہاں سے بھاگ جائے لیکن تہذیب مانع تھی۔ اسے یہ معلوم ہوا کہ اگر وہ مزید کچھ دیر کھڑا رہا تو غش کھا کر گر پڑے گا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے سُرخ ایرانی قالین پر دونوں پاؤں جما دیے۔

"تشریف رکھیے۔"

اس نے حکم کی تعمیل کی۔ وہ بھی جالیوں سے نکل کر اس کے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔

"پان کھائیے گا؟"

"پان تو میں کھاتا ہوں۔"

"میں بنائے دیتی ہوں۔"

قریب ہی چاندی کا پاندان رکھا تھا۔ وہ پان بنانے میں مصروف تھی اور وہ محویت سے اسے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا، آخر اسے اس عورت نے بے وقت کیوں بُلایا ہے اس میں آخر ایسی کیا بات ہے۔

"پان حاضر ہے" اس نے مرزا کی محویت میں خلل اندازی کی۔

"شکریہ"

"کیا سوچ رہے ہیں۔ سوچ رہے ہوں گے، میں کون ہوں اور آپ کو کیوں بُلایا ہے۔"

"جی۔ سوچ تو یہی رہا تھا۔" وہ اس کی ذہانت کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔

"اسے آپ میری زمانہ شناسی کہہ سکتے ہیں۔ اتنی ٹھوکریں کھائی ہیں کہ آدمیوں کی پہچان ہو گئی ہے۔ آپ کو دیکھا، آپ اچھے لگے۔ یوں بھی میرے پاس ابھی لوگ کم آتے ہیں، سوچا آپ ہی سہی۔ مسافر ہیں، کچھ دیر ستا ہی لیں گے۔"

"آپ نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں۔"

"لو، میں تو بھول ہی گئی۔ روشن آرا میرا نام ہے، کلکتے میں دُکان جمائے بیٹھی تھی۔ وہاں ایک ڈیرے دار طوائف ہیں مُنّی جان۔ میں ان کی نوچیوں میں سب سے افضل تھی۔ میرے ہی دم سے ان کا کوٹھا آباد تھا۔ لاکھوں کما کر دے دیے، ہزاروں جمع کیے۔ دلّی سے ایک نواب صاحب وہاں آئے اور مجھ پر ریجھ گئے۔ میں ان کے چکر میں آ گئی اور وہاں سے نکل آئی۔ کچھ دن نواب صاحب نے مجھے رکھیل بنا کر رکھا اور پھر ان کا دل بھر گیا۔ مُنّی جان کے پاس دوبارہ کیا جاتی، لکھنؤ کی شہرت سُنی تھی، جو جمع پونجی تھی اس سے یہ مکان خریدا، کچھ سازندے ملازم رکھ لیے ہیں، کپڑوں اور پان کا خرچ نکل ہی آتا ہے۔"

"کب سے ہو لکھنؤ میں؟"

"یہی کوئی ڈیڑھ مہینے سے۔"

"اسی لیے کبھی آمنا سامنا نہیں ہوا۔"

"کیا مطلب، کیا آپ بھی لکھنؤ کے ہیں؟"

"جی ہاں۔ میں کچھ دنوں سے باہر تھا، ڈیڑھ سال بعد لکھنؤ آیا ہوں۔"

"کیا شغل ہے؟"

"طالب علم ہوں۔"

"دولت کدہ کہاں ہے؟"

"کبھی تھا، اب تو کسی دوست کا سایہ ڈھونڈوں گا۔"

"برا نہ مانیے گا، کچھ عرض کروں۔"

"فرمائیے۔"

"یہ غریب خانہ حاضر ہے۔ میں مجبور تو نہیں کرتی لیکن جب تک کوئی انتظام نہیں ہو جاتا، آپ مجھے یہ عزت دے سکتے ہیں۔"

"آپ کے مشاغل ذرا مختلف ہیں، ان میں خلل پڑے گا۔"

"آپ یہ کیوں نہیں کہتے کہ آپ کی تعلیم کا حرج ہوگا۔ لیکن اس کی فکر نہ کریں، نچلی منزل بالکل خالی پڑی ہے۔ آپ وہاں آرام سے رہیں۔"

"اور کرایہ؟"

"کبھی کبھی، جب آپ کا جی چاہے میرا گانا سُننے اوپر تشریف لے آیا کیجیے۔"

اس نے یہ کہہ کر خود کو مطمئن کر لیا کہ لوگ آخر کرائے پر رہتے ہی ہیں۔ جیسے ہی کسی دوسرے مکان کا انتظام ہو جائے گا وہاں اٹھ جاؤں گا۔ یوں بھی یہاں ملنے جلنے والے

غزل

بن جائے جو بگڑ کے وہ تقدیر چاہیے
خانہ خرابیوں میں بھی تاثیر چاہیے
میں مرگِ ناگہاں کا طلب گار ہجر میں
اور اقتضائے شوق کہ تاخیر چاہیے
ممکن تو ہے کہ ضعف میں آنکھیں کھُلی رہیں
پیشِ نگاہ آپ کی تصویر چاہیے
خانہ خرابیوں کی تلافی ضرور ہے
زنداں بہ قدر وسعتِ تقصیر چاہیے

○☆○

کم آئیں گے، خوب اطمینان رہے گا۔

سامان ہی کیا تھا، ایک بکس تھا اس نے اُٹھایا اور نیچے اُتر آیا۔ نچلی منزل کا راستہ بالکل الگ تھا۔ اوپر کی منزل پر جانے کے لیے زینہ باہر کی طرف اُترتا تھا۔ مکان کی ساخت دیکھ کر اسے مزید اطمینان ہو گیا۔

بے کار بیٹھنا تو جیسے وہ جانتا ہی نہ تھا۔ ہفتہ بھر بھی نہیں گزرا تھا کہ اسے خیال آیا، جب مفت کی استانی موجود ہے تو اس سے فائدہ کیوں نہ اُٹھایا جائے۔ اسے ستار بجانے کا شوق تھا اور اب اس شوق کی تکمیل کا موقع مل رہا تھا۔ اس نے اپنی خواہش کا اظہار روشن آرا سے کیا۔ اسے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

طوائفوں کے گھر، دن کے وقت ویرانی کا سماں پیش کرتے ہیں۔ مہمانوں کی آمدورفت تو چراغ جلنے کے بعد شروع ہوتی ہے۔ مرزا نے اس تنہائی کا فائدہ اٹھا کر ستار بجانا سیکھنا شروع کر دیا۔ کچھ دن کی مشق کے بعد اس کی انگلیاں ستار پر اس طرح چلنے لگیں جیسے برسوں سے وہ یہی کام کر رہا ہو۔ اس کی ذہانت کسی راستے پر قید نہیں تھی۔ خود روشن آرا کو تعجب ہوتا تھا کہ... اتنا مشکل ساز وہ اتنی جلدی کیسے سیکھ گیا۔

○☆○

کوئٹہ کے گرد و نواح میں ریلوے لائن بچھائی جا رہی تھی۔ یہاں اوور سیئر کی اسامی خالی تھی۔ مرزا نے بھی درخواست دے دی۔ اس کے دوست جعفر حسین نے بھی کوشش کی۔ مرزا کو ستّر روپے ماہوار اور بیس روپے الاؤنس

کی یہ نوکری مل گئی۔ وہ ایک مرتبہ لکھنؤ سے نکلا۔ اس مرتبہ اس کا رخ کوئٹہ جیسے پہاڑی، خشک اور ویران جگہ کی طرف تھا۔ یہ جگہ اس کے ذوقِ جمال کے معیار پر ہرگز پوری نہیں اُترتی تھی لیکن پرکشش تنخواہ نے اس کا دامن کھینچ لیا۔

ذرا فراغت ملی تو اس کا علمی شوق پھر عود کر آیا۔ اس نے اپنی کتابوں کی گرد صاف کی اور مطالعے میں مصروف ہوگیا۔ فنِ کیمیا پر ہشام بن الحکم کا رسالہ نظر سے گزرا۔ اس سے قبل وہ بوعلی سینا کا رسالہ کیمیا دیکھ چکا تھا۔ یہ اور اس موضوع پر دوسری کتابیں دیکھنے کے بعد اسے شوق ہوا کہ وہ بھی کیمیا داں مشہور ہو لیکن اس کے پاس ایسے آلات نہیں تھے جن سے وہ ان نظریات کو ثابت کرسکے جو اس نے پڑھے تھے۔ وہ ابھی ان کتابوں کے مطالعے میں مصروف تھا کہ اس کی ملاقات ایک مقامی باشندے سے ہوئی جو خود بھی علم کیمیا کا ماہر تھا۔ اس نے جب مرزا کا شوق دیکھا تو عربی زبان میں لکھی ہوئی ایک کتاب مرزا کو دی۔ اس کتاب کے مطالعے کے بعد اس کا یہ شوق اتنا بڑھا کہ جو کچھ ان کتابوں میں لکھا تھا اس پر تجربے کرنے کے لیے وہ بے چین ہوگیا۔ نوکری کی زنجیر پیروں میں پڑی ہوئی تھی اور اس کی تعیناتی جنگل میں تھی جہاں ضروری آلات مل نہیں سکتے تھے۔ اسے اب دو سو روپے نقد اور سواری کا الاؤنس الگ مل رہا تھا۔ ایسی شاندار نوکری چھوڑنے کو بھی جی نہیں چاہتا تھا۔ آخر اس کے شوق نے اسے مجبور کیا۔ یہ دُھن ایسی سمائی کہ ملازمت سے چھ ماہ کی چھٹی لی اور لکھنؤ چلا آیا۔ ملازمت کے دوران اس نے اچھی خاصی رقم پس انداز کرلی تھی۔ نخاس میں ایک مکان کرائے پر لیا، بمبئی اور ولایت سے آلات منگوائے اور تجربات میں مصروف ہوگیا۔ پھر یہ شوق ایسا بڑھا کہ دوستوں کی صحبت بھی بُری لگنے لگی۔ وہ ایک لمحہ بھی ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے مہینے بھر کا راشن خرید کر رکھ لیا اور دروازہ مقفل کرکے بیٹھ گیا۔ دوست آتے اور دستک دے کر چلے جاتے۔ ایک مہینہ گزر گیا مگر تجربات سے دل نہیں بھرا۔ اس نے پھر دال، چاول، گھی، لکڑی خرید کر گھر میں رکھ لی، دروازہ پھر بند ہوگیا۔

کئی مہینے بعد وہ گھر سے نکلا تھا۔ بے ترتیب بال، میلے کچیلے کپڑے سخت گھبرایا ہوا، بنئے کی دُکان پر کھڑا تھا کہ جعفر حسین کا اس طرف سے گزر ہوا، پہلے تو انہیں یقین ہی نہیں آیا کہ یہ مرزا ہادی ہوسکتے ہیں۔ یقین آتا بھی کیسے۔ یہ تو لکھنؤ کی تہذیب ہی میں داخل نہیں تھا کہ کوئی اس حالت میں گھر سے قدم باہر نکالے لیکن جب انہوں نے غور سے دیکھا تو انہیں یقین کرنا پڑا۔

"مرزا تم" انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

مرزا نے نہایت اطمینان سے پلٹ کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بسے ہوئے رت جگے صاف نظر آرہے تھے۔ کوئی بھی دیکھتا صاف پہچان لیتا کہ کئی راتوں کی نیندیں اس کی آنکھوں سے دور گزر گئی ہیں۔

"مرزا تم اور اس حال میں۔ یہ کیا حالت بنالی ہے؟"

"کچھ نہیں دوست۔ تجربے میں مصروف تھا گندھک کم پڑگئی تھی، وہی لینے چلا آیا۔"

"لباس تو درست کرلیتے۔"

"بس تجربہ کامیاب ہونے ہی والا ہے۔ پھر ملاقاتیں ہوں گی۔ اچھا، خدا حافظ"

ابھی جعفر حسین شاید کچھ اور کہنے والے تھے لیکن مرزا نے موقع ہی نہیں دیا۔ وہ اتنی سرعت سے بچھڑا جیسے بھاگنے کے لیے تیار ہو۔ جعفر حسین اسے دیکھتے رہ گئے۔

وہ اپنے تجربے کے ذریعے سونا بنانے کی کوشش کررہا تھا لیکن ہمیشہ ایک آنچ کی کسر رہ جاتی تھی۔ یہاں تک کہ چھ مہینے گزر گئے چھٹی کی مدت ختم ہوگئی۔ اب اسے کوئٹہ واپس جانا تھا لیکن وہ اپنے تجربے کو ادھورا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اس نے استعفیٰ لکھ کر بھیج دیا اور دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ لیکن اب آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ تجربات کے علاوہ دیگر اخراجات کے لیے بھی رقم کی ضرورت تو بہرحال تھی۔ مجبوراً اسے گھر سے نکلنا پڑا۔ اب وہ ملازمت کے جھنجٹ میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے چند ٹیوشنوں کو اپنی آمدنی کا ذریعہ بنانے پر اکتفا کیا۔ دن بھر وہ اپنے تجربات میں مصروف رہتا اور شام کو ٹیوشن پڑھانے نکل جاتا۔ اب اس کا دل شاعری سے بھی اُچاٹ ہوچکا تھا۔ اتنا وقت ہی نہیں تھا کہ کسی اور کام میں مصروف ہوتا۔ وہ ابھی تک سونا بنانے میں کامیاب تو نہیں ہوسکا تھا لیکن اسے علم کیمیا پر اتنا عبور ہوگیا تھا کہ جو لوگ لندن سے یہ علم حاصل کرکے آئے تھے وہ بھی اس کی معلومات پر حیران رہ جاتے تھے۔

جعفر حسین کے بھائی نئے نئے ولایت سے آئے تھے اور محکمۂ زراعت میں ملازمت کررہے تھے۔ وہ کسی مٹی پر تجربہ کررہے تھے لیکن انہیں کوئی ایسا آدمی نہیں مل رہا تھا جو اس کام میں ان کا ہاتھ بٹائے۔ انہوں نے جعفر حسین سے تذکرہ کیا۔ جعفر حسین نے مرزا کا پتا بتادیا۔

"اس وقت لکھنؤ میں ایک ہی آدمی ہے جو اس فن میں

اپنا ثانی نہیں رکھتا۔" جعفر حسین نے کہا۔

"کیا انہوں نے لندن میں تعلیم حاصل کی ہے؟" ان کے بھائی محمدؐ حسین نے کہا۔

"لندن کیا' انہوں نے تو یہاں کی بھی کسی یونیورسٹی میں نہیں پڑھا۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ انہوں نے یہ علم اپنی ذاتی کوشش سے حاصل کیا ہے۔"

"یہ ممکن ہی نہیں"

"تو آپ ان سے مل کر دیکھ لیجئے۔"

"مگر میں اپنا وقت کیوں برباد کروں۔ وہ میری ایک بات کا بھی ڈھنگ سے جواب نہیں دے سکتے۔"

"آپ ایک مرتبہ ان سے مل تو لیں۔"

بڑی مشکل سے وہ ان سے ملنے پر تیار ہوئے اور انہیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ مضمون جو ہندوستان کے نصاب ہی میں داخل نہیں' مرزا اس پر ایسی دسترس رکھتے ہیں جیسی انگلینڈ کے اساتذہ۔

محمدؐ حسین ان سے ملاقات کے بعد سخت وحشت زدہ سے واپس آئے۔

"مجھے تو آپ کے اس دوست سے ڈر لگتا ہے۔" انہوں نے جعفر حسین سے کہا۔

"خیریت تو ہے۔ وہ بے حد خلیق اور نہایت ملنسار آدمی ہیں۔ ایسے تو ہرگز نہیں کہ ان سے ڈرا جائے۔"

"مجھے تو اس آدمی کی ذہانت سے ڈر لگ رہا ہے۔ وہ تو کیمسٹری میں اتنی معلومات رکھتا ہے جتنی ان اساتذہ کو بھی نہیں تھیں۔ جنہوں نے ہمیں پڑھایا ہے جب کہ آپ کہتے ہیں انہوں نے اس مضمون کی تعلیم کہیں حاصل نہیں کی۔"

"حقیقت تو یہی ہے۔"

"حقیقت ہے تو پھر حیرت کرنے کے سوا کیا کیا جا سکتا ہے۔"

○☆○

سونا بنانے کی وبا ایسی عام تھی کہ ہزاروں کو اس شوق نے برباد کر دیا تھا۔ اس آرزو میں جائیدادیں بک جاتی تھیں لیکن ہمیشہ ایک آنچ کی کسر رہ جاتی تھی۔ لوگ قلاش ہو کر کوڑی کوڑی کو محتاج ہو جاتے تھے۔ ان کی ناکامی کی بڑی وجہ ان کا ادھورا علم تھا۔ وہ محنت تو کرتے تھے لیکن ان کے پاس علم نہیں تھا۔ مرزا محنت بھی کر رہا تھا اور اسے اس علم پر مکمل عبور بھی تھا' اس لیے وہ منزل سے بہت قریب تھا۔

آہستہ آہستہ اس کی شہرت پھیلتی گئی۔ وہ تمام کیمیا داں جو اس شوق میں لٹ پٹ چکے تھے اس کے گرد جمع ہونے لگے۔ اسے بھی ایسے لوگوں کی ضرورت تھی جو اس کا ہاتھ بٹائیں۔ یہ سب لوگ ایک جگہ جمع ہو جاتے اور کیمیا بنایا کرتے۔ آخر ان لوگوں نے سونا بنا لیا جو کسوٹی پر پورا اُترا۔

میٹل ورکس حسن گنج لکھنؤ کے مالک نے مرزا کو پانچ روپے پیشگی دے کر اس شرط پر ایک ہزار روپے دینے کا وعدہ کیا کہ ایسا سونا تیار کر دیں جو اصلی سونے کے ہم رنگ ہو۔ مرزا نے نسخہ تیار کر لیا تھا اب اس کے لیے ایسا سونا تیار کرنا کیا مشکل تھا۔ اس نے تیسرے دن آدھ پاؤ کا ڈلا تیار کر لیا۔

اس نے یہ سونا جیب میں ڈالا اور حسن گنج کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں کالکا سنگھ سنار کی دُکان پڑتی تھی۔ اس نے سوچا یہ سونا سنار کو دکھایا جائے' دیکھو وہ کیا کہتا ہے۔ وہ سنار کی دُکان پر پہنچ گیا۔

"لالہ ذرا یہ سونا تولنا کتنا ہے۔"

"کیوں کیا بیچنا ہے؟"

منتخب اشعار

سمجھا ہوں جو مراد ہے اس چھیڑ چھاڑ سے
ناصح کو بھی ہوس ہے کہ رسوا کرے کوئی

○☆○

غلط انداز ہی سہی وہ نظر
کیوں مرے حال پر نہیں ہوتی

○☆○

وصل کی رات ہے پہلے سے بتا دو ہم کو
تم کسی بات پہ روٹھو تو منائیں کیوں کر

○☆○

دیکھو دیکھو مرے رونے کا تماشا دیکھو
اور ساون میں برستی ہیں گھٹائیں کیوں کر

○☆○

عین وحدت خلاف کثرت ہے
لطف خلوت جدا ہے محفل سے

○☆○

کہیے کیا آسمان سے ٹھیری
آپ کوٹھے سے کیوں اُتر آئے

○☆○

"ہاں، کسی آڑے وقت کے لیے اُٹھا رکھا تھا۔ اب ضرورت پڑ گئی ہے۔"

کالکا سنگھ نے سونے کا وزن کیا اور پھر اسے کسوٹی پر چڑھا کر دیکھا۔ اسے ذرا بھی شک نہیں ہوا کہ یہ اصلی سونا نہیں ہے۔

"بازار میں سونے کا بھاؤ ۲۲ روپے ہے، میں ۱۹ روپے کے حساب سے خرید سکتا ہوں۔"

"بڑے گھاٹے میں رہو گے، لالہ۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کیوں گھاٹے کی کیا بات ہے۔ تین روپے فی تولہ تو مجھے پھر بھی بچے گا۔"

"بچے گا تو جب، جب یہ اصلی ہوگا۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ یہ سونا میں نے بنایا ہے۔"

"اچھا!" کالکا سنگھ حیرت زدہ رہ گیا۔

"جو حقیقت تھی میں نے بتا دی۔"

"اگر حقیقت یہی ہے تو بھی میں اسے خریدنے پر تیار ہوں۔ جب میں اسے نہیں پہچان سکا تو اور کون پہچانے گا۔ آپ اس کا نسخہ میرے ہاتھ فروخت کر دیں۔"

"اب میں اسے آپ کے ہاتھ فروخت نہیں کر سکتا۔"

"کیوں کیا تکلیف ہے آپ کو۔"

"میں اس کا نسخہ میٹل ورکس حسن گنج کے مالک کے ہاتھوں فروخت کر چکا ہوں۔"

"وہ کیا قیمت دے رہے ہیں؟"

"ہزار روپے۔"

"میں دو ہزار دینے کو تیار ہوں۔"

"لالہ، اب جس سے بات ہو گئی، ہو گئی۔ یہ بات وضع داری کے منافی ہے کہ میں زیادہ رقم کے لالچ میں یہ نسخہ آپ کو دے دوں۔ اب اگر آپ دس ہزار بھی دیں تو مجھے منظور نہ ہوگا۔"

○☆○

اس کے خیالات تو دریا کی لہروں کی طرح تھے۔ کسی کام کی دُھن اسے صرف اس وقت تک رہتی تھی جب تک وہ اس کام میں کامیابی حاصل نہ کر لے۔ کامیاب ہوتے ہی وہ اس طرح بے خبر ہو جاتا تھا جیسے کوئی فاتح، مفتوحہ علاقہ اپنے کسی جنرل کے سپرد کر کے نئی فتوحات کے لیے آگے بڑھ جائے۔

نسخے سے ملنے والی قیمت اس کے پاس چند دن بھی مہمان نہ رہ سکی۔ ہزار روپے کی خطیر رقم رنگین مزاجی کی نذر ہو گئی۔ اب اس کا کیمیا سے دل بھر گیا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ دوست بھی بچھڑ گئے۔ جو صرف اس شوق کی خاطر اس کے قریب آئے تھے۔ وہ پھر تنہا رہ گیا۔

مالی پریشانیاں اپنی جگہ موجود تھیں۔ اس کی دریا دلی اسے کبھی خوش حال رہنے ہی نہیں دیتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں تو جیسے سوراخ تھے۔ چھلنی میں پانی نہیں رُکتا اس کے ہاتھ میں پیسہ نہیں رُکتا تھا۔ اس مرتبہ افتاد ذرا سخت تھی۔ اسی افتاد کو شکست دینے کے لیے اس نے کوشش کی اور چرچ مشن اسکول میں مدرس ہو گیا۔

یہ نوکری اسے ذاتی قابلیت اور شہرت پر ملی تھی ورنہ اس کے پاس کوئی ڈگری نہیں تھی۔ کیمیا دانی سے فرصت ملی تو اسے اس کمی کا احساس ہوا۔ مدرسے کے علمی ماحول نے اس کے اندر چھپے ہوئے طالب علم کو ایک مرتبہ پھر بیدار کر دیا۔ اس نے پرائیویٹ طور پر فاضل فارسی کا امتحان پاس کیا اور اس کے بعد بہ آسانی میٹرک پاس کر لیا۔

لکھنؤ کرسچن کالجیٹ اسکول نیا نیا کھلا تھا۔ اسکول کے لیے فارسی کے ٹیچر کی ضرورت تھی۔ اس نے بھی درخواست دے دی۔ امیدوار تو بہت آئے لیکن قرعۂ فال اس کے نام نکلا۔

اس کے ایک دوست سیّد شہنشاہ حسین کو علمی بحثوں کا بہت شوق تھا۔ مرزا کب چوکنے والا تھا۔ ایسے دلائل دیتا کہ شہنشاہ حسین لاجواب ہو جاتے۔ وہ گریجویٹ تھے جب کہ مرزا صرف میٹرک پاس تھا لیکن ذاتی کوششوں اور دن رات کے مطالعے سے اس نے ایسا کمال حاصل کر لیا تھا کہ کوئی مشکل ہی سے اس کے سامنے ٹک سکتا تھا۔

ایک روز فلسفے کا ایک ادق مسئلہ موضوعِ بحث تھا۔ مرزا کا جوشِ بیان دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ شہنشاہ حسین کی کوئی دلیل ماننے کو تیار نہیں تھا بالآخر شہنشاہ حسین نے زچ ہو کر کہا، مرزا یہ باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آ سکتیں۔ انہیں سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی گریجویٹ ہو۔

ممکن ہے یہ بات انہوں نے مزاقاً کہی ہو لیکن مرزا کے لیے تو یہ ایک چیلنج تھا۔ اسے کوئی طعنہ دے اور وہ برداشت کر لے۔ یہ اس کے مزاج ہی میں نہیں تھا۔ اس نے یہ طعنہ خاموشی سے سُنا اور چپکے سے اُٹھ آیا لیکن سکون سے بیٹھ نہیں سکا۔ اس نے فوراً پنجاب یونیورسٹی سے رجسٹریشن کرایا۔ پہلے ایف اے اور پھر بی اے کا امتحان پاس کر کے شہنشاہ حسین کا منہ بند کر دیا۔

بی اے کا آخری سال تھا اور وہ امتحان دینے کے لیے دہلی گیا ہوا تھا۔ محمد حسین آزاد کی شہرت اس نے بہت سُنی تھی۔ امتحانوں سے فارغ ہوا تو اس نے سوچا آزاد سے مل لیا جائے۔ آزاد اس وقت طلبہ کو فارسی کی کوئی کتاب پڑھانے میں مصروف تھے۔ ایک تو وہ آخری عمر میں اونچا سُننے لگے تھے دوسرے وہ تدریس میں ایسے محو تھے کہ انہیں یہ معلوم ہی نہیں ہوا کہ کون ان کے قریب آکر کھڑا ہوگیا ہے۔ آزاد کسی عبارت میں اُلجھ رہے تھے اور طلبہ کو مفہوم سمجھانے سے قاصر نظر آرہے تھے۔ مرزا نے خاموشی سے چند الفاظ میں عبارت کا مطلب بیان کردیا۔ آزاد نے اس آواز کو سروشِ غیبی تصور کیا اور طلبہ کو مطمئن کردیا۔ طلبہ کے جانے کے بعد آزاد نے مرزا کی طرف توجہ کی۔

"جناب کی تعریف۔"

"بندے کو مرزا محمد ہادی کہتے ہیں۔"

"کہاں سے تشریف لائے ہیں؟"

"لکھنؤ سے۔"

"دہلی کیسے آنا ہوا؟"

"بی اے کا امتحان دے رہا ہوں۔"

"لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ کی قابلیت بی اے کے عام طالب علموں سے کہیں زیادہ ہے۔ جس عبارت میں، میں الجھ رہا تھا آپ نے کس سہولت سے بیان کردی۔"

"اتفاق کہیے ورنہ بندہ کس قابل ہے۔"

آزاد اتنی شفقت سے پیش آئے کہ مرزا پہلی ملاقات ہی میں بے تکلف ہوگیا۔ دونوں اہلِ علم دیر تک مختلف مسائل پر گفتگو کرتے رہے۔ دہلی کے جنتر منتر کا بھی ذکر آیا۔ مرزا کو علمِ نجوم سے بھی شغف تھا۔ اس نے اسے دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ مولانا نے اسے رصد خانے کی سیر کرائی اور مرزا کی معلومات پر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

اب مرزا گھسیاری منڈی کے قریب کرائے کا مکان لے کر رہ رہا تھا۔ اسی جگہ مرزا اوج کا مکان بھی تھا۔ اوج اس کے استاد تھے۔ ان سے ملاقات ہوتی ہی رہتی تھی لیکن اپنی مصروفیات کی وجہ سے وہ شاعری سے بھی دور ہوگیا تھا اور استاد سے بھی کبھی کبھی ملتا تھا لیکن جب ایک ہی جگہ رہنا ہوا تو اس کے ذوقِ شاعری نے ترقی کی۔ اب کیمیا سازی کی دُھن میں کمی آگئی تھی لہٰذا شاعری کے لیے وقت بہت تھا۔

اس وقت لکھنؤ کے ادبی ماحول میں چک بست، ناطق، صفی، ثاقب، عزیز، ریاض، فانی، جلال، نفیس وغیرہ کا طوطی بول رہا تھا۔ مرزا کے ان سب سے دوستانہ مراسم تھے۔ مرزا اکیلا رہتا تھا لہٰذا ان شعرا کی بے تکلف نشستیں باقاعدگی سے اس کے گھر پر جمنے لگیں۔

مرزا کے زمانے تک ایک نیا دور آچکا تھا۔ حالی اور سرسید کی کوششوں سے فرسودہ شاعری میں چپکے چپکے تبدیلی آرہی تھی۔ لکھنؤ میں حالی کی انقلابی کوششوں سے بیزاری کا اظہار کیا جارہا تھا لیکن گردوپیش کے اثرات سے بے تعلق رہنا آسان بھی نہیں تھا۔ لکھنؤ کے جدید شعرا نے رعایتِ لفظی، عریانی و فحاشی کے مذاق کی اصلاح ضرور کرلی تھی لیکن اندازِ فکر اور طرزِ تخیل میں اب بھی ایک انقلاب کی ضرورت تھی۔ مرزا اس ضرورت کو محسوس کررہا تھا۔ اس کے گھر جمنے والی نشستیں انہی مباحث سے گونج رہی تھیں۔ اس کے دوست بھی اس کے ہم خیال تھے چنانچہ ان سب دوستوں نے ایک انجمن کی بنیاد رکھی جس کا نام "انجمن معیارِ ادب" تجویز ہوا۔ اس انجمن کا بنیادی مقصد لکھنؤی شاعری کی اصلاح تھا۔ اس انجمن کے تحت ایک رسالہ "معیار" بھی نکلتا تھا۔

مرزا تو جو کام کرتا تھا اسے انتہا تک پہنچا کر دم لیتا تھا۔ انجمنیں سب بناتے ہیں، رسالے سب نکالتے ہیں لیکن وہ تو جیسے سب کچھ بھول کر شاعری کی اصلاح میں مصروف ہوگیا تھا۔ اس نے "مشہور اور مفید مراسلے" کے عنوان سے "معیار" میں مضامین لکھنے کا آغاز کیا۔ اردو میں یہ پہلا موقع تھا کہ فلسفۂ شعر پر ایسے گراں قدر مضامین لکھے جارہے تھے۔

مضامین کا شائع ہونا تھا کہ تعریفوں اور مخالفتوں کا طوفان اُٹھ کھڑا ہوا لیکن اس کے ارادوں کا چراغ کسی آندھی سے بجھنے والا کب تھا۔ وہ مخالفتوں کی پروا کیے بغیر مضامین لکھتا رہا بلکہ اس نے تو ایک اور حرکت کرڈالی۔

صفی لکھنؤی کے گھر مشاعرہ تھا، نوجوان اور بزرگ شعرا پرے جمائے بیٹھے تھے۔ مشاعرہ شروع ہونے والا تھا کہ صفی لکھنؤی نے اعلان کیا کہ صاحبو! اس سے قبل کہ مشاعرے کا باقاعدہ آغاز ہو، مرزا محمد ہادی، مرزا لکھنؤی اپنا ایک مضمون پڑھیں گے۔

"کیا اب لکھنؤ کے نوجوان، مشاعرے کے آداب بھی فراموش کرچکے ہیں۔" بزرگوں میں سے کسی نے کہا۔

"کیا اب وہ ہمیں یہ بتائیں گے کہ ہمیں کیسی شاعری کرنا چاہیے اور کس طرح پڑھنا چاہیے۔" کسی دوسرے بزرگ نے کہا۔

"ہرگز نہیں۔ کیا مجال جو آپ ایسے اساتذۂ سخن کی گستاخی کا خیال بھی دل میں آیا ہو، مرزا ہادی تو لکھنؤ کی

نوجوان نسل سے مخاطب ہو رہے ہیں۔" صفی لکھنوی نے صفائی پیش کی۔

"وہ یہ زحمت نہ فرمائیں۔ ہم اپنے شاگردوں کی تربیت خود کر سکتے ہیں۔"

بزرگ شعرا نے اچھا خاصا ہنگامہ برپا کر دیا۔ دراصل وہ بھانپ گئے تھے کہ مرزا مضمون کے نام پر کیا پڑھیں گے۔ "معیار" میں چھپنے والے مضامین سے یہ بزرگ پہلے ہی نالاں تھے انہیں معلوم تھا کہ وہ تقریر میں بھی انہی باتوں کا اعادہ کرے گا۔ بہر حال، بڑی مشکل سے وہ تیار ہوئے اور مرزا نے مضمون پڑھنا شروع کیا۔

"زمانہ دراز سے مشرقی شاعری کو درستی الفاظ کا لحاظ رہا ہے لہٰذا معنویت کی باریکیوں کی طرف غور کرنے کی فرصت نہ ملی۔ وزن اور قافیے کی پابندی شاعر کے لیے کم نہ تھی کہ اس پر ردیف بڑھائی گئی۔ پھر اور لفظی جھگڑے نکالے گئے۔ بے چارہ جدید مضمون کہاں سے پیدا کرے۔"

پورا مضمون انہی خیالات سے بھرا ہوا تھا۔ ناک بھوں تو بہت چڑھائی گئی لیکن سُننا پڑا۔ لیکن ایک اعتراض اب بھی باقی تھا۔

"اب انہی خیالات پر مبنی شاعری بھی سُنا دیجیے۔ ہم بھی تو دیکھیں شاعری رہتی بھی ہے یا نہیں۔"

"صاحبو! ردیف اور قافیے سے تو میں آزادی حاصل نہیں کر سکا شاید ہمارے بعد کوئی اس کی بھی ہمت کر لے لیکن لفظی باریکیوں کے بے جا استعمال کے باوجود میں نے معنویت اور سلاست کو برقرار رکھ کر شعر کی دلچسپی کو برقرار رکھا ہے۔ ملاحظہ ہو۔"

بن جائے جو بگڑ کے وہ تقدیر چاہیے
خانہ خرابیوں میں بھی تاثیر چاہیے
میں مرگِ ناگہاں کا طلب گار ہجر میں
اور اقتضائے شوق کہ تاخیر چاہیے
ممکن تو ہے کہ ضعف میں آنکھیں کھلی رہیں
پیشِ نگاہ آپ کی تصویر چاہیے
خانہ خرابیوں کی تلافی ضرور ہے
زندان پہ قدر وسعتِ تقصیر چاہیے

○☆○

غزل ایسی تھی کہ کوئی تعریف کیے بغیر رہ ہی نہیں سکتا تھا اور تعریف ہوئی بھی لیکن بزرگوں نے کم ہی حوصلہ افزائی کی۔

اس مشاعرے کے بعد اس نے یہ دستور سا بنا لیا کہ مشاعرے کے آغاز سے قبل وہ تقریر ضرور کرتا تھا۔ آہستہ آہستہ یہ تقریریں اس کی پہچان بن گئیں۔ لوگ اسے مذاق سے مرزا ہادی بی اے کہنے لگے۔ مقصد یہی تھا کہ ثابت یہ کر سکیں کہ بی اے کر کے ان کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔

لوگ اس کی ان ناصحانہ تقریروں سے تنگ آ گئے تھے۔ ہر مشاعرے میں اس کا موقع مل بھی نہیں سکتا تھا جب کہ اس کا مزاج یہ کہ جس کام کی ٹھان لیتا تھا، اس سے باز آنا اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ جب اس نے دروازے بند ہوتے دیکھے تو صفی لکھنوی کے مکان پر "دائرہ ادبیہ" کی بنیاد رکھی گئی۔ اس کے تحت مشاعرے ہوتے تھے۔ روح رواں خود مرزا تھا لہٰذا اسے تقریر کرنے سے کون روک سکتا تھا۔

اب اس کی خدمات کرسچن کالجیٹ اسکول سے کرسچن کالج میں منتقل ہو گئی تھیں۔ شام کے وقت ازابیلا تھیوبرن گرلز کالج میں ملازمت مل گئی تھی۔

یہ ملازمت اس کی آمدنی بڑھانے میں بے حد معاون ثابت ہوئی۔ اب اس کی زندگی ایک ڈگر پر آ گئی تھی لیکن اچانک اس کی زندگی میں پھر ایک تلاطم آ گیا۔

ابھی اسے کالج جاتے ہوئے کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ اس کی نظر ایک طالبہ پر پڑی۔

زلف بکھرائے ہوئے تا سرِ دوش
چشم بدمست نگہ آفت ہوش
سانولا رنگ، نشیلی آنکھیں
شوخ طرار رسیلی آنکھیں

○☆○

اسے دیکھتے ہی وہ استاد سے شاعر بن گیا۔ دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ وہ کچھ دیر کو لیکچر دینا بھول گیا۔ وہ اس کے سامنے تصویر بنی بیٹھی تھی مگر یہ تصویر آج سے پہلے کہاں تھی۔

"کہاں تھیں آپ؟" اس نے بے اختیاری میں سوال کر ڈالا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ آج سے پہلے تو آپ کو نہیں دیکھا۔"

"دیکھتے کیسے، میں کل ہی اس کالج میں آئی ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے کہا "ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا......" وہ کلاس سے مخاطب ہوا اور اس نے لیکچر دینا شروع کر دیا۔ لیکن اس کا دھیان ابھی تک اس تصویر میں اُلجھا ہوا تھا۔

وہ کلاس سے نکلا تو یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ تصویر آنکھوں سے اوجھل ہو چکی ہوگی لیکن جب ذرا فرصت ملی اور تصور کو

پرواز ملی تو اس تصویر کے سوا آنکھوں میں کچھ نہیں تھا۔ وہ بے چین قدموں سے رات بھر ٹہلتا رہا۔ ٹہلتے ٹہلتے صبح ہوگئی اور وہ کالج چلا گیا۔

شام کو اسے پھر ازابیلا تھیوبرن کالج جانا تھا۔ وہ پھر اسی کیفیت سے دوچار ہونے لگا جس سے وہ ایک دن پہلے گزر چکا تھا۔ وہی اُداس حسن تصویر بنا اس کے تصور کے آئینے میں بیٹھا تھا۔ اس نے اپنی بدحواسی پر قابو پایا اور کالج کے لیے روانہ ہوگیا۔

اسے بدحواس رہتے ہوئے چند ہی دن گزرے تھے کہ اس کے اضطراب میں اور اضافہ ہوگیا۔ لڑکی کو اس کے پڑھانے کا انداز ایسا پسند آیا کہ اس نے ٹیوشن کی فرمائش کردی۔ کوئی اور کہتا تو نظرانداز بھی کردیتا لیکن یہ تو اس نے کہا تھا جس کے لیے اس کا ایمان تھا' وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔ اس نے فوراً ہامی بھرلی۔

وہ پہلے دن اسے پڑھانے پہنچا تو اپنا استقبال دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ مکان سے متصل باغ میں کرسی ڈالے بیٹھی تھی۔ ملازم نے مرزا کو باغ میں پہنچا دیا۔

"میں نے فارسی پڑھنے کے لیے باغ کا انتخاب اس لیے کیا ہے کہ شاعری اگر شاعرانہ ماحول میں پڑھی جائے تو لطف دوبالا ہوجاتا ہے۔" لڑکی نے کہا۔

مرزا سحرزدہ ہوکر اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ وہ اس کے اتنا قریب ہے۔ اس نے ابتدا شاعری سے کی تاکہ اشعار کی تشریح کرتے ہوئے اپنے جذبات کا اظہار کرسکے لیکن ظاہر ہے لڑکی اس کے جذبات کو اشعار کی تشریح سمجھ کر پڑھ رہی تھی۔ اسے اگر ہمدردی ہوئی بھی ہوگی تو شاعر سے' نہ کہ مرزا سے۔

اس کے کوچے میں وہ جانا سرِ شام
باغ میں اس کا وہ آنا سرِ شام
زلف بکھرائے ہوئے تا سرِ دوش
چشمِ بدمست نگہ آفت ہوش

○☆○

اسے قربت تو نصیب ہوگئی تھی لیکن وہ ہمت کہاں سے لاتا کہ جسے پڑھا رہا تھا اس سے اظہارِ عشق بھی کرسکتا جب کہ وہ اس کا ہم عمر بھی نہیں تھا۔ اس نے اگر کچھ بیان بھی کیا تو اشعار کے پردے میں۔ کئی مرتبہ لڑکی کا چہرہ متغیر ہوا لیکن وہ اسے استاد کی زندہ دلی سے زیادہ اہمیت نہ دے سکی۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ راکھ میں چنگاریاں دبی ہوئی ہوں' مرزا کو کریدنے کی فرصت نہ ملی ہو۔ یک طرفہ محبت تھی جسے مرزا بڑی عقیدت سے قبول کیے ہوئے تھا۔ لیکن اس آگ میں وہ کب تک جلتا۔ اب اسے یہ بھی احساس ہونے لگا تھا کہ وہ اس آنچ سے پگھل کر وہ سب کچھ کہہ بیٹھے گا جو اس کے منصب کو زیب نہیں دیتا۔ اس نے اچانک ٹیوشن چھوڑ دی۔ ازابیلا تھیوبرن کالج بھی جانا ترک کردیا۔

یہ اتنا آسان نہیں تھا کہ وہ زندگی پھر شروع کردیتا۔ اسے تو یوں لگا جیسے وہ دو کناروں کے درمیان گھر گیا ہے۔ ایک کنارہ اس کی پہنچ سے دور ہے' دوسرے کنارے تک وہ جانا نہیں چاہتا۔ وہ درمیان میں کہیں کھڑا رہ گیا' دونوں کنارے اس سے دور ہٹتے چلے گئے لیکن اس نے کسی ماحول سے شکست کھانا سیکھا ہی نہیں تھا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر خود کو مصروف کرنا چاہا' خونِ دل میں انگلیاں ڈبوئیں اور جو کچھ وہ آج تک نہیں کہہ سکا تھا' اسے اپنی مثنوی "امید و بیم" کے ذریعے ادا کردیا۔

یوں تو ہیں دل میں ہزاروں ارماں
غیر ممکن ہے کہ ہو ان کا بیاں
ایک مطلب ہے مگر سب سے اہم
تم اگر سُن لو تو ہے عین کرم
شیفتہ اپنا سمجھ لو مجھ کو
گوشۂ دل میں جگہ دو مجھ کو
تم کو لازم ہے مرا پاس کرو
دل میں کچھ اور نہ وسواس کرو
شاعری اس کو نہ سمجھو زنہار
واقعی ہے یہ مری حالتِ زار

انتخابِ کلام

دردِ دل کی لذتیں صرف شبِ غم ہوگئیں
طولِ فرقت سے بہت بے تابیاں کم ہوگئیں
ہم نشیں دیکھی نحوست داستانِ ہجر کی
محفلیں جمنے نہ پائی تھیں کہ برہم ہوگئیں
ہم کو بھی کیا کیا مزے کی داستانیں یاد تھیں
لیکن اب تمہید ذکرِ دردِ ماتم ہوگئیں
دل یہ کہتا ہے فراقِ ماہ و انجم دیکھ کر
ہائے کیا کیا صحبتیں راتوں کو برہم ہوگئیں

○☆○

چاہیے تم کو مرا دھیان رہے
عشق پر حسن کا احسان رہے

○☆○

طبیعت پھر بھی نہیں بہلی۔ بدحواسی اب بھی طاری تھی۔ ان دنوں اگر اس کا دل لگتا تھا تو شاعری میں۔ کالج میں کلاسیں وہ پہلے بھی باقاعدگی سے نہیں لیتا تھا۔ اب اس میں مزید تعطل گیا۔ دوسرے تیسرے دن کلاس میں چلا جاتا اور وہ بھی اس حال میں کہ گریباں چاک ہی کہا جاسکتا ہے۔ کوئی اور پروفیسر ہوتا تو طلبہ اس کی گوشمالی کرچکے ہوتے لیکن طلبہ اس کی علمیت کے قائل تھے۔ وہ جب بھی کلاس میں جاتا، طلبہ اس کی موجودگی کو غنیمت جانتے۔

اس کی وحشت مزید بڑھ گئی تھی۔ اسی عالم وحشت میں اس نے گھسیاری منڈی والا مکان چھوڑ دیا اور جنگو خان کی گلی میں کرائے کا مکان لے کر رہنے لگا۔ مرزا عبدالحلیم شرر اس کے مکان کے قریب ہی رہتے تھے۔

اب مرزا نے اپنی وحشت کا علاج اسی میں دیکھا کہ شادی کرلی جائے۔ کٹرہ ابوتراب میں ایک بیوہ رہا کرتی تھیں۔ ان کا نام صاحب زادی بیگم تھا۔ یہ مال دار بیوہ تھیں۔ ان کی جائیداد واملاک کانپور ڈسٹرکٹ میں تھی۔ انہیں ایک ایسے آدمی کی ضرورت تھی جوان سے شادی کرکے ان کی جائیداد کی دیکھ بھال کرسکے۔ دوستوں نے مرزا کو راضی کرلیا اور یوں انہوں نے صاحب زادی بیگم سے دوسری شادی کرلی۔

شادی کیا ہوئی مرزا کی فارغ البالی کے دن آگئے۔ اس کی چال ڈھال میں تو فرق نہیں آیا لیکن اب وہ بنا سنورا رہنے لگا... اطلس کی اچکن جو ہر وقت عطر سے مہکتی رہتی۔ اس کی خوش حالی کی گواہ تھی۔ گھر میں نوکر چاکر تھے۔ لنچ کا وقت ہوتا اور وہ کالج میں ہوتا تو ماما چاندی کی کٹوری میں حریرہ لے کر آتی۔

ذرا فراغت ملی تو علمی شوق پھر عود کر آیا۔ اس مرتبہ نجوم کا میدان اس کی فتوحات کا منتظر تھا۔

اس کی عادت تھی کہ کالج سے واپسی پر کتابوں کی دکانوں کا طواف ضرور کرتا تھا۔ ایک روز وہ بازار سے گزر رہا تھا کہ علم نجوم پر کوئی پرانی کتاب اسے نظر آئی جو کسی نے بیکار سمجھ کر کباڑیے کے ہاتھ فروخت کردی تھی۔ اس نے بھی بیکار سمجھ کر ہی اسے خرید لیا۔

رات ہوئی تو وہ کتاب لے کر بیٹھ گیا۔ کتاب کیا تھی ایک روشنی تھی جس میں وہ رات بھر نہاتا رہا۔ دن نکل آیا وہ کالج بھی نہیں گیا۔ کتاب ختم ہوئی تو کئی الجھنیں اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگیں۔ کئی مسئلے ایسے تھے جنہیں حل کرنے میں وہ کتاب ناکام رہی تھی۔ وہ دن بھر نقشے بناتا اور مٹاتا رہا لیکن کچھ حاصل نہیں ہوا۔ یہ ناکامی اس کے لیے چیلنج بن گئی۔ اس نے اس موضوع پر سیکڑوں کتابیں جمع کرلیں۔ جن آلات کی ضرورت ہوسکتی تھی کچھ تو ہاتھ سے بنالیے، کچھ دوسرے شہروں سے منگالیے اور تجربات میں مصروف ہوگیا۔

اس کی گھریلو زندگی اب پُرسکون تھی۔ دو لڑکے ہوچکے تھے، آغا ولی اور آغا علی۔

وہ ابھی اس پُرلطف زندگی کا لطف اُٹھانے بھی نہیں پایا تھا کہ ان تجربات میں مصروف ہوگیا۔ اس کا ایک شاگرد افتخار حسین جو سیشن جج کے عہدے تک پہنچ گیا تھا ایک دن اس سے ملنے آیا۔

"میاں اس ججی وجی میں کیا رکھا ہے، تم میرے ساتھ ہیئت پڑھا کرو۔" مرزا نے کہا۔

"آجکل چھٹیاں ہیں، میں اتنا وقت نکال تو سکتا ہوں۔"

"تو پھر دیر کس بات کی ہے، کل سے آجاؤ۔ میرا بھی دل لگا رہے گا، تم بھی کچھ سیکھ جاؤ گے۔"

افتخار حسین وعدے کے مطابق دوسرے دن اس کے پاس پہنچ گئے۔ اب مرزا کے شوق میں مزید اضافہ ہوگیا۔ کبھی دل چاہتا تو کالج چلا جاتا ورنہ دن رات دوربین لگائے ستاروں کی چال کا مشاہدہ کرتا رہتا۔

صاحب زادی بیگم سے نہ اس سے شادی اس لیے کی تھی کہ جائیداد کی دیکھ بھال ہوسکے گی لیکن یہ کام اس کے بس کا کہاں تھا۔ بدانتظامی کی نذر ہوکر جائیداد بک بکا گئی۔ اب گزارہ صرف کالج کی تنخواہ پر تھا جب کہ دو بچوں کے بعد اخراجات بھی بڑھ گئے تھے۔ اسے اس مشکل کا احساس تو تھا لیکن اس کے اختیار میں کچھ نہیں تھا۔ بیوی کی شکایتیں روز بروز بڑھتی جارہی تھیں۔

اس دن وہ بہت پریشان تھا۔ اسے ایک نادر کتاب کے بارے میں معلوم ہوا کہ فلاں جگہ فروخت ہورہی ہے لیکن اس کے پاس پیسے نہیں تھے کہ وہ کتاب خرید سکے۔ صاحب زادی بیگم کو اس کی اس پریشانی کا علم تھا لیکن نقد رقم اس کے پاس بھی نہیں تھی۔

"آپ کچھ پریشانی نظر آرہے ہیں۔"

"پریشان تو ہم رہتے ہی ہیں۔"

"لیکن آج کچھ زیادہ پریشان ہیں۔"

"بیگم، اب آپ سے کیا چھپانا۔ ایک کتاب مل رہی ہے، وقت گزر گیا تو کوئی اور خرید لے گا اور ہمارا حال یہ کہ

ہمارے پاس پیسے نہیں ہیں۔"

صاحب زادی بیگم کمرے میں گئیں اور سرخ کپڑے کی ایک تھیلی لاکر اس کے سامنے رکھ دی۔

"یہ رہ گئے ہیں‘ انہیں بیچ کر کتاب خرید لیں۔"

وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ اس میں کچھ رقم ہے جو اس کی بیوی نے پس انداز کرلی ہوگی۔ اس نے شکر گزار آنکھوں سے بیوی کی طرف دیکھا اور تھیلی کھولی۔ تھیلی میں دو کڑے رکھے تھے۔

"بیگم یہ کیا۔ یہ تو تمہارے کڑے ہیں۔"

"آپ ہی کے ہیں‘ انہیں بیچ لیجیے۔"

وہ کچھ دیر ان کڑوں کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ایک فیصلہ کرلیا۔

"میں انہیں بیچ نہیں سکتا۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ گروی رکھ دوں‘ تنخواہ ملنے پر انہیں چھڑا لوں۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔"

اس نے بے دلی سے سلیپر پاؤں میں ڈالے‘ تھیلی ہاتھ میں لی اور گھر سے نکل گیا۔

"لالہ یہ گروی رکھنا ہے۔" اس نے بنئے کے سامنے کڑے رکھ دیے۔

"مرزا صاحب ایسی کیا آفت آگئی۔"

"بس پندرہ دن کی بات ہے‘ تنخواہ پر لے جاؤں گا۔"

"وہ تو لے ہی جائیں گے۔ آپ کو کیا میں جانتا نہیں۔ میں تو یوں بھی پیسے گن دیتا لیکن کاروبار کے اصول ہوتے ہیں اس لیے مجبور ہوں۔"

بنئے نے کڑے رکھ لیے اور رقم اس کے حوالے کردی۔ مرزا نے روپے گننے کی زحمت بھی نہ کی اور سیدھا اس دکان پر پہنچا جہاں وہ کتاب مل رہی تھی۔ اس کی محنت ٹھکانے لگی کہ کتاب ابھی فروخت نہیں ہوئی تھی۔ اس نے کتاب بغل میں دبائی اور پھر گوشہ نشیں ہوکر بیٹھ گیا۔

تنخواہ ملی تو اس نے کڑے چھڑا لیے لیکن تنخواہ تو آدھی رہ گئی۔ گھر کی پریشانی دیکھ کر اسے خود سے شرم آنے لگی۔ اس نے سوچا‘ تجربات تو چلتے ہی رہیں گے‘ اب آمدنی بھی بڑھانی چاہیے۔

مہادیو پرشاد ورما جو ناول فروش تھے‘ اس کے دوست تھے۔ یہ حضرت ناولیں فروخت بھی کرتے تھے اور چھاپتے بھی تھے۔ مرزا ان کی فرمائش پر پہلے بھی کچھ تراجم وغیرہ کرچکا تھا۔ اس مرتبہ اس نے سوچا کہ کوئی ناول لکھ کر ان سے چھپوایا جائے۔ اس طرح آمدنی کا ذریعہ نکل سکتا ہے۔

★★★★★★★★★★★★★★★★

منتخب اشعار

کس قدر معتقد حسنِ مکافات ہوں میں
دل میں خوش ہوتا ہوں جب رنج سوا ہوتا ہے

○☆○

موت کیا چیز ہے؟ ترکِ لذات
ہے اسی موت سے مقصود حیات

○☆○

جسے ہو حسنِ ظن تم سے کسی سے بدگماں کیوں ہو
تمہارے عہد میں بدنام دورِ آسماں کیوں ہو

○☆○

ادا سے جھک کے ملتے ہو نگہ سے قتل کرتے ہو
ستم ایجاد ہو‘ ناوک لگاتے ہو کماں ہوکر

○☆○

حیا کی شوخیوں سے اٹھتے اٹھتے جھک گئیں نظریں
مری قسمت سے ان کے تیر بھی آئے کماں ہوکر

○☆○

جواں ہوتے ہی وہ تو اور ہی کچھ ہوگئے اے دل
کہاں کی پاک بازی ہم بھی اب نیت بدلتے ہیں

○☆○

حسن شاہد ہے مری رنگینی تحریر کا
اک ادائے شوخ ہے جو رنگ ہے تصویر کا

اس نے چند اوراق‘ ناول کے طرز پر کسی فرصت کے وقت میں لکھ کر چھوڑ دیے تھے۔ اب جو ناول لکھنے کا خیال آیا تو ان اوراق میں اس نے چند اوراق اور شامل کرلیے۔ اس میں جو قصہ بیان کیا گیا تھا‘ وہ خود مرزا کی آپ بیتی تھی۔ مرزا کی پہلی نسبت خالہ زاد بہن سے ہوئی تھی جو جائیداد کے جھگڑوں میں ٹوٹ گئی تھی۔ مرزا اس داغ کو بھلا نہیں سکا تھا۔ اس نے اس ناول میں اسی قصے کو کسی اور کی کہانی بنا کر پیش کردیا۔ آپ بیتی کی طرز پر یہ ناول اردو میں بڑی نئی چیز تھا۔ اسے امید تھی کہ نہ صرف خواص بلکہ عوام بھی اس ناول کو پسند کریں گے۔

اب سوال یہ تھا کہ اسے کس نام سے چھپوایا جائے۔ کچھ وضع قدیم کا پاس‘ کچھ اپنی ثقاہت کا لحاظ‘ داستان سرائی کرنے بیٹھا تو اپنے چہرے پر "مرزا رسوا" کا نقاب ڈال لیا۔

شاعری میں وہ مرزا تخلص کرتا تھا لیکن ناول نگاری کے لیے رسوا تخلص اختیار کیا۔

یہ سب معاملات طے ہوگئے تو مہادیو پرشاد ورما نے اس کا یہ ناول چھاپ دیا۔ اس وقت لکھنؤ میں شرر لکھنوی کے تاریخی ناولوں کی بڑی دھوم تھی لیکن یہ ایک معاشرتی ناول تھا جو بالکل نئی چیز تھی۔ ابھی تک ناولوں پر داستانوں کا قدیم اثر غالب تھا۔ مرزا رسوا نے اپنے ناول کے ہیرو کو بالکل عام آدمی کے روپ میں پیش کیا۔ کہاں آزاد اور شرر کے تاریخی ہیرو کہاں یہ سادہ لوح سیّد محمد ذکی' افشائے راز کا ہیرو' مرزا رسوا نادانستگی میں جدید ناول نگاری کی داغ بیل رکھ رہا تھا۔ وہ یہ بتا رہا تھا کہ صرف بڑے لوگوں کے قصے ہی ناول کا موضوع نہیں بنتے بلکہ عام لوگوں کی زندگی اور ان کے مسائل بھی دلچسپ ہوسکتے ہیں بشرطیکہ واقعات کی صحیح تصویر کھینچنے کی کوشش کی جائے۔

ایک مبتدی ناول نگار کی تمام خامیوں کے باوجود' رسوا نے اس ناول میں لکھنؤ کے رہنے والے' اس کی عمارتیں' اس کے محلے' اور اس کا سماجی پس منظر اس انداز میں بیان کردیا تھا کہ ناول چھپتے ہی کسی نئی چیز کی طرح اس کا استقبال کیا گیا۔

پرشاد ورما کو اُمید نہیں تھی کہ یہ ناول اتنا مقبول ہوجائے گا۔ یہ ناول مرزا ہی کی نہیں خود ورما کی آمدنی کا ذریعہ بھی بنا۔ اب خود اسے فکر ہوئی کہ وہ مرزا سے ایسا ہی ایک ناول اور لکھوائے۔ مرزا اس ناول کو لکھ کر پھر سے اپنے تجربات میں مصروف ہوگیا تھا۔ مہادیو پرشاد ورما کو اپنے کاروبار کی فکر تھی۔ وہ کچھ دن تو انتظار کرتا رہا کہ مرزا خود اس کے پاس آئے گا اور وہ دوسرے ناول کے لیے اصرار کرے گا لیکن جب وہ نہیں آیا تو مایوس ہو کر وہ خود اس کے دروازے پر پہنچ گیا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے دو تین مرتبہ کنڈی کھٹکھٹائی۔ جب کوئی آواز نہیں آئی تو مہادیو پرشاد نے زور سے پکارا۔

"مرزا صاحب ہیں؟"

"وہ گھر پر نہیں ہیں۔" اندر سے آواز آئی۔

"مگر آواز تو مرزا صاحب ہی کی ہے۔"

"مجھے کیا معلوم تھا' میں آواز نہ دیتا۔" مرزا نے کہا اور دروازہ کھول دیا۔

"مرزا صاحب ایسی بھی کیا گوشہ نشینی۔"

"بھئی کام ہی کچھ ایسے ہیں ورنہ سیرو تفریح کسے بُری لگتی ہے۔ ایک دوربین بنانے میں مصروف ہوں۔ آپ فرمایئے کیسے آنا ہوا۔"

"آپ کا ناول "افشائے راز" تو بہت مقبول ہوا۔"

"ہوا ہوگا۔"

"آپ کو خوشی نہیں ہوئی۔"

"مجھے علمی کاموں سے خوشی ہوتی ہے۔ ناول کو میں اہمیت نہیں دیتا۔"

"لیکن آپ میں ناول نگاری کی جو صلاحیت ہے' اس سے مجھے یہ لگتا ہے کہ آپ تاریخ ادب میں زندہ رہیں گے تو اپنے کسی نہ کسی ناول کی وجہ سے زندہ رہیں گے۔"

"کیوں خوشامد فرماتے ہیں۔"

"خوشامد نہیں حقیقت عرض کر رہا ہوں۔"

"چلیے یوں ہی سہی' پھر کیا کیا جائے۔"

"کیا کیا جائے۔ دوسرے ناول کی تیاری کیجیے۔ میں چھاپنے کو تیار رہوں۔"

"ورما صاحب' میں ناول نگار کبھی بھی نہیں تھا۔ چند اوراق کسی وجہ سے تحریر کرلیے تھے' وہ ناول بن گئے۔ ضروری نہیں کہ کچھ اور لکھ سکوں۔"

"آپ کوشش تو کیجیے۔ عمر گزری ہے کتابیں چھاپتے' میرا تجربہ کہتا ہے آپ لکھ لیں گے۔"

"اچھا ٹھیک ہے' ہم کوشش کریں گے۔"

"نہیں' وعدہ کیجیے کہ آج ہی لکھنے بیٹھ جائیں گے۔"

"چلیے بیٹھ جائیں گے۔"

"یہ کچھ ایڈوانس ہے رکھ لیجیے۔"

"شکریہ۔"

مہادیو پرشاد اُٹھ کر گئے اور مرزا نئی کہانی کی داغ بیل ڈالنے بیٹھ گیا۔ افشائے راز کی اشاعت اور مقبولیت کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ ناول وہ کامیاب ہوسکتا ہے جو حقیقت سے قریب ہو اور ایسی زندگی کی ترجمانی کرتا ہو جو پڑھنے والوں کی زندگی سے ہم آہنگ ہو۔ وہ اس حقیقت سے بھی واقف ہوچکا تھا کہ ناول میں مصنف کا تجربہ اور مشاہدہ بھی بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کر اپنے نئے ناول کے لیے ایک ایسے قصے کی بنیاد رکھی جس سے وہ اچھی طرح واقف تھا اور جسے بیان کرتے ہوئے اس کا قلم خوب اچھی طرح دوڑ سکتا تھا۔ طوائف اس معاشرے کا اہم کردار تھی۔ خود مرزا کی عمر کے بہت سے شب و روز اس کوچے کی نذر ہوئے تھے۔ اس نے ایک طوائف کو موضوع بنایا اور اس کی داستان اپنی زبان سے بیان کرکے "امراؤ جان ادا" تصنیف کردی۔ افشائے راز میں جو کسر رہ گئی تھی' اس

ناول میں پوری کردی، نہایت مربوط و متناسب پلاٹ رکھا۔ کرداروں پر خاص توجہ دی اور مکالمے لکھتے وقت تو اس نے جیسے قلم ہی توڑ دیا۔

یہ ناول چھپ کر بازار میں آیا تو جیسے قیامت آگئی۔ عوام سے لے کر ناقدین تک میں دھوم مچ گئی۔ اخبارات اور رسائل میں تنقیدی مضامین لکھے گئے اور پہلی مرتبہ یہ محسوس کیا گیا کہ کوئی نیا ناول نگار سامنے آیا ہے۔ اس نے یہ ناول کچھ ایسی چابکدستی سے لکھا تھا کہ افسانے پر حقیقت کا گمان ہوتا تھا۔ لوگوں کو یہ غلط فہمی ہونے لگی کہ اس ناول کی ہیروئن "امراؤ جان ادا" حقیقی کردار ہے جس سے مرزا رسوا کی ملاقات ہوئی اور انہوں نے اس کے واقعات اپنی زبانی بیان کردیے۔ لکھنوی معاشرے کے لیے طوائف کوئی نئی چیز نہیں تھی لیکن طوائف جتنی عام تھی اس کی زندگی کے واقعات اتنے ہی پوشیدہ تھے۔ وہ ایک پُراسرار سی شے تھی جس کے بارے میں کوئی بھی کچھ نہیں جانتا تھا۔ اب جو رسوا نے ایک طوائف کی نجی زندگی اور اس کے ماضی کو موضوع بنایا تو لوگوں کی دلچسپی کی انتہا نہیں رہی۔

جب رسوا تک یہ خبر پہنچی کہ لوگ اس ناول کو حقیقت سمجھ رہے ہیں تو اس نے اس غلط فہمی میں مزید رنگ بھرنا چاہا۔ اس نے ایک مثنوی "نالہ رسوا" لکھی اور اسے "امراؤ جان ادا" کے نام سے شائع کرادیا۔ اس کے دیباچے میں امراؤ جان نے لکھا تھا کہ جب مرزا نے میری سوانح عمری شائع کرائی تو میں ان کے عدم موجودگی میں ان کے گھر گئی اور ایک ناتمام مثنوی اُڑا لائی۔ اس مثنوی کی مدد سے ان کے ایک معاشقے کے بارے میں معلومات ہوئیں۔ میں نے ان معلومات کو اپنے طور پر بیان کرکے چھپوادیا اور اس طرح اپنا انتقام لے لیا۔

اس کتاب کا چھپنا تھا کہ جنہیں یقین نہیں آیا تھا، انہیں بھی یقین آگیا کہ مرزا نے جو کردار اپنے ناول میں بیان کیا تھا وہ فرضی نہیں، حقیقی ہے اور ابھی زندہ ہے۔ اسی لیے تو اس نے انتقاماً یہ مثنوی شائع کی ہے جب کہ حقیقت یہ تھی کہ یہ مثنوی بھی خود مرزا نے شائع کرائی تھی۔

اس ناول کی مقبولیت کے بعد اس نے تیسرا ناول "ذات شریف" کے عنوان سے لکھنا شروع کردیا اور ساتھ ہی ہیئت دانی کے مشغلے میں مصروف ہوگیا۔ اس مرتبہ وہ اپنے تجربات اور ناول نویسی میں ایسا مصروف ہوا کہ کالج سے دل اُچاٹ ہوگیا۔ اس نے چھ ماہ کی رخصت لے لی اور اپنی جگہ علامہ فدا حسین کو مقرر کرادیا۔ خود چوتھائی تنخواہ یک مشت

انتخابِ کلام

لڑکے جاتے ہو تو اک تیغ لگاتے جاؤ
ہاتھ اٹھاتے ہو تو یوں ہاتھ اٹھاتے جاؤ
حالِ دل سچ بھی کہوں تو مجھے جھٹلا دو گے
بھید کھلتے ہوں تو کچھ بات بناتے جاؤ
وعدۂ شام کرو صبح کو جاتے ہو اگر
کوئی بے وقت جو سوئے تو جگاتے جاؤ
یوں چلو راہِ وفا میں کہ نہ پائے کوئی
جو نشاں راہ میں ہیں ان کو مٹاتے جاؤ
مہر کا نام تو روشن ہے جہاں میں مرزا
اک چراغ اور سرِ راہ جلاتے جاؤ

وصول کرلی جو زیادہ دن اس کی فضول خرچیوں کا ساتھ نہ دے پائی۔

اب اس نے پے در پے دو ناول شائع کروائے۔ ذاتِ شریف اور شریف زادہ۔

وہ ایسا شاہ خرچ تھا کہ چھوٹی موٹی آمدنیاں اس کے ہفتے بھر کا خرچ بھی نہیں تھیں۔ چھ ماہ گزرے بھی نہیں تھے کہ عسرت نے گھیر لیا۔ اس نے پھر سے کالج جانا شروع کردیا لیکن اب اس کا دل کالج کی نوکری سے بھر گیا تھا۔ آخر کار اس نے حیدر آباد دکن جانے کا ارادہ کرلیا۔ اس مرتبہ اپنی جگہ پر سیّد احمد حسن موسوی کو مقرر کرادیا اور خود بیوی بچّوں سمیت حیدر آباد چلا گیا۔

حیدر آباد میں اس کی تنخواہ چار سو روپے ماہوار مقرر ہوئی۔ لیکن یہ نوکری بلدیہ سے دور مضافات میں تھی۔ آب و ہوا بھی موافق نہیں تھی، یار دوست بھی بچھڑ گئے۔ وہ لکھنؤ کی رنگینیوں سے نکل کر اس اجاڑ جنگل میں آکر پڑ گیا، دل لگتا تو کیسے لگتا۔ وہ گوشہ نشیں ضرور تھا لیکن اس کی گوشہ نشینی خاص مواقع کے لیے تھی ورنہ تو وہ باغ و بہار اور حد درجہ یار باش تھا۔

وہ ایک دن سو کر اُٹھا تو بدن جل رہا تھا۔ اس ویرانے میں ڈاکٹر کہاں۔ بیوی بچے گیلی پٹیاں رکھ رکھ کر بخار اُتارنے کی کوشش کرتے رہے لیکن شام تک تو وہ ہاتھوں میں آگیا۔ بڑی مشکل سے کوئی ڈاکٹر ملا جس نے پورے دو ہفتے اسے بستر پر لٹایا تب کہیں جاکر بخار اُترا لیکن صرف بخار اُترا، طبیعت پھر بھی ٹھیک نہ ہوئی۔ کمزوری اتنی بڑھ گئی تھی کہ ٹانگیں اس طرح کانپتی رہتی تھیں جیسے ملیریا کا مریض کانپتا ہے۔ اسی

کمزوری میں مرے پہ سو درے اور ہوئے کہ وہ اسہال کے مرض میں مبتلا ہوگیا۔ ڈاکٹروں نے افیون تجویز کی۔ اس کی تو جان پر بنی ہوئی تھی۔ کوئی کچھ بھی بتاتا وہ استعمال کرنے پر تیار ہوجاتا۔ اس نے افیون کھانا شروع کردیا۔ مرض تو جاتا رہا لیکن وہ افیون کا عادی ہوگیا۔ وہ پہلے ہی قرض دار ہوگیا تھا' افیون کے خرچ نے اسے اور بھی زیرِ بار کردیا۔ جن کا مقروض تھا ان کے تقاضے شدید سے شدید تر ہوتے جارہے تھے۔

مسلسل بیماریوں نے حیدر آباد سے اس کا دل اُچاٹ کردیا۔ اس بیماری میں اسے لکھنؤ کے دوست بھی بے تحاشا یاد آئے۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے اسے لکھنؤ کی یاد آئی اور اس نے لکھنؤ کے لیے سامانِ سفر باندھ لیا۔

لکھنؤ آتے ہوئے اسے یہ فکر تو تھی ہی نہیں کہ نوکری کا کیا ہوگا۔ وہ اپنی جگہ سیّد احمد حسن موسوی کو ملازم کرا گیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ لکھنؤ پہنچتے ہی کالج کی ملازمت پھر اسے مل جائے گی۔

لکھنؤ پہنچنے کے بعد دو دن تک تو وہ تھکن اُتارتا رہا۔ جب کچھ حواس بحال ہوئے تو وہ کالج پہنچ گیا۔ یہاں تو رنگ ہی بدلا ہوا تھا۔ جن صاحب کو وہ اپنی جگہ مقرر کرکے گیا تھا انہوں نے صرف پچاس روپے ماہوار پر ہی کام کرنے کی ہامی بھرلی۔ مرزا کو شدید صدمہ ہوا کہ جس شخص کو انہوں نے ملازمت دلوائی اس نے اپنی قیمت اتنی گرادی' صرف اس لیے کہ وہ اتنی کم تنخواہ قبول نہیں کرے گا اور ان کی نوکری پکی ہوجائے گی۔

وہ مایوس ہوکر پرنسپل کے کمرے سے باہر آگیا۔ ابھی وہ چند قدم ہی چلا تھا کہ کسی نے بہت قریب سے اسے پکارا۔

اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ پرنسپل صاحب اس کا تعاقب کرتے ہوئے کمرے سے باہر آگئے تھے۔

"مرزا صاحب' ہم آپ کی قابلیت کے بے حد معترف ہیں۔"

"نوازش ہے حضور کی' لیکن میں ان مولوی صاحب سے زیادہ قابل نہیں جنہیں آپ نے پچاس روپے کی خطیر تنخواہ پر ملازم رکھا ہے۔"

"ہم ان مولوی صاحب سے متفق نہیں۔ اگر آپ اتنی ہی تنخواہ پر آنا چاہیں تو ہم انہیں جواب دے دیں گے۔"

"لیکن پھر مجھ میں اور ان مولوی صاحب میں کیا فرق ہوا۔"

"فرق یہ ہے کہ ہم انہیں نکال کر آپ کو ملازمت دینے کے لیے تیار ہیں۔"

"لیکن تنخواہ وہی ہونی چاہیے جس پر میں حیدر آباد جانے سے پہلے کام کررہا تھا۔"

"اب یہ بہت مشکل ہے۔ اس لیے کہ مولوی صاحب کم تنخواہ پر تیار ہوچکے ہیں۔ انتظامیہ کو اعتراض ہوگا کہ میں نے کم تنخواہ کے پروفیسر کو نکال کر زیادہ تنخواہ پر آپ کو ملازم کیوں رکھا۔ ہاں یہ میرا وعدہ ہے کہ اس وقت آپ اسے قبول کرلیں بعد میں' میں بورڈ سے سفارش کروں گا کہ آپ کا معاوضہ بڑھایا جائے۔"

وہ اس وقت اتنا ضرورت مند تھا کہ مجبوراً پچاس روپے ہی قبول کرنا پڑے۔

وہ ان دنوں گولہ گنج کے ایک مکان میں قیام پزیر تھا۔ یہ مکان آرام دہ نہیں تھا۔ وہ کچھ عرصے کے لیے سلیمان نگر چلا گیا لیکن دوبارہ پھر گولہ گنج کے مکان میں اُٹھ آیا۔

اس کے شوق عجیب عجیب تھے۔ اُدھر تو یہ عسرت' اِدھر یہ حال کہ اس نے ایک شادی اور کرلی۔ پچاس روپے ماہوار کی تنخواہ میں پچیس روپے تو قرضے میں چلے جاتے' بقیہ پچیس میں سے بھی وہ کتابیں خریدنے کے شوق کو پورا کرلیا کرتا تھا۔ یہ زمانہ اس کے لیے بہت سخت تھا۔

افیون کھانے کی عادت وہ اپنے ساتھ حیدر آباد سے لگا لایا تھا۔ اب اتنی استطاعت کہاں کہ اس شوق کو باقاعدگی سے پورا کرسکے۔ اس نے یہی بہتر سمجھا کہ اس عادت کو ترک کردے۔ وہ ارادے کا بہت پکا تھا۔ جس بات کا فیصلہ کرلیتا' پھر دنیا کی کوئی طاقت اسے بدل نہیں سکتی تھی۔ اس نے سوچا افیون کی عادت چھوڑ دینا کون سا مشکل کام ہے۔ بس ایک دن ارادہ کیا اور وقتِ مقررہ پر افیون کھانا چھوڑ دیا۔ ایک دن تو خیریت سے گزر گیا لیکن دوسرے دن اس کی حالت غیر ہوگئی۔ آنکھیں اوپر کی طرف چڑھ گئیں' جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ بیویوں نے زور دیا کہ وہ قسم توڑ دے لیکن وہ نہ مانا۔ ڈاکٹروں نے تجویز کیا کہ افیون کے بغیر اس کی حالت کا کوئی علاج نہیں۔ لیکن وہ پختہ ارادہ کرچکا تھا اس نے ڈاکٹروں کی رائے سے بھی اختلاف کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دورے پڑنے لگے۔

وہ ابھی ابھی ہوش میں آیا تھا۔ اس کے دوست غلام الثقلین دیر سے اس کے سرہانے بیٹھے تھے۔ اس نے غنودگی کے عالم میں ان کی طرف دیکھا اور مسکرا کر آنکھیں بند کرلیں۔

"اب طبیعت کیسی ہے؟" غلام الثقلین نے پوچھا۔

"مولا کا کرم ہے۔ ایک دو دن اور گزریں گے تو بالکل ٹھیک ہوجاؤں گا۔ افیون کی عادت بالکل چھوٹ جائے گی۔"

"یہ آپ کا خیال ہے' ڈاکٹر کچھ اور کہتے ہیں۔"

"ڈاکٹروں کا ذکر چھوڑیئے۔"
"نہیں' ڈاکٹروں کا خیال درست ہے۔ ہم نے آج تک ایک دم سے کسی کو اس عادت کو ترک کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ خدانخواستہ آپ کی جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔"
"کچھ نہیں ہوتا' لوٹ پیٹ کے ٹھیک ہو جاؤں گا۔"
"ابھی آپ کو علم و ادب کی بہت خدمت کرنی ہے۔ آپ ہماری خاطر اسے ایک دم سے نہ چھوڑیں' آہستہ آہستہ کم کرتے جایئے۔"
"بہت اچھا" اس نے کہا اور اس پر پھر غنودگی طاری ہوگئی۔ غنودگی کیا' نقاہت تھی جو اسے زیادہ دیر ہوش میں نہیں رہنے دیتی تھی۔

بالآخر اس نے دوستوں کے اصرار پر اپنی قسم توڑ دی۔ تھوڑے ہی دن میں طبیعت بحال ہوگئی۔

بیماری سے اٹھنے کے بعد اس کی توجہ مذہب کی طرف مبذول ہوگئی۔ اس نے اس شوق کی تشفی کے لیے ہفتہ وار پرچہ "الحکم" نکالا جو مفت تقسیم کیا جاتا تھا۔ اس نے بڑی تن دہی سے مذہب کا مطالعہ شروع کر دیا۔ وہ عقیدتاً اثنائے عشری شیعہ تھا لیکن تعصب اور تنگ نظری سے کوسوں دور۔ مذہبی معلومات علما کی صحبت کے طفیل یوں بھی بہت تھیں لیکن اب اس نے باقاعدہ مطالعے سے حدیث' قرآن' علم الکلام' علم تفسیر میں ایسی دستگاہ فراہم کی کہ بس اجتہاد کی مسند لینے کی کسر باقی رہ گئی۔

اب اس کی مذہبی معلومات اظہار کا راستہ ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہ مذہبی تالیفات کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اس نے "فصوص الحکم در بحث اصول و اخبار' اصول مناظرہ' فطرت اسلام اور منطق استقرائی جیسی کئی کتابیں لکھ کر طبع کرا دیں۔

ہیئت دانی کا شوق اب سرد پڑ چکا تھا لیکن ایک واقعے نے اس آتش شوق کو پھر بھڑکا دیا۔ اس کے ایک دوست ممتاز عثمانی کے والد نے ضلع بارہ بنکی میں مسجد بنوانی چاہی۔ مرزا کا دعویٰ تھا کہ اس علاقے میں مسجدیں صحیح سمت پر نہیں ہیں۔ انہوں نے مرزا سے درخواست کی اگر صحیح سمت پر نہیں ہیں تو آپ سمتِ قبلہ درست کر دیں۔ مرزا نے وہاں جاکر انگاروں کی مدد سے صحیح سمت معلوم کی۔ یہ واقعہ تو جیسے پرانے زخموں کو کریدنے کا عمل ثابت ہوا۔ وہ واپس لوٹا تو ہیئت کا دورہ پڑ چکا تھا۔ دوسرے دن سے تجربات پھر شروع ہوگئے۔ یہ مشغلہ کالج جاتا' کالج سے واپسی پر مکان کی چھت پر جاکر لکڑی کے دوائر اور قطر اور مثلث بنانے میں مشغول ہو جاتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے مکان کی چھت کارخانے کی شکل اختیار کر گئی۔

وضع داریاں

شاہ جہان پور بھارت کے ان شہروں میں سے تھا جو اپنی بہادری اور "پٹھن ولی" کی روایات کے ساتھ ساتھ علما اور شعرا کی اچھی تعداد کے سبب بھی شہرت رکھتا تھا۔ شاگردوں کے حساب سے سارا شہر دو حلقوں میں بٹا ہوا تھا۔ ایک حلقہ اعتبار الملک حضرت دل شاہجہانپوری کے شاگردوں کا تھا اور دوسرا مولانا اسعد شاہجہانپوری کے تلامذہ کا تھا۔ دونوں حضرات اچھے شاعر ہونے کے علاوہ اپنی شرافت اور نجابت کے لئے بھی مشہور تھے۔ نہ ان میں آپس میں کبھی شاعرانہ چشمک ہوئی اور نہ کسی قسم کے تقابل یا مسابقت کا سوال پیدا ہوا۔

ایک بار ایسا ہوا کہ اسعد صاحب کے ایک دیرینہ شاگرد ممتاز شاہجہانپوری کسی سبب سے اُستاد سے شاکی ہو کر دل صاحب کی خدمت میں پہنچ گئے اور مشورے کے لئے غزل پیش کی۔ دل صاحب نے حیرت سے پوچھا کہ آپ تو حضرت اسعد کے تلامذہ میں سے ہیں' میرے پاس کیا لینے آئے ہیں! ممتاز صاحب نے اپنی رنجش کا ذکر کیا۔ دل صاحب نے انہیں آڑے ہاتھوں لیا اور کہا کہ تم نے ذرا سی بات پر برسوں کے احسانات بھلا دیئے۔ وہیں جاؤ اور ان سے معافی مانگو۔

اللہ اللہ ہمارے بزرگوں میں کیسی وضع داریاں تھیں۔ جو اب ہم میں عنقا ہیں۔

"دید شنید" سے اقتباس از حنیف اسعدی

یہ دورہ اتنا شدید تھا کہ وہ گھر بار کی طرف سے بالکل ہی غافل ہوگیا۔ اسی سال کا واقعہ ہے کہ اس کا بڑا لڑکا آغا ولی جسے سب پیار سے ننھے کہتے تھے کہیں غائب ہوگیا۔ اس نے بھی سُنا لیکن اس کے انہماک میں ذرہ برابر بھی فرق نہ آیا۔ شام کو ممتاز عثمانی گھبرائے ہوئے آئے۔
"مرزا کچھ سُنا آپ نے؟"
"ہاں آج بڑھئی نہیں آیا' میں نے اپنے ہاتھ سے تختے چیرے ہیں۔"
"میں آغا ولی کے بارے میں کہہ رہا ہوں۔"
"کیا ہوا اسے؟"

"صبح سے کہیں غائب ہے۔"
"ہاں سُنا تو ہم نے بھی ہے لیکن یہ قطر صحیح نہیں بیٹھ رہا ہے۔ صبح سے اسی میں لگا ہوا ہوں۔"
اس نے اس طرح سنی ان سنی کردی کہ ممتاز عثمانی اس کا منہ تکتے رہ گئے۔ کسی کا بیٹا گم ہوجائے اور وہ اتنے اطمینان سے اپنے کام میں مصروف رہے۔ وہ جب چھت سے نیچے اُترے تو مرزا اسی طرح اپنے کام میں مصروف تھا۔
کچھ دن بعد آغا ولی خدا جانے کس طرح مل گیا۔ اسے نہ گُم ہونے کا غم تھا نہ مل جانے کی خوشی ہوئی۔ یہ خوش خبری بھی ممتاز عثمانی نے اسے پہنچائی۔
"مبارک ہو مرزا، تمہارا بیٹا واپس آگیا ہے۔"
"اچھا، مگر وہ چلا کہاں گیا تھا؟" مرزا نے معصومیت سے پوچھا۔
"تمہیں نہیں معلوم وہ گم ہوگیا تھا۔"
"اچھا؟ مگر مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں۔"
ممتاز عثمانی پھر اس کا منہ تکنے لگے۔ اب ایسے دیوانے سے کوئی کیا کہے۔ وہ چھت سے نیچے اترے تو مرزا اسی طرح اپنے کام میں مصروف تھا۔
چھ مہینے کی مسلسل چلہ کشی کے بعد کچھ افاقہ ہوا۔ مصروف وہ اب بھی تھا لیکن اب اتنا وقت اس کے پاس تھا کہ اگر کوئی دوست ملنے آجاتا تو کچھ دیر کو کام روک کر اس سے مل لیتا تھا۔
محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس لکھنؤ میں ہو رہا تھا۔ اس کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے مہمان لکھنؤ آئے ہوئے تھے۔ کوئی اہلِ علم لکھنؤ کا رخ کرے اور مرزا سے ملنے نہ آئے یہ کیسے ہوسکتا تھا لہٰذا ان دنوں اس کے گھر بڑی رونق تھی۔
مرزا سان بنانے میں مصروف تھا کہ خواجہ الطاف حسین حالی اور غلام الثقلین آگئے۔ اس نے سب آلات ایک طرف رکھ دیے۔ کچھ دیر شاعری کا دور چلتا رہا۔ امرود رکھے تھے، جیلی بنائی، خود کھائی اور سب کو کھلائی۔ دوسرے دن اجلاس تھا۔ طے ہوا کہ ممتاز عثمانی، مرزا کو لے کر اس اجلاس میں آئیں گے۔ وہ ان دنوں کہیں آنے جانے کے لائق نہیں تھا لیکن حالی کا اصرار تھا، ٹال بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے وعدہ کرلیا۔
وعدے کے مطابق ممتاز عثمانی اسے لے کر کانفرنس کے اجلاس میں پہنچ گئے۔ نواب محسن الملک، وقار الملک، پروفیسر ضیاء الدین، صاحبزادہ آفتاب احمد خان، کئی ستاروں سے یہ کانفرنس آسمان بنی ہوئی تھی۔ وہ کسی کے لیے اجنبی کب تھا۔ جو ملا تپاک سے ملا۔ ان ستاروں میں ایک ستارے کا اضافہ اور ہوگیا۔
تقریریں شروع ہوئیں۔ اعلان ہوا کہ حسین آباد ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر مرزا حبیب حسین بی اے تقریر کریں گے۔ مرزا ان صاحب سے واقف تھا اس لیے ان کے نام پر مسکرایا اور توجہ سے ان کی تقریر سُننے لگا۔ حبیب حسین بی اے کہہ رہے تھے۔ "آپ لوگوں کو تو کچھ پروا نہیں۔ میں نے اس فن کی ایجاد میں راتوں کی نیند حرام کی اور اپنے کندھوں پر اینٹیں اُٹھائی ہیں......"
اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں سُن سکا۔ وہ محفل میں قہقہہ لگا کر ہنسنا بدتہذیبی سمجھتا تھا لہٰذا اس نے بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کی۔
"بھئی شب بیداری تو سمجھ میں آتی ہے، یہ اینٹوں کی کیا ضرورت تھی۔" اس نے قریب بیٹھے ہوئے ممتاز عثمانی سے سرگوشی کی اور اس مرتبہ ممتاز عثمانی بھی ہنسے بغیر نہ رہ سکے۔
"واپسی میں ذرا امین آباد کی طرف سے ہو کر چلیے گا۔" اس نے ممتاز عثمانی سے کہا۔
"کیوں، خیریت؟"
"ہاں خیریت ہے۔ میں ان ہیڈ ماسٹر صاحب کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔ اب شارٹ ہینڈ میں ایجاد کروں گا۔"
"لیکن اس ایجاد کا امین آباد سے کیا تعلق؟"
"ہے ایک تعلق۔"
پانچ بجے جلسہ ختم ہوا۔ وہ دونوں باہر نکلے۔ اس نے گھر جانے کے لیے امین آباد کا راستہ اختیار کیا۔ ممتاز عثمانی اب تک حیران تھے۔ ان کی حیرانی اس وقت ختم ہوئی جب مرزا، نول کشور ورما بک سیلر کی دکان میں داخل ہوا اور شارٹ ہینڈ مینول خریدی۔
"تو گویا اب اردو شارٹ ہینڈ ایجاد ہوکر ہی رہے گی۔" ممتاز عثمانی نے کہا۔
"یہ تو میں اس کتاب کے مطالعے کے بعد ہی کہہ سکوں گا۔" مرزا نے کہا۔
مرزا جیسے تیسے گھر تک پہنچا اور رات بھر میں اس کتاب کو نہ صرف ختم کرلیا بلکہ طے کرلیا کہ وہ اردو شارٹ ہینڈ ایجاد کرے گا۔
اس نے مزید معلومات کے لیے کالج میں انگریزی شارٹ ہینڈ کا شعبہ تعلیم دیکھا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ عربی حروف کبھی جوڑ پیوند لگانے میں حرفوں کے شوشے اور

اشارات خود ایک قسم کا شارٹ ہینڈ ہیں۔
اتنا بڑا کام جس میں مالی وسائل بھی ملوث تھے، وہ اکیلا انجام نہیں دے سکتا تھا۔ اس نے پرنسپل کو اعتماد میں لیا۔ پروفیسر منی لال گھوش جو کالج میں شارٹ ہینڈ کے پروفیسر تھے۔ اس کے مددگار کے طور پر اس کے ساتھ ہوگئے۔ اس کے علاوہ اس نے ممتاز عثمانی کو بھی اپنے ساتھ رکھا۔ مرزا نے اصطلاحات وضع کرنے کا کام اپنے ذمے لیا، مسٹر گھوش نے آؤٹ لائن بنائی اور ممتاز عثمانی نے قواعد کے لیے مشقیں تیار کرنے اور جملے بنانے کا کام شروع کیا۔ اس کام کے لیے مرزا کو کالج کی طرف سے ڈیڑھ سو روپے کا الاؤنس، تنخواہ کے علاوہ ملتا رہا۔

وہ ارادے کا ایسا پکا تھا کہ جس کا ارادہ کرلیتا اسے تکمیل تک پہنچائے بغیر دم نہ لیتا تھا۔ اس کے ساتھ کام کرنے والوں کو بھی مجبوراً اسی رنگ میں رنگنا پڑتا تھا۔ پروفیسر گھوش اور ممتاز عثمانی بھی اپنی استطاعت کے مطابق اس کا ساتھ دیے جارہے تھے لیکن اس کی طرح کشتیاں کون جلا سکتا تھا۔ کچھ دن تک تو وہ اس کی رفتار سے اس کے ساتھ چلتے رہے لیکن پھر ان پر تھکن غالب آنے لگی۔ یہ کام تینوں کے مل کر کرنے کا تھا اس لیے مرزا کو بھی رفتار کم کرنی پڑی وہ بھی سست ہوگیا۔ اب کبھی کبھی اسے اتنا وقت مل جاتا تھا کہ تفریح کے لیے گھر سے باہر نکلنے لگا۔

ایک روز وہ کتب فروشوں کا طواف کرنے کے بعد امین آباد کے راستے سے ہوتا ہوا گھر کی طرف پلٹ رہا تھا کہ اسے شاہ زادہ مرزا محمدؐ ہمایوں قدر تام جھام میں سوار جاتے نظر آئے۔ اسے کسی نے بتایا تھا کہ مرزا قدر کے پاس ان کے بزرگوں کی نشانی "زیچ محمد شاہی" ہے۔ یہ ایسی نایاب جنتری ہے کہ اس کی مدد سے ہیئت کا بڑے سے بڑا مسئلہ معمولی حساب کتاب سے حل ہوسکتا ہے۔ شارٹ ہینڈ مینول کی مصروفیت میں وہ اسے بھول بھال گیا تھا لیکن آج مرزا قدر کو دیکھتے ہی اسے یہ کتاب یاد آگئی۔ شرفا کی تہذیب کو بھول کر وہ تام جھام کے پیچھے بھاگنے لگا۔ علم کا پروانہ تھا جو شمع کے تعاقب میں بھاگ رہا تھا۔ ایک پیاسا تھا جو کنوئیں کی طرف بے تحاشا دوڑ رہا تھا۔ اسے یہ بھی خیال نہیں تھا کہ رہ گیر اس کے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے۔ اسے تو بس یہ دُھن تھی کہ یہ موقع ہاتھ سے نکل نہ جائے۔ مرزا ہمایوں قدر کی نظر جوں ہی ان پر پڑی انہوں نے تام جھام رُکوا لیا۔

"ایں یہ تو مرزا ہادی معلوم ہوتے ہیں مگر یہ بے تحاشا دوڑ کیوں رہے ہیں۔"

اتنی دیر میں مرزا، سواری کے نزدیک پہنچ چکے تھے۔ سانس پھولا ہوا تھا اس لیے کچھ دیر گہرے گہرے سانس لینے کے بعد وہ سوار ہوگیا۔

"معاف کیجیے گا، ایک ضروری کام یاد آگیا تھا اس وقت اگر نہ بھاگتا تو پھر بھول جاتا۔ اور پھر خدا جانے کب یاد آتا۔ آتا بھی یا نہیں۔" مرزا نے کہا۔

"خدا خیر کرے۔ ایسا کیا کام ہے کہ آپ لڑکوں کی طرح بھاگ رہے تھے۔"

"آپ کے پاس زیچ محمد شاہی ہے۔"

"ہاں ہے تو۔"

"وہ مجھے عاریتاً درکار ہے۔ بس یہی کام تھا۔"

"مرزا، آپ کے متعلق جیسا سُنا تھا ویسا ہی پایا۔ لکھنؤ کیا، ہندوستان بھر میں آج ایسا کوئی دوسرا نہیں جو آپ کی طرح فنافی العلم ہوچکا ہو۔ لیکن "زیچ محمد شاہی" آپ کو نہیں دے سکتا۔"

"کیوں؟"

"ایک سال میں آپ ایسی زیچ تیار کردیں گے کہ زیچ محمد شاہی اس کے آگے ہیچ ہوجائے گی اور میرا فخر خاندان خاک میں مل جائے گا۔" ہمایوں قدر نے بات کو ہنسی میں ٹالتے ہوئے کہا۔

بظاہر مرزا بھی ہنسنے لگا لیکن غصہ اسے بہت آیا۔ اس نے اسی وقت سوچ لیا کہ ہمایوں قدر کو منہ توڑ جواب دے گا۔ اس کا دل علمِ ہیئت کی طرف سے ہٹ گیا تھا لیکن ہمایوں قدر کے انکار نے اس کی آتشِ شوق کو بھڑکا دیا۔

گرمیوں کے دن تھے۔ وہ صبح چار بجے اٹھ بیٹھا۔ شہر سے باہر بہت سے باغ تھے۔ ان میں سے ایک باغ کبھی اس کا بھی تھا۔ انہی باغوں میں سے ایک میں اس نے صبح کی نماز ادا کی۔ طلوعِ آفتاب کے بعد وہ گھر چلا آیا لیکن وہ طے کرچکا تھا کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔ آج کی سیر کا مقصد دراصل جائزہ لینا تھا۔ اس نے اپنے ایک دوست سے اس کا باغ رصد گاہ کے طور پر استعمال کرنے کی اجازت مانگ لی۔ تمام گرمیوں اس کا یہ معمول رہا کہ صبح کی نماز باغ میں ادا کرتا۔ نماز کے بعد تجربات میں مصروف ہوجاتا۔ دس بجے کھانا کھاتا۔ کھانے کے بعد اخبار دیکھتا۔ یہ گھنٹا گویا اس کی استراحت کا ہوتا۔ استراحت بھی کیا۔ پلنگ تو وہاں تھا نہیں۔ ایک آرام چوکی پر گھنٹا آدھ گھنٹا بیٹھ جاتا۔ اس کے بعد پھر کام میں مصروف ہوجاتا۔ شام کے چار بجتے تو رصد گاہ سے باہر نکلتا، اس کام میں کچھ مزدور اس کے مددگار بھی تھے۔ جس دن اسے کالج

جانا ہوتا، دس بجے مزدوروں کو کام سمجھا کر کالج چلا جاتا۔ مزدور مصروف ہوجاتے، وہ کالج سے واپسی پر ان مزدوروں کے ساتھ شامل ہوجاتا۔

اب اس نے یہ معمول بنالیا تھا کہ گرمیوں کے دن باغ میں گزارتا اور سردیوں میں شارٹ ہینڈ مینول پر کام کرنے لگتا۔ چار سال کی مشقت کے بعد شارٹ ہینڈ مینول چھپ گئی اور اس پر مرزا کا نام آگیا۔

اردو میں شارٹ ہینڈ کی کوئی کتاب نہیں تھی، مرزا نے اس کمی کو پورا کردیا۔ شارٹ ہینڈ کی ایجاد کا سہرا اس کے سر بندھ گیا۔ اخبارات اور رسائل اس کے اس کارنامے کی تعریف میں یک زبان ہوگئے۔ شاعروں نے اس کارنامے کی تعریف میں قطعات کہے۔

اور مرزا محمد ہادی
منطق و فلسفے کے ہیں رہبر
ہر طرف ملک میں ہیں کھلے
ان کے فضل و کمال کے دفتر
اس صناعت میں وہ شریک رہیں
ان کا احسان رہے گا اوروں پر

اس کام سے نمٹنے کے بعد اب اس کی پوری توجہ ہیئت دانی کی طرف مبذول ہوگئی تھی۔ الغ بیگی اور بہادر خانی زیچیں... اسے مل گئیں۔ کئی سنسکرت کی زیچیں بھی میسر آگئیں۔ اس نے بے حد تگ و دو کے بعد مختلف رصد گاہوں کی رپورٹیں بھی حاصل کرلیں۔ بعض عمدہ دوربینیں بھی اسی فقر و فاقہ میں مول لے لیں۔ اصطرلاب کے اوراق خود ہی پیتل کی چادروں اور شیشے کے صفحات پر بنالیے۔ ربع مجیب جس کا نصف قطر پانچ فٹ سے زیادہ تھا، کچھ بڑھئی کی مدد سے اور کچھ اپنی کاریگری سے دائروں اور ہندسوں کی مدد سے جنوب و شمال پر اس طرح نصب کردیا کہ ہر طرف گھوم سکے اور سیاروں کے ظل کی پیمائش میں آسانی ہو۔ کبھی رصد گاہ باغوں میں بنی، کبھی کالے پہاڑوں پر، کبھی مکان کی چھت پر بالآخر وہ "زیچ محمد شاہی" کے جواب میں "زیچ مرزائی" مرتب کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

اب موقع تھا کہ وہ مرزا ہمایوں قدر سے ملاقات کرے اور انہیں یہ خوش خبری سُنائے۔ اس کا موقع خود ہمایوں قدر نے فراہم کردیا۔ انہوں نے اس کی تیاری کا چرچا سُنا تو مرزا سے ملنے خود ہی چلے آئے۔

"مرزا، ہم نے سُنا ہے آپ زیچ تیار کرنے میں کامیاب ہوگئے۔"

"حضور، آپ کی دعا سے زیچ تیار ہوگئی۔"

"چلیے مبارک ہو۔"

"صرف مبارک باد نہ دیجئے۔ اپنی خاندانی زیچ سے مقابلہ فرمائیں، دیکھیں کون سی افضل و مکمل ہے۔ حضور، مجھے افسوس ہے کہ اس کتاب میں جابجا انگریز مصنفوں کا تذکرہ ہے مگر آپ کے بزرگوں کا نام لینے کا فخریہ کتاب حاصل نہ کرسکی۔" مرزا نے ترش روئی سے جواب دیا۔

ہمایوں قدر، کسی قدر شرمندہ ہوئے اور مرزا کی صاف گوئی پر غصہ بھی آیا لیکن بات مناسب تھی، کیا کرتے۔ کچھ دیر بیٹھے اور مرزا کی بے رخی کو بھانپ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ مرزا نے بدلہ لے لیا۔

○☆○

ابھی وہ اردو شارٹ ہینڈ کی ایجاد سے نمٹا تھا کہ پرنس کالج کے پرنسپل مسٹر بیڈلی نے اسے بُلوالیا۔ اردو شارٹ ہینڈ کے بعد ضروری تھا کہ اردو ٹائپ کا "کی بورڈ" بھی تیار کیا جائے..... ریمنگٹن کمپنی نے مسٹر بیڈلی سے فرمائش کی تھی کہ اردو کی بورڈ تیار کروادیں۔ اس کام کے لیے مرزا سے بہتر اور کون ہوسکتا تھا۔ مرزا نے دو سو روپے ماہوار پر یہ کام شروع کردیا اور چار ماہ کی مسلسل محنت سے اردو "کی بورڈ" تیار ہوگیا۔ انہی دنوں مسٹر بیڈلی امریکا چلے گئے اور "کی بورڈ" پرنس کالج میں پڑا رہ گیا۔

اب اس کی عمر پچاس سے تجاوز کررہی تھی۔ جوانی میں چہرہ داڑھی سے بے نیاز تھا مگر اب چہرے پر اوسط قسم کی ترشی ہوئی مونچھیں.... اور دو انگل کی داڑھی رکھ لی تھی۔ بالوں میں سفیدی آگئی تھی لیکن جفاکشی کا نتیجہ تھا کہ بالکل نوجوان معلوم ہوتا تھا۔ چوڑی ہڈی، زبردست کلائیاں، مضبوط ہاتھ۔ ایک نظر دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہر عضو میں قوت بھری ہوئی ہے۔ کام کرتے وقت اس کا شوق اور طرزِ آمادگی سے ایسا ظاہر ہوتا تھا جیسے کوئی بچّہ کھیل کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور کھیل کود میں کھانے پینے کی سدھ بھی نہیں رہتی۔ اس کو کسی حالت اور کسی وقت بھی کسی نے بیکار نہیں دیکھا ہوگا۔

جب تک جوانی رہی، مصروفیات کے باوجود اس کی زندگی بڑی رنگین گزری۔ طوائفوں کے کوٹھوں سے لے کر یاروں اور مشاعروں کی محفلوں تک میں وہ پابندی سے شریک ہوتا رہا لیکن جوانی ڈھلتے ہی، وہ ان رنگینیوں سے دور ہوگیا۔ آل انڈیا شیعہ کانفرنس کی رکنیت نے اسے مذہبی رنگ میں رنگ دیا۔ وہ شیعہ تصنیف و تالیف کا سیکریٹری تھا۔ علی حیدر

نظم طباطبائی کے بھانجے نواب علی سجاد حسین اس کی معاونت پر مقرر تھے۔

شاہ عبدالعزیز کی کتاب "تحفہ اثناء عشری" کا شیعوں میں بڑا چرچا تھا لیکن کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس کا جواب لکھتا۔ چند کتابیں لکھی بھی گئیں تو نامکمل جب کہ اس کتاب کے بھرپور جواب کی ضرورت تھی۔ آخر یہ بارِ گراں مرزا نے اپنے سر لیا۔ اس کی مذہبی اور فقہی معلومات قابلِ رشک تھیں۔ اس لیے اسے اُمید تھی کہ وہ اس کتاب کا جواب تسلی بخش طور پر تحریر کر سکے گا۔

اس کام کے لیے مکمل یکسوئی کی ضرورت تھی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر لی۔ ایک علیحدہ مکان لے کر اس میں بند ہو گیا۔ ملنا جلنا ترک کر دیا۔ جتنی ضروری کتابیں، حوالے کے لیے ضروری ہو سکتی تھیں ان سب کا انتظام کر لیا تاکہ پھر گھر سے نکلنا نہ پڑے۔ اس خالی گھر میں کتابوں کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ ایک چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ وہی اس کا بستر تھا، وہی لکھنے کی میز۔ چاروں طرف حقے کی راکھ بکھری رہتی اور سماوار میں چائے تیار رہتی تھی۔ اس کے علاوہ اسے کچھ درکار نہ تھا۔ نوکر معین وقت پر کھانا رکھ جاتا، جب دوسرے وقت کا کھانا لاتا تو برتن بھی ساتھ لے جاتا۔

اتنی سخت محنت کے بعد اس نے شاہ عبدالعزیز کی کتاب کا جواب "تحفتہ اُلسنہ" کے نام سے پندرہ ضخیم جلدوں میں مرتب کر لیا۔ برسوں تک تنہائی کی سزا کاٹنے کے بعد اس اکیلے دم نے وہ کام کر دکھایا جو ادارے کرتے ہیں۔

وہ ان جلدوں کو مرتب کرنے کے بعد اس خالی مکان سے نکلا تو اس کی کمر میں ہلکا سا خم آ چکا تھا لیکن وہ خوش تھا کہ آج اس نے ایک اور معرکہ سر کر لیا۔

شیعہ کانفرنس کے ایک جلسے میں اس نے اپنے ہم مذہبوں کو اس کتاب کی تکمیل کی خوش خبری سُناتے ہوئے کہا۔ "یہ کتاب مذہب شیعہ کی انسائیکلوپیڈیا ہے۔"

وہ شعبۂ تصنیف و تالیف کا سیکریٹری ضرور تھا لیکن ان جلدوں کی اشاعت کے لیے جس کثیر سرمائے کی ضرورت تھی، وہ ادارے کے پاس کہاں تھا۔ اس نے ان غیر مطبوعہ جلدوں کو مدرستہ الواعظین لکھنؤ کے کتب خانے میں رکھوا دیا اور اشاعت کے وقت کا انتظار کرنے لگا جو کبھی نہ آیا۔

ان دنوں مرزا کی دو مصروفیات تھیں۔ دائرہ ادبیہ کے تحت ہونے والی شعری نشستوں میں شرکت اور شیعہ کانفرنس کے امور کی دیکھ بھال۔

مذہبی معلومات میں مرزا کی قابلیت مسلم تھی۔ کلاں پھاٹک میں مجلس تھی جسے مولوی سبط حسن پڑھنے والے تھے۔ مرزا بھی اس مجلس میں موجود تھا۔ مولوی صاحب کو ایک مجلس دل آرا کی بارہ دری میں بھی پڑھنا پڑی اس لیے یہاں آنے میں دیر ہو گئی۔ مرزا موجود تھے لوگوں نے اصرار کیا اور اسے منبر پر بیٹھنا پڑا۔ اس کے لہجے میں نہ گھن گرج تھی نہ بے جا رعب علمی۔ سادہ الفاظ، لہجہ دل نشیں۔ معلومات کا ایک دریا تھا جو موجزن تھا۔ اہلِ مجلس حیرت میں غرق تھے۔ اسے یہ مجلس نہیں پڑھانی تھی، اس لیے وہ کوئی تیاری کر کے بھی نہیں آیا تھا۔ وہ پیشہ ور مقرر بھی نہیں تھا کہ ایسے موقعوں سے اسے اکثر سابقہ پڑتا رہتا ہو لیکن اس کے باوجود ایسی مدلل تقریر تھی کہ اہلِ لکھنؤ کو برسوں یاد رہی۔

مشاعروں میں افتتاحیہ تقریریں تو وہ کرتا ہی تھا، یار لوگوں نے اسے میلاد کی محفل میں کھڑا کر دیا۔ اس نے اپنا سکّہ وہاں بھی جما لیا۔

اس کی تقاریر کی شہرت ہوئی تو محفلیں اس کی سادہ مگر پُر مغز تقریروں سے گونجنے لگیں۔ کیننگ کالج میں اسے نجوم پر لیکچر دینے کو بُلایا گیا۔ اس کی سادہ وضع قطع دیکھ کر طلبہ قطعی متاثر نہیں ہوئے لیکن وہ تقریر کرنے کھڑا ہوا تو سب دم بخود رہ گئے۔ اس نے اس مضمون کے ایسے ایسے نکتے واضح کیے کہ وہاں کے اس مضمون کے پروفیسر نے مرزا کو فرطِ حیرت سے گود میں اُٹھا لیا۔

بیسویں صدی کی دوسری دہائی تھی کہ یہ ستارہ علمی لکھنؤ کے آسمان سے حیدر آباد دکن کی طرف منتقل ہو گیا۔ اس سے پہلے بھی وہ لکھنؤ سے حیدر آباد گیا تھا اور جلد ہی واپس بھی آ گیا تھا۔ اس کے خیالات اس شہر کے لیے اچھے نہیں تھے لیکن اس مرتبہ وہ جس ملازمت پر جا رہا تھا، وہ اس کی پسند کے عین مطابق تھی۔ اس نے اپنی زندگی تعلیم حاصل کرنے اور تعلیم دینے کے لیے وقف کر دی تھی اور اس ملازمت کا تعلق محکمۂ تعلیم ہی سے تھا۔ جامعہ عثمانیہ میں ذریعۂ تعلیم اردو تھا۔ اس کے نصاب کے لیے انگریزی سے اردو میں کتابیں ترجمہ کرائی جا رہی تھیں۔ اس کے لیے دارالترجمہ حیدر آباد کا قیام عمل میں آیا تھا۔ مرزا کو اسی دارالترجمے میں ملازمت کی پیش کش ہوئی تھی۔

مرزا کو ترجمہ نگاری سے ایک خاص شغف تھا۔ اسے اس کام کی مشق بھی بہت تھی۔ مرزا کو جب بھی روپوں کی ضرورت ہوتی وہ اپنے دقیق اور تحقیقی مضامین کو چھوڑ کر چند گھنٹوں یا دنوں میں کوئی کتاب ترجمہ کر دیا کرتا تھا۔ اس نے

فلسفے اور قانون کی کتابوں کے علاوہ بہت سی ناولیں بھی ترجمہ کی تھیں۔

سرکارِ عثمانیہ حیدر آباد سے اس کے نام دعوت نامہ بطور تقرر نامہ جاری ہو کر اسے موصول ہوا۔ وہ لکھنؤ کی محبت سے سرشار تھا لیکن علم کی محبت اسے کسی بھی صحرا میں لے جاسکتی تھی۔ پھر بھی اسے تکلف تھا کہ لکھنؤ کی رونق چھوڑ کر اب وہ اس بڑھاپے میں کہاں جائے۔

اس نے تقرر نامہ جیب میں رکھا اور چھڑی اُٹھا کر صفی لکھنوی کی طرف جا نکلا۔ دو چار ہم مزاج حسبِ معمول وہاں پہلے ہی سے موجود تھے۔

"صاحبو' اپنے کوچ کا نقارہ تو بج گیا۔"

"خیر تو ہے' کیا کوئی نیا خواب دیکھ لیا۔" صفی نے کہا۔

"خواب ہی جانو۔ ایسا خواب کہ اب دوستوں کے چہرے خواب ہو کر رہ جائیں گے۔"

اب حاضرین متفکر ہوگئے کہ آخر بات کیا ہے۔ مرزا آج اس قدر سنجیدہ کیوں ہیں۔

"بھئی ہر وقت کا فلسفہ اچھا نہیں لگتا۔ کھُل کر کہئے بات کیا ہے۔"

"حیدر آباد سے دعوت نامہ آیا ہے۔ دارالترجمہ میں بطور مترجم تقرری ہوئی ہے۔"

"یہ تو خوشی کی بات ہوئی۔ لکھنؤ کا تو بس اب نام ہی رہ گیا ہے۔ علم و ادب کی جیسی قدر و منزلت حیدر آباد میں ہے۔ کہیں نہ ہوگی۔ اہلِ علم کا جمگھٹا ہے ان دنوں حیدر آباد میں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے' لیکن میں خوف زدہ ہوں۔ پہلے بھی وہاں گیا تھا اور کس حال میں واپس آیا تھا' آپ حضرات کے علم میں ہے۔" مرزا نے کہا۔

"آپ درست کہتے ہیں لیکن وہ ملازمت آپ کے ذوق سے ہم آہنگ نہیں تھی اور پھر رہائش شہر سے باہر تھی۔ ہم صحبت بھی آپ کو آپ کے معیار کے نہ ملے ہوں گے۔ لیکن اب تو ایسی صورتِ حال نہیں ہوگی۔"

"لیکن ترجمے کا کام تو میں یہاں رہ کر بھی کر سکتا ہوں۔"

"بے شک۔ لیکن اوّل تو یہ کہ یہاں آپ کو وہ معیاری کتب دستیاب نہیں ہوں گی جن کے تراجم کیے جائیں۔ دوسرے یہ کہ حیدر آباد میں آپ کو مشاہرہ اچھا ملے گا۔ یہاں رہ کر آپ زیادہ سے زیادہ ناولوں کے ترجمے کر سکتے ہیں جو کہ اب تک کرتے رہے ہیں۔ وہاں آپ کے ذمے فلسفے کا شعبہ کیا گیا ہے۔ وہ کتابیں آپ ترجمہ کریں گے جو ہمیشہ یادگار رہیں گی۔"

"تو آپ کی مرضی یہ ہے کہ میں اس پیش کش کو قبول کرلوں۔"

"ہماری رائے تو یہی ہے۔"

"اچھا دوستو' قسمت کو یہی منظور ہے تو پھر یہی سہی۔

دلّی چھٹی تھی پہلے اب لکھنؤ بھی چھوڑیں
تھے دونوں شہر اپنے' دونوں تباہ نکلے"

○☆○

مرزا کی مصروفیات نے اتنی فرصت ہی نہیں دی تھی کہ وہ گھر اور بچّوں کی طرف دیکھتا۔ دو بیٹے تھے' دونوں کی کوئی قابلِ ذکر تربیت نہیں ہو سکی تھی۔ بڑا لڑکا سوز خوانی کرتا تھا اور کسی نواب کی ڈیوڑھی سے وابستہ تھا' چھوٹا البتہ حیدر آباد میں سب رجسٹرار تھا۔

لڑکے تو جو ہوئے سو ہوئے' مرزا کو اپنی بیٹی کی فکر تھی جس کی نسبت طے ہو چکی تھی۔ وہ چاہتا تھا' حیدر آباد جانے سے پہلے اس کی شادی ہو جائے۔ یہ شادی اب تک آج اور کل پر ٹلتی رہی تھی لیکن اب اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ اس کی فطرت میں جلد بازی تھی۔ جب حیدر آباد کا ارادہ کرلیا تو اب جتنی جلد ہو اس ارادے کو پورا کرنا چاہیے۔ اب وہ صبر نہیں کر سکتا تھا۔

"آج شادی ہو جائے۔" اس نے بیوی سے کہا۔

"کیا دیوانے ہوئے ہو۔ شادی نہ ہوئی کھیل ہو گیا۔"

"میری چھڑی اُٹھاؤ۔ تیاری کرلو' شام کو شادی ہے" اس نے کہا اور چھڑی اُٹھا کر گھر سے نکل گیا۔

سو روپے اس کے پاس جمع تھے۔ کچھ کالج سے نکلوایا اور دولھا والوں کے گھر پہنچ گیا۔ اسی دن شام کو عقد کا وقت مقرر ہوا اور رات سے پہلے ہی لڑکی رخصت ہو کر سسرال چلی گئی۔ اور دوسرے دن مرزا حیدر آباد روانہ ہو گیا۔

جاتے ہیں خوش خوش مگر ناشاد ہو کر آئیں گے
رشکِ مجنوں' غیرتِ فرہاد ہو کر آئیں گے

دارالترجمہ ایک وسیع و عریض ادارہ تھا جس میں ہر مضمون کا شعبہ الگ الگ نہایت خوبصورتی سے کام کر رہا تھا۔ وہ اس ادارے کے انتظام سے ازحد متاثر ہوا۔ مقامی اور غیر مقامی ادیب و شعرا اس ادارے سے وابستہ تھے۔ شہر کا علمی ماحول بھی اس کی طبیعت کے مطابق تھا۔

کچھ دن عمائدینِ شہر سے ملاقاتوں اور اپنے اعزاز میں ہونے والی محفلوں میں گزارنے کے بعد وہ کام میں مصروف ہو گیا۔

اس نے پہلا ترجمہ انگریزی سے اردو میں "مبادی علم النفس" کے عنوان سے کیا۔ ۲۴۵ صفحات پر مشتمل یہ ترجمہ چند مہینوں کی کاوش کا نتیجہ تھا۔ اس کتاب میں ایک اہم کام اس نے یہ کیا کہ بارہ صفحات پر مشتمل انگریزی اصطلاحات کا اردو ترجمہ بھی شائع کیا۔ اصطلاحات کے ترجمے کے لیے الگ محکمہ قائم تھا لیکن اس کی علمیت کسی دروازے میں بند نہیں تھی۔

وہ اس کتاب کے ترجمے اور اس کی اشاعت سے نمٹا ہی تھا کہ محرم آگئے' محرم ہوں اور اسے لکھنؤ یاد نہ آئے۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا۔ وہ لکھنؤ چلا آیا۔ دوستوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ مجلسوں میں شرکت کی اور پھر واپس آیا۔

اس مرتبہ اس نے ترجمے کے لیے منطق کی ایک انگریزی کتاب منتخب کی۔ اس کتاب کے ترجمے سے زیادہ وقیع بات یہ تھی کہ اس نے حواشی پر ایسی مدلل بحث کی جو اصل کتاب سے بھی زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔ ترجمے اور اس کے لکھے ہوئے حواشی سے طالب علم کو مضمون کے سمجھنے میں بے پناہ آسانی ہوسکتی تھی۔ اس کتاب میں بھی اس نے نہ صرف اصطلاحات کا ترجمہ کیا بلکہ وضاحت بھی کی۔

اب رمضان آگئے تھے۔ لکھنؤ کے رمضان کی بھی اپنی بہار تھی۔ وہ رمضان گزارنے پھر لکھنؤ آگیا۔ اس بہانے اسے والدین کی قبر پر حاضری دینے کا موقع بھی مل گیا۔

پھر یہ اس کا معمول بن گیا۔ سال میں دو مرتبہ' محرم اور رمضان کے موقعے پر وہ حیدر آباد سے والدین کی قبر پر حاضری دینے آیا کرتا۔

یہ زمانہ اس کی فراغت اور سکون کا زمانہ تھا۔ ادارے سے ملنے والی تنخواہ اس کے اخراجات کے لیے کافی تھی تصنیف و تالیف کے لیے مواقع بھی تھے اور شہر بھر کی علمی مجالس کا وہ رکن خاص بھی بنا ہوا تھا۔

اس نے اس دارالترجمے میں رہ کر نو کتابیں ترجمہ کیں جو نصابِ تعلیم جامعہ عثمانیہ کے لیے وہیں طبع ہوئیں اور داخلِ نصاب ہوئیں۔

فلسفیانہ مضامین پر اس کی نظر بہت گہری تھی۔ یوں تو کئی مضامین اس کا موضوعِ خاص تھے لیکن وہ خود کو فلسفی کہتا تھا۔ ان کتابوں کے تراجم کے بعد اس کا مطالعہ بہت وسیع ہوگیا تھا۔ اپنے ان خیالات کو وہ برسوں سے مرتب کر رہا تھا۔ رفتہ رفتہ ایک کتاب مرتب ہوگئی جسے اس نے فلسفۂ قدیم و جدید کے تقابل کے عنوان سے شائع کرادیا۔

یہ کتاب اس موضوع پر اتنی بھرپور دستاویز تھی کہ

کسی نے ظریف لکھنوی کی موجودگی میں داغ کا یہ شعر پڑھا۔

مرے مزار کو وہ ٹھوکروں سے ٹھکرا کر
فلک سے کہتے ہیں' یوں پائمال کرتے ہیں

ظریف یہ سن کر چند لمحے خاموش رہے پھر یہ شعر پڑھا۔

ٹھوکروں سے جو اُڑا ڈالے مزارِ عاشق
وہ تو معشوق نہ ہوگا کوئی ہاتھی ہوگا

امریکن یونیورسٹی نے اسے پی ایچ' ڈی کی ڈگری دی۔

حیدر آباد ہی میں اس نے اپنی بہترین تصنیف "کتاب الرویا" لکھی جو "روح" کے موضوع پر لکھی جانے والی کتابوں پر سب سے افضل ہے۔

اس کی بے نیازی اور غفلت جو ہمیشہ سے اس کے مزاج کا حصہ تھی' اب بھی باقی تھی۔ وہ تو سمندر تھا جسے خود نہیں معلوم ہوتا کہ اس میں کتنی طاقت ہے۔ اس میں اُٹھنے والی لہریں بھی قائم نہیں رہتیں۔ بس ایک لہر دوسری لہر کی جگہ لیتی رہتی ہے۔

وہ صرف کتابیں لکھ کر ہی نہیں بھول جاتا تھا۔ پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی اس نے اسی طرح کسی جگہ پھینک دی جیسے وہ محض کاغذ کا ایک ٹکڑا ہو۔ کسی کے ہاتھ لگ گئی اور اس نے اُڑالی۔ اس نے بھی ڈھونڈنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ اسے اس کی ضرورت بھی کیا تھی۔ ڈگریوں کی ضرورت اہلِ علم کو نہیں ہوتی' اہلِ علم کی ضرورت ڈگریاں دینے والوں کو ہوتی ہے۔

ڈگری گُم نہیں ہوئی تھی' چوری ہوگئی تھی۔ بعد میں اسے چور کا علم بھی ہوگیا تھا مگر اس نے باز پرس تک نہیں کی۔

اس غفلت شعاری کے باوجود وہ دوست نواز اور کنبہ پرور بہت تھا۔ اس کی مصروفیات ملنے جلنے نہیں دیتی تھیں لیکن جب کوئی دوست آجاتا تو اس کی راہ میں آنکھیں بچھاتا تھا۔ دور کے رشتوں کو بھی اس طرح نبھاتا تھا جیسے لوگ سگے رشتے داروں کے ساتھ سلوک کرتے ہیں۔ بچّوں کے ساتھ اسے خصوصی شغف تھا۔

دارالترجمہ میں اس کا ایک کارپرداز میرزو الفقار حسین موہانی تھا۔ مرزا کو اس کے بچّے سے بے حد انسیت تھی۔

جب موقع ملتا اسے دیکھنے چلا جاتا۔ کبھی وہ باپ کے ساتھ دارالترجمہ چلا آتا اور مرزا سب کام چھوڑ کر اس سے باتیں کرنے میں لگ جاتا۔ وہ بچّہ تھا بھی بہت پیارا۔

کئی دن سے مرزا کو بھی فرصت نہیں ملی تھی، بچّہ بھی خلافِ معمول باپ کے ساتھ نہیں آرہا تھا۔

”بھئی ذوالفقار، ہمارا بیٹا کئی دن سے نظر نہیں آیا۔ ہم تو ان دنوں ایک کتاب پر کام کررہے ہیں۔ آخری صفحات ہیں، فرصت ہی نہیں ملتی۔ تم اسی کو کسی دن یہاں لے آؤ۔“ مرزا نے ذرا دیر کو قلم روک کر کہا اور پھر لکھنے میں مصروف ہوگیا۔

وہ سمجھ رہا تھا، ذوالفقار صاحب جواب میں ضرور کچھ کہیں گے لیکن جب خاصی دیر تک کوئی جواب نہ ملا تو اس نے کاغذات سے نظر اُٹھائی۔ ذوالفقار خاموش تھا لیکن اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔

”کیا بات ہے۔ یہ تمہاری آنکھیں بھیگ کیوں گئیں؟“

”مرزا صاحب، اس کی طبیعت تو بہت خراب ہے۔ آپ کو اس لیے نہیں بتایا تھا کہ آپ پریشان ہوں گے، لکھنے پڑھنے کا حرج ہوگا۔“

”ایں۔ یہ کیا غضب کیا۔ تم نے مجھے بتایا ہی نہیں۔ کیا ہوا اسے؟“

”ٹائیفائڈ ہوا تھا، بگڑ گیا۔“

”تم ابھی مجھے اس کے پاس لے کر چلو۔“

”نہیں، آپ کام کیجیے۔ ٹھیک ہوجائے گا تو میں آپ ہی اسے لے آؤں گا۔“

”نہیں، اب ہم سے نہیں رہا جائے گا۔ وہ ہمیں یاد کررہا ہوگا۔“

مرزا نے کھونٹی پر لٹکی ہوئی شیروانی اُتار کر گلے میں ڈالی، کاغذات لپیٹ کر ایک طرف رکھے اور ذوالفقار کے ساتھ دفتر سے باہر نکل گیا۔

بچّہ نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ مرزا کے آواز دینے پر اس نے آنکھیں کھولیں اور پھر غفلت میں چلا گیا۔ بچّے کی حالت ایسی تھی کہ مرزا اس کی پٹی سے لگ کر رہ گیا۔

تیسرے روز بچّے کا انتقال ہوگیا۔ مرزا جو بڑی سے بڑی تکلیف پر حوصلہ نہ ہارا تھا، پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔

بچّے کو اپنے ہاتھوں سے قبر میں اُتارنے کے بعد وہ سیدھا گھر پہنچا۔ تھکن ایسی تھی جیسے اس نے بچّے کو قبر میں نہ اُتارا ہو، اس کی قبر کھودی بھی خود ہو۔ کپڑے تبدیل کرنے کی ہمت بھی نہ ہوئی جیسا آیا تھا ویسا ہی بستر پر دراز ہوگیا۔ اگلے دن سو کر اُٹھا تو اسی مرض میں مبتلا تھا جس میں بچّے نے انتقال کیا تھا۔

ڈاکٹروں نے ٹائی فائیڈ تشخیص کیا تھا لیکن یہ حملہ اتنا شدید نہیں تھا کہ تشویش کا باعث بنتا۔ اس کی صحت بھی ایسی گئی گزری نہیں تھی کہ معمولی سے بخار کو برداشت نہ کرسکے۔

اس کے دوست ممتاز حسین عثمانی اپنے کسی نجی کام سے حیدرآباد آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے جب اس کی یہ حالت دیکھی تو وہ بھی اس کی تیمارداری کے لیے رُک گئے۔ اس کا ایک بیٹا جو حیدرآباد ہی میں سب رجسٹرار تھا، وہ بھی موجود تھا۔ اس لیے علاج معالجے میں کسی کوتاہی کی نوبت نہیں آئی لیکن تیسرے دن اس کی حالت بگڑ گئی۔

مرزا نے اشارے سے ممتاز عثمانی کو اپنے قریب بُلایا، کچھ دیر رُک رُک کر بے ترتیب سانس پر قابو پایا۔

”میں نے ایک کتاب مابعد الطبیعات کے موضوع پر لکھی ہے۔ اس کے اوراق دارالترجمہ میں میری میز کی دراز میں ہیں۔ میر ذوالفقار تمہیں فراہم کردیں گے۔ ان اوراق کو جلد بندی کے لیے دے دو۔ زندگی رہی تو اس کی اشاعت کا بندوبست کروں گا۔“

اس نیم بے ہوشی میں بھی اسے اگر کوئی خیال تھا تو اپنی کسی کتاب کا۔ وہ خود بکھر جائے لیکن کتاب کے اوراق نہ بکھریں۔

شام ہوئی تو منشی دیا نرائن نگم ایڈیٹر ”اخبار زمانہ“ کانپور اس کی عیادت کے لیے آئے اور باتوں باتوں میں ان کے حالاتِ زندگی دریافت کرنے لگے۔

”یہ میرے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں، ان سے دریافت کرلیں۔“ مرزا نے ممتاز عثمانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور آنکھیں بند کرلیں۔

یہ الفاظ اس کے آخری الفاظ تھے۔ وہ رات بھر بے ہوش رہا۔ دوسرے دن ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو صبح دس بجے یہ سورج غروب ہوگیا۔

چار بجے کے قریب اس کا جنازہ چند عمائدینِ حیدرآباد کی ہمراہی میں مرلی دھر کے باغ کے قریب واقع قبرستان کی طرف جارہا تھا۔

لکھنؤ کا چاند، حیدرآباد کی مٹی میں دفن ہوگیا۔

خاک میں تو نے ملایا ہے کہاں مرزا کو
حیف اتنا بھی نہ پوچھے گا زمیں سے کوئی

■

❊❊

آغا حشر کاشمیری

حشر ساماں
حشر بداماں

اے۔ایس۔آفاق

ایسی [illegible] کاشمار بھی [illegible] شاہ پارو [illegible] اُردو ڈراما [illegible] آغا حشر [illegible] آغا حشر [illegible]
[illegible] اسی وجہ سے بعض قارئین کو آغا حشر کی سرگزشت [illegible] حصّہ خشک محسوس ہو لیکن اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ یہ حصّہ نادر علمی معلومات کا خزانہ بھی ہے۔ اُردو ادب کے طالب علم اس سے یقیناً بھرپور طور پر کسبِ فیض کریں گے۔ آغا حشر اپنے وقت کے قادر الکلام شاعر بھی تھے لیکن آج اُن کا کلام نایاب ہے۔ سرگزشت میں پہلی بار اُن کے کلام سے انتخاب بھی پیش کیا جا رہا ہے اور یہ بھی [illegible]

برصغیر کے نامور اردو ڈراما نگار، شاعر آغا حشر کاشمیری کی [illegible]

اردو ڈراما آغا حشر سے پہلے

اردو ڈرامے میں آغا حشر کاشمیری کا نام ایک دیو قامت شخص کی حیثیت رکھتا ہے۔ آغا حشر سے پہلے بھی ڈرامے لکھے جاتے تھے مگر ان کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ انہیں باوقار حیثیت حاصل نہیں تھی۔ وہ محض سستی تفریح کا ذریعہ تھا جن کے دیکھنے والوں میں تعلیم یافتہ طبقہ شامل نہیں تھا۔ وہ منشیوں کا دور تھا جو عام لوگوں کو سستی تفریح فراہم کرنے کا سامان مہیّا کرتے تھے اور عموماً سیٹھوں کی خوشنودی اور ہدایات کو پیشِ نظر رکھتے تھے۔ آغا حشر نے اس میدان میں قدم رکھا تو دیکھتے ہی دیکھتے اس صنف کا حُلیہ ہی بدل گیا۔ اردو ڈراما ایک قابلِ ذکر چیز بن گئی۔ عوام ہی نہیں 'خواص بھی اس کی طرف مائل ہوئے اور تھیٹر کی دنیا میں ایک خوش گوار اور شگفتہ تبدیلی پیدا ہوگئی۔ اس اعتبار سے آغا حشر کو نہ صرف تھیٹر میں بلکہ ادب میں بھی ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ وہ پہلے ڈراما نویس ہیں جن کے لکھے ہوئے ڈرامے اسٹیج پر دیکھنے والوں کے دلوں کو بھاتے تھے اور جب کتابی صورت میں شائع کیے جاتے تھے تو بھی ان کی ایک حیثیت اور ایک وزن تھا۔ ورنہ اس سے پہلے پیش کیے جانے والے ڈراموں کو کاغذ پر منتقل کرنا ایک لاحاصل کوشش سمجھی جاتی تھی کیونکہ عموماً ان کا ادبی معیار پست ہوتا تھا۔ فقرہ بازی' بے معنی مکالمے اور پوچ پلاٹ پر ان کا انحصار تھا۔ مگر آغا صاحب کے ڈراموں کو کاغذ پر کتابی شکل میں پڑھنے کا بھی ایک لطف ہے۔ پیش رو دوسرے ڈراما نویسوں اور آغا محمّد شاہ حشر کاشمیری میں یہی بنیادی فرق ہے۔

ایسا بھی نہیں ہے کہ آغا حشر سے پہلے اردو ڈرامے کا وجود ہی نہیں تھا۔ اس سے پہلے بھی اردو ڈراما موجود تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ ڈراما پڑھنے کے لیے نہیں 'دیکھنے کے لیے زیادہ موزوں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جتنے بھی ڈرامے اس زمانے میں لکھے گئے۔ ان کی لفظوں میں اتنی زیادہ اہمیت نہ تھی۔ البتہ مثنویوں سے جو ڈرامے اخذ کیے گئے تھے وہ ادبی مزاج اور چاشنی کے حامل تھے مگر ان کی تعداد بہت کم تھی اور اسٹیج تک پہنچتے پہنچتے ان کی شکل و صورت ہی کافی تبدیل ہو جاتی تھی۔

اردو کے ڈراموں میں "اندر سبھا" کو سب سے پہلی کوشش قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے مصنف سید آغا حسن امانت لکھنوی تھے جو میر آغا علی عرف میر آغا کے صاحب زادے تھے۔

سیّد آغا حسن امانت کی داستان بھی عجیب ہے۔ وہ سن ۱۸۱۵-۱۶ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے اور ۱۸۵۹ء میں چوالیس برس کی عمر میں انتقال کر گئے۔ عجیب اور دلچسپ بات یہ ہے کہ بیس سال کی عمر تک تو وہ بالکل صحت مند اور چاق و چوبند تھے مگر اس کے بعد بیمار پڑ گئے۔ اس بیماری کے باعث ان کی زبان بند ہو گئی اور وہ بولنے سے معذور ہو گئے۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ گھر والے اور وہ خود بھی صبر کر کے بیٹھ رہے۔ یہ بھی عجیب صورتِ حال تھی کہ ایک بیس

سالہ نوجوان' ذہین' تعلیم یافتہ اور باصلاحیت مگر اچانک بولنے سے معذور ہوگیا۔ وہ اشاروں کنایوں میں بات کرتے یا کاغذ پر لکھ کر گفتگو کرنے پر مجبور ہوگئے تھے۔

کہتے ہیں کہ جب تک سانس ہے' تب تک آس ہے۔ امانت نے بھی' آس نہ چھوڑی۔ سن ۱۹۴۴ء میں وہ زیارتوں کے لیے عراق گئے۔ ایک دن امام حسینؓ کے روضے میں نماز کے بعد بیٹھے دعا مانگ رہے تھے کہ اللہ کی طرف سے معجزہ رونما ہوگیا۔ ان کی زبان جو دس برس سے بالکل بند تھی اچانک خود بخود کھل گئی اور وہ بولنے پر قادر ہوگئے۔ ان کی خوشی کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ وہ خود اور ان کے اہل خانہ سبھی نہال ہوگئے اور بارگاہ رب العزت میں شکر ادا کیا کہ ایک اَن ہونی' ہونی ہوگئی۔ وہ قوتِ ناطقہ جو ہر طرح کے علاج سے واپس نہ آئی تھی' دیارِ امام حسینؓ میں خود بخود واپس آگئی۔

خاموشی کے زمانے میں بھی آغا حسن امانت نے اپنی ادبی سرگرمیاں ترک نہیں کی تھیں۔ یوں تو وہ خانہ نشین ہوگئے تھے مگر دن بھر کمرے میں تنہا بیٹھے فکرِ سخن میں مصروف رہتے تھے۔ کبھی غزل کہہ دی۔ کبھی مرثیہ لکھ دیا۔ شام ہوتے ہی دوست احباب اور شعرا کا مجمع ہوجاتا تھا۔ یہ چپ چاپ بیٹھے سب کی سنتے رہتے۔ ان کا لکھا ہوا کلام دوسروں کی زبانی پیش کیا جاتا اور یہ داد وصول کرتے۔ مگر اپنی بے کسی پر طبیعت بے چین ہو کر رہ جاتی تھی۔

ڈراما "اندر سبھا" اسی زمانے کی تخلیق ہے۔ امانت کے جی میں بہت کچھ کرنے کی تمنا تھی۔ انہوں نے غزلوں اور مرثیوں پر اکتفا کرنا مناسب نہ جانا اور ایک ڈراما لکھنے کی ٹھانی۔ ڈراما اس زمانے میں اشعار' موسیقی' گیتوں' راگنیوں اور رقص و سرود کا مجموعہ ہوتا تھا۔ یہ روایت قدیم ہندوستان کی تھی جو بعد میں مسلمانوں نے بھی اپنالی تھی۔ ایک اندازے کے مطابق "اندر سبھا" کی تکمیل ۱۲۸۶ ہجری میں ہوئی تھی۔ بعض مصنفین نے اس کی تحریر اور تکمیل کا سال ۱۲۷۰ ہجری قرار دیا ہے۔ ایک تحقیق کے مطابق ڈراما "اندر سبھا" ۴ اکتوبر ۱۸۵۳ء سے لے کر ۲۳ اگست ۱۸۵۴ء تک کے زمانے میں مکمل ہوا تھا۔

"اندر سبھا" کی اشاعت کے ساتھ ہی اس کی مقبولیت کا دور شروع ہوگیا۔ اسٹیج پر تو اسے پیش کیا ہی جارہا تھا مگر پے در پے اس کے ایڈیشن بھی شائع کیے جارہے تھے۔ اس کا تیسرا ایڈیشن جو ۱۲۷۲ ہجری میں شائع ہوا تھا۔ اس کے نسخے کے آخر میں امانت کا لکھا ہوا ایک قطعۂ خاتمۂ اندر سبھا بھی شاملِ کتاب ہے۔ اب ذرا یہ قطعہ ملاحظہ فرمایئے۔

گزر کر دہر میں اپنی نظر سے
صحیح اندر سبھا' بس یہ چھپی ہے
غلط اس میں نہیں ہے ایک نکتہ
برائے صحت اس پر مہر کی ہے

اس قطعے کے نیچے امانت کی مُہر بھی لگی ہوئی ہے جس میں "امانت ۱۲۵۹ ہجری" درج ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ "اندر سبھا" نہ صرف ۱۲۵۹ ہجری سے پہلے تحریر کی گئی تھی بلکہ اس کی نمائش بھی شروع ہوچکی تھی۔

امانت نے "اندر سبھا" تحریر کرنے کی وجہ یہ بتائی کہ دو چار گھڑی دل لگی کی خاطر یہ ڈراما لکھا گیا ہے۔ اس وقت وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کی یہ "دو چار گھڑی دل لگی" اردو ڈرامے کی تاریخ کا ایک سنہرا باب بن جائے گی اور نہ صرف تفریح و دلچسپی کے لیے ہوگی بلکہ اس کی ادبی حیثیت بھی مسلمہ ہوگی۔

اس وقت تک برصغیر میں یہ تصور عام تھا کہ ناٹک یا ڈراما دو اقسام کا ہوتا ہے۔ ایک وہ جس کا لطف پڑھنے سے آئے اور اسے کھیلا نہ جاسکے اور دوسرا وہ ڈراما جس کا لطف دیکھنے سے حاصل ہو۔ "اندر سبھا" اور "فسانۂ عجائب" ایسے ڈرامے ہیں جنہیں پڑھنے اور دیکھنے دونوں طرح سے لطف آتا ہے۔

اردو اسٹیج ڈرامے میں رقص و موسیقی اور شعر و شاعری کی موجودگی آغاز ہی سے ضروری سمجھی گئی ہے۔ وجہ یہ تھی کہ یہ دراصل عام تفریح اور دلچسپی کا ذریعہ تھا۔ قدم قدم پر اشعار' راگ راگنیاں اور گھنگھروؤں کی جھنکار پیش کی جاتی تھی۔ "اندر سبھا" بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھا۔

"اندر سبھا" کی پیش کش کس طرح اور کب ہوئی۔ اس سلسلے میں امانت ہی کی لکھی ہوئی "شرح اندر سبھا" کافی مددگار ثابت ہوسکتی ہے۔

وہ لکھتے ہیں۔

"چودھویں شوال ۱۲۶۸ ہجری (مطابق یکم اگست ۱۸۵۲ء) اندر سبھا جلسے کا نام رکھ کر اس کی پیش کش کا اہتمام شروع کیا۔ شہرت گھر گھر ہوئی۔ اہلِ محلّہ کو خبر ہوئی۔ دو شخص اس جلسے کی تیاری پر آمادہ ہوئے۔ ہجوم حد سے زیادہ ہوا۔ رفتہ رفتہ بعد از ہزاراں ہزار شور' فساد اور حجت و تکرار کے ڈیڑھ برس میں جلسہ تیار ہوا۔" یعنی یہ ڈراما اسٹیج پر پیش کرنے کے قابل ہوگیا۔ اس کی نمائش کے ساتھ ہی مقبولیت کا آغاز ہوگیا۔ بقول امانت "زمانہ اندر سبھا پر جان دیتا ہے۔ شہر میں چاروں طرف یہ جلسہ ہوتا ہے' مشتاقوں کے ہوش کھوتا ہے۔"

چنانچہ ڈرامے کا باقاعدہ آغاز "اندر سبھا" سے ہوا۔

ڈرامے کو فروغ دینے میں لکھنؤ کے والیان' خصوصاً واجد علی شاہ کا نمایاں ہاتھ ہے۔ ان کی فن پرستی اور رنگین مزاجی کا زمانہ شاہد ہے۔ ابھی وہ اودھ کے ولی عہد ہی تھے کہ انہوں نے اپنی سرگرمیوں کا آغاز کردیا تھا۔ یوں تو انہیں عہدِ شباب کی رنگینیاں کہہ سکتے ہیں مگر سچ تو یہ ہے کہ فنونِ لطیفہ کو فروغ دینے میں ان کی یہ ذاتی دلچسپیاں بہت مددگار ثابت ہوئیں۔ رقص و سرود کی محفلوں کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس مقصد کے لیے خوب صورت

طوائفوں کی خدمات بھی حاصل کرلی گئیں۔ واجد علی شاہ کی رنگین مزاجی اور فن کارانہ مزاج کا اندازہ اس طرح لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے جن طوائفوں کو ملازم رکھا انہیں "پری" کا نام دیا۔ ان کو تربیت اور تعلیم دینے کی غرض سے ایک ادارہ قائم کیا گیا جسے "پری خانہ" کہا جاتا تھا۔ اس تام جھام کی فراہمی کے بعد واجد علی شاہ نے باقاعدہ ڈرامے پیش کرنے کا آغاز کیا۔ انہوں نے سب سے پہلے اندر سبھا پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس ڈرامے کی طباعت میں جو غلطیاں رہ گئی تھیں، ان کی اصلاح کی گئی۔ ڈرامے کی پہلی پیش کش کو "رہس دھاری" کا نام دیا گیا۔ واجد علی شاہ نے اس ڈرامے کو ہندوؤں کی روایات کے مطابق اسٹیج کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ انہوں نے اس کی وضاحت پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "ہندوؤں کے مذہب میں ناچ گانے کی پرستش کی جاتی ہے۔ وہ لوگ ہزاروں روپیہ اس پرستش پر صرف کرتے ہیں۔ اس میں کنہیا اور ان کے معشوقوں کی شبیہ اور ہیئت بنائی جاتی ہے۔ حق تو یہ ہے کہ جیسا رہس میری سرکار میں تیار ہوا کہیں اور تیار نہ ہوا ہوگا۔"

اس رہس (ڈراما) میں کنہیا اور دوسرے کرداروں کے مکالمے میں بھی شامل کیے گئے تھے۔

۱۳ فروری ۱۸۴۷ء کو جب واجد علی شاہ تخت نشین ہوئے تو نومبر ۱۸۴۷ء میں انہوں نے اپنی سالگرہ کا جشن بڑی دھوم دھام سے منایا اور ناچ گانے کا بطورِ خاص بندوبست کیا گیا۔ ان کی علالت اور صحت یابی کے بعد انہوں نے اپنی ہی لکھی ہوئی مثنویوں کو ڈرامے کے سانچے میں ڈھال کر اسٹیج کرایا۔ اردو ڈرامے کی روایت کو آگے بڑھانے میں واجد علی شاہ کا نمایاں ہاتھ ہے۔ جون ۱۸۵۱ء میں جب بادشاہ نے دوسری شادی کی تو جشن منانے کے لیے دریائے گومتی کے کنارے ایک ڈراما "شاہ منیر" بھی پیش کیا گیا تھا۔ اس ڈرامے میں مکالمے، رقص، گیت سبھی کچھ تھا اور یہ مداری لال کا لکھا ہوا تھا۔ واجد علی شاہ کی اس قسم کی سرگرمیوں کی وجہ سے ہی وہ "رنگیلے شاہ" کہلائے۔ ان کے عہد میں نہ صرف امرا کے لیے بلکہ عوام کے لیے بھی سیر و تفریح، ناچ گانے اور میلوں ٹھیلوں کا وسیع پیمانے پر انتظام تھا یہاں تک کہ انگریزی حکومت نے انہیں معزول کردیا اور رقص و سرود کی یہ دنیا اُجڑ کر رہ گئی۔

لکھنؤ کے بعد بمبئی میں بھی ڈراموں کا آغاز ہوگیا تھا۔ یہ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ تھیٹر کی روایت بمبئی میں سب سے پُرانی ہے۔ یہاں ایک مغربی انداز کا تھیٹر ۱۷۵۰ء میں بھی قائم تھا جس میں انگریزی ڈراموں کی نمائش ہوتی تھی۔ ۱۸۵۳ء کے بعد یہاں انگریزی ڈراموں کے ساتھ ساتھ مرہٹی، گجراتی اور اردو ڈرامے بھی پیش کیے گئے۔ بمبئی کے اردو ڈراموں میں ناچ گانے کی اتنی اہمیت نہ تھی۔ اس کے برعکس نثری ڈرامے پیش کیے جاتے تھے۔ یہاں سب سے پہلا اردو ڈراما "گوپی چند اور جالندھر" کے نام سے پیش کیا گیا تھا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس کے مصنف ایک مرہٹہ ڈراما نویس ڈاکٹر بھاؤ داجی لاڈ تھے۔ اس میں اداکاری کرنے والے تمام اداکار مرہٹے تھے۔ اس ڈرامے کے ہمراہ ایک مزاحیہ کھیل بھی پیش کیا جاتا تھا جس کا نام "شریمتی جی" تھا۔ یہ دونوں ڈرامے نثر میں تھے۔ بعض محققین اس ڈرامے کو اردو کا سب سے پہلا ڈراما قرار دیتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی نمائش "اندر سبھا" کے دس سال بعد ہوئی تھی۔ اس کے بعد بھی بمبئی کے تھیٹروں میں اردو، گجراتی، انگریزی اور مرہٹی ڈراموں کے ساتھ ساتھ اردو ڈرامے بھی پیش کیے جاتے رہے۔ اس وقت یہ رواج تھا کہ ڈرامے کے ساتھ علیحدہ سے ایک مزاحیہ ڈراما بھی پیش کیا جاتا تھا۔ یعنی اصل ڈرامے میں کامیڈی اور ہنسنے ہنسانے کی گنجائش نہیں تھی۔ بمبئی کے ڈراموں میں ایک اور تبدیلی یہ تھی کہ ان میں رقص و سرود اور رنگینیوں کے بجائے زندگی کی حقیقتوں کی عکاسی کی جاتی تھی اور تو اور یہاں تاریخی پس منظر رکھنے والے ڈرامے بھی اسٹیج کیے جاتے تھے۔

ان حقائق کی روشنی میں یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ اردو ڈرامے کو "اندر سبھا" کے رنگ ہی میں فروغ دیا گیا تھا لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ جو قبولِ عام "اندر سبھا" کو حاصل ہوا تھا وہ کسی دوسرے ڈرامے کے حصے میں نہ آیا۔ اس کی مقبولیت اور شہرت کا یہ عالم تھا کہ ڈرامے کی کتابیں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوتی تھیں۔ اس کے گانے ہر ایک کی زبان پر تھے۔ لوگوں نے مکالمے اور گانے لکھ کر محفوظ کرلیے تھے اور زبانی بھی سُناتے رہتے تھے۔ امانت کا اس پر خوش ہونا فطری امر تھا۔

"اندر سبھا" کی بے پناہ مقبولیت کے بعد لکھنؤ میں جا بجا مختلف مقامات پر منڈلیاں قائم ہوگئیں بلکہ قصبات اور دیہات میں بھی ڈراموں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ پھر تو یہ رواج ہوگیا کہ جس کی ڈفلی اس کا راگ۔ جو بھی ڈراما تیار کرتا اس میں تھوڑی بہت تبدیلیاں کرکے اپنا نام دے دیتا مثلاً حافظ کی اندر سبھا۔ جوہر کی اندر سبھا وغیرہ۔ ان میں باہم مقابلے بھی ہوتے تھے۔

ڈراموں کی مقبولیت کے پیشِ نظر اور قسم کے ڈرامے بھی پیش کیے جانے لگے۔ اس کے بعد تبدیلی کا دور آیا تو ڈراموں میں طلسماتی کہانیاں بھی پیش کی جانے لگیں۔ ان ڈراموں میں ناچ گانے بھی لازمی طور پر ہوتے تھے۔ ایسے ڈراما نویسوں میں منشی محمد خان حباب کا ڈراما "سلیمانی تلوار و بہشتِ شداد المعروف بہ نقشِ سلیمانی" بہت مشہور ہوا۔ یہ ڈراما پہلی بار ۱۸۵۷ء میں لکھا گیا تھا۔ جنگِ آزادی کے بعد بھی شمالی ہندوستان میں ایسے ہی ڈرامے لکھنے کا رواج برقرار رہا۔

سنجیدہ ڈراموں کا آغاز دراصل بمبئی میں ہوا تھا۔ یہ ڈرامے نثر میں ہوتے تھے۔ ۱۸۶۴ء میں الفریڈ ناٹک منڈلی نے پہلی دفعہ "اندر سبھا" اور پھر "گل روزینہ" کے نام سے اردو ڈرامے پیش کیے تھے۔ پھر ایک گجراتی ڈرامے کو اردو میں منتقل کرا کے "رستم و

سہراب" کے نام سے پیش کیا گیا۔ بمبئی میں اس زمانے میں کئی ڈراموں کو گجراتی سے اردو میں ترجمہ کرکے پیش کیا گیا تھا۔

عادل جی جمشید جی کھودی کا لکھا ہوا ڈراما "خدا بخش" اور پھر نروان جی مہروان جی آرام کا ڈراما "نور جہاں" بھی پیش کیا گیا اور مقبول ہوا۔

بمبئی میں شمالی ہند کے ڈراموں کے برعکس نثری ڈرامے ہی پیش کیے جاتے تھے۔ یہاں منظوم ڈراموں کا آغاز "بے نظیر بدر منیر" سے ہوا تھا۔ یہ ڈراما بہت مقبول ہوا تھا۔ اس کی کامیابی کے بعد گجراتی اور اردو میں منظوم "اندر سبھا" کو اسٹیج کیا گیا۔ اوریجنل "اندر سبھا" میں مختلف گانے ہوتے تھے مگر یہ عام منظوم ڈراما ایک ہی راگ اور راگنی میں پیش کیا گیا تھا۔ اس میں روشنیوں کے ذریعے مناظر میں خوب صورتی پیدا کردی گئی تھی جسے دیکھ کر تماشائی بہت خوش اور حیران ہوتے۔ ایک اور اہتمام یہ کیا گیا کہ "اندر سبھا" میں جو بھی پری آتی تھی سارا اسٹیج اس پری کے لباس کے رنگ میں رنگ جاتا تھا۔ اس کی مقبولیت کے بعد بمبئی میں بھی ناچ گانوں کے ساتھ ڈرامے پیش کیے جانے لگے۔ اکثر ڈراموں کا نام "اندر سبھا" ہوتا تھا مگر ان کا امانت کی "اندر سبھا" سے دور کا تعلق بھی نہیں ہوتا تھا۔ امانت کی "اندر سبھا" کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس کا جرمن زبان میں ترجمہ کرکے وہاں شائع کیا گیا۔ اس کتاب کے مصنف اور مترجم نے اپنی کتاب میں کم از کم گیارہ اندر سبھاؤں کا تذکرہ کیا ہے۔ "اندر سبھا" کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ہندوستان میں ہر ڈرامے کو "اندر سبھا" ہی کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ کہانی خواہ کچھ بھی ہو مگر طرزِ تحریر اور انداز امانت کے ڈرامے جیسا ہی ہوتا تھا۔ "اندر سبھا" کی کہانیوں میں پریاں انسانوں پر عاشق ہوجایا کرتی تھیں۔ بعد میں یہ تبدیلی ہوئی کہ انسان پریوں پر عاشق ہونے لگے۔ اس کے بھی بعد میں جب ڈراموں میں حقیقی رنگ پیدا ہوا تو پریوں کی جگہ شہزادیوں نے لے لی۔ بعض ڈراموں میں دیوزاد بھی شاہ زادیوں اور دوسری امیر زادیوں پر عاشق ہونے لگے۔ گویا جن، پری اور دیو زاد سے ڈرامے کو پھر بھی نجات نہیں ملی۔ تدریجی ترقی کے بعد پیر فقیر اور جوگی بھی ڈراموں میں آگئے جو کرداروں کی مشکل آسان کرنے کے لیے انہیں کوئی سوغات دے دیا کرتے تھے۔ بعد کے دور میں انسانوں کے مسائل پیش کیے جانے لگے اور ان میں ضرورت مندوں کی مدد کرنے کا رجحان پیدا ہوگیا۔ اس زمانے میں ڈراموں میں عجیب و غریب طلسماتی واقعات اور کردار بھی پیش کیے جاتے تھے مثلاً پرندے اور جانور باتیں کرتے تھے۔

اندر سبھاؤں سے جی بھرنے لگا تو "گُل بکاؤلی" کا زمانہ آگیا اور طرح طرح کی گُل بکاؤلیاں پیش کی جانے لگیں۔ مختلف مصنفین نے گل بکاؤلی کے کردار پر ڈرامے لکھے۔

مثنویوں کو ڈراموں میں پیش کرنے کا رجحان بھی کافی مقبول ہوا تھا۔ مثنوی "زہر عشق" کو مختلف ناموں سے لکھا گیا اور اسٹیج کیا گیا۔ مثنوی "دریائے تعشق" منشی محمدؐ الف خان حباب نے لکھی تھی۔ اس طرح کئی مثنویاں تھیٹر کے ڈراموں میں ڈھال دی گئیں۔

اس کا اگلا دور عربی کہانیوں کا تھا۔ مثلاً الف لیلہ، لیلیٰ مجنوں، الٰہ دین کا چراغ، حاتم طائی، علی بابا چالیس چور وغیرہ۔ یہ داستانیں منظوم بھی ہوتی تھیں اور نثری بھی۔ مگر ناچ گانے اور موسیقی کی شمولیت بھی ضروری سمجھی جاتی تھی۔ پہلے تمام ڈراموں میں کرداروں کا لباس ایک ہی رہتا تھا مگر بعد میں کرداروں کے لباس بدلنے لگے۔ جادوئی ڈراموں کا زور ہوگیا جس میں سحر اور جادو کا مظاہرہ کیا جاتا تھا۔ مثلاً جنگل میں آگ لگ جانا۔ دیوؤں کا زمین میں دھنس جانا، پہاڑ پھٹ جانا، دیو کا ہیروئن کو بغل میں دبا کر اڑا لے جانا۔ الٰہ دین کے چراغ کے بارے میں بہت سے ڈرامے لکھے اور اسٹیج کیے گئے تھے۔ نیم رومانی، تاریخی اور نیم تاریخی ڈراموں کا دور آیا تو شیریں فرہاد، خسرو شیریں، ہیر رانجھا، سوہنی مہینوال کو موضوع بنایا گیا۔

ہندوستان میں ڈرامے کا بادا آدم کوی کالی داس کو قرار دیا جاتا ہے۔ کالی داس نے چوتھی صدی عیسوی میں ڈرامے لکھے تھے۔ ان کا ڈراما "شکنتلا" تو بے حد مقبول و معروف ہے۔ اس ڈرامے کو مختلف انداز سے نہ صرف اسٹیج پر پیش کیا جاچکا ہے بلکہ فلمیں بھی بن چکی ہیں اور بے حد پسند کی جاچکی ہیں۔ بعد میں برج بھاشا، ہندی، گجراتی، مرہٹی اور اردو میں بھی "شکنتلا" کو منتقل کرکے اسٹیج کیا گیا تھا۔ اندر سبھا کی طرح شکنتلا میں بھی ہر منڈلی والا تبدیلیاں کرکے اس کا نام بھی قدرے بدل دیا کرتا تھا۔ شکنتلا دراصل سنسکرت زبان میں ہے۔ بعد میں ہندی اور دوسری زبانوں میں اس کا ترجمہ کیا گیا۔ مولانا عبدالحلیم شرر نے بھی اس کا اردو ترجمہ شروع کیا تھا مگر مکمل کرنے سے پہلے وہ وفات پاگئے تھے۔ اردو کے مشہور ادیب ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے براہِ راست اس ڈرامے کا سنسکرت سے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ شکنتلا کو نہ صرف مختلف ہندوستانی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا بلکہ اسے مثنوی کے انداز میں منظوم بھی پیش کیا جاتا رہا۔ مہاکوی کالی داس کے دیگر ڈراموں کا بھی اردو میں ترجمہ کیا گیا اور انہیں اسٹیج کیا گیا۔

نیم تاریخی کہانیوں میں رانی پدماوتی، راجا نل، باز بہادر روپ متی وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ شہنشاہ اورنگزیب کی صاحب زادی زیب النسا اور لاہور کے صوبے دار عاقل خاں کی محبت کی داستان بھی ڈرامے کے روپ میں پیش کی گئی تھی۔ "شہزادہ سلیم اور مہرالنسا" مولانا محمدؐ حسین آزاد کی تحریر ہے۔ انہوں نے "ڈراما اکبر" کے نام سے ایک رومانی داستان کو ڈرامے کی صورت میں لکھنا شروع کیا تھا مگر اسے مکمل نہ کرسکے۔ سر عبدالقادر نے رسالہ

"مخزن" میں اس تاریخی ڈرامے کے اقتباسات بھی شائع کیے تھے۔ اس کہانی کو ارشاد احمد ارشاد نے ڈراما "نور جہاں عرف دہلی کی ملکہ" میں ڈرامائی رنگ دیا۔ شہزادہ سلیم اور حرم کی کنیز نادرہ کے عشق کی داستان کو عباس علی عباس دہلوی نے "انار کلی" کے نام سے پیش کیا تھا۔ اس کہانی کو بعد میں دوسرے لوگوں نے بھی لکھا مگر سیّد امتیاز علی تاج کی "انار کلی" سب پر بازی لے گئی اور اب کلاسیکی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ اس کو ڈراموں اور فلموں میں بھی ڈھالا جا چکا ہے۔ اسٹیج بھی کیا جا چکا ہے اور ریڈیائی ڈرامے کی شکل میں بھی پیش کیا جا چکا ہے۔ ہر رنگ میں اسے مقبولیت اور محبوبیت حاصل رہی ہے۔

ڈراموں میں ایرانی رنگ کے ڈراموں کا دور بھی رہا ہے۔ ان میں فردوسی کے شاہ نامے سے اخذ کر کے کئی کہانیاں بنائی گئیں۔ رستم و سہراب، شاہ جمشید اور ظالم ضحاک۔ ضحاک اور فریدوں جیسے کھیل جو پارسی سیٹھوں نے گجراتی میں پیش کیے تھے اس کے بعد اردو میں بھی اسٹیج کیے گئے۔ فارسی اداروں میں پار[illegible]وں کو [illegible] [illegible] دیا جاتا تھا کہ ان کے مشاہیر کیسے بڑے لوگ تھے۔ ان میں حب الوطنی کے جذبات کو اجاگر کیا جاتا تھا اور یہ احساس دلایا جاتا تھا کہ ان کا اصل وطن ایران ہے جس کی خدمت کرنا ان کا فرض ہے۔

۱۸۴۶ء میں بمبئی میں ہندی کرداروں کے مرہٹی ڈراموں کو اردو میں پیش کیا گیا تو ان کی دھوم مچ گئی۔ ان میں رام کہانی، دروپدی کی شادی، سیتا رام، پانڈو، کرشن اور گوپیاں، اوکھان ہرن، بھرت ملاپ، شری ایل کھان جیسے مقبول ڈرامے شامل ہیں۔ اس وقت بمبئی میں اردو اتنی مقبول ہو گئی تھی کہ مرہٹی ڈراموں میں بھی بعض کرداروں کے مکالمے اردو میں لکھے جاتے تھے۔ ہندوؤں کے تاریخی ڈرامے عموماً دیومالائی کہانیوں سے اخذ کیے گئے ہیں جو مختلف ناموں اور تبدیلیوں کے ساتھ پیش کیے جاتے رہے۔ رام لیلا، رامائن، سیتا ساوتری، کرشن سراما، کرشن جنم، گنیش جنم، بال کرشن جیسے ڈرامے جب اردو میں پیش کیے گئے تب بھی بہت مقبول ہوئے۔ کرشن بھگوان بھی ایک مقبول ڈراما تھا۔ ان ڈراموں کے مصنف اکثر مسلمان تھے۔ ہندوستان کے ہندو راجاؤں کے بارے میں بھی ڈرامے بنائے گئے جیسے مہاراجا بکرماجیت عرف تین اندھے، چندر گپت، پرتھوی راج چوہان۔ مہاراج بھرتری، رانا پرتاب، شیواجی مرہٹہ وغیرہ اردو میں اسٹیج کیے گئے اور بہت پسند کیے گئے۔ ہندوؤں کے بھگت اور رشیوں کے بارے میں بھی ڈرامے لکھے اور پیش کیے گئے۔ بھگت کبیر، بھگت نرسی، شرون کمار، پریم بھگت پرہلاد، پرس رام۔ آغا حشر نے بھی "بھگت سورداس" کے نام سے بہت مقبول ڈراما لکھا تھا۔ ان کا ایک ڈراما "بھیشم پرتگیا" بھی تھا۔

ہندوستان میں ہندو کرداروں پر ڈرامے لکھے جائیں تو پھر بھلا مسلمان کیسے پیچھے رہ جاتے۔ انہوں نے بھی مسلمانوں کی تاریخ پر مبنی ڈرامے لکھے۔ مسلمان اولیائے کرام، بزرگانِ دین، مذہبی رہنماؤں اور پیشواؤں کے بارے میں براہِ راست نہیں لکھا جا سکتا اس لیے مسلمان سلاطین کا انتخاب کیا گیا۔ عالمگیر، انصافِ محمود غزنوی، عدلِ سلطان محمود، سومنات جیسے ڈرامے تحریر کیے گئے اور اسٹیج پر انہیں بہت سراہا گیا۔ اس کے علاوہ سلطان صلاح الدین ایوبی، بچہ سقہ، خالد بن ولید، چاند بی بی، شاہجہاں، تاج محل، دارا شکوہ، چنگیز خان، نادر شاہ درانی، غازی محمدؐ بن قاسم، عمر خیام، طارق اعظم، شیر شاہ کا انصاف یہ سب اعلیٰ پائے کے ڈرامے تھے اور اسٹیج پر انہیں بہت کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ اس کے بعد ایک دور سیاسی ڈراموں کا بھی آیا۔ ہندوؤں نے اپنے سیاسی رہنماؤں کو اسٹیج ڈراموں کا موضوع بنایا اور جدوجہدِ آزادی کے بارے میں ڈرامے پیش کیے۔ مسلمانوں نے اپنے مذہب کی تبلیغ کے سلسلے میں نور وطن، نورِ اسلام عرف شاہی فقیر، شمشیرِ اسلام، حورِ عرب، پانچ ایران، شیرِ کابل جیسے ناموں کے ڈرامے پیش کیے جنہیں مسلمان تماشائیوں [illegible] بے حد پسند کیا۔ سیاسی اور اسلامی تبلیغی ڈراموں کی تعداد درجنوں بلکہ سیکڑوں تک پہنچتی ہے۔ اصلاحی اور معاشرتی ڈرامے بھی پیش کیے گئے جن میں کردار سازی پر زور دیا گیا اور معاشرتی خرابیاں اجاگر کی گئیں۔

معاشرتی اور اصلاحی ڈراموں کے سلسلے میں آغا حشر کے ڈراموں نے بہت کامیابی حاصل کی۔

دھرتی بالک، بھارتی بالک جیسے ڈراموں میں زمینداروں اور جاگیرداروں کا غریب کسانوں پر ظلم دکھایا گیا تھا۔ پھر عورتوں کے مسائل اسٹیج پر پیش کرنے کا رجحان شروع ہوا۔

اردو ڈرامے نے بتدریج اتنی ترقی کر لی تھی کہ بہت بڑے بڑے مفکروں اور ادیبوں نے بھی ڈرامے لکھے۔ مولانا عبدالحلیم شرر کا ڈراما "میوۂ تلخ" بے جوڑ شادیوں کے بارے میں ہے۔ مولانا عبدالماجد دریاآبادی نے اسی موضوع پر "زود پشیماں" لکھا۔ آغا محمد اشرف کا "تریاہٹ" تعلیم بالغاں کے موضوع پر تھا۔ خواجہ محمد تقی حسین کے ڈرامے "صفائی کی دیوی" میں صحتِ عامہ کے موضوع کو اجاگر کیا گیا تھا۔ مولانا ظفر علی خاں جیسے صحافی اور شاعر نے بھی "ایڈیٹر کا حشر" نام سے ڈراما لکھا تھا۔

بیسویں صدی میں اشتراکیت نے زور پکڑا تو اردو میں اس مسئلے پر بھی بہت سے ڈرامے لکھے گئے۔

اردو کے ڈراموں میں ادب کی کمی ہمیشہ سے محسوس کی گئی۔ انگریزی میں تو ڈرامے کو بہت بڑے بڑے ناموں کی سرپرستی حاصل رہی ہے اور عظیم لکھنے والوں نے بھی ڈرامے لکھے لیکن اردو میں ادب ذرا دیر سے آیا۔ آغا حشر نے بھی اس سلسلے میں ایک نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ اردو میں یہ المیہ ہوا کہ پہلے تو یہ ڈرامے اکثر و بیشتر اسٹیج کرنے کے لیے لکھے جاتے تھے مگر رفتہ رفتہ ایسے ادبی ڈراموں کا رواج شروع ہوا جنہیں کبھی اسٹیج کرنے کی نوبت ہی

نہیں آئی اور وہ محض کتابی صورت تک ہی محدود رہے۔

طالب بنارسی نے سب سے پہلے ڈرامے میں ادب کو سمویا۔ سید میر مہدی حسن احسن لکھنوی کے ڈرامے بھی ادبی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ احسن لکھنوی بلند پایہ شاعر اور انشا پرداز تھے۔ انہوں نے ایک بار دعویٰ کیا تھا کہ ہندوستان میں اسٹیج پر ڈراموں کے اسٹائل کو بدلنے کا فخر ان ہی کے ناچیز قلم کو حاصل ہے۔ انہوں نے "خون ناحق" لکھ کر ادب کو اسٹیج ڈرامے سے روشناس کرایا تھا۔ ان کے بعد آرزو لکھنوی نے بھی ادبی انداز کے ڈرامے لکھے۔ سلیس اور عمدہ زبان، اچھا اسلوب اور خوب صورت اشعار انہوں نے ڈراموں میں متعارف کرائے۔

لیکن آغا محمد شاہ حشر کاشمیری جب ڈرامے کی دنیا میں وارد ہوئے تو انہوں نے ادب کی ایسی رنگ آمیزی کی اور اتنی خوب صورت اور معیاری اردو لکھی کہ دیکھنے اور سننے والے مسحور ہو کر رہ گئے۔ ان کے ڈراموں میں اردو بہت نمایاں ہوتی تھی مگر وہ ہندی کی آمیزش بھی کردیتے تھے۔ ان کے شاگردوں میں حکیم احمد شجاع نے بھی ایسا ہی انداز اپنایا اور شوکتِ الفاظ اور مکالموں کی خوب صورتی کو نکھار کر پیش کیا۔ حکیم احمد شجاع کا ڈراما "باپ کا گناہ" ادبی حسن اور بانکپن کی نمایاں مثال ہے۔ حکیم احمد شجاع مصنف، فلم ساز و ہدایت کار انور کمال پاشا کے والد گرامی تھے جن سے خود انور کمال پاشا بھی بہت متاثر تھے اور ان ہی کے رنگ میں لکھ کر انہوں نے پاکستانی فلموں میں ایک نیا انداز و اسلوب متعارف کرایا تھا۔ حکیم احمد شجاع بنیادی طور پر ڈراما نگار تھے۔ ان کا ڈراما "باپ کا گناہ" ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا تھا جس کے دیباچے میں انہوں نے لکھا تھا۔

"میری تمنا ہے کہ ڈراموں کی روشِ عام تبدیل ہوجائے مگر جو تبدیلی مدارج و منازل سے بے نیاز ہو، مقبول نہیں ہوسکتی۔ اس لیے اس ڈرامے میں بہت سی قابلِ اعتراض رسمیات کو ترک کردیا گیا ہے تاہم طرزِ تحریر اور بیرونی حیثیت سے بہت تغیر نہیں رکھا گیا۔"

حکیم احمد شجاع کا یہ ڈراما خاص آغا حشر کے رنگ میں لکھا گیا ہے جس میں کثرت سے اشعار استعمال کیے گئے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی اس دور کے ڈرامائی رجحانات کو بدلنے کی کوشش بھی نظر آتی ہے۔

اردو ڈراموں میں مختلف موضوعات پر لکھا گیا۔ خاص بات یہ ہے کہ لکھنے والوں نے دوسری زبانوں سے تراجم کرنے یا خیال مستعار لینے میں بھی پس و پیش نہیں کیا۔ گجراتی، مرہٹی، انگریزی، سنسکرت، ہندی ڈراموں کے علاوہ انگریزی ڈراموں کے تراجم اور اخذ کردہ خیال بھی ہمیشہ کامیابی حاصل کرتے رہے ہیں۔ دیکھا جائے تو اردو ڈرامے پر یورپی زبانوں خاص کر انگریزی کے اثرات بہت نمایاں ہیں اور یہ سلسلہ کافی عرصہ پہلے شروع کردیا گیا تھا۔

اس طریقۂ کار کی مقبولیت کا اندازہ یوں لگایا جاسکتا ہے کہ ولیم شیکسپیئر کے کل ۳۷ ڈرامے موجود ہیں جن میں سے ۳۲ کو ساٹھ مرتبہ سے زیادہ اردو ڈراموں میں استعمال کیا جاچکا ہے۔ کچھ کو ترجمہ کرکے اور کچھ کو کردار، خیال اور پلاٹ اخذ کرکے۔ تاریخی حوالے کے لیے اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ انگریزی سے جو ڈراما سب سے پہلے اردو میں اپنایا گیا وہ "لیڈی آف لیان" کے نام سے فراموز گستادجی دلال نے تحریر کیا تھا اور یہ بمبئی میں گورنر جنرل کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ انگریزی سے لیا جانے والا دوسرا ڈراما شیکسپیئر کا "پریکلز" تھا جسے دادا بھائی نروان جی پٹیل ایم اے نے اپنایا تھا اور یہ ۱۸۷۰ء میں بمبئی کے تھیٹرہال میں پیش کیا گیا تھا۔

اس کے بعد تو شیکسپیئر اردو ڈراما نویسوں کا پسندیدہ مصنف ٹھہرا جس کے اردو کے قالب میں ڈھالے جانے والے ڈراموں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ انہیں مختلف لکھنے والوں نے باربار مختلف ناموں سے اپنا کر پیش کیا ہے۔ اور تو اور شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد جیسے جید اردو لکھنے والے نے بھی ۱۸۸۵ء میں شیکسپیئر کے ڈرامے "میکبتھ" کا اردو میں ترجمہ شروع کیا تھا جو مکمل نہ ہوسکا۔ شیکسپیئر کے بہت سے ڈرامے اردو میں اپنائے گئے مگر جو قبولِ عام آغا حشر کے ڈراموں کو حاصل ہوا وہ کسی اور کے حصّے میں نہیں آیا۔ اردو ہندی کے ادیب پریم چند نے بھی تین ڈرامے لکھے تھے جو انگریزی سے ماخوذ تھے۔ پطرس بخاری نے اناطول فرانس کے مشہور ناول "تائس" کو اوپیرا کی صورت میں تحریر کیا تھا۔ جن دنوں پطرس بخاری گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل تھے تو ان کی زیرِ سرپرستی کالج میں ڈرامیٹک کلب نے بہت ترقی کی تھی۔ یہاں پیش کیے جانے والے بیشتر ڈرامے انگریزی سے ترجمہ یا اخذ شدہ ہوتے تھے۔ شیکسپیئر ہی پر منحصر نہ تھا، انگریزی کے دوسرے ادیبوں، ناول نگاروں اور ڈراما نگاروں کی تصنیفات سے بھی خوشہ چینی کی گئی۔ آسکر وائلڈ، گولڈ اسمتھ اور دوسرے لکھنے والوں کے نام اس سلسلے میں قابلِ ذکر ہیں۔

آغا حشر کاشمیری نے اس پس منظر میں ڈراما نویسی کے میدان میں قدم رکھا تھا اور اتنے بہت سے نامور اور ذہین تخلیق کاروں کے ہوتے ہوئے اپنے لیے ایک الگ روش اور منفرد مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ آغا حشر نے کم و بیش سات انگریزی ڈراموں کو اردو کے قالب میں ڈھال کر اسٹیج پر پیش کیا جن میں سے پانچ ولیم شیکسپیئر کے لکھے ہوئے تھے۔ آغا صاحب کے ان ڈراموں کو ترجمہ کہنا درست نہ ہوگا کیونکہ اگر اوریجنل انگریزی ڈراموں اور آغا صاحب کے اردو ڈراموں کا موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوجائے گا کہ آغا حشر نے مصنف کے خیال کو اپنا کر اپنا اسلوب، اپنا رنگ اور اپنا انداز دے دیا ہے۔

اس موضوع پر خود آغا حشر نے بھی اظہارِ خیال کیا ہے۔ اپنے پہلے تجارتی ڈرامے "مرید شک" کے دیباچے میں انہوں نے جو

وضاحت پیش کی وہ ذیل میں پیش کی جارہی ہے۔ اس سے آغا حشر کے ڈراموں کا ماخذ اور اس سلسلے میں ان کے زاویۂ نظر کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے۔

"گرامی ناظرین، آج میں آپ کی نکتہ بیں نگاہوں کے سامنے اپنی وہ ناچیز تصنیف پیش کرتا ہوں جس کا نام "مرید شک" ہے۔ یہ ڈراما بھی اسی غیر معمولی ساخت کے دل و دماغ کی کوششوں کا مجموعہ ہے جس کے ایک ایک لفظ کو اہل یورپ الہامی فرشتے کا لیکچر یا کتابِ زندگی کی تشریح سمجھتے ہیں۔

"نیچر اور سائنس کے دقیق مسائل اور فطرتِ انسانی کے لاینحل عقدے اپنی موشگاف ذہانت کے ناخن سے جس خوب صورتی کے ساتھ شیکسپیئر نے کھولے ہیں وہ ابدالآباد تک یاد کیے جائیں گے۔ کاغذ کے سادہ صفحوں میں انسان اور انسانی جذبات کی جیتی جاگتی تصویریں کس ادا سے دوڑتی پھرتی ہیں۔ اس کا پورا فوٹو کھینچ کر دکھانا اور اس میں وفا، جفا، الفت، نفرت، حیاداری، ریاکاری، اخلاق، نفاق، مختلف اقسام کے رنگ، بھر کر جان ڈال دینا شیکسپیئر ہی کے دل و دماغ کا کام تھا۔ جس کی تحریر کے طرز، پلاٹ کی خوبی، سبجیکٹ، التزام اور ان کے علاوہ رزلٹ میں گوناگوں کردینے والی کیفیت کا احساس اس بات کی گواہی دے کر ثابت کر رہا ہے کہ یہ نامور مصنف نیچرل کالج کا پاس شدہ گریجویٹ ہے اور کتابِ فطرت کا شروع سے آخر تک مطالعہ کرچکا ہے۔ منشی جوالا پرشاد برق، سب جج لکھنو ایک جگہ علامہ عصر ڈاکٹر جانسن کا قول نقل کرتے ہیں "اگر کوئی شخص تمام عمر گوشہ نشین رہا ہو اور وہ بھی اگر شیکسپیئر کی تصانیف کو پڑھے تو دنیا کی مختلف کیفیات اس پر ظاہر ہوجائیں۔

"جس تاجدارِ سخن کے صریرِ قلم نے اس طرح اہل دل پر فتح یاب ہو کر عزت اور شہرت کے ڈنکے بجا رکھے ہیں اس کی کسی تحریر کو اپنی زبان میں لینا یا اس کے حسنِ مذاق اور کوائف معاشرت کو اپنے ملک کے طبائع و ضروریات زندگی کے ساتھ ایک پلے پر رکھ کر دکھانا جس قدر اہم و دشوار ہے، اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ اچھی طرح کرسکتے ہیں جنہوں نے کسی غیر زبان کے ترجمے میں دس پانچ دن اپنا خون پانی ایک کیا، دو چار راتیں آرام کی خواہش اور جلتے ہوئے لیمپ کے سامنے آنکھوں کی روشنی کھو کر صبح کی ہیں۔

"میں دعویٰ تو نہیں کرسکتا کہ اپنی اس کوشش میں اس حد تک کامیاب ہوا ہوں۔ جس کو کمال ترجمہ کہتے ہیں مگر اس قدر کہنے کا حق ضرور رکھتا ہوں کہ میں نے شاہد فرنگ کو ایشیائی لباس و ہندوستانی مذاق کے گہنوں سے ایک ایسی پیاری نئی دنیا بنا دیا ہے جو جلوہ اندوزی کے وقت جاں ربا تو نہیں مگر دل ربا ضرور ثابت ہوگی۔

"میرے اس ناچیز ترجمے پر بمبئی کے نامی گرامی اخبارات جام جمشید، قیصر ہند، راست گفتار، فرصت نے جن لفظوں میں ریمارکس دے کر میری بہت ہمت افزائی فرمائی ہے۔ میں انہیں ہمیشہ فخریہ طور پر یاد کیا کروں گا۔ میں یہ امید کرنے کا کوئی سبب نہیں رکھتا ہوں کہ میری یہ جاں کاہیاں یہاں بھی رائگاں نہ جائیں گی۔

آنا نکہ را بنظر کیمیا کنند۔ آیا بود کہ گوشہ چشمے بما کنند۔

آغا محمد شاہ حشر کاشمیری، آتھر کمپنی"

آغا حشر کا ڈراما "اسیر حرص" شریڈن کے ڈرامے (پزارو PIZARO ۱۷۹۹ء) سے ماخوذ ہے۔ حشر نے اس کا دیباچہ تحریر کیا ہے۔ اس میں لکھا ہے۔

"ہندوستان نے جو کچھ سلطنتِ انگلشیہ سے لیا اس میں کچھ نہ کچھ دسترس حاصل کرلی مگر افسوس اس فن پر نہ کبھی توجہ دی اور نہ کسی مرتبے پر پہنچایا۔ یہی سبب ہے کہ جس کے اولڈ فیشن والے حضرات ایسے ذلیل و ناقابل توجہ آج تک سمجھے جاتے ہیں۔ ڈرامے کو ایسی گری پڑی ہوئی حالت میں دیکھ کر الفریڈ ناٹک کمپنی کے مالک مسٹر کاوس جی پالن جی کھٹاؤ کا خیال اس کی ترقی کی طرف رجوع ہوا اور یہ سب سے پہلے شخص ہیں جن کی محنت سے ہندوستانی ناٹک یورپین لباس سے آراستہ ہو کر اسٹیج پر جلوہ فروشی کرنے لگا۔ اردو ڈرامے کا وہ ڈھانچا جو مدت سے بوسیدہ ہو رہا تھا، اس میں کایا پلٹ کردینے کی کوشش سے انگریزیت کی روح بولنے لگی۔ آج اس عمارت میں "اسیر حرص" کے نام سے ایک منزل کا اور اضافہ کرتا ہوں۔ خدا کرے یہ بھی قدر داں پبلک سے قبولیت کا تمغا حاصل کرے۔"

آغا حشر کا یہ ڈراما ۱۹۰۱ء کی یادگار ہے۔ اس میں بھی کرداروں کے ہندوستانی نام رکھے گئے ہیں۔ یہ ڈراما کل سولہ مناظر پر مشتمل ہے جس میں سے آٹھ مزاحیہ ہیں۔

آغا حشر کاشمیری کا ڈراما "شہید ناز" شیکسپیئر کے ڈرامے MEASURE FOR MEASURE سے ماخوذ ہے۔ حشر نے اسے کاوس جی پالن جی کی الفریڈ کمپنی کے لیے ۱۹۰۲ء میں قلم بند کیا تھا۔

کاوس جی کھٹاؤ نے اس کا دیباچہ ۱۳ اگست ۱۹۰۴ء کو تحریر کیا۔ وہ اس ڈرامے کے متعلق لکھتے ہیں۔

"یہ کھیل مہاکرو شیکسپیئر کے "میشر فار میشر" سے تیار ہوا ہے۔ میں اپنے قلم سے یہ لکھنا نہیں چاہتا کہ وہ سب سے اچھا ہے کیونکہ میری کمپنی اس سے قبل پانچ ڈرامے پیش کرچکی ہے اور ان پر ہم عصر حضرات اور پریس کی تنقیدیں بھی ہوئی ہیں۔ اس لیے اس ڈرامے کے متعلق میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کو اس ڈرامے میں بعض مناظر دوسرے ڈراموں سے ملتے جلتے معلوم ہوں گے لیکن اس میں کمپنی یا مصنف قابلِ الزام نہیں۔ ہم نے یہ ڈراما خاص طور پر اپنے منشی سے لکھوایا ہے۔ اس لیے اس میں جو مناظر پیش کیے گئے ہیں وہ یا تو اصل کتاب سے ماخوذ ہیں یا موقع اور لحاظ سے ترتیب دیے گئے ہیں۔ دوسروں کی تقلید نہیں کی گئی ہے۔

"یہ ڈراما منشی محمد شاہ حشر کاشمیری نے آج سے تین سال قبل

یعنی ۱۹۰۲ء میں لکھا تھا۔ اس کے بعد بعض کمپنیوں نے بعض مناظر ہمارے ڈرامے سے ملتے جلتے پیش کیے اس لیے ہم نے ضرورتاً ان کو تبدیل کرایا اور ان کو ازسرِ نو نئے رنگ و روپ میں پیش کیا۔ اس ڈرامے کی ترتیب و تدوین کے دوران میں یہ بات ہمیشہ میرے مدِ نظر رہی ہے کہ شیکسپیئر کے پلاٹ اور اس کے نام کو دھبّا نہ لگے۔ اس لیے میں نے خاص خاص مقام پر کوئی تبدیلی نہیں کی۔ اس میں بعض چیزیں ایسی پیش کی گئی ہیں جو آپ کی نظر سے دوسرے ڈراموں میں نہ گزری ہوں گی۔ یہ ڈراما سن ۱۹۰۳ء میں دہلی دربار میں رکھا گیا تھا۔ اس کے بعد لکھنؤ اور احمد آباد میں پیش کیا گیا۔ اسی سال جب حضور نظام بمبئی تشریف لائے تو کوڈی کارنر میں ایک منڈوا بنوا کر سرکارِ عالی کی خدمت میں پیش کیا گیا جسے اعلیٰ حضرت نے بے حد پسند فرمایا۔

اس ڈرامے کے تیسرے ڈراپ کے آخری دو مناظر میں پائیں باغ کا بندرگاہ میں بدل جانا میرے ایک شاعر دوست مسٹر شاپور بھیدوار کی دماغی اپج کا نتیجہ ہے۔ آپ نے اس سلسلے میں بہت محنت کی ہے۔ اس طرح کمپنی کے نوجوان پینٹر ڈنشا ایرانی کے موئے قلم نے پردوں میں نئی نئی خوبیاں پیدا کی ہیں۔ میں نے بھی پیسہ اور محنت سے دریغ نہیں کیا۔"

آغا حشر کا ڈراما سفید خون کنگ لیئر سے ماخوذ ہے جو بمبئی ناٹک کمپنی کے لیے ۱۹۰۷ء میں تحریر کیا گیا تھا۔ آغا صاحب کا ڈراما "صیدِ ہوس" میں شیکسپیئر کے ڈراموں کنگ رچرڈ سوئم اور کنگ جان کے اثرات بھی نظر آجاتے ہیں۔ آغا حشر نے اپنا ڈراما "خوابِ ہستی یا فریبِ ہستی" ۱۹۰۸ء میں تحریر کیا تھا جس میں شیکسپیئر کے ڈرامے میکبتھ کا تاثر صاف نظر آجاتا ہے۔ اس سے پہلے یہ ڈراما پروفیسر مولوی ظہیر حسن سجّادہلوی نے "فیضِ صحبت" کے نام سے تحریر کیا تھا۔ آغا حشر کاشمیری نے بعد میں بھی انگریزی ڈراموں سے متاثر ہو کر چند مشہور ڈرامے لکھے۔ مثلاً اپنی کمپنی کے لیے "مشرقی ستارہ" ڈراما تحریر کیا تھا۔ انہوں نے کلکتہ میں اسی ڈرامے کو "یہودی کی لڑکی" کے نام سے پیش کیا تھا۔ یہ ڈراما دراصل ڈراما نویس طالب بنارسی کے ایک ڈرامے "کرشمۂ قدرت" سے اخذ کیا گیا ہے جسے منشی طالب بنارسی نے مسٹر ڈبلیو ڈی الیگرف کے ڈرامے "جیوش" (یعنی یہودن) سے اخذ کیا تھا۔ شیکسپیئر کے ڈرامے "انٹونی اینڈ کلوپیٹرا" سے ہی متاثر ہو کر ایک ڈراما "کرشمۂ شباب" کے نام سے حیران شکوہ آبادی نے بھی تحریر کیا تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ صرف آغا حشر ہی نہیں کئی دوسرے ڈراما نویس بھی شیکسپیئر کے ڈراموں سے متاثر ہو کر ڈرامے تحریر کر رہے تھے۔

اردو ڈراموں میں مزاح کے عنصر کو شامل کرنے کا رجحان نیا نہیں ہے۔ دراصل قدیم یونانی ڈراموں میں بیک وقت سنجیدہ اور مزاحیہ حصّے رکھے جاتے تھے۔ ممکن ہے اردو ڈراموں کے لکھنے والے یونانی ڈراموں سے ناواقف ہوں لیکن پھر بھی جنوبی ہندوستان کے اردو ڈراموں میں دلچسپ مزاحیہ عنصر شامل کیا جاتا تھا۔ یہ رواج گجراتی اور مرہٹی ڈراموں میں بھی اپنایا گیا تھا۔

یہ بھی ہوا کہ "اندر سبھا" کے ساتھ ایک مزاحیہ ڈراما بھی پیش کیا گیا تھا۔ لیکن اصل ڈرامے میں مزاح کو شامل کرنے کا انداز غلام حسین ظریف نے ۸۷-۱۸۸۶ء میں اپنایا تھا اور وہی اس کے موجد تھے۔ انہوں نے اصل ڈرامے کے درمیان میں مزاحیہ مناظر شامل کرنے کا طریقہ اپنایا جو اصل ڈرامے کا ہی حصّہ ہوا کرتے تھے۔

آغا حشر نے بھی اس روش کو اپنایا تھا۔ مثلاً ان کے ڈرامے "اسیرِ حرص" کے سولہ مناظر میں سے آٹھ مناظر مزاح پر مشتمل ہیں۔ آغا حشر کے ڈرامے "خوابِ ہستی" میں بھی اصل پلاٹ کے ساتھ ساتھ مزاحیہ مناظر بھی موجود ہیں جن کا اصل پلاٹ اور کہانی سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں، اسی طرح ان کے ڈرامے "نیک پروین عرف سلور کنگ" میں تین مزاحیہ مناظر بھی شامل ہیں جو اصل پلاٹ سے غیر متعلق ہیں۔ "یہودی کی لڑکی" میں انہوں نے ابتدائی مناظر مزاحیہ رکھے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ بعض لوگوں نے کتابی ایڈیشن میں اس میں سے مزاحیہ حصّے نکال دیے۔ مثلاً سیّد وقار عظیم کے مرتب کردہ آغا حشر اور ان کے ڈرامے کے پہلے ایڈیشن میں آغاز میں مزاحیہ مناظر موجود تھے مگر جب دوسرا ایڈیشن شائع ہوا تو اس میں مزاحیہ حصّے شامل نہ تھے۔ یہ تبدیلی سیّد امتیاز علی تاج کے مشورے پر کی گئی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ مزاحیہ حصّے آغا حشر کے تحریر کردہ نہیں تھے بلکہ جب ڈرامے کی نمائش ہوئی تو کسی اور مصنف سے لکھوا کر تماشائیوں کی دلچسپی اور تفریح کے لیے یہ مناظر ڈرامے میں شامل کرلیے گئے تھے۔ واللہ اعلم۔

بات یہ تھی کہ مزاحیہ مناظر کا ڈرامے کی اصل کہانی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا۔ یہ اصل کہانی کے مناظر کے درمیان میں پیش کیے جاتے تھے اور بالکل الگ سے لگتے تھے۔ آغا حشر مرحوم کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے رفتہ رفتہ اس روایت کو اپنے ڈراموں میں ختم کردیا لیکن یہ تبدیلی رفتہ رفتہ پیش آئی۔ مثلاً ان کے ڈرامے "بلوا منگل" میں صرف ایک مزاحیہ منظر ہے۔ اسی طرح ان کے ایک اور ڈرامے "آنکھ کا نشہ" میں بھی صرف ایک مزاحیہ منظر شامل تھا۔ آغا حشر نے یہ کارنامہ سرانجام دیا کہ مزاحیہ مناظر کو کہانی ہی کا ایک حصّہ بنادیا۔ ان کا ڈراما "شہیدِ ناز" پہلا ڈراما ہے جس میں مزاح کو الگ مناظر میں پیش کرنے کے بجائے کہانی کے ساتھ ہی شامل کردیا گیا ہے اور مزاحیہ مناظر سے اصلی کہانی کا آغاز کیا گیا ہے۔ ڈرامے کے مرکزی اور اہم کردار پہلے مزاحیہ مناظر میں نظر آتے ہیں اور مزاح پیدا کرتے ہیں مگر بعد میں کہانی المیہ رُخ اختیار کرلیتی ہے۔ ان کے ڈرامے "نیک پروین" میں بھی بعض کرداروں کے ذریعے مزاح پیدا کیا گیا ہے الگ سے مناظر نہیں ڈالے گئے۔ ڈراما "خوب صورت بلا" اور "ماشاء

اللہ" کے کردار بھی اسی طرح ہنساتے رہتے ہیں اور پھر کہانی بعد میں سنجیدہ اور المناک رُخ اختیار کرلیتی ہے۔ "بلوا منگل" اور "آنکھ کا نشہ" میں بھی انہوں نے ایسا ہی کیا ہے۔ ان کے ڈرامے "رستم وسہراب" میں کچھ ابتدائی حصّہ مزاحیہ ہے۔ اس کے بعد اس کا رنگ سنجیدہ اور المیہ ہوجاتا ہے۔ اس اعتبار سے اردو تھیٹر میں ایک بالکل نئی روایت اور نیا انداز متعارف کرانے کا سہرا آغا حشر کے سر ہے۔

۱۹۳۰ء میں جب ہندوستان میں فلمی صنعت نے ترقی کرنی شروع کی تو لوگوں کا رجحان تھیٹر کی طرف کم ہوگیا اور انہوں نے سینما کا رُخ کرلیا۔ تھیٹر کے معروف ڈراما نویس فلموں کی کہانیاں، اسکرین پلے اور منظرنامے تحریر کرنے لگے۔ آغا حشر نے جو تھیٹر کی دنیا کے مانے ہوئے ڈراما نویس تھے۔ ۱۹۳۰ء کے بعد تھیٹر سے تعلق قطع کرلیا اور فلم کی طرف توجہ دینے لگے۔ تھیٹر کے لیے ان کے آخری دو ڈرامے "دل کی پیاس" اور "رستم وسہراب" تھے۔ اس کے بعد انہوں نے فلمی دنیا میں پیر پھیلائے۔ انہوں نے کلکتہ میں نیو تھیٹرز جیسے روشن خیال اور ترقی پسند ادارے کے لیے دو فلمی کہانیاں لکھیں۔ ان میں سے ایک کا نام "یہودی کی لڑکی" تھا اور دوسری کہانی "چنڈی داس" تھی۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ فلموں میں بھی شہرت اور کامیابی نے آغا حشر کے قدم چومے اور ان کی لکھی ہوئی فلموں کو بے حد پسند کیا گیا۔ چنڈی داس اور یہودی کی لڑکی کلاسیکی فلموں میں شمار کی جاتی ہیں۔

نیو تھیٹرز کے بعد انہوں نے ایسٹ انڈیا فلم کمپنی کے لیے فلم "عورت کا پیار" کی کہانی لکھی جو ان کے ایک اسٹیج ڈرامے پر مبنی تھی۔

پانیئر کمپنی کے لیے انہوں نے کئی فلمی کہانیاں لکھیں جن پر کامیاب فلمیں بنائی گئیں۔ ان میں شیریں فرہاد، قسمت کا شکار، آتشی طوفان، دل کی آگ وغیرہ شامل ہیں۔ اس طرح وہ پہلے نامور اسٹیج کے ڈراما نویس تھے جنہوں نے فلموں کی نئی تکنیک کو کھلے دل سے اپنایا اور اس میدان میں بھی نام کمایا۔

آغا حشر کاشمیری

آغا حشر کاشمیری، اردو ڈراما نویسی میں ایک ایسا نام ہے جو ڈرامے کے ساتھ لازم وملزوم بن کر رہ گیا ہے۔ آغا حشر کاشمیری نے پہلا ڈراما ۱۸۹۹ء میں لکھا تھا۔ اس کا خیال انہوں نے ولیم شیکسپیئر کے مشہور ڈرامے (WINTER'S TALES) سے اخذ کیا تھا جس کے معنی ہیں "موسم سرما کی کہانیاں"۔ اس سے دو باتیں بالکل واضح ہوجاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ آغا حشر کا معیار آغاز میں بھی بہت بلند تھا۔ انہوں نے اس زمانے کے رواج کے مطابق نوٹنکی نما بے مقصد اور بے معنی ڈرامے لکھنے کے بجائے انگریزی ادب کے مستند ڈراما نویس ولیم شیکسپیئر کی مثال کو اپنے پیش نظر رکھا اور اس کو ہی اپنا مرکزِ نگاہ بنایا۔ گویا شعوری یا غیر شعوری طور پر آغا حشر نے فنِ ڈراما نویسی کے سب سے بڑے اور لافانی نام کو اپنی کاوشوں کا ہدف بنایا اور اسی سے تحریک حاصل کی۔ آغا حشر نے یہ ڈراما اپنی تعلیم کے زمانے میں ایک دوست کی زبانی سُنا تھا اور پھر اس سے مستعار لے کر اس کا مطالعہ کیا تھا۔ اس ڈرامے کا موضوع، اسلوب اور اندازِ بیان ان کے ذہن پر نقش ہو کر رہ گیا تھا۔ پسندیدگی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کا پلاٹ انہیں اتنے سال گزر جانے کے بعد بھی یاد رہا اور انہوں نے اپنی ڈراما نگاری کا آغاز کرنے کے لیے اسی کو منتخب کیا۔ ایسا نہیں ہے کہ آغا حشر نے شیکسپیئر کے ڈرامے کا ترجمہ یا نقل کردی تھی۔ انہوں نے اس ڈرامے سے صرف خیال اخذ کیا تھا اور اس مغربی ڈرامے کو ٹھیٹ ہندوستانی پیکر میں ڈھال کر پیش کیا تھا جو ان کی جدتِ طبع اور تخلیقی صلاحیتوں کا ثبوت ہے۔ اس ڈرامے کو انہوں نے "مرید شک" کا عنوان دیا تھا۔ یہ ڈراما اپریل ۱۸۹۹ء میں بڑی تیاریوں کے بعد اسٹیج پر پیش کیا گیا تو اسے تھیٹر کے شائقین نے بہت پسند کیا اور اس کو اتنی مقبولیت اور کامیابی حاصل ہوئی کہ پہلے ہی ڈرامے سے آغا حشر نے سب کو چونکا دیا۔ نہ صرف اسٹیج کی دنیا میں ایک نئے ڈراما نویس کا جنم ہوا بلکہ پہلے ہی ڈرامے سے ان کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ ان کے پہلے ہی ڈرامے کو اتنی مقبولیت اور پزیرائی حاصل ہوئی کہ خود کمپنی کے مالک کاؤس جی کھٹاؤ نے اس کی مختصر کہانی کتابی صورت میں شائع کردی اور نوجوان ڈراما نویس کو بھرپور انداز میں خراجِ تحسین پیش کیا۔ وہ منشیوں اور روایت پرست ڈراما نویسوں کا دور تھا جو محض جاہل سیٹھوں کی خواہشات اور فرمائشوں کے پیش نظر الفاظ کی جمع بندی کیا کرتے تھے۔ ان ڈراموں میں کوئی نیا پن، نیا خیال یا اپج نہیں ہوتی تھی۔ ایک بھیڑ چال تھی کہ جاری تھی اور لطف یہ ہے کہ دیکھنے والے بھی ان کو دیکھ دیکھ کر اکتاتے نہیں تھے۔ دراصل بات یہ ہے کہ اسٹیج ڈراما اس وقت تک خواص اور دانش ور طبقے کی توجہ حاصل نہیں کرسکا تھا۔ عوام کی تفریحِ طبع کی خاطر مختلف واقعات، فقرہ بازی، مزاح، ناچ گانے کا سہارا لے کر ایک چوں چوں کا مربہ تیار کردیا جاتا تھا جسے دیکھنے والوں کی اکثریت ان پڑھ اور بے علم لوگوں پر مشتمل ہوا کرتی تھی۔ ایک اسٹیج ڈرامے کی طوالت اس زمانے میں سات یا ساڑھے سات گھنٹے کی ہوا کرتی تھی۔ کرسیوں کی جگہ چٹائی یا دری کا فرش ہوتا تھا جس پر تماشائی جم کر بیٹھ جاتے تھے اور اس طرح کہ کھانے پینے کا سامان اور موسم سرما کی رعایت سے لحاف اور کمبل بھی ہمراہ لاتے تھے۔ رات بھر یہ لوگ بیٹھے اوٹ پٹانگ واقعات اور ناچ گانوں، مزاح اور پھبتیوں سے لطف اندوز ہوتے رہتے تھے۔ اگر نیند آئی تو سولیے ورنہ ہنستے ہنساتے، باتیں کرتے اور فقرے چست کرتے ہوئے رات بسر کردی۔
ہمارے جو دانشور اور نقاد ابتدائی دور کے ڈراما نویسوں، خصوصاً آغا حشر کاشمیری کو یہ الزام دیتے ہیں کہ ان کے ڈراموں میں

تکنیک، معقولیت اور معیار نظر نہیں آتا اور ان ڈراموں کا انگریزی ڈراموں سے موازنہ کرتے رہتے ہیں، وہ ان حالات اور ان شائقین کو فراموش کر بیٹھتے ہیں جن کے لیے یہ ڈرامے لکھے جاتے تھے۔ اردو ڈراموں اور انگریزی ڈراموں میں ایک فرق تو یہ تھا کہ یہاں ڈرامے عام لوگوں کی دل بستگی اور دلچسپی کا سامان تھے جبکہ انگلستان میں تھیٹر کو باشعور، فہمیدہ طبقات اور امرا و شرفا کی سرپرستی حاصل تھی۔ یہاں تک کہ بادشاہ اور شہزادے اور شہزادیاں بھی بہت اہتمام سے تھیٹر میں رونق افروز ہو کر ڈراموں سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔

ایک اور نمایاں فرق یہ تھا کہ انگریزی ڈراما پہلے لکھا جاتا تھا جس کی وجہ سے اس کی ادبی حیثیت مستند تھی۔ لیکن ہمارے ہاں ڈراما پہلے اسٹیج پر پیش کیا جاتا تھا اور کامیابی کی صورت میں یار لوگ اسے مصنف کی اجازت کے بغیر ہی چھاپ کر اونے پونے داموں کتابی صورت میں فروخت کرنے میں مصروف ہو جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ نہ تو اس کی صحت اور معیار کو پیش نظر رکھا جاتا تھا اور نہ ہی طباعت اور کاغذ کا معیار اچھا ہوتا تھا۔ سستے کاغذ پر کتابت کرا کے انہیں حافظے کی مدد سے شائع کر دیا جاتا تھا جس کی وجہ سے اس میں بیان کے علاوہ کتابت کی بھی بے شمار غلطیاں ہوتی تھیں مگر نہ تو پڑھنے والوں کو اس کی پروا تھی اور نہ ہی ڈراموں کے مصنفین کی پیشانی پر بل پڑتا تھا۔ وہ ان ڈراموں سے خود کو بری الذمہ سمجھتے تھے، البتہ انہیں یہ فائدہ ہوتا تھا کہ اس طرح ان کی اور ان کے ڈرامے کی شہرت ہو جاتی تھی۔ پڑھنے والے کون سے تعلیم یافتہ اور اہل ذوق ہوتے تھے جو ان چیزوں پر اعتراض کرتے۔ کافی عرصہ گزر جانے کے بعد جب علم و ادب کو فروغ حاصل ہوا اور تعلیم یافتہ لوگوں نے اسٹیج ڈرامے کی طرف توجہ دی اور یہ ڈرامے نقادوں کی کسوٹی پر پرکھے گئے تو ان خامیوں کی نشان دہی کی گئی ورنہ اس سے پہلے جو بھی تھا وہی غنیمت سمجھ کر آنکھوں سے لگایا جاتا تھا۔

پہلے ڈرامے کی کامیابی آغا حشر کی خوش نصیبی کی علامت تھی۔ اس کامیابی نے ان کے لیے آئندہ کامیابیوں کی راہ ہموار کر دی اور قسمت ان پر یوں مہربان ہوئی کہ پھر وہ کامرانیوں کی منزلیں طے کرتے ہوئے آخری چوٹی تک پہنچ گئے۔ ڈراما نگار کی حیثیت سے انہیں ایسا مقام حاصل ہوا کہ باید و شاید۔ انہوں نے اپنی زندگی میں ہی دولت، شہرت اور عظمت کے مزے چکھ لیے تھے اور ڈراما نویسی کی معراج پر پہنچ گئے تھے۔ مرنے کے بعد بھی دانش وروں، ترقی پسندوں اور نقادوں کے قلم کی بے رحم نشتر زنی کے باوجود آغا حشر آج بھی محبوبیت اور مقبولیت کے اسی درجے پر براجمان ہیں جس پر روزِ اوّل ہی سے متمکن ہو گئے تھے۔ ان کا کوئی مدمقابل اور حریف ان کی خاک تک بھی نہ پہنچ سکا۔ ان کا نام انڈین شیکسپیئر اور بے مثال ڈراما نویس کے طور پر تاریخ کے صفحات میں درج ہو گیا۔ آغا حشر کو ایک ضرب المثل کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ ڈراما نویسی کی معراج ہی آغا حشر کے ڈرامے ٹھہرے۔ اردو ادب کی ترقی اور فروغ کے زمانے میں اور لوگوں نے بھی ڈراما نگاری کی صنف پر توجہ دی اور بہت اچھے ڈرامے بھی لکھے گئے مگر فرق صرف یہ تھا کہ ان میں سے بیشتر ڈراموں کو اسٹیج کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ یہ محض کتابوں تک ہی محدود ہو کر رہ گئے یا زیادہ سے زیادہ انہوں نے ریڈیو میں جگہ پائی۔ اسٹیج یا تھیٹر تک ان کی رسائی نہ ہو سکی۔ ان حالات میں ان کا آغا حشر کے ڈراموں سے موازنہ و مقابلہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ آغا حشر کے ڈرامے تھیٹر کے اسٹیج پر پیش کیے جاتے تھے اس لیے ان میں عام تماشائی کی ضروریات اور نفسیات کا پوری طرح خیال رکھا جاتا تھا۔

آغا حشر کے تحریر کردہ مکالمے آسان، سادہ، رواں اور شستہ ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ انہیں اداکار بے تکلفی اور روانی سے اسٹیج پر بولا کرتے تھے جبکہ لکھے ہوئے ڈراموں کے مکالمے ادبی، کتابی اور ثقیل نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر انہیں اسٹیج پر پیش کیا جائے تو نہ صرف بولنے والے اداکاروں کو مشکل درپیش ہو بلکہ سننے والے بھی ان سے پوری طرح لطف اندوز نہ ہو سکیں۔ رہا آغا حشر پر مغربی ڈراموں سے متاثر ہونے کا الزام تو یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ آغا حشر نے اس وقت انگریزی ڈراموں سے خیال اور کردار مستعار لینے کا رواج ڈالا تھا جب اس ملک کی بہت بڑی اکثریت ان ڈراموں کے وجود ہی سے ناآشنا تھی۔ عام لوگوں کی تو بات ہی کیا ہے، پڑھے لکھے افراد بھی مغرب کے ادب اور فنونِ لطیفہ سے ناواقف تھے۔ ایسے میں آغا حشر نے مقامی گھسے پٹے موضوعات اور انداز کو پسِ پشت ڈال کر ڈراموں میں ایک نئی روح پھونک دی اور بدیسی خیالات کو اس خوبی، مہارت اور ذہانت سے مقامی سانچے میں ڈھالا کہ ان پر اوریجنل کا گمان گزرنے لگا۔ رہا مغرب خصوصاً انگریزی ڈراموں اور خیالات کو مستعار لینے کا سوال تو تھیٹر اور پھر بعد میں سینما میں ذہین اور اعلیٰ دماغ لوگوں نے مغرب ہی کو اپنے سامنے نمونے کے طور پر رکھا۔ بمبئی ٹاکیز، نیو تھیٹرز اور پھر بمبئی کے تعلیم یافتہ اور روشن خیال فلم سازوں، ہدایت کاروں اور لکھنے والوں نے مغرب ہی کی خوشہ چینی کی اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ ہر نیا اور چونکا دینے والا خیال مغرب ہی سے متاثر ہو کر اسکرین پر پیش کیا گیا تھا۔ نیو تھیٹرز اور بمبئی ٹاکیز کی معیاری کلاسیکی فلمیں اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ ڈبلیو زیڈ احمد جیسے ذہین اور تخلیقی ذہن رکھنے والے مصنف، فلم ساز اور ہدایت کار نے جب فلمی دنیا میں قدم رکھا تو انہوں نے بھی "من کی جیت" جیسی فلموں کا مرکزی خیال "ٹیس" جیسے مقبول انگریزی ناول سے اخذ کیا اور سارے ملک کو چونکا دیا تھا۔ لیکن بے چارے آغا حشر کا یہ "جرم" ہمارے دانش ور آج بھی معاف کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ دراصل اس نکتہ چینی کے پیچھے حسد کا جذبہ بھی کارفرما ہے۔ بڑی بڑی ڈگریاں اور بیرونی تربیت اور تجربہ حاصل

کرنے والے مصنف بھی آج تک وہ مقبولیت اور شہرت حاصل نہ کرسکے جو آغا حشر جیسے چٹائی کے مدرسے پر بیٹھ کر اکتسابِ علم کرنے والے اور کسی بھی باقاعدہ ڈگری سے محروم شخص کا مقدر بنی۔ تو پھر رقابت اور حسد کا پیدا ہونا تو لازمی امر ہے۔

آغا حشر ایک لیجنڈ کی حیثیت اختیار کرچکے ہیں۔ ادب، تھیٹر اور فنونِ لطیفہ سے وابستہ بہت کم لوگوں نے ان کو ان کا جائز مقام دینے اور ان کی اہمیت کا احساس کرنے کی ضرورت محسوس کی ہے۔ جہاں تک حکومتوں کا تعلق ہے تو وہ بے علم سیاست داں حکمرانوں اور ایک مخصوص ذہنی سانچے میں ڈھلے ہوئے احساسِ کمتری کے مارے ہوئے بیوروکریٹس کے حصار میں رہنے کی وجہ سے علم و ادب اور فائن آرٹس کی طرف توجہ دینے سے معذور ہی رہی ہیں۔ اس کے باوجود آج بھی اگر آغا حشر کو ایک ناقابلِ فراموش اور ناقابلِ تسخیر مقام حاصل ہے تو یہ ان کی عظمت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

آج تو بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ آغا حشر کون تھے۔ کہاں سے آئے تھے، ڈرامے اور تھیٹر کی دنیا میں کیونکر داخل ہوئے اور کس طرح انہوں نے محض ذاتی صلاحیتوں کی بنا پر یہ قابلِ رشک حیثیت حاصل کرلی؟

آغا حشر کا پورا نام آغا محمد شاہ تھا۔ آباؤ اجداد کا وطن کشمیر جنت نظیر تھا جس کے حوالے سے وہ ہمیشہ کاشمیری کے لاحقے سے یاد کیے گئے اور اس کو انہوں نے خود بھی اپنے نام کا ایک جزو بنالیا تھا۔ ان کے والد محترم کا نام غنی شاہ تھا۔ آغا حشر کے دو بزرگوں نے سری نگر کو خیرباد کہہ کر امرتسر کا رُخ کیا اور وہی پیشہ اختیار کیا جو اس دور میں کشمیری اپنایا کرتے تھے۔ وہ شالوں اور اونی چادروں کی تجارت کرتے تھے۔ کشمیر سے بہت سے خاندانوں نے ہجرت کرکے امرتسر کو اپنا دوسرا وطن بنالیا تھا اور کم و بیش یہ سب اسی کاروبار سے وابستہ تھے اور بہت خوش حال تھے۔

آغا حشر کے والد محترم غنی شاہ سن ۱۸۶۸ء میں کاروباری ضرورتوں کے تحت امرتسر سے نقلِ وطن کرکے یوپی میں ہندوؤں کے مقدس شہر بنارس پہنچ گئے اور وہیں آباد ہوگئے۔ آغا صاحب کے والد اپنے ماموں آغا احسن اللہ شاہ کے ساتھ مل کر تجارت کرتے تھے اور ان ہی کی تحریک پر امرتسر سے بنارس پہنچے تھے۔ یہ شہر شاعروں اور افسانہ نگاروں کے خیال میں انتہائی رومانی حیثیت رکھتا ہے۔ صبحِ بنارس کے تذکروں سے اردو شاعروں کے دیوان بھرے پڑے ہیں۔ جوش ملیح آبادی سے لے کر قدیم و جدید بیشتر شاعروں نے بنارس کے ماحول اور حسن کو بیان کیا ہے اور نہایت دلکش اور پُرکشش انداز میں بنارس کے گھاٹ اور جمنا و گنگا کے سنگم کے حسین واقعات کی منظرکشی کی ہے۔

اسی رومان انگیز مقدس شہر میں آغا محمد شاہ کاشمیری نے جنم لیا تھا۔ ان کے والد آغا محمد غنی شاہ عین عنفوانِ شباب میں اٹھارہ سال کی عمر میں بنارس گئے تھے۔ انہوں نے اردو، فارسی، عربی کی تعلیم حاصل کی تھی جو کہ اس زمانے کے شرفا کے گھرانوں کا رواج تھا۔ انہوں نے دینی تعلیم بھی حاصل کی اور اس کے ساتھ ساتھ ماموں کے کاروبار میں بھی سرگرمی سے حصّہ لیتے رہے۔

آغا غنی شاہ کے ماموں آغا احسن اللہ شاہ کی شادی بنارس کے ایک متمول رئیس شیخ عبدالرحمٰن کی بڑی صاحب زادی سے ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنے بھانجے آغا محمد غنی شاہ کے لیے اپنی چھوٹی سالی کو منتخب کیا اور سن ۱۸۶۸ء ہی میں ان کی شادی خانہ آبادی کردی گئی۔ شادی کے لگ بھگ گیارہ سال بعد یکم اپریل ۱۸۷۹ء کو بنارس میں آغا محمد شاہ نے جنم لیا جو دنیا میں آغا حشر کاشمیری کے نام سے مشہور ہوئے۔ آغا حشر اپنے والد کی دوسری اولاد تھے۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ آغا حشر امرتسر میں پیدا ہوئے تھے لیکن یہ درست نہیں ہے۔ آغا حشر کے قریبی دوستوں اور عزیزوں نے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ وہ یکم اپریل ۱۸۷۹ء کو بنارس میں پیدا ہوئے تھے۔ اس زمانے میں ان کے والدِ محترم گووند پورہ کلاں، ناریل بازار بنارس میں رہائش پذیر تھے۔ اس اعتبار سے تو آغا محمد شاہ کو "بنارسی" ہونا چاہیے تھا مگر آغا حشر کو اپنے کاشمیری ہونے پر فخر تھا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اگر کوئی انہیں کشمیری کہہ کر مخاطب کرتا تو وہ اسے ناپسند کرتے تھے اور تصحیح کردیا کرتے تھے کہ حضرت میں کشمیری نہیں، کاشمیری ہوں۔ آغا محمد شاہ کی پیدائش کے سترہ روز بعد بنارس کے ایک معروف ماہر علم جفر مولوی محمد مرزا جفّار نے فارسی زبان میں ان کا زائچہ (جنم پتری) تیار کیا تھا۔

دستور کے مطابق ہوش سنبھالنے پر آغا محمد شاہ کو مدرسے میں داخل کردیا گیا جس کے مدرس حافظ عبدالصمد تھے۔ عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم انہوں نے اسی مدرسے میں حافظ عبدالصمد صاحب سے حاصل کی۔ اس کے ساتھ ہی انہیں حفظِ قرآن کا درس بھی دیا جاتا تھا مگر وہ پورا قرآن حفظ نہ کرسکے اور سولہ سیپارے حفظ کرنے کے بعد یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔ مدرسے کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد انہیں انگریزی تعلیم کے حصول کے لیے راج نرائن ہائی اسکول میں داخل کردیا گیا۔ اس زمانے میں مسلمان گھرانوں میں یہی رواج تھا کہ بچّوں کو عربی، فارسی، اردو اور مذہبی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے مدرسوں میں ابتدائی تعلیم دلائی جاتی تھی جس کے بعد انہیں انگریزی تعلیم کے حصول کے لیے انگریزی اسکولوں میں داخل کردیا جاتا تھا۔ آغا محمد شاہ بھی ان ہی مراحل سے گزرے۔ تعلیم کے زمانے میں ہی وہ شعرگوئی کی طرف راغب ہوگئے۔ طبیعت میں شعروادب سے لگاؤ ابتدائی عمر ہی سے تھا، مدرسے اور پھر اسکول کی تعلیم نے اس شوق کو مہمیز کیا اور وہ نوعمری میں ہی شعر کہنے لگے۔ ذہانت، جدتِ طبع اور شعروادب سے موزونیت کی بنا پر شعروشاعری کی طرف رجحان تو تھا ہی، ادبی محفلوں اور تخلیقی صحبتوں نے اس شوق کو مزید نکھار دیا۔ ابھی وہ آٹھویں

میر باقر علی داستان گو

داستان گوئی کا فن اب ہمارے ہاں بالکل ختم ہوچکا ہے۔ دلّی کے آخری داستان گو میر باقر علی تھے۔ جن کے انتقال کو اب بیس برس سے اوپر ہوئے۔ دُبلے پتلے سے آدمی تھے۔ سفید چھوٹی سی داڑھی، سر پر دو پلی، پاؤں میں دیسی جوتی، انگرکھا اور چست پاجامہ پہنتے تھے۔ عمر ساٹھ اور ستّر کے درمیان، کھلتا ہوا رنگ، ستواں ناک، میانہ قد، باتیں کرتے تو منہ سے پھول جھڑتے۔ داستان سُنانے دور دور جاتے تھے۔ رجواڑوں اور نوابوں میں بُلائے جاتے۔ ایک زمانے میں ریاست پٹیالہ میں داستان سنانے کے لیے ملازم بھی رہے۔ رئیس مرگیا تو دلی واپس آگئے۔ املی کی پہاڑی پر گھر تھا۔ آخری وقت میں افلاس نے گھیر لیا تھا۔ سنیما ایسا چلا کہ میر صاحب کی پُرسش ختم ہوگئی۔ دلی کے ہندو رئیس چھنامل کے ہاں کسی وقت میں چالیس پچاس روپے ماہوار پر ملازم تھے۔ چھنامل والوں کا بیان ہے کہ ہم میر صاحب سے بچپن سے داستان سن رہے ہیں۔ بیس پچیس سال ہوگئے، ایک داستان ہی ختم ہونے میں نہیں آتی۔

میرے بچپن میں میر صاحب فراش خانہ میں داستان سُنایا کرتے تھے۔ ہفتے میں ان کا ایک دن مقرر تھا۔ گھنٹا ڈیڑھ گھنٹا داستان کہتے۔ برسوں یہ سلسلہ جاری رہا۔ داستان کا ایک حصہ سنانے پائے تھے کہ یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔ میر صاحب ہمیشہ داستان امیر حمزہ ہی سُنایا کرتے تھے۔ ایک نے ان سے پوچھا کہ میر صاحب! یہ داستان کبھی آپ نے ختم بھی کی ہے؟ بولے "عمر بھر میں ایک دفعہ۔"

میر صاحب کے آباو اجداد شاہی داستان گو تھے۔ غالباً انہی میں سے کسی کے متعلق یہ روایت مشہور تھی کہ بادشاہ کو روزانہ داستان سُنایا کرتے تھے۔ ایک موقع ایسا آیا کہ عاشق و معشوق کے درمیان صرف ایک پردہ حائل تھا۔ پردہ اٹھ جائے تو وصال ہوجائے مگر داستان گو نے احساسات، خیالات اور کیفیات کے بیان میں بارہ سال گزار دیے اور پردہ نہ اُٹھا۔ آخر بادشاہ کا اشتیاق بے قابو ہوگیا اور اس نے تنگ آکر کہا "آج پردہ اُٹھ جانا چاہیے" تب کہیں وہ پردہ اٹھا۔ میر صاحب کا بھی اسی سے کچھ ملتا جلتا حال تھا۔ بیگم کے بناؤ سنگھار میں ایک نشست ختم کردیتے تھے۔ آراستہ ہونے کی تفصیل، زیورات کی قسمیں، لباس کی قسمیں۔ زیورات کی تفصیل شروع ہوتی تو میر صاحب سیکڑوں نام گنا جاتے۔ پھر یہ بھی بتاتے کہ شاہی بیگمات کے زیور کیا ہوتے تھے، درمیانے طبقے کی خواتین کون کون سے زیور پہنتی تھیں، بھٹیاریاں، سقنیاں اور مہترانیاں کیا کیا پہنتی تھیں۔

میر صاحب بزم اور رزم کو اس انداز سے بیان کرتے کہ آنکھوں کے سامنے پورا نقشہ کھنچ جاتا۔ داستان کہتے جاتے اور موقع بہ موقع ایکٹنگ کرتے جاتے۔ آواز کے زیروبم اور لب ولہجے سے بھی اثر بڑھاتے۔ امیر حمزہ اور عیاروں کا جب بیان کرتے تو ہنساتے ہنساتے لٹا دیتے۔ ہتھیاروں کے نام گنانے شروع کرتے تو سوڈیڑھ سو نام ایک سانس میں لے جاتے۔ پھر کمال یہ کہ نام صرف طوطے کی طرح رٹے ہوئے نہیں تھے بلکہ آپ جب چاہیں، ٹوک کر کسی ہتھیار کی شکل اور اس کا استعمال دریافت کرسکتے تھے۔ میر صاحب پوچھنے سے چڑتے نہ تھے بلکہ خوش ہوتے اور تفصیل سے بتاتے۔ مثلاً منجنیق کو بیان کرنے ہی میں پندرہ منٹ صرف کردیے۔ عورت کا حُسن بیان کرنے پر آئیں تو زمین آسمان کے قلابے ملادیں اور کچھ نہیں تو چال کی ہی سیکڑوں قسمیں بتاتے۔ بیگم بن سنور کر ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں آرہی ہیں۔ ڈیڑھ گھنٹا ہوگیا، بیگم دہلیز نہیں پھلانگتیں۔ پھر کیا مجال کہ آپ میر صاحب کے بیان سے اپرانے یا اکتانے لگیں۔ انہوں نے یہ وسیع معلومات بڑی محنت سے حاصل کی تھیں۔ ہر علم کا انہوں نے باقاعدہ مطالعہ کیا تھا۔ استادوں سے باقاعدہ سیکھا تھا اور تو اور جب دلی میں طبیہ کالج کھلا تو میر صاحب نے ساٹھ سال کی

جماعت کے طالب علم تھے جب انہوں نے حشر تخلص اختیار کرکے شعر موزوں کرنے کا آغاز کردیا تھا۔ عموماً وہ اردو میں شاعری کرتے تھے مگر کبھی کبھی فارسی میں بھی شعر کہا کرتے تھے۔ آغاز میں تو ان کے سامعین اور مدّاحوں کا حلقہ ان کے ہم جماعتوں اور بے تکلّف دوستوں تک محدود رہا جو ان کے اشعار کو سُن کر جھوما کرتے تھے اور فراخ دلی سے داد بھی دیا کرتے تھے۔ ان کی غزلیں اپنے دوستوں کے حلقے میں بہت مقبول تھیں۔ آغا حشر تحت اللفظ اور ترنم دونوں انداز سے شعر سُناتے تھے۔ زبان پر عبور حاصل تھا۔ خوش کلامی اور آواز کی نغمگی نے بہت جلد ان کی شہرت کو دوستوں کے حلقے سے باہر تک پھیلادیا۔ گھر والوں اور بزرگوں کو ان کے اس شوق کی ہوا تک نہیں لگی اور وہ چپکے چپکے مشاعروں میں شریک ہونے لگے۔ انہوں نے بنارس کے ایک مستند شاعر اور ماہر علم عروض مرزا محمّد حسن فائز کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا۔ فائز اس وقت بنارس کے مشن اسکول میں ہیڈ مولوی تھے۔ ان ہی سے آغا حشر نے کلام کی اصلاح لی۔ ڈراما نویسی کا شوق بھی آغا حشر کے دل میں اسی زمانے میں پیدا ہوچکا تھا۔ درحقیقت انہوں نے اپنا پہلا ڈراما "آفتابِ محبت" کے عنوان سے اسی زمانے میں تحریر کیا تھا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ نوعمر آغا حشر کا یہ ڈراما سن ۱۸۹۷ء میں ہی شائع ہوگیا تھا۔ بنارس کے جواہر اکسیر پریس نے اسے شائع کیا تھا۔ اس ڈرامے میں ان کا ابتدائی شاعرانہ کلام اور غزلیں بھی شامل

عمر میں اس میں داخلہ لیا اور لڑکوں کے ساتھ بیٹھ کر پڑھنے لگے اور وہاں سے فارغ التحصیل ہونے کی سند بھی حاصل کی۔

میر صاحب کی داستان جہاں ہوتی وہاں اُجلی اُجلی چاندنیوں کے فرش بچھ جاتے۔ میر صاحب کے لیے ایک چھوٹا سا تخت بچھا دیا جاتا۔ اس پر قالین اور گاؤ تکیہ ہوتا۔ سامعین گاؤ تکیوں سے لگ کر بیٹھ جاتے۔ پان اور حقّے کا دور چلتا رہتا۔ گرمیوں میں شربت اور جاڑوں میں چائے سے تواضع کی جاتی۔ میر صاحب تخت پر براجمان ہوتے۔ کٹورے یا گلاس میں پانی منگواتے۔ جیب میں سے چاندی کی ڈبیا اور چاندی کی چھوٹی سی پیالی نکالتے۔ ڈبیا میں سے افیون کی گولی نکالتے۔ اسے روئی میں لپیٹتے۔ پیالی میں تھوڑا سا پانی ڈال کر انٹے کو اس میں گھولتے رہتے اور دوستوں سے باتیں کرتے رہتے۔ جب ساری افیون ڈھل کر پانی میں آجاتی تو روئی اُگال دان میں پھینک دیتے اور گھولوے کی چسکی لگا لیتے۔ اس کے بعد چائے کا ایک گھونٹ پیتے، فرماتے "چائے کی خوبی یہ ہے کہ لب بند، لب ریز اور لب سوز ہو۔" پھر داستان شروع کر دیتے۔

دلی میں کہیں داستان کہنے جاتے تو دو روپے لیا کرتے پھر ایک دور ایسا آیا کہ لوگوں کو دو روپے بھی اکھرنے لگے تو میر صاحب نے اپنے گھر پر داستان کہنی شروع کر دی اور ایک آنہ ٹکٹ لگا دیا۔ دس بیس شائقین آجاتے اور میر صاحب کو روپیہ سوا روپیہ مل جاتا۔ بعض دفعہ سامعین کی حسب فرمائش کسی ایک پہلو کو بیان کرتے۔ کوئی کہتا "میر صاحب۔ آج تو لڑائی کا بیان ہو جائے" اور میر صاحب رزم کو اس تفصیل کے ساتھ پیش کرتے کہ آنکھوں کے سامنے میدانِ جنگ کا نقشہ آجاتا۔ کوئی کہتا "میر صاحب آج تو عیاریاں بیان ہو جائیں" اور میر صاحب عیاروں کے کارنامے بیان کرنے لگتے۔

میر محمود علی صاحب نے بتایا کہ کلکتہ میں ایک دفعہ لکھنؤ کے ایک داستان گو کی دھوم مچی۔ ایک دن ہم بھی سُننے گئے تو دیکھا کہ داستان گو کے آگے کتاب کھلی دھری ہے۔ اس میں سے پڑھتے جاتے ہیں اور بہت جوش میں آتے ہیں تو ایک ہاتھ اونچا کر لیتے ہیں۔ طبیعت بڑی مکدر ہوئی۔ جی چاہا کہ کسی طرح میر باقر علی یہاں آجاتے تو کلکتہ والوں کو معلوم ہوتا کہ داستان گوئی کسے کہتے ہیں۔ نہ سان نہ گمان، اگلے دن کیا دیکھتے ہیں کہ کولوٹولہ میں میر صاحب سامنے سے چلے آتے ہیں۔ معلوم ہوا اپنے کسی کام سے آئے ہیں۔ قصّہ مختصر میر صاحب کی داستان ہوئی اور لکھنوی داستان گو ہاتھ جوڑ جوڑ کر کہتا تھا "حضور، یہ اعجاز ہے، حضور یہ آپ ہی کا حصّہ ہے۔"

جب داستان سُننے والوں کا قحط ہو گیا تو میر صاحب نے چند کتابیں لکھیں۔ مثلاً گاندھی جی کی کھادی تحریک کے زمانے میں ایک کتابچہ "گاڑھے خاں نے ململ جان کو طلاق دے دی"، "باجی پڑوسن"، "مولا بخش ہاتھی" اور ایسی ہی چھوٹی چھوٹی کتابیں کئی لکھی تھیں۔ جو ایک بار چھپنے کے بعد پھر نہیں چھپیں۔ اکثر رسالوں میں ان کے مضامین بھی شائع ہوئے مگر جو لطف ان کی تقریر میں تھا، تحریر میں نہ آسکا۔

میر باقر علی اپنے نانا میر امیر علی کے شاگرد تھے۔ جن بزرگوں نے میر امیر علی کی داستانیں سُنی تھیں، کہتے تھے کہ باقر علی کی داستان ان کی پاسنگ بھی نہیں تھی۔ غالباً فرق یہی ہوگا کہ وہ بارہ سال تک پردہ پڑا رہنے دیتے ہوں گے، میر باقر علی سال دو سال میں پردہ اُٹھا دیتے تھے۔

بڑھاپے میں ناقدری اور کس مپرسی کے ہاتھوں میر صاحب کو بڑی تکلیف پہنچی۔ دلّی کا کامل الفن آخری داستان گو اپنا پیٹ پالنے کے لیے چھالیا بیچتا تھا۔

اے کمال افسوس ہے، تجھ پر کمال افسوس ہے

تھیں۔ اس زمانے کے ڈراموں میں غزلیں اور اشعار آزادانہ استعمال کیے جاتے تھے۔ دستور کے مطابق آغا حشر نے بھی ایسا ہی کیا۔ گھر کا ماحول مذہبی تھا اس لیے ابتدا میں انہوں نے گھر والوں سے اپنی شاعری اور ڈراما نویسی کو پوشیدہ رکھا تھا لیکن یہ بات زیادہ عرصے تک گھر والوں سے چھپی نہ رہ سکی۔ شاعری اور ڈراما نویسی کے شوق کی بدولت وہ اپنی تعلیم کی طرف سے غافل ہو گئے تھے۔
والد بزرگوار کے علم میں یہ بات آئی کہ وہ تعلیم میں دلچسپی نہیں لیتے اور اپنا وقت حصولِ تعلیم میں لگانے کے بجائے شاعری جیسے فضول اور بے کار مشغلے میں صرف کر رہے ہیں تو انہوں نے بیٹے کی گوشمالی کی۔ مگر والد صاحب کو جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ تعلیم کی طرف سے آغا محمد شاہ کا دل اچاٹ ہو چکا ہے اور وہ جن محفلوں اور مشغلوں کے رسیا ہو چکے ہیں۔ وہ تعلیم کی راہ میں حارج ہیں۔ گھر والوں نے آغا محمد شاہ کو اس شوقِ فضول سے باز رکھنے کے لیے پند و نصائح کا دفتر کھول دیا اور بہتیرا سمجھایا کہ پہلے وہ اپنی تعلیم مکمل کرنے پر پوری توجہ دیں۔ اس کے بعد دوسرے مشاغل پر دھیان دیں مگر یہ نشہ ایسا نہ تھا جو آسانی سے اُتر جاتا۔

ستم در ستم یہ کہ قدرت خود بخود آغا محمد شاہ کے لیے ان کے من پسند حالات پیدا کر رہی تھی۔ تھیٹریکل کمپنیاں ملک کے دوسرے شہروں کی طرح بنارس کا رُخ بھی کرتی تھیں۔ سن ۱۸۹۷ء میں ایک مشہور تھیٹریکل کمپنی نے بنارس میں ڈیرا جمایا اور ڈرامے

پیش کرنے کا آغاز کیا تو آغا محمدؐ شاہ کے شوق پر اس نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ پارسی مالک کی یہ کمپنی الفریڈ تھیٹریکل کمپنی کے نام سے مشہور تھی۔ بنارس میں اس کمپنی نے اسٹیج پر ڈرامے پیش کرنے کا سلسلہ شروع کیا اور لوگوں میں اس کا چرچا ہوگیا۔ بھلا آغا محمدؐ شاہ کیسے اس سے بے تعلق اور بے خبر رہ سکتے تھے۔ انہوں نے بھی اپنے بے تکلف دوستوں کے ہمراہ تھیٹر کا رُخ کیا اور ڈرامے دیکھنے لگے۔ اس کمپنی کے مستقل ڈراما نگار احسن لکھنوی تھے جو اس زمانے میں ڈراما نگار کی حیثیت سے مشہور و معروف تھے۔ اس زمانے میں ڈراما نگار کو منشی کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ منشی کے لیے ضروری تھا کہ وہ نثر نگاری کے ساتھ ساتھ شعر و شاعری پر بھی عبور رکھتا ہو کیونکہ ڈراموں میں غزلیں اور اشعار بھی باقاعدگی سے پیش کیے جاتے تھے اور دیکھنے والے ان سے بہت لطف اندوز ہوتے تھے۔ آغا محمدؐ شاہ نے دوستوں کی معیت میں الفریڈ تھیٹریکل کمپنی کے دو تین ڈرامے دیکھے تو ان کے دل میں بھی ڈراما لکھنے کا شوق کروٹیں لینے لگا۔ منشی احسن لکھنوی کے ڈرامے "چندراولی" سے وہ اتنے متاثر ہوئے کہ اسی انداز میں خود بھی ایک ڈراما لکھ ڈالا۔ اس کا نام "آفتابِ محبت" تھا۔ انہوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ دوسرے دن یہ ڈراما لے کر کمپنی کے مالک کے پاس پہنچ گئے اور اس کے ملاحظے کے لیے ڈراما پیش کر دیا۔ پارسی سیٹھ نے اپنے ڈراما نویس منشی احسن لکھنوی کو طلب کیا اور آغا محمدؐ شاہ سے ان کا تعارف کرانے کے بعد "آفتابِ محبت" انہیں مطالعہ کرنے کے لیے دیا۔ منشی احسن بھلا اس نوعمر اور نو آموز لڑکے کو کیا اہمیت دیتے۔ انہوں نے ایک سرسری نظر ڈالنے کے بعد بے نیازی سے آغا محمدؐ شاہ کی طرف دیکھا اور کہا۔

"میاں صاحب زادے! ڈراما لکھنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ ابھی تمہاری پڑھنے کی عمر ہے۔ میری مانو تو پہلے تعلیم حاصل کرو پھر ڈراما نگاری کر لینا۔ ابھی تم ڈراما لکھنے کے قابل نہیں ہو۔"

یہ طنزیہ گفتگو آغا محمدؐ شاہ کے حساس دل پر تیر کی طرح لگی۔ پارسی مالک کا رویّہ بھی انہیں پسند نہیں آیا تھا۔ مگر خاموشی اور صبر کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ چپ چاپ تھیٹر سے واپس چلے آئے مگر یہ طنز میں بجھے ہوئے الفاظ ان کے ذہن پر شعلے برسا گئے اور آغا محمدؐ شاہ نے دل ہی میں عہد کر لیا کہ وہ دنیا کو ڈراما نگار بن کر دکھائیں گے۔ خود اعتمادی کی دولت سے وہ نوعمری میں بھی مالا مال تھے۔ تھیٹر کمپنی کے مالک کی بے اعتنائی اور منشی احسن لکھنوی کی بے نیازی کا انہوں نے زیادہ اثر نہیں لیا۔ دوسرے ہی دن وہ اپنا یہ ڈراما لے کر بنارس کے ایک ناشر بسم اللہ خاں کے پاس جا پہنچے۔

"خان صاحب! میں ایک ڈرامے کا مسودّہ لے کر حاضر ہوا ہوں۔"

بسم اللہ خان نے اس گورے چٹے، کم عمر لڑکے کو سر سے پیر تک دیکھا اور بولے "تو پھر؟"

"تو پھر آپ اس کا مطالعہ کر لیجئے اور مناسب سمجھیں تو اسے طبع کر دیجئے۔"

بسم اللہ خان نے اس نوعمر لڑکے کو دلچسپی سے دیکھا جس کی ابھی مسیں بھیگ رہی تھیں مگر اس کے انداز و اطوار میں پختگی تھی۔ انہوں نے مسودّہ لے کر اس پر نظر ڈالی اور بھانپ گئے کہ وہ ایک کار آمد چیز ہے۔

انہوں نے کہا "ڈراما تو ٹھیک ہی لگتا ہے۔ کیا تم نے پہلے بھی کوئی ڈراما لکھا ہے؟"

آغا صاحب نے جواب دیا "جی نہیں۔ یہ میری پہلی کوشش ہے۔"

"ماشاء اللہ" بسم اللہ خان نے متاثر ہو کر آغا محمدؐ شاہ پر نظر ڈالی اور ان کے ڈرامے کی اشاعت کے جملہ حقوق ساٹھ روپے کے عوض حاصل کر لیے۔

ساٹھ روپے اس زمانے میں ایک معقول رقم ہوتی تھی اور پھر ایک نو آموز نوعمر لڑکے کی پہلی ڈرامائی تحریر کا یہ معاوضہ بے حد حوصلہ افزا تھا۔ کہاں تو بہت سے لکھنے والے اپنے مسوّدے بغل میں دبائے ناشروں اور ایڈیٹروں کے دفتروں کے چکر لگا لگا کر جوتے گھس لیا کرتے تھے اور کہاں یہ کہ آغا محمدؐ شاہ کے پہلے ہی ڈرامے کو کسی جدوجہد کے بغیر ہی ایک ناشر نے ساٹھ روپے کے عوض خرید لیا تھا۔ ڈرامے کی دنیا میں یہ آغا حشر کا پہلا قدم تھا جس کے بعد ان کا ہر قدم آگے ہی بڑھتا رہا اور ان پر دولت و شہرت کی بارش ہونے لگی۔ مقبولیت، کامیابی اور دولت نے تو جیسے اسی روز سے آغا حشر کی ہم نشینی اور مصاحبت اختیار کر لی تھی۔ محاورے کے مطابق ہونہار بروا کے پیر پالنے ہی میں نظر آجاتے ہیں۔ آغا محمدؐ شاہ حشر کاشمیری کے ساتھ بھی یہی واقعہ پیش آیا تھا۔

بسم اللہ خان نے "آفتابِ محبت" کو شائع بھی کر دیا مگر آغا حشر کا یہ ڈراما کسی تھیٹریکل کمپنی نے اسٹیج نہیں کیا۔ اس طرح ان کی پہلی ڈرامائی کاوش عوام کی نظروں تک پہنچنے سے محروم ہی رہی۔

اس تجربے نے آغا حشر کو مایوس نہیں کیا بلکہ حوصلہ دیا اور ان کی خود اعتمادی میں اضافہ ہوگیا۔ تھیٹر کے پارسی مالک کا طرزِ عمل اور منشی احسن کی بے نیازی نے ان کے شوق کو مزید بھڑکا دیا تھا۔ پھر ناشر کی حوصلہ افزائی نے انہیں ڈراما نگاری پر ایسا اکسایا کہ وہ زمانۂ تعلیم ہی میں دوسرا ڈراما لکھنے بیٹھ گئے۔ ان کی تمکنت اور حسّاس مزاج کا تقاضا تھا کہ وہ ڈراما نگار کی حیثیت سے خود کو منوائیں اور منشی احسن لکھنوی کے غرور کو پارہ پارہ کر دیں۔ وہ چپکے چپکے اپنے شوق کی تکمیل یعنی ڈراما نگاری میں مصروف رہے۔ انہیں مناسب وقت اور موقع کا انتظار تھا جب وہ اپنی صلاحیتوں کو دنیا کے سامنے پیش کر کے اپنی اہمیت کا احساس دلا سکیں۔

انگریزی کا محاورہ ہے کہ جہاں ارادہ ہوتا ہے وہاں راستہ خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ قدرت نے آغا محمدؐ شاہ حشر کاشمیری کو بہت

جلد ایک موقع فراہم کرایا۔ ایک روز کسی کام کے لیے انہیں والدہ نے کچھ رقم دی تو آغا حشر کی نیت میں فتور آگیا۔ یہ رقم ان کی اور ان کے دوستوں کی تھیٹربازی کی نذر ہوگئی۔ ان کا ہاتھ شروع ہی سے کھلا ہوا تھا۔ ناشر بسم اللہ خان سے وصول ہونے والے ساٹھ روپے وہ پہلے ہی ٹھکانے لگا چکے تھے اور اب انہیں خرچ کرنے کی لت سی پڑ گئی تھی۔ گھر سے جو بھی جیب خرچ ملتا تھا وہ ناکافی تھا۔ اب والدہ کی دی ہوئی رقم بھی وہ اپنے شوق میں اُڑا چکے تھے۔ اس حالت میں گھر واپس جاکر والدہ کی باز پرس اور والدِ محترم کی ڈانٹ ڈپٹ کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہ تھا۔ تھوڑے بہت پیسے بچ گئے تھے۔ تعلیم سے ان کا دل پہلے ہی اچاٹ ہوچکا تھا۔ بنارس کی فضا میں اب وہ گھٹن سی محسوس کرنے لگے تھے۔ انہوں نے تھیٹر کے حوالے سے بمبئی اور کلکتہ کا نام سُن رکھا تھا۔ خاص طور پر بمبئی کی رنگینیوں کی ایسی تعریف سُنی تھی کہ جی مچل گیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے بمبئی جانے کی ٹھان لی۔ تھوڑے بہت پیسے جیب میں باقی رہ گئے تھے۔ کچھ رقم اپنے دوستوں سے مانگ تانگ کر حاصل کرلی۔ وہ بھی تو دوستوں پر دولت لٹاتے آئے تھے۔ اب ان کی خواہش کے لیے معمولی سی رقم بطور قرض فراہم کرنے میں دوستوں کو بھلا کیا عذر ہوسکتا تھا۔ پیسہ ہاتھ میں آیا تو بمبئی کی کشش نے زور مارا اور وہ گھر جاکر اہلِ خانہ کی ناراضی کا سامنا کرنے کے بجائے بمبئی جانے کے لیے چوری چھپے ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے۔ مگر اس طرح کہ بالکل خالی ہاتھ تھے۔ تن کے کپڑوں کے سوا ان کے پاس سامان نام کی کوئی چیز نہ تھی، نہ صندوق، نہ بستر۔ بس اکیلی جان تھی اور ذہن میں ڈراما نگار بننے کی والہانہ لگن۔ ٹکٹ کٹاکر وہ بمبئی جانے والی ٹرین میں سوار ہوگئے۔ قریبی دوست انہیں رخصت کرنے کے لیے موجود تھے۔ بھرے ہوئے دل مگر خوش آئند توقعات اور دعاؤں کے ساتھ انہوں نے اپنے دوستوں کو خدا حافظ کہا۔ اس وقت کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ آغا محمد شاہ کے مستقبل کے لیے یہ ایک یادگار سفر ثابت ہوگا اور ان کا ڈراما نگار بننے کا خواب اس انداز سے شرمندۂ تعبیر ہوگا کہ رہتی دنیا تک ڈراما نگار اور شاعر کی حیثیت سے آغا حشر کاشمیری کا نام باقی رہے گا۔

بمبئی جیسا غدار شہر اور آغا حشر جیسا نوعمر اور ناتجربہ کار مسافر، وکٹوریہ اسٹیشن پر وہ کسی اسباب کے بغیر ٹرین سے باہر نکلے تو اس شہر کی وسعت، خوبصورتی، گہما گہمی اور بھاگ دوڑ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ یہ شہر ان کے لیے اور وہ اس شہر کے لیے قطعاً اجنبی تھے۔ نہ کوئی جان پہچان، نہ دوست، نہ عزیز رشتے دار، کوئی معمولی سا شناسا تک نہ تھا۔ وہ تو بس اللہ توکل گھر سے نکل کر بمبئی پہنچ گئے تھے، اب اللہ ہی ان کا نگراں اور مددگار تھا۔

سب سے پہلے قیام کا بندوبست کرنا ضروری تھا۔ ہوٹل میں ٹھہرنے کی حیثیت نہ تھی۔ لوگوں سے پوچھتے ہوئے ایک سرائے میں جا پہنچے۔ یہ شہر، یہ ماحول اور یہ جگہ ان کے لیے بالکل غیرمانوس اور اجنبی تھی۔ انہوں نے بڑے ناز و نعم میں پرورش پائی تھی۔ اب ایک سستی سی سرائے ان کے سر چھپانے کا ٹھکانا تھی۔ سستا زمانہ تھا۔ انہیں چار آنے روز کرائے پر ایک کمرا مل گیا۔ ساز و سامان تو تھا نہیں۔ بس ہاتھ منہ دھوکر تازہ دم ہوئے اور حصولِ مقصد کی خاطر نکل کھڑے ہوئے۔ پیٹ بھرنے کا مسئلہ نہ تھا۔ بمبئی میں تندور خانوں اور ایرانی ہوٹلوں کی کمی نہ تھی۔ سب سے پہلے پیٹ پوجا کا فریضہ ادا کیا اور پھر یہ فکر ہوئی کہ تھیٹر کمپنی تک رسائی کیوں کر ہو؟ بمبئی جیسے شہر میں ایک انجان نوعمر لڑکے کے لیے تھیٹر کمپنی کے مالک تک رسائی حاصل کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ مگر آغا حشر ہار ماننے والے نہیں تھے۔ دوسرے ہی روز تھیٹر کمپنیوں کی تلاش میں سرائے سے نکل کھڑے ہوئے.... سارا دن مارے مارے پھرے مگر گوہرِ مراد ہاتھ نہ آیا۔ بڑی مشکل سے ایک دو تھیٹر کمپنیوں کا پتا ٹھکانا معلوم کرکے مارا مار وہاں پہنچے مگر دروازے سے آگے نہ جاسکے۔ ان جان لوگوں کو بھلا کون تھیٹر کمپنیوں کے اندر داخل ہونے کی اجازت دیتا ہے۔ کسی مالک نے ان سے ملنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ بہت ہوا تو چپراسی یا چوکیدار تک رسائی ہوگئی۔ وہ لوگ ایسے شوقینوں کو دیکھنے کے عادی تھے۔ ہندوستان کے دور دراز گوشوں تک سے لوگ اداکار یا ڈراما نگار بننے کی حسرت دل میں لیے بمبئی پہنچ کر تھیٹر کمپنیوں کے دروازوں سے سر ٹکراتے رہتے تھے۔ بعض ہمدرد قسم کے چوکیداروں نے مالکوں تک ان کا پیغام پہنچا بھی دیا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ کسی نے بھی مستقبل کے انڈین شیکسپیئر سے ملنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ انہیں زیادہ سے زیادہ حوصلہ افزا جواب یہی ملا کہ بھیا، ابھی کوئی جگہ خالی نہیں ہے۔ پھر آنا۔ وہ جانتے تھے یہ لگا بندھا جواب بھی دراصل انکار ہی ہے مگر آغا محمد شاہ نے حوصلہ نہ ہارا۔ بدستور اپنی دُھن میں لگے رہے۔ بمبئی کی سڑکیں تھیں اور وہ تھے۔ پیدل مارے مارے پھرتے رہے۔ مختلف تھیٹر کمپنیوں کے دروازوں پر دستک دی مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ ادھر سرائے کی رہائش اور تندور خانوں کے کھانوں سے دل بیزار ہوگیا تھا۔ ایک اور مشکل یہ تھی کہ ان کی جمع پونجی انتہائی کفایت سے خرچ کرنے کے باوجود ختم ہورہی تھی اور یہ فکر کھائے جارہی تھی کہ اگر جلد آمدنی کا کوئی بندوبست نہ ہوا تو آخری پائی بھی خرچ ہوجائے گی اور پھر گزارے کے لیے دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانے یا محنت مزدوری کرنے کے سوا کوئی اور چارہ نہ رہے گا۔ اس تصور ہی سے آغا محمد شاہ کو ہول آتا تھا۔ وہ گوہرِ مقصود حاصل کرنے کے لیے سرتوڑ کوشش کررہے تھے مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ ”ضرورت نہیں ہے“ کا فقرہ ان کا مقدر بن گیا تھا۔

قدرت جب مہربان ہوتی ہے تو خود بخود راہیں پیدا ہوجاتی ہیں۔ اللہ کو آغا محمد شاہ کو آغا حشر کاشمیری بنانا مقصود تھا تو پھر راستہ کیسے نہ پیدا ہوتا۔ خدا کی قدرت تو دریائے نیل کے درمیان میں

بھی راستہ بنا دیتی ہے' یہ تو پھر بمبئی تھا۔

خوش نصیبی نے ایک روز ان کا دامن تھام لیا۔ اچانک ایک تندور نما ہوٹل میں ان کی ملاقات آغا شاعر قزلباش سے ہوگئی۔ آغا شاعر اس زمانے میں معروف ڈراما نگار تھے۔ ان کے کئی ڈرامے کامیابی سے ہم کنار ہوچکے تھے۔ آغا محمدؐ شاہ پر نظر پڑی تو آغا شاعر ان کی شخصی وجاہت سے متاثر ہوگئے۔ باتوں باتوں میں احوال دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ ڈراما نگار بننے کے لیے گھر سے نکلے ہیں اور بمبئی میں ٹھوکریں کھاتے ہوئے کئی دن گزر گئے ہیں مگر ہنوز روزِ اوّل والا معاملہ ہے' آغا شاعر قزلباش دلی والے اور صاحب احساس بزرگ تھے۔ ایک اعلیٰ خاندان کے چشم و چراغ کو یوں مٹی میں رُلتے دیکھا تو ان کے دل پر بہت اثر ہوا۔ گفتگو کے دوران میں انہوں نے یہ اندازہ بھی لگالیا کہ یہ نوجوان باصلاحیت اور ذہین ہے۔ خود اعتمادی کی دولت سے بھی مالا مال ہے اور مضبوط قوتِ ارادی کا مالک بھی ہے۔ پھر دونوں میں ایک قدرِ مشترک یہ بھی نکل آئی کہ اگر یہ آغا تھے تو وہ بھی آغا تھے۔ آغا شاعر کی وضع داری نے مجبور کردیا کہ وہ اس نوجوان کی مدد کریں۔ انہوں نے آغا حشر کو الفریڈ تھیٹریکل کمپنی کا پتا بتایا اور کمپنی کے مالک کے لیے ایک تعارفی خط بھی لکھ کر دے دیا۔ اس زمانے میں تھیٹر کے کاروبار پر پارسیوں کا ہی قبضہ تھا۔ فن کے فروغ سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ تو محض دولت کمانے کی غرض سے تھیٹر اور ڈرامے کی طرف راغب ہوئے تھے۔ یہی پارسی سیٹھ جو تھیٹر پر چھائے ہوئے تھے جب برصغیر میں فلم کا آغاز ہوا اور سنیما نے پرپُرزے نکالے تو انہوں نے ہی اس طرف بھی توجہ دی اور فلم سازی کی طرف دھیان دیا۔

آغا حشر کو جس پارسی تھیٹر کے مالک کی طرف آغا شاعر قزلباش نے بھیجا تھا ان کا نام سیٹھ کاؤس جی پالن جی کھٹاؤ تھا۔ آغا حشر ان سے ملاقات کے لیے پہنچے تو اس وقت کمپنی کے سب سے اہم اداکار امرت لال بھی اتفاق سے وہیں موجود تھے۔ یہ نہ صرف اداکار تھے بلکہ تھیٹر کے ڈائریکٹر بھی تھے۔

سیٹھ کاؤس جی پالن جی کھٹاؤ نے دیکھا کہ ایک نوعمر لڑکا جس کی ابھی مسیں بھیگی ہیں اور وہ نوجوانی کے آنگن میں قدم دھرنے والا ہے' معمولی سے لباس میں بے نیازی سے سامنے آن کھڑا ہوا ہے۔ کاؤس جی کھٹاؤ نے آغا حشر کی طرف خاص توجہ نہ دی۔ اگر آغا شاعر کا خط نہ ہوتا تو شاید سیٹھ کھٹاؤ تک آغا حشر کی رسائی تک نہ ہوتی۔

سیٹھ کھٹاؤ اس وقت چائے نوشی میں مصروف تھے۔ انہوں نے نوجوان آغا حشر کو بے پروائی سے دیکھا اور پھر چائے پینے میں مصروف ہوگئے۔ وہ آغا حشر کی عمر اور شخصیت سے قطعی متاثر نہیں ہوئے تھے۔

انہوں نے امرت لال سے کہا "جسے دیکھو وہ ڈراما لکھنے چلا آتا ہے۔ یہ لڑکا بھلا کیا لکھے گا؟"

امرت لال نے سیٹھ سے کہا "سیٹھ جی۔ آزمائش کرلینے میں کیا حرج ہے۔ ہوسکتا ہے اس میں صلاحیتیں موجود ہوں۔ آپ کو ایک نیا ڈراما لکھنے والا مل جائے گا۔"

سیٹھ کھٹاؤ نے بے دلی سے آغا حشر پر ایک نگاہ ڈالی پھر چائے کی پیالی کی طرف دیکھا۔ انہوں نے پوچھا "کیا شاعری بھی کرتے ہو؟"

آغا حشر نے جواب دیا "بالکل کرتا ہوں۔"

"اچھا۔ تو پھر یہ چائے کی پیالی رکھی ہے۔ اس پر کچھ شعر کہہ سکتے ہو؟"

آغا حشر نے اسی وقت چند اشعار فی البدیہہ کہہ دیے۔ سیٹھ کھٹاؤ اور امرت لال آغا حشر کی قادرالکلامی اور ذہانت دیکھ کر حیران رہ گئے۔ امرت لال نے دل کھول کر آغا حشر کو داد دی۔ وہ ان کی صلاحیتوں سے بہت متاثر ہوا تھا۔

اس وقت محفل میں سیٹھ کھٹاؤ کے ایک بے تکلّف دوست دادا بھائی ٹھونٹھی بھی موجود تھے۔ انہوں نے سیٹھ سے کہا "کھٹاؤ جی! یہ لڑکا بہت ہوشیار لگتا ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ اسے رکھ لو اور ڈراما لکھنے کا موقع دو۔ یہ مجھے اچھا منشی لگتا ہے۔"

سیٹھ کھٹاؤ خود بھی آغا حشر کی صلاحیتوں سے متاثر ہوگئے تھے۔ انہوں نے اسی وقت آغا حشر کو اپنی کمپنی میں ملازمت دے دی۔ ان کی تنخواہ پندرہ روپے ماہوار مقرر کی گئی۔ آغا حشر نے سیٹھ کا شکریہ ادا کیا۔ جب رخصت ہونے لگے تو سیٹھ نے روکا اور پوچھا "تم کہاں ٹھہرے ہوئے ہو؟"

آغا حشر نے بتایا کہ سرائے میں قیام ہے۔

سیٹھ نے کچھ سوچا اور پھر اپنے خزانچی کو حکم دیا کہ ایک مہینے کی تنخواہ آغا حشر کو پیشگی دے دی جائے۔ اس طرح وقتی طور پر آغا حشر کی مالی مشکل حل ہوگئی۔

سیٹھ نے آغا صاحب سے کہا کہ وہ فوری طور پر کمپنی کے لیے ایک نیا ڈراما لکھنا شروع کردیں۔

آغا صاحب ذہنی طور پر اس کے لیے بالکل تیار تھے۔ ان کے ذہن میں ولیم شیکسپیئر کے ڈرامے "ونٹرز ٹیل" کی کہانی کا خاکہ موجود تھا۔ یہ ڈراما انہوں نے اسکول کے دنوں میں پڑھا تھا اور یہ انہیں اتنا اچھا لگا تھا کہ وہ اسے بھول نہ سکے انہوں نے فوراً ہامی بھرلی اور رخصت کی اجازت طلب کی۔

آغا صاحب سیٹھ کھٹاؤ کے گھر سے نکل کر آغا شاعر کو تلاش کرتے ہوئے ان کے پسندیدہ ہوٹل میں پہنچ گئے۔ آغا شاعر نے انہیں دیکھتے ہی کہا۔

"آؤ آؤ۔ بھئی بہت مبارک ہو۔"

آغا حشر نے حیرت سے انہیں دیکھا "کس بات کی مبارک باد دے رہے ہیں؟"

"ارے میاں، تمہیں کام جو مل گیا ہے۔ اس سے بڑھ کر خوشی اور مبارک باد کی بات اور کیا ہو سکتی ہے؟"

"شکریہ۔ آپ کو کس نے بتایا؟"

"تمہارے دمکتے ہوئے چہرے اور مسکراتی ہوئی آنکھوں نے۔"

آغا صاحب نے اپنے محسن کا شکریہ ادا کیا اور انہیں ملاقات کی تمام تفصیل سُنائی۔ انہوں نے کہا "ذرا ہم بھی تو سُنیں، چائے کی پیالی پر تم نے کیا اشعار کہے؟"

آغا صاحب بولے "آغا صاحب! وہ شعر کیا ہیں بس تُک بندی ہے۔ ان لوگوں کو پسند آگئے۔ مگر کسی صاحبِ ذوق استاد کے سامنے سُنانا مناسب نہیں ہے۔"

"ارے نہیں بھئی، ہم تو ضرور سنیں گے۔ اگر مرزا غالب چھالیا کی تعریف میں اشعار کہہ سکتے ہیں تو تم نے چائے کی پیالی پر شعر کہہ دیئے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔"

آغا حشر نے اشعار سُنائے تو آغا شاعر بے حد خوش ہوکر انہیں گلے لگالیا۔ بہت تعریف کی اور دعائیں بھی دیں۔ پھر انہیں ڈراما نویسی کے رموز اور اس زمانے کی ضروریات اور تقاضوں کے بارے میں بتاتے رہے۔ انہوں نے آغا حشر کو یہ مشورہ بھی دیا کہ ڈراما نویسی اپنی جگہ۔ مگر تمہیں اللہ نے شاعری کی صلاحیتیں بھی عطا کی ہیں۔ مناسب ہے کہ تم شعر و شاعری کا مشغلہ بھی جاری رکھو۔ ویسے بھی ڈرامے کے مکالموں میں اشعار ضرور شامل ہوتے ہیں اور وہی ڈراما نویس زیادہ شہرت اور کامیابی حاصل کرتا ہے جسے شاعری کے فن پر بھی عبور حاصل ہو۔ انہوں نے یہ بھی مشورہ دیا کہ فنِ موسیقی سے واقفیت بلکہ اس میں مہارت بھی ڈراما نگار کے لیے ضروری ہے۔

"وہ کیوں بھلا؟"

"اس لیے کہ ڈرامے کی کامیابی کا انحصار بہت حد تک گانوں اور موسیقی پر بھی ہوتا ہے اس لیے ایک کامیاب ڈراما نویس کے لیے شاعری اور موسیقی دونوں سے واقفیت ضروری ہے۔"

اللہ اللہ، کیسے بے غرض، بے لوث اور کشادہ دل لوگ تھے۔ آغا شاعر قزلباش ان دنوں خود بھی تھیٹر کے لیے ڈرامے لکھا کرتے تھے۔ ایک نئے ڈراما نویس کی آمد سے جلنے کے بجائے وہ اس کی مدد کر رہے تھے۔ اس کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔ کام حاصل کرنے کے سلسلے میں اس کی مدد کر رہے تھے اور پھر اسے ڈراما نویسی کے گُر بھی بتا رہے تھے۔

آغا حشر اپنے محسن کا یہ کرم کبھی فراموش نہیں کرسکے اور تاعمر انہیں عزت و احترام دیتے رہے۔ اس روز ہوٹل میں آغا قزلباش نے نوجوان حشر کو ملازمت ملنے کی خوشی میں چار آنے کی مٹھائی منگا کر ان کا منہ میٹھا کرایا اور حاضرین کو اس خوشی میں چائے بھی پلائی۔

آغا حشر اسی روز قلم کاغذ سنبھال کر ڈراما لکھنے بیٹھ گئے۔ خیال پہلے ہی موجود تھا۔ اب اسے ڈرامے کی صورت میں ڈھالنا تھا۔ زود نویسی میں ان کا ثانی کوئی مشکل ہی سے ہوگا۔ چند ہی روز میں انہوں نے تھیٹر کے لیے اپنا پہلا ڈراما تحریر کرکے پہلے آغا شاعر کو دکھایا اور ان کی جانب سے پسندیدگی کی سند ملنے پر سیٹھ کھٹاؤ اور امرت لال کے حوالے کردیا۔ یہ ڈراما "مرید شک" تھا۔ سیٹھ اور امرت لال دونوں ہی نے ڈرامے کو بہت پسند کیا۔ یوں تو آغا حشر کا یہ پہلا ڈراما تھا جو تھیٹر پر اسٹیج کرنے کے لیے لکھا گیا تھا لیکن لکھنے کا تجربہ وہ پہلے ہی کر چکے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ ڈراما اسٹیج پر پیش نہیں کیا جاسکا تھا۔ ڈرامے کی تیاری کے سلسلے میں بھی وہ آغا شاعر سے مشورے لیتے رہے تھے۔ پھر خود بھی بہت سے ڈرامے دیکھ چکے تھے اس لیے اعتماد کی دولت سے مالا مال تھے۔

اس ڈرامے کی تکمیل کے بعد اداکاروں کا انتخاب کیا گیا۔ ریہرسلیں کی گئیں اور تمام تیاریاں مکمل کرنے کے بعد اپریل ۱۸۹۹ء میں یہ ڈراما اسٹیج کی زینت بن گیا۔

سیٹھ کاؤس جی کو یہ ڈراما بہت پسند آیا۔ وہ اس سے بلکہ اس نووارد ڈراما نویس کی صلاحیتوں سے اتنے متاثر ہوئے کہ اس ڈرامے کے لیے خود ہی دیباچہ لکھ ڈالا۔ سیٹھ کاؤس جی پالن جی کھٹاؤ کا لکھا ہوا دیباچہ ذیل میں پیش کیا جارہا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سیٹھ جی نوجوان آغا حشر کی پہلی کاوش سے کتنے متاثر اور خوش ہوئے تھے۔

"خدا کی قدرت عجیب و غریب ہے۔ میں اپنے قدرداں تماش بینوں کے سامنے کمپنی کا تیسرا اور آغا حشر کاشمیری کا پہلا شاہ کار "مرید شک" پیش کرنے کی مسرت حاصل کرتا ہوں۔ امید ہے کہ یہ اسی قدر بہتر اور کامیاب ثابت ہوگا جس قدر کمپنی کے دوسرے شاہکار۔ یہ ناٹک خوبی و رعنائی اور دل فریبی و دل بستگی میں بے مثل ہے اس لیے میں کوئی ضمانت پیش کرنا ضروری نہیں سمجھتا لیکن میری یہ پیش کش بہ آسانی اسٹیج پر کامیاب ثابت ہوتی ہے یا نہیں، اس کے لیے میں خدا پر بھروسا کرتا ہوں اور اسی کے سپرد کرتا ہوں۔ اس خادم نے جس طرح "خون ناحق" اور "بزم فانی" کے لیے زرِ کثیر اور محنت صرف کی ہے اسی طرح اس کھیل کے لیے بھی صرف کیا گیا ہے لیکن آیا شائقین اس کو کامیاب بناتے اور پسند کرتے ہیں؟ اس کا اندازہ صرف قدرت کے بھروسے اور شوقین مزاج تماش بینوں کی انصاف پسندی اور ذوق پر منحصر ہے۔"

تماش بینوں نے آغا حشر کی اس پہلی کاوش کو بے حد سراہا تھا۔ اسٹیج پر پیش کرتے ہی یہ ڈراما مقبول ہوگیا تھا۔ ایک نئے ڈراما نویس کی یہ کوشش جب بے پناہ کامیابی سے ہم کنار ہوئی تو نہ صرف تماشائی تھیٹر پر ٹوٹ پڑے بلکہ تھیٹر کی دنیا میں بھی ہلچل سی پیدا ہوگئی۔ آغا حشر کا نام پہلے ڈرامے کے ساتھ ہی معروف ہوگیا اور بمبئی سے کلکتہ تک سب کو معلوم ہوگیا کہ ایک نیا ڈراما نویس بڑے

زور شور کے ساتھ تھیٹر کی دنیا میں وارد ہوا ہے۔

اس زمانے میں یہ دستور تھا کہ جو ڈراما اسٹیج پر کامیابی حاصل کرتا تھا۔ اس کی مختصر کہانی یا خلاصہ کتابی شکل میں بھی شائع کردیا جاتا تھا۔ اسی سال کے آخر میں ڈراما "مرید شک" کو کتابی صورت میں شائع کیا گیا تو سیٹھ کاوس جی کھٹاؤ نے اس کتاب کے لیے بھی ایک دیباچہ تحریر کیا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آغا حشر کی یہ پہلی ڈرامائی کاوش کتنی کامیاب ثابت ہوئی تھی اور کمپنی کا مالک جو اس نوجوان کو ناقابلِ توجہ سمجھتا تھا ان کی کارکردگی سے کتنا مسرور و مطمئن تھا۔ سیٹھ کاوس جی نے کتاب کے دیباچے میں لکھا۔

"جس کی مدد خدا کرتا ہے۔ اس کی ہر مشکل آسان اور مصیبت رد ہوتی ہے۔ یہ اس طرح کہ اس ادنیٰ کمپنی کا ناچیز ناٹک "مرید شک" نو ماہ کی مختصر مدت میں ساٹھ مرتبہ سے زیادہ پیش ہوا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے اس خادم کو محتاج نہ رکھا۔ اس لیے پہلے روزی رساں اور پھر اپنے تماش بین بھائیوں بہنوں کا شکریہ ادا کرنا یہ خادم اپنا فرض سمجھتا ہے۔"

اس کتاب کا ایک دیباچہ خود آغا حشر نے بھی لکھا تھا۔ جب کمپنی یہ ڈراما لے کر لکھنؤ پہنچی اور وہاں اس کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی تو اس کی کہانی اور گانوں کا خلاصہ نول کشور پریس لکھنؤ سے شائع ہوا اور تقسیم کیا گیا۔

"مرید شک" نے ڈراما دیکھنے والوں ہی کو نہیں تھیٹر کمپنیوں کے مالکوں کو بھی آغا حشر کا مرید بنادیا۔ اس کامیابی کے بعد ہی کمپنی نے آغا حشر کے معاوضے میں خاطرخواہ اضافہ کردیا اور ان کی ہر طرح قدرومنزلت کی۔ وہ پندرہ روپے ماہوار مشاہرے پر ملازم رکھے گئے تھے۔ "مرید شک" کی کامیابی کے بعد ان کی تنخواہ میں ایک دم ۲۵ روپے کا اضافہ کردیا گیا اور وہ چالیس روپے ماہوار پانے لگے جو کہ اس زمانے میں ایک معقول رقم تھی۔

آغا حشر کے لکھے ہوئے دوسرے ڈرامے "اسیر حرص" کو بھی بے حد کامیابی اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ کاوس جی نے اس خوشی میں آغا حشر کا معاوضہ ایک دم دُگنا کردیا۔ اب وہ اسّی روپے ماہوار تنخواہ پانے لگے۔ آغا صاحب نے اپنے دوسرے ڈرامے کے لیے بھی ولیم شیکسپیئر ہی کو تاکا تھا۔ یہ نیا ڈراما ۱۹۰۱ء میں پیش کیا گیا تھا اور اس کا پلاٹ انگریزی ڈرامے "کنگ رچرڈ سوئم" سے ماخوذ تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ آغا صاحب انگریزی ڈراموں کو من و عن اپنالیا کرتے تھے۔ یہ الزام بھی درست نہیں ہے کہ وہ انگریزی ڈراموں کا ترجمہ کرلیتے تھے۔ بات صرف اتنی ہے کہ آغا صاحب کرداروں اور پلاٹ سے متاثر ہوکر اس خیال کو اپنے انداز میں پیش کرتے تھے۔ ابتدائی زمانے میں تو ان کی انگریزی استعداد اتنی تھی بھی نہیں کہ وہ انگریزی ڈراموں سے ترجمہ کریں۔ اس زمانے میں انہوں نے شیکسپیئر کے جو ڈرامے پڑھے تھے۔ وہ انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیے گئے تھے۔ مگر اس کے بعد آغا صاحب کو یہ احساس ہوا کہ انگریزی زبان ڈراما اور افسانہ نگاری کے فن سے مالا مال ہے۔ اس لیے انہوں نے باقاعدگی سے انگریزی کا مطالعہ شروع کردیا۔ مطالعے کا تو انہیں بچپن ہی سے شوق تھا اور اس کی بدولت ان کی استعداد اور قابلیت اپنی عمر سے کہیں زیادہ ہوگئی تھی۔ یہ بجا ہے کہ انہوں نے باقاعدہ کالج کی تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ اس کا سبب ان کا ذوقِ ڈراما تھا۔ ڈرامے کے شوق میں وہ دل لگا کر تعلیم حاصل نہ کرسکے تھے۔ ادب، شعروشاعری اور پھر ڈراما دیکھنے اور لکھنے کا شوق اس قدر بڑھ گیا تھا کہ دیوانگی کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے نوعمری ہی سے شعروشاعری اور ڈراما نویسی کا آغاز کردیا تھا۔

جب انہیں انگریزی سے ناواقفیت کا احساس ہوا تو انہوں نے باقاعدہ انگریزی پڑھنی شروع کردی۔ انہوں نے ایک انگریز خاتون کی خدمات بطورِ سیکریٹری حاصل کرلی تھیں جو انہیں نہ صرف انگریزی کی تعلیم دیتی تھی بلکہ وہ انگریزی ادب اور ڈرامے سے بھی بخوبی واقفیت رکھتی تھی۔ آغا صاحب اپنی انگریز سیکریٹری کے ساتھ ڈراما نویسی کے بارے میں تبادلۂ خیال کرتے رہتے تھے اور جو ڈرامے لکھتے تھے ان کے بارے میں اس کی رائے اور مشورہ بھی حاصل کرتے تھے۔ شیکسپیئر کے ڈرامے سمجھنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ مگر ان کی سیکریٹری نے آغا صاحب کو شیکسپیئر کے ڈراموں کے رموز سے آگاہ کیا۔ اس طرح آغا صاحب باقاعدگی سے انگریزی ڈرامے خصوصاً شیکسپیئر کو سمجھنے کی کوشش میں کامیاب ہوگئے۔ اسی خصوصیت کی وجہ سے وہ اپنے عہد کے دوسرے ڈراما نویسوں سے منفرد اور ممتاز تھے۔ دوسرے لکھنے والوں کی اکثریت نہ صرف انگریزی سے ناواقف تھی بلکہ انہیں ڈرامے کی خوبیوں اور ضروریات کا بھی علم نہ تھا۔

"اسیر حرص" کی کامیابی نے آغا حشر کو ایسی شہرت دی کہ ان کا نام سارے ملک میں گونجنے لگا۔ وہ بڑی دھوم دھام سے ڈرامے کی دنیا میں وارد ہوئے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے بے انتہا کامیابی اور شہرت حاصل کرلی تھی۔ ڈراما نویس تو اس زمانے میں اور بھی تھے مگر آغا حشر نے نئے انداز اور آب و تاب کے ساتھ ڈراما نویسی کا آغاز کیا تھا۔ ان کے اندازِ تحریر میں شگفتگی اور بے ساختگی تھی۔ مکالمے برجستہ اور رواں تھے۔ اشعار ان کے ڈراموں کی خوب صورتی میں مزید اضافہ کردیتے تھے۔ وہ خود ایک بہت اچھے شاعر تھے اور برمحل اشعار سے مکالموں کو اس طرح سجاتے تھے کہ وہ انگوٹھی میں نگینے کی طرح نظر آتے تھے۔ اپنی ذہانت، صلاحیت اور جدّتِ طبع کے اعتبار سے وہ خوشبو کے ایک جھونکے کے مانند تھیٹر کی دنیا میں داخل ہوئے تھے۔ پھر روز بروز ان کا فن نکھرتا چلا گیا یہاں تک کہ وہ ڈراما نویسوں میں ممتاز ترین شخصیت کی حیثیت سے تسلیم کیے گئے۔ آغا حشر کو انڈین شیکسپیئر کہا جاتا تھا جو کہ ایک بہت بڑا اور منفرد اعزاز ہے۔ ایسی مقبولیت، محبوبیت اور شہرت پھر کسی اور ڈراما

نویس کو نصیب نہ ہو سکی۔ آغا حشر نے بہت جلد وہ مقام حاصل کر لیا جو دوسرے ڈراما نویسوں کے لیے باعث رشک و حسد تھا۔ آغاز میں پیشہ ور منشیوں نے ان کی حیثیت کو تسلیم نہیں کیا بلکہ انہیں طنز و حقارت کا نشانہ بنایا مگر کہاں تک؟ صداقت اپنا لوہا منوا کر ہی رہتی ہے۔ کچھ عرصے بعد جب آغا حشر پے در پے کامیابیاں حاصل کرنے لگے تو ان کے حریفوں اور دشمنوں کو بھی حقیقت کو تسلیم کرنا پڑا۔

منشی احسن کی داستان پہلے بیان کی جا چکی ہے۔ یہ وہی ڈراما نویس ہیں کہ جب بنارس میں آغا حشر اپنا پہلا تحریر کردہ ڈراما لے کر کمپنی کے مالک کے پاس گئے تھے تو منشی احسن نے انہیں تضحیک کا نشانہ بنایا تھا اور کہا تھا کہ صاحب زادے' ڈراما نویسی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ ان کے الفاظ آغا حشر کے دل میں نشتر کی طرح پیوست ہو کر رہ گئے تھے۔ انہوں نے یہ عزم کر لیا تھا کہ وہ ایک کامیاب ڈراما نویس بن کر دکھائیں گے۔ قدرت نے جب ان کی اس آرزو کی تکمیل کر دی اور آغا حشر کی شہرت و عظمت کا آفتاب طلوع ہو کر نصف النہار پر پہنچ گیا تو بالآخر ان کے معترضین اور حاسدین نے بھی ان کی عظمت کو تسلیم کر لیا۔ منشی احسن لکھنوی نے آغا حشر کو کھلے دل سے خراج تحسین پیش کیا اور اس طرح ان دونوں کے مابین ایسے گہرے مراسم کا آغاز ہوا جو آخر دم تک قائم رہے۔

منشی احسن نے ان کی تعریف و توصیف کے سلسلے میں ذرا بھی بخل سے کام نہیں لیا اور اس طرح اس دور کے ایک بڑے اور نامور ڈراما نویس بھی آغا حشر کی صلاحیتوں کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اس کے باوجود کئی ڈراما نویس اور نقاد ایسے تھے جو آغا حشر پر طعنہ زنی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے مگر جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے؟ شہرت و عظمت آغا حشر کا مقدر بن چکی تھی ان پر اعتراض کرنا آسمان پر تھوکنے کے مترادف تھا۔

جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے کہ آغا حشر کو تھیٹر کی دنیا سے متعارف کرانے کا سہرا آغا شاعر قزلباش کے سر ہے۔ انہوں نے نہ صرف ان کی ہر طرح معاونت کی تھی بلکہ انہیں قیمتی اور مفید مشوروں سے بھی نوازا تھا۔ انہوں نے ہی آغا حشر کو یہ گر بتایا تھا کہ ایک اچھے ڈراما نویس کے لیے شاعری اور موسیقی میں مہارت رکھنا ضروری ہے۔ شاعری تو خیر آغا حشر کے گھر کی باندی تھی مگر موسیقی میں بھی انہوں نے کمال حاصل کرنے کی کوشش کی۔ باقاعدہ اس فن اور ہنر کو سیکھا اور اپنے ڈراموں میں ان دونوں چیزوں کو نہایت مہارت اور خوب صورتی کے ساتھ سمو دیا۔ آغا شاعر ایک کشادہ دل اور شفیق انسان تھے۔ آغا حشر کی ہر کامیابی ان کے لیے خوشی کا باعث تھی۔ وہ آغا حشر کی ذہانت اور صلاحیت کے تو پہلے ہی معترف تھے مگر جب انہوں نے شہرت و کامیابی کے زینے پر آخری سیڑھی تک پہنچ کر اپنی مہارت کا لوہا منوایا تو اس کی سب سے زیادہ خوشی آغا شاعر کو ہوئی تھی۔ آغا حشر کے ہم عصروں میں سے دوسرے ڈراما نگاروں نے بھی آغا صاحب کی حیثیت کو تسلیم کر لیا تھا۔ آغا حشر نے بے انتہا کامیابی حاصل کرنے کے بعد بھی اپنے کسی ہم عصر کو طنز و تعریف کا نمونہ بنانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ ہر ایک کی عزت کرتے تھے۔ ان کی پزیرائی کرتے تھے اور کھلے دل سے ان کے کام کی تعریف کرتے تھے۔ اپنے سینئر ڈراما نویسوں سے تو وہ صلاح و مشورہ لینے میں بھی پس و پیش سے کام نہیں لیتے تھے۔ اس عہد کے دو مشہور ڈراما نگاروں منشی عبداللطیف شاد اور منشی الف خان رام پوری سے تو وہ مشورہ بھی کر لیا کرتے تھے جو ان کی سعادت مندی' نیازمندی اور کسر نفسی کا ثبوت ہے۔

آغا حشر کی شہرت و کامیابی کا دور شروع ہو چکا تھا اور وہ ایک سیل رواں کی طرح آگے بڑھ رہے تھے۔ کامیابیوں نے ان میں خود اعتمادی اور تخلیق کا ایک نیا جذبہ پیدا کر دیا تھا اور ان کا ذہن اب بہتر سے بہترین کی تلاش میں رہتا تھا۔

"اسیر حرص" بھی ایک کامیاب ڈراما ثابت ہوا تھا۔ اس کے بعد آغا حشر نے مختلف موضوعات پر ڈرامے لکھنے کا پروگرام بنایا۔ شیکسپیئر روز اول کے مانند ان کی پہلی ترجیح تھا۔ انہوں نے انگریزی کے اس لازوال ڈراما نویس کی عظمت کی طرف سے کبھی منہ نہ موڑا اور اس کے ڈراموں سے متاثر ہوتے رہے۔

سیٹھ کاؤس جی پالن جی کھٹاؤ کی کمپنی کے لیے تیسرا ڈراما انہوں نے "مار آستین" لکھا تھا۔ "مار آستین" بھی بے حد مقبول ہوا۔ ایسا لگتا تھا جیسے آغا حشر کا نام ہی تماش بینوں کے لیے کشش انگیز بن چکا ہے۔ وہ ان کے ہر ڈرامے پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ مسلسل اور پے در پے کامیابیوں نے ہر طرف ان کے نام کے جھنڈے گاڑ دیے تھے۔ دوسری تھیٹریکل کمپنیوں کے مالک بھی اب ان کی خدمات حاصل کرنے کے لیے بے قرار تھے۔ جن دنوں وہ سیٹھ کھٹاؤ کے لیے ڈراما "ہیملٹ" عرف خون کا خون لکھنے میں مصروف تھے' ایک اور کمپنی کے مالک نے ان پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیے۔ یہ بھی پارسی تھے اور بمبئی تھیٹریکل کمپنی کے مالک تھے۔ ان کا نام بہت دلچسپ و عجیب تھا۔ نوروز جی پرسی کی مسلسل کوشش تھی کہ وہ آغا حشر کو اپنی کمپنی میں لے جائیں۔ آخر ان کی کوشش بار آور ہو گئی اور وہ آغا حشر کو متاثر کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ بڑی منت اور سماجت سے آغا صاحب کو لے گئے اور ان کی تنخواہ سوا سو روپے مقرر ہوئی۔ سیٹھ کھٹاؤ کی کمپنی میں حاصل ہونے والی تنخواہ کے مقابلے میں یہ رقم خاصی زیادہ تھی .... تھی۔ سوا سو روپے اس زمانے میں ایک خطیر رقم تھی۔

آغا حشر نے سیٹھ کاؤس جی کھٹاؤ کی کمپنی کو خیرباد کہہ کر نئی کمپنی کے لیے کام شروع کر دیا لیکن اتنی دیانت داری کا ثبوت ضرور فراہم کیا کہ "ہیملٹ" کے بجائے سیٹھ نوروز جی پرسی کے لیے ایک نیا ڈراما تحریر کر دیا۔ اس کا نام "میٹھی چھری" تھا۔ دستور کے مطابق اس کی عرفیت "دورنگی دنیا" تھی۔ "میٹھی چھری" نے بھی کامیابی حاصل کی۔ سیٹھ نوروز جی پرسی کے لیے انہوں نے دوسرا

ڈراما "ٹھنڈی آگ" لکھا اور وہ بھی کامیاب ہوا۔

آغا حشر الفریڈ کمپنی کو چھوڑ کر چلے تو گئے تھے مگر سیٹھ کاؤس جی مسلسل اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ انہیں منا کر یا سمجھا بجھا کر دوبارہ اپنی کمپنی میں لے آئیں۔ انہوں نے بہت سے لوگوں کو درمیان میں ڈالا اور آغا صاحب کو دوبارہ اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ انہوں نے اس سلسلے میں آغا شاعر قزلباش اور منشی احسن لکھنوی کی خدمات بھی حاصل کیں۔ ان دونوں حضرات کے آغا حشر سے گہرے مراسم تھے۔ آغا شاعر قزلباش کی تو آغا حشر اپنے بزرگ اور استاد کے مانند عزت کرتے تھے۔ جب سیٹھ کھٹاؤ نے بہت دباؤ ڈالا تو مجبور ہو کر آغا حشر نے دوبارہ الفریڈ کمپنی سے وابستہ ہونے کا فیصلہ کرلیا۔

الفریڈ کمپنی میں واپس آنے کے بعد آغا حشر کا پہلا ڈراما "شہیدِ ناز عرف اچھوتا دامن" تھا۔ حسب معمول اس ڈرامے کا خیال بھی انہوں نے شیکسپیئر کے ایک ڈرامے سے اخذ کیا تھا۔ آغا صاحب کو تو جیسے کامیابی کی عادت سی پڑ گئی تھی۔ ان کا لکھا ہوا ہر ڈراما کامیابی سے ہم کنار ہو رہا تھا۔ "شہیدِ ناز" بھی مقبول و کامیاب ہو گیا۔

آغا حشر کا نام اب ڈراموں کی کامیابی کی ضمانت بن چکا تھا۔ تماش بینوں کے تو وہ محبوب تھے ہی مگر تھیٹر کے پارسی مالکوں کے حلقوں میں بھی وہ ڈرامے کی دنیا کے بادشاہ سمجھے جاتے تھے۔ ہر ایک سیٹھ کی یہ خواہش تھی کہ ان کی خدمات اپنی کمپنی کے لیے حاصل کرلیں۔ ابھی آغا حشر کو دوبارہ الفریڈ کمپنی میں آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ سیٹھ دادا بھائی ٹھو نٹھی نے ان پر ڈورے ڈالنے شروع کردیے۔ یہ وہی سیٹھ صاحب تھے جنہوں نے آغاز میں سیٹھ کاؤس جی سے آغا حشر کی تعریف اور سفارش کی تھی۔ اب ان کی خواہش تھی کہ آغا حشر ان کی کمپنی کے لیے ڈرامے تحریر کریں۔ انہوں نے آغا صاحب کو ہر طرح سے مائل کرنے کی کوشش کی۔ بھاری معاوضہ بھی پیش کیا اور کئی جاننے والوں سے پُرزور سفارش بھی کرائی۔ اس طرح آغا حشر ایک بار پھر سیٹھ کاؤس جی کو چھوڑ کر سیٹھ ٹھو نٹھی کی کمپنی سے وابستہ ہو گئے۔ انہیں اتنا معاوضہ پیش کیا گیا تھا جو اس زمانے میں کوئی دوسرا ڈراما نویس حاصل نہیں کرتا تھا۔ اس طرح وہ تھیٹر کی دنیا کے سب سے زیادہ مہنگے ڈراما نویس بن گئے تھے۔ آغا حشر نے نئی کمپنی کے لیے دو ڈرامے تحریر کیے۔ پہلا "سفید خون" تھا۔ یہ ڈراما بھی شاندار کامیابی سے ہم کنار ہوا۔ دوسرا ڈراما "صیدِ ہوس" تھا۔ اس کا خیال انہوں نے شیکسپیئر کے ڈرامے "کنگ جان" سے اخذ کیا تھا۔ یہ دونوں ڈرامے بے حد مقبول ہوئے۔ اب آغا صاحب پارسی سیٹھوں کے نزدیک سونے کے انڈے دینے والی مرغی بن چکے تھے۔ ہر سیٹھ کی خواہش تھی کہ وہ ان کی کمپنی سے وابستہ ہو جائیں۔ ایک پارسی سیٹھ جو نیو الفریڈ تھیٹریکل کے مالک تھے، آغا حشر کی خدمات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور آغا صاحب نے سیٹھ دادا بھائی ٹھو نٹھی کی کمپنی کو خیرباد کہہ دیا۔ ان سیٹھ صاحب کا نام سہراب جی اوگرا تھا۔ وہ کافی عرصے سے آغا حشر کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش میں تھے اور بالآخر اس کوشش میں کامیاب ہو گئے۔ آغا حشر نے ان کے لیے ڈراما "خوابِ ہستی" لکھا۔ اس ڈرامے کا خیال انہوں نے شیکسپیئر کے ڈرامے "میکبتھ" سے اخذ کیا تھا۔ وہ یہ ڈراما اس سے پہلے "داؤ پیچ" کے نام سے پیش کر چکے تھے۔ "خوابِ ہستی" ان کے کامیاب ڈراموں میں ایک اور اضافہ ثابت ہوا۔ ان کا اگلا ڈراما "خوب صورت بلا" تھا۔ یہ وہ ڈراما تھا جو آغا صاحب نے کہیں سے اخذ نہیں کیا تھا۔ یہ ان کا اپنا خیال تھا۔ اس ڈرامے کو بھی بہت کامیابی حاصل ہوئی۔ آغا صاحب کو ڈراما نویسی کرتے ہوئے دس گیارہ سال ہو چکے تھے اور ان کی شہرت اور مقبولیت روز افزوں تھی۔ اس دوران میں انہوں نے جتنے بھی ڈرامے لکھے تھے وہ سب کے سب کامیاب ہوئے تھے۔ اس گیارہ سال کے عرصے میں آغا صاحب کے ڈراموں میں مزید پختگی اور نکھار پیدا ہو چکا تھا۔ انہوں نے ڈراما نویسی کا آغاز تو مروجہ انداز سے کیا تھا لیکن اس کے بعد انہوں نے کچھ نئے تجربات کرنے شروع کردیے تھے۔ ان کے ڈرامے دوسرے ڈراما نویسوں کے ڈراموں سے ہر لحاظ سے مختلف اور منفرد نظر آتے تھے۔ اشعار کی بندش اور برجستگی اور ان کا خوب صورت استعمال ان کے ڈراموں کی ایک نمایاں خوبی تھی اور پھر اشعار کا معیار بھی خوب تھا۔ انہیں اخبارات، تماشائی اور نقاد "انڈین شیکسپیئر" کے نام سے پکارتے تھے اور تھیٹر کی دنیا میں ان کا مدِمقابل کوئی اور نہ تھا۔ سیٹھوں کی نوازشات اور مہربانیوں کا سلسلہ تھا کہ بڑھتا ہی جاتا تھا۔ کون سا ایسا سیٹھ تھا جو انہیں اپنے ساتھ رکھنے کا تمنائی نہ تھا۔

ان پر دولت اور شہرت کی بارش ہونے لگی تھی۔ ان کا قلم مسلسل ہٹ ڈرامے لکھنے میں مصروف تھا۔ ہر کمپنی انہیں منہ مانگا معاوضہ دینے کے لیے تیار تھی مگر آغا حشر اب خود اپنی ذاتی کمپنی بنانے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ اپنے اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے انہوں نے اپنی ذاتی کمپنی قائم کرلی۔ یہ کمپنی حیدر آباد دکن میں قائم کی گئی تھی اور اس کا نام انڈین شیکسپیئر تھیٹریکل کمپنی رکھا گیا تھا۔ اپنی ذاتی کمپنی کے تحت انہوں نے پہلا ڈراما "سلور کنگ عرف نیک پروین" پیش کیا۔ بعد میں یہ ڈراما "جرمِ وفا" کے نام سے بھی پیش کیا گیا تھا۔ ان کی کمپنی کا پہلا ڈراما ہی بے حد کامیاب ہوا۔ آغا حشر کا نام ہی کسی ڈرامے کی کامیابی کا ضامن تھا۔ پھر یہ تو ان کی ذاتی کمپنی کا ڈراما تھا۔ ڈراما کامیاب ہوا مگر خود آغا صاحب ناکام ہو گئے تھے۔ ان میں کاروباری سوجھ بوجھ نام کو بھی نہیں تھی۔ وہ آمد و خرچ کا حساب رکھنا نہیں جانتے تھے۔ کاروبار کرنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ پہلے ہی ڈرامے نے انہیں اس قدر پریشان کردیا کہ انہوں نے ذاتی کمپنی کا خیال ترک کردیا

اور کمپنی کو بند کردیا۔ اس کے بعد انہوں نے ایک تھیٹریکل کمپنی کے لیے ڈراما "پہلا پیار" تحریر کیا جسے بے حد کامیابی حاصل ہوئی مگر ذاتی کمپنی کا جو مزہ ان کے منہ کو لگ چکا تھا وہ کسی طرح نہ چھٹ سکا۔ کچھ عرصے بعد انہوں نے پھر دہلی جاکر ایک تھیٹریکل کمپنی قائم کرلی اور نیا ڈراما لکھنے میں مصروف ہوگئے۔ اس کا نام "خود پرست" تھا۔ اس ڈرامے کو اسٹیج پر پیش کرنے سے پہلے ہی ان کے گھر والوں نے ایک خاندانی گھریلو لڑکی سے ان کی شادی کردی۔ یہ شادی بنارس میں ہوئی تھی جہاں ان کے اہلِ خاندان رہائش پزیر تھے۔ بنارس سے آغا صاحب بیگم کو لے کر واپس دہلی پہنچے اور اپنی تھیٹریکل کمپنی کے لیے ڈراما پیش کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہوگئے۔ اس کمپنی کا پہلا ڈراما "خود پرست" اسٹیج پر پیش کیا گیا تو بے حد کامیاب ہوا۔ یہ ڈراما بعد میں "باپ کا قاتل" کے نام سے بھی اسٹیج کیا جاتا رہا۔ اس زمانے میں تھیٹریکل کمپنیاں شہر شہر کے دورے کیا کرتی تھیں اور وہاں جاکر ڈرامے پیش کرتی تھیں۔ آغا صاحب کی کمپنی نے بھی دہلی میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد دوسرے شہروں کا رخ لیا۔ ان کے گھر والے خصوصاً والد جو زمانۂ تعلیم میں ان کے شوقِ شاعری اور لکھنے لکھانے کے سخت مخالف تھے۔ ان کی کامیابیوں کو دیکھ کر اب ان کی ذہانت اور قابلیت کے قائل ہوگئے تھے بلکہ ان پر فخر کرتے تھے۔

آغا صاحب جب اپنی کمپنی کے ساتھ کلکتہ پہنچے تو یہ شہر انہیں اتنا پسند آیا کہ انہوں نے وہیں رہنے کا فیصلہ کرلیا۔ انہوں نے ایک محلہ سواتی لگان میں اپنا تھیٹر قائم کیا اور ڈرامے پیش کرنے لگے۔ آغا حشر اپنے سب سے پہلے پارسی مالک سے علیحدہ تو ہوگئے تھے مگر ان کا باہمی تعلق قائم تھا۔ جب سیٹھ کاؤس جی پالن جی نے کلکتہ میں ایک تھیٹرہال خریدا تو آغا حشر اس تھیٹرہال میں اپنے ڈرامے پیش کرنے لگے۔ آغا صاحب نے اس زمانے میں کئی ڈرامے لکھے اور اسٹیج کیے۔ "یہودی کی لڑکی"، "شیر کی گرج" اور "بلوا منگل" ڈرامے انہوں نے اسی تھیٹر میں پیش کیے تھے اور سب ہی کامیابی سے ہم کنار ہوئے تھے۔ کامیابیاں، کامرانیاں اور شہرت و دولت ان کے قدم چوم رہی تھی۔ ہر طرف ان کے نام کا چرچا تھا۔ سارے ہندوستان میں ان کے نام کا ڈنکا بج رہا تھا۔ ان کا ہر قدم کامیابی اور بلندی کی طرف اُٹھ رہا تھا۔ مگر ایک غلط قدم نے انہیں ایک روز حادثے سے دوچار کردیا۔ ریلوے اسٹیشن پر وہ پھسل کر گر گئے اور ان کے پاؤں کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس ناگہانی حادثے کی وجہ سے وہ کئی سال تک صاحبِ فراش رہے لیکن ڈراموں کا سلسلہ جاری رہا۔ ان کے چھوٹے بھائی آغا محمود ان کے ساتھ ہی کلکتہ آگئے تھے۔ انہیں آغا صاحب نے ہدایت کاری کی تربیت بھی دی تھی۔ وہ ان کے ڈراموں میں اداکاری بھی کرتے تھے۔ آغا صاحب کی علالت کے زمانے میں آغا محمود چند پرانے اور قابلِ اعتماد ساتھیوں کے تعاون سے ڈرامے اسٹیج کرتے رہے اور کاروبار کی دیکھ بھال بھی کرتے رہے۔ اس طرح حادثے کے باوجود آغا صاحب کا کام جاری رہا۔ ان کے لکھے ہوئے ڈرامے تو موجود ہی تھے جنہیں دیکھنے کے لیے لوگ جوق در جوق آیا کرتے تھے۔

صحت یاب ہونے کے بعد آغا حشر نے ایک نیا ڈراما لکھا۔ اس کا نام "نعرۂ توحید" تھا۔ یہ ڈراما تو کامیاب ہوا مگر آغا صاحب کی بیماری کے دوران میں ان کی کمپنی کے مالی حالات بدنظمی کی وجہ سے ابتر ہوگئے تھے۔ یہاں تک کہ کاروباری پریشانیوں سے تنگ آکر انہوں نے اپنی کمپنی بند کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ ذاتی کاروبار آغا صاحب کا مزاج نہ تھا اور نہ ہی وہ بزنس کے معاملات میں دلچسپی لیا کرتے تھے۔ اس کمپنی کے بند ہونے پر انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ انہیں اس بات کی خوشی تھی کہ وہ کاروبار کے جھنجھٹ سے آزاد ہوکر اپنی تمام تر توجہ ڈراما نویسی کی طرف مبذول کرسکتے تھے۔ ڈراما نویسی ان کے لیے سراسر فائدے کا سودا تھا جبکہ ذاتی کاروبار میں نقصان کا بھی احتمال تھا۔ اسی زمانے میں آغا صاحب ایک بیٹے کے باپ بن چکے تھے جس کا نام انہوں نے آغا حسن شاہ رکھا تھا۔

دوسری بار اپنی ذاتی کمپنی بند کرنے کے بعد آغا حشر کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ کلکتہ کے میڈن تھیٹرز کی جانب سے انہیں ڈراما نویس کے طور پر ملازمت کی پیش کش کی گئی تو آغا صاحب نے رضامندی ظاہر کی اور میڈن تھیٹرز سے وابستہ ہوگئے۔ میڈن تھیٹرز سے آغا صاحب کی وابستگی ایک طویل عرصے تک قائم رہی۔ انہیں بارہ سو روپے ماہوار تنخواہ دی جاتی تھی جو کسی دوسرے ڈراما نویس کے خواب و خیال سے بھی زیادہ تھی۔ اس دور میں انہوں نے جو ڈرامے لکھے ان میں آنکھ کا نشہ، ترکی حور، مدھر مرلی اور بھگیرت گنگا شامل ہیں۔ اس زمانے میں آغا حشر نے دوسرے لکھنے والوں سے خیالات مستعار لینا بالکل ترک کردیا تھا اور یہ تمام ڈرامے سراسر ان کے اپنے ذہن کی تخلیق تھے۔ اس زمانے میں انہوں نے جو ڈرامے لکھے ان میں معاشرتی اور اصلاحی پہلو نمایاں تھا۔ ان تمام ڈراموں نے بھی حد سے زیادہ مقبولیت اور کامیابی حاصل کی۔

ایک طرف وہ کامیابیوں اور شہرت کی بلندیوں کی جانب گامزن تھے مگر دوسری طرف ایک بہت المناک صدمہ ان کی گھات میں تھا۔ ان کا اکلوتا بیٹا حسن شاہ اچانک بیمار ہوا اور صرف ڈیڑھ سال کی عمر میں اللہ کو پیارا ہوگیا۔ یہ بیٹا آغا صاحب اور ان کی بیگم کی آنکھوں کا تارا تھا۔ وہ اسی کو دیکھ کر جیتے تھے۔ اس کی موت کا صدمہ ان دونوں ہی کے لیے روح فرسا تھا لیکن بیگم نے ماں ہونے کی وجہ سے بہت گہرا اثر قبول کیا اور بچے کی جدائی کے صدمے نے انہیں بیمار کردیا۔ بہتیرا علاج کرایا مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ ہر تدبیر ناکام ثابت ہوئی جب کلکتہ کے ڈاکٹروں اور حکیموں نے جواب دے دیا تو آغا صاحب اپنی علیل بیوی کو ہمراہ لے کر لاہور چلے گئے۔ لاہور میں ان کے طبیب دوست حکیم فقیر محمد چشتی

رہتے تھے۔ آغا صاحب بیگم کے ہمراہ لاہور پہنچے تو آغاز میں اپنے دوست ہی کے گھر پر قیام کیا۔ حکیم فقیر محمد چشتی ایک بے مثل طبیب تھے جنہیں شفاء الملک کا لقب حاصل تھا۔ وہ بے بدل حکیم تھے لیکن خدا نہ تھے۔ ان کی تمام کوششوں کے باوجود آغا صاحب کی بیگم کا مرض بڑھتا گیا یہاں تک کہ نومبر ۱۹۲۶ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ بنارس سے ان کی مٹی انہیں کشاں کشاں لاہور لے گئی تھی اور کون جانتا تھا کہ خود آغا حشر بھی بالآخر اسی خاک میں مل جائیں گے۔ کہاں بنارس، بمبئی، کلکتہ اور کہاں لاہور۔ اپنے عروج کے زمانے میں آغا حشر ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں کی خاک چھانتے پھرتے تھے مگر یہ نہ جانتے تھے کہ لاہور کی فضاؤں میں وہ آخری سانسیں لیں گے اور تاقیامت یہیں کے ہو کر رہ جائیں گے۔

پے در پے ان دو صدموں نے آغا حشر کی کمر توڑ کر رکھ دی اور یہ زندہ دل، خوش باش اور خوش کلام انسان مرجھا کر رہ گیا۔ ان کی بیگم کو لاہور کے مشہور میانی صاحب کے قبرستان میں دفن کیا گیا تھا۔ آغا حشر بیگم کی میت کو آخری کندھا دینے گئے تو بالکل ہمت ہار چکے تھے۔ انہوں نے اپنے دوست حکیم فقیر محمد چشتی کے سامنے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ مرنے کے بعد انہیں بیگم کے پہلو میں ہی دفن کیا جائے۔ انہوں نے اپنی قبر کے لیے مخصوص جگہ کی نشان دہی بھی کردی تھی۔ آغا حشر کی ساری زندگی حسین ایکٹریسوں کے جھرمٹ میں گزری تھی اور ان کی مقبولیت بلکہ تھیٹر کی دنیا میں ان کی بے تاج بادشاہی کے پیش نظر بڑی بڑی اداکارائیں ان کی قربت اور خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش میں رہتی تھیں مگر آغا حشر نے ہمیشہ بلند اور مضبوط کردار کا نمونہ پیش کیا اور کسی کے حسن کے جال میں نہ پھنسے۔ تھوڑی بہت دلچسپی کی بات اور ہے۔ شادی کے بعد ان کی تمام تر توجہ اور محبت کا مرکز ان کی بیگم ہی رہیں۔ شادی کے بعد بیگم کی وفات تک انہوں نے کسی اور کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ جب بیگم کی رفاقت سے محروم ہوئے تو مایوسیوں، غموں اور بیماریوں نے ان کے گھر میں ڈیرا ڈال دیا اور وہ بستر سے لگ گئے۔ کئی سال تک وہ صاحبِ فراش رہے اور اس دوران میں لکھنے لکھانے کا سلسلہ بالکل بند رہا اور ان کا کوئی نیا ڈراما منصۂ شہود پر نہیں آیا۔ ایک طرف غم اور دوسری طرف بیماری۔ طبیعت لکھنے کی طرف مائل ہوتی کیوں کر؟ لیکن تابہ کے؟

دنیا کا دستور ہے کہ انسان جب تک بقیدِ حیات رہتا ہے۔ وہ اپنی مصروفیات اور سرگرمیوں سے بے تعلق اور بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ فطرتِ انسانی اسے بالآخر دنیاوی تقاضوں کی طرف مائل کر ہی دیتی ہے۔ چنانچہ آغا حشر نے بھی دوسرے دنیاوی امور کی طرف توجہ دی اور اپنے غم واندوہ اور محرومیوں کے خول سے نکل کر ایک بار پھر زمانے کی رنگینیوں کی طرف متوجہ ہوگئے۔

آغا حشر کاشمیری کے حوالے سے یوں تو کئی ہستیوں نے شہرت حاصل کی لیکن مغنیہ مختار بیگم کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ آغا صاحب کا نام ان کی پہچان بن چکا ہے۔ جب کبھی مختار بیگم کا تذکرہ ہوتا ہے، آغا حشر کا نامِ نامی ضرور سننے میں آتا ہے۔ مختار بیگم اور آغا حشر کے مراسم بھی اب ادبی تاریخ کا حصہ ہیں اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ زندگی کے آخری ایام میں آغا صاحب اور مختار بیگم ایک دوسرے کے بہت نزدیک ہوگئے تھے۔ آغا صاحب بیماری اور تنہائی کے ستائے ہوئے تھے اور مختار بیگم سالہا سال سے ان کی مدّاح، پرستار اور عقیدت مند تھیں۔ آغا صاحب کی چہیتی بیگم کا انتقال ہو چکا تھا۔ اکلوتا بیٹا اس سے پہلے ہی کمسنی میں وفات پا چکا تھا۔ ان دونوں صدموں نے آغا صاحب کو نڈھال کردیا تھا اور ان کے قریبی دوستوں کا کہنا ہے کہ آغا صاحب کی بیماری اور پھر وفات کا سبب بھی یہی دو صدمات تھے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آغا صاحب کی بیماری کے دنوں میں ہی ان کی مختار بیگم سے رسم و راہ ہوئی تھی۔ اس سے پہلے وہ دونوں آپس میں ملے تک نہیں تھے لیکن یہ خیال درست نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مختار بیگم آغازِ عمر ہی سے آغا حشر کی معترف اور پرستار تھیں۔ انہوں نے اپنے دل کے مندر میں آغا صاحب کا صنم سجا رکھا تھا اور اس کی پوجا کرتی رہتی تھیں۔ جب مختار بیگم نے ہوش سنبھالا تو ہندوستان میں کشمیر سے راس کماری تک آغا صاحب کے نام کا غلغلہ برپا تھا۔ ڈراما، شاعری اور موسیقی کے شعبوں میں وہ ایک معتبر نام بن چکے تھے اور لاکھوں افراد ان کے نادیدہ پرستار تھے۔ مختار بیگم نے بھی سب سے پہلے آغا حشر کا نام اور ڈراما نویس کی حیثیت سے ہی ان کی شہرت سُنی تھی اور ان کی دلدادہ بن چکی تھیں مگر ملاقات کی کوئی صورت نہ تھی۔ مختار بیگم امرتسر میں مقیم تھیں۔ جبکہ آغا صاحب بمبئی اور کلکتہ کے باسی تھے لیکن انہوں نے آغا صاحب کو اپنے من مندر میں آغاز ہی سے ایک مقدس اور بلند مقام دے دیا تھا۔

۱۹۲۸ء کا ذکر ہے جب مختار بیگم کا عنفوانِ شباب تھا لیکن وہ مغنیہ کے طور پر اپنا لوہا منوا چکی تھیں۔ صورت شکل کے لحاظ سے وہ حسینوں میں شمار کی جاتی تھیں۔ سُرخ و سفید رنگت، میدے شہاب جیسی بے داغ جِلد۔ بڑی بڑی آنکھیں، کتابی چہرہ اور اس پر آواز ایک قیامت۔ بقول ان کے وہ چھوٹی عمر میں ہی راجوں مہاراجوں کے درباروں میں اپنے فن کا مظاہرہ کر چکی تھیں اور جھولیاں بھر کر داد و تحسین سمیٹ چکی تھیں۔ اس زمانے میں فنونِ لطیفہ کی سرپرستی راجا، مہاراجا، نواب اور بڑے روٴسا ہی کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ فنونِ لطیفہ اپنے عروج پر تھے۔ مختار بیگم نے گلوکارہ کی حیثیت سے اپنی شخصیت کا اعتراف کرالیا تھا مگر ذاتی طور پر وہ خود آغا حشر کاشمیری کی مدّاح تھیں۔

میڈن کمپنی شہر شہر میں ڈراموں کا مظاہرہ کرتے ہوئے امرتسر پہنچی تو مختار بیگم کے دل کی مراد بر آئی۔ آغا حشر کے ڈرامے مقامی

اسٹیج پر پیش کیے گئے تو سارا شہر پاگل ہوگیا۔ ان دیوانوں میں ایک دیوانی مختار بیگم بھی تھیں۔ ترکی حور، آنکھ کا نشہ، یہودی کی لڑکی جیسے ڈراموں کو جس نے بھی دیکھا، مسحور ہو کر رہ گیا۔ انہوں نے آغا حشر کے ڈراموں کے بارے میں جو کچھ سُنا تھا وہ حرف بحرف درست پایا۔ مختار بیگم پر بھی ان ڈراموں اور آغا صاحب کے قلم کا جادو چل گیا تھا اور ایسا چلا کہ پھر عمر بھر وہ اسی سحر میں گرفتار رہیں۔ آغا صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے مگر مختار بیگم کے سر سے یہ سودا نہ نکل سکا۔

آغا صاحب نہیں تھے مگر ان کے کارنامے اور ان کی یادیں تو تھیں۔ مختار بیگم نے ان ہی کے سہارے اپنی ساری زندگی کاٹ دی۔

تھیٹر کمپنی کے مالک ہمیشہ اچھے فن کاروں کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ انہیں جہاں بھی کوئی دُرِ نایاب نظر آتا ہے اسے حاصل کرنے کے درپے ہو جاتے ہیں۔ میڈن تھیٹرز کے مالکوں نے بھی امرتسر میں مختار بیگم کی شہرت سنی اور ان کے فن اور شہرت سے فائدہ اٹھانے کا ارادہ کیا۔ انہوں نے مختار بیگم کو بہت معقول معاوضے پر کلکتہ آنے کی دعوت دی۔ وہ مختار بیگم کو اسٹیج کی ہیروئن بنانے کے خواہاں تھے مگر مختار بیگم کے والد ان کے تھیٹر میں کام کرنے کے حق میں نہیں تھے مگر مختار بیگم کی ضد کے آگے ہار گئے اور ہتھیار ڈال دیے۔ اس طرح مختار بیگم امرتسر سے کلکتہ پہنچ گئیں۔

کلکتہ پہنچ کر مختار بیگم اسٹیج پر نغمے گایا کرتی تھیں، ڈرامے میں اداکاری نہیں کرتی تھیں۔ اس لحاظ سے ان کا آغا صاحب سے واسطہ نہ تھا مگر پھر بھی آغا حشر میڈن تھیٹرز کے روحِ رواں تھے۔ ان کا تذکرہ ہر جگہ سُننے میں آتا رہتا تھا۔ آغا صاحب سے مختار بیگم کی عقیدت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ اب تک وہ اسٹیج پر مغنیہ کے طور پر نمودار ہوتی تھیں مگر تھیٹر کمپنی والوں نے سوچا کہ اپنے حُسن وجمال اور دلکش سراپا کے ساتھ اگر وہ اداکارہ بن جائیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔ ڈراموں میں اداکاری کرنے کے حوالے سے مختار بیگم کی آغا صاحب سے ملاقات ضروری تھی کیونکہ اداکاری کے رموز اور اداکاری کی ضرورتوں کے بارے میں وہی فن کاروں کو ہدایات دیا کرتے تھے۔ مختار بیگم جب ملاقات کی غرض سے آغا حشر سے ملاقات کے لیے ان کے گھر گئیں تو اپنی توقعات اور اندازوں کے برعکس ان کے گھر کا ماحول اور آغا صاحب کا بے تکلفانہ اور سادہ انداز دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ آغا حشر کاشمیری کے ساتھ مختار بیگم کی پہلی ملاقات کا احوال خود ان ہی کی زبانی سنیے۔

"آغا حشر، جن کے ڈراموں نے برصغیر میں قیامت برپا کر رکھی تھی۔ ان کے متعلق میرا خیال تھا کہ بڑے ٹھاٹ سے رہتے ہوں گے۔ ان کے دولت کدے پر پہنچی تو میرے ذہن میں جو نقشہ تھا معاملہ اس کے اُلٹ پایا۔

"جب میں ان کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہاں لکڑی کے ایک تختے پر بستر کیا ہوا تھا۔ چند معمولی سی کرسیاں اور اسی معیار کی دو تین الماریاں تھیں جن پر کتابیں بڑے قرینے سے سجی ہوئی تھیں اور ایک شخص کھدر کے کپڑوں میں ملبوس آرام کرسی پر دراز، کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا۔

میں اس شخص سے مخاطب ہوئی کہ میں آغا حشر سے ملنے آئی ہوں۔ ذرا ان کو خبر کر دی جائے۔

وہ شخص مجھے دیکھتے ہی چونک پڑا اور اس نے مجھ پر ٹکٹکی باندھ لی۔ اس کی نگاہوں میں عجیب سی کشش تھی، ساتھ ہی وہ مجھے سر تا پا دیکھنے لگا تو میں پریشان ہو گئی اور گھبرا کر بولی "جی میں پنجاب سے آئی ہوں اور آغا صاحب کے سلام کے لیے حاضر ہوئی ہوں۔ برائے مہربانی انہیں خبر کر دیجیے، کیا وہ گھر پر تشریف رکھتے ہیں؟"

میری بات سن کر وہ کہنے لگا "آغا حشر کی موت آئی ہے جو وہ آپ کے سامنے آئے۔"

اور پھر فوراً ہی بولا "جی... جی... جی۔ آپ تشریف رکھیے..... میں آپ کی تشریف آوری اور حشر کو موت کی خبر دے کر ابھی حاضر ہوتا ہوں" یہ کہہ کر وہ اُٹھا اور اندر چلا گیا۔

میں سخت حیران بلکہ پریشان ہوئی۔ یا خدا، یہ کیا ماجرا ہے۔ میں ڈر سی گئی اور سوچا کہ یہ آدمی تو پاگل لگتا ہے۔ یہاں سے چلنا چاہیے۔"

میں یہ سوچ ہی رہی تھی کہ وہی شخص گلے میں مفلر لپیٹے، سبز رنگ کی ریشمی لنگی اور سفید سلک کا کرتہ پہنے میرے سامنے آ گیا اور کہنے لگا "فرمایئے، کیا حکم ہے؟"

میں نے کہا "جی، میں تو آغا حشر صاحب سے ملنے آئی تھی لیکن یہاں تو..."

اس نے میرا جملہ کاٹتے ہوئے کہا "اس خادم کو ہی حشر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔"

اب میری حیرت کی کوئی حد نہ رہی۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے عرض کیا "مجھے آپ سے ملنے اور آپ کو دیکھنے کی بڑی تمنا تھی۔ مجھے میڈن تھیٹرز والوں نے صرف فنِ موسیقی پیش کرنے کے لیے بُلایا تھا لیکن اب انہوں نے فلم میں اور اسٹیج پر کام کرنے کی پیش کش بھی کر دی ہے۔ میں اس فن سے بے بہرہ ہوں اس لیے آپ سے اکتساب کرنا چاہتی ہوں۔"

آغا صاحب نے کہا "آپ کی خدمت کر کے میں فخر محسوس کروں گا۔"

لیکن ان کے چہرے پر گھبراہٹ طاری تھی۔ آغا حشر کی شکل وصورت کا جو تصور میرے ذہن میں تھا وہ تو اُڑ چکا تھا۔ اس کے بجائے ان کی ہر بات میں مٹھاس، عاجزی اور رمزیت نے میری ساری کوفت دور کر دی۔ کافی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ پھر میں نے ان سے یہ کہتے ہوئے اجازت طلب کی کہ میں انشاء اللہ پھر حاضر ہوں

ہوں گی۔ وہ مجھے چھوڑنے کے لیے نیچے تک تشریف لائے۔

موٹر میں بیٹھ کر میں نے کہا "آپ سے مل کر مجھے بے حد خوشی ہوئی ہے۔ میں آپ کے حسنِ اخلاق اور دلکش شخصیت کا گہرا تاثر لے کر جارہی ہوں لیکن ایک بات جاننے کے لیے سخت بے تاب ہوں کہ آپ کی ایکٹنگ کا مطلب نہیں سمجھ سکی۔"

خدا خدا کر کے کچھ مسکراہٹ ان کے چہرے پر آئی اور کہنے لگے "یہ بھی ایک بڑی سہانی اور دلچسپ کہانی ہے۔ انشاء اللہ کسی اچھے وقت عرض کروں گا۔"

آغا حشر کے ساتھ مختار بیگم کی یہ ڈرامائی پہلی ملاقات بذاتِ خود ڈرامے کے ایک سین کی حیثیت رکھتی ہے۔ آغا صاحب ان کو دیکھ کر مبہوت ہو گئے۔ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے اور بے اختیار ایسی حرکتیں کرنے لگے جو مختار بیگم کو بہت عجیب سی لگ رہی تھیں۔ مختار بیگم نے جس ملاقات کا احوال بیان کیا ہے اس کا کوئی اور عینی شاہد نہ تھا۔ صرف آغا حشر اور مختار بیگم ہی وہاں موجود تھے۔ آغا صاحب کے ساتھ جیتے جی' اور پھر ان کی وفات کے بعد بھی' مختار بیگم کی جو وابستگی اور والہانہ عقیدت رہی ہے اس کے پیشِ نظر یہ تصور نہیں کیا جاسکتا کہ انہوں نے اس عظیم شخصیت کے بارے میں مبالغے سے کام لیا ہوگا۔

بہرحال یہ ان دونوں کی آئندہ محبت کا حرفِ آغاز اور ایک پائیدار دائمی تعلق کا آغاز تھا۔

مختار بیگم کے ساتھ آغا حشر کے مراسم تیزی سے بڑھنے لگے یہاں تک کہ یہ داستانیں عام ہو گئیں۔ ان دونوں میں سے کسی نے بھی اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔ کچھ عرصے کے بعد مختار بیگم اکثر آغا حشر کے مکان پر جلوہ افروز نظر آنے لگیں اور آغا صاحب کی ان کے بارے میں والہانہ محبت چھپی نہ رہ سکی اور یہ داستان بہت جلد عام ہو گئی۔ آغا صاحب کو تازہ غموں اور صدموں نے چُور چُور کر دیا تھا۔ تنہائی اس پر مزید ستم تھی۔ ایسے میں مختار بیگم کی حسین اور مخلص رفاقت میسر آئی تو آغا صاحب کی زندگی میں تبدیلی آگئی اور وہ مایوسیوں کے بھنور سے باہر نکلنے کے لیے خود کو تیار کرنے لگے۔

آغا صاحب اور مختار بیگم کے مراسم کیوں کر بڑھے اور کس مقام تک پہنچ گئے خود مختار بیگم نے بھی ایک انٹرویو میں یہ روداد بیان کی ہے' وہ کہتی ہیں۔

"فن سیکھنے کے لیے میرا ان کے پاس آنا جانا شروع ہوا۔ ہر ملاقات خلوص اور اپنائیت کے نئے در وا کرتی چلی گئی۔ اتفاق سے ان ہی دنوں میرے پیٹ میں شدت کا درد رہنے لگا۔ بعض اوقات تو پوری رات آنکھوں میں کٹتی۔ ڈاکٹروں سے مشورہ کیا تو انہوں نے فوری آپریشن کے لیے حکم صادر کردیا جس پر والد صاحب مرحوم بہت پریشان ہوئے کیونکہ اس زمانے میں لوگ آپریشن کے لفظ سے ہی خوف زدہ ہو جایا کرتے تھے۔ آپریشن کا مطلب موت سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ ہمارے گھر میں رونا پیٹنا شروع ہو گیا۔ اسپتال جانے سے پہلے میں آغا صاحب سے ملنے گئی تو وہ گھر پر موجود نہیں تھے۔ میں دو سطریں لکھ کر چھوڑ آئی۔

"آج میرا آپریشن ہے۔ زندگی' موت سے لڑنے جارہی ہے۔ اگر زندگی جیت گئی تو ضرور ملاقات ہوگی ورنہ خدا حافظ۔"

نرسیں مجھے ٹرالی پر لٹا کر آپریشن تھیٹر میں لے جانے والی تھیں کہ آغا صاحب بھی پہنچ گئے۔ وہ بہت گھبرائے ہوئے تھے۔ بڑی حسرت سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ بڑے ملتجیانہ لہجے میں نرس سے کہنے لگے "کیا آپ مجھے اجازت دیں گی کہ انہیں میں آپریشن تھیٹر تک لے جاؤں؟"

وہ سب لوگ آغا صاحب کی شخصیت سے واقف تھے اس لیے انکار نہ ہوا۔ یہ منظر بھی دیدنی تھا۔ سب کی نظریں انڈین شیکسپیئر پر جمی ہیں۔ آغا صاحب کی حالت دیکھ کر میرا دل دھڑکنے لگا۔ انہوں نے اپنے آنسو روک رکھے تھے اور زبان پر میرے لیے دعاؤں کا ایک سلسلہ تھا۔ ساتھ ہی انہوں نے مجھے اپنا یہ شعر سنایا۔

سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر
اُٹھتے نہیں ہیں ہاتھ مرے اس دُعا کے بعد

پھر کہا "میں نے تمہیں اپنے خدا کے سپرد کر دیا ہے اور جو چیز خدا کے سپرد کر دی جائے اس کی وہ خود حفاظت کرتا ہے اس لیے کہ وہ سب سے بڑا انصاف کرنے والا ہے۔"

میں نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا "زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن میرا دل کہتا ہے کہ آپ کی دعا ضرور قبول ہوگی۔"

آپریشن واقعی خطرناک تھا۔ اس زمانے میں آپریشن سے پہلے مریض کو کلوروفارم سنگھایا جاتا تھا جس کے باعث متلی ہوتی اور ابکائی آتی۔ کلوروفارم کے نتیجے میں جب میں اس صورتِ حال سے دوچار ہوئی تو آغا صاحب جذبۂ محبت سے مغلوب ہو کر میری طرف ہاتھ بڑھانا چاہتے لیکن سب کی موجودگی میں رک جاتے۔ ان کی یہ کشمکش دیکھ کر مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ جب اوکھلی میں سر دے ہی دیا ہے تو ڈر کس بات کا ہے اور آپ تو ماشاء اللہ بہت بڑے ادیب' شاعر' ڈراما نگار اور شیکسپیئر کا خطاب لیے ہوئے ہیں اس لیے آپ خوب جانتے ہیں کہ محبت ہر خوف سے بے نیاز ہوتی ہے۔

چونکہ میں نے یہ کہہ کر انہیں اظہارِ محبت کی ہمت دے دی اس لیے وہ میری اس صاف بیانی سے بے حد متاثر ہوئے۔"

اس طرح اظہارِ محبت کا مرحلہ بھی طے ہو گیا۔

مختار بیگم کہتی ہیں "ایک ہفتے بعد میں صحت یاب ہو کر گھر واپس آئی تو انہوں نے ایک قیمتی ہیرے کی انگوٹھی مجھے پہناتے ہوئے کہا "یہ آپ کی صحت یابی کی خوشی میں پیش کر رہا ہوں۔"

پھر انہوں نے مجھے اس پہلی ملاقات کے تاثرات سنانے

شروع کیے "مجھے اپنی بیوی سے بہت محبت تھی۔ ۱۹۲۹ء میں اس کا انتقال ہوگیا۔ میری زندگی پریشانی میں گزرنے لگی۔ اسی زمانے میں میں نے خواب میں ایک پری چہرہ دیکھا... وہ خواب اکثر میرے ذہن میں رہتا اور مجھے پریشان کرتا۔ جب آپ پہلی بار میرے سامنے آئیں تو میں دنگ رہ گیا اور سوچنے لگا، کہیں میری آنکھیں مجھے دھوکا تو نہیں دے رہیں؟ میں خواب تو نہیں دیکھ رہا کیونکہ وہ حسین صورت آپ ہی تھیں جسے میں خواب میں دیکھ چکا تھا۔ میری گھبراہٹ کی یہی وجہ تھی۔ میں ایکٹنگ قطعی نہیں کر رہا تھا۔ وہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوچکا ہے کہ آپ نے بھی مجھے اپنے دل کی گہرائیوں میں سمولیا ہے، میں اس قابل کہاں تھا؟"

آغا حشر کی یہ وضاحت سچائی پر مبنی معلوم ہوتی ہے کیونکہ محض مختار بیگم کو پرچانے اور حاصل کرنے کے لیے انہیں جھوٹ گھڑنے کی ضرورت نہیں تھی۔ آغا صاحب کی شخصیت اس وقت اتنی بلندی پر تھی کہ ملک کی بڑی بڑی [illegible] دولت مند عورتیں اور ذی اثر خواتین ان کی [illegible] رہا کرتی تھیں۔ مختار بیگم اس زمانے میں بہت بڑی [illegible] تھیں لیکن ان کے مقابلے میں تھیٹر اور شوبزنس کی دنیا کی عظیم ترین اور معروف ترین اداکارائیں بھی آغا صاحب کی خوشنودی اور توجہ حاصل کرنے کے لیے ترسا کرتی تھیں۔ تو پھر آغا صاحب کو مختار بیگم کی توجہ حاصل کرنے کے لیے کسی من گھڑت بہانے کی کیا ضرورت ہوسکتی تھی۔ یہ گویا دو طرفہ محبت تھی اور وہ دونوں اس سے پہلے ایک دوسرے کی تلاش ہی میں سرگرداں تھے۔ ایک دوسرے کو پاکر ان کی جستجو ختم ہوگئی اور وہ پُرسکون ہوگئے۔

مختار بیگم آغا صاحب کی محبت میں سرشار تھیں اور آغا صاحب بھی ان پر پوری طرح فریفتہ ہو چکے تھے۔ ان دونوں کی یہ باہمی انسیت محتاجِ بیان نہیں رہی تھی۔

مختار بیگم کا کہنا ہے کہ "ہماری ملاقاتیں انسیت میں اور انسیت محبت میں بدل گئی اور پھر سچی اور بے لوث محبت نے ہمیں ایک دوسرے کا جیون ساتھی بنا دیا۔

"میں جب ان کی زندگی میں داخل ہوگئی تو انہوں نے بتایا کہ میں ساری زندگی اپنے آپ کو شاعر سمجھتا رہا۔ تمہارے ملنے سے شعر بن گیا ہوں۔ میری نامکمل زندگی کے ساتھ ساتھ تم نے میری شاعری کو بھی مکمل کردیا ہے۔ اب میری تحریر اس قدر بلندی پر جا پہنچی ہے کہ مجھے کوئی دوسرا نظر ہی نہیں آتا۔

"یہاں اس بات کا بھی ذکر کردوں کہ آغا صاحب نے اپنے پہلے دور کے ڈراموں میں عورت کے کئی روپ پیش کیے۔ ایک کو وفادار دکھایا تو دوسری کو بے وفا۔ ایک کو رحم دل اور دوسری کو ظالم۔ ایک کو شرم و حیا کا پیکر ظاہر کیا تو دوسری کو بے حیائی کے بازار میں نیلام کردیا۔ میں ان کی زندگی میں داخل ہوئی تو ان کا یہ انداز بدل گیا۔ جیسا کہ "عورت کا پیار" جو ان کا آخری ڈراما تھا اس میں انہوں نے عورت کو وفا اور صرف وفا کی تصویر بنا کر پیش کیا۔

"آغا صاحب کی وفات کے بعد میں بمبئی چلی گئی جہاں میں نے مختار فلم کمپنی کے نام سے ایک ادارہ بنایا۔ آغا صاحب کے ڈرامے "پریم آگ" پر فلم بنائی۔ ہندو قوم مسلمانوں کے بارے میں بڑی تنگ نظر اور متعصب تھی۔ ہندوؤں نے سوچا کہ اگر مختار بیگم نے آغا حشر کے ڈرامے فلمانے شروع کیے تو ہندو ادیبوں کا رنگ پھیکا پڑ جائے گا۔ پھر کیا تھا۔ میرے خلاف ہندو پوری طرح سرگرم عمل ہوگئے۔ ہندو پروڈیوسروں نے یہ فلم ناکام بنانے کی پوری کوششیں کیں۔ یہ حالت دیکھ کر میں امرتسر آگئی جہاں آغا حشر اکیڈمی کی بنیاد ڈالی۔ اس کے بعد جلد ہی قائداعظم کے ہاتھوں پاکستان قائم ہوا اور مسلمان آزاد ہوئے ورنہ ہندو، مسلمان کو ہر لحاظ سے تباہ کرنے کا تہیہ کیے ہوئے تھے۔ افسوس کہ نئی نسل کو ہندوانہ عیاریوں سے کماحقہ آگاہ نہیں کیا جارہا۔"

مختار بیگم نے کہا کہ آغا صاحب کی رفاقت نے ان میں ڈراما [illegible] کی صلاحیت پیدا کی تھی۔ دوسروں تک لے جانے میں انہوں نے کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔

آغا حشر کی وفات کے بعد مختار بیگم نے بھی کچھ عرصے بعد عملی طور پر شوبزنس کی دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد انہوں نے راولپنڈی کا رخ کیا تھا ساری جمع پونجی امرتسر میں رہ گئی تھی مگر آغا حشر کی تصنیفات اور یادوں کا خزانہ ان کے پاس محفوظ تھا۔ کچھ عرصے بعد انہوں نے ایک معزز سیّد خاندان کے فرد قمر الزماں سے شادی کرلی تھی اور پھر کبھی اسٹیج، تھیٹر یا فلم کا منہ نہیں دیکھا۔ اپنے شوہر سے ان کے تعلقات ہمیشہ مثالی رہے تھے۔ ان کے شوہر نے مختار بیگم کی خواہش کے مطابق انہیں چار بار حج بھی کرایا تھا جو کہ ان دونوں کے لیے بہت بڑی سعادت تھی۔

مگر مختار بیگم اور آغا حشر کا نام پھر ایک دوسرے کے ساتھ ایسا وابستہ ہوا کہ ہمیشہ ایک ساتھ ہی لیا جاتا تھا۔ آغا صاحب کی کوئی اولاد نہ تھی۔ بیگم پہلے ہی وفات پاچکی تھیں۔ ان حالات میں مختار بیگم نے ہی عملی طور پر ان کی وارث اور جانشینی کا فریضہ سرانجام دیا اور ان کی یادوں، ڈراموں اور اشعار کو سنبھالے بیٹھی رہیں۔ جب کسی کو آغا حشر کے بارے میں کوئی تفصیلی معلومات درکار ہوتی تھیں یا ان کی کسی چیز کی ضرورت پیش آتی تھی تو وہ سیدھا مختار بیگم کی خدمت میں حاضر ہو کر حرفِ مدّعا زبان پر لاتا تھا اور مختار بیگم بہت خلوص اور شفقت سے حاجت روائی کردیا کرتی تھیں۔ دنیاوی مال و اسباب کی ان کے پاس کوئی کمی نہ تھی۔ باقی ماندہ زندگی انہوں نے بہت آرام و آسائش کے ساتھ گزاری تھی۔ گانا وہ ترک کرچکی تھیں مگر شوقیہ اور نجی ملاقاتیوں کی محفلوں میں کبھی کبھی نغمہ سرا ہوجاتی تھیں۔ پیسے کی انہیں کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اس لیے انہوں نے آغا حشر کے نام یا حوالے سے کبھی کوئی مالی فائدہ اُٹھانے کی کوشش نہیں کی۔

کچھ عرصے بعد وہ راولپنڈی سے کراچی منتقل ہوگئی تھیں اور پھر وہیں مقیم رہیں۔ البتہ کبھی کبھی فریدہ خانم کے ہاں مختصر قیام کرنے کی غرض سے لاہور آجایا کرتی تھیں۔

محاورہ ہے کہ چور چوری سے جائے پر ہیرا پھیری سے نہیں جاسکتا۔ اداکاری اور گلوکاری انہوں نے ترک کردی تھی لیکن۔

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

فن کارانہ محفلوں میں شرکت اور اپنے گھر پر موسیقی کی محفلیں آراستہ کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ فریدہ خانم کے بارے میں کسی زمانے میں یہ مشہور تھا کہ وہ مختار بیگم کی بیٹی ہیں مگر مختار بیگم۔ انہیں اپنی چھوٹی بہن بتاتی تھیں اور اس بیان پر یقین نہ کرنے کی کوئی معقول وجہ بھی نظر نہیں آتی ہے۔ فریدہ خانم نے موسیقی اور گائیکی کی تعلیم مانے ہوئے اساتذہ سے حاصل کی تھی مگر مختار بیگم کے فن اور تجربے سے بھی فیض حاصل کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی ہنرمند اور پُرکار فن کارہ کے نزدیک رہ کر اس کے فن اور تجربے کی خوشہ چینی نہ کرنا ایک ناممکن سی بات تھی۔ مختار بیگم اور فریدہ خانم میں ہمیشہ بے حد یگانگت اور محبت وخلوص کا رشتہ قائم رہا۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ مختار بیگم کے لیے فریدہ خانم کے دل میں عقیدت اور احترام کا جذبہ کارفرما تھا اور وہ مختار بیگم کی قربت پر فخر کیا کرتی تھیں۔

وہ عورت جسے آغا حشر جیسی شخصیت نے سارے ہندوستان کی حسیناؤں کو نظرانداز کرکے اپنی توجہ اور محبت کا مرکز بنایا تھا آخر کون تھی۔ کہاں سے آئی تھی اور فن کے اس مقام پر کیسے پہنچ گئی تھی؟

مختار بیگم نے امرتسر میں جنم لیا تھا۔ مستند تاریخ پیدائش تو دستیاب نہیں ہے لیکن ایک اندازے کے مطابق وہ سن ۱۹۱۰ء یا ۱۲ میں پیدا ہوئی تھیں۔ ان کے والد غلام محمّد کا موسیقی کے فن سے گہرا تعلق تھا۔ وہ ہارمونیم بجانے میں بہت شہرت رکھتے تھے۔

مختار بیگم ان کا پیدائشی اور گھریلو نام تھا۔ ان کی عمر چھ سال ہوئی تو انہیں ایک مکتب میں داخل کردیا گیا۔ اس دور میں اوّل تو اسکول بہت کم تھے دوسرے لڑکیوں کو اسکول بھیجنا بہت معیوب سمجھا جاتا تھا۔ انہیں مکتب، مدرسے یا گھر پر مولوی صاحب سے تعلیم دلانے کا رواج تھا۔ مختار بیگم کو مکتب میں قرآن شریف کی تعلیم دی گئی۔ قرآن کریم تو وہ مکمل نہ پڑھ سکیں مگر اردو لکھنا، پڑھنا سیکھ لیا۔ تعلیم کی طرف ... ان کا ویسے بھی رجحان نہ تھا۔ یہ دیکھ کر ان کے والد غلام محمّد نے انہیں موسیقی کی تعلیم دلانے کا فیصلہ کیا۔ موسیقی ان کے گھر میں بسی ہوئی تھی۔ ان کے لیے کوئی نئی یا نامانوس شے نہ تھی۔ جب ان کی عمر آٹھ برس ہوئی تو انہیں پٹیالہ گھرانے کی گائیکی کے استاد عاشق علی خان کی شاگردی میں دے دیا گیا۔ کچھ عرصے تعلیم دینے کے بعد استاد عاشق علی خان نے مختار بیگم کی صلاحیتوں کا اندازہ لگالیا اور ان کے والد کو بتایا کہ موسیقی میں مختار بیگم کا مستقبل بہت شاندار ہے۔ یہ بچّی اس میدان میں بہت نام پیدا کرے گی۔ اس لیے بچی کی تربیت کا مناسب انتظام ضروری ہے۔

مختار بیگم کو استاد عاشق علی خان کے مشورے پر استاد مہربان خان کی شاگرد بنانے کا فیصلہ ہوا۔ ان کے والد استاد عاشق علی خان کی سفارش کے ساتھ اپنی بیٹی کو لے کر استاد مہربان خان کے پاس حاضر ہوئے اور حرفِ مدّعا زبان پر لائے۔ انہوں نے پہلے تو پس وپیش کیا مگر پھر جب مختار بیگم کی شعلے جیسی آواز سُنی اور اس کی صلاحیتوں کو محسوس کیا تو راضی ہوگئے۔ اس طرح کمسن مختار بیگم نے موسیقی اور گائیکی کے سبق حاصل کرنے شروع کردیے اور والد کی نگرانی میں ریاض بھی کرنے لگیں۔ ہونہار بروا کے پاؤں پالنے میں ہی نظر آجاتے ہیں۔ استاد مہربان خان کو بھی مختار بیگم کی صلاحیتوں کا اندازہ ہوگیا تھا اور وہ ان کے روشن مستقبل کی پیش گوئی کررہے تھے۔ مختار بیگم نے اس کے بعد استاد عاشق علی خان سے بھی تربیت حاصل کی اور وہ گانے بجانے کی تعلیم دینے لگے۔

اسی زمانے میں دو ہندو موسیقار استاد شبّو مرار اور کچھو مرار کا بہت شہرہ تھا۔ وہ امرتسر گئے تو قریباً ایک سال تک مختار بیگم کو گائیکی کے رموز سے آگاہ کرتے رہے۔ مختار بیگم کا بیان تھا کہ گائیکی میں اظہارِ جذبات کا فن انہوں نے ان ہی دونوں استادوں سے سیکھا تھا۔

مختار بیگم نے کمسنی سے نکل کر شباب کی منزل میں قدم رکھا تو امرتسر میں ان کے حُسن وجمال اور ہنرمندی کا چرچا پھیل گیا۔ ایک تو شکل وصورت اور اس پر کھنکتی ہوئی آواز اور گائیکی پر عبور۔ بہت جلد ان کی شہرت گانے کے حوالے سے دور دور تک پھیل گئی۔ انہوں نے باقاعدہ اپنے فن کا مظاہرہ شروع کیا تو جس نے بھی سُنا وہ ان کا مدّاح ہوگیا۔

اس زمانے کے دستور کے مطابق نامور فن کاروں کی سرپرستی والیانِ ریاست اور رئیس لوگوں کے ذمّے تھی چنانچہ جب مختار بیگم کی شہرت خوشبو کی طرح پھیلی تو انہیں بھی راجوں مہاراجوں اور حکمرانوں کے درباروں سے دعوت نامے موصول ہونے لگے اور انہوں نے کئی راجاؤں اور نوابوں کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کرکے داد وتحسین حاصل کی۔

اس دور کے بارے میں چند واقعات خود مختار بیگم نے بھی بیان کیے ہیں۔ انہوں نے کہا۔

"میں نے اس بات کا خاص دھیان رکھا کہ فن کو عزت کے ساتھ پیش کیا جائے۔ بڑے بڑے راجوں، مہاراجوں کے درباروں میں، میں نے اگر داد وتحسین وصول کی تو اس کی یہی وجہ تھی۔ وہ لوگ صحیح معنوں میں فن آشنا اور فن کے قدرداں تھے۔

" جب میں ریاست حیدر آباد گئی تو نظام حیدر آباد میر عثمان علی خان نے دربار میں مجھے اپنی بہو بیٹیوں کے برابر کرسی دی۔ ایسی پر

نظام کے ماموں معترض ہوئے کہ کہاں شہزادی نیلوفر اور شہزادی دُرِّ شہوار اور کہاں ایک گانے والی۔

نظام نے اعتراض کا یوں جواب دیا "یہ کرسی مختار بیگم کو نہیں، ان کے فن کو پیش کی گئی ہے۔"

ایک اور واقعہ سنیے۔ مہاراجا الور کے دربار میں ننگے سر ناچنے کی اجازت نہیں تھی۔ میں ایک رنگین محفل میں نغمہ کناں تھی کہ میرے سر پر سے ساری کا پلو ڈھلک گیا۔

ایک صاحب نے مجھے ٹوکنا چاہا تو مہاراجا نے اسے منع کر دیا اور کہا "یہ فن کارہ دربار کے آداب کے قیدوبند سے آزاد ہے۔ میں اگر صاحبِ تخت و تاج ہوں تو یہ بھی اپنے فن کی ملکہ ہے۔"

"یہ واقعات میں نے اس لیے سنائے ہیں کہ فن کے بارے میں آپ کے سامنے اس دور کی تصویر آجائے کہ ایک فن کار کے لیے وہ کتنا قدر افزائی کا دور تھا۔ نوابوں اور راجوں، مہاراجوں کے درباروں میں پزیرائی پانے کی خواہش ہر مطرب کو ریاض [illegible] کے سلسلے میں انتہا کی منزلیں طے کرنے پر مجبور کرتی تھی۔ اب وہ فن رہا نہ فن کار اور نہ ہی فن کے قدرداں ہیں۔ [illegible] جس میں رئیس لوگ اچھے فن کاروں کو جانِ محفل بنانے [illegible] اپنی بہو بیٹیوں کو نچوا اور گوا کر یہ کمی پوری کر لیتے ہیں۔"

اس زمانے میں آغا حشر کے اسٹیج ڈراموں کی مقبولیت کی وجہ سے میڈن تھیٹرز بہت عروج پر تھا۔ آغا صاحب اپنے ڈراموں کی موسیقی خود ہی ترتیب دیتے تھے حالانکہ وہ گا نہیں سکتے تھے لیکن یہ ان کی بڑی خوبی تھی کہ وہ اپنے خیالات اشاروں کنایوں سے میوزک ڈائریکٹر کو سمجھا کر اپنا مقصد پورا کر لیتے تھے اور بہترین طرزیں بناتے تھے۔ ان [illegible] ان میں اچھی آواز کی کمی تھی۔ ان کے اداکار [illegible] قدر معیاری تھے اور [illegible] طرح برصغیر میں ان کی دھوم مچی تھی اس لحاظ سے میڈن تھیٹرز والوں کے پاس فنِ موسیقی کی اعلیٰ درجے کی کوئی فن کارہ نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ [illegible] کمی آغا حشر کو کھٹکی اور انہوں نے مختار بیگم کی شہرت سنی تو [illegible] کے طور پر ان کی خدمات حاصل کر لیں۔ یہ تفصیل آپ [illegible] پڑھ چکے ہیں۔

مختار بیگم نے فریدہ خانم کو [illegible] وہاں سے گائیکی سکھائی تھی مگر پاکستان کی دو اور نامور فن کارائیں بھی ان کی زیرِ سرپرستی پرورش پا کر بہت نمایاں ہوئیں۔ گلوکارہ نسیم بیگم کی تربیت میں مختار بیگم کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ انہوں نے گائیکی میں بڑا نام پیدا کیا اور پاکستانی فلموں میں بعض یادگار نغمے آج بھی ان کی یاد تازہ کر دیتے ہیں۔ افسوس کہ وہ جوانی ہی میں انتقال کر گئی تھیں۔ انہوں نے ساری زندگی مختار بیگم کو اپنی مربی اور استاد کا درجہ دیا اور ان کی ممنون رہیں۔

اداکارہ رانی دوسری فن کارہ ہیں جنہوں نے مختار بیگم کے زیرِ سایہ پرورش پائی۔ رانی کے بارے میں مختار بیگم نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ مغنیہ بننے کی صلاحیتوں سے محروم ہیں لیکن ان کے جسم کا لوچ اور ردھم دیکھ کر مختار بیگم کی تجربہ کار، جہاندیدہ نگاہوں نے جانچ لیا کہ وہ ایک اچھی رقاصہ اور اداکارہ بن سکتی ہیں۔ رانی کو فلمی دنیا سے متعارف کرانے کا سہرا بھی مختار بیگم ہی کے سر ہے۔

کچھ عرصے بعد رانی، مختار بیگم سے علیٰحدہ ہو کر اپنی والدہ اور سوتیلے والد کے ساتھ رہنے لگیں اور آسمانِ فلم پر ستارہ بن کر جگمگائیں۔ اب نہ مختار بیگم ہیں اور نہ رانی۔ صرف یادیں رہ گئی ہیں۔

رانی نے جب مختار بیگم سے علیٰحدگی اختیار کی تو انہیں بہت صدمہ ہوا تھا۔ انہوں نے کھلے عام تو اظہار نہیں کیا مگر ان کے قریبی لوگوں کو معلوم تھا کہ وہ رانی کی اس حرکت سے ناراض ہیں۔ اس بارے میں ایک مختصر اشارہ مختار بیگم کے اس بیان میں بھی موجود ہے۔ انہوں نے رانی کے بارے میں لب کشائی سے ہمیشہ پرہیز کیا لیکن ایک انٹرویو میں اس سلسلے میں جو کچھ کہا وہ درج ذیل ہے۔

"میں نے جو کچھ سیکھا دوسروں تک پہنچانے میں کسی بخل سے کام نہیں لیا۔ آغا حشر کی رفاقت نے مجھ میں ڈراما بولنے کی صلاحیت پیدا کی جسے میں نے دوسروں تک پہنچانے میں ہمیشہ فیاضی سے کام لیا۔ ناصرہ جسے میں نے رانی کا نام دیا تھا، اس کی بہترین مثال ہے جو آج آسمانِ فلم پر جگمگا رہی ہے۔

"وہ میرے ڈرائیور کی بیٹی تھی۔ وہ دس برس کی تھی کہ اس کے والدین نے اسے میری صحبت میں دے دیا۔ اس کی آواز اچھی نہیں تھی اس لیے میں نے اسے اداکاری اور اظہارِ جذبات کی تربیت دی۔ کوئی نہیں جانتا کہ میں نے رانی کو رقص و موسیقی سکھانے پر کتنی محنت کی اور کتنا روپیہ خرچ کیا۔ رقص کی تعلیم اسے ملک کے بہترین استادوں سے دلوائی۔ یہ اٹھارہ انیس برس پرانی بات ہے۔ جب "بزمِ عمل خواتین کراچی" نے امدادی رقم جمع کرنے کے لیے ایک ورائٹی پروگرام ترتیب دیا تھا۔ بزمِ عمل نے مجھے بھی دعوت دی کہ میں وہاں آغا حشر کی غزلیں سناؤں۔ میں نے اس پروگرام میں بلا معاوضہ شرکت کا وعدہ کیا لیکن شرط رکھی کہ اس محفل میں رانی کا ایک رقص بھی ہوگا۔ یہ رقص رانی کا پہلا رقص تھا۔ میں نے ایسا اس لیے کیا کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ رانی بھی آرٹسٹ بن چکی ہے۔ اس محفل میں نواب جوناگڑھ مہمانِ خصوصی تھے۔"

آغا حشر کی مقبولیت اور مانگ میں اس قدر اضافہ ہو چکا تھا کہ تھیٹر کے شیدائی ہمیشہ ان کے نئے ڈرامے کے منتظر رہتے تھے۔ انہوں نے جب سے ڈراما نویسی کا آغاز کیا تھا مسلسل ڈرامے پیش کر رہے تھے۔ لیکن بیگم کی وفات کے بعد وہ اس قدر پژمردہ اور غمگین ہو گئے کہ لکھنے لکھانے کی طرف سے بھی جی اچاٹ ہو گیا۔ کمسن بیٹے کا صدمہ پہلے ہی کیا کم تھا کہ شریکِ حیات کی جدائی کا دکھ جھیلنا پڑا۔ بیگم کی وفات کے بعد وہ کئی سال تک کوئی ڈراما نہ

لکھ سکے جس کی وجہ سے ڈرامے اور تھیٹر کی دنیا میں بے رونقی سی پیدا ہوگئی۔ سچ تو یہ ہے کہ آغا حشر نے تھیٹر کی دنیا میں ایسی گہما گہمی اور چہل پہل پیدا کردی تھی کہ ان کی طویل خاموشی ہر ایک کے لیے بارگراں تھی۔ کمپنی والوں کا اصرار جاری تھا بلکہ نوبت خوشامد تک پہنچ گئی تھی مگر آغا صاحب کی طبیعت نئے ڈرامے لکھنے کی طرف مائل نہ ہوئی۔

اس زمانے میں ڈراما نویسی میں منشی محمد ابراہیم محشر انبالوی‘ منشی نرائن پرشاد بے تاب دہلوی اور منشی ونائک پرشاد طالب بنارسی بھی مصروف عمل تھے۔ ان میں سے دو حضرات تو آغا صاحب کی آمد سے پہلے ہی مستند سمجھے جاتے تھے۔ مگر آغا صاحب کے آتے ہی ان کا رنگ پھیکا پڑگیا تھا۔ اب جو آغا صاحب کا قلم رکا تو انہوں نے آغا صاحب کا مقام حاصل کرنے کی کوشش شروع کردی۔ آغا صاحب نے یہ ثابت کردیا تھا کہ وہ ڈرامے کی قلمرو کے بے تاج بادشاہ ہیں۔ ان کی شہرت پھیلی تو بعض لکھنے والوں نے یہ کہنا شروع کردیا تھا کہ وہ ہندی ڈراموں میں مقابلہ نہیں کرسکتے۔ مگر آغا حشر کسی میدان میں بند نہ تھے۔ انہوں نے جب ہندی ڈرامے تحریر کیے تو دوسروں کو مات دے دی۔ بلوا منگل‘ آنکھ کا نشہ‘ مرلی دھر ایسے ڈرامے ہیں جنہوں نے معاشرتی اصلاحی ڈراموں میں بھی آغا صاحب کا لوہا منوالیا۔ ان کے مکالمے شگفتہ‘ رواں اور انتہائی لطافت انگیز ہوتے تھے جبکہ ان کے معاصرین کے قلم میں یہ بات نہ تھی۔

بیگم کی وفات کے بعد آغا حشر لاہور ہی میں مقیم رہے۔ وہ پرانے دوست حکیم فقیر محمد چشتی کے پاس رہائش پزیر تھے جو انہیں غم واندوہ سے نجات دلانے کی ہر ممکن کوشش کرکے تھک چکے تھے۔ حکیم صاحب نہ صرف ان کی خاطر ادبی اور شعری محفلیں منعقد کرتے رہے بلکہ انہیں ڈراما لکھنے پر بھی اکساتے رہے تاکہ ان کی توجہ بٹ جائے مگر آغا صاحب کا غم ہلکا ہونے کا نام نہ لیتا تھا۔ اس زمانے میں وہ بلاناغہ ہر روز صبح شام اپنی اہلیہ کی قبر پر جاکر فاتحہ خوانی کرتے تھے۔

چار ساڑھے چار سال کے وقفے کے بعد آغا صاحب لوگوں کے پرزور اصرار پر دوبارہ ڈراما نویسی کی طرف مائل ہوئے تو سب سے پہلی صف میں میڈن تھیٹرز کلکتہ کے مالک کھڑے نظر آئے۔ وہ مسلسل ان پر دباؤ ڈالتے رہے تھے۔ آغا صاحب نے ان کی دعوت قبول کرلی اور کلکتہ چلے گئے۔ انہوں نے میڈن تھیٹرز کے لیے ڈرامے تو لکھے مگر کمپنی سے باقاعدہ طور پر وابستہ نہیں ہوئے۔ وہ پابند ہونے سے گریزاں تھے۔ تاکہ اپنی طبیعت اور مزاج کے مطابق کام کریں۔ تھوڑے عرصے قیام کرنے کے بعد وہ بنارس چلے گئے جہاں ان کے اہل خاندان مقیم تھے۔ بنارس میں آغا صاحب نے ایک بار پھر اپنی ذاتی کمپنی بنائی اور اس کے لیے ڈراما ”سیتا بن باس“ تحریر کیا۔ یہ موضوع انہوں نے شاید اس لیے چنا کہ یہ شوہر اور بیوی کی محبت کی کہانی تھی پھر بنارس کے ماحول میں ہندو دیومالا کی کہانیاں زیادہ پُراثر تھیں۔ جب یہ ڈراما اسٹیج ہوا تو سب یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ آغا حشر نے مسلمان ہونے کے باوجود ہندی زبان‘ تہذیب اور روایات پر عبور کا ثبوت فراہم کردیا تھا۔ دیکھنے والوں کو یقین ہی نہیں آتا تھا کہ یہ ڈراما کسی غیر ہندو نے لکھا ہے۔ اس ڈرامے کو بے حد پزیرائی اور کامیابی ملی۔ آغا صاحب کے ہندی ڈراموں کی ایسی دھاک بیٹھی کہ مہاراجا چرکھاری نے ان کی کمپنی خریدلی۔ اس زمانے میں آغا صاحب کی کمپنی مختلف شہروں میں ڈرامے پیش کررہی تھی۔ آغا صاحب خود کو اس طرح مصروف رکھنا چاہتے تھے۔ بیگم کی جدائی کا غم دور نہ ہوا تھا۔ گھر والوں نے بہتیری کوشش کی کہ ان کی دوسری شادی ہوجائے مگر آغا صاحب باقی ماندہ زندگی اپنی اہلیہ کی یاد میں گزارنے پر مصر تھے اور کہتے تھے کہ وہ مرحومہ کے ساتھ بے وفائی نہیں کرسکتے۔

آغا صاحب نے کلکتہ کے دوران قیام میں اپنے تمام ڈرامے جو اپنی کمپنی کے لیے لکھے تھے‘ میڈن تھیٹرز کو فروخت کردیے۔ اس زمانے میں ان کا زیادہ تر قیام کلکتہ ہی میں رہا۔ وہاں ان کا وقت بہت مصروف گزرا۔ انہوں نے ایک اور تجربہ کیا۔ کلکتہ کے دوران قیام میں انہوں نے بنگالی زبان بھی سیکھ لی تھی۔ ہندوستان کی دوسری زبانیں سنسکرت بھی وہ سیکھ چکے تھے۔ عربی و فارسی سے بھی واقف تھے اور انگریزی بھی سیکھ چکے تھے۔ انہوں نے اپنا ایک ڈراما ”ترکی حور“ بنگالی زبان میں لکھا اور جب یہ اسٹیج پر پیش کیا گیا تو بنگالی تماشائی اس پر ٹوٹ پڑے۔ آغا حشر جس کمپنی میں ملازمت کرتے تھے اس کے ساتھ یہ شرط بھی تھی کہ ہر شہر میں ڈرامے سے حاصل کی جانے والی پہلی رات کی آمدنی بھی آغا صاحب کو دی جائے گی۔ بنگلہ ڈرامے کے ساتھ بھی ان کی یہی شرط تھی۔ یہ بنگلہ ڈراما انہوں نے میڈن تھیٹرز کی ایک ذیلی کمپنی ”شام بازار“ کے لیے لکھا تھا۔ آغا صاحب نے میڈن تھیٹرز سے وابستگی کے زمانے میں بہت سے شاندار... ڈرامے تحریر کیے تھے۔ عورت کا پیار‘ دل کی پیاس‘ بھارتی بالک‘ رستم وسہراب‘ آنکھ کا نشہ‘ بھیشم پرتگیا‘ دھرمی بالک ڈرامے اسی زمانے کی تحریریں ہیں۔

۱۹۳۰ء کے آغاز میں ہندوستان میں سینما یعنی فلم کا چرچا شروع ہوگیا تھا۔ تھیٹر نے بہت عرصے دھومیں مچائی تھیں اور ایک زمانے میں یہ لوگوں کی واحد دل پسند تفریح تھی۔ مگر فلم کا آغاز ہوا تو آغا صاحب کی ذہانت نے بھانپ لیا کہ آنے والا دور یقیناً فلم اور سینما کا دور ہوگا۔ فلمیں تو اس سے پہلے ہی بننے لگی تھیں مگر وہ خاموش فلمیں تھیں جن سے آغا صاحب کو دلچسپی نہ تھی۔ وہ تو مکالموں‘ شاعری اور بول چال کے شہنشاہ تھے۔ خاموش فلموں میں بھلا کیا دلچسپی لیتے؟ اس زمانے میں کلکتہ میں نیو تھیٹرز کا قیام عمل میں آچکا تھا اور اس ادارے نے بولتی فلمیں بنانے کا آغاز کردیا تھا۔

بولتی فلموں کے آغاز ہی سے ملک کا تعلیم یافتہ اور فہمیدہ طبقہ

ان میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ یہ نیا میڈیم تھا۔ دوسرا یہ کہ مغرب سے آیا تھا۔ ان کے لیے تکنیک کار بھی باہر سے درآمد کیے گئے تھے۔ تھیٹر کے ڈرامے عوام الناس کے لیے بہت اچھے تھے مگر معقول اور پڑھے لکھے لوگوں کے لیے رات بھر بیٹھ کر لمبے لمبے ڈرامے دیکھنا بہت مشکل ہوتا تھا۔ فلموں کا دور آیا تو انہیں نسبتاً کم وقت میں اچھی تفریح ملنے لگی اور پھر میڈیم کی جدت اپنی جگہ تھی۔

ایک لحاظ سے بولتی فلموں کے آغاز کے ساتھ ہی تھیٹر کا زوال شروع ہو گیا تھا مگر یہ رفتار آہستہ تھی کیونکہ فلموں اور سینما گھروں کی تعداد زیادہ نہ تھی۔ کلکتہ کا فلم ساز ادارہ نیو تھیٹرز بہت جلد سارے ہندوستان میں معروف ہو گیا۔ ان کی بنائی ہوئی بولتی فلمیں تعلیم یافتہ باشعور طبقے کے لیے انتہائی پسندیدہ تھیں۔ نیو تھیٹرز سے بہت اچھے ہدایت کار مصنف اور شاعر وابستہ ہو گئے تھے اور اس کی بنائی ہوئی فلموں نے سارے ملک میں ہلچل سی مچا دی تھی۔

نیو تھیٹرز والوں کو آغا حشر کی بے پناہ صلاحیتوں اور قلم پر مکمل عبور کا پوری طرح احساس تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آغا حشر کو مسلسل فلمی کہانیاں اور نغمات لکھنے کے لیے اکساتے رہتے تھے۔ وہ آغا صاحب کی شہرت سے بھی فائدہ اٹھانا چاہتے تھے جو کہ ایک کاروباری مصلحت تھی۔

بالآخر نیو تھیٹرز کے پُرزور اصرار پر آغا صاحب نے فلم کی کہانیاں لکھنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ ان کی پہلی فلم کا اسکرپٹ "یہودی کی لڑکی" کا تھا۔ ان کے چند مشہور گانے بھی اس اسکرپٹ میں شامل تھے۔ کون یقین کرے گا کہ اس کہانی کا معاوضہ آغا صاحب کو دس ہزار روپے ادا کیا گیا تھا جو اس زمانے کے حساب سے بہت گراں قدر رقم تھی۔ قسمت تو آغا صاحب پر مہربان ہی تھی اور ان کا قلم بھی مانا ہوا تھا۔ "یہودی کی لڑکی" ان کی پہلی فلم تھی۔ یہ ریلیز ہوتے ہی سپرہٹ ہو گئی۔ آغا صاحب نے اس کے بعد نیو تھیٹرز کے لیے "چنڈی داس" اور "دیوداس" کی کہانیاں بھی لکھیں۔ یہ سب فلمیں بے حد کامیاب و مقبول ہوئیں اور آغا حشر کاشمیری کے نام کے جھنڈے فلمی صنعت میں بھی لہرانے لگے۔ یہ تمام فلمیں اب ہندوستان کی فلمی تاریخ کا حصّہ ہیں اور انہیں کلاسیکی حیثیت حاصل ہے۔

ان فلمی کہانیوں کی وجہ سے دوسرے فلم ساز بھی آغا صاحب کے پیچھے لگ گئے۔ کلکتہ کی ایسٹ انڈیا فلم کمپنی نے ناقابلِ یقین معاوضے پر آغا صاحب کی خدمات حاصل کر لیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ انہوں نے آغا صاحب کو کہانی اور گانے لکھنے کے ساتھ ساتھ اس فلم کی ہدایت کاری کرنے کی بھی دعوت دی..... فلم کی ہدایت کاری آغا صاحب کے لیے ایک نیا میدان تھا مگر انہیں اپنی قابلیت، ذہانت اور سمجھ بوجھ پر پورا اعتماد تھا۔ اس کمپنی کے لیے آغا صاحب نے اپنے مشہور ڈرامے "عورت کا پیار" فلمانے کا فیصلہ کیا۔ اس فلم میں مختار بیگم نے ہیروئن کا کردار کیا تھا۔ یہ فلم بھی حد سے زیادہ کامیاب ہوئی اور آغا صاحب کا بطورِ مصنف وہدایت کار طوطی بولنے لگا۔ مگر پھر جلد ہی اختلافات کے باعث آغا صاحب نے اس کمپنی سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ آغا حشر نے بعد میں کئی اور فلمی کہانیاں بھی تحریر کیں جن میں "دل کی آگ"، "قسمت کا شکار"، "آتشی طوفان"، "گناہ کی بیٹیاں اور شیریں فرہاد" قابلِ ذکر ہیں۔ یہ بھی ایک قابلِ قدر بات ہے کہ آغا حشر نے جس میدان میں بھی قدم رکھا وہاں شہرت اور کامیابی نے ان کے قدم چومے اور انہوں نے اپنی دھاک بٹھا دی۔ تھیٹر میں تو ان کا طوطی بول ہی رہا تھا مگر جب انہوں نے فلمی کہانیاں لکھنے پر توجہ دی تو ایک بالکل نیا میڈیم ہونے کے باوجود اس شعبے میں بھی اپنی صلاحیتوں کا اعتراف کرا لیا۔

آغا حشر نے آخری ایام میں لاہور کو اپنا مرکز بنا لیا تھا اور ان کا پھر یہیں قیام رہا۔ لاہور میں انہوں نے ذاتی فلم کمپنی بنائی اور فلم سازی کا ایک طویل پروگرام مرتب کیا۔ اپنی فلم کمپنی کا نام انہوں نے "حشر فلمز آف پنجاب" رکھا تھا اور اس کے زیرِ اہتمام اپنے معروف اور مقبول ڈرامے "بھیشم پرتگیا" کو فلمانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ یہ ایک دلچسپ اور خیال انگیز موضوع ہے جس میں اصلاحی پہلو بھی ہے اور ہندوؤں کی بُت پرستی کے حوالے سے بھی اشارے ملتے ہیں۔ اس ڈرامے کو انہوں نے فلمی اسکرپٹ کے سانچے میں ڈھالا، اس کے لیے گانے تحریر کیے، موسیقی تیار کرائی اور پھر فلم بندی کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ اس فلم میں بھی انہوں نے مختار بیگم کو ہیروئن کے روپ میں پیش کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ جو اس زمانے میں آغا صاحب کے بے حد قریب تھیں اور زیادہ وقت ان کی دیکھ بھال میں صرف کرتی تھیں۔ کمپنی کے لیے انہوں نے جیل روڈ پر ایک کوٹھی کرائے پر حاصل کی تھی۔ اسی کے ایک حصّے میں ان کی رہائش بھی تھی۔ اس فلم کے اداکاروں میں لاہور اور کلکتہ کے نمایاں فن کاروں کو کاسٹ کیا گیا تھا۔

اس فلم کی شوٹنگ شروع ہو چکی تھی مگر اسی زمانے میں آغا صاحب کی صحت خراب ہو گئی۔ فلم کی تمام ذمّے داریاں خود ان کے کاندھوں پر تھیں۔ ہدایت کار بھی وہی تھے۔ ذمّے داریوں کے بوجھ اور کام کی زیادتی کے باعث ان کی صحت نے جواب دے دیا۔ حکیم فقیر محمد چشتی کے علاوہ مقامی ڈاکٹروں کا بھی علاج کرایا مگر مرض الموت کی دوائی کس کے پاس ہے؟ کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ ان کی صحت مسلسل گرتی رہی یہاں تک کہ ایک دن اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ۲۸ اپریل ۱۹۳۵ء کو ان کا انتقال ہوا۔ اس وقت ان کی عمر ۵۶ سال تھی۔ ان کے جنازے میں زیادہ لوگ موجود نہ تھے جو کہ حیرت انگیز بات ہے لیکن مولانا ظفر علی خان، مولانا عبدالمجید سالک، ابوالاثر حفیظ جالندھری، مولانا علم الدین سالک، مولانا عبداللہ قریشی، سیّد امتیاز علی تاج، حکیم احمد شجاع جیسی ہستیاں

تدفین کے وقت موجود تھیں۔ میانی صاحب کے قبرستان میں انہیں ان کی مرحومہ بیگم کے پہلو میں دفن کردیا گیا۔ ابوالاثر حفیظ جالندھری نے قطعۂ تاریخِ وفات لکھا۔

کون ہے جو حشر کا ہو جانشیں
ہو فلک جس کے تخیل کی زمیں
خندہ زن ہو گنبدِ افلاک پر
ہے کوئی ایسا نہیں کوئی نہیں

آغا حشر کی وفات کے ساتھ ہی ہندوستان میں ڈراما نویسی کے دور کا خاتمہ ہوگیا۔ آغا حشر کاشمیری سے پہلے اور نہ بعد میں کسی نے ایسی شہرت اور کامیابی حاصل کی اور نہ ہی وہ مقام جو زندہ جاوید ہوچکا ہے۔

حشر اور دوسرے ڈراما نگاروں کی تحریروں میں ایک بنیادی فرق تو یہ تھا کہ رواجِ عام کے برعکس وہ ابتذال اور پھکڑبازی کو پسند نہیں کرتے تھے اور محض قبولِ عام یا عوام کی داہ داہ لینے کی خاطر ادبی مقام سے گرنا بھی انہیں گوارا نہ تھا۔ خیال وہ کہیں سے بھی لیتے ہوں، اسے سلیقے سے سجاسنوار کر پیش کرنا ان کا ہنر تھا۔ ان کی سب سے بڑی خوبی ان کی مکالمہ نگاری تھی۔ ان کے لکھے ہوئے مکالموں میں سلاست اور فصاحت کی فراوانی تھی۔ کردار بولتے تو یوں لگتا جیسے الفاظ کا دریا بہہ رہا ہے۔ ان کے مکالموں میں سادگی بھی تھی لیکن خطابت کا انداز بھی موجود تھا جو کہ اس عہد کے ڈراموں کا ایک لازمی حصّہ سمجھا جاتا تھا۔ مگر خطابت اور شوکتِ الفاظ کی خاطر وہ فقروں کو بے معنی اور منظر کو بے مقصد بنانے کے قائل نہ تھے۔ انہیں مختلف زبانوں پر جو عبور حاصل تھا اس کی وجہ سے زبان ان کے گھر کی باندی تھی، الفاظ کی ترتیب و استعمال، محاوروں اور روز مرّہ کا برتنا، فقروں کی چستی اور شگفتگی کے ساتھ ساتھ ان کی تحریروں میں ایک تازگی اور نیا پن بھی تھا جس سے ان کے ہم عصر محروم تھے۔ آغا حشر کے ڈراموں میں وقت اور مزاج کے ساتھ ساتھ تبدیلی ہوتی رہی اور ہر دور میں انہوں نے وقت کے تقاضوں کو پیشِ نظر رکھا۔

ابتدائی زمانے میں وہ پُرزور الفاظ کا استعمال کیا کرتے تھے مگر بعد میں بہت سوچ سمجھ کر لفظوں کا چُناؤ کرنے لگے تھے۔ تجربے اور مشاہدے نے ان کے ذہن کو وسعت اور قلم کو رنگینی اور معنی بخش دیے تھے۔ ابتدائی ڈراموں میں وہ عام دستور کے مطابق اشعار کثرت سے استعمال کرتے تھے مگر رفتہ رفتہ اس کو ترک کردیا اور اشعار کا انتخاب اور استعمال برمحل اور ضرورت کے مطابق ہی کرنے لگے۔

شاعری پر آغا صاحب کو دسترس حاصل تھی۔ ان کی شاعری کا تفصیلی تذکرہ آگے ہوگا لیکن اس جگہ یہ بیان کردینا کافی ہے کہ اگر ان کی شخصیت مختلف خانوں میں بٹ کر نہ رہ جاتی تو وہ بہت اچھے اور ممتاز شاعر تسلیم کیے جاتے۔ پھر بھی انہوں نے جو غزلیں اور نظمیں تحریر کی ہیں وہ ان کی بلند خیالی اور فنِ شاعری پر قدرت کی آئینہ دار ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ اشعار کا بہت صحیح اور مناسب استعمال کیا۔ مکالموں میں جب انہوں نے ہندی کی آمیزش کی تو اس میں بھی ایک نیا انداز نظر آتا ہے۔ جب انہیں ڈراما نویسی پر عبور حاصل ہوا تو انہوں نے پلاٹ کے ساتھ ساتھ کرداروں پر بھی توجہ دینی شروع کردی۔ ان کے ابتدائی ڈراموں میں دو کہانیاں متوازی چلتی تھیں۔ ایک سنجیدہ اور دوسری مزاحیہ، جس کی وجہ سے اصل کہانی کی روح مجروح ہوجاتی تھی۔ مگر بعد کے ڈراموں میں انہوں نے مزاح کو بھی اصل کہانی ہی میں گوندھ کر پلاٹ کا حصّہ بنادیا تھا۔

ترقی پسند خواہ کچھ کہتے رہیں مگر یہ حقیقت ہے کہ آغا حشر نے ڈراما نویسی میں جدّت اور ترقی پسند نظریات و خیالات کو پیش کرنے کی ابتدا کی تھی اور اس دور کے دقیانوسی خیالات اور اسلوب کو تبدیل کرکے رکھ دیا تھا۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اس زمانے میں تھیٹر کے دیکھنے والوں کا ذہنی معیار اور شعور کتنا بلند ہوگا۔ اس کا اندازہ یوں لگایا جاسکتا ہے کہ آج قریب قریب پون صدی بلکہ لگ بھگ ایک صدی گزر جانے کے باوجود برصغیر کی فلموں اور ڈراموں کا مجموعی معیار دیکھنے والوں کی کم علمی، جہالت اور کم شعوری کے باعث کیا ہے؟ بلکہ آج کمرشل بنیادوں پر جو بے معنی، بے ربط اور بے مقصد ڈرامے پیش کیے جارہے ہیں۔ ان میں جگت بازی اور پھکڑبازی کو جس قدر فراوانی سے پیش کیا جارہا ہے اس کے مقابلے میں آغا حشر کے ڈرامے ادبِ عالیہ نظر آتے ہیں۔ تجارتی اور کاروباری ضرورتوں اور وقت کی مصلحتوں اور تقاضوں کو نظرانداز کرنا اس وقت ممکن نہ تھا، اس کے باوجود آج کے دور میں شیکسپیئر اور دوسرے غیر ملکی دانشوروں کے خیالات سے کوئی استفادہ کرنے کے بارے میں سوچتا بھی نہیں ہے۔ اس لیے اگر آغا حشر کے ڈراموں پر سستے پن کا الزام عائد کیا جائے تو یہ ایک تہمت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کئی نقادوں نے آغا صاحب کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

سیّد امتیاز علی تاج نے لکھا ہے کہ "آغا حشر نے اپنے لیے ایک بالکل جدا راستہ تلاش کیا تھا جسے تماشائیوں نے بے حد پسند کیا۔ انہوں نے ڈراموں میں خطابت کی روح پھونک دی تھی۔ انہوں نے اپنے ڈراموں میں عصری تقاضوں اور فطرت شناسی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ ان کی نثر کے ایک ایک فقرے اور نظم کے ایک ایک شعر میں ایسی خطیبانہ قوت تھی کہ لوگ سُن کر وارفتگی کے عالم میں سُر دھنتے اور تالیاں پیٹتے تھے۔"

آغا صاحب بہت زود نویس تھے۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ بیک وقت کئی منشیوں کو مختلف ڈرامے بول کر لکھواتے تھے۔ ڈراما نویسی کے وقت وہ عموماً اس میں کھوجاتے تھے۔ وہ ٹہلتے رہتے اور ڈراما بولتے رہتے تھے اور دو دو منشی مسلسل لکھنے میں

مصروف رہتے تھے۔ وہ ڈرامے کی کہانی، منظر اور کرداروں کو اپنے اوپر اس طرح طاری کرلیتے تھے کہ گردوپیش سے بالکل بے خبر ہوجاتے تھے۔ ہر کردار کے مکالمے وہ اسی کے انداز میں بولتے تھے۔ ان کو ڈراما لکھواتے ہوئے دیکھنے والا... مبہوت اور مسحور ہوکر رہ جاتا تھا۔ ڈراما جب لکھ کر ان کو پیش کیا جاتا تو وہ اسے پڑھ کر نظرِثانی کرتے تھے۔ اس طرح ڈراما مکمل ہوجاتا تھا۔

آغا حشر نے اپنی ڈراما نویسی کے بارے میں خود بھی اظہار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

"میں اپنے لکھنے کا طرز آپ کو بتاؤں تو آپ ہنسیں گے۔ مرثیہ نگاری کی طرح میں بھی ڈرامے کو کئی ٹکڑوں میں تقسیم کردیتا ہوں۔ مرثیہ نگار کے ہاں ساقی نامہ، تلوار کی تعریف، صبح کا بیان، گرمی کی شدت، سراپا، رجز اور بین وغیرہ ہوتے ہیں اور میرے ہاں عشقیہ مناظر، فراق کا سماں، دغابازی، مکاری، عیاشی اور دنیاداری، ظرافت، گانے وغیرہ ہوتے ہیں۔ یہ ٹکڑے میں الگ الگ طبیعت کی موزونیت کے وقت کہہ کہہ کر ڈال دیتا ہوں اور جب ڈراما تیار کرنا ہوتا ہے تو ان ٹکڑوں کو اکٹھا کرکے حسب فرمائش ڈراما تیار کرلیتا ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ بعض مواقع پر میں نے مکمل ڈراما بھی لکھا ہے لیکن میں آپ کو اپنی حد تک ایک عام اصول بتارہا ہوں۔"

آغا صاحب کو مطالعے کا بے حد شوق تھا۔ جوں جوں عمر بڑھتی رہی یہ شوق بھی پروان چڑھتا رہا۔ کوئی خالی وقت ایسا نہ ہوتا تھا جب وہ مطالعے میں مصروف نہ ہوں۔ یہاں تک کہ بازار سے سودا آتا تو جن کاغذوں کی پڑیوں میں سودا ہوتا تھا، اسے نکال کر کاغذ صاف کرکے آغا صاحب کے لیے رکھ دیا جاتا تھا اور وہ اسے پڑھنے میں مشغول ہوجاتے تھے۔ اخبارات، کتب وغیرہ بھی اسی طرح پڑھتے رہتے تھے۔ ان کے ذاتی کتب خانے میں ہر موضوع پر بے شمار نادر کتابیں موجود تھیں۔ تاریخِ اسلام پر بھی انہیں عبور حاصل تھا۔ مشاہدہ بھی گہرا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ڈراموں میں وقت کی نبض چلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

پروفیسر تپش نے ان کے ڈراموں کے بارے میں لکھا ہے کہ۔

"اردو ڈرامے کی تاریخ گویا حشر کی سوانح حیات ہے۔ حشر کو اردو ڈرامے کا خالق کہنا چاہیے۔ آغاز سے لے کر آخر دور تک اردو ڈراما جن جن منازل سے گزرا ہے اور جو ترقیاں کی ہیں سچ پوچھیے تو وہ سب حشر کی قلم کاری ہے۔"

خواجہ حسن نظامی نے لکھا۔

"آغا حشر نے اردو ڈراموں کے ذریعے سے ہندوستان کی بہت بڑی خدمت انجام دی جس کی داد نیم بیدار ملک میں ملنی دشوار ہے۔"

مولانا ظفر علی خاں نے ایک ادارتی نوٹ میں یوں لکھا۔

"آغا حشر نے اردو ڈرامے کو بلند پایہ مضامین، نصیحت آمیز اور عبرت انگیز واقعات، اخلاقی طرز کے رنگ سے اس طرح آباد کردیا کہ باغ رضواں کی دلچسپیوں کو اس کی لطافتوں پر مسکرانا پڑا۔"

آغا حشر ذاتی طور پر نہایت بااخلاق، بامروت اور متواضع آدمی تھے۔ نرم گوئی اور نرم خوئی ان کے مزاج میں شامل تھی۔ ان کے دوستوں کی تعداد زیادہ نہ تھی مگر ان سے ہمیشہ دوستی کا رشتہ قائم رہا اور کبھی تلخی یا اختلاف کی نوبت نہ آئی۔ وہ علامہ اقبال کے معترف تھے اور لاہور کے زمانۂ قیام میں ان سے ملاقات کی غرض سے ضرور جاتے تھے۔ انہیں اپنے والدین سے بے حد محبت تھی۔ اہل خاندان کو بھی عزیز رکھتے تھے۔

آغا حشر کے کردار کا ایک عجیب پہلو یہ بھی ہے کہ وہ مے نوش بھی تھے مگر پکے مسلمان بھی تھے۔ روزہ نماز کے پابند تھے۔ تلاوتِ قرآن پاک ان کے روزانہ کے معمول میں داخل تھی۔ رنگین مزاج بھی تھے مگر اس میں بھی سلیقے اور قرینے کے قائل تھے۔ ۱۹۳۲ء میں انہوں نے شراب ترک کردی تھی۔ اس سے پہلے عرصۂ دراز تک مسلسل مے نوشی بلکہ بلانوشی کا یہ اثر ہوا کہ یک لخت شراب چھوڑنے سے بیمار پڑگئے۔ سب نے سمجھایا یہاں تک کہ معالجین نے بھی مشورہ دیا کہ شراب سے قطعی اجتناب نہ کریں کیونکہ وہ ان کی رگ رگ میں بس چکی ہے اور صحت کے لیے تھوڑی بہت استعمال کرلیں مگر آغا حشر نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ جب ایک بار اس خراب چیز سے منہ موڑلیا تو پھر کس منہ سے منہ لگاؤں؟ کہتے ہیں کہ ترکِ شراب کی وجہ سے ان کی صحت نے جواب دے دیا تھا۔ ہر وقت اضمحلال سا طاری رہتا تھا۔ یہاں تک کہ اللہ کو پیارے ہوگئے مگر انہوں نے مرتے مرتے بھی شراب کو منہ نہ لگایا۔

آغا حشر کے ڈراموں پر ایک نظر ڈالی جائے تو انہوں نے بے شمار ڈرامے لکھے۔ مختلف زبانوں اور مختلف موضوعات پر لکھے، ان کی تفصیل یہ ہے۔

پہلے دور کے ڈرامے (۱۹۰۱ء-۱۸۹۹ء)

۱۔ مرید شک ۱۸۹۹ء
۲۔ مار آستین ۱۸۹۹ء
۳۔ اسیر حرص ۱۹۰۰ء
۴۔ میٹھی چھری عرف دورنگی دنیا ۱۹۰۰ء
۵۔ دام حسن عرف شہید ناز عرف اچھوتا دامن ۱۹۰۱ء

دوسرا دور جو ۱۹۰۲ء سے ۱۹۰۸ء تک قرار دیا جاتا ہے اس دوران میں انہوں نے حسبِ ذیل ڈرامے لکھے تھے۔

۱۔ شہیدِ ناز عرف اچھوتا دامن ۱۹۰۲ء
(یہ ڈراما انہوں نے نظرِثانی کے بعد دوبارہ لکھا تھا)
۲۔ سفید خون ۱۹۰۷ء
۳۔ صیدِ ہوس ۱۹۰۸ء

حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۰۲ء کے بعد چار سال تک آغا حشر نے کوئی

ڈراما نہیں لکھا تھا کیونکہ اس زمانے میں ان پر مذہبی جوش غالب تھا اور وہ تبلیغی کاموں میں مصروف ہوگئے تھے۔ تقریباً ۱۹۰۶ء تک وہ اس سے دست کش رہے۔ پھر ۱۹۰۷ء میں انہوں نے دوبارہ ڈراما نویسی کی طرف توجہ دی اور حسبِ ذیل ڈرامے تصنیف کیے۔

۱۔ خوابِ ہستی عرف داؤ پیچ ۱۹۰۸ء
۲۔ خوب صورت بلا ۱۹۰۹ء
۳۔ سلور کنگ عرف نیک پروین ۱۹۱۰ء
۴۔ پہلا پیار ۱۹۱۱ء
۵۔ بن دیوی ۱۹۱۳ء
۶۔ یہودی کی لڑکی ۱۹۱۵ء
۷۔ بلوا منگل عرف سورداس ۱۹۱۶ء

آغا حشر کا تیسرا دور اس وقت عارضی طور پر ختم ہوگیا جب ۱۹۱۶ء میں ان کی بیگم وفات پاگئیں۔ اس سے پہلے انہیں کمسن بیٹے کی موت کا صدمہ برداشت کرنا پڑا تھا۔ شریکِ حیات کی وفات نے انہیں توڑ پھوڑ کر رکھ دیا اور ان صدموں نے ان کے ذہن و دل کو بُری طرح متاثر کیا۔ وہ لکھنے لکھانے اور سوچنے کی صلاحیت سے محروم ہوگئے۔ یہی وجہ ہے کہ پھر وہ تین چار سال تک تحریری کاموں سے دور ہوگئے۔ جب مختلف کمپنیوں کے مالکوں نے ان پر دباؤ ڈالنا شروع کیا اور وہ خود بھی ذہنی فراغت سے تنگ آگئے تو آغا صاحب نے دوبارہ اپنی طبیعت کو ڈراما نویسی کی مصروفیات کی طرف راغب کیا اور ۱۹۱۹ء میں ان کی ڈراما نویسی کا چوتھا دور شروع ہوا جو ۱۹۳۰ء تک جاری رہا۔ اس کے بعد وہ فلمی کہانیوں کی طرف متوجہ ہوگئے تھے۔ چوتھے دور میں آغا حشر نے مندرجہ ذیل ڈرامے سپردِ قلم کیے تھے۔

۱۔ شیر کی گرج عرف نعرۂ توحید ۱۹۱۹ء
۲۔ مدھر مرلی ۱۹۲۰ء
۳۔ بھگیرت گنگا ۱۹۲۰ء
۴۔ عورت کا پیار ۱۹۲۱ء
۵۔ ہندوستان ۱۹۲۱ء
۶۔ ترکی حور ۱۹۲۲ء
۷۔ آنکھ کا نشہ ۱۹۲۳ء
۸۔ سیتا بن باس ۱۹۲۷ء
۹۔ بھیشم پرتگیا ۱۹۲۸ء
۱۰۔ دھرمی بالک عرف غریب کی دنیا ۱۹۲۹ء
۱۱۔ بھارتی بالک عرف سماج کا شکار ۱۹۲۹ء
۱۲۔ دل کی پیاس ۱۹۳۰ء
۱۳۔ رستم و سہراب ۱۹۳۰ء

رستم و سہراب آغا صاحب کا تحریر کردہ آخری ڈراما تھا۔ اس کے بعد انہوں نے فلمی کہانیوں اور اسکرپٹ لکھنے کا آغاز کردیا تھا۔ انہوں نے جن فلموں کی کہانیاں لکھی تھیں ان کے نام اس سے پہلے بیان کیے جاچکے ہیں۔

آغا محمد شاہ حشر کاشمیری کی یہ خوش قسمتی تھی یا بدقسمتی کہ ان کی فن کارانہ صلاحیتیں کسی ایک شعبے تک محدود نہ تھیں۔ نثر نگاری میں وہ طاق تھے۔ مکالمے ایسے لکھتے تھے کہ سُننے والا بے اختیار داد دینے پر مجبور ہوجاتا تھا۔ تھیٹر کی ڈراما نویسی سے کنارہ کش ہوکر فلمی اسکرپٹ لکھنے کی طرف مائل ہوئے تو اس میدان میں بھی بہت نام پیدا کیا اور قابلِ رشک کامیابیاں حاصل کیں۔ پھر فلموں کی ہدایت کاری کی طرف راغب ہوئے اور اس میں بھی بہت نام اور بلند مقام حاصل کیا۔ وہ بلا کے ذہین تھے اور بلا تامل لکھتے تھے۔ ان پر خیالات و اشعار بارش کی بوندوں کی طرح برستے تھے۔ یوں تو اس زمانے میں ڈراما نویس کے لیے شاعر ہونا بھی ضروری تھا مگر یہ ضروری نہ تھا کہ وہ بہت اچھا شاعر بھی ہو اور اس کے اشعار میں معنی، حُسن اور گہرائی بھی موجود ہو۔ مگر آغا حشر کی شاعری محض ضرورت یا بھرتی کی شاعری نہ تھی۔ وہ درحقیقت ایک شاعر تھے۔ خیال آفرینی، بلند خیالی اور شعری حُسن ان کے اشعار کا ایک نادر اور خوب صورت پہلو تھا۔ ان کی شاعری اس معیار کی تھی کہ اگر وہ محض شاعری ہی کرتے تو بطور شاعر شعری ادب میں ایک اہم اور ممتاز مقام حاصل کرسکتے تھے۔ ان کا شمار اردو کے گنے چنے ممتاز شعرا میں ہوسکتا تھا۔ اگرچہ انہوں نے شاعری کی طرف یکسوئی سے توجہ نہیں دی اور ڈراما نویسی اور تھیٹر کی دیگر مصروفیات نے انہیں اتنی مہلت نہ دی کہ وہ فکرِ سخن کی طرف پورا دھیان دیتے پھر بھی انہوں نے ایسے اشعار بھی کہے جو ضرب المثل کی حیثیت اختیار کرگئے اور روزمرّہ کی گفتگو کے علاوہ تحریروں میں زور پیدا کرنے کے لیے بھی استعمال ہوتے ہیں۔ یہ اعزاز و افتخار ہر شاعر کو نصیب نہیں ہوتا۔

آغا حشر ایک ہفت پہلو شخصیت کے مالک تھے۔ شاعری، ڈراما نویسی، خطابت، سماجی خدمت ہر جگہ ان کا قدم موجود تھا اور انہوں نے سبھی کا حق ادا کردیا۔

یہ تو ایک حقیقت ہے کہ ڈراما نویس بننے سے پہلے وہ شاعر تھے اور نوعمری کے باوجود بہت اچھے شعر کہتے تھے۔ بعد میں ڈراما نویسی شروع کی تو ان کا انداز یہ تھا کہ ٹہل ٹہل کر ڈرامے کے مکالمے بول کر لکھواتے تھے اور فی البدیہہ، بے ساختہ اشعار بھی موزوں کرتے جاتے تھے۔ یہ اشعار مکالموں کے ساتھ ساتھ کسی کاوش یا فکر کے بغیر ہی ان کے لبوں پر آجاتے تھے گویا وارد ہوتے تھے۔ اس طرح ڈراما نویسی کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری بھی خود بخود نکھرتی چلی گئی۔ کبھی بیٹھے بٹھائے طبیعت موزوں ہوجاتی اور آمد ہونے لگتی تو وہ ان اشعار کو بھی نوٹ کرلیتے تھے۔ مگر بدقسمتی سے ان کے کلام کو باقاعدہ محفوظ کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ ان کی بے پروائی اس پر سوا تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا بہت سا کلام ضائع ہوگیا۔ یوں تو ان کی ایک بیاض بھی تھی مگر اس کی ترتیب کے لیے ان کے پاس

وقت نہ تھا۔ مختلف رسائل و جرائد کے مدیران کی فرمائش پر وہ جو غزلیں وغیرہ کہتے رہے انہیں محفوظ کرنے کا بھی کوئی بندوبست انہوں نے نہیں کیا۔

آغا جمیل کاشمیری کو آغا صاحب کی زندگی کے آخری ایام میں چند سال آغا صاحب کے ہمراہ رہنے کا موقع ملا تو انہوں نے ان کی بیاض سے منتخب کلام نقل کرنے کا فریضہ اپنے ذمّے لے لیا۔ ان کی وفات کے بعد بھی ان کی مسودات یا مختلف رسائل و جرائد سے وقتاً فوقتاً جو اشعار دستیاب ہوتے رہے انہیں بھی وہ سنبھالتے رہے۔ ان کا بیان ہے کہ ۱۹۲۷ء میں ایک بار مولانا ظفر علی خان بنارس تشریف لے گئے تو ان کی فرمائش پر آغا جمیل نے آغا حشر کے کلام کی ایک نقل انہیں بھی فراہم کر دی تھی۔ بعد میں عبدالقدوس نیرنگ نے ایڈٹ کرنے کے بعد "کلام حشر" کے نام سے اس کو شائع کیا تھا۔ آغا جمیل کاشمیری نے اپنے پاس محفوظ بیاض کو از سرِ نو ترتیب دے کر آغا صاحب کا کلام "انتخاب کلام آغا حشر کاشمیری" کے عنوان سے شائع کرنے کا اہتمام کیا تھا۔ اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ کے زیرِ اہتمام یہ نسخہ اشاعت پزیر ہوا جسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ مگر اب پاکستان میں یہ مجموعۂ کلام ناپید ہے۔

بمبئی کے دوران قیام میں آغا حشر باقاعدگی سے انجمن ضیاء الاسلام کے جلسوں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ انجمن کے جلسوں میں انہوں نے اسلام، معجزات قرآن اور دیگر اہم دینی مسائل کے بارے میں تقاریر بھی کیں۔ اسی زمانے میں آغا صاحب کے ایک عزیز ترین دوست ڈاکٹر امرت لال وفات پا گئے۔ آغا صاحب پر اس صدمے کا گہرا اثر ہوا اور انہوں نے ایک مرثیہ تحریر کر دیا تھا۔ والیِ افغانستان جب ہندوستان کے دورے پر آئے تو آغا صاحب نے ان کے خیر مقدم کے لیے ایک استقبالیہ قصیدہ تحریر کیا تھا۔ ان کی نظم "شکریہ یورپ" کو اردو نظموں میں ایک ممتاز درجہ حاصل ہے۔

۱۹۱۳ء میں آغا صاحب تھیٹر کی مصروفیات کے سلسلے میں لاہور میں مقیم تھے جہاں انہوں نے انجمن حمایتِ اسلام کی دعوت پر ان کے اجلاس میں شریک ہو کر ایک نظم پڑھنے کا وعدہ بھی کر لیا تھا مگر مصروفیات کی بنا پر نظم نہ لکھ سکے۔ جلسے سے ایک روز قبل جب حکیم فقیر محمدؐ چشتی نے انہیں یہ وعدہ یاد دلایا تو آغا صاحب نے فی الفور نظم لکھوانے کا ارادہ کر لیا۔ حسبِ عادت انہوں نے ٹہل ٹہل کر نظم لکھوانی شروع کر دی۔ کچھ دیر میں ہی نظم مکمل ہو گئی۔ اسی رات اس کی طباعت ہوئی اور دوسرے دن آغا صاحب جلسے میں شرکت کرنے کے لیے پہنچ گئے۔ علمائے کرام اور انجمن کے کچھ اراکین اس بات پر معترض تھے کہ ایک ایسے شخص کو انجمنِ حمایت اسلام کے جلسے میں بُلایا گیا ہے جس کا تعلق تھیٹر سے ہے اور جو ڈراما نویسی کرتا ہے۔ جب آغا حشر اپنی نظم پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے تو پہلے انہوں نے علمی و دینی مسائل کے بارے میں ایک تقریر کی اور اس میں اپنی علمیت اور مذہبی تعلیمات کا اس طرح مظاہرہ کیا کہ سامعین دم بخود رہ گئے اور ان کے بُلائے جانے پر ناراض ہونے والے بھی معترف ہو گئے۔ زورِ خطابت کا مظاہرہ کرنے کے بعد انہوں نے اپنی نظم "شکریہ یورپ" پیش کی تو ایک سماں بندھ گیا اور محفل پر جوش و رقت کی کیفیت طاری ہو گئی۔ آغا صاحب کی یہ نظم ایک مستقل حیثیت کی حامل ہے۔ اس نظم کی پیش کش کا احوال پروفیسر علم الدین سالک نے اس طرح لکھا ہے۔

"جب جلسے کی کارروائی شروع ہوئی تو لوگوں نے دیکھا کہ ایک دُبلا پتلا، سُرخ و سفید انسان، آنکھوں پر چشمہ لگائے، سر پر ترکی ٹوپی رکھے، سیاہ سوٹ پہنے اسٹیج کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ہر طرف سے انگلیاں اُٹھنی شروع ہوئیں اور معلوم ہوا کہ آغا حشر آ گئے۔ مولانا ثنا اللہ امرت سری اس وقت صدر جلسہ تھے۔ آغا صاحب ان کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔ جب آپ کی نظم پڑھنے کا وقت آیا تو سب سے پہلے آپ نے نہایت موزوں الفاظ میں اس بات کا شکوہ کیا کہ انہیں بہت کم وقت دیا گیا۔ اس کے بعد حمایت اسلام کے اراکین کی توجہ اس امر کی جانب مبذول کرائی کہ وہ کشمیری نہیں کاشمیری ہیں۔ یہاں اس کاشمیری کی تشریح کرتے ہوئے ختمی پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد "موتوا قبل ان تموتو" پیش کیا اور اس پر تقریر کرتے ہوئے علم و معارف کے دریا بہا دیے۔ تمام حاضرین پر وجد طاری تھا۔ علمائے کرام کی وہ جماعت جو اس سے قبل اراکین انجمن پر اس وجہ سے ناراض ہو رہی تھی کہ انہوں نے ایک ناٹک والے کو اسٹیج پر کیوں بُلایا، اب سر جھکائے بیٹھی تھی۔ آخر آغا صاحب نے اپنی تقریر ختم کی اور دیکھنے والی آنکھوں نے دیکھا کہ علما نے اٹھ اٹھ کر نہایت عقیدت مندی سے آغا صاحب کے ہاتھ چومے۔ اس کے بعد آغا صاحب نے اپنی نظم شروع کی۔ اس وقت محفل کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔ اہلِ درد رو رہے تھے۔ ملتِ بیضا کے شیدائی سسکیاں لے رہے تھے۔ بوڑھے آہیں بھر رہے تھے۔ نوجوان جوش کی وجہ سے بے قابو ہو رہے تھے۔ عوام پر سکتے کا عالم طاری تھا۔ بچے بُت بنے سناٹا کھینچے بیٹھے تھے۔ آخر مناجات والا بند آیا۔ آغا صاحب نے آستین چڑھا کر اثر میں ڈوبے ہوئے انداز میں پہلا شعر پڑھا۔

آہ جاتی ہے فلک پر رحم لانے کے لیے
بادلو ہٹ جاؤ دے دو راہ جانے کے لیے

محفل تڑپ اُٹھی۔ بے خودی اور اضطرار کی حالت میں ہزاروں ہاتھ دعا کے لیے بارگاہِ ایزدی میں بلند ہوئے اور آمین آمین کی آواز سے آسمان میں گونج پیدا ہو گئی۔ اس نظم کو اس درجہ مقبولیت حاصل ہوئی کہ اس کے مطبوعہ نسخے جو ایک ایک آنے پر فروخت ہونا شروع ہوئے تھے، اس جلسے میں ایک ایک روپے میں بھی دستیاب نہ ہو سکے۔

مناسب ہوگا کہ اس موقع پر آغا صاحب کی نظم "شکریہ یورپ" کے چند بند پیش کیے جائیں، جن سے ان کی شاعرانہ عظمت

کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ مکمل نظم آخر میں ان کے منتخب کلام کے ساتھ پڑھیے۔

آہ جاتی ہے فلک پر رحم لانے کے لیے
بادلو ہٹ جاؤ' دے دو راہ جانے کے لیے
اے دعا' ہاں عرض کر عرشِ الٰہی تھام کے
اے خدا' اب پھیر دے رُخ گردشِ ایام کا
صلح تھی کل جن سے اب وہ برسرِ پیکار ہیں
وقت اور تقدیر دونوں درپے آزار ہیں
ڈھونڈتے ہیں اب مداوا سوزشِ غم کے لیے
کر رہے ہیں زخمِ دل فریاد مرہم کے لیے
رحم کر' اپنے نہ آئینِ کرم کو بھول جا
ہم تجھے بھولے ہیں لیکن تُو نہ ہم کو بھول جا
خلق کے راندے ہوئے' دنیا کے ٹھکرائے ہوئے
آئے ہیں اب تیرے در پر ہاتھ پھیلائے ہوئے
خوار ہیں' بدکار ہیں' ڈوبے ہوئے ذلت میں ہیں
کچھ بھی ہیں لیکن ترے محبوب کی امت میں ہیں
حق پرستوں کی اگر کی تُو نے دل جوئی نہیں
طعنہ دیں گے بُت کہ مسلم کا خدا کوئی نہیں

آغا حشر کی اس نظم کے تیور' اس کا اسلوب و انداز' اس کی شدتِ احساس سبھی کچھ مولانا الطاف حسین حالی کی یاد تازہ کرنے کے لیے کافی ہے اور یہ کسی بھی ڈراما نواز اور شاعر کے لیے ایک بڑے اعزاز و افتخار کی بات ہے۔

انجمن حمایتِ اسلام کے جس جلسے میں آغا صاحب نے یہ نظم پڑھی تھی' وہاں جو سماں بندھا تھا اس کا بیان اوپر آ چکا ہے۔ آغا حشر جنہیں عموماً ایک سطحی قسم کے ڈراما نویس کے طور پر جانا جاتا تھا' اس موقع پر ایک اور ہی انداز میں نظر آئے۔ نظم پڑھنے سے پہلے انہوں نے عالمانہ تقریر کی تھی اور علمیت کے ساتھ ساتھ خطابت کا جو بے مثال مظاہرہ کیا تھا اس کے بعد ان کے بارے میں علما اور مذہبی حلقوں کی رائے بھی بدل گئی تھی۔ آغا حشر نے بعد میں ہندو پنڈتوں کے ساتھ جو مناظرے کیے' انہوں نے ان کی شخصیت پر ایک مستند عالمِ دین ہونے کی مہرِ تصدیق بھی ثبت کر دی تھی۔ اس کے بعد کسی نے انہیں محض کمرشل ڈراما نویس جان کر حقارت کی نظر سے نہ دیکھا۔

انجمن حمایتِ اسلام کے جلسوں میں آغا حشر کی شرکت بھی ایک روایت سی بن گئی تھی اور ہر جلسے میں وہ ایک روح پرور نظم پیش کرتے تھے۔ ایک ایسے ہی جلسے میں ان کی پڑھی ہوئی ایک اور نظم نذرِ قارئین ہے۔

آسماں ہے محفلِ ہستی میں مے خانہ مرا
کہکشاں میری صراحی' چاند پیمانہ مرا
ہر نفس سے بربطِ گیتی پہ ہوں مضراب زن
اضطرابِ برق ہے اک رقصِ مستانہ مرا

اس طویل نظم کے خاتمے کا اختتام بھی ایک مناجات پر ہوا ہے۔ جس کے چند اشعار پیش کیے جا رہے ہیں۔

اے خدا' دے زورِ دستِ خالد وحیدر ہمیں
پھر اُلٹنا ہے صفِ کفر و درِ خیبر ہمیں
مست تھی جس کے نشے سے روحِ سلمان وبلال
ہاں پلا دے پھر وہی صہبائے کیف آور ہمیں
دل صنم خانہ بنا ہے یادِ غیر اللہ سے
بُت بھی اب کہنے لگے مسلم نما کافر ہمیں
المدد اے نعرۂ اللہ اکبر' المدد
بُت کدے کو پھر بنانا ہے خدا کا گھر ہمیں
تیری رحمت دیتی جاتی ہو تسلی ساتھ ساتھ
لے چلے جب شرمساری جانبِ محشر ہمیں
ڈگمگاتے ہیں' گرے جاتے ہیں تیرے ناتواں
اے تری رحمت کے صدقے' تھام لے بڑھ کر ہمیں
تیرے در کو چھوڑ کر ہم بے نوا جائیں کہاں
یا بتا دے اور کوئی اپنا جیسا گھر ہمیں
دوسروں کو زور و زر دے' عیش دے آرام دے
اور ہمیں اس دولتِ دنیا سے صرف اسلام دے

آغا حشر نے متعدد روح پرور نظمیں تحریر کی ہیں جن میں انہوں نے مسلمانوں کی حالتِ زار کا نوحہ کرتے ہوئے اللہ سے دعا کی ہے کہ اس گمراہ امت کو صحیح راستے پر لگا دے لیکن آغا حشر نے غزل کے میدان میں بھی اپنی ہنرمندی کا مظاہرہ کیا ہے۔

ان کی چند غزلیں اور متفرق اشعار ذیل میں پیش کیے جا رہے ہیں' ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ آغا صاحب کو نثر کے ساتھ ساتھ نظم اور غزل پر بھی کس قدر عبور حاصل تھا۔

انتخابِ کلام آغا حشر کاشمیری

نہ ذوقِ تماشا' نہ شوقِ جوانی
لیے جا رہی ہے' کدھر عمرِ فانی
وفاؤں کے دشمن' جفاؤں کے بانی
تجھے کیا سُنائیں ہم اپنی کہانی
نہ چھیڑ آہ اے موجِ بادِ بہاری
بہت بڑھ چلی ہے مری ناتوانی
رقابت نہ ہو کیوں زمانے کو پیدا
کہانی تری اور میری زبانی
یوں ہی کھو چکے تجھ کو اے عمرِ رفتہ

نہ جانی تری قدر، ہم نے نہ جانی

چوری کہیں کُھلے نہ نسیمِ بہار کی
خوشبو اُڑا کے لائی ہے گیسوئے یار کی
اے میرے دل کے چین، میرے گھر کی روشنی
آ، اور صبح کردے شبِ انتظار کی
غیروں کی بزمِ عیش سے فرصت اُسے کہاں
بے درد کیوں خبر لے کسی بے قرار کی
اللہ رکھے اس کا سلامت غرورِ حُسن
آنکھوں کو جس نے دی ہے سزا انتظار کی

کیا دیر ہے اے ساقیِ [illegible] کا نام چکھادے
ساغر نہیں ملتا ہے تو [illegible] پلا دے

مجھ کو ملا کے خاک میں وہ غیر کی طرف
اس طرح دیکھتے ہیں کہ دیکھا کرے کوئی
رہ رہ کے چھیڑتے ہیں زلیخا کی داستاں
منظور ہے کہ ذکر ہمارا کرے کوئی

کہنا پڑتا تھا الٰہی تری نعمت کو بُرا
میں نے پی بھی ہے تو ایمان بچانے کے لیے
حشر کے شعر ہوں کس طرح سے مقبولِ عوام
یہ سمجھنے کے لیے ہیں نہ کہ گانے کے لیے

شبِ غم جان لے کر جائے گی لیکن یہ جائے بھی
میں خود کہتا ہوں موت آئے مگر کم بخت آئے بھی
میں خود راضی ہوں اپنی موت پر آمین کہنے کو
دعا کے واسطے لیکن وہ ظالم ہاتھ اُٹھائے بھی
خداوندا خطا کیا ہے گرفتارِ محبت کی
کہ دشمن ہوگئے ہیں آج، اپنے بھی پرائے بھی

بیمارِ غم نہ ہوگا اچھا تسلّیوں سے
اچھی دوا تھی لیکن وہ کارگر نہیں ہے

مقدّر خوش، نہ دنیا خوش، نہ خوش ہے آسماں ہم سے
خفا جس روز سے تم ہو، خفا ہے کُل جہاں ہم سے
تمنا پاؤں اس کی چومتی اور کہتی جاتی ہے
نہ جا او بے مروت اس طرح دامن کشاں ہم سے

جواب

امریکا کا مشہور مزاح نگار مارک ٹوائن ایک محفلِ موسیقی میں شریک تھا۔ ایک شخص نے وائلن پر ایک نہایت فضول قسم کی دُھن بجانی شروع کردی اور نہایت بے سُری آواز میں گانے لگا۔

حاضرین میں سے ایک عورت جو اسی وائلن نواز کی شاید بیوی تھی، خوب بڑھ بڑھ کر اسے داد دینے لگی۔ اسی زورِ تعریف و تحسین کے دوران اس نے مارک ٹوئن کو مخاطب کیا جو اس کے نزدیک ہی بیٹھا ہوا تھا "کیوں جناب۔ اس وائلن نواز کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"اس کا [illegible] سُن کر مجھے رالف ایمرسن یاد آرہا ہے" مارک ٹوائن نے جھومنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

"رالف ایمرسن؟" خاتون نے حیرت سے اسے دیکھا اور بولی "مگر ایمرسن تو ایک شاعر تھا۔ اس کا موسیقی سے کیا تعلق؟"

"وہی۔ جو ان صاحب کا وائلن سے ہے۔" مارک ٹوائن نے جل کر جواب دیا۔

لبِ خاموشِ عبرت سے کہا ہر لوحِ تربت نے
عدم کے جانے والوں کی نہ پوچھو داستاں ہم سے

ایک قیامت اور ہے بیمارِ الفت کے لیے
کیسے مانوں دن مقرر ہے قیامت کے لیے
جس کے ہونٹوں پر دوا ہے، جس کی آنکھوں میں شفا
آئے سب لیکن نہ آیا وہ عیادت کے لیے

اِس رشک سے مرجائیں گے مایوسِ محبت
تو عام کر شیوۂ بیداد گری کو

ہاں ساقیِ مستانہ، بھردے مرا پیمانہ
گھنگھور گھٹا ہے یا، اُڑتا ہوا پیمانہ
ہوتی ہیں شبِ غم میں یوں دل سے مری باتیں
جس طرح سے سمجھائے دیوانے کو دیوانہ

کیا تم نے کہا دل سے، کیا دل نے کہا ہم سے
بیٹھو تو سنائیں ہم اِک روز یہ افسانہ
غصے میں جو دی گالی، منہ چوم لیا میں نے
ظالم نے کہا، یہ کیا؟ میں نے کہا، جرمانہ

جائیں گے وہیں، خوش دل دیوانہ جہاں ہو
گھر لیں گے وہیں اب کہ پری خانہ جہاں ہو
پانی کے عوض مستی رنگین ہے برستی
پر اتنے ہی ٹکڑے پہ کہ میخانہ جہاں ہو
منہ چوم نہ لے پھول کے دھوکے میں تمہارا
جانا نہ وہاں بلبلِ دیوانہ جہاں ہو

جو خزاں ہوئی وہ بہار ہوں، جو اُتر گیا وہ خمار ہوں
جو بگڑ گیا وہ نصیب ہوں، جو اُجڑ گیا وہ سنگھار ہوں
میں کہاں رہوں، میں کہاں بسوں، نہ یہ مجھ سے خوش، نہ وہ مجھ سے خوش
میں زمیں کی پیٹھ کا بوجھ ہوں، میں فلک کے دل کا غبار ہوں

ساقی تری شراب میں بھی کیفیت سہی
اِس چشمِ بادہ ریز کی مستی مگر کہاں
وہ سرمئی نشاط تھی عہدِ شباب میں
خاکِ حیاتِ سوختہ میں اب شرر کہاں
ہو حوصلہ تو کفر سمجھتا ہوں ترکِ عشق
دل تو وہی ہے حشر مگر وہ جگر کہاں

یاد میں تیری جہاں کو بھولتا جاتا ہوں میں
بھولنے والے، کبھی تجھ کو بھی یاد آتا ہوں میں
ایک دھندلا سا تصور ہے کہ دل بھی تھا یہاں
اب تو سینے میں فقط اک ٹیس سی پاتا ہوں میں
جس طرح اوپر سے نیچے کو گرے پانی کی دھار
اس کے قدموں کی طرف یوں ہی بہا جاتا ہوں میں
او وفا نا آشنا، کب تک سنوں تیرا گلہ
بے وفا کہتے ہیں تجھ کو اور شرماتا ہوں میں
حشر میری شعر گوئی ہے فقط فریادِ شوق
اپنا غم دل کی زباں میں دل کو سمجھاتا ہوں میں

شہیدِ عشق کے ماتم میں چشمِ ناز پرنم ہو
مبارک اس کا مرنا جس کے مرنے کا تمہیں غم ہو
فغانِ نیم شب سے ہے بہارِ جلوۂ ہستی
کہ ڈھل جاتی ہے ظلمت روح کی، جب آنکھ پرنم ہو
گلے میں ہار، آنکھوں میں نشہ، چلنے میں یہ مستی
مسلماں رہ چکے ہم، جب یہ اس کافر کا عالم ہو
بڑھاتے جا رہے ہو پیار حشر اس بے مروت سے
دعا مانگو گے اِک دن یہ محبت یا خدا کم ہو

وہ تجھ کو مانگتی ہے، بتا میں کہاں سے دوں
شرمندہ ہو رہا ہوں تری آرزو سے میں
ہر حرف پاش پاش ہے لیکن تو چپ نہ ہو
تسکین پا رہا ہوں تری گفتگو سے میں
ساقی کی خیر ہو کہ حیات و شبابِ حسن
ہر صبح و شام پاتا ہوں دستِ سبو سے میں

بتا نصیب کہ ہم بے وطن کدھر جائیں
یہی زمیں ہے، یہی آسماں جدھر جائیں
کوئی بتائے کہ گزرے ہوئے خوشی کے دن
کہاں ملیں گے، انہیں ڈھونڈنے اگر جائیں
جگر میں داغ، کلیجے میں زخم، سر پہ خاک
شکستہ حال کہاں لے کے چشمِ تر جائیں
وہ بدنصیب ہوں گر دام اور قفس کی طرف
میں خود نہ جاؤں تو اُڑ اُڑ کے بال و پر جائیں

یاس و غم دے کے دلِ زار سے قسمت نے کہا
اب نہ کرنا یہ شکایت کہ میں آباد نہیں
مر کے چھوٹیں گے ترے دامِ محبت کے اسیر
یہ ہے وہ قید کہ جس کی کوئی معیاد نہیں
قصۂ عشق مصیبت میں بس اے حشر نہ پوچھ
یہ وہ دلچسپ کہانی ہے جو اب یاد نہیں

کیا نالہ کیجئے جو فلک داد ہی نہ دے
ہاں تم اگر سنو تو سراپا فغاں ہیں ہم
فرمایا ہنس کے یہ گلۂ ترکِ جور پر
کب تک کریں گے ظلم، کوئی آسماں ہیں ہم
دشمن کا حال دیکھ کے جی سرد ہوگیا
تیری عنایتوں سے بھی اب بدگماں ہیں ہم
اس عاشقی میں پھونک دیا دین و ننگ و نام
کیا پوچھتے ہو، آتشِ صد خانماں ہیں ہم
میں حشر لاکھ بار کہوں بے وفا اسے
اس کا جواب کیا ہے جو کہہ دے کہ ہاں ہیں ہم

وہ گلشن کو بھی تیرِ ناز کا بسمل سمجھتے ہیں
کہ وقتِ سیر ہر غنچے کو میرا دل سمجھتے ہیں

بچاتے ہیں متاعِ حُسن کو چشمِ تمنا سے
نگاہِ شوق کو بھی وہ کفِ سائل سمجھتے ہیں
امیدوں کی تباہی، حسرتوں کی پامالی کو
محبت کے ستم کش عمر کا حاصل سمجھتے ہیں
دمِ آخر ہجومِ آرزو ہے، تم بھی آجاؤ
ہم اس کو زندگی کی آخری محفل سمجھتے ہیں

تاکجا شورشِ فریاد نہ آئے لب تک
صبر اک شے ہے مگر پھر بھی کہاں تک، کب تک
جلوہ آنکھوں کو دکھاؤگے، یہ مانا میں نے
پر یہ رونا ہے کہ آنکھیں ہی نہ ہوں گی تب تک
مرگیا حشر تو اس کی نہیں حیرت مجھ کو
میں تو حیران ہوں زندہ رہا کیوں کر اب تک

.

سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر
اُٹھتے نہیں ہیں ہاتھ مرے اس دعا کے بعد
بے مہر التماسِ تمنا پہ ہنس پڑا
کتنے خجل ہوئے نگہِ التجا کے بعد
برباد زندگی کی ہے ڈھارس فقط اُمید
یہ بھی دعا نہ دے، دلِ نا آشنا کے بعد
تسکین کے ساتھ عمرِ خضر بھی تو دیجیے
کیوں کر جئیں گے وعدۂ صبر آزما کے بعد

ان کے تیور ہیں وہی اتنی دل آزاری کے بعد
آج تو میں رو دیا احساسِ ناچاری کے بعد
کتنی محنت سے بنایا تھا امیدوں کا محل
کیا خبر تھی تم اسے ڈھادوگے تیاری کے بعد
آبرو کے مدعی تھے جان کے دشمن نہ تھے
دشمنوں کی قدر جانی آپ کی یاری کے بعد
عشق کی توہین ہے ورمانِ الفت کی تلاش
کہہ گئے چپکے سے یہ بھی میری غم خواری کے بعد
پیچھے پیچھے حشر ہے آگے فریبِ آرزو
پھر چلا اس کی گلی میں اس قدر خواری کے بعد

نکھری ہوئی ہے رنگِ شفق سے عروسِ شام
لائی کہاں سے تیرا دوپٹہ رنگا ہوا

○☆○

فلم "برسات کی رات" میں شکیل بدایونی کی ایک غزل نے بہت دھوم مچائی تھی۔ اس قافیہ ردیف میں اور بھی شعرا نے غزلیں کہیں ہیں جن میں ساحر لدھیانوی کی غزل بھی کافی مشہور ہوئی۔

اب ذرا آغا حشر کی غزل بھی ملاحظہ کرلیجیے۔

اب کہاں جاؤگے، رہ جاؤ یہیں رات کی رات
میرے گھر آئی ہے تقدیر سے برسات کی رات
آئی ہے ساتھ لیے حسن و طرب کیف و بہار
موسمِ نغمۂ گل ہے کہ ملاقات کی رات
عشق کہتے ہیں جسے خواب ہے بیداری کا
اور جوانی ہے فقط عالمِ جذبات کی رات
اس کی تقدیر میں یہ جلوۂ پر کیف کہاں
صبحِ فردوس پہ ہنستی ہے خرابات کی رات
نہ مئے ناب، نہ معشوق، بس اے حشر نہ پوچھ
ہائے افلاس مرا، ہائے یہ برسات کی رات

غریبوں کا بھی کوئی آسرا ہوتا تو کیا ہوتا
بُتِ کافر ہمارا بھی خدا ہوتا تو کیا ہوتا
جب اتنی بے وفائی پہ دل اس کو پیار کرتا ہے
تو یارب وہ ستم گر باوفا ہوتا تو کیا ہوتا
کوئی لذت نہیں ہے پھر بھی دنیا جان دیتی ہے
خداوندا محبت میں مزہ ہوتا تو کیا ہوتا
سُنا ہے حشر وہ ذکرِ وفائے غیر کرتے تھے
جو میں بھی بیچ میں کچھ بول اُٹھا ہوتا تو کیا ہوتا

مرقدِ قیس کا نشاں لیلیٰ زار اب کہاں
نجد میں اک جگہ پہ ہاں جمع ہے کچھ غبار سا

دیتا نہیں گر داد تو دشنام دیے جا
کچھ بھی تو مرے پیار کا انعام دیے جا
اچھا ہے کسی طرح کٹے بھی شبِ فرقت
اے میں تجھے، تو مجھے الزام دیے جا
کہہ دے کہ شبِ ہجر کی اب صبح نہ ہوگی
آغاز میں تو مژدۂ انجام دیے جا

ایک اک دن تری فرقت میں مہینا ہوگا
کس کو معلوم تھا اس طرح بھی جینا ہوگا
دولتِ داغِ محبت، دلِ برباد میں ڈھونڈ
یہی ویرانہ ہے جس میں وہ دفینا ہوگا
روز امید پلاتی تھی مجھے آبِ حیات
یاس نے آج کہا زہر بھی پینا ہوگا
آگیا ہوش چمن میں ترے دیوانے کو
گل کی خوشبو میں ملا تیرا پسینہ ہوگا
حشر ہے مست، اسے دیر و حرم سے کیا کام

یہ وہیں ہوگا، جہاں جلوۂ مینا ہوگا

غیر کی باتوں کا آخر اعتبار آہی گیا
میری جانب سے ترے دل میں غبار آہی گیا
جانتا تھا کھارہا ہے، بے وفا جھوٹی قسم
سادگی دیکھو کہ پھر بھی اعتبار آہی گیا
پوچھنے والوں سے گو میں نے چھپایا دل کا راز
پھر بھی تیرا نام لب پر ایک بار آہی گیا
تو نہ آیا او وفا دشمن، تو کیا ہم مرگئے
چند دن تڑپا کیے آخر قرار آہی گیا
جی میں تھا اے حشر اس سے اب نہ بولیں گے کبھی
سامنے جب بے وفا آیا، تو پیار آہی گیا

معمورۂ فغاں ہے یہ دنیائے عاشقی
اس کارواں نے ساتھ فقط اک جرس لیا
گلشن ہے تیرے عشوۂ رنگیں کا قرض دار
بو گل نے، رنگ لالہ نے، کلیوں نے رس لیا

بعد میرے بے وفائی اپنی یاد آئی تو کیا
بندہ پرورا! آپ نے اب قدر فرمائی تو کیا
جب کہ گل چیں کی ہاتھوں کو اجازت ہی نہیں
مژدۂ سیرِ چمن بادِ صبا لائی تو کیا
حشر پھر بھی دے دُعا ان کی بہارِ حسن کو
وہ پھلیں پھولیں، تری حسرت نہ بر آئی تو کیا

دل کے جانے کا کہ جانِ زار کا غم کیجیے
روئیے کس کس کو اور کس کس کا ماتم کیجیے
نا امیدی کہہ رہی ہے اب تو مرجانا ہے خوب
شوق کہتا ہے توقف اور کچھ دم کیجیے
بے وفائی سے تمہاری، خوں اسیروں کا ہوا
حسرتیں کہتی ہیں، دل سے مل کے ماتم کیجیے

بے نیازی بھی آن بان بھی ہے
ان بتوں میں خدا کی شان بھی ہے
المدد اے فغانِ عالم سوز
اس زمیں پر اک آسمان بھی ہے

بے وفاؤں کے خدا پالے نہ ڈالے دل کو
موت آئی جو کیا ان کے حوالے دل کو
تم نہیں قدر سمجھتے تو نہ سمجھو صاحب
ہم بھی کردیں گے کسی بت کے حوالے دل کو

پی اے غمِ فراق لہو چوس چوس کے
تو اور یہ کہے کہ بس اب سیر ہوگئے
اے قلبِ جور کش تیری طاقت کہاں گئی
اے ضبط و صبر! عشق سے کیوں زیر ہوگئے
درباں کے ساتھ ڈانٹ رہا ہے رقیب بھی
کتے بھی اب گلی کے تری شیر ہوگئے
ٹھکرا کے میری قبر کو کہتے ہیں حشر اٹھو
تم بھی جہاں پہ بیٹھ گئے، ڈھیر ہوگئے

روتا ہے دل جفائے محبت سے ٹوٹ کے
اچھا ہے آبلہ جو یہ بہہ جائے پھوٹ کے
دل چھیدتی ہے شرم سے سمٹی ہوئی نظر
خنجر بنی ہے آپ کی تلوار ٹوٹ کے
دل ہے ادا پرست، تغافل بھی ہے ادا
عاشق ہیں ہم تو وہ وفا! تیرے جھوٹ کے
کتنی گھٹائیں آئیں برس کر نکل گئیں
آنسو مرے مگر نہ تھمے تھم سے چھوٹ کے
اک مصحف کی نظر ہے علاجِ شکستِ دل
جڑ جاتا ہے یہ آئینہ سوبار ٹوٹ کے
دل مرگیا کہ دل کی تمنائیں مرگئیں
سینے میں رورہا ہے کوئی پھوٹ پھوٹ کے

دیکھا اسے اور آنکھ سے آنسو ٹپک پڑے
کیا کرگئی وہ پرسشِ حالت نہ پوچھیے

راہِ عدم میں آٹھ پہر چل چلاؤ ہے
کہتے ہیں جس کو قبر وہ پہلا پڑاؤ ہے

مے رنگیں تھا سادہ پانی بھی
ہائے کیا چیز تھی جوانی بھی

ڈر ہے کہ دل کے ساتھ نہ جل جائے جان بھی
نزدیک آتی جاتی ہے اب آگ دور کی

پر ہوں گے نہ یہ طاقتِ پرواز رہے گی
تھک جائے گی جب عقل تو خود باز رہے گی
انسان اور انسان کے دکھ سکھ کی کہانی
اک راز ہے اور قبر تلک راز رہے گی

بجھ رہے ہیں داغِ دل تربت میں جانے کے لیے
روشنی کم ہورہی ہے نیند آنے کے لیے

خود ان کے جرم آکر گھیرلیں گے روسیاہوں کو
اُگل دے گا یہ گھر رکھتا ہے دل میں جن گناہوں کو
یہاں کا ذرّہ ذرّہ معصیت کا راز کھولے گا
خدا آواز دے گا اور گناہ سرچڑھ کے بولے گا

تپِ غم سے مریض تفتۂ جاں اس طرح جلتا ہے
کہ اُٹھتا ہے دھواں بستر سے جب کروٹ بدلتا ہے
ترے بیمار کی حالت نہ بدلی ہے نہ بدلے گی
مگر ہاں رنگ چہرے کا ہے جو ہر دم بدلتا ہے
لیے جاتی ہیں سانسیں دوش پر طوفانِ ناکامی
ہزاروں آرزوئیں ساتھ لے کر دم نکلتا ہے

نہ ذوقِ تماشا، نہ شوقِ جوانی
لیے جارہی ہے کدھر نوجوانی
وفاؤں کے دشمن، جفاؤں کے بانی
تجھے کیا سُنائیں، ہم اپنی کہانی
نہ چھیڑ آہ اے موجِ بادِ بہاری
بہت بڑھ چلی ہے مری ناتوانی
رقابت نہ ہو کیوں زمانے کو پیدا
کہانی تری اور میری زبانی
یوں ہی کھوچکے تجھ کو اے عمرِ رفتہ
نہ جانی تری قدر ہم نے نہ جانی

بظاہر کھیلتے رہتے ہیں مجرم راحت وزر میں
مگر کٹتی ہے شب بدخوابیوں میں اور دن ڈر میں
گناہوں سے بھرے دل کو کبھی راحت نہیں ملتی
وہاں ٹھنڈک کہاں سے ہو گی ہو آگ جس گھر میں

گھر سے جنگل کی طرف جب تیرا دیوانہ چلا
ساتھ میں روتا ہوا ہر اپنا بے گانہ چلا
پاؤں کے چھالوں سے کانٹوں کی بجھائی میں نے پیاس
آج جنگل میں بھی ساقی دورِ پیمانہ چلا
دل کے آئینے میں تصویریں جڑی ہیں حُسن کی
جس طرف کو میں چلا ساتھ اک پری خانہ چلا
حشر یہ کالی گھٹائیں اور توبہ کا خیال
تم یہیں بیٹھے رہو، میں سوئے میخانہ چلا

ضرورت کیا انہیں تیغ وتبر کی
ادا کافی ہے اک ترچھی نظر کی
تجھے معلوم ہے کچھ او ستمگر
شبِ غم کس طرح ہم نے بسر کی
لگاکر دل کسی سے حشر ہم نے
مصیبت مول لے لی عمر بھر کی

جو خزاں ہوئی وہ بہار ہوں، جو اُتر گیا وہ خمار ہوں
جو بگڑگیا وہ نصیب ہوں، جو اُجڑ گیا وہ دیار ہوں
میں کہاں رہوں، میں کہاں بسوں، نہ یہ مجھ سے خوش نہ وہ مجھ سے خوش
میں زمیں کی پیٹھ کر بوجھ ہوں، میں فلک کے دل کا غبار ہو
میرا حال قابلِ دید ہے، نہ تو یاس ہے نہ اُمید ہے
نہ گلہ گزارِ خزاں ہوں میں، نہ سپاس سنجِ بہار ہوں
کوئی زندگی ہے یہ زندگی، نہ ہنسی رہی نہ خوشی رہی
وہ جو گھٹ کے حسرتیں مرگئیں انھی...حسرتوں کا مزار ہوں

کشاکش زندگی کی ارتباطِ جسم وجاں تک ہے
یہ سب ہنگامۂ محفل ہماری داستاں تک ہے
خبر لے خشک ہوجائیں نہ آنسو سوزشِ دل سے
ترا غم گُل بداماں دیدہائے خونچکاں تک ہے

کسے معلوم تھا عشق اس طرح ناچار کرتا ہے
دل اس کو جانتا ہے بے وفا اور پیار کرتا ہے
نوائے شوق سے گونجی ہوئی ہے عشق کی دنیا
یہاں کا ذرّہ ذرّہ گفتگوئے یار کرتا ہے
اُمیدیں مرکے جی اٹھیں تری جھوٹی تسلی سے
ارے بیداد، کیوں جینا مرا دشوار کرتا ہے

اک قیامت روز ہے بیمارِ الفت کے لیے
کیسے مانوں دن مقرر ہے قیامت کے لیے
اس لیے کرتا ہے سجدے عشق تیری یاد کو
اِک خدا بھی چاہیے دنیائے الفت کے لیے

مقدر آزما فریاد بے تاثیر ہوتی ہے
سکوتِ عشق کو پھر جُراتِ تقریر ہوتی ہے
گنہگارِ وفا کو اس ادا سے دی سزا تونے
کہ ناکردہ گناہ کو خواہشِ تعزیر ہوتی ہے
سزا پھر سوچ لیجئے جُراتِ عرضِ تمنا کی

خفا ہیں آپ جس سے پھر وہی تقصیر ہوتی ہے

جائیں گے وہاں، خوش دل دیوانہ جہاں ہو
گھر لیں گے وہیں اب، کہ پری خانہ جہاں ہو
ہوگی کوئی جنت، مری جنت تو وہی ہے
حسن خانہ وجانانہ و پیمانہ جہاں ہو
پانی کے عوض مستیِ رنگیں ہے برستی
پر اتنے ہی ٹکڑے پہ کہ مے خانہ جہاں ہو

بہا جاتا ہے تن گھل گھل کے، اشکوں کی روانی میں
گرے کٹ کٹ کے دریا کا کنارہ جیسے پانی میں
لکھی ہیں قصۂ مجنوں میں لیلیٰ کی وفائیں بھی
یہ ٹکڑا بھی پڑھو، یہ بھی تو شامل ہے کہانی میں
وفا ٹھکرائی جاتی ہے، امیدیں قتل ہوتی ہیں
دیارِ عشق ہے برباد، تیری حکمرانی میں
لگاوٹ کی نظر سے تونے کیوں دیکھا کہ اس دن سے
میری آنکھیں رہا کرتی ہیں دل کی پاسبانی میں

جس دن سے بے مروت تو جلوہ گر نہیں ہے
دنیائے عاشقی میں، شب ہے سحر نہیں ہے
بیمارِ غم نہ ہوگا اچھا تسلیوں سے
اچھی دوا تھی لیکن اب کارگر نہیں ہے

یقین ان کی عنایت کا زنہار نہ کر
بہشت بھی جو یہ بت دیں تو اعتبار نہ کر
وہ مرگِ عشق کی لذت سے آشنا ہی نہیں
دعائے خضر پہ آمین باربار نہ کر

شہیدِ عشق کے ماتم میں چشمِ ناز پُرنم ہو
مبارک اس کا مرنا جس کے مرنے کا تمہیں غم ہو
شبِ غم میں کلیجا دونوں ہاتھوں سے دبائے ہوں
دعا کو ہاتھ اٹھاؤں میں جو ظالم درد کچھ کم ہو

انجامِ محبت ہے بربادی ورسوائی
کس طرح سے سمجھاؤں تجھ کو دلِ سودائی
کیا تجھ سے کہوں گزری کیا کیا شبِ فرقت میں
آنکھیں تھیں اور آنسو تھے، تم آئے نہ موت آئی
کیوں میری قضا کرتی قدموں پہ ترے سجدے
معلوم اگر ہوتا، تو ہے بُت ہرجائی

کہہ رہا ہے آسماں یہ سب سماں کچھ بھی نہیں
پیس دوں گا ایک گردش میں، جہاں کچھ بھی نہیں
تخت والوں کا پتا دیتے ہیں تختے گور کے
کھوج ملتا ہے یہیں تک، بعد ازاں کچھ بھی نہیں
جن کے محلوں میں ہزاروں رنگ کے فانوس تھے
جھاڑ ان کی قبر پر ہیں اور نشاں کچھ بھی نہیں
جس جگہ تھا جسم کا ملبہ اور خسرو کا محل
چند قبروں کے سوا اب تو وہاں کچھ بھی نہیں
گونجتے تھے جن کے ڈنکوں سے زمین و آسماں
چپ پڑے ہیں قبر میں، اب ہوں نہ ہاں، کچھ بھی نہیں
تاجِ کیخسرو کہاں، شداد کا گلشن کہاں
فوجِ دارا، لشکرِ نوشیرواں، کچھ بھی نہیں

اچھا ہے کسی طرح کٹے بھی شبِ فراق
اے دل میں تجھے، تو مجھے الزام دیے جا
ڈر ہے کہ کہیں سعی کی طاقت بھی نہ لے لے
قسمت کو دعا، کوشش ناکام دیے جا

نہ تن میں تاب، نہ بازو میں بل، نہ سر میں شور
بدن کی فکر میں کپڑے، کفن کی تاک میں چور
پڑا ہے کس لیے خاموش اے نوالۂ گور
کہاں ہے، آج ترا زر، کدھر ہے تیرا زور
لحد ہے، تو ہے اور اک بیکسی سی چھائی ہے
جواب دے کہ فنا پوچھنے کو آئی ہے

جس راہ میں ہیں ٹھوکریں وہ راہ اے انسان نہ چل
جرم وگنہ کے بوجھ سے ورنہ گرے گا منہ کے بل
تاریکیاں ہیں ہر طرف، اندھا نہ بن اب بھی سنبھل
ایمان کا فانوس لے، اس میں جلا شمع عمل
مڑ، بھاگ، دوڑ اس طرف، طاقت ابھی ہے پاؤں میں
آرام، راحت، زندگی، سب ہیں خدا کی چھاؤں میں

ہائے وہ دل بانیِ جور و جفا کیوں کر ہوا
ناز تھا جس کی وفا پر، بے وفا کیوں کر ہوا
لاکھ بھیجے آسماں میرے ستانے کے لیے
پر شبِ غم تجھ کو اتنا حوصلہ کیوں کر ہوا

ساقی بھی ہے، چمن بھی ہے، ٹھنڈی ہوا بھی ہے
ٹوٹے جو آج توبہ تو اے دل مزہ بھی ہے
رگ رگ پھڑک رہی ہے نیا رنگ دیکھ کر

انگرڈ جونکر

موت کے اندھیروں میں گُم ہو جانے والی شاعرات میں، براعظم افریقہ کی انگرڈ جونکر کو بھی کبھی نہیں بھُلایا جا سکتا۔ صرف ۳۲ سال کی عمر میں جس نے اپنے ہاتھوں اپنی زندگی کا چراغ گُل کر لیا۔ اس نے بھی کم عمری ہی میں زندگی کی نفی کی۔

آج جونکر افریقی ادب میں ایک بہت بلند مقام کی مالک ہے۔ زندگی میں اس پر زبردست سرکاری دباؤ تھا۔ خودکشی کر کے ہی وہ اس سے چھٹکارا پا سکتی تھی۔

میں کہہ سکتی ہوں
کہ میں نے تمہارا بہت انتظار کیا
گلیوں اور نہروں کے کنارے
جہازوں کے اڈے پر
اور آنسوؤں کی صلیب پر...

قاتل بھی ہے، چھُری بھی ہے، میرا گلا بھی ہے
مہندی مرے لہو کی مبارک ہو آپ کو
رنگِ حنا بھی اس میں ہے، بُوئے وفا بھی ہے

پھینک کر مے، مرے قاضی صاحب
چھینے لیتے میرے پیمانے ہو
اب نہ مسجد میں تم آنا جانا
یاد رکھنا، مرے پہچانے ہو
تم بھی بس خیر سے قاضی صاحب
کچھ عجب طرح کے دیوانے ہو
جب رہے پھیر میں رندوں کے رہے
آدمی کا ہے کو پیمانے ہو

نہ کوئی پُرسانِ حال اپنا، نہ کوئی اب داد رس رہا ہے
اُجڑ گیا جو چمن تھا دل کا، نصیب میں یہ قفس رہا ہے
گھرے ہیں بدبختیوں کے بادل، عذاب سر پہ برس رہا ہے
زمین کا ایک ایک ذرّہ کمرِ عداوت پہ کس رہا ہے
نہ بھول بندوں کو اپنے یا رب، ہمارا حق تجھ پہ کیا نہیں ہے
خبر لے ورنہ کہے گی دنیا کہ اس کا کوئی خدا نہیں ہے

شکریہ یورپ

پیکرِ احساس میں پوشیدہ روحِ درد بھی
شعلہ ریزیِ نواہائے اخوت سرد بھی
کر چکا تھا اپنی ہستی مسلم پُرجوش گم
گرم ہنگامہ تھے سب یہ محشرِ خاموش گم
ماضی رنگیں تماشا حیرتیِ حال تھا
روزگارِ جلوہ زا کے لب پہ کیف الحال تھا
[illegible] آئی تھی پیغامِ حیات
ورنہ نذرِ خود فراموشی تھا ناکامِ حیات
چشمِ بینا حیرتِ طفلانہ کا گہوارہ تھی
صرف تعمیرِ تحیّر طاقتِ نظارہ تھی
نغمہ سنجِ قدس چُپ تھا گلشنِ تکبیر میں
بند تھا شورِ انا مسلم لبِ تقریر میں
مدفنِ صد جلوۂ آشوب زا آئینہ بود
یک جہانِ بے قراری دم بخود راسینہ بود
وہ پیامِ آخری، اسلام جس کا نام تھا
وہ ظہورِ صدق جو پروردۂ الہام تھا
وہ تجلیِ حقیقت جو ضلالت سوز تھی
گرمیِ قلبِ محمدؐ سے تپش اندوز تھی
روشنی دنیا کو دی جس مہرِ عالمتاب نے
رنگِ فطرت دھو دیا جس نور کے سیلاب نے
ظلمت آگیں خلقتِ انساں کو بینا کر دیا
رنگ ریزے کو جِلا دے کر نگینہ کر دیا
شعلے پیدا کر دیے خاکسترِ افسردہ میں
زندگی کی لہر دوڑا دی حیاتِ مُردہ میں
شورشِ ہنگامہ آرا آب و گل میں ڈال دی
شور بادل کا، تڑپ بجلی کی، دل میں ڈال دی
ایک ہلچل پڑ گئی جذبات زنگ آلود میں
آگ سی گویا لگا دی تودۂ بارود میں
بارہا نالید و گفت، اے قوم ما بیدار شد
حصۂ خود از حریفاں گیر و گرم کار شد
ہاں چھڑک پیشانیِ ظلمت پر افشانِ سحر
ٹانک دے دامانِ شب میں پھر گریبانِ سحر

بہرہ ور کر دل کو سوزِ احمدِ بے میم سے
جگمگا دے بزمِ جاں کو شمعِ ابراہیم سے
ڈال دے شورِ نوا' معمورۂ ظلمات میں
دوڑ جا' آہنگ بن کر سازِ موجودات میں
خاک کو بھر دے سرورِ آسماں پرواز سے
گرم کر دے روحِ ہستی شعلۂ آواز سے
حُسنِ آرائش سے زینتِ عالمِ امکاں کو دے
خلعتِ تجدیدِ آئینِ کہن ساماں کو دے
کلیاتِ دہر کی اک شرحِ نو تحریر کر
نظمِ ہستی کی نئے الفاظ میں تفسیر کر
طرحِ نو انداز و بنیادِ جہاں از سر فگن
شعلہ در پیراہنِ آتش بخشک و تر فگن
تیری لب بندی سبق آموزِ گویائی ہوئی
طعنہ زن ہیں تجھ پہ قومیں تیری ٹھکرائی ہوئی
آج ان ذروں کو بھی ناز اپنی تابانی پہ ہے
تیرے در کا نقشِ سجدہ جن کی پیشانی پہ ہے
منتظر نظارہ ہیں چشمِ خمار آلود کھول
اُٹھ! کلیدِ فتح بن کر قفلِ درِ مقصود کھول
اے خوشا غفلت جو ممنونِ اثر کچھ بھی نہیں
کان نے سب کچھ سنا' دل کو خبر کچھ بھی نہیں
گو صدائے ہمت افزا نا بگوش آتی رہی
نالہ بن کر پیہم آوازِ سروش آتی رہی
پھر بھی ننگِ زندگی آسودۂ خواری رہا
سونے والے پر وہی خوابِ گراں طاری رہا
جب تغافل اپنا شیوہ خفتۂ قسمت نے کیا
اور ہی سامانِ بیداری مشیت نے کیا
رفعتاً از جلوۂ عیسیٰ افق تابندہ شد
قم باذنی' گفت مغرب روحِ مشرق زندہ شد
اے زمینِ یورپ! اے مقراضِ پیراہن نواز
اے حریفِ ایشیا! اے شعلۂ خرمن نواز
چارہ سازی تیری بنیاد افگن کاشانہ ہے
تیرے دم سے آج دنیا ایک ماتم خانہ ہے
اشکِ حسرت زا سے چشمِ حریت نمناک ہے
خونچکاں روداد اقوامِ گریباں چاک ہے
صرف تسنیمِ ستم ہے فلسفہ دانی تری
آدمیت سوز ہے تہذیبِ حیوانی تری
عظمتِ دیرینہ نالاں ہے ترے برتاؤ سے
ڈھل گیا حسنِ قدامت خون کے چھڑکاؤ سے
جلوہ گاہِ شوکتِ مشرق کو سونا کر دیا
جنتِ دنیا کو دوزخ کا نمونہ کر دیا
اُٹھ رہا ہے شورِ غم خاکسترِ پامال سے
کہہ رہا ہے ایشیا رو کر زبانِ حال سے
بر مزارِ ما غریباں نے چراغے نے گلے
نے پرِ پروانہ سوزد' نے صدائے بلبلے
گرچہ اک دنیا کا دل تیری طرف سے خون ہے
امتِ خیر الوریٰ لیکن تری ممنون ہے
کون ہوں' کیا ہوں' کہاں ہوں' سب حقیقت کھل گئی
تو نے وہ ٹھوکر لگائی چشمِ ملت کھل گئی
چوٹ کھا کر بھر گیا دل' لذتِ ایثار سے
جلوے جاگے شیشۂ بشکستہ کی جھنکار سے
یک بیک خونِ تنِ بے جاں میں ہیجان آ گیا
قطرہ دریا بن گیا' دریا میں طوفاں آ گیا
چونک اُٹھی روحِ اخوت ایک دل خستہ ہوئے
پتیاں گُل بن گئیں' گُل مل کے گلدستہ ہوئے
چھا گئیں بکھری ہوئی اینٹیں بہم تعمیر کی
مل گئی ہر اک کڑی ٹوٹی ہوئی زنجیر کی
بُت شکن وحدت پرست اک جسم اک جاں ہو گئے
کل ہوا دنیا میں پھر کافر مسلماں ہو گئے
از کرم بپذیر یارب جوشِ بے اندازہ را
تا قیامت زندہ دار ایں زندگیِ تازہ را
آہ جاتی ہے فلک پر رحم لانے کے لیے
بادلو ہٹ جاؤ' دے دو راہ جانے کے لیے
اے دعا' ہاں عرض کر عرشِ الٰہی تھام کے
اے خدا' اب پھیر دے رُخ گردشِ ایام کا
صلح تھی کل جن سے اب وہ برسرِ پیکار ہیں
وقت اور تقدیر دونوں درپے آزار ہیں
ڈھونڈتے ہیں اب مداوا سوزشِ غم کے لیے
کر رہے ہیں زخمِ دل فریاد مرہم کے لیے
رحم کر' اپنے نہ آئینِ کرم کو بھول جا
ہم تجھے بھولے ہیں لیکن تو نہ ہم کو بھول جا
خلق کے راندے ہوئے' دنیا کے ٹھکرائے ہوئے
آئے ہیں اب تیرے در پر ہاتھ پھیلائے ہوئے
خوار ہیں' بدکار ہیں' ڈوبے ہوئے ذلت میں ہیں
کچھ بھی ہیں لیکن ترے محبوب کی امت میں ہیں
حق پرستوں کی اگر کی تو نے دل جوئی نہیں
طعنہ دیں گے بُت کہ مسلم کا خدا کوئی نہیں

حکیم محمد سعید

شہیدِ پاکستان

غلام حسین میمن

عزم صمیم، جہدِ مسلسل اور قوتِ ایمانی کے ذریعہ انسان اپنی مشکل سے مشکل ترین منزل بھی حاصل کرسکتا ھے۔ دنیا کے تمام عظیم افراد کی سوانح ھمیں یہ ھی درس دیتی ھے اور اسی پر عمل کرتے ھوئے حکیم محمد سعید نے اپنے تمام عزائم کو نہ صرف پایۂ تکمیل تک پہنچایا بلکہ آنے والی نسلوں کی راھنمائی کے واسطے ایسی شمعیں روشن کیں جن کی لو سے علم کی روشنی دور تک پھیلنے کا سبب بن رھی ھے۔ تقسیم ھند کے بعد وہ بھی بغیر کسی سہارے اور مال و دولت کے پاکستان آئے مگر ان کا سب سے بڑا سرمایہ ان کی قوتِ ایمانی، لگاتار محنت، دیانتداری اور وہ لگن تھی جس کی راہ میں بڑی سے بڑی رکاوٹ بھی کوئی رخنہ نہ ڈال سکی۔ طب کے حوالے سے بھی ان کی کاوشوں کو فراموش کرنا مشکل ھے۔

''انسانیت کی خدمت ایک شخص کی اعلیٰ ترین معراج ہے۔'' حکیم محمد سعید

دہلی کے پالم ائرپورٹ پر جہاز روانگی کے لیے تیار کھڑا تھا۔

پاکستان کو آزاد ہوئے ابھی چند ماہ ہی ہوئے تھے۔ اس جہاز میں ہندوستان سے کافی مسلمان نئے ملک پاکستان کی طرف ہجرت کررہے تھے۔ ان مسافروں میں ایک اٹھائیس سالہ نوجوان محمد سعید بھی تھا۔ وہ ائرپورٹ پر اپنی بیوی اور بچی کے ساتھ کھڑا تھا۔ یہ 9 جنوری 1948ء کا دن تھا اور یہ اس کی سالگرہ کا بھی دن تھا۔

اسے الوداع کہنے کے لیے آنے والی ہر آنکھ اشکبار تھی۔ اس کے جاننے والے اور عزیز چاہتے تھے کہ وہ پاکستان نہ جائے۔ کیونکہ وہ سب ہی کو عزیز تھا۔ بڑے بھائی کے لیے اس کی حیثیت ایک بازو کی سی تھی۔ اس نے کیا کیا خواب نہ دیکھے تھے کہ میں محمد سعید کے ساتھ مل کر طبِ مشرق کو بامِ عروج تک پہنچاؤں گا۔ مگر آج وہی بھائی اس سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو کر ایک نئے ملک اور انجانی منزل کی طرف رواں تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کو دیکھ کر محمد سعید کے ایک استاد نے کہا۔

''جانے دو! جب کراچی کی سڑکوں پر خاک چھانے گا تو فوراً ہی لوٹ کر دوبارہ دہلی آجائے گا۔''

یہ محض چند الفاظ نہ تھے بلکہ بم کا گولہ تھے جو گویا اس نوجوان کے ارادوں کے مینار کو ہلا رہے تھے۔ اس نے اسی وقت فیصلہ کیا کہ اب کچھ بھی ہو جائے، میں دوبارہ یہاں واپس نہیں آؤں گا اور پاکستان میں ہی کچھ کر کے دکھاؤں گا۔

جیسے ہی جہاز نے اپنے سفر کا آغاز کیا اور آہستہ آہستہ رینگنا شروع کیا تو اس نے ایک حسرت بھری نگاہ اس شہر پر ڈالی جہاں اس کا سارا خاندان رہائش پذیر تھا۔ یہیں اس کا شرارتوں بھرا بچپن اور پرعزم جوانی کے ابتدائی سال گزرے تھے۔ آنکھوں میں جھلملاتے ہوئے آنسوؤں کی لڑیاں رواں ہوئیں اور ذہن کے دریچوں پر یادوں کے اوراق پلٹنے لگے۔

اور پھر اس کی نگاہوں میں اپنے بچپن کا ایک منظر گھوم گیا۔

بڑے بھائی اور بزرگوں کے ساتھ اس وقت وہ سب جنگل میں کسی شکار کی تلاش میں تھے۔ گرمی اور شدید دھوپ کے عالم میں دوپہر تک جب کوئی شکار ہاتھ نہ لگا تو وہ بڑا بے چین ہوا۔ ادھر پیاس کے مارے بھی حال برا ہو رہا تھا۔ اس نے گنّے کے کھیت سے گزرتے ہوئے ایک گنّا توڑ کر چوسنا شروع کردیا۔ بڑے بھائی نے دیکھا تو پوچھا۔

''گنّا توڑنے سے پہلے کیا کھیت کے مالک سے اجازت لی تھی......؟''
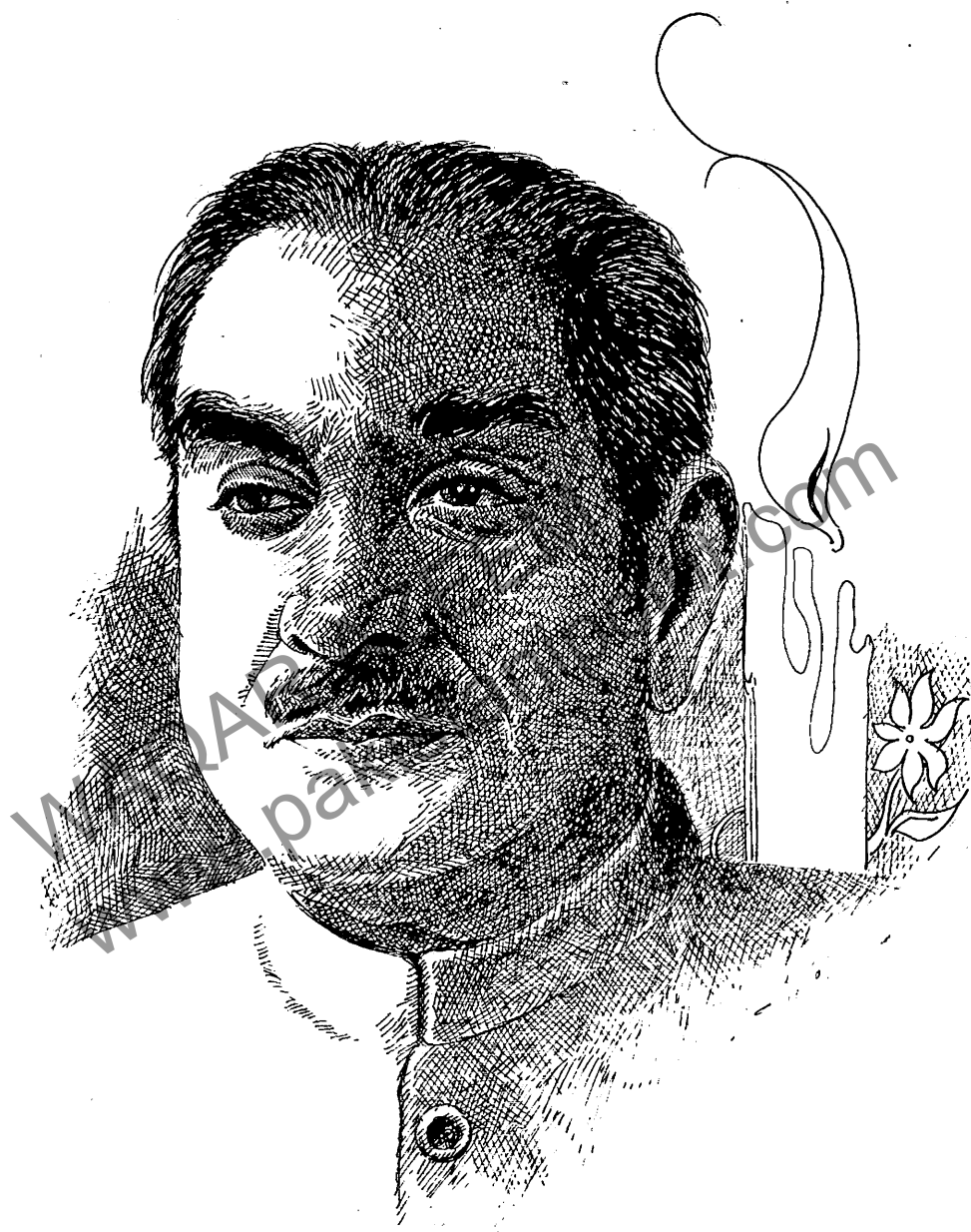
یہ سوال اس کی سماعت سے ٹکرایا تو اسے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوا، کیونکہ یہ خیال تو اسے آیا ہی نہ تھا۔ اب اسے شرمندگی ہونے لگی تھی۔ بڑے بھائی نے فوراً مالک کی تلاش شروع کروائی۔ جب وہ ملا تو اسے سارا ماجرا بیان کر کے گنے کی رقم لینے پر اصرار کیا۔ اس نے یہ کہہ کر معاملہ ختم کر دیا!

''بچہ ہے۔ لے لیا تو کیا ہوا...... اسے ہماری طرف سے تحفہ سمجھ لیجیے۔''

وہ اب تک بھائی کی تربیت کا یہ انداز بھول نہ پایا تھا اور آج اسی تربیت گاہ اور باپ جیسے شفیق بھائی سے اس کا ساتھ چھوٹ رہا تھا۔

جہاز اب اوپر اٹھ رہا تھا۔ اس کی نظریں دہلی کی طرف تھیں جو لحظہ بہ لحظہ اس سے دور ہو رہا تھا۔ اس شہر سے اس کی جذباتی وابستگی تھی۔ ایک بار پھر وہ ماضی کی یادوں میں کھو گیا۔ منظر نامے میں اس بار وہ بڑے بھائی حکیم عبدالحمید کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے۔

''سعید میاں! تم کھیل تو سارے کھیل چکے۔ اب بتاؤ کیا ارادے ہیں؟ کیا زندگی اسی طرح کھیل کود میں بسر کرنی ہے یا کوئی کارنامہ بھی انجام دینا ہے؟''

وہ خاموش کھڑا بھائی جان کو دیکھتا رہا۔ وہ پھر بولے۔

''اب تعلیم اور کھیل میں سے تمہیں کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا اور فیصلہ بھی تمہیں خود ہی کرنا ہے۔ جلد بازی کی ضرورت نہیں۔ خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو اور پھر مجھے بتاؤ۔''

بالآخر فیصلہ تعلیم کے حق میں ہوا۔ نوعمر محمد سعید کسی اسکول میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ انہیں ابتدائی تعلیم گھر ہی میں دی گئی۔ ماسٹر اقبال حسین نے انہیں انگریزی اور ماسٹر ممتاز حسین نے اردو اور حساب پڑھایا۔ عربی اور فارسی کی تعلیم انہوں نے مشہور عالم مولانا قاضی سجاد حسین سے حاصل کی تھی۔ محمد سعید نے ناظرہ قرآن پاک چھ سال کی عمر میں اور حفظ نو سال کی عمر میں مکمل کر لیا تھا۔

سارے کھیل بند ہوئے اور پھر ایک دن بڑے بھائی حکیم عبدالحمید اس کا ہاتھ پکڑ کر دلی میں مسیح الملک حکیم اجمل خان کے قائم کردہ طبیہ کالج لے گئے اور رجسٹرار سے داخلے کی خواہش کا اظہار کیا۔ جب طالب علم کی عمر بتائی گئی تو رجسٹرار نے داخلہ دینے سے انکار کر دیا۔ وجہ یہ تھی کہ کالج کے قواعد وضوابط کے مطابق اس کی عمر کم تھی۔ حکیم عبدالحمید تو اپنے چھوٹے بھائی کو داخلہ دلوانے کی نیت سے لائے تھے مگر ان کی یہ بھی خواہش تھی کہ کسی طرح کالج کے قواعد وضوابط پر ضرب نہ پڑے۔ انہوں نے رجسٹرار صاحب کو مشورہ دیا کہ امیدوار کا انگریزی، اردو، عربی اور فارسی کا امتحان لے لیا جائے۔ اگر وہ کامیاب ہو جائے تو پھر داخلہ دینے پر غور کیا جائے۔ تجویز مناسب تھی۔ رجسٹرار نے امتحان لیا اور نتیجے کے طور پر محمد سعید نے حیرت انگیز کامیابی حاصل کی۔ ایسے ہونہار طالب علم کو داخلہ دینا کالج کے مفاد میں بھی تھا۔ اس کی لسانیات پر خصوصی توجہ کالج میں داخلے کا سبب بنی۔ اس نوجوان نے بڑی لگن اور توجہ سے طب کی تعلیم مکمل کی اور پھر وہ محمد سعید سے حکیم محمد سعید بن گئے۔

یہ دوسری جنگِ عظیم کا زمانہ تھا۔ اسی دوران ہندوستان کے مسلمان بھی اپنی آزادی اور حقوق کے حصول کی جنگ میں مصروف تھے۔ بالآخران کی جدوجہد بارآور ہوئی اور 3 جون 1947ء کو آل انڈیا ریڈیو دہلی سے تقسیم ہند کا اعلان ہوا اور 14 اگست 1947ء کا دن اپنے جلو میں برصغیر کے مسلمانوں کے لیے آزادی کا سورج لے کر آیا۔

ایک بار پھر حکیم محمد سعید کی یادوں کا سلسلہ ٹوٹا۔ کیونکہ اب جہاز کراچی کی سرزمین پر لینڈ کر چکا تھا۔ سب مسافر آہستہ آہستہ اترنے لگے۔ جہاز سے اترنے والوں میں حکیم محمد سعید بھی تھے۔ ان کے ساتھ ان کی بیوی اور کم سن بچی تھی۔ اب کراچی ہی ان کا مستقل مسکن بننے والا تھا۔ وہ اپنے مختصر سے خاندان کے ساتھ جمشید کوارٹر کی سب سے آخری کالونی ''58 پر سندھ'' آگئے، جہاں وہ اپنی رہائش کا بندوبست پہلے ہی کر چکے تھے۔ اس گھر میں فرنیچر نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ حتیٰ کہ جب رات کو سونے کے لیے تکیے کی ضرورت پڑی تو وہ بھی نہ تھا۔ مجبوراً ننھی بیٹی سعدیہ کے نہالچوں سے ہی کام لینا پڑا۔

کراچی میں ان کی پہلی صبح کا آغاز ہوا۔

اس نئی اور اجنبی جگہ پر عملی زندگی کا آغاز کیسے ہوگا۔ یہ انہیں نہیں معلوم تھا مگر وہ خود کو ذہنی اور جسمانی طور پر ہر کام کے لیے تیار کر چکے تھے۔ اب کیا کیا جائے؟ یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب ان کے پاس نہیں تھا۔ البتہ عزم وارادے کا ایک دریا ان کے اندر موجزن تھا۔ وہ جب ہندوستان میں تھے تو ہمدرد کا ایک وسیع کاروبار تھا۔ ہر طرف محبت بھری نظریں ان کا استقبال کرتی تھیں۔ وہ سب ہی کے منظورِ نظر تھے۔ ان کی کون سی خواہش تھی جو پوری نہ ہوئی ہو۔ ناز و نعم کے اس ماحول سے انہوں نے خود ہی تو نکلنے کا فیصلہ کیا تھا۔ فیصلے کے وقت ان کے ایک عزیز نے مشورہ دیا تھا۔

''یہ جو ہمدرد کا اتنا وسیع کاروبار ہے۔ اس کے وارث تم دونوں بھائی ہی تو ہو۔ اس لیے اس میں سے اپنا حصہ لے کر پاکستان جاؤ تاکہ عملی زندگی کے آغاز میں تمہیں کسی قسم کی پریشانی نہ ہو۔''

سوانحی خاکہ

☆ پیدائش: 9 جنوری 1920ء دہلی

☆ شادی: 1943ء

☆ پاکستان ہجرت: 1948ء

☆ تعلیم: بی ای ایم ایس (دہلی)' ڈی ایس سی (میڈیسن آلٹرنیٹو)

☆ عہدے: چیئرمین ہمدرد وقف لیبارٹریز' صدر ہمدرد فاؤنڈیشن' بانی صدر' مدینۃ الحکمۃ' چانسلر ہمدرد یونیورسٹی' واقف متولی' ہمدرد بنگلہ دیش۔

☆ اعزازات: ستارۂ امتیاز (پاکستان) 1966ء۔ اسلامک میڈیسن پرائز کویت 1982ء۔ بوعلی ابن سینا پرائز' روس 1989ء۔ ورلڈ ٹوٹو بیکوڈے میڈل ایوارڈ (ڈبلیو ایچ او) 1995ء۔ نشانِ امتیاز (بعد از شہادت) پاکستان 2000ء

☆ خطابات: سعیدِ ملت' قائدِ نونہال' سرسید ثانی' شہید پاکستان۔

☆ سرکاری عہدے: مشیر طب و صحت' صدر پاکستان 1979ء۔ گورنر سندھ 1993ء

☆ قلمی کاوشیں: اردو اور انگریزی کی 190 کتب تحریر کیں۔ پانچ سو سے زائد مختلف موضوعات پر مضامین لکھے۔ ایک سو کے قریب مقالے مختلف کانفرنسوں میں پڑھے۔

☆ ادارت: ہمدرد صحت' ہمدرد نونہال' اخبار الطب' آواز اخلاق' ہمدرد میڈیکس' میڈیکل ٹائمز' ہمدرد اسلامکس' اینڈ یوز' SPEM۔

☆ شہادت: 17 اکتوبر 1998ء

مگر انہوں نے مشورہ دینے والے کو یہ کہہ کر خاموش کر دیا۔

''یہ تو میری والدہ کی خواہش پر بھائی جان قوم کے نام وقف کر چکے ہیں اس لیے اس پر صرف اور صرف ہندوستان میں رہنے والے لوگوں کا ہی حق ہے اور میں اس میں سے ایک روپیہ بھی لے جانے کا روادار نہیں۔''

اور یوں وہ خالی ہاتھ ہی پاکستان آئے۔

☆☆☆

حکیم محمد سعید جنوری 1920ء میں دلّی میں پیدا ہوئے۔ حکیم صاحب کے والد حکیم عبدالمجید کے پانچ بچے تھے جن میں محمد سعید سب سے چھوٹے تھے۔ حکیم صاحب کے آباؤ اجداد سترہویں صدی کی ابتداء میں کاشغر سے ہجرت کر کے پشاور میں آ بسے تھے مگر اسّی سال بعد اس کنبے نے یہاں سے بھی ترکِ وطن کیا اور ملتان کو آباد کیا۔ 1820ء میں حکیم محمد سعید کے پردادا ملتان سے نکل کھڑے ہوئے اور انہوں نے دلی کا رخ کیا۔ حکیم صاحب کے دادا رحیم بخش پانی پت میں پیدا ہوئے مگر یہ لوگ پھر دلی میں آباد ہو گئے۔ اپنی جوانی میں رحیم بخش دلی سے پھر پانی پت لوٹ گئے جہاں حکیم سعید کے والد عبدالمجید 1883ء میں پیدا ہوئے لیکن پھر یہ خاندان واپس دلی لوٹ آیا، جسے انہوں نے اپنا مستقل ٹھکانا بنالیا۔

خاندانی روایات اور اس دور کے طریقوں کے مطابق حکیم سعید کے والد حکیم عبدالمجید نے سب سے پہلے قرآن حفظ کیا اور اس کے بعد فارسی اور خطاطی میں مہارت حاصل کی۔ حکیم صاحب کے بزرگوں نے اپنی ایک سے دوسری جگہ ہجرت اور پھر ملتان میں قیام کے دوران طبی جڑی بوٹیوں میں دلچسپی لینا شروع کی اور ان کا علم حاصل کیا۔ حکیم صاحب کے والد میں بھی یہ موروثی خوبی نمایاں ہوئی اور انہوں نے اپنے دور کے عظیم طبیب حکیم اجمل خان کے دواخانے میں شامل ہو کر یونانی اور اسلامی طریق علاج کی تربیت حاصل کی۔ یہاں حافظ حکیم عبدالمجید کو طب مشرق (یا جڑی بوٹیوں کی خصوصیات) کے وسیع مطالعہ کا موقع ملا اور جلد ہی انہوں نے نہ صرف اپنا علیحدہ مطب شروع کر لیا بلکہ دلی کے محلّہ ''قاضی کے حوض'' میں ہمدرد دواخانے کے نام سے علاج معالجہ اور ادویات کی تیاری شروع کر دی۔ ان کے بڑے بیٹے عبدالحمید ان ہی کے نقش قدم پر چلے اور باپ کے قائم کردہ ''ہمدرد'' کو وسعت دی۔ انہیں اپنے چھوٹے بھائی محمد سعید سے بڑی توقعات تھیں، مگر وہ مسلمانوں کے لیے حاصل کردہ نئے ملک کو چل دیئے۔

☆☆☆

آج محمد سعید گھر سے باہر نکل کر یہ سوچنے لگے کہ اب کیا کیا جائے وہ حافظ قرآن تھے۔ سوچا کہ چلو کسی اسکول میں بچوں کو قرآن پاک کی تعلیم دینے کا فریضہ انجام دیتے ہیں تاکہ گزربسر کا کوئی آسرا تو ہو مگر یہ کام بھی نہیں بنا۔ ایک اسکول کے چوکیدار نے تو ان کی ظاہری حالت دیکھ کر انہیں اسکول کے اندر ہی داخل نہ ہونے دیا۔ اب وہ ہر روز صبح کام کی تلاش میں نکلتے تو پیدل ہی کراچی کی سڑکوں پر گھومتے رہتے۔ حالانکہ ہندوستان میں ان کے پاس وہ شان دار گاڑی تھی جو اس وقت صرف اور صرف وائسرائے ہی خریدنے کا متحمل ہوسکتا تھا مگر پھر بھی آج پیدل گھومتے ہوئے ان کے دل میں ایک لمحے کے لیے بھی کوئی احساسِ تاسف نہیں تھا۔ ہاں البتہ اب انہیں پیدل سفر کے دوران بھوک بہت لگنے لگی تھی۔ اس کا حل انہوں نے یہ نکالا کہ گھر آکر بیگم سے کہا ''اب روزانہ صبح ناشتے میں مجھے موٹا سا پراٹھا بنا کر دیا کرو تاکہ جلد بھوک نہ لگے۔''

ایک نئے ملک میں ناکافی وسائل کے ساتھ ایک طرح کی مفلوکانہ زندگی گزارنا آسان نہیں تھا مگر محمد سعید کے اندر انتہائی پائیدار جذبے موجود تھے اور ان کا عزم صمیم، ان کے پختہ ارادوں کو قائم رکھے ہوئے تھا۔

کئی روز کی کوششوں کے بعد بالآخر انہیں ایک اسکول میں پڑھانے کا کام مل گیا۔ انہوں نے اس پر خدا کا شکر ادا کیا۔ یہ پاکستان میں ان کی پہلی ملازمت تھی، مگر عارضی تھی۔ اسی دوران وہ برابر کوشش میں لگے رہے کہ اپنے بڑے بھائی کی خواہش کے مطابق وہ طب کا خاندانی پیشہ اپنا ئیں۔ انہیں ایک روز خیال آیا کہ آخر مطب کیوں نہ شروع کیا جائے..... مگر کہاں؟ یہ بھی ایک اہم اور تکلیف دہ مسئلہ تھا کہ خالی ہاتھ مطب کے لیے جگہ کیسے حاصل کی جائے۔

خاصی بھاگ دوڑ کے بعد اعوان لاج کا ایک کمرا پسند آیا۔ اس کا مالک ایڈل ڈنشا تھا جو پگڑی کی رقم لیے بغیر کمرا کرائے پر دینے کے لیے تیار نہ تھا۔ حکیم محمد سعید بھی اس پر کھلے لفظوں میں واضح کر چکے تھے کہ ''مجھے ماہانہ کرایہ پچاس روپے منظور ہے مگر پگڑی کے لیے کوئی رقم میرے پاس نہیں ہے۔'' اس نے انکار کر دیا۔

حکیم محمد سعید کم وبیش روزانہ ہی اس کے پاس آتے رہے۔ بالآخر ایک روز اس نے ان کے عزم اور حوصلے کی داد دیتے ہوئے اپنے مطالبے سے دستبرداری کا فیصلہ کیا اور انہیں بغیر پگڑی لیے کمرا کرائے پر دے دیا۔ اس کمرے میں فرنیچر نہیں تھا، لہٰذا انہوں نے ساڑھے بارہ روپے ماہانہ کرائے پر ضروری فرنیچر حاصل کیا اور یوں مطب کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ گویا پاکستان میں ہمدرد کا آغاز تھا۔

مطب کے بعد اب انہیں دواسازی کی بھی فکر ہوئی۔ اس کے لیے بھی کشادہ جگہ کی ضرورت تھی۔ اس بار ان کی نگاہِ انتخاب دھرم شالہ روڈ پر واقع ایک جگہ پر پڑی جس کی الاٹمنٹ جمشید نسروانجی کے ذریعے ہی ممکن تھی۔ اس موقع پر ان کے بزرگ سید میراں محمد شاہ مدد کو آگے بڑھے اور انہوں نے حکیم محمد سعید کو ایک تعارفی رقعہ جمشید نسروانجی کے نام دیا۔ جب ان کی ملاقات جمشید صاحب سے ہوئی تو انہوں نے پوچھا۔

''تم جوان ہو...... یہ جگہ لے کر کیا کرو گے.....؟''

''میں حکیم ہوں، مطب قائم کر کے دواسازی کروں گا۔ اس طرح لوگوں کی خدمت ہوگی۔'' حکیم صاحب نے نہایت متانت سے جواب دیا۔

''جمشید نسروانجی نے بخوشی اعوان لاج کے سامنے والا حصہ انہیں دے دیا اور یوں مطب کے ساتھ ساتھ دواسازی کے کام کا بھی آغاز ہو گیا۔ بعد میں ان کے بہنوئی حکیم محمد یحییٰ بھی دہلی سے آگئے، جس سے انہیں کافی سہارا ملا اور دواسازی کا کام پھیلنے لگا۔ اسی دوران بڑے بھائی حکیم عبدالحمید نے انہیں دہلی سے ہمدرد کے گرائپ واٹر ''نونہال'' کی سیکڑوں بوتلیں بھیج دیں۔ یہ ہمدرد پاکستان کے مالی استحکام کا سبب بنا۔

دہلی سے چلتے وقت حکیم محمد سعید کی والدہ نے آنسوؤں کے ساتھ انہیں رخصت کیا تھا اور بہو کے ہاتھ میں ایک تکیہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ اسے سنبھال کر رکھنا۔ ایک دن نعمت بیگم نے کسی خیال کے تحت اس تکیے کو ادھیڑا تو اس میں سے کرنسی نوٹ برآمد ہوئے۔ وہ دونوں ماں کی محبت اور ایثار کے اس جذبے سے بے حد متاثر ہوئے۔ ماں نے خالی ہاتھ جانے والے سب سے چھوٹے بیٹے کی مالی مدد کا یہ انوکھا طریقہ اختیار کیا تھا۔ حکیم محمد سعید کو ایسے حالات میں اس رقم نے بہت سہارا دیا۔

دواسازی کا کام شروع ہوا تو ادویات کی تیاری کے بعد اسے فروخت کرنے کے لیے بھی ایک بڑی جگہ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اب تک حکیم محمد سعید مالی طور پر کافی مستحکم ہو چکے تھے۔ چنانچہ انہوں نے فریئر روڈ پر ایک دکان خرید لی۔ اسی دوران ان کے ایک کرم فرما بزرگ سید میراں محمد شاہ نے جو اس وقت وزیر مہاجرین تھے، انہوں نے بجلی کا کنکشن فوراً دلوا دیا۔ (بعد میں میراں محمد شاہ اسپین میں سفیر بھی رہے۔ واپس پاکستان آکر KDA کے صدر بنے) ایک روز انہوں نے حکیم محمد سعید سے کہا۔

''میاں سعید! پاگل نہ بنو۔ اپنے لیے کوئی بڑا سا پلاٹ یا زمین کا ٹکڑا پسند کر لو۔ میں الاٹ کیے دیتا ہوں۔''

مگر وہ نہ مانے۔ جو گھر تھا وہ بھی ان کی بیگم کے نام تھا' ان کی بیگم کے انتقال کے بعد انہوں نے یہ گھر اپنی بیٹی سعدیہ راشد کے نام کرا دیا اور یوں وہ اپنی بیٹی کے کرایے دار بن گئے اور ہر ماہ اسے نقد کرایہ ادا کرتے رہے۔

اسی دوران انہیں ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آیا۔ ایک روز پولیس نے مطب پر دھاوا بول دیا۔ پولیس پارٹی کے انچارج ڈی ایس پی حامد حسین کا مؤقف تھا کہ مطب پر قبضہ غیر قانونی ہے اور پولیس حکیم محمد سعید کی بات آسانی سے ماننے کو تیار نہ تھی۔ بالآخر کافی پریشانی کے بعد یہ مسئلہ حل ہوا اور حکیم صاحب کو ذہنی کوفت سے نجات ملی۔

حکیم محمد سعید کا معمول تھا کہ وہ مطب میں بیٹھ جاتے۔ مریض باری باری آتے اور مرض کی کیفیت بیان کرنے کے بعد دوا لے کر چلے جاتے۔ ایسی ہی قطار میں ایک دن جمشید نسر وانجی بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ اپنی باری پر وہ آئے' فرضی مرض بیان کیا' نسخہ لیا مگر دوائی نہیں لی۔ بعد میں کسی نے نسر وانجی سے پوچھا کہ اس کی کیا وجہ تھی؟ تو انہوں نے کہا ''میں یہ دیکھنے کے لیے آیا تھا کہ مطب کیسا چل رہا ہے اور کیا واقعی یہ جگہ صحیح معنوں میں اسی کام کے لیے استعمال ہو رہی ہے جس کے لیے میں نے دی تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ مطب کے ذریعے دکھی اور بیمار لوگوں کی خدمت ہو رہی ہے۔''

ادھر ہمدرد کی تیار کردہ مصنوعات کی فروخت میں بھی دن بدن اضافہ ہوتا گیا اور دوا سازی کے کام کے لیے مزید جگہ کی ضرورت ناگزیر ہو گئی۔ منصوبہ بندی کے بعد ناظم آباد میں فیکٹری کے لیے ایک وسیع جگہ خریدی گئی جس کے لیے ان کی بیگم کا زیور تک بک گیا۔ یوں ہمدرد لیبارٹریز کا کاروبار وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ اسی دوران انہوں نے بھارت سے آئی ہوئی گرائپ واٹر کی بوتلوں کی قیمت بھی اپنے بھائی حکیم عبدالحمید کو واپس بھجوا دی تاکہ ان کے قول و عمل میں کوئی تضاد نہ رہے۔ انہوں نے ہندوستان سے روانگی کے وقت کہا تھا کہ ''ہمدرد (وقف) انڈیا پر وہاں کے بسنے والوں کا ہی حق ہے۔''

پاکستان میں ہمدرد کے پھلتے پھولتے کاروبار کو انہوں نے 1953ء میں والدہ کی خواہش اور بڑے بھائی کی تقلید میں قوم کے نام وقف کر دیا۔ اسی سال انہوں نے بچوں کی تفریح' تعلیم اور تربیت کے لیے ایک ماہنامہ ''ہمدرد نونہال'' جاری کیا جو اپنے اندر بچوں کے لیے بے پناہ دلچسپی' معلومات اور تربیت کے گُر لیے ہوئے ہوتا ہے۔ یہ رسالہ آج بھی بلاناغہ اسی آب و تاب کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔

دو سال بعد پاکستان بھر کے اطبا کی رہنمائی اور ان سے رابطے کے لیے ''اخبار الطب'' جاری کیا۔ اس کی ضرورت کیوں پیش آئی......؟ اس کے لیے طبی تحریک کا پس منظر جاننا یقیناً دلچسپی کا باعث ہوگا۔

پاکستان کے قیام کے دو سال بعد ہی پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن نے ایک قرارداد پیش کی کہ طب یونانی غیر مؤثر اور فضول ہے۔ اس لیے اسے ممنوع قرار دیا جائے۔ 1950ء میں یہاں تک ہوا کہ رجسٹرار سندھ میڈیکل کونسل نے تمام اطبا کو نوٹس جاری کر دیئے کہ وہ مطب کرنے کے مجاز نہیں۔ اس کے ردعمل میں کئی کمیٹیاں بنیں' سفارشات منظور ہوئیں۔ بعد ازاں ایک طبی بل اسمبلی میں پیش ہوا۔ ایک طویل جدوجہد کے بعد بالآخر 17 اپریل 1957ء کو اس وقت کے وزیر صحت ظہیر الدین نے بل پیش کیا جو منظور کر لیا گیا۔

اس بل کی منظوری سے ایک سال قبل ہی حکیم محمد سعید نے طب مشرق کے احیاء کے لیے انجمن ترقی طب کے سیکریٹری کی حیثیت سے مختلف سیاست دانوں، ارکان اسمبلی اور اخبار و جرائد کے حوالے سے ایک تحریک چلائی جو بار آور ثابت ہوئی۔ اس تحریک کے نتیجے میں ایک طبی بورڈ قائم ہوا۔ جدوجہد ہوئی اور بالآخر 3 دسمبر 1966ء کو کراچی میں شاہراہ حکیم ابن سینا پر ادارہ حکمت و تحقیقاتِ طب کا قیام عمل میں آیا۔ طب کے فروغ کے لیے انہوں نے ایک کوشش اور کی اور وہ یہ کہ انہوں نے کراچی میں ہمدرد طبیہ کالج قائم کیا۔ اس کا افتتاح 14 اگست 1958ء کو قائداعظم کی عزیز بہن محترمہ فاطمہ جناح نے کیا تھا۔

جون 1956ء کی بات ہے جب ایک دن شدید گرمی میں وہ نماز جمعہ کی ادائیگی کے بعد گھر لوٹے تو سخت کمزوری محسوس کر رہے تھے۔ ان کا دل ڈوبنے لگا اور کچھ دیر بعد وہ بے ہوش ہو گئے۔ دوست احباب بھاگ کر آئے اور فوراً ہی انہیں اسپتال لے جایا گیا۔ طبی معائنے کے بعد معلوم ہوا کہ بلڈ پریشر انتہائی کم اور دل کی کیفیت بے حد نازک ہے۔ معالجین نے ہدایات دیں کہ ہر قسم کی حرکت سے گریز کیا جائے۔ غسل تو در کنار وضو بھی نہ کیا جائے۔ حکیم محمد سعید کو ہوش میں آنے کے بعد ان احتیاطی تدابیر سے آگاہ کر دیا گیا۔

معالجین کو خطرہ تھا کہ انفلوئنزا کے جراثیم دل پر حملہ آور ہو چکے ہیں اور اس سے ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ ان کا مشورہ تھا کہ مریض کو نماز بھی اشاروں سے پڑھنا ہوگی۔ برش کرانے کا فرض بھی نرس انجام دے گی۔ اب حال یہ تھا کہ مریض کی معمولی سی حرکت تک معطل کر دی گئی۔

خدا کا کرنا یہ ہوا کہ تھوڑی دیر بعد بخار نے آ دبوچا اور اسی نے تریاق کا کام کیا۔ خون کا دباؤ بحال ہونے لگا اور کمزوری میں

خاندانِ سعید

دادا...... حافظ رحیم بخش

نانا...... شیخ کریم بخش

والد...... حکیم حافظ عبدالمجید

والدہ...... رابعہ بیگم

بھائی بہن...... جمیدہ بیگم، حکیم عبدالحمید، محمودہ بیگم، حافظ عبدالوحید۔

شریکِ حیات...... نعمت بیگم

اولاد...... سعدیہ راشد

نواسیاں...... ڈاکٹر ماہم منیر احمد، آمنہ ہمایوں میاں، فاطمۃ الزہرہ منیر احمد

داماد...... بیرسٹر راشد منیر احمد

مدینے کا شہید

مدینے کا شہید، حکیم محمد سعید کی شہادت پر لکھا گیا جاوید چوہدری کا وہ کالم ہے جس پر انہیں آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی (APNS) نے 98-1997ء کا بہترین کالم نگار کا ایوارڈ دیا۔ یہ کالم زیرو پوائنٹ کے سلسلے کے تحت روزنامہ جنگ کراچی کی ایک اشاعت میں شامل ہوا تھا۔

بھی رفتہ رفتہ کمی ہونے لگی۔ دل کی حرکت بھی معمول پر آ گئی اور آنکھیں خود بخود کھلنے لگیں۔ رات ایک بار پھر معالجین نے معائنے کے بعد بتایا کہ دل کی حالت نازک ہے اور کسی بھی وقت یہ دوبارہ ٹھہر کر زندگی سے رشتہ توڑ سکتا ہے۔ یہ ان کی قوت برداشت کا امتحان تھا۔ موت انہیں چند قدم کے فاصلے پر نظر آ رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ادھر حرکت کی نہیں اور موت آئی نہیں۔

رات پابندیوں کے سائے میں کٹی۔ صبح ہوئی تو انہوں نے چپکے سے غسل کیا اور نماز فجر ادا کی۔ "یا قوی" کا ورد کیا اور پھر کسی کو پتا چلنے سے قبل ہی دوبارہ بستر پر دراز ہو گئے۔ اب تو یہ روزانہ کا معمول ہو گیا۔ نرس کے کرنے کا کوئی کام ہی نہ رہا۔ وہ بیکاری سے بیزار ہو کر چلی گئی۔

معالجین مطمئن تھے کہ مریض پوری طرح ان کی ہدایات پر عمل کر کے صحت یابی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ایک روز انہوں نے اپنی حالت پر خود غور کرنا شروع کیا...... پھر تازہ گلاب کا ایک پھول عرق گلاب میں پیس کر اس میں شہد ملایا اور پینا شروع کر دیا۔ اس کے بعد پان کا پتا، پودینہ اور ادرک کو جوش دے کر پینا شروع کیا۔ انہی دنوں انفلوئنزا اور ہارٹ اٹیک کے سبب تین اموات تواتر کے ساتھ ہوئیں اور یہ تینوں شخصیات نامور تھیں۔

ان میں لندن میں متعین ایک پاکستانی سفارت کار محمد سلیم، سر آغا خان اور فلم ساز فضل کریم شامل تھے۔ ان باتوں نے بھی ان پر وحشت طاری کر دی تھی۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ اس قسم کی خبریں مریض کو معالجین کی ہدایات کا سختی سے پابند کرواتیں، مگر یہ مریض تو کچھ اور ہی انداز کا تھا۔ موت کو ابدی زندگی سے رابطے کا وسیلہ سمجھتا تھا۔ انہوں نے ایک نرالی حرکت کی۔ چپکے سے ریل کا ٹکٹ کٹایا اور راولپنڈی پہنچ گئے۔ پہلی رات ایک دوست صفدر کے ہاں بسر کی۔ دوسرے دن ایبٹ آباد چلے گئے۔ ایبٹ آباد سے نتھیا گلی پہنچے اور وہاں چند دن رہنے کا ارادہ کیا۔ صفدر سے قسم لی کہ "میرا پتا کسی کو نہ بتانا۔"

اب نتھیا گلی کی فضائیں تھیں اور تنہائی۔ انہوں نے اپنا رابطہ مکمل یک سوئی کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے جوڑا اور سوچنے لگے کہ میں بیمار ہونے سے قبل خود اپنے دن رات کے آرام سے بالکل بے خبر ہو گیا تھا اور انفلوئنزا کے مریضوں کی خدمت میں مصروف رہا۔ مجھے ان مریضوں سے ملنے والی تمام روحانی دعائیں کہاں گئیں؟ کیا وہ فضا میں تحلیل ہو گئیں؟ نہیں نہیں...... ایسا نہیں ہو سکتا۔

انہیں اللہ تعالیٰ پر مکمل بھروسا تھا۔ ان لمحات میں فکر بیدار ہوئی اور روح کو تازگی ملی اور روحانی مسرتوں نے مرض سے

آہستہ آہستہ نجات دلانی شروع کی۔

حکیم محمد سعید ہمدرد کے فروغ اور پاکستان کو مستحکم کرنے کے لیے اپنا ہر لمحہ اور ہر سوچ قربان کر چکے تھے۔ یہ پاکستان کی بدقسمتی تھی کہ اس کے قیام کے تقریباً ایک سال بعد ہی پاکستان کے بانی قائداعظم محمد علی جناح انتقال کر گئے۔ اس کے بعد ملک کے تمام تر انتظامی معاملات کی ذمے داری قائد ملت لیاقت علی خان کے کاندھوں پر آن پڑی اور پھر 16 اکتوبر 1951ء کو لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد اقتدار کے حصول کے لیے جو رسہ کشی ہوئی اور جس طور کے لوگ حکمران بن بیٹھے' وہ کسی سے ڈھکی چھپی بات نہیں۔ اس عرصے میں پاکستان کے قیام کی اصل روح ہی فراموش کر دی گئی تھی۔ یہ بات حکیم محمد سعید کو بہت کھٹکتی تھی' لہٰذا انہوں نے ہمدرد کے پلیٹ فارم سے تمام تر دستیاب وسائل بروئے کار لا کر ''شام ہمدرد'' کا آغاز کیا۔ جس کا مقصد شروع میں تو عظیم پاکستانیوں کو وثیقۂ اعتراف پیش کرنا تھا' مگر بعدازاں اس کے مقصد کو مزید وسعت دیتے...... ہوئے ایک ایسا فکری ادارہ بنا دیا گیا جس میں علماء اور دانشور حضرات بیٹھ کر غوروفکر کرتے اور ملکی مسائل کے حل کے لیے تمام ممکنہ تدابیر تحریری رپورٹ کی صورت میں حکومت کو بھیجتے' تاکہ ملک میں ترقی اور سدھار کا راستہ ہموار ہو۔ بعد میں اسے ہمدرد مجلسِ شوریٰ کا نام دے دیا گیا۔

حکیم محمد سعید کھلے دل و دماغ کے آدمی تھے۔ انہوں نے طب یونانی کو طب مسلمانی کہا اور زندگی بھر اس کے فروغ کے لیے کوشاں رہے' لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ایلوپیتھی اور ہومیوپیتھی کے مثبت پہلوؤں کے بھی معترف رہے۔ 1963ء میں چین جانے والے طبی وفد میں وہ بھی شامل تھے۔ انہوں نے چین میں رہ کر وہاں کی طب کا بغور مشاہدہ و مطالعہ کیا اور واپس آ کر ایک کتاب ''میڈیسن ان چائنا'' لکھی جو بہت مقبول ہوئی۔ اس کتاب کے بارے میں چینی دانشوروں کا خیال ہے کہ حکیم محمد سعید نے ہمارے لیے وہ کام کیا ہے جو ہمارے اپنے نہ کر سکے۔

طب کے فروغ کے لیے ان کی خدمات کے اعتراف میں حکومت پاکستان نے انہیں 1966ء میں ''ستارۂ امتیاز'' سے نوازا۔

انہوں نے ملک میں طب کے حوالے سے تحقیقی کام کو سرکاری سطح پر کرنے کی کوشش کی مگر انہیں اس میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ ایک بار انہوں نے کویت کے شیخ کو اسلامی تحقیقاتی ادارے کے قیام کا مشورہ دیا۔ جواب میں انہیں دس منٹ کی ملاقات کی اجازت ملی۔ وہ جب کویت جا کر شیخ سے ملے تو انہوں نے کہا ''میں آپ کا نیا کارڈیولوجی سینٹر دیکھ کر آیا ہوں۔ وہ بہت اچھا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسلامی تحقیقی ادارے کی بھی اشد ضرورت ہے۔'' حکیم محمد سعید نے اس موقع پر بتایا ''ایک بار حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو دل کا درد اٹھا۔ پسینہ بھی آنے لگا۔ یہ دل کے دورے کی علامت تھی۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں پہلے کسی طبیب کے پاس بھیجنے کا کہا مگر پھر واپس بلا لیا کہ اس سے کام نہیں ہوگا۔ آپ نے سات عدد کھجوریں مع گٹھلیوں کے پیس کر سعد بن ابی وقاصؓ کو پلایا۔ اس سے دل کا درد دور ہو گیا۔ حکیم محمد سعید نے کہا کہ ان دواؤں کے خواص کو جاننے کے لیے اسلامی تحقیقاتی ادارے کی اشد ضرورت ہے۔ شیخ ان سے متفق ہوئے اور ادارے کے قیام کی اجازت دیتے ہوئے 60 کروڑ روپے اس کے لیے مختص کر دیئے۔ باتوں کا سلسلہ 10 منٹ کے بجائے 65 منٹ تک جاری رہا مگر شیخ نے انہیں نہ ٹوکا' بلکہ ملاقات کے اختتام پر انہیں خود دروازے تک چھوڑنے آئے۔

بابائے بصریات ابن الہیثم کی تحقیقات اور کام سے مسلمانوں کی بے خبری حکیم محمد سعید کو بہت کھٹکتی تھی۔ ایک ابن الہیثم ہی کیا ہمارے اسلاف میں سے کئی نامور مسلمان سائنس دانوں کی عظیم علمی تحقیقات اور سائنسی کارناموں سے عالم اسلام کی بے خبری قابلِ افسوس ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ انسانی جسم میں خون کی گردش کا پہلا نظریہ ولیم ہاروے نے پیش کیا تھا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس سے کئی سو سال پہلے مشہور مسلمان سائنس دان ابن النفیس یہ نظریہ پیش کر چکے تھے۔ حکیم محمد سعید نے نومبر 1969ء میں ابن الہیثم کا ہزار سالہ جشن منانے کا اہتمام کیا اور اس جشن کے تحت مختلف مقامات پر شام ہمدرد میں مذاکرات ہوئے۔ انہوں نے اس عظیم شخصیت پر تحقیقی کام کا آغاز کیا۔ ابن الہیثم کی عربی تصنیف ''کتاب المناظر'' علم بصریات پر سب سے پہلی جامع کتاب ہے۔ حکیم محمد سعید نے اس کی تلاش شروع کی۔ یہ کتاب ناپید تھی۔ تلاش کے دوران معلوم ہوا کہ اصل عربی کتاب کو اس وقت ہی ضائع کر دیا گیا تھا جب ایک برطانوی ماہر بصریات نے اس کا انگریزی ترجمہ لکھ کر اسے اپنی کتاب بنا کر پیش کیا۔ جب حکیم محمد سعید نے معلومات حاصل کرنا شروع کیں تو وہ اس راز تک پہنچے اور پھر اس کی کھوج میں لگ گئے۔ وہ ''کتاب المناظر'' کی تلاش میں پہلے ترکی گئے۔ بعد میں بغداد اور مصر گئے۔ یہاں سے بھی ناکامی ہوئی تو انہوں نے اسپین کا رخ کیا۔ بالآخر ان کی کوششیں رنگ لائیں اور وہ ''کتاب المناظر'' کا نسخہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو ہی گئے۔ انہیں معلوم ہوا کہ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ ہارورڈ یونیورسٹی

پہلی بار

☆ پہلا سفرنامہ "یورپ نامہ" لکھا۔
☆ پہلا افسانہ "دسمبر" 1933ء میں شائع ہوا۔
☆ پہلی کتاب "استدلال" خریدی جو فلسفے سے متعلق تھی۔
☆ پہلے استاد ماسٹر ممتاز حسین تھے۔
☆ پہلی تراویح مسجد حوض قاضی دہلی میں پڑھائی۔
☆ پہلی ادارت ہمدرد صحت کی 1940ء میں کی۔
☆ پاکستان آنے کے بعد پہلا غیر ملکی سفر مصر کا کیا۔

خونِ جگر!

وزیراعظم پاکستان کی حیثیت سے بے نظیر بھٹو صاحبہ مدینۃ الحکمتہ کا دورہ کررہی تھیں۔ بیت الحکمتہ کے دورے کے دوران انہوں نے حکیم محمد سعید سے جوان دنوں صوبہ سندھ کے گورنر تھے کہا۔

"گورنر صاحب! کیا آپ ہمیں یونہی گھماتے پھراتے رہیں گے یا چائے وائے بھی پلوائیں گے۔"

اس موقع پر مرکزی وزیر آفتاب شعبان میرانی نے وزیراعظم سے کہا "حکیم صاحب تو خود چائے نہیں پیتے۔"

اس پر بے نظیر بھٹو نے حیرت سے حکیم صاحب کو دیکھتے ہوئے کہا "تو گورنر صاحب آپ کیا پیتے ہیں؟"

حکیم محمد سعید نے برجستہ جواب دیا "میں قوم کے غم میں اپنا خونِ جگر پیتا ہوں۔" اس پر بے نظیر بھٹو مسکرا کر خاموش ہوگئیں۔

کے ڈاکٹر اے آئی صابرا نے کیا ہے۔ ڈاکٹر صابرا کا تعلق مصر سے تھا۔ حکیم محمد سعید اس کتاب کے لیے کئی بار ہارورڈ یونیورسٹی گئے اور یوں یہ ترجمہ ان کی کوششوں سے منظر عام پر آیا۔ بعد میں پاکستان کے محکمۂ ڈاک نے ایک یادگاری ڈاک ٹکٹ بھی جاری کیا۔ انہوں نے "کتاب المناظر" کے علاوہ ابن الہیثم کے سات مقالات کا بھی اردو ترجمہ کروا کر اسے بڑے اہتمام سے شائع کروایا۔

حکیم محمد سعید کی دوسری پسندیدہ شخصیت ابوریحان محمد بن احمد البیرونی کی تھی جس کے کارناموں کو اجاگر کرنے اور ان کی کتب کو سامنے لانے کے لیے انہوں نے پاکستان کے علاوہ دنیا کے دیگر ملکوں میں اس کی کمیٹیاں بنوائیں اور اس کام کو پھیلایا۔ انہی کی کوششوں سے البیرونی پر ایک بین الاقوامی کانفرنس بھی ہوئی۔

جب ایوب خان برسر اقتدار تھے تو انہوں نے حکیم محمد سعید کو سیاست میں حصہ لینے کا مشورہ دیا، مگر انہوں نے انکار کردیا۔ مولانا کوثر نیازی سے حکیم محمد سعید کے دیرینہ تعلقات تھے اور باوجود سیاسی اختلاف کے، دونوں تاعمر اچھے دوست رہے۔

انہی دنوں کی بات ہے، حکیم محمد سعید کی تلی بگڑ چکی تھی مگر انہوں نے اس کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جو وہ اس سے قبل اپنے دل کے ساتھ کر چکے تھے۔ وہ 1970ء میں امریکا کے دورے پر گئے۔ محمد شعیب وہاں موجود تھے۔ وہ دونوں گہرے دوست تھے۔ محمد شعیب وزیر خزانہ بھی رہ چکے تھے۔ انہوں نے حکیم محمد سعید کو طبی معائنے کا مشورہ دیا۔ سرجن برنارڈ دالش نے معائنہ کیا اور مختلف رپورٹس کے نتیجے میں زیادہ فعال تلی کو نکالنے کا فیصلہ ہوا۔ یہ فیصلہ نہ صرف سرجن کا تھا بلکہ دوست احباب کی رائے بھی اسی کے حق میں تھی۔ حکیم محمد سعید نے ان سب کا شکریہ ادا کیا اور ایک بار پھر اس ارادے کا اظہار کیا کہ وہ اپنا علاج خود کریں گے۔

اسی زمانے میں ان کی ملاقات ایک ایسی امریکی خاتون سے ہوئی جو "کافی کپ" پڑھنے میں بڑی مشہور تھی۔ حکیم محمد سعید اس ملاقات سے قبل "کافی کپ" کو مذاق سمجھتے تھے۔ ان خاتون کا طریقہ کار یہ تھا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے کافی بنا کر پلاتی اور پھر کپ میں بچ جانے والی تلچھٹ کو ہلانا شروع کردیتی۔ اس طرح کافی کے کپ میں ان کے مطالعے کے لیے نقش و نگار بن جاتے۔ وہ ان کا مطالعہ کرکے کافی پینے والے کا ماضی، حال اور مستقبل بیان کردیتی۔

بڑی مشکل سے حکیم محمد سعید ان خاتون سے ملاقات کے

لیے راضی ہوئے۔ ایک دن ملاقات کا وقت طے ہوا۔ مقررہ دن وہ خاتون آ گئیں اور اپنے ساتھ لائی ہوئی کافی بنا کر انہوں نے حکیم محمد سعید کو پلائی۔ بچ جانے والی تلچھٹ سے اس نے پڑھنا شروع کیا اور ان کا ماضی بتاتے ہوئے کہا کہ ''خدمت خلق کے شعبے میں ان کی خدمات کا ایک زمانہ معترف ہے اور یہ بعد میں بھی یاد رکھی جائیں گی۔''

حال کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ ''یہ اپنی بیماری کا علاج خود کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور ایسا کرنا نقصان دہ ثابت ہوگا۔'' مستقبل کے بارے میں ان کی گھریلو زندگی کے متعلق بتاتے ہوئے کہا کہ ''ان کی بیٹی سعدیہ راشد کے ہاں کئی بیٹیاں پیدا ہوں گی۔'' آج حکیم محمد سعید کی نواسیوں کی تعداد تین ہے۔

حکیم محمد سعید امریکا میں آپریشن کروائے بغیر پاکستان آ گئے۔ بعد ازاں ان خاتون کی بات سچ ثابت ہوئی اور ایک دن وہ اپنے مطب میں ہی بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ محمد شعیب ان دنوں عالمی بینک کے نائب صدر تھے۔ انہوں نے اپنی بیگم کو واشنگٹن سے کراچی بھیجا اور حکیم محمد سعید کو امریکا بلالیا۔ طبی معائنے کے بعد انکشاف ہوا کہ اگر تلی کا فوری آپریشن نہ کیا گیا تو زیادہ نقصان ہونے کا اندیشہ ہے۔ حکیم محمد سعید تلی کے متعلق ہونے والی تشخیص سے تو متفق تھے مگر علاج وہ اپنے دیسی طریقے سے کرنے پر بضد تھے۔ انہوں نے کراچی سے واشنگٹن جانے سے قبل اپنا وصیت نامہ تحریر کر کے اپنی سیکریٹری خانم للی ڈی سلوا کو دے دیا تھا۔ بالآخر وہ آپریشن کروانے پر راضی ہو گئے۔

جارج ٹاؤن اسپتال کے ریڈیو آئی سوٹوپ ڈویژن میں تلی کی کارکردگی کا ازسرنو جائزہ لیا گیا جس نے اس بات کی تصدیق کی کہ اگر مریض کا فوری آپریشن نہ کیا گیا تو ناقابلِ تلافی نقصان کا خطرہ موجود رہے گا۔ 3 مئی 1971ء کو آپریشن کا دن مقرر ہوا۔ خود کو بے ہوش کیے جانے سے قبل انہوں نے ڈاکٹروں سے کہا کہ ''میرا اپنڈکس کا آپریشن بھی لگے ہاتھوں کر دیجیے مگر خیال رہے کہ میں نے زندگی بھر اینٹی بایوٹک ادویات سے پرہیز کیا ہے، اسے ذہن میں رکھ کر میرے جسم کے ساتھ سلوک کیجیے گا اور کسی خطرناک آدمی کا خون مجھے نہ دیجیے گا۔''

اس کے بعد سات گھنٹے کا آپریشن ہوا جو بخیر و خوبی انجام پایا۔ دو روز بعد سرجن نے معائنہ کیا تو حیران رہ گیا۔ اینٹی بایوٹک کے بغیر بھی گہرے گھاؤ بھر چکے تھے۔ سرجن نے اپنی حیرت دور کرنے کے لیے ان سے پوچھا۔

''سعید صاحب! ایک بات تو بتائیں؟''

''جی فرمایئے......!'' حکیم محمد سعید نے کہا۔

''کیا آپ کا جسم عام انسانوں سے مختلف ہے؟ کیونکہ سارے گھاؤ صرف دو دن میں بھر گئے ہیں......!''

''اس جسم میں بڑی مضبوط روح ہے۔'' حکیم صاحب نے مختصر مگر جامع جواب دے کر معالج کو خاموش کر دیا۔

مولانا کوثر نیازی نے 1977ء میں الیکشن کے دوران پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر حکیم محمد سعید کو سیاست میں آنے کا مشورہ دیا، جسے انہوں نے محبت کے ساتھ رد کر دیا۔ جب یہ بازگشت سنی گئی تو روزنامہ ''آفاق'' کے مدیر مصطفیٰ صادق نے مولانا کوثر نیازی پر چوٹ کی کہ کسی کو تو غیر جانب دار رہنے دیں۔ لیکن مولانا کا اصرار بڑھتا ہی گیا۔ انہوں نے حکیم محمد سعید کے بہترین دوست مسرت حسین زبیری کو آگے بڑھایا کہ وہ انہیں منائیں۔ مگر حکیم صاحب قطعی طور پر سیاست کے خارزار میں آنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

پھر ایک دن حکیم محمد سعید کی رائے اور خواہش کے برخلاف پاکستان پیپلز پارٹی نے اعلان کر دیا کہ انہیں ٹکٹ دیا جا رہا ہے۔ انہوں نے پی پی پی کے چیئرمین اور ملک کے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کے نام تار بھیجا کہ مجھے نظر انداز کر کے یہ ٹکٹ کسی اور کو دے دیا جائے۔ ان کی یہ درخواست بے اثر ثابت ہوئی اور یہ خبر پریس کو جاری کر دی گئی کہ حکیم محمد سعید پاکستان پیپلز پارٹی کے امیدوار کی حیثیت سے انتخابات میں حصہ لیں گے۔

اب بے بسی کا عالم یہ تھا کہ قومی اسمبلی کا مبینہ امیدوار نہ چاہتے ہوئے بھی انتخابی سرگرمیوں میں حصہ لینے پر مجبور تھا۔ انتخاب اور سیاست میں حصہ نہ لینے کی دو بڑی وجوہات تھیں۔ ایک تو ان کا مزاج سیاست کرنے کا نہیں تھا اور دوسرے یہ کہ جس پارٹی نے انہیں ٹکٹ دیا تھا، اس سے ان کی کوئی وابستگی نہ تھی۔ انہیں تو حیرت اس بات پر تھی کہ وہ اس پارٹی کے ممبر بھی نہ تھے جس نے انہیں انتخابات میں اپنا نمائندہ نامزد کیا تھا مگر وہ جانتے تھے کہ بھٹو صاحب کا اپنا مزاج تھا۔

اب انتخابی جلسوں میں عجیب تماشا ہوا۔ یہ ایک عام روش ہے کہ ان مواقع پر ہر امیدوار اپنے حریف کے ماضی کی ناکامیوں اور خامیوں کو اپنے ووٹروں کے سامنے مبالغہ آمیزی کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ اے این پی کے امیدوار رفیق باجوہ نے ایک انتخابی جلسے میں حکیم محمد سعید کے خلاف کچھ کہا تو جوابی طور پر وہ خاموش رہے۔ یہ رویہ پارٹی کی مرضی کے خلاف تھا۔ ان کے اس انداز سے تنگ آ کر پاکستان پیپلز پارٹی نے اندر ہی اندر ان کی مخالفت شروع کر دی۔ اب انہیں پارٹی کے رہنماؤں کی طرف سے وارننگ ملی کہ آپ اپنا رویہ تبدیل کریں اور پارٹی

عرق گلاب!

بیگم رعنا لیاقت علی خان کو ہالینڈ کے سفیر نے تحفتاً اعلیٰ قسم کے گلاب بھیجے۔ انہوں نے یہ گلاب حکیم محمد سعید کے سپرد کر دیئے اور فرمائش کی کہ عرق گلاب کشید کروائیں۔ چار دن بعد عرق گلاب بیگم رعنا لیاقت علی خان کے پاس پہنچ گیا اور اسی دن لیاقت علی خان کی سناؤنی آگئی۔ یہی عرق گلاب لیاقت علی خان کے کفن پر چھڑکا گیا۔ ہالینڈ کے جو گلاب بلا قیمت آئے تھے وہ اس شخص کے کام آئے جس کی قومی خدمات کی کوئی قیمت نہیں لگائی جا سکتی۔

تربیت

کسریٰ نے اپنے بچے کو آداب سکھانے کے لیے ایک استاد رکھا جب بچہ خوب علم والا ہو گیا تو ایک روز استاد نے بچے کو بلایا اور بغیر جرم اور... کسی سبب کے خوب مارا۔ بچے نے استاد کے خلاف دل میں غصہ چھپائے رکھا۔ جب اس کا باپ فوت ہوا اور اس کے بعد وہ خود بادشاہ بنا تو اس نے استاد کو بلایا اور پوچھا ''تم نے مجھے فلاں دن اس طرح بغیر کسی جرم و سبب کے کیوں مارا تھا؟''

استاد نے جواب دیا ''اے بادشاہ تو بہت ہی کمال و فضیلت والا بن چکا تھا اور میں نے سمجھ لیا تھا کہ تو اپنے باپ کے بعد بادشاہ ہو گا۔ اس لیے میں نے سوچا کہ تجھے مارنے کا مزہ اور ظلم کا دکھ چکھاؤں تاکہ اس کے بعد تو کسی پر ظلم نہ کرے۔'' اس نے یہ سن کر کہا۔ ''استاد اللہ تجھے جزائے خیر دے۔''

امام غزالی کی شہرآفاق تصنیف ''مکاشفۃ القلوب'' سے حکایت
مرسلہ، قیصر شاہ گمبٹ

منطق اور معلمین منطق

منطق کے لغوی معنی ہیں بولنے کی جگہ یا جسے بولا جائے، بولا گیا ہو، بولنے کا وقت، بولنے والا۔ منطق کی تعریف مختصر الفاظ میں یوں ہے کہ

''ان قوانین کا علم جو فکری غلطی سے محفوظ رکھے۔''

منطق کی غرض فکر کی درستگی، تفکر، تدبیر میں درستگی ہے۔ منطق کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ آپ گفتگو میں دوسروں پر حاوی ہو سکتے ہیں۔

منطق کو ''علم میزان'' اور ''علم آلہ'' بھی کہتے ہیں۔ منطق کا تعلق فلسفہ سے ہے اور اس کا آغاز یونان سے ہوا۔

مرسلہ: ہمایوں دین پوری، خان پور کٹورا

ظالمانہ رحم

مشہور فاتح چنگیز خان کی بربریت اور ظلم کی داستانیں اپنی مثال آپ ہیں۔ ایک دن چنگیز خان خوش گوار موڈ میں تھا۔ ایک درباری نے موقع کو غنیمت جان کر ڈرتے ڈرتے پوچھا ''خاقان اعظم! کیا زندگی میں کبھی آپ کو کسی پر رحم آیا ہے؟''

چنگیز خان نے مسکرا کر کہا ''ہاں! ایک بار میں گھوڑے پر سوار جا رہا تھا کہ میں نے ایک عورت کو چیختے اور ایک بچے کو روتے ہوئے سنا۔ پاس ہی دریا میں ایک بچہ ڈوب رہا تھا اور اس کی ماں مدد کے لیے چیخ رہی تھی۔ مجھے ان دونوں پر بہت رحم آیا۔ میں نے اپنے تیر کی نوک بچے کے سینے میں داخل کی اور اس کو نکال کر ماں کے حوالے کر دیا۔''

مرسلہ: محمد خالد خلیل، جہکال بالا پشاور

بلا کا آدمی

"میرا نام......" اس نے اپنا کارڈ میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے اپنا نام بتایا۔ نام کے ساتھ بہت سی علمی ڈگریاں اور سماجی اعزازات مرقوم تھے۔ اخبار نویس، وکیل، منتظم، دانشور، آرٹسٹ، آج کل مجلسِ اقوام متحدہ کے میگزین کوریا کے تامل ایڈیشن کا ایڈیٹر ہے اور اسی تامل اخبار کی روشناسی کی مہم پر دنیا بھر میں گھوم رہا ہے۔ اسے جب معلوم ہوا کہ میں پاکستانی ہوں تو پوچھا۔

"کیا آپ حکیم محمد سعید کو جانتے ہیں؟"

"جاننا کیا معنی۔" میں نے کہا "وہ ہمارے مخدوم ہیں، ان کا شمار ہمارے ملک کی ممتاز شخصیتوں میں ہوتا ہے۔"

وہ پچھلے ہفتے کسی کانفرنس کے سلسلے میں امریکا میں ایک ہفتہ حکیم محمد سعید کے ساتھ ایک ہی ہوٹل کے ایک ہی کمرے میں مقیم رہا تھا اور جہاں علوم و فنون کے مختلف شعبوں میں حکیم صاحب کے درک و دستگاہ کا معترف تھا، وہیں حکیم صاحب کے بعض معمولات سے بھی بہت متاثر تھا۔

"صاحب بلا کا آدمی ہے تمہارا حکیم صاحب۔ غضب کی سردی میں بھی ٹھنڈے پانی سے غسل کرتا ہے۔ ٹھنڈا شیروانی پہنتا ہے۔ ایک وقت کا کھانا نہیں کھاتا۔ روزانہ اٹھارہ بیس گھنٹے کام کرتا ہے۔ رات کو ڈائری لکھ کر بستر پر جاتا ہے۔"

وہ حکیم محمد سعید صاحب کی مصروفیات و معمولات سے کافی باخبر تھا۔ حیرت اس پر ہوئی کہ اسے یہ بات معلوم نہ تھی کہ حکیم صاحب نے پاکستان قومی اسمبلی کا الیکشن بھی لڑا تھا۔

(ضمیر جعفری کے سفرنامے "سورج میرے پیچھے" سے اقتباس۔ مطبوعہ 1995ء)

کے چیئرمین بھٹو صاحب کی ہر جلسے میں تعریف کیا کریں۔ مگر وہ تو سچائی کے علمبردار تھے۔ بھلا ایسا کیسے گوارا کرسکتے تھے۔ جب انتخابات کے نتائج سامنے آئے تو وہ بری طرح شکست کھا چکے تھے۔ اور وہ تو خود یہی چاہتے تھے۔

حکیم محمد سعید کے ساتھ دل اور تلی کے ساتھ آنکھ نے بھی بے وفائی کرنے کی کوشش کی۔ 1977ء میں مذاکرہ عالمی تعلیمی اسلامی کانفرنس کا انعقاد مکہ میں ہوا۔ پاکستان سے اس کانفرنس میں شرکت کرنے والوں میں اے کے بروہی، ڈاکٹر خیرات ابن رسا، عبدالہاشم خان اور ڈاکٹر منظور احمد کے ساتھ حکیم محمد سعید بھی شامل تھے۔ اس کانفرنس کے دوران حکیم محمد سعید کی ذاتی رائے یہ تھی کہ ساری دنیا کے مسلمان ممالک میں پرائمری تعلیم ایک جیسی ہونی چاہیے۔ وہ عملی طور پر بھی اس فکر کو ساتھیوں میں عام کرنے کے لیے کوشاں رہے۔

قیام مکہ کے دوران حکیم محمد سعید کی راتیں خانہ کعبہ میں اور دن مذاکرے کی تیاری میں صرف ہوتے۔ یہ سلسلہ چار روز تک جاری رہا۔ ایک روز ان کے ساتھ آئے ہوئے مندوب ابن رسا نے پوچھا "بھائی سعید! کیا تمہیں سونے کی عادت نہیں؟ تم مسلسل چار روز سے جاگ رہے ہو۔" حکیم محمد سعید زیرلب مسکرا کر خاموش ہوگئے۔ پانچویں رات انہوں نے مدینہ منورہ میں بسر کی۔ وہاں سے نماز فجر کے بعد روانگی ہوئی۔ گاڑی چلاتے ہوئے حکیم محمد سعید کو اچانک یوں محسوس ہوا جیسے آنکھوں کے سامنے شعلے لپک رہے ہوں۔ یہ روشنی ان کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ دائیں آنکھ بند کی مگر کیفیت پھر بھی وہی رہی۔ اسی کیفیت میں مکہ پہنچے اور پھر براستہ جدہ، لندن آگئے۔ جہاں وہ چودہ چودہ گھنٹے مطب کرنے لگے اور اس کے بعد کراچی آگئے۔ آنکھ کی تکلیف نے ہر جگہ بے چین رکھا۔ جب تکلیف برداشت سے باہر ہوئی تو ماہرین امراض چشم سے مشورے ہوئے مگر ان کی تکلیف کسی کی سمجھ میں نہ آئی۔ اسی دوران حکیم محمد سعید کو امریکا جانا پڑا۔ میزبان محمد شعیب نے ان کی آنکھ کے طبی معائنے کا پہلے ہی سے انتظام کر رکھا تھا۔ وہاں یہ حقیقت سامنے آئی کہ دائیں آنکھ کے قرنیہ میں سوراخ ہوچکا ہے اور یہ سوراخ اس قدر غیر معمولی ہے کہ آنکھ کا ڈھیلا کسی بھی وقت سامنے آسکتا ہے۔ فوری آپریشن تجویز ہوا، مگر یہاں بھی انہوں نے سوچنے کے لیے مہلت مانگی۔ بعد میں قرنیہ کے نامور سرجن ڈاکٹر بل کرٹن سے رابطہ ہوا اور آپریشن کی تاریخ مقرر ہوگئی۔

مقررہ دن حکیم محمد سعید نے سن کرنے کی دوا کے استعمال کے بغیر آپریشن کرایا اور لیزر کے گیارہ جھٹکے برداشت کیے۔ آپریشن کے اختتام پر سرجن نے حیران ہو کر کہا "کمال ہے، یہ

حوالہ جات!

1-حیات سعید از ستار طاہر۔
2-ماہنامہ قومی ڈائجسٹ، لاہور۔ جنوری 99ء۔
3-وہ بھی کیا دن تھے از مسعود احمد برکاتی۔
4-سہ ماہی انشاء، حیدرآباد۔
5-بچوں کے حکیم محمد سعید۔
6-سال گرہ از حکیم محمد سعید۔
7-حکیم محمد سعید۔ یادیں اور باتیں مرتبہ رفیع الزماں زبیری۔
8-اردو ڈائجسٹ مارچ 2002ء۔
9-سورج میرے پیچھے از ضمیر جعفری۔
10-کتابِ سعید از ڈاکٹر ظہور احمد اعوان۔
11-"درونِ روس۔ دیدوشنید" از حکیم محمد سعید۔
12-زیرو پوائنٹ از جاوید چوہدری۔
13-خبرنامہ ہمدرد۔ مختلف شمارے۔
14-روزنامہ جنگ کراچی کی متعدد اشاعتیں۔
15-روزنامہ امت کراچی کی متعدد اشاعتیں۔
16-ذاتی ملاقات از رفیع الزمان زبیری۔

عمل تو بڑا تکلیف دہ تھا مگر آپ نے اف تک نہیں کی۔"

حکیم محمد سعید نے زیرلب مسکرا کر جواب دیا "محترم! جو شاک میں پہلے اٹھا چکا ہوں وہ ان لیزر شعاعوں سے زیادہ تکلیف دہ تھے۔"

ایک جمہوری حکومت کی معزولی کے بعد جب جنرل محمد ضیاء الحق نے صدر کے عہدے کا بھی حلف اٹھالیا تو انہوں نے حکیم محمد سعید کو اپنا مشیر طب بننے کی پیشکش کی۔ حکیم صاحب نے اس پر بہت غور خوض کیا۔ وہ اس کے حق میں تو نہ تھے مگر صرف ایک مقصد ایسا تھا جس نے انہیں یہ عہدہ قبول کرنے پر آمادہ کیا اور اس خیال سے وہ اس پر آمادہ ہوئے کہ "اس عہدے پر رہ کر میں طب کے فروغ کے لیے بہتر کام کرسکوں گا۔"

حکیم محمد سعید مشیر طب بن گئے۔ ان کا یہ عہدہ وفاقی وزیر کے برابر تھا۔ اس عہدے کو قبول کرنے کے باوجود انہوں نے مطب نہ چھوڑا اور نہ ہی حکومت سے کسی قسم کی سہولت طلب کی۔ بلکہ فراہم کردہ سہولتیں بھی واپس کردیں۔ جن میں سرکاری کار، پیٹرول، ٹیلی فون اور گارڈز وغیرہ شامل تھے۔

ایک بار سرکاری خرچ کے لیے ملنے والا غیر ملکی زرمبادلہ، جس کی مالیت بیانوے ہزار روپے تھی، انہوں نے دوبارہ سرکاری خزانے میں جمع کرادیا جس پر ان کی وزارت کے ایک آفیسر نے ان سے کہا "آپ غلط روایات قائم کررہے ہیں۔"

ان کی سرکاری مصروفیات ان کی پیشہ ورانہ ذمے داریوں کی راہ میں رکاوٹ بننے لگیں تو انہوں نے ایک روز اس عہدے سے استعفیٰ دے دیا اور اس کی وجہ یہ لکھی۔

"میرے لمحات بہت قیمتی ہیں۔ میں مزید انہیں ضائع نہیں کرسکتا۔ اس لیے مجھے چھٹی دے دی جائے۔"

اگست 1981ء میں انہیں ایک سانحے سے دوچار ہونا پڑا۔ ان کی رفیقۂ حیات کا اس دن انتقال ہوا۔ ان کی شادی 1943ء میں دہلی میں ہوئی تھی۔ 1948ء میں وہ اپنے شوہر اور بچی کے ساتھ کراچی آگئیں تھیں۔ انہوں نے گھر کی تمام تر ذمے داریاں اپنے سر لے کر شوہر کو زندگی کے دیگر معاملات کے لیے آزاد کردیا تھا۔ حکیم صاحب آخری وقت تک اپنی بیوی کے ان احسانات کو نہیں بھولے۔ وہ اکثر اپنی بیگم کے اس ایثار کا ذکر کرتے تھے کہ انہوں نے "ہمدرد پاکستان" کے قیام کے لیے اپنا زیور تک بیچ دیا اور کبھی اس کا تذکرہ تک نہیں کیا۔ ایک بار حکیم محمد سعید نے کہا کہ زیور واپس لے لو تو کہا کہ میرا زیور تو آپ ہیں۔

38 سالہ رفاقت کے اس سفر میں انہوں نے ہمیشہ رات دیر تک آنے پر شوہر کا انتظار کیا اور ان سے پہلے کبھی رات کا کھانا نہیں کھایا۔ اولاد نرینہ نہ ہونے پر انہوں نے حکیم محمد سعید کو دوسری

شادی کا بھی مشورہ دیا' جو انہوں نے نہ مانا۔

1983ء کا سال حکیم محمد سعید کے لیے اہم تھا۔ خانہ کعبہ میں انہیں ایک ایسے شہر کے بسانے کا خیال آیا جو علم و حکمت کا منبع ہو اور جہاں بیک وقت تعلیم و تحقیق کی تمام تر سہولتیں میسر ہوں۔ اسی خیال کو انہوں نے زندگی کا مشن بنالیا۔ اس شہر علم و حکمت کے لیے کراچی سے چند میل دور ایک بیاباں میں 260 ایکڑ زمین خریدی گئی۔ اس جگہ کی پسندیدگی کی وجہ یہ تھی کہ تاریخی شواہد کے مطابق یہاں محمد بن قاسم کے قدم سندھ میں داخلے کے وقت سب سے پہلے پہنچے تھے۔ جب حکیم محمد سعید نے زمین خرید کر یہاں ایک شہر علم و حکمت بسانے کا خیال ظاہر کیا تو سب ہی نے حیرت سے ان کی جانب دیکھا۔ ایسی بے آباد جگہ جہاں پانی کا بھی انتظام نہ تھا' وہاں تعلیمی شہر بسانے کا خواب عقل سے ماورا لگتا تھا۔ مگر وہ تو کام کے دھنی تھے۔ ارادہ کر کے فیصلہ اللہ پر چھوڑ دیتے تھے اور خود عملی کام میں مصروف ہو جاتے تھے۔

دسمبر 1983ء کی ایک سرد شام ملک کے دانشوروں اور عالموں نے اپنے اپنے نام کی ایک اینٹ رکھ کر اس کی تعمیر کا آغاز کیا۔ کام آگے بڑھتا گیا۔ دو سال بعد ایک بڑی جامعہ ''ہمدرد یونی ورسٹی'' کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اس کے دو سال بعد 1987ء میں ہمدرد پبلک اسکول کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ جب یہ اسکول مکمل ہوگیا تو یہاں تعلیم کا آغاز ہوا۔

1991ء میں بڑی کوششوں کے بعد ہمدرد یونیورسٹی کا چارٹر منظور ہوا اور حکیم محمد سعید اس کے تاحیات چانسلر منتخب ہوئے۔ انہوں نے ڈاکٹر منظور الدین احمد کو اس کا پہلا وائس چانسلر مقرر کیا۔ یہیں ہمدرد لائبریری کا قیام بھی عمل میں آیا۔ اسے ''بیت الحکمۃ'' کا نام دیا گیا۔ یہاں پر ہمدرد سینٹر کراچی سے حکیم محمد سعید کے ذاتی ذخیرے کی تمام کتب لائی گئیں۔ اس کے ساتھ ساتھ دنیا بھر کے پبلشروں اور لائبریریوں سے خریداری اور تبادلے کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ حکیم محمد سعید کا عزم تھا کہ اسے پاکستان کی سب سے بڑی لائبریری بنایا جائے۔ اس لائبریری کا افتتاح 11 دسمبر 1989ء کو اس وقت کے صدر غلام اسحٰق خان نے کیا۔ بیت الحکمۃ کی یہ عمارت ایک لاکھ ستائیس ہزار مربع فٹ پر مشتمل ہے جو مکمل طور پر ائیر کنڈیشن ہے۔ یہاں پر کمپیوٹر' ٹیلی فون' انٹر کام' فیکس' اسکینگ مشین' انٹرنیٹ' آڈیو ویڈیو سیکشن' پروجیکٹر' اوور ہیڈ پروجیکٹر' فلم' مائیکرو فلم' مائیکرو فش' لیمی نیشن اور فوٹو کاپی کی سہولتیں موجود ہیں۔

اس لائبریری میں عربی' اردو' فارسی اور انگریزی کی تقریباً سوا چار لاکھ سے زائد کتابیں موجود ہیں۔ حکیم محمد سعید کی خصوصی توجہ تو سارے شعبوں پر ہی رہی مگر دو شعبے خصوصی طور پر پروان چڑھے۔ ان میں ایک ترجمہ قرآن ہے۔ یہاں پر 64 زبانوں پر مشتمل 359 تراجم قرآن کے نسخے ہیں۔ دوسرا شعبہ تراشہ جات کا ہے۔ جہاں تقریباً گیارہ سو موضوعات پر تراشہ جات کی فائلیں قارئین کے استفادے کے لیے موجود ہیں۔

حکیم محمد سعید کی کتاب سے محبت کا یہ واقعہ بھی یاد رکھا جائے گا کہ ایک بار ایران میں گھومتے ہوئے لب سڑک کسی پرانے کتب فروش سے انہوں نے فارسی کی ایک کتاب خریدی اور بعد میں اسے ہمدرد لائبریری کے ذخیرے میں جمع کرا دیا۔ حکیم محمد سعید اس کتاب کو بھول چکے تھے۔ ایک بار پھر اس کتاب کی کہانی گردش میں آئی جب ایران کے سرکاری علمی تحقیقی ادارے کا ایک وفد بیت الحکمۃ کا دورہ کرنے آیا۔ وہ لائبریری کی خدمات سے بے حد متاثر ہوئے۔ اسی دوران ان کی نظر فارسی شاعری کے اس مجموعے پر پڑی جو حکیم محمد سعید ایران کے پرانے کتب فروش سے خرید کر لائے تھے۔ وفد کے ارکان جان گئے کہ یہ تو ایران کے عظیم شاعر فردوسی کا خود ہاتھ سے لکھا ہوا مسودہ ''شاہنامہ'' ہے۔ وفد حکیم محمد سعید سے ملا اور اس مسوّدے کو ملک کے میوزیم میں رکھنے کے لیے مانگا۔ اس کے بدلے انہوں نے حکیم محمد سعید کو خطیر رقم کی پیشکش بھی کی مگر حکیم محمد سعید نے ان کا مطالبہ یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ یہ کتاب اب بیت الحکمۃ کی امانت ہے اور اس پر صرف اور صرف اس کے قارئین کو ہی مطالعے کا حق ہے۔

حکیم محمد سعید کا علم و ادب میں خدمت کا سفر یہاں تک محدود نہیں بلکہ انہوں نے شام ہمدرد کا پلیٹ فارم بھی اس سے قبل تشکیل دیا تھا۔ وہ تعلیمی ادارے بھی قائم کرتے جا رہے تھے۔ بچوں کی تعلیم و تربیت اور تفریح کے لیے انہوں نے 1953ء میں ہمدرد نونہال بھی جاری کیا تھا۔ 1988ء میں بزم ہمدرد نونہال کا آغاز ہوا۔ حکیم محمد سعید نے خود زندگی بھر وقت کی پابندی کو شعار بنایا تو یہ کس طرح ممکن تھا کہ وہ بچوں کو اس تربیت سے محروم کرتے۔ انہوں نے یہاں بھی پابندیٔ وقت کا درس دیا اور ہمیشہ یہ بزم مقررہ وقت پر شروع کرا دیتے تھے۔

یہ حقیقت ہے کہ پاکستان میں بچوں کے ادب پر توجہ نہیں دی گئی۔ حکیم محمد سعید کو اس کا بڑا قلق تھا۔ انہوں نے ہمدرد کے پلیٹ فارم سے اس کمی کو دور کرنے کی کوشش کی اور ریڈیو پاکستان کے سینئر براڈ کاسٹر رفیع الزمان زبیری کی خدمات حاصل کر کے ایک شعبہ نونہال ادب قائم کیا اور اس کے تحت بچوں کی کتب کی اشاعت کا آغاز کر دیا گیا۔ اس کے لیے ملک کے تمام ادیبوں سے مسودات طلب کیے گئے۔ خود حکیم محمد سعید نے بھی اس شعبے کے لیے کئی کتابیں لکھیں۔ انہیں یہ بھی اعزاز

کالم نویسوں کا خراجِ عقیدت

☆ حکیم صاحب ان لوگوں میں سے تھے جو اپنی دنیا آپ پیدا کرتے ہیں۔ دلّی کے ایک متوسط گھرانے کا لڑکا جو باپ کے سائے سے محروم، ماں اور بڑے بھائی کے سہارے دنیا کمانے نکلا تھا، اس نے اپنا سفر اس تیزی سے طے کیا کہ پھر تو دنیا پیچھے رہ گئی اور وہ علم وادب کی خدمت کا سودا سر میں لیے منزلوں پر منزلیں مارتا چلا گیا۔ افسوس! جسے دلّی کے بلوائی نہ مار سکے، اسے ہم نے مار دیا۔ (زاہدہ حنا)

☆ پاکستان کے پچاس برسوں پر نگاہ دوڑائیں تو تین عظیم ترین پاکستانی دکھائی دیتے ہیں۔ قائداعظم، ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور حکیم محمد سعید! (عبدالقادر حسن)

☆ وہ اپنی زبان سے، اپنے قلم سے، اپنی دولت سے، اپنی محنت سے، اپنے خیالات سے اس دنیا کو بدل دینا چاہتے تھے۔ اس ملک کو عظیم تر بنا دینا چاہتے تھے اور اس شہر کی روشنیوں میں اضافہ کر دینا چاہتے تھے۔ افسوس کہ جس شہر نے ان کی صلاحیتوں سے سب سے زیادہ فائدہ اٹھایا اسی کی سڑک پر ان کی لاش خون میں نہائی پڑی تھی۔ ان کی شہادت سے دورِ مسیحائی تمام ہوا۔ (نفیس صدیقی)

☆ جس کے دل میں پاکستان کی محبت تھی، جو غریبوں کا ہمدرد تھا۔ جس کے خون کے ہر قطرے میں اسلام کی عقیدت اور علم کے چراغ جل رہے تھے۔ اس گرم خون کو سڑک پر بہا دیا گیا۔ ایک خوش پوش نفیس شخص کو فرش پر گرا دیا۔ چند سکوں کی دو چٹکی بارود اور لوہے کے برادے نے مدینۃ الحکمۃ اور لاکھوں کتابوں کو ذہن میں رکھنے اور سیکڑوں کتابوں کو لکھنے والے کو خاموش کر دیا۔ (قمر علی عباسی)

تمہارے بچوں میں جو بانٹتا تھا علم کا نور
اسی منارۂ دانش کو ڈھا دیا لوگو......!

(اقبال حیدر)

ہم جو بیمار ہیں کہاں جائیں
جب مسیحائے روزگار گیا
ہوگئی بارگاہِ طب ویران
آخری بار لُٹ گیا یونان

(جون ایلیا)

حاصل ہے کہ بچوں کے لیے سب سے زیادہ سفرنامے انہوں نے ہی لکھے ہیں۔ بچوں کے لیے سب سے پہلا سفرنامہ لکھنے کا اعزاز ان کے رفیقِ خاص مسعود احمد برکاتی کو حاصل ہے۔

1993ء میں ملک کے وزیرِاعظم محمد نواز شریف مستعفی ہوئے تو سندھ حکومت میں بھی تبدیلی ہوئی۔ حکیم محمد سعید اعلیٰ حکومتی اداروں کے بے حد اصرار اور ملکی مفاد میں سندھ کے گورنر بنے۔ وہ تقریباً چھ ماہ اس عہدے پر فائز رہے۔ اس دوران انہوں نے صوبے میں جامعات کے اضافے کے لیے کوششیں کیں اور کامیاب بھی رہے۔ ان کے دور میں چار نئی جامعات کو چارٹر ملے۔ اس کے علاوہ تعلیمی مسائل کے حل کے لیے انہوں نے ماہرینِ تعلیم اور محکمۂ تعلیم کے ذمے داران پر مشتمل ایک تعلیمی گول میز کانفرنس بھی بلائی۔

15 دسمبر 1994ء کو کراچی کے ایک ہوٹل میں یونیسف کی بچوں سے متعلق ایک رپورٹ کی تعارفی تقریب تھی جس کی صدارت نثار کھوڑو کر رہے تھے۔ حکیم محمد سعید کو بھی اس تقریب میں بطورِ خاص بلایا گیا تھا۔ انہوں نے اس تقریب میں نونہالانِ پاکستان کی بے بسی پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''جب بھوک اور فاقہ کشی کے شکار نحیف و نزار بچے کوڑوں کے ڈھیر پر غذا تلاش کرتے نظر آتے ہیں تو میرا دل خون کے آنسو روتا ہے۔ کوئی ان کا پرسانِ حال نہیں۔ کوئی ایسا نہیں جو ان کے دکھوں کا مداوا کر سکے۔ اگر ہم نے اس وقت قوم کے ان نونہالوں کے حال پر توجہ نہیں دی تو انسانیت کے بنیادی مسائل اور گمبھیر ہو جائیں گے۔''

تقریب کے اختتام پر حکیم محمد سعید اپنے دوستوں کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھے کہ ایک صحافی ان کے پاس آیا اور نہایت رازداری کے ساتھ اپنا پیجر ان کے سامنے کر دیا۔ پیجر پر

ابا جان

دفتر میں ابا جان ایک ڈسپلن قائم رکھتے تھے۔ میں پہلے دن آئی تو انہیں مخاطب کرتے ہوئے میرے منہ سے ''ابا جان'' نکل گیا عادت جو ابا جان کہنے کی پڑی ہوئی تھی۔ انہوں نے فوراً مجھے ٹوک دیا۔ ''دفتر میں' میں ابا جان نہیں ہوں۔'' میرے لیے اتنا ہی جملہ کافی تھا۔ اس کے بعد تو چیئر مین صاحب اور حکیم صاحب کہنے کی ایسی عادت پڑی کہ گھر میں بھی یہی کہنے لگی۔ میں ان کو دیکھتی تھی کہ وہ کیا چاہتے ہیں اور وہی کرتی تھی۔ میرا جی نہیں چاہتا تھا کہ وہ مجھے کچھ کہیں۔ ساری دنیا مجھے کہہ لے' مجھے پروا نہیں تھی لیکن میں یہ نہیں چاہتی تھی کہ ابا جان مجھے کچھ کہیں۔

ابا جان کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے اپنے رفقائے کار سے مشورہ ضرور کرتے تھے۔ وہ شورائیت کے قائل تھے۔ جو لوگ ان کے اعتماد میں تھے وہ ان سب کی رائے سنتے تھے۔ ان پر غور کرنے کے بعد فیصلہ کرتے۔ ایک دفعہ فیصلہ کرلیتے تو بس اس پر قائم رہتے۔ آخری دنوں میں تو انہوں نے مجھ سے یہ کہا کہ مجھے اپنی نیند کا ایک گھنٹا اور کم کرنا پڑے گا۔ میں نے کہا آپ یہ کیسے کریں گے۔ چار گھنٹے تو آپ سوتے ہیں' تین گھنٹے سو کر آپ فنکشن کس طرح کریں گے۔ وہ کہنے لگے نہیں مجھے کام بہت ہے۔ مجھے اپنی نیند کا ایک گھنٹا کم کرنا ہی پڑے گا۔

جب غیر ملکی کرنسی پر پابندیاں تھیں اور بیرونی سفر کے لیے اسٹیٹ بینک سے مقررہ زرمبادلہ ملتا تھا تو ابا جان سفر سے واپس آکر بچا ہوا ایک ایک ڈالر واپس کر دیتے تھے۔ بعض اوقات تو جتنا فارن ایکسچینج لے گئے ہیں' وہ سارا کا سارا واپس کر دیا ہے۔ ان کا کوئی ''فارن اکاؤنٹ'' نہیں تھا۔ انہیں بین الاقوامی کانفرنسوں میں بلایا جاتا اور سفر خرچ پیش کیا جاتا تو وہ لکھ دیتے کہ اس کی ضرورت نہیں' میں اپنے خرچ پر آؤں گا۔ کانفرنسوں اور سیمیناروں میں مقالوں پر اچھا خاصا معاوضہ پیش کیا جاتا' مگر وہ اسے قبول نہیں کرتے۔ کہہ دیتے علمی کاموں کا معاوضہ لینا مجھے پسند نہیں۔

ابا جان کی کسی سے دشمنی نہیں تھی۔ انہوں نے کبھی کسی کا برا نہیں چاہا۔ کسی کو تکلیف نہیں پہنچائی۔ ہمیشہ لوگوں کے ساتھ بھلائی کی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا ایسے اجلے اور بھلے' نیک نفس انسان پر کیسے گولیاں چلائی گئیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ خدمت کرنے والے امر ہو جاتے ہیں۔ وہ امر ہو گئے ہیں۔

(سعدیہ راشد)

پیغام تھا۔

''حکیم سعید کو گولی ماردی گئی!''

انہوں نے یہ پڑھ کر ایک زبردست قہقہہ لگایا۔ اس پر وہ صحافی ہی نہیں آس پاس موجود دیگر دوست واحباب بھی انہیں غور سے دیکھنے لگے۔ اتنے میں ہوٹل کا منیجر پریشانی کے عالم میں آیا اور کہنے لگا ''سر ہوٹل میں ٹیلی فون کالوں کا تانتا بندھ گیا ہے اور ہر کوئی آپ کے بارے میں معلوم کر رہا ہے۔'' یہ بات آناً فاناً ہوٹل میں موجود تمام ہی لوگوں کو معلوم ہو گئی اور وہ حکیم محمد سعید کے قریب آتے گئے' اور ان سے خیریت دریافت کرنے لگے۔ وہ ہنس کر سب کو جواب دیتے۔ دوسری جانب ہمدرد سینٹر میں بھی پاکستان کے ہر کونے اور دنیا بھر سے حکیم محمد سعید کی خیریت دریافت کرنے کے لیے فون آنے لگے اور وہاں موجود عملہ انہیں مطمئن انداز میں جواب دیتا رہا۔ یہی عالم اخبارات کے دفاتر میں بھی رہا۔

ریڈیو پاکستان کراچی نے عوام میں پھیلی بے اطمینانی اور حکیم محمد سعید سے ان کی محبت دیکھ کر فوری طور پر حکیم محمد سعید کا اپنی خیریت کے بارے میں پیغام ریکارڈ کیا اور ریڈیو کی جاری نشریات میں ہر گھنٹے بعد نشر کرتے رہے۔

اس افواہ کے بعد حکیم محمد سعید مطب کرنے جس شہر بھی گئے' لوگ بے اختیار ان سے لپٹ گئے۔ حکیم محمد سعید کی آنکھوں سے اس وقت آنسو رواں ہو جاتے اور ان کا دل فرطِ مسرت سے بھر آیا۔ وہ خود کو خوش قسمت انسان تصور کر رہے تھے کہ لوگ ان سے کس قدر محبت کرتے ہیں۔ اس افواہ پر ان کا تبصرہ تھا۔

''یہ افواہ دراصل پاکستان میں میری عوامی مقبولیت کا ایک جائزہ تھا۔ ان افواہ گروں کے ذہن میں بھی نہ تھا کہ افواہ بجلی کی لہروں کی طرح پاکستان کے کونے کونے تک پہنچ جائے

افکارِ سعید

☆ "ہم نے زبان سے اقرار کیا ہے مگر اپنے تسلسلِ عمل سے اس حقیقت کی نفی کی ہے کہ نونہال بھی پاکستان کا عنوان ہیں۔ نونہالوں کی عظمت پاکستان کی عظمت و رفعت ہے۔ اگر ہم نے اپنے نونہالوں کو عظیم نہ بنایا تو پاکستان عظیم و رفیع نہیں بن سکتا۔ گزشتہ پچاس سال سے ہم پورے ظلم و تسلسل کے ساتھ نونہالوں کو جہل اور جہالت کی نظر کرتے رہے ہیں۔ ہم نے نہایت بے شرمی کے ساتھ گولڈن جوبلی منائی مگر ہم نے 95 فیصد نونہالوں کو تعلیم و تربیت سے محروم کر رکھا ہے۔ اگر آج پاکستان حقیر، فقیر اور سراپا تقصیر ہے تو اس کی وجہ تربیت و تعلیم نونہالان سے غفلت ہے۔"

☆ "ہمیں ہر حال میں یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ انگریزی عالمی زبان کو ثانوی تعلیم میں اختیار کیا جائے۔ دنیا کا ہر آزاد ملک ابتدائی تعلیم قومی زبان میں دیتا ہے۔ جرمنی کئی دہائیوں تک انگریزوں کے زیرِ اثر رہا اور امریکا کا ماتحت رہا مگر ذریعہ تعلیم جرمن زبان ہی رہی۔ یہی حال جاپان کا ہے، چین کا ہے اور دنیا کے ہر ملک کا ہے۔ ہم نے پاکستان میں ابتدائی تعلیم کے لیے انگلش میڈیم کی اجازت دے کر پاکستان کی اساس اور بنیاد کو نقصان پہنچایا ہے اور تہذیبِ مغرب کو ہوا دی ہے۔"

☆ اگر پاکستان میں روزِ اول سے نافع اور اسلامی تعلیم کا آغاز کر لیا جاتا تو آج پاکستان کا شمار دنیا کے عظیم ممالک میں ہوتا اور اقوام و ملل پاکستان کا اتباع کرتیں۔ مگر پاکستان میں ہم نے نافع تعلیم اور اسلامی تعلیم سے صرفِ نظر کیا۔ گناہ بر گناہ یہ کہ پوری قوم کو جہالت کی تاریکیوں کے حوالے کر دیا۔

☆ آج ریاست اسلامی پاکستان میں ایک حشر برپا ہے۔ ایک قیامت ہے کہ پاکستان پر ٹوٹ پڑی ہے۔ اقتدار ہو کہ اختلاف، سیاست ہو کہ صحافت، امامت ہو کہ امارت۔ سب کے سب دولت کے پجاری بنے ہوئے ہیں۔ اس سے بڑی قیامت بھی بھلا کوئی ہو سکتی ہے کہ ہر انسان اپنا ایمان فروخت کرتا چلا جا رہا ہے۔ ہر شخص اپنی خودداری کا نیلام عام کر رہا ہے اور دولتوں کے انبار لگائے چلا جا رہا ہے۔ اپنی آزادی فروخت کر رہا ہے اور پاکستان کی آزادی سے کھیل رہا ہے۔ دولت کو دیکھ رہا ہے اور پاکستان سے آنکھیں بند کیے چلا جا رہا ہے۔

☆ "دشمن اسلام کو نیست و نابود فرما، جیسی دعاؤں کے لیے آج بھی ہمارے ہاتھ بلند و دراز ہیں مگر اللہ تعالیٰ کیسے ان دعاؤں کو شرفِ قبولیت بخشے گا۔ جبکہ وہ دیکھ رہا ہے کہ پورا عالم عرب و اسلام روحِ فکر سے خالی ہو چکا ہے۔ روحِ عمل سے بیگانہ ہو چکا ہے۔ تعلیماتِ قرآنِ حکیم سے غافل ہو چکا ہے۔ عبادتِ الٰہی سے عاری ہو چکا ہے۔ سنتِ نبوی کو فراموش کر چکا ہے۔"

☆ "پاکستان میں گزشتہ پچاس سال سے تعلیم کے ساتھ جو مذاق جاری ہے اس نے پاکستان کو آج غلامی کی ذہنی زنجیروں میں جکڑ دیا ہے۔ تعلیم ہی فقط وہ ہتھیار ہے، جس کی طاقت سے قلوب فتح کیے جاتے ہیں۔ فکرِ اغیار پر قابو حاصل ہوتا ہے۔ حفظ حریت وطن کا جذبہ فراواں ہوتا ہے۔ خودی اور خودداری کا تصور قائم رہتا ہے۔"

☆ "کیا یہ حیرت کی بات نہیں ہے مقامِ غیرت نہیں ہے کہ ہم پاکستان میں پچاس سال سے 27 رمضان اور قیام پاکستان کی اہمیت سے قطعاً صرفِ نظر کر رہے ہیں۔ اس سے بڑی بدبختی بھی کیا اور ہو سکتی ہے کہ منشائے الٰہی 27 رمضان قیام پاکستان ہے اور ہم 14 اگست کو ترک کرنے کے لیے تیار نہ کل تھے اور نہ آج ہیں!"

گی۔ خود مجھے بھی یہ اندازہ نہ تھا۔ اب ان افواہ سازوں کو میرے قتل کے لیے زیادہ غور کرنا پڑے گا۔"

ایک بار حکیم محمد سعید نے چند غیر ملکی حضرات کے اعزاز میں ایک بڑے ہوٹل میں دعوت کا اہتمام کیا۔ کفایت شعاری کے خیال کے پیشِ نظر فیصلہ یہ کیا گیا کہ ہمدرد کے کارکنان اس ہوٹل میں کھانا نہیں کھائیں گے۔ ان کے لیے الگ انتظام کیا گیا تھا۔ ڈائریکٹر انفارمیشن سید رحمٰن علی کو یہ بات ناگوار گزری۔ انہوں نے اپنے ہم خیال ساتھیوں سے کہا کہ وہ کھانا ہی نہ کھائیں۔ جب حکیم محمد سعید کو یہ اطلاع ملی تو وہ مسکراتے ہوئے آہستہ آہستہ کارکنان کے قریب آئے اور سید رحمٰن علی سے مخاطب ہو کر کہا "آج بھوک لگ رہی ہے۔ بہتر ہے کہ کھانا ابھی اور اسی ہوٹل میں کھالیا جائے۔"

رحمٰن علی نے حیرت کے انداز میں انہیں دیکھا اور بڑی مشکل سے ایک جملہ کہا "مگر حکیم صاحب......! آپ تو دوپہر کا کھانا کھاتے ہی نہیں......!"

"کبھی کبھار احباب کے ساتھ کھالینے میں لطف آتا ہے۔" ان کا جواب تھا۔ اس کے ساتھ ہی کھانا بھی لگ گیا اور پھر سب نے ساتھ ہی اس ہوٹل میں کھانا کھایا۔ خود حکیم محمد سعید

3 جون اور ہمدرد

☆ 3 جون 1947ء کو ریڈیو دہلی سے تقسیم ہند کا منصوبہ پیش ہوا۔ یہ تاریخ ہمدرد کے لیے بھی اہم ہے۔
☆ 3 جون 1948ء کو کراچی میں حکیم محمد سعید کے ہاتھوں ہمدرد کا قیام عمل میں آیا۔
☆ 3 جون 1991ء کو صدر پاکستان کے ہاتھوں حکیم محمد سعید کو ہمدرد یونیورسٹی کا چارٹر ملا۔
☆ 3 جون 1998ء کو وزیر اعلیٰ پنجاب کے ہاتھوں ہمدرد مرکز، ہمدرد مطب اور ہمدرد کانفرنس سینٹر کا افتتاح ہوا۔

نے آم کی چند قاشیں ہی کھائیں اور وہ اپنے ساتھیوں کو کھاتا دیکھ کر خوش ہوتے رہے۔ بعد میں جب ساتھیوں کو اصل حقیقت معلوم ہوئی تو وہ بڑے شرمندہ ہوئے۔ حکیم محمد سعید نے ثابت کر دیا کہ جب احباب کی دل شکنی ہو رہی ہو تو اصولوں کو قربان کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

ایک واقعہ پشاور کے مطب میں پیش آیا۔ ایک معمر خاتون اپنی باری پر ان کے مطب میں آئی۔ اس کے پاؤں میں شدید تکلیف تھی۔ طبیب نے مریض کے گھریلو حالات بھی معلوم کیے تاکہ درد کے اصل اسباب تک پہنچا جا سکے۔ مریضہ نے بتایا کہ وہ بیوہ ہے اور اپنا اور بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے اسے سلائی مشین پر بیٹھ کر کام کرنا پڑتا ہے۔ جسے پاؤں سے چلایا جاتا ہے۔ مرض کی نوعیت کے پیش نظر حکیم محمد سعید نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ سلائی مشین میں موٹر لگوا لیں۔

موٹر کا سن کر مریضہ نے کہا ”اتنے پیسے کہاں سے لاؤں کہ موٹر لگوا سکوں۔“ حکیم محمد سعید نے دل جوئی کے انداز میں اس سے گھر کا پتا معلوم کیا۔ ان کے مخصوص اشارے پر ان کے معاون یہ پتا لکھ رہے تھے۔ جب وہ خاتون مطب سے باہر نکلیں تو انہوں نے حکم دیا کہ ”رات ہونے سے قبل ان خاتون کی سلائی مشین میں موٹر لگ جانی چاہیے۔“

حکیم محمد سعید ایک انقلابی انسان تھے۔ قتل کی افواہ جیسے منفی پروپیگنڈے سے ان کے اندر مثبت تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ انہوں نے پہلے سے زیادہ پاکستان کی خدمت کرنے کو اپنا شعار بنایا۔ وہ پاکستان میں موجود سماج دشمن عناصر کے خلاف سینہ تان کر ڈٹ گئے۔ اب تقریر کے ساتھ ساتھ انہوں نے تحریر کی رفتار بھی تیز کر دی۔ ایک بار انہوں نے اپنے ساتھی رفیع الزماں زبیری سے کہا کہ مجھے بہت کام کرنا ہے اس لیے میں سوچ رہا ہوں کہ اپنی نیند کا ایک گھنٹا کم کر دوں۔ زبیری صاحب فکر مند ہوئے اور کہا ”حکیم صاحب آپ پہلے ہی نیند کم لے رہے ہیں۔ کہیں اس کے مضر اثرات آپ کی صحت پر نہ پڑیں۔“

انہوں نے جواب دیا ”اللہ مالک ہے!“ ان کی اکلوتی بیٹی سعدیہ راشد بھی ان کے اس فیصلے سے پریشان ہوئیں۔

حکیم محمد سعید ارسطو کے اس قول کی انسانی شکل تھے کہ ”کسی بھی پیشے میں کامیابی اور مہارت کے لیے تین چیزیں لازمی ہیں۔ فطرت (قدرتی صلاحیتیں اور عادات)، مطالعہ اور پھر اس پر عمل۔“

وہ اپنی تحریر و تقریر کے ذریعے پاکستان اور اسلام کو نقصان پہنچانے والوں کے خلاف سرگرم عمل ہو گئے۔ قومی اخبارات کے ساتھ پندرہ روزہ آواز اخلاق میں، جس کے وہ خود مدیر تھے، ان کے مضامین تواتر کے ساتھ شائع ہونے لگے۔

17 اکتوبر 1998ء کی صبح کا آغاز ہونے والا تھا۔ وہ روزہ کی نیت کر کے نماز فجر کی ادائیگی کے بعد اپنی گاڑی میں آرام باغ مطب کی جانب روانہ ہوئے۔ ہر ہفتہ اور اتوار کو آرام باغ میں مطب کرنا ان کا معمول تھا۔ آج بھی مطب میں مریضوں کا جم غفیر تھا جو اپنے مسیحا کی آمد کے منتظر تھے۔ گاڑی مطب کے پاس رکی۔ گاڑی کا دروازہ کھولنے کے لیے ایک کارکن آگے بڑھا۔ حکیم محمد سعید گاڑی سے اترے اور اپنی ٹوپی کارکن کے حوالے کرتے ہوئے آگے بڑھنے کے لیے ابھی ایک قدم ہی اٹھایا تھا کہ تین جانب سے ان پر فائرنگ ہوئی اور وہ اپنے کارکن کے ساتھ ہی زمین پر گر پڑے۔ ان کی صاف شفاف سفید شیروانی خون میں نہا گئی۔ حکیم محمد سعید کی روح اسی وقت قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ ان کا کارکن بھی ان پر قربان ہو کر موت کی آغوش میں جا سویا تھا۔

ادھر مریضوں کے لیے یہ منظر انتہائی صدمہ اور دکھ کا باعث بنا اور کیوں نہ ہوتا ان کا مسیحا، ان کا ہمدرد آج ان کے سامنے خون میں نہا گیا تھا۔ حکیم محمد سعید کی شہادت نے ملکی اور بین الاقوامی طور پر سب کو ہلا کر رکھ دیا۔ وہ کوئی معمولی موت نہیں تھی بلکہ ایک عہد ساز شخصیت کی موت تھی۔ انہوں نے تشکیلِ پاکستان میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

ان کی آخری خواہش تھی۔

”میں ایسے حال میں فرشتۂ اجل کا استقبال کرنا چاہتا ہوں کہ میری نگاہوں کے سامنے ہمدرد اسکول اور الفرقان میں پانچ ہزار بچے تعلیم پا رہے ہوں۔ ہمدرد یونیورسٹی امتیازات کے ساتھ ہزارہا جوانوں کو انسان کامل بنا رہی ہو۔ یہ جوان دنیا بھر میں پھیل کر آواز حق بلند کرنے کی تیاری میں کمر بستہ ہوں۔“

اسی دن شام کو انہیں ان کی متعین کردہ جگہ پر مدینۃ الحکمۃ میں دفن کر دیا گیا۔

لو وصل کی ساعت آ پہنچی پھر حکم حضوری پر ہم نے
آنکھوں کے دریچے بند کیے اور سینے کا در باز کیا

محمد حسین آزاد

انشاپرداز

تحریر و تحقیق: ساجد امجد

اردو کے عناصرِ خمسہ میں ایک اہم نام جس کی زبان پروری اور انشا پردازی مسلم الثبوت ہے۔ وہ حالی، شبلی، سرسید کے ہمعصر اور غالب و ذوق کا زمانہ دیکھ چکے تھے۔ جدید اردو نظم کی ترقی و ترویج میں خصوصی حصہ لیا، اردو نثر کو ایک نئے اسلوب و آہنگ سے روشناس کیا۔ فنِ تاریخ نگاری میں ممتاز مقام حاصل کیا۔ اپنے محترم استاد محمد ابراہیم ذوق کی شاگردی کا حق ادا کر دیا۔ ورنہ آج شاید ذوق اس مقام پر فائز نظر نہ آتے جہاں ہیں۔

بے مثل انشا پرداز شمس العلما محمد حسین آزاد کی سرگزشت

زمانہ فراغت کے تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا لیکن اس تکیے میں بے سکونی کی روئی بھری ہوئی تھی جو کسی وقت بھی بے چینی کی چنگاریوں میں تبدیل ہو سکتی تھی۔

اکبر شاہ ثانی کے بعد بہادر شاہ ظفر تختِ شاہی پر جلوہ افروز ہو چکے تھے۔ مجبوریوں اور بے چارگیوں کے کشکول میں شاہی ٹھاٹ باٹ اپنی آخری بہار دکھا رہے تھے۔

انگریزوں کی چیرہ دستیاں روز بروز بڑھتی جا رہی تھیں لیکن شاہی سرپرستی میں تمدنی بہار ابھی تک اپنا رنگ جمائے ہوئے تھی۔ مدرسے آباد تھے، مشاعروں کی محفلوں پر شباب تھا۔ تشنگانِ علم کے لیے یہ شہر، شہرِ بغداد تھا۔

کروٹیں بدلتے ہوئے وقت نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ اب فارسی کے دامن میں اردو کے پھول کھلنے کا وقت آ گیا ہے۔ فنِ طباعت کی ترقی نے علم و فضل کی اشاعت کو تیز تر کر دیا تھا۔

بہادر شاہ ظفر کی تخت نشینی سے ایک سال قبل ۱۹۳۶ء میں دلی میں رہنے والے ایک شخص مولوی محمد باقر نے دہلی اردو اخبار کی بنیاد رکھی جو شمالی ہند کا پہلا اور ہندوستان کا دوسرا اخبار تھا۔ اس سے اگلے سال سرسید احمد خان کے بڑے بھائی سید محمد خان نے سید الاخبار کا اجرا کیا۔ اس کے بعد صادق الاخبار اور گلِ رعنا بھی سامنے آ گیا۔

ان اخباروں کی وجہ سے دلی کے عوام میں بیداری کی لہر دوڑ گئی اور وہ دنیا کے حالات سے باخبر ہونے لگے۔ انہی اخباروں کی بدولت عوام کو سیاسی شعور ملا اور انہیں احساس ہوا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا بڑھتا ہوا اقتدار کتنی خطرناک چیز ہے۔ انہی اخباروں کی وجہ سے عمل اور ردِعمل ایک ساتھ سفر کرتے ہوئے نظر آنے لگے۔ فراغت کے تکیے میں بے چینی کی چنگاریاں گرم ہونے لگیں۔

○☆○

مولوی باقر ایک علمی گھرانے کے فرد تھے۔ ابتدائی تعلیم سے فراغت کے بعد وہ میاں عبدالرزاق کے درس میں شرکت کرنے لگے۔ یہیں ان کی ملاقات شیخ ابراہیم ذوق سے ہوئی۔ یہ ملاقات پُرخلوص دوستی میں تبدیل ہو گئی۔ دونوں کو ایک دوسرے کے بغیر چین نہ آتا تھا۔

ذوق نے شاعری کا سنگھاسن سنبھالا اور مولوی باقر نے دہلی کالج کی مدرسی اور بعد میں اخبار کا اجرا۔

دوستوں کی محفل میں بچوں کو لے جانے کا رواج نہیں تھا لیکن مولوی باقر اپنے بیٹے محمد حسین کی ذہانت کو دیکھتے ہوئے کبھی کبھی اسے بھی اپنے ساتھ میاں ذوق کے پاس لے

جاتے تھے۔ اسے بھی یہ صحبت ایسی پسند آئی کہ ضد کرکے وہاں جانے لگا۔ ذوق کی محفل میں شاعری کے سوا کیا تھا۔ یہ بچہ ایک ایک کی صورت تکتا اور پڑھے جانے والے اشعار کو سمجھنے کی کوشش کرتا۔ اکتاہٹ اور بیزاری ایک پل کو بھی اس کے چہرے پر اپنی جگہ نہ بناتی۔

بن ماں کا یہ بچہ اپنی پھوپی کے دامنِ تربیت سے وابستہ تھا اور اپنے دادا مولوی اکبر کے ساتھ مکتب جایا کرتا تھا۔

مولوی باقر کاروباری آدمی تھے اس لیے انہیں اتنی فرصت کہاں تھی کہ محمد حسین کی نوشت و خواند کی طرف توجہ کرسکتے البتہ جب وہ مکتب کی تعلیم ختم کرچکا اور اپنی عمر سے زیادہ علم حاصل کرچکا تو اس کے شوقِ علمی کے چرچے ہونے لگے۔

ایک دن وہ گھر میں رکھے ہوئے اخبار کو پڑھتا بھی جاتا تھا اور خبروں پر تبصرے بھی کرتا جاتا تھا۔ اتفاق سے مولوی باقر کا گزر ہوا۔ اس کے تیکھے تیکھے تبصرے سن کر ان کے قدم رک گئے۔

"ارے بھائی، یہ پھوپی بھتیجے میں کیا سیاست ہو رہی ہے۔"

"جایئے بھی آپ کو کیا" ان کی بہن نے کہا "آپ کو تو محمد حسین کی تعلیم کی کچھ فکر ہی نہیں۔ وہ اپنا شوق الا بلا کتابیں پڑھ کر پورا کرتا رہتا ہے۔ خود دہلی کالج کے مدرس رہ چکے، اخبار نکالتے ہیں، اب کچہری میں بیٹھتے ہیں، مولوی کہلاتے ہیں اور بیٹے کی فکر ہی نہیں۔ مجھے جو بنانا تھا، میں نے اسے بنادیا۔ اب آپ کی اولاد ہے آپ جانیں۔"

"تم کیا سمجھتی ہو۔ مجھے اس کی فکر نہیں ہے؟ ایک ہی تو بیٹا ہے میرا۔ میں نے اس کے لیے کیا سوچا ہے، یہ آکر بتاؤں گا۔"

وہ ان دنوں کلکٹر کے دفتر میں ملازم تھے اور اس وقت دفتر جانے کے لیے ہی تیار ہو رہے تھے۔ اخبار پر ابھی ان کا نام نہیں چھپتا تھا۔ اخبار کی دیکھ بھال بھی دوسرے ہی لوگ کرتے تھے۔

وہ دفتر جانے کے لیے گھر سے نکل گئے تو ان کی بہن ان کی واپسی کا انتظار کرنے بیٹھ گئیں کہ دیکھو کب آتے ہیں اور کیا نوید سناتے ہیں۔

مولوی باقر دوپہر تک تو دفتر کے کاموں میں پھنسے رہے پھر اپنے اخبار کے دفتر میں پہنچ گئے۔ کچھ احباب وہاں آگئے تھے ان سے ملے پھر استاد ذوق کی طرف نکل گئے۔ چراغ جل چکے تھے کہ وہ گھر لوٹے۔

"لو بھائی، ہم نے محمد حسین کے بارے میں سوچ لیا کہ کیا کرنا ہے۔ ہم اسے دہلی کالج میں داخل کرائیں گے۔"

"اے لو! اسے وہاں داخل کراؤ گے؟ وہاں تو موئی انگریزی بھی پڑھائی جاتی ہے" محمد حسین کی پھوپی نے کہا۔

"اسی لیے تو میں اسے وہاں داخل کرا رہا ہوں۔ ویسے بھی جو انگریزی پڑھنا چاہتا ہے، وہ پڑھتا ہے۔ میں تو اسے مشرقی علوم کے شعبے میں بٹھاؤں گا۔"

"پھر یہی کالج کیا ضروری ہے؟"

"تم گھر میں بیٹھنے والی ہو، تمہیں کیا معلوم۔ اس کالج میں مشرقی علوم کے ساتھ ساتھ علوم جدیدہ کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ ضابطہ دیوانی، الجبرا، تاریخ اور جغرافیہ وغیرہ کی تعلیم حاصل کرکے طالب علم لکیر کا فقیر نہیں رہ جاتا۔ اب زمانہ بدل رہا ہے۔ ایک یہی کالج ہے جہاں قدیم و جدید کی آمیزش ملتی ہے۔ محمد حسین کے جوہر خوب کھلیں گے۔ جتنے لائق اساتذہ ہیں۔ اتنی ہی کار آمد تعلیم ہے۔"

"میں نے سنا ہے وہاں کا پرنسپل ہمیشہ انگریز ہوتا ہے۔"

"بھئی انگریزوں نے ادارہ قائم کیا ہے۔ پرنسپل تو انگریز ہوگا لیکن ایسے لوگوں کا تقرر کیا جاتا ہے جو مشرقی علوم کے ماہر ہوتے ہیں۔ بس میں نے سوچ لیا ہے، اسے وہیں داخل کراؤں گا۔ میاں ذوق کا بھی یہی خیال ہے۔"

"وہ شاعر آدمی، انہیں کیا معلوم؟"

"وہ شاعر ضرور ہیں لیکن قلعے سے ان کا تعلق ہے۔ بدلتے ہوئے حالات پر ان کی گہری نگاہ ہے۔ وہ جانتے ہیں، ہوا کس طرف کی ہے۔"

یہ بحث زیادہ طول نہ پکڑ سکی۔ اولاد تو ان کی تھی، پھوپی کو کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ محمد حسین دہلی کالج میں داخل ہوگیا۔

یہاں کے اساتذہ کی قابلیت اور ہم جماعتوں کی صحبت نے بہت جلد محمد حسین کے پوشیدہ جوہروں کو ابھارنا شروع کردیا۔

کالج کی طرف سے مضمون نویسی کا مقابلہ ہوا۔ عنوان تھا "اسلامی اور انگریزی حکومتوں کے تحت آزادیِ رعایا کے بارے میں کیا فرق تھا۔"

محمد حسین کو اخبارات کے مطالعے سے مضمون نگاری کا ڈھنگ آگیا تھا۔ ایک عام طالب علم کے مقابلے میں اس کے پاس معلومات کا خزانہ بھی زیادہ تھا۔ اس نے اس مقابلے کے لیے مضمون لکھا اور خوب لکھا۔ اس کے مضمون کو پہلے

انعام سے نوازا گیا۔

وہ جو ایک جھجک سی اس کے دل میں تھی، وہ نکل گئی۔ اسے یقین آ گیا کہ وہ مضمون نگاری کر سکتا ہے۔ جب کالج میں ایک اور انعامی مقابلہ ہوا تو اس نے پھر مضمون لکھا۔ اس مرتبہ بھی اس کا مضمون سب سے بہتر قرار پایا۔

کالج کے علمی ماحول سے اس کی صلاحیتیں چمکنے لگی تھیں۔ اس ماحول کے ساتھ ساتھ استاد ذوق کا سایۂ عاطفت بھی اسے میسر تھا۔ ذوق کو صحتِ زبان کا خاص ذوق تھا۔ گفتگو میں لفظی بحثیں کرتے بھی تھے اور اشعار میں اس کا علمی اظہار بھی ہوتا تھا۔ ان کی صحبت سے اسے بھی الفاظ کی تراش خراش کا شوق ہوا۔ زبان دانی کا یہ جنون اسے ہر شام ذوق کی خدمت میں پہنچا دیتا۔ جب وہ ٹہلنے کے لیے نکلتے تو وہ بھی ساتھ ہوتا۔ ذوق باتیں کرتے جاتے۔ مضامین کتابی، خیالات علمی افادہ فرماتے اور وہ سنتا جاتا۔

ایک دن جو وہ ٹہلنے کے لیے نکلا تو ذوق، بادشاہ کے لیے غزل کہنے میں مصروف تھا۔

"تم بھی تو کچھ کہو" انہوں نے کہا۔

"میں کیا عرض کر سکتا ہوں۔"

"میاں اسی طرح آتا ہے۔ ہوں ہاں، غوں غاں، کچھ تو کہو۔ کوئی مصرع ہی سہی۔"

محمد حسین نے کچھ دیر سوچنے کے بعد ایک شعر موزوں کر لیا۔

آ جائے اگر ہاتھ تو کیا چین سے رہیے
سینے سے لگائے تری تصویر ہمیشہ

"ہاں درست ہے" ذوق نے کہا۔ ساتھ ہی اس مسرت کا بھی اظہار کیا کہ وہ شعر کہہ سکتا ہے "تم شعر کیوں نہیں کہتے؟"

"کہتا تو ہوں، آپ کو دکھانے کی ہمت نہیں ہوتی۔"

"واہ، میاں! یہ اچھی کہی، اب کے آنا تو کوئی غزل لے کر آنا، ہم بھی تو سنیں۔"

اس کا میلان نثر کی طرف زیادہ تھا لیکن ذوق کی صحبت نے شاعری کا رنگ چڑھا دیا۔ اس نے اپنے لیے آزاد تخلص انتخاب کیا اور استاد کے ساتھ مشاعروں میں جانے لگا۔ تحقیق و تجسس اور زبان دانی کے شوق نے اسے ابتدا ہی میں قادر الکلام اور پختہ کار بنا دیا۔ تنقیدی نظر ایسی تھی کہ استاد ذوق انہیں اپنے اشعار سنا کر اس کی داد کے منتظر رہتے تھے۔

ذوق اپنا کلام آزاد کے والد کے پاس جمع کراتے تھے۔ آزاد نے جب شاعری کے خارزار میں قدم رکھا تو یہ بارِ گراں

سوانحی خاکہ

نام۔ ☆ ۔محمد حسین
تخلص۔ ☆ ۔آزاد
خطاب۔ ☆ ۔شمس العلما
والد۔ ☆ ۔مولوی سید محمد باقر
پیدائش۔ ☆ ۔۱۰ جنوری ۱۸۳۰ء
وفات۔ ☆ ۔۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء
مدفن۔ ☆ ۔لاہور، نزد گامے شاہ

اپنے ذمے لے لیا۔ اب استاد کا دیوان اس کے گلے کا تعویذ تھا کہ ایک دم کے لیے آنکھ سے اوجھل نہ ہوتا تھا۔ جہاں کہیں ان کا کوئی غیر معروف شعر سنتا، فوراً لکھ لیتا اور تصدیق کے لیے استاد کے پاس لے جاتا۔ کتنے ہی ایسے اشعار اور ادھوری غزلیں جو ذوق کو بھی یاد نہیں رہی تھیں، ادھر ادھر سے جمع کر کے دیوان میں داخل کر دیں۔ شیفتگی اور عقیدت کی یہ وہ منزل تھی جس کے قدرداں خود ذوق بھی تھے لہٰذا وہ بھی ہر وقت اسے اپنے ساتھ لگائے رہتے تھے۔ ایک دن وہ حکیم آغا جان عیش کی ملاقات کو جا رہے تھے کہ آزاد بھی ساتھ ہو لیا۔

حکیم آغا جان عیش خاندانی طبیب تھے۔ شیریں کلام، شگفتہ مزاج، ہر وقت یہ معلوم ہوتا تھا مسکرا رہے ہیں۔ ساتھ اس کے شعر کا عشق تھا۔ انہیں دیکھ کر آزاد کے دل میں خیال آیا کہ استاد کے بعد اگر کوئی استاد بنانے کے قابل ہے تو وہ یہی شخص ہے۔

یہ قبولیت کی کوئی ایسی گھڑی تھی کہ کچھ عرصے بعد ہی ذوق کا انتقال ہو گیا۔ میاں ذوق اس کے لیے صرف استاد نہیں تھے، شفقت کی ایسی چھاؤں تھے کہ ان کے اٹھتے ہی اس کے سر سے سایہ اٹھ گیا۔

استاد کے بعد ان کا دیوان ہی اس کے لیے سب کچھ تھا۔ کسی خبطی کی طرح مسودے کے کاغذات کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہتا۔ پھر ایک دن اسے خیال آیا کہ استاد کی یہ نشانی کب تک کاغذوں میں بند رہے گی۔ زمانے کی آندھی اسے ورق ورق بکھیر دے گی۔ اسے تو خوشبو کی طرح پھیلنا چاہیے۔ اسے ترتیب دے کر شائع کرانا چاہیے۔

شیخ اسمٰعیل، ذوق کے فرزند تھے جن کے بغیر یہ کام مکمل نہیں ہو سکتا تھا۔ دونوں نے مل کر کلام کو ترتیب دینا چاہا۔ مصیبت

یہ تھی کہ ذوق نے کبھی اپنے کلام کی حفاظت نہیں کی تھی۔ کچھ کلام آزاد کے پاس محفوظ تھا لیکن اس سے بھی زیادہ مٹکوں اور صندوقوں میں بھرا پڑا تھا۔ اس میں شاگردوں اور بادشاہ کی غزلیں بھی مل جل گئی تھیں۔ ان میں سے ذوق کے کلام کو پہچاننا اور اسے الگ کرنا آسان کام نہیں تھا۔ کچھ ادھوری غزلیں تھیں۔ ان کے اشعار تلاش کرنا آسان کام نہیں تھا۔

شیخ اسمٰعیل نے تمام اثاثہ ان کے سامنے لا کر رکھ دیا۔

"یہ کام تم ہی کر سکتے ہو۔ میری مدد درکار ہو تو میں حاضر ہوں۔"

آزاد نے تمام پرزے سمیٹے اور گھر چلا آیا۔ اب اسے ان غزلوں کو صاف کرنا اور الحاقی کلام کو الگ کرنا تھا۔

یہ کام نہ تو آسان تھا اور نہ جلدی میں ہونے والا لیکن ایسا ضرور تھا کہ آزاد کا عشق اسے آسان بنا سکتا تھا۔ وہ پوری تن دہی سے استاد کا کلام جمع کرنے میں لگا ہوا تھا۔

شہر دہلی میں شاعروں کی کمی نہیں تھی لیکن وہ تو پہلے ہی ارادہ کر چکا تھا کہ استاد نہ رہے تو وہ حکیم آغا جان عیش کو استاد بنائے گا۔

ایک دن وہ کالج سے نکلا تو سیدھا آغا جان عیش کے گھر پہنچ گیا۔ سر پر ایک ایک انگل بال سفید۔ ایسی ہی داڑھی، سرخ و سپید رنگ۔ گلے میں ململ کا کرتہ جیسے چنبیلی کا ڈھیر پڑا ہنس رہا ہو۔ دیکھتے ہی پہچان گئے۔

"کہو میاں، کیسے آئے؟"

"آج استاد کی یاد بہت ستا رہی تھی، ایک مرتبہ ان کے ساتھ حاضر ہوا تھا۔ آج اکیلا ہی چلا آیا۔"

"ہائے برخوردار! کیا یاد دلا دیا۔ مرحوم کیا گئے کتنوں کے دل اجڑ گئے۔ اب تو قلعے میں بھی وہ رونق نہ رہی۔ مہتابی کا مشاعرہ اب بھی ہوتا ہے لیکن ان کے بغیر چاندنی، دھوپ کی طرح کھٹکتی ہے۔"

بہت دیر تک استاد ذوق کی باتیں ہوتی رہیں۔ آخر آزاد نے حرفِ مطلب ادا کیا۔

"استاد کے بعد آپ ہی میرے بزرگ ہیں۔ جو کچھ ان سے سیکھتا تھا، آپ سے سیکھنے آتا رہوں گا۔"

"میاں، ان سے ہمارا کیا مقابلہ۔ بزرگوں سے کچھ محاورے سیکھ لیے ہیں، انہی کو شعروں میں جوڑتے پروتے رہتے ہیں۔ بہرحال، دروازے کھلے ہیں جم جم آیئے۔"

"آپ کے یہ محاورے ہی تو استاد کی یاد دلاتے ہیں۔ اب رنگ جہاں کچھ اور ہے۔ کچھ دن گزریں گے کہ یہ بہار بھی لٹ لٹا جائے گی۔"

"نوجوانوں میں ان چیزوں کی قدردانی کہاں۔ تمہیں ہے، غنیمت ہے۔"

اتنی ہمت افزائی بہت تھی۔ وہ پابندی سے وہاں جانے لگا۔ کالج کے طلبہ میں اس کی یہ انفرادیت حیرت سے دیکھی جاتی تھی کہ پہلے ذوق جیسا عظیم شاعر اس پر مہربان تھا اور اب اس کی نشستیں حکیم آغا جان عیش کے ساتھ ہوتی ہیں۔

کالج کی تعلیم مکمل ہو چکی تھی۔ اسے ملازمت کے لیے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ گھر کا پریس اور اخبار تھا۔ تعلیم سے فراغت پاتے ہی پریس کی دیکھ بھال اور اخبار کی اشاعت کا انتظام سنبھال لیا۔ یہیں سے اس کی ادبی زندگی کا ایک نیا دور بھی شروع ہوا۔ اس کی ادبی طبیعت نے صرف انتظامات تک اسے محدود نہیں رکھا۔ اس کی تخلیقات بھی اس اخبار کے سپرد ہونے لگیں۔ اخبار کی ضروریات کے اعتبار سے غزل کے بجائے نظم گوئی کا شعور بیدار رہوا۔ سیاسی حالات پر مبنی نظمیں شائع ہونے لگیں۔ ان نظموں کو دیکھ کر فنی پختگی کے ساتھ یہ احساس ہوتا تھا کہ شاعر کو فارسی ترکیبیں استعمال کرنے کا بے حد شوق ہے۔

ایک انقلاب یہ پیدا ہوا کہ شاعری کے ساتھ ساتھ وہ نثر نگاری کی طرف متوجہ ہوا۔ اپنے مخصوص اندازِ تحریر میں خبریں بنانے کے ساتھ ساتھ ملکی حالات پر مضامین بھی تحریر کرنے لگا۔ عبارت کی رنگینی، فارسی تراکیب، تشبیہات اور استعاروں کے پھولوں کی بہار صاف بتا رہی تھی کہ ابھی اسلوب میں پختگی تو نہیں آئی لیکن ایک ایسا انشا پرداز سامنے آنے والا ہے جو صاحبِ طرز کہلائے گا۔ اس کا انداز سب سے جدا، سب سے الگ تھا۔

استاد کا دیوان سرہانے رکھا تھا اور اس راہ کی مشکلیں اس کے سامنے کھڑی تھیں۔ ایک ایک غزل کو پڑھنا مٹے ہوئے لفظوں کو سمجھنا۔ نامکمل غزلوں کو مکمل کرنے کے لیے شاگردوں اور دوستوں کی یادداشتوں سے مدد لینا۔ جتنا کام کر لیتا تھا، ذوق کے فرزند کے پاس جمع کرا دیتا تھا۔

مشکلوں کا یہ پہاڑ آہستہ آہستہ کٹ رہا تھا کہ ۱۸۵۷ء کا سال سیاہ آن پہنچا۔

موسم گرما کے باعث اول وقت کچہری ہو رہی تھی۔ صاحب مجسٹریٹ محکمہ عدالت میں سرگرم حکمرانی تھے کہ سات بجے میر بحری نے آن کر میرٹھ کی بغاوت کی خبر سنائی۔ جب تک افواہوں پر کان دھرے جاتے، کمپنی کی باغی سپاہ دہلی میں داخل ہو گئی۔

خنزیر اور گائے کی چربی کے کارتوسوں کا قضیہ کئی دن سے چل رہا تھا۔ جن دیسی سپاہیوں نے ان کارتوسوں کو استعمال کرنے سے انکار کردیا تھا، ان کا کورٹ مارشل کردیا گیا تھا۔ یہ بغاوت اسی کا شاخسانہ تھا۔ دیسی سپاہ میرٹھ سے دہلی تک پہنچ گئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے لاہوری دروازہ انگریزوں کے خون سے لال ہوگیا۔ جتنے مکان انگریزوں کے تھے، لوٹ لیے گئے۔

دہلی کالج بھی اسی ہنگامے کی زد میں آگیا۔ انگریز اساتذہ جان بچاکر بھاگے اور میگزین میں پناہ لی لیکن جب کمک کی توقع نہ رہی تو انگریزوں نے میگزین کو آگ لگادی۔ ایسا دھماکا ہوا کہ جیسے قیامت زمین پر اتر آئی۔ پورا شہر دھوئیں سے اٹ گیا۔

دہلی کالج کے پرنسپل مسٹر ٹیلر اسی میگزین میں پناہ لیے ہوئے تھے۔ وہ جان بچاکر بھاگے۔ میگزین سے صحیح سلامت باہر نکل آئے لیکن حواس باختہ حیران تھے کہ کہاں جائیں۔ ہر سمت موت کھڑی تھی۔ انہیں اور تو کچھ سوجھا نہیں، بے اختیار کالج کے احاطے کی طرف دوڑ لگادی۔ کالج ویران پڑا تھا۔ دیواروں کے سوا وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ یہ دیواریں انہیں کتنی دیر پناہ دے سکتی تھیں۔ اچانک انہیں اپنا بوڑھا خانساماں نظر آیا۔ شاید وہ اپنی کوٹھری میں ہو۔ وہ ایک موہوم سی امید کے ساتھ کوٹھری میں گھس گئے۔ حالت ایسی تھی کہ برسوں جس نے صاحب کہہ کر پکارا تھا، انہیں پہچاننے کے لیے اپنی آنکھیں ملنے لگا۔

"دیکھ کیا رہے ہو۔ کیا تم بھی پہچاننے سے انکار کردو گے، میں ٹیلر ہوں۔"

"صاحب! یہ آپ ہیں" بوڑھے خانساماں کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے "میں اور بھلا آپ کو نہ پہچانوں لیکن آپ کی حالت ہی ایسی۔۔۔"

"حالت کو چھوڑو۔ اس وقت مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

"میری ایک ایک بوٹی آپ کی ہے صاحب!"

"مجھے کسی طرح مولوی باقر کے گھر پہنچادو۔"

"صاحب، اگر باغیوں نے دیکھ لیا تو آپ کے ساتھ میری جان بھی جائے گی۔"

"ابھی تو تم کہہ رہے تھے، تمہاری ایک ایک بوٹی میری ہے؟"

بوڑھے نے کچھ دیر سوچا اور حامی بھرلی۔ وہ انہیں لے کر کشمیری دروازے کے علاقے کھڑکی ابراہیم علی خاں پہنچ گیا جہاں مولوی باقر کا مکان تھا۔

مولوی باقر کو بھی انہیں دیکھ کر وہی حیرانی ہوئی جس سے بوڑھا خانساماں دوچار ہوچکا تھا۔ برسوں کی دوستی تھی اور یہ امتحان کا وقت تھا۔

"باقر، مجھے چھپالو ورنہ میں اپنی جان سے چلا جاؤں گا۔ زندگی رہی تو تمہاری دوستی کا حق ضرور ادا کروں گا۔"

"دوستی کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ آپ اندر آ جائیے۔"

مولوی باقر انہیں اندر لے آئے اور سوچنے لگے کہ انہیں کہاں چھپایا جائے۔ گھر کے قریب ہی انہوں نے ایک امام باڑہ بنوایا تھا، اس وقت یہی کام آیا۔ انہوں نے ٹیلر کو اس امام باڑے کے تہ خانے میں چھپادیا۔ اس راز سے آزاد کے سوا گھر میں کوئی بھی واقف نہیں تھا۔

اس روز تو انہوں نے یہ خطرہ مول لے لیا لیکن دوسرے دن جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ ان گھروں کو بھی جلا رہے ہیں جہاں کسی انگریز نے پناہ لے رکھی ہے تو انہیں فکر ہوئی۔ انہوں نے بہت رازداری سے کام لیا تھا لیکن محلے میں یہ خبر عام ہوگئی تھی کہ انہوں نے کسی انگریز کو پناہ دی ہے اس لیے بھی انہیں خطرہ اپنے دروازے پر کھڑا نظر آیا۔

"یہ خبر عام ہوگئی ہے کہ آپ یہاں چھپے ہوئے ہیں" مولوی باقر نے مسٹر ٹیلر سے کہا "اب آپ یہاں محفوظ نہیں رہے۔ میں آپ کے لیے کپڑے لایا ہوں۔ ان ہندوستانی کپڑوں میں آپ کو کوئی نہیں پہچانے گا، آپ انہیں پہنیں اور کسی نہ کسی طرح دہلی سے باہر نکل جائیں۔"

چند اہم تصانیف (ادبی)

آبِ حیات، نیرنگِ خیال، سخن دانِ فارس۔ نگارستان فارس۔ دربارِ اکبری۔ دیوانِ ذوق۔ ڈراما اکبر، نظم آزاد۔ خم کدہ آزاد۔

تعلیمی تصانیف

نصیحت کا کرن پھول، قصصِ ہند، فارسی کی پہلی کتاب، دوسری کتاب۔ اردو کی پہلی، دوسری، تیسری اور چوتھی کتاب۔ قواعد اردو۔ قواعد فارسی، جامع القواعد۔ تذکرہ علماء۔ کائناتِ عرب، حکایاتِ آزاد۔ قندِ پارسی، آموزگار پارسی، لغتِ آزاد۔

عالم جنوں کی تصانیف

مکاشفات آزاد۔ سپارک ونماک۔ فلسفۂ الہیات۔ جانورستان۔

ٹیلر نے بھی سوچا کہ یہاں کب تک چھپے رہیں گے۔ یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ انہوں نے وہ کپڑے پہن لیے۔

"دہلی کالج سے متعلق میرے پاس کچھ کاغذات ہیں" ٹیلر نے کہا "جب دہلی پر انگریزی فوج کا قبضہ ہوجائے تو یہ کاغذات افسر اعلیٰ تک پہنچا دینا۔"

مولوی باقر نے وہ کاغذات لے لیے اور انہیں رخصت کردیا۔

مسٹر ٹیلر ابراہیم خاں کی کھڑکی تک پہنچے ہوں گے کہ پہچان لیے گئے۔ اب بچاؤ کی کوئی صورت نہیں تھی۔ کچھ ہی دیر میں خبر آگئی کہ ٹیلر قتل کردیے گئے۔

باغیوں نے بہادر شاہ کے نام پر شہر کا نظم و نسق سنبھال لیا تھا۔

فساد پھیلا تو کچھ سلامت نہ بچا۔ دکانیں لٹ گئیں، مکانات اجڑ گئے۔ جب تک بخت خاں بریلی سے آنہیں گیا، یہی حالت رہی۔

بالآخر بادشاہ نے شہر کا گشت کیا اور حالات پر قابو پالیا۔

دہلی اخبار اب اور بھی آب و تاب سے نکل رہا تھا۔ پل پل کی خبریں چھپ رہی تھیں۔ ایسے مضامین شائع ہو رہے تھے جس میں مسلمانوں کو بادشاہ کی مدد کرنے کی تاکید کی گئی تھی۔ مولوی باقر کا ایک فتویٰ بھی چھپا جس میں انہوں نے کہا تھا، یہ جنگ جہاد کی حیثیت رکھتی ہے۔

ان خدمات کی وجہ سے انہیں بادشاہ کا قرب حاصل ہوگیا۔ بادشاہ ہی کے کہنے سے انہوں نے اپنے اخبار کا نام "اخبار الظفر" رکھ دیا۔

وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ انگریزوں کا تسلط ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا لیکن ان کا یہ اندازہ غلط نکلا۔ کئی مہینے کی لڑائی کے بعد انگریزوں نے، سکھ لشکر کی معیت میں دوبارہ دہلی پر قبضہ کرلیا۔

کالوں کے بعد گوروں کی انتقامی کارروائی شروع ہوگئی۔ جو راہ میں ملا، قتل کردیا گیا۔ وہ باپردہ مستورات جنہوں نے گھر کی دہلیز بھی کبھی نہیں دیکھی تھی، ننگے پاؤں، برہنہ سر، سڑکوں پر بھاگی جارہی تھیں۔ جو رہ گئے تھے، وہ موت کے استقبال میں آنکھیں کھولے جاگ رہے تھے۔

ذوق کا فرزند محمد اسمٰعیل اپنی بیوی کو لے کر گھر سے نکلا اور ایسا غائب ہوا کہ پھر کسی کو نہیں ملا۔ ملتا کہاں سے، کسی گولی کا نشانہ بن گیا اور سیکڑوں لاشوں کے ساتھ دفن ہوگیا۔

آزاد کو جتنا دکھ اس کے مرنے کا ہوا، دلی لٹنے کا بھی نہیں تھا۔ استاد کی یہ نشانی بھی رخصت ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی آزاد کی برسوں کی محنت بھی قتل ہوگئی۔ اس نے استاد کی جو غزلیں صاف کرکے اسمٰعیل کے پاس جمع کرادی تھیں، وہ اس کے ساتھ ہی دفن ہوگئیں۔

○☆○

باغیوں کا زور ٹوٹتے ہی انگریزوں کا تسلط پوری طرح قائم ہوگیا۔ قتل کرنے کو کچھ نہ بچا تو گرفتاریاں شروع ہوگئیں۔

ہنگامہ فرو ہوتے ہی مولوی باقر کو ان کاغذات کا خیال آیا جو مسٹر ٹیلر انہیں دے گئے تھے۔ وہ اس خیال سے ہڈسن صاحب کے پاس پہنچ گئے کہ ان کاغذات کو ان کے حوالے کرکے وہ انگریز دوستی کا ثبوت دیں گے اور آئندہ کے لیے راہیں ہموار ہوجائیں گی۔

ہڈسن نے ان کاغذات کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور ایک گہری سانس لی۔

"ویل! مسٹر ٹیلر کہاں ہیں؟"

"وہ تو قتل کردیے گئے۔ باغیوں نے انہیں مار دیا۔"

مولوی صاحب نے پوری روئیداد سنادی۔

"آپ کو ان کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا جاتا ہے۔"

مولوی باقر اپنی صفائی پیش کرتے رہ گئے لیکن کون سننے والا تھا۔

بعد میں یہ سننے میں آیا کہ مسٹر ٹیلر نے ان کاغذات پر یہ عبارت لکھ دی تھی کہ یہ شخص مجھے بچا سکتا تھا لیکن اس نے کوئی کوشش نہیں کی۔ اسی عبارت کو پڑھ کر ہڈسن نے ان کی گرفتاری کے احکامات صادر کیے۔

دوسرے بہت سے مکانوں کی طرح محمد حسین کا مکان بھی جاگ رہا تھا۔ بچے خوف سے سہمے ہوئے تھے، بڑے فکر سے۔

دروازے کے دل پر کسی نے زور سے لات ماری پھر جیسے گھونسے برسنے لگے۔ فتح یاب لشکر کے بہادر گھر میں گھس آئے اور بندوقیں تان لیں۔

"تمہارا باپ باغیوں کا دوست تھا۔"

"یہ غلط ہے مگر پھر بھی تم نے اسے گرفتار تو کرلیا، اب کیا ہے؟"

"فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔"

"گھر سے نکل جائیں، اپنے گھر سے؟"

"گھر ہی سے نہیں، شہر سے نکل جاؤ۔ جلدی کرو۔"

بھرا گھر سامنے پڑا تھا۔ کون سی چیز اٹھائے، کون سی رہنے دے۔ قیمتی زیور تو پہلے ہی کنوئیں کی تہ میں اتار دیا تھا۔ اسے نکالنے کا وقت نہیں تھا۔ بھاری چیزیں سمیٹی نہیں

جاسکتی تھیں۔ اس کی نظر ذوق کی غزلوں کے مسودے پر پڑی‘ محمد حسین! اگر خدا نے کرم کیا اور زندگی باقی ہے تو سب کچھ ہوجائے گا مگر استاد کہاں سے پیدا ہوں گے جو یہ غزلیں پھر آکر کہیں گے۔ اس نے مسودہ ہاتھ میں اٹھایا۔ سجے سجائے گھر کو چھوڑ کر اکیس یتیم جانوں کے ساتھ گھر سے نکل گیا۔ ان میں آزاد کی اہلیہ اور برس بھر کی لڑکی بھی تھی۔ وہ پھوپی بھی تھیں جو آزاد کی ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھتی تھیں۔

”محمد حسین‘ ہم جائیں گے کہاں؟“ آزاد کی پھوپی نے پوچھا۔

”ابھی کچھ نہ سوچئے۔ گھر سے نکلئے ورنہ ان فرنگیوں کا کچھ بھروسا نہیں۔“

ان کا کنبہ بھاگم بھاگ‘ کھلا گھر چھوڑ کر گھر سے نکلا۔ گھر سے دور جاکر دھوبی واڑے کی گلی میں پہنچ کر آزاد نے سب کو رکنے کا اشارہ کیا۔

”یہاں سکون سے بیٹھ کر سوچتے ہیں کہ شہر سے باہر کس طرح نکلیں اور کہاں جائیں؟“

”یہاں؟ اس گلی میں بیٹھیں؟“ آزاد کی پھوپی نے کہا۔

”پھوپی اماں‘ یہ تو وہ وقت ہے کہ بادشاہِ دہلی بھی ننگی چارپائی پر بیٹھا ہوا ہوگا۔ ہم بھلا کیا چیز ہیں۔“

گلی سنسان پڑی تھی۔ ہر دروازے پر خوف کے تالے پڑے ہوئے تھے۔ کھلے بھی ہوتے تو کیا ہوتا۔ جنہیں انگریزوں نے شہر سے نکل جانے کا حکم دیا تھا‘ انہیں پناہ کون دیتا۔ یہ سب ایک دیوار کا سہارا لے کر زمین پر بیٹھ گئے۔ جلدی جلدی طے ہوا کہ سونی پت جایا جائے۔

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ گلی میں ایک گولہ آکر گرا۔ دھماکا اتنا شدید تھا کہ آزاد کی شیرخوار بیٹی جو ماں کی گود میں تھی‘ اس صدمے سے بے ہوش ہوگئی۔ یہ نئی افتاد تھی لیکن اس وقت ہر افتاد جانوں کی قیمت سے کم تھی۔ ماں نے بے ہوش بچی کو سینے سے لگایا کہ راستے میں ہوش آجائے گا۔

یہ قافلہ دھوبی واڑہ سے نکلا اور تین میل برابر پیدل چلتا ہوا برف خانے پہنچا۔ اب جان میں جان آئی کہ شہر سے باہر نکل آئے تھے۔ بے فکری تو ہوگئی تھی لیکن پیٹ بڑا دوزخ ہے۔ اسے تو ہر حال میں کھانے کو چاہیے ہے۔ ایک کھیل بھی اڑ کر منہ تک نہیں پہنچی تھی۔ سواریوں کا بندوبست نہیں تھا۔ کب سونی پت کی شکل دیکھنے کو ملتی ہے‘ کیا خبر۔ کچھ پیٹ میں ڈال لیا جائے۔ ایک درخت نظر آیا‘ اسی کے نیچے سب بیٹھ گئے۔ تھکن اور بھوک سے برا حال تھا۔ جس کے پاس جو کچھ تھا‘ نکال کر سامنے رکھ دیا کہ کھانے کا بندوبست کرو۔

متفرقات آزاد۔

بیاضِ آزاد‘ سیرِ ایران‘ مکتوباتِ آزاد۔

غیر مطبوعہ تصانیف

تاریخی مقامات۔ ترکی قواعد۔ عربی قواعد۔ قواعد اردو۔ قواعد فارسی۔

اس کے علاوہ کم وبیش ۸۹ مسودات جو انہوں نے عالمِ جنوں میں تحریر کیے۔

سیاحت

وسط ایشیا‘ ایران۔

منشی بشیر حسین بھی ساتھ تھے جو آزاد کے چھاپے خانے کے منتظم تھے۔ انہوں نے پیسے جیب میں ڈالے اور کھانے کا انتظام کرنے کے لیے روانہ ہوگئے۔

ہزار دقتوں کے بعد سونے کے مول آٹا ملا اور وہ بھی گھنٹوں کی تگ ودو کے بعد۔ اس کھلے میدان میں چولھا کہاں۔ مٹی کے ٹھیکرے میں آٹا گوندھا۔ پتھر جمع کرکے ان کا چولھا بنایا۔ ادھر ادھر سے درختوں کے پتے اور سوکھی ٹہنیاں جمع کیں اور آگ جلائی۔ ٹھیکرے ہی سے توے کا کام لیا اور کچی پکی روٹیاں پک گئیں۔ پتھروں پر ہی لہسن مرچ کی چٹنی پیسی۔

اب یہ فکر تھی کہ بیل گاڑیاں مل جائیں تو سونی پت کا سفر طے ہو۔ بہ دقت تمام‘ بیل گاڑیاں کرائے پر مل گئیں۔

”منشی صاحب‘ آپ ان بیل گاڑیوں کے ساتھ سونی پت جائیں۔ زندگی رہی تو میں آپ سے بعد میں آکر مل لوں گا“ آزاد نے کہا۔

”مگر آپ کہاں جارہے ہیں؟“

”میں واپس دہلی جارہا ہوں۔“

”اے ہے! دہلی“ آزاد کی بیوی کی چیخ بلند ہوئی۔

”ہاں دہلی۔ میں بابا جانی سے آخری بار ضرور ملوں گا۔“

”اب ایک کو رو رہے ہیں پھر ہم دو کو روئیں گے اور اس بچی کی طرف تو دیکھو‘ اسے ہوش آگیا ہے لیکن نہ ہنستی ہے نہ روتی ہے۔ کیا خبر کیا ہوجائے۔ آپ ہمارے ساتھ ہی چلیں“ اس کی اہلیہ نے کہا۔

منشی صاحب نے بھی سمجھایا لیکن اس نے کسی کی ایک نہ سنی۔

"اللہ نگہبان ہے۔ میں ایک مرتبہ اپنے والد سے ضرور ملوں گا۔"

آخر یہ قافلہ روتا پیٹتا روانہ ہوگیا۔ آزاد نے استاد کا کلام بغل میں دبایا اور دہلی کی طرف روانہ ہوگیا۔

دہلی پہنچ کر اسے خیال آیا کہ اس مقتل میں اس کی مدد کون کرے گا۔ یہاں اب رہا کون ہوگا جس کے دروازے پر دستک دے۔ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ اس اندھیرے میں کون روشنی دکھائے گا۔ آخر اسے اپنے باپ کے دوست سکھ جرنیل کا خیال آیا۔ وہ گرتا لڑکھڑاتا ان کے پاس پہنچ گیا۔

"کیا کروگے ان سے مل کر۔ اور پھر یہ ممکن بھی نہیں ہے۔ تم میرے پاس رہو، میں تمہاری پوری حفاظت کروں گا۔"

"میں صرف ایک نظر انہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ کوئی بات نہیں کروں گا، خاموش رہوں گا۔ بس آپ کسی طرح مجھے ان کے سامنے پہنچادیں۔"

وہ سکھ برابر انہیں سمجھاتا رہا لیکن آخر تیار ہوگیا لیکن اس شرط پر۔

"تمہیں یہ لباس بدل کر میرے سائیس کا لباس پہننا ہوگا اور میرے گھوڑے کے ساتھ ساتھ اس طرح دوڑنا ہوگا جیسے تم کوئی اور نہیں، میرے گھوڑے کے رکھوالے ہو، میرے نوکر ہو۔"

"مجھے ہر شرط منظور ہے۔"

"اب سوجاؤ۔ رات بہت ہوگئی ہے۔ میں صبح وہاں لے چلوں گا۔"

صبح ہوئی تو آزاد نے اپنا حلیہ بدلا۔ سائیس کا لباس پہنا اور سکھ جرنیل اپنے گھوڑے پر سوار ہوا۔ یہ وہی دہلی تھی جہاں وہ استاد ذوق کے ساتھ چہل قدمی کے لیے نکلا کرتا تھا اور اب ایک سکھ جرنیل کے گھوڑے کے ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا۔

دہلی دروازے کے باہر باغی قیدی لق ودق میدان میں پڑے تھے۔ چاروں طرف سنگین بردار پہرے پر تھے کہ کوئی جان بچاکر نکل نہ بھاگے۔

کوئی قیدی بھوک سے رو رہا تھا۔ کسی کو موت اور بربادی کا غم تھا۔ بہت سے بے فکرے اس عالم میں بھی بے فکر تھے۔

سکھ جرنیل ایک ایک قیدی کے پاس جاکر اس کا معائنہ کررہا تھا۔ مطلب یہی تھا کہ مولوی باقر کہیں نظر آجائیں۔

ایک جگہ آزاد کے قدم رک گئے۔ شفیق باپ، بے زبان بنا بیٹھا تھا۔ نظر اٹھاکر دیکھا تو نازوں کا پالا، اکلوتا جگر گوشہ محمد حسین آزاد، سائیس کے لباس میں کھڑا ہے۔ کچھ کہنے کے لیے لبوں کو جنبش ہوئی تھی کہ آزاد نے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ہونٹ خاموش ہوئے تو آنکھیں باتیں کرنے لگیں۔ ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

زیادہ دیر کسی قیدی کے پاس کھڑے رہنا مناسب نہیں تھا۔ جرنیل نے گھوڑے کو آگے بڑھایا۔ سائیس کو بھی آگے چلنا پڑا لیکن اس طرح کہ پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا جاتا تھا۔ قیدی کے دونوں ہاتھ دعا کے لیے بلند تھے، اے خدا! میرے بیٹے کو سلامت رکھ۔

شہر میں افواہ پھیلی کہ تمام قیدیوں کو گولی کا نشانہ بنادیا گیا ہے۔ اب آزاد کی باری تھی۔ اس کے ہاتھ دعا کے لیے بلند تھے، اے خدا! میرے والد کی قربانی قبول کر۔ اس کے آنسو دل ہی دل میں کہیں اتر کر رہ گئے۔

اب کسی ملاقات کی توقع نہیں تھی۔ دلی نے اسے سب کچھ دیا تھا اور سب کچھ چھین لیا۔ اب وہ یہاں رہ کر کیا کرتا، اس نے اجازت طلب کی۔

استاد کے کلام کا پلندا اس کی بغل میں تھا۔ آٹا گوندھنے کا تسلا اور ایک دری بھی ساتھ تھی۔ وہ شہر سے باہر نکلنا چاہتا تھا کہ ایک فرنگی نے اسے ٹوکا۔

"اے بڈھا! اس میں کیا ہے؟" اس انگریز نے بندوق کی سنگین سے کاغذوں کا پلندا زمین پر گرادیا۔ کاغذ ادھر ادھر بکھر گئے۔ جب اس نے دیکھا کہ کاغذوں کے سوا کچھ نہیں تو کچھ بکتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ آزاد پاگلوں کی طرح اڑتے ہوئے کاغذوں کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ بہ دقت تمام کاغذوں کو جمع کیا اور آگے بڑھ گیا۔

اس کی عمر صرف ستائیس سال تھی لیکن پریشانیوں نے اس کی حالت ایسی کردی تھی کہ اس انگریز نے اسے بڈھا کہہ کر مخاطب کیا۔

کیا میں بوڑھا ہوگیا ہوں؟ اس نے چلتے چلتے سوچا۔ اس انگریز نے ٹھیک ہی تو کہا۔ جو مرتے نہیں ہیں وہ بوڑھے ہی تو ہوجاتے ہیں۔ میری بنائی ہوئی جنت مسمار ہوگئی۔ عزیزو اقارب چھوٹ گئے۔ باپ کا سایہ اٹھ گیا۔ روزگار، کاروبار، لکھنا پڑھنا سب کچھ ختم ہوگیا۔ اب میں بے یارومددگار ہوں۔ بے سہارا ہوں اور بے وطن بھی۔ دھوپ آنکھوں میں گھسی چلی آتی تھی اور وہ سامان سر پر لادے کسی مزدور کی طرح اسی دھوپ کا سینہ چیر کر آگے بڑھ رہا تھا۔ جس طرح

ابھی ہندوستان کا مستقبل طے نہیں ہوا تھا، اسی طرح اس کی کوئی منزل نہیں تھی۔ راستے میں ایک بستی نظر آئی۔ ایک ٹوٹی پھوٹی مسجد دیکھی۔ اس کی سیڑھیوں پر جا بیٹھا۔ کسی نے فقیر سمجھ کر کچھ کھانے کے لیے دے دیا۔ اس نے آنکھ اٹھا کر دیکھا۔ دو روٹیوں پر کچھ سالن رکھا تھا۔ بھوکا تھا۔ بے حال تھا۔ وہ یہ بھی نہ بتا سکا کہ وہ کون ہے کہاں سے آیا ہے، کہاں جاتا ہے۔ سر جھکا کر نوالے توڑنے لگا۔

روٹی دینے والے نے آبخورے میں پانی لا کر رکھ دیا۔ حلق میں پھنستے ہوئے نوالوں کو اس نے پانی سے نیچے اتارا۔

"بابا! دعا کرنا" روٹی لانے والے نے کہا اور واپس چلا گیا۔

اس نے دری بچھائی اور کمر سیدھی کرنے کے لیے لیٹ گیا۔ لیٹتے ہی خیالوں نے پاؤں دابنے شروع کر دیے۔ کتنے ہی منظر آنکھوں کے سامنے آئے اور چلے گئے۔ دلی جو ایک شہر تھا مگر اب کہاں ہے۔ مشاعروں کی محفلیں سجتی تھیں، میلے لگتے تھے۔ قلعے کی کیا شان تھی۔ کیسے کیسے باکمال تھے۔ سب کچھ اجڑ کر رہ گیا۔ اب وہ صورتیں دوبارہ دیکھنے کو کیا ملیں گی۔

اس نے رات اسی مسجد میں گزاری۔ صبح ہوتے ہی وہاں سے روانہ ہو گیا۔ ایک گاؤں سے گزر ہوا۔ کسی پیڑ کے نیچے بہت سے بچے اپنا اپنا سبق یاد کر رہے تھے۔ یہ گویا اس گاؤں کا اسکول تھا۔ وہ بھی ایک طرف بیٹھ گیا۔

"بھائی کہاں سے آ رہے ہو۔ کہاں جانا ہے؟" بچوں کے مولوی صاحب نے پوچھا۔

"دلی سے آ رہا ہوں۔ اب آگے تقدیر ہے جہاں پہنچا دے۔"

"دلی میں تو سنا ہے بڑی مارا ماری ہوئی ہے۔"

"بہت۔"

"کیا فرنگی آ گئے؟"

"ہاں!"

"لکھنؤ تو اب بھی ڈٹا ہوا ہے۔ نوابی ختم ہو گئی مگر مجاہد ڈٹے ہوئے ہیں۔"

لکھنؤ کا نام سنتے ہی جیسے اسے منزل مل گئی۔ لکھنؤ نے ہمیشہ دلی کے باکمالوں کو سر آنکھوں پر بٹھایا ہے۔ میر، سودا، سوز، مصحفی اور انشا جیسے باکمالوں نے لکھنؤ ہی سے فیض اٹھایا تھا۔ ابدالی کی فوجوں نے جب دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجائی تھی تو میر نے لکھنؤ کا رخ کیا تھا۔ آج مجھ پر بھی وہی وقت پڑا ہے۔ مجھے بھی لکھنؤ جانا چاہیے۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"کہاں چلے مسافر۔"

"مجھے اپنی منزل یاد آ گئی۔"

"واہ! ایسے کیسے، ہمارے گاؤں میں مسافر آئے اور ہم اسے کھائے پیئے بغیر جانے دیں" مولوی صاحب نے کہا اور ساتھ ہی بچوں کو حکم دیا کہ اپنے اپنے گھروں سے جو کچھ ہے فوراً لے کر آئیں۔ بچے تتلیوں کی طرح اڑ گئے۔

تھوڑی دیر میں دسترخوان بھی سج گیا اور گاؤں کے کچھ لوگ بھی آ گئے۔

ہر آدمی کو دلی کی بپتا سننے کی خواہش تھی۔ اسے نہ چاہتے ہوئے بھی بتانا پڑ رہا تھا۔ جو کچھ اس پر گزری تھی، دوسروں کی کہانی بنا کر سنا رہا تھا۔

خود بھی رویا، دوسروں کو بھی رلایا اور اس گاؤں سے روانہ ہو گیا۔

اسی طرح مسجدوں اور سرائیوں میں ٹھہرتا ہوا، کئی مہینوں کی مسافت طے کرنے کے بعد لکھنؤ پہنچ گیا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ اعلانیہ کہتا کہ مولوی محمد باقر کا بیٹا محمد حسین آزاد آیا ہے لیکن اب وہ ہر کس و ناکس پر اپنا حال ظاہر نہیں کر سکتا تھا۔ حال ایسا تھا بھی نہیں کہ کسی پر ظاہر کیا جاتا۔ کسی کو معلوم ہو بھی جاتا تو اتنے سوال کرتا کہ اس کے زخم تازہ ہو جاتے۔ وہ خاموشی سے ایک سرائے میں جا کر ٹھہر گیا۔

حالات یہاں کے بھی حسب دل خواہ نہیں تھے۔ واجد علی شاہ اختر مٹیا برج کلکتہ میں تھے اور اس کی ملکہ سلطنت کو بچانے کے لیے انگریزوں کے سامنے ڈٹی ہوئی تھی۔ دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہوتے ہی، مجاہدین لکھنؤ پہنچنا شروع ہو گئے تھے۔ اب صاف معلوم ہوتا تھا کہ دوسری بڑی جنگ لکھنؤ میں اور اس کے آس پاس لڑی جائے گی۔

جب میر اور سودا یہاں آئے تھے تو حالات دوسرے تھے۔ آصف الدولہ کا چشمۂ فیض جاری تھا۔ آزاد یہاں پہنچا تو سب کنوئیں خشک ہو چکے تھے۔ دربار کی سرپرستی ختم ہو چکی تھی البتہ ادب کے سوتے خشک نہیں ہوئے تھے۔

وہ کچھ دن سرائے میں بند رہنے کے بعد باہر نکلا۔ باہر نکلنا بھی بس اس اتفاق کے طفیل ہو گیا کہ اس کی ملاقات ارسطو جاہ رجب علی کے صاحب زادے سے ہو گئی۔ رجب علی اس کے باپ کے شاگرد تھے۔ اس حوالے سے ان کا بیٹا اس کا قدر داں تھا۔

کوئی لکھنؤ آئے اور میر انیس سے ملے بغیر چلا جائے؟ اسے خود تعجب ہو رہا تھا کہ اب تک اپنی پریشانیوں میں ان سے ملاقات کا خیال کیوں نہیں آیا۔ اس نے اشتیاق ظاہر کیا

اور ارسطو جاہ کا بیٹا اسے لے کر میر انیس کے درِ دولت پر پہنچ گیا۔ جیسا سنا تھا ویسا ہی دیکھا۔ میانہ قد، گورا رنگ خوش اندام۔ سر پر بانکی ٹوپی تنزیب کا انگرکھا پھنسی ہوئی آستینوں کا۔ کمر سے دوپٹا بندھا ہوا۔ اس وقت بالا خانے پر بیٹھے سڑک کی سیر کر رہے تھے، اوپر ہی بلوالیا۔

انیس نے یہ اہتمام پہلے ہی کرلیا تھا کہ ان کا حال ظاہر نہ ہونے پائے۔ بس انہیں دیکھنا اور ان کے لبوں سے نکلے ہوئے پھولوں کو سمیٹنا مقصود ہے۔

انیس کو صرف یہ معلوم ہوسکا کہ یہ صاحب دہلی سے تشریف لائے ہیں۔ گردشِ دوراں کے ستائے ہوئے ہیں اس لیے لائقِ تکریم ہیں۔

شربت اور الائچیوں سے تواضع ہوئی اور ساتھ ہی ساتھ دہلی کی بربادی کی باتیں ہوتی رہیں۔ غالب کا ذکر آیا، داغ کے متعلق پوچھا۔ بڑی دیر تک کفِ افسوس ملتے رہے۔

"میاں، دلی والوں کا کچھ کلام تو سناؤ۔" انیس نے کہا۔

آزاد نے بے اختیار ذوق کا یہ مطلع پڑھ دیا۔

کوئی آوارہ تیرے نیچے اے گردوں نہ ٹھہرے گا
ولیکن تو بھی گر چاہے کہ میں ٹھہروں نہ ٹھہرے گا

یہ مطلع وقت اور حالات سے ایسی مناسبت رکھتا تھا کہ انیس پھڑک ہی تو اٹھے۔

"میاں، یہ شعر ہے کس کا؟"

"شیخ ابراہیم ذوق کا۔"

انیس نے سنا اور چپ ہوگئے لیکن صاف ظاہر ہوتا تھا کہ شعر ہی میں الجھے ہوئے ہیں۔ دو چار باتیں کرکے پھر فرمایا، ذرا وہی شعر پھر تو پڑھیئے گا۔ آزاد نے پھر پڑھا۔ اب انیس نے اسے اپنی زبان سے پڑھا۔

"صاحب کمال کا یہی تو فن ہے کہ جو لفظ جس مقام پر اس نے بٹھادیا ہے اسی طرح پڑھا جاوے تو ٹھیک ہے ورنہ شعر اپنے رتبے سے گر جاتا ہے۔"

"استاد ذوق کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟" آزاد نے پوچھا۔

"میاں! میر کے بعد دلی میں ایسا شاعر کون ہوا ہے۔"

اس انوکھے خراجِ عقیدت کے بعد آزاد نے اجازت چاہی۔ بڑی دیر تک اس جملے کا سرور طاری رہا۔ اس کے استاد کی تعریف ایک دوسرے باکمال نے ایسے الفاظ میں کی تھی۔

○☆○

بھٹیارن نے چراغ میں تیل ڈال کر سرہانے رکھ دیا تھا۔ جب ذرا اندھیرا ہوا، اس نے چراغ روشن کیا۔ انیس کی ملاقات ابھی تک حواس پر چھائی ہوئی تھی۔ اس نے ایک نظر استاد کے غیر مطبوعہ دیوان پر ڈالی۔ یہ غزلیں اگر شائع ہوجائیں تو انیس جیسے دوسرے باکمال بھی ان سے واقف ہوں۔ دیکھیں کہ لفظوں کے کیسے گل کھلائے ہیں۔ محاوروں کے کیسے گل دستے باندھے ہیں۔ مضامین عرش سے زمین پر اتارے ہیں لیکن آہ! گردشِ زمانہ کہیں بیٹھنے بھی دے کہ اسے از سرِ نو مرتب کروں۔ وہ دماغ، وہ فرصت، وہ فارغ البالی کہاں سے لاؤں۔ کب تک ان کاغذوں کی حفاظت کرتا رہوں گا۔ اس خیال کے ساتھ ہی ایک اور خیال نے اس کے دل پر دستک دی۔ ذوق کے علاوہ بھی تو کتنے ہی باکمال ہیں جنہیں کل دنیا فراموش کردے گی۔ بزرگانِ سلف کی جو عظمت ہمارے دلوں میں ہے، آنے والوں کے دلوں میں کب ہوگی۔ ان کا کلام باقی رہ بھی گیا تو ان کے حالات سے لوگ کیسے واقف ہوں گے۔ کوئی ایسی کتاب ہو جس سے ان بزرگوں کی تصویر آنکھوں کے سامنے گھوم جائے، کتنے ہی بزرگوں کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، کتنوں کے حالات معلوم کیے جاسکتے ہیں۔ اس کتاب کا نام میں "آبِ حیات" رکھوں گا۔

لکھنؤ میں دو عظیم یادگاریں اس وقت بھی موجود تھیں۔ میر تقی میر اور مرزا سودا کے صاحب زادگان یہ دونوں سے ملے۔ ان کے حالات اور اشعار جمع کیے۔

اس پریشان حالی میں بھی وہ ادبی تحقیق میں مصروف تھا کہ اسے یہ اطلاع ملی کہ اس کی گرفتاری کے وارنٹ نکل چکے ہیں اور گرفتار کرنے والے کے لیے پانچ سو کا انعام مقرر ہوا ہے۔ شاید یہ تحقیق ہوگئی تھی کہ دہلی اردو اخبار میں شائع ہونے والے باغیانہ مضامین اور اشتہار اس کے قلم سے نکلے تھے۔

اس اطلاع کے بعد اس کا گھبرا جانا لازمی تھا۔ انعام کے لالچ میں کوئی شخص بھی مخبری کرسکتا تھا۔ اس نے اپنا حال چھپایا ضرور تھا لیکن بہت سے لوگوں کو معلوم بھی تھا۔

اس نے اپنا مختصر سا سامان اٹھایا اور کسی کو کچھ بتائے بغیر لکھنؤ سے روانہ ہوگیا۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں گیا۔ خود اسے بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں جائے گا۔ پھر وہی دہشت وہی خارِ مغیلاں تھے۔ آسماں دور زمیں سخت تھی۔ اب پورے ملک میں شورش کے حالات پیدا ہوگئے تھے۔ کہیں جائے اماں نہیں تھی۔ اس نے کئی راتیں غیر آباد بیابانوں میں گزاردیں۔ آخر چلتے چلتے مدراس پہنچ گیا۔

نیل گری کے ملٹری اسکول میں استاد کی جگہ خالی تھی۔ اس کے ذوقِ علمی نے اسے اسکول کے سامنے لے جاکر کھڑا کردیا تھا کہ ایک آدمی اسے ضرورت مند سمجھ کر اندر لے گیا۔

"کچھ پڑھے لکھے بھی ہو؟"

"ہاں۔ میں نے دہلی کالج سے مشرقی شعبے کی تعلیم مکمل کی ہے۔"

"تم تو بہت پڑھے لکھے ہو" اس آدمی نے کہا "نوکری کرو گے؟"

"کروں گا۔"

اسے اس اسکول میں نوکری مل گئی۔ اس نے اس سہارے کو غنیمت سمجھا اور بچوں کو پڑھانے لگا۔

اس نے بس اتنے دن وہاں نوکری کی کہ کچھ پیسے جمع کرلے۔ پیسے جمع ہوتے ہی وہ وہاں سے بھی نکل گیا اور بمبئی آگیا۔ بمبئی میں پارسیوں کی کثرت تھی اور آزاد کو قدیم فارسی سے عشق تھا۔ وہ پارسیوں کے موبدوں سے ملا۔ ان کے صحیفے دیکھے اور ان کی زبان کا جائزہ لیا۔

اس نے یہ سفر کسی علمی تحقیق کے لیے نہیں کیا تھا۔ اس غریب الوطنی میں اتنی فرصت اسے تھی بھی نہیں۔ وہ تو یہاں اس لیے آیا تھا کہ کسی طرح یہاں اس کے قدم جم جائیں لیکن وہی مثل صادق آئی کہ آگ لینے گئے تھے پیغمبری مل گئی۔ اکتسابِ علم کا موقع ملا تو اس نے اسے جانے نہیں دیا۔

آخر وہ یہاں بھی زیادہ عرصے نہ رہ سکا۔ اس نے پنجاب کا رخ کیا۔ شہر شہر کی سیر کرتے' مالوے سے گزرتے ہوئے اس نے پنجاب کی ریاست جند میں قدم رکھا۔ یہ مشہور سکھ ریاست تھی۔ راجا سروپ سنگھ یہاں کا راجا تھا۔ اس راجا نے انگریزوں کی بیش بہا خدمات انجام دی تھیں اس لیے اسے حکومت کی نظروں میں وقعت حاصل تھی۔

۱۸۵۷ء کے بعد دیسی ریاستیں باکمالوں کا بڑا مرکز تھیں۔ دلی اور لکھنؤ کے باکمال رامپور' بھرت پور' پٹیالہ اور حیدر آباد کا رخ کررہے تھے۔ آزاد نے ان ریاستوں کو چھوڑ کر ایک دور دراز کی ریاست کا انتخاب شاید اس لیے کیا ہو کہ راجا سروپ سے تعلقات بڑھاکر اپنا قصور معاف کراسکیں۔

کچھ دن کی بے کاری کے بعد اسے دفتر فوجداری میں محافظ دفتر کی نوکری مل گئی۔

یہ نوکری اس کا گوہرِ مقصود نہیں تھا۔ وہ برابر اس کوشش میں لگا ہوا تھا کہ کسی طرح دربار تک اس کی رسائی ہوجائے۔ ریاستوں میں جتنے داؤ پیچ ہوتے ہیں' اس نے سب استعمال کیے اور بالآخر اسے راجا کی قربت نصیب ہوگئی۔

مغلیہ حکومت ختم ہوگئی تھی لیکن ان ریاستوں میں قصائد کی گرم بازاری تھی۔ وہی شاعر سرسبز ہوسکتا تھا جو پُرعظمت قصیدے لکھ سکتا ہو۔ آزاد نے ذوق کے دامنِ تربیت سے فیض اٹھایا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ قصیدے کی تشبیب اور گریز شاعر کی قادرالکلامی اور جدت طرازی کا اصل میدان ہوتی ہے۔ آزاد کی وہ علمیت جس نے اس کی غزلوں کو رسمی اور بے کیف بنادیا تھا' قصائد میں بڑے پُرشوکت انداز سے عیاں ہوئی۔

فروغِ نور سے کس کی ہے یہ جہاں روشن
کہ ہے زمیں سے دلا تا بہ آسماں روشن
زبسکہ عام انوار مہر ذرہ نواز
جہاں جہاں ہیں منور مکاں مکاں روشن
یہی نظر ہے کرم کی تو چرخ پر ہوں گے
بہ مشکل ماہِ ثریا و فرقداں روشن
طلوعِ نیر اعظم کا دیکھنا جلوہ
ہوئی ستارہ نمط چشم مردماں روشن
چراغ گل کے یہ انوار ہیں چمن میں کہ ہے
برنگ کشتِ فلک باغ کن فکاں روشن
پئے شعاع ہے لازم سرایت انوار
کہ ہوں زمیں میں جگرہائے بحروکاں روشن

مگر ہمیشہ سے تھی طبع خود بخود مائل
بہ اکتساب علوم و بہ اجتنائے فنون
بہ صرف نحو و معانی گئے بہ علمِ ادب
گئے بہ علم لغت ہوتا شوقِ دل تھا فزوں
کبھی صحاح تھی پیشِ نظر کبھی قاموس
محاورات عرب پر زبس تھا دل مفتوں
گئے بہ علم حدیث و گئے بہ علم اصول
گئے بہ فقہ و فرائض تھی طبع راہِ نموں

اس نے ایک نہیں' کئی قصیدے دربار میں گزارے۔ وہ ذوق کا شاگرد ہونے کا حق ادا کررہا تھا لیکن جوہر تو اس وقت کھلتے ہیں جب محنت کا صلہ اور کاوش کی داد خاطر خواہ ملے۔ یہ دربار ضرور تھا لیکن دلی یا لکھنؤ کا دربار نہیں تھا۔ انہیں یہ دربار اپنی اڑان کے بہت کم نظر آنے لگا۔

وہ یہاں سے نکلنے کی فکر میں تھا لیکن اس آشیانے [illegible] سے اڑتا تو کہاں جاتا [illegible]۔ اسی فکر میں اسے [illegible] گزر گئے۔

ارسطو جاہ [illegible] علی شاہ [illegible] والد کے شاگرد رہ چکے [illegible] لکھنؤ میں مل چکا تھا۔ اب اسے معلوم ہوا کہ انہوں نے لدھیانہ کے قریب جگراؤں میں ایک پریس مجمع البحرین کے نام سے قائم کیا ہے۔ آزاد خوش نویس بھی تھا اور پریس کے کام سے واقفیت بھی تھی لہٰذا اس نے رجب علی شاہ کو خط لکھا کہ اگر وہ اسے اپنے پریس میں کام دیں تو وہ بھی ریاست جند سے جگراؤں آسکتا ہے۔

رجب علی کی طرف سے مثبت جواب ملا تھا۔ اب ریاست سے نکلنے کا سوال تھا۔ راجا کی مرضی کے بغیر وہ یہاں سے قدم نہیں نکال سکتا تھا۔ ملازمت کا کہتا تو راجا کی سبکی ہوتی۔ وہ اسے اپنی توہین بھی سمجھ سکتا تھا۔ اس لیے آزاد نے اپنی گھریلو مصروفیات کو بہانہ بنا کر استعفیٰ پیش کر دیا۔ اس کے باوجود راجا اسے روکنے پر بضد تھا۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح اس نے راجا سے اجازت لے ہی لی۔

وہ جند سے نکلا اور جگراؤں (لدھیانہ) پہنچ گیا۔ ملاقات کا عجب منظر تھا۔ وہ عمر میں بہت چھوٹا تھا لیکن پے در پے صدمات اور انقلابات سے بوڑھا ہو گیا تھا۔ ارسطو جاہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کے سامنے کا بچہ اس حال میں ان کے سامنے آئے گا۔ استاد کو یاد کر کے خوب روئے۔

"آپ کے والد اور دادا میرے استاد رہے ہیں۔ آج میں جو کچھ ہوں' انہی کا فیض ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ میرا جو کچھ ہے' آپ کا ہے۔ اب آپ کو کوئی فکر نہیں ہونی چاہیے۔ اب آپ اپنے گھر والوں کو بھی یہیں بلالیں۔"

ان کا یہ سلوک دیکھ کر آزاد کی خاطر جمع ہوئی۔ اس نے سونی پت خط لکھ دیا۔

سواریاں دروازے پر آکر رکیں۔ معلوم ہوا آزاد کی بیوی اور پھوپی آئی ہیں۔ بیوی کی گود خالی تھی۔ وہ لڑکی؟ جب وہ دلی سے نکلا تھا۔ دھوبی واڑے کی گلی میں ایک گولہ آکر گرا تھا جس سے آزاد کی شیر خوار بچی بے ہوش ہو گئی تھی۔ بعد میں اسی سکتے کی حالت میں انتقال کر گئی۔ یہ کمائی بھی چھن گئی۔

آزاد نے اس پر بھی اللہ کا شکر ادا کیا اور مجمع البحرین پریس میں پرنٹر' پبلشر کے فرائض انجام دینے لگا۔ اس پریس سے اسی نام کا ایک اخبار بھی نکلتا تھا۔ یہ اخبار بھی اس کی جولانگاہ بن گیا۔ اس کی نگارشات بھی اس میں شائع ہونے لگیں لیکن وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ یہ کوئی ادبی کام نہیں۔ اخبار میں آج کا لکھا [illegible] اتنا ہو جاتا ہے اور زیادہ تر ہنگامی موضوعات پر لکھنا پڑتا ہے [illegible]۔ اس کے سینے میں ادیب کا دل تھا۔

اخبار اور پریس کی مصروفیات اسے کچھ سوچنے ہی نہیں دیتی تھیں۔

ایک دن ارسطو جاہ بڑی سج دھج سے تیار ہوئے' معلوم ہوا ڈائریکٹر تعلیمات پنجاب' لدھیانہ آئے ہوئے ہیں۔ ارسطو جاہ ان سے ملاقات کے لیے جا رہے ہیں۔ انہوں نے آزاد سے بھی کہا کہ وہ بھی ساتھ چلے۔

لدھیانہ کے ڈاک بنگلے میں' کپتان فلر نہایت کروفر سے موجود تھے۔ خوشامدی انہیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔ ارسطو جاہ کو دیکھا تو بڑے تپاک سے ملے۔ ارسطو جاہ نے آزاد کا تعارف ان سے کروایا۔

"عربی' فارسی کے فاضل ہیں۔ اردو کے بہت اچھے انشا پرداز ہیں اور شاعر ہیں۔"

"پھر یہ آپ کے پاس کیا کر رہے ہیں؟" فلر نے ہنستے ہوئے کہا۔

"حضور! یہ میرے پریس اور اخبار سے وابستہ ہیں۔"

"بہت خوب' بہت خوب۔"

اس کے بعد مسٹر فلر باتوں میں مصروف ہو گئے لیکن آزاد کسی اور دنیا میں پہنچ چکا تھا "پھر یہ آپ کے پاس کیا کر رہے ہیں؟" یہ جملہ بار بار اس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ اس کا مطلب ہے خود فلر یہ سمجھتے ہیں کہ پریس اور اخبار میری منزل نہیں۔ مجھے تو کہیں اور ہونا چاہیے۔

اس کا یہ خواب اس وقت ٹوٹا جب ملاقات کا وقت ختم ہوا۔ اس نے ایک خاص عقیدت کے ساتھ مسٹر فلر سے ہاتھ ملایا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

اس ملاقات کے بعد اچانک اس کا دل جگراؤں سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ اب ایک ہی خواب اس کی آنکھوں میں سمایا ہوا تھا کہ وہ لاہور جا کر محکمۂ تعلیم میں ملازمت کی کوشش کرے۔ اتفاق سے لاہور میں ایک سہارا بھی موجود تھا۔ اس کے پھوپی زاد بھائی محمد علی پوسٹ ماسٹر جنرل کے دفتر میں ہیڈ کلرک تھے۔ اس نے انہیں خط لکھا اور ۱۸۶۱ء میں یہاں سے بھی رخت سفر باندھ لیا۔

پرندہ کتنا ہی پھڑپھڑائے' پنجرا اپنی مرضی سے تو نہیں کھول سکتا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ لاہور پہنچتے ہی مراد پوری ہو جاتی۔ اس نے بھائی کے کہنے سے عارضی طور پر پوسٹ آفس میں ملازمت کر لی۔

یہ ملازمت اس کی امنگوں کے مطابق بھی نہیں تھی اور

مشاہرہ بھی صرف تیس روپے ماہوار تھا۔

وہ دیکھ رہا تھا کہ اس کے اور ساتھی جو دہلی کالج میں اس کے ہم سبق تھے، اس سے بہت آگے نکل چکے ہیں۔ مولوی نذیر احمد ڈپٹی کلکٹر ہوگئے۔ مولوی ذکاء اللہ مدارس کے ڈپٹی انسپکٹر۔ اپنے اردگرد بھی دیکھتا تھا تو کم اہلیت کے لوگ اس سے آگے نظر آتے تھے۔ اس کے دل کا کنول بجھنے لگا۔ اس کے دن اطمینان اور راتیں ذہنی سکون کے لیے ترسنے لگیں۔ خاموشی سے گھر چلا آتا، چپکے سے گھر سے نکل جاتا۔ پھر ایک دن اس نے مسٹر فلر کے نام خط لکھا جس میں اس نے ڈاک بنگلے کی ملاقات کا ذکر خاص طور پر کیا لیکن اب وہ ملاقات انہیں کہاں یاد رہی ہوگی۔ پروانۂ ملاقات جاری نہ ہوسکا۔

وہ قسمت سے لڑتا رہا اور پوسٹ آفس میں ملازمت کرتا رہا لیکن اس عالم میں بھی اس کا دماغ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے مضطرب رہتا تھا۔

۱۸۶۲ء میں اس نے لڑکیوں کی تعلیم سے متعلق ایک کتاب "آئینۂ صحت" لکھ کر گورنمنٹ کے سامنے پیش کی لیکن حوصلہ افزائی نے یہاں بھی اس سے منہ پھیر لیا۔ گورنمنٹ کی طرف سے جواب آیا۔

"کتاب مفید معلوم ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے سائل نے بہ صلاح ارباب کمیٹی سکھشا سبھا لاہور سے واسطے تعلیم مکاتب زنانہ تصنیف کی ہے پس وہی صاحب کمیٹی اس کے چھپوادیں گے۔ اس وقت ہم واسطے انعام کے گورنمنٹ میں رپورٹ کریں گے۔"

سکھشا سبھا نے بھی کوئی توجہ نہیں دی اور یوں اس کی یہ پہلی تصنیف زمانے کی آنکھ سے پوشیدہ ہی رہ گئی۔

ابھی وہ اس ناانصافی کو بھولا نہیں تھا کہ اس کا تبادلہ ملتان کردیا گیا۔ ہرچند کہ اسے ترقی دے کر بھیجا جارہا تھا لیکن اسے لاہور سے باہر جانا منظور نہیں تھا۔ اس نے یہ سوچے بغیر کہ اب وہ کیا کرے گا، ڈاک کے دفتر کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔

کہاں وہ دلی کا شاندار اثر آفریں ماحول کہاں یہ لاہور کی غریب الوطنی۔ وہ لاہور کی وسیع فضا میں اپنے لیے جگہ تلاش کررہا تھا۔ جب قسمت میں خرابی ہو تو کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی۔ وہ افسران کو چٹھیاں لکھ لکھ کر تھک گیا لیکن محکمۂ تعلیم میں اس کی ملازمت کا بندوبست نہ ہوسکا۔

اس نے تھک ہار کر پرانی اور نادر کتابوں کی تجارت شروع کردی۔ جہاں سے کوئی اچھی کتاب ملتی، خرید لیتا۔ پھر بڑے بڑے افسروں کو خط لکھتا کہ اس کے پاس فلاں نادر کتاب برائے فروخت موجود ہے۔

قطعہ تاریخ وفات از مولانا الطاف حسین حالی

آزاد وہ دریائے سخن کا دُرِ یکتا
جس کی سخن آرائی پہ اجماع تھا سب کا
ہر لفظ کو مانیں گے فصاحت کا نمونہ
جو اس کے قلم سے دمِ تحریر ہے ٹپکا
ملکوں میں پھرا مدتوں تحقیق کی خاطر
چھوڑا نہ دقیقہ بھی کوئی رنج و تعب کا
دیکھا نہ سنا ایسا کہیں اہلِ قلم میں
تصنیف کا تدوین کا تحقیق کا لپکا
صحت میں علالت میں اقامت میں سفر میں
ہمت تھی بلا کی تو ارادہ تھا غضب کا
فرض اپنا ادا کرکے کئی سال سے مشتاق
بیٹھا تھا کہ آئے کہیں پیغام طلب کا
آخر شبِ عاشور کو تھی جس کی تمنا
آپہنچا نصیبوں سے بلاوا اسے رب کا
تاریخ وفات اس کی جو پوچھے کوئی حالی
کہہ دو کہ ہوا خاتمہ اردو کے ادب کا

یہ تجارت اس کے لیے ذریعۂ معاش بھی تھی اور اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ بڑے بڑے افسروں سے اس کے تعلقات استوار ہونے لگے۔

ایک دن وہ صبح کی سیر کو نکلا ہوا تھا کہ پنڈت من پھول سے ملاقات ہوگئی۔ پنڈت جی دہلی کالج کے تعلیم یافتہ تھے اور لاہور میں گورنر پنجاب کے محکمے میں میر منشی کے عہدے پر فائز تھے۔ آزاد سے اکثر ملاقاتیں رہتی تھیں۔

"بھئی آزاد، تم اس وقت خوب ملے۔ ایک الجھن تھی مگر یقین ہے اب نہیں رہے گی۔ یہ بتاؤ ایجاد مذکر ہے یا مؤنث؟"

"خیریت ہے پنڈت جی! کیا ایجاد کرلیا۔"

"میجر فلر صاحب نے کوئی تحریر اردو میں لکھی ہے۔ اس میں لفظ ایجاد استعمال ہوا ہے۔ میجر صاحب کو یہ تحقیق کرنی ہے کہ ایجاد مذکر ہے یا مؤنث!"

"مذکر ہے۔"

"یہی خیال مولوی کریم الدین سررشتے دار کا بھی تھا لیکن فلر صاحب کو سند درکار ہے۔ آپ کے پاس کوئی سند ہے۔"

"بھئی، اگر آپ مرزا سودا کو سند مانتے ہیں تو فلر صاحب کو

یہ شعر سنا دیجیے گا۔"

ہائے کس بھڑوے کا یہ ایجاد ہے
نسخے میں معجونِ زر نباد ہے

پنڈت جی کی الجھن دور ہوگئی اور آزاد کی ملازمت کا بہانہ بن گیا۔

پنڈت من پھول نے یہ واقعہ من وعن فلر صاحب کے گوش گزار کردیا۔

"اس آدمی سے تو میں مل چکا ہوں۔ اس کے کئی خط بھی مجھ تک پہنچے ہیں۔" فلر نے کہا۔

"حالات کا ستایا ہوا ہے۔ نہایت قابل ہے لیکن قسمت یاوری نہیں کرتی۔ محکمۂ تعلیم میں ملازمت کے لیے کئی سال سے لاہور میں پڑا ہوا ہے۔"

آزاد کا نام وہ سن ہی چکے تھے۔ اس واقعے نے اس کی علیت کا سکہ ان کے دل پر جمادیا بالآخر دو سال بے کار رہنے کے بعد ۱۸۶۴ء میں اس کا تقرر محکمۂ تعلیم میں ہوگیا۔

ایک مرتبہ پھر مُردے میں جان پڑگئی۔ دلی مراد پوری ہوئی۔ حوصلے بیدار ہوگئے۔ عمر کی فصلِ بہار گزر چکی تھی لیکن ابھی اتنی دور نہیں گئی تھی کہ آواز نہ دی جاسکے۔ محکمہ تعلیم سے منسلک ہوتے ہی علمی سرگرمیوں میں مصروف ہوگیا۔ قواعد عربی کا ایک مسودہ تیار کرکے حکومت کو پیش کیا۔ سرکاری مدارس کے لیے ایک کتاب لکھنے کی اجازت مانگی۔ منطق پر ایک رسالہ لکھا۔ سررشتہ تعلیم کے لیے ابتدائی کتابیں لکھیں جو مدرسوں میں پڑھائی جانے لگیں۔ یہ سب تو تھا لیکن اس کا ادبی ذوق اب بھی کسی کونے میں بند پڑا تھا۔ جس کے قلم سے ادب کے شاہکار جنم لے سکتے تھے' وہ تعلیمی کتابیں لکھنے میں مشغول تھا۔ بچوں کو قواعد نویسی سکھا رہا تھا۔ اس کا افسوس اسے عمر بھر رہا۔

"کاش وہ دن جو میری عمر کی فصلِ بہار تھے۔ طبیعت جوان تھی۔ جوش ٹپکتے تھے' مضامین برستے تھے اور رنگ اڑتے تھے' ان تصانیف میں خرچ ہوتے جن سے میرے دل کے ارمان نکلتے.... لیکن بندگی بے چارگی۔ آخر کو نوکر تھا۔ وہ نہ کرتا تو کیا کرتا۔"

اس بندگی بے چارگی کے باوجود وہ اپنی صلاحیتوں سے بے نیاز نہ رہ سکا اور اس نے اپنی پہلی ادبی کاوش "کرن پھول" کے نام سے تصنیف کی۔ یہ تصنیف تعلیم نسواں کے موضوع پر لکھی گئی تھی لیکن زبان وبیان کی شگفتگی نے اسے ادبی تحریر بنادیا۔ قدیم وجدید کے امتزاج سے اس نے ایک نیا رنگ تخلیق کیا تھا۔ اس تحریر میں داستانی دور کی رنگینی بھی تھی اور جدید دور کی سادگی بھی۔ قصہ گوئی کی ایسی دلچسپ مثال پیش کی تھی جو اس کے شاندار مستقبل کی پیش گوئی کرتی تھی۔

۱۸۶۴ء میں گورنمنٹ کالج آف لاہور کا قیام عمل میں آیا اور ڈاکٹر لائٹنر اس کالج کے پرنسپل مقرر ہوکر لاہور آئے۔

آزاد اپنی آمدنی کو بڑھانے کے لیے ملازمت کے ساتھ ساتھ انگریزوں کو اردو بھی پڑھاتا تھا۔ لائٹنر نے اس کی شہرت سنی تو اسے اپنا ٹیوٹر مقرر کرلیا۔

مسٹر لائٹنر بڑے لائق اور زبانوں کی تحقیق کے مرد میدان تھے۔ آزاد ہی کی طرح انقلاباتِ زمانہ کی سختیاں جھیل چکے تھے لہٰذا یہ دو روحیں ایسی ملیں کہ پانچ مہینے کی ٹیوٹری ہمیشہ کی دوستی میں تبدیل ہوگئی۔ اب آزاد کا بیشتر وقت ان کے ساتھ گزرنے لگا۔ اس قربت نے لائٹنر کو آزاد کی علیت کا معترف بنادیا۔ لاہور میں جو چند قابلِ ترین لوگ تھے' آزاد کا شمار ان لوگوں میں ہونے لگا۔

محکمۂ تعلیم کی ملازمت اور لائٹنر کی ہمت افزائی نے آزاد کے حوصلے بہت بلند کردیے اور وہ نئے عزائم کے ساتھ کارزارِ حیات میں شریک ہوگیا۔

لائٹنر نہایت عملی آدمی تھے۔ کچھ نہ کچھ کرتے رہنا ان کی فطرت میں شامل تھا۔ جب کچھ دن انہوں نے لاہور میں گزار لیے تو انہیں ایک ایسی انجمن بنانے کا خیال آیا جس میں ادبی اور فنی مضامین پڑھے جائیں اور ان لیکچروں کو کتابی صورت میں شائع کراکے ملک میں پھیلایا جائے۔ انہیں حکومت کی سرپرستی بھی حاصل تھی اس لیے یہ کام ان کے لیے مشکل نہیں تھا۔

اپنی اس تجویز کو 'رئیسانِ لاہور سے مشورے کے بعد بہت جلد علمی صورت دے دی۔

۲۱ جنوری ۱۸۶۵ء کو سکھشا سبھا کے مکان میں لاہور کے سربرآوردہ لوگوں کا جلسہ ہوا۔ ان لوگوں میں زیادہ تر سرکاری ملازم تھے۔ پنڈت من پھول میر مجلس تھے جنہوں نے ابتدا میں اس جلسے کی غرض بیان کی۔

"اے صاحبان! ہم کئی برس سے اس بات کی فکر میں تھے کہ مثل شاہ جہاں پور' بریلی اور کلکتہ وغیرہ۔ اس شہر لاہور میں بھی ایک مجلس نامی گرامی عالم وفاضل افراد کی مقرر کی جائے جس میں ترقی علم وہنر کے خیالات تحریری اور تقریری انداز میں سامنے آئیں۔"

اس کے بعد انہوں نے لائٹنر کی علم دوستی اور ان کی

کوششوں کو بیان کیا۔
انجمن کا نام انجمن مطالب مفیدہ پنجاب رکھا گیا۔ من پھول صدر اور منشی ہرسکھ رائے کو سیکریٹری مقرر کیا گیا۔
انجمن کے ممبران میں دوسرے بہت سے لوگوں کے ساتھ آزاد کا نام نامی بھی تھا۔
اسے یہ اندازہ ہوچکا تھا کہ انجمن کے ذریعے وہ اپنی خداداد صلاحیتوں کو دنیا کے سامنے پیش کرسکتا ہے چنانچہ اس نے پورے جوش کے ساتھ انجمن کی کارروائیوں میں حصہ لینا شروع کردیا۔
وہ صرف رکن نہیں تھا جو اس انجمن کی ترقی کے لیے کام کرتا رہتا۔ وہ اپنا شمار ان لوگوں میں کرانا چاہتا تھا جن کے لیے نامی گرامی عالم وفاضل کے الفاظ استعمال کیے گئے تھے چنانچہ اس نے نہایت تحقیق اور محنت کے بعد ایک مضمون "درباب رفع افلاس" تیار کیا اور گیارہ فروری ۱۸۶۵ء کے جلسہ عام میں پبلک کے سامنے پیش کیا۔
اس مضمون کے بعد چوبیس فروری کے جلسے میں اس نے ایک اور مضمون "اہل ہند کو اپنے سود بہبود میں خود کوشش کرنی چاہیے" پڑھا۔
تین مارچ کے جلسے میں اس کی قابلیت کو دیکھتے ہوئے اسے کمیٹی امتحان زبان عربی کا ممبر مقرر کیا گیا۔ ۷ اپریل کے جلسے میں اس نے ایک اور مضمون "ترقی تجارت ہندوستان" پڑھ کر سنایا۔
چودہ اپریل کے جلسے میں اسے کمیٹی ترقی سررشتہ تعلیم کا رکن مقرر کیا گیا اور ۱۹ اپریل کو اس نے ایک مضمون ارتباط سلاطین سابق وحال پڑھ کر سنایا۔
انجمن کا اجلاس ہر ہفتے ہوتا تھا اور وہ ہر ہفتے ایک نیا مضمون لے کر حاضر ہوجاتا تھا۔ چند جلسوں کے بعد ہی اس کا نام چمکنے لگا۔ دور دور شہرت ہونے لگی۔
جب تک وہ گمنام تھا، کوئی بات تک پوچھنے کا روادار نہیں تھا لیکن جونہی اس کے مراتب میں اضافہ ہونے لگا، اس کے حاسد پیدا ہونے لگے۔
اس کے قریبی عزیزوں میں سے ایک صاحب مرزا محمد علی اس کے بڑھتے ہوئے رسوخ کو نہ دیکھ سکے۔ انہوں نے خفیہ طور پر گورنمنٹ کو اطلاع دی کہ محمد حسین آزاد وہی شخص ہے جس کے باپ کو غدر کے بعد مسٹر ٹیلر کے قتل کے الزام میں گولی سے اڑا دیا گیا تھا اور خود اس کے وارنٹ گرفتاری جاری ہوگئے تھے مگر اب تک یہ آزاد پھرتا ہے۔
غدر ہوئے کئی سال بیت گئے تھے لیکن گورنمنٹ ایسے

خراجِ عقیدت

"سرسید سے معقولات الگ کرلیجیے تو کچھ نہیں رہتے۔ نذیر احمد بغیر مذہب کے لقمہ نہیں توڑ سکتے۔ شبلی سے تاریخ لے لیجیے تو قریب قریب کورے رہ جائیں گے۔ حالی بھی جہاں تک نثر کا تعلق ہے سوانح نگاری کے ساتھ چل سکتے ہیں۔ آزاد صرف انشاء پرداز ہیں جن کو کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں۔"

(مہدی افادی)

"آزاد کی ادبی شخصیت ایک ہشت پہلو نگینہ ہے۔ اس کا جو رخ بھی ہمارے سامنے آتا ہے، وہ اپنی تابناکی سے نگاہوں کو خیرہ کردیتا ہے۔ اس نگینے کی تراش، رنگ روپ، وزن، سب اہم ہیں لیکن ان کی انشاپردازی ان کی باقی تمام خصوصیات پر فوقیت رکھتی ہے۔"

لوگوں سے اب بھی خائف تھی۔ اس مخبری کا خاطرخواہ اثر ہوا اور اس کے خلاف تحقیقات شروع ہوگئیں۔
معمولی بات نہیں تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنی ترقی کا شیش محل بنایا تھا۔ ذرا سی ٹھیس اسے کانچ کے ٹکڑوں میں تبدیل کرسکتی تھی۔ الزام غلط بھی نہیں تھا کہ وہ مطمئن رہتا۔ بات ایسی بھی نہیں تھی کہ دل میں رکھ لیتا۔ یہ خبر جیسے ہی اسے ملی اور گھر تک پہنچی، ایک کہرام برپا ہوگیا۔ دلی کی بربادی پھر آنکھوں کے سامنے گھومنے لگی۔
کچھ لوگوں سے امید تھی جو اس مشکل وقت میں کام آسکتے تھے۔ اس نے انہیں خط لکھ کر صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ ڈاکٹر لائٹنر نے بھی اسے تسلی دی کہ وہ اسے اس الزام سے بری کرانے کے لیے کوشش کریں گے۔
امیدیں تو سبھی دلاتے ہیں۔ دیکھیے کس کی کوشش بارور بھی ہوتی ہیں۔ ایک دھڑکا تھا کہ جان کے ساتھ لگا ہوا تھا کہ دیکھیے کب کیا خبر آتی ہے۔
آخر وہ گھڑی آپہنچی۔ شملے میں اس کی طلبی ہوئی تھی کہ وہ اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے فوراً شملہ پہنچے۔
وہ کئی مرتبہ شملہ گیا تھا لیکن یہ گھڑی کچھ اور تھی۔ وہاں سے واپس آنا نصیب بھی ہوگا کہ نہیں۔ وہ گھر میں سب کو روتا چھوڑ کر، ڈگمگاتے قدموں سے شملہ پہنچ گیا۔
ڈاکٹر لائٹنر اور ارسطوجاہ کی کوششیں رنگ لائیں۔

شملہ میں اس سے سوال جواب ضرور ہوئے لیکن وہ مجرم قرار نہیں پایا اور شملہ سے سرخرو واپس ہوا۔

○☆○

انیسویں صدی کے نصف اول پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعے ہندوستان پر برطانیہ کا قبضہ مستحکم ہوچکا تھا لیکن ہندوستان کی شمال مغربی سرحدوں کی کنجی ابھی تک اس کے ہاتھ میں نہیں آئی تھی۔

برطانیہ اس بات سے پریشان تھا کہ روس نے آہستہ آہستہ ایشیا میں جنوب کی طرف پاؤں پھیلانا شروع کردیئے ہیں۔ وسط ایشیا کا یہ علاقہ روس کے لیے گویا گھر کا پچھواڑا تھا۔ جب جی چاہے وہ وہاں اپنی فوجیں بھیج سکتا تھا۔ برطانیہ کی طرح اسے سمندر پار کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

برطانیہ نے افغانستان کو اپنے زیر اثر لاکر روس کے راستے میں خندق بنانے کی کوشش کی۔ ادھر روس نے افغانستان کے شمال میں ترکستان کی طرف قدم بڑھائے۔ دیکھتے ہی دیکھتے تاشقند، خوقند اور سمرقند روس کے اثر میں آگئے۔ دریائے سیحوں تک روس کی فوجی چھاؤنیاں بن گئیں۔ بخارا، بدخشاں اور پورا ترکستان روس کے زیر اثر آنے کو تھا۔

برطانیہ کو روس کی اس پیش قدمی سے یہ خطرہ لاحق ہوگیا تھا کہ کہیں وہ افغانستان سے ہوتا ہوا ہندوستان تک نہ پہنچ جائے۔

اس کا راستہ روکنا تھا لیکن حالات سے پوری طرح آگاہی نہیں ہورہی تھی۔ نہ ریڈیو تھا نہ تاربرقی کا سلسلہ کہ پل پل کی خبریں آنکھ جھپکتے دنیا کے ہر گوشے سے حاصل ہوجاتیں۔ فوجوں کی چڑھائی اور لڑائی کی خبریں عموماً سیاحوں اور مسافروں کی زبانی پہنچتی تھیں اور وہ بھی مبالغہ آمیز اور ادھوری۔

جب خطرہ بہت بڑھنے لگا اور روس کی لشکر کشی کے حالات جاننے کی ضرورت لازمی ہوگئی تو گورنر پنجاب نے وسط ایشیا کے حالات معلوم کرنے کے لیے ایک خفیہ جاسوسی مشن بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ حکومت پنجاب نے اس مقصد کے لیے چار آدمیوں کا انتخاب کیا۔ پنڈت من پھول، محمد حسین آزاد، منشی فیض بخش اور کرم چند نند رام۔

آزاد کو اس سفر کی دشواریوں کا پوری طرح علم تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر وہ جاسوسی کے الزام میں گرفتار ہوگیا تو حکومت ہندوستان اسے بچا نہیں سکے گی۔ اس نے یہ افسانے بھی سنے تھے کہ ترکمان قزاق، قافلوں پر دن دہاڑے چھاپے مارتے ہیں۔ وسط ایشیا میں بردہ فروشی عام ہے۔

دوسری طرف یہ لالچ بھی تھا کہ سمرقند و بخارا، بدخشاں وغیرہ کے وہ علاقے جن کا تذکرہ صرف کتابوں میں پڑھا ہے، انہیں دیکھنے کا موقع ملے گا۔ ترکی، فارسی اور عربی زبانوں سے شغف نے بھی اسے اس سفر پر اکسایا۔

وہ عجیب گومگوں کے عالم میں تھا۔ جان کو ہلاکت صاف نظر آرہی تھی۔ جان ہتھیلی پر رکھ کر اس سفر پر روانہ ہونا ہوگا۔ پھر بھی یہ ضرورت نہیں کہ زندہ سلامت اس سفر سے واپس آجاؤں۔

یہ مشن اتنا خفیہ تھا کہ کسی کو بتا بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ کس مہم پر جارہا ہے۔ مشورہ تو دور کی بات ہے۔ پھر اس نے خود ہی سوچا کہ اگر بہ خیریت واپس آگیا تو انگریزوں کی قربت اسے نصیب ہوجائے گی۔ ہندوستان کی بغاوت میں حصہ لینے کا جو الزام اس پر ہے وہ بھی دھل جائے گا اور بقیہ عمر اطمینان سے ادبی کام کرنے کا موقع ملے گا۔ اس کے مناصب میں اضافہ ہوگا۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کر اس سفر پر جانے کی حامی بھرلی۔

جیسے جیسے سفر کا وقت قریب آرہا تھا، اسے اپنے اہل و عیال کی فکر ستارہی تھی۔ وہ اس نئے شہر میں اکیلے کیسے رہیں گے۔ سفر ایسا درپیش تھا کہ واپسی کا کوئی وقت معین نہیں تھا۔ اس نے یہی مناسب سمجھا کہ بیوی کو اس کے میکے، دلی بھیج دیا جائے۔ اس نے اپنی مصروفیات کا بہانہ کیا اور بیوی بچوں کو دلی بھیج دیا۔

ان چاروں آدمیوں نے اپنے حلیے تبدیل کیے اور فرضی نام اختیار کرلیے۔ آزاد نے اپنا نام بہاؤالدین تجویز کیا اور ایک غریب طالب علم کا روپ دھارا جو بخارا، تعلیم حاصل کرنے کے لیے جارہا تھا۔

حکومت پنجاب نے ایک سوال نامہ ان لوگوں کو دیا۔ اس سوال نامے کی مدد سے انہیں وہ معلومات جمع کرنی تھیں جو حکومت چاہتی تھی۔

پنڈت من پھول اس وفد کی سربراہی کررہے تھے۔ وہ ہدایات لینے کوہ مری پہنچے اور آزاد پشاور روانہ ہوگیا۔

کوہ مری میں حکومت پنجاب کے سیکریٹری نے من پھول کو فرماں روائے کابل کے نام تعارفی خط دیا اور پشاور کے کچھ تاجروں کے نام چٹھیاں دیں جن میں وفد کے ممبروں کی مدد اور مالی اعانت کی ہدایات درج تھیں۔

پنڈت من پھول کوہ مری سے ایبٹ آباد آئے جہاں انہوں نے کرنل بیچر سے ملاقات کی۔

ایبٹ آباد میں پنڈت من پھول نے مشہور کرادیا کہ وہ تبدیلی آب وہوا کے لیے کشمیر جارہے ہیں تاکہ اس مشن کا راز کسی پر ظاہر نہ ہوجائے۔

پنڈت من پھول یہ چکما دے کر کشمیر جانے کے بجائے پشاور آگئے جہاں وفد کے دوسرے لوگ ان کے منتظر تھے۔

پشاور سے یہ چاروں افراد الگ الگ قافلوں میں کابل کے لیے روانہ ہوئے۔ گویا تمام افراد ایک دوسرے سے لاتعلق تھے۔

آزاد ایک طالب علم کے روپ میں سفر کررہا تھا لہٰذا اسے پوری اداکاری کرنی تھی' ایک طالب علم کے پاس اتنے پیسے نہیں ہوتے کہ وہ اشیائے خوردونوش پر خرچ کرتا پھرے چنانچہ جہاں قافلہ رکتا۔ یہ غریب طالب علم چند پیسوں میں اپنا پیٹ بھر کر قافلے والوں کو یقین دلاتا کہ وہ کوئی تاجر نہیں محض طالب علم ہے۔ کہیں روٹی اور کباب سے پیٹ بھرلیا۔ کہیں موقع ملا تو آٹا' گھی' نمک اور ماش کی دال لے کر کھانا کھالیا۔ جلال آباد میں سردہ کھاکر اور فتح آباد میں انار کھاکر گزارہ کیا۔

کئی منزلوں کے بعد قافلے والوں میں اس کے ذوق علمی کی باتیں ہونے لگیں کہ طلبِ علم اسے کسی دوردراز کے مقام پر لے کر جارہی ہے۔ بہرحال پندرہ دن کے سفر کے بعد وہ کابل پہنچ گیا۔

کڑاکے کی سردی پڑرہی تھی۔ وہ اکیلا تھا۔ اس کے ساتھی الگ الگ قافلوں کے ساتھ یا تو پہلے ہی پہنچ چکے تھے یا پہنچنے والے تھے۔

وہ جیسے ہی شہر میں داخل ہوا' سب سے پہلے اس نے سوا تین روپے کی ایک پوستین خریدی۔ اب وہ بالکل افغانی معلوم ہورہا تھا۔ اس کے اردگرد ہیبت ناک شکلوں کے قوی ہیکل افغانی' ہتھیار باندھے چل پھر رہے تھے۔ بعض آنکھوں نے اس کی طرف گھور کر دیکھا لیکن وہ برابر آگے بڑھتا گیا۔

اب اسے کسی سرائے کی تلاش تھی تاکہ وہ رہائش کے انتظام سے فارغ ہوکر کرم چند سنار کو تلاش کرسکے۔ یہ شخص سندھ کا رہنے والا تھا اور وفد میں شامل تھا۔ طے یہ ہوا تھا کہ سب ممبر ایک دوسرے سے لاتعلق رہیں گے۔ کرم چند کے ذریعے ان کے درمیان رابطہ ہوگا۔

ایک جگہ چند افغانیوں نے اسے پکڑلیا۔ اس پر جاسوس ہونے کا شبہ تھا۔ اس نے ہاتھ جوڑے' خوشامدیں کیں لیکن وہ اسے قتل کرنے کے درپے تھے۔ موت آنکھوں کے سامنے کھڑی تھی۔ ایک بھیڑ لگ گئی تھی لیکن کوئی اس کی بات سننے

کو تیار نہیں تھا۔

"اچھا، مان لیا تم جاسوس نہیں ہو لیکن کافر تو ضرور ہو اور ہمارے ملک میں کافر کی سزا قتل ہے۔"

"اللہ کے فضل سے میں مسلمان ہوں" آزاد نے کہا اور قرآن کی آیتیں پڑھ کر سنائیں۔ نماز سنائی کہ انہیں یقین آجائے۔

"یہ کافر ہے اور اس نے دھوکا دینے کے لیے نماز یاد کرلی ہے" لوگوں نے آوازیں لگائیں۔

"خدا کے لیے تم یہ بتاؤ کہ میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ میں مسلمان ہوں کافر نہیں ہوں۔ اگر میں ثابت نہ کرسکوں تو بے شک مجھے قتل کردینا۔"

آخر ایک بوڑھا آدمی سامنے آیا۔ آزاد نے یہی التجا اس سے بھی کی۔

"اس شخص کے کپڑے اتاردو۔ ابھی معلوم ہوجائے گا کہ یہ مسلمان ہے یا نہیں۔"

آزاد کو سرِبازار یہ بے عزتی برداشت کرکے اپنی جان بچانی پڑی۔

جب معلوم ہوگیا کہ یہ واقعی مسلمان ہے اور تعلیم حاصل کرنے بخارا جارہا ہے تو وہی افغانی اس سے برادرانہ پیش آئے اور انہی کے توسط سے ایک سرائے میں اس کا قیام ہوگیا۔

سفر کا آغاز ہی ایک بھیانک خواب سے ہوا تھا۔ سرعام اس کی کیسی بے عزتی ہوئی تھی۔ اسے اپنی دلی کے ایک شاعر کا یہ شعر یاد آگیا۔

مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بے کسی کی شرم

اسے افسوس ضرور ہوا لیکن یہ سوچ کر صبر بھی کرلیا کہ اس سفر میں ایسے مراحل تو آنا ہی تھے۔ ان کا اندازہ غلط بھی نہیں تھا۔ میں جاسوس ہی تو ہوں۔

ابھی دن تھا اور وہ باہر نکل سکتا تھا۔ درپیش آنے والے واقعے نے اسے بدمزہ کردیا تھا لیکن نکلنا ضروری بھی تھا۔ اسے پہلی فرصت میں کرم چند سنار کو تلاش کرنا تھا۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد وہ سرائے سے نکلا۔

دھوپ چمکنے لگی تھی لیکن سردی کی شدت میں کمی نہیں آئی تھی۔ بازاروں میں اتنی بھیڑ تھی جیسے اس شہر کے لوگوں کو کوئی کام ہی نہ ہو۔ جگہ جگہ قہوہ خانے بنے ہوئے تھے۔ ان کثیف قہوہ خانوں میں قہوے کے دور چل رہے تھے۔ کلے پائے کا شوربا پیا جارہا تھا۔ وہ بھی ایک قہوہ خانے میں پہنچ گیا۔ اس کی نگاہیں قہوے کی پیالی پر اور کان لوگوں کی باتوں پر لگے ہوئے تھے۔

اس کے اردگرد بیٹھے ہوئے لوگ سخت گھبرائے ہوئے تھے۔ ہر زبان پر لشکر کشی کے قصے تھے۔ امیر کابل ان دنوں قندھار گیا ہوا تھا۔ اس کا ایک بھتیجا سردار عبدالرحمٰن خاں کابل کے تخت کے حصول کے لیے بخارا میں فوجیں جمع کررہا تھا اور یہ افواہیں گردش کررہی تھیں کہ وہ بہت جلد حملہ کرنے والا ہے۔

اس نے اس وقت تو کوئی اہمیت نہیں دی لیکن جب ادھرادھر گھوم کر اسے اندازہ ہوا کہ ہر جگہ یہی خبریں گرم ہیں تو اس کی آنکھوں کے سامنے دلی کی تباہی کا نقشہ گھوم گیا۔ جنگ شروع ہوگئی تو یہاں سے نکلنا بھی دوبھر ہوجائے گا۔ اگر جنگ چھڑگئی تو کابل سے آگے جانا بھی خطرناک ہوجائے گا۔

یہی سوچتا ہوا وہ ان مقامات کی طرف جارہا تھا جہاں کرم چند سنار کو اس سے ملنا تھا۔ بالآخر ایک جگہ اس سے ملاقات ہوگئی۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ پنڈت من پھول اس سے پہلے یہاں پہنچ چکے ہیں۔ امیر کابل سے ملاقات نہیں ہوسکی کیونکہ وہ قندھار میں ہیں۔ کرم چند بھی لشکر کشی کی افواہوں سے پریشان تھا۔

دوسرے روز ایک خفیہ مقام پر ان چاروں نے ملاقات کی اور طے ہوا کہ کابل سے فوراً نکل جانا چاہیے۔ یہ تجویز بھی پیش ہوئی کہ ہندوستان واپس چلیں لیکن اس پر اتفاق نہ ہوسکا۔ پنڈت من پھول کی ہدایت کے مطابق کابل سے نکل کر ترکستان کے سفر کے لیے سامانِ سفر باندھنا پڑا۔

ایک قافلہ تاشقرغان کی طرف جارہا تھا۔ آزاد اور ایک دوسرے ساتھی منشی فیض بخش جو غلام ربانی کے نام سے سفر کررہے تھے اس قافلے میں شریک ہوگئے۔ من پھول پہلے ہی روانہ ہوچکے تھے۔

کابل سے بخارا تک قافلے صدیوں سے برابر آتے جاتے تھے لیکن اس راستے کی صعوبتیں ضرب المثل تھیں۔ راستہ تنگ اور خطرناک دروں سے گزرتا تھا اور بعض جگہ یہ پگڈنڈی باریک لکیر بن جاتی تھی۔ ترکمان لٹیروں اور چھاپا ماروں کا خوف الگ دامن گیر رہتا تھا۔ جتنی داستانیں اس نے سنی تھیں، وہ اب انہیں خود دیکھ رہا تھا۔

کابل سے نکلتے ہی دونوں طرف بلند پہاڑ دیواروں کی طرح ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ بیچ میں شاہراہ تھی جس پر قافلہ چلا جاتا تھا۔ دونوں طرف گہرے گڑھے کہ دیکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ ذرا پاؤں بہکا اور گیا۔ ٹھہرنے کے لیے نہ کہیں سرائے

نہ منزل کا انتظام۔ جہاں قافلہ تھک جاتا وہیں ڈیرے ڈال دیتا۔ یہ تو اکتوبر تھا۔ ان پہاڑوں پر تو مئی اور جون میں بھی برف جمی رہتی تھی۔

خدا خدا کرکے بلخ آگیا۔ بلخ سے چند منزل آگے بڑھ کر قافلے نے پڑاؤ کیا۔

راستے بھر وہ عبرت کے عجیب مناظر دیکھتا آیا تھا۔ قلعہ ضحاک ویران پڑا تھا۔ اس کی فرسودہ فصیلیں اور بے شمار برج اور کنگرے دور سے اداسی اور مایوسی کی تصویر دکھا رہے تھے۔ ہزاروں خرابے اور ویرانے گمنام پڑے تھے۔ شہر کے شہر زیر زمین مدفون پڑے تھے۔ جا بہ جا پرانے زمانے کے پیسے اشرفیاں اور نگینے نکلتے تھے۔

جیسے ہی قافلے نے پڑاؤ کیا' گاؤں کے لوگ آ آکر قافلے میں پھرنے لگے۔ یہ لوگ کھانے پینے کی مختلف اشیا ہاتھوں میں اٹھائے ہوئے تھے۔ ہاتھ کے بنے ہوئے قالین بھی ان کے پاس تھے۔

قافلے کے کچھ لوگوں نے جب کپڑا' سوئیاں' انگوٹھیاں اور مختلف ایسی ہی چیزیں دے کر کھانے کا سامان ان سے خریدا تو آزاد کو معلوم ہوا کہ یہ لوگ روٹیاں' انڈے' گھی' دودھ وغیرہ بیچنے کے لیے آئے ہیں ورنہ وہ تو یہ سمجھے ہوا تھا کہ میزبانی کا یہ بھی کوئی انداز ہے۔

یہ لوگ راستے کی دشواریوں کی وجہ سے یہاں سے نکل نہیں سکتے اس لیے قافلے والوں سے بڑے شوق سے مل رہے تھے اور ان سے طرح طرح کی باتیں پوچھ کر خوش ہو رہے تھے۔ زبان فارسی تھی اس لیے آزاد کو ان کی بات سمجھنے میں دشواری نہیں ہو رہی تھی۔

اس راستے کا سب سے اہم مقام تاشقرغان تھا۔ افغانستان کے اس شہر کو اس لیے اتنی اہمیت حاصل تھی کہ یہاں چین' بدخشاں' ترکستان' قندھار' ہرات وغیرہ سے راستے آکر ملتے تھے۔ یہ تجارت کی بھی بہت بڑی منڈی تھا جہاں بخارا کے لوگ سلک' شکر' روسی کاغذ اور دوسری چیزیں شمال سے لاتے تھے اور ہندوستان' افغانستان کے قافلے یہیں سے سامان خرید کر بخارا جاتے تھے۔

یہ کاروباری مرکز تھا۔ غیر ملکی یہاں آتے جاتے تھے اس لیے آزاد یہاں بے خوفی سے گھومتے رہے۔ وفد کے دیگر ارکان بھی یہاں آکر اس سے مل گئے تھے۔

یہاں کی آبادی زیادہ تر ازبک تھی اور ترکی زبان بولتی تھی۔ قافلوں کے آنے جانے کی وجہ سے فارسی زبان بھی لوگ آسانی سے سمجھ لیتے تھے۔ آزاد کو یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ یہاں کے مقامی تاجر زیادہ تر ہندو ہیں جو عموماً سندھ کے شہر شکارپور کے باشندے تھے۔

اس سے زیادہ حیرت اسے اس بات پر ہوئی کہ یہاں کے بازاروں میں بچے' عورتیں اور مرد بھیڑ بکریوں کی طرح بکنے آتے تھے۔ یہ نہ انسانیت کے خلاف جرم سمجھا جاتا تھا نہ قانون کے مطابق۔

تاشقرغان ان کی منزل نہیں تھی۔ یہاں سے انہیں اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہونا تھا چنانچہ پنڈت من پھول اور کرم چند سنار تو بدخشاں کے دارالحکومت فیض آباد کے لیے روانہ ہوگئے اور آزاد اپنے ساتھی غلام ربانی کے ساتھ ایک قافلے کے ہمراہ ترکستان روانہ ہوگیا۔

تاشقرغان سے ترکستان جانے والے قافلے آمو دریا کی جانب روانہ ہوتے تھے کیونکہ افغانستان اور ترکستان کی سرحد یہ دریا تھا۔ اس دریا کا پاٹ اس قدر چوڑا تھا کہ اسے پار کرنے میں کشتی کو ڈھائی گھنٹے لگ گئے۔ دریا کے دائیں کنارے پر ترکستان کا علاقہ تھا۔ میلوں تک بے آب و گیاہ صحرا کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔

اب اس قافلے کا رخ بخارا کی طرف تھا۔ مختلف منزلوں سے گزرتا ہوا یہ قافلہ قرشی پہنچا۔ یہ ایک قصبہ تھا جو آبادی کے لحاظ سے تاشقرغان سے بھی بڑا تھا۔ اس کے آس پاس خوبصورت باغات تھے جن میں شیریں اور لذیذ پھلوں سے لدے درخت جھوم رہے تھے۔ یہاں بھی بردہ فروشی کا بازار گرم تھا۔

اس قصبے سے گزرنے کے بعد اس قافلے کو پھر ایک دشت عبور کرنا تھا۔ اس دشت میں جگہ جگہ ترکمان قبیلوں کے خیمے نصب تھے۔ ان ترکمانوں کا گزارا لوٹ مار پر تھا اس لیے قافلے کا ہر شخص چوکنا اور ہوشیار تھا۔ ایک جگہ یہ دیکھ کر آزاد پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے کہ یہ ترکمان اپنے گھوڑوں کو دنبے اور بکری کا گوشت کھلا رہے تھے۔ جلد ہی یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی کہ یہاں گھاس کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ پھر یہ اپنے جانوروں کو گوشت نہ کھلائیں تو کیا کھلائیں؟

آمو دریا سے پندرہ دن کی مسافت کے بعد' پانی کی کمی اور سخت سردی جھیل کر وہ بخارا کے نزدیک پہنچ گیا۔

بخارا وہی شہر تھا جس کے علم و فضل' مسجدوں' مدرسوں' حماموں اور قہوہ خانوں کے افسانے زبان زد خاص و عام تھے۔ اسلامی دنیا میں اسے بڑی وقعت سے دیکھا جاتا تھا۔

بخارا کے گرد فصیل کا حصار بنایا گیا تھا۔ یہ فصیل مٹی

کی بہت موٹی دیوار تھی اور شہر میں داخل ہونے کے گیارہ دروازے تھے۔ سورج چھپتے ہی شہر کے دروازے بند کردیے جاتے تھے۔

یہاں کے بازار نہایت پُررونق تھے۔ ایران، کابل اور ہندوستان تک سے تجارت کا سامان بخارا کے بازاروں میں لاکر بیچا جاتا تھا۔ اس اعتبار سے بخارا، ایشیا کی سب سے بڑی منڈی تھا۔

شہر میں جگہ جگہ سرائیں تھیں جو دن رات قافلوں کے آنے جانے کی وجہ سے بھری رہتی تھیں۔ ہندوؤں اور یہودیوں کو گھوڑوں یا گدھوں پر سواری کی اجازت نہیں تھی۔ مسلمانوں کو تمباکو پینے کی اجازت نہیں تھی۔

نمازِ مغرب کے بعد نقارہ بجاکر بازار بند کرادیے جاتے تھے۔ اس کے بعد کسی کو کاروبار کرنے کی اجازت نہیں تھی۔

شہر کے قلعے کو "آرک" کہتے تھے۔ امیر بخارا کے محلات اسی قلعے کے اندر تھے۔ قلعے کے قریب مینار کلاں تھا۔ اس مینار سے مجرموں کو پھینک کر موت کی سزا دی جاتی تھی۔

یہاں کی سیکڑوں مسجدیں اور مدرسے تو پوری اسلامی دنیا میں مشہور تھے۔

عورتیں سختی سے پردہ کرتی تھیں۔ مرد رنگ برنگ کے چغے اور عبائیں پہنتے تھے اور سر پر سفید عمامہ باندھتے تھے۔

جب آزاد وہاں پہنچا تو بخارا میں مخبری کا بازار گرم تھا۔ امیر بخارا کی طرف سے بہت سے جاسوس اس کام پر مقرر تھے کہ وہ بازاروں میں گھوم پھر کر غیر ملکی باشندوں پر نظر رکھیں۔

آزاد چونکہ منشی فیض بخش کے ساتھ تھا جو تاجر کے روپ میں سفر کررہے تھے اس لیے وہ مطمئن تھا۔ اس کا بیشتر وقت بازاروں میں گزرتا تھا اس لیے لوگوں کے خیالات جاننے کی بہت سہولت تھی۔

بے پناہ سردی کا مقابلہ کرتے ہوئے وہ بڑی ہوشیاری سے روزانہ کی رپورٹ لکھ کر اپنے لباس کی خفیہ جیبوں میں رکھتا جارہا تھا۔

روسی فوجیں تاشقند پر قبضہ کرچکی تھیں اور اب ایک اور علاقے خجند پر محاصرے کی تیاریاں ہورہی تھیں۔ امیر بخارا کی طرف سے مقابلے کی تیاریاں شروع ہونے لگی تھیں۔ کابل کی طرح یہاں بھی جنگ کا ماحول تھا اور آزاد کو ابھی اور آگے جانا تھا۔

وہ بخارا سے نکلا اور ڈیڑھ سو میل کے فاصلے کو طے کرکے سمرقند پہنچ گیا۔ اب منشی فیض بخش اس کے ساتھ نہیں تھے، وہ اکیلا تھا۔

سمرقند کی خوبصورتی، اس کی عمارتوں کی دلکشی اور آب و ہوا کے مداح مغرب و مشرق کے تمام سیاح تھے۔

اس شہر کے بارے میں آزاد نے تزکِ بابری میں پڑھا تھا کہ دنیا کا سب سے خوبصورت شہر ہے۔ جیسے اعلیٰ پائے کے فقیہہ اور امام یہاں ملتے ہیں ان کی کوئی اسلامی شہر مثال پیش نہیں کرسکتا لیکن آزاد جب یہاں پہنچا تو ابتری اور بدحالی کا دور تھا۔ روسی حملے کے خوف سے لوگوں کے چہرے پیلے پڑے ہوئے تھے۔ ہر طرف دھول اڑ رہی تھی۔

اس نے جلدی جلدی اس شہر کو گھوم پھر کر دیکھنا شروع کیا۔ اس نے وہ مسجد دیکھی جس کی محراب پر قرآن شریف کی آیات اس قدر جلی حروف میں لکھی ہوئی تھیں کہ ایک میل سے انہیں پڑھا جاسکتا تھا۔

اس نے گور امیر کی سیاحت بھی کی۔ یہاں امیر تیمور دفن ہے۔ تیمور کی قبر کا تعویذ سنگ سیاہ کا تھا اور اس میں بال پڑا ہوا تھا۔ معلوم کرنے پر اسے معلوم ہوا کہ ایک روایت کے مطابق جب نادر شاہ نے سمرقند فتح کیا تو اس پتھر کو توڑنے کی کوشش کی تھی جس کی وجہ سے یہ بال پڑگیا۔ قبر پر ایک جھنڈا رکھا تھا جو عام عقیدے کے مطابق تیموری فتوحات کی یادگار تھا۔

اب تک وہ اس علاقے میں سفر کررہا تھا جہاں امیر بخارا کی حکومت تھی۔ سمرقند سے نکلنے کے بعد وہ دریائے جیحوں کے کنارے کھڑا تھا جس کے اس پار وہ علاقے تھے جو روس کے قبضۂ اقتدار میں آچکے تھے۔ یہاں پہنچ کر اسے یہ معلوم کرنا تھا کہ روسی فوجوں کی تعداد کتنی ہے۔ توپیں کتنی ہیں۔ فوج میں اصل روسی کتنے ہیں۔ کیا مسلمان بھی شامل ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

رستے میں کئی منزلیں ایسی ملیں کہ جہاں سرائے یا مکان کچھ نہ تھا۔ زمین پر کمر کمر برف چڑھی تھی اور ادھر ادھر پہاڑ برف سے سفید دکھائی دیتے تھے۔ جب قافلہ کہیں پڑاؤ کرتا تھا اور آگ جلانی پڑتی تھی تو برف ہٹاکر زمین نکالنا اور لکڑیاں جمع کرنا دشوار ترین کام ہوتا تھا۔

دریائے جیحوں سردی کی شدت سے جم گیا تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے یہ دریا نہیں کسی نے شیشے کا بڑا تختہ بچھادیا ہو جس پر سے قافلے بلا تکلف آ اور جارہے تھے۔

روسی عمل داری میں اس وقت برطانوی رعایا کے کسی فرد کا قدم رکھنا گویا موت کے منہ میں جانا تھا۔ آزاد کی پامردی کہ وہ بے جھجک بخارا کی سرحد عبور کرکے روسی علاقے میں داخل ہوگیا۔

اس علاقے میں پہنچتے ہی اس نے طالب علم کا چولا اتار پھینکا اور اپنے آپ کو درویش یا قلندر ظاہر کرنے لگا۔
کسی منزل پر رات کو اس نے قیام کیا۔ سردی کے موسم میں سب سے گرم جگہ سرائے میں تندور کے پاس ملی۔ یہ وہیں لیٹ گیا۔ چراغ کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ ایک شخص جو بالکل اس جیسا تھا، سامنے کھڑا ہے۔ پہلے تو اس نے اسے اپنا وہم سمجھا لیکن جب یہ شخص اس کے پاس آکر بیٹھا تو اس پر گھبراہٹ طاری ہوئی اور اس وقت تو وہ بالکل ہی ڈر گیا جب اس شخص کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔
"میرا نام محمد حسین ہے" اس کے ہم شکل نے اپنا تعارف کرایا۔
آزاد اس سفر میں بہاؤالدین کے نام سے سفر کر رہا تھا۔ اس کا اصل نام کسی کو بھی معلوم نہیں تھا۔ اس کی زبان سے اپنا نام سن کر آزاد کو یقین ہو گیا کہ اس کا راز فاش ہو گیا اور اب جان کی خیر نہیں۔ خوف سے اس کی رگوں میں خون جم گیا۔ اٹھنے کی سکت نہیں تھی لیکن وہ ہمت کر کے اسی وقت سرائے سے روانہ ہو گیا۔
وہ شخص کون تھا؟ آزاد کا ہمزاد؟ یہ معما وہ کبھی حل نہ کر سکا۔ شاید یہ اس کا وہم ہی ہو۔
یہ وہاں سے نکلا اور خوقند، خجند اور تاشقند ہوتے ہوئے شمال میں چم کنت تک پہنچ گیا۔ یہی نہیں بلکہ وہ دریائے آرس کے کنارے تک پہنچ گیا۔ یہ وہ علاقہ تھا جہاں روس کے قبضے کے بعد کسی غیر ملکی باشندے کے قدم یہاں نہیں پہنچے تھے۔
وہ ان علاقوں کے ایک ایک گاؤں میں گھوما، مسجدوں میں ٹھہرا، مدرسوں کی خاک چھانی، محاذوں کی طرف نکل گیا۔ روسی توپوں کے گولوں کی آوازیں سنیں۔ کسی نے دیکھ بھی لیا تو کوئی مجذوب فقیر سمجھ کر اس سے تعرض نہیں کیا۔ اس کی حالت اب ہو بھی ایسی گئی تھی کہ کوئی اسے مجذوب ہی سمجھتا۔ نہائے ہوئے مہینوں گزر گئے تھے۔ بال اجڑے ہوئے، کپڑوں میں جوئیں۔ جہاں جگہ مل جاتی، لیٹ جاتا۔ جہاں کھانے کو مل جاتا کھا لیتا۔ دیوانے کا روپ دھار کر وہ روسی فوجوں کی معلومات اور ان کے ٹھکانے قلمبند کرتا رہا۔ نقشے بناتا رہا۔

○☆○

پنڈت من پھول آزاد کے ترکستان روانہ ہونے کے وقت بدخشاں میں ٹھہر گئے تھے۔
جب سات آٹھ مہینے گزر گئے اور ترکستان سے آزاد کی

نمونۂ کلام

متردّد ہے دل کہوں نہ کہوں
پوچھتے ہیں وہ مدعا میرا
ہر نگہ میں ہیں سیکڑوں ارماں
کوئی دیکھے تو دیکھنا میرا
پاس تم کو اگر نہیں تو نہ ہو
اے بتو! کیا نہیں خدا میرا
لیے جاتے ہو تم کہاں دل کو
ہے وہ مدت سے آشنا میرا

شب نشے میں جو رخِ یار سے پردہ اٹھا
لطف دورِ شبِ مہتاب سے کیا کیا اٹھا
خلق سے اٹھ گئے پر سنگ درِ جاناں سے
روشِ نقشِ قدم پاؤں نہ اپنا اٹھا
جل گئے سوزِ نہاں سے جگر و دل شاید
دیکھنا روزنِ سینہ سے دھواں سا اٹھا
شعر گوئی کا تو رکھتا نہیں دعویٰ آزاد
ہاں پہ استاد کی صحبت میں ہے اٹھا بیٹھا

گزرے خموش کوئے سلامت روی میں ہم
ہم نے برا سنا نہ کسی کو برا کہا

جہاں کے حسن ہیں تم میں کہ شاہ حسن ہو تم
جو عیب پوچھو جہاں کے تو اس غلام میں ہیں

جہازِ عمرِ رواں پر سوار بیٹھے ہیں
سوار خاک ہیں بے اختیار بیٹھے ہیں

ہر دم پھرے ہے ساتھ نسیم و صبا لگی
ایسی چمن میں آکے گلوں کو ہوا لگی
اس گل سے جا لگی کبھی اس گل سے جا لگی
گلشن میں ہے کسی نہ کسی سے صبا لگی

کوئی خبر نہیں آئی تو انہیں تشویش ہوئی۔ بدخشاں، ترکستان جانے والے قافلوں کے راستے سے ہٹ کر ہے اس لیے کسی مسافر سے بھی ان کی خبر نہیں مل سکتی تھی۔ آخر کرم چند سنار کو ان کی تلاش میں روانہ کیا۔ کرم چند انہیں ڈھونڈتا ہوا خوقند تک جا پہنچا اور آخر ان کا پتا لگالیا۔ منشی فیض بخش بھی مل گئے اور آزاد بھی۔

بعد میں منشی فیض بخش اور آزاد بہت سی معلومات لے کر علیحدہ علیحدہ بدخشاں کی طرف روانہ ہوئے۔ جولائی ۱۸۶۶ء میں وہ بدخشاں پہنچ گیا۔

بدخشاں کا نام جب وہ کتابوں میں لکھا دیکھتا تھا تو دل، دولت سے مالا مال ہوجاتا تھا لیکن جب آنکھ سے دیکھا تو پیٹ سے پتھر باندھنے کو جی چاہا۔

فیض آباد اس کا دارالخلافہ تھا جس کے گرد پہاڑوں کی قطاریں حفاظت کو کھڑی تھیں۔ جن پر برف سفید چادر کی طرح بچھی ہوئی تھی۔ مخملی پہاڑ، چشمے جابجا جاری، زمین سرسبز، رنگ رنگ کے پھول۔ پورا ملک میووں سے مالا مال۔

اس سرزمین پر قدرت نے اپنی دست کاری کا تھیلا الٹ دیا تھا لیکن انسانی دست کاری بالکل مفقود تھی۔ تعلیم، صنعت گری، زراعت، تجارت وغیرہ جو سامان تحصیلِ دولت کے ہیں یہاں ایک بھی نہیں تھا۔ انسان تمام صاحبِ جمال، قوی ہیکل مگر بے ہمت اور آرام طلب۔ زراعت بقدرِ ضرورت کرلیتے تھے، تجارت کے لیے گھر سے باہر نکلنا پڑتا تھا اس لیے کون نکلے۔

ان کی کاہلی کا یہ حال تھا کہ فیض آباد تقریباً سات سو گھروں کی بستی تھی لیکن یہاں ایک بھی نائی نہیں تھا۔ ہر شخص کی کمر میں ایک چھری لٹکی ہوئی تھی۔ چھری سے گوشت کاٹ لیتے تھے، چاقو سے ایک دوسرے کی حجامت کرلیتے تھے۔

بدخشاں میں آکر اسے کسی قدر آرام ملا تھا لہٰذا کامل چار ماہ اس ملک میں گزارے۔ یادداشتیں لکھیں۔ رپورٹ تیار۔ ان معلومات کو مرتب کیا جو وہ روسی علاقوں سے لایا تھا۔

اب واپسی کا وقت آگیا تھا۔ منشی فیض بخش تو بدخشاں سے کوہِ ہندوکش کے راستے پر جلال آباد ہوتے ہوئے پشاور کی سمت روانہ ہوئے۔ آزاد، پنڈت من پھول اور کرم چند کافرستان کی طرف چلے تاکہ وہاں چترال اور دیر سے ہوتے ہوئے وطن پہنچیں۔

چاروں طرف پہاڑ۔ درختوں کا بن۔ گھاٹی ایسی تنگ کہ دو تین آدمی بہ مشکل چل سکیں۔ رستہ ایسا کہ پتھروں کے اتار چڑھاؤ پر ایک لکیر سی پڑی ہے۔ گھوڑوں کا دل تھا کہ چلے جاتے تھے۔

ان پہاڑوں پر ایسے گھنے جنگل تھے کہ دن میں بھی اندھیرا رہتا تھا۔ چشموں کی چادریں اس زور سے گر رہی تھیں کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

ان دشوار گزار پہاڑی دروں کو عبور کرکے یہ چھوٹا سا قافلہ کافرستان میں داخل ہوا۔ اس وقت کافرستان پر افغانستان کی حکومت قائم نہیں ہوئی تھی اس لیے ہر وقت چھاپے مار کافروں کا ڈر لگا رہتا تھا۔

کافروں کے نزدیک مسلمانوں کا قتل بڑا ثواب سمجھا جاتا تھا۔ جو شخص چار مسلمانوں کو قتل کرلیتا تھا، اسے برادری میں ایک خاص درجہ حاصل ہوجاتا تھا۔ اسی لیے آزاد اور ان کے ساتھی، آبادی سے دور دور رہتے تھے۔ ایک وادی میں دور سے انہیں کسی عورت نے دیکھ کر شور مچایا اور غالباً گاؤں والوں کو خبردار کرنا چاہا لیکن اس سے پہلے کہ لوگ موقع پر پہنچتے، یہ سب وہاں سے جلدی جلدی آگے بڑھ گئے اور بڑی دیر تک پہاڑوں میں چھپے رہے۔ جب یقین ہوگیا کہ کوئی تعاقب میں نہیں تو آگے بڑھے۔

اب درۂ دوراہ ان کے سامنے تھا۔ یہ درہ ۱۳ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع تھا۔ یہ درہ عبور کرکے وہ درہ لورالائی پہنچے۔ یہ مقام بھی دس ہزار فٹ کی بلندی پر تھا۔ قدم قدم پر گھوڑوں کے سم پتھروں سے ٹکرا رہے تھے مگر جان کے خوف سے برابر آگے بڑھنا پڑ رہا تھا۔

ایک دشوار گزار راستے پر پہنچے تو پگڈنڈی پہاڑ کے موڑ کے ساتھ ایک باریک سی لکیر بن گئی تھی۔ اس کے آگے نالا تھا۔ خدا پر توکل کرکے گھوڑے پانی میں ڈال دیے اور اس کے نام کی برکت سے غیر شپر کرتے پار ہوگئے۔

چترال پہنچ کر چند روز آرام کیا۔ یہاں سے نکل کر باجوڑ کے علاقے میں پہنچے۔

دیر کے علاقے سے آزاد نے انگریزی عمل داری میں قدم رکھا۔ آخر ہوتی مردان کے راستے ۷ نومبر ۱۸۶۶ء کو پشاور واپس پہنچ گئے۔

اگر سفر کی ابتدا مری سے کی جائے تو آزاد نے یہ مہم پندرہ مہینے میں تقریباً ڈھائی ہزار میل کی مسافت پیدل، گھوڑوں اور اونٹوں پر طے کی جو انیسویں صدی میں ایک تاریخی واقعہ تھا۔

وہ اپنی سسرال دلی پہنچا جہاں وہ بیوی بچوں کو چھوڑ کر گیا

تھا تو یہ معلوم ہوتا تھا جیسے مردہ، زندہ ہو کر آگیا ہے۔ کون سی منت تھی جو اس کی غیر موجودگی میں نہیں مانی گئی تھی اور اب ان منتوں کو پورا کرنے کا وقت آگیا تھا۔

سفر کی تکمیل ہو چکی تھی لیکن وہ کئی مہینوں تک پنڈت من پھول کے ساتھ مل کر رپورٹ مرتب کرتا رہا۔ پھر اسے کلکتہ جانا پڑا کیونکہ حکومت ہند کے مرکزی دفاتر کلکتہ میں تھے اور پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ کے افسر زبانی جمع خرچ کرکے روسی ترکستان کے حالات کی تحقیق کے خواہش مند تھے۔

کلکتے کے قیام میں اس نے وہاں کے ادیبوں سے ملاقاتیں کیں، کتب خانے دیکھے، مکتبوں اور مدرسوں کا معائنہ کیا، نایاب کتابیں خریدیں اور اس سفر کو بھی اپنے لیے یادگار بنالیا۔

○☆○

ترکستان کے سفر پر روانگی سے قبل ہی ایک بے قاعدگی کی وجہ سے محکمۂ تعلیم کی ملازمت ختم ہو گئی تھی۔ اس نے یہ سفر فارن ڈپارٹمنٹ کی طرف سے کیا تھا چنانچہ واپسی پر اسے چھ سو روپے کا خلعت اور سو روپے کے حساب سے چودہ ماہ کی تنخواہ مل گئی اور وہ اسی طرح حیران لڑا رہ گیا جس طرح پہلے دن لاہور میں آیا تھا۔ بے کار ۔ بے روزگار۔

وہ بے روزگار ضرور تھا لیکن پہلے کی طرح بے سہارا نہیں تھا۔ اس نازک وقت پر ڈاکٹر لائٹنر نے اس کی دست گیری کی۔ انہوں نے آزاد کو انجمن پنجاب کا سیکریٹری مقرر کرادیا۔ یہاں سے اسے پچاس روپے ماہوار تنخواہ ملنے لگی۔

اس نے انجمن کا سیکریٹری مقرر ہونے کے بعد انجمن میں نئی روح پھونک دی۔ تھوڑے ہی دن میں یہ روشنی کا ایسا مینار بن گئی جسے دیکھنے کے لیے دور دور سے لوگ آتے تھے۔ چندہ کرکے امدادی رقوم بھیجتے تھے اور انجمن کی کامیابی کے لیے دعا کرتے تھے۔

یہ دور اس کی مضمون نگاری کے عروج کا دور تھا۔ انجمن کے جلسوں میں پڑھنے کے لیے وہ کم و بیش ہر مہینے ایک نیا مضمون تخلیق کرتا تھا۔ ہر طرف اس کی انشا پردازی کی دھوم مچ گئی۔ یہاں تک کہ خود ناظمِ تعلیمات پنجاب کو اس کی ضرورت پڑ گئی۔

انسپکٹر تعلیمات اردو زبان میں تاریخ ہند مرتب کر رہے تھے۔ اس کے لیے انہیں ایک اردو داں کی مدد کی ضرورت تھی۔ ان کی نگاہِ انتخاب آزاد پر پڑی۔ جس محکمے نے اسے بے قاعدگی کے سبب ملازمت سے برطرف کردیا تھا وہی محکمہ اسے دوبارہ ملازم رکھنے پر مجبور ہو گیا۔ جولائی ۶۸ء میں اس کا تقرر دوبارہ ہو گیا اور وہ مسٹر پیٹرسن انسپکٹر تعلیمات کا ہاتھ بٹانے کے لیے کوہ مری روانہ ہو گیا۔

پیٹرسن کی قلمی رفاقت کے بعد آزاد کو سرکاری اخبار کا ایڈیٹر مقرر کردیا گیا۔

یہ زمانہ اس کی سرکاری، ادبی اور تعلیمی تصانیف کا عہد کہلانے کا مستحق ہے۔ وہ سرکاری اخبار کی مصروفیات سے وقت نکال کر بچوں کے لیے اردو ریڈریں تیار کرتا رہا لیکن ستم ظریفی یہ تھی کہ اس کی یہ محنت اس کے نام سے شائع نہیں ہوتی تھی بلکہ ان کتابوں پر پنجاب کے ناظمِ تعلیمات ہالرائڈ کا نام درج ہوتا تھا۔

چند اقتباسات

"ولی عہد چھپر کھٹ میں پڑا تھا۔ وزیرزادہ دوڑا آیا اور کہا "لو میاں، پروانے اٹھو، تمہاری شمع نے آکر محل کو روشن کردیا۔" شہزادہ حیران ہو گیا۔ جب وزیرزادے نے قسم کھا کر کہا ... تو اٹھ کر اس کی پیشانی چوم لی اور کلاہ جواہر نگار جس پر ہما کے پروں کی کلغی لگی تھی، تکیے پر سے اٹھا کر اس کے سر پر رکھ دی۔"

(قصصِ ہند)

"دیکھو جلسہ مشاعرے کا امرا شرفا سے آراستہ ہے۔ معقول معقول بڈھے اور جوان برابر لمبے لمبے جامے موٹی موٹی پگڑیاں باندھے بیٹھے ہیں۔ کوئی کٹاری باندھے ہے، کوئی سیف لگائے ہے۔ بعض وہ کہن سال ہیں جن کے بڑھاپے کو سفید داڑھی نے نورانی کیا ہے۔ بعض ایسے ہیں کہ عالم جوانی میں اتفاقاً داڑھی کو رخصت کیا تھا اب کیوں کر رکھیں کہ وضع داری کا قانون ٹوٹتا ہے۔ اس پر خوش مزاجی کا یہ عالم ہے کہ ان کے بڑھاپے کی زندہ دلی سے آج نوجوانوں کی جوانی پانی پانی ہوتی ہے۔"

"دفعتاً ہوا بند ہوئی۔ ابر سا گھر آیا۔ دنیا دھواں دار ہو گئی۔ پھر سفید غبار سا برستا ہوا معلوم ہوا۔ تھوڑی دیر میں دیکھا تو زمین پر، کوٹھوں پر، دیواروں پر اور منڈیروں پر کوئی سفید سفید آٹا سا چھڑک گیا۔ غرض کہ ایک جھکولا برف کا پڑا۔ رات گزری۔ صبح کو دیکھا تو تمام درختوں پر برگ ریز کا حکم پہنچ گیا۔ دوسرے دن ایک جھکولا اور ساتھ ہی ایک سناٹا ہوا کا آیا۔ پھر جو دیکھا تو درخت پر پتے کا نام نہیں۔"

اسی دور میں اس نے قصص ہند مرتب کی جو اس کے نام سے شائع ہوئی۔ فارسی قواعد بھی مرتب کی۔ حکومت کی طرف سے ہونے والے مقابلوں میں بھی حصہ لیتا رہا اور انعام کا مستحق ٹھہرتا رہا۔ ان تصنیفات نے اسے مقبول خاص و عام بنادیا۔

ادبی کاوشوں اور عارضی ملازمتوں کا یہ سلسلہ جاری تھا کہ گورنمنٹ کالج لاہور کی مسند عربی نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔

مولوی علم دار حسین جو کالج میں عربی کے پروفیسر تھے، بیماری کے سبب طویل رخصت پر چلے گئے۔ طلبہ کا حرج ہو رہا تھا للٰہذا ڈاکٹر لائٹنر کے توسط سے اس پوسٹ پر آزاد کا عارضی تقرر ہو گیا۔

اس نے چغا پہنا اور ہمیشہ کی طرح ایک آستین میں ہاتھ ڈالا، ایک خالی لٹکتی رہی۔ گھوڑے پر سوار ہوا اور کالج پہنچ گیا۔ طلبہ کے لیے اس کا نام نیا نہیں تھا۔ جب انہوں نے اس کے پڑھانے کا انداز دیکھا تو اس کے گرویدہ ہو گئے۔ بات بات پر اشعار کا برمحل استعمال۔ لیکچر کے دوران میں ادبی لطیفوں کی بھرمار۔ بے تکلفی کا انداز، یہ طریقہ کار کسی اور پروفیسر کا کیسے ہو سکتا تھا۔ تھوڑے دن میں یہ حال ہو گیا کہ اس کا گھوڑا پیچھے پیچھے چل رہا تھا، وہ آگے ہے اور طلبہ اس کے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ کلاس سے باہر بھی ایک کلاس لگی ہوئی ہے۔

اس کی قسمت کہ مولوی علم دار کا انتقال ہو گیا اور طلبہ میں اس کی مقبولیت دیکھتے ہوئے اس کی نوکری عارضی سے مستقل ہو گئی۔

گورنمنٹ کالج سے وابستہ ہونے کے بعد اس کی زندگی کا بہترین دور شروع ہوا۔ عارضی ملازمتوں کی بے اطمینانی ختم ہو گئی، ہم چشموں میں وقار بڑھ گیا اور معاشی الجھنوں سے نجات مل گئی۔

ملازمت کے ساتھ ساتھ انجمن پنجاب کی طرف سے شائع ہونے والے اخبار "ہمائے پنجاب" کی ذمے داریاں بھی اسی کو سنبھالنا پڑ رہی تھیں۔

وہ ان دونوں ذمے داریوں کو نہایت خوبی سے انجام دے رہا تھا۔

۱۸۷۱ء میں ہمائے پنجاب میں، سیالکوٹ کے ایک نامہ نگار کا خط شائع ہوا جس میں اس نے لکھا تھا کہ ڈاک خانے کے ملازم لفافے میں کوئی قیمتی چیز اور نوٹ وغیرہ دیکھ کر اسے ایسی خوبی سے تراشتے ہیں کہ پتا تک نہیں چلتا۔

پوسٹ ماسٹر جنرل نے صدر انجمن سے باضابطہ طور پر شکایت کی اور آزاد کی جواب طلبی ہو گئی۔ صدر ڈاکٹر لائٹنر تھے اس لیے آزاد کو اطمینان تھا لیکن جب اسے یہ معلوم ہوا کہ اسے اخبار سے نکال دیا گیا ہے اور اس کی جگہ کسی اور کو ایڈیٹر بنا دیا گیا ہے تو اسے سخت صدمہ ہوا۔ اسی دوران میں انجمن کے کاغذات اور کتابیں وغیرہ جو اس کی تحویل میں تھیں واپس لے لی گئیں تو وہ نہایت دل برداشتہ ہوا۔

وہ کسی انگریز سے اور وہ ڈاکٹر لائٹنر سے لڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن اس کے دل میں ان کا یہ رویہ پھانس بن کر چبھنے لگا۔

اس کسک کو کبھی نہ کبھی تو اپنا رنگ دکھانا تھا۔ آخر اس کا وقت آ گیا۔

ڈاکٹر لائٹنر نے تاریخ کے موضوع پر ایک کتاب "سنین اسلام" آزاد سے لکھوا کر اپنے نام سے شائع کی تھی۔

جب تک دوستی تھی، آزاد نے یہ بات گوارا کر لی تھی لیکن جب اس کتاب کا دوسرا حصہ لکھنے کا وقت آیا اور اس دوران میں یہ تلخ واقعات بھی پیش آ گئے تو آزاد نے سابقہ تندہی سے کام نہیں لیا اور لائٹنر کو بار بار تقاضے کرنے پڑے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لائٹنر اس سے خفا ہو گئے اور دونوں دوستوں کے درمیان کشیدگی کی ایک گہری لکیر کھنچ گئی۔

محکمانہ میل جول اب بھی جاری تھا لیکن اب وہ اگلا سا التفات باقی نہ رہا۔

○☆○

لیفٹیننٹ گورنر بہت دن سے یہ بات محسوس کر رہے تھے کہ سرکاری مدارس میں اردو کی جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، ان میں نظمیں بالکل نہیں ہیں۔ انہوں نے اس کمی کا ذکر ناظم تعلیمات مسٹر ہالرائڈ سے کیا لیکن ہالرائڈ کے جواب نے انہیں خاصا مایوس کیا۔

"جناب، اُردو میں نظمیں لکھنے کا رواج ہی نہیں، غزلیں ہیں۔ ان کے مضامین اس قابل نہیں کہ بچوں کو پڑھائے جائیں۔"

"وہاٹ! یہاں کے شاعر نظمیں نہیں کہتے؟"

"نظموں کے نام پر قصیدے اور عاشقانہ مثنویاں لکھتے ہیں" ہالرائڈ نے کہا۔

"آپ انعام کا لالچ دیجیے۔ کچھ بھی کیجیے، بچوں کے لیے اس قسم کی نظمیں لکھوائیے جیسے کہ انگریزی میں ہوتی ہیں۔ اگر آپ کامیاب ہو گئے تو یہ ہم انگریزوں کا بڑا کارنامہ ہوگا۔ اس سے انگریزی تہذیب کی روح اردو میں سرایت کر جائے

گی۔"گورنر نے مشورہ دیا۔

اس وقت تو بات کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی لیکن اپنے افسر کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ہالرائڈ اس اسکیم پر برابر سوچتے رہے اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اس کام کے لیے باقاعدہ تحریک چلانے کی ضرورت پڑے گی۔ یہ تحریک کس طرح چلائی جائے؟ اس کا جواب ان کے پاس نہیں تھا۔ ان کی نگاہِ انتخاب محمد حسین آزاد پر پڑی۔ وہ محکمۂ تعلیم کا ذمے دار فرد تھا۔ انجمن پنجاب کے جلسے اس کی گل افشانیٔ گفتار سے گونج رہے تھے۔ اس کی ادبی شہرت سارے ملک میں پھیلی ہوئی تھی۔ ہالرائڈ نے اس کے تجربے سے فائدہ اٹھانے کا ارادہ کیا اور آزاد کے سامنے اپنا منصوبہ رکھا۔

ہالرائڈ کی خواہش تو صرف یہ تھی کہ نصاب کی کتابوں کے لیے نظمیں مل سکیں لیکن اس منصوبے سے واقف ہوتے ہی آزاد کی دوربیں نگاہوں نے ادبی افق پر ایک آفتاب تازہ کو دیکھ لیا۔ اس نے سوچا وہ اس تحریک سے فائدہ اٹھا کر اردو شاعری کا رخ موڑ سکتا ہے اور اسے محدود موضوعات کے دائرے سے نکال کر لامتناہی وسعتیں عطا کر سکتا ہے۔

اس نے تجویز پیش کی کہ ایسے مشاعرے منعقد کیے جائیں جن میں مختلف موضوعات پر شعرا سے نظمیں پڑھوائی جائیں۔ چند مشاعروں کے بعد یہ نئی شاعری تحریک کی صورت اختیار کر جائے گی۔ پھر یہ مشاعرے لاہور تک محدود نہیں رہیں گے۔ ملک کے دوسرے حصوں میں خود بخود منعقد ہوا کریں گے۔

"کوئی اور صورت نہیں ہو سکتی؟" ہالرائڈ نے کہا۔

"ہندوستانی شعرا، مشاعروں کے عادی ہیں۔ یہ تبدیلی آئے گی تو صرف مشاعروں کے ذریعے آئے گی۔"

آزاد کی بات اتنی معقول تھی کہ ہالرائڈ کو قائل ہونا پڑا۔

۱۹ اپریل ۱۸۷۴ء کو شام چھ بجے انجمن پنجاب کے اشتراک سے ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں عوام کو ان مشاعروں سے باخبر کیا گیا۔ ابتدا میں آزاد نے ایک لیکچر دیا۔

"نئے انداز کے خلعت و زیور جو آج کے مناسب حال ہیں وہ انگریزی صندوقوں میں بند ہیں اور ہمارے پہلو میں دھرے ہیں اور ہمیں خبر نہیں۔"

"تمہاری شاعری چند محدود احاطوں میں بلکہ چند زنجیروں میں مقید ہو رہی ہے۔ اس کے آزاد کرانے میں کوشش کرو نہیں تو ایک زمانہ تمہاری اولاد ایسا پائے گی کہ ان کی زبان شاعری کی زبان سے بے نشان ہوگی۔"

نمونۂ کلام

قیدیانِ زلف پر کیا جانے شب کیونکر کٹی
آج زنداں سے نہیں آتی صدا فریاد کی
سروساں زنجیرِ الفت سے ہے پابندِ چمن
نام کو آزاد ہے حالت یہ ہے آزاد کی

چشمِ نرگس کو بھی گلشن میں بڑے ہیں دعوے
تم ذرا چل کے دکھا دو سرِ گلزار آنکھیں

اس کے بعد آزاد نے اپنی ایک مثنوی جو رات کی حالت پر تھی، پیش کی۔ اس مثنوی میں اس نے یہ جدت پیدا کی تھی کہ مثنوی کے لیے عام طور پر جو بحریں رائج تھیں، اس سے اختلاف کرتے ہوئے ایک نئی بحر میں تھی۔

عالم ہے اپنے بسترِ راحت پہ خواب میں
آزاد سر جھکائے خدا کی جناب میں
پھیلائے ہاتھ صورتِ امیدوار ہے
اور کرتا صدقِ دل سے دعا بار بار ہے
مجھ کو تو ملک سے ہے نہ ہے مال سے غرض
رکھتا نہیں زمانے کے جنجال سے غرض
یارب یہ التجا ہے کرم تو اگر کرے
وہ بات دے زباں پہ کہ دل پر اثر کرے

ہونا وہ بعدِ شام شفق پر عیاں ترا
اڑنا وہ آبنوس کا تختِ رواں ترا
اے رات سنتا ہوں کہ ترے سر پہ تاج ہے
ہر گوہر اس میں ملکِ حبش کا خراج ہے
دنیا پہ سلطنت کا تری دیکھ کر حشم
کھاتا ہے دن بھی تاروں بھری رات کی قسم

یہ نظم اردو کی جدید شاعری کا نقطۂ آغاز تھا۔ اس میں کوئی بڑی تبدیلی تو نظر نہیں آتی تھی لیکن مخصوص بحر سے انحراف کر کے اس نے تقلید سے بغاوت کرنے کی طرف ایک اشارہ ضرور کر دیا تھا۔

ہرچند بقول ہالرائڈ یہ جلسہ اس لیے منعقد کیا تھا کہ نظمِ اردو جو چند عوارض کے باعث تنزل اور بدحالی میں پڑی ہے اس کی ترقی کا سامان بہم پہنچائے جائیں لیکن آزاد کے لیکچر کا

خاطر خواہ اثر نہ ہوا۔ اخبارات میں بھرپور مخالفت کی گئی۔ لاہور کے ایک اخبار "پنجابی" نے آزاد کی پوری تقریر کی مخالفت کی۔ اس کے علاوہ اخبار سررشتہ تعلیم اودھ میں منشی غلام حسین نے آزاد کے لیکچر پر تفصیلی تبصرہ کیا اور اس کی مخالفت کی۔

ان تبصروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ آئندہ ہونے والوں کی پذیرائی نہیں ہوسکے گی۔ مخالفت کی آندھی بڑے زور شور سے چلے گی۔

اس اندیشے کے باوجود تیس جون ۱۸۷۴ء کو نظمِ اردو کا پہلا مشاعرہ منعقد ہوا۔ اس کا موضوع برسات تھا۔

بہت سے ممتاز افراد، عہدے داران و سرکاری ملازمین کالجوں اور مدارس کے اساتذہ اور طلبہ اور علم دوست حضرات نے اس مشاعرے میں شرکت کی۔

اس مشاعرے کو عام شعرا نے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ صرف سات شعرا شریک ہوئے۔ ان میں بھی حالی اور آزاد ہی دو قابلِ ذکر شعرا تھے۔ آزاد نے اس مشاعرے میں اپنی نظم ابرِ کرم کے عنوان سے پیش کی۔ اس نظم میں بھی جزئیات نگاری عروج پر نظر آتی تھی۔ بیان میں جوش اور زبان سادہ تھی۔ صاف نظر آتا تھا کہ یہ اردو کی موجودہ شاعری سے کوئی مختلف چیز ہے۔

بوندوں میں جھومتی وہ درختوں کی ڈالیاں
اور سبز کیاریوں میں وہ پھولوں کی لالیاں
وہ ٹہنیوں میں پانی کے قطرے ڈھلک رہے
وہ کیاریاں بھری ہوئی تھالے چھلک رہے
آبِ رواں کا نالیوں میں لہر مارنا
اور روئے سبزہ زار کا دھوکر سنوارنا
گرنا وہ آبشار کی چادر کا زور سے
اور گونجنا وہ باغ کا پانی کے شور سے
جل تھل ہیں کوہ و دشت میں تالاب آب کے
گویا چھلک رہے ہیں کٹورے گلاب کے
کوئل کا دور دور درختوں پہ بولنا
اور دل میں اہلِ درد کے نشتر تھنگھولنا
جھولوں میں نوجواں ہیں پینگیں بڑھا رہے
اور بچے آم کے ہیں پپیہے بجا رہے
ساون کے گیت اٹھا رہے ارماں دلوں میں ہیں
پردیسیوں کی یاد سے ارماں دلوں میں ہیں

اب تک اُردو شعرا منظر نگاری کے جو مرقعے کھینچتے تھے، ان میں ایران کا اثر صاف نظر آتا تھا۔ باغ کی منظر کشی ہوتی تھی لیکن صاف نظر آتا تھا کہ یہ باغ ایران میں واقع ہے، ہندوستان میں نہیں۔ آزاد کی اس نظم میں ہندوستان کی برسات نظر آتی تھی۔ زبان کی سادگی بھی ایک نئی چیز تھی۔

اس کوشش کی پذیرائی ہونی چاہیے تھی لیکن نئی چیز بڑی دیر میں قبول ہوتی ہے۔ کان جس چٹخارے سے آشنا ہوگئے تھے، اس کے سوا کچھ قبول کرنے کو تیار نہیں تھے۔ اخبارات نے اس مشاعرے میں پڑھی جانے والی نظموں کے خلاف محاذ بنالیا۔ آزاد پر خاص طور پر تنقید کی گئی کیونکہ وہی ان مشاعروں کا روحِ رواں تھا۔

مخالفتوں کے اس طوفان کے باوجود ایک کے بعد دوسرا مشاعرہ منعقد ہوتا رہا۔ مشاعروں کی گہما گہمی کے ساتھ ساتھ مخالفت کا زور بھی بڑھتا جارہا تھا۔

آزاد نے ان مخالفتوں کا ابھی تک کوئی جواب نہیں دیا تھا لیکن وہ دل برداشتہ ضرور تھا۔ اسے یہ فکر بھی دامنِ گیر تھی کہ کہیں مخالفت کا یہ طوفان اردو شاعری میں اصلاح و ترقی کی اس اولین کوشش کو بالکل ختم نہ کردے۔

اس نے اس صورتِ حال سے گھبرا کر سرسید احمد خاں کو خط لکھا تھا کہ وہ اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے اپنے قلم سے اس کو سہارا دیں۔ سرسید کا جواب آیا۔

"میں مدت سے چاہتا تھا کہ ہمارے شعرا نیچر کے حالات کے بیان پر متوجہ ہوں۔ آپ کی مثنوی "خواب امن" پہنچی۔ بہت دل خوش ہوا۔ اب بھی اس میں خیالی باتیں بہت ہیں۔ اپنے کلام کو اور زیادہ نیچر کی طرف مائل کرو۔ لوگوں کے طعنوں سے مت ڈرو۔ بعد رمضان ایک مضمون طویل اس باب میں لکھوں گا۔"

سرسید نے اپنا وعدہ پورا کیا اور ایک طویل مضمون "علم انشا اور اردو نظم" لکھ کر تہذیب الاخلاق میں شائع کرایا۔

اس کے بعد بھی ہنگامے ختم نہیں ہوئے بلکہ مزید بڑھ گئے۔ ان ہنگاموں نے لکھنؤ کے ادبی معرکوں کی یاد تازہ کردی۔ خاص طور پر آزاد کو نشانۂ ستم بنایا گیا۔ اس سے بعض لوگوں نے یہ بھی اندازہ لگایا کہ آزاد کا کوئی حریف ہے جو اس موقع سے فائدہ اٹھا کر انہیں رسوا کررہا ہے۔

مخالفتوں اور حوصلہ افزائیوں کا یہ ہنگامہ جاری تھا کہ یہ مشاعرے اچانک بند کردیے گئے۔

مشاعرے بند ہوگئے لیکن ان مشاعروں نے آزاد کو اردو شاعری میں ایک خاص مقام عطا کردیا۔ اس کی کوششوں سے اردو شاعری کو ایک نیا موڑ ملا، نئی راہ کھلی۔ آزاد نے اپنا نام جدید

شاعری کے علم برداروں میں لکھوالیا۔

مخالفتوں کے باوجود ان مشاعروں کی بدولت پورے ملک میں تبدیلی کی لہر دوڑ گئی۔ دہلی اور میرٹھ میں اس انداز کے مشاعرے منعقد ہونے لگے اور اردو شاعری میں غزلوں کے ساتھ ساتھ نظمیں بھی جگہ پانے لگیں۔

مشاعروں کے ہنگامے سے نجات پانے کے بعد آزاد یک سوئی اور اطمینان کے ساتھ تصنیف و تالیف میں مشغول ہوگیا۔

آزاد نے جو مضامین انجمن پنجاب کے رسالے کے لیے لکھے تھے اور شائع ہو کر مقبول بھی ہوچکے تھے' اس نے ان مضامین کو جمع کیا۔ مزید مضامین لکھے اور انہیں ترتیب دے کر "آبِ حیات" اور "نیرنگِ خیال" کے عنوان سے کتابی صورت میں مرتب کرنا شروع کردیا۔

وہ ان کتابوں کو مرتب کرنے کی دشواریوں سے گزر رہا تھا کہ ایک مرتبہ پھر ڈاکٹر لائٹنر اس کے مقابل آگئے۔

آزاد نے ایک درخواست دی کہ اب کالج کے طالبہ کی تعداد میں اضافہ ہوگیا ہے اس لیے اس کی تنخواہ میں اضافہ کیا جائے اور دوسرے یہ کہ حسنِ خدمت کے صلے میں اسے کم از کم ایک ہزار ایکڑ زمین لاہور میں عطا کی جائے۔ اس کا ارادہ ایک موڈل فارم قائم کرنے کا ہے جس کے لیے زمین درکار ہے۔"

ڈاکٹر لائٹنر نے اس درخواست پر نہایت جارحانہ نوٹ لکھا۔ یہاں تک کہ اسے سازشی اور ناقابلِ اعتماد تک لکھ دیا اور یہ لکھا کہ اگر گورنمنٹ انہیں زمین کا عطیہ دے کر کالج سے علیحدہ کردے تو انہیں خوشی ہوگی۔

ماضی کا یہ دوست اس کا سب سے بڑا دشمن بن کر اس کے سامنے کھڑا تھا اور طرح طرح سے اس کی تضحیک کر رہا تھا۔

اسی سال آزاد کے دو جگر گوشے وفات پاچکے تھے۔ وہ زخموں سے چور تھا کہ لائٹنر نے اس کے اعتماد کو پاش پاش کردیا۔

اس نے کیا تو یہ کیا کہ وہ خاموشی سے راولپنڈی پہنچا اور ناظم تعلیمات کو درخواست دی کہ وہ اب کالج کی ملازمت کرنا نہیں چاہتا۔ اسے ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر بنادیا جائے۔ اس کی خدمات محکمہ تعلیم سے محکمہ انتظامی کو منتقل کردی جائیں۔

اس کی بدقسمتی لاہور سے اس کے ساتھ گئی تھی۔ اس نے درخواست پیش کی تھی کہ لائٹنر عارضی طور پر ناظمِ تعلیم مقرر ہوگئے۔

لائٹنر کے سامنے درخواست پہنچی اور آزاد کے پاس جواب صاف آگیا۔

"آپ کا نام حکومت کے پاس بھیجنا بے کار ہے کیونکہ حکومت پہلے ہی یہ فیصلہ کرچکی ہے کہ وہ افسر جو مدت دراز تک محکمۂ تعلیم سے وابستہ رہا ہے' اس کی سرکاری زندگی کے آخری حصے میں اسے عدلیہ سے منسلک کرنا بالکل بے کار ہے۔"

مرتا کیا نہ کرتا۔ وہ راولپنڈی سے واپس آگیا اور ایک مرتبہ پھر اسی تنخواہ پر گورنمنٹ کالج میں خدمات انجام دینے لگا۔

"آبِ حیات" کا کام بہت بکھر گیا تھا' اسے سمیٹنے کی کوشش کی۔ جن شعرا کے حالات جمع ہوچکے تھے' انہیں زبان و بیان کی میناکاری سے سجا کر ایوانِ ادب میں پیش کردیا۔

"اے اہلِ وطن میں اس حال میں بھی تمہیں بھولا نہیں جو وقت نوکری کے کام سے خالی پاتا تھا' اس میں آرام نہ کرتا تھا۔ بہت کم سوتا تھا۔ اپنی معلومات کو اور جو اس سے خیال پیدا ہوتے تھے' لکھتا تھا اور پرکھتا جاتا تھا۔ اسی میں یہ اوراق پریشاں نکالے اور آبِ حیات کا جام بنا کر تمہاری ضیافت طبع کے لیے حاضر کیا۔"

یہ کتاب یوں اہلِ نظر کے سامنے آئی جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے۔ ایسی نثر کسی نے اس سے پہلے نہیں پڑھی تھی۔ نثر میں شاعری کس نے کی ہوگی۔ تخیل کی بلند پروازی نظم کے ساتھ مخصوص تھی' اس نے نثر میں دکھادی۔ آزاد میں ڈرامائی قوت بلا کی تھی۔ اس قوت سے کام لے کر اس نے مردہ شعرا کو چلتے پھرتے ہوئے دکھادیا۔ جو زمانہ گزر گیا تھا' اسے آنکھوں کے سامنے لاکر کھڑا کردیا۔ تشبیہ اور استعاروں کا چمن کھلادیا۔ ایسی رنگین نثر لکھ دی کہ گھنٹوں پڑھیے' سر دھنیئے۔ اس کے اس اسلوب کی کہیں اور مثال نہیں ملتی تھی۔

تعریفی تبصروں کے ساتھ ساتھ اس کے خلاف پھر ایک ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا۔ بعض شاعروں کا حال اس کتاب میں شامل نہ ہوسکا تھا' اس کے خلاف ایک ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا۔ مومن خان مومن جیسے شاعر کو اس نے نظرانداز کردیا تھا۔ اسے اس کی بدنیتی پر محمول کیا گیا اور شیعہ و سنی کی بحثیں چھڑ گئیں۔

صادق الاخبار نے لکھا۔

"مومن تو نام پایا اور مذہب سنی۔ ایسے کٹر اور ڈبل سنی کو کہ اصحاب ثلاثہ کرام کی تعریف و توصیف میں قصائد لکھے اور ایسے دل سے لکھے کہ مقبول بھی ہوگئے۔ مولوی آزاد کو کیا پڑی تھی کہ ایسے سنی مومن کا حال لکھ کر اور اس کو اس زمرہ استاداں میں شمار کرکے آپ بھی اس کے پیرو ہوتے۔"

اخبارات کے ساتھ ساتھ اس کے پاس ان خطوں کے بھی ڈھیر لگ گئے جن میں ان کوتاہیوں کی طرف اشارے کیے

گئے تھے جو اس کتاب میں اس سے سرزد ہوئی تھیں۔

اس ہنگامے کے باوجود اس نے اپنی دوسری تصنیف "نیرنگِ خیال" پڑھنے والوں کے سامنے پیش کردی۔

آبِ حیات تو ایک تحقیقی کتاب تھی اس لیے بعض لوگوں کے نزدیک اس کا افسانوی طرزِ تحریر، تحقیق کی متانت کو مجروح کرتا تھا لیکن نیرنگ خیال تخیلاتی مضامین پر مشتمل تھی لہٰذا اس کی فکر نے خوب پرواز کی اور انشاء پردازی کے وہ جوہر دکھائے کہ اگر اس کے سوا کچھ اور نہ بھی لکھتا تو بھی صاحبِ طرز انشاپرداز کہلاتا۔

وہ اس تصنیف کی بدولت اردو میں تمثیلی مضامین کا موجد بن گیا۔ اس سے پہلے کسی نے اردو میں اس طرز کے مضامین نہیں لکھے تھے البتہ انگریزی میں ایڈیسن اور جانسن کے تمثیلی مضامین ملتے تھے۔ ان مضامین میں ایسے حواس اور جذبات کو جن کی کوئی شکل نہیں ہوتی، فرضی کرداروں کے ذریعے پیش کیا گیا تھا۔ یہ طرزِ ادا آزاد کی ڈرامائی قوت کے عین مطابق تھا لہٰذا وہ اس میں خوب کامیاب رہا۔

اس تصنیف سے نمٹ کر وہ "دربارِ اکبری" کو ترتیب دینے میں مصروف ہو گیا۔

وہ اس تصنیف کو سرسالار جنگ اول کے نام معنون کرکے حیدر آباد دکن میں ملازمت کا خواہش مند تھا۔ دکن میں قدردانی کا بازار گرم تھا اور وہ کالج کی سیاست سے تنگ آگیا تھا۔

ابھی کتاب مکمل نہیں ہوئی تھی۔ انتساب کا موقع نہیں آیا تھا کہ سرسالار جنگ وفات پاگئے۔

"مزہ تو اس کا جب تھا کہ خود لے کر جاتا اور بعض مقامات اس کے اپنی زبان سے پڑھتا اور دیکھتا کہ اس مقام پر وہ کیا فرماتے۔ ہائے سالار جنگ۔ سارے ارمان دل میں رہے، ہائے سالار جنگ!"

وہ سالار جنگ کے ماتم سے زیادہ اپنی قسمت کا ماتم کرکے، دل مسوس کر رہ گیا۔

سید حسن بلگرامی، عماد الملک سے خط و کتابت برابر جاری تھی لیکن اب وہ حیدر آباد جاکر کیا کرتا۔ کس توقع پر جاتا۔

آبِ حیات اور نیرنگِ خیال پنجاب یونیورسٹی نے اپنے کورس میں شامل کرلی تھیں۔ دوستوں نے مشورہ دیا کہ آبِ حیات پر جو اعتراضات تھے، انہیں دور کرکے امتحان سے قبل اگر اسے چھپوا دیا جائے تو بڑی تعداد میں فروخت ہوگی۔

مالی طمع نے اسے اکسایا اور وہ دوسرے ایڈیشن کی تیاری میں مصروف ہوگیا۔ اعتراضات اتنے تھے کہ انہیں دور کرتے کرتے اس کی آنکھیں جواب دینے لگیں۔ مومن کا تذکرہ شامل کیا۔ مفید اضافے کیے۔ نئے حالات تلاش کیے اور لکھے۔ ایسا ہوا کہ پوری کتاب دوبارہ لکھنی پڑگئی۔ دس مہینے کا کام اس نے ڈیڑھ ماہ میں مکمل کرکے دوسرا ایڈیشن شائع کرادیا۔

گھریلو الجھنیں اور تصنیفی صعوبتیں کیا کم تھیں کہ ایک اور خبر نے اس کے ہوش اڑادیئے۔ بہت دن سے یہ خبر افواہ بن کر گردش کررہی تھی کہ گورنمنٹ سررشتہ تعلیم کے بوجھ سے سبکدوش ہونا چاہتی ہے۔ پھر یہ خبر عام ہوگئی کہ گورنمنٹ کالج پنجاب یونیورسٹی کی تحویل میں چلا جائے گا۔

یہ افواہ حقیقت بن کر سامنے آگئی۔ یونیورسٹی نے اخراجات کم کرنے کے لیے یہ تجویز پیش کی کہ علوم وفنون، ریاضی وغیرہ کی تعلیم ترجموں کے ذریعے ہوجایا کرے گی صرف انگریزی کے لیے ایک پروفیسر کافی ہے۔

کالج کے یونیورسٹی کی تحویل میں چلے جانے کے بعد عملے کی تخفیف لازمی تھی۔ آزاد یہ سوچ رہا تھا کہ جس گھر میں ڈیڑھ سو روپے آتے ہوں، پچاس روپے کی پنشن میں کیسے گزارا ہوگا۔

گورنمنٹ کالج کے مولوی اور پنڈت تخفیف میں ضرور آئے لیکن حکومت نے اس سلسلے میں پنجاب یونیورسٹی سے درخواست کی کہ ان لوگوں کو اپنے یہاں جگہ دے۔

عمرِ عزیز کے پندرہ سال گورنمنٹ کالج کی نذر کرنے کے بعد وہ یونیورسٹی سے منسلک ہوگیا۔

تصنیف و تالیف کی محنتِ شاقہ نے اسے اعصابی طور پر کمزور کردیا تھا۔ مختلف بیماریوں نے اسے گھیر لیا تھا لیکن سب سے زیادہ تشویش ناک اس کی ذہنی غیرحاضری تھی۔ بیٹھے بیٹھے یوں گم ہوجاتا جیسے عالم بالا کی سیر کو نکلا ہوا ہے۔ ہوش میں آتا تو بہت دیر تک حیرانی اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی رہتی۔

وہ گورنمنٹ کالج سے کیا نکلا کہ مصیبتیں ایک ایک کرکے اس طرح ٹوٹنے لگیں جیسے سب اسی دن کے انتظار میں تھیں۔

مکان میں آگ لگ گئی جس میں ایک قدیمی ملازمہ جل کر مرگئی۔ یہ صدمہ بہت دن تک اس کی چھاتی کا داغ بنا رہا۔

یہ صدمے کیا کم تھے کہ ایک دن خبر آئی کہ اس کی پیاری بیٹی جس کو اس نے خود پڑھایا تھا، تصنیف و تالیف میں مدد کرتی تھی۔ بڑے ارمانوں سے اس کی شادی کی تھی، عین شباب میں انتقال کرگئی۔

وہ ایک دو نہیں، چودہ اولادیں زمین کے سپرد کرچکا تھا۔ اس کی چھاتی فولاد بن گئی تھی لیکن اس بیٹی کے انتقال نے اس کے دماغ کو بے قابو کردیا۔ یہ شبہ ہونے لگا تھا کہ اس کا دماغ چل گیا ہے۔ تصنیفات کا قلم دان الٹ گیا۔ لاہور بھر میں اس کی

دیوانگی کا چرچا ہوگیا لیکن یہ کیفیت عارضی تھی۔

یونیورسٹی کا یہ ایک سال اسی بے خودی میں گزر گیا۔ صحت یاب ہوتے ہی اسے ایران کی سیاحت کی سوجھی۔ اس ارادے کو بھی اس کی دیوانگی کا ہی شاخسانہ سمجھا گیا۔ اس کی اہلیہ 'بیٹی کا صدمہ بھول کر اس فکر میں لگ گئی کہ وہ انہیں اس طویل سفر پر جانے سے کس طرح روکے۔ دوستوں نے اسے روکنا چاہا لیکن اب اس کی دماغی کیفیت شاید کچھ ایسی ہوگئی تھی کہ آگے کی طرف دیکھنے کے بجائے پیچھے کی طرف لوٹنا شروع ہوگیا تھا۔ ماضی کی ہر چیز اپنی طرف کھینچتی تھی۔ ایران اس کے اجداد کا ملک تھا۔ اسے دیکھنے کی تمنا نے اسے بے تاب کردیا اور رخصت کے لیے درخواست دے دی۔

لائٹنر ان دنوں پنجاب یونیورسٹی کے رجسٹرار مقرر ہوگئے تھے۔ انہوں نے معاندانہ روش پر چلتے ہوئے یہ درخواست مسترد کردی۔ آخر یہ معاملہ سرچارلس ایچی سن گورنر پنجاب تک پہنچا۔ وہ آزاد سے واقف تھے۔ انہوں نے رخصت کی درخواست منظور کرلی لیکن یہ رخصت اسے نیم اوسط تنخواہ پر ملی۔

رخصت منظور ہوتے ہی اس نے رختِ سفر باندھا اور ۲۳ ستمبر ۱۸۸۵ء کو ریل میں بیٹھ کر کراچی روانہ ہوا۔ اس کے ایک شاگرد مولوی عمرالدین سندھ مدرسۃ الاسلام کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ کراچی پہنچ کر آزاد نے ان کے گھر قیام کیا۔

کراچی پہنچ کر معلوم ہوا کہ جہاز کل ہی روانہ ہوا ہے اور اب ایک ہفتے تک انتظار کرنا ہوگا۔ مولوی عمرالدین اس کی ہر طرح سے دلداری کر رہے تھے اس لیے یہ انتظار اس کی طبعِ نازک پر گراں نہ گزرا۔ اس نے اس فرصت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان لوگوں سے ملاقاتیں کیں جن کا اثر رسوخ ایران میں تھا اور مختلف لوگوں کے نام تعارفی خط لیے۔

جمعہ دو اکتوبر کو وہ عریبیا نامی جہاز میں سوار ہوا۔ شام ساڑھے چار بجے کے قریب جہاز نے لنگر اٹھایا۔

اس نے سنا تھا کہ جہاز کے سفر میں چکر آتے ہیں اور جی متلاتا ہے۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر اس نے لیموں' انار اور تربوز بھی اپنے ساتھ لے لیے تھے لیکن اسے اس قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔

چار اکتوبر کو یہ جہاز گوادر کے قریب سے گزرا' چھ اکتوبر کو بندر عباس پہنچا اور بحرین ہوتا ہوا دس اکتوبر کو "بو" شہر میں لنگر انداز ہوا۔ اس نے یہاں تک کا کرایہ صرف ۲۳ روپے ادا کیا۔

چھ دن تک بوشہر میں قیام کرنے کے بعد اس نے ایک ایرانی رہوار کرائے پر لیا اور شام کے وقت شہر سے نکل کر شیراز جانے والے ایک قافلے میں شامل ہوگیا۔

شب و روز مسلسل سفر کرنے کے بعد ۲۶ اکتوبر کو وہ شیراز پہنچا۔

شیراز دیکھنے کا ارمان تھا۔ ایک مدت کے بعد خدا نے یہ ارمان پورا کیا۔ خواجہ حافظ اور شیخ سعدی کا پیارا وطن جس پر وہ لوگ دعاؤں اور تعریفوں کے پھول چڑھائیں' اسے دیکھنے کا ارمان کیوں نہ ہو۔ اس نے دیکھا اور تعجب کے ساتھ دیکھا کیونکہ جس شیراز پر نورانی بزرگوں نے نور برسائے تھے' اس کی رونق و آبادی ان کے ساتھ ہی رحلت کر گئی تھی۔ اب بڑی بڑی وسیع اور بلند مسجدیں اور مدرسے گرے پڑے کھڑے تھے اور بنانے والوں کی ہمتوں پر دلائل پیش کر رہے تھے۔

موسم سرما کا خوف سامنے تھا لیکن شیراز کو جی بھر کے دیکھنے کے لیے یہاں قیام ضروری بھی تھا۔ ایک شخص مرزا علی اکبر سے قیام و طعام کا معاملہ طے ہوا۔ طے یہ ہوا تھا کہ وہ دونوں وقت کھانا کھلائے گا اور مصارف آزاد ادا کرے گا لیکن تین دن بعد آزاد کو اس سے پیچھا چھڑانا پڑ گیا۔ علی اکبر کے بوڑھے باپ نے یہ دیکھ کر کہ مہمان دونوں وقت گوشت پکواتا ہے' کھانے میں شریک ہونے لگا بلکہ اپنے نواسوں کو بھی بلا بلا کر بٹھانے لگا۔ آخر آزاد کو ایک اور جگہ اپنا انتظام کرنا پڑا۔ معلوم ہوا یہاں ایسے گھر بہت سے ہیں جہاں مہمانوں کو مقیم رکھا جاتا ہے۔

اس طرف سے اطمینان ہوجانے کے بعد اس نے شیراز کی سیر کرنی شروع کی۔ سب سے زیادہ اسے یہاں کے لوگوں کی وضع قطع نے متاثر کیا۔ یہ لوگ ابھی تک لباس کی تراش خراش میں اپنے بزرگوں کی تصویر تھے۔ علما اور ثقہ لوگ عمامہ باندھتے تھے۔ خاندانی ترک کلاہ پوست برہ کی پہنتے تھے۔

وہ ایک روز بازار سے گزر رہا تھا کہ مٹی کی چھوٹی چھوٹی ٹکیاں بکتی ہوئی دیکھیں۔ معلوم ہوا لوگ اس سے سر اور داڑھیاں دھوتے ہیں۔ اس مٹی میں خوشبو اٹھانے کی قدرتی تاثیر ہے لہٰذا اسے پھولوں میں بسا کر صاف کرتے ہیں اور ٹکیاں بنا کر بیچتے ہیں۔ گِل گُل (پھولوں کی مٹی) اس کا نام رکھا ہے۔ اسے بے اختیار شیخ سعدی کا یہ مصرع یاد آگیا۔

گِلے خوشبوئے در حمام روزے

شہر کی عمارتوں اور حماموں کو اچھی طرح دیکھ لینے کے بعد اس نے یہاں کے مدرسوں کا رخ کیا۔ کہنہ مدرسوں میں نئی عمر کے لڑکے صرف' نحو' بلاغت' فقہ کی کتابیں سامنے رکھے کتاب کی مدد کے بغیر بحث میں مصروف تھے۔ اسے یہ دیکھ کر قدرے

تعجب ہوا کہ ہندوستان کی طرح طلبہ فقرہ بہ فقرہ سبق نہیں پڑھ رہے تھے بلکہ استاد کتاب کے اسباق کو تشریح کے ساتھ بیان کرتا جارہا تھا' طلبہ سنتے جاتے تھے۔ جس کے دامن میں جتنی وسعت تھی اتنا فیض اٹھا رہا تھا۔ یہی حال اس نے یہاں کے ہر مدرسے کا دیکھا۔

علم و ادب کا ذوق یہاں کے امیروں کی زندگی میں بھی شامل تھا۔ اس کی ملاقات نواب مرزا علی خاں صدر سے ہوئی۔ باوجود پیرانہ سالی کے جب دیکھو' گرد کتابیں چنی ہیں۔ ایک دو ملا پاس بیٹھے ہیں۔ بیچ میں وہ خود بیٹھے ہیں۔ تصحیح کرتے ہیں حواشی لکھتے ہیں۔ ایک خوش نویس کتابوں کی تکمیل کررہا ہے۔ مصور نقاشی کررہا ہے۔ کھانے کا وقت ہوا وہیں پہلو میں دسترخوان بچھ گیا۔

نواب مرزا نے اسے اصرار کرکے دو دن اپنا مہمان رکھا۔

جس جس کو معلوم ہوتا جاتا تھا' اس سے ملاقات کے لیے آتا جاتا تھا۔ ہر ایک کا اصرار تھا کہ وہ اس کا مہمان بننا قبول کرے۔ حکیم مرزا حسن بھی ملاقات کو آئے۔ انہوں نے شیراز کی مفصل تاریخ لکھ کر "پارس نامہ" نام رکھا تھا۔

شام ہوگئی تھی۔ بوندیں پڑرہی تھیں۔ انکار کے باوجود اصرار کرکے گھر لے گئے۔ رات بھر اپنی کتاب سناتے رہے۔ مطالب پر مشورہ کرتے رہے۔

شیرازیوں کی مہمان نوازی' زنجیر کی طرح پاؤں پکڑے ہوئی تھی لیکن اسے آگے جانا تھا۔

شیراز میں پندرہ دن قیام کرنے کے بعد اس نے رختِ سفر باندھا اور اصفہان و طہران کی طرف کوچ کیا۔

راستے میں چار چار پانچ پانچ کوس پر شاہ عباسی سرائیں موجود تھیں۔ ان میں ہر قسم کی سہولتیں مہیا تھیں۔ چار پانچ آنے کو مرغ اور پیسے کے دو انڈے' ہر قسم کے تر و خشک میوے نہایت اعلیٰ اور نہایت ارزاں مل جاتے تھے۔

سفر طویل ضرور تھا لیکن آرام سے کٹ گیا۔ بارہ دن کے سفر کے بعد وہ اصفہان پہنچ گیا۔ شہر کیا تھا سلاطین صفویہ کی ہمتوں کا عجائب خانہ تھا۔

اس کثرت سے عمارتیں تھیں کہ دن بھر انہیں دیکھتا پھرتا تھا رات کو آکر بستر پر گر پڑتا تھا۔

اصفہان میں پانچ دن ٹھہرنے کے بعد وہ پھر روانہ ہوگیا اور کاشان پہنچا۔ یہاں وہ دم دروازے کی سرائے میں مقیم ہوا۔ کاشان سے قم پہنچا۔ یہاں امام علی ابنِ موسیٰ رضا کی ہمشیرہ کا مزار تھا۔ آزاد نے مزار پر حاضری دی۔ مختلف قبروں کے کتبے نقل کیے اور پھر اپنے سفر پر روانہ ہوکر طہران پہنچ گیا۔

اس سفر کی غایت' کتابوں کی تلاش تھی۔ اس نے یہاں پہنچتے ہی مطلب کے ٹھکانے تلاش کرنے شروع کردیے۔

وہ سب سے پہلے شہزادہ معتمد الدولہ نواب فرہاد مرزا سے ملا جن کا کتب خانہ پورے ایران میں لاثانی تھا۔

وہ اندرونِ خانہ تکیوں کے سہارے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے چاروں طرف کتابوں کی الماریاں تھیں۔ اسی خوش اخلاقی سے پیش آئے جو معزز ایرانیوں کا خاصہ ہے۔ ان کے چہرے مہرے اور آنکھوں سے بے پناہ قوت اور طاقت کا اظہار ہورہا تھا۔ بڑھاپا اور جسمانی معذوری بھی ان کی اس خصوصیت پر غالب نہ آسکی تھی۔ رخصت کے وقت اپنی ایک تصویر اور دو نسخے اپنی کتابوں کے دیے اور اصرار کیا کہ جب تک طہران میں ہو ملاقات کرتے رہو۔

شہزادے کی وساطت سے آزاد کو طہران کے دوسرے علما اور امرا سے بھی ملنے کا موقع ملا۔

لسانی تحقیق آزاد کا بڑا موضوع تھا۔ طہران میں اس واقفیت کے لیے بڑے مواقع تھے۔ وہ ان پارسیوں سے ملا جو قدیم فارسی بولتے تھے۔ آزاد نے جدید فارسی کا اس سے موازنہ کیا اور جدید و قدیم الفاظ کی ایک فہرست مرتب کی۔

مرزا رضا خان افشار سے بھی ملاقات کی۔ مرزا رضا خاں اس تحریک کے اولین علم بردار تھے جس کا مقصد ایران میں "پارسی خالص" کو رواج دینا تھا اور عربی الفاظ کو فارسی زبان سے خارج کرنا تھا۔ اصولی طور پر آزاد بھی اس کا حامی تھا۔

اس نے طہران کے شاعروں سے ملاقاتیں کیں۔ وہ ان کی شاعری سے کچھ زیادہ متاثر نہیں ہوا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ جس قدر تہذیب بڑھتی ہے' شاعری گھٹتی ہے۔

وہ تین مہینے تک طہران میں کتابیں اور معلومات جمع کرتا رہا۔ مضافاتی علاقوں میں جاکر الفاظ کی تحقیق کرتا رہا۔ سردیوں کا موسم گزر گیا اور جب آخری برف گر چکی تو اس نے مشہد مقدس کا رخ کیا۔

چھ منزلیں طے کرنے کے بعد آزاد سمنان پہنچا۔ یہاں پہنچ کر اسے خیال آیا کہ فارسی کے مشہور شاعر اور محقق مرزا یغما جندقی یہیں کے رہنے والے تھے چنانچہ اس نے ان کے خاندان اور اولاد کے بارے میں مقامی لوگوں سے دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ مرزا کا منجھلا اور چھوٹا بیٹا زندہ ہے۔

وہ انہیں ڈھونڈتا ہوا ان کی دکان پر پہنچ گیا۔ دیکھا کہ

دونوں بھائی دکان میں بیٹھے برنجی حقے اور چلمیں بنا رہے ہیں۔ ان کی حالت دیکھ کر سخت افسوس ہوا۔ شرفا والی کوئی بات بھی ان میں نہیں تھی۔ انہیں اس بات کی بھی کوئی خوشی نہیں تھی کہ ایک شخص ہندوستان سے ان کے باپ کو پوچھتا ہوا یہاں تک آیا ہے۔ اپنا کام کرتے رہے اور آزاد سے باتیں کرتے رہے۔

"مرزا مرحوم نے ایک کتاب فنِ لغت پر بھی لکھنی شروع کی تھی، وہ مکمل ہو سکی تھی یا نہیں؟" آزاد نے پوچھا۔

"ہمیں کیا معلوم۔ ویسے بھی وہ ہمارے بڑے بھائی کی تصنیف تھی۔ اب کہاں ہے ہمیں نہیں معلوم۔"

آزاد کو مزید افسوس ہوا کہ بڑے بھائی نے باپ کے مال پر ہاتھ صاف کیا اور تصنیف کو اپنے نام سے مشہور کر دیا۔

زمانے کی نیرنگیوں پر غور کرتا ہوا وہ آگے بڑھ گیا۔

سبزوار اور نیشاپور ہوتا ہوا مشہد کے قریب پہنچ گیا۔

ڈیڑھ فرسخ شہر رہا تو "قبہ مبارک" نمودار ہوا ایک دو ٹوٹے پھوٹے گھر اور ایک کارواں سرائے پختہ مگر شکستہ حال ملی۔ اس کا نام "طرق" تھا۔ سنا کرتا تھا کہ اس مقام سے زائرین پیادہ ہو جاتے ہیں۔ اس نے بھی سواری چھوڑی اور زمین کو بوسہ دیتا ہوا روضۂ اقدس تک پہنچا۔ دل حاضر تھا اور آنکھیں آنسو دے رہی تھیں۔

مشہد چونکہ تجارتی منڈی تھا۔ ترکستان، افغانستان اور ہندوستان وغیرہ سے تجارتی قافلے یہاں آتے تھے اس لیے کارواں سرائیں ہمیشہ آباد رہتی تھیں اور بازاروں میں ہر وقت رونق رہتی تھی۔ دو بازار نہایت طولانی اور وسعت میں نہایت دلکشا تھے۔ بیچ میں نہر جاری تھی اور دونوں طرف دکانیں اسباب سے مالا مال۔

مشہد مزاروں اور بازاروں کا شہر تھا۔ آزاد تاجر تو تھا نہیں کہ بازاروں سے دلچسپی ہوتی البتہ مشائخ اور بادشاہوں کے مزارات میں اس کی دلچسپی کے سامان تھے۔ نادر کی قبر دیکھ کر عبرت ہوئی۔ وہ نادر جس کی تلوار کی امان نہ تھی۔ جس کے گھوڑے کی جھپٹ سے لشکر پھوس کی طرح اڑتے تھے، وہ ایک چبوترے پر پڑا تھا۔

علما میں شیخ بہاؤالدین عاملی، شیخ حر عاملی، شیخ طبرسی مدفون تھے۔ شعرا میں فردوسی اور اسدی یہیں آسودہ خاک تھے۔ آزاد ان سب مزاروں پر گیا۔ فاتحہ پڑھی اور کتبوں کی نقلیں لیں۔

وہ یہاں بارہ دن مقیم رہا اور اب اسے ہندوستان واپس آنا تھا۔

مشہد سے ہندوستان آنے کے دو راستے تھے۔ پہلا راستہ کرمان ہوتا ہوا بندر عباس پہنچتا تھا لیکن یہ راستہ غیر آباد اور ریگستانی تھا۔ آزاد نے دوسرا راستہ پسند کیا جو ہرات، قندھار ہوتا ہوا کوئٹہ پہنچتا تھا۔

یہ سفر اس کے لیے نہایت صبر آزما ثابت ہوا۔ خیر آباد کی منزل سے روانہ ہوا تو رات ہو چکی تھی۔ وہ اونٹ پر سوار تھا۔ نیند نے غلبہ کیا اور وہ اونگھنے لگا۔ کسی مقام پر اونٹ اس بری طرح اچھلا کہ آزاد نیند کی حالت میں اونٹ سے نیچے گر گیا۔ سر اور گدی کے بل گرا تھا۔ مرنے میں کچھ باقی نہ تھا کہ مگر خدا کی قدرت کہ سر بال بال بچا۔ زیادہ تر پشت، دونوں پہلو اور سینے پر صدمہ پہنچا لیکن وہی مثل ہے مرغی کو تکلے کا گھاؤ بہت۔ وہ مسلسل بیماریوں، ذہنی ریاضت اور سفر کی صعوبت سے اتنا کمزور ہو چکا تھا کہ اس نئی افتاد نے اس کی جان کے لالے ڈال دیے۔ شکر ہے شتربان کی نظر پڑ گئی۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ کسی کو خبر ہی نہ ہوتی اور قافلہ آگے بڑھ جاتا۔ زمین سخت تھی اور وہ اونٹ کی بلندی سے گرا تھا۔ گر کر اٹھنے کی سکت بھی نہ ہو سکی۔ قافلے والوں نے اسے اٹھا کر اونٹ پر ڈال دیا اور اوپر سے لحاف ڈال کر رسی سے کس دیا۔ سب کا خیال تھا کہ مر کر رہ جائے گا۔ کہیں جا کر دفن کر دیں گے۔

منزل پر پہنچ کر شتربان نے آواز دی۔ آزاد نے آنکھیں کھولیں۔

"تو کیستی" (تو کون ہے؟)

شتربان نے نام لیا۔ گود میں لے کر اتارا اور بستر پر رکھ دیا۔ تین دن تک عجیب حال رہا۔ کھانستا بھی دکھ دیتا تھا۔ آخر آہستہ آہستہ اس نے جان پکڑی۔

○☆○

ہرات کے راستے میں آزاد جام سے گزرا۔ جام کا نام آتے ہی اسے مولانا جامی یاد آ گئے۔ اس کے علاوہ شیخ زندہ پیلؒ کی قبر مبارک کی وجہ سے یہ مقام اہمیت رکھتا تھا۔

اس نے شیخ زندہ پیلؒ کے مزار پر حاضری دی۔ یہ دیکھ کر اسے فخر آمیز خوشی ہوئی کہ میر محمد معصوم بھکری نے اس مزار کو از سرِ نو تعمیر کروایا تھا۔ میر معصوم امرائے اکبر شاہی میں شامل تھے۔ دربارِ اکبری لکھتے ہوئے آزاد اس نام سے واقف ہو چکا تھا اور اب اس دیارِ غیر میں یہ نام اس نے مزار کے کتبے پر منقوش دیکھا۔

وہ ہرات میں داخل ہوا تو یہ سوچ کر دل کا کنول کھل گیا کہ وہ ایک ایسے تاریخی شہر میں ہے جسے شاہان گزشتہ کا عیش باغ کہا جاتا تھا لیکن دیکھنے کے بعد بجھ گیا۔ اب یہ شہر ویران

ہوچکا تھا۔

ہرات پہنچتے ہی نائب کوتوال اس کے پاس آیا اور اسے سپہ سالار کے پاس لے گیا۔ مطلب یہ تھا کہ آزاد اسے پروانۂ راہ داری دکھائے۔

آزاد نے آتے ہی کارواں کی تلاش شروع کردی تھی تاکہ آگے بڑھے۔ ایک قافلہ باشی سے گفتگو بھی ہوئی۔ اس نے کہا پرسوں روانہ ہوجائیں گے۔ آزاد مطمئن ہوکر جلدی جلدی شہر کو دیکھنے لگا۔ شہر کیا دیکھتا' یہاں کے لوگوں نے اس کا جینا دوبھر کردیا۔ یہاں کے لوگ عجیب تھے جس طرف سے نکلتا' لوگ طرح طرح کے سوال کرکے اسے دق کرتے۔ کہاں سے آئے ہو؟ کیوں آئے ہو؟ کس راستے سے آئے ہو؟ اتنی کتابیں کیوں لائے ہو؟ ان کا کیا کروگے؟ اللہ کی پناہ! آزاد کا ان سوالوں سے بُرا حال تھا۔

سوال پوچھنے تو کوئی بات نہیں تھی۔ ان سوالوں کے پیچھے ان کا شک چھپا ہوا تھا۔ اسے رہ رہ کر ملک ایران یاد آتا تھا۔ وہ وہاں مہینوں رہا۔ کسی نے اس پر شک نہیں کیا۔

وہ یہاں سے فوراً نکل جانا چاہتا تھا لیکن روانگی مسلسل ٹلتی جارہی تھی۔ اس جبری قیام سے تنگ آکر اس نے تاریخی عمارتوں کا رخ کیا۔

یہاں شاہان سلف' جلیل القدر نامی مصنف اور شعرا بھی موجود تھے۔ امام فخرالدین رازی بھی یہیں آسودہ خاک تھے۔ ملا محمد حسین کاشفی اور مولانا جامی بھی یہیں ابدی نیند سورہے تھے۔ مولانا جامی کی قبر کو جاکر دیکھا۔ احاطہ ٹوٹا پھوٹا پڑا تھا۔ کسی زمانے میں تعویذ قبر اور قبر پر سنگ مرمر کی سلوں پر بہت دعائیں اور غزلیں عمدہ خط میں منقش ہوں گی۔ اب بس ایک ڈھیر پتھروں کا تھا۔ کسی شعر کا کوئی مصرعہ پڑھ لیا جاتا تھا باقی اللہ اللہ۔

مساجد میں گوہر شاد بیگم کی بنوائی ہوئی مسجد قابلِ تعریف تھی۔ اس نے کئی دن وہاں گزارے۔ جو فرمان اس پر کندہ تھے' انہیں بہ غور پڑھا اور اپنے پاس اتار لیا لیکن جو فرمان مسجد کے اندر تھے انہیں وہ نہیں پڑھ سکا۔ پہاڑی ملا مسجد کے اندر دروں میں حجرے بناکر رہتے تھے اور اکثر موجود ہوتے تھے۔ ان کے ڈر کے مارے اس نے ان فرمانوں کو غور سے دیکھا تک نہیں کہ ابھی کوئی آکھڑا ہوا اور چھرا ماردے تو کیسی خرابی ہو۔ جو اس کی ہر حرکت کو شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے ان سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔

قافلہ باشی نے پرسوں کہا تھا اور ٹلتے ٹلتے اٹھائیس دن گزر گئے۔

ہرات سے قندھار تک کا سفر بارہ چودہ منزلوں کا تھا۔ خیال تھا کہ جلدی طے ہوجائے گا لیکن دیر ہوتی گئی۔

اس نے بہت سی روٹیاں ساتھ لے لی تھیں۔ پانچویں دن وہ سڑ گئیں۔ انہیں بڑی مشکل سے سکھایا کہ پانی میں بھگو کر حلق سے اتارلوں گا۔ ایک جگہ گدھا پانی میں بیٹھ گیا اور سب روٹیاں' خمیر آٹا بن گئیں۔ دوسرے لوگوں کے پاس کھانے پکانے کا سب سامان موجود تھا لیکن وہ لوگ آزاد کو کسی چیز کو ہاتھ بھی نہیں لگانے دیتے تھے کہ ناپاک ہوجائیں گے۔ وہ ہندوستان کا تھا اس لیے ان کے نزدیک کافر تھا۔

مورچا خاک میں منزل ہوئی۔ عجیب ویران اور بے برکت گاؤں تھا۔

آزاد نے قافلے میں شریک ایک حاجی کو ساتھ لیا اور گاؤں میں گیا کہ کچھ کھانے کو لائیں۔ جس سے پوچھا' نان ہے؟ اس نے نفی میں گردن ہلادی۔ انہیں بھی ضد آگئی تھی۔ ایک ایک دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ کہے روٹی ہے۔ اندر سے جواب آتا نہیں ہے۔

"کوئی مرغ مل جائے گا۔"

"نہیں۔"

"انڈا ہے؟"

"نہیں۔"

مہمان نوازی ان لوگوں میں تل کے دانے کے برابر نہیں ملتی تھی۔ شاید متعصب تھے کہ دوسری قوم والے کو برداشت نہیں کرسکتے تھے۔

پورا گاؤں چھان مارا' صرف چند روٹیوں کے لیے۔ آخر ایک شخص کو کچھ لالچ آیا اور اس نے ڈیوڑھی قیمت وصول کرکے چار خشک روٹیاں ہاتھ میں تھمادیں۔ وہ انہی روٹیوں کو پانی میں بھگو بھگو کر حلق سے اتارتا ہوا اگلی منزل پر پہنچ گیا۔

اسی طرح روٹیاں مانگتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ کہیں موقع ملتا تو روٹیاں پکوالیتا۔ آخر یہ تکلیف دہ سفر چھبیس دن بعد قندھار پہنچ کر ختم ہوا۔

قندھار میں بھی وہی قباحتیں دیکھیں جن سے وہ ہرات میں دوچار ہوچکا تھا۔ جس طرف سے گزرتا' سوالوں کی بوچھار ہوجاتی۔ افغانیوں کی بے مروتی اور کج خلقی اس کے دل پر نقش ہوکر رہ گئی۔ اس پر مستزاد یہ کہ بارش اور سخت سردی نے اس کے پاؤں سُن کردیے۔

قندھار میں پانچ دن گزارنے کے بعد وہ کوئٹہ پہنچا اور اطمینان کی سانس لی۔

کوئٹہ میں اس نے ایک چھکڑا کرائے پر لیا۔ اس میں

کتابیں لادیں اور خود بچھونا بچھا کر اوپر لیٹ گیا۔ دو دن اور ایک رات سفر کرنے کے بعد وہ رندلی پہنچا اور وہاں سے ریل میں سوار ہو کر لاہور پہنچا۔

یہ بوڑھا مسافر جب ایران سے واپس آیا تو نادر کتابوں کا ذخیرہ اور فارسی محاوروں کا پشتارا اس کے ہمراہ تھا۔ یہ سفر اس نے اختیار بھی اسی لیے کیا تھا کہ بعض فارسی کتابوں کی تکمیل، ایران جائے بغیر نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ مقصد اس کا پورا ہو گیا۔ اگر وہ ایران نہ گیا ہوتا تو "سخن دانِ فارس" اور "نگارستانِ فارس" وجود میں نہ آتیں اور دربارِ اکبری کی عبارات اتنی مرصع نہ ہوتیں جتنی وہ بعد میں ہوئیں۔

ایران سے واپسی میں کتابوں کا جو ذخیرہ وہ اپنے ساتھ لایا تھا، اس کی موجودگی میں اس خیال نے سر ابھارا کہ اگر زمین حاصل ہو جائے تو وہ ایک شاندار کتب خانہ تعمیر کرے۔ ایران جانے سے پہلے بھی وہ زمین کے حصول کے لیے درخواست دے چکا تھا لیکن ڈاکٹر لائٹنر کی وجہ سے اس کی مخالفت ہوئی تھی۔ اب وہ گورنمنٹ کالج کا ملازم بھی نہیں رہا تھا اور لائٹنر بھی رخصت ہو چکے تھے لہٰذا اس نے ایک مرتبہ پھر محکمۂ تعلیم کے توسط سے درخواست پیش کی۔ محکمۂ تعلیم نے یہ درخواست فنانس کمشنر کو روانہ کر دی۔ خط و کتابت جاری رہی اور بالآخر فنانس کمشنر نے صاف انکار کر دیا۔ اس نے گورنر کو لکھا۔ وہاں سے بھی انکار ہو گیا۔

اس نے مایوس ہونا سیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ برابر دفتروں کے چکر کاٹتا رہا اور بالآخر حکومت نے اعانت کی۔ درگاہ شاہ محمد غوثؒ کے پہلو میں زمین کا ایک قطعہ اسے اس مقصد کے لیے عطا ہو گیا۔

یہ منظر دیکھنے کا تھا۔ زمین ملتے ہی اس نے کتب خانے کی عمارت کا کام شروع کرا دیا۔ جس انداز سے وہ تعمیر کی نگرانی کر رہا تھا، کوئی دیوانہ ہی کر سکتا تھا۔ جتنی دیر مزدور کام کرتے رہتے، وہ بھی کھڑا رہتا۔ ایک ایک اینٹ کو آنکھوں آنکھوں میں چومتا رہتا۔

ایک مرتبہ بادل گھر کر آ گئے۔ بادلوں کے لشکر پانی برسانے کو تیار کھڑے تھے اور وہ پریشان ہو رہا تھا کہ اگر بارش ہو گئی تو تعمیر کا کام متاثر ہو گا۔ ایک دن کا بھی نقصان کیوں ہو۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر بہ آوازِ بلند دعا مانگنی شروع کر دی "یا اللہ! بارش نہ ہو۔ اگر بارش ہو گئی تو تعمیر کا کام بند ہو جائے گا" بجلی بڑے زور سے گرجی۔ آزاد کو طرارہ آ گیا۔ اس نے بادلوں کی طرف منہ کر کے ہاتھ سے اس طرح اشارے کیے جیسے کوئی کبوتر اڑاتا ہے۔

"بادلو، اڑ جاؤ۔ کہیں اور جا کر برسو۔ آزاد کے کام میں کیوں خلل ڈالتے ہو۔"

مزدور اس کی حالت دیکھ کر یہی سمجھے ہوں گے کہ اس کا دماغ چل گیا ہے۔

وہ مسلسل اشارے کر رہا تھا اور بادلوں کو ڈانٹ رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بادل چھٹ گئے۔ اس کا جذبہ کام آیا اور خدا نے اس کی سن لی۔

اسی دوران میں اسے ملکہ وکٹوریہ کے پنجاہ سالہ جشن کے موقع پر شمس العلما کا خطاب عطا ہوا۔ وہ اپنے معاصرین میں پہلا شخص تھا جسے اس خطاب سے نوازا گیا۔

اسی سال وہ اپنے بیٹے آغا محمد ابراہیم کی شادی کے فرض سے سبک دوش ہوا۔

انہی مصروفیات میں کتب خانے کی تعمیر کی دیکھ بھال بھی شامل تھی اور نوکری کے بکھیڑے بھی لیکن اس کے باوجود وہ تصنیف و تالیف کی طرف سے غافل نہیں ہوا۔

دری بچھی ہوئی ہے۔ سردیاں ہیں تو اس پر ایک پتلا سا گدیلا۔ پیچھے گاؤ تکیہ۔ سامنے لیمپ، پہلو میں کشمیری قلم دان، اس کے برابر تھال۔ اس میں مختلف طرح کے قلم اور مختلف رنگوں کی دواتیں۔ اسی میں ایک طرف کٹی ہوئی چھالیا کہ جب جی چاہا چند دانے اٹھا کر منہ میں ڈال لیے۔ نصف شب کو لکھنے بیٹھتا اور صبح تک مسلسل قلم چلتا رہتا۔

اسی عالم میں اس نے "سخن دانِ فارس" پر نظرثانی کی اور جو معلومات ایران سے جمع کر کے لایا تھا، اس نسخے کے سپرد کر دیں۔ دوسری کتاب "نگارستانِ فارس" بھی اسی سیرِ ایران کا عطیہ تھی جس میں اس نے ایرانی شعرا کا احوال رقم کیا تھا۔

اس کام سے نمٹنے کے بعد اس نے چاہا کہ اب "دربارِ اکبری" کو سنبھالوں مگر مروت و حمیت نے اجازت نہ دی۔ اپنے استاد ذوق کی بے ترتیب غزلیں جو وہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے بچا کر لے آیا تھا اب تک یونہی بے ترتیب پڑی تھیں۔ اس نے سوچا وہ کب تک انہیں کلیجے سے لگائے زندہ رہے گا۔ اگر وہ نہ رہا تو استاد کا نام بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مٹی میں دفن ہو جائے گا۔ دوست اس سے تقاضے کرتے رہے کہ وہ سب کام چھوڑ کر دربارِ اکبری کو مکمل کرے کہ اس تصنیف سے اس کا نام زندہ رہے گا لیکن اسے اپنے نام سے زیادہ استاد کے نام کی فکر تھی۔ وہ سب کام چھوڑ کر ذوق کا دیوان مرتب کرنے بیٹھ گیا۔

یہ کسی اور کا نہیں اس کے استاد کا دیوان تھا۔ اسے وہ

معمولی طریقے سے ترتیب دینا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے یہ انفرادیت پیدا کی کہ جن غزلوں اور قصیدوں سے کوئی خاص واقعہ منسلک تھا' اسے بھی حاشیے میں درج کردیا جس سے ذوق کے زمانے کی دلی چلتی پھرتی نظر آتی تھی۔

دیوانِ ذوق کی تکمیل کے سلسلے میں اس نے اپنی بیاضوں' ذوق کے مسودوں کے ساتھ ساتھ ذوق کے شاگردوں سے بھی معلومات جمع کیں۔

قلم کا مسافر زمین سے آسمان اور مکان سے لامکان تک بارہا اترتا چڑھتا رہا۔ دس مہینے بعد آکر قلمدان میں دم لیا۔

دس مہینے کی محنت شاقہ کے بعد ایک ایسا دیوان وجود میں آگیا جس نے ذوق کے نام کو ہمیشہ کے لیے زندہ کردیا۔

ذوق کے نام کا چراغ جل گیا لیکن وہ خود بجھنے لگا۔ اس دیوان کو مرتب کرتے ہوئے اس نے اپنی ہمت سے بڑھ کر محنت کی تھی۔ اتنا جاگا کہ سونے کی عادت ہی ختم ہوگئی۔ رات رات بھر ٹہلتا تھا مگر نیند نہ آتی تھی۔ مسلسل بے خوابی نے اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ مسلسل حوادث اور لگاتار محنت نے اس کے اعصاب کو پہلے ہی کمزور کردیا تھا' یہ دیوان ایک بہانہ بن گیا۔ مزاج میں ایسا چڑچڑاپن پیدا ہوگیا جو دوسروں کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگیا۔ جب غصہ حد سے زیادہ بڑھ گیا تو گھر والوں نے ڈر کے مارے بات کرنی چھوڑ دی۔ ایک کونے میں چپکا بیٹھا رہتا۔ کسی نے کھانے کو دے دیا' کھالیا۔ رات ہوتی تو لکھنے بیٹھ گیا لیکن کسی کو نہیں معلوم تھا کہ وہ کیا لکھ رہا ہے۔ اپنے مسودوں کو کسی خزانے کی طرح چھپاتا تھا۔

یہ کیفیت ایک قسم کے مراق میں تبدیل ہوگئی۔ ہر ایک کی طرف سے دل میں شک آنے لگا۔ بہو زہر دے دے گی' بیٹا کل روپے پر قابض ہوجائے گا۔ یہ لوگ میرے مسودے چرا کر بیچ آئیں گے۔ ہوا خوری کے لیے باہر نکلتا تو بادلوں سے' چڑیوں سے' بچوں سے' پیڑوں سے' کبھی اپنے آپ سے باتیں کرتا ہوا چلتا۔ لوگ دیکھتے تو ہنستے کہ میاں آزاد کا دماغ چل گیا ہے۔

یہ مراق اتنا شدید ہوگیا کہ وہ کتب خانہ جو بڑے شوق سے پبلک کے فائدے کے لیے بنوایا تھا' بند کردیا کیونکہ اب وہ وہاں کسی کو قدم بھی رکھنے نہیں دیتے تھے کہ آنے والے میری کتابیں چرا کر لے جائیں گے۔ حکومت کی طرف سے نوٹس آیا کہ کتب خانہ کھولا جائے لیکن یہاں تو حالات ہی دوسرے تھے۔ اس کے بیٹے نے تمام حالات لکھ کر حکومت کو بھیج دیے۔ حکومت نے پھر نوٹس بھیجا کہ کتب خانہ خالی کردیا جائے۔ تعمیر پر جو رقم خرچ ہوئی ہے وہ میونسپل کمیٹی ادا کردے گی لہٰذا کتب خانہ وہاں سے منتقل کردیا گیا۔ دیوانگی کے ہاتھوں برسوں کی محنت منٹوں میں برباد ہوگئی۔

یہ دیوانگی عجیب قسم کی تھی۔ پانچ منٹ' دس منٹ.... بعض اوقات آدھا پونا گھنٹا اچھی طرح باتیں کرتا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ دماغ پر کوئی اثر نہیں۔ حافظہ اور دل اچھا ہے۔ یکایک دیوانگی شروع ہوجاتی۔ سامنے والا حیران رہ جاتا۔ اسے اس وقت ہوش آتا جب آزاد اسے پہچاننے سے انکار کرتا یا گالیوں سے نوازتا۔

اس کی بیوی اس کی حالت دیکھتی تھی اور روتی تھی۔ بیٹا الگ پریشان تھا۔ علاج کرانے یا دوا کھانے پر وہ تیار نہیں ہوتا تھا۔ آخر یہ طے ہوا کہ دہی کا بہت شوق ہے' دہی میں دوا ملا کر کھلادی جایا کرے۔ خدا جانے اسے کیسے معلوم ہوگیا کہ دہی کھانا ہی چھوڑ دیا۔ پھر بھی کسی نہ کسی طرح دوا کھلادی جاتی تھی لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔

مولوی خلیل الرحمٰن اس کے ایک دوست اس سے ملنے آئے۔

صحن میں دو چارپائیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ایک پر آزاد بیٹھے تھے۔ مولوی صاحب ازراہِ ادب پائنتی بیٹھ گئے۔

"میاں کس لیے وہاں بیٹھے ہو' آرام سے سرہانے بیٹھو۔"

"اچھا بیٹھا ہوں۔ بس آپ کی خیریت لینے آگیا تھا۔"

"میں خیریت سے ہوں مگر تم ٹھیک طرح بیٹھ جاؤ۔"

"ٹھیک بیٹھا ہوں۔ اور سنایئے۔"

"کیا ٹھیک ٹھیک کی رٹ لگا رکھی ہے۔ میری پائنتی ٹوٹی جاتی ہے اور تو کہتا ہے ٹھیک بیٹھا ہوں۔"

مولانا نے یہ رنگ دیکھا تو جھٹ سرہانے کی طرف بیٹھ گئے۔

اچھی خاصی باتیں ہو رہی تھیں۔ یہ معلوم بھی نہیں ہوتا تھا کہ اس کے دماغ پر کچھ اثر ہے۔

اسی وقت چوڑھی آئی اور صحن میں جھاڑو دینے لگی۔ بس پھر کیا تھا۔ آزاد نے بلند آواز میں چیخنا شروع کردیا۔ اپنی بیوی کو آواز دی۔

"ابرو کی ماں! تم سے کتنی دفعہ کہا ہے کہ چوڑھی کے آنے سے پہلے یہ چھڑکاؤ کرا دیا کرو۔"

"بہشتی نہیں آیا تھا اس لیے چھڑکاؤ نہیں ہوسکا۔ تم چوڑھی سے کہو' جھاڑو نہ دے۔"

اس کا جو جواب آزاد نے دیا اسے سن کر مولوی خلیل الرحمٰن کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

آزاد نے نہایت بلند آواز میں فرمایا "اگر بہشتی نہیں آیا تھا تو تم ہی نے ذرا کھڑے ہو کے موت دیا ہوتا کہ گرد تو بیٹھ جاتی۔"

بوڑھی اہلیہ پر اس جواب سے کیا گزر گئی ہوگی۔ یہ گھر کے اندر کا سناٹا بول رہا تھا۔

مولوی خلیل وہاں سے نکلے تو انہیں یہ طے کرنے میں دیر نہیں لگی کہ مولانا آزاد اگر اب نہیں تو آئندہ بالکل دیوانے ہو جائیں گے۔ آزاد جیسا مہذب آدمی ایسے الفاظ زبان سے نکالے۔ یہ دماغ کی خرابی نہیں تو اور کیا ہے؟

انہی دنوں لاہور میں ایک فقیر سید دھیان شاہ چشتی تشریف لائے اور نویں کوٹ میں قیام کیا۔ یہ درویش کبھی سالک تھے کبھی مجذوب۔ کبھی ہوش میں ہوتے تو اچھی خاصی باتیں کرتے۔ آنے جانے والوں سے صاحب سلامت بھی کر لیتے لیکن بعض اوقات آپے سے باہر ہو جاتے۔

آزاد کو عملیات اور روحانیات سے ابتدا ہی سے دلچسپی تھی۔ مختلف وظیفے پڑھتے اور چلے کھینچتے رہتے تھے۔ اس فقیر کا احوال سنا تو اس سے ملنے چلے گئے۔ سید صاحب اس شفقت سے ملے جیسے اسی سے ملنے لاہور آئے ہوں۔

دیوانے کو دیوانہ مل گیا۔ کچھ دن نہیں گزرے کہ راز و نیاز کی محفلیں گرم ہونے لگیں۔ اب وہ کالج سے نکلتا اور سیدھا نویں کوٹ اس فقیر سے ملنے پہنچ جاتا۔ اپنے تمام علم و فضل کے باوجود وہ اس فقیر کا اسیر ہو کر رہ گیا تھا۔ لوگ حسرت سے اسے اس فقیر کے پاس بیٹھا دیکھتے اور آگے بڑھ جاتے۔

اس کا نتیجہ یہی ہونا تھا کہ اس کی ذہنی حالت مزید خراب ہونے لگی۔ اب اسے آسمانوں سے آوازیں آتی تھیں اور وہ ان آوازوں کا جواب دیتا تھا۔

ایک روز جو اس کا بیٹا آغا ابراہیم گھر آیا تو عجیب تماشا دیکھا۔ آزاد اپنے کمرے میں اکیلا کھڑا تھا لیکن اس طرح جھک جھک کر آداب کر رہا ہے جیسے کوئی سامنے ہے۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں، کس کو سلام ہو رہا ہے؟"

"ہش!" آزاد نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا "حضرت، بس کیا عرض کروں، اپنی حالت دیکھ کر آپ ہی کا ایک شعر یاد آتا ہے۔

زمانے نے رکھا مجھے متصل
پراگندہ روزی پراگندہ دل

"آپ سنایئے۔ عالم بالا میں کیسی گزر رہی ہے؟" وہ کسی سے مخاطب تھے اور ابراہیم افسوس کے ساتھ ان کی اس حالت کو دیکھ رہا تھا۔

جب وہ ہوش میں آ چکے اور یہ معلوم ہوا کہ جس سے وہ باتیں کر رہے تھے، وہ رخصت ہو چکا تو ابراہیم نے پوچھا۔

"آپ کس سے باتیں کر رہے تھے۔ یہاں تو کوئی بھی نہیں تھا؟"

"میں نے میر تقی میر کی روح کو بلایا تھا۔ انہی سے باتیں کر رہا تھا۔ واہ بھئی واہ! جیسا کلام ہے ویسے ہی باتیں کرتے ہیں۔ دل شکستہ ہیں مگر ہیں بڑے دلچسپ۔"

"مجھے تو کوئی بھی نظر نہیں آتا۔"

"روحیں کہیں ہر ایک کو نظر آتی ہیں۔ اور تم میرے معاملات میں دخل مت دیا کرو۔ تم اپنی جورو کے ساتھ خوش رہو۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو" آزاد نے کہا "اور ہاں اب تم یہاں سے جاؤ۔ مجھے ابھی سودا کی روح کو بھی بلانا ہے۔"

آغا ابراہیم کیا کرتا۔ وہاں سے اٹھ کر چلا آیا۔ اب وہ ہر روز کسی نہ کسی روح کو بلاتے اور جھک جھک کر سلام کرتے۔

جب یہ حالت ہو تو نوکری کیسے برقرار رہ سکتی تھی۔ محکمے نے اسے دیوانہ قرار دے کر جبری ریٹائر کر دیا اور گورنر جنرل کی تحریک پر اس کی پنشن منظور ہو گئی۔

ایک ملازمت کا کانٹا تھا، وہ بھی نکل گیا۔ اس دوران میں علاج معالجے بھی ہوتے رہے لیکن اس کا مراق، جنون میں تبدیل ہوتا چلا گیا۔

ایک دن عالم بے قراری میں وہ سید دھیان شاہ کے پاس جا نکلا۔ ابھی چند قدم کا فاصلہ تھا کہ درویش نے نظر اٹھا کر دیکھا۔

"جا محمد حسین جا۔ تیرے لیے دہلی کا حکم آیا ہے۔ دلی چلا جا۔"

خدا جانے اس حکم میں کیا تاثر تھا۔ ایک بجلی تھی جس نے صبر و سکون، ہوش و حواس، تمدن و وضع داری، علمیت سب کو خاک سیاہ میں تبدیل کر دیا۔ کوچۂ رسوائی کوچۂ محبوب نظر آنے لگا۔ وہ الٹے قدموں لوٹا اور پیدل ہی دلی کی طرف چل دیا۔

کہاں لاہور کہاں دلی۔ جنگل بیابانوں سے گزرتا ہوا اس حال میں دلی پہنچا کہ سر سے پگڑی غائب، پیر میں جوتا ندارد، کپڑے تار تار، پاؤں میں آبلے، ہاتھ زخمی۔ پیٹ کمر سے لگا ہوا۔ شور مچ گیا کہ شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد اس حال میں وارد ہوئے ہیں۔ جس راہ سے گزرتا تھا، ایک خلقت اسے دیکھنے آتی تھی اور انگشت بدنداں تھی۔

رشتے داروں کو پتا چلا۔ وہ اسے ڈھونڈنے کے لیے نکلے۔

"ابھی تو یہیں تھے۔ قدم شریف کی طرف گئے ہیں۔"

وہاں کسی نے بتایا' استاد ذوق کی قبر پر ملیں گے۔ بہ ہزار دقت وہ ایک جگہ ملا۔ کچھ شریر بچے اس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

رشتے داروں کو یقین نہ آتا تھا لیکن جب آنکھوں سے دیکھا تو بے اختیار آنسو رواں ہو گئے۔

"محمد حسین' یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔ چلو گھر چلو۔ ہم تمہاری خدمت کریں گے۔ کیوں تماشا بنے ہوئے ہو۔"

وہ لوگ منت سماجت کرتے تھے مگر وہ کب کسی کی سنتا تھا۔ اس نے ایک نگاہ غلط انداز سب پر ڈالی اور آگے بڑھ گیا۔

"خدا کے واسطے محمد حسین' گھر چلو۔"

"سب مجھے تنگ کرتے ہیں۔ دسترخوان گھسیٹ لیتے ہیں۔ کھانے میں زہر ملاتے ہیں۔ میری بہو جسے میں بیاہ کر لایا تھا' میری سب سے بڑی دشمن ہے۔"

"تم ان سے مت ملنا مگر ہمارے ساتھ تو چلو۔"

"تم بھی تو انہی کے رشتے دار ہو۔ ہٹ جاؤ میرے راستے سے" آزاد نے باقاعدہ بھاگنا شروع کر دیا۔ بچے بھی اس کے ساتھ بھاگنے لگے۔

رشتے دار مایوس ہو کر لوٹ آئے کہ پھر کسی وقت سمجھالیں گے۔

وہ اپنے رشتے داروں سے جان چھڑا کر بھاگا اور سیدھا قطب صاحب پہنچ گیا۔ وہاں سے نظام الدین اولیا کی درگاہ پر پہنچ گیا۔ لنگر تقسیم ہو رہا تھا۔ وہ بھی فقیروں میں فقیر بن کر کھڑا ہو گیا۔ کئی دن سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ جو کچھ لنگر کے نام پر ملا' ایک طرف بیٹھ کر خوب سیر ہو کر کھایا۔ اس مست کا دل یہاں بھی نہیں لگا۔ وہاں سے بھی چل کھڑا ہوا۔ دلی سے باہر نکل گیا۔ دور تک جنگل ہی جنگل تھا۔ تھک گیا تھا۔ پاؤں پھیلا کر سو گیا۔ رات سے پہلے سو گیا تھا۔ رات آئی اور گزر گئی۔ دن نکلا تو پھر اس نے شہر کا رخ کیا۔

کئی دن اسی طرح گزر گئے۔ کبھی شہر کبھی جنگل جہاں اس کا جی لگتا' وہاں پہنچ جاتا۔ بھوک لگتی تو کسی دکان سے مٹھی بھر چنے اٹھا لیتا۔ لوگ مٹھائیاں پیش کرتے مگر وہ آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔

وہ دلی میں تھا ادھر لاہور میں گھر والے پریشان تھے کہ دیوانگی میں نہ جانے کدھر نکل گئے۔ پورا لاہور چھان مارا کہیں نظر نہ آئے۔ آخر دلی سے تار آیا کہ آزاد یہاں ہیں۔ گھر میں کہرام مچ گیا۔ آغا ابراہیم فوراً دلی پہنچے۔ ان کے ساتھ بھی وہی ہوا جو دیگر رشتے داروں کے ساتھ ہوا تھا۔ بہت سمجھایا کہ گھر چلئے مگر ایک نہ مانی۔

آغا ابراہیم کتنے دن دلی میں ٹھہرتے۔ ملازمت سے مجبور تھے لہٰذا آزاد کو اس کے حال پر چھوڑ کر واپس آگئے۔

یہ دیوانہ کئی مہینے اسی طرح گھومتا رہا۔ آخر جذبہ سکون کی طرف مائل ہونے لگا۔ کبھی کبھی پرانے دوستوں کی طرف جا نکلتا۔ اب اس کی کیفیت دھیان شاہ والی تھی۔ کبھی سالک کبھی مجذوب' کبھی پُرسکون کبھی وحشت زدہ۔ دوستوں کے پاس بیٹھ کر ادبی نکات پر طویل بحثیں کرتا۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے تمام علوم اس کے ذہن میں سماگئے ہیں۔ اسی دوران میں دورہ سا پڑتا اور اٹھ کھڑا ہوتا۔

اب اس کی ایسی حالت تھی کہ اسے سمجھایا جا سکتا تھا چنانچہ اس کے بچپن کے دوست منشی ذکاء اللہ بہلا پھسلا کر اسے اپنے دولت کدے پر لے آئے۔ شیشے کے برتن کی طرح اس کی حفاظت کی۔

ایک وہی نہیں' پورا گھر اس کی نازبرداریوں میں لگا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی حکیم محمود خاں کا علاج بھی ہو رہا تھا۔ اسے یہ فرق پڑا کہ ہوش مندی کے وقفے بڑھنے لگے۔ رفتہ رفتہ طبیعت نے بہت کچھ قرار پکڑ لیا۔ ایک مرتبہ پھر دوستوں کی محفلیں آباد ہونے لگیں۔

ایک سال تک منشی ذکاء اللہ نے اس کی نازبرداری کی۔ دوستی کا حق ادا کر دیا۔ اب آزاد کا یہاں جی گھبرانے لگا تھا۔ اس کے مرض کا تقاضا تھا کہ اس کے ساتھ زبردستی نہ کی جائے لہٰذا آغا ابراہیم کو خط لکھا گیا۔ وہ آئے اور آزاد کو اپنے ساتھ لاہور لے گئے۔

آزاد کو بہو کے ساتھ رہنا گوارا نہیں تھا لہٰذا اپنے الگ مکان میں رہے۔ آس پاس الماریوں میں کتب خانہ سجا دیا۔ درمیان میں پلنگ۔ ایک گوشے میں چھوٹا سا بوریا' اس پر فرش' کاغذ قلم سب کچھ پاس رکھ کر بیٹھتا۔ صبح شام دہی پیتا۔ چار پانچ میل سیر کو جنگل یا باغوں میں جاتا جہاں ہر پتا اس کا مخاطب تھا۔ ہر درخت اس سے باتیں کرتا تھا۔ نسیم کا ہر جھونکا' اس کے لیے نئی خبریں لاتا۔ غرضیکہ صبح و شام کی تفریح اس کی زندگی تھی۔ اب اس نے اپنے اردگرد صفحات بھی پھیلا لیے تھے۔ رات رات بھر کاغذ رنگین کرتا تھا اور انہیں سنبھال کر رکھتا جاتا تھا۔ یہ اس کی نئی تصنیفات تھیں۔ مکاشفات آزاد۔ فلسفہ الٰہیات' جانورستان' ترکی قواعد' عربی

قواعد وغیرہ۔

احباب کو خوشی تھی کہ دماغ ٹھکانے آیا۔ تھوڑی بہت آشفتگی ہے وہ بھی جاتی رہے گی۔

ایک روز مولوی خلیل الرحمٰن دفتر جارہے تھے کہ آزاد دور سے آتے ہوئے نظر آئے۔ مولانا پریشان ہوئے کہ عرصہ دراز سے نہیں ملا ہوں دیکھئے کیا سخت سست سناتے ہیں۔ آزاد کی ذہنی کیفیت سے وہ یوں بھی خائف تھے۔ مولانا نے بچنا چاہا لیکن آزاد نے دیکھ لیا۔ خیریت پوچھی۔ ایک ایک بچے کی تعلیم کے بارے میں پوچھتے رہے۔

مولانا خلیل الرحمٰن کی شامت آئی تھی کہ ازراہِ ادب اس سے کہہ بیٹھے۔

"آپ کی بہت دنوں سے زیارت نہیں ہوئی۔"

بس پھر کیا تھا۔ آزاد کو موقع مل گیا اور مولانا پر برس پڑے۔

"تو ایسا بے ایمان پاجی ہے۔ تو نے میری خبر بھی نہیں لی۔ میرے اوپر کیا کیا بن گئی' تو نے کروٹ نہیں لی۔ پاجی پوچھتا ہے بہت دنوں سے زیارت نہیں ہوئی۔ خبر بھی ہے میرے ساتھ کیا دغا ہوئی؟"

"خیریت؟ کیا ہو گیا؟"

"میرے ساتھ ذکاء اللہ نے پھر دغا کی۔ اس کی۔" آزاد نے گالی دی "میں ایک روز ہوا خوری میں دہلی پہنچ گیا۔ ذکاء اللہ نے بڑی خاطر سے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنے مکان میں ٹھہرایا' مجھے کیا معلوم اس کے دل میں دغا ہے۔ اس کے مکان کے نزدیک ایک برات آکر ٹھہری۔ مجھ سے کہنے لگے' آزاد! تو بھی برات دیکھ آ' میں گیا۔ برات والوں نے جو مجھے دیکھا تو شور مچایا کہ آزاد آیا' آزاد آیا۔ مجھے بڑی خاطر سے دولھا کے پاس بٹھا دیا۔ مجھے کیا خبر ذکاء اللہ نے اس کی.... کیا فریب کیا ہے۔ اب جو نکاح بندھنے لگا تو نکاح اور مہر کے ساتھ مجھے بھی باندھ دیا اور ایسا جکڑا کہ رسوں کے بندھنوں سے اب تک میرے بدن میں درد ہے۔ جس طرح ہو سکا میں رسوں کو تڑا ابھی چلا آرہا ہوں۔"

ایسا کوئی واقعہ نہیں تھا۔ یہ سب آزاد کی ذہنی اختراع تھی۔ اس کی فطرت میں داستان طرازی تھی' اس کی دیوانگی سے مل کر عجیب وغریب رنگ اختیار کر گئی تھی۔ کبھی کسی کو خضر علیہ السلام سے اپنی ملاقات کا احوال سناتا تھا۔ کبھی خود کو راجا جے چند کا اوتار کہتا تھا۔

مولانا خلیل الرحمٰن نے بھی جب منشی ذکاء اللہ سے منسوب واقعہ اس کی زبان سے سنا تو انہیں شک ہوا کہ آزاد ٹھیک نہیں ہوئے ہیں۔ ان کا مرض کسی وقت بھی شدت اختیار کر سکتا ہے۔ یہی ہوا' آزاد ایک مرتبہ پھر لاہور سے غائب ہو گیا۔ اس مرتبہ اس کا رخ علی گڑھ کی طرف تھا اور وہ بھی پیدل۔ پیروں پر ورم آچکا تھا۔ آبلوں پر کپڑے پھاڑ کر دھجیاں لپیٹی ہوئی تھیں۔ جب سرسید کی کوٹھی پر پہنچا تو نوکروں سے اطلاع کرائی کہ سید احمد سے کہہ دو' تمہاری ملاقات کے لیے آزاد لاہور سے آیا ہے۔

آزاد کا نام سنتے ہی سرسید گھبرا کر باہر نکلے۔ دیکھا تو واقعی شمس العلما آزاد ہیں۔ دیوانگی کے قصے وہ سن ہی چکے تھے' اب دیکھ بھی رہے تھے۔ آنکھوں میں آنسو آگئے اور آبگینے کی طرح سنبھال کر اسے اندر لائے۔

"سید! یہ بھی جانتے ہو' میں یہاں کیوں آیا ہوں؟" آزاد نے کرسی پر بیٹھتے ہی کہا۔

"ظاہر ہے' محض مجھ سے ملنے کے لیے آپ نے یہ تکلیف اٹھائی ہے۔"

"نہیں۔ اس سے بھی ایک خاص بات ہے۔ ذرا غور سے سننا۔ کئی دن ہوئے ابوالفضل کی روح میرے پاس آئی تھی۔ میرا اور ابوالفضل کا اکبر کے مذہبِ الٰہی پر دیر تک مناظرہ ہوا۔"

آزاد نے کرسی سے کھڑے ہو کر اس مناظرے کی تفصیلات سنانی شروع کیں۔ اول ابوالفضل کی تقریر فارسی میں سناتا تھا۔ پھر اپنا جواب سناتا تھا۔ اسی عالم جنوں میں وہ جیسی بے مثال فارسی بول رہا تھا اور جو نکتے بیان کر رہا تھا' اسے سن کر سرسید دم بخود تھے اور افسوس کر رہے تھے کہ کیسا بے مثال دماغ' دیوانگی کے ہاتھوں تباہ ہو گیا۔ یہ شخص تمام زندگی تجربات جمع کرتا رہا۔ نادر کتابوں کے مطالعے میں ایک عمر لگا دی اور اب اس علم کو ظاہر کرنے کا وقت آیا تھا کہ اپنے ہوش ہی میں نہیں رہا۔ اب اس کی باتیں دیوانے کی بڑ ہیں۔ افسوس' صد ہزار افسوس۔

دیوانے کو سمجھانے والا بھی دیوانہ۔ سرسید نے بھی اس دیوانے کو سمجھانے کے بجائے' ایک ہفتے تک اپنا مہمان بنا کر رکھا۔ جب اس کے پاؤں کے آبلے کچھ اچھے ہو گئے تو اپنے ایک ملازم کے ساتھ اسے لاہور بھیج دیا۔

وہ دلی اور علی گڑھ تک پیدل ہو آیا تھا۔ یہ خطرہ روز بہ روز بڑھتا جا رہا تھا کہ کہیں وہ کسی ایسی طرف نہ نکل جائے کہ واپس نہ آسکے یا کسی حادثے سے دوچار ہو جائے۔ دماغ کی خرابی تھی کہ روز بہ روز بڑھتی جا رہی تھی۔ بیٹے کی محبت نے جوش مارا اور اسے کسی بہانے سے پاگل خانے میں داخل

کرادیا کہ شاید ڈاکٹر مناسب علاج کرا سکیں لیکن ایک روز وہ ان سے ملنے گیا تو ان کی حالت دیکھی نہ گئی جس باپ نے اسے نازوں سے پالا تھا، اسے بجلی کے جھٹکے دیے جا رہے تھے اور وہ بری طرح چیخ رہا تھا۔ وہ اسے واپس گھر لے آیا۔

ادھورے علاج کا اثر تھا یا کیا تھا کہ پاگل خانے سے آنے کے بعد اس کی حالت مزید بگڑ گئی۔ صاف نظر آرہا تھا کہ رفتہ رفتہ ہوش و خرد سے بالکل ہی بے گانہ ہو جائے گا۔ مکان کو اندر سے بند کرکے بیٹھا رہتا۔ لکھنے کا سلسلہ اس عالم میں بھی جاری تھا۔ ہر تحریر نہایت خوش خط، دیدہ زیب لکھتا تھا۔ عنوانات سرخ روشنائی سے لکھتا تھا۔ جلد کی پیشانی پر جلی حروف میں کتاب کا نام۔ جب کتاب مکمل ہو جاتی تو نہایت احتیاط سے ڈوری میں باندھ کر بکس میں بند کردیتا۔ یہ بھی عجیب بات تھی کہ اب وہ زیادہ تر عربی زبان میں لکھ رہا تھا۔

جیسے جیسے اس کی حالت بگڑتی جا رہی تھی، احباب کا تقاضا بڑھتا جا رہا تھا کہ "دربارِ اکبری" کو اب شائع ہو جانا چاہیے۔ یہ وہی کتاب تھی جس کے لیے سید حسن بلگرامی نے کہا تھا کہ یہ کتاب آپ کے نام کو زندہ رکھے گی۔ آزاد نے جس ذوق وشوق سے اس دربار کو سجایا تھا اور جس جگر کاوی سے اسے مکمل کیا تھا اس کا تقاضا بھی یہی تھا کہ اسے شائع ہونا چاہیے۔ آخر آغا ابراہیم نے ہمت کرکے آزاد سے اس کی اشاعت کے بارے میں بات کی۔ آزاد کبھی اس کی اشاعت کے خواب دیکھا کرتا تھا، اس لیے امید تھی کہ وہ خوش ہوگا لیکن خیر ہو دیوانگی کی کہ وہ سنتے ہی بھڑک اٹھا۔

"ہرگز نہیں۔ میں ہرگز پسند نہیں کروں گا کہ اکبر جیسے اولوالعزم بادشاہ کی زندگی ہر کس و ناکس کے ہاتھ میں جائے اور چند سکوں کے عوض بازاروں میں بکتی پھرے۔"

"کتابیں تو لکھی ہی اس لیے جاتی ہیں کہ شائع ہوں اور لوگ انہیں پڑھ کر فائدہ اٹھائیں۔"

"میری اور کتابوں سے کتنا فائدہ اٹھالیا جو اس سے اٹھائیں گے۔ اب چلے جاؤ، مجھے مت چھیڑو۔ میں اس کی ہوا بھی نہیں لگنے دوں گا۔ میری محنت سے تم ٹکے کمانا چاہتے ہو۔ اس کتاب میں ابوالفضل کی روح بند ہے۔ خان خاناں کی روح بند ہے۔"

"اچھا، ایک نظر مسودہ دکھا تو دیجیے۔ دیکھوں تو محفوظ بھی ہے۔"

"ہوشیار بنتے ہو، مجھے دیوانہ سمجھا ہوا ہے۔ میں تمہیں مسودہ دکھاؤں اور تم جھپٹ لو۔ غور سے سنو! اگر تم نے زیادہ ضد کی تو میں اس مسودے کو راوی میں پھینک آؤں گا۔"

آغا ابراہیم ڈر گئے کہ زیادہ ضد کرنا مناسب نہیں۔ ان کا کیا بھروسا کہیں یہ ایسا کر ہی نہ گزریں۔

اس کے بعد بھی کئی دوستوں نے کوشش کی لیکن وہ تیار نہیں ہوتا تھا بلکہ اتنا محتاط ہو گیا تھا کہ کسی کو کتب خانے میں قدم بھی نہیں رکھنے دیتا تھا۔

اب ایک ہی راستہ تھا۔ وہ ہوا خوری کے لیے نکلا اور اس کی غیر موجودگی میں مسودہ حاصل کرلیا گیا۔

وہ شاید ہر روز اسے دیکھتا تھا۔ ہوا خوری سے واپس آنے کے بعد مسودے کو غائب پایا تو رہا سہا ہوش بھی جاتا رہا۔ دیوانوں کی سی حالت طاری ہو گئی۔ نہ کچھ کھاتا تھا نہ پیتا تھا۔ گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا رہتا تھا۔ کسی کی ہمت نہیں تھی کہ اس سے ملنے چلا جاتا۔ کسی نہ کسی طرح کھانا پہنچا دیا جاتا تھا ورنہ وہ سب سے قطع تعلق کر چکا تھا۔

حمایت اسلام کے جلسے میں لیکچر دینے کے لیے مولوی نذیر احمد لاہور آئے ہوئے تھے۔ آزاد سے ملنے کے مشتاق تھے۔ کئی مرتبہ ملنے آئے لیکن آزاد نے ملنا تو درکنار دروازہ بھی نہیں کھولا۔ مولوی نذیر احمد ہر مرتبہ کفِ افسوس ملتے ہوئے واپس چلے گئے۔

ایک دن اس کے جی میں نہ جانے کیا آئی کہ اسی دیوانگی کی حالت میں گھر سے نکلا اور وہاں پہنچ گیا جہاں ڈپٹی نذیر احمد ٹھہرے ہوئے تھے۔ دونوں ہم مکتب تھے۔ بچپن کے دوست تھے۔ گلے مل کر خوب آنسو بہائے۔ گلے شکوے ہوئے۔ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ کبھی سلجھی ہوئی کبھی الجھی ہوئی۔

اسی اثنا میں ڈپٹی نذیر احمد نے اپنا لیکچر اس کے سامنے رکھ دیا۔

"یہ لیکچر مجھے جلسے میں پڑھنا ہے۔ اگر ایک نظر تم بھی دیکھ لو تو اطمینان ہو جائے۔"

آزاد نے لیکچر پڑھنا شروع کیا۔ ساتھ ہی ساتھ ترمیم و اضافے بھی کرتا جاتا تھا۔ ایک گھنٹے میں..... اس نے پورا لیکچر دیکھ لیا۔ کوئی صفحہ ایسا نہیں تھا جو ترمیم و اصلاح سے خالی رہا ہو۔

"بھئی، نذیر احمد! تم اردو لکھنا بھول گئے ہو" یہ کہا اور اٹھ کر چل دیا۔ نہ سلام نہ دعا۔

ڈپٹی نذیر احمد حیرت سے اسے جاتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ اس دیوانگی میں بھی ذہن کی برق رفتاری کا یہ عالم ہے۔

شب و روز اس کے نام کا ماتم کرتے ہوئے گزر رہے تھے۔ کبھی حالت بگڑ جاتی کبھی سنبھل جاتی۔ شاید سنبھل ہی جاتی لیکن ایک ٹھوکر اور لگی۔ اس کی اہلیہ کا انتقال ہو گیا۔

اپنی دیوانگی میں وہ اس سے بھی لاتعلق ہو گیا تھا لیکن اس کے مرنے کا سنا تو اچانک محبت جاگ اٹھی۔ وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کے رویا۔ ننگے پاؤں اس کے جنازے کے ساتھ ساتھ گیا اور دفن کر کے چلا آیا لیکن اس دن کے بعد سے وہ یوں چپ ہو گیا جیسے بیوی کے ساتھ خود دفن ہو گیا ہو۔

وہ اسے اپنے ہاتھوں سے دفن کر کے آیا تھا لیکن اسے یقین نہیں آتا تھا کہ وہ مر چکی ہے۔ پورے گھر میں اسے آوازیں دیتا پھرتا تھا۔ جب تھک جاتا تو ایک کونے میں سر جھکا کر بیٹھ جاتا۔ نہ سردی کا ہوش تھا نہ گرمی کا۔ اب گویا بالکل ہی پاگل ہو چکا تھا۔

بیوی کے انتقال کو تھوڑی ہی مدت ہوئی تھی کہ ایک دن دروازے پر کہار ڈولی لے کر آئے۔ کہاروں نے آواز لگائی۔

"محمد حسین کوتوال کے گھر سے سواری آئی ہے۔"

آزاد مردانہ مکان میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کوتوال تو سنا نہیں، اس نے صرف محمد حسین سنا۔ وہ اپنے مکان سے نکلا اور تیز رفتاری سے زنانہ مکان میں داخل ہوا۔ وہ خاتون جو ڈولی میں بیٹھ کر آئی تھیں، ابھی صحن ہی میں تھیں کہ آزاد بیوی، بیوی کہتے ہوئے ان کے پیچھے بھاگا۔ وہ بے چاری اس اچانک افتاد سے حواس باختہ ہو گئیں۔ اب یہ حال تھا کہ وہ پورے صحن میں بھاگتی پھر رہی تھیں اور آزاد انہیں پکڑنے کے لیے ان کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔

گھر کی عورتیں اسے سمجھا رہی تھیں کہ تمہاری بیوی تو مر گئی ہیں۔ یہ تو محمد حسین کوتوال کی بیوی ہیں لیکن وہ بضد تھا کہ سب غلط کہہ رہے ہیں۔ یہ تو میری بیوی ہیں، میں ان کی شکل ضرور دیکھوں گا۔ اتنے میں وہ خاتون پلنگ کے نیچے گھس گئیں۔ یہ بھی پلنگ کے نیچے چلے گئے۔ وہ دوسری طرف سے نکل کر دوسرے پلنگ کے نیچے چھپ گئیں۔ سب سمجھاتے رہے مگر انہوں نے کسی کی ایک نہ سنی۔ ان کو زبردستی پلنگ کے نیچے سے نکالا اور شکل دیکھی۔ صورت دیکھ کر لاحول پڑھی۔

"یہ تو واقعی وہ نہیں ہیں۔ وہ تو واقعی مر چکی ہیں" یہ کہتے ہوئے اپنے مکان میں آ گیا۔

اس کی زندگی اس قسم کے سیکڑوں واقعات کا مرقع بن کر رہ گئی تھی۔ طرح طرح کی وارداتیں دل پر گزرتی تھیں۔ ان وارداتوں کو تصنیفات کے نام پر کاغذوں پر اتارتا جا رہا تھا۔ دوستوں کو خط لکھتا تھا اور اپنے پاس رکھتا جاتا تھا۔

بہت دنوں سے اس کی کوئی خبر نہیں آئی تھی۔ دلی میں سب احباب فکر مند تھے۔ آخر ناصر نذیر فراق کو خیال آیا کہ ایک بار لاہور چل کر مولانا کی زیارت کر لو۔ ایسا نہ ہو، خدانخواستہ اس جہان سے رخصت ہو جائیں اور یہ آنکھیں آخری دیدار سے محروم رہ جائیں۔

وہ دلی سے لاہور آئے اور انارکلی، محمد شفیع کی سرائے میں ٹھہرے۔ ایک دن آرام کرنے کے بعد وہ اکبری دروازے، آزاد کی دولت سرا پر پہنچ گیا۔ یہ سوچ کر ہی دل دھڑک رہا تھا کہ شمس العلما آزاد کے نام پر وہ ایک خبط الحواس بوڑھے سے ملے گا کیا خبر وہ اسے پہچانے بھی یا نہیں۔

آزاد کا پوتا گھر سے باہر آیا۔ ناصر نذیر فراق نے اپنا مدعا بیان کیا۔

"آپ کے دادا جان کی قدم بوسی کے لیے دلی سے آیا ہوں۔"

"امام باڑے میں بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں۔ آیئے، میں آپ کو لے چلوں۔"

وہ دونوں ساتھ ساتھ گئے۔ آزاد امام باڑے کے برآمدے میں بیٹھے تھے اور جس حالت میں بیٹھے تھے، اسے دیکھ کر کلیجا منہ کو آتا تھا۔ ایک میلی سی اچکن گلے میں تھی جس کی چولی میں پورے بٹن نہیں تھے۔ ایسا ہی میلا کچیلا ڈبل زین کا پاجامہ تھا۔ سر پر مغلئی وضع کی ٹوپی جس پر انگل انگل بھر میل چڑھا ہوا تھا اور پاؤں میں بہت ہی بوسیدہ جوتی تھی۔ ایک بوریے پر بیٹھے تھے۔ ایک مٹی کی رکابی میں شوربا تھا اور ایک چنگیر میں چپاتیاں تھیں۔ چپاتی کا نوالہ بنا کر شوربے میں ڈبوتا تھا اور منہ میں رکھ لیتا تھا اور دیر تک چبا کر مشکل سے حلق سے نیچے اتار لیتا تھا۔

اپنی تصنیف آب حیات میں اس نے انشاء اللہ خاں انشا کے آخری دور کا بیان کرتے ہوئے انشا کے بارے میں لکھا تھا۔

"دیکھا کہ ایک کونے میں تن برہنہ۔ دونوں زانوؤں پر سر دھرا ہے۔ آگے راکھ کے ڈھیر ہیں۔ ایک ٹوٹا سا حقہ پاس رکھا ہے۔"

آج خود اس کا یہی حال تھا۔ ادھر ادھر کچھ راکھ کچھ کوئلے اور کچھ کوڑا پڑا تھا۔

ماخذات

محمد حسین آزاد (حیات و تصانیف) از ڈاکٹر اسلم فرخی۔
وسط ایشیا کی سیاحت، آغا محمد اشرف۔
سیر ایران، آزاد۔

"بھئی، تم کون ہو؟" آزاد نے ان کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"میں ناصر نذیر فراق ہوں۔"

"میں تمہیں نہیں جانتا۔"

"میں آپ کا شاگرد ہوں۔"

"اچھا! اگر تم میرے شاگرد ہو تو گرما گرم جلیبیاں تو لے آؤ۔"

ناصر نذیر بھاگ کر گئے اور جلیبیاں لے کر آگئے۔ گرم جلیبیاں ہر وقت تو ملتی نہیں، ٹھنڈی تھیں۔ آزاد نے ایک جلیبی اٹھا کر منہ میں رکھی اور تھوک دی۔

"میرے ہلتے ہوئے دانتوں سے یہ ٹھنڈی جلیبیاں کہاں چبائی جائیں گی، انہیں اٹھالو۔"

وہ اصرار کرنے لگے تو آزاد بگڑ گئے "اب آپ یہاں سے چلے جائیں اسی میں خیریت ہے۔"

آزاد کے پوتے نے بھی کہا کہ اس وقت ان کے سامنے سے ہٹ جائیں ورنہ اور بگڑیں گے۔

"میاں، تم ان کا خیال نہیں رکھتے۔ یہ کس حالت میں بیٹھے ہوئے ہیں؟" ناصر نذیر نے کہا۔

"حضرت، گور کا حال مردہ ہی خوب جانتا ہے۔ اگر دسترخوان میں روٹی لائی جاتی ہے تو دسترخوان جلا دیتے ہیں۔ چینی کی رکابیوں میں سالن دیا جاتا ہے تو توڑ کر پھینک دیتے ہیں۔ تانبے کی رکابیاں دیجیے تو بازار میں جا کر بیچ آتے ہیں۔ اچھے کپڑوں سے تو دشمنی ہے۔ ادھر پہنائے ادھر پھاڑے۔ ہم کہاں تک خیال رکھیں۔"

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ دیکھا آزاد، دانتوں میں خلال کرتے ہوئے چلے آرہے ہیں۔

"ہیں! بھئی، تم کب دلی سے آگئے" آزاد نے ناصر نذیر سے کہا "واللہ! میں نے تمہیں اس وقت نہیں پہچانا تھا" یہ کہہ کر تخت پر بیٹھ گئے۔

"آپ نے مجھے پہچان لیا؟"

"ہاں میاں، تمہارا نام سید ناصر نذیر ہے۔ ہے نا یہی نام؟"

"بے شک آپ نے سچ مچ مجھے پہچان لیا۔ ایک تازہ سلام کہا ہے۔ کہیں تو آپ کو سناؤں؟"

"پڑھو۔"

ناصر نذیر نے سلام پڑھنا شروع کیا۔ جو شعر پسند آتا تھا اس پر داد دیتے تھے جو پسند نہ آتا تو فرماتے یہ کچھ نہیں۔

سلام ختم ہونے کے بعد دیر تک باتیں کرتے رہے پھر اچانک اٹھے اور بازار کی طرف چل دیے۔ پلٹ کر بھی نہیں دیکھا کہ کوئی مہمان آیا تھا۔

اس کی زندگی کے بیس سال اسی مجبوری اور بے چارگی کے عالم میں گزر گئے۔ آخر وہ وقت بھی آگیا جب دوائیں بے کار اور تدبیریں ضائع ہو جاتی ہیں۔

۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء کو عاشورے کی شب میں آزاد بھی قیدِ جنوں سے آزاد ہو کر مالک حقیقی سے جا ملے۔

انتقال کی خبر پھیلتے ہی عقیدت مند جمع ہونا شروع ہو گئے۔ صبح کو عاشورہ تھا اس لیے قرار پایا کہ اس دن دفن نہ کیا جائے۔

تیسرے دن جنازہ اٹھا۔ پورا شہر جنازے پر اُمڈ آیا تھا۔ تمام سرکاری دفاتر اور سرکاری و غیر سرکاری مدارس بند ہو گئے۔

داتا گنج بخشؒ کے مزار کے قریب گامے شاہ میں جسے کربلا کہتے ہیں، اسے دفن کر دیا گیا۔

آزاد کے بیٹے آغا محمد ابراہیم نے مقبرہ بنوایا جس پر سونے کا کلس لگوایا۔

مقبرے کے باہر یہ کتبہ لگا ہوا ہے۔

ہوالعلی الاعلی

مقبرہ آزاد

از ماثر نیات آغا محمد ابراہیم ابن شمس العلما
مولوی محمد حسین آزاد رحمتہ اللہ
یکم رجب ۱۳۲۸ھ

اور قبر پر یہ عبارت کندہ ہے۔

لا اله الا اللہ محمد رسول اللہ
علی وصی اللہ وصی رسول اللہ

انتقال کے بعد اس کے مسودے تلاش کیے گئے۔ نو اسی مسودے ہاتھ لگے جو انہوں نے عالمِ جنوں میں لکھے تھے۔ نہایت خوش خط میں تحریر کیے گئے تھے۔ ان مسودوں کو دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ عالمِ جنوں کی یادگاریں ہیں۔ البتہ چند صفحے پڑھ کر یہ یقین پختہ ہو جاتا تھا۔ ایک بات لکھتے لکھتے اچانک کوئی اور بات لکھنے لگتے تھے۔ ذہنی رو تھی جس کے ہاتھوں وہ کھیل رہے تھے۔

اُردو ادب میں تو کیا، عالمی ادب میں بھی ایسی مثال نہیں مل سکتی کہ کسی ادیب نے ایسی ذہنی پراگندگی میں اتنی صحت مند زبان لکھی ہو۔

یوں پھریں اہلِ کمال آشفتہ حال افسوس ہے
اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے

(ذوق)

■■■

جگر مرادآبادی

بلانوش

تحریر و تحقیق: ڈاکٹر ساجد امجد

نغمہ وہی نغمہ ہے جس کو
رُوح سُنے اور رُوح سُنائے

رِندی اور سرمستی اس کے کلام ہی کا طُرّۂ امتیاز نہ تھی، اس کی شخصیت کا ایک حِصّہ تھی۔ دُنیا کی منافقتوں سے پاک، مروت اور وضع داری کا وہ جیتا جاگتا نمونہ جس سے ملتا اُسے اپنا گرویدہ کرلیتا، جہاں جاتا، ایک دھوم مچا ڈالتا۔ اس کی زندگی میں اُس کے بغیر آل انڈیا مشاعرہ نامکمل تصور کیا جاتا۔ کلام ایسا کہ دل میں اُترتا چلا جائے، اس پر قیامت کا ترنم کہ سُننے والے جُھوم جُھوم اُٹھتے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب [illegible] ترقی پسند تحریک کے زیرِ سایہ پورے برصغیر میں اپنے قدم جما چکی تھی اور غزل گو شعرا اپنی اہمیت کھو [illegible] رہے تھے لیکن اُس نے غزل کی روایت کو پوری [illegible] بڑھایا اور اسے نئے دور کے تقاضوں سے روشناس کیا۔

شیشہ بدست و نغمہ بہ لب رئیس المتغزلین جگر مُراد آبادی کی سرگزشت۔

اس کے سوا اس میں کوئی خوبی نہیں تھی کہ وہ مکتب کے دوسرے بچوں کے مقابلے میں خوش خط تھا بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ان بچوں سے اس کا کوئی مقابلہ تھا ہی نہیں۔ اسے تو بلاشبہ ایک اچھا خطاط کہا جاسکتا تھا۔ جس عمر میں بچے تختی لکھتے ہیں، وہ خطِ نستعلیق سے خطِ ماہی تک ہر خط پر حاوی ہوچکا تھا۔ وہ اپنی کاپیوں پر دوسروں کے اشعار اپنے خوبصورت خط میں تحریر کرتا رہتا تھا۔

یہ اس کی انفرادیت تھی۔ مولوی معین الدین اس کی اس خوبی کے قدرداں بھی تھے لیکن کتابوں سے عدم دلچسپی ان کے لئے ناقابلِ برداشت بھی تھی۔

"کم بخت، تو اس خاندان سے متعلق ہے جس کے ایک فرد مولوی سمیع اللہ شاہ، بادشاہِ دہلی فرخ سیر کو حدیث پڑھاتے تھے۔ اور تو کتابوں کا ایسا چور!"

اسے یہ طعنے روز سننے کو ملتے تھے لیکن اس کا دل کتابوں کی طرف راغب ہی نہیں ہوتا تھا۔ والد کے ڈر سے اردو اور فارسی کی جو کتابیں اس نے گھر پر پڑھ لی تھیں، بس وہی اس کا علمِ کل تھا جبکہ اس کے استاد یہ سمجھتے تھے کہ وہ اپنی ذہانت کو ضائع کر رہا ہے۔ اگر ارادی کوشش کرے تو [illegible] بڑا عالم بن سکتا ہے لیکن وہ ایک گھبرایا ہوا بچہ تھا جس کا دل [illegible] میں نہیں لگتا تھا۔ کتابوں سے تو اسے ازلی چڑ تھی۔

علم و فضل کے بعد اس کے خاندان کی دوسری انفرادیت شاعرانہ ذوق تھا۔ اس کے باپ، چچا، تایا، چچازاد بھائی سب شاعر تھے۔ اس ذوق کا کچھ حصہ اسے بھی ملا تھا۔ وہ دن دن بھر اپنی کاپیوں پر رنگ بندیوں کے پھول بکھیرتا رہتا تھا۔

اس کا مزاج ہی نہیں، شکل و صورت بھی سب سے الگ تھی۔ انتہائی سیاہ رنگت، ضرورت سے زیادہ پھیلی ہوئی ناک، آنکھوں میں بہت نمایاں زردی، الجھے ہوئے بال البتہ تبسم دل آویز تھا لیکن ہنستا بہت کم تھا۔

ان دنوں اس کی دو ہی مصروفیات تھیں۔ اپنی کاپیوں پر اشعار لکھنے کی مشق کیا کرتا تھا یا اپنے تایا کے ایک کرایہ دار کے گھر جاکر بیٹھ جاتا تھا۔ درودیوار دیکھنے نہیں، کرائے دار کی بیوی کو دیکھنے۔ آٹھ نو سال کی عمر تھی لیکن آنکھوں میں حسن پرستی نے ڈیرے جما دیے تھے۔ یہ خاتون اسے اچھی لگتی تھیں اور وہ بھی اسے بچہ سمجھ کر خاطر تواضع میں لگی رہتی

مجھ سے چھپنا تجھے زیبا نہیں اے پیکر حسن
میں محبت ہی محبت ہوں محبت کی قسم
اے رحمت تمام مری ہر خطا معاف
میں انتہائے شوق میں گھبرا کے پی گیا
ہم ہی جب نہ ہوں گے تو کیا رنگ محفل
کسے دیکھ کر آپ شرمایئے گا
زاہد یہ میری شوخی رندانہ دیکھنا
رحمت کو باتوں باتوں میں بہلا کے پی گیا
محبت میں ایک ایسا وقت بھی آتا ہے انسان پر
کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں، طغیانی نہیں جاتی
وہ ادائے دلبری ہو کہ نوائے عاشقانہ
جو دلوں کو فتح کرلے وہی فاتح زمانہ

تھیں۔

یہ دن اس کے والد کی عسرت کا زمانہ تھا۔ وہ خاندان جس کا کبھی شاہی دربار سے تعلق تھا، اپنے زوال کے دور سے گزر رہا تھا۔ اس غربت میں اس کی اچھی تعلیم کا بندوبست نہیں ہو سکتا تھا جبکہ اسے شوق بھی نہیں تھا۔ اس کے چچا علی ظفر نے حالات کو بھانپتے ہوئے اس کی کفالت کی ذمّے داری لے لی۔

اس نے اس تبدیلی کو محسوس بھی نہیں کیا۔ باپ اور چچا میں فرق ہی کیا ہوتا ہے لیکن اس وقت وہ بپھر گیا جب چچا کا تبادلہ کروی (ضلع باندہ) میں ہوا۔ اسے بھی چچا کے ساتھ جانا پڑتا۔ اسے مکتب چھوٹنے کا افسوس نہیں تھا لیکن کرائے دار کی بیوی سے جدا ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

ننھی سی جان کی ضد ایک ہی دن میں دم توڑ گئی۔ اسے مراد آباد کو خیرباد کہہ کر چچا کے ساتھ کروی جانا پڑا۔

والدین تو یہیں تھے، اس کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ وہ اس عورت کو بھولا بھی نہیں تھا۔ جب آتا اس سے ملنے ضرور جاتا تھا لیکن ایک مرتبہ وہ مراد آباد آیا تو معلوم ہوا کہ کرائے دار مکان چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ کس محلے میں گئے ہیں، یہ بھی کسی کو معلوم نہیں تھا۔ وہ بجھ کر رہ گیا۔

ایک دن گھر والوں کے ساتھ وہ ایک محلے میں گیا۔ وہاں پہنچتے ہی اس کی سانسوں نے بے ترتیب ہونا شروع کر دیا۔ اسے محسوس ہوا، گوہر مقصود یہیں ہے۔ پتا کرنے پر معلوم ہوا کہ اس کا دل صحیح مقام پر دھڑکا ہے۔ وہ خاتون اسی محلے میں آکر بسی تھیں۔ وہ چپ چاپ سر جھکائے ان کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ گھر میں اسے سب ہی جانتے تھے لیکن اسے یہاں دیکھ کر سب ہی کو تعجب ہوا۔

”علی سکندر، تم یہاں کیسے آگئے؟“

”آپ تو غائب ہی ہو گئی تھیں۔“

”جب مکان چھوڑا تو تم مراد آباد میں تھے ہی نہیں، میں بتاتی کیسے۔“

وہ جب تک مراد آباد میں رہا وہاں آتا جاتا رہا لیکن بالآخر پھر اسے جانا پڑا۔

تقریباً چار سال وہ کروی میں رہا۔ آخری مرتبہ مراد آباد آیا تو اس سے اپنی بے کلی دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ عجیب سی پریشانی تھی جس کا اسے سامنا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اتنا پریشان کیوں ہے۔ اس کا سبب جلد ہی اسے معلوم ہو گیا۔ وہ ان خاتون سے ملنے گیا اور ہاتھ ملتا ہوا واپس آگیا۔ ان کا انتقال ہو چکا تھا۔

اب اس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ اگر وہ مراد آباد میں ہوتا تو اس کی چاہت یوں نہ مرتی۔ اگر انتقال ہونا بھی تھا تو اسے بروقت معلوم ہو جاتا اور وہ انہیں آخری مرتبہ دیکھ تو لیتا۔ اسے کروی سے نفرت ہو گئی۔ اس نے اعلان کر دیا کہ اب وہ کروی نہیں جائے گا۔

خدا نے اس کی سن لی۔ اسے مراد آباد سے کروی جانا نہیں پڑا۔ لیکن مراد آباد پھر بھی چھوٹ گیا۔ اس کے چچا کا تبادلہ لکھنؤ ہو گیا اور اسے لکھنؤ جانا پڑا۔

لکھنؤ بڑا شہر تھا۔ جلد ہی یہاں کی رنگینیوں نے اس کی حسن پرست طبیعت کو قبضے میں کر لیا۔ اس کا دل یہاں لگ گیا۔ وہ بھول گیا کہ کس کا ماتم کرتا ہوا وہ مراد آباد سے لکھنؤ آیا تھا۔

اس کے چچا نے اسے مشن ہائی اسکول میں داخل کرا دیا جہاں وہ انگریزی تعلیم حاصل کرنے لگا۔

یہاں آکر بھی اس کا حال وہی رہا۔ کتابوں سے اسے کوئی دلچسپی تھی ہی نہیں۔ وہ تو اس بات کا قائل تھا۔

کتابوں میں دھرا ہی کیا ہے حافظ
سبق لے زندگی سے زندگی کا

وہ زندگی کو نچوڑتا پھر رہا تھا۔ لکھنؤ کی تفریح گاہیں اس کے قدموں سے آباد ہو گئیں۔ دوستوں کی ٹکڑی کو لے کر باغوں اور پارکوں میں گھومتا پھرتا تھا۔ لکھنؤ کے ادبی ماحول میں اس کے شاعرانہ ذوق نے بھی ترقی کی تھی۔ کچھ ایسے دوست بھی مل گئے جو اس کی طرح تک بندی کر لیا کرتے تھے۔ جب یہ شوق زیادہ بڑھ گیا تو سیر سپاٹے کی فرصت بھی جاتی رہی۔ دن دن بھر مشقِ سخن میں مصروف رہتا۔ اس کا خداداد ترنم اور شعر گوئی کی فطری اہلیت اس کے ساتھیوں کو حیران کر دیا کرتی تھی۔

اس کے والد غالب کی شاعری کے پرستار تھے۔ ان کے اثر سے وہ بھی غالب کو پسند کرنے لگا تھا جبکہ تایا، فارسی شاعر قتیل کے قائل تھے۔ ان کے اثر سے ان کے بیٹے محمد احمد بھی قتیل کے حق میں دلیلیں دیتے تھے۔

ایک روز محمد احمد اور اس کے درمیان زوردار بحث ہوئی۔ محمد احمد نے قتیل کی فارسی دانی کے اتنے قصیدے پڑھے کہ علی سکندر کو غصہ آگیا۔ اس وقت تو وہ چپ ہو گیا لیکن بعد میں اس نے فارسی میں غزل کہی۔ مقطع میں قتیل کا تخلص ٹانکا اور محمد احمد کے سامنے پہنچ گئے۔

”آپ ٹھیک کہتے تھے۔ آج تو میں بھی مرزا قتیل کا قائل ہو گیا۔“ اس نے کہا۔

"قائل تو ہونا ہی تھا۔ تم جیسا صاحبِ ذوق کب تک قتیل سے دور رہ سکتا تھا۔" محمد احمد نے کہا۔ پھر کچھ سوچ کر بولے۔ "لیکن یہ کایا پلٹ ہوئی کیسے؟ آج کیسے قائل ہوگئے۔"

"آج مرزا قتیل کی ایک غزل نظر سے گزری۔ بس پڑھتے ہی قائل ہوگیا۔"

"کیا غزل ہے' ذرا ہم بھی تو سنیں۔" محمد احمد نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

اس نے غزل پڑھنی شروع کی۔ محمد احمد ہر شعر پر لوٹ پوٹ ہوئے جا رہے تھے۔ وہ اسے قتیل ہی کی غزل سمجھ رہے تھے۔ داد دے دے کر ان کا بُرا حال تھا۔ بالآخر اس نے مقطع پڑھا۔

کرد مارا بہ یک نظارہ قتیل
ختم بر توست اے چہ رعنائی

اس شعر کو بھی بے پناہ داد سے نوازا گیا۔ علی سکندر نے دو قدم پیچھے ہٹ کر بھائی کو ایک فرشی سلام کیا۔

"یہ قتیل کی نہیں اس خاکسار کی ادنیٰ کاوش تھی جس پر آپ اتنے خوش ہو رہے تھے۔" اس نے کہا اور بھاگ کھڑا ہوا۔

یہ خبر چھپنے والی نہیں تھی۔ ان دنوں اس کے والد بھی لکھنؤ آئے ہوئے تھے۔ اس کی شرارت کی خبر والد کے کانوں تک بھی پہنچ گئی۔

"ہم نے سنا ہے' فارسی میں تم نے کوئی غزل کہی ہے۔" والد نے پوچھا۔

"کہی تو ہے۔" اس نے سر جھکا کر جواب دیا۔

"ذرا ہم بھی تو سنیں۔"

اس نے جھجکتے ہوئے وہ غزل والد کے گوش گزار کر دی۔ خوشی کی تو بات ہی تھی۔ تیرہ چودہ کا سن اور فارسی میں غزل! والد نے شاباش دی۔

"تم غزل کہہ سکتے ہو مگر ابھی نہیں۔ پہلے اپنی تعلیم مکمل کرلو' اس کے بعد شاعری کرنا۔" والد نے نصیحت کی۔ پھر اس سے پوچھا۔ "تم نے یہ حرکت کیوں کی۔ اپنی غزل قتیل کی کہہ کر کیوں سنائی؟"

"بھائی صاحب کو یہ بتانے کے لئے کہ قتیل جیسی غزل کہنا کوئی کمال نہیں ہے' وہ تو میں بھی کہہ سکتا ہوں اور ایسی کہ بھائی صاحب کو گمان بھی نہیں گزرا کہ یہ زبان قتیل کی نہیں۔"

والد نے پھر خوشی کا اظہار کیا لیکن نصیحت یہی کی کہ وہ

سوانحی خاکہ

نام	علی سکندر
تخلص	جگر
تعلیم	نان میٹرک
پیدائش	اپریل ۱۸۹۰ء
وفات	۹ ستمبر ۱۹۶۰ء گونڈہ
تصانیف	داغِ جگر' شعلۂ طور' آتشِ گل

ابھی اس خارزار میں قدم نہ رکھے۔

انہوں نے نصیحت ضرور کی لیکن چھلنی میں پانی سماتا کہاں ہے۔ وہ اشعار لکھتا رہا اور کاپیاں چھپاتا رہا۔

ایسے ہی ہم ذوق مل گئے تھے جن کے ساتھ بیٹھ کر بڑا شاعر بننے کی ترکیبیں سوچی جاتی تھیں۔ شاعروں کے تخلص بھی تو ہوتے ہیں۔ کسی کا دل تخلص تھا' اس نے اپنے لئے جگر منتخب کیا۔ اس عجیب و غریب تخلص پر اس کے احباب دیر تک ہنستے رہے لیکن پسند بھی سب کو آیا۔ والد کا تخلص نظر تھا' وہ جگر ہوگیا۔ تخلص کے انتخاب کے بعد یہ مرحلہ درپیش تھا کہ استاد کسے بنایا جائے۔ لکھنؤ میں کوڑیوں شاعر بکھرے ہوئے تھے لیکن لکھنؤ کی طرز ادا اس کی طبیعت سے میل نہیں کھاتی تھی۔ تشبیہات کی رنگینیوں سے زیادہ وہ سادگی کا قائل تھا۔

سبھی اندازِ حسن پیارے ہیں
ہم مگر سادگی کے مارے ہیں

اس وقت ہندوستان بھر میں استاد داغ کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ اقبال تک داغ کے شاگرد تھے۔ صحتِ زبان سادگی اور شوخیِ ادا میں کوئی داغ کا ثانی نہیں تھا۔ مصیبت یہ تھی کہ داغ حیدر آباد دکن میں تھے اور جگر کی عمر ایسی نہیں تھی کہ اتنا طویل سفر کر کے ان تک پہنچتے۔ وہ کئی دن تک اس گتھی کو سلجھاتا رہا۔ کئی مرتبہ تو یہ سوچا کہ گھر سے بھاگ کر داغ تک پہنچ جائے لیکن پھر ہمت نے پاؤں سمیٹ لئے اب ایک ہی صورت تھی۔ اس نے ایک پرچے پر غزل اتاری اور ڈاک کے حوالے کر دی۔ اللہ ری شہرت! داغ کا نام اور حیدر آباد لکھ دینا کافی ہوتا تھا۔

چند دنوں کے انتظار کے بعد اس کی غزل اصلاح ہو کر اس تک پہنچ گئی۔

"لو بھئی' ہم تو داغ کے شاگرد ہوگئے۔" اس نے

دوستوں کی محفل میں اعلان کردیا۔ "یہ دیکھو، داغ کے قلم سے اصلاح ہوئی ہے۔"

دوست بھی اسی کے ہم عمر تھے۔ سراپا اشتیاق بن گئے۔ کبھی اسے دیکھتے کبھی اصلاح شدہ غزل کو۔ لفظ تھے کہ موتی۔ موتی بھی آب دار۔ دریائے تغزل سے سطح پر آئے ہوئے۔ داغ نے غزل واپس نہیں کی بلکہ اصلاح کے قابل سمجھی۔ بس یہی بہت تھا۔ دوستوں نے اس کی اہمیت کو تسلیم کرلیا۔

شاعری کے شوقِ بے پناہ کا فوری اثر یہ ہوا کہ وہ نویں کلاس میں دوسری مرتبہ فیل ہونے کے بعد پڑھائی چھوڑ بیٹھا۔

اب اس کے لئے لکھنؤ میں رہنا بے کار تھا۔ چچا بھی اس کی آوارگی سے خوش نہیں تھے۔ ان کے کانوں میں تو یہ خبریں بھی پہنچنے لگی تھیں کہ وہ نشہ بھی کرنے لگا ہے۔ اس پر غضب یہ ہوا کہ والد کے انتقال کی خبر آگئی۔ اسے لکھنؤ کو خیرباد کہہ کر مراد آباد آنا پڑا۔

وہ لکھنؤ سے مراد آباد آیا تو دو تحفے اس کے ساتھ تھے۔ ایک شاعری، دوسرے شیعیت کے عقائد۔ اس کی ایک عزیزہ لکھنؤ میں تھیں۔ وہ ان سے بہت مانوس تھا اور اکثر ان کے گھر چلا جاتا تھا۔ وہ شیعہ مذہب سے تعلق رکھتی تھی۔ چپکے چپکے اپنے مذہب کے بارے میں اسے بتاتی رہتی تھیں۔ یہاں تک کہ شیعی تعلیمات اس کے ذہن میں راسخ ہوگئیں اور اپنے عقائد کی طرف سے اس کے دل میں شکوک پیدا ہوگئے۔

مراد آباد پہنچا تو بچپن کے دوستوں نے اسے گھیر لیا۔ آوارہ مزاجی اس کی فطرت میں چھپی بیٹھی تھی جو موقع ملتے ہی باہر کی طرف لپکتی تھی۔ یہاں بھی اسے ایسے دوست مل گئے جنہوں نے اس کے پیروں میں پہیے لگا دیئے۔ گھڑی بھر کو گھر میں نکتا ہی نہیں تھا۔ "ابھی گھر میں ہے" پلک جھپکتے ہی اس کی خوشبو بھی ندارد۔ والد کا انتقال ہوچکا تھا، کوئی اور بڑا سرپر تھا نہیں۔ یوں بھی یتیم بچے سے سب شفقت ہی کا برتاؤ کرتے ہیں۔ کسی نے غور ہی نہیں کیا کہ وہ کس طرف جارہا ہے۔

یہاں ایک حکیم صاحب تھے جن کے پاس وہ کبھی کبھی جاکر بیٹھ جاتا تھا۔ حکیم صاحب نشہ کرنے کے عادی تھے۔ کبھی بھنگ پی لیتے کبھی کچھ اور۔ ان کی صحبت میں وہ اس کوچے کی سیر کو بھی جا نکلا۔ غضب خدا کا! چودہ پندرہ برس کے سن میں وہ نشہ کرنے لگا۔ ایک مرتبہ حکیم صاحب نے انگور کی بیٹی سے بھی اس کا تعارف کرا دیا۔ اس کے ہاتھ میں گلاس، گلاس میں شراب اور دل میں یہ عہد تھا کہ ہاتھ تھاما ہے تو چھوڑنا نہیں ہے۔ اس شے نے اس کی بے قرار طبیعت کو اور زیادہ بے قرار کردیا۔ شہر سے باہر نکل جاتا اور گھنٹوں گھوم کر واپس چلا آتا۔

اس صحرانوردی میں کچھ وقت شاعری کے لئے بھی تھا۔ یہ الگ بات کہ نشے کی طرح شاعری بھی، ابھی اندر ہی اندر سفر کررہی تھی۔ جب ہوش آیا تو داغ کا انتقال ہوچکا تھا۔ ان کی اصلاح شدہ ایک ہی غزل اس کے کاغذات میں محفوظ تھی لیکن اب کیا کیا جائے۔ اسے پھر کسی کو استاد بنانے کی دھن سوار ہوئی۔

ایک روز وہ کسی رسالے کی ورق گردانی کررہا تھا کہ ایک غزل کی سج دھج نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ بالکل استاد داغ کا مزہ تھا۔

میری حسرت اور نکالی جائے گی؟
وعدۂ فردا پہ ٹالی جائے گی

شاعر کے نام پر نظر ڈالی، رسا رام پوری۔ ارے! یہ اپنے پڑوس کا رام پور۔ طاق میں چراغ جل رہا ہے اور گھر میں اندھیرا ہے۔

داغ تو دور تھے لیکن رام پور تو قریب ہے۔ رسا رام پوری سے تو ملا جاسکتا ہے۔ اس نے ایک دوست کو ساتھ لیا اور رام پور پہنچ گیا۔ چودہ پندرہ میل کا فاصلہ باتوں باتوں میں کٹ گیا۔

اس چھوٹے سے شہر میں رسا رام پوری کا پتا ڈھونڈنا کون سا مشکل تھا۔ یہ مشکل اسٹیشن پر ہی حل ہوگئی۔ کئی چوڑی پتلی گلیوں سے گزرنے کے بعد وہ ایک بڑے سے پھاٹک کے سامنے کھڑا تھا۔ یہ تھا رسا رام پوری کا مکان۔ جان نہ پہچان لیکن اس کی بے تابی اسے کھینچ لائی تھی۔ اس نے ہمت کرکے دروازے کی کنڈی زور زور سے کھڑکا دی۔

"کون ہے بھائی؟" اندر سے ایک پاٹ دار آواز آئی۔

وہ خاموش رہا۔ نام کیا بتاتا کہ صاحب خانہ اسے پہچانتے تو تھے نہیں۔

وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور پھر اس بڑے دروازے کا ایک حصہ کھل گیا۔ دروازے پر ایک لڑکا کھڑا تھا جو غالباً ملازم تھا۔

"جی فرمایئے؟"

"میرا نام علی سکندر ہے۔ مراد آباد سے حاضر ہوا ہوں۔ رسا رام پوری سے ملنا ہے۔"

"ٹھہریئے، میں پوچھ کر آتا ہوں۔ کیا نام بتایا آپ نے؟"
"وہ مجھے نام سے نہیں پہچانتے ہوں گے۔ ان سے کہئے مراد آباد سے ان کا ایک پرستار آیا ہے۔"
لڑکا سر جھکا کر اندر چلا گیا اور تھوڑی دیر میں واپس آگیا۔
"آیئے۔"
وہ اپنے دوست کے ساتھ اندر چلا گیا۔ دروازہ ختم ہوتے ہی بائیں ہاتھ کو مردانہ حصّہ تھا۔ کمرے کی آرائش بالکل اسی طرز کی تھی جو اس وقت شرفا کے گھروں کا قاعدہ تھا۔ چوکیوں کا فرش لگا ہوا تھا۔ ایک طرف مونڈھے پڑے ہوئے تھے، ایک طرف دو کرسیاں تھیں۔ دیواروں پر کچھ تصویریں بھی آویزاں تھیں جنہیں ظاہر ہے وہ نہیں جانتا تھا۔
وہ لڑکا پھر آیا۔ اس کے ہاتھ میں شربت کے دو گلاس تھے۔ ایک گلاس جگر نے لے لیا، ایک اس کے دوست نے۔ تھوڑی دیر میں خاصدان میں پان بھی آگئے۔
"سنو، رسا صاحب کیا کر رہے ہیں؟" جگر نے اس لڑکے سے پوچھا۔
"بس، آرہے ہیں۔" اس لڑکے نے کہا اور کمرے ہی میں ایک طرف کھڑا ہوگیا۔
عطر کی تیز مہک نے بتا دیا، کوئی آرہا ہے۔ رسا رام پوری کے سوا کون ہو سکتا ہے؟
ململ کا کرتہ، چھوٹی موری کا پاجامہ، سر پر رام پوری طرز کی کپڑے کی ٹوپی۔ چھریرے بدن کا ایک آدمی کمرے میں داخل ہوا۔ وہ دونوں اپنی جگہ سے کھڑے ہوگئے۔
"اچھا، تو آپ حضرات تشریف لائے ہیں مراد آباد سے۔ رام پور کیونکر آنا ہوا اور ہم سے ملنے کا اشتیاق کیسے ہوا؟"
"جی، وہ آپ کی ایک غزل پڑھی تھی ایک رسالے میں۔ سوچا آپ سے ملاقات بھی کی جائے۔"
"سخن فہم ہو۔"
"سخن ساز بھی ہوں۔" جگر نے برجستہ کہا۔
"بہت خوب!" انہوں نے کہا اور پھر ملازم سے مخاطب ہوئے۔ "حقہ تازہ کر کے لاؤ۔"
"تخلص کیا فرماتے ہیں آپ؟"
"جگر۔"
"بہت نادر تخلص ہے اس کی حفاظت کرنا۔ میرا مطلب شاعری کرتے رہیے گا۔"
"بشرطیکہ آپ جیسا کامل استاد مل جائے۔"

نعت

اِک رند ہے اور مدحتِ سلطانِ مدینہ
ہاں کوئی نظر، رحمتِ سلطانِ مدینہ
تو صبحِ ازل آئنہ حسنِ ازل بھی
اے صلی علیٰ صورتِ سلطانِ مدینہ
دامانِ نظر تنگ و فراوانی جلوہ
اے طلعتِ حق، طلعتِ سلطانِ مدینہ
اے خاکِ مدینہ تری گلیوں کے تصدق
تو خلد ہے، تو جنتِ سلطانِ مدینہ
اس طرح کہ ہر سانس ہو مصروفِ عبادت
دیکھوں میں درِ دولتِ سلطانِ مدینہ
اِک ننگ غمِ عشق بھی ہے منتظرِ دید
صدقے ترے اے صورتِ سلطانِ مدینہ
کونین کا غم یادِ خدا، وردِ شفاعت
دولت ہے یہی دولتِ سلطانِ مدینہ
ظاہر میں غریب الغربا پھر بھی یہ عالم
شاہوں سے سوا سطوتِ سلطانِ مدینہ
اس امتِ عاصی سے نہ منہ پھیر خدایا
نازک ہے بہت غیرتِ سلطانِ مدینہ
کچھ ہم کو نہیں کام جگر اور کسی سے
کافی ہے بس اک نسبتِ سلطانِ مدینہ

"اِس، ابھی تک استاد کے بغیر گھوم رہے ہو۔"
"طبعِ رسا کی رہنمائی میسر ہے۔" رسا کی رعایت سے جگر نے کہا۔ "ویسے ایک غزل پر داغ مرحوم سے اصلاح لی تھی۔ دوسری غزل روانہ کرنے کی نوبت نہیں آئی کہ ان کا انتقال ہوگیا۔ اب آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ داغ مرحوم کے بعد مجھے آپ ہی کا رنگ پسند آیا ہے۔"
حقہ آگیا تھا۔ رسا ہلکے ہلکے کش لگا رہے تھے اور کچھ سوچتے جاتے تھے۔ جگر سانس روکے جواب کا منتظر تھا۔
"میاں داغ مرحوم کا نام لے کر تم نے ہمیں کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ کیسی پُر لطف بات یاد آگئی۔ لو تم بھی سنو۔ داغ کو جب پہلے پہل رام پور میں ملازمت ملی تو اس وقت میری نوجوانی تھی۔ وہ سرکاری اصطبل کے مہتمم مقرر ہوئے تھے۔ ان کے سیاہ رنگ کی مناسبت سے میں نے ایک شعر موزوں کیا اور شرارت دیکھئے کہ اصطبل کی دیوار پر لکھ بھی دیا۔

شہر دہلی سے آیا اک مفلس
آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا

اللہ رے اعلیٰ ظرفی۔ داغ نے چراغ پا ہونے کے بجائے تبسم کیا اور اعلان کیا کہ جس نے یہ شعر کہا ہے وہ مجھ سے ملے۔ شاید انعام دینے کا وعدہ بھی کیا تھا لیکن میری ہمت نہیں ہوئی کہ اپنی اس شرارت کا اعتراف کرتا۔"

اس کے بعد اِدھر اُدھر کی دوسری باتیں ہونے لگیں۔ جگر بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا کہ مطلب کی بات دور نکل گئی۔

"کیا میں یہ باور کرلوں کہ آپ نے مجھے شرفِ تلمذ عطا کردیا ہے۔" بالآخر جگر نے موقع دیکھ کر کہا۔

"میاں ایسے نہیں۔ کچھ سناؤ تو ہم دیکھیں کتنے پانی میں ہو۔"

جگر تو تیار ہوکر آیا ہی تھا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر اجازت لی اور غزل پڑھنی شروع کی۔

تصور جب کسی دست نگاریں کا رہا دل میں
تو شمعِ طور ہوکر رنگ لائی کیا حنا دل میں
نہیں سوزِ نہانی سے جو میرے آبلہ دل میں
تو مثلِ قلقلِ مینا چھلکتا ہے یہ کیا دل میں
وہ حسرت ہوں کہ حسرت کو ہے حسرت میری حسرت پر
وہ مضطر ہوں کہ گویا ہے گزر سیماب کا دل میں
وہ ہوں دیوانۂ بے کس کہ جب گلشن میں جا نکلا
تو اک شورِ قیامت ہوگیا برپا عنادل میں
وہ بے کس ہوں کہ میری بے کسی پر بسکہ اے قاتل
کیا کرتی ہے حسرت خندۂ دنداں نما دل میں
وہ کہتے ہیں کہ اس نے جان دے دی سنکھیا کھا کر
خدا جانے جگر کم بخت کے کیا آگیا دل میں

○☆○

غزل میں کوئی خاص بات نہیں تھی لیکن یہ ایسا آئینہ ضرور تھی جس میں آئندہ کی ترقی صاف نظر آتی تھی۔ ظاہر ہوتا تھا کہ شاعر کا مستقبل تابناک ہے۔

رسا جیسے استاد اگر قسمت والوں کو ملتے ہیں تو جگر جیسے شاگرد بھی کسے ملتے ہیں۔ استاد آگے بڑھے اور جگر کی پیشانی پر بوسۂ شفقت ثبت کردیا۔

اب اس کی آوارگی کے ساتھ ساتھ اس کی شاعری بھی محوِ پرواز تھی۔

ایک دن وہ کسی دھن میں گھر کے باہر بیٹھا تھا کہ ایک ہندو لڑکی سر پر گھڑا رکھے اس کے سامنے سے گزری۔ چلتے چلتے اس لڑکی نے ایک نظر اس کو دیکھا۔ خدا جانے اس کی آنکھوں میں کیا تھا کہ وہ پتھر بن کر رہ گیا۔ وہ کدھر سے آئی تھی کہاں گئی، اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ عجیب عالمِ بے خبری تھا اگر ہوش تھا تو یہ۔

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں یہ آرہے ہیں وہ جا رہے ہیں
وہی قیامت ہے قد بالا وہی ہے صورت وہی سراپا
لبوں کو جنبش نگہ کو لرزش کھڑے ہیں اور مسکرا رہے ہیں
خرامِ رنگیں نظامِ رنگیں کلامِ رنگیں پیامِ رنگیں
قدم قدم پر روش روش پر نئے نئے گل کھلا رہے ہیں
وہی لطافت وہی تبسم وہی نزاکت وہی ترنم
میں نقشِ حرماں بنا ہوا تھا وہ نقشِ حیرت بنا رہے ہیں
شبابِ رنگیں جمالِ رنگیں وہ سر سے پا تک تمام رنگیں
تمام رنگیں بنے ہوئے ہیں تمام رنگیں بنا رہے ہیں
یہ موجِ دریا یہ ریگِ صحرا یہ غنچہ و گل یہ ماہ و انجم
ذرا جو وہ مسکرا دیے ہیں یہ سب کے سب مسکرا رہے ہیں
خوشی سے لبریز شش جہت ہے زبان پُرشور تہنیت ہے
یہ وقت وہ ہے جگر کے دل کو وہ اپنے دل سے ملا رہے ہیں

تصورات کی دنیا کسی کے دم سے آباد تھی۔ ایک لمحے کو اس کی تصویر نظر سے اوجھل نہیں ہوتی تھی۔ وہ جب آنکھیں کھولتا تھا، لگتا تھا وہ کھڑی ہے اور مسکرا رہی ہے۔

کدھر ہے تیرا خیال اے دل یہ وہم کیا کیا سما رہے ہیں
نظر اٹھا کر تو دیکھ ظالم کھڑے وہ کیا مسکرا رہے ہیں

وہ گھبرا کر پھر آنکھیں بند کرلیتا۔ پرچھائیوں سے لڑنے کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ وہ اس کے تصور سے ڈرنے لگا۔ یہ کیسی صورت تھی جو ہٹ کر بھی میرے سامنے سے ہٹتی ہی نہیں۔

بے تاب ہے، بے خواب ہے معلوم نہیں کیوں
دل ماہیِ بے آب ہے معلوم نہیں کیوں
بے نام سی اک یاد ہے کیا جانئے کس کی
بے وجہ تب و تاب ہے معلوم نہیں کیوں
خلوت میں بھی جلوت میں بھی گھیرے ہوئے دل کو
اک شعلۂ بے تاب ہے معلوم نہیں کیوں
محسوس یہ ہوتا ہے کہ ہر تازہ تغیّر
میرے لئے بے تاب ہے معلوم نہیں کیوں

اس بے خبری کو خبر میں بدلنے کے لئے اس نے ساغر میں انڈیلنے کا انتظار بھی نہیں کیا، بوتل سے منہ لگایا اور آگ سینے میں اتارلی۔ میرے یار، اس آگ میں برف، سوڈا یا پانی تو ملا لے۔ نہیں، کچھ نہیں۔ کچھ ملالیا جائے تو مجھے شرک کی بُو آتی

ہے۔

حال یہ ہو گیا کہ جب ہوش میں آتا' وہ غارت گر ہوش سامنے آکر کھڑی ہو جاتی۔ وہ گھبرا کر پھر بوتل اٹھا لیتا۔ بس اتنی دیر وہ اسے بھولے رہتا جتنی دیر نشے میں رہتا۔ ذرا دیر کے لئے ہوش میں آتا تو پھر یہ عالم ہو جاتا.....

"یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں یہ آرہے ہیں وہ جا رہے ہیں"

وہ اسے بھلانے کے لئے نشے میں ڈوبا رہا۔ وہ کون تھی؟ شاید اس کے کسی سوئے ہوئے جذبے کو جگانے آئی تھی۔ وہ جاگ گیا تو وہ پھر اسے کبھی نہیں ملی۔

وہ گھر کی طرف سے غافل ہو گیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں بالکل ہی بگڑ گیا تھا۔

اس کے سرپرست اس کے چچا ہی تھے۔ وہ ایک مرتبہ لکھنؤ سے آئے تو جگر کی والدہ نے ان سے اس کی آوارگی کا ذکر کیا۔

"سکندر تو میرے ہاتھ سے گیا۔ سچ ہے' باپ سر پر نہ ہو تو بچے اسی طرح بگڑ جاتے ہیں۔" اس کی والدہ نے کہا۔

"سچ ہے! اس میں کوتاہی میری بھی ہے۔ مجھے چاہئے تھا اس کے لئے مصروفیات کا کوئی سامان پیدا کر دیتا۔ پڑھنا تو اس نے چھوڑ ہی دیا۔ اگر کہیں نوکری ہو جائے تو آہستہ آہستہ سنبھل جائے گا۔"

وہ یہ کہہ کر چلے گئے اور جلد ہی اس کے لئے نوکری کا بندوبست کر دیا۔

نجیب آباد میونسپلٹی میں محافظِ دفتر کی اسامی خالی تھی' جگر کا وہاں تقرر ہو گیا۔

نوکری کے بکھیڑے اس کے بس کے نہیں تھے لیکن یہ سوچ کر تیار ہو گیا کہ مراد آباد سے دور رہو گا تو اس آفتِ جاں کو بھلا سکے گا جو نہ ملتی ہے نہ بھلائی جاتی ہے۔

وہ اپنی یادیں مراد آباد کی کسی گلی میں دفن کر کے نجیب آباد پہنچ گیا۔

نجیب الدولہ کی یادگار نجیب آباد میں وہ تنہا تھا۔ اس کے چچا کو اس کا احساس تھا۔ انہوں نے فوراً اسے خط لکھا کہ وہاں ایک تحصیلدار فلاں نام کے ہیں۔ ان سے جا کر ملو۔ خالی اوقات میں ان سے ملتے رہنا۔ تمہارا وقت کٹ جائے گا۔ ان کے ذریعے دوسرے لوگوں سے بھی ملاقات ہو گی۔

وہ پریشان تو تھا ہی۔ خط ملتے ہی تحصیلدار کے پاس پہنچ گیا۔ جگر کے چچا نے انہیں بھی خط لکھ دیا تھا۔ لہٰذا دیکھتے ہی پہچان گئے۔

"علی سکندر رہو۔"

"جی۔"

"آج سے تم مجھے تحصیلدار نہیں' اپنا چچا سمجھنا۔ کوئی مسئلہ ہو' بتانے میں تکلف مت کرنا۔"

"جی بہت بہتر۔"

"تمہاری چچی کو بلواتا ہوں۔ ان سے بھی مل لو۔ میں گھر میں نہ بھی ہوں تو بے کھٹک چلے آنا۔ بس یہ سمجھو کہ یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔ کوئی پردہ کوئی تکلف نہیں۔"

انہوں نے اپنی بیوی کو آواز دی۔ تحصیلدار بوڑھے آدمی تھے لیکن ان کی بیوی کو دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ ایک نوجوان عورت اس کے سامنے کھڑی تھی اور تحصیلدار صاحب کہہ رہے تھے یہ تمہاری چچی ہیں۔ وہ عورت اتنی خوبصورت تھی کہ جگر کی حسن پرستی پلک جھپکنا بھول گئی۔

"بھئی' یہ ہمارے دوست کا بھتیجا ہے۔ یہاں نوکری کے سلسلے میں آیا ہوا ہے۔ اس کی دیکھ بھال ہمارا فرض ہے۔" تحصیلدار نے کہا۔

"کیوں نہیں۔ یہ تو ہمارے بچوں کی طرح ہے۔"

"میاں' تم اپنا سامان یہیں لے آؤ۔ چھت پر کمرا موجود ہے ٹھاٹ سے رہو۔" تحصیلدار نے کہا اور ان کی بیوی نے تائید کی۔

"آپ کو زحمت ہو گی۔"

"اماں زحمت کیسی؟"

جگر اسی دن ان کے گھر اٹھ آیا۔

تحصیلدار کی یہ بیوی پہلے طوائف تھیں۔ تحصیلدار نے انہیں گھر میں ڈال لیا تھا۔ بلا کی حسین' حد درجہ شوخ۔ چند روز کی قربت بڑھی اور بے تکلفی ہوئی تو جگر کا دل ان کی زلفوں میں اٹک گیا۔ توجہ اس طرف ہوئی تو وہ مراد آباد کا رنگین حادثہ بھول گیا۔ وہ یہی چاہتا بھی تھا۔ اس نے اس موقع کو غنیمت جانا اور بہانے بہانے سے زیادہ وقت تحصیلدار کی بیوی کے ساتھ گزارنے لگا۔ تحصیلدار کی بیوی کو جب معلوم ہوا کہ موصوف شاعر بھی ہیں تو ان کی دلچسپی بھی بڑھی۔ وہ سخن فہم بھی تھیں اور ترنم کی باریکیوں سے واقف بھی۔ انہوں نے ضد کر کے جگر کا کلام سنا تو اس کے عاشقانہ اشعار اور دل آویز ترنم پر نثار ہو گئیں۔ اب تو یہ عالم ہوا کہ جگر جب کوئی نئی غزل کہتا سب سے پہلے انہیں سناتا۔ ان کا بھی یہ عالم ہوا کہ پورے گھر میں اس کے شعر گنگناتی پھرتی تھیں۔

آئنہ رو برو ہے کچھ گنگنا رہے ہیں

زلفیں سنور چکی ہیں، قشقہ لگا رہے ہیں
کافر جمال والے کافر بنا رہے ہیں
ایمان لانے والے ایمان لا رہے ہیں
ساون کی رین اندھیری تنہائیوں کا عالم
بھولے ہوئے فسانے سب یاد آ رہے ہیں

○☆○

اس کی شاعری ابھی اس کی ذات تک محدود تھی۔ لوگ اس کے نام سے آشنا نہیں ہوئے تھے۔ وہ غزلیں لکھتا اور ڈاک کے ذریعے رسارام پوری کو بھیج دیتا۔

جگر کی یہ حالت تھی کہ اپنی میزبان پر سو جان سے فدا تھا۔ وہ جس کی خاطر ویرانۂ عشق میں سرگرداں ہے، خود اس کے دل میں کیا ہے، یہ عقدہ نہیں کھلتا تھا۔ خود اس کا یہ عالم تھا، اور سب باتیں کرتا تھا اظہار عشق کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ ایک دن اس نے اپنا حال دل ایک کاغذ پر تحریر کیا اور تحصیلدار کی بیوی کو دے دیا۔ وہ سمجھیں کوئی تازہ غزل ہے۔ مسکرا کر پرچہ وصول کرلیا۔ پھر کسی کام میں مصروف ہوگئیں۔ ذرا فرصت ملی تو انہوں نے پرچہ کھولا۔ پڑھتے ہی ان کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ اظہار عشق کی تمام منزلیں طے ہو چکیں تو وہ خاموشی سے اٹھیں اور تحصیلدار کے سامنے جاکر کھڑی ہوگئیں۔ تحصیلدار نے نگاہ اٹھائی اور انہوں نے پرچہ آگے بڑھادیا۔

"یہ کیا ہے؟"

"آپ کے دوست کے بھتیجے کے کرتوت۔"

"کیا مطلب!"

"پڑھ کر تو دیکھئے۔"

تحصیلدار نے پڑھنا شروع کیا۔ غصے اور صدمے سے ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

"کہاں ہیں صاحب زادے۔"

"اس سے کچھ کہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ بات اس کے بڑوں کے علم میں آنی چاہئے۔ انہیں بھی تو معلوم ہو کہ ہمارے احسانات کا بدلہ ہمیں کس صورت میں ملا ہے۔"

"کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو۔ میں ابھی اس کے چچا کو خط لکھتا ہوں۔"

تحصیل دار نے خط لکھ دیا۔ جگر کا خط بھی اس خط کے ساتھ روانہ کردیا۔

ان کا خط آیا کہ سکندر کو کہیں جانے مت دینا، میں نجیب آباد پہنچتا ہوں اور وہ پہنچ بھی گئے۔ جگر نے جو یوں اچانک انہیں وہاں دیکھا تو ساری بات سمجھ میں آگئی۔ اب بھاگنے کے لئے رستہ نہیں تھا۔ چچا تو تحصیل دار کے پاس بیٹھ کر اصلیت جاننے میں مصروف ہوگئے جگر اپنے بچاؤ کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ پھر ایک ترکیب سمجھ میں آگئی۔ اس کے پاس بہت ساری بھنگ رکھی ہوئی تھی۔ اس نے اتنی بھنگ ایک ساتھ کھالی کہ وہ بے ہوش ہوگیا۔

اس کے چچا اور تحصیل دار اس کے کمرے میں آئے تو وہ بے سدھ پڑا ہوا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ اس نے خودکشی کی کوشش کی ہے۔ دونوں کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

"بچے سے ایک حرکت سرزد ہوگئی تھی۔ سمجھا بجھا کر بات رفع دفع ہوجاتی مگر اس نے تو یہ عجیب نادانی کی۔" تحصیل دار نے کہا۔

"کسی کو بلوایئے صاحب، اسے اسپتال لے کر جانا ہوگا۔" تحصیل دار نے اپنے ایک نوکر کو آواز دی، کچھ خود ہاتھ لگایا اور اسے اٹھا کر اسپتال لے گئے۔

اسے ہوش آگیا تھا لیکن نیم غنودگی کے عالم میں تھا۔ ذرا سوچنے کے قابل ہوا تو اسے یاد آیا کہ چچا کیوں آئے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں اسے شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اسے لعنت ملامت کی جائے گی۔ وہ چچا کا سامنا کس طرح کرے گا۔ اس نے یہی مناسب سمجھا کہ یہاں سے فرار ہوجائے۔ وہ نجیب آباد سے نکل گیا۔ پہلے سوچا مراد آباد چلا جائے لیکن چچا تو وہاں بھی آسکتے ہیں بلکہ پہلے وہاں آئیں گے پھر کہیں اور جائیں گے۔ مجھے تو ایسی جگہ جانا چاہئے جہاں مجھے کوئی ڈھونڈ نہ سکے۔ جہاں کسی کا خیال بھی نہ پہنچے۔

وہ منزل کا تعین کئے بغیر روانہ ہوا تھا اور کسی ارادے کے بغیر آگرہ پہنچ گیا۔ یہاں کیوں آگیا؟ کیا کرے گا؟ کب تک ٹھہرے گا۔ اس کے پاس کسی سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

وہ نجیب آباد سے بے سرو سامانی کی حالت میں فرار ہوا تھا۔ چند کپڑوں اور کچھ روپوں کے علاوہ کچھ بھی اس کے پاس نہیں تھا۔ ہاں، وہ کاپی.... ساتھ تھی جس پر اس نے اب تک کی غزلیں لکھی ہوئی تھیں۔ اس نئے شہر میں کوئی اسے جانتا بھی نہیں تھا۔ وہ شاعر ہے۔ یہ تو ابھی اسے خود بھی معلوم نہیں تھا۔ فانی بدایونی اور اصغر گونڈوی کے کلام رسالوں میں پڑھتا رہتا تھا۔ ان سے مرعوب بھی تھا۔ اس نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ مولانا حالی کی سخت ترین تنقید کے بعد اردو غزل پر جو عام مایوسی طاری ہوئی تھی، ان شعراء کی غزلوں نے اس مایوسی کو ختم کرکے غزل کا اعتبار قائم کیا ہے۔ انگریزی ادب کے اثر سے نظموں کو فروغ مل رہا ہے لیکن یہ دونوں شاعر جاندار غزلیں لکھ کر نظم گوئی کا مقابلہ کررہے ہیں۔ ان غزل

گویوں نے غزل کے مضامین کو حقیقت سے قریب تر کیا ہے۔ ان کی غزلیں عشق کا ایک نیا معیار پیش کر رہی ہیں۔ وہ سوچتا تھا، وہ بھی اس قافلے میں شریک ہوگا۔ لیکن ابھی تو معاش کی سختیاں ہی اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھیں۔ وہ آگرے کی سڑکوں پر خلقِ خدا سے بے نیاز، گھومتا پھر رہا تھا۔ پاس سے گزرنے والے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے کہ اس عجیب سے حلیے کے لڑکے کے عزائم کیا ہیں اور یہ ہے کون؟

وہ سرائے میں ٹھہرا ہوا تھا اور اس لمحے کی تلاش میں تھا جب اسے معاش کی کوئی سبیل نظر آجائے۔ سستی سرائے کی بوسیدہ کوٹھڑی میں جب وہ اپنی حالت پر غور کرتا تھا، ایک آہ سی نکل جاتی تھی۔

جس نے بنا دیا مجھے وحشی و خستہ حال سا
ہائے وہ شکل چاند سی، ہائے وہ قد نہال سا

وطن سے دور تھا، بے سہارا تھا لیکن ابھی حوصلہ نہیں ہارا تھا۔ اس کے عزائم اب بھی بلند تھے۔

گم شدگانِ عشق کی شان بھی کیا عجیب ہے
آنکھ میں اک سرور سا، چہرے پہ اک جلال سا

اس نے سرور کی آخری بوند اپنے اندر اتاری اور صبح کے استقبال کی تیاری کے لئے چراغ بجھا دیا۔

سرائے میں صبح ہوئی تو وہ بھی بیدار ہو گیا۔ اسے ہنسی آگئی۔ میں تو یوں اٹھ بیٹھا ہوں جیسے نوکری پر جانا ہے۔ سڑکیں ناپنے کے لئے وہ روز کی طرح پھر ایک سڑک پر آگیا۔ دکانوں اور دفاتر پر لگے ہوئے سائن بورڈ پڑھتا چلا جا رہا تھا کہ ایک جگہ اس کے قدم رک گئے۔ "بی۔ این۔ بیچل" یہ چشموں کی ایک فرم تھی۔ اس نے یہ نام سنا ہوا تھا۔ دل نے کہا گوہرِ مقصود یہیں ملے گا۔ وہ اندر چلا گیا۔

"مجھے کسی ایسے آدمی سے ملنا ہے جو مجھے نوکری دے سکے۔" اس نے وہاں بیٹھے ہوئے ایک آدمی سے کہا۔

"اس کمرے میں منیجر صاحب بیٹھے ہیں، ان سے مل لو۔" اس آدمی نے اس کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

اس نے چق اٹھائی اور اجازت لئے بغیر اندر چلا گیا۔ اندر ایک بھاری بھرکم آدمی بیٹھا تھا۔ جگر نے اس سے اس طرح ہاتھ ملایا جیسے بہت پرانا شناسا ہو اور اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

"میرا نام جگر ہے۔ میں نوکری کی تلاش میں ہوں۔ آپ مجھے کوئی نوکری دے دیں۔"

منیجر نے ایسا نام پہلی مرتبہ سنا تھا۔ نوکری کا مطالبہ بھی اس انداز سے کسی نے نہیں کیا ہوگا۔ وہ بہت دیر تک اس بے تکلف لڑکے کو دیکھتا رہا۔

"کیا کام کر سکتے ہیں آپ۔"

"کوئی بھی کام ہو۔"

"ہمیں ایجنٹ حضرات کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر آپ یہ کام کر سکتے ہیں۔"

"میں تیار ہوں۔"

"اس کے لئے آپ کو ضمانت کا انتظام کرنا ہوگا۔"

"میں تو اس شہر میں کسی کو جانتا نہیں۔"

"پھر تو بہت مشکل ہے۔"

"میں شاعر ہوں۔ میرا کلام بطور ضمانت رکھ لیجئے۔ یہ میرے لئے بڑی سے بڑی رقم سے زیادہ ہے۔"

اتفاق سے وہ شخص شاعروں کا قدرداں تھا۔ یہ دیکھ کر کہ ایک شاعر اس کے پاس آیا ہے، وہ پگھل گیا۔ اس نے جگر کو کمپنی کے ایجنٹ کی حیثیت سے نوکری دے دی۔

کمپنی نے اسے ایک بکس دیا جس میں چشمے رکھے ہوئے تھے۔ اسے یہ چشمے فروخت کرنے تھے اور دکانداروں سے آرڈر لے کر چشمے سپلائی کرنے تھے۔

صحرا گرد کو نوکری بھی ملی تو ایسی کہ دکان دکان گھومتا رہے اور مختلف شہروں کے چکر لگاتا رہے۔

چشموں کی فروخت کے لئے اسے مختلف شہروں میں جانا

غزل

وہ ادائے دل بری ہو کہ نوائے عاشقانہ
جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتحِ زمانہ
یہ ترا جمالِ کامل، یہ شباب کا زمانہ
دلِ دشمناں سلامت، دلِ دوستاں نشانہ
کبھی حُسن کی طبیعت نہ بدل سکا زمانہ
وہی نازِ بے نیازی، وہی شانِ خسروانہ
ترے عشق کی کرامت یہ اگر نہیں تو کیا ہے
کبھی بے ادب نہ گزرا مرے پاس سے زمانہ
مرے ہم صفیرِ بلبل، مرا تیرا ساتھ ہی کیا
میں ضمیرِ دشت و دریا، تو اسیرِ آشیانہ
میں وہ صاف کیوں نہ کہہ دوں ہے جو فرق مجھ میں تجھ میں
ترا درد، دردِ تنہا، مرا غم، غمِ زمانہ
ترے دل کے ٹوٹنے پر ہے کسی کو ناز کیا کیا
تجھے اے جگر مبارک یہ شکستِ فاتحانہ

پڑتا تھا لیکن لوٹ کر آتا تو آگرہ ہی اس کا مستقل ٹھکانا تھا۔

اس شہر نوردی سے اسے یہ فائدہ پہنچ رہا تھا کہ جس شہر میں جاتا' وہاں کچھ شاعروں سے ملاقات ہو ہی جاتی۔ وہ نہایت خاموشی سے اپنا نام اور غزلیں مختلف شہروں میں پہنچاتا رہا۔ اس وقت جو معتبر رسائل تھے' ان میں بھی اس کی غزلیں شائع ہونے لگیں۔ اس نے ابھی کوئی مشاعرہ نہیں پڑھا تھا۔ لوگ اس کا نام رسالوں میں پڑھتے تھے اور ایک ایک سے پوچھتے تھے کہ یہ جگر کون ہے؟

چلتے چلتے جوتے گھس گئے تو اس نے سوچا ایک جوتا ہی بنوا لیا جائے۔ سرائے کے قریب ہی جوتے کی ایک دکان تھی۔ وہ اس دکان پر پہنچا اور پاؤں کا ناپ دے دیا۔ دکان کا مالک اسے دلچسپ آدمی معلوم ہوا۔ وہ بھی کچھ کم دلچسپ نہیں تھا۔ تھوڑی دیر میں دونوں خوب گھل مل گئے۔ یہ شخص' بجنور کا رہنے والا تھا۔ اس کا خاندان تجارت پیشہ تھا۔ کبھی اچھے دن دیکھے تھے لیکن اب معاشی بدحالی کا شکار تھا۔ اس چھوٹی سی دکان پر گزارہ تھا۔

اب یہ دکان اس کا مستقل ٹھکانا بن گئی۔ وہ شہر کا چکر لگا کر لوٹتا یا کسی شہر کی یاترا کے بعد واپس آتا' اسی دکان پر بسرام کرتا۔

دوستی اتنی بڑھی کہ جگر ان کے گھر بھی جانے لگا۔ کچھ دن بعد گھر کی عورتوں سے اس کا پردہ رسمی سا رہ گیا۔ کچھ دن اس کی مترنم غزلیں پردے کے پیچھے سے سنی جاتی رہیں۔ پھر سب سامنے آ گئے۔ انہی میں وحیدن بھی تھی۔ وحیدن کو اس کے شوہر نے چھوڑ دیا تھا اور اب وہ باپ کے گھر بیٹھی ہوئی تھی۔

وحیدن کو حسین کہا جاسکتا تھا۔ اس کے حسین چہرے' اداس ہنسی اور نیچی نگاہوں نے جگر کو ایک اور ٹھوکر کھانے پر مجبور کردیا۔

کچھ بات بن پڑی نہ دل داد خواہ سے
کیا جانے کیا وہ کہہ گئی نیچی نگاہ سے
کوئی نہ بچ سکا تری قاتل نگاہ سے
ذرے بھی صدقے ہوگئے اٹھ اٹھ کے راہ سے
یہ جانتا ہوں جانتے ہو میرا حالِ دل
یہ دیکھتا ہوں دیکھتے ہو کس نگاہ سے

○☆○

ایک دن اس نے یہ اشعار سنائے تو وحیدن کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ان شعروں کا مخاطب کون ہے۔ وہ بہت دن سے جگر کی آنکھوں کو پڑھ رہی تھی' اب یقین ہوگیا کہ اس کی آنکھوں میں وہ بسی ہوئی ہے۔

جگر کی شکل و صورت واجبی تھی لیکن اس کی شاعری' سحر انگیز ترنم' پُرخلوص برتاؤ۔ وحیدن اس کی اسیر ہوگئی۔ جگر کی آوارگی کو ایک اور ٹھکانا مل گیا۔ ملاقاتوں کے سائے گھنیرے ہونے لگے۔ سو سو پھیرے ہونے لگے۔ جگر کا نیاز' ناز میں بدل گیا۔ اس خیال نے کہ اس پر کوئی مرتا ہے' اس کا نشہ دو آتشہ کردیا۔

اُف وہ روئے تابناک و چشمِ تر میرے لیے
ہائے وہ زلفِ پریشاں تا کمر میرے لیے
ہر نفس میں ایک دنیائے محبت نو بہ نو
ہر نظر میں اک پیامِ تازہ تر میرے لئے
وہ رخِ رنگیں پہ انوارِ محبت زرد زرد
وہ لبِ نازک پہ طوفانِ دگر میرے لیے
سر سے پا تک آہ وہ اک پیکرِ حسنِ حزیں
چار جانب دیدۂ حسرت نگر میرے لئے
سرد سرد آہوں میں تاثیرِ محبت گرم گرم
خشک خشک آنکھوں میں جوشِ اشکِ تر میرے لئے
سامنے آتے ہی آتے وہ تنفس تیز تر
سینۂ شفاف وہ زیر و زبر میرے لئے
اُف وہ کہنا اس کا پھر بانہوں میں بانہیں ڈال کر
میں جگر کے واسطے ہوں اور جگر میرے لئے

○☆○

سرائے کے سیلے فرش پر بیٹھ کر وہ رات بھر لفظوں کے موتی پروتا رہا۔ صبح ہوئی تو وہ طے کرچکا تھا کہ وحیدن کو ہمیشہ کے لئے اپنا بنالے گا۔

اس کے خیال کو زبان وحیدن نے دے دی۔ اس نے وحیدن سے ذکر کیا اور وحیدن نے اپنے گھر والوں کو آمادہ کرلیا۔

جگر نے کموتولے نیل کرائے پر مکان لیا اور وحیدن کو بیاہ کر لے آیا۔

جگر نے شادی تو کرلی تھی لیکن اسے اپنی آوارگیوں پر قابو نہیں تھا۔ کچھ تو اس کا کام ایسا تھا کہ کئی کئی دن گھر سے غائب رہنا پڑتا تھا' کچھ وہ اپنی بے قراری سے مجبور تھا۔ شراب کی لت ایسی پڑ گئی تھی کہ جو کماتا' بوتل میں ڈوب جاتا۔ وحیدن کو شادی کے بعد معلوم ہوا کہ وہ شراب پیتا ہے لیکن وہ ایسی صابر و شاکر عورت تھی کہ حرفِ شکایت زبان پر نہیں لائی۔ وہ کئی کئی دن گھر نہیں آتا اور آتا تو خالی ہاتھوں لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ۔ گھر میں کیا ہو رہا ہے اس سے

ختم نبوت ﷺ زندہ باد　　　　　　　　　　　　　　　عظمت صحابہ زندہ باد

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ:

معزز ممبران: آپ کا وٹس ایپ گروپ ایڈمن "**اردو بکس**" آپ سے مخاطب ہے۔

آپ تمام ممبران سے گزارش ہے کہ:

- گروپ میں صرف کتب پوسٹ کی جاتی ہیں لہذا کتب کے متعلق اپنے کمنٹس وریویوز ضرور دیں۔ گروپ میں بغیر ایڈمن کی اجازت کے کسی بھی قسم کی (اسلامی وغیر اسلامی، اخلاقی، تحریری) پوسٹ کرنا سختی سے منع ہے۔
- گروپ میں معزز، پڑھے لکھے، سلجھے ہوئے ممبرز موجود ہیں اخلاقیات کی پابندی کریں اور گروپ رولز کو فالو کریں بصورت دیگر معزز ممبرز کی بہتری کی خاطر ریموو کر دیا جائے گا۔
- سب سے اہم بات:

گروپ میں کسی بھی قادیانی، مرزائی، احمدی، گستاخِ رسول، گستاخِ امہات المؤمنین، گستاخِ صحابہ و خلفائے راشدین حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی المرتضیٰ، حضرت حسنین کریمین رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین، گستاخ اہلبیت یا ایسے غیر مسلم جو اسلام کے خلاف پراپیگنڈا میں مصروف ہیں یا ان کے روحانی وذہنی سپورٹرز کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے لہذا ایسے اشخاص بالکل بھی گروپ جوائن کرنے کی زحمت نہ کریں۔ معلوم ہونے پر فوراً ریموو کر دیا جائے گا۔

- تمام کتب انٹرنیٹ سے تلاش/ڈاؤنلوڈ کر کے فری آف کاسٹ وٹس ایپ گروپ میں شیئر کی جاتی ہیں۔ جو کتاب نہیں ملتی اس کے لئے معذرت کر لی جاتی ہے۔ جس میں محنت بھی صرف ہوتی ہے لیکن ہمیں آپ سے صرف دعاؤں کی درخواست ہے۔
- ہمارا اردو کتب کا وٹس گروپ جوائن کرنے کے لئے درج ذیل لنکس پر کلک کریں ہر دو کیٹیگری میں صرف ایک ہی گروپ جوائن کریں اگر پہلے سے جوائن ہیں تو اس کو سکپ کر دیں۔ عمران سیریز کے شوقین عمران سیریز گروپ جوائن کر سکتے ہیں۔

اردو بکس 1	https://chat.whatsapp.com/EFrs3uGTgEm2319kK0wfu2
اردو بکس 2	https://chat.whatsapp.com/Ke9odWnuu7T9zRUGgYEcYV
اردو بکس 3	https://chat.whatsapp.com/IEl5cejf7Xc0b1HjApSyxI
اردو بکس 4	https://chat.whatsapp.com/J2HwtCI39spKjifu3aC61i
1 New Books	https://chat.whatsapp.com/EFrs3uGTgEm2319kK0wfu2
2 New Books	https://chat.whatsapp.com/D9yLIpv8dLVJHLjuVNIAtk
3 New Books	https://chat.whatsapp.com/I5dFInQasVTLcmKrbpa1bv
عمران سیریز 1	https://chat.whatsapp.com/Ggokw9DndA68GCuURnNA2H
عمران سیریز 2	https://chat.whatsapp.com/C11xpIXfws3JRqn8gSt3LZ

گروپ فل ہونے کی صورت میں ایڈمن سے وٹس ایپ پر میسیج کریں۔ برائے مہربانی اخلاقیات کا خیال رکھتے ہوئے موبائل پر کال یا ایم ایس کرنے کی کوشش ہرگز نہ کریں۔ ورنہ گروپس سے ریموو کر دیا جائے گا اور بلاک بھی کیا جائے گا۔

0306-7163117　　0343-7008883　　0333-8033313

محمد سلمان سلیم　　پاکستان زندہ باد　　راؤ ایاز

پاکستان زندہ باد　　　　　　　　　　　　　　　پاکستان پائندہ باد

اللہ تبارک تعالیٰ ہم سب کا حامی وناصر ہو

اسے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وحیدن اس کی ہر خطا معاف کر رہی تھی۔ صرف اس لئے کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔

مراد آباد میں کسی کو معلوم نہیں تھا کہ جگر کہاں ہے؟ چچا کا انتقال ہو چکا تھا۔ بوڑھی ماں جگر کی خیریت کے لئے پریشان تھی لیکن کوئی نہیں بتاتا تھا کہ وہ ہے کہاں۔ بالآخر ایک دن اس کے بھائی علی مظفر کو معلوم ہوا کہ وہ آگرے میں ہے۔ علی مظفر نے والدہ کو ساتھ لیا اور آگرے آگئے۔ کسی نہ کسی طرح وہ گھر تک بھی پہنچ گئے۔ جگر اس وقت کہیں سے آکر بیٹھا تھا۔ بھائی کو دیکھ کر جگر نے آنکھیں جھکالیں۔ شرمندگی ابھی تک تھی۔ والدہ کی آنکھوں سے کب کے رُکے ہوئے آنسو بہہ رہے تھے۔

"میں آپ سے شرمندہ ہوں۔ آپ سے اجازت لئے بغیر میں نے شادی کرلی ہے۔" اس نے والدہ سے کہا۔

"مجھے تو یہ خوشی ہے' تو آباد ہوا ہے برباد نہیں ہوا۔ تو مجھ سے اجازت لیتا تو بھی میں انکار تھوڑی کرتی۔ اچھا ہوا تو نے شادی کرلی۔"

انہوں نے وحیدن کو سینے سے لگایا۔ وحیدن کو یوں لگا جیسے اس کی شادی آج ہوئی ہے۔

ماں نے اصرار کرکے اسے مراد آباد چلنے پر رضامند کرلیا۔ وہ نوکری چھوڑ چھاڑ کے ماں اور بھائی کے ساتھ مراد آباد آگیا۔ وحیدن بھی گویا پہلی مرتبہ میکے سے سسرال آئی۔ دیوانے کو کچھ دن کے لئے قرار آگیا۔ بہت دن بعد مراد آباد آیا تھا' بہت دنوں تک در و دیوار کو تکتا پھرا۔

یاد ہیں اب تک جگر وہ بے قراری کے مزے
درد پیہم کی لگاوٹ زخم کاری کے مزے
وہ جبینِ شوق اپنی وہ کسی کے پائے ناز
سجدہ ریزی کی لطافت اشکباری کے مزے
حسن کی سرشاریاں خوابِ جوانی کی بہار
عشق کی بے تابیاں شبِ زندہ داری کے مزے

○☆○

وحیدن کے ایک رشتے دار عاقل مراد آباد میں رہتے تھے اور چشموں کا کاروبار کرتے تھے۔ جگر کو بھی اس کام کا کچھ تجربہ ہو گیا تھا۔ اسے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا' عاقل کے ساتھ مل کر چشموں کی ایجنسی شروع کردی۔

قمر مراد آبادی نے ایک مشاعرہ کرایا۔ سب کو معلوم تھا کہ جگر بھی شعر کہتے ہیں۔ مشاعرہ مراد آباد ہی میں تھا لہٰذا جگر کو بھی بلا لیا گیا۔ اس وقت تک بہ حیثیت شاعر اسے بہت کم لوگ جانتے تھے۔

دورِ حاضر کے غزل گو شعرا میں رندی و سرمستی اور عشق و عاشقی کے مضامین کے اعتبار سے جگر مراد آبادی کا شمار اساتذہ میں ہوتا ہے۔

جگر نے ایک ایسے دور میں غزل گوئی شروع کی جس میں حسرت' اصغر اور فانی جیسے امام غزل موجود تھے۔ یہ ان کا شاعرانہ کمال ہے کہ انہوں نے اس محفل میں اپنے لئے ایک مقام پیدا کرلیا۔

جگر نے جن جذبات اور کیفیات کی ترجمانی کی ہے وہ ان کے ذاتی تجربے اور احساس پر مبنی ہیں اور اسی لئے ان میں تاثیر پائی جاتی ہے۔

(ڈاکٹر ابواللیث صدیقی)

"رشید احمد صدیقی نے غزل کو اردو شاعری کی آبرو کہا ہے۔ اگر یہ بات مان لی جائے تو جگر مراد آبادی ان شعرا میں سے تھے جو جدید غزل کی آبرو تھے۔ جن شعرا نے غزل کو نئے زمانے کے تقاضوں سے آشنا کیا اور پھر اسے مقبولیت بخشی ان میں حسرت' فانی اور اصغر کے ساتھ جگر کا نام ضرور لیا جائے گا۔"

(محمد حسن)

اسے ابھی مشاعروں سے ملنے والی شہرت کا اندازہ نہیں تھا۔ اس لئے اس نے اس مشاعرے میں شرکت کے لئے کوئی اہتمام نہیں کیا تھا بلکہ وہ تو بھول ہی گیا تھا کہ آج مشاعرہ ہے۔ جب وہ مشاعرے میں نہیں پہنچا تو اس کے دوستوں کو تشویش ہوئی اور وہ اسے لینے آگئے۔ وہ مشاعرے میں پہنچا تو مشاعرہ اس وقت شباب پر تھا۔ اس متبدی شاعر کو پڑھوا کر مشاعرہ خراب نہیں کرنا تھا لیکن قمر مراد آبادی کی کوششوں سے اس کا نام پکار لیا گیا۔ اس کا مخصوص انداز دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ شیروانی کے آدھے بٹن کھلے ہوئے' بالوں کی ایک آوارہ لٹ کو ایک ہاتھ سے بار بار اوپر کرتا ہوا' جھومتا جھامتا اسٹیج پر پہنچا۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے دنیا بھر کی شرابوں کا نشہ پیکرِ انسانی میں ڈھل گیا ہے۔ اس نے پہلے مصرع کو دھیمی آواز میں ادا کیا۔ اسی انداز میں دہرایا لیکن دوسرا مصرع اس بلند آہنگ سے پڑھا کہ لوگ آسمان کی طرف دیکھنے لگے۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے اس کی آواز آسمان کی طرف سفر کر رہی ہے۔ اس کی شاعری کا سادہ انداز' مستی بھرا لہجہ' خلوص کی چاشنی اور منفرد تبسم۔ چھایا تو پھر چھاتا چلا گیا۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ہے اور ہزاروں سننے والے۔ درمیان کوئی شے نہیں ہے۔ وجد کا سماں تھا اور وہ تھا۔

"اچھا، یہ ہیں جگر۔"
"ان کا نام تو سنا تھا لیکن دیکھا آج ہے۔"
"پڑھ کیا رہا تھا، دل کو نکالے لئے جا رہا تھا۔"
مشاعرے کے بعد ہر زبان پر یہی باتیں تھیں۔
اس مشاعرے کے بعد ارد گرد کے علاقوں سے اس کے پاس مشاعروں کے دعوت نامے آنے لگے۔ اس کی مصروفیت میں ایک اور مصروفیت کا اضافہ ہو گیا۔
مراد آباد آنے کے بعد اس کے لا ابالی پن میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ اسے یہ سہارا ہو گیا تھا کہ وحیدن کی دیکھ بھال کے لئے گھر میں ماں موجود ہیں۔ پھر ایک دن یہ سہارا بھی نہیں رہا۔ اس کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ یہ صدمہ ایسا نہیں تھا کہ جگر جیسا حساس آدمی اسے آسانی سے برداشت کر لیتا۔ وہ جب کسی صدمے سے لڑتا تھا، شراب کو اپنے لشکر میں شامل کر لیتا تھا۔ وہ کئی دن تک گھر نہیں آیا۔ نہ جانے کہاں بیٹھا شراب پیتا رہا۔ پیتا رہا اور روتا رہا۔ میری کیا حالت ہو گئی ہے۔ یہ شراب مجھ سے چھوٹتی کیوں نہیں۔ میں اپنے لشکر سے بچھڑ کیوں نہیں جاتا۔ میں صدموں سے مر کیوں نہیں جاتا کہ قصہ ہی پاک ہو جائے۔
اسے اس کے دوست گھر لے کر آئے تو اس کی عجیب حالت تھی۔ کئی دن کے میلے کپڑے، بالوں میں دھول اٹی ہوئی۔ وحیدن کو دیکھتے ہی زارو قطار رونے لگا۔
"میں تمہارا گنہ گار ہوں۔ اب تک میں اماں کی وجہ سے تم سے بے خبر رہا۔ اب میں تمہیں تنہا نہیں چھوڑوں گا۔"
"یہ کم بخت شراب چھوٹے تب نا۔"
"ایسا مت کہو وحیدن بیگم۔ یہی تو وہ چیز ہے جو مجھے گناہ کا احساس دلاتی ہے۔ یہ نہ رہی تو میں بے حس ہو جاؤں گا۔"
شیروانی کی جیب میں اس وقت بھی بوتل موجود تھی۔ اس نے بوتل نکالی اور منہ سے لگالی۔ نشہ ہوتے ہی آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔
یہ ہمیشہ سے اس کی عادت تھی۔ شراب پینے کے بعد بے تحاشا روتا تھا اور اپنے گناہ یاد کرتا تھا۔
وہ بے سُدھ ہو کر بچوں کی طرح سو گیا۔ کتنے دن کی تھکن تھی جو اس کی ہڈیوں میں اتر گئی تھی۔ وحیدن اس کے پاؤں دبانے بیٹھ گئی۔
اس نے وعدہ کیا تھا کہ اب والدہ نہیں رہیں اس لئے گھر پر پوری توجہ دے گا لیکن اس کا لا ابالی پن اب بھی جاری رہا۔ گھر سے غائب رہنا پھر اس کا معمول بن گیا۔ جو کچھ کماتا شراب پر خرچ ہو جاتا۔ الٹا وحیدن کا کوئی زیور بیچ کر اپنی ضرورت پوری کر لیتا۔
وحیدن ایک مشرقی عورت کی طرح سب کچھ برداشت کر رہی تھی لیکن اندر ہی اندر گھلتی جا رہی تھی۔ جگر جب ہوش میں ہوتا، اس کی حالت دیکھ کر کڑھتا لیکن مدہوش ہوتے ہی اسے کچھ یاد نہ رہتا۔
بیماری طول پکڑتی رہی۔ ڈاکٹروں نے اسے ٹی بی بتائی تھی۔ معقول علاج نہ ہو سکا اور وہ گور کنارے پہنچ گئی۔ جگر کو اب ہوش آیا لیکن وہ ناامید نہیں تھا۔

چشمِ امید میں ہے جان ابھی تھوڑی سی
ابھی دھندلا سا اُجالا نظر آتا ہے مجھے

امید کی یہ روشنی روز بروز کم ہوتی جا رہی تھی۔ چراغ بھڑک رہا تھا۔ وحیدن کے بچنے کی اب کوئی امید نہیں تھی۔
وہ وحیدن کے سرہانے بیٹھا تھا۔ اٹھ کر ٹہلنے لگتا اور پھر بیٹھ جاتا۔ اسے وہ زمانہ یاد آ رہا تھا جب وحیدن سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ اس بے چاری نے مجھ سے کیسی کیسی توقعات وابستہ کی ہوں گی۔ افسوس! میں اس کی کسی توقع پر بھی پورا نہیں اتر سکا۔
"سنیے۔" وحیدن کی کمزور آواز اُبھری۔
"کیا، پانی چاہئے؟"
"یاد ہے؟ جب آپ ہمارے گھر آتے تھے تو میں ضد کر کے آپ سے غزل سنا کرتی تھی۔"
"یاد تو ہے۔"
"آج بھی کوئی غزل سنائیے۔"
"تم سو جاؤ، تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"
"اسی لئے تو کہہ رہی ہوں۔ کیا خبر پھر موقع ملے نہ ملے۔"
جگر کے آنسو اس کے دل میں اُترنے لگے۔ اس نے گھبرا کر غزل شروع کر دی۔
"ایسے نہیں۔ ترنم سے سنائیے۔ آپ کے ترنم ہی نے تو مجھے خریدا تھا۔"
جگر نے اپنے ترنم کی قیمت کو آج محسوس کیا تھا۔ اس نے دل کا حال لفظوں میں کہہ دیا۔

صبر کے ساتھ مرا دل بھی لئے جائیں آپ
اس قدر رحم مرے حال پہ فرمائیں آپ
میری رگ رگ میں سما کر بھی یہ پردہ مجھ سے
ظلم ہے ظلم ہے آئینے سے شرمائیں آپ
کردیا دردِ محبت نے مرا کام تمام

اب کسی طرح کی تکلیف نہ فرمائیں آپ
نالے کرتے ہوئے رہ رہ کے یہ آتا ہے خیال
کہ مری طرح نہ دل تھام کے رہ جائیں آپ

اور جب وہ اس شعر پر پہنچا تو ایک ساتھ دونوں کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

دیکھئے میری تمناؤں کا احساس رہے
باغِ فردوس میں تنہا نہ چلے جائیں آپ

"آپ کیوں روتے ہیں۔ بدنصیب تو میں ہوں کہ آپ کی شہرت کو کمال تک پہنچتے ہوئے نہیں دیکھ سکی۔"

"تم زندہ رہو' اسی میں میری شہرت ہے۔"

"اب وقت آگیا ہے۔ شاید یہیں تک آپ کا میرا ساتھ تھا۔"

وحیدن نے اس کے ہاتھوں میں دم توڑ دیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب اس نے رونا چاہا مگر اس کے آنسو خشک ہوگئے۔

محبت میں اک ایسا وقت بھی آتا ہے انسان پر
کہ آنسو خشک ہوجاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی

آنکھ سے آنسو نہ بہے لیکن دل میں تو دریا ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ وہ لہریں گنتا رہا اور قدم..... گن گن کر قبرستان تک پہنچ گیا۔ سب لوٹ آئے مگر وہ وہیں کھڑا تھا۔ دم بخود' حیران حیران' پھر وہ دوزانو بیٹھ گیا۔ قبر پر پڑے ہوئے پھولوں میں ترنم کے پھول شامل کرنے کے لئے۔ قبرستان اس کی درد بھری آواز سے سسکیاں لے رہا تھا۔

آہ! میری یہ فغاں اب نہ سنی جائے گی
اب نہ سنو داستاں' اب نہ سنی جائے گی
پھر گئی ان کی نظر' پھر گئے دنیا سے وہ
دوستیِ جسم و جاں اب نہ سنی جائے گی
یاس بھرا دردِ دل اب نہ کہا جائے گا
درد بھری داستاں اب نہ سنی جائے گی
قصۂ غم کہہ کے میں لیجئے خاموش ہوں
میرے دہن میں زباں اب نہ سنی جائے گی
بزم سے باچشمِ تر اٹھ گئے کہتے ہوئے
ہم سے تری داستاں اب نہ سنی جائے گی
رحم نہیں آگیا میرے دلِ زار پر
یہ روشِ آسماں اب نہ سنی جائے گی
کہہ کے بُرا غیر کو ان کو خفا کردیا
بات جگر کی وہاں اب نہ سنی جائے گی

○☆○

اس دن کے بعد سے اس کا یہ معمول ہوگیا کہ جب کوئی نئی غزل کہتا' وحیدن کو سنانے اس کی قبر پر پہنچ جاتا۔

یہ حادثہ اس کی شاعری میں ایک نیا موڑ لے کر آیا۔

اب اس کی شاعری میں سوز و گداز بڑھ گیا۔ اسے وحیدن سے بڑی محبت تھی۔ اس کے بچھڑ جانے کا کرب اس کی شاعری میں نظر آنے لگا۔

داغ ہی داغ نظر آتے ہیں
کس طرح قلب و جگر دیکھوں میں
آشیاں کے جو اٹھا لوں تنکے
اپنے ٹوٹے ہوئے پر دیکھوں میں

اسے اپنے ٹوٹے ہوئے پروں کا مطلق احساس نہیں تھا۔ اس کی مے نوشی بہت بڑھ گئی تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ خودکشی کرنے پر آمادہ ہے۔ سستی شراب دن رات کی قید نہیں اور پھر اس میں سوڈا یا پانی ملانا گناہ سمجھتا تھا۔ دنیا کی ہر خبر سے بے خبر مراد آباد کی سڑکوں پر گھومتا پھر رہا تھا پھر ایک دن معلوم ہوا' دیوانے کو صحرا تنگ پڑتا تھا۔ وہ مراد آباد سے نکل گیا۔ کبھی کسی شہر میں کبھی کسی سرائے میں۔

مٹا کر اپنی ہستی یار کی تصویر دیکھیں گے
ہم اس تخریب ہی میں صورتِ تعمیر دیکھیں گے

○☆○

یہ غور دیکھ لو انداز میرے مٹنے کے
یہ سانحہ نہ کبھی پھر نظر سے گزرے گا

شراب کا یہ عالم کہ جیسے وہ پی رہا تھا' کوئی پلا رہا تھا۔ جہاں پہنچتا' اس سے پہلے شراب وہاں پہنچ جاتی۔

اسی عالمِ مدہوشی میں وہ شہروں شہروں گھومتا ہوا ایک مرتبہ پھر آگرہ آگیا۔ اس شہر میں اسے بوئے یار آتی تھی۔ وحیدن اسے یہیں ملی تھی۔ یہاں پہنچ کر اسے کچھ قرار آیا۔ اس نے پاؤں کے چھالوں کو فرصت دینے کے لئے کچھ دن یہاں قیام کا ارادہ کیا۔

وہ طرح طرح سے خود کو بہلا رہا تھا لیکن اس کے اندر کوئی ایسا چھپا بیٹھا تھا کہ خود بھی تڑپتا تھا اسے بھی تڑپاتا تھا۔ ایک دن جو بے قراری بڑھی تو اس کے قدم ایک طوائف کے گھر پہنچ گئے۔ اس کا نام روشن فاطمہ تھا۔ حسین' شوخ' چنچل' کم سن۔

"حضور کی تعریف؟" اس نے پوچھا۔

جگر آنکھیں جھکائے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ شاید نگاہ بھر کے اسے دیکھا تک نہیں تھا۔ جواب میں دو شعر پڑھ دیئے۔

سراپا آرزو ہوں' درد ہوں' داغِ تمنا ہوں

مجھے دنیا سے کیا مطلب کہ میں آپ اپنی دنیا ہوں
کبھی کیفِ مجسم ہوں کبھی شوقِ سراپا ہوں
خدا جانے کہ کس کا درد ہوں کس کی تمنا ہوں
"سبحان اللہ" طوائف کی زبان سے بے اختیار نکلا۔
"بے چارے عاشق معلوم ہوتے ہیں۔"
جگر نے پھر ایک شعر پڑھ دیا۔
مجھی میں حسن کا عالم مجھی میں عشق کی دنیا
نثار اپنے پہ ہو جاؤں اگر سو بار پیدا ہوں
"حضور نے اس غریب خانے کو کیسے رونق بخشی؟"
کچھ ہمی جانتے ہیں لطف ترے کوچے کا
ورنہ پھرنے کو تو مخلوقِ خدا پھرتی ہے
اس شعر کا سننا تھا کہ روشن فاطمہ پھڑک گئی۔ طوائف تھی، چہرہ شناس تھی، سخن فہم تھی۔ بار بار اس شعر کو پڑھتی تھی اور داد دیتی تھی۔
"میں اب تک کیوں آپ سے محروم رہی۔ کیا آپ اس شہر کے نہیں ہیں۔ ہیں تو یہاں کب سے ہیں اور اب تک یہاں کیوں نہیں آئے۔"
یہ نہ پوچھو دہر میں کب سے میں اسی طرح خانہ خراب ہوں
جو نہ مٹ سکا وہ طلسم ہوں جو نہ اٹھ سکا وہ حجاب ہوں
"دیکھیے میں پاگل ہو جاؤں گی۔ اللہ کے واسطے آپ اپنا نام تو بتائیے۔ آپ ہیں کون۔"
جگر یہ کہتے ہوئے اس کے سامنے بیٹھ گیا۔
دیکھا تھا کل جگر کو سرِراہِ میکدہ
اس درجہ پی گیا تھا کہ نشے میں چور تھا
وہ پھر بھی نہیں سمجھی۔ شاید اس نے جگر کا نام سنا ہی نہیں تھا یا پھر وہ یہ سمجھی کہ وہ یہاں کہاں آئیں گے، کوئی اور جگر ہوگا۔
اسی وقت ایک مہمان اور آگیا۔ یہ جگر کا واقف کار تھا اور شاید جگر کو ڈھونڈتا ہوا یہاں تک آگیا تھا۔ دن کا وقت تھا اس لئے محفل گرم نہیں ہوئی تھی۔
"جگر صاحب، مجھے کسی نے بتایا کہ آپ یہاں آئے ہیں اور میں آپ کو تلاش کرتا ہوا یہاں آگیا۔" پھر وہ شخص روشن فاطمہ سے مخاطب ہوا۔
"آپ واقف ہیں ان سے؟ مشہور شاعر جگر مراد آبادی ہیں۔"
"آؤ بھائی چلیں۔ میں نے بہت زحمت دے لی انہیں۔"
"ایسے تو نہیں جانے دوں گی۔" روشن فاطمہ نے جگر کا ہاتھ تھام لیا۔ "یہ طوائف کا کوٹھا ہے۔ یہاں وہ آتا ہے جس کی جیب میں مال ہوتا ہے۔"
جگر نے شیروانی کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور جتنے نوٹ ہاتھ میں آئے اس کے سامنے رکھ دیئے۔
"نہیں حضور، قیمت تو گاہک کی حیثیت دیکھ کر طے ہوتی ہے۔ ایسے نوٹ تو مجھے کوئی بھی جاہل سیٹھ دے سکتا ہے۔ آپ تو مجھے غزل سنائیں۔"
"شعر سمجھتی ہو؟"
"حضور، پہلے سمجھتی ہوں پھر گاتی ہوں۔"
ابھی روشن فاطمہ کا جملہ ختم نہیں ہوا تھا کہ جگر کی پُرسوز آواز نے دن کو قیامت کا دن بنا دیا۔
کیا چیز تھی، کیا چیز تھی ظالم کی نظر بھی
اُف کرکے وہیں بیٹھ گیا دردِ جگر بھی
کیا دیکھیں گے ہم جلوۂ محبوب کہ ہم سے
دیکھی نہ گئی دیکھنے والے کی نظر بھی
واعظ نہ ڈرا مجھ کو قیامت کی سحر سے
دیکھی ہے ان آنکھوں نے قیامت کی سحر بھی
اس دل کے تصدق جو محبت سے بھرا ہو
اس درد کے صدقے جو اِدھر بھی ہو اُدھر بھی
ہے فیصلۂ عشق جو منظور تو اٹھئے
اغیار بھی موجود ہیں حاضر ہے جگر بھی

ملاقات کی محفل، مشاعرے کی محفل بن گئی۔ روشن فاطمہ

غزل

حسن جس رنگ میں ہوتا ہے جہاں ہوتا ہے
اہلِ دل کے لئے سرمایۂ جاں ہوتا ہے
ہائے وہ وقت کہ جب حسن پہ آتا ہے شباب
اف وہ ہنگام کہ جب عشق جواں ہوتا ہے
دل کو بے درد محبت میں بتانے والے
دل سا ہمدرد زمانے میں کہاں ہوتا ہے
ہائے وہ سلسلۂ اشک کہ جو تیرے حضور
دل میں رکتا ہے نہ آنکھوں سے رواں ہوتا ہے
ساز و مطرب کے کرشموں پر نہ جانا کہ یہاں
اکثر اس طرح سے بھی رقصِ فغاں ہوتا ہے
انقلابات سے کیا خوف کہ ہر عزمِ جگر
اسی آغوش میں پلتا ہے جواں ہوتا ہے

پر وجد کا عالم طاری تھا۔

اس نے اٹھتے وقت جگر کا ہاتھ تھام لیا "وعدہ کیجیے' کل پھر آئیں گے۔"

"میں اپنے اختیار میں تو ہوں نہیں جو وعدہ کرلوں۔"

"میری خاطر۔"

اس نے اس ادا سے کہا کہ جگر نے وعدہ کرلیا۔ روشن فاطمہ اسے دروازے تک رخصت کرنے آئی۔ جگر نے اپنے الجھے ہوئے بالوں میں انگلیاں پھیریں اور باہر نکل گیا۔

دوسرے دن اس کی مستی نے پھر اس کے قدموں کو سہارا دیا۔ بے خودی سے چونکا تو روشن فاطمہ کے دروازے پر تھا۔ پھر یہ سلسلہ روز کا ہوگیا۔

روشن فاطمہ جگر کی غزلوں سے محفلیں سجاتی رہی اور اندر ہی اندر جگر پر مرتی رہی۔ جگر کی بے نیازی یہاں بھی اس کے ساتھ تھی۔ روشن اس کی مدارات میں لگی رہتی اور وہ اپنے خیالوں میں کھویا رہتا۔ جب نشہ کچھ کم ہوتا اور اسے احساس ہوتا کہ یہاں کیوں آگیا تو دامن جھاڑ کر اٹھ جاتا۔

روشن فاطمہ الجھتی جارہی تھی۔ دوسری جانب جگر کی تہذیب کو یہ گوارا نہیں تھا کہ وہ اظہار عشق کرتا۔ اس کی تازہ غزلوں سے یہ معلوم ضرور ہوتا تھا کہ اس کا دل کہیں اٹک گیا ہے لیکن اپنی چاہت کا اقرار سننے کے لیے روشن کے کان ترس رہے تھے۔ بالآخر غرورِ حسن نے شکستِ غرور کا اعلان کردیا۔

"میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

"میں باسی نہیں مسافر ہوں۔ اس وقت تک چلتا رہوں گا جب تک منزل نہیں مل جاتی اور لطف یہ ہے کہ مجھے نہیں معلوم میری منزل کیا ہے۔"

"مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ اب میں یہاں نہیں رہ سکتی۔"

"میں نے کہا نا' مجھے تو خود اپنے ٹھکانے کا علم نہیں۔"

"آپ کو نہ معلوم ہو لیکن مجھے معلوم ہے' آپ کی منزل میں ہوں۔"

"میں شراب پیتا ہوں۔"

"میں آپ کو وہ نشہ دوں گی کہ آپ شراب کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔"

"تمہارے گھر والے تمہیں اتنی آسانی سے نہیں نکلنے دیں گے۔"

"ان سے میں نمٹ لوں گی۔"

کئی دن برابر یہ تکرار ہوتی رہی اور بالآخر وہ جگر کو شیشے میں اتارنے میں کامیاب ہوگئی۔

جب جگر بھی تیار ہوگیا تو ایک دن وہ نکلی اور جگر کے پاس پہنچ گئی۔

جگر اسے لے کر نکلا اور ریاض خیر آبادی کے مکان پر پہنچ گیا۔ انہوں نے کچھ سوچ کر اسے پناہ دے دی۔

روشن فاطمہ کے بھائیوں نے جگر کے خلاف اغوا کا مقدمہ درج کرا دیا اور جگر کے وارنٹ جاری ہوگئے۔ ریاض خیر آبادی کو معلوم ہوا تو انہوں نے معذرت کرلی۔ جگر کو یہاں سے نکلنا پڑا۔

گرفتاری کا خوف' تنگ دستی اور روشن فاطمہ کا ساتھ۔ وہ سخت خطرے میں تھا۔

تکلیف میں ماں اور پردیس میں وطن یاد آتا ہے۔ وہ روشن فاطمہ کو لے کر مراد آباد آگیا۔

راستے ہی میں اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ روشن فاطمہ کو لے کر کہاں جائے گا۔

وحیدن کا ایک رشتے دار عاقل' مراد آباد میں رہتا تھا۔ وہ بھی چشموں کا کاروبار کرتا تھا اس لیے جگر سے اس کے دوستانہ مراسم تھے۔ وہ روشن کو لے کر اس کے گھر پہنچ گیا۔ اس نے تمام حالات عاقل کو بتانے کے بعد کہا۔

"یہ میری امانت ہے جو میں تمہارے پاس چھوڑے جارہا ہوں۔ میرے وارنٹ نکلے ہوئے ہیں' ذرا معاملہ کچھ دب جائے تو میں اسے کہیں لے جاؤں گا۔ اس عرصے میں میری معاشی حالت بھی کچھ ٹھیک ہوجائے گی۔"

عاقل نے اس سے وعدہ کیا کہ وہ اس کی امانت کی حفاظت کرے گا۔

ممکن ہے عاقل کی نیت اس وقت خراب نہ ہو لیکن روشن کے حسن نے اس کا ایمان ڈانواں ڈول کردیا۔ اس نے کسی طرح روشن کے بھائیوں سے رابطہ کیا اور انہیں بتایا کہ روشن اس کے پاس ہے لیکن وہ حاملہ ہے۔ اگر وہ چاہیں تو اس کے بچے کا باپ بننے کے...... لیے تیار ہوں۔ آدمی پیسے والا تھا' کچھ رقم دے دلا کر انہیں تیار کرلیا۔ دوسرا کام یہ کیا کہ جگر کے خلاف روشن کے کان بھرنا شروع کردیے۔ اسے یہ یقین دلایا کہ جگر اسے یہاں چھوڑ کر بھاگ گیا ہے اور اب کبھی نہیں آئے گا۔

اس نے بھی سوچا' جس کے خاطر نکلی تھی وہ ہے نہیں' واپس جا نہیں سکتی' ایک شریف آدمی ہاتھ تھام رہا ہے تو کیا حرج ہے۔ عاقل نے اس سے شادی کرلی۔

جگر لوٹ کر آیا تو دن میں رات ہوگئی۔ عاقل کسی ڈھیٹ مجرم کی طرح اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"تمہاری موت کی خبر مشہور ہوگئی تھی للذا میں نے روشن سے شادی کرلی۔"

"روشن کیوں کر تیار ہوگئی؟؟"

"اسے تم سے محبت نہیں تھی۔ وہ تو اس ماحول سے نکلنا چاہتی تھی۔ تمہارے پاس نہیں میرے پاس پہنچ گئی۔ اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔"

"میں اس سے ایک مرتبہ مل تو لوں۔"

"اب وہ میری بیوی ہے۔"

"مجھے معاف کر دینا یار' میں نے تمہاری بیوی سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔"

دنیائے آب و گل کی ہوا گرم ہو چلی
کھلنے نہ پائے تھے ابھی بندِ قبائے عشق

شیشۂ دل وہ ہستی نازک ٹھیس لگی اور ٹوٹ گیا
اس پہ کسی کے تیرِ ستم کی مشقِ سیاست کیا کہئے

عاقل کی مشقِ ستم اور روشن کی بے وفائی کا داغ ایسا لگا کہ ایک مرتبہ پھر اس نے وطن کو خیرباد کہہ دیا۔ اس کے پاس اتنی فرصت بھی نہیں تھی کہ اپنے گھر چلا جاتا۔

"اسٹیشن چلو" اس نے تانگے والے سے کہا اور اسے حیرت ہوئی کہ کسی سہارے کے بغیر وہ تانگے میں بیٹھ گیا۔ زخموں کے ٹانکے ایک ایک کر کے ٹوٹنے لگے۔ اپنی چیخوں کو بڑی مشکل سے اس نے اشعار کی شکل میں ڈھال کر ترنم بنا دیا۔

سر میں پھر لہر' جنوں کی صفتِ تیر چلی
اے فلک روک مرے پاؤں سے زنجیر چلی
صدقے ان ہاتھوں کے' مجھ کو بھی خبر تک نہ ہوئی
اس نزاکت سے گلے پر مرے شمشیر چلی
اب مری لاش پہ کیوں سوگ لیے بیٹھے ہو
تم نے شمشیر چلائی تھی تو شمشیر چلی

روشن فاطمہ کو یہ خبر ملنے میں دیر نہیں لگی کہ جگر آئے تھے۔ یہ عقدہ کھلنے میں بھی دیر نہیں لگی کہ عاقل نے ایک سازش کے تحت اس سے شادی کی ہے۔ یہ سب معلوم ہونے کے باوجود اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ جگر کو اس کی وفاداری کا یقین کون دلائے گا۔ وہ اب دوبارہ یہاں کاہے کو آئیں گے۔ جگر پر اب جو کچھ گزرے گی' اس کی مجرم وہ ہوگی۔ اس خیال نے اسے لرزا دیا۔ دنیا سے ایسا دل اچاٹ ہوا کہ اس نے عاقل سے طلاق کا مطالبہ کر دیا۔

"آپ مجھے طلاق دے دیں' میں اب باقی عمر اجمیر جا کر غریب نواز کی درگاہ پر گزارنا چاہتی ہوں۔"

عاقل نے بہت چاہا کہ وہ اپنے ارادے سے باز آجائے لیکن جب کوئی رہنا ہی نہ چاہے تو اسے رہنے پر مجبور کون کر سکتا ہے۔ عاقل کو طلاق دینی پڑی۔ روشن فاطمہ اجمیر چلی گئی۔ پھر کسی کو نہیں معلوم کہ اس پر کیا بیتی۔

○☆○

روشن کو تو خواجہ غریب نواز کے قدموں میں جگہ مل گئی لیکن جگر کی آزمائش کے دن ابھی باقی تھے۔ گردشِ زمانہ اسے جس طرف چاہ رہی تھی اڑائے لیے پھر رہی تھی۔ اس کی حالت' حالتِ عبرت بنی ہوئی تھی۔ شراب میں غرق' آنسوؤں سے تر۔ ابھی شاعرانہ شہرت ایسی نہیں ہوئی تھی کہ جس طرف جاتا' قدرداں ہاتھوں ہاتھ لیتے۔ ابھی تو وہ چشموں کا بیوپاری تھا یا شراب پینے کی وجہ سے شرابی۔

مختلف شہروں کی خاک چھانتا ہوا وہ لاہور پہنچ گیا۔ یہاں بھی چشموں کی ایک فرم میں ملازمت کرلی۔

کاروباری سیاحت کے دوران ہی اس کی ملاقات اخبار قیصرِ

کراچی کے ایک مشاعرے میں جگر مراد آبادی بھارت سے تشریف لائے ہوئے تھے۔ اس مشاعرے میں بہزاد لکھنوی بھی تھے۔

بہزاد کو دیکھ کر پبلک نے شور مچایا۔ "اے جذبۂ دل' اے جذبۂ دل" یہ اشارہ ان کی مشہور غزل کی طرف تھا۔

اے جذبۂ دل گر میں چاہوں ہر چیز مقابل آجائے
منزل کے لئے دو گام چلوں اور سامنے منزل آجائے

غزل کی شہرت اور بہزاد کے ترنم نے مشاعرے کو گرما دیا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اب کسی کا چراغ نہیں جلے گا۔ جگر کا بھی نہیں۔

جگر کی باری آئی تو انہوں نے بہزاد کو مخاطب کر کے اپنی غزل پڑھی جس کا مطلع تھا۔

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں
فیضانِ محبت عام سہی عرفانِ محبت عام نہیں

بہزاد کے شعر میں "گر میں چاہوں" سے بے جا غرور ظاہر ہوتا تھا جبکہ جگر نے کہا "اللہ اگر توفیق نہ دے"۔

پبلک نے اس چوٹ اور اس فرق کو محسوس کرلیا اور جگر کو وہ داد ملی کہ سب کو کہنا پڑا "جگر آخر جگر ہے۔"

ہند کے ایڈیٹر قاضی حامد حسن حسرت سے ہو گئی۔ ان دنوں اس پر شیعیت کے ساتھ ساتھ دہریت کا غلبہ ہونے لگا تھا۔ حامد حسن سے بحث کے دوران میں وہ طرح طرح کی دلیلوں سے اپنے عقائد کو درست ثابت کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ بحث کے دوران اصغر گونڈوی کا تذکرہ بھی نکل آیا۔ حامد حسن نے کچھ اس انداز سے ان کی تعریف کی کہ وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

اب اسے ایک دھن لگی ہوئی تھی کہ گونڈہ پہنچ کر اصغر سے ملاقات کی جائے۔ گونڈہ جانے کا خیال ایسا طاری ہوا کہ وہ بے تاب ہو گیا۔ ایک دن سب کچھ چھوڑ چھاڑ گونڈہ پہنچ گیا۔

اصغر گونڈوی بساطی کی دکان کرتے تھے۔ خواجہ میر دردؔ کے بعد تصوف کے سب سے بڑے شاعر تھے۔

گونڈہ پہنچ کر اصغر کو تلاش کرنا بالکل ایسا ہی تھا جیسے زمین پر کھڑے ہو کر سورج کو دیکھ لینا۔ اصغر، شاعر تو تھے ہی، رشد و ہدایت کا چراغ بھی تھے۔ اندھیرے میں روشن چراغ سب کو نظر آجاتا ہے۔

قدرت نے تمام انتظامات پہلے ہی مکمل کر لیے تھے، بس جگر کے پہنچنے کی دیر تھی۔

اصغر اپنی دکان پر بیٹھے کسی صاحب سے بحث کر رہے تھے۔ اس گفتگو میں دخل دینا خلافِ تہذیب تھا لہٰذا جگر اتنے فاصلے پر رک گیا کہ دونوں اصحاب کی آوازیں اس کے پردۂ سماعت تک آتی رہیں۔ یہی قدرت کی مصلحت تھی۔

گفتگو کا موضوع وہی تھا جو جگر کی الجھن کا سبب بنا ہوا تھا۔ شیعیت اور دہریت۔ جگر ان دنوں انہی دو دائروں کے درمیان چکر کاٹ رہا تھا۔ کبھی ایک طرف بھاگتا تھا کبھی دوسری طرف۔ مطمئن دونوں سے نہیں تھا لیکن نکلنے کا راستہ بھی نہیں ملتا تھا۔ وہ کوئی عام آدمی بھی نہیں تھا کہ معمولی دلیلیں اسے قائل کر دیتیں۔

وہ بڑی محویت سے اصغر کی باتیں سن رہا تھا۔ ان کے سمجھانے کا انداز، مضبوط دلائل، پُرخلوص آواز، چہرے پر پھیلی ہوئی سچائی کی روشنی۔ اس کا دل اس کے سینے سے نکلنے لگا۔ اصغر کسی اور کو سمجھا رہے تھے لیکن باتیں جگر کے دل میں اُتر رہی تھیں۔

دیکھے بغیر عاشق ہونے کے تو کئی قصے ہیں لیکن بحث کیے بغیر قائل ہونے کا مظاہرہ جگر نے کیا۔ وہیں کھڑے کھڑے اس نے اپنے عقائد سے توبہ کی اور راسخ العقیدہ حنفی ہو گیا۔

وہ صاحب رخصت ہوئے تو وہ اصغر کے سامنے پہنچ گیا۔ دونوں کی نظریں ملیں اور جگر کا پیمانۂ ضبط لبریز ہو گیا۔ وہ دہاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ کبھی ان کے قدموں پر پیشانی رگڑتا تھا کبھی ہاتھ چومتا تھا۔

"میں فاسق و فاجر ہوں، مجھے پاک کر دو۔ میں کہیں کا نہیں رہوں گا مجھے اپنا بنا لو۔"

اصغر بڑی دیر تک مسکرا مسکرا کر اس بسمل کا تڑپنا دیکھتے رہے۔ جب غبار دھل گیا تو اصغر نے اسے سہارا دے کر اپنے پاس بٹھایا۔

"جگر خود چل کر میرے پاس آیا ہے، یہ میرے لیے اعزاز نہیں تو کیا ہے۔" اصغر نے کہا۔

جگر پھر رونے لگا "آپ مجھے ایسا سمجھتے ہیں مگر میں ایسا نہیں ہوں۔"

"تم کیا ہو، یہ تم ابھی نہیں جانو گے۔"

"میں رند ہوں۔ شراب مجھ سے نہیں چھوٹتی۔"

"ہر چیز کا وقت مقرر ہوتا ہے۔"

"وہ وقت کب آئے گا؟"

"انتظار کرو۔"

"کربِ انتظار میں جان جانے کو۔"

"اسی میں تو نجات ہے۔"

"آپ کو مجھ سے نفرت نہیں ہوتی؟"

"اتنے اچھے شاعر سے کون نفرت کرے گا۔ رہی تمہاری رندی تو اللہ تعالیٰ نیکوں سے زیادہ توبہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ تمہاری روح توبہ کی طرف مائلِ پرواز ہے۔ اس لیے تم مجھے عزیز ہو۔"

وہ اصغر کی اعلیٰ ظرفی پر دنگ تھا۔ نہ کوئی لعن نہ طعن، نہ نصیحت نہ اعلانِ پارسائی۔ یہ مجھ سے اس طرح مل رہے ہیں جیسے میں خزانہ ہوں اور یہ ضرورت مند۔

"چلو گھر چلتے ہیں۔ سفر سے آئے ہو۔ تھک گئے ہو گے۔ کچھ آرام کر لو، پھر باتیں ہوں گی۔"

وہ ان کے ساتھ ان کے گھر چلا گیا۔ عجیب پشیمانی کا عالم تھا۔ کیا میں ان کے گھر کے پاک و پاکیزہ بستر ہی پر بیٹھنے کے لائق ہوں؟ گھر جاؤں گا تو یہ کھانا بھی کھلائیں گے۔ ان کے برتنوں کو ہاتھ لگانے کا میں اہل ہوں؟ یہ تو مروت میں سب کچھ کر رہے ہیں لیکن میں تو مجبور نہیں ہوں۔ ان سے بہانہ کر کے کسی طرف بھی نکل جاؤں۔ بس ہو چکی ملاقات۔

"کس سوچ میں غلطاں ہو؟" اصغر نے اس کی کیفیت کو بھانپتے ہوئے کہا۔ پھر خود ہی جواب دیا "سوچتے ہو گے، جگر کی رندی اور اصغر کی پارسائی یک جا کیسے ہو گئی۔ بھائی یک جائی روحوں کی ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے تمہاری روح پارسا ہو۔"

جگر آنکھیں نیچی کیے، سر جھکائے اس کے ساتھ ساتھ چلتا

رہا۔ اصغر نے اسے دیوان خانے میں آرام سے بٹھا دیا۔

"میں تمہارے غسل وغیرہ کا انتظام کرتا ہوں۔ تم یہاں آرام سے بیٹھو۔"

آرام کسے تھا۔ وہ تو ایسی بے آرامی سے بیٹھا ہوا تھا کہ ابھی موقع ملے اور ابھی یہاں سے بھاگ جائے۔ بار بار بے چینی سے پہلو بدلتا تھا۔

اصغر کے کہنے سے اس نے غسل کیا' کپڑے تبدیل کیے۔ کھانا آیا تو بے دلی سے کھانا بھی کھایا اور آرام کرنے کے لیے لیٹ گیا۔ تیسرے پہر آنکھ کھلی تو شراب کی طلب ہوئی۔ شراب اس کے ساتھ رہتی تھی لیکن کیا یہاں بیٹھ کر پیوؤں گا۔ یہاں رہا تو پیاس کے مارے میرا دم نکل جائے گا۔ اس سے پہلے کہ حضرت اصغر یہاں پہنچیں میں یہاں سے نکل جاؤں۔ اس نے عینکوں کا بکس اٹھایا اور چپکے سے نکل گیا۔ آدھی رات مے کدے میں اور آدھی سرائے میں گزارنے کے بعد دن چڑھے سو کر اٹھا تو اپنی کج خلقی کا خیال آیا۔ حضرت اصغر میرے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے۔ مجھے فوراً ان کے پاس جانا چاہیے۔ اسے پھر اپنی تشنگی کا خیال آیا۔ ان کے سامنے مدہوشی میں کیسے جا سکتا ہوں اور اگر مدہوش نہ ہوا تو جگر کیا ہوا۔

وہ شراب پی کر بھی شعر نہیں کہتا تھا' کہہ ہی نہیں سکتا تھا۔ جب جذبۂ شعر متحرک ہوتا تھا' وہ شراب کو اتنی دیر کے لیے خیرباد کہہ دیتا جتنی دیر میں غزل مکمل ہوتی۔ بس یہی اس کا وقفۂ ہوش ہوتا تھا۔ اس وقت بھی وہ ہوش میں تھا اور کوئی جذبہ اسے شعر کہنے پر اکسا بھی رہا تھا۔ اس کا تازہ محبوب اصغر تھا۔ کاغذ پر اسی محبوب کی تصویریں بنتی چلی گئیں۔

وہ اپنے جذبوں کو تخلیق بنا کر اٹھا تو اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ اندھیرا بہت ہے' کچھ تو روشنی ہو۔ اس نے بوتل کو منہ سے لگا لیا۔

رات بھیگنے لگی تھی اور وہ بہت بے چین تھا۔ وہ اک عالم محویت میں اصغر کے گھر پہنچ گیا۔ اصغر اس کی آواز پر گھبرا کے باہر نکلے۔

"مجھے معلوم تھا' تم کہیں چلے جاؤ لوٹ کر یہیں آؤ گے۔" اصغر نے کہا۔

"مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ آپ کے سامنے اور اس حالت میں! یہ مجھ سے کیا ہو گیا۔" جگر نے کہا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

اصغر بڑی مشکل سے گھسیٹتے ہوئے اسے اندر لے گئے۔

"باہر کھڑے رہے تو تماشا بن جاؤ گے۔"

جگر مسلسل رو رہا تھا اور اصغر سے معافی طلب کر رہا تھا

"میں اپنی خوشی سے نہیں پیتا۔ مجھے اتنے زخم لگے ہیں کہ ہوش میں رہوں تو مر جاؤں۔ میں فاسق ہوں' فاجر ہوں۔ مجھے سنبھال لو۔"

اصغر اسے دلاسے دے رہے تھے اور وہ رو رہا تھا۔ پھر جیسے اسے کچھ یاد آ گیا۔ آنسوؤں کی بارش میں بھیگتے ہوئے اس نے دن میں کہے ہوئے اشعار اصغر کی نذر کر دیے۔

اپنا ہی سا اے نرگسِ مستانہ بنا دے
میں جب تجھے جانوں مجھے دیوانہ بنا دے
تو ساقیِ میخانہ بھی' تو نشہ و مے بھی
میں تشنۂ مستی' مجھے مستانہ بنا دے
تو ساقیِ میخانہ ہے میں رندِ بلا نوش
میرے لیے میخانے کو پیمانہ بنا دے
اک برقِ ادا خرمنِ ہستی پہ گرا کر
نظروں کو مری طور کا افسانہ بنا دے
یا دیدہ و دل میں مرے تو آپ سما جا
یا پھر دل و دیدہ ہی کو پیمانہ بنا دے
ہر دل ہے تری بزم میں لبریزِ مۓ عشق
اک اور بھی پیمانے سے پیمانہ بنا دے

اصغر کا معنی خیز تبسم اس کے لیے حیران کن تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اصغر اسے کس نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔

"میں دیکھ رہا ہوں' تم اور تمہاری رندی زیادہ دن ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔"

"میں نے آج سے رندی کو خیرباد کہہ دیا۔"

"ابھی تم نشے میں ہو' صبح بات ہو گی۔"

اصغر نے اسے بستر پر لٹا کر ایک ہلکی چادر اس کے اوپر ڈال دی اور کمرے سے نکل گئے۔

صبح ہوئی تو وہ اصغر کے روبرو اس طرح مؤدب بیٹھا تھا جیسے مرشد کے سامنے مرید بیٹھتا ہے۔ اس کے چہرے پر وہی جلال تھا جو سلوک کی منزلیں طے کرنے کے بعد ہوتا ہے۔ فضا میں وہی نور تھا جو رحمتِ خداوندی جوش میں آتی ہے تو ہوتا ہے۔

"مجھے سنبھالو۔ مجھے اپنے دامن میں پناہ دے دو۔ میرا ہاتھ تھام لو۔"

اصغر کچھ دیر اس کی بدلتی ہوئی حالت کو دیکھتے رہے پھر اس سے مخاطب ہوئے۔

"میرے مرشد عبدالغنی منگلوری ہیں۔ ان کے در پر جاؤ۔ وہ تمہاری رہنمائی کریں گے۔"

جگر اسی وقت منگلور روانہ ہوگیا۔ سرائے میں اترا تاکہ تھکن اتارنے کے بعد اطمینان سے پیر کی خدمت میں حاضر ہو۔

وہ یہاں پہلے بھی کسی سفر میں قیام کرچکا تھا۔ سرائے کے مالک سے واقفیت تھی۔ اس کے ذریعے سے چند احباب اور بھی اس کے واقف کار ہوگئے تھے۔ انہیں پتا چلا کہ جگر آیا ہوا ہے تو سب ملنے چلے آئے۔ جگر ہوں اور شراب نہ ہو۔ یہ کیسے ہوسکتا تھا۔ احباب اس کی پذیرائی میں مصروف ہوگئے۔ وہ پیتا رہا اور مدہوشی اس کے قدم چومتی رہی۔

اے اہلِ حقیقت مجھے آنکھوں پہ بٹھاؤ
طے کرکے چلا آتا ہوں میدانِ وفا میں

وہ حقیقت کی تلاش میں نکلا تھا، مجاز میں کھو گیا۔ رات بھر شاعری اور قہقہے شور مچاتے رہے۔ صبح کسی وقت آنکھ لگی۔ دن بھر سونے کے بعد شام ہوئی تو نادان دوست پھر جمع ہوگئے۔ وہ پھر دوستوں کے تقاضوں سے مجبور ہوگیا۔

جب کئی دن گزر گئے تو اچانک ایک دن اسے یاد آیا کہ وہ یہاں کیوں آیا تھا۔

خبر لے اپنی اے غارت گرِ ہوش
ہوا جاتا ہے تو بھی خود فراموش

اس نے اسی وقت غسل کیا، نئے کپڑے زیب تن کیے اور باہر نکلا کہ پیر کی قدم بوسی کے لیے حاضر ہو۔ دیکھا کہ ایک بزرگ، چند اصحاب کے ہمراہ اس کی طرف چلے آرہے ہیں۔ فراخ چہرہ، کشادہ پیشانی، بھری ہوئی داڑھی، میانہ قد۔ ململ کا لانبا کرتہ، مغلئی پاجامہ، سر پر دوپلی ٹوپی۔ کسی نے بتایا، یہی تو ہیں شاہ عبدالغنی منگلوری۔

"مجھے سنبھال لو۔" جگر نے پھر وہی نعرہ بلند کیا۔ جس کا ورد وہ کئی دن تک اصغر گونڈوی کی خدمت میں کرتا رہا تھا۔

"ہم تو سنگ بے نمک ہیں۔ تم شاعر ہو، اپنی رنگینیوں میں جاؤ۔ تمہیں وہیں لطف آئے گا۔" بزرگ نے کہا۔

جگر نے قدم پکڑ لیے۔ اس کے آنسو اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ بزرگ کو رحم آگیا۔ انہوں نے جھک کر جگر کو اٹھایا۔

"ہمارے ساتھ ہمارے گھر چلو۔"

عجیب منظر تھا۔ ایک رندِ بلا نوش، ایک صاحبِ کشف بزرگ کی ہمراہی میں، خود ان کی دعوت پر ان کے گھر جا رہا تھا۔

وہ ان بزرگ کا مہمان تھا۔ کئی ہفتے گزر گئے۔ زبان سے یہ کہنے کی ہمت نہیں تھی کہ کس لیے آیا تھا۔ رمضان آگیا۔ بالآخر وہ ہمت کرکے ان کے سامنے پہنچا۔

"الوداع پر آنا۔" بزرگ کا ارشاد ہوا۔

وہ آنکھیں جھکائے بیٹھا تھا، گردن جھکا کے اٹھ گیا۔ مرشد کا حکم تھا، اختلاف کی تاب کسے تھی۔

اب الوداع کا انتظار تھا۔ وقت جوں توں کاٹا۔ انتظار کا صحیح لطف اب اس پر کھلا تھا۔

نظر ہے وقفِ غمِ انتظار کیا کہنا
کھنچی ہے سامنے تصویرِ یار کیا کہنا
حریمِ حسن کے پردے اٹھے ہوئے ہیں جگر
یہی اگر ہے غمِ انتظار، کیا کہنا

الوداع کا دن آگیا۔ الوداع کی نماز پڑھی اور شاہ صاحب کے سامنے پہنچ گیا۔ ہمت اب بھی نہیں ہوئی کہ اظہارِ مطلب کرتا۔

"جاؤ بھائی، آرام کرو۔" شاہ صاحب نے فرمایا۔

وہ الٹے قدموں لوٹ آیا۔ اپنے بستر پر آکر لیٹ گیا اور سوچنے لگا کہ چشمِ کرم سے اب بھی محروم رہا۔ آخر اور کون سا وقت آئے گا۔ یہی سوچتے سوچتے نیند کے جھونکے آنے لگے اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ ایک روشنی تھی، جس کے درمیان وہ تیر رہا تھا۔ یہ روشنی بڑھتی گئی۔ پھر وہ بلند آواز سے کلمہ پڑھتا ہوا اٹھ بیٹھا۔

آنکھ کھلی تو شاہ منگلوری اس کے سامنے کھڑے تھے۔

"جاؤ بھائی، وقت آگیا ہے، وضو کرکے آؤ۔"

یہاں اٹھنے کی تاب کسے تھی۔ پورا بدن پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ بڑی ہمت کرکے اٹھا اور وضو کرکے ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے اپنے ہاتھ پر اسے بیعت کیا۔ چند نصیحتیں کیں اور اسے رخصت کردیا۔

مستانہ کر رہا ہوں رہِ عاشقی کو طے
لے جائے جذبِ شوق مرا اب جدھر مجھے

وہاں سے نکلنے کے بعد اس کی سیاحت پھر شروع ہوگئی۔ وہ اپنی توبہ پر چند دن ہی قائم رہ سکا۔ ایک مشاعرے میں دوستوں نے پھر اسے مجبور کردیا۔

اب تک پینے کے بعد اسے یہ فکر ہوتی تھی کہ اللہ کو کیا منہ دکھاؤں گا اب یہ فکر بھی ہونے لگی کہ پیر کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ ان کے سامنے نہ بھی گیا تو بھی انہیں خبر تو ضرور ہوجائے گی۔ وہ ہر بار توبہ کرتا ہر بار توڑ دیتا۔ پھر اس نے ہوش کی کشتی کو مدہوشی کی موجوں میں غرق کردیا۔ یہ سوچنا ہی چھوڑ دیا کہ کس نے کس سے وعدہ کیا تھا۔

اس نے خود کو سستی شراب کا عادی کرلیا تھا۔ بقول اس کے صرف اس لیے کہ پلانے والوں پر بوجھ نہ پڑے۔ اس

سہولت کا اس کے پرستار خوب خوب فائدہ اٹھا رہے تھے۔ ایک بوتل کے عوض اس سے رات رات بھر غزلیں سنتے۔ جہاں چاہتے اسے لیے پھرتے۔ اس نے بھی لنگر اٹھا لیا تھا۔ کٹی پتنگ بن گیا تھا۔ جس کے ہاتھ میں اس کی ڈور آجاتی، اچک لیتا۔ اس کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ روشن فاطمہ کی بے وفائی کا داغ اب تک اس کے دل پر تھا۔ جب وطن ہی چھوٹ گیا تو پھر غریب الوطنی کے دن کہیں بھی گزر جائیں۔ یادوں کے ہجوم میں، احباب کی بھیڑ میں۔ خود سے غافل، زمانے سے بے خبر۔ ایک شہر سے دوسرے شہر۔ اپنی دھن میں گھومتا پھر رہا تھا۔

گھومتا گھومتا ایک دن پھر اصغر گونڈوی کی محفل میں پہنچ گیا۔ انہوں نے پھر وہی جملہ دہرایا "کہیں بھی چلے جاؤ، لوٹ کر یہیں آؤ گے۔"

وہ مؤدب، سر جھکائے بیٹھا تھا اور اصغر صاحب کبھی مسکرا کر کبھی ڈانٹ کر اسے نصیحت کر رہے تھے۔

"یہ سب تمہارے شعر نہیں سنتے تمہارا گوشت کھاتے ہیں۔ تمہیں گھٹیا شراب پلا پلا کر اپنی محفلیں سجاتے ہیں اور پھر یکّے پر لاد کر یہاں چھوڑ جاتے ہیں۔ خدارا سنبھلو! یہ تمہارا مقام نہیں ہے۔"

کچھ دیر بعد وہ خود بھی رویا، اصغر کو بھی رلایا۔ جب کچھ دل ہلکا ہوا تو اٹھ کر کھڑا ہو گیا جیسے پھر کسی مہم پر جانے کی تیاری ہو۔

"اب کہاں چلے۔"

"دل گھبراتا ہے۔"

"جاؤ، مگر اب ہم نے کچھ اور سوچا ہے۔" اصغر نے کہا۔

انہوں نے یہ سوچا تھا کہ اگر جگر کی شادی کرا دی جائے تو اس کے مزاج میں ٹھہراؤ آجائے گا۔ اس کی آوارگی ختم ہو جائے گی۔ اس کی روح نیک ہے۔ وہ برا ہے نہیں، برائی کی طرف چلا گیا ہے۔ ذمے داری پڑے گی تو راہِ راست پر آجائے گا۔ اکثر بزرگ یہی سوچتے ہیں۔ انہوں نے بھی اگر یہی سوچا تو کیا غلط سوچا۔

ان کی ایک سالی تھی جس کا نام نسیم تھا۔ اصغر نے سوچا جگر کی شادی نسیم سے کرا دی جائے۔ اس طرح جگر کا گھر بھی بس جائے گا اور وہ ان کی نگرانی میں بھی رہے گا۔ دراصل وہ جگر سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔ اس محبت کا تقاضا تھا کہ جگر زیادہ سے زیادہ ان کے قریب رہے۔ یہ رشتے داری انہیں یہ موقع دے سکتی تھی۔

انہوں نے اپنی سسرال میں بات کی۔ ان کی توقع کے عین مطابق اس رشتے کی مخالفت ہوئی لیکن انہوں نے کسی نہ کسی طرح سب کو تیار کر ہی لیا۔ جگر کی طرف سے انہیں فکر نہیں

غزل

شرما گئے لجا گئے دامن چھڑا گئے
اے عشق مرحبا، وہ یہاں تک تو آگئے
سب کچھ لٹا کے راہِ محبت میں اہلِ دل
خوش ہیں کہ جیسے دولتِ کونین پا گئے
صحنِ چمن کو اپنی بہاروں پہ ناز تھا
وہ آگئے تو ساری بہاروں پہ چھا گئے
اب کیا کروں میں فطرتِ ناکامِ عشق کو
جتنے تھے حادثات مجھے راس آگئے

○☆○

تھی۔ وہ ان کی خواہش کو ٹھکرا نہیں سکتا تھا۔

اب انہیں جگر کا انتظار تھا کہ دیکھو کب پھیرا لگتا ہے۔ ایک دن اسے ایک تانگے والا اصغر کے گھر چھوڑ کر چلا گیا۔

"میں یہاں تمہارے لیے کیا کیا جتن کر رہا ہوں اور تم ہو کہ اپنی حرکتوں سے باز ہی نہیں آتے۔"

جگر حسبِ معمول سر جھکائے بیٹھے تھے۔

"میں نے نسیم سے تمہارا رشتہ طے کر دیا ہے۔" اصغر نے کہا۔

"اچھا۔"

"کیا اچھا۔ تم تیار بھی ہو یا نہیں؟"

"آپ کیا کہتے ہیں۔"

"مجھے کیا کہنا ہے۔ میں نے تو یہی بہتر سمجھا۔"

"جیسا حکم۔"

"لیکن تمہیں اپنی عادتیں بدلنی ہوں گی۔"

"ٹھیک ہے۔"

"شراب پیتے رہے تو گھر نہیں چلے گا۔"

"چھوڑ دوں گا۔"

جگر کے پاس کیا تھا جو شادی پر خرچ کرتے۔ اصغر نے اپنے خرچ پر نہایت سادگی سے ان کی شادی کر دی۔

شادی کے بعد کچھ دن تو یہ معلوم ہوا جیسے وہ بدل گیا ہے لیکن جلد ہی اپنی دنیا میں واپس لوٹ گیا۔ کئی کئی دن گھر سے غائب رہنا اس کا معمول بن گیا۔ جو کچھ کماتا، پیمانے میں غرق کر دیتا۔

نسیم ایک باشرع گھرانے کی لڑکی تھی۔ اسے جگر کی ہر ادا پسند تھی لیکن وہ ان کی شراب کو پسند نہیں کر سکتی تھی۔ وہ بہانے بہانے سے اپنی ناخوشی کا اظہار کر دیا کرتی تھی۔ جگر کو

اس کی ہر بات تسلیم بھی تھی۔ اس کے سامنے روتا بھی تھا، اپنے آپ کو برا بھلا بھی کہتا تھا، گڑگڑا کر دعائیں بھی کرتا تھا لیکن اسے خود پر اختیار نہیں تھا۔ وہ خود پر قابو پا بھی لیتا تو اس کے پرستار مجبور کردیتے۔ اس نے کئی مرتبہ توبہ کی لیکن ہر مرتبہ توبہ توڑنے کے لیے توبہ کی۔

نسیم نے کہنا چھوڑ دیا تھا لیکن وہ خوش بھی نہیں تھی۔ اس کی ناخوشی کا علم اس کی بڑی بہن یعنی اصغر کی بیوی کو بھی تھا۔ نسیم اپنا دکھڑا بڑی بہن ہی کے سامنے روتی تھی۔ اصغر الگ اپنے آپ کو مجرم سمجھنے لگے تھے۔ ان کا اندازہ غلط نکل گیا تھا۔ وہ سمجھ رہے تھے شادی کے بعد جگر شراب چھوڑ دے گا لیکن یہ ان کا خیال تھا۔ شہرت کے ساتھ ساتھ اس کی شراب نوشی میں اضافہ ہی ہوتا چلا جارہا تھا۔ یہ چیز ایسی تھی جس نے جگر کی تمام خوبیوں کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ جگر جیسا مہذب رند اردو شاعری کو کبھی نصیب نہیں ہوگا۔ وہ نشے کی حالت میں بھی انسانیت اور وضع داری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔ کسی کا دکھ اس سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ کسی کی برائی یا عیب نکالنا تو گویا اسے آتا ہی نہیں تھا۔ ایسا راست کردار تھا وہ رند لیکن شراب تو شراب ہے۔ نسیم کا کہنا تھا کہ ان میں کوئی خوبی نہ ہوتی وہ انہیں برداشت تھے لیکن ان کی شراب نوشی برداشت نہیں ہوتی۔

ہوتے ہوتے یہ ہوا کہ نسیم نے ان کے برتن الگ کردیے۔ ان کا بستر الگ ہوگیا۔ اس نے ذرا بھی شکایت نہیں کی بلکہ یہی کہتا رہا "نسیم! میں ہوں بھی اس قابل۔ تم بیوی ہوکر مجھ سے اتنی خفا ہو تو میرا اللہ مجھ سے کتنا خفا ہوگا۔"

"جب اسے اتنا بُرا سمجھتے ہیں اور اللہ کی ناراضگی کا اتنا ڈر ہے تو چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔"

"بس آج سے ختم۔ اب نہیں پیوں گا۔"

دو ایک روز اس توبہ پر عمل بھی ہوتا لیکن پھر کسی سفر سے لوٹ کر آتے یا کسی مشاعرے سے واپسی ہوتی تو ظالم شراب ہے ارے ظالم شراب ہے، کہتے ہوئے گھر میں داخل ہوتے۔

یہ کشیدگی اتنی بڑھی کہ نباہ کا کوئی راستہ باقی نہیں رہا۔ نسیم اب صرف اس شرط پر جگر کے ساتھ رہنے پر تیار تھیں کہ وہ شراب چھوڑ دیں اور یہ ممکن نہیں تھا۔

ایک روز اصغر کی بیوی اور نسیم کے درمیان دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ اصغر کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ معاملہ کس حد تک پہنچ چکا ہے۔ دونوں بہنیں کسی نتیجے تک پہنچ گئیں تو نسیم اپنے گھر چلی گئیں۔

"کیا کہہ رہی تھی نسیم۔ آج بہت پریشان معلوم ہو رہی تھی۔"

"جگر کی طرف سے بہت پریشان ہے۔ محبت بھی بہت کرتی ہے اور ان کی رندی بھی اسے برداشت نہیں۔"

"بیگم، ہم خود بہت شرمندہ ہیں۔ نسیم سے آنکھ ملانے کی ہمت نہیں ہوتی۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم نے ہی اسے پھنسوا دیا۔ جگر جیسا شریف النفس آدمی شراب چھوڑ کیوں نہیں دیتا۔"

"ان سے شراب نہیں چھوٹنے کی۔"

"ہاں، مگر اب کیا ہو سکتا ہے؟"

"ہو تو سکتا ہے۔ اس پر میں نے غور بھی کیا ہے بلکہ نسیم پر بھی اپنا خیال ظاہر کردیا ہے۔ اگر آپ بھی تیار ہوجائیں تو میری تجویز معقول ہے۔"

"بات ماننے کی ہوئی تو ضرور مانیں گے۔"

"میں اولاد کی نعمت سے محروم ہوں اور اب کوئی امید بھی نہیں ہے۔ آپ مجھے طلاق دے دیں۔ جگر سے کہیں وہ نسیم کو طلاق دے دے۔ پھر آپ نسیم سے شادی کرلیں۔ شاید اللہ تعالیٰ آپ کو اس سے اولاد دے دے۔"

"یہی تھی آپ کی تجویز۔ دو گھر برباد کروں تو اولاد پاؤں۔ سبحان اللہ۔"

"نسیم کا گھر آباد ہی کب ہے۔ وہ جگر سے خوش نہیں ہے۔"

"اور آپ؟"

"اسے آپ بہن کی خاطر میرا ایثار کہہ سکتے ہیں ورنہ میں آپ سے بہت خوش ہوں۔"

"میں اپنی خوشی کے لیے تمہیں برباد نہیں کرسکتا۔"

"میری بربادی کہاں سے آگئی؟ میں تو گزار چکی۔ میں نے بہت عیش دیکھ لیے تمہارے گھر میں۔"

"کچھ بھی ہو، میں اس کے لیے تیار نہیں۔"

"طلاق مانگنا میرا حق ہے۔ میں خود طلاق مانگ رہی ہوں۔"

ان کی بیوی نے اتنی ضد کی اور اس سنجیدگی سے کی کہ وہ مجبور ہوگئے۔

"اچھا، میں جگر سے بات کروں گا۔ کیا خبر وہ طلاق دے بھی یا نہیں۔"

"آپ کہہ کر تو دیکھیں۔"

اصغر نے جگر کو بُلا بھیجا۔ وہ حسب معمول سر جھکا کر خاموش بیٹھ گئے۔ وہ اصغر کے سامنے اسی طرح مؤدب بیٹھے رہتے تھے، چاہے گھنٹوں گزر جائیں۔ ہوں، ہاں سے زیادہ بات

ہی نہیں کرتے تھے۔
"جگر کیا نسیم تم سے خوش نہیں ہیں؟"
"کوشش تو بہت کرتا ہوں لیکن شاید خوش نہیں ہیں۔"
"جب کوئی خوش نہیں ہے تو زبردستی ساتھ رکھنے کا کیا فائدہ؟ آزاد کردو اسے۔"
"یہ حکم ہے آپ کا؟"
"مشورہ ہے۔"
"بہتر ہے۔ ایسا ہی ہوگا۔"
جگر نے کوئی بحث نہیں کی، کچھ دیر نہیں لگائی حالانکہ وہ طلاق دینے پر تیار نہیں تھا لیکن اصغر کا حکم تھا جنہیں وہ مرشد کا درجہ دیتا تھا۔
جگر نے نسیم کو طلاق دے دی اور عدت گزارنے کے بعد اصغر نے اپنی بیوی کو طلاق دے کر نسیم سے شادی کرلی۔
مرشد کا حکم ضرور تھا۔ جگر نے اسے تسلیم بھی کیا لیکن اس کے قلب پر جو چوٹ لگی اس نے اسے بے حال کردیا۔ وہ گونڈہ سے نکل کھڑا ہوا۔
یہ اس کی زندگی کا بدترین دور تھا۔ جتنی شراب اس نے اس دور میں پی، کبھی نہیں پی ہوگی۔ گھٹیا شراب سے لے کر اسپرٹ تک، جو ملا اس نے حلق سے اتار لیا۔
جگر کی بادہ کشی ان دنوں معاذ اللہ
جب آپ دیکھیں گے غرق شراب دیکھیں گے
وہ سلطان پور کی سرائے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ غلام محمد آغا عینک فروش بھی وہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ دونوں میں پرانی واقفیت تھی۔
آغا صاحب کو اس کی موجودگی کا علم نہیں تھا لیکن ایک دن انہوں نے سرائے میں کچھ لوگوں کو باتیں کرتے ہوئے سنا۔ وہ کہہ رہے تھے "ایک عجیب مولوی آیا ہوا ہے جو اعلانیہ شراب پیتا ہے۔ جگر کی داڑھی کی وجہ سے وہ اسے مولوی سمجھ رہے تھے۔
آغا کو شک ہوا کہ مولوی کے پردے میں کہیں جگر تو نہیں۔ وہ اسے دیکھنے گئے اور ان کا اندازہ درست نکلا۔ وہ کمبل اوڑھے لیٹا تھا۔ آغا نے آواز دی اور اس نے آنکھ کھول کر آغا کی طرف دیکھا۔
"جگر! کس حال میں پڑے ہو۔"
اے کاش وہ حسرت زدۂ طور کو ملتی
جس آنکھ سے ہم حسن بتاں دیکھ رہے ہیں
جگر نے شعر پڑھا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ آغا کی طرف دیکھا اور پھر اسے پہچان کر اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

فردیات

اپنا زمانہ آپ بناتے ہیں اہلِ دل
ہم وہ ہیں کہ جن کو زمانہ بنا گیا

میرا کمالِ شعر بس اتنا ہے اے جگر
وہ مجھ پہ چھا گئے میں زمانے پہ چھا گیا

ترک تعلقات کو مدت گزر چکی
ظالم ترے خیال سے پھر بھی مفر کہاں

وہ چیز کہتے ہیں فردوسِ گم شدہ جس کو
کبھی کبھی تری آنکھوں میں پائی جاتی ہے

جہلِ خرد نے دن یہ دکھائے
گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے

ان کی جفا پہ ترکِ وفا کررہا ہوں میں
سائے کو زندگی سے جدا کررہا ہوں میں

بے ساختہ آج ان کے بھی آنسو نکل آئے
دیکھا نہ گیا حالِ فقیرانہ کسی کا

ہم جب نہ ہوں گے تو کیا رنگِ محفل
کسے دیکھ کر آپ شرمایئے گا

کبھی شاخ و سبزہ برگ پر کبھی غنچہ و گل و خار پر
میں چمن میں چاہے جہاں رہوں مرا حق ہے فصلِ بہار پر

تصور میں ہے کچھ ایسا تری تصویر کا عالم
کہ جیسے اب لبِ نازک سے کچھ ارشاد ہوتا ہے

○☆○

"تمہیں تو بخار ہے۔"
"مدہوشی کا یہی تو فائدہ ہے۔ مجھے بخار ہے اور مجھے معلوم ہی نہیں۔"
"میں اعظم گڑھ جارہا ہوں۔ چلو گے میرے ساتھ۔"
"پوچھتے کیوں ہو بھائی۔ کچھ دن وہاں بھی سہی۔ ایک داغ وہاں سے بھی لے کر اٹھیں گے۔"
وہ آغا عینک فروش کے ساتھ اعظم گڑھ آگیا۔ یہاں ایک صاحب اقبال سہیل تھے جن کا معیارِ شعر بہت بلند تھا۔ مشکل ہی سے کسی کو شاعر تسلیم کرتے تھے۔ آغا عینک فروش جگر کو ان سے ملوانے لے گئے۔ جگر کی آمد کا سن کر چند مقامی شعرا بھی وہاں پہنچ گئے۔
جگر نے تازہ غزل کہی تھی، وہی سنادی۔
اس درجہ بے قرار تھے دردِ نہاں سے ہم

کچھ دور آگے بڑھ گئے عمرِ رواں سے ہم
کب تک رہیں گے دور ترے آستاں سے ہم
اب پہنچے شرط باندھ کے عمرِ رواں سے ہم
اے چارہ ساز ! حالتِ دردِ نہاں نہ پوچھ
اک راز ہے جو کہہ نہیں سکتے زباں سے ہم
بیٹھے ہی بیٹھے آگیا کیا جانے کیا خیال
پہروں لپٹ کے روئے دلِ ناتواں سے ہم
بے تابیوں نے کام دیا دستِ ناز کا
آخر لپٹ کے سوگئے دردِ نہاں سے ہم

محفل پر وجد طاری ہوگیا۔ کچھ اس کے ترنم پر مرمٹے تھے کچھ اس کی حالت پر۔ کچھ ایسے بھی تھے جنہیں اس کے شاعر ہونے میں شک تھا۔

"ایسا سُریلا شاعر ہم نے تو آج تک دیکھا نہیں۔ ہندوستان بھر میں ایسا ترنم کسی کا نہیں ہوگا۔"

"اسی لیے تو ہم کہتے ہیں' اس ترنم کا فائدہ اٹھا کر کوئی اسے غزلیں لکھ کر دے رہا ہے۔"

"ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔ طرحی مشاعرہ رکھ کر دیکھ لو۔ ہوجائے گی آزمائش۔ دیکھ لیں گے وہاں کتنے پانی میں ہیں۔"

فیصلہ ہوگیا۔ طرح دے دی گئی۔ مشاعرے کی تاریخ کا اعلان بھی ہوگیا۔

جگر طرحی مشاعروں کا مخالف تھا۔ وہ کہتا تھا طرح پر شعر کہلوانا بلبل کا گلا گھونٹنے کے مترادف ہے لیکن یہاں مسئلہ کچھ اور تھا۔ لہٰذا اسے غزل کہنا پڑی۔

اس نے غزل کہی اور ایسی کہی کہ اعظم گڑھ میں کوئی ایسا نہیں تھا جس نے اس کے ہاتھ نہ چومے ہوں۔ اور شاید اسی مشاعرے سے اس کی شہرت کا آغاز بھی ہوا اور اسے یہ شوق بھی ہوا کہ وہ مشہور ہو۔ غزل اور پھر اس کا ترنم۔

کیا آگیا خیال دلِ بے قرار میں
خود آشیاں کو آگ لگا دی بہار میں
محشر میں عرضِ شوق کی امید کیا کروں
دل ہی تو ہے رہا نہ رہا اختیار میں
دستِ جنونِ عشق کی گل کاریاں نہ پوچھ
ڈوبا ہوا ہوں سر سے قدم تک بہار میں
رگ رگ میں دل ہی دل میں تڑپ دردِ عشق کی
محشر بنا ہوا ہوں تمنائے یار میں
تھم تھم کے دل سے چھیڑ ہو تیرِ نگاہ کی
کیا لطف جب ہی نہ رہے اختیار میں

وہ تو جوگی تھا۔ ایک جگہ اس کا دل لگتا نہیں تھا۔ طبیعت میں عجیب سا اضطراب تھا جو اسے ایک جگہ ٹکنے نہیں دیتا تھا۔ پاؤں اٹھ جاتے تو پھر بڑی سے بڑی ترغیب اسے روک نہیں سکتی تھی۔ اعظم گڑھ میں ابھی لوگوں کا دل اس سے بھرا نہیں تھا کہ ایک دن اس نے عینکوں کا بکس اٹھایا اور اعظم گڑھ سے نکل گیا۔ اس طرح نکلا کہ آغا عینک فروش کو بھی خبر نہ ہوئی۔

مختلف شہروں کی خاک چھانتا ہوا ایک دن کان پور پہنچ گیا۔ شہر میں مشاعرہ تھا۔ اس نے بھی سستی سی ایک سرائے میں قیام کیا۔ چشموں کا بکس وہاں رکھا اور مشاعرے میں پہنچ گیا۔ کچھ لوگ اسے جانتے تھے کچھ نہیں جانتے تھے۔ بڑی مشکل سے اپنا نام شعرا کی فہرست میں شامل کرایا اور ایک طرف بیٹھ گیا۔ اس کی باری آئی اور وہ جھومتا ہوا پہنچ گیا۔ اس کے ہونٹوں پر وہی دل فریب مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی جو ایسے موقعوں پر اس کے ہونٹوں کا حسن بن جاتی تھی۔ دراصل اسے معلوم ہوتا تھا کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ وہ جادو کرے گا اور لوگ تڑپنے لگیں گے۔ کہیں اور ایسا ہوا ہو یا نہیں لیکن کان پور میں ضرور ہوا۔ اس نے مطلع پڑھا۔

فلک کے جور زمانے کے غم اٹھائے ہوئے
ہمیں بہت نہ ستاؤ کہ ہیں ستائے ہوئے

اس کے بعد بہ مشکل ایک شعر اور پڑھا ہوگا کہ جادو کام کرگیا۔ مقامی شاعر حسنی کان پوری نے جھرجھری سی لی اور ان پر وجد طاری ہوگیا۔ کچھ دیر بیٹھے بیٹھے جھومتے رہے اور پھر باقاعدہ فرش پر لوٹنے لگے۔ بزمِ مشاعرہ' قوالی کی محفل بن گئی۔ جس طرح قوال ایک شعر کی تکرار کرتے رہتے ہیں اسی طرح جگر کو بھی مجبور کیا جارہا تھا کہ وہ ایک شعر کو بار بار پڑھے۔ بلا مبالغہ ایک ایک شعر کو اس نے دس دس مرتبہ پڑھا۔ جب پڑھنے اور حال کھیلنے والا دونوں بے دم ہوگئے تب کہیں یہ سلسلہ تھما۔ اس نے ایک ہی مشاعرے سے کان پور فتح کرلیا۔

شاعروں نے اس کے قدموں میں پڑاؤ ڈال دیا۔ "کوئی پلا رہا ہے پیے جارہا ہوں میں" ایسے ایسے ثقہ حضرات جنہوں نے کبھی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا تھا' اس کی دلداری کے لیے شراب لے کر آرہے تھے۔ وہ سر سے پاؤں تک شراب میں ڈوب گیا۔

ایسا شرابی کسی نے کاہے کو دیکھا تھا۔ مدہوشی میں بھی مجال ہے کوئی بات خلافِ تہذیب منہ سے نکل جائے یا وضع داری میں فرق آجائے۔ اس کے اعلیٰ کردار نے سب کا دل موہ لیا تھا۔

ایک روز ایک نوجوان اس سے ملنے آیا۔ بے روزگار تھا اور نہایت پریشان۔

"جگر صاحب، آپ کے بہت تعلقات ہیں۔ میری نوکری کا بندوبست کروا دیجیے۔"

"میاں نوکری میں کیا رکھا ہے، تجارت کرو تجارت۔"

"تجارت کے لیے رقم کی ضرورت ہوتی ہے اور میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔"

"اس کی تم فکر مت کرو۔"

اس کے لیے شیشے کا نہایت خوب صورت بکس بنوایا اور قیمتی چشمے اس کے حوالے کیے "لو میاں، اسے بیچ کر روزی پیدا کرو۔"

وہ بھی غالباً انہی کی طرح پردیسی تھا کہ رہنے کا ٹھکانا تک نہیں تھا۔ اسے اپنے پاس ہی ٹھہرالیا۔

اس نوجوان نے جب یہ دیکھا کہ یہ سیدھے آدمی ہیں، ہر وقت نشے میں بھی رہتے ہیں تو اس کی نیت خراب ہوگئی۔ ایک دن اس نے اپنے ساتھ ساتھ ان کا بکس بھی اٹھایا۔ کچھ رقم رکھی تھی وہ اڑائی اور غائب ہوگیا۔

احباب ملنے آئے تو جگر پریشان بیٹھا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ دوستوں سے اپنے ایک دوست کی شکایت کیسے کرے۔ دوستوں نے خود ہی بھانپ لیا۔

"آپ کے وہ دوست نظر نہیں آرہے ہیں جن کو آپ نے کاروبار کرایا تھا۔ کل بھی نہیں تھے۔"

"ہاں صاحب، میں خود ان کی خیریت کی طرف سے پریشان ہوں۔ میرا بھی کچھ سامان لے گئے ہیں۔ لوٹ کر نہیں آئے۔"

"کیا سامان لے گئے ہیں؟"

"کچھ نہیں۔ کچھ روپے تھے۔ ایک گھڑی تھی۔ ایک شیروانی نئی سلوائی تھی۔ چشموں کا بکس تھا۔"

"سب ہی کچھ تو لے گئے۔ آپ کہہ رہے ہیں، کچھ نہیں۔"

"وہ تو شکل ہی سے چور لگتا تھا۔ اب نہیں آنے والا۔" ایک اور صاحب نے کہا۔

کوئی کچھ کہہ رہا تھا کوئی کچھ۔ جگر کے بشرے سے معلوم ہورہا تھا کہ وہ سخت اذیت میں ہے۔ اسے یہ باتیں ناگوار گزر رہی ہیں۔ جب لوگ بہت برا بھلا کہنے لگے تو اس سے نہیں رہا گیا۔

"بس جناب بس۔ جو شخص سامنے نہیں ہے اس کی برائی کرنا آپ لوگوں کو زیب نہیں دیتا۔ آپ کو یا مجھے کیا معلوم اس کی کیا مجبوری تھی۔ کیا خبر اس نے یہ کام کس مجبوری سے کیا۔"

احباب سوائے چپ ہوجانے کے کیا کرسکتے تھے۔ ہاں یہ کرسکتے تھے جگر کی مدد کردیں۔ اس نے پھر نیا بکس بنوالیا۔

ایک دن غزل کہتے ہوئے اصغر کی یاد آگئی اور اس سے یہ شعر سرزد ہوگیا۔

کیا دن تھے جگر وہ بھی جب صحبتِ اصغر میں
مسرور طبیعت تھی مسرور مرا دل تھا

چند دن نہیں گزرے تھے کہ ایک غزل میں یہ شعر ہوگیا۔

تجھ سے وحشی ترے غافل نہیں ہونے پاتے
روز آکر کوئی زنجیر ہلا دیتا ہے

پے در پے ہونے والے ان اشاروں نے اس کا دل اچاٹ کردیا۔ اسے احساس ہوا جیسے کہیں سے بلاوا آیا ہے۔ وہ ایک رات کان پور سے روانہ ہوکر اصغر کی بارگاہ میں پہنچ گیا۔ اسی طرح مؤدب، آنکھیں نیچی، سر جھکائے مرشد و مولائی کے حضور مرید عاجز۔

"خوب سیاحت ہورہی ہے۔" اصغر نے کہا۔

"ہوں۔"

"جگر کچھ بولا کرو۔ دوستوں میں تو خوب چہکتے ہو۔"

اس بات کا جگر کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اصغر نے پھر بات کو آگے بڑھایا "چلو نہ بولا کرو مگر آتو جایا کرو۔ اب کے بہت دن میں آئے۔ ایک رسالے میں تمہاری غزل دیکھی تھی۔ بہت اچھی غزل تھی مگر یہ مشاعرے بازی کم کردو ورنہ تمہارے نادان دوست تمہیں شراب پلا پلا کر مار دیں گے۔"

"اچھا۔"

"شاہ عبدالغنی قدس سرہ کی طرف گئے تھے؟"

"کس منہ سے جاؤں؟ شراب تو چھوٹتی ہی نہیں۔"

"تم اتنے بے اختیار کیوں ہو؟"

"آپ بھی تو دعا نہیں کرتے۔ آپ چاہتے ہی نہیں۔ آپ کو میری فکر کیوں نہیں ہے؟"

وہ آ ضرور گیا تھا لیکن اس طرح گھبرایا ہوا تھا جیسے کوئی زبردستی اسے یہاں لے کر آیا ہے اور ابھی یہاں سے اٹھ جائے گا۔

کھانا تیار تھا لیکن جگر نے معذوری ظاہر کی۔ اصغر بگڑے بھی لیکن جگر بے دلی سے در و دیوار تکتا رہا اور پھر اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

"جاؤ گے؟"

"پھر آؤں گا۔"

یہاں بیٹھ کر اکھڑا اکھڑا تو وہ ہمیشہ رہتا تھا لیکن آج اسے

یہاں پہنچتے ہی نسیم کی یاد آگئی تھی۔ نسیم جسے وہ کبھی نسیم جگر لکھتا تھا' اب اصغر کی بیوی تھی۔ وہ ابھی اس کی یادوں کے بھنور سے نکل نہیں سکا تھا۔ بس اب وہ یہاں مزید نہیں رک سکتا تھا۔

اب کے جو گیا تو بدایوں پہنچ گیا۔ یہاں بھی ایک سرائے میں ٹھہر گیا۔ ابھی اس کی اتنی شہرت نہیں ہوئی تھی کہ لوگ اسے دیکھتے ہی پہچان لیتے۔

بدایوں شعرا کا گڑھ تھا۔ آئے دن مشاعرے ہوتے تھے۔ وہ بھی ایک مشاعرے میں بن بلایا مہمان بن کر پہنچ گیا۔ جادوگر نے جادو دکھایا۔ دوسرے ہی دن قدر دانوں کا ہجوم لگ گیا۔ بدایوں کے جتنے استاد شعرا تھے' انہوں نے اسے سر آنکھوں پر بٹھایا۔

بدایوں کے قیام نے اسے بہت شہرت دی تھی۔ یہاں اس نے تین سال گزارے۔ بدایونی شعرا کے ساتھ بیرونی مشاعرے پڑھے اور اس کی شہرت پھیلنے لگی۔ اب اس کا نام مشاعروں کی کامیابی کی ضمانت سمجھا جانے لگا تھا۔

جھانسی سے دعوت نامہ آیا ہوا تھا۔ بہت اصرار کرکے بلایا گیا تھا لہٰذا وہ بدایوں سے نکلا' جھانسی پہنچ گیا۔

جگر سے پہلے یہاں ایک مولوی صاحب آئے ہوئے تھے۔ ان کے وعظوں کی بڑی دھوم مچی ہوئی تھی لیکن جگر کے پہنچتے ہی ان کی مجلسیں پھیکی پڑ گئیں۔ جگر کی شان میں جگہ جگہ مشاعرے ہو رہے تھے اور لوگ جوق در جوق اسے سننے کے لیے پہنچ رہے تھے۔ اس کے پڑھنے کا خاص انداز' عاشقانہ اشعار اور اس کی وضع قطع ہر جگہ مرکزِ نگاہ بن جاتی تھی۔ یہاں بھی دھوم مچی ہوئی تھی۔ مولوی صاحب اس صورتِ حال سے بے حد برافروختہ تھے۔ اب وہ اپنی تقریروں میں جگر کے خلاف خوب زہر اگلنے لگے تھے۔ انہیں عوام سے سخت شکایت تھی کہ وہ اس فاسق و فاجر شاعر کا کلام سننے کیوں جاتے ہیں لیکن لوگوں پر کوئی اثر ہی نہیں ہوتا تھا۔

ایک روز ایک ایسی جگہ مشاعرہ تھا جہاں سے مولوی صاحب کا گھر قریب تھا۔ وہ اس مشاعرے کو روک تو نہیں سکتے تھے لیکن گھر کی کھڑکیاں بند کرکے بیٹھ گئے۔

اس مشاعرے کی صدارت جگر کو کرنی تھی۔ وکیل مبارک علی کا بیٹا انہیں لینے کے لیے گیا۔

"بھائی' ایسے کیا مزہ آئے گا۔ ذرا حلق تر کرلیں پھر چلتے ہیں۔" جگر نے کہا اور پینے بیٹھ گیا۔

شراب کم تھی اور پیاس زیادہ "چلو میکدے چلتے ہیں" جگر نے کہا اور اسے لے کر ایک شراب خانے میں آگئے۔

نشہ تو گھر پر ہی ہو گیا تھا' مے خانے میں آکر بے تحاشا پی گئے۔ بہکنے لگے۔ غضب یہ ہوا کہ میزبان نے وقت گزاری کے لیے بحث چھیڑ دی۔ بحث یہ تھی کہ ہر انسان کو بالآخر خاک میں مل جانا ہے۔

"جب ایک دن خاک میں مل کر خاک ہو جانا ہے تو پھر آج ہی کیوں نہیں۔" جگر نے کہا اور بے اختیار زمین پر لوٹنا شروع کردیا۔

میزبان روکتا رہا اور وہ لوٹتے رہے۔ تھوڑی دیر میں حالت یہ ہو گئی کہ پہچاننا مشکل تھا۔ پورا بدن مٹی سے اٹ گیا۔ سفید کپڑے خاکی ہو گئے۔

خدا خدا کرکے یہ رقصِ وحشت تھما۔ وہ اسی حالت میں مشاعرہ گاہ کی طرف چل دیے۔

اس کا یہ روپ بھی لوگوں کو بھا گیا۔ ایسا شاعر جسے اپنے تن بدن کا ہوش نہیں۔ اسی لیے تو اس کی شاعری میں اتنا درد ہے۔ اہلِ مشاعرہ کی تمام ہمدردیاں اس کے ساتھ ہو گئیں۔ جگر زندہ باد کے نعرے لگنے لگے۔

جگر کو سننے کے لیے لوگ ایسے بے تاب تھے کہ کسی دوسرے شاعر کو سننا نہیں چاہتے تھے۔ شاعر آتے رہے اور گھاس کی طرح کٹتے رہے۔ آخر جگر کا نمبر آگیا۔

غزل

آئی جب اُن کی یاد تو آتی چلی گئی
ہر نقشِ ماسوا کو مٹاتی چلی گئی
ہر منظرِ جمال دکھاتی چلی گئی
جیسے انہیٰ کو سامنے لاتی چلی گئی
ہر واقعہ قریب تر آتا چلا گیا
ہر شے حسین تر نظر آتی چلی گئی
ویرانۂ حیات کے اِک اِک گوشے میں
جوگن کوئی ستار بجاتی چلی گئی
جتنا ہی کچھ سکون سا آتا چلا گیا
اتنا ہی بے قرار بناتی چلی گئی
کیا کیا نہ حُسنِ یار سے شکوے تھے عشق کو
کیا کیا نہ شرمسار بناتی چلی گئی
میں تشنہ کام شوق تھا پیتا چلا گیا
وہ مست انکھڑیوں سے پلاتی چلی گئی
پھر میں ہوں اور عشق کی بے تابیاں جگر
اچھا ہوا وہ نیند کی ماتی چلی گئی

آج جگر تھا بھی خوب رنگ پر۔

جب تو کچھ ظرف ہے اے دل ترے پیمانے کا
راز مے خانے سے باہر نہ ہو مے خانے کا
عرصۂ حشر کہاں یہ دلِ برباد کہاں
وہ بھی چھوٹا سا ہے ٹکڑا اسی ویرانے کا
جذبۂ شوق نے دم لینے کا موقع نہ دیا
شمع منہ دیکھتی ہی رہ گئی پروانے کا

جگر کی آواز آسمان میں جگہ بنا رہی تھی۔ مولوی صاحب کے کانوں تک بھی پہنچ رہی تھی۔ جادو نے اپنا کام دکھایا۔ مولوی صاحب کچھ دیر تو بے چینی سے ٹہلتے رہے، پھر گھر سے باہر آگئے۔ سوز میں ڈوبی ہوئی آواز نے ان کے دل کو کھینچ لیا۔ انہوں نے قدم بڑھائے اور اس طرح مشاعرے کی طرف چل دیے جیسے کوئی اسلام قبول کرنے آتا ہو۔

مشاعرے میں پہنچ کر سیدھے اسٹیج کی طرف بڑھے اور جگر کے بالکل برابر بیٹھ کر جھومنے لگے۔

جگر ایک ایک کرکے غزلیں پڑھتا جارہا تھا اور مجمع پر وجد کا عالم طاری تھا۔

جب جگر اپنا کلام سنا چکا تو اس کی نظر مولوی صاحب پر پڑی۔

"حضرت شراب حرام ہے، سب جانتے ہیں لیکن جہاں تک آپ کی خاص ذات کا تعلق ہے، شاید یہ آپ کے لیے حلال کردی گئی ہو۔" مولوی صاحب نے کہا۔

جگر نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا اور جیب سے بوتل نکال کر انہیں پیش کی "بسم اللہ۔"

"حضور، میرا ظرف اس قابل نہیں کہ اسے ہاتھ بھی لگا سکوں۔" مولوی صاحب نے کہا۔

پھر سب نے دیکھا کہ جگر ان کے سامنے بیٹھ کر پی رہا ہے اور مولوی صاحب نفرت سے اٹھ کر نہیں گئے۔

"جب مولوی صاحب نے مجھ پر اتنا کرم کیا ہے تو ایک غزل میں خاص ان کے لیے پیش کرتا ہوں۔"

مشاعرہ ختم ہوچکا تھا لیکن جگر کے اس اعلان کے بعد جو جہاں تھا وہیں بیٹھ گیا۔ جگر نے غزل پیش کی۔

کثرت میں بھی وحدت کا تماشا نظر آیا
جس رنگ میں دیکھا تجھے، یکتا نظر آیا
جب اس رخِ پر نور کا جلوہ نظر آیا
کعبہ نظر آیا نہ کلیسا نظر آیا
قربان تری شانِ عنایت کے دل و جاں
جب آنکھ کھلی، قطرہ بھی دریا نظر آیا
ہر رنگ ترے رنگ میں ڈوبا ہوا نکلا
ہر نقش ترا نقشِ کفِ پا نظر آیا
ہر جلوے کو دیکھا ترے جلووں سے منور
ہر بزم میں تو انجمن آرا نظر آیا

مولوی صاحب نے ایک رند سے تصوف میں ڈوبی ہوئی غزل سنی تو چودہ طبق روشن ہوگئے۔ علمِ مکتبی دھرا کا دھرا رہ گیا۔ جگر انہیں نیم بسمل چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

کسی مشاعرے میں اس کی ملاقات جگت موہن لال رواں سے ہوگئی۔ رواں کو جگر سے ایسی عقیدت ہوئی کہ وہ اسے اپنے ساتھ اناؤ لے آئے۔

جگر کی زندگی اس وقت اسی طرح گزر رہی تھی۔ جس کے ہاتھ لگ جاتا وہ اسے پکڑ کرلے جاتا۔ یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ جگر جیسے شاعر سے اس کے اتنے قریبی تعلقات ہیں۔ پھر یا تو اسی کا دل بھر جاتا یا خود جگر رسی تڑا کر کہیں نکل جاتا۔

رواں اسے لے کر اپنے وطن اناؤ آئے اور اپنے پاس ٹھہرایا۔ اسی دن اس کے چشموں کا بکس کہیں پھنکوا دیا۔

"اب آپ جیسے شاعر کو یہ کام زیب نہیں دیتا۔"

"پھر ہماری شراب کا کیا ہوگا؟"

"اس کا ذمہ میں لیتا ہوں۔ آپ کو شراب ملتی رہے گی۔"

"نہیں جناب یہ کوئی ایک دو دن کی بات نہیں ہے۔ آپ کب تک مجھے پلاتے رہیں گے اور میں کب تک آپ سے مانگتا رہوں گا؟ نہیں جناب نہیں، میری غیرت یہ گوارا نہیں کرے گی۔"

اس کی یہ بات رواں کے دل کو لگی۔ انہوں نے کوشش کرکے ڈسٹرکٹ گزٹ کی ایڈیٹری اس کے سپرد کردی لیکن دفتر جانے کی پابندی نہیں تھی۔ یہاں سے سو روپے ملنے لگے۔

دن رات، شہر بھر کے شعرا اس کے گرد جمع رہنے لگے۔ بعض بعض شاعر تو کئی کئی دن اس کے پاس سے اٹھ کر گھر جانے کا نام نہیں لیتے تھے۔ ان شاعروں کے گھر والوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ جس شاعر کی محبت میں انہیں گھر بار کا ہوش نہیں رہا، وہ واقعی کوئی شاعر ہے یا کوئی طوائف ہے جسے ان لوگوں نے کسی گھر میں چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ بعض گھروں میں تو جھگڑے اتنے بڑھے کہ جگر کو باقاعدہ وہاں لے جاکر رونمائی کرائی گئی کہ دیکھ لو یہ ہیں وہ ذات شریف جن کے عشق میں پورا اناؤ پاگل ہوگیا ہے۔

سب اس کے عشق میں مبتلا تھے اور وہ سندری اور مندری پر مرمٹے تھے۔

یہ دونوں حسین و جمیل پریاں، نور کی شکلیں جیسے کھانڈ کے کھلونے، آپس میں بہنیں تھیں۔ کسی ہندو ریاست کے مہاراجا کی ملازم تھیں اور شہر سے باہر ایک کوٹھی میں رہتی تھیں۔ ہر ایسے ویسے کی تو ہمت بھی نہیں تھی کہ وہاں جاتا۔ جگر نے کسی محفل میں انہیں دیکھ لیا اور پھر بے کھٹک وہاں پہنچ گیا۔ اس کی شہرت اب اتنی تو ہو ہی گئی تھی کہ وہ اسے پہچان بھی سکیں اور قدر بھی کر سکیں۔ اور پھر اچھی غزلوں کی تلاش طوائفوں کو ہمیشہ رہتی ہے، انہیں بھی تھی۔ جگر ان سے خوش ہو تو نئی سے نئی غزل انہیں مل سکتی ہے۔ یہی سوچ کر انہوں نے جگر کو آنکھوں سے لگایا، پلکوں پہ بٹھایا۔

اناؤ میں رہنے کے لیے کوئی تو سہارا چاہیے تھا۔ جگر نے یہ در دیکھ لیا۔ ہمیشہ نہیں لیکن کبھی کبھی وہاں پہنچ جاتا تھا۔ کوشش کرتا تھا کہ ہوش میں آجائے لیکن عالمِ مدہوشی میں بھی پہنچ ہی جاتا تھا۔ پینے کے معاملے میں بے اعتدال تھا اس لیے وہ دونوں بہنیں اس سے پریشان رہنے لگیں۔ عزت کرتی تھیں لیکن ذلیل کبھی نہیں کیا۔

ان کی... بیزاری، جگر کی نظروں سے چھپی نہیں رہ سکی۔ ایک دن یہ کہہ کر وہاں سے اٹھ گیا ؎

رہ گئیں پردۂ ظاہر میں الجھ کر نظریں
حسن دیکھا نہ کسی نے مری رسوائی کا

"جگر صاحب، سنیئے تو۔ یہ مطلب نہیں تھا۔ آپ تو برا مان گئے۔" سندری اسے روکنے کے لیے دروازے تک آئی مگر وہ چلا آیا۔

اناؤ کے ایک ایک گھر میں ان کی مے نوشی کی شہرت ہو گئی تھی۔ بیویاں اپنے شوہروں کو روکتی تھیں۔ خبردار! اس شاعر کے پاس مت بیٹھنا۔ ایک دن رواں کی والدہ نے اس سے پوچھا۔ "یہ تو نے کس مولوی کو اپنے پاس ٹھہرالیا ہے۔ سنا ہے شراب پیتا ہے۔ ایسے ہی مولویوں نے تو سب کو بدنام کیا ہے۔ تو اس سے بچ کر رہا کر۔ مسلمان بھی ہے اور شرابی بھی۔" رواں ہنس کر چپ ہو گئے۔ کیا کہتے۔

جس طرح جگت موہن لال رواں اسے ایک مشاعرے سے پکڑ لائے تھے، اسی طرح ایک مشاعرے میں وہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔ وہ ہاتھ ملتے رہ گئے۔ معلوم ہوا جگر مین پوری میں دیکھا گیا ہے۔

جگر کے اناؤ سے جانے کے بعد سندری اور مندری بھی چلی گئیں۔ وہ کوٹھی ویران ہو گئی جو کبھی سندری کی آواز اور جگر

"جگر صاحب میں مروت اور وضع داری بہت تھی جس سے رسم و راہ ہو جائے اس کے لئے وہ تمام آداب برتتے جو شریفوں میں زمانۂ قدیم سے چلے آتے ہیں۔ اس میں انہوں نے بڑے دھوکے کھائے اور نقصان اٹھائے۔ جگر صاحب کا شمار کھاتے پیتے لوگوں میں نہیں تھا۔ مدتوں بڑی تنگی ترشی سے بسر ہوئی۔ خرچ آمدنی سے بہت زیادہ تھا لیکن انہوں نے تنگ دستی کا اظہار کبھی کسی سے نہیں کیا۔ مہمان کا خیر مقدم اس طرح کرتے جیسے ان کے گھر خیر و برکت کا نزول ہو رہا ہو۔ تکریم و تواضع میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے۔ کپڑے اچھے پہنتے، سامان قیمتی رکھتے جس کو ہمیشہ کوئی نہ کوئی مانگ لیتا یا چرا لیتا یا خود کہیں کھو آتے۔

شراب کو انہوں نے اپنایا اور اس دھڑلے سے پی کہ شاید ہی اتنی سستی اور اتنی زیادہ شراب ہندوستان کے کسی زبان کے شاعر نے پی ہو۔"

(رشید احمد صدیقی)

کی غزلوں سے گونجتی رہتی تھی۔

○☆○

مین پوری میں اصغر حسین، آنریری مجسٹریٹ اس کے کفیل تھے۔ انہوں نے یہ سوچ کر کہ اس کی دل بستگی کے لیے بھی کوئی سامان ہونا چاہیے، اسے ایک طوائف شیرازن سے ملوا دیا۔ یہ ڈیرا دارنی تھی اور ایک ہندو سیٹھ لالہ دھرم داس کی ملازمت میں تھی یعنی کسی اور سے تعلق نہیں رکھ سکتی تھی۔ کوئی خاص مہمان آتا بھی تو دن کے وقت۔ اصغر حسین نے شیرازن سے سفارش کی کہ بے چارے شاعر ہیں اور پریشان حال ہیں۔ تم کہو تو وقت گزاری کے لیے تمہارے پاس آجایا کریں گے۔ اصغر حسین نے اس مہربانی کے صلے میں کچھ رقم بھی اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔

جگر نے اسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس محویت میں اس کی حسن پرستی کو تو دخل تھا ہی لیکن بات یہ تھی کہ اس کی صورت جگر کی پہلی بیوی سے بہت مشابہت رکھتی تھی۔ وہ وہاں سے لوٹا تو حال یہ تھا ؎

ہجومِ تجلی سے معمور ہو کر
نظر رہ گئی شعلۂ طور ہو کر

اصغر حسین، کچہری چلے جاتے اور وہ اکیلا رہتا تو کبھی کبھی شیرازن کے گھر جا نکلتا تھا۔ اس کے انداز اوباش تماش بینوں جیسے نہیں تھے۔ اس کی یہی ادا شیرازن کے دل میں اتر گئی تھی۔

اردو مرکز زیادہ عرصے قائم نہ رہ سکا اور اسے لاہور سے واپس آنا پڑا۔

لاہور سے نکلنے کے بعد اس پر پھر دیوانگی کا دورہ پڑا۔ یونہی بے مقصد گھومتا رہا۔ کبھی دہلی میں نظر آتا' کبھی لکھنؤ کی سڑکوں پر کسی کو مل جاتا۔ کبھی لوگ اسے ڈھونڈتے پھرتے اور وہ کسی کو کبھی نہ ملتا۔ اک عالم جنوں تھا جس کی سیاحی کو وہ نکلا ہوا تھا۔

پھر عشق جنوں پیشہ یوں سلسلہ جنباں ہے
راہیں بھی گریزاں ہیں منزل بھی گریزاں ہے

یہ کس نے منتشر کردیں جنوں سامانیاں میری
زمیں سے آسماں تک ایک میں ہوں یا فغاں میری

شاید وہ شیرازن کی یادوں سے دامن بچاتا پھر رہا تھا لیکن دنیا اتنی چھوٹی ہے کہ بھاگ کر کہاں جاتا۔

وہ اچانک مین پوری کے سالانہ مشاعرے میں نمودار ہوا۔ وہ بھی اس حالت میں کہ آنکھیں چڑھی ہوئی' ہونٹ تر' قدم بہکے ہوئے' گریباں چاک' شراب بجسم۔ توبہ کہیں راستے میں رہ گئی تھی۔

اصغر حسین ایڈووکیٹ اسٹیج پر بیٹھے تھے' وہ ان کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

"جگر' یہ کیا حالت بنالی ہے۔"

"سرکار کے بغیر جیا نہیں جاتا۔"

"تو اس نے کون سی پابندی لگادی تھی۔ چلے آتے۔"

"آتو گیا ہوں۔"

"مگر کس حال میں؟"

"سرکار کے شہر میں آنے کے لیے شراب کے بغیر ہمت کہاں سے لاتا۔"

یہ شہر اس کے لیے نیا نہیں تھا۔ یہاں کے لوگوں نے اس کے جنونِ محشر بدوش کے بہت سے تماشے دیکھے تھے۔ شیرازن اور اس کی محبت کے چرچے بھی ہر زبان پر تھے۔ اس کی شاعری کے قدرداں بھی بہت تھے اور پھر آج تو اس کا عالم ہی کچھ اور تھا۔ اس بادیہ پیمائی نے اسے کیا سے کیا بنا دیا ہے۔ اس کا اندازہ اس وقت ہوا جب اس نے دنیائے ادب میں اس غزل کا اضافہ کیا۔

فکرِ منزل ہے نہ ہوشِ جادۂ منزل مجھے
جا رہا ہوں جس طرف' لے جا رہا ہے دل مجھے
اب کدھر جاؤں بتا اے جذبۂ کامل مجھے
ہر طرف سے آج آتی ہے صدائے دل مجھے
روک سکتی ہو تو بڑھ کر روک لے منزل مجھے
لے اڑی ہے ایک موجِ بے قرارِ دل مجھے
کیسا قطرہ' کیسا دریا' کس کا طوفاں' کیسی موج
تو جو چاہے تو ڈبو دے خشکیٔ ساحل مجھے
یہ بھی کیا منظر ہے بڑھتے ہیں نہ ہٹتے ہیں قدم
تک رہا ہوں دور سے منزل کو میں' منزل مجھے

یہ غزل اس کی حالتِ زار کی ایسی ترجمان تھی کہ جس نے سنی اسے معلوم ہوگیا کہ وہ کس حال میں ہے' کیا سوچ رہا ہے۔ اس کے پاؤں کے چھالے' اس کے سینے کے داغ ہر ہاتھ نے محسوس کیے' ہر آنکھ نے دیکھ لیے۔

اس نے تو شراب ترک کردی تھی' پھر کیا ہوا۔ کیوں ٹوٹ گئی توبہ؟

اس نے شکستِ توبہ کا جواز پیش کیا اور اس انداز سے کہ شکست کو فتح اور فتح کو تخلیق بنا دیا۔

ساقی کی ہر نگاہ پہ بل کھا کے پی گیا
لہروں سے کھیلتا ہوا لہرا کے پی گیا
بے کیفیتوں کے کیف سے گھبرا کے پی گیا
توبہ کو توڑ تاڑ کے تھرا کے پی گیا
زاہد یہ میری شوخیِ رندانہ دیکھنا
رحمت کو باتوں باتوں میں بہلا کے پی گیا
سرمستیِ ازل مجھے جب یاد آ گئی
دنیائے اعتبار کو ٹھکرا کے پی گیا
آزردگیِ خاطرِ ساقی کو دیکھ کر
مجھ کو یہ شرم آئی کہ شرما کے پی گیا
اے رحمتِ تمام مری ہر خطا معاف
میں انتہائے شوق میں گھبرا کے پی گیا
پیتا بغیر اذن یہ کب تھی مری مجال
در پردہ چشمِ یار کی شہ پا کے پی گیا
اس جانِ مے کدہ کی قسم بارہا جگر
کل عالمِ بسیط پہ میں چھا کے پی گیا

اردو میں خمریات کا ذخیرہ نایاب نہیں۔ ہزاروں اشعار شراب کو موضوع بنا کر لکھے گئے ہوں گے۔ خود اس کے دور میں ریاض خیر آبادی اس موضوع کو جانِ شاعری بنائے ہوئے تھے لیکن اس نے یہ نغمۂ سرمستی اس مہارت سے چھیڑا کہ اس کی دوسری مثال اردو تو کیا فارسی میں بھی نظر نہیں آتی۔ جگر کا حق بھی تھا کہ یہ شاہ کار جگر سے منسوب ہو۔

یہ اشعار دیکھتے ہی دیکھتے بچے بچے کی زبان پر آگئے۔ وہ ایک مصرع پڑھتا تو مجمع دوسرا مصرع پڑھ دیتا۔

○☆○

اب کے جو وہ مین پوری آیا تو حد درجہ مضطرب تھا۔ پیتا پہلے بھی تھا لیکن اب اس کا عالم ہی دوسرا تھا۔ شیرازن اسی شہر میں موجود تھی لیکن ابھی تک وہ اس سے ملنے نہیں گیا تھا۔ اس کی حکم عدولی ہوئی تھی۔ اس نے توبہ توڑ دی تھی۔ اب وہ کیا منہ لے کر اس کے پاس جاتا۔

ایک دن وہ مدہوش تھا اور ضد کر رہا تھا کہ شیرازن کے پاس جائے گا۔ احباب اسے شیرازن کے پاس لے کر پہنچے۔ گھر کے قریب پہنچے تو دیوانے کو ہوش آگیا۔

"سرکار کو تکلیف ہوگی۔"

احباب اس کی ضد پر اسے واپس لے آئے۔ آتے ہی پھر وہاں جانے کی ضد تھی۔ اضطرابی کیفیت کا ایسا غلبہ ہوا کہ احباب پھر مجبور ہو گئے۔ اسے پھر یکے میں لادا گیا۔

سہارا دے کر اسے اُتارا گیا۔ ہاتھ بھر کے فاصلے پر شیرازن کا دروازہ تھا۔

"سرکار کو تکلیف ہوگی۔ میں اس قابل نہیں۔ مجھے واپس لے چلو۔"

شیرازن کو اطلاع ہوئی۔ وہ گھبرا کر دروازے پر آگئی ۔

ہجومِ تجلی سے معمور ہو کر
نظر رہ گئی شعلۂ طور ہو کر

جگر گردن جھکائے کھڑا تھا جیسے مجرم رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہو۔ شیرازن نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"جگر، میں بھی یہاں تم بھی یہاں پھر یہ اضطراب کیسا۔"

جگر کی خاموشی اسے بولائے دیتی تھی۔ وہ خوشامد کر رہی تھی اور وہ خدا جانے کس عالم میں خاموش بیٹھا تھا۔ بار بار پہلو بدلتا تھا جیسے بھاگنے کی فکر ہو۔

یہ عالم کبھی کبھی کا نہیں تھا۔ ہمیشہ یہی ہوتا۔ مضطرب ہو کر اس کے در پر پہنچتا پھر یا تو لوٹ آتا یا ایسا مؤدب ہو کر بیٹھتا جیسے پیر کے سامنے مرید۔

حقیقی محبت کی بہت سی کہانیاں زمانے نے سنی ہوں گی۔ جگر بھی ایک کہانی مرتب کر رہا تھا۔

وہ شیرازن کے گھر کو "طور" کہتا تھا۔ شعلۂ طور نے اسے جلا کر کندن بنا دیا۔

وہ شیرازن کے سامنے زبان تو نہیں کھول سکتا تھا لیکن ایک طوفان اس کے اندر کروٹیں بدل رہا تھا جس کا اظہار آخر اس کی شاعری میں ہو کر رہا۔

دل

دہلی کے لال قلعے میں مشاعرہ تھا۔ یہ ایک طرحی مشاعرہ تھا۔ "دل" کا قافیہ باندھنا ضروری تھا۔ دیکھنا یہ تھا کہ اس قافیے کو کون شاعر کس ڈھنگ سے باندھتا ہے۔

اساتذۂ وقت جمع تھے۔ ان میں سیماب اکبر آبادی بھی تھے اور جگر بھی۔

سیماب نے اس قافیے کو یوں باندھا۔

خاکِ پروانہ، رگِ گل، عرقِ شبنم سے
اس نے ترکیب تو سوچی تھی مگر دل نہ بنا

شعر ایسا ہو گیا تھا کہ شور مچ گیا۔ سب کا خیال تھا کہ اس قافیے کو اس سے اچھا اب کوئی کیا باندھے گا۔ سب کی نظریں جگر پر جمی ہوئی تھیں۔

معاملہ دل کا ہو اور جگر چوک جائیں۔ وہ شعر پڑھا کہ سیماب کا شعر ذہنوں سے محو ہو گیا ۔

زندگانی کو مری عقدۂ مشکل نہ بنا
برق رکھ دے مرے سینے میں مگر دل نہ بنا

یہ ایسا دلچسپ مقابلہ ثابت ہوا کہ اسی قافیے کو ردیف بدل کر اگلے مشاعرے کے لئے پیش کر دیا گیا یعنی "دل نہ بنا" کے بجائے "دل بنا دیا" پر طبع آزمائی کرنی تھی۔

یہ مشاعرہ بھی لال قلعہ دہلی میں ہوا۔ اس مشاعرے میں حیدر دہلوی کے شعر نے دھوم مچا دی ۔

اک دل پہ ختم قدرتِ تخلیق ہو گئی
سب کچھ بنا دیا جو مرا دل بنا دیا

حیدر دہلوی استادِ وقت تھے اور خیام الہند کہلاتے تھے۔ یہ شعر ایسا بے اختیار ہو گیا تھا کہ لگتا تھا کہ اب کوئی کیا کہے گا۔ پھر بھی یہ اعتماد تھا کہ جگر بیٹھے ہیں۔

جگر نے شعر پڑھا اور یادگار پڑھا ۔

بے تابیاں سمیٹ کے سارے جہان کی
جب کچھ نہ بن سکا تو مرا دل بنا دیا

شیرازن سے ملاقات کے بعد اس کی شاعری کا ایک دور ختم ہوا، دوسرے دور کا آغاز ہوا جو نہایت جذباتی، نہایت ہنگامہ خیز، نہایت سرمست تھا۔ ایک دریا تھا جو اپنی دھن میں مست تھا۔ ایک شعلۂ بے تاب تھا جو خرمنِ ساعت میں آگ لگا دیتا۔ تمام زخموں کے تمام ٹانکے ایک ساتھ کھل گئے تھے۔ اسے شیرازن سے عشق نہیں، عشق سے عشق ہو گیا تھا اور جب حضرت اصغر کی تربیت کے طفیل اس عشق میں تصوف کی

SARGUZASHT○JAN.99

چاشنی گھل جاتی تھی تو یہ سرمدی نغمے زمین و آسمان ہلا دیتے تھے۔

جدید اردو غزل کے اس وقت تین بڑے ستون تھے۔ فانی، اصغر اور حسرت۔ فانی کے نغموں میں غم کی لے اتنی تیز تھی کہ دل بجھ جاتے تھے۔ اصغر کا تصوف خواجہ میر درد کی بازگشت تو تھا لیکن چند لوگ ہی فیض یاب ہوسکتے تھے۔ حسرت کا عشق عام سطح سے بہ مشکل اوپر اٹھتا تھا۔ ایک آواز کے لیے جگہ بالکل خالی تھی اور وہ تھی جراتِ رندانہ کی آواز، سرمستی ازل کی آواز، شوخی و ناز کی آواز، جراتِ عشق کی آواز۔ بے نیازی بے فکری، بے قراری کی آواز۔ پہاڑوں سے گرتے ہوئے آبشار کی آواز۔ موسیقیت سے بھرپور آواز، نشے سے مخمور آواز۔ اردو شاعری کو اب تک کوئی حافظ شیرازی میسر نہیں آیا تھا، شیرازن نے اسے اردو کا حافظ شیرازی بنا دیا۔

میں نہیں بلبل خیام جگر
حافظ خوش کلام نے مارا

صاف نظر آرہا تھا کہ وہ اردو غزل کی عمارت کا چوتھا ستون بننے والا ہے۔ اس کی تعمیر میں شیرازن کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

کثرتِ شراب نوشی اثر دکھائے بغیر نہیں رہتی۔ ۱۹۲۸ء میں وہ شدید بیمار پڑا۔ کئی بیماریوں نے ایک ساتھ زور باندھا تھا لیکن سب سے زیادہ خطرناک بات یہ تھی کہ وہ قلب میں تکلیف محسوس کر رہا تھا۔

شیرازن اس کی خیریت معلوم کرنے آئی تھی۔ سخت افسردہ تھی۔

"کیسے ہو؟"

"بہتر ہوں۔"

"تم شاعر نہیں معلوم ہوتے۔" اس نے جھنجلا کر کہا "کیا کوئی محبت کرنے والا جبکہ وہ شاعر بھی ہو، یہ پسند کرسکتا ہے کہ اس کا محبوب اپنی شکست کا اعلان کرے؟"

وہ پھر بھی خاموش رہا تو شیرازن نے اپنی شکست کا اعلان کردیا۔

"میں کھلے دل سے پیشکش کرتی ہوں کہ تم مجھ سے شادی کرلو۔"

"نہیں سرکار نہیں۔ میرا تم سے فراق کا رشتہ ہے۔"

"آتے تو رہو گے؟"

"ٹھیک ہوجاؤں۔"

اس علالت کے دوران میں اسے اصغر کی یاد آگئی۔ بیماری کا کیا بھروسا۔ مرشد کے پاس تو ہو آؤں۔

ابھی شفایاب نہیں ہوا تھا۔ بس ذرا طبیعت سنبھلی تھی کہ وہ اصغر کے پاس پہنچ گیا۔

اصغر کے سامنے تو وہ یوں بھی کوشش کرتا تھا کہ پی کر نہ جائے اور اب تو بیمار تھا۔

"تمہاری غزل لہرا کے پی گیا، بل کھا کے پی گیا مجھ تک پہنچی۔ یہ اپنی نوعیت کی بے مثال غزل ہے۔ میں تمہیں مبارک باد دیتا ہوں۔"

"میں نے تو اقرارِ گناہ کیا ہے۔"

"گناہ اور اتنے روشن! جگر، تمہاری توبہ قبول نہیں ہوئی لیکن اس غزل پر شکستِ توبہ ضرور معاف ہوگئی ہوگی۔ اللہ غفور الرحیم ہے۔"

جگر آب دیدہ ہوگیا "آپ دعا کیوں نہیں کرتے کہ مجھے اس بلا سے نجات مل جائے۔"

"اس کا بھی وقت آئے گا۔ ابھی کچھ سفر باقی ہے۔ تھکے ہوئے ہوگے، آرام کرو۔"

رات کا وقت ہے۔ گھر کے ایک کمرے میں اس کا بستر کیا گیا ہے جس پر وہ لیٹا ہوا ہے۔ ابھی ابھی اصغر اس کے پاس سے اٹھ کر گئے ہیں۔ کچھ دیر کروٹیں بدلنے کے بعد اسے نسیم کا خیال آگیا۔ اسی گھر میں وہ بھی موجود ہے۔ اس کا خیال آتے ہی اس کی نیند اچٹ گئی۔ کروٹ پر کروٹ بدل رہا تھا لیکن نیند کا کوسوں تک پتا نہیں تھا۔ پھر اچانک اس کی طبیعت بگڑنے لگی۔ اس کے سینے میں درد اٹھا تھا۔ وہ ہلکے ہلکے کراہ رہا تھا۔ اس احتیاط کے ساتھ کہ کہیں اصغر یا نسیم نہ سن لیں۔ خواہ مخواہ انہیں زحمت ہوگی۔

دوسرے کمرے میں نسیم اور اصغر کا بستر لگا ہوا تھا۔ نسیم بھی کروٹ پر کروٹ بدل رہی تھیں۔ اصغر بہت دیر سے اس کی یہ حالت مشاہدہ کررہے تھے۔ آخر ان سے رہا نہیں گیا۔

"جاگ رہی ہو؟" اصغر نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"کیوں۔"

"جگر بھی تو جاگ رہے ہیں۔ سن نہیں رہے ہو۔ ان کی کراہوں کی آواز آرہی ہے۔"

"اچھا ایک بات بتاؤ۔" اصغر نے پوچھا "تم مجھ سے زیادہ محبت کرتی ہو یا جگر سے۔"

"جگر سے۔" نسیم کے منہ سے بے اختیار نکلا "اگر وہ شراب نہ پئیں تو ان سے اچھے آدمی کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔"

"نسیم، مجھے خوشی ہوئی کہ تم نے سچ کہہ دیا۔ اب ایک بات غور سے سنو۔"

"کہیے۔"

"اگر میں جگر سے پہلے مرجاؤں اور جگر شراب چھوڑدیں تو یہ میری وصیت ہے کہ تم ان سے شادی کرلینا۔"

اس کے بعد نہ اصغر کے پاس کچھ کہنے کو تھا نہ نسیم کے پاس۔ کمرے میں سناٹا تھا۔ کبھی کبھی جگر کے کراہنے کی آواز نسیم کو بے کل کردیتی تھی۔

اس مرتبہ وہ خود وہاں سے رخصت ہوا تو کسی نہ کسی طرح نسیم سے آنکھیں چار ہوگئیں۔

نظروں نظروں میں سرگزشتِ فراق
دونوں جانب دہائیاں توبہ
حسن کی لہر پھر سے دوڑا کر
اس کی معجز نمائیاں توبہ
پھر وہی چشمِ مست و جام بدست
پھر وہی نغمہ زائیاں توبہ
پھر وہی لب وہی تبسمِ ناز
پھر وہی کج ادائیاں توبہ
پھر وہ اک بے خودی کے عالم میں
مل کے باہم جدائیاں توبہ

وہ مین پوری واپس آیا تو صحت یاب ہوچکا تھا لیکن ذہنی طور پر منتشر تھا۔ نسیم سے شادی ہو نہیں سکتی تھی، شیرازن سے شادی، عشق کی موت تھی۔ یہی عشق تو تھا جو اس کی شاعری کو ساحری بنائے ہوئے تھا۔ شیرازن کی ایک ایک ادا شاعری میں قلم بند کررہا تھا۔ اسی عشق نے اسے وہ فخرِ قناعت دیا تھا کہ تختِ شاہی بھی اسے ٹاٹ کا بوریا نظر آتا تھا۔

نظر سے حسنِ دو عالم گرا دیا تُونے
نہ جانے کون سا عالم دکھا دیا تُونے
کمالِ حسن کا عالم دکھا دیا تُونے
چراغ سامنے رکھ کر بجھا دیا تُونے
ہزار جانِ گرامی فدا بہ ایں نسبت
کہ میری ذات سے اپنا پتا دیا تُونے
خوشا وہ دردِ محبت زہے وہ دل کہ جسے
ذرا سکون ہوا، گد گدا دیا تو نے
ہر ایک دل کو عطا کرکے مدعائے حیات
جگر کو اک دلِ بے مدعا دیا تُونے

اس دور میں اس نے اپنی زندگی کی بہترین غزلیں کہیں۔ ان غزلوں کی سب سے بڑی خصوصیت وہ بے اختیاری ہے جو عشقِ صادق نے اس کی فطرت کے خمیر میں گوندھ دیا تھا۔

اب اس کی شہرت عروج پر تھی۔ اتنی شہرت شاید داغ کے

غزل

پھول کھلے ہیں گلشن گلشن + لیکن اپنا اپنا دامن
خیر مزاجِ حسن کی یارب + تیز بہت ہے دل کی دھڑکن
دل کہ مجسم آئنہ ساماں + اور وہ ظالم آئنہ دشمن
بیٹھے ہر محفل میں لیکن + جھاڑ کے اٹھے اپنا دامن
کانٹوں کا بھی حق ہے کچھ آخر + کون چھڑائے اپنا دامن
چلتی پھرتی چھاؤں ہے پیارے + کس کا صحرا کیسا گلشن

سوا کسی شاعر کو اپنی زندگی میں نہیں ملی ہوگی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسے خود بھی احساس ہوگیا تھا کہ کوئی اس کا مد مقابل نہیں ہے

تیرا دیوانہ، غریب جگر
فخرِ ہندوستان ہے پیارے

شہرت اور شہرت بھی عزت و احترام کے ساتھ۔ اس کی رندی و آوارگی کے باوجود ہر چھوٹا بڑا جگر صاحب کہہ کر پکارتا تھا۔ اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں تھی کہ وہ شراب کا۔۔۔۔ گنہگار تھا لیکن گناہ اس کا مزاج نہیں بن سکا۔

اسے معلوم تھا، وہ کبھی ہوش میں نہیں رہتا ہے

للہ جگر اب تو ذرا ہوش میں آجا
تنگ آگئے احباب تری بے خبری سے

لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس شراب نے اسے کتنا نقصان پہنچایا ہے

سب کو مارا جگر کے شعروں نے
اور جگر کو شراب نے مارا

شراب پینے کے باوجود ندامت کا احساس اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔

اصغر کہتے رہے کہ ابھی وقت نہیں آیا، سب ٹھیک ہوجائے گا اور وہ درپردہ اذنِ یار کی شہ پا کے پیتا رہا۔ اب شراب اس کے لیے مسئلہ نہیں تھی۔ اس کے لیے شراب خریدنا، اپنے ہاتھوں سے پلانا لوگ سعادت سمجھتے تھے۔ وہ عالمِ ہوش میں غزلیں لکھتا رہا، عالمِ مدہوشی میں سناتا رہا۔

اب نہ پیسوں کی کمی تھی نہ شراب کی لیکن پیسوں کو جیب میں رکھنا اسے زندگی بھر نہیں آیا۔ جسے ضرورت ہوتی، مشاعرے سے ملنے والی رقم اس کے حوالے کرکے آگے بڑھ جاتا۔ کبھی اسے مدہوش دیکھ کر لوگ اس کی جیب صاف کرجاتے۔ بھولنے کی عادت شروع ہی سے تھی۔ قیمتی سے قیمتی چیز کہیں رکھ کر، کسی کو دے کر بھول جاتا اور پھر بھول کر بھی اس

کا ملال نہ کرتا۔

۱۹۵۰ء تک پہنچتے پہنچتے عارضۂ قلب نے مستقل صورت اختیار کرلی۔ چند مخلص احباب نے مختلف طریقوں سے اس کی شراب نوشی پر پابندی لگانی چاہی لیکن بقول اصغر ابھی وقت نہیں آیا تھا۔ نہ اس کی موت کا نہ ترکِ شراب کا۔

بھوپال کے نواب علی حسن طاہر اُس کے بڑے قدرداں تھے۔ لکھنؤ میں ان کی کوٹھی بھوپال ہاؤس کے نام سے مشہور تھی۔ انہوں نے کئی مرتبہ اس سے کہا کہ وہ بھوپال ہاؤس مستقر بنا لے لیکن جگر اس نوازش کو اپنی ہتک ہی سمجھتا رہا لیکن ایک مرتبہ شیرازن سے کچھ ایسا بدگمان ہوا۔۔ کہ لکھنؤ چلا آیا۔

نواب صاحب کو موقع مل گیا۔ انہوں نے جگر پر پابندی لگا دی کہ وہ بھوپال ہاؤس سے باہر نہیں جائے گا۔ پابندی اس لیے تھی کہ یہاں سے نکل کر وہ کسی مے خانے کا رخ نہ کرلے۔

انہیں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ جگر بڑی پابندی سے اس پابندی پر عمل پیرا ہے۔ پھر ایک دن یہ تعجب اس وقت ختم ہوگیا جب انہوں نے جگر کو غرقِ شراب دیکھ لیا۔

”حضور، آپ تو کہیں آتے جاتے نہیں پھر یہ نشہ کیسا۔“

”میں نہیں جاتا لیکن احباب تو میرے پاس آتے ہیں۔ اب وہ لے آتے ہیں تو بھئی مجھ سے انکار نہیں ہوتا۔“

نواب صاحب نے اب یہ پابندی لگا دی کہ کوئی ایسا شخص ان کے پاس نہ آنے پائے جو انہیں شراب لا کر دے سکتا ہے۔ جگر نے مسکرا کر اس پابندی کو بھی قبول کرلیا۔

یہ پابندی بھی اس وقت دم توڑ گئی جب کسی نے دیوار کے ذریعے بوتل اندر پھینکی اور جگر نے دبوچ لی۔

”جب میرا اللہ مجھے دیتا ہے تو کوئی روکنے والا کون ہوتا ہے۔“ جگر نے پکڑے جانے پر کہا اور ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ اگر ایسی ہی پابندیاں رہیں تو بندہ یہاں سے کہیں اور چلا جائے گا۔

شیرازن سے بدگمانی کا زخم تازہ تھا کہ لکھنؤ میں مشاعرہ ہوا۔ جگر نے دل نکال کر کاغذ پر رکھ دیا۔ وہ مشہورِ زمانہ غزل پڑھی جو مدتوں تک گلی کوچوں میں دہرائی جاتی رہی۔

کیا حسن نے سمجھا ہے کیا عشق نے جانا ہے
ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے

یا وہ تھے خفا ہم سے یا ہم ہیں خفا اُن سے
کل ان کا زمانہ تھا آج اپنا زمانہ ہے

اے عشقِ جنوں پیشہ ہاں عشقِ جنوں پیشہ
آج ایک ستمگر کو ہنس ہنس کے رُلانا ہے

آنسو تو بہت سے ہیں آنکھوں میں جگر لیکن
بندھ جائے تو موتی ہے رہ جائے سو دانا ہے

اب بھوپال ہاؤس اس کا مستقل مسکن تھا۔ اب جو بھی لکھنؤ آتا اُس کی زیارت کو ضرور جاتا۔ نوجوانوں کے لیے تو وہ ایک داستانوی حیثیت اختیار کرگیا تھا۔

”دیکھو وہ جگر صاحب۔“ ایک آواز آتی ہے، ہزاروں آنکھیں اس طرف اٹھ جاتی ہیں۔ جگر کو اس کے احباب زبردستی یکے میں بٹھا رہے ہیں۔ وہ بار بار نیچے اترنے کی کوشش کرتا ہے۔ نشے میں وحشت ہے۔ معلوم ہوا حضرت علی گڑھ مشاعرہ پڑھنے تشریف لے جا رہے ہیں۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں مشاعرہ ہے۔ دھن سوار ہوگئی ہے تحصیل علم کا ایسا مقدس ادارہ اور میں ٹرین میں جاؤں۔ پیدل جاؤں گا۔ سر کے بل جاؤں گا۔ علی گڑھ سے طلبہ انہیں لینے آئے ہیں اور اسٹیشن لے جا رہے ہیں۔

نوجوانوں سے بہت خوش ہوتے تھے، خصوصاً طلبہ کا بہت احترام کرتے تھے۔ ٹرین میں بیٹھے اور طلبہ نے خاطر تواضع شروع کی تو بہل گئے۔

ٹرین میں بھی عالم یہ رہا کہ جس اسٹیشن پر گاڑی رک جاتی، دوسرے ڈبوں سے لوگ اتر کر اسے دیکھنے آتے۔ جو اس دیدار سے محروم رہ جاتے، اگلے اسٹیشن پر گاڑی رکنے کا انتظار کرتے۔

علی گڑھ کے اسٹیشن پر جمِ غفیر تھا۔ طلبہ انہیں راستے بھر پلاتے ہوئے آئے تھے۔ اسٹیشن پر اترتے ہی کسی طالبِ علم نے بوتل ان کے منہ سے لگا دی۔

ہوسٹل پہنچ کر بھی یہی شغل جاری رہا۔ طلبہ کے ہاتھ تو ایک کھلونا آگیا تھا۔ اس کھیل میں جگر سے ان کی عقیدت بھی تھی اور نوجوانی کی شرارت بھی۔

مشاعرے کا وقت ہوتے ہوتے منکوں شراب اس کے پیٹ میں اتر گئی۔ کوئی اور ہوتا تو قدموں کے ساتھ ساتھ اس کا ظرف بھی بہک جاتا لیکن وہ جگر تھا۔ اتنا ہوا کہ خود چل کر اسٹیج تک نہیں جاسکتا تھا۔

شور مچا کہ جگر صاحب آگئے۔ مجمع بے قابو تھا۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ طلبہ اسے دیکھنے کے لیے ایک دوسرے کو دھکے دے رہے تھے۔ والنٹیر حضرات نے راستہ بنایا۔ چند طلبہ اسے سہارا دے کر اسٹیج پر لے گئے۔ وہ آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔

اسے ایسے وقت مشاعرے میں لایا گیا تھا کہ آتے ہی اسے کلام پڑھنا تھا۔

بے قابو مجمع چیخ چیخ کر اس سے کلام سننے کی استدعا کر رہا تھا۔

جگر نے آنکھیں کھولیں۔ ایک نظر سامعین پر ڈالی، پھر اسٹیج پر بیٹھے ہوئے حضرات کا جائزہ لیا۔ مولانا احسن مارہروی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان پر نظر پڑتے ہی جیسے اسے سکتہ ہوگیا۔

"پڑھو جگر" مولانا نے بڑی محبت سے کہا۔

جگر نے چیخ مار کر ان کے پاؤں پکڑ لیے "میں گنہ گار ہوں۔ آپ جیسی مقدس ہستی کے سامنے اس حال میں آگیا۔ میں مجبور ہوں۔ قابل رحم ہوں۔ میرے دل میں ناسور ہیں، میں نے شراب میں ان کا علاج ڈھونڈا ہے۔"

"جگر، وہ بخشنے والا ہے۔ اس کی رحمت پر یقین رکھو۔ مایوس مت ہو۔"

"مجھے اس حال میں آپ کے سامنے نہیں آنا چاہیے تھا۔"

"تمہیں احساس ہے، یہی تمہاری عظمت ہے۔ اللہ تعالیٰ کو نیکی سے زیادہ ندامت پسند ہے اور تم نادم ہونا جانتے ہو۔ مجھے یقین ہے تم ایک دن ضرور شراب چھوڑ دو گے۔"

مولانا تسلیاں دے رہے تھے اور جگر کے آنسو تھے کہ تھمنے میں نہیں آتے تھے۔ سامعین دم بخود تھے عجیب روح پرور منظر تھا۔

"بچے تمہیں سننے کے لیے بے تاب ہیں۔ پڑھو جگر۔" مولانا نے کہا۔

اب عالم یہ تھا کہ جگر کی داڑھی آنسوؤں سے تر تھی اور وہ اس پانی سے لفظوں کے چہرے دھو رہا تھا۔

جب تک شباب عشق مکمل شباب ہے
پانی بھی ہے شراب ہوا بھی شراب ہے

یہ وقت ہی ایسا تھا کہ وہ جو بھی پڑھتا قابل قبول ہوتا، قابل داد ہوتا۔ قیامت برپا ہوگئی لیکن اگلا شعر اس نے ایسا پڑھ دیا کہ لوگ اپنے ہوش میں رہ گئے بس یہی بہت ہے۔

اے محتسب نہ پھینک، مرے محتسب نہ پھینک
ظالم شراب ہے، ارے ظالم شراب ہے

کتنی ہی دیر تک یہ معلوم ہوتا رہا کہ اس دنیا میں آوازوں کے سوا کوئی نہیں رہتا۔ لوگ چیخ چیخ کر تھک گئے تھے۔

"ظالم شراب ہے ارے ظالم شراب ہے"

پہلا مصرع وہ پڑھتا، دوسرا مصرع لوگ پڑھتے۔ نہ جانے کتنی دیر اس مصرعے کا لطف اٹھاتے ہوئے گزر گئی، آخر مولانا احسن نے اعلان کیا۔

"یہ شعر جگر نے ایسا نکالا ہے کہ اس کے بعد مشاعرہ جاری رکھنے کا جواز نہیں رہتا لیکن ہم جگر کی غزل سے محروم رہنا بھی نہیں چاہتے۔ اس لیے آپ سے گزارش ہے کہ جگر کو آگے پڑھنے دیں۔"

جگر نے اگلا شعر پڑھا۔

مانوس اعتبار کرم کیوں کیا مجھے
اب ہر خطائے شوق اسی کا جواب ہے

اس شعر میں بھی اظہار محبت اور جرات رندانہ کا مظاہرہ اس شوخ انداز سے کیا تھا کہ لوگ بے اختیار ہوگئے۔

اب وہ تھا اور سامعین کے تڑپتے ہوئے دل۔

اپنے حدود سے نہ بڑھے کوئی عشق میں
جو ذرہ جس جگہ ہے، وہیں آفتاب ہے
وہ لاکھ سامنے ہوں مگر اس کا کیا علاج
دل مانتا نہیں کہ نظر کامیاب ہے
میری نگاہ شوق بھی کچھ کم نہیں مگر
پھر بھی ترا شباب ترا ہی شباب ہے

میں اس کا آئنہ ہوں، وہ ہے میرا آئنہ
میری نظر سے اس کی نظر کامیاب ہے
تنہائیِ فراق کے قربان جائیے
میں ہوں خیالِ یار ہے چشم پُر آب ہے
سرمایۂ فراق جگر آہ کچھ نہ پوچھ
اک جان ہے سو اپنے لیے خود عذاب ہے

اس دن علی گڑھ میں ہر زبان پر ایک مصرع تھا "ظالم شراب ہے 'ارے ظالم شراب ہے۔'"

زبانوں پر یہ مصرع تھا یا مولانا احسن مارہروی کے روبرو اظہارِ ندامت کا واقعہ۔ چرچا یہی تھا کہ جگر کا مذہبی احساس اسے ہمیشہ اس حال میں رہنے نہیں دے گا۔

عام طور پر یہی دیکھا گیا ہے کہ شراب نوشی ہو یا کوئی اور گناہ سیاہیِ قلب بڑھتی ہی چلی جاتی ہے لیکن اس کا قلب آئنہ تھا۔ اس کی روح داغ دار نہیں ہوئی تھی۔ اس کی روح اس کی رندی کو قبول نہیں کر رہی تھی۔ اس کا اضطراب اسی کشمکش کا نتیجہ تھا۔ ہر وقت حالتِ جنگ میں تھا۔ یہ الگ بات کہ اسے ہمیشہ شکست ہوجاتی تھی۔ توبہ کرتا تھا مگر توڑ دیتا تھا۔

اس کا مذہبی احساس بہت ترقی یافتہ تھا۔ اس کے مظاہرے اس کے طرزِ عمل سے اکثر ہوتے رہتے تھے۔

جن دنوں وہ بھوپال ہاؤس میں ٹھہرا ہوا تھا، زائرِ حرم حمید صدیقی اس سے ملنے اکثر آجاتے تھے۔ جگر ان کا بہت احترام کرتا تھا۔ اس نے ان سے درخواست کی تھی کہ وہ اس وقت اس کے پاس نہ آیا کریں جب وہ عالمِ کیف میں ہوا کرے۔

ایک روز وہ اس سے ملنے آئے۔ جگر عالمِ سرشاری میں لیٹا ہوا کوئی غزل گنگنا رہا تھا۔ تپائی پر بوتل رکھی تھی۔ گویا ابھی گھونٹ گھونٹ کرکے اس نے اس آگ کو پانی کیا تھا۔ جیسے ہی حمید صدیقی پر نظر پڑی وہ گھبرا کر بیٹھا۔

"میں نے آپ کو منع کیا تھا کہ ایسے وقت میرے پاس نہ آیا کریں۔"

"جگر صاحب، کیا حرج ہے۔ میں آپ کے اس شغل سے واقف بھی ہوں اور معترض بھی نہیں ہوں۔"

"بات معترض ہونے کی نہیں ہے۔ اس عالم میں اگر میں آپ سے نعت سنوں تو کیسے سنوں۔" وہ آب دیدہ ہوگیا۔

"اللہ اکبر! جگر صاحب، اس مدہوشی میں ایسا شعور۔"

ایک طرف یہ احساس دوسری طرف نہ دن کی قید نہ رات کی۔ کبھی گھبرا کے پی گیا، کبھی لہرا کے پی گیا۔

لکھنؤ کے مشہور قیصر باغ میں مشاعرہ تھا۔ منتظمین نے قید لگادی تھی کہ کوئی شاعر بارہ شعر سے زیادہ نہ پڑھے۔ جگر بھی اس مشاعرے میں شریک تھا۔ اس کی باری آئی تو چار شعر پڑھ کر اتر آیا۔ لوگ چیختے رہ گئے۔ کچھ یہ بھی سمجھے کہ جگر اس شرط کا برا مان گیا۔

"جگر صاحب، یہ کیا۔ صرف چار شعر پڑھے۔" احباب نے ان سے سرگوشی میں پوچھا۔

"بارہ کا جواب تو چار ہی سے دیا جاسکتا تھا۔" انہوں نے ہنستے ہوئے کہا "بھائی، میں کسی زمانے میں شیعہ رہ چکا ہوں۔ تم نہیں سمجھو گے، میں سمجھتا ہوں، منتظمین نے بارہ کی شرط بارہ اماموں کی وجہ سے رکھی تھی۔ میں نے چار شعر پڑھ کر چار خلفاء کی نمائندگی کا حق ادا کردیا۔"

وہ مشاعرے پڑھتا رہا۔ ہوش اور مدہوشی کے درمیان چکر کاٹتا رہا۔ نسیم کا خیال دامن گیر تھا۔ دوسری طرف شیرازن کی محبت پاؤں کی زنجیر تھی۔ وہ ان یادوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے خود کو شراب میں غرق کر رہا تھا۔ وہ دنیا میں گھومتا لیکن لوٹ کر مین پوری چلا آتا جہاں اس کی شیرازن رہتی تھی۔ گھومتا بھی تو شیرازن کے ساتھ ہی گھومتا۔ اس کی ہر غزل شیرازن کے لیے تھی۔ پردۂ زنگاری میں کوئی معشوق تھا جو بول بول پڑتا تھا۔

وہ ایک ایسے آدمی کی طرح ہر منزل سے دور بھاگ رہا تھا جسے منزل کا علم نہ ہو لیکن منزل کی تلاش میں سرگرداں ہو۔

اسی تلاش و تجسس میں کھو گیا ہوں میں
اگر نہیں ہوں تو کیونکر جو ہوں تو کیا ہوں میں
مجھے تلاش کر اے بے خودیِ شوق سجود
پہنچ کے منزلِ ہستی پہ کھو گیا ہوں میں
جگر یہ ہرزہ سرائی مری یہ بے ربطی
یقیں ہوا کسی مجذوب کی صدا ہوں میں

بھوپال ہاؤس میں رہتے رہتے گھبرانے لگا تھا۔ رہتا کیا تھا، گھوم پھر کر یہاں لوٹ آتا تھا لیکن اسے یہ ٹھکانا بھی گوارا نہیں ہوا۔

وہ لکھنؤ سے نکلا اور بھوپال پہنچ گیا۔ وہ بھوپال ایک مشاعرے میں گیا تھا لیکن ایک نوجوان کی ذہانت نے اسے بھوپال پرست بنادیا اور اس نے بھوپال کو یہ کہنے کے لائق بنادیا کہ جگر نے یہاں کچھ دن قیام کیا تھا۔

مشاعرے کی ابتدا تھی۔ ایک نوجوان اسٹیج پر آیا اور غزل پڑھنی شروع کی۔ عجیب بے تکی غزل تھی۔ ہر شعر میں کوئی نہ کوئی غلطی موجود تھی۔

جگر نے آہستہ سے اسے ٹوکا۔ مجبوراً اسے پیچھے مڑ کر دیکھنا پڑا۔ وہ لڑکا اس مرتبہ تو برداشت کر گیا لیکن جب دوسرے شعر پر

بھی جگر نے اسے ٹوکا تو اس نے مڑ کر دیکھا اور اس طرح آداب کیا جیسے شعر پر داد ملتی ہے تو کرتے ہیں۔ وہ مسلسل یہی طریقہ اختیار کرتا رہا۔ جب جگر اسے ٹوکتا' وہ آداب کرتا۔ لوگ یہ سمجھے کہ جگر تعریف کر رہے ہیں۔ اسی لیے یہ لڑکا آداب کر رہا ہے۔ جگر تعریف کر رہے ہیں تو کوئی بات ہوگی۔ دو چار شعروں کے بعد لوگوں نے بھی داد دینی شروع کر دی۔ اس نے پوری غزل کامیابی سے پڑھی اور خوب داد وصول کی۔ جب وہ پڑھ کر جانے لگا تو اس نے جگر کی طرف منہ کر کے فرشی سلام کیا۔

"کہیے حضور' کیسی رہی۔" اس لڑکے نے کہا اور یہ جا وہ جا۔

جگر اس کی ذہانت پر مسکرا کر رہ گئے۔

"بھئی یہ لڑکا کس بلا کا ذہین تھا۔"

"بھوپال کی سرزمین بڑی مردم خیز ہے' جگر صاحب" کسی نے کہا۔

"پھر تو ہم یہیں رہیں گے۔"

"میرا ایک مکان خالی پڑا ہے۔ آپ رہیں۔ آپ کے لیے حاضر ہے۔" مخمور جامعی نے کہا۔

بھوپال کے قیام کا ایک یادگار واقعہ "دارالکسلا" کا قیام ہے۔

جگر جہاں قیام کرتا تھا' اپنے گرد ایسے بے فکروں کو اکٹھا کر لیتا تھا جن کے پاس وقت ہی وقت ہو۔ یہاں بھی اسے ایسے احباب میسر آ گئے۔ ان بے فکروں کا سرخیل خود جگر تھا اور کوئی ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ اس سے زیادہ فرصت کس کے پاس تھی۔

اس فرصت کو دلچسپ بنانے کے لیے ایک عجیب و غریب تجویز پیش کی گئی۔ کاہلوں کا ایک ادارہ قائم کیا جائے۔

اس ادارے کا نام دارالکسلا رکھا گیا۔ جگر اس کے صدر بنائے گئے اور حسرت لکھنوی نائب صدر۔ اس ادارے کے ارکان کی اہلیت یہ تھی کہ جو جتنا بڑا کاہل ہوگا' اتنی ہی اہمیت کا حامل ہوگا۔ اس ادارے میں شمولیت کے لیے کاہلی کا امتحان دینا پڑتا تھا۔ اس کی رکنیت کا واحد فائدہ یہ تھا کہ رکن پڑا پڑا سوچتا رہے' غور کرتا رہے اور کوئی نہ ہو جو اس کی سوچوں میں دخیل ہو۔

اس ادارے میں شمولیت کی کوئی فیس نہیں تھی۔ بس ممبر کو اپنا تکیہ اپنے ساتھ لانا پڑتا تھا۔

مخمور جامعی کے گھر میں جہاں جگر ٹھہرا ہوا تھا' فرش پر پوال (سوکھی گھاس) بچھا کر' اس پر سفید چاندنی بچھا دی گئی تھی۔ اس فرش پر تمام ارکان اپنے اپنے تکیے رکھ کر لیٹ جاتے تھے۔ اس لیٹنے کو اجلاس کہتے تھے۔ جب اجلاس شروع ہوتا تھا تو کاہلی کے تمام مظاہرے روبہ عمل لائے جاتے تھے۔ بات تک کرنے کو کاہلی کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔ کروٹ بھی کسی نے بدلی تو سمجھا جاتا تھا کہ اس نے کاہلی کے خلاف حرکت کی۔

ایک روز ایک صاحب چت لیٹے ٹھاٹ سے حقہ پی رہے تھے کہ چلم سے ایک کوئلا نکل کر ان کے پیٹ پر گر گیا۔ کاہلی سے بعید تھا کہ وہ گھبراتے یا اٹھ کر بیٹھ جاتے۔ انہوں نے صرف یہ کیا کہ پیٹ کو ذرا سی حرکت دی اور کوئلا نیچے گرا دیا۔ دوسرے کاہل بڑی حسرت سے ان کی کاہلی کو دیکھ رہے تھے لیکن پھر اچانک کسی کو خیال آیا کہ اس طرح تو فرش میں آگ لگ جائے گی۔ فوراً اجلاس برخاست کیا گیا اور کوئلے کو بجھا کر ممکنہ آتش زدگی پر قابو پایا گیا۔ اسی دن یہ قانون بنا دیا گیا کہ اضطراری حالت میں اجلاس برخاست کر دیا جائے گا مثلاً کسی کو اپنی غزل سنانی ہے یا پانی پینا ہے یا کوئی اور ایسی حاجت ہے تو وہ رکن اجلاس ملتوی کرنے کی درخواست کر سکتا ہے۔

جگر آخر صدر تھا۔ کاہلی کے اس مقابلے میں بھی وہ سرِ فہرست ہی رہا یعنی اس کی جانب سے اجلاس ملتوی کرنے کی کبھی درخواست دائر نہیں کی گئی۔

کسی اور نے اس ادارے کی رکنیت سے فائدہ نہ اٹھایا ہو لیکن جگر نے اس فرصت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس دور میں کئی یادگار غزلیں تخلیق کیں۔ یہ غزلیں بعد میں جگر کی نمائندہ غزلیں سمجھی گئیں۔ مثلاً ؎

ہم جب نہ ہوں گے تو کیا رنگِ محفل
کسے دیکھ کر آپ شرمائیے گا

کاہلی کے اس مقابلے میں شریک ہو کر جگر بہت دن تک

غزل

دل میں کسی کے راہ کیے جارہا ہوں میں
کتنا حسیں گناہ کیے جارہا ہوں میں

فردِ عمل سیاہ کیے جارہا ہوں میں
رحمت کو بے پناہ کیے جارہا ہوں میں

آگے قدم بڑھائیں جنہیں سوجھتا نہیں
روشن چراغِ راہ کیے جارہا ہوں میں

گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کیے جارہا ہوں میں

یوں زندگی گزار رہا ہوں ترے بغیر
جیسے کوئی گناہ کیے جارہا ہوں میں

مجھ سے ادا ہوا ہے جگر جستجو کا حق
ہر ذرّے کو گواہ کیے جارہا ہوں میں

پردۂ ظاہر سے غائب رہا لیکن اب وہ اتنا غیر اہم نہیں رہا تھا کہ وہ جو بھولا تھا تو پھر لوگ بھی اسے بھول جاتے۔ وہ جس کے لیے کہتا رہا تھا، فصلِ حسن اس کی موسمِ شباب اس کا۔ اس نے اپنے قصیدہ خواں کو ڈھونڈ نکالا۔ ڈھونڈتا کیا تھا، کہلوا بھیجا کہ ایسی بھی کیا خفگی۔ فرصت ہو تو آن ملو۔

اس کا حال یہ کہ فرصت ہی فرصت تھی لیکن دل پھر بھی نہیں لگتا تھا۔ ان دنوں وہ ایک ایسی چیز کی تمنا کر رہا تھا جو اس کے اختیار میں نہیں تھی۔ بھوپال اگرچہ خلد بہ داماں تھا لیکن وہ دل کی شگفتگی کے لیے ترس رہا تھا۔

بھوپال گرچہ خلد بداماں ہے اے جگر
دل کیا شگفتہ ہو کہ نسیم جگر نہیں

جیسے جیسے عمر بڑھ رہی تھی، نوجوانی کی بہت سی غلطیاں پچھتاوا بن کر سامنے آ رہی تھیں۔ اسی میں ایک نسیم بھی تھی۔ اسے اب شدت سے احساس ہونے لگا تھا کہ اس نے نسیم جیسی بیوی کی قدر نہیں کی۔ یہ پچھتاوا اسے اور زیادہ، اور زیادہ اور زیادہ پینے پر مجبور کر دیتا تھا۔ وہ اپنا تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھنا نہیں چاہتا تھا اس لیے غفلت اختیار کیے رہتا تھا۔

دیوانے کو صحرا نے آواز دی اور وہ شیرازن کے پاس پہنچ گیا۔

"جگر تم مجھ سے کس بات کا بدلہ لے رہے ہو؟ مجھے اپناتے بھی نہیں ہو، ٹھکراتے بھی نہیں ہو۔"

"میں کیا کروں، میرا تمہارا فراق کا رشتہ ہے۔"

"یہ فراق، وصال میں بھی تو بدل سکتا ہے۔"

"اس کے لیے جس انتظار کی ضرورت ہے، وہ تم سے ہوگا نہیں۔"

"میں قیامت تک انتظار کروں گی۔"

"پھر انتظار کرو۔ میرے فیصلے تک، پردۂ غیب سے کچھ ظاہر ہونے تک۔"

"جگر تم تو شراب پی لیتے ہو، شاعری کر لیتے ہو۔ میں کس سوئی سے دل کے زخموں کو ٹانکے دوں۔"

جگر کے پاس اس کی بہت سی باتوں کی طرح اس کا بھی کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ مؤدبانہ سر جھکائے بیٹھا تھا۔

"میں گناہ کی زندگی سے تنگ آ چکی ہوں۔"

"میں زندگی سے تنگ آ چکا ہوں۔"

"اب کب ملو گے؟"

"اب تو آتا رہوں گا۔"

وہ اتنی خاموشی سے آیا تھا کہ مین پوری میں کسی پر اس کی آمد نہیں کھل سکی لیکن پھر بھی نہ جانے کیسے خبر ہو گئی زمانے کو۔

وہ بھوپال پہنچا تو کچھ لوگ، جے پور سے اسے ڈھونڈتے ہوئے آئے بیٹھے تھے۔

اس کا دماغ اس وقت ہرگز کسی کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھا لیکن اس سے بے مروتی ہوتی نہیں تھی۔ اسے تو بڑے شاعروں کی طرح اپنی قیمت لگانے کا ہنر بھی نہیں آیا تھا۔

جے پور میں مشاعرہ تھا۔ یہ لوگ اس مشاعرے میں شرکت کے لیے اسے آمادہ کرنے آئے تھے۔

"آپ لوگ اتنی دور سے آئے ہیں، میں انکار کیسے کردوں۔" جگر نے کہا۔

"ہمارے شہر میں آپ کبھی تشریف نہیں لائے ہیں۔ لوگ آپ کو سننے کے مشتاق ہیں۔"

اور وہ تیار ہو گیا۔

وہ شیرازن سے مل کر آیا تو تھوڑی دیر کے لیے نسیم کو بھول گیا۔ اسی خود فراموشی کے عالم میں وہ جے پور پہنچ گیا۔

اہلِ مشاعرہ کو معلوم تھا کہ جگر آ رہے ہیں لہٰذا شراب کے دریا، بوتلوں میں بند کر کے رکھ دیے گئے تھے۔ وہ بھی اتنا ٹوٹ کر آیا تھا کہ بکھرتے ہوئے دیر نہیں لگی۔ ایسا کبھی نہیں بہکا تھا جیسا اب بہکا۔ سہارے کم پڑ گئے۔ اسے گود میں اٹھا کر اسٹیج تک لے جایا گیا۔

ہمیشہ سفر میں رہنے والا آج کسی ایک جگہ آ کر رک گیا تھا۔ کسی کی فرمائش تھی یا خود اس کی چاہت کہ دل سے نکلی تھی، ہونٹوں پر جم گئی تھی۔

"ان کے لیے چنری چاہیے"

پہلے تو کوئی سمجھا نہیں کہ معاملہ کیا ہے لیکن جب اس نے اس ایک جملے کو وردِ زباں بنا لیا تو بات سب کی سمجھ میں آ گئی۔

"ان کے لیے چنری چاہیے۔"

"جگر صاحب، وہ بھی آ جائے گی۔ لوگ آپ کا کلام سننے کے مشتاق ہیں۔"

"سب کو اپنا خیال ہے۔ میرا خیال کسی کو نہیں۔ ان کے لیے چنری چاہیے۔"

بہت سوں کو معلوم تھا کہ کس کے لیے چنری چاہیے۔ شیرازن سے اس کی محبت کا احوال بہت سوں کو معلوم تھا۔ جے پور آتے ہی جگر کو خیال آیا ہوگا کہ یہاں کی چنریاں مشہور ہیں۔ وہ شیرازن کے لیے چنری لے کر جائے گا۔ نشے میں یہی خیال اس کے سامنے رہا۔

چنری کوئی ایسی بیش قیمت چیز نہیں تھی لیکن سوال یہ تھا کہ اتنی رات گئے چنری کہاں سے آئے اور وہ اس کے بغیر پڑھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کا حل یہ نکالا گیا کہ کسی نے

اپنے گھر سے چنری لا کر اس کے سامنے رکھ دی۔
"جگر صاحب' اب تو چنری آ گئی۔ اب تو کچھ سنایئے۔"
"ان کے لیے چنری آ گئی۔ اب ان کے لیے غزل بھی سنیئے۔"

نظر سے حسنِ دو عالم گرا دیا تُو نے
نہ جانے کون سا عالم دکھا دیا تُو نے
ہزار دل کو مٹا کر' دیا مجھے اک درد
اس ایک درد کو پھر دل بنا دیا تُو نے
فنائے عشق کو رنگِ بقا دیا تُو نے
حیات و موت کو یکجا دکھا دیا تُو نے
یہ کیا کیا کہ عطا کر کے عشقِ لامحدود
مجھے حریفِ مقابل بنا دیا تُو نے

آج وہ شیرازن کے حصار سے نکلنے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے چنری کو ایک خاص ادا سے ہوا میں لہرایا اور دوسری غزل شروع کر دی۔

اب کہاں زمانے میں دوسرا جواب ان کا
فصلِ حسن ہے ان کی' موسمِ شباب ان کا
اوج پر جمال ان کا جوش پر شباب ان کا
عہدِ ماہ تاب ان کا' دور آفتاب ان کا
تو جگرؔ سے مستوں پر طعن کر نہ اے واعظ
تو غریب کیا جانے مسلکِ شراب ان کا

جے پور میں کئی مشاعرے پڑھنے کے بعد جب وہ بھوپال واپس آیا تو وہ چنریاں ٹرین ہی میں کہیں چھوڑ آیا جو اسے کارکنانِ مشاعرہ نے خرید کر دی تھیں۔ ہر سفر میں کچھ نہ کچھ بھول کر آنا اس کی پرانی عادت تھی۔

جیسے جیسے اس کی شہرت بڑھتی جا رہی تھی' مشاعروں کی تعداد بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ علی گڑھ تو خیر اس کا دوسرا گھر بن کر رہ گیا تھا۔ طلبہ اس پر فدا تھے۔ رشید احمد صدیقی اس کے خاص قدر داں تھے۔ طلبہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر موقع نکالتے تھے اور جگر کو لے کر علی گڑھ پہنچ جاتے تھے۔ اگر معلوم ہو جاتا کہ وہ کسی مشاعرے سے واپس آ رہا ہے اور علی گڑھ سے گزرے گا تو پلیٹ فارم طلبہ سے بھر جاتا۔ اسے زبردستی اتار لیتے۔

مشاعروں کی اس گرم بازاری میں' بھوپال میں رہتے ہوئے بھی وہ بھوپال میں نہیں تھا۔ اس کی غیر حاضری میں "دارالکسلا" کیسے قائم رہ سکتا تھا۔ جتنے کاہل تھے سب بکھر گئے۔

اب وہ مشاعروں سے بھاگنے لگا تھا لیکن مصیبت یہ تھی کہ یہ مشاعرے ہی اس کی آمدنی کا ذریعہ بھی تھے اور پھر اسے ایسی چشم موت ملی تھی کہ صاف انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے مسافروں کی زندگی گزارنے پر مجبور تھا۔

ایک مشاعرے کے سلسلے میں ٹونک گیا ہوا تھا۔ والیِ ٹونک کا مہمان تھا۔

ٹونک پہنچ کر ایک واقعے نے اسے احساس دلایا کہ اس کی شہرت اس کے لیے عذاب بن گئی ہے۔ اس کی شہرت سے خوش ہونے والے بھی موجود تھے اور اسی شہرت نے اس کے دشمن بھی پیدا کر دیے تھے۔ ایسے ہی ایک حاسد نے اس کے کھانے میں زہر ملا دیا۔ کھانا کھاتے ہی اس کی حالت غیر ہو گئی۔ پہلے تو لوگوں نے یہ سمجھا کہ شراب بہت پی لی ہے لیکن جب حالت بہت بگڑنے لگی تو اسے ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا۔ معلوم ہوا اسے زہر دیا گیا ہے۔ بروقت طبی امداد نے اس کی جان بچالی۔ ڈاکٹروں کا یہ بھی خیال تھا کہ انہوں نے اتنی شراب پی ہے کہ اس زہر کا آدھا اثر بھی ان پر نہیں ہو سکا۔

زہر دینے والا پکڑا گیا۔ اس نے اپنا جرم قبول بھی کر لیا۔ ریاستوں میں کسی کو سزا دینا اتنا ہی آسان ہوتا ہے جتنا انعام و اکرام سے نوازنا۔ اسے بھی موت کی سزا ہو جاتی' کچھ بعید نہیں تھا لیکن جب اسے جگر کے سامنے لایا گیا تو اس نے اسے معاف کر دیا۔

"اس شخص کو ممکن ہے میری ذات سے کوئی تکلیف پہنچی ہو۔ میں بھی اسے معاف کرتا ہوں' یہ بھی مجھے معاف کر دے۔"

"لیکن اسے آپ کی جان لینے کا حق نہیں تھا۔" والیِ ٹونک نے کہا۔

"جان لی تو نہیں۔" جگر نے کہا۔

"کچھ بعید بھی نہیں تھا۔ اگر ایسا ہو جاتا تو ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتے۔ آپ ہمارے مہربان مہمان ہیں۔"

"میں اگر مر جاتا تو بے شک آپ جو بھی فیصلہ کرتے لیکن میں زندہ ہوں اور اس شخص کو معاف کرتا ہوں۔ آپ بھی اسے معاف فرما دیں۔"

جگر اس طرح اپنے دشمن کی وکالت کر رہا تھا جیسے وہ اس کا ازلی دوست ہو اور بالآخر اس نے والیِ ٹونک کو مجبور کر دیا کہ وہ اس شخص کو معاف کر دیں۔

جگر کے حسنِ سلوک سے یہ شخص اتنا متاثر ہوا کہ بھوپال تک ان کے ساتھ آیا۔ جگر نے بڑی خوشامد کر کے اسے واپس

بھیجا۔

شاعروں کا یہ بے تاج بادشاہ اس وقت ایسی حکومت کر رہا تھا کہ اس کی شمولیت کے بغیر کسی مشاعرے کا تصور کیا ہی نہیں جا سکتا تھا' چاہے وہ ہندوستان کے کسی بھی کونے میں ہو۔

اجمیر میں نعتیہ مشاعرہ تھا۔ فہرست بنانے والوں کے سامنے یہ مشکل تھی کہ جگر کو اس مشاعرے میں کیسے بلایا جائے وہ کھلا رند تھا اور نعتیہ مشاعرے میں اس کی شرکت ممکن نہیں تھی۔ اگر فہرست میں اس کا نام نہ رکھا جائے تو پھر مشاعرہ ہی کیا ہوا۔ منتظمین کے درمیان سخت اختلاف پیدا ہو گیا۔ کچھ اس کے حق میں تھے' کچھ خلاف۔

دراصل جگر کا معاملہ تھا ہی بڑا اختلافی۔ بڑے بڑے شیوخ اور عارف باللہ اس کی شراب نوشی کے باوجود اس سے محبت کرتے تھے۔ اسے گناہ گار سمجھتے تھے لیکن لائقِ اصلاح۔ شریعت کے سختی سے پابند مولوی حضرات بھی اس سے نفرت کرنے کے بجائے افسوس کرتے تھے کہ ہائے کیسا اچھا آدمی کس برائی کا شکار ہے۔ عوام کے لیے وہ ایک اچھا شاعر تھا لیکن تھا شرابی۔ تمام رعایتوں کے باوجود مولوی حضرات بھی اور شاید عوام بھی یہ اجازت نہیں دے سکتے تھے کہ وہ نعتیہ مشاعرے میں شریک ہو۔

آخر کار بہت کچھ سوچنے کے بعد منتظمینِ مشاعرہ نے فیصلہ کیا کہ جگر کو مدعو کیا جانا چاہیے۔ یہ اتنا جرأت مندانہ فیصلہ تھا کہ جگر کی عظمت کا اس سے بڑا اعتراف نہیں ہو سکتا تھا۔

جگر کو مدعو کیا گیا تو وہ سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ 'میں رند' سیاہ کار' بدبخت اور نعتیہ مشاعرہ! نہیں صاحب نہیں۔' اب منتظمین کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ جگر کو تیار کیسے کیا جائے۔ اس کی تو آنکھوں سے آنسو اور ہونٹوں سے انکار رواں تھا۔ نعتیہ شاعر حمید صدیقی نے اسے آمادہ کرنا چاہا۔ اس کے مربی نواب علی حسن طاہر نے کوشش کی لیکن وہ کسی صورت تیار نہیں ہوتا تھا۔ بالآخر اصغر گونڈوی نے حکم دیا اور وہ چپ ہو گیا۔

سرہانے بوتل رکھی تھی' اسے کہیں چھپا دیا۔ دوستوں سے کہہ دیا کہ کوئی اس کے سامنے شراب کا نام تک نہ لے۔

دل پر کوئی خنجر سے لکیر سی کھینچتا تھا۔ وہ بے اختیار شراب کی طرف دوڑتا تھا مگر پھر رک جاتا تھا۔ 'شیرازن سے ہمارا رشتہ فراق کا ہے لیکن شراب سے تو نہیں۔ لیکن مجھے نعت لکھنی ہے۔ شراب کا ایک قطرہ بھی حلق سے اترا تو کس زبان سے اپنے آقا کی مدح لکھوں گا۔ یہ موقع ملا ہے تو مجھے اسے کھونا نہیں چاہیے۔ شاید یہ میری بخشش کا آغاز ہو۔ شاید اسی بہانے میری اصلاح ہو جائے۔ شاید مجھ پر اس کملی والے کا کرم ہو جائے۔ شاید خدا کو مجھ پر پیار آ جائے۔'

ایک دن گزرا۔ دو دن گزر گئے۔ وہ سخت اذیت میں تھا۔ نعت کے مضمون سوچتا تھا اور غزل کہنے لگتا تھا۔ سوچتا رہا' لکھتا رہا' کاٹتا رہا۔ لکھے ہوئے کو کاٹ کاٹ کر تھکتا رہا۔ آخر ایک دن نعت کا مطلع ہو گیا پھر ایک شعر ہوا۔ پھر تو جیسے بارشِ انوار ہو گئی۔ نعت مکمل ہوئی تو اس نے سجدۂ شکر ادا کیا۔

مشاعرے کے لیے اس طرح روانہ ہوا جیسے حج کو جا رہا ہو۔ کونین کی دولت اس کے پاس ہو۔ جیسے آج اسے شہرت کی سدرۃ المنتہٰی تک پہنچنا ہو۔ اس نے کئی دن سے شراب نہیں پی تھی لیکن حلق خشک نہیں تھا۔

ادھر تو یہ حال تھا' دوسری طرف مشاعرہ گاہ کے باہر اور شہر کے چوراہوں پر احتجاجی پوسٹر لگ گئے تھے کہ ایک شرابی سے نعت کیوں پڑھوائی جا رہی ہے۔ لوگ بھپرے ہوئے تھے۔ اندیشہ تھا کہ جگر کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ یہ خطرہ بھی تھا کہ لوگ اسٹیشن پر جمع ہو کر نعرے بازی نہ کریں۔

ان حالات کو دیکھتے ہوئے منتظمین نے جگر کی آمد کو خفیہ رکھا تھا۔ وہ کئی دن پہلے اجمیر پہنچ چکا تھا جبکہ لوگ سمجھ رہے تھے کہ مشاعرے والے دن آئے گا۔

جگر اپنے خلاف ہونے والی ان کارروائیوں کو خود دیکھ رہا تھا اور مسکرا رہا تھا۔

کہاں پھر یہ مستی' کہاں ایسی ہستی
جگر کی جگر تک ہی سے خواریاں ہیں

آخر مشاعرے کی رات آ گئی۔ جگر کو بڑی حفاظت کے ساتھ مشاعرے میں پہنچا دیا گیا۔

"رئیس المتغزلین حضرت جگر مراد آبادی۔"

اس اعلان کے ساتھ ہی ایک شور بلند ہوا۔ جگر نے بڑے تحمل کے ساتھ مجمع کی طرف دیکھا۔

"آپ لوگ مجھے ہوٹ کر رہے ہیں یا نعت رسول پاک ﷺ کو جس کے پڑھنے کی سعادت مجھے ملنے والی ہے اور آپ سننے کی سعادت سے محروم ہونا چاہتے ہیں۔"

شور کو سانپ سونگھ گیا۔ بس یہی وہ وقفہ تھا جب جگر کے ٹوٹے ہوئے دل سے یہ صدا نکلی۔

اک رند ہے اور مدحتِ سلطانِ مدینہ
ہاں کوئی نظر' رحمتِ سلطانِ مدینہ

جو جہاں تھا ساکت ہو گیا۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے اس کی زبان سے شعر ادا ہو رہا ہے اور قبولیت کا پروانہ عطا ہو رہا ہے۔

نعت کیا تھی، گناہ گار کے دل سے نکلی ہوئی آہ تھی، خواہشِ پناہ تھی۔ آنسوؤں کی سبیل تھی، بخشش کا خزینہ تھی۔ وہ خود رو رہا تھا، سب کو رلا رہا تھا۔ دل نرم ہوگئے، اختلاف ختم ہوگئے۔ رحمت عالمؐ کا قصیدہ تھا، بھلا غصے کی کھیتی کیونکر ہری رہتی۔

"یہ نعت اس شخص نے کہی نہیں ہے، اس سے کہلوائی گئی ہے۔" مشاعرے کے بعد ہر زبان پر یہی ایک بات تھی۔

○☆○

۱۹۴۶ء کا سال اس کے لئے حزن و ملال کا سال بن کر آیا۔ اس کے مربی، دوست، غم خوار۔ جن کی وجہ سے اس نے بھوپال ہاؤس میں دن گزارے، بھوپال میں قیام کیا۔ اس کا مجموعۂ کلام شعلۂ طور شائع ہوا، داغ مفارقت دے گئے۔ اس موت کا دکھ صرف وہی جان سکتا تھا۔

اے غم دوست ترا صبر مجھی پر ٹوٹے
بے ترے نیند بھی آنکھوں میں اگر آئی ہو

ابھی آنکھوں کو رت جگے مناتے دس دن گزرے تھے کہ ہوا نے اس کا ایک چراغ اور بجھا دیا۔ چراغ بھی ایسا جس سے اس کے حریم دل میں روشنی تھی۔

یوں تو ہونے کو جگر اور بھی ہیں اہل کمال
خاص ہے حضرت اصغر سے ارادت مجھ کو

اصغر گونڈوی کا انتقال ہوگیا۔ زندگی بھر وہ ان کے سایۂ تربیت میں رہا تھا۔ ابھی تربیت ختم نہیں ہوئی تھی کہ سایہ اٹھ گیا۔ ایسی تیز دھوپ سے اسے کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا۔ اس نے گھبرا کر بے خودی کا ہاتھ تھام لیا۔

اک بزم ناز میں چل، زاہد تجھے دکھا دوں
مینا بدوش آنکھیں، ساغر بہ کف نگاہیں

ایسے میں شیرازن کا سہارا بڑا سہارا تھا۔ وہ اسے بھول گیا تھا، ایسا تو نہیں تھا لیکن جس شدت سے اب اس کی یاد آرہی تھی، کبھی نہیں آئی تھی۔

وہ دنیا کی طرف سے آنکھیں پھیر کر شیرازن کے حضور مصروف طواف ہوگیا۔ اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ تن بدن کا ہوش نہیں تھا۔ لگتا تھا، دنیا کی شراب کم پڑ جائے گی۔ ہندوستان اس کے لئے صحرا تھا جس میں وہ قیس کی طرح گھومتا پھر رہا تھا۔ چلتے چلتے تھک جاتا تو شیرازن کے حضور پل دو پل کے لئے بیٹھ جاتا۔ یہاں آکر بھی اسے قرار نہیں آتا۔ بھاگنے کی فکر میں مبتلا رہتا۔

۳۸ء میں شیرازن کی توبہ مکمل ہوگئی۔ اس نے اپنے پیشے کو خیرباد کہا اور حج پر جانے کی تیاری کرنے لگی۔ جگر کی بے قراری اور بڑھ گئی تھی۔ وہ شیرازن سے بھی گیا گزرا ہوگیا۔ اسے کس دربار میں بلایا جارہا ہے۔ اب اس کے دکھوں میں ایک دکھ کا اور اضافہ ہوگیا۔ اس کے پاس تو ہر زہر کی ایک ہی دوا تھی۔ اس نے قسم کھالی تھی کہ اب ہوش میں نہیں آئے گا۔ اس کے احباب اس کی طرف سے مایوس ہو چلے تھے۔

شیرازن حج سے واپس آچکی تھی۔ وہ گھومتا گھامتا مین پوری آیا اور اطلاع ملی تو شیرازن سے ملنے چلا گیا۔ نشے میں قدم بہکے ہوئے، آنکھوں میں سرخ ڈورے، چہرے پر رت جگوں کی گرد۔

"سرکار، کیا زمانے کی طرح تم بھی ہم سے روٹھ گئیں۔"

وہ جگر کو دیکھ کر ہمیشہ کی طرح بے قرار ہوکر اس کے سامنے نہیں آگئی تھی۔ اس لئے جگر کو خفگی کا احساس ہو رہا تھا۔

"آپ سے خفگی کا تصور بھی نہیں کرسکتی لیکن اب میں حج کر آئی ہوں۔ میں نے اللہ سے کچھ وعدے کئے ہیں جن پر مجھے چلنا ہے۔ میں اب آپ کے سامنے نہیں آسکتی۔ میں پردہ کرنے لگی ہوں۔"

"کیا ہم سے بھی؟"

"جس کی ملازمت میں تھی، اب اس کے سامنے بھی نہیں آتی۔"

"ملازمت اور محبت میں فرق ہوتا ہے۔"

"محبت تو دلوں میں ہوتی ہے۔ اس کے لئے سامنے آنا ضروری تو نہیں۔"

"کیا ہمیں حج کے تبرکات سے بھی نہیں نوازو گی؟"

"قطعی نہیں۔ آپ شراب پیتے ہیں، اس تبرک کو ہاتھ نہیں لگا سکتے۔"

"اگر میں شراب چھوڑ دوں؟"

"پھر بے شک لیکن آپ ایسا کریں گے نہیں۔"

"میں تم سے عہد کرتا ہوں۔"

"میں کون ہوتی ہوں۔ اپنے اللہ سے عہد کیجئے۔"

"تمہیں گواہ بنا کر عہد کرتا ہوں۔"

"تو پھر جائیے۔ غسل کرکے، پاک ہوکر آئیے۔ میں حج کے تبرک سے آپ کی ضیافت کروں گی۔"

جگر اپنے دوست نواب علی حسن سے کہا کرتا تھا، آپ فکر نہ کریں۔ میں توبہ کئے بغیر مروں گا نہیں۔ اصغر گونڈوی کہا کرتے تھے، جگر ایک دن شراب ضرور چھوڑ دیں گے۔ شاید اب وہ وقت آگیا تھا۔

وہ بغیر کچھ کہے سنے وہاں سے اٹھ گیا۔ شیرازن یہی سمجھی ہوگی کہ ناراض ہو کر گئے ہیں، اب بھی نہیں آئیں گے۔ اس نے اپنی آنکھوں کے گوشوں میں ابھرنے والی نمی کو دوپٹے کے کونے سے صاف کیا اور آرام کرنے کے لئے لیٹ گئی۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ کہیں لالہ دھرم داس تو نہیں ہیں؟ میں نے انہیں سختی سے منع کردیا تھا لیکن یہ شوقین مزاج مردیوں ماننے والے کب ہیں۔

"جگر صاحب تشریف لائے ہیں۔" ملازم نے آکر بتایا۔

"جگر آئے ہیں۔ پھر آئے ہیں۔" وہ گھبرا کر اٹھی اور کمرے سے باہر بھاگی پھر خود بخود اس کے قدم رک گئے۔ اب میں وہ شیرازن نہیں ہوں۔

"انہیں بٹھاؤ۔" اس نے ملازم سے کہا۔

"وہ تشریف فرما ہوچکے ہیں۔"

وہ دروازے کے قریب پہنچ گئی۔ "یا اللہ! یہ کیا بے قراری ہے۔ اب کیوں چلے آئے۔"

"میں پاک ہو کر آگیا ہوں۔ اب تو تمہارے لائے ہوئے تبرک کو ہاتھ لگا سکتا ہوں؟"

گھر میں مٹھائی رکھی تھی۔ حج سے کھجوریں لائی تھی۔ آبِ زم زم تھا۔

"یہ چیزیں جگر صاحب کو لے جاکر دے دو۔"

"شیرازن، کیا اب بھی ہمارے سامنے نہیں آؤ گی؟"

"یہ ضد نہ کیجئے۔ آپ میرے لئے نامحرم ہیں۔"

جذبات کا عجیب بھنور تھا جس میں گھرا ہوا تھا۔ شیرازن سے بچھڑنے کا دکھ تھا یا اس مقدس تبرک کی موجودگی کا احساس۔ اس کا دل بھر آیا۔ اس نے تبرک کو آنکھوں سے لگایا، ہونٹوں سے چوما، دل سے قبول کیا۔

"اچھا شیرازن، اب میں چلتا ہوں۔"

"اب میں یہ نہیں کہہ سکتی کہ پھر آئیے گا لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ مجھے بھول جائیے گا۔"

جگر نے آخری مرتبہ اس گھر کے در و دیوار کو دیکھا اور وہاں سے نکل آیا۔

واعظ نے اور نہ عابدِ شب زندہ دار نے
مجھ کو جگا دیا مرے دل کی پکار نے

اصغر کا انتقال ہوچکا تھا اور نسیم بیوگی کے دن گزار رہی تھیں۔ جگر کو شراب چھوڑتے ہی نسیم کی یاد نے بے قرار کردیا۔ نسیم کو اس کی شراب نوشی سے اختلاف تھا اور کوئی جھگڑا نہیں تھا۔ اب شراب چھوڑ دی، اختلاف ختم ہوگیا۔ میری محبت اس کے دل میں اب بھی باقی ہوگی لیکن اب وہ میرے لئے غیر ہے۔ غیریت کی یہ دیوار ختم بھی ہوسکتی ہے۔ میں نسیم سے شادی کرسکتا ہوں۔ اس خیال کے آتے ہی وہ گونڈہ پہنچ گیا۔ کچھ دوستوں کے ذریعے اس نے اپنی خواہش کو نسیم تک پہنچایا۔

اس کی توبہ کا اعتبار نہیں تھا۔ نسیم کے گھر والوں نے اس رشتے سے انکار کردیا۔ شاہ منگلوری کا انتقال ہوچکا تھا۔ ان کے صاحبزادے تک بھی یہ معاملہ پہنچا۔ انہوں نے بھی مخالفت کی۔ غرض نسیم کے گھر والے کسی قیمت پر تیار نہیں ہوتے تھے۔ اصغر کی وصیت درمیان میں آئی لیکن سوال یہی تھا کہ جگر نے شراب چھوڑی بھی ہے؟ بالآخر نسیم نے فیصلہ کن بات کہہ دی۔

"اگر جگر نے ایک سال تک شراب کو ہاتھ نہیں لگایا تو میں ان سے شادی کرلوں گی۔"

جگر نے اس فیصلے کو قبول کرلیا۔

نسیم کیا، کسی کو بھی یقین نہیں تھا کہ وہ اپنی توبہ پر قائم رہے گا۔ اس سے پہلے بھی وہ کئی مرتبہ توبہ کرچکا تھا لیکن ہر مرتبہ کبھی گھبرا کے پی گیا کبھی لہرا کے پی گیا۔ سب کو یقین تھا کہ اس مرتبہ بھی اس کی توبہ کا یہی حشر ہوگا۔

اس نے چودہ پندرہ سال کی عمر سے شراب پینی شروع کی تھی۔ اس کا لہو، شراب بن چکا تھا۔ یکلخت شراب ترک کردینا مذاق نہیں تھا۔

کثرتِ شراب نوشی سے اعصاب کمزور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ نہ قوتِ فیصلہ باقی رہتی ہے نہ حوصلہ۔ اسی لئے شراب چھوڑنے والا اپنے فیصلے پر قائم نہیں رہ پاتا۔

"اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں۔"

ترکِ گناہ کے لئے جس قوتِ ایمانی کی ضرورت ہوتی ہے، کسی کی دعاؤں سے اسے وہ قوت عطا ہوئی تھی۔

سال بھر گزر گیا۔ کہیں سے کوئی شہادت نہیں ملی کہ اس نے شراب کو ہاتھ بھی لگایا ہو۔ گونڈہ کا وہ شراب خانہ جہاں کے چکر کاٹتے کبھی اس کے قدم نہ تھکتے تھے، اب یہ حال ہوگیا کہ ادھر سے گزرنا چھوڑ دیا۔

"بھئی، اب شراب کی بو برداشت نہیں ہوتی۔"

وہ جسمانی طور پر شراب و شیرازن سے دور ہوگیا تھا۔ لیکن بہت دن تک اسے یہ یادیں پریشان کرتی رہیں۔

کسی صورت نمودِ سوزِ پنہانی نہیں جاتی
بجھا جاتا ہے دل، چہرے کی تابانی نہیں جاتی
مزاجِ اہلِ دل بے کیف و مستی رہ نہیں سکتا

کہ جیسے نکہتِ گل سے پریشانی نہیں جاتی
گئے وہ دن کہ دل سرمایہ دار دردِ پیہم تھا
مگر آنکھوں کی اب تک سیر سامانی نہیں جاتی
جسے رونق ترے قدموں نے دے کر چھین لی رونق
وہ لاکھ آباد ہو اس گھر کی ویرانی نہیں جاتی
وہ یوں دل سے گزرتے ہیں کہ آہٹ تک نہیں ہوتی
وہ یوں آواز دیتے ہیں کہ پہچانی نہیں جاتی
مجھے تو کردیا سیراب ساقی نے مرے لیکن
مری سیرابیوں کی تشنہ سامانی نہیں جاتی
نہیں معلوم کس عالم میں حسنِ یار دیکھا تھا
کوئی عالم ہو لیکن دل کی حیرانی نہیں جاتی
محبت میں اک ایسا وقت بھی آتا ہے انسان پر
کہ آنسو خشک ہوجاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی

○☆○

آنسو خشک ہوگئے تھے لیکن طغیانی نہیں جاتی تھی۔ دل میں کوئی رہ رہ کر چٹکیاں لیتا تھا لیکن دونوں دروازے اس کی مخالف سمت بند ہوگئے تھے۔ نہ میکدہ کھلا تھا نہ شیرازن کا دروازہ۔

وہ زمانے کو حیرت میں ڈبوتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ جگر نے شراب چھوڑ دی؟ جس نے یہ خبر سنی، حیرت سے سنی۔ کچھ نے اسے مطعون کیا، کچھ نے شکر ادا کیا کہ جگر جیسا آدمی زیادہ دیر اس برائی کے ساتھ چل نہیں سکتا تھا۔

"جگر، تم کمزور آدمی ہو۔" جوش نے اس سے کہا۔ "اپنی روش بدل لی۔ مجھے دیکھو جہاں تھا وہیں ہوں۔ آج تک دھڑلے سے پی رہا ہوں۔"

"میں ریل کی طرح ہوں جو آگے بڑھتی رہتی ہے۔ تم ریل کے کھمبے کی طرح ہو۔ بے جان، ایک جگہ ٹھہرے ہوئے۔"

کسی کو یہ فکر تھی کہ جگر نے زندگی کا ایک بڑا حصہ شراب کے ساتھ گزارا ہے، شراب چھوڑنے کے بعد اس کی شاعری یقیناً ختم ہوجائے گی۔ اگر ختم نہیں بھی ہوئی تو اس میں وہ بات نہیں رہے گی جو جگر کی پہچان تھی۔

"جناب، آپ کو اگر یہ غلط فہمی ہے کہ میں شراب پی کر شعر کہتا تھا تو اس غلط فہمی کو دور کرلیجئے۔ شاید چند ہی غزلیں ہوں گی جو میں نے نشے کی حالت میں کہی ہوں گی۔ میں تو دورِ رندی میں بھی غزل کہتے ہوئے شراب کو ہاتھ نہیں لگاتا تھا۔"

وہ ہر اعتراض کو رد کرتا ہوا اپنے عہد پر قائم رہا۔ اس ایفائے عہد میں اس پر جو گزری، اس کا دل ہی جانتا ہوگا۔

شراب کیا چھوٹی، وہ بھری دنیا میں اکیلا رہ گیا۔ اسے وقت گزارنے کے لئے کچھ سہاروں کی ضرورت شدت سے ہونے لگی۔

اس نے سگریٹ اور چائے کو شراب کا نعم البدل بنایا۔ اس کی انتہا پسند فطرت نے یہاں بھی کام دکھایا۔ سگریٹ نوشی شروع کی تو اس کثرت سے کہ لگتا تھا دنیا بھر کے سگریٹ دھواں بنا کر اڑا دے گا۔ چائے کی ایک پیالی ختم نہیں ہوتی کہ دوسری آجاتی۔ ہر پیالی کے ساتھ سگریٹ الگ پھونکتا رہتا۔ چائے بھی ایسی کڑوی پیتا کہ دوسرا آدمی ایک گھونٹ نہیں پی سکتا۔

اسے دل کا دورہ پڑ چکا تھا۔ شراب ترک کرنے کے بعد طرح طرح کی بیماریاں بھی سر اٹھانے لگی تھیں۔ اس لئے سگریٹ نوشی اس کے لئے شراب سے بھی زیادہ خطرناک ہوسکتی تھی۔ ڈاکٹروں نے اسے مشورہ بھی دیا لیکن سگریٹ کے ساتھ گناہ کا احساس نہیں تھا جو اسے پریشان کرتا۔ تلخ چائے اور سگریٹ اس کا اوڑھنا بچھونا بن گئے۔

ان دنوں تاش کھیلنا بھی اس کا محبوب مشغلہ تھا جو ساری عمر باقی رہا۔ دراصل وہ اپنے ذہن کو کسی وقت خالی چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ شراب کا خیال تک آئے۔ تنہائی میں بہک سکتا تھا، اس لئے دوستوں کے ساتھ تاش کھیلتے ہوئے راتیں گزارتا تھا۔

سگریٹ، تاش، چائے اور رت جگے۔ اب یہی اس کی زندگی تھی۔

اس نے ثابت کردیا تھا کہ وہ شراب چھوڑ چکا ہے۔ اب نسیم کو اس سے نکاح کرنے میں کوئی امر مانع نہیں ہوسکتا تھا۔ جگر نے نسیم سے نکاح کرلیا۔

مدت میں وہ پھر تازہ ملاقات کا عالم
خاموش اداؤں میں وہ جذبات کا عالم
نغموں میں سمویا ہوا وہ رات کا عالم
وہ عطر میں ڈوبے ہوئے لمحات کا عالم
وہ نظروں ہی نظروں میں سوالات کی دنیا
وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں جوابات کا عالم
نازک سے ترنم میں اشارات کے دفتر
ہلکے سے تبسم میں کنایات کا عالم
دو بچھڑے دلوں کی وہ بہم صلح و صفائی
پُر کیف وہ تجدیدِ ملاقات کا عالم
تا صبح وہ تصدیقِ محبت کے نظارے

تا شام وہ پھر فخر و مباہات کا عالم
عالم مری نظروں میں جگر اور ہی کچھ ہے
عالم ہے اگرچہ وہی دن رات کا عالم

○☆○

دورِ غرقابی ختم ہوا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ہوش کی دنیا میں قدم رکھا۔ گرد و پیش پر نظر ڈالی۔ دنیا ہی بدل چکی تھی۔ ادبی دنیا میں ترقی پسندی کا دور دورہ تھا۔ وہ خود کو اس سے الگ تھلگ نہیں رکھ سکتا تھا۔ یہاں سے اس کی شاعری ایک نئے ذائقے سے آشنا ہوئی۔ بھوک' افلاس' انقلاب کی خواہش' عوام کی حالتِ زار۔ نشہ اترتے ہی اسے سب کچھ نظر آنے لگا۔ اس جیسا غزل گو یہ کہنے پر مجبور ہوگیا۔

فکرِ جمیل خوابِ پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل

سننے والوں نے تعجب سے سنا اور پھر ذرا دیر میں اس کی بات سمجھ میں آگئی۔ وہ یہ نہیں کہہ رہا تھا کہ غزل نہ کہی جائے بلکہ مطلب یہ تھا کہ اب غزل کے مضامین میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔

سازِ حیات' سازِ شکستہ ہے ان دنوں
بزمِ خیال جنتِ ویراں ہے آج کل

زندگی کا ساز اپنی آواز کھو چکا ہے۔ ضرورت ہے کہ شکستہ ساز کی درستی کے لئے کچھ کیا جائے۔

جگر کے نزدیک حیات کا ساز' مادی آسودگی اور ظاہری چمک دمک سے نغمہ ریز نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے باطنی آسودگی اور راست کرداری کی ضرورت ہے۔ اسے اپنے وطن میں راست کرداری' جرات مندانہ خلوص اور وسعتِ نظری کی کمی نظر آئی۔ اس نے خارجی حالات پر تنقید کے ساتھ ساتھ باطنی ترقی کو بھی اپنا موضوع بنایا۔

خود اپنے سوزِ باطنی سے نکال اک شمعِ عرفانی
چراغِ دیر و حرم تو اے دل جلا کریں گے' بجھا کریں گے

○☆○

اپنا زمانہ آپ بناتے ہیں اہلِ دل
ہم وہ نہیں کہ جن کو زمانہ بنا گیا

○☆○

خود اپنی آگ میں جلتی ہے شمع' جلنے دو
پرائی آگ میں جلنا ہے کارِ مردانہ

○☆○

یہ مصرعہ کاش نقشِ ہر در و دیوار ہوجائے
جسے جینا ہو مرنے کے لئے تیار ہوجائے

○☆○

جہلِ خرد نے دن یہ دکھائے
گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے

یہ ایک بالکل بدلی ہوئی دنیا تھی جس کی جھلکیاں وہ دکھا رہا تھا۔

اس کی شاعری کے بارے میں اب تک عام طور پر یہ رائے تھی کہ اس میں شراب و شباب کی پُرکیف سرمستیاں ہیں اور اسے سماجی تنقید سے سروکار نہیں لیکن رندی کا زمانہ گزرتے ہی اس رائے میں تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس نے ثابت کردیا کہ اس کی قوتِ تغزل اس قدر پُرتاثیر ہے کہ وہ خیال کے براہِ راست اظہار کے باوجود شعریت اور تغزل کے انداز کو برقرار رکھ سکتا ہے۔ جگر کی کوئی غزل' غزل کے کیف سے خالی نہیں۔

اس نے اپنی زندگی بدلتے ہی شاعری کی ڈگر بھی بدل دی۔ اب تک اس کے نغمے اپنے لئے تھے لیکن اب وہ زمانے کا نغمہ خواں بن گیا۔ ہوش مندی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوسکتا تھا۔ ترقی پسند جس قسم کی شاعری کا مطالبہ کررہے تھے' چند چیزوں سے اختلاف کے باوجود' اس کی شاعری اس ضرورت کو پورا کررہی تھی۔

وہ بدستور مشاعروں کی ضرورت بنا رہا۔ نوجوان شعرا میں اس کا احترام بدستور موجود رہا۔

وہ عالم فاضل نہیں تھا۔ شعر و ادب پر اس کی گفتگو فلسفیانہ نہیں ہوتی تھی لیکن احساس کی شدت اور جذبے کی فراوانی نے اس کی شاعری کو پھیکا نہیں ہونے دیا اور اس کی شاعری میں وقت کی رفتار کے ساتھ چلنے کی قوت باقی رہی۔

اگر ایک زمانے میں شراب و شباب کی لذت پر لوگ اس کی شاعری سن کر سر دھنتے تھے تو اب اس لئے پسند کرتے تھے کہ دیکھیں اس نے دنیا کو کس نظر سے دیکھا ہے۔

اس کی رندی کا دور ختم ہوگیا تھا لیکن اس کی جراتِ رندانہ ابھی تک قائم تھی۔

دورِ فرنگی میں قیصر باغ لکھنؤ کے ایک مشاعرے میں ایک انگریز کی صدارت کے باوجود اس نے اپنی نظم قحطِ بنگال پڑھی۔

بنگال کی میں شام و سحر دیکھ رہا ہوں
ہر چند کہ ہوں دور مگر دیکھ رہا ہوں
افلاس کی ماری ہوئی مخلوق سرِ راہ
بے گور و کفن خاک بہ سر دیکھ رہا ہوں
تعمیر کے پردے میں بہ اندازِ حکومت

تخریب بہ عنوانِ دگر دیکھ رہا ہوں
انجامِ ستم اب کوئی دیکھے کہ نہ دیکھے
میں صاف ان آنکھوں سے مگر دیکھ رہا ہوں
اربابِ وطن کو مری جانب سے ہو مژدہ
اغیار کو مجبورِ سفر دیکھ رہا ہوں
جو خواب کہ شرمندۂ تعبیر تھا اب تک
اس خواب کی تعبیر جگر دیکھ رہا ہوں

○☆○

اب اس کے پاس دولت بھی تھی، شہرت بھی تھی اور عزت بھی۔ شراب چھوڑ ہی چکا تھا۔ نسیم کو اب اس سے کوئی شکایت نہیں ہوسکتی تھی۔ شاعرانہ آوارگی ضرور برقرار تھی لیکن اتنا تو نسیم کو بھی معلوم تھا کہ وہ شاعر ہے۔ تاش (رمی) کھیلنے کا شوق ایسا تھا کہ کئی کئی راتیں ایک نشست سے بیٹھے ہوئے گزر جاتی تھیں۔ مشاعروں کی مصروفیت ایسی تھی کہ ہفتوں گھر آنا نصیب نہ ہوتا۔ ہندوستان کا ہر کونا وہ کئی کئی مرتبہ پھلانگ چکا تھا۔

اب عمر ایسی نہیں تھی کہ ہر سختی بہ آسانی جھیل جاتا۔ طویل عرصے تک شراب خوری کے اثرات اب ظاہر ہونا شروع ہوگئے تھے۔ بے اعتدالیوں نے اس کے اعصاب پر بڑا بُرا اثر ڈالا تھا۔ مستقل رت جگوں نے اس کی صحت پر بہت بُرا اثر ڈالا تھا۔

اس نے ان سب باتوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے مشاعروں کو خود پر حرام کرنے کی ٹھان لی۔ کچھ دن اس پر عمل بھی کیا لیکن یہ مشاعرے ہی تو اس کا ذریعۂ معاش تھے۔ وہ سفر کی صعوبتیں برداشت کرنے پر مجبور ہوگیا۔ اسے مجبوراً مشاعروں میں شرکت پر راضی ہونا پڑا۔

دوسری عالم گیر جنگ کی تباہ کاریوں سے ہندوستان بھی متاثر ہو رہا تھا۔ اس کے دوش بہ دوش ہندوستان کی سیاست بھی کروٹ بدل رہی تھی۔ آزادی کی کوششیں تیز ترین ہوچکی تھیں۔ انگریزوں کے نظامِ مملکت میں ہندو، مسلم اختلافات کا آغاز ہوچکا تھا۔ اس کے پہلو بہ پہلو ایسے نفسیاتی عوارض کے مظاہر بھی نظر آنے لگے تھے، ایسے حالات میں قومیں جن کا شکار ہوجاتی ہیں۔

جگر سیاسی آدمی نہیں تھے لیکن ایک قومی شعور ضرور رکھتے تھے۔ ایک ایسے انسانی سماج کا تصور رکھتے تھے جس میں افراد خود غرضی اور تعصب کے بجائے محبت، راست کرداری اور خلوص کو نظامِ حیات قرار دے سکیں۔ اگر انسان لالچ، تنگ دلی اور تعصب سے نہیں نکل سکتا تو ترقی بے کار ہے۔

تسخیرِ مہر و ماہ مبارک تجھے مگر
دل میں اگر نہیں تو کہیں روشنی نہیں

اب نہایت سنجیدگی کے ساتھ یہ مضامین اس کی شاعری کا حصہ بن رہے تھے۔ یہاں اس کی شاعری نے یہ الزام دھو دیا کہ غزل میں صرف عشق و عاشقی کے مضامین بیان ہوسکتے ہیں۔ حسرت موہانی نے بھی اپنی غزل سے یہی کام لیا تھا لیکن تغزل کا جو رچاؤ جگر کے ہاں تھا، حسرت کو نہیں ملا تھا۔

اس نے کٹر غزل گو ہونے کے باوجود نظم گوئی کا راستہ بھی اختیار کیا۔ وہ ہنگامی اور خارجی مضامین جن کے لئے تفصیل کی ضرورت ہوتی ہے، غزل کی جگہ نظم کا راستہ اختیار کیا۔ اس نے ان نظموں میں بھی تغزل کی وہ دل کشی پیدا کردی جو دوسرے نظم گو کو نصیب نہیں ہوسکتی تھی۔

۱۹۴۷ء میں یہ شاعرِ خوش فکر اس انداز میں نغمہ سرا ہوا۔

بھاگ مسافر میرے وطن سے، میرے وطن سے بھاگ
اوپر اوپر پھول کھلے ہیں بھیتر بھیتر آگ
بھاگ مسافر بھاگ
گاندھی جی کا نام زباں پر من کے اندر روگ
کام نہیں بے جھانسا پٹی بات نہیں بے لاگ
بھاگ مسافر بھاگ

○☆○

اس کی صحت تیزی سے گر رہی تھی۔ قلب کا عارضہ تھا جو رہ رہ کر پریشان کرتا تھا۔ ۱۹۴۲ء میں جب وہ جوناگڑھ میں مقیم تھا، شدید تر دورہ پڑا تھا۔ اب بلڈ پریشر کا عارضہ بھی شروع ہوگیا تھا۔

ہندوستان کی آزادی اور اس کے نتیجے میں ہونے والے ہندو مسلم فسادات نے اس کی صحت پر بہت بُرا اثر ڈالا۔ انسانیت کا درس دینے والے اس شاعر نے جب انسانوں کو قتل ہوتے ہوئے دیکھا تو وہ بیمار پڑ گیا۔ اذیت اور مایوسی نے اسے دبوچ لیا۔

بیماری کے ساتھ ساتھ وہ شدت سے تنہائی محسوس کرنے لگا تھا۔ دوست، احباب پاکستان چلے گئے تھے۔ اب اس کے نغمے تھکن بانٹنے لگے تھے۔

اب کوئی تیر دل کے پار نہیں
اب مجھے زندگی سے پیار نہیں
اب کوئی روح کی پکار نہیں
اب کوئی جیسے انتظار نہیں
اب کوئی غم نہیں طرب افزا
اب کوئی درد خوش گوار نہیں

زخم سینے پہ آج بھی ہے جگر
ناز پروردۂ بہار نہیں

○☆○

اس نے بھی دوسرے بہت سوں کی طرح آزادی کے سہانے خواب دیکھے تھے لیکن دورِ جمہوریت میں اس خواب کی تعبیر اس کے حسبِ منشا سامنے نہیں آئی۔ وہ بہت سے دوسروں کی طرح اس صورتِ حال سے مصالحت نہیں کر سکتا تھا۔ خاموش رہنے کی قیمت وصول نہیں کر سکتا تھا۔

اس نے ہندوستان کے یومِ جمہوریہ کے موقع پر لال قلعہ دہلی کے ایک مشاعرے میں جواہر لعل نہرو کی موجودگی میں اپنی نظم "آوازیں" پڑھ کر سب کے کان کھڑے کر دیئے۔

اگرچہ آزادیِ وطن کو گزر چکا ایک سال کامل
مگر خود اہلِ وطن کے ہاتھوں فضا ہے ساز گار اب بھی
زمین بدلی، زمانہ بدلا مگر نہ بدلے تو وہ نہ بدلے
جو تنگ و تاریک ذہنیت تھی وہی ہے بر روئے کار اب بھی
کوئی یہ چپکے سے ان سے پوچھے کہاں گئے آپ کے وہ وعدے
نچوڑتا ہے لہو غریبوں کا دستِ سرمایہ دار اب بھی
سفارشیں ظالموں کے حق میں پیامِ رحمت بنی ہوئی ہیں
نہیں ہے شائستۂ سماعت دکھے دلوں کی پکار اب بھی
جو محوِ جشنِ نظامِ نو ہیں پکار کر ان سے کہہ رہا ہوں
یہ جان ہے سوگوار اب تک، یہ دل ہے ماتم گسار اب بھی
غلط یہ جمہوریت کے وعدے، دروغ یہ زندگی کے نقشے
دلیل اس کی یہی ہے کافی کہ ذہن ہے تنگ و تاریک اب بھی
کہاں کی دلداری و محبت، تلافیوں کا تو ذکر ہی کیا
حقوق پامال کر رہے ہیں حقوق کے پہرا دار اب بھی

○☆○

اس ایک نظم اور اس کے سخت ترین اشعار پر ہی منحصر نہیں۔ اس نے جہاں ضرورت محسوس کی اہلِ اقتدار کو بھی للکارا اور بے حس انسانوں کو بھی توجہ دلائی۔

اٹھو، اٹھو! کہ زندگی ہی زندگی پہ بار ہے
بڑھو، بڑھو! کہ چار سو پکار ہی پکار ہے
کہاں کے مطرب و غزل، کہاں کے شاہد و چمن
کہ زندگی تمام تر بساطِ کارزار ہے
زمین کو روندتے ہوئے صفوں کو چیرتے ہوئے
بڑھے چلو بڑھے چلو! یہ وقت کی پکار ہے
(نوائے وقت)

○☆○

کدھر ہے تو اے جرأتِ باغیانہ
بدل دے مقدر، پلٹ دے زمانہ
کھلا بابِ زنداں تو کیا اس سے حاصل
کہ خود زندگی بن گئی قید خانہ
غریبوں پہ جو کچھ گزرتی ہے گزرے
سمٹ آئے جیبوں میں لیکن خزانہ
بشر کی یہ پستی ارے توبہ توبہ!
زمانے کا آقا، غلامِ زمانہ
(زمانے کا آقا، غلامِ زمانہ)

○☆○

یہ سنتا ہوں کہ پیاسی بہت خاکِ وطن ساقی
خدا حافظ چلا میں باندھ کر سر سے کفن ساقی
رگ و پے میں کبھی صہبا ہی صہبا رقص کرتی تھی
مگر اب زندگی ہی زندگی ہے موج زن ساقی
لباسِ حریت کے اڑ رہے ہیں ہر طرف پرزے
بساطِ آدمیت ہے شکن اندر شکن ساقی
مجھے ڈر ہے کہ اس ناپاک تر دورِ سیاسی میں
بگڑ جائے نہ خود میرا مذاقِ شعر و فن ساقی
(ساقی سے خطاب)

دنیا اسے محض لب و عارض کا ترجمان سمجھ کر نظر انداز کر دیتی تو بڑی زیادتی ہوتی۔ اس نے ایک ذمے دار شاعر کا فرض ادا کر کے خود کو تاریخ میں محفوظ کر لیا۔ اس کی نظمیں اس کی شاعری کا روشن تر باب بن گئیں۔ اس نے اپنی شاعری کو اس مقام پر پہنچا دیا جہاں وہ سستا نشہ نہیں بنتی، سوزِ یقین اور جوشِ عمل کی پیغامبر بن جاتی ہے۔ ایسا اس لئے ہو سکا کہ یہ شاعری اس کے ذاتی خلوص سے پیدا ہوئی۔ اس میں نہ کسی تقلید کا رنگ ہے نہ کسی مخصوص مکتبِ خیال کے نظریات۔

اپنی تمام تر حب الوطنی کے باوجود وہ سچ بات کہنے سے کبھی باز نہیں آیا۔ اس نے کبھی کسی مصلحت کو آڑے نہیں آنے دیا۔ اس نے نہایت اہم شخصیت ہونے کے باوجود اپنی آواز چھپانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔

آزادی کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں پر جو گزر رہی تھی، اس کا اسے شدت سے احساس تھا۔

"ہندوستان میں مسلمان جن حالات سے گزر رہا ہے اس کی نزاکتوں کا احساس اس شدت سے کر رہا ہوں کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔"

یہ اس کا جذبۂ دردمندی ہی تھا کہ اس نے اپنی خواہش کے برعکس پاکستان آنا گوارا نہیں کیا۔

"اگر تمام صاحب رسوخ مسلمان پاکستان چلے گئے تو بے سہارا مسلمانوں کا کیا ہوگا۔"

وہ خود کو ایسا با اثر آدمی سمجھتا تھا جو مسلمانوں کے حق میں آواز اٹھا سکتا تھا اور اس کی آواز سنی جاتی۔

مسلمان اور اردو زبان اس کا پسندیدہ مقدمہ تھے۔ ان دونوں کے خلاف جو بھی زیادتی ہوتی وہ بہانگ دہل اس کے حق میں بولتا تھا۔

اردو کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے اس نے ایک انٹرویو میں کہا۔

"جہاں نامعقولیت کا دور دورہ ہو وہاں کوئی معقول بات کہنا یا کسی معقولیت کا مطالبہ کرنا سب سے بڑی نامعقولیت سمجھی جاتی ہے۔"

وہ کہیں ہو، کسی جگہ ہو، کسی حال میں ہو کسی کی حق تلفی اس سے برداشت نہیں ہوتی تھی۔ اس وقت تک اسے چین نہیں آتا تھا جب تک وہ اسے اس کا حق دلا نہ دے۔

۱۹۵۰ء میں وہ پاکستان آیا۔ عبدالرب نشتر کی گورنری کا زمانہ تھا۔ جگر لاہور میں ٹھہرا ہوا تھا۔ پرستار جوق در جوق اس سے ملنے کے لئے آرہے تھے۔ ان میں ایک صاحب ایسے بھی تھے جن کے متعلق جگر کو معلوم ہوا کہ ان کی تعلیمی قابلیت پی ایچ ڈی ہے۔

"آپ کسی تعلیمی درسگاہ سے منسلک ہوں گے؟" جگر نے پوچھا۔

"ارے نہیں جگر صاحب۔ میں تو محکمۂ آبادکاری میں ملازم ہوں۔" اس شخص نے جواب دیا۔

"واہ، یہ کیا بات ہوئی۔ آپ پی ایچ ڈی ہیں اور محکمۂ آبادکاری کی ملازمت؟"

"بس جناب، وہاں ایک اسامی خالی تھی، میں نے کہا چلو یہی سہی۔"

"شکر ہے، کہیں گھاس کاٹنے والے کی اسامی خالی نہیں تھی ورنہ آپ کہتے چلو یہی سہی۔"

وہ شخص شرمندہ ہوگیا۔ "بات یہ ہے جگر صاحب کہ میرے پاس کوئی سفارش نہیں تھی۔"

"پاکستان میں بھی سفارش کی ضرورت! کمال ہے صاحب آپ کل میرے پاس تشریف لائیے گا۔ آپ کو تو کسی تعلیمی ادارے میں ہونا چاہئے۔"

اس شخص سے جگر کی جان پہچان تک نہیں تھی لیکن اس کی حق تلفی ہوئی تھی۔ جگر بے چین ہوگیا۔ اس کے جانے کے بعد بھی وہ دیر تک یہی کہتے رہے۔ "واہ صاحب واہ! پی ایچ ڈی اور محکمۂ آبادکاری کی ملازمت، نہیں صاحب نہیں۔ یہ تو ظلم ہے۔"

"نشتر صاحب کو فوراً ٹیلی فون کیجئے۔" انہوں نے اپنے میزبان سے کہا۔ "ان سے کہیے جگر آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

میزبان نے فون کیا۔ نشتر صاحب نے دوسرے دن شام کی چائے پر جگر کو مدعو کرلیا۔

جگر اپنے چند دوستوں کے قافلے کے ساتھ نشتر سے ملنے پہنچ گئے۔ ان میں وہ صاحب بھی تھے جن کے کام کے سلسلے میں وہ جارہے تھے۔

نشتر صاحب اس تپاک سے ملے جیسے جگر گورنر ہوں اور نشتر محض ایک شاعر۔

باتوں کا سلسلہ دراز ہوا۔ چائے بھی پی لی گئی۔ جگر نے وہ بات ہی نہیں نکالی جس کے لئے وہ آئے تھے۔ دراصل وہ یہاں آنے کا سبب بھول ہی گئے تھے۔ بھول جانے کی عادت ان کی پرانی تھی۔

انہیں کسی نے یاد دلایا اور انہیں یاد آگیا۔ زیر لب، اپنی عادت پر لاحول پڑھی پھر نشتر سے مخاطب ہوئے۔

"صاحب، آپ کے محکموں میں کیا ہورہا ہے۔ یہ صاحب پی ایچ ڈی ہیں۔ کسی درس گاہ میں ہوں تو کتنے لوگوں کا بھلا ہو لیکن انہیں محکمۂ آبادکاری میں رکھا ہوا ہے۔"

نشتر صاحب زیرک آدمی تھے۔ فوراً سمجھ گئے بات کیا ہے۔ جگر کو مزید کچھ کہنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔

"بس جگر صاحب، میں پوری بات سمجھ گیا۔ آپ تردد چھوڑ دیں۔ اب یہ میری ذمے داری ہے۔"

یہی ہوا بھی۔ جگر صاحب ابھی پاکستان سے واپس جانے نہیں پائے تھے کہ ان صاحب کو ایک کالج میں نوکری مل گئی۔

○☆○

عبدالغفور شاہ نقش بندی کے بھتیجے حج بیت اللہ کو تشریف لے گئے تھے۔ وہاں انہوں نے ایک خواب دیکھا۔ ایک صاحب چارپائی پر بیٹھے ہیں۔ بکھرے بال، پریشان آنکھیں۔ اہلِ مدینہ کا مجمع ہے اور وہ صاحب جھوم جھوم کر اشعار پڑھ رہے ہیں۔ خواب دیکھنے والا دل میں سوچ رہا ہے کہ جانے یہ کون صاحب ہیں جن کی ایسی پذیرائی ہو رہی ہے۔

اشعار پڑھنے کے بعد وہ شخص روضۂ رسولؐ کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہتا ہے "یا رسول اللہ! کچھ مجھے بھی اپنی رحمت کا صدقہ عطا ہو۔"

اب خواب دیکھنے والے سے نہیں رہا جاتا۔ وہ کسی سے پوچھتا ہے' یہ صاحب کون ہیں؟ یہ ہندوستان کے مشہور شاعر جگر مراد آبادی ہیں۔ جواب ملتا ہے اور اس کے ساتھ ہی خواب دیکھنے والے کی آنکھ کھل جاتی ہے۔

جب وہ صاحب ہندوستان واپس آئے تو انہوں نے یہ خواب اپنے چچا کو سنایا۔ خواب کی تعبیر ظاہر تھی۔ جگر کا بلاوا آگیا تھا۔

عبدالغفور شاہ نقش بندی فوراً جگر کے پاس پہنچے۔ جگر اس وقت کسی غزل کو بیاض پر اتار رہے تھے۔ شاہ صاحب کو دیکھتے ہی ادب سے اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ انہوں نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا لیکن شاہ صاحب نے آگے بڑھ کر گلے سے لگالیا اور فرطِ عقیدت سے ماتھا چوم لیا۔

"اللہ غنی کیا مرتبہ ہے۔ کیا مقام ہے۔"

"شاہ صاحب' کیوں شرمندہ کرتے ہیں۔ بات کیا ہے؟"

"مبارک ہو۔ اللہ اکبر! کیا مرتبہ ہے کیا مقام ہے۔"

"شاہ صاحب' آپ کا حسنِ نظر کچھ زیادہ ہی مہربان ہو رہا ہے۔ مجھ گنہ گار سے ایسی کیا نیکی انجام پاگئی؟"

"میاں تسلی سے بیٹھو تو عرض کروں۔"

انہوں نے وہ خواب جگر کو سنایا جو ان کے بھتیجے نے دیکھا تھا۔

جگر کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ شدتِ جذبات سے جسم کانپ رہا تھا۔

"میں اور وہ دربار! شاہ صاحب' دعا فرمایئے کہ یہ خواب سچا ہو۔"

"بس آپ تیاری کریں۔ مجھے یقین ہے' آپ کو بلایا گیا ہے۔"

وہ عشق ہی نہیں ہے وہ دل ہی نہیں جگر
لبیک خود کہا نہ جسے حسنِ یار نے

اس رات جگر کی آنکھوں سے نیند اڑ گئی۔ اسے اپنا دورِ معصیت یاد آرہا تھا۔ میں ہرگز اس قابل نہیں ہوں۔ ہاں مگر اس طرف سے کرم ہوجائے تو بعید بھی نہیں ہے

مری طلب بھی اسی کے کرم کا صدقہ ہے
قدم یہ اٹھتے نہیں ہیں' اٹھائے جاتے ہیں

○☆○

اسے اس خواب اور اس کی تعبیر پر اتنا یقین تھا کہ اس نے تیاری شروع کردی۔ پھر جیسے رات بیتی' صبح ہونے لگی۔ ایسے وسائل مہیا ہونے لگے کہ بالآخر خواب' حقیقت بن گیا۔

جگر حج پر جارہے ہیں۔

شیروانی کی جیب میں شراب کی بوتل رکھ کر ایک مجذوب حلیے کا آدمی جسے بھی یاد تھا' اسے تعجب ہوا۔ پھر یہ تعجب اس یقین میں بدل گیا کہ سچے دل سے توبہ کی جائے تو قبول ضرور ہوتی ہے۔

جگر بمبئی گئے ہیں۔ وہاں سے وہ حج پر جائیں گے۔ وہ اکیلے نہیں ہیں۔ حج پر بھی ان کے احباب کا قافلہ ان کے ساتھ ہے۔

سعودی حکومت کو بھی معلوم ہوگیا ہے کہ شاعر ہندوستان حج کے لئے تشریف لارہے ہیں۔

جدہ کی بندرگاہ پر سعودی حکومت کے افسران اس کے استقبال کے لئے موجود تھے۔

"آپ شاہی مہمان ہیں۔ بادشاہ کی طرف سے آپ کے نام دعوت نامہ ہے۔"

"میں اکیلا نہیں ہوں۔ میرے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ہیں۔"

"آپ انتظار فرمائیں۔ ان کے دعوت نامے بھی تیار ہوجائیں گے۔"

"شکریہ! ہمارے قیام کا انتظام ہے۔"

حرم نبوی کے سامنے اصطفا منزل میں قیام کیا۔ ہندوستان سے چلتے وقت ہی انتظام ہوگیا تھا۔

بابرکت دن اور مقدس راتیں' ذکر و فکر میں گزارے لیکن یہاں آکر جانے کو جی کس کا چاہتا ہے۔ واپسی کی گھڑیاں جوں جوں قریب آرہی تھیں' وہ بھی یہی سوچ رہا تھا۔ کاش کچھ دن اور....!

ہندوستان سے آئے ہوئے حاجیوں کی عبادات میں ایک عبادت یہ بھی شامل تھی کہ جسے معلوم ہوتا تھا' جگر آئے ہوئے ہیں۔ ان کی زیارت کے لئے اصطفا منزل پہنچ جاتا تھا۔ اس دربارِ اقدس میں نوابوں کی بھی وہ پذیرائی نہیں ہوتی ہوگی جو اس کی ہو رہی تھی۔

ایک دن ایک صاحب اس سے ملنے آئے اور یہ سوچ کر کہ شاعر ہیں' خوش ہوں گے' خواہش ظاہر کی کہ وہ جگر کے سامنے نعت پڑھنا چاہتے ہیں۔ جگر خود تو نعت کہتے نہیں تھے لیکن سننے کا بے حد شوق تھا۔ انہوں نے اس سعادت کے لئے دامن پھیلا دیا۔

نعت ایسی پُراثر تھی اور وہ صاحب ایسے خوش الحان کہ جگر کی محویت بے ہوشی کی حد تک پہنچ گئی۔ قریب ہی چائے کے لئے پانی گرم ہو رہا تھا۔ ان کا پاؤں لگا اور کھولتا ہوا پانی

ان کی ٹانگ پر گر گیا۔ ان کی محویت نے احساس بھی نہیں ہونے دیا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ پوری ٹانگ بُری طرح جل گئی ہے۔

اسے ٹانگ کے علاج کے لئے ۲۹ دن مزید مہمان رہنا پڑا۔ وہ خوش تھا کہ اس بہانے کچھ دن اور اس کا وجود اس زمین پر رہے گا۔

خبر اس کی نہیں ان خام کارانِ محبت کو
اسی کو دکھ بھی دیتے ہیں جسے اپنا سمجھتے ہیں

○☆○

فضل احمد کریم فضلی نے ایک فلم "آسمانی مشاعرہ" کے نام سے بنانی شروع کی تھی۔ اس میں ایک تمثیلی مشاعرہ پیش ہونا تھا۔ فضلی نے یہ جدت پیدا کی کہ اداکاروں کے بجائے نامور شاعروں اور ادیبوں کو مرحوم شعراء کے روپ میں پیش کیا جائے۔ داغ کا کردار ادا کرنے کے لئے جگر کو منتخب کیا گیا۔ جگر کو آمادہ کرنے کے لئے فضلی خود ان کے پاس آئے۔

"کمال ہے صاحب' اب میں فلموں میں کام کروں گا۔"

"یہ اداکاری نہیں ہے جگر صاحب۔ آپ کو تو ایک مشاعرہ پڑھنا ہے۔"

"میں کسی ایسے مشاعرے کو نہیں مانتا جو فلم کے پردے پر چلے۔"

"وہ آپ نہیں ہوں گے۔ آپ تو داغ کی نمائندگی کر رہے ہوں گے پردے پر تو داغ چل رہے ہوں گے۔"

"پھر آپ کسی کو بھی داغ بنا دیجئے۔ میں ہی کیوں؟"

"صرف اس لئے کہ اس طرح یہ فلم حقیقت سے قریب ہو جائے گی۔"

غرض بڑی بحث و تمحیص کے بعد جگر کو قائل کر لیا گیا۔ انہوں نے بڑی کامیابی سے داغ کا کردار ادا کیا۔ داغ کا گیٹ اَپ ان پر خوب سج رہا تھا۔

اس فلم میں بابائے اردو مولوی عبدالحق نے الطاف حسین حالی کا کردار ادا کیا تھا۔

یہ فلم مکمل نہیں ہو سکی اور پھر اس کے نیگیٹیو بھی ضائع ہو گئے ورنہ یہ تمثیلی مشاعرہ یادگار ہوتا۔

اس فلم کی عکس بندی کے دوران ہی کسی فلم ساز کو یہ خیال آیا کہ جگر سے فلم کے لئے گانے لکھوائے جائیں۔ فلمی دنیا اس وقت شاعروں کے لئے بے حد منافع بخش تھی۔ اکثر نامور شعرا اس طرف کا رخ کر چکے تھے لیکن جگر نے کبھی اسے پسند نہیں کیا ورنہ اس کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے کوئی بھی فلم ساز انکار نہیں کر سکتا تھا۔

جگر کو جب پیشکش ہوئی تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔ صاف انکار کرتے ہوئے مروت آڑے آتی تھی اور وہ فلم ساز کسی طرح ماننے کو تیار نہیں تھا۔ آخرکار جگر نے یہ ترکیب نکالی کہ بہت زیادہ معاوضہ طلب کیا جائے۔ فلم ساز اتنا معاوضہ دے نہیں سکے گا اور بات ٹل جائے گی۔

جگر کو اس دنیا سے واقفیت تو تھی نہیں۔ معاوضوں سے بھی واقف نہیں تھا۔ اس نے دس گانوں کے دس ہزار معاوضہ اپنی دانست میں بہت زیادہ بتایا۔ فلم ساز فوراً تیار ہو گیا۔ اس نے پانچ ہزار ایڈوانس دے کر کنٹریکٹ کر لیا۔

وہ زبان دے چکا تھا لہٰذا گانے لکھنے بیٹھ گیا۔ ایک دو گانے لکھ بھی چکا تھا کہ اس نے خواب دیکھا۔ ایک شیر ہے جو گندگی کے ڈھیر پر بیٹھا ہے اور اپنے پنجوں سے گندگی اچھال رہا ہے جس سے تعفن پھیل رہا ہے۔

اس نے اس خواب کی تعبیر یہی نکالی کہ وہ ایک شعر کی طرح ہے لیکن گندگی اچھالنے پر راغب ہو گیا ہے یعنی فلمی گانے لکھنا اس کی شان کی خلاف ہے۔ اس نے فوراً ایڈوانس کی رقم واپس کی اور گانے لکھنے سے توبہ کر لی۔

○☆○

۱۹۵۷ء میں ایک مرتبہ پھر پاکستان تشریف لائے۔ دل کے کئی دورے پڑ چکے تھے' اور بھی کئی بیماریاں لاحق ہو چکی تھیں۔ بہت نحیف ہو چکے تھے۔ پرانے دوستوں سے ملے' نئے شعرا سے متعارف ہوئے تو پھر پہلے جیسے جگر نظر آنے لگے۔ وہی بشاش بشاش چہرہ' خوش و خرم' تازہ دم۔

جگر آئے ہیں۔ دوستوں نے رات کو دن بنا دیا۔ نشستیں' مشاعرے' دعوتیں' رت جگے۔

حیدر آباد (سندھ) پہنچا تو تھکن سے نڈھال تھا۔ حیدر آباد سے نواب شاہ کے مشاعرے میں جانا تھا۔

حیدر آباد میں قابل اجمیری کے رنگِ شاعری کا وہ قتیل تھا۔ اسے معلوم ہوا کہ قابل بیمار ہیں اور تنگ دست تو ہیں ہی۔ وہ قابل کو دیکھنے گیا۔

اٹھتے وقت اس نے اپنا بٹوا قابل کے تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ قابل کو بہت دیر تک یہ نشہ رہا کہ جگر صاحب اسے دیکھنے آئے۔ کسی وقت اس نے تکیہ اٹھایا تو بٹوا نظر آیا۔ یہ سمجھنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی کہ بٹوا جگر صاحب جان بوجھ کر چھوڑ گئے ہیں تاکہ میں ان کی مدد قبول کر لوں۔ ان کی مروت بھی برقرار رہے اور میری عزتِ نفس کو دھچکا نہ پہنچے۔ پھر اس نے سوچا' وہ تو خود مسافر ہیں۔ مشاعروں سے جو آمدنی ہوئی ہو گی' میرے سپرد کر دی۔ ان کی محبت اپنی جگہ لیکن مجھے یہ ہرگز

قبول نہیں ہوگا۔

اس نے اسی وقت... بٹوا یہ کہہ کر واپس کروا دیا کہ شاید آپ بھول کر آگئے تھے۔ جگر یہ کہہ کر قابل کو شرمندہ کرنا نہیں چاہتا تھا کہ وہ جان بوجھ کر بٹوا چھوڑ آیا تھا۔ اس نے بٹوا لیا اور خاموشی سے جیب میں رکھ لیا۔

نواب شاہ کے مشاعرے کے بعد اسے قلب میں تکلیف محسوس ہوئی۔ ایک دوا وہ ہر وقت اپنے پاس رکھتا تھا۔ اس کے استعمال سے کچھ افاقہ ہوا۔ اتنا ہو گیا کہ وہ واپسی کا سفر طے کر سکے۔ دن بھر گزارنے کے بعد شام کو حیدر آباد آگیا۔

نومبر کا مہینہ تھا۔ ۹ نومبر کو ملتان میں مشاعرہ تھا مگر وہ علیل تھا۔ ملتان والوں نے مشاعرہ ملتوی کر دیا۔ نئی تاریخ سولہ نومبر مقرر ہوئی۔

اس کی طبیعت بحال ہو گئی تھی لیکن ۱۴ نومبر کو حالت پھر بگڑ گئی۔ ڈاکٹر نے انجکشن لگائے۔ طبیعت بحال ضرور ہو گئی لیکن ایسی نہیں تھی کہ ملتان تک کا سفر کر سکے۔ دوستوں نے مشورہ دیا کہ معذرت کر لے۔

"نہیں صاحب، یہ بدعہدی ہوگی۔ میں وعدہ کر چکا ہوں۔ میری خاطر ان لوگوں نے مشاعرہ ملتوی کر دیا۔ اب میں پھر ان سے معذرت کر لوں؟"

اس نے اسی بیماری کی حالت میں ملتان تک کا سفر کیا۔

دس بارہ مشاعروں میں شرکت سے دس بارہ ہزار کمائے لیکن زرِ مبادلہ کی خراب حالت کی وجہ سے بہ مشکل ڈھائی ہزار کا ڈرافٹ مل سکا۔ یہ گورکھ دھندا اس کی سمجھ سے بالاتر تھا مگر ناراض ہونے کے سوا کیا کر سکتا تھا۔

کسی نے مشورہ دیا کہ ملتان کے مشاعرے سے جو رقم ملی ہے اس سے سونے کے بٹن بنوا لو، فائدے میں رہو گے۔

پاکستان سے واپس آنے کے بعد وہ میرٹھ میں تھا کہ ۳ جنوری ۵۸ء کو وجع القلب کا دورہ پڑا۔ اسے میرٹھ سے لکھنؤ لایا گیا جہاں جارج میڈیکل کالج میں داخل ہو گیا۔ تشخیص سے معلوم ہوا کہ قلب کا ایک حصہ بڑھ گیا ہے۔

مئی ۵۸ء میں لکھنؤ سے گونڈہ آگئے۔

۳ دسمبر ۵۸ء کو ریڈ کراس کے مشاعرے کے لئے پاکستان بلایا گیا لیکن اب وہ اس قابل نہیں رہے تھے کہ جا سکتے۔ آٹھ دس مہینوں میں چودہ پندرہ دورے پڑ چکے تھے۔ انہوں نے معذرت کر لی۔

۸ جنوری ۵۹ء کو لکھنؤ میں پھر شدید دورہ پڑا۔ سول سرجن دیکھنے آیا تھا۔ ذرا طبیعت سنبھلی تو ڈاکٹر نے فرمائش کی۔

"جگر صاحب، میری فیس یہ ہے کہ آپ مجھے غزل سنائیں۔"

"بھائی، جس دل پہ ناز تھا وہ دل ہی نہیں رہا۔ بہرحال تم کہتے ہو تو انکار بھی نہیں کر سکتا۔"

اس کی آنکھیں بند تھیں۔ تصور کیا خبر کس کا تھا۔ اک سوز تھا کہ ساز بن کر غزل میں ڈھل گیا تھا۔

دنیا کے ستم یاد نہ اپنی ہی وفا یاد
اب مجھ کو نہیں کچھ بھی محبت کے سوا یاد

میں شکوہ بلب تھا مجھے یہ بھی نہ رہا یاد
شاید کہ مجھے بھولنے والے نے کیا یاد

چھیڑا تھا جسے پہلے پہل تیری نظر نے
اب تک ہے وہ اک نغمۂ بے ساز و صدا یاد

جب کوئی حسیں ہوتا ہے سرگرمِ نوازش
اس وقت وہ کچھ اور بھی آتے ہیں سوا یاد

مدت ہوئی اک حادثۂ عشق کو لیکن
اب تک ہے ترے دل کے دھڑکنے کی صدا یاد

کیا لطف کہ میں اپنا پتا آپ بتاؤں
کیجئے کوئی بھولی ہوئی خاص اپنی ادا یاد

○☆○

اس کی حالت پھر سنبھل گئی لیکن اب اس کے چاہنے والوں کو تشویش ہونے لگی تھی۔

اس کا مجموعۂ کلام "آتشِ گل" نیا نیا آیا تھا۔ ساہتیہ اکیڈمی کی جانب سے اسے اس مجموعۂ کلام پر پانچ ہزار کا انعام دیا گیا۔ حصولِ انعام کے لئے اسے دہلی جانا پڑا۔ بلبل کی طرح چہکنے والا آج بہت خاموش تھا۔ نقاہت اور بیماری کے آثار اس کے چہرے سے ظاہر تھے۔ اس کے پرستاروں نے اس کی گردن پھولوں سے ڈھانپ دی۔

اس پذیرائی نے اسے ایک مرتبہ پھر تازہ دم کر دیا۔ اتنا تازہ دم کہ اپریل ۵۹ء میں ہونے والے جشنِ میر کے مشاعرے میں شریک ہونے بمبئی پہنچ گیا۔

ہندوستان کا کون سا ایسا قابلِ ذکر شاعر تھا جو اس شاعرے میں نہیں تھا لیکن جگر صاحب، جگر صاحب تھے۔ ہر آنکھ اسی کا طواف کر رہی تھی۔ اس کی بیماری کی خبریں چھپتی رہتی تھیں۔ اس لئے عوام اسے اپنے درمیان دیکھ کر جشنِ میر کو جشنِ جگر سمجھ کر خوش ہو رہے تھے۔

اب اس سے پڑھا نہیں جاتا تھا لیکن سننے والوں کو مایوس کرنا بھی اس کی غیرت کے خلاف تھا۔ وہ بہت دیر سے

اپنے پرستاروں پر نچھاور کرنے کے لئے سانسیں جمع کررہا تھا۔ پھر اس نے ان سانسوں کو غزل کا روپ دے کر نذرِ دوستاں کردیا۔

یہ مے خانہ ہے بزمِ جم نہیں ہے
یہاں کوئی کسی سے کم نہیں ہے
شکستِ دل شکستِ غم نہیں ہے
مجھے بھی یہ سہارا کم نہیں ہے
ارے او شکوہ سنجِ عمرِ فانی
یہ فانی زندگی بھی کم نہیں ہے

○☆○

جوہو کے کنارے نہایت شاندار بنگلے میں اس کا قیام تھا۔ بہت دن بعد بمبئی آیا تھا اس لئے دوستوں کے لئے نعمت بنا ہوا تھا۔ مشاعرے اور محفلیں خوب سج رہی تھیں۔

خلافت ہاؤس میں ڈنر تھا۔ عمائدینِ شہر' اہلِ اقتدار اور شعرا کا مجمع تھا۔ جگر گویا میرِ محفل تھا۔

ڈنر کے بعد موسیقی کی محفل آراستہ ہوئی۔ آغاز اسی کی ایک غزل سے ہوا۔

محفل عروج پر تھی کہ جگر کا دل بے قابو ہوگیا۔ شدید دورہ پڑا تھا۔ محفل برہم ہوگئی۔ بمبئی بڑا شہر تھا اور پھر اس وقت تمام وسائل مہیا تھے۔ اسی وقت طبی امداد مل گئی۔ ایک مرتبہ پھر چراغ نے بجھتے بجھتے سنبھالا لے لیا۔

۴ اگست ۵۹ء کو وہ بمبئی سے گونڈہ پہنچا لیکن اس حال میں کہ انتہائی درجے کی نقاہت طاری تھی اور پیروں پر ورم تھا۔ زندگی بھر کی شراب نوشی نے جگر اور گردوں کو بھی متاثر کیا تھا۔ بھوک ختم ہوکر رہ گئی تھی۔ زندگی بھر گھومتا رہا تھا اس کی یہ سزا ملی تھی کہ پاؤں متورم ہوگئے تھے۔ لہٰذا آرام کے سوا کیا ہوسکتا تھا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ آنکھوں میں موتیا اُتر آیا۔

لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن پر مشاعرہ تھا لیکن اب وہ کیسے جاسکتا تھا۔ مشاعرے میں اس کی شرکت ضروری بھی تھی کہ نہ جانے کب یہ آواز خاموش ہوجائے۔ ریڈیو کا عملہ گونڈہ آیا اور اس کی تازہ غزل' اس کی آواز میں ریکارڈ کرلی گئی۔

لکھنؤ ریڈیو سے مشاعرہ نشر ہوا۔ آخری شاعر کی حیثیت سے اس کی ریکارڈ شدہ غزل سنوائی گئی۔

"حضرات' حضرت جگر مراد آبادی علالت کے باعث اسٹوڈیو میں تشریف نہ لاسکے لیکن ان کی غزل' انہی کی آواز میں ہم تک پہنچ گئی۔ جسے ہم نذرِ سماعت کررہے ہیں۔" اس اعلان کے ساتھ ہی جگر کی مترنم آواز نے ماحول کو سوگوار کردیا۔

جان کر من جملۂ خاصانِ مے خانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے
ننگِ مے خانہ تھا میں' ساقی نے یہ کیا کردیا
پینے والے کہہ اٹھے "یا پیرِ مے خانہ" مجھے
سبزہ و گل' موجِ دریا' انجم و خورشید و ماہ
اک تعلق سب سے ہے لیکن رقیبانہ مجھے
زندگی میں آگیا جب کوئی وقتِ امتحاں
اس نے دیکھا ہے جگر بے اختیارانہ مجھے

○☆○

کوئی آنکھ ایسی نہیں تھی جو اس غزل کو سن کر اشک بار نہ ہوگئی ہو۔ غزل کیا تھی' جانے والے کا الوداعی سلام تھی۔ ریڈیو بند ہوگیا تھا لیکن بڑی دیر تک جگر کی آواز آتی رہی۔

"مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے"

○☆○

۸ ستمبر ۱۹۶۰ء کی رات نے انہیں گہری نیند سلادیا۔ صبح ساڑھے چار بجے گھبراہٹ سے آنکھ کھل گئی۔ چائے کی فرمائش کی۔

نسیم تو رات بھر جاگتی ہی رہی تھیں۔ چائے کا حکم ہوا تو چائے بنا کر لے آئیں۔

چائے پیتے اور باتیں کرتے ہوئے کچھ وقت اور گزر گیا۔

"وقت کیا ہوا ہے؟"

"ساڑھے پانچ۔"

"تاخیر ہورہی ہے۔" تھوڑی دیر بعد کہا۔ "میں زیادہ سے زیادہ دس بجے تک مہمان ہوں۔"

نسیم نے گھبرا کر جگر کے بھائی مظفر کو جگادیا۔

"ڈاکٹر کو بلا لائے تاکہ تم لوگوں کو تسلی ہوجاتی۔" جگر نے کہا۔

مظفر صاحب ڈاکٹر کو بلانے گئے۔ ابھی ڈاکٹر آیا نہیں تھا کہ دو ہچکیاں لیں اور ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئے ؎

کچھ ہم کو نہیں کام جگر اور کسی سے
کافی ہے بس اک نسبت سلطانِ مدینہ

کرشن چندر

کرشن چندر

تحریر و تحقیق : ڈاکٹر ساجد امجد

اس کا نام اردو کے چند صفِ اوّل کے افسانہ نویسوں میں سب سے نمایاں ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ وہ جدید اردو افسانے کے معماروں میں سب سے آگے نظر آتا ہے۔ منشی پریم چند کے بعد کوئی دوسرا افسانہ نگار اس کی ہمسری کا دعوے دار نہیں۔ تقسیمِ ہند سے قبل شروع ہونے والی ترقی پسند تحریک سے وابستہ شاعروں اور ادیبوں میں بھی وہ سب سے زیادہ عزت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ آخر میں مشہور طنز نگار پروفیسر رشید احمد صدیقی کی صاحبزادی سلمیٰ صدیقی سے شادی کر کے اس نے ایک نیا دھماکہ کر دیا۔ وہ مسلمان ہو گیا تھا۔ اب اس کی شخصیت کا ایک نیا روپ سامنے آیا جس پر ہندو اور مسلمان دونوں کا ردِعمل مختلف تھا۔ بیسویں صدی میں پیدا ہونے والے اور اپنی شخصیت اور کام سے برِصغیر کو متاثر کرنے والوں میں اس کا نام نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ دیکھئے اس تخلیق کار نے زندگی کو کس طور دیکھا اور زندگی نے اسے کیا دیا۔

اردو زبان کے قد آور افسانہ نگار کرشن چندر کی دلچسپ سرگزشت

فلم یونٹ کے پہنچنے کی خبر ملتے ہی شوٹنگ دیکھنے کے لیے لوگوں کی بھیڑ لگ گئی۔

یہ قافلہ اس وقت ریاست کشمیر کے علاقے پونچھ میں تھا۔ سرکاری افسران نے پرتپاک استقبال کیا اور ڈاک بنگلے کے دروازے کھول دیے۔ اب یہاں پرانے ڈاک بنگلے کے ساتھ ساتھ نیا ڈاک بنگلا بھی بن گیا تھا۔

پرانے بنگلے کو دیکھتے ہی' پرانی یادوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اسی بنگلے میں' جب وہ اسکول میں پڑھتا تھا' ٹھاکر چین سنگھ اور ٹھاکر موہن سنگھ کے ساتھ میدان میں کھیلنے کے بعد آیا کرتا تھا۔ ڈاک بنگلے کا ایک کمرا ان کے لیے کھول دیا جاتا تھا جہاں وہ قریب کی باؤلی سے جھرنے کا ٹھنڈا پانی منگواتے اور لیموں کا شربت پیتے۔ گراموفون پر سہگل' جانکی بائی آگرے والی یا کلو قوال کے ریکارڈ بجائے جاتے۔

وہ ڈاک بنگلے سے نکل کر توپ خانے کے میدان' جیل' ڈاک گھر سے ہوتے ہوئے اسی اسپتال تک گیا جہاں کبھی اس کے پتا جی بیٹھا کرتے تھے۔ اسپتال وہی تھا لیکن پتا جی نہیں تھے۔ اب وہاں ایک نوجوان ڈاکٹر شرما بیٹھے تھے۔

اس کے پرستار یہاں بھی موجود تھے۔ اسکول اور کالج کے لڑکے لڑکیوں کے ٹھٹ لگ گئے۔ افسانہ نگاری کا بے تاج بادشاہ کرشن چندر ان کے درمیان موجود تھا جو پوری چار دہائیوں کے بعد اس علاقے میں آیا تھا۔ جس زمین پر اس کے قدموں نے کھیلنا سیکھا تھا' جہاں اس کی معصومیت عشق کے مفہوم سے واقف ہوئی تھی' جہاں اس کا شباب رنگوں میں نہایا تھا' وہاں اب ساٹھ سال کا بوڑھا' شہرت اور عظمت کی بلندیاں طے کرتا ہوا اس فلم یونٹ کے ساتھ آیا تھا۔ کیمرے اس کے بچپن کی یادوں کو محفوظ کرنے کے لیے آنکھیں جھپک رہے تھے۔ اس کی عظمت کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے' اس کی زندگی پر مبنی ایک دستاویزی فلم بنائی جا رہی تھی۔ اس کے دونوں بھائی مہندر ناتھ' اوپندر ناتھ اور بہن سرلا دیوی بھی اس کے ساتھ تھے۔

ایک شوخ سی لڑکی نے کرشن چندر کو گھیر لیا "مجھے افسانے لکھنے کا بے حد شوق ہے۔ مجھے بتائیے کہ میں کس طرح ایک اچھی افسانہ نگار بن سکتی ہوں؟"

"دیکھیے آپ ایسا کریں" کرشن کے بھائی نے کہا "ایک اچھی افسانہ نگار بننے کے لیے آپ افسانے تو کرشن جی کے پڑھا کیجیے لیکن خط مجھے لکھا کیجیے۔"

اس برجستہ جواب پر ابھی قہقہے تھمے نہیں تھے کہ اس لڑکی نے یہ کہہ کر سب کو لاجواب کر دیا۔

"اچھا چاچا جی۔"

اس جواب پر جن قہقہوں کا طوفان اٹھا' وہ تھمنے والا نہیں تھا۔

ہر شہرت کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھنے والا کرشن' ان قہقہوں کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ یہاں سے کچھ فاصلے پر وہ گھر تھا جہاں اس نے بچپن کے سہانے دن گزارے تھے۔

گھر کے دروازے پر پہنچ کر وہ پتھر کا ہو گیا۔ وہی در و دیوار تھے اور وہی گھر میں لگا' دیوار سے باہر جھانکتا ہوا خوبانی کا پیڑ۔ وہ دیر تک اس دروازے کو تکتا رہا جسے ہاتھ لگائے اسے برسوں بیت گئے تھے۔ گھر سے بھاگے ہوئے بچے کی طرح

اطلاع دیے بغیر وہ آج اپنے گھر پہنچ گیا تھا۔ ہر لحظہ یہ احساس ہو رہا تھا کہ ابھی دروازہ کھلے گا۔ گلابی کنارے والی ساڑی پہنے اس کی ماں جی دروازے پر آئیں گی اور ممتا بھرے لہجے میں کہیں گی "اتنے برس کہاں رہے بڑے کاکا۔ کہاں تھے تم۔ جلدی سے اندر آجاؤ۔ تمہیں بھوک لگی ہوگی۔ میں نے تمہارے لیے مکھن اور شہد بھرے پراٹھے تیار کیے ہیں۔"

تھوڑی دیر کو ماضی، حال پر غالب آگیا تھا لیکن جلد ہی حقیقت پسند کرشن پر یہ حقیقت کھل گئی کہ دروازہ کھولنے والی تو اب اس دنیا ہی میں نہیں۔ اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے۔ اس نے عینک کے اندر سے آنسو صاف کیے اور دل میں کوئی چیخا "ماں جی، باؤجی!" لیکن یہ پکار، آواز کے بغیر تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پایا۔ رسوئی گھر میں اسے اپنی ماں بیٹھی نظر آئی۔ وہ سب بچوں کے لیے الگ الگ تھالیوں میں کھانا نکال رہی تھی۔ اس نے گھبرا کر اپنا منہ دوسری طرف موڑ لیا۔

وہ کسی طرف بھی منہ پھیر لیتا۔ اس گھر میں تو ہر طرف اس کا بچپن کھڑا تھا۔

اس کی درازیٔ عمر اور صحت مندی کے لیے پوجا پاٹھ کرانا اس کی والدہ کا معمول تھا۔ اس وقت بھی ایک ایسا ہی منظر اس کی آنکھوں کے تخت پر سجا ہوا تھا۔ برآمدے کا فرش آئینے کی طرح چمک رہا تھا۔ اس نے ایک سفید کوری دھوتی پہنی ہوئی تھی۔ گلے میں ایک دھاگا پڑا ہوا تھا جسے جینو کہتے ہیں۔ اس کی ماں نے اسے ایک چھوٹے سے غالیچے پر بٹھا کر پانچ سو بار گائتری منتر کا جاپ کرنے کو کہا۔ اتنے میں برہمن پجاری آگیا۔ ست ناجا (سات اناجوں کا آمیزہ) لکڑیاں تولنے والے کانٹے میں رکھ کر دوسرے پلڑے میں کرشن کو بٹھا دیا گیا۔ پجاری نے منتر پڑھنا شروع کر دیے۔

اتنے میں اسے باؤجی کی آواز آئی جو پوجا ختم ہونے کے بعد گھر میں داخل ہوئے تھے۔

"پجاری کا فراڈ پورا ہو گیا؟"

"ہاں ہو گیا۔" اس کی ماں نے تنک کر کہا۔

"اب اس کے بعد کیا گوردوارے جاؤ گی؟"

"ہاں ہاں۔ جاؤں گی، ضرور جاؤں گی۔ تمہیں تو ہر وقت مذاق ہی سوجھتا ہے۔ کیوں نہ ہو، آریہ سماجی جو ٹھہرے۔ تمہارا تو کوئی مذہب ہی نہیں ہے۔"

اس کی آنکھیں رو رہی تھیں لیکن باؤجی کا خیال آتے ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ ماں جی جتنی مذہب پرست تھیں، باؤجی اتنے ہی آزاد خیال تھے۔ وہ نہ مورتی پوجا کے قائل تھے اور نہ اوہام پرستی کے۔ اسے وہ جھڑپیں بھی یاد آگئیں جو مذہب کے موضوع پر اس کی ماں اور باپ کے درمیان ہوتی تھیں اور اکثر ہوتی تھیں۔

اس کے والد مے نوش بھی تھے گوشت خور بھی۔ حسن پرست بھی تھے اور عاشق پیشہ بھی۔ میری ذات کا یہ حصہ شاید انہی کے خون کا اثر ہے، اس نے سوچا۔ اس کی نظروں میں ان عورتوں کے چہرے گھوم گئے جن کو اس نے اپنے بچپن میں دیکھا تھا۔ یہ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ دل نواز عورتیں دراصل وہ محبوبائیں تھیں جن کو اس کے باپ کی حسن پرستی نے اپنا اسیر بنالیا تھا اور جن کی وجہ سے اس کی ماں بہت پریشان رہتی تھی... اور ان کے پیچھے گھر میں روز جھگڑے ہوتے تھے۔ ان جھگڑوں میں فتح ہمیشہ اس کی ماں کی ہوتی اور عشق کی کہانی نامکمل ہی رہ جاتی۔

ان بہت سے چہروں میں اسے ایک سپیرن یاد آگئی۔ نہایت خوب صورت، جوان، تانبے کا سا رنگ، گہری سبز آنکھیں۔ سانپ پکڑنے آئی تھی لیکن اس کے باپ کی آنکھوں کی قیدی بن گئی تھی۔ اس کے باپ نے اسے مالی کی خالی کوٹھری میں ٹھہرا دیا تھا لیکن ماں جی پر راز کھل گیا اور پتا جی بے بس ہو گئے۔ چلتے وقت اس سپیرن نے کیسی دردناک بین بجائی تھی۔

باؤجی عام ہندوؤں کی طرح ذات پات کے قائل نہیں تھے۔ ان کا مذہب انسان دوستی تھا۔ یہ خیال آتے ہی اسے وہ بچی یاد آگئی جو اس کی خاطر بری طرح پٹ گئی تھی۔ اس کا نام تاراں تھا اور چمار کی بیٹی تھی۔ ماں جی نے اسے میرے ساتھ کھیلتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ کھیل میں بھی رہا تھا لیکن ماں کا غصہ اس معصوم پر اترا۔ انہوں نے اسے بے تحاشا پیٹ ڈالا۔

"کم بخت، کمینی، اچھوت، کم ذات۔ آج پورن ماشی کے شبھ دن تو میرے بچے کے ساتھ کھیلتی ہے۔"

باؤجی نے اسے ماں کے چنگل سے چھڑا لیا اور اسے باغیچے میں لے گئے۔ اس کی جھولی سرخ سیبوں سے بھر دی۔

"خبردار جو آئندہ تم نے میرے بیٹے کو تاراں سے کھیلنے کو منع کیا" انہوں نے ماتا سے کہا۔

"تاراں اچھوت ہے۔ چمار کی بیٹی ہے۔"

"چمار کی بیٹی ہے تو کیا ہوا۔ کیا انسان نہیں ہے؟"

"تم اپنے دھرم کو اپنے پاس رکھو۔ میں اپنے بیٹے کو تمہاری طرح ناستک (دہریہ) نہیں بننے دوں گی۔"

وہ سوچ رہا تھا، مجھے پتا جی اس دن بہت اچھے لگے تھے۔ میں بھی جب بڑا ہوا تو انہی کے نقشِ قدم پر چلا۔ میں نے بھی اونچ نیچ کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ میں نے بھی خوب عشق کیے۔

میں نے بھی خوب شراب پی۔ میں نے بھی انسان‘ انسان میں تفریق نہیں کی لیکن ہوا کیا؟ چمار کی بیٹی تو اب بھی اچھوت ہے۔

یہ فلم بنانے والے درودیوار کو قید کرسکتے ہیں لیکن کیا میرے دل میں اٹھنے والے جذبات کے طوفان کو کیمرے میں قید کرسکیں گے؟

اسی عالم میں اور نہ جانے کب تک وہ ٹوٹتا بکھرتا رہتا کہ کسی نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھا۔ یہ اس کی زندگی بھر کے مشاہدے کا ہاتھ تھا جو اسے اشاروں میں سمجھا رہا تھا کہ گئے وقت کو آواز دینا سعیِ لاحاصل ہے۔ وہ یادوں کے چوبارے سے ہٹ گیا جیسے دیوار سے دھوپ ہٹ جاتی ہے۔

وہ گھر پھر اسی طرح ویران ہوگیا۔ وہ گھر سے باہر نکل آیا تھا۔ اس کے خیالوں کی سیپرن‘ دردناک آواز میں بین بجارہی تھی۔

اس کی تصانیف کے تراجم دنیا کی ساٹھ زبانوں میں ہوچکے ہیں۔ اس نے برصغیر کی حدود سے نکل کر بین الاقوامی میدان میں بھی نام پیدا کیا۔ اس کی تصانیف کی لاکھوں جلدیں فروخت ہوچکی ہیں۔ اس کے افسانوں کے سامنے شعرا کی غزلیں پھیکی ہیں۔ دل کے دو دورے پڑ چکے ہیں لیکن نہ وہ تھکا ہے نہ اس کا قلم۔ افسانے کی آبرو ہے کرشن چندر۔

یہ وہ خیالات تھے جو اہالیانِ شہر نے اس کی خدمت میں پیش کیے۔

اعزازات سے لدا پھندا کرشن چندر اپنی سوچوں میں گم اپنی زندگی کی اس کہانی کی ابتدا پر غور کررہا تھا جہاں کیمرے کی آنکھ نہیں پہنچ سکتی تھی۔

○☆○

”پتاجی! عشق کسے کہتے ہیں؟“

”عشق؟“ اس کے پتا چونک کر بولے ”عشق ایک حماقت ہوتی ہے۔“

”حماقت کسے کہتے ہیں؟“

”تم ابھی بچے ہو۔ اس کو نہیں سمجھ سکتے۔ جب بڑے ہوجاؤ گے تو خود معلوم ہوجائے گا‘ عشق کسے کہتے ہیں۔“

”نہیں‘ نہیں۔ میں تو ابھی معلوم کروں گا۔“

وہ اپنے والد کی انگلی پکڑے چلتا رہا اور عشق کے معنی جاننے پر اصرار کرتا رہا۔

دونوں باپ‘ بیٹے ڈراما دیکھنے تھیٹر گئے تھے۔ شیکسپیئر کا شہرۂ آفاق ڈراما تھا۔ اسٹیج پر ہیملٹ پُرجوش انداز میں اپنی محبوبہ اوفلیا سے اظہارِ عشق کرتا ہے۔ بازو ہلاہلا کر‘ چیخ چیخ کر اپنے عشق کا اعلان کرتا ہے۔ یہ پہلا موقع تھا جب اس نے

سوانحی خاکہ

نام ——— کرشن چندر
والد ——— گوری شنکر
آبائی وطن ——— وزیر آباد (پاکستان)
پیدائش ——— بھرت پور (راجستھان)
تاریخِ پیدائش ——— ۲۳ نومبر ۱۹۱۳ء
تعلیم ——— ایم اے‘ ایل ایل بی
ملازمت ——— آل انڈیا ریڈیو
بیوی ——— ودیاوتی
سلمٰی صدیقی
وفات ——— ۸ مارچ ۱۹۷۷ء بہ مقام بمبئی۔

عشق کا لفظ سنا اور اب اس کے معنی جاننے کے لیے بے چین تھا۔ جب اس کی ضد کے باوجود اس کے والد اسے عشق کے معنی نہ سمجھا سکے تو وہ رونے لگا۔

وہ گھر پہنچا تو اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ آنسو خشک ہوکر رخساروں پر جم گئے تھے۔ ماں پر نظر پڑتے ہی اس کی ہچکی بندھ گئی۔ اس کی ماں اس کی یہ حالت دیکھ کر تڑپ اٹھی۔

”کیا ہوا میرے بچے کو؟“

”پوچھتا ہے عشق کسے کہتے ہیں؟“

”ہائے رام! یہ عمر اور یہ لچھن۔ اور لے کر جاؤ اسے تھیٹر۔“

”ماں!“ وہ زور سے چیخا ”میں بھی عشق کروں گا جیسے وہ آدمی تھیٹر میں کرتا ہے۔“

ماں نے غصے میں آکر پے درپے دو تھپڑ اس کے گیلے رخساروں پر رسید کیے ”ہاں بیٹا‘ تو کیوں نہیں عشق کرے گا۔ عشق بھی کرے گا اور اپنے خاندان کا نام بھی ڈبوئے گا۔ میری تو تقدیر ہی خراب ہے۔ باپ کو روتی تھی‘ اب بیٹا بھی......“

اس کے پتا اپنی تمام تر روشن خیالی کے باوجود اسے عشق کا مفہوم سمجھانے سے قاصر رہے۔ وہ بھی یوں چپ ہوگیا جیسے کہہ رہا ہو‘ مت سمجھاؤ میں خود سمجھ لوں گا۔

میلوں تک پھیلے ہوئے ہرے بھرے کھیت‘ جنگل‘ ٹھنڈے اور گرم پانی کے چشمے اس کی توجہ کا مرکز بنے رہے۔

وہ جلد ہی لاہور کو بھول گیا جہاں وہ پونچھ (کشمیر) آنے سے پہلے اپنے تایا کے گھر رہا کرتا تھا۔

ڈاکٹر گوری شنکر‘ بھرت پور میں ملازمت کرتے تھے۔ ایک دن اپنے انگریز افسر سے جھگڑ پڑے۔ افسر اور پھر

انگریز۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑ گئے۔
انہوں نے اپنے دونوں بیٹوں کرشن چندر، مہندر ناتھ اور بیوی پرمیشوری دیوی کو اپنے بھائی کے پاس لاہور میں چھوڑا اور خود ملازمت تلاش کرنے میں لگ گئے۔ بہت تگ و دو کے بعد کشمیر کے ایک دور افتادہ علاقے پونچھ میں انہیں ملازمت مل گئی۔ قدم جمتے ہی انہوں نے بیوی بچوں کو بھی بلا لیا۔

پونچھ کی کلچرل زندگی میں تھیٹر کو ایک خاص اہمیت حاصل تھی۔ گوری شنکر رنگین مزاج آدمی تھے۔ بڑی پابندی سے تھیٹر دیکھنے جاتے تھے۔ ایک دن کرشن چندر کو بھی لے گئے اور پھر اسے عشق کا مفہوم سمجھانے میں پسینے آ گئے۔

اس سے پہلے کہ اس کا اصرار کوئی اور صورت اختیار کرتا، اس کے پتا کا تبادلہ پونچھ کی ایک تحصیل مینڈر میں ہو گیا۔

پانچ سال کی عمر میں اس کا داخلہ مینڈر کے پرائمری اسکول میں ہو گیا۔

وہ اپنی عمر سے آگے چل رہا تھا۔ اس میں مشاہدے کو جذب کرنے کی بے پناہ قوت تھی۔ جس چیز کو ایک مرتبہ دیکھ لیتا کبھی نہ بھولتا بلکہ اس پر غور کرتا اور نتائج اخذ کرنے کی کوشش کرتا۔ اپنی اسی یادداشت کے طفیل وہ یہ جاننے کے لیے سرگرداں تھا کہ عشق کسے کہتے ہیں۔

ایک دن وہ اپنے باپ کے ساتھ اسپتال گیا جہاں اس کے باپ ڈاکٹر تھے۔ ایک دبلی پتلی، نازک اندام عورت۔ بوٹا سا قد، مرمریں جسم، پتلے پتلے گلاب کی پتیوں کے سے ہونٹ۔ ایک بیڈ پر لیٹی تھی۔ اس کے باپ نے اس سے کرشن کا تعارف کرایا اور ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگی۔

وہ دق کی مریضہ تھی لیکن گوری شنکر کے علاج اور ہمدردی سے اس کا مرض ختم ہونے لگا تھا۔ اس کے رخساروں پر سرخی آ گئی تھی۔ اب وہ پہلے سے زیادہ خوب صورت نظر آنے لگی تھی۔ گوری شنکر اس عورت میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لے رہے تھے۔ گھنٹوں اس کے پاس جا کر بیٹھتے۔ کبھی کبھی اس کے ساتھ ٹہلنے کو بھی نکل جاتے۔ ہوتے ہوتے اسپتال میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ بات اس کی ماں تک پہنچ گئی اور دونوں میں خوب لڑائی ہوئی۔

"سارا اسپتال تم پر تھو تھو کر رہا ہے۔ صاف کیوں نہیں کہتے کہ تم اس عورت سے عشق لڑا رہے ہو۔"

کرشن نے ماں کی زبان سے عشق کا لفظ سنا تو ساری بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ اس کا مطلب ہے کسی خوب صورت عورت کے پاس بیٹھ کر ہنسنے بولنے کو عشق کہتے ہیں۔

یہ عشق کا اس سے پہلا تعارف تھا۔ اپنی اس کامیابی پر وہ بہت خوش ہوا کہ جو بات اس کے پتا جی نہ بتا سکے، اس نے خود جان لی۔

اس کی عمر اب دو چار سال اور آگے بڑھ گئی تھی۔ اس نے اپنے باپ کو کئی حسین عورتوں کے پاس بیٹھ کر ہنستے بولتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کی فطری حسن پرستی اسے رہ رہ کر اکساتی تھی کہ وہ بھی کسی سے عشق کرے لیکن کس سے کرے، یہ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اس کا شرمیلا پن بھی اسے اس راستے پر جانے سے روکتا تھا۔ پھر اسے ایک اور راستہ نظر آ گیا جو اسے عشق سے بھی زیادہ دلچسپ نظر آیا۔

اس کا ایک ہم جماعت دیانند کپور تھا۔ اس کے باپ کی کتابوں اور رسائل کی دکان تھی۔ وہ ایک روز دیانند کے ساتھ اس کی دکان پر گیا تو اسے یوں لگا جیسے پیاسا کنوئیں کے پاس آ گیا ہو۔ ایک رسالے پر اس نے مدیر کا نام گوری شنکر لکھا ہوا دیکھا۔ یہی نام اس کے والد کا بھی تھا اس لیے اسے شوق ہوا کہ وہ اس رسالے کو پڑھے۔ اس نے اپنے دوست سے وہ رسالہ مانگ لیا اور گھر آ کر پڑھنے بیٹھ گیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب وہ کوئی ادبی رسالہ پڑھ رہا تھا۔

اسے نصاب کی کتابیں پڑھنے کا قطعی شوق نہیں تھا۔ اردو تو اسے قطعی نہیں آتی تھی۔ پانچویں جماعت تک اس نے بہ مشکل اردو پڑھی تھی۔ اس میں بھی ہر روز پٹتا ہی رہا تھا۔ روز روز کی مار سے تنگ آ کر اس نے چھٹی جماعت میں اردو کو چھوڑ کر سنسکرت لے لی تھی لیکن اسے یہ بھی مشکل لگتی تھی۔

نصابی کتب سے اسے نفرت تھی لیکن جب رسالہ پڑھنے بیٹھا تو اٹک اٹک کر پڑھتا رہا مگر دلچسپی برقرار رہی پھر تو یہ حال ہوا کہ ایک کے بعد دوسرا رسالہ ختم کرتا رہا۔ جب ذرا مشق ہو گئی تو منشی پریم چند کی تصنیفات پڑھنا شروع کر دیں۔

اس دکان پر شام کے وقت مقامی شعرا اور ادیب جمع ہوتے تھے۔ ان کے درمیان ہونے والی ادبی بحثوں کو وہ بڑے غور سے سنتا تھا۔ اس کے نزدیک یہ وہ لوگ تھے جو نیند میں چلتے ہیں، خوابوں میں رہتے ہیں۔

"اردو سیکھنی ہے تو الف لیلہ پڑھو" کسی ادیب نے اسے مشورہ دیا تھا۔ دکان پر یہ کتاب موجود تھی لہٰذا فوراً مل گئی۔ اس کتاب کی طلسماتی دنیا نے اسے اس طرح اپنی گرفت میں لے لیا کہ کسی اور طرف دیکھنا ہی بھول گیا۔ نہ کھانے کی سدھ نہ کھیلنے کا ہوش۔ اس کا یہ انہماک دیکھ کر اس کی والدہ کو فکر لاحق ہوئی۔

"آپ اسے منع کیوں نہیں کرتے" انہوں نے اپنے پتی سے کہا۔

"کس بات کو منع کروں؟"

"آپ تو کچھ دیکھتے ہی نہیں ہیں۔ اسکول کی کتابوں کا تو

ہوش نہیں ہے' وہ دن بھر ناول پڑھتا رہتا ہے اور اب تو اخبار بھی پڑھنے لگا ہے۔ بگڑے گا نہیں تو کیا ہوگا۔"

"چلو کچھ نہ کچھ پڑھتا تو ہے۔"

"آپ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ اس کی آنکھیں کمزور ہوجائیں گی۔ صحت الگ بگڑ جائے گی۔"

"اس کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔"

"کیسے چھوڑ دوں' آپ کو تو فکر نہیں ہے۔ میں بھی فکر نہ کروں۔"

"ہوتی رہو فکر میں دُبلی۔"

"آپ ہی نے تو بگاڑا ہے اسے" وہ بڑبڑاتی رہی اور گوری شنکر نے خاموشی اختیار کرلی۔

باپ کی طرف سے جب کوئی تہدیدی کارروائی نہیں ہوئی تو اس کا حوصلہ بڑھ گیا۔

وہ جلد سے جلد دکان پر رکھی تمام کتابیں ختم کردینا چاہتا تھا۔ وہ شاید اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو بھی جاتا لیکن ساتویں جماعت پاس کرتے ہی اس کے باپ کا تبادلہ دوبارہ صدر مقام پونچھ میں ہوگیا۔

اب وہ پونچھ کے وکٹوریہ جوبلی ہائی اسکول میں آٹھویں کلاس کا طالبِ علم تھا۔

اس نے اردو کی جگہ سنسکرت لے لی تھی لیکن اب معلوم ہوا یہ تو اردو سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ اس نے آٹھویں میں سنسکرت کو بدل کر فارسی لے لی۔

ہر زبان کو اس سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ اردو اسے نہیں آئی' سنسکرت میں وہ نہیں چل سکا اور اب فارسی' یہ بھی اسے اتنی ہی مشکل لگتی تھی جتنی پچھلی دو زبانیں۔ مصیبت یہ ہوئی کہ وہ اس اسکول میں آتے ہی ماسٹر بلاقی رام نندہ کے ہتھے چڑھ گیا کیونکہ فارسی وہی پڑھاتے تھے اور بہت سخت استاد تھے۔ وہ کرشن چندر کو اس وجہ سے مارتے تھے کہ ایک تو اسے فارسی نہیں آتی تھی' دوسرے انہیں یہ معلوم ہوگیا تھا کہ وہ اخبار پڑھتا ہے۔ ان کے نزدیک اخبار بینی ہی ساری خرابیوں کی جڑ تھی۔

بلاقی رام کی مار وہ بڑے صبر سے سہہ رہا تھا۔ اسے خود حیرت ہوتی تھی کہ وہ اتنے مظالم کے بعد اب تک اسکول سے بھاگ کیوں نہیں گیا۔

○☆○

تھانے دار نیاز احمد' ڈاکٹر گوری شنکر کا جگری دوست تھا۔ اس پر راجا کی ہمشیرہ عاشق ہوگئی تھی۔ غضب یہ ہوا کہ راجا کو اس معاشقے کا علم ہوگیا۔ جابر حکمرانوں کا نزلہ رعایا پر ہی گرتا ہے۔ اس معاملے میں بھی قصوروار نیاز احمد ٹھہرا۔ نیاز احمد فرار ہوگیا تھا اور اس کی گرفتاری پر دس ہزار روپے کا انعام مقرر تھا۔ ریاست کی فوج اس کی تلاش میں پونچھ کا چپّا چپّا چھانتی پھر رہی تھی۔

کرشن چندر اس وقت گھر پر ہی تھا جب فوج کے سپاہی اس کے گھر بھی آئے۔ ایک ایک کمرے کی تلاشی لی لیکن نیاز احمد انہیں نہ مل سکا۔

اکثر بااثر لوگوں کے گھروں کی تلاشی لی جارہی تھی اس لیے کرشن نے اس کی پروا بھی نہیں کی' نہ اسے یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ اپنے باپ سے کچھ پوچھتا۔

وہ رات کو سونے کے لیے لیٹا تو ماں کی دبی دبی سسکیوں سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ پہلے تو اس نے اہمیت نہیں دی کیونکہ ان دونوں کے درمیان اتنے اختلافات تھے کہ اکثر کسی نہ کسی بات پر تکرار ہوتی ہی رہتی تھی لیکن جب نیاز احمد کا نام آیا تو وہ چوکنا ہوگیا۔

"وہ پوجا پاٹھ کا کمرا ہے اور تم نے ایک مسلمان کو وہاں چھپا رکھا ہے۔ وہ بھی مورتیوں کے درمیان۔ اے بھگوان! نہ جانے اس گھور پاپ کی سزا ہمیں کیا ملے۔"

اب کرشن چندر پر یہ راز کھلا کہ نیاز احمد اس کے گھر میں موجود ہے۔ وہ اس وقت بھی مورتیوں کے درمیان بیٹھا ہوگا۔ اسے ڈر لگنے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ ابھی کمرے میں جاکر نیاز احمد کو دیکھے لیکن اس کی ماں اتنی زور زور سے بول رہی تھی کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی سننے پر مجبور ہوگیا۔

"میں تم سے کہے دیتی ہوں اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔"

"انجام تو اس کا بھی اچھا نہیں ہوگا' اگر وہ پکڑا گیا۔"

"جیسے اس کے کرتوت ویسے اس کے پھل۔"

"اس کا کیا قصور جب راجا کی بہن ہی اس پر عاشق ہوگئی۔"

"اسے منع تو کرسکتا تھا۔ کہہ تو سکتا تھا تم ہندو میں مسلمان۔"

"محبت دھرم نہیں دیکھتی ہے۔"

"تم تو ناستک ہو۔ تم نے ایک مسلمان کو پناہ دی۔ تم تو آریہ سماجیوں سے بھی گئے گزرے ہوگئے۔"

"دوستی بھی تو کوئی چیز ہے۔"

"اور دھرم کوئی چیز نہیں۔"

"دوستی بھی تو ایک دھرم ہے۔ دوستی خود ایک مذہب ہے" گوری شنکر نے بڑے دُلار سے کہا۔

باپ کی باتیں کرشن کے دل میں قطرہ قطرہ کرکے اترتی جارہی تھیں۔ اس کے دل میں یہ خیال پختہ ہوتا جارہا تھا کہ دوستی اور خلوص بذاتِ خود ایک دھرم ہے۔ یہ دوستی ہندو اور مسلمان میں بھی ہوسکتی ہے۔ مورتیوں کے کمرے میں کسی

مسلمان کے قدم رکھ دینے سے دھرم بھرشٹ نہیں ہو جاتا۔ اگر ایسا ہوتا تو اس کے پتا جی ایک مسلمان کو کبھی وہاں نہیں چھپاتے۔ اس کے ساتھ ہی جابر حکمرانوں کا ظلم و ستم بھی اس کے دل میں جاگزیں ہو گیا جو محبت کرنے کے جرم میں کسی کی جان لینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ یہ تو دھرتی پر بھگوان بنے بیٹھے ہیں۔ اس نے راجا کے متعلق نفرت سے سوچا۔

ماں ابھی تک بڑبڑا رہی تھی لیکن اب اس کی آواز میں وہ طاقت نہیں رہی تھی۔

"تم اس مسلمان کو یہاں سے نکال دو پھر میں اکیس دن کی کتھا رکھوں گی۔ ہون کروں گی، بھوجن کراؤں گی۔"

"سب کچھ کرلینا۔ میں اس سے کہہ دوں گا، وہ چلا جائے گا۔"

گوری شنکر نے رفعِ شر کے لیے کہا اور پرمیشوری دیوی چپ ہو گئی۔

اگلے دن صبح جب اس کی والدہ نیاز احمد کے لیے چائے اور ناشتا لے کر پوجا کے کمرے میں گئی تو نیاز احمد کمرے میں موجود نہیں تھا۔ کمرے کے عقب کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ شاید نیاز احمد نے رات کی گفتگو سن لی تھی اور وہ فرار ہو گیا تھا۔

اسی دن قلعہ نما تھانے کی سیڑھیوں کے نیچے نیاز احمد کی لاش پائی گئی۔ کسی نے اسے مار کر اس کی لاش کے چار ٹکڑے کر دیے تھے۔

یہ نیاز احمد کی دوستی کی انتہا تھی۔ اس نے اپنی جان دے دی لیکن گوری شنکر پر آنچ نہیں آنے دی۔

اس واقعے نے کرشن کی نو تعمیر شخصیت میں ایک باب کا اور اضافہ کر دیا۔ اس نے اپنے دل میں عزم کیا کہ وہ باؤجی کے نقشِ قدم پر چلے گا اور دوستی کی ایسی ایسی کئی مثالیں قائم کرے گا۔

اس کا باپ اس کے لیے ہیرو تھا، آئیڈیل تھا۔ وہ چپکے چپکے ان کی تمام خصوصیات اپنے اندر سموتا جا رہا تھا۔ حسن پرستی اور عشق، انسانیت کو دھرم سمجھنا، دوستی میں حد سے گزر جانا، انسان اور انسان کے درمیان ذات پات کی دیوار کھڑی نہ کرنا، خلوص، مہمان نوازی، مظلوم کی حمایت اور ایسے کتنے ہی سبق وہ اپنے باپ کی درس گاہ سے سیکھ رہا تھا۔ اس کی کشادہ پیشانی، بڑی بڑی روشن چمکیلی آنکھیں، کالے گھنے بال اور درمیانہ قد اس بات کی گواہی دیتے تھے کہ وہ محبوب بنائے گا بھی اور محبوب بنے گا بھی۔

نیاز احمد کے واقعے نے اسے بتا دیا تھا کہ دوستی ایک پاکیزہ جذبہ ہے۔ دوستی کرنا اپنے آپ کو دوست کے حوالے کر دینے کے مترادف ہے۔ دوستی بے غرض اور بے لوث ہوتی ہے۔ بہت سے دوست، بہت سی دولت ہوتی ہے۔

اس نے اسی جذبے کے تحت بہت جلد پورے اسکول کو اپنا دوست بنا لیا۔ ان دوستوں کے ساتھ پہاڑوں اور جنگلوں میں گھومتے رہنے میں اسے لطف آنے لگا۔ جھرنوں اور چشموں کا شیریں ٹھنڈا پانی اس کے لیے آبِ حیات بن گیا۔ اس کی نت نئی شرارتیں، پُرخلوص جذبہ، دلچسپ باتیں ایسی مقبول ہوئیں کہ پورے اسکول میں اس کے نام کی جے ہونے لگی۔

درسی کتابوں سے اسے ویسے ہی رغبت نہیں تھی۔ کھیل کود میں پڑ کر اس طرف سے اور بھی غافل ہو گیا۔

رنگوں میں نہائے ہوئے ایسے ہی کسی موسم میں وہ اپنے والد کے ساتھ سید مظفر حسین شاہ، دیوان مال گزاری کے گھر گیا۔ یہ دنیا ہی اس کے لیے نئی تھی۔ مسلم معاشرے کی نہایت جوان روایات اس گھر میں موجود تھیں۔

"آداب عرض، جناب گوری شنکر صاحب۔"

"آداب عرض۔"

"مزاج بخیر؟"

"اللہ کا کرم ہے۔"

"یہ صاحب زادے ہیں؟"

"بڑا بیٹا ہے، کرشن چندر۔"

"ماشاء اللہ! خوب صورت بھی ہے اور ذہین بھی معلوم ہوتا ہے۔"

"مجھے اس سے بڑی امیدیں ہیں لیکن پڑھنے میں اس کا دھیان ذرا کم ہی ہے۔"

"ذہین بچے اکثر اسکول سے نہیں بھاگتے لیکن کتابوں سے ضرور بھاگتے ہیں۔"

اس بات پر دونوں نے قہقہہ لگایا۔ اتنی دیر میں ملازم حقہ تازہ کر کے لے آیا۔ گوری شنکر نے چند کش لیے اور حقہ مظفر حسین شاہ کی طرف بڑھا دیا۔ باری باری ایک ہی حقے سے دونوں دوست کش لگا رہے تھے اور کرشن چندر حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ یہ ہوتی ہے دوستی۔ اس وقت دو انسان بیٹھے ہیں جو آپس میں دوست ہیں۔ یہی ان کا ایمان ہے یہی دھرم۔

اس دوران میں دونوں دوستوں کے درمیان گفتگو بھی جاری تھی۔ اس گفتگو کا مرکز و محور انگریز... حکومت کا ناپسندیدہ اور قابلِ مذمت پہلو تھا۔

"کتنی شرم کی بات ہے کہ سات سمندر پار سے آ کر ایک قوم ہم پر حکومت کر رہی ہے۔"

"ہاں صاحب، جدھر دیکھو گورے ہی گورے سر اٹھا کر فرعونوں کی طرح چلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔"

"ان کی انصاف پسندی کے بڑے چرچے ہیں مگر سوچنے

والے یہ نہیں سوچتے کہ ظلم کرنے والا منصف کیسے ہو سکتا ہے۔"

کرشن چندر نے پہلی بار انگریزوں کے بارے میں اتنی تفصیل سے باتیں سنی تھیں اور پہلی مرتبہ انگریزوں کے خلاف اس کے دل میں نفرت کا احساس پیدا ہوا تھا۔

انگریزوں سے گزر کر بات مقامی حکمرانوں کے ظلم و جبر تک آگئی۔

کرشن چندر اس نتیجے پر پہنچا کہ ظالم تو ظالم ہوتا ہے انگریز یا دیسی نہیں ہوتا۔ ظلم کہیں بھی ہو، اس کے خلاف لڑنا چاہیے۔

اسے اب تک راجاؤں کا چہرہ بہت پُرکشش، پُرشکوہ اور بڑا پُروقار لگا تھا لیکن اس گفتگو کے بعد اس چہرے کا دوسرا رخ نمایاں ہوگیا جو بہت گھناؤنا، بدنما اور قابلِ نفریں تھا۔

اسے یاد آیا، وہ ایک روز اپنے باپ کے ساتھ راجا بلدیو سنگھ کے محل میں گیا تھا۔ محل کی آرائش دیکھ کر وہ بہت مرعوب ہوا تھا۔ اس کے باپ راجا کے علاج کے لیے گئے تھے۔ وہ اپنے کام میں مصروف ہوگئے۔ وہاں دو راج کمار بھی تھے۔ کرشن ان کے ساتھ کھیلنے لگا۔ راج کماروں نے اسے اپنی کچھ بیش قیمت چیزیں دکھائیں۔ کرشن کے پاس اس وقت اس کے آبائی شہر وزیرستان کا بنا ہوا چاقو تھا، اس نے وہ دکھایا۔ چاقو دیکھتے ہی دونوں راجکمار مچل گئے۔ ایک راجکمار نے چاقو اس کے ہاتھ سے چھین کر اپنی جیب میں ڈال لیا۔ وہ اپنے چاقو کے لیے دونوں راجکماروں سے الجھ پڑا۔ وہ دو تھے اور یہ اکیلا۔ دونوں نے اس کا مار مار کے بھرکس نکال دیا۔ چاقو الگ اس کے ہاتھ سے گیا۔ یہ لوگ اسی طرح کرتے ہیں۔ بابو جی ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں کہ غریبوں کا خون چوستے ہیں۔ دوسروں کا مال مار مار کر ہی تو جاگیردار بنے ہیں۔

وہ اپنے خیالوں میں مست تھا کہ ملازم نے آکر نوید دی۔ کھانا چُنا جا چکا تھا۔

کھانے کے کمرے میں پہنچتے ہی اس کی بھوک چمکنے لگی۔ وسیع دسترخوان پر طرح طرح کے کھانے چنے ہوئے تھے۔ ایسے کھانے جو اس کے گھر میں کبھی نہیں بنے تھے۔ یہ قورمہ ہے، یہ پلاؤ ہے، یہ بھنا گوشت ہے، یہ شاہی ٹکڑے ہیں، یہ فیرنی ہے۔ گوشت کو دیکھ کر اسے اچانک یاد آگیا کہ وہ ہندو ہے۔ ماتاجی ماس کھانے والوں کو برا سمجھتی ہیں۔ مجھے بھی منع کرتی ہیں۔ اس کے باپ کو اس کی کیفیت کا فوراً اندازہ ہوگیا۔

"تمہاری والدہ سناتن دھرمی ہیں مگر تمہیں نہیں ہونا چاہیے۔ تم اگر ان چکروں میں پڑگئے تو ہرگز ترقی نہیں کرسکو گے۔ گھر جاکر کچھ مت بتانا مگر اس وقت تو کھالو۔"

تصنیفات

افسانوی مجموعے

۱۔ طلسمِ خیال ۲۔ نظارے ۳۔ ہوائی قلعے ۴۔ گھونگھٹ میں گوری جلے ۵۔ ٹوٹے ہوئے تارے ۶۔ زندگی کے موڑ پر ۷۔ نغمے کی موت ۸۔ پرانے خدا ۹۔ ان داتا ۱۰۔ تین غنڈے ۱۱۔ ہم وحشی ہیں ۱۲۔ اجنتا سے آگے ۱۳۔ ایک گرجا ایک خندق ۱۴۔ سمندر دور ہے ۱۵۔ شکست کے بعد ۱۶۔ نئے غلام ۱۷۔ میں انتظار کروں گا ۱۸۔ مزاحیہ افسانے ۱۹۔ ایک روپیہ ایک پھول ۲۰۔ یوکلپٹس کی ڈالی ۲۱۔ ہائیڈروجن بم کے بعد ۲۲۔ نئے افسانے ۲۳۔ کتاب کا کفن ۲۴۔ دل کسی کا دوست نہیں ۲۵۔ مسکرانے والیاں ۲۶۔ کرشن چندر کے افسانے ۲۷۔ سینو کا قیدی ۲۸۔ مس نینی تال ۲۹۔ دسواں پل ۳۰۔ گلشن گلشن ڈھونڈا تجھ کو ۳۱۔ آدھے گھنٹے کا خدا ۳۲۔ الجھی لڑکی کالے بال۔

اس نے ڈرتے ڈرتے سالن میں ہاتھ ڈالا۔ مسالے دار گوشت جس میں لال مرچوں کی بہتات تھی، اسے اتنا پسند آیا کہ ذرا سی دیر میں چٹ کرگیا۔ پلاؤ کی خوشبو نے تو اسے دیوانہ کردیا۔ شاہی ٹکڑوں پر بھی خوب ہاتھ صاف کیا۔

کھانے پر مظفر شاہ کا بیٹا حسن شاہ بھی موجود تھا جس سے اس کی فوراً دوستی ہوگئی۔

کھانے سے فراغت کے بعد وہ اسی حویلی کا کتب خانہ دیکھنے حسن شاہ کے ساتھ گیا۔ ہزار ہا کتابیں شیلفوں میں بڑے قرینے اور سلیقے سے سجی ہوئی تھیں۔

"باپ رے باپ! اتنی کتابیں۔ کون پڑھتا ہے انہیں؟"

"میں بھی پڑھتا ہوں، ابا حضور بھی۔"

"ہر طرح کی کتابیں ہیں؟"

"ہر طرح سے کیا مطلب؟"

"مثلاً ناول، افسانے وغیرہ؟"

"یہ سب ناول ہیں" حسن شاہ نے ایک طرف اشارہ کیا "اور اس طرف افسانے رکھے ہیں اور یہ داستانیں ہیں۔"

"حسن شاہ، ایک بات کہوں۔"

"کہو۔"

"کیا میں ان کتابوں کو پڑھ سکتا ہوں؟"

حسن شاہ تذبذب میں پڑگیا۔ وہ سوچ رہا تھا کیا جواب دے۔ ابھی اتنی دوستی نہیں ہوئی تھی کہ فوراً تیار ہو جاتا۔

"اگر واپس کرنے کا وعدہ کرو تو۔"

"کتاب پڑھتے ہی واپس کردوں گا۔ دوسری کتاب بھی تو پڑھنی ہوگی۔"

"اس کے لیے بھی ابا حضور سے اجازت لینی ہوگی۔"

"یار، تم سفارش کردو۔ مجھے بہت شوق ہے ان کتابوں کا۔"

"ٹھہرو، میں ابھی پوچھ کر آتا ہوں۔"

مظفر شاہ کی اس کے پتا سے جو دوستی تھی، اس رشتے سے یہ بعید تھا کہ وہ انکار کرتے۔ انہوں نے فوراً اجازت دے دی۔ حسن شاہ کو کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔

"کون سی کتاب دوں؟"

"کوئی ناول دے دو۔"

"یہ پڑھو" حسن شاہ نے سرشار کا ایک ناول نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔

اب اس کے لیے وہاں ٹھہرنا بے سود تھا لیکن باپ کے بغیر کیسے آسکتا تھا۔ اسے کچھ دیر اور رکنا پڑا۔

وہ گھر آیا تو اس کے ہاتھ میں خزانہ بھی تھا، خزانے کی چابی بھی۔ یہ کتاب خزانہ تھی اور اس کتاب کو واپس کرکے وہ دوسری کتاب لاسکتا تھا۔ اسے اس وقت کتاب پڑھنے سے زیادہ یہ فکر تھی، وہ جلدی سے اسے ختم کرے تاکہ دوسری ملے۔

اس نے یہ ضخیم ناول صرف دو دن میں ختم کرلیا۔ اب اسے وہاں جانے کے لیے پتاجی کے سہارے کی ضرورت نہیں تھی۔ اب وہاں اس کا دوست حسن شاہ رہتا تھا۔

حسن شاہ کو کتابوں سے ایسی محبت تھی جیسے کوئی ماں اپنے اکلوتے بیٹے سے کرتی ہے۔ کرشن چندر کے آنے سے زیادہ اسے یہ خوشی ہوئی کہ اس کی کتاب واپس آگئی تھی۔ اب اسے دوسری کتاب دینے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ نہیں ہوئی۔

چند ملاقاتوں کے تکلف کے بعد حسن شاہ نے اپنے کتب خانے کا دروازہ اس پر کھول دیا۔ کرشن بلا تکلف اپنی پسندیدہ کتابیں وہاں سے لے آتا اور گھر پر ان کا مطالعہ کرنے کے بعد انہیں لوٹا دیتا۔

کچھ نادر اور نایاب نسخے ایسے بھی تھے جو تمام تر دوستی کے باوجود حسن شاہ دینے پر آمادہ نہیں تھا۔ انہیں پڑھنے کے لیے اسے وہیں بیٹھنا پڑتا۔ اس قربت نے جہاں اس کے آتشِ علمی کو تیز کیا وہیں حسن شاہ سے دوستی بھی گہری ہوتی گئی۔ پھر تو یہ حال ہوا کہ گھر سے اسکول جانے کے لیے روانہ ہوتا اور حسن شاہ کے گھر پہنچ جاتا۔ حسن شاہ نے اسے بائبل پڑھائی، قرآن مجید اور رگ وید کا ترجمہ سنایا۔ کالی داس کا شہرۂ آفاق ڈراما، شکنتلا، شیکسپیئر کا ہیملٹ وغیرہ پڑھ کر سنائے۔

اس پاکیزہ ماحول میں اس کے ذوقِ ادب کو جلا ملی۔ اس گھر میں وہ کتابوں کے ساتھ ساتھ ایک مخصوص تہذیب سے بھی واقف ہوا جس کی آگاہی کسی کتاب سے حاصل نہیں ہوسکتی تھی۔

وہ اپنی دانست میں اچھا خاصا عالم بن چکا تھا لیکن نصابی کتب میں دلچسپی نہ لینے کی وجہ سے وہ ابھی تک نالائق طالبِ علم تھا۔ اس کے ماسٹر بلاقی رام کا سلوک اب بھی پُرتشدد تھا۔

بلاقی رام کی مسلسل مار سے تنگ آکر اس نے ان کے خلاف ایک طنزیہ مضمون "پروفیسر بلیسکی" لکھا اور چپکے سے ہفتہ وار اخبار "ریاست" دہلی کو بھیج دیا۔

کثرت سے کتابیں پڑھنے کی وجہ سے اسے اپنے قلم پر اعتماد تو تھا لیکن یہ یقین نہیں تھا کہ اس کا مضمون اخبار میں چھپ بھی جائے گا۔ اسی لیے اس نے کسی دوست کو ہوا نہیں لگنے دی تھی۔ صرف عبداللہ تھا جو اس کے اس راز سے واقف تھا۔ عبداللہ، اسکول کے ہیڈ ماسٹر کا برادرِ نسبتی تھا اسی لیے تمام اساتذہ اس کا خیال رکھتے تھے اور اسی لیے کرشن نے اسے اپنا دستِ راست بنایا ہوا تھا۔

عبداللہ روز اس سے پوچھتا رہا تھا کہ مضمون کا کیا ہوا۔ اب تو اسے یہ پچھتاوا ہونے لگا تھا کہ اس نے عبداللہ کو بھی کیوں بتایا۔

وہ تقریباً مایوس ہوچکا تھا کہ ڈاکیے کی آمد نے اسے حیران کردیا۔ اخبار میں اس کا مضمون جوں کا توں چھپ گیا تھا۔

دوسرے دن وہ عبداللہ کو ایک گوشے میں لے گیا "مضمون چھپ گیا ہے۔ اب یہ تمہارا کام ہے کہ اسے پھیلاؤ۔ پروفیسر بلیسکی کی آڑ میں بلاقی رام پر میں نے ایسی چوٹیں کی ہیں کہ بچو... کو مزہ آجائے گا۔"

عبداللہ کے لیے یہ کام کون سا مشکل تھا۔ اس نے یہ اخبار استادوں تک پہنچادیا۔ ایک دن تو عملے کے تمام ارکان اسے مزے لے لے کر پڑھتے رہے اور دوسرے دن پورے وکٹوریہ اسکول میں پروفیسر بلیسکی کی آوازیں آنے لگیں۔

"یار، تم بڑے چھپے رستم نکلے۔ مضمون تو ادیب لکھتے ہیں، تم تو ادیب ہو۔"

"اب دیکھنا میں کیسے کیسے مضامین لکھتا ہوں اور سب ریاست اخبار میں چھپیں گے۔ دوسرے اخبار والے مانگیں گے بھی تو نہیں دوں گا۔"

وہ کئی دن تک بڑے بڑے منصوبے بناتا رہا۔ کئی مضامین کے خاکے اس کے ذہن میں جمع ہوگئے جن پر اسے قلم اٹھانا تھا لیکن پھر زمین بوس ہوگئے۔

مضمون کی ایسی شہرت ہوئی تھی کہ پورے علاقے میں

غلغلہ سا مچ گیا تھا۔ اس کے والد کو بھی علم ہو گیا۔
"کیوں جی' یہ مضمون آپ نے تصنیف کیا ہے؟" اس کے والد نے پوچھا۔
"جی!" اس نے اکڑ کر کہا۔ وہ سمجھ رہا تھا پتاجی اسے شاباش دیں گے۔
"قلم اس لیے ہوتا ہے کہ اس سے اپنے بزرگوں کی پگڑیاں اچھالی جائیں؟ اگر اب میں نے دیکھ لیا کہ تم نے کوئی مضمون لکھا ہے تو میں نہ قلم ثابت چھوڑوں گا نہ تمہارے ہاتھ۔"
والد نے کچھ ایسے سخت الفاظ میں سرزنش کی اور اس کی مضمون نگاری کو نازیبا حرکت قرار دیا کہ اس کی ہمت جواب دے گئی۔ اس نے ذہن میں ترتیب پانے والے مضامین کو پھاڑ کر پھینک دیا اور عہد کیا کہ آئندہ وہ کوئی مضمون نہیں لکھے گا۔
چور چوری سے جاتا ہے' ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔ اس نے مضمون نگاری سے توبہ کی تھی' شاعری کا میدان کھلا پڑا تھا۔
اسکول میں سالانہ جلسہ تھا۔ راجا صاحب اس جلسے میں بطور خاص شریک ہوئے۔
اردو کے ماسٹر دینا ناتھ شاعر تھے اور شوق تخلص فرماتے تھے۔ انہوں نے راجا کی شان میں قصیدہ پڑھا۔ اس قصیدے کی اتنی تعریف ہوئی' اتنی تالیاں بجیں کہ کرشن کو بھی ایسی کوئی چیز کہنے اور اپنی تعریف سننے کا اشتیاق ہوا۔
وہ کئی دن تک مختلف شاعروں کے دیوان پڑھتا رہا اور پھر اپنی ایک غزل لکھ لی۔ اب سوال یہ تھا کہ اسے درست کس سے کرایا جائے۔ اسے اپنے ماسٹر دینا ناتھ کا خیال آیا کہ پونچھ بھر میں وہ ہی واحد شاعر تھے۔ بھری کلاس میں تو ایسی چیزیں دکھائی نہیں جاسکتی تھیں لہٰذا اس نے دروازے پر پڑی ہوئی چق اٹھائی اور ان کے کمرے میں پہنچ گیا۔ وہ کچھ دیر سر جھکائے کھڑا رہا اور پھر وہ کاغذ ان کے سامنے رکھ دیا جس پر اشعار لکھے ہوئے تھے۔
"کیا ہے یہ؟"
"میں نے شاعری کی ہے۔ آپ بھی اسے دیکھ لیں۔"
"اچھا' تو آپ نے شاعری کی ہے" انہوں نے کہا اور اس کی اولین شعری کاوش کو جانچنے پرکھنے لگے۔
"یہ شعر ہیں؟" ماسٹر دینا ناتھ نے کہا۔
"اچھے ہیں نا؟"
"یہ شعر ہیں؟ انہیں تم شعر کہتے ہو۔ قافیہ کیا ہے' ردیف کدھر ہے' اور وزن!"
وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور ایک چانٹا اس کے دائیں گال پر رسید کیا۔ وہ ابھی سنبھلا ہی تھا کہ دوسرا چانٹا بائیں گال پر پڑا۔
"مذاق سمجھا ہوا ہے شاعری کو۔ مجھے جتانے آیا ہے کہ میں ایسی شاعری کرتا ہوں۔ میں بلاقی رام نہیں ہوں جس پر تو نے مضمون لکھا تھا۔ نکل جا میرے کمرے سے۔ چلے آتے ہیں شاعر کہیں کے۔"
یہ حادثہ اس کے لیے بڑا اچانک اور نہایت غیر متوقع تھا۔ وہ خاموشی سے چلا آیا۔
یہ بات یہیں رہ جاتی تو بھی غنیمت تھا لیکن دینا ناتھ نے بھری کلاس میں اسے کھڑا کردیا اور اس کے شعروں کا اس طرح ہنس ہنس کر مذاق اڑایا کہ اس نے زندگی بھر کے لیے شاعری سے توبہ کرلی۔
"دینا ناتھ نہیں چاہتے کہ پونچھ میں ان کی ٹکر کا کوئی دوسرا شاعر پیدا ہو۔ اسی لیے انہوں نے میری شاعری کا مذاق اڑایا۔ خیر' اگر وہ یہی چاہتے ہیں تو یہی سہی' میں آئندہ شاعری نہیں کروں گا۔"
اس نے اپنی بہترین شاعری کو بدترین قرار دیے جانے کا یہ جواز پیش کیا اور شاعری سے توبہ کرلی۔
اب اس کی ساری توجہ کرکٹ میچوں کی طرف ہوگئی۔ جوبلی ہائی اسکول کے میچ اکثر مسلم ہائی اسکول سے ہوتے رہتے تھے۔ اس نے ان میچوں میں اتنا نام پیدا کیا کہ اپنی ٹیم کی ریڑھ کی ہڈی سمجھا جانے لگا۔
اس کے دوست بے انتہا تھے۔ اسکول میں بھی اسکول سے باہر بھی۔ راجکماروں تک سے اس کی دوستی تھی جن کے ساتھ وہ گرمیوں کی دوپہریں ڈاک بنگلے کے آرام دہ کمروں میں گزارتا تھا۔
ہاکی' فٹ بال' گھڑ سواری' موسیقی اور مصوری کون سا ایسا شوق تھا جس سے اسے دلچسپی نہیں تھی۔ ان دلچسپیوں نے رخ بدلا اور ڈرامے اس کی جان بن گئے۔ پونچھ میں ہونے والا شاید ہی کوئی ڈراما ہو جو اس نے نہ دیکھا ہو۔ اسکول میں ہونے والے ایک ڈرامے میں اس نے خود بھی ارجن کا پارٹ کیا۔
یہ شوق اور نہ جانے کیا رنگ دکھاتا کہ دسویں کے امتحان سر پر آگئے۔ اس کے ساتھی کتابیں لے کر بیٹھ گئے۔ کھیلوں کے میدان خالی ہوگئے۔ اسے بھی مجبوراً کتابیں کھولنی پڑیں۔
جس طرح لڑکیاں طاقوں میں گڑیاں چھوڑ کر پی کے گھر سدھار جاتی ہیں' اسے بھی میٹرک کرتے ہی میںنڈر اور پونچھ کی ساری دلچسپیاں چھوڑ کر لاہور جانا پڑا۔
اب گھر کے آنگن میں اس کے دوسرے بہن بھائی بھی

آگئے تھے لیکن اس کی ماں کو کرشن کی ایک پل کی جدائی بھی گوارا نہیں تھی۔ جب سے انہوں نے سنا تھا کہ وہ پڑھنے کے لیے لاہور جائے گا ان کا رو رو کر بُرا حال تھا لیکن بیٹے کا مستقبل بھی عزیز تھا۔ اسے روک بھی نہیں سکتی تھیں۔ یہ سہارا بھی انہیں سہارا دیئے ہوئے تھا کہ لاہور میں کرشن کے تایا رہتے ہیں۔ وہ ان کی نگرانی میں رہے گا۔

وہ لاہور کیا آیا ایک نئی دنیا میں آگیا۔ پونچھ کے مقابلے میں یہاں کی زندگی کھلی کتاب کی طرح تھی۔ پونچھ کی معصومیت یہاں تک پہنچتے پہنچتے شباب کی منزلوں میں داخل ہوگئی تھی۔ کالجوں اور باغوں کا شہر اس اعتبار سے اس کے لیے نیا نہیں تھا کہ اس نے اپنے بچپن کے کچھ دن یہاں گزارے تھے لیکن اب میں اور جب میں بہت فرق آگیا تھا۔ اب لاہور بھی بدل گیا تھا، اس کا بچپن بھی شباب کی دہلیز پر دستک دے رہا تھا۔

اس کے پتا اسے چھوڑنے آئے تھے اور آتے ہی اس کے داخلے کے لیے کوشش کرنے لگے تھے۔ وہ مصر تھے کہ ان کا بیٹا بھی ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ڈاکٹر بنے جبکہ خود اسے سائنس کے مضامین سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن باپ کی ضد کے آگے اسے مجبور ہونا پڑا۔ گوری شنکر نے اسے فارمین کرسچین کالج میں ایف۔ ایس۔ سی (میڈیکل) میں داخلہ دلا دیا۔

گوری شنکر تو کچھ دن رہنے کے بعد واپس چلے گئے اور وہ اپنے تایا کے گھر چوک متی میں رہائش پذیر ہوگئے۔

باپ کے جاتے ہی اس نے آنکھ کھول کر لاہور کو دیکھا۔ ادب اور سیاست کا مرکز لاہور، اس کے سامنے دسترخوان کی طرح بچھا ہوا تھا۔

انقلابِ روس نے اشتراکیت پسند طبقے کو پیدا کردیا تھا۔ نوجوان طبقہ اشتراکی خیالات سے بے حد متاثر ہو رہا تھا۔ سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام کو مٹا کر ایک ایسے نظام کو رواج دینے کی باتیں ہو رہی تھیں جو اقتصادی برابری، اخوت اور امن و صلح پر یقین رکھتا ہو۔ کالج پہنچتے ہی اسے اشتراکی خیالات سے شرابور نوجوان ملنے لگے۔

کرشن چندر ایک ایسی ریاست سے لاہور آیا تھا جہاں اس نے آنکھ کھولتے ہی دل دہلا دینے والی غربت دیکھی تھی۔ محنت کش طبقے کو دو وقت کی روٹی نصیب نہیں تھی اور اہلِ ثروت، ریاست کو اپنی جاگیر سمجھ کر دندناتے پھرتے تھے۔ اس ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے والوں کی زبانیں کھینچ لی جاتی تھیں۔

ایسا نامنصفانہ اور انسانیت کش ماحول سے اشتراکیت نے بے تحاشا اپنی طرف کھینچ لیا۔

اس کی شخصیت میں اس کے باپ کی شخصیت بھی گھل مل گئی تھی۔ اس کے باپ رجعت پسندانہ خیالات کو لایعنی سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ بھگوان کے وجود کے بھی منکر تھے۔ ذات پات اور چھوت چھات سے نفرت کرتے تھے۔ یہی وہ خیالات تھے جو اشتراکیت سے عبارت تھے۔ ان خیالات کو جب اس نے مرتب شکل میں اور ایک تحریک کی صورت میں دیکھا تو وہ ان کی طرف جھکتا چلا گیا۔

سائمن کمیشن کی آمد آمد تھی۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی، مہاتما گاندھی کی قیادت میں کمیشن کا بائیکاٹ کرچکی تھی۔ ایک بہت بڑا احتجاجی جلوس نکالا گیا جس کی قیادت لالہ لاجپت رائے کر رہے تھے۔

لاکھوں افراد کا مجمع لاہور ریلوے اسٹیشن کے باہر کمیشن کے ارکان کی آمد کا منتظر تھا۔ اس ہجوم میں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ کرشن چندر بھی موجود تھا اور چلا چلا کر "سائمن گو بیک" کے نعرے لگا رہا تھا۔

کمیشن کے ارکان جونہی گاڑی سے اترے، نعروں میں شدت آگئی۔ بپھرے ہوئے جلوس کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ کمیشن کے ارکان پولیس کے نرغے میں اسٹیشن سے باہر نکلنا چاہتے تھے لیکن بے قابو جلوس راستہ دینے پر تیار نہیں تھا۔ انگریز پولیس افسر نے لاٹھی چارج کا حکم دے دیا۔ حکم ملنے کی دیر تھی کہ لاٹھیوں کی بارش شروع ہوگئی۔

کرشن چندر جوشِ غضب میں جلوس کے اگلے حصے میں پہنچ چکا تھا۔ بھگدڑ مچی تو وہ بھی چوکنا ہوا لیکن اتنی دیر میں لاٹھی کا ایک بھرپور وار اس کے کاندھے پر پڑا۔ وہ چیختا ہوا جلوس کی پچھلی جانب بھاگا۔ لاٹھیاں یہاں بھی برس رہی تھیں۔ لوگ بھاگ رہے تھے۔ اس نے بھی دوڑنا شروع کردیا اور موچی دروازے تک دوڑتا چلا گیا۔

قدم رُکے تو کاندھے کی تکلیف کا احساس ہوا۔ وہ پیدل چلتا ہوا ایک باغ میں پہنچ گیا۔ اب اسے اپنی بزدلی کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ مجھے بھاگنا نہیں چاہیے تھا، اس نے اپنا کاندھا سہلاتے ہوئے کہا۔ اگر سب اسی طرح بھاگ گئے تو آزادی کا یہ سفر کیسے طے ہوگا۔ مجھے ان لاٹھیوں کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ حب الوطنی کا یہی تقاضا ہے۔ وہ باغ سے نکلا اور اسٹیشن کی طرف چل دیا۔ لوگ ابھی تک واپس آ رہے تھے، اسٹیشن کی طرف جانے والا اس کے سوا کوئی نہیں تھا پھر اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ بکھرا ہوا جلوس اب جلسے کی شکل میں احتجاج کرے گا۔ موری گیٹ پر جہاں وہ اس وقت موجود تھا جلسہ ہوگا۔ لالہ لاجپت رائے خطاب کریں گے۔ اب آگے بڑھنا بے کار تھا۔ وہ پھر موری گیٹ کے باغ میں آکر بیٹھ گیا اور جلسہ جمنے کا انتظار کرنے لگا۔ اسے اب یہ فخر تھا کہ

ناول

شکست، جب کھیت جاگے، طوفان کی کلیاں، دل کی وادیاں سوگئیں، آسمان روشن ہے، باون پتے، ایک گدھے کی سرگزشت، ایک عورت ہزار دیوانے، غدار، سڑک واپس جاتی ہے، دادر پل کے بچے، برف کے پھول، بورن کلب، میری یادوں کے چنار، گدھے کی واپسی، چاندی کے گھاؤ، ایک گدھا نیفا میں، ہانگ کانگ کی حسینہ، مٹی کے صنم، ایک وائلن سمندر کے کنارے، درد کی لہر، لندن کے سات رنگ، کاغذ کی ناؤ، پانچ لوفر، پانچ لوفر ایک ہیروئن، گنگا بہے نہ رات، دوسری برف باری سے پہلے، گوالیار کا حجام، بمبئی کی شام، چندا کی چاندنی، ایک کروڑ کی بوتل، مہارانی، پیار کی ایک خوشبو (ماخوذ)، مشینوں کا شہر، کارنیوال، آئینے اکیلے ہیں، چنبل کی چنبیلی، اس کا بدن میرا چمن، محبت بھی قیامت بھی، سونے کا سنسار، سپنوں کی وادی، آدھا راستہ، ہونولولو کا راجکمار، فٹ پاتھ کے فرشتے، آدھے سفر کی پوری کہانی (ہندی)

اس نے وطن کی آزادی کی خاطر لاٹھی کھائی ہے۔ اس کا اس جلسے میں شریک ہونا بہت ضروری ہے۔ وہ گھر بھی نہیں گیا اور جلسہ شروع ہونے تک وہیں بیٹھا رہا۔

لالہ لاجپت رائے شعلہ بیان مقرر تھے۔ شیرِ پنجاب کہلاتے تھے۔ انہوں نے وہ شعلے برسائے کہ دلوں میں آگ لگ گئی۔ نوجوان کرشن چندر کے دل میں جاگیردارانہ نظام کے خلاف باغیانہ جذبات نے جگہ بنائی، بدیسی حکومت سے نجات حاصل کرنے کا آتشیں جذبہ پیدا کر دیا۔

وہ جلسہ ختم ہونے کے بعد چوک متی، اپنے گھر کی طرف آیا تو مکمل اشتراکی بن چکا تھا۔ یہ عقیدہ پختہ ہوگیا اس کے غریب ہندوستان کا علاج اشتراکیت میں پوشیدہ ہے۔ آج کے واقعے سے اسے یہ بھی یقین آگیا تھا کہ ہمیں سیاسی آزادی کی نہیں، ایک انقلاب کی ضرورت ہے۔ انقلاب اور باغیانہ خیالات کا طوفان اس کے دل میں دھومیں مچانے لگا۔ اب کوئی طاقت نہیں تھی جو اسے اشتراکیوں سے عملی تعاون کرنے سے روک سکتی۔ اس کا فطری اور جبلی رجحان بھی اسی طرف تھا۔

مشہورِ زمانہ انقلاب پسند بھگت سنگھ انقلابی تحریک چلا رہے تھے۔ یہ شخص برٹش حکومت کے لیے چھلاوا بنا ہوا تھا۔ نوجوانوں کے لیے اس کے عزائم میں بڑی کشش تھی۔

یہ نوجوان جوق در جوق انقلابی پارٹی میں شریک ہو رہے تھے۔ اس خفیہ تحریک کا اثر کالج میں بھی تھا۔ بھگت سنگھ کی انقلابی پارٹی کے بہت سے طلبہ کالج میں تھے۔ کرشن ان سے واقف تھا لیکن اس نے باقاعدہ پارٹی جوائن نہیں کی تھی۔

سائمن کمیشن کے خلاف ہونے والے جلسے میں شرکت کے بعد اس کے دل میں انقلاب کی آگ دہکنے لگی تھی۔

کالج ہوسٹل کے ایک کمرے میں انقلابی تحریک کا کام بڑی رازداری سے کیا جا رہا تھا۔ ایک دن وہ بھی وہاں پہنچ گیا۔ ان لڑکوں کے خیالات اور ان کی جوشیلی باتیں سن کر اس کا خون گرم ہوگیا۔

رات کے اندھیرے میں چوک متی سے ہاسٹل تک آنا آسان نہیں تھا۔ جی کڑا کر کے آ بھی جاتا تو گھر پر کیا بہانہ کرتا۔ اس کا ایک ہی علاج تھا۔ وہ تایا کے گھر سے ہاسٹل منتقل ہوگیا۔ رات کے اندھیرے میں انقلابی لٹریچر تقسیم کیا جاتا تھا۔

اس نے پہلی مرتبہ ڈان برین کی معرکہ خیز انقلابی کتاب "مائی فائٹ فار آئرش فریڈم" اور ویرے ورکر کی "انڈیاز فرسٹ وار آف انڈی پینڈنس" پڑھیں۔ کچا ذہن باغیانہ خیالات کی آماجگاہ بن گیا۔

ایف۔ ایس۔ سی پاس کرنے کے بعد سائنس سے اس کا دل بھر گیا۔ اس نے اپنے فطری رجحان کے مطابق بی۔ اے میں داخلہ لے لیا اور سیاست، تاریخ، ادب کے مضامین لیے۔

وہ بی۔ اے کے دوسرے سال میں تھا۔ ملک میں قومی تحریک نے ایک واضح صورت اختیار کر لی تھی۔ آنے والی آزادی کے نشان دھندلے دھندلے سہی لیکن نمودار ہونے لگے تھے۔ بھگت سنگھ کی کارروائیاں تیز سے تیز تر ہونے لگی تھیں۔ بھگت سنگھ تخریبی سرگرمیوں کے لیے دستے تشکیل دے رہے تھے۔ وہ بھی کالج سے بھاگ کر بھگت سنگھ کے گروہ میں شامل ہوگیا۔

کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے۔ بس اتنا معلوم تھا کہ وہ ہاسٹل سے بھاگ گیا ہے۔

کسی کے وہم و خیال میں بھی نہیں تھا کہ اس کا رابطہ بھگت سنگھ کے خطرناک گروہ سے ہو سکتا ہے۔ سب گھر والے تو یہی سمجھ رہے تھے کہ وہ کہیں چلا گیا ہے۔

اس کی ماں کی تو جان ہی اس میں تھی۔ بچے اور بھی تھے لیکن کرشن پر وہ جان چھڑکتی تھی۔ وہ فوراً پونچھ سے لاہور آگئی۔

سب اسے ڈھونڈنے میں لگے ہوئے تھے لیکن اسے کسی پر بھروسا نہیں تھا۔ کیا خبر کوئی ڈھونڈ بھی رہا ہے یا نہیں۔ وہ خود اسے ڈھونڈنے نکل کھڑی ہوئی۔ شہر کا کونا کونا چھان مارا۔ دیوانوں کی طرح ہر جگہ دوڑتی پھر رہی تھی۔ تھک ہار کر لوٹ آتی تو گھر میں ٹہلتی رہتی۔ میرا کاکا کہاں ہوگا۔ کس حال میں ہوگا۔ کہاں کھانا کھاتا ہوگا۔ اسے تو کھانے کا بہت شوق ہے۔

اب اسے اچھا کھانا کہاں مل رہا ہوگا۔

گھر والوں کو یہ فکر ہونے لگی تھی کہ کہیں وہ کرشن کے غم میں پاگل نہ ہو جائے کہ ایک دن کرشن واپس آگیا۔

یہ ملاپ عارضی ثابت ہوا کیونکہ گھر پہنچتے ہی پولیس نے اسے گرفتار کرلیا۔

وہ لاہور کے قلعے میں نظربند تھا اور اس سے تفتیش ہورہی تھی۔ وہ نظربندی دو ماہ تک جاری رہی۔ تفتیش کے دوران میں کوئی ثبوت ایسا نہیں ملا جو اسے مجرم ثابت کرتا لہٰذا اسے رہا کرنا پڑا۔ وہ کچھ دن کے لیے پونچھ چلا گیا۔

○☆○

وسندھرا نام کی ایک لڑکی اس کے بچپن کی ساتھی تھی۔ عمر میں اس سے بڑی تھی لیکن دونوں کی خوب بنتی تھی۔ اب کرشن ہی نہیں وہ بھی جوان ہوگئی تھی۔ جوانی سب پر آتی ہے مگر اس پر ٹوٹ کر آئی تھی۔ وہ قتالہ اب قتالۂ عالم بن گئی تھی۔ ایسی خوب صورت نکلی تھی کہ اس کے حسن و جمال کے چرچے گھر گھر ہونے لگے تھے۔ وہ جدھر سے گزر جاتی' اس کے قدموں میں آنکھیں بچھ جاتیں۔

کرشن اپنی رہائی کے بعد پونچھ آیا تو اس نے بھی یہ قصے سنے۔ اسے اپنے بچپن کی بھولی بسری کئی کہانیاں ایک ساتھ یاد آگئیں۔ وہ کتنی شوخ تھی۔ مجھ سے کتنا لاڈ کرتی تھی۔ پیار ہی پیار میں کتنا چھیڑتی تھی۔ شاید مجھے چاہتی بھی تھی۔ میں بھی اسے چاہنے لگا تھا لیکن اس وقت اظہار کرنا آتا ہی نہیں تھا۔ نہر پر جہاں اور لڑکیاں بھی نہاتی تھیں' وسندھرا مجھے اپنے ساتھ لے کر جاتی تھی۔ وہ جل پری کی طرح پانی میں تیرتی تھی۔ سنہرے بال' دراز قامت' پانی میں آگ لگاتی تھی۔ اب تو قیامت ہوگئی ہوگی۔

عشق نام کا جو جذبہ اب تک اس کے دل میں چھپا ہوا تھا اور جس کا اسے احساس ہی نہیں تھا' اچانک سر اٹھانے لگا۔ اسے ایک نظر دیکھنا تو چاہیے۔ اسے بھی تو معلوم ہو کہ اس کا کرشنا آگیا ہے۔

بچپن کی آزادی' شباب کی پابندیوں کی نذر ہوچکی تھی۔ اب دونوں کا ملنا آسان نہیں تھا اور وسندھرا تو یوں بھی فخر و ناز کے زیور سے آراستہ تھی اس لیے گھر سے کم ہی نکلتی تھی۔ کرشن کی بے چینی بڑھتی جارہی تھی۔ وہ کسی ایسے ذریعے کی تلاش میں تھا جو وسندھرا سے ملاقات کا وسیلہ بن جائے۔ اندھیرے میں جگنو کی طرح گوربخش سنگھ کا نام چمکا۔ وہ کرشن کا دوست بھی تھا اور وسندھرا کا دور کا رشتے دار بھی۔ وہ اس ملاقات کا اہتمام کرسکتا تھا۔ اس نے گوربخش سنگھ کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

"اس سے ملنے کا اب کیا فائدہ۔ اس نے تو تمہیں بھلا بھی دیا ہوگا۔ اب تو ریاست کا راجکمار تک اس کے شیدائیوں میں ہے' وہ تم سے کیوں ملے گی؟" گوربخش نے کہا۔

"بچپن' بچپن ہوتا ہے گوربخش سنگھ۔ وہ میرا بچپن بھولی نہیں ہوگی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کا پہلا عشق تھے۔ پہلا عشق کوئی نہیں بھولتا۔"

"کیا کروگے اس سے مل کر؟"

"ایک نظر دیکھوں گا۔"

"پھر؟"

"پھر دوبارہ دیکھنے کی آرزو میں عمر گزار دوں گا۔"

"لاہور جاکر خوب باتیں آگئی ہیں۔ اگر ایسی ہی باتیں کیں تو ممکن ہے وہ تم پر نچھاور ہوجائے" گوربخش نے کہا "اچھا' میں کچھ کرتا ہوں۔"

گوربخش نے اپنا وعدہ پورا کیا اور ایک تقریب میں اس نے وسندھرا کو مدعو کرلیا۔

ان دنوں بہترین انگریزی لباس پہننے کا اسے خبط سا تھا۔ وہ خوش لباس تھا اور اس وقت تو ایک ایسی تقریب میں جارہا تھا جہاں وسندھرا بھی تھی۔ اس نے بہترین سوٹ زیب تن کیا' شاندار ٹائی باندھی اور خوشبو میں نہاکر تقریب میں پہنچ گیا۔

وہ بھی عجیب روح پرور نظارہ تھا جب وہ دونوں روبرو ہوئے۔ وہ گھر سے کیا کیا سوچ کر آیا تھا لیکن اب گونگوں کی طرح خاموش کھڑا تھا۔ رعب حسن نے اس کی زبان بند کردی تھی۔ آخر وسندھرا نے ہی پہل کی۔

"ارے کسنے (کرشن) بچپن میں تیرے گال پر یہاں ایک گڑھا پڑتا تھا" وسندھرا نے اس کے گال پر اپنی انگلی رکھتے ہوئے کہا "وہ گڑھا کیا ہوا؟"

کرشن کے گال پر کسی نے جلتا ہوا انگارہ رکھ دیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ اس کے لیے یہی بہت تھا کہ وسندھرا نے اس کے بچپن کو یاد رکھا تھا۔ اسے یاد تھا کہ گال میں گڑھا پڑتا تھا۔ اسے اتنی چھوٹی سی بات بھی یاد ہے۔ اس نے کچھ بولنا چاہا لیکن آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی۔

پھر وہ اس کی گھبراہٹ پر بے اختیار ہنسنے لگی "تم تو اب تک اسی طرح جھینپتے ہو۔"

وہ اس ریمارک پر اور جھینپ گیا۔ اسی وقت وسندھرا کو کسی نے آواز دی اور وہ معذرت کرکے آگے بڑھ گئی۔

گوربخش جو دور کھڑا دونوں کی ملاقات کا منظر دیکھ رہا تھا' دوڑا ہوا آیا۔

"کیا باتیں ہوئیں؟"

"مجھ سے تو کوئی بات ہی نہ ہو سکی۔ بس وہی بول رہی تھی۔"

"کمال ہے' تم نے کوئی بات ہی نہیں کی۔ خیر' اب بھی بہت وقت ہے۔ تم بات ضرور کرنا۔"

اس تقریب میں کئی مواقع آئے جب وہ آمنے سامنے ہوئے لیکن وہ یہی سوچتا رہا کہ اس کو دیکھے یا اس سے بات کرے۔

وہ اس کی انگلی کی تپش اپنے گالوں پر محسوس کرتا ہوا گھر چلا آیا۔ اس کے گال میں تو اب گڑھا نہیں پڑتا تھا لیکن دل میں ایک گڑھا ضرور پڑ گیا۔ اس گڑھے میں اس نے وسندھرا کی انگلی کو محفوظ کر لیا جو بہت دن تک اندھیری راتوں میں اُجالا بن کر چمکتی رہی۔

بی۔ اے کرنے کے بعد اس نے ذوقِ ادب کی تسکین کے لیے ایم۔ اے انگریزی ادب میں داخلہ لے لیا۔

ادب و شعر سے اس کا پہلا تعارف حسن شاہ کے کتب خانے میں ہوا تھا۔ اس وقت سے اب تک اس کی زندگی میں کئی نشیب و فراز آئے تھے۔ ان سے نبرد آزما ہونے میں اسے اتنی فرصت ہی نہیں مل سکی تھی کہ اپنے ذوق کی تسکین کے لیے کوئی عملی کوشش کرتا' اسکول کے زمانے میں اپنے اسکول ماسٹر پر طنزیہ مضمون لکھنے اور باپ کی ڈانٹ سننے کے بعد اسے یہ جرأت نہیں ہو سکی تھی کہ قلم اٹھاتا لیکن ادب کی چنگاری اس کے دل میں جل ضرور رہی تھی۔ ایم اے (ادب) میں داخلہ لینے کے بعد یہ چنگاری بھڑکنے کے لیے بے تاب ہو گئی۔

وہ ایم۔ اے کا امتحان دینے کے بعد میینڈر گیا ہوا تھا کہ اسے یرقان ہو گیا۔ مرض اتنا طول کھینچ گیا کہ وہ بستر سے لگ گیا۔ ان دنوں کتابیں پڑھنے کے سوا اسے کوئی کام نہیں تھا۔

وہ بہت دیر سے اپنے کمرے میں تنہا لیٹا ہوا تھا۔ اس وقت کوئی کتاب بھی قریب نہیں تھی کہ اٹھا کر دیکھ لیتا۔ وہ بستر سے اٹھا اور چہل قدمی کے انداز میں کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اچانک اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے قدم زمین سے اوپر اٹھنے لگے ہیں۔ پہلے اس نے سوچا کمزوری کی وجہ سے چکر آ رہے ہیں لیکن پھر یوں لگا جیسے وہ خواب کی حالت میں ہے اس کا ذہن اس سے بچھڑ کر کہیں دور چلا گیا ہے۔ وہ گھبرا کے بستر پر بیٹھ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے سامنے کشمیر جنت نظیر کے رنگین' حسین' دلفریب مناظر بکھرے ہوئے تھے۔ کہسار' مرغزار' آبشار' چنار۔ چشمے' جھرنے' جھیلیں' کشمیری دوشیزائیں جن کے رخساروں پر کشمیری سیبوں کی سرخی تھی۔ جن کے گھنے سیاہ بال گھٹاؤں کی طرح دن میں اندھیرا کر رہے تھے۔ زعفران کے کھیت انہیں دیکھ کر شرما رہے تھے۔ یہ دوشیزائیں گیت گا رہی تھیں۔ فراق کے گیت' وصال کے گیت' حسن و جمال کے گیت ترشے ہوئے بدن' کھلتے ہوئے چمن۔

ایک لڑکی چشمے کے قریب کھڑی ہے۔ پانی کا گھڑا اس کے قریب رکھا ہے۔ وہ اپنے پریمی کی منتظر ہے جو آئے اور گھڑا اس کے سر پر رکھ دے۔ پریمی آ گیا۔ اس نے گھڑا اٹھا کر اس کے سر پر رکھ دیا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں۔ گھڑے سے پانی رس رس کر لڑکی کے گلابی گالوں پر بہہ رہا ہے۔ سنہری بدن کی لہراتی چھایا سے اس کا پریمی دم بخود ہے....

"بھائی' لو یہ سوپ پی لو" اس کی بہن سرلا دیوی کمرے میں آ کر اس کی محویت کو توڑتے ہوئے بولی۔

"یہ سوپ یہاں رکھ دو" کرشن نے کہا "اور سب سے کہہ دینا کوئی اس کمرے میں نہ آئے۔"

"کیوں؟"

"بس کہہ دیا نا۔ کوئی یہاں نہ آئے' میں کچھ سوچ رہا ہوں۔"

اس نے مزید احتیاط کے لیے کمرا اندر سے بند کر لیا۔ اس نے ان واقعات کو پھر سے دہرانا شروع کر دیا۔ یہ تو وہی مناظر' وہی حقیقی مشاہدات ہیں جن کو وہ دیکھ چکا ہے' جن سے وہ گزر چکا ہے۔ یہ مناظر' یہ واقعات اب مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔ انہوں نے مجھ پر یلغار کیوں کی ہے۔ کیوں نہ میں ان یادداشتوں کو کاغذ پر منتقل کر لوں۔ اس نے قلم اٹھایا اور سوچنے لگا کیا لکھوں' وہ خود وہیں بیٹھا رہ گیا۔ اس کا ذہن کمرے سے باہر نکل گیا۔ زعفران کے کھیت سیبوں کے باغ اس کے سامنے پھیلے ہوئے تھے۔ اسے وہ فلمیں یاد آ گئیں جو اس نے قیام لاہور کے دوران میں دیکھی تھیں۔ ان فلموں میں یہ کھیت' یہ مناظر کہانی کے پس منظر میں ہوتے ہیں۔ دو کردار محبت کرتے ہیں' سماج رکاوٹ بنتا ہے اور اکثر یہ عشق ناکام ہو جاتے ہیں۔ اسے بھی تاراں' وسندھرا اور کئی لڑکیاں یاد آ گئیں۔ اگر وہ بھی کوئی کہانی لکھے' اس نے سوچا۔ کئی خیال ذہن میں آئے بالآخر ایک خیال نے اس کے قدم

پکڑ لیے۔ اس نے قلم اٹھایا اور لکھنا شروع کردیا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے مسلسل لکھنے کے بعد اس پر یہ عقدہ کھلا کہ اس نے تو افسانہ لکھ دیا ہے۔ یہ ایک رومانی افسانہ تھا۔ انفرادیت سے قریب اجتماعیت سے دور۔ سماجی تلخیوں کا ہلکا سا احساس لیکن انفرادی دکھ درد کا بھرپور شاہ کار۔ تخیل، رعنائی اور تازگی۔

اس نے اس افسانے کا عنوان "یرقان" رکھا۔ یہ اس کی زندگی کا اولین افسانہ تھا۔

اس وقت کئی ملک گیر شہرت کے ادبی جرائد مثلاً ہمایوں، ادبی دنیا، شاہکار، ادبِ لطیف، نیرنگ خیال، عالمگیر وغیرہ اپنے عروج پر تھے۔ ان رسائل میں "ادبی دنیا" اپنے مدیر کی پرکشش شخصیت کی وجہ سے ادیبوں میں خاص طور پر مقبول تھا۔ مولانا صلاح الدین ادب شناس اور ادیب ساز تھے اور نئے ادیبوں کی تلاش میں رہتے تھے۔ کسی ادیب کا ادبی دنیا میں شائع ہونا ہی اس کے معتبر ہونے کی دلیل سمجھا جاتا تھا۔ کرشن نے بھی اپنے اس افسانے کو "ادبی دنیا" میں بھیج دیا۔

اس کی خوشی کی انتہا نہیں رہی جب ادبی دنیا کے مدیر نے اس کے افسانے کو نہ صرف شائع کیا بلکہ تبصرہ کرتے ہوئے لکھا "اس افسانے کا شمار دنیا کے بہترین افسانوں میں کیا جاسکتا ہے۔"

ہر بڑے فنکار کی طرح اسے بھی اپنی صلاحیتوں پر یقین نہیں تھا۔ پہلا ہی افسانہ اتنے بڑے رسالے میں شائع ہوگیا۔ یہ اعزاز تھا لیکن اسے شک ہورہا تھا کہ شاید اتفاق سے اتنا اچھا افسانہ لکھ لیا گیا۔ وہ ایسا افسانہ اب نہیں لکھ سکے گا۔ اس نے ایک افسانہ "مصور کی محبت" اور لکھا تو اسے کچھ کچھ یقین آنے لگا کہ وہ لکھ سکتا ہے۔

وہ لاہور واپس آیا تو چائے خانوں میں، رسائل کے دفاتر میں اس کے افسانے "یرقان" کی باتیں ہورہی تھیں۔ افسانہ نگاروں کی اس کھیپ میں جو اس وقت رسائل میں نظر آرہی تھی، اس کے ایک ہی افسانے نے اسے سب سے بلند کردیا تھا اور جب رسالہ "ہمایوں" کے مدیر میاں بشیر احمد نے اس کے بارے میں یہ تحریر کیا "عمر اور تجربے کی کچھ منزلیں طے کرنے کے بعد یہ شخص اردو کا مایہ ناز ادیب ثابت ہوگا۔" تو وہ راتوں رات ایک مستند ادیب بن گیا۔

○☆○

اس نے انگریزی ادب میں ایم۔ اے پاس کرلیا تھا۔ اس کی والدہ کا اصرار تھا کہ وہ ایل ایل بی کا امتحان پاس کرکے وکالت کا پیشہ اختیار کرے کیونکہ ان کے نزدیک یہ بڑا پُروقار اور باعزت پیشہ ہے۔ اسے نہ آگے تعلیم جاری رکھنے سے دلچسپی تھی نہ وکالت کے پیشے سے لیکن والدہ کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اس نے لا کالج لاہور میں داخلہ لے لیا۔

اس کا چھوٹا بھائی مہندر ناتھ ہندو ہوسٹل میں رہتا تھا۔

یہ ہوسٹل نہایت بوسیدہ اور خستہ حال عمارت میں تھا اور لاہور کا سب سے سستا اور غلیظ ہوسٹل سمجھا جاتا تھا۔ کرشن جیسا حُسن پرست ایسی عمارت میں رہنا کبھی گوارا نہ کرتا لیکن کچھ بھائی کی محبت اور کچھ پیسے بچانے کے خیال نے اسے یہاں آنے پر مجبور کردیا۔ اس کے علاوہ ایک اور دلچسپ شخص کنہیا لال کپور یہاں موجود تھا۔ یہ ایسی دلچسپ باتیں کرتا تھا کہ کرشن کا دل یہاں لگ گیا۔ کرشن بھی کچھ کم محفل باز نہیں تھا۔ اس کے آتے ہی ہندو ہوسٹل میں رونق سی آگئی۔

"یار، تم لوگ اس بور زندگی سے اکتا نہیں جاتے؟"

"اکتا جاتے ہیں" کنہیا لال کپور نے کہا۔

"کیسے دل بہلاتے ہو؟"

"میں تو دیواروں کے پلستر کو دیکھ کر دل بہلاتا ہوں کہ آج کتنے انچ پلستر زمین پر گر گیا اور مہندر مجھے اس حال میں دیکھ کر دل بہلاتا ہے۔"

"آج سے یہ مصنوعی طریقہ ختم" کرشن نے کہا "اب اس ہندو ہوسٹل میں قوالیوں کی آوازیں گونجیں گی کیونکہ یہ ہوسٹل اپنی خستہ حالی میں کسی مزار سے کم نہیں ہے۔ اس نے اقبال کا کلام قوالی کے انداز میں چھیڑ دیا۔ کنہیا لال کپور نے اس کی آواز میں آواز ملائی اور دیکھتے ہی دیکھتے قوالی کی محفل گرم ہوگئی۔ بیچ بیچ میں قہقہے بھی چلتے رہے اور ایک نہ ایک شریکِ محفل اٹھ کر ناچتا بھی رہا۔

"یار، اس طرح تو ہمارے گلے بالکل قوالوں کی طرح ہوجائیں گے۔ مزہ تو جب ہے کہ کوئی اور گا رہا ہو اور ہم مزے سے بیٹھے سُن رہے ہوں۔"

"ابے، یہاں مجرا کرایا تو کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہیں گے۔ آس پاس گھر ہیں۔"

"اس کا انتظام کرنا ہماری نہیں، محلے والوں کی ذمّے داری ہے۔"

"کیا پڑوسی یہاں آکر ناچیں گے؟"

"یہ میں تمہیں کل بتاؤں گا" کرشن نے کہا۔

دوسرے دن کرشن کہیں سے گراموفون اٹھا کر لے آیا "اب یہ گائے گا اور ہم سنیں گے۔"

"تم تو کہہ رہے تھے، یہ محلے والوں کی ذمّے داری

ہے۔"

"میں نے کیا غلط کہا تھا۔ یہ گراموفون میں محلے والوں سے مانگ کر لایا ہوں۔ ایک پڑوسی کو ہماری حالت پر رحم آگیا ہے۔"

"دن' رات یہ بھونکتا رہے گا تو ہم پڑھیں گے کس وقت۔"

"بھئی مجھے تو پڑھنے سے کوئی دلچسپی ہے نہیں" کرشن نے کہا "میں تمہاری خاطر اتنا کرسکتا ہوں کہ جتنی دیر تم پڑھنے میں مصروف رہوگے' میں افسانہ لکھتا رہوں گا۔ جب تم پڑھتے پڑھتے تھک جاؤ تو مجھے بتادیا کرنا۔ میں گراموفون چلادوں گا۔"

یہ رعایت اس نے دے تو دی تھی لیکن اس پر عمل اس کے بس کا نہیں تھا۔

ان دنوں اس میں خود اعتمادی کی اتنی کمی تھی کہ جب تک اپنا لکھا کسی کو سنا نہیں لیتا' اسے یقین ہی نہیں آتا تھا کہ اس نے جو کچھ لکھا ہے' وہ کسی قابل ہے بھی یا نہیں لہٰذا جب وہ کوئی افسانہ مکمل کرتا' دوڑا ہوا آتا۔

"ایک افسانہ ہوا ہے۔ تم اسے سن کر اپنی رائے دو۔"

"بھئی' مجھے کچھ نوٹس تیار کرنے ہیں۔ میں کتاب پڑھ رہا ہوں۔ دیکھ نہیں رہے ہو۔" کپور نے کہا۔

"تمہاری یہ کتاب' میرے افسانے سے بڑھ کر نہیں ہے" وہ اس کے ہاتھ سے کتاب چھینتے ہوئے کہتا۔

"اچھا سناؤ۔"

وہ افسانہ سناتا۔ پھر دیر تک اس پر باتیں ہوتی رہتیں' کپور کی کتاب دھری رہ جاتی۔

"بھئی' میں تو اب کچھ فراغت چاہتا ہوں۔ کیا خیال ہے' کچھ دیر گراموفون سن لیا جائے۔"

ساری سنجیدگی رخصت ہوجاتی۔ ہلا گلا شروع ہوجاتا کہ دل بہلانے کا یہی ایک طریقہ تھا۔

کنہیا لال کپور ڈی اے او کالج میں پروفیسر تھا۔ ابھی اس نے مزاح نگاری میں قدم نہیں رکھا تھا لیکن ادب پر گہری نظر تھی لہٰذا وہ کرشن کا بہترین سامع اور رہنما بنا ہوا تھا۔

کرشن کی ادبی زندگی کا آغاز ہوچکا تھا۔ لاہور کے ادبی حلقوں میں اس کا اٹھنا بیٹھنا بڑھتا جارہا تھا۔ ترقی پسند ادیب اور شعرا اسے ایک قابلِ ذکر ادیب ماننے لگے تھے۔

اس کی ملاقات پروفیسر سنت سنگھ سیکھوں سے ہوئی جو مشہور سوشلسٹ تھے۔ دونوں نے طے کیا کہ سوشلزم کے پرچار کے لیے ہفتہ وار اخبار جاری کیا جائے لہٰذا ضروری تیاری کے بعد ہفتہ وار پرچا "دی ناردرن ریویو" کے نام سے نکالنا شروع کردیا۔ ترقی پسند ادیب فیض احمد فیض اور ڈاکٹر دین محمد تاثیر اور دوسرے ساتھی باقاعدگی سے اس کا ہاتھ بٹارہے تھے۔

وہ سوشلسٹ پارٹی سے منسلک ہوگیا تھا۔ اپنی ذہانت' خلوص اور عملی قوت سے بہت جلد پارٹی میں اعتبار پیدا کرلیا۔ یہاں تک کہ ایک بار وہ بھنگیوں کی انجمن کا صدر بھی منتخب ہوگیا۔ باقاعدگی سے ان کی بستیوں میں جاتا۔ ان کی میٹنگز کرتا' ان کے مسائل کو سمجھنے اور انہیں سلجھانے کے لیے سرکاری دفتروں کے چکر کاٹتا اور پھر ان مشاہدات کو اپنے افسانوں میں لکھ دیتا گویا یہ زندگی اس کے افسانوں کے لیے خام مواد فراہم کررہی تھی۔

اب اس کی مصروفیات میں افسانہ نگاری' بھنگیوں کی سیاست اور کنہیا لال کے ساتھ تقریباً ہر روز کوئی رومانی فلم دیکھنا شامل تھا۔

مال روڈ پر واقع پلازا سینما میں مشہور زمانہ فلم "رومیو اور جولیٹ" دکھائی جارہی تھی۔ کرشن چندر اور کنہیا لال کپور' رات کے دوسرے شو میں اس فلم کو دیکھنے گئے۔

گلابی جاڑے کی آمد آمد تھی۔ چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ دونوں دوست فلم کا شو ختم ہونے کے بعد ہوسٹل کی طرف آرہے تھے۔ فلم ایسی مسحور کن تھی کہ سحر اب تک نہیں ٹوٹا تھا۔ کرشن ابھی تک فلم کے نشے میں ڈوبا ہوا تھا۔ مزے لے لے کر فلم کی تعریفیں کررہا تھا۔

"آپ تو ترقی پسند ادیب ہیں اور یہ ایک رومانیت میں ڈوبی ہوئی فلم۔ پھر آپ اس کی مدح سرائی کیوں کررہے ہیں؟" اچانک کنہیا لال کپور نے سوال کیا۔

"ہر ترقی پسند ادیب نفاست پسند اور حسن پرست ہوتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ دنیا کی ہر چیز اتنی حسین بن جائے جیسی یہ فلم تھی" کرشن چندر نے مسکرا کر جواب دیا۔

یہ بات اسی وقت ختم ہوگئی لیکن کنہیا لال کپور کا طنز کرشن کے ذہن میں برابر گونجتا رہا۔ ہوسٹل میں آنے کے بعد بھی وہ برابر غور کرتا رہا۔ وہ سوچتا رہا کہ واقعی کپور کی بات میں کتنی صداقت ہے۔ میں اپنے خیالات میں ترقی پسند ہوں لیکن میرے افسانے رومان پرور ہیں۔ میں اپنے فن میں رومان نگار ہوں۔ میرے افسانوں میں جمال پرستی' تخیل پرستی اور ماورائیت پائی جاتی ہے۔ ایک خواب ناک فضا ہے جس میں عشق کی جولانیاں اپنا رنگ جماتی ہیں۔ ایک شاعرانہ زبان ہے جو سراسر رومانوی ہے۔ ترقی پسندی کا تقاضا یہ ہے

کہ گردوپیش کی دھڑکتی ہوئی زندگی کی عکاسی کی جائے جس کا تعلق حیاتِ انسانی اور اس کے مسائل سے ہو۔ زندگی کی حرکت، حرارت اور ارضیت کو بیان کیے بغیر ترقی پسندی کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ پھر اس نے ترقی پسندی کے نام پر لکھے جانے والے ادب کا جائزہ لینا شروع کیا۔ یہاں زندگی کے مسائل تو تھے لیکن بے جان اور بے رنگ۔ رومان کو شعوری طور پر نکال کر پھینک دیا گیا تھا۔ دوسری طرف رومان نگار افسانہ نگار تھے جنہوں نے زندگی کے مسائل کو نکال باہر کیا تھا۔ اس نے سوچا کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ رومان اور حقیقت نگاری کو ملادیا جائے۔ عشق دکھایا جائے لیکن ان سماجی عوامل کا بھی ذکر ہو جو اس عشق میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ سرمایہ دار کس طرح دولت کے بل پر کسی کی جوانی خرید لیتا ہے اور ہیرو اس لیے ناکام رہتا ہے کہ وہ نادار ہے۔ اسی طرح افسانے کی زبان میں شادابی اور رعنائی قائم رکھ کر رومان کا تاثر برقرار رکھا جاسکتا ہے۔ رومان اور حقیقت کے امتزاج سے ایک نئی چیز پیدا ہوگی۔

فلم سے واپسی پر ہونے والی معمولی سی بات نے اس کی راہ میں کئی چراغ جلادیے۔ اس کی فنی زندگی میں ایک نیا موڑ آیا۔ اس نے ترقی پسندوں کی حقیقت نگاری کو رومانی حقیقت نگاری بنادیا۔ اس نے اپنے آئندہ افسانوں میں صرف دھان کے کھیتوں کو بیان نہیں کیا بلکہ ان کھیتوں میں کھڑے ہوئے بھوکے کسان کا سراپا بھی بیان کیا۔

یہ رومانی حقیقت نگاری کرشن چندر کی عطا تھی جو اس نے اردو ادب کو دی۔ وہ اس کا موجد تھا۔ اس انداز کے افسانے اسے منفرد بناتے رہے اور وہ مشہور ہوتا چلا گیا۔

اس نے ایل ایل بی کا امتحان پاس کرلیا تھا لیکن وکالت کو بطور پیشہ اختیار کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اب وہ بطور ادیب اتنا مشہور ہوچکا تھا کہ اپنی باقی زندگی ادب کی خدمت کرتے ہوئے صرف کردے لیکن فی الوقت سوال ذریعۂ معاش کا تھا۔

وہ سخت ذہنی اذیت سے گزر رہا تھا۔ اس کے سامنے دو راستے تھے۔ وکالت اختیار کرے یا ادب کو اوڑھنا بچھونا بنالے۔ اس نے ادب کے حق میں فیصلہ سنادیا تھا لیکن تلاشِ معاش میں پریشان تھا۔

کنہیا لال کپور کے توسط سے اسے ایک پبلشر کے ہاں ملازمت مل گئی۔ روزانہ آٹھ دس گھنٹے کی ریاضت کے بعد ڈیڑھ سو روپے ماہوار ملتے تھے۔ وہ اسی کو غنیمت سمجھے ہوئے تھا لیکن کام کی یکسانیت سے اس کا دل اچاٹ ہوگیا۔

یہ ملازمت چھوڑنے کے بعد اس کے پاس کرنے کو کچھ نہیں تھا۔ افسانے لکھ رہا تھا۔ انشائیے اور چند ڈرامے بھی لکھ کر چھپوا چکا تھا۔ اس نے سوچا ادیب بننا ہے تو ادب میں ایک ڈگری اور لے لی جائے۔ وہ علامہ اقبال پر تھیسس لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اس سلسلے میں بہت سارا مواد بھی اکٹھا کرلیا تھا، بس اجازت ملنے کی دیر تھی۔

اس نے ایک روز کنہیا لال کو ساتھ لیا اور ڈاکٹر محمد اقبال، صدرِ شعبہ فارسی کے پاس پہنچ گیا جو اتفاق سے علامہ اقبال کے ہم نام تھے اور جن کے متعلق بتایا گیا تھا کہ وہ اس کی رہنمائی کرسکتے ہیں۔

”ریسرچ کے معنی ہوتے ہیں گم شدہ کی تلاش۔ اقبال کے متعلق ایسے کون سے واقعات ہیں جن کو آپ تلاش کرنا چاہتے ہیں“ صدرِ شعبہ فارسی نے عجیب طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

”میرا موضوع ہوگا، اقبال بہ حیثیت شاعر“ کرشن نے کہا۔

”اس پر تو آپ سے پہلے بہت سے لوگ لکھ چکے ہیں۔“

”میں اپنے نقطۂ نظر سے لکھنا چاہتا ہوں۔“

”آپ فرمائیں، آپ کا نقطۂ نظر کیا ہے؟“

”اقبال فطرتاً ایک ترقی پسند شاعر ہیں۔“ کرشن نے کہا۔

”انہوں نے کبھی اپنے ترقی پسند ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔“

”اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔“

”فرق کیوں نہیں پڑتا۔ یہ تو وہی بات ہوئی، مدعی سست گواہ چست۔“

”بعض اوقات شاعر اپنی عظمت سے واقف نہیں ہوتا۔ آپ شیکسپیئر کی مثال لے لیجیے۔“

”یک نہ شد دو شد! آپ نے یہ کیسے اندازہ لگالیا کہ اقبال اپنی عظمت سے واقف نہیں۔“ صدرِ شعبہ نے اعتراض کیا۔

”خود اقبال نے اس بات کا اعتراف کیا ہے۔“

”کہاں؟“

”ان کا یہ مصرع تو آپ کی نظر سے گزرا ہوگا۔ اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے۔“

”وہ تو شاعرانہ بات ہے“ صدرِ شعبہ نے کہا ”خیر، آپ یہ بتائیے کہ آپ کی فارسی کی استعداد کتنی ہے۔“

”خاصی ہے۔“

”خاصی سے کام نہیں چلے گا۔“

”کیا آپ کو صرف یہی اعتراض ہے“ کرشن نے

جھنجلا کر کہا۔

"یہ بھی ہے لیکن سب سے اہم اعتراض یہ ہے کہ اقبال ابھی زندہ ہیں اور ہم کسی زندہ شخص پر تھیسس لکھنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔"

اب یہ تو وہ نہیں کر سکتا تھا کہ پہلے اقبال کو مارتا اور پھر ان پر تھیسس لکھنے بیٹھتا۔ وہ کسی اور پر لکھ سکتا تھا مگر کیوں لکھتا؟ جس پر وہ لکھنا چاہتا تھا اس کے ساتھ یہ شرط کیوں کہ پہلے اسے مرنا چاہیے۔ وہ اس مردہ پرست ذہنیت پر کڑھتا ہوا چلا آیا۔

کچھ دنوں تک وہ یہ کہہ کر دل کو تسلی دیتا رہا کہ اچھا ہی ہوا ورنہ میں کسی کالج کا پروفیسر بن کر رہ جاتا۔ میں ادب پڑھانے کے لیے نہیں، ادب لکھنے کے لیے پیدا ہوا ہوں۔ وہ اس طرف سے مایوس ہونے کے بعد مزید شدومد سے ادب کی تخلیق میں مشغول ہو گیا۔

○☆○

انجمن ترقی پسند مصنفین کا پہلا حلقہ ۱۹۳۵ء میں چند ہندوستانی طلبہ نے لندن میں قائم کیا تھا۔ اس میں سجاد ظہیر پیش پیش تھے۔ جب وہ لندن سے ہندوستان آئے تو انہوں نے ترقی پسند مصنفین کی ایک انجمن بنانے کا ارادہ کیا۔ اس مقصد کے لیے لکھنؤ میں ایک آل انڈیا کانفرنس منعقد کی اور انجمن کی بنیاد رکھی۔

اس انجمن میں جو تقاریر ہوئیں اور جو اغراض و مقاصد بیان کیے گئے، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ ترقی پسند مصنفین سرمایہ داری، جاگیرداری اور ظلم کے سامراجی گروہ کے خلاف ہیں اور جمہوری طاقت کے حق میں ہیں۔ ان مصنفین کا مقصد ادب کو رُجعت پرست طبقوں کے چنگل سے نجات دلانا ہے۔ ادب کو عوام کے قریب لانا ہے۔ زندگی کے بنیادی مسائل مثلاً بھوک، افلاس، سماجی پستی اور غلامی وغیرہ کو بیان کرنا ہے۔

اس اعلان کے ساتھ ہی ادبی دنیا میں ہلچل مچ گئی۔ وہ ادیب جو پہلے سے ایسا ادب تخلیق کر رہے تھے، ان کے ہاتھ ایک پلیٹ فارم آ گیا۔ ہر شہر میں ترقی پسندوں کی انجمنیں قائم ہو گئیں، ہر نیا ادیب ترقی پسند کہلانے کا مشتاق نظر آنے لگا۔

کرشن چندر کا میلان شروع ہی سے اشتراکیت کی جانب تھا۔ اس نے ریاست پونچھ میں دل دہلا دینے والی غربت دیکھی تھی۔ اس کا علاج وہ اشتراکی نظام میں ڈھونڈتا رہا تھا۔ ترقی پسندی کے اعلان نامے میں اشتراکیت کا لفظ استعمال نہیں ہوا تھا لیکن خیالات وہی تھے۔ کرشن کی تشفی اس انجمن کی شمولیت ہی سے ہو سکتی تھی لہٰذا وہ پنجاب کی انجمن کے سرگرمی سے کام کرنے لگا۔ بہ حیثیت ادیب بھی اب اس کی اتنی شہرت ہو گئی تھی کہ وہ انجمن کا ایک مؤثر رکن سمجھا جانے لگا اور بہت جلد اسے انجمن کا سیکریٹری بنا دیا گیا۔

۱۹۳۸ء میں ترقی پسند کانفرنس کلکتہ میں منعقد ہوئی جس میں کرشن نے پنجاب کے ادیبوں کی نمائندگی کرتے ہوئے شرکت کی اور یہاں کے ادب کی کارکردگی کی رپورٹ پیش کی۔

اس سے اگلے سال اس کا پہلا افسانوی مجموعہ "طلسم خیال" شائع ہوا۔ اس مجموعے کی اشاعت نے اس کی شہرت کو پر لگا دیے۔ کئی معتبر ادیبوں نے تبصرہ کرتے ہوئے اسے صفِ اول کے افسانہ نگاروں میں شمار کیا۔

وہ نئے افسانہ نگاروں کا قافلہ سالار تسلیم کیا جانے لگا تھا لیکن خود اس کا حال یہ تھا کہ بے کاری کے دن گزار رہا تھا۔ اسے بہترین لباس پہننے کا شوق تھا، قرینے کی زندگی گزارنے کی آرزو تھی لیکن وہ تو دوستوں کی مدارات کرنے سے بھی عاجز تھا، شاندار زندگی کیسے گزارتا۔ وہ ایسے ملک کا ادیب تھا جہاں ادب سے روٹی نہیں کمائی جا سکتی۔ کسی معقول ملازمت کا دور دور تک نشان نہیں ملتا تھا۔ بے کاری کے دن یوں تو بڑے مزے کے تھے کہ تخلیقی سفر کے لیے وقت ہی وقت تھا۔ لاہور کے وہ تمام ہوٹل جو ادیبوں کے دم سے آباد تھے، اس کی موجودگی سے رونق کدہ بنے ہوئے تھے، ادبی سرگرمیوں میں اس کی بدولت جان سی پڑی ہوئی تھی۔ وہ بڑی مشکل سے سفید پوشی کا بھرم قائم رکھے ہوئے تھا۔ بہترین سوٹ پر شاندار نکٹائی باندھ کر ادیبوں کے درمیان بیٹھتا تھا لیکن اسے ماں جی کا خیال آتا تھا۔ چھوٹے بہن بھائیوں کی فکر ستاتی تھی، ماں جی کے دل میں کتنے ارمان ہوں گے۔ میں ایک بھی پورا نہ کر سکا۔

لاہور میں نیا نیا ریڈیو اسٹیشن قائم ہوا تھا۔ ادیبوں کے لیے ریڈیو کی ملازمت میں بڑی کشش تھی۔ اسے ہاتھ بڑھانا نہیں پڑا۔ اس کی شہرت نے خود اس کا انتخاب کیا۔ اسے "پروگرام اسسٹنٹ" کے طور پر ملازمت کی پیش کش ہوئی۔ یہ ایسی پیش کش تھی کہ اس شام وہ کافی ہاؤس میں جا کر بیٹھا تو دوستوں نے اسے مبارک بادیں دیں لیکن وہ خود بجھا بجھا تھا۔

وہ سخت ذہنی تذبذب کا شکار تھا۔ اس کے جو خیالات تھے اور جس مقصد کے لیے وہ جنگ کر رہا تھا، جابر انگریز حکومت کی ملازمت اس کے برعکس تھی۔ یہ ملازمت اختیار کرنا اس کے لیے باعثِ ننگ تھا۔ ایک طرف اس کے

تصورات تھے دوسری جانب معاش۔ وہ کئی دن اس دوراہے پر کھڑا، دائیں اور بائیں دیکھتا رہا۔ پھر وہ کھڑے کھڑے تھک گیا، مجبور ہوگیا۔ ضمیر میں کانٹا کھٹکتا رہا۔ اس نے اس کھٹک کو برداشت کرلیا اور یہ ملازمت قبول کرلی لیکن اس عزم کے ساتھ کہ وہ اپنے تصورات کو مرنے نہیں دے گا اور جب موقع ملے گا اس پنجرے کو توڑ کر اڑ جائے گا۔ ادیبوں کو جیل بھی تو ہو جاتی ہے، میں بھی اس قفس میں چند دن گزار لوں۔

اس کی ملازمت کی نوعیت ایسی تھی کہ اس کا براہ راست تعلق اردو ادب سے تھا۔ افسانہ نگاری اور ڈراما نگاری سے تھا۔ ریڈیو کا ماحول بھی اس کے حسب منشا تھا۔ چوٹی کے ادیب اور شاعر یہاں ہر وقت موجود رہتے تھے اس لیے اس کا جی لگ گیا۔ اس کا قلم رواں دواں رہا۔ یہ ملازمت اس کے نظریات پر پہرے نہیں بٹھا سکی۔

اس کی ماں دوسری بہت سی ماؤں کی طرح نہ جانے کب سے اس کے سر پر سہرا دیکھنے کی آرزو مند تھی۔ ملازمت کی نوید ملتے ہی اس نے اس کے لیے لڑکی بھی دیکھ لی اور جھٹ منگنی کی نوبت آنے سے پہلے ہی پٹ بیاہ ہوگیا۔

ودیا وتی نام کی ایک لڑکی اس کی پتنی بن کر اس کی زندگی میں آگئی۔

وہ ایک جمال پرست ادیب تھا۔ ودیا وتی کو جب اس نے اس نظر سے دیکھا تو اس میں کوئی جسمانی کشش اور جاذبیت نظر نہیں آئی۔ اس نے اس کمی کو بھی ماں کی پسند سمجھ کر گوارا کرلیا اور یہ سوچ لیا کہ اصل حسن تو خدمت اور محبت میں ہوتا ہے۔ یہ بیوی بن کر میری خدمت کرے گی، مجھ سے محبت کرے گی، میری ضرورتوں کا خیال رکھے گی۔ بس یہی میرے لیے بہت ہے۔ اس نے ودیا وتی کو بیوی کے طور پر قبول کرلیا۔

شادی کے ابتدائی دنوں میں، جب تک گھر کا انتظام ودیا وتی نے نہیں سنبھالا تھا، سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ کرشن اپنے فطری اخلاص کی بدولت ودیاوتی کی دلداری میں مصروف تھا لیکن جیسے ہی ودیا وتی نے گھر کا انتظام سنبھالا، کرشن کو لگا جیسے اس عورت میں کوئی گڑبڑ ہے۔

"ودیا، ذرا جلدی سے چائے تو بنادو۔ کچھ دوست آگئے ہیں۔"

"یہ کوئی وقت ہے دوستوں کے آنے کا۔"

"دوستوں کے لیے دروازے ہر وقت کھلے ہوتے ہیں۔"

"پہلے کی بات اور تھی۔ اب اس گھر میں آپ کی بیوی بھی آگئی ہے۔"

"اب تو یہ دوست اور زیادہ آئیں گے کیونکہ تم ان کی بھابی بھی تو ہو۔ اب ان کا زیادہ حق ہے اس گھر پر۔"

"بنائے دیتی ہوں لیکن روز روز ایسا نہیں چلے گا۔"

"اچھا بابا، نہیں چلے گا۔ اب تو بنادو بڑھیا سی چائے۔ بس چار کپ۔"

کرشن دوستوں کے پاس جاکر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ چائے کا پوچھنے اندر آیا۔ ودیا وتی ابھی رسوئی میں تھی۔

"بن گئی چائے۔"

"بن گئی۔"

"ارے بھئی تو لے آتیں۔ وہاں پردے کا کون ہے۔"

"اب تو یہ بات کہی ہے، آئندہ نہ کہئے گا۔ میں کسی کے سامنے آنے والی نہیں۔"

"نہ آؤ، چائے تو دو۔" کرشن نے ٹرے میں رکھی ہوئی چائے کو دیکھا "تم سے کتنی بار کہا ہے مہمانوں کے سامنے خالی چائے نہیں رکھتے۔"

"گھر میں کچھ نہیں ہے۔"

"خشک میوہ نہیں رکھا ہے؟"

"گھر میں تو پتا نہیں کیا کیا ہے۔ سب رکھ دوں ان کے آگے۔"

کرشن نے اپنے ہاتھ سے میوہ نکالا اور چائے کے ساتھ دوستوں کے پاس لے کر پہنچ گیا۔

رات گئے دوست رخصت ہوئے تو وہ ودیا وتی کے پاس پہنچا۔

"ابھی تک سوئی نہیں۔ بھئی ہمارا تو ایسا ہی ہے۔ نہ دن کی خبر ہے نہ رات کی۔ تم میرے انتظار میں مت جاگا کرو۔"

"میں بیوی ہوں، نوکرانی نہیں ہوں کہ کام کاج کرنے کے بعد اپنی کوٹھری میں سو رہوں۔ مجھے انتظار کرنا ہوتا ہے۔ اب آپ کا یہ فرض ہے کہ انتظار نہ کرایا کریں۔ میں جب سے اس گھر میں آئی ہوں، آپ ایک رات بھی وقت پر گھر نہیں آئے ہیں۔"

"ودیا وتی! سمجھنے کی کوشش کرو۔ میرا کام، میری مصروفیات ایسی ہیں کہ دیر ہو ہی جاتی ہے۔ میں ادیب ہوں کوئی عام آدمی نہیں ہوں کہ دفتر سے سیدھا گھر آجایا کروں۔"

"ادیبوں کے کیا بیوی بچے نہیں ہوتے۔ آپ کیا دنیا سے انوکھے ادیب ہیں۔"

"سب کے ساتھ ہی ہوتا ہوں۔ وہ بھی اسی وقت گھروں کو جاتے ہیں جس وقت میں آتا ہوں۔ تمہیں تو خوش ہونا

چاہیے کہ تمہارا پتی اتنا بڑا افسانہ نگار ہے۔ اسے دنیا جانتی ہے۔"

"یہی کرنا تھا تو شادی کیوں کی تھی؟"

"میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ تم میری مجبوریوں کو سمجھو گی بھی نہیں۔"

"میں خوب سمجھ گئی ہوں۔ میں یہاں اکیلی پڑی رہتی ہوں اور تم باہر عیش کرتے ہو۔"

"اس وقت تم غصے میں ہو پھر بات کریں گے" کرشن نے جھگڑا چکانے کے لیے کہا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔

وہ یہ سمجھ کر ٹالتا رہا کہ ودیا وتی اپنی محبت میں یہ سب کچھ کرتی ہے' آہستہ آہستہ سمجھ جائے گی۔ گھر میں روز چخ چخ ہوتی تھی لیکن کرشن برداشت کرتا رہا۔ وہ زور سے بولتا بھی نہیں تھا کہ کہیں گھر والوں کو علم نہ ہو جائے۔

کرشن کی تمام مصالحانہ کوششیں ایک ایک کرکے دم توڑتی گئیں۔

ودیا وتی کے ساتھ اس کی شادی گویا دو متضاد طبیعتوں کا تصادم تھا۔ دونوں کے درمیان کوئی مطابقت نہیں تھی۔

کرشن ایک بلند پایہ ادیب تھا۔ ودیا وتی کو ادب سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ وہ اپنے شوہر کی تخلیقات کی عظمت سے قطعی ناواقف تھی۔ گھر سے باہر اس کے فن کا طوطی بولتا تھا جبکہ گھر میں اس کا کوئی مداح نہیں تھا۔ اس کی سیاسی اور سماجی سرگرمیاں ایسی تھیں کہ گھر سے باہر جانے اور واپس آنے کے اوقات متعین نہیں تھے۔

جبکہ اس کی بیوی کا اصرار کہ وہ ایک پابند اوقات دفتر کلرک کی طرح معینہ وقت پر گھر سے باہر جائے اور واپس آئے۔ گھر کا سودا سلف لائے۔

کرشن کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔ آئے دن گھر پر دعوتیں ہوتی تھیں۔ ودیا وتی کو خندہ پیشانی سے دوستوں کی تواضع کرنا بھی گوارا نہیں تھا۔

گھر کی گھٹی گھٹی فضا' ہر وقت کی تکرار اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔

اس نے ہر شریف آدمی کی طرح اس کا ایک ہی حل نکالا کہ چپ سادھ لی۔ صبح ہوتے گھر سے نکل جاتا اور رات گئے گھر لوٹتا۔ اس ناسازگار ماحول نے اس کے فن پر بہت بُرا اثر ڈالا۔ اس کی شخصیت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے لگی۔ گھر میں سکون تو درکنار' الگ بیٹھ کر لکھنے کی جگہ تک نہیں تھی جبکہ وہ تنہائی میں لکھنے کا عادی تھا۔ لکھتے وقت ودیا وتی ایک چائے کا کپ بنانے کی روادار نہیں تھی' دو میٹھے بول تو کیا بولتی۔ اپنے افسانے کی جھوٹی تعریف تک اپنی بیوی سے سننے کو اس کے کان ترستے رہتے تھے۔

اس نے پھر بھی ودیا وتی سے علیٰحدگی مناسب نہیں سمجھی کہ ماتا جی کو تکلیف پہنچے گی۔

یہ شب و روز تھے کہ اس کا تبادلہ آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ہو گیا۔

کرشن کو لاہور سے محبت نہیں' عشق تھا۔ اس شہر میں اس نے جوانی کے طوفانی دن گزارے تھے۔ یہیں وہ تعلیم کے زیور سے آراستہ ہوا تھا۔ یہیں اس کا فن پروان چڑھا تھا۔ یہاں اس کے احباب تھے' وہ جرائد اور مدیران تھے جو اس کے لیے خضرِ راہ بنے ہوئے تھے۔ ان سب سے جدا ہونا اس جیسے حساس آدمی کے لیے آسان نہیں تھا لیکن اسے سفر سے اور تبدیلیوں سے بھی عشق تھا۔ تمام تر نفرتوں کے باوجود اسے نوکری عزیز بھی تھی۔

دہلی بذاتِ خود ادب و شعر کا ایک بڑا مرکز تھا۔ یہاں کی اپنی تاریخ اور دلچسپیاں تھیں۔ وہ ان دلچسپیوں کی تلاش میں نکلا اور دہلی پہنچ گیا اور تیس ہزاری کے علاقے میں رہائش اختیار کی۔

یہ ایک پرانی طرز کا مکان تھا جس کے سامنے کھلا برآمدہ تھا۔ اس سے گزر کر ایک بڑا کمرا جو بہ یک وقت ڈرائنگ روم اور شب خوابی کے کمرے کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس کمرے کے بازو میں ایک اور شب خوابی کا کمرا تھا جس سے ملحق باورچی خانہ اور اس کے عقب میں غسل خانہ تھا۔

آل انڈیا ریڈیو پر اس کی تقرری پطرس بخاری کی سفارش پر ہوئی تھی لیکن پُرلطف بات یہ تھی کہ اب تک پطرس سے بالمشافہ ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔

ایک دن کرشن' دفتر کے کام سے فارغ ہونے کے بعد پیدل اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا کہ کسی نے اپنی موٹر کا دروازہ کھولتے ہوئے بڑی کھرج دار آواز میں کہا۔

"آئیے کرشن چندر صاحب' آپ کو گھر چھوڑ آئیں۔"

کرشن کو فوراً اندازہ ہو گیا کہ ہو نہ ہو یہ پطرس ہیں لیکن بجائے اس کے کہ وہ اظہارِ تشکر کرتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ جاتا' بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا "نو' تھینک یو۔"

پطرس نے پھر اپنی پیش کش کو دہرایا۔ کرشن نے پھر اسی انداز میں انکار کر دیا۔

"نہیں صاحب! میں پیدل چلنے کا عادی ہوں۔ پیدل ہی جاؤں گا۔"

اس مرتبہ کرشن کی آواز میں قدرے غصہ تھا۔ پطرس

نے اس پر ایک گہری نظر ڈالی اور موٹر آگے بڑھالی۔

موٹر جب خوب آگے چلی گئی تو اسے اپنے رویے پر افسوس ہوا۔ اس نے اپنے طرزِ عمل سے خواہ مخواہ پطرس صاحب کی ناراضی مول لی۔ وہ ڈائریکٹر جنرل ہیں اور میں معمولی پروگرام اسسٹنٹ، پھر وہ ایک اچھے ادیب بھی تو ہیں۔

دراصل کرشن کے اس وقت تک تین افسانوی مجموعے شائع ہو کر شہرتِ دوام حاصل کر چکے تھے۔ بڑے بڑے جغادری ادیبوں نے ان پر تعریفی تبصرے لکھے تھے۔ ریڈیو پر ہونے کی وجہ سے کئی خوشامدی ادیب اس کے آگے پیچھے بھی رہنے لگے تھے۔ نام و نمود کے نشے میں وہ ایسا مست رہنے لگا تھا کہ کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتا تھا۔

اس پر شرمندگی کی کیفیت کئی دنوں تک طاری رہی اور پھر آہستہ آہستہ معدوم ہوتی چلی گئی۔ ہم بھی کسی سے کم نہیں کہہ کر اس نے اپنا فیصلہ خود کرلیا۔

یہ واقعہ ابھی تازہ تھا کہ اسے آؤٹ ڈور براڈکاسٹ کے لیے متھرا بھیجے جانے کا حکم نامہ ملا تاکہ وہ بھگوان کرشن کے یومِ ولادت پر مندروں میں جاکر وہاں کا آنکھوں دیکھا حال نشر کرے۔

یہ ایک خاصا مشکل اور ذمے داری کا کام تھا اور عموماً تجربہ کار اسٹاف کو ایسے کاموں کے لیے بھیجا جاتا تھا۔ کرشن حیران تھا کہ اس جیسے ناتجربہ کار کو کیوں منتخب کیا گیا ہے۔ اسے پطرس سے اپنی تلخ کلامی یاد آگئی۔ اس کے دل میں اس وسوسے نے سر ابھارا کہ پطرس نے جان بوجھ کر یہ مشکل کام اس کے سپرد کیا ہے تاکہ جب یہ کام بہ طریقِ احسن پورا نہ ہو تو پطرس اسے بہانہ بنا کر ملازمت سے سبک دوش کردیں۔

اس نے اس چیلنج کو قبول کیا اور اپنے عملے کو لے کر متھرا روانہ ہوگیا۔

وہ متھرا سے واپس آیا تو اسے معلوم ہوا کہ پطرس خود ریڈیو اسٹیشن آکر اس کی کارکردگی کے بارے میں بات چیت کریں گے۔

اسے امید تھی کہ پطرس اس کی پیٹھ تھپ تھپائیں گے اور حوصلہ افزائی کریں گے لیکن ہوا اس کے برعکس۔ پطرس نے متعلقہ عملے کے سامنے اس کی ڈانٹ ڈپٹ شروع کردی۔ اب اسے یقین ہوگیا کہ اس کا اندازہ درست تھا۔ پطرس اسے نکالنے کے بہانے ڈھونڈ رہے ہیں۔ اس نے سوچا جب ملازمت سے برطرف ہونا ہی ہے تو میں بھی ادھار کیوں رکھوں۔ اس نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیے۔

پطرس کے لیے شاید یہ پہلا موقع ہوگا جب ان کا کوئی ماتحت ان سے اس طرح برابری سے بات کر رہا ہو۔ کرشن نے تین سال سنسکرت پڑھی تھی۔ رامائن چھ بار پڑھی تھی۔ پھر یہ کہ یہ خود اس کے مذہب کی بات تھی۔ پطرس کے دلائل کے سامنے وہ ہتھیار نہیں ڈال سکتا تھا۔

یہ مباحثہ تقریباً پون گھنٹے چلتا رہا۔ اس کے بعد پطرس نے میٹنگ برخاست کرنے کا اعلان کردیا۔

ابھی میٹنگ ختم ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ چپراسی آگیا۔

"پطرس صاحب نے آپ کو یاد کیا ہے۔"

"مجھے! اب کیوں؟ کہاں بیٹھے ہیں۔"

"ایڈوانی (اسٹیشن ڈائریکٹر) صاحب کے کمرے میں۔"

"تم چلو، میں آتا ہوں۔"

اس نے دوستوں کو الوداعی نظر سے دیکھا بلکہ دل ہی دل میں نوکری ہی کو خیرباد کہہ دیا۔ اس کی دانست میں اب اسے اس کی گستاخی کی سزا ملنے والی تھی۔

وہ ڈرتے ڈرتے اسٹیشن ڈائریکٹر کے کمرے میں داخل ہوا۔ پطرس اسے دیکھتے ہی آگے بڑھے اور اسے گلے لگالیا۔

"برخوردار، میں تمہارا امتحان لے رہا تھا۔ تم اس امتحان میں کامیاب ہوئے" پطرس نے کہا۔ اس کی پیٹھ تھپکی اور اسے اپنے پاس کرسی پر بٹھایا۔

"دیکھو مسٹر ایڈوانی" وہ ایڈوانی سے مخاطب ہوئے "تم آفس میں داخل ہوا کرو تو سب سے پہلے اس لڑکے کو سلام کیا کرو۔" پھر زیڈ اے بخاری سے مخاطب ہو کر کہا "اس لڑکے کے لچھن اچھے معلوم نہیں ہوتے۔ یہ ایک دن کچھ نہ کچھ ضرور کر گزرے گا۔"

کمرے میں ہونے والی باتیں کمرے سے باہر بھی آگئیں۔ جہاں کچھ لوگوں کو اس کی کامیابی پر خوشی ہوئی وہیں کچھ لوگوں کو حسد بھی پیدا ہوا۔ پطرس جو قطعی انگریز ٹائپ کے افسر تھے، اس طرح کسی کی تعریف کریں!

کرشن اپنے حاسدوں سے بے خبر نہیں تھا۔ وہ اب نہایت احتیاط، فرض شناسی، لگن اور تندہی سے کام کر رہا تھا۔

اس عہد کا ایک اور بڑا افسانہ نگار سعادت حسن منٹو بمبئی میں فلمی صحافی کی زندگی گزار رہا تھا۔ کچھ فلموں کی کہانیاں اور مکالمے بھی لکھ چکا تھا۔ اسے آل انڈیا ریڈیو، دہلی میں ملازمت کی پیش کش ہوئی تو وہ دہلی چلا آیا۔ یہاں اس کی ملازمت بطور ڈراما نگار عمل میں آئی تھی۔ اس سے پہلے اس نے ڈراما کبھی نہیں لکھا تھا لیکن فلمی دنیا میں رہنے کی وجہ سے ڈرامے کی تکنیک سے خوب واقف تھا۔

اس نے اپنا ٹائپ رائٹر اٹھایا' جس پر وہ افسانے لکھتا تھا اور بمبئی سے دہلی آ گیا۔

مسئلہ یہ تھا کہ مستقل قیام ہونے تک رہا کہاں جائے۔

کرشن کی دوست نوازی ضرب المثل بنی ہوئی تھی۔ اس کا مکان بے فکروں کا ٹھکانا بنا ہوا تھا۔ کوئی دوست شب گزار کر چلا جاتا۔ کوئی چار چار دن پڑا رہتا اور کرشن ہر ایک کی اس طرح خاطر تواضع کرتا رہتا کہ جیسے یہ دوست ناراض ہو کر چلا گیا تو بہت بڑا نقصان ہو جائے گا۔

منٹو نے بھی سوچا جب تک کوئی انتظام نہیں ہو جاتا' کرشن کے گھر جا کر رہا جائے۔

وہ شاہد احمد دہلوی سے ملنے ساقی کے دفتر گیا ہوا تھا۔ وہاں سے اٹھا تو سیدھا تیس ہزاری' کرشن کے گھر پہنچ گیا۔

ادھر ادھر کی باتوں کے بعد منٹو نے اپنے چھوٹے کوٹ کی جیب سے شراب کی بوتل نکالی "لو' شراب پیئو۔"

کرشن نے کبھی شراب چکھی بھی نہیں تھی لیکن یہ کہتے ہوئے اسے شرم آ رہی تھی کہ وہ شراب نہیں پیتا۔ جواب میں منٹو کو یہی کہنا تھا کہ کمال ہے' ادیب ہو اور شراب نہیں پیتے۔

"گلاس منگواؤ۔ دیر ہو رہی ہے" منٹو نے حکم دیا۔

کرشن نے نہایت اطمینان سے دو گلاس منگوائے اور منٹو کے سامنے رکھ دیے۔ اب منٹو کو کیا خبر کہ وہ شراب نہیں پیتا ہے۔ اس نے دونوں گلاسوں میں شراب انڈیلنی شروع کر دی۔

"تم کون سی شراب پیتے ہو؟" منٹو نے کہا۔

"برانڈی یا پھر کوئی اچھی سی انگریزی وہسکی" کرشن نے بڑی صفائی سے جھوٹ بولا۔

"کون سی انگریزی وہسکی" منٹو نے منہ بناتے ہوئے کہا "وہسکی انگریزی نہیں ہوتی' اسکاچ ہوتی ہے۔ سالے انگریز شراب تک تو کشید کر نہیں سکتے' ہندوستان پر حکومت کیا کریں گے۔"

کرشن نے کہیں سے ایک نام سنا ہوا تھا وہی دہرا دیا "مجھے ہیگ پسند ہے۔"

"سب بکواس" منٹو بولا "سولن وہسکی نمبرا سب سے بہتر .... ہے جو اس وقت تم پی رہے ہو۔ ایک تو پیسے کم اور پھر مزے میں اور نشے میں ہیگ سے بہتر۔ آئندہ سے یہی پیا کرو' سمجھے؟"

"ٹھیک ہے' آئندہ سے ہیگ نہیں پیا کروں گا۔"

"اور ڈالوں؟" منٹو نے اس کے گلاس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو پہلے ہی ایک چوتھائی بھر چکا تھا۔

"تمہاری مرضی۔ اور ڈال دو" کرشن نے بے بسی سے کہا۔

"اچھا' تو پٹیالہ پیگ پیو گے۔"

"ہاں" کرشن نے سوچے سمجھے بغیر کہہ دیا۔ اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ پٹیالہ پیگ کیا ہوتا ہے۔

"بھئی' بڑے پیاک ہو" منٹو نے کہا اور "پٹیالہ پیگ" اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

کرشن کی عجیب حالت تھی۔ اسے یہ اعزاز تو مل رہا تھا کہ منٹو کے ساتھ بیٹھ کر پیئے مگر پیئے کیسے؟

پہلی مرتبہ پینے والے پر جو گزرتی ہے' اس پر بھی گزری۔ گھونٹ گھونٹ کر کے اس نے پورا گلاس بالآخر حلق میں انڈیل لیا۔ وہ اپنی جگہ جما بیٹھا تھا' اس کی آنکھیں ناچ رہی تھیں۔ کبھی بند ہو جاتیں کبھی کھل جاتیں۔ کبھی چیزیں سمٹ جاتیں کبھی پھیل جاتیں۔

یہ ایک پیگ ہی اس کے لیے میخانہ بن گیا۔ منٹو اس کی حالت دیکھ کر مسکرا رہا تھا اور اسی لیے اس نے دوسرے پیگ پر اصرار نہیں کیا بلکہ اپنے تجربے سے سمجھ گیا کہ کرشن کھلاڑی نہیں ہے۔

"سچ کہو پیارے' آج سے پہلے پی تھی؟"

"نہیں۔ میں نے آج تمہارا دل رکھنے کے لیے پہلی مرتبہ پی ہے" کرشن نے اقرار کیا۔

"وہ تو ٹھیک ہے' اسی طرح دل رکھا کرو" منٹو نے کہا "لیکن شراب باقاعدگی سے پیا کرو۔"

منٹو کئی پیگ حلق سے اتار چکا تھا۔ پینے کے بعد وہ بڑی پُرلطف باتیں کرتا تھا۔ اس وقت بھی کر رہا تھا۔ موضوع کرشن چندر تھا۔ وہ اسے شراب کے فائدے گنوا رہا تھا اور کرشن کسی سعادت مند شاگرد کی طرح سن رہا تھا۔

"گناہ کی لذت شراب میں ہے۔ ادب کی چاشنی شراب میں ہے۔ عورت کی رنگت شراب میں ہے۔ مکروہاتِ دنیا سے نجات شراب میں ہے۔ بھئی تم کب تک پنڈت بنے رہو گے۔ آخر تمہیں ادب تخلیق کرنا ہے۔ کوئی اسکول کے بچوں کو تو پڑھانا ہے نہیں۔ زندگی نہیں دیکھو گے' گناہ نہیں کرو گے' موت کے قریب نہیں جاؤ گے' غم کا مزہ نہیں چکھو گے' سولن وہسکی نمبرا نہیں پیو گے تو کیا تم خاک لکھو گے۔"

کرشن نے جہاں شراب پہلی مرتبہ پی تھی' وہیں یہ تجربہ بھی پہلی مرتبہ ہوا کہ ودیا وتی گھر میں تھی لیکن اسے محسوس

ہوا جیسے وہ گھر میں نہیں ہے۔ پہلے کوئی دوست گھر میں آتا تھا تو اس کا دل دھڑکتا ہی رہتا تھا کہ نہ جانے کب وہ ہنگامہ کھڑا کر دے لیکن اس وقت اسے کوئی فکر نہیں تھی۔ منٹو ٹھیک کہتا ہے کہ مکروہاتِ دنیا سے نجات شراب میں ہے۔ اسے ودیا وتی کے ساتھ مکروہات کا خیال آنے پر ہنسی آگئی۔

ودیا وتی کے نزدیک اس میں جو برائیاں تھیں، اس میں ایک برائی کا اور اضافہ ہوگیا۔ اس رات وہ اس سے خوب لڑی۔

"تم پہلے بھی پیتے ہوگے، تم نے آج تک مجھ سے چھپایا۔"

"یقین کرو، آج پہلی مرتبہ پی ہے۔ وہ بھی منٹو صاحب کا دل رکھنے کے لیے۔ تم ایک ادیب کی بیوی ہو۔ ادیبوں میں مے نوشی بُری بات نہیں سمجھی جاتی۔"

"مجھے کوئی شوق نہیں ہے ادیب کی بیوی بننے کا۔ کان کھول کر سن لو، اس گھر میں شراب نہیں چلے گی۔"

"اچھا بابا، اس وقت تو سوجاؤ۔ کل دیکھا جائے گا۔"

وہ سونے کے لیے لیٹ گیا لیکن اس کا ذہن جاگ رہا تھا۔ عورت عورت میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ پتا جی کی مے نوشی پر ماں جی لڑتی بھی تھیں لیکن ان کے لیے گلاس لا کر بھی رکھتی تھیں۔ وہ سرور میں آکر باتیں کرتے تھے تو ان سے باتیں بھی کرتی تھیں۔ ان کے آرام کا خیال رکھتی تھیں۔ ایک یہ ودیا وتی ہے۔ اس نے ودیا کی طرف دیکھا جو مزے سے آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔ اسے ودیا وتی کی شکایت مناسب معلوم ہوئی تھی لیکن اب وہ سوچ رہا تھا، وہ کتنا ہی لڑے کل وہ پھر شراب پیئے گا۔

اب اس کے لیے شراب پینا کون سی مشکل بات تھی۔ منٹو اسی کے ساتھ رہ رہا تھا جو چلتا پھرتا شراب خانہ تھا۔ دوسرے دن کچھ اور دوست بھی آگئے۔ پھر سب نے دیکھا کہ کرشن نشے میں اتنا بہک گیا کہ سر پر گلاس رکھ کر ناچنے لگا۔

اچھی بیوی نہ ملنے کا دکھ وہ شراب میں انڈیلتا رہا۔ انتہا پسند طبیعتوں کے لیے شراب بڑی جان لیوا چیز ہے۔ کرشن بھی ایسی ہی طبیعت کا مالک تھا۔ وہ باقاعدگی سے پینے اور بہکنے لگا۔

آل انڈیا ریڈیو کے پروگراموں میں شرکت کرنے کے لیے جو ادیب و شاعر بھی دہلی آتا، کرشن اسے گھیر گھار کے اپنے گھر ضرور لے آتا۔ پھر پُر تکلف دعوتیں ہوتیں، ادبی مباحث ہوتے، خوش گپیاں ہوتیں، جام کھنکتے۔ ادیبوں کا ایک تانتا سا بندھا رہتا۔ ن م راشد، ڈاکٹر تاثیر، فیض احمد فیض، ریوتی سرن شرما، جگن ناتھ آزاد، منٹو، ہنس راج رہبر، کون تھا جو ان محفلوں میں شریک نہیں ہو رہا تھا۔

کرشن چندر کے اندر باغیانہ خیالات کی آگ اب بھی سُلگ رہی تھی۔ سرکاری ملازمت کی گھٹن کے باوجود اس نے اپنے نظریات کو مرنے نہیں دیا تھا۔ وہ اپنی تحریروں میں اب بھی سامراجیوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر رہا تھا۔ کبھی اشاروں میں کبھی صاف لفظوں میں بہ بانگِ دہل یہ اعلان کر رہا تھا کہ غلامی کی زنجیروں کو توڑ دو۔ معاشرے میں ہونے والی ناانصافیوں کو وہ اب بھی اپنا موضوع بنا رہا تھا۔

دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔ اس نے سرکاری ملازم ہونے کے باوجود دہلی میں ایک اینٹی فاشسٹ کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لیے پطرس سے اجازت لینی ضروری تھی۔ اسے امید نہیں تھی کہ پطرس اسے اجازت دے دیں گے لیکن انہوں نے اجازت دے دی۔

اس منصوبے میں اس کے معاون ہندی کے مشہور کوی "آگے" اور ناول نگار جتیندر تھے۔ کانفرنس نہایت کامیاب رہی لیکن وہ حکومت کی نظروں میں آگیا۔

اس کانفرنس کے بعد اس نے ایک اور منصوبہ بنایا کہ ہندوستان کی مختلف زبانوں کے ادیبوں کا ایک کنونشن بلایا جائے اور انہیں بتایا جائے کہ موجودہ حالات میں ہندوستان کے ادب کا رخ کیا ہونا چاہیے۔ اس نے اس منصوبے کی تکمیل کے لیے شاہد احمد دہلوی سے رجوع کیا۔

"کنوینر آپ ہوں گے۔"

"کنوینر تو آپ کو ہونا چاہیے" شاہد احمد دہلوی نے کہا "کیونکہ آپ کو اردو والے بھی جانتے ہیں، ہندی والے بھی جانتے ہیں۔"

"لیکن آپ غیر جانب دار ادیب ہیں اور حکومت کے ملازم بھی نہیں۔"

شاہد احمد دہلوی تیار ہوگئے۔ نام ان کا تھا کام کرشن کا تھا۔

دو ہفتے بعد ہندوستان بھر کے ادیب دہلی آنا شروع ہوگئے۔ ان کی تعداد کسی طرح بھی سو سے کم نہیں تھی۔

اتنے مہمانوں کی دیکھ بھال، روپوں کا بندوبست، اخراجات کا حساب کتاب، کوئی مذاق نہیں تھا لیکن کرشن نے تمام کام نہایت مستعدی سے انجام دیے۔ شاہد صاحب کو کچھ بھی کرنا نہیں پڑا۔

ہارڈنگ لائبریری کے ہال میں دو دن تک شاندار جلسہ ہوا۔ دھواں دھار تقاریر ہوئیں، قراردادیں پاس ہوئیں۔

بعد میں معلوم ہوا، اس کامیابی میں ایک خفیہ ہاتھ پطرس کا بھی تھا۔ وہ کئی وجوہات سے کھلے عام ترقی پسندی کا اعلان نہیں کرتے تھے لیکن کرشن کا ساتھ دے رہے تھے۔

وہ چپکے چپکے اپنے افسرِ اعلیٰ پطرس کے اتنے قریب آگیا تھا کہ ان کی اجازت بلکہ ان کی معاونت سے اپنی سیاسی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سرکاری ملازمت اس کے خیالات کی آنچ مدھم نہ کرسکی بلکہ اس کی لَو تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔ اس کے ساتھ ہی خفیہ ایجنسیوں کے پاس اس کی فائل ضخیم سے ضخیم تر ہوتی چلی گئی اور اس کی دفتری ترقی میں ہمیشہ رکاوٹ بنی رہی۔

وہ تو اپنی کارکردگی کی بدولت یہ سوچے بیٹھا تھا کہ جلد ہی ترقی کی منزلیں طے کرلے گا لیکن پطرس کے قریب ہونے کے باوجود وہ وہیں کا وہیں تھا۔ وہ اتنا دل برداشتہ ہوگیا کہ ذرا ذرا سی بات پر غصے میں آکر استعفیٰ دے دیا کرتا تھا۔ پطرس اس کی اس کیفیت سے لطف اندوز ہورہے تھے۔

"کرشن، تم استعفیٰ چھپوا کر اپنی جیب میں کیوں نہیں رکھ لیتے" ایک دن پطرس نے کہا "جب بیٹھے بٹھائے غصہ آیا، استعفیٰ پیش کردیا مگر کچھ ہوگا نہیں۔ جب تک میں تمہارا ڈائریکٹر جنرل ہوں، تمہارا استعفیٰ منظور نہیں ہوگا۔"

"صاحب، آپ اس قدر مجھ پر مہربان ہیں تو میری ترقی کیوں نہیں ہوتی۔ مجھے پروگرام ایگزیکٹو یا اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائریکٹر کیوں نہیں بنادیا جاتا" کرشن نے کہا۔

"کرشن، تمہارے خلاف انگریزی حکومت کی سی آئی ڈی نے اتنی دبیز فائل تیار کررکھی ہے کہ تم جان ہی نہیں سکتے کہ میں کس قدر مشکل سے تمہاری ملازمت کو برقرار رکھے ہوئے ہوں۔"

اب وہ بالکل مایوس ہوگیا۔ اس قفس سے رہائی ملنی مشکل تھی۔ پھڑکنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

ترقی ہوتی تو تنخواہ بڑھتی جبکہ اخراجات بڑھتے جارہے تھے۔ مہینے کے آخر میں جیب خالی ہوجاتی تھی۔ منٹو نے اسے صلاح دی کہ فلموں میں بڑا پیسہ ہے۔ کیوں نہ ایک فلمی کہانی لکھی جائے۔ ان دنوں اسے ایک اونی سوٹ بھی سلوانا تھا اور جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں تھی۔ ناشرین سے بھی جلدی کوئی معاوضہ ملنے کی امید نہیں تھی۔

منٹو کا مشورہ اسے پسند تو آیا لیکن اسے فلمی کہانی لکھنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا لیکن منٹو فلمی کہانیوں کی تکنیک سے خوب واقف تھا۔ دونوں نے مل کر ایک کہانی "بنجارا" لکھی اور کہانی کا مسودہ دہلی کے سیٹھ جگت نارائن، مالک جگت ٹاکیز، ڈسٹری بیوٹرز چاندنی چوک کے پاس لے گئے۔ کرشن تو نووارد تھا، سارا کام منٹو کررہا تھا۔

منٹو نے سیٹھ کو کہانی سنائی۔ کہانی سن کر سیٹھ نے کہا۔

"کہانی بہت اچھی ہے۔ ہم لوگ خرید لیں گے لیکن منٹو صاحب آپ نے مل منیجر کو بہت برا بتایا ہے۔ اسے اچھا دکھانا چاہیے ورنہ مزدوروں پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔"

"تو اسے اچھا دکھادیں گے" منٹو نے معصومیت سے کہا۔

کرشن کہنے ہی والا تھا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ منٹو نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

سیٹھ نے پھر کہا "اور یہ جو منیجر کی بیوی ہے، اگر اس کی کنواری بہن ہو اور ہیرو سے پیار کرے۔ ایک ویمپ کے موافق۔ کیسا رہے گا منٹو صاحب!"

"بہت اچھا، بہت اچھا!" منٹو نے کہا۔

کرشن پھر حیران ہوا۔ یہ وہی منٹو ہے جو کسی کے لیے اپنی ایک سطر تو کیا ایک حرف بھی تبدیل نہیں کرسکتا۔ اس کے افسانے جوں کے توں شائع ہونے چاہئیں ورنہ وہ افسانہ واپس لے لے گا۔ یہ وہی منٹو ہے!

کہانی کا کچومر نکال کر جب وہ باہر نکلے تو منٹو نے کرشن کی خفگی کو بھانپ لیا۔

"بھئی، یہ ادب نہیں ہے۔ یہ فلم ہے جو پڑھے لکھے، ذہین اور ادب شناس قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ ہمارے افسانے پرکھنے والے مولانا صلاح الدین ہیں، حامد علی خان ہیں۔ وہ سارو بھائی ٹوکرجی پٹیل یا منگو بھنگو جنگو اینڈ برادرس نہیں ہیں۔ اس لیے فلم میں ماں کو بہن اور بہن کو معشوق اور معشوق کو ویمپ بنادینا ہمارے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ سمجھے! ادب کی خدمت کرو اور فلم سے پیسے کماؤ۔ اب بولو، تمہیں سوٹ چاہیے کہ نہیں؟"

"چاہیے۔"

"تو فلمی کہانی میں تبدیلی ضرور ہوگی۔"

"ضرور ہوگی بھئی۔"

حسبِ ضرورت ترمیم کردی گئی اور کہانی کا معاوضہ پانچ سو روپے مل گیا جو دونوں نے آپس میں بانٹ لیا۔

اس واقعے نے کرشن کا ذہن فلم لائن کی طرف موڑ دیا اور وہ کسی مناسب موقع کی تلاش کا انتظار کرنے لگا۔

○☆○

منٹو کی فطرت میں رعونت بہت تھی۔ بات بات پر بھڑک اٹھتا تھا اور نشے کی حالت میں تو اس کو سنبھالنا دشوار

ہوجاتا تھا۔ وہ اپنی تعریف پر جتنا خوش ہوتا تھا' اپنی برائی یا تنقید پر اتنا ہی آگ بگولا ہوجاتا تھا۔ وہ اسی فطرت کو لے کر دلی ریڈیو اسٹیشن پہنچا۔

ریڈیو اسٹیشن پر اس نے یہ نئی روایت ڈالی کی ہر ڈراما ٹائپ رائٹر پر براہِ راست لکھتا تھا۔ کرشن سے پوچھتا' آج ڈراما کس موضوع پر لکھا جائے۔ مضمون طے ہوجانے کے بعد وہ ٹائپ رائٹر پر کاغذ چڑھاتا' کچھ دیر اسے گھورتا اور پھر انگلیاں حرکت میں آجاتیں۔ لکھتے لکھتے قریب بیٹھے ہوئے دوستوں کو سناتا بھی جاتا۔ اس کے خوشامدی دوست اور مختلف آرٹسٹ "منٹو صاحب' آپ ڈرامے کے بادشاہ ہیں" کہتے ہوئے منٹو کے خرچ پر چائے اڑایا کرتے تھے۔

اپنی اس برق رفتاری کی بدولت وہ ریڈیو کی ضرورت بن گیا۔ اسے اپنی اہمیت کا خود بھی احساس تھا جس نے اسے بددماغی کی حد تک بدمزاج بنادیا۔

یہ ماحول تھا جب مشہور افسانہ نگار اوپندر ناتھ اشک کو بھی کرشن چندر نے لاہور سے دلی بلوایا۔ گویا دو شیروں کو ایک پنجرے میں بند کردیا۔

دلی ریڈیو کی ملازمت سے بہت پہلے کبھی اوپندر نے منٹو کی ایک کہانی "خوشیا" پر اپنی رائے دیتے ہوئے اسے دو کوڑی کی کہانی کہہ دیا تھا۔ یہ رائے منٹو تک بھی پہنچ گئی تھی۔ وہ اس وقت اوپندر ناتھ کو جانتا نہیں تھا اس لیے بات آئی گئی ہوگئی لیکن جب اوپندر ناتھ ملازم ہوکر دلی ریڈیو پہنچا اور منٹو سے ملاقات ہوئی تو منٹو کو جیسے سب کچھ یاد آگیا۔ اسے اتفاق کہہ لیجیے کہ اوپندر بھی کسی کو خاطر میں لانے والا مزاج نہیں رکھتا تھا لہٰذا دو مضبوط برتن اتنی زور سے ٹکرائے کہ دور تک گونج سنائی دی۔

اوپندر ناتھ اسے جہاں کہیں ملتا' وہ اپنی مخصوص حقارت آمیز نگاہیں اس پر جمادیتا اور کسی نہ کسی طریقے سے اپنی نفرت کا اظہار بھی کردیتا۔ آخر اوپندر کی قوتِ برداشت جواب دینے لگی۔ اس نے کرشن چندر سے کہا "تم منٹو کو سمجھادو' وہ مجھے خواہ مخواہ تنگ کرتا ہے۔ میں طرح دے جاتا ہوں۔"

"تم بھی تنگ کرو۔ میرے سمجھانے سے وہ کیا سمجھے گا" کرشن نے کہا۔

اب اوپندر کے سامنے ایک ہی راستہ تھا۔ وہ سیدھا منٹو کے کمرے میں پہنچا۔

"میں نے تمہاری کہانی "دھواں" پڑھی۔" اوپندر نے اس سے کہا۔

"کیسی لگی؟" منٹو نے پوچھا۔

"بکواس' فحش۔"

"تم کیا جھک مارتے ہو' میں نے تمہارے ڈرامے پڑھے ہیں۔"

منٹو نے جان بوجھ کر اس کے افسانوں کا ذکر نہیں کیا گویا وہ کہنا چاہتا تھا کہ میں تمہیں افسانہ نگار مانتا ہی نہیں۔

"میں تو ڈراما لکھنا ابھی سیکھ رہا ہوں مگر تم تو ڈراموں کے بادشاہ کہلاتے ہو۔ تم کیا جھک مارتے ہو' اچھی طرح جانتا ہوں" اوپندر نے کہا اور اٹھ کر کرشن کے کمرے میں چلا گیا۔ اسے معلوم تھا کہ کسی کو جلتا ہوا چھوڑ دو تو وہ کیسا تڑپتا ہے اسی لیے اس نے بحث کو طول نہیں دیا۔

منٹو کی بھڑاس تو ابھی نکلی نہیں تھی۔ وہ بھی پیر پٹختا ہوا کرشن کے کمرے میں آگیا۔ اوپندر اسے دیکھ کر اسٹوڈیو میں چلا گیا۔ منٹو کئی دن تک اسے گالیاں دے دے کر اپنا بخار اتارتا رہا۔

اس گفتگو کے بعد دونوں کے درمیان تعلقات مزید کشیدہ ہوگئے۔ منٹو ان دنوں زوروں پر تھا۔ جب بات بہت آگے بڑھ گئی تو کرشن نے بھی منٹو کا ساتھ دیا۔ ن۔ م۔ راشد بھی منٹو کا دوست تھا اس لیے اوپندر ناتھ دبا دبا رہتا تھا لیکن اسی دوران میں منٹو نے راشد سے بھی بگاڑ لی۔

یہ بگاڑ منٹو سے زیادہ کرشن کے حق میں نقصان دہ ثابت ہوا۔ شاید منٹو کی حمایت ہی کی یہ سزا اسے بھگتنی پڑی کہ راشد نے پروگرام ڈائریکٹر کے عہدے پر ترقی پاتے ہی راشد کا تبادلہ لکھنؤ کرادیا۔

آل انڈیا ریڈیو' دہلی میں کرشن چندر نے ادبی لحاظ سے بڑا زرخیز اور معرکہ خیز دور گزارا۔ اوپندر ناتھ اشک' منٹو' راشد' دیوندر ستیارتھی جیسے ادیب بہ یک وقت وہاں جمع ہوگئے تھے۔ صحت مند رقیبانہ جذبے سے سرشار نخلِ ادب کی آبیاری کررہے تھے۔ اردو ادب اور خاص طور پر افسانہ نگاری اور ڈرامانویسی کا یہ بڑا روشن دور تھا۔

گھریلو اعتبار سے وہ قیامِ دہلی کے زمانے میں بھی ناآسودہ ہی رہا۔ ودیاوتی سے اس کی ذہنی مطابقت نہ ہونے کے برابر تھی۔ وہ اس کمی کو گھر سے باہر پورا کررہا تھا۔

کرشن حد درجہ نفاست پسند تھا۔ ہر چیز میں قرینہ سلیقہ اور خوب صورتی دیکھنے کا خواہاں تھا۔ ہر خوب صورت چیز اسے متاثر کرتی تھی۔ خوش شکل اور خوش عقل عورتوں سے اسے گہرا لگاؤ تھا۔ جہاں بھی ایسی صورت دیکھ لیتا' اس کے گرد دھونی رما کر بیٹھ جاتا۔

ایسے ہی کسی موسم میں اس نے کسی مشاعرے میں شاہدہ نکہت کو سنا۔ زہد شکن حسن اور مسحور کن ترنم۔ مشاعرہ تو اس نے لوٹ ہی لیا تھا' جب کرشن نے اس سے بات کی تو وہ بھی لٹ گیا۔ حسن ہو اور ذہانت ہو۔ یہی تو اس کی کمزوری تھے۔ شاہدہ میں یہ دونوں باتیں تھیں۔ دہلی کے مشاعروں پر چھائی ہوئی تھی' کرشن کے ذہن پر بھی چھا گئی۔

ان دنوں کرشن' افسانہ نگار کم اور شاعر زیادہ نظر آتا تھا۔ شاہدہ کے ساتھ ہر شعری نشست میں موجود نظر آنے لگا لیکن جلد ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ شاہدہ کی زلفِ گرہ گیر کے اور بھی اسیر ہیں۔ وہ اپنی فطرت سے مجبور تھا۔ جذبۂ رقابت کو برداشت کرنے سے قاصر تھا۔ وہ خاموشی سے دست بردار ہوگیا۔ بعد ازاں شاہدہ کی شادی ہوگئی۔

ناؤ نوش کی محفل تھی۔ کرشن کھل کر گلاب بن چکا تھا کہ کسی نے سرب جیت کور کا ذکر چھیڑ دیا۔ حسن و شباب کا پیکر ہے' موسیقار ہے' سحر طراز نغموں سے کانوں میں رس گھول دیتی ہے۔ وہ بچے کی طرح مچل گیا کہ ابھی اس کے گھر لے کر چلو۔

اس کا دوست ساحر ہوشیار پوری اسے لے کر سرب جیت کے گھر پہنچ گیا۔

سرخ و سفید' دُبلی پتلی' سرو قد' کٹورا سی آنکھیں' بیس اکیس کا سن۔ یہ تھی سرب جیت کور۔

"آپ انہیں تو جانتی ہوں گی' یہ ہیں کرشن چندر مشہور افسانہ نگار" ساحر ہوشیار پوری نے تعارف کرایا۔

"آپ سے ملی تو نہیں ہوں لیکن میں نے آپ کا ہر افسانہ پڑھا ہے" سرب جیت نے کہا اور آگے بڑھ کر کرشن کے پاؤں چھو لیے۔

وہ بوڑھا نہیں ہوا تھا لیکن اس کے فن نے اسے محترم بنا دیا تھا۔ اتنا محترم کہ سرب جیت اس کے پاؤں چھونے پر مجبور ہوگئی۔

"انہیں کچھ سناؤ گی بھی یا پاؤں چھوتی رہو گی" ساحر نے کہا۔

"آج کرشنا جی میرے گھر چل کر آئے ہیں۔ انہیں نہیں سناؤں گی تو کسے سناؤں گی۔"

سرب جیت نے ایک فلمی گانا چھیڑا۔ وہ اس خوبی سے گا رہی تھی کہ کرشن کو اصل کا گمان ہونے لگا۔

اس نے پے درپے کئی گانے سنائے اور ہر گانے کو اس خوبی سے ادا کیا کہ کرشن اس کے فن کا قائل ہو کر اٹھا۔

"یار' یہ شہرت ہے بہت بُری چیز" کرشن نے سرب جیت کے گھر سے واپس آتے ہوئے اپنے دوست سے کہا۔

"کیوں؟"

"اب یہی دیکھ لو۔ یہ لڑکیاں عاشق سمجھنے کے بجائے بزرگ سمجھ کر پاؤں چھونے لگتی ہیں۔ خیر' میں اسے اپنا قائل کرکے ہی چھوڑوں گا۔"

گھر پہنچتے ہی اس نے سرب جیت کو بھلانے کے لیے بوتل اور گلاس کا سہارا لیا۔ نشہ تیز ہوا تو سرب جیت کے حسن کی آنچ بھی تیز ہونے لگی۔ اس نے یہ رات پہلے عشق کی پہلی رات کی طرح گزاری۔

دوسرے دن وہ پھر سرب جیت کور کے گھر پہنچ گیا۔

وہ ایک مہینے تک مسلسل اس کے گھر جاتا رہا لیکن وہ اس کی جانب ملتفت نہ ہوئی۔ اس کا رویہ عقیدت مندانہ تھا محبوبانہ نہیں۔ کرشن کو بھی یقین ہوگیا کہ اس کا عشق یک طرفہ ہے لہٰذا مجبور ہو کر کنارہ کش ہوگیا۔

کسی تقریب میں اس کی ملاقات سلیمہ جعفری سے ہوئی۔ نہایت خوش شکل' مہذب اور آزاد خیال۔ کرشن کو تعارف کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ وہ انہیں پہلے سے جانتی تھی۔

"آپ کے مشاغل کیا ہیں؟" کرشن نے پوچھا۔

"ایک اسکول میں پڑھاتی ہوں۔ مصوری کرتی ہوں' شعر کہتی ہوں' اچھے لوگوں سے مل کر خوش ہوتی ہوں۔ میرے خیال میں اتنے مشاغل بہت ہیں۔"

"اچھے لوگوں سے ملنے والا مشغلہ غلط ہے۔"

"ارے وہ کیوں؟" وہ چونک کر بولی۔

"بھئی' اس طرح آپ ہم سے مل کر تو خوش ہوں گی نہیں۔"

"یہ کس نے کہہ دیا کہ آپ اچھے آدمی نہیں ہیں۔"

"کیا آپ نہیں جانتیں کہ میں شراب پیتا ہوں۔"

"تو کیا ہوا۔ وہ تو سبھی ادیب پیتے ہیں۔ اس سے آدمی بُرا تو نہیں ہوجاتا۔"

"اچھا آپ میرے افسانوں کے بارے میں کیا کہیں گی۔"

"آپ دراصل شاعر ہیں۔ لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے نثر لکھتے ہیں۔"

اس کی اس رائے پر کرشن لطف اندوز ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ جچی تلی رائے کسی عام عورت کی نہیں ہوسکتی۔

"آپ تو ادب پر بڑی اچھی نظر رکھتی ہیں۔ آپ سے تو تفصیل سے باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔"

"کرشن صاحب، ادب کو بیچ میں کیوں گھسیٹتے ہیں۔ آپ ویسے بھی میرے گھر آ سکتے ہیں۔ مجھے اپنے گھر میں آپ کو دیکھ کر خوشی ہوگی۔"

وہ تو ایسے ٹھکانوں کی تلاش میں رہتا تھا جہاں گھر سے دور رہ کر کچھ وقت کٹ جائے۔ سلیمہ ایسی شائستہ، اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون کی معیت میں بہت سارا وقت گزارا جا سکتا تھا۔ اجازت ملتے ہی اس نے سلیمہ کے گھر جانا شروع کر دیا۔

کچھ دنوں بعد ہی اس گھر میں غیر معمولی چہل پہل نظر آنے لگی۔ معلوم ہوا کہ سلیمہ کی شادی ہو رہی ہے۔

سلیمہ کی شادی کے ساتھ ہی اس کا یہ عشق بھی دم توڑ گیا۔

اس نے ہزار گناہوں کے داغ اپنے سینے پر لیے۔ دل کے آئینے کو ہزار صورتوں سے سجایا۔ ہزار وادیوں میں بھٹکا۔ سیکڑوں راتیں جاگ کر گزاریں۔ اس ایک لمحے کو ڈھونڈنے کے لیے، اس ایک چہرے کو تلاش کرنے کے لیے جسے چھوتے ہی وہ کندن بن جائے لیکن یہ سب سنگِ میل تھے منزل نہیں۔

اب تک وہ افسانے لکھتا رہا تھا۔ ۱۹۴۳ء میں اس نے اپنا پہلا ناول "شکست" لکھا۔ اس کی اس اولین کاوش ہی نے اسے صفِ اول کے ناول نگاروں میں لا کھڑا کیا۔

فطری حسن کی منظر نگاری، کرداروں کا گہرا نفسیاتی مطالعہ، روزمرہ کا عمیق مشاہدہ، زبان کی رنگینی و رعنائی اور لطافت و شیرینی، چست مکالمے۔ ان سب نے مل کر "شکست" کے حسن کو دوبالا کر دیا تھا۔

وہ اپنی اس کامیابی پر بے پناہ خوش تھا لیکن ادبی دنیا میں ڈاکٹر تاثیر کا تبصرہ پڑھ کر سخت مایوس ہوا۔ اس کی حساس فطرت نے اس بے جا تنقید کا اتنا اثر قبول کیا کہ اپنی ادبی صلاحیتوں پر سے اس کا ایمان ہی اٹھ گیا۔

ڈاکٹر تاثیر نے اس ناول کے عیب شمار کرنے کے بعد اسے یہ مشورہ دیا تھا کہ "تم ابھی طفلِ مکتب ہو۔ تمہیں ناول نویسی سے بھی توبہ کر لینی چاہیے تاکہ تمہاری عاقبت خراب نہ ہو۔"

ہر بڑے فنکار کی طرح اسے بھی اپنی فنی صلاحیتوں پر کامل یقین نہیں تھا۔ اس تنقید نے اس کا اعتماد مزید کمزور کر دیا حالانکہ اس وقت تک اس کے افسانوں کے چھ مجموعے شائع ہو کر شرفِ قبولیت حاصل کر چکے تھے۔

اس پر یہ احساس طاری ہو گیا کہ وہ ادیبانہ صلاحیتوں سے یکسر عاری ہے اور مستقل طور پر تصنیف و تالیف کی راہ اختیار کرنے سے اسے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔ وہ یہاں تک سوچنے لگا کہ وکالت کا پیشہ اختیار کر کے ادب کی خدمت سے باز آ جائے۔

ان ہیجانی لمحوں کو اس نے شراب میں ڈبونے کی بہت کوشش کی لیکن وہ اس غیر یقینی حالت سے نکل نہیں سکا۔ اس کی خوش گوار باتیں اندر ہی اندر کہیں دب کر رہ گئی تھیں۔

نومبر کی ایک سرد شام تھی کہ اسے اس کا دوست اور راز داں کنہیا لال کپور مل گیا۔ وہ اسے دیکھ کر کھل جاتا تھا لیکن آج وہ بجھا بجھا تھا۔ کنہیا لال نے کئی مرتبہ اس سے پوچھنے کی کوشش کی لیکن وہ تصویر کی طرح خاموش تھا۔

"کیا تم سمجھتے ہو میں ادیب نہیں ہوں" کرشن چندر نے چیخ کر کہا جیسے تصویر کو اچانک زبان مل گئی ہو۔

"جی ہاں۔" کنہیا لال نے شرارت سے کہا۔

"اس کا مطلب ہے ڈاکٹر تاثیر نے ٹھیک لکھا ہے۔"

"جی ہاں۔"

کرشن پر جیسے بجلی گر پڑی۔ اسے کنہیا لال سے اس جواب کی توقع نہیں تھی۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا اور پھر کنہیا لال کے دونوں بازو پکڑ کر جھنجوڑ ڈالے۔

"کیا تم قسم کھا کر کہہ سکتے ہو کہ میں ادیب نہیں ہوں؟"

"قسم نہیں کھاؤں گا۔"

"اس کا مطلب ہے تم نے اب تک جو کہا، وہ بکواس تھی؟"

"جی ہاں۔"

"میں زندگی کے دوراہے پر کھڑا ہوں۔ مجھے ابھی اور اسی وقت فیصلہ کرنا ہے کہ میں کدھر جاؤں۔"

"کیسا فیصلہ؟"

"اگر واقعی مجھے لکھنا نہیں آتا تو کل سے کیوں نہ وکالت شروع کر دوں؟"

"خدا کے لیے ایسا مت کرنا" اس مرتبہ کنہیا لال چیخا۔

"کیوں؟"

"اس لیے کہ تمہیں واقعی لکھنا آتا ہے۔"

"اس کا ثبوت؟"

"تم ایک رائے پر اتنے مایوس ہو گئے۔ کیا تمہیں یاد نہیں کہ "ادبی دنیا" اور "ہمایوں" کے مدیر نے تمہارے بارے میں کتنی توصیفی رائے کا اظہار کیا تھا۔"

"میں ان کی نہیں تمہاری رائے جاننا چاہتا ہوں۔"

"میرے خیال میں تمہیں لکھنا آتا ہے۔"

"تم یہی بات قسم کھا کر کیوں نہیں کہتے؟"
"اصرار کرو گے تو قسم بھی کھالوں گا لیکن ایک بات بتادوں کہ وہ وقت بہت قریب ہے۔ جب تم بین الاقوامی شہرت کے مالک ہوگے۔"
"میری قسم کھاؤ۔"
"تمہاری قسم۔"
کرشن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی "میں ضرور لکھوں گا۔ میں ادیب ہوں' نقاد جائیں جہنم میں۔"
ایک مخلص دوست کے مخلصانہ مشورے نے ایک ادیب کو وکیل بننے سے بچالیا۔
اس نے نقادوں کے خیالات کی پڑیا بنا کر دل میں رکھی اور لکھنے بیٹھ گیا۔
لکھنؤ کے ادبی ماحول نے اس کی صلاحیتوں کو مزید نکھارا۔ لکھنؤ کی ملازمت نے فراق' مجاز' حیات اللہ انصاری' احتشام حسین اور سبط حسن جیسے دوستوں سے نوازا۔
لکھنؤ میں بھی اس کی ہردل عزیزی نے وہی رنگ اختیار کرلیا جو دہلی میں تھا۔ اس کا گھر دوستوں سے اور دسترخوان کھانوں سے بھرا رہتا تھا۔ مرچ مسالوں کے چٹخارے' ہندو ہوتے ہوئے گوشت کے کباب اس کی مرغوب غذا تھے۔ پلاؤ کی خوشبو اسے دیوانہ کردیتی تھی۔ آئے دن دوستوں کی دعوتیں ہوتیں۔ شراب کے دور چلتے۔ دوست رخصت ہوجاتے تو وہ دن بھر کے تجربات کو کسی افسانے کے سپرد کرکے سو رہتا۔
لکھنؤ کے چلبلے سلام' شرمیلے کلام' مے خانے' بالاخانے اس کی روح کو سرشار کررہے تھے لیکن اب وہ ریڈیو کی ملازمت سے اکتا چکا تھا۔ چاہتا تھا کسی طرف نکل جائے مگر کہاں؟ اسے منٹو کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ دلی ریڈیو کی ملازمت چھوڑ کر بمبئی چلا گیا ہے اور فلموں کی کہانیاں لکھ کر پیسے کما رہا ہے۔ اسے وہ واقعہ یاد آگیا جب اس نے سوٹ سلوانے کے لیے منٹو کے ساتھ مل کر فلمی کہانی لکھی تھی۔ اسے بھی بمبئی جانا چاہیے لیکن وہ وہاں کرے گا کیا۔ اسے کون جانتا ہوگا۔
وہ ابھی کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکا تھا کہ پونا کی شالیمار پکچرز سے فلم پروڈیوسر ڈبلیو' زیڈ احمد کا تار آیا جس میں اسے بطور مکالمہ نگار ملازمت کی پیش کش کی گئی تھی۔ گھر بیٹھے لکشمی نے دستک دے دی تھی۔
اسے اس بات کا احساس ہوچکا تھا کہ اس جیسے اشتراکی ادیب کے لیے سرکاری ملازمت میں ترقی کی راہیں مسدود ہیں۔ وہ اس قفس کو توڑ کر اڑ جانا چاہتا تھا۔ اب جو اسے سہارا ملا تو اس نے موقع غنیمت جانا اور اپنا استعفیٰ پیش کردیا۔
اس کے دوستوں نے اسے روکنا چاہا' افسران نے سمجھایا لیکن وہ پونا روانہ ہوگیا۔ اپنی بیوی ودیاوتی سے اور دور ہوگیا۔
ڈبلیو' زیڈ احمد نہایت نستعلیق اور ادیب دوست ڈائریکٹر تھے۔ انہوں نے ایسے لوگوں کو شالیمار کمپنی میں ایک جگہ جمع کرلیا تھا جو باقاعدہ ادیب وشاعر تھے۔ ان لوگوں کی موجودگی نے اسٹوڈیو ہی میں نہیں' پونا شہر میں ایک ادبی ماحول پیدا کردیا تھا۔ جوش' ساغر نظامی' اخترالایمان' ایک ہندی شاعر بھرت ویاس جیسے لوگ یہاں تھے۔ ان حضرات سے ملنے تقریباً تمام قابلِ ذکر ادیب وشاعر بمبئی سے پونا آتے رہتے تھے۔
کرشن چندر پونا پہنچا تو اس ادبی ماحول نے پہلے دن ہی اس کے قدم پکڑ لیے۔ شالیمار اسٹوڈیو شنکر سیٹھ روڈ پر تھا جو شہر سے باہر کا علاقہ تھا اور اس کے آس پاس چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں۔
شالیمار پکچرز کی فضا بڑی کشادہ' بڑی آزاد اور بڑی دل خوش کن تھی۔
تیس سال کے خوبرو کرشن چندر نے اسٹوڈیو میں قدم رکھا تو ہر طرف حسن وجوانی کی رنگینیاں اور رعنائیاں ہر طرف بکھری ہوئی دیکھیں۔ نسوانی حسن وجمال کی تصویر اداکاراؤں کے ناز وانداز اس کے لیے دروازۂ بہشت کا نظارہ تھے۔ یہ ماحول اس حسن پرست سے بہت قریب بھی تھا اور اس کے لیے نیا بھی۔ زندگی میں جتنی اچھی چیزیں ہیں جیسے اچھے کھانے' اچھی شراب' اچھے دوست مرد ہوں یا عورت اسے سب پسند تھے۔
یہ پسندیدگیاں اپنی جگہ' تنخواہ بھی ساڑھے چھ سو طے ہوئی۔ زیڈ احمد کا رویہ بھی مشفقانہ تھا۔ اسے اور کیا چاہیے تھا۔
اس نے ۱۳ تلک روڈ پر مکان کرائے پر لیا اور کام شروع کردیا۔ ان دنوں "من کی جیت" نامی فلم بن رہی تھی جس کے مکالمے لکھنے کا کام کرشن چندر کو سونپا گیا۔ گانے جوش اور بھرت ویاس کے ذمے تھے۔
کرشن تو جہاں جاتا تھا دوستوں کا جمگھٹا لگالیتا تھا۔ پونا پہنچتے ہی یہاں کے دوست اسے کم پڑے تو اس نے دلی ریڈیو

کے بعض آرٹسٹوں کو یہاں بلالیا۔ ان میں پریم' راج کمار اور محمد حسین شامل تھے۔

ایسٹ اسٹریٹ پر ایک ہوٹل تھا جہاں بُھنا گوشت بہت اچھا ملتا تھا۔ کرشن نے اپنے دوستوں کی بھیڑ وہاں جمائی۔

ہوٹل کے مالک کی طرف سے پینے پلانے کی اجازت ملنے کے بعد تو یہ ہوٹل ان بے فکروں کا دوسرا گھر بن گیا۔

جب اس ٹکڑی کی شہرت پھیلنے لگی تو نئے نئے کبوتر اترنے لگے۔ انہی میں اداکار شیام اور اداکار مسعود پرویز تھے۔ دونوں خوب صورت' مردانہ وجاہت سے مالا مال اور کرشن سمیت تینوں کا عہدِ شباب۔ کرشن کے گھر لڑکیوں کا ہجوم بسیرا کرنے لگا۔ گھر سے اکتا کر سڑک پر نکل آتے۔ ہاتھوں میں ہاتھ' گیتوں کے بول' جذبوں کی آنچ۔ ایک برادری ایک خاندان۔

ان ہنگامہ خیزیوں کے باوجود ادبی تسکین کے لیے بھی اس نے حالات کو اپنی گرفت سے نکلنے نہیں دیا۔ دوسرے تیسرے دن اس کے گھر ادبی محفل منعقد ہوتی تھی جن میں اس کے دوست ادیب' مقامی ادیب اور کبھی کبھی بمبئی سے آئے ہوئے ادیب و شاعر شریک ہوتے تھے' ادبی بحثیں ہوتی تھیں۔ پونا میں رہتے ہوئے ہی اس نے اپنے شاہ کار افسانے "ان داتا" اور "موبی" لکھے۔

جن دوستوں کو اس نے دلی سے پونا بلایا تھا' ان میں ایک اداکارہ ثمینہ خاتون بھی تھی۔ معمولی شکل وصورت کی لڑکی تھی بظاہر اس میں کوئی ایسی جاذبیت نہیں تھی کہ کوئی اس پر مرتا لیکن کرشن اس پر مرتا تھا۔

کرشن کی حُسن پرستی کا کوئی ایک رخ نہیں تھا۔ وہ صرف ظاہری حسن کا دلدادہ نہیں تھا' باطنی حسن بھی اس کی توجہ کا مرکز بنتا تھا۔ یہاں بھی یہی معاملہ تھا۔ ثمینہ کا دل نشین لب و لہجہ اور اس کی شستہ زبان اس کی فریفتگی کا باعث بن گئی۔

اس کا عشق انگارے کی طرح دہک رہا تھا۔ رات دن وہ اس کی دلداری میں ایسا مصروف تھا کہ دوستوں کے لیے بھی اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ اس کی کوششوں سے ثمینہ کو شالیمار پکچرس میں کام مل گیا۔ اسی کی کوشش سے اسے مکان ملا۔

کرشن اس لڑکی پر پانی کی طرح روپیہ بہا رہا تھا۔ دوست اس کی محبت سے لطف اندوز بھی ہو رہے تھے' فکر مند بھی تھے۔ اس کا عشق پونا کی رنگین زندگی میں ایک اور رنگینی کا اضافہ کر رہا تھا۔

اب یہ عالم ہو گیا تھا کہ کرشن کے دوست اسے ثمینہ خاتون کا نام لے کر چھیڑنے لگے تھے۔ ایک روز اداکارہ نواب بیگم اختر الایمان کے پاس آئیں۔ نہایت مایوس اور افسردہ نظر آ رہی تھیں۔

"کیا ہوا تمہیں۔ اتنی بجھی بجھی کیوں نظر آ رہی ہو؟" اختر نے پوچھا۔

"کیا بتاؤں' میں تو ان کی بہت عزت کرتی تھی لیکن آج انہیں اس حال میں دیکھ کر افسوس ہوا۔"

"کسے دیکھ لیا؟"

"چھوڑیئے بھی' پوچھ کر کیا کریں گے۔ اس بڑے قلم کار کے لیے میرے ذہن میں جو تصور تھا' بُری طرح مجروح ہوا ہے۔"

"تم کس کا ذکر کر رہی ہو۔ میری تو سمجھ میں کچھ آ نہیں رہا ہے۔"

"کرشن چندر کا اور کس کا۔"

"کیوں' کیا ہوا اسے؟" اختر سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"میں نے ابھی راستے میں کرشن چندر کے ساتھ ثمینہ خاتون کو دیکھا۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔ تم بھی تو لڑکی ہو اور میرے پاس بیٹھی ہو۔"

"یہ بات اور ہے۔ وہ تو ثمینہ خاتون کا چپل ہاتھ میں لیے موچی کے پاس جا رہے تھے۔"

"یہ بھی کوئی عجیب بات نہیں۔ اگر تم میرے ساتھ بازار جاؤ اور تمہاری چپل ٹوٹ جائے تو میں بھی یہی کروں گا۔"

"آپ نہیں سمجھیں گے۔" نواب بیگم نے کہا اور اسی ملال کے عالم میں اٹھ کر چلی گئیں۔

اس کے جانے کے بعد خود اختر نے سوچا کہ کرشن اس عشق میں اپنی فنکارانہ عظمت کو بھی بُھلا بیٹھا ہے۔

من کی جیت ریلیز ہوئی اور ہٹ ہو گئی اور سلور جوبلی منائی۔ اس فلم نے کرشن چندر پر ترقی کی راہیں کھول دیں۔ ڈبلیو زیڈ احمد بھی کرشن سے بہت خوش تھے۔ وہ اگلی فلم "غلامی" شروع کرنے والے تھے۔ ممکن ہے کرشن کو اس میں بھی کام ملتا لیکن ایک ایسا واقعہ پیش آ گیا جس نے پونا سے کرشن چندر کا آب و دانہ اٹھا دیا۔

اداکار بلراج ساہنی شالیمار پکچرز میں ملازمت کی غرض سے آئے ہوئے تھے لیکن معاوضے سے مطمئن نہیں تھے۔ کرشن نے ان سے اپنی دوستی کو ملحوظ رکھتے ہوئے انہیں مشورہ دیا کہ اگر وہ احمد صاحب کی محبوبہ اور ہیروئن نینا دیوی

کو ان کی تنخواہ بڑھانے کے لیے سفارش کرنے پر آمادہ کرلیں تو ان کا کام بن سکتا ہے۔

اس مشورے کو کئی دن گزر گئے تھے کہ ایک دن ڈبلیو زیڈ احمد نے کرشن چندر کو اپنے آفس میں بلایا۔ وہاں نینا بھی موجود تھی۔

"آپ نے بلراج ساہنی کو یہ مشورہ دیا تھا کہ نینا دیوی سے ان کی تنخواہ بڑھانے کی سفارش کرائیں؟"

بات سچ تھی لیکن اچھی نہیں تھی۔ کرشن کی چوری پکڑی گئی تھی۔ اس نے بڑی ندامت محسوس کی۔

چند لمحے کمرے میں سناٹا چھایا رہا پھر احمد صاحب بولے۔

"آج سے ہم آپ کی تنخواہ بڑھائے دیتے ہیں۔"

اسے ایسا لگا جیسے اس کے منہ پر کسی نے زوردار چانٹا مارا ہو۔ احمد صاحب نے بڑی خوب صورتی سے بڑا گہرا طنز کیا تھا۔

وہ اس وقت تو ان کا شکریہ ادا کرکے کمرے سے نکل آیا لیکن سوچنے لگا کہ اب اس کا پونا میں رہنا ٹھیک نہیں۔ کاش! مجھے کوئی بمبئی بلالے۔

فلمی زندگی میں اب اس نے اتنا نام پیدا کرلیا تھا کہ بمبئی کی فلمی دنیا میں قدم جمانا اس کے لیے مشکل نہیں تھا۔ بمبئی میں کتنے ہی لوگ تھے جو اس کی مدد کرسکتے تھے۔ کتنے ہی دوست تھے جو اسے خود بلانا چاہتے تھے۔ اس کی مرضی دیکھی تو وہ بھی سرگرم ہوگئے۔

کامیابی کی امید بندھتے ہی کرشن نے شالیمار پکچرز سے استعفیٰ دیا، سامان باندھا اور بمبئی پہنچ گیا۔

بمبئی ٹاکیز میں انچارج، اسٹوری ڈیپارٹمنٹ کے طور پر اسے ملازمت مل گئی۔ اس کی تنخواہ پندرہ سو روپے ماہوار مقرر ہوئی۔ یہ معاوضہ اتنا تھا کہ وہ ایک شاندار زندگی کے خواب دیکھ سکتا تھا لیکن اخراجات اب اتنے بڑھ گئے تھے کہ یہ رقم بھی کم پڑتی تھی۔ یہاں بھی اس کا گھر مہمان سرا بنا ہوا تھا۔ آٹھ دس مہمان۔ بے کاری کے دن گزارنے والے، کام کی تلاش میں بمبئی آنے والے، بمبئی گھومنے والے، اداکار، ادیب، شاعر اور ایسے بھی جو کچھ نہیں تھے محض اس کے دوست تھے، بستر ڈالے اس کے گھر پڑے رہتے تھے۔ کھانے کا ہی نہیں، ان کی شراب کا خرچ بھی کرشن کے ذمے تھا اور وہ اس مہمان داری کو فراخ دلی کے ساتھ نبھا رہا تھا۔

اب وہ اپنی زندگی کے اس موڑ پر پہنچ گیا تھا جہاں لالہ صحرائی کو نشانِ منزل نظر آنے لگا تھا۔ یہ زمانہ ۱۹۴۶ء کا تھا۔ ملک کی تقسیم قریب تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے فسادات کی آگ بھڑک اٹھی۔ بمبئی کی فلمی دنیا بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اسٹوڈیوز سنسان ہوگئے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے محلے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوگئے۔

وہ اپنی زندگی کے طور طریقوں میں نہ ہندو تھا نہ مسلمان۔ اسے کسی مذہب سے کوئی لگاؤ نہیں تھا لیکن انسانوں کا خون بہتا دیکھ کر وہ تڑپ اٹھا۔ سب کے لیے تو یہ محض فسادات تھے لیکن اس کے تو تصورات کا خون ہورہا تھا۔ وہ خود کو اشتراکی کہتا تھا۔ امن اور مساوات کے خواب دیکھتا رہا تھا۔ اب اس کا ہر خواب خون میں نہایا سڑک پر پڑا ہوا تھا۔ کہیں مسلمان کی صورت میں کہیں ہندو کے روپ میں۔ وہ نہ ہندو کی موت پر آنسو بہا سکتا تھا نہ مسلمان کے قتل پر خوش ہوسکتا تھا۔ وہ تو یہ دیکھ رہا تھا کہ انسانیت قتل ہورہی ہے۔ انسانی رشتوں پر تلوار چل رہی ہے۔ خوف کے مارے مسلمان اداکاروں نے اسٹوڈیو آنا چھوڑ دیا تھا۔ اپنے مسلمان دوستوں کو ان کے گھروں تک اسے خود چھوڑ کر آنا پڑتا تھا کہ راستے میں ہندوؤں کے کئی محلے آتے تھے۔

یہ ایسا تجربہ تھا جو اس سے پہلے اسے کبھی نہیں ہوا تھا۔

ایک حساس ادیب ہونے کے ناتے وہ ہنگامی حالات سے خواہ وہ ملکی ہوں یا غیر ملکی، فوراً متاثر ہوتا تھا اور انہیں اپنی تحریروں کا موضوع بنانا اپنا فریضہ سمجھتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۴۲ء میں قحطِ بنگال سے متاثر ہوکر اس نے شہرۂ آفاق افسانہ "ان داتا" لکھا۔ دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں جب پرل ہاربر کی لڑائی زوروں پر تھی، اس نے اپنا مشہور افسانہ "موبی" لکھا۔ تحریکِ آزادی کے دوران میں جب بحریہ کے فوجیوں نے انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کا پرچم بلند کیا تو کرشن چندر نے افسانہ "تین غنڈے" لکھا۔

تقسیمِ ملک اور اس کے صلے میں فسادات کے تحفے تو اس کے اپنے معاملات تھے۔ یہ فسادات اس لیے بھی اس کے لیے سوہانِ روح تھے کہ وہ ایک ترقی پسند تھا۔ ترقی پسندوں نے ایک ایسی مشترکہ انسانی تہذیب کا خواب بُنا تھا جس میں مذہب کو برتری حاصل نہیں تھی۔ سیاسی نقطۂ نظر سے ان کا مسلک ایک قوم، ایک ملک اور ایک تہذیب تھی۔ وہ تہذیب کو ہندو اور مسلمانوں کے خانوں میں بانٹ کر دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ کرشن تو یوں بھی اپنے طرزِ زندگی میں مسلمانوں سے بہت قریب تھا۔

ان جاں گداز واقعات سے متاثر ہوکر اپنے جذبات اور احساسات کو فن کے سانچے میں ڈھال کر پیش کرنا اس کی روایت کا حصہ تھا۔ اور یہ بھی ضروری تھا کہ لکھنے سے پہلے وہ

کم از کم بمبئی کے ان علاقوں کا بہ چشم خود جائزہ لے جو ان فسادات کا مرکز تھے۔ ہندو علاقوں میں تو وہ خود گھوم پھر کر دیکھ چکا تھا۔ مسلم علاقوں میں جانے کے لیے اسے اپنے مسلمان احباب کی ضرورت تھی۔ وہ اپنے دوستوں سے تقاضا کرتا رہا کہ وہ اسے فساد زدہ علاقوں میں لے چلیں۔ احباب اسے متنبہ کرتے رہے کہ وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں۔ کسی نے پہچان لیا تو نہ جانے کیا ہو جائے۔

جب یوں کام نہیں چلا تو اس نے دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ وہ ایک روز حمید اختر (افسانہ نگار) کے گھر پہنچ گیا۔

"یار، ذرا بھنڈی بازار تک جانا ہے۔ چلو چلتے ہیں۔"

"جناب، بھنڈی بازار محمد علی روڈ پر ہے۔ وہاں کی حالت تمہیں معلوم ہے۔ کیوں اپنے ساتھ مجھے بھی مروانا چاہتے ہو۔"

"یار، گوشت کھائے ہوئے ہفتہ ہو گیا ہے۔ خدا کے لیے منہ کا ذائقہ درست کرالاؤ۔"

"وہاں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو تمہیں جانتے ہیں، تمہیں صورت سے پہچانتے ہیں۔ خود ہوٹل والا تمہیں جانتا ہوگا۔ کیوں اپنی جان خطرے میں ڈالتے ہو۔"

"کچھ نہیں ہوتا یار۔ گوشت کھانے کی لت ایسی پڑ گئی ہے کہ وہاں جائے بغیر اب میں رک نہیں سکتا۔ تم نہیں چلتے تو میں اکیلا ہی چلا جاتا ہوں۔"

مجبور ہو کر حمید اختر تیار ہو گئے لیکن دل ہی دل میں ڈر ضرور رہے تھے۔ وہ کرشن کے ساتھ کئی مرتبہ اس علاقے میں گئے تھے لیکن پہلے کی بات اور تھی۔

وہ بھنڈی بازار پہنچ کر ایک ہوٹل میں بیٹھ گئے۔ وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں نے سر سے پاؤں تک کرشن کا جائزہ لیا جیسے پہچان گئے ہوں اور پھر باتوں میں مصروف ہو گئے۔ حمید اختر کو پسینے آ گئے لیکن کرشن مزے سے گوشت کھانے میں مشغول تھا۔

"تمہیں معلوم ہے، اشوک کمار مسلمانوں کے محلے میں پہنچ گئے تھے۔"

"پھر؟"

"پھر کیا۔ وہ جیسے ہی گاڑی سے اُترے سب کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ یہاں یہی میرے ساتھ ہو رہا ہے۔"

"جلدی کھاؤ، اب چلنا بھی ہے۔"

"چلتے ہیں، ذرا رات تو ہو لے۔"

اب کرشن چندر اس کی گھبراہٹ سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

کھانا کھا کر اور علاقے میں پیدل گھوم پھر کر کرشن چندر واپس آیا تو اس کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔

"گوشت کھانے کا تو بہانہ تھا" کرشن نے کہا "دیکھنا یہ تھا کہ عام لوگ مجھ پر ہاتھ اٹھاتے ہیں یا نہیں۔ دیکھ لو سب نے مجھے پہچانا مگر کسی نے حملہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ فسادات نہ غریب ہندو کرتے ہیں نہ غریب مسلمان بلکہ یہ اور ہی لوگ ہوتے ہیں۔"

"پھر بھی احتیاط کیا کرو "یہ اور لوگ" بھی تمہیں کسی جگہ مل سکتے ہیں۔"

"کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو" کرشن نے کہا "ویسے مجھے جو دیکھنا تھا میں نے دیکھ لیا۔"

اس کے بعد اس نے صرف پندرہ دن کی قلیل مدت میں چھ معرکہ آرا افسانے فسادات کے موضوع پر لکھے جو "ہم وحشی ہیں" کے عنوان سے شائع ہوئے۔

فسادات کے موضوع پر دیگر افسانہ نگاروں نے بھی لکھا۔ عصمت چغتائی کا افسانہ "جڑیں" خواجہ احمد عباس کا "سردار جی" راجندر سنگھ بیدی کا "لاجونتی" فکر تونسوی کا "چھٹا دریا" اور منٹو کے افسانے لیکن ان سب میں کرشن چندر کو فوقیت حاصل رہی اس لیے کہ اس نے ان افسانوں کو غیر مذہبی آدمی کی حیثیت سے دیکھا۔ ایک ایسے آدمی کی حیثیت سے جو نہ ہندو ہے نہ مسلمان لہٰذا ان افسانوں میں توازن کا احساس ہوتا ہے۔

وہ اس لیے بھی اس دور میں اہمیت اختیار کر گیا کہ اس نے نہ صرف خود لکھا بلکہ دوسروں کو بھی ترغیب دلائی کہ وہ فساد کے موضوع پر لکھیں۔ گویا فسادات کے موضوع پر لکھنا اس کے لیے روحانی فریضہ بن گیا تھا۔

یہ اس کی صلح پسندی ہی تھی کہ پاکستان کی طرف سے اس کے دل میں نفرت کے جذبات نہیں ابھرے بلکہ وہ پاکستان کی ترقی و خوش حالی کا دل سے خواہاں تھا۔

"میں تو پاکستان کی سلامتی اور ترقی کا دل سے خواہاں ہوں اور ہندوستان کی سلامتی کا بھی۔ میں سوچتا ہوں دونوں ملک اپنی اپنی جگہ پر آزاد اور خود مختار رہتے ہوئے ایک دوسرے سے خیرسگالی سے کام لیتے ہوئے اس طرح کے تعاون کا ثبوت دیں جس سے اس برِصغیر کے غریب انسانوں کے مسائل حل ہو سکیں۔ نفرت کی دیواریں مسمار ہوں اور مصالحت اور مفاہمت کی بنا پر تعلقات استوار رہوں۔"

(ناول "غدار")

کرشن کا قلم بڑی روانی سے چل رہا تھا۔ فسادات کے

سلسلے میں اس کے دل نے اتنے چرکے کھائے تھے کہ وہ چیخ اٹھا تھا لیکن اس نے امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور برابر اپنے افسانوی ادب سے لوگوں کے دلوں پر مرہم رکھتا رہا۔ جب فسادات کی آگ سرد پڑی تو اسے تھوڑا سا سکون ملا لیکن اب ایک آزاد ملک میں جو روز مرہ کے مسائل پیدا ہو رہے تھے' وہ ان سے نبرد آزما ہو گیا۔

اب وہ ایک ایسے افسانہ نگار کا روپ دھار تا جارہا تھا جس کے افسانے' حقیقت کا روپ دھار چکے تھے' جس کی تحریروں میں وقت کی آواز بولتی تھی' جس کا ہاتھ مسائل کی نبض پر تھا' یہ افسانے نہیں' کسی دانش ور کی رائے تھی جو فن کے سانچے میں ڈھل گئی تھی۔

اس نے بمبئی پہنچتے ہی بمبئی ٹاکیز میں ملازمت اختیار کرلی تھی۔

وہ ملازمت سے ہمیشہ دور بھاگتا تھا لیکن یہ اس کی مجبوری بھی تھی کہ وہ صرف ادب کو اپنی روزی کا ذریعہ نہیں بناسکتا تھا البتہ فلمی دنیا میں آنے کے بعد وہ یہ سوچنے لگا تھا کہ فلموں سے بہت کچھ کمایا جاسکتا ہے۔ یہاں ہونے والی دولت کی ریل پیل نے اس کی آنکھوں کو چندھیا دیا تھا۔ بمبئی ایک بڑی فلم انڈسٹری تھی۔ یہاں کام کرنے کے مواقع بھی زیادہ تھے اور اسے اپنے قلم پر اعتماد بھی تھا۔ بمبئی ٹاکیز میں کچھ عرصہ ملازمت کرنے کے بعد وہ سوچنے لگا کہ اپنے قلم کو فروخت کرنے کے بجائے اگر وہ اسے اپنے لیے استعمال کرے تو زیادہ منافع حاصل ہو سکتا ہے۔ ایک شاندار زندگی ہمیشہ سے اس کا خواب رہی تھی۔

وہ آنکھیں بند کرکے اس سیلاب میں کود پڑا۔ اس نے ملازمت سے استعفیٰ دیا اور اپنی ذاتی فلم کمپنی "ماڈرن تھیٹر" کے نام سے قائم کرلی۔

کمپنی قائم ہوتے ہی اس کی محبوبہ دلنواز ثمینہ خاتون بھی پونا سے بمبئی پہنچ گئی۔

ملازمت ترک کرنے کے بعد وہ وکٹوریہ ٹرمنس سے سترہ اسٹیشن دور اندھیری کے ساحل پر واقع کوور لاج میں منتقل ہو گیا۔ کوور لاج میں تاڑ اور ناریل کے ہرے بھرے جھنڈ تھے۔ آم اور چیکو کے پیڑ تھے' جنگلی پھولوں کی جھاڑیاں تھیں۔ یہاں بہار رُت میں کوئل کوکتی اور طوطے شور مچاتے تھے۔ نچلی منزل اس نے بیوی بچوں کے لیے مخصوص کی ہوئی تھی اس کی بہن سرلا اور بھائی مہندر بھی آگئے تھے۔

دوسری منزل آنے جانے اور ٹھہرنے والوں کے لیے مخصوص تھی۔ دن بھر اخبار نویس' شاعر' فلمی ایکسٹرا' گویّے' مزدور لیڈر اور ناکام فلم ڈائریکٹر وہاں آتے جاتے رہتے تھے۔ یہ گھر چوبیس گھنٹے جاگتا تھا۔ اس گھر نے سرائے کی سی شہرت اختیار کرلی تھی۔ جس کے پاس رہنے کا ٹھکانا نہیں ہوتا اور کرشن سے تھوڑی سی شناسائی نکل آتی' اس کے لیے لکڑی کے فرش پر ایک بستر کا اضافہ ہو جاتا۔ اس منزل پر خاموشی کا راج ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ دن بھر اور رات گئے تک آوازوں کی دنیا قہقہوں سے آباد رہتی تھی۔ نیچے البتہ خاموشی تھی۔ اس کی بیوی ودیاوتی اب ان ہنگاموں کی عادی ہو گئی تھی۔ اس نے اب کرشن سے لڑنا چھوڑ دیا تھا لیکن خوش بھی نہیں تھی۔ بس ایک سمجھوتا سا کرلیا تھا۔ اس کی دونوں بچیاں اسکول جانے لگی تھیں۔ ان کے اسکول جانے کے بعد نچلی منزل قطعی سنسان ہو جاتی تھی۔ باہر لگے درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندوں کی آوازیں کبھی کبھی اس سناٹے کو توڑتی تھیں۔

اس سناٹے میں عجیب و غریب حلیے کا ایک آدمی لکڑی کا زینہ اترتے چڑھتے دکھائی دیتا تھا جو اس سناٹے کو پُراسرار بنا دیتا تھا۔ یہ میرا جی تھا جو مستقل کرشن چندر کے پاس رہتا تھا۔

ان دنوں کرشن چندر مغل اعظم بنا ہوا تھا۔ اس نے زندگی میں ایک کار کی تمنا کی تھی' اب اس کے پاس تین تین کاریں تھیں۔ اسے ایک نوکر کی ضرورت تھی لیکن چار چار نوکر اس کی خدمت میں حاضر تھے۔ زمین آسمان ہی بدل گئے تھے۔

اس نے دلی ریڈیو کی ملازمت کے دوران میں ایک ڈراما "سرائے کے باہر" لکھا تھا جو نشر بھی ہوا تھا۔ پونا کے قیام کے دوران میں اس کو اسٹیج پر بھی پیش کیا تھا۔ اپنی ذاتی فلم کمپنی کے تحت اس نے اس کی کہانی کو سلولائیڈ پر اتارنے کا ارادہ کیا۔

جب وہ اس فلم کی کاغذی کارروائیاں مکمل کرچکا تو یہ مسئلہ درپیش ہوا کہ فلم کی ہیروئن کے لیے کس لڑکی کا انتخاب کیا جائے۔ مسئلہ دوسروں کا تھا ورنہ وہ تو ثمینہ خاتون کو ہیروئن منتخب کرچکا تھا۔ دوست اسے سمجھا رہے تھے کہ بمبئی میں ایک سے ایک لڑکی پڑی ہوئی ہے لیکن وہ کسی کی بات سمجھنے پر تیار نہیں تھا۔ ایک سے ایک بڑھ کر خوشامدی دوست اس کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ خوشامدیوں نے اس کی کمزوری کو تاڑ لیا تھا۔ بات بات پر ثمینہ خاتون کی تعریفوں کے پُل باندھ دیتے۔ کرشن کو یقین ہوتا جارہا تھا کہ اس کا انتخاب درست ہے۔ ایسے میں وہ مخلص دوست جو اسے صحیح مشورے دے

رہے تھے' اسے بُرے لگنے لگے۔ وہ آہستہ آہستہ انہیں بھولتا جارہا تھا کہ ثمینہ کو یاد رکھنے کے لیے ان مخلص دوستوں کو بھلانا ضروری تھا۔

اپنی گرم بازاری دیکھ کر ثمینہ بھی اس پر نچھاور ہوئی جارہی تھی۔ کرشن چندر اس پر اپنی دولت بے دریغ لٹا رہا تھا۔

ودیاوتی بھی وہیں موجود تھی اور ثمینہ خاتون بھی۔ یہ راز اب راز نہیں رہا تھا۔ ودیاوتی اب گونگی بن چکی تھی لیکن ایک دن اچانک بول پڑی۔ اس کا ساتھ کرشن کی بہن سرلا نے بھی دیا۔ اس معاشقے پر اس کے گھر والے بھی ناخوش تھے لیکن اسے ثمینہ کی کوئی ایسی ادا بھاگئی تھی کہ کسی کی بات سننے پر تیار نہیں تھا۔

ثمینہ خاتون اس کی داد و دہش سے خوب خوب فیض یاب ہورہی تھی۔

"یہ لڑکی تم سے محبت نہیں کرتی۔"

"یہ لڑکی تمہاری دولت سے پیار کرتی ہے۔"

"تم اسے عروج بخشو گے اور یہ تمہی کو آنکھیں دکھائے گی۔"

"دیکھ لینا ایک دن تمہیں چھوڑ کر چلی جائے گی۔"

"تم ایک لڑکی کی خاطر دوستوں کو بھی نظرانداز کررہے ہو۔"

"اس کی قربت میں تمہاری کارکردگی متاثر ہورہی ہے۔ تم نے بہت دن سے کوئی افسانہ بھی نہیں لکھا۔"

"پچھلے دنوں ایک ادبی کانفرنس ہوئی تھی، تم اس میں بھی نہیں گئے۔ ثمینہ کے ساتھ ایک ہوٹل میں ٹھہرے رہے۔"

"سرائے کے باہر" کی شوٹنگ شروع ہوچکی تھی۔ مہندر ناتھ ہیرو اور ثمینہ ہیروئن تھی۔ جسے پیا چاہے وہی سہاگن کے مصداق فلم کمپنی کی مالک وہی بنی ہوئی تھی۔ جب وہ کرشن کے اعصاب پر سوار ہوچکی تھی تو اسے ڈرکس کا۔ وہ کبھی سیٹ پر آتی کبھی نہیں آتی۔ وہ کسی بات پر برہم ہوتی تو کرشن اپنی حیثیت کا لحاظ کیے بغیر سب کے سامنے اس کی خوشامد کرتا' اس کے ناز اٹھاتا۔

اس کے دوست ٹھیک کہتے تھے۔ ثمینہ کے چاؤ چونچلوں میں ڈھیر سارا وقت ضائع ہوگیا۔ اس کی فلم مقررہ وقت سے بہت بعد میں مکمل ہوئی اور اندازے سے زیادہ رقم خرچ ہوگئی۔ وہ اب بھی خوش تھا کہ اس کی ڈائریکشن میں ایک نظریاتی فلم پردۂ سیمیں پر جلوہ گر ہوئی۔ ثمینہ کا دل بھی اس نے جیت لیا۔

یہ ایک نظریاتی کہانی پر مبنی فلم تھی۔ عام آدمی کو اس میں کوئی دلچسپی نہیں ہوسکتی تھی۔ وہ مرچ مسالا بھی اس میں نہیں ڈالا گیا تھا جو کمرشیل فلموں کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ کچھ کرشن کی ناتجربہ کاری کو بھی دخل تھا۔ لہٰذا یہ فلم بُری طرح فلاپ ہوگئی۔

اس نے ہمت نہیں ہاری۔ اس نے ایک فلم کی ناکامی کے بعد دوسری فلم کا آغاز کردیا۔ اس فلم کا نام اس نے "راکھ" تجویز کیا۔ قسمت آزما پھر اس کے گرد جمع ہوگئے۔ کام پھر شروع ہوگیا۔ اس فلم کی ہیروئن بھی ثمینہ ہی تھی۔

وہ یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ قسمت باربار ساتھ نہیں چھوڑے گی۔ اس کی قسمت اس کا ساتھ ضرور دے گی لیکن بازی اس مرتبہ بھی الٹ گئی۔ یہ فلم بھی فلاپ ہوئی۔

پہلی چوٹ تو وہ سہہ گیا لیکن اس زخم نے اسے بے حال کردیا۔ تینوں گاڑیاں بک گئیں۔ چار نوکروں میں سے ایک نوکر رہ گیا۔ ایک بڑا قرض الگ چڑھ گیا۔

مالی بحران میں مبتلا ہوتے ہی خوشامدی دوستوں نے اس کا ساتھ چھوڑدیا۔ فلمی دنیا کی یہی روایت رہی ہے۔ یہاں جب کسی پر زوال آتا ہے تو کوئی اس کی طرف مڑکر بھی نہیں دیکھتا۔ اس کے قریب آنا بھی گوارا نہیں کرتے کہ کہیں اس کی نحوست سے ہماری قسمت بھی داغدار نہ ہوجائے۔ وہی ایکسٹرا لڑکے لڑکیاں جو اس کے آگے پیچھے رہتے تھے' دانہ چگنے کہیں اور جاچکے تھے۔

وہ اس وقت ٹوٹ کر بکھر گیا تھا جب ثمینہ بھی اس سے کترانے لگی۔ ملاقاتوں میں وقفے آنے لگے اور پھر تعطل آگیا۔ پھر معلوم ہوا اس نے بحریہ کے کسی افسر سے شادی کرلی پھر معلوم ہوا وہ پاکستان چلی گئی۔

اس دن اسے معلوم ہوا' اس کے دوست ٹھیک کہتے تھے "دیکھنا ایک دن تمہیں چھوڑ کر چلی جائے گی۔"

○☆○

دسمبر کا مہینہ ہے۔ دلی میں یوں بھی سردی بہت ہوتی ہے اور رات تو بارش ہوچکی ہے۔ کرشن ابھی باہر نہیں نکلا لیکن اسے یقین ہے کہ باہر کہر پڑرہی ہوگی۔ وہ ان دنوں دلی آیا ہوا ہے۔ بہت دنوں بعد آرام کرنے کا موقع ملا ہے اس لیے دیر تک سونے کا پروگرام ہے۔

"مجاز صاحب آئے ہیں" اس کی بہن سرلا نے اسے جگانے کے بعد کہا۔

"مجاز آیا ہے؟ یہ کم بخت ہر کام بے تکا کرتا ہے۔ بھلا یہ کوئی وقت ہے آنے کا۔"

"ان کے ساتھ ایک عورت بھی ہے جس کی گود میں بچہ ہے۔"

"ارے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ اور کوئی گرم چیز اوڑھنے کے لیے دو۔ قلفی جم جائے گی دونوں کی۔"

"آپ تو اٹھیں، میں نے انہیں بٹھا دیا ہے۔"

"تم انہیں گرما گرم چائے پلاؤ' میں تیار ہو کر آتا ہوں۔"

کرشن لحاف سے نکل آیا تھا اور تیار ہو کر سوچ رہا تھا کہ اس کے ساتھ عورت کون ہو سکتی ہے۔ مجاز نے کہیں شادی تو نہیں کرلی۔ اگر شادی کر ہی لی ہے تو یہ کون سا وقت ہے گھر سے نکلنے کا۔ پھر خیال آیا' مجاز کسی مصیبت میں نہ ہو۔ یہ خیال آتے ہی وہ بے قرار ہو گیا۔ مجھے گرم سوٹ میں بھی سردی لگ رہی ہے اور مجاز یہاں تک آگیا۔ وہ دونوں ہاتھوں کو آپس میں رگڑتا ہوا ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا۔

"ارے مجاز' تم! اتنے سویرے سویرے۔" کرشن نے کہا۔

"سلمیٰ صاحبہ کو آج ہی علی گڑھ پہنچنا ہے اور آپ سے ملے بغیر جانا نہیں چاہتی تھیں لہٰذا آنا پڑا۔"

"آپ نے ان کا تعارف نہیں کرایا؟"

"یہ سلمیٰ صدیقی ہیں۔ مشہور ادیب رشید احمد صدیقی کی صاحب زادی۔"

"یہ تو رشید صاحب کا تعارف ہو گیا۔ کون ادیب ہو گا جو رشید صاحب کو نہیں جانتا ہو گا۔ آپ تو سلمیٰ کا تعارف کرایئے۔"

"افسانے لکھتی ہیں۔ علی گڑھ میں پڑھاتی ہیں اور خورشید منیر سے ان کی شادی ہو گئی ہے۔"

"اب تعارف مکمل ہوا۔ افسانے لکھتی ہیں اس لیے ہماری برادری کی ہوئیں" کرشن نے کہا اور ہاتھ ملانے کے لیے سلمیٰ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ سلمیٰ نے کرشن کی گرم جوشی کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھا اور جواب میں اپنا ہاتھ آگے نہیں کیا۔

"ارے! کچھ ناراض ہیں آپ ہم سے" کرشن نے کہا۔ اور اپنا ہاتھ سمیٹ لیا۔

مجاز نے لہک لہک کر گانا شروع کر دیا۔

چپ چپ کھڑے ہو ضرور کوئی بات ہے
پہلی ملاقات ہے یہ پہلی ملاقات ہے

"بچہ بڑا پیارا ہے۔ کیا نام ہے اس کا؟" کرشن نے سلمیٰ کی گود سے بچے کو لیتے ہوئے کہا۔

"راشد خورشید منیر" سلمیٰ نے آہستہ سے کہا۔

"آپ کے شوہر کا نام خورشید منیر ہے؟"

"جی۔"

"یہ وہی خورشید منیر تو نہیں ہیں جو فلموں میں کام کی تلاش میں کچھ دنوں پونا میں بھی مقیم رہے؟"

"جی ہاں۔ شادی کے بعد وہ مجھے بھی پونا لے گئے تھے۔"

ڈرامے

دروازہ' حجامت' نیل کنٹھ' قاہرہ کی ایک شام' بے کاری' سرائے کے باہر۔ بدصورت راجکماری' جھاڑو' ہم سب غلیظ ہیں' عشق کے بعد' کتاب کا کفن' نقش فریادی۔ رپور تاژ۔ پودے' صبح ہوتی ہے۔

بچوں کی کتابیں

۱۔ الٹا درخت ۲۔ بیوقوفوں کی کہانیاں ۳۔ سونے کی صندوقچی ۴۔ چڑیوں کی الف لیلہ ۵۔ شیطان کا تحفہ ۶۔ سونے کا سیب ۷۔ لال تاج ۸۔ ستاروں کی سیر ۹۔ خرگوش کا سپنا ۱۰۔ ہمارا گھر ۱۱۔ بہادر یار جنگ۔

مرتب شدہ کتابیں۔

نئے زاویے (حصہ اول' دوم)
ہل کے سائے میں۔

"میں ان دنوں پونا سے بمبئی آچکا تھا ورنہ بہت پہلے ملاقات ہو چکی ہوتی۔"

"قسمت میں تھا کہ اس وقت ملاقات نہ ہو۔"

"ایک بات بتاؤں" مجاز نے سرگوشی میں کہنا شروع کیا "ان کا حال بھی آپ سے مختلف نہیں ہے۔ آپ کی اپنی بیوی سے نہیں بنتی' ان کی اپنے شوہر سے نہیں بنتی۔"

کرشن نے دیکھا کہ سلمیٰ کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ شاید مجاز کا یہ تبصرہ اسے پسند نہیں آیا تھا۔

کرشن نے بڑی ہوشیاری سے بات کا رخ موڑ دیا "آپ کی ساڑی کا رنگ جوگیا ہے نا؟"

"جی ہاں۔"

"مجھے بہت پسند ہے یہ رنگ۔ یہ رنگ مجھے سن کیسر کے پھولوں کی یاد دلاتا ہے۔"

"سن کیسر کون سا پھول ہوتا ہے؟"

"کمال ہے' آپ نے سن کیسر کا پھول نہیں دیکھا۔ خیر' کوئی بات نہیں۔ آپ بمبئی آئیں گی تو ہم آپ کو سن کیسر کے پھول دکھائیں گے۔"

مجاز نے ہنس کر پوچھا "تم ان کو بمبئی بلا رہے ہو؟"

"بمبئی تو ان کو آنا ہی پڑے گا" کرشن نے اتنے یقین سے کہا جیسے کسی ہمدم دیرینہ کو بمبئی آنے کی دعوت دے رہا ہو۔

اس کے لہجے میں خلوص اور لفظوں میں اپنائیت کا رنگ تھا۔ سلمیٰ کا تکلف ختم ہو گیا تھا لیکن وہ خاموش تھی۔

چائے ابھی ابھی آئی تھی۔ مجاز چائے کی چسکیاں لے رہا تھا۔ کرشن چندر افسانہ نگار کی آنکھ سے سلمیٰ کا جائزہ لے رہا تھا۔ دراز قامت، صبیح رنگت، بھرا پرا جسم، موٹی موٹی سیاہ روشن آنکھیں جو اس کی ساری شخصیت پر چھائی ہوئی نظر آتی تھیں۔ کرشن کو اچانک محسوس ہوا، وہ جس چہرے کی تلاش میں اب تک بھٹکتا رہا ہے، وہ چہرہ اسے آج ملا ہے۔

"اب یہ کہنا تو فضول ہے کہ آپ بہت اچھا لکھتے ہیں" سلمیٰ نے کہا۔

"کبھی کبھی معقول آدمی کو فضول باتیں بھی کرنی چاہئیں۔"

"تو آپ چاہتے ہیں، آپ کی تعریف کی جائے؟"

"اس کے بعد ہی تو میں آپ کی تعریف کرسکوں گا۔"

"آپ بہت اچھا لکھتے ہیں۔"

"اب اور اچھا لکھوں گا۔"

"کیوں؟ اب کیا بات ہوگئی؟"

"ایک دوست کی تلاش تھی۔ وہ مل گیا ہے لہٰذا اس خوشی میں لکھوں گا۔"

"آپ جتنا لکھیں گے ہمارے ادب کی تاریخ بنے گا۔"

"اگر آپ کا جانا ضروری نہ ہو تو کچھ دن ہمارے گھر مہمان رہیے۔"

"آپ کی مہمان نوازی کے بڑے قصے سنے ہیں لیکن میرا جانا بہت ضروری ہے۔"

"خط تو لکھیں گی؟"

"بہت چور ہوں۔"

"چوری چوری ہی لکھ دیا کیجیے گا۔"

سلمیٰ کو بے اختیار ہنسی آگئی "اب میری عمر چوری کی نہیں ہے۔"

"بے شک! سینہ زوری کی ہے" مجاز نے فقرہ چست کیا۔

"اگلی مرتبہ آیئے تو مجاز کو ساتھ نہ لایئے گا۔"

یہ کرشن سے سلمیٰ کی پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد سلمیٰ علی گڑھ چلی گئی اور کرشن بمبئی واپس لوٹ گیا۔

بمبئی میں اب اس کے لیے خاک اڑ رہی تھی۔ اس کی جیب خالی تھی۔ سر پر بھاری قرض تھا جسے اتارنا تھا۔ فلم پروڈکشن کے دوران میں ادب سے اس کا ناتا تقریباً ٹوٹ چکا تھا۔ اسے استوار کرنا تھا۔ فلمی دنیا میں نئے رابطے بنانے تھے۔ زندہ رہنے کے لیے از سرِ نو تگ ودو کرنی تھی۔ بمبئی پہنچتے ہی اس نے ایک نئے جذبے کے ساتھ نئی زندگی شروع کی۔ اب اس کے ساتھ سلمیٰ کا خیال بھی تھا جو ہر وقت اس کا حوصلہ بلند رکھتا تھا۔

اب اسے اپنے زوال کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ جب میرے پاس دولت تھی اس وقت سلمیٰ سے ملاقات نہیں ہوئی۔ اب خالی ہاتھ ہوں، اسے کیا دے سکوں گا۔ کاش! میں نے وہ دولت بچا کر رکھی ہوتی۔ جائداد بنالی ہوتی۔ میں تو کم از کم پانچ فلیٹ شراب میں ڈبو کر پی گیا۔ یہ بمبئی ہے! یہاں گاڑی میں سوار، پیدل چلنے والے کو نہیں دیکھتا۔ یہاں دو طبقے ہیں، لکھ پتی یا فقیر۔ ان کے درمیان کوئی نہیں رہتا۔ مجھے یہ بات پہلے سوچنی چاہیے تھی۔

مایوسی کے یہ فقرے اس کے ذہن میں گونجتے ضرور تھے لیکن اسے اپنے قلم پر اعتماد تھا۔ وہ اس رفتار سے لکھتا تھا جیسے کوئی باتیں کرتا ہے۔ جتنی دیر میں کوئی ادیب دانتوں میں قلم دبا کر سوچنے کے عمل سے گزرتا ہے، وہ افسانہ مکمل کرلیتا تھا۔ تیز رفتاری میں اگر کوئی اس کا حریف تھا تو وہ تھا منٹو۔ وہ پاکستان جاچکا تھا۔ ہندوستان بھر میں کرشن اکیلا تھا۔

کوور لاج میں لگے ناریل اور تاڑ کے درخت اب بھی اسی طرح ہرے بھرے تھے۔ پرندے اب بھی بولتے تھے۔ کرشن اوپر کی منزل پر بیٹھا اپنے نیلے کاغذ کے پیڈ پر افسانے لکھتا رہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے زیادہ سے زیادہ افسانے لکھ کر مجموعے شائع کرائے تاکہ ان سے ملنے والی رقم سے گھر کا خرچ چلا سکے۔ ایک مقدس سناٹا اس کے چاروں طرف پھیلا ہوا ہے۔

ہندوستان میں طبقاتی کشمکش ابھی ختم نہیں ہوئی۔ سرمایہ داری کا سانپ اب بھی پھن کھولے کھڑا ہے۔ معاشی زندگی مسلسل ناہموار چلی آرہی ہے۔ مارواڑی سیٹھوں کی ذہنیت وہی ہے، مزدور طبقے کی زندگی بھی اب تک وہی ہے۔ اس کا کشمیر ابھی تک بھوک اور افلاس کا شکار ہے۔

زندگی تلخ ہے۔ سماج جابر ہے۔ عوام استحصال کا شکار ہیں۔ دہقان کے پاؤں ننگے ہیں۔ نسوانی حسن چیتھڑوں میں ملبوس ہے۔ خواہشیں قیدی ہیں۔ جذبے مردہ ہیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ شام سہانی ہے۔ رات نشہ بار ہے اور برف چاندی کی طرح چمکتی ہے۔ اور پھول بوسوں کی طرح دہکتے ہیں۔

اس کے اس دور کے افسانے انہی دونوں موسموں کا امتزاج پیش کررہے تھے یعنی رومان اور حقیقت کا امتزاج۔ اس کے اندر ایک شاعر چھپا ہوا تھا جو اس کی رومانی کیفیات کا نمائندہ تھا اور اس کا افسانہ نگار اردگرد بکھری ہوئی تلخ حقیقتوں سے غافل نہیں رہ سکتا تھا۔ ایک اور چیز تھی اور وہ

تھی اس کے مزاج کی فطری شوخی جو اس کے افسانوں میں طنز و مزاح کے رنگ شامل کر دیتی تھی۔

ان تینوں خصوصیات کا یک جا ہو جانا اسے دیگر افسانہ نگاروں سے منفرد ثابت کر رہی تھیں۔

وہ ان افسانوں کو مختلف رسائل میں بھیج کر اپنے زندہ ہونے کا ثبوت فراہم کرتا رہا۔ اس کی واپسی ادب کے لیے خوش آئند تھی۔ اس کے پڑھنے والوں نے اس کا استقبال کیا۔ نقادوں نے خیر مقدم کیا۔ اس کے بارے میں باتیں ہونے لگیں۔ اس کے فن پر تبصرے کیے جانے لگے۔ ترقی پسند ادب کی اہمیت ثابت کرنے کے لیے اس کی مثال پیش کی جانے لگی۔

دیکھتے ہی دیکھتے اس نے کئی افسانوی مجموعے پڑھنے والوں کے سپرد کر دیے۔ "میں انتظار کروں گا' مزاحیہ افسانے' ایک روپیہ ایک پھول' یوکلپٹس کی ڈالی' ہائیڈروجن بم کے بعد' نئے افسانے۔"

اس فرصت سے فائدہ اٹھا کر اس نے ایک ناول "طوفان کی کلیاں" بھی شائع کرا دیا۔

اس کی ان تخلیقی کاوشوں نے جہاں اس کی مقبولیت میں اضافہ کیا' اس کا ادبی قد بڑھایا وہیں ان کتابوں سے ملنے والی رائلٹی نے اس کی مالی مدد بھی کی۔

قدرے تگ و دو کے بعد اسے فلمی کام بھی ملنے لگا اور یوں اس کی زندگی کی ناؤ ہچکولے کھانے کے بعد سنبھلنے لگی۔

سلمیٰ سے دوسری ملاقات کا موقع نصیب نہیں ہو سکا تھا۔ یہ موقع بھی قسمت سے نکل آیا۔

کرشن کے سب سے چھوٹے بھائی اوپندر ناتھ کی شادی تھی۔ اسے انتظامات کے لیے دلی آنا پڑا۔ خوشی کا یہ موقع ہو اور وہ سلمیٰ کو یاد نہ کرے؟ اس نے دعوت نامہ سلمیٰ کو روانہ کر دیا۔

دلی کے تیس ہزاری والے مکان کے سامنے شامیانہ لگا ہے۔ برات سجائی جا رہی ہے۔ ڈھولک پر گیت گائے جا رہے ہیں۔ لڑکیاں ہنسی مذاق کر رہی ہیں۔ برات کا گھر ہے۔ کسی کو کسی کا ہوش نہیں ہے۔

کرشن چندر یہ دیکھنے کے لیے کہ سلمیٰ آئی یا نہیں کبھی شامیانے میں آتا ہے اور کبھی باہر آ جاتا ہے۔ بالآخر سلمیٰ اسے نظر آ گئی۔ رسمی سی گفتگو ہوئی۔ ایک دوسرے کی خیریت پوچھی گئی کیونکہ اس وقت سلمیٰ عورتوں میں گھری کھڑی تھی اور دلچسپی سے یہاں ہونے والی رسموں کو دیکھ رہی تھی۔

کرشن کو اس سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں لیکن موقع نہیں مل رہا ہے۔ اس کی آنکھیں مسلسل سلمیٰ پر لگی ہوئی ہیں۔

سلمیٰ جونہی اکیلی ہوئی وہ وہاں پہنچ گیا اور دونوں باتیں کرتے ہوئے شامیانے کے ایک گوشے میں پہنچ گئے۔

"آج آپ نے جوگیا ساڑی کیوں نہیں پہنی؟" کرشن اسے یاد دلا رہا تھا کہ اسے پہلی ملاقات ابھی تک یاد ہے۔

"میرے پاس کیا صرف ایک ہی ساڑی ہے کہ بس اسی کو پہنتی رہوں" سلمیٰ نے اٹھلاتے ہوئے کہا اور کرشن بے اختیار ہنس پڑا۔

"ارے بُرا مان گئیں۔ یہ گلابی ساڑی بھی آپ پر خوب سج رہی ہے۔ آئندہ بھی یہی رنگ پہننا پڑے گا۔"

"میں تو آپ کو کہانی کار سمجھتی تھی۔ آپ تو ساڑی ڈیزائنر نکلے۔"

"یہ انکشاف مجھ پر خود آپ سے ملاقات کے بعد ہوا ہے۔ دراصل انسان میں بہت سی باتیں چھپی ہوئی ہوتی ہیں۔ اسے خود معلوم نہیں ہوتا۔ ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے کس کو کس وقت ظاہر ہونا ہے۔ رنگوں کا یہ احساس شاید میری فطرت میں ودیعت کیا تھا جو آپ سے ملاقات کے بعد خود بخود ظاہر ہو گیا۔ اب آپ خوشی سے مجھے ساڑی ڈیزائنر کہہ سکتی ہیں۔"

"آپ نے تو میرے مذاق کو بھی اچھا خاصا فلسفہ بنا دیا" سلمیٰ نے کہا۔

"اس سے آپ اندازہ لگا سکتی ہیں کہ میں کتنا سنجیدہ ہوں۔ آپ کا مذاق بھی میرے لیے سنجیدگی ہے۔ اندازہ کیجیے جب آپ سنجیدہ ہو جائیں گی تو مجھ پر کیا گزرے گی؟"

"آپ کا نیا افسانہ پڑھا تھا" سلمیٰ نے بات کا رخ موڑنے کے لیے یہ ذکر چھیڑ دیا۔

کرشن اس وقت اپنے اور سلمیٰ کے درمیان کسی کو لانا نہیں چاہتا تھا۔ چاہے وہ ادب ہی کیوں نہ ہو۔

"وہ لڑکی جو بالوں میں پھولوں کا گجرا سجائے ہنستی جا رہی ہے' میری بھاوج ہے۔"

"ملاقات ہو چکی ہے۔"

"لیکن یہ کسی نے نہیں بتایا ہو گا کہ یہ مہاراشٹرین ہے۔ مہاراشٹر میں گجرے کو وینی کہتے ہیں۔"

"اچھا!"

"آپ بمبئی آئیں گی تو آپ بھی اپنے بالوں میں ایسی ہی وینی سجایا کیجیے گا۔"

"آپ نے کیسے طے کر لیا کہ میں بمبئی آؤں گی؟"

"تو کیا آپ نے ابھی تک طے نہیں کیا؟ بمبئی تو آپ کو آنا ہی پڑے گا۔"

"چلیے آجائیں گے کبھی گھومنے کا موڈ ہوا تو۔"

"جی نہیں۔ گھومنے کے لیے نہیں۔ کبھی آیئے گا تو مستقل رہنے کے لیے آیئے گا۔"

"بھلا میں بمبئی میں مستقل کیوں رہنے لگی۔"

"جب آپ بمبئی آؤ گی تو سن کیسر کے پھول کے رنگ کی ساڑی پہننا، گلابی رنگ کی ساڑی پہننا، بالوں میں وینی (گجرا) سجانا" کرشن نے اس کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا "میں وہاں ایک اور گھر بناؤں گا جہاں تم آکر اتروگی۔"

اس کی باتوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ بات بطور عارضی مہمان بمبئی آنے کی نہیں بلکہ مستقل طور پر رہنے کی ہے۔ سلمٰی نے بھی اس کی نیت کو بھانپ لیا تھا۔ اس کی خاموشی نیم رضامندی کو ظاہر کر رہی تھی۔

سلمٰی تو دوسرے ہی دن واپسی کا ارادہ کر رہی تھی لیکن کرشن نے اسے ضد کرکے روک لیا۔

"بھئی، تمہارے ساتھ بیٹھ کر پینے میں لطف آئے گا۔"

"آپ پی کر بہکتے تو نہیں ہیں؟"

"جو ہوش میں نہیں بہکتا وہ مدہوشی میں کیا بہکے گا۔ میں تو پینے کے لطف کی بات کر رہا تھا۔"

"پھر کوئی حرج نہیں۔"

"آپ شراب کو برا نہیں سمجھتیں؟"

"اچھا آدمی اچھا ہی رہتا ہے، پینے کے بعد بھی۔"

"آپ کتنی روشن خیال ہیں۔ مجھے ایسی ہی ساتھی کی ضرورت تھی۔"

"اس میں روشن خیالی کی کیا بات ہے۔ آپ ادیب ہیں، یہ سب تو چلتا ہے مگر جو بھی ہو اعتدال سے ہونا چاہیے۔"

"میں نے زندگی میں بہت سے عشق لڑائے ہیں۔ کیا تمہیں علم ہے؟"

"مجھے کیسے علم ہو سکتا ہے۔ ویسے کچھ بعید بھی نہیں۔ آپ کتنے ہی دلوں میں آباد ہیں۔"

"آپ کے دل میں بھی؟"

سلمٰی کچھ دیر کے لیے بوکھلا گئی "اگر میرے دل میں آپ کے لیے جگہ نہ ہوتی تو میں مجاز کے ساتھ آپ سے ملنے آپ کے گھر نہ آتی۔"

"اس کا مطلب ہے۔۔۔"

"اس کا مطلب ہے آپ بہت اچھے انسان ہیں۔"

دھنک کے ساتوں رنگ کتنی ہی دیر تک میڈن ہوٹل دہلی کی چھت پر اترے رہے جہاں وہ دونوں بیٹھے تھے۔

"میں یہ بتانا چاہتا تھا کہ وہ عشق جو میں لڑاتا رہا، اپنے آپ کو دھوکا دینے کے مترادف تھے۔ میں ایک صورت کی تلاش میں تھا جس کی محبت کے بغیر میرے دل کا آئینہ مکمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اب وہ چہرہ مجھے مل گیا ہے۔ اب میری تلاش ختم ہو گئی ہے۔ محبت کا مفہوم بہت دیر سے میری سمجھ میں آیا۔"

"چلیں، بہت دیر ہو گئی ہے۔ گھر پر سب لوگ ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"آپ بات کا رخ کیوں موڑ رہی ہیں۔ آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔"

"بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا کوئی جواب نہیں ہوتا۔"

"بس، مجھے میری بات کا جواب مل گیا۔ آیئے چلیں۔"

وہ سلمٰی کو لے کر ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ اس وقت دونوں، ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے تھے۔ ایک جواب یہ بھی تھا۔

گھر میں واقعی ان کا انتظار ہو رہا تھا۔ کرشن کی والدہ کھانے پر ان کا انتظار کر رہی تھیں۔

"یہ تو دیر سے کھانا کھاتا ہے۔ بیٹی، تم کھانا کھالو۔"

"ماں جی، ہم نے ہوٹل میں الٹی سیدھی چیزیں اتنی کھالیں کہ بھوک نہیں رہی۔ میں بھی دیر سے کھالوں گی۔"

سلمٰی کو معلوم تھا کہ وہ دیر سے کھانا کیوں کھاتا ہے۔ ہر رات شراب پینا اس کے لیے لازمی ہے۔ شراب سے نمٹ کر ہی کھانا کھاتا ہوگا۔ اس نے کہا تھا "تمہارے ساتھ بیٹھ کر پینے میں لطف آئے گا۔ میں اسے پیتے ہوئے دیکھوں گی اور پھر اسی کے ساتھ کھانا کھالوں گی۔

کرشن چندر پینے بیٹھا تو اس کے سامنے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ، مہذب اور نہایت شائستہ گفتگو کرنے والی ایک خاتون بیٹھی تھی۔ کبھی کبھی سرلا کمرے میں آجاتی تھی۔ کرشن آج نہایت شگفتہ موڈ میں تھا۔ عام طور پر وہ چار پیگ سے زیادہ نہیں پیتا لیکن آج اس نے دو پیگ زیادہ پی لیے۔

"بس کیجیے۔ آپ چھ پیگ پی چکے ہیں" سلمٰی نے اسے ٹوکا۔

"کیا خبر، تمہارے ساتھ بیٹھنا کب نصیب ہو۔ سوچتا ہوں جتنی پینی ہے آج پی لوں۔"

"بس کیجیے۔ ایسے مواقع پھر بھی آئیں گے۔"

"وعدہ؟"

"وعدہ رہا۔"

"چلو، پھر ٹھیک ہے۔ سرلا سے کہو کھانا لے آئے۔ تم بھی میری وجہ سے بھوکی بیٹھی ہو۔"

سرلا کھانا لے آئی اور دونوں نے مل کر کھانا کھایا۔

کھانے کے بعد اس نے سرلا کی مدد سے کرشن کو اس کے کمرے میں پہنچایا اور خود سرلا کے ساتھ بستر پر دراز ہوگئی۔

"کرشن جی کی ان کی بیوی سے کیوں نہیں بنتی؟" سلمیٰ نے سرلا سے پوچھا۔

"کچھ نہ پوچھو دیدی! کرشن بھیا کی تو قسمت ہی پھوٹ گئی۔ ودیا بھابی ان کے لائق نہیں ہیں۔ اب تو ماتا جی کو بھی افسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے کیسی لڑکی کا ہاتھ بھیا کے ہاتھ میں تھمادیا۔"

اس کے بعد نہ سرلا نے کچھ کہا نہ سلمیٰ نے کچھ پوچھا۔ شاید دونوں سوگئی تھیں، شاید دونوں نہیں سوئی تھیں۔

دوسرے دن دوپہر کے بعد سلمیٰ اس گھر سے روانہ ہوگئی جیسے سخت سردی ہو اور دھوپ رخصت ہوجائے۔

سلمیٰ صدیقی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور جانی پہچانی ادیبہ تھی اور اس کا خاندان علی گڑھ ہی نہیں بلکہ ہندوستان بھر کے ادبی حلقوں میں عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

کرشن چندر کا شمار بھی چوٹی کے افسانہ نگاروں میں ہوتا تھا۔ عوام وخواص میں اس کی نگارشات کو قبولیت حاصل تھی۔

دونوں اپنی اپنی ازدواجی زندگی سے نامطمئن اور نالاں تھے۔ کرشن کی اپنی بیوی سے نہیں بنتی تھی، سلمیٰ کی گھریلو زندگی اپنے شوہر کی وجہ سے ناآسودہ تھی۔ دونوں گردشِ دوراں کے ستائے ہوئے تھے اسی لیے ذہنی طور پر جلد ہی دونوں میں گہری ہم آہنگی ہوگئی۔

اس کے جانے کے بعد گھر میں کیا رہ گیا تھا۔ سب تھے لیکن تنہائی تھی۔ وہ اس تنہائی سے اکتا کر بمبئی واپس لوٹ گیا۔

○☆○

کرشن کی چھوٹی بیٹی الکا جب چھٹی جماعت میں تھی تو اچانک اس کے دماغ میں فتور پیدا ہوگیا۔ کچھ دنوں تو حالت قابلِ برداشت رہی۔ بس بیٹھے بیٹھے ہنسنے لگتی تھی یا رونے لگتی تھی لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا اس کی حالت بگڑتی گئی۔ اس دوران میں علاج بھی ہوتا رہا لیکن کوئی افاقہ نہیں ہوسکا۔ اس مرتبہ جو وہ دہلی سے بمبئی لوٹا، تو الکا کے بجائے ایک مکمل پاگل لڑکی کے وجود نے اسے دہلا دیا۔ اب اس کا پاگل پن تشدد پر اُتر آیا تھا۔ چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینکتی تھی۔ کچھ نہیں تو اپنے بال نوچتی تھی۔ اسے رسیوں سے باندھ کر رکھا گیا تھا۔

جوان لڑکی پاگل ہوجائے اور وہ بھی ایسی کہ گالیاں بکتی رہے، مارپیٹ پر اُتر آئے۔ کرشن کے لیے کیا کسی باپ کے لیے بھی عذاب سے کم نہیں تھا۔

کرشن ہر مشکل سے لڑتا رہا تھا لیکن بیٹی کی حالت نے اسے توڑ دیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"نہ جانے میں نے کون سا پاپ کیا ہے جس کی سزا میری بچی کو مل رہی ہے۔"

بمبئی بڑا شہر تھا۔ بڑے بڑے ڈاکٹر موجود تھے۔ ہر سہولت حاصل تھی۔ وہ اپنی بچی کو لے کر ایک ایک ڈاکٹر کے دروازے پر گیا، ہر اسپتال کی خاک چھانی۔ جتنی جمع پونجی تھی سب اس بچی کے علاج پر لگادی لیکن بہتری کی کوئی صورت نظر نہ آئی تھی۔ یہ احساس کہ الکا کا مرض لاعلاج ہے، اس کے لیے اذیت ناک احساس تھا۔

بمبئی کا ہر ڈاکٹر ایک ہی نتیجے پر پہنچا تھا کہ الکا کو رانچی کے پاگل خانے میں داخل کرادیا جائے۔

اس مایوسی کے بعد کرشن کا دل گوارا نہیں کرتا تھا کہ اپنے جگر کے ٹکڑے کو پاگل خانے کے حوالے کردے۔

اسے کسی نے بتایا کہ دہلی کے پاگل خانے میں ایک نیا ڈاکٹر امریکا سے آیا ہے۔ وہ الکا کو دہلی لے گیا۔ اپنے کام کاج چھوڑ کر وہ دہلی میں پڑا رہا۔ سلمیٰ بھی ایک دو مرتبہ عیادت کے لیے دہلی آئی۔ احباب بھی ہر دلداری ہمدردی کے لیے موجود تھے لیکن کرشن کی حالت دیکھی نہیں جارہی تھی۔ وہ حساس فنکار تھا۔ بیٹی کے غم میں خود اس کی حالت پاگلوں جیسی ہوگئی تھی۔ الکا تو ڈاکٹروں کے حوالے تھی اور وہ دن دن بھر سڑکوں پر نظر آتا تھا۔ ناشروں کے دفتروں کے چکر کاٹ رہا تھا، ان ملنے والوں کو ڈھونڈتا پھر رہا تھا جو علاج کے لیے رقم کا بندوبست کرسکتے تھے۔ اس کے لباس پر کبھی شکن نہیں ہوتی تھی، اب اسے لباس بدلنے کا ہوش نہیں تھا۔ احباب کو یہ فکر تھی کہ کہیں بیٹی کے بعد باپ بھی پاگل نہ ہوجائے۔

ڈیڑھ مہینے کے مسلسل علاج کے بعد یہاں کے ڈاکٹروں نے بھی یہی فیصلہ کیا کہ اسے رانچی کے پاگل خانے میں داخل کرادیا جائے۔

اس نے ضروری رقم کا بندوبست کیا اور الکا کو لے کر رانچی پہنچ گیا۔ اس کے افسانہ نگار دوست یہاں بھی موجود تھے۔ رہنے کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ ایک دوست کے گھر

ٹھہرا اور الکا کو لے کر رانچی کے پاگل خانے پہنچ گیا۔

ڈاکٹروں نے رائے دی کہ مریضہ کی حالت پر دو ماہ تک تحقیق ہوگی اور اس کے بعد مستقل طریقۂ علاج کی بابت فیصلہ کیا جائے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آپریشن کرنا پڑے۔

کرشن نے الکا کو اسپتال کے حوالے کیا اور خود بمبئی واپس آگیا۔

وہ تو قلم سے روزی کما رہا تھا۔ ان پریشانیوں میں مبتلا ہوا تو فلمی کام بھی بند ہوگیا، ادبی کام بھی۔ جب دماغ ہی بند ہو تو تخلیق کا دروازہ کیسے کھلے۔

نہ لکھتا تو گھر کیسے چلتا، الکا کا علاج کیسے ہوتا۔ وہ آنسوؤں کو روشنائی بنا کر پھر لکھنے بیٹھ گیا۔

ان دنوں کوور لاج میں بڑا ہیبت ناک سناٹا تھا۔ ودیا وتی اپنی خالی خالی آنکھوں سے دیواروں کو تکتی رہتی تھی۔ الکا کی بڑی بہن کپیلا، بہن کو یاد کرکے روتی رہتی تھی۔ سلمیٰ کے خط آرہے تھے لیکن وہ خود بمبئی نہیں آئی۔ کرشن کو یہ دکھ بھی تھا۔

ابتدائی رپورٹیں حوصلہ افزا نہیں تھیں۔ اب الکا کو مکمل صحت یابی تک رانچی کے پاگل خانے میں رہنا تھا۔

اس ناگہانی افتاد نے اسے صرف جذباتی صدمہ نہیں پہنچایا تھا بلکہ وہ مالی طور پر بھی زیر بار ہوا تھا۔ اسے یہ نقصان پورا کرنا تھا۔ وہ سخت محنت کر رہا تھا۔ اس جدوجہد میں طویل عرصے تک وہ سلمیٰ سے نہیں مل سکا لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ اس کے خیال سے غافل رہا ہو۔

اسے معلوم تھا کہ علی گڑھ کے گرلز کالج میں گرمیوں کی چھٹیاں ہوئی ہوں گی۔ اس نے سلمیٰ کو لکھا کہ تبدیلی آب و ہوا کے لیے کسی پہاڑی مقام پر چلا جائے اور وہ مسوری پہنچ گئے۔

اس کے بعد تو ہر جگہ سلمیٰ اور کرشن ساتھ ساتھ دیکھے جانے لگے۔ عالمی میلے، وگیان بھون دہلی میں ہونے والے سیمینار، کوئی سمیلن، وزرا اور امرا کے ڈنر، ہر جگہ وہ اور سلمیٰ ایک ساتھ نظر آتے تھے۔

اب ان کا عشق کسی سے چھپا ہوا نہیں تھا۔ ممکن ہے اس کے گھر والوں کو بھی علم ہو۔ سلمیٰ کسی احتیاط کا خیال نہیں رکھ رہی تھی۔ کرشن بڑا افسانہ نگار تھا اور وہ اس کی ادبی پرستار۔ کم از کم وہ ہر پوچھنے والے سے یہی کہتی تھی لیکن بات اس سے کہیں آگے جا چکی تھی۔

دھند میں لپٹی ہوئی شامیں، چاندنی راتیں، نور میں نہائی ہوئی صبحیں۔ کون سے لمحات تھے جو انہوں نے ایک ساتھ نہیں گزارے۔ ادبی تقریبات کے بہانے وہ دونوں شہروں شہروں گھومتے رہے، ہوٹلوں میں ٹھہرتے رہے۔ حرفِ مطلب بار بار زبان پر آیا لیکن دونوں ایک کیسے ہوسکتے تھے۔ وہ دونوں تو دریا کے دو کنارے تھے۔ ایک ہندو، ایک مسلمان۔

سلمیٰ تو اب یہ سوچنے لگی تھی کہ جتنی دور وہ آگئی ہے بس وہی بہت ہے، واپس لوٹ جائے۔ برسوں پر پھیلا ہوا یہ سفر تشنہ ہی سہی، محبتیں یوں بھی تو ہوا کرتی ہیں۔ وہ یہ سوچ رہی تھی لیکن کرشن چٹان کی طرح اپنی جگہ کھڑا تھا۔ اسے اپنے جذبۂ عشق پر کامل بھروسا تھا۔ وہ سلمیٰ کو رفیقۂ حیات بنانے پر مصر تھا۔ سلمیٰ کے بار بار انکار کے باوجود وہ بضد تھا۔

اس نے اپنے فیصلے کے پہلے مرحلے میں اپنی بیوی ودیا وتی اور بچوں کو بمبئی میں چھوڑا اور بمبئی کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیا۔ یہ اس کے طوفانی عشق کا پہلا ہیجانی فیصلہ تھا۔

اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ سلمیٰ سے شادی کرنے کے بعد بمبئی سے دور جہاں اس کی بیوی رہتی ہے، دلی میں رہے گا۔ دلی پہنچتے ہی اس نے ماڈل ٹاؤن کے علاقے میں اپنے مربی لالہ کشن لال کے توسط سے ایک مکان کرائے پر لے لیا۔

اس کی یہ ساری کارروائیاں یک طرفہ تھیں۔ ابھی سلمیٰ کی طرف سے رضامندی کا اشارہ نہیں ملا تھا۔ کرشن کو اپنے جذبے پر اتنا اعتماد تھا کہ اپنی رضا کو سلمیٰ کی رضا سمجھتا تھا۔

اب ان دونوں کی ہر ملاقات کسی فیصلے پر پہنچنے کے لیے ہو رہی تھی۔ دونوں کی اپنی اپنی مجبوریاں تھیں۔ یہ مجبوریاں اتنی پیچیدہ تھیں کہ دو عقل مند انسان انہیں سلجھانے میں لگے ہوئے تھے لیکن یہ الجھتی چلی جا رہی تھیں۔

سلمیٰ کا شوہر تھا جس سے طلاق لینے کا مسئلہ درپیش تھا۔ کیا خبر اس میں کیسی کیسی جگ ہنسائی ہو۔ بیٹا تھا۔ طلاق کے بعد اسے اپنی تحویل میں لینے کے لیے کتنے پاپڑ بیلنے پڑیں گے۔ ماں باپ، خاندان والوں کے دباؤ اور سخت مزاحمت کا سامنا۔ پھر مذہب کی سنگین دیوار حائل تھی۔ زمانہ کیا کہے گا۔ کرشن گمنام آدمی نہیں ہیں۔ ان کی شادی کی دھوم پورے برصغیر میں مچے گی۔

کرشن چندر کے سامنے بھی کم سوال نہیں تھے۔ اس کی بیوی موجود تھی جس سے ہندو قانون کے مطابق طلاق نہیں ہوسکتی تھی۔

ایک لڑکا اور دو لڑکیاں تھیں۔ ان کی تعلیم و تربیت اور شادی بیاہ کا انتظام بھی کرنا تھا۔ کیا وہ دو گھروں کے اخراجات

کا کفیل ہوسکے گا؟ مذہب کا سوال اس کے سامنے بھی تھا کیا سلمیٰ اپنا مذہب تبدیل کرسکے گی؟ ودیاوتی کے ردِ عمل کا سامنا کرسکے گا؟

یہ سوال کئی مرتبہ ان دونوں کے سامنے آئے تھے اور ہر مرتبہ کسی نتیجے پر پہنچے بغیر دم توڑ گئے تھے۔ سلمیٰ کی باتوں سے لگتا تھا کہ وہ سخت اذیت سے گزر رہی ہے اور امکانی پریشانیوں کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہوگئی ہے لیکن وہ ہر جنگ لڑنے کے لیے تیار تھا۔ اس نے ساری کشتیاں جلادی تھیں۔ بمبئی کو خیرباد کہہ کر دہلی میں ڈیرا جمالیا تھا۔ اب وہ واپس بمبئی جانا نہیں چاہتا تھا۔

کسی فیصلے پر پہنچنے کے بعد اس نے سلمیٰ کو لکھنؤ بلالیا۔

لکھنؤ کے کارلٹن ہوٹل میں اس کا کمرا ایک تھا۔ وہ سلمیٰ کے آنے سے ایک دن پہلے ہی وہاں پہنچ گیا تھا۔ سلمیٰ کو علی گڑھ سے آنا تھا۔ شہر میں کسی ادیب کو معلوم نہیں تھا کہ کرشن آئے ہوئے ہیں ورنہ اس کے کمرے میں بھیڑ لگ جاتی۔

وہ اسے لینے اسٹیشن بھی نہیں گیا تھا۔ آج وہ پہلی مرتبہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی سلمیٰ کو اس کے ساتھ دیکھے۔

سلمیٰ کو رات کی گاڑی سے آنا تھا۔ سب انتظامات اسی لیے تھے کہ کسی کی نظر نہ پڑے۔ وہ گرم کپڑوں میں لپٹا کارلٹن ہوٹل کے وسیع و عریض ہال میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ ہزار وسوسے اسے گھیرے ہوئے تھے۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے وہ نہ آئے اور وہ آگئی۔ ٹیکسی سے اترنے والی عورت سلمیٰ ہی ہوسکتی تھی اور وہ سلمیٰ ہی تھی۔

"شکر ہے تم آگئیں۔"

"ہوسکتا ہے یہ ہماری آخری ملاقات ہو۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"اب راستے میں تو مت لڑو۔"

"آؤ کمرے میں چلتے ہیں۔"

دونوں باتیں کررہے تھے لیکن دونوں کے لہجے مفلس کے چراغ کی طرح بجھے ہوئے تھے۔

کچھ دیر کمرے میں بیٹھ کر باتیں ہوتی رہیں، اس کے بعد دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہوٹل کے لان میں نکل آئے۔ پورے دنوں کے چاند نے اداس چاندنی کا تحفہ بھیجا ہے۔

"تو یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے" کرشن نے پوچھا۔

"ہاں، یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔"

"کوئی فیصلہ آخری فیصلہ نہیں ہوتا" کرشن نے مضبوط لہجے میں کہا "جس طرح کوئی قتل آخری قتل نہیں ہوتا۔"

"نہیں، یہ کسی طرح ممکن نہیں۔"

"بیوقوف نہ بنو" کرشن نے پیار سے اسے ڈانٹا "مجھے زندگی کا تجربہ تم سے کہیں زیادہ ہے۔ ہم ضرور اکٹھے رہیں گے، رہ سکتے ہیں۔"

"بڑی کٹھنائیاں ہیں۔"

"کٹھنائیاں کہاں نہیں ہوتیں؟"

"دنیا کیا کہے گی؟"

"دنیا نے کب کسے کیا نہیں کہا۔"

"میرا بھی ایک بچہ ہے۔ تمہارے بھی بچے ہیں۔"

"محض اتنا ہی نہیں۔ تمہارے بھی ماں باپ ہیں اور میری بھی ماں ہے۔ تمہارا بھی ایک پتی ہے اور میری بھی ایک پتنی ہے۔ تمہارا بھی ایک دھرم ہے اور میرا بھی ایک دھرم ہے۔"

"تو یہ کیا معمولی باتیں ہیں؟"

"میرے پیار کے سامنے سب معمولی باتیں ہیں۔"

"میں مسلمان ہوتے ہوئے ایک ہندو سے کیسے شادی کرسکتی ہوں؟"

"تو تم ہندو ہوجاؤ۔"

"یہ میں نہیں کرسکتی۔"

"تو میں مسلمان ہوجاتا ہوں۔ تم جانتی ہو مذہب میرے لیے کبھی مسئلہ نہیں رہا۔ میں ایک لبادہ اتار کر دوسرا پہن لوں گا۔"

"کرشن اس کے علاوہ بھی کئی مسئلے ہیں۔ دنیا نہیں مانے گی کہ تم مسلمان ہوگئے۔"

"نہ مانے مگر میں تمہیں حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی کرسکتا ہوں۔"

"کرشن، میں کس کس سے لڑوں گی۔"

"میں جو ہوں تمہارے ساتھ۔"

"تمہاری بیوی؟"

"وہ تمہارے ساتھ نہیں رہے گی۔ وہ میرے ساتھ نہیں رہے گی۔ اتنے دن میں اکیلا رہا ہوں، اب وہ اکیلی رہے گی۔"

سلمیٰ کے دل کا پتھر پگھلنے لگا تھا۔ اب اس کے پاس کوئی دلیل نہیں تھی۔ سرجھکائے خاموش کھڑی تھی۔

"پھر کیا سوچا۔"

"میں خورشید منیر سے طلاق لے لوں گی۔"

"اور تمہارے گھر والے؟"

"جب میں نے سوچ ہی لیا ہے تو پھر جو بھی ہو۔"
"مجھے تم سے یہی امید تھی۔"
جس خاموشی سے سلمٰی آئی تھی، صبح ہوتے ہی اسی خاموشی سے رخصت ہوگئی۔ کسی کو معلوم ہی نہ ہوسکا کہ اس ایک رات میں کتنا بڑا فیصلہ ہوگیا۔

سلمٰی اپنے قول میں سچی نکلی۔ اس نے اپنے شوہر سے باقاعدہ طلاق لے لی اور بچے کو اپنی تحویل میں لے لیا اور کرشن چندر کو اطلاع دے دی۔

کرشن چندر نے بھی اپنی بیوی اور گھر والوں کو اپنے فیصلے سے آگاہ کردیا۔ اپنی پہلی بیوی سے علیحدگی اختیار کرلی۔ بچوں کی دائمی کفالت اس کی ذمے داری تھی۔

سلمٰی نے اپنا فیصلہ اپنے گھر والوں کو سنایا تو قیامت آگئی۔ رشید احمد صدیقی کسی قیمت پر اس کے فیصلے کو ماننے کو تیار نہیں تھے لیکن اس نے اپنی ماں کو یہ کہہ کر مطمئن کرلیا کہ کرشن چندر اس کے لیے اپنا مذہب چھوڑنے پر تیار ہیں۔

آخر وہ ساعت آپہنچی۔ سلمٰی اپنی والدہ کے ساتھ نینی تال پہنچ گئی۔ جہاں یہ شادی ہونے والی تھی۔

سلمٰی کی والدہ نے نینی تال پہنچتے ہی یہ شرط رکھ دی تھی کہ شادی اسلامی رسوم کے مطابق ہوگی۔ کرشن کو کب انکار تھا۔ پہلے اس کا اسلامی نام "اللہ رکھا" رکھا گیا جو اسے پسند نہ آیا۔ پھر وقار الملک کے نام سے مشرف بہ اسلام ہوا۔ وہ سلمٰی کو حاصل کرنے کے لیے نام کی حد تک وقار الملک بن گیا جس طرح نام کی حد تک کرشن چندر رہا۔

سلمٰی کی والدہ نے جو اس وقت موجود تھیں، بنارس کے رواج کے مطابق سلمٰی کے ماتھے پر بندیا لگائی اور مہارانی صاحبہ جہانگیر آباد اور دیگر دوستوں کی موجودگی میں جہانگیر آباد پیلس میں ان کا نکاح ہوگیا۔ اکیاون ہزار مہر بندھا۔

کرشن چندر اور سلمٰی صدیقی بڑے البیلے اور انوکھے میاں بیوی ثابت ہو رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے عاشق بھی تھے، محبوب بھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہ دو جسموں کا نہیں، دو بھٹکتی ہوئی روحوں کا ملاپ ہو۔ دونوں میں اتنی زیادہ ذہنی ہم آہنگی تھی کہ اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے زندگی کی رنگینیوں اور رعنائیوں سے لطف حاصل کرتے رہے۔ سلمٰی نے اس کی زندگی ہی بدل کر رکھ دی۔ اس کا خیال بچوں کی طرح رکھتی، وہ بھی جواب میں اس کے دکھ درد کا ساتھی بنا ہوا تھا۔ گھر میں دعوتیں ہوتیں، دوست جمع ہوتے تو کرشن کو ویسی شرمندگی نہ ہوتی جیسی ودیا وتی کی موجودگی میں ہوتی تھی۔ اب وہ بہترین میزبان کے فرائض انجام دے رہی تھی۔

سلمٰی کے آنے سے پہلے کرشن کے لکھنے کے لیے کوئی میز تک نہیں تھی۔ سلمٰی نے اس کے لکھنے پڑھنے کا اہتمام کیا۔ اسے اتنی ذہنی فرصت دی کہ وہ بے فکر ہو کر تخلیقی کام کرسکے، غرض سلمٰی کے آنے کے بعد کرشن کی دنیا ہی بدل گئی۔

سوہن راہی انگلستان سے ہندوپاک کلچرل کانفرنس میں شرکت کے لیے دہلی آئے ہوئے تھے۔ وہ ابراہیم جلیس کے ساتھ کرشن چندر سے ملنے بھی آئے۔ اس کی مہمان نوازی ضرب المثل تھی۔ اس کے دوست آئے تھے۔ ان کی خاطر داری اس پر فرض تھی۔ وہ انہیں کھانا کھلانے ایک ہوٹل میں لے گیا۔

"معاف کیجیے گا، مجھے ایک کام یاد آگیا ہے۔ آپ لوگ بیٹھیں، میں ابھی آتا ہوں۔"

"واہ، یہ کیا بات ہوئی۔ ہمیں بٹھا کر خود جا رہے ہو۔"

"بس بات ہی ایسی ہے۔ یوں گیا اور یوں آیا۔"

کرشن نے ہوٹل سے نکلتے ہی ٹیکسی پکڑی اور اپنے ایک دوست کے گھر پہنچ گیا۔

"یار، کچھ دوست آگئے ہیں۔ انہیں کھانا کھلانا ہے۔ کچھ پیسے ہوں گے تمہارے پاس؟"

"کتنے؟"

"سو روپے میں کام چل جائے گا۔"

"کیا ابھی چاہییں؟"

"ہاں، انہیں ہوٹل میں بٹھا کر تمہارے پاس آگیا ہوں۔"

"جب تمہارے پاس پیسے نہیں تھے تو انہیں ہوٹل لے کر ہی کیوں گئے؟"

"اب انہیں تو یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔"

اس دوست نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور سو روپے اسے دے دیے۔

سوہن راہی اور ابراہیم جلیس کو یہ معلوم بھی نہ ہوسکا کہ وہ کس کام سے باہر گیا تھا۔

دوست تو خوش ہو کر چلے گئے لیکن وہ گھر پہنچ کر بہت دیر تک سوچتا رہا کہ سلمٰی کی محبت میں اسے خیال ہی نہیں رہا۔ تنگ دستی یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ آج مجھے دو دوستوں کی دعوت کے لیے ایک تیسرے دوست سے ادھار لینا پڑا۔ اس نے اب جو غور کیا تو دور دور تک امید کی کوئی کرن نہیں تھی۔ دہلی اس کے لیے بنجر زمین کی طرح تھی جو اس کے اخراجات کی کفیل نہیں ہوسکتی تھی۔

اس نے سامانِ سفر باندھا اور بمبئی واپس جانے کی ٹھانی۔ اس کی پہلی بیوی اپنے بچوں کے ساتھ بمبئی والے مکان میں رہ رہی تھی۔ وہ سلمٰی کو لے کر اس گھر میں نہیں جا سکتا تھا۔ وہ بار بار اس دور کو یاد کر رہا تھا جب وہ ایسے ایسے کئی گھر خرید سکتا تھا لیکن اس نے ساری خوش حالی شراب میں بہا دی اب سلمٰی کو دینے کے لیے اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔

بمبئی پہنچ کر اس کے سامنے دو مسئلے تھے۔ کام کی تلاش اور رہنے کا ٹھکانا۔ مکان کا مسئلہ تو یوں حل کیا کہ ایک ہوٹل میں قیام کر لیا اور کام کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔

فلمی دنیا کی حقیقت اس پر اب کھلی۔ وہ احباب جو اس کے چمکتے ہوئے دور میں اس سے ملنے کے بہانے ڈھونڈتے تھے، وقت بگڑا تو اب ملنے سے بھی کتراتے تھے۔ ایک سلمٰی تھی جو اس کا حوصلہ بڑھا رہی تھی۔ دو سال کی غیر حاضری سے فلمی دنیا سے اس کے روابط ختم ہو چکے تھے۔ ان روابط کو بحال کرنے کے لیے اسے سخت جدوجہد کا سامنا تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ اس بے وفا شہر کو چھوڑ کر کسی اور طرف نکل جاتا لیکن سلمٰی اس کے پاؤں کی زنجیر بنی ہوئی تھی۔ وہ یہیں رہ کر کچھ کرنا چاہتا تھا۔

اس کی جدوجہد کام آئی اور اسے فلموں میں پھر سے کام ملنے لگا۔ آہستہ آہستہ اس کے قدم جم گئے.... زندگی پھر سے مسکرانے لگی۔

اس کی دونوں بیویاں ایک شہر کے دو الگ الگ مکانوں میں رہ رہی تھیں۔ ایک کے ساتھ کرشن رہ رہا تھا، دوسرے کے ساتھ اس کے بچے لیکن وہ پہلی بیوی سے غافل نہیں تھا۔ اس سے علیحدگی اختیار کر لی تھی لیکن ہر ماہ باقاعدگی سے ایک معقول رقم پہلی بیوی کو بھیجتا تھا۔

اس نے پہلی بیوی کی کفالت سے منہ نہیں موڑا تھا لیکن وہ اس کانٹے کو اپنے دل سے نہیں نکال سکی کہ کرشن نے سلمٰی سے شادی کر لی ہے۔ حسد کی آگ میں جلتے ہوئے اس نے کرشن اور سلمٰی پر فوجداری مقدمہ دائر کر دیا۔

کرشن پر الزام لگایا گیا تھا کہ اس نے پانچ سال قبل مہندر ناتھ (کرشن کا بھائی) کے فلیٹ میں سلمٰی صدیقی سے ہندو رسم و رواج کے مطابق شادی کر لی تھی۔ یہ شادی ایک بیوی کی موجودگی میں ایک غیر قانونی فعل تھا۔

اس مقدمے کے دائر ہوتے ہی کرشن اور سلمٰی کے وارنٹ نکل گئے۔

ان دونوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ضمانت پر رہائی تو عمل میں آ گئی لیکن مقدمہ عدالت میں پہنچ گیا۔

یہ الزام ہی سراسر غلط تھا۔ اس کی شادی کو پانچ سال نہیں صرف دو سال ہوئے تھے اور یہ شادی ہندو رسم و رواج کے مطابق نہیں ہوئی تھی۔ اس کے پاس نکاح نامہ اور تمام ثبوت موجود تھے۔

ودیا وتی نے بھی جھوٹے گواہ تیار کیے تھے جنہوں نے کرشن کے خلاف گواہی دی۔

۱۶ جولائی ۱۹۶۳ء کو اس مقدمے کی پہلی پیشی ہوئی اور پھر چند پیشیوں میں جھوٹ ظاہر ہو گیا۔

کرشن نے نکاح نامہ اور دوسرے ثبوت پیش کر کے نجات حاصل کر لی۔

کرشن نے اپنے بھائی کو خط لکھا۔

"اب تم خود سوچ لو یہ عورت (ودیاوتی) کیسی ہے اور ماں جی کو بھی بتا دو جو دن رات ودیاوتی کے غم میں گھلی جاتی ہیں۔"

وہ خود بھی جانتا تھا کہ وہ کیسی عورت ہے لیکن اس مقدمے کے بعد بھی اس نے ودیاوتی اور اپنے بچوں کی کفالت سے دستبردار ہونا یا کوئی انتقام لینا پسند نہیں کیا۔ یہی نہیں بلکہ اپنی دو تہائی تصنیفات کی رائلٹی کا حق دار ودیاوتی کو قرار دیا تاکہ اس کے بعد اسے کسی کا دستِ نگر نہ ہونا پڑے۔

تینوں بچوں کی تعلیم و تربیت کی طرف پوری توجہ دی۔ بڑی بیٹی کے لیے خود رشتہ ڈھونڈا اور شادی کرائی۔ معذور بیٹی کے لیے ایک ٹرسٹ قائم کیا۔ بیٹے کی شادی بھی اس نے ہی کرائی۔

اسے ۱۹۶۲ء میں "سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ" عطا کیا گیا۔

اس اعزاز میں اس کی پندرہ دن کی روس کی سیر و سیاحت بھی شامل تھی۔ کرشن تو سلمٰی کے بغیر ادھورا تھا۔ اس نے سلمٰی کو ہمراہ لے جانے کے لیے روسی سفارت خانے سے اجازت چاہی جو اسے مل گئی اور وہ روس کی چوتھی ادبی کانفرنس میں شرکت کے لیے سلمٰی کے ہمراہ ماسکو روانہ ہو گیا۔

پہلی شام جب کرشن اور سلمٰی ڈنر کے لیے ہوٹل ماسکو کے وسیع ڈائننگ ہال میں کھانے کے لیے پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ ہر ملک کے نمائندے کے لیے ایک میز آراستہ ہے جس پر اس ملک کا چھوٹا سا جھنڈا لہرا رہا ہے۔ تقریباً تیس میزوں کے فاصلے پر پاکستان کی میز تھی۔ پاکستان کی نمائندگی فیض احمد فیض کر رہے تھے۔ وہ منظر دیدنی تھا جب فیض اور کرشن کی نظروں نے ایک دوسرے کا بوسہ لیا۔ دونوں درمیان کی کسی میز پر مل گئے۔ انہوں نے اپنے اپنے جھنڈے

اس میز پر رکھ دیے اور ایک دوسرے کے گلے مل گئے۔ سارا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

"کیا سمجھتے ہیں یہ لوگ۔ کیا ہم لوگ بھی اپنے بغض و عناد رکھنے والے سیاست دانوں کی طرح ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ ادب میں یہ دشمنی نہیں چلتی اور کاش کبھی نہ چلے۔"

"مگر اس بدقسمتی کو کیا کہئے کہ تمہاری میری ملاقات اب نہ ہندوستان میں ہوتی ہے نہ پاکستان میں۔ ہوتی ہے تو ماسکو میں۔"

"ان لوگوں کو چاہیے' اپنی روسی ادیبوں کی کانفرنس ہر سال کیا کریں۔"

وہ دونوں ہنسنے لگے۔ پھر جام سے جام ٹکرانے لگے۔ دو جھنڈے ساتھ ساتھ لہرانے لگے۔

اس کانفرنس کے بہانے اسے دنیا بھر سے آئے ہوئے اشتراکی ادیبوں سے ملنے کے مواقع ملے۔ روس کے تاریخی اہمیت کے مقام کو محقق کے ذہن سے پرکھا اور اپنے دائرۂ علم و دانش کو نئی وسعتوں سے ہم کنار کیا۔

ماسکو سے وہ دونوں ہنگری کی سیاحت کو نکل کھڑے ہوئے۔ وہاں انہوں نے نہ صرف قابل دید مقامات اور مصوری اور مجسمے سازی کے نوادرات دیکھے بلکہ ملک کی سماجی معاشی' ثقافتی زندگی کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ ان معلومات نے اس کے افسانوں کو ایک نئی زندگی سے آشنا کیا۔

○☆○

کرشن سے شادی کرنے کے بعد سلمیٰ بہت سے رشتوں سے بچھڑ گئی تھی۔ اس کے باپ رشید احمد صدیقی نے اس رشتے کو کبھی دل سے قبول نہیں کیا بلکہ انہیں اس بات کا دکھ تھا کہ سلمیٰ نے کرشن سے شادی کرلی۔ اس دکھ نے انہیں اتنی تکلیف پہنچائی کہ انہوں نے گھر سے نکلنا' احباب سے ملنا تک کم کردیا۔ اپنے ایک دوست کو خط لکھتے ہوئے انہوں نے لکھا۔

"میرے لیے اب زندگی میں کیا رہ گیا ہے۔ منہ لپیٹے گھر میں پڑا رہتا ہوں۔"

انہیں اس شادی سے دلی اذیت پہنچی تھی۔ بیٹی کی محبت میں وہ کبھی کبھی اسے خط لکھ دیا کرتے تھے لیکن کرشن کو انہوں نے کبھی داماد نہیں سمجھا۔ وہ اس کا نام لینا تک گوارا نہیں کرتے تھے۔

گجرال کمیٹی کے ایک اجلاس کے دوران میں کرشن نے گیان چند سے اپنے اس دکھ کا اظہار کیا۔

"رشید صاحب کبھی میرا نام لینے کے روادار نہیں۔ میرا نام بمبئی رکھ چھوڑا ہے۔ سلمیٰ کو خطوط میں یہ لکھ کر پوچھتے ہیں۔ "بمبئی والوں کا کیا حال ہے؟ بمبئی کا مزاج کیسا ہے؟" وغیرہ۔"

سلمیٰ کی والدہ البتہ کبھی کبھی بمبئی آکر سلمیٰ سے ملتی تھیں۔ کرشن ان کی ویسی عزت کرتا تھا جس کی وہ مستحق تھیں۔ وہ بھی حقیقی داماد کی طرح کرشن کا خیال رکھتی تھیں۔

یہ تو ہونا ہی تھا۔ سلمیٰ کو معلوم تھا یہ ہوگا لیکن کرشن جس چاؤ سے اس کا خیال رکھ رہا تھا' جس محبت کا برتاؤ کررہا تھا سلمیٰ کے لیے وہی بہت تھا۔ وقت کے ساتھ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ سلمیٰ اپنے دل کو تسلی دیے جارہی تھی۔

○☆○

ہنگری کی سیاحت سے لوٹنے کے بعد دعوتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ کبھی دوسرے اسے مدعو کررہے تھے کبھی اس کے گھر اہتمام ہورہا تھا۔

"واہ واہ! کیا مرغِ مسلم ہے۔ شامی کباب کا تو جواب نہیں۔ بریانی بھی مزے کی ہے مگر بھنا گوشت بے مثال ہے اور یہ شاہی ٹکڑے۔ جی چاہتا ہے انہی ٹکڑوں پر پڑے رہیے۔ یہ دہی بڑے ہیں۔ یہ تلی ہوئی مچھلی ہے۔"

سلمیٰ اسے منع کررہی ہے لیکن وہ کسی سرکش بچے کی طرح ایک ایک چیز کو چکھ رہا ہے۔

غذا کی طرف سے بے احتیاطی' شراب کی کثرت اور تھکن نے اسے بیمار ڈال دیا۔

۲۳ نومبر ۱۹۶۷ء کو اس پر دل کا شدید دورہ پڑا۔ مشہور ماہر امراض قلب ڈاکٹر وکیل کو فوراً طلب کرلیا گیا۔ سلمیٰ اسے اسپتال بھیجنے پر تیار نہیں تھی لہٰذا اس کی دیکھ بھال کے لیے دو نرسیں مقرر کردی گئیں۔ آکسیجن اور دوسرا سامان بھی گھر پر ہی مقرر کردیا گیا۔

ایک مہینے تک اس کی حالت تشویش ناک رہی اور پھر آہستہ آہستہ اس کی حالت سدھرنے لگی۔

تین مہینے کے علاج کے بعد وہ پھر سے معمولاتِ حیات میں مصروف ہوگیا۔

وہ صحت یاب ہوگیا تھا لیکن اس کی شخصیت کی جاذبیت رخصت ہونے لگی تھی۔ اس کے چمکیلے بال اس کی چندیا سے غائب ہوتے جارہے تھے۔ عینک کے موٹے موٹے کانچ کے ٹکڑوں کے پیچھے اس کی آنکھیں اندر کی طرف دھنس گئی تھیں۔ اس کے بشاش چہرے پر سوچ' پریشانی محنت اور دوڑ

دھوپ نے گہری لکیریں ڈال دی تھیں۔ اگر جوان تھا تو اس کا فن۔

اُردو ادب کے شاید ہی کسی دوسرے ادیب کو ایسی عزت ملی ہو جو اسے حاصل تھی۔ اس کے ہم عصر افسانہ نگار اس کی زبان سے اپنے لیے ستائش کا ایک کلمہ سننے کی خواہش کرتے تھے۔ وہ جہاں جاتا اس کے مداحین اس کی راہ میں آنکھیں بچھاتے تھے۔ آٹوگراف لینے والوں کا تانتا بندھ جاتا۔ انٹرویو لینے والے اسے چین نہیں لینے دیتے تھے۔ شہر میں ادبی نشستیں منعقد کی جاتیں جہاں اسے کہانیاں سنانی پڑتیں۔ حتیٰ کہ مشاعروں تک میں جہاں لوگ غزلیں سننے آتے ہیں اسے افسانہ پڑھنے کے لیے کھڑا کردیا جاتا۔

اس کی مروت اور عاجزی یہ گوارا نہیں کرسکتی تھی کہ کسی کا دل ٹوٹے۔ اس کی صحت جواب دے رہی تھی لیکن وہ اپنے مداحوں کی آواز پر محفل محفل، شہر شہر گھوم رہا تھا۔

۱۸ مارچ ۱۹۶۹ء کو اس کا پچپن سالہ جشن بمبئی کے برلا ہال میں بڑے اہتمام سے منایا گیا۔ اس جشن میں شرکت کے لیے اندرا گاندھی خاص طور پر دہلی سے تشریف لائی تھیں۔

اگلے دن کی رات ساڑھے چار بجے اس کی حالت اچانک بگڑ گئی۔ ڈاکٹروں نے اس کی حالت نازک بتائی اور اسپتال میں داخل کرانے کا مشورہ دیا۔

سلمٰی کو اسپتال کے نام سے وحشت ہوتی تھی۔ وہ رونے لگی اور اپنے فیملی ڈاکٹر سنگل سے کہا کہ ان کا علاج گھر پر ہی کیا جائے جیسا کہ پہلے دورے کے وقت کیا گیا تھا۔ اس کی خواہش کا اس مرتبہ بھی احترام کیا گیا۔

طویل بیماری کے دوران کئی نشیب و فراز آئے۔ حالت بگڑی، سدھری اور پھر بگڑی اور پھر سدھر گئی۔ قسمت نے یاوری کی اور چھ مہینے بستر پر پڑے رہنے کے بعد وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

ڈاکٹروں نے غذا پر خاص پابندی لگادی تھی۔ شراب کے لیے بھی منع کردیا تھا لیکن سلمٰی کی سخت نگرانی کے باوجود نہ شراب اس سے چھوٹ سکی نہ چٹپٹے کھانے۔ راتوں کو جاگنا بھی نہیں چھوڑ سکا اور دوستوں کی محفلیں بھی نہیں چھوٹ سکیں۔ قدردانوں کی فرمائشیں بھی پوری کرتا رہا۔

اس روز بھی آدھی رات تک دوستوں کے ساتھ رہا۔ کھانا بہت عمدہ تھا، شراب بہت اچھی تھی۔

"سب کچھ نوکروں میں مت بانٹ دینا۔ تھوڑے سے کباب اور بریانی میرے ناشتے کے لیے رکھ لینا۔ صبح اٹھ کر یہی ناشتا کروں گا" کرشن نے دوستوں کے رخصت ہونے کے بعد سلمٰی سے کہا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔

درد کی شدت سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ساڑھے چار بجے تھے۔ پھر گھبرا کر ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"ڈاکٹر صاحب، جلدی آیئے۔ مجھے دل کا دورہ پڑا ہے، بہت درد ہے۔"

آواز سن کر سلمٰی کی آنکھ کھل گئی۔ وہ ہڑبڑا کر بستر سے اٹھ گئی۔

"سلمٰی! مجھے لٹادو۔ دم گھٹ رہا ہے۔ بہت درد ہے۔"

پندرہ منٹ نہیں گزرے تھے کہ اس کا فیملی ڈاکٹر کے ایل سنگل پہنچ گئے۔

"تم ٹیلی فون پر احباب کو اطلاع کردو" کرشن نے سلمٰی سے کہا۔

تھوڑی دیر میں سردار جعفری، مجروح سلطان پوری، راہی معصوم رضا وغیرہ آگئے۔ یہ وہ لوگ تھے جو اسی رات اس کے پاس سے اٹھ کر گئے تھے اور اب حیران تھے کہ چند گھنٹوں میں یہ کیا ہوگیا۔

اس مرتبہ سلمٰی کی ضد نہیں چلی۔ کرشن کی حالت اتنی خراب تھی کہ اسے اسپتال میں داخل کرانا پڑا۔

کرشن کو انجکشن لگا کر سلا دیا گیا تھا۔ سلمٰی ایک خاموش تماشائی کی طرح کسی گہری سوچ میں بیٹھی تھی۔ شاید وہ ان یادوں کو تازہ کررہی تھی جو کرشن سے اس کی سترہ سالہ رفاقت سے وابستہ تھیں۔

یک لخت مشین میں خطرے کی گھنٹی بجی۔ کرشن نے گردن موڑ کر مشین کی طرف دیکھا۔ دونوں طرف خطرے کی روشنی چمک رہی تھی۔ بھگدڑ سی مچ گئی۔ کرشن کو اسٹریچر پر لٹادیا گیا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں جن میں حیرت تھی۔

"سلمٰی!"

"ہاں۔"

"اپنا ہاتھ دو۔"

"کیا بات ہے؟"

"میں نے ان لوگوں کو کہتے سنا ہے کہ میرے مرنے میں تھوڑی دیر باقی ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"اگر میرے پاس صرف اتنا ہی وقت ہے تو علاج میں ضائع مت کرو۔ تم میرے پاس رہو۔ میں اپنے دوستوں سے ملنا چاہتا ہوں۔ میرے سب دوستوں کو خبر کردو۔"

ڈاکٹروں نے اسے فی الحال مرنے نہیں دیا۔ آپریشن کرکے اس کے دل میں ایک آلہ (پیس میکر) لگا دیا گیا اور تقریباً ایک ماہ بعد وہ گھر آگیا۔

"ڈاکٹر صاحب، میں کباب اور پلاؤ کھا سکتا ہوں؟"

صحت یاب ہوتے ہی اچھے کھانوں کے لیے اس کی رال ٹپکنے لگی۔ احباب پہلے کی طرح آنے لگے۔ ہلاکت آفریں روش پھر سے اختیار کرلی۔

دسمبر ۷۶ء تک یہ سلسلہ چلتا رہا لیکن اس کے بعد اس کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ ہر چوتھے پانچویں روز نبض چلتے چلتے رک جاتی۔

پندرہ جنوری ۷۷ء کو سلمیٰ کے والد کا انتقال ہوگیا۔ کرشن نے اپنی بیماری کے باوجود ضد کرکے اسے علی گڑھ بھیجا۔

پندرہ دن بعد وہ واپس آئی تو اس نے کرشن چندر کو صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے دیکھا لیکن چہرے کی طرف دیکھ کر اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ چہرے پر زندگی کے آثار قطعی نہیں تھے۔

ایک ہفتہ ہنسی خوشی کٹ گیا۔ اس نے دو مزاحیہ مضمون بھی لکھے "ایک لڑکی بگھارتی ہے دال" اور "ایک عورتوں کا سال۔"

"چلو پھل لے آئیں" اس نے سلمیٰ سے کہا۔

"کسی اور کو بھیج دو۔"

"نکلو بھی یار اس چکر سے۔ تم لوگوں نے تو مجھے بیمار سمجھ لیا ہے۔"

بازار گیا۔ شاپنگ کی۔ مرغ لے کر آیا تھا۔ نوکر سے خاص ہدایت کے ساتھ پکوایا۔ کھانے کے بعد ٹی وی دیکھتا رہا اور پھر دوائیاں کھا کر سو گیا۔

"دل گھبرا رہا ہے ڈاکٹر صاحب! جلدی چلے آیئے۔"

پانچ منٹ بعد ہی وہ اپنے ڈاکٹر کو فون کرنے پر مجبور ہوگیا۔

اسے بمبئی اسپتال لے جایا گیا۔ اس کا بلڈ پریشر کم ہوگیا تھا جسے جلد ہی سنبھال لیا گیا۔

اگلے دن ایک بجے دوپہر تک مزے مزے کی باتیں کرتا رہا۔ چناؤ کی باتیں، سیاست اور دوستوں کی باتیں۔ ایک روسی خاتون آنٹش ان سے باتیں کرتا رہا۔

دو بجے دن کے قریب اس کا بلڈ پریشر صفر پر آگیا۔ اسپتال کا پورا عملہ اس کے علاج میں مصروف ہوگیا۔ بلڈ پریشر پھر نارمل ہوگیا۔

وہ فنکار جس نے زندگی سے والہانہ عشق کیا تھا، اب مایوس ہونے لگا تھا۔ اب موت سے لڑنے کی سکت اس میں نہیں تھی۔

اسے بجلی کے جھٹکے دیے جارہے تھے جس سے اس کا پورا جسم نیلا پڑ گیا تھا۔

"کوئی بات کرنی ہو تو کرلیں" ڈاکٹر نے کہا "پھر ہم انہیں بے ہوش کردیں گے ورنہ ان کے بھیانک درد ہوگا۔"

کرشن نے اپنا کانپتا ہاتھ بڑی مشکل سے سلمیٰ کی طرف بڑھایا "بس اتنا ہی ساتھ تھا۔ ویسے میں نے بھرپور زندگی بتائی۔ بس یہ دکھ ہے کہ تمہیں کوئی سکھ نہیں دے سکا۔"

ڈاکٹر نے نرس کو ٹیکا لگانے کا اشارہ کیا تو کرشن نے انگلی کے اشارے سے تھوڑی سی مہلت مانگی اور پھر رک رک کر سلمیٰ سے کہنا شروع کیا۔

"بمبئی میں مکان بڑی مشکل سے ملتا ہے۔ اگر ہوسکے تو گھر مت چھوڑنا۔ اگر حالات پر قابو نہ پاسکو تو پاکستان چلی جانا۔ وہاں میرے بہت سے دوست ہیں۔ تم وہاں اکیلی نہ رہو گی۔" پھر کچھ دیر توقف کے بعد اس نے کہا "سلمیٰ! میرے مرنے کے بعد تم جس طرح چاہو میری آخری رسومات ادا کرنا۔"

اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ دونوں ہاتھ بڑھا کر سلمیٰ کے گلے میں ڈال دیے اور آہستہ سے اپنا سر اس کے کندھے پر رکھ دیا۔ اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کرگئی۔

وہ بے مثال کہانیاں یتیم ہوگئیں جو اس کی تخلیق تھیں اور جنہیں وہی تخلیق کرسکتا تھا۔ افسانہ نگاری کے ماتھے کا جھومر اور مانگ کی افشاں۔ کرشن چندر اب اس دنیا میں نہیں تھا۔

اس کی ارتھی تیار ہوچکی تھی۔ ایک طرف قرآن خوانی ہو رہی تھی، ایک طرف وید اور گیتا کا پاٹھ ہو رہا تھا۔

سلمیٰ نے دو زانو بیٹھ کر آخری مرتبہ کرشن چندر کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیا اور پھر اس کے منہ پر منہ رکھ کر دہاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ کچھ اس طرح کہ اس کو سنبھالنا دشوار ہوگیا۔ بہ مشکل اسے خواب گاہ میں پہنچایا گیا۔ کرشن کے لکھنے کی میز پر اس کا چشمہ، نیلے رنگ کا پیڈ اور قلم پڑا تھا۔

"کرشن میرا ہم پیشہ بھی تھا ہم راز بھی۔ اسے پہلا کندھا میں دوں گا" راجندر سنگھ بیدی نے کہا "رام نام ست ہے۔"

ارتھی کو آگے سے راجندر سنگھ بیدی.... اور خواجہ احمد عباس نے اٹھایا اور پیچھے سے رامانند ساگر اور مجروح سلطان پوری نے۔ ہندو، مسلم، سکھ احباب نے اسے شمشان گھاٹ تک پہنچایا۔

اس کے بیٹے رنجن نے اپنے پتا کی چتا کو آگ دی اور کرشن کو شعلوں نے اپنی آغوش میں لے لیا۔

میر انیس

میر انیس

تحقیق و تحریر: ڈاکٹر ساجد امجد

اُردو ادب میں دیگر اصنافِ سخن کی طرح مرثیہ گوئی کا آغاز بھی اُردو شاعری کے ابتدائی دور سے ہی ہوگیا تھا مگر اس صنفِ سخن کو اوجِ کمال اُسی کے عہدِ زرّیں میں حاصل ہوا ــــ اور ایسا کہ متقدمین تو کیا متاخرین میں بھی آج تک کوئی اس کا ہمسر نظر نہیں آتا۔ اس کی معجز بیانی اور کمالِ فن کا اعتراف اپنوں نے ہی نہیں اس کے حریفوں نے بھی کیا جن سے ساری عمر اُس کی معرکہ آرائیاں رہیں۔ کہنے والے تو یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر وہ مرثیہ گوئی کی طرف متوجہ نہ ہوتا اور غزل کے میدان کا رُخ کر لیتا تو پھر شاید غالب کا یک سخت حریف ثابت ہوتا۔

اُردو مرثیہ گوئی کے آفتابِ عالم تاب میر ببر علی انیس کی سرگزشت

مسافر سمجھا منزل آگئی!

بازار لگا ہوا تھا۔ خرید و فروخت کی گرم بازاری تھی۔ انواع و اقسام کے پکوان، مٹھائیاں، شربت، کباب پراٹھے، بھُنا ہوا گوشت، پانی کے بتاشے، فالودہ اور نان خطائیاں۔ خریدار ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے۔

"بھائی، کیا چوک بازار یہی ہے؟"

"ابھی کہاں۔ ابھی تو آپ شہر پناہ کے دروازے میں بھی داخل نہیں ہوئے۔"

جب رات ایسی ہے تو چاند کیسا ہوگا۔ مسافر نے آنکھیں وہیں چھوڑ دیں اور قدم اٹھا دیے۔

شہر کے مغربی دروازے سے وہ شہر پناہ میں داخل ہوا۔ آنکھیں حیرت سے اور دل استعجاب سے بھر گیا۔ ہر نقشِ نظارہ دل میں اتر گیا۔ ہر طرف ناچنے اور گانے والے طائفے تھے جو خرد بیچتے، ہوش خریدتے تھے۔ گھڑیالوں کی صداؤں اور نوبت کی آوازوں سے کان بہرے تھے۔ لباسِ فاخرہ پہنے ہوئے، شرفائے دہلی سرگرمِ خرام تھے۔ دلِ نقد، چہرے خوش باش۔ جیبیں سونے چاندی سے بھری ہوئی تھیں۔ مفلسی کا نام و نشان نہیں تھا۔ فلاکت کا کال تھا۔ لگتا تھا خزانے کا منہ سخاوت کے پانی سے دُھل گیا ہے۔ مسافر کو شہر دہلی کے اچھے دنوں کی یاد آگئی۔

تو یہ ہے فیض آباد۔ جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا بلکہ اس سے بڑھ کر پایا۔ دلی کا منہ اترا تو اس شہر پر شباب آگیا۔ شجاع الدولہ کی فیاضیوں نے شہر کو کیسا تارا سا چمکا دیا ہے۔ اسی لیے تو کیا سپاہی کیا علما اور شاعر، جس کو دیکھو یہاں آن بسا ہے۔

اس شہرِ خوش اندام کی فضا اوروں کے ساتھ میر ضاحک کو بھی یہاں کھینچ لائی تھی جو اپنے بیٹے میر حسن اور اہلِ خاندان کے ساتھ محلہ گلاب باڑی میں فرد کش تھے۔ وہ نواب شجاع الدولہ کے ماموں نواب سالار جنگ کی سرکار سے وابستہ تھے۔ عیشِ تمام میسر تھا، شاعری مشغلہ ہمہ وقت۔ ان کی شہرت خاص طور پر ان ہجوؤں کی بنا پر تھی جو انہوں نے سودا کے بارے میں اور سودا نے ان کے بارے میں کہی تھیں۔

○☆○

شجاع الدولہ کے انتقال کے بعد آصف الدولہ، اودھ کے فرماں روا ہوئے۔ جی میں کیا سمائی کہ اقتدار کا مرکز ثقل فیض آباد سے منتقل کر کے لکھنؤ کو پری خانۂ عالم بنا دیا۔ فیض آباد کا جوہر لکھنؤ میں سمٹ آیا۔

اس جناب کے فیض و احسان کے نتیجے میں لکھنؤ فضلا،

نمک خوانِ تکلّم ہے فصاحت میری
ناطقے بند ہیں سُن سُن کے بلاغت میری
رنگ اُڑتے ہیں وہ رنگیں ہے عبارت میری
شور جس کا ہے وہ دریا ہے طبیعت میری
عمر گزری ہے اسی دشت کی سیّاحی میں
پانچویں پُشت ہے شبیرؓ کی مدّاحی میں

شعرا، ہر طرح کے ارباب صنعت اور دانش وروں غرض کہ خوبان عالم کا ایسا مجمع ہوگیا کہ ایسا شہر دنیا میں سنا نہیں گیا۔ شہر کیا تھا خوان کرم تھا، سلاطین گزشتہ کا بھرم تھا۔

میر ضاحک اس بہار نو سے زیادہ دن لطف اندوز نہ ہوسکے لیکن ان کے بیٹے میر حسن اور ان کے فرزند میر خلیق نے شاعری کے اس خاندانی ورثے کی خوب خوب حفاظت کی۔ خاص طور پر نوجوان میر خلیق کی غزلوں نے فیض آباد میں دھوم مچا رکھی تھی۔

لکھنؤ کی آب و تاب چادر مہتاب کو خجل کر رہی تھی۔ دنیا تھی کہ روشنیوں کے اس سیلاب کی طرف رخ کر رہی تھی۔ ہر فن کے قدردان یہاں موجود تھے۔ جس کو جو چاہیے تھا، مل رہا تھا۔ ہندوستان پر ہی منحصر نہیں، ایران و خراسان کے ضرورت مند بھی اسی سرکار کے دامن دولت کے سائے میں پہنچ رہے تھے۔

پڑوس میں دولت و شہرت منتظر تھی لیکن فیض آباد کا یہ خاندان اپنی وضع داریوں کے نوالے گن رہا تھا۔

مرزا محمد تقی خاں بہادر ترقی فیض آباد کے ایک عالی خاندان اور دولت مند رئیس تھے جنہوں نے میر حسن اور میر خلیق پر مربیانہ احسانات کیے تھے۔ وضع داری کے خلاف تھا کہ اس سرکار کو چھوڑ کر کسی اور سرکار کا منہ تکا جاتا لہٰذا فیض آباد کی ویرانی گوارا کرلی، لکھنؤ کی رونق میں رہائش کا خیال تک نہ آیا۔ حتیٰ کہ میر حسن کو لکھنؤ منتقل ہونا پڑا تو بھی میر خلیق فیض آباد ہی میں رہے۔ شکر احسان ادا کرنے والا کوئی تو ہو۔ لکھنؤ آنا جانا لگا رہتا تھا لیکن مسافرانہ قیام کے سوا کچھ نہیں۔

○☆○

اودھ کے نوابین نے صرف ثقافتی ترقی پر ہی زور نہیں دیا بلکہ اپنے عقائد کا بھی کھل کر اظہار کیا۔ ان کی نفاست طبع اور فراخ دلی نے رسوم عزاداری میں بھی چار چاند لگا دیے۔ آصف الدولہ نے جب اپنے لیے محل تعمیر کرایا تو اس سے زیادہ اہتمام سے امام باڑا تعمیر کرایا۔ عزا داری کو سرکاری سرپرستی حاصل ہوئی تو مجالس و تعزیہ داری کی دور دور تک دھوم مچ گئی۔

محرم کا چاند نظر آتے ہی لکھنؤ کے باشندے دنیا کے مخمصوں سے بے نیاز ہوکر غم حسین کی سیاہ چادر اوڑھ لیتے۔ گلیاں سنسان، ہر شخص گوشہ نشین و غم گین۔ دوسری تاریخ کو گلیوں میں پھر بھیڑ دکھائی دینے لگتی اور لوگ ماتمی لباس پہنے ہوئے تعزیوں کے جلوس کے ساتھ چلتے پھرتے نظر آتے۔

امام باڑوں کی زیب و زینت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ روشنی کی بہتات، کارچوبی کام، علموں کے طلائی اور نقرئی پنجوں کی چمک، رات میں دن کا سماں۔

ایام عزا میں دن میں دو مرتبہ مجلس عزا منعقد ہوئی تھی۔ جھاڑ، فانوس اور شمعوں کی تیز روشنی میں پھیلے ہوئے سکوت کو ذاکر کی آواز سسکیوں میں تبدیل کرتی تھی۔ خاتمۂ مجلس پر مرثیہ خوانی شروع ہوتی تھی۔

مجالس کی ایسی کثرت ہونے لگی تھی کہ ہر پائے کے مرثیہ خواں کو کہیں نہ کہیں پڑھنے کا موقع مل جاتا تھا۔ مرثیہ خوانوں کو نذرانے بھی دیے جاتے تھے اس لیے بھی شعرا میں مرثیہ نگاری کا رجحان بڑھنے لگا تھا۔

ہر شاعر کی آرزو تھی کہ اس کی رسائی شاہی امام باڑے یا روسا کے قائم کردہ امام باڑوں تک ہوسکے۔ اس کوشش میں بہتر سے بہتر مرثیہ کہنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ ایام عزا گزر جانے کے بعد بھی شعرائے کرام اگلے سال کی تیاریوں میں مصروف رہتے تھے۔ یوں سارے سال شعرا کی محفلیں مرثیہ نگاری کی ادبی بحثوں سے آباد رہتی تھیں۔ مرثیہ نگاری کی وہ روایت جو آغاز شاعری سے چلی آرہی تھی، لکھنؤ کی اس فضا میں خوب پروان چڑھی۔ یہاں کے ادبی ماحول نے اسے زمین سے آسمان بنا دیا۔

○☆○

لکھنؤ کے سامنے فیض آباد کا چاند گہنا گیا تھا جبکہ فیض آباد کے عاشق یہ چاہتے تھے کہ آسمان لکھنؤ کے کچھ ستارے توڑ کر یہاں بچھادیں تاکہ یہاں بھی روشنی ہو۔ مرزا تقی، رئیس اعظم فیض آباد ان کوششوں میں سب سے آگے تھے۔ انہوں نے مشاعرہ قائم کیا اور لکھنؤ سے آتش کو بلایا۔ تجویز یہ تھی کہ انہیں وہیں رکھیں گے۔

"صاحب، ہمارا ارادہ ہے کہ جناب حیدر علی آتش کو اپنی سرکار سے وابستہ کرلیں۔ جو کچھ ہم سے بن پڑے گا ان کے لیے حاضر ہوگا۔"

"وہ کاہے کو یہاں رہنے لگے تھے۔ خلد زمیں کو چھوڑ کر کون یہاں آئے گا۔ جانے والے تو یہاں سے رخت سفر باندھ رہے ہیں۔"

"خواجہ آتش کی بات دوسروں سے مختلف ہے۔ وہ درویشانہ مزاج رکھتے ہیں۔ انہیں کسی کے سونے چاندی سے کیا سروکار۔ یوں بھی وہ لکھنؤ میں کس سے خوش ہیں۔ انہیں یہاں آنے میں عار نہ ہوگی۔"

"مولا کرے ایسا ہی ہو۔"

خواجہ آتش لکھنؤ میں بالی کی سرائے کے قریب ایک پٹے سے مکان میں رہتے تھے۔ شاعروں کے شاعر تھے لیکن مزاج میں فقیری کا رنگ تھا۔ لکھنؤ میں بکھری ہوئی دولت سے بے خبر، رئیسوں کی قدردانی سے بے نیاز آزادانہ زندگی گزار رہے تھے۔ کوئی راہ ان پر بند نہیں تھی۔ جس نے جس طرف چاہا چل پڑے۔ نہ دل میں طمع نہ لالچ۔ صاف گوئی اور بے باکی مشہور تھی۔ توکل پر گزارہ تھا لیکن کوئی سلوک کرنا چاہتا تو انکار بھی نہیں تھا۔ اسی لیے کبھی خوش حال رہتے کبھی فاقوں کی نوبت آجاتی۔

فاقوں کے دن تھے کہ فیض آباد سے طلبی آگئی۔ اس نے فاقوں کی سردی میں اس چنگاری کو غنیمت جانا اور عازم سفر ہوا۔

چھریرا بدن، کشیدہ قامت، سپاہیانہ وضع، تلوار باندھے بانکی ٹوپی بھوں پر دھرے، مسندِ صدارت پر جلوہ افروز تھا۔ شاعر ایک ایک کرکے آرہے تھے کہ میر خلیق کی باری آئی۔ انہوں نے غزل پڑھی جس کا مطلع تھا۔

عکسِ آئینہ ہے اس رشکِ قمر کا پہلو
صاف اِدھر سے نظر آتا ہے اُدھر کا پہلو

غزل ختم ہوئی تھی کہ آتش مسند سے اٹھ گئے۔ اپنی غزل پرزے کرکے ہوا میں بکھیر دی۔

"جب ایسا شخص یہاں موجود ہے تو میری کیا ضرورت ہے" انہوں نے کہا اور مشاعرے سے ہاتھ اٹھالیے۔

خلیق کی غزل گوئی کا یہ عالم تھا کہ باپ کی موت نے، اہل وعیال کا بوجھ پہاڑ بنادیا۔

شاعری کا ایسا چرچا تھا کہ جو شاعر نہیں تھا اسے بھی شاعر بننے کا شوق تھا۔ غزلیں بکا کرتی تھیں۔ مصحفی تک شوقیہ شاعروں کے ہاتھوں غزلیں فروخت کیا کرتے تھے۔ خلیق نے بھی شاعری کو آمدنی کا ذریعہ بنالیا۔ انہی دنوں راجا ٹکیٹ رائے کے بچوں کی اتالیقی ہاتھ آگئی۔ راجا صاحب لکھنؤ میں رہتے تھے لہٰذا میر خلیق کا لکھنؤ آنا جانا مستقل ہوگیا۔

لکھنؤ کے قیام نے انہیں مرثیہ نگاری کی طرف راغب کیا۔ یہ شغل حصول ثواب کا ذریعہ بھی تھا اور آمدنی کا سہارا بھی۔ اب ان کا زیادہ وقت لکھنؤ میں گزرنے لگا خصوصاً ایام عزا میں مستقل قیام کرتے۔ دیکھتے دیکھتے ایسی شہرت ہوئی کہ مجالس لکھنؤ ان کے مرثیوں کا انتظار کرنے لگیں۔ اس وقت دو نام لکھنؤ کی فضا میں گونج رہے تھے۔ میر خلیق اور میر

لکھنؤ میں کئی مہینے قیام کے بعد میر خلیق ابھی ابھی گھر

سوانحی خاکہ

نام	میر ببر علی رئیس
والد	میر مستحسن خلیق
دادا	میر حسن
پردادا	میر ضاحک
برادران	میر انس، میر مونس
فرزند	میر نفیس، سلیس، رئیس
پیدائش	۱۸۰۱ء بہ مقام فیض آباد
انتقال	۱۰ دسمبر ۱۸۷۴ء
مدفن	ذاتی باغ، واقع سبزی منڈی لکھنؤ

میں آکر بیٹھے تھے۔

"ببر علی نظر نہیں آرہے ہیں" انہوں نے اپنے بڑے بیٹے کی بابت بیوی سے پوچھا۔

"ابھی تو میں انہیں نادِ علی یاد کرا رہی تھی۔ آپ کے آنے کی نوید سنی تو شرارت میں کہیں چھپ گئے ہیں۔ لاڈ بھی تو آپ اتنا ہی کرتے ہیں۔"

"دیکھتی نہیں ہو، کیسی پیاری باتیں کرتے ہیں وہ۔ اور پھر ان کی صورت میں ہمیں اپنی شبیہہ نظر آتی ہے۔ ہو بہو ہماری تصویر۔"

"اس میں شک نہیں۔ ببّن میاں کی زوجہ محترمہ کل تشریف لائی تھیں۔ ببر علی کو دیکھ کر کہنے لگیں، بنا بنایا باپ کا بچپن ہے۔"

"ٹھیک کہتی ہیں وہ۔ انہوں نے تو ہمارا بچپن بھی دیکھا ہے۔"

"لکھنؤ کی بھی تو کچھ کہیے آتے ہی ببر علی میں لگ گئے۔"

"خدا نوابین اودھ کو تادیر سلامت رکھے۔ خلقِ خدا کو روزی کی فکر سے آزاد کردیا ہے۔"

ابھی وہ کچھ اور کہتے کہ ببر علی کی آواز آئی۔ وہ کہیں چھپا ہوا تھا اور یہ دیکھ کر کہ باپ تو اسے بھول ہی گئے، اس نے اپنی موجودگی کا احساس دلایا تھا کہ باپ اسے ڈھونڈیں۔ میر خلیق اٹھ کر اس طرف گئے جدھر سے آواز آئی تھی۔ صحن میں مہندی کا درخت تھا۔ اس کی آڑ میں دیوار تھی۔ ببر علی اس دیوار پر چڑھا ہوا تھا۔ میر خلیق کو اندازہ ہوگیا تھا لیکن انہوں نے انجان بن کر آواز دی۔

"ببر علی! بھئی کہاں ہو، اب نکل بھی جاؤ۔"

ببرعلی نے درخت کی آڑ میں چھپے چھپے یہ شعر پڑھا۔

برگِ حنا پہ بیٹھ کے لکھتا ہوں دل کی بات
شاید کہ رفتہ رفتہ لگے دلربا کے ہات

بات کا ہاتھ لگنا اور ہاتھوں سے مہندی کا تعلق ایسی رعایتیں تھیں کہ میر خلیق جھوم اٹھے۔ یہ سن اور یہ شعر۔ آٹھ نو سال کی عمر ہی کیا ہوتی ہے۔

یہ ایسا تعجب خیز بھی نہیں تھا۔ گھر میں دن رات شاعری کے چرچے رہا کرتے تھے۔ باپ شاعر، دادا اور پردادا شاعر۔ پھر تینوں چچا بھی شاعر۔ ملنے جلنے والے بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ انوکھی بات نہیں تھی لیکن باپ کی محبت تو باغ باغ ہوگئی۔ اتنی دیر میں ببرعلی بھی درخت کی آڑ سے نکل آیا تھا۔

"کیوں میاں، شاعری کب سے شروع کردی۔ ہمارا چراغ جلنے دوگے یا کیا ارادے ہیں؟"

بیٹے کو پیار کیا، گود میں اٹھایا اور اس کی ماں کے پاس آئے۔

"آپ کے بیٹے نے شعر کہا ہے اور شعر بھی بے عیب، لاجواب شیرینی تقسیم کروایئے۔"

"ماشاء اللہ۔ اس کا مطلب ہے شاعری اس گھر سے جائے گی نہیں۔ آپ کے جانشین تشریف لاچکے ہیں۔"

ببرعلی خاموش تھا لیکن دل ہی دل میں اپنی تعریف پر پھولے نہیں سما رہا تھا۔ اس نے ایسے ایسے کئی شعر کہہ رکھے تھے لیکن ابھی وقت نہیں آیا تھا کہ باپ کو سناتا۔

"حضرت، شاعری بڑی اچھی چیز ہے لیکن پہلے اپنی تعلیم پر توجہ دیجیے۔ کہیں اس میں پڑکر تعلیم کی جانب سے غافل نہ ہوجایئے گا۔ خداداد صلاحیت کیسی بھی ہو، علم کے بغیر شاعری کچھ نہیں۔"

"کیوں بے جا تنبیہہ کرتے ہو" خلیق کی زوجہ نے کہا "یہ پڑھائی کی طرف سے غافل کب ہیں۔ مسائل کی کتابیں، فارسی اور عربی کے ابتدائی قاعدے سب کچھ تو پڑھ لیے ہیں انہوں نے۔ یہ جو شعر انہوں نے کہا ہے یوں ہی تو نہیں کہہ دیا۔"

میر خلیق کی پاک دامن بی بی مسائل مذہب اثنا عشری سے واقف تھیں اور فارسی اتنی جانتی تھیں کہ "جامع عباسی" کو پڑھ لیتی تھیں اور پڑھا دیتی تھیں۔ نماز روزے کی پابند اور انتہا سے زیادہ پرہیز گار تھیں۔ وہ ہر بات کو امامیہ اثنا عشریہ کے موافق کرنا چاہتی تھیں۔ ان کی وضع، ان کا لباس، ان کی رفتار و گفتار دوسری بیبیوں کے لیے شریفانہ وضع کا مستند نمونہ تھی۔

ببرعلی کی تعلیم ان ہی معظمہ کے مدرسہ آغوش میں ہورہی تھی جس نے اسے اس عمر میں متین، مہذب اور وضع دار بنادیا تھا۔

باپ کی نصیحت یاد تھی کہ پہلے اپنی تعلیم پر توجہ دیجیے لیکن شاعری کا شوق ایسا تھا کہ نصیحت کے صندوق میں بند نہیں رہ سکتا تھا۔ اس نے بہت چاہا کہ تعلیم کی تکمیل تک انتظار کرے لیکن اشعار اس کی قلمرو میں داخل ہونے کے لیے بے تاب ہوں تو وہ انہیں مایوس کیسے کرے۔ وہ باپ سے چھپ کر مشقِ سخن میں مصروف رہا۔ اپنے لیے "حزیں" تخلص بھی منتخب کرلیا اور غزل کو اپنا میدان بنایا۔ جب باپ کو خبر نہ ہو تو کسی اور کو ہوا کیوں لگے۔ وہ غزلیں کہہ کہہ کر چھپاتا رہا۔

باپ کے ارشادات اس کے کان میں گہر کی طرح پڑے ہوئے تھے "علم کے بغیر شاعری کچھ نہیں" اس لیے وہ سیلاب سخن میں بہہ کر اپنی تعلیم کی طرف سے غافل نہیں ہوا۔

میر نجف علی فیض آبادی بڑے جید عالم تھے۔ ان کی پاک دامن ماں اپنے پھول نچھاور کرچکیں تو ببرعلی ان بزرگ کے دامن فیض سے وابستہ ہوگیا۔ حافظہ خداداد تھا، ذوقِ علمی ورثے میں ملا تھا۔ سنجیدہ ایسا کہ کھیل کود سے شغف ہی نہیں تھا۔ ہمہ وقتی التفات نے مروجہ علوم کے دروازے اس پر کھول دیے۔

"میں چاہتا ہوں، ببرعلی کو لکھنؤ لے جاؤں" میر خلیق نے ایک دن کہا۔

"اے ہے، ہماری آنکھوں سے اتنی دور" ان کی بیوی نے کہا۔

"لکھنؤ دور کہاں ہے۔ فیض آباد کا ایک محلہ ہی تو ہے۔"

"پھر بھی۔"

"ببرعلی کا مستقبل میں بہت روشن دیکھ رہا ہوں۔ اسے شوق بھی ہے تو کیوں نہ اس کی تعلیم کا خاطر خواہ بندوبست ہو۔ لکھنؤ بڑا شہر ہے، وہاں تعلیم کے مواقع بھی زیادہ ہیں۔ مولوی حیدر علی بڑے پائے کے عالم ہیں۔ میری ان سے بات ہوگئی ہے۔ بس ببرعلی کے لکھنؤ پہنچنے کی دیر ہے۔"

"جیسی آپ کی صلاح۔"

"دیکھو ببرعلی کی ماں۔ ہم نے تو جیسی تیسی کاٹ دی۔ کیا خبر فیض آباد میں ہمارا کب تک آب و دانہ ہے۔ ان بچوں کو بالآخر لکھنؤ میں رہنا ہوگا۔ اس بہانے ببرعلی لکھنؤ سے مانوس بھی ہوجائے گا۔"

لکھنؤ کی باتیں پریوں کے دیس کی کہانیاں تھیں۔ ببرعلی

نے یہ کہانیاں سنی تھیں، اس دیس کو دیکھا نہیں تھا۔ اس نے سنا تو باغ باغ ہوگیا۔

"وہاں امام بخش ناسخ بھی تو ہوں گے؟" ببر علی نے کہا۔

"بالکل ہوں گے۔ ہم تمہیں ان سے ملوا بھی دیں گے لیکن یاد رکھو، تم وہاں تعلیم حاصل کرنے جارہے ہو۔"

"جی، مجھے یاد ہے۔"

سولہ سال کی عمر میں ببر علی پہلی مرتبہ لکھنؤ آیا۔ چھوٹا بھائی میر مونس بھی اس کے ساتھ تھا۔

ماں نے امام ضامن باندھ کر اسے رخصت کیا تھا، میر خلیق نے اسے اللہ کا نام لے کو مولوی حیدر علی کے حوالے کردیا۔ استاد نے شاگرد کی ذہانت دیکھی تو توسیعِ علم کی ہامی بھرلی۔

میر خلیق، بیٹوں سے ملنے لکھنؤ آتے رہے۔ کبھی یہ فیض آباد چلے جاتے۔

ایک مرتبہ میر خلیق لکھنؤ آئے تو انہیں اپنا وعدہ یاد آیا۔ انہوں نے ببر علی سے کہا تھا کہ وہ اسے ناسخ سے ملوائیں گے۔ ناسخ کی شاعری، صحت لفظی اور محاوروں کی بندش کی ان دنوں لکھنؤ میں دھوم تھی۔ ببر علی کو اسی لیے شوق ملاقات تھا۔

"آؤ میاں، آج تمہیں حضرت ناسخ کی طرف لیے چلتے ہیں" میر خلیق نے کہا۔

بھاری ڈیل ڈول، بلند قد، فراخ سینہ، منڈا ہوا سر، گاؤ تکیے سے لگے یوں بیٹھے تھے جیسے شیر بیٹھا ہے۔ جاڑوں میں تن زیب کا کرتہ ان کے بدن پر دیکھ کر ببر علی کو تعجب ہوا، یہ بتانے کی ضرورت ہی نہیں تھی کہ یہ ناسخ ہیں۔

"میر خلیق کے بیٹے اور میر حسن کے پوتے ہو۔ شعر تو یقیناً کہتے ہوگے؟" ناسخ نے پوچھا۔

"علم کے بغیر کیا شاعری۔ پھر بھی کچھ نہ کچھ کہہ لیتا ہوں۔"

"بھئی انکسار تو تمہارے گھر کی دولت ہے۔ کچھ اپنا کلام پڑھو تو معلوم ہو کہ کتنے پانی میں ہو۔"

ببر علی نے والد کی طرف دیکھا۔ جب ادھر سے اجازت مل چکی تو یہ مطلع پڑھا۔

کھلا باعث یہ اس بے درد کے آنسو نکلنے کا
دھواں لگتا ہے آنکھوں میں کسی کے دل کے جلنے کا

مطلع سن کر شیخ ناسخ جھومنے لگے۔

"یہ فرزند رشید آپ کے یادگارِ خاندان ہوں گے اور یاد رکھیے، ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ ان کی زبان اور ان کی ...ت عالم گیر شہرت ہوگی" انہوں نے میر خلیق سے کہا پھر

"ایک غیر مطبوعہ نوحہ"

دنیا میں آج حشر کا دن آشکار ہے
سبطِ نبی کے سینے پہ قاتل سوار ہے
چلاّ رہی ہے خیمے سے زینب اُٹھ لعین
بھائی کا میرے زخموں سے سینہ فگار ہے
کہتے تھے شاہ، شمر سے مجھ کو نہ ذبح کر
دنیائے چند روزہ کا کیا اعتبار ہے
مرجاؤں گا میں آپ ہی تھوڑی سی دیر میں
قالب میں روح کا کوئی دم کو شمار ہے
اُنیس سو ہیں تیغ وسنان وتبر کے زخم
سنگ ستم کے خوں سے بدن لالہ زار ہے
قرآں ہے صاف سینہ یہ بیٹھا ہے جس پہ تو
بوسہ گہہِ رسولؐ پہ خنجر کی دھار ہے
ہے زلزلہ زمیں کو، گہن میں ہے آفتاب
بارش ہے خوں کی، چشم فلک اشک بار ہے
اب آگے کر بیاں نہ انیس جگر فگار
یہ دن وہ ہے کہ سارا جہاں اشکبار ہے

ببر علی سے مخاطب ہوئے "کچھ تخلص بھی ضرور ہوگا۔"

"جی، حزیں تخلص اختیار کیا ہے۔"

شیخ ناسخ نے تھوڑا سکوت اختیار کیا پھر فرمایا "نہیں میاں۔ تخلص نے ہمیں خوش نہیں کیا۔"

"پھر آپ ہی فرمادیجئے۔"

"مجھے انیس پیارا معلوم ہوتا ہے۔"

ببر علی نے بہ کمالِ ادب سلام کیا اور اس روز سے بجائے حزیں، انیس ہوگیا۔

شیخ ناسخ ورزش کرتے تھے۔ ان سے متاثر ہونے کا نتیجہ تھا یا خود اپنا شوق کہ انہوں نے بھی ورزش شروع کردی۔ مگدر کے سوُدو سو ہاتھ روز نکالتے تھے۔ جوانی کا آغاز تھا۔ اس ورزش نے سونے پہ سہاگے کا کام کیا۔ جسم ٹھوس اور اعضا چست ومتناسب ہوگئے۔ چھریرا بدن، چوڑا سینہ، قد مائل بہ درازی، صراحی دار گردن، خوب صورت کتابی چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں۔ گیہواں رنگ، حباب کی شکل کی چوگوشیہ ٹوپی، نیچا گھیر دار کرتہ، ڈھیلی مہری کا سفید پاجامہ۔ ہاتھ میں رومال بھی ضرور ہوتا۔ اس وضع قطع سے جب وہ نکلتے تو زمانہ مشتاق دید ہوتا۔

دلی میں میر کاظم علی سفید پوش پٹا، بانک، بنوٹ کے استاد

تھے۔ دلی اُجڑنے کے بعد یہ بھی لکھنؤ آگئے۔ بہت بوڑھے ہوگئے تھے لیکن اپنے بیٹے میرا میر علی کو ان فنون میں ماہر بنادیا تھا۔ انیس نے علی مد، لکڑی کا ٹھاٹھ اور بانک بنوٹ کی کچھ گھائیاں ان سے سیکھیں۔ شہ سواری اور شمشیرزنی کے فنون بھی سیکھے جو اس وقت کے شرفا کا عام شوق تھا۔

لکھنؤ کا یہ عارضی قیام گزارنے کے بعد وہ پھر فیض آباد چلے گئے۔ ابھی مرثیہ گوئی کا آغاز نہیں کیا تھا، غزلیں ہی متاع سخن تھیں۔

ایک موقع پر کہیں مشاعرے میں گئے۔ غزل پڑھی۔ وہاں تعریف ہوئی۔ میر خلیق دل میں باغ باغ ہوئے لیکن یہ دکھ بھی ہوا کہ یہ اپنی صلاحیتیں غزلوں میں ضائع کررہا ہے۔ اس وقت تک تو چپکے ہو رہے لیکن دوسرے دن پوچھا۔

"کل رات کو کہاں گئے تھے؟"

"باوا جان، ایک مشاعرے میں چلا گیا تھا۔"

"سنا ہے آپ کی غزل نے خوب دھوم مچائی؟"

"آپ کی دعاؤں کے طفیل۔"

"بھائی، اب اس غزل کو سلام کرو اور اس شغل میں زور طبع صرف کرو جو دین و دنیا کا سرمایہ ہے۔ مرثیہ کہا کرو۔"

سعادت مند انیس نے باپ کے ایک اشارہ ابرو پر غزل گوئی صرف موقوف ہی نہیں کردی بلکہ جتنی غزلیں کہی تھیں اس طرح ضائع کردیں جیسے کبھی کہی ہی نہیں تھیں۔ اپنی آنکھوں کو اپنے تلووں سے مسلنے کا تصور کون کرسکتا ہے۔ انیس کی فرماں برداری نے اس اذیت کو سہل کردیا۔ متاع غزل سے منہ پھیرا اور سلام کہنے بیٹھ گیا۔

ضبط گریہ ماتم سرور میں ہوسکتا نہیں
سر جھکا کر بیٹھ مجلس میں جو روسکتا نہیں
رات اندھیری، پرسشِ اعمال، ایذائے فشار
قبر میں بھی چین سے انسان سوسکتا نہیں
شاہ کہتے تھے کہ یہ دنیا بھی ہے عبرت کی جگہ
مرگیا بیٹا جواں اور باپ رو سکتا نہیں
نظم ہے یہ یا دُرِ شہوار کی لڑیاں انیس
جوہری بھی اس طرح موتی پروسکتا نہیں

سلام کی ہیئت اور مضامین غزل سے ملتے جلتے ہیں اس لیے انیس کی طبیعت اس صنف میں خوب چلی۔ شفیق باپ نے دل لگا کر اس کے کلام کی اصلاح کی۔

جب مشق ذرا پختہ ہوئی تو انیس مرثیہ نگاری کی طرف راغب ہوئے۔

میر خلیق نے تحت اللفظ پڑھنے کی مشق کرائی۔ انیس کے ساتھ اتنی محنت کی کہ دن رات ایک کردیے۔ آئینہ سامنے رکھ کر گھنٹوں مشق کراتے کہ مرثیہ نگاری کی طرح مرثیہ خوانی بھی ایک فن ہے۔ آواز کا اُتار چڑھاؤ، چہرے کا تغیر، آنکھوں کی گردش، اعضا کی حرکت۔ تلوار کھینچنے کا انداز، نیزہ چلانے کو مجسم کرکے دکھانا، چہرے پر حسبِ موقع حزن وملال، فخرو مباہات کے جذبات طاری کرنا۔ یہ سب ایسی مشقیں تھیں جنہیں نوجوان انیس سیکھتا رہا۔ ادھر منبرِ حسینؑ اس کا انتظار کررہا تھا۔

اس نے فیض آباد کی مجالس میں پڑھنا شروع کردیا تھا لیکن ابھی لکھنؤ اس کی خوش بیانی سے محروم تھا۔ میر خلیق چاہتے تھے وہ اچھی طرح مشق فراہم کرلے، اس کے بعد اسے اپنے جانشین کے طور پر متعارف کرائیں۔ وہ وقت کا انتظار کررہے تھے اور وقت ابھی نہیں آیا تھا۔

○☆○

نصیرالدین حیدر بادشاہِ لکھنؤ کا زمانہ تھا۔ دلگیر، ضمیر اور خلیق ہم پلہ شاعر سمجھے جاتے تھے۔ اب تک مرثیہ نگاری بین، نوحہ وزاری اور فریاد وفغاں تک محدود تھی لیکن میر ضمیر نے موضوع سخن کو وسعتیں دینا اور روایتیں نظم کرنا شروع کردی تھیں۔ صاحبان مجلس کے لیے یہ بالکل نئی چیز تھی۔ دیکھتے دیکھتے انہوں نے مرثیے کے لوازم وخصوصیات کو اتنی وسعت عطا کردی کہ یہ جوئے کم آب، بحرِ بے کراں بن گیا۔

انہوں نے اردو مرثیے میں جن چیزوں کا اضافہ کیا تھا، وہ یہ تھیں۔

چہرہ: جس میں صبح کا سماں یا تاریکیِ شب اور ماہ ونجوم کا ذکر ہوتا تھا۔

سراپا: مرثیے کے ہیرو کی شکل وشباہت، قد وقامت اور خط وخال کا بیان۔

مرکب: گھوڑے، تلوار اور اسلحۂ جنگ کی تعریف۔

رخصت: ہیرو کا امام حسینؑ سے اجازت لے کر میدانِ جنگ کی طرف روانہ ہونا۔

آمد: میدان جنگ میں ہیرو کی آمد آمد کا بیان۔

رجز: ہیرو کا اپنے حسب نسب اور ذاتی فضائل بیان کرنا۔

جنگ: ہیرو کا مدِمقابل سے معرکہ آرا ہونا۔

شہادت: ہیرو کا دشمن کے ہاتھوں جام شہادت نوش کرنا۔

نوحہ: ہیرو کی لاش پر، پردگیانِ حرم وبانوانِ حریم کی گریہ وزاری۔

دعا: مرحوم مجاہد کے اعمال حسنہ کا ذکر اور مغفرت کی دعا۔

ان مضامین کے اضافے کے ساتھ ساتھ میر ضمیر نے زبان کی صفائی اور حسنِ تراکیب وبندشِ الفاظ پر بھی خاص توجہ

دی تھی۔

دوسری طرف مرزا دبیر تھے۔ جو میر ضمیر کے شاگرد ہونے کی وجہ سے اسی انداز میں مرثیے لکھ رہے تھے۔ ان کی نوجوانی نے استاد کو بھی مات کردیا تھا۔ ہر طرف ضمیر اور دبیر کی دھوم مچنے لگی تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے مرثیہ عروجِ کمال پر پہنچ گیا۔ اب مزید ترقی کی گنجائش نہیں۔

اس فضا میں میر خلیق کی آواز دبنے لگی تھی۔ ان کے مرثیے نوحہ و بین تک محدود تھے۔ وہ میر ضمیر کی سرزمین میں قدم رکھتے ہوئے ہچکچا رہے تھے۔ وہ برم کے آدمی تھے رزم کے نہیں۔ رزمیہ مضامین اس گرمی سے بیان نہیں کرسکتے تھے جیسا کہ ضمیر و دبیر کر رہے تھے۔ بڑھاپے نے آواز میں نقاہت بھی پیدا کردی تھی البتہ حسنِ بیان اور لطفِ بیان میں جواب نہیں تھا۔

یہی وہ موقع تھا جب انہوں نے اپنے بیٹے میر انیس کو سامنے لانے کا فیصلہ کیا۔ وہ دیکھ چکے تھے کہ انیس رزم و برم دونوں میں لاجواب ہے۔ زبان کا لطف تو گھر کا ہے' شیرینی آواز اور انداز خوانی بھی ایسا ہے کہ بے مثال۔

یہ امام باڑا کریم خاں کا امام باڑا کہلاتا ہے اور لکھنؤ کے محلہ نخاس میں واقع ہے۔ آنے والے آچکے ہیں اور مجلس بھر چکی ہے۔ مجلس میں ضمیر ایسے صاحبِ فن بھی تشریف فرما ہیں اور وہ بھی جنہیں دلگیر اور دبیر کا کلام بھی یاد ہے بلکہ جو خاص طور پر دبیر کی سحر طرازیوں اور معنی آفرینیوں کے دلدادہ ہیں اور جن کے دلوں میں یہ بات سما چکی ہے کہ ضمیر و دبیر پر مرثیہ ختم ہوچکا۔ ایسے میں کوئی خیبر شکن ہی اس قلعے کو فتح کرسکتا تھا۔

میر خلیق خاموشی سے اپنی جگہ سے اٹھے اور میر ضمیر کے پہلو میں جا بیٹھے۔

"آج اجازت ہو تو آپ کے بھتیجے سے کچھ پڑھواؤں؟"

"بسم اللہ" میر ضمیر نے باوقار انداز میں کہا اور خاموش ہوگئے۔

میر خلیق نے اس اجازت کے ساتھ اربابِ مجلس کو مخاطب کیا "آپ حضرات نے اکثر میرے لڑکے کے سننے کی خواہش ظاہر فرمائی ہے' آج سن لیں۔"

اس اعلان کے ساتھ ہی ایک سانولا سلونا نوجوان' لیے دیے انداز میں انتہائی متانت اور وقار سے شرمیلے شرمیلے قدم رکھتا منبر کی طرف بڑھتا ہوا دکھائی دیا۔ میر خلیق منبر کے دوسرے زینے پر بیٹھتے تھے' یہ اس سے ایک درجہ بلند تیسرے زینے پر بیٹھے اور اس وقار کے ساتھ کہ تمام اربابِ مجلس کی نگاہوں میں وہ خوب صورت ٹھاٹھ جم گیا۔ ان کا ورزشی بدن' خوب صورت چہرہ' شباب کی جوشیلی امنگ مل جل کر غیر معمولی

"تلوار"

یوں تیغ شعلہ زا نکل آئی نیام سے
نکلی بیاض صبح شب تیرہ فام سے
جس طرح برق ابر سے' معنی کلام سے
چہرہ دکھایا حور نے دارالسلام سے
آئینہ ظفر تھا کہ نکلا غلاف سے
کھینچا پری کو فخر سلیماں نے قاف سے

"منظر نگاری"

گرز ستم سے شق ہوا ناگہ سرِ جناب
تھرائے ہونٹ چھٹ گئی دانتوں سے مشکِ آب
فرمایا ہائے دیں گے سکینہ کو کیا جواب
گھوڑے سے تھرتھرا کے گرے مثلِ آفتاب
تڑپے گرے' کراہ کے خاموش ہوگئے
منہ رکھ کے خالی مشک پہ بے ہوش ہوگئے

اثر ظاہر کرنے لگی۔ اس تاثر کو ان کے کچھ دیر کے سکوت نے مزید گہرا کردیا۔ ایک تصویر تھی جو منبر پر چپ بیٹھی تھی۔ پھر تصویر کے باریک لبوں کو جنبش ہوئی۔ انیس نے رباعی پڑھی۔

بالیدہ ہوں وہ اوج مجھے آج ملا
ظلِ علم صاحبِ معراج ملا
منبر پہ نشست سرپہ حضرت کا علم
اب چاہیے کیا' تخت ملا' تاج ملا

پڑھنے کے انداز اور جوانی کی آواز نے سماں باندھ دیا۔ سبحان اللہ کی آوازیں بلند ہوئیں۔

اس کے بعد سلام پڑھ کر پوری محفل کو متوجہ کرلیا۔ گرفت اور مضبوط ہوگئی۔

اب انسانی نفسیات' جذبات نگاری' حالات کی مرقع کشی اور عاجزی و انکسار کی داستان شروع ہوئی۔

یارب چمن نظم کو گلزار ارم کر
اے ابر کرم خشک زراعت پہ کرم کر
تو فیض کا مبدا ہے توجہ کوئی دم کر
گم نام کو اعجاز بیانوں میں رقم کر
جب تک یہ چمک مہر کے پرتو سے نہ جائے
اقلیم سخن میرے قلمرو سے نہ جائے

بھر دے دُرِ مقصود سے اس درج وہاں کو
دریائے معانی سے بڑھا طبع رواں کو
آگاہ کر انداز تکلم سے زباں کو

عاشق ہو فصاحت بھی وہ دے حسن بیاں کو
تحسیں کا سمٰوٰت سے غل تابہ سمک ہو
ہر گوش بنے کان ملاحت وہ نمک ہو

اسے احساس تھا کہ میر ضمیر کے مرثیے رزمیہ شان وشوکت کی وجہ سے مقبول ہو رہے ہیں۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ میر ضمیر اور مرزا دبیر، میر خلیق کو رزم کے میدان میں اپنا ہم پلہ نہیں سمجھتے۔ اس نے رزم کا ذکر خاص طور پر اور بڑے طمطراق سے کیا۔

آؤں طرفِ رزم ابھی چھوڑ کے جب بزم
خیبر کی خبر لائے مری طبع اولعزم
قطعِ سرِ اعدا کا ارادہ ہو جو بالجزم
دکھلائے یہیں سب کو زباں معرکۂ رزم
جل جائیں عدو، آگ بھڑکتی نظر آئے
تلوار پہ تلوار چمکتی نظر آئے

مصرع ہو صف آرا صفتِ لشکرِ جرار
الفاظ کی تیزی کو نہ پہنچے کوئی تلوار
نقطے ہوں جو ڈھالیں تو الف خنجرِ خونخوار
مد آگے بڑھیں برچھیوں کو تول کے اک بار
غل ہو یوں کبھی فوج کو لڑتے نہیں دیکھا
مقتل میں رن ایسا کبھی پڑتے نہیں دیکھا

آج وہ بڑے جوش میں تھا۔ اس کے خاندان کی عظمت گنوائی جا رہی تھی۔ مداحِ شبیرؑ میں اس کے باپ دادا کی خدمات فراموش کی جا رہی تھیں۔

تائید کا ہنگام ہے یا حیدر صفدر
امداد ترا کام ہے یا حیدر صفدر
تو صاحبِ اکرام ہے یا حیدر صفدر
تیرا ہی کرم عام ہے یا حیدر صفدر
تنہا ترے اقبال سے شمشیر بکف ہوں
سب ایک طرف جمع ہیں میں ایک طرف ہوں

رزم و بزم کی چلتی پھرتی تصویریں تھیں جو منبر سے دلوں تک سفر کر رہی تھیں۔ سننے والے تڑپ تڑپ کر داد دے رہے تھے۔ وہ بھول چکے تھے کہ یہ میر ضمیر کا لکھنؤ ہے یا میر انیس کا۔ پہلی ہی مجلس میں ہزاروں قدرداں پیدا ہو گئے۔ وہ ٹیپ کا آخری شعر پڑھ کر منبر سے نیچے اتر آیا۔

ناحق ہے عداوت انہیں اس ہیچ مداں سے
بے سیف کٹے جاتے ہیں شمشیر زباں سے

مرثیہ ختم ہوا تو ہزاروں ہاتھ اس سے مصافحہ کر رہے تھے۔ سیکڑوں لب اس کی دست بوسی کے لیے سرگرداں تھے۔ لوگوں کو شربت اور پانی کا ہوش بھی نہیں تھا۔

ایک ہی مرثیے میں اس نے میر ضمیر کی بساط سخن لپیٹ کر رکھ دی۔ ان کی سلطنت میں قدم رکھا اور تخت پر قبضہ جمالیا۔

اس کے مرثیے کی شہرت اچانک تمام شہر میں پھیل گئی۔ ہر زبان پر اس کا کلام دیکھا تو شیخ ناسخ کو اسے دیکھنے کا شوق ہوا۔ حتیٰ کہ دوسری ہی مجلس میں ناسخ مشتاقانہ آئے اور ان کا آنا کوئی معمولی آنا نہ تھا۔

آتش نے یہ گرم بازاری دیکھی تو اپنے مخصوص لب ولہجے میں اسے خراج پیش کیا۔

"میر خلیق کا لونڈا آفتیں ڈھا رہا ہے۔"

آتش کا یہ فقرہ ایک نو مشق شاعر کے لیے استاد کی سیکڑوں سندوں کے برابر تھا۔

میر کی حلاوت، ذوق کی سلاست و صفائی، میر حسن کی طلسم کاری، خلیق کی محاورہ بندی اور انیس کی اپنی فنکاری اور پرکاری کچھ اس چابک دستی سے فارم اور فن کی طرح داری میں نمودار ہوئیں کہ سننے والے ششدر رہ گئے۔ ایک ہی نشست میں ضمیر و دبیر کے لفظی جاہ و جلال اور طمطراق کو اس طرح مات دے دی جیسے پچھلے پہر کی چھاؤں دوپہر کی کڑی دھوپ پر آہستہ آہستہ چھا کر اسے یکسر محو کر دے۔

وہ یہ میدان مار کر فیض آباد آئے تو شہرت بھی ان کے ہمراہ تھی۔ یہ شہرت دوسروں کے لیے دل خوش کن ہو لیکن خود ان کے لیے فکر و اندوہ کا سبب بنی ہوئی تھی۔ اب ان پر یہ ذمے داری آن پڑی تھی کہ وہ اس معیار کو برقرار بھی رکھیں۔ شعر گوئی کا ملکہ تو خداداد تھا لیکن علم و فضل تو کسبی ہوتا ہے۔ مقابلہ اربابِ لکھنؤ سے تھا۔ مثنوی میر حسن تو سرہانے دھری رہتی تھی لیکن اس کے علاوہ بھی تو کچھ ہے۔ انہوں نے کمرے میں بند ہو کر کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیا۔ عروض، منطق، فلسفہ، طب، رمل غرض ہر علم پر دفتر کے دفتر ختم کر ڈالے۔ خاص طور پر وہ کتابیں جو ان کی جنگی معلومات کو بڑھا سکیں۔ فنونِ حرب سے واقفیت کے لیے شاہنامہ فردوسی ان کے لیے بہترین سرچشمہ تھا۔ انہوں نے اپنے خوانِ تکلم کے لیے فردوسی کے دسترخوان سے نمک حاصل کیا۔ مرزا کاظم کے بیٹے سے کبھی جو کچھ سیکھا تھا وہ بھی اس وقت کام آیا۔

اس واقفیت کے بعد جب انہوں نے جنگ کا نقشہ کھینچا تو

تفصیل نے سننے والوں کو انگشت بدنداں کر دیا۔ حریفوں کے جسموں پر سجے ہوئے ہتھیار، جنگی ہُنر، داؤ پیچ، حملہ کرنا اور خود کو بچانا، تلوار کے ہاتھ، نیزے کے بند، تیراندازی، کمانوں کا کڑکنا، تلواروں کا چمکنا، گھوڑوں کا بھڑکنا۔ اس خوبی سے بیان ہوا کہ اردو شاعری میں بالکل نئی چیز بن گیا۔

لڑائی کی تیاری، معرکے کا زور شور، تلاطم، ہنگامہ خیزی، ہل چل، نقاروں کی گونج، ٹاپوں کی آواز، ہتھیاروں کی جھنکار، تلواروں کی چمک، نیزوں کی لچک غرض یہ تمام مضامین انیس نے اس خوبی سے بیان کیے کہ میر ضمیر کوسوں پیچھے رہ گئے۔

چلّے میں رکھ کے تیر بڑھے قبلۂ امم
اک ہاتھ راست کر کے کیا دوسرے کو خم
کچھ کہہ کے گوش شہ میں چلا تیر تیز دم
آواز دی کماں نے زہے شاہِ باکرم
چلّہ تو شست شاہِ زمن سے نکل گیا
واں تیر دل کو توڑ کے سن سے نکل گیا

جھنجلا کے چوب نیزہ کو لایا وہ فرق پر
قاسم نے ڈانڈا ڈانڈ کے مارا بچا کے سر
دو انگلیوں میں نیزۂ دشمن کو تھام کر
جھٹکا دیا کہ جھک گئی گھوڑے کی بھی کمر
نیزہ بھی دب کے ٹوٹ گیا نابکار کا
دو انگلیوں سے کام لیا ذوالفقار کا

اپنے علم اور مطالعے کے بل پر اس نے میدانِ جنگ کے نقشے اس خوب صورتی سے قلم بند کیے کہ سننے والا مبہوت ہو کر سنے اور تھوڑی دیر کے لیے خود کو اسی ماحول میں محسوس کرے۔ یہ سمجھے کہ یہ جنگ اس کی آنکھوں کے سامنے ہو رہی ہے۔ گویا انیس نے وقت کی طنابیں کھینچ دیں۔ کربلا کو لکھنؤ میں برپا کر دیا۔

صرف سپہ گری میں مہارت سے بات نہیں بنتی۔ انیس کے پاس ادبی صلاحیتوں کے اعلیٰ ترین ہتھیار بھی تھے۔ پروازِ تخیل، طرزِ بیان، ندرتِ ادا، تشبیہات، استعارات کا برمحل استعمال ان جنگوں کو اور بھی دل نشین بنا دیتا ہے۔

کٹ کٹ کے ذوالفقار سے گرتے تھے خاک پر
پہنچوں سے ہاتھ، شانوں سے بازو، تنوں سے سر
قبضے سے تیغ، برسے زرہ، ہاتھ سے سپر
برچھی سے پھل، کمان سے زہ، زین سے تبر
یوں برچھیاں تھیں چاروں طرف اس جناب کے
جیسے کرن نکلتی ہے گرد آفتاب کے

اس نے لائبریری میں کتابیں اور پائیں باغ میں ہتھیار جمع کرنا شروع کر دیے۔ جن ہتھیاروں کو کتابوں میں پڑھتا، ان کو بہ چشم خود ملاحظہ کرتا۔ وہ مشاہدے اور مطالعے کو مرثیوں میں بیان کرتا رہا۔

جنگ ناموں کے مطالعے نے کوئی ہتھیار اس کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہنے دیا، شاعری کے مطالعے نے صنائع بدائع کی کوئی قسم نہیں رہنے دی جو اس نے بیان نہیں کر دی۔ اہلِ لکھنؤ انہی خوبیوں پر تو جان چھڑکتے تھے۔

قرآن رحل زیں سے سرِ فرش گر پڑا
دیوار کعبہ بیٹھ گئی، عرش گر پڑا

چہرے تھے زرد خوف سے حیدر کے لال کے
نامرد منہ چھپاتے تھے گھونگھٹ میں ڈھال کے

تُلّی کا رعب سب پہ عیاں ہے خدائی میں
بیٹھا ہے شیر پنجوں کو ٹیکے ترائی میں

حسنِ ترتیب:

چرخ و نجوم و شمس و قمر، شہر و دشت و در
سنگ و معادن و صدف و قطرہ و گہر
اشجار و شاخ و برگ و گل و غنچہ و ثمر
رکن و مقام و باب و منا و زمزم و حجر
جن و ملک ہیں، انس ہیں، غلمان و حور ہیں
کہہ دیں یہ سب کہ ابنِ علی بے قصور ہیں

ان سب پر مستزاد زورِ بیان کا یہ عالم۔

حملہ کریں چڑھا کے اگر آستین کو
ہم آسماں سمیت الٹ دیں زمین کو
یوں روح کے طائر سر و تن چھوڑ کے بھاگے
جیسے کوئی بھونچال میں گھر چھوڑ کے بھاگے
طاقت دکھاؤں میں جو رسالت مآب کی
رکھ دوں زمیں پہ چیر کے ڈھال آفتاب کی
کیا جانے کس نے روک دیا ہے دلیر کو
سب دشت کانپتا ہے وہ غصہ ہے شیر کو

انسانی نفسیات کا شعور اسے فطری طور پر حاصل تھا۔

مختلف حالات میں متنوع کیفیات کی تصویر کشی اور قلبِ انسانی پر ان مناظر سے جو اثرات مرتسم ہوتے ہیں ان کی تفصیلات رقم کرنے میں اس نے شعوری کوشش کی تاکہ اس کے مرثیے واقعیت سے قریب تر ہو جائیں۔ لوگوں کو رُلا بھی سکیں اور فنی حسن کا شاہ کار بھی ہوں۔

دو دن سے بے زباں پہ جو تھا آب و دانہ بند
دریا کو ہنہنا کے لگا دیکھنے سمند
ہر بار کانپتا تھا سمٹتا تھا بند بند
چمکارتے تھے حضرت عباسؑ ارجمند
تڑپاتا تھا جگر کو جو شور آبشار کا
گردن پھرا کے دیکھتا تھا منہ سوار کا

دریا کو دیکھ کر گھوڑے کا ہنہنانا کتنا فطری عمل ہے۔ پانی نظر آنے کی خوشی میں اس کے بند بند کا کانپنا، سمٹنا بھی قدرتی بات ہے۔ وفادار ہے، پالتو گھوڑا ہے اس لیے پانی کی طرف دوڑ نہیں پڑتا بلکہ گردن گھما کے سوار کی طرف دیکھتا ہے گویا اجازت طلب کر رہا ہے۔

یہی منظر نگاری ہے، یہی واقعیت نگاری، یہی محاکات نگاری اور انیس چپکے چپکے ان اوصاف کو اپنی شاعری میں جگہ دیتا جا رہا تھا۔

مرثیوں میں ہزار مواقع ایسے آتے ہیں جہاں کرداروں کی گفتگو دکھائی جاتی ہے۔ انیس کا چونکہ مشاہدہ بہت تیز تھا اور مطالعہ وسیع اس لیے ان کے قلم سے یہ بات چھپی نہیں رہ سکتی تھی کہ کن حالات میں کس بات کا کیا جواب ہو سکتا ہے اور کس شخص سے کس قسم کی توقع ہو سکتی ہے۔ انہوں نے اس شان سے مکالمہ نگاری کی کہ انسانی نفسیات کی تصویریں کاغذ پر بنا دیں۔ یہ وہ صفت ہے جو موضوع کی یکسانیت کو ختم کر دیتی ہے۔ پڑھتے وقت آنکھوں کے سامنے ایک باغ سا لگا رہتا ہے۔

منہ دیکھ کے اس کا متبسم ہوئے عباسؑ
فرمایا کہ جو کہتا ہے تو، لائے خدا راس
میں جانتا ہوں ہے تجھے ایسا ہی مرا پاس
پر بھائی سے آشفتہ ہوں میں اس کی نہ رکھ آس
میں کیا ہوں ہر اک طفل بھی اس گھر کا جری ہے
بھائی کے تصدق میں مری ناموری ہے

ماں گرد پھر کے بولی کہ اے میرے گل عذار
تم صبح سے گئے تھے اب آئے یہ ماں نثار
در پر تڑپ تڑپ کے میں جاتی تھی بار بار
کھولو بس اب کمر کہ مرا دل ہے بے قرار
گرمی یہ اور قحط کئی دن سے آب کا
رخ تمتما گیا ہے مرے آفتاب کا

مکالموں کی سلاست، فصاحت اور بے تکلفی نے اس کے مرثیوں کو پڑھنے سے زیادہ سننے کی چیز بنا دیا۔ مجلسوں میں مقبولیت کے لیے اسی وصف کی ضرورت تھی۔

انیس اس متاعِ ہنر کو لے کر لکھنؤ جاتے رہے۔ پہلا مرثیہ ہی ایسا پڑھ آئے تھے کہ پھر ہر سال بلائے جانے لگے۔ لکھنؤ وہ کسوٹی تھی جس پر، پرکھے جانے کے بعد فیض آباد میں بھی انیس کی قدر و منزلت میں اضافہ ہو گیا۔ چار پشتیں ادب کی خدمت میں گزر گئی تھیں اور پھر انیس کی تو ابتدا ہی لاجواب تھی۔

میر خلیق ضعیف ہو گئے تھے، آرام کے دن تھے۔ انیس نے منبر سنبھال لیا تھا اور اس شان سے کہ بوڑھا باپ تعریفیں سن سن کر شاد ہوتا رہتا تھا۔ چھوٹا بیٹا مونس اور منجھلا انس بھی کشورِ سخن سرائی کے باشندے تھے۔ گھر میں ہر وقت مصرعے گونجتے رہتے تھے۔ میر خلیق صاف ستھرے پلنگ پر دراز ہیں۔ قریب بڑی کرسیوں پر تینوں فرزند بیٹھے ہیں۔ مصرع پیشِ نظر ہے، بند کے بند تصنیف ہو رہے ہیں۔ میر مونس کے بندوں پر انیس اصلاح دیں گے، میر انس، میر خلیق کی ذمے داری ہیں۔ میر مونس اور انیس شروع سے ساتھ رہے ہیں اس لیے انیس ان پر جان چھڑکتے ہیں۔ اب بھی لکھنؤ جاتے ہیں تو پیش خوانی کے لیے مونس ساتھ ہوتے ہیں۔ اس لیے اصلاح بھی ایسی دیتے ہیں کہ میر مونس خود صاحبِ طرز شاعر بنتے جا رہے ہیں۔

میر انیس کے لیے لکھنؤ اب ایسا مقام تھا جہاں بادشاہ سے وزیر تک اور امیر سے غریب تک ہر شخص قدر دانی کے ہاتھ پھیلائے ہوئے تھا لیکن انیس کی وضع داری اسے فیض آباد سے باہر جانے نہیں دیتی تھی۔ نواب تقی کے ان کے خاندان پر بڑے احسانات تھے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے مرزا حیدر، باپ کی وضع کو نبھا رہے تھے۔ انیس بھی اپنا نقصان کر رہے تھے مگر واہ ری احسان شناسی! کبھی توکل سے ہاتھ نہیں اٹھایا۔ پرانی سرکار سے منہ موڑ کر لکھنؤ میں مستقل قیام کو جی نہیں چاہا البتہ یہ ہے کہ زیادہ وقت لکھنؤ ہی میں گزرنے لگا۔

لکھنؤ میں مستقل قیام نہ کرنے کا نقصان یہ ہوا کہ ان کی مقبولیت تو ہوئی لیکن وہ شہرت نہ ہو سکی جس کے وہ حق دار تھے۔ مرزا دبیر لکھنؤ میں تھے اور انیس سے پہلے شہرت کا تاج ان کے سر پر رکھا جا چکا تھا۔ عوام سے خواص تک ان کے کلام کے والہ

وشیدا تھے اور پھر میر ضمیر جیسا استاد ان کی پشت پر موجود تھا۔ ان کے اثر کو زائل کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔ انیس مستقل لکھنؤ میں رہتے تو ممکن ہے وہ بہت جلد اپنا حلقۂ اثر پیدا کرلیتے لیکن ان کی غیر حاضری نے یہ کام ہونے نہیں دیا۔ بہت ہوا تو یہ کہ اگر کسی صحبت میں بیس بیٹھے ہیں تو پانچ انیس کے ثنا خواں اور پندرہ مرزا دبیر کے۔ سارے ہندوستان میں دبیر کو ایسی شہرت حاصل تھی کہ شاید کسی باکمال کو نصیب نہیں ہوئی ہو۔ مسافروں کی طرح پھیرا لگالینے سے انیس اس شہرت کو یکسر ختم نہیں کرسکتے تھے۔

وہ آسمانِ لکھنؤ پر یک لخت نہیں چھاسکتا تھا لیکن اڑان اسی طرف تھی۔ وہ اس وقت کے مشہور مرثیہ گو میر ضمیر کا تعاقب کرتا ہوا بڑھ رہا تھا۔ جو مضمون میر ضمیر باندھتے' اگلی مجلس میں انیس اپنے ستھرے اسلوب میں اسے ایسا چمکادیتا کہ فرق صاف ظاہر ہونے لگتا۔

ضمیر کے ایک بند میں امام عالی مقام اتمام حجت کے طور پر فوج مخالف کو سمجھاتے ہیں اور اپنے ہتھیار وغیرہ دکھا کر اپنی عظمت وجلالت کا اظہار کرتے ہیں۔

پہچانتے ہو کس کی مرے سر پہ ہے دستار
دیکھو تو عبا کس کی ہے کاندھے پہ نمودار
یہ کس کی زرہ' کس کی سپر' کس کی ہے تلوار
میں جس پہ سوار آیا ہوں کس کا ہے یہ رہوار
باندھا ہے کمر میں جسے یہ کس کی ردا ہے
کیا فاطمہ زہرا نے نہیں اس کو سیا ہے

(میر ضمیر)

اسی مضمون کو انیس نے اس وضاحت اور صفائی سے پیش کیا کہ قدامت اور جدّت کا فرق ظاہر کردیا۔ یہ بتادیا کہ اب ہوا کچھ اور ہے۔

یہ قبا کس کی ہے بتلاؤ یہ کس کی دستار
یہ زرہ کس کی ہے' پہنے ہوں جو میں سینہ فگار
بر میں کس کا ہے یہ چار آئینہ جوہر دار
کس کا رہوار ہے یہ آج میں جس پر ہوں سوار
کس کا یہ خود ہے' یہ تیغ دو سر کس کی ہے
کس جری کی یہ کماں ہے یہ سپر کس کی ہے

مرثیے میں جو مضامین بیان ہو رہے تھے میر انیس انہیں نئی آب و تاب اور "اپنے گھر کی زبان" میں پیش کر کے ایک نئی فضا کی تخلیق کر رہے تھے۔ لکھنؤ کے احباب شوکت الفاظ اور "راز کار تشبیہات پر جان دیتے تھے۔ فارسی ملی اردو پر جان چھڑکتے تھے۔ انیس نے اس اردو کے نمونے بھی پیش کیے لیکن آہستہ آہستہ ایک ایسی زبان بھی تخلیق کرتے گئے جس میں دہلی اور لکھنؤ دونوں جگہوں کی بول چال آکر مل گئی۔ یہ زبان اودھ کی نہیں' ہند کی ہے اور سہلِ ممتنع سے قریب تر آگئی۔

پچھلے سموں پہ رکھے ہے سر دوسری بہن
پکڑے شکار بند کو ہے بیوۂ حسن
روکے ہے راہ زوجۂ عباس صف شکن
گھونگھٹ دھرے ہے یال پہ اک رات کی دلہن
صدمے سے تھرتھری تنِ خوش خرام میں
ڈالے ہے ننھے ہاتھ سکینہ لگام میں

کیا یہ انیس کے دادا میر حسن کا فیض نہیں؟

انیس نے اپنے مرثیوں کو شعوری طور پر اودھ کی تہذیب کا مرقع بنادیا۔ واقعہ کربلا عرب سے متعلق ہے' کردار بھی عرب کے ہیں لیکن انیس نے اس واقعے میں اودھ کی تہذیب کے رنگ بھرے۔ ان کے لباس' گفتگو' رسوم و رواج' آداب وتسلیمات' ان کے ہتھیار ایرانی' طریقہ جنگ ایرانی۔ وہی ڈیوڑھیاں' وہی زیورات' دولھا کا سہرا باندھنا۔ مہندی اور آرسی مصحف تک۔

مرثئے میں اپنی تہذیب کی عکاسی سے ان کا مقصد ہی یہ تھا کہ کربلا کے پس منظر میں اپنی ترجمانی دیکھ کر زیادہ سے زیادہ لوگ

"حضرت عباس میدان جنگ میں"

فرما کے یہ غازی نے کیا گھوڑے کو' کوڑا
جوں تیر نظر ٹوٹ پڑا فوج پہ گھوڑا
ماری جسے تلوار نہ جیتا اسے چھوڑا
پامال تھی جس صف کی طرف باگ کو موڑا
تھے کتنے لعین خوف سے بے ہوش زمیں پر
مچھلی سے تڑپتے تھے زرہ پوش زمیں پر

"عون ومحمد میدان جنگ میں"

جانب عون جو سرکش نے کیا تیر کو سر
چھوٹے بھائی نے قلم کردیا اس کو بڑھ کر
کیا چھوٹے کی طرف تیر نے جس وقت گزر
عون کی تیغ سے تھا نصف اِدھر نصف اُدھر
تیر کٹ کٹ کے اِدھر اور اُدھر گرتے تھے
گھوڑے شہزادوں کے بجلی کی طرح پھرتے تھے

ان کی طرف متوجہ ہوں۔ تاریخی اعتبار سے ان کا یہ عمل نادرست سہی لیکن تہذیب کی تمثیل بندی میں وہ کامیاب رہے اور قدرے بعد میں سہی، اسی خوبی نے انہیں مقبول بھی کیا۔

○☆○

مرزا دبیر نے مرثیہ لکھا "دستِ خدا کا قوتِ بازو حسین ہیں" میر ضمیر کے پاس پہنچے اور اصلاح کے لیے پیش کیا۔

استاد کو نئے خیالات، طرزِ بیان اور ترتیب مضامین پسند آئی۔ دل کھول کر تعریف کی اور دل لگا کر اسے بنایا۔ اصلاح کے بعد مرثیہ اور بھی چمک گیا۔

ابھی اصلاح جاری تھی کہ نواب اشرف الدولہ کے یہاں ایک مجلس نکل آئی۔ نواب صاحب میر ضمیر کے بڑے قدردان تھے۔ مرزا دبیر کے جوہرِ کمال کے باعث ان سے بھی حسن سلوک کرتے تھے۔ ان کی مجلس میں اول مرزا بعد ان کے میر ضمیر پڑھا کرتے تھے۔

اس مرتبہ بھی یہی ہوا۔ ایک ہی دن دونوں کو پڑھنا تھا۔ میر ضمیر اس نئے مرثیے پر فدا تھے۔ حقِ استادی کے زعم میں فرمائش کر بیٹھے۔

"بھئی، اس مرثیے کو ہم مجلس میں پڑھیں گے۔"

"آپ استاد ہیں۔ زندگی بھر آپ نے حقِ اصلاح کے عوض طلب ہی کیا کیا ہے۔ یہ ہے تو یونہی سہی۔" دبیر تسلیم بجالائے اور مرثیہ انہی کو دے دیا۔

وہاں سے آنے کے بعد بعض احباب کو حال سنایا۔ مسودہ پاس تھا، وہ بھی سنایا۔ لکھنؤ کے لڑانے اور چمکانے والے غضب کے تھے۔ باتوں کی ہوا کچھ ایسی باندھی کہ دبیر کو اب افسوس ہونے لگا کہ انہوں نے کیا کر دیا۔

میر ضمیر وہی مرثیہ صاف کر کے لے گئے کہ پڑھیں گے۔ معمول کے مطابق اول دبیر منبر نشیں ہوئے۔ استاد ہمہ تن گوش تھے کہ دیکھو لب شاگرد سے کیا ادا ہوتا ہے۔ دبیر نے جونہی مطلع پڑھا، استاد کا رنگ فق پڑ گیا۔ یہ تو وہی مرثیہ تھا جو وہ استاد کو دے چکے تھے۔ ہر طرف سے داد و تحسین کا شور بلند ہو رہا ہے مگر وہ خاموش۔ کچھ غصہ، کچھ بے وفائی زمانہ کا خیال، کچھ اپنی محنتوں کا افسوس۔ سب سے بڑھ کر یہ فکر کہ اب میں پڑھوں گا کیا۔

پڑھنا بھی ایسا کہ استادی کا رتبہ بڑھے نہیں تو اپنے درجے سے گرے بھی نہیں۔ بہرحال، پڑھنا تو تھا۔ استاد پھر استاد ہوتا ہے۔ پڑھا اور خوب پڑھا۔ کمال کی دستار سلامت لے کر منبر سے اترے لیکن اس دن سے دل پھر گیا۔ آئندہ یہ ہوا کہ ایک مجلس میں دونوں کا اجتماع موقوف ہو گیا۔ کچھ دن یہی صورت رہی پھر بالکل ہی دل کھٹا ہو گیا۔ گوشۂ عزلت میں آرام فرمایا، منبر پر دبیر اور انیس رہ گئے۔

دونوں نوجوان میدانِ مجالس میں اترے تو مرثیے کی ترقی کے بادل گرجتے برستے اٹھے۔ سچ ہے مدمقابل سامنے نہ ہو تو مقابلے کا لطف نہیں رہتا۔ ایک نے ایک پر سبقت لے جانے کے لیے صلاحیتوں کو صیقل کرنا شروع کر دیا۔

دونوں نوجوانوں کے کمال کو خوش اعتقاد قدردان ملے۔ وہ قدر و منزلت ہوئی کہ بہشت میں بھی نہ ہو۔ تعظیم و تکریم ہی نہیں گراں بہا تحائف اور نذرانوں کی صورت میں بھی۔ ان ترغیبوں کی بدولت بھی ذہنوں کی پرواز بلند سے بلند تر ہوتی چلی گئی۔ ان کا بھی یہ عالم کہ چاہیں رلادیں، چاہے ہنسادیں اور چاہیں تو حیرت کی مورت بنادیں۔ ایجاد مضامین کے دریا بہادیے۔ ایک مضمون کو سیکڑوں نہیں ہزاروں رنگ سے ادا کیا۔ چہرہ نیا، آمد نئی، رزم جدا، بزم جدا۔ تلوار نئی، نیزہ نیا، گھوڑا نیا۔ صبح کا عالم، نور کا ظہور، آفتاب کا طلوع، دوپہر کی گرمی، رات کی سیاہی، تاروں کا جھرمٹ، غرض جس منظر کو بیان کیا، سماں باندھ دیا۔

ان معرکوں نے وہ شور بلند کیا کہ لکھنؤ گونج اٹھا۔ ہر طرف دبیر و انیس کی دھوم تھی۔ ایک جگہ انیس پڑھ رہے ہیں تو قریب ہی دبیر سخن آرا ہیں۔ دونوں جگہ ایسا ہجومِ سخن شناساں کہ پہلو بدلنے کی جگہ نہیں۔

دبیر کی گرم بازاری میں کوئی فرق نہیں آیا تھا، ہاں اتنا ہوا کہ اب انیس کی شہرت بھی ہونے لگی۔ اگر دبیر کے طرف دار تھے تو ان کے حمایتی بھی سامنے آنے لگے تھے۔ دو جتھے بن گئے تھے۔ ایک انیسیے کہلانے لگے ایک دبیریئے۔ انیسیے صفائی کلام، حسن بیان اور لطف محاورہ کو دلیل بنا کر انیس کی تعریف کرتے جبکہ دبیریئے شوکتِ الفاظ، بلند پروازی اور تازگی مضامین کو مقابلے میں حاضر کرتے۔

"جسے تم فخر کا سرمایہ سمجھتے ہو، یہ باتیں اب دربار فصاحت میں نامقبول ہو کر خارج ہو چکیں۔" انیسیئے کہتے۔

"یہ علم کے جوہر ہیں، اسے بلاغت کہتے ہیں۔ انیس میں دم ہے تو پہاڑوں کو چیرے اور یہ جواہر نکالے۔ انیس کے کلام میں زبانی جمع خرچ کے سوا ہے کیا" دبیریئے جواب دیتے۔

انیسیے چمک اٹھتے "جسے باتوں کا جمع خرچ کہتے ہو یہ صفائی کلام اور قدرت بیان کی خوبی ہے۔ اسے سہل ممتنع کہتے ہیں۔ یہ جوہر خداداد ہے۔ کتابیں پڑھنے اور کاغذ سیاہ کرنے سے نہیں آتا۔"

"حضرت! فقط لفاظی کی دھوم دھام سے کچھ نہیں ہوتا، ادائے مطلب اصل شے ہے۔"

"دیکھیے کیا صاف بول چال ہے۔ دیکھیے کیا محاورہ ہے۔"

"کس کی مجال ہے جو رات کو بیٹھے اور سوبند کہہ کر اٹھے۔"

"جو رات بھر میں سوبند کہتے ہیں وہ بے ربط تو ہوں گے ہی۔"

"جس مجلس میں ان کا کلام پڑھا گیا کہرام ہو گیا۔"

"وہ کیا پڑھیں گے حضت! ان کی آواز تو دیکھیے۔ مرثیہ پڑھنا وہ کیا جانیں۔"

"بھائی کیوں لڑتے ہو۔ دونوں باکمال ہیں۔ ایک ماہ تاب ہے تو دوسرا آفتاب۔"

بات آئی گئی ہو جاتی لیکن پھر کہیں نہ کہیں یہی بحث چھڑ جاتی۔ پھر یہی اعتراضات یہی ردِ اعتراضات۔

○☆○

نصیرالدین حیدر کے زمانہ سلطنت تک میرانیس کی شہرت، دبیر کی شہرت کے سامنے دبی رہی۔ معرکوں کو آغاز ہو چکا تھا لیکن دبیر کی رسائی دربار شاہی تک تھی۔ اہل علم کی نگاہوں میں دبیر کا مرتبہ بلند تھا چنانچہ مرزا رجب علی بیگ نے اپنی کتاب "فسانۂ عجائب" میں صاحب کمالات لکھنؤ کا ذکر کیا ہے اور علما سے لے کر ادنیٰ طبقے تک کا ذکر کیا لیکن انیس کا نام اس فہرست میں نہیں حالانکہ یہ کتاب نصیرالدین حیدر کے زمانے میں تکمیل یاب ہوئی۔

○☆○

زمانہ پاؤں پاؤں چلتا ہوا امجد علی شاہ کے عہد تک آگیا تھا۔ امجد علی شاہ کو علما اور فضلا کی صحبت سے فیض پہنچا تھا اور تعلیم بھی مشرقی طرز پر ہوئی تھی اس لیے مذہبی احکام کے شدت سے پابند تھے۔ ان کے عہد میں لکھنؤ نے فضول خرچیوں سے ہاتھ اٹھالیا۔ سیاسی اعتبار سے بھی یہ دور ایسا تھا کہ انگریزوں کی عمل داری بڑھنے لگی تھی۔

جس وقت سیکڑوں امرا مجالس کے دلدادہ اور امام حسینؑ کے نام پر بے دریغ خرچ کرنے والے بلکہ محلات، خواجہ سرا مجلس کے دلدادہ تھے اور صاحبانِ کمال کے لیے دریادلی کے مظاہرے ہو رہے تھے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے بے کل تھا۔ میرانیس فیض آباد میں بند تھے۔ کمر ہمت باندھی تو اس وقت جب وہ بات جاتی رہی اور گویا انگریزی سلطنت شروع ہو گئی۔ ویسے امرا باقی نہ رہے جو کبھی تھے۔ جو تھے وہ سوچ سوچ کر راستہ چلنے پر مجبور تھے۔ رؤسا عاشقِ ابروئے نذر نہیں، بادشاہ دنیادار نہیں۔

"سلام"

گنہ کا بوجھ جو گردن پہ ہم اٹھا کے چلے
خدا کے آگے خجالت سے سر جھکا کے چلے
مقام یوں ہوا اس کارگاہ دنیا میں
کہ جیسے دن کو مسافر سرا میں آ کے چلے
ملا جنھیں انہیں افتادگی سے اوج ملا
انھی نے کھائی ہے ٹھوکر جو سر اٹھا کے چلے
خیال آگیا دنیا کی بے ثباتی کا
چلے جہان سے اصغر تو مسکرا کے چلے
حسین کہتے تھے واحسرتا علی اکبر
بہار باغ جوانی ہمیں دکھا کے چلے
ملی نہ پھولوں کی چادر تو اہلِ بیتِ امام
مزار شاہ پہ لختِ جگر چڑھا کے چلے
تمام عمر جو کی سب نے بے رخی ہم سے
کفن میں ہم بھی عزیزوں سے منہ چھپا کے چلے
انیس دم کا بھروسا نہیں ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

انیس کو ان نشیب و فراز سے کیا سروکار، وہ تو کسی اور ہی "بادشاہ" کے مدح گزار تھے۔ انہیں تو کسی اور سے حصول انعام کی توقع تھی۔

ترکِ وطن کیا اور فیض آباد سے لکھنؤ میں آگئے۔ گومتی کے کنارے کچھ دور ایک محلہ آباد تھا جسے محلہ شیشی یا شیدیوں کا احاطہ کہا جاتا تھا۔ آصف الدولہ کے امام باڑے کے قریب آباد تھا اور یہاں شرفا و امرا کے مکانات تھے۔ انیس نے بھی یہیں سکونت اختیار کی۔

وہ لکھنؤ میں کیا آیا شہر کے بدن میں جان آگئی۔ اب وہ دولت کے درخت کٹ کٹا گئے تھے لیکن اس گئی گزری حالت پر بھی چاند کے لیے چکور بہت سے تھے۔ دیانت الدولہ نے ایک امام باڑا، ایک محل سرا محلہ شیشی میں تعمیر کرائی۔ امام باڑے میں بہ کمال عقیدت میرانیس کو پڑھوایا اور مکان نذر کیا۔ یہ اس کے لکھنؤ آنے کا پہلا انعام تھا۔

معالی خاں کی سرائے میں مجلس تھی۔ انیس نے نیا مرثیہ لکھا تھا اور اشتیاق تھا کہ اہلِ نظر اسے سنیں اور تعریف کریں۔ خواجہ آتش کا مکان قریب تھا اور ان سے امید بھی تھی

کہ اٹھے چلے آئیں گے۔ انیس تیار ہوئے اور آتش کے مکان پہ دستک دے دی۔ مکان کیا تھا، ایک ٹوٹا پھوٹا ویرانہ تھا جس پر کچھ چھت کچھ چھپر سایہ کیے ہوئے تھا۔

"آجاؤ بھائی، یہ شاہوں کا دربار نہیں فقیر کا تکیہ ہے۔"

آتش کی آواز آئی اور انیس اندر چلے گئے۔

اندر ایک بوریا بچھا تھا جس پر ایک لنگی باندھے، آلتی پالتی مارے آتش بیٹھے تھے۔ انیس کو دیکھتے ہی پہچان لیا۔

"اخاہ! میر خلیق کے فرزند آئے ہیں۔"

"حضور، ایک ضرورت کھینچ لائی ہے۔"

"ضرورت نہ ہو تو آدمی مجھ سا نہ ہو جائے۔" انہوں نے اپنے بوریے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"قریب ہی مجلس ہے۔ میں نے مرثیہ لکھا ہے، چاہتا ہوں آپ بھی سن لیں۔ آپ کو تشریف آوری کی زحمت دینے آیا تھا۔"

"و بھئی، ہمیں یہیں سنا ڈالو۔ ہم کہیں نہیں جاتے آتے۔"

"حضور، آپ کی شرکت سے مجھے داد مل جائے گی۔"

آتش نے یہ سن کر گردن جھکالی۔ اس کے بعد ان سے انکار ممکن ہی نہ ہو سکا۔

لوگ آتے گئے۔ میر مجلس انہیں سر آنکھوں پر بٹھاتا چلا گیا۔ حقے کے دور چلنے لگے۔ گوٹے اور ڈلی کی کشتیاں بزم میں گردش کرنے لگیں۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہو رہی تھیں لیکن نگاہیں بار بار جانب در اٹھ رہی تھیں۔ میر انیس کا انتظار تھا، وہ آگئے۔ اسی وضع قطع میں جس میں ہر جگہ دیکھے جاتے تھے۔ وہی گھیر دار کرتہ، ڈھیلی مہری کا سفید پاجامہ، گھیتلا جوتا۔ ہاتھ میں چھڑی، رومال اور ساتھ ان کے چھوٹے بھائی میر مونس جو پیش خوانی کے لیے ہر جگہ ساتھ جاتے تھے۔ اہلِ مجلس نے کھڑے ہو کر استقبال کیا اور اس وقت تک کھڑے رہے جب تک وہ بیٹھ نہیں گئے۔

ابھی کچھ دیر گزری تھی کہ خواجہ آتش کمر میں تلوار لگائے، سپاہیانہ آن بان کے ساتھ داخل مجلس ہوئے۔ بوڑھے ہوگئے تھے مگر کس بل وہی تھے۔ حاضرین نے آنکھیں بچھادیں۔ انیس کا مرثیہ سننے آتش آئے ہیں۔ سمجھیے مجلس کا وقت ہو گیا۔ حقے بڑھائے جانے لگے، طشتریاں اور کشتیاں سمٹ گئیں۔ ساری مجلس مؤدب، ہمہ تن گوش اور سراپا شوق بن کر منبر کی طرف رخ کر کے بیٹھ گئی۔ منبر نہایت پروقار انداز میں ایسی جگہ پر رکھا گیا ہے جہاں سے پڑھنے والا پورے مجمع پر نظر ڈال سکتا ہے۔

پیش خوانی کے بعد انیس نہایت وقار اور متانت سے اٹھے اور منبر پر جلوہ افروز ہو گئے۔ صلوٰت کے نعروں سے فضا گونجی۔ حسبِ دستور انیس نے کچھ دعائیں زیر لب پڑھیں۔ رباعیات سنائیں، سلام پیش کیا۔ جب مجلس گرم ہو گئی تو مرثیے کی طرف آئے۔

بخدا فارس میدان تہور تھا حُر
ایک دو لاکھ سواروں میں بہادر تھا حُر
نارِ دوزخ سے ابوذر کی طرح حر تھا حُر
گوہر تاج سر عرش ہو وہ دُر تھا حُر
ڈھونڈ لی راہ خدا کام بھی کیا نیک ہوا
پاک طینت تھی تو انجام بھی کیا نیک ہوا

واہ رے طالع بیدار زہے عزت و جاہ
حُر پہ کیا فضلِ خدا ہوگیا اللہ اللہ
پیشوائی کو گئے آپ شہِ عرش پناہ
خضرِ قسمت نے بتادی اسے فردوس کی راہ
مدتوں دور رہے وہ جو قریب ایسا ہو
بخت ایسے ہوں اگر ہوں تو نصیب ایسا ہو

جب انیس بند پر بند پڑھتے ہوئے یہاں تک پہنچے۔

سخنِ حق کی طرف گوش کو مصروف کرو
شور باجوں کا مناسب ہو تو موقوف کرو

تو آتش پورے قد سے کھڑے ہو گئے۔ بیٹھے جھوم تو رہے تھے مگر اب تو گویا مقطع ہی پڑھ دیا۔

"سبحان اللہ! واہ! اب اس سے زیادہ مرثیے کی ترقی کیا ہوگی۔"

آتش کی داد کوئی مذاق نہیں تھی۔ اہلِ مجلس تو وجد میں آگئے۔ زمین کا شور آسمان تک پہنچنے لگا۔ کامرانی کو گویا سند مل گئی۔

شکر گزاری واجب ہو گئی تھی۔ بعد مجلس انیس ان کے پاس گئے، تشریف آوری اور عزت افزائی کا شکریہ ادا کیا۔

"بھئی ماشاء اللہ! اس میدان میں تمہارا سامنا ایک نہیں کر سکتا۔"

انیس کی طبیعت میں عاجزی ایسی تھی کہ اس قدر تعریف کے بعد سر جھکا لیا۔ پلکیں تھیں کہ بار توصیف سے اٹھتی نہیں تھیں۔

"یہ صاحب زادے کون ہیں جو پیش خوانی کر رہے تھے؟"

آتش نے میر مونس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"میرا چھوٹا بھائی، میر مونس ہے۔"

"واہ! کیا نیک کمائی ہے میر خلیق کی۔ رہے نام اللہ کا۔"
آتش نے کہا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی اہلِ مجلس بھی اٹھ گئے۔

گلی کوچوں میں آتش کی آمد اور اس بے پناہ داد کا شور مچ گیا۔ احباب آتے تھے اور مبارک بادوں کے تحفوں سے نوازتے تھے۔

قدردانی کے اس شور میں وہ پھر ایک مرثیہ کہنے بیٹھ گیا۔ اس کا طالع بلندی پر تھا۔ اس کا قلم یوں بھی موتی بکھیرتا تھا مگر اب تو جیسے بلبل کو زبان مل گئی۔ مرثیہ لکھا اور ایسا لکھا کہ قلم کہتا تھا مداحِ اہلِ بیت کا منہ چوم لوں۔

آمد ہے کربلا کے نیستاں میں شیر کی
ڈیوڑھی سے چل چکی ہے سواری دلیر کی
جاسوس کہہ رہے ہیں نہیں راہ پھیر کی
غش آگیا ہے شہ کو یہ ہے وجہ دیر کی
خوشبو ہے دشت، باد بہاری قریب ہے
ہشیار غافلو کہ سواری قریب ہے

آتا ہے وہ جری جو ہزاروں میں فرد ہے
شیروں کا شیر عازمِ دشتِ نبرد ہے
دہشت سے آفتاب کا چہرہ بھی زرد ہے
بڑھ کر پرے سے جو اسے روکے وہ مرد ہے
دکھلائیں گے چلن اسدِ کردگار کا
گھر گھاٹ ان کی تیغ میں ہے ذوالفقار کا

آواز کوسِ حرب ہوئی ہر طرف بلند
تیغیں کھنچیں کہ ہوگئی دریا کی راہ بند
شور دہل سے اور تزلزل ہوا دو چند
صف میں کنوتیوں کو بدلنے لگے سمند
چھوٹے گھر اژدروں سے ترائی ہزبر سے
جنگل سیاہ ہوگیا ڈھالوں کے ابر سے

چلّوں سے کج نہاد ملانے لگے خدنگ
منہ ترکشوں نے کھول دیے صورتِ نہنگ
خنجر رکھے کمر میں دودھارے چتا کے سنگ
برچھے ہلا کے فوج نے جولاں کیے سرنگ
سرہنگ شام گرز گراں تولنے لگے
بڑھ بڑھ کے بیرقوں کو عدو کھولنے لگے

وہ سر سے پاؤں تک چادر اوڑھے لیٹا تھا۔ اس کا مطلب

"امام حسینؓ میدان جنگ میں"

رکھا قدم رکاب میں حیدر کے لال نے
نعلین پا کو فخر سے چوما ہلال نے
بخشی جو صدرِ زیں کو ضیا خوش جمال نے
دم کو چنور کیا فرس بے مثال نے
کس ناز سے وہ رشکِ غزالِ ختن چلا
طاؤس تھا کہ سیر کو سوئے چمن چلا

"گھوڑا"

وہ تھوتھنی، وہ ابلی ہوئی انکھڑیاں وہ یال
گویا کھلے تھے حور کے گیسو پری کے بال
وہ جلد، وہ دماغ، وہ سینہ وہ سم وہ چال
دم میں کبھی ہما، کبھی ضیغم، کبھی غزال
وہ قصر آسماں پہ بھی جانے میں طاق تھا
دو پر اگر خدا اسے دیتا براق تھا

تھا نزول ہو رہا ہے۔
جب گھر میں چراغ جلا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ غلافی آنکھیں کسی نشے سے بوجھل تھیں۔ ماتھے کی لکیریں بتا رہی تھیں کچھ سوچ کر اٹھے ہیں۔ چہرے کی سرخی بتا رہی تھی، کامران لوٹے ہیں۔ اٹھتے ہی میر مونس کی طلبی ہوئی۔

"بھئی طبیعت میں کچھ کسل مندی ہے۔ فکر کر رہا تھا کہ ایک مرثیے کے کچھ بند ہوگئے۔ حافظے سے اتر نہ جائیں ذرا جلدی سے لکھ دو۔"

میر مونس دوڑ کر گئے اور مسطر کشیدہ کاغذ لے آئے۔
انیس نے پھر آنکھیں بند کرلیں۔

ایک بند کے بعد دوسرا بند۔ میر مونس کی انگلیاں درد کرنے لگیں۔ بیس بندوں کے بعد انیس نے آنکھیں کھولیں۔

"ایک آدھ بند اور تھا، اب یاد نہیں آتا۔ کسی اور نشست میں سوچیں گے۔"

"بھیا، آپ کے حافظے پر قربان۔ اتنے بند کہنا اور پھر انہیں یاد رکھنا؟"

انیس مسکرا کر خاموش ہوگئے۔

مرثیہ مکمل ہوگیا اور جلد ہی اس کے پڑھنے کی سبیل بھی نکل آئی۔

زوجۂ میر ضمیر کا چہلم تھا۔ میر انیس کو مجلس پڑھنی تھی۔ دیکھا تو خواجہ آتش بھی تشریف فرما ہیں۔ سوچ کر تو وہ کچھ اور گیا تھا۔ لیکن آتش کو دیکھ کر اس نے ارادہ بدل دیا۔ اپنی عادت کے مطابق حاضرین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور نو تصنیف مرثیہ شروع کر دیا۔

"آمد ہے کربلا کے نیستاں میں شیر کی۔"

آتش سمیت شعرائے کاملین کا مجمع تھا۔ مصرع ہی نے سماں باندھ دیا۔ اہلِ نظر سمجھ گئے کہ وہ آج کس پائے کا مرثیہ سننے والے ہیں۔ جوں جوں وہ آگے بڑھتا گیا' زورِ سخن بھی بڑھتا گیا اور داد کا شور بھی۔

تلوار کی تعریف میں جب بیت پڑھنے کی نوبت آئی تو انیس نے خواجہ آتش کو مخاطب کیا۔

"اس بیت کی داد میں آپ سے چاہتا ہوں۔"

اشراف کا بناؤ رئیسوں کی شان ہے
شاہوں کی آبرو ہے سپاہی کی جان ہے

خواجہ آتش کی آزاد روی اور شوریدہ مزاجی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ پہلے سے بیٹھے جھوم رہے تھے' جب انیس نے مخاطب کیا اور بیت پڑھی تو نصف قد سے کھڑے ہو گئے اور با آواز بلند کہا۔

"کون بے وقوف کہتا ہے کہ تم محض مرثیہ گو ہو۔ واللہ تاللہ تم شاعر ہو اور شاعری کا مقدس تاج تمہارے سر کے لیے موزوں بنایا گیا ہے' خدا مبارک کرے۔"

آتش کی یہ مداحی ایک دن کی نہیں تھی۔ میر خلیق کی غزل پر اپنی غزل پھاڑ چکے تھے۔ لکھنؤ کی مجلسوں میں خلیق کو سن چکے تھے اور اب انیس کو سن رہے تھے۔ ان دو مرثیوں کے بعد تو جہاں بیٹھتے تھے' انیس ہی کا دم بھرتے تھے۔ دبیر کے ماننے والوں کے لیے یہ ایک بڑا دھچکا تھا جو انہیں روز سہنا پڑتا تھا۔ آتش کو جواب دینا آسان نہیں تھا۔

ایک دن سید محمد خاں رند نے آتش کے سامنے کہا "جب سے میں نے غزلیں کہنی شروع کی ہیں مرثیہ کا ذوق جاتا رہا۔ اگر یہ مرثیہ گو غزلیں کہیں تو معلوم ہو کہ کس قدر دشوار فن ہے۔"

"شاید آپ نے خلیق والوں کو نہیں سنا ہے" آتش نے کہا۔

"میں نے فیض آباد میں سب کو سنا ہے۔"

"کانوں سے سنتے تو یہ نہ کہتے" آتش نے برہم ہو کر کہا۔

"انیس کے مرثیے پر سیکڑوں دیوان صدقے کیے جا سکتے ہیں۔"

یہ بے چارے اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

یہ عظمت و منزلت یونہی حاصل نہیں ہو گئی تھی۔ وہ اپنے گھرانے کی زبان کی حفاظت آبرو سے بڑھ کر کرتے تھے۔ اپنے دونوں بھائیوں اور اولاد سے بھی یہی توقع رکھتے تھے۔

وہ مغربین کی نماز تحسین کی مسجد میں ادا کرتے تھے۔ اس دن بھی جریب ہاتھ میں لیے مسجد کی طرف رواں تھے۔ جوں ہی سبزی منڈی ختم ہوئی اور انہوں نے چوک میں قدم رکھا' قدم اٹھانا بھول گئے۔ ایک طائفہ دار غزل گا رہی تھی۔

مجھے آنا ملے کیوں کر تری محفل میں جانا نہ
ترا دربار شاہانہ مری صورت گدایانہ

"آواز ایسی پکی ہے کہ میر صاحب بھی رک کر سنے بغیر نہ رہ سکے۔" کسی من چلے نے فقرہ کسا اور آگے بڑھ گیا۔

میر صاحب مسجد کی راہ بھول گئے' راستے ہی سے پلٹ آئے۔ خدا جانے رات کس بے چینی سے بسر کی ہو گی۔ صبح ہوتے ہی میر مونس کو بلوایا۔ یہ بلاوا خلافِ وقت تھا۔ مونس گھبرائے ہوئے ان کے سامنے آئے اور حکم کے انتظار میں کھڑے ہو گئے۔

"ہمیشہ میں نے کہا ہے' منع کیا ہے کہ غزلیں مت کہا کرو۔"

"بھیا' خیر تو ہے۔"

"یہ کیا کم غضب ہے کہ میر خلیق کے گھرانے کی زبان طائفہ داروں کے گھر پہنچے۔"

"میں اب بھی نہیں سمجھا۔"

"آج ہم چوک سے گزرے تو ایک طوائف جناب کی غزل گا رہی تھی۔ بھرے بازار میں رسوائی ہو رہی تھی۔"

"بھیا' میں غزلیں کہاں کہتا ہوں۔ وہ کسی اور کی غزل ہو گی۔"

"عذرِ گناہ بدتر از گناہ۔ اب ہم ایسے ہو گئے کہ اپنے گھر کی زبان بھی نہ پہچان سکیں۔ ایسی زبان لکھنؤ میں اور کون لکھ سکتا ہے۔" انیس نے کہا اور شعر پڑھ دیا۔

اب مونس کے سامنے اقرار کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ انہوں نے حقیقت بیان کر دی۔

"یہ غزل ایک نواب صاحب لے گئے تھے۔ انہی نے طائفہ دار تک پہنچا دی ہو گی۔"

"آپ غزلیں بانٹتے پھریں گے تو اسی طرح نام اچھلے گا۔"

"بھیا' اب ایسا نہیں ہو گا۔"

"یوں نہیں' ہمارے سر کی قسم کھائیے۔"

"آپ کے سر کی قسم۔"
مونس نے ان کے سر کی قسم کھائی تب کہیں جا کر اطمینان ہوا جب احتیاط کا عالم یہ ہو تو فن میں برکت کیوں نہ ہو۔ نکتہ طرازوں کے شہر میں نکتہ ور کی خوب پذیرائی ہوئی۔
آتش کی طرف داری اس کے لیے بڑا سہارا بنی ہوئی تھی لیکن ۱۸۴۶ء میں آتش کا انتقال ہوگیا۔ میر خلیق ایک سال پہلے ہی رخصت ہوگئے تھے۔

بس اے انیس بس کہ دعا کا ہے اب مقام
ہو مغفرت خلیق کی یارب ذوالکرام
مداحِ آلِ پاک نبی تھا وہ خوش کلام
یارب اسی بزرگ کا یہ فیض ہے تمام

میر انیس نہایت سنبھل سنبھل کر لیکن نہایت فنکارانہ چال سے سفر طے کر رہے تھے۔ ہر مجلس میں اندازہ کر کے اٹھتے تھے کہ اہل نظر کن چیزوں کو پسند کرتے ہیں۔ جوں جوں معقول پسند حضرات جن جن مقاموں پر پہنچ پہنچ کر داد دینے لگے 'وہ اسی قسم کے کلام کو ترقی دینے لگے۔ راہِ مضمون تازہ بند نہیں تھی' ہر مرثیے میں ایک نئی شان نظر آنے لگی۔

اس کی مقبولیت سے دبیر کے چاہنے والے فکر مند ہونے لگے تھے۔ دوسری طرف انیس کے قدر دان اپنی ہوا باندھتے تھے۔ دونوں کے چاہنے والے باہم لڑتے تھے مگر یہ لڑائی عوام تک تھی۔ انیس اور دبیر ایک دوسرے کو نہایت عزت و وقعت کی نظر سے دیکھتے رہے۔ نہ میر انیس اپنی صحبت میں دبیر کی بدگوئی سننے کے روادار تھے نہ مرزا دبیر اپنے حلقہ احباب میں کسی کو انیس پر بے جا اعتراض کرنے دیتے۔ کلام پر نکتہ چینی جو ہر کمال پر صیقل تھی) اور یہ دونوں استادوں کے یہاں ایک دوسرے پر ہوتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی سخن گسترانہ چوٹیں ہوجاتی تھیں مگر دل صاف تھے۔

انیس نے کسی جگہ رباعی پڑھی۔

کس دن مضمون کا نہ نقشہ اترا
پرواز معانی کا نہ چہرہ اترا
منبر سے ہم اترے نئے مضمون لے کر
ان کے لیے گویا من و سلوا اترا

مرزا دبیر نے دبے لفظوں میں چوٹ کی۔

بعضوں میں نہ فہم نکتہ دانی پایا
تصنیف کا دعویٰ بھی زبانی پایا

"فخر"

کس جنگ میں سینے کو سپر کرکے نہ آئے
کس مرحلۂ صعب کو سر کرکے نہ آئے
کس فوج کی صف زیر و زبر کرکے نہ آئے
تھی کون سی شب جس کو سحر کرکے نہ آئے
تھا کون جو ایماں تہ صمصام نہ لایا
اس شخص کا سر لائے جو اسلام نہ لایا

"غصہ"

برہم ہوئے یہ سنتے ہی عباس خوش خصال
غازی کو شیر حق کی طرح آگیا جلال
قبضے پہ ہاتھ رکھ کے یہ بولا علی کا لال
اب یاں سے کوئی ہم کو ہٹا دے یہ کیا مجال
حملہ کریں چڑھا کے اگر آستین کو
ہم آسماں سمیت الٹ دیں زمین کو

دُزدانِ معانی کے وہ شاکی ہیں بجا
یعنی سخن ان کا بے معانی پایا

بس اس سے آگے کچھ نہیں۔ دونوں ایک دوسرے کی نسبت فرماتے تھے کہ ایسا صاحب کمال شاید پھر پیدا نہ ہو۔
دونوں بزرگوں کی اعلیٰ ظرفی اپنی جگہ لیکن دونوں کے طرف داروں کی بدولت اکثر معرکہ آرائی کی فضا پیدا ہوجاتی تھی۔
میاں مداری لکھنؤ میں بڑے بااثر شخص تھے۔ انیس کے چاہنے والوں میں تھے۔ جس سے ملتے' انیس کی تعریف ضرور کرتے تھے۔ ایک روز ایک نواب صاحب ان سے ملنے آئے۔ میاں مداری نے حسب عادت میر انیس کی تعریف شروع کردی۔ نواب صاحب بھڑک اٹھے۔ دونوں جانب سے دلیلیں دی جانے لگیں۔ نواب صاحب کچھ نرم پڑے مگر اتنا پھر بھی کہا۔
"میر انیس رخصت اور بین کہہ لیں مگر رزم مرزا صاحب کا حصہ ہے۔"
"یہ بات تو ثبوت چاہتی ہے۔ ایک مجلس کیے لیتے ہیں جس میں انیس بھی مرثیہ پڑھیں اور دبیر بھی۔"

"دبسم اللہ۔"

نواب صاحب رخصت ہوئے اور میاں مداری انیس کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

"مرثیہ ایسا ہو کہ خاص طور پر رزم کے مضامین، گھوڑے اور تلوار کی تعریف نظم ہو۔"

انیس نے سنا اور مسکرا کے چپ ہو گئے۔

لکھنؤ میں اس مجلس کی شہرت ہو گئی جس میں ایک دن دبیر کو پڑھنا تھا اور دوسرے دن انیس کو۔

انیس نے دن رات محنت کر کے رزمیہ مرثیہ کہنا شروع کیا۔ دوسری طرف دبیر نے یہ جدّت کی کہ بیس پچیس بند بے نقطے کے تصنیف کیے۔

غرض مرزا دبیر نے ایسا مرثیہ پڑھا کہ سارے لکھنؤ میں شور مچ گیا۔ عام تاثر یہی تھا کہ میرانیس ایسے مضامین نہیں کہہ سکیں گے۔ میر انیس کے ہوا خواہ بھی ڈرے ہوئے تھے۔

دوسری مجلس میں سارا شہر اس معرکے کو دیکھنے کے لیے جمع تھا۔ میرانیس چہرہ، آمد اور سراپا کی منزل سے گزرنے کے بعد رجز کی منزل میں داخل ہوئے تو لگتا تھا کربلا کے رن میں قدم رکھ دیا۔ تلوار کی طرف آئے تو تلوار چلتی ہوئی نظر آئی، گھوڑے کا ذکر کیا تو گھوڑے کی ٹاپوں کی آوازیں سماعت سے ٹکرانے لگیں۔ رتس پر انیس کے پڑھنے کا انداز۔ جو منظر بیان کیا، آنکھوں سے دکھا دیا۔

چمکی، گری، اٹھی، اِدھر آئی اُدھر گئی
خالی کیے پرے تو صفیں خوں میں بھر گئی
کاٹے کبھی قدم کبھی بالائے سر گئی
ندی غضب کی تھی کہ چڑھی اور اتر گئی
اک شور تھا یہ کیا ہے جو قہر صمد نہیں
ایسا تو رودِ نیل میں بھی جزر ومد نہیں

گھوڑے کے لیے ارشاد ہوا۔

سمٹا، جما، اُڑا، اِدھر آیا اُدھر گیا
چمکا، پھرا، جمال دکھایا ٹھہر گیا
تیروں سے اڑ کے برچھیوں میں بے خطر گیا
برہم کیا صفوں کو پرے سے گزر گیا
گھوڑوں کا تن بھی ٹاپ سے اس کے فگار تھا
ضربت تھی نعل کی کہ سروہی کا وار تھا

مرثیہ تھمتے تھمتے تھما۔ لوگوں کو آتے آتے یقین آیا۔ خود نواب صاحب نے بھی بعدِ مجلس دوڑ کر میرانیس سے مصافحہ کیا اور اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔

"میں ابھی تک غلطی پر تھا۔ آپ کا جواب نہیں۔"

ان بزرگوں نے چاہے خیال بھی نہ کیا ہو لیکن دبیر کے طرف داروں نے اسے جان بوجھ کر انیس کو نیچا دکھانے کے عمل سے تعبیر کیا۔

"میرانیس کو بہت پہلے سے بتا دیا گیا تھا اس لیے انہوں نے خوب تیاری سے مرثیہ کہا جب کہ دبیر کو عین وقت پر بتایا گیا۔"

"دبیر کو سننے کے لیے زیادہ لوگ نہیں بلائے گئے۔"

"دبیر نے پچیس بند ایسے کہے جن میں کوئی نقطہ نہیں آیا۔ کیا یہ کمال نہیں۔"

"انیس کے پڑھنے کا کمال ہے ورنہ شاعر تو دبیر ہی ہیں۔"

غرض جتنے منہ تھے اتنی باتیں ہوئیں۔ انیس کے چاہنے والوں نے بھی جواب دیے اور اس آزمائشی مقابلے کو معرکہ آرائی سے تعبیر کیا گیا اور یہ سمجھا گیا کہ یہ سب دبیر کو نیچا دکھانے کے لیے تھا۔

انہی دنوں ایک واقعہ اور ایسا ہو گیا جس نے دبیریوں کے دلوں میں کدورت پیدا کر دی۔

میر کلو لکھنؤ کے ایک تاجر تھے۔ وہ اپنے یہاں ہر سال مجلس کراتے تھے اور ایسی مجلس کہ لکھنؤ میں کوئی ایسا نہ تھا جو اس میں شریک نہ ہوتا ہو۔ مرزا دبیر ہر سال وہاں پڑھا کرتے تھے۔

اس سال بھی مجلس تھی۔ مجلس بھر چکی تھی اور مرزا صاحب کا انتظار تھا مگر وہ نہ اب آتے ہیں نہ جب۔ کسی بات سے ایسا صدمہ پہنچا کہ پڑھنے سے انکار کر دیا۔ میر کلو خود گئے۔ مرزا صاحب نے ان سے بھی معذرت کر لی۔

دبیر کے عاشقوں سے مکان کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ دبیر آنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ کسی اور کو بلائیں تو رنگ کیسے جمے۔ بالآخر یہی سوچا کہ اس مشکل وقت میں انیس کو آواز دی جائے۔ وہ شیدیوں کے احاطے میں پہنچ گئے۔

دوپہر قریب تھی۔ انیس گھر میں لیٹے کسی مرثیے پر نظرِ ثانی کر رہے تھے کہ کسی نے عجیب انداز میں پکارا۔

"اے حلّالِ مشکلات کے پوتے، ذرا ادھر آئیے۔"

گلے میں کرتہ ڈالنے اور سر پر ٹوپی جمانے میں جو وقت لگا سو لگا، انیس گھبرا کر باہر نکل آئے۔ میر کلو کو دیکھ کر حیرت ہوئی۔

"بس مجلس تیار ہے اور کچھ نہ پوچھیے، تشریف لے چلیے۔"

میر کلو نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔

پالکی اور کہار ساتھ لے کر گئے تھے۔ انیس سوار ہوئے اور مجلس میں پہنچ گئے۔

یہ بھی عجب امتحان تھا۔ لوگ ذہنی طور پر دبیر کے منتظر تھے۔ انیس اچانک آ گئے تھے اس لیے ان کے حمایتی بھی وہاں نہیں ہوں گے۔ ایسے ماحول میں لوگوں کو آمادہ کرنا اور داد لینا مشکل کام تھا۔ انیس کی فنکاری نے جادو جگایا۔ وہ تین گھنٹے مستقل پڑھتے رہے۔ منبر سے اترے تو حاضرین کی زبانوں پر "واہ انیس" کے سوا کچھ نہ تھا۔

حاسدوں نے اسے بھی طرح طرح کے معنی پہنا دیے۔ میر کلو اور انیس کی مجبوری کو دبیر دشمنی کا رنگ دینے کی کوشش کی۔ ان دو واقعات نے انیسیوں اور دبیریوں کے درمیان مزید فاصلے بڑھا دیے۔

O☆O

انیس کے لکھنؤ نے ایک کروٹ اور لی۔ امجد علی شاہ نے انتقال کیا اور حکومت واجد علی شاہ کے ہاتھ آئی۔ شہزادہ جب تخت پر بیٹھا تو بالکل جوان تھا۔ دل امنگوں سے معمور تھا۔ نہ دولت کی کمی تھی نہ شاہد و مطرب کی۔ ولی عہدی کے زمانے میں وہ مراحل عشق طے کر بھی چکا تھا۔ روز و شب پری خانے میں بسر ہوتے تھے لیکن تخت پر بیٹھتے ہی بیدار مغز کا ثبوت بھی دیا۔ نظام مملکت کی درستی اور عسکری طاقت کے استحکام و ثبات پر پوری توجہ دی۔

کاروبارِ سلطنت کی مصروفیات نے ولی عہدی کے زمانے کے بہت سے شوق چھین لیے۔ البتہ موسیقی اور شاعری کا شوق اس سے کوئی نہیں چھین سکا۔ خاص طور پر شاعری۔

اس کا زمانہ شاعری کے شباب کا زمانہ تھا۔ وہ خود شاعر تھا۔ ولی عہدی سے غزل گوئی کا شوق تھا۔ اب جو دیگر مکروہات سے فرصت ملی تو اس شوق نے پرواز دکھائی۔ حکم ہوا کہ لال بارہ دری میں مشاعرے کا اہتمام ہونا چاہیے۔

گرمیوں کے دن تھے۔ لال بارہ دری پر چھڑکاؤ کیا گیا تھا۔ قناتیں لگا کر پھولوں کے گلدستے منڈیروں پر رکھ دیے گئے۔ مکلف فرش بچھا دیا گیا۔ جھاڑ، کنول، فانوس شام سے روشن ہو گئے۔ اہلِ دربار قرینے سے مؤدب بیٹھے تھے کہ بادشاہ کی آمد کا شور بلند ہوا۔ تمام اراکین سروقد کھڑے ہوئے اور بسم اللہ کی صدا چاروں طرف سے آنے لگی۔ جانِ عالم واجد علی شاہ مسند زرنگار پر بصد جاہ و جلوہ افروز ہوئے۔ بادشاہ کے تشریف فرما ہوتے ہی مشاعرے کا آغاز ہو گیا۔

مشاعرے کے بعد درباری شعرا، مصاحبین، ندیمانِ خاص جمع تھے کہ دوران گفتگو میر انیس کا ذکر نکل آیا۔

یہاں بھی دبیر کی گرم بازاری تھی۔ بادشاہ خود دبیر کی شاعری کو پسند کرتے تھے۔ کچھ لوگ انیس کے طرف دار بھی تھے لہٰذا گفتگو نے بحث کی شکل اختیار کر لی۔

"لکھنؤ میں ایک ہی شاعر ہیں اور وہ ہیں میر انیس۔"

"حضت مرثیے میں کہئے مرثیے میں۔ ہمارے حضور پر نور کی طرح ہر صنفِ سخن میں طاق نہیں ہیں۔"

"انہوں نے اہل بیت اطہار کی مدح و توصیف کو شعار بنا لیا ہے ورنہ کسی اور صنف میں کیا وہ کہہ نہیں سکتے۔ ایسا سوچنا بھی گناہ ہے۔"

"آپ نے یہ اچھی کہی۔ اگر مرثیے کی بات ہے تو آپ مرزا دبیر کو کیوں بھولے جاتے ہیں۔ وہ بھی تو اسی لکھنؤ کے ہیں۔"

"اجی ان کا انیس سے کیا مقابلہ۔"

"یہ تو نہ کہئے۔ دونوں برابر کے ہیں۔ انیس میں اگر فصاحت ہے تو دبیر میں بلاغت۔ چاند اور سورج میں سے کسی ایک کی بھی آپ اہمیت سے انکار نہیں کر سکتے۔ پسند کی بات الگ ہے۔"

واجد علی شاہ اس بحث کو بڑی دلچسپی سے سن رہے تھے۔ جب بحث اس نکتے پر پہنچی کہ یہ دونوں کبھی کسی مجلس میں ایک ساتھ جمع نہیں ہوئے تو بادشاہ نے گاؤ تکیے سے پشت ہٹالی۔

"فتح الدولہ۔"

"جی حضور؟"

"ابھی ابھی ایک بات ذہن میں آئی۔"

"ارشاد عالی۔"

"کیوں نہ ہم ان دونوں صاحبوں کو ایک جگہ جمع کر کے لکھنؤ والوں کو خوش کر دیں۔ یہ ایک بالکل نئی بات ہو گی۔"

"حضور ہو گی تو بالکل نئی بات بشرطیکہ یہ حضرات تیار ہو جائیں۔ کہیں ایسا نہ ہو ان کے انکار سے مزاج شاہی کو ٹھیس پہنچے۔"

"تم حکم باریابی تو پہنچاؤ۔ ہمیں امید ہے وہ ہمارا دل رکھ لیں گے۔"

شاہی قاصد پیغام لے کر انیس کے پاس پہنچا۔

"مجھے عذر تو کوئی نہیں لیکن میں دربار کے حفظِ مراتب کا لحاظ نہیں رکھ سکوں گا۔ اپنے معمولی لباس میں حاضر ہونے کی جسارت کروں گا۔"

مرزا دبیر نے بھی رضامندی ظاہر کر دی۔

شاہی امام باڑا روشنی کی بہتات سے جگمگا رہا تھا۔ علموں کے نقرئی اور طلائی پنجوں کی چمک، بھاری پٹکوں کی آراستگی، زردوزی کام پر گنگا جمنی جھالروں کی زیبائش در و دیوار کو روشن کر رہی تھی۔ عام طور پر اجالے کا یہ سیلاب محرم کے دنوں میں

نظر آتا تھا۔ اب محرم نہیں تھے لیکن بادشاہ کی آمد کے استقبال کے لیے روشنی اور اجالے کا فرش تو بچھانا تھا۔

مرزا دبیر کی آمد کا شور بلند ہوا۔ امام باڑا کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ بڑی مشکل سے پاؤں رکھنے کی جگہ بنی۔ ہجوم نے راستہ دیا اور مرزا دبیر باریاب حضور ہو کر ایک جانب بیٹھ گئے۔

میر انیس کا انتظار تھا۔ وقت زیادہ ہوتا جا رہا تھا اور وہ ابھی تک پہنچے نہیں تھے۔ حاضرین کا اشتیاق اور بادشاہ کی گھبراہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔

بات یہ تھی کہ میر انیس جان بوجھ کر دیر لگا رہے تھے۔ مدعا یہ تھا کہ مرزا دبیر کی آمد کا حال معلوم ہو جائے تو وہ گھر سے چلیں۔ شاہی چوب دار کب سے لینے آیا ہوا تھا۔ جب ایک اور چوب دار آیا اور مرزا دبیر کی آمد کا حال بھی معلوم ہو گیا تو انہوں نے تام جھام میں پاؤں رکھا۔

مجلس میں، فرش پر پاؤں رکھتے ہی تمام ارباب مجلس تعظیماً اٹھ کھڑے ہوئے۔ میر انیس نہایت تمکنت اور وقار سے منبر کی طرف گئے اور منبر کے نزدیک بیٹھ گئے۔

فتح الدولہ نے ان کی دعا بادشاہ تک پہنچا دی اور اس کے ساتھ ہی مجلس شروع ہو گئی۔ پہلے مرزا دبیر کو پڑھنے کا حکم ہوا۔ مرزا دبیر نے مرثیہ شروع کرنے سے پہلے بادشاہ کی تعریف میں رباعی پڑھی۔

اس کے بعد منبر پر میر انیس جلوہ افروز ہوئے۔ انہوں نے حضرت علیؓ کی تعریف میں رباعی پڑھی۔ اس کے بعد سلام پڑھنے کے لیے ان کی آواز گونجی۔

غیر کی مدح کروں شہ کا ثنا خواں ہو کر
مجرئی اپنی ہوا کھوؤں سلیمان ہو کر

لکھنؤ کے سامعین، نکتہ شناس طبیعتیں مطلع سنتے ہی معنی کی گہرائی میں اتر گئیں۔

سلام کا تیسرا شعر ختم نہیں ہوا تھا کہ واجد علی شاہ چلمن اٹھا کر باہر نکل آئے۔

زلف اکبر کو جو دیکھا سر نیزہ پُر خوں
موئے سر کھول دیے ماں نے پریشاں ہو کر

مجلس پر وجد کی کیفیت طاری تھی۔ سبحان اللہ کی آوازوں سے عالی شان ہال گونج رہا تھا۔

سلام ختم کر کے انیس نے مرثیے کے چند بند پڑھے اور منبر سے اتر آئے۔

"فتح الدولہ! میر انیس لکھنؤ میں ایک ہی شاعر ہیں۔ دیکھا تم نے، یہ زبان انہی کے لیے مخصوص ہے۔" واجد علی شاہ نے کہا اور پھر علی نقی خاں کو حکم ہوا کہ میر صاحب کو دروازے تک رخصت کرنے جائیں۔

(بعض حضرات کا خیال ہے، دبیر نے بادشاہ کی تعریف میں رباعی نہیں پڑھی تھی۔ اگر پڑھی بھی تھی تو اس سے ان کی توہین کا پہلو نہیں نکلتا اس لیے کہ بادشاہ نے سیکڑوں مرتبہ ان کی تعریف کی تھی بلکہ ان کا ایک مصرع بھی ملتا ہے۔

"میں بچپنے سے عاشقِ نظمِ دبیر ہوں"

دبیر نے اگر رباعی پڑھی تو بادشاہ کے احسانات کے جواب میں پڑھی)

اس قدر دانی کے بعد انیس کی شہرت کو پر لگ گئے۔ ان کی زبان سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ کو قدر شناس موتیوں اور جواہرات کی طرح عزیز رکھنے لگے۔ ان کا کلام تحفے کے طور پر دوسرے شہروں کو بھیجا جاتا تھا۔ ایک دن وہ تھا جب انیس کو یہ کہنے کی ضرورت پڑی تھی۔

گر قدرداں ہیں کم تو نہ کر اتنا اضطراب
جلدی مدد کریں گے شہ آسماں جناب

اب یہ کہنے کی ضرورت پیش آئی۔

آباد لکھنؤ رہے تا حشر یااللہ
رکھ، میرے دوستوں کو جہاں میں بہ عزوجاہ
یارب ہرا بھرا چمنِ آرزو رہے
جب تک چمن میں گل رہے اور گل میں بو رہے

بادشاہ کی قدردانیوں اور داد و دہش نے گھر گھر سخن کا چرچا دراز کر دیا۔ گھر کی خواتین تک قافیے جوڑنے لگیں۔ تانگوں میں بیٹھی ہوئی سواریاں اس طرح اشعار پڑھتے سفر کاٹتی تھیں جیسے مشاعرہ ہو رہا ہے۔ اشعار کی رعایت لفظی روز مرہ کی گفتگو تک اتر آئی تھی۔ فقرے بازیوں نے راہ چلتوں کو روکنا شروع کر دیا تھا۔ انعام و اکرام کی فراوانی نے خوش حالی کو دعوت قیام دے دی تھی۔ واجد علی شاہ کی رنگین مزاجی نے پورے شہر کو میلے ٹھیلوں کا شوقین، نازک طبع اور رنگین مزاج بنا دیا تھا۔ لکھنؤ کا یہ آخری عہد چراغ کے بھڑکنے کا سماں پیش کر رہا تھا۔ تمام نوابین اودھ کی تمام حشر سامانیاں اس ایک عہد میں مجتمع ہو گئی تھیں۔ جاگنے کی راتیں، بے فکری کے تکیے، عیش و آرام کے بستر بچھے ہوئے تھے۔

اب مرثیے اور سلام محرم کی آمد کا انتظار نہیں کر سکتے تھے۔ مرثیوں اور سلاموں کے قدر دان مشاعروں کی طرح مجالس منعقد کر کے انیس و دبیر کے کمال ہنر کو تحسین پیش کرتے تھے۔ جس طرح غزلیں، ہونٹوں سے نکلتے ہی کوٹھوں کی زینت

بن جاتی تھیں، اس طرح مرثیوں اور سلام کے اشعار اہلِ نظر آنکھوں پر لیے پھرتے تھے۔ ہفتوں ان پر بحث ہوتی تھی۔

یہ دن انیس کے اوجِ کمال کے دن تھے۔ فنی اعتبار سے بھی، قدر دانی کے لحاظ سے بھی۔ واجد علی شاہ اس کا بے حد ادب کرتے تھے۔ اُمرا و رؤسا اس پر جان چھڑکتے تھے۔ مالی اعتبار سے بھی یہ اس کی خوش حالی کا دور تھا۔ مجالس سے ملنے والے نذرانوں اور سرکاری تنخواہ نے اسے معاش کی الجھنوں سے آزاد کردیا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اس شہر میں اس کے ناز اٹھانے والے موجود تھے۔ جب سے وہ لکھنؤ آیا تھا اس شہر سے باہر نکلنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی تھی۔ اس کے کلام کی شہرت دیکھتے ہوئے دوسرے شہروں سے دعوت نامے آتے تھے لیکن اس کی قناعت پسندی نے اسے کہیں نہیں جانے دیا۔ وہ ہمیشہ یہ کہتا رہا "اس کلام کو اسی شہر کے لوگ خوب سمجھتے ہیں اور کوئی اس کی قدر کیا جانے گا اور ہماری زبان کے لطف کو کیا سمجھے گا۔"

واجد علی شاہ کی بیداریِ مغز اور خاص طور پر فوجوں کی ازسرنو تعمیر و تربیت کی وجہ سے انگریز بہت خائف تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ فوجی طاقت ان کی زبردستیوں کے خلاف استعمال ہوسکتی ہے۔

ایک روز برطانوی ریذیڈنٹ بادشاہ سے ملاقات کے لیے آیا۔ یہ معمول کی ملاقات نہیں تھی۔ کچھ ہی دیر بعد اس کی نیت ظاہر ہوگئی۔

"حضور، فوج کی تیاری میں اس قدر زحمت کیوں فرماتے ہیں؟"

"اس لیے کہ میرے سپاہی بیٹھے بیٹھے ناکارہ نہ ہوجائیں۔"

"لیکن آپ تو رسالے اور پلٹنیں بنا رہے ہیں۔"

"اسے میرا ذاتی شوق سمجھ لیں۔"

"ملک کی حفاظت کے لیے افواج کی ضرورت ہو تو برطانوی افواج استعمال کی جاسکتی ہیں۔"

ریذیڈنٹ رخصت ہوگیا لیکن بادشاہ کی حیرت رخصت نہیں ہوئی۔

اس کے بعد اس کی ہر کوشش کو شک کی نظروں سے دیکھا جانے لگا۔ اس پر اتنی پابندیاں لگ گئیں کہ اس نے بددل ہوکر اپنے آپ کو عیش و نشاط میں گم کرلیا۔ زمانۂ ولی عہدی کو آواز دے دی۔ کاروبارِ سلطنت علی نقی خاں کے سپرد ہوگیا۔

وہ دیوانِ خاص میں جلوہ افروز تھا۔ مرشد زادے، امرائے

"گنجینۂ گوہر"

تُلی کا رعب سب پہ عیاں ہے خدائی میں
بیٹھا ہے شیر پنجوں کو ٹیکے ترائی میں

○☆○

پیچھے ہٹیں صفیں، یہ تلاطم عیاں ہوا
دریا جو باڑھ پر تھا وہ الٹا رواں ہوا

○☆○

چہرے تھے زرد خوف سے حیدر کے لال کے
نامرد منہ چھپاتے تھے گھونگھٹ میں ڈھال کے

○☆○

یوں روح کے طائر سروتن چھوڑ کے بھاگے
جیسے کوئی بھونچال میں گھر چھوڑ کے بھاگے

○☆○

الٹوں طبق زمین کا یوں جھک کے زین سے
جس طرح جھاڑ دیتے ہیں گرد آستین سے

○☆○

غربت میں کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا
شمعیں بھی جلاؤ تو اُجالا نہیں ہوتا

○☆○

عالم پیری میں ہے غفلت انیس
رات بھر جاگے سحر کو سوگئے

○☆○

خاروں سے پوچھیے نہ کسی گل سے پوچھیے
صدمہ چمن کے لٹنے کا بلبل سے پوچھیے

○☆○

گرمی ہجوم فوج سے دو چند ہوگئی
خاک اس قدر اڑی کہ ہوا بند ہوگئی

○☆○

مقتل میں کیا ہجوم تھا اس نور عین پر
پروانے گر رہے تھے چراغ حسین پر

○☆○

کسی کو کیا ہو دلوں کی شکستگی کی خبر
کہ ٹوٹنے میں یہ شیشے صدا نہیں دیتے

○☆○

سنگریزوں میں تب و تاب تھی انگاروں کی
سر پہ یا دھوپ تھی یا چھاؤں تھی تلواروں کی

.... نامدار اور عمائدین شہر قرینے سے کھڑے۔ ہر چہرہ فکر مند، ہر آنکھ پریشان تھی۔ بہت دن سے یہ خبریں آرہی تھیں کہ ملک اودھ کا نیا ریذیڈنٹ گورنر جنرل کو مجبور کر رہا ہے کہ اسے انتظامی حالات کا جائزہ لینے کے لیے ملک اودھ کا تفصیلی دورہ کرنے کی اجازت دی جائے اور آج وہ اس دورے پر روانہ ہوگیا تھا۔ دکھ یہ تھا کہ اسے کیا حق پہنچتا ہے۔ یہ تخت غازی الدین حیدر کا ہے یا انگریزوں کے باپ کا۔ رپورٹ کے مرتب کرنے کے پیچھے جو عزائم تھے وہ صاف نظر آرہے تھے۔ یہی فکر مندی تھی۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ گورنر جنرل کے نام خط لکھا جائے۔ خط کا مضمون تیار ہوا۔ بادشاہ نے دستخط کیے۔ اجلاس برخواست ہوا اور بادشاہ قیصر باغ کی سیر کو روانہ ہوگیا۔ ابھی تک رعایا کو علم نہیں تھا کہ اودھ کی قسمت کے ساتھ کس کھیل کا آغاز ہو چکا ہے۔

○☆○

میر انیس نے ایک سلام کہا تھا جس کا مطلع تھا۔

سدا ہے فکرِ ترقی مآل بینوں کو
ہم آسمان سے لائے ہیں ان زمینوں کو
یہ جھریاں نہیں ہاتھوں پہ ضعفِ پیری نے
چنا ہے جامۂ ہستی کی آستینوں کو
خیالِ خاطرِ احباب چاہیے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

آستین کے قافیے کی پورے شہر میں دھوم مچ گئی۔ واجد علی شاہ تک کو اس قافیے کے باندھنے کا شوق ہوا۔ انہوں نے کہا۔

جہادِ نفس عبادت میں مجھ کو ہے منظور
وضو کے وقت الٹتا ہوں آستینوں کو

مرزا دبیر کے صاحب زادے مرزا اوج نے بھی طبع آزمائی کی۔

یہ دست بردِ خزاں کا بہار میں ڈر ہے
کہ غنچے تھامے ہیں مٹھی میں آستینوں کو

ہزاروں قافیے آستینوں کے بندھ گئے لیکن انیس کے شعر کا جواب نہیں تھا۔

اس پر غضب یہ ہوا کہ میر مونس (برادرِ انیس) نے ایک مجلس میں سلام پڑھا جس میں یہ دو شعر بھی تھے۔

بھلا ترددِ بے جا سے اس میں کیا حاصل
اٹھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں کو
نیا مزہ ہے کہ مضموں تو دستیاب نہیں
مقابلے پہ چڑھاتے ہیں آستینوں کو

شہزادگانِ اودھ میں سے نواب ممتاز الدولہ بھی اس مجلس میں شریک تھے۔ وہ مرزا دبیر کے شاگرد تھے۔ انہوں نے شعروں کو براہِ راست مرزا دبیر پر چوٹ سمجھا اور خفا ہو کر مجلس سے اٹھ گئے۔

ان کا اٹھ جانا غضب کا آجانا ہوا۔ دبیریوں میں شور مچ گیا۔ دونوں طرف سے خوب چوٹیں ہونے لگیں۔

نظیر برادرِ دبیر نے اپنے سلام کے مقطع میں کہا۔

طعنہ زن ہوتے ہیں جو بیٹھ کے منبر پہ نظیر
کیا نہیں جانتے وہ اہلِ زباں اور بھی ہیں

یہاں تک ہوا کہ مرزا دبیر کے مشہور شاگرد میاں مشیر نے یہ سخت اشعار بھی کہہ سنائے۔

جلی کٹی مرے استاد سے کرے جو کوئی
تو پھونک دوں مع خرمن میں خوشہ چینوں کو
ہزار بار سزا پا کے منہ پہ چڑھتے ہیں
مشیر کیا کہوں ان احمق الذّینوں کو
اساتذہ کی ہیں غزلیں، سلام بھی اکثر
نیا سمجھتے ہیں پھر لوگ ان زمینوں کو

یہ اشعار تو ہجو کا درجہ رکھتے تھے۔ دبیر یہ کب برداشت کرسکتے تھے۔ انہوں نے مشیر کو ڈانٹا اور حکم دیا کہ انیس کے روبرو پہنچ کر معافی مانگیں۔

شاگرد لڑتے رہتے تھے لیکن دونوں اساتذہ میں ایسی ہی محبت تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو باکمال سمجھتے تھے۔

میاں مشیر انیس کے روبرو حاضر بھی ہوئے، عذر خواہ بھی ہوئے لیکن یہ ایسی لڑائی نہیں تھی جس کا خاتمہ ہو جاتا۔ ایک مشیر نہیں تھے لکھنؤ میں بے فکروں کی کمی نہیں تھی۔ آتش و ناسخ اور انشا و مصحفی کے معرکے اسی شہر میں گرم ہوئے تو پھر دبیر و انیس کیوں نہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ایسی گرمی آتی گئی کہ قربان علی سالک جب دہلی سے لکھنؤ آئے تو یہ تماشے دیکھ کر دنگ رہ گئے۔

"دہلی میں مرزا غالب اور استاد ذوق کی چوٹیں دیکھتا سنتا تھا مگر یہاں میر انیس اور مرزا دبیر کی معرکہ آرائی کا عالم نرالا ہے۔ ایک طرف کا معتقد دوسری طرف والوں میں ایسا دیکھا جاتا ہے جیسا موحدین میں مشرک اور مسلمانوں میں کافر۔"

لکھنؤ کے من چلے ایک کو دوسرے سے لڑانے میں مہارت رکھتے تھے۔ یہاں تک ہوا کہ انیس کو چہیتے بھائی سے لڑوا دیا۔ میر مونس اور انیس کے درمیان کمال کی محبت تھی۔ مونس ان پر جان چھڑکتے تھے اور وہ انہیں اولاد سے بڑھ کر چاہتے تھے۔

میر مونس نواب محمد حسین خاں کی صحبت میں بیٹھے تھے۔ گفتگو میں میر انیس کا ذکر نکل آیا۔ ان دنوں انیس نے ایک نیا مرثیہ لکھا تھا جس کی بہت شہرت ہو رہی تھی۔ یہی مرثیہ اس وقت موضوعِ بحث تھا۔

"سنا ہے اس مرثیے کا نصف حصہ صرف ایک شب میں تصنیف فرمادیا۔" نواب صاحب نے کہا۔

"مشاقوں کے نزدیک ایک شب میں سو پچاس بند مرثیے کے کہہ لینا کون سی بڑی بات ہے۔" میر مونس نے کہا۔

غمازوں نے اس فقرے کو اچک لیا اور مرضی کے مطابق تبدیل کر کے انیس کے کانوں تک پہنچا دیا۔

"حضور ان کے مرثیے بنا بنا کر تھکے جاتے ہیں اور ان کی رائے آپ کے بارے میں یہ ہے۔"

"کیا کہتے ہیں وہ بھلا؟"

"کہنا کیا ہے 'اگر آپ کی اصلاح کے بغیر پڑھیں تو ان کی حقیقت کھلے۔ وہ تو اب خود کو بھی آپ کی جگہ سمجھنے لگے ہیں۔"

"پھر بھی کچھ معلوم تو ہو؟"

"آپ کا ذکر نکل آیا کہ آپ نے تقریباً نصف مرثیہ ایک شب میں تحریر کر دیا۔ فرمانے لگے 'کون سی بڑی بات ہے۔"

"اچھا' یہ کہا!"

وہ صاحب تو چنگاری ڈال کر چلے گئے لیکن میر کے دل میں بھائی کی طرف سے ملال آگیا۔ اس وقت تو کچھ نہیں کہا لیکن موقع کے انتظار میں رہے۔

نواب میر محمد حسین خاں کی سالانہ مقررہ مجلس کے لیے میر مونس نے مرثیہ کہا اور انیس کی خدمت میں بہ غرضِ اصلاح حاضر ہوئے۔

گرمی کی فصل تھی' میر انیس دیوان خانے کے حوض میں غسل کر رہے تھے۔ میر مونس تسلیم کر کے بیٹھ گئے۔

"کیوں میر نواب۔ اس وقت کہاں آئے؟" انیس نے پوچھا۔

"اصلاح کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ مجلس کا زمانہ قریب ہے۔"

"تم مرثیہ پڑھو' میں سنتا ہوں۔"

پچیس تیس بند سننے کے بعد فرمایا 'لاؤ مرثیہ مجھے دے دو۔ مونس نے ہاتھ بڑھا کر مرثیہ دے دیا۔ میر انیس نے مرثیے کو دو تین مرتبہ حوض میں غوطہ دے کر اسی کے اندر چھوڑ دیا۔

"اس مرثیے میں ہے کیا جسے اتنی بڑی مجلس میں پڑھنے کا ارادہ کیا ہے۔ لاحول ولا قوۃ کیا دماغ پریشان ہوا ہے۔" یہ کہہ کر حوض سے باہر آئے اور زنانہ مکان میں چلے گئے۔

"جذبات نگاری"

وہ بات نہ ہوگی کہ جو بے چین ہوں مادر
ہر صبح میں پی لوں گی دوا آپ بنا کر
دن بھر مری گود میں رہے گا علی اکبر
لونڈی ہوں سکینہ کی نہ سمجھو مجھے دختر
میں یہ نہیں کہتی کہ عماری میں بٹھا دو
بابا مجھے فضّہ کی سواری میں بٹھا دو

صاحب تمہیں تو سونے کو ہاتھ آئی خوب جا
دریا کا قرب' سرد ترائی' خنک ہوا
میں اور آپ آج کی شب تک نہ تھے جدا
بستر کو خالی دیکھ کے گزرے گی مجھ پہ کیا
تڑپوں نہ کس طرح کہ نئی واردات ہے
صدقے گئی فراق کی یہ پہلی رات ہے

"غزل"

شہیدِ عشق ہوئے قیسِ نامور کی طرح
جہاں میں عیب بھی ہم نے کیے ہنر کی طرح
سیاہ بختوں کو یوں باغ سے نکال اے چرخ
کہ چار پھول تو دامن میں ہوں سپر کی طرح
تجھی کو دیکھوں گا جب تک ہیں برقرار آنکھیں
مری نظر نہ پھرے گی تری نظر کی طرح
انیس یوں ہوا حالِ جوانی و پیری
بڑھے تھے نخل کی صورت گرے ثمر کی طرح

میر مونس سکتے میں بیٹھے رہ گئے۔ کچھ تصنیف کے ضائع ہونے کا افسوس' کچھ بھائی کی ملامت کا اثر۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہوا کیا۔

انیس کے معمولات میں شامل تھا کہ جب تک وہ بلائیں نہیں کوئی ان کے پاس جا نہیں سکتا تھا۔ مونس افسردہ بیٹھے رہے کہ اب کیا کریں۔ ان کا لکھا ہوا مرثیہ پانی میں تیر رہا تھا اور وہ حسرت سے دیکھ رہے تھے۔ بالآخر ملازمہ آئی کہ میر صاحب بلاتے ہیں' اندر تشریف لے چلیے۔ انہوں نے آخری مرتبہ حوض کی طرف دیکھا اور زنانے میں چلے گئے۔ اندر دسترخوان بچھا ہوا تھا اور سب لوگ کھانے کے لیے بیٹھ چکے تھے۔

"مجھے معلوم ہے مرثیے کا غم تمہیں بہت ہے لیکن خیر کھانا تو کھالو۔" انیس نے کہا اور مونس تعمیلِ حکم میں مصروف ہو گئے۔

خاموشی سے کھانا کھا رہے تھے مگر صاف معلوم ہوتا تھا کہ نوالے حلق میں اٹک رہے ہیں۔

"بھائی اتنا غم کیوں کرتے ہو۔" اچانک انیس کی آواز ابھری "جوان آدمی ہو۔ کیا بڑی بات ہے۔ مجلس میں ابھی کئی روز باقی ہیں، دوسرا مرثیہ کہہ لو۔"

مونس کے ہاتھ کا نوالہ ہاتھ میں رہ گیا "حضور خوب واقف ہیں کہ مجھ میں اتنی قوتِ شاعری نہیں۔ بڑی مشکل سے تو یہ مرثیہ کہا تھا اور اب اور۔"

"پھر کس بھروسے پر کہہ دیا تھا کہ سو پچاس بند کہہ لینا کوئی بڑی بات نہیں۔ بڑی بات نہیں تو اب کہو۔" انیس کی آواز میں غصہ صاف جھلک رہا تھا۔

اب مونس سمجھے کہ بات کیا ہے۔ انہیں اپنا قول یاد آگیا جو وہ نواب محمد حسین کی محفل میں کہہ چکے تھے۔

"واللہ باللہ جو یہ بات میں نے کسی خاص ارادے سے کہی ہو۔" میر مونس ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہوگئے "بر سبیل تذکرہ میری زبان سے نکل گیا تھا اور وہ بھی آپ کی مشاقی کی تعریف میں۔ اس کا ہرگز مطلب یہ نہیں تھا کہ ہر شخص کہہ سکتا ہے۔ میں نے تو یہ کہا تھا کہ مشاقوں کے نزدیک۔"

اب انیس کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ مجھ تک پہنچانے والوں نے جملے کو غلط رنگ دیا ہے۔

سعادت مند بھائی نے گردن جھکائی اور بڑے بھائی نے گلے سے لگالیا۔

"میں تمہیں شاعری کے بلند مقام پر دیکھنا چاہتا ہوں لیکن اگر تمہاری تعلیوں کی یہی کیفیت رہی تو میر نفیس (فرزندِ انیس) کی جوتیاں ہوں گی اور تمہارا سر۔"

کھانے سے فراغت کے بعد میر انیس پلنگ پر چلے گئے اور میر مونس اور فرزند میر نفیس کو حکم ہوا کہ پلنگ کے قریب کرسیوں پر بیٹھیں۔ کاغذ ہر ایک کے ہاتھ میں دے دیا گیا۔ تینوں نے مل کر نیا مرثیہ تصنیف کرنا شروع کیا جو رات تک مکمل ہوگیا۔

جانِ عالم واجد علی شاہ کی حکومت روز بہ روز گرفتِ فرنگ کی طرف بڑھتی جارہی تھی۔ سب پر حکومت کرنے والا انگریز ریذیڈنٹ کا حکم ماننے پر مجبور تھا۔ رعایا اس کی بے بسی سے ناواقف عیش و عشرت میں بسر کررہی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ شعروشاعری کے چرچے بڑھتے جارہے تھے۔ انیس کا آفتابِ شہرت بھی نصف النّہار پر تھا۔ شہر کے تمام اہم لوگوں کی مجالس میں اب انیس ہی پڑھتے تھے۔

ملکہ کشور (والدہ واجد علی شاہ) کے یہاں مجلسوں میں انیس کو بلایا جاتا تھا۔ نواب علی نقی خاں کے گھر بھی وہی پڑھتے تھے۔ اسی طرح محمد خاں داروغہ فیل خانہ شاہی، حیدر خاں وغیرہ کے یہاں ان کی مجالس مخصوص تھیں۔ کسی معمولی آدمی کی تو ہمت ہی نہیں تھی کہ انہیں بلاسکتا۔

وہ مرثیہ جس کی وجہ سے بھائی کی طرف سے دل میں کدورت آئی تھی، دل ہی سے اتر گیا تھا۔ پڑھنے کا خیال ہی نہیں آتا تھا۔ بالآخر میر مونس ہی نے توجہ دلائی اور وہ بے دلی سے تیار ہوگئے۔ امام باڑا افضل محل میں مجلس تھی۔ میر مونس اسی مرثیے کو صاف کرکے اپنے ساتھ لے گئے۔ میر انیس منبر پر گئے اور حسبِ عادت میر مونس سے پوچھا "کیا لائے ہو؟"

میر مونس نے وہ مرثیہ آگے کردیا۔ انیس مسکرائے اور پڑھنا شروع کردیا۔

جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے
جلوہ کیا سحر کا رخِ بے حجاب نے
دیکھا سوئے فلک شہِ گردوں رکاب نے
مڑ کر صدا رفیقوں کو دی اس جناب نے
آخر ہے رات حمد و ثنائے خدا کرو
اٹھو فریضۂ سحری کو ادا کرو

یہ صبح ہے وہ صبح، مبارک ہے جس کی شام
یاں سے ہوا جو کوچ تو ہے خلد میں مقام
کوثر پہ آبرو سے پہنچ جائیں تشنہ کام
لکھے خدا نماز گزاروں میں ان کے نام
سب ہیں وحیدِ عصر یہ غل چار سو اٹھے
دنیا سے جو شہید اٹھے سرخ رو اٹھے

یہ سن کے بستروں سے اٹھے وہ خدا شناس
اک اک نے زیب جسم کیا فاخرہ لباس
شانے محاسنوں میں کیے سب نے بے حراس
باندھے عمامے آئے امامِ زماں کے پاس
رنگیں عبائیں دوش پہ کمرے کسے ہوئے
مشک و زباد و عطر میں کپڑے بسے ہوئے
لب پر ہنسی گلوں سے زیادہ شگفتہ رو
پیدا تنوں سے پیرہنِ یوسفی کی بو
غلماں کے دل میں جن کی غلامی کی آرزو
پرہیز گار و زاہد و ابرار و نیک خو
پتھر میں ایسے لعل، صدف میں گہر نہیں
حوروں کا قول تھا یہ ملک ہیں بشر نہیں

میر صاحب بند پر بند پڑھتے جا رہے تھے اور داد دینے والوں کے حلق خشک ہوتے جا رہے تھے۔ مرثیہ بھی خوب تھا اور آج ان کے پڑھنے کا انداز بھی مختلف۔

عزاداروں میں سر جھکائے اسیر لکھنوی بھی بیٹھے تھے۔ اسیر دربار شاہی میں اعلیٰ عہدہ و منصب پر فائز تھے۔ خود باکمال شاعر تھے اور ایسے کہ کسی صنفِ سخن میں بند نہیں تھے۔ سلام اور مرثیے بھی کہہ رکھے تھے۔ وجد تو سب پر طاری تھا مگر وہ خالی خالی آنکھوں سے در و دیوار کو گھور رہے تھے۔

مجلس ختم ہوئی تو خاموشی سے اٹھے، گھر گئے، بیاض اٹھائی اور پالکی میں سوار ہو گئے۔ انیس کی موجودگی میں کسی اور کو کیا حق ہے کہ مرثیہ کہے۔ جتنے مرثیے اب تک کہے تھے سب دریا برد کیے اور گھر چلے آئے۔

یہ مرثیہ تھا بھی ایسا، مقبولیت بھی ایسی ملی کہ ہر جگہ اسی کے چرچے ہونے لگے۔

اس دربار میں انیس کو ایسی شہرت حاصل ہو گئی تھی کہ اگر کوئی مہمل شعر بھی انیس کے نام سے سنا دیتا تو لوگ واہ واہ کر اٹھتے تھے۔

○☆○

جب کوئی قوم مٹنے لگتی ہے تو شجاعانہ مشاغل چھوڑ کر درباری داری اور عیش پرستی کی طرف جھک جاتی ہے۔ توازن بگڑ جاتا ہے اور قوم کی زندگی انحطاط کی طرف بڑھنے لگتی ہے۔ لکھنؤ کی زندگی اپنے عہد کے سیاسی اور تمدنی تقاضوں سے بے خبر اسی انحطاط کی طرف رواں دواں تھی۔ عیش و عشرت کی فراوانی تھی، شجاعانہ مشاغل مرثیوں کے رزمیہ حصوں تک محدود ہو گئے تھے۔ گویا عمل غائب گفتار حاضر تھی۔

اس ماحول میں عزاداری دلوں کی بھڑاس نکالنے کا ذریعہ بھی تھی اور وسیلہ نجات بھی۔ فریضہ مذہبی بھی تھی اور رونق دنیوی بھی۔ لکھنؤ کے معاشرے نے عزاداری کے ادارے کو جس طرح پروان چڑھایا، اس میں جو نزاکتیں پیدا کیں۔ ان میں اس دم توڑتی ہوئی تہذیب کا سارا حسن بھی جھلکتا ہے اور تمام کمزوریاں بھی۔

ایک طرف تو اس فضا نے پورے ماحول کو عزاداری کی فضا دی اور دوسری طرف خود رسوم عزا میں اس فضا کی کارفرمائی بڑھی۔ تکلف، تصنع، رنگینی، مبالغہ، زبان و بیان کی نزاکتیں، رعایتِ لفظی، ضلع جگت، سبھی آداب مرثیہ گوئی میں داخل ہو گئے۔

انیس اس ماحول میں رہتے ہوئے بھی ان چیزوں سے اکثر مقامات پر اونچے نظر آتے ہیں۔ انیس کے زمانے کے اُمرا نہایت خوشامد پسند تھے اور انیس کا گزارا انہی کی داد و دہش پر تھا لیکن وہ بھری مجلس میں نتائج سے بے پروا ہو کر اپنی خودداری اور توکل کے بلند آہنگ نغمے چھیڑتے تھے۔

ہمیں تو دیتا ہے رازق بغیر منت خلق
وہی سوال کریں جو خدا نہیں رکھتے

یہ دعوے زبانی نہیں تھے۔ انہوں نے کبھی کسی رئیس سے ربط ضبط نہیں بڑھایا۔ کبھی کسی سرکار میں خود چل کر نہیں گئے۔ حتیٰ کہ شاہی مجالس میں بھی جب تک شاہی قاصد نہیں آ گیا، خود نہیں گئے۔ مختلف سرکاروں سے وظائف ملتے تھے اور وہ رشتۂ جسم و روح قائم رکھنے کے لیے انہیں قبول بھی کرتے تھے لیکن دب کر یا جھک کر کسی کی کوئی عنایت کبھی قبول نہیں کی۔

کیا قبول قناعت سے بحرِ عالم میں
صدف کی طرح میسر جو آب و دانہ ہوا

گرم و سردِ زمانہ کی تلخی نے منہ ایسا کڑوا کر دیا تھا کہ خودداری، نازک مزاجی کی حد تک بڑھ گئی تھی۔ یہ نازک مزاجی

"غزل"

وجد ہو بلبلِ تصویر کو جس کی بُو سے
اس سے گل، رنگ کا دعویٰ کرے پھر کس رو سے
کس سے اے شوخ ہوئی رات کو ہاتھا پائی
نورتن آج جو ڈھلکا ہے ترے بازو سے
کل تو آغوش میں شوخی نے ٹھہرنے نہ دیا
آج کی شب تو نکل جاؤ مرے قابو سے
شمع کے رونے پہ بس صاف ہنسی آتی ہے
آتشِ دل کہیں کم ہوتی ہے چار آنسو سے
شوخیِ چشم کا تو کس کے ہے دیوانہ انیسؔ
آنکھیں ملتا ہے جو یوں نقشِ سمِ آہو سے

"عبرت"

دنیا بھی عجب گھر ہے کہ راحت نہیں جس میں
وہ گل ہے یہ گل بوئے محبت نہیں جس میں
وہ دوست ہے یہ دوست مروت نہیں جس میں
وہ شہد ہے یہ شہد حلاوت نہیں جس میں
بے دردِ والم شامِ غریباں نہیں گزری
دنیا میں کسی کی کبھی یکساں نہیں گزری

"میر بے دماغ" کی یاد دلاتی تھی۔

آٹھویں یا ساتویں محرم کو ایک مجلس میر انیس نواب علی نقی خاں کے یہاں پڑھتے تھے۔ ایک روز مجلس شروع ہونے سے پہلے نواب صاحب نے پیغام بھیجا کہ میں آج درد سر کی وجہ سے حاضری سے معذور ہوں۔ میر انیس نے جواب دیا، آج میرا بھی جی درست نہیں۔ مناسب ہے مجلس موقوف رکھی جائے۔ انشاءاللہ آئندہ سال دیکھا جائے گا۔ نواب صاحب گھبرا کر باہر نکل آئے۔ میر انیس سے معافی مانگی اور حالتِ مرض میں اختتام مجلس تک بیٹھے رہے۔

حکیم مہدی نے جب اس بھروسے پر کہ ان کے توسط سے انیس کا وثیقہ مقرر ہے، بغیر انیس سے اجازت لیے ان کی مجلس کا اعلان کروا دیا اور کہلا بھیجا کہ میری مجلس میں آپ نہیں پڑھیں گے تو مبارک محل کے وظیفے سے ہاتھ دھو رکھیے۔ تو انیس نے اس وثیقے کو اپنی جوتی کے ایک ستارے کے برابر بھی اہمیت نہیں دی اور مجلس پڑھنے سے انکار کر دیا۔

جس وقت وہ منبر پر بیٹھے ہوں اس وقت تو ان کی نازک مزاجی تیغ جوہردار بن جاتی تھی۔ اس وقت ان پر ایک محویت کا عالم طاری ہوتا تھا اور وہ اپنے کمال کے نشے میں سرشار ہو کر اس بلندی پر پہنچ جاتے تھے کہ جہاں سے بے کمالی کا درجہ خواہ وہ ریاست و امارت کا لباس کیوں نہ پہنے ہو، بہت پست معلوم ہونے لگتا۔

ہر کس و ناکس سے جھکنے کا نہیں
ہمدمو میں تیغ جوہردار ہوں

دولت کا ہمیں خیال آتا ہی نہیں
یہ نشۂ فقر ہے کہ جاتا ہی نہیں
لبریز ہیں یہ دولت استغنا سے
آنکھوں میں کوئی غنی سماتا ہی نہیں

شاد عظیم آبادی نے تو یہاں تک لکھ دیا "میر انیس کی نازک مزاجی بے حد تھی۔ میر مونس اگر ہمراہ نہ ہوتے اور لوگوں سے بہ اخلاق پیش نہ آتے تو ان کی مجالس میں دوبارہ لوگوں کو جانے کی ہمت نہ ہوتی۔ تاہم ان کے کمال کے آگے لوگوں نے سر ڈال دیا۔

گریباں مرا چھوڑ اے حرصِ دنیا
مرے ہاتھ میں دامنِ پنجتن ہے

دنیا میں رہتے ہوئے دنیا کسی کا گریبان کہیں چھوڑتی ہے۔ محبت یا مروت کے نام پر کہیں نہ کہیں انسان پھنستا ہی ہے۔ اہل کمال کی زندگی میں ایسے امتحان کئی آتے ہیں۔

انیس بھی اہل کمال تھے۔ ترغیبات کو ٹھوکر پہ مارتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے کہ واجد علی شاہ سامنے آ گئے۔

"ہم چاہتے ہیں شاہ نامے کے طور پر اپنے خاندانی حالات نظم کرائیں۔"

"اس کام کو سرانجام کون دے گا؟"

"شاعر ایسے ہوں جو اپنی مملکت کے خود بادشاہ ہوں۔"

قرعۂ فال چار شاعروں کے نام نکلا۔ فتح الدولہ محمد رضا برق، تدبیر الدولہ منشی مظفر علی اسیر، مرزا مہدی قبول اور میر انیس۔

یہ بات قرار پائی کہ تھوڑا تھوڑا حصہ تاریخ کا ان چاروں شعرا میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس التزام سے کتاب جلد تمام ہو جائے گی اور ہر شاعر کا رنگ بھی علیحدہ علیحدہ قائم ہو جائے گا۔

انیس کو آمادہ کون کرے۔ علی نقی خاں، وزیرِ سلطنت بہ نفسِ نفیس خود ان کے پاس جائیں۔

علی نقی خاں شاہی بگھی میں سوار شاہی محل کے دروازے سے نکلے اور شیدیوں کے احاطے میں انیس کے گھر پہنچ گئے۔ ان کی ناوقت آمد نے انیس کو بوکھلا دیا۔ اس کے دل میں بہت دن سے لکھنؤ کے بارے میں برے برے خیالات آ رہے تھے۔ انگریزوں اور بادشاہ کے درمیان جو رسّا کشی چل رہی تھی، اس کا اندازہ اسے تھا۔ وہ یہی سمجھا کہ کوئی بری خبر ہے جس نے اس تک پہنچنے کے لیے علی نقی خاں کا سہارا لیا ہے۔ وہ ملاقات کا وقت طے کیے بغیر آئے تھے لیکن انیس ان سے ملنے سے انکار نہ کر سکا۔ انیس کے فرزند میر نفیس نے انہیں دیوان خانے میں بٹھایا، شربت اور پان سے تواضع کی۔ اتنی دیر میں انیس بھی زنانے سے مردانے میں آ گئے۔ علی نقی خاں نے بادشاہ کا منصوبہ سامنے رکھا تو انیس کی جان میں جان آئی ورنہ وہ تو یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ اودھ کی ضبطی کا پروانہ آ گیا جس کی افواہیں بہت دن سے سنی جا رہی تھیں۔

"بھائی، مجھے دماغ شاعری کہاں۔ صدقۂ حسینی ہے جسے لوگ اشعار کہہ لیتے ہیں۔ مجھ سے یہ کام نہ ہو گا۔ اس کے لیے اور بہت سے شاعرانِ خوش گفتار موجود ہیں۔"

"جان عالم آپ کے منتظر ہیں۔ یہ بات آپ خود چل کر ان سے کہہ دیجیے۔"

"آپ جانتے ہیں، میں دربار سے دور بھاگتا ہوں۔"

"آپ کی طلبی دربار میں نہیں۔ ایک دوست دوسرے دوست سے ملنے جائے گا۔"

"وہ دوست یہاں بھی تو آ سکتا تھا۔"

"میر صاحب، آپ ان کی بے بسی جانتے ہیں۔ انہیں یہ خوشی تو دے دیجیے کہ تاجدارِ سخن ان سے ملنے آیا۔"

"چلیے بھائی، یہ دنیا کب پیچھا چھوڑتی ہے۔ چلا چلتا ہوں۔"

محل کی آرائش وزیبائش، ذخیرہ نوادرات وعجائب صنعت، نظر کو خیرہ کرنے والے جھاڑ فانوس، کنول مردنگ کو دیکھ کر وہ حیرت کے سوا کیا کرسکتا تھا۔

وہ مربع قطعات پر مشتمل چمنستان سے گزرتا ہوا ان محرابوں تک آگیا جس کی چھت اور دیواریں گل کاری سے منقش تھیں۔ دربار تک جانے والے زینے سے اترنے کے بعد وہ اس کمرے میں پہنچ گیا جہاں دربار ہوتا تھا۔

سرخ رنگ کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ دیواروں میں ادھر ادھر کھڑکیاں تھیں جن سے ہلکی ہلکی روشنی اندر آرہی تھی۔ شاہان اودھ کی قد آدم تصویریں اس کمرے کے جاہ وجلال میں اضافہ کررہی تھیں۔ وسیع دالان کے ایک سرے پر تخت شاہی رکھا ہوا تھا۔

یہ دربار کا موقع نہیں تھا۔ مستعد چوب داروں میں سے ایک نے انہیں دربار سے متصل ایک کمرے میں پہنچادیا جہاں بادشاہ اس کا منتظر تھا۔ آرائش و دلربائی میں یہ کمرا بھی خواب جنت سے کم نہیں تھا۔ جگمگاتے جھاڑ فانوس، صندل، آبنوس اور ہاتھی دانت کی میزیں مرصع اور زرنگار آئینے اور بیش بہا نفیس اشیا سے کمرا سجا ہوا تھا۔

واجد علی شاہ انیس کی بڑی قدر کرتا تھا۔ انیس بھی بادشاہ کو بادشاہ کی جگہ سمجھتے تھے۔ خودداری اپنی جگہ لیکن محبت اور خلوص ایک الگ شے ہے۔ وہ بھی چشم مروت کی باتوں میں آکر بادشاہ کے حکم کو ٹال نہیں سکا۔

بادشاہ نے علی نقی خاں وزیر سلطنت کی جانب اشارہ کیا کہ میر انیس کے ہمراہ جائیں اور مصاحب منزل کے کمرے دکھائیں۔ جو کمرا میر انیس پسند فرمائیں ان کے قیام کے لیے اسباب راحت وہاں جمع کردیا جائے۔

انیس کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہ کام اس پابندی سے ہوجائے گا کہ شب وروز یہاں رہنا پڑے گا تو بے دل ہوگئے۔ علی نقی خاں کے ساتھ کمرے دیکھنے لگے لیکن سخت برہمی کے عالم میں۔

نواب علی نقی خاں ہر کمرا دکھاتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ یہ آپ کو پسند ہے؟ انیس پریشان ہوگئے اور یہ شعر پڑھا اور واپس پلٹ آئے۔

غریبوں کی کیا موت کیا زندگی
جگہ جس جگہ مل گئی مر رہے

"صاحب، لوگ یہ کیوں چاہتے ہیں کہ ہم لکھنؤ میں نہ رہیں؟"

"کیا ہوا بابا جان؟" میر نفیس نے کہا۔

"ہونا کیا تھا، سلطنت سنبھل نہیں رہی ہے، دارا و سکندر کی ہم سری کا شوق ہے۔ غنیم دروازے پر دستک دے رہا ہے اور وہ اپنے خاندان کی تاریخ لکھوانے پر بضد ہیں۔ جب اپنے کارنامے ختم ہوجاتے ہیں تو ماضی یاد آتا ہے۔ تاریخ لکھواتے ہیں تو لکھوائیں مجھ گوشہ نشین کو کیوں ستاتے ہیں۔"

"رباعیات"

مرمر کے مسافر نے بسایا ہے تجھے
رخ سب سے پھرا کے منہ دکھایا ہے تجھے
کیونکر نہ لپٹ کے سوؤں تجھ سے اے قبر
میں نے بھی تو جان کھو کے پایا ہے تجھے

نا فہم سے کب دادِ سخن لیتا ہوں
دشمن ہو کہ دوست سب کی سن لیتا ہوں
چھپتی نہیں بوئے دوستاں یک رنگ
کانٹوں کو ہٹا کے پھول چن لیتا ہوں

افسوس یہ عصیاں یہ تباہی دل کی
کی خوب انیس خیر خواہی دل کی
کپڑے اجلے پہن کے نازاں ہوئے تم
بڑھتی گئی دن رات سیاہی دل کی

راحت میں بسر ہوئی کہ ایذا گزری
کیونکر تاریک گھر میں تنہا گزری
اے کنج لحد میں سونے والو! افسوس
کس سے پوچھیں کہ تم پہ کیا گزری

ٹھوکر بھی نہ ماریں گے اگر خودسر ہے
زردار کو بھی فروتنی بہتر ہے
ہے میوۂ نخل قد انساں تسلیم
جھکتی ہے وہی شاخ جو قد آور ہے

ہاں بعد فنا، سخن نشاں ہے میرا
دنیا میں یہ باغ بے خزاں ہے میرا
تاحشر رہے گا نام اس سے روشن
ہر شعر چراغِ دودماں ہے میرا

"آپ انکار کر دیتے۔" میر مونس نے کہا۔
"بھئی ہم ان کی محبت سے مجبور ہو گئے۔"
"کسی حیلے سے معذرت کر لیں۔"
"یہی کرنا ہوگا۔ دیکھو کوئی ترکیب نکالتا ہوں۔"
اس سے پہلے کہ وہ کوئی ترکیب نکالتا' بادشاہ خود ایسے مسائل میں گھر گیا کہ یہ منصوبہ جہاں تھا وہیں رہ گیا۔

اخبارات میں یہ خبریں شائع ہو رہی تھیں کہ انگریز افواج نے کانپور میں جمع ہونا شروع کر دیا ہے۔ یہ اخبارات ان خدشات کا اظہار کر رہے تھے کہ کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ یہ افواج' ضبطی اودھ کا بہانہ بھی ہو سکتی ہیں۔
ان خبروں نے عوام کے دل دھڑکا دیے۔ ہر جگہ یہی باتیں ہوتی تھیں اور اس دعا پر ملنے والے بچھڑتے تھے کہ الٰہی لکھنؤ کو آباد رکھے۔
ان خبروں کو قیصر باغ کی دیواریں پھلانگنے میں دیر نہیں لگی۔ جب یہ خبریں بادشاہ کے عیش و نشاط کو متاثر کرنے لگیں تو اس نے ریذیڈنٹ کے اسسٹنٹ سے اس بارے میں دریافت کیا۔ اس کا جو جواب آیا وہ بادشاہ کی تسلی کے لیے کافی تھا۔
"راجا نیپال اپنے لاکھ آدمیوں کی جمعیت کے ساتھ اپنے مقام پرستش کو جاتا ہے۔ اس کے اہتمام کو فوج سرکار جمع ہوئی ہے۔ آپ رعایا کی تشفی کے لیے اشتہار جاری کر دیں تاکہ فوج کا خوف دلوں سے جاتا رہے۔"
اس جواب سے بادشاہ کا تردد دور ہو گیا لیکن وقت کی قینچی جھوٹ کے اس پردے کو چاک کرنے کے لیے بے چین تھی۔
ریذیڈنٹ اودھ شاہانہ جاہ و جلال کے ساتھ جنوری ۱۸۵۶ء کو داخل لکھنؤ ہوئے۔ علی نقی خاں حسب روایت استقبال کو گئے۔ بادشاہ کو گمان بھی نہیں تھا کہ واپسی میں وہ کیا تحفہ اپنے ساتھ لے کر آئیں گے۔
دوسرے دن علی نقی خاں' ریذیڈنٹ کے پاس پہنچے۔ ابھی وہ سنبھل کر بیٹھے بھی نہیں تھے کہ انہیں خبر مل گئی جس کا انہیں انتظار تھا۔
"تم سرکار کے مجرم بننا چاہو گے یا انعام کے حق دار؟"
"میں تو نمک خوار ہوں' نمک خوار ہی رہنا چاہوں گا۔"
"ہمیں تم سے یہی امید تھی۔"
"آپ گورنر جنرل کو احکام سنانے والے تھے؟"
"کمپنی نے سرکار اودھ کی معزولی کا فیصلہ کیا ہے۔ عہد نامہ گورنر جنرل نے تجویز کیا ہے۔ چاہیے کہ اس پر بادشاہ اپنی رضامندی سے دستخط کر دیں۔"
"میرے لیے کیا حکم ہے؟" علی نقی خاں نے کہا۔
"تمہیں بادشاہ کے مزاج میں پوری طرح دخل ہے اس لیے امید کی جاتی ہے کہ تم انہیں مجبور کرو گے۔"
"میں تو تابعدار ہوں۔"
علی نقی خاں جس اطمینان سے گئے تھے اسی اطمینان سے واپس آ گئے۔ انہیں معلوم تھا بادشاہ اس وقت کہاں ہوگا۔ رنگ محل کے دروازے پر ہی وہ بگھی سے کود گئے۔
"نادرہ بیگم' بادشاہ کو ہمارے آنے کی اطلاع کرو۔" انہوں نے پہرے پر کھڑی عورت سے کہا۔
وہ اندر گئی اور اجازت باریابی لے کر آ گئی۔
"ابھی ایک لڑکی بہت اچھی ٹھمری گا رہی تھی۔ بھائی یہ لکھنؤ بھی خوب چیز ہے۔ خیر تم کہو کیا خرید لائے۔"
"الحاق کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ بقائے دولت کا بس ایک ہی راستہ ہے کہ آپ عہد نامے پر دستخط کر دیں۔"
"اپنا ملک انہیں دے دیں؟"
"اس کے سوا کوئی راستہ نہیں۔"
"ہم اپنی رعایا کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں؟"
"دوسری صورت میں کشت و خون ہوگا۔"
"نہیں بھائی' میں اپنے پھولوں کو مرجھاتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔"
"آپ بغیر تخت کے شاہی کریں گے۔"
"ہائے مگر یہ لکھنؤ۔ ہنروران لکھنؤ کوئی چھوڑ دینے والی چیز ہیں۔ ان سب کو سرپرستی کی ضرورت ہے۔ میں نہیں رہا تو یہ بھی نہیں رہیں گے۔"
"آپ کے پاس اتنی دولت پھر بھی ہوگی کہ آپ ان کی سرپرستی کر سکیں گے۔"
"آپ صاحبوں کو اتنی جلدی کیوں ہے؟ ریذیڈنٹ سے کہو ہم سے آ کر ملے۔"
"یہ کون سی مشکل ہے۔"
راہ گیروں نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر محل کے دروازے کو دیکھا جیسے کوئی بیوہ سنگھار کی سب چیزیں اتارے عدت میں بیٹھی ہو۔ محل کے دروازے پر سے توپیں اتار لی گئی تھیں۔ پہرے داروں کے پاس ہتھیار نہیں تھے۔ کیا خبر بادشاہ بھی اندر ہے کہ نہیں؟
یہ ایسی انوکھی بات تھی جو کبھی نہیں ہوئی تھی۔ جس نے سنا' یقین نہ کیا' انیس خود دوڑا دیکھنے چلا آیا۔ دوپہر تک شہر میں بھی منادی ہو گئی کہ اہل شہر میں سے کوئی بھی ہتھیار باندھ کر نہ نکلے۔ یاالٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔

"دیکھو، یہ حکم کب آتا ہے کہ ہم اپنے مرثیوں میں ہتھیاروں کا نام بھی نہ لیں۔" انیس نے کہا اور لکھنؤ اسے کربلا معلوم ہونے لگا جس کا ایک کردار خود واجد علی شاہ تھا۔

یہ بات چھپی نہ رہ سکی کہ جنرل اوٹرم، ریذیڈنٹ اودھ بادشاہ کی ملاقات کو آئے ہیں اس لیے یہ انتظام ہوئے ہیں۔ وہ تو پہلے بھی آتے رہے ہیں۔ اس مرتبہ کوئی خاص بات ضرور ہے۔ خلقت کے کان شاہی محل کی دیواروں سے لگ گئے۔

ملاقات ہوئی۔ بادشاہ نے دلائل دیے۔ والدۂ بادشاہ نے قائل کرنے کی کوشش کی۔

"ہم بادشاہ سے بات کرنے آئے ہیں، ان کے کسی نائب سے نہیں۔" اوٹرم نے کہا۔

"میں ان کی نائب نہیں ان کی والدہ ہوں۔"

"لیکن بادشاہ نہیں۔"

"ان کے ساتھ متاثر ہم بھی ہوں گے۔ اگر آپ واجد علی شاہ سے ناراض ہیں تو میرے دوسرے بیٹے کو وارثِ سلطنت کیجیے۔"

جنرل اوٹرم نے ان باتوں کا جواب دینا بھی مناسب نہ سمجھا۔ وہ اودھ کی ضبطی کا فیصلہ کر کے آئے تھے۔

"ہم آپ کو تین دن کی مہلت دیتے ہیں۔ آپ دستخط کردیں ورنہ اشتہار چسپاں کرنے کے سوا ہمارے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں بچے گا۔"

اوٹرم کے رخصت ہوتے ہی صبر بھی رخصت ہوگیا۔ محلات شاہی میں ماتم برپا ہوگیا۔ یہ خبر وحشت اثر محل سے باہر نکلی تو پورا شہر سوگ میں ڈوب گیا۔

تین دن کے بعد ہر تھانے میں اشتہار چسپاں ہوگئے کہ آج سے ملک اودھ کا نظم و نسق بلا شرکت غیرے ہمیشہ کے لیے انگریز بہادر کے قبضے میں آگیا۔

"بھیا، غضب ہوگیا۔" میر مونس خبر لائے تھے "اودھ کی ضبطی کے اشتہار لگ گئے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے اب جان عالم بادشاہ نہیں رہیں گے؟"

"کیا خبر۔ اندازہ تو یہی ہوتا ہے۔ ممکن ہے وہ مقابلہ کریں۔"

"پھر بھی کیا ہوگا۔"

قربِ مزارِ شاہِ دو عالم نصیب ہو
بس کربلا میں اب کی محرم نصیب ہو

"میر نواب، مجھے سہارا دے کر پلنگ پر بٹھا دو۔ میں جس لکھنؤ کی دیوار کا سہارا لیے کھڑا تھا، وہ دیوار ہی ہٹ گئی۔"

"خراجِ عقیدت"

اردو زبان نے انیس اور دبیر سے بہتر مرثیہ گو نہیں پیدا کیے۔ ایسے مرثیہ گو نہ ہوئے ہیں نہ ہوں گے اور جس میں انیس کا مرثیہ نہایت بلند ہے۔

(مرزا غالب)

دلی کی زبان کا سہارا تھا انیس
اور لکھنؤ کی آنکھ کا تارا تھا انیس
دلی جڑ تھی تو لکھنؤ اس کی بہار
دونوں کو ہے دعویٰ کہ ہمارا تھا انیس

(حالی)

انیس نے کہا اور مونس نے انہیں پلنگ پر لٹا دیا۔

کیوں کر دل غم زدہ نہ فریاد کرے
جب ملک کو یوں غنیم برباد کرے
مانگو یہ دعا کہ پھر خداوند کریم
اُجڑی ہوئی مملکت کو آباد کرے

حکم ہوا کہ بادشاہ کو محل میں رہنے کی اجازت ہے، باقی سب عمارات انگریزی تصرف میں آئیں گی۔ لکھنؤ کی فوج کے لیے حکم ہوا کہ اب وہ خود کو بادشاہ کا نوکر نہ سمجھیں۔ ملازمان شاہی کی ایک بڑی تعداد یا تو خود بھاگ گئی یا بادشاہ نے فارغ کردیا۔ نہ اب شاہی نقیب ہیں نہ چوبدار، نہ دربار شاہی کا طمطراق۔

شہر میں انگریزوں کا راج ہے۔ وہ اپنی میموں کے ساتھ بگھیوں میں اڑتے پھرتے ہیں۔ شاہی محلات ویران پڑے ہیں۔ واجد علی شاہ بستر علالت پر ہیں۔ چند وفادار بیگمات کے سوا ان کے پاس کوئی نہیں۔ تنہائی سی تنہائی ہے۔

شہر میں کسی نے مجلس برپا کی اور تاجدار سخن نے لکھنؤ کو کربلا بنا دیا۔ وہ مرثیہ پڑھا کہ اہل لکھنؤ کو مدتوں یاد رہا۔ اس مرثیے پر بہنے والے آنسو عبرت کے تھے یا صدمے کے؟

آج شبیر پہ کیا عالم تنہائی ہے
ظلم کی، چاند پہ زہرا کے گھٹا چھائی ہے
اس طرف لشکر اعدا میں صف آرائی ہے
یاں نہ بیٹا نہ بھتیجا نہ کوئی بھائی ہے
برچھیاں کھانے چلے جاتے ہیں تلواروں میں
مار لو پیاسے کو، ہے شور ستم گاروں میں

مطلع کے بند کا سننا تھا کہ اہلِ مجلس کی آنکھوں میں جان عالم کی شبیہ ابھر آئی۔ ایسے میں کسی نے ہائے جانِ عالم کہا۔ بس پھر کیا تھا۔ ہچکیوں اور آہوں کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ ان کا محبوب بادشاہ ستم گاروں کے سامنے تنہا تھا' بے یارو مددگار تھا۔

زخمی بازو ہیں کمر خم ہے بدن میں نہیں تاب
ڈگمگاتے ہی نکل جاتی ہے قدموں سے رکاب
پیاس کا غلبہ ہے لب خشک ہیں آنکھیں پُرآب
تیغ سے دیتے ہیں ہر وار کا اعدا کو جواب
شدت ضعف میں جس جا پہ ٹھہر جاتے ہیں
سیکڑوں تیر ستم تن سے گزر جاتے ہیں

برچھی آکر کوئی پہلو میں لگاجاتا ہے
مارتا ہے کوئی نیزہ توغش آجاتا ہے
بڑھتے ہیں زخم بدن زور گھٹاجاتا ہے
بند آنکھیں ہیں سرپاک جھکا جاتا ہے
لاکھ تلواریں ہیں اور ایک تنِ اطہر ہے
ایک مظلوم ہے اور ظالموں کا لشکر ہے
سیکڑوں خنجرِ فولاد ہیں اور اک سر ہے
نہ کوئی یار نہ ہمدم نہ کوئی یاور ہے
باگ گھوڑے کی لٹکتی ہے اٹھاسکتے نہیں
سامنے اہلِ حرم روتے ہیں جاسکتے نہیں

پورا مرثیہ تمثیل بن کر رہ گیا۔ اس کا ایک کردار جان عالم واجد علی شاہ تھے جو مظلوم تھے' جن پر ظلم ہوا تھا' جن کے لیے مشہور ہوگیا تھا کہ اب وہ لکھنؤ سے بھی نکالے جائیں گے۔ جنھوں نے پتلیوں میں جنت بسادی ان کی آنکھوں سے روشنی چھین لی جائے گی۔ وائے جانِ عالم۔ ہائے جانِ عالم۔

اہلِ لکھنؤ کی آنکھیں آباد تھیں کہ ان کا محبوب اب بادشاہ نہیں لیکن لکھنؤ میں تو ہے لیکن وہ کچھ اور سوچ رہا تھا۔ اس نے سوچا تھا' کلکتہ جاکر گورنر جنرل سے ملے اور انگلستان جائے اور اپنا مقدمہ پیش کرنے کی اجازت طلب کرے۔

مارچ ۱۸۵۶ء کی تیسری تاریخ کو پہر رات گئے' وہ اپنی چھ بیگمات' والدہ' برادرِ حقیقی اور دو بیٹوں کے ساتھ لکھنؤ سے نکل گیا۔

اس رات کی صبح ہوئی تو اہلِ شہر پر قیامت گزر گئی۔ ان کا محبوب ان سے جدا ہوگیا اور وہ سوتے رہ گئے۔

ان کے جاتے ہی تخریب وانہدام کا دور دورہ شروع ہوا۔ محلات کھدوا ڈالے' جواہرات نوچ لیے گئے۔ بعض شاہی کوٹھیوں میں دفاتر سرکاری قائم ہوگئے۔ لاکھوں افراد بے روزگار ہوکر محتاج ہوگئے۔

انیس اپنے گھر میں بیٹھا یہ سب تماشے دیکھ رہا تھا۔ اسے مظلوم بادشاہ کا غم تو تھا ہی لیکن یہ دکھ سب سے زیادہ تھا کہ اب لکھنؤ وہ لکھنؤ نہیں رہا۔ اب میرحسن کی زبان سمجھنے والے کہاں سے لاؤں گا۔ اب ایسا شہر کہاں نصیب ہوگا۔ ماتم عزا میں ایسے رونے والے کہاں ملیں گے۔ باہر نکلنا کب سے موقوف کردیا تھا مگر اب تو اسے یہاں کا آسمان بھی اجنبی لگنے لگا تھا۔

افسوس زمانے کا عجب طور ہوا
کیوں چرخِ کہن نیا یہ کیا دور ہوا
گردش کب تک نکل چلو جلد انیس
اب یاں کی زمیں اور فلک اور ہوا

مرزا دبیر نے یہ رباعی سن کر تسکین دی۔

کس عہد میں تبدیل نہیں دور ہوا
گہہ عدل گئے' ظلم گئے جور ہوا
اللہ وہی ہے تو نہ مضطر ہو دبیر
کیا غم جو زمیں اور فلک اور ہوا

کسی امید نے اس کے پاؤں پھر پکڑ لیے۔ دبیر ٹھیک کہتے ہیں۔ جس آسمان نے اتنے دن چھاؤں دی' جس زمین پر میں اتنے دن ناز سے چلتا رہا۔ اب ذرا مصیبت آئی تو اسے چھوڑ کر چلا جاؤں؟

ابھی مکمل ایک برس بھی نہیں گزرا تھا کہ دہلی سے فساد کی خبریں آئیں۔ اس کے ساتھ ہی الٰہ آباد اور فیض آباد کے باغی لکھنؤ پہنچے۔ لکھنؤ کی چکیلی سڑکوں پر وہ ان باغیوں کو دیکھ کر دہل گیا۔ ایسے بے باک چہرے اس نے اس سے پہلے کاہے کو دیکھے تھے۔

قیصرباغ میں تھوڑی سی انگریزی فوج موجود تھی' باغیوں نے اسے تہِ تیغ کیا' جو بچ گئے وہ بیلی گارڈ (ریذیڈنسی) میں قلعہ بند ہوگئے۔ باغیوں نے بیلی گارڈ کا محاصرہ کرکے انگریزوں کا قتل عام شروع کردیا۔

انیس گھر کے دروازے بند کیے بیٹھا تھا اور پچھتا رہا تھا کہ یہ دن دیکھنے سے پہلے وہ یہاں سے نکل کیوں نہیں گیا۔ آتش بازی کا مظاہرہ تو بچے دیکھتے ہیں۔ وہ بچہ تو نہیں تھا پھر کیوں بہل گیا؟

باغیوں نے واجد علی شاہ کے صغیر سن بیٹے دس سالہ برجیس قدر کو تخت پر بٹھایا اور اس کی ماں حضرت محل نے کمان سنبھالی۔

بیلی گارڈ کے محصور انگریزوں سے جنگ جاری تھی۔ پورے اودھ میں آگ لگی ہوئی تھی کہ محرم آگئے۔

اگست کا مہینہ تھا۔ چھاجوں مینہ پڑ رہا تھا۔ بیلی گارڈ پر زبردست گولہ باری ہو رہی تھی۔ نہ امام باڑوں میں وہ روشنی تھی، نہ وہ مجلس نہ وہ مجلس کرنے والے۔ گھروں میں آہ وبکا تھی۔ اس سال لکھنؤ کا محرم حسرت وعبرت کی دردناک تصویر بنا ہوا تھا۔

انیس اس کے سوا کیا کہہ سکتا تھا۔

بادل آ آ کے رو گئے ہائے غضب
آنسو نایاب ہو گئے ہائے غضب

جی بھر کے حسین کو نہ روئے اس سال
آنکھوں کے نصیب سو گئے ہائے غضب

برجیس قدر تخت پر تھا لیکن پورا لکھنؤ باغیوں کے تسلط میں تھا۔ بیلی گارڈ کا محاصرہ جاری تھا۔ اہل شہر یہ سوچ کر فکر مند تھے کہ محاصرہ طول کھینچ گیا اور انگریزوں کی کمک آگئی تو شہر والوں پر کیا بیتے گی۔

انیس بڑھاپے کی لاٹھی سے ٹٹول ٹٹول کر دن گن رہا تھا۔ کئی مرتبہ سوچا کہ نکل جائے لیکن دوسرا لکھنؤ کہاں جو وہ جاتا۔ شہر کو تاریکی نے نگل لیا تھا لیکن وہ امید کی شمعیں جلائے دیوان خانے سے زنان خانے تک آتا رہا جاتا رہا۔

"بھائی اس رات کی کوئی سحر بھی ہوگی؟" ایک دن اس کے دل میں کسی نے شور مچایا۔

وہ قلم کے ترکش میں لفظوں کے تیر رکھے خاموش بیٹھا تھا کہ توپ کے گولوں نے اس کے قافیے اڑا دیے، ردیفوں میں کھلبلی مچ گئی۔

"جہاں زور سے کھانسنا بے تہذیبی تھی وہاں ایسا شور۔"

ایک کے بعد ایک۔ توپوں کی گرج سے اس کا دالان ہل گیا۔ کہیں حملہ ہوا ہے۔ آواز تو چکر کوٹھی کی طرف سے آئی ہے۔ تو کیا انگریزوں کی کمک آگئی۔ اگر آگئی ہے تو کوٹھیوں کے راستے میں مکانات بھی تو پڑتے ہیں۔ وہ گھبرا کر اٹھ گیا لیکن پھر بیٹھ گیا۔ میں کہاں جاتا ہوں۔ منبر پر بیٹھ کر جنگ کا نقشہ کھینچنا ایک بات ہے، توپوں کے سامنے جانا دوسری بات ہے۔

یہ بات معلوم ہونے میں دیر نہیں لگی کہ انگریزوں نے لکھنؤ پر حملہ کر دیا ہے۔

جب تک سورج اپنی تھکن اتارنے کے لیے مغرب کا رخ کرتا چکر کوٹھی اور بادشاہ باغ سے باغی فرار ہو گئے۔

اگلے دن سکندر باغ نے دم توڑ دیا پھر قیصر باغ ہاتھوں میں آگیا۔ بیگم کی کوٹھی چند گھنٹے بھی سانس نہ لے سکی۔

دو دن کی گولہ باری میں برجیس قدر کی حکومت شعلۂ مستعجل کی طرح بجھ گئی۔ حضرت محل شہر سے نکلنے میں کامیاب ہو گئیں اور انگریز قیصر باغ میں داخل ہو گئے۔

گورے رتھوں میں بیٹھے گولیاں برساتے جاتے تھے۔ عبارت خانے کو آگ لگا دی۔ راستے میں جو آیا، شکار کیا۔ مسجد فدا حسین میں کھانا کھایا پھر توشہ خانہ سلطانی میں گئے۔ جتنے شیر جانور وغیرہ تھے سب کو مار ڈالا۔ نبی بخش داروغہ کو گولی مار دی پھر آگ لگائی۔ چوپرا کے اصطبل میں آئے، جتنی چھاؤنی تھی سب کو جلا دیا۔

جب بھگدڑ مچی اور شرفا روپوش ہونے لگے تو اس نے بھی ضروری سامان ساتھ لیا اور درو دیوار پر حسرت کی نظر کرتا ہوا لکھنؤ سے نکل گیا۔ کاکوری قریب تھا لہٰذا ارادہ اُدھر کا تھا۔

اودھ کے علاقے میں آگ لگی ہوئی تھی لیکن رفتہ رفتہ یہ آگ دھواں دینے لگی پھر یہ دھواں دلوں میں اتر گیا۔ مطلع صاف تھا۔ بغاوت فرو ہوگئی تھی۔ امن کا اشتہار جاری ہوا تو پھر وہ لکھنؤ آگیا مگر یوں آیا جیسے بہروں کو کلام سنانے آیا ہو۔ چاروں طرف ویرانی ہی ویرانی نظر آتی تھی۔ وہ عبرت کی نظر چہار سو کرتا ہوا شیدیوں کے احاطے پہنچا۔ مکان، ملبے کا ڈھیر بنے پڑے تھے۔ طنابیں ٹوٹ گئی تھیں، خیمے جل گئے تھے۔ جنگ کے بعد کربلا کا منظر یہی ہوگا۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ شکستہ دروازوں اور گری پڑی دیواروں کو بہت دیر دیکھا کیا۔

چند روز محلہ منصور نگر میں قیام کیا، وہاں سے راجا کے بازار اور پھر سبزی منڈی میں رہائش اختیار کرلی۔

منصور نگر میں عارضی قیام تھا لیکن بہت دن بعد لکھنؤ کے آسمان نے کوئی سایہ بانی کی تھی۔ ذرا ہوش ٹھکانے آئے تو جگر کا خون سخن بن کر بہہ گیا۔

ورق الٹ گیا دنیا کا یک بہ یک کیوں چرخ
یہ کس طرح کا زمانے میں انقلاب آیا
پیامِ مرگ ہے موئے سفید اے اجل
سنا ہے کہ پیری گئی شباب آیا
الٹ گیا نہ فقط لکھنؤ کا اک طبقہ
انیس ملکِ سخن میں بھی انقلاب آیا

بہت دن ہوگئے تھے، وہ گھر میں بند تھا۔ جن سرکاروں سے تنخواہ آتی تھی ان کی طرف سے اب خبر بھی نہیں آرہی تھی۔

”میر مونس۔“

”جی بھیا۔“

”بہت دن ہوگئے، آج سیر کو چلتے ہیں۔ نواب فدا حسین کی طرف بھی پھیرا لگالیں گے۔ اب وہ بھی نواب کہاں رہے، مل لیتے ہیں، کیا حرج ہے۔“

مونس نے فینس منگوائی اور انیس سوار ہوگئے۔ چوک تک پہنچے تھے کہ دوسری فینس میں مرزا دبیر آتے نظر آئے۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئی اور دبیر فینس سے اتر آئے۔ انیس نے بھی پاؤں نیچے رکھ دیا۔ دونوں دوست بغل گیر ہوئے۔

”مرزا صاحب، آپ کب آئے؟“

”کل ہی آیا ہوں مگر یوں جیسے ویرانے سے ویرانہ تر میں آگیا۔ لکھنؤ کو دیکھ رہے ہیں آپ۔ سہاگ بھی کسی کا کیا اُجڑا ہوگا۔ ڈھونڈنے سے کوئی چہرہ نظر نہیں آتا۔“

شطرنج دو رنگی سے ہیں ششدر بندے
آوارہ ہیں شہر شہر در در بندے
اے بندہ نواز ہے تعجب کا محل
تو مالک ملک اور بے گھر بندے

”ہاں بھائی، بات تو یہی ہے۔“ انیس نے کہا۔

”اب تو کوئی اتنا بھی نہیں کہ ہماری تمہاری خاطر لڑسکے۔“

”کیا دور تھا۔ اب وہ دور کاہے کو پلٹے گا۔“

دبیر اپنی راہ ہولیے اور انیس اپنے رستے لیکن دبیر کی باتوں نے ایسا اثر کیا تھا کہ راہ سے لوٹ آئے، فدا حسین کا خیال رستے میں رہ گیا۔

”بس مونس، گھر چلو۔ اس سیر سے دل سیر ہوگیا۔“

آبلے بن کر دن گزر رہے تھے۔ لکھنؤ میں اب وہ بات کہاں رہی تھی کہ مجاور بنا پڑا رہتا۔ پروں میں جان آگئی تھی مگر اڑنے کے لیے آسمان بھی تو ہو پھر ایک دن اسے اشارہ پرواز مل گیا۔

عظیم آباد سے نواب قاسم علی کا دعوت نامہ آیا تھا۔ وہ اس کے بڑے قدر شناس تھے۔ اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ بلا چکے تھے لیکن وہ ہمیشہ یہ کہہ کر ٹال دیا کرتے تھا کہ میرے کلام کو اسی شہر کے لوگ خوب سمجھ سکتے ہیں مگر اب کلام تو وہی تھا، شہر کے لوگ کہاں تھے۔ اس نے جواب تحریر کردیا تھا کہ ہم آرہے ہیں۔

مرزا دبیر بھی بلائے گئے تھے۔ بنارس سے ایک ہی اسٹیمر میں مرزا دبیر، انیس دانا پور پہنچے۔ گھوڑا گاڑیاں استقبال کے لیے تیار کھڑی تھیں۔ یہ حضرات شہر میں آئے اور اپنے اپنے مقام پر ٹھہرا دیے گئے۔

انیس کے پہنچتے ہی شہر میں دھوم مچ گئی۔ دبیر تو کئی سال سے آرہے تھے اس لیے لوگ سن چکے تھے البتہ انیس کا انتظار بہت دن سے تھا۔ جیسے جیسے مجلس کا دن قریب آرہا تھا، لوگوں کا اشتیاق بڑھتا جارہا تھا۔

۲۴ جولائی ۱۸۵۹ء کو محرم کی چوتھی تاریخ تھی۔ میر انیس آج عظیم آباد میں پہلی مجلس پڑھ رہے تھے۔ شہر کا شہر اُمڈ آیا تھا۔ سارا صحن، دونوں طرف پورب پچھم کی چھتیں، آگے کا برآمدہ اندر کا ہال سب بھرا ہوا تھا۔ جس کو جہاں جگہ ملی۔ سایہ

یا دھوپ' بیٹھ کر خواہ کھڑے ہو کر' سننے کے لیے بے تاب تھا۔
ہال میں پورب کی طرف چھوٹا سا سیاہ پوشش کا منبر اپنے منبر نشین کا منتظر تھا۔ ایک طرف میر مونس اور دوسری طرف میر سید محمد مور چھل لیے تیار کھڑے تھے کہ میر انیس پروقار انداز میں چلتے ہوئے منبر نشین ہوئے۔ حاضرین نے نعرے بلند کیے اور خاموشی طاری ہو گئی جیسے سب کی سانسوں نے ساتھ چھوڑ دیا ہو۔
انیس نے فاتحہ پڑھی' کچھ دیر آنکھیں بند کر کے سکوت کیا اور پھر رباعی کے مصرع کے ساتھ آنکھیں کھول دیں۔

جز آہ نہ جب اپنے وہاں سے نکلے
نغموں کی صدا خاک زباں سے نکلے
پھولوں کی جگہ جب نظر آئے کانٹے
بلبل تھے پھڑک کے آشیاں سے نکلے

وہ آج تک لکھنؤ سے باہر نہیں نکلے تھے۔ لکھنؤ کی بربادی کے بعد اب جو لکھنؤ سے نکلے اور عظیم آباد آئے اور یہ رباعی پڑھی تو بلبل اور آشیاں کے مفہوم نے قیامت مچا دی۔ ابھی اس قیامت سے لوگ سنبھلے بھی نہیں تھے کہ انہوں نے اپنا مشہور مرثیہ "جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے" شروع کر دیا۔
لفظوں کا ٹھہراؤ' لب ولہجہ' لبوں کی مسکراہٹ' آواز کا زیروبم غرض جو بات تھی' کلیجے کے اندر اترتی چلی جا رہی تھی۔ تعریفوں کا وہ سماں بندھا کہ حاسدوں نے کان بند کر لیے۔
انیس کی بھی ایسی ہمت بندھی کہ گرمی کے باوجود پورا مرثیہ پڑھا' ٹوپی اور کپڑے پسینے میں تر ہو کر جسم سے چپک گئے۔ بالآخر ہاتھوں ہاتھ منبر سے اتارے گئے۔
نواب قاسم علی نے ان کی جوتیاں اپنے ہاتھ سے لے کر ان کے پیروں میں ڈالیں۔
"کیوں شرمندہ کرتے ہیں۔" میر انیس نے کہا۔
"آپ اس سے کہیں زیادہ احترام کے سزاوار ہیں۔" نواب صاحب نے کہا۔
صبح کی مجلس انیس نے پڑھی' شام کی مجلس میں دبیر منبر افروز ہوئے۔ انیس کی رباعی سن ہی چکے تھے' انہوں نے بھی اس مضمون کو قلم بند کیا۔

جو پھول کبھی نہ بوستاں سے نکلے
اس دور میں جور آسماں سے نکلے
پر شکر کہ شہر لکھنؤ تھا جنت
آدم ٹھہرے جو ہم جناں سے نکلے

دوسرے دن احباب ملاقات کو آنے لگے۔ پچھلے دنوں کی طرح مجالس زیر بحث تھیں کہ اتنے میں ایک سائل کیف ہلوری آ گئے۔ چپکے کھڑے سنتے رہے پھر انیس کو خوش کرنے کے لیے خوشامد پر اتر آئے۔
"مرزا دبیر آپ کا کیا مقابلہ کر سکتے ہیں۔"
یہ جملہ سنتے ہی انیس کا رنگ متغیر ہو گیا۔ اٹھ کر کمرے میں گئے اور دو روپے لے کر نکلے۔
"سید صاحب' مرزا دبیر نے آپ کا کیا بگاڑا ہے۔ وہ آپ کے جد کے حال کا مرثیہ کہتے ہیں۔ دیکھیے پھر آئندہ ایسا کلمہ زبان سے نہ نکالیے گا۔"
دو روپے ان کے ہاتھ پر رکھے اور وہ چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد بھی بہت دیر تک ان کا غصہ فرو نہیں ہوا۔
"صاحب' اچھے پڑھے لکھے لوگ بھی اس عیب میں مبتلا ہیں کہ میں خوش ہوں گا حالانکہ مجھ پر الٹا اثر ہوتا ہے۔ مرزا دبیر نے میرا کیا بگاڑا ہے۔ کیا وہ میرے لیے مرثیہ گوئی ترک کر دیتے۔"
ایک مجلس میں انیس نے یہ رباعی پڑھی۔

نالے نہ رکیں جب تو کہاں بند کروں
گھٹ جاؤں اگر شور وفغاں بند کروں
سن سن کے میری صدا چہک لے بلبل
کھل جائے جو دم بھر میں زباں بند کروں

دوسرے دن مرزا دبیر نے یہ جواب دیا۔

شیرازِ مضامیں کو کہاں بند کروں
کیا طبع کا دریائے رواں بند کروں
خلاقِ مضامیں تو بھی ہیں لیکن
کھل جائے حقیقت جو زباں بند کروں

جہاں انیس و دبیر ہوں وہاں حریفانہ چشمک نہ ہو؟ لوگوں نے یہی سوچا کہ یہ ردوبدل چلتا رہے گا لیکن انیس نے اس شہر کو لکھنؤ بنانا نہیں چاہا۔ یہ بھی لکھنؤ بن گیا تو اجڑے گا ضرور۔ یہ قطعہ زمین بھی چھن گیا تو دستر خوان کہاں بچھاؤں گا۔ اس نے ہاتھ سمیٹ لیے۔
"حضور کوئی رباعی۔"
"مرثیے سنئے۔"
رات کو مجلس پڑھی تھی اور یوں بھی دوپہر کو سونے کی عادت تھی۔ میر انیس پلنگ پر دلائی لپیٹے سو رہے تھے' سید سلطان

مرزا، میر، اُنس اور شاد عظیم آبادی بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ شاعری کا تذکرہ نکل آیا۔

"بعد چہلم یہاں مشاعرہ ہونے والا ہے۔" شاد عظیم آبادی نے کہا "مصرع طرح ہے۔"

وہ شب کو بام پہ اپنے رہے قمر کی طرح

میر مونس نے ذرا غور کر کے مطلع کہہ لیا۔

کچھ آج شام سے چہرہ ہے فق سحر کی طرح
ڈھلا ہی جاتا ہوں فرقت میں دوپہر کی طرح

یہ سمجھے ہوئے تھے کہ انیس سو رہے ہیں لیکن شاید وہ جاگ رہے تھے۔ اٹھ کر بیٹھ گئے۔

"آپ لوگ شعر کہہ رہے تھے، اس بندے کا بھی ایک شعر سن لیجئے۔"

خدا جہاں میں سلامت رکھے تجھے اے قبر
کہ سوئے پاؤں کو پھیلا کے اپنے گھر کی طرح

اپنے مخصوص لہجے میں شعر پڑھا اور پھر کسی کام سے اندر چلے گئے۔

"حضرت کی عادت ہے کہ جب شعر کہنے لگتا ہوں، مصرع طرح پوچھ کر خود ایسا عمدہ شعر کہہ دیتے ہیں کہ دوسرے کا جی چھوٹ جائے چنانچہ بنارس سے آتے ہوئے اسٹیمر پر میں سلام کہہ رہا تھا۔

"لہو روتی ہیں آنکھیں مثلِ گل آنکھوں میں لالی ہے"

حضرت نے مصرع پوچھ کر فوراً یہ شعر لکھوا دیا۔

تباہی میں سفینہ آچکا تھا امت جد کا
یہ کشتی بحرِ غم میں ڈوب کر شہ نے نکالی ہے

عظیم آباد میں دبیر کے کمالِ فن کے بہت چرچے تھے۔ ان کے شاگرد بھی وہاں موجود تھے۔ شاد عظیم آبادی جیسا شاعر مرثیے میں مرزا دبیر کا شاگرد تھا۔ اس چلتے ہوئے بازار میں اپنا سکہ چلانا مذاق نہیں تھا لیکن انیس کا مال ایسا کھرا تھا کہ خریدار اگلے سال کا انتظار کرنے لگے۔

اگلے برس اسے پھر عظیم آباد بلایا گیا۔ اس مرتبہ میر انس بھی ساتھ تھے یعنی تینوں بھائی میر مونس، انس اور انیس۔

مجلس میں پہلے میر مونس نے پڑھا، پھر میر انس نے۔ میر انس نہایت عمدہ پڑھتے تھے بلکہ بعضے تو یہ کہتے تھے کہ جس نے انیس کو نہ سنا ہو، انس کو سن لے۔

مونس اور انس نے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا آج انیس کا رنگ نہیں جم سکے گا۔ خود انیس نے بھی کہا "مونس اور انس کے بعد آپ صاحبوں کا مجھ پر اصرار فضول ہے لیکن جب پڑھنا شروع کیا تو پہلے ہی مصرع میں مجلس کوری تھی۔"

ساتویں تاریخ میں تین کشتیاں پشمینے کی تینوں صاحبوں کے سامنے رکھی گئیں۔ اٹھارہ سو میر انس اور اٹھارہ سو میر مونس اور تقریباً چار ہزار میر انیس کو، پانچ سو روپے راہ کے خرچ کے دیے گئے۔

ابھی لکھنؤ کے چراغ بجھے ہوئے تھے۔ اجڑی ہوئی بستی، بستے بستے بستی ہے۔ لڑکھڑائے ہوئے قدم سنبھلنے کی تیاری کر رہے تھے۔ انیس کے محرم اب عظیم آباد میں گزر رہے تھے۔ نواب قاسم کی دل داری اسے ہر سال بلا لیتی تھی۔

ایک مرتبہ بنارس کے لوگوں نے بھی اسے سننے کا اشتیاق ظاہر کیا اس نے وعدہ کر لیا کہ عظیم آباد سے واپسی پر وہ بنارس کی مجلس پڑھے گا۔

اس سفر میں میر انس، میر مونس، میر نفیس اور میر وحید بھی اس کے ہمراہ تھے۔

آغا میر تقی شیرازی نے میزبانی کا شرف حاصل کیا۔ جس کوٹھے پر یہ حضرات ٹھہرے تھے، وہ سرِ راہ تھا۔

میر انیس کوٹھے پر ٹہل رہے تھے۔ چند راہ گیر ادھر سے گزرے جو کچھ انہوں نے کہا، انیس نے سن لیا اور فوراً پلٹ آئے۔

"سنا میر نواب تم نے؟ ابھی ادھر سے چند خوش لباس جا رہے تھے۔" کوٹھے کی طرف اشارہ کر کے انہوں نے کہا۔ "یہ کیسے مرثیہ خواں ہیں جو عظیم آباد کو لوٹ لائے۔ پانچ پانچ ہزار ایک ایک کو ملے ہیں۔"

"بھیا، لوگوں کا کیا ہے۔ لوگ تو باتیں بناتے ہی ہیں۔"

"مجھے ان کی باتوں کا دکھ نہیں۔ مجھے تو اس پر تعجب ہے کہ وہ دن آگئے کہ مجھ کو لکھنؤ سے باہر جانا پڑا۔ نہ میں نکلتا، نہ یہ باتیں سنتا۔ جنہیں پانچ ہزار بہت لگتے ہیں، وہ میری قدر کیا کریں گے۔ اب تم ہی رسوا ہونا، میں تو اب لکھنؤ سے نہیں نکلوں گا۔"

ماحول اتنا افسردہ ہو گیا تھا کہ میر مونس کو یہ شک ہونے لگا کہ انیس کہیں آج کی مجلس پڑھنے ہی سے انکار نہ کر دیں۔

یہ مجلس قاضی میر یار علی کے امام باڑے واقع نیلیا نالے میں منعقد ہوئی۔

میر وحید (میر انیس کے بھتیجے، میر انس کے صاحب زادے) نے پیش خوانی کی پھر میر نفیس نے پڑھا۔ اس کے بعد میر مونس اور انس یکے بعد دیگرے منبر نشین ہوئے۔

خاص طور پر میرانس کے مرثیے نے خوب رنگ جمایا۔ گریہ ایسا ہوا کہ آنکھوں میں آنسو کم پڑ گئے۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے انس کی صورت میں انیس نے محفل کو گرما دیا ہو۔

میرانیس سے درخواست کی گئی مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ اب میر مونس کا ماتھا ٹھنکا۔ ہو نہ ہو یہ اسی گفتگو کی خفگی ہے جو انیس نے کوٹھے پر ٹہلتے ہوئے سنی تھی لیکن اس میں صاحبانِ مجلس کا کیا قصور۔ مونس نے بھی درخواست کی۔ انیس کے پاس یہی ایک جواب تھا۔

"مالِ مجلس ہو چکا۔ میرانس ماشاءاللہ خوب پڑھے۔ اب میری کوئی ضرورت نہیں۔"

"یہاں سب حضور ہی کے مشتاق ہیں۔" صاحبِ خانہ نے دست بستہ عرض کیا۔

"اچھا؟" انیس نے کہا اور منبر پر پہنچ گئے۔ فاتحہ پڑھی "نماز ادا کرلی جائے اس کے بعد پڑھوں گا۔" انہوں نے کہا اور منبر سے اتر آئے۔

صاحب خانہ پریشان کہ اب اتنا بڑا مجمع کا ہے کو ہوگا۔ لوگ نکل جائیں گے پھر کیا خبر کون لوٹ کر آتا ہے کون نہیں آتا۔

نماز کے بعد مجلس پھر تیار ہوئی۔ انیس منبر پر آئے۔ مجمع پہلے سے بھی زیادہ تھا۔

"میں یہ دیکھنا چاہتا تھا، انیس کو سننے والے کتنے ہیں۔"

امید کسے تھی بزم کے بھرنے کی
اللہ جزا دے اس کرم کرنے کی
ماشاءاللہ چشم بددور انیس
مجلس میں جگہ نہیں ہے تل دھرنے کی

رباعی کے بعد اپنا مشہور مرثیہ "جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے" پڑھا اور ایسا پڑھا کہ سب کے رنگ اتار دیے۔ مجلس ختم ہوئی تو سب کی زبانوں پر یہی جملہ تھا "انیس آخر انیس ہے۔"

تین برس تک میرانیس عظیم آباد جاتے رہے۔ بنارس میں کہہ آئے تھے کہ اب وہ لکھنؤ سے نہیں نکلیں گے۔ خدا نے اس کا انتظام خود ہی کر دیا۔ چوتھے سال قاسم علی خاں کا انتقال ہو گیا۔ اس سال وہ عظیم آباد گئے لیکن یہ آخری پھیرا تھا۔ وضع داری کا یہی تقاضا تھا کہ جب قاسم علی خاں نہ رہے تو کسی اور کے بلانے پر وہ کیوں جائے۔ اپنی جگہ میر مونس کو بھیجتے رہے۔ میر مونس برسوں تک عظیم آباد آتے جاتے رہے۔

لکھنؤ کیسا بھی تھا، اس کا لکھنؤ تھا۔ اشرفیوں کے ڈھیر ختم ہو گئے تھے لیکن تعریفوں کے پہاڑ تو اب بھی موجود تھے۔ اس نے بہتر یہی سمجھا کہ مونس کے ذریعے اپنے گھرانے کی زبان عظیم آباد پہنچا دے اور خود لکھنؤ کی سلطنت سنبھالے۔ اب سفر کی صعوبتیں اٹھائی نہیں جاتیں۔

وقت نے بہت سی قدریں پامال کر دی تھیں۔ وہی لکھنؤ جہاں اس کے کلام کی پرستش ہوتی تھی، نئی نسل نے ایسے مظاہرے بھی کیے کہ بر سرِ عام اس کے کلام پر اعتراضات ہونے لگے۔ اب اسے زلفِ سخن سنوارنے کے ساتھ ساتھ، ان اعتراضات سے بھی الجھنا پڑ رہا تھا۔ ایک مرتبہ گھوڑے کی تعریف میں انیس نے یہ شعر پڑھا۔

سم تر نہ اور قلزمِ زخار پہ دوڑے
جس طرح سے نغمے کی صدا تار پہ دوڑے

مشہور شاعر میاں امید بھی بیٹھے سن رہے تھے۔ انہوں نے اس بند کو دوبارہ پڑھوایا۔ انداز یہ تھا جیسے معترض ہوں۔ انیس کو گمان ہوا کہ مبالغے اور تشبیہ پر اعتراض ہے جب کہ میاں امید کا اشارہ ردیف کی طرف تھا جس میں اگر "د" پر پیش لگا کر پڑھا جائے تو "پدوڑے" پڑھا جاتا ہے۔

انیس نے مرثیہ روک کر وہیں سے کہا "کسی صاحب نے حقیر کے اس مصرع پر اعتراض کیا ہے۔ جس طرح سے نغمے کی صدا تار پہ دوڑے، اک اکیلا میں ہی ملزم نہیں ہوں، عرفی بھی کہہ گیا ہے۔"

میاں امید نے دبی زبان میں کہا "معنی پر اعتراض نہیں بلکہ ردیف کے پہلو پر ہے۔"

"صاحب آہستہ آہستہ دبے ہوئے لفظوں میں کیا کہہ رہے ہو۔ سامنے آؤ۔" انیس نے ڈانٹ کر کہا۔

میاں امید نے بات بڑھانی مناسب نہیں سمجھی اور خاموشی اختیار کرلی۔

اعتراض ٹھیک تھا۔ انیس کو اس ذم کے پہلو سے گریز کرنا چاہیے تھا لیکن انیس کا ادب اتنا تھا کہ امید نے خود ہی اعتراض اٹھایا اور خود ہی خاموش ہو گئے۔

اسی طرح بند کے اس مصرع پر کسی نے اعتراض کیا۔ مصرع یہ تھا۔

"جس طرح سے بجلی کی صدا تار پہ دوڑے"

اعتراض یہ تھا کہ بجلی کی آواز تار پر نہیں دوڑتی ہے بلکہ حرکت دوڑتی ہے۔

میرانیس نے علمِ طبیعیات سے ثابت کیا کہ مادّی اشیا میں جب تصادم ہوگا تو آواز یقینی پیدا ہوگی اور وہ فاصلہ جو مادۂ برقی کے خلا میں واقع ہے آواز سے مملو ہے خواہ وہ آواز مسموع ہو یا

نہ ہو۔

انیس کے علم و فضل سے سب واقف تھے لہٰذا قائل بھی ہوگئے لیکن یہ بالکل نئی باتیں تھیں۔ اس سے پہلے کسی کی ہمت بھی نہیں تھی کہ انگشت نمائی کرتا اور ایک مرتبہ ایک مصرع پر تو ہنگامہ ہی برپا ہوگیا۔

انیس نے ایک مرثیہ پڑھا جس میں مصرع تھا۔

"بحرِ علی کے گوہر یکتا حسین ہیں"

سننے والوں نے فوراً ٹوک دیا کہ حضرت علی ہرگز بہرے نہیں تھے۔

انیس نے اسی وقت سجدہ سہو ادا کرتے ہوئے اس مصرع کی اصلاح کردی۔

"کانِ علی کے گوہر یکتا حسین ہیں"

لیکن لوگوں نے ظاہر ہے "کانے علی" پر بھی اعتراض کیا۔

انیس نے پھر کہا۔

گنج علی کے گوہر یکتا حسین ہیں۔"

لوگوں نے "گنجے علی" پر آوازے کسے۔ بعض لوگ اچھے خاصے برہم بھی تھے۔ آخر میں انیس نے مصرع یوں کردیا۔

"کنزِ علی کے گوہر یکتا حسین ہیں"

تب جاکر لوگوں نے پیچھا چھوڑا اور جان عذاب سے چھوٹی۔

کوئی اور ہوتا تو چکرا کر رہ جاتا۔ انیس چومکھی لڑتے رہے۔ حاضرین کو مطمئن بھی کردیا لیکن کہنے والوں کو موقع مل گیا۔

"صاحب، انیس تو گھوم کر رہ گئے۔"

"اتنی مشق کے بعد بھی ایسے مصرعے کہہ جاتے ہیں۔"

"بڑھاپا ہے، اب وہ بات نہیں رہی۔"

طرح طرح کی باتیں انیس کے کانوں میں پڑتی رہتی تھیں۔ کچھ بڑھتی ہوئی عمر، کچھ نازک دماغی، کچھ یہ احساس کہ لکھنؤ کیا اجڑا ادب احترام ہی اٹھ گیا، انیس بھی تیغ بے نیام بن گیا۔ اب اس کی ہر مجلس معرکہ آرائی کا نمونہ پیش کرنے لگی۔ کسی نے ذرا پہلو بدلا اور اس نے ڈانٹ پلائی۔

ایک مجلس میں میر انیس مرثیہ پڑھ رہے تھے۔ بعض روسا کسی ضرورت سے مجلس سے اٹھ گئے۔ انیس کو یہ جسارت کہاں برداشت۔ انہوں نے مرثیہ روک دیا اور منبر سے اتر آئے۔ لوگوں نے ہاتھ جوڑے، خوشامد کی لیکن وہ منبر کا پایہ پکڑ کر بیٹھے رہے۔

"لکھنؤ میں سخن فہمی اور قدر شناسی کا خاتمہ ہوگیا۔ اب میری یہاں ضرورت ہی کیا رہی۔"

انیس کے اٹھتے اٹھتے لوگ اتنے برہم ہوگئے کہ کسی صاحب نے بھڑک کر کہا۔

"ابھی کوئی بڑا آدمی مجلس کرے گا تو دوڑے جائیں گے۔"

انیس کو اتنا ملال ہوا کہ قطعی حکم دے دیا "اگر لکھنؤ میں رہنے دینا گوارا ہو تو کوئی صاحب اب مجھ پر مجلس کے لیے اصرار نہ کریں ورنہ میں لکھنؤ چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔"

صرف کہنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ جہاں جہاں مقررہ مجالس تھیں اور وقف تنخواہیں تھیں، ان سے کہلوادیا کہ میر انیس نے پڑھنا ترک کردیا ہے۔ آپ چاہیں تو میر مونس اور میر نفیس سے پڑھوالیں یا چاہے کسی اور سے پڑھوالیں۔

میر نفیس اور میر مونس پڑھتے رہے، انیس نے گوشہ نشینی اختیار کرلی۔ قدردانوں نے کس کس طرح خوشامد نہ کی ہوگی مگر مجلسیں انیس کی آواز سے محروم ہوگئیں۔

انیس کو خاموش ہوئے تین برس گزر گئے تھے۔ ایک مرتبہ نہ جانے کیا جی میں سمائی کہ نواب فدا علی خاں کے اصرار پر پڑھنے کا وعدہ کرلیا۔

یہ خبر ایسی نہیں تھی کہ فدا علی تک محدود رہتی۔ یہ خبر مشہور ہوگئی۔ لکھنؤ کے چاروں طرف ریل نکل چکی تھی لہٰذا مجلس والے دن دور دور سے لوگ اشتیاق سے آتے تھے۔

اہل مجلس منتظر تھے کہ فینس آکر رکی، آنکھوں نے انیس سمجھ کر استقبال کیا لیکن فینس سے انیس کے بیٹے نفیس اترے۔ بجھے ہوئے دلوں نے خوش آمدید کہا اور کشاں کشاں منبر تک لے جائے گئے۔

حقیقتِ حال اس وقت کھلی جب وہ منبر پر گئے اور انہوں نے وضاحت کی۔

"سب لوگ جناب قبلہ و کعبہ کے اشتیاق میں جمع ہوئے ہیں۔ میرے پڑھنے کا کوئی محل نہ تھا لیکن میں جناب قبلہ کے ارشاد سے معذور ہوں۔ انہوں نے ارشاد کیا، میں اس وقت نہیں جاسکتا، تو جاکے پڑھ دے۔"

چند مہینے بعد حیدر خاں کے یہاں میر خورشید علی نفیس پڑھنے والے تھے۔ حیدر خاں چاہتے تھے، اس مرتبہ تو انیس قسم توڑ دیں۔ وہ انیس کے گھر پہنچے اور اپنی ٹوپی انیس کے قدموں میں رکھ دی۔

"حیدر خاں مجھے شرمندہ مت کیجیے۔ میں لکھنؤ میں رہ رہا ہوں یہی بہت ہے۔"

"آپ صرف شریک ہوجائیں۔ میری عزت بڑھ جائے گی۔ میر نفیس نے اب بہت ترقی کرلی ہے۔ آپ انہیں سنیں گے تو آپ کو خوشی ہوگی۔"

انیس نے اس شرط پر شرکت کی ہامی بھرلی کہ وہ صرف

شریک ہوں گے، پڑھیں گے نہیں۔
انیس، حیدر خاں کی مجلس میں چلے آئے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ لکھنؤ کے تمام ماہرین فن اور نقادانِ سخن کا مجمع ہے۔
ان سخن شناسوں نے ایسا اصرار کیا کہ میر صاحب منبر پر چلے گئے۔
ابھی آدھا مرثیہ پڑھا ہوگا کہ نواب فدا علی خاں پر نظر پڑ گئی۔ آنکھ ملتے ہی انیس کی وضع داری کو دھچکا لگا۔ وہ فدا علی خاں کے گھر وعدے کے باوجود مجلس پڑھنے نہیں گئے تھے اور اب یہاں پڑھ رہے تھے۔ ان پر ایسا حجاب طاری ہوا کہ مرثیہ روک دیا۔
"باقی مرثیہ نواب فدا علی خاں صاحب کی آئندہ مجلس میں پڑھوں گا۔"
سب نے اصرار کیا، خود فدا علی خاں نے بھی کہا لیکن وہ منبر سے اتر آئے۔
پھر نواب فدا علی کی مجلس پڑھی اور دوسری مجلسیں بھی پڑھیں۔
تین سال کے ترک کے بعد جب انہوں نے دوبارہ پڑھنا شروع کیا تب لوگوں کو ان کی اہمیت کا احساس ہوا۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے عزاداری بھی ان کے ساتھ رخصت ہوگئی تھی اور اب کئی سال بعد پہلی مرتبہ لکھنؤ میں محرم آئے ہیں۔
ضعیفی کے باوجود پڑھنے کا انداز وہی تھا، آواز وہی تھی۔ ہزاروں کے مجمع میں اس طرح پڑھتے جیسے شیر گونج رہا ہو۔
زود گوئی کا عالم یہ تھا کہ جس طرح کوئی باتیں کرتا ہے اس طرح وہ مرثیے کہتے تھے۔ رعشے کی وجہ سے ہاتھ کانپنے لگے تھے لیکن حافظہ ابھی تک ایسا تھا کہ جتنے بند کہتے، یاد رکھتے اور بعد میں کسی سے لکھوا لیتے۔

گھٹا زور مشقِ سخن بڑھ گئی
ضعیفی نے ہم کو جواں کردیا

عمر گھٹتی جا رہی تھی، ضعف بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ بیمار تو نہیں تھے لیکن بڑھاپا خود ایک بیماری ہے۔ کمزوری کی وجہ سے اکثر ہاتھ تھام کر چلنے کی ضرورت پیش آتی تھی لیکن لوگ تھے کہ مانتے ہی نہیں تھے۔ شائقین ان کا کوئی عذر سننے کو تیار ہی نہیں تھے۔ اب تو وہ آنکھوں کی عبادت تھے۔ لوگ انہیں دیکھنا چاہتے تھے۔
"بھائی، میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ آواز بیٹھی ہوئی ہے، یہ تو فرمائیے میں پڑھوں گا کیسے؟"
"آپ صرف ہونٹ ہلا دیں گے تو ہماری مجلس قبول ہو جائے گی۔"
"اچھا بھائی، چلتے ہیں۔"
منبر پر تشریف لے گئے اور رباعی فی البدیہہ کہہ کر پڑھی۔

ہر چند کہ خستہ و حزیں ہے آواز
پُر تعزیہ دارِ شاہِ دیں ہے آواز
نکلے نہ اگر کنجِ دہن سے تو بجا
ماتم کے ہیں دن سوگ نشیں ہے آواز

گرمی کا موسم اور ضعیفی۔ ایک مرتبہ مشتاقوں کے ہجوم نے مجلس میں سانس لینا دشوار کردیا۔ میر انیس نے کہا۔

دھوپ آکے یہاں زرد ہوجاتی ہے
آندھی آئے تو گرد ہوجاتی ہے
آہوں کے ہیں پنکھے، آنسوؤں کا چھڑکاؤ
یاں گرم ہوا بھی سرد ہوجاتی ہے

کئی دن سے بخار میں مبتلا تھے۔ بخار ذرا خفیف ہوا تو علی اصغر کی شہادت کے احوال پر مرثیہ تحریر کیا۔ مقطع میں اپنی حالت زار بیان کی۔

دفنِ علی اصغر کا ہے پردرد بہت حال
کر شہ سے یہی عرض کہ اے فاطمہ کے لال
بیمار انیس جگر افگار ہے امسال
یہ میرا مرض دور ہو، یاور رہے اقبال
ہو داد رس خلق مری داد کو پہنچو
اے شاہِ شہیداں مری امداد کو پہنچو

خدا کا کرنا یہ ہوا کہ چند ہی روز میں بخار اتر گیا۔ شکر گزاری کے طور پر ایک مرثیہ اور کہا۔
"جبکہ تیروں سے بدن شاہ کا غربال ہوا"
اس کی عمر نے ۷۰ سال طے کرلیے تھے۔ علیل رہنے لگا تھا اور ابھی سخت بیماری سے اٹھا تھا کہ حیدر آباد دکن سے نواب تہور جنگ کا خط آیا۔ انہوں نے اسے طلب فرمایا تھا۔ موسم کے بغیر بارش ہوئی تو اس نے بھیگنے سے انکار کردیا۔ یہ سفر وہ کس طرح کرسکتا ہے۔
ایک دن دیکھا تو علامہ حامد حسین بہ نفس نفیس اس کے پاس تشریف لائے ہوئے ہیں۔ نواب تہور جنگ نے ان سے گزارش کی تھی اور وہ انیس کے پاس آئے تھے۔ یہ عمر ایسی نہیں تھی کہ انیس یہ طویل سفر کرتے لیکن علامہ حامد تشریف لائے تھے اور کئی معززین نے بھی مجبور کیا۔ بالآخر انیس اس شرط پر تیار ہوگئے کہ ان کے فرزند میر سلیس بھی ان کے ساتھ

جائیں گے۔

ریل کا سفر اور وہ بھی اتنا طویل۔ حیدر آباد پہنچتے ہی میر انیس سفر کی زحمت سے بیمار ہوگئے۔ مجلس میں صرف ایک دن رہ گیا تھا اور وہ سخت بخار میں مبتلا تھے۔ علاج کے لیے استخارہ نکالا گیا تھا اور استخارہ ڈاکٹر کے نام پر آیا تھا۔ انیس ڈاکٹری علاج کے لیے قطعی تیار نہیں ہو رہے تھے۔

”میں نے کبھی ڈاکٹر کا علاج نہیں کیا ہے۔ ڈاکٹر اپنے معمولات میں شراب کو ہر مرکب کا جزوِ اعظم سمجھتے ہیں۔ میں ان کی دوا استعمال نہیں کروں گا۔“

”میر صاحب، ڈاکٹر صاحب مسلمان ہیں۔ کوئی دوا خلافِ شریعت استعمال نہیں کریں گے۔“

”صاحب، کیا دوائیں بھی وہ اپنی بنالیں گے؟“

”آپ یقین کریں۔ ان سے کہہ دیا گیا ہے، وہ کوئی ایسی دوا نہیں دیں گے۔“

میر صاحب کا شک دور ہوا اور ڈاکٹر نے تپ اتارنے کی دوا دی۔ تھوڑی دیر تک پسینہ آیا اور پھر بخار یک لخت اتر گیا۔ کمزوری بہت تھی لیکن ارکانِ سلطنت کی خوشامد سے مجبور ہو کر مجلس میں تشریف لے گئے۔

مجلس میں حیدر آباد کے تمام اُمرا و شرفا شریک تھے۔ ہزاروں آدمی مکانوں کی چھتوں پر چڑھ گئے تھے اور ایک جمِ غفیر جسے اندر جانے کی گنجائش نہیں ملی، باہر کھڑا ہوا تھا۔

وہاں کے دستور کے مطابق جتنے نامور اُمرا تھے، زیرِ منبر قطار سے دوزانو بیٹھے تھے۔ انہوں نے اپنے اپنے ہتھیار کھول کر سامنے رکھ دیے۔ پائیں میں ان کے ہتھیار بند ملازمین کی ایک بہت بڑی تعداد صف باندھ کر کھڑی تھی۔

”بھئی، میں یہ مجلس پڑھ نہیں سکوں گا۔“ انیس نے معذرت کی۔

”میر صاحب، یہ کیا غضب کرتے ہیں؟“

”کمزوری بے حد ہے، پڑھا نہیں جائے گا۔“

”میر صاحب، حاسدوں نے یہاں یہ مشہور کردیا ہے کہ حضور تشریف ہی نہیں لائے ہیں۔ آپ بس منبر پر تشریف فرما ہوجائیں تاکہ لوگوں کو آپ کی آمد کا یقین آجائے۔“

انیس نے ہمت کی اور منبر پر جلوہ افروز ہوگئے۔ کچھ دیر سر جھکائے بیٹھے رہے پھر آواز نے خاموشی کا قفل توڑنے کی ٹھان لی۔

اللہ و رسولِ حق کی امداد رہے
سرسبز یہ شہر فیض بنیاد رہے
نواب ایسا رئیسِ اعظم ایسے
یارب آباد حیدر آباد رہے

اپنی آواز خود سنی تو اپنے ہونے کا یقین آیا۔ شوق ہوا کہ اس نقاہت کے موسم میں ایک مرتبہ پھر خود کو سنوں۔

موجود ہے جو کچھ جسے منظور ہے یاں
علم و عمل و عطا کا دستور ہے یاں
مختار الملک اور بندگانِ عالی
رحمت رحمت پہ نور پر نور ہے یاں

یہ واقعی خود پڑھ رہا تھا، خود سن رہا تھا۔ غور کیا تو یوں لگا جیسے اس کے کان بج رہے تھے، آواز نکلی ہی نہیں، کسی تک پہنچی ہی نہیں۔ کسی نے گردن تک نہیں ہلائی۔ یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ کیا میرے کلام میں اثر ختم ہوگیا؟ مرثیہ پڑھ کر دیکھتا ہوں۔ مرثیے تو میرے سب آزمائے ہوئے ہیں۔ مصرعے ایسے ہیں کہ گونگا بھی داد دینے پر مجبور ہوجائے۔ اس نے مرثیہ پڑھنا شروع کیا۔

جب لاشۂ قاسم کو علم دار نے دیکھا
قبضے کی طرف غیظ سے جرار نے دیکھا
منہ بھائی کا روکر شہ ابرار نے دیکھا
کی عرض بڑا داغ نمک خوار نے دیکھا
تیغوں سے عجب سرو رواں کٹ گیا آخر
واللہ کہ دل زیست سے اب ہٹ گیا آخر

وہ بند پر بند پڑھ گیا۔ سب سر جھکائے بیٹھے تھے۔ کسی نے سر اٹھا کر دیکھا تک نہیں، تعریف تو بڑی بات ہے۔ سات بندوں کے بعد جھلا کر مرثیہ بند کردیا۔

”انیس کو بس یہی آتا ہے جو آپ لوگوں نے سن لیا۔“ انیس نے کہا اور منبر سے اترنے لگے۔

”حضور، سب مشتاق ہیں۔ کچھ تو اور ارشاد ہو۔“ صاحبِ خانہ نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔

”جمادات و نباتات کے سامنے کیا پڑھوں؟“ ارشاد ہوا اور نیچے اتر آئے۔

صاحبِ خانہ حیران کہ کون سی بات بری لگی۔ اہلِ مجلس اسے بد دماغی پر تعبیر کر رہے تھے۔

”حضور، مجھے تو بتائیں کیا بات ہوئی؟“

”ہائے لکھنؤ، تجھے کہاں سے لاؤں۔“ انیس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری کہ صاحب خانہ اس سے کچھ بھی نہ پوچھ سکے۔

اس وقت تو ناسازیِ طبیعت کا بہانہ کر کے بات نبھ گ

یان جب خلوت ہوئی تو نواب تہور جنگ حاضر خدمت ہوئے۔ بار افسگی کا سبب پوچھا۔

"کیسے کیسے انمول بند میں نے پڑھ ڈالے۔ کسی کو داد دینے کی بھی فرصت نہیں ہوئی۔" انیس نے کہا۔

اب سب پر کھلا کہ ماجرا کیا ہے اور اس کی وضاحت بھی کی گئی۔

"یہ امر کسی تکبر کی وجہ سے نہیں ہوا۔ یہاں کا ضابطہ ہی یہ ہے۔ ذاکر پڑھتا ہے اور سب سر جھکا کر ادب سے پڑھتے ہیں۔"

"عجیب ضابطہ ہے صاحب! لکھنؤ اور دوسرے شہروں کا دستور ہے کہ جب ذاکر پڑھنا شروع کرتا ہے، سامعین بہ قدرِ فہم داد دینا شروع کرتے ہیں۔ ذاکر کا دل لگتا ہے۔ ضابطہ یہی ہے تو بندے کو عاجز سمجھیں۔"

"میر صاحب، پھر اب کیا ہو سکتا ہے؟"

"اس شہر میں سیکڑوں اہلِ لکھنؤ اور ہندوستان کے دوسرے شہروں کے لوگ ہوں گے۔ ان میں سے خاص خاص لوگوں کو مدعو کیجیے تو مجلس ابھرے۔"

یہاں تو یہ تجویز زیر غور تھی اور شہر میں باتیں بننا شروع ہو گئی تھیں۔ انیس ظاہر ہے ذرا بھی تاثر نہیں چھوڑ سکے تھے۔

"بس، یہی میر انیس تھے۔"

"ان سے تو فلاں ذاکر اچھا ہے۔"

"کچھ اکھڑے اکھڑے تھے۔"

"لکھنؤ کی نزاکت۔ ارے سبحان اللہ۔"

"بیمار بھی تو تھے۔"

"پھر بھی صاحب۔ نکو جی مزہ نہیں آیا۔"

انیس کی تجویز کے مطابق اگلی مجلس میں لکھنؤ اور شمالی ہند کے دوسرے شہروں کے لوگ مدعو کیے گئے۔ بخار میں مبتلا ہونے کے باوجود انہوں نے ایسی مجلس پڑھی کہ جو لوگ مخالف تھے، وہ بھی تعریف کرنے والوں کے ہم زبان ہو گئے۔

اس مجلس کی شہرت ہوئی تو سر آسمان جاہ بہادر نے بھی چاہا کہ انیس ان کے گھر مجلس پڑھیں۔

"جب آہی گیا ہوں تو مجھے کسی جگہ جانے میں کیا اعتراض ہو۔"

"لیکن آسمان جاہ بہادر کی ایک شرط ہے۔"

"یہ دور بھی دیکھنا تھا کہ انیس کے سامنے شرطیں رکھی جائیں۔ بہرحال بتائیے۔"

"ان کی شرط ہے کہ آپ اپنی ٹوپی کی جگہ حیدر آباد کی پگڑی باندھ کر زیبِ مجلس ہوں۔"

انیس کی وضع داری نے کہنے والے کا گلا دبوچ لیا "آسمان جاہ بہادر اپنی امارت کے زعم میں میری غیرت خریدنا چاہتے ہیں؟" انیس کی آواز بھرا گئی "وہ پانچ ہزار کی بات کرتے ہیں۔ اگر دس ہزار بھی دیں تو انیس اپنی وضع تبدیل نہیں کرے گا۔"

آخری مجلس تھی۔ ایک رئیس اعظم تشریف لائے۔ لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ منبر کے قریب پہنچایا اور کھڑے ہو کر تعظیم دی۔

انیس نے فقط اتنا ہی کہا، بسم اللہ۔

انیس کا کھڑا نہ ہونا، رئیس مذکور کے خلافِ مزاج ہوا۔

وہ چپ تو ہو گئے لیکن مصاحبوں سے سرگوشیوں میں مصروف ہو گئے۔ آدھا ادھورا جملہ انیس کے کانوں میں بھی پہنچ ہی گیا۔ وہ اپنے مصاحبوں کو ہدایت کر رہے تھے کہ انیس کو ان کے مرثیے پر داد نہ دی جائے۔

انیس ایسے رئیسوں کی فرعونیت کا توڑ خوب جانتے تھے۔ اگر شبیر کی مداحی میں چوتھی پشت تھی تو ان رئیسوں سے نمٹتے ہوئے بھی عمر گزری تھی۔ وہ منبر پر گئے تو چند رباعیاں سنانے کے بعد ایسے کلام کا انتخاب کیا جو ایسے رئیسوں کی رعونت پر خوب تنقید کرتا تھا۔

ابتدا سے ہم ضعیف و ناتواں پیدا ہوئے
اُڑ گیا جب رنگ رُخ سے استخواں پیدا ہوئے

پہلے ہی شعر پر رئیس مذکور کو جنبش ہوئی۔ دوسرا شعر شروع کرنے سے پہلے میر صاحب نے اس رئیس کو مخاطب کر کے فرمایا "سنیے، یہ آپ کے سننے کا شعر ہے۔"

نوبتِ جمشید و دارا و سکندر اب کہاں
خاک تک چھانی نہ قبروں کے نشاں پیدا ہوئے

پھر تیسرا شعر پڑھا۔

خاکساری نے دکھائیں رفعتوں پر رفعتیں
اس زمیں سے واہ واہ کیا آسماں پیدا ہوا

بس اب پورا رنگ جم چکا تھا۔ چوتھے شعر نے ساری مجلس کو بے تاب کر دیا۔

بود و نابود علی اصغر کا کیا کیجے بیاں
بے زباں دنیا سے اٹھے بے زباں پیدا ہوئے

رئیس اعظم کا جو حال ہوا سو ہوا۔ اس قصے کے ساتھ جب یہ سلام مجلس سے باہر پہنچا تو انیس کے کمال فن کے چرچے ہو گئے۔

پہلی مجلس کا داغ جلد ہی مٹ گیا۔ رؤسا کے شہر نے ایسی

قدر شناسی کی کہ ایک مرتبہ نواب تہور جنگ بہادر، میرانیس کو فینس میں سوار کرانے کے لیے دروازے تک تشریف لائے اور انیس کی جوتیاں اپنے ہاتھ سے اٹھا کر فینس میں رکھیں۔ انیس کو لکھنؤ یاد آگیا "بھئی، اب ہم چلیں گے۔"

رخصت کے وقت سرسالار جنگ نے سات ہزار اور نواب تہور جنگ نے تین ہزار روپے نذر کیے۔ آمدورفت کا خرچ الگ۔

○☆○

حیدر آباد کی مجلس میں میرانیس کو سننے کے لیے بوہری حضرات بمبئی سے تشریف لائے تھے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ انیس واپس جارہے ہیں تو ان کا ایک وفد انیس کی خدمت میں حاضر ہوا۔

"بمبئی یہاں سے قریب ہے۔ آپ بمبئی چلیں، وہاں مجلسوں کے پڑھنے سے ہم لوگ اتنا پیش کش حاضر کریں گے کہ حیدر آباد سے نمبر بڑھ جائے گا۔"

"آپ لوگ کتنا دیں گے؟" انیس نے کہا اور وہ سمجھے، انیس تیار ہوگئے۔

"دس ہزار تو کہیں نہیں گئے۔"

"آپ لوگ دس لاکھ بھی دیں تو بھی میں یہاں سے بمبئی نہیں جاؤں گا۔ اس واسطے کہ یہ بات ہی خلاف وضع ہے۔ وہاں لکھنؤ سے بلوایا جاؤں تو میرا کام یہی ہے یا پھر آپ نے لکھنؤ سے آتے وقت طے کرلیا ہوتا جیسا کہ الٰہ آباد والوں نے کیا تھا۔ ان سے طے ہے اس لیے واپسی میں الٰہ آباد جھانکتا جاؤں گا۔ آپ سے میرا ایسا کوئی وعدہ نہیں تھا۔"

اس وقت چند مقامی احباب بھی بیٹھے تھے جو اس گفتگو کو بڑے غور سے سن رہے تھے۔ انیس کے انکار کے بعد حیرت کی بھول بھلیوں میں گم ہوکر رہ گئے۔ کوئی ایسا بھی ہوسکتا ہے جو دس ہزار کی خطیر رقم محض اپنی وضع داری کو برقرار رکھنے کے لیے ٹھکرا دے اور ماتھے پر شکن تک نہ آئے۔

انیس کی سواری تمثّل بادبہاری حیدر آباد سے رخصت ہوئی اور وعدے کے مطابق وہ الٰہ آباد پہنچ گئے۔

انیس الٰہ آباد پہنچے تو جگہ جگہ اشتہار لگے ہوئے تھے۔ کالجوں میں ایک روز کی تعطیل کردی گئی تھی۔ تمام کچہریوں میں اہل عملہ کو شرکت مجلس کی اجازت دی گئی تھی۔

روز مقررہ پر ایک عالی شان مکان میں اس کثرت سے خلقت جمع تھی کہ اس سے پہلے کسی عام تقریب میں اتنے لوگ ایک جگہ جمع نہیں ہوئے تھے۔ سیکڑوں مشتاق دھوپ میں کھڑے محوِ سماعت تھے۔ پورے شہر میں سناٹا تھا۔ ہر آواز نے اس مکان کا رخ کرلیا تھا۔

انیس کا بڑھاپا تھا لیکن طرز بیان جوانوں کو مات کررہا تھا۔ جو دیکھتا تھا یہ محسوس کرتا تھا، ایک شخص منبر پر بیٹھا ہے اور جادو کررہا ہے۔ ہر شخص پر محویت طاری تھی۔ یہاں تک پہنچ کر دھوپ اور چھاؤں برابر ہوگئی تھیں۔ مرثیہ بھی ایسا شروع کیا تھا کہ بڑھاپے کے بوجھ سے جھکی ہوئی گردن آپ ہی آپ تن گئی تھی۔

نمک خوانِ تکلم ہے فصاحت میری
ناطقے بند ہیں سن سن کے بلاغت میری
رنگ اڑتے ہیں وہ رنگیں ہے عبارت میری
شور جس کا ہے وہ دریا ہے طبیعت میری
عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

ایک قطرے کو جو دوں بسط تو قلزم کردوں
بحرِ مواج فصاحت کا تلاطم کردوں
ماہ کو مہر کروں ذروں کو انجم کردوں
گنگ کو ماہر انداز تکلم کردوں
درد سر ہوتا ہے بے رنگ نہ فریاد کریں
بلبلیں مجھ سے گلستاں کا سبق یاد کریں

قلمِ فکر سے کھینچوں جو کسی بزم کا رنگ
شمع تصویر پہ گرنے لگیں آ آ کے پتنگ
صاف حیرت زدہ مانی ہو تو بہزاد ہو دنگ
خوں برستا نظر آئے جو دکھاؤں صفِ جنگ
رزم ایسی ہو کہ دل سب کے پھڑک جائیں ابھی
بجلیاں تیغوں کی آنکھوں میں چمک جائیں ابھی

دو گھنٹے سے زیادہ دیر تک پڑھتے رہے، مجال ہے جو آواز میں ضعف آیا ہو۔ یہ معلوم ہوتا تھا انیس یہاں ہیں ہی نہیں۔ طلسم شعر سے باہر آئے تو ہاتھوں ہاتھ منبر سے اتارے گئے پھر اتنی طاقت نہیں تھی کہ قدم بھی اٹھا سکیں۔

کون سی ہمت تھی کہ اس سفر کی صعوبت گوارا کرلی تھی۔ واپس آئے تو ہڈیوں کا ڈھیر تھے۔ اب کہیں جانے کی ہمت نہیں تھی۔

آقا انیس ہند میں کب تک پھرے تباہ
گھٹتی ہے عمر بڑھتے چلے جاتے ہیں گناہ
ضعف اس برس بہت ہے اجل آ نہ جائے آہ

بلوائیے غلام کو اے میرے بادشاہ
قربِ مزارِ شاہِ دو عالم نصیب ہو
بس کربلا میں اب کی محرم نصیب ہو

آنکھوں میں ایسا ضعف آگیا تھا کہ مرثیوں کے بند چوبی حرفوں میں لکھوائے جاتے تھے۔ اس پر بھی کبھی میر مونس، کبھی میر نفیس یا کوئی اور منبر کے پاس کھڑے رہتے تھے اور بتاتے جاتے تھے۔

یہ بزم اور آج کا پڑھنا ہے یادگار
رعشہ ہے دست وپا میں لرزتا ہے جسم زار
وہ یوں پڑھے جسے نہ ہو طاقت کلام کی
تائید ہے حسین علیہ السلام کی

اب انہیں اپنے مرنے کا یقین ہو چلا تھا۔ اس دور کے کلام میں وہ بار بار اس طرف اشارے کر رہے تھے کہ بس اب چل چلاؤ ہے۔

اس یقین کے ساتھ ہی انہیں یہ فکر ہونے لگی تھی کہ کلام یکجا ہو جائے۔

''میر نواب، ہم نے جتنا کچھ کہا ہے وہ سب محفوظ بھی رہے گا۔''

''بھیا، میں نے کوشش تو کی ہے لیکن آپ تو دریا ہیں کوئی کوزہ کیسے اسے بند کرے۔ ہاں ایک صاحب ہیں میر سلامت علی۔ انہیں آپ کا کلام جمع کرنے کا شوق ہے۔ جو تحریریں کسی کے پاس نہیں وہ ان کے پاس ہیں۔''

''اچھا! وہ تو بڑے دلچسپ آدمی ہوں گے۔ کبھی انہیں ہمارے پاس لے کر آؤ۔ دیکھیں تو ان کے پاس کیا کیا ہے۔''

اس میں کون سی قباحت تھی، سلامت علی دوسرے ہی دن پیش خدمت ہو گئے۔

''کیوں صاحب، میرا کلیات سب آپ نے جمع کر لیا ہو گا؟'' انیس نے دریافت کیا۔

''حتی الامکان میں نے کوشش بلیغ کی ہے۔''

''بھلا جناب عون و محمد کے حال کے کتنے مرثیے آپ کے پاس ہیں؟'' انیس نے پوچھا۔

میر سلامت علی نے مطلعے پڑھنے شروع کیے۔ دس پندرہ مطلعوں کے بعد میر انیس نے کہا ''اچھا اب آپ خاموش رہیں، میں مطلع پڑھتا ہوں، آپ اقرار کرتے جائیے۔''

میر سلامت علی حیرت سے منہ دیکھتے رہ گئے۔ انیس مطلعے پڑھ رہے تھے اور وہ کہتے جاتے تھے ''یہ مرثیے میرے پاس نہیں ہیں۔''

''بس، اسی تلاش پر تمہیں ناز ہے۔ بھائی کس پھیر میں پڑے ہو۔ واللہ انیس کو خود معلوم نہیں کہ اس کی تصنیف کی حد کیا ہے۔ مجھے گمان واثق ہے کہ فیض آباد سے لکھنؤ تک میری تصنیف عون و محمد کے حال کے مرثیے دو سو سے زیادہ ہوں گے۔ یہی حال دوسرے مضامین کا ہے۔ میری تصنیفات میں سے آدھی بھی میرے پاس نہیں۔ کسی کے پاس ہوں تو ہوں۔ میں نے کوئی کم لکھا ہے؟ اب تک یہ حال ہے۔''

فیضِ غمِ حسین سے ہوتے ہیں اے انیس
ہر سال ایک حال کے دفتر جُدا جُدا

یہی حال سلام اور رباعیات کا تھا۔ رباعیات کا شمار تو خیر ممکن ہی نہیں۔ یہ تو اُن کی باتیں تھیں جو وہ چلتے پھرتے کرتے تھے۔ زندگی میں کس نے کتنی کہیں، اس کا شمار کون کر سکتا ہے۔

اپنی ولادت ۱۸۰۱ء سے چل کر وہ ۱۸۷۴ء تک آگیا تھا۔ اس راہ میں اس نے لکھنؤ کا قتل ہوتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ اس کے پاؤں لہولہان تھے مگر وہ شرمندہ نہیں تھا۔ شاعر کی حیثیت سے کمالِ شاعری کو چھو لیا تھا۔ خودداری اور وضع داری کی ناقابلِ تقلید مثالیں چھوڑی تھیں۔ کامیاب زندگی گزاری تھی۔ اپنی اولاد کو ہر وہ سکھ دیا تھا جو میسر ہو سکتا ہے۔

بڑھاپے کا ضعف جوانی کے زور پر غالب آگیا۔ ۲۴ رمضان ۱۲۹۱ھ بمطابق ۱۸۷۴ء کو تپ اور درد سر میں مبتلا ہوئے پھر یوں لگا جیسے بہت سی بیماریاں ان کے اندر چھپی ہوئی تھیں لیکن حملہ کرتے ہوئے ڈرتی تھیں۔ تپ کی غفلت سے بے خبر دیکھ کر ٹوٹ پڑیں۔ ورمِ جگر کی شکایت لاحق ہوئی پھر اسہال اور دق کی شکایت ہو گئی۔

آخر ہے حیات کوچ کرتا ہوں میں
رخصت اے زندگانی مرتا ہوں میں
اللہ سے لو لگی ہوئی ہے میری
اوپر کے دم اس واسطے بھرتا ہوں میں

''مرزا دبیر آپ کی مزاج پرسی کو آئے ہیں۔'' میر مونس نے انیس کے کان میں کہا۔

انیس آنکھیں موندے لیٹے تھے، آواز پر آنکھیں کھول دیں۔

مرزا دبیر سراپا تاسف بنے کھڑے تھے۔ انیس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ انہوں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اٹھ نہیں سکے۔

''میر صاحب، کیا حال ہے؟''

انیس نے جواب میں فرمایا۔

آخر ہے عمر' زیست سے دل اپنا سیر ہے
پیمانہ بھر چکا ہے چھلکنے کی دیر ہے

دبیر صاحب کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

"مرزا صاحب۔" انیس کی کمزور آواز ابھری "میں آپ کے استقبال کے لیے اٹھ نہیں سکا۔ اسے میرا تکبر نہ سمجھئے گا۔"

"میر صاحب' آپ لیٹے رہیے۔"

"زمانہ ہمیں ایک دوسرے کے حریف کے طور پر یاد رکھے گا لیکن یہ تو میں جانتا ہوں کہ میرے دل میں آپ کا کیا مقام ہے۔"

"مجھے معلوم ہے میر صاحب' اس وقت ایسی باتوں میں نہ الجھیے۔ لڑنے والے لڑتے رہے لیکن ہم نے ایک دوسرے کا احترام ہی کیا۔"

"پھر بھی اگر مجھ سے کوئی زیادتی ہوئی ہو تو معاف کیجیے گا۔"

دبیر نے فرطِ عقیدت سے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا "آپ بھی مجھے معاف کیجیے گا۔"

۲۹ شوال ۱۲۹۱ھ بمطابق ۱۰ دسمبر ۱۸۷۴ء بروز سہ شنبہ قریب مغرب آسمانِ شاعری کا یہ آفتاب غروب ہو گیا۔

مرزا دبیر حضرت عباس کے حال میں مرثیہ تحریر کر رہے تھے۔ یہ مرثیہ نصف ہو چکا تھا لیکن انیس کے انتقال کی خبر وحشت اثر پہنچی۔

"دبیر' یہ تیرا آخری مرثیہ ہے۔" بے اختیار ان کی زبان سے نکلا۔ آنسوؤں نے حشر اٹھایا۔۔۔ روتے ہوئے چوبداری محلے کی طرف چل دیے۔

سوم کی مجلس میر باقر سوداگر کے امام باڑے واقع جوہری محلے میں منعقد ہوئی۔ مرزا دبیر نے مجلس پڑھی۔ ایک دردناک تاریخ لکھی اور "حریف" ہونے کا حق ادا کر دیا۔ مرزا تاریخ کے اشعار پڑھتے جاتے تھے اور آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔

در سنین عیسوی تاریخ گفتم صاف صاف
گرچہ طبعم بود محزون و مکدر بے انیس
آسماں بے ماہِ کامل سدرہ بے روح الامیں
طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس

۱۲۹۱ھ

اللہ اللہ کیا لوگ تھے۔ گلا کاٹ لو ایسی خودداریوں اور وضع داریوں پر۔ دبیر نے جو کہا تھا وہ کر کے دکھایا۔ انیس کے بعد کوئی مرثیہ نہیں لکھا۔ جو مرثیہ ادھورا تھا وہ ادھورا ہی رہا اور صرف تین مہینے بعد ۲۹ محرم کو خود بھی انتقال کر گئے۔ دنیا نے یہی کہا کہ دبیر نے انیس کے غم میں انتقال کیا۔ اب ایسے دوست بھی نہیں ملتے' حریف کیا ملیں گے۔

مرزا دبیر کی وفات پر منشی محمد مرزا جان نے جو تاریخ کہی اس میں کمال کر دیا۔ ایک ہی مصرع سے انیس اور دبیر دونوں کی تاریخ نکالی۔

فلک کے یاد رہیں گے ہمیں یہ جور و ستم
کہ ایک رنج سے ہے رنج دوسرا توام
لکھی فلک کی شکایت میں اس طرح تاریخ
غم انیس میں ہے ہے' دیا دبیر کا غم

۱۲۹۱ھ ۱۲۹۲ھ

انیس کی موت کا دکھ تو ایسا تھا کہ لکھنؤ سوگ میں ڈوب گیا لیکن میر مونس کی تو دنیا ہی اجڑ گئی۔ زندگی بھر جس طرح وہ انیس کی انگلی تھام کر چلتے رہے وہ دنیا نے دیکھا تھا۔ وہ انگلی چھوٹ گئی تو مونس بے سہارا ہو گئے۔ محبت جس کمال کی تھی' دکھ بھی اسی شدت کا ہوا۔ ان کا جذبۂ عشق یہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھا کہ انیس اب اس دنیا میں نہیں رہے۔

سوئم کے بعد بھاگتے ہوئے انیس کے دروازے پر پہنچے اور جب بھیا کی پکار پر انیس باہر نہیں آئے تو دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔

اس کے بعد سے روز کا معمول بن گیا کہ وقتِ معینہ پر انیس کے دروازے پر جاتے اور مکان کو دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتے۔

ابھی چھ مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ یہ روز کا آنا جانا کھلنے لگا۔ ان کی آواز پر انیس گھر سے نہیں نکلے تو وہ انیس کے پاس پہنچ گئے۔

انیس کے غم میں صرف چھ مہینے بعد ان کا بھی انتقال ہو گیا۔

خود نوید زندگی لائی قضا میرے لیے
شمع کشتہ ہوں فنا میں ہے بقا میرے لیے

انیس کے آخری سلام کا یہ شعر آج بھی ان کے مزار پر کندہ ہے۔

شمس العلماء میر حسن

استادِ اقبال

تحقیق و تحریر: ڈاکٹر ساجد امجد

اس بار جس ہستی کا فسانہ ان صفحات کی زینت بن رہا ہے اس کی تعریف اور تعارف میں اتنا ہی لکھ دینا کافی ہے کہ اسے شاعرِ مشرق اور مفکر بے مثل علامہ اقبال کا استاد ہونے کا شرف حاصل ہے .... تاہم اس استاد کی زندگی کیسی تھی اور کیوں کر گزری اس کا احوال ادب پرستوں اور قارئین سرگزشت کے لیے خصوصی طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔

دنیائے علم و حکمت کے درخشاں ستارے میر حسن کے حالاتِ زندگی

انیسویں صدی کے شروع کی دہائیاں تھیں۔

سیالکوٹ کی چوڑی سڑکوں کے دونوں اطراف کھلی دکانیں، گاہکوں کا انتظار کر رہی تھیں۔ ابھی دن چڑھا نہیں تھا اس لیے چہل پہل کم تھی۔ سید میر محمد شاہ نماز اشراق اور اوراد و وظائف وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد سودا سلف لینے کے لیے گلی سے نکلے اور چوڑی سڑک پر آ گئے۔ یہی ان کا روز کا معمول تھا۔ مختلف دکانوں سے ہوتے ہوئے ایک دکان پر پہنچے۔ دکان دار شناسا تھا کہ انہیں دیکھتے ہی نیم قد کھڑا ہو گیا اور بڑے ادب سے دریافت کیا، سرکار کو کیا پیش کروں؟

”بھائی، آج مسور کی دال کو جی چاہ رہا ہے، وہی تول دو۔“

”سرکار، کتنی؟“

”ایک پاؤ ٹھیک رہے گی، آدمی ہی کتنے ہیں۔“

”ابھی لیجیے بزرگو!“

دکان دار نے دال تول دی۔ دو ایک چیزیں اور خریدنی تھیں۔ سید صاحب نے سودا تھیلے میں دھرا اور گھر کی طرف چل دیے۔ میانہ روی سے چلتے ہوئے گھر تک پہنچ گئے۔ سودے کا تھیلا اپنی بیوی عطر نشاں کے حوالے کیا اور خود باہر جانے کے لیے تیار ہونے لگے۔ وہ عربی، فارسی کے عالم و فاضل تھے اور روزی کمانے کے لیے طبابت کے پیشے کو اپنائے ہوئے تھے۔ طبابت ان کا خاندانی پیشہ تھا جسے سید میر محمد شاہ نے بھی قائم رکھا ہوا تھا۔ زہد و تقویٰ بھی آبائی ورثہ تھا لہٰذا ان کا مطب خدمت خلق کی دکان تھی۔ صرف اتنا کما لینا جائز سمجھتے تھے کہ عزت کی روٹی کما سکیں اور سفید پوشی کا بھرم قائم رہ سکے۔ مطب کو دیر ہو رہی تھی لہٰذا جلدی جلدی تیار ہوئے، چمڑے کے قصوری چپل پاؤں میں ڈالے اور کمرے سے صحن میں آ گئے۔ اس وقت عطر نشاں کی آواز نے ان کے قدم پکڑ لیے۔

”ادھر تو آیئے۔ دیکھیے دال میں سے یہ ایک پیسا بھی نکلا ہے۔“

”دال میں کالا یا دال میں کنکر تو سنا تھا۔ یہ پیسے کہاں سے نکلنے لگے؟“ انہوں نے وہیں کھڑے کھڑے کہا۔

”آپ ہی کی جیب سے گرا ہوگا۔“

”میری جیب کا پیسا دال میں کہاں سے آ گیا؟“ انہوں نے بیوی کے قریب پہنچتے ہوئے کہا۔

”یہ لیجیے، جیب میں ڈال لیجیے۔“

”بھائی، میرا ہو تو جیب میں ڈالوں۔ یہ دکان دار کا سکہ ہے، اس کو واپس کرنا ہوگا۔“

”مطب سے واپسی پر واپس کرتے آیئے گا۔“

”اس وقت تک تو بہت دیر ہو جائے گی۔ یہ کسی کا حق ہے، میری جیب میں انگارا بن کر جلتا رہے گا۔ اسے ابھی واپس کرنا ہوگا۔“

سید صاحب نے سکہ بیوی کے ہاتھ سے لیا، بیوی کو خدا کی امان میں دیا اور پاؤں گھر سے باہر ڈال دیا۔

انہیں جلدی تھی لیکن میانہ روی اب بھی نہیں چھوڑی تھی کیونکہ ان کے نزدیک تیز تیز چلنا شرفا کا شیوہ نہیں۔ اب بازار میں آمد و رفت بڑھ گئی تھی اس لیے جگہ جگہ انہیں مصافحے کے لیے رکنا بھی پڑ رہا تھا۔ وہ دکان پر پہنچے تو دکان دار گاہکوں

میں مصروف تھا۔ سید صاحب پر نگاہ پڑی تو وہ ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''شاہ صاحب، کوئی چیز لے جانے کو رہ گئی جو واپس آنا پڑا؟''

''تمہارا حق تھا جو میرے ساتھ چلا گیا تھا' وہی لوٹانے آیا ہوں۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں شاہ جی!''

''بھائی' ابھی جو میں تم سے دال لے گیا تھا' اس میں سے یہ سکہ نکلا ہے۔''

''یہ دال کے ساتھ چلا گیا' اس پر میرا کیا حق!''

''نہیں بھائی' اس پر تمہارا حق ہے یہ تم رکھ لو۔ میرا حق یہ ہے کہ اس کے وزن کے برابر مجھے دال دے دو۔''

''شاہ جی' یہی تو آپ کی باتیں ہیں' جو دنیا آپ کی عزت کرتی ہے۔''

''عزت' ذلت دینے والا تو اوپر بیٹھا ہے۔''

انہوں نے اپنے حصے کی دال لی اور ان چند دانوں کو گھر پہنچاتے ہوئے مطب پہنچ گئے۔ شاگردوں نے مطب کھول لیا تھا۔ شاہ صاحب نے ان سے دیر ہو جانے کی معذرت کی اور پھر اس مریض سے معذرت کی جو بڑی دیر سے ان کے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔

''میں تو مفت کا مریض ہوں شاہ جی! نسخے تک کے تو پیسے آپ مجھ سے لیتے نہیں ہیں۔ میں نے اگر کچھ دیر انتظار کر لیا تو آپ مجھ سے معافی کیوں مانگتے ہیں؟''

''میں اگر تم سے پیسے نہیں لیتا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ انتظار کراؤں۔''

''شاہ صاحب' آپ ہی لوگوں کے دم سے دنیا قائم ہے۔''

''اللہ جس سے جو کام لے۔'' سید صاحب نے کہا اور اس مریض کو دیکھنے کے بعد دیگر کاموں میں مشغول ہو گئے۔

ظہر کی نماز ادا کرنے کے بعد مسجد سے مطب آئے اور قیلولہ کرنے کے لیے لیٹے تو انہیں یاد آیا کہ فیروز والا سے مہمان آ چکے ہوں گے۔ انہیں یہ بھی یاد آیا کہ وہ لوگ اس کی بیوی کو فیروز والا لے جانے کے لیے آئے ہیں۔ خاندانی روایت کے مطابق پہلے بچے کی ولادت میکے میں ہوتی تھی۔

عطر نشاں کے ہاں ولادت متوقع تھی اس لیے انہیں فیروز والا جانا تھا جہاں ان کا میکا تھا۔

انہیں معلوم تھا کہ مہمان آ چکے ہوں گے لیکن وقت سے پہلے مطب بند کر دینا قاعدے کے خلاف تھا۔ وہ عصر کی نماز تک مطب پر رہے۔ مغرب کی نماز وہ محلے کی مسجد میں ادا کرتے تھے۔ اس لیے مغرب سے پہلے مطب بند کر دیا کرتے تھے۔ وقت مقررہ پر مطب بند کیا اور گھر جانے سے پہلے مسجد پہنچ گئے۔ روز کا یہی قاعدہ تھا۔ نماز ادا کی اور بوجھل قدموں سے گھر کی طرف چل دیے۔ انہیں رہ رہ کر یہ دکھ ہو رہا تھا کہ کل عطر نشاں اپنے میکے چلی جائے گی۔ گھر پہنچے تو انہیں اداسی کا چغہ اتار کر پھینکنا پڑا۔ سسرالی رشتے دار تھے' انہیں خوش رکھنا ان کی ذمے داری تھی۔ رات دیر گئے تک باتیں ہوتی رہیں۔ صبح ہوئی تو وہ مطب کے لیے روانہ ہو گئے اور عطر نشاں فیروز والا چلی گئیں جہاں سے انہیں زچگی کے بعد واپس آنا تھا۔

مطب پہنچ کر بھی وہ بہت دیر تک خیالوں میں الجھے رہے۔ پھر یہ سوچ کر اداسی دور بھی ہو گئی کہ عطر نشاں جب واپس آئے گی تو ایک تحفہ بھی ساتھ لائے گی۔ بیٹی ہو یا بیٹا' خدا کی کتنی بڑی نعمت اس کے ساتھ ہو گی۔ یہ خیال ان کی سرشاری کے لیے بہت تھا۔

☆☆☆

سید میر محمد شاہ کی راستی و پاکبازی ان کی فطرت میں یوں ہی جگہ نہیں پا گئی تھی بلکہ یہ اس خون کا اثر تھا جو ان کی رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ ان کا نسب حضرت امام حسینؓ کے صاحبزادے حضرت امام زین العابدینؒ سے جا ملتا تھا۔

سید صاحب کے آباؤ اجداد میں سے سید عارض نامی ایک بزرگ شیراز میں مستقل طور پر رہائش پذیر ہو گئے تھے۔ عرصہ دراز کے بعد اسی خاندان کے ایک بزرگ سید شیر علی مغل بادشاہ ہمایوں کے ساتھ ہندوستان میں داخل ہوئے۔ ان بزرگ کے ایک بیٹے سید شاہ شمس نے خوشاب میں سکونت اختیار کی۔ شاہ شمس کے لڑکے سید محمد شاہ پور میں آباد ہو گئے اور تبلیغ اسلام میں عمر گزار دی۔ سید محمد کے پانچ صاحبزادے ہوئے۔ ان میں سے ایک شاہ کبیر تھے۔ ان کی چھٹی پشت میں سید میر مہدی ہوئے۔ ان کے پوتے سید میر قاسم تھے جو میر محمد شاہ کے دادا تھے۔ سید میر قاسم کے والد سید شاہ سلطان اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں سیالکوٹ میں مستقل طور پر رہنے لگے تھے۔

سیالکوٹ کی سرزمین کئی صدیوں سے خداشناس لوگوں کا مرکز چلی آ رہی تھی۔ شاہ سلطان کو یہی کشش سیالکوٹ کھینچ لائی تھی۔ بزرگ موصوف اور ان کے دونوں بیٹوں نے یہاں کی قدیم روایات کو قائم رکھتے ہوئے درس و تدریس کے مشغلے کو اپنایا اور طبابت کو بہ طور پیشہ اپنا کر خلق خدا کی خدمت میں مصروف ہو گئے۔

سید میر محمد شاہ نے اپنے خاندان کی اس روایت کو تسلسل دیا۔ درس و تدریس کو شغل اور طبابت کو پیشہ بنا کر زندگی کے دن گزارنے لگے۔ ان کی یہ ثابت قدمی ان کے ضمیر کو بھی مطمئن کر رہی تھی اور ان کے احترام میں بھی اضافہ کر رہی تھی۔

☆☆☆

وہ اس روز مطب پر تھے کہ فیروز والا سے اطلاع آئی' وہ ایک بیٹے کے باپ بن گئے تھے۔ اب وہ اپنے بیٹے کو دیکھے بغیر نہیں رہ سکتے تھے لیکن مصیبت یہ تھی کہ مطب بند کرنا پڑتا اور یہ انہیں کسی قیمت پر گوارا نہیں تھا۔ انہیں جدائی کے یہ دن جیسے تیسے گزارنے پڑے۔

سوا مہینے بعد جب عطر نشاں سیالکوٹ آئیں تو ان کی گود میں ایک خوبصورت بچہ بھی تھا۔ اس کے چہرے پر خاندانی وقار ابھی سے نظر آ رہا تھا۔ چوڑی پیشانی' خوش قسمتی کی علامت تھی۔ باپ نے گود میں لیا تو اتارنے کو جی نہ چاہا۔

''بھئی اس کا نام بھی رکھ کر آئی ہو؟''

''نام تو بہت سے تجویز ہوئے تھے لیکن پھر سب نے یہی کہا کہ یہ تو آپ کا حق ہے۔ اب آپ ہی کوئی نام رکھیے۔''

''اچھا تو پھر سوچنا پڑے گا۔'' انہوں نے کہا اور بچے کو بستر پر لٹا دیا۔

''ابھی تک آپ نے نام بھی نہیں سوچا؟''

''سوچنا کیا ہے۔ یہ میرا امیر حسن ہے' سید میر حسن۔''

یہ گفت و شنید ہو ہی رہی تھی کہ میر محمد شاہ کے دونوں بھائی میر نعمت اللہ اور میر فیض اللہ بھی آ گئے۔ انہیں بھی یہ نام بتایا گیا۔ انہوں نے بھی پسند کیا البتہ میر فیض اللہ نے تاریخی نام کا بھی تقاضا کیا۔

''بچے کا تاریخی نام بھی ہونا چاہیے تاکہ تاریخ ولادت [illegible]در ہے۔''

''رونق بخش سے سال ولادت نکل آتا ہے۔''

''اسے کسی جگہ لکھ لو۔ بولنے میں تو آئے گا نہیں' ایسا نہ ہو بعد میں بھول جاؤ۔''

میر محمد شاہ نے اسی وقت اس نام کو کاپی پر لکھ لیا۔ میر فیض اللہ کا بڑا بیٹا میر حسام الدین جس کی عمر پانچ سال تھی' کھیلتا ہوا آیا اور بستر پر بیٹھ کر میر حسن سے کھیلنے لگا۔

''کیسا لگا تمہیں تمہارا چھوٹا بھائی؟''

''بہت اچھا...... اس کا نام کیا ہے؟''

''میر حسن......!''

''مجھے تو یہ نام بھی بہت اچھا لگا۔ یہ بڑا ہو جائے گا تو میں اس کے ساتھ کھیلا کروں گا۔''

''تم تو اب بھی کھیل سکتے ہو مگر یہ تمہارے ساتھ اس وقت کھیلے گا جب یہ بڑا ہو جائے گا۔''

گھر میں غربت کا راج تھا۔ گنی چنی آمدنی تھی اور پھر سادگی مزاج میں تھی۔ بڑے پیمانے پر خوشی کی کوئی تقریب نہیں ہو سکتی تھی لیکن پھر بھی خاندان کی عورتوں نے رسم و رواج کے نام پر خوب ہنگامہ گرم کیا۔

یہ ہنگامے کب تک ہوتے' آہستہ آہستہ زندگی اپنی سابقہ روش پر آ گئی۔ صبح نماز فجر کے لیے مسجد تشریف لے جاتے۔ واپس آ کر اوراد و وظائف میں مشغول ہو جاتے اور پھر سودا سلف لانے کے لیے بازار نکل جاتے۔ دن بھر مطب میں گزارتے۔ یہیں بچوں کو تعلیم بھی دیتے۔ شام کے وقت احباب ملاقات کے لیے آ جاتے۔ یہ ملاقاتیں رات کے کھانے تک جاری رہتیں۔ اس دوران میں آپ تھوڑی تھوڑی دیر بعد زنان خانے میں تشریف لاتے اور میر حسن کو دیکھ کر دوبارہ مردانے میں چلے جاتے۔

☆☆☆

جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا' میر حسن کی ذہانت کے آثار ظاہر ہوتے جا رہے تھے۔ وہ عام بچوں سے مختلف ثابت ہو رہا تھا۔ جس بات کو ایک مرتبہ سن لیتا' ہمیشہ یاد رکھتا۔ اس کی پرورش جس گھر میں ہو رہی تھی' روشنی کا ایک مینار تھا' یہ روشنی کا مینار دوسرے گھروں کو بھی علم کی روشنی سے منور کر رہا تھا۔ اس کے والد عربی فارسی کے عالم تھے' قرآن و حدیث پر گہری نظر رکھتے تھے۔ گھر کا ماحول مذہبی تھا۔ یہ اثرات بھی اس کے ذہن کو جلا بخشنے کے لیے بہت تھے۔ جب اس کی تعلیم کا آغاز بھی نہیں ہوا تھا' ماں کے ساتھ نماز کے لیے کھڑا ہوتا تو والدین کے دل باغ باغ ہو جاتے۔

یہ وہ گھرانا نہیں تھا جس پر ''چراغ تلے اندھیرا'' کی مثال صادق آتی ہے بلکہ یہ گھرانا تو ''ایں ہمہ خانہ آفتاب است'' کا آئینہ دار تھا۔ اس بچے کو اپنے بزرگوں کا جانشین ہونا تھا لہٰذا جب وہ پڑھنے کی عمر کو پہنچا تو والد نے ابتدائی تعلیم خود دینے کا فیصلہ کیا۔ وقت کے رواج کے مطابق قرآن پاک کی تعلیم سے آغاز ہوا۔ حروف کی شناخت کی تعلیم چند دنوں ہی میں ختم ہو گئی۔ حروف کو پہچاننے میں اس نے غیر معمولی صلاحیت کا مظاہرہ کیا۔ عام بچے ''قاعدہ'' پڑھنے میں کئی کئی مہینے صرف کر دیتے ہیں لیکن وہ بہت جلد قرآن پاک کا درس لینے لگا اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ایک دن کا سبق

دوسرے دن یاد نہ ہو بلکہ ایک روز تو اس نے سب کو حیرت میں ڈال دیا۔ ایک روز اس کے والد نے قرآن پاک کا درس دیا۔ بعد میں سنانے کے لیے کہا گیا تو بچے نے عجیب بات کہی۔

''پڑھ کر سناؤں یا زبانی سناؤں؟''

میر محمد شاہ کسی خیال میں گم تھے' اچانک چونک پڑے۔ بے یقینی سے بیٹے کی طرف دیکھا اور زبانی سنانے کی فرمائش کی۔ میر حسن نے زیر زبر کی غلطی کیے بغیر تمام سبق فرفر سنا دیا۔ اب باپ کی طرف سے حکم ملا کہ آیندہ سبق زبانی سنایا کرو۔ دراصل وہ یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ یہ سبق اتفاقیہ یاد ہو گیا ہے یا وہ آیندہ بھی اس پر کاربند رہتا ہے لیکن جب اس نے دوسرے دن بھی اور پھر تیسرے دن بھی سبق زبانی سنایا تو اس کی ذہنی صلاحیتوں کا اندازہ لگانا مشکل نہ رہا۔ بڑوں کی طرف سے فیصلہ ہوا کہ اسے حافظ قرآن بنائیں گے۔ وہ ناظرہ پڑھنے کے بجائے قرآن حفظ کرنے میں مشغول ہو گیا۔ حفظ قرآن کے بعد جو وقت بچ رہتا اس میں فارسی کی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

سیالکوٹ پڑھے لکھوں کا شہر سمجھا جاتا تھا۔ پنجاب کے دوسرے ضلعوں کی نسبت یہ ضلع بہت آگے تھا۔ میر حسن کا گھرانا بھی علما و فضلا سے بھرا پڑا تھا' پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ صرف قرآن پاک حفظ کرنے اور ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کر لینے پر اکتفا کر لیتا۔ اس نے بھی دوسرے بچوں کی طرح اسکول جانے کی ضد شروع کر دی۔ اس ننھے حافظ قرآن کو سیالکوٹ کے ضلع اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ سیالکوٹ کے پڑھے لکھے طبقے نے خود اس درس گاہ کو قائم کیا تھا اور یہاں آٹھویں تک تعلیم دی جاتی تھی۔ عربی اور فارسی زبان و ادب پر دسترس حاصل کرنا علمیت کی دلیل تھا اور یہ اسکول اس لحاظ سے خاص اہمیت رکھتا تھا۔ تمام شہر کے شرفا کے بچے اسی اسکول میں زیر تعلیم تھے۔

وہ دن یادگار تھا جب میر حسن دوسرے رشتے دار بچوں کے ساتھ مل کر ضلع اسکول پہنچا اور نہایت سنجیدگی سے زمین پر بچھی چٹائی پر بیٹھ کر مولوی صاحب کے چہرے کو تکنے لگا جو اس جماعت کو پڑھانے کے لیے آئے تھے۔ انہوں نے پر اشتیاق نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور پڑھانے میں مشغول ہو گئے۔

وہ جو کچھ پڑھا رہے تھے' میر حسن وہ پہلے ہی پڑھ چکا تھا۔ اس کے باوجود وہ اکتایا ہوا نہیں تھا۔ اس کا شوق اسے مجبور کر رہا تھا کہ وہ مولوی صاحب کی باتوں کو غور سے سنتا رہے۔ وہ پلک جھپکے بغیر مولوی صاحب کی باتیں سن رہا تھا۔ دوسرے چپکے چپکے باتیں کر رہے تھے مگر وہ ان سب سے بے نیاز سراپا نیاز بنا بیٹھا تھا۔

مولوی صاحب نے اپنے طریقہ تدریس کے مطابق بچوں سے سوال پوچھنے شروع کیے۔ بچے بغلیں جھانکنے لگے۔ بعض بچوں نے الٹے سیدھے جواب دینے کی کوشش کی اور پھر مولوی صاحب کی نگاہیں میر حسن پر جم گئیں۔ انہوں نے سوال کیا اور میر حسن نے نہایت اعتماد کے ساتھ تشفی بخش جواب دے دیا۔ مولوی صاحب نے دوسرا سوال کیا۔ اس کا جواب بھی حاضر تھا۔ تعجب کی روشنی مولوی صاحب کے چہرے پر صاف نظر آ رہی تھی۔ انہوں نے اسے اپنے پاس بلایا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟''

''سید میر حسن۔''

''کس کے بیٹے ہو؟''

''میرے والد حکیم سید میر محمد شاہ ہیں۔''

''تم میر محمد شاہ کے بیٹے ہو؟''

''جی مولوی صاحب!''

''اسی لیے تو ایسے ہو۔'' انہوں نے میر حسن سے کہا اور پھر دوسرے لڑکوں سے مخاطب ہوئے ''کم بختو! دیکھو! میر حسن آج ہی اسکول آیا ہے اور پورا سبق اسے یاد ہو گیا۔ صرف اس لیے کہ اس نے میری باتیں غور سے سنی ہیں۔ تم بھی سن لیتے تو شرمندہ نہ ہونا پڑتا۔''

''مولوی صاحب! یہ بات نہیں۔'' میر حسن نے کہا ''ان بچوں کے لیے یہ سبق آج ہی پڑھا ہے اس لیے ازبر نہ ہو سکا۔ میں گھر پر پڑھ چکا ہوں۔ میں نے تو اسے آج دہرایا ہے۔''

''ماشاء اللہ! سچ بولنا بھی تمہاری خاندانی روایت ہے۔ اسی طرح سچ بولتے رہنا۔ اور ہاں' کل سے اگلی صف میں بیٹھنا۔ جاؤ اب اپنی جگہ بیٹھ جاؤ۔''

میر حسن نہایت متانت سے چلتا ہوا آیا اور اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ دوسرے بچے اس کی طرف رشک سے دیکھ رہے تھے مگر وہ سب سے بے نیاز سراپا نیاز بنا بیٹھا تھا جیسے کہہ رہا ہو' اب جتنے سبق پڑھائے جائیں گے' اسی طرح دوسروں کو حیران کرتا رہوں گا۔''

اسکول کی چھٹی ہوئی اور وہ گھر پہنچا تو اس کی ماں دروازے پر اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ یہ پہلا دن تھا جب ان کا بیٹا اتنی دیر ان سے جدا رہا تھا۔ بیٹے کو دیکھتے ہی ان کی

آنکھیں بھیگ گئیں۔ یہ خوشی کے آنسو تھے جوان کی آنکھوں سے نکل آئے تھے۔ ان کا بیٹا پہلی مرتبہ اسکول گیا تھا۔

میر محمد شاہ مطب سے گھر آئے، شام ہوئی اور چراغ جلا تو میر حسن کی طلبی ہوئی۔ اسکول کا احوال پوچھا گیا اور پھر وہ سبق پڑھایا گیا جو اسے دوسرے دن اسکول میں پڑھنا تھا۔ ماں کے بستر پر لیٹ کر اس نے بلند آواز میں چھ کلمے پڑھے اور آنکھیں بند کر کے سو گیا۔

اس کے والدین تہجد کی نماز کے لیے بیدار ہوئے تو حسب معمول وہ بھی آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔ وضو کیا اور اپنے مصلے پر کھڑا ہو گیا۔ تہجد کی نماز ادا کی اور پھر بستر پر چلا گیا۔

میر محمد شاہ اوراد و وظائف میں مشغول تھے کہ مسجد سے اذان فجر بلند ہوئی۔ انہوں نے پہلے عطر نشاں کو اٹھایا اور پھر میر حسن کو آواز دی۔ وہ پہلی آواز پر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں باپ بیٹوں نے ایک مرتبہ پھر وضو کیا اور مسجد جانے کے لیے گھر سے نکل گئے۔

میر حسن دوسرے دن اسکول گیا تو بچوں میں اس کی مقبولیت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ بچوں نے اسے گھیر لیا۔ سب کی زبان پر ایک ہی سوال تھا کہ وہ اتنی جلدی سبق کیسے یاد کر لیتا ہے۔ وہ ہنس ہنس کر بچوں کو مطمئن کر رہا تھا اور انہیں سبق یاد کرنے کے گر سکھا رہا تھا۔ گویا آئندہ کا استاد تھا جو ابھی طالب علمی کے مراحل سے گزر رہا تھا۔

اس کے گھر کا ماحول اپنی جگہ لیکن وہ خود اتنا ذہین واقع ہوا تھا کہ اسکول میں داخل ہونے کے بعد بہت جلد نصابی کتب پر عبور حاصل کرنے لگا۔ اسی اعزاز کے ساتھ وہ مستقل آگے بڑھتا رہا۔

1856ء لاہور اور سیالکوٹ کے عوام کی تعلیم سے محبت اور لگاؤ کی بنا پر پنجاب میں سررشتہ تعلیم قائم ہوا۔ بڑے بڑے شہروں میں ضلع اسکول کے نام سے تعلیمی ادارے کھولے گئے۔ ہر جگہ ایک بہار سی آ گئی۔ خوشی کی لہر سی دوڑ گئی۔ میر حسن جس ضلع اسکول میں پڑھتا تھا اسے بھی حکومت نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ اسکول کا معیار مزید بلند ہو گیا۔ میر حسن نے اس تبدیلی کو بڑی خوشی سے قبول کیا اور مزید محنت سے پڑھنا شروع کر دیا۔

1861ء کا سال میر حسن کے گھر والوں کے لیے بڑا مبارک ثابت ہوا۔ میر حسن نے آٹھویں جماعت کا امتحان اعلیٰ نمبروں سے پاس کر لیا۔ خاص طور پر فارسی زبان وادب میں نمایاں پوزیشن حاصل کی۔

سوانحی خاکہ

نام:	سید میر حسن
خطاب:	شمس العلما
والد:	سید پیر محمد شاہ
والدہ:	عطر نشاں
زوجہ:	۱) سعدیہ بیگم ۲) برکت بی بی
لڑکے:	سید علی نقی سید محمد تقی سید محمد ذکی
لڑکیاں:	زیب النسا فیض بیگم چراغ بیگم رابعہ بیگم
ملازمت:	ضلع اسکول سیالکوٹ اسکاچ مشن اسکول اسکاچ مشن کالج
وطن:	سیالکوٹ
تاریخ پیدائش:	18 اپریل 1844ء
وفات:	25 ستمبر 1929ء
تدفین:	سیالکوٹ

اس کی علمی قابلیت، اسکول کے معیار سے کہیں بلند تھی۔ اس میں اتنی صلاحیت بھی تھی کہ بڑی آسانی سے ذخیرۂ علم میں اضافہ کر سکتا تھا لیکن اب وہ بچہ نہیں رہا تھا کہ کتابیں کھول کر باپ کے سامنے بیٹھ جاتا۔ وہ کسی ایسی شخصیت کی تلاش میں تھا جو اس کے پیمانۂ علم کو لبریز کر سکے۔ گھر کی مذہبی فضا نے اسے اسلام کا شیدائی بنا دیا تھا۔ بچپن ہی میں اللہ تعالیٰ کا کلام حفظ کر لیا تھا۔ چھوٹی سی عمر ہی میں پانچ وقت کی نماز باقاعدگی سے پڑھنے کا عادی ہو گیا تھا۔ تہجد بھی باقاعدگی سے پڑھتا تھا۔ اس کے اس مزاج نے اسے مجبور کیا کہ وہ کسی ایسے عالم کو تلاش کرے جو اسے مذہبی تعلیم سے سرفراز کر سکے۔

☆☆☆

امیر تیمور کے زمانے میں ایک شخص مخدوم عمر 1398ء میں تیمور کے ساتھ ہندوستان آیا اور عہدۂ قضاۃ پر فائز ہوا۔ مخدوم عمر کا سلسلہ نسب حضرت ابوبکر صدیقؓ سے جا ملتا تھا۔ مغلیہ دور میں مخدوم عمر کی اولاد مختلف مقامات پر قضاۃ کے

فرائض انجام دیتی رہی۔

مخدوم عمر کی پشت سے ایک شخص قطب الدین، سکھ عہد میں بن باجوہ نامی گاؤں میں آ کر آباد ہوا۔ 1820ء میں اس کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا، جس کا نام اس نے شیر محمد رکھا۔

قطب الدین حکمت کرتے تھے لہٰذا انہوں نے اپنے بیٹے کو بھی دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ حکمت کی تعلیم سے آراستہ کیا۔ شیر محمد حکمت کے ساتھ ساتھ کتابت بھی کرتے تھے اور کاغذ لینے کے لیے اکثر سیالکوٹ آیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جب وہ کاغذ لینے کے لیے سیالکوٹ آئے ہوئے تھے تو مرمت شدہ مسجد ''دو دروازہ'' کی امامت کا قرعہ ان کے نام پڑا اور وہ اس مسجد کے امام مقرر ہو گئے۔ مولانا شیر محمد نے سیالکوٹ کو مستقر بنا لیا۔ کچھ دنوں بعد وہ پانچ وقت کی نماز کے علاوہ مسلمان بچوں کو قرآن و حدیث کی تعلیم بھی دینے لگے۔ ان کا طریقہ درس ایسا دل نشیں تھا کہ ان کی شہرت بہت جلد خوشبو کی طرح پھیلنے لگی۔

میر حسن اسکول کی تعلیم سے فارغ ہوئے اور کسی علمی مرکز کی تلاش ہوئی تو انہوں نے بھی مولانا شیر محمد کی خدمت میں حاضری دی۔ شیر محمد اس روز حسب معمول حدیث کا درس دے رہے تھے کہ میر حسن ان سے ملاقات کے متمنی ہوئے۔ درس سے فارغ ہونے کے بعد مولانا شیر محمد نے اپنی توجہ ان کی جانب مبذول کی۔

''برخوردار! کہو کیسے آنا ہوا؟''

''پیاسا، کنویں کے پاس کیوں آتا ہے''

''ظاہر ہے پیاس بجھانے۔'' مولانا شیر محمد نے کہا ''لیکن پانی کو کنویں سے باہر نکالنا بھی تو ضروری ہوتا ہے۔''

''اسی لیے تو آیا ہوں۔''

''ڈول اور رسی ساتھ لائے ہو؟''

''میں نے ضلع اسکول سے آٹھویں پاس کی ہے۔''

''ان اسکولوں کی پڑھائی میں کیا رکھا ہے؟''

''میں نے اپنے والد سے بھی کچھ کتابیں پڑھی ہیں۔''

''کون ہیں تمہارے والد؟''

''سید میر محمد شاہ!''

''تم سید شاہ کے بیٹے ہو؟''

''میری خوش قسمتی ہے۔''

''ڈول اور رسی ساتھ لیے پھرتے ہو، جتنا چاہو پانی کھینچ لو۔''

''میں تو آپ کی توجہ کا محتاج ہوں!''

''ٹھیک ہے۔ ہم تمہارے والد سے خود بات کریں گے کہ تمہیں کیا پڑھایا جائے اور کس طرح پڑھایا جائے، تم کل آنا۔''

دوسرے دن میر حسن مسجد دو دروازہ پہنچا تو اس کا مکمل تعارف ہو چکا تھا اور مروجہ علمی کتب اس کا نصاب تجویز ہوا۔ مولانا شیر محمد بڑے عالم و فاضل شخص تھے اور پھر میر حسن جیسا مودب شاگرد ان کے سامنے تھا۔ انہوں نے اپنا سینہ خالی کر دیا۔ میر حسن کا سینہ، گنجینہ بن گیا۔

سیالکوٹ بڑا شہر تھا۔ علما سے خالی نہیں تھا۔ میر حسن وہاں سے اٹھے تو مولانا بشیر احمد کی خدمت میں رہ کر عربی اور فارسی کی تحصیل کی۔ مولانا محبوب عالم سے بھی کسب فیض کیا۔

سولہ سترہ سال کی عمر تھی کہ میر حسن عربی، فارسی اور مذہبی علوم پر حاوی ہو گئے۔ مطالعے کا شوق تھا لہٰذا ہر وہ کتاب پڑھ ڈالی جو انہیں دستیاب ہوئی۔

تحصیل علم کے بعد میر حسن کو روزی کمانے کی فکر دامن گیر ہوئی۔ ان کا خاندانی پیشہ حکمت تھا۔ والد کی صحبت میں رہ کر ہزاروں نسخے ازبر ہو چکے تھے۔ وہ چاہتے تو خود بھی حکمت کا پیشہ اختیار کر لیتے، ان کے تمام چچا زاد بھائی اسی پیشے سے وابستہ تھے۔ دیگر اقربا بھی یہی پیشہ اختیار کیے ہوئے تھے لیکن میر حسن کو حکمت سے دلچسپی نہیں تھی۔ اس دریا میں اتر کر وہ اپنا وجود گم کرنا نہیں چاہتے تھے۔ دوسری طرف گھر کے حالات بھی ان کے سامنے تھے۔ وہ کچھ نہ کچھ کرنا چاہتے تھے تاکہ باپ کے کندھوں کا کچھ بوجھ ہلکا ہو جائے۔ کوئی نوکری سامنے نہیں تھی۔ ایک مسجد میں امامت کی جگہ خالی تھی، انہوں نے اسی کو غنیمت سمجھا۔ مسجد میں امام مقرر ہو گئے۔

وہ عشا کی نماز ادا کر چکے تھے کہ محلے کا ایک شخص کھانا لے کر آیا۔ انہوں نے دسترخوان کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ خودداری اور غیرت سادات نے جوش مارا۔ ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ مدہوشی طاری ہو گئی۔ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

وہ شخص حیران کھڑا تھا کہ مولوی صاحب کو ہوا کیا ہے۔ مسجد میں گھپ اندھیرا تھا۔ کسی طاق میں ایک دیا ٹمٹما رہا تھا۔ وہ شخص میر حسن کو اٹھا کر اسی دیے کے قریب لے گیا۔ پھر بھاگتا ہوا وضو خانے کے قریب پہنچا۔ مٹی کے لوٹے میں پانی بھرا۔ پانی کے چھینٹے میر حسن کے چہرے پر مارے۔ تھوڑی دیر میں انہیں ہوش آ گیا۔

''مولوی صاحب! آپ کو غالباً بھوک کی وجہ سے غش آ گیا تھا۔ میں کھانا لایا ہوں۔ تناول فرما لیں۔''

''نہیں بھائی، یہ کھانا اپنے ساتھ لے جاؤ، میں اسے نہیں

ھا سکتا۔"

"آپ یہ کھانا رکھ لیں جب بھوک لگے تو کھا لیجیے گا۔"

"میں نے کہا ناں ..... یہ کھانا لے جاؤ۔ میں اسے نہیں
ھا سکتا۔"

"خیر تو ہے مولوی صاحب! میرے کھانے میں ایسی کیا
ت ہے؟"

"کوئی بات نہیں ہے۔ میں گھر جانا چاہتا ہوں۔ میری
یعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"آپ کی طبیعت واقعی ٹھیک نہیں ہے۔" اس شخص نے
ہا اور دسترخوان اٹھا کر مسجد سے نکل گیا۔

مسجد پھر تنہا ہوگئی۔ میر حسن اپنے ضمیر کے سامنے کھڑے
ھے۔ کیا میں اس لیے دنیا میں آیا ہوں کہ گھروں سے آیا ہوا
ھانا کھاتا رہوں۔ یہ کھانا حلال کے پیسوں کا تھا یا نہیں' مجھے
یا معلوم۔ لوگ رحم کھا کر کل کو میرے کپڑے بھی بنائیں گے'
دقے اور فطرے کے پیسے بھی دیں گے۔ مجھے ایسی مدد
یب نہیں دیتی۔ مجھے تو ایسی نوکری کرنی چاہیے جس میں مجھے
رے کام کے عوض حلال کی تنخواہ نصیب ہو۔ وہ اسی وقت
جد سے نکلے اور گھر پہنچ گئے۔

میر محمد شاہ اسی سال دوسرے بیٹے سید عبدالغنی کے باپ
نے تھے۔ عطر نشاں سید عبدالغنی کو سلانے میں مشغول تھیں۔
ر محمد شاہ کو صبح جلد اٹھنا ہوتا تھا اس لیے سو چکے تھے۔
واز ے پر دستک ہوئی۔ دستک کی آواز سے ان کی والدہ
نے پہچان لیا کہ میر حسن دروازے پر ہیں۔ انہوں نے
مولود کو روتا ہوا چھوڑا اور جا کر دروازہ کھول دیا۔ میر حسن
ب روشنی میں آئے تو ماں کی ممتا نے دیکھتے ہی پہچان لیا کہ
ن کا بیٹا کسی مشکل میں ہے۔

"اماں جان' کچھ کھانے کو ہوگا؟"

"ہاں بیٹا' ایک روٹی رکھی تو ہے۔"

"بس وہی بہت ہے۔"

"تم بھائی کو سنبھالو۔ میں ابھی لائی۔"

ان کی والدہ سمجھ تو گئی تھیں کہ کوئی بات ضرور ہے لیکن
ھانے سے پہلے کچھ پوچھنا نہیں چاہتی تھیں۔ جب میر حسن
ھانا کھا چکے تو انہوں نے کچھ پوچھنا چاہا۔ میر حسن تو خود ہی
ب کچھ بتا دینا چاہتے تھے۔ پانی کا آخری گھونٹ ختم کیا اور
م ماجرا ماں کے گوش گزار کر دیا۔ ماں نے بھی ان کے گمان
ے اتفاق کیا اور بیٹے کا ماتھا چوم لیا۔

"میری تربیت رنگ لائی۔ تمہیں ایسا ہی ہونا چاہیے
"

"مولوی صاحب کے چند احباب"

مولانا غلام حسن' مرزا غلام احمد قادیانی' حکیم نورالدین' مولوی عبدالکریم' مولوی فیروز الدین' حافظ میراں بخش' شیخ نور محمد' سائیں کبیر شاہ' الطاف حسین حالی' اللہ داد شیخ' بھیم سین' پیٹرسن آر۔ ایم۔ سی' سر راس مسعود' منشی سراج الدین' سید محمود' شبلی نعمانی' احمد شفیع' سر فضل حسین' نواب محسن الملک' ڈپٹی نذیر احمد' ریورنڈ جارج' ریورنڈ ولیم اسکاٹ۔ ریورنڈ جان گیریٹ۔

مشاہیر سے ملاقات

سر سید احمد خان' محمد حسین آزاد' الطاف حسین حالی' نواب محسن الملک' ڈاکٹر مولوی محمد شفیع۔

تہجد کے وقت گھر میں چراغ جلا تو میر حسن نماز کے لیے بیدار ہوئے۔ والد اور والدہ پہلے ہی اٹھ چکے تھے۔ نماز کے بعد انہوں نے والد محترم سے بھی واقعے کا ذکر کیا۔ انہوں نے بھی میر حسن کے خدشات کا خیر مقدم کیا۔

"تمہارا خدشہ بالکل درست ہے۔ کسی گھر سے کن پیسوں کا کھانا آتا ہے کسی کو کیا معلوم! پھر اس کے جو اثرات ہوں گے وہ ظاہر ہیں۔"

"تو میں امامت ترک کر دوں؟"

"ایسا ہی کرو۔ کوئی اور نوکری ڈھونڈو۔ اللہ مدد کرے گا۔"

میر حسن نماز فجر پڑھانے مسجد گئے ضرور لیکن انہوں نے نمازیوں سے کہہ دیا کہ وہ کسی اور کو امام مقرر کر لیں۔ گھر آ کر انہوں نے دو نفل شکرانے ادا کیے کہ اللہ نے انہیں ایسی روزی سے بچا لیا جو ان کی محنت کی نہیں تھی۔

دھوپ اسی طرح سر پر ٹھہری ہوئی تھی۔ گھر کے حالات بہ دستور تھے۔ نوکری کی کوئی سبیل نہیں نکل رہی تھی کہ ضلع سیالکوٹ کو ایک استاد کی ضرورت پڑی۔ میر حسن نے بھی درخواست دے دی۔ ادارے کی انتظامیہ کے سامنے یہ درخواست پہنچی تو فوراً منظور کر لی گئی۔ یہ وہی اسکول تھا جہاں سے انہوں نے تعلیم حاصل کی تھی۔ وہاں کے اساتذہ ان کی علمی قابلیت کے معترف تھے۔

میر حسن کا تقرر نو روپے ماہوار پر ہوا اور وہ طلبہ کو عربی و فارسی پڑھانے لگے۔ یہ ایسی ملازمت تھی جہاں ان کا دل لگنا

چاہیے تھا لیکن ایک تو مشاہرہ کم تھا دوسرے یہ کہ انہیں یہاں وہ علمی ماحول نظر نہ آیا جس کی انہیں تلاش تھی لہٰذا وہ اس سے بہتر کسی علمی ادارے کی ملازمت کے حصول کی کوشش کرنے لگے۔

سکھوں کی عمل داری ختم ہوتے ہی انگریزوں کی عمل داری نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔ جگہ جگہ ضلع اسکول قائم ہو رہے تھے۔ ضلع اسکولوں کے ساتھ ساتھ مشنری اسکول بھی کھل رہے تھے۔ سیالکوٹ مشن چرچ آف اسکاٹ لینڈ نے سیالکوٹ چھاؤنی میں ایک اسکول کھولا۔ اس کے بعد 1864ء میں وزیر آباد شہر میں ایک پرائمری اسکول کھول کر اپنی شاخ قائم کی۔ اس نئے تعلیمی ادارے کے لیے اسکاچ مشن کو اساتذہ کی ضرورت پڑی۔

مسلمان ان مشنری اسکولوں اور اس کی ملازمت کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھ رہے تھے لیکن میر حسن نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور درخواست دے دی۔ کیونکہ ضلع اسکول کی نسبت مشن کا سلسلہ پختہ بنیادوں پر قائم تھا اور تنخواہ بھی زیادہ تھی۔ مسلمان اساتذہ مل کہاں رہے تھے' ان کی درخواست پر فوری غور ہوا اور فوری ملازمت مل گئی۔ انہیں بہ طور مدرس السنہ شرقیہ اسکاچ مشن وزیر آباد تعینات کر دیا گیا۔ گویا اب انہیں آبائی وطن سے دور وزیر آباد میں رہنا تھا لیکن تنخواہ پرکشش تھی اور مسلمان بچوں میں تعلیم کی روشنی پھیلانے کا موقع مل رہا تھا لہٰذا انہوں نے یہ پیش کش قبول کر لی۔

''میں جو کچھ سن رہا ہوں کیا وہ درست ہے؟'' ان کے والد نے ان سے پوچھا۔

''آپ کیا سن رہے ہیں؟''

''یہی کہ تم نے اسکاچ مشن اسکول کے لیے درخواست دی ہے؟''

''درخواست دی تھی' اب تو تقرری نامہ بھی موصول ہو گیا۔ مجھے ملازمت مل گئی ہے۔''

''اس ملازمت سے ہاتھ کھینچ لو۔''

''ابا جی' کس لیے؟ ملازمت میں کیا خرابی ہے؟''

''کیا تمہیں نہیں معلوم کہ ہمارے خاندان میں آج تک کسی نے فرنگی کی نوکری نہیں کی۔''

''جب وہ ہم پر حکومت کر رہے ہیں تو ان کی نوکری میں کیا برائی ہے؟''

''ان کی نوکری نہ کرنا ہمارے اختیار میں ہے۔''

''میں نے یہ اسامی چھوڑ دی تو کوئی اور حاصل کر لے گا۔''

''کوئی اور کرے مگر تم چھوڑ دو۔''

''آپ کو معلوم ہے' اس وقت مسلمانوں کا سب سے بڑا مرض کیا ہے؟''

''کیا ہے؟''

''جہالت۔ اور میں اسی جہالت کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔''

''ضلع اسکول کیا برا ہے؟''

''ابا جی' وقت تبدیل ہو رہا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں' بہت جلد انگریزی اسکولوں کا جال پھیلنے والا ہے۔ ہم اس سیلاب کو نہیں روک سکتے۔ ایک ہی علاج ہے کہ ہم انگریز کی مہربانیوں سے فائدہ اٹھائیں اور اپنے بچوں میں تعلیم کا نور پھیلائیں۔''

''دینی علوم پھیلاؤ' اسی میں نجات ہے۔''

''علوم دینی سے بے شک خدا کا قرب حاصل ہوتا ہے لیکن علوم دنیوی بھی بے کار نہیں۔ اس کے ذریعے فطرت کے راز انسان پر منکشف ہوتے ہیں۔ علم حاصل کرنا پیغمبروں کی میراث ہے۔''

میر محمد شاہ کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا لیکن چہرے سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ میر حسن کے جواب سے مطمئن نہیں ہیں۔ دل کا کرب چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا۔ ان کی والدہ آنسو بھری آنکھوں سے ان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ ان کے بیٹے نے کام ہی ایسا کیا تھا کہ خاندان بھر کی ناک کٹوا دی تھی۔

اس گھر میں ہمیشہ کے لیے اندھیرا ہو گیا تھا۔ بیٹے نے فرنگی کی نوکری کر لی' اس غم میں رات کو گھر میں دیا بھی نہیں جلا لیکن میر حسن پختہ ارادہ کر چکے تھے۔ انہوں نے ملازمت نہیں چھوڑی اور وزیر آباد پہنچ کر نئی ملازمت اختیار کر لی۔

سیالکوٹ سے وزیر آباد تک جانے کے لیے ریل کی سہولت موجود نہیں تھی لیکن ارادہ پختہ تھا لہٰذا پیدل ہی گھر سے چل پڑے۔ کوئی ساتھی ساتھ نہیں تھا۔ گھر سے بھی اس عالم میں روانہ ہوئے تھے کہ کوئی گھر سے باہر تک چھوڑنے نہیں آیا تھا۔ ایک ماں کے آنسو تھے جو ان کے دامن سے لپٹ کر خشک ہو گئے تھے۔

حافظ قرآن تو تھے ہی ''تلاوت'' شروع کی اور قدم پر قدم اٹھاتے چلے گئے۔ کوئی کسان بیل گاڑی لیے چلا جا رہا تھا۔ اس نے رحم کھا کر بٹھا لیا لیکن اس کی منزل بھی اگلے کسی گاؤں تک تھی۔ میر حسن پھر پیدل ہو گئے لیکن خوش تھے کہ بہت سارا راستہ تو کٹ گیا۔ علم کا یہ متوالا کسی نہ کسی طرح وزیر آباد تک پہنچ گیا۔ تھکن بہت تھی لیکن عمارت میں قدم رکھتے ہی ساری تھکن دھوپ کی طرح سر سے اتر گئی۔ پادری

سے ملے تو جیسے تازہ دم ہوگئے۔ علم کی ایسی قدر دانی انہوں نے اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ پادری کو معلوم ہوا کہ نئے استاد آگئے ہیں تو وہ انہیں لینے خود دروازے تک گئے۔

علم کی ایسی قدر دانی دیکھی تو دل جمعی نے ہاتھ پکڑ لیا۔ اسی وقت ارادہ باندھ لیا کہ کتنی ہی مخالفت ہو وہ علم کی شمع روشن رکھیں گے۔ پہلے دن جماعت میں گئے تو یہ دیکھ کر دل خوش ہوگیا کہ عربی، فارسی پڑھنے والوں میں مسلمان بچوں کے ساتھ سکھ، ہندو اور جین مذہب کے بچے بھی تھے۔ ان بچوں کو دیکھ کر تعصب کی ہوا دل سے نکل گئی۔ پھول کوئی بھی ہو اس سے تو پیار کیا جاتا ہے۔ پھولوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ انہوں نے اتنے پیار سے بچوں کو مخاطب کیا کہ بچوں کی وحشت دور ہوگئی۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ نئے مولوی صاحب زبان سے کم ڈنڈے سے زیادہ بات کریں گے لیکن یہاں تو معاملہ ہی دوسرا تھا۔ پڑھانے کا انداز ایسا دلنشیں کہ بات دل سے نکل کر دل تک پہنچتی تھی۔

مہینے کی پہلی تنخواہ ملی تو انہیں والدین کی یاد آئی۔ سفر پھر ہی پیدل کا تھا لیکن جانا بھی ضروری تھا۔ کمر ہمت باندھی اور کچھ پیدل، کچھ بیل گاڑی پر سفر طے کرتے ہوئے سیالکوٹ آ گئے۔ اتنے دنوں کی جدائی نے والدین کی ہر خفگی کو دور کر دیا تھا۔ ماں نے بھیگی آنکھوں سے تنخواہ ہاتھ میں لی لیکن اتنا ضرور کہا کہ وہ سیالکوٹ میں ان کی آنکھوں کے سامنے ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ ان کا جواب یہی تھا کہ وہ علم کی روشنی پھیلا رہے ہیں۔ اس وقت مسلمانوں کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ ان میں تعلیم کا نور پھیلایا جائے۔

''وہاں ہندو بھی تو پڑھتے ہوں گے۔''

''سکھ بھی ہیں۔''

''تم ان دشمنوں میں بھی علم پھیلا رہے ہو۔''

''عربی، فارسی تو ہماری زبان ہے۔ آپ یہ کیوں نہیں سمجھتیں کہ یہ زبانیں انہیں سکھا رہا ہوں۔''

وہ تو کچھ سمجھیں، کچھ نہیں سمجھیں لیکن میر محمد شاہ جو بستر پر بیٹھے کسی کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے، لیکن کان اسی طرف لگے ہوئے تھے، یہ کہہ کر بیوی کو خاموش کرا دیا۔

''یہ جو کچھ کہہ رہا ہے، ٹھیک کہہ رہا ہے۔ رہی جدائی کی بات تو وہ بھی ختم ہو جائے گی۔''

''مجھے تو نظر نہیں آتا۔''

''میں نے سنا ہے، وزیر آباد اسکاچ مشن اسکول کی ایک شاخ یہاں بھی کھلنے والی ہے، تبادلہ کرا لے گا۔'' انہوں نے کہا اور کتاب پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔

مولوی صاحب کے چند تلامذہ (شاگرد)

علامہ اقبال، کنور سین، مولوی میر ابراہیم، مولوی احمد دین، افضل حسین، سید افضل علی، امین حزیں سیالکوٹی، بالمکند، ڈاکٹر بشارت احمد، پنڈت بیلی رام، جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر جمشید علی راٹھور، سردار چڑت سنگھ، حاکم رائے، شیخ رکن الدین، آغا محمد صفدر، مولوی ظفر اقبال، میر عبدالقیوم، غلام محمد، شیخ گلاب دین، شیخ نور الہٰی۔

''میں تو یہ سوچتی ہوں کہ تو وزیر آباد تک کا طویل فاصلہ پیدل طے کرتا ہے۔''

''ارے نہیں، کوئی نہ کوئی بیل گاڑی مل جاتی ہے۔ مزے سے چلا جاتا ہوں۔''

''خدا تجھے استقامت دے۔''

وہ جب تک گھر پر رہے، ماں کی دعائیں سمیٹتے رہے اور پھر انہی دعاؤں کو رخت سفر بنا کر وزیر آباد روانہ ہوگئے جہاں ان کے پروانے شمع روشن ہونے کے انتظار میں تھے۔

ان کے اجداد مذہب پرست تھے۔ سنت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نمونہ تھے۔ اس لیے آپ بھی اسی نمونے کے انسان تھے۔ اللہ والوں کی صحبت میں شریک ہو کر ان کی اچھی باتوں سے مستفید ہوا کرتے تھے۔ بزرگوں کے مزاروں پر جا کر، فاتحہ پڑھ کر ان کے لیے خدا کی بخشش کے طلب گار ہوا کرتے تھے۔

وزیر آباد آ کر آپ کو معلوم ہوا کہ یہاں سے چار فرلانگ کے فاصلے پر ایک سید بزرگ کا مزار ہے۔ وہ بزرگ سید مٹھا شاہ کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کے مزار پر شروع بیساکھ میں عرس ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ جب عرس کے دن آئے تو آپ چند دوستوں کے ہمراہ عرس میں شریک ہوئے اور مزار پر حاضری دی۔

میر حسن کو وزیر آباد آئے ایک سال بھی نہیں ہوا تھا کہ حکومت نے وزیر آباد کے گورنمنٹ اسکول کو بھی اسکاچ مشن وزیر آباد کی تحویل میں دے دیا۔ گورنمنٹ اسکول میں 88 طلبہ زیر تعلیم تھے۔ اس اسکول کے ملنے پر اسکاچ مشن اسکول کی بنیادیں اور بھی مضبوط ہوگئیں اور وسیع بنیادوں پر بچوں کو تعلیم دی جانے لگی۔

میر حسن نے اس خوبی سے بچوں کو تعلیم دی اور نتائج اتنے شاندار نکلے کہ مشن کے پادریوں کے دلوں پر ان کی قابلیت کا سکہ جم گیا۔ ان کی قدر و منزلت پہلے سے بھی زیادہ

ہونے لگی۔

مئی 1868ء میں حکومت نے ضلع اسکول کنک منڈی سیالکوٹ کو اسکاچ مشن سیالکوٹ کی تحویل میں دے دیا اور اس طرح اب ضلع اسکول سیالکوٹ کو اسکاچ مشن چلانے لگا۔

اس درس گاہ کی افادیت کا اندازہ مشن کے پادریوں کو ہوگیا تھا لہٰذا وہ اس نئی تحویل شدہ درس گاہ میں لائق و فاضل اساتذہ کے حصول کے لیے کوشش کرنے لگا۔ عربی و فارسی کا کوئی اسکالر دستیاب نہیں ہو رہا تھا جس کی وجہ سے مشرقی زبانوں کی کلاسیں متاثر ہو رہی تھیں۔ بالآخر ارباب اختیار نے مولوی میر حسن کو وزیر آباد سے سیالکوٹ بلوالیا اور اس طرح پانچ سال بعد 1868ء میں وہ اسکاچ مشن مڈل اسکول سیالکوٹ میں تبدیل ہوکر آ گئے اور یہاں عربی' فارسی کی تعلیم دینے لگے۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر ریونڈ جے۔ پی لنگ نے اپنی رپورٹ میں لکھا۔

''مشرق زبانوں کا شعبہ کسی لائق استاد کے نہ ہونے کی وجہ سے بہت متاثر ہو رہا تھا۔ اب جبکہ نہایت لائق اسکالر کا تقرر ہوگیا ہے۔ ایک بڑی تبدیلی رونما ہوگی۔''

سیالکوٹ میں تبادلہ ہو جانے کے بعد میر حسن کی زندگی میں باقاعدگی آ گئی اور ذہنی پریشانی سے نجات مل گئی۔ والدین' بہن بھائیوں سے دوری ختم ہوگئی۔ گھر کا سکون' دوستوں کا ساتھ میسر آ گیا لہٰذا مزید دل جمعی سے طلبہ کو پڑھانے لگے۔

1871ء میں اسکاچ مشن سٹی اسکول' مڈل سے ہائی درجے تک ہوگیا۔ میر حسن کی قابلیت اور محنت کے سب ہی معترف تھے لہٰذا انہیں ہائی اسکول کی کلاسیں ساتویں جماعت سے لے کر دسویں جماعت تک دے دی گئیں۔

ہائی اسکول میں آنے کے بعد انہیں اپنے جوہر دکھانے کے خوب مواقع ہاتھ آئے۔ فارسی آباؤاجداد کی زبان چلی آ رہی تھی۔ ہندوستان میں اسے آٹھ' نو سال سے درباری حیثیت حاصل تھی۔ بڑے بڑے صوفیا کا کلام بھی اسی زبان میں تھا۔ میر صاحب کو ہزارہا اشعار یاد تھے۔ فارسی شعرا کے ساتھ ساتھ پنجابی شعرا کے سیکڑوں اشعار ازبر تھے۔ وہ طلبہ کو ان اشعار کے ذریعے مشکل فارسی اشعار اس طرح واضح کر دیتے کہ ہمیشہ کے لیے ذہن نشین ہو جاتے۔ کند ذہن سے کند ذہن طالب علم بھی جب ایک مرتبہ ان سے پڑھ لیتا تو فارسی پر عبور حاصل کر لیتا۔

جب ان کی مقبولیت بڑھنے لگی اور طلبہ ہر حال میں ان سے پڑھنے کے متمنی نظر آنے لگے تو انہوں نے گھر کو بھی اسکول بنالیا۔ چٹائیاں بچھادیں اور طلبہ کے لیے دروازہ کھول دیا اور وہ بھی اس طرح کہ کسی معاوضے کے بغیر جس کا جی چاہے اندر آ کر بیٹھ جائے۔ ایسا انوکھا اسکول' سیالکوٹ میں کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ مفت تعلیم حاصل کرنے والوں کی ایسی ناز برداری بھی کسی نے نہیں دیکھی ہوگی۔

ایک دفعہ محمد ابراہیم سیالکوٹی کے ساتھ میر حسن کا دوسرا شاگرد حبیب اللہ بھی میر صاحب کے گھر گیا۔ حبیب اللہ کو چمنا چمنا کہتے تھے کیونکہ اس کا قد بہت چھوٹا تھا۔ میر صاحب کے گھر جا کر یہ دونوں ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔ چمنا کے پاؤں چھوٹے قد کی وجہ سے نیچے زمین پر نہیں لگ رہے تھے۔ گویا بے آرامی سے بیٹھا ہوا تھا۔ میر صاحب باتیں کر رہے تھے کہ ان کی نظر چمنا کے پیروں پر پڑی۔ وہ چپکے سے اٹھے اور چوکی اٹھا کر ان کے پاؤں کے نیچے رکھ دی۔ اپنے شاگردوں کی ایسی ناز برداری ایک علم دوست ہی کر سکتا تھا۔

اپنے شاگردوں کی دعوت بھی کیا کرتے تھے۔ باتوں باتوں میں ان کی من پسند چیزیں پوچھ لیتے اور وہی چیز پکا کر اس کو بڑے پیار سے کھلاتے اور خوش ہوتے۔

پڑھانے کا طریقۂ کار بھی ان کا اپنا تھا' طالب علم عربی نصاب کی نثر یا اشعار پڑھتا' مولوی صاحب مشکل الفاظ کے معنی بتاتے جاتے اور پھر طالب علم سے نثری فقروں کے معنی پوچھتے۔ نظم کے سلسلے میں مولوی صاحب شعر کے بیان میں متعدد اردو فارسی اور پنجابی کے اشعار پڑھتے۔ اس طرح اس عربی شعر کا مفہوم طالب علم کے ذہن نشین ہو جاتا۔

مختصر اوقات ملازمت کے بعد جب وہ اپنے بیت العلوم میں تشریف رکھتے تو گرد و پیش کے بوریے عجیب منظر پیش کرتے تھے۔ ایک طرف کسی جید مولوی صاحب کی تفسیر القرآن کے نکات سمجھائے جاتے تھے' دوسری طرف کسی دوسرے مولانا کو حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا درس دیتے ہوئے چند عربی' فارسی کے اعلیٰ درجات کے طلبہ کی مشکلات کو بھی اس طرح حل فرماتے جاتے کہ حضرت کا ایک ایک لفظ سننے والوں کے دل و دماغ پر برقی اثر پیدا کرتا جاتا تھا۔ ایک جانب ایک جماعت چھوٹے بچوں کی بیٹھی نظر آتی تھی۔ کسی کے ہاتھ میں قاعدہ ہے' کوئی اردو کی پہلی کتاب سامنے رکھے بیٹھا ہے۔

میر حسن انگریز دور کی علمی ترقیوں اور سماجی اصلاحات کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ جگہ جگہ اسکول قائم ہو رہے ہیں جن سے مسلمان بچے مستفید ہو رہے

اشارہ

ایک دفعہ کراچی کی ایک غیر ملکی فرم کے انگریز ڈائریکٹر ملک صاحب (فیروز نون) کے پاس آئے اور مزدوروں کے بڑھتے ہوئے حقوق اور مطالبات کی شکایت کرنے لگے۔ ملک صاحب بڑے اعتماد سے متعلقہ قانون کی مختلف شقوں کی وضاحت کرنے لگے۔ بدقسمتی سے جس قانون کا ملک صاحب حوالہ دے رہے تھے' اس کا مزدوروں سے کوئی تعلق نہ تھا' میرے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ بھری محفل میں ملک صاحب کے بیان کی تصحیح کرتا' ادھر غیر ملکی مہمان حیران تھا کہ وزیراعظم ان کی بات کیوں نہیں سمجھ پا رہے۔ آخر طے ہوا کہ میں مہمان کو اپنے کمرے میں لے جاؤں اور وہاں معاملے کو سلجھاؤں۔ میں نے مہمان کو سمجھا دیا کہ ان کی شکایت بجا ہے اور وزیراعظم کی طرف سے ضروری ہدایات جاری کردی جائیں گی۔ واپس آ کر جب میں نے وزیراعظم صاحب سے یہ کہا کہ غیر ملکی فرم والے ٹھیک کہہ رہے تھے اور جس قانون کا وزیراعظم حوالہ دے رہے تھے' وہ غلط تھا تو ملک صاحب برہم ہوگئے ''اس وقت تم کیوں چپ سادھے بیٹھے رہے؟'' اور پھر مسکرا کر کہنے لگے ''دیکھو' جب کبھی ایسی بات ہو تو اپنے کان کی لو کو انگلی سے دبایا کرو۔''

اقتباس: ''لکھتے رہے جنوں کی حکایت'' از الطاف گوہر
مرسلہ: اقتدار احمد خان' باغ و بہار' خان پور کٹورہ

یں۔ اسپتال قائم ہو رہے ہیں۔ انگریزوں ہی کے دور میں
حکیم فنڈ قائم کیا گیا جس سے خود ان کے والد کو بہت فائدہ
پہنچا۔ اسی انگریزی اسکول کی برکت تھی کہ اچھی تنخواہ کی
دولت ان کے گھر کی بدحالی دور ہوئی تھی۔ ان سب باتوں
نے انگریزوں کی طرف سے ان کے دل میں نرم گوشہ پیدا
کر دیا تھا۔ وہ علی گڑھ سے بہت دور بیٹھ کر سر سید احمد خاں کی
اجی کاموں کو بھی بڑے غور سے دیکھ رہے تھے اور دل ہی دل
یں ان کے قدردان ہوگئے تھے۔ بہت جی چاہتا تھا کہ کسی
رح ان سے ملاقات ہو لیکن مصروفیات حائل تھیں۔ پھر یہ
ر ان تک پہنچی کہ سر سید احمد خان مسلمانوں کو خواب غفلت
سے بیدار کرنے کے لیے دورے کر رہے ہیں اور عنقریب
نجاب پہنچیں گے۔ انہوں نے اس محسن قوم سے ملنے کی
یاریاں شروع کر دیں۔

پنجاب کے دورے میں سر سید کو زبردست پذیرائی ملی۔
ر جگہ شاندار استقبال ہوا۔ اسی دورے کے درمیان میر حسن کو
ی سر سید سے ملاقات کا موقع ملا۔ اس ملاقات میں دونوں
ک دوسرے سے اتنے متاثر ہوئے کہ یہ ملاقات دوستی میں
دیل ہوگئی اور دونوں کے درمیان مراسلت کا سلسلہ شروع
گیا۔

ان کی مقبولیت روز بہ روز بڑھتی جا رہی تھی۔ 1886ء
ے قریب وہ عربی' فارسی کے علاوہ لڑکوں کو حساب بھی
ھانے لگے۔ اس کے لیے اسکول انتظامیہ سے فاضل
یاوضہ ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ ان کا شغف تھا
انہیں علم کے ہر شعبے کی طرف لے جا رہا تھا۔

☆☆☆

ایک روز میر حسن کا گزر شوالہ تیجہ سنگھ کی مسجد کی طرف ہوا۔ یہاں مولانا غلام حسن مسلمان بچوں کو عربی اور فارسی کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ میر حسن یہ سوچ کر مسجد میں داخل ہوگئے کہ چلو غلام حسن سے ملاقات کرتے چلیں۔ مولانا غلام حسن نہایت تپاک سے ملے۔ دونوں دوست باہم گفتگو میں شامل ہوگئے۔ اچانک ان کی نظر ایک گول مٹول' گورے چٹے بچے پر پڑی۔ وہی ذہانت اور اقبال مندی اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی۔

''کیا نام ہے اس بچے کا؟''

''اقبال۔''

''اس کا نام اقبال ہی ہونا چاہیے تھا۔'' میر حسن نے کہا ''کس خوش نصیب کا بیٹا ہے؟''

''میرے ایک دوست ہیں' شیخ نور محمد! ان کا بیٹا ہے۔ کبھی کبھی وہ بھی معارف دین کی سماعت کے لیے یہاں تشریف لاتے ہیں۔''

اس اطلاع کے بعد دونوں دوست ایک مرتبہ پھر گفتگو میں مشغول ہوگئے۔ کچھ دیر بعد میر حسن نے اجازت طلب کی اور مسجد سے باہر آ گئے۔ باہر نکلے تو ایک آدمی سودا بیچ رہا تھا۔ آپ اس کے پاس رک گئے۔

''سردا کیا بھاؤ ہے؟''

''آٹھ آنے سیر۔''

''نہیں بھائی' مینوں نئیں سردا۔'' انہوں نے پنجابی میں کہا۔

سردا پھل بھی ہے اور پنجابی میں سردا ''قبول'' کو بھی کہتے ہیں۔ اس پر مذاق جملے پر پھل والا بھی ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔ ان کا مزاج بھی خوش گوار ہوگیا۔ انہیں پھر مسجد میں بیٹھے ہوئے اقبال کا خیال آیا۔ شیخ نور محمد کا بیٹا ہے تو کیوں ناں ان سے ملا جائے۔ وہ ان کے گھر پہنچ گئے۔ شیخ نور محمد نے دیکھا کہ مولوی میر حسن تشریف لائے ہیں تو انہیں خود اپنے آپ پر فخر ہونے لگا۔

''میر صاحب! میرے تو گھر کے نصیب جاگ گئے۔ آپ تشریف لائے ہیں۔''

''کیوں شیخ صاحب! مجھ میں ایسی کیا خاص بات ہوگئی؟''

''آپ کا آنا تو ایسا ہی ہے جیسے دریا خود چل کر پیاسے کے پاس آگیا۔''

''آج تو ایسا ہے شیخ صاحب' کہ دریا بھی میں ہوں اور پیاسا بھی میں ہوں۔''

''خیر تو ہے' میر صاحب!''

''بھئی آج تمہارے لڑکے اقبال کو دیکھا۔''

''مولانا غلام حسن کی طرف تشریف لے گئے ہوں گے' وہ وہیں جاتا ہے' پڑھنے کے لیے۔''

''اسی کے سلسلے میں آیا ہوں بات کرنے۔''

''کیا ہوا' کیا پڑھنے میں نالائق ثابت ہو رہا ہے؟''

''میں نالائقوں کی سفارش لے کر نہیں آتا۔ میرا قیافہ تو یہ کہہ رہا ہے کہ وہ دنیائے اسلام میں بڑا نام پیدا کرے گا۔ میرے تجربے نے اس کے چہرے پر لکھا بہت کچھ پڑھ لیا ہے۔''

''خدا کرے ایسا ہی ہو' ایک باپ کو اور کیا چاہیے۔''

''میں آپ سے ایک درخواست کرنے آیا ہوں۔''

''فرمایئے۔''

''آپ اقبال کو میرے پاس بھیجئے' میں خود اسے پڑھاؤں گا۔''

''مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے لیکن......''

''لیکن کیا؟''

''غلام حسن برا نہ مانے' اس کی میری دوستی کا سوال ہے۔''

''اجی اسے چھوڑیے۔ اس سے میں بات کرلوں گا۔ مجھے آپ کی اجازت کی ضرورت تھی۔''

شیخ نور محمد نے مولانا غلام حسن سے بات کی اور اقبال کو قدرت نے درست مقام پر بھیج دیا۔ میر حسن کے ''بیت العلوم'' میں بچھی چٹائیوں پر بیٹھا اقبال فارسی کی گردانیں یاد کر رہا تھا اور اردگرد کا ماحول اس کے مستقبل کو آواز دے رہا تھا۔ یہ بچہ وہی اقبال تھا جو بعد میں شاعر مشرق علامہ اقبال کے نام سے جگمگایا۔

استادی' شاگردی کا یہ رشتہ ایسا قائم ہوا کہ تادم مرگ زندہ رہا۔ میر حسن ہی نے انہیں اسکاچ مشن اسکول میں داخل کرایا جہاں وہ خود مدرس تھے۔ اس طرح اسکول کے بعد اسکاچ مشن کالج میں بھی اقبال عربی' فارسی کی تعلیم ان سے حاصل کرتے رہے۔ اقبال کا قیام جب لاہور میں ہوا تب بھی یہ رشتہ قائم رہا۔ اقبال جب بھی سیالکوٹ آتے' استاد محترم سے مودبانہ ملتے اور مختلف علمی وادبی مسائل میں استاد سے استفادہ کرتے۔ یہاں تک کہ اقبال جب 1905ء میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے انگلستان گئے تو وہاں بھی آپ بذریعہ مراسلت میر حسن سے علمی وادبی گتھیاں سلجھانے کے لیے رابطہ کرتے رہے۔

علامہ اقبال ٹرنٹی کیمبرج سے خواجہ حسن نظامی کو ایک مکتوب ارسال کرتے ہیں۔

''قرآن شریف میں جس قدر آیات صریحاً تصوف کے متعلق ہوں ان کا پتا دیجئے۔ سیپارہ اور رکوع کا پتا لکھیے۔ اس بارے میں آپ قاری شاہ سلیمان صاحب یا کسی اور صاحب سے مشورہ کر کے مجھے جلد مفصل جواب دیں۔ اس مضمون کی سخت ضرورت ہے اور یہ آپ کا کام ہے۔''

خواجہ حسن نظامی کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکے۔ اقبال نے گھبرا کر اپنے استاد میر حسن کو لکھا۔ مولوی صاحب نے نو صفحات پر مشتمل جواب ان کو کیمبرج ارسال کیا۔

ایک مرتبہ مرزا غالب کے ایک فارسی شعر کی تشریح پوچھی تو میر صاحب نے کئی صفحات لکھ کر بھیجے اور اقبال اس سے پوری طرح مطمئن بھی ہوئے۔

یہ میر حسن کی علیت ہی کا اثر تھا کہ استاد کو دیکھتے ہی اقبال سرتاپا ادب بن جاتے تھے۔ ایک روز اقبال سیالکوٹ میں رحیم عطار کی دکان کے سامنے کھڑے تھے۔ تختے پر پاؤں رکھا تھا اور حقہ پی رہے تھے۔ ان کا ایک پاؤں زمین پر تھا اور دوسرا تختے پر۔ جو پاؤں تختے پر تھا' اس کا جوتا پاؤں سے اترا ہوا تھا۔ میر حسن کا اس طرف سے گزر ہوا۔ اقبال پر ایسی گھبراہٹ طاری ہوئی کہ انہوں نے تختے والا جوتا وہیں چھوڑا۔ ایک پاؤں میں جوتا تھا اور دوسرا جوتے سے بے نیاز۔ اس حالت میں استاد کی طرف بڑھے اور ان کے ساتھ ہوگئے۔ سر' پاس ادب سے جھکا ہوا تھا۔ میر صاحب کو گھر

پہنچا کر واپس آئے، پھر آ کر دوسرا جوتا پہنا۔

اقبال، انگلستان روانہ ہونے سے پہلے دہلی میں حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مزار پر حاضر ہوئے اور "التجائے مسافر" کے تحت دعا مانگی تو بھی استاد محترم کو نہیں بھولے۔

وہ شمع بارگہ خاندان مرتضوی
رہے گا مثل حرم جس کا آستاں مجھ کو
نفس سے جس کی کھلی میری آرزو کی کلی
بنایا جس کی مروت نے نکتہ داں مجھ کو
دعا یہ کر کہ خداوند آسمان وزمیں
کرے پھر اس کی زیارت سے شادماں مجھ کو

☆☆☆

میر حسن بھی اپنے اس ہونہار شاگرد کا اتنا ہی خیال رکھتے تھے۔ ایک بار اقبال ایک خطرناک مرض میں مبتلا ہو کر علاج کے لیے دہلی گئے تو میر صاحب کو اس قدر تشویش ہوئی کہ ایک خاص آدمی کو اس غرض سے مقرر کیا کہ وہ روزانہ اسٹیشن جا کر اخبار "پرتاب" لائے اور اقبال کی علالت کے متعلق اس میں جو خبر شائع ہو، ان کو پڑھ کر سنائے۔"

میر صاحب کلام اقبال پر کبھی کبھی تنقیدی نگاہ بھی ڈالا کرتے تھے۔ اس میں جو خامی نظر آتی، فوراً اس کی تصحیح کرتے۔ ایک مرتبہ اقبال نے ایک نظم پڑھی جس کا ایک شعر یہ تھا۔

قصہ مطلب طویل و دفتر تقریر تنگ
ہم جو کچھ کہنے کو ہیں سو مختصر کہنے کو ہیں

میر صاحب نے سنا تو آپ نے دفتر کی جگہ "عرصہ" کا لفظ تجویز کیا۔

☆☆☆

1886ء کا سال میر حسن کی زندگی میں ایک الم ناک سال تھا۔ یہ صاحب اولاد درویش اس صدمے سے بے حال ہو گیا۔ ان کی بیوی سعید بیگم 18 جون 1886ء کو بیٹے کی ولادت کے دوران انتقال کر گئیں۔ بیوی کی ناگہانی موت اپنی جگہ، یہ فکر بھی صدمے ہی کی صورت تھی کہ ایک دن کے بچے کی پرورش کیسے اور کیونکر ہوگی جبکہ اس کے علاوہ بھی تین لڑکے اور چار لڑکیاں تھیں۔

سر سید سے دوستانہ مراسم اتنے گہرے ہو چکے تھے کہ اس مشکل گھڑی میں میر حسن کو وہی یاد آئے۔ اپنا درد دل ایک مکتوب کے ذریعے ان تک پہنچا دیا۔ اس کے جواب میں سر سید کا خط آیا۔

"آپ کے اہل خانہ کی خبر سے اور اس رنج وتردد پرورش اطفال کا حال سن کر جو آپ نے لکھا ہے، سخت افسوس ہوا۔ خدا تعالیٰ آپ کا مددگار ہو۔ دنیا میں علی الخصوص تاہل میں اس قسم کے رنج والم پیش آ جاتے ہیں۔ دوست تسلی دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ صبر کرو مگر ایسے واقعات پر صبر کرنا ہی مجبوری ہے۔ صبر نہ کرے تو کیا کرے۔"

میر حسن نے اس صدمے کو مردانہ وار برداشت کیا لیکن آسمان کب کسی کو چین سے بیٹھنے دیتا ہے۔ بیوی کی وفات کے آٹھ ماہ بعد وہ بچہ بھی انتقال کر گیا جس کی ولادت کے دوران میں بیوی کا انتقال ہوا تھا۔ ایک ماہ بعد والد بھی اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ چھوٹے بھائی سید عبدالغنی اور اس کی بیوی کے درمیان ہونے والے جھگڑوں نے بھی انہیں پریشان کیے رکھا۔ بالآخر ان جھگڑوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ سید عبدالغنی نے اپنی بیوی برکت بی بی کو طلاق دے دی۔ یہ ان کے گھرانے کے لیے معمولی سانحہ نہیں تھا۔ تمام ذمے داریاں بڑے ہونے کے ناتے میر حسن پر تھیں۔

برکت بی بی کے عدت کے دن گزر گئے تو میر حسن کی والدہ نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ طلاق شدہ بھاوج برکت بی بی سے شادی کر لیں۔

"دیکھو میر حسن! برکت ہمارے خاندان کی عزت ہے۔ گھر سے باہر نکلی تو دنیا ہنسے گی۔"

"جس کی عبدالغنی سے نہیں نبھی، مجھ سے کیا نبھے گی!"

"وہ ذرا مزاج کا تیز ہے۔ تم میں تحمل ہے۔ بڑا فرق ہے تم میں اور اس میں۔"

"اس سے کہو یونہی رہتی رہے، ہم اس کا ہر طرح سے خیال رکھیں گے۔"

"اس طرح کیسے رہ سکتی ہے؟ کس رشتے سے رہے گی؟ جوان ہے، کہیں نہ کہیں تو شادی کرے گی۔"

"تو کرنے دیجیے۔"

"وہ بچے کو اپنے ساتھ لے جائے گی۔ ذرا یہ تو سوچو۔ ہمارا خون کس گھر میں پلے گا! پھر یہ بھی ہے کہ وہ تمہارے بچوں کی دیکھ بھال کرے گی۔ تمہیں اس فکر سے بھی نجات ملے گی۔"

"وہ بھی تیار ہے؟"

"مجھے تمہاری رائے کی ضرورت تھی، اسے میں خود منا لوں گی۔"

"آپ کی خاطر مجھے یہ رشتہ قبول ہے۔"

میر حسن اس نکاح کے لیے تیار نہیں تھے لیکن ماں کے کہنے پر یہ نکاح کر لیا۔ برکت بی بی کا ایک چھوٹا بچہ احسان علی تھا جو میر حسن کی کفالت میں آ گیا۔

☆☆☆

سرسید اور ان کے رفقا سے میر حسن کے تعلقات روز بہ روز گہرے ہوتے گئے۔ سرسید کے توسط سے علمی وادبی اور سماجی شخصیات سے آپ کی اچھی خاصی روشناسی ہوگئی۔ وہ اپنی بے پناہ مشغولیات کے باوجود علم وادب اور عوام کی فلاح وبہبود کے لیے دل وجان سے مشغول رہنے لگے۔ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل سوسائٹی میں آپ باقاعدہ حصہ لیا کرتے تھے اور ان کی حاضری کو بہت قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ان کے مشورے کو بڑی توجہ سے سنا جاتا تھا۔ یہ اجلاس ہندوستان بھر کے مسلمانوں کی ترقی کے لیے ہوا کرتے تھے لیکن میر حسن اپنے مولد ومسکن سیالکوٹ کے مسلمانوں کے لیے بھی سرگرم عمل رہتے تھے۔ سیالکوٹ کے جوان مسلمانوں نے انجمن مشاق المسلمین قائم کی تھی۔ اس انجمن کا مقصد مسلمان قوم کی فلاح وبہبود تھا۔ اس کا سال میں ایک جلسہ ہوا کرتا تھا۔ میر حسن ان جلسوں میں شریک ہوتے تھے اور نوجوانوں کو مفید مشوروں سے نوازتے تھے۔

اس انجمن کے تحت انہوں نے مسلمان طلبہ میں ایک انعامی مقابلے کے اہتمام کا مشورہ دیا۔ مقابلے کے لیے تاریخ اسلام سے سوالات پوچھے جانے تھے میر صاحب نے سوال نامہ مرتب کرنے کی ذمے داری خود قبول کی۔

گوجرانوالہ کے مولوی محمد شفیق نے ایک پرائمری مدرسے اور یتیم خانے کی بنیاد رکھی۔ ان کے انتقال کے بعد ایک انتظامیہ کمیٹی بنائی گئی۔ اس کمیٹی نے سیالکوٹ کی تین انجمنوں کو ملا کر ایک انجمن، انجمن اسلامیہ کی بنا ڈالی۔ میر حسن کو اس انجمن کا صدر چنا گیا۔

اسی انجمن کے قائم کردہ اسلامیہ ہائی اسکول سیالکوٹ کی نئی عمارت کا سنگ بنیاد میر صاحب نے رکھا۔ آپ کی علمی خدمات کے طفیل اسکول کے ہال کو میر حسن کے نام سے منسوب کیا گیا۔

انجمن پنجاب لاہور کی طرز پر سیالکوٹ میں بھی ایک انجمن تھی۔ اس انجمن کا مقصد یورپ کے جدید علوم وفنون کو اردو زبان میں ترجمہ کرکے لوگوں کو ان سے روشناس کرانا تھا۔ میر حسن بھی اس انجمن کے کاموں میں حصہ لیا کرتے تھے۔

☆☆☆

حکومت نے 1889ء میں اسکاچ مشن کو سیالکوٹ میں کالج کھولنے کی اجازت دی۔ اسکاچ مشن اسکول میں گیارہویں جماعت کا اضافہ ہوگیا اور پھر بارہویں جماعت کا بھی اضافہ ہوگیا۔ میر صاحب ان جماعتوں کو بھی عربی، فارسی اور اردو پڑھانے لگے۔

کالج جانے کا وقت ہوتا تو شاگردوں سے وقت مقرر کرلیے جاتے تھے۔ ان کے گھر کے دروازے پر چھ لڑکے میر صاحب کے باہر آنے کا انتظار کرتے۔ آپ جب گھر سے نکلتے تو یہ چھ لڑکے ان کے دائیں بائیں ہوکر راہ چلتے چلتے سبق لیتے جاتے۔ جو حد ان کے لیے مقرر ہوتی اس کے بعد وہ جدا ہوجاتے۔ ان کی جگہ چھ مزید لڑکے مل جاتے۔ وہ جدا ہوتے تو تیسرا گروہ مل جاتا جو کالج کے دروازے تک ان سے پڑھتا جاتا۔ یہ سب کچھ کسی فیس کے بغیر ہوتا۔ یہ ایسی مثال تھی جو سیالکوٹ میں کیا دنیا میں ملنی مشکل تھی۔ گھر کا سودا سلف لینے جاتے تو بھی چند طلبہ ساتھ ہوتے، انہیں راہ چلتے پڑھایا کرتے تھے۔

کالج میں بھی یہ حال تھا کہ طلبہ ان کے پیریڈ کے منتظر رہتے تھے۔ ان کی کلاس میں طلبہ کا ذوق وشوق دیدنی ہوتا تھا۔ کالج کے اساتذہ کا بھی ان سے محبت کا یہی حال تھا۔ کالج کا پرنسپل ان کی پذیرائی کے لیے تیار ملتا تھا۔

وقت کی پابندی کا ایسا خیال تھا کہ کالج جاتے وقت ایک رومال میں ٹائم پیس باندھ کر لے جاتے تھے تاکہ وقت کی پابندی برقرار رہے۔ دیر سے کالج پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ دیکھا یہ گیا ہے کہ جب کسی ادارے میں کسی کی قدر ومنزلت بہت بڑھ جاتی ہے اور وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اب اسے کوئی کچھ کہنے والا نہیں تو وہ اس کا غلط فائدہ اٹھاتا ہے۔ ادارے کے کاموں پر اپنے کاموں کو ترجیح دینے لگتا ہے، لیکن میر صاحب کو اپنی کسی خوبی پر غرور نہیں تھا۔ تمام تر مصروفیات کے باوجود ایک منٹ کی بھی دیر انہیں گوارہ نہیں تھی۔

ایک روز کالج اسٹاف کی میٹنگ تھی۔ میر صاحب اتفاق سے دو منٹ دیر سے پہنچے۔ دو منٹ دیر سے آنا کوئی حیثیت نہیں رکھتا کسی اور سے یہ حرکت ہوگئی ہوتی تو کوئی توجہ بھی نہ دیتا لیکن میر صاحب کی حد تک یہ نہایت غیر معمولی بات تھی۔ انگریز پرنسپل نے محض انہیں چھیڑنے کے لیے گھڑی دکھائی۔

''مولوی صاحب! آپ نے پورے دو منٹ ہمیں انتظار کرایا۔''

''پھر کیا ہوا!'' میر صاحب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ''یہ نہیں دیکھتے کہ ہم نے اس دنیا میں آپ کا کتنے برس انتظار کیا ہے؟''

وہ پرنسپل ان سے کئی برس چھوٹا تھا۔ یعنی دنیا میں میر صاحب کے بہت بعد میں آیا تھا اس لیے یہ مذاق اس کے

لیے نہایت موزوں ثابت ہوا۔

اس کالج کے ایک پرنسپل نے ایک مرتبہ محرم کے دنوں میں لیکچر دیتے ہوئے کہا' مسلمانوں کے رسول نے نہ معجزات دکھائے نہ نواسوں کی شفاعت کی۔ میر صاحب نے لیکچر کے بعد تقریر کرتے ہوئے اس کا جواب دیا۔

''ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شفاعت لے کر گئے تھے مگر خدا نے کہا کہ انہوں نے تو میرے بیٹے کو سولی پر چڑھا دیا' میں آپ کے نواسے کو کیا کروں؟''

اسی انگریز پرنسپل نے اذان کے لفظ پر میر صاحب سے کہا' مولوی صاحب ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں' خفا نہ ہونا۔ یہ کیا بات ہے کہ آپ کے خدا کو جب تک پانچ مرتبہ نہ پکارا جائے' وہ سنتا ہی نہیں۔

میر صاحب نے برجستہ جواب دیا ''ہاں صاحب' ہمارا خدا ایسا نہیں ہے کہ آٹھویں دن ٹن ٹن کی بے معنی آواز سن کر خوش ہوجائے۔''

اس کے بعد اذان کی حکمت اور اس کے معنی اس انداز میں سمجھائے کہ وہ پرنسپل بول اٹھا ''مولوی صاحب! آپ گواہ رہیں تو میں آج سے مسلمان ہوتا ہوں' لیکن مصلحت یہ ہے کہ اسے اخفا میں رکھا جائے۔''

اس پرنسپل کی وفات سیالکوٹ میں ہوئی۔ آپ اس کی وفات پر اس کی کوٹھی پر پہنچے تو وہاں موجود سوگواروں نے آپ کو گھیر لیا۔

''صاحب کی وصیت کے مطابق آپ کو بلایا گیا ہے۔ جس کمرے میں صاحب کی میت ہے' وہاں آپ اکیلے جائیں گے۔ آپ اجازت دیں گے تو میت اٹھائی جائے گی۔''

میر صاحب کمرے میں گئے۔ اس کے لیے دعا کی۔ پھر اجازت دی تو میت اٹھا کر دفن کی گئی۔ یہ راز صرف میر حسن کو معلوم تھا کہ وہ مسلمان ہوچکے ہیں۔ انہوں نے اس راز کا حق ادا کیا اور وصیت کا حق ادا کیا۔

آپ اسلام کے خلاف ایک بات سننے کے روادار نہیں تھے لیکن تعصب نام کو نہیں تھا۔ ہندو' سکھ' عیسائی' حتیٰ کہ قادیانی تک ان کے حسن اخلاق سے متاثر تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہر مذہب کے لوگ اپنے بچوں کو میر صاحب کی شاگردی میں دینا اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھے اور ان سے عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کرنا اپنی خوش نصیبی سمجھتے تھے۔ قانونی دنیا کی ایک مشہور و معروف شخصیت کنور سین کو ان کے والد بھیم سین نے مڈل میں سنسکرت پڑھنے کے لیے کہا۔ حالانکہ بھیم سین فارسی کے عالم تھے اور عربی اچھی خاصی جانتے تھے۔ میر صاحب نے کنور سین کو عربی پڑھنے کا مشورہ دیا۔ بہت دن تک کنور سین اور ان کے والد کے درمیان تکرار ہوتی رہی بالآخر یہ طے ہوا کہ کنور سین عربی بھی پڑھیں گے اور سنسکرت بھی۔ دیکھیں کس میں نمبر زیادہ آتے ہیں۔

کنور سین کو ایک پنڈت ان کے گھر پر سنسکرت پڑھانے لگے اور میر صاحب اپنے گھر پر کنور سین کو عربی کا درس دینے لگے۔ ایک معاوضہ لیتا تھا' دوسرا اسے فریضہ سمجھ کر پڑھا رہا تھا۔ کنور سین عربی کے امتحان میں کامیاب ہوگئے۔ میٹرک کے امتحان میں بھی اس پرچے میں اعلیٰ نمبر حاصل کیے۔

اس طالب علم کی بنیاد اتنی مضبوط ہوگئی تھی کہ جب یہ انگلینڈ گیا تو آئی سی ایس کے امتحان میں بھی اس نے عربی زبان کا پرچہ رکھ کر اعلیٰ پوزیشن حاصل کی۔

میر صاحب کے شاگردوں کی کامیابی کی وجہ یہ تھی کہ وہ عام اساتذہ کی طرح شاگردوں کو محض سبق رٹانے پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ ان میں فارسی اور عربی کا صحیح ذوق پیدا کردیتے تھے۔ علامہ اقبال کے علاوہ ان کے بیسیوں شاگرد ایسے تھے جو عربی' فارسی کا صحیح ذوق رکھتے تھے۔

ایک مشکل اس وقت پیش آئی جب یونیورسٹی کی طرف سے یہ ہدایت ہوئی کہ فارسی اور عربی کے طلبہ جوابات انگریزی میں لکھا کریں۔

میر صاحب سخت الجھن میں پڑ گئے۔ انہوں نے یونیورسٹی کے ان احکامات پر قطعی احتجاج نہیں کیا کیونکہ وہ انگریزی تعلیم کے حق میں تھے اور سمجھ رہے تھے کہ آئندہ انگریزی زبان ہی مسلمانوں کے کام آئے گی۔ طلبہ کو یہ زبان سیکھنا چاہیے۔ اس کشادہ دلی کے باوجود ان کے لیے الجھن یہ تھی کہ وہ انگریزی نہیں جانتے تھے۔ انہوں نے اس وقت کمال فیصلہ کیا۔ انگریزی نہ جاننے کے باوجود طلبہ کو انگریزی ترجمے کی مشق کرانے کا فیصلہ کیا۔

انہوں نے عربی کی بائبل خریدی اور کلاس روم میں لے گئے۔ طلبہ کو حکم دیا کہ انگریزی بائبل پڑھو۔ اس طرح لفظوں کا مقابلہ کرکے انہیں عربی سے انگریزی میں منتقل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ پھر یہ معمول بن گیا۔ خود انہیں بھی اچھی خاصی مشق ہوگئی۔ ایک ایک حرف پر توجہ کا یہ حال تھا کہ کوئی طالب علم پڑھتے وقت انگریزی کا ایک لفظ بھی چھوڑ جاتا تو ٹوک دیتے۔

یہ ایک طریقہ تھا ترجمے کی مشق کرانے کا ورنہ ان کے جذبہ دین داری کو یہ خیال بھی تھا کہ بائبل کی عبارت سن کر

طلبہ متاثر نہ ہوجائیں یا ان پر غلط اثر نہ پڑے۔ اس لیے یہ معمول بھی تھا کہ آخری پانچ منٹ میں بائبل کے اصل موضوع پر تنقید فرمادیتے تھے تاکہ طلبہ کا ذہن صاف ہوجائے۔

آپ کی اس اسلام دوستی کے سب ہی دل سے معترف تھے۔ ایک بار وہ کالج کے چند شاگردوں کے ساتھ سرسید سے ملنے گئے۔ سرسید ان طلبہ سے بڑی محبت سے ملے اور بڑی شفقت سے پوچھا۔

"آپ کہاں تعلیم حاصل کرتے ہیں؟"

"اسکاچ مشن کالج' سیالکوٹ میں۔" طلبہ نے جواب دیا۔

"یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ تم مسلم ہوکر عیسائیوں کے کالج میں پڑھتے ہو۔ تمہیں اپنے مذہب کے حقائق کا علم نہیں۔ تم پادریوں کے زیراثر آجاؤ گے۔"

میر حسن ایک طرف بیٹھے خاموشی سے یہ گفتگو سن رہے تھے۔ جب سرسید کے تیور زیادہ ہی بگڑنے لگے تو انہیں دخل دینا پڑا۔ وہ سرسید سے مخاطب ہوئے۔

"یہ قصور میرا ہے۔ مجھ سے پڑھنے کے لیے یہ طلبہ وہاں داخل ہوئے ہیں۔"

"اگر ایسا ہے تو پھر کوئی حرج نہیں۔ پھر تو سب مسلمانوں کے بچوں کو اسکاچ مشن کالج میں داخل ہونا چاہیے۔"

سرسید کو معلوم تھا کہ میر حسن عیسائیوں کے اسکول میں پڑھاتے ضرور ہیں لیکن نماز روزے کی سختی سے پابندی کرتے ہیں اور اسلامی تعلیمات سے طلبہ کی روح کو منور کرتے رہتے ہیں۔

میر حسن چھوٹی سی عمر میں نماز کے پابند ہوگئے تھے۔ نفلی عبادت خاموشی سے اور چھپ کر ادا کرتے تھے۔ روزے باقاعدگی سے رکھتے تھے۔ ایک بار رمضان سے فارغ ہوکر آپ گھر واپس آرہے تھے' گرمی کا موسم تھا۔ شدید لو چل رہی تھی۔ راستے سنسان تھے۔ آپ نے ہونٹوں پر زبان پھیری ہونٹ خشک پڑے تھے۔ سر پر دھوپ کی بارش ہورہی تھی۔ پیاس کی شدت جو بڑھی تو غش کھا کر گر پڑے۔ لوگ دوڑ کر آپ کو اٹھا کر ایک دکان پر لے گئے اور ہوش میں لانے کی سعی کرنے لگے۔

"گرمی نہیں دیکھ رہے ہو کیسی پڑ رہی ہے۔ انہیں صندل شربت پلاؤ۔"

"ارے وہ سامنے عطار کی دکان ہے۔ دوڑ کر کوئی شربت لے آئے۔"

"مولوی صاحب روزے سے ہوں گے۔ جان دے دیں گے مگر شربت نہیں پئیں گے۔"

"بھائی' وہ بے ہوش ہیں۔ جان بچانے کے لیے کچھ بھی کیا جاسکتا ہے۔ جاؤ شربت لاؤ۔"

ایک ساتھ کئی لوگ دوڑ پڑے۔ سکھ عطار کی دکان سامنے تھی۔ اس نے بھی یہی کہا کہ مولانا' یقیناً روزے سے ہوں گے۔ یہ شربت کبھی نہیں پئیں گے۔ لوگوں نے اس کی بات نہیں مانی۔ عطار سے شربت لیا اور گلاس کو مولانا کے لبوں سے لگانے کی کوشش کی۔ انہوں نے فوراً آنکھیں کھول دیں اور انگلی کے اشارے سے اس فرحت بخش جام سے بیزاری کا اظہار کیا۔ ہوش آنے پر آپ کو تانگے پر گھر پہنچادیا گیا۔

دوسرے دن آپ وقت مقررہ سے چند منٹ پہلے ہی کالج پہنچ گئے۔ پرنسپل کو معلوم ہوچکا تھا کہ ایک دن پہلے ان پر کیا گزری ہے۔ وہ تو یہ توقع کررہے تھے کہ میر صاحب آج کالج تشریف نہیں لائیں گے۔ انہیں دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔

"آپ آج بھی کالج آگئے؟ چند روز آرام کرتے۔"

"آپ کا بہت بہت شکریہ۔" میر حسن نے کہا "کالج سے میرا تعلق معاشی بنا پر ہے اور ملازمت سے شکم پروری مقدر ہے لیکن جس تعلق کی بنا پر یہ مصاحب یا تکلیف برداشت کرتا ہوں' وہ عشق اور محبت کا رشتہ ہے اور اسی راہ میں جان کی کیا حیثیت ہے۔ مذہبی احکام سے انحراف میرے لیے ممکن نہیں۔"

مرزا غلام احمد قادیانی ملازمت کے سلسلے میں سیالکوٹ آئے تو سیالکوٹ کی مذہبی فضا میں ایک ہلچل مچ گئی۔ آئے دن مناظرے ہونے لگے۔ بعض لوگ متاثر بھی ہورہے تھے اور مرزا غلام احمد کے ہاتھ پر بیعت کررہے تھے۔ یہ ایک نئی صورت تھی جس سے میر حسن کو واسطہ پڑ رہا تھا۔ انہوں نے سرسید کو خط لکھ کر اس صورت حال پر ان کی رائے طلب کی۔ سرسید کا جواب آیا۔

"مرزا غلام احمد قادیانی کے کیوں لوگ پیچھے پڑے ہیں۔ اگر ان کے نزدیک ان کو الہام ہوتا ہے تو بہتر۔ ہم کو اس سے کیا فائدہ۔ نہ ہمارے دین کام کا ہے اور نہ دنیا۔ ان کا الہام ان کو مبارک رہے۔ اگر نہیں ہوتا تو صرف اُن کے توہمات اور خلل دماغ کا نتیجہ ہے تو ہم کو اس سے کیا نقصان۔ وہ جو ہوں' سو ہوں اپنے لیے ہوں...... جھگڑا اور تکرار کس بات کا ہے۔ ان کی تصانیف میں نے دیکھی ہیں' وہ اسی قسم کی ہیں جیسا کہ ان کا الہام یعنی نہ دین کے کام کی' نہ

دنیا کے کام کی......''

سرسید کے اس جواب نے میر حسن کو مطمئن کر دیا۔ وہ غیر متعصب ذہن رکھتے تھے لیکن ہندو، مسلم اور سکھ وغیرہ سب ہی ان کے شاگرد تھے۔ مشنری اسکول میں پڑھاتے تھے۔ انگریزی کی حمایت کرتے تھے لیکن مسلمانوں میں اٹھنے والے فتنے کی آنچ ان کے ذہن تک پہنچنے لگی تھی۔ سرسید کے جواب نے انہیں مشورہ دیا کہ اس فتنے سے بھی رواداری سے نمٹنا ہے۔

وہ سیالکوٹ کے اہم آدمی تھے۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ کوئی نووارد سیالکوٹ میں آکر ٹھہرے اور میر حسن سے ملاقات نہ ہو۔ مرزا غلام احمد بھی ان سے ملے اور ان کی عربی دانی کے ساتھ ساتھ ان کے حسن اخلاق سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ میر حسن نے ان کے عقائد سے متفق نہ ہونے کے باوجود ان سے ملاقاتیں جاری رکھیں۔ جب کبھی سیالکوٹ کچہری کی طرف گزر ہوتا، مرزا سے ملاقات ضرور کرتے۔

جب مرزا غلام احمد قادیانی کا شہرہ ہوا تو دیگر مذاہب کے لوگ خم ٹھونک کر میدان میں آگئے۔ عیسائیوں انہیں مناظرے کی دعوت دے ڈالی۔ اس مناظرے کے لیے کسی منصف کی بھی ضرورت تھی۔ اہل شہر کو اور خود مرزا صاحب کو ان پر اتنا اعتماد تھا کہ انہیں اس مناظرے کا منصف مقرر کیا گیا۔ اگلی مرتبہ ہندوؤں نے مناظرہ کیا تو بھی انہی کو منصف مقرر کیا۔

مرزا غلام احمد کا اثر رسوخ بڑھتا جا رہا تھا۔ بہت سے لوگ ان کے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ بیعت کی یہ کہانی ان کے خاندان میں بھی سنی جانے لگی۔ ان کے چچا زاد بھائی میر حسام الدین ان سے عمر میں پانچ سال بڑے تھے، قادیانی ہوگئے۔ سخت مزاج اور درشت خو تھے لٰہذا خاندان کے دوسرے لوگوں کے ساتھ زبردستی کرنے لگے۔ ایک روز وہ میر صاحب کے پاس آئے۔ دو کتابیں ان کے ہاتھ میں تھیں۔ ایک کتاب کے کچھ صفحے مڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے ان صفحات کو کھولا اور درشتی سے حکم دیا۔

''یہ عبارت پڑھو۔''

''کیا پڑھوں؟''

''انہیں پڑھو اور بتاؤ، مسیح فوت ہوگیا یا نہیں؟''

''فوت ہوگیا ہوگا۔'' میر صاحب نے عبارت پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''پھر آئے گا؟''

''تمہارے والد میر فیض اللہ مر کر آئے ہیں۔''

''بے ایمان، کافر، منکر خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔'' میر حسام الدین زور سے دہاڑے اور کتابیں اٹھا کر اپنے مکان کی سیڑھیاں چڑھ گئے۔

اس کے بعد بھی میر حسام الدین نے بہت کوشش کی لیکن میر صاحب اپنے عقیدے پر قائم رہے لیکن اپنے عقیدے کو کسی پر زبردستی ٹھونسنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ مرزا غلام احمد سے بھی ان کے تعلقات اسی طرح خوشگوار رہے۔ عرصہ دراز بعد جب ایک مرتبہ میر حسن کا قادیان جانا ہوا۔ مرزا غلام احمد ان دنوں قادیان میں مقیم تھے۔ میر حسن مسجد جا کر اس جگہ بیٹھ گئے جہاں مرزا غلام احمد بیٹھتے تھے۔ لوگوں نے آپ کو وہاں سے اٹھا دیا۔ آپ دوبارہ پھر اسی جگہ آکر بیٹھ گئے۔ اتنی دیر میں مرزا غلام احمد آگئے اور سلام کا جواب دے کر ایک طرف بیٹھ گئے لیکن صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ پہچانے نہیں ہیں۔ میر صاحب نے توجہ دلائی۔ مرزا صاحب نے غور سے دیکھا تو پہچان گئے۔

''عبدالکریم۔'' مرزا صاحب نے ایک شخص کو آواز دی۔ جب وہ گیا تو اس سے کہا ''میر صاحب کو اچھی جگہ ٹھہراؤ اور ہاں میر صاحب کو صبح صبح بھوک لگتی ہے۔ انہیں ہر وقت ان کی مرضی کے مطابق کھانا دیا جائے۔ دوسرے انہیں مطالعے کا شوق ہے۔ اچھی اچھی کتابیں پڑھنے کو دی جائیں۔''

''مرزا صاحب، آپ شرمندہ نہ کریں۔ فقیر تو ہر حال میں خوش رہ لیتا ہے۔'' میر حسن نے کہا۔

''صبح کی چائے آپ میرے ساتھ پئیں گے۔'' مرزا صاحب نے کہا اور اپنے خلفا کے ساتھ کہیں چلے گئے۔

جب تک میر حسن قادیان میں رہے۔ مرزا صاحب کی ہدایات کے مطابق ان کی تواضع کی جاتی رہی۔ مرزا صاحب بھی کبھی کبھی تشریف لے آتے اور بڑے انہماک سے گفتگو کرتے رہتے۔''

''جب میر حسن قادیان سے آنے لگے تو مرزا صاحب یکے کے ساتھ ساتھ دو میل پیدل چل کر پکی سڑک پر آئے اور میر صاحب سے راز و نیاز کرنے لگے۔ یہ وہ باتیں تھیں جو وہ میر حسن ہی سے کر سکتے تھے۔

''میں جو کچھ کر رہا ہوں، کیا یہ دکانداری ہے؟'' مرزا غلام احمد نے پوچھا۔

''یہ مجھے معلوم نہیں۔ میں نے آپ کے رجسٹر نہیں دیکھے، آمدن اور خرچ کی پڑتال نہیں کی۔ اس حالت میں کیا کہہ سکتا ہوں۔''

''مسیح فوت ہوگیا۔''

"فوت ہو گیا ہوگا۔"
"وہ دوبارہ آئے تو کیا کرے گا۔"
"یہ مسیح کو معلوم ہے۔"
اس سے زیادہ کچھ اور پوچھنے کی مرزا صاحب میں تاب
یں تھی۔ انہوں نے میر حسن کو خدا حافظ کہا۔ میر صاحب کا
لہ آگے بڑھ گیا اور مرزا غلام احمد قادیان کی طرف لوٹ
ئے۔

☆☆☆

خطۂ پنجاب، اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد سے
ریخ کے کئی ادوار دیکھ چکا تھا۔ احمد شاہ ابدالی کے پنجاب پر
لوں نے سکھوں کے لیے پنجاب میں حکومت قائم کرنے کا
ستہ ہموار کر دیا تھا۔ افغانوں کے آئے دن حملوں کی وجہ
ے پنجاب میں سیاسی بدامنی اور بے انتظامی پھیل گئی تھی۔
س کی وجہ سے سکھ اپنے آپ کو ایک وحدت میں منظم کرنے
ں کامیاب ہو گئے۔ پھر سکھوں کی حکومت قائم ہو گئی لیکن
ام کی زندگی میں سکون برائے نام تھا۔ ان کے حملوں اور
ٹ کھسوٹ سے عوام پریشان اور بدحال تھے۔ رنجیت سنگھ
ے بھی جب پختہ بنیادوں پر پنجاب میں حکومت قائم کی تو
ٹ کھسوٹ اور ناانصافی کا دور دورہ اس زمانے میں بھی
جود تھا۔ میر حسن سکھ دور کے آخری سالوں میں پیدا ہوئے
ے۔

سکھوں سے دوسری لڑائی میں انگریزوں نے ان کو
ست دی اور اس طرح انگریز حکومت قائم ہو گئی۔ اس
مت کے قائم ہونے سے عام لوگ لوٹ کھسوٹ سے بچ
ے۔

میر حسن کی عمر پانچ سال کی تھی کہ جب انگریزوں کی
مت قائم ہوئی۔ انہوں نے سکھ دور کے مظالم کی بہت سی
تانیں اپنے بڑوں سے سنی تھیں لیکن وہ انگریز دور کی
یں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ انگریزوں کے
ں آنے سے مغربی علوم پڑھائے جانے لگے جس سے
ں زندگی میں قدرے خوشگوار تغیرات پیدا ہونے لگے
ہ اپنی زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے کی جستجو کرنے لگے۔
توں سے انصاف ملنے لگا۔ جان لیوا بیماریوں کا سائنسی
یقے سے علاج ہونے لگا۔ آمد و رفت کے لیے ریل گاڑی
ہولت میسر ہوئی۔ میر حسن نے ان سب چیزوں کو قدر کی
ے دیکھا۔ ان کی ذاتی زندگی میں بھی اس دور کے فوائد
آ رہے تھے۔ اسکاچ مشن نے اپنے ادارے میں
ت دے کر ان کو اور ان کے ماں باپ کو آرام اور سکون
سے زندگی بسر کرنے کا موقع فراہم کیا۔ اسی مشن نے اسپتال
قائم کر کے دکھی اور بیمار انسانوں کو صحت دی۔ میر صاحب ان
نعمتوں کے قدردان تھے۔ سرسید سے دوستی اور سرسید کے رفقا
سے گہرے تعلقات نے ان کے ترقی پسند خیالات کو مزید جلا
بخشی چنانچہ 1867ء میں جب ملکہ برطانیہ کی ڈائمنڈ جوبلی کا
موقع آیا تو انہوں نے اس جشن کو تزک و احتشام سے منانے
کی تحریک سیالکوٹ کے مسلمانوں کے دلوں میں بیدار کی۔
بڑے پیمانے پر چندہ جمع کیا گیا۔ مخیر حضرات سے مدد لی گئی۔
ان کے کہے کو کون ٹال سکتا تھا! پورا شہر دلہن کی طرح سج گیا۔
ہر طرف رنگ برنگی جھنڈیاں اور آرایشی دروازے نظر آ رہے
تھے۔ ایک جلسے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ لوگوں کا جوش و خروش
دیدنی تھا۔ جلسہ گاہ میں کئی ہزار کا مجمع موجود تھا کہ جلسے کی
کارروائی شروع ہوئی۔ سب سے پہلے منشی غلام قادر، میونسپل
کمشنر سیالکوٹ نے تقریر کی۔ اس کے بعد میر صاحب کو
دعوت خطاب دی گئی کہ وہ اپنے جذبات و احساسات سے
عوام کو آگاہ کریں۔ میر حسن ایک شان بے نیازی سے اٹھے
اور عوام سے مخاطب ہوئے۔ طویل تمہید بیان کرنے کے بعد
وہ اصل موضوع کی طرف آئے۔

"صاحبو! ایسے ملک عظیم الشان یعنی ہندوستان میں
جہاں ہر قسم کے مختلف المذاہب لوگ بستے ہوں اس خوبی اور
دانش مندی سے حکومت کرنا کہ کسی فرقے کی آسایش جسمانی
اور روحانی میں خلل نہ آئے، اسی مدبر اور دور اندیش قیصرہ ہند
کا کام ہے۔ اس کے مبارک زمانے میں جو خوبیاں اور
آسایشیں ہیں ان کو بیان کرنا عین دوپہر میں سورج کو انگلی
سے بتانا ہے۔ نادان سے نادان بھی جانتا ہے کہ یہ آسایش
جو اس وقت ادنیٰ درجے کے آدمی کو میسر ہے زمانہ سابق میں
کسی اعلیٰ درجے کے آدمی کو بھی میسر نہ تھی۔ راستے ایسے
صاف اور ستھرے ہیں کہ گھروں کے صحن بھی ایسے
مصفا نہیں۔ سیدھے ایسے کہ اندھے بھی ٹھوکر نہ کھائیں۔
پیغام کے وہ ذریعے کہ مہینوں کے سفر دنوں میں اور دنوں کے
سفر گھنٹوں میں بلا مشقت طے کر لو۔
تحصیل علوم کے لیے بیت العلوم اور مدارس موجود ہیں
جن میں طرح طرح کے علوم و صنائع سکھائے جاتے ہیں۔
غربا و امرا کے لیے جسمانی بیماریوں کے رفع کرنے کو ایسے
ایسے حاذق اطبا و ڈاکٹر موجود ہیں کہ انہیں بقراط زمانہ کہیں تو
مبالغہ نہیں۔ حفظ امن ایسا کہ شب و روز گلی کوچے بازار میں
پاسبان کمر بستہ گشت کرتے پھرتے ہیں۔ تجارت کو وہ رونق
کہ گھر بیٹھے دنیا کے جس حصے سے جو چیز چاہو منگا لو۔ دفع

تنازعات کے لیے محکمۂ عدالت موجود ہیں۔ جج ایسے عالم اور قانون داں کہ بات کی تہ تک پہنچ جائیں۔ غرض جس طرح خدا کی نعمتیں بے شمار ہیں اسی طرح پر اس مہربان و عادل قیصرہ ہند کی مہربانیاں بھی رعایا پر افزوں از شمار ہیں۔''

☆☆☆

وہ کھلے دل سے انگریزوں کی خدمات کا ذکر کررہے تھے تو یہ کس طرح ممکن تھا کہ حکومت وقت ان کی خدمات کا اعتراف نہ کرتی۔ یہ اعتراف خوشامد کا صلہ نہیں تھا بلکہ ان کی قابلیت اور خلوص کا اعتراف تھا۔ مشن آپ کو جو ماہوار مشاہرہ دیا کرتا تھا' اسے حلال کرنے کے لیے آپ خون پسینہ ایک کردیا کرتے تھے۔ اسکول اور کالج کے علاوہ گھر پر' راستے میں غرض کہ ہر فالتو وقت میں بغیر کسی معاوضے کے طلبہ کو تعلیم سے نوازا کرتے تھے۔ اپنی اہمیت کا کبھی غلط فائدہ نہیں اٹھایا۔ کوئی رعایت وصول نہیں کی۔ جوں جوں آپ کی ملازمت بڑھتی گئی' ویسے ویسے آپ اور زیادہ محنت اور لگن سے پڑھانے لگے۔ قناعت ایسی تھی کہ کبھی زیادہ کی آرزو یا آشیانہ بدلنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ احباب بھی اگر اصرار کرتے کہ اپنی قابلیت کا فائدہ اٹھاؤ۔ مشن میں کب تک پڑے رہوگے۔ دنیا بہت بڑی ہے۔ تو ان کا جواب یہی ہوتا کہ یہ لوگ بہت اچھے ہیں۔ بڈھے بیل کو بھس ڈالے جاتے ہیں۔ وہ اسی پر خوش تھے کہ وہ جب بھی تانگے پر گھر سے کالج جاتے ہیں تو مسٹر گیرٹ پرنسپل ہو کر ان کو خود ہاتھ سے پکڑ کر تانگے سے اتارا کرتے ہیں۔

اردو کے عظیم انشاپرداز محمد حسین آزاد' گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی زبان وادب کے پروفیسر تھے۔ میر صاحب کے دوستوں میں تھے۔ میر صاحب جب بھی لاہور جاتے تھے' آزاد ہی کے پاس قیام کرتے تھے۔ آزاد ان کی علمیت کے معترف تھے اور یہ بانگ دہل کہتے تھے۔

''صرف مولوی صاحب کے شاگرد ہی اردو' عربی اور فارسی صحیح پڑھ سکتے ہیں اور سمجھ سکتے ہیں۔''

یہی محمد حسین آزاد جب ملازمت سے ریٹائر ہوئے تو محکمۂ تعلیم پنجاب نے تجویز پیش کی کہ محمد حسین آزاد کے بعد مولوی میر حسن ان کے جانشین ہوں۔ یہ تجویز ان تک پہنچی بھی لیکن انہوں نے صاف انکار کردیا۔

''مشن نے اس وقت میری خدمات کا اعتراف کیا تھا جب مجھے کوئی جانتا نہ تھا۔ اب میں ہرگز مشن کالج کو نہیں چھوڑ سکتا۔''

یہ خبر دوستوں تک پہنچی تو انہیں بڑا دکھ ہوا۔ اتوار کا دن تھا۔ میر صاحب کے عزیز دوست اللہ داد شیخ ہر اتوار کو ان کے ساتھ کھانا کھاتے تھے اور ایسی وضع داری تھی کہ کبھی اس میں تعطل نہیں آیا۔ اس وقت بھی وہ میر حسن کے گھر کی طرف جارہے تھے کہ مولوی امام الدین اور مولوی انشاء اللہ خان بھی مل گئے۔

''شیخ صاحب' آپ تو وہی ملا کی دوڑ مسجد تک۔ مولوی میر حسن کے گھر جارہے ہوں گے۔'' دونوں حضرات نے پوچھا۔

''ہاں بھائی' اس کے گھر کھانا کھانے کی ایسی عادت پڑ گئی ہے کہ لگتا ہے اتوار پندرہ دن کے بعد آنے لگا ہے۔''

''شیخ صاحب' سنا ہے انہوں نے گورنمنٹ کالج کی پروفیسری ٹھکرادی۔''

''ٹھیک ہی تو کیا ورنہ اتوار کے اتوار مجھے لاہور جانا پڑتا۔''

''یہ بھی تو دیکھیے وہاں جا کر ان کے جوہر کیسے کھلتے۔''

''دیکھیے آج دسترخوان پر یہ ذکر بھی چھڑ جائے گا۔''

''چلیے ہم بھی چلتے ہیں۔ ہم بھی ایسے مجبور کریں گے۔''

''وہ کسی کی ماننے والے نہیں ویسے بسم اللہ' چلیے۔''

تینوں حضرات مولوی صاحب کے گھر کے قریب پہنچے تو انہیں گھر کے باہر ٹہلتے ہوئے دیکھا۔ غالباً اللہ داد شیخ کو آنے میں دیر ہوگئی تھی' اس لیے مولوی صاحب گھر آکر باہر نکل آئے تھے۔ اب جو باقی دو دوستوں پر نظر تو کھل اٹھے۔

''اخاہ! آج کا اتوار تو یادگار رہے گا۔'' میر حسن نے کہا۔

''یہ تو کھانے کے بعد ہی معلوم ہوگا۔''

''بھائی' ہمارے حکیم حسین کو بھی لیتے آتے۔ ان کے ساتھ شطرنج کی ایک آدھ بازی ہوجاتی۔''

''ہم تو اتفاقی آگئے ورنہ اتوار تو آپ کا اللہ داد کے ساتھ گزرتا ہے۔''

''ارے' ہم لوگ بازاریوں کی طرح ابھی تک باہر کھڑے ہیں۔ چلو اندر چلو۔''

ڈیوڑھی سے مکان کے اوپر جانے والی سیڑھیاں چڑھ کر یہ لوگ اوپر پہنچے۔ کمرے میں سفید چاندنی کا فرش بچھا تھا۔ ایک طرف حقہ رکھا تھا جو ابھی ابھی تازہ کیا گیا تھا۔

''بھائی' ایک دور حقے کا چل جائے۔ اس کے بعد کھانا کھائیں گے۔''

''کھانے سے پہلے آج کچھ باتیں ہوں گی میر صاحب۔''

"وہ تو کھانے کے بعد بھی ہو سکتی ہیں۔ پورا دن
ا ہے۔"
"بات ایسی ہے کہ زیادہ صبر نہیں ہوتا۔"
"کیا بات ہے مولوی انشا۔ کچھ خفا نظر آ رہے ہو۔"
"خفگی کی تو بات ہی ہے میر صاحب۔ گورنمنٹ کالج
ہور میں آپ کو تدریس کی پیش کش ہوئی اور آپ نے
ھکرا دی۔ دوستوں سے مشورہ تو کرنا چاہیے تھا۔"
"اچھا' تو یہ بات ہے کالج والوں کی سفارش لے کر
ئے ہو۔"
"ہم اپنے دلوں کی سفارش لے کر آئے ہیں۔"
"تم لوگ مجھے کیوں سیالکوٹ سے نکالنے پر تلے
وئے ہو؟"
"مذاق چھوڑیے سید صاحب! یہ پیش کش قبول
کر لیجیے۔"
"میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ یہ فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر
کیا ہے۔"
"یہ کون سا عقل مندی کا فیصلہ ہے؟"
"دیکھو بھائی' اس ادارے نے میرا اس وقت ساتھ دیا
ب کوئی مجھے جانتا بھی نہیں تھا۔ اب میں کسی قابل ہو گیا ہوں
نہیں اور چلا جاؤں۔ یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ میری وضع داری
کے خلاف ہے۔"
"اس ادارے کی بہت خدمت کر لی اب آپ کو لاہور
انا چاہیے۔"
"بھائی' وہ بڑا شہر ہے۔ وہاں پڑھانے والے بہت مل
ئیں گے۔ یہاں کے غریب لڑکوں کے لیے تو میں ہی ایک
ہ گیا ہوں۔ انہیں میں بھی چھوڑ کر چلا جاؤں۔ نہیں بھائی
یں۔ یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ اور پھر یہاں میری قدر و منزلت
ہے۔ نئے شہر میں کہاں ٹھوکریں کھاؤں گا؟"
"وہ آپ کے لیے نیا شہر نہیں ہے۔ محمد حسین آزاد تو
پ کے دوست بھی ہیں۔"
"سچی بات تو یہ ہے کہ میں خود کو ان کی جانشینی کا اہل نہیں
سمجھتا۔"
"یہ تو آپ کی کسرِ نفسی ہے۔ ان کی رائے آپ کے
ے میں کچھ اور ہے۔"
"یہ ان کی بڑائی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میں کیا
"
"آپ کی تنخواہ بھی تو بڑھ جائے گی۔"
"اب کون سی کم ہے! میری ضرورت سے بہت زیادہ
ہے۔"
"آپ کو کون سمجھائے میر صاحب!"
"اس بڑھاپے میں کیا سمجھوں گا۔ میں ملازم سے کہتا
ہوں' پہلے کھانا کھاتے ہیں پھر اور باتیں ہوں گی۔"

دوستوں نے سمجھ لیا کہ میر صاحب اب اکتا چکے ہیں۔
اس موضوع پر بات کرنا ہی نہیں چاہتے۔ اس سے زیادہ انہیں
مجبور کرنا مناسب بھی نہیں تھا۔ کھانا چن دیا گیا۔ کھانے کے
بعد ایک مرتبہ پھر حقے کا دور چلا۔ درمیان میں باتیں بھی ہوتی
رہیں لیکن موضوع دوسرے تھے۔

دوستوں نے سوچا تھا کہ شاید محمد حسین آزاد کی جانشینی
آپ کو گوارا نہیں اس لیے انکار کر دیا لیکن آپ کا ایک ہی
جواب تھا "میرے والدین' میری اولاد اور خود میں نے
پرورش پائی ہے۔ اس لیے اس کالج کو چھوڑ نہیں سکتا۔"

☆☆☆

سر عبدالقادر کا ادبی رسالہ "مخزن" ایک اہم قومی
خدمت انجام دے رہا تھا۔ اس رسالے میں علامہ اقبال کا
کلام تواتر سے شایع ہو رہا تھا۔ انگلستان روانگی سے قبل اقبال
کا کلام محض شاعرانہ خوبیوں کی وجہ سے مقبول ہو رہا تھا لیکن
قیامِ انگلستان کے دوران ان کے نظریات میں بہت کچھ
تبدیلی آگئی۔ تعلیم کے دوران انہوں نے مشرق و مغرب کے
فلسفیوں کا مطالعہ نہایت گہری نظر سے کیا۔ اتحاد المسلمین کی
تحریک سے بھی متاثر ہوئے۔ وہ انگلستان سے واپس آئے تو
ملت و قوم کا ایک واضح فلسفہ ان کے پاس تھا۔ اب وہ رسالہ
"مخزن" سے نکل کر لوگوں کے دلوں میں آباد ہو رہے تھے۔
اب وہ محض شاعر نہیں' قومی رہنما تھے۔ تمام مسلمانوں کی
نگاہیں ان پر جمی ہوئی تھیں۔ میر حسن کو اپنے اس شاگرد پر فخر
تھا۔ کوئی اقبال کا نام لیتا تو فخر سے ان کی چھاتی چوڑی
ہو جاتی۔

1918ء میں علامہ اقبال کی فارسی تصنیف "رموز بے
خودی" شایع ہوئی۔ اس فارسی منظوم کتاب میں مختلف
چھوٹے چھوٹے عنوانات کے تحت فرد اور جماعت کی خودی کا
رشتہ دکھایا گیا تھا۔ اس کتاب کا دیباچہ خود اقبال نے تحریر کیا
اور اپنے استاد کا ذکر کیا۔

"استادی حضرت' قبلہ مولانا مولوی سید میر حسن
صاحب دام فیضہم پروفیسر مرے کالج سیالکوٹ مولانا شیخ غلام
قادر صاحب گرامی' شاعر خاص نظام دکن خلد اللہ ملکہ واجلالہ
میرے شکریے کے خاص طور پر مستحق ہیں کہ ان دونوں بزرگ
سے بعض اشعار کی زبان اور طرز بیان کے متعلق قابل قدر

مشورہ ملا۔''

سر عبدالقادر کی طرح سر فضل حسین بھی اقبال کے عاشقوں میں تھے۔ انہوں نے پہلی مرتبہ قانون کی ڈگری لے کر سیالکوٹ میں پریکٹس کا آغاز کیا تو اقبال کے سب سے بڑے حوالے مولوی میر حسین سے ملاقات پر مجبور ہو گئے اور ان کی قابلیت، دینی معلومات، ان کے خیالات اور طرز بیان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ پہلی ملاقات مسلسل ملاقاتوں میں بدلنے لگی۔ ہر ملاقات میں مولوی میر حسین کی ایک نئی خوبی سامنے آتی۔ وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ اقبال کے استاد کو ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔

یہ ملاقاتیں جاری تھیں کہ سر فضل حسین، پنجاب کے وزیراعلیٰ بنا دیے گئے۔ اقبال کا نام ''سر'' کے خطاب کے لیے طے پا چکا تھا۔ ایک خطاب ''شمس العلما'' کا تھا۔ اس کے لیے سر فضل حسین نے پنجاب کی کسی شخصیت کو یہ خطاب دینے کی تجویز پیش کی۔ ان کے ذہن میں یقیناً مولوی میر حسن کا نام ہوگا کیونکہ پنجاب میں ان دنوں میر صاحب سے زیادہ فاضل شخصیت اور کون ہوگی۔ انہیں یقین ہوگا کہ جب نام پیش ہوں گے تو میر حسن کا نام سرفہرست ہوگا۔

1922ء کے آخری دن تھے کہ اقبال کو گورنر ہاؤس لاہور سے دعوت نامہ ملا۔ گورنر پنجاب میکلگن ان سے ملنے کا متمنی تھا۔ اقبال کو معلوم ہو چکا تھا کہ ان کا نام ''سر'' کے خطاب کے لیے تجویز کیا گیا۔ یہ ملاقات اس سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ اقبال نے اس دعوت کو قبول کیا اور گورنر ہاؤس پہنچ گئے۔ قدرے انتظار کے بعد گورنر پنجاب ملاقات کے لیے کمرے میں داخل ہوا۔ اقبال کا اندازہ درست نکلا۔ گورنر نے انہیں اس خطاب کی مبارک باد دی۔

جب گورنر اس خطاب کے سلسلے میں گفتگو کا آغاز کر چکا تو گفتگو کا رخ ایک ایسی جانب مڑ گیا جس نے بعد میں تاریخی حیثیت اختیار کر لی۔ گورنر نے اقبال سے مشورے کے لیے الفاظ خرچ کر دیے۔

''گورنمنٹ کے خزانے میں ایک خطاب شمس العلما کا بھی ہوتا ہے۔''

''کیا وہ بھی میرے نام کیا گیا ہے؟'' اقبال نے مزاحاً کہا۔

''کاش! ایسا ہو سکتا۔ یہ دو خطاب ایک ہی شخصیت کو مل سکتا تو آپ بھی اس کے اہل ہیں۔ میں تو یہ کہنا چاہتا تھا کہ اس خطاب کے لیے اس دفعہ صوبہ پنجاب کی باری ہے اگر آپ کے ذہن میں کوئی موزوں نام ہو تو بتائیں۔''

''اس شرط پر بتاتا ہوں کہ اس کے بعد کسی اور نام پر غور نہ کیا جائے۔''

یہ شرط ایسی نہیں تھی جو گورنر کے لیے بہ آسانی قابل قبول ہوتی۔ اس کے ماتھے پر ابھرنے والی شکنیں صاف بتا رہی تھیں کہ اسے اس تجویز کو ماننے میں تامل ہے۔

''اچھا نام بتائیں۔'' گورنر کو بالآخر کہنا پڑا۔

''یہ نام ہے میرے استاد سید میر حسن (سیالکوٹی) کا۔''

''یہ بتایئے کہ انہوں نے کون کون سی کتابیں تصنیف کی ہیں تاکہ ان کی یہ کتابیں میں وزارت تعلیم کو بھیج سکوں۔''

''انہوں نے کوئی کتاب تو تصنیف نہیں کی۔''

''پھر تو فیصلہ بہت مشکل ہے۔''

''ان کی زندہ تصنیف میں ہوں۔ میں کہ جسے گھر بلا کر ''سر'' کے خطاب کی پیش کش کی جارہی ہے۔''

''آپ نے مجھے لاجواب کر دیا ہے۔ میں اس تصنیف کو جھٹلا نہیں سکتا۔''

''ایک اور شرط بھول گیا ہوں۔''

''فرمایئے۔''

''اگر اس خطاب کی سفارش منظور ہو جائے تو میرے ضعیف العمر استاد کو یہ سند لینے کے لیے سیالکوٹ سے لاہور آنے کی زحمت نہ دی جائے۔''

''کوشش کروں گا کہ انہیں یہ زحمت نہ دی جائے۔''

اقبال ان شرائط کو منظور کرانے کے بعد گورنر ہاؤس سے باہر آئے تو ان کی گردن فخر سے تنی ہوئی تھی۔ انہیں وہی خوشی ہو رہی تھی جو کسی بڑے فرض کی بجا آوری کے بعد ہوتی ہے۔ انہوں نے استاد کے احسانات کا حق ادا کر دیا تھا۔ اس خاموش طبع اور گوشہ گیر استاد کا حق، جس نے اپنے لیے بھی کچھ طلب نہیں کیا۔ جس کے شاگرد پنجاب بھر میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ ایک تصنیف تھا لیکن وہ خود سادگی کا نمونہ بنا کم آمدنی ہی میں کامیاب زندگی گزار رہا تھا۔

وزارت تعلیم کی منظوری اور دیگر کاغذی کارروائیوں سے گزرنے کے بعد منظوری مل گئی کہ مولوی میر حسن شمس العلما کے خطاب کے اہل ہیں۔ انہیں اس خطاب سے سرفراز کیا جائے۔

یہ شرط بھی منظور ہو گئی تھی کہ اس خطاب کی وصولی کے لیے میر صاحب کو نہیں بلایا جائے گا۔ اب یہ سوال تھا کہ یہ خطاب ان کی طرف سے کون وصول کرے گا۔ یہ مشکل جلد ہی حل ہو گئی۔ میر حسن کے بڑے صاحب زادے سید علی نقی گورنر ہاؤس میں میڈیکل انچارج تھے۔ انہیں حکم دیا گیا کہ

س اعزاز کو وہ وصول کریں۔

یکم جنوری 1923ء کو ایک تقریب میں شمس العلما کی
ند' سفید ریشمی چوغا' کلاہ اور سفید چاندی نما میڈل ان کے
ماحب زادے ڈاکٹر سید علی نقی کو عطا کیا گیا۔ علی نقی نے اپنے
بیٹے سید محمد عبداللہ کے ذریعے یہ چیزیں اپنے والد ماجد
ید میر حسن کے پاس سیالکوٹ پہنچا دیں۔

مولوی میر حسن بستر پر دراز تھے۔ چند طالب علم فرش پر
بیٹھے تھے۔ کسی عربی شعر کا مطلب پوچھا جا رہا تھا۔ مولوی
ماحب ایک نکتے کی وضاحت کر رہے تھے۔ کسی نے بتایا کہ
مد عبداللہ' لاہور سے آئے ہیں۔ انہیں معلوم تھا کہ کیوں آئے
وں گے۔ اس لیے فوراً بلا لیا۔

''آؤ بیٹا' عبداللہ۔ کیسا ہے تیرا باپ؟''

''وہ ٹھیک ہیں دادا جان۔ آپ بھی عجیب ہیں۔ آپ کو
طاب ملنا تھا اور آپ ہی تقریب میں نہیں آئے۔''

''مجھے اس قسم کی تقریبات سے کوئی دلچسپی نہیں۔''

''آپ کو اتنے اچھے اچھے لفظوں میں یاد کیا گیا اور آپ
یں تھے۔''

''میری تعریف کرنے والے یہ طالب علم بیٹھے ہیں۔
رے لیے یہی بہت ہے۔''

''یہ سند آپ کو ملی ہے۔ یہ ریشمی چوغا ہے یہ کلاہ اور یہ
یڈل۔''

''یہ سب لے جا کر ذکی کی دلہن کو دے دو۔''

''دادا جان آپ کو ذرا بھی خوشی نہیں ہوئی؟''

''میں خطاب سے اتنا ہی ڈرتا ہوں جتنا عتاب سے۔
ہہ دینا اپنے باپ سے۔'' میر حسن نے کہا اور شعر کا مطلب
بھانے میں مشغول ہو گئے۔ شاید انہیں یاد بھی نہیں رہا تھا کہ
س کو کوئی خطاب ملا ہے۔

☆☆☆

میر حسن کو خطاب ملنے یا نہ ملنے کا احساس نہ ہو لیکن ان
ے احباب' تلامذہ اور سب سے زیادہ اس ادارے کو فخر تھا
ں میں وہ پڑھاتے تھے۔۔ ان کے اعزاز واحترام میں
یہ اضافہ ہو گیا تھا۔ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں
لوگ جلنے لگتے ہیں لیکن ان کے لیے لوگوں کے دلوں میں
ں ہی محبتیں تھیں۔ ان کے ساتھی ان پر جان نچھاور کرتے
یہ بھی ہوتا ہے کہ اکثر لوگ اس عروج پر پہنچ کر تھک
ہیں۔ ان کا سفر رک سا جاتا ہے لیکن میر حسن کے
۔ درس و تدریس کی کوئی منزل نہیں تھی۔ نہ وہ تھک رہے
ور نہ ان سے فیض پانے والوں کی تعداد کم ہو رہی تھی۔

سیالکوٹ میں نائٹ اسکول' بالغوں کے لیے قائم ہوا تو پیرانہ سالی کے باوجود میر حسن نے اس اسکول میں پڑھانے کا فیصلہ کر لیا۔ ادھیڑ عمر اور بوڑھے لوگ اس اسکول کا رخ کرنے لگے۔ میر صاحب کی موجودگی نے ان لوگوں کو مزید حوصلہ دیا۔ بالغان کی تعلیم میں پڑھانے سے زیادہ ان افراد میں پڑھنے کا شوق پیدا کرنا ہوتا ہے۔ میر صاحب سے زیادہ یہ کام کون بہتر انجام دے سکتا تھا۔ کبھی کبھی ایسے واقعات بھی رونما ہو جاتے تھے کہ کوئی اور ہوتا تو برہم ہو جاتا لیکن میر صاحب ان طالب علموں کی عمروں کا لحاظ کرتے ہوئے بات کو ہنسی مذاق میں اڑا دیتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے حروف ابجد' تختۂ سیاہ پر لکھے اور ایک شخص سے پوچھا' لو بھائی ان حروف کو غور سے دیکھو اور بتاؤ ان میں سے ''ل'' کون سا ہے۔ اس شخص پر اس نے ''ص'' پر انگلی رکھ دی۔

''شاباش' شاباش۔'' مولوی صاحب نے کہا۔

''یہ شاباش کا کون سا موقع ہے۔'' پروفیسر دین محمد بھٹی نے پوچھا جو اس وقت وہاں موجود تھے۔

''انہیں اتنا تو معلوم ہے کہ ل' ص' اور ی' حروف ہیں۔''

اس جواب پر پوری کلاس زعفران زار بن گئی۔ وہ صاحب بھی خوش ہو گئے کہ مولوی صاحب نے ان کی تعریف کی ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے دوستی کا ماحول بن گیا۔ کچھ دیر گپ شپ کا سلسلہ جاری رہا پھر پڑھائی کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا۔

ایک روز محلے کے چند کشمیری بچے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے پڑھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اب وہ اس مرتبے کے پروفیسر تھے کہ ان معمولی بچوں کو پڑھانا ان کے شایان شان نہیں تھا لیکن یہ ہو نہیں سکتا تھا کہ کوئی پڑھنے کے لیے کہے اور وہ کسی اور دروازے کا پتا بتا دیں۔ انہوں نے اس مطالبے کو بھی پورا کیا اور رات کے وقت ان کشمیری بچوں کو پڑھانے لگے۔ لوگوں کو حیرت ہوتی تھی کہ اس عمر میں وہ اتنا کام کیسے کر لیتے ہیں؟ سوتے بھی ہیں یا نہیں۔ عبادت کے لیے الگ وقت نکال لیتے تھے۔ تہجد کے وقت اٹھ بیٹھتے۔ تہجد کی نماز ادا کر کے کچھ دیر کے لیے کمر ٹکا لیتے پھر فجر کی نماز کے لیے مسجد چلے جاتے۔ روزانہ کا معمول تھا کہ مسجد سے قبرستان چلے جاتے اور اپنی مرحومہ بہن کی قبر پر فاتحہ پڑھتے۔

آپ کی ایک بہن کا انتقال 1876ء میں ہو گیا تھا جب آپ کی عمر 22 برس تھی۔ مرنے والی بہن نے بڑے دکھ سے

کہا تھا کہ میں نے تو شادی بھی نہیں کی ہے۔ میری قبر پر فاتحہ پڑھنے کون آئے گا۔ کوئی اولاد ہوتی تو کبھی کبھار فاتحہ کے لیے تو آجاتی۔ آپ نے اس وقت اپنی بہن سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ان کی قبر پر روزانہ فاتحہ کے لیے آیا کریں گے۔ برسوں گزر گئے تھے' آندھی ہو یا برسات۔ آپ بلاناغہ فاتحہ کے لیے قبرستان جاتے تھے۔ صرف اس وقت ناغہ ہوتا تھا جب آپ سیالکوٹ سے باہر ہوتے تھے۔ حافظ تو تھے ہی قبرستان جاتے اور آتے کلام پاک کا ورد کرتے جاتے۔ واپس آتے تو کوئی نہ کوئی طالب علم انتظار میں بیٹھا ہوتا۔ اسے درس دیتے۔ کالج جانے کے لیے نکلتے تو لڑکوں کی ٹولیاں' مقام بدل بدل کر آپ کے ساتھ ہوتے جاتے۔ کالج سے واپس آتے۔ کچھ دیر آرام کرتے اور پھر طالب علم آنا شروع ہوجاتے۔ یہ سلسلہ رات گئے تک جاری رہتا۔

بڑھاپے کی عمر نے اپنے اثرات دکھانے شروع کردیے تھے۔ صحت پر تو کوئی زیادہ اثرات مرتب نہیں ہوئے لیکن بینائی تیزی سے کم ہونے لگی تھی۔ دوستوں نے مشورہ دیا کہ اب وہ آنکھوں کا استعمال کم کردیں۔ رات کے وقت طلبہ کو پڑھانے سے گریز کریں لیکن انہیں یہ گوارا نہیں تھا کہ وہ اپنی صحت کے لیے طلبہ کا نقصان کریں۔ اپنے معمولات میں کوئی کمی نہ آنے دی۔ جب بینائی خطرناک حد تک گرنے لگی تو احباب اور بیٹیوں کے اصرار پر ڈاکٹر میجر اسمتھ کے پاس معائنے کے لیے پہنچے۔ اس نے آپریشن کا مشورہ دیا۔ مولوی صاحب کو اب بھی تکلف تھا لیکن جب دواؤں سے افاقہ نہ ہوا تو آپ آپریشن کے لیے تیار ہوگئے۔

آپریشن کا دن طے ہوچکا تھا۔ میر صاحب تیار ہوکر نکلنے والے تھے کہ ان کا ایک شاگرد چیت رام لدھیانوی آگیا۔ وہ خواجہ حافظ کا دیوان پڑھنے آیا تھا۔ آپ اسے دیکھ کر بیٹھ گئے۔

''لاؤ میاں' پہلے سبق پڑھ لیں۔ یہ آپریشن واپریشن تو ہوتا رہے گا۔''

''نہیں مولوی صاحب' آپ جائیں بلکہ میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔''

''واہ میاں واہ۔ تم اتنی دور سے پڑھنے آئے ہو اور میں تمہیں چھوڑ کر ایک معمولی ڈاکٹر کے دربار میں حاضر ہوجاؤں۔''

میر صاحب کے صاحب زادے ذکی بھی قریب کھڑے تھے' انہوں نے بھی سمجھایا لیکن میر صاحب کہاں ماننے والے تھے! چیت رام کو بھی مجبور ہونا پڑا۔ اس نے حافظ کا دیوان کھولا اور بیٹھ گیا۔ وہ شعر پڑھتا جاتا تھا اور میر صاحب اس کی باریکیاں بیان کرتے جاتے تھے۔ چیت رام کہتا تھا' مولوی صاحب! بس بہت ہوچکا اور میر صاحب اگلا شعر پڑھنے کی فرمایش کرتے تھے۔ انہوں نے اتنی ہی دیر پڑھایا جتنا وقت اس کے لیے مقرر تھا۔

ڈاکٹر اسمتھ نے آپ کی آنکھوں کا آپریشن کیا۔ ڈاکٹر کو امید تھی کہ آپریشن بہت کامیاب ہوا ہے۔ بینائی یقیناً بحال ہوجائے گی۔ چند روز اسپتال میں گزارنے کے بعد مولوی صاحب گھر تشریف لے آئے۔ پٹی کھل چکی تھی۔

ایک روز ان کے صاحبزادے ان سے ملنے کے لیے کمرے میں آئے۔ یہ دیکھ کر ان کے قدم کمرے سے باہر ہی رک گئے کہ میر صاحب نماز ادا کررہے ہیں اور اس وقت سجدے میں ہیں۔ وہ سلام پھیرنے کا انتظار کرنے لگے۔ مولوی صاحب نے جیسے ہی سلام پھیرا' محمد ذکی تقریباً برس پڑے۔

''آپ یہ کیا کررہے ہیں؟''

''دیکھتے نہیں' نماز پڑھ رہا ہوں۔ تمہیں اتنی حیرت کیوں ہورہی ہے؟''

''حیرت کی بات نہیں ہے۔ ڈاکٹر نے آپ کو جھکنے سے منع کیا ہے اور آپ سجدہ کررہے ہیں۔ بینائی زائل ہوسکتی ہے۔''

''ڈاکٹر کے کہنے سے میں اللہ کے حضور سر جھکانے سے رک جاؤں۔''

''نماز بے شک ادا کریں۔ سجدہ تو نہ کریں۔''

''میں خود پر پابندی عاید نہیں کرسکتا۔ بینائی جاتی ہے تو جائے۔ اللہ کرم کرے گا۔ جاؤ تم اپنا کام کرو۔''

اس کے بعد بھی ان کے گھر والے مستقل ٹوکتے رہے لیکن وہ چھپ چھپ کر نمازیں پڑھتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کی بینائی کمزور ہوتے ہوتے مستقل ضائع ہوگئی۔ اس کے باوجود آپ ایک ماہ تک کالج جاتے رہے لیکن ایک ماہ بعد کالج کی انتظامیہ نے آپ کو کالج کی ملازمت سے سبکدوش کردیا۔

دن رات طلبہ کے درمیان گھرا رہنے والا شخص اکیلا رہ گیا۔ زندگی بھر کام کرنے والا شخص اچانک یہ محسوس کرنے لگا جیسے اس کے لیے کوئی خاص کام نہیں رہ گیا۔ ان کے بیٹے اعلیٰ ملازمتوں پر فائز تھے۔ انہیں اب تنخواہ کی ضرورت نہیں تھی نہ پنشن کی لیکن کام کرنے کی عادت پڑی ہوئی تھی۔ کچھ دن لاٹھی ہاتھ میں لے کر گھر کے چکر کاٹتے رہے' زینہ اترنے کی

مشق کرلی تھی۔ پھر کسی کو ساتھ لیے بغیر بازار میں نکلنے لگے۔ یہ [illegible] تھا لیکن دل روز بہ روز اداس ہوتا جارہا تھا۔ وہ طالب علم یاد آتے تھے جن کے جھرمٹ میں زندگی گزری تھی۔ بالآخر انہیں اداسی کو دور کرنے کی ایک ترکیب سوجھ ہی گئی۔ انہوں نے اپنے گھر میں درس قرآن کا اہتمام کرلیا۔ حافظ قرآن تو تھے ہی، طلبہ آتے، مولوی صاحب تلاوت کرتے اور قرآن آیات کی تفسیر بیان کرتے۔ کچھ ایسے طلبہ بھی آجاتے جو کہیں اور تعلیم حاصل کررہے تھے۔ کوئی مشکل درپیش ہوتی تو اپنا مسئلہ لے کر مولوی صاحب کے پاس آجاتے۔ میر صاحب کتاب دیکھے بغیر اکثر عبارتیں حافظے کے زور پر دہرا دیتے اور مشکل مقامات کی تشریح بیان کردیتے۔

بینائی زائل ہوئی تو دیگر حواس اس قدر ترقی کرگئے کہ محض آواز سن کر کسی کے اچھے یا برے ہونے کی تصدیق کردیتے۔ ایک مرتبہ پروفیسر عطاء اللہ ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک طالب علم میر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میر صاحب نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پروفیسر عطاء اللہ نے میر صاحب سے کہا کہ یہ لڑکا صورت سے تو شریف معلوم ہوتا ہے۔ میر صاحب نے فوراً کہا۔

''ہاں۔'' پروفیسر صاحب نے کہا۔

''آپ نے دیکھا تو نہیں پھر تصدیق کیسے فرمائی۔ میر صاحب نے جواب دیا کہ آواز سے پہچانتا ہوں۔

بینائی زائل ہونے کے بعد ان کی جسمانی زندگی تقریباً ختم ہوکر رہ گئی تھی۔ چند دوست دلداری کے لیے آجاتے تھے۔ ان دوستوں سے خبریں مل جاتی تھیں۔ اکثر مسلمانوں کی موجودہ صورت حال پر بحث چھڑ جاتی تھی۔ میر صاحب کو اس بات کا بڑا رنج تھا کہ مسلمان اخلاقی طور پر بہت پست ہوچکے ہیں۔ ایک روز فرمانے لگے کہ مسلمان نوجوان بڑے بے راہ رو ہوگئے ہیں سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کہاں پہنچیں گے۔

دوستوں نے پوچھا۔

''یہ کیسے معلوم ہوا؟''

فرمانے لگے ''میں جب کبھی بازار سے نکلا تو پیچھے سے تیزی کے ساتھ کوئی شخص اس طرح نکلا جیسے اسے دوسرے رستہ چلنے والوں کا کوئی خیال نہ ہو۔ میں نے جب بھی ایسے شخص کا بازو پکڑ کر پوچھا کہ بھائی آپ کون ہیں؟ تو معلوم ہوا کہ مسلمان ہیں کسی غیر مسلم سے کبھی ایسی حرکت سرزد نہیں ہوئی۔''

آپ کے پوتے سید مہدی علی اور سید عابد علی دن کے وقت باری باری آپ کے کمرے میں حاضر رہا کرتے تھے تاکہ بوقت ضرورت ان کے احکام کی تکمیل کی جاسکے۔ ایک روز سید مہدی علی اپنی ڈیوٹی سے فارغ ہوکر کمرے سے باہر جانے لگے تو عابد علی سے دریافت کیا کہ مہدی کہاں ہے۔ عابد علی نے جواب دیا کہ اب میں آگیا ہوں، مہدی جارہے ہیں۔ میر صاحب برجستہ تو تھے ہی فوراً دو شعر موزوں کردیے۔

آزردہ کردیا ہے دل بے قرار نے
جاتا ہوں بار بار میں در پر پکارنے
دہرا مکان بنایا ہے رہنے کو یار نے
جب میں ادھر گیا وہ ادھر سے نکل گیا

وہ اپنے آپ کو بہلائے ضرور رکھتے ہیں۔ روز بہ روز صحت گرتی جارہی تھی۔ موت سے کچھ روز قبل بالکل ہی چارپائی پکڑ لی۔ نماز کے وقت توانائی بحال ہوجاتی۔ نماز ادا کرتے اور کمزوری پھر لیٹنے پر مجبور کردیتی۔ آپ کے پوتے دن رات آپ کی خدمت میں لگے ہوئے تھے۔ ایک روز سید مہدی علی نے آپ کے چہرے کی طرف دیکھا۔

''دادا جان، آج آپ کا چہرہ بہت زیادہ زرد نظر آرہا ہے۔''

''ہاں میاں، یہ شعر سن لو۔

زرد رخ دکھلا دیا غم کا اثر بتلادیا
ہم نے ان کو اپنا زور و زر دکھلا دیا

''آپ کے بیسیوں شاگرد تھے جو پنجاب بھر میں اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز تھے۔ دن بھر عیادت کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ سیکڑوں ایسے تھے جو مالی امداد کے لیے بضد ہوتے تھے لیکن آپ نے زندگی بھر اپنا کام خود کیا تھا۔ اس وقت بھی کسی مالی امداد کے لیے تیار نہیں تھے۔ ایک روز ایک شاگرد جو محکمہ تعلیم پنجاب میں اعلیٰ عہدیدار تھا، عیادت کے لیے آیا اور تین ہزار روپے کی خطیر رقم نذر کرنی چاہی۔ آپ نے یہ رقم لوٹادی۔

24 ستمبر 1939ء کو صبح ہی سے آپ کی طبیعت میں گھبراہٹ اور بے چینی پیدا ہوگئی۔ کسی کا انتظار تھا۔ بار بار دروازے کی طرف جاتے تھے اور لوٹ آتے تھے۔ فقیر چند اور جوگی رام جو آپ کے نہایت عقیدت مند شاگرد تھے روزانہ عیادت کے لیے آتے تھے اس وقت بھی آئے ہوئے تھے لیکن آپ کی گھبراہٹ میں کمی نہیں آئی۔

''مولوی صاحب آپ کو کس کا انتظار ہے؟''

''تم لوگ آگئے اب کس کا انتظار ہوگا۔''

''آج آپ کی طبیعت میں وہ دل جمعی نہیں ہے۔''
''بھائی تم لوگوں کے ساتھ جگن ناتھ آتا تھا' آج وہ نہیں آیا۔''
''اگر آپ کو اس کا انتظار ہے تو ہم ابھی کسی کو بھیج کر اسے بلوالاتے ہیں۔''
''نہیں بھائی' آدمی کو اپنے بھی کام ہوتے ہیں، کوئی کام ہوگیا ہوگا۔''

دوپہر کو کھانے کا وقت ہوا اور میر صاحب کے دنوں پوتے ان کے ہاتھ دھلانے کے لیے کمرے میں آئے تو نفر چند اور جوگی رام نے اجازت طلب کی' مولوی صاحب نے دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔

کھانا کھانے کے بعد مولوی صاحب نے کچھ دیر قیلولہ کیا۔ پھر نماز ادا کرکے دوبارہ بستر پر لیٹ گئے۔ ان کا پوتا مہدی علی ان کے سرہانے بیٹھا ان کی بے قراری کو غور سے دیکھ رہا تھا، مولوی صاحب کبھی ایک کروٹ لیتے تھے کبھی دوسری کروٹ۔ کبھی لگتا تھا سوگئے ہیں کبھی کسی کام کے لیے مہدی علی کو آواز دے لیتے تھے، جب شام تک یہی کیفیت رہی تو مہدی علی نے اس بے چینی کا سبب پوچھا۔

''دادا جان' آپ کی طبیعت آج کچھ ٹھیک معلوم نہیں ہوتی۔''
''میں ٹھیک ہوں' مجھے کیا ہونا ہے۔''
''پھر یہ بے قراری؟''
''یار' جگن ناتھ روزانہ آتا تھا۔ آج نہیں آیا۔ معلوم نہیں وہ کس حال میں ہے؟''
''کل آجائے گا۔ آپ تو یونہی پریشان ہوجاتے ہیں۔''
''نہیں بھائی' کسی کو بھیج کر معلوم کراؤ۔ اس کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟ ایسا کرو اسے بلوا ہی لو۔''

سعادت مند پوتے نے اسی وقت آدمی بھیجا۔ جگن ناتھ اسی وقت حاضر ہوگیا۔ مولوی صاحب کی بے قراری جاتی رہی۔ اٹھ کر بیٹھ گئے۔

''آج کیوں نہیں آئے۔''
''آج کچھ کام تھا۔''
''میں ڈر گیا تھا کہ تم بیمار نہ ہوگئے ہو۔''
''نہیں مولوی صاحب' میں اچھا بھلا ہوں۔ آج نہیں آسکا تھا مگر کل ضرور آتا۔''
''اسی لیے تو ہم نے تمہیں بلوالیا۔ کل ہمیں کچھ کام ہوجاتا اور ملاقات رہ جاتی۔ بس اب تم جاؤ۔ اور ہاں کل ضرور آنا یہ نہ ہو کہ کل پھر کوئی کام نکل آئے۔''
''جی مولوی صاحب' کل ضرور آؤں گا۔''
''کل بہت سے لوگ ہوں گے، تمہاری کمی مجھے شدت سے محسوس ہوگی۔''
''میں ضرور آؤں گا۔''

جگن ناتھ نے حکم کی تعمیل کی۔ اسے یوں بھی اٹھنا پڑا کہ مولوی صاحب کے چند بے تکلف احباب آگئے تھے جن میں ان کے دوست احباب آگئے تھے جن میں ان کے دوست بھیم سین بھی شامل تھے۔

''بھیم سین کم بخت آنکھیں دھوکا دے گئیں۔ ورنہ آج جی چاہ رہا تھا کہ شطرنج کی ایک بازی ہوجاتی۔''
''جب سے آپ کی آنکھیں گئی ہیں میں نے بھی شطرنج لپیٹ کر رکھ دی ہے جب آپ ہی سے نہ کھیل سکوں تو کسی سے کیا کھیلنا!''
''ارے مجھ بڈھے کے لیے اپنے شوق کیوں بند کرتے ہو۔ میرے لیے کیا' کیا چھوڑو گے۔ کیا دنیا بھی چھوڑ دو گے؟''
''مولوی صاحب آپ کی خاطر دنیا چھوڑ تو دوں لیکن سنا ہے وہاں ہندو' مسلمان الگ الگ کردیے جائیں گے اس لیے نہیں ٹھیک ہے۔ ہم دونوں ساتھ تو ہیں۔''
''میاں' یہ ساتھ بھی کب تک' آج نہیں تو کل' جدا تو ہونا ہے۔''
''ایسی ناامیدی کی باتیں آپ کے منہ سے جچتی نہیں ہیں۔''
''کب تک امید لیے بیٹھا رہوں! دنیا کے حالات دیکھ دیکھ کر سخت کوفت ہوتی ہے۔''
''دنیا تو اسی طرح بدلتی رہے گی۔ ہم دوستوں میں سے کوئی نہیں بدلا۔''
''بس یہی سوچ کر جی اٹھتا ہوں۔ اللہ نے مجھے احباب ایسے دیے ہیں کہ دنیا میں جی لگا رہا۔''
''یہ احباب اسی طرح آپ کے ساتھ رہیں گے۔''
''ہاں مگر کب تک!'' میر صاحب نے کہا اور نقاہت سے ان کی آنکھیں بند ہوگئیں۔
''میر صاحب' آپ آرام کریں۔ ہم لوگ کل پھر آجائیں گے۔''
''کل ضرور آنا، مجھے تمہاری کمی محسوس ہوگی۔''

احباب نے اجازت لی اور کمرا ایک مرتبہ پھر خالی ہوگیا۔ میر صاحب نے بستر پر ہی عشا کی نماز ادا کی۔ ان کے پوتے نے سونے سے پہلے کی دوا دی۔

سید مہدی کی ڈیوٹی ختم ہوگئی تھی، دوسرا پوتا عابد علی ان کے پاس رات کو رہنے کے لیے کمرے میں آچکا تھا میر صاحب نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔

''بیٹا عابد! آج نیند نہیں آرہی ہے۔''

''آپ کوشش کریں، نیند آجائے گی۔''

''میرے کتب خانے سے دیوان بیدل نکال کر لاؤ۔''

''داداجان اس وقت؟''

''میری آنکھیں ہوتیں تو تمہیں تکلیف نہ دیتا۔''

''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' عابد علی نے کہا اور کتب خانے سے مطلوبہ کتاب لے آیا۔

''پہلی غزل سے پڑھنا شروع کرو جب تک کہ مجھے نیند نہ آجائے۔''

عابد علی نے پڑھنا شروع کیا۔ میر صاحب کہیں کہیں ٹوک دیتے یا عادت کے مطابق کسی کسی شعر کی تشریح کرنے لگتے پھر اچانک عابد علی کو محسوس ہوا جیسے وہ سوگئے ہیں۔ اس نے جان بوجھ کر ایک شعر غلط پڑھا، میر صاحب خاموش رہے۔ مطلب صاف تھا کہ انہیں نیند آگئی ہے، عابد علی نے کتاب بند کی اور خاموشی سے اپنی چارپائی پر آگیا۔ رات کو اس کی آنکھ کھلی۔ میر صاحب اسے آواز دے رہے تھے۔

''شاید تہجد کا وقت ہوگیا۔ مجھے سہارا دے کر اٹھاؤ۔ اپنے اللہ کے حضور سجدہ ریز ہوجاؤں کیا خبر کل کیا ہو؟''

عابد علی نے سہارا دے کر اٹھایا۔ وضو کرایا۔ میر صاحب نے باقاعدہ کھڑے ہوکر تہجد کی نماز ادا کی، یہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ بیمار ہیں یا نقاہت کا غلبہ ہے۔

نماز کے بعد آپ پھر بستر پر لیٹ گئے، عابد علی مطمئن ہوکر اپنے بستر پر چلا گیا۔ فجر کی اذان ہوئی تو عابد علی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا میر صاحب کو فجر کی نماز کے لیے بیدار کرنا تھا، وہ ان کے بستر کے قریب گیا، میر حسن کی روح خالق حقیقی سے جاملی تھی۔ وہ آوازیں دیتا رہ گیا۔ خاموشی ہی خاموشی تھی۔ ستر سال تک تدریس کے عمل میں مصروف رہنے والا ہمیشہ کے لیے خاموش ہوچکا تھا۔

کمرے میں پھیلی ہوئی خاموشی اچانک ٹوٹ گئی۔ عابد کی چیخوں سے گھر گونج گیا، پورے کمرے میں سمٹ گیا۔ تھوڑی دیر میں روشنی پھیل گئی، مولوی صاحب کے الفاظ ذہنوں میں گونج رہے تھے۔ ''کل ضرور آنا'' وہ ایک دن پہلے ہر ایک سے یہی اصرار کررہے تھے، لوگوں نے آنا شروع کردیا تھا۔

جب تک دن نکلتا، آپ کے انتقال کی خبر سیالکوٹ شہر میں پھیل گئی۔ تعلیمی ادارے سرکاری و نیم سرکاری اور نجی ادارے آپ کے سوگ میں بند ہوگئے۔ مسلمان، ہندو، سکھ، عیسائی اور قادیانی غرض یہ کہ سب مذاہب کے لوگ اس بزرگ کے آخری دیدار کے لیے دولت کدے پر حاضر ہونے لگے۔ ہر شخص اس طرح زار زار رورہا تھا جیسے اسی کے گھر کا کوئی فرد ہمیشہ کے لیے اس کا ساتھ چھوڑ کر ایسی دنیا میں چلا گیا ہے جہاں سے کبھی کوئی واپس نہیں آیا۔ وہ اس بزرگ کے سائے سے ہمیشہ کے لیے محروم ہوگئے ہیں کیونکہ وہ اس کی موجودگی میں ایک روحانی یا ذہنی سکون محسوس کرتے تھے۔ یہ بزرگ ان کے دکھ درد میں برابر کا شریک ہوتا تھا۔

مولوی صاحب، خوددار انسان تھے اپنی اولاد تک کا احسان مند ہونا پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کے بڑے صاحبزادے سید علی نقی نے ان کے لیے ایک تانگا بنوایا تھا، یہ تانگا میر صاحب کو کچھ مدت تک گھر سے کالج پہنچاتا رہا۔ میر صاحب نے اس کے کرائے کا حساب کرکے پیسا پیسا اپنے بیٹے کو ادا کردیا چنانچہ وفات کے وقت کسی کی کوئی رقم آپ کے ذمے نہیں تھی رقم تو رقم کسی کا احسان تک ان کے ذمے نہ تھا۔ وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے، میں اپنے ہاتھ کو اوپر رکھنا چاہتا ہوں۔ میری آرزو ہے کہ یہ اسی طرح رہے، نیچے نہ ہو اور کسی کے سامنے نہ پھیلے۔ ان کی یہ آرزو پوری ہوئی۔ اپنے کفن دفن کے لیے سارا خرچ پہلے ہی سے الگ کرکے اپنے بچوں کے حوالے کردیا تھا۔

جنازہ تیار تھا۔ عقیدت مندوں کی بھیڑ اتنی تھی کہ ہر ایک کا کندھا دینا ممکن ہی نہیں تھا جبکہ ہر شخص کی تمنا تھی کہ وہ یہ سعادت حاصل کرے لہٰذا جنازے کے دونوں جانب بڑے بڑے بانس باندھ دیے گئے۔

شہر کی سڑکیں عقیدت مندوں سے بھری ہوئی تھیں۔ دکانیں بند تھیں۔ خواتین گھر کی چھتوں سے پرنم آنکھوں سے اس منظر کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ بزرگ جو ان سڑکوں پر دعائیں تقسیم کرتا ہوا گزرتا تھا، آج آہیں اور سسکیاں اسے رخصت کررہی تھیں۔ کلمہ شہادت کی آوازوں سے شہر گونج رہا تھا۔

جو لوگ جنازے میں شریک نہیں ہوسکے تھے، عیدگاہ میں جمع ہورہے تھے۔ جہاں ان کی نماز جنازہ ادا ہونی تھی۔ نماز جنازہ کے لیے دوپہر تین بجے کا اعلان کیا گیا تھا لیکن عقیدت مند اور سوگوار دو بجے ہی عیدگاہ پہنچ چکے تھے۔

جنازہ عیدگاہ پہنچ چکا تھا۔ آپ کی وصیت کے مطابق آپ کے شاگرد رشید مولانا محمد ابراہیم میر، نماز جنازہ پڑھانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال کا انتظار

تھا جنہیں لاہور سے سیالکوٹ آنا تھا۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ عقیدت مندوں کا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔ بالآخر یہ طے پایا کہ نماز ادا کر دی جائے۔ عیدگاہ سے قبرستان تک جانے میں خاصا وقت لگ سکتا تھا۔ مولانا ابراہیم نے نماز پڑھائی۔

جنازہ قبرستان کی طرف روانہ ہوا۔ ہر آنکھ اشکبار تھی۔ اہل خانہ کو انتظار تھا کہ آپ کے شاگرد رشید سر محمد اقبال کسی نہ کسی طرح پہنچ جائیں اور استاد مرحوم کے آخری دیدار سے مشرف ہوں۔ اسی کشاکش میں مولوی میر حسن کی میت قبرستان پہنچ گئی۔ اقبال اب بھی تشریف نہیں لائے تھے۔ میت قبرستان میں رکھ کر ڈاکٹر صاحب کا انتظار کیا جانے لگا۔ پھر ایک شور سا مچا کہ ڈاکٹر صاحب تشریف لے آئے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے سیالکوٹ آنے کے لیے کوئی مسافر گاڑی نہ مل سکی تھی۔ آپ بذریعہ مال گاڑی' لاہور سے وزیرآباد آئے اور پھر وزیرآباد سے چار بجے سیالکوٹ پہنچے۔

جب ڈاکٹر اقبال آ گئے اور استاد مرحوم کے دیدار سے مشرف ہو چکے تو عصر اور مغرب کے درمیانی عرصے میں سیالکوٹ کی اس بزرگ شخصیت کو پیوند خاک کر دیا گیا۔ اسی جگہ آپ کے والدین' ہمشیرہ اور دوسرے عزیزوں کی قبریں تھیں۔

آپ کی وفات حسرت آیات کی خبر اس وقت کے مشہور روزناموں میں نمایاں طور پر شائع کی گئی۔ روزنامہ انقلاب میں یہ خبر یوں شائع ہوئی۔

''تمام ہندوستان میں یہ خبر نہایت رنج والم کے ساتھ سنی جائے گی کہ 25 ستمبر 1929ء مطابق 21 ربیع الثانی 1348ھ کو ادیب' ادیب فاضل' اجل حضرت قبلہ سید میر حسن صاحب سیالکوٹی نے اس دار فانی سے رحلت کی۔ 25 ستمبر کو (صبح) یہ خبر تار کے ذریعے علامہ اقبال مدظلہ العالی کو پہنچی۔ آپ پہلی ٹرین سے سیالکوٹ روانہ ہو گئے تاکہ نماز جنازہ میں شریک ہو سکیں۔ مولانا میر حسن کی وفات کا صدمہ نہ صرف ان کی اعزہ واقارب اور ہزار ہا تلامذہ بلکہ تمام قوم کو ہوگا جو ایک گراں مایہ ہستی سے تہی دامن ہو گئی۔ علم و حکمت کے آفتاب مطلع اقوام پر ہر روز طلوع نہیں ہوتے نہ بیک وقت اتنے طلوع ہوتے ہیں کہ ایک کا غروب علم کی روشنی کے مدھم پڑھ جانے کا باعث ہو۔''

مرے کالج سیالکوٹ نے ماہ نومبر میں اپنے میگزین میں آپ کی وفات پر تعزیت کی قرارداد اس طرح منظور کی۔

''ہمیں نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ 25 ستمبر 1929ء کو شمس العلما مولوی میر حسن صاحب انتقال فرما گئے۔ مرحوم نے مشن اسکول اور مرے کالج میں 65 سال تک تعلیمی خدمات انجام دیں۔ ہم تہ دل سے ان کے فرزندوں اور عزیز واقارب سے تعزیت کا اظہار کرتے ہیں۔

اس تعزیت میں اس کا اظہار کیا گیا کہ میر حسن کی یاد میں:

1) میر حسن اسکالرشپ

2) کالج کے کتب خانے میں ایک اضافی حصہ قائم کیا جائے

3) اگر فنڈ نے اجازت دی تو میر حسن ہال نیا تعمیر کیا جائے گا۔

ان قراردادوں پر عمل کرنے کے لیے میر حسن میموریل فنڈ کمیٹی تشکیل دی گئی۔ مولوی صاحب کے ایک شاگرد مولوی جمشید علی راٹھور' پروفیسر فارسی اس کمیٹی کے خزانچی مقرر کیے گئے۔ چیئرمین پرنسپل ریورنڈ جان مقرر ہوئے۔

اس کمیٹی کے خزانچی مولوی جمشید علی راٹھور کی طرف سے چندے کی اپیل کی۔ اس اپیل پر مختلف اصحاب نے توجہ بھی دی لیکن چندے میں اتنی رقم جمع نہ ہو سکی اس لیے نہ تو میر حسن کے نام پر ''ہال'' تعمیر کیا جا سکا اور نہ ہی میر حسن اسکالرشپ قائم ہو سکا۔ صرف میگزین کا ''میر حسن نمبر'' نکالنے پر ہی اکتفا کیا گیا۔

ان کے احباب اور شاگردوں کے دلوں میں یہ حسرت کئی برس تک پرورش پاتی رہی کہ میر حسن کے نام پر ایک نیا ہال تعمیر کیا جائے بالآخر 1938ء کالج ہال کے ایک حصے کو میر حسن کے نام سے منسوب کر دیا گیا۔ یہ حسرت پھر بھی رہی کہ ایک نیا ہال تعمیر ہو جاتا۔

مولوی صاحب کے شاگرد کنور سین نے ایک اسکالر شپ اپنے والد بھیم سین اور اپنے مرحوم استاد کے نام پر بھیم سین' میر حسن اسکالرشپ جاری کیا۔ یہ اسکالرشپ اس کو دیا جاتا تھا جو عربی میں اچھے نمبر لے کر کامیاب ہوتا تھا۔

میر صاحب کی وفات پر ان کے شاگرد رشید ڈاکٹر محمد اقبال نے یہ مادہ تاریخ نکالا۔

''ما ارسلنک الا رحمۃ العالمین

(ترجمہ) ہم نے جو تم کو بھیجا ہے تو یہ دراصل دنیا والوں کے حق میں ہماری رحمت ہے۔

میر صاحب اپنی اولاد' رشتے داروں' دوستوں اور شاگردوں کے لیے واقعی رحمت تھے۔

راجندر سنگھ بیدی

بے تاج

ڈاکٹر ساجد امجد

اس شہرۂ آفاق، یگانۂ روزگار، گراں مایہ ادیب کا احوالِ زیست جس کی خیال آفرینی کا سکہ آج بھی اردو ادب میں جاری ہے۔ جس نے قوتِ قلم سے خزانہ، ادبِ اردو کو لبا لب بھر دیا لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ابتدائے سفر میں سکہ بند ادیبوں نے اس کی راہ کھوٹی کرنا چاہی تھی مگر اپنی راہ خود پیدا کرتے ہوئے اس نے خود کو شہنشاہِ بے تاج ثابت کیا اور اردو ادب میں ناموری کا حامل قرار پایا۔ اسی نابغۂ روزگار ادیب کے گریاں و خنداں، سسکتے چہکتے شب و روز کا احوال، قصہء مآل جو بذاتِ خود اردو ادب میں ایک اضافہ ہے۔

صاحبِ طرزِ جادو بیاں قلم کار کے قلم سے راجندر سنگھ بیدی کی جیون کتھا

اک وقتِ خاص میں دو دل ایک ساتھ اس طرح دھڑکے کہ ایک ساتھ رہنے کی قسم کھا بیٹھے۔ ایک سکھ تھا' ایک ہندو۔ بات بنتی تو کیسے بنتی؟ پہلے زمانے کو بیچ میں ڈالا پھر محبت نے اپنا راستہ خود تلاش کرلیا۔ زمانہ ہار گیا' محبت جیت گئی!

ایک لڑکی سیوا دیوی اپنے گھر' امرتسر سے نکلی اور لاہور پہنچ گئی اور یونہی نہیں' گھر سے بھاگ کر پہنچی۔ رسوم و قیود کو ٹھکرا کر پہنچی۔ لاہور کے آریہ سماج مندر میں اس کی شادی' اس کے پریمی بابا ہیرا سنگھ کے ساتھ انجام پا گئی۔ زمانہ ہار گیا' محبت جیت گئی۔

طے یہ ہوا کہ ایک ہی چھت کے نیچے گوردوارہ بھی ہوگا اور مندر بھی۔ گوردوارے کے بھید بھاؤ ہیرا سنگھ جانے' مندر کی ریت رسمیں سیوا دیوی ادا کرتی رہے گی۔

ہیرا سنگھ کا تو مذہب سے تعلق تہواروں تک تھا لیکن سیوا دیوی کٹر برہمن تھی اور ہر روز گیتا کا پاٹھ اس کا معمول تھا۔ اور ہیرا سنگھ عقیدت مند چیلے کی طرح اس کے پاس بیٹھ کر سنا کرتے تھے۔

ہیرا سنگھ' لاہور چھاؤنی کے علاقے صدر بازار میں ڈاک خانے میں پوسٹ ماسٹر تھے اور سنت نگر کے ایک محلے شیام گلی میں سکھ' ہندو ملن کا وہ گھر تھا جہاں وہ سکونت پذیر تھے۔ پڑھے لکھے آدمی تھے۔ گورو صاحبان کی زندگی اور ان سے متعلقہ ساکھیوں کے علاوہ رامائن' مہابھارت اور خدا رسیدہ درویشوں کے قصے انہیں ازبر تھے۔ سیوا دیوی بھی اردو' ہندی خوب جانتی تھیں۔

ہیرا سنگھ صبح صبح ڈاک خانے چلے جاتے' سیوا دیوی گھر کا سونا پن دور کرنے کے لیے گیتا لے کر بیٹھ جاتی یا پھر کبھی کبھی امرتسر کو یاد کر کے آنسو بہا لیتی۔ پچھتاوے کے نہیں' محبت کے۔ بھرا پرا گھر چھوڑ کر آئی تھی' خیال تو آتا ہی ہے۔

پھر اس کی اس تنہائی کو دور کرنے کے لیے ایک کھلونا آ گیا۔ بیٹا پیدا ہوا۔ ہیرا سنگھ نے بڑے چاؤ سے اس کا نام دھرم سنگھ رکھا۔ ہیرا سنگھ کو احساس تھا کہ یہ نام سکھ دھرم کی ترجمانی کرتا ہے۔ سیوا دیوی اسے میری اجارہ داری نہ سمجھ لے۔ اس نے بڑے پیار سے اسے آشا دلائی۔

''تم یہ نہ سمجھ لینا کہ سکھوں جیسا نام دے کر اس بچے کو میں نے سکھ بنا دیا ہے بلکہ صرف بات یہ ہے کہ بیٹا باپ کا ہوتا ہے' اس لیے اسے میں نے اپنے جیسا نام دیا ہے۔ بڑا ہو کر اس کی مرضی' یہ جو جی چاہے بنے۔''

''ناموں میں کیا رکھا ہے' جب میں نے تمہیں قبول کرلیا تو یہ تو میری اولاد ہے۔''

''لڑکی ماں کی ہوتی ہے' اس لیے اگر ہمارے گھر بیٹی ہوئی تو اس کا نام اپنے دھرم کے مطابق رکھنا۔''

''اب تو میرا دھرم آپ ہیں۔''

”بھلی مانس، یہی سوچ رکھ، اسی طرح جیون کٹے گا۔“

سیوا دیوی خوش ہوگئی۔ اب وہ اپنے بھگوان سے یہ دعا کرنے لگی کہ ایک بیٹی بھی اسے مل جائے تاکہ وہ اسے اپنا نام دے سکے۔ جب تک بیٹی آنے ملتی، دھرم سنگھ بھی ہاتھ سے چلا گیا۔ معمولی سا بخار ہوا اور وہ فوت ہوگیا۔

پہلا بیٹا، پہلے پیار کی پہلی نشانی یوں چٹ پٹ ہوگیا کہ سیوا دیوی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اور پھر وہ ایسا پھوٹ پھوٹ کر روئی کہ ہیرا سنگھ کو سنبھالنا مشکل ہوگیا۔ وہ کئی دن تک ڈاک خانے سے چھٹی لے کر بیٹھا رہا۔ پھر سیوا دیوی کو خود سے زیادہ اس پر رحم آنے لگا۔ اس نے دل پر پتھر رکھ لیا۔

زندگی انہیں ساتھ لے کر پھر آگے بڑھنے لگی۔ سیوا دیوی، بھگوان کی سیوا میں اور زیادہ مشغول ہوگئی۔ گیتا کے پاٹھ طول کھینچنے لگے۔ ”بھگوان میری تنہائی کو دور کرے۔“

بھگوان نے اس کی سن لی۔ اس مرتبہ اس کے آنگن میں بیٹی ذات نے پاؤں دھرے تھے۔ وہ تو پھول کی طرح کھل گئی

”اب میری باری ہے۔ بیٹی تو ماں کی ہوتی ہے۔ اس کا نام میں رکھوں گی۔“ وہ ہیرا سنگھ کو چڑا رہی تھی۔ اس نے اس کا نام ”رام پیاری“ رکھا۔ وہ تھی بھی پیاری، بالکل سیوا دیوی کی طرح۔

ابھی وہ باتیں کرنے کی عمر کو بھی نہیں پہنچی تھی کہ سیوا دیوی کا یہ کھلونا بھی اس سے چھن گیا۔ اس کی گود ایک مرتبہ پھر اجڑ گئی۔ اس مرتبہ اس کی آنکھیں ٹھہرے ہوئے چشمے کی طرح خاموش ہوگئیں۔ رام پیاری کی شکل یاد رہی، رونا بھول گئی۔

باپ کا بیٹا نہ رہا، ماں کی بیٹی نہ رہی۔ ”میرے بھگوان! کیا تو ہم دونوں سے روٹھ گیا ہے؟“ اسے بڑی شدت سے اپنے ماں باپ کی یاد آئی۔ ”میں نے ان کا دل دکھایا ہے، بھگوان میرا دل دکھا رہا ہے۔ میری نجات اسی میں ہے کہ میں صبر کروں۔ بھگوان میرے قرار کی کوئی نہ کوئی صورت ضرور نکالے گا۔“

قرار کی صورت یہ نکلی کہ سیوا دیوی بھگوان کی سیوک ہو کر رہ گئی۔ اب وہ مندر بھی جانے لگی تھی۔ اس کی ایک ہی منت ایک ہی مراد تھی۔ ”بھگوان! میری گود اب نہ اجاڑیو۔“ ہیرا سنگھ کو احساس تھا کہ وہ کس کرب سے گزر رہی ہے۔ وہ اس کو بہلانے کی پوری کوشش کررہے تھے۔ گھر کی چھوٹی سی دنیا کو آباد رکھنے کے لیے وہ سخت محنت کررہے تھے۔ دن بھر دفتر میں سر کھپانے کے بعد گھر لوٹتے تو بیوی کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر اپنی تھکن بھول جاتے۔ اسے ہنسانے کی کوشش کرتے۔ گھمانے کے لیے باہر لے جاتے مگر اس کا درد تو یہ تھا کہ گود بھرے اور پھر خالی نہ ہو۔ قدرت کو اس پر ایک مرتبہ پھر رحم آ گیا۔ وہ پھر امید سے تھی لیکن سخت خوف زدہ بھی۔ وہ ایک حادثے سے دو مرتبہ گزر چکی تھی۔ اگر اس مرتبہ بھی ایسا ہی کچھ ہوا تو......؟

جیسے جیسے دن بڑھتے جارہے تھے، سیوا کا خوف بھی بڑھتا جارہا تھا۔ خوف زدہ تو ہیرا سنگھ بھی تھا لیکن وہ مرد تھا اور پھر اسے سیوا کو بھی تو سنبھالنا تھا۔ وہ اسے سمجھا رہا تھا، بہلا رہا تھا۔ اس کا من کہیں اور لگانے کے لیے دلچسپ قصے سنا رہا تھا۔

دن پھیلتے لگے۔ پھر وہ شبھ گھڑی بھی آ گئی۔ سیوا نے اس مرتبہ ایک بیٹے کو جنم دیا۔ صورت شکل تو کیا دیکھنی تھی، اس نے تو بس یہ دیکھا کہ زندہ ہے اور من ہی من میں پرارتھنا کی کہ بھگوان، اسے زندہ رکھیو۔

”اس مرتبہ نام رکھنے کی میری باری ہے۔“ ہیرا سنگھ نے شوخی سے کہا۔

”آپ اس کا نام نہ رکھیں۔ اپنے کسی دوست سے کہیں، اس کا نام وہ رکھے۔“

”وہ کیوں بھئی، بیٹا تو باپ کا ہوتا ہے۔“

”پہلے بھی آپ نے رکھا تھا تو.....“ وہ چیخ چیخ کر رونے لگی۔

”اچھا بھئی، کسی اور سے رکھالیں گے اپنے راجندر سنگھ بیدی کا نام۔“

”رہے نا سکھ کے سکھ۔“ سیوا دیوی روتے روتے ہنس پڑی۔

”اس میں کیا بات ہوگئی سکھ ہونے کی؟“

”نام تو آپ نے پہلے ہی رکھ چھوڑا ہے، راجندر سنگھ بیدی۔“

”او یار، غلطی ہوگئی۔ میں نے سوچا تھا، باہر سے آکر کہہ دوں گا، میرے دوست نے بتایا ہے راجندر سنگھ بیدی۔ چھوڑ یار، معاف کردے۔“

”جا معاف کیا۔“

راجندر سنگھ اس بچے کا نام ٹھہرا۔ ”بیدی“ کا لاحقہ خاندان کو ظاہر کرتا تھا۔ بیدی ذات کے اعتبار سے کھتری ہوتے ہیں اور اپنا سلسلۂ نسب براہِ راست گورو نانک دیو جی سے ملاتے ہیں۔

جیسا بھاری بھرکم نام تھا، یہ بچہ اتنا ہی دبلا پتلا اور ہلکا تھا۔ شکل صورت کے اعتبار سے بھی بس گوارا تھا۔ رنگ بھی بے حد دبا ہوا تھا۔ نہ سکھ معلوم ہوتا تھا نہ برہمن۔

”ذرا بڑا ہونے دو۔ کھائے ہے گا تو خوب موٹا

ہو جائے گا۔ آخر ہیرا سنگھ کا بیٹا ہے ہیرا سنگھ کا۔ بس یہ دعا کرو میرا گرو اور تمہارا بھگوان اسے لمبی زندگی دے۔'' ہیرا سنگھ کے دل میں دبا ہوا خوف باہر آ گیا۔

''میں اب یہ صدمہ نہیں جھیل سکوں گی' میں نے کہہ دیا ہے ہاں۔''

''یہ صدمہ اب تمہیں ملے گا بھی نہیں' گرو اور بھگوان کی کرپا سے۔''

سیوا اس کی خوب دیکھ بھال کر رہی تھی لیکن راجندر سنگھ اتنا کمزور تھا کہ دوا دارو سے باہر نکلتا ہی نہیں تھا۔ چھوٹی موٹی تکلیفیں اسے ستاتی ہی رہتی تھیں۔ اس کی بیماری کو دیکھتے ہوئے سیوا کو کبھی کبھی اپنے گزرے ہوئے دونوں بچے یاد آنے لگتے تھے۔ وہ راجندر کی صحت اور زندگی کی طرف سے سخت فکر مند رہنے لگی تھی۔

ایک روز ہیرا سنگھ ڈاک خانے سے واپس آئے تو ایک پنڈت جیوتشی بھی ان کے ساتھ تھا۔ پہلے تو سیوا یہ سمجھی کہ اس کے میکے سے کوئی آ گیا لیکن جب ہیرا سنگھ نے اسے یہ بتایا کہ یہ پنڈت جیوتشی ہے اور وہ اسے اس لیے لائے ہیں کہ راجندر سنگھ کی جنم کنڈلی بنوائی جائے تو وہ ان سے خوب لڑی۔

''اگر اس نے کوئی ایسی ویسی بات بتادی تو میں تو ابھی سے مر جاؤں گی۔''

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے' وہ ایسی ویسی بات نہ بتائے۔''

''تو تم مجھے خوش کرنے کے لیے اسے سکھا پڑھا کے لائے ہو؟''

''تمہارے بھگوان اور اپنے گرو کی قسم! میں نے اسے کچھ نہیں سکھایا پڑھایا۔''

''پھر مجھے نہیں بنوانی جنم کنڈلی۔''

''تم تو برہمن ہو' تمہارے یہاں تو یہ کام بہت ہوتا ہے' پھر تم ہی منع کر رہی ہو؟''

''اب کہاں رہی برہمن۔'' سیوا نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''تو پھر کہوں' وہ اپنا کام شروع کرے۔''

''جو من میں آئے' کرو۔''

ہیرا سنگھ کے لیے یہی اجازت تھی۔ انہوں نے پنڈت سے کہا کہ وہ زائچہ بنائے۔ پنڈت نے ایک کاغذ پر لکیریں کھینچنے اور خانے بنانے کا عمل شروع کر دیا۔ کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھایا۔

''چونکہ شنی' شنکر کو دیکھتا ہے اس لیے اس بالک کی زندگی میں بیسیوں عورتیں آئیں گی۔ شنی اور شنکر کا یہ میل شاید اسے

سوانحی خاکہ

نام......راجندر سنگھ بیدی

والد......ہیرا سنگھ بیدی

والدہ......سیوا دیوی

پیدائش......لاہور

تعلیم......انٹرمیڈیٹ' لاہور

پہلی ملازمت......پوسٹ آفس' لاہور

دوسری ملازمت......پبلسٹی ڈپارٹمنٹ' دہلی

تیسری ملازمت......آل انڈیا ریڈیو' لاہور

شادی......1934ء (عمر 19 سال)

بیوی......ستونت کور

ہجرت......1947ء

فلمی زندگی کا آغاز......1949ء

تاریخ پیدائش......پہلی ستمبر 1915ء لاہور

وفات......گیارہویں نومبر 1984ء

کوٹھے پر بھی لے جائے لیکن برہمنی گھر کا ہونے کے باعث کبھی بدنامی نہ ہوگی۔''

ہیرا سنگھ نے یہی سوغات اندر جا کر سیوا دیوی کے آگے رکھ دی۔

''چلو' اتنی بات تو طے ہوئی کہ تمہارا راجندر لمبی عمر پائے گا۔ لمبی عمر پائے گا تو یہ سب کارنامے انجام دے گا ناں جو پنڈت نے بتائے ہیں۔''

''میرا راجندر لمبی عمر ضرور پائے گا لیکن ایسا نہیں ہونے کا۔''

''اوئے تو پھر سردار کاہے کا ہوا۔'' ہیرا سنگھ نے باقاعدہ بھنگڑا ڈالتے ہوئے کہا ''اور سنو' اس نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ بچہ بہت شہرت پائے گا۔ تم لوگوں کا نام روشن کرے گا۔''

''ہاں' یہ ٹھیک کہا جیوتشی نے پر پہلی بات غلط ہے۔''

''نہیں کا راجا مہاراجا بنے گا کیا؟''

''وہ تو بنے ہی بنے۔ تمہاری طرح ڈاک خانے کا بابو نہیں بننے والا۔''

اس دن کے بعد سے فکر کا پہاڑ کھسک گیا۔ کمرے کے روشن دان سے تازہ ہوا اندر آنے لگی۔ سیوا دیوی کو اطمینان ہو گیا کہ اب اس کی گود نہیں اجڑے گی۔ اس کے بھگوان نے

اس کی سن لی ہے۔

راجندر سنگھ بیدی (جسے ہم آیندہ صرف ''بیدی'' لکھیں گے) کی ولادت یکم ستمبر 1915ء کو ہوئی تھی۔ ان دنوں برٹش راج تھا۔ سرکاری عہدوں کا حصول ہر پڑھے لکھے کا خواب ہوتا تھا۔ ان خوابوں میں اعلیٰ ترین خواب ''کلکٹر'' ہو جانا تھا۔ ہیرا سنگھ اور سیوادیوی کی آنکھیں بھی ایسے ہی خواب دیکھنے لگی تھیں حالانکہ وہ ابھی چار پانچ سال ہی کا ہوا تھا۔

دونوں میاں بیوی جب بیٹھتے تو ایک دوسرے سے یہی کہتے کہ وہ اپنے بیٹے کو پڑھا لکھا کر کلکٹر بنائیں گے۔ درمیان میں جیوتشی کا بھی تذکرہ نکل آتا۔ اس نے بھی یہی لکھا تھا کہ یہ بالک بہت شہرت پائے گا۔ بیدی کے والدین کی محدود سوچ یہیں تک ہوسکتی تھی کہ وہ کلکٹر بن کر ان کا نام روشن کرے گا۔ وہ یہ کیسے سوچ سکتے تھے کہ بیدی آفتاب بن کر آسمانِ ادب پر چمکے گا۔

سیوادیوی گیتا کا پاٹھ کیا ہی کرتی تھیں۔ جب بیدی چار پانچ سال کا ہو گیا، باتیں کرنے اور سمجھنے لگا تو عقیدت مندانہ انداز میں ماں کے پاس بیٹھنے لگا۔ وہ پڑھتیں اور یہ سنتا۔ اس کی سمجھ میں گیتا کے گہرے فلسفے کی باتیں تو نہیں آتی تھیں لیکن جب اس کی ماں گیتا کے ان حصوں میں داخل ہوتی جو کہانی کے انداز میں ہوتے ہیں تو ننھے بیدی کی دلچسپی بڑھ جاتی۔ وہ کھسک کر ماں کے اور قریب ہو جاتا۔ کبھی ماں کی طرف دیکھتا کبھی گیتا کی طرف۔ اس ''حصے'' میں بھی اس کی سمجھ میں سب کچھ نہیں آ جاتا تھا۔ کچھ لفظ تھے جو اس کی سمجھ میں آ جاتے تھے جیسے راجا، برہمن، رانی وغیرہ۔ اس کی دلچسپی برقرار رہتی تھی کہ کوئی کام کی بات ہو رہی ہے۔

ایک روز وہ اسی طرح بیٹھا سن رہا تھا کہ اس کی ماں نے ایک لفظ ''گنکا'' پڑھا۔ یہ لفظ اس کی سمجھ میں بالکل نہ آیا۔ اس نے کبھی سنا ہی نہیں تھا۔

''ماں! یہ گنکا کیا ہوتا ہے؟''

''ہوتی ہے، آرام سے بیٹھو۔'' ماں نے اسے جھڑک دیا اور پھر پڑھنا شروع کر دیا۔

''اوں! بتاؤ نا، گنکا کیا ہوتا ہے؟''

''چپ رہو۔''

اس مرتبہ بیدی نے اصرار نہیں کیا۔ وہ چپ ہو کر بیٹھ گیا لیکن اس کا چہرہ کملائے ہوئے پھول کی طرح مرجھا کر رہ گیا۔ کچھ دیر بعد سیوادیوی کو احساس ہوا کہ بیدی چپ ہو گیا ہے۔ گیتا سے نظر ہٹا کر چہرے پر ڈالی تو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ بیدی تو بہت حساس ہے اور اس نے اس کا دل توڑ دیا۔

''میرے لال! گنکا بری عورت کو کہتے ہیں۔''

''تم تو اچھی ہو ناں!'' بیدی کا چہرہ پھر کھل اٹھا۔ اس پر کسی نے توجہ جو دی تھی۔

''ماں ہمیشہ اچھی ہوتی ہے، کسی کی بھی ہو۔''

''تو پھر بری کون ہوتی ہے؟''

''افوہ! تو تو سر کھا گیا ہے۔ بری وہ ہوتی ہے جو بہت سے مردوں کے ساتھ رہتی ہے۔''

''اب میں سمجھ گیا۔''

''شکر ہے، میری جان تو چھوٹی۔'' ماں نے کہا اور اس کی طرف سے بے فکر ہو کر پھر گیتا میں گم ہو گئی۔

یہ بات آئی گئی ہو گئی۔ خود بیدی کو بھی یاد نہ رہا کہ اس نے کیا لفظ پوچھا تھا اور ماں نے کیا معنی بتائے تھے۔ اسے یاد نہیں رہا تھا لیکن حافظے کی صندوقچی میں یہ لفظ پڑا ضرور رہا تھا۔

اس کے پڑوس میں ایک لڑکی ساوتری رہتی تھی۔ وہ اکثر اس کے گھر چلا جایا کرتا تھا۔ ساوتری کا کنبہ بہت بڑا تھا۔ اس کی ماں اپنے دیوروں اور جیٹھ کے ساتھ ایک ہی گھر میں رہتی تھی۔ اس روز جو بیدی، ساوتری کے گھر گیا تو اسے اچانک ''گنکا'' کا لفظ یاد آ گیا۔ ساوتری کی ماں بہت سے آدمیوں میں گھری بیٹھی تھی اور خوب ہنس بول رہی تھی۔

''تمہاری ماں تو گنکا ہے۔'' بیدی نے عالمانہ انداز میں کہا۔

''یہ گنکا کیا ہوتا ہے؟'' ساوتری نے پوچھا۔

''میری ماں کہتی ہے جو عورت بہت سے مردوں کے ساتھ رہتی ہے، وہ گنکا ہوتی ہے۔''

ساوتری اب بھی نہیں سمجھی تھی لیکن اس نے اپنی ماں سے کہا ضرور کہ بیدی تمہیں گنکا کہہ رہا تھا۔ ساوتری نے اپنی ماں سے کہا اور اس کی ماں نے بیدی کی ماں سے نہ صرف کہا بلکہ خوب لڑی بھی کہ تم نے اپنے بچے کو ایسی تربیت دی ہے کہ وہ دوسری عورتوں کو گالیاں دیتا پھرے۔ میری تو بچی بھی اس کے ساتھ کھیلتی ہے۔ میں اسے روک دوں گی کہ اب وہ اس کے ساتھ نہ کھیلے۔ بیدی کی ماں سوائے اس کے کیا کر سکتی تھی کہ خاموشی سے سنتی رہے۔

وہ تو چلی گئی لیکن اس کے جانے کے بعد بیدی کی خوب درگت بنی۔ اس نے ایک بات معصومیت سے کہہ دی تھی لیکن سیوادیوی نے اپنا سارا غصہ بیدی پر اتارا۔ اس کی عمر کا لحاظ کیے بغیر اس کی خوب پٹائی کی۔ وہ پٹتا رہا اور سوچتا رہا کہ

ماں نے خود ہی تو بتایا تھا اور اب خود ہی مار بھی رہی ہے۔

یہ قصہ کوئی ایک دن کا نہیں تھا۔ تجسس اس کی فطرت میں شامل تھا۔ وہ جو نہیں جانتا تھا' اسے جاننا چاہتا تھا۔ کرید کرید کر راکھ سے چنگاریاں ڈھونڈنے کی کوشش کرتا تھا۔ طرح طرح کے سوال کرتا رہتا تھا۔ ہر سوال پر اسے چپ رہنے کو کہا جاتا تھا۔ کبھی وہ حقیقت جان لیتا تھا اور اپنے تجربے کی کسوٹی پر پرکھنا چاہتا تھا تو اس پر طمانچوں کی یلغار ہو جاتی تھی۔

اس کی پیدائش کے بعد اس کے بہن بھائیوں میں بھی اضافہ ہو گیا۔ ایک بھائی گربچن سنگھ' بہن راج دلاری' دوسرا بھائی ہربنس سنگھ۔ ماں کی توجہ بٹتی چلی گئی۔ ذہین بیدی اپنی ذات میں سمٹ گیا۔ اس کی شکل معمولی تھی' کمزور تھا' بیمار بھی رہتا تھا۔ ان سب باتوں نے مل کر اسے بے حد حساس بنا دیا۔

وہ بغیر غور کیے یہ سمجھنے لگا کہ کوئی مجھے اہمیت نہیں دیتا۔ راج دلاری کو سب چاہتے ہیں' مجھے کوئی نہیں چاہتا۔ ہربنس کو سب پیار کرتے ہیں' مجھ سے کوئی پیار نہیں کرتا۔ اگر ایسا نہیں ہے تو میں روز روز پٹتا کیوں ہوں؟

اس کی اس حساسیت نے اسے زود رنج بنا دیا۔ ذرا ذرا سی بات پر اس کا دل بھر آتا تھا۔ کوئی فقیر دروازے پر آ جاتا اور اپنی بپتا سنانے لگتا تو بیدی کے آنسو بہنے لگتے۔ اس کی بہن یا بھائی اسے منہ چڑا کر بھاگ جاتے تو وہ رونے لگتا۔

تھوڑے ہی دن میں وہ اچھا خاصا چڑچڑا مشہور ہو گیا حالانکہ وہ اچھا خاصا ہنس مکھ تھا۔ جب خوش ہوتا تو معلوم ہی نہ ہوتا کہ یہ وہی راجندر سنگھ بیدی ہے لیکن اس کا کوئی بھروسا بھی نہیں تھا۔ ابھی ہنس رہا ہے تو ابھی رونے لگے گا۔ روتے روتے ہنسنے لگے گا۔

اس روتے ہنستے بیدی کو اس کے باپ نے لاہور چھاؤنی کے صدر بازار کے ایک اسکول میں داخل کرا دیا۔ یہاں بھی اسے کچھ اچھا تجربہ نہیں ہوا' یہاں بھی اسے ''چپ رہو'' کا سامنا تھا۔ وہ شرمیلا ضرور تھا لیکن کبھی کبھی اپنی فطرت سے مجبور ہو کر اپنے استاد سے کوئی ایسا سوال کر بیٹھتا تھا کہ جواب میں اسے ''چپ رہو'' سننے کو ملتا تھا اور لڑکے اس پر ہنستے تھے۔

یہ سب کچھ کم تھا کہ گھر میں ایک اور آفت آ گئی۔ اس کی ماں بہت دن سے بیمار چلی آ رہی تھی' اب معلوم ہوا انہیں تپ دق ہے۔ اس وقت یہ بیماری تقریباً لاعلاج تھی۔ اس بیماری کی سنگینی کو ہیرا سنگھ سمجھ رہے تھے' بیدی یا دوسرے بہن بھائی تو بس یہ دیکھ رہے تھے کہ ان کی ماں بدل گئی ہے' پہلے جیسی نہیں رہی۔ بیدی چونکہ بہت حساس تھا' اس لیے اس صورتِ حال

تصانیف

دانہ و دام (1936ء) گرہن (1942ء)
بے جان چیزیں (ڈرامے) 1943ء
سات کھیل (1946ء)
کوکھ جلی (1949ء)
ایک چادر میلی سی (1962ء) "
اپنے دکھ مجھے دے دو (1965ء)
ہاتھ ہمارے قلم ہوئے (1974ء)
مکتی بودھ (1982ء)

سے وہ سب سے زیادہ متاثر ہو رہا تھا۔

ہیرا سنگھ ان دنوں صرف سیوا دیوی کے ہو کر رہ گئے تھے۔ کبھی اس حکیم کے پاس جا رہے ہیں کبھی اس ڈاکٹر کو دکھا رہے ہیں۔ کبھی سیوا دیوی کو خوش کرنے کے لیے اسے لطیفے اور قصے سنا رہے ہیں۔ بیدی کو لگ رہا تھا جیسے وہ تنہا رہ گیا ہے۔ اس کے شب و روز میں ایک خلا سا پیدا ہو گیا ہے۔ وہ قریب بھی جاتا ہے تو اس کی ماں اپنی بیماری کے خوف سے اسے دور ہٹا دیتی ہے۔

ہیرا سنگھ جب اپنی پتنی کو قصے سنا سنا کر تھک گئے تو انہوں نے یہ ترکیب نکالی کہ لائبریری سے ناول لے آتے تھے اور سیوا دیوی کے سرہانے بیٹھ کر اسے سنایا کرتے تھے۔ بیدی' پائنتی میں دبک کر ان ناولوں کو سنا کرتا تھا۔ ابھی بہت سی باتیں اس کی سمجھ سے بالاتر تھیں لیکن یہ ناول اور ان کے اندر موجود کہانی اس کے شعور کی پرداخت کر رہے تھے۔ اسے بتا رہے تھے کہ کہانی کیا ہوتی ہے' کردار کس طرح آپس میں باتیں کرتے ہیں۔ یہ وہ تربیت تھی جو آگے چل کر اس کے کام آنے والی تھی۔

وہ پانچویں جماعت پاس کر چکا تھا کہ اس کے والد کا تبادلہ چھاؤنی سے شہر کے ایک پوسٹ آفس میں ہو گیا۔ انہیں گھر اور اسکول دونوں بدلنے پڑے۔

اب بیدی خالصہ اسکول میں داخل ہو گیا۔ اس نئے گھر میں آنے کو بھی اس نے بری طرح محسوس کیا۔ وہ دوست بنانے کا رسیا تو تھا لیکن اس نئی جگہ آئے دن ہی کتنے ہوئے تھے۔ سارے دوست تو اس کے پیچھے رہ گئے تھے۔ پھر ایک روز اس کی یہ تنہائی ہمیشہ کے لیے دور ہو گئی۔ وہ ایک کمرے کی طرف گیا تو اسے کتابوں سے بھرا ہوا دیکھا۔ اس کے چچا کا

پرنٹنگ پریس تھا۔ مختلف مصنفوں کی کتابیں اس پریس میں چھپتی تھیں۔ ان کتابوں کے کچھ نسخے وہ اس کمرے میں جمع کرتے رہتے تھے۔ گویا یہ کمرا ایک قسم کا گودام تھا۔ اس نے ایک کتاب اٹھائی۔ یہ کوئی ناول تھا۔ پھر دوسری اٹھائی۔ یہ انگریزی سے ترجمہ کی ہوئی کہانیاں تھیں۔ یہ سب کتابیں اسی طرح کی تھیں۔ اس نے ایک ناول اٹھایا اور چھت پر پہنچ گیا۔

چھت پر کمرا تو کوئی نہیں تھا لیکن ایک سائبان سا پڑا ہوا تھا جہاں یہ بچے اکثر کھیلتے تھے لیکن آج وہ یہاں کھیلنے نہیں آیا تھا۔ اس نے کتاب کھولی اور پڑھنا شروع کر دیا۔ ناول اتنا دلچسپ تھا کہ وہ ورق الٹتا چلا گیا۔ ”اچھا تو یہ ہوتی ہے کہانی۔ آدمی پڑھے تو بس پڑھتا ہی جائے۔ میں بھی ایسا ہی ایک ناول لکھوں گا۔“

جب تک اس کی ماں نے اسے آواز نہیں دے لی، وہ پڑھتا ہی رہا۔ پھر چھت سے نیچے اتر آیا۔ اسے اتنی عقل تو تھی نہیں کہ کہانی شروع ہوتی ہے تو اسے ختم بھی کرنا چاہیے۔ دوسرے دن کوئی اور ناول اس کے ہاتھ لگ گیا۔ پھر یہ اس کا روز کا معمول بن گیا۔ بچے اِدھر اُدھر کھیلتے ہوتے اور وہ چھت پر ایک کونے میں بیٹھا ناول پڑھتا رہتا۔

اس مطالعے کی عادت سے یہ تو ہوا کہ ایک لکھنے والے کے تمام عناصرِ ترکیبی اس میں جمع ہو گئے جو بعد میں اس کے کام آنے والے تھے لیکن یہ بھی ہوا کہ ان ناولوں کے چکر میں اس کی نصابی کتابیں بن پڑھی رہ گئیں۔ خاص طور پر ریاضی میں تو وہ بہت ہی کمزور تھا کیونکہ اس میں مشق کی ضرورت ہوتی ہے، وہ فیل ہو گیا۔

”میں خود کمزور ہوں مگر مجھے ریاضی میں تو کمزور نہیں ہونا چاہیے۔“ وہ اب ناولوں سے ہٹ کر نصابی مضامین پر بھی توجہ دے رہا تھا۔ اس نے سخت محنت کی۔ خاص طور پر ریاضی پر توجہ دی اور اپنی کمزوری دور کر لی۔

سیوادیوی کی بیماری روز بروز شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ ہیر اسنگھ کی محدود آمدنی سیوادیوی کے علاج میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ وہ پھر بھی ایک ایک پیسا بچا کر، قرض ادھار کر کے اس کا علاج کرا رہے تھے۔

بیدی کی حساس طبیعت اب یہ سمجھنے کی عمر کو پہنچ گئی تھی کہ اس کی ماں بیمار ہے اور ماں کی خدمت کرنا اس کا فرض ہے۔ وہ دن رات ماں کی چارپائی سے لگا بیٹھا رہتا اور سیوادیوی اپنی نحیف آواز میں اسے دعائیں دیتی رہتیں۔

ہیر اسنگھ کی امیدیں اس وقت اپنے عروج پر پہنچ گئیں جب بیدی نے میٹرک فرسٹ ڈویژن میں پاس کر لیا۔ کتنے بچے تھے جو اس وقت میٹرک پاس کر سکتے تھے۔ ہیر اسنگھ کو اپنا خواب سچ نظر آنے لگا۔ ”میں اپنے راجندر کو اعلیٰ تعلیم دلواؤں گا۔ اسے کلکٹر بناؤں گا۔“

”بھاگ بھری، سن رہی ہے؟“ اس نے سیوادیوی کو مخاطب کیا ”تیرے راجے نے میٹرک کر لیا ہے۔ اب اسے کلکٹر بننے سے کوئی نہیں روک سکتا۔“

”میں اپنے بچے کے لیے کچھ بھی تو نہیں کر سکی۔ وہ دبلا کا دبلا ہی رہ گیا، کمزور، سوکھا سا۔“

”پر کیا ہوا، اس کا دماغ تو تیز ہے۔ جب کلکٹر بن جائے گا، اچھی تنخواہ ہو گی تو ہڈی پر گوشت بھی چڑھ جائے گا۔“

”راجندر کے باپو، پتا نہیں میں اس وقت تک رہوں، نہ رہوں۔“

”ایسی باتیں منہ سے نہ نکال جھلی! ابھی تو تجھے بہت کچھ دیکھنا ہے۔“

”میں خود بھی یہی چاہتی ہوں کہ زندہ رہوں۔ میرے بچے ابھی بہت چھوٹے ہیں پر کیا کروں، میری صحت گرتی ہی جا رہی ہے۔“

”اب تو پہلے سے بہت اچھی ہوئی ہو تم۔ تھوڑے پیسے جمع ہو جائیں تو میں آب وہوا کی تبدیلی کے لیے کسی پہاڑی مقام پر لے جاؤں۔“

”راجندر سنگھ کے لیے تم نے کیا سوچا؟ اب اس کے داخلے کا بھی انتظام کرنا ہے۔“

”ڈی۔ اے۔ وی کالج کی بہت شہرت سنی ہے۔ اسے وہاں داخلہ مل بھی جائے گا۔ فرسٹ ڈویژن آئی ہے اس کی۔“

”میں کیا پہاڑ پر جاؤں گی۔ آپ ان پیسوں سے اس کا داخلہ کرا دیں۔“

ڈی۔ اے۔ وی کالج میں اس کا داخلہ بہ آسانی ہو گیا۔ وہ اسکول سے نکل کر کالج میں گیا تو خود اسے بھی اپنا مستقبل تابناک نظر آنے لگا۔

کالج تک آتے آتے وہ سب عناصر جن کا ایک فنکار میں ہونا ضروری ہے، مجتمع ہو گئے تھے۔ اب صرف محنت، لگن اور مشق کی ضرورت رہ گئی تھی۔ طبیعت پہلے ہی حساس پائی تھی جو ایک فنکار کے لیے بے حد ضروری ہوتی ہے۔ اب بس منزل کا تعین اور اس کی طرف بے تحاشا دوڑنے کی ضرورت باقی رہ گئی تھی۔ ماں سے سنے ہوئے گیتا کے قصے، باپ کی زبانی سنے ہوئے کہانیوں کے اقتباسات، چچا کے پرنٹنگ پریس میں چھپی ہوئی ناولیں، یہ سب اس کے ذہن میں گردش

کر رہی تھیں۔ اس نے ان سب کو ذہن میں تازہ کیا اور پنجابی زبان میں ایک کہانی ''دکھ سکھ'' لکھ کے ایک رسالے ''سارنگ'' میں اشاعت کے لیے بھیج دی اور وہ شائع بھی ہوگئی۔ یہ اس کی پہلی کہانی تھی۔ اس کی اشاعت نے اس کی ہمت بڑھائی اور اس نے اردو میں ایک کہانی ''مہارانی کا تحفہ'' لکھ کر اس دور کے مشہور رسالے ''ادبی دنیا'' کو روانہ کردی۔

یہ کہانی نہ صرف شائع ہوئی بلکہ رسالے کے مدیر کی طرف سے اسے سال رواں کی بہترین کہانی قرار دیا گیا۔ اس کا یہ سفر آہستہ آہستہ آگے بڑھ ہی رہا تھا کہ اس کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔

سیوا دیوی کا انتقال کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ ہیرا سنگھ تو جیتے جی مر گئے۔ سیوا دیوی اپنا سب کچھ چھوڑ کر ان کے پاس چلی آئی تھیں۔ محبت کی شادیاں اکثر ناکام ہو جاتی ہیں لیکن ان دونوں میں عمر بھر پیار رہا تھا۔ اب وہ نہیں رہیں تو ہیرا سنگھ اجڑ کر رہ گئے۔ اب کس کے لیے دفتر جاؤں۔ کون واپسی میں راہ تکے گا۔ ایسا دل ٹوٹا کہ بیدی کو کلکٹر بنانے کا خواب بھی آنکھوں سے دور جا گرا۔ انہوں نے ڈاک خانے کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور بیدی کو کالج سے اٹھا کر پوسٹ آفس میں بطور کلرک بھرتی کرا دیا۔

ڈاک خانے میں بیدی کی ڈیوٹی کے اوقات مقرر نہ تھے۔ بعض اوقات اسے سترہ اٹھارہ گھنٹے کام کرنا پڑتا تھا اور کام بھی بڑا غیر دلچسپ جیسے چٹھیاں چھانٹنا، فائلیں اِدھر سے اُدھر لے جانا۔ افسروں کی ڈاک ان کے گھروں پر پہنچانا۔ رات کو تھکے ہارے گھر پہنچنا اور دوسرے دن پھر وہی بھاگ دوڑ۔

وہ اس مشقت سے جان چھڑانے ہی والا تھا کہ اس کی ڈیوٹی منی آرڈر کی کھڑکی پر لگ گئی۔ یہ کام اسے آسان معلوم ہوا۔ فرصت ملتے ہی اس کے عزائم نے انگڑائی لی۔ عنفوانِ شباب تھا۔ اس کا دل امنگوں سے لبریز تھا۔ کوئی جذبہ تھا جو اظہار پانے کے لیے مچل رہا تھا مگر راہ نہیں مل رہی تھی۔ بہن بھائیوں کی ذمے داری بھی اس پر آن پڑی تھی۔ ابھی اس جوہر کی نشاندہی نہیں ہوئی تھی جس میں اسے اپنی معراج کو چھونا تھا۔ وہ تو بس اس وقت یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح کوئی ایسا پیشہ اختیار کیا جائے جس میں دولت ہی دولت ہو۔

ایک دن ڈاک خانے میں منی آرڈر کی کھڑکی پر کوئی نہیں تھا۔ فرصت ہی فرصت تھی۔ وہ ترنگ میں آ کر گنگنانے لگا۔ اس کے ساتھی اسے غور سے دیکھ رہے تھے۔

''سردار جی، گلا تو اچھا پایا ہے۔ ذرا ریاض کرلو تو اچھے خاصے گویّے بن جاؤ گے۔''

اس نے سنا اور شرما کر چپ ہوگیا لیکن دل ہی دل میں سوچ ضرور رہا تھا کہ اگر وہ واقعی گانا سیکھ لے تو سنگیت کے ذریعے ڈاک خانے کی تنخواہ سے کہیں زیادہ کما سکتا ہے اور شہرت ہوگی سو الگ۔ پھر اسے والدین کی زبانی سنی ہوئی جیوتشی کی ''غیب دانی'' یاد آ گئی کہ بچہ بڑا ہو کر شہرت پائے گا۔ کہیں یہی تو شہرت کا وہ راستہ نہیں؟ ڈاک خانے سے اٹھتے اٹھتے وہ خود کو تیار کر چکا تھا۔

ڈاک خانے سے نکل کر وہ اپنی سائیکل پر بیٹھا اور گھر آنے کے بجائے گاندھرو مہا ودیالیہ، راوی روڈ پہنچ گیا۔ یہاں سنگیت کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس نے یہاں داخلہ لے لیا۔

لطیفہ گو بیدی

بیدی میانہ قد تھے جبکہ ان کے دوست مشہور ہدایت کار روی ڈی کیشپ دراز قامت تھے۔ ایک دن وہ دونوں ساحل سمندر پر چہل قدمی کر رہے تھے اور ایک فلمی کہانی زیر بحث تھی۔ کیشپ پسینے میں شرابور تھے لیکن بیدی کو پسینا نہیں آ رہا تھا۔ ایک جگہ کیشپ صاحب نے رک کر کہا ''بیدی صاحب' کیا وجہ ہے کہ مجھے پسینا بہت آ رہا ہے اور آپ کو نہیں؟''

بیدی نے بے ساختہ جواب دیا ''وجہ ظاہر ہے' آپ سورج سے زیادہ قریب ہیں۔''

☆☆☆

بیدی اپنے بھائی کے پاس ڈلہوزی گئے ہوئے تھے۔ ایک دن سیر کرتے ہوئے بیدی کے بچپن کے دوست ہربنس سنگھ مل گئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ ان دنوں ہربنس سنگھ ہوٹل چلا رہے تھے۔ بات چیت کے دوران بیدی نے دریافت کیا ''بھئی کام کاج کیسا چل رہا ہے؟'' جواب ملا ''ست ہے' بہت کم ٹورسٹ آتے ہیں۔''

''بال بچے کتنے ہیں؟'' بیدی نے پوچھا۔

''وہ تو گرو کی کرپا سے کافی ہیں۔'' ہربنس سنگھ نے کہا۔

''تو اچھا ہی ہے ویسے بھی آدمی بے کار بیٹھا برا سا لگتا ہے۔''

یہاں بھی اسے یہی سننے کو ملا کہ گلا اچھا ہے۔

وہ کئی مہینے تک ڈاک خانے سے اٹھ کر یہاں آتا رہا اور اپنے روشن مستقبل کے خواب دیکھتا رہا۔ اپنی دانست میں بہت کچھ سیکھ بھی گیا تھا لیکن استاد بوٹے خان اور چوہتھ رام امرتسر والے کی مجلسوں میں جاتے ہی اس کے چودہ طبق روشن ہوگئے۔ اس منزل تک پہنچنے کے لیے تو سالہا سال کی کڑی ریاضت کی ضرورت ہے۔ اس شوق کو پیشہ بنانے تک تو وہ زندہ بھی نہیں رہے گا۔ چنانچہ وہ یوں الگ ہوگیا' جیسا کہ چھلکے پر سے پھسلا ہوا آدمی تھوڑا اِدھر اُدھر دیکھتا ہے اور پھر پگڑی سنبھالتا' منہ میں کچھ منمناتا ہوا اس منظر سے ٹل جانے کی کوشش کرتا ہے۔

جہاں کی "کھوتی" تھی پھر وہیں آ کھڑی ہوئی۔ پھر وہ ایک عجیب وغریب راستے پر چل نکلا۔ یہ وہ دور تھا جب تحریکِ آزادی اپنے نقطۂ عروج پر تھی۔ قائدینِ قوم عدم تشدد کا درس دے رہے تھے جبکہ وہ اور اس جیسے بہت سے دوسرے نوجوان اس سے متفق نہیں تھے۔ وہ عدم تشدد کے نہیں تشدد کے قائل ہوتے جارہے تھے۔

بیدی سے یہ امید نہیں کی جاسکتی تھی لیکن جوانی میں آدمی ہر وہ کام کرگزرتا ہے جس کی امید نہیں کی جاسکتی۔ اسے کہیں سے ایک کتاب مل گئی جس میں "بم" بنانے کی ترکیب لکھی ہوئی تھی۔ اس نے کئی دن تک اس کتاب کا اچھی طرح مطالعہ کیا اور جب ترکیب ازبر ہوگئی تو اس نے چند ہم عمر لڑکوں کو اپنے ساتھ ملایا اور ایک کھنڈر میں جا کر بم بنانے کی کوشش کرنے لگے۔ اس "بم" کا مقصد صوبۂ پنجاب کے انگریز گورنر مونٹ مورنسی کو جہنم واصل کرنا تھا۔

اس سے پہلے کہ گورنر کو کچھ نقصان پہنچتا' بم بنانے کی کوشش میں بیدی کے ایک ساتھی کا ہاتھ اُڑ گیا۔ بیدی نے ایک جگہ لکھا ہے "وہ ہاتھ میرا بھی ہوسکتا تھا۔"

یہ شوق بھی دم توڑ گیا۔ دراصل یہ سب شہرت کے حصول کے شاخسانے تھے جو کبھی تو اسے سنگیت کی طرف لے جارہے تھے کبھی بم سازی کی طرف۔

ان کوچوں سے نکلے تو مصوری کا شوق ہوا اور یہ شوق اپنی فطرت اور جسمانی ساخت کے اعتبار سے مناسب بھی نظر آیا۔ بہت دن تک رنگوں اور برش سے کھیلتا رہا اور جلد ہی لینڈ اسکیپ کو چھوڑ کر عورت کے پیکر پر اپنی توجہ مرکوز کردی۔ مگر اسے بنانے کے عمل میں خود ہی اس پر عاشق بھی ہوگیا اور حقائق شاہد ہیں کہ وہ تمام عمر اس "عورت" کی تلاش میں سرگرداں رہا۔

تھوڑے دنوں میں مصوری سے بھی دل بھر گیا۔ بس وہ "عورت" حواس کے دروازے بجاتی رہی' اس کے خطوط کی وضاحت کے لیے اس نے انگریزی نظمیں لکھنی شروع کردیں۔ ڈاک خانے کی خشک نوکری اور انگریزی نظمیں! یہ نظمیں اس نے اشاعت کے لیے بھیجیں تو پسند بھی کی گئیں۔

ان نظموں کے طفیل لاہور کے کئی شعرا سے اس کی دوستی بھی ہوگئی۔ اب ادبی حلقوں میں اس کا اٹھنا بیٹھنا ہونے لگا تھا۔ ان صحبتوں نے اسے اردو شاعری کی طرف مائل کیا۔ اس نے کوشش تو بہت کی مگر کوشش سے کیا ہوتا ہے؟ وہ لکھتا رہا اور اپنا لکھا خود ہی کاٹتا رہا۔ اس میں خود احتسابی کا مادہ بہت تھا۔ وہ حقیقت پسند تھا۔ اپنا جائزہ لینا' خود پر تنقید کرنا خوب جانتا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ اردو شاعری میں "وزن" کا مسئلہ اس کے آڑے آرہا ہے۔ اس نے پرانے رسالے نکال کر ان کی ورق گردانی شروع کردی کہ شاید اس طرح طبیعت کچھ مائل ہوجائے۔ طبیعت تو کیا مائل ہوتی' ایک غزل پسند آگئی۔ نام دیکھا تو کوئی گم نام سا شاعر تھا جس کی یہ غزل تھی۔ جب میں اس کا نام نہیں جانتا تو اور کون جانتا ہوگا؟ اس نے وہ غزل ایک کاغذ پر صاف صاف اتارلی اور ایک اخبار کو اشاعت کے لیے بھیج دی۔ وہ جوں کی توں شائع ہوگئی۔

اس کے ضمیر نے ملامت ضرور کی تھی لیکن وہ خود کو تسلی دیتا رہا تھا کہ ہمیشہ مجھے یہ حرکت تھوڑی کرنی ہے۔ میں نے تو یہ اس لیے کیا ہے کہ تھوڑا حوصلہ بڑھے۔ کچھ لوگوں کو یقین بھی آجائے کہ میں شعر کہہ سکتا ہوں۔ اس دوران کوشش کرتا رہوں گا۔ کوئی غزل ہو ہی جائے گی۔ وہ میری اپنی ہوگی۔ وہ دن میں تین تین بار اس مطبوعہ غزل کو پڑھ رہا تھا اور خوش ہورہا تھا کہ غزل اس کے نام سے چھپی ہے۔

ابھی چند روز گزرے تھے کہ اسی اخبار میں (جس میں اس کی غزل چھپی تھی) "دردِ سخن" کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا۔ اس نے پہلے تو غور نہیں کیا لیکن چند سطریں پڑھنے کے بعد اسے کچھ شک سا ہوا کہ یہ تو کچھ اس کی باتیں لگ رہی ہیں۔ ذرا غور سے پڑھا تو اپنا نام تک نظر آیا۔ کسی نے اس کی چوری پکڑلی تھی۔ اس رسالے کا نام تک لکھا تھا جہاں سے یہ چرائی گئی تھی۔ بیدی کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا' اب تو میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا' شکر ہوا کہ نہ اس غزل پر کسی نے داد دی تھی نہ اس مضمون کو کسی نے پڑھا اور یہ ظاہر معاملہ رفع دفع ہوگیا لیکن وہ خود بہت دن تک اپنی نظروں میں گرا رہا۔ پھر یہ کہ اپنے آپ کو معاف کیا کہ آئندہ وہ ایسے کسی فعل کا اعادہ نہیں کرے گا اور اس کے ساتھ ہی شاعری کا

خیال بھی دل سے نکال دیا۔

وہ اپنے لیے ابھی کوئی راہ متعین نہیں کر پایا تھا کہ اس کی شادی ستونت کور نامی لڑکی سے ہوگئی۔ اس کی یہ شادی اس کے باؤجی نے کرائی تھی۔ اس میں عشق وشق کا کوئی چکر نہیں تھا۔ وہ عشق کر بھی نہیں سکتا تھا' شرمیلا اتنا تھا کہ لڑکی کو دیکھتے ہی اس کی زبان لڑکھڑانے لگتی تھی اور وہ بہت دیر تک کسی سے بات نہیں کر پاتا تھا۔ یہ اس کے بے حد حساس ہونے کی نشانی تھی۔ اتنا حساس اور جذباتی تھا کہ بعض مواقع پر اپنی خود اعتمادی کھو بیٹھتا تھا۔

اس کی پتنی ستونت کور اتنی ہی سندر تھی جتنی سندر بیدی نے کبھی تصویر بنائی تھی اور جس کی تلاش میں مہینوں سرگرداں رہا تھا۔ اسے وہم سا ہوگیا تھا کہ یہ تصویر حقیقت میں اسے ملے گی ضرور۔

ستونت کور کے ملنے کے بعد اس کی دنیا ہی بدل گئی تھی۔ جب وہ ڈاک خانے میں ہوتا تو بار بار گھڑی دیکھتا رہتا کہ کب چھٹی ہو اور کب وہ گھر جائے۔ چھٹی ہوتے ہی وہ گھر کی طرف بھاگنے لگتا تھا۔ کوئی دوست اگر مل بھی جاتا اور اصرار کرتا کہ کہیں بیٹھ کر چائے پئیں گے تو وہ صاف انکار کر دیتا۔ اسے ڈر ہوتا کہ کہیں دیر نہ ہو جائے اور ستونت کور انتظار کرتی رہ جائے۔ ایسے مواقع اکثر آجاتے تھے کہ کوئی دوست اسے کھانے پر مدعو کرتا تھا اور وہ دل ہی دل میں کڑھنے لگتا تھا' یہ کیا ہر وقت لوگوں کو کھانے کی پڑی رہتی ہے۔ کھانا تو بس ستونت کور پکاتی ہے۔ میں کیوں کہیں اور کھاؤں' رسی تڑا کر بھاگ آتا اور رسوئی میں آلتی پالتی مار کر ستونت کور کے سامنے بیٹھ کر کھانا کھاتا۔ دوست اس کی اس تبدیلی کو دیکھ رہے تھے مگر یہ سوچ کر معاف کر دیتے تھے کہ نئی نئی شادی ہوئی ہے۔

ایک روز وہ اپنے ایک ادیب دوست کو اپنے گھر لے آیا۔ وہ بھی اس لیے کہ اگر وہ اسے نہ لاتا تو اس کا دوست اسے اپنے گھر لے جاتا۔ کھانے کا وقت ہوگیا تھا اور اسے ستونت کور کے ہاتھ کا پکا کھانا' کھانا تھا۔

اس کی بیوی چولھے کے آگے پیڑھی کے اوپر بیٹھی روٹیاں پکا رہی تھی۔ بیدی اور اس کا دوست سامنے بیٹھے ایک ہی تھالی میں کھا رہے تھے۔

کچھ دیر بعد بیدی نے اپنے دوست سے کہا ''تجھے معلوم ہے' ہم ایک ہی تھالی میں کیوں کھا رہے ہیں؟'' پھر خود ہی جواب دیا ''اس لیے نہیں کہ ہم دونوں دوست ہیں بلکہ اس لیے کہ میری بیوی کو دوسری تھالی نہ مانجنی پڑ جائے۔ یہ بہت

اعزازات

ساہتیہ اکادمی ایوارڈ (1965ء)
پدم شری (1972ء)
سودی غالب ایوارڈ (1978ء)
فلم فیئر اور کئی دوسرے ریاستی ایوارڈز

سندر ہے۔ اس کے ہاتھ بھی بہت سندر ہیں۔ میری شکل تو بس ایسی ہی ہے۔ یار میں نے ضرور موتی دان کیے ہوں گے پچھلے جنم میں جو اتنی خوبصورت بیوی ملی ہے۔ میں تو اس کو اندھیرے میں ہی پیار کر سکتا ہوں۔ مجھے شرم آتی ہے اس کے سامنے۔'' وہ اپنی دھن میں برابر بولے جا رہا تھا۔

''ایسے ہی دوسروں کے سامنے نہ بولتے جایا کرو۔'' بیوی نے پیار سے گھورا۔ تب جاکے وہ خاموش ہوا۔

بیوی کی اس سندرتا اور اس سے محبت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ دولت کما کر اس کی ہر خواہش کو پورا کر دے۔ وہ تمام طریقے آزما چکا تھا لیکن وہ ہر مرتبہ ناکام رہا تھا۔ اب اسے رہ رہ کر یہ احساس ہو رہا تھا کہ اس کی تعلیم ادھوری رہ گئی ہے۔ اگر اس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کر لی ہوتی تو اسے کوئی اچھی نوکری مل سکتی تھی۔ اس نے سوچا وہ بی اے کر لے۔ اکثر طلبہ جو کالج میں باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کر سکتے تھے یا ملازمت کرتے تھے' وہ کسی پرائیویٹ اسکول میں داخلہ لے کر منشی فاضل کا امتحان پاس کر لیا کرتے تھے اور اس کے بعد صرف انگریزی کا امتحان دے کر بی اے کی ڈگری لے لیا کرتے تھے۔ اس نے بھی اپنے لیے یہی مناسب سمجھا۔ لاہور میں دہلی دروازے کے باہر ایک پرائیویٹ اسکول ''دارالعلوم السنۃ شرقیہ'' تھا۔ اکثر طلبہ اسی ادارے میں داخلہ لیتے تھے۔ اس نے بھی یہاں داخلہ لے لیا۔

وہ سارا دن پوسٹ آفس میں کام کرتا اور شام کو سائیکل پر میلوں کا سفر طے کر کے مدرسہ پہنچ جاتا۔ رات کو دیر گئے گھر آتا جہاں ستونت کور بے چینی سے اس کا انتظار کر رہی ہوتی تھی۔ اسی کی خاطر تو وہ یہ محنت کر رہا تھا۔ ستونت کور کو بھی اس کا احساس تھا۔ وہ بھی سراپا شکر گزار بنی اس کی خدمت میں مصروفِ عمل تھی۔

تھکا دینے والے یہ دن گزارتے ہوئے اسے ایک سال ہوگیا تھا۔ سیاسی حالات مخدوش تھے۔ شہید گنج ایجی ٹیشن شروع ہو چکا تھا۔ ایک دن وہ مدرسے سے گھر جا رہا تھا کہ بلوائیوں سے آمنا سامنا ہوگیا۔ بلوائیوں نے دیکھا کہ ایک

سکھ جو دبلا پتلا بھی ہے اور کمزور بھی تن تنہا سائیکل پر چلا جا رہا ہے تو انہوں نے اسے گھیر لیا۔ اس کی سائیکل نے راستہ نہ دیکھ کر سانپ کی طرح بَل کھائے اور پھر بیدی سمیت زمین پر لیٹ گئی۔ کتابیں بکھر گئیں۔ مثنوی مولانا روم ایک طرف پڑی تھی تو سکندر نامہ دوسری طرف فردوسی کا شاہ نامہ تیسری طرف۔ وہ جان بچاتا کہ کتابیں سمیٹتا۔ اس نے اسی میں عافیت سمجھی کہ سائیکل اور کتابیں چھوڑ کر کسی طرف بھاگ کھڑا ہو۔ وہ کچھ دور بھاگا اور پھر ایک مکان کا دروازہ کھلا دیکھ کر مکان میں گھس گیا۔ یہ گھر خالی پڑا تھا۔ یہی لگتا تھا کیونکہ کوئی آواز تک نہیں آرہی تھی' وہ آگے بڑھا تو ایک کوٹھری میں ایک سن رسیدہ عورت کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔ اس کا مطلب ہے یہ کسی مسلمان کا مکان ہے۔ پہلے اس نے سوچا یہاں سے بھاگ کھڑا ہو لیکن پھر بلوائیوں کا خیال آ گیا۔ باہر کون سے فرشتے میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ خطرہ باہر بھی ہے اور اندر بھی۔ اس سے تو اندر ہی کا خطرہ ٹھیک ہے۔ وہ دہشت زدہ سا بڑی بی کے قریب کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے سلام پھیرا تو ایک سکھ لڑکے کو اپنے گھر میں دیکھ کر وہ بھی خوف زدہ ہو گئیں۔

''کون ہو تم! یہاں کیوں آئے ہو' چور ہو کیا؟''

''نہیں ماں جی' میں چور نہیں ہوں۔ میں تو ایک غریب طالب علم ہوں۔ مدرسے سے آرہا تھا کہ بلوائیوں نے مجھے گھیر لیا۔ مجھے مار دینا چاہتے تھے۔ میں جان بچانے کے لیے یہاں آ گیا۔ مجھے معاف کر دیں۔'' بیدی ان کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

''ان کا ستیاناس ہو۔ مسلمان ہو کر مسلمانوں کو بدنام کر رہے ہیں۔ کسی کی جان لینا ثواب سمجھتے ہیں۔''

اتنی دیر میں گلی میں شور مچنے لگا۔ بلوائی اسے ڈھونڈتے ہوئے دروازے تک آ گئے تھے اور اب بری طرح دروازے کو پیٹ رہے تھے۔

''اس سکھڑے کو باہر نکالو۔ سردار کو باہر بھیجو۔ آج نہیں چھوڑیں گے سالے کو۔''

''تم یہیں بیٹھو' میں دیکھتی ہوں۔'' وہ دروازے پر چلی گئی اور بیدی اس کوٹھری میں چھپ گیا۔ وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اسے یہ بھی ڈر تھا کہ یہ عورت بھی مسلمان ہے کہیں مجھے ان بلوائیوں کے حوالے ہی نہ کر دے۔ یہ بھی ڈر تھا کہ یہ بلوائی اسے دھکا دے کر کہیں اندر ہی نہ آ جائیں۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا کہ شاید فرار کا کوئی راستہ نظر آ جائے۔ اسی وقت باہر سے زوردار آوازیں اس کے کانوں میں آنے لگیں۔ ان آوازوں میں عورت کی آواز سب سے بلند تھی۔ وہ مرنے مارنے پر اتر آئی تھی۔

آوازوں کا شور کچھ کم ہو گیا۔ خاموشی پھیل گئی۔ اس کا مطلب تھا بلوائی چلے گئے۔ وہ عورت بھی واپس آ گئی۔ بیدی کی جان میں جان آئی اور اس نے گھر سے باہر نکلنے کی ٹھانی لیکن وہ بوڑھی عورت ابھی اس کے حق میں نہیں تھی۔

''یہ لوگ بڑے مکّار ہیں۔ کہیں چھپ کر تمہارا انتظار ہی نہ کر رہے ہوں' کچھ دیر ٹھہر کر جانا۔''

''اماں جی' ان سے میری دشمنی تھوڑی ہے۔ وہ میرا کیوں انتظار کریں گے۔ کہیں اور نکل گئے ہوں گے۔ میں چلتا ہوں۔''

''میں دروازہ کھلا رکھوں گی۔ کوئی خطرہ ہو تو پھر چلے آنا۔''

''آپ کا بہت بہت شکریہ! آپ نے میری جان بچائی۔'' اس نے اس بوڑھی عورت کے سامنے پھر ہاتھ جوڑ لیے۔

وہ اس عورت کے گھر سے نکلا تو گلی سنسان پڑی تھی۔ وہ اس طرف گیا جہاں وہ سائیکل سے گرا تھا۔ اب وہاں سائیکل تھی نہ کتابیں' کوئی اس کی سائیکل لے کر چلتا بنا تھا۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔ جان کی قیمت کچھ تو ادا کرنی تھی۔ انسانیت کی تصویر' اس عورت کے چہرے کو اس نے آنکھوں میں محفوظ کیا اور پیدل گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس واقعے سے وہ اتنا دل برداشتہ ہوا کہ ایک سال کی محنت کے باوجود وہ امتحان میں نہیں بیٹھا۔ منشی فاضل کا کورس مکمل نہ ہو سکا اور اس کے ساتھ ہی بی۔ اے کا خواب بھی ادھورا رہ گیا۔

قدرت مختلف بہانوں سے اسے اس کے مقصد کے قریب لاتی جا رہی تھی۔ ایک کے بعد ایک نئی منزل اس کے استقبال کے لیے تیار کھڑی تھی۔ وہ آگے نہیں بڑھ رہا تھا لیکن چیزیں وہی اس کے سامنے آرہی تھیں جو آگے بڑھنے کے دوران آتی ہیں۔ ایسا ہی ایک واقعہ اسے اچانک پیش آ گیا۔ وہ دوستوں کی ایک محفل میں بیٹھا تھا کہ ایک دوست نے اس کا مضحکہ اڑاتے ہوئے کہا' ''وہ شکل صورت' قد و قامت' ذہنی صلاحیت' کسی اعتبار سے بھی تو قابل قبول نہیں۔''

اس میں صرف اتنی صداقت تھی کہ وہ شکل وصورت کی طرف سے معمولی تھا لیکن شکل وصورت کا عقل و دانش سے کیا

واسطہ۔ اسے جارج برنارڈ شایاد آگیا۔ وہ بھی تو معمولی شکل صورت کا تھا۔ کیا اسے بھی یہ کہہ کر کوڑے دان کی غذا بنایا جاسکتا ہے۔ اگر اسے اس بنیاد پر رد نہیں کیا جاسکتا تو میں کیوں؟ پھر اسے ایک حقیقت کا سامنا ہوا۔ برنارڈ شا فنکار اتنا بڑا تھا کہ اس کی شکل صورت اس کی ذات کا ثانوی حصّہ بن گئی۔ مجھ میں اور اس میں یہی فرق ہے۔

اس نے اس رائے کے ردّعمل میں یہ فیصلہ کیا کہ وہ کچھ بن کر دکھائے گا۔ اس کی جو تذلیل ہوئی تھی اس کا جواب یہی تھا کہ وہ کچھ بن کر دکھائے اور تذلیل کرنے والے کو لاجواب کردے۔

وہ شاعری اور مصوری کر کے چھوڑ چکا تھا۔ کچھ کہانیاں لکھی تھیں جو ادھر اُدھر چھپ بھی چکی تھیں اور ان کی پذیرائی بھی ہوئی تھی۔ اس کی ایک کہانی کو تو سال کا بہترین افسانہ قرار دیا جاچکا تھا۔ اس نے سوچا، افسانہ ہی وہ صنفِ سخن ہے جس میں اسے کسی حد تک کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ شاید یہی صنف اس کے مزاج سے قریب تر ہے۔ اسی کو اپنانا چاہیے۔ وہ بہت سے روسی ناول نگاروں کو پڑھ چکا تھا۔ ٹیگور بھی اس کے مطالعے میں رہا تھا اور اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ افسانے کو حقیقت سے قریب تر ہونا چاہیے۔ اس میں ارضیت ہونی چاہیے نہ کہ رومانیت۔ وہ خود بھی حقیقت پسند تھا، ہواؤں میں اُڑنے والے نوجوانوں کی طرح نہیں تھا۔ اس نے افسانہ نگاری کی دنیا میں قدم رکھ دیا، یہ تو ہونا ہی تھا۔

اس کے چند ہی افسانے لاہور کے مقتدر رسائل میں شائع ہوئے تھے کہ ایک ہلچل سی مچنے لگی۔ ہر ادیب دوسرے ادیب سے پوچھتا پھر رہا تھا کہ یہ راجندر سنگھ بیدی کون ہیں؟ بات یہ تھی کہ چند بڑے افسانہ نگاروں کو چھوڑ کر جتنے لکھنے والے تھے، وہ ابھی پوری طرح حقیقت نگاری کے قریب نہیں آئے تھے۔ شاعری کی طرح افسانوی ادب پر بھی رومانوی ادب کے اثرات تھے۔ ترقی پسندی کی تحریک ابھی کوسوں دور تھی جو یہ کہنے والی تھی کہ معاشرے کے نظر انداز ہونے والے کرداروں، کچلے ہوئے انسانوں، غریب اور مفلس کرداروں کو ادب کا موضوع بنایا جائے اور راجندر سنگھ بیدی نے لاشعوری طور پر ان کرداروں اور ان کے مسائل کو اپنے افسانوں میں بیان کرنا شروع کردیا۔

اس کا افسانہ ”گرم کوٹ“ ایک تنگ دست کلرک کی زندگی کے گرد گھومتا تھا۔ اس نے جب یہ افسانہ لکھا تو لاہور کے مشہور ادبی رسالے ”ہمایوں“ کو برائے اشاعت بھیج دیا۔

ایک دلچسپ واقعہ

بیدی نے ایک فلم بنائی تھی ”دستک“ اس فلم کے پریمیئر پر فلم انڈسٹری، صحافت اور ادب کے سیکڑوں لوگ شریک ہوئے۔ جب شو ختم ہوا تو ایک صاحب جھٹ ایک طرف سے نکلے اور بیدی سے بولے۔

”آپ کی فلم بہت اچھی ہے۔“

”شکریہ!“ بیدی نے کہا۔

”اس میں سب اداکاروں نے عمدہ اداکاری کی ہے۔“ وہ صاحب مزید بولے۔

”بہت مہربانی کہ آپ کو ہمارے اداکاروں کا کام پسند آیا۔“ بیدی نے ان کا پھر شکریہ ادا کیا۔

”مدن موہن کی دھنوں کا تو جواب نہیں۔“ بیدی بہت خوش ہوگئے۔

”لیکن صاحب! ایک آپ سے بہت بڑی غلطی ہوگئی۔“

”جی، مجھ سے کیا غلطی ہوگئی؟“

”اتنی اعلیٰ قسم کی فلم کا نام آپ نے ”دس تک“ کیوں رکھ دیا۔ اس کا نام تو گیارہ تک یا بارہ تک ہونا چاہیے تھا۔“

بیدی کے تو تلی تلووں سے لگ گئی۔ اپنے ساتھیوں سے کہنے لگے ”کاش میں ادیب نہ ہوتا، سردار ہوتا تو میں اس الو کے پٹھے کو بتاتا کہ میں نے یہ فلم محض دس تک کیوں بنائی ہے۔“

اسے اس ماہنامے میں چھپنے کا بہت ارمان تھا۔ اب وہ خوش تھا کہ اس کا یہ ارمان پورا ہورہا ہے۔

وہ اشاعت کے انتظار میں بیٹھا تھا کہ مدیر ہمایوں نے اس افسانے کو ناقابلِ اشاعت قرار دے کر واپس کردیا۔ جواز پوچھا تو معلوم ہوا کہ اس میں املا اور زبان کی چند خامیاں موجود ہیں۔ بیدی کو بہت دکھ ہوا کہ مدیر نے فنی محاسن کو نظر انداز کرتے ہوئے چند فروعی خامیوں کی بنا پر اسے مسترد کردیا۔

یہی سلوک اس کے افسانے ”پان شاپ“ کے ساتھ ہوا۔ اس نے یہ افسانہ لکھا اور ماہ نامہ ”ادبِ لطیف“ کے

سالنامے میں اشاعت کے لیے بھیج دیا جس کے ایڈیٹر مرزا ادیب تھے۔ انہوں نے اس افسانے پر ایک اجنبی نام دیکھا اور کسی مبتدی کی کاوش سمجھ کر ناقابلِ اشاعت قرار دے کر لوٹا دیا۔ بیدی کو اس افسانے پر بھی بڑا ناز تھا۔ اس کے نزدیک یہ افسانہ تمام فنی رعایتوں کو پورا کرتا تھا۔ اس مرتبہ وہ خاموش نہیں بیٹھا۔ اس نے یہ افسانہ ساتھ لیا اور اپنے دوست اوپندر ناتھ اشک کے پاس پہنچ گیا۔ ایڈیٹروں کی شان میں جو کچھ کہہ سکتا تھا وہ بھی کہا اور افسانے کا مسودہ اوپندر ناتھ اشک کے سامنے پٹخ دیا۔

''اس افسانے کو پڑھو اور میری خامیاں مجھے بتاؤ۔ کیا یہ صرف اس لیے قابلِ اشاعت نہیں ٹھہرا کہ میں نیا لکھنے والا ہوں۔ کیا نیا ہونا جرم ہے؟ کیا میں ہمیشہ نیا رہوں گا۔''

''بیدی! ذرا ٹھہر تو...... میں دیکھتا ہوں۔ اچھا ایسا کر' تو خود مجھے پڑھ کر سنا۔''

بیدی نے افسانہ پڑھنا شروع کیا۔ اشک سنتا رہا اور بیچ بیچ میں تعریفی کلمات بھی ادا کرتا گیا جس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اسے یہ افسانہ پسند آرہا ہے۔

''نئے لکھنے والوں کے ساتھ اکثر ایسا ہوتا ہے۔ تم فکر مت کرو' تمہارا یہ افسانہ سال نامے کی زینت ضرور بنے گا۔''

''مگر یہ افسانہ تو وہ واپس کر چکے ہیں۔''

''یہ مسودہ میرے پاس چھوڑ جاؤ۔ پھر تم مجھ پر چھوڑ دو۔''

اشک نے اپنے گھر پر ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا۔ اس نشست میں اس نے مقتدر ادیبوں کو مدعو کیا۔ ان میں اور لوگوں کے علاوہ کرشن چندر' مرزا ادیب اور ادب لطیف کے مالک چوہدری نذیر احمد نے بھی شمولیت کی۔

اشک نے رومانیت اور حقیقت نگاری کی بحث سے گفتگو کا آغاز کیا۔ اس گفتگو میں افسانہ نگاری کے فنی رموز و نکات بھی زیرِ بحث آتے رہے۔ اس کے بعد ان ادیبوں نے اپنی تخلیقات پیش کیں۔ اشک نے اپنی کہانی ''ڈاچی'' پڑھی۔ کرشن چندر نے ''دو فرلانگ لمبی سڑک''۔

اس کے بعد اشک نے بیدی کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے وہی کہانی جو واپس کر دی گئی تھی یعنی 'پان شاپ' پڑھی۔ جب وہ سنا چکا تو اشک نے اسی افسانے کے فنی رموز بیان کرنے شروع کیے اور وہ تمام خوبیاں اس میں دکھا دیں جو ابھی کچھ دیر پہلے زیرِ بحث آچکی تھیں۔

نشست برخاست ہوئی تو چوہدری نذیر احمد کہانی اپنے ساتھ لے گئے اور وہ ''ادب لطیف'' کے سالنامے میں شائع ہوئی۔

اس کا ایک افسانہ ''دس منٹ بارش میں'' اسی ادب لطیف میں شائع ہوا۔ اس کے بعد تو کوئی مقتدر رسالہ ایسا نہیں تھا جس میں اس کی کوئی نہ کوئی تخلیق شائع نہ ہو رہی ہو۔ تلادان' من کی من میں' چھمن' ردِعمل وغیرہ تواتر سے شائع ہوئیں تو بڑے بڑے نام اس کی طرف متوجہ ہونے لگے۔ سب سے بڑا نام منٹو کا تھا۔ اس نے احمد ندیم قاسمی کو خط لکھا۔

''یہ راجندر سنگھ بیدی کون ہیں؟ یہ بھی ''مٹی کے ڈھیلے'' معلوم ہوتے ہیں۔ خوب لکھتے ہیں۔ ان کے افسانے آپ غور سے پڑھا کریں۔ ''ادب لطیف'' کو آپ اور بیدی صاحب پر ناز ہونا چاہیے۔''

ایک اور خط میں لکھا ''ادب لطیف'' کے تازہ شمارے میں راجندر سنگھ بیدی کا افسانہ ''دس منٹ بارش میں'' پڑھا' خوب لکھا ہے۔''

اور اس تبصرے نے تو دھوم ہی مچا دی۔ ''بیدی صاحب جو لکھتے ہیں' انہیں لکھنا ہوتا ہے۔ اور جس طرح ٹھیٹ روسی ادب کا آغاز گوگول کے افسانے ''لبادہ'' سے ہوا تھا' اسی طرح ہندوستان کے ٹھیٹ افسانوی ادب کا آغاز راجندر سنگھ بیدی کے افسانے ''گرم کوٹ'' سے ہوگا۔''

گرم کوٹ وہی افسانہ تھا جو ناقابلِ اشاعت کہہ کر واپس کر دیا گیا تھا۔ اب منٹو اسے افسانوی ادب کا آغاز کہہ کر خراجِ تحسین پیش کر رہا تھا۔ ادب میں بھی گواہیوں سے کام چلتا ہے۔ منٹو کی گواہی نے اس افسانے کے ساتھ ساتھ بیدی کے نام کو بھی بام عروج پر پہنچا دیا۔

اب ضروری ہو گیا تھا کہ وہ اپنے افسانوں کا مجموعہ شائع کر کے دنیائے ادب کو حیرت میں ڈال دے۔ اس نے ''دانہ و دام'' کے عنوان سے اپنا مجموعہ شائع کر دیا۔

بیدی کو شاید دنیائے ادب میں اپنا مقام بنانے میں کچھ دیر لگتی لیکن اس مجموعے کی اشاعت کے بعد پروفیسر رشید احمد صدیقی' پروفیسر آل احمد سرور اور سعادت حسن منٹو جو ان دنوں ہفتہ وار ''مصور'' بمبئی کے مدیر تھے' بھانپ لیا کہ افسانہ نگاری کے آسمان پر ایک روشن ستارہ طلوع ہوا ہے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی اور آل احمد سرور نے آل انڈیا ریڈیو سے اپنے نشریوں میں نمایاں طور پر بیدی کی آمد کو اردو ادب کے حق میں ایک نیک فال قرار دیا اور ان کے خوش آیند مستقبل کی بشارت دی۔ منٹو نے ہفتہ وار ''مصور'' میں اس کے فن پر تبصرے شائع کیے۔ وہ راتوں رات لاہور' بمبئی اور دہلی میں یکساں مقبول ہو گیا۔

اس کی مقبولیت آسمان کو چھو رہی تھی اور وہ خود معاش کی گرم بھٹی میں جل رہا تھا۔ ڈاک خانے میں بیٹھا ٹکٹوں پر کھٹا کھٹ مہریں لگا رہا تھا یا منی آرڈروں کی رقوم لے کر رسیدیں جاری کر رہا تھا۔ ایک طرف کاغذوں کا پلندا رکھا ہے' کھڑکی پر ذرا رش کم ہوتا ہے تو افسانہ لکھنے لگتا ہے۔

''ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی۔''

ایک صاحب اسے دیکھنے اور اس سے ملنے بہار سے لاہور آئے۔ معلوم ہوا' وہ فلاں ڈاک خانے میں ملازمت کرتے ہیں۔ وہ صاحب ڈاک خانے پہنچ گئے۔ کسی نے اشارہ کیا' وہ ہیں بیدی صاحب! پہلے تو اس شخص کو یقین ہی نہ آیا۔ یہ تو سانولے رنگ کا دبلا پتلا سکھ لڑکا تھا۔ چہرے پر ادیبوں والی رعونت اور شان و شوکت تھی ہی نہیں۔ یہ سکھ خطوں پر دھڑا دھڑ مہریں لگا رہا تھا۔ وہ شخص حیرت سے انہیں دیکھتا رہا پھر اپنا تعارف کرایا۔ بیدی نے جلدی جلدی اپنی روشنائی سے لتھڑی ہوئی انگلیوں سے اپنے پرستار کا ہاتھ تھام لیا۔ تو یہ تھا معروف افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی۔

1942ء میں اس کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ''گرہن'' شائع ہو گیا۔ اس میں شامل تمام افسانوں پر وہ پہلے ہی داد وصول کر چکا تھا۔ جب یہ افسانے یکجا ہو کر پڑھنے والوں کے سامنے آئے تو یہ معلوم ہوتا تھا جیسے لاہور میں بیدی کے علاوہ کوئی رہتا ہی نہ ہو۔ ریڈیو پر تبصرے نشر ہو رہے تھے۔ رسائل اس کی تعریفوں سے بھر گئے تھے۔

ڈاک خانے کی نوکری اب اس کے معیار سے بہت گری ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ مشورے دینے والے بہت تھے۔ اسے اس کی اہمیت کا احساس دلانے والے بھی بہت تھے لیکن باتوں سے پیٹ نہیں بھرتا۔ وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ نوکری چھوڑ دے گا تو کرے گا کیا؟ دوستوں کی طرف سے برابر تقاضے ہو رہے تھے کہ وہ یہ نوکری چھوڑ دے۔

ایک دن مشہور مزاح نگار کنہیا لال کپور اور مہندر ناتھ' بیدی کے گھر اس سے ملاقات کے لیے پہنچے۔ بیدی اس وقت تک ڈاک خانے سے واپس نہیں آیا تھا۔ بس آنے ہی والا تھا۔ بیدی کی بیوی نے انہیں بٹھا لیا اور وہ انتظار کرنے لگے۔ اس دن بیدی کو کچھ زیادہ ہی دیر ہو گئی' وہ جب گھر پہنچا تو دونوں دوستوں کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔

''ارے آپ لوگ کب پہنچے۔ کام زیادہ تھا' مجھے کچھ دیر ہو گئی۔''

''تم اتنے بڑے افسانہ نگار ہو۔ ڈاک خانے کی معمولی سی کلرکی کرتے تمہیں شرم نہیں آتی' چھوڑو اس نوکری کو۔''

چند مشہور افسانے

گرم کوٹ' لاجونتی' پان شاپ' دس منٹ بارش میں' گرہن' کوکھ جلی' اپنے دکھ مجھے دے دو' لمبی لڑکی' حجام الہ آباد کے' صرف ایک سگریٹ' تلادان' بھولا' متھن' جنازہ کہاں ہے۔

چند مشہور فلمیں

بڑی بہن' داغ' مرزا غالب' دیوداس' ابھیمان' مدھومتی' انورادھا' انوپما' گرم کوٹ' پھاگن' رنگولی' دستک

''ملازمت چھوڑ دوں' تو کیا کروں؟ بڑی ذمے داریاں ہیں' تین بچے ہیں۔ بھائی کی تعلیم کا خرچ الگ ہے۔''

''نوکری چھوڑ کر بے کار پھرنے کو کون کہتا ہے' کہیں اور نوکری کر لینا۔''

''میری انگریزی کی تعلیم معمولی ہے۔ دوسری ملازمت مجھے دے گا کون؟ گریجویٹ یا ایم اے ہوتا تو الگ بات تھی۔''

''اصل بات یہ ہے کہ تم کم ہمت ہو۔ خطرہ مول لے ہی نہیں سکتے۔ اتنے دوست ہیں' سب مل کر تمہارے لیے کوشش کریں گے۔ کوئی ایسی نوکری بھی مل سکتی ہے جس میں تمہاری اردو دانی کام آ سکتی ہے۔''

''اگر تمہاری مراد رسالوں کی ایڈیٹری سے ہے تو ان نوکریوں میں پیسے کتنے ہیں؟''

''ریڈیو کے دروازے بھی تو کھلے ہوئے ہیں۔''

''اچھا دیکھو' کچھ سوچیں گے۔''

''تم نے سوچ لیا' ٹکٹوں پر مہریں لگاتے رہو۔'' یہ کہہ کر ان دوستوں نے اس قصے کو یہیں چھوڑا اور دوسری باتوں میں مشغول ہو گئے۔

رات گئے یہ دوست اٹھ کر گئے تو ستونت کور منہ پھلائے بیٹھی تھی۔ بچے سو چکے تھے لہٰذا میدان صاف تھا۔ دونوں کے درمیان خوب لڑائی ہوئی۔ ستونت کور یہی کہے جا رہی تھی کہ تمہارے نکھٹو دوست آ جاتے ہیں اور تم ان سے میرے خلاف باتیں کرتے ہو۔ بیدی اسے سمجھاتا رہا اور پھر دھکا جو دیا تو وہ بستر پر اوندھے منہ گر گئی۔

''کھایا پیا کیا لگے گا۔ اگر اندر ہی اندر تمہارے کوسنے مجھے کھائے جائیں گے۔''

''اور کیسے لگے گا۔ دُبلی تو ہوگئی ہو۔ یوں دکھائی دیتا ہے جیسے سانپ نے برساتی مینڈک کھالیا ہو۔''

''تم نے مجھے سانپ کہا' ناگن کہا۔'' وہ بکتی جھکتی رہی اور بیدی دوسرے کمرے میں جا کر سوگیا۔ یہ روز ہی کی کہانی تھی' وہ کب تک لڑتا رہتا۔

ابھی اس کی شادی کو پانچ چھ سال ہی ہوئے تھے کہ سارا طلسم ٹوٹ گیا تھا اور پیار کی جگہ روز روز کے ایسے جھگڑوں نے لے لی تھی' یہ جھگڑے دونوں کو ایک دوسرے سے دور لے جارہے تھے۔ ایک زمانہ وہ تھا جب بیدی کہتا تھا' وہ برتن مانجھے گی تو اس کے ہاتھ خراب ہوجائیں گے۔ وہ بہت سندر ہے اور اب وہ اسے ایسا سانپ نظر آتی تھی جس نے برساتی مینڈک کھالیا ہو۔

ستونت کور بے شک خوبصورت تھی لیکن دونوں کے درمیان ذہنی ہم آہنگی نہ ہوسکی جو خوبصورتی سے زیادہ پائیدار ہوتی ہے۔ ستونت کور قریب قریب ناخواندہ تھی جبکہ بیدی عالم فاضل اور بہ طور افسانہ نگار برصغیر کے چوٹی کے فنکار تھے۔ وہ بے چاری ان کے صحیح منصب و مقام کو سمجھنے سے قاصر تھی۔ دونوں بے لچک اور ہٹیلے تھے۔ دونوں جھکنے اور دبنے کے قائل نہ تھے۔ نتیجہ یہ کہ گھر میں کھینچا تانی اور کشاکش رہنے لگی۔

وہ اس رات کے جھگڑے کے بعد صبح سو کر اٹھا تو جان بوجھ کر دفتر نہیں گیا۔ کچھ دوستوں کی باتوں کا اثر کچھ ستونت کور سے جھگڑے کا غصہ وہ بڑی دیر تک اپنے آپ سے لڑتا رہا' میرے دوست ٹھیک ہی تو کہتے ہیں۔ میں اتنا بڑا فنکار اور ڈاک خانے کی نوکری؟ کسی دن لکڑی کی کرسی پر بیٹھے بیٹھے میرا دم گھٹ جائے گا۔ اس سے پہلے کہ میرا دم گھٹے' مجھے کھلی ہوا میں نکل جانا چاہیے۔ تمام ادیب' ڈاک خانے میں تو نوکر نہیں ہیں۔ آخر وہ بھی گزارہ کر ہی رہے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا؟ بھوکا ہی تو مروں گا۔ بھوکا کیوں مروں گا' میرا اتنا نام ہوگیا ہے۔ دوست میری مدد کو ضرور آئیں گے۔ میرے تو قلم میں اتنی جان ہے کہ اس کو روٹی روزی کا ذریعہ بنالوں گا۔

اس نے کسی سے کوئی مشورہ نہیں کیا۔ ستونت کور کو تو ہوا بھی نہیں لگنے دی ''وہ جاہل کیا سمجھے گی استعفا کسے کہتے ہیں؟'' اس نے جلدی جلدی کپڑے بدلے اور ہیڈ آفس جا کر استعفا دے آیا۔

اس نے گھر میں کسی کو نہیں بتایا تھا' اس لیے انہیں دکھانے کے لیے صبح ہی گھر سے نکل جاتا اور شام کو واپس آجاتا جیسے وہ اب بھی نوکری پر ہے اور نوکری سے واپس آیا ہے۔

اس کی حقیقت نگاری کے تمام حقائق کھل کر سامنے آگئے۔ اسے بڑا ناز تھا کہ وہ قلم سے کمالے گا۔ اب جو چمکتی دھوپ میں گھر سے نکلا تو معلوم ہوا قلم گھس بھی جاتا ہے۔ وہ کوئی ڈراما لکھے بھی تو معاوضہ پچیس روپے ملے گا۔ وہ بھی کئی مہینے کے بعد۔ کسی رسالے میں افسانہ چھپے تو معاوضہ دس روپے ملے گا۔

یہ اضافی آمدنی تو اسی وقت اچھی لگتی ہے جب کوئی مستقل نوکری بھی ساتھ ساتھ چلتی رہے۔ اس نے نوکری کے لیے کوششیں شروع کردیں لیکن وعدے اور پھر وعدے۔

ایک مہینا گزر گیا اور جب تنخواہ نہیں آئی تو بات کھل ہی گئی۔ گھر میں تو سراسیمگی پھیل گئی۔ پینتالیس روپے کی رقم آجاتی تھی' وہ بھی ہاتھ سے گئی۔ ستونت کور نے ماتھا پیٹ لیا۔ اب تو وہ لڑ بھی نہیں سکتا۔ پس انداز کیا ہوا کچھ نہیں تھا جس پر تکیہ کرتا۔ جو تھا وہ مہینے بھر میں خرچ ہوچکا تھا۔ اس نے گھبرا کر ریڈیو پر درخواست دے دی۔ وہاں سے بھی کوئی جواب نہ آیا۔ تمام راہیں مسدود ہوگئیں تو اس نے گھر والوں کو ان کے حال پر چھوڑا اور دہلی پہنچ گیا کہ شاید وہاں کوئی صورت نکل آئے۔

دہلی ریڈیو اسٹیشن اردو کے چوٹی کے ادیبوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ منٹو' کرشن چندر' فیض احمد فیض' ن۔ م راشد' اوپندر ناتھ اشک سب وہاں موجود تھے۔ بیدی ریڈیو کی عمارت میں داخل ہوا تو شور مچ گیا۔ کسی کو یقین نہیں آتا تھا کہ اس جیسا کم ہمت لاہور سے دہلی آسکتا ہے اور جب یہاں موجود ادیبوں کو یہ معلوم ہوا کہ وہ ڈاک خانے کی ملازمت ترک کرکے پہنچا ہے تو سوائے حیرت کے وہ کیا کرسکتے تھے۔ لوگ اسے اٹھا کر کشاں کشاں پطرس بخاری کے پاس لے گئے جو ڈائریکٹر آل انڈیا ریڈیو تھے۔ پطرس اس سے کبھی نہیں ملے تھے لیکن نام ضرور سنا تھا اور اس کے افسانے بھی نظر سے گزرے تھے۔ وہ تپاک سے ملے۔ ''اچھا کچھ کرتے ہیں۔'' انہوں نے کہا کہ یہی ان کا تکیہ کلام تھا۔

بیدی کو پہلا پروگرام ملا اور اس کا معاوضہ پچاس روپے پایا تو اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ یہ تو ڈاک خانے کے پورے مہینے سے زیادہ معاوضہ ہے جو چند دنوں میں مل گیا ہے۔ کہیں میری قسمت میری مفلسی کے دنوں کا مذاق تو نہیں اڑا رہی ہے لیکن یہ مذاق نہیں تھا۔ وہ آل انڈیا ریڈیو' دہلی کے پبلسٹی

ڈپارٹمنٹ سے وابستہ ہوگیا تھا۔ اگر کوئی واحد دکھ تھا تو یہ کہ وہ لاہور سے دور ہوگیا تھا۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کی ایک کانفرنس دہلی میں منعقد ہوئی جس کی صدارت پطرس بخاری نے کی۔ کانفرنس کے بعد پطرس نے چند قابلِ ذکر ادیبوں کو اپنے گھر کھانے پر مدعو کیا۔ ان مقتدر ادیبوں میں نووارد بیدی بھی شامل تھے۔

''کہو بیدی، یہاں دہلی میں تمہارا دل تو خوب لگ رہا ہوگا۔ یہاں تمہارے مطلب کے بہت سے لوگ ہیں؟'' پطرس نے پوچھا۔

''یہاں اس کے سوا کیا خوشی ہوسکتی ہے کہ میں بیوی سے دور ہوں۔''

''خوشی کے اور بھی تو سامان یہاں ہیں۔''

''آپ تو خود لاہور کے ہیں۔ آپ ہی بتائیے بندہ لاہور کے علاوہ کہیں اور خوش رہ سکتا ہے؟''

''اس کا مطلب ہے تم یہاں خوش نہیں ہو؟''

''مزدور کی خوشی تو یہ ہے کہ اسے مزدوری ملتی رہے۔''

''مزدوری تو تم لاہور میں بھی کر سکتے ہو۔ لاہور ریڈیو کیوں جوائن نہیں کر لیتے؟''

''جناب! غریب بچھو کی کب موسم گرما میں قدر ہوتی ہے کہ وہ موسم سرما میں باہر نکلے۔'' اس کا اشارہ اس پہلی درخواست کی طرف تھا جو وہ بے کاری کے زمانے میں لاہور ریڈیو پردے چکا تھا اور کوئی جواب نہیں آیا تھا۔

پطرس نے اس کا اشارہ سمجھ لیا لیکن اس کا خوبصورت جواز بھی ان کے پاس موجود تھا ''برادر! دراصل ہم تخلیق کار سے اس کی صلاحیت چھین کر بیل گاڑی میں نہیں جوت سکتے۔ آپ نے دفتری کی جگہ کے لیے درخواست دی تھی جو لا نازمارد ہوئی تھی۔''

''کیا کرتا' میں بے کار تھا اور ریڈیو پر اس وقت ''دفتری' کی جگہ خالی تھی۔''

''تم نے تو یہاں انا پرستی کی اچھی مثالیں قائم کی ہیں پھر تمہیں یہ سوجھی کیا تھی۔ دفتری کی اسامی کے لیے درخواست دے بیٹھے تھے۔ میرے خیال میں تو یہ جگہ چپراسی کی ملازمت سے بالشت بھر ہی اونچی ہوتی ہے۔''

''تنگ دستی میں حوصلے پست ہوجاتے ہیں۔ پسینے چھوٹ جاتے ہیں۔ انا اور خودداری کی باتیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ بس میں بھی اسی عالم سے گزر رہا تھا۔''

پطرس نے اسی وقت اس کی تقرری اسکرپٹ رائٹر کی حیثیت سے لاہور ریڈیو اسٹیشن پر کردی۔ اس نے وہ تقرری

الٹی ریکھا

بیدی کے کانوں میں ایک جیوتشی کی شہرت کی خبر پہنچی تو وہ موسلا دھار بارش میں اپنے بیٹے نریندر کو ساتھ لیے اس جیوتشی کے گھر پہنچے جو بمبئی کے کسی دور افتادہ علاقے میں تھا۔ جیوتشی نے پیش گوئی کی کہ نریندر کے مصائب اکتوبر میں ختم ہوجائیں گے اور اس کا کاروبار پھر سے چمک اٹھے گا اور اسے خوش حالی میسر ہوگی.. مگر قدرت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ تھوڑے عرصے بعد ہی نریندر کو دل کا دورہ پڑا اور وہ چل بسا۔

نامہ جیب میں رکھا اور پھر اپنے خوابوں کے دیس لاہور چلا آیا۔

لاہور میں اسٹیشن ڈائریکٹر رشید احمد صاحب تھے ''آپ کو پچاس روپے ماہانہ تنخواہ ملے گی۔''

''مگر میں تو ڈیڑھ سو سے کم نہیں لوں گا۔''

''ڈائریکٹر میں ہوں یا آپ؟''

''میں راجندر سنگھ بیدی ہوں اور آپ رشید احمد۔ اس لیے میں ڈیڑھ سو روپے ماہوار کا حق دار ہوں۔''

''اتنے معاوضے پر تو میں اسکرپٹ رائٹر نہیں رکھ سکتا۔''

''ٹھیک ہے تو بخاری صاحب کو لکھ دوں گا کہ آپ پچاس روپے والے اسکرپٹ رائٹر کو یہاں بھیج دیں۔''

''آپ مجھے بخاری صاحب کی دھمکی دے رہے ہیں' یہاں کا مالک میں ہوں۔''

''اور ہم سب کا مالک اوپر بیٹھا ہے۔ خدا حافظ!'' بیدی نے کہا اور ان کے پاس سے اٹھ کر آگیا۔

اس معاملے کو ظاہر ہے بخاری صاحب تک پہنچنا ہی تھا۔ انہوں نے اس کا معاوضہ ڈیڑھ سو روپے مقرر کر دیا اور یوں اس کے تقرر کو رشید احمد صاحب روک نہ سکے۔

اس کی تقرری ہوگئی لیکن رشید احمد صاحب کے دل میں اس کی طرف سے بال آگیا۔ انہوں نے غالباً سوچ لیا تھا کہ وہ بیدی کو اتنا تنگ کریں گے کہ وہ زچ ہو کر نوکری ہی چھوڑ بیٹھے۔ ایک اسٹیشن ڈائریکٹر اور اسکرپٹ رائٹر کا بھلا کیا مقابلہ۔ رشید احمد صاحب نے داؤ کھیلنے شروع کر دیے۔

بیدی نے ریڈیو کے لیے ڈراما لکھا۔ منظوری کے لیے رشید احمد کے پاس گیا۔ انہوں نے اسے رد کر دیا اور نشر ہونے پر پابندی لگا دی۔ ایک حساس فنکار کے لیے یہ معمولی حادثہ

نہیں تھا۔ اس کے باوجود بیدی کڑوا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ جان لڑا کر ایک اور ڈراما لکھ مارا۔ اس کا بھی یہی حشر ہوا۔ جب کئی مرتبہ یہ حادثہ گزر چکا تو بیدی کو فکر ہوئی۔ اس نے سوچا' معلوم تو کیا جائے۔ ڈائریکٹر صاحب آخر کس قسم کا ڈراما چاہتے ہیں۔ اسے کچھ کچھ یہ بھی شبہ ہونے لگا تھا کہ اس کے خلاف کوئی سازش کی جارہی ہے' ظاہر ہے جب اس کا کوئی کام ہی سامنے نہیں آئے گا تو ریڈیو پر اس کے وجود کا فائدہ!

اس نے ملاقات کا وقت لیا اور چق اٹھا کر رشید صاحب کے کمرے میں داخل ہوگیا۔ رشید صاحب کے چہرے پر ناگواری کے اثرات ابھرے اور انہوں نے بے دلی سے اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ شکریہ ادا کر کے بیٹھ گیا۔

''کہیے بیدی صاحب! کیسے آنا ہوا؟''

''سر' میں یہ پوچھنے حاضر ہوا ہوں کہ میرا لکھا ہوا ایک بھی ڈراما اب تک نشر نہیں ہوا۔''

''کوئی بات تو ہوگی۔''

''اسی بات کو جاننے کے لیے آیا ہوں تاکہ میں اپنی اصلاح کرسکوں۔''

''بھئی' اب تو مجھے یاد بھی نہیں۔''

''آپ مسودے نکالیے' آپ نے ان پر کوئی یادداشت تو لکھی ہوگی۔''

''ہاں مگر کام اتنا ہے کہ اس وقت تو یہ کام نہیں ہوسکتا۔''

''آپ نے پڑھے تو ہوں گے' کچھ تو یاد ہوگا؟ موضوع سے اختلاف ہے یا کیا ہے؟''

''بیدی صاحب! آپ مجھے تنگ نہ کریں۔ دیکھ کر بتادوں گا کسی وقت۔''

''بہت بہتر!'' وہ اٹھ گیا۔

وہ وہاں سے اٹھ کر آ تو گیا لیکن اسے یقین ہوگیا تھا کہ اس کے ڈرامے پڑھے بغیر ہی رد کردیے گئے ہیں۔ اگر ان میں کوئی تبدیلی کرانی مقصود ہوتی تو رشید صاحب اسے بتاتے ضرور۔ اس نے طے کرلیا کہ وہ یہ معاملہ پطرس صاحب کے علم میں ضرور لائے گا۔ یہ بات اس نے اپنے دو چار ساتھیوں کو بھی بتادی۔

یہ بات اُڑتے اُڑتے رشید صاحب تک بھی پہنچ گئی۔ انہیں معلوم تھا کہ بیدی کا براہِ راست تعلق پطرس بخاری سے ہے۔ لہٰذا وہ ڈر گئے کہ معاملے نے طول کھینچا تو ان تک جاسکتا ہے۔ انہوں نے فوراً ہی ڈرامے نشر کرنے کا حکم دے دیا۔ اس کے بعد تو اس نے جو کچھ لکھا' نشر کیا گیا اور پسند کیا گیا۔

اس کے ڈرامے نشر ہونے لگے تھے لیکن رشید احمد صاحب کا دل اب بھی صاف نہیں ہوا تھا۔ وہ موقعے کی تلاش میں تھے اور یہ موقع انہیں مل بھی گیا۔

بیدی نے ایک ڈراما دوسری جنگِ عظیم کے پس منظر میں لکھا اور یہ ڈراما نہایت دھوم دھام سے لاہور ریڈیو سے نشر ہوا۔ اس کے نشر ہونے سے پہلے اس ڈرامے کے ہدایت کار ملک حبیب احمد نے برصغیر کے بعض نامور ادیبوں اور دانش وروں کو لکھا کہ وہ اس ڈرامے کو سنیں اور اس کی بابت اپنی رائے سے نوازیں۔

ڈراما نشر ہوا تو سب سے پہلا خط شاہد احمد دہلوی نے لکھا۔ انہوں نے جہاں اس ڈرامے کی بے حد تعریف کی وہاں یہ الفاظ بھی لکھ دیے کہ یہ ڈراما موپساں کی ایک کہانی سے ماخوذ ہے۔

اس خط کا موصول ہونا تھا کہ گویا قیامت آ گئی۔ پہلے تو ایک پلاننگ کے تحت پورے اسٹیشن پر اس کا چرچا کیا گیا اور پھر رشید احمد صاحب نے اسے اپنے دفتر میں بلالیا اور اس طرح بات کی جیسے کوئی عظیم چوری پکڑلی ہو اور اب بیدی کا پورا مستقبل داؤ پر لگ گیا ہے۔ وہ تو یہ ظاہر کرنے لگے جیسے ایک چوری پکڑلی گئی ہے ورنہ ان کے دوسرے ڈرامے بھی کہیں نہ کہیں سے مارے ہوئے ہوں گے۔ بیدی نے موپساں کی کہانی سے لاعلمی ظاہر کی اور اسے محض اتفاق کہہ کر جان چھڑالی لیکن رشید احمد خاموش بیٹھنے والے نہیں تھے۔ انہوں نے اس ''چوری'' کی رپورٹ بنا کر شاہد احمد دہلوی کے خط کے ساتھ پطرس بخاری کے پاس بھیج دی۔

بخاری صاحب نے وہی جواب دیا جو ایک معقول ادیب دوسرے ادیب کے لیے اختیار کرسکتا ہے۔ انہوں نے لکھا کہ جب بیدی صاحب موپساں کی کہانی سے لاعلمی ظاہر کررہے ہیں تو ان کی بات کو سمجھا جائے۔ ان جیسے عظیم فنکار سرقے کے مرتکب نہیں ہوسکتے۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ فرانس اور ہندوستان کے دو ادیبوں نے واقعے کے مناظر کو ایک ہی طرح سے سوچا جس کی وجہ سے ان کے ادب پاروں میں مماثلت در آئی۔

بات آئی گئی ہوگئی لیکن اس وقت تک اچھی خاصی رسوائی ہوچکی تھی۔ بعض کو یقین آیا بعض کو نہیں آیا۔ کچھ یہ کہتے بھی دکھائی دیے کہ بیدی نے اپنے تعلقات سے معاملہ رفع دفع کرادیا ورنہ بات تو سچی تھی۔

بیدی مطمئن ہو کر بیٹھ گیا تھا لیکن اس کی روح زخمی ہوگئی تھی۔ اس کے حساس دل کو سخت چوٹ لگی تھی کہ محنت کی کوئی

دادنہیں اور محض اتفاقی مماثلت کو اتنا طول دیا گیا اور یہ بات پھیلائی گئی کہ گویا میرا ہر افسانہ کہیں نہ کہیں سے چرایا گیا ہے۔

ابھی اس رسوائی کی گرد بیٹھی بھی نہیں تھی کہ سازشوں نے ایک اور جال بنا۔ ایک گم نام شخص نے ریڈیو کے نام ایک مراسلہ لکھا جس میں اس نے خود کو بیدی کا معتقد ظاہر کیا تھا۔ اس مراسلے میں تو اس نے لکھا کہ دنیائے ادب میں بیدی کا مخصوص مقام ہے۔ ان پر موپساں کی کسی کہانی کے سرقے کا الزام سراسر بہتان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موپساں نے بیدی کا سرقہ کیا ہے۔

یہ ایک صریحاً طنز تھا جس سے اس کی تضحیک کا پہلو صاف نکلتا تھا۔ عموماً گم نام خطوں کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی لیکن اس خط کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی گئی۔ خود بیدی نے اسے جان کا روگ بنالیا۔ وہ اتنا آزردہ خاطر ہوگیا کہ اپنے سابقہ کام ہی سے انکار کرنے لگا۔ کس دکھے دل سے اس نے اپنے دوست اوپندر ناتھ اشک کو خط لکھا۔

”بہ طور افسانہ نگار کے میں مرچکا ہوں۔ اب تو بس رسم پوری کررہا ہوں۔ یہ بات کسی سے کہنا نہیں کیونکہ یہ بھی میرا راز ہے جس کا اخفا تمہارے سامنے مصلحت نہیں۔ یار لوگوں نے تو میرے چند ایک...... جو میں نے کسی زمانے میں لکھے تھے اور جنھیں میں اچھا کہا کرتا تھا‘ اس کے متعلق یہی کہنا شروع کردیا ہے کہ وہ چرائے ہوئے ہیں یا فلاں بن فلاں سے متاثر ہوکر لکھے ہیں۔ ان ہم پیشہ لوگوں کی جب یہ کمینگیاں ملاحظہ کرتا ہوں تو مجھے چیخوف کا ”ماسکو ہملٹ“ یاد آتا ہے جس میں اس نے اپنے طبقہ علوی کے سفلہ پن کو بے نقاب کیا ہے۔ اسے پڑھ کر یہی خیال آتا ہے کہ مصنف اور اس کی زندگی پر تین حرف۔ ان مصنفوں پر تین حرف جن میں تم بھی شامل ہو۔“

اس نے اپنے ہم پیشہ مصنفوں پر تین حرف بھیج کر دل کی بھڑاس نکال لی لیکن وہ دل ہی دل میں کڑھتا رہا۔ حسد کرنے والوں کا علاج کسی کے پاس بھی نہیں ہوتا‘ وہ کیا۔

دوسری طرف اس کے گھریلو حالات بگڑتے جارہے تھے۔ اس ذہنی بعد کو پاٹنا ناممکن ہوگیا تھا جو اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان تھا اور بڑھتا ہی جارہا تھا۔ اس کے اپنی بیوی سے تعلقات پیار اور جھگڑے کا بھونڈا سا امتزاج بن کر رہ گئے تھے۔ وہ تو اس وقت سے ڈر رہا تھا جب پیار ختم ہوجائے گا اور صرف جھگڑا رہ جائے گا۔

ستونت کور کٹر مذہب پرست اور دھرم کرم کی پابند تھی مگر

بہ زبانِ خود

ایک دن میں اور میرا بیٹا کار میں بیٹھے ہوئے جارہے تھے۔ میں حسبِ معمول آہستہ چلا رہا تھا۔ اچانک پیچھے سے کوئی بچہ بھاگتا ہوا آیا۔ اسے کار کا دھکا لگا تو فٹ پاتھ پر جاگرا۔ خیر ہوئی اس کی جان بچ گئی۔

”دیکھا میں تمہاری اسپیڈ میں ہوتا تو بچہ مرگیا ہوتا۔“

”آپ میری اسپیڈ پر ہوتے تو بچے کے آنے سے بہت پہلے نکل گئے ہوتے۔“

ساتھ ہی وہ دبنگ‘ زبان دراز‘ ہٹیلی اور غصیلی بھی تھی جبکہ بیدی آزاد خیال‘ مے نوش‘ سگریٹ نوش‘ پان خور‘ راگ رنگ کی محفلوں کا دلدادہ اور عاشق مزاج سب سے بڑھ کر فنکارانہ بے نیازی سے سرشار۔ ستونت کور کی سمجھ میں یہ باتیں کب آنے والی تھیں۔

سکھ دھرم کے مطابق تمباکو نوشی کی کوئی معافی نہیں تھی اور بیدی سکھ ہونے کے بعد سگریٹ نوش تھا۔ پان میں تمباکو اتنا ڈالتا تھا کہ پان کے پتے کو موڑنا مشکل ہوجاتا تھا۔ باقاعدگی سے شراب پینے لگا تھا۔ ستونت کور کو یہ باتیں قطعی ناپسند تھیں۔ اتنی اس میں صلاحیت نہیں تھی کہ وہ کسی اور طریقے سے بیدی کو روک سکتی۔ اس کے پاس تو ایک ہی ہتھیار تھا‘ وہ تھا لڑائی۔

ان گھریلو حالات سے نجات پانے کا ایک فوری موقع اسے یہ مل گیا کہ اس کا تبادلہ سرحد ریڈیو اسٹیشن پر کردیا گیا۔ اس نے سوچا‘ سازشوں سے بھی نجات مل جائے گی اور بیوی سے بھی۔ وہاں جانے کی تنخواہ بھی پانچ سو روپے مقرر ہوئی جو بڑی دلکش تھی۔ اس نے یہ فیصلہ قبول کرلیا۔

اس کی بے چین روح نے یہاں بھی چین سے نہیں رہنے دیا۔ بیدی نے وہاں بہ مشکل ایک سال کام کیا اور پھر استعفا دے کر لاہور چلا آیا۔

لاہور آنے کے بعد ایک مرتبہ پھر بے کاری کے دن تھے اور وہ تھا۔ اس نے دوبارہ ریڈیو کا رخ بھی نہیں کیا۔ کچھ دن دوستوں کے ساتھ وقت ضائع کرنے کے بعد اس نے ”مہیشوری فلم کمپنی“ میں چھ سو روپے ماہوار پر ملازمت اختیار کرلی۔ لاہور میں رہ کر چھ سو روپے ماہوار مل رہے تھے اور

مهنگائی

کسی زمانے میں ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ اس کے دور میں بھی مہنگائی کا راج تھا۔ چیزیں بے تحاشا مہنگی تھیں مگر کانوں کو ہاتھ لگا کر بھی لوگ خرید لیتے۔

بادشاہ بھی حالات کا جائزہ لیتا رہتا تھا۔ وہ حیران تھا کہ لوگ اتنی مہنگائی میں بھی چیزیں خرید رہے ہیں۔ وہ ان کی بے حسی دیکھ کر آخر ایک دن تنگ آ گیا۔ اس نے ہر طرح سے عوام کو آزمایا لیکن عوام مہنگائی ہونے کے باوجود چیزیں خرید لیتے۔ آخر ایک دن اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ اس نے اپنے دربان سے کہا کہ جو آدمی بھی بازار سے گزرے اسے جوتے مارو۔ دربان حکم سن کر بازار گیا اور لوگوں کو جوتے مارنے شروع کر دیے۔ بادشاہ کا خیال تھا کہ لوگ آ کر اس سے اس کی وجہ پوچھیں

فلمی دنیا کی رنگینیاں الگ میسر تھیں۔ اسے یہ خیال بھی نہیں آیا کہ وہ تو تخلیقی ادب کے لیے پیدا ہوا ہے' فلمی دنیا میں کیوں چلا آیا۔ کسی نے ٹوکا بھی تو گھر کی ناداری اس کا بہترین بہانہ تھا لیکن دوست جانتے تھے کہ شراب نوشی اور بہترین برانڈ کے سگریٹ پینے کے لیے فلمی دنیا سے اچھی کوئی دنیا نہیں۔

اس نے اس کمپنی کے لیے ایک فلم "کہاں گئے" لکھی لیکن فلمی دنیا تو جوا خانہ ہے۔ جیت گئے تو پو بارے ہار گئے تو کنگلے۔ اس کی قسمت نے ساتھ نہیں دیا اور یہ فلم باکس آفس پر پٹ گئی اور بیدی نے فلم کمپنی سے استعفیٰ دے دیا۔

1942ء کا سال آ گیا تھا لیکن وہ سیاسی افق پر اٹھنے والے طوفانی بادلوں کو نہ دیکھ سکا اور اس نے مسٹر سریندر سہگل کے اشتراک سے ایک اشاعتی ادارہ "سنگم پبلشرز لمیٹڈ" کی بنیاد رکھ دی۔

اس ادارے کے تحت اس نے کتابیں چھاپنا شروع کر دیں جس میں اس کی اپنی کتاب "سات کھیل" بھی شامل تھی۔ چند ماہ گزرے تھے کہ سترہ اٹھارہ کتابیں چھاپ دیں۔ لاکھ سوا لاکھ کا سرمایہ پھنس چکا تھا کہ لاہور کی سیاسی فضا بگڑنے لگی۔ چنگاریاں شعلہ بن کر ناچنے لگیں۔ تقسیم سے پہلے ہی فسادات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ وہ سکھ تھا اور لاہور میں ہندوؤں سے زیادہ سکھوں کو خطرہ تھا۔ اس کا احساس اس دن ہوگیا جب اس کے تاؤ' بلوائیوں کی تلواروں کی نذر ہوگئے۔ پھر اس کا اشاعتی ادارہ نذرِ آتش ہوگیا۔ کئی اور رشتے داروں کی ہلاکت کی خبریں آئیں۔

اب یہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اس کے مسلمان دوست اسے سہارا دینے کو تیار تھے لیکن محلے کے محلے اس طرح خاکستر ہو رہے تھے کہ اس کی ہمت ٹوٹ گئی۔ ابھی تو ملک تقسیم نہیں ہوا کہ انسانیت برہنہ ہوگئی ہے' ملک تقسیم ہوگیا تو کیا ہوگا؟ لیکن ایسا نہ ہو کہ اس کے مسلمان مددگار بھی اس کی مدد سے ہاتھ اٹھالیں اور بھاگنے کے تمام راستے ہی بند ہو جائیں۔

ہزاروں لاکھوں مہاجرین کی طرح اس نے بھی بیوی' بچوں کو ساتھ لیا اور بے سروسامانی کی حالت میں لاہور سے نکل گیا۔

وہ راجندر سنگھ بیدی جسے لاہور سے عشق تھا' جس کا عقیدہ تھا کہ جو لاہور میں رہ لیا کہیں اور رہ ہی نہیں سکتا' اتنا مجبور ہوگیا کہ گھر کا سامان چھوڑ کر جو بعد میں لوٹ لیا گیا' دہلی پہنچ گیا۔ یہ سوچ کر پہنچ گیا کہ فسادات کا زور تھمتے ہی وہ اپنی جنم بھومی لاہور واپس چلا جائے گا۔ دہلی میں بھی حالات کون سے خوش گوار تھے۔ موت کا رقص یہاں بھی جاری تھا بس ذرا اندازِ رقص بدلا ہوا تھا۔ لاہور سے آنے والے مہاجر سکھ اور ہندو تھے اور یہاں سے جو جا رہے تھے' وہ مسلمان تھے۔ وہ یہ رقص زیادہ دیر نہ دیکھ سکا۔ دہلی کے دل میں اترا ضرور لیکن پھر شملہ جانے کی ٹھان لی تاکہ دہلی کے شوروغل سے دور بیٹھ کر کچھ لکھنے پڑھنے کا کام کرے گا اور پھر حالات ٹھیک ہوتے ہی لاہور چلا جائے گا۔ شملہ جانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کا چھوٹا بھائی ہربنس سنگھ وہاں لیکچرر تھا۔

وہ شملہ پہنچا تو اس کا چھوٹا بھائی اسی عقیدت سے ملا جس عقیدت سے کوئی اپنے محسن سے ملتا ہے۔ ہربنس کو یہاں تک پہنچانے میں بیدی کا بڑا ہاتھ تھا۔ والدین کے انتقال کے بعد وہی تو تھا جس نے ہربنس سنگھ کی پرورش کی تھی۔

شملہ کے حالات پُرسکون تھے لیکن نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کس وقت کیا ہو جائے۔ بیدی نے بگڑتے ہوئے حالات کو دیکھ کر سوچا کہ اس نفسانفسی کے دور میں ہربنس کا ساتھ کون دے گا؟ وہ بھی لاہور چلا گیا تو ہربنس کی شادی رکی رہ جائے گی۔ ابھی میں موجود ہوں تو بڑا بن کر اس کی شادی کر دوں۔ شادی کے لیے سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہربنس سے پوچھا تو اس کے پاس جمع جوڑا کچھ بھی نہیں تھا۔ بیدی بھی لٹ پٹ کر آیا تھا اور ابھی روزگار کا کوئی موقع بھی ہاتھ نہیں آیا

گے تو میں انہیں اس کی وجہ بتاؤں گا۔ لوگ جوتے کھاتے رہے اور گزرتے رہے۔ آخر پانچ دس آدمیوں کی ٹولی بادشاہ کے پاس آئی۔ بادشاہ خوش ہوا کہ چلو وجہ تو پوچھنے آئے۔ اس نے پوچھا۔ ''کہو کیسے آئے؟''

ٹولی میں سے ایک آدمی نکلا اور مسکین شکل بنا کر بولا ''بادشاہ سلامت! آپ نے ہمیں جوتے ہی مارنے ہیں تو خدارا اپنے آدمیوں کی تعداد بڑھا دیں۔ ہم۔ سے لائن میں کھڑا نہیں ہوا جاتا۔''

بادشاہ یہ جواب سن کر اپنا سا منہ لے کر رہ گیا اور اس نے عوام کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

مرسلہ: حافظ محمد بلال حیدر، کبیر والا

تھا۔ اس کے پاس ایک قلم ہی تھا جو اسے اس کی ذمے داریوں سے سبک دوش کرنے کے لیے ہمیشہ چلتا رہتا تھا۔ اس نے قلم جیب میں لگایا، بہت سارے سادہ کاغذ ہاتھ میں لیے اور مال روڈ پر واقع ایک کیفے میں جا کر بیٹھ گیا۔ چائے کا آرڈر دیا اور اس کا قلم سامنے رکھے ہوئے کاغذوں پر اس کی ضرورتوں کا نوحہ رقم کرنے لگا۔ جب بہت دیر گزر گئی اور ویٹر اسے گھورنے لگا کہ عجیب آدمی ہے، ایک چائے کے پیسوں میں کرسی پر چپک ہی گیا ہے تو بیدی نے ایک چائے اور منگالی۔ قلم پھر چلنے لگا اور یوں کئی گھنٹے گزار کر وہ گھر چلا آیا۔ پھر یہ روز کا معمول بن گیا۔ اس نے گویا اس کیفے کو دریافت کرلیا تھا۔ اسے دیکھ کر بعض اور ادیب و شاعر بھی وہاں بیٹھنے لگے۔

ان کاغذوں پر وہ دراصل ایک فلم ''ستیاریو'' کے نام سے لکھ رہا تھا۔ اس کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ یہ فلم لکھ کر دہلی جائے گا اور وہاں کوشش کرے گا کہ یہ فلم فروخت ہو جائے۔ اس سے جو روپے ملیں گے ان سے وہ ہربنس کی شادی کردے گا۔ اس نے یہ فلم لکھ بھی لی اور دہلی بھی گیا لیکن وہ بھائی کی محبت میں یہ بھول ہی گیا تھا کہ اس کام کے لیے یہ وقت سخت نامناسب ہے۔ اس کی سعی و کاوش بے کار گئی۔ کوئی بھی اس فلم کو خریدنے پر تیار نہیں ہوا اور اسے خالی ہاتھ واپس آنا پڑا۔ ہربنس کی شادی کا خواب بھی کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھنا پڑا۔

فساد کی آگ شملہ میں بھی بھڑک اٹھی تھی لیکن یہاں معاملہ یک طرفہ تھا۔ مسلمانوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کیا جا رہا تھا۔ بیدی سکھ ہونے کی وجہ سے محفوظ تھا لیکن اس کے لیے تو یہ تماشا بھی سوہانِ روح تھا کہ کسی مسلمان کو بھی کیوں قتل کیا جائے۔ اس کا دوست ایشور سنگھ بھی انہی خیالات کا حامل تھا۔ بیدی اپنے اس دوست کے ساتھ مل کر مسلمانوں کی حفاظت کررہا تھا۔ جہاں کوئی مسلمان خطرے میں گھرا ہوا ملتا، اس کی مدد کرتے اور اسے بہ حفاظت ریل گاڑی تک پہنچا دیتے۔ یقین ہی نہیں آتا تھا کہ بیدی جیسا کمزور دل ان خطرات سے کھیلنے پر کس طرح آمادہ ہو گیا ہے۔ شاید اس لیے کہ لاہور میں اس کی بھی مدد ایک مسلمان عورت نے کی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ فنکار تھا، افسانہ نگار تھا یا شاید اس لیے کہ وہ انسان تھا۔

وہ ابھی شملہ ہی میں تھا کہ اسے معلوم ہوا حفیظ جالندھری بھی شملہ میں ہیں۔ انہیں یہاں سے نکالنا ضروری تھا۔ وہ ان کا سراغ لگانے نکل کھڑا ہوا۔ پھر اسے معلوم ہوا وہ فلاں محلے میں ہیں۔ وہ پتا پوچھتے پوچھتے آگے بڑھنے لگا۔ ہر قدم پر خطرہ تھا۔ کوئی دل جلا مسلمان اسے بھی تو ٹھکانے لگا سکتا تھا۔ اتفاق سے سر عبدالقادر کا بیٹا جو فوج میں تھا، اسے مل گیا۔ اسے ساتھ لے کر بڑی تگ و دو کے بعد حفیظ جالندھری کو تلاش کرلیا۔

''اوئے بیدی توں......!'' حفیظ جالندھری نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا ''تو بھی آ گیا کرپان لے کے۔ سکھ آخر سکھ ہی ہوتا ہے۔'' انہوں نے مذاق کیا۔

''حفیظ صاحب! یہ مذاق کا وقت نہیں ہے، یہاں سے جلدی نکلیے۔ میں آپ کو لینے آیا ہوں۔''

''یار بیدی! دیکھا تو نے، انسان کتنی جلدی جانور بن جاتا ہے۔''

بیدی انہیں لے کر چلا اور خطروں سے بھرے انہی راستوں سے ہوتا ہوا اسٹیشن پہنچ گیا۔ دمِ رخصت بارِ ممنونیت سے حفیظ آبدیدہ ہو گئے۔ بیدی کو گلے سے لگا لیا۔

ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات یاد نہ تم کو آ سکے
ہم نے تمہیں بھلا دیا تم نہ ہمیں بھلا سکے

☆☆☆

بیدی کو یہاں رہتے ہوئے سات آٹھ ماہ ہو چکے تھے۔

وہ یہاں سکون کی تلاش میں آیا تھا لیکن محض سکون سے تو زندگی نہیں گزاری جاسکتی۔ اسے یقین ہوگیا تھا کہ وطن کی تقسیم اب ناقابلِ تنسیخ ہے۔ اب لاہور دیکھنے کو نہیں ملے گا۔ اب اسے ہندوستان ہی میں رہنا ہے اور یہاں رہنے کے لیے کسی معقول روزگار کا ہونا بھی ضروری ہے۔ وہ دہلی واپس چلا جائے۔ اس کے علاوہ اس کے پاس کوئی راستہ نہیں تھا۔

ریل نے کالکا سے انبالہ تک کا سفر طے کیا تھا کہ چھتیس گھنٹوں کا کرفیو لگ گیا۔ گاڑی کھڑی ہوگئی۔ اسٹیشن پر ہزاروں آدمی پڑے ہوئے تھے۔ بھوک سے جاں بلب' خوف زدہ' پریشان۔ ہر لمحہ ایک انتظار کہ کیا ہونے والا ہے؟ بڑا ہیبت ناک منظر تھا۔ گاڑی آئی تو لوگ بے تحاشا ٹوٹ پڑے۔ اس نے بھی کسی نہ کسی طرح بیوی بچوں کو ٹھونس دیا۔ اس کے بچے ڈبے میں جاچکے تھے لیکن خود اس کے لیے راستے بند تھے۔ سوچنے کا وقت نہیں تھا' وہ چھت پر چڑھ گیا۔ چھت پر بھی لوگ مکھیوں کی طرح چپکے ہوئے تھے۔ ہر لمحہ یہ خوف ستا رہا تھا کہ کون کب چھت سے گر جائے۔ لوگ ایک دوسرے کو پکڑے بیٹھے ہوئے تھے۔ ریل ایک پل کے نیچے سے گزری۔ بیدی کی پگڑی اُڑ گئی' سر بچ گیا۔

اس وقت دہلی کے بازاروں میں گولیاں چل رہی تھیں۔ چاروں طرف آپادھاپی کا دور دورہ تھا۔ پرانے دوستوں میں کوئی بھی دہلی میں نہیں تھا اور اسے رہائش کا مسئلہ درپیش تھا۔ وہ دریا گنج ہوتا ہوا موری گیٹ تک پہنچ گیا۔ ایک مکان نظر آیا جس کے دروازے چوپٹ کھلے ہوئے تھے۔ اس نے کئی آوازیں دیں لیکن اندر سے کوئی نہ نکلا۔ نکلتا کون' گھر خالی پڑا تھا۔ گھر کے مکین سب کچھ چھوڑ کر جان بچا کر بھاگ چکے تھے۔ کیا خبر وہ اپنی منزل تک پہنچے بھی یا راستے ہی میں ختم کردیے گئے۔

بیدی نم دیدہ آنکھوں سے تصویرِ عبرت بنا گھر کے آنگن میں کھڑا تھا۔ گھر کے مکینوں کو یاد کر رہا تھا۔ اِدھر اُدھر بکھرا ہوا سامان بھاگنے والوں کا حال ظاہر کر رہا تھا۔ واگورو! اس گھر کے لوگ پاکستان تک پہنچ گئے ہوں اور انہیں ماڈل ٹاؤن والا مکان مل گیا ہو جو میں لاہور میں چھوڑ آیا ہوں۔"

ایک کمرے میں بوسیدہ کتابوں کا انبار پڑا تھا۔ بیدی اکڑوں بیٹھ گیا اور کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ اچانک اس کی نظر اپنی کتاب "گرہن" پر پڑی۔ اسے یوں لگا جیسے بچھڑا ہوا کوئی عزیز سرِراہ مل جائے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر یہ کتاب اٹھالی اور ورق گردانی کرنے لگا۔ اس کے حاشیوں میں قاری نے کہانیوں کے بارے میں اپنے تاثرات لکھ دیے تھے۔ ایک جگہ لکھا تھا۔

"زندہ رہو' بھئی چہ خوب۔ واللہ......شاباش یہی تو ہونا تھا۔

خدا کی قسم تم نے......ہاہا......خوب! خوب!"۔

بیدی رقیق القلب تھا۔ ذرا سی بات اسے رلا جاتی تھی۔ اس کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔ "ہم کتنے بڑے غاصب ہیں' کتنے عظیم مجرم ہیں۔ دشمنِ انسانیت ہیں۔ اے لکھنے والے! کیا تجھے خبر تھی کہ تو جو میری اس بے باکی سے تعریف کر رہا ہے' ایک دن تجھے اس کی کتنی بڑی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔"

اب وہ باقاعدہ رو رہا تھا۔

اس کی کتاب اس گھر میں تھی اب وہ رہنے لگا۔

اتنے دنوں میں وہ اتنے دکھ بھوگ چکا تھا کہ اس کی روح زخمی ہوگئی تھی۔ وہ لفظوں کے ٹانکے دینے بیٹھ گیا۔ الٹی ہتھیلی سے آنسو پونچھنے لگا اور سیدھے ہاتھ سے اپنے تجربات کو کہانی بنانے لگا۔ افسانے کا عنوان تھا "مہاجرین!"

جب حالات کا غصہ کم ہوا تو اس نے بھی پگڑی سر پر رکھی۔ بہت دن بعد کپڑے بدلے تھے۔ گھر سے باہر نکلا۔ چند دوستوں کو تلاش کیا۔ ان سے لاہور کی باتیں کیں۔ پھر یونہی اکیلا دہلی کی سڑکوں پر گھومتا رہا۔ شام ہوئی تو پرندے کی طرح گھر لوٹ آیا۔ دل کے زخم ابھی بھرے نہیں۔ وہ پھر لفظوں کے ٹانکے لگانے میں مصروف ہوگیا۔ ایک اور افسانہ اس کے قلم کی زد میں تھا۔

"نی راجندرا! قلم ہی توڑتا رہے گا یا کبھی کمانے بھی جائے گا؟"

ستونت کور کی آواز اس کے کانوں میں آئی تو اسے یاد آیا کہ وہ کہیں نوکر نہیں ہے۔ اسے کوئی ملازمت بھی ڈھونڈنی ہے۔ ورنہ اس دیارِ غیر میں فاقوں کی نوبت آجائے گی۔ اس نے وہ رات سوچتے اور جاگتے ہوئے گزاری۔ ماہ نامہ "آجکل" حکومتِ ہند کا رسالہ تھا۔ یہی ایک نوکری تھی جو اس کے مطلب کی تھی۔ اس کا حق بھی بنتا ہے کہ وہ مہاجر ہوکر لاہور سے یہاں آیا ہوا ہے۔ وہ صبح ہوتے ہی "آجکل" کے دفتر پہنچ گیا۔ کئی دن تک ہوم ڈپارٹمنٹ کے اور وزارتِ اطلاعات کے چکر کاٹتا رہا۔ کہیں کوئی اسے جانتا تھا کہیں اسے تعارف کرانا پڑا لیکن مقصد میں کامیابی نہ ہوسکی۔

اب ایک ہی صورت تھی' بمبئی کی فلمی دنیا میں اسے کوئی کام مل سکتا تھا۔ اس نے قسمت آزمائی کے لیے بمبئی جانے کا ارادہ کرلیا۔ اسے یاد آیا' ستونت کور کے رشتے کا بھائی پورن

کمار بھلہ بمبئی میں رہتا ہے۔ اسے یہ بھی یاد تھا کہ کمار بھلہ ماڈل ٹاؤن لاہور والے مکان میں اس کے پاس طویل عرصے تک قیام پزیر رہا تھا اور بیدی نے ان کی مدد کی تھی۔ اب اس پر وقت پڑا تھا تو وہ اس کی ضرور مدد کرے گا۔

بیدی بمبئی پہنچ گیا اور کمار بھلہ کے ہاں ٹھہر گیا۔ چند روز میں اس کے بیوی بچے بھی بمبئی آگئے۔ کمار بھلہ نے شروع میں تو ان لوگوں کی خوب آؤ بھگت کی لیکن جونہی اسے یہ معلوم ہوا کہ بیدی بے روزگار بھی ہے اور تہی دست بھی' اس نے آنکھیں پھیر لیں۔ اب وہ احسان بھی یاد نہ رہا جو ابتدائی دنوں میں بیدی اس پر کر چکا تھا۔

اس عسرت کے ہاتھوں بیدی کے لیے یہ صورت حال ناگوار تھی۔ وہ یہاں سے اٹھ جانا چاہتا تھا لیکن جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں تھی۔ اسے [illegible] بھائی کے ہاتھوں ذلیل ہونے سے اچھا یہ لگا کہ وہ کہیں بھی نکل جائے اور وہ نکل گیا۔ جیب خالی ہوتے ہوئے بھی میرین ڈرائیو کے ایک عمدہ ہوٹل میں سولہ روپے یومیہ کرائے پر کمرا لے لیا۔ طے ہوا کہ ہفتہ وار بل ادا کریں گے۔ گویا اب اس کے پاس ایک ہفتہ تھا اس میں اسے پیسوں کا انتظام کرنا تھا۔

وہ گھر گیا اور بچوں کو لے کر ہوٹل آگیا۔ ایک ہفتہ پلک جھپکتے گزر گیا۔ ہوٹل والوں نے بل ادا کرنے کا تقاضا کیا۔ وہ صرف اس حد تک انتظام کر سکا تھا کہ اس نے پرانی فائلیں کھنگال کر کچھ افسانے نکال لیے تھے۔ کچھ افسانے دہلی میں لکھے تھے۔ کچھ بمبئی آکر لکھ لیے تھے۔ یہ کل بارہ افسانے تھے۔ ان میں ایک افسانہ ''کوکھ جلی'' تھا۔ اس نے اس افسانے کے عنوان پر مجموعے کا نام ''کوکھ جلی'' رکھا اور مسودہ لے کر نکل کھڑا ہوا۔ ہوٹل کا مالک دیکھ رہا تھا کہ یہ سکھ نوجوان جا تو رہا ہے واپس بھی آتا ہے یا نہیں لیکن یہ سوچ کر مطمئن بھی تھا کہ وہ اکیلا ہے۔ اس کے بیوی بچے ہوٹل ہی میں ہیں۔

وہ پبلشروں کے بورڈ پڑھتا چلا جارہا تھا۔ ایک جگہ اسے میسرز کتب پبلشرز لمیٹڈ کا بورڈ نظر آیا۔ وہ چق اٹھا کر اندر داخل ہوگیا اور پبلشر کے سامنے [illegible]

''آپ وہی راجندر سنگھ بیدی ہیں جو لاہور میں تھے اور ریڈیو سے منسلک تھے؟''

''ہاں' میں وہی ہوں اور وہی ہوں جس کے دو مجموعے ''دانہ ودام'' اور ''گرہن'' پہلے ہی شائع ہو چکے ہیں اور اگر آپ اس مسودے کو شائع کر دیں گے تو یہ راجندر سنگھ بیدی کا تیسرا مجموعہ ہوگا۔''

''بیدی جی' بات یہ ہے کہ حالات آج کل ٹھیک نہیں ہیں۔ تقسیم سے پہلے کی بات الگ تھی۔ آج کل ہندوستان میں اردو پڑھتا کون ہے۔ میں چھاپ تو دوں لیکن ڈرتا ہوں رقم ڈوب نہ جائے۔''

''یہ میرے افسانے ہیں۔ مجھے پڑھنے والے کم نہیں ہوئے۔''

پبلشر اور بیدی کے درمیان بڑی دیر تک بحث ہوتی رہی۔ پھر بارہ سو روپے رائلٹی پر معاملہ طے ہوگیا۔ اب بیدی کا اصرار تھا کہ رقم اسے ایڈوانس دی جائے۔

''میں یہ کر سکتا ہوں کہ آدھی رقم آپ کو ابھی دے دوں' آدھی چھپنے کے بعد۔''

''چلیے نکالیے۔ میری ضرورت شدید ہے۔''

بیدی نے یہ رقم پکڑی اور ہوٹل پہنچ کر ہوٹل کا بل ادا کر دیا۔ کئی ہفتوں کی اور بھی رقم محفوظ تھی لیکن اس کے خرچ ہونے سے پہلے پہلے اسے کوئی نہ کوئی انتظام کرنا تھا۔ اس کے ذہن میں ابھی کوئی خاکہ نہیں تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ بس ایک دھندلا سا' یہ خیال ابھرتا تھا کہ یہ بمبئی ہے کیوں نہ یہاں کی فلم لائن میں قدم جمانے کی کوشش کی جائے۔

اس کے ذہن میں بہت سے ایسے نام آئے جو افسانہ نگار تھے لیکن انہوں نے جسم وروح کے رشتے کو بحال رکھنے کے لیے ایک اطمینان بخش اور پُرسکون زندگی گزارنے کے لیے فلم لائن جوائن کر لی۔ منٹو اور کرشن چندر تک اس سے نہ بچ سکے۔ وہ اس بات کا بھی جائزہ لے رہا تھا کہ اب موجودہ ہندوستان میں اردو کا کیا مستقبل ہے۔ اردو میں لکھا جانے والا ادب کتنے فیصد پڑھا جائے گا۔ اگر اس نے افسانہ نگاری ہی کو اپنا مشغلہ بنائے رکھا تو وہ کتنے افسانے لکھ سکے گا اور کتنے چھپیں گے۔ چھپ بھی گئے تو رائلٹی کتنی مل جائے گی۔ رہا یہ سوال کہ فلم سازوں کا مرہون منت رہنا پڑے گا۔ معاوضے کے حصول کے لیے گڑگڑانا پڑے گا۔ وہ تو ادب میں بھی ہوتا ہے۔ ادب تخلیق کرنا الگ بات ہے اور اسے پبلشروں کے ہاتھوں فروخت کرنا دوسری بات ہے۔ یہ پبلشر کیا کم استحصال کرتے ہیں۔ اسے منٹو کا لکھا ہوا ایک جملہ یاد آگیا۔ ''ادب کی خدمت کرو اور فلم سے روپے کماؤ۔''

اس کے بعد سوچنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ منٹو اس کا محسن تھا۔ اس کی رائے آخری۔ اس نے سوچا' اب میں بھی ادب کی خدمت کروں گا اور فلم سے روپے کماؤں گا۔

اب سوال صرف ایک تھا کہ اس سنہری دروازے میں داخل کیسے ہوا جائے۔ یہ بھی اس کے لیے ایسا کوئی زیادہ مشکل نہیں تھا۔ وہ لکھنے پڑھنے والوں کے لیے اجنبی نہیں تھا۔

بمبئی پہنچتے ہی ادبی حلقوں میں اس کے پہنچنے کی خبر پہنچ گئی تھی۔ مختصر سی تگ و دو کے بعد اس کی ملاقات مشہور پنجابی فلم ڈائریکٹر ڈی۔ڈی کیشپ سے ہوگئی جو ان دنوں بابوراؤ پائی کے اشتراک سے فلمیں بنا رہے تھے اور اس سے پہلے وہ پربھات فلم کمپنی' پونا سے وابستہ رہے تھے۔

کیشپ نے اس کا صرف نام سنا تھا' اسے دیکھا کبھی نہیں تھا لہٰذا اتفاق سے انہوں نے بھی اس سے وہی سوال کیا جو چند روز پہلے وہ پبلشر کر چکا تھا جس کے پاس وہ ''دکھ جلی'' کا مسودہ لے کر گیا تھا۔

''آپ ہی راجندر سنگھ بیدی ہیں جو ریڈیو سے منسلک تھے؟''

''جی ہاں' اور وہی بیدی ہوں جس کے افسانوں کے دو مجموعے چھپ چکے ہیں۔''

''افسانے لکھنا اور بات ہے۔ میں نے تو وہ ڈرامے سنے ہیں جو آپ نے ریڈیو کے لیے لکھے تھے' اس لیے پوچھ رہا تھا۔''

''چلیے۔وہی بیدی سمجھ لیجیے۔''

''آپ کے دوست امر کمار بتا رہے تھے کہ آپ فلموں کے لیے لکھنا چاہتے ہیں؟'' کیشپ نے امر کمار کی طرف اشارہ کیا جو اسے لے کر آئے تھے۔

''جی ہاں' میں پاکستان سے لٹا پٹا آیا ہوں۔ فلموں کے لیے لکھ کر کچھ کھا کما لوں گا۔''

''تو پھر میری ''فیمس پکچرز کمپنی'' کے لیے لکھیے۔ ہم آپ کو چھ سو روپے ماہوار تنخواہ دیں گے۔''

''یہ تو بہت کم ہیں۔ آپ میری ضرورت دیکھ کر تنخواہ مقرر نہ کریں۔ میں ایک ہزار سے کم نہیں لوں گا۔''

''کیا کہہ رہے ہیں بیدی صاحب! قمر جلال آبادی اور راجندر کرشن جیسے کہنہ مشق لکھنے والوں کو بھی چھ سو روپے دے رہا ہوں' آپ تو......''

''میں کسی پر انگلی اٹھانے کا قائل نہیں۔ میں تو اپنی بات کر سکتا ہوں۔''

''اچھا ایسا کیجیے ابھی چھ سو روپے قبول کر لیجیے۔ دو تین ماہ بعد اضافہ کر دوں گا۔''

بیدی شروع سے ایک ہزار پر اڑا ہوا تھا اور اڑا رہا۔ اُدھر کیشپ بھی چھ سو روپے سے آگے نہیں بڑھ رہا تھا لہٰذا معاملہ طے نہ ہو سکا اور بیدی اٹھ کر چلے آئے۔

امر کمار جوان کے ساتھ ہی اٹھ گیا تھا اور غالباً کیشپ سے کہہ بھی آیا تھا کہ وہ بیدی کو بہلا پھسلا کر پھر لے آئے گا' راستے ہی میں اس پر برس پڑا۔

''یار' تم عجیب آدمی ہو۔ وہاں سے اٹھنے سے پہلے اپنے حالات تو دیکھے ہوتے۔ ابھی تم نئے ہو۔ ذرا قدم جما لو تو پھر اپنی مرضی کا معاوضہ لے لینا۔''

''یار' چھ سو روپے۔''

''تمہارے جیسے ادیب کے لیے کم ہیں مگر اس وقت اپنے بچوں پر رحم کھاؤ۔''

''اوئے یار!'' یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔ میرے بچے بھی تو ہیں اور پتنی بھی تو ہے۔ جوتے موزے تو وہی ڈھونڈ کر دیتی ہے' اس لیے اسے بھی زندہ رکھنا ہے مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ میں تو اٹھ کر آ گیا۔''

''اب کل پھر اس کے پاس چلیں گے۔ اس سے کہنا چل ٹھیک ہے۔ چھ سو روپے تنخواہ سہی۔''

''کل تو نہیں جائے گا میرے ساتھ۔ میں اکیلا جاؤں گا۔''

''کیوں۔''

''مجھے دوستوں کے سامنے ذلیل ہونا اچھا نہیں لگتا۔ اچھا لگوں گا' ہزار سے چھ سو روپے پر آتے ہوئے تیرے سامنے۔''

''تیری مرضی! اکیلے چلے جانا۔''

''چھ سو بھی بہت ہوتے ہیں یار' میں چھ سو لے لوں گا۔''

دوسرے دن اس نے بسنتی پگڑی سر پر رکھی' ترشی ہوئی داڑھی پر ہاتھ پھیرا (وہ داڑھی ترشواتا تھا) آئینے میں اپنے منہ کو مختلف زاویوں سے سیدھا ٹیڑھا کر کے دیکھا اور کیشپ سے ملنے چلا گیا۔ اس کے قدم تیز تیز اٹھ رہے تھے۔ اس لیے نہیں کہ اسے کیشپ سے ملنے کی جلدی تھی بلکہ بات یہ تھی کہ صبح صبح بیوی سے جھڑپ ہوگئی تھی اور وہ ابھی تک غصے میں تھا۔ ''کہتی ہے تمباکو کھانا چھوڑ دوں' سگریٹ پینا چھوڑ دوں۔ یہ نہیں مانتی کہ وہ بیوی کس کی ہے' راجندر سنگھ بیدی کی' وہ بڑبڑاتا ہوا چل رہا تھا۔

کیشپ کے دفتر کی بلڈنگ آتے ہی اس کے دونوں ہاتھ پگڑی کی طرف چلے گئے۔ پگڑی درست کی اور کیشپ کے دفتر کی طرف بڑھنے لگا۔ ستونت کور ٹھیک ہی تو سوچتی ہے ''راجندر سنگھ تیری حیثیت ہی کیا ہے' ابھی اندر جا کر کہے گا' ٹھیک ہے مجھے چھ سو منظور ہیں۔''

''آئیے راجندر سنگھ' آئیے۔ مجھے معلوم تھا' آپ ضرور آئیں گے۔ اب کہیے' کیا سوچا؟''

''سوچنا کیا ہے کیشپ صاحب! یہ بتانے آیا ہوں کہ

مجھے ہزار روپے سے کم تنخواہ قبول نہیں ہے۔''

''ایں! آپ یہ بتانے آئے ہیں؟'' کیشپ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''اور یہ بھی بتانے آیا ہوں کہ معاہدہ تحریری ہوگا زبانی نہیں۔''

''مگر یہاں تو سب زبانی چلتا ہے۔''

''اگر زبان سے پھرنا نہیں ہے تو تحریری میں کوئی حرج بھی نہیں۔''

''اور کوئی شرط ہے بیدی صاحب!''

''ایک شرط یہ بھی ہے کہ میں ایک پکچر باہر بھی لکھا کروں گا۔''

کیشپ نے میز کی دراز سے کچھ کاغذات نکالے اور اس کے آگے رکھ دیے ''اپنے ہاتھ سے اپنی شرائط لکھ دیجیے۔ میں دستخط کردوں گا۔ مجھے آپ کی شرائط منظور ہیں۔''

بیدی اپنی شرائط پر فیمس پکچرز کمپنی، بمبئی سے منسلک ہوگیا۔

بیدی کی آمد کا سنتے ہی حاسدوں کے پرے اس کے گرد حلقہ سجا کر بیٹھ گئے۔ تعریف کے پردے میں حوصلہ شکنی کے کلمات ادا ہونے لگے۔

''بیدی صاحب، یہ تو دنیا تسلیم کرتی ہے کہ آپ بہتر بڑے افسانہ نگار ہیں۔ ہمیں خود بھی تسلیم ہے لیکن فلم اسکرپٹ تیار کرنا دوسری چیز ہے۔ برسوں کی ریاضت چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو آپ افسانوں سے بھی جائیں اور فلموں سے بھی۔''

ان حاسدین نے ایک طرف بیدی کی حوصلہ شکنی کی تو دوسری طرف کیشپ کو اس کے خلاف بھڑکانا شروع کردیا تاکہ اس کا اعتماد متزلزل ہوجائے۔

''وہ افسانہ نگار تو بہت اچھے ہیں لیکن اسکرپٹ لکھنا انہیں نہیں آتا۔''

''کل میں ان سے ملنے گیا۔ نہ جانے کیا اول فول لکھ رہے تھے۔ میں نے انہیں بتا تو دیا ہے کہ کس طرح لکھنا ہے۔ اب دیکھیے کیا لکھتے ہیں۔''

''مسٹر کیشپ! آپ نے بہت بڑا رسک لے لیا ہے۔ بالکل نئے آدمی کے ہاتھ میں فلم پکڑا دی۔''

''سیکھ تو وہ جائیں گے لیکن یہ فلم ان کے ہاتھوں نہ جانے کیا سے کیا بن جائے گی۔''

کیشپ کچھ دنوں تو ان کی تکذیب کرتا رہا لیکن پھر اسے کچھ کچھ یقین آنے لگا کہ شاید وہ لوگ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔ اس نے چند قریبی لوگوں سے درخواست کی کہ وہ کیشپ کا نقصان نہ ہونے دیں۔ بیدی سے جہاں کوئی غلطی ہوتے دیکھیں، اسے مشورہ دیں۔

ان لوگوں کے لیے یہ اجازت بہت تھی۔ اب ان لوگوں نے کیشپ سے یہ کہنا شروع کردیا کہ اس نے فلاں سین ٹھیک نہیں لکھا تھا، ہم نے درست کرادیا آپ فکر نہ کریں۔ اس نے چند مکالمے درست نہیں لکھے تھے، ہم نے لکھ کر دے دیے۔ کمرشل مزاج تو وہ رکھتا ہی نہیں ہر چیز میں ادب ٹھونستا ہے۔ کہو تو برا مانتا ہے، خیر سب ٹھیک ہوجائے گا، ابھی نیا نیا ہے۔''

ان سب باتوں سے بے خبر نہایت خاموشی، محنت اور لگن سے اپنا کام کرتا رہا۔ وہ فلموں کے لیے نیا ضرور تھا لیکن ایک خداداد صلاحیت کا مالک بھی تھا اور اپنی صلاحیتوں سے کام لے رہا تھا۔ وہ اگر نیا تھا تو اس تجربے میں کہ فلمی دنیا میں سازشیں کس اعلیٰ پیمانے پر کی جاتی ہیں۔

اس نے ان ناموافق حالات میں فیمس پکچرز کے لیے فلم ''بڑی بہن'' لکھی۔ اس فلم کی عکس بندی کے دوران بھی وہ موجود رہا۔ روشنیوں کا یہ کھیل اس کے لیے بالکل نیا تجربہ تھا۔

یہ فلم پردۂ سیمیں پر چلی تو نہایت کامیاب رہی لیکن المیہ یہ ہوا کہ اس میں بیدی کا کہیں نام نہیں تھا جبکہ طے یہ ہوا تھا کہ اس کا نام آئے گا۔ یہ لازمی تھا کہ وہ کیشپ سے اس کی وضاحت طلب کرتا۔ اس کے پوچھنے پر مسٹر کیشپ بے تحاشا ہنسنے لگے۔

''بھئی، کس کس کا نام دیتے۔ ہم نے سوچا کسی کا بھی نام نہ دیں۔''

''کس کس کا کیا مطلب! اسکرین پلے میں نے لکھا تھا۔ میرا نام ہونا چاہیے تھا، یہی طے ہوا تھا۔''

''بیدی صاحب! یہ آپ کی پہلی فلم تھی۔ بہت سے لوگوں کے مشورے اس میں شامل تھے۔ آئندہ جب آپ اکیلے کوئی فلم لکھیں گے تو پھر آپ ہی کا نام دیا جائے گا۔''

''مجھے ان حضرات کا آپ نام بتائیں گے جنہوں نے لکھنا سکھایا ہے؟''

''بیدی صاحب، یہ میرا راز ہے میرے پاس رہنے دیجیے۔''

''مسٹر کیشپ! یہ میری عزت کا سوال ہے۔ کسی نے آپ کو مجھ سے بدظن کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں منشی نہیں ہوں افسانہ نگار ہوں اور مجھے کوئی کیا لکھنا سکھائے گا۔''

''سچ بتائیے، بیدی صاحب! یہ مکالمے لکھنے میں آپ کی کسی نے مدد نہیں کی؟''

''اس سے بڑا بہتان مجھ پر اور کوئی نہیں ہو سکتا۔''
''میں سب کچھ سمجھ گیا ہوں۔'' کیشپ نے کہا ''یہ فلم لائن ہے۔ یہاں ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچی جاتی ہے۔ آپ تو خیر نئے تھے' غضب تو یہ ہوا کہ میں بھی ان لوگوں کے کہنے میں آ گیا۔ میں ان لوگوں سے خود باز پرس کرلوں گا' آپ جانے دیجئے۔ آپ دوسری کہانی پر کام کیجئے۔''
بیدی انتقام کا قائل نہیں تھا۔ وہ اکثر انسانی برائیوں کو ان کی ضرورت کہہ کر مطمئن ہو جاتا تھا۔ اس وقت بھی اس نے اتنی بڑی چوٹ کھانے کے بعد بھی کیشپ کے کہنے پر اپنے نادیدہ مخالفین کو معاف کر دیا اور پھر سے اپنے کام میں لگ گیا۔
ایسا ہی ایک واقعہ مسٹر کیشپ سے ملاقات سے پہلے اس کے ساتھ پیش آیا تھا۔ وہ روزگار کی تلاش میں تھا کہ اس کی ملاقات مشہور فلم ڈائریکٹر نندا سے ہو گئی۔ نندا صاحب اس کے فن کے مداح تھے۔ انہوں نے اسے ایک ہزار روپے ماہوار مشاہرے پر اپنے ساتھ کام کرنے کی پیشکش کی۔ اس نے نہ صرف یہ کہ یہ پیشکش قبول کر لی بلکہ اپنے دوست راما نند ساگر سے اپنی اس کامیابی کا ذکر بھی کر دیا۔ رامانند ساگر اس وقت تو چپ ہو گئے لیکن بیدی کے پاس سے اٹھ کر وہ سیدھے نندا صاحب کے پاس پہنچے اور ان کے کان بھر دیے۔
''کوئی کتاب لکھنا ایک بات ہے لیکن فلم لکھنا دوسری بات ہے۔ ضروری نہیں جو اچھا ادیب ہو وہ اچھی فلم بھی لکھ سکے بلکہ دیکھنے میں یہی آیا ہے کہ اچھا ادیب اچھی فلم نہ لکھ سکا۔ دیکھ لیجئے منشی پریم چند کو۔ یہی حال بیدی کا ہے۔ آپ کسی اناڑی کے ہاتھ میں اپنی لاکھوں روپے کی گردن تھمار ہے ہیں۔''
نندا صاحب نے جو بہت محتاط قسم کے ڈائریکٹر تھے' بیدی کے بجائے رامانند ساگر کو اس اسامی کی پیشکش کر دی۔ بیدی نے یہ خبر سنی تو سکتے میں آ گیا۔ وہ صرف اتنا کہہ سکا' ساگر کی ضرورت مجھ سے بڑی ہوگی۔
یہی وہ پس منظر تھا کہ جب وہ کیشپ سے ملا تو ایک ہزار سے کم مشاہرہ لینے پر تیار نہیں ہوا۔ وہ اپنی خودی کو تسکین دینا چاہتا تھا کہ اگر ساگر نے ایک ہزار کی اسامی اس سے چھین لی تو اس نے ایک ہزار کی اسامی کہیں اور سے لے کر دکھا دی۔
بیدی نے دوسری فلم ''داغ'' لکھی۔ اس فلم کے ڈائریکٹر امیہ چکرورتی' ہیرو دلیپ کمار اور ہیروئن نمی تھی۔ یہ فلم کمرشل فلموں کی مروجہ روش سے ہٹ کر تھی۔ اس کے باوجود فلم بینوں نے اسے خوب سراہا اور باکس آفس پر سپر ہٹ ثابت ہوئی۔ اس میں بطور مکالمہ نگار صرف انہی کا نام مندرج تھا۔ اور محض اس ایک فلم سے اس کا شمار چوٹی کے مکالمہ نگاروں میں ہونے لگا۔
مشہور بنگالی فلم ڈائریکٹر بمل رائے فلم ''دیوداس'' بنانے کا ارادہ کر رہے تھے۔ اس فلم کی کہانی ایک ادبی ناول سے ماخوذ تھی لہٰذا اس کے مکالمے لکھنے کے لیے بھی کسی ادبی شخصیت کی تلاش ہوئی۔ نظر انتخاب بیدی پر گئی۔
فلم کے ہیرو دلیپ کمار کی منجھی ہوئی اداکاری اور بیدی کے چست اور ادبی رنگ لیے مکالموں نے اس میں نئی روح پھونک دی۔ فلم ہٹ رہی۔ اس طرح فلمی دنیا میں ہر فلم کی کامیابی کے ساتھ بیدی کی بلند قامتی میں اضافہ ہوتا گیا۔
فلم ''مرزا غالب'' نے تو بیدی کو ان بلندیوں پر پہنچا دیا جہاں بہت کم لوگ پہنچے تھے۔ اس فلم کی کامیابی نے نہ صرف فلم بینوں بلکہ ناقدین سے بھی خراجِ تحسین وصول کیا۔ ہر طرف بیدی کے نام کے چرچے ہونے لگے۔ اب وہ ان رائٹرز میں تھا جو منہ مانگا معاوضہ وصول کرتے ہیں۔
یہ فلم سعادت حسن منٹو کی کہانی ''غالب اور چودھویں'' پر مبنی تھی۔ یہ کہانی منٹو نے بہت تحقیق اور کاوش کے بعد لکھی تھی تاکہ وہ معتبر اور مستند حقائق پر مبنی ہو اور تاریخی پہلو سے اس پر انگشت نمائی نہ کی جا سکے۔ منٹو کی اس کہانی کو بیدی کے مکالموں نے چار چاند لگا دیے۔
فلمی دنیا تو ہمات کی دنیا ہے۔ اگر کسی ہیرو کی ایک فلم سپر ہٹ ہو جائے تو تمام فلم ساز اس کے پیچھے دوڑ پڑتے ہیں۔ اسے خوش قسمتی کا نشان سمجھا جانے لگتا ہے۔ اگر کوئی ناکام ہو جائے تو سب منہ پھیر لیتے ہیں۔ ہارنے والے گھوڑے پر کون رقم لگائے۔ بیدی کی مسلسل کامیابیوں نے اسے ''خوش قسمتی کا نشان'' بنا دیا۔ پروڈیوسر اس کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ دولت' شہرت' ناموری اس کے ساتھ تھی۔
بیدی نے ایک اور فلم ''مدھومتی'' کے مکالمے لکھے۔ یہ فلم بھی بمل رائے نے ڈائریکٹ کی اور اس کا ہیرو بھی دلیپ کمار ہی تھا۔ یہ ایک رومانی فلم تھی لیکن یہاں بھی بیدی نے اپنے ادبی معیار کو برقرار رکھا۔ یہ فلم نہ صرف عوام و خواص میں مقبول ہوئی بلکہ کمرشل اعتبار سے بھی ثمر آور ثابت ہوئی۔
بمل رائے سے اس کے مراسم استوار ہوئے تو ان کے توسط سے رشی کیش مکرجی سے بھی اس کا تعلق ہو گیا جو بمل رائے کے خصوصی معاون ہدایت کار تھے۔
مکرجی ایک لائق ہدایت کار تھا لیکن بمل رائے کی موجودگی میں اور اس کے معاون کی حیثیت سے کام کرتے

ہوئے خود اس کی شہرت نہ صرف یہ کہ ماند پڑ رہی تھی بلکہ وہ آزادی سے کام بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے بمل رائے سے علیحدہ ہو کر اپنی فلمیں بنانا شروع کیں تو اس کی قدر دان آنکھوں نے بیدی کا انتخاب کر لیا۔ اب بیدی مستقل طور پر اس سے وابستہ ہو گیا۔ مکرجی بڑا اعلیٰ ادبی ذوق رکھتا تھا لہٰذا وہ بیدی کی صلاحیتوں کا قائل تھا۔ بیدی کے تعلقات بمل رائے سے تھے اور وہ اس جھگڑے میں پڑ کر بمل رائے سے علیحدہ ہونا نہیں چاہتا تھا لیکن جب بمل رائے نے خود اجازت دے دی تو وہ رشی کیش مکرجی سے مستقل طور پر وابستہ ہو گیا۔ انہوں نے مکرجی کے لیے ایک درجن سے زیادہ کہانیاں لکھیں جن میں انورادھا، انوپما اور ستیہ کام جیسی اعلیٰ فلمیں شامل تھیں۔ مکرجی اکثر کہا کرتے تھے کہ ان کی کامیابی میں ایک ہاتھ راجندر سنگھ بیدی کا بھی ہے۔

فلمی دنیا کی بے پناہ مصروفیات نے اسے ادبی دنیا سے بالکل ہی دور کر دیا۔ کبھی کبھی اس کا کوئی افسانہ کسی ادبی رسالے میں شائع ہو جاتا تو ٹھہرے ہوئے پانی میں ہلکی سی ہلچل پیدا ہوتی اور پھر جمود سا چھا جاتا۔ وہ جب 1949ء میں بمبئی آیا تھا تو اس کا تیسرا افسانوں کا مجموعہ ''کوکھ جلی'' شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد برسوں گزر گئے تھے کوئی کتاب سامنے نہیں آئی تھی۔

بیدی ان لوگوں میں سے تھا جو ذمے داریوں سے بھاگتے نہیں بلکہ انہیں آواز دیتے ہیں۔ جو ذمے داریاں ان کی نہیں بھی ہوتیں، انہیں بھی وہ اپنی ذمے داری سمجھتے ہیں۔ ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اسے ہمیشہ پیسوں کی ضرورت رہی۔ بچوں کی اچھی تعلیم، شادیاں، شادی شدہ بہن تک کی ذمے داری، بیوی سے اچھے تعلقات نہ ہونے کے باوجود اس کی فرمائشیں، دوستوں کی مہمان نوازی کی ذمے داری۔ سارے جہاں کا درد اس کے جگر میں تھا۔ اسے احساس تھا کہ فلموں میں رہ کر اس نے اپنا وقت برباد کیا۔ یہی محنت اگر وہ نخلِ ادب کی آبیاری کے لیے کرتا تو کتنا اچھا ہوتا مگر ذمے داریوں کو نبھانے کی تگ و دو میں وہ ادب کی طرف اس طرح متوجہ نہ ہو سکا جس طرح ہونا چاہیے تھا۔ مخلص دوست اگر اسے لعن طعن بھی کرتے کہ وہ تخلیقی ادب کی طرف کیوں متوجہ نہیں ہوتا تو وہ اسی عذر کو اپنی آڑ بنا لیتا۔

''نان نفقہ کی کشمکش کوئی بھی سنجیدہ کام نہیں کرنے دیتی۔ کچھ گلے شکوے جو تم جیسے عزیز دوستوں کے ہیں، وہ صحیح ہیں لیکن تم زندہ ہو، صحبت باقی ہے۔ نتیجہ بہتر ہی ہوگا۔ ابھی میں اپنی پگڑی سنبھالنے کی فکر میں ہوں۔''

اس کے اپنے حالات کے ساتھ ساتھ زمانے کے حالات نے بھی اسے مجبور کر دیا تھا۔ تقسیم ملک کے بعد ہندوستانی ادیبوں کے لیے ممکن نہیں رہا تھا کہ وہ محض ادب کے سہارے زندہ رہ سکیں۔ اردو کو ان لوگوں کی زبان گردانا گیا جنھوں نے وطن عزیز کی تقسیم کی مانگ کی تھی۔ گویا زبان کو سیاست میں گھسیٹ لیا گیا۔ پاکستان کی قومی زبان اردو تھی لہٰذا ہندوستان میں ہندی ''راشٹر بھاشا'' کو قومی زبان قرار دیا گیا۔ اردو کو سرکاری نظم و نسق سے نکال باہر کیا گیا۔ ہندی کی بالادستی مسلم ہو گئی۔ کمال یہ ہوا کہ فلموں کی زبان خالص اردو رہی۔

اردو کے قارئین کم ہوئے تو معیاری رسائل و جرائد بھی ناپید ہوتے گئے۔ اردو فنکاروں میں بھی بہت سوں نے ہندی کے حق میں آواز بلند کی۔ اوپندر ناتھ اشک نے اردو سے قطع تعلق کر کے ہندی کو وسیلۂ اظہار بنایا۔ کرشن چندر نے ہندی میں زیادہ لکھنا شروع کر دیا۔ بیدی کے سامنے بھی یہی مجبوری تھی۔ اس نے بھی جھلا کر کہا اور ٹھیک کہا۔

''میں کس کے لیے لکھوں اور کیوں لکھوں؟ ہندوستان میں اردو کا کوئی فیوچر ہے بھی؟ یہاں اردو کا کوئی رسالہ نکلتا ہے جس میں کہانی چھپے۔ نہ کوئی پبلشر ہے جو مجموعہ چھپے۔''

بمبئی کی زندگی نے اسے وہ سب کچھ دے دیا تھا جس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ ایک دور وہ تھا جب وہ سولہ روپے روز کے ایک ہوٹل میں رہ رہا تھا۔ اب ماٹنگا میں ایک معقول فلیٹ اس کے پاس تھا اور ایک چھوڑ دو دو کاریں اس کے اور بیوی بچوں کے لیے حاضر رہتی تھیں۔ سمندر کے کنارے ایک کمرا الگ لے رکھا تھا جہاں وہ بے تکلف دوستوں کو شراب پلاتا تھا اور کہانیاں لکھتا تھا۔ اس کے اپنے دفتر کی آرائش دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ اب وہ دبلا پتلا سکھ نہیں رہا تھا۔ اس کا بدن اور گال بھر گئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں مظلومیت کی جگہ ذہانت نظر آنے لگی تھی۔ اب وہ بہترین سوٹ پہنتا تھا اور روز بدلتا تھا۔ احباب کو آئے دن کی پُرتکلف نائو نوش کی دعوتیں اور مہمانوں کی غیر معمولی طور پر خاطر مدارات بھی اس کی خوش حالی کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ وہ ایک مخصوص پنواڑی سے پان لیا کرتا تھا جس کی دکان اس کے گھر سے بیس میل کے فاصلے پر تھی اور وہ پان لینے اپنی کار میں ہمیشہ اس دکان پر جایا کرتا تھا۔ یہ تھی اس کی شاہ خرچی۔

☆☆☆

بیدی کا فلم انڈسٹری میں قابلِ رشک مقام تھا اور تمام لوگ اس کی فنی صلاحیتوں کے تہ دل سے قائل تھے۔ فلموں

دا! تہ ہوئے بھی ایک زمانہ گزر گیا تھا مگر اب بھی اپنے کام کا معاوضہ لینے میں خمیدہ سر ہونا پڑتا تھا گویا کسی سخی کے سامنے کوئی حاجت کا مارا دستِ طلب دراز کررہا ہو۔ یہ بات اس کے دل کو کھٹکتی ضرور تھی لیکن وہ مکڑی کے جالے میں اس طرح پھنس گیا تھا کہ نکل نہیں سکتا تھا۔

ادبی دنیا میں وہ کوئی بھی حیثیت رکھتا ہو' فلمی دنیا میں اس کی حیثیت وہی تھی جو مکالمہ نگار اور کہانی کار کی ہوتی ہے۔ بعض اوقات وہ بہت کاوش اور لگن سے جو کچھ لکھتا' پروڈیوسر اور ڈائریکٹر اس پر خطِ تنسیخ پھیر دیتے یا کمرشل تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کی شکل ہی مسخ کردیتے۔ بیدی کی روح بیچین رہ جاتی لیکن حالات کہتے' تجھے تو اپنے پیسوں سے غرض ہے۔

کئی دفعہ ایسا ہوتا کہ اس کے پیسے پھنسے رہ جاتے اور وہ تقاضے کرتا رہ جاتا۔

''میں نے راج کپور کی فرمائش پر ایک کہانی لکھی تھی۔ وہ نرگس کو لے کر ایک بڑی فلم بنانا چاہتے تھے۔ میں نے بھی خوب محنت کی۔ راج کپور بھی خوش تھے لیکن اچانک نرگس سے ان بن ہوگئی پھر نرگس نے سنیل دت سے شادی کرلی۔ پھر وہ فلموں سے آؤٹ بھی ہوگئی۔ وہ فلم کب بنے گی؟ میری محنت کا صلہ کب ملے گا؟ جب کوئی نرگس پیدا ہوگی اور راج کپور کو پسند آجائے گی۔''

پھر یہ بھی تھا کہ عمر کا ایک حصّہ فلم کے بستر پر گزارنے کے باوجود وہ یہاں کے طور طریقوں سے مانوس نہ ہوسکا یا یہ طریقے اختیار نہ کرسکا للہذا پریشان ہی رہا۔

یہ آزردہ خاطری کبھی کبھی ان خطوں میں ابھر آتی تھی جو وہ اپنے دوستوں کو لکھ کر دل ہلکا کرلیتا تھا۔

''دیکھو رام لعل' تمہیں ایک واقعہ سناتا ہوں۔ میں نے ایک فلم کا پورا منظر نامہ لکھا تھا۔ ہیرو نے پروڈیوسر کو فون کیا کہ ڈائیلاگ رائٹر کو میرے بنگلے پر بھیج دو۔ میں وہاں پہنچا۔ پورے چار گھنٹوں تک مجھے برآمدے میں بٹھایا گیا۔ جب ہیرو بالآخر برآمد ہوا تو میں نے اس سے پہلی بات یہی کہی ''ہم بھی ادب کی دنیا کے ہیرو ہیں لیکن اس قسم کا سلوک کبھی کسی کے ساتھ نہیں کرتے۔'' اس کے بعد اس نے معذرت کرلی۔

تمہیں یہ واقعہ سنانے کا مقصد یہ تھا کہ یہاں ایک لٹریری رائٹر کی نہیں بلکہ فلمی رائٹر کی ضرورت ہے' بس ایک منشی سمجھ لو۔ پیٹ کی خاطر اور فلموں میں گھسنے کی خاطر اس میڈیا سے بھی شاید کچھ اظہار کرسکیں' اس لیے یہاں آنا پڑا۔''

تحقیر و تذلیل کی ان مثالوں کا سامنا صرف بیدی ہی کو نہیں کرنا پڑ رہا تھا بلکہ اس سے پہلے اور اس کے بعد بھی کتنے ہی ادیب اس کا شکار ہوئے۔ اس تذلیل کو مہندر ناتھ برداشت نہ کرسکے اور فلم لائن سے کنارہ کش ہوگئے۔ کرشن چندر ڈٹے رہے مگر سر جھکا کر سہتے رہے۔ منٹو کی کہانی جب ہزار کوششوں کے باوصف اشوک کمار نے رد کردی تو وہ اس اہانت آمیز رویے کو گوارا نہ کرسکے اور ہجرت کرکے پاکستان چلے گئے۔ اوپندر ناتھ اشک بھی دل برداشتہ ہوکر فلمی دنیا کو خیرباد کہہ گئے۔ اور جو عمر بھر برداشت کرتے رہے ان کی اپنی مجبوریاں تھیں۔

اس نے اس تذلیل سے بچنے کے لیے اپنی قید میں مزید اضافہ کرلیا۔ اس نے یہ فیصلہ کرلیا کہ وہ اپنی فلمیں خود بنائے تاکہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے اور اپنا معاوضہ طلب کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔ نہ اس کے احباب کی کمی تھی نہ اس پر اعتبار کرنے والوں کی۔ ذرا سی کوشش کے بعد اس نے چند احباب کو اپنے ''جوہو'' والے کمرے میں جمع کرلیا۔ سب یہی سمجھ رہے تھے کہ مے نوشی کی کوئی تقریب ہے جس میں اس نے دوستوں کو یاد کیا ہے۔ ایسا وہ اکثر کیا کرتا تھا۔

جب تمام دوست جمع ہوگئے تو پہلے تو واقعی اس نے بوتل کا کاک کھولا اور گلاس تقسیم کردیے لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے آئیڈیا انڈیل دیا۔

''عقل سے کورے لوگ فلموں پر سانپ بنے بیٹھے ہیں۔ اگر ہم خود فلم بنائیں اور اس کا منافع آپس میں تقسیم کریں تو یہ تفریح بھی ہوگی' آمدنی کا ذریعہ بھی اور دوستوں کے مل بیٹھنے کا بہانہ بھی۔''

''یہ فلم چل بھی جائے گی؟''

''اتنا تجربہ تو اب مجھے بھی ہوگیا ہے کہ فلم کیسے بنتی ہے' بس سرمائے کی کمی ہے۔ اسے ہم آپس میں مل کر پورا کرلیں گے۔ ایک یہی طریقہ ہے اجارہ داری ختم کرنے کا۔''

''اخراجات کتنے ہوں گے؟''

''فلم لکھنے پر جو خرچ آتا ہے تو آپ نفی کردیں کیونکہ میں فلم لکھنے کا معاوضہ نہیں لوں گا۔ صرف منافع میں میرا حصّہ ہوگا۔ اسی کو آپ معاوضہ کہہ لیں۔ اس کے علاوہ جو خرچ ہوگا' آپ کے سامنے ہوگا۔''

''ٹھیک ہے' آپ کہانی وغیرہ طے کرلیں۔''

''وہ میں سوچ چکا ہوں۔ میرا افسانہ ''گرم کوٹ'' نہایت معرکتہ الآراء افسانہ ہے۔ ایک زمانے میں یہ میری پہچان تھا۔ منٹو صاحب نے اسے بہت سراہا تھا اور منٹو کی فلمی

بصیرت آپ جانتے ہیں۔ اس میں ایک کلرک کی تنگ دستی کو موضوع بنایا گیا ہے جو ایک گرم کوٹ خریدنے تک کی استطاعت نہیں رکھتا۔ میرے خیال میں یہ موجودہ ہندوستان کے ہر گھر کی کہانی ہے۔ اس پر مستزاد مکالموں کا جادو سر چڑھ کر بولے گا۔

چند دوست روپیا فراہم کرنے پر تیار ہوگئے اور ایک ادارے کی بنیاد رکھ دی گئی۔ یہ اس کی ذاتی فلم تھی' اس نے نہایت جانفشانی سے منظر نامہ' مکالمے وغیرہ لکھے' کاسٹ کا چناؤ کیا۔ فلم کی تکمیل میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔

گرم کوٹ اس کا شاہکار افسانہ تھا لیکن یہ ضروری تو نہیں کہ کوئی شاہ کار افسانہ شاہ کار فلم بھی بن جائے۔ فلم میں فلم بینوں کے لیے دلچسپی کا سامان ہونا بھی ضروری ہے جو اس کی فلم ''گرم کوٹ'' مہیا نہ کرسکی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ فلم باکس آفس پر بری طرح پٹ گئی۔ بیدی کے ذاتی ادارے کو ستر ہزار روپے کا نقصان ہوا۔

ادارے کے مالی نقصان اور اپنی محنت کے رائگاں جانے کا اس نے قطعی افسوس نہیں کیا اور اپنی ناکامی کو کامیابی کا پیش خیمہ سمجھا لیکن دنیا نے اس کی ناکامی کو اس کی نحوست سمجھ کر اسے نظر انداز کرنا شروع کردیا۔

وہ روز روز تو فلمیں نہیں بنا سکتا تھا۔ کام ڈھونڈنے باہر نکلا تو پروڈیوسر اسے کام دینے سے کترانے لگے۔ ہر جگہ اس کی فلم ''گرم کوٹ'' کا تذکرہ نکل آتا۔

''بیدی صاحب' بزرگ ٹھیک ہی تو کہتے ہیں۔ افسانہ لکھنا الگ بات ہے لیکن فلم لکھنا اس سے آگے کی بات ہے۔ لوگ چند فلمیں لکھ کر سوچنے لگتے ہیں کہ وہ فلم بھی بنالیں گے۔ فلم بن تو جاتی ہے لیکن کامیاب کیسے ہو۔ اس کے لیے تو خاص صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے جو ہر کسی میں نہیں ہوتی۔''

اس وقت وہ [illegible] کی طرح تھا۔ انہیں جھٹلا بھی نہیں سکتا تھا۔ اپنے آپ سے یہی کہہ کر چپ ہوجاتا تھا کہ ابھی [illegible] چلا۔ نتیجہ الٹا نکلے' کام سے بھی گئے۔ اب نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن والی [illegible]

☆☆☆

بیدی نے فلمی کام کی شروعات بطور مکالمہ نگار اور کہانی کار کے کی تھی لیکن پھر اس نے فلم پروڈکشن اور ڈائریکشن کا کام بھی شروع کردیا اور اس دلدل میں دھنستا ہی چلا گیا۔ پھر یہ حال ہوا کہ وہ تو چھوڑنا چاہتا تھا کمبل اسے نہیں چھوڑتا تھا۔ رک رک کر بعض اوقات لمبے وقفوں سے اپنا تخلیقی کام جاری رکھا اور اس طرح یہ امید بندھی رہی کہ وہ دیر سویر اپنے فن کی جانب ضرور لوٹ آئے گا۔

بیدی کو اس بات کا احساس تھا کہ فلمی کام ان کے ادب کو دیمک کی طرح چاٹ رہا ہے لیکن مادی ضروریات اور نت نئے فلمی معاشقوں نے اسے فلموں سے کنارہ کشی کرنے اور فقط ادب کو اوڑھنا بچھونا بنانے سے روکے رکھا۔ وہ اب کچھ لکھ بھی رہا تھا تو بے دلی سے' رک رک کر۔ تخلیقی ادب جز وقتی کام نہیں۔ یہ مسلسل توجہ چاہتا ہے اور بیدی کے پاس فلموں اور معاشقوں کو منہا کر کے وقت ہی کتنا بچتا تھا۔ وہ تو اب یہ سوچنے لگا تھا۔

''میں نے بمبئی میں آکر کوئی غلطی تو نہیں کی۔ لکھنا پڑھنا سرے سے چھوٹ گیا۔ صحت ہے تو یہاں کی غارت گر آب و ہوا کی نذر ہو چکی ہے۔ اس پر یہ نہیں کہ بینک بیلنس بن گیا ہو۔ جو آتا ہے' خرچ ہو جاتا ہے۔''

جب بہت دن تک اس کی کوئی تازہ تخلیق سامنے نہیں آئی تو سب نے سمجھ لیا کہ دستِ ہوس نے بیدی کا گلا گھونٹ دیا۔ اسے اب وہ چیزیں تخلیق کرنے میں مزہ آتا ہے جن سے پیسے بٹورے جاسکتے ہیں۔ وہ اپنے قریبی دوستوں کو بار بار یقین دلا رہا تھا کہ وہ جلد ہی اپنے فن کی طرف لوٹ آئے گا۔ دراصل وہ یہ سوچ رہا تھا کہ ابھی کوئی فلم ہٹ ثابت ہوگی تو ہزاروں لاکھوں سمیٹ کر فلموں سے کنارہ کشی کرلوں گا اور بقیہ زندگی ادب کے لیے وقف کردوں گا لیکن وہ سہانی گھڑی انتظار پر ہی انحصار کرتی رہی' کبھی سامنے نہیں آئی' آ بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ کہہ بھی رہا تھا کہ بس اس کام کے بعد' بس اس فلم کے بعد لیکن یہ سب محض عزائم ثابت ہو رہے تھے۔ وہ برق رفتاری سے دوڑا چلا جا رہا تھا۔ دولت کے پیچھے ہیروئنوں کے پیچھے۔ پھر ایک وقت وہ بھی آیا کہ اس نے سمجھ لیا کہ ادب کی جانب لوٹنے کا وقت نکل گیا ہے' اب فلموں پر ہی قناعت کرنی ہوگی۔

''میں زندگی کے ڈیڈ اینڈ پر پہنچ گیا ہوں یعنی کہ آپ لوگ کہہ سکتے ہیں کہ میں فلموں سے نکلنا سرے سے چاہتا ہی نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پچھلے دنوں جو بے کاری آئی اس میں سب عزیزوں کے پول کھل گئے۔ جن کو میں سہارا سمجھتا تھا' انہوں نے اپنی لاٹھی کھینچ لی اور میں دھڑام سے گرا' چنانچہ میں اور کنٹریکٹ کرنے جا رہا ہوں۔''

اس کا بیٹا نریندر بیدی اب اس کے مقابل آ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے بھی فلم لائن اختیار کرلی تھی ''برہمچاری'' اور ''بندھن'' جیسی شاندار فلموں کی ہدایت کاری سے اس نے نام بھی پیدا کرلیا تھا لیکن بیدی سے نہایت گستاخی اور بدتمیزی

سے پیش آتا تھا۔ اس کے سامنے صرف سگریٹ ہی نہیں، مے نوشی بھی کرتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بیدی اپنی مصروفیات میں الجھ کر اس کی تربیت کرنا ہی بھول گیا تھا۔ وہ بگڑا ہوا ذہین نوجوان تھا۔ اس کے باوجود بیدی کی صلاحیتوں کا معترف تھا اور اس کی رائے کو اہمیت دیتا تھا جبکہ نریندر اپنے باپ کی صلاحیتوں کا قطعی منکر تھا۔ وہ اکثر کہتا تھا کہ میں آپ کی طرح ناکام فلمیں بنانا نہیں چاہتا۔

''گرم کوٹ'' کی ناکامی کے بعد بیدی بالکل خاموش ہوگیا تھا لیکن نریندر نے اسے مشورہ دیا کہ وہ ادب کی ٹانگ نہ توڑے بلکہ ایک ایسی فلم بنائے جو کمرشل ہوتا کہ پچھلے نقصان کا ازالہ ہوسکے۔

نریندر، رشی کیش مکرجی سے بہت متاثر تھا لہٰذا اس نے انہیں ایڈیٹنگ کا انچارج مقرر کیا اور بیدی نے ''پھاگن'' کے نام سے یہ فلم لکھنے کا آغاز کردیا۔

فلم کی ہیروئن وحیدہ رحمٰن تھی۔ ابھی فلم کی شوٹنگ شروع نہیں ہوئی تھی کہ بیدی کی حسن پرست طبیعت نے اسے دیکھ کر بھرپور انگڑائی لی۔

''اگر آپ کے مکالمے آپ کو سامنے بٹھا کر لکھوں تو آپ پر بہت سجیں گے۔''

''مجھے تو کوئی اعتراض نہیں لیکن آپ کی دھرم پتنی کیا کہیں گی؟''

''انہیں تو ہوا بھی نہیں لگے گی۔ میں گھر پر نہیں لکھتا ہوں۔ سمندر کے کنارے ''جوہو'' پر میں نے ایک کمرا لے رکھا ہے۔ آپ وہاں آجائیں۔'' وحیدہ رحمٰن وہاں پہنچ گئی۔

بیدی ان دنوں کچھ زیادہ ہی شراب پینے لگا تھا۔ وحیدہ رحمٰن وہاں پہنچی تو اس وقت تک بیدی آدھی بوتل خالی کرچکا تھا۔ شراب کا نشہ اس کی آنکھوں سے نکلنے کے لیے بے چین تھا۔

''آپ اس قدر نشے میں ہیں، لکھیں گے کیسے؟''

''کون کم بخت لکھے گا؟''

''آپ نے تو مجھ سے یہی کہا تھا۔''

''دو چار دن تو یہ دیکھنے میں لگ جائیں گے کہ کس عمل پر آپ کا کیا ردِعمل ہوتا ہے۔ آپ کا مزاج کیا ہے۔ اس کے مطابق ہی تو آپ کے کردار میں الفاظ ڈالے جائیں گے۔''

وحیدہ رحمٰن بے تحاشا ہنسنے لگی۔ وہ بچی نہیں تھی کہ ان باتوں کو سمجھ نہ پاتی لیکن وہ ایک ایسے آدمی کے پاس بیٹھی تھی جو اپنی فلم بنا رہا تھا۔ وہ اور بھی فلم بنا سکتا تھا۔ اس کا روشن مستقبل اس آدمی کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے ایک پیگ بنایا اور بیدی کے منہ سے لگادیا۔

اب وحیدہ وہاں روز آنے لگی تھی۔ وہ گھنٹوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے سمندر پر گھومتے رہتے۔ اکثر کسی ہوٹل میں جاکر کھانا کھاتے۔ کچھ وقت ملتا تو فلم لکھ بھی لیتا ورنہ تو وہ دوسری راہ جا نکلا تھا۔

دونوں کے درمیان زبردست عشق چل نکلا تھا۔ اگر بیدی اس کے حسن کا شکار ہوا تھا تو ہوشیار وحیدہ رحمٰن اپنے مستقبل کی بنیادیں مضبوط کررہی تھی۔

یہ باتیں چھپنے والی نہیں تھیں جبکہ بیدی خود بہت بڑا ڈھنڈورچی تھا۔ اس کے پیٹ میں کوئی بات رکتی ہی نہیں تھی بلکہ وہ تو ان اسکینڈلز کو شہرت و ناموری کا ذریعہ سمجھتا تھا۔ جتنے زیادہ اسکینڈلز، ڈائریکٹر اور پروڈیوسر سے وابستہ ہوں، وہ اتنا ہی نام پاتا ہے۔ وہ اکثر راج کپور اور دیوآنند کی مثالیں دیا کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر ڈائریکٹر اور اس کی ہیروئن میں جذباتی رشتہ استوار ہوجائے تو وہ زیادہ تندہی سے کام کرتی ہے۔

اچانک غلغلہ بلند ہوا، ہر جگہ وحیدہ رحمٰن کا نام اس کے ساتھ لیا جا رہا تھا۔ شاید وہ دونوں اپنی اپنی جگہ خوش ہوں کہ فلم ریلیز ہونے سے پہلے ہی شہرت مل رہی ہے لیکن گھر میں جو طوفان اٹھ کھڑا ہوا، اس نے اسے پریشان کردیا۔ اس کے اپنی بیوی سے تعلقات کشیدہ چلے آرہے تھے لیکن تھی تو بیوی، اس کے چار بچوں کی ماں۔ بیدی گھر پہنچا تو بیوی نے منہ نوچ لیا۔ نریندر، اس کا بیٹا اتنا گستاخ تھا کہ پہلے ہی اسے جوتی کی نوک پر رکھتا تھا۔ اس کا رویہ بیدی کے ساتھ اتنا ہتک آمیز تھا کہ بیدی کی بزدلی تھی جو اسے برداشت کرتی چلی آرہی تھی۔ اپنی ماں کے ساتھ تن کر کھڑا ہوگیا اور پھر وہ باتیں ہوئیں جو بیدی جیسے ادیب کے گھر میں نازیبا نظر آتی ہیں۔

''آپ کو شرم آنی چاہیے۔'' نریندر اس پر برس پڑا ''اپنی عمر دیکھو اور یہ چوچلے۔ پورے شہر میں تھوتھو ہو رہی ہے۔''

''اور تو جو میرے سامنے بیٹھ کر شراب پیتا ہے؟''

''میں شراب ضرور پیتا ہوں لیکن کوئی میرے کیریکٹر پر انگلی نہیں اٹھا سکتا۔''

''میرا کیریکٹر بھی خراب نہیں ہے، وحیدہ مجھ پر مرتی ہے اور بس۔''

''ایک وحیدہ سے کیا ہے۔ آپ کی کار تو میں نے طوائفوں کے کوٹھوں کے نیچے بھی کھڑی دیکھی ہے۔ میرے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ جو کام میری عمر کو سجتے ہیں، تم کررہے ہو۔''

"ارے تو کیا کرے گا' یہ کام مردوں کے ہیں۔"

"باسٹرڈ چپ ہوجا۔" نریندر نے بیٹا ہوکر یہ الفاظ اتنی زور سے کہے کہ بیدی کا نشہ ہرن ہوگیا۔

اس کے بعد ستونت کور تو رونے بیٹھ گئی اور نریندر نے اپنا سامان باندھا اور گھر سے نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد ایک مرتبہ پھر ستونت کور اس کے مقابل آ گئی۔ اب صرف وہ لڑ رہی تھی' بیدی کے الفاظ ختم ہوگئے تھے۔

ستونت کور بولتے بولتے تھک گئی اور بستر پر ڈھیر ہوکر سسکنے لگی۔ بیدی نے دوسرے کمرے میں جا کر بوتل کھول لی۔ وہ بار بار بڑبڑا رہا تھا "میرے بیٹے نے مجھے باسٹرڈ کہا۔ مجھے گالی دی۔ صرف اس لیے کہ وحیدہ رحمٰن مجھ پر مرتی ہے۔ میں جب اس کے ساتھ کسی پارٹی میں جاتا ہوں تو لوگ مجھے رشک سے دیکھتے ہیں' جلتا ہے سالا مجھ سے۔"

وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا کہ اس کی دونوں بیٹیاں اس کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔ ان دونوں نے بھی اسے سمجھانا شروع کردیا۔ اسے بڑی شرم آئی کہ بیٹیاں اسے سمجھا رہی ہیں لیکن بیوی کو سامنے نہ دیکھ کر وہ پھٹ پڑا۔

"اپنی ماں کو سمجھاؤ' جس نے ہم سب کی زندگی اجیرن کردی ہے۔ یاد کرے لاہور کا زمانہ' بمبئی تک پہنچتے پہنچتے میں نے اسے مہارانی بنادیا۔ دن رات محنت کرتا ہوں کس کے لیے؟ اس کے لیے' تم سب کے لیے مگر وہ ہے کہ مجھ سے منہ ہی نہیں لگاتی۔ لڑتی ہے مجھ سے۔"

"پاپا' آپ تو پڑھے لکھے ہو۔ وہ تو خیر جاہل ہیں۔"

"پڑھا لکھا ہونا ہی تو میرا پاپ ہے۔ وہ دیکھو' مجھے باسٹرڈ کہہ کر چلا گیا۔" بیدی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ دونوں بچیوں نے بوتل اور گلاس اس کے سامنے سے ہٹالیے اور سہارا دے کر اسے لٹا دیا۔

گھر میں کئی روز تک تناتنی رہی۔ پھر کچھ دوست بیچ میں پڑے اور اس کے بیٹے کو منا کر گھر لے آئے لیکن بیدی پر کئی پابندیاں عائد کردی گئیں۔ گھر میں ہونے والی ناؤ نوش کی دعوتوں پر پابندی لگ گئی۔ ستونت کور نے یہ اعلان بھی کردیا کہ وہ اس کی جاسوسی کرے گی کہ وہ کہاں جاتا ہے' کس ہیروئن سے ملتا ہے' بیدی نے بظاہر ہر بات مان لی۔

"گھر اور باہر کے جملہ حالات کے پیش نظر میری ذہنی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ اگر میرے دُم ہوتی تو ٹانگوں میں دبی ہوئی دکھائی دیتی۔ میں آج کل کسی سے لڑنا نہیں چاہتا۔ فوراً ہتھیار ڈال دیتا ہوں اور ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوجاتا ہوں۔ ہر کسی سے معافی مانگتا پھرتا ہوں۔ جب مدمقابل چلا جاتا ہے تو سوچتا ہوں میں نے کس بات کی معافی مانگی تھی۔"

جب یہ طوفان گزر گیا تو وہ فلم کی طرف متوجہ ہوا۔ اس وقت تک وحیدہ رحمٰن کے بھی کان ہوچکے تھے۔ نریندر نے اسے جان سے مارنے کی دھمکی دی تھی لہٰذا اس نے آہستہ آہستہ گریز کرنا شروع کردیا تھا۔ وہ دونوں چھپ چھپ کر اب بھی مل رہے تھے لیکن اب وہ گرم جوشی نہیں رہی تھی۔

جن ذہنی طوفانوں کے بیچ یہ فلم مکمل ہوئی اس کا انجام یہی ہونا تھا۔ یہ فلم ریلیز ہوتے ہی ناکام ہوگئی۔ بیدی کو اس حد تک زیر بار ہونا پڑا کہ اس کا آفس مع سامان بک گیا اور پھر اسے طویل عرصے تک فلم بنانے کی ہمت نہ ہوئی۔

وہ اتنے عظیم نقصان سے گزرا تھا لیکن گھر میں کسی کو پروا نہیں تھی کہ وہ کس عذاب سے دوچار ہے۔ ستونت کور تو خیر کچھ جانتی ہی نہیں تھی لیکن اس کے بیٹوں کو تو معلوم تھا' خصوصاً نریندر کو کیونکہ اس کے مشورے پر بیدی نے یہ فلم بنائی تھی' اس کے باوجود اس نے پوچھا تک نہیں کہ باؤجی' ہوا کیا؟

اس کے بیٹوں اور خاص طور پر بڑے بیٹے نریندر کا اس کے ساتھ رویہ نہایت افسوس ناک تھا۔ انہوں نے بہ طور ایک باپ' بیدی کی قدر و قیمت نہ جانی اور وہ عزت نہ دی جس کے وہ مستحق تھے۔ وہ ایک قابل فخر باپ تھا۔ بڑے بڑے کج کلاہ اس کا احترام کرتے تھے لیکن بیٹوں کا اس کے ساتھ سلوک نہایت تحقیر آمیز تھا۔

کسی نے اس سے پوچھا تک نہیں اور بڑی بیٹی سریندر کور کی شادی طے کردی۔ وہ تو پیسے بنانے کی مشین تھا۔ اس سے تو صرف یہ مطالبہ کیا گیا کہ بیٹی کی شادی ہورہی ہے سب انتظامات اسے کرنے ہیں اور بیٹے؟

اس کی فلم ابھی فیل ہوچکی تھی۔ وہ قلاش تھا۔ فلم کی ناکامی کے ساتھ ہی پروڈیوسروں کے ساتھ ساتھ وحیدہ رحمٰن نے بھی اس سے منہ موڑ لیا تھا لہٰذا وہ ذہنی طور پر بھی پریشان تھا۔ اب اسے احساس ہورہا تھا کہ اس نے لاکھوں کمائے اور پس انداز کچھ بھی نہیں کیا۔ اس کی بیٹی کی شادی ہے اور دوسروں کو بانٹنے والا آج خود دوسروں کا محتاج ہے۔ اس نے فلم کے لوگوں کے دروازے کھٹکھٹائے' کہیں سے کوئی آواز نہیں آئی۔ اب تو کوئی اس کی کہانی خریدنے اور ایڈوانس پیسے دینے پر بھی تیار نہیں تھا۔ ہر دروازہ بند ملا تو اسے بھولا ہوا "میدان" یاد آیا۔ اس نے ادیبوں سے اپنی ضرورت بیان کی۔ ادیب ہی اس کے کام آئے۔ کوئی کچھ لے کر آیا' کوئی کچھ لے کر آیا۔ مجروح سلطان پوری نے زیورات کا پورا سیٹ لاکر دے دیا۔ بہرحال شادی ہوگئی اور دھوم دھام سے

ہوگئی۔

بیدی خوش تھا کہ بیٹی کو اس کا گھر مل گیا۔ ایک ایسے گھر سے اسے نجات ملی جہاں ہر وقت جھگڑے ہی ہوتے رہتے ہیں۔ ابھی ایک بیٹی اور ہے اس کی بھی شادی ہوجائے تو اسے کوئی فکر نہیں رہے گی۔ پھر وہ بھی گھر چھوڑ کر کہیں نکل جائے گا۔ اس کے دم سے سارے جھگڑے ہیں، وہ نہیں رہے گا تو جھگڑے بھی ختم ہوجائیں گے۔

گھر کے آنگن سے چھاؤں رخصت ہوئی تو اسے احساس ہوا کہ وہ دھوپ میں آگیا ہے۔ بیٹی کے جانے کے بعد بیٹی کی یاد آرہی تھی۔ ایک بیٹا جرمنی چلا گیا تھا۔ نریندر اپنی بیوی کو لے کر الگ رہنے لگا تھا۔ ستونت کور تو اس کی صورت دیکھنے کی روادار نہیں تھی۔ الگ پڑی رہتی تھی یا مہینوں کے لیے پنجاب اپنے رشتے داروں کے پاس چلی جاتی تھی۔

اس نے ایک مرتبہ پھر ادب کی طرف رجوع کرنا چاہا مگر ضرورتیں اب بھی منہ کھولے کھڑی تھیں۔ اس نے گھبرا کر اپنے دوست اوپندر ناتھ اشک کو خط لکھا جو الٰہ آباد میں تھا۔ اشک نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اپنے مجموعوں کے تراجم ہندی میں کرائیں تاکہ ہندی داں طبقہ ان کے نام اور کام سے مانوس ہو اور مالی اعتبار سے بھی معاملہ سودمند رہے۔ اشک نے حق دوستی ادا کرتے ہوئے یہ ذمے داری بھی اپنے کندھوں پر لے لی کہ وہ ان تصانیف کے تراجم کرائیں گے اور ان کا اشاعتی ادارہ نیلابھ پرکاشن الٰہ آباد ان کی نگرانی میں انہیں شائع کرے گا لیکن اس شرط کے ساتھ۔

''میں دو کتابیں چھاپ دوں، تو تیری تمہیں نئی لکھ کر دینی ہوگی۔ جب تمہاری یہ شکایت ہی دور کردوں گا کہ تم کیوں اور کس کے لیے لکھو، تب نیا تو تمہیں لکھنا ہی ہوگا ورنہ اپنا لکھنا پڑھنا چھوڑ کر تمہاری چیزوں پر میرا اتنی محنت کرنا بے کار ہے۔''

بیدی نے یہ پیشکش شکریے کے ساتھ قبول کرلی۔ اشک نے اس کے افسانوں کے دو مجموعے ''لاجونتی'' اور ''دیوار'' ہندی میں شائع کیے اور بیدی نے حسب وعدہ ایک ناولٹ ''ایک چادر میلی سی'' کا مسودہ اشک کو پیش کردیا۔ یہ ناولٹ پہلے ہندی میں شائع ہوا اور پھر پنجابی میں۔ اسی ناولٹ پر بیدی کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملا۔

یہ معلوم ہوتا تھا کہ اب وہ ادب کی طرف دوبارہ راغب ہوگیا ہے اور عنقریب فلموں کو چھوڑ کر اس طرف آجائے گا لیکن اچانک اعلان آگیا کہ وہ فلم ''رنگولی'' بنا رہا ہے۔

''میں ناکام ہوکر نہیں لوٹنا چاہتا۔ ایک شاندار سپرہٹ فلم بناؤں گا اور اسے چھوڑ کر جاؤں گا۔''

دراصل اس کی حالت اس جواری کی طرح ہوگئی تھی جو ہر داؤ پر کہتا ہے کہ بس اس مرتبہ جیت کر اٹھ جاؤں گا اور جب جیت جاتا ہے تو کہتا ہے ایک داؤ اور، کیا خبر اس مرتبہ کی جیت زیادہ بڑی ہو۔

اس نے بڑی دھوم دھام سے فلم ''رنگولی'' بنائی لیکن یہ فلم بھی باکس آفس پر پٹ گئی۔ بیدی کو اسی ہزار کا نقصان ہوا۔

''کوئی بات نہیں، اپنا تو بال بال قرض میں جکڑا ہوا ہے۔'' اس نے حسبِ عادت اپنی داڑھی کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا اور ایک قہقہے اور چند گالیوں کے ساتھ اس صدمے کو ہوا میں اُڑا دیا۔

''کیا اب بھی کوئی فلم بناؤ گے؟''

''میں ہمت نہیں ہارا ہوں۔ میں ایک ایسی فلم بنانا چاہتا ہوں جس سے خوب دولت کماؤں اور ہمیشہ کے لیے فکرِ معاش سے آزاد ہوکر ہمیشہ کے لیے فلم لائن چھوڑ جاؤں۔''

وہ بے کاری کے اس وقفے میں ایک مرتبہ پھر ادب کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اس نے ''لاجونتی''، ''لمبی لڑکی'' اور ''اپنے دکھ مجھے دے دو'' جیسے افسانے لکھے۔ بیدی کی یہ تخلیقات اردو رسائل سے پہلے معروف ہندی جرائد ہفت روزہ ''دھرم یگ'' اور ''ساریکا'' میں شائع ہونے لگیں اور ان افسانوں کا ایک مجموعہ ''اپنے دکھ مجھے دے دو'' کے عنوان سے شائع ہوا جس پر حکومت یوپی نے اسے اعزاز سے نوازا۔ دوستوں نے اس کی دوبارہ آمد کو خوش آمدید کہا۔ یہ امید ہونے لگی تھی کہ وہ فلموں کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد ادب کی طرف لوٹ آئے گا۔ اتنے دنوں کی غیر حاضری کے بعد جو لوگ اسے بھول گئے تھے، وہ بھی اسے یاد کرنے لگے۔

اس کی آمد کو سب دیکھ رہے تھے، اس کے اندر ابلنے والے لاوے کو کوئی نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ بلڈ پریشر کا پرانا مریض تھا، جس کا آغاز پاکستان سے ہجرت کے بعد ہی ہوگیا تھا۔ بمبئی کی مرطوب آب و ہوا نے کئی عوارض اور پیدا کردیے تھے۔ وہ عرصہ دراز سے ایک گردے پر چل پھر رہا تھا۔ ایک گردہ خراب ہوچکا تھا۔ یہ اس کی قوت ارادی تھی جو اسے سنبھالے ہوئے تھی۔ بیوی سے لڑائی جھگڑوں اور بیٹوں کی نافرمانی نے اس کے ذہن پر بہت اثر ڈالا۔ اس کی فلمیں بار بار فیل ہوئیں تو مالی پریشانیوں نے اسے اور نڈھال کردیا۔ یہ دھچکا سب سے بڑا تھا کیونکہ گھریلو پریشانیاں تو ہر جگہ ہوسکتی تھیں لیکن بمبئی تو وہ آیا ہی دولت کمانے تھا۔ جب

دولت بھی چھننے لگی تو یہ احساس ستانے لگا کہ بے کار گیا تیرے شہیدوں کا لہو بھی۔ بمبئی میں اتنے دن جھک مارنے کا فائدہ کیا ہوا۔ جو کمایا تھا' وہ تو یہیں لٹا دیا۔

ایک دن نہ جانے کن خیالوں کی سیر کو نکلا ہوا تھا کہ خون نے جوش مارا اور دماغ کی طرف چل دیا۔ بے ہوشی کی حالت میں اسپتال لے جایا گیا۔ معلوم ہوا' معمولی سا لقوہ ہوا ہے۔ جلد ہی قابو پالیا گیا۔ لیکن پھر اثرات رہ گئے۔ منہ ذرا سا ٹیڑھا ہوگیا اور ایک آنکھ قدرے بھینچ گئی۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ اس کی جلد صحت یابی میں اس کی خوش مزاجی کا بڑا دخل ہے۔ اس نے اپنی اس بیماری کو بھی ہنسی میں اڑا دیا۔

''ایک مضحکہ خیز بیماری مول لے لی جسے لقوہ کہتے ہیں۔ بال بال بچا ورنہ ایک آنکھ جاتی رہی تھی۔ آنکھ تھوڑی بھینچ بھی گئی اور کچھ دیر کے لیے ان لوگوں میں شامل ہوگیا جو بات آپ سے کرتے ہیں اور بظاہر دیکھتے کہیں اور ہیں۔ علاج معالجے کے علاوہ ہر بات پر ہنس دینے کی عادت نے بچالیا۔ ایک ہی تسلی تھی کہ پہلے ہی یوسف نہ تھے اس لیے کسی یعقوب کے گریے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔''

ڈراما نگار بلونت گارگی اس کی مزاج پرسی کو آئے تو اس نے اپنی بیماری کا نقشہ یوں کھینچا۔ ''شیشے میں مجھے اپنا چہرہ ٹیڑھا لگتا ہے۔ آج میں نے ٹیڑھا شیشہ پکڑا تاکہ سیدھا چہرہ نظر آئے۔''

قدرت نے اس کے ساتھ نہ جانے کب کا بدلہ لیا تھا کہ اس کی صورت ہی مسخ کر ڈالی۔ وہ پہلے ہی کون سا خوبصورت تھا' اب اور خوبصورت نظر آنے لگا۔ ان بیماریوں نے اس کی صحت پر بہت برا اثر ڈالا تھا۔ وہ ابھی بہ مشکل پچاس کا ہوا تھا لیکن بوڑھا نظر آنے لگا تھا۔

اس بیماری سے اٹھا اور بستر جھاڑ کر کھڑا ہوا تو دوراہے پر کھڑا تھا۔ ایک طرف ادب کی شاہ راہ تھی' دوسری طرف فلم اسٹوڈیو۔ اس نے کمال کردیا۔ وہ ایک ساتھ دونوں سمتوں میں چل دیا۔ اس نے کئی افسانے بھی لکھے کہ کسی وقت اوپندر ناتھ اشک کو بھیج دے گا۔ اور کان پر قلم رکھ کر فلمی کہانیاں لکھنے بھی نکل کھڑا ہوا۔ ایک مرتبہ پھر رشی کیش مکرجی اس کے کام آیا اور بیدی کو ایک فلم ''انو پما'' لکھنے کو مل گئی۔

انہی دنوں سب سے چھوٹی بیٹی ہرمندر کور کی شادی کا قصہ چل نکلا۔ ایک سال پہلے کنول جیت سنگھ سے اس کی منگنی ہوچکی تھی جو فوج میں افسر تھا۔ جب منگنی ہوئی تھی تو جنگ کے آثار تھے۔ لوگوں نے بیدی کو سمجھایا تھا کہ جنگ ہونے والی ہے' نہ جانے کیا ہو' ابھی منگنی نہ کرو لیکن بیدی نے جواب دیا تھا کہ ایک ماں جب اپنے بیٹے کو محاذ پر بھیج سکتی ہے تو کیا میں اپنی بیٹی ایک فوجی کو نہیں دے سکتا؟ اور اب ایک سال بعد اس کی شادی کا سوال تھا۔ بیدی کے مالی حالات ان دنوں بھی اچھے نہیں تھے۔ کئی فلمیں ایک ایک کرکے ڈوب گئی تھیں۔ اس نے ایک مرتبہ پھر اوپندر ناتھ اشک کو یاد کیا۔ اپنی کچھ کتابوں کی رائلٹی یاد دلائی اور کچھ اِدھر اُدھر سے جمع کرکے یہ آخری بیٹی بھی بیاہ دی۔ اب تنہائی اور گہری ہوگئی تھی۔ بیوی سے تعلقات اسی طرح کشیدہ چلے آرہے تھے بلکہ اور زیادہ کشیدہ ہوگئے تھے کیونکہ درمیان میں اس نے ایسی حرکت کردی تھی کہ بیدی اس کی طرف سے بالکل ہی مایوس ہوگئے تھے۔ وہ کسی کو کچھ بتائے بغیر گھر سے غائب ہوگئی تھی۔ بعد میں مل گئی تھی لیکن اس کے اس طرح غائب ہوجانے کا بیدی پر بہت برا اثر ہوا تھا۔ بے عزتی کے احساس نے اسے بیمار ڈال دیا تھا۔ کئی مہینے تک اس کی زبان میں لکنت رہی تھی جو اس کی ذہنی حالت کا پتا دیتی تھی۔ اس واقعے نے ستونت کور کی طرف سے اس کے دل میں ایسی گرہ ڈال دی جو پھر کبھی نہ نکل سکی۔

مشہور ہے کہ دیوانے کی دیوانگی جب بڑھتی ہے تو وہ صحرا کی طرف بھاگتا ہے۔ بیدی کا بھی یہی حال تھا۔ ذرا زخموں پر انگور بندھتے تھے اور بھلا چنگا ہوکر اٹھ بیٹھتا تھا۔ دو فلموں کے پے بہ پے فیل ہوجانے سے اس کی جان لبوں پر آگئی تھی۔ پھر بیماری اور گھریلو صدموں سے بھی گزرا تھا لیکن مکرجی کی دو فلمیں انو پما اور ستیہ کام کرنے کے بعد اسے پھر اپنی فلم کرنے کی سوجھی۔ اس مرتبہ اس نے اپنے ہی ایک ریڈیائی ڈرامے کو ''دستک'' کے نام سے فلمانے کا ارادہ کیا لیکن وقت اور حالات کے اعتبار سے اس میں تبدیلیاں بھی کیں جو ضروری تھیں۔ یہاں تک کہ کرداروں کے نام بھی بدل دیے۔ سنجیو کمار فلم کا ہیرو اور ہیروئن کا کردار معروف اداکارہ ریحانہ سلطان نے بہ طریق احسن نبھایا۔ ہدایت کاری کے فرائض خود بیدی نے انجام دیے۔

اس فلم کی شوٹنگ کے دوران فلم کی ہیروئن ریحانہ سلطان' بیدی کے راستے میں آگئی۔ دونوں کے درمیان معرکے کا عشق شروع ہوگیا۔ سیٹ پر ان دونوں کا انتظار ہوتا رہتا اور وہ کسی ہوٹل کے کمرے میں اگلا سین یاد کر رہے ہوتے۔ جس شوٹنگ کو تین ماہ میں ختم ہوجانا چاہیے تھا' اسے طویل عرصہ لگ گیا۔ بیدی کو یہ کہاں یاد رہنے والا تھا کہ وحیدہ رحمٰن کے قضیے کو ابھی ستونت کور بھولی نہیں ہوگی۔

ستونت کور کہہ چکی تھی کہ وہ بیدی کی نگرانی کرے گی۔ اس نے اپنی سراغ رسانی سے یہ معلوم کرلیا تھا کہ بیدی نے

کس ہوٹل میں کمرا بک کرایا ہے جہاں وہ ریحانہ سلطان کے ساتھ وقت گزارتا ہے۔ یہ ایک غصّے سے بھری ہوئی عورت کا کردار تھا کہ وہ انہیں رنگے ہاتھوں پکڑنے کے لیے ہوٹل پہنچ گئی۔ اس نے ہوٹل پہنچ کر شور مچانا شروع کردیا۔ بیدی ہوشیار ہوگیا اور اس نے ریحانہ سلطان کو وہاں سے نکال دیا۔ اس کے باوجود ستونت کور نے بھرے ہوٹل میں بیدی اور ریحانہ سلطان کو بے بھاؤ کی سنائیں۔ ایک مرتبہ پھر بیدی کی ناموری کو بٹا لگ گیا حالانکہ وہ اس سے خوش بھی ہوا کہ اس کا نام ریحانہ سلطان جیسی اداکارہ کے ساتھ لیا جارہا ہے۔

ستونت کور واویلا کرتی رہی لیکن بیدی کو اب اس کی پروا نہیں تھی۔ اب تو بیٹیاں بھی اپنے اپنے گھروں کی ہوچکی تھیں، بیٹا بھی بے عزتی کرتے کرتے تھک گیا تھا۔ بیدی اور ریحانہ سلطان ایک ساتھ پارٹیوں میں جاتے رہے۔ ستونت کور کے کانوں میں سب باتیں پڑتی رہیں اور اس کا بلڈ پریشر بڑھتا رہا۔

یہ فلم پردۂ سیمیں پر پیش ہوئی تو بیدی کے اگلے پچھلے سب گناہ معاف ہوگئے۔ اس فلم نے باکس آفس پر اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے۔ سنجیو کمار اور ریحانہ سلطان کو بہترین اداکاری کے ایوارڈز ملے۔ مدن موہن کو اس سال کا بہترین میوزک ڈائریکٹر کا ایوارڈ ملا۔ اس سال بیدی کو حکومت ہند نے پدم شری کا ایوارڈ دیا جو اس کی فلمی کامیابیوں کا واضح اعتراف تھا۔

اس فلم کی کامیابی کے ساتھ ہی ریحانہ سلطان اور بیدی کے راستے الگ ہوگئے۔ فلمی معاشقوں کی زندگی بس اتنی ہی تو ہوتی ہے۔ ایک شعلہ سا بھڑکا تھا جو دیکھتے ہی دیکھتے سرد ہوگیا۔

ان کا ملنا جلنا اب ختم ہوچکا تھا لیکن [illegible] یہ سمجھتی تھی کہ بیدی اس سے ملتے ہیں۔ روز جھگڑے ہوتے تھے اور روز بیدی اپنی صفائی پیش کرتا تھا۔ آخر ایک دن اس نے جھلا کر کہہ دیا کہ ہاں ملتا ہوں [illegible] کرسکتی ہو تو کرلو۔ ستونت کور [illegible] ہوئے آدمی کو اس کے حال پر چھوڑ دیتی لیکن اس نے [illegible] کے معاشقوں کو اپنی انا کا مسئلہ بنالیا تھا۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر دیکھتی تھی کہ بیدی گھر پر ہے یا نکل گیا۔ الگ الگ کمروں میں سوتے تھے۔ وہ کمرے میں جھانک کر دیکھتی تھی کہ اس کے ساتھ کوئی ہے یا وہ اکیلا ہے۔ کبھی کبھی تو تمام رات اس کے کمرے کے سامنے بیٹھی جاگتی رہتی۔ محبت کے بھی عجیب عجیب روپ ہوتے ہیں۔ وہ بیدی سے شدید نفرت کرتی تھی لیکن اس نفرت میں بھی یہ محبت چھپی ہوئی تھی کہ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ بیدی عارضی طور پر ہی سہی، کسی اور کا ہوگیا ہے۔ فلمی دنیا میں ہزار لڑکیاں آگے پیچھے رہتی ہیں، ضروری تو نہیں کہ بیدی کا سب سے معاشقہ ہو لیکن اسے تو یہ وہم ہوگیا تھا کہ بیدی کے ساتھ جو لڑکی بھی ہوتی ہے، وہ بیدی کی محبوبہ ہوتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے مگر دونوں اپنی ضد اپنی انا کے اسیر تھے۔

اس مسلسل وہم کا نتیجہ یہ ہوا کہ ستونت کور کا ذہنی توازن خراب ہوگیا۔ بیٹھے بیٹھے، اچانک چیخنے چلّانے لگی۔ پھر ٹیلی فون اٹھا کر پٹخ دیا۔ دیواروں سے سر ٹکرانے لگی۔ ان سب لڑکیوں کے نام لے لے کر گالیاں بک رہی تھی جن سے اس کے خیال میں بیدی کے تعلقات رہے تھے۔ گھر میں اچھا خاصا ہنگامہ گرم ہوگیا۔ نوکروں نے بڑی مشکل سے قابو پایا اور بیدی کو فون کردیا گیا۔ وہ گھر پہنچا تو گھر کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ پورا گھر الٹا ہوا تھا۔ ستونت کور کے منہ سے جھاگ بہہ رہے تھے اور وہ خود ہی خود باتیں کررہی تھی۔ کبھی ہنسنے لگتی تھی، کبھی رونے لگتی تھی۔ بیدی چور بنا کھڑا تھا کہ یہ سب کچھ اسی کی وجہ سے ہوا ہے لیکن وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ یہ سب کچھ ہوا بھی تو اسی کی وجہ سے ہے۔ یہ جاہل عورت اتنا نہیں سمجھتی کہ میں رائٹر ہوں۔ لڑکیاں اگر مجھ پر مرتی ہیں تو مرا کریں۔ اس کا کیا جاتا ہے۔ اس نے مجھے برداشت نہیں کیا، میں دوسروں کے پاس چلا گیا۔ ان میں سے کوئی مجھے طعنے نہیں دیتی اس نے طعنے مار مار کر میرا اکیلا پن پھانسی کردیا ہے۔ میں اسے بیاہ کر لایا تھا تو اسے [illegible] نہیں لگنے دیتا تھا، اس نے اپنی زبان درازی [illegible]

[illegible] یاد آیا کہ ستونت کور کو اسپتال بھی لے جانا ہے۔ اس نے پھر اس کی طرف دیکھا۔ اب وہ بے ہوش ہوچکی تھی۔ وہ اسے دماغی اسپتال لے گیا جہاں اسے داخل کرلیا گیا۔

وہ وہاں سے شفایاب ہوکر آ تو گئی لیکن اب کھوئی کھوئی سی رہنے لگی تھی۔ بیدی نے اس کی تیمارداری بھی کی تھی، اس کے علاج پر پیسے بھی خرچ کیے تھے لیکن جونہی اس نے دیکھا کہ وہ صحت مند ہوگئی ہے، وہ پھر اس کی طرف سے بےفکر ہوگیا اور اب وہ شاندار فلم بنانے کے لیے تانے بانے بننے لگا جس کے متعلق وہ کہا کرتا تھا کہ ایک لافانی فلم بنا کر وہ فلم لائن سے الگ ہوجائے گا اور اپنے آپ کو مکمل طور پر ادب کے سپرد کردے گا۔ بہت سی کہانیاں اس کے سینے میں مچل رہی تھیں جنہیں وہ باہر لانا چاہتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ ناول ''پہاڑی

کوا‘‘ دس پندرہ دن میں لکھ سکتا ہوں اور اس کے بعد کنیا دان اور بیکے نام کے دو ناول اسکیچ کرر کھے ہیں جو اسی سال میں ختم کروں گا۔

وہ بہت کچھ سوچ رہا تھا لیکن وہ اتنا کر سکا کہ اس نے 1974ء میں افسانوی مجموعہ ’’ہاتھ ہمارے قلم ہوئے‘‘ پڑھنے والوں کو دیا۔ پھر اس کی قسمت کی خرابی کچھ اور سوچ رہی تھی۔

اس نے اپنا خواب اپنی لافانی فلم کے لیے کہانی لکھ لی۔ اس فلم کا نام اس نے ’’آنکھن دیکھی‘‘ رکھا۔ یہ فلم مہاتما گاندھی کے آدرشوں پر مبنی' ہری جنوں کے استحصال کے بارے میں لکھی تھی۔ اس کے مطابق یہ اپنی نوعیت کی منفرد کہانی تھی۔ اس فلم کو بنانے کے لیے اس نے اپنی زمین رہن رکھ کو قرض لیا تھا۔

یہاں پھر ایک ’’سمن‘‘ اس کے راستے میں آ کھڑی ہوئی۔ سمن چوبیس پچیس سال کی لڑکی تھی۔ یو پی کی رہنے والی اور ذات کی کائستھ تھی۔ میانہ قد تھا' بھر بھرا جسم اور گندمی رنگ۔ جسم کی چستی ایسی تھی جیسے کوئی کڑی کمان کا تیر۔ باتیں کرنے اور دوسروں کو شیشے میں اتارنے کا فن جانتی تھی۔ تھوڑی بہت پڑھی لکھی بھی تھی اور شاعری سے بھی لگاؤ تھا۔ فلموں میں کام ڈھونڈنے بمبئی آئی ہوئی تھی لیکن نو وارد تھی اس لیے اسٹوڈیوز کی خاک چھان رہی تھی۔

اسی تلاشِ ملازمت میں کوئی اسے بیدی کے پاس بھی لے کر آیا۔ بیدی کی تجربہ کار آنکھوں نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اس سے باتیں کیں۔ اس سے متاثر بھی ہوا لیکن ہیروئن والی کوئی بات اس میں نظر نہیں آئی۔ پھر یہ بھی بات تھی کہ ابھی بہت وقت پڑا تھا۔ انتخاب کے ابھی اور بھی مراحل آنے تھے۔ لڑکی ہوشیار تھی' یہ کہہ کر چلی گئی ’’کبھی تنہائی محسوس کریں تو خدمت کا موقع دیجیے گا۔‘‘

ایک دو مرتبہ اس کا فون آیا بھی لیکن بیدی دودھ کا جلا تھا' چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پی رہا تھا۔ ابھی معاشقوں کے کئی طوفانوں سے گزرا تھا۔ بیوی کی بیماری بھی اس کے ذہن میں تھی' اس نے سمن کو ٹال دیا۔

’’ابھی آنکھن دیکھی‘‘ کا کام ابتدائی مراحل میں تھا۔ بیدی گھر کی تناؤ بھری فضا سے دور ہوٹل کا ایک کمرا لے کر وہ اسکرپٹ لکھ رہا تھا۔ اس فلم کی ہیروئن ایک اچھوت لڑکی ہوتی ہے۔ اسکرپٹ کے منظرنامے میں اس نے اس اچھوت لڑکی کے جسم کی ساخت' اس کا قد' اس کی بول چال وغیرہ لکھی تو اسے چند روز پہلے ملنے والی لڑکی' سمن کا خیال آیا۔ وہ اس رول کے لیے مناسب رہے گی۔ پھر فوراً ہی اس خیال کو جھٹک بھی دیا۔ سمن بالکل نئی لڑکی ہے۔ یہ تو رسک لینے والی بات ہو گی۔ نئی کاسٹ کی فلمیں چلتی نہیں ہیں۔ مجھے اس فلم کے ذریعے پیسے کمانے ہیں تاکہ بمبئی سے جاؤں تو یہ تو کہہ سکوں کہ بمبئی دولت کمانے آیا تھا۔

ایک دن وہ ہوٹل کے کمرے میں بیٹھا اسکرپٹ لکھ رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ناگواری سے فون اٹھایا۔ دوسری طرف سمن تھی۔ اس کی آواز کسی پازیب کی طرح چہک رہی تھی۔

’’بیدی صاحب' ایک موقع تو دیجیے۔ کوئی چھوٹا موٹا رول ہی سہی' میری انٹری تو ہو۔‘‘

’’دیکھو تمہارے لیے کوئی رول نکالتا ہوں۔‘‘

’’تو پھر آ جاؤں؟‘‘

’’آ جایئے۔‘‘

بس' یہ ایسا کوئی کمزور لمحہ تھا کہ وہ آ گئی اور بیدی اس پر فدا ہو گیا' نہ صرف اپنی فلم کی ہیروئن بنالیا بلکہ وہ اپنے جسم کے ذریعے اس کی روح میں اتر گئی۔ ایسے خانہ خراب عشق سے وہ بھی نہیں گزرا تھا۔ سمن میں کوئی ایسا ہنر ضرور تھا کہ بیدی کی وارفتگی' جنون کی حدوں کو چھونے لگی۔ وہ بے حجابانہ اس سے ملنے لگا۔ اس نے اس عشق کو ایک دن بھی راز رکھنے کی کوشش نہیں کی بلکہ کوئی نہ بھی پوچھتا تو بڑے فخر سے کہتا' میں وہ ہوں جس پر سمن مرتی ہے۔ وہ دن میں اتنی بار سمن کا ذکر کرتا کہ یار لوگوں کو وحشت ہونے لگتی۔

بیدی ان دنوں اس بچے کی طرح نظر آتا تھا جسے اس کا پسندیدہ کھلونا مل گیا ہو۔ پوری طرح اس کی گرفت میں ہو اور اس نے ٹھان لیا ہو کہ کچھ بھی ہو جائے' وہ اس کھلونے کو ہاتھ سے جانے نہیں دے گا۔ اب اس کے دل سے ستونت کور کا خوف بھی نکل گیا تھا۔ مختصر یہ کہ وہ سمن کے لیے پوری دنیا سے ٹکرانے کو تیار ہو گیا تھا۔ وہ پوری بمبئی میں تماشا بنا ہوا تھا۔ بڑھاپے کے اس عشق نے اسے خوب رسوا کیا تھا لیکن اسے کسی کی پروا نہیں تھی۔

دوسرے لوگ تو صرف کہہ کر رہ جاتے تھے لیکن ستونت کور تو بیوی تھی۔ بیدی کا سمن سے کھلے عام معاشقہ اس کی نسوانیت پر کاری چوٹ تھی جسے کوئی بھی خوددار عورت گوارا نہیں کرسکتی۔ اس نے بل کھائی ہوئی ناگن کی طرح بیدی کا جینا حرام کر دیا۔ اس عشق کی کارستانی یہ تھی کہ بیدی میں بھی طاقت آ گئی تھی۔ وہ بھی اب خم کھانے کو تیار نہیں تھا۔ جب دونوں ایک دوسرے کے سامنے ڈٹ کر کھڑے ہو گئے تو گھر

میں لڑائی جھگڑا، گالی گلوچ، مار پیٹ روز کا معمول ہو گئے۔ ستونت کور جذبۂ رقابت میں جل رہی تھی، بیدی نشۂ عشق میں سرشار تھا۔ نہ وہ پیچھے ہٹتی تھی نہ یہ راہ سے ہٹتا تھا۔

ایک زخم خوردہ عورت کی طرح جس کی انا اور خودداری کو پاؤں تلے روند دیا گیا ہو، ستونت کور نے بیدی پر زندگی دوبھر کر دی۔ وہ گھر چھوڑ کر اپنے دفتر میں رہنے لگا۔

اوپندر ناتھ اشک ان حالات سے بے خبر الہ آباد سے بمبئی پہنچے تو راستے ہی میں اس خبر نے ان کے ہوش اُڑا دیے کہ اس معاشقے کے طفیل بیدی گھر چھوڑ کر چلا گیا ہے۔

اوپندر ناتھ اشک، بیدی کے ان دوستوں میں تھا جس کا احترام ستونت کور بھی کرتی تھی۔ وہ بیدی کے گھریلو حالات سے واقف بھی تھا۔ لہٰذا وہ مصالحت کرا سکتا تھا لیکن اس نئے معاشقے کی جزئیات سے وہ واقف نہیں تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ کسی تیسرے آدمی سے معلومات حاصل کرے اور پھر اس روشنی میں وہ حق دوستی ادا کرے۔ اشک کے لیے نہ یہ شہر نیا تھا نہ وہ فلمی لوگ جن سے معلومات جمع کی جا سکتی تھیں۔ وہ بیدی کے گھر جانے سے پہلے ان لوگوں سے ملا۔ خبریں بہت تشویش ناک تھیں۔ اتنی خطرناک کہ اس نے سوچا، اگر ذرا دیر ہوگئی تو ستونت کور کوئی انتہائی قدم اٹھا سکتی ہے جو بعد میں بیدی کے لیے پچھتاوے کے سوا کچھ نہیں چھوڑے گا۔ وہ بیدی سے ملنے سے پہلے ستونت کور سے ملنا چاہتا تھا۔ وہ بیدی کے گھر پہنچ گیا۔ گھر میں عجیب مرگھٹ کی اداسی پھیلی ہوئی تھی جیسے اس گھر میں کبھی کوئی رہا ہی نہ ہو۔ اسے افسوس ہوا کہ محض دو لوگوں کی ضد اور انا نے اس گھرانے کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ وہ بیدی جو افسانوں کی سلطنت کا بے تاج بادشاہ کہلاتا ہے، غلط فہمیوں نے اس کے گھر کا کیا حال کر دیا ہے۔ تھوڑی دیر کو تو یوں لگا تھا جیسے بیدی مر گیا ہے اور وہ اس کا پرسا دینے آیا ہے۔

اشک کو کچھ کہنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ ستونت کور نے خود پر گزرنے والی قیامت کی خود ہی تصویر کھینچ دی۔ اشک سب کچھ سنتا رہا پھر معاملے کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اور یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ کتنی لچک دکھاتی ہے، اس نے ستونت کور کو بیدی سے نرم اور مصالحانہ رویہ اختیار کرنے کو کہا تو وہ چمک اٹھی۔

"بیدی صاحب مجھے پاگل بتا کر من مانی کرنے کے ساتھ گل چھرے اُڑانا چاہتے ہیں، میں سچ مچ انہیں پاگل بنا دوں گی۔ وہ مجھے بدنام کرتے ہیں، بمبئی بھر میں انہیں منہ دکھانے کے لائق نہ چھوڑوں گی۔"

یہ ایک چوٹ کھائی ہوئی عورت کی آواز تھی اور ساتھ ہی ایک منہ پھٹ، تند خو، انتقامی جذبے سے مغلوب عورت کی آواز تھی جو بے عناں جذبات کی رو میں بہہ کر اپنے خاوند سے بے تحاشا ٹکرا جانے پر آمادہ دکھائی دیتی تھی۔ اتنی آمادہ کہ ایک لمحے کو اشک بھی ڈر گیا کہ نہ جانے وہ کیا کر بیٹھے گی لیکن اسے غصہ دلا کر اس کی بھڑاس نکالنے کے لیے اس نے کہا۔

"جب تم بیدی سے اتنی نفرت کرتی ہو تو اس کا دل برداشتہ ہو کر گھر سے باہر جھک مارنا قابلِ فہم۔ جب تم اسے منہ نہیں لگاتیں تو وہ باہر ہی جائے گا۔"

"معاف کرنا، یہ کوئی آج کی بات نہیں ہے۔ منہ لگانا تو میں نے اب چھوڑا ہے، وہ تو شروع ہی سے ایسے ہیں۔"

"ستونت کور، ایک بات مجھے ٹھنڈے دل سے بتاؤ۔ تم اتنی سندر تھیں، پھر تمہارا شوہر باہر باہر کیوں جاتا تھا؟ کوئی تو بات ایسی ہوگی جو اس کا من بھٹکتا تھا۔ شوہر اپنی بیوی کے دس خون معاف کر سکتا ہے، بے قدری کا ذرا سا اشارہ بھی برداشت نہیں کر سکتا۔"

"میں نے کیا بے قدری کر دی؟"

"تم اس کے دوستوں کے سامنے اس کی برائی کرتی رہتی ہو۔ تم کیا سمجھتی ہو، وہ دوست اس سے نہیں کہتے ہوں گے؟"

"اس میں جو برائی ہے کیا میں وہ بھی نہ کہوں؟ کیا میرا اتنا حق بھی نہیں ہے، وہ میرے شوہر ہیں۔"

"تم بیدی کو چاہتی بھی ہو اسے دھتکارتی بھی ہو۔ اس میں کیڑے بھی ڈالتی ہو، اسے چاہتی بھی ہو، وہ جیسا بھی ہے اسے اپنا لو۔ سمن اپنے آپ تم لوگوں کے بیچ سے نکل جائے گی۔"

"اتنی آسانی سے نکلنے والی نہیں۔ بیدی صاحب کو آوارگی کا چٹخارہ لگ گیا ہے۔ وہ بھی اپنی عادتوں سے باز نہیں آئیں گے۔"

"ستونت تم اتنی ہمت والی ہو اور بے ہمتی کی باتیں کرتی ہو۔ میں ایک مرد ہونے کی حیثیت سے کہہ رہا ہوں، تم اسے اس کی برائیوں سمیت قبول کر لو گی تو وہ تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گا۔ تم چاہتی ہو وہ سگریٹ چھوڑ دے، تمباکو چھوڑ دے، شراب چھوڑ دے، یہ اب کیسے ہو سکتا ہے۔ کم از کم زور زبردستی سے تو نہیں ہو سکتا۔ تم جتنا کہو گی وہ ضد میں اور کرے گا۔"

"مجھے کچھ نہیں پڑھانا۔ بس وہ میری جان چھوڑ دیں۔ پھر جو جی چاہے کرتے پھریں۔"

''ستونت! کیوں جگ ہنسائی کی باتیں کرتی ہو۔ جب اتنی گزاردی اور گزاردو۔ تمہارے داماد کیا کہیں گے۔ بیدی کی بھی معاشرے میں عزت ہے' اس کو لوگ کیا کہیں گے' یہ بھی تو سوچو۔''

''میں کیا سوچوں..... اب مجھے کیا سوچنا ہے۔''

''تم اسے منا کر گھر لے آؤ' وہ خوش ہو جائے گا۔''

''اب منانے بھی میں ہی جاؤں؟''

''روٹھ کر وہ گیا ہے' منانے تم ہی جاؤ گی۔ یاد ہے' تم ایک مرتبہ گھر چھوڑ کر چلی گئی تھیں تو وہی تمہیں ڈھونڈنے نکلا تھا۔''

''سارا نزلہ کمزور پر ہی گرتا ہے۔ کچھ انہیں بھی تو سمجھایئے۔ داڑھی سفید ہوگئی ہے اب تو یہ حرکتیں چھوڑ دیں۔''

''میں اسے بھی نہ صرف سمجھاؤں گا بلکہ اس سے عہد لوں گا۔ آپ لوگ پتی پتنی کی طرح رہیں' بس بہت ہو چکا۔''

''پہلے آپ ان سے جا کر بات کرلیں پھر میں آپ کے ساتھ چلی چلوں گی۔ منا کر لے آؤں گی۔''

وہ یہاں سے اٹھ کر بیدی کے پاس اس کے دفتر گیا۔ یہاں کا ماحول گھر سے بالکل مختلف تھا۔ بیدی نہایت خوش نظر آرہا تھا۔ اسے ذرا بھی پروا نہیں تھی کہ وہ گھر چھوڑ کر آگیا ہے۔ اشک کو دیکھتے ہی مزید کھل اٹھا۔ دراز سے نکال کر سمن کی تصویر اس کے سامنے رکھ دی اور اپنے عشق کی داستان مزے لے لے کر سنانے لگا۔ لب لباب یہ تھا کہ اسے تو اب اتنی عمر میں جا کر معلوم ہوا ہے کہ زندگی کیا ہے؟

اشک یوں اس کی باتیں سنتا رہا جیسے اسے کچھ معلوم ہی نہ ہو۔ اس نے یہ بھی نہیں بتایا کہ وہ ستونت کور سے مل کر آیا ہے۔ اس نے یونہی دوست بن کر ناصح کا کردار ادا کیا۔

''تم اس بات پر خوش ہو کہ تم نے سمن کی خاطر اپنا گھر چھوڑ دیا۔ یہ بھی تو سوچو ستونت پر کیا گزر رہی ہوگی۔''

''وہ تو خوش ہوگی کہ بیدی کی شکل سے نجات ملی۔''

''وہ قطعی خوش نہیں ہوگی۔ وہ تم سے پیار کرتی ہے بیدی! یہ میرا یقین ہے۔''

''یار! تم بھی ایسی بات کہہ رہے ہو' تم تو سب حالات سے واقف ہو۔ سمن کا قصہ تو اب چلا ہے' میرے گھر میں تو پہلے بھی جھگڑے ہوتے رہے ہیں۔''

''کچھ قصور تمہارا بھی ہے۔ اس نے تمہارے من میں جھانک کر نہیں دیکھا مگر تم تو اس سے زیادہ ذہین تھے' تم ہی جھانک لیتے۔''

''میں نے جھانک کر دیکھا ہے۔ اس کے من میں میرے لیے پاپ ہی پاپ ہے۔ وہ ایک عام سے آدمی کی بیوی ہونے کے لائق تھی' مجھ افسانہ نگار کے لائق نہیں تھی۔''

''بے شک نہیں تھی مگر اس کے خلوص سے تم انکار نہیں کرسکتے۔ وہ تمہارے بچوں کی ماں ہے۔''

''ان جھگڑوں میں میرے بچے بھی میرے نہیں رہے۔''

''یہ بات تم اگر پہلے سوچ لیتے تو ٹھیک تھا مگر اب نہیں اور وہ بھی ایک عورت کے لیے۔''

''اس عورت نے مجھے زندگی کے لطف سے آشنا کیا ہے۔ میری اصل قدردان تو وہی ہے۔''

''بیدی! اب تم صاف صاف بات سنو۔ سمن تم سے محبت نہیں کرتی' تمہاری فلم کی ہیروئن بننے کے لیے ہتھکنڈے استعمال کر رہی ہے۔ ستونت کو تمہاری فلم کی ہیروئن نہیں بننا۔''

''وہ کیا بنے گی ہیروئن' جاہل......''

''تم یہ کیوں توقع کرتے ہو کہ سمن جو لطف تمہیں دے رہی ہے' وہی لطف دھرم کرم کی پابند' قدامت پسند گھریلو عورت دے سکتی ہے۔ تمہاری اور سمن کی عمروں میں کوئی مطابقت نہیں' وہ صرف تمہیں بے وقوف بنا رہی ہے۔ فلم ختم ہوتے ہی وہ کہیں شادی کرلے گی۔''

''تمہیں معلوم نہیں ہے اشک' وہ مجھ سے کتنی محبت کرتی ہے' میرے بغیر سانس نہیں لے سکتی۔''

''تمہیں میری بات کا یقین نہیں آتا تو جاؤ اس سے کہو' سمن! میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں تم میری فلم میں ہیروئن بننے کا خیال چھوڑ دو اور مجھ سے شادی کرلو۔ دیکھو پھر وہ کیا کہتی ہے' کتنی محبت جتاتی ہے۔''

''میں نے تو اس سے کبھی نہیں پوچھا۔''

''جاؤ' پوچھ کر دیکھ لو۔ مجھے یقین ہے وہ نہیں مانے گی اور تمہیں تکلیف ہوگی۔ اس سے بہتر ہے کہ اس قصے کو یہیں ختم کردو۔''

''اشک! اب یہ میرے اختیار میں نہیں۔ اس کہانی کو اپنے انجام تک پہنچنے دو۔''

''اپنا گھر تباہ کیے بغیر اس کہانی کو انجام تک پہنچاؤ تو کتنی عقل مندی ہے۔ ستونت کور نے اگر کوئی ایسا ویسا قدم اٹھالیا تو تمہاری اور زیادہ بدنامی ہوگی۔ اسے منالو۔ تم نے تمام عمر ستونت کو من مانی کرنے دی' اب اس عمر میں یہ توقع کرنا کہ وہ تمہاری خواہش کے مطابق ڈھل جائے گی' ممکن نہیں۔''

''وہ جب تک خود نہیں آئے گی' میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔''

''اس کی ذمے داری میں لیتا ہوں۔ اسے ابھی جا کر سمجھاتا ہوں لیکن وہ جب یہاں آئے تو انکار مت کرنا۔''

اشک ایک مرتبہ پھر بیدی کے گھر آیا اور اپنی طرف سے ستونت کور کو یہ کہہ کر سمجھانے کی کوشش کی کہ بیدی بہت شرمندہ ہو رہا تھا۔ سمن سے قطع تعلق کرنے پر بھی تیار ہو گیا ہے۔

''میں آپ کے کہنے سے چلی جاتی ہوں لیکن مجھے یقین نہیں ہے کہ وہ اپنے وعدے پر قائم رہیں گے۔ وہ کوئی اور سمن تلاش کر لیں گے۔'' ستونت کور نے کہا اور اشک کے ساتھ اس کے دفتر پہنچ گئی۔

بیدی کا مزاج تھا کہ ذرا ذرا سی بات پر اس کی آنکھیں بھر آتی تھیں۔ کئی دن بعد ستونت کو دیکھا اور وہ بھی اس حال میں کہ اسے گھر چلنے کو کہہ رہی تھی' اس کے آنسو بہنے لگے۔ ستونت بھی آبدیدہ ہو گئی۔

''آپ بازار کا کھانا کھا کر اپنی صحت کا ستیاناس کر رہے ہیں' یہ کوئی اچھی بات ہے؟''

وہ اسے گھر لے تو آئی تھی لیکن سمن بہ دستور ان کے درمیان موجود رہی۔ بیدی نے کچھ دن تو احتیاط کی لیکن پھر یونٹ کے لوگوں کے ذریعے ستونت کور کو یہ اطلاعیں ملنے لگیں کہ بیدی اب بھی سمن کے گھر جاتے ہیں یا کسی ہوٹل میں کمرا بک کرا لیتے ہیں۔

بیدی اس کے احساسات سے بے نیاز اپنی ڈگر پر رواں دواں رہا۔ نہ اس سے سمن چھوٹ سکی' نہ وہ شراب نوشی سے منہ موڑ سکا۔ ستونت کو یہ سب خبریں ملتی رہتی تھیں لیکن اب تو شاید اس میں لڑنے کی ہمت بھی نہیں رہی تھی۔ وہ اندر ہی اندر کڑھتی سلگتی رہی۔

ستونت کور کو ایک عرصے سے ہائی بلڈ پریشر کی شکایت تھی۔ ایک روز کسی خیال نے اس کے سینے میں ایسا طوفان اٹھایا کہ بلڈ پریشر خطرے کی حدود سے تجاوز کر گیا اور اسے دل کا سخت دورہ پڑا۔ اسے بمبئی کے نانا وتی اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں داخل کرا دیا گیا۔ اس کا منہ بولا بھائی پرشوتم اور بڑی بیٹی سریندر کور اس کی تیمارداری کو پہنچ گئے۔

دوست احباب کے کہنے سننے پر بیدی اس کے ساتھ اسپتال میں رکنے پر رضامند ہو گیا لیکن شراب کی بوتل وہ یہاں بھی ساتھ لے آیا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد غسل خانے میں جا کر حلق تر کر لیتا تھا۔

''آپ کیوں گندی چیز گندی جگہ جا کر پی رہے ہیں۔ جب آپ کو اپنے وعدے کا پاس ہے نہ میری حالت کا تو پھر یہ تکلف کیوں؟ یہیں میرے سامنے بیٹھ کر پی لیں۔ مجھے یہ اطمینان تو ہو گا کہ آپ میرے پاس ہیں۔''

وہ اس کے سامنے بیٹھ کر پینے لگا۔ دو تین دن کی قید بھی بیدی سے برداشت نہ ہو سکی۔ شراب یہاں تھی لیکن سمن کہاں تھی؟ وہ اسے جل دے کر سمن سے ملنے چلا گیا۔ ستونت کور کو اس کا پتا چل گیا۔ بیدی واپس آیا تو وہ اسے دیکھتے ہی آپے سے باہر ہو گئی۔

''میں مر رہی ہوں اور آپ کو عیش اُڑانے کی پڑی ہے۔''

''تو نہ مرتی ہے نہ میرا پیچھا چھوڑتی ہے۔'' بیدی بھی غصے سے اکھڑ گیا ''مرنا چاہتی ہے تو مر' مجھے پروا نہیں۔''

ستونت کور کو شاید اس بے رحمی کی اس سے توقع نہیں تھی۔ اسے دل کا شدید دورہ پڑا۔ جتنی دیر میں ڈاکٹر آتے' اس نے دیکھتے ہی دیکھتے بیدی کی بانہوں میں جان دے دی۔

اپنی بیوی کی موت کے بعد بیدی کئی دن دھاڑیں مار مار کر روتا رہا۔ پھر اس نے اپنی محبوبہ کو پچیس ہزار روپے دیے۔ سونے کی چوڑیاں اور کنگن بنوا کر دیے۔ وہ نئے کپڑے سلوا رہا تھا اور زندگی پھر سے خوبصورتی اور پیار کے ساتھ جینے کی تیاری کر رہا تھا۔ اب ستونت کا کھٹکا بھی نہیں رہا تھا لہٰذا وہ اور بھی کھل کھیلنے لگا۔

''آنکھن دیکھی'' کی شوٹنگ شروع ہو چکی تھی۔ سمن صبح ٹیکسی میں بیدی کے ہاں جاتی' بیدی بے قراری سے اس کی آمد کا منتظر رہتا اور اسے کار میں لے کر شوٹنگ پر جاتا۔ شوٹنگ کے بعد وہ اسے اس کے گھر چھوڑنے جاتا' رات وہیں گزارتا یا کبھی کبھی اسے اپنے فلیٹ میں روک لیتا۔ کوئی شام تنہا ہوتی تو وہ وسکی پیتا اور ملکہ پکھراج کی گائی ہوئی فیض کی اس غزل کی ریکارڈنگ لگا دیتا۔

اب ٹھہرے گا درد اے دل کب رات بسر ہو گی
کہتے تھے وہ آئیں گے کہتے تھے سحر ہو گی
کب تک تری رہ دیکھیں اے قامتِ جانانہ
کب حشر معین ہے تم کو تو خبر ہو گی

فلم بن گئی اور وہی بات ہوئی جس کا کھٹکا روزِ اول سے لگا ہوا تھا۔ سمن نے چپکے سے ایک نوجوان لڑکے سے شادی کر لی۔ بیدی نے یہ خبر اخبار میں پڑھی تو اس پر بجلی سی ٹوٹ پڑی۔ اس نے خودکشی کی کوشش کی لیکن احباب نے بچا لیا۔

بیدی اس کے عشق کی گرفت میں ایسا جکڑا ہوا تھا کہ

عرصہ دراز تک خوش فہمی اس کے پاؤں کی بیڑی بنی رہی۔ وہ دوستوں سے یہی کہتا رہا کہ سمن نے شادی کر لی ہے ورنہ عشق وہ اب بھی مجھ ہی سے کرتی ہے۔

بیدی ایسا زمانہ شناس، جہاں دیدہ، نفسیاتی گتھیاں سلجھانے والا دانش ور اس قدر خود فریبی میں مبتلا ہو سکتا ہے بظاہر بعید از فہم ہے لیکن حضرت عشق جہاں ہوں وہاں منطق نہیں چلتی۔

اس نے ستونت کی موت کے ایک سال بعد جب نشہ اتر چکا تھا، سمن اسے چھوڑ کر جا چکی تھی، اوپندر ناتھ اشک کو ایک خط لکھا جس میں ترجمانی ہوتی ہے کہ اس پر کیا گزر رہی تھی۔

"ایک بیٹا جرمنی جا بیٹھا ہے۔ دوسرا چوبیس گھنٹے شراب میں دھت رہتا ہے۔ کیا کروڑوں روپے بنانے کا یہی ایک نسخہ ہے۔ خوش قسمتی سے بیٹیاں نظر بد دور گھروں میں اچھی ہیں صرف میں اکیلا رہ گیا ہوں۔ گھر لوٹتے پر ہول اٹھتا ہے۔ خط لکھنے کے لیے بھی میز کے پاس نہیں کھسکتا۔ آٹھویں منزل سے کود کر خودکشی کرنے کی کوشش اور پھر ہنس کر لوٹ آیا ہوں۔ مرنا کچھ برا سا لگا۔ مصیبت سے بھاگتا ہوں اور پھر پہلی فرصت میں وہاں لوٹ آتا ہوں جہاں مصیبت کا گڑھ ہے۔ فرق اتنا ہے کہ اچھے برے میں اپنے کو دیکھ رہا ہوں اور شاید بربیت کی یہی علامت ہے۔"

فلم مکمل ہو چکی تھی۔ اب اسے فروخت کرنے کا مسئلہ تھا لیکن اس کی کاسٹ نئی تھی لہٰذا تقسیم کار اسے خریدتے ہوئے جھجک رہے تھے۔ ہر چند کہ اس کے کہنے کے مطابق اس نے اس میں بالکل اچھوتا موضوع فلمایا تھا اور اپنی تمام صلاحیتیں بروئے کار لایا تھا لیکن بدقسمتی گھر دیکھ چکی تھی۔ بعض تقسیم کار اس پر مصر تھے کہ اگر اس فلم کا تفریحی ٹیکس معاف کرا لیا جائے تو وہ اسے خرید لیں گے۔ یہ اس کے لیے آسان تھا۔ اسے اپنے تعلقات پر ناز تھا۔ وہ فلموں کے دس ڈبے صندوق میں رکھ کر بمبئی سے دہلی آیا۔ متعلقہ مرکزی وزیر مملکت سے مل کر اس بارے میں درخواست کی۔ انہوں نے فلم دیکھی۔ اسے سراہا بھی اور صوبائی حکومتوں کے وزرا کو تفریحی ٹیکس معاف کرنے کی سفارش بھی کی لیکن افسر شاہی کے تغافل اور بے حسی نے فلموں کے بند ڈبوں کو کھلنے ہی نہیں دیا۔

وہ فلم کے ڈبوں کو صندوق میں ڈالے ڈالے اس طرح بمبئی اور دہلی کے چکر کاٹتا رہا جیسے کوئی مردے کا تابوت اٹھائے پھر رہا ہو۔ حکومت کا الگ اصرار بڑھتا جا رہا تھا کہ وہ قرض اتارے۔ سود الگ بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ پریشان تھا کہ قرض کیسے اتارے گا؟ گلوخلاصی کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ قرض تھا کہ شیطان کی آنت کی طرح بڑھتا جا رہا تھا۔

"میں نے فلم بنائی اچھوتوں پر۔ زمین رہن رکھ دی۔ اب سرکار کہتی ہے میں رقم واپس کر دوں۔ میں دہلی کے چکر کاٹ کاٹ کر بیمار ہو گیا۔ فلم کے دس ڈبوں کو صندوق میں اٹھائے پھرتا ہوں جیسے کوئی مردے کا تابوت اٹھائے۔ میں بھی تو اسی فلم جیسا ہی ہوں۔ میں نے سرکار کا میرے حساب سے پچاس ساٹھ ہزار دینا تھا۔ میں نے کہا یہ فلم لے لو، یہ تمہارے لیے ہی بنائی ہے، کہیں ریلیز نہیں ہوئی۔ سود در سود ڈال کر ڈیڑھ لاکھ ہو گیا اب پونے پانچ لاکھ بنائے بیٹھی ہے سرکار، کیسے اتاروں گا یہ روپیا....."

اس کی سمن اسے چھوڑ کر چلی گئی۔ بیوی کا انتقال ہو گیا۔ بچے ساتھ چھوڑ گئے اور اب قرض کا بوجھ تھا کہ بڑھتا جا رہا تھا۔ ایک روز یہ تمام دکھ اکٹھے ہو کر اس پر حملہ آور ہو گئے۔ ڈاکٹروں نے کہا، اس کے جسم کے دائیں حصے پر فالج گرا ہے۔ اسے بھی معلوم تھا کہ فالج کیا ہوتا ہے یا تو معذور ہو جائے گا یا معذوروں جیسا ہو گا۔ وہ کچھ دن اسپتال کے بستر کا بوجھ بنا رہا پھر بڑا بیٹا نریندر اسے اپنے گھر لے گیا۔ بیٹا نافرمان بھی ہو تو باپ کی بیماری میں تو کام آ ہی جاتا ہے۔

فالج کا حملہ تازہ تازہ ہو چکا تھا۔ چوٹ کی دکھن بہت دیر تک رہتی ہے۔ وہ بھی اسی کیفیت سے گزر رہا تھا، آرام کرسی پر تکیوں کے سہارے آدھا بیٹھا آدھا لیٹا رہتا تھا۔ فالج نے یادداشت کو متاثر کیا تھا لہٰذا کبھی کسی کو پہچانتا تھا کبھی نہیں پہچانتا تھا۔ ذہن پر زور ڈالتا تھا اور پھر بے بسی سے آنے والے کو دیکھتا تھا۔ زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ احباب کا تانتا بندھا ہوا تھا جو اسے دیکھنے آ رہے تھے اور وہ دوستوں میں بلبل بن کر چہکنے والا ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں اپنی بے بسی کا اظہار کر رہا تھا۔

"مجھ سے جملے بنتے نہیں ہیں۔ بیچ ہی میں کہیں رک جاتے ہیں۔ کبھی کوئی لفظ صحیح نہیں ملتا اور کبھی کوئی خیال ادھورا رہ جاتا ہے۔ شعر سنتا ہوں داد دینے کو جی چاہتا ہے لیکن صرف گردن ہلا کر چپ ہو جاتا ہوں اور شاعر سمجھتا ہے کہ میں نے شعر سمجھا نہیں۔"

وہ بیدی جو لطیفوں اور چٹکلوں کا بادشاہ اور حاضر جوابی میں یکتا تھا، وہ بیدی اب بے رحم قضا و قدر کے تھپیڑے کھا کھا کر بے دست و پا ہو گیا تھا۔ وہ نہ صرف جسمانی طور پر معذور تھا بلکہ ذہنی طور پر بھی انحطاط پذیر ہو گیا تھا۔ چہرے پر حسرت و یاس ہویدا، آنکھوں سے ذہانت اور بیدار مغزی کی

روشنی غائب، لباس اور رکھ رکھاؤ میں تغافل۔ یقیناً وہ بیدی نہیں تھا جو سب کا دیکھا بھالا تھا۔

سال چھ مہینے کے بستر کے بعد وہ آہستہ آہستہ چلنے لگا تھا البتہ دایاں ہاتھ بے جان ہوگیا تھا اور سیدھی ٹانگ میں خم آگیا تھا لیکن بالکل بے جان نہیں ہوگئی تھی۔ وہ لنگڑا کر چل سکتا تھا۔ ڈاکٹروں نے ہدایت کی تھی کہ اسے ہر روز شام کو ساحل سمندر پر چہل قدمی کرنی چاہیے تاکہ باقاعدہ چلنے سے ٹانگ کا ٹیڑھاپن آہستہ آہستہ درست ہوجائے۔ کوئی ساتھ چلنے والا مل جاتا تھا تو وہ ساحل کی سیر کے لیے اس کے ساتھ چلا جاتا تھا۔ ایک روز مشہور افسانہ نگار بلونت گارگی ملنے آئے تو وہ ان کے ساتھ جوہو کی سیر کو چلا گیا۔

ساحل پر خوب چہل پہل تھی۔ نوجوان خوش گپیاں کرتے تیز تیز چل رہے تھے۔ کہیں ناریل کا پانی بک رہا تھا کہیں آئس کریم بیچنے والے آوازیں لگا رہے تھے۔ ایک طرف جھولے تھے جس پر بچے سوار تھے۔ وہ بلونت گارگی کو سہارا بنائے لنگڑاتا ہوا چل رہا تھا۔

''یہاں اتنی خلقت چلتی جاتی ہے۔ ان میں میں بڈھا لنگڑاتا ہوا چل رہا ہوں۔ کیا ان کو معلوم ہے کہ یہ لنگڑا بڈھا راجندر سنگھ بیدی ہے۔ اردو کا بڑا ادیب، فلم میکر جس کے پیچھے ریحانہ سلطان اور وحیدہ رحمن گھومتی تھیں جس کو دلیپ کمار سلام کرتا تھا اور راج کپور جھک کر ملتا تھا۔'' بیدی بڑی حسرت سے کہہ رہا تھا۔

''تمہیں کیا لینا ہے پتا کر کے۔'' بلونت گارگی نے کہا۔

''نہیں، میں پتا لگانا چاہتا ہوں کہ کیا انہیں پتا ہے کہ میں راجندر سنگھ بیدی ہوں۔ یہ لوگ تو یہ سمجھتے ہوں گے کہ یہ کوئی ریٹائرڈ بڈھا ہے جو لنگڑاتا ہوا چلا جارہا ہے اور اس حسین فضا کو خراب کر رہا ہے۔ میں بتانا چاہتا ہوں کہ میں راجندر سنگھ بیدی ہوں۔''

وہ اس ٹوٹی پھوٹی شکستہ حالت میں بھی اس ثابت و سالم بیدی کو ڈھونڈ رہا تھا جو اب ماضی کا حصہ بن چکا تھا اور ماضی کبھی لوٹ کر نہیں آتا۔ اس کا ماضی کہیں دور رہ گیا تھا اور وہ گھر میں قید ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ ناکارہ ہو چکا تھا لہٰذا اب وہ لکھنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔ وقت کاٹے نہیں کٹتا تھا۔ یارانِ طریقت جو کبھی ناؤنوش کی محفلوں میں اُمڈ گھمڈ کر آیا کرتے تھے، ہوا ہوگئے تھے۔ ایسے میں کوئی یارِ دیرینہ آنکلتا تو بیدی کا مسخ چہرہ کھل اٹھتا تھا، کبھی کبھی آنکھوں میں پرانے بیدی کی جھلک ہویدا ہوجاتی تھی۔

اس تنہائی میں کوئی چڑیا بھی اس کی کھڑکی پر آکر بیٹھ جاتی تو وہ سمجھتا، کوئی ملنے آگیا ہے۔ پھر اس چڑیا پر رشک کرنے لگتا۔ یہ اُڑ تو سکتی ہے، میں تو سیدھی طرح چل بھی نہیں سکتا۔

وہ کچھ کچھ صحت یاب ہونے لگا تھا۔ احباب کی محفلوں میں بے جان بت کی طرح سجنے لگا۔ پینسٹھ سال کی عمر کیا ہوتی ہے لیکن وہ سو سال کا لگتا تھا۔

1980ء میں لوگوں نے اسے ''پریم چند صد سالہ جشن'' کے موقع پر دہلی میں دیکھا۔ وہ کبھی اپنی داڑھی بڑی صفائی سے تراشتا تھا۔ کالی پنسل کی مدد سے کچھ بالوں کو کالا کر لیتا تھا لیکن اس کی داڑھی کے بال برف سے سفید تھے اور نہ وہ ترشے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں اس طرح ویران تھیں جیسے کسی کو بھی پہچاننے سے قاصر ہوں۔

اس تقریب میں اسے اپنا افسانہ سنانا تھا مگر وہ اسے پڑھنے سے معذور تھا۔ حاضرین کا اصرار تھا کہ وہ اپنے افسانے کا تھوڑا سا حصہ ہی پڑھ کر سنا دیں۔ اسے سہارا دے کر مائک تک لایا بھی گیا لیکن الفاظ اس کے منہ میں گڈمڈ ہو کر رہ گئے۔

1981ء میں بیدی کی بائیں آنکھ کا آپریشن ہوا مگر کامیاب نہیں ہوا۔ بینائی جاتی رہی۔ اسی سال کے اوائل میں وہ اپنی چھوٹی بیٹی کے پاس جبل پور چلا گیا۔ بے کاری کے مشغلے کے طور پر وہ ایک آنکھ بند کر کے خراب آنکھ پر اپنی ہتھیلی کی دوربین سی بنا کر دیکھنے کی کوشش کرتا کہ اسے کچھ دکھائی دیتا ہے یا نہیں۔

یہی صدمے کیا کم تھے کہ قسمت نے کہا، ایک چوٹ اور سہی۔ یہ چوٹ ایسی تھی کہ وہ تلملا کر رہ گیا۔ اس کا بڑا بیٹا نریندر بیدی کثرت شراب نوشی کے باعث دل کے دورہ پڑنے سے انتقال کر گیا۔

اس ناگہانی صدمے نے بیدی کو ہلا کر رکھ دیا۔ بیوی کے مرنے کے بعد اور بیٹوں کے اپنے اپنے گھر چلے جانے کے بعد نریندر ہی اس کا واحد سہارا رہ گیا تھا۔ قسمت نے وہ بھی چھین لیا۔

''سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھوں۔ آپ کے سامنے 45 سالہ بچے کی لاش پڑی ہو تو پھر آپ پر کیا گزرے گی؟ میں خود پہلے ایک لاش سے زیادہ نہ تھا لیکن نریندر کے سامنے آجانے پر میں اس لاش کو بھول گیا۔ اب پون مہینا گزر چکا ہے، کچھ سنبھلا ہوں۔''

(خط بنام گوپی چند نارنگ)

نریندر کی موت نے اسے اپنی زندگی سے مایوس کر دیا۔

اب اس کا کوئی پرسانِ حال نہ رہا تھا۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ سر پر منڈلاتی موت کا سایہ اور زیادہ گہرا ہو گیا۔ لیکن موت نے بھی سوچ لیا تھا کہ اتنی آسانی سے نہیں آئے گی۔ فالج کا حملہ اور آنکھ کا اندھیرا ہی کیا کم تھا کہ اسے کینسر کا مہلک مرض لاحق ہو گیا۔ یکے بعد دیگرے دو آپریشن ہوئے پہلا سینے اور پھر پیٹ کا۔ اب اس کے سینے میں جینے کی امید دم توڑنے لگی تھی۔

وہ سینٹ زیور سلور کلینک میں داخل تھا۔ اس کا چھوٹا بھائی ہربنس سنگھ اور اس کی اہلیہ اس کی تیمارداری کے لیے آ گئے تھے۔ اوپندر ناتھ اشک کو معلوم ہوا تو وہ بھی دوڑا چلا آیا۔ بیدی آنکھیں بند کیے بستر پر بےسدھ پڑا تھا۔ پیشاب کے اخراج کے لیے پلاسٹک کی تھیلی بستر کے نیچے لٹک رہی تھی۔

اوپندر ناتھ اشک سوچ رہے تھے کہ یوں بے حس و حرکت لیٹے لیٹے نہ جانے اس عظیم فنکار کے دل و دماغ میں کیا کیا طوفان اٹھتے ہوں گے۔ کس قدر ہیجان برپا ہوتا ہوگا۔ وہ ضرور سمن کو یاد کر کے تڑپتا ہوگا۔ وہ یقیناً اپنے اچھوتے افسانوں کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے کے لیے پیچ و تاب کھاتا ہوگا۔ شراب پینا اس کا روز کا معمول تھا۔ اس کی زبان کتنی خشک ہو گئی ہوگی۔

بیدی نے ایک طویل وقفہ گزر جانے کے بعد آنکھ کھول کر اشک کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں خلافِ معمول آنسو نہیں تھے ورنہ وہ تو آبدیدہ ہونے کے لیے مواقع ڈھونڈا کرتا تھا۔ آنسو خشک ہو گئے تھے یا اسے صبر آ گیا تھا۔ اشک اس سے اس کی بیماری کے بارے میں دریافت کرتے رہے اور بیدی اس بات کا رونا روتا رہا کہ ذہن میں خیالات کی یورش ہے اور وہ لکھنے سے قاصر ہے۔ اسے اپنی زندگی سے زیادہ اپنے افسانوں کا خیال تھا۔

''میں ایک نہ ایک دن ضرور لکھوں گا۔'' اس نے کہا حالانکہ اس جیسا ذہین شخص یہ ضرور جانتا ہوگا کہ اب لکھنے کا خیال بھی جنون سے زیادہ کچھ نہیں۔

جولائی 1983ء کو پاکستان کے ادیب احمد سلیم' بیدی کے پنجابی ادیب دوست سکھ بیر کے ہمراہ اس کا انٹرویو لینے آئے' اس وقت بھی اسے اپنے نہ لکھ سکنے کا دکھ تھا۔

''میرا خیال ہے میں لکھوں گا۔ اگر اللہ نے مجھے صحت دی تو میں ضرور لکھوں گا۔ میرے دماغ میں بہت کچھ ہے۔ یہ جو درمیان میں ساڑھے چار سال گزرے ہیں نا انہوں نے مجھے بہت کچھ دیا ہے۔ اگر میں زندہ رہا' اگر عمر نے وفا کی تو میں ضرور لکھوں گا۔ ایک آدمی لکھنا چاہتا ہے اور لکھ نہیں پاتا' کیسا اندوہناک تجربہ ہے یہ۔ مت پوچھیں کہ میرے دل پر کیا گزر رہی ہے؟'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا پھر اس نے خود پر قابو پایا اور پھر کہنا شروع کیا ''میں دیکھتا ہوں محلات ہیں' سیڑھیاں ہیں' جھگیاں ہیں' لوگ ہیں اور میں ان میں گھوم پھر رہا ہوں۔ جب تک تخلیقی عمل کے یہ خواب باہر نہیں آتے میں اذیت میں رہوں گا۔''

اس انٹرویو کے یہ اقتباسات اس کی قابلِ رحم ذہنی حالت کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس میں اس نے زندگی کے آخری چھ سال گزارے۔ اس کا دماغ جزوی حالت میں مفلوج ہونے کے باوجود اسے لکھنے کی ترغیب دیتا لیکن فالج زدہ ہاتھ اس پر سوالیہ نشان لگا دیتا۔ بیدی سے ملنے والے اخلاق و آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسے تسلی و تشفی دیتے' یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کی صحت یابی بعید از قیاس ہے۔

اب وہ خود بھی مایوس ہو گیا تھا۔ اس کی ڈاک جوں کی توں پڑی رہتی تھی۔ اس کا خط تک پڑھنے والا کوئی نہیں تھا۔ تمام زندگی کون کسی کی تیمارداری کرتا ہے۔ اس کا ذاتی نوکر ترلوچن تھا جو اب تک وفاداری نبھائے جا رہا تھا۔ وہ اکیلا کتنا کام کرتا؟

اب دوائیں بےسود تھیں' دعاؤں کا وقت تھا۔ اب شمعِ حیات بجھنے کو تھی۔ احباب کو پتا چل گیا تھا کہ وقتِ رخصت قریب ہے۔ وہ دم سادھے آتے' حسرت و یاس سے دیکھتے اور سر جھکائے چلے جاتے۔

موت کی گرفت اس پر لحظہ بہ لحظہ مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ گردے کا ماؤف ہو جانا' کثرت تمبا کو خوردنی سے منہ میں کینسر کے آثار پیدا ہو جانا' اعصابی تناؤ' ذیابیطس' ہائی بلڈ پریشر' لقوہ' فالج' دائیں آنکھ کی بینائی جاتے رہنا اور آخر میں پیٹ کا کینسر ہو جانا۔ پھر پے در پے صدمات' قرض کا خیال' قلم ابھی تک ڈبے میں پڑی تھی۔ اب وہ بچ کر کیا کرتا' اس نے موت کو آواز دے لی۔

11 نومبر 1984ء کو اس کی کفن زدہ لاش گھر کے باہر رکھی تھی اور دوردرشن سے اس کی موت کا اعلان ہو رہا تھا۔ کرشن چندر اور منٹو کے بعد وہ بھی اس دنیا سے چلا گیا تھا۔

ماخذ:

راجندر سنگھ بیدی' شخصیت اور فن
عصری آگہی۔ 1982ء جگدیش چندر ودھاون

شاہد احمد دہلوی

افتخارِ ادب

تحریر و تحقیق: ڈاکٹر ساجد امجد

وہ پشتینی صاحبِ علم و قلم تھا۔ صرف چوبیس سال کی عمر میں "ساقی" جیسا بلند معیار ادبی پرچہ جاری کیا اور نہ صرف یہ کہ اس کے معیار کو کبھی گرنے نہ دیا بلکہ اس کے ذریعے بہت سے نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی۔ صحافت اور ادب کے ساتھ ساتھ اس کا ایک امتیازی وصف علمِ موسیقی سے خصوصی واقفیت تھا اور آخر عمر میں پھر یہی وصف زندگی گزارنے کا ذریعہ بنا۔
تصنیف و تالیف اور تراجم کے میدان کا یہ نامور شہسوار دِلّی کی ٹکسالی زبان پر سند کا درجہ رکھتا تھا۔ اس کے طرزِ تحریر میں زبان کے چٹخارے کے ساتھ بڑی دل کشی اور جاذبیت تھی۔ دِلّی کے مخصوص محاورے اس کی تحریر میں بڑی بے تکلفی سے استعمال ہوتے، اس کے ساتھ ساتھ مزاح اور شوخی کا رنگ بھی خوب کھلتا جس سے منفرد ادبی چاشنی پیدا ہوتی۔ اس طرح ایک ایسا لطیف و دلکش طرزِ نگارش وجود میں آیا جو کسی دوسرے ادیب کو نصیب نہیں ہوا۔

ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے "ساقی" کے مدیر، دِلّی کی ٹکسالی زبان کے وارث شاہد احمد دہلوی کی سرگزشت

مولوی بشیر احمد آج ہی حیدر آباد سے دِلّی پہنچے تھے۔
اساڑھ کی گرمی نے دِلّی کا منہ لال کر دیا تھا۔ آسمان سے آگ برس رہی تھی۔ لو کے تھپیڑوں سے چہرے جھلس رہے تھے۔ زمین پر جوتے، جوتوں میں پاؤں جلے جاتے تھے۔ دیواریں تانبے کی طرح تپ رہی تھیں۔ سورج آگ کا گولا بنا ہوا تھا۔ آٹھ دن میں نو میلوں کے شہر میں اس وقت بازار ویران ہو گئے تھے۔ دکانداروں نے خس کی ٹٹیاں اور پردے لگا لیے تھے۔ ان پر پانی چھڑکا جا رہا تھا۔
دو گھوڑوں والی فٹن کوچہ نواب مرزا کے نکڑ تک آکر رک گئی۔ گھوڑوں کے نتھنوں سے "فرفر" کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ لگتا تھا گرمی کی شدت سے نتھنوں میں دم آگیا ہے۔
مولوی بشیر احمد نے اس گرمی بھی شیروانی پہنی ہوئی تھی جس کے بٹن گلے تک لگے ہوئے تھے۔ سر پر ترکی ٹوپی منڈھی ہوئی تھی۔ انہوں نے فٹن رکتے ہی، سر پر رکھی ہوئی ٹوپی کو درست کیا اور نہایت پھرتی سے نیچے اترے۔ حیدر آباد سے ساتھ آئے ہوئے دونوں ملازموں نے جلدی جلدی سامان نیچے اتارا۔ اتنی دیر میں بشیر احمد نے گلی پار کر لی تھی۔ داہنی طرف ایک پتلی سی گلی تھی جو ڈپٹی صاحب کی گلی کہلاتی تھی۔ اس لیے کہ اس گلی کے سب ہی مکان ڈپٹی نذیر احمد یا ان کے عزیزوں کے تھے۔ دائیں رخ ایک ہی وضع کے تین مکان ایک دوسرے سے پیوست تھے۔ پہلا مکان مردانہ کہلاتا تھا۔ یہ ڈپٹی نذیر احمد کا کتب خانہ بھی تھا اور مہمان خانہ بھی۔ اسی مکان میں بیٹھ کر انہوں نے قرآن مجید کا ترجمہ مکمل کیا، تعزیرات ہند کو اردو کے قالب میں ڈھالا اور اپنے آخری دور کی کتابیں لکھیں۔ دوسرا مکان ڈپٹی صاحب کے بھانجے کا تھا جسے سب کھڑکیوں والا مکان کہتے تھے۔ تیسرا مکان ڈپٹی صاحب کا زنانہ مکان تھا۔
ڈپٹی نذیر احمد دِلّی کی آخری بہار کے آخری پھول تھے۔ انہوں نے ضلع بجنور کے ایک گمنام سے قصبے ریہڑ میں غریب مولویوں کے خاندان میں آنکھ کھولی۔ خاندان اتنا غریب تھا کہ اس بچے کی تعلیم کا بار بھی برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اس بچے کو اس کے باپ نے پنجابی کٹرے (دہلی) کی ایک مسجد میں پڑھنے کے لیے بٹھا دیا۔ مسجد ہی میں طالب علم رہتے بھی تھے، وہ بھی رہنے لگا۔ دوسرے طالب علموں کی طرح وہ بھی گھروں سے روٹیاں مانگ لاتا اور رات کو ٹاٹ کی صفوں میں لپٹ کر سو جاتا۔
یہی وہ ڈپٹی نذیر احمد تھے جو لکھ پتی بنے اور علم و فضل کے آسمان پر سورج بن کر چمکے۔ جس شہر کی ایک مسجد کے ایک کونے میں راتیں کاٹیں اسی شہر میں رئیسوں کی شان سے زندگی گزاری مولوی بشیر احمد انہی ڈپٹی نذیر کے اکلوتے فرزند تھے جو حیدر آباد دکن میں تعلقہ دار تھے اور باپ سے ملنے دہلی آتے رہتے تھے۔
"ماموں چیل سلام" گلی میں کھڑے کسی توتلے بچے نے ماموں بشیر کہنے کے شوق میں 'ماموں چیل' کہہ کر سلام کیا۔ مولوی بشیر نے

shahid
96

مسکرا کر سلام کا جواب دیا اور مردانہ مکان سے گزرتے ہوئے زنانہ مکان کے سامنے پہنچ کر رک گئے۔ ملازموں نے اندر خبر کردی۔ گرمیوں میں یخ جھونکوں کی طرح ان کے آنے کی خبر پھیل گئی۔

دالانوں کے کھلے رخوں پر خس کی ٹٹیاں چڑھادی گئی تھیں۔ ملازم تھوڑی تھوڑی دیر بعد ان پر پانی پھینک رہے تھے۔ برف کی سلیں رکھی ہوئی تھیں۔

صحن میں دھوپ بھری ہوئی تھی۔ مولوی بشیر اونچی کرسی کے کشادہ صحن چبوترے سے ہوتے ہوئے دالان سے پس دالان میں آئے تو ان کی جان میں جان آئی۔ باہر آگ برس رہی تھی اور یہاں ایسی خنکی کہ شملہ اور مسوری میں بھی کیا ہوگی۔

مولوی بشیر کو ان کے والد ڈپٹی نذیر احمد نے خاص طور پر حیدر آباد سے بلوایا تھا۔ خدا جانے کیا بات تھی۔ گھر کی عورتوں سے دریافت کیا، کسی کو بھی کچھ معلوم نہیں تھا۔ سب کے چہروں پر خاموشی پہرا دے رہی تھی۔ بشیر احمد متفکر تھے لیکن اب شام تک تو اسی الجھن میں رہنا تھا۔ انہوں نے بے دلی سے کپڑے تبدیل کیے اور گھر میں بنے ہوئے تہہ خانے میں آرام کرنے چلے گئے۔

اب دوپہر گزر گئی تھی۔ صحن میں چھڑکاؤ ہوچکا تھا۔ چھڑکاؤ کا بھبکا نکلتے ہی صحن میں تخت بچھا دیے گئے۔ ان پر دری چاندنی کا اجلا اجلا فرش بچھ گیا۔ بشیر احمد تہہ خانے سے باہر آئے۔ چاندی کے کٹورے میں فالسے کا شربت پیا اور والد سے ملنے مردانہ مکان میں پہنچ گئے۔

سامنے والے دالان میں قدم رکھتے ہی سید اشتیاق احمد چشتی نے آگے بڑھ کر نہایت ادب سے انہیں سلام کیا۔ چشتی صاحب ڈپٹی نذیر احمد کی جائیداد کے مہتمم تھے۔ دالان کی فرشی نشست پر منشی عبدالرحیم اور کئی دوسرے منشی، محرر اور کاتب اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ ڈپٹی صاحب کی کتابوں کی ترتیب و کتابت کا کام ہو رہا تھا۔

اندر والے دالان کو کمرہ بنادیا گیا تھا جس میں کتابوں کی الماریاں لگی ہوئی تھیں۔ اس کے دائیں بائیں چھوٹے چھوٹے کئی دالان تھے۔ ڈیوڑھی کے بائیں طرف والے دالان میں خادم خدا بخش اپنے کبوتروں کے ساتھ رہتا تھا۔ اسی دالان سے ہو کر ایک زینہ اوپر کی طرف جاتا تھا جہاں ڈپٹی نذیر احمد کا کمرہ تھا۔

خدا بخش نے مولوی بشیر کو دیکھتے ہی اپنے کبوتروں کو ڈانٹا "ہشو۔ راستہ دو۔ چھوٹے ڈپٹی صاحب آئے ہیں۔" وہ جب بھی مولوی بشیر کو دیکھتا تھا، اسی طرح کبوتروں کو ڈانٹتا تھا چاہے کبوتر اپنی کابک میں ہوں یا رستے میں بیٹھے ہوں۔

مولوی بشیر اس سے اس کی خیریت دریافت کرتے ہوئے زینہ چڑھ گئے۔ کشادہ چھت پر سامنے کے رخ کتابوں کا کمرہ تھا جو اس وقت بند تھا۔ اس کے برابر ایک لمبا سا کمرہ تھا۔ پرانی طرز و روش کے معیار کے مطابق مزین و مرصع کمرہ۔ سفید چاندنی، سفید گاؤ تکیے، اگالدان، خاص دان، سگریٹ پینے والوں کے لیے رنگ رنگ کی ایش ٹرے۔ دیواروں پر ہرن اور بارہ سنگھوں کے خوش نما سینگ۔

یہی وہ کمرہ تھا جو ڈپٹی نذیر احمد کے استعمال میں رہتا تھا۔ وہ تصنیف و تالیف کا کام اسی کمرے میں کرتے تھے۔ یہی وہ کمرہ تھا جہاں مسجد فتح پوری کے بیسیوں طالب علم ڈپٹی نذیر احمد سے عربی پڑھنے آیا کرتے تھے۔

مولوی بشیر احمد نے ڈرتے ڈرتے کمرے میں جھانکا۔ ڈپٹی نذیر لیٹے ہوئے تھے اور ان کی پائنتی کی طرف مرزا فرحت اللہ بیگ اپنے استاد کے دیدار سے آنکھیں تازہ کر رہے تھے۔

"بشیر آگئے۔" ڈپٹی نذیر احمد نے انہیں دیکھ کر کہا اور اٹھ کر بیٹھ گئے۔

مولوی بشیر تیزی سے آگے بڑھے اور ان سے بغل گیر ہو کر رونے لگے۔ ہمیشہ سے ان کا یہی قاعدہ تھا۔ وہ جب بھی حیدر آباد سے آتے، اسی طرح بغل گیر ہو کر روتے۔

فرحت اللہ بیگ نے قیافے سے سمجھ لیا کہ اب انہیں یہاں سے اٹھ جانا چاہیے۔ باپ کو بیٹے سے نہ معلوم کیا باتیں کرنا ہوں۔ انہوں نے اجازت لی اور خاموشی سے باہر نکل گئے۔

"بشیر میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ بس اب بہت انتظار ہوچکا، تمہیں کوئی نہ کوئی فیصلہ کرلینا چاہیے۔" ڈپٹی صاحب نے کہا۔

"کیسا فیصلہ" مولوی بشیر نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"بنومت۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔ میں تمہاری بے اولادی سے بہت افسردہ ہوں۔ خاندان کی عورتوں میں بھی چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ میں چاہتا ہوں تم دوسری شادی کرو۔ پہلے بھی کہا تھا، اب پھر کہہ رہا ہوں۔"

"ابا میاں، مجھے اپنی دلہن کا خیال آتا ہے۔ مجھے اس سے کوئی شکایت بھی نہیں۔ پھر اس کے سینے پر مونگ دلنے کے لیے سوکن کیوں لے آؤں۔"

"بہو سے مجھے بھی کوئی شکایت نہیں لیکن یہ بھی تو سوچو تم میرے اکلوتے بیٹے ہو۔ میری نسل تم ہی سے چلے گی۔ تمہارے اولاد نہ ہوئی تو اس خاندان کو لوگ کے دن یاد رکھیں گے۔"

"کچھ دن انتظار بھی تو کیا جاسکتا ہے۔"

"کچھ دن؟ دس برس سے زیادہ ہوگئے۔ اور اب تو ڈاکٹروں نے بھی کہہ دیا کہ تمہاری دلہن سے اولاد نہیں ہوسکے گی۔"

"اگر دوسری بیوی سے بھی نہیں ہوئی؟"

"کیوں خدا چھوڑی باتیں کرتے ہو۔ اگر دوسری سے بھی نہیں ہوئی تو تیسری سہی۔"

"لیکن میں سوکن لاتے کیا اچھا لگوں گا۔"

"بات اچھے' برے کی نہیں ہے۔ ضمیر کی ملامت کی بھی نہیں ہے۔ تمہارا مذہب تمہیں چار شادیوں کی اجازت دیتا ہے۔ یہ حکم انہی مواقع کے لیے آیا ہے۔ ہمارے مذہب میں شادی کا مقصد فروغِ نسل ہے۔ جب یہی نہیں تو دوسری شادی میں کیا مضائقہ ہے۔"

سنگ آمد و سخت آمد۔ باپ کا کہنا ٹل نہیں سکتا تھا۔ لہٰذا سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔

دلی کے غریب سیّدوں کے ایک خاندان کی دبی دبائی لڑکی مل گئی۔ چٹ منگنی پٹ بیاہ ہوگیا۔

مولوی بشیر شادی سے فارغ ہو کر کچھ دن دلّی میں رہے اور پھر چھوٹی بیگم کو چھوڑ کر دکن اپنی ملازمت پر چلے گئے۔ جہاں بڑی بیگم ان کی منتظر تھیں۔

دس سال مزید گزر گئے۔ چھوٹی بیگم کی کوکھ بھی ہری نہیں ہوئی۔ مولوی بشیر سوچ کانپ گئے کہ اب تیسری کرنی پڑے گی۔ بڑی دلہن کو کہنے کا خوب موقع ملا۔ دن رات کے طعنوں تشنوں سے انہوں نے کلیجے برما دیے۔ پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ چھوٹی دلہن کا پاؤں بھاری ہوگیا۔

ڈپٹی صاحب نے بچے کا نام مُنذّر احمد رکھا۔ بشیر احمد کو چھوٹی بیگم سے التفات کم ہی تھا۔ وہ خود بڑی دلہن کے ساتھ حیدر آباد میں رہے اور یہ بچہ دہلی میں دادا' دادی کی آنکھ کا تارا بنا رہا۔

مولوی بشیر گاہے گاہے دلّی کا پھیرا لگاتے ضرور تھے۔ اب کے جو آئے اور گلگوتھنا سا بچہ' بیوی کی گود میں دیکھا تو یوں لگا جیسے بھری دوپہر میں فالسے کا شربت حلق سے نیچے اتار لیا ہو۔ برسوں کی پیاس بجھ گئی۔ اب معلوم ہوا اولاد کی محبت کیا ہوتی ہے۔ اب وہ چھوٹی بیگم کی طرف ملتفت ہوئے اور انہیں اپنے ساتھ حیدر آباد لے گئے۔ بڑی دلہن ان کے ساتھ رہنا کیونکر گوارا کرتیں' طیش میں آکر اپنے میکے سدھار گئیں۔

قسمت کی نظر سیدھی تھی' اگلے برس چھوٹی دلہن کے ہاں ایک اور لڑکا پیدا ہوا۔ اس کا نام مبشر احمد رکھا گیا۔

تیسرے بچے کے آثار ظاہر ہوئے تو چھوٹی دلہن دہلی آگئیں۔ ان کے ہٹتے ہی جگہ بھرنے کو بڑی دلہن پھر اپنے میکے سے حیدر آباد چلی گئیں۔

چھوٹی بیگم کو اس مرتبہ پھر خدا نے ایک بیٹا دیا۔ سب بچوں کے نام ڈپٹی نذیر احمد ہی نے رکھے تھے' اس بچے کا نام شاہد تجویز کیا۔

اس بچے میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ رنگ سانولا' چہرہ لمبا' ناک موزوں البتہ چہرے پر ایک شریر سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ کمزور بہت تھا' غالباً اسی لیے ڈپٹی صاحب نے اسے گود لیتے ہی نزاکت محبوبی کی رعایت سے اس کا نام شاہد رکھ دیا۔

چھوٹی بیگم کے ہاں یہ تلے اوپر کی تیسری ولادت تھی۔ لیکن دلّی کے نخرے اور گھر میں خوش حالی کا عروج۔ شاہد کی پیدائش پر دھوم دھام سے خوشیاں منائی گئیں۔

خدا جب مہربان ہوتا ہے تو اسی طرح ہوتا ہے۔ چھوٹی دلہن کی گود اب خالی ہونے ہی میں نہیں آتی تھی۔ شاہد کی پیٹھ پر ایک لڑکی بشریٰ پیدا ہوئی۔ پھر شاہد کا ایک اور بھائی پیدا ہوا جس کا نام منیر احمد رکھا گیا۔

○☆○

ڈپٹی نذیر احمد کی اہلیہ کا انتقال ہوگیا تو ان کی دیکھ بھال کے لیے چھوٹی دلہن نے مستقل طور پر دہلی میں رہنے کا فیصلہ کرلیا۔ چھوٹی دلہن جہاں قسمت کی زبر تھیں وہاں سیرت اور سلیقہ شعاری میں بھی بے مثال تھیں۔ گھر میں مامائیں ملازم تھیں لیکن وہ سالن خود بگھارتی تھیں۔ نوکروں کے ہوتے ساتے' اپنے ہاتھ سے گھر کا کام کاج کرنے میں انہیں عار نہیں تھی۔ گھر ہمیشہ چندن سا پڑا رہتا تھا۔ بڑے دالان میں چاندنی کا فرش بچھا رہتا' چھوٹے دالان میں چوکیوں کا فرش' چوکیوں پر چاندنی کا فرش' دونوں دالانوں میں ہاتھ سے کھینچنے کے پنکھے لٹکے رہتے۔

چھوٹی دلہن صبح کا ناشتا اور دونوں وقت کا کھانا خود لے کر گلی میں سے گزر کر مردانے مکان میں جاتی تھیں اور ڈپٹی صاحب کے سامنے بیٹھ کر انہیں کھانا کھلاتی تھیں۔

یہ کام وہ اس عقیدت سے کررہی تھیں کہ ڈپٹی صاحب کے دل میں ان کے لیے بڑی جگہ ہوگئی تھی۔ ڈپٹی نذیر احمد اٹھتے بیٹھتے انہیں دعائیں دیتے۔ "چھوٹی بہو' چھوٹی بہو" کہتے ان کا منہ نہیں دکھتا تھا۔

رشتے کنبے کی عورتیں ان کی اس خدمت گزاری کو تو دیکھتی نہیں تھیں' خسر کی ان سے محبت دیکھ کر جل ہی تو جاتیں۔ جب کہیں ایک جگہ جمع ہوجاتیں' ناک پر انگلی رکھ کر کہتیں "اے بی' اب ان کے چونچلے نہیں ہوں گے تو کیا ہمارے تمہارے ہوں گے۔ ایک چھوڑ چار چار بیٹوں کی ماں ہیں۔"

"ڈپٹی صاحب پر تو جیسے جادو کردیا ہے" کوئی دوسری عورت گرہ لگاتی۔

"اگر ایسا ہی خدمت کا شوق ہے تو حیدر آباد جاکر سوکن کا دل ہاتھوں میں لیں۔"

"سوکن کو تو چولہے میں ڈالو بیوی' اپنے میاں بشیر احمد ہی کی خدمت کرلیں وہاں جاکر۔ شوہر وہاں پڑا ہے' یہ یہاں خسر کی خدمت کررہی ہیں۔"

"یہ خسر کی نہیں' ان کی دولت کی خدمت ہے۔"

"اے یہ سیّدانی تو بڑی چنٹ نکلی۔"

"اے بہن' ایسی ویسی۔"

○☆○

یہ سیّدانی ایسی صابرہ تھیں کہ سب کی سنتی رہیں اور کان دبا کر

اپنے کام سے کام رکھا۔ کہنے والوں کی زبان کون پکڑ سکتا ہے۔ طعنے دینے والیاں طعنے دیتی رہیں مگر دلہن بیگم کے ماتھے پر شکن نہیں ابھری۔

ہمیشہ کی طرح اس روز بھی انہوں نے گلی میں جھانک کر ادھر اُدھر دیکھا اور جب اچھی طرح اطمینان ہوگیا کہ گلی خالی پڑی ہے' انہوں نے ناشتے کا سامان اٹھایا اور مردانہ مکان پر پہنچ گئیں۔

"آؤ چھوٹی بہو۔ آج کچھ دیر نہیں ہوگئی۔" ڈپٹی صاحب نے انہیں دیکھ کر کہا۔

"بس' وہ.... منیر میاں کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ انہیں سلانے میں دیر ہوگئی۔"

"کیا ہوا اسے۔" ڈپٹی صاحب کا نوالہ ہاتھ میں رہ گیا۔

"کچھ نہیں' بچہ ہی تو ہے مچل گیا تھا۔ آپ ناشتہ کریں۔"

"ہاں ان بچوں کی بھی عجیب ضدیں ہوتی ہیں۔" انہوں نے کہا...اور ناشتہ کرنے میں مصروف ہوگئے۔

ناشتے کے دوران وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے' چھوٹی دلہن بے دلی سے "ہوں ہاں" میں جواب دیتی رہی۔

"لو بھئی ناشتہ تو ہم کر چکے۔ اب تم جاؤ۔ اپنے گھر کو دیکھو۔ یہ برتن میں کسی کے ہاتھ بھجوا دوں گا۔"

یہ سننا تھا کہ چھوٹی دلہن کی آنکھیں بھیگ گئیں اور دیکھتے دیکھتے برسات شروع ہوگئی۔ پھر تو ایسی جھڑی لگی کہ ڈپٹی صاحب بھی گھبرا گئے۔

"خیر تو ہے چھوٹی دلہن۔ کیا ہوا۔"

"منیر اللہ کو پیارا ہوگیا۔"

"کب۔ کیسے۔ یہ کیا کہہ دیا تم نے۔"

"ہاں۔ دو دن سے معمولی سا بخار تھا۔ رات کو اچھا خاصا سویا اور صبح...." چھوٹی دلہن اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکیں۔

"شاباش ہے چھوٹی دلہن۔ بچہ مرا پڑا ہے اور ناشتہ تیار کر کے خود لا رہی ہو اور مجھے کھلا رہی ہو۔ پہلے نہیں بتایا کہ میں کہیں ناشتہ چھوڑ کر کھڑا نہ ہو جاؤں۔"

ایسی ٹوک لگی کہ منیر میاں ہٹ گئے اور چھوٹی دلہن تین بیٹوں کی ماں رہ گئیں۔ لیکن ان کی اہمیت میں کمی نہ آسکی ڈپٹی صاحب کے دل میں اب ان کے لیے پہلے سے زیادہ جگہ تھی۔

اپنی نیک نفسی کی بدولت چھوٹی دلہن پورے گھر پہ راج کر رہی تھیں۔ نیک نیت ایسی کہ گھر میں برکت کے پھول کھل رہے تھے' خدا ترس ایسی کہ نوکر' مامائیں ان کے نام کا کلمہ پڑھتے۔ آئے گئے کی خدمت میں ایسی جُت جاتیں کہ جو اٹھتا انہیں سلام کر کے اٹھتا۔

قدرت نے اس صبر کا صلہ دیا کہ چھوٹی بیگم کو ایک بیٹا اور دے دیا۔ ڈپٹی صاحب نے اس کا نام سراج الدین احمد رکھا۔

اس بیٹے کی ولادت کے بعد مولوی بشیر نے انہیں حیدر آباد بلا لیا۔ چھوٹی دلہن نے بچوں کو سمیٹا اور حیدر آباد روانہ ہوگئیں۔

وہ آنے کو تو حیدر آباد آگئی تھیں لیکن دل دلی میں پڑا ہوا تھا۔ ڈپٹی صاحب کی فکر مارے ڈال رہی تھی۔ دلی میں بھرا پُرا گھر تھا لیکن چھوٹی دلہن پریشان تھیں کہ ڈپٹی صاحب کی دیکھ بھال کون کر رہا ہوگا۔ لیکن جب خیریت کے خط آنے لگے تو وہ مطمئن ہوگئیں۔

شاہد اب چھ برس کا ہوگیا تھا۔ اس نے ابھی اسکول جانا شروع نہیں کیا تھا۔ شام کی چہل قدمی کے بعد مولوی بشیر خود سب بچوں کو لے کر بیٹھتے اور عربی پڑھاتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ پہلے بنیاد مضبوط کر دی جائے پھر کسی اسکول میں داخلے کا سوچیں۔

چھوٹی دلہن کے یہاں پھر کسی بچے کی ولادت کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ گھر میں ایک ملازمہ تھی' اس کی شادی' مولوی بشیر کی پیشی کے چپراسی مخدوم سے کرا دی گئی تھی۔ یہی دونوں میاں بیوی ان دنوں بچوں کی دیکھ بھال میں دن رات ایک کیے ہوئے تھے۔

مولوی بشیر ایک دن دفتر سے آئے تو سخت گھبرائے ہوئے تھے۔ دلی سے خط آیا تھا۔ ڈپٹی صاحب کی طبیعت ناساز تھی۔ چھوٹی دلہن تو جانے کے لائق نہیں تھیں' انہوں نے مُنوّر' مبشر اور شاہد کو ساتھ لیا اور دہلی چلے آئے۔

کوچہ نواب مرزا والے مردانہ مکان میں اسی طرح دھوپ اتری ہوئی تھی۔ پیش دالان میں دو منشی بیٹھے کتابت کر رہے تھے۔ پس دالان میں کتابیں کسی کا انتظار کر رہی تھیں۔ خدا بخش کے کبوتر غٹرغوں کا شور مچا رہے تھے۔ مولوی بشیر نے زینہ چڑھا اور کمرے میں جھانکا۔ بچے ان کے پیچھے دبکے کھڑے تھے۔ اندر ایک پلنگ بچھا ہوا تھا جس پر نذیر احمد آنکھیں بند کیے پڑے تھے۔ ان کا ملازم خدا بخش ان کے سرہانے بیٹھا تھا۔ یہاں کوئی کبوتر نہیں تھا جو وہ کہتے' "ہوا راستہ دو' چھوٹے ڈپٹی صاحب آئے ہیں۔" ڈپٹی نذیر احمد کو خود ہی اندازہ ہوا کہ کوئی آیا ہے۔ انہوں نے آنکھیں کھولیں۔

"بشیر آگئے۔" انہوں نے نحیف آواز میں کہا اور خدا بخش کے سہارے سے اٹھ کر بیٹھ گئے۔

دونوں باپ بیٹے بغل گیر ہوئے اور دونوں رونے لگے۔

"آپ کی طبیعت خراب ہے' آپ لیٹے رہیے۔" خدا بخش نے کہا اور ڈپٹی صاحب کو لٹا دیا۔

"دادا ابا کو سلام کرو۔" مولوی بشیر نے بچوں سے کہا۔

تینوں بچوں نے آگے بڑھ کر دادا ابا کو سلام کیا۔ دادا ابا نے باری باری سب کو پیار کیا۔

"ٹھہرو" انہوں نے کہا اور صندوقچی میں سے نکال کر ایک ایک اشرفی تینوں کو دی۔

"خدا بخش۔ بچوں کو لے جا کر اپنے کبوتر دکھاؤ۔ میں ابا میاں کے پاس ہوں۔"

"بہت بہتر۔"

بچے باہر نکل کر کبوتروں کے ساتھ کبوتر بن گئے۔

ڈپٹی صاحب کی طبیعت ایسی نہیں تھی کہ تشویش ہوتی۔
مولوی بشیر کو چھوٹی دلہن کی فکر بھی لگی ہوئی تھی۔ نوکری سے بھی زیادہ دن غیر حاضر نہیں رہ سکتے تھے لہٰذا دو چار دن دلی میں رہ کر پھر حیدر آباد چلے آئے۔

اس مرتبہ چھوٹی دلہن کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام صفیہ رکھا گیا۔ یہ ان کی ساتویں اولاد تھی۔

ابھی وہ جاپے میں تھیں کہ ڈپٹی نذیر احمد کے انتقال کی خبر آ گئی۔ بائیں طرف فالج گرا تھا اور وہ دو تین دن ہی میں چل بسے۔ چھوٹی دلہن پر تو جیسے بجلی گر گئی۔ انہوں نے کس محبت سے برسوں ان کی خدمت کی تھی لیکن اب ایسی بے بسی کہ ان کے جنازے میں بھی شرکت نہیں کر سکتی تھیں۔ تڑپ کر رہ گئیں۔ مولوی بشیر نے رختِ سفر باندھا اور دہلی روانہ ہو گئے۔

ابھی وہ ریل ہی میں ہوں گے کہ چھوٹی دلہن بچوں کو روتا بلکتا چھوڑ کر دنیا سے سدھار گئیں۔ اچھی خاصی تھیں لیکن جاپے میں ایسا بگاڑ ہوا کہ جان پر بن گئی۔ مولوی بشیر سیدھے پاؤں گئے تھے‘ الٹے پاؤں لوٹ آئے۔

یہ وقت ان کے لیے بہت بھاری تھا۔ نو مولود صفیہ صرف بارہ دن کی تھی‘ اور سب بچے بھی چھوٹے تھے۔ ان بچوں پر وہ مثل تو صادق آتی تھی کہ منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوئے تھے لیکن ماں کی کمی کو دولت سے پورا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ بچوں کو سمیٹے بیٹھے تھے اور آنکھیں اس سوال پر لگی ہوئی تھیں کہ اب کیا ہو گا۔

صفیہ صرف بارہ دن کی جان تھی۔ اسے ماں کی گرمی ہی کی نہیں‘ ماں کے دودھ کی ضرورت بھی تھی۔ اس کے لیے فوراً ایک انّا کی تلاش کی گئی۔ انّا کا دودھ اسے راس آ گیا۔ ایک پریشانی تو دور ہوئی۔ برتی اور مخدوم نے بچوں کی دیکھ بھال میں ایسی جان ماری کہ بچے‘ ماں کا غم بھول گئے۔

مولوی بشیر‘ بے فکر تو ہو گئے تھے لیکن بے غم نہ ہو سکے۔ چھوٹی دلہن کی ناوقت موت نے انہیں آدھا کر دیا تھا۔ ایک یاد تھی جو ہر وقت انہیں گھیرے رہتی۔ چھوٹی دلہن کی بڑی بڑی سنجیدہ آنکھیں ہر وقت ان کے سامنے رہتیں۔ چھوٹی دلہن کا خوش الحانی سے قرآن پڑھنا‘ سولہ کلیوں کے غرارے کے بڑے بڑے پائنچوں کو بائیں ہاتھ پر ڈال کر چلنے کا انداز۔ غرض سیکڑوں یادیں تھیں جو انہیں بے چین رکھتی تھیں۔ ان یادوں کے ہجوم میں وہ تنہا تھے۔ رفتہ رفتہ یہ حال ہوا کہ گھر کے در و دیوار انہیں کاٹنے کو دوڑتے تھے۔ اب یہی علاج تھا کہ ان یادوں کو یہیں چھوڑ کر کہیں اور چلا جائے۔ انہوں نے کوشش کر کے اپنا تبادلہ حیدر آباد سے ضلع رائچور میں کرا لیا۔

اب بچے بڑے ہو گئے تھے۔ اپنے غم میں ان کی تعلیم کی طرف سے غافل نہیں ہوا جا سکتا تھا۔ مولوی بشیر نے اپنے دوسرے بڑے بچوں کے ساتھ شاہد کو بھی کانونٹ اسکول میں داخل کرا دیا۔ یہ

تصانیف

۱۔ گنجینۂ گوہر.... (۱۷ شخصیتوں پر سوانحی خاکوں کا مجموعہ)

۲۔ دِلّی کی بپتا

۳۔ اُجڑا دیار

اور لاتعداد تراجم‘ مضامین اور خاکے

ایک اعلیٰ درجے کا انگریزی اسکول تھا۔ شاہد اور اس کے دو بھائیوں کے علاوہ یہاں جتنے بچے زیرِ تعلیم تھے سب یورپین تھے۔ اس وقت نہ تو ہندوستانی مسلمانوں میں انگریزی کا اتنا رواج تھا اور نہ ہی اتنی استطاعت تھی کہ ان اسکولوں کے اخراجات برداشت کر سکیں۔ مولوی بشیر کے خیالات ترقی پسندانہ تھے اور اتنے دولت مند بھی تھے کہ اخراجات برداشت کر سکتے۔

کانونٹ کے بچوں کے معیار پر پورا اترنے کے لیے ضروری تھا کہ گھر کے ماحول میں انگریزی زبان اور انگریزی طرزِ زندگی کا عمل دخل ہو۔ اس مقصد کے لیے نہایت بھاری تنخواہ پر ایک یورپین گورنس کا انتظام کر دیا گیا۔

اس عورت کے آتے ہی گھر کا تو نہیں لیکن بچوں کا ماحول یکسر تبدیل ہو گیا۔ اس نے آتے ہی بچوں سے انگریزی میں بات چیت شروع کر دی۔ شاہد کی طبیعت میں سنجیدگی تھی لیکن وہ بھی اس عورت کی انگریزی دانی پر شوخ سی ہنسی ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے اب تک اپنے گھر کی عورتوں کے سولہ سولہ کلیوں کے غرارے دیکھے تھے۔ اس انگریز گورنس کا مختصر لباس اس کے لیے بڑا اجنبی تھا لیکن طبیعت میں حسن پرستی تھی‘ اس لیے اس عورت کی سفید چمڑی اس کے لیے باعثِ دلچسپی بھی تھی۔ وہ اسے گونگوں کی طرح تک رہا تھا۔

"یہ تمہاری گورنس ہیں۔ تمہیں انگریزی سکھائیں گی‘ لباس پہننا سکھائیں گی۔ تمہارے ساتھ سیر کرنے جائیں گی۔ تم اپنی ہر مشکل کا اظہار ان سے کرو گے۔"

"جی" شاہد نے بہ مشکل کہا۔

"اور خبردار! جو تم نے انہیں ستایا‘ یا ان کی حکم عدولی کی۔"

مولوی بشیر غصیلے آدمی تھے۔ آواز ایسی گرج دار کہ کئی گھروں تک جاتی تھی۔ بچوں سے پیار کرتے تھے لیکن وہ کسی کے ساتھ بے جا شوخی کریں یہ انہیں برداشت نہ تھا۔ بچوں کا ان سے دم نکلتا تھا۔

مجال ہے جو ان کے حکم سے سرتابی کو جی بھی چاہے۔ شاہد نے تہیہ کرلیا کہ وہ اپنی گورنس کا ہر حکم مانے گا تاکہ ابا خفا نہ ہوں۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ وہ عورت اسے اچھی بھی لگی تھی۔ وہ خوبصورت بھی تھی اور بچوں کے لیے ایک اچھی تبدیلی بھی۔

اس کی ہم نشینی نے ایسا اثر کیا کہ شاہد روانی سے انگریزی بولنے لگا۔ اب گورنس اس سے باتیں کرتی تو وہ دیوانوں کی طرح اس کا منہ نہیں تکتا تھا۔ وہ کم گو تھا لیکن جس سے ملتا رہتا تھا' اس سے بے تکلف بھی ہو جاتا تھا۔ پھر وہ دوسرا ہی شاہد ہو جاتا تھا۔ شوخ اور شرارتی۔ گورنس کے ساتھ دن رات رہنے کی وجہ سے وہ اس سے بے تکلف ہو گیا تھا۔ اس کی بے تکلفی اکثر کسی نہ کسی شرارت کا پیش خیمہ ہوا کرتی تھی۔ ایک روز وہ کسی طرح گورنس کے کمرے میں پہنچ گیا۔ کوئی اور شرارت تو سوجھی نہیں' اس کے میک اپ کا سامان چھپا دیا اور صبح ہی سے ضد کرنے لگا کہ کہیں سیر کرنے چلو۔ مطلب یہی تھا کہ وہ باہر جانے کے لیے تیار ہو اور آرائش کا سامان نہ پا کر جل بھن جائے۔ بچوں کی ضد دیکھ کر مولوی بشیر نے بھی گورنس سے کہا کہ جب بچے ضد کر رہے ہیں تو ان کے ساتھ کہیں چلی جاؤ۔ شاہد اسی وقت کے انتظار میں تھا۔ گورنس نے تیار ہونا شروع کیا لیکن تمام سامان غائب تھا۔ وہ گھبرائی گھبرائی پھر رہی تھی اور شاہد لطف اندوز ہو رہا تھا۔ بڑی منت سماجت کے بعد اس نے یہ سامان لوٹایا۔

یہ شرارتیں کوئی ایک دن کی نہیں تھیں۔ آئے دن یہی کھیل تماشے ہوتے۔ شاہد کی شرارتیں اسکول میں بھی رنگ لاتیں۔ اکثر یورپین بچوں کی وہ خوب ٹھکائی کرتا لیکن کلکٹر کا بیٹا تھا اس لیے بات رفع دفع ہو جاتی۔

دہلی گئے ہوئے بہت دن ہو گئے تھے۔ مولوی بشیر احمد کو دہلی کی یاد ستانے لگی تھی۔ اسکول کی چھٹیاں ہو گئیں تو وہ منظور' مبشر اور شاہد کو لے کر چھٹیاں گزارنے دہلی آ گئے۔

جامع مسجد کے عقب میں چوڑی والان تھا جہاں شاہد کے ماموں اور ننھیال کے کئی دوسرے لوگ رہتے تھے۔ مولوی بشیر کو چھوٹی دلہن کی وجہ سے ان لوگوں سے بہت محبت تھی۔ وہ جب بھی دہلی آتے' کئی پھیرے چوڑی والان کے ضرور لگاتے۔ اس مرتبہ بھی وہ ایک دن بڑی مشکل سے گزار سکے اور دوسرے ہی دن بچوں کو لے کر چوڑی والان پہنچ گئے۔

قریب ہی مطبع مجتبائی تھا جس کے مالک مولوی عبدالاحد سے مولوی بشیر کو بڑی محبت تھی۔ انہوں نے کچھ وقت سسرال کی خوش گپیوں میں گزارا اور پھر عبدالاحد سے ملنے مطبع مجتبائی پہنچ گئے۔

ان دنوں ڈاکٹر ضیا الدین دہلی آئے ہوئے تھے اور وہاں مقیم تھے۔ مولوی بشیر ان سے واقف تو نہیں تھے لیکن علم کی جو روشنی ان کے چہرے پر بکھری ہوئی تھی' وہ اس سے متاثر ضرور ہوئے۔ اور جب عبدالاحد نے ان کا تعارف کرایا تو مولوی بشیر نے بڑی عقیدت سے ڈاکٹر ضیا الدین سے ہاتھ ملایا۔ اور جب ڈاکٹر صاحب کو معلوم ہوا کہ وہ جس سے ملاقات کر رہے ہیں۔ وہ ڈپٹی نذیر احمد کے بیٹے ہیں' انہوں نے اس سے بھی زیادہ عقیدت سے ہاتھ ملایا۔ بچوں کی طرف دیکھ کر ڈاکٹر ضیا الدین نے ان کی تعلیمی کیفیت کے بارے میں پوچھ لیا۔

"آپ کو معلوم ہے میں ان دنوں ضلع رائچور میں ملازم ہوں۔ ان بچوں کو ریلوے انگلش اسکول میں داخل کرا دیا ہے۔" مولوی بشیر نے کہا۔

"کیسا اسکول ہے۔" ڈاکٹر ضیا الدین نے پوچھا۔

"نہایت شاندار۔ یورپین اور اینگلو انڈین ریلوے حکام کے بچے پڑھتے ہیں۔ معلمات بھی سب کی سب یورپین ہیں۔ میں نے ایک گورنس بھی ان کی تعلیم و تربیت کے لیے رکھ چھوڑی ہے۔"

"ڈپٹی صاحب' آپ بھی کن بکھیڑوں میں پڑ گئے ہیں۔ ان انگریزی اسکولوں کی تعلیم کچھ یونہی واجبی سی ہے۔ آپ انہیں علی گڑھ میں کیوں داخل نہیں کرا دیتے۔ ہاسٹل میں رہیں گے۔ پڑھائی بھی بہت اچھی ہے۔ نگرانی کے لیے میں بھی موجود رہوں گا۔ اسکول کے اساتذہ سے بھی کہہ دوں گا۔ ڈپٹی صاحب! علی گڑھ تو آپ کے گھر کا ادارہ ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد اور سرسید علیہ الرحمتہ کے درمیان جو قلبی تعلق تھا' اس کا تو آپ کو علم ہو گا ہی۔"

"کمال ہے' مجھے اب تک وہاں کا خیال کیوں نہیں آیا تھا۔"

"چلیے اب بھی وقت ہے۔"

"تو پھر اب علی گڑھ میں ملاقات ہو گی۔"

"انشا اللہ۔"

اب کوچہ نواب مرزا کے زنانے مکان میں یہ تذکرے ہو رہے تھے کہ شاہد میاں اور ان کے دونوں بھائیوں کو علی گڑھ میں داخلہ دلایا جائے گا۔

مولوی بشیر پر ڈاکٹر ضیا الدین کی باتوں کا ایسا اثر ہوا تھا کہ وہ چاہتے تھے گھڑی کی چوتھائی میں بچوں کو لے کر علی گڑھ چلے جائیں۔

کچھ دن تک خط و کتابت ہوتی رہی۔ پھر ایک دن وہ تینوں بچوں کو لے کر علی گڑھ چلے گئے۔ ڈپٹی نذیر احمد کا نام ہی سفارش کے لیے کافی تھا۔ مولوی بشیر کی وہاں ایسی پذیرائی ہوئی جیسے وہ مہمان خصوصی ہوں۔ کالج کے سیکریٹری نواب اسحاق خان کے گھر قیام کیا۔ ڈاکٹر ضیا الدین احمد بھی نہایت تپاک سے ملے۔

دوسرے دن تینوں بچوں کو میر ولایت حسین سیکنڈ ہیڈ ماسٹر کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ ولایت حسین نے بچوں کی قابلیت پرکھنے کے لیے تینوں کا امتحان لیا۔ اس امتحان کے مطابق شاہد کو پانچویں جماعت میں داخلہ ملا۔ بڑے بھائی کو ساتویں کے لائق سمجھا گیا لیکن ہاسٹل میں وہ تینوں ایک ساتھ ہی تھے۔

اسکول کے ماسٹر مولوی سلیم انہیں لے کر ظہور وارڈ کے کمرہ نمبر ۵ میں آ گئے۔

"بچو! یہ ہے تمہارا کمرہ۔"

کمرہ تو اچھا تھا، گھر سے ایک ملازم بھی ساتھ آیا تھا لیکن کہاں کوچہ نواب مرزا کی حویلی اور رائچور کا آزادانہ ماحول کہاں یہ بند کمرہ اور اجنبی ماحول۔ شاہد تو کمرے میں قدم رکھتے ہی منہ بسورنے لگا۔ مولوی بشیر کے رخصت ہوجانے کے بعد تو باقاعدہ رونا پیٹنا مچ گیا۔ گھر سے باہر اکیلے رہنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ ملازم مخدوم جو ساتھ گیا تھا وہ بھی ہراساں تھا لیکن بڑے بھائی منظور میاں نے ہمت دکھائی۔

"اگر تم اسی طرح روتے رہے تو دوسرے لڑکے ہمیں بزدل سمجھیں گے اور پہلے دن ہی سے ہمیں دبانا شروع کردیں گے۔ اس لیے ہمت پکڑو اور حالات کا مقابلہ کرو۔"

"نکو رو سرکار۔ کب تک ایسے اِچ روتے رہیں گے۔ میں ساتھ ہوں نا۔" ملازم مخدوم نے بھی اپنے مخصوص حیدرآبادی لہجے میں انہیں سمجھایا۔

آوازیں سن کر مولوی سلیم بھی کمرے میں آگئے۔ وہ بھی بہت دیر تک سمجھاتے رہے۔ اب اس کے علاوہ چارہ نہیں تھا کہ حالات سے سمجھوتا کرلیا جائے۔ شاہد نے آنسو پونچھ لیے۔

دوسرے دن سے ان پابندیوں کا آغاز ہوگیا جن کا شاہد کو ڈر تھا۔ پانچوں وقت کی نماز باقاعدگی سے پڑھائی جاتی تھی۔ وقت پر سونا، وقت پر جاگنا۔ وقت پر کھانا، اسکول بھی روز جانا۔ نہ یہاں ابا کے دورے تھے جن کے بہانے اسکول سے چھٹی ہوجاتی تھی اور ابا کے ساتھ دوروں پر چلے جاتے، نہ وہ گورنس تھی جسے تنگ کرکے مزے آتے تھے۔ شاہد شروع ہی سے کاہل واقع ہوا تھا۔ وقت کی پابندی کرنے کا تو اس کے پاس وقت ہی نہیں تھا۔ اور یہاں اسی چیز پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ تھوڑے ہی دن میں یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ انگریزی کے علاوہ ہر مضمون میں پھسڈی ہیں۔ بات بات پر طعنے ملنے لگے۔ "دیکھو، تم کس دادا کے پوتے ہو۔ لوگ کیا کہیں گے، ایسے دادا کے پوتے اور پڑھائی میں یہ حال۔"

غالباً رپورٹ مولوی بشیر کو بھی پہنچی چنانچہ کالج کے ایک طالب علم کو ٹیوٹر مقرر کردیا گیا۔ کالج کے پروفیسر اسلم جیراج پوری فارسی پڑھانے پر مقرر ہوئے۔

ان احتیاطی تدابیر کے بعد جہاں یہ ہوا کہ وہ کلاس میں چلنے کے لائق ہوگئے وہاں یہ بھی ہوا کہ مصروفیت اتنی بڑھ گئی کہ آہستہ آہستہ گھر کا خیال ماند پڑنے لگا۔ لیکن دل ایسا اچاٹ تھا کہ کیلنڈر پر نشان لگائے جاتے تھے کہ کب چھٹیاں ہوں گی اور کب دہلی جائیں گے۔

خدا خدا کرکے چھٹیوں کے دن آئے۔ ہاسٹل کے دوسرے لڑکوں کی طرح انہوں نے بھی خوشی خوشی سامان باندھا۔

پھر وہی دلی کے چٹخارے اور چوک کی بہاریں تھیں اور لطف تھا کہ آؤ بھگت مہمانوں کی طرح ہو رہی تھی۔ عزیزوں کے بچوں پر

زندگی کے اہم واقعات

نام	شاہد احمد
پیدائش	دہلی۔ ۲ مئی ۱۹۰۶ء
پہلی شادی	۱۴ جنوری ۱۹۲۲ء
دوسری شادی	۱۹۳۸ء
پہلی بیوی	عالیہ بیگم
دوسری بیوی	عاصمہ بیگم
ساقی کا اجرا	جنوری ۱۹۳۰ء
ہجرت	۲۳ ستمبر ۱۹۴۷ء دہلی سے لاہور آئے۔
کراچی سے ساقی کا اجرا	ستمبر ۱۹۴۸ء
صدارتی انعام	۱۹۶۳ء
وفات	۲۷ مئی ۱۹۶۷ء
مدفن	سندھی قبرستان کنٹری کلب روڈ کراچی۔

رعب الگ پڑ رہا تھا کہ بھئی علی گڑھ سے آئے ہیں۔ کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ خوب جی بھر کے ہندو عورتوں سے مٹی کے کھلونے خریدیں، ماموں کے گھر جاکر نانی اماں سے کہانیاں سنیں، چھت پر کھڑے ہوکر گڈیاں اڑائیں۔ ان سب پابندیوں کو توڑا جو علی گڑھ میں عائد تھیں۔

خوشی کے دن کتنی جلد گزر جاتے ہیں۔ چھٹیاں ختم ہوگئیں اور شاہد کو پھر اپنے بھائیوں کے ساتھ علی گڑھ آنا پڑا۔

کچھ دن منہ بسورنے کے بعد، دلی کا نشہ اترا۔ پھر وہی کیلنڈر اور چھٹیوں کا انتظار۔

گھر سے خط آیا کہ ابا پنشن لے کر حیدرآباد سے دلی آگئے ہیں۔ اب تو شاہد کو اور بھی غصہ آنے لگا تھا، اتنی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ ان سے کہیں کہ ہمیں بھی دلی بلالیں۔ روز نئی نئی ترکیبیں یہاں سے نکلنے کی سوچتے تھے لیکن نہ کوئی ترکیب سمجھ میں آتی تھی نہ عمل کرنے کی ہمت ہوتی تھی۔

اسی طرح ایک سال اور گزر گیا۔ پھر چھٹیاں ہوگئیں اور تینوں بھائی پھر دلی آگئے۔

اس مرتبہ تو ایک اور ہی تفریح یہاں موجود تھی۔ مولوی بشیر احمد نے ایک شاندار لینڈو خریدی تھی۔ یہ لینڈو اور اس کے شاندار گھوڑوں کی جوڑی امیر کابل نے حکیم اجمل خان کو تحفے میں دی تھی اور حکیم صاحب سے مولوی بشیر نے خریدی تھی۔ یہ لینڈو مع اپنے شاندار گھوڑوں کے جدھر سے گزرتی گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز آنے جانے والوں کو اپنی طرف متوجہ کرلیتی۔ لوگ رک رک کر اسے دیکھتے اور پوچھنے پر مجبور ہوجاتے کہ یہ شاندار سواری کس کی

ہے۔

شاہد تو سنتے ہی مچل گیا مگر گھوڑے کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ پریشان ہو رہا تھا کہ اتنے بڑے بڑے گھوڑے چھپائے کہاں ہیں۔ اس نے تینوں مکان چھان مارے، گھوڑے کہیں بھی نہیں تھے۔

بات یہ تھی کہ گلی اتنی تنگ تھی کہ گھوڑے یہاں آ ہی نہیں سکتے تھے۔ طویلہ کہیں اور بنانا پڑا تھا۔ جب سیر کا وقت ہوتا، ملازم جاکر کہہ دیتا اور کوچوان، لینڈو کو گلی کے نکڑ تک لے آتا۔ شاہد سے یہ بات اس لیے چھپائی جارہی تھی کہ اس کا شوق بڑھتا رہے، شام کو اچانک اس پر یہ راز کھلے۔

خدا خدا کرکے سیر کا وقت ہوا۔ ملازم نے اطلاع دی کہ گاڑی گلی کے نکڑ پر آگئی ہے۔ شاہد کے دل کی دھڑکن رکنے کے قریب تھی۔ وہ ابا میاں کے ساتھ گھر سے نکلا۔ ان کے نکلتے ہی گلی کے چھوٹے چھوٹے بچوں نے انہیں گھیر لیا۔

"ماموں بشیر سلام۔"

"ماموں بشیر سلام۔"

مولوی بشیر نے ہر بچے کو انعام کے طور پر ایک ایک اکنی دی اور سلام کا جواب دیتے ہوئے گلی کے نکڑ تک آئے۔

کوچ بکس پر سنہرے کام کی ٹیڑھی پگڑی باندھے سرخ کمربند پر سنہری پیٹی کسے، داڑھی چڑھائے کوچوان بیٹھا تھا۔ ایسی شاہانہ سواری دیکھ کر شاہد کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ ان کے بیٹھتے ہی...دو سائیسوں نے دونوں گھوڑوں کی لگامیں تھام لیں۔ انہوں نے لگامیں پکڑے پکڑے گھوڑوں کے ساتھ ساتھ دوڑنا شروع کردیا۔ اس دوران، کوچوان پاؤں سے گھنٹی بجاتا رہا۔ مسجد فتح پوری کے قریب پہنچ کر جب گھوڑوں کے نتھنوں سے فرفر کی آوازیں نکلنے لگیں، اور وہ ہوا سے باتیں کرنے لگے تو دونوں سائیس اچک کر پچھلے پائیدان پر چڑھ گئے۔ اب گاڑی، چاندنی چوک کی کھلی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ شاہد کو وہ شہزادہ یاد آنے لگا جو نانی اماں کی کہانیوں میں گھوڑے پر بیٹھ کر نکلتا تھا۔ وہ جب سونے کو لیٹتا تو اس پری کو یاد کرنے لگا جو شہزادے کے پاس آتی تھی اور اسے اٹھا کر لے جاتی تھی۔ یہ پری آئی لیکن سونے کے بعد، ایک رنگین خواب میں۔

یہ خواب ٹوٹا تو وہ علی گڑھ میں تھا۔ اس نے اٹھتے ہی منہ بسور لیا وہی کمرہ، وہی گھر والوں سے دوری۔ نہ گھوڑے نہ لینڈو۔ کیسے مزے کی زندگی، کتنی جلد چھن گئی۔ اسے آج اپنی ماں یاد آنے لگیں۔ یہاں کسی نے بھی اس کے آنسو نہیں دیکھے۔ وہ فارسی کا سبق یاد نہ کرنے پر پٹتا، فرفر انگریزی بولنے پر شاباش پاتا رہا۔

ایک روز کسی شرارت پر اسکول کے ایک ماسٹر نے اسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ ان ماسٹر صاحب کی ایسی ہیبت طاری تھی کہ سب بچے انہیں "شیر" کہتے تھے۔ اس شیر نے ایسے پنجے مارے کہ اس کے احساس کا چہرہ لہولہان ہوگیا۔ وہ پہلے ہی یہاں رہنے سے گھبرا رہا تھا، اب اور گھبرانے لگا۔ یہ گھبراہٹ اتنی بڑھی کہ ابا میاں کا خوف بھی کافور ہوگیا۔

اسی رات وہ خاموشی سے اپنے بستر سے اٹھا اور ابا کو خط لکھنے بیٹھ گیا۔ اس خط میں اس نے ان ماسٹر صاحب کی شکایت کی تھی جنہوں نے اس کی پٹائی کی تھی۔ خط لکھتے ہوئے جب وہ اس فقرے پر پہنچا تو اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو رواں ہوگئے۔

"آپ نے ہماری والدہ کے انتقال کے بعد ہم سے وعدہ کیا تھا، ہمیں کبھی الگ نہیں کریں گے۔ آپ اپنا وعدہ بھول گئے۔ آپ نے کئی برس سے ہم کو یہاں چھوڑ رکھا ہے۔"

اسے یقین نہیں تھا لیکن اس فقرے میں ایسی دھمکی، ایسی تاثیر تھی کہ مولوی بشیر خط ملتے ہی علی گڑھ آگئے۔

شاہد کا رنگ پیلا پڑگیا۔ "ابا کا اس طرح بغیر اطلاع کے آنا خطرے سے خالی نہیں" اس نے اپنے بڑے بھائی سے کہا اور جو کچھ اب ظہور میں آنے والا تھا اس کا انتظار کرنے لگا۔

مولوی بشیر کے پہنچتے ہی ہاسٹل میں پُراسرار چہل پہل شروع ہوگئی۔ پہلے ماسٹر ناظر حسن انصاری کو بلایا گیا، پھر ماسٹر واجد علی شیدا طلب کیے گئے۔ کچھ دیر چپکے چپکے باتیں ہوتی رہیں۔ پھر یہ سب اٹھ کر مولوی سلیم کے کمرے میں چلے گئے جو اس ہاسٹل کے پراکٹر تھے۔

اندر کیا باتیں ہو رہی ہیں، انہیں کچھ معلوم نہیں تھا۔ بس وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ وقفے وقفے سے کوئی نہ کوئی ٹیچر کمرے میں آ رہا تھا۔ شاہد نے خط لکھا تھا اس لیے وہ تو کچھ کچھ سمجھ رہا تھا لیکن منذر بالکل بے خبر تھا۔

"بھائی، یہ ابا میاں کیوں آئے ہیں۔" شاہد نے بظاہر بے خبر بنتے ہوئے کہا۔

"میں خود حیران ہوں۔ اور پھر یہ استادوں سے کیا باتیں کررہے ہیں۔ تم ہی شرارتیں کرتے رہتے ہو۔ ہو نہ ہو تمہاری کوئی شکایت گھر تک پہنچی ہے۔"

تینوں بچے کمرے میں دبکے ہوئے ابا کے آنے کا انتظار کررہے تھے۔ شاہد کبھی کبھی باہر نکل کر جھانک لیتا تھا۔

مولوی سلیم کا کمرہ کھلا اور مولی بشیر باہر نکلے۔ بہت خاموش تھے۔ آتے ہی انہوں نے فیصلہ سنایا کہ تینوں بچوں کو علی گڑھ سے دہلی منتقل کردیا جائے گا۔ یہ پوچھنے کی ہمت کسی میں نہیں تھی کہ یہ فیصلہ کیوں کیا گیا البتہ شاہد دل ہی دل میں خوش تھا کہ اس کی ترکیب کارگر ہوئی۔ ابا پسیج گئے۔

اسی وقت سامان باندھا گیا اور شاہد اپنے بھائیوں سمیت علی گڑھ سے نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔

اب وہ ساتویں کلاس میں تھا۔ علی گڑھ سے نجات ملی تھی، اسکول سے نجات تھوڑی ملی تھی۔ دہلی آکر ابھی تھکن بھی نہیں اتری تھی کہ مولوی بشیر اسے لے کر عربک اسکول کے ہیڈ ماسٹر مولوی فضل الدین کے پاس چلے گئے جن کو سب طلبہ ان کی دراز

قد کی وجہ سے "قطب" یعنی قطب مینار کہتے تھے۔ دہلی میں ان کے باپ اور دادا کو کون نہیں جانتا تھا۔ جانے کی دیر تھی' عربک اسکول میں اس کا داخلہ ہوگیا۔

داخلہ تو کہیں نہ کہیں مل ہی جاتا اسے تو یہ خوشی تھی کہ اب وہ دلی میں رہے گا' اپنی حویلی میں رہے گا اور اس سے بھی زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ انصار ناصری بھی اسی اسکول میں پڑھتا تھا۔ انصار ناصری رشتے میں اس کا بھانجہ تھا' عمر میں کچھ چھوٹا بھی تھا لیکن دونوں میں بڑی ہم آہنگی تھی۔ انصار ناصری کے والد ملازمت کے سلسلے میں اکثر باہر رہتے تھے اس لیے وہ اپنی والدہ کے ساتھ زیادہ تر شاہد کے گھر ہی رہتے تھے۔

عربک اسکول میں داخلہ کیا ہوا' انصار ناصری کے ساتھ مل کر شرارتوں کا پٹارا کھل گیا۔

شاہد کے مزاج میں بڑوں کا احترام شامل تھا' پہلی نظر میں وہ خاموش طبع بھی نظر آتا تھا لیکن وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھا۔ محلے بھر میں اس کے کوڑیوں دوست تھے۔ سب کے سب اس کے خاندانی معیار پر پورے نہیں اترتے تھے لیکن شاہد سرمایہ دار گھرانے کا ہونے کے باوجود سرمایہ دارذہنیت سے دور تھا۔ اس کے دوست ہر طبقے سے تعلق رکھتے تھے لیکن وہ ان سب سے برابری سے ملتا تھا۔ پھر بھی چونکہ نچلے طبقے سے میل جول معیوب سمجھا جاتا تھا' اس لیے زیادہ وقت خاندان کے بچوں کے ساتھ گزارتا تھا۔ ان میں بھی خصوصاً انصار ناصری کے ساتھ۔ دونوں مل جاتے تو ایسی ایسی شرارتیں ظہور میں آتیں جو اس ثقہ خاندان کا کوئی دوسرا بچہ نہیں کرسکتا تھا۔

اور اس دن تو قیامت ہی آگئی۔ دلی کے رمضان اور وہ بھی گرمیوں کے۔ مئی جون کی گرمی۔ الاماں الحفیظ۔ ظہر کے بعد لو چلنی شروع ہوجاتی۔ ٹٹیاں اور پردے لگادیئے جاتے۔ بار بار دھوپ دیکھی جاتی کہ کتنی رہ گئی' کتنی ڈھل گئی۔

محلے میں وقت معلوم کرنے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ صرف دن کے بارہ بجے قلعے کی توپ کی آواز کبھی کبھی آجاتی تھی۔ لاؤڈ اسپیکر ایجاد نہیں ہوئے تھے۔ لہٰذا مغرب کی اذان بھی سنائی نہیں دیتی تھی۔ مولوی بشیر نے کمرے کی چھت پر تین لکڑیوں پر ایک گھنٹہ لٹکادیا تھا۔ اس گھنٹے کو بجانے کے لیے ایک ملازم وہاں بیٹھا رہتا تھا۔ اس ملازم کا نام ناگا تھا۔ ناگا کو ایک جیبی گھڑی دے دی گئی تھی۔ اس گھڑی کی مدد سے وہ ہر پورے گھنٹے اور آدھے گھنٹے پر اس گھنٹے کو زور سے بجادیا کرتا تھا اور روزہ کھلنے کے وقت وہ زور زور سے گجر بجاتا تھا۔

اس دن آٹھواں روزہ تھا۔ شاہد' انصار ناصری اور دو تین لڑکے شام ہی سے گھنٹے کی آواز سننے کے لیے گھنٹے کے سامنے دھرنا دے کر بیٹھے ہوئے تھے۔ ناگا نہ جانے کہاں غائب ہوگیا تھا۔ روزے کا وقت قریب آتا جارہا تھا۔ بچوں کی بے چینی بڑھتی جارہی تھی کہ کب ناگا آئے اور کب گھنٹے کی آواز سنائی جائے۔ سورج بالکل ڈوب چکا تھا۔ شفق کی سرخی بھی گم ہوگئی تھی۔ صبر کی بھی آخر کوئی حد ہوتی ہے۔ شاہد سے صبر نہیں ہوا' اس نے جھٹ موگری اٹھائی اور بڑی شان سے گجر بجادیا اور اس کے ساتھ ہی فاتحانہ نظروں سے دوستوں کی طرف دیکھا۔ ابھی فتح کا نشہ اترا بھی نہیں تھا کہ ایک دم سے شور بلند ہوا۔

"ارے یہ کون ہے۔ کس نے گجر بجادیا۔ ابھی تو روزہ کھلنے میں دس منٹ باقی ہیں۔"

چاروں طرف سے چیخ پکار کی آوازیں سنائی دیں۔ ایک کہرام سا برپا ہوگیا۔ یہ شور سنا تو شاہد کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اتنی دیر میں ناگا بھی کہیں سے ٹپک گیا۔ شاہد نے زقند بھری۔ مردانے کا زینہ اتر کر صحن میں آیا اور پھر گلی میں نکل یہ جا وہ جا۔ ناگا نے کچھ دور تک تعاقب کیا لیکن اتنی دیر میں واقعی روزے کا وقت ہوگیا اور ناگا کو بھاگ کر دوبارہ گجر بجانا پڑا۔ اس وقت تک بہت سے لوگ روزہ کھول بھی چکے تھے۔

ناگا کی کیا مجال جو شاہد میاں کا نام بھی لیتا۔ اس نے یہی کہا کہ پتا نہیں جن تھا یا بھوت' میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں اور گھنٹا آپی آپ بج گیا۔

"آپی آپ کبھی گجر بج سکتا ہے۔ معلوم نہیں کس پنک میں تھے کہ وقت سے پہلے ہی گجر بجادیا۔ آئندہ یہ حرکت نہ ہو" مولوی بشیر نے اسے ڈانٹا اور وہ سر جھکائے سنتا رہا۔

ناگا بیڑیاں پیا کرتا تھا۔ بیڑی پینا کوئی عجیب بات نہیں لیکن شاہد نے تو یہی دیکھا تھا کہ سب لوگ حقہ پیتے ہیں۔ ابا میاں بھی اور دوسرے لوگ بھی۔

"ناگا' تمہیں بیڑی پینے میں کیا مزہ ملتا ہے۔" ایک دن شاہد نے اس سے پوچھا۔

"مزہ ہی مزہ ہے۔ ساتوں آسمانوں کی سیر کرتا ہوں' ایک بیڑی میں۔" ناگا نے جواب دیا۔

"تم حقہ کیوں نہیں پیتے' جیسے ابا میاں پیتے ہیں۔"

"جو بات بیڑی میں ہے' وہ حقے میں کہاں۔"

"کیا بہت مزہ آتا ہے۔"

"تم خود پی کر دیکھ لو۔"

"میں؟"

"ہاں' ہاں۔ کوئی دیکھ تو رہا نہیں ہے" ناگا نے خوشامد سے کہا۔

شاہد تو خود کئی دن سے یہی چاہ رہا تھا۔ اس نے جھجکتے ہوئے ناگا کے ہاتھ سے بیڑی لے لی۔ ہلکے ہلکے کش لگائے۔

"دھواں حلق سے نیچے اتارو۔ نہیں تو آسمان کی سیر کیسے ہوگی۔" ناگا نے مشورہ کیا۔

شاہد نے زوردار کش لگایا اور سارے کا سارا دھواں حلق میں

اتار لیا۔ گلے میں کسی نے چھری سی چلادی۔ چکر سا آیا اور شاہد کھڑے ہو کر گول گول گھومنے لگا۔ اتفاق سے اسی وقت گلی میں ملائی کی برف بیچنے والے کی آواز سنائی دی۔

"کم بخت کیا پلا دیا مجھے۔ یہ لے پیسے۔ جلدی سے دو قُلفیاں کھلوا کے لا۔ ایک اپنے لیے ایک میرے لیے۔" شاہد نے ناگا کو پیسے دیتے ہوئے کہا۔

ناگا بھاگا ہوا گیا اور دو قُلفیاں لے کر آگیا۔ آج یہ ملائی کی برف شاہد کو جنت کا میوہ معلوم ہو رہی تھی۔ جان میں جان آگئی' سینے میں ٹھنڈ پڑ گئی۔

"دیکھا' بیڑی پینے کے بعد قُلفی کھانے میں کتنا مزہ آتا ہے۔"

"ہاں آتا تو ہے۔"

شاہد کو یقین آگیا کہ قُلفی اس وقت اس لیے مزہ دے گئی کہ اس سے پہلے بیڑی پی لی گئی تھی۔

اب یہ معمول ہو گیا کہ گلی میں جب بھی ملائی کے برف والے کی آواز گونجی' ناگا شاہد سے کہتا' قلفی کھانا ہے۔ اور اس کا مطلب یہ تھا کہ پہلے بیڑی پی لیں پھر قلفی کھانے کا مزہ آئے گا۔

شاہد ابھی اسکول ہی میں تھا کہ ناگا نے اسے بیڑیاں پلا پلا کر بیڑی پینے کی لت ڈال دی۔ یہ لت ایسی پڑی کہ شاہد نے اس کے بعد پوری عمر بیڑی کے علاوہ کچھ اور نہیں پیا۔ بڑی سے بڑی محفل میں وہ جیب سے بیڑی کا بنڈل نکالتے اور ناگا کی یاد تازہ کر لیتے۔

شاہد نے کہیں سے سن لیا تھا کہ بیڑی پینے سے صحت خراب ہو جاتی ہے۔ اس سنی سنائی پر اسے رفیع الدین عرف رفو یاد آگیا۔ رفو کی والدہ اسی گلی میں رہتی تھیں۔ بیوہ تھیں اور شاہد کے گھر سلائی کا کام کرتی تھیں۔ کُرتے غضب کے سیتی تھیں۔ شاہد انہی کے ہاتھ کے سلے ہوئے کُرتے پہنتا تھا۔

رفو کو کسرت کے علاوہ کچھ نہیں آتا تھا۔ اپنا گھر چھوڑ کر شاہد کے مردانہ مکان میں پڑا رہتا تھا۔ اس گھر سے اس کی کچھ مدد بھی ہو جایا کرتی تھی۔ ادھر شام ہوئی اور ادھر اس نے لنگوٹ کسا۔ ڈنٹر' بیٹھکیں لگنی شروع ہو گئیں۔ شاہد بھی اس کی ٹکڑی میں شامل ہو گیا۔ اس دور میں شرفا میں ان ورزشوں کا دستور بھی بہت تھا لہٰذا شاہد کی خوب حوصلہ افزائی ہوئی۔ لیکن یہ شوق اس کے بس کا نہیں تھا۔ کچھ دن بعد ہی یہ شوق دم توڑ گیا۔

شاہد کی ان شرارتوں اور دلچسپیوں کا سلسلہ گھر سے اسکول تک پھیلا ہوا تھا۔ گھر میں تو وہ پھر بھی دبا دبا رہتا کہ ابا میاں سے جان نکلتی تھی لیکن اسکول میں کوئی دیکھنے والا نہیں تھا۔ اکثر اساتذہ اس کے خاندان کا لحاظ کر کے اس کی شرارتوں کو نظر انداز کر دیتے تھے لیکن بہت سے ایسے بھی تھے جو مروت ایک طرف رکھ کر ہاتھ میں چھڑی اٹھا لیتے تھے اور ایسے مواقع روز ہی آتے تھے۔

○☆○

مولوی بشیر نے جب سے پنشن لی تھی' تصنیف و تالیف ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا۔ وہ صحیح معنوں میں ڈپٹی نذیر احمد کے وارث تھے۔ ڈپٹی نذیر احمد کی طرح وہ بھی ناول نگار تھے۔ بچوں کے لیے نصیحت آموز کتابیں بھی لکھی تھیں۔ حیدر آباد دکن کی ملازمت کے دوران تاریخ بیجا نگر لکھ چکے تھے۔ شاعر بھی تھے اور دلی آنے کے بعد دیوانِ بشیر کو ترتیب دے رہے تھے۔ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ ڈپٹی نذیر احمد اس گھر سے رخصت ہو چکے ہیں۔ مردانے میں اسی طرح منشی اور کاتب بیٹھے رہتے جس طرح ڈپٹی نذیر احمد کے زمانے میں۔ یہ کاتب بشیر احمد اور ڈپٹی نذیر احمد کی کتابیں تصحیح و مُرتّب کرنے میں مصروف رہتے۔

گرمیوں میں صبح چھ بجے ناشتہ کر کے لکھنے پڑھنے کے کام پر جم جاتے۔ صدر دالان میں چاندنی کا فرش' پیچھے گاؤ تکیہ۔ آگے لمبی سی

مولانا کی دیوانگی عجب طرح کی تھی۔ کہتے تھے کہ میں روحوں کو بُلاتا ہوں اور ان سے باتیں کرتا ہوں۔ پھر ان کے دل میں یہ سماگئی کہ میں راجا اِندر ہوں۔ لال پری اور سبز پری کی باتیں سناتے۔ لال دیو اور کالے دیو کا تذکرہ ہوتا۔ منشی ذکاء اللہ کے بچوں کے ہاتھ ایک کھلونا آگیا۔ فرحت کہتے "چچا جان' طوطا لاؤں؟" مولانا فرماتے "ہاں لاؤ" فرحت دوڑ کر زنانے میں سے طوطے کا پنجرہ اٹھا لاتے۔ مولانا گھنٹوں اس ہیرا من طوطے سے جان عالم کا حال پوچھتے رہتے مگر لکھنے لکھانے کا مشغلہ اس حالت میں بھی جاری رہا۔ جو کچھ لکھتے اسے دری کے نیچے چھپا دیتے۔

ایک دن دیوانگی نے زور مارا تو مولانا نے دربارِ اکبری کا صاف کیا ہوا مسوّدہ بغل میں دبایا اور جا کر راوی میں ڈال آئے۔

(مولانا محمد حسین آزاد از شاہد احمد دہلوی)

رونق یہ اس کا مصرعہ تاریخ مرگ ہے
خلد بریں میں شاہد شیریں زباں گیا

۱۹۶۷

نیچی میز۔ دونوں پہلوؤں میں کتابوں کے ڈھیر۔ بائیں طرف بڑے سے تھال میں اونچا سا حقہ۔ ایک لڑکا صرف حقے پر نوکر تھا۔ صبح سے شام تک حقہ تازہ کرتا رہتا اور چلمیں بھرتا رہتا۔ خمیرہ تمباکو لکھنؤ سے آتا۔ اس کی خوشبو سے سارا گھر مہک جاتا۔ لکھنے پڑھنے کے کام میں انہیں اس قدر انہماک ہوتا کہ دین و دنیا کی خبر نہ رہتی۔ دوپہر ہوتی تو بی مغلانی ہلکے سے کھنکار کر دالان میں داخل ہوتیں اور کہتیں۔

"سرکار' کھانا تیار ہے۔"

مولوی بشیر چونک کر قلم ہاتھ سے رکھ دیتے۔ اگلے دالان میں فرشی دسترخوان بچھ جاتا۔ کھانا چُن جاتا۔ ملازم آفتابہ سلفچی لے کر پہنچ جاتا۔

روز کا یہی معمول تھا۔

شاہد کا ایک شوق یہ بھی تھا کہ وہ اپنی شرارتوں سے وقت نکال کر' گھنٹوں' انہیں لکھتے پڑھتے ہوئے دیکھا کرتا تھا۔ اتنی قابلیت تو نہیں تھی کہ ہاتھ بٹاتا لیکن اسے یہ سب اچھا بہت لگتا اور دل میں سوچا کرتا' کاش! اس کے آس پاس بھی کتابوں کا ڈھیر ہو اور وہ بھی کوئی کتاب لکھے۔ لیکن ابا میاں کو تو بہت محنت کرنا پڑتی ہے۔ اس خیال کے آتے ہی اسے کوئی نہ کوئی کھیل یاد آجاتا اور وہ بھاگ کھڑا ہوتا۔

مولوی بشیر ان دنوں بہت مصروف تھے۔ دلی کے چیف کمشنر ہیلی صاحب نے ان سے دلی کی تاریخ لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ مولوی بشیر دن بھر کھنڈرات کی خاک چھانتے' پرانی کتابوں کی گرد جھاڑتے اور رات دیر گئے تک' ان تحقیقات کو تحریر کرتے۔ اب تک وہ اس تاریخ کی دو جلدیں لکھ چکے تھے۔ پھر ایک دن انہوں نے یہ خوش خبری سنائی کہ تیسری جلد بھی مکمل ہو چکی ہے۔

○☆○

شاہد کو عربک اسکول میں پڑھتے ہوئے چار سال ہو گئے تھے۔ اب وہ میٹرک میں تھے۔

مولوی بشیر دلی کی تاریخ کا کام مکمل کر چکے تھے۔ ان دنوں ذہن کو آرام دینے کے لیے اپنا وقت تفریح اور آرام میں گزار رہے تھے۔ ایک روز وہ شاہد کو لے کر اعظم خان کی حویلی گئے۔ شاہد ایک آدھ مرتبہ یہاں پہلے بھی آچکا تھا۔ یہاں دلی کے نامور عالم اور مفسر مولوی احمد حسین صاحب احسن التفاسیر رہتے تھے۔ یہ مولوی صاحب' مولوی بشیر کے برادرِ نسبتی تھے۔

شاہد کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ یہاں کیوں لایا گیا ہے اور اس کے بزرگ اس کے خلاف کیا سازشیں کر رہے ہیں۔ وہ تو اسی طرح اس گھر میں آیا تھا جس طرح دوسرے رشتے داروں کے گھر چلا جاتا تھا۔ لینڈو کی سیر کے لالچ میں بھی اور اس لیے بھی کہ رشتے داروں سے ملنا جلنا اسے اچھا لگتا تھا۔

اعظم خان کی حویلی سے کوچہ نواب مرزا تک آنے کی دیر تھی کہ اسے یہ معلوم ہو گیا کہ وہ کیوں وہاں لے جایا گیا تھا۔ مولوی احمد حسین کی صاحب زادی عالیہ سے شاہد کی شادی طے ہو گئی تھی۔ تھی تو عجیب سی بات لیکن تھی۔ ابھی تو اس نے دسویں بھی پاس نہیں کی تھی۔ عمر بھی ایسی تھی کہ شادی کے مفہوم سے بھی واقف نہیں تھا۔ لیکن اس خاندان میں کم سنی کی شادیوں کا رواج تھا' اس لیے کسی کو بھی شاہد کی شادی کا ذکر سن کر تعجب نہیں ہوا۔ کسی کو بہت تعجب ہوا تو یہ کہہ کر رہ گیا "ہاں بھئی' بڑے لوگوں کے چونچلے ہیں۔"

جاڑوں کے دن تھے۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ شاہد نے کسی اچھے کپڑے کا چسٹر پہنا ہوا تھا' گلے میں مفلر تھا۔ وہ اسکول کے بڑے دروازے سے باہر نکلا۔ غالباً آج چھٹی سے پہلے ہی گھر جانے کا ارادہ تھا۔ اسے انصار ناصری آتا ہوا دکھائی دیا۔ چھٹی کے بعد وہ دونوں اکثر ساتھ آیا کرتے تھے۔ شاہد کے پریکٹیکل دیر تک چلتے تھے جب کہ انصار ناصری کی چھٹی جلدی ہو جاتی تھی۔ اس کے باوجود وہ شاہد کا انتظار کیا کرتا تھا۔ انصار کا گھر فراش خانے میں تھا۔ فراش خانہ اور بتاشوں والی گلی' کوچہ نواب مرزا قریب قریب تھے۔ انصار اپنے گھر چلا جاتا' شاہد اپنے گھر۔

"چلو گے نہیں؟" شاہد نے انصار ناصری کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ابھی سے" انصار نے پوچھا۔

"ہاں' آج ذرا جلدی ہے۔"

"مگر میرا تو ایک پیریڈ ابھی باقی ہے۔"

"روز تم میرا انتظار کرتے ہو' آج میں تمہارا انتظار کر لوں گا۔ تم پیریڈ لے کر آؤ۔"

انصار ناصری چلا گیا اور شاہد' اسکول کے قریب املی کے درخت کے نیچے ٹہلنے لگا۔

انصار ناصری بستہ لے کر واپس آیا تو شاہد اس کا منتظر تھا۔

"بڑی دیر لگائی یار۔ چلو کوئی بات نہیں۔ آج خوشی کی بات ہے اس لیے تمہیں حوض قاضی سے ٹرام میں لے کر چلیں گے۔ تم بھی کیا یاد کرو گے۔"

"ایسی کیا خوشی کی بات ہو گئی۔"

"تمہیں نہیں معلوم؟ تمہیں معلوم بھی کیسے ہوتی۔ تم گھر نہیں آئے اور میں دو دن سے اسکول نہیں۔ آج بھی میں چھٹی کی درخواست ہیڈ ماسٹر صاحب کو دینے آیا تھا۔"

"تم نے چھٹی لی ہے' مگر کیوں؟"

"یار یہاں سے تو چلو۔ راستے میں بتاؤں گا۔"

ان دونوں نے حوض قاضی کی طرف چلنا شروع کر دیا۔

"یار اب تو بتا دو۔"

"ہماری شادی جو ہو رہی ہے۔" شاہد نے بوکھلاہٹ میں آنکھوں پر لگی عینک کو اتارا اور پھر آنکھوں پہ رکھتے ہوئے کہا۔

"ارے کب؟"

"بس پرسوں نکاح ہے' چوتھے روز ولیمہ' پھر چالے ہیں۔"

"چالے کیا ہوتے ہیں۔"

"دلہا' دلہن کی دعوتیں ہوتی ہیں اور کیا ہوتا ہے۔"

"پھر تو یار بڑے مزے آئیں گے۔"

"تم بھی چھٹی لے لو۔"

"کیسے لے لوں' تم نے ہمیں تو شادی میں بلایا نہیں ہے۔"

"کیوں نہیں بلایا ہے۔ آج سب جگہ نیوتے جائیں گے۔ تمہارے گھر بھی جائے گا۔"

"پھر تو میں چھٹی کرلوں گا۔" انصار ناصری نے کہا اور دونوں دوست تیز تیز چلنے لگے۔

حوض قاضی پہنچ کر شاہد نے دو' دو پیسے کے دو ٹکٹ لیے اور وہ دونوں گھر جانے کے لیے ٹرام میں سوار ہو گئے۔

شادی کی تیاریوں سے گزر کر شادی کا دن آگیا۔ زنانے میں شاہد کو دلہا بنایا جارہا تھا۔ عنابی رنگ کی بڑے بڑے پھولوں والی ریشمی شیروانی' سلک کا پاجامہ اور سنہری کام کی مخملی جوتی پہنے' بڑا سا پگڑ باندھے' اس پر سہرا لگائے' دلہا میاں زنانے سے نکل کر مردانے میں آئے۔ دونوں بڑے بھائیوں نے اسے سہارا دیا ہوا تھا۔ شاہد نے مردانے میں آکر مہمانوں کو سلام کیا۔ گھوڑا تیار کھڑا تھا۔ گھوڑا کیا تھا' سجا سجایا دلہا تھا۔ چاندی کا جھلمل کرتا زیور' ہیکل' دمچی' مخمل کا زین پوش' لگاموں اور تسموں پر گوٹا چڑھا ہوا۔ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا گھوڑا کہاں ہے۔

مولوی بشیر نے سہارا دے کر اسے گھوڑے پر چڑھایا اور مٹھیاں بھر بھر کے سکے نچھاور کیے۔

مستورات کے لیے ڈولیاں اور تانگے تیار تھے جب کہ اکثر باراتی پیدل ہی گھوڑے کے پیچھے پیچھے اعظم خان کی حویلی کی طرف چل دیے' جہاں دلہن کا گھر تھا۔

مولوی احمد حسین نے حسب استطاعت بارات کا استقبال کیا لیکن یہاں دھوم دھڑکے کی بجائے سادگی تھی۔

نکاح کے بعد قاضی نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور تڑا تڑ چھوارے کٹائے جانے لگے۔ شہدوں نے آوازیں لگائیں۔

"الٰہی دولہا سات پوتا۔ الٰہی آمین۔"

مولوی بشیر جس شان سے بارات لے کر آئے تھے' اسی شان سے بہو کو لے کر واپس ہوئے۔

کوچہ نواب مرزا میں ایک خلقت جمع تھی۔ شہدے' ڈومنیاں' بہشتی' مالن' چوڑی والی' مہندی والی' نوکر چاکر' مغلانی' مہترانی' سب نے بڑھ چڑھ کر مانگا' مولوی بشیر احمد نے دل کھول کر ان کو ان کا حق دیا۔ سب نے ہاتھ پھیلا کر دعائیں دیں۔

یہاں تک تو دوسروں کی خوشیاں تھیں۔ شاہد کو تو ولیمے کے دن کا انتظار تھا کہ اس دن دہلی کی مشہور طوائف کا مجرا ہونا تھا۔

میر باقر علی داستان گو

املی کی پہاڑی پر ایک بڑے میاں رہتے تھے۔ دُبلا ڈیل' اکہرا بدن' میانہ قد' چھوٹی سفید داڑھی' کبھی خاصے آسودہ حال تھے مگر اب اُجلے پوشی سے گزارا کرتے تھے۔ بڑے چرب زبان اور لسان آدمی تھے۔ نام تھا میر باقر علی' یہ دِلّی کے آخری داستان گو تھے۔ جب یہ فن زندہ تھا اور اس کے قدر دان بھی زندہ تھے تو میر صاحب دور دور سے بلائے جاتے تھے اور جھولیاں بھر بھر کے لاتے تھے۔ جب زمانے کے مشاغل بدل گئے اور میر صاحب کا فن کسمپرسی میں پڑ گیا تو میر صاحب چھالیا بیچنے لگے تھے۔

(شاہد احمد)

اس سے پہلے کبھی مجرا دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اپنی دلہن سے زیادہ مجرا دیکھنے کا ارمان دل میں کروٹیں لے رہا تھا۔

مولویوں کا خاندان اور رنڈی کا ناچ! تھی عجیب سی بات لیکن مولوی بشیر کی روشن خیالی نے اسے گوارا کرلیا تھا۔ اگر مہمانوں کی تواضع کے لیے مجرا بھی ہوجائے تو مضائقہ نہیں۔ بس انہوں نے اتنی احتیاط کرلی تھی کہ مجرے کا انتظام اپنے گھر میں نہیں' اپنے محلے دار شام لال کے گھر کیا تھا اور مشہور بھی یہ کیا کہ مجرا شام لال کی طرف سے ہے۔

گلی میں شادی کے دن ہی سے شامیانے لگ گئے تھے۔ زنانے میں ڈومنیاں گا بجا رہی تھیں' گلی میں نوبت بج رہی تھی۔ شور شرابا' قہقہے' چہچہے' گہما گہمی' چہل پہل' ناز' انداز چونچلے' چار دن اس کے علاوہ گلی میں کوئی موسم نہیں تھا۔

ولیمے کی رات' شام لال کا گھر دلہن کی طرح سجا دیا گیا۔ یہ معلوم ہوتا تھا یہ گھر بنا ہی مجرے کے لیے ہے۔ صحن چبوترے پر صدر نشست' دری' چاندنی' قالین' گاؤ تکیے۔ دالان در دالان میں بھی چاندنی' قالین' صحنچیوں میں خالی دری۔ یہ گویا لڑکے بالوں کے لیے تھی۔ اوپر کٹہرے پر چلمنیں لگا کر عورتوں کے لیے الگ دری چاندنی بچھادی گئی تھی۔

کھانے سے فراغت کے بعد مہمانوں کی آمد شروع ہو گئی۔ گھر

کے کچھ لوگ اس کام پر مقرر کیے گئے تھے کہ ہر ایک کو اس کے مرتبے کے اعتبار سے نشستوں پر بٹھائیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے شام لال کا وسیع مکان مہمانوں سے بھر گیا۔ نوشابہ بھی آگئی' اس کے سازندے بھی اپنے مقام پر جا کر بیٹھ گئے۔

شاہد کی نگاہیں نوشابہ پر تھیں۔ اس کی جھل جھل کرتی فیروزی رنگ کی پشواز پر تھیں۔ اس کے سولہ سنگھار پر تھیں۔ جھومر' گلوبند' چمپا کلی نتھ' ہاتھوں میں کڑے' انگلیوں میں انگوٹھیاں' انگوٹھے میں آرسی' بڑی سی چوٹی میں گوٹے کا مُوباف' پاؤں میں گھنگرو اور وہ بھی آدھی پنڈلیوں تک۔

"بھائی شاہد' یہ تو بڑی رئیس ہے۔" انصار ناصری نے شاہد سے سرگوشی کی۔

"ہوگی نہیں' ابا میاں کہہ رہے تھے' ایک مجرے کے ایک ہزار لیتی ہے۔"

"جبھی تو۔"

شاہد پھر اسے دیکھنے میں مصروف ہوگیا۔ نوشابہ نے پان کی گلوری منہ میں رکھی اور سفید رومال سے لبوں کے گوشے صاف کیے۔

"مجرا شروع کیوں نہیں ہوتا" شاہد نے بے چینی سے کہا۔

"کیا خبر" انصار ناصری نے اداس لہجے میں کہا۔

"شاید ابا میاں کا انتظار ہوگا" شاہد نے خود ہی اپنے سوال کا جواب دیا۔

"ارے ہاں وہی نہیں آئے ہیں ابھی تک۔"

ایک دم سے شور ہوا' ڈپٹی صاحب آگئے۔ پوری محفل سروقد کھڑی ہوگئی۔

"ابا میاں آگئے" شاہد نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

مولوی بشیر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے صحن چبوترے پر آئے سب مہمانوں کو سلام کیا اور اپنی مسند پر بیٹھ گئے۔ اس کے ساتھ ہی جو جہاں کھڑا تھا' وہیں بیٹھ گیا۔

چھم۔ چھم۔ چھم نوشابہ اپنی جگہ سے اٹھی اور بیچ صحن میں آکر کھڑی ہوگئی۔ کچھ دیر کو گھنگرو بجے پھر سانسوں کی طرح رک گئے۔ وہ مورتی بنی خاموش کھڑی تھی۔ کسی اجازت کی متمنی' کسی اشارے کی منتظر۔

مولوی بشیر نے گردن کے خفیف سے اشارے سے اجازت بخشی۔ اک دم بجلی سی دوڑ گئی۔ طبلے پر تھاپ پڑی۔ سارنگی پر درمیانی چال کی گت شروع ہوگئی۔ نوشابہ نے بھی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر گت بھرنی شروع کی۔ گردن کے ڈورے بھی پڑنے لگے۔ اک مورنی تھی جو کبھی ایک طرف گردن گھماتی تھی کبھی دوسری طرف۔ جنگل میں مکمل سکوت تھا۔ ہر آنکھ اسی مورنی کو دیکھ رہی تھی۔ دیکھ کیا رہی تھی' تک رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے نوشابہ کے قدم تیز ہوئے۔ اس کی بوٹی بوٹی تھرکنے لگی۔ بازوؤں کو قوس بنایا اور خود دائرہ بن گئی۔ یہ دائرہ بڑھتا گیا۔ پشواز میں ہوا بھری' پشواز کا دامن کمر تک اٹھ گیا لیکن وہ اس تیزی سے گھوم رہی تھی کہ پشواز کے دامن کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ لڑکے بالوں نے آنکھیں مل مل کر دیکھا' فضا میں ہر طرف گھنگرو بکھرے ہوئے تھے۔ جیسے چنگاریاں اُڑتی ہیں۔ کبھی کبھی' چنگاریوں میں اس کے بازو اس طرح چلتے تھے جیسے تلوار چلتی ہے۔

طبلے کی لے تیز ہوئی۔ گت اور سم کا ملاپ ہوا۔ سم کے ساتھ نوشابہ مولوی بشیر کے روبرو گئی۔ ایک ہچکولا سا لیا۔ سلام کیا اور گت بھرتی ہوئی لوٹ آئی۔ اسی طرح تین سلام ادا کیے۔ پھر ذرا ترچھی ہوئی اور مہمانوں کی طرف گئی۔ وہاں جو سلام کیے تو ہر طرف سے واہ' واہ کی صدائیں گونجنے لگیں۔

یہ گویا سلامی کی رسم تھی۔ بادلوں نے چھاؤنی ڈال دی تھی' اب بارش ہونا باقی تھی۔ ساز و آواز کی سنگت ہوئی۔ نوشابہ نے سہرا گایا۔ مقطع میں شاہد کا نام اس خوبصورتی سے باندھا تھا اور اس دل آویزی سے ادا کیا کہ محفل سراپا داد بن گئی۔

مولوی بشیر نے سہرے کے اختتام پر شیروانی کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور سو روپے کا نوٹ اس کی ہتھیلی پہ رکھ دیا۔ یہ گویا اس بات کا اعلان تھا کہ صدرِ محفل نے آغاز کردیا۔ اب اہلِ محفل بھی نوٹ برسا سکتے ہیں۔

مولوی بشیر تھوڑی دیر بیٹھ کر اٹھ گئے۔ ان کا اٹھ جانا اس بات کا اشارہ تھا کہ اب مجرا ذرا کھل کر ہوگا۔ اب نوشابہ کی ادائیں عروج پر تھیں۔ شاہد کی سمجھ میں آگیا تھا کہ مجرا کیا ہوتا ہے۔

مجرا صبح کی اذان تک جاری رہا۔ جو جاگا تھا' دوسرے دن خوب خوب سویا۔

ولیمہ ختم ہوا تو چوتھی' چالے شروع ہوگئے' ایسی دلچسپیاں شروع ہوئیں کہ شاہد دن رات ساتھ رہنے والے دوستوں کو بھول گیا۔

یہ ہنگامے جاری تھے کہ امتحان سر پر آگیا۔ اسے چاندی کے پایوں والے چھپر کھٹ سے اترنے کی فرصت نہیں تھی' کتابوں میں کیا مغز کھپاتا۔ نتیجہ وہی ہوا جو نظر آرہا تھا۔ امتحان دیا ضرور لیکن فیل ہونے کے لیے۔ قصور اس کا تھا لیکن عربک اسکول کا سمجھا گیا۔

اب اسے مشن اسکول میں داخل کرادیا گیا۔ بالآخر ایک سال بعد اس نے میٹرک پاس کرلیا۔

کچھ دنوں بعد اس کا پہلا بیٹا پیدا ہوا۔ اس کا نام اس نے شاہد احمد کی رعایت سے مشہود احمد رکھا۔

"اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے"

مشہود احمد کی پیدائش پر جو خوشیاں منائی گئیں انہوں نے شاہد احمد کی شادی کی یاد تازہ کردی۔ شام لال کے مکان میں مجرا ہوا اور وہی نوشابہ بلائی گئی جو شاہد کے ولیمے میں آئی تھی۔

مولوی بشیر چاہتے تھے کہ شاہد احمد ڈاکٹر بنیں۔ اسی لیے انہوں نے شاہد کو میٹرک میں سائنس کی تعلیم دلائی تھی۔ اب یہ فکر ہوئی کہ میٹرک کے بعد انہیں کہاں داخل کرایا جائے۔ شاہد کے بہنوئی ڈاکٹر اجمل حسین لاہور کے میڈیکل کالج میں پڑھاتے تھے۔ ان کے مشورے سے شاہد احمد کو لاہور کے ایف سی کالج میں داخلہ دلا دیا گیا۔

شاہد احمد، دلی کے عاشق ایک مرتبہ پھر دلی سے نکلے اور لاہور پہنچ گئے۔ ان کی بہن بشریٰ ریلوے روڈ پر ایک بلڈنگ کی بالائی منزل پر رہتی تھیں۔ شاہد نے بھی انہی کے ساتھ قیام کیا۔

لاہور ایک بڑا ادبی مرکز تھا۔ شاہد اس وقت تک نہ ادیب تھا نہ صحافی لیکن ادبی گھرانے سے تعلق ضرور تھا۔ اسے ایسے افراد سے دلچسپی ضرور تھی جن کا تعلق ادب سے تھا۔ لاہور میں اس کے لیے ایسی کئی دلچسپیاں تھیں۔ اس نے یہاں امتیاز علی تاج، پطرس بخاری اور عبدالمجید سالک کو پہلی مرتبہ دیکھا اور ان سے ملاقات کی۔ حفیظ جالندھری، غلام عباس اور چراغ حسن حسرت سے بھی قیام لاہور کے اسی دور میں ملاقاتیں ہوئیں۔

لیکن وہ یہاں ادیب بننے نہیں، ڈاکٹر بننے آیا تھا۔ یہاں لاکھ دلچسپیاں سہی، دلی جیسی مصروفیات تو نہیں تھیں۔ اس کے پاس بہت وقت تھا۔ ڈاکٹر اجمل اسے پڑھانے کے لیے موجود تھے، اس کی بہن خدمت کے لیے حاضر تھی۔ وہ لاہور کی ادبی فضا سے بھی فیض یاب ہوتا رہا اور دل لگا کر پڑھتا بھی رہا۔ اس نے میڈیکل گروپ سے انٹر سائنس پاس کرلی۔ اب منزل بہت قریب تھی۔

اس کے ڈاکٹر بننے میں کچھ ہی فاصلہ باقی رہ گیا تھا۔ مولوی بشیر کا خط آیا کہ وہ اسے تعلیم حاصل کرنے کے لیے ایڈنبرا بھیجیں گے لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ابھی اس خط کو اس نے اچھی طرح پڑھا بھی نہیں تھا کہ ایک اور خط آگیا۔ مولوی بشیر کے دائیں طرف فالج کا اثر ہوگیا۔ وہ گھبرا کر دلی آگیا۔

”میری زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔ جب تک میری آنکھیں بند نہیں ہوجاتیں، تم میرے سامنے رہو تو اچھا ہے۔“ مولوی بشیر نے اسے دیکھ کر اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

دراصل مولوی بشیر اس بیماری کو موت کا پیغام سمجھنے لگے تھے۔ ڈپٹی نذیر احمد کا انتقال بھی فالج ہی سے ہوا تھا اس لیے مولوی بشیر کے دل میں یہ وہم جڑ پکڑ گیا تھا۔

مولوی بشیر تو رفتہ رفتہ صحت یاب ہونے لگے لیکن شاہد کی نوبیاہتا بیوی جو عرصے سے بیمار چلی آرہی تھی، موت کے قریب پہنچنے لگی۔ وہ سال بھر سے بیمار چلی آرہی تھی لیکن اب تو اس کی یہ حالت تھی کہ اس کی طرف دیکھ کر خوف آتا تھا۔ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ یہ عورت زندہ ہے۔ ہڈی سے چمڑہ لگ گیا تھا۔ ادھر باپ کی بیماری، ادھر بیوی کی یہ حالت، بیرون ملک جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

شاہد ایک مرتبہ پھر لاہور آیا لیکن اس مرتبہ وہ پڑھنے نہیں، بیمار بیوی کا علاج کرانے آیا تھا۔

ریلوے روڈ کی بلڈنگ کے جس کمرے میں اس کی کتابیں سجی ہوئی تھیں، وہاں بیمار بیوی کا پلنگ بچھا دیا گیا۔ ڈاکٹر اجمل کی وجہ سے علاج معالجے کی ہر ممکنہ سہولت حاصل تھی۔ شہر کا ہر قابل ذکر ڈاکٹر گھر پر آکر معائنہ کررہا تھا۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ پھیپھڑے کے غلاف میں جو پانی بھر گیا ہے۔ اسے نکال دیا جائے۔ معائنے کے بعد معلوم ہوا کہ پیپ پڑ گئی ہے۔ اب آپریشن ضروری تھا۔ دائیں جانب کی دو پسلیاں کاٹ دی گئیں۔ آپریشن کامیاب رہا لیکن زخم تھا کہ بھرنے ہی میں نہیں آتا۔ مجبوراً ٹانکے کاٹ کر اسے کھلا زخم بنادیا گیا۔ ربر کی نلکی کا بالشت بھر ٹکڑا زخم میں ڈال دیا گیا۔ اس کی ڈریسنگ روزانہ کرنی پڑتی تھی۔ یہ سلسلہ دو مہینے تک چلتا رہا۔ ڈاکٹروں نے گھبرا کر کہہ دیا کہ انہیں فوراً دلی لے جاکر لیڈی ہارڈنگ زنانہ اسپتال میں داخل کردیا جائے۔

وہ لڑکی جسے مولوی بشیر بڑے چاؤ سے بیاہ کرلائے تھے۔ جس کو بہو بنانے کی خوشی میں انہوں نے پانی کی طرح دولت لٹائی تھی، شادی کے دو سال بعد ہی اس طرح ایڑیاں رگڑ رہی تھی کہ دیکھنے والوں سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ اس لڑکی کے دل میں کیسے کیسے ارمان ہوں گے کہ وہ اتنے بڑے گھر میں بیاہ کر جارہی ہے، زندگی خوب عیش میں گزرے گی لیکن وائے قسمت کہ ایک سال بعد ہی بستر پکڑ لیا۔

○☆○

ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق شاہد اپنی بیوی کو لے کر دہلی آگیا۔ لیڈی ہارڈنگ زنانہ اسپتال کے پرائیویٹ کمرے میں لیٹی ہوئی اس کی بیوی نے اس کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھا۔

”آپ میری وجہ سے اپنا نقصان نہ کریں۔ میں تو اب جیسی بھی ہوں ٹھیک ہوں، آپ اپنی پڑھائی جاری رکھیں۔“

”تم کتنی عظیم ہو عالیہ۔ اتنی بیماری میں بھی تمہیں اگر خیال ہے تو میرا۔“

”آپ نے کیا میرا کم خیال رکھا ہے۔ ایک بیمار بیوی کو کون اتنا چاہتا ہے۔“ عالیہ کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ ابھری اور ختم ہوگئی جیسے کوئی چنگاری ہوا میں تحلیل ہوجاتی ہے۔

”تم ٹھیک ہوجاؤ، پھر سب ٹھیک ہوجائے گا۔“ شاہد نے کہا۔

”آپ میری فکر نہ کریں، بھرا گھر ہے میری دیکھ بھال کے لیے آپ کو میری قسم، آپ میڈیکل میں داخلہ ضرور لیں۔ ابا میاں آپ کو ڈاکٹر دیکھنا چاہتے ہیں۔“

شاہد کو اپنی بیوی سے محبت تو خیر تھی ہی، اب اس پر ترس بھی آنے لگا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا گھر میں ہر طرح کی نعمتیں موجود ہیں اور وہ بے چاری گھر سے دور، اسپتال کے ایک کمرے میں ہے جہاں کبھی کبھی کوئی اس سے ملنے آجایا کرے گا۔

وہ لاہور جانے پر تیار نہیں تھا لیکن مولوی بشیر کا اصرار تھا اور پھر بیوی کی خواہش بھی یہی تھی۔ اس نے لاہور جا کر میڈیکل کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔

بیوی کی بیماری سے دل ویسے ہی اچاٹ ہو گیا تھا کہ سڑے ہوئے مُردوں پر کام کرنا پڑا۔ اسے رہ رہ کر بیوی کے پہلو کا زخم یاد آتا تھا۔ وہ خود لاہور میں تھا، دل دلی میں پڑا ہوا تھا۔ ہر وقت ایک دھڑکا سا لگا رہتا تھا کہ نہ جانے کب کوئی ایسی ویسی خبر آ جائے۔ وہ جس حالت میں اسے چھوڑ کر آیا تھا، یہ اندیشے محض اندیشے نہیں تھے۔ اس نے بہت کوشش کی کہ ان خیالوں سے دامن چھڑا لے لیکن کوئی کانٹا تھا جو اس کی روح کو مسلسل کرید رہا تھا۔ آخر اس کی ہمت جواب دے گئی۔

"اب یہ پڑھائی مجھ سے نہیں چلے گی۔" اس نے ڈاکٹر اجمل سے کہا۔

"بے وقوف مت بنو۔ تم وہاں چلے بھی گئے تو وہ تمہاری موجودگی سے اچھی نہیں ہو جائے گی۔ بہترین ڈاکٹر اس کا علاج کر رہے ہیں، گھر میں نہ تو روپے پیسے کی کمی ہے اور نہ دیکھ بھال کرنے والوں کی۔ تم اپنا مستقبل کیوں خراب کرتے ہو۔"

"نہیں، بس اب میرا دل اچاٹ ہو گیا۔ مجھے اپنے آپ سے گھن آنے لگی ہے۔ میرا وجود دواخانہ بن گیا ہے۔ جس سے ہر وقت دواؤں کی بُو آتی رہتی ہے۔ مجھے لگتا ہے یہ میرا مستقبل نہیں۔ شاید میں اس کام کے لیے بنا ہی نہیں ہوں۔"

"تو تم فیصلہ کر چکے ہو۔"

"جی ہاں" شاہد نے سر جھکا کر اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ڈاکٹر اجمل جتنا سمجھا سکتے تھے سمجھایا لیکن پھر یہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔

"جیسی تمہاری مرضی۔"

شاہد نے اپنے والد کو خط لکھ دیا کہ میں نے آپ کی خواہش کی تکمیل کے لیے میڈیکل میں داخلہ لے تو لیا تھا لیکن یہ کام میرے بس کا نہیں، میں واپس آ رہا ہوں۔

وہ گھر پہنچا تو عجیب سی ویرانی نے اس کا استقبال کیا۔ گھر میں سب تھے لیکن اس کی بیوی عالیہ نہیں تھی۔ ابا میاں کو دیکھ کر اسے دھچکا سا لگا۔ جو شخص دن رات تصنیف و تالیف میں مگن رہتا تھا، اب اتنا مجبور ہو گیا تھا کہ اپنے ہاتھ سے خط تک نہیں لکھ سکتا تھا۔ دو قدم بھی چلتا تو کسی کے سہارے سے۔ پہاڑ جیسا جسم ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔ آواز کی گرج، لہجے کی اداسی میں بدل گئی تھی۔ وہ انہیں دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

"پاگل آدمی، روتا کیوں ہے۔ خدا اپنے بندوں کا امتحان لیتا ہے۔"

شاہد نے دیکھا، ابا میاں کی آنکھیں بھیگی ہوئی ہیں۔ وہ صبر کی تلقین کر رہے ہیں لیکن خود ٹوٹ چکے ہیں۔

"اب کیا کرنے کا ارادہ ہے۔" مولوی بشیر نے پوچھا۔

"بی اے اور ایم اے کروں گا۔"

"چلو جیسی تمہاری مرضی۔ نہیں تھا تمہاری قسمت میں کہ ڈاکٹر بنو۔" اب ان کے آنسو ان کے رخساروں تک آ گئے تھے۔

"شام کو اپنی بیوی کو دیکھنے اسپتال جانا اور ہاں مجھے بھی ساتھ لے جانا۔" انہوں نے کہا اور شاہد کو گلے لگا کر دیر تک روتے رہے۔

ابا میاں سے رخصت ہو کر وہ مردانے میں گیا۔ خدا بخش اپنے کبوتروں سے کھیل رہا تھا، ناگا بھی موجود تھا البتہ منشی اور کاتب رخصت ہو گئے تھے۔ لکھنے والے وہ ہاتھ ہی نہیں رہے تھے کہ نذیرو بشیر کے دفتر کی رونق قائم رہتی۔ اس کے اندر سے آواز آئی کہ کاش کوئی ہو جو پھر اس دفتر کی رونق لوٹا دے۔

وہ پھر زنانے میں آ گیا۔ اس کا بیٹا مشہود اپنی دایہ کی گود میں تھا۔ اسے پھر اپنی بیوی یاد آ گئی۔ اسے مشہود کا عقیقہ یاد آ گیا جس میں نوشابہ کا مجرا ہوا تھا۔

شام کو دو گھوڑوں والی لینڈو گلی کے نکڑ پر آ گئی۔ نوکروں نے سہارا دے کر مولوی بشیر کو گلی کے نکڑ تک پہنچایا اور بگھی پر سوار کرا دیا۔ گھوڑوں نے فراٹے بھرے۔ سڑک پر پہنچتے ہی مولوی بشیر کی گردن تن گئی۔ وہ اسی طرح اکڑ کر بیٹھ گئے جیسے کبھی بیماری سے پہلے بیٹھتے تھے۔ اسپتال کی عمارت خاموش کھڑی تھی۔ سناٹے کی چادر اوڑھے، اداسی کا لباس پہنے۔

"ڈاکٹر گوبند کور کہاں ملیں گی؟" شاہد نے استقبالیے پر پوچھا۔

"اپنے کمرے میں ہوں گی یا پھر ڈاکٹر رمیش کے کمرے میں دیکھ لیجیے۔" استقبالیہ کلرک نے جواب دیا۔

"ان کا کمرہ؟"

"سیڑھیاں چڑھ کر دائیں طرف دوسرا کمرہ" استقبالیہ کلرک نے مختصر سا جواب دیا اور اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

شاہد نے اپنے والد کو سہارا دے کر، کچھ گود میں اٹھا کر سیڑھیاں چڑھائیں۔ گوبند کور اپنے کمرے میں موجود تھی۔

گوبند کور سکھ ڈاکٹرنی تھی جو بڑی جانفشانی سے شاہد کی بیوی عالیہ کا علاج کر رہی تھی۔ اس کی محبت کا صلہ تھا کہ عالیہ آج چھ مہینے بعد بھی زندہ تھی ورنہ وہ اسے جس حالت میں چھوڑ کر گیا تھا کسی کو اس کے زندہ بچ جانے کی امید نہیں تھی۔

"اوہ! مسٹر شاہد آپ؟ آئیے آئیے۔" ڈاکٹر گوبند کور نے اسے خوش آمدید کہا۔

"ڈاکٹر صاحب، میں نے سوچا عالیہ کو دیکھنے سے پہلے آپ سے مل لوں۔"

"اچھا کیا آپ نے۔ ویسے آپ کی بیوی اب بہت ٹھیک ہو گئی ہے۔"

"جی ہاں، ابا میاں مجھے بتا رہے تھے۔"

"ارے ڈپٹی صاحب بھی آئے ہوئے ہیں۔ آپ نے انہیں کیوں تکلیف دی۔ اب تو آپ آ گئے ہیں۔"

اس کے بعد ڈاکٹر کور نے اسے تفصیل سے بتایا کہ یہ مرض کیا ہے اور کیوں اچھا نہیں ہوسکتا۔ اب صرف یہی ہوسکتا تھا کہ ناسور کو ربر کی ٹیوب کے ذریعے روزانہ دھویا جائے اور عام صحت کو گرنے نہ دیا جائے۔

"آیئے' میں آپ کی ملاقات مریضہ سے کراتی ہوں۔"

ڈاکٹر کور انہیں لے کر عالیہ کے کمرے میں آگئی۔ عالیہ کو یہ گمان بھی نہیں تھا کہ شاہد آئے ہوئے ہوں گے۔

عالیہ کے بال سلیقے سے بندھے ہوئے تھے۔ کپڑے صاف ستھرے اور صحت اچھی ہورہی تھی۔ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ یہ وہی پہلے والی عالیہ ہے۔

"آپ نے تو کمال کردیا ڈاکٹر کور۔ میری بیوی کو آپ نے نئی زندگی دی ہے۔"

"اب چاہیں تو آپ انہیں گھر لے جاسکتے ہیں۔ میں دوائیں لکھ دوں گی اور ڈریسنگ کا طریقہ بتادوں گی۔"

اگلے دن ڈاکٹر کور نے شاہد کے سامنے ڈریسنگ کی۔ پہلو میں ایک سوراخ تھا جس میں ٹیوب پڑی ہوئی تھی۔ اس ٹیوب کو نکال کر دوسری صاف ستھری ٹیوب ڈال دی اور پچکاری سے زخم صاف کرکے' روئی رکھ کر پٹی باندھ دی۔

"بس اس طرح دن میں ایک مرتبہ آپ کو ڈریسنگ کرنا ہے۔" ڈاکٹر کور نے کہا۔

زخم کی نوعیت ایسی تھی کہ بظاہر یہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ پہلو میں کوئی ناسور ہے۔ لیکن یہ پابندی کوئی کم اذیت ناک بات نہیں تھی کہ جب تک زندگی ہے' زخم کا منہ دیکھنا ہے اور ڈریسنگ کرنی ہے۔

شاہد اس وعدے کے ساتھ دلی آیا تھا کہ وہ میڈیکل کو تو چھوڑ بیٹھا لیکن تعلیم کو خیرباد نہیں کہے گا۔ اس نے مشن کالج دہلی میں بی اے آنرز (انگریزی ادبیات) میں داخلہ لے لیا۔

انگریز گورنس کا عطیہ تھا کہ انگریزی مادری زبان کی طرح بولتے تھے لہٰذا یہ فیصلہ نہایت درست ثابت ہوا۔ چند ہی دنوں میں کالج کے نمایاں طالب علموں میں شمار ہونے لگا۔ مشن کالج کے اکثر اساتذہ اس کے والد کی سفارش پر ملازم ہوئے تھے اور یوں بھی کون تھا جو ڈپٹی نذیر احمد کے خاندان سے واقف نہیں تھا لہٰذا یوں بھی کالج میں اسے امتیازی حیثیت حاصل تھی۔

بیمار بیوی کے اچھی لگتی ہے' یہ تو شاہد کی نیک خصلت تھی کہ اس نے کبھی اپنی بددلی کو ظاہر نہیں ہونے دیا' رئیسوں کے شوق کو بھی پورا نہیں کیا کہ بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کرلیتا جب کہ خاندان بھر کا اصرار تھا کہ اب اسے دوسری شادی کرلینی چاہیے۔ کئی لڑکیاں تھیں جو چپکے چپکے اس کی محبت کا دم بھرتی تھیں اور اس سے شادی کی خواہش مند تھیں لیکن وہ بیوی پر سوکن لاکر اس کا دل توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ حیلے بہانوں سے ہر مطالبے کو ٹالتا رہا۔ خاندانی مطالبوں کو بھی' نازنینوں کے تقاضوں کو بھی۔ پھر بھی وہ انسان ہی تو تھا۔ بیوی کے "ناسور" کی ڈریسنگ کرتے کرتے دل اکتانے لگتا تھا۔

وقت گزاری کے لیے اسے کسی شغل کی ضرورت تھی۔ یہ شغل اسے موسیقی کی صورت میں مل گیا۔

افضل حسین اس کے چچا زاد بھائی تھے جنہیں وہ پیار سے بھائی فجی کہتا تھا۔ وہ ایسی باغ و بہار ہستی تھے کہ ان جیسا دوسرا ڈھونڈے سے نہیں مل سکتا۔ عربی' فارسی میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ شیکسپیئر کے ڈراموں کے سین فرفر سنادیتے تھے۔ حالیؔ اور داغؔ کی محفلیں' مشاعرے دیکھے ہوئے تھے۔ موسیقی سے بھی شغف تھا۔ طبلہ' ستار' وائلن' دلربا سارے ساز جانتے تھے۔ محکمۂ زراعت میں ملازم تھے۔ زیادہ تر دوسرے شہر میں رہتے تھے لیکن سال دو سال میں رخصت پر دلی آتے اور اس طرح آتے کہ آٹھ آٹھ دس دس مہینے تک ملازمت پر جانے کا نام نہیں لیتے تھے۔ دن رات ہنگامے اور محفلیں برپا کرتے کنبے بھر کے لڑکوں کو جمع کرتے اور رات رات بھر محفلیں جمتیں۔ کوئی تصویر بنا رہا ہے' کوئی قصے سنا رہا ہے۔ ساز مل رہے ہیں' نغمے گائے جارہے ہیں۔

جن دنوں شاہد تفریح کا کوئی بہانہ ڈھونڈ رہا تھا' بھائی فجی انہی

مارٹن روڈ پر سرکاری کوارٹر ہیں جو سب کے سب ہم شکل اور یکساں ہیں۔ شاہد ایک دن شام کو گھر لوٹ رہے تھے۔ غلطی سے کسی اور مکان میں گھس گئے۔ بلا تکلف اندر کمرے میں گئے۔ شیروانی اتاری اور کھونٹی پر لٹکانے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ کھونٹی وہاں نہ تھی۔ کسی کو آواز دی۔ ایک عورت کمرے میں آئی۔ غیر مردوے کو دیکھ کر اس کی چیخ نکل گئی۔ انہوں نے اسے دیکھا تو ان کے بھی پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ جلدی سے شیروانی اور دونوں ہاتھوں سے دستار تھامتے ہوئے باہر نکلے۔ اندر سے عورتیں چیخنے چلّانے لگیں۔

مجھ سے ملے تو کہنے لگے۔

"جمیل صاحب' قرب قیامت ہے' ہر چیز ہم شکل ہونے لگی ہے" اور پھر زور زور سے ہنسنے لگے۔

(جمیل جالبی)

دنوں رخصت پر آئے۔ شاہد کا شوقِ آوارگی اسے بھائی جی کی محفل میں لے گیا۔ ساز و آواز مل کر ایک ہو رہے تھے۔ قاضی عباس حسین جو بھائی جی کے بہنوئی تھے فارسی کی ایک غزل سنا رہے تھے۔ شاہد سے بھی اصرار ہوا۔ لاہور کے قیام کے زمانے میں اس نے کچھ مشق کی تھی، اس کا سہارا لے کر اس نے غزل چھیڑ دی۔

ساتیا صحبتِ دیرینہ جو یاد آتی ہے
آنکھ سے خون کی اِک بوند ٹپک جاتی ہے

لے میں گا رہے تھے، خوب تعریف ہوئی۔ کئی غزلیں ضد کر کے اور سنی گئیں، توہمت اور بڑھی۔ اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ مل گیا۔ بیمار بیوی سے طبیعت اکتاتی تو بھائی جی کے پاس جا کر بیٹھ جاتا۔ آہستہ آہستہ اس پر ایسا رنگ چڑھا کہ ہر وقت گنگنانے لگا۔

بھائی جی تو سال بھر کا پھیرا لگا کر چلے گئے، شاہد کو مستقل آزار لگا گئے۔ سب کے تو دم بولا گئے لیکن شاہد مستقل مزاج آدمی تھا۔ جو کام بھی کرتا تھا، جم کر کرتا تھا۔ اس نے اس شوق کو صیقل کرنے کا ارادہ کر لیا۔

بھائی جی کے یہاں اس کی ملاقات ماسٹر بشیر سے ہوئی تھی۔ ماسٹر بشیر ہارمونیم بہت اچھا بجاتے تھے۔ شاہد نے ان سے ہارمونیم بجانا سیکھا، ہلکی پھلکی غزلیں گالیا کرتے تھے استادوں کی محفلوں میں اٹھے بیٹھے تھے اور موسیقی سے طبیعت کو مناسبت بھی تھی اس لیے راگوں سے بھی سطحی واقفیت ہو گئی تھی۔ ماسٹر بشیر کو جو کچھ آتا تھا، وہ بھی اس نے گھول کر پلا دیا تھا۔

اب شاہد، خاندان بھر کا بھائی جی بن گیا تھا۔ خاندان میں کوئی تقریب ہوتی، شاہد کا گانا ضرور ہوتا۔ یہ اچھا شوق اس کے ہاتھ لگا تھا کہ دل بہلا ہوا تھا۔

دلی میں کوئی گانے کی محفل تھی۔ دلی کے مشہور گویے چاند خاں کے چھوٹے بھائی رمضان خاں بھی اس میں شریک تھے۔ شاہد کی باری آئی تو وہ گانے کے لیے سامنے آیا اور خیال گانا چاہا۔

"خیال نہیں گا سکتے، میاں صاحب زادے غزل سناؤ غزل۔"

رمضان خاں نے اسے ٹوک دیا۔

"کیوں، میں خیال کیوں نہیں گا سکتا" شاہد بھی اڑ گیا۔

"یہ اُستاد کی محفل ہے، تم ٹھہرے نو مشق اور عطائی۔ تمہارا خیال گانا ہماری توہین ہے۔ پہلے استادوں کی جوتیاں سیدھی کرو، پھر آ کر خیال گانا۔"

یہ تکرار اتنی بڑھی کہ منتظمین کو بیچ میں آنا پڑا۔ رمضان خاں کی بات کون ٹال سکتا تھا، فیصلہ یہی ہوا کہ شاہد خیال نہیں، غزل سنائے۔

شاہد اتنا غصے میں آیا کہ نہ غزل سنائی نہ خیال، جھنجلا کر اٹھ آیا۔

ذلت کا احساس اس کے وجود پر چھا گیا۔ رمضان خان کے اعتراض نے اسے جھنجھوڑ دیا۔ میں نو مشق ضرور رہوں لیکن ضروری تو نہیں کہ میں سیکھ نہ سکوں۔ رمضان خاں نے بھی تو کسی سے سیکھا ہی ہوگا۔ میں خاندانی گویا نہ سہی لیکن سیکھ تو سکتا ہوں۔ اب سوال یہ تھا کہ آج تک خاندان میں کہیں ایسا نہیں ہوا۔ لوگ کیا کہیں گے۔ شوقیہ غزلیں گانا اور بات ہے، باقاعدہ پکے راگوں کی تعلیم حاصل کرنا اور بات ہے۔ لیکن اس ذلت سے وہ ذلت بڑی تھی جس میں رمضان خان نے اسے مبتلا کر دیا تھا۔ پھر اس کی دلیل یہ بھی تھی کہ فنِ موسیقی مسلمانوں [illegible] پرداختہ ہے۔ امیر خسرو نے اس کی شیرازہ بندی کی۔ [illegible] نے اسے رطب و یابس سے پاک کیا۔ سلطان حسین [illegible] والیٔ جون پور نے خیال کا اسلوب ایجاد کیا۔ بادشاہوں اور [illegible] نے اس فن کی سرپرستی کی۔ یہ ہمارا تہذیبی ورثہ [illegible] خاندانوں نے اسے میراثیوں کا فن سمجھ کر نظرانداز کر [illegible] اور برا سمجھا جاتا ہے۔ ایک سوال یہ بھی تھا کہ کس سے سیکھا جائے۔ یہ سوال اس لیے مشکل تھا کہ خاندانی حضرات، عطائی کو موسیقی کا علم دینے میں اتنے بخیل ہوتے ہیں کہ گلے پر چھری رکھ دو تو بھی ایک نکتہ نہ بتائیں۔ خاندانی گانے والے کبھی یہ گوارا نہیں کرتے کہ غیر خاندانی کچھ سیکھ لے۔ برسوں لگا دیں گے۔ لیکن ایسا سکھائیں گے کہ گانے والا ٹھوکریں ہی کھاتا رہے۔

پنڈت لکشمن پرشاد زیادہ مشہور تو نہیں تھے لیکن علم موسیقی کا دریا تھے۔ شاہد کو اس مرحلے پر ایک ایسے ہی استاد کی ضرورت تھی جو فن سے واقف تو ہو لیکن شہرت کے غرور سے ابھی آشنا نہ ہوا ہو۔ شاہد چاہتا تھا کہ بنیادی باتیں پنڈت جی سے سیکھ لے تاکہ جب کسی استاد کے پاس جائے تو وہ اسے محض عطائی کہہ کر نظر انداز نہ کر سکے۔ شاہد نے سُر، تال اور راگوں کے اسلوب سیکھنے کے لیے لکشمن پرشاد کے آگے ہاتھ جوڑ لیے۔

مولوی بشیر کی صحت تو اب اس قابل رہی نہیں تھی کہ وہ کوئی روک ٹوک کرتے، بڑے بھائی نے ناک بھوں چڑھائی لیکن شوق کے دریا نے کسی ساحل کی پروا نہیں کی۔ مولوی بشیر اگر صحت مند ہوتے تو وہ شاید یہ ہمت نہ کر سکتا۔ کچھ دن یہ شوق چھپے چوری جاری رہا لیکن پھر سب پر ظاہر ہو گیا۔

پنڈت لکشمن پرشاد باقاعدگی سے اسے گانا سکھانے آنے لگے۔ ان کی اس نے ایسی عزت کی جیسے کوئی چیلا اپنے گرو کی کرتا ہے۔ ان کے لیے کھانے پینے کا الگ انتظام کرتا۔ ان کے لیے پان بھی آتے تو ہندو پنواڑی کی دکان سے اور وہ بھی دھاگے میں لٹک کر تاکہ کسی کا ہاتھ نہ لگ جائے۔ عزت سے عظمت ہے۔ تھوڑے ہی دن میں بلمپت، مدھ اور دُرت ہر ایک پر کمال حاصل کر لیا۔

بی اے کرنے کے بعد اسے ایک مرتبہ پھر علی گڑھ کا خیال آیا۔ کبھی وہ بچپن میں وہاں پڑھنے گیا تھا، اب سوچا ایم اے وہاں سے کیا جائے۔ علی گڑھ جانے کے لیے روانہ بھی ہو گیا لیکن راستے میں دلی کی یاد ایسی آئی کہ دوسرے ہی دن واپس آ گیا۔ کچھ نہ کچھ تو

کرنا ہی تھا۔ اس نے ایم اے (فارسی) میں داخلہ لے لیا۔

بیمار بیوی کی ڈریسنگ، موسیقی اور ایم اے (فارسی) ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ اتنا وقت ہی نہیں تھا کہ اندیشے دل میں گھر کرتے یا زندگی سے بیزاری پیدا ہوتی۔

کالج میں وہ فارسی کے مضمون کا اکلوتا طالب علم تھا۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور شمس العلما مولوی عبدالرحمٰن اس کے اساتذہ میں شامل تھے۔ ڈاکٹر قریشی نے تو دو ایک ہی اسباق کے بعد اندازہ لگا لیا کہ اسے کسی امداد کی ضرورت نہیں لہٰذا انہوں نے کہہ دیا کہ اگر کوئی دشواری محسوس کرو تو مجھ سے پوچھ لیا کرو ورنہ ٹھیک ہے، خود ہی پڑھتے رہو البتہ مولوی عبدالرحمٰن مروت میں پڑھاتے رہے اور وہ بھی اس پابندی کے ساتھ کہ شاہد علی الصباح ان کے گھر پہنچ جاتا۔

رمضان کے دن تھے۔ شاہد "اخلاقِ جلالی" پڑھ رہا تھا مگر اٹک اٹک کر۔ ایک جگہ بالکل ہی رک گیا۔

"کیوں رک گئے؟" مولوی صاحب نے کمبل سے منہ نکال کر پوچھا۔

"جی، میں فارسی میں تو رواں ہوں لیکن یہ عربی ہے۔"

"تو پھر کیا ہوا۔"

"کیا خبر قرآن کی کوئی آیت ہو۔"

"تو پھر"

"غلط پڑھ دوں تو گناہ ہوگا۔"

"ماشاءاللہ کیا عذر ہے۔ اس پر دعویٰ کہ جناب ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے ہیں۔"

وہ یہ طعنہ اتنے لوگوں سے اور اتنی مرتبہ سن چکا تھا کہ کان پک گئے تھے۔ اس وقت غصہ ہی تو آ گیا۔

"میرا اس میں کیا قصور کہ میں نذیر احمد کے خاندان میں پیدا ہو گیا۔ وہ ہوں گے عالم فاضل، مجھے عربی نہیں آتی۔" اس نے قدرے ترش ہو کر کہا۔

"تو جناب فارسی چھوڑیئے، پہلے عربی پڑھیئے۔"

"میں نہیں پڑھتا اور کل سے نہیں آؤں گا۔"

اب مولوی صاحب کو احساس ہوا کہ شاہد کو غصہ آ گیا ہے۔ وہ کمبل پھینک کر اٹھ بیٹھے، دیر تک سمجھاتے بجھاتے رہے۔

دوسرے دن شاہد نہ مولوی صاحب کے گھر گیا نہ کالج گیا اور یوں ایم اے فارسی راستے ہی میں رہ گیا۔

اس نے اس جھنجلاہٹ سے فرار، مضمون نگاری میں تلاش کیا۔ رسالوں کے لیے طبع زاد افسانے لکھے، موپاساں اور چیخوف کے تراجم کیے۔

کبھی یہ چیزیں چھپ جاتیں، کبھی شکریے کے ساتھ واپس آجاتیں، کبھی ایڈیٹر حضرات یہ زحمت بھی نہیں کرتے۔ اس کا بڑا دل دکھتا۔ اب وہ اتنی محنت سے کوئی مضمون یا افسانہ لکھتا اور اس کا

بیخود دہلوی

یہ صاحب جو مٹیا محل سے ٹُلکتے ٹُلکتے چلے آ رہے ہیں۔ گندمی رنگ، بڑی سی پھریری داڑھی، ہاتھوں میں ہزار دانہ سنبھالے، اُستاد بیخود ہیں۔ ٹانگیں دیکھیے ذرا ان کی، کمانیں بنی ہوئی ہیں۔ جوانی میں گھڑسواری کا شوق تھا۔ منہ زور سے منہ زور گھوڑا ان کی ران تلے چیں بول جاتا تھا۔ ہم نے انہیں اسّی برس کی عمر میں بھی گھوڑے پر سدھ بیٹھے دیکھا ہے۔ ان کے والد سو سے اوپر ہو کر مرے تھے۔ میر صاحب بھی سو کے لگ بھگ ہو گئے ہیں۔

(شاہد احمد دہلوی)

یہ حشر ہوتا۔ اسی کا ہم ذوق انصار ناصری بھی تھا۔ دونوں مل جل کر کامیابیاں اور ناکامیاں اکٹھی کر رہے تھے کہ مولوی بشیر کا انتقال ہو گیا۔

بستر پر ہی سہی جب تک باپ زندہ تھے، کسی کو کچھ فکر ہی نہیں تھی۔ یہ سایہ اٹھتے ہی دھوپ سی نکل آئی۔ کچھ ایسی ضرورت نہیں تھی لیکن اچانک ذمے داریوں کا احساس ہونے لگا۔

بڑے بھائی منظور نے ریلوے کے محکمۂ اکاؤنٹس میں ملازمت کر لی تھی۔ انہوں نے شاہد سے بھی کہا۔

"خالی رہنے سے بہتر ہے، تم بھی یہ ملازمت کر لو۔"

"حساب کتاب کے یہ گورکھ دھندے میرے بس کے کہاں" شاہد نے کہا۔

"میں یہ کب کہتا ہوں کہ ہمیشہ یہیں پڑے رہنا۔ کوئی اچھا موقع ملے تو چھوڑ دینا۔"

شاہد نے کچھ بھائی کے کہنے سے کچھ یہ سوچ کر کہ دل بہلا رہے گا، ملازمت کر لی۔ وہ تو افسانہ بھی لکھتا تو زمین پر بیٹھ کر لکھتا تھا، میز کرسی کی یہ بہار اسے کہاں راس آنے والی تھی۔ وہ تو کچھ دن ہی میں اکتا کر رہ گیا۔

"بھائی، تم نے یہ مجھے کہاں پھنسا دیا۔" اس نے تنگ آ کر شکایت کی۔

"میں بھی تو آخر پھنس ہی گیا ہوں، اور خوش بھی ہوں۔"

"آپ کی بات الگ ہے، مجھ سے یہ سب نہیں ہونے کا۔"

"جمے رہو، کچھ دن بعد عادت پڑ جائے گی۔"

"اس وقت تک میں کسی اور لائق تو رہوں گا نہیں۔"

"اور کس لائق رہنا ہے۔"

"بس، مجھ سے یہ نوکری نہیں ہوتی۔"

شاہد نے ملازمت چھوڑ دی۔ اب پھر وہی موسیقی، وہی مضمون نگاری۔

ایک روز اس نے اور انصار ناصری نے اپنے اپنے افسانے ایک ہی رسالے کے نام پوسٹ کیے اور ایک ہی تاریخ کو شکریے کے ساتھ واپس آگئے۔

"یار، یہ ایڈیٹر حضرات تھپڑ مار کر شکریہ کیوں ادا کرتے ہیں۔" شاہد نے کہا۔

"کیا مطلب"

"مطلب یہ کہ ہم نے کتنی محنت سے افسانے لکھے تھے اور کس بے دردی سے واپس کردیے گئے اور وہ بھی شکریے کے ساتھ۔ یہ تھپڑ نہیں تو اور کیا ہے۔"

"بھائی وہ شکریے کے بغیر واپس کردیتے تو ہم ان کا کیا بگاڑ لیتے۔"

بات آئی گئی ہوگئی لیکن اس بے عزتی کو محسوس انصار ناصری نے بھی کیا۔ وہ مسلسل سوچتا رہا اور پھر اس نتیجے پر پہنچا۔

"بھائی شاہد، ہم اپنا رسالہ خود نکالے لیتے ہیں، پھر ہماری تخلیقات کیسے واپس ہوں گی۔"

انصار ناصری نے یہ خیال اچانک حملے کی طرح پیش کیا تھا لیکن شاہد نے محسوس کیا جیسے اندھیرے میں چراغ جل گیا۔ اس نے سوچا، اس طرح نذیر و بشیر کا جو دفتر ویران ہوگیا ہے پھر سے آباد ہوجائے گا۔ منشی اور کاتب جو اٹھ گئے ہیں پھر سے بیٹھ جائیں گے۔ روزگار بھی ہوگا شوق بھی۔

یہ خیال نوجوانی کی ترنگ میں پیش کیا گیا تھا۔ انصار ناصری کو یقین بھی نہیں تھا کہ اس پر عمل ہوسکے گا لیکن شاہد ایک رسالہ نکالنے پر سنجیدگی سے سوچنے لگا۔

رسالہ نکالنے کے لیے رقم کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کے پاس تھی۔ مولوی بشیر نے ہر لڑکے کے لیے بینک میں پچاس پچاس ہزار روپیہ چھوڑا تھا۔ جائیداد کا کرایہ الگ تھا جو تقسیم ہونے کے بعد فی لڑکا تین سو روپے بنتا تھا۔ یہ رقم کوئی بھی اچھا رسالہ نکالنے کے لیے بہت تھی۔ شاہد نے طے کرلیا کہ وہ رسالہ نکالے گا۔

ہر رسالے کا کوئی نام بھی ہوتا ہے۔ اس نے یہ مشکل بھی انصار ناصری کے حوالے کی۔

"تمھی نے تجویز پیش کی ہے، تمھی کوئی نام تجویز کرو، ڈیکلریشن لینا میرا کام ہے۔"

"نگار ہے، ساغر ہے، صہبا ہے، مینا ہے، ساقی نہیں ہے۔" انصار ناصری نے مذاق ہی مذاق میں نام تجویز کردیا۔

"بس ٹھیک ہے، ساقی نام ہوگا۔" شاہد نے فوراً اتفاق کیا۔

اس نام کے سامنے آنے کی دیر تھی کہ قریبی احباب کے حلقے میں فوراً سرایت کرگیا۔ جس نے سنا پسند کیا۔ فضل حق قریشی نے مہرِ تصدیق ہی ثبت کردی۔

"ہم تو ہم، لسان الغیب حافظ شیرازی نے تو بہت پہلے یہ اعلان کردیا تھا کہ ایک شخص شاہد پیدا ہوگا اور ساقی نکالے گا۔"

"اچھا" شاہد نے تعجب سے پوچھا۔ "کیا مطلب ہے، کھل کر بیان کرو۔ کیا فال نکال لی۔"

"فال کی کیا ضرورت ہے، حافظ کا یہ مصرعہ دیکھ لو۔

جہانِ فانی و باقی فدائے شاہد و ساقی"

محفل میں کئی قہقہے ایک ساتھ گونجے۔ شاہد کا دل ساقی کے نام پر مزید ٹھک گیا۔ بس پھر کیا تھا، فوراً ایک فہرست بنائی گئی کہ اس رسالے میں کون کون لکھے گا۔ پہلے تمام دوستوں کے نام لکھے گئے۔ ان میں سے بیشتر وہ تھے جنھوں نے آج تک کوئی مضمون نہیں لکھا تھا۔ اس کے بعد شہر میں جو ادبی شخصیتیں تھیں ان کے نام لکھے گئے اور پھر ملک کی نامور ہستیوں کا نمبر آیا۔ یہ بھی طے پایا کہ ساقی بنیادی طور پر دلی کی زبان اور ثقافت کا نقیب ہوگا۔

شاہد نے ڈیکلریشن کے لیے درخواست دی اور خود نامور ہستیوں کو خطوط لکھنے بیٹھ گیا کہ وہ اس نئے رسالے کے ساتھ قلمی تعاون کریں۔

اس کے ایک عزیز رازق الخیری دہلی سے "عصمت" نکال رہے تھے۔ ایک سال قبل عصمت کا گولڈن جوبلی نمبر شائع ہوکر دھوم مچا چکا تھا۔ شاہد نے سوچا رازق الخیری سے بھی مشورہ لینا چاہیے۔ وہ تجربے کار ہیں یقیناً کوئی مشورہ دیں گے۔ شاہد ایک دن ان کے پاس پہنچ گیا۔

"آپ نے میرا خط تو پڑھ ہی لیا ہوگا۔ میں ایک رسالہ "ساقی" کے نام سے نکال رہا ہوں اور چاہتا ہوں اس سلسلے میں آپ مجھے کوئی مشورہ دیں۔"

"آپ ارادہ کرہی چکے ہیں ورنہ میں تو یہ مشورہ دیتا کہ کسی ادبی رسالے کے پنپنے کے امکانات ذرا کم ہی ہوتے ہیں۔ کیسے کیسے جغادری رسالے نکل رہے ہیں۔ قوسِ قزح، نیرنگِ خیال، عالمگیر، ہمایوں، زمانہ اور نگار کا بھی ڈنکا بج رہا ہے۔ ان کی موجودگی میں کون ہمت کرسکتا ہے۔"

"لیکن میں تو یہ ہمت کرچکا۔" شاہد نے مسکرا کر جواب دیا۔

"میں تمھیں شاباش ہی دے سکتا ہوں۔"

"میں تو آپ کے تجربے سے فائدہ اٹھانے آیا تھا۔"

"تو میرا تجربہ تو یہ کہتا ہے کہ کم از کم دو سال تک رسالے سے مالی فائدے کی امید نہ رکھیں۔ دو سال بعد اگر رسالہ باقی رہا اور ہزار خریدار آپ نے بنالیے تو پرچہ جاری رہ سکے گا۔"

"یہ نقصان تو میں برداشت کرلوں گا۔"

"ایک کام اور کیجیے گا۔ میں بھی یہی کرتا ہوں۔ ممکن ہو تو

کتابوں کی اشاعت کا بھی انتظام کیجئے گا۔ میرا رسالہ بھی عصمت بک ڈپو سے چل رہا ہے، عصمت سے نہیں۔ کتابوں کی فروخت سے آپ کو بہت مدد ملے گی۔ اشتہارات جتنے بھی مل جائیں وہ آپ کی قسمت۔"

ڈیکلریشن ملنا کون سا مشکل تھا۔ ساقی کے نام سے ڈیکلریشن مل گیا۔ شاہد نے لاہور کا دورہ کیا اور کئی نامور ادیبوں کے مضامین حاصل کر کے دلی لوٹا۔

یہ پہلے ہی طے ہو چکا تھا کہ ساقی کا دفتر اسی حویلی کے ایک حصے میں ہوگا جہاں ڈپٹی نذیر احمد اور پھر مولوی بشیر احمد بیٹھ کر خدمتِ ادب کرتے تھے۔ نیچے کی منزل میں ان دو بزرگوں کی مطبوعات کا دفتر تھا۔ اوپر کی منزل میں سے دو بڑے کمرے شاہد نے گھیر لیے۔ ایک کمرہ ساقی کے دفتر کے لیے، دوسرا کمرہ خود اپنے اور اپنے دوستوں کے لیے۔ دونوں کمرے سادگی کا نمونہ تھے۔ نہ میز نہ کرسی دری بچھا کر اس پر چاندنی کا فرش لگا دیا۔ جو مضامین وہ لاہور سے لایا تھا اس نے کاتب کے حوالے کیے اور خود پروف پڑھنے بیٹھ گیا۔

انصار ناصری گلی در گلی ہوتا ہوا کھاری باؤلی کی ایک گندی سی گلی میں چھوٹی اینٹوں سے بنی ہوئی حویلی میں داخل ہوا۔ زینہ چڑھ کر اوپر پہنچا۔ نہ یہ حویلی اس کے لیے نئی تھی، نہ یہ زینہ لیکن ساقی کا دفتر بننے کے بعد وہ یہاں پہلی مرتبہ آیا تھا۔ سفید چاندنی کے چاروں طرف کاغذات بکھرے پڑے تھے جن کے درمیان شاہد خاکی گرم قمیص اور سلیٹی رنگ کا پاجامہ پہنے، آنکھوں پر موٹے شیشوں کی عینک لگائے کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ سردیوں کے زمانے کا اس کا یہ خاص لباس تھا۔ ایک گرم چادر بھی کمر سے لپٹی رہتی تھی۔

"تو آخر تیاری مکمل ہو ہی گئی۔" انصار ناصری نے کہا۔

"کم از کم چار پرچوں کا مواد دستیاب ہو گیا ہے۔"

"تو کب لا رہے ہو پہلا پرچہ۔"

"اگلے مہینے کی پہلی کو پہلا پرچہ آجائے گا۔"

"مذاق ہی مذاق میں ہم نے کتنا بڑا کارنامہ انجام دے دیا۔" انصار ناصری نے کہا۔

"کارنامہ تو جب ہوگا جب یہ پرچہ آئے گا اور دھوم مچائے گا۔" شاہد نے کہا اور پھر اچانک اسے ایک خیال آگیا۔ "دھوم مچانے کے لیے اشتہار کی بھی تو ضرورت ہوتی ہے۔"

"تو اخباروں میں اشتہار دے دو۔"

"میں چاہتا ہوں اس میں بھی کوئی انفرادیت پیدا کروں۔"

"مثلاً"

"میں چاہتا ہوں لوگ صبح اٹھیں تو دلی کی ہر دیوار پر ہمارے پرچے کا اشتہار لگا ہو اور جب لوگ بازار میں نکلیں تو ہر دکان پر ساقی رکھا نظر آئے۔"

"تو پھر لگوا دو اشتہار۔"

"ابھی نہیں۔ میں نے کہا نا، جس روز پرچہ بازار میں آئے اسی شب یہ اشتہار لگنا چاہیے۔"

"مگر اشتہار میں لکھو گے کیا؟"

"بیٹھ کر بنائے لیتے ہیں اشتہار۔"

دونوں نے مل کر اشتہار بنایا۔

"پہلی جنوری ۱۹۳۰ء کو مے گسارانِ ادب کو اپنے جُرعاتِ بوقلموں سے کیف اندوز کرنے والا دارالسلطنت دہلی کا علمی و ادبی ماہوار جریدہ "ساقی" جام بکف منصۂ شہود پر نمودار ہوا۔"

پہلی جنوری ۱۹۳۰ء کی شب یہ اشتہار ناگا اور رفو کے حوالے کیا جنہوں نے راتوں رات شہر کی دیواروں پر چپکا دیا۔

ساقی کا بازار میں آنا تھا کہ دھوم مچ گئی۔ اس کا قدیم اور جدید اندازِ نظر، اس کی نفاست اور ایک خاص اندازِ نظر کے مضامین۔ یہ سب پڑھنے والوں کے لیے نئی چیزیں تھیں۔

شاہد کے دوست اس پر جان چھڑکتے تھے۔ انہوں نے صرف زبانی ساتھ نہیں دیا بلکہ جو لکھنا نہیں بھی جانتے تھے انہوں نے بھی لکھنا شروع کر دیا۔ ان میں سے جو بھی کچھ لکھتا، سب اسے سنتے، مشورے دیتے اور پھر ساقی میں چھپ جاتا۔ یہ ترکیب اس لیے کارگر ہوئی کہ نئی چیز میں ہمیشہ کشش ہوتی ہے۔ اس رسالے میں اس کثرت سے نئے نام دیکھ کر دلچسپی بڑھتی گئی۔ نئے اور پرانے ناموں کا ایسا حسین امتزاج کسی اور رسالے کو نصیب نہیں تھا۔

ساقی کی اشاعت کے بعد دہلی میں ایک حلقۂ ادب نے جنم لیا۔ اس میں انصار ناصری، فضل حق قریشی، ممتاز حسین، علامہ مضحک، اشرف صبوحی، ظفر قریشی، اخلاق احمد، صلاح الدین قریشی شامل تھے۔ شاہد کی قدر دانی نے دہلی سے باہر بھی چند ایسے نام تلاش کر لیے جو اب تک اہلِ ادب کے لیے اتنی اہمیت نہیں رکھتے تھے، ساقی نے انہیں نہ صرف متعارف کرایا بلکہ اہلِ ادب کے سامنے اس طرح پیش کیا کہ ان کی اہمیت مسلّم ہو گئی اور وہ ستاروں کی طرح چمکنے لگے۔ عظیم بیگ چغتائی، عصمت چغتائی، اختر حسین رائے پوری وغیرہ ایسے ہی نام ہیں۔

شاہد کی یہ صلاحیت ساقی کے اجرا کے بعد ظاہر ہوئی کہ اس میں کسی کو لکھنے پر آمادہ کرنے کا خاص ہنر ہے۔ وہ کم نام سے کم نام لکھنے والے کے خط کا جواب اپنے ہاتھ سے تحریر کرتا، اس کی ہمت بڑھاتا۔ وہ اگر ایک آدھ تحریر کے بعد خاموشی اختیار کر لیتا تو شاہد بار بار اصرار کرتا یہاں تک کہ وہ لکھنے پر مجبور ہو جاتا۔ یہ صلاحیت "نگار" کے نیاز فتح پوری میں بھی تھی لیکن شاہد اور نیاز فتح پوری میں فرق یہ تھا کہ نیاز کسی مضمون کو چھاپتے وقت اس میں اتنی اصلاح کر دیا کرتے تھے کہ مضمون کا حُلیہ ہی بگڑ جاتا تھا اور بعض اوقات لکھنے والے کی انا کو ٹھیس لگتی تھی۔ اس کے برخلاف شاہد کا خیال تھا کہ ایڈیٹر، اسکول ماسٹر نہیں ہوتا جو کاپیاں جانچتا ہے۔ وہ کتر بیونت کا قائل نہیں تھا۔ وہ یا تو مضمون واپس کر دیتا یا اگر چھاپتا تو جوں کا توں۔ نئے لکھنے والوں کے لیے یہ بڑا اعزاز تھا۔ لہٰذا جو ساقی

سے وابستہ ہو جاتا' اس کا دامن چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوتا۔

کھاری باؤلی کی تنگ گلیوں کو پار کرنے کے بعد جو بھی ساقی کے دفتر میں پہنچتا شاہد کی سادگی کو دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ وہ سوچ کر تو یہ آتا کہ ساقی کا ایڈیٹر ہے' خاندانی رئیس ہے' نہایت شاندار کپڑوں میں' میز کرسی پر بیٹھا کچھ لکھ رہا ہو گا لیکن جب وہ یہ دیکھتا کہ ایک آدمی تہمد پر بنیان پہنے' منہ میں بیڑی دبائے' زمین پر بیٹھا اپنے کام میں مصروف ہے تو آنے والا خود اس سے پوچھتا' شاہد صاحب کہاں ملیں گے۔ شاہد کہتا' فرمایئے' میں ہی شاہد ہوں۔ آنے والا کہتا' ساقی کے ایڈیٹر شاہد احمد دہلوی سے ملاقات منظور ہے۔ وہ کہتا' میں ہی ہوں ساقی کا ایڈیٹر۔

شاہد نے اپنی زندگی' مال و دولت' آرام و سکون سب چیزیں ساقی کے لیے وقف کر دی تھیں۔ دیکھتے دیکھتے ساقی کا شمار ملک کے صفِ اوّل کے ادبی ماہناموں میں ہونے لگا۔ شاید ہی کوئی تعلیم یافتہ اردو داں خاندان ایسا ہو جہاں ساقی' ذوق و شوق سے نہ پڑھا جاتا ہو۔ ساقی کے انتظار میں آنکھیں جاگنے لگیں۔ پہلی تاریخ ہوئی نہیں کہ ڈاکیے سے پوچھ گچھ شروع ہو گئی۔ ہر لکھنے والا ساقی میں چھپنا باعثِ فخر سمجھنے لگا۔ نئے لکھنے والوں کی جیسی پذیرائی شاہد کر رہا تھا' کسی نے نہیں کی ہو گی۔ تھوڑے ہی دن میں شاہد احمد' ادیب گر کہلانے لگا۔ یہ رسالہ ایک ادارہ بن گیا تھا جو ادب کی خدمت بھی کر رہا تھا' ادیبوں کی بھی۔ اسی قدر دانی نے ساقی کے ذریعے اردو ادب کو کئی بلند پایہ ادیب دیے۔ شاعر' افسانہ نویس' ناول نگار' نقاد۔ اور صرف مسلمان ہی نہیں۔ ہندو' سکھ' عیسائی بھی۔ یہ زبان کی بڑی خدمت تھی جو ساقی نے انجام دی۔

ادیبوں سے شاہد کے مراسم کاروباری ضرور تھے لیکن وہ آڑے وقتوں میں ان کے کام بھی اتنا آیا کہ اس کی خدمات سے انکار نہیں ہو سکتا۔ ان کی کتابیں شائع کرنے میں مدد دی' وقت پر رائلٹی ادا کی' پیشگی رقم ادا کر کے مسودے خریدے' یہ سوچے بغیر کہ مسودے شائع بھی ہو سکیں گے یا نہیں۔

ساقی برابر عروج کی جانب گامزن تھا کہ ایک روز ایک کتاب تبصرے کے لیے "ساقی" میں آئی۔ یہ کتاب امتیاز علی تاج کا ڈرامہ "انار کلی" تھا۔ حسبِ دستور اس کتاب کو ساقی کے دفتر میں با آواز بلند پڑھا گیا۔ اس پر تبادلۂ خیال ہوا اور یہ طے پایا کہ کتاب پر سخت تنقید کی جائے گی۔

سب نے اپنی رائے پیش کی اور ان سب خیالات کو ساقی میں شائع کر دیا گیا۔ لاہور کی ادبی محفلوں میں ہلچل مچ گئی۔ اس مضمون کی بعض باتیں اتنی ناگوار گزریں کہ تاج کے دوستوں نے نیرنگِ خیال میں "نیاز مندانِ لاہور" کے نام سے اس مضمون کا جواب لکھا۔ شاہد کا نام آئے اور ڈپٹی نذیر کا ذکر نہ ہو' یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ یہاں تک لکھ دیا گیا کہ ڈپٹی نذیر احمد پگڑی والی تصویر میں کان میلیے لگتے ہیں۔ ادھر سے بھی جواب دیا گیا۔ شاہد کے چچا زاد بھائی افضل حسین ہر فن مولا تھے۔ فقرے باز ایسے کہ روتے کو ہنسا دیں۔ ایسی پھبتی کستے تھے کہ دوسرے کو جواب نہیں سوجھتا تھا۔ طے ہوا کہ جب یہ بحث مزاحیہ رخ اختیار کر ہی گئی ہے تو اس کا جواب افضل حسین یعنی بائی جی دیں گے۔ افضل حسین نے مضحک دہلوی کا قلمی نام اختیار کیا اور مضمون لکھ مارا۔ اور جب انہوں نے نیاز مندانِ لاہور کو "شلوارانِ ادب" کہہ کر خطاب کیا تو لوگوں کو ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔ بحث میں اچانک گرمی آ گئی۔ جواب الجواب کا ایسا سلسلہ چلا کہ مہینوں گزر گئے ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ یہ بحث اتنی دلچسپ تھی کہ ساقی کی اشاعت قابلِ رشک حد تک بڑھ گئی۔ ساقی کا نام پورے ملک میں متعارف ہو گیا۔

اس واقعے کے بعد شاہد کا یہ کردار بھی واضح ہوا کہ وہ نڈر اور بے باک ہے۔ نیرنگِ خیال جیسے رسالے سے ٹکر لینا اس بات کا بین ثبوت تھا۔ دوسرے رسالے جن مضامین کو چھاپتے ہوئے تکلف کرتے تھے' وہ مضامین ساقی میں چھپ جایا کرتے۔ یا کم از کم ادیبوں کو یہ اعتبار ہو گیا کہ گرم سے گرم بحث کا آغاز ساقی میں کیا جا سکتا ہے۔

ماہر القادری نے مرزا یاس یگانہ چنگیزی کی شاعری پر طویل تنقیدی مضمون لکھا تھا۔ مرزا یگانہ کا بڑا نام تھا۔ اس مضمون کو چھاپنے پر کوئی رسالہ تیار نہیں تھا۔ یگانہ کے مزاج سے بھی لوگ خوف زدہ رہتے تھے۔ ماہر نے یہ مضمون ساقی کے نام روانہ کر دیا۔ شاہد نے ان کے خط کا جواب دیتے ہوئے لکھا کہ ساقی میں آپ کی تنقید ضرور چھپے گی۔ تیس صفحوں کا یہ مضمون ساقی کی ایک ہی اشاعت میں چھپا۔ ردِعمل توقع کے مطابق ہوا۔ یگانہ نے نہایت سخت خط لکھا۔ شاہد نے وہ خط بھی چھاپ دیا۔

غرض یہ کہ شاہد نے ساقی کے ابتدائی دنوں ہی میں اتنے معرکے لڑے اور سرخرو رہا کہ ساقی کی شہرت نے اس دور کے بڑے بڑے پرچوں کو شرما دیا۔

ساقی ہر ماہ آب و تاب سے شائع ہوتا رہا۔ اس شہرت و مقبولیت کے باوجود صرف تین سال میں پچیس ہزار روپے کا گھاٹا ہوا۔ اس نے اب تک غور ہی نہیں کیا تھا کہ ساقی کی آمدنی کیا ہے' خرچ کیا ہے لیکن جب حساب کیا تو اس کی چڑیاں اُڑ گئیں۔ کاغذ وغیرہ کے واجبات ادا کرنے کے بعد بینک میں پانچ سو سے زیادہ نہیں بچ رہے تھے۔ اسے یقین ہو گیا کہ اب ساقی بند کرنا پڑے گا۔ یہ نقصان اس کے بڑے بھائی مُنِّدر سے بھی چھپا نہ رہ سکا۔

"میاں یہ زائد خرچ کس طرح پورا ہو گا" ایک دن بڑے بھائی نے پوچھا۔

"جب تک میرے ترکے کی رقم میں ایک پیسہ بھی باقی ہے' میں یہ رسالہ نکالتا رہوں گا۔"

"لیکن یہ کیا عقل مندی ہے۔ اس مشغلے سے سوائے نقصان کے اور کچھ حاصل نہ ہو گا۔ کب تک اس کو چلاؤ گے۔"

"آپ بھی تو شکار پر خرچ کرتے ہیں۔ وہ آپ کا شوق ہے' یہ میرا شوق ہے۔" شاہد نے آنکھیں نیچی کر کے جواب دیا۔

"آج تک تم نے اس طرح جواب نہیں دیا' یہ آج تمہیں کیا ہو گیا ہے۔"

"میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی مجھے ساقی بند کرنے کو کہے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ یہ پاس بک اور چیک بک پکڑو۔ تم جانو' تمہارا کام جانے۔"

یہ بات تھی ہی ایسی کہ وہ افسردہ ہو گیا۔ ایک طرف تو نقصان کا دکھ' دوسری طرف بڑے بھائی کی خفگی کا غم' شام کو انصار ناصری اور فضل حق آئے تو وہ سخت غمگین بیٹھا تھا۔

"خیر تو ہے' کیا اب پھر کوئی معرکہ درپیش ہے۔"

"معرکہ ہوتا تو اداس کیوں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ غصے میں ہوتا۔"

"پھر کیا بات ہے۔"

"ساقی کے بند ہونے کا وقت آ گیا ہے۔"

"کھل کر بات کیجئے' ایسی کیا بات ہو گئی۔"

"بات کیا ہوتی' مسلسل گھاٹا ہو رہا ہے۔ اب تو کوئی پانچ سو روپے بچے ہیں۔"

"یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ساقی میں نقصان ہو۔" فضل حق نے کہا۔

"نقصان ہو رہا ہے' آپ کہہ رہے ہیں ممکن نہیں۔"

"آپ حساب کتاب خود سنبھالیے' یہ سارا روپیا خرد برد ہوا ہے۔"

بات سمجھ میں آتی تھی۔ شاہد کا یہ مزاج نہیں تھا لیکن اب آمدنی اور اخراجات کا حساب اس نے اپنے پاس رکھنا شروع کر دیا۔ فضل حق کی بات درست ثابت ہوئی۔ پانچ سو روپے کی قلیل رقم سے نہ صرف رسالہ نکلتا رہا بلکہ اسی کی لوٹ پھیر میں اس نے کتابوں کی اشاعت کا کام شروع کر دیا۔ ساقی رسالے کے ساتھ ساتھ ساقی بک ڈپو بھی وجود میں آ گیا۔ نہ صرف نقصان سے نجات مل گئی بلکہ ہزار پندرہ سو روپے ماہوار کی آمدنی ہونے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے روپے کی ریل پیل ہو گئی۔

ذرا فراغت ملی تو موسیقی کے شوق نے اس کے دل میں پھر گدگدی کی۔ ساقی کے دفتر میں جوں ہی شام اترتی کلرک اور کاتب اپنے اپنے گھر چلے جاتے۔ ہم ذوق جمع ہوتے۔ کچھ دیر ادبی گفتگو ہوتی۔ مغرب کی اذان کے بعد صحن میں دری بچھ جاتی۔ ناگا کی ڈیوٹی لگ جاتی۔ ہارمونیم اور طبلے کی جوڑی کسی کمرے سے نکل کر صحن میں آ جاتی۔ انصار ناصری کو طبلے سے شغف تھا' پیر ولایت حسین خمار دہلوی کو فارسی کی دو غزلیں یاد تھیں لیکن سچی بات یہ ہے کہ جسے گانا کہتے ہیں شاہد کے علاوہ کسی کو نہیں آتا تھا۔ سب اپنا اپنا شوق پورا کرتے اور پھر یہ محفل شاہد کے حوالے ہو جاتی۔ رات گئے سُر تال کی یہ محفل ختم ہوتی' دوست اپنے اپنے گھروں کو سدھارتے اور شاہد مردانے سے نکل کر زنانے کا رخ کرتا۔

شروع شروع میں بڑے بھائی کی طرف سے لاگ ڈانٹ تھی لیکن رفتہ رفتہ اس میں کمی آ گئی۔ شاہد اس وقت تک تین چار بچوں کا باپ بن چکا تھا' یہ ڈانٹ ڈپٹ آخر کب تک ہوتی۔ بھائی نے انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ لیکن ادیب اسے کہاں چھوڑنے والے تھے۔

اس کے ایک دوست وصی اشرف نے جامع مسجد کے زیرِ سایہ "کتب خانۂ علم و ادب" قائم کیا۔ اب ساقی کی محفلیں اس کتب خانے پر جمنے لگیں۔ شاہد' شام کو دوستوں کے جھرمٹ میں ساقی کے دفتر سے نکلتا اور کتب خانۂ علم و ادب پر آ کر بیٹھ جاتا۔ جامع مسجد کے میناروں تلے ستارے سے نکل آتے۔

شاہد کی باغ و بہار طبیعت نے کتابوں کی اس دکان پر باتوں کے چمن کھلا دیے۔ اس باغ کی خوشبو دور تک پھیل گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ دکان' دہلی کا ادبی مرکز بن گئی۔ ہر روز شام ہوتے ہی ساقی کے حلقے کے ادیب کشاں کشاں آ جاتے۔ اردو بازار کی اس چھوٹی سی دکان میں افسانے پڑھے جاتے' طنزیہ خاکے سنائے جاتے' تراجم پیش کیے جاتے' غزلیں اور رُباعیاں سنائی جاتیں۔ جو کچھ پڑھا جاتا اس پر فنی بحثیں ہوتیں۔ ہنسی' مذاق' قہقہے ہوتے۔ اور شاہد ان محفلوں میں میرِ محفل ہوتا۔

دلی ریڈیو اسٹیشن پر اس زمانے میں کئی دانش ور جمع ہو گئے تھے۔ چراغ حسن حسرت تھے' میراجی اور منٹو تھے' کرشن چندر تھے۔ اور یہ سب حضرات کتب خانۂ علم و ادب پر حاضری ضرور دیتے تھے۔ ساقی کا دفتر تو تنگ گلیوں میں تھا' جہاں کسی نو وارد کا پہنچنا مشکل تھا۔ شاہد سے جسے بھی ملنا ہوتا' کتب خانے پر آ کر مل لیتا۔ شہر میں جو ادیب بھی داخل ہوتا' وہ پہلے اسی کتب خانے کا طواف کرتا اور یہ سب گرم بازاری شاہد کی وجہ سے تھی۔ اس دکان کی اہمیت ہی یہ تھی کہ یہاں ساقی کا ایڈیٹر شاہد احمد دہلوی بیٹھتا ہے۔

پھر یہ ہوا کہ "ساقی" اسی دکان سے پوسٹ ہونے لگا۔ ہوتا یہ تھا کہ ساقی کے تمام مضامین کتابت کے بعد محبوب المطابع میں بھیج دیے جاتے۔ یہیں گاماں دفتری کا کارخانہ تھا۔ وہاں سے رسالہ تیار ہو کر دکان پر آ جاتا۔ دوست' احباب مل کر پیکنگ کرتے۔ باتیں ہوتی رہتیں' قہقہے برستے رہتے اور رسالہ پوسٹ ہوتا رہتا۔

شاہد نے وہ کتابیں بھی کتب خانے پر رکھ دیں جو اس نے ساقی بک ڈپو کے تحت شائع کی تھیں۔ ساقی بک ڈپو کی تمام کتابیں کتب خانۂ علم و ادب ہی سے ملا کرتی تھیں۔

کتب خانے کی یہ محفل رات دس بجے تک جاری رہتی۔ اس کے بعد کسی محفلِ موسیقی کا رخ کرتا ورنہ شاہد اپنے گھر چلا آتا۔

دفترِ ساقی میں جمنے والی محفلوں میں ہلکی پھلکی غزلوں کا دور چلتا

تھا۔ تفریح تو ہو جاتی تھی لیکن شاہد کے ذوق کو آسودگی نصیب نہیں ہو رہی تھی۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا' اصل گانا تو راگ راگنیوں کا ہے۔ دہلی میں باکمال موسیقی دانوں کی کمی نہیں تھی۔ سارنگی نواز استاد بندو خان تھے۔ چاند خان اور رمضان خان پکا گانے والوں میں مشہور تھے۔ استاد ولایت علی تھے' عثمان خاں تھے۔ طبلہ نواز اللہ دیے پکھاوجی تھے۔ ان لوگوں کے گھروں پر محفلیں جمتی تھیں جن میں باذوق لوگوں کو شرکت کا اذنِ عام تھا۔ شاہد کو پکے گانے کا شوق ہوا تو اس نے ان محفلوں کا رخ کیا۔ جب ان استادوں میں سے کسی کے ہاں محفل ہوتی تو شاہد اپنے دوستوں کے ساتھ ان محفلوں میں شریک ہوتا۔ دوستوں میں سے کسی کو بھی پکے راگوں سے کوئی سروکار نہیں تھا لیکن شاہد کچھ اور ہی سوچے ہوئے تھا۔

گلی تان رس کے ایک مکان میں داخل ہوتے وقت' شاہد کو یقین نہیں تھا کہ استاد چاند خاں اسے اپنی شاگردی میں قبول کر ہی لیں گے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے' وہ انکار کر دیں۔ وہ سوچ رہا تھا لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ان گانے والوں کی روٹی روزی نوابوں اور رئیسوں کے دم ہی سے قائم ہے۔ جب سے شاہی دربار ختم ہوئے ہیں' نوابوں اور رئیسوں کے وظیفے ہی تو ان گویّوں کا سہارا ہیں۔ وہ بھی خود کو رئیس ہی سمجھتا تھا۔ اس کے پاس خدا کا دیا اتنا تو تھا ہی کہ وہ اپنے اس شوق کے حصول کے لیے اس کا کچھ حصہ اپنے استاد کی نذر کر سکے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ چاند خان کے لیے وہ اجنبی نہیں ہے۔ چاند خاں اس کے خاندان کو بھی جانتے ہیں' اور اس کے شوق کے بھی قائل ہیں۔ کئی محفلوں میں وہ اسے دیکھ اور سن چکے ہیں۔ انہی دونوں باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے اسے امید تھی کہ آج وہ ناکام نہیں لوٹے گا۔

اس کے لیے یہ گھر' یہ کمرہ اجنبی نہیں تھا۔ فرش پر بچھی چاندنی اور دری بھی وہی تھی' گاؤ تکیے بھی وہی تھے' اگالدان بھی اسی طرح رکھے ہوئے تھے۔ اپنی مخصوص نشست پر چاند خاں ریاض میں مصروف تھے۔ آنکھیں بند کیے وہ کسی اور ہی دنیا میں پہنچے ہوئے تھے۔ طبلے والے نے آنکھوں ہی آنکھوں میں شاہد کو سلام کیا۔ وہ ان گھرانوں کے آداب سے واقف تھا۔ اس نے شیروانی کے دامن کو سمیٹا اور خاموشی سے بیٹھ گیا۔

چاند خاں موسیقی کے بولوں میں الجھے ہوئے تھے۔ تیز لے کا گانا تھا۔ چاند خاں راگ کی چال کو بڑی خوبصورتی سے چلا رہے تھے۔

تم چتر سگر بیاں
پکڑت ہو بلما رے
وہ تو نویلی نار' کیا جانے ہت کی سار۔ گنوار
چتر سگر بیاں پکڑت ہو سار

کئی منٹ گزر گئے۔ وہ سانس روکے بیٹھا تھا۔ چاند خاں تانوں کی لگاوٹ کے عجیب عجیب انداز بنا رہے تھے۔ کئی مرتبہ شاہد کا جی چاہا کہ چاند خاں کو ان کے فن پر داد دے لیکن چھوٹا منہ بڑی بات سمجھ کر چپ رہا۔

چاند خان نے گاتے گاتے آنکھیں کھولیں' شاہد پر نگاہ پڑتے ہی وہ آنکھوں آنکھوں میں مسکرائے۔

"شاہد صاحب' یہ راگ کیدارا ہے۔ چاندنی اور محبوب کی شکایت کا راگ۔" چاند خاں نے ریاض ختم کرتے ہوئے کہا۔

"آپ ریاض جاری رکھیں' میں بیٹھا ہوا ہوں۔"

"بھئی ریاض کا وقت تو ختم ہوا۔ اب آپ سنائیں اس وقت کیسے آنا ہوا۔"

"مجھے میری غرض یہاں کھینچ لائی ہے۔ آپ کو معلوم ہی ہے مجھے گانے کا شوق ہے۔ اب تک غزلیں گاتا رہا ہوں۔ کچھ عرصے پنڈت لکشمن پرشاد کی خدمت کا موقع بھی ملا ہے۔"

"جی ہاں' مجھے سب معلوم ہے۔ آپ جیسے قدر دانوں کے دم ہی سے تو گن چرچا کی محفلیں آباد ہیں۔"

"خانصاحب! اب میں چاہتا ہوں' آپ کی انگلی تھام کر راگوں کی سیر کے لیے نکل پڑوں۔ مسلمانوں کا وہ ورثہ جو کلاسیکل موسیقی کہلاتا ہے اور جس کے آپ امین ہیں' اس کا کچھ حصہ آپ مجھے دے دیں۔" شاہد نے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ آپ کو معلوم ہے ہم بڑے بخیل لوگ ہوتے ہیں۔ خاص طور پر عطائیوں کو وہ کچھ نہیں بتاتے جو کچھ ہم جانتے ہیں۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ گویّوں کا خاندانی علم کسی اور کو منتقل ہو۔"

"خانصاحب! اتنا تو میں جانتا ہوں لیکن یہ بھی مجھے معلوم ہے کہ جتنی مجھ میں صلاحیت ہوگی اتنا علم حاصل کر لوں گا اور یہ بھی امید ہے کہ آپ میرے لیے بخیل ثابت نہیں ہوں گے۔"

"شاہد صاحب' ایک بات اور ہے۔ آپ بہت مصروف آدمی ہیں۔ آپ کی ادبی مصروفیات ہیں' آپ وقت نہیں نکال سکیں گے۔"

"خانصاحب" میں وقت نکال لوں گا' بس آپ میری درخواست قبول کر لیں۔"

شاہد نے اسی وقت بازار سے پان اور بتاشے منگائے۔ پانوں پر ایک سوا ایک روپے رکھ کر بتاشوں کے ساتھ چاند خاں کی خدمت میں پیش کیے۔ چاند خاں نے قبول کیے۔ اس کا مطلب تھا' شاگردی استادی کا تعلق قائم ہو گیا۔

دلی میں موسیقی کے برتاؤ کے دو معروف گھرانے تھے۔ ایک تو دلی کے گائکوں کا گھرانا تھا جس میں تان رس خاں اور ممن خاں جیسے گائیک پیدا ہوئے۔ استاد چاند خاں اسی گھرانے کے تھے۔ دوسرا گھرانا غیر مسلم گائیکوں کا تھا۔ لکشمن پرشاد اسی اسٹائل کے نمائندے تھے۔

شاہد نے لکشمن پرشاد سے بھی کسب فیض کیا تھا اور اب وہ

چاند خاں کے دروازے پر کھڑا تھا۔

جب شاہد کی توجہ پکے گانے کی طرف مبذول ہوئی تو ساقی کے دفتر میں شام کے وقت موسیقی کی محفلیں بالکل ختم ہوگئیں۔ وہ رات کا کھانا ذرا جلدی کھالیتا اور استاد چاند خاں کے ہاں چلا جاتا اور گیارہ بارہ بجے تک چاند خاں کے ریاض میں مشغول رہتا۔

کلاسیکی موسیقی پر عبور حاصل کرنا ہنسی مذاق نہیں اور پھر اس حالت میں کہ دن بھر وہ ساقی کے کام میں مصروف رہتا۔ لیکن یہ اس کا ذوق اور محنت ہی تھی کہ خود چاند خاں اس کے معترف ہوتے چلے گئے۔

اس کی بیوی ابھی تک بیمار تھی۔ ساقی اور موسیقی کی مصروفیات سے جو وقت بچ رہتا' وہ بیوی کی تیمارداری میں صرف ہوتا۔ ناسور کی ڈریسنگ اسے روز کرنا پڑتی تھی۔ کسی نے اسے بتایا کہ حیدرآباد میں کوئی سادھو ہے جو پہاڑوں میں رہتا ہے' اس ناسور کا علاج وہی کرسکتا ہے۔ وہ اپنی بیوی کو حیدرآباد لے گیا۔ سادھو کو دکھایا' اس نے دوا بھی دی لیکن فائدے کی بجائے الٹا نقصان ہی ہوا۔

اسے جہاں امید نظر آئی' اس نے جگنو کی طرح اس روشنی کو مٹھی میں بند کرنا چاہا لیکن کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔ ناسور کا زہر پھیلتا چلا گیا اور ایک دن وہ بدنصیب عورت چودہ سال تک اذیت اٹھانے کے بعد نصف درجن بچوں کو چھوڑ کر اس دنیا سے چلی گئی۔ یہ وقت شاہد کے لیے بے حد نازک تھا۔ اس کی مصروفیات ایسی تھیں کہ وقت ملتا ہی نہیں تھا۔ بیوی جیسی بھی تھی' بچوں کی دیکھ بھال کے لیے موجود تو تھی لیکن اب وہ نہیں رہی تو بچے بالکل اکیلے رہ گئے۔ بالآخر یہی طے ہوا کہ وہ شادی کرلے۔ اپنی بڑی سالی کی بیٹی عاصمہ بیگم سے اس نے شادی کرلی۔

زندگی جب ذرا ٹھکانے پر آئی' وہ ایک مرتبہ پھر ادب اور موسیقی کی دنیا میں لوٹ گیا۔

یہ دور اس کی زندگی کا شاندار دور تھا۔ رسالے اور ساقی بک ڈپو کی مطبوعات سے اچھی خاصی آمدنی ہورہی تھی۔ عزت و شہرت کے اعتبار سے بھی یہ اس کا دور عروج تھا۔ اگر ایک طرف شاعر' ادیبوں میں اس کی قدر افزائی تھی تو دوسری طرف بڑے بڑے گانے والے اس کے فن کے قائل ہوتے جارہے تھے۔ وہ موسیقی کی تعلیم میراثیوں کی طرح حاصل نہیں کررہا تھا بلکہ طالب علم کی طرح سیکھ رہا تھا۔ اس نے اس موضوع پر سیکھنے کے ساتھ ساتھ اتنا لٹریچر پڑھ لیا تھا کہ باریکیاں اس کی نظروں سے پوشیدہ نہیں تھیں۔ میراثی صرف موسیقی سے واقف ہوتے ہیں' وہ علم موسیقی سے واقف ہوگیا تھا۔ جب بھی وہ گن چرچا کی کسی محفل میں بیٹھتا' میاں تان سین' نایک گوپال' سدا رنگ نعمت خاں کی بندشوں پر اس طرح بات کرتا کہ اس کا قائل ہونا پڑتا۔ بڑے بڑے گویے جب کہیں اٹکتے تو اس کے پاس آتے۔ یہ دوسرے بہت سوں کے لیے اس لیے تعجب کی بات تھی کہ اس کا تعلق موسیقی کے کسی گھرانے سے نہیں تھا۔ اور جب استاد بندو خان نے 'اندور سے دلی خط لکھ کر اپنے بیٹے امراؤ بندو خان کو بتایا کہ "شاہد احمد اب ہم میں سے ہے۔" تو یہ اعزاز اس کے لیے ایسا ہی تھا جیسے کسی کو تمغائے حسنِ کارکردگی مل جائے۔

چاند خاں کی نظروں میں اس کا اعتبار ایسا بڑھا کہ تربیت کے لیے اپنے بھانجے امراؤ بندو خاں کو اس کے حوالے کردیا۔

"اب آپ امراؤ بندو کی دیکھ بھال کریں اور اسے ریاض کرائیں۔" استاد چاند خاں نے کہا۔

ایک خاندانی گویا' اپنے گھرانے کے بچے کو ایک عطائی کے حوالے کررہا تھا۔ یہ کم اعزاز تھا؟

امراؤ بندو خاں صبح 9 بجے شاہد کے گھر پہنچ جاتا اور دوپہر تک دونوں مل کر ریاض کرتے۔ پھر یہ ساتھ ایسا قائم ہوا کہ شاہد اگر کسی سفر پر بھی جاتا تو امراؤ بندو اس کے ساتھ ہوتا۔

اس عرصے میں شاہد کی شہرت بطور ماہر موسیقی پھیلنے لگی تھی۔

اس کا فن چھوٹی بڑی محفلوں سے گزر کر آل انڈیا ریڈیو تک پہنچ گیا۔ اسے ایک پروگرام دیا گیا جس میں مختلف تانوں کا تعارف اس طرح کرانا تھا کہ گا کر بھی بتایا جائے۔ یہ کام اتنا مشکل تھا کہ معمولی گانے والے کے بس کا روگ تھا ہی نہیں کیونکہ مختلف قسم کی تانوں میں اتنا باریک فرق ہوتا ہے کہ ذرا سی لغزش بدنامی کا باعث بن سکتی تھی۔

شاہد نے اس پروگرام کو اس طرح ترتیب دیا کہ وہ خود تو "تان" کا تعارف کراتا اور امراؤ بندو خاں اسے گا کر بتاتے۔

ان تانوں کا اس نے اس خوبصورتی سے تعارف کرایا اور ان کے فرق کو اس طرح واضح کیا کہ بڑے بڑے موسیقار اس کا لوہا مان گئے۔

اب تو یہ حال ہوا کہ ہوا کے دوش پر اس کا نام اور کام نشر ہوتے ہی اسے استادی کا درجہ حاصل ہوگیا۔ جب بھی کوئی معروف گویا دلی آتا' شاہد کے گھر ضرور آتا اور گانے کی محفل گرم ہوتی۔ دلی کے مشہور گلوکار اور سازکار روز ہی اس کے گھر یا ساقی کے دفتر میں محفل جماتے۔ طبلہ نواز' ستار نواز' دھرپد اور خیال گانے والے' بین کار' سرود نواز۔ کون تھا جو اس کے شیدائیوں میں نہیں تھا۔ استاد عبدالوحید خان' رجب خاں' استاد عظمت حسین خان آگرے والے' چھوٹے غلام علی' بڑے غلام علی سب ہی ان محفلوں میں شریک ہوتے اور گھنٹوں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے۔ یہ محفلیں شاہد کے دم سے آباد تھیں۔ وہ پرانے وقتوں کے رئیسوں کا کردار ادا کررہا تھا جن کے دسترخوان پر فنونِ لطیفہ پروان چڑھتے تھے۔

"نئی شادی کی ذمے داریاں' بچوں کا ساتھ' ادب کے بکھیڑے لیکن اس نے ایسا بھاری پتھر اٹھایا تھا کہ جو دیکھتا تھا اس کی ہمت کی

داد دیتا تھا۔

اپنے اس شوق کی وجہ سے وہ بیوی سے دور ہو گیا تھا۔ عاصمہ کو ادب و شعر سے تو کچھ سروکار تھا بھی لیکن موسیقی کی دنیا اس کے لیے اجنبی تھی۔ وہ سُر، تال اور لے کی باتیں کرتا اور عاصمہ کو جماہیاں آنے لگتیں۔ یہ صورتِ حال اس کے لیے کچھ زیادہ مناسب نہیں تھی۔ اس نے بیوی کو اپنا ہم مذاق بنانے کے لیے اسے میوزک اسکول میں داخل کرا دیا۔ یہ بھی ایک ایسی جسارت تھی جو اس خاندان میں کسی اور نے نہیں کی تھی۔ اس زمانے میں کتنی مسلمان لڑکیاں تھیں جو اسکول جاتی تھیں اور وہ بھی میوزک سیکھنے۔ یہ سب وہ موسیقی کے عشق میں کر رہا تھا۔ اس لیے کر رہا تھا کہ گھر میں بھی کوئی تو ایسا ہو جس سے وہ موسیقی کی باتیں کر سکے۔

عاصمہ اسکول جاتی تو برابر رہی لیکن یہ کام اس کے بس کا تھا نہیں۔ تنگ آ کے گانے کو خیرباد کہہ دیا۔ شاہد نے سوچا، اگر گانا نہیں تو کوئی ساز ہی انہیں سکھوا دیا جائے۔ ایک روز وہ ایک ہندو استاد کو پکڑ کر گھر لے آیا۔

"یہ ٹیک چند ہیں۔ بہت اچھے استاد ہیں، تمہیں ستار سکھایا کریں گے۔" شاہد نے عاصمہ سے کہا۔

"ایک مرتبہ آپ میرا حشر دیکھ چکے۔ یہ چیزیں میرے بس کی نہیں۔"

"یہ ساز بہت شریفانہ ہے، محفل میں بیٹھ کر بھی بجایا جا سکتا ہے۔"

"لیکن اس وقت جب مجھ میں سیکھنے کی صلاحیت بھی ہو۔"

"دیکھو بیگم!" شاہد ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ "ان ماسٹر صاحب کو ماسٹر بشیر لے کر آئے ہیں۔ کہتے ہیں آج کل بے روزگار ہے، اس کے کچھ پیسے بن جائیں گے۔ اب اس فن کے قدر دان ہی کتنے رہ گئے ہیں۔ اگر ہم بھی ان کی مدد نہیں کریں گے تو کون کرے گا۔ تمہاری ٹیوشن انہیں مل جائے گی، ان کا کچھ بھلا ہو جائے گا۔ سیکھ گئیں تو سبحان اللہ ورنہ اگر ہم کسی قابل ہیں تو ماسٹر ٹیک چند کی کچھ مدد ہی ہو جائے گی۔"

اب عاصمہ کے پاس انکار کا کوئی جواز نہیں رہ گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور نہایت ادب سے ماسٹر ٹیک چند کو آداب کر کے ان کے سامنے بیٹھ گئی۔

وہ ادیبوں کے ساتھ بھی یہی کر رہا تھا۔ جس کو پیسوں کی ضرورت ہوتی، اپنا مسودہ اس کے حوالے کر دیتا۔ اب چاہے وہ کتاب چھپے یا نہ چھپے، بکے نہ بکے۔ کتنے ہی مسودے ایسے تھے جن کے چھپنے کی نوبت کبھی نہیں آئی، جب کہ شاہد نے جیب سے ان کی قیمت ادا کی تھی۔ کتنے ہی ادیب و شاعر ایسے تھے جن کا اس نے خیال رکھا اور ان کے مرنے کے بعد ان کے لواحقین کی مدد کی۔

موسیقی کا شوق ہوا تو کتنے ہی ماسٹر بشیر اور ماسٹر ٹیک چند اس کے دامن سے وابستہ ہو گئے۔ اس کی یہی دریا دلی تھی کہ وہ دونوں جگہ یکساں مقبول تھا لیکن یہ دریا دلی چند اصولوں میں محدود تھی۔ اگر کوئی ان اصولوں سے انحراف کرتا تو وہ بے دردی کی حد تک بے مروت بن جاتا تھا۔ اس کا تجربہ ایک روز اختر شیرانی کو ہوا۔

اختر شیرانی کسی ریڈیو پروگرام کے سلسلے میں دلی آئے ہوئے تھے۔ سخت نشے کی حالت میں ن۔ م۔ راشد کو مل گئے۔

"چلو، مجھے شاہد احمد دہلوی کے گھر لے چلو۔ پرانا دولت ہے، کچھ گپ شپ کریں گے۔" اختر شیرانی نے ن۔ م۔ راشد سے کہا۔

"آپ کے دوست ہیں؟"

"ارے بھئی، بہت گہرے"

"تو پھر چلتے ہیں۔"

راشد انہیں لے کر شاہد کے گھر پہنچ گئے۔ شاہد دروازے پر آئے۔

"اختر شیرانی آپ سے ملنے آئے ہیں۔"

ابھی راشد نے اتنا ہی کہا تھا کہ اختر بیچ میں بول پڑے۔

"ارے یار شاہد، فوری ضرورت نکل آئی ہے۔ کچھ رقم ہو تو دے دو۔"

شاہد نے اس کی طرف اس طرح دیکھا جیسے کوئی آدمی نہیں مجسم گالی اس کے سامنے کھڑی ہو۔

"میں تمہیں جانتا نہیں، تم میرے رسالے کے مضمون نگار تک نہیں۔ عمر بھر میں آج تم میرے سامنے آئے ہو۔ تم کس برتے پر مجھ سے قرض مانگ رہے ہو۔"

"کیا کہا؟ تم اختر شیرانی کو نہیں جانتے۔ اتنا بڑا رسالہ چلاتے ہو اور اختر شیرانی کو نہیں جانتے۔" اختر کا نشہ گہرا ہو گیا۔

"جانتا ہوں مگر اتنا نہیں جانتا کہ آپ مجھے ارے یار شاہد کہہ کر مخاطب کریں۔"

"چلو، کچھ کہہ کر مخاطب نہیں کرتا۔ میں تو قرض مانگنے آیا ہوں۔ قرض دے دو۔"

"آپ نے جس زبردستی کا مجھے دوست بنایا ہے اور جس بے تکلفی کا مظاہرہ کیا ہے، اس کے بعد میں کوئی رقم آپ کو نہیں دے سکتا۔" شاہد نے نہایت اطمینان سے جواب دیا اور خاموشی سے دروازہ بند کر لیا۔

یہ دروازے سب کے لیے بند نہیں ہوتے تھے۔ اس کا گھر تو ادیبوں کا ہاسٹل بنا ہوا تھا۔ جو ادیب دہلی آتا ساقی کے دفتر میں ٹھہرتا۔ وہ ان کا خرچ برداشت کرتا اور ان سے افسانے، مضامین لکھواتا۔ لیکن جب کوئی اس سے منافقت کرتا، ہوشیاری دکھاتا تو اس کے اندر ایک نہایت غصہ ور آدمی بھی چھپا ہوا تھا۔

اس کا کمال یہ تھا کہ وہ موسیقی کا زبردست پارکھ ہونے کے باوجود ادب اور ادیبوں سے کنارہ کش نہ ہو سکا۔ ادب کی ایک ایک تحریک میں شامل ہوتا رہا۔

وہ اپنی تمام تر وضع داریوں اور روایت پرستیوں کے باوجود اپنے رویوں میں ترقی پسند تھا۔ وہ ایک سمندر تھا جس میں ہزار طرح کی دنیائیں آباد ہوتی ہیں۔ وہ بہ یک وقت روایت کی پاسبانی اور جدت کی سربراہی کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ کلاسیکی موسیقی کے روایتی ورثے کی حفاظت کر رہا تھا لیکن دوسری طرف ادب میں رائج ہونے والی ہر جدید تحریک میں شامل بھی ہو رہا تھا۔

ترقی پسند ادب کی گونج سنائی دی تو اس نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر نہ صرف اسے قبول کیا بلکہ اس تحریک کے ہراول دستے میں شمار ہوا۔ اس کی کوششوں سے اس تحریک نے دلی میں جگہ بنائی۔

اس کی کوششوں سے ترقی پسند ادیبوں کی ایک میٹنگ بلائی گئی۔ یہ اجتماع چاندنی چوک میں ڈاکٹر شوکت اللہ انصاری کے مطب میں ہوا۔ شاہد اس دن ایسا خوش تھا جیسے اس کی کوشش سے ادب ایک نئی کروٹ بدلنے والا ہے۔ اس اجلاس میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی دہلی شاخ کا قیام عمل میں آیا۔ شاہد کو جنرل سیکریٹری کی ذمے داری سونپی گئی اور اس نے یہ سوچے بغیر کہ اس عہدے سے اس کا کاروبار متاثر ہو سکتا ہے، غیر ترقی پسند ادیب اس کے خلاف ہو سکتے ہیں، اس ذمے داری کو قبول کیا۔

اس انجمن کا پہلا باقاعدہ اجلاس کوچہ چیلان میں رازق الخیری مدیر "عصمت" کے مکان پر ہوا۔ شاہد نے تحریک پیش کی کہ آئندہ جلسوں میں شعرا اور ادیب تخلیقات پیش کریں گے اور حاضرین کو تنقید کی دعوت دی جایا کرے گی۔

ایک عرصے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ شاہد کی نگرانی میں ایک رسالہ "شاہ جہاں" بھی شائع ہوتا تھا۔ شاہد نے اس رسالے کو تحریک کی نشر و اشاعت کے لیے مخصوص کر دیا۔ جلسوں کی کارروائی اور پڑھی جانے والی تحریروں کا انتخاب باقاعدگی سے اس رسالے میں شائع ہو رہا تھا اور اس طرح پورے ملک کو اس تحریک کے تدریجی مراحل سے واقف رکھا جا رہا تھا۔

اس تحریک کے کوئی سیاسی مقاصد نہیں تھے لیکن ہندوستان کی سیاسی فضا مکدر تھی، زبان اور قلم پر پہرے لگے ہوئے تھے۔ اس ماحول میں اس تحریک اور دلی میں شاہد احمد کو حکومت نے شک کی نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ سی آئی ڈی کے سفید پوش شاہد کی نگرانی پر مامور ہو گئے۔ وہ جہاں بھی جاتا، کوئی نہ کوئی اہلکار اس کے ساتھ لگا رہتا۔ وہ ان پابندیوں سے تنگ آ چکا تھا۔

ایک روز موسیقی کا کوئی پروگرام کرنے کے لیے وہ ریڈیو اسٹیشن کی عمارت میں داخل ہو رہا تھا کہ اسے ایک آدمی پر شک ہوا۔ وہ اسے پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ تو موصوف ہماری نگرانی کر رہے ہیں۔

"ادھر آیئے۔" شاہد نے اسے حکم دیا۔

"جی شاہد صاحب۔"

"اپنے محکمے والوں سے کہیے، اس طرح اپنے آدمیوں کو کب تک پریشان کرتے رہیں گے۔ ہم سے لکھ کر پوچھ لیا کریں کہ ہمارا جلسہ کب اور کہاں ہو گا۔ کئی جلسے ہو بھی گئے اور آپ کو خبر بھی نہ ہو سکی۔ بڑا رحم آتا ہے آپ پر اور آپ کے محکمے پر۔"

وہ شخص حیرانی سے شاہد کو دیکھ رہا تھا۔ سوچ رہا ہو گا کیا جی دار آدمی ہے۔ یہ بھی سوچ رہا ہو گا کہ کچھ کھسکا ہوا ہے۔

"شاہد صاحب' ہم تو خود بڑے پریشان ہیں۔ آپ ایسا کیجئے' ہمارے محکمے کو اسی مضمون کا ایک مراسلہ بھیج دیجیے جو باتیں آپ نے مجھ سے کہیں۔ ہماری جان چھوٹ جائے گی۔"

"چلو ہم ہی لکھ دیں گے۔ اب تم جاؤ۔" شاہد نے اتنے اطمینان سے کہا جیسے کسی بچے کو بہلا رہا ہو۔

شاہد نے دفتر پہنچتے ہی سی آئی ڈی آفس کو مراسلہ بھیج دیا کہ آئندہ سے جس دن ہمارا جلسہ ہوگا' ہم تاریخ' وقت اور مقام کی پیشگی اطلاع خود کردیا کریں گے۔ ایک نمائندہ آپ علی الاعلان بھیج دیا کریں۔ ہماری تحریک خالص ادبی تحریک ہے' کوئی سیاسی تنظیم یا دہشت پسندوں کی ٹولی نہیں۔

اس کے بعد سے سی آئی ڈی کا ایک نمائندہ باقاعدہ ان جلسوں میں شریک ہونے لگا۔ ایک عرصے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ ان پابندیوں کے باوجود شاہد نے انجمن کی سرپرستی نہیں چھوڑی۔ اسے طرح طرح سے پریشان کیا جانے لگا' مقدمات قائم کیے گئے لیکن وہ سمجھتا تھا کہ یہ تحریک ادب کے مفاد میں ہے' اس نے اس تحریک سے ہاتھ نہیں کھینچا۔ وہ اپنی ذاتی زندگی میں بھی اسی ترقی پسندی کا قائل تھا۔ اس کا گھر مشرق و مغرب کے امتزاج سے عبارت تھا۔ نماز پابندی سے پڑھتا تھا لیکن پردے کا صرف اس قدر حامی تھا کہ کوٹ پہن کر مستورات اِدھر اُدھر گھوم پھر سکتی ہیں۔

وہ ترقی پسند تحریک کا سرگرم رُکن تھا لیکن اس کے باوجود اس نے ایسے ادیبوں کو بھی نہ صرف اپنے رسالے میں جگہ دی بلکہ ان کی کتابیں بھی چھاپیں جنہیں ترقی پسند اپنی صف میں جگہ نہیں دیتے تھے اور وہ سمجھتا تھا کہ یہ لوگ اچھے ادیب ہیں۔

اس نے منٹو کی کتاب "دھواں" بھی شائع کی اور عصمت کی "چوٹیں" بھی۔ ان دونوں کو ترقی پسند 'اپنا ادیب نہیں سمجھتے تھے۔ دونوں بدنام مصنف تھے۔ لیکن شاہد ہر تعصب سے بالا تر تھا۔

یہ کتابیں چھاپے ہوئے ابھی کچھ ہی مہینے گئے تھے کہ ایک دن ایک سب انسپکٹر' دلی پولیس کے چند سپاہی لے کر ساقی کے دفتر میں آدھمکے۔ ان کے پاس گرفتاری کے وارنٹ بھی تھے۔

"آپ کی گرفتاری کے وارنٹ ہیں' میں آپ کو گرفتار کرتا ہوں۔"

اتفاق سے اس وقت دفتر میں بھائی جی بیٹھے تھے۔ انہوں نے شخصی ضمانت کا کاغذ لکھ دیا۔ اس وقت تو جان بخشی ہوگئی لیکن دو مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ اس معاملے نے پھر سر اٹھایا۔

شاہد اس وقت اپنے دفتر میں موجود نہیں تھا۔ وہ دفتر پہنچا تو اس نے اپنے دفتر کو پولیس اسٹیشن بنے ہوئے دیکھا۔ چند پولیس والے دفتر کے باہر چوکیداری کر رہے تھے' اندر ایک سکھ انسپکٹر تلاشی میں مصروف تھا۔

"آپ ہی شاہد احمد ہیں؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"جی ہاں" شاہد نے کہا۔

لباس میں' گفتار میں' کھانے پینے میں وہ سادگی پسند کرتے تھے۔ تصنّع بناوٹ سے متنفر تھے۔ ٹھاٹ باٹ کا تو ذکر ہی کیا۔ لباس میں لٹّھا' ململ' وائل یا چکن پہنا کرتے تھے مگر وضع داری کے ساتھ کُرتے میں مونڈھوں اور گریبان میں بیل لگی ہوئی ہو۔ اکثر بنگالی سلک کا بنگالی قطع کا کُرتا بھی پہنتے تھے۔ پاجامے کی موریوں میں جالی بنی ہوئی ہوتی تھی جو میں خود بناتی تھی۔ جاڑوں میں گرم کپڑے کی قمیص اور گرم پاجامہ پہنتے تھے۔ گریبان میں سونے کے بٹن لگا لیتے تھے۔ گلے میں مفلر یا محفل میں بیٹھتے وقت اونی شال ٹانگوں پر ڈال لیتے تھے۔ جوتی عام طور پر براؤن رنگ کے چمڑے کی ہوتی۔ اس پر ہر روز پالش کرنا ضروری نہیں تھا۔ بارہ مہینے باہر جاتے وقت موزے پہنتے۔ ٹوپی ہندوستان میں ترکی اور پاکستان میں جناح کیپ پہنتے تھے۔ ہاتھ میں گھڑی باندھنا نہیں بھولتے تھے۔ ایک شادی کی روایتی انگوٹھی' ایک سبز پتھر کی' دردِ گُردہ کی وجہ سے ہاتھ میں پڑی رہتی تھی۔

(عاصمہ بیگم' اہلیہ شاہد احمد)

"دھواں اور چوٹیں کہاں رکھی ہیں۔"

"ہٹادی ہیں۔" شاہد نے اطمینان سے جواب دیا۔

"ہٹادی ہیں' مگر کیوں۔"

"اس لیے کہ مجھے معلوم تھا' آپ پھر تشریف لائیں گے۔ مجھے معلوم تھا کہ "دھواں" اور "لحاف" کے سلسلے میں پنجاب حکومت کو بہت تشویش ہے۔ دونوں افسانے فحش قرار دیے گئے ہیں اور میں جن دو کتابوں کا پبلشر ہوں' ان میں یہ دو افسانے شامل ہیں۔ پھر مجھ پر تو آپ کی مہربانی ہونا ہی تھی۔"

انسپکٹر لاجواب ہو کر اس وقت تو چلا گیا لیکن لاہور کی عدالت سے سمن آگئے۔ اس سمن میں منشی اور کاتب تک ملزم ٹھہرائے گئے۔

شاہد ان سب کو لے کر لاہور پیشی بھگتانے چلا گیا۔ عدالت نے اگلی تاریخ دے دی۔ وہ ادیبوں سے مل کر اور لاہور کی سیر کر کے واپس دہلی آگیا۔ وہ بار بار لاہور جاتا رہا اور ہر مرتبہ تاریخ پڑ جاتی تھی۔ غالباً مقصد یہی تھا کہ پریشان کیا جائے۔ اس نے اس کوڑی

پھیری میں بھی کام کا موقع نکال ہی لیا۔ اس کا قیام ایم اسلم کے گھر ہوا کرتا تھا۔ شہر بھر کے ادیبوں سے اس کی ملاقات ہوا کرتی تھی۔ ہر پھیرے میں ساقی کے لیے مضامین جمع کر کے لے آتا۔ لاہور ریڈیو اسٹیشن کے دروازے بھی اس پر کھلے ہوئے تھے جہاں سے وہ موسیقی کے پروگرام ایس احمد کے نام سے نشر کرتا تھا۔

ایک پیشی پر منٹو اور عصمت بھی بمبئی سے آ گئے۔ ان سب نے مل کر وکیل کیا۔ بیان ہوئے' جرح ہوئی۔ مقدمہ کمزور پڑ گیا لیکن حکومت کی ہدایت تھی کہ کچھ ہو جائے جرمانہ ضرور ہو۔ شاہد پر بیس روپے جرمانہ ہو گیا۔

منٹو اور عصمت تو جرمانے کے بعد خاموش ہو گئے لیکن شاہد خاموش رہنے والا نہیں تھا۔ اس نے وکیل کیا اور اپیل کر دی۔ ہائی کورٹ کی اپیل میں جج انگریز تھا۔ اس کے سامنے کالی شلوار' دھواں اور لحاف کا انگریزی ترجمہ پیش ہوا تو اس نے فیصلے میں لکھا۔

"ان افسانوں میں کچھ بھی فحش نہیں ہے۔"

وہ اگر درخواست دیتا تو جرمانہ بھی واپس ہو سکتا تھا۔ لیکن وہ ان پیشیوں پر ڈھائی ہزار روپے خرچ کر چکا تھا۔ اس کے سامنے اس جرمانے کی کیا حقیقت تھی۔ اس نے حکومت سے انتقام یہ لیا کہ ان کتابوں کے ایڈیشن فوراً چھاپ دیے۔

مقدمے کی تھکن اتنی ہو گئی تھی کہ شاہد نے بیوی بچوں کو ساتھ لیا اور برف باری دیکھنے شملے چلا گیا۔ امراؤ بندو خان اور سجاد میراثی بھی اس کے ساتھ تھے۔ شاہد کے نزدیک موسیقی روح کی غذا تھی۔ پہاڑ کے قدرتی مناظر میں اس کے جاتے ہی رونق بڑھ گئی۔ دن بھر برف پوش چوٹیوں کی سیر کرتا رہا اور رات کو گانے کی محفل جمی۔ پھر یہ روز کا معمول ہو گیا۔

شملہ میں اس کی محفلوں کی دھوم مچ گئی۔ مشہور ہو گیا کہ دہلی کے کوئی بہت بڑے رئیس ہیں' وہ شملہ تشریف لائے ہوئے ہیں۔ بڑے بڑے گانے والے ان کے ساتھ ہیں' خود بھی بہت بڑے نایک ہیں۔

حسب معمول محفل جمی ہوئی تھی۔ ابھی شاہد کا بیٹا مشہود کوئی چیز سنا چکا تھا اور اب امراؤ بندو خان کوئی راگ چھیڑے ہوئے تھے کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ عاصمہ نے دروازہ کھولا۔

"بہن جی نمستے۔ میں کچھ ہی فاصلے پر رہتا ہوں۔ یہ میری بیٹی ہے۔" اس آدمی نے اپنے قریب کھڑی ہوئی لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"آیئے اندر آ جایئے۔"

"اپنے کوی مہاراج سے اجازت لے آیئے۔ وہ برا تو نہیں مانیں گے۔"

"ارے نہیں' آپ لوگ آئیں تو۔"

"اچھا' یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔"

وہ ان دونوں کو لے کر اندر آ گئی۔ شاہد اس آدمی کو دن میں بھی دیکھ چکا تھا۔ یہ ایک ہندو بنگالی تھا۔

"میرا نام ہری ہے اور یہ میری بیٹی پشپا ہے" اس نے اپنا تعارف کرایا۔

"میں شاہد احمد دہلوی ہوں۔"

"ارے آپ کا نام تو ہم نے سن رکھا ہے۔ آپ تو ساقی رسالہ نکالتے ہیں۔ آپ کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر تو یہ سمجھ رہے تھے کہ آپ راجا ہیں کہیں کے۔"

شاہد مسکرا کر رہ گیا۔ اس کی یہ عادت تھی کہ جب کوئی اس کی تعریف کرتا تھا' وہ آنکھیں جھکا کر زمین دیکھنے لگتا تھا۔

"پشپا کو بھی گانے کا شوق ہے" ہری بابو نے کہا۔

"اچھا! یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ ان سے کہیے کچھ سنائیں۔" شاہد نے کہا۔

"آپ کے سامنے کہاں جی ابھی تو میں سیکھ رہی ہوں۔" لڑکی نے شرماتے ہوئے کہا۔

"ہم سب ہی سیکھ رہے ہیں' طالب علم ہیں۔ آپ سنائیں تو۔"

سجاد میراثی نے طبلہ سنبھالا۔

"گھے' گھے' دھن دھن' کڑ دھاں دھا۔ کڑ دھاں دھا۔"

پشپا کچھ دیر تو شرماتی رہی اور پھر لڑکی نے راگ باگیشری چھیڑ دیا۔

ہر طرف پھول سے مہکنے لگے۔ پشپا کی آواز میں جادو تھا۔ سجاد میراثی بڑے دل سے ٹھیکا لگا رہا تھا۔ لیکن شاہد کچھ بے چین سا نظر آ رہا تھا۔

گانا ختم ہوا اور لڑکی نے شاہد کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھا۔

"آپ کو کس نے سکھایا ہے۔"

"استاد چاند خاں نے۔"

"آ گئی بات سمجھ میں۔"

"کیا ہوا مہاراج" ہری بابو نے کہا۔

شاہد کو عجیب کشمکش کا سامنا تھا۔ استاد نے اس لڑکی کو سکھانے میں بخل سے کام لیا تھا۔ اکثر خاندانی گویئے یہی کرتے ہیں۔ وہ لڑکی ایسی باریک غلطی کر رہی تھی جو کوئی استاد ہی سمجھ سکتا ہے۔ اب شاہد کے لیے مشکل یہ تھی کہ اگر وہ اس غلطی کی طرف توجہ دلاتا ہے تو استاد کی بے عزتی ہوتی ہے' اور نہیں بتاتا تو ضمیر ملامت کرتا ہے۔ بالآخر اس سے رہا نہیں گیا۔

"آپ کے استاد نے بخل سے کام لیا ہے۔ مکمل راگ نہیں سکھایا۔ لایئے میں بتاتا ہوں۔"

شاہد نے نشاندہی کی تو امراؤ بندو اور سجاد میراثی حیرت میں رہ گئے۔

"مہاراج جب تک آپ شملہ میں ٹھہرے ہوئے ہیں، پشپا کو کچھ گُن کی باتیں سکھا دیں۔"

پشپا اور ہری بابو اس محفل میں روز آنے لگے۔

شاہد کی واپسی میں ایک دن باقی تھا۔ ہری بابو نے اپنی قیام گاہ پر ایک محفل کا اہتمام کیا۔

محفل کے دوران ایک صاحب نے اصرار کیا کہ طبلہ وہ بجائیں گے۔ سجاد میراثی طبلہ بجانے کے لیے موجود تھا لیکن ان صاحب کا اصرار دیکھ کر شاہد نے انہیں اجازت دے دی لیکن اس کی ضد دیکھ کر شاہد کو یہ یقین ہو گیا کہ یہ صاحب جو کوئی بھی ہیں، اس کا امتحان لینا چاہتے ہیں۔

کچھ دیر بعد ہی شاہد کو اندازہ ہو گیا کہ ان صاحب کا خاص ہنر بلمپت میں لے گاڑھ دینا ہے۔ لیکن شاہد بھی ایک کائیاں تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس نے ان کا ٹھیکا سمجھ لیا۔ وہ ایک تالہ آٹھ دم کا بجا رہے تھے۔ شاہد بڑے حساب اور دھیان سے گاتا رہا۔ محفل برخاست ہوئی تو طبلہ نواز اس کا معترف ہو چکا تھا۔

"شاہد صاحب آپ پہلے آدمی ہیں جنھوں نے میری لے سمجھی اور اس کے ساتھ گایا۔ آپ واقعی بڑے فنکار ہیں۔"

شاہد کے لیے یہ پہلا موقع نہیں تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ بہت سی کشتیاں کرچکا تھا اور پیشہ ور سازندوں کو شکست ہوئی تھی۔

دراصل شاہد نے موسیقی صرف سیکھی نہیں تھی، اس نے اس علم کا وسیع مطالعہ کیا تھا اور ثابت کر دیا تھا کہ پڑھا لکھا آدمی جو کام بھی کرتا ہے، اس میں انفرادیت قائم رکھتا ہے۔ خاندانی گویوں کا علم صرف استادوں کی تعلیم تک محدود ہوتا ہے، شاہد ایک استاد تک محدود نہیں رہا تھا۔ اس نے اس موضوع پر کتابیں پڑھی تھیں۔ وہ لکیر کا فقیر نہیں تھا۔ اس نے نظریاتی علم اور عملی مہارت حاصل کرنے کے بعد ایسی اختراعات کی تھیں جو ایک استاد ہی کرسکتا ہے۔

اس مظاہرے کے بعد تو ہری بابو اس کے معتقد ہو گئے۔ وہ جب تک شملہ میں رہا، اور اس کے بعد جب بھی وہاں گیا ہری بابو اور ان کی بیٹی اسی طرح ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے جس طرح کسی گرو کے چرنوں میں اس کے چیلے بیٹھتے ہیں۔

شملے کے قیام کے دوران ہی اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی دہلی شاخ کو ختم کردے گا کیونکہ اب اس تحریک نے غلط رخ اختیار کر لیا ہے۔ اس کے مقاصد میں سیاست بھی شامل ہو گئی ہے۔

اس نے یہ انجمن سجاد ظہیر کی خواہش پر قائم کی تھی اور وہ اتنا مخلص تھا کہ حکومت کی سختیاں بھی اسے نہیں روک سکیں، صرف اس لیے کہ وہ اس تحریک کو ادب کے فروغ کے لیے کار آمد سمجھتا تھا لیکن جوں ہی اسے اندازہ ہوا کہ اس تحریک نے غلط رخ اختیار کر لیا ہے۔ اس نے دہلی پہنچتے ہی اس انجمن کو ختم کر دیا اور اس کے بدلے "بزم تہذیب ادب" قائم کر دی۔

اس بزم کے تحت کئی ادبی جلسے ہوئے لیکن اس بزم کی شہرت اس کے تحت کھیلے جانے والے ڈراموں کی بدولت ہوئی۔

انصار ناصری اور فضل حق قریشی کو اداکاری کا شوق تھا۔ خود شاہد بھی مشن کالج کے زمانے میں کئی ڈرامے کر چکا تھا لہٰذا ڈرامے کی تجویز بڑی سنجیدگی سے زیر بحث آئی اور منظور ہوئی۔

شاہد تو جو کام بھی کرتا تھا سلیقے سے کرتا تھا۔ اس نے ان ساتھیوں کو ڈھونڈنا شروع کر دیا جو مشن کالج کے زمانۂ طالب علمی میں اداکاری کا شوق رکھتے تھے۔ اس بزم کے تحت اوپر تلے چھ ڈرامے پیش کیے گئے۔ ان ڈراموں میں شاہد نے خود بھی اداکاری کی۔ ان ڈراموں سے ہونے والی آمدنی انہوں نے عربک کالج بلڈنگ فنڈ میں دے دی۔

اب وہ پابندی سے ریڈیو پروگرام بھی کر رہا تھا لیکن موسیقی کے یہ پروگرام اس کی خاندانی عظمت کے منافی تھے اس لیے ان پروگراموں میں وہ ایس احمد کے فرضی نام سے متعارف ہو رہا تھا۔ اسے ان پروگراموں سے ہونے والی آمدنی سے بھی کوئی غرض نہیں تھی۔ جو رقم ملتی اسے اسی وقت سازندوں میں تقسیم کر دیتا۔

اسے اس رقم کی ضرورت بھی کیا تھی۔ اس کی خاندانی وجاہت مسلم تھی۔ دادا کو سلام کرنے پر اشرفی ملا کرتی تھی۔ کانونٹ اسکول میں پڑھا جہاں کالوں کا داخلہ ممنوع تھا۔ انگریز

مولانا عبدالسلام دہلوی

دلّی کے ایک قلندر مزاج بزرگ تھے۔ چار ابرو کا صفایا۔ گول چہرہ۔ کھلتا ہوا رنگ۔ سر پر دوپلی۔ ململ کا کرتہ اور چست پاجامہ۔ پاؤں میں نری کی جوتی۔ ان کے علم و فضل کی دھاک بڑے بڑوں کے دلوں پر بیٹھی ہوئی تھی۔ جس علم سے کہو وجود باری تعالیٰ ثابت کر دیتے تھے۔ عربی فارسی کی تمام پرانی کتابیں انہیں ازبر تھیں۔ جورو نہ جاتا اللہ میاں سے ناتا۔ چھڑا دم، کتابیں تھیں اور طالب علم۔ شاگردی میں مشکل ہی سے کسی کو قبول کرتے تھے۔ کسی سے کچھ لیتے لواتے تو تھے ہی نہیں اس لیے ان پر کسی کا بس نہیں چلتا تھا۔

(شاہد احمد)

گورفس اس کی دیکھ بھال کے لیے نوکر رہی۔ وہ دو گھوڑے والی بگھی میں سیر کے لیے نکلا کرتا تھا۔ اب یہ عالم تھا کہ "ساقی" اور ساقی بک ڈپو سے وہ ہزاروں میں کھیل رہا تھا۔ رئیسوں کی طرح گرمیوں کے دن شملہ، مسوری اور دہرہ دون میں گزارتا تھا اور اکیلے نہیں، سازندوں، گانے والوں اور نوکروں کی فوج کے ساتھ۔

اس کی اسی دریا دلی سے ادیب بھی فیض یاب ہوئے۔ کرشن چندر کی خواہش تھی کہ کشمیر کی وادیوں میں بیٹھ کر ناول لکھے۔ شاہد نے ایک ہزار روپے اس کے دامن میں رکھ دیے۔ عظیم بیگ چغتائی کے ابتدائی تیرہ مضامین مختلف رسائل نے ناقابلِ اشاعت قرار دے دیے تھے۔ شاہد نے ان سب کو ساقی میں چھاپا۔ اسی پر اکتفا نہیں ہوا۔ ان کے تمام ناول بھی مکتبۂ ساقی سے شائع ہوئے۔ چغتائی نمبر شائع کرکے عظیم بیگ چغتائی کو دنیائے ادب میں مشہور کردیا۔ ان کی موت کے بعد تمام کتابوں کے حقوق ان کی بیوہ کو واپس کردیے۔ شوکت تھانوی کو معاوضے کے پیشگی منی آرڈر بھیجتے رہے۔ اختر حسین رائے پوری کی شہرت ہوئی تو انہیں خط لکھ کر دلی بلوایا۔ دفتر ساقی میں ان کے ٹھہرنے کا انتظام کیا گیا۔ یہاں رہ کر اختر نے چار عمدہ افسانے لکھ کر اردو ادب کے حوالے کیے۔

بھاری معاوضے دے کر ادیبوں کو ساقی کی طرف راغب کیا۔ اس کے ساتھ ہی مہمان داریاں، اعزازی دعوتیں، طرح طرح کے تحفے، ریل کے اونچے درجے کے ٹکٹ، یہ سب ایسے اعزاز تھے جنہوں نے شاہد اور "ساقی" کو افسانوی حیثیت دے دی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس صدی کا بہترین ادب ساقی کی اشاعت کا رہینِ منت ہے۔ کتنے ہی پڑھنے والے، بڑے بڑے لکھنے والوں سے اسی رسالے کے ذریعے متعارف ہوئے۔

وہ صرف کسی رسالے کا مدیر نہیں تھا، خود بھی کانٹے کا لکھنے والا تھا۔ اس نے اداریے بھی تحریر کیے، خاکے بھی لکھے، مغربی افسانوں کے تراجم بھی کیے، مضامین بھی لکھے۔ ہر تحریر میں وہ منفرد نثر نگاری کی حیثیت سے ابھرا۔ وہ تحقیق و تنقید کا آدمی نہیں تھا، اتنا وقت بھی اس کے پاس نہیں تھا لیکن اظہارِ بیان میں وہ شگفتگی، شوخی، بذلہ سنجی اور کاٹ تھی جو اور کہیں نہیں ملتی۔

دلی کی ٹکسالی زبان اور اس میں محاوروں کی کثرت اس کا طرۂ امتیاز تھا۔ حد تو یہ ہے کہ غیر ملکی شہہ پاروں کا ترجمہ کرتے ہوئے بھی وہ اپنے اس اندازِ بیان کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔

وہ محاوروں اور استعاروں کو اس طرح برابری کی جگہ دیتا تھا کہ پڑھنے والوں کو نذیر احمد اور محمد حسین آزاد کی یاد ایک ساتھ آجاتی تھی۔

○☆○

حالات کئی کروٹیں بدل چکے تھے۔ وہ اپنے پرچے کو دوسری جنگِ عظیم میں کاغذ کے بحران سے بچالایا تھا لیکن اس مرتبہ معرکہ سخت تھا۔ ہندوستان 47ء میں داخل ہوگیا تھا۔ چنگاریاں تو بہت دن سے بھڑک رہی تھیں لیکن وہ "ساقی" کے تکیے پر مجاور بنا بیٹھا تھا۔ سیاست کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا لیکن بے نیازی سے ادب کی خدمت کیے جارہا تھا۔ غیر یقینی حالات نے کاروباری حلقوں کی کمر توڑدی تھی لیکن وہ صرف تجارت نہیں کررہا تھا کہ فکر میں مبتلا ہوجاتا۔ نقصان پر نقصان اٹھاتا رہا لیکن اچھے دنوں کی امید میں راتیں گزارتا، دن سنوارتا رہا۔

پھر یہ چنگاریاں شعلوں کا رنگ اختیار کرنے لگیں۔ افواہوں سے کان بھر گئے۔ بازاروں میں خوف ناچنے لگا، دکانوں پر خبریں فروخت ہونے لگیں۔ ریڈیو اسٹیشن پر اس کا آنا جانا لگا رہتا تھا، جہاں عجیب و غریب تجزیے اور خبریں اس کے کانوں میں پڑ رہی تھیں لیکن کسی خبر کسی تجزیے نے اس کے قدم نہیں اکھاڑے۔

بہت دن ہوئے، اس نے مکان تبدیل کرلیا تھا۔ جامع مسجد کے علاقے میں حویلی اعظم خاں منتقل ہوگیا تھا البتہ ساقی کا دفتر اب بھی کھاری باؤلی میں تھا۔ زنانہ مکان میں اس کی سوتیلی والدہ مقیم تھیں۔

وہ اپنے دفتر میں بیٹھا ساقی کے پروف پڑھنے میں مصروف تھا کہ رازق الخیری، مدیر عصمت اس سے ملاقات کے لیے آئے۔

"قائد اعظم اعلان کرچکے ہیں کہ پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہوگی۔ وہاں اردو کا مستقبل نہایت شاندار ہے۔ میں تو کراچی ہجرت کرنے کا فیصلہ کرچکا ہوں۔" رازق الخیری نے کہا۔

"پتھر اپنی جگہ بھاری ہوتا ہے۔ میں تو یہیں جما ہوا ہوں۔ آپ بھی نہ جائیں۔ یہاں آپ کی اپنی ایک پوزیشن ہے۔ پردیس میں نہ جانے کیا کیا دقتیں ہوں۔"

"یہ تو ہے لیکن یہ سوچ لو کہ دلی میں ہندی رہ جائے گی۔" رازق الخیری نے کہا۔

"ہندی ہونے کے بعد بھی اردو ختم تو نہیں ہوسکتی۔"

"ختم نہ ہو لیکن مجھے اس کے مستقبل پر شک ہے۔"

"جب شک یقین میں بدل جائے گا اس وقت دیکھ لیں گے۔ پانی سے پہلے پل کیوں باندھیں۔"

"اس کے علاوہ بھی حالات کا رخ کسی اور طرف ہے۔ سکھوں کو اکسایا جارہا ہے۔ نہ معلوم کیا حالات ہوں۔ کس حال میں جانا ہو تو پھر ابھی کیوں نہیں۔"

یہ اور اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔ شاہد اپنی عادت کے مطابق گردن نیچی کیے مسکراتا رہا۔ رازق الخیری اس کی طرف سے مایوس ہوکر اٹھ گئے۔

رمضان کا مہینہ آدھے سے زیادہ گزرچکا تھا۔ دلی میں تو رمضان کا چاند نظر آتے ہی عید کی تیاریاں شروع ہوجایا کرتی تھیں۔ تیل، پھلیل، مسی، سرمہ، ابٹنا، غازہ ایک ایک چیز سنگھار کی خرید خرید کر رکھی جانے لگتی تھی۔ درزیوں کی دکانیں اچکن کے کپڑوں سے بھر جاتی تھیں۔ بچوں کے لیے کرتے، ٹوپی سلنا شروع

ہوجاتے تھے لیکن اس مرتبہ دھڑکے دھڑکے میں آدھے رمضان گزر گئے تھے۔ اب عید سر پر تھی' بچوں کے علاوہ کوئی خوش نہیں تھا۔

ابھی اگست کا مہینہ پہنچا بھی نہیں تھا کہ گوڑگانوہ کے اطراف وجوانب کے مسلمان الور اور بھرت پور کی فوجوں سے کٹ پٹ کر اور بچ بچاکر جامع مسجد کے اردو بازار میدان میں آن پڑے دلی والوں نے ان کے گرد میلہ سا لگادیا۔ گھر گھر سے چندہ جمع کیا جاتا اور کھانا پکواکر تقسیم کیا جاتا۔ دلی والوں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ کچھ دن جاتے ہیں کہ کھانا تقسیم کرنا تو بڑی بات ہے' اپنے لیے پکانا بھی دوبھر ہوجائے گا۔

ستمبر آیا نہیں تھا کہ پنجاب اور سرحد کے شرنارتھی دلی پہنچنا شروع ہوگئے۔ ان کے لیے جگہ جگہ کیمپ کھل گئے۔ ان کے آنے کے بعد دلی کی فضا مکدر ہونے لگی۔ مسلمانوں میں یہ افواہیں عام ہونے لگیں کہ ان سکھوں کو منصوبے کے تحت یہاں لایا گیا ہے۔ مسلمانوں کا قتلِ عام ہوگا۔ لوگ کوڑیوں کے بھاؤ اپنی جائیدادیں بیچ کر پاکستان روانہ ہونے لگے۔

کٹی ہوئی ریلیں دلی میں آنے لگیں۔ مسلمان مسافر چُن چُن کر قتل کیے جانے لگے۔ امرتسر مسلمانوں سے خالی ہوگیا۔ ادھر لاہور میں سکھ اور ہندو نام کو نہیں رہا۔ دلی میں شرنارتھیوں کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ مسلمانوں کا دم گھٹنے لگا۔ خنجرزنی کے واقعات رونما ہونے لگے۔ ریلوں میں خون ہی خون نظر آنے لگا۔

دلی کی انتظامیہ نے طویل ترین کرفیو لگاکر گھروں میں فاقوں کا انتظام کردیا۔ جس شہر میں آٹھ دن میں نو میلے لگا کرتے تھے گندگی کے ڈھیر میں تبدیل ہوگیا۔ لوگ گھروں میں بند ہوگئے۔ کرفیو کھلتا تو لوگ بدحواس ہوکر گھروں سے نکلتے اور پھر قلعہ بند ہوجاتے۔

شاہد کرفیو کی وجہ سے گھر میں بند تھا۔ پیسے تو تھے لیکن شہر میں راشن ختم ہوگیا تھا۔ اس کی بیوی عاصمہ نے گھوڑوں کا دانہ پیسنے کی چکی نکلوائی اور گھر میں رکھا گندم پیسنے بیٹھ گئی۔ عادت کہاں تھی۔ شام تک سیر بھر آٹا بھی نہیں پسا تھا کہ ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے۔

جمعے کے دن کرفیو اٹھا تو شاہد کھاری باؤلی اپنے دفتر گیا۔ دوپہر تک ضروری خطوں کے جواب لکھتا رہا۔ نماز کا وقت ہوا تو محلے کی مسجد میں نماز پڑھنے چلا گیا۔ نماز پڑھ کر اپنے کمرے میں واپس آیا ہی تھا کہ ایک زوردار دھماکا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی آسمان کبوتروں سے بھر گیا۔

اس نے گھبرا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ یہ کبوتر مسجد فتح پوری کے میناروں سے اڑ رہے تھے۔ اللہ اکبر کے نعرے ان کبوتروں کا تعاقب کررہے تھے۔ یقیناً یہ دھماکا مسجد میں ہوا ہے۔ وہ ساکت کھڑا مسجد کے افسردہ میناروں کو دیکھ رہا تھا کہ گلی میں شور ہوا۔ کچھ لوگ مسجد سے نکل کر اس طرف بھاگ آئے تھے۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ مسجد میں بم پھٹا ہے۔ یہ اطلاع ہی ایسی تھی کہ شاہد سراسیمہ ہوگیا۔ مسجد پر حملہ ہوا ہے تو تھوڑی دیر میں فساد بھی شروع ہوسکتا ہے۔ یہ محلّہ ویسے بھی ہندوؤں کا تھا۔ یہ خیال آتے ہی وہ دفتر کی چھت سے ہوتا ہوا زنانہ مکان میں پہنچ گیا۔ یہاں کا تو منظر ہی عجیب تھا۔ پورے محلے کے مسلمان اپنی عورتوں اور بچوں سمیت دالانوں میں بھرے ہوئے تھے' چھوٹے دالان میں مرد جمع تھے۔ کسی کے ہاتھ میں چھری' کسی کے ہاتھ میں لکڑی۔ ایک صاحب تو کباب سینکنے کی سیخ لیے کھڑے تھے کہ اگر ہندو حملہ کریں تو ان کا مقابلہ کیا جائے۔ چند بڑی بوڑھیاں جھولیوں پتھر لیے کھڑی تھیں۔ مٹی کے تیل کے کنستر تیار رکھے تھے۔ شاہد نے کوٹھے سے ہی یہ منظر دیکھا اور پھر اپنے دفتر میں آگیا۔ اب اسے حالات کی کشیدگی کا احساس ہونے لگا تھا۔ دفتر میں اس وقت دو منشی کام میں مصروف تھے۔ وہ انہیں لے کر جلدی جلدی دفتر سے نکلا۔ اسے یہ ڈر تھا کہ کہیں کرفیو نہ لگ جائے۔ اسے حویلی اعظم خاں جانا تھا۔ بازار میں ہو کا عالم تھا۔ دکانیں بند ہوگئی تھیں۔ کرفیو سے پہلے ہی کرفیو لگ چکا تھا۔ اسے اب ایسے راستے سے ہوکر جانا تھا جو ہندوؤں کے محلے سے ہوکر نہ گزرتا ہو۔

گلیوں سے گزرتا ہوا وہ قاضی کے حوض پہنچ گیا۔ یہاں اسے چند مسلمان چاوڑی کی طرف جاتے دکھائی دیے۔ وہ بھی ان کے ساتھ ہولیا۔ چلتے چلتے چوڑی والان پہنچ گیا۔ یہاں تک وہ آرام سے آگیا تھا لیکن یہاں پہنچتے ہی دل دھڑکنے لگا۔ اس علاقے میں اکثر چاقو زنی کی وارداتیں ہوتی رہتی تھیں اور اس وقت بھی چند ہندو غنڈے تاک لگائے کھڑے تھے۔ وہ اکیلا نہیں تھا اس لیے کچھ ہمت بندھی۔ یہ غنڈے بھی اتنے لوگوں کو ایک ساتھ آتے ہوئے دیکھ کر جھجک گئے۔ گھورتے رہے' حملہ کرنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ اب وہ مطبع مجتبائی کے قریب پہنچ گیا تھا۔ یہاں سے مسلمانوں کی آبادی شروع ہوجاتی تھی۔ اب فکر کی کوئی بات نہیں تھی۔

دوسرے دن خبر آئی کہ سکھوں اور ہندوؤں نے مل کر قرول باغ میں جتنے مسلمانوں کے گھر تھے' سب لوٹ لیے۔ جامعہ ملیہ کی عمارت میں آگ لگادی گئی۔ مکتبۂ جامعہ کی لاکھوں کتابیں راکھ کا ڈھیر بن گئیں۔

قرول باغ کی تباہی کے بعد خبر آئی کہ لودھی روڈ کالونی میں جتنے مسلمان تھے سب کے سب شہید کردیے گئے۔ اس کے بعد سبزی منڈی کی بستی لٹ گئی۔ بھاگتے ہوئے مسلمان اس طرح گرے جیسے درختوں سے پھل گرتے ہیں۔ وہ عورتیں جنہوں نے گھر سے باہر قدم نہیں رکھا تھا دربدر ہوگئیں۔ اس بستی میں جب مسلمان نام کا کوئی بچہ بھی باقی نہ رہا تو شام کی خبروں میں بتایا گیا کہ سبزی منڈی میں امن قائم ہوگیا ہے۔

سبزی منڈی میں مالدار اور بڑے جی دار مسلمان رہتے تھے۔ یہ محلّہ مسلمانوں کا مضبوط قلعہ سمجھا جاتا تھا۔ اس کے ختم ہوتے ہی ہندو حملہ آوروں کے حوصلے بڑھ گئے۔ اب پہاڑ گنج کی باری

آ گئی۔ یہاں ہندو مسلمانوں کی ملی جلی آبادی تھی۔ یہاں کے مسلمانوں نے تین دن برابر حملہ آوروں کا مقابلہ کیا لیکن کب تک؟ تیسرے دن پہاڑ گنج کے مسلمان صرف تن کے کپڑے ساتھ لے کر پناہ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ جن کے عزیز محفوظ محلوں میں تھے وہ وہاں چلے گئے، جن کا کوئی نہیں تھا انہوں نے جامع مسجد میں پناہ لے لی۔

شاہد کے محلے میں ایک بھی ہندو نہیں تھا اور گلی میں لوہے کے پھاٹک لگے ہوئے تھے۔ اس لیے اب تک محفوظ تھا۔ لٹی ہوئی بستیوں سے بہت سے لوگ یہاں آ کر پناہ لے رہے تھے۔

شاہد مغرب کی نماز پڑھ کر گلی میں آیا تو گلی ماتم کدہ بنی ہوئی تھی۔ ہر آنکھ اشکبار تھی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ پہاڑ گنج سے ایک عورت لائی گئی ہے جس کے دونوں ہاتھ کٹ گئے ہیں۔ اس کا شیر خوار بچہ بھی اس کے ساتھ ہے۔ اسے اپنے ساتھ لانے والے نے بتایا تھا "یہ غریب اپنے گود کے بچے کو سینے سے لگائے چھتوں پر چھپتی پھر رہی تھی کہ ایک سکھ نے اسے دیکھ لیا۔ وہ سمجھا اس کے پاس کوئی قیمتی چیز ہے۔ اس نے تلوار کا وار کیا۔ اس عورت نے اپنے بچے کو بچانے کے لیے تلوار کو ہاتھ پر روکا۔ بچہ بچ گیا مگر ہاتھ کٹ گیا۔ سکھ نے دوسرا وار کیا۔ دوسرا ہاتھ بھی کٹ گیا۔ اس کے بعد وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ بچہ روتا رہا اور لاشوں کے انبار میں اپنی ماں کو ڈھونڈتا رہا۔ میں نے بچے کے رونے کی آواز سنی اور بہ ہزار دقت عورت اور اس کے بچے کو یہاں لے آیا۔"

شاہد کے دل کو جیسے کسی نے نوچ کے پھینک دیا۔ یہ کیسے ظلم ہیں جو دلی والوں پر ٹوٹ رہے ہیں۔ بڑے بوڑھوں سے غدر کے واقعات بہت سنے تھے لیکن یہ غارت گری ۱۸۵۷ء کی تباہی سے زیادہ ہے۔ تو کیا دلی ایک مرتبہ پھر لٹ گئی؟ اس نے وہیں کھڑے کھڑے فیصلہ کیا کہ کچھ ہو جائے وہ دلی چھوڑ کر نہیں جائے گا۔ اس عورت کے دونوں ہاتھ کٹ گئے لیکن اس نے اپنے بچے کو نہیں چھوڑا۔ میرے تو دونوں ہاتھ سلامت ہیں، میں اپنی دلی کیوں چھوڑوں؟ لیکن کیسی دلی، کہاں کی دلی۔ میں تو گھر میں بند بیٹھا ہوں۔ کھاری باؤلی تک تو جا نہیں سکتا۔ کتنے ارمانوں سے "ساقی" جاری کیا تھا۔ کتنے دن سے دفتر بند پڑا ہے کتنے مسودے ہیں جو مجھے آواز دے رہے ہیں لیکن میں ان کی خبرگیری نہیں کر سکتا۔ خیال یہی تھا کہ ایک دو دن میں امن ہو جائے گا تو دفتر جا کر ضروری کاغذات، بینک اور ڈاک خانے کی کاپیاں وغیرہ لے آؤں گا لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ کرفیو پر کرفیو لگنے شروع ہو گئے۔ میں ان کٹے ہوئے ہاتھوں کی عورتوں کا ماتم کروں یا باہر نکلنے کی فکر کروں۔ وہ کتنی ہی دیر گلی کے نکڑ پر لگے لوہے کے پھاٹک سے لگا کھڑا رہا، سوچتا رہا اور پھر سر جھکا کر گھر چلا آیا۔

قطب صاحب، روشن چراغ دہلی، رسول نما، امام باڑہ، کئی درس گاہیں، درگاہیں اور بستیاں اجاڑی جا چکی تھیں۔ جو رہ گئی تھیں وہ خالی ہوتی جا رہی تھیں۔ ان خالی گھروں میں سکھ شرنارتھی آباد ہو گئے تھے۔

جب کاٹنے کے لیے انسانوں کے سر باقی نہ رہے تو دکانوں کی لوٹ مار شروع ہو گئی۔ اس نے سنا نئی دہلی میں فوج کھڑی تماشا دیکھتی رہی، اس کی موجودگی میں مسلمانوں کی دکانیں لٹ گئیں۔ اس کے بعد مسلمانوں کی کوٹھیاں، فلیٹ اور کوارٹر بھی ایک ایک کر کے چھن گئے۔ نئی دہلی مسلمانوں سے خالی ہو گئی۔

پھر تو یہ عالم ہوا، آج یہ بازار کل وہ بازار، آج یہ دکان، کل وہ دکان، مسلمان تو گھروں میں بند تھے، ملٹری کھڑی تماشا دیکھ رہی تھی۔

ہندو راؤ کا باڑہ، صدر بازار، چاندنی چوک سب لٹ گئے۔ جامع مسجد کے علاقے کی دکانیں باقی رہ گئی تھیں اور وہ بھی اس لیے کہ ان میں دھرا کیا تھا۔

اب پوری دلی جامع مسجد کے آس پاس علاقوں میں آباد ہو گئی تھی۔

جمعے کا دن آ گیا۔ شاہد ہمت کر کے جامع مسجد پہنچ گیا۔ ہزاروں مسلمان مسجد میں پڑے ہوئے تھے۔ مسجد کیا، سرائے معلوم ہوتی تھی۔ نماز پڑھنے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ اتنے میں یہ خبر پھیل گئی کہ گاندھی جی آ رہے ہیں۔ گاندھی جی تین دن سے شہر میں تھے۔ ان کے آنے کے بعد شہر میں کچھ امن ہوا تھا۔ مسلمان ان کی آمد کو برکت تصور کر رہے تھے۔ اب جو سنا کہ گاندھی مسجد کی طرف آ رہے ہیں تو طمانیت کی لہر سی دوڑ گئی۔ مہاجرین کے علاوہ تماشائیوں کے ٹھٹ لگ گئے۔ شاہد کو بھی مسجد کی سیڑھیوں میں سے کسی سیڑھی پر جگہ مل گئی۔ اس کے ارد گرد "مہاتما گاندھی زندہ باد" کے نعروں سے مسجد گونج رہی تھی۔ لوگوں کا حال یہ تھا کہ خدا کو بھول کر گاندھی کو یاد کر رہے تھے۔

چار موٹریں یکے بعد دیگرے مسجد کے سامنے آ کر رکیں۔

والنٹیئروں کی حفاظت میں گاندھی نے سیڑھیاں چڑھنا شروع کیں۔ ہجوم کا جوش بڑھتا جا رہا تھا۔ گاندھی جی مسجد کے اندر آئے۔ نعرے اب بھی لگ رہے تھے۔ بے قاعدہ ہجوم کے درمیان وہ کچھ دیر کھڑے رہے۔ پھر چند الفاظ کہے اور واپس چلے گئے۔ بہت کچھ کہنا چاہتے ہوں گے لیکن نعروں کے شور میں کسی نے کچھ نہیں سنا۔ ہجوم اتنا بے قابو تھا کہ وہ واپس چلے گئے۔

دوسرے دن اعلان کیا گیا کہ جامع مسجد خالی کر دی جائے اور مہاجرین پرانے قلعے میں چلے جائیں۔ عبادت گاہوں میں رہنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ پرانے قلعے میں راشن بھی ملے گا۔ مسجد خالی ہو گئی۔ اردو بازار کا میدان بھی سنسان ہو گیا۔ ان لوگوں کے جاتے ہی شہر والوں کے لیے خطرہ بڑھ گیا۔ وہ چاروں طرف سے گھر گئے۔ حملہ آور برابر آگے بڑھ رہے تھے۔ آنے والے وقت کا خیال کر کے کلیجہ کانپ رہا تھا۔

ہر آدمی دوسرے سے پوچھ رہا تھا۔ "آپ تو نہیں جا رہے ہیں؟"

جواب میں ہر آدمی سینہ پھلا کر کہتا تھا۔ "بھلا دلی ہم سے کیسے چھٹے گی۔ ہم کہاں جانے والے۔" لیکن حال یہ تھا کہ لوگ چپکے چپکے کھسکنا شروع ہوگئے۔ لوگ تیزی سے پرانے قلعے جا رہے تھے جہاں سے انہیں پاکستان جانا تھا۔

محلہ ویران ہوا تو اسے بھی فکر ہوئی۔

"گھر میں نقدی کتنی ہے؟" اس نے بیوی سے پوچھا۔

"اب تو کل سو روپے پڑے ہیں۔ کچھ انتظام کرو ورنہ اب تو جنس بھی ختم ہونے والی ہے۔" بیوی نے کہا۔

"انتظام کہاں سے کروں۔ بینک اور ڈاک خانہ دونوں نے روپیا ادا کرنا ترک کردیا ہے۔ سب کو اپنی پڑی ہے' کون کام آئے گا۔"

"اللہ مالک ہے' وہی مشکل آسان کرے گا۔" بیوی نے ٹھنڈی سانس بھری۔

وہ بھی پریشان تو ہوا لیکن یہ اطمینان تھا کہ سو روپے تو گھر میں ہیں۔

اسی دن اس کے ایک دوست کی بیوی ہانپتی کانپتی اس کے گھر پہنچیں۔ بری حالت تھی۔ یہ پہلے قرول باغ میں لٹیں اور پھر جس کوارٹر میں ٹھہری تھیں وہاں لٹیں۔ اب کوچہ چیلان میں اپنے ایک رشتے دار کے یہاں ٹھہری ہوئی تھیں۔ ان کے پاس راشن خریدنے تک کے لیے پیسے نہیں تھے۔

شاہد کی غیرت کو یہ گوارا نہیں ہوا کہ وہ ان سے کہے ہمارے پاس بھی کھانے کو کچھ نہیں رہا ہے۔ وہ اس دادا کا پوتا تھا جو اسے سلام کرنے پر ایک اشرفی دے دیا کرتے تھے۔ اس گھر میں سو پچاس روز نوکروں پر خرچ ہوجایا کرتے تھے۔ شاہد نے پچاس اپنے پاس روک کر' پچاس ان خاتون کو دے دیے۔

اب واقعی پریشانی کی بات تھی۔ یہ پچاس کتنے دن چلیں گے۔ اب تو اتنے پیسے بھی پاس نہیں کہ اگر پاکستان جانا پڑا تو کرائے کے نام پر دے سکے۔

اسی پریشانی میں کسی نے آکر اطلاع دی کہ آپ کے ایک عزیز ہیں' ان کے پاس جہاز کی چار سیٹیں ہیں۔ انہوں نے کہلوا دیا ہے کہ آپ کے یہاں سے چار آدمی جا سکتے ہیں۔ شاہد کے سامنے مشکل یہ تھی کہ بیس آدمی تو گھر کے ہی تھے' اس کے علاوہ وہ رشتے دار بھی تھے جو خوف کی وجہ سے اس کے گھر آکر ٹھہر گئے تھے۔ کس کو بھیجتا' کس کو نہیں بھیجتا۔ اس نے بیوی سے بات کی۔ بیوی نے کہا۔

"ہم یوں قسطوں میں نہیں جائیں گے۔ جائیں گے تو سب ساتھ' مریں گے تو سب ساتھ۔"

بیوی کا کہنا بھی درست تھا۔ شاہد نے اپنی ساس اور ان کی تین بچیوں کو بھیج دیا۔ اس کے ہم زلف جو پاکستان اسٹاف کے آدمی تھے انہیں ایئرپورٹ چھوڑنے گئے اور چلتے وقت کہہ گئے کہ آپ بھی سامان تیار رکھیے۔ اگر میں ٹکٹ بنوا سکا تو ٹرک لے کر آجاؤں گا۔ پھر آپ کو بھی چلنا ہوگا۔

گھر والوں نے سامان باندھنا شروع کردیا۔ سامان کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ ہوائی جہاز سے جانے کا الگ' ریل سے جانے کا الگ' پیدل بھاگنے کا الگ۔ کیا خبر کس طرح جانا پڑے۔

شاہد دور بیٹھا تماشا دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنی کسی چیز کو بھی ہاتھ نہیں لگایا۔ اسے پاکستان نہیں جانا تھا۔ اس سے دلی کیسے چھوٹتی۔ وہ تو بس اس حد تک تیار ہوا تھا کہ عورتیں اور بچے یہاں سے اگر نکل سکتے ہیں تو نکل جائیں۔ وہ اگر گیا بھی تو امن قائم ہونے کے بعد چلا جائے گا۔ ساقی کی فائلیں' مکتبۂ ساقی کی کتابیں۔ یہ سب تو امن کے بعد ہی جا سکتی ہیں۔ حساب کتاب بھی تھا۔ کئی بکھیڑے تھے۔

دو دن گزر گئے' عزیز صاحب لوٹ کر نہیں آئے۔

۱۵ ستمبر کی دوپہر وہ نمازِ ظہر کی تیاری کر رہا تھا کہ عزیز صاحب گھبرائے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔ بال بکھرے ہوئے' کپڑے میلے جیسے کئی دن سے نہ سو سکے ہوں۔

"جلدی چلیے' ٹرک آگیا ہے۔ دس منٹ سے زیادہ نہیں ٹھہرے گا۔"

سب ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔ شاہد کا حال یہ تھا جیسے کہہ رہا ہو' عزیز صاحب! تم کیوں آگئے۔ نہ آئے ہوتے تو یہ تسلی تو ہوتی کہ مجبوری ہے ورنہ ہم بھی چلے گئے ہوتے۔

"آپ لوگ سوچ کیا رہے ہیں' جلدی کیجیے۔" عزیز صاحب نے پھر تقاضا کیا۔

ایک دم جیسے سب کو ہوش آگیا۔ جس کے ہاتھ میں جو سامان آیا لے کر کھڑا ہوگیا۔

گھر میں آئی مہمان عورتوں نے رونا شروع کردیا۔

"ایلو' ہم تو تمہارے سہارے یہاں آن پڑے تھے۔ اب تم ہی چلیں تو ہمارا کیا ہوگا۔"

"ہمیں بھی ساتھ لے چلو۔ جو تم کھاؤ گی ہم وہ بھی نہیں کھائیں گے۔"

"اے شاہد میاں' تم تو کہتے تھے گھر سے محفوظ مقام کوئی نہیں۔ اب تم بھی جا رہے ہو۔"

ڈھارس بندھانے' جواب دینے کی فرصت کسی کے پاس بھی نہیں تھی۔ گھر کی عورتیں اس طرح سامان سمیٹ رہی تھیں جیسے کسی کی کوئی بات سننے کو تیار ہی نہ ہوں۔

"آپ لوگ آرام سے رہیں' یہ جا رہی ہیں' میں تو نہیں جا رہا ہوں" شاہد نے کہا۔

مہمان عورتوں کے چہروں پر رونق آگئی کہ چلو کچھ تو سہارا ہے لیکن اس کے بیوی بچوں کے ہاتھ رک گئے۔ جو سامان جہاں تھا

وہیں رہ گیا۔
"تو ہم بھی جا کر کیا کریں گے، ہم بھی نہیں جاتے۔"
"تم چلو میں بھی آجاؤں گا۔" شاہد نے تسلی دی۔
"نہیں، آپ کو چلنا ہے تو چلیے ورنہ ہم بھی بعد میں چلے جائیں گے۔" بیوی بچوں نے یک زبان ہو کر کہا۔
اس بحث میں اچھا خاصا وقت گزر گیا۔ ٹرک والا شور مچا رہا تھا۔ بیوی بچے کسی صورت چلنے کو تیار نہیں تھے۔ شاہد کو فوراً کوئی فیصلہ کرنا تھا۔ اس نے دیوانوں کی طرح گھر کے در و دیوار کو دیکھا، احمقوں کی طرح اٹھا، الماری کھول کر چند نایاب کتابیں نکالیں اور صحن میں آگیا۔
"چلو"
گھر میں بھری ہوئی مہمان عورتوں نے اس کی طرف اس طرح دیکھا جیسے انہوں نے پہلی مرتبہ ایسا بے مروت آدمی دیکھا ہو۔
شاہد کی غیرت نے یہ گوارا نہ کیا کہ پلٹ کر ان مظلوم عورتوں کی طرف دیکھتا۔
"جاؤ، اللہ کی امان میں۔" مہمان عورتوں نے اسے دعا دی۔
یہ آخری الفاظ تھے جو اس نے اپنے گھر کے آنگن میں سنے۔ بھرا پرا گھر مہمانوں پر چھوڑا اور باہر نکل آیا۔ کتنا عجیب میزبان تھا یہ۔ حالات بھی تو کتنے عجیب تھے۔
وہ سر جھکائے، ملزموں کی طرح گھر سے باہر آیا۔ محلے کے لوگ ٹرک کے گرد جمع ہو گئے تھے۔
"کیوں میاں، آپ بھی جا رہے ہیں۔"
"ہائیں، آپ بھی جا رہے ہیں۔ ہم تو سمجھ رہے تھے صرف عورتیں جائیں گی۔"
"آپ تو ہم سے کہتے تھے، یہیں جمے بیٹھے رہو اور اب خود ہی...."
"واہ صاحب! ہمیں خوب دھوکے میں رکھا۔"
وہ سب کی سن رہا تھا لیکن یوں خاموش تھا جیسے بولنا بھول گیا ہو۔
دو ٹرک کھڑے تھے۔ ایک کیپٹن اور دو رائفل والے بھی ساتھ تھے۔ شاہد کے ہم زلف عزیز صاحب چونکہ ملٹری کے دفتر میں ملازم تھے اس لیے کیپٹن اور رائفل والوں کو اپنے ساتھ لانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔
شاہد نے دل ہی دل میں محلے والوں کو خدا حافظ کہا اور ٹرک میں سوار ہو گیا۔ کچھ سواریاں ان ٹرکوں میں پہلے سے موجود تھیں، بہرحال انہیں بھی جگہ مل ہی گئی۔
بازار سنسان پڑے تھے۔ کہیں کہیں گورکھا فوجی پہرا دے رہے تھے۔ اب یہ ٹرک پھول منڈی سے گزر کر فیض بازار سے گزر رہا تھا۔ ہندو اور سکھ اپنے مکانوں پر کھڑے تھے۔ اچانک گولیوں کی بوچھار آئی اور شاہد کو زخمی کر گئی۔ یہ وہی دلی تھی جہاں اس کے باپ دادا کے قصیدے پڑھے جاتے تھے۔ جہاں کے ہندو اسے میاں صاحب کہہ کر بلاتے تھے۔ انہی سڑکوں پر وہ بچپن میں اپنے والد کے ساتھ دو گھوڑوں والی شاندار بگھی میں بیٹھ کر نکلتا تھا۔ جسے لوگ حیرت سے دیکھتے تھے اور پوچھتے تھے یہ کس کی سواری ہے۔
اس نے بیوی بچوں سے آنکھ بچا کر اپنی آنکھوں کے آنسو پونچھے۔ اسے بھائی رازق الخیری کی یاد آگئی جنہوں نے اس سے کہا تھا، ابھی نکل چلو۔ پھر نہ جانے کن حالات میں جانا پڑے۔ اس سے برے حالات اور کیا ہوں گے۔ جس مکان میں میرا بچپن کھیلا تھا، اس مکان کو دیکھنا تک نصیب نہیں ہوا۔ جس رسالے کو میں نے اکلوتے پوت کی طرح پالا تھا اسے بے سہارا چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ مکتبۂ ساقی میں کچھ نہیں تو دو لاکھ کی مطبوعات ہوں گی۔ کہاں ہیں وہ؟ میں نے جس شہر میں رئیسوں کی زندگی گزاری اسی شہر میں آج میری جیب میں صرف پچاس روپے ہیں۔ ان پچاس روپوں کا بھی کیا بھروسا۔ کب کوئی سکھ، کوئی ہندو پیٹ میں خنجر گھونپ دے اور یہ آخری پونجی بھی جیب سے نکال لے۔ جاگیریں، جائیدادیں سب یہیں رہ گئیں، اب اس سے زیادہ خراب حالات اور کیا ہوں گے۔
ٹرک نے دلی دروازہ پار کیا۔ یہاں سناٹا ہی سناٹا تھا۔ اب خطرہ ٹل گیا تھا۔ پرانا قلعہ قریب تھا۔
قلعے کے باہر اس قدر ہجوم تھا کہ اندر پہنچنے میں ایک گھنٹا لگ گیا۔ ظہر کے بعد تو گھر سے نکلے تھے، یہاں پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی۔ شاہد نے سامان اتارا اور اس محشر کو دیکھنے لگا جو قلعے کے اندر بپا تھا۔ فصیلوں اور برجیوں تک خلقِ خدا بھری ہوئی تھی۔ اتنے لوگ تھے کہ قلعہ، تنگ گلی معلوم ہو رہا تھا۔
اب یہ مشکل تھی کہ اس ہجوم میں اپنے لیے کہاں ٹھکانہ بنائیں۔ جہاں چپہ بھر زمین خالی پڑی تھی، وہیں بستر پھیلا دیے۔ پوری زندگی میں کبھی اس طرح کاہے کو بیٹھے ہوں گے۔ لیکن حواس بحال ہوئے اور دیکھا کہ سب کا یہی حال ہے تو ہمت بندھی۔ خدا کا شکر ادا کیا۔
"ابلو چچا جان بیٹھے ہیں۔" کسی بچے نے چیخ کر کہا۔
شاہد نے آواز کے تعاقب میں نگاہیں دوڑائیں۔ سامنے گٹھری بنی کچھ عورتیں نظر آئیں۔ غور سے دیکھا تو چھوٹا بھائی سراج اور بڑے بھائی مُنذر بھی نظر آگئے۔ شاہد کو حیرت ہوئی کہ یہ دونوں یہاں کیسے۔ ان کی کوٹھی تو سول لائنز میں تھی۔ ان پر کیا افتاد پڑ گئی۔ شاہد دوڑ کر ان کے پاس پہنچا۔ دونوں بھائی اس طرح اس سے لپٹ گئے جیسے برسوں کے بچھڑے اب ملے ہیں۔
"آپ لوگ یہاں کہاں" شاہد نے پوچھا۔
"اور تم یہاں کیوں آگئے۔ تمہارا محلّہ تو محفوظ تھا۔" بھائیوں نے پوچھا۔
"شاید اب یہاں کوئی محفوظ نہیں۔"
"تم سچ کہتے ہو۔" مُنذر بھائی کی آنکھوں سے آنسو جاری

ہوگئے۔

"کل ایک فوجی دستے نے آکر گھیرا ڈال لیا اور بندوقیں رکھوالیں۔ ہم نے کہا بھی کہ ان بندوقوں کے لائسنس موجود ہیں لیکن انہوں نے ایک نہیں سنی۔ ہم نے سوچا جب ہتھیار ہی نہ رہے تو اپنی جان کیسے بچائی جاسکتی ہے۔ ناچار مختصر سا سامان لے کر نکل کھڑے ہوئے۔"

"اور کوٹھی؟"

"کوٹھی ایک ہندو پڑوسی کے حوالے کر آئے ہیں کہ کبھی آنا ہوا تو دیکھا جائے گا۔ لیکن اب سوچتا ہوں شاید ہی کبھی آنا ہو۔" مُنذِر بھائی نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

رات بڑھ رہی تھی۔ کیمپ میں چولہے روشن ہوگئے تھے۔ مصیبت کیسی بھی ہو' پیٹ تو بھرنا ہوتا ہی ہے۔ شاہد کی بیوی عاصمہ اپنے ساتھ چند روز کا راشن' گھی وغیرہ ایک کنستر' بوری میں بھر کر لے آئی تھی۔ بھائی کے پاس انگیٹھی اور کوئلہ موجود تھا۔ عاصمہ نے کھچڑی چڑھادی۔ ایسا کھانا شاہد کے گھر میں کبھی نہیں پکا تھا۔ اسے ایک مرتبہ پھر اپنی بے بسی پر رونا آگیا۔

مُنذِر اور سراج کو دوسرے دن کی اسپیشل سے لاہور جانا تھا۔ ٹکٹوں میں دو آدمیوں کی گنجائش تھی۔ اس نے اپنی دو بچیوں کو ان کے ساتھ بھیجنے کا فیصلہ کرلیا۔

صبح پانچ بجے جانے والوں میں ہلچل مچ گئی۔ شاہد نے بھائیوں ان کے بیوی بچوں اور اپنی دونوں بچیوں کو خدا حافظ کہا اور اپنی باری کا انتظار کرنے لگا۔

دو دن بعد عزیز صاحب نے بتایا کہ سامان بُک کیا جارہا ہے' تم بھی اپنا سامان بُک کرادو۔ ریل تک سامان پہنچانا اور ڈبوں پر چڑھانا آسان نہیں ہوتا۔ شاہد نے بھی سوچا سامان بُک ہوگیا تو ٹرین پر چڑھنا آسان ہوجائے گا۔ ضرورت کا سامان اپنے پاس رکھ کر باقی سب بُک کرادیا۔ ٹھیکے دار نے یہ سب سامان قلعے سے اٹھوا کر نئی دلی کے کسی سرکاری دفتر کے کمروں میں رکھوادیا۔

شامتِ اعمال کہ کسی کے سامان میں ایک بکس تھا جو گر کر ٹوٹ گیا اور اس میں سے ایک برین گن اور کارتوس نکل کر گر پڑے۔ اب شک ہوا کہ دوسرے بکسوں میں بھی کوئی نہ کوئی ہتھیار ہوگا۔ اتنی فرصت تو کسی کو تھی نہیں کہ ان بکسوں کی تلاشی لی جاتی۔ سامان کو آگ لگادی گئی۔ اس آگ کی لپیٹ میں شاہد کا سامان بھی آگیا۔ سامان تھا ہی کتنا' جو تھا وہ بھی جل گیا۔

"شام تک تو لاہور پہنچ ہی جائیں گے۔ تم نے اچھا کیا جو سامان تقسیم کردیا۔" شاہد نے کہا۔

"اور نہیں تو کیا' ایک ہی وقت تو پیٹ کا جہنم بھرنا ہے۔"

سامان سے لدا ہوا ٹرک قلعے سے نکلا اور بستی نظام الدین کی طرف چل دیا۔ اسٹیشن کے باہر ہزاروں آدمی پڑے تھے۔ افراتفری کا سماں تھا۔ ہر ایک کو ڈبے میں چڑھنے کی جلدی تھی۔ لوگ کھڑکیوں سے سامان اندر پھینک رہے تھے۔ ٹین کے بکس' تانبے کے لوٹے لوگوں کے سروں پر گر رہے تھے لیکن شاید لوگ اتنی بڑی مصیبت سے گزر کر آرہے تھے کہ کوئی ان بدتمیزیوں کا برا نہیں مان رہا تھا۔ ہر ڈبے میں گنجائش سے زیادہ آدمی بھرے ہوئے تھے اور اس وقت تک بھرتے رہے جب تک پاؤں رکھنے کی جگہ تھی۔

آدھے گھنٹے کی بھاگ دوڑ کے بعد شاہد کو بھی ایک ڈبے میں گھُسنے کی جگہ مل گئی۔

جس گاڑی کو صبح سات بجے چلنا تھا' دس بجے روانہ ہوئی۔

نظام الدین سے گاڑی چلی اور نئی دلی پر ٹھہری' اسٹیشن پر بے شمار سکھ کھڑے بے ہنگم قہقہے لگا رہے تھے۔ پندرہ منٹ بعد گاڑی نے یہاں سے بھی کوچ کیا۔ دہلی کے اسٹیشن سے گاڑی گزرتی چلی گئی۔ شاہد نے باہر جھانک کر دیکھا۔ اسٹیشن سنسان پڑا تھا اور جا بجا فوجی پہرا دے رہے تھے۔ پھر شاہدرہ آیا' غازی آباد آیا' گاڑی رکے بغیر تیز رفتاری سے بھاگتی رہی۔

میرٹھ کے اسٹیشن پر دو چار مسلمان نظر آئے مگر وہ بھی ڈرے سہمے۔ یہاں سودا بیچنے والے بھی تھے مگر جنگلے کے دوسری طرف گاڑی کے ساتھ چلنے والے فوجی کسی کو نیچے اترنے نہیں دیتے تھے۔ میرٹھ چھاؤنی پر بھی یہی کیفیت تھی۔ ہندو خوب چل پھر رہے تھے لیکن مسلمان کوئی نظر نہ آتا تھا۔

اب رات نے پر پھیلا دیے تھے۔ ڈبے میں تو روشنی نہیں تھی البتہ باہر ملگجی چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ ڈبے کے اندر خوف اور اندھیرا ایک ساتھ جمع ہوگئے تھے۔ ایسی اداسی پھیلی ہوئی تھی کہ بچے تک رونا بھول گئے تھے۔

شاہد کھڑکی سے سر نکالے بھاگتے ہوئے درختوں کو دیکھ رہا تھا اور آنے والے وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ گاڑی پوری رفتار کے ساتھ بھاگے جارہی تھی۔ گاڑی کی رفتار سے تیز شاہد کا ذہن بھاگ رہا تھا۔ وہ ذہنی طور پر لاہور میں تھا۔ لاہور پہنچ کر اسے کیا کرنا ہے' کیا مسائل آسکتے ہیں' ان سے کس طرح نمٹنا ہے' بہت سے سوال تھے جو ابھر رہے تھے اور گاڑی کی گڑگڑاہٹ میں ڈوبتے جارہے تھے۔

ریل چلتی اور رکتی رہی۔ بیٹھے بیٹھے شاہد کی آنکھوں میں نیند اتر آئی۔ کسی وقت آنکھ کھلی۔ آنکھ کیا کھلی' اس کی گود میں بیٹھے ہوئے اس کے بچے نے رونا شروع کردیا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کیے کیے بچے کو تھپک دیا۔ پھر اس نے بے دلی سے' ایک آنکھ کھول کر چاند کی روشنی میں گھڑی کی سوئیوں کو دیکھا۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ اب لدھیانہ آنے والا ہوگا۔ اس نے دل میں سوچا اور پھر آنکھیں بند کرلیں بالکل اس طرح جیسے خواب ٹوٹ جائے اور کوئی اس خواب کو آنکھوں کی کٹوریوں میں دوبارہ بند کرنا چاہے۔ اچانک ایک جھٹکا سا لگا۔ پھر دوسرا' پھر تیسرا اور گاڑی رک گئی۔

اس نے گود کے بچے کو مضبوطی سے تھام لیا۔ ایک عورت اپنی سیٹ سے اچھلی اور اس کے قدموں میں گر پڑی۔ ڈبہ اتنا بھرا ہوا تھا کہ لوگ گرنے کے بجائے ایک دوسرے سے ٹکرا کر رہ گئے۔

”یا اللہ خیر“

”حملہ ہوگیا‘ حملہ ہوگیا“ کسی نے زور زور سے چیخنا شروع کردیا۔

اس آواز سے ایسی سراسیمگی پھیلی کہ عورتوں نے زور زور سے رونا شروع کردیا۔ ان کی دیکھا دیکھی بچوں نے بھی چیخنا شروع کردیا۔ مرد اپنی اپنی عورتوں کو ڈانٹنے لگے۔ عورتیں سہم کر چپ ہوگئیں۔

”کھڑکیاں بند کرو“ کسی فوجی نے باہر سے چیخ کر کہا۔ آواز کے ساتھ ہی کھڑکیاں کھٹا کھٹ بند ہوگئیں۔

”دیکھا‘ میں نہ کہتا تھا حملہ ہوگیا ہے۔“ اندھیرے میں وہی آواز پھر گونجی۔

کھڑکیاں بند ہوئیں تو ڈبہ ابلنے لگا۔ گرمی نے بچوں کو الٹا دیا۔ عورتیں تو سہم گئیں‘ بچوں کو کیسے چپ کرایا جائے۔ ریلیں کٹ رہی تھیں‘ روز کا یہی معمول تھا۔ کچھ بھی ہوسکتا تھا‘ کچھ بعید نہیں تھا۔ ڈبے میں سب نہتے تھے۔ کسی کے پاس چھری تک نہیں تھی۔ سب مرنے کے لیے تیار تھے۔ کوئی گولی کسی بھی وقت کھڑکی توڑ کر اندر آسکتی تھی۔ اتنے میں فوجی موٹروں اور جیپوں کی آوازیں آنے لگیں۔ اب اس میں کوئی شک نہیں رہ گیا کہ حملہ ہوا ہے یا ہونے والا ہے۔

اب محافظ دستے نے گولیاں چلانا شروع کردیں۔ دونوں طرف سے گولیاں چل رہی تھیں۔ باہر کیا ہورہا ہے کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ باہر سے کسی فوجی کے بولنے کی آواز آئی۔ وہ کھڑکی کے پاس ہی کھڑا تھا۔ شاہد نے ہمت کرکے اس سے پوچھا۔

”ہم اتر کر کہیں بھاگ جائیں؟“

”تم ریل میں بیٹھے رہو‘ جب تک ہم زندہ ہیں تم نہیں مرسکتے۔“ فوجی نے کھڑکی سے منہ لگا کر کہا۔

”کیا خبر تھی کہ یوں مارے جائیں گے۔ ورنہ میں تو گھر کی دہلیز پکڑے بیٹھی رہتی۔“ شاہد نے اندھیرے میں عاصمہ کی آواز سنی۔

”موت سے کس کو رستگاری ہے۔ بس چپکی بیٹھی رہو اور خدا کو یاد کرو۔“ شاہد نے تسلی دی۔

”ہاں بہن‘ کیسی بے کسی کی موت ہوگی۔“ کسی عورت کی آواز آئی۔

”جانے اگلے ڈبوں پر کیا قیامت گزر گئی ہوگی۔“ شاہد نے سرگوشی میں کہا۔

ایک گھنٹے تک گولیوں کا تبادلہ ہوا پھر یہ آوازیں کم ہوتے ہوتے ختم ہوگئیں۔

”بھاگ گئے حرام زادے۔“ کسی فوجی کے کہنے کی آواز سنائی دی۔

تھوڑی دیر میں ایک جھٹکا اور لگا اور ریل چل دی۔ جب یقین ہوگیا کہ اب اسٹیشن گزر گیا ہوگا تو جان میں جان آئی۔

خطرے کے ٹلتے ہی احساس ہوا کہ ڈبہ تپ کر تنور بن گیا ہے۔ کپڑے پسینے میں اس طرح بھیگ گئے ہیں کہ ابھی اتارو اور نچوڑلو۔ شاہد نے تنگ آکر کھڑکی کھول دی۔

”میاں کیا کرتے ہو‘ کوئی گولی مار دے گا۔“ ایک مسافر نے اسے زور سے ڈانٹا۔

”گولی میرے لگے گی‘ کھڑکی کے پاس میں بیٹھا ہوں۔“

”آپ اپنے ساتھ ہمیں بھی مروائیں گے۔“

”کھڑکی نہیں کھلی تو دو چار گرمی سے مرجائیں گے۔“

گرمی سے سب ہی تنگ تھے۔ دو چار مسافروں نے شاہد کی حمایت بھی کی۔

چاند کہیں چھپ گیا تھا۔ چاندنی نے ملگجا لباس پہن لیا تھا۔ جھاڑیاں تھیں‘ اندھیرا تھا اور غیر یقینی صورت حال۔ جب کچھ دیر تک کوئی گولی نہیں چلی تو مسافروں کو اطمینان ہوگیا۔ جو کچھ ابھی ہوا تھا‘ اس پر تبصرے ہونے لگے۔ ہر شخص یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ ابھی کیا ہوا تھا‘ کون لوگ تھے‘ کیا نقصان پہنچا گئے۔ لیکن یہ اسی وقت معلوم ہوسکتا تھا جب ریل کسی اسٹیشن پر ٹھہرے۔ کوئی چار بجے ہوں گے کہ گاڑی کسی اسٹیشن پر رکی۔ اعلان ہوا کہ اب گاڑی صبح چلے گی۔ جو اترنا چاہے وہ پلیٹ فارم پر اتر سکتا ہے۔ بیٹھے بیٹھے گھٹنے جواب دے گئے تھے۔ شاہد کھڑکی کے قریب ہی تو بیٹھا تھا‘ کھڑکی سے پلیٹ فارم پر کود گیا۔ یوں لگا جیسے برسوں کے بعد قید سے رہائی ملی ہو۔ بہت سے لوگ اگلے ڈبوں کی طرف جارہے تھے۔ وہ بھی چل دیا۔ اب اس کی آنکھیں کھلیں کہ اس حملے میں کیا کچھ نہیں ہوگیا۔ انجن سے متصل تین ڈبوں میں سوائے لاشوں کے کچھ نہیں تھا۔ اب انہیں لاہور تک اسی عالم میں جانا ہوگا۔

مرد اور عورتیں پانی کے نلکوں پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ شاہد نے بھی کندھے جھکائے‘ ڈبے کی طرف واپس آیا کہ صراحی لے کر نل سے پانی بھر لے لیکن عزیز صاحب اس سے پہلے ہی یہ کام کرچکے تھے۔ بچے مزے سے بیٹھے پانی پی رہے تھے۔

یہ گاڑی دس بجے جالندھر سے روانہ ہوئی لیکن ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر جاکر پھر رک گئی۔ معلوم ہوا‘ انجن میں کچھ خرابی ہے دوسرا انجن آئے گا اس کے بعد گاڑی چلے گی۔ پانی پھر ختم ہوگیا تھا یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ گاڑی کب چلے گی گھنٹا بھر تو لوگوں نے ضبط کیا لیکن اس کے بعد پانی کی تلاش میں نکل گئے۔ قریب ہی ایک کنواں تھا۔ لوگوں نے سوچا‘ کنویں سے پانی نکالا جائے لیکن اندیشہ یہ تھا کہ اس میں کسی نے زہر نہ ملا دیا ہو۔ ایک جوہڑ... میں بارش کا پانی جمع ہوگیا تھا۔ اسے چکھ کر دیکھا گیا۔ ذائقہ بالکل ٹھیک تھا‘ بس ذرا

رنگ گدلا تھا۔ دوسرے لوگوں کی طرح شاہد نے بھی اسی پانی سے صراحی بھرلی۔ عجیب بے بسی تھی لیکن قدرت شاید اسے ان سختیوں کے لیے تربیت دے رہی تھی جو آئندہ اسے پیش آنے والی تھیں۔

چار گھنٹے کے مسلسل اور تکلیف دہ انتظار کے بعد ایک انجن آیا اور گاڑی نے رینگنا شروع کردیا۔

اب یہ گاڑی امرتسر کے پلیٹ فارم پر تھی۔ غالباً جان بوجھ کر پلیٹ فارم پر لگے نل کھلے چھوڑ دیئے گئے تھے کہ کوئی پیاسا ادھر آئے اور اسے شکار کریں۔

"کیوں صاحب، ہم سامنے کے نل سے پانی بھرلیں؟" شاہد نے سکھ گارڈ سے پوچھا۔

"تہاڈا دماغ تو ٹھیک اے۔ جاندے نئیں اوایہہ امرتسرائے امرتسر۔" گارڈ نے تیوری چڑھا کر کہا۔

پانی بہتا رہا اور پیاسے، پیاسے ہی رہ گئے۔ کس کی ہمت تھی کہ امرتسر کے اسٹیشن پر اترے۔

ایک گھنٹے بعد امرتسر سے نجات ملی۔ مُردوں میں جان پڑگئی۔ اب کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اب کچھ ہی دیر میں اس زمین پر قدم ہوں گے جس کے لیے خون کا دریا پار کیا ہے۔

"پاکستان زندہ باد"

"قائداعظم زندہ باد۔"

پاکستان کی سرحد آگئی تھی۔ سرگوشیاں نعروں میں تبدیل ہوگئی تھیں۔ فضا اللہ اکبر کے نعروں سے گونج گئی۔ اب کسی کو اپنے لٹنے کا دکھ نہیں تھا۔ کسی کو اپنے پیاروں سے بچھڑنے کا غم نہیں تھا۔ کسی سے راستے بھر کچھ بھی نہیں کھایا گیا تھا لیکن بھوک کا احساس بھی نہیں تھا۔

پاکستان کا پہلا اسٹیشن جلّو آگیا۔ ریل کے رکتے ہی ہر ڈبے میں کئی کئی آدمی آئے اور سب مسافروں میں روٹیاں، دال اور چاول تقسیم کرکے چلے گئے۔ راستے بھر خوف کے مارے کچھ نہیں کھایا تھا، اب خوشی سے منہ میں روٹی نہیں چل رہی تھی۔ بڑی مشکل سے آدھی روٹی حلق سے اتاری۔

لاہور کا اسٹیشن اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ پچیس سال پہلے وہ اسی شہر کے ایک کالج میں داخلہ لینے آیا تھا۔

اس وقت یہاں آدمیوں کا جنگل تھا۔ جس طرف نگاہ اٹھتی، آدمی ہی آدمی تھے۔

"حملہ کہاں ہوا ہے؟"

"کتنے آدمی مارے گئے۔"

کئی آدمی مسافروں سے پوچھتے پھر رہے تھے۔ اور جب پوری طرح تصدیق ہوگئی تو یہ کہتے ہوئے چلے گئے۔

"فکر مت کرو، آج ہی تمہارا بدلہ ان سکھوں سے لیتے ہیں۔ چلو بھائیو! باغبانپورہ کی طرف۔ دیکھتے ہیں مشرقی پنجاب جانے والی کوئی گاڑی کیسے سلامت جاتی ہے۔"

شاہد ان لوگوں کو جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا، بدلہ تو یہ لے لیں گے لیکن یہ آخری ٹرین تو نہیں تھی۔ بھارت سے ابھی اور ٹرینیں بھی تو آرہی ہوں گی!!

لاہور کا حال بھی دلی سے مختلف نہیں تھا۔ اسٹیشن پر اترتے ہی معلوم ہوا کہ شہر میں کرفیو لگا ہوا ہے لہٰذا صبح ہونے سے پہلے باہر نہیں نکل سکتے۔

شاہد نے یہ رات بیوی بچوں کے ساتھ اسٹیشن پر گزاری اور صبح، کرفیو اٹھنے کے بعد وہ اپنے دوست ایم اسلم کے گھر پہنچ گیا۔ وہ جب بھی لاہور آتا تھا، ایم اسلم ہی کے گھر ٹھہرتا تھا لہٰذا وضع داری کا تقاضا تھا کہ اب بھی وہ اسی دروازے پر دستک دے۔

وہ اس گھر میں کئی مرتبہ آچکا تھا لیکن اب اس حال میں آیا تھا کہ ایم اسلم اسے حیرانی سے دیکھتے رہے، پھر پہچان کر گلے لگالیا۔

"آپ تو اچانک بوڑھے ہوگئے۔"

اب شاہد انہیں کیا بتاتا کہ اس نے ایک ایک دن، ایک ایک برس کرکے کاٹا ہے۔ اس لیے اپنی عمر سے دس سال آگے بڑھ گیا ہے۔

ایم اسلم نے اس کی ایسی دل جوئی کی کہ وہ شام آنے سے پہلے پہلے اپنے دکھ بھول چکا تھا۔

ایم اسلم کو یقین تھا کہ شاہد ایک دن یہاں ضرور آئے گا۔ اس کے آنے سے پہلے ہی انہوں نے اس کے مستقل قیام کے لیے اپنے قریب ہی ایک مکان کا انتظام کرلیا تھا۔

"آپ کے لیے علیحدہ مکان کا انتظام ہے لیکن جب تک میرا جی چاہے گا آپ کو اپنے پاس ٹھہراؤں گا۔" ایم اسلم نے نہایت اپنائیت سے کہا۔

شاہد مجبور ہوگیا اور تقریباً بیس دن وہ ایم اسلم کے ساتھ رہ کر اپنے گھر میں منتقل ہوگیا۔

○☆○

وہ خیریت سے پاکستان پہنچ گیا تھا لیکن بھارتی اخباروں میں یہ خبر چھپ گئی کہ ساقی کے مدیر شاہد احمد دہلوی جس ٹرین سے پاکستان جارہے تھے اس پر حملہ ہوا اور شاہد احمد دہلوی قتل کردیئے گئے۔ اخباروں نے یہ تک چھاپ دیا تھا کہ ان کی شناخت ان کی انگلی میں پڑی ہوئی انگوٹھی سے ہوئی۔ اس کی یاد میں تعزیتی جلسے تک ہوگئے اور وہ یہاں زندہ سلامت تھا۔

○☆○

جب لاہور کے حالات کچھ سازگار ہوئے، امن قائم ہوا تو اسے فکر ہوئی کہ معاش کا کچھ انتظام کیا جائے۔ اس نے سوچا، بچھڑی ہوئی دلی کو تو کاندھے پر اٹھا کر نہیں لاسکتا، دلی کے "ساقی" کو تو یہاں لایا جاسکتا ہے۔ اس نے "ساقی" کے ڈیکلریشن کے لیے درخواست دے دی۔ ڈیکلریشن کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا لیکن وہ

بلا مقابلہ فاتح

پاکستان کی انتخابی تاریخ فقط چوبیس برس اور چھ انتخابات پر محیط ہے۔ ان چھ انتخابات میں ۳۰ ارکانِ قومی اسمبلی بلامقابلہ منتخب ہوئے۔ اس قسم کے سب سے زیادہ واقعات ۱۹۷۷ء میں پیش آئے۔ اگرچہ ان انتخابات کے متعلق شکوک وشبہات پائے جاتے ہیں لیکن بہرحال وہ اب تاریخ کا حصہ ہیں اور ۱۹۷۷ء کے الیکشن ریکارڈز کو مسترد تو کیا جاسکتا ہے 'تاریخ سے نہیں نکالا جاسکتا۔ آیئے ایک نظر بلامقابلہ فاتح قرار دیئے جانے والے ارکانِ قومی اسمبلی کی فہرست پر ڈالتے ہیں۔

نمبر شمار	رُکنِ اسمبلی	سن	پارٹی	حلقہ
۱	ملک نعمت اللہ خان شنواری	۷۰ء	آزاد	این ڈبلیو ۲۱ قبائلی علاقہ ۳
۲	نور محمد لنڈ	۷۷ء	پیپلز پارٹی	این اے ۱۵۴ سکھر ۴
۳	مہران خان بجارانی	۷۷ء	پیپلز پارٹی	این اے ۱۵۵ جیکب آباد' ۱
۴	عبدالفتح میمن	۷۷ء	پیپلز پارٹی	این اے ۱۵۷ نواب شاہ' ۱
۵	غلام مجتبیٰ جتوئی	۷۷ء	پیپلز پارٹی	این اے ۱۵۸ نواب شاہ ۲
۶	سیّد بشیر احمد شاہ	۷۷ء	پیپلز پارٹی	این اے ۱۵۹ نواب شاہ ۳
۷	ذوالفقار علی بھٹو	۷۷ء	پیپلز پارٹی	این اے ۱۶۳ لاڑکانہ' ۱
۸	سلطان احمد چانڈیو	۷۷ء	پیپلز پارٹی	این اے ۱۶۴ لاڑکانہ ۲
۹	ممتاز بھٹو	۷۷ء	پیپلز پارٹی	این اے ۱۶۵ لاڑکانہ ۳
۱۰	مخدوم محمد زمان' طالب المولیٰ	۷۷ء	پیپلز پارٹی	این اے ۱۶۶ حیدر آباد' ۱
۱۱	حاجی نجم الدین سریوال	۷۷ء	پیپلز پارٹی	این اے ۱۷۱ بدین' ۱
۱۲	نیاز محمد وسان	۷۷ء	پیپلز پارٹی	این اے ۱۷۳ تھرپارکر' ۱
۱۳	ملک سکندر خان	۷۷ء	پیپلز پارٹی	این اے ۱۷۶ دادو' ۱
۱۴	رئیس الن خان لغاری	۷۷ء	پیپلز پارٹی	این اے ۱۷۷ دادو ۲
۱۵	لیاقت علی خان جتوئی	۷۷ء	پیپلز پارٹی	این اے ۱۷۸ دادو ۳
۱۶	رئیس عطا مری	۷۷ء	پیپلز پارٹی	این اے ۱۸۰ سانگھڑ ۲
۱۷	تاج محمد جمالی	۷۷ء	پیپلز پارٹی	این اے ۱۹۷ سبّی' ۱
۱۸	میر عبدالنبی جمالی	۷۷ء	پیپلز پارٹی	این اے ۱۹۸ سبّی' ۲
۱۹	شہزادہ محی الدین	۷۷ء	پیپلز پارٹی	این اے ۱۹۹ قلات ۱
۲۰	امان اللہ گچکی	۷۷ء	پیپلز پارٹی	این اے ۲۰۰ قلات ۲
۲۱	ملک سیّد خان	۸۵ء	★ آزاد	این اے ۳۱ قبائلی علاقہ ۴
۲۲	الٰہی بخش سومرو	۸۵ء	آزاد	این اے ۱۵۴ شکار پور' ۱
۲۳	سیّد بشیر احمد شاہ	۸۵ء	آزاد	این اے ۱۶۱ نواب شاہ ۴
۲۴	سلطان چانڈیو	۸۵ء	آزاد	این اے ۱۶۵ لاڑکانہ ۲
۲۵	محمد خان جونیجو	۸۵ء	آزاد	این اے ۱۸۰ سانگھڑ ۲
۲۶	ظفراللہ خان جمالی	۸۵ء	آزاد	این اے ۲۰۳ نصیر آباد
۲۷	میر محمد عارف جان	۸۵ء	آزاد	این اے ۲۰۵ خضدار
۲۸	حاجی باروز خان	۹۰ء	آزاد	این اے ۲۷ قبائلی علاقہ ۱
۲۹	ملک اسلم آفریدی	۹۰ء	آزاد	این اے ۳۴ قبائلی علاقہ ۸
۳۰	مخدوم امین فہیم	۹۳ء	پیپلز پارٹی	این اے ۱۶۷ حیدر آباد' ۱

☆ ۱۹۸۵ء کے انتخابات غیر جماعتی بنیادوں پر منعقد کیے گئے تھے۔ بعد ازاں اسمبلی میں ارکان نے اپنی پسند کے گروپس میں شمولیت اختیار کرلی تھی۔

دفتر کے چکر کاٹ کاٹ کر تھک گیا۔ عقدہ یہ کھلا کہ پریس برانچ میں وہی چودھری محمد حسن بیٹھے ہوئے ہیں جنہوں نے منٹو اور عصمت پر فحش نگاری پر مقدمہ چلوایا تھا اور کبھی اچھے دنوں میں شاہد نے انہیں شکست دی تھی۔ اس کے دل میں ابھی تک زہر بھرا ہوا تھا۔ وہ درخواست کو آگے نہیں بڑھنے دے رہا تھا۔

شاہد کا نام اجنبی نہیں تھا۔ لاہور کا کوئی ادیب ایسا نہیں تھا جو اس سے واقف نہ ہو' اس کی خدمات کا معترف نہ ہو۔ اس نے تمام تعلقات استعمال کرکے دیکھ لیے لیکن ڈیکلریشن ملنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔

شاہد لاہور میں رہنا چاہتا تھا۔ لاہور سے اسے جذباتی محبت تھی۔ اس نے یہاں طالب علمی کا بہترین زمانہ گزارا تھا۔ یہاں صحافی اور ادیب اسے جانتے تھے۔ لاہور کی ادبی فضا کا بھی وہ معترف تھا لیکن جب معاش کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو وہ مجبوراً بیوی بچوں کے ساتھ کراچی چلا آیا۔ لاہور میں اس نے دس ماہ گزارے اور ان دس مہینوں میں ساقی شائع نہیں ہوا۔ اس کا اسے بہت قلق تھا۔

○☆○

ڈھیلی ڈھالی شیروانی' کھلتا ہوا سیاہ رنگ' پھیلی ہوئی کھڑی ناک' مسکراتے سنجیدہ ہونٹ' آنکھوں پر موٹے فریم کا چشمہ' داڑھی مونچھ صاف' سر پر جناح کیپ' چہرے پر ایک وقار اور سنجیدگی۔ اس حلئے کا ایک آدمی اپنے کنبے کے ساتھ مارٹن روڈ کراچی کے ایک چھوٹے سے مکان میں آکر ٹھہرا۔ محلے والوں نے اس کی طرف دلچسپی سے دیکھا اور اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔ پاکستان بنے ہوئے ابھی ایک سال ہوا تھا۔ ہندوستان سے بچے کھچے مہاجر اب بھی پاکستان آرہے تھے اور اپنے عزیز و اقارب کے پاس ٹھہر رہے تھے۔ انہی میں ایک وہ بھی ہوگا۔ چلو خیریت معلوم کرتے ہیں۔ محلے کے ایک بزرگ شام کو اس سے ملنے آئے۔ وہ تہمد اور بنیان پہنے آنگن بیچ بیٹھا تھا۔ کچھ کاغذ کچھ کتابیں کھری چارپائی پر ادھر اُدھر پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ اسی حالت میں دروازے پر آیا' بزرگوار سے مصافحہ کیا اور انہیں ساتھ لے کر گھر میں آگیا۔ اسی کھری چارپائی پر وہ بھی ٹک گئے۔

دوسرے دن پورے محلے میں سب کو معلوم ہوگیا کہ یہ صاحب ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے' رسالہ ساقی کے مدیر شاہد احمد دہلوی ہیں۔ لوگ اسے اس طرح دیکھنے آنے لگے جیسے زیارت کرنے آئے ہوں۔ کچھ اس کی سادگی سے متاثر ہوتے کچھ اس کی لچھے دار باتوں سے۔

ابھی ایک دن نہیں گذرا تھا کہ شہر بھر کے ادیب و شاعر اس سے ملنے کے لیے آنے لگے۔

وہ ململ کا کُرتا پہنے' تہمد باندھے پلنگ پر بیٹھا رہتا' بار بار بیڑی سلگاتا اور باتوں کے پھول کھلاتا رہتا۔ اندھیرا پھیل جاتا تو کمرے کی لالٹین آنگن میں آجاتی۔ ہوا تیز ہوتی تو اندھیرے ہی میں رنگ گھلنے لگتے۔ باتیں ہوتی رہتیں۔ دنیا زمانے کی باتیں' فساد کے قصے' دلی کا ذکر اور نہ جانے کیا کیا۔ ان باتوں میں سب کچھ ہوتا' اپنی پریشانی کا ذکر نہ ہوتا۔ فساد کا ذکر کرتا بھی تو اس طرح جیسے دوسروں کا ذکر کررہا ہو' وہ خود اس طوفان سے گزر کر نہ آیا ہو۔ کوئی توجہ دلاتا بھی تو ہلکا سا ایک قہقہہ لگا کر بات کا رخ موڑ دیتا۔ دیکھنے والے حیرت سے اسے دیکھتے کہ یہ شخص کس مٹی سے بنا ہے۔ دلی میں باپ دادا کی جاگیریں چھوڑ کر آگیا' بھوؤں پر میل تک نہیں تھا۔ دلی میں کیا تھا جو اسے میسر نہیں تھا۔ اسے اس عیش و عشرت کا عادی ہو جانا چاہیے تھا لیکن وہ جس پامردی سے ان حالات کا مقابلہ کررہا تھا کیا یہ حیرت کی بات نہیں تھی؟

کوئی تکلف کا مہمان آجاتا تو شاہد خاموشی سے اٹھتا اور تین ہٹی کے ایک سستے سے چائے خانے میں مہمان کے ساتھ جاکر بیٹھ جاتا۔ اسے لکڑی کی بینچوں پر بیٹھ کر' شیشے کے گلاسوں میں چائے پینے میں کوئی عار نہیں تھا۔

کراچی ان دنوں تین ہٹی کے پُل تک آباد تھا۔ شام ہوتے ہی ہو حق کا سماں ہوجاتا تھا۔ وہ اس جنگل میں اپنی دنیا سجائے بیٹھا تھا اور وہ بھی اس عالم میں کہ سواری تک اس کے پاس نہیں تھی۔ کہیں جانا ہوتا تو بسوں کے دھکے کھاتا ہوا جاتا اور اسی طرح لوٹ آتا۔

گھر کا احوال پوچھو تو اور بھی دگرگوں۔ بغیر نل اور بجلی کے دو کمروں میں چوبیس آدمی بھرے ہوئے۔ کہاں وہ لق و دق حویلیاں اور کہاں...... ایک کابک نما کوارٹر' کہاں چوک کی بہاریں' کہاں تین ہٹی کا صحرا' اس کی زندگی نمونۂ عبرت تھی لیکن دوسروں کے لیے۔ وہ عزم و عمل کا پہاڑ' اپنی جگہ ساکت کھڑا تھا اور آندھیوں پر ہنس رہا تھا۔

بیوی اصرار کرتی رہی کہ پہلے سر چھپانے کا کوئی ٹھور ٹھکانا کرلو اس کے بعد کچھ اور سوچنا لیکن وہ سوچ چکا تھا۔ اس کا ہاتھ تنگ تھا لیکن رئیسوں کے دل تنگ نہیں ہوتے۔ اس نے پہلا کام یہ کیا کہ "ساقی" کا ڈیکلریشن لے کر ساقی نکالنا شروع کردیا۔ یہی چھوٹا سا کوارٹر ساقی کا دفتر بھی بن گیا۔ اتنے وسائل نہیں تھے کہ دفتر لے کر عملہ رکھتا۔ خود ہی پرچہ مرتب کرتا' پروف خود پڑھتا' صفحات بچ رہتے تو مضامین بھی خود ہی لکھنا پڑتے۔ پرچہ خود ہی لپیٹتا' پتے اپنے ہاتھ سے لکھتا۔

ایک روز وہ اپنے کام میں مصروف تھا کہ ایک نوجوان اس سے ملنے آیا۔

"شاہد صاحب' میں آپ سے ملنے آیا ہوں۔" نوجوان نے کہا۔

"آیئے مل لیجئے۔"

نوجوان کو اندر بلایا اور صحن میں بیٹھ گیا کہ یہی اس کا ڈرائنگ

روم تھا۔ اندر سے لیمپ منگا کر رکھ لیا۔

"میرا نام جمیل جالبی ہے" نوجوان نے تعارف کرایا۔

ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا۔ بھڑک کر لیمپ بجھ گیا۔ شاہد نے آواز دی اور ایک بچہ لالٹین دے گیا۔

"آپ کا نام بارہا سنا تھا' ملنے کی تمنا تھی سو آج پوری ہوئی۔"

"بھئی لکھنے پڑھنے والے ہو' نام ضرور سنا ہوگا۔"

اب یہ لالٹین بھی تیز ہوا کی تاب نہ لا سکی۔ لڑکھڑائی اور رخصت ہوگئی۔

"لو' یہ بھی دلی کی آخری شمع ہوگئی۔" شاہد نے ہنستے ہوئے کہا" چلو کوئی بات نہیں' ہم ایک دوسرے کو دیکھ تو چکے ہیں' اندھیرے ہی میں باتیں کیے لیتے ہیں۔"

"یہاں تو بجلی تک نہیں' آپ کس طرح کام کرتے ہیں۔"

"بھئی' جب تک بجلی نہیں آئی تھی لوگ کام کیا ہی کرتے تھے۔"

جمیل جالبی نے اس کے دلی میں ٹھاٹ باٹ کی بہت سی کہانیاں سن رکھی تھیں' اس جواب پر اس کے حوصلے کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔

پھر شاہد خود ہی اپنے پاکستان آنے کی کہانی مزے لے لے کر سنانے لگا۔

"بہت سوں کو تو اب بھی معلوم نہیں کہ میں زندہ ہوں۔ کرشن چندر کا خط آیا تھا جس میں میرے انتقال پُرملال کے بارے میں تعزیتی جلسے اور قرارداد کا ذکر کیا تھا۔ مگر آپ دیکھ لیں' میں زندہ ہوں۔ ہاں جما جمایا کام بکھر گیا۔ لیکن اگر زندہ رہا تو آپ دیکھئے گا کہ ساقی کو اسی مقام پر کھڑا کردوں گا۔"

جمیل جالبی کو یہ آدمی ایسا پسند آیا کہ اس نے روز آنا شروع کردیا۔ پھر تو یہ ہوا کہ جمیل اس کی لاٹھی بن گیا۔ آنا جانا' اٹھنا بیٹھنا ساتھ ہوگیا۔ ساقی کے کاموں میں بھی اس سے مدد ملنے لگی۔ جمیل کے پاس کار تھی۔ یہ کار بھی اس کے بہت کام آئی۔

رسالوں کے لیے حالات سازگار نہیں تھے۔ مہاجر رسالوں پر ہی موقوف نہیں تھا' جو رسالے لاہور سے شائع ہو رہے تھے ان کے بھی آدھے سے زیادہ خریدار بھارت میں رہ گئے تھے۔ وی پی اور منی آرڈر' بھارت جانے کا سلسلہ بند ہوگیا تھا جس سے رسالوں کو زبردست نقصان اٹھانا پڑ رہا تھا۔ اشتہاروں کی حالت بھی دگرگوں تھی۔ ساقی میں اشتہاروں کی تعداد بھی نہ ہونے کے برابر تھی لہٰذا نقصان ہی نقصان تھا۔

جب وہ اپنا سب اندوختہ جھونک چکا تو دو وقت کی روٹی اور بچوں کی تعلیم کی فکر ہونے لگی۔

اسے آل انڈیا ریڈیو' دہلی کی یاد آنے لگی جہاں اس نے بارہا موسیقی کے پروگرام کیے تھے۔ وہ دوستوں کے ساتھ ریڈیو پاکستان کراچی پہنچ گیا۔

"اقتباس"

دلّی والے بڑے چٹورے مشہور تھے۔ انہیں زبان کے چٹخاروں نے مار رکھا تھا۔ کچھ مردوں ہی پر موقوف نہیں' عورتیں بھی دن بھر چرتی رہتی تھیں۔ اور کچھ نہیں تو پان کی ہی جگالی ہوتی رہتی تھی۔ بنگلہ پان تو غریب غربا بھی نہیں کھاتے تھے۔ جب دیسی پان افراط سے ملتا ہو تو موٹے پتّے کون چبائے۔ دو ڈھائی آنے میں ڈھولی ملتی تھی۔ یہ بڑے بڑے پان' اور ایسے کرارے کہ اگر ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گرے تو اس کے چار ٹکڑے ہو جائیں۔ ۴۲ء تک چھالیا پرانی رول کی' روپے کی چار سیر آتی تھی۔ کتھا کلکتے کا دو روپے سیر۔ چُونے کی کلھیاں پان والوں کے پاس رکھی رہتی تھیں۔ چُونے کے دام نہیں لیے جاتے تھے۔ پان خریدیے اور چُونا مفت لیجیے۔ پان والے گلی گلی پھر کے بھی پان بیچا کرتے تھے۔ ایک پیسے کے چھ' ایک پیسے کے آٹھ' پٹاری ہر گھر میں ہوتی تھی۔ فوری خاطر پان ہی سے کی جاتی تھی۔ پان کی تھالی میں عموماً کوئی شعر کندہ ہوتا تھا مثلاً

دستِ نازک بڑھائیے صاحب
پان حاضر ہے کھائیے صاحب

اقتباس....(چٹورپن)

ان دنوں ریڈیو اسٹیشن نیا نیا قائم ہوا تھا۔ ایک لمبی سی بیرک میں دو اسٹوڈیو تھے۔ ارد گرد خیمے لگے ہوئے تھے۔ ان خیموں میں دفاتر بھی تھے' پروگراموں کی ریہرسل بھی ہوتی نئے پروگرام بھی یہیں بنتے۔

اس کا کنٹریکٹ ہوگیا۔ موسیقی کا جو فن اس نے کبھی اچھے دنوں میں شوق کی تسکین کی خاطر سیکھا تھا' اب وہی اس کا ذریعۂ معاش بن رہا تھا۔ دہلی یا لکھنؤ کے ریڈیو اسٹیشنوں پر اس نے جتنے پروگرام کیے تھے کبھی معاوضہ وصول نہیں کیا لیکن اب معاوضہ حاصل کرنے کے لیے ہی ریڈیو کی طرف گیا تھا۔ اس نے برسوں ادب کی خدمت کی۔ کتنے ہی لوگوں کو قلم پکڑ کے لکھنا سکھادیا' کتنے ہی گمنام ادیبوں کو شہرت کی بلندیوں پر پہنچادیا لیکن روزی کا ذریعہ بنی

تو موسیقی۔

دہلی میں ایک مرتبہ اس کے پاس سہراب مودی آئے۔ انہیں دہلی کی ثقافت کے پس منظر میں اپنی فلم کے لیے اسکرپٹ لکھوانا تھا۔ شاہد تیار ہوگیا۔ چلتے وقت سہراب مودی نے معاوضے کی بات چھیڑ دی۔ بس پھر کیا تھا۔

"اگر معاوضہ دے کر ہی لکھوانا ہے تو کہیں اور جائیے' یہاں کیا لینے آئے ہیں۔"

اب سہراب مودی کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ مگر اب کیا ہوسکتا تھا۔ نشانہ تو خطا ہو ہی گیا تھا۔ وہ پیر پٹختے رہ گئے لیکن شاہد ہتھے سے اکھڑ گیا تھا۔ سہراب مودی اپنا سا منہ لے کر واپس چلے گئے۔

اب وہ پاؤں پٹخ رہا تھا کہ گانے کے پروگرام دو اور معاوضہ بھی دو۔ اب میں اس معاوضے کو میراثیوں میں تقسیم نہیں کروں گا۔ اب ان پیسوں کی میرے بچوں کو ضرورت ہے۔

لیکن اس شان کا گویا بھی ریڈیو کے در و دیوار نے کبھی نہ دیکھا ہوگا۔

وہ ریڈیو پاکستان' پشاور ایک پروگرام کے سلسلے میں گیا ہوا تھا۔ اپنی اسی شان سے' چکن کا کرتا' شیروانی کے بٹن کھلے ہوئے پاؤں میں سیاہ پمپ' منہ میں بیڑی دبائے وہ ڈیوٹی افسر کے کمرے میں داخل ہوا اور بغیر اجازت لیے ڈیوٹی افسر کے قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور یوں بیٹھا کہ جوتے زمین پر اور دونوں پاؤں کرسی پر۔ جیب سے ایک کاغذ نکالا اور ڈیوٹی افسر کے سامنے رکھ دیا۔

"دیکھو بھئی' یہ دو چیزیں مجھے دی گئی ہیں۔ ایک تو سعدی کی غزل ہے اور دوسرا پوربی گیت۔ اب یہ بتاؤ میں پہلے کیا گاؤں۔"

ڈیوٹی افسر ابھی اس کی جسارت پر حیران تھا کہ اس کا اعتماد دیکھ کر مرعوب بھی ہوگیا۔

یہ ڈیوٹی افسر آج کے مشہور کالم نگار نصراللہ خان تھے۔

"ذرا سعدی کی غزل پڑھ کر سنائیے۔" نصراللہ نے یہ سوچ کر فرمائش کی کہ ابھی پول کھلے جاتی ہے۔

شاہد نے حکم کی تعمیل کی۔ لب و لہجہ درست' تلفظ صحیح' فارسی کی غزل اور گویا صحیح پڑھے!

نصراللہ خاں اسے لے کر اسٹوڈیو میں داخل ہوئے تو سازندے اسے دیکھ کر کھڑے ہوگئے۔

یہ اتنی عجیب بات نہیں تھی لیکن حیرت تو اس وقت ہوئی جب نصراللہ خان اسٹیشن ڈائریکٹر محمود نظامی کے کمرے میں کسی کام سے آئے۔ انہوں نے دیکھا کہ یہ شخص ان کے سامنے بھی جوتیاں زمین پر رکھے دونوں پاؤں کرسی پر رکھے بیٹھا ہے۔ اسٹیشن ڈائریکٹر نے اس کے منہ میں سگریٹ رکھا' ماچس جلائی اور آگے بڑھ کر اس کا سگریٹ سلگایا۔ نصراللہ خاں کو چکر آنے لگے۔ یا الٰہی! یہ کیسا گویا ہے۔ پھر ان دونوں کے درمیان منٹو کے افسانوں کے بارے میں نہایت علمی باتیں شروع ہوگئیں۔

جب یہ آدمی جانے لگا تو محمود نظامی نے آگے بڑھ کر اس کے لئے دروازہ کھولا اور اسے چھوڑنے باہر آئے۔ نصراللہ خاں یوں کھڑے تھے "جیسے تصویر لگادے کوئی دیوار کے ساتھ۔"

"سر! یہ صاحب کون تھے۔" نصراللہ خاں نے محمود نظامی سے پوچھا۔

"شاہد احمد دہلوی تھے۔"

"ساقی والے"

"جی ہاں"

شاہد کے پاس کوئی دنیاوی ساز و سامان نہیں تھا لیکن اس کی تعظیم کرنے پر سب مجبور تھے۔ وہ جس سے ایک مرتبہ مل لیتا' اس کا شاہد بھائی بن جاتا۔ لیکن عزت افزائی سے پیٹ تو نہیں بھرا جاسکتا۔

اس کی شریکِ حیات عاصمہ بیگم نے اس نکتے کو محسوس کیا۔ خاموشی سے رونقِ اسلام اسکول میں نوکری کرلی۔

کچھ دن تو یہ نوکری راز میں رہی لیکن ایک دن وہ وقت سے کچھ پہلے گھر پہنچ گیا۔ عاصمہ اسکول گئی ہوئی تھی۔ بچوں نے کہا۔

"ریڈیو پاکستان گئی ہیں۔"

"کمال ہے' وہاں تو نہیں تھیں۔"

جب ایک آدھ مرتبہ یہی معاملہ دہرایا گیا تو عاصمہ کو بتانا پڑا۔

"میں رونقِ اسلام اسکول میں پڑھانے جانے لگی ہوں۔"

شاہد نے خاموشی سے سنا۔ نہ خوش ہوا نہ خفا۔ لیکن سوچا ضرور ہوگا کہ ڈپٹی نذیر احمد کی بہو ملازمت کررہی ہے۔

جب عاصمہ نوکری کرسکتی ہے تو میں کیوں نہیں کرسکتا۔ اب تک وہ کنٹریکٹ پر کام کررہا تھا' اب اس نے باقاعدہ ملازمت کرلی۔

اس دوران پیر الٰہی بخش کالونی میں اس نے اپنا ذاتی مکان بنوالیا۔ اس مکان میں آنے کے بعد اسے کچھ سہولت ہوگئی۔ مکان نہایت روشن اور ہوادار تھا۔ جمیل جالبی اور رئیس احمد جعفری بھی اسی کالونی میں رہتے تھے۔

پانچ کھڑکیوں والے روشن کمرے کے ایک کونے میں اس نے اپنی مسہری بچھالی۔ اس کے پاس ہی ایک چھوٹی میز جس پر لفافوں' کارڈوں اور کاغذات کا انبار' قلم اور دوات۔ نیچے ایک گدا بچھا رہتا تھا جس پر انوار کاتب بیٹھتے تھے۔ دوسری طرف کرسیاں اور صوفہ' صوفے کے پیچھے تخت بچھے ہوئے۔ دیوار میں تختے لگا کر الماری بنالی گئی تھی جس میں کتابیں اور رسالے بھرے ہوئے تھے۔

اس نے آمدنی بڑھانے کے لیے مکتبۂ فرینکلن سے معاہدہ کرلیا۔ اسے امریکی کتابوں کا ترجمہ کرنے کا کام مل گیا۔ اس معاوضے سے مالی مشکلات کا سامنا کرنے میں خاصی مدد ملی۔ صبح ہوتے ہی وہ ریڈیو کے لیے روانہ ہوجاتا' بیوی اس سے پہلے ہی گھر سے نکل جاتی۔ بچوں اور گھر کی دیکھ بھال کے لیے اس کی ساس

موجود تھیں۔

اس کے ساتھ ستم یہ ہوا کہ اسے صرف مدیر سمجھ لیا گیا جب کہ وہ ادیب بھی تھا اور ایسا ادیب کہ دلی کی ٹکسالی اور قلعۂ معلیٰ کی ٹھیٹ زبان کا آخری نمائندہ تھا۔ اس کا ذریعۂ معاش بھی بنا تو موسیقی، کسی ادبی ادارے میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی حتیٰ کہ اردو بورڈ بنا تو وہاں بھی اس کے لیے گنجائش نہیں تھی۔ لیکن اس کا مزاج ہی ایسا تھا کہ نہ حرفِ شکایت زبان پر لاتا تھا نہ مصائب کی یورش سے گھبراتا تھا۔ نازک سے نازک مرحلوں پر اس کی استقامت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ ایک مرتبہ ایسا انقلاب ہوا کہ وہ تخفیف کی نذر ہوگیا۔ اس کی ملازمت ختم ہوگئی۔ لیکن اس نے کوئی واویلا کیا اور نہ ہی نوکری بچانے کے لیے بھاگ دوڑ کی نہ تعلقات استعمال کیے۔ اسی طرح ہنستا رہا۔ ہنستے ہوئے ریڈیو اسٹیشن سے رخصت ہوگیا۔ اتفاق سے دوسرے دن صبح کی نشریات میں اس کا پروگرام تھا۔ اناؤنسر نے اعلان کیا اور اس نے گانا شروع کیا۔

کارسازِ ما بہ سازِ کارِ ما
فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما

اس کا گانا جیسے ہی ختم ہوا زیڈ اے بخاری کا ٹیلی فون آیا کہ شاہد بھائی سے کہو، جائیں نہیں میں آرہا ہوں۔

بخاری صاحب پر ان بولوں کا ایسا اثر ہوا کہ آتے ہی اسے امید دلائی اور وہ جلد ہی نوکری پر بحال ہوگیا۔

نوکری اس کے مزاج سے کوسوں دور تھی۔ نہ تو وہ وقت کی پابندی کرسکتا اور نہ ہی افسروں کی خوشامد کے فن میں طاق تھا۔ لہٰذا ایک مرتبہ پھر اس کی نوکری پر بن گئی۔ اس نے نوکری کی شرط کو خیرباد کہہ کر کنٹریکٹ پر کام شروع کردیا۔ فیچر لکھے، 'عشائیے تحریر کیے' ہفتہ وار موسیقی کے سبق نشر کیے۔

ہندوستان میں جن کے پاس کچھ بھی نہیں تھا انہوں نے یہاں آکر سب کچھ بنالیا۔ جس کی کٹیا تھی اس نے کوٹھی بنالی۔ دکانوں اور مکانوں کی قطاریں لگ گئیں۔ شاہد لاکھوں کی جائیداد چھوڑ کر آیا اور یہاں کچھ طلب نہیں کیا۔ بس پیر الٰہی بخش کالونی کے مکان کے ایک کمرے میں فرش پر بیٹھا لکھتا رہا اور مسکراتا رہا۔ دلی کی بپتا لکھی، دوستوں کے خاکے لکھے 'اجڑی ہوئی دلی پر یادگار مضامین لکھے اور روزی کمانے کے لیے ترجمے کیے۔

موسیقی سے اسے عشق تھا۔ یہ عشق پاکستان آنے کے بعد بھی قائم رہا۔ کچھ دن محفلیں سُونی رہیں لیکن ذرا ہاتھ کھلا تو ساز و آواز کی یہ محفلیں پھر جمنے لگیں۔ شام ہوتے ہی کمرے میں فرشی نشست جم جاتی' احباب جمع ہوتے اور ریاض شروع ہوجاتا۔ بڑے بڑے گویئے آتے اور اس سے سبق لیتے۔ کوئی بھی قابلِ ذکر موسیقار کراچی آتا' شاہد اسے اپنے گھر مدعو ضرور کرتا۔ رات ہوتے ہی کوئی نہ کوئی آتا اور اسے بلا کر لے جاتا۔ کہیں نہ کہیں گانے کی کوئی محفل ضرور جمتی۔ رات گئے واپسی ہوتی۔ شاگردوں کا ایک حلقہ بھی تیار ہوگیا تھا۔ سب ایک جگہ جمع ہوجاتے اور شاہد کو بلا کرلے جاتے' ریاض کراتا اور پھر اپنی کٹیا آباد کرلیتا۔

اب وہ خود رئیس نہیں تھا لیکن اس کا دل رئیس تھا۔ فنکاروں کی خدمت کرنا وہ اب بھی اپنے فرائض میں داخل سمجھتا تھا۔ دلی والے ماسٹر بشیر نے اسی کے دروازے پر آکر جان دی۔ ماسٹر یعقوب قوال کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ شاہد نے اسے اپنے پاس ٹھہرایا اور وہ عرصۂ دراز تک اسی کے در پر پڑا رہا۔ امام الدین ریڈیو آرٹسٹ کے لیے ایک جھونپڑی بھی چند دن کے لیے ڈال دی گئی تھی کہ سر چھپانے کے لیے کوئی جگہ تو ہو۔ اس کا گھر کیا تھا ادب اور موسیقی کا ایک ادارہ تھا۔

انجمن سازی اس کا مزاج نہیں تھی لیکن اس کے بے داغ کردار کی وجہ سے اسے "نوپارٹی مین" سمجھا جاتا تھا لہٰذا کوئی انجمن کوئی ادارہ بنتا اسے ضرور شامل کیا جاتا۔

پاکستان میں اخبارات کی انجمن تو تھی لیکن رسائل کے مسائل حل کرنے کے لیے کوئی انجمن نہیں تھی جب کہ رسائل بہت سے مسائل میں گھرے ہوئے تھے۔ کاغذ کا مسئلہ تھا' اشتہاروں کا اور دیگر مسائل تھے۔ سب سے پہلے رازق الخیری مدیر "عصمت" نے اس طرف توجہ کی اور مشورے کے لیے شاہد کو بھی طلب کرلیا۔ وہ خود ان مسائل سے دوچار تھا۔ دونوں نے بیٹھ کر پروگرام وضع کیا اور کراچی کے تمام رسائل کے مدیروں کو عصمت کے دفتر میں آنے کی دعوت دی۔ اتفاقِ رائے سے انجمنِ ادبی رسائل پاکستان کا قیام عمل میں آگیا۔ مولانا خیری اس کے صدر ہوئے اور شاہد کو سیکریٹری منتخب کیا گیا۔

اس انجمن کا پہلا سالانہ جلسہ لاہور میں کیا گیا۔ ملک فیروز خان نون' وزیرِ اعلیٰ پنجاب نے بھی اس افتتاحی جلسے میں شرکت کی اور اعلان کیا کہ اگر اس انجمن کو رجسٹرڈ کرالیا جائے تو وہ پانچ ہزار کا عطیہ دیں گے۔

انجمن رجسٹرڈ ہوگئی اور عطیہ بھی مل گیا۔ اس انجمن نے بساط بھر ادبی رسائل کی خدمت کی۔ سرکاری اشتہارات رسائل کو نہیں ملتے تھے' محکمے کے سیکریٹری سید ہاشم رضا سے اس قدغن کو دور کرایا۔ سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اس انجمن کے طفیل مختلف مدیران اور ادب کے لیے کام کرنے والے ایک دوسرے سے قریب آگئے۔

یہ انجمن نہایت کامیابی سے سفر کررہی تھی۔ باقاعدگی سے اس کے اجلاس ہو رہے تھے۔ اس کا دائرہ مشرقی پاکستان تک پھیل گیا تھا۔ اور یہ سب شاہد احمد دہلوی کی انتھک محنت کا نتیجہ تھا۔

شاید اس انجمن ہی کا اثر تھا کہ بعض ادیبوں کو بھی یہ خیال آیا کہ مصنفین کی بھی ایک انجمن ہونی چاہیے۔

ملک میں مارشل لاء آچکا تھا۔ سیاسی جماعتوں کی عدم موجودگی

بھی اس انجمن کے قیام کا باعث ہوئی کہ کوئی تو پلیٹ فارم ہو جس کے ذریعے ادیب و شاعر اپنی آواز کو حکومت تک پہنچا سکیں مارشل لاء کے کارپردازوں نے بھی اس انجمن کو غنیمت سمجھ کر اس کی حوصلہ افزائی کی۔

چند مقامی مصنفین جمیل الدین عالی کے گھر جمع ہوئے۔ قرۃالعین حیدر، قدرت اللہ شہاب، جمیل جالبی، شاہد احمد اور چند دوسرے ادیب اس اجلاس میں شریک ہوئے۔

اس جماعت کے مقاصد پر گفتگو کرنے کے بعد اس کا نام پاکستان رائٹرز گلڈ تجویز ہوا۔ شاہد کا "نو پارٹی مین" ہونا یہاں بھی ثابت ہوا۔ اسے تمام شرکا نے بالاتفاق اس گلڈ کا کنوینر منتخب کرلیا۔

شاہد اپنے ذاتی کاموں کے لیے نہایت کاہل اور بے پروا ثابت ہوتا تھا۔ اتنا کاہل کہ اپنی املاک کے گوشوارے تک داخل کرانے کا وقت اس کے پاس نہیں تھا۔ مارشل لاء حکومت نے خانہ بدوش دعوے داروں سے املاک کے گوشوارے طلب کیے۔ شاہد کے علاوہ اس کے سب بھائی بہنوں نے گوشوارے جمع کرادیے۔ جب وقت تنگ ہونے لگا تو اس کے بڑے بھائی منظور احمد نے شاہد کے بڑے بیٹے مشہود احمد سے فارم بھرا کر داخل کروا دیا۔ شاہد کو تو دستخط کرنے میں بھی تامل تھا، بے دلی سے دستخط کردیے۔ پیروی کے لیے بھاگ دوڑ کی فرصت اس کے پاس کہاں تھی۔ اس کا فارم تو داخل ہوگیا۔ کلیم کا فیصلہ بھی ہوگیا۔ اب رقم کی وصولی کا وقت آیا۔ بازار میں کلیم نصف قیمت پر فروخت ہونے شروع ہوئے تو منظور احمد نے شاہد سے کہا،

"تم اپنا کلیم پچاس فیصدی پر نکال دو۔"

"نہیں، یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ جو کلیم پہلے ہی اونی پونی قیمت پر منظور ہوا ہو، اب اس کی مزید کوڑیاں کرلوں۔"

بالآخر حکومت نے کلیم کی کتابیں واپس لے لیں۔

اپنے معاملات میں وہ اتنا بے نیاز تھا، دوسری طرف گلڈ کا کنوینر بنتے ہی وہ وقت بھی اس نے گلڈ کو دے دیا جس میں وہ کوئی مضمون لکھ کر یا کوئی ترجمہ کرکے پیسے کما سکتا تھا۔ اس نے اپنے وقت کی کوئی قیمت بھی گلڈ سے وصول نہیں کی۔ وہ یہ خدمات بلامعاوضہ انجام دیتا رہا۔

عہدہ ملتے ہی اس نے پہلا کنونشن بلایا۔ اپنے ہاتھ سے پتے لکھ کر پانچ سو دعوت نامے ہر زبان کے ادیبوں اور شاعروں کو بھیجے۔ کراچی میں دو دن تک اس کی مختلف نشستیں ہوئیں، گرماگرم بحثیں ہوئیں، دستور بنا اور گلڈ کی شاخیں کراچی، لاہور اور ڈھاکا میں قائم ہوئیں۔

۱۹۵۸ء کی گرمیوں کے دن تھے۔ وہ اپنے دفتر میں بیٹھا کوئی فیچر تحریر کررہا تھا۔ اسے پیغام ملا کہ چیف کمشنر کراچی نے اسے اپنے دفتر میں طلب کیا ہے۔

وہ شاید ہرگز نہ جاتا لیکن یہ سوچ کر چلا گیا کہ گلڈ یا انجمنِ رسائل سے متعلق کوئی کام ہوگا۔ کئی اور خیال بھی آئے۔ بہرحال، وہ کمشنر کے دفتر پہنچ گیا۔ یہاں پہنچا تو معلوم ہوا معاملہ کچھ اور ہے۔ کمشنر نے کہا۔

"سیٹو نے چند ایسے لوگوں کے نام پاکستان سے مانگے ہیں جو پاکستانی ثقافت سے سیٹو کے ممبر ملکوں کو روشناس کراسکتے ہوں۔ موسیقی کے شعبے کے لیے میں نے آپ کا نام تجویز کیا ہے۔"

شاہد کو تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ سیٹو اور سنٹو کہاں ہیں اور ان کے کام کیا ہیں لیکن یہ سوچ کر خاموش رہا کہ اگر کمشنر سے معلوم کرتا ہوں تو خواہ مخواہ لاعلمی ظاہر ہوگی۔

"آپ مختصراً اپنے کام کا تعارف انگریزی میں لکھ کر مجھے بھیج دیجیے۔"

اس نے احباب سے مشورہ کیا۔ سب کا خیال یہی تھا کہ اس پیش کش کو فوراً قبول کرلینا چاہیے۔ شاہد نے اپنے "کارنامے" لکھ کر کمشنر کے دفتر میں پہنچا دیے۔

اگلے برس فروری کے مہینے میں اس کے پاس سیٹو کے دفتر سے خط آیا۔ "آپ کو اکیس دن تھائی لینڈ میں اور اکیس دن فلپائن میں رہنا ہوگا۔"

وسط فروری میں وہ پرواز کرگیا۔ تھائی لینڈ میں اس نے بارہ لکچر دیے۔ اس خوبصورتی سے پاکستانی موسیقی کو متعارف کرایا کہ محفلیں سراپا تعریف بن گئیں۔

اس نے پاکستانی کلاسیکی گائیکی کی مختلف طرزوں اور اس کی پیچیدہ دھنوں کا مکمل خاکہ پیش کیا۔ لوازمات، تیکنیکی معاملات پر نہ صرف روشنی ڈالی بلکہ دھرپد، خیال، دادرا، ٹھمری وغیرہ کی دھنیں گا کر اپنے کمال کا مظاہرہ کیا۔ کلاسیکی راگ ٹیپ ریکارڈ سے بھی سنوائے۔ چند سلائیڈ بھی دکھائے جن میں پاکستانی سازوں مثلاً الغوزہ، بانسری، سارنگی، ستار، سرود، ڈھولک، طبلہ، تان پورہ وغیرہ کی تصویریں دکھائیں۔

تھائی لینڈ کے بعد وہ فلپائن گیا۔ یہاں سے جاپان اور ہانگ کانگ ہوتا ہوا پاکستان واپس آگیا۔

پاکستان واپس آنے کے بعد پھر وہی کنواں کھودنا اور وہی پانی پینا۔

اُجلا خرچ، فیاضی کی عادت، آنکھ میں مروت، آمدنی کے کئی ذرائع نکل آئے تھے لیکن مالی پریشانیوں سے اس کا پیچھا کبھی نہیں چھوٹا۔ آئے دن دعوتیں، تقریبات، کھانے اور تقریب کے بعد گانا بھی ضرور ہوگا۔ کسی نے کچھ مانگا تو قرض دینے میں خست نہیں۔ اور پھر عادت ایسی کہ اپنے لیے خود کسی سے کچھ نہیں مانگا۔ ہر وقت ہونٹوں پر ایک دلکش تبسم۔ کیسے کیسے مشکل حالات نہیں گزرے مگر جب کوئی پوچھتا، جواب ملتا "اچھا ہوں۔"

ظاہر میں وہ اچھے تھے لیکن اندر تو زلزلہ آتا ہی رہتا تھا۔ خاص

طور پر یہ احساس بہت ہونے لگا تھا کہ خدمت کی ادب کی اور روزی کماتا ہوں موسیقی سے۔ گویا زمانے کی نظر میں وہ گویا بن کر رہ گیا تھا۔ عمر کے ساتھ ساتھ صحت بھی ساتھ چھوڑتی جارہی تھی۔ زمانے کی آنکھ دیکھ کر اگر اس کی نازک مزاجی میں تلخی کا عنصر شامل ہوگیا تھا تو یہ تعجب انگیز نہیں۔ اس کے مزاج میں کہیں نہ کہیں بارُود چھپا ہوا ضرور تھا لیکن یہ ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دینے کی حد تک تھا اور اسے بھی وہ اپنی شگفتہ مزاجی سے زیر کرتا رہتا تھا۔ اگر وہ موقع پرست ہوتا تو ممکن ہے یہ بارُود خانہ بالکل ہی سرد ہوجاتا لیکن یہ صفت اس میں نہیں تھی لہٰذا وہ کئی مرتبہ زمانے سے الجھا۔

دہلی میں "نیاز مندانِ لاہور" سے معرکہ آرائی ہوئی تھی۔ کراچی آکر ترقی پسندوں نے اسے رجعت پسند قرار دے دیا۔ بات صرف اتنی تھی کہ حسن عسکری کی جھلکیاں "ساقی" میں کیوں چھپتی ہیں۔ ترقی پسند یہ بھول گئے کہ شاہد نے اس وقت اس تحریک کے لیے کام کیا جب اس تحریک کی ابتدا تھی۔ اسی کی کوششوں سے پہلی مرتبہ دلی میں انجمنِ ترقی پسند مصنفین کی شاخ قائم ہوئی تھی۔ اس کے پرچے میں ترقی پسندوں کا لٹریچر چھپتا رہا تھا۔

لاہور اور کراچی کے ترقی پسندوں نے اعلان کردیا کہ وہ ساقی کے لیے نہیں لکھیں گے۔ شاہد نے ان کے آگے گھٹنے نہیں ٹیکے۔ بالآخر کراچی کے ایک اجلاس میں ترقی پسندوں کو معذرت کرنا پڑی۔

قرۃ العین حیدر سے دو مرتبہ ٹھن گئی لیکن ایسی نہیں کہ شعلے بھڑک اٹھتے۔

حیدر آباد کے ایک مشہور ادیب سے بھی ان کی معرکہ آرائی رہی۔ شاہد نے "غضنفر کی ڈائری" ایک ادبی رسالے میں لکھ لکھ کر ان صاحب کا ناطقہ بند کیا اور بالآخر معذرت کرنے پر یہ قضیہ ختم ہوا۔

ایسے معرکے اس کی زندگی میں کئی مرتبہ آئے لیکن صابون کے جھاگ کی طرح بیٹھ بھی گئے۔ ہر ضدی آدمی کی طرح اس کا غصہ بھی بہت جلد فرو ہوجاتا تھا۔

شاہد نے مسلسل محنت سے پاکستان میں تقریباً وہی مقام حاصل کرلیا جو اسے دہلی میں حاصل تھا۔ غیر ممالک میں پاکستان کی نمائندگی کی، رائٹرز گلڈ کا روحِ رواں بن گیا، ساقی کو کامیابی سے چلایا۔ بچوں کو اچھی تعلیم دلائی۔ لیکن یہاں تک پہنچتے پہنچتے وہ لہو لہان ہوگیا۔

وہ پھولوں کی آس میں کانٹوں کی باڑھ عبور کرکے آیا تھا لیکن یادِ ماضی کو دل سے نوچ کر نہ پھینک سکا۔ اب وہ حویلیاں نہیں رہی تھیں۔ باپ دادا کا نام ہی تو رہ گیا تھا، جب اس پر بھی کسی نے نام دھرا تو وہ بلبلا اٹھا۔ اس کی شخصیت کا جلالی پہلو اس پر غالب آگیا۔ اس نے جوش پر لکھتے ہوئے کہیں لکھ دیا تھا کہ "مفت کی پیتے ہیں۔" اس کے جواب میں جوش نے اسے رگید کر رکھ دیا۔

قطعہ تاریخِ وفات

وصالِ شاہد احمد دہلوی ہے
ادب کا، نثر کا، انشا کا ماتم
مدیرِ ساقی بزمِ صحافت
ادیب و نکتہ پرداز مسلم
عبارت نثرِ دہلی کا نمونہ
نذیر احمد کی تحریروں کا عالم
وہ سب کچھ کہہ گیا ہے کہہ چکا ہے
رئیس اس کے علاوہ کیا کہیں ہم
جہاں تک سالِ غم کا ہے تعلق
غمِ شاہد ہے گویا شاہد غم

۱۳۸۷ھ

(رئیس امروہوی)

"مفت کی وہ پیتے ہیں جن کی جیب خاک اڑاتی ہے۔ جن کی غیرت مفلوج ہوا کرتی ہے اور جو ٹُٹ پونجیے خاندانوں یا سُود خور مُلّاؤں یا غاصب حکمرانوں کے پٹھو علمائے کرام کے گھر میں جنم لیتے ہیں۔"

اور جب جوش نے ڈپٹی نذیر احمد کی "منتخب الحکایات" کو سرخ پنسل سے سرخ کردیا اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ انہیں اردو لکھنا نہیں آتی تو شاہد کی تلخی ہونٹوں پر آگئی۔ اس نے جوش کے خلاف پورا نمبر نکالنے کا اعلان کردیا جیسے کوئی اپنے غنیم کے خلاف اعلانِ جنگ کرتا ہے۔

ادب کی مملکت میں زلزلہ آگیا۔ خیر خواہوں نے سمجھایا، سفارشیں ڈلوائی گئیں۔ سمجھانے والوں نے سمجھایا بھی لیکن وہ تلخ سے تلخ تر ہوتا چلا گیا۔ وہ جوش کے خلاف مضامین جمع کرنے دلی تک گیا۔ ایک ایک ادیب کے گھر کی خاک چھانی۔ مضامین لکھوائے۔ جوش کی زندگی کے کمزور گوشوں کو تلاش کیا۔

ان دنوں وہ شمشیرِ بے نیام بنا پھرتا تھا۔ صلح کی بہت کوششیں کی گئیں لیکن سب بے سود۔ اس کا جواب یہی تھا۔ بس یہ نمبر نکال لوں، اس کے بعد جوش سے میرا کوئی جھگڑا نہیں۔

آخری حل یہی تھا کہ اس کے بڑے بھائی کو درمیان میں ڈالا

جائے۔ وہ بڑے بھائی کا اتنا ہی احترام کرتا تھا جتنا اس کے والد زندہ ہوتے اور وہ ان کا کرتا۔ بھائی کو بھی یقین تھا کہ وہ ان کا کہنا نہیں ٹالے گا۔ لیکن اس جواب کے بعد ان کے پاس بھی کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ شاہد نے سر جھکا کر کہا۔

"بھائی، اگر صرف میری ذات کا تعلق ہوتا تو تمہارا حکم سر آنکھوں پر۔ میں کبھی انکار نہ کرتا لیکن دیکھو تو ان حضرت نے بلاوجہ ہمارے اسلاف کو پُن کر رکھ دیا۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ شاید ان کی طرف سے اب جواب دینے والا کوئی نہیں۔ تم ہی بتاؤ کہ تمہاری غیرت گوارا کرے گی کہ دادا ابا کو یوں بُرا بھلا کہا جائے اور ہم یوں ٹکر ٹکر دیکھا کریں۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ مجھے جواب دینے دو۔ اس کے بعد میں خاموش ہو جاؤں گا۔"

جوش نمبر نکلا اور اس دھوم دھام سے نکلا کہ چھپتے ہی دوسرے ایڈیشن کی نوبت آگئی۔ لیکن وہ تو ہتھیار کھول کر سرہانے رکھ چکا تھا۔ اس نے دوسرا ایڈیشن شائع نہیں کیا۔ ایک ادیب نے کچھ لکھنا چاہا تو اسے ساقی میں جگہ نہیں دی کہ نہیں، اب بات ختم ہو چکی۔

اگر اس کا مقصد تجارت ہوتا تو جوش نمبر کے کئی ایڈیشن شائع ہوتے۔ اس کا مقصد تو دادا ابا کی طرف سے جواب دینا تھا۔ اس نے حق ادا کر دیا۔

وہی ہوا جو اس قسم کے معاملات میں ہوتا ہے۔ اس نمبر کی اشاعت کے بعد نہ تو شاہد کے قد میں اضافہ ہوا نہ جوش کی شاعرانہ عظمت میں فرق آیا لیکن اتنا ضرور ہوا کہ اردو میں پہلی مرتبہ کسی شخصیت کے منفی گوشے بھی صفحات پر آگئے۔ یہ اعزاز بھی ساقی اور شاہد ہی کو حاصل ہوا۔

۱۹۶۳ء میں صدارتی اعزاز "افتخارِ ادب" ملا۔ اس اعزاز کے ساتھ پانچ ہزار روپے کا نقد انعام بھی ملا۔ اس کی مالی حالت کا عالم یہ تھا کہ اس اعزاز سے زیادہ اسے اس بات کی خوشی تھی کہ پانچ ہزار یک مشت مل گئے۔ اس نے بینک سے قرض لیا ہوا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اتارے گا کہاں سے۔ قدرت نے غیب سے انتظام کر دیا۔

وقت گزرتا رہا۔ گلڈ کی مصروفیات، ادبی رسائل کی انجمن کی دیکھ بھال، ساقی کے کام، ریڈیو کے بکھیڑے، بے انتہا بیڑیاں، راتوں کا جاگنا، دن بھر میں چالیس چائے کی پیالیاں۔ اس کی صحت گرتی جا رہی تھی۔

ایک دن وہ گلڈ کی ایک میٹنگ میں شرکت کے بعد گھر جانے کے لیے روانہ ہوا۔ کچھ دور چل کر اسے محسوس ہوا جیسے اس کی ایک ٹانگ سُن ہو گئی ہے۔ وہ ضبط کر کے چلتا رہا۔ پھر لنگڑانے لگا۔ جیسے تیسے بس میں بیٹھا اور گھر پہنچ گیا۔

وہ ضبط کیے رہا لیکن تکلیف میں روز بہ روز اضافہ ہوتا رہا۔

جب یہ تکلیف ناقابلِ برداشت ہو گئی تو وہ ڈاکٹروں کی طرف رجوع ہوا۔

ڈاکٹر یاور عباس اور دلاور عباس ادیبوں، شاعروں کے فیملی ڈاکٹر سمجھے جاتے تھے۔ یاور عباس خود شاعر بھی تھے۔ دلاور عباس سرجری کی تربیت باہر سے لے کر آئے تھے۔ شاہد بھی ان کے پاس پہنچ گیا۔ معائنہ کیا گیا۔ کسی نس کی خرابی کی وجہ سے آپریشن تجویز ہوا۔

کئی ہفتے وہ کلینک میں رہا۔ بہر حال آپریشن کامیاب رہا اور وہ چھڑی لے کر چلنے لگا۔

بیڑیوں اور چائے نوشی کی کثرت اب رنگ لا رہی تھی۔ کھانسی کئی سال سے تھی مگر اب تو رو کے نہیں رُکتی تھی۔ پھر ایک دن دل جواب دے گیا۔ شدید دورہ پڑا تھا لیکن ابھی کچھ اور غم اٹھانے باقی تھے کہ وہ جناح اسپتال سے زندگی خرید کر واپس آگیا۔

آسمان تاک میں تھا۔ اس کی بیٹی مسعودہ بیگم، تین بچوں کی ماں کینسر کے مرض میں مبتلا ہو گئی۔

جب شاہد کو پہلا دورہ پڑا تھا اور وہ صحت یاب ہو کر گھر آیا تھا تو عبدالعزیز خالد اس کی عیادت کے لیے آئے تھے۔ شاہد نے قہقہہ لگا کر کہا تھا۔

"جی ہاں، دوبارہ زندہ ہو گیا ہوں۔ حالت تو خطرناک تھی۔ ابھی مجھ سے کہا گیا ہے کہ اور دُکھ اٹھا۔"

اس کی یہ بات سچ ہو گئی۔ بیٹی کو ایسے موذی مرض میں گرفتار دیکھ کر وہ اپنی تکلیف بھول گیا۔ حکیم، وید، ڈاکٹر سب ایک کر ڈالے مگر وہ اپنی بیٹی کو نہیں بچا سکا۔

کسی پہاڑ کی طرح حوصلہ رکھنے والا چیخیں مار کر اس طرح رویا کہ زمین آسمان ایک کر ڈالے۔

پھر اس کے یہ آنسو دل میں اُتر گئے۔ اندر ہی اندر پھیلتے گئے۔ وہ خود چُپ ہو گیا مگر دل روتا رہا۔

۲۷ مئی ۱۹۶۷ء کی رات تھی۔ وہ لکڑی ٹیکتے ہوئے۔ کالونی کے احباب سے ملتے ملاتے نو بجے کے قریب گھر میں داخل ہوا۔

ریڈیو پر کوئی المیہ ڈراما چل رہا تھا۔ کچھ دیر بچوں کے ساتھ بیٹھا رہا پھر کہا۔

"کھانا لے آؤ، مرنا جینا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔"

کھانا کھایا۔ کچھ دیر باتیں کیں اور لیٹ گیا۔ گیارہ بجے کے قریب کھانسی کا دھکا ہوا۔ خود اٹھ کر دوا پی۔ کھانسی پھر اٹھی۔ اس کی بیوی عاصمہ "الٰہی خیر" کہتی ہوئی دوسرے کمرے تک بیٹی کو بلانے گئی۔ اکیلا دیکھ کر موت نے شاہد کو لوٹ لیا۔ عاصمہ واپس آئی تو وہ جا چکا تھا۔

مرزا رفیع سودا

سخن ساز

تحریر و تحقیق: ڈاکٹر ساجد امجد

اردو زبان و ادب کے عناصرِ خمسہ میں سے ایک نہایت قد آور اور معتبر نام جس کے بغیر اردو شاعری کے ابتدائی دور کی تاریخ نامکمل سمجھی جائے گی بلکہ مستند ناقدینِ ادب تو اس دور کو میر و سودا کا دور ہی قرار دیتے ہیں۔ خود میر تقی مؔیر کا یہ نظریہ تھا کہ وہ اپنے زمانے میں صرف ڈھائی شاعروں کی بات کرتے تھے۔ یعنی ایک وہ خود‘ دوسرے نمبر پر سوؔدا اور آدھا شاعر خواجہ میر دؔرد کو مانتے تھے۔ الغرض جب مؔیر صاحب جیسے محتاط شخص نے ان کی شاعرانہ عظمت کو تسلیم کرلیا تو پھر کیا گنجائش رہ جاتی ہے۔ ان کا شمار بھی اردو کے ان محسنوں میں کیا جاتا ہے جنھوں نے زبان کو پاک و صاف کیا اور شاعری میں بلند خیالی کو رواج دیا۔ مغل ہونے کے ناتے مزاج کا طنطنہ ان کے طرز بیان میں نمایاں نظر آتا ہے اور ایک نئے لب و لہجے سے متعارف کراتا ہے جس میں گھن گرج بھی ہے اور چٹخارا بھی۔ دنیا کے اس خرابے میں اس شاعرِ بے مثال پر کیا گزری‘ یہ تماشا دلچسپ بھی ہے اور عبرت اثر بھی۔

عہد ساز شاعر مرزا محمد رفیع سوؔدا کی سرگزشت

دہلی میں محمد شاہی حکومت (۱۱۳۱ھ۔۱۱۶۱ھ) کا آخری دور ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد طویل خانہ جنگیوں سے گزر کر اس بادشاہت کو کچھ قرار ملا ہے تو اہلِ دہلی نے بھی سکھ کا سانس لیا ہے۔

شاعری کے چرچے گھر گھر میں ہیں۔ خان آرزو‘ شاہ حاتم اور مظہرجانِ جاناں وغیرہ کی کوششوں سے اردو زبان نے پر پرُزے نکالنے شروع کردیے ہیں۔ فارسی سے مقابلے پر آمادہ ہے۔ جنہیں فارسی کے چٹخارے سے فرصت نہیں تھی‘ اب وہ بھی اُردو کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔

کابلی دروازے کے قریب ایک شاندار مکان کے عظیم الشان پھاٹک میں ہمیشہ کی طرح آج بھی نشست جمی ہوئی ہے۔ خوش فکر نوجوانوں کے بے فکرے قہقہے دہلی کے زندہ ہونے کی گواہی دے رہے ہیں۔

یہ مکان مرزا شفیع سوداگر کا ہے اور اپنے مالک کی امارت کا اظہار اپنی ایک ایک اینٹ سے کررہا ہے۔ مرزا شفیع کا انتقال ہوچکا ہے۔ اب ان کا بیٹا مرزا رفیع سودا فطری فیاضی اور شاعر مزاجی کی بدولت بے فکری کے تکیے سے لگا‘ اس دولت کو مٹھیاں بھر بھر کے لٹا رہا ہے۔

صحبت شعر و بکف جام و صراحی در دست
اس سوا مرزا کو کچھ کام نہیں دنیا سے

اس کی طبیعت میں بزلہ سنجی اور فقرے بازی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ باتوں کے طوطا مینا ایسے بناتا ہے کہ سامنے والا مسحور ہو کر رہ جائے۔ ہر وقت ہنسنے ہنسانے سے کام ہے گویا گردشِ زمانہ اس کی غلام ہے۔ دہلی کے سیاسی حالات ہرگز قابلِ اعتبار نہیں لیکن وہ خوش مستیوں میں وقت گزار رہا ہے۔

آنکھ کھولتے ہی شعرِ شاعری کے چرچے اور شاعرانہ محفلوں کی ہنگامہ آرائی‘ اچھے اچھوں کو متاثر کررہی تھی۔ وہ بھی شعرِ سخن میں مگن رہنے لگا۔ فارسی شرفا کی زبان سمجھی جاتی تھی‘ اس نے بھی زیورِ تعلیم سے آراستہ ہونے کے بعد فارسی کو ذریعۂ اظہار بنایا۔ سلیمان قلی خاں وداد فارسی کے بہت بڑے استاد تھے۔ ان سے اصلاح لینے لگا۔ شاگرد ان کا تھا لیکن خان آرزو کا ہم صحبت تھا کہ وہ بھی فارسی کا مذاق بے بہا رکھتے تھے۔

اس وقت بھی یہ سوداگر زادہ لطیفوں اور نقلوں کے بیچ بیچ اپنے فارسی اشعار سنا رہا ہے اور اپنی فارسی دانی پر نازاں ہے کہ اچانک یہ شوخ محفل‘ سنجیدگی کا رخ اختیار کرلیتی ہے۔

”مرزا‘ تمہاری فارسی دانی مسلّم لیکن اب ہوا کچھ اور ہے۔ اب ریختہ کا دور ہے ریختہ کا“ ایک دوست نے کہا۔

خوبوں میں دلدہی کی روش کم بہت ہے یاں
خواہانِ جاں جو چاہو تو عالم بہت ہے یاں
چشمِ ہوس اٹھالے تماشے سے جوں حباب
نادیدنی کا دید بس اک دم بہت ہے یاں
آنکھوں میں دوں اس آئینہ رو کو جگہ ولے
ٹپکا کرے ہے بسکہ یہ گھر نم بہت ہے یاں
دیکھا جو باغِ دہر تو مانندِ صبح و گل
کم فرصتی ملاپ کی باہم بہت ہے یاں
غافل نہ رہ تو اہلِ تواضع کے حال سے
تیغ وکماں کی طرح خم و چم بہت ہے یاں

"وہی ریختہ جو مرزا مظہر فرماتے ہیں" سودا نے طنزاً کہا۔

"وہ بھی تو ریختہ ہے جو شاہ حاتم فرماتے ہیں۔"

"وہ کہہ لیتے ہوں گے، میری بلند خیالی کو فارسی کی ضرورت ہے۔"

اس کے اس دعوے نے کئی احباب کو اُداس کردیا۔ حاتم جیسے استادِ سخن کی شان میں ایسے کلمات، بات بگڑ بھی سکتی تھی لیکن ایک تو وہ صاحب خانہ تھے، دوسرے اس کے مزاج سے سب واقف تھے اس لیے سمجھا ہی سکتے تھے۔

"مرزا تم انصاف سے کہہ دو۔ فارسی میں تم کتنی ہی زباں دانی دکھادو، کیا اہلِ زبان کی برابری کرسکتے ہو؟ کیا شیخ سعدی، فیضی یا خسرو بن سکتے ہو؟ یقیناً نہیں پھر تضیع اوقات سے فائدہ۔"

"فائدہ تو اردو سے بھی کچھ نہیں۔ سدا نام کس کا رہا ہے؟"

"اردو میں فائدہ ہے" دوست نے کہا "آبرو، ناجی، مضمون جیسے چند ایہام گو سلطنت سخن پر چھائے ہوئے ہیں۔ تمہاری بلند خیالی بہت جلد تمہیں بہت آگے لے جائے گی۔"

"کیا ضروری ہے" سودا نے کہا مگر اب اس کے لہجے میں اعتماد نہیں تھا۔

"پھر یہ بھی تو دیکھو سودا" تمام دوستوں نے بہ یک آواز کہا "اردو کی گرم بازاری کی وجہ سے آج کل جگہ جگہ مراختے (اردو مشاعرے) منعقد ہورہے ہیں۔ تمہیں اپنے جوہر دکھانے کے مواقع ملیں گے۔ شہرت تمہارے قدم چومے گی۔ فارسی کلام سنانے کے اب مواقع کہاں ہیں۔ لے دے کے مرزا بیدل کے عرس کے موقع پر مشاعرہ ہوجاتا ہے۔"

"بھئی، اُردو کی طرف طبیعت آتی نہیں پھر بھی تم کہتے ہو تو سوچوں گا" سودا نے کہا۔

اتنی گفتگو کے بعد محفل ایسی مکدر ہوگئی۔ طبیعت کا اچاٹ ہونا لازمی تھا۔ سودا نے دوستوں کو رخصت کیا اور خود سراج الدین علی خاں آرزو کے گھر پہنچ گیا۔

سودا کا یہاں آنا نئی بات نہیں تھی۔ دیرینہ سال استاد کے مشوروں سے وہ ہمیشہ ہی فیض یاب ہوتا تھا۔ وہ ان کی علمی حیثیت کا معترف تھا۔ وہ بھی سودا کے شاعرانہ احساس کے قائل تھے۔ اس کی بزلہ سنجی سے واقف تھے لیکن اس وقت اس کے چہرے پر کچھ اور ہی تحریر تھا۔

"خیر تو ہے، آج طبیعت کا کنول بجھا ہوا کیوں ہے" آرزو نے پوچھا۔

سودا تو آیا ہی اس لیے تھا۔ اس نے دوستوں کے ساتھ ہونے والی گفتگو ان کے سامنے رکھ دی۔

"ایک نووارد زبان کے لیے دوست مجھ سے کہتے ہیں، میں فارسی میں شعر کہنا چھوڑ دوں۔"

"وہ ٹھیک کہتے ہیں" آرزو نے کہا "مرزا! فارسی تمہاری مادری زبان نہیں ہے۔ اس میں ایسے نہیں ہوسکتے کہ تمہارا کلام اہل زبان کے مقابل میں قابلِ تعریف ہو۔ طبع موزوں ہے۔ شعر سے نہایت مناسبت رکھتی ہے۔ تم اردو کہا کرو تو یکتائے زمانہ ہوگے۔"

"آپ بھی تو فارسی میں کہتے ہیں بلکہ اسی کو فخر سمجھتے ہیں۔"

"ہم بڈھے طوطے اب کیا خاک پڑھیں گے مگر تم تو نامِ خدا جوان ہو۔ فارسی، فارسی والوں کے لیے رہنے دو، تم اپنی زبان سنبھالو۔"

بات اب بھی اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی لیکن دل میں کوئی چٹکیاں سی ضرور لے رہا تھا۔

اسی عالم یاس میں وہ گھر چلا آیا۔ بستر پر لیٹا تو دن بھر کی باتیں ایک ایک کرکے دہرانے لگا۔

اُردو کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور لوگوں کے بڑھتے ہوئے رجحان نے فارسی کا بُت توڑ دیا تھا۔ اس کا احساس اسے بھی تھا لیکن طبیعت کی ضد مانتی نہیں تھی۔ اب جو آرزو جیسے جہاں دیدہ فاضل نے بھی یہی مشورہ دیا تو وہ سنبھل گیا۔ سوچنے پر مجبور ہوگیا۔ مقبولیت تو اسی چیز کی ہوتی ہے جس کا رواج ہو۔ بادشاہ کے دربار تک میں اردو کا سکہ چل رہا ہے۔ سرہانے جزدان رکھا تھا۔ چند صفحے کاغذ کے نکالے اور اپنی ذہنی تبدیلی کا اعلان نامہ لکھنے بیٹھ گیا۔

میں ایک فارسی داں سے کہا کہ اب مجھ کو
ہوئی ہے بندشِ اشعار فرس ذہن نشیں
جو آپ کیجئے اصلاح شعر کی میرے
نہ پایئے غلطی تو محاورے میں نہیں
کہا یہ بعدِ تامل کہ دوں جواب تجھے
جو میری بات کا اے یار تجھ کو ہووے یقیں
جو چاہے یہ کہ کہے ہند کا زباں داں شعر
تو بہتر اس کے لیے ریختے کا ہے آئیں
وگرنہ کہہ کے وہ کیوں شعرِ فارسی ناحق
ہمیشہ فارسی داں کا ہو موردِ نفریں
کوئی زبان ہو لازم ہے خوبیٔ مضموں
زبانِ فرس پہ کچھ منحصر سخن تو نہیں

اگر فہیم ہے تو چشمِ دل سے کرکے نظر
زباں کا مرتبہ سعدی سے لے کے تابہ حزیں
کہاں تک اُن کی زباں تو درست بولے گا
زباں اپنی میں تو باندھ معنیِ رنگیں
دیارِ ہند میں دوچار ایسے ہو گزرے
جنہوں نے باز رکھا مضحکے سے اپنے تئیں
چنانچہ خسرو و فیضی و آرزو و فقیر
سخن انہوں کا منعل کے ہے قابلِ تحسیں
سوائے ان کے کوئی اور بھی ہو پرشاعر
سوادِ ہند میں وہ ہی ہیں بامزہ نمکیں

غزل شاعرانہ مشق کی پہلی سیڑھی تھی۔ شاعروں کا یہی میدان ابتدائی جولانگاہ تھی۔ شاعری کا آغاز اسی سے ہوتا تھا۔ سودا نے بھی ارادۂ سخن باندھا تو ابتدا میں دوشیزہ غزل ہی سے اس کا سامنا ہوا۔

جب تک وہ فارسی کے مرغ زار میں ٹہل رہا تھا، اس نے اردو غزل کی بے ترتیب کیاریوں کو غور سے دیکھا ہی نہیں تھا۔ اب جو غور کیا تو اس نے دیکھا، ہم تو فارسی سے بہت پیچھے ہیں۔ فارسی غزل کا عظیم الشان سرمایہ ہمارے سامنے ہے لیکن کوئی اس سے فائدہ نہیں اٹھا رہا ہے۔

ایہام گوئی اس کے ہم عصروں کا خاص انداز تھا۔ ایہام کی بنیاد ہندی پر تھی۔ شعر میں ایسے الفاظ استعمال کیے جاتے تھے جن کے ایک سے زائد معنی ہوں۔ سامع کا ذہن ایک معنی کی طرف منتقل ہوتا تھا جبکہ شاعر نے اس سے دوسرے معنی مراد لیے ہوئے تھے۔ یہ غیر فطری طرز تھی جس میں صرف الفاظ کا کھیل تھا۔ اگر یہ روش جاری رہتی تو موضوعات کی ترقی رک جاتی اور شاعری معما بن کر رہ جاتی۔ اس روش کے خلاف اس وقت کئی لوگ آواز بلند کر رہے تھے۔ سودا نے بھی اس تحریک میں نمایاں حصہ لیا بلکہ اپنی صلاحیتوں کی بدولت دوسروں سے زیادہ حصہ لیا۔ اس نے اپنی غزلوں میں ٹھیٹ ہندی الفاظ کے بجائے عربی فارسی کے سہل الفاظ استعمال کیے۔ تشبیہات کے لیے مقامی سرمائے کے بجائے فارسی سے استفادہ کیا۔ اس نے صرف بنے بنائے الفاظ مستعار نہیں لیے بلکہ نئے الفاظ بنائے بھی۔ فارسی محاوروں اور فقروں کا ترجمہ کرکے اپنی غزلوں میں استعمال کیا اور انہیں اردو کا بنا دیا۔ مثلاً فارسی میں تھا "پوست کشیدن" اس نے اپنی غزل میں اسے اس طرح استعمال کرلیا۔

چاہے تجھ چشم کے آگے جو ہو بادام سفید

سوانحی خاکہ

نام: مرزا محمد رفیع
تخلص: سودا
والد: مرزا محمد شفیع
استاد: شاہ حاتم
سنِ پیدائش: اختلاف ہے۔ اکثر لوگ ۱۱۲۵ھ پر متفق ہیں
مولد: دہلی
قیام: دہلی، فرخ آباد، لکھنؤ
وفات: ۱۱۹۵ھ
مدفن: امام باڑا، آغا باقر، لکھنؤ

کھینچ کر پوست کرے گردشِ ایام سفید

بعض فارسی کے ٹھیٹ الفاظ کو ہوبہو قبول کرلیا مثلاً خوابیدہ، شوریدہ وغیرہ۔

اردو میں، عربی فارسی کے مرکب الفاظ شامل کرکے عجیب چمن سا کھلا دیا مثلاً خانہ بر اندازِ چمن۔

گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر اندازِ چمن کچھ تو ادھر بھی

اسی طرح دامن کشیدہ، گریباں دریدہ، حلقہ در گوش وغیرہ۔

بعض فقرے کے فقرے فارسی کے اردو میں داخل کرکے دامنِ اردو کو وسیع کردیا مثلاً یک حرف آرزوئے بلب نارسیدہ۔

تو آپ سے زباں زدِ عالم ہے ورنہ میں
یک حرف آرزوئے بلب نارسیدہ ہوں

اسی طرح "دل دادۂ زلف ورخ دلبر ندیدہ" ساعد دوست حنا بستہ، مشت حباب جو وغیرہ۔

وقتاً فوقتاً وہ اپنے کلام میں اصطلاحات کو بھی بے تکلف استعمال کرتا چلا گیا چنانچہ موسیقی کی اصلاحات، پہلوانی کی اصطلاحات۔ اسی طرح سپاہیوں، آتش بازوں، باورچیوں، ساہوکاروں وغیرہ کی بے شمار اصطلاحات سے اس نے زبان کو مالا مال کردیا۔

○☆○

اس نے تمام اُردو غزل گویوں کی طرح، شاعری کا آغاز غزل گوئی سے کیا۔ زبان کی درستی کے سوا ابتدا میں اس کے پاس کوئی انفرادیت نہیں تھی۔ حسن و عشق کے مضامین جو غزل کی جان سمجھے جاتے تھے، اس کے سامنے تھے۔ اس کے دورِ شباب کا تقاضا بھی یہی تھا لیکن اس نے اس میں بھی اپنے لیے الگ راہ نکالی۔ وہ دور تصوف کا تھا۔ تصوف کے اثر سے

جب بھی حسن کا تذکرہ آتا تھا، معشوقِ حقیقی اور حسنِ بے زوال کے جلوے دکھائے جاتے تھے۔ سودا نے انسانی حسن کی بے مثال تصویریں بنانی شروع کیں۔

نازک اندامی کروں کیا اس کی اے سودا بیاں
شمع ساں جس کے بدن پر ہو پسینے کا خراش

چہرہ ترا سا کب ہے سلطانِ خاوری کا
چیرہ ہزار باندھے سر پر جو وہ زری کا

دیکھے جو ایک آن ترا سروِ خوش خرام
قمری نہ دیکھے پھر کبھی شمشاد کی طرف

اس زلف کو جب دیکھا میں ہاتھ میں سودا کے
بپھرے ہوئے ہاتھی کی زنجیر نظر آئی

تصویر ہو کے آپ ہی حیراں وہ رہ گیا
بیٹھا تھا منہ کو پھیر جو بہزاد کی طرف

حسن کے بعد دوسرا بڑا موضوع عشق اور عشق کے حوالے سے وارداتِ قلبی کا بیان تھا۔ سودا فطری طور پر خوش رہنے والا انسان تھا۔ وہ دوسروں کی طرح منہ بسور کر جذب و تاثیر کے اشعار نہیں کہہ سکتا تھا لیکن اس کے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔ اس نے شاعری کی خاطر ہی سہی ایسے اشعار بھی نکالے۔

غنچہ سمٹے تو سمٹے ممکن ہے
دل جو بکھرے تو کب سمٹتا ہے
تجھ قید سے دل ہو کر آزاد بہت رویا
لذت کو اسیری کی کر یاد بہت رویا
تجھ عشق میں روز خوش نہ دیکھا
دکھ بھرتے ہی بھرتے مرگئے ہم
جس روز کسی اور پہ بیداد کرو گے
یہ یاد رہے ہم کو بہت یاد کرو گے
تونے سودا کے تئیں قتل کیا کہتے ہیں
یہ اگر سچ ہے تو ظالم اسے کیا کہتے ہیں

اس دوران میں وہ خان آرزو کے مشوروں سے تو فیض یاب ہوتا رہا تھا لیکن اردو میں طبع آزمائی کا خیال پیدا ہوتے ہی اسے استاد کی تلاش کا خیال بھی رہنے لگا تھا۔ ایسا استاد جو اس کے پُرعزم خیالات کا ساتھ دے سکے۔ زبان و بیان کا ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ نئی روشنی کا ساتھ دینے کی سکت بھی رکھتا ہو۔ کئی استادوں کے نام ذہن میں آئے بالآخر شاہ حاتم کے نام تک آکر وہ رک گیا۔

دہلی میں حاتم کی شہرت عام تھی۔ اچھے اچھے شاعران کی شاگردی کا دم بھرتے تھے۔

تمام ہند میں دیوان کو ترے حاتم
رکھے ہیں جان سے اپنی عزیز خاص اور عام

حاتم کا شعر تیس برس سے ہے ہند میں
صاحب قراں ہے ریختہ گوئی کے فن کے بیچ

سودا خود بھی ان کی استادی کا معترف تھا اور پھر خان آرزو نے بھی یہی مشورہ دیا۔

ایک شام اس نے کچھ غزلیں ساتھ لیں اور پالکی میں سوار، شاہ حاتم کی ملاقات کو چل دیا۔

اسے معلوم تھا وہ شاہ تسلیم کے تکیے پر ملیں گے۔ راج گھاٹ کے رستے میں قلعے کے نیچے کچھ چمن تھے، کچھ درختوں کا سایہ تھا۔ سامنے پُرفضا میدان تھا۔ یہی مرد فقیر شاہ تسلیم کا تکیہ تھا۔ شاہ حاتم انہی درختوں کے سائے میں، شاگردوں کے ساتھ بیٹھا کرتے تھے اور گھنٹوں شعر و شاعری کا چرچا رہتا تھا۔

سودا نے اس چمن زار میں قدم رکھا تو دل باغ باغ ہو گیا۔ شاہ حاتم، بانکوں کی طرح سر پر ٹیڑھا دوپٹا باندھے بیٹھے تھے۔ کسی بات پر قہقہہ بلند ہوا ہی تھا کہ سودا سامنے پہنچ گیا۔

"آؤ سودا آؤ۔ بھئی یہاں تکیہ تو ہے لیکن بستر نہیں۔ تم ٹھہرے سوداگر زادے۔"

"شاہ صاحب، میں شاعر بھی تو ہوں۔ آپ کے قدموں میں بیٹھنے کے لیے آیا ہوں۔"

"سنا ہے تم ریختہ کہنے لگے ہو" شاہ حاتم نے کہا اور ساتھ ہی اس کا یہ شعر پڑھ دیا۔

یہ غزل سودا کہی ہے تونے اس انداز کی
ہند سے پہنچے گی ہاتھوں ہاتھ نیشاپور تک

"تو یہ شعر آپ تک بھی پہنچ گیا۔"

"میاں میں نیشاپور میں تو نہیں ہوں۔ یہیں دلی میں ہوں۔ تمہارے بہت سے احباب مجھ سے ملنے بھی آجاتے ہیں۔ بس انہی میں سے کوئی لے آیا تھا۔" شاہ صاحب نے کہا پھر کچھ توقف کے بعد فرمائش کی "میاں، اس طرف آ ہی نکلے ہو تو کچھ سناؤ۔"

سودا نے تعمیل کی۔

خوبوں میں دلدہی کی روش کم بہت ہے یاں
خواہانِ جاں جو چاہو تو عالم بہت ہے یاں
چشمِ ہوس اٹھالے تماشے سے جوں حباب
نادیدنی کا دید بس اک دم بہت ہے یاں
آنکھوں میں دوں اس آئینہ رو کو جگہ ولے
ٹپکا کرے ہے بسکہ یہ گھر نم بہت ہے یاں
دیکھا جو باغِ دہر تو مانندِ صبح و گل
کم فرصتی ملاپ کی باہم بہت ہے یاں
غافل نہ رہ تو اہلِ تواضع کے حال سے
تیغ وکماں کی طرح خم و چم بہت ہے یاں

شاہ حاتم اس کے ایک ایک شعر پر بیٹھے جھوم رہے تھے۔ جب تک غزل ختم ہوان کا عالم ہی اور تھا۔

"میاں، تم نے تو دلی میں فارس کے پھول کھلا دیے۔ زبان کو ایک ہی جست میں کہاں سے کہاں پہنچادیا۔ اسی طرح کہتے رہے تو استادوں میں شمار ہوگا۔ بس ذرا سوزِ دروں کی کمی۔ خیر وہ بھی وقت کے ساتھ ساتھ آہی جائے گی۔"

"میں چاہتا ہوں آپ میری غزلیں دیکھ لیا کریں تاکہ مراختوں میں جانے اور وہاں پڑھنے کی ہمت ہوسکے۔"

"بعض شاگرد وہ ہوتے ہیں جن پر استاد کو فخر ہوتا ہے۔ میں تمہیں ایسا ہی سمجھتا ہوں۔"

اس نے اب تک جو کچھ کہا تھا، ان کے حوالے کیا اور گھر چلا آیا۔

شاہ حاتم کا سہارا ملتے ہی ہمت و اعتماد نے اس کا دامن تھام لیا۔ اس نے شہر میں ہونے والے مشاعروں میں جانا شروع کردیا۔

ہر ماہ کی پندرھویں کو خان آرزو کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا جس میں اردو شعرا جمع ہوتے تھے۔ وہ بھی پہنچ گیا۔

شعرا پرے جمائے بیٹھے تھے۔ ایک ایک کو اشتیاق تھا کہ دیکھیں سودا کیا پڑھتے ہیں۔

اس نے مطلع پڑھا۔

آلودۂ قطراتِ عرق دیکھ جبیں کو
اختر پڑے جھانکیں ہیں فلک پر سے زمیں کو

مطلع کا ادا ہونا تھا کہ خان آرزو نے فی البدیہہ ایک شعر موزوں کیا اور بر سرِ مشاعرہ پڑھا۔

شعرِ سودا حدیثِ قدسی ہے
چاہیے لکھ رکھیں فلک پہ ملک

یہ شعر دراصل فارسی کے ایک شاعر قدسی کے اس مطلع کی طرف اشارہ تھا۔ وہ مطلع یہ تھا۔

آلودۂ قطرات عرق دیدہ جبیں را
اختر زفلک مے نگرد روئے زمیں را

سودا نے اپنے شعر میں اس شعر کا لفظ بہ لفظ ترجمہ کردیا تھا۔

سودا بے اختیار اٹھ کھڑا ہوا اور خان آرزو کے گلے سے لپٹ گیا اور ایسی خوشی ظاہر کی گویا حقیقت میں خاں صاحب نے اس کے کلام کو مثلِ حدیث قدسی کہا ہے۔

اس کی خوشی کا انداز ایسا تھا کہ خان آرزو تک یہی سمجھے کہ وہ اس اشارے کو سمجھ نہیں سکا ہے چنانچہ جب وہ رخصت ہونے لگے تو خان آرزو اسے ایک گوشے میں لے گئے۔

"تم شاید سمجھے نہیں۔ میں نے یہ اشارہ کیا تھا کہ تمہارا شعر دراصل قدسی کے شعر کا ترجمہ ہے۔"

"خان صاحب، میں سمجھ گیا تھا لیکن شرمندہ ہوکر دوسروں کو ہنسنے کا موقع کیوں دیتا۔"

"وہ تو اب بھی ہنسے ہوں گے تمہاری لاعلمی پر۔"

"مجھے اس کی پروا نہیں۔ میں شعر کا ترجمہ شعر میں کرنے کو کمال سمجھتا ہوں، حقارت نہیں۔"

اس کے مزاج کی گرمی سے سب ڈرتے تھے۔ خان صاحب بھی چپکے ہو رہے۔

اگلی مرتبہ وہ ان سے ملا تو اس کے ہاتھ میں ایک اور شعر تھا۔

بہار بے سپر جام و یار گزرے ہے
نسیم تیری سی سینے کے پار گزرے ہے

یہ فارسی کے اس شعر کا ترجمہ تھا۔

بہار بے سپر جام ویار می گزرد
نسیم ہمچو خدنگ از کنارمی گزرد

اس مرتبہ خان آرزو کو بھی کہنا پڑا "مرزا، تم شعر میں شعر کا ترجمہ کرنے میں کمال رکھتے ہو۔ یہ بھی زبان میں وسعت کا ایک عمل ہے، اسے جاری رکھو۔"

وہ صرف ماہرِ لسانیات نہیں تھا کہ زبان کو وسعت دینے

ماخذات

سودا ——— شیخ چاند
آبِ حیات ——— محمد حسین آزاد
کلیاتِ سودا ——— حالاتِ سودا

کے لیے الفاظ سازی کی مشق کرتا رہتا۔ اس نے موضوعات کی وسعت کی طرف بھی توجہ دی۔ اب تک اردو غزل چند مضامین کے گرد گھوم رہی تھی۔ ان مضامین میں حسن و عشق کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ کچھ تصوف کے مضامین تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مضامین کے پھیلاؤ کو سمیٹنے کے لیے بھی الفاظ کا دامن موجود نہیں تھا۔ اس نے اپنے لیے الفاظ خود بنائے اور مضامین کا انبار لگادیا۔

اردو غزل کو عام طور پر وارداتِ قلبی کے بیان کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ سودا نے اس میں بیرونی و خارجی عناصر کو بھی داخل کردیا۔

وہ جس دور میں زندہ تھا اس میں سیاسی اور معاشی اضطراب کارفرما تھے۔ قتل و غارت اور حکومتوں کے زوال و انحطاط نے دنیا کی ناپائیداری کے ہولناک نقوش دلوں پر ثبت کردیے تھے۔ زمانے کی اس تلون مزاجی نے اس کے دل میں دنیا کی بے اعتباری کا نہایت مستحکم یقین پیدا کردیا۔ اس نے غزل جیسی داخلی صنف میں ان اشاروں کو بیان کرنے کی روایت ڈالی۔

نہ دیکھا اس سوا کچھ لطف اے صبح چمن تیرا
گل ادھر لے گئے گل چیں، گئی روتی ادھر شبنم

اس گلشن ہستی میں عجب دید ہے لیکن
جب چشم کھلی گل کی تو موسم ہے خزاں کا

اس کے دل کا کنول ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔ انقلابات زمانہ کے احوال اس کے سامنے تھے لیکن وہ یاس و ناامیدی کا شکار ہونا نہیں جانتا تھا۔ دنیا کی بے اعتباری کے اثرات بھی اس پر دوسری طرح ظاہر ہوئے۔ وہ چاہتا تھا جتنی فرصت ملے، اس میں دنیا کی رنگینیوں کا رس نچوڑ کر پی جائے۔ درد و ملال کے اس ماحول میں اس نے نئے انداز کے نغمے چھیڑے۔

ساقی ہے اک تبسم گل فرصتِ بہار
ظالم بھرے ہے جام تو جلدی سے بھر کہیں

آ.... پہنچ ساقی کو پھر ایام کب آتے ہیں یہ
فصلِ گل کے کچھ گئے دن کچھ چلے جاتے ہیں یہ

بجھے ہوئے دلوں کے لیے اس کی غزلیں خوشی کا سندیسہ بن گئیں۔ خوشی اور انبساط کی کیفیات نے اسے بے فکروں کا تاجدار بنادیا۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے اس کی غزلیں تحفوں کی طرح تقسیم ہونے لگیں۔ عوام کے لیے وہ ایک خوش فکر شاعر تھا اور شاعروں کے خیال میں وہ شاعری کی نئی تاریخ رقم کررہا تھا۔

وہ اس راز کو پاگیا تھا کہ پھول سے زیادہ گلدستہ جاذبِ نظر ہوتا ہے۔ وہ اردو شاعری تک محدود نہیں رہا۔ اس نے فارسی کے اساتذہ کا بغور مطالعہ کیا اور ان کی اتباع میں انہی کے مضامین اور طرزِ ادا کو اپنی غزلوں کا حصہ بنادیا۔

اس نے سب سے پہلے نظیری نیشاپوری کا اتباع کیا اور اس اعلان کے ساتھ۔

پوچھنا اشعار کا سودا کے کیا ہے شاعرو
گفتگو میں اس کی پاتا ہوں نظیری کا دماغ

نظیری کا خاص انداز یہ تھا کہ حکیمانہ خیالات کو تمثیل کے پردے میں بیان کرتا تھا۔ ایک دعویٰ کرتا ہے اور پھر عقلی دلیل پیش کرتا ہے۔ سودا نے بھی یہی انداز اختیار کیا۔

دلِ بے عشق کی دشمن ہے تحریکِ نفس ناصح
کرے ہے کام پتھر کا ہوا، مینائے خالی سے

آب سے کام نہیں نشوونما کو اپنے
شجرِ خشک کو آتش سے ہے کار آخرکار

اخلاقی و حکیمانہ مضامین بیان کرنے کی روایت پہلے بھی تھی لیکن فارسی کے مشہور اساتذہ کے رنگ میں اردو جیسی نوعمر زبان میں ادا کرنا دشوار تھا۔ سودا نے بڑی استادی سے اس کو ادا کیا۔

تیغِ چوبی سے کہاں قبضۂ فولاد ہو نصب
نہ رہے صاحب جوہر کبھی نامرد کے ساتھ

استقامت ہے عجب شے نہیں جس میں لغزش
نخل کا پاؤں زمیں پر نہ پھسلتے دیکھا

اس راستے میں اس نے صرف نظیری کی نہیں، کلیم اور صائب کی پیروی بھی کی۔

خیال بندی اور مضمون آفرینی اس کے دور میں ناپید تھیں۔ کسی ریختہ گو کے یہاں یہ خصوصیت نہیں ملتی تھی۔

مرزا بیدل ہندوستان کے تھے لیکن فارسی شاعر تھے۔ ان کا کلام بلند خیالی کی معراج کو چھوتا تھا۔ ان کے انتقال کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ ان کے کلام کے چرچے ابھی تازہ تھے لیکن کسی ریختہ گو نے ان کی اس خصوصیت سے فائدہ نہیں اٹھایا تھا۔ سودا نے ان کی اس طرز کو اپنایا اور اردو غزل کو ایک اور انداز سے آشنا کردیا۔ اس کے اس انداز نے اہلِ دل ہی کو نہیں اہلِ دماغ کو بھی متاثر کیا۔

سخنِ عشق نہ گوشِ دلِ بے تاب میں ڈال
مت یہ آتش کدہ اس قطرۂ سیماب میں ڈال

ٹوٹے تری نگہ سے اگر دل حباب کا
پانی بھی پھر پئیں تو مزہ ہے شراب کا

یہ کیفیت ہے ساقی جلوہ ہائے برق چشمک زن
خروش ابر سے دم ساز کیا آواز قلقل ہے

بے شمار ایسے اشعار کہہ ڈالے جن کی بنیاد صرف تخیل پر تھی لیکن قوتِ بیان نے انہیں جیتی جاگتی تصویروں میں بدل دیا۔

چمن میں آتے سن کر تجھ کو بادِ سحر یہ گھبرائی
ساغر جب تک لاویں ہی لاویں توڑ سبو کو جام کیا

ابر اس کو بجھاتا ہے وہ بجھتی نہیں سودا
دی لالۂ خودرو نے یہ کہسار کو آتش

ایک آدمی نے اتنے کام کر ڈالے کہ اُردو غزل ایک ہی جست میں کہیں سے کہیں جا پہنچی۔

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد جب ولی کا دیوان دہلی پہنچا تو یہاں بھی اردو شاعری کا آغاز ہو گیا لیکن تمام شعرا ولی کی پیروی سے آگے بڑھنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ کچھ اساتذہ نے اصلاحِ زبان کے لیے کوششیں ضرور کیں اور یہ تحریک چلی بھی کہ فارسی کا اتباع کیا جائے لیکن یہ بحث محض الفاظ سازی تک محدود رہی۔ کسی میں اتنی قوتِ بیان نہیں تھی کہ اردو میں فارسی رنگِ شاعری کو متعارف کرا سکے۔ یہ قوت سودا کی شکل میں دنیائے شاعری کو مل گئی تھی۔ سودا اپنی اس قوت کا مظاہرہ ہر مشاعرے میں کر رہا تھا۔

مقبولیت کا تاج سر پر آیا تو اپنی قوت کا اندازہ اسے بھی ہوا۔ وہ اب یہ کہنے کے لائق ہو گیا تھا۔

اب سامنے میرے جو کوئی پیرو جواں ہے
دعویٰ نہ کرے یہ کہ مرے منہ میں زباں ہے
میں حضرت سودا کو سنا بولتے یارو
اللہ رے اللہ رے کیا نظمِ بیاں ہے

اس کے کارناموں نے اس کے استاد شاہ حاتم کا سر بھی فخر سے بلند کر دیا تھا۔ اب وہ اس کی غزل پر اصلاح دینے بیٹھتے تو بڑے ناز سے صائب کا یہ شعر پڑھتے۔

از ادب صائب خموشم ورنہ در ہر وادئے
رتبۂ شاگردیِ من نیست استاد مرا

(صائب میں ادب سے خاموش ہوں ورنہ میری شاگردی کے اعزاز کے بغیر میرا استاد کچھ نہیں)

"آپ ہمیشہ یہی شعر کیوں پڑھتے ہیں؟" کوئی شاگرد پوچھتا۔

شاہ حاتم کہتے "اس لیے کہ صائب نے یہ شعر میری استادی اور مرزا رفیع کی شاگردی کے بارے میں کہا ہے۔"

سودا کی ترقیاں اپنی جگہ لیکن یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ وہ اپنی انفرادیت یا اپنا کوئی رنگ پیدا نہیں کر سکا تھا۔ کئی اساتذۂ سخن کا اتباع کیا، ان کے رنگِ شاعری کو اپنانے کی کوشش کی اور نتیجے میں اس کی غزلیں مختلف طرزوں کا مجموعہ بن گئیں۔ کہیں کہیں تو وہ محض نقال بن کر رہ گیا۔

غزل کی جان زبان کی صفائی اور بیان کی سادگی میں پوشیدہ ہے لیکن وہ اس کا خیال نہ رکھ سکا۔ اس میں اس کی مجبوری بھی تھی۔ اس نے فارسی کے جن صاحبِ طرز شعرا کی پیروی کی ان کی خصوصیات اردو میں آسانی سے نہیں نبھ سکتی تھیں۔ اردو بھی ابتدائی حالت میں تھی۔

اس کے علاوہ اس نے غزلوں میں قصیدے کی زبان استعمال کی جس میں فارسی زبان کی بہتات ہے اور قصیدے کی طرح غزلوں میں بھی مشکل زمینیں اختیار کیں۔ طرزِ بیان کی پے چیدگی اور زبان کی بلند آہنگی نے اس کی غزلوں کو تاثیر سے محروم کر دیا اور یہ معلوم ہونے لگا کہ ان میں خیال آفرینی کے سوا

تصانیف و کلام

نظم: نظم میں ایک ضخیم کلیات ہے جس میں تمام اصناف پر وافر مقدار میں کلام موجود ہے۔

تنقید:

۱۔ عبرت الغافلین۔

یہ وہ رسالہ ہے جو مرزا فاخر کی کارستانیوں کے جواب میں لکھا گیا ہے۔

۲۔ سبیلِ ہدایت۔ یہ ایک مثنوی ہے جس میں ایک شاعر کے مرثیے اور سلام پر تنقید کی گئی ہے۔

تذکرہ: یہ اردو شعرا کا تذکرہ تھا جو اب ناپید ہے۔

نثر اردو:

۱۔ دیباچہ سبیلِ ہدایت
۲۔ نثری ترجمہ مثنوی شعلۂ عشق
۳۔ خط بنام میر۔

فارسی دیوان۔ پہیلیاں۔

کچھ نہیں۔

○☆○

قارون کا خزانہ بھی ہو تو ایک دن ختم ہونے کا اعلان ضرور سنتا ہے۔ سودا دونوں ہاتھوں سے باپ کی دولت لٹا رہا تھا اور شہر میں عزت بنائے پھر رہا تھا۔ ہر وقت دوستوں کی بھیڑ لگی رہتی۔ احباب تو اسے رئیس اعظم سمجھے ہوئے تھے۔ کسی کو خیال تک نہیں آیا کہ اس کی جیب خالی ہو چکی ہے۔ جب باپ کا چھوڑا ہوا تمام ترکہ پھونک ڈالا تب اسے احساس ہوا کہ دھوپ کتنی تیز ہے۔ اس دھوپ میں اسے کسی شامیانے کا خیال آیا۔ نوکری کا خیال آیا مگر یہ خیال اس کی شان کے خلاف تھا۔ امرا کی مصاحبت ایک دل خوش کن خیال تھا۔ اس کا مزاج اس سے متفق بھی تھا۔ وہ بزلہ سنج تھا، ہنسوڑ تھا، شاعری کے کسی خانے میں بند نہیں تھا۔ اس کی تو غزلیں بھی قصیدے کے رنگ میں تھیں، قصیدہ لکھتا تو کیا لکھتا۔ امیروں کو اپنے مصاحبین میں انھی باتوں کی تلاش ہوتی ہے۔

یہ نوکری جاذبِ نگاہ تو تھی لیکن حالات زمانہ نے امرا کے کردار و عمل کو بھی متاثر کیا تھا۔ کچھ تو خانہ نشین ہو گئے تھے، جو تھے ان کا حال یہ تھا۔

بس فرض کیا کیا ہے کہ اشعار رتبہ دار
لے جاکے تو پڑھا کرے ان ناکساں تلک
جو نخوت و غرور سے تحسین کے محل
ابر و سوا سخن کو نہ لاویں زباں تلک
نزدیک جن کے ہے وہ بڑا صاحبِ کمال
منصب کا جس کے رتبہ ہو فیل ونشاں تلک
گو بو علی سلام کرے آن کر انہیں
بس سینے پروے ہاتھ رکھے ہیں جہاں تلک
چاہیں کہ ہم کلام ہوں اس سے تو یہ کہیں
پہنچے ہے تیرا سلسلہ کس خاندان تلک
آدم تک ان کے پاس غرض آدمی نہیں
پہنچادے تا نسب کو نہ شائستہ خاں تلک

غرض ان امرا کے نزدیک آدمی یا ہنر کی قدر نہیں تھی، نسلی اعزاز کی قدر تھی۔

سودا میں یہ تمام خوبیاں موجود تھیں۔ خاندانی اور نسلی امتیاز کے ساتھ سودا میں ذاتی اوصاف بھی تھے اور سب سے بڑا وصف یہ تھا کہ وہ بڑا شاعر تھا۔

سودا کو شہرت و قبولیت نصیب ہوئی تو اس کی زندگی نے نیا رخ بدلنا شروع کیا۔ امرائے وقت تک اس کی رسائی ہونے لگی۔

اب تک وہ ان امرا سے برابری سے ملتا رہا تھا لیکن حالات کے بھنور میں گھر گیا تو مصاحب پیشگی پر اتر آیا۔

محمد شاہی عہد میں ایک خواجہ سرا بسنت خاں نے بہت عروج پایا تھا۔ وہ مرزا کا بے حد قدرداں تھا اور سب سے پہلا سرپرست بھی وہی بنا۔

اس نے بسنت خاں کی شان میں قصیدہ لکھا اور اس کی خدمت میں پہنچ گیا۔

جو کچھ کہا ہے تُو نے یہ تجھ کو سب مبارک
میں اور میرے سر پر میرا بسنت خاں ہو
کس واسطے کہ مجھ کو اتنا ہی چاہیے ہے
جاء ہو ایک تن پر کھانے کو نیم ناں ہو
گر ہو زیادہ اس سے تیرا کرم ہے مجھ پر
کفرانِ نعمت اوپر قادر نہ یہ زباں ہو
اتنی ہی آرزو ہے کچھ عمر ہو جو باقی
مصرف جہاں میں اس کا تیرے قدم کے یاں ہو
کب جاسکے ہے کوئی دروازے تیرے آکر
بیٹھے جو تیرے در پر وہ سنگِ آستاں ہو

عیش و فراغت کی روٹی توڑتے ایک ہی سال گزرا تھا کہ جنگ کے بادل منڈلانے لگے۔ نادر شاہ درانی کے قتل کے بعد احمد شاہ ابدالی نے ہاتھ پاؤں نکالے تھے۔ اپنی سلطنت کو مستحکم کرنے کے لیے وہ سرزمینِ ہند کی طرف بڑھ رہا تھا۔

محمد شاہ بادشاہ دہلی بسترِ علالت پر تھے کہ مخبر نے حاضری کی استدعا کی۔

”حضور، ابدالی فوجیں لاہور تک پہنچ گئی ہیں۔ ان کے لشکر میں شامل گھوڑوں کی آوازیں کئی کئی میل تک سنائی دے رہی ہیں۔“

محمد شاہ نے بے بسی سے بوڑھے حکیم کی طرف دیکھا۔ اس کا اصرار تھا کہ وہ ابدالی کا راستہ روکنے کے لیے دہلی سے باہر ضرور نکلے گا لیکن اس کے معالج اس کے حق میں نہیں تھے۔ اس کی حالت ہرگز ایسی نہیں تھی کہ میدان جنگ کی صعوبتوں کو برداشت کر سکتا۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ شہزادہ احمد شاہ لشکر کی سربراہی کریں گے۔

قلعے کی مسجد سے مغرب کی اذان بلند ہوئی۔ ہر چیز اس طرح ساکت ہو گئی جیسے در و دیوار نے ہونٹوں پر انگلی رکھ لی ہو۔

قلعے میں اس رات کوئی نہیں سویا۔ صبح کی اذان کے ساتھ ہی دو لاکھ کا لشکر، مقابلے کے لیے روانہ ہو گیا۔

محمد شاہی فوج سرہند کے قریب پہنچ کر صف آرا ہوئی۔
جنگ کا فیصلہ جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی ہو گیا۔ ابدالی
کا شکست ہوئی۔ وہ لاہور سے چند بان ضبط کر کے لایا تھا۔
ناواقفیت سے ان کو الٹا سر کیا جس سے اس کی فوج تتر بتر ہو گئی۔
ئی ہزار سپاہی زندہ جل کر مر گئے۔ مجبوراً راہِ فرار اختیار کرنی
پڑی۔

محمد شاہی افواج نے واپسی کی راہ پکڑی۔ ابھی یہ لشکر پانی
پت تک پہنچا تھا کہ علمِ سیاہ سربلند ہوا۔ خبر پہنچی کہ دہلی میں محمد
شاہ کا انتقال ہو گیا۔

محمد شاہ کی حیات کا چراغ بجھتے ہی احمد شاہ اپنے باپ کی جگہ
سلطنت شاہی پر جلوہ افروز ہوا۔ صفدر جنگ کو وزارت اور احمد
علی خاں سیف الدولہ کو بخشی گری ملی۔

سودا ان حوادث کو بہ غور دیکھ رہا تھا۔ وہ اس سے نالاں
بھی تھا لیکن اس کا حصہ بننے پر مجبور بھی۔

حالات بدلے تو مہرے بھی اِدھر سے اُدھر ہو گئے۔ کل جو
بااختیار تھے آج بے اختیار ہو گئے۔ سودا ان مہروں کے مطابق
اپنی چال چلنا خوب جانتا تھا۔ اس نے سیف الدولہ سے مراسم
استوار کیے اور بالآخر ان کے دسترخوان سے وابستہ ہو گیا۔

امیروں کے حضور قصیدے کے بغیر جانا بے ادبی تھا۔ اس
نے اس سرپرست کی شان میں بھی ایک شاندار قصیدہ رقم کیا۔
شجاعت کی مبالغہ آمیز تصویر کھینچی۔

اور اس کی پوچھتے ہو شجاعت یہ سن رکھو
اژدر کے چیرے جبڑے کہ جب تھا یہ شیر خوار
یک دم جو اس کی تیغ کی برش زراہِ سہو
دل میں اگر خیال کرے اپنے کوہسار
جس تودے پر کہ تیرِ قضا کارگر نہ ہو
خاک کو اپنے اس میں سے پھوڑے ہے وہ دوسار
تیری ہی تیغ و تیر کی دہشت ہے یاں تلک
تا وحش و طیر نے کی مسلح پوشی اختیار

گھوڑے کی سبک رفتاری کی تعریف یوں کی۔

رانوں میں یہ سبک جو پھرے سطحِ آب پر
ٹوٹے حباب سُم تلے آکر نہ زینہار
مشرق کی سرزمین سے مغرب کی سمت کو

اس برق وش کو پھینک دے گر ہو کے تو سوار
اس عرصے میں پھر آوے کہ شاید نہ بجھنے پائیں
گر پھینکنے میں نعل سے اس کے جھڑیں شرار

چند شاگردانِ سودا

میاں معین، قائم چاندپوری، فخرالدین ماہر، شرف الدین
شرف، مرزا عظیم بیگ، منشی بندرابن راقم، میر ہاشم علی ہاشم،
میر امان اسد، مرزا عظیم بیگ، مرزا حسن احسن، عبدالہادی
ہادی۔ وغیرہ تقریباً چالیس نام ہیں۔

نامور ہم عصر

میر تقی میر، خواجہ میر درد، مرزا مظہر جان جاناں، خان آرزو،
میر ضاحک۔

پھر گریز کرتا ہوا اپنے مطلب پر آیا۔

کہنے لگا کہ تجھ سے تعجب ہے یہ سخن
اتنا تو ہو کے عاقل و دانا و ہوشیار
یہ رمز اب تلک نہیں سمجھا ہزار حیف
ہے یہ وہ جس کے خوانِ کرم کا تو ریزہ خوار
یعنی وہ سیف دولہ بہادر کہ جس کی تیغ
کرتی رہی سدا سرِ اعدا پہ کارزار

○☆○

دہلی میں جب اردو شاعری کا آغاز ہوا تو تقریباً تمام اصنافِ
سخن پر شعرا نے طبع آزمائی کی لیکن قصیدہ نگاری پر کسی نے توجہ
نہیں دی۔ اگر کسی نے کوئی قصیدہ کہا بھی تو اس پر قصیدے کا
اطلاق نہیں ہوتا تھا۔

اس کی ایک وجہ اس وقت کے سیاسی اور معاشرتی تباہ کن
انقلابات تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ حالات قصیدے کے لیے سازگار
نہیں ہو سکتے تھے۔ زبان بھی اس حالت میں نہیں تھی کہ
قصیدے کی شوکتِ لفظی کا ساتھ دے سکے جبکہ فارسی میں
قصیدے کی روایت بہت ترقی کر چکی تھی۔ خاقانی، عرفی اور
انوری تو قصیدہ نگاری کے بادشاہ تھے۔

سودا نے سمجھ لیا تھا کہ اب اس کی شاعرانہ زندگی ان امرا
کی سرپرستی میں ہی گزرے گی اور قصیدے کہنا اس کا شعار
ہو گا۔ اس نے ایرانی اساتذہ کے قصائد کو پیشِ نظر رکھا اور
پورے لوازم کے ساتھ نہایت دھوم دھام سے قصیدہ نگاری
کی۔

سودا سے قبل قصیدہ نگاری دہلی میں رائج نہیں تھی۔ وہ
اس صنف کا موجد ٹھہرا اور اتنی عظیم الشان صنفِ اردو شاعری
کے سپرد کرنے کا اعزاز حاصل کیا۔

قاعدہ ہے کہ جب پہلے پہل کوئی چیز ایجاد ہوتی ہے تو اس میں بہت کچھ کمی رہ جاتی ہے لیکن سودا اس پائے کے قصیدے لکھ رہا تھا کہ معلوم ہوتا تھا' اس کے بعد بھی کوئی اس سے بہتر نہیں لکھ سکے گا۔ یہ صنف اس کے مزاج اور اس کی علمیت دونوں کے عین مطابق تھی۔ غزلیں تو اور بہت لوگ کہہ رہے تھے لیکن اس صنف میں وہ اکیلا تھا۔

قصیدے کے اولین لوازم میں چار چیزیں ہیں۔ سب سے پہلے یہ دیکھا جاتا ہے کہ مطلع کس معیار کا ہے۔ وہ مطلع کامیاب سمجھا جاتا ہے جس میں کوئی جدت آمیز بات بیان کی جائے تاکہ طبیعت خوش ہو اور سامع طویل ترین قصیدہ سننے کے لیے تیار ہو جائے۔

سودا نے کمال کے مطلع لکھے۔

برجِ حمل پہ بیٹھ کے خاور کا تاجدار
کھینچے ہے اب خزاں پہ صفِ لشکرِ بہار

یا

اٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل
تیغ اردی نے کیا ملکِ خزاں مستاصل

یا

ہوا کے فیض سے ایسا ہے سبز باغِ جہاں
شبیہ سنبلِ تر سے ہے موجِ ریگِ رواں

دوسری چیز تمہید ہے جسے تشبیب کہتے ہیں۔ یہ حصہ قوتِ شعری اور شوکتِ الفاظ کے اظہار کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ فارسی شعرا نے اس میں بڑے بڑے کمالات دکھائے تھے۔ سودا نے بھی اس میں اتنا تنوع پیدا کیا کہ اسے صرف شباب کے موضوعات تک محدود نہیں رکھا بلکہ بہار' خزاں' شکایت گردوں' ذکرِ محبوب' حکیمانہ خیالات اور اخلاقی صداقتوں کا بھی اظہار کیا۔ نئے نئے ڈھنگ سے تمہیدیں باندھیں۔

سجدۂ شکر میں ہے شاخِ ثمردار ہر ایک
دیکھ کر باغِ جہاں میں کرمِ عز وجل
قوت نامیہ لیتی ہے نباتات کا عرض
ڈال سے پات تلک پھول سے لے کر تا پھل
واسطے خلعتِ نو روز کے ہر باغ کے بیچ
آب جو قطع لگی کرنے روش پر مخمل
عکس بلبل یہ زمیں پر ہے کہ جس کے آگے
کار نقاشیِ مانی ہے دوم وہ اول
بار سے آبِ رواں عکس ہجوم گل کے
لوٹے ہے سبزے پہ از بس کہ ہوا ہے بے کل
شاخ میں گل کی نزاکت یہ بہم پہنچی ہے
شمع ساں گرمیِ نظارہ سے جاتی ہے پگھل
سایۂ برگ ہے اس لطف سے ہر اک گل پر
ساغرِ لعل میں جوں کیجئے زمرد کو حل

قصیدے کی روح "گریز" کہلاتی ہے۔ یہ دراصل تمہید اور اس کے بعد آنے والے حصہ مدح کو ملاتی ہے۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ دونوں میں ایسا ربط پیدا کرے کہ سامع مدحیہ اشعار سننے کا مشتاق ہو جائے۔

سودا نے اس حصے کو بیان کرنے میں بھی اپنی استادی کو منوا لیا۔

ایک قصیدے میں اس نے حرص کی ترغیبات کا ذکر بڑے دل فریب انداز میں کیا لیکن گریز اس طرح کی۔

القصہ گزری تھی مجھے شب اس خیال میں
ناگاہ پیرِ عقل نے آ اس مکاں تلک
ایسا ہی مارا ایک طمانچہ کہ تا ہنوز
پہنچے ہے رنگِ چہرہ گلِ ارغواں تلک
کہنے لگا وہ مجھ سے کہ سودا ہزار حیف
اخاہ میں نے تجھ کو نہ سمجھا تھا یاں تلک

گریز کے بعد مدح کی نوبت آتی ہے۔ اس میں شاعر ممدوح کے اوصاف بیان کرتا ہے۔ یہ قصیدے کا بدنام ترین حصہ ہے۔ تمام فارسی قصائد مبالغہ آرائی سے بھرے پڑے تھے۔ سودا نے بھی فارسی قصائد کو سامنے رکھا اور مبالغہ آرائی کی ایسی ایسی تصویریں بنائیں کہ الاماں۔ یہی چیز شاعر کی قوتِ تخیل کی پہچان بھی تھی۔ اس لیے اس کے قصیدے اہلِ نظر میں مقبول ہوئے۔ اس نے اپنے ممدوحین کو اتنا خوش کیا کہ وہ ان کی ضرورت بن گیا۔ قصائد کے صلے میں ہونے والی نوازشات ہی کہ بدولت اس کی زندگی فارغ البالی سے گزر رہی تھی۔ جہاں بہت سے اہلِ ہنر نان شبینہ کے محتاج تھے' وہاں اس کی زندگی رئیسانہ شان سے گزر رہی تھی۔

اس کی قصیدہ نگاری کی دھوم ایسی مچی کہ اس شور میں اس کی غزلیں دب کر رہ گئیں۔ اسے قصیدے کا شاعر سمجھا جانے لگا۔ اس کی غزلیں پس منظر میں چلی گئیں۔ اس کا مردانہ لہجہ' بلند آہنگی' مشکل الفاظ' حد سے بڑھی ہوئی قوتِ تخیل۔ یہ سب ایسی چیزیں تھیں جنہوں نے مل کر تغزل کی سادگی کے جوہر کو چھین لیا تھا۔

اہم ترین بات یہ ہوئی کہ اب میر تقی میر اور خواجہ میر درد نے بھی غزل سرائی کا آغاز کر دیا تھا۔ خصوصاً میر کی سادگی سے

سودا کے تکلف کا کیا مقابلہ۔ میر کے نشتر اہلِ دہلی کے دلوں میں اتر کر رہ گئے۔ جب تک انہوں نے میر کے اشعار نہیں سنے تھے' وہ سودا کی غزلوں کو پسند کرتے تھے لیکن جب سے میر واردِ دہلی ہوا تھا' اس کی سادہ بیانی پر دل قربان تھے۔

سودا کا یہ حال کہ اپنی قادر الکلامی کے آگے موتیوں کو پتھر سمجھے۔ اسے میر کی یہ گرم بازاری کیسے راس آسکتی تھی۔ ایک نو عمر لڑکا اکبر آباد سے دہلی آئے اور پھر ایسا اعتبار حاصل کرلے۔ اسے یہ کیسے گوارا ہوتا۔

دوسری طرف میر کا بھی یہ حال کہ گردشِ زمانہ نے اسے پھوڑوں کی طرح دُکھادیا تھا۔ حد درجہ حساس بنادیا تھا۔ باکمال وہ بھی تھا۔ اپنے کمال کے آگے کسی پیرو جواں کو وہ بھی کچھ نہیں سمجھتا تھا۔ مشاعروں میں آمنا سامنا ہوا تو معاصرانہ چشمک نے چنگاری سے شعلہ بنتے دیر نہیں لگائی۔

سودا نے ایک مشاعرے میں یہ شعر پڑھا۔

سودا تو اس غزل کو غزل در غزل ہی کہہ
ہونا ہے تجھ کو میر سے استاد کی طرف

ہرچند کہ اس نے میر کی استادی کا اعتراف کیا تھا لیکن ساتھ ہی خود کو بھی اس کے برابر کا ظاہر کیا تھا۔ میر کو یہ کہاں برداشت کہ کوئی اس کے برابر چلنے کی کوشش بھی کرے۔ اس نے اگلے ہی مشاعرے میں یہ کہہ کر حساب بے باق کردیا۔

طرف ہونا مرا مشکل ہے میر اس شعر کے فن میں
یونہی سودا کبھی ہوتا ہے سو جاہل ہے کیا جانے

یہ سن کر سودا خاموش نہیں رہ سکتا تھا۔ اس نے فوراً اس کا جواب دیا۔

نہ پڑھیو یہ غزل سودا تو ہرگز میر کے آگے
وہ ان طرزوں سے کیا واقف وہ یہ انداز کیا جانے

میر نے پھر نعرۂ مستانہ بلند کیا۔

وہ ہے اک مندرس' نالہ مبارک مرغِ گلشن کو
وہ اس ترکیبِ نو کی نالہ وزاری کو کیا جانے

یہ قصہ یہیں تمام نہیں ہوگیا بلکہ میر نے سودا کے خلاف پوری مثنوی کہہ ڈالی۔ سودا کو کتے پالنے کا نہایت شوق تھا۔ اس مثنوی میں اس نے اسی شوق کو نشانہ بنایا۔

کتے ہیں پاس' کتے ہیں جیب وکنار میں
کتے ہیں آستین میں کتے ازار میں
آیا جو ایک روز وہ بے تہ چلا ہوا
کتا ازار اس کی سے نکلا بندھا ہوا
اک سگ گزیدہ کی سی طرح جھومنے لگا
پھر کھول اس کے منہ کے تئیں چومنے لگا
کتوں کی جستجو میں ہوا روڑا باٹ کا
دھوبی کا کتا ہے کہ نہ گھر کا نہ گھاٹ کا

○☆○

سودا بھی کب ماننے والا تھا۔ اس نے بھی ٹھاٹ دار جواب دیا۔

یہ سچ ہے جو کہتا ہے تو مجھ کو بھی یقیں ہے
کتے کو کہے پاک سو وہ دشمنِ دیں ہے
لیکن وہ سگِ نفس' نجس اس سے کہیں ہے
تجھ پر جو ہر اک لحظہ و ہر آن ہے
تو اس کا نہ کہنا کرے تب پاک ہے واللہ

چاند کی پندرھویں تھی۔ خواجہ میر درد کے مکان پر مشاعرہ تھا۔ میر کو خاص طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ مشاعروں میں شریک ہوتا رہا تھا۔ درد سے عقیدت بھی تھی لہٰذا کیا عذر ہو سکتا تھا۔ وہ اپنی مخصوص وضع کے ساتھ مشاعرے میں پہنچ گیا۔ کمر میں تلوار بندھی' ہاتھ میں جریب۔

شہر بھر کے رئیس اور صاحبانِ فن اس مشاعرے میں جمع تھے۔

سودا معذرت کرچکا تھا کہ وہ اس مشاعرے میں نہیں آئے گا لیکن پھر یہ سوچ کر کہ وہاں میر بھی ہوں گے' وہ بھی چلا آیا۔ اس کی سواری آکر رکی تو مشاعرے میں شور مچ گیا۔ میر و سودا

غزل

نے بلبلِ چمن نہ گلِ نو دمیدہ ہوں
میں موسمِ بہار میں شاخِ بریدہ ہوں
گریاں بہ شکلِ شیشہ وخنداں بہ طرزِ جام
اس میکدے کے بیچ عبث آفریدہ ہوں
تو آپ سے زباں زد عالم ہے ورنہ میں
یک حرف آرزو وبلبِ نارسیدہ ہوں
کرتا ہے جاکے گل کی تسلی چمن میں تو
خونِ جگر سے میں بھی تو دامن کشیدہ ہوں
غافل ہے کیوں ترا مری فرصت سے گوشِ دل
اے بے خبر میں نالہ حلق بریدہ ہوں
میں کیا کہوں کہ کون ہوں سودا بقولِ درد
جو کچھ کہوں سو ہوں غرض آفت رسیدہ ہوں

کے درمیان ہونے والی چشمکوں کا احوال سب کے علم میں تھا۔ اب وہ دونوں ایک جگہ جمع ہو رہے تھے۔ معاملہ تھا تو دلچسپ۔
خواجہ میر درد جو بادشاہ سلامت تک کے لیے کھڑے ہونے کی زحمت نہ کریں، اسے لینے خود دروازے تک گئے۔
معاصرانہ چشمک اپنی جگہ لیکن لیکن جب میر اور سودا آمنے سامنے آئے تو لوگوں نے یہ بھی دیکھا کہ دونوں نے گلے مل کر ایک دوسرے کی خیر و عافیت دریافت کی لیکن بیٹھے ایک دوسرے سے الگ الگ۔
شمعِ محفل گردش کرتی رہی۔ میر اپنی اداسیوں سے ہم کلام رہا۔ سودا کے ہونٹوں پر مستقل تبسم کھیلتا رہا۔
شمعِ محفل میر کے سامنے آئی۔ اس کا نام سن کر سودا نے آنکھیں کھول دیں۔
میر نے مطلع پڑھا۔

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

سادہ سی بات تھی لیکن "دلِ ستم زدہ کو تھام تھام لیا" نے دلوں پر نشتر سے چلا دیے۔
اس نے زخمیوں کو تڑپتا ہوا چھوڑا اور دوسرا شعر پڑھا۔

قسم جو کھائیے تو طالعِ زلیخا کی
عزیزِ مصر کا بھی صاحب اک غلام لیا

میر نشتر چلا چکا تھا۔ غزل ختم ہو گئی تھی۔ بسمل تڑپ رہے تھے کہ سودا کی باری آئی۔
طرحی مشاعرہ تھا اس لیے سودا نے بھی اسی زمین میں غزل سنائی۔

چمن میں صبح جو اس جنگ جو کا نام لیا
صبا نے تیغ کا موجِ رواں سے کام لیا

دونوں کے مزاج کا فرق ظاہر تھا۔ جنگجو، موجِ رواں، تیغ اور پھر جنگ و جدل، لشکر کشی کا تاثر۔ وہ بات کہاں تھی جو میر کے دلِ ستم زدہ کو تھام تھام لینے میں تھی۔

کمالِ بندگی عشق ہے خداوندی
کہ ایک زن نے مہ مصر سا غلام لیا

اس میں بھی وہی تکلف اور قصیدے کا انداز۔ اس کے بعد پوری غزل کا رنگ ڈھنگ یہی تھا جس میں زورِ کلام تو تھا لیکن جذب و تاثیر کی کمی تھی۔
مشاعرہ ختم ہوا تو میر کی دست بوسی کے لیے بھیڑ لگ گئی۔
قدرداں اس کے بھی کم نہیں تھے بلکہ خواص تو سب اس ہی کے اردگرد تھے لیکن اسے اس میں بھی اپنی سبکی معلوم ہوئی کہ اس کے روبرو میر کی پذیرائی... کیوں ہوئی۔

شاعرانِ ہند کا تو گرچہ پیغمبر نہیں
پر سخن کہنے میں اے سودا تجھے اعجاز ہے

اس نے اپنا یہ شعر پڑھا اور مشاعرے سے اٹھ گیا۔
گھر پہنچا تو رات اپنا دامن پھیلا چکی تھی لیکن وہ آج ہر رات سے زیادہ جاگ رہا تھا۔
اس کے ملازم نے اس کا اشارہ دیکھتے ہی حقہ تازہ کر کے لا دیا اور ہاتھ باندھ کر کسی اور حکم کا انتظار کرنے لگا۔
"ارے غنچہ!"
"جی سرکار؟"
"ذرا لانا تو قلم دان۔ آج میں ان سب کی خبر لیتا ہوں۔ مجھے سمجھا کیا ہے؟"
غنچہ کو معلوم تھا کہ جب وہ اس طرح بلاتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ کسی کی ہجو لکھنے کے لیے بے چین ہے۔
دیر کس بات کی تھی۔ اس نے قلم دان آگے کر دیا۔
سودا کے مخاطب سب ہی تھے۔ وہ آج اپنے معاصرین کے خلاف زہر اگل رہا تھا۔

کیا غرور و دماغ کیا نسبت
کون سا کبر ہے جو ان میں نہیں
بعد صد منت و سماجت کے
جاویں گر یہ مشاعرے میں کہیں
میر مجلس کی تاب و طاقت کیا
کرے تکلیف شعر ان کے تئیں
شعر اپنا پڑھیں جو ان کے حضور
کر کے سرگوشی یک دگر دو ہیں
ایک کہتا ہے یہ تو اردو ہے
دوسرا بولے اوف ری تمکیں
خلق کو انتظار کش کر کے
یک دو مصرعے پڑھیں جو آپ کہیں
درد کس کس طرح بلاتے ہیں
کر کے آواز منحنی و حزیں
اور جو احمق ان کے سامع ہیں
دم بدم ان کو یوں کریں تحسیں
جیسے سبحان من یرانی پر
لڑکے مکتب کے سب کہیں آمیں
کوئی پوچھے ذرا کہ عالم میں
فخر کس چیز کا ہے ان کے تئیں
شعر و تقطیع ان کے دیواں کی
جمع ہوئے تو جیسے نقش نگیں

اس میں بھی دیکھیے تو آخر کار
یا تو اردو ہوا ہے یا تفنیں

وہ اپنے دل کا بخار اتارتا رہا۔ بخار کم نہیں ہوا البتہ نام تم ہوگئے۔

اب یہ روز کا معمول ہوگیا تھا۔ جہاں کسی سے بگڑا' اس نے آواز لگائی "غنچہ! ذرا لانا تو میرا قلم دان۔"

جب یہ قلم دان کئی مرتبہ آ اور جا چکا تو اسے محسوس ہوا کہ اس صنف سے اس کی طبیعت کو ازحد مناسبت ہے۔ مزاح اور طنز کے اور اکثر فحاشی کے ایسے ایسے مضامین تلاش کر لیتا ہے کہ شیطان کانوں میں انگلیاں دے لے۔

اردو میں ایک دوسرے پر لعن طعن کرنے کی روایت تو پرانی تھی لیکن ایک دو شعروں میں غصہ اتار لیا جاتا تھا البتہ فارسی میں اسے باقاعدہ صنف کا درجہ حاصل ہوگیا تھا۔

سودا کی فطرت میں تمسخر اور ظرافت کا عنصر بہت زیادہ تھا اور اس کے ساتھ ہی غصہ اور گرم مزاجی کی بھی شدت تھی۔ انہی دو باتوں نے اسے ہجویات کہنے پر اکسایا۔

جن شعرا کے مزاج میں ظرافت ہوتی تھی۔ وہ غزل کے بجائے ہزل کا محدود راستہ اختیار کرتے تھے لیکن سودا نے نسبتاً زیادہ وسیع راستے کو اختیار کیا۔ اس نے فارسی شعرا کی پیروی میں اس صنف کو محض دل کے پھپھولے پھوڑنے کے لیے نہیں بلکہ ایک صنف کی حیثیت سے اختیار کیا۔ اور کئی ایسی نظمیں اس سے کہلوا دیں جو ہجو کے پردے میں زبردست اصلاحی پہلو اپنے اندر رکھتی تھیں۔

جب وہ اپنے دور کے امرا یا سیاسی و معاشرتی حالات کی ہجو لکھتا ہے تو اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ بے قابو اس وقت ہو جاتا تھا جب وہ کسی سے ناراض ہو کر ملازم کو آواز دیتا تھا۔ وہ اس وقت یہ بھول جاتا تھا کہ کسی کے جسمانی عیوب بیان کرنا یا فحش بیانی پر اتر آنا عیب ہے ہنر نہیں۔ غصے میں اسے کچھ نہیں سوجھتا تھا۔ شاہ ولی اللہ سے لے کر خواجہ میر درد تک کون تھا جو اس کے قلم کی زد میں نہ آیا ہو۔

ایک روز ایک صاحب اس سے ملنے کے لیے آئے۔ ان صاحب سے اس نے پوچھا کہ وہ آج کل کیا کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا' فرصت ہی کہاں ملتی ہے۔ ایک غزل جان کو لگی ہوئی ہے سو بھی کبھی کہہ لیتا ہوں۔

"غزل کا کیا کہنا۔ ہجو کہا کرو ہجو" سودا نے کہا۔

"ہجو! ہجو کس کی کہوں" ان صاحب نے کہا۔

"اس میں کیا ہے۔ میں آپ کی ہجو کہتا ہوں' آپ میری ہجو کہیں۔"

اس کو اس صنف سے ایسی ہی رغبت تھی۔ ہجو کہنے کا کوئی نہ کوئی موقع نکال ہی لیتا تھا۔ اس باب میں اس کی طبیعت انتہا پسند واقع ہوئی تھی۔ مزاح یا لطیفِ ظرافت سے گزر کر تمسخر اور فحش کی حدود میں جا نکلتا تھا۔ طبیعت کہیں رکتی نہیں تھی۔ جہاں کہیں موقع دیکھتا بے خوف و خطر اپنے قلم اور زبان کو جنبش دیتا۔ اور پنجے جھاڑ کر ایسا پیچھے پڑتا کہ حریف کے لیے جان چھڑانی مشکل ہو جاتی۔

میر ضاحک' فدوی لاہوری' مرزا فاخر' بقا اللہ بقا وغیرہ اہلِ کمال نے اسے چھوڑا نہیں۔ خوب خوب جواب دیے لیکن حسنِ قبول اور شہرتِ عام اس کے نصیب میں تھی۔

ہو کے کسل مند جو وہ بے حیا
اپنے تئیں آپ کرے ہے دوا
مردہ شود مولوی' تابوت گر
گھیرتے ہیں آن کے سب اس کا گھر
دیں ہیں دہائی وہ بصد قیل و قال
ان میں سے ہر ایک کرے ہے سوال
خوب خوب کرتا ہے تو اپنی دوا
اور کوئی آپ سا ہم کو بتا
روزی سے خاطر ہو مری تاکہ جمع
بھیجوں تری گور پہ گل اور شمع

(حکیم غوث کی ہجو)

ساجدا کیوں نہ یہ پرواز کرے تا بہ فلک

سودا کی قیافہ شناسی

ایک دن سودا مشاعرے میں بیٹھے تھے۔ لوگ اپنی اپنی غزلیں پڑھ رہے تھے۔ ایک شریف زادے کی بارہ تیرہ برس کی عمر۔ اس نے غزل پڑھی' مطلع تھا۔

دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

گرمیِ کلام پر سودا بھی چونک پڑے۔ پوچھا' یہ مطلع کس نے پڑھا۔ لوگوں نے کہا کہ یہ صاحب زادہ ہے۔

"میاں لڑکے' جوان تو ہوتے نظر نہیں آتے" سودا نے بے اختیار کہا۔

خدا کی قدرت انہی دنوں اس لڑکے کے گھر میں آگ لگی اور وہ جل کر مر گیا۔

لڑکے کا نام آج کوئی بھی نہیں جانتا۔ یہ شعر مشہور ہوگیا۔

پہنچی پشتین سے یوں نطفے کی حلت جس تک
(مولوی ساجد کی ہجو)

شاعر ہوا ہے فدوی کیا شاعروں کا تلا
مادہ وزن تخلص یاروں کا مسخرا
(فدوی لاہوری کی ہجو)

ایک ولایتی کہ زمرۂ اہلِ سیف میں معزز ملازم تھا۔ سودا نے اس کی ہجو کہہ رکھی تھی۔ ایک دن اتفاق سے وہ اسے ایک مشاعرے میں نظر آگیا۔ سودا نے موقع غنیمت جانا اور اس کی ہجو اس کے سامنے پڑھنی شروع کردی۔ وہ چپکا بیٹھا سنتا رہا۔ جب سودا نظم ختم کرچکا تو وہ نہایت اطمینان سے اپنی جگہ سے اٹھا اور سودا کے سامنے بیٹھ کر گالیوں کی بارش کردی۔ ایسی ایسی نادرالوجود گالیاں کہ سودا نے کبھی سنی بھی نہ ہوں گی۔ سودا نے اٹھنے کی کوشش کی تو اس نے کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ گالیوں کا زور تھا کہ کم ہی نہ ہوتا تھا۔

”خیر باشد“ سودا نے گھبرا کر کہا ”جناب آغا! اقسام ایں مقامات شایانِ شانیست۔“ (یہ آپ کے شایانِ شان نہیں ہے)

ولایتی نے اپنی کمر سے تلوار کھینچی اور ان کے پیٹ پر رکھ دی ”نظم خودت گفتی حالا ایں نثر گوش کن۔“ (تم اپنی نظم سنا چکے۔ اب میری نثر سنو)

وہ بڑی دیر تک نثر کے نام پر گالیاں سناتا رہا۔ جب خوب جی ہلکا ہوگیا تو وہ انہیں چھوڑ کر الگ ہوگیا۔

سودا نے ایسی شاعری کبھی نہیں سنی تھی۔ پسینے سے اس کا ماتھا بھیگ گیا لیکن شکر بھی ادا کیا کہ اس ولایتی نے تلوار پیٹ میں گھونپ نہیں دی۔

ولایتی اٹھ کر جاچکا تھا۔ اب کیسی شاعری کہاں کا مشاعرہ۔ کچھ لوگ تو اس ولایتی کی حرکت پر ہنس رہے تھے، کچھ افسوس کررہے تھے کہ سودا جیسے باعزت شاعر کی یہ درگت بنی۔

وہ چند دوستوں کے ساتھ کابلی دروازے پہنچا تو اپنی درگت پر خود بھی قہقہے لگا رہا تھا۔

”بھئی، آئندہ کے لیے توبہ۔ جو کبھی کسی غیر شاعر کی ہجو لکھی ہو۔ گالیاں نثر میں اچھی نہیں لگتیں۔ ان کا مزہ تو نظم میں سے جواب ملے تو نظم میں۔ یہ کیا کہ تلوار کے آگے پیٹ آگے کرنا پڑے۔“

اس نے پھر غنچہ کو آواز دی۔ اس نے جھٹ قلم دان آگے رکھ دیا اور خاموش کھڑا ہوگیا کہ دیکھئے اب کس کی شامت آتی ہے۔

”مرزا مظہر بھی تو ریختہ کہتے ہیں۔ ان کی ہجو کیسی رہے گی۔“

”وہ بزرگ آدمی ہیں، انہیں تو چھوڑ دیجئے۔“

”بھئی، شاعری میں کیا بزرگی کیا خوردی۔ ہم ان کی ہجو لکھ رہے ہیں وہ ہماری ہجو لکھ دیں گے۔ تلوار تو پیٹ میں نہیں رکھیں گے۔“

وہ مرزا مظہر جانِ جاناں کی ہجو لکھنے بیٹھ گیا۔

مظہر کا شعر فارسی اور ریختہ کے بیچ
سودا یقین جان کہ روڑا ہے باٹ کا
آگاہ فارسی تو کہیں اس کو ریختہ
واقف جو ریختہ کے ذرا ہووے ٹھاٹ کا
سن کر وہ یہ کہے کہ نہیں ریختہ ہے یہ
اور ریختہ بھی ہے تو فروز شہ کی لاٹھ کا
القصہ اس کا حال یہی ہے جو سچ کہوں
کتا ہے دھوبی کا کہ نہ گھر کا نہ گھاٹ کا

وہ اپنی قصیدہ گوئی پر نازاں بھی تھا اور یہ بھی معلوم تھا کہ لوگ اسے قصیدہ گو سمجھتے ہیں، غزل گو نہیں۔ غزل کی سلطنت میں میر تقی میر اور خواجہ میر درد ہی کا سکہ چلتا ہے لیکن وہ اپنی قادرالکلامی سے بعید سمجھتا تھا کہ لوگ اسے کسی ایک صنف کا شاعر سمجھیں۔ اس کا مقابلہ میر سے تھا۔ اس نے اپنی دانست میں نہایت شاندار غزل لکھی۔

جی مرا مجھ سے یہ کہتا ہے کہ ٹل جاؤں گا
ہاتھ سے دل کے ترے اب میں نکل جاؤں گا
لطف اے اشک کہ جوں شمع گھلا جاتا ہوں
رحم اے آہ شرر بار کہ جل جاؤں گا
چین دینے کا نہیں زیرِ زمیں بھی نالہ
سوتوں کی نیند میں کرنے کو خلل جاؤں گا
قطرۂ اشک ہوں پیارے مرے نظارے سے
کیوں خفا ہوتے ہو پل مارتے ڈھل جاؤں گا
میری صورت سے تو بیزار ہے ایسا تو دیکھ
شکل اس غم سے کوئی دن میں بدل جاؤں گا
چھیڑ مت بادبہاری کہ میں جوں نکہتِ گل
پھاڑ کر کپڑے ابھی گھر سے نکل جاؤں گا

اس غزل کے مقطع میں اس نے صاف اظہار کردیا کہ وہ قصیدہ ہی نہیں غزل بھی لکھ سکتا ہے۔

کہتے ہیں وہ جو ہے سودا کا قصیدہ ہی خوب
ان کی خدمت میں لیے میں یہ غزل جاؤں گا

اس نے یہ غزل کہی بھی اور ان کی خدمت میں لے کر گیا
ی: ؛ ا سے قصیدہ گو سمجھتے تھے لیکن وقت اپنا فیصلہ سنا چکا تھا۔
لو ... تسلیم کر چکے تھے کہ میر صاحب کی طبیعت قدرتی درد خیز اور
دل ... رت انگیز ہے۔ یہی چیزیں غزل کی جان ہیں۔ مرزا سودا کی
طبیعت ہمہ رنگ اور ہمہ گیر ہے۔ ذہن براق اور زبان مشاق
... ہیں۔ توسنِ فکر ان کا' منہ زور گھوڑے کی طرح جس
طرف جاتا ہے پھر ان کے روکے بھی نہیں رکتا۔ کوئی بحر اور
کوئی قافیہ ان کے ہاتھ آئے جس برجستہ مضمون میں بندھ
... باندھ لیتے ہیں۔ تغزل کی خصوصیت نہیں رہتی۔ کبھی
کبھی ایسے شعر بھی کہہ جاتے ہیں۔

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

لیکن بہ حیثیت مجموعی ان کی غزلوں میں لفظوں کے انبار
ہیں' کاوش ذہن تو ہے۔ دُکھا ہوا دل نظر نہیں آتا جو اچھی
... کے لیے ضروری ہے۔

○☆○

زمانہ کروٹ پر کروٹ بدل رہا تھا۔ وہ اپنی اقلیم سخن کی
... و تعمیر میں مصروف تھا۔ اس نے اس طرف غور ہی نہیں
... احمد شاہ بادشاہ کی نسوانیت نے خواجہ سراؤں اور ڈوم
... ہوں کے ہاتھوں میں انتظام سلطنت دے دیا ہے۔ امرا میں
... بےچینی بڑھتی جا رہی ہے اور کسی وقت بھی کوئی دھماکا ہو سکتا

پہلا دھماکا اس وقت ہوا جب اس نے خواجہ سرا جاوید کی
... کی خبر سنی۔

خواجہ سرا جاوید کو بادشاہ نے اتنا سر چڑھا لیا تھا کہ اس کی
... ت کے بغیر کوئی بادشاہ سے نہیں مل سکتا تھا۔ امرا اس
... پر سخت برہم تھے اور تاک میں تھے کہ کب موقع ملے
... اس کانٹے کو سلطنت کے پاؤں سے نکال پھینکا جائے۔
... صفدر جنگ' وزیرِ مملکت کا داؤ چل گیا۔ اس نے خواجہ
... ضیافت پر بلایا اور دھوکے سے قتل کر دیا۔

"دوسرا دھماکا اس وقت ہوا جب صفدر جنگ کی جگہ بادشاہ
... زی الدین عماد الملک کو وزیر بنا دیا۔

عماد الملک' سودا کا قدر داں تھا۔ اس لحاظ سے یہ اس کے
... اچھی خبر تھی لیکن اس سے یہ اندازہ بھی ہوتا تھا کہ امرا کی
... سلطنت کو کوئی بڑا نقصان بھی پہنچا سکتی ہے۔

اس دھماکے کی گونج اس وقت مکمل ہوئی جب ۱۱۶۷ھ میں
... نے احمد شاہ اور اس کی ماں ردھم بائی کو قید کر دیا اور
... بعد ہی دونوں کی آنکھوں میں سلائی پھیر کر اندھا

"انتخاب کلام"

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

○☆○

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغِ قبلہ نما آشیانے میں

○☆○

برابری کا تری گل نے جب خیال کیا
صبا نے مار طمانچے منہ اس کا لال کیا

○☆○

سودا تری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات
اب آئی سحر ہونے کو ٹک تو کہیں مر بھی

○☆○

نہیں معلوم کیا اس سینے میں جوں شمع جلتا ہے
دھواں نوکِ زباں سے بات کرنے میں نکلتا ہے

○☆○

پڑے رہ برقِ خارِ آشیاں میرے کہتا ہوں
اڑے گا دھجیاں ہو کر ترا دامن جو یاں اٹکا

○☆○

آئے جو بزم میں تو اٹھا چہرے سے نقاب
پروانے ہی کو شمع سے بیزار کر چلے

○☆○

اے غنچہ آنکھ کھول کے ٹک تو چمن کو دیکھ
جمعیتِ دلی پہ تری پھول ہنس چلے

○☆○

گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر اندازِ چمن کچھ تو اِدھر بھی

○☆○

سمجھ کے رکھیو قدم خارِ دشت پر مجنوں
کہ اس نواح میں سودا برہنہ پا بھی ہے

○☆○

ہوں وہ آوارہ کہ طفلی ہی میں جوں اشک مجھے
کردیا مادرِ ایام نے گھر سے باہر

○☆○

کردیا۔ عالمگیر ثانی کو تری پولیہ کی کال کوٹھری سے نکال کر تخت پر بٹھایا لیکن کل اختیارات اسی کے ہاتھ میں تھے۔

عمادالملک کے ستارے کے ساتھ ہی سودا کا ستارہ چمکا۔ وہ سودا کی شاعری پر فریفتہ تھا چنانچہ اختیارات ملتے ہی اس نے سودا کی سرپرستی شروع کردی۔ سودا نے بھی کئی شاندار قصائد لکھ کر حقِ نمک ادا کیا۔

نہیں ہے معجزِ عیسیٰ سے کم تری تدبیر
کیا ہے زندہ سرِ نو سے جن نے عالم گیر
سنا نہیں ہے کہ غازی دیں عمادالملک
جو میر بخشی تھا واں کا سو اب ہوا ہے وزیر
اگر طلب کرے کاغذ وہ تجھ سے اے ناداں
تو ہوسکے گی پھر اس وقت اس کی کچھ تدبیر
کرے ہے عرض یہ سودا ہمیشہ عالم کا
رہے ہے تو کار کشا اے امیر ابنِ امیر

اس کے مصرف کے جو دیہات ہیں بس ان میں سے
اپنے مداح کو بھی کردے مقرر صحنک
تو ہی ٹک دل میں کر اب عرض کا میری انصاف
جائے کس در پہ کوئی پہنچ کے ایسے در تک

عمادالملک نے اپنا خاص ہاتھی بھیج کر اسے بلوایا تھا۔ یہ اس کے لیے اعزاز تھا لیکن جب وہ بازار سے گزرا تو اسے یہ خیال بھی آیا کہ میں تو اپنی شاعری کی بدولت امرا کی آنکھ کا تارا بنا ہوا ہوں لیکن کیا سلطنت کا یہ فرض نہیں کہ وہ ان غریب شہریوں کی حفاظت کرے۔ امرا کی سازشوں نے یہ دن دکھائے ہیں کہ کبھی کوئی درانی آتا ہے اور اس عوام کو کچل کر چلا جاتا ہے۔ کبھی کوئی ابدالی دوڑ پڑتا ہے۔ کبھی مرہٹے ان سے جبری چندہ وصول کرتے ہیں۔ میں کہاں تک ان کی ہجویں لکھتا رہوں گا۔ کب تک یہ رہیں گے اور میرے قصیدے رہیں گے۔

وہ عمادالملک سے ملاقات کے بعد قلعے کی بلند و بالا دیواروں سے باہر آیا تو اس کا یہ احساس اور فزوں ہوگیا کہ دربار دہلی پست ہمتی اور ہوس اقتدار کی منڈی بنا ہوا ہے۔ سازشوں کے جال دربار سے حرم سرا تک پھیلے ہوئے ہیں۔ محمد شاہ رنگیلے کی رنگین مزاجی اور احمد شاہ کی نسوانیت سے گزر کر آنے والا یہ درباری ماحول، جو ہر مردانگی سے خالی ہوچکا ہے۔ مغلوں کا وقار دربار میں موجود اربابِ نشاط کے گھنگھروؤں تلے دب کر دم توڑ چکا ہے۔ وہ سوچ رہا تھا، کاش وہ تاریخ کے اس موڑ پر دنیا کی سیر کو آیا ہوتا جب اس کی شاعری کی طرح مغلوں کا عروج تھا۔

قلعہ معلیٰ کی دیواریں، اسے حسرت سے دیکھنے کے بجائے فخر سے تو دیکھتیں۔ اب تو میں جس امیر کا دامن تھامتا ہوں وہ ہنگامہ دار و گیر کا شکار ہوجاتا ہے۔

وہ ہر وقت ہنستا رہتا تھا لیکن بے حس نہیں تھا۔ اسے اپنے اور دوسروں کے لٹنے کا شدت سے احساس تھا۔ بس فطرت ایسی تھی کہ رونے اور منہ بسورنے کے بجائے طنز و ظرافت کے پردے میں دل کے پھپھولے پھوڑتا رہتا تھا۔ جہاں کوئی اخلاقی خرابی دیکھتا، اس کے قلم کو حرکت میں آتے دیر نہیں لگتی تھی۔ وہ یہی کر سکتا تھا۔

وہ عمادالملک کی فیاضیوں کے باوجود عدم اطمینان کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس کی زندگی فارغ البالی میں بسر ہو رہی تھی۔ اس کے قدرداں اس کو کبھی انتشار اور پریشان خاطر کا شکار نہیں ہونے دیتے تھے لیکن وہ والیٔ ملک کی نادانی اور امرا کی ریشہ دوانیوں سے خود کو غیر محفوظ سمجھنے لگا تھا۔ اپنے دور کے امرا کی زبوں حالی کی بے باک تصویریں کھینچ کھینچ کر دل ہلکا کر رہا تھا۔

امیر اب جو ہیں دانا انہوں کا ہے یہ حال
ہوئے ہیں خانہ نشیں دیکھ کر زمانے کی چال
بچھے ہے سوزنی، خوجہ کھڑا جھلے ہے رومال
حضور بیٹھے ہیں، اک دو ندیم اہلِ کمال
دھری ہے روبرو اک پیک دان اور تنبول

جو کوئی ملنے کو ان کے انہوں کے گھر آیا
ملے یہ اس سے گرا پنا دماغ خوش پایا
جو ذکرِ سلطنت اس میں وہ درمیاں لایا
انہوں نے پھیر کے ادھر سے منہ یہ فرمایا
خدا کے واسطے بھائی کچھ اور باتیں بول

غرض میں کیا کہوں یارو کہ دیکھ کر یہ قہر
کروڑ مرتبہ خاطر میں گزرے ہے یہ لہر
جو ٹک بھی امن دل اپنے کو دیوے گردشِ دہر
تو بیٹھ کر کہیں یہ رویئے کہ مردمِ شہر
گھروں سے پانی کو باہر کریں جھکول جھکول

دلی سے اس کی بیزاری روز بہ روز بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ چاہتا تھا، دلی چھوڑ کر کہیں اور نکل جائے۔ کچھ دنوں جو دل شکن حوادث و انقلاب کے باوجود ٹھہرا رہا، محض احباب کے اصرار سے۔

نادیدنی از بسکہ ہے روئے عالم

ہے کفر ملاقات جو کیجئے باہم
کرتا ہوں کہیں جانے کا جس وقت میں عزم
درد آن کے سودا مرے پکڑے ہے قدم

○☆○

ہوادار زمین پر اترا ہی تھا کہ وہ اس طرح باہر کود پڑا جیسے زمین کو دیکھے بہت دن ہوگئے ہیں۔ وہ بہت جلدی میں تھا۔ عمادالملک نے اسے فوراً بلوایا تھا اور وہ فوراً حاضر ہوگیا تھا۔ قلعہ نما دروازے اور دہرے دالان سے گزر کر وہ دیوان خانے میں پہنچ گیا۔ کشمیری قالین میں اس کے پاؤں دھنس رہے تھے۔ چھت پر قیمتی فانوس لٹک رہے تھے۔ درمیان میں کارچوبی کرسی اور دیوار کے ساتھ ساتھ مخملیں گاؤتکیے رکھے تھے۔ یہ سب کچھ اس کے لیے نیا نہیں تھا لیکن آج نہ جانے کیوں اسے نیا لگ رہا تھا۔ ابھی کل کی بات ہے، وہ میر تقی میر سے ملنے ان کے گھر گیا تھا۔ بے چراغ گھر میں اقلیم سخن کا تاجدار بیٹھا کیسا لگ رہا تھا۔ میر کا وہ حال اور عمادالملک کے یہ ٹھاٹ۔

وہ ابھی خیالوں سے الجھا ہوا تھا کہ عمادالملک کارچوبی کرسی پر متمکن ہوگیا۔

"سودا، کیوں کھڑے کیوں ہو؟"

"حضور، نیرنگیِ زمانہ پہ غور کررہا تھا۔"

"یہ نہیں پوچھوگے، ہم نے تمہیں کیوں بلایا ہے؟"

"یہ دیکھنے کے لیے کہ سودا دہلی سے فرار تو نہیں ہوگیا۔"

"یہ تو ہمیں معلوم ہے، تم ہمیں چھوڑ کر نہیں جاسکتے۔"

"میں تو پہلے ہی کہہ چکا ہوں، جائے کس در پہ کوئی پہنچ کے ایسے در تک۔"

"ہم نے لاہور کا قصد کیا ہے۔ سوچتے ہیں تم ساتھ ہوگے تو سفر کی کلفت دور ہوجائے گی۔"

"ایک صاحب ہیں فدوی لاہوری۔ بس ان کی وجہ سے لاہور سے نفرت ہوگئی ہے ورنہ ضرور چلتا۔"

"مرزا، تم ہر بات ہنسی میں اڑا دیتے ہو۔ یہ بھی نہیں پوچھوگے، ہم لاہور کیوں جارہے ہیں؟"

"رموزِ مملکت، اہلِ مملکت ہی بہتر جان سکتے ہیں۔"

"سلطنت کی جو حالت ہے اس سے تو تم واقف ہی ہوگے۔ سپاہیوں کو دینے کے لیے تنخواہیں تک نہیں ہیں۔ ہم نے سوچا ہے، لاہور کی صوبہ داری آدینہ بیگ کے ہاتھوں فروخت کردیں۔ اس سے ہمیں تیس لاکھ روپے ملیں گے۔"

"یہ سوچ لیں کہ معین الملک کو شاہ درانی نے حاکم مقرر کیا تھا۔ اس کی وفات کے بعد، اب اس کی اہلیہ متصرف ہے۔ آپ نے اس سے صوبے داری چھین لی تو احمد شاہ درانی خاموش نہیں بیٹھے گا۔"

"اول تو ایسا ہوگا نہیں اور اگر ایسا ہوا تو اس وقت دیکھی جائے گی۔"

اس کا کام ایک اندیشے کا اظہار کرنا تھا سو اس نے کردیا۔ لاہور جانے سے معذرت کی اور گھر چلا آیا۔

عمادالملک ہانسی وحصار کے راستے لاہور روانہ ہوا بیمار اہلیہ معین الملک کو جو کمال غفلت میں تھی۔ قید کیا اور اسے معزول کرکے لاہور کی صوبے داری آدینہ بیگ کو تیس لاکھ کے بدلے سپرد کرکے دہلی واپس آگیا۔

احمد شاہ ابدالی کو جب یہ خبر پہنچی تو وہ منزلیں مارتا ہوا لاہور پہنچ گیا۔ اس کی آمد کی خبر ملتے ہی آدینہ بیگ نے راہِ فرار اختیار کی۔ ابدالی نے فوراً دہلی کا رخ کیا اور دہلی سے بیس کوس کے فاصلے پر اپنے خیمے لگالیے۔

عمادالملک بے سروسامانی کی حالت میں تھا۔ جنگ کی تاب نہیں تھی، مجرم کی طرح سر جھکائے ابدالی کے خیمے میں پہنچ گیا۔

ابدالی سخت غصے میں تھا۔ عمادالملک کو یقین ہوگیا تھا کہ اب وہ اس کے عتاب سے بچ نہیں سکے گا لیکن اہلیہ معین الملک نے بڑے ظرف کا ثبوت دیا۔ اسی کی سفارش تھی جس نے ابدالی کے غصے کو ٹھنڈا کیا۔

ابدالی نے وزارت کی بحالی کے لیے خطیر رقم کا مطالبہ کیا۔

"خاندان شاہی سے دو شہزادے اور درانی فوج اگر میرے ساتھ کردی جائے تو میں دو آبے سے زر خطیر وصول کرکے داخل سرکار کرسکتا ہوں۔"

عمادالملک کی اس پیش کش کو ابدالی نے قبول کرلیا۔ دو شہزادے دہلی سے طلب کیے اور اپنے ایک سردار جان باز خاں کے حوالے کرکے عمادالملک کے ہمراہ کیا۔

اس مرتبہ پھر عمادالملک نے سودا کو اپنے ساتھ چلنے پر آمادہ کرنا چاہا۔ اس کا اصرار اتنا بڑھا کہ سودا کو اس کے ہمراہ جانا پڑا۔

عمادالملک نے دریائے جمنا کو عبور کیا اور احمد خان بنگش کے مسکن فرخ آباد کا عزم کیا۔

احمد خاں نے نہایت شاندار استقبال کیا۔ خیمے، خرگاہ، ہاتھی، گھوڑے شہزادوں اور عمادالملک کو پیش کش میں دیے۔

عمادالملک نے وہاں سے نکل کر گنگا کو عبور کیا اور صوبہ اودھ کا رخ کیا۔ شجاع الدولہ، ناظم اودھ آمادۂ جنگ لکھنؤ سے نکلا اور اودھ کی سرحد سانڈی پالی کے میدان میں پہنچ گیا۔

سودا بھی عمادالملک کی مصاحبت میں اس کے ساتھ تھا۔ اسے اس پُرہول ماحول میں دن گزارتے کئی ہفتے گزر گئے تھے۔

دن بھر جنگ کا میدان گولوں کی گرج سے گونجتا رہتا، رات پڑتی تو اگلے دن کی حکمتِ عملی پر غور ہوتا۔ آخر سعد اللہ خان روہیلے کی وساطت سے پانچ لاکھ روپے کے عوض صلح ہوگئی۔

عماد الملک نے شہزادوں سمیت ۱۱۷۰ھ میں میدان سے کوچ کیا اور ایک مرتبہ پھر فرخ آباد پہنچ گیا۔

احمد خاں بنگش کی میزبانی میں دن گزر رہے تھے۔ سودا کو اس لشکر کے ساتھ ٹھوکریں کھاتے ہوئے تین سال کے قریب ہوگئے تھے۔

اس میزبانی میں احمد خاں کا دیوان مہربان خاں پیش پیش تھا۔ سودا کا تو وہ اس طرح خیال رکھ رہا تھا جیسے شاگرد، استاد کی خدمت کرتا ہے۔

مہرباں خاں خود بھی شاعر تھا۔ رند تخلص کرتا تھا اور میر سوز سے اصلاح لیتا تھا۔ موسیقی میں مہارت رکھتا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ فیاضی میں دور دور تک اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ کئی ریختہ گو شعرا اس کی سرکار سے وابستہ تھے۔ دن رات ان اہلِ سخن کے ساتھ سرگرمِ سخن رہتا تھا۔

سودا کی شہرت اس تک پہنچ چکی تھی۔ اب جو عماد الملک کے ساتھ سودا اس کے پاس پہنچ گیا تو اس کی نیت ڈانواں ڈول ہوگئی۔

اس نے سودا کو اپنی رفاقت میں رکھنے کے لیے کمال اشتیاق ظاہر کیا۔ عماد الملک کسی قیمت پر اسے خود سے جدا کرنا نہیں چاہتے تھے لیکن اس نے اتنا اصرار کیا کہ وہ نیم رضامند ہوگئے۔

"اگر سودا تیار ہوجائیں تو مجھے اعتراض نہ ہوگا"
عماد الملک نے یہ کہہ کر سودا کو امتحان میں ڈال دیا۔

سودا تو کب سے سوچ رہا تھا کہ کوئی ٹھکانا مل جائے تو وہ دلی چھوڑ دے۔ یہ موقع اسے اب مل رہا تھا لیکن اس کی وضع داری یہ گوارا نہیں کررہی تھی کہ عماد الملک کا ساتھ چھوڑ دے۔

یہ مروت بھی اسے اس وقت بالائے طاق رکھنی پڑ گئی جب عماد الملک کی غیر حاضری میں اس کا اقتدار خطرے میں پڑ گیا۔

احمد شاہ ابدالی اکبر آباد سے گزر کر اپنی ولایت کو واپس جارہا تھا۔ عالمگیر ثانی نے نجیب الدولہ کے ساتھ اس سے ملاقات کی اور عماد الملک کی شکایتوں کا دفتر کھول دیا۔ ابدالی نے نجیب الدولہ کو امیر الامرائی کا منصب دیا اور لاہور کی طرف روانہ ہوگیا۔

عماد الملک نے یہ خبر فرخ آباد میں سنی تو اس کے ہوش اڑ گئے۔ وہ جیسا بیٹھا تھا ویسا ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ سودا نے سوچا اب وہ اس کے ساتھ جا کر کیا کرے گا۔ نہ جانے اسے اپنا اقتدار حاصل کرنے کے لیے کیا کچھ کرنا پڑے اور کیا خبر پھر بھی اقتدار ملے یا نہ ملے۔ اس نے اسی میں عافیت جانی کہ مہرباں خاں رند کی سرپرستی قبول کرکے فرخ آباد میں رہ جائے۔

عماد الملک بھی اتنی جلدی میں تھا کہ اسے یاد بھی نہیں رہا کہ سودا اس کے ساتھ آیا بھی تھا یا نہیں۔

سوز جیسا باکمال شاعر یہیں تھا۔ مہرباں خاں رند خود شاعر تھا۔ موسیقی میں مہارت رکھتا تھا۔ سودا خود بھی موسیقی میں استادانہ مہارت رکھتا تھا۔ اس نے سوچا دہلی کی ابتری سے پردیس اچھا۔

نکلِ وطن سے ہے غربت میں زورِ کیفیت
کہ آبِ بحث ہے جب تک ہے تاک میں صہبا

سودا نے جونہی قیام کی ہامی بھری، مہرباں خاں نے نہایت شاندار حویلی میں اسے ٹھہرایا۔ ایک ہاتھی، پالکی، ملازم سب اس کے دروازے پر مہیا کردیے۔ فراغت وعیش اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوگئے۔ وہ باطمینان محوِ سخن ہوگیا۔

ہنر کو مفلسی ہرگز ضرر نہیں کہ نہیں
چنار کوتہی دستی سے نقص جوہر کا
بلند ہمت اگر ہوں نہ زیرِ چرخ ضعیف
ہلالِ عید ہو عالم کا کیونکر روزہ کشا
جو ناتواں نہ کریں دست گیری دشمن
تو خار و خس نہ کرے شعلے کو کبھی برپا
فتادگی میں یہ عزت ہے دیکھ اے سرکش
کہ نیک و بد نے کیا نقشِ پا کو راہ نما

عجیب پُر فضا دربار تھا، امن و سکون قدموں کے آگے آگے چلتا تھا۔ دن رات محافلِ نشاط میں وقت کٹتا تھا۔ ریختہ کی محفلیں تو روز آراستہ ہوتی تھیں۔ میر سوز اور سودا ان محفلوں کی جان بنے ہوئے تھے۔

میر سوز جب تک دلی میں تھے، سودا سے ان کی چشمکیں چلتی رہتی تھیں۔ پردیس میں ملاقات ہوئی تو سارے گلے بھول گئے۔ سودا البتہ اپنی فطرت سے مجبور تھا۔ شوخی کا کوئی نہ کوئی موقع ڈھونڈ ہی لیتا تھا۔

ایک روز میر سوز نے اپنا مطلع پڑھا۔

نہیں نکسے ہے مرے دل کی اپاہے گاہے
اے فلک بہر خدا رخصت آہے گاہے

مرزا سودا کو اتنے زور کی ہنسی آئی کہ اچھو لگ گیا۔ میر سوز حیران تھے کہ یہ ہنسی کا کون سا مقام ہے۔

"میر صاحب، بچپن میں ہمارے ہاں پشور کی ڈومنیاں آیا کرتی تھیں۔ آہے گا ہے یا تو جب سنا تھا یا آج سنا۔"

یہ عجیب انداز کی داد تھی۔ بے چارے میر سوز کیا کرتے، ہنس کر چپ ہوگئے۔

سودا کو بھی دل شکنی منظور نہیں تھی، محض ٹھٹول تھا جو انہوں نے کرلیا۔ پھر خود بھی اس زمین میں مطلع کہا اور سوز کو سنایا۔

نہیں جوں گل موس ابر سیاہے گا ہے
کاہ ہوں خشک میں اے برق نگاہے گا ہے

"ڈمنیوں کی زبان یاد آپ نے بھی خوب رکھی" سوز نے فقرہ چست کیا۔

"بھئی، جس کے ساتھ رہنا ہوتا ہے اسی کی زبان میں بات کی جاتی ہے" سودا نے جواب دیا۔

"مرزا، باتوں میں تم سے کوئی نہیں جیت سکتا" سوز نے کہا اور دونوں ایک ساتھ ہنس پڑے۔

ان دلچسپیوں کے باوجود ممکن ہے اس کا دل یہاں کی رنگینیوں سے بھر جاتا اور وہ دہلی واپس چلا جاتا لیکن عمادالملک کے ہاں سے جانے کے بعد جو خبریں آرہی تھیں وہ نہایت ہولناک تھیں۔

عمادالملک نے فرخ آباد سے روانہ ہوتے ہی مرہٹوں کو اپنے ساتھ ملایا اور دہلی کا محاصرہ کرلیا۔ بادشاہ اور نجیب الدولہ دونوں محصور ہوگئے۔ پھر دونوں طرف سے توپوں کے دہانے کھل گئے۔ جنگ کیا تھی، ایک قیامت تھی کہ اہل دہلی پر ٹوٹ پڑی تھی۔ آخر کار مرہٹوں نے نجیب الدولہ سے زبردست رشوت لی اور جنگ کا سودا صلح میں تبدیل ہوگیا۔ نجیب الدولہ اپنے علاقے میں واپس چلا گیا۔ عمادالملک نے اپنا منصب بزورِ قوت چھین لیا۔

سودا دہلی میں نہیں تھا لیکن اس مصیبت کے ٹلنے پر اس نے سکھ کا سانس لیا۔

اس کی یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی۔ وہ مہربان خاں کے پاس بیٹھا تھا کہ ایک وحشت ناک خبر فرخ آباد پہنچی۔ بادشاہ دہلی عالمگیر ثانی شہید ہوگئے۔ کسی جنگ میں نہیں بلکہ کسی نے سازش کرکے انہیں قتل کردیا۔ یہ خبر بھی گردش کرتے ہوئے پہنچ ہی گئی کہ اس قتل میں عمادالملک کا ہاتھ ہے اور اب وہ نجیب الدولہ کے خلاف مرہٹوں کا ساتھ دینے دہلی سے نکل چکا ہے۔

اسے اب اپنے فیصلے کی صداقت کا یقین ہونے لگا۔ وہ اگر دہلی میں ہوتا تو عمادالملک کی مصاحبت کی وجہ سے یا تو کسی کے عتاب کا نشان بن چکا ہوتا یا پھر عمادالملک کے ساتھ لشکر میں پڑا ہوتا۔ اسے یہ بھی اندازہ ہونے لگا کہ یہ خبر احمد شاہ ابدالی کو بھی پہنچ چکی ہے۔ وہ یقیناً دہلی کی طرف کوچ کرے گا۔

اس کا اندیشہ درست ثابت ہوا۔ ابدالی کی فوج کے غلبے کے آثار رونما ہونے لگے۔ عمادالملک خوف زدہ ہوکر دہلی سے فرار ہوگیا۔

احمد شاہ ابدالی نے جب عمادالملک کو مفرور پایا تو نجیب الدولہ کو طلب کیا۔ عالمگیر ثانی کا بیٹا، باپ کے قتل کے بعد دہلی سے فرار ہوگیا تھا اس لیے ابدالی نے روہیلہ سردار نجیب الدولہ کو نیابت کے فرائض سونپے اور واپس چلا گیا۔

اب اگر وہ دہلی واپس جانا بھی چاہے تو کیسے جائے۔ نہ جانے اس کے سرپرستوں پر کیا گزر رہی ہو۔ امرا تو خود نان شبینہ کے طلب گار ہوں گے، اسے کیا دیں گے۔ اسے آج دہلی کی یاد بہت آئی۔ اس کے ساتھ ہی وہ دوست یاد آئے جن کے ساتھ وہ مشاعرے پڑھتا تھا، جن کی ہجویں لکھتا تھا، دوستی اور دشمنی کے مزے لوٹتا تھا۔ اپنے استاد شاہ حاتم یاد آئے، شاہ تسلیم کے تکیے اور اس کے چمن زاروں کی یاد آئی۔ ان دوستوں کی بے وفائیوں کا خیال آیا جنہوں نے اس کی خبر تک نہیں لی۔ خط تک نہیں لکھا۔ اس رات دیر تک وہ دل کے زخموں کو قافیوں کے ٹانکوں سے سیتا رہا۔

وہی ہیں دن وہی راتیں وہی فجر وہی شام
وہی ہے روشنی مہر و مہ جو کچھ تھی مدام
نہ جانوں درد محبت کا کیا ہوا یارب
کہ دوستوں سے جدا کرکے گردش ایام
ہمیں لے آئی ہے شہر غریب جس دن سے
کبھو انہوں کی طرف سے ملا نہ نامہ و پیغام
علی الخصوص تغافل کو میر صاحب کے
کہوں میں کس سے کہ باوصف اتحاد تمام
لکھا نہ پرچہ کاغذ بھی اتنی مدت میں
کہ بے قراروں کو تا ہووے موجب آرام
کبھی انہوں کو ہماری بھی الفتِ سابق
کسی کے ہاتھ جو بھیجے ہے نامہ و پیغام
جو وہ پھرے ہے ادھر سے تو یہ بھی کہتا نہیں
کہ میں کہی تھی تری بندگی انہوں کو سلام

دہلی کے حالات اب ایسے نہیں رہے تھے کہ وہ ادھر کا رخ کرتا۔ اس کی قربت ایسے امرا سے رہی تھی جو بادشاہ دہلی کے خلاف تھے۔ بادشاہ کے قتل ہوجانے کے بعد اسے بھی کسی افتاد

کا سامنا ہو سکتا تھا۔ پھر جس فارغ البالی میں اس کی یہاں بسر ہو رہی تھی، اس نے بھی پاؤں پکڑے ہوئے تھے۔

مہرباں خاں رند کی فیاضیاں تو تھیں ہی، احمد خاں بنگش بھی اسے عزیز رکھنے لگا تھا۔ وہ ان ہر دو حضرات کی مدحیہ نظمیں اور قصائد لکھ لکھ کر وقت گزار رہا تھا۔ مہرباں خاں رند کے دیوان کی تعریف میں لکھا۔

یہ سفینہ ہے رشک ابرِ بہار
ہر ورق اس میں قطعۂ گلزار
اس کے ہوتے نہ کر چمن پہ نظر
شعر اس میں ہیں گل سے رنگیں تر
اس کے پٹھوں پہ جلد کی یہ بہار
در باغِ بہشت کے ہیں کواڑ
صرف شیرازہ جو ہوا تیار
ہے رگ جانِ عاشقانِ زار

لعل سفتہ ہے لب و دہن تیرا
درِ شہوار ہے سخن تیرا
تجھ دہن میں زبانِ سحر طراز
ناطقے کی ہے تکیہ گاہِ ناز

ان قصائد اور نظموں کے ذریعے ملنے والی مراعات سے وہ رئیسانہ زندگی بسر کر رہا تھا۔ اطمینان اور فراغت نے اسے موقع دیا تھا کہ وہ اپنے شاعرانہ سرمائے میں اضافہ کرتا رہے۔ اس کی غزلیں اور اشعار فرخ آباد سے باہر بھی جا رہے تھے۔ پورے ہندوستان میں اس کے شعروں کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ کئی دربار اسے اپنے ہاں بلانے کے متمنی تھے چنانچہ محمد یار خان والیِ روہیل کھنڈ نے ایک کثیر رقم بطور زادِ راہ اور نذرانہ بھیج کر اپنی ریاست میں آنے کی دعوت دی لیکن وہ فرخ آباد میں اس قدر خوش تھا کہ اس نے اس دعوت کو رد کر دیا۔

محمد یار خان صاحب ذوق حاکم تھا۔ موسیقی کا بڑا ماہر اور شعر کا زبردست پرستار تھا۔ اس کی سرکار میں کئی شاعر جمع تھے جو گردشِ شب و روز سے بے خبر اس کی ضیافتوں سے بہرہ ور تھے۔

محمد یار خان کے درباری شاعروں کے حلقے میں سودا کی معذرت کا بڑا چرچا ہوا۔ شعرا نے اسے نواب کی نہیں اپنی بے عزتی تصور کیا۔ انہوں نے اسے سودا کی بد دماغی پر محمول کیا۔ انہوں نے یہ خیال کیا کہ سودا کا غرور اسے ہمارے نزدیک بیٹھنے سے روک رہا ہے چنانچہ اس دربار کا ایک شاعر فدوی لاہوری اس سے مقابلہ کرنے کی غرض سے فرخ آباد آگیا۔

فدوی اصل میں ہندو تھا، بعد میں مسلمان ہو گیا تھا۔ مرزا نے اسی رعایت سے اس کے خلاف ایک نظم لکھی جس کا آغاز اس شعر سے کیا۔

جہاں میں کون بناتا ہے الو بنئے کا
کسی سے بن کوئی آتا ہے الو بنئے کا

اس کا تلملانا جائز تھا لیکن تیر تو کمان سے نکل چکا تھا۔ سودا نے پوری نظم کہہ ڈالی تھی۔

"ہندوستان میں رہتے ہو اور فارسی بگھارتے ہو۔ ہندی میں بھی کچھ کہو تو قادر الکلامی ثابت ہو۔"

مرزا نے جھٹ دو شعر فی البدیہہ کہہ دیے۔

نکل کے چوکھٹ سے گھر کی پیاری جو پٹ کے اوجھل ٹھٹک رہا ہے
سمٹ کے گھٹ سے ترے درس کو نین میں جیرا اٹک رہا ہے

اسی طرح کے کئی اور امتحان لیے۔ خوب خوب چوٹیں چلتی رہیں۔ غزلوں کے تبادلے ہوئے۔ اعتراضات ہوئے جواب دیے گئے۔

جب ہر طرح سے ہزیمت ہوئی تو وہ گالیوں پر اتر آیا۔

کچھ کٹ گئی ہے پٹی کچھ کٹ گیا ہے دوڑا
دم داب سامنے سے وہ اڑ چلا لٹورا

بھڑوا ہے مسخرا ہے سودا اسے ہوا ہے

اس نے سانپ کے بل میں خود ہاتھ ڈال دیا۔ ہجو نگاری تو سودا کا میدان تھا۔ اس نے فدوی کی شان میں ایسے ایسے نازیبا

غزل

اب تلک اشک کا طوفاں نہ ہوا تھا سو ہوا
تجھ سے اے دیدۂ گریاں نہ ہوا تھا سو ہوا
جس نے دیکھا ترا مکھڑا کہا سبحان اللہ
قدرتِ حق سے نمایاں نہ ہوا تھا سو ہوا
قابلِ شانہ ہوئی زلف تری جس دن سے
کبھی جو دل کہ پریشاں نہ ہوا تھا سو ہوا
خط کی خوبی ترے عارض پہ یہ کہتی ہے کہ مور
رونقِ ملکِ سلیماں نہ ہوا تھا سو ہوا
خونِ دل چشم سے بہتا تھا مرے دامن تک
موجزن تا بہ گریباں نہ ہوا تھا سو ہوا
ابرِ مژگاں کے تصدق سے ترے اے سودا
سبز و خرم یہ بیاباں نہ ہوا تھا سو ہوا

شعر گھڑے کہ بچے بچے کی زبان پر فدوی کا نام آگیا۔ کہتا وہ بھی رہا لیکن سودا کے دھوم دھڑکے نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔

بالآخر سودا نے آخری داؤ مارا۔

اے بیابان نحیست کے غول
بستیوں کو نہ کر تو ڈانوا ڈول
فرخ آباد کے محلوں میں
حد سے باہر تو کرچکا ہے کلول
جلد یاں سے نکل وگرنہ ترا
بھرم اس طرح سے میں دوں گا کھول

فدوی کو بھاگنا پڑا۔ اس کا کلام کسی کے حافظے میں بھی نہیں رہا جبکہ سودا نے اس کے خلاف جو کچھ کہا' اس کی گونج محمد یار خان کے دربار تک پہنچی۔

وہ اس قضیے سے نمٹا تھا کہ والیِ اودھ شجاع الدولہ کی طرف سے دعوت نامہ موصول ہوا۔ انہوں نے کمالِ اشتیاق سے برادرِ من مشفق من لکھ کر سفر خرچ بھیجا۔

فیض آباد میں سخاوت کی گنگا بہہ رہی تھی اور شجاع الدولہ وہاں مسند نشیں تھا۔ دلی اجڑ چکی تھی' فیض آباد' آباد تھا۔ جو دلی سے نکلتا تھا' یہاں پہنچتا تھا۔ شجاع الدولہ کی ادب پروری ضرورت مندوں کے دامن بھر رہی تھی' ایک دریا تھا جو رواں تھا۔ جو یہاں تھا وہ کہاں تھا۔ مانگنے والا اتنا کچھ پاتا تھا کہ دوسری طرف خیال نہ جاتا تھا۔ قدردانی کو دل جھکتے تھے۔ نقطے کتابوں کے مول بکتے تھے۔ حرص نے کہا' چل وہیں چل۔ قناعت نے کہا جب سب کچھ یہاں میسر ہے تو دربدری کیوں ہو۔

ایک مرتبہ پھر فرخ آباد نے اس کے قدم پکڑ لیے۔ وہ یہاں اتنا خوش تھا کہ فیض آباد کی کشش بھی اسے کھینچ نہ سکی۔

اس نے یہ کہہ کر معذرت کرلی۔

سودا پئے دنیا تو بہر سو کب تک
آوارہ ازیں کوچہ بآں کو کب تک
حاصل یہی اس سے کہ نہ دنیا ہووے
بالفرض ہوا یوں بھی تو پھر تو کب تک

فرخ آباد جانے سے پہلے وہ تلاشِ معاش کے لیے کہیں نہیں گیا تھا۔ یہاں سے دوسری جگہ جانا اس کے لیے آوارگی تھی۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ مہرباں خاں اس سے شاگرد اور استاد جیسا رشتہ نباہ رہا تھا۔

دن پھولوں میں تل رہے تھے لیکن ہر باغ میں خزاں تو آتی ہے۔ نواب احمد خاں بنگش ایک مختصر سی علالت کے بعد بصارت سے محروم ہوگئے۔ گھر کا چراغ اچانک بجھ جائے تو کچھ سجھائی نہیں دیتا کہ کون سی چیز کہاں رکھی ہے۔ وہ بصارت سے محروم ہوا اور حکومت کے کاروبار کو پوری طرح دیکھنے بھالنے کا موقع نہ مل سکا تو ابتری پھیلنے لگی۔ سودا کا سرپرست مہربان خاں دیوان بھی سرکاری فرائض کی بہ نسبت نواب کے علاج کی تدبیروں میں مصروف رہنے لگا۔

ان حالات نے فرخ آباد کے پناہ گزیں شعرا کو نئی گردش کا پیغام سنایا۔

سودا نے بھی اپنے کاغذات سمیٹے جیسے بارش سے پہلے لوگ اپنے سامان کی حفاظت کیا کرتے ہیں۔ اسی مصیبت میں اسے شجاع الدولہ کی یاد آئی۔ کس محبت سے انہوں نے برادرِ من کہا تھا۔ وہ ضرور میری راہ میں آنکھیں بچھائیں گے۔

وہ جانے سے پہلے مہربان خاں کے احسانات کا بدلہ اتار دینا چاہتا تھا۔ اس نے قلم دان سنبھالا اور اس کی تعریف میں مثنوی لکھنے بیٹھ گیا۔ اس کی تعریف کی اور دعا دی کہ تو نواب کے سائے میں پھلے پھولے اور اس کے استاد میر سوز کی سفارش کی کہ وہ ایک طائرِ خوش نوا ہے جو اتفاق سے تیری محبت کے جال میں گرفتار ہوگیا ہے۔ اگر وہ یہاں سے چھوٹا تو پھر کبھی ہاتھ نہ آئے گا۔

شعر کے بحر میں ترا استاد
کشتیِ ذہن کو ہے بادِ مراد
اس کو ہر طرح تو غنیمت جان
پھر ملے گا نہ سوز سا انسان
کیسے ہی رام ہوں کسی کے ساتھ
پنچھی بھڑکے ہوئے نہ آویں ہاتھ

کرچکا میں دعا پہ ختم کلام
پہنچے رخصت کا میری تجھ کو سلام
حشر تک زیرِ سایۂ نواب
رہیو جوں آفتابِ عالم تاب

سودا لاولد تھا لیکن ایک لڑکا لے کر پال لیا تھا جس کا نام مرزا غلام حیدر تھا۔ یہ بھی شاعری کرتا تھا اور مجذوب تخلص تھا۔

سودا نے اپنے عیال کے ساتھ فرخ آباد کو خیرباد کہا اور فیض آباد کی راہ لی جو شجاع الدولہ کی راجدھانی تھی۔

اس کا رتھ ایک بارونق سے گزر رہا تھا۔ خرید و فروخت کی گرم بازاری تھی۔ انواع و اقسام کے پکوان' مٹھائیاں' کباب'

خراجِ عقیدت

”ان کی طبیعت ایک ڈھنگ کی پابند نہیں تھی۔ نئے نئے خیال اور چٹختے قافیے جس پہلو سے جمتے دیکھتے تھے، جمادیتے تھے اور وہی ان کا پہلو ہوتا تھا کہ خواہ مخواہ سننے والوں کو بھلے معلوم ہوتے تھے یا زبان کی خوبی تھی کہ جو اس سے نکلتی تھی اس کا انداز نیا اور اچھا معلوم ہوتا تھا۔ ان کے ہم عصر استاد خود اقرار کرتے تھے کہ جو باتیں ہم کاوش اور تلاش سے پیدا کرتے ہیں، وہ اس شخص کے پیش پا افتادہ ہیں۔

جن اشخاص نے زبان اردو کو پاک صاف کیا ہے۔ مرزا کا ان میں پہلا نمبر ہے۔ انہوں نے فارسی محاوروں کو بھاشا میں کھپا کر ایسا ایک کیا ہے جیسے علمِ کیمیا کا ماہر ایک مادے کو دوسرے مادے میں جذب کردیتا ہے اور تیسرا مادہ پیدا کردیتا ہے۔ انہوں نے ہندی زبان کو فارسی محاوروں اور استعاروں سے نہایت زور بخشا۔“

(محمد حسین آزاد)

”تخیل کی قوت سودا میں زبردست تھی۔ اس نے اس کی پرواز کو حدِ کمال تک پہنچادیا۔ اپنے خیالات و مضامین میں ایسے نازک و لطیف پہلو پیدا کئے ہیں کہ قوت متخیلہ کے زور و کمال پر حیرت ہوتی ہے۔ ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک معمولی شخص اور شاعر کے زاویۂ نگاہ اور نقطۂ خیال میں کیا فرق ہے۔

تخیل کے ساتھ ایجاد کی قوت بھی اس میں موجود تھی۔ اس نے نہ صرف خیالات و مضامین میں جدت طرازیاں کی ہیں بلکہ زبان و بیان میں بھی ایسی جدت آمیز تراش خراش کی ہے اور زبان کی تشکیل و ترکیب اس ڈھنگ سے کی ہے کہ ہمیں اس کی زبان سازی کی عظیم الشان قوت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔“

جب تک اردو زبان زندہ ہے سودا کا نام زندہ رہے گا اور اس کا کلام ہمیشہ زندہ رہ کر ہماری رہنمائی کرتا رہے گا۔

(شیخ چاند)

”سودا کے کلام میں غزلیں، مثنویاں، مرثیے سب کچھ موجود ہیں اور ان اصناف میں بھی انہوں نے بعض بہت اچھے شعر کہے ہیں مگر ان کا اصلی کمال ان کے قصیدوں میں ہی ظاہر ہوتا ہے۔ تخیل کی بلند پروازی، مضمون آفرینی، شکوہِ بیان اور قدرتِ زبان جیسی ان کے قصیدوں میں ملتی ہے، وہ مشکل سے کسی اور قصیدہ گو کے ہاں نظر آتی ہے۔

سودا بلاشبہ اردو کے سب سے بڑے قصیدہ گو ہیں۔“

(ڈاکٹر ابواللیث صدیقی)

بھنا ہوا گوشت وغیرہ نظر آتی تھیں۔ مسافر خریدنے میں سبقت کرنے کی وجہ سے ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے۔ اس نے چوک بازار کا نام سنا ہوا تھا جو قلعے کے جنوبی دروازے سے سڑک الہ آباد کے آخری کونے تک چلا گیا تھا۔ اس کے جی میں یہی آئی کہ وہ چوک بازار سے گزر رہا ہے۔

”بھائی کیا یہ چوک بازار ہے؟“

”کا کہت رہو بھین۔ چوک بازار ابھی کہاں۔ ابھی تو شہر بھی چار کوس ہے۔“

وہ حیران رہ گیا۔ شہر ابھی شروع نہیں ہوا اور شہر کی رونق شروع بھی ہوگئی۔ اس نے یہاں کی خوش حالی کے بارے میں سنا ضرور تھا لیکن ایسا نہیں سنا تھا۔

وہ اپنے خیالوں میں مگن بیٹھا تھا کہ رتھ بان نے ایک سرائے کے سامنے رتھ روک دیا۔

”لیھو صاحب۔ اوہ رہا چوک اور ایہہ رہی سرائے۔“

اس خیال سے کہ اب وہ شجاع الدولہ سے بہت قریب ہے، تھکن یوں اتر گئی جیسے منڈیر سے دھوپ اترتی ہے۔

اس نے بیوی اور بیٹے کو سرائے میں چھوڑا اور خود شجاع الدولہ کے محل کی طرف اس سے ملنے چل دیا۔ اس نے اپنے آنے کی اطلاع پہلے ہی دے دی تھی اور اسے پروانۂ اجازت مل چکا تھا۔

محل میں داخل ہوتے وقت اسے یہ احساس نہیں تھا کہ وہ کس خطۂ بے نظیر کی سیر کے لیے جا رہا ہے۔ محل کی زینت و زیبائی، نظر کو خیرہ کردینے والے جھاڑ فانوس، کنول مردنگ کو دیکھ کر وہ حیرت کے سوا کیا کرسکتا تھا۔

وہ مربع قطعات پر مشتمل چمنستان سے گزرتا ہوا ان محرابوں تک آگیا جس کی چھت اور دیواریں گل کاری کے نقش سے مزین تھیں۔ دربار تک جانے والے زینے سے اترنے کے بعد وہ اس کمرے میں پہنچ گیا جہاں نواب دربار کیا کرتا تھا۔ یہ دربار کا موقع نہیں تھا۔ وہ تو ملاقات کے لیے آیا تھا اور نواب کی اجازت سے آیا تھا ورنہ یوں آسانی سے ملنا دشوار تھا۔

مستعد چوب داروں میں سے ایک نے اسے دربار سے متصل ایک کمرے میں پہنچا دیا۔ یہ کمرا بھی خوابِ جنت سے کم نہیں تھا۔

دراز قد، نہایت شکیل آدمی اس کے استقبال کے لیے موجود تھا۔ کم از کم اس نے اپنی زندگی میں ایسا حسین آدمی نہیں دیکھا تھا۔

ایک سبز ریشم کا چغہ جس پر سنہرا روپہلا کام ہو رہا تھا، اس کے شانوں سے ٹخنوں تک لٹک رہا تھا۔ سرخ ریشم کا پاجامہ اور ایسا جوتا جس پر زردوزی کا کام تھا، پہنے ہوئے تھا۔ ایک اونچی ٹوپی مثل کلاہ اوڑھی ہوئی تھی جو جواہرات میں چھپی ہوئی تھی۔ دو بیش قیمت ہیرے کی انگوٹھیاں انگلیوں میں تھیں۔

یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہی شجاع الدولہ ہے البتہ اپنا تعارف ضروری تھا۔ اس نے یہ دو شعر کہ خدا جانے کہ اسی وقت کہے یا کہہ کر لایا تھا، گوش گزار کر دیے۔

سخن کو ریختہ کے پوچھے تھا کوئی سودا
پسند خاطرِ دلہا ہوا یہ فن مجھ سے
کب اس کو گوش کرے تھا جہاں میں اہلِ کمال
یہ سنگریزہ ہوا ہے درِ عدن مجھ سے

"ہم تو تمہارے کمالِ سخن کے پہلے ہی معترف ہیں اور تمہاری وہ رباعی بھی اب تک نہیں بھولے جو تم نے ہمارے اشتیاق کے جواب میں تحریر کی تھی۔"

اسے یوں لگا جیسے نواب اسے طعنہ دے رہے ہوں کہ بہت بنتا تھا قناعت پسند۔ آخر کو کھائی نا مات۔

"حضور، غربت کا تجربہ تھا، غربتِ وطن سے واقف نہیں تھا۔ جب پاؤں جلتے ہیں اس وقت ریت کے گرم ہونے کا احساس ہوتا ہے۔"

"یہ تم نے ٹھیک کہا۔ ہر فکر کو دل سے نکال دو۔ اب تم ہمارے سائے میں ہو۔"

بادشاہوں اور نوابوں کے حضور خالی ہاتھ جانا بے ادبی ہے۔ اس نے فرخ آباد ہی میں قصیدہ لکھ لیا تھا۔ نوک پلک راستے میں سنوار لیے تھے۔ اس وقت وہی قصیدہ نذرِ سماعت کیا۔

روزِ میداں قدم اپنا تو جہاں گاڑے ہے
کوہ کا سینہ پھٹے دیکھ ترا استقلال
شرق سے غرب تلک رعب ترے نیزے کا
دھاک ہے تیغ جنوبی کی تری تابہ شمال
اس کی خوں ریزی سے یوں فوج عدو گھونگھٹ کھائے
جوں مہِ نو سے محرم کے پلٹتا ہے سال

نواب نے اس کے رہنے کا بندوبست کر دیا تھا، کچھ وظیفہ بھی مقرر ہو گیا تھا لیکن اسے نوکری نہیں کہہ سکتے تھے۔

اس کے دل میں یہ بات بھی بیٹھ گئی تھی کہ نواب نے اسے اس کی رباعی کا طعنہ دیا۔ وہ کبھی کبھی دربار چلا جاتا تھا۔ خاص مواقع پر تہنیتی اشعار بھی پڑھ آتا تھا۔ ان اشعار کا صلہ بھی مل جاتا تھا لیکن نواب کی طرف سے اس کے دل میں بال آگیا تھا۔

وہ تنگ آکر دلی چلا جاتا لیکن وہاں بھی حالات اس کے حق میں کب تھے۔ شاہ عالم تخت پر تھا لیکن مرہٹوں کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا۔

عید کا دن تھا۔ دربار نہ جاتا تو کیا کرتا اور جاتا تو کیا لے کر جاتا۔ ایک تہنیتی قطعہ لکھا اور نواب کی طرف سے عیدی وصول کر کے گھر چلا آیا۔

یہ روزِ عید ہے، آفاق میں ہے رسمِ قدیم
موالی چاہیے مولا کو نذر دیں زر و سیم
بقدر رتبے کے حاضر ہوئے ہیں لے کر نذر
جو تیرے دامنِ دولت کے سائے میں مقیم
کوئی تو لعل لے آیا ہے اور کوئی یاقوت
سخن وہ نذر کیا میں کہ ہے یہ درِ یتیم

ان تہنیتی قصیدوں اور اشعار پر اس کی زندگی کٹ رہی تھی البتہ قلعے سے باہر کی زندگی اس کے لیے بڑی دلفریب تھی۔ دلی کے اتنے قابلِ ذکر اشخاص یہاں جمع ہو گئے تھے کہ دلی کا سا ماحول ہو گیا تھا۔ آئے دن طرحی مشاعرے منعقد ہوتے رہتے تھے جو اس کی مشقِ سخن کا بہانہ بنے ہوئے تھے۔

ابھی ان بہاروں میں اسے تین سال بھی نہیں ہوئے تھے کہ شجاع الدولہ کا انتقال ہو گیا۔ اس کا بیٹا آصف الدولہ مسند نشیں ہوا۔

تدبیر شہنشاہی و تقدیر الٰہی
باہم یہ تجھے دیکھ کر پڑھ کر فیتارک
تدبیر لگی کہنے کہ ہے باب وزارت
تقدیر اٹھی بول کہ بسیار مبارک

آصف الدولہ نے تخت نشینی کے بعد' ماں کی نظروں سے چھپ کر اپنے اشغال پورے کرنے کے لیے لکھنؤ کو اپنا دارالمستقر بنالیا چنانچہ فیض آباد کی ساری چہل پہل اور سرکاری دفاتر اور کارخانے جوں کے توں لکھنؤ منتقل ہوگئے۔

آصف الدولہ کی دریادلی کی شہرت سیکڑوں ماہرین فن کو ہندوستان کے گوشے گوشے سے کھینچ لائی۔ دلی جس بری طرح اجڑی' لکھنؤ اسی شان سے آباد ہوا۔

اب جو آنکھیں کھول کر سودا نے فیض آباد کی طرف دیکھا تو ایک قصبے سے زیادہ حیثیت نظر نہ آئی۔ ایک طویل اور رنگین خواب تھا جو ٹوٹ گیا تھا۔ چند معمولی روسا اور غریبوں کے سوا سب لکھنؤ جاچکے تھے۔

اس نے بھی ہجرت کی اور لکھنؤ پہنچ گیا۔ آصف الدولہ کی نئی حکومت تھی۔ رنگ رلیوں اور خوش مستیوں کا زمانہ تھا۔ نام و نمود اور شان و شکوہ کی دھن میں روپیا پانی کی طرح بہتا تھا۔

آصف الدولہ کی داد و دہش تو خیر تھی ہی' کئی اور چھوٹی چھوٹی سرکاریں تھیں جن سے شعرا کے چلے آباد تھے۔ ان میں نواب سعادت علی خاں' نواب سرفراز الدولہ اور مرزا سلیمان شکوہ کے دربار خصوصیت رکھتے تھے۔ آصف الدولہ تک ہر ایک کی رسائی ممکن نہیں تھی۔ اس صورت میں یہ چھوٹے چھوٹے دربار بڑے غنیمت تھے۔

سودا لکھنؤ آتو گیا تھا لیکن آصف الدولہ سے ملاقات کی سبیل نہیں نکل رہی تھی۔ اس نے جن سازشوں سے کام لینا چاہا تھا' وہ بھی اب تھکنے لگی تھیں۔ پیاسا کب کنوئیں تک پہنچتا ہے یہ اسے معلوم نہیں تھا۔ اسے تو بس یہ معلوم تھا کہ ان ریاستوں میں آندھی نہیں چلتی وقت چلتا ہے جس میں اکثر ملاقاتیں تنکوں کی طرح بہہ جاتی ہیں۔ اس کا نام آصف الدولہ تک پہنچا ضرور ہوگا لیکن ان کی اپنی تفریحات بہت تھیں۔

یہ لکھنؤ تھا۔ سخن وروں کے شہر میں سخن ور آئے اور کسی کو خبر نہ ہو۔ سخن ور بھی ایسا جو اس خوش حال معاشرے کے لیے نہایت مناسب تھا۔ دلی میں تو میر تقی میر کا ڈنکا بجتا تھا' اداسی کے پھول کھلتے تھے اس لیے غزل گوئی میں اس کا وہ نام نہ ہوسکا لیکن یہ تو لکھنؤ تھا۔ اس جیسی طبیعت کا آدمی یہاں بہت سرسبز ہوسکتا تھا۔ یہی ہوا بھی۔ شہر میں ہونے والے چند مشاعرے پڑھے تھے کہ اس کا پُرتکلف انداز بیان' مشکل زمینیں' غزلوں میں قصیدے کا انداز' مردہ دلی کے بجائے خوش دلی' اہل لکھنؤ کے دلوں میں اتر گئے۔ ہر طرف اس کا نام گونجنے لگا۔

غزل

جو گزری مجھ پہ مت اسے کہو' ہوا سو ہوا
بلا کشانِ محبت پہ جو' ہوا سو ہوا
مبادا ہو کوئی ظالم ترا گریباں گیر
مرے لہو کو تو دامن سے دھو' ہوا سو ہوا
کہے ہے سن کے مری سرگزشت وہ بے رحم
یہ کون ذکر ہے جانے بھی دو' ہوا سو ہوا
پہنچ چکا ہے سر زخم دل تلک یارو
کوئی سیو' کوئی مرہم کرو' ہوا سو ہوا
یہ کون حال ہے احوال دل پہ اے آنکھو
نہ پھوٹ پھوٹ کے اتنا بہو' ہوا سو ہوا
دیا اسے دل و دیں اب یہ جان ہے سودا
پھر آگے دیکھیے جو ہو سو ہو' ہوا سو ہوا

غزل

غیر کے پاس یہ اپنا ہی گماں ہے کہ نہیں
جلوہ گر یار مرا ورنہ کہاں ہے کہ نہیں
دل کے ٹکڑوں کو بغل بیچ لیے پھرتا ہوں
کچھ علاج اس کا بھی اے شیشہ گراں ہے کہ نہیں
مہر ہر ذرے میں مجھ کو ہی نظر آتا ہے
تم بھی ٹک دیکھو تو صاحب نظراں ہے کہ نہیں
جرم ہے اس کی جفا کا کہ وفا کی تقصیر
کوئی تو بولو میاں' منہ میں زباں ہے کہ نہیں
آگے شمشیر تمھاری کے بھلا یہ گردن
مُو سے باریک تر' اے خوش کمراں ہے کہ نہیں
ق
پوچھا سودا سے میں اک روز کہ اے آوارہ
تیرے رہنے کا معین بھی مکاں ہے کہ نہیں
یک بہ یک ہوکے یہ آشفتہ لگا وہ کہنے
کچھ تجھ عقل سے بہرہ بھی میاں ہے کہ نہیں
دیکھا میں قصر فریدوں کے اوپر اک شخص
حلقہ زن ہوکے پکارا کوئی یاں ہے کہ نہیں

مرزا سلیمان شکوہ جو شاہ عالم کے بیٹے تھے، دلی سے جان بچا کر بھاگے اور لکھنؤ میں نوابی ٹھاٹ سے رہنے لگے۔

لکھنؤ میں اس وقت دلی کے جتنے شعرا موجود تھے، وہ سب ان کے دامن دولت سے وابستہ تھے۔ انہوں نے سودا کی شہرت سنی تو اسے بھی طلب کرلیا۔ نہایت اخلاق سے ملے اور پھر یہ رشتۂ مصاحبت مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا گیا۔

یہاں بیٹھنے والوں کے درمیان بیٹھ کر وہ خود کو تھوڑی دیر کے لیے دہلی میں محسوس کرتا تھا اس لیے تقریباً روز ہی وہاں جانے لگا۔ ملاقاتوں کی کثرت نے رفتہ رفتہ بے تکلفی کی فضا پیدا کردی۔ یہاں نوعمر شعرا بھی تھے اور میر ضاحک جیسے ثقہ بزرگ بھی۔ سودا کی بے تکلفی سب ہی کے ساتھ تھی۔

میر ضاحک اور سودا کے درمیان، جب تک دلی میں تھے ہمیشہ اَن بن رہی۔ دونوں نے ایک دوسرے کے خلاف ایسی ہزلیات لکھیں کہ لوگوں نے کانوں میں انگلیاں دے لیں لیکن اب دونوں پردیس میں ملے تو یوں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ لیکن سودا کی طبیعت میں جو ایک رگِ شرارت کی تھی، وہ کسی وقت بری طرح پھڑکنے لگتی تھی۔ اس روز بھی یہی ہوا۔

مرزا سلیمان شکوہ کے ہاں حسبِ معمول پائیں باغ میں تخت بچھے تھے۔ شرفا شعرا کا مجمع تھا۔ مرزا رفیع سودا اور میاں سکندر مرثیہ گو بھی موجود تھے کہ میر ضاحک تشریف لائے۔ ان کی پرانی وضع اور لباس پر صاحب عالم مسکرائے۔ میر ضاحک آکر بیٹھے۔ مزاج پرسی ہوئی۔ حقہ سامنے آیا۔

اتفاقاً صاحبِ عالم نے سودا سے کہا "کچھ ارشاد فرمائیے۔"

"میں نے تو ان دنوں میں کچھ کہا نہیں، میاں سکندر نے ایک مخمس کہا ہے۔ ایک بند تو میں سنائے دیتا ہوں باقی میاں سکندر سنادیں گے۔"

"ارشاد!"

سودا نے پڑھنا شروع کیا۔

یارب یہ دعا مانگتا ہے تجھ سے سکندر
ضاحک کے اڑادیوے کسی بن میں قلندر
گھر اس کے تولد ہو اگر بچۂ بندر
گلیوں میں نچاتا پھرے وہ بنگلے کے اندر
روٹی تو کما کھائے کسی طور مچھندر

یہ پڑھنا تھا کہ میر ضاحک اٹھ کر میاں سکندر سے دست و گریباں ہوگئے۔ سکندر بے چارے حیران نہ واسطہ نہ سبب، یہ کیا آفت آگئی۔ سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ دونوں صاحبوں کو الگ کیا۔ سودا کی مسکراہٹ نے سب کو بتادیا کہ شرارت کس کی تھی۔ میر ضاحک نے انہیں بھی سیکڑوں سنادیں مگر ان پر اثر ہونے والا کہاں تھا۔

اس کی خوش مذاقی وخوش کلامی کی شہرت روز بروز بڑھتی جارہی تھی۔ اس کی قسمت نے ایک کروٹ اس وقت بدلی جب سرفراز الدولہ حسن رضا خاں نائب السلطنت اس پر مہربان ہوا۔ وہ خوش فکر شاعر تھا اور سودا سے رشتۂ شاگردی استوار کرنے کا خواہاں۔ وہ سودا کے سائے میں مشقِ سخن کرتا رہا اور اس کے عوض سودا کی زندگی آرام سے کٹتی رہی۔

ترا قیام حکومت رہے قیامت تک
مطیع خلق کو تیرا سدا رکھے اخلاق
کروڑ عید کی شادی نصیب ہو تجھ کو
ہمیشہ نذر تری دیویں ساکن آفاق
بسر کرے جو ترا دوست ہو بہ عشرت وعیش
عدو ترا ہو زمانے کا مورد شلاق

اس کی آخری منزل آصف الدولہ کا دربار تھا لیکن وہاں تک رسائی مشکل نظر آرہی تھی۔ وہ کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھا۔ یہ موقع ملا مگر بہ ہزار ذلت وخواری۔

اشرف علی خان نام ایک شریف خاندان شخص تھے۔ انہوں نے فارسی کے تذکروں اور استادوں کے دیوانوں میں سے پندرہ برس کی محنت میں ایک انتخاب مرتب کیا اور تصحیح کے لیے مرزا فاخر کے پاس لے گئے۔ وہ لکھنؤ کے فارسی شاعروں میں نامور ترین تھے لیکن مصیبت یہ تھی کہ اپنے سوا کسی کو نہیں گردانتے تھے۔ انہوں نے کچھ انکار کچھ اقرار اور بہت سی تکرار کے بعد انتخابِ مذکورہ کو رکھا اور دیکھنا شروع کیا مگر جابجا استادوں کے اشعار کو کہیں بے معنی سمجھ کر کاٹ ڈالا کہیں تیغِ اصلاح سے زخمی کرڈالا۔ فیضی، امیر خسرو اور مرزا بیدل تک کو نہیں چھوڑا۔

اشرف علی خان کو جب یہ حال معلوم ہوا تو گئے اور بہت سی قیل وقال کے بعد انتخابِ مذکورہ کو لے آئے۔ کتاب اصلاحوں سے چھلنی ہوگئی تھی۔ اپنی محنت کا یہ حشر دیکھ کر انہیں بے حد رنج ہوا۔ سودا کی شہرت تھی لہٰذا وہ ان کے پاس آئے اور انصاف طلب ہوئے۔

"دیکھئے صاحب، میری غلطیاں نکالتے۔ انہوں نے تو اساتذہ کو بھی نہیں چھوڑا۔ میں نے مسودہ اس لیے دیا تھا کہ مجھ سے کہیں سہو ہوگیا ہو تو وہ اس کی اصلاح کردیں۔ انہوں نے تو اساتذہ کا قتل عام کردیا۔"

"ہاں صاحب، یہ تو بہت برا کیا۔"

"اب آپ ہی یہ ثابت کرسکتے ہیں کہ انہوں نے یہ اصلاحیں صحیح دی ہیں یا غلط۔"

"بھائی، مجھے فارسی زبان کی زیادہ مشق نہیں ہے۔ اردو میں چند لفظ جوڑ لیتا ہوں۔ اس سے زیادہ کا دعویٰ نہیں۔ مرزا فاخر مکیں فارسی داں ہیں۔ انہوں نے جو کچھ کیا سمجھ کر کیا ہوگا۔ آپ کو اصلاح منظور ہے تو شیخ علی حزیں کے شاگرد شیخ آیت اللہ ثنا موجود ہیں۔ حکیم بوعلی ہاتف بنگالہ میں، نظام الدین صانع بلگرامی فرخ آباد میں۔ شاہ نورالعین واقف شاہ جہاں آباد میں ہیں۔ یہ ان لوگوں کے کام ہیں۔"

"ان ناموں کو تو مرزا فاخر خاطر میں بھی نہیں لاتے۔"

"ارے! اس کا تو مطلب ہے وہ بڑا جاہل ہے۔"

"صاحب، ایسا ویسا! مجھ سے ہی غلطی ہوئی کہ اس کے پاس چلا گیا۔ اب آپ ہی اسے جواب دے سکتے ہیں۔"

"کیوں مجھے کانٹوں میں گھسیٹتے ہو۔ میں ویسے ہی بدنام ہوں کہ ہر کسی سے جھگڑتا پھرتا ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے میری پندرہ سال کی محنت ضائع چلی گئی۔"

"آپ اسے اسی حالت میں چھپوا دیجیے، جس طرح آپ نے لکھا تھا۔"

"آپ اسے پڑھ تو لیں۔ بے شک اصلاح نہ کریں دیکھ تو لیں۔ مرزا فاخر نے کس طرح حلیہ بگاڑا ہے۔"

سودا نے یہ سوچ کر مسودہ رکھ لیا کہ ایک نظر دیکھ کر واپس کردے گا۔

اس نے فرصت کو مصروفیت میں بدلا اور اسے دیکھنا شروع کیا۔ معلوم ہوا کہ جو باکمال سلف سے آج تک مسلم الثبوت چلے آتے ہیں ان کے اشعار تمام زخمی تڑپتے ہیں۔

مرحومین کے ساتھ فاخر نے اتنی زیادتیاں کی تھیں کہ مرزا کو ازحد رنج ہوا۔ اب اشرف علی خان کے کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ طیش میں آ، قلم اٹھا اعتراضات کے جواب لکھنے بیٹھ گیا۔ خود مرزا فاخر کے دیوان سے سیکڑوں غلطیاں نکال کر رسالہ "عبرت الغافلین" مرتب کرنے بیٹھ گیا۔

باتیں کہیں چھپی رہتی ہیں۔ احباب جب آتے اسے اسی کام میں غرق پاتے۔ بعض اہل علم سے اس نے مشورے بھی کیے لہٰذا فاخر کو اس رسالے کا علم ہوگیا۔ وہ مرزا سودا کے قلم کی تپش کو جانتا تھا۔ سمجھتا تھا کہ اگر اس کے اعتراضات منظر عام پر آئے تو بڑی بدنامی کا باعث ہوں گے۔ چاہا کہ زبانی پیاموں سے ان داغوں کو دھوئیں۔ اپنے ایک شاگرد بقاءاللہ خاں بقا کو گفتگو کے لیے بھیجا۔

"صاحب، یہ کب چاہیے تھا کہ جن سے ہم نے زبان سیکھی وہ ان پر تنقید کریں۔" سودا نے کہا۔

"یہ اشرف علی خاں کا معاملہ ہے۔ آپ مسودہ انہیں واپس کردیں۔ وہ خود جواب دے لیں گے۔"

"یہ اب ان کا نہیں میرا معاملہ ہے۔ انہوں نے اشرف علی خاں کو نہیں، اساتذہ کو نشانہ بنایا ہے۔ ان میں سے بہت سے اس دنیا میں موجود نہیں۔ ان کا جواب مجھے دینا ہے۔"

"لیکن آپ نے تو مرزا فاخر کی بھی غلطیاں نکالی ہیں۔"

"صرف یہ بتانے کے لیے کہ جس کا اپنا یہ حال ہے وہ کیا کسی کی غلطیاں نکالے گا۔"

"یہ کیا ضروری ہے کہ آپ نے ان کی غلطیوں کی درست نشاندہی کی ہو۔"

"اس کا فیصلہ علما کریں گے۔"

"دو چار فیصلے تو اسی وقت ہوسکتے ہیں۔"

"بسم اللہ۔"

"آپ کوئی ایک اعتراض تو دہرایئے۔"

"اسی شعر کو لے لیجیے" مرزا نے کہا اور فاخر کا یہ شعر پڑھا۔

گرفتہ بود دریں بزم چوں قدح دل من
شگفتہ روئی صہبا شگفتہ کرد مرا

مرزا کا اعتراض تھا کہ قدح کو گرفتہ دل کہنا بے جا ہے۔ اہل انشا نے ہمیشہ قدح کو کھلے ہوئے پھول سے تشبیہ دی ہے۔ یا ہنسی ہے کہ اسے بھی شگفتگی لازم ہے۔

بقا نے اعتراض سن کر جواب میں شاگردی کا پسینہ بہت بہایا اور ثبوت میں ایک استاد کا یہ شعر بھی پڑھا۔

چہ نشاط بادہ بخشد بمن خراب بے تو
بہ دل گرفتہ مانند قدح شراب بے تو

"اس شعر میں بھی قدح کو گرفتہ باندھا گیا ہے۔ کیا یہ بھی غلط ہے؟" بقا نے بڑے فخر سے کہا۔

"اپنے استاد سے کہنا، اساتذہ کے شعر پڑھا کرو تو سمجھا بھی کرو" سودا نے نہایت اطمینان سے کہا "یہ شعر تو میرے اعتراض کی تائید کرتا ہے یعنی باوجودیکہ پیالہ ہنسی اور شگفتگی میں ضرب المثل ہے اور پیالہ شراب سامانِ نشاط ہے مگر وہ بھی دل افسردہ کا حکم رکھتا ہے۔"

بقاءاللہ بقا نے کئی اور شعروں پر بھی تکرار کی اور بگڑ کر اٹھ گیا "میں تو کہتا تھا، معاملہ یہیں رفع دفع ہوجائے لیکن آپ کو کچھ اور منظور ہے۔"

مرزا فاخر کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ اس کے شاگرد لکھنؤ میں بہت تھے خصوصاً شیخ زادے کہ ایک زمانے میں

وہی ملک اودھ کے حاکم بنے ہوئے تھے۔ سینہ زوری کے بخار ابھی تک دماغوں سے نہ گئے تھے۔ استاد کی بے عزتی ہو اور وہ خاموش رہ جائیں۔

سودا اپنے گھر میں بے خبر بیٹھا تھا کہ فاخر کے شاگرد زبردستی اندر گھس آئے۔ وہ ابھی گاؤ تکیے سے اٹھنے بھی نہیں پایا تھا کہ ایک بلوائی نے اس کے پیٹ پر چھری رکھ دی۔

"جو بکواس تم نے لکھی ہے وہ سب لو اور ہمارے استاد کے سامنے چل کر فیصلہ کرو۔"

اسے مضامین کے گل بوٹے اور باتوں کے طوطے مینا بنانا تو خوب آتے تھے مگر یہ مضمون ہی نیا تھا۔ باتیں کیا' اوسان تک جاتے رہے۔ جزدان غلام کو دیا خود میانے میں بیٹھے اور بلوائیوں کے ساتھ ہو لیے۔

جس شہر میں ننگے سر نکلنا بے تہذیبی تھا' وہ ننگے پاؤں میانے میں بیٹھا تھا۔ شہدوں نے پاؤں میں جوتے تک ڈالنے کی فرصت نہیں دی تھی۔

چاروں طرف وہ لشکر شیطان تھا' بیچ میں وہ۔ تالیاں بجاتے' نعرے لگاتے چلے جاتے تھے۔

"بڑا باعزت بنا پھرتا ہے۔ اس کے تو بیچ چوک میں جوتے لگائے جائیں۔"

"دلی سے اب تک سب کی پگڑیاں اچھالتا آیا ہے۔"

"اس کے سر پر تو پگڑی بھی نہیں ہے' اچھالو گے کیا؟"

"دو چار چپت ٹانٹ پر پڑیں گے' یہی بہت ہے۔"

"لو' چوک' کون سا دور ہے' آگیا۔"

میانہ رک گیا۔ شیخ زادوں نے اسے گھسیٹ کر باہر نکالا۔

قریب تھا کہ بڑھاپے کی عزت مٹی میں مل جاتی' اتفاقاً نواب سعادت علی کی سواری ادھر سے گزری۔ مجمع دیکھ کر ٹھہر گئے۔ غنڈوں نے انہیں دیکھا تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ بھاگ کھڑے ہوئے۔ سودا کا یہ حال کہ اکیلی سڑک پر سر جھکائے کھڑے تھے۔

سعادت علی خاں نے اسے اپنے ساتھ ہاتھی پر بٹھایا اور نواب آصف الدولہ کے پاس لے گئے۔ وہ اسی وقت دسترخوان پر بیٹھے تھے۔ سعادت علی خاں اندر گئے۔

"بھائی صاحب' غضب ہو گیا۔ آپ کی حکومت اور شہر میں یہ قیامت۔"

"کیوں بھئی' خیر باشد۔"

"مرزا رفیع جس کو باوا جان نے برادرِ من اور مشفق مہربان کہہ کر خط لکھا تھا۔ آرزوئیں کر کے بلایا۔ وہ آج یہاں موجود ہے اور اس حالت میں اگر اس وقت میں نہ پہنچتا تو شہر کے بدمعاشوں نے اس کو بے حرمت کر ڈالا تھا" سعادت خاں نے تمام ماجرا بیان کیا۔

"بھئی مرزا فاخر نے ایسا کیا تو مرزا کو کیا' کیا گویا ہم کو بے عزت کیا۔ باوا جان نے ان کو بھائی لکھا تو وہ ہمارے چچا ہوئے۔"

"اس میں کیا شک ہے۔" سعادت علی خاں نے کہا۔

آصف الدولہ اسی وقت دسترخوان سے اٹھ گئے۔ باہر آئے اور سودا سے ملاقات کی۔

جس ملاقات کے لیے وہ ترس رہا تھا' ہوئی تو اس حال میں کہ نہ سر پر ٹوپی نہ پاؤں میں جوتی۔

یہ حال دیکھا تو غضب کی حد نہ رہی "شیخ زادوں کا محلہ اکھڑوا کر پھینک دو اور شہر سے نکلوا دو۔ اور مرزا فاخر جس حال میں ہو اسی حال میں حاضر کرو۔" نوابی حکم جاری ہو گیا۔

سودا نے ہاتھ باندھ کر عرض کی "حضور' ہم لوگوں کی لڑائی کاغذ قلم کے میدان میں آپ ہی فیصل ہو جاتی ہے۔ حضور اس میں مداخلت نہ فرمائیں۔ غلام کی بدنامی ہوگی۔ جتنی مدد حضور کے اقبال سے پہنچی وہ کافی ہے۔"

سودا باعزاز و اکرام وہاں سے رخصت ہوا۔ نواب نے احتیاطاً سپاہی ساتھ کر دیے۔

حریفوں پر جب یہ راز کھلا تو امرائے دربار کے پاس دوڑے۔ صلاح ٹھہری کہ معاملہ روپے یا جاگیر کا نہیں۔ تم سب مرزا فاخر کو لے کر مرزا سودا کے پاس جاؤ اور خطا

پہیلیاں

سونے کی وہ نار کہاوے
بنا کسوٹی بان دکھاوے
(چارپائی)

رات سمیں اک میوہ آیا
پھولوں پاتوں سب کو بھایا
آگ دے وہ ہووے روکھ
پانی دے وہ جاوے سوکھ
(آتش بازی کا انار)

مندر ایک سکھی کا بنا
یا میں پون نہ آوے کھنا
اس مندر کی ریت دیوانی
آگ بجھاوے اوڑھے پانی
(حمام)

آدھی بوبو ساری رانی
جو بوجھے سو بڑا گیانی
(بورانی)

معاف کروالو۔

دوسرے دن آصف الدولہ نے مرزا فاخر کو طلب کرلیا۔ چوب دار بھیج کر سودا کو بھی بلالیا۔ آج وہ اس شان سے آیا کہ نواب کا ہاتھی اسے لے کر آیا تھا۔ ایک ملازم مورچھل کرتا چلا آیا تھا۔ سودا جس سڑک سے گزرا یہ گمان ہوتا تھا کہ شاید نواب نے اسے اپنا استاد مقرر کرلیا ہے۔

قیاس آرائیوں کو پیچھے چھوڑتا ہوا جب وہ دربار میں حاضر ہوا تو مرزا فاخر کو موجود پایا۔

"تمہاری طرف سے بہت نازیبا حرکت ہوئی ہے۔" نواب نے مرزا فاخر کو مخاطب کرکے کہا "اگر شعر کے مرد میدان ہو تو اب روبرو سودا کے ہجو کہو۔"

"یہ مجھے نہیں آتا" فاخر نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

"تمہیں یہ آتا ہے کہ شیطانوں کے گروہ کو مرزا کے گھر پر چڑھائی کرنے کے لیے بھیج دو اور اسے بے عزت کرو۔"

پھر سودا کی طرف اشارہ کیا۔ یہاں کیا دیر تھی۔ سودا نے فی البدیہہ اس کی ہجو میں ایک فارسی رباعی پڑھ دی۔

نواب نے خوش ہو کر اسے زمرۂ شعرا میں شامل کرلیا اور چھ ہزار سالانہ وظیفہ مقرر کیا۔

اب اس پر فرض ہو گیا تھا کہ وہ نواب کا قصیدہ رقم کرے۔

اے وہ کہ تیرے عدل کی نسبت بہ خاص و عام
نوشیروانِ عدل کا گویا ہے اتہام
دنیا ہے تیرے عدل میں اے عادل زماں
زخمِ جگر کو سودۂ الماس التیام
کیا کیا ہی خوبیوں نے کیا حق نے تجھ کو خلق
ابنائے روزگار کے اے فخر و احترام
زہرہ ہو آب' سینے میں ہیبت سے شیر کا
تڑپے نہنگ پیاس سے ماہی ہو جوں مدام
اشجع تو اس قدر ہے کہ میداں میں روز جنگ
کیا تاب روبرو ہوں ترے رستم اور سام
سائل کے گھر میں کب تری بخشش سما سکے
تا اس کے گھر کا تا بہ فلک ہو نہ پشت بام
باغ جہاں میں آج تو وہ نخل سبز ہے
پہنچی ہے چار فصل ثمر تجھ سے روم و شام

اسے وہ تمام گُر آتے تھے جو رئیسوں کو رجھانے کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ اس نے چند ملاقاتوں میں نواب پر ایسا جادو کردیا کہ اگر حرم سرا میں بیٹھے ہوتے اور مرزا کے آنے کی اطلاع ملتی تو باہر نکل آتے۔ شعر سن کر خوش ہوتے اور انعام سے نوازتے۔

"بھئی مرزا' ہم کب تک ایک ایک پھول کی خوشبو سونگھتے رہیں گے۔ تم تو اپنا پورا چمن ہمارے حوالے کردو۔"

"حضور' چمن زار تو آپ کو سلامت۔ بندہ تو لفظوں کے پھول کھلاتا ہے۔ شاید حضور کا اشارہ دیوان کی جانب ہے۔"

"ہم یہی چاہتے ہیں۔ کبھی جی چاہتا ہے تم شعر سناؤ اور تم سامنے ہوتے نہیں۔ دیوان ہوگا تو پلنگ پر دھرا رہے گا۔"

سودا نے دیوان کی نقل ان کے حضور پہنچادی۔

ایک آصف الدولہ پر منحصر نہیں' سرفراز الدولہ' ریذیڈنٹ مسٹر جانسن' سلیمان شکوہ اور کئی چھوٹے بڑے رئیس اس کے ممدوحین میں شامل تھے جو اسے انعام واکرام سے سرفراز کرتے رہتے تھے۔ وہ نہایت رئیسانہ ٹھاٹ سے دن گزار رہا تھا۔

○☆○

وہ اب بوڑھا ہو چکا تھا اس لیے عہد شباب کی گرمیِ سخن بھی اب 'سرد پڑنے لگی تھی۔ جوانی میں تو وہ آگ تھا کہ جس نے چھوا جل اٹھا۔ کون تھا ایسا جس کی اس نے ہجو نہ لکھی ہو' بے نقط نہ سنائی ہوں۔ جس کے پیچھے پڑجاتا' اسے جان چھڑانی مشکل ہوجاتی۔ بڑھاپے نے کس بل نکال دیے تھے لیکن اب بھی کبھی جوانی کی ترنگ آ ہی جاتی تھی پھر وہ یہ نہیں دیکھتا تھا کہ مخاطب کون ہے۔ ایک مرتبہ آصف الدولہ شکار کو گئے۔ خبر آئی کہ نواب نے بھیلوں کے جنگل میں شیر مارا۔ سودا نے فوراً کہا۔

یارو! یہ ابنِ ملجم پیدا ہو دوبارہ
شیرِ خدا کو جس نے بھیلوں کے بن میں مارا

نواب شکار سے واپس آئے تو کسی نے یہ شعر انہیں بھی سنادیا۔ سودا سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے شکایت کی۔

"مرزا' تم نے ہمیں شیر خدا کا قاتل بنادیا؟"

سودا نے ہنس کر کہا "جناب عالی! شیر تو اللہ ہی کا تھا۔ نہ حضور کا نہ فدوی کا۔"

نواب مطمئن ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں لیکن خاموش ضرور ہوگئے کہ شعر بھی خوب تھا' جواب بھی ذہانت کا تھا۔

○☆○

نواب' بادشاہوں کی فرمائشیں حریص بچوں کی طرح ہوتی ہیں۔ جتنی پوری کرتے جاؤ کمی نہیں آتی۔ درباری شاعر ہونا مذاق نہیں ہوتا۔ اس کے لیے ایک خاص فطرت اور خاص شاعری کی ضرورت ہوتی ہے۔ مصاحبت کے دوران میں سودا کو ایسے مواقع سے اکثر گزرنا پڑتا تھا۔ وہ اس سے سرخرو گزر گیا

یہی اس کی کامیابی تھی۔ یہ فرمائشیں کبھی کبھی ناگوار بھی گزر جاتی تھیں لیکن ہر کوئی میر تقی میر نہیں ہوتا۔

آصف الدولہ کی اَنّا کی لڑکی خرد سال تھی۔ نواب نے اس کی ماں کا دودھ پیا تھا اس لیے اس کی ناز برداری کرتے تھے۔ نواب کی ناز برداریوں نے اسے شوخ بنا دیا تھا۔ اس کی شرارتوں سے وہ تنگ آگئے تھے۔

ایک دن دوپہر کا وقت تھا۔ نواب سوتے تھے کہ لڑکی نے ایسا غل مچایا کہ نواب کی آنکھ کھل گئی۔ بہت جھنجلائے۔

"مرزا کو بلاؤ۔"

انہوں نے یہ حکم اتنے غصے میں جاری فرمایا کہ ملازمین سمجھے مرزا پر عتاب ہونے والا ہے۔

دو سپاہی دوڑتے ہوئے مرزا کے گھر پہنچ گئے۔ وہ بھی اس وقت آرام کر رہے تھے۔

"نواب صاحب نے فوراً طلب کیا ہے۔ آپ جیسے بیٹھے ہیں ویسے ہی چلے جائیے۔"

"اس وقت بلایا ہے؟ یہ تو ان کے آرام کا وقت ہے۔ میں بھی سونے کے لیے لیٹا ہی تھا۔"

"نواب صاحب بہت غصے میں ہیں۔ نہ جانے آپ سے کیا قصور سرزد ہو گیا ہے۔"

اس کا دل دھک سے ہو گیا۔ اس دربار کا سہارا تھا۔ کیا یہ بھی ہاتھ سے جانے والا ہے پھر اس نے نواب کی مہربانیوں پر نظر کی اور معافی کی امید میں ان سپاہیوں کے ساتھ ہو لیا۔

وہ پہنچا تو واقعی نواب کو غصے میں پایا۔ ادھر سے ادھر ٹہل رہے تھے۔ گالیاں دینے کی عادت تھی۔ شاید اس وقت بھی وہ کسی کو منہ ہی منہ میں گالیاں دے رہے تھے۔ سودا پر نظر پڑی لیکن آج خلافِ معمول چہرے پر مسکراہٹ نہیں تھی۔

"بھئی مرزا' اس لڑکی نے ہمیں حیران کر دیا ہے۔ ہم خود تو اسے کچھ کہہ نہیں سکتے۔ تم اس کی ہجو کہہ دو۔"

"کس لڑکی کی ہجو کہہ دوں حضور؟"

نواب نے تفصیل بتائی تو سودا کی جان میں جان آئی۔ ورنہ وہ تو کچھ اور ہی سمجھے ہوا تھا۔

نواب تو آرام فرمانے چلے گئے اور وہ ہجو کہنے بیٹھ گیا۔

لڑکی وہ لڑکیوں میں جو کھیلے
نہ کہ لونڈوں میں جاکے ڈنٹر پیلے

جب تک نواب سو کر اٹھتے، ہجو تیار تھی۔ اب وہ اس انتظار میں تھا کہ نواب اسے طلب کرے تو وہ ان اشعار کو اس کی سماعت کے سپرد کرے۔

معلوم ہوا نواب گل گشت کو نکلے ہیں۔ اسے بھی وہاں

رباعیات

سودا بہ جہاں اپنی زبانی تو ہے
آفاق میں خاقانی ثانی تو ہے
ذی نطق کا ہر چند نہیں تو خالق
پر نطق کا خلاقِ معانی تو ہے

منہ پھیرے ہے گو دیکھ کے ہم کو عالم
قدر اس سے کچھ اپنی نہیں ہوتی ہے کم
اتنا ہے بڑا ہم کو کیا خالق نے
خلقت کی نظر میں نہیں آسکتے ہم

جہاں کے بحر میں اے دل لباس اتنا چاہ
کہ جوں حباب وہی پیرہن وہی ہو کلاہ
تو کس تلاش میں سر مارتا پھرے ہے کہ عمر
برنگ رشتۂ سوزن ہے ہر قدم کوتاہ

خراج منظوم

نہ ہو کیوں ریختہ بے شورش و کیفیت و معنیٰ
گیا ہو میر دیوانہ رہا سودا سو مستانہ
(میر تقی میر)

آبرو، یکرنگ، ناجی، احسن اللہ اور ولی
ریختہ کہتے نہ تھے تاباں مرے سودا کی طرح
(عبدالحیٔ تاباں)

کب ہماری فکر سے ہوتا ہے سودا کا جواب
ہاں تتبع کرتے ہیں ناسخ، ہم اس مغفور کا
(ناسخ)

سودا کے خیال کو نہ سمجھے کوئی کم
سودا فنِ ریختہ میں گزرا رستم
(مصحفی)

سنیئے کس کا سخن کہ دل سے مٹے
داغ مرزا رفیع سودا کا
(قائم شاگرد سودا)

○☆○

طلب کیا ہے۔

نواب چند ملازمین خانگی کے ہمراہ گل گشت میں مصروف تھے۔ سودا پر نگاہ پڑتے ہی انہوں نے ملازموں کو رخصت کیا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ایک طرف کو چل دیے۔

سامنے وہ مصنوعی جھیل تھی جس نے تمام باغ کو چھپالیا تھا۔ اس کے بیچوں بیچ ایک بارہ دری تھی۔ اس بارہ دری میں باہر کی جانب نہایت نفیس رنگ آمیزی اور گل کاری کی ہوئی تھی اور اس کی وضع بڑی بانکی تھی۔ جھیل میں سنہری، روپہلی مچھلیاں ادھر ادھر تیر رہی تھیں۔ نظارہ کیا تھا، پرستان کا چربہ تھا۔ جھیل میں مچھلیوں کا سیماب وشی سے تیرنا، ڈوبنا اور پھر ابھرنا۔ ساحل پر رنگ برنگی پھولوں کی گوٹ اور اردگرد گھاس اور گھنی جھاڑیاں جن میں ایسی تیز خوشبو کے پھول چھپے ہوئے کہ پورا ماحول عطر بیز۔

ساحل پر ٹہلتے ہوئے نواب صاحب نے چھڑی سے مچھلیوں کو چھیڑنا شروع کردیا۔ مچھلیاں دائرے کی شکل میں چھڑی کے گرد جمع ہوتیں اور کائی کی طرح ادھر اُدھر پھیل جاتیں۔

"ہاں بھئی مرزا اب سناؤ کیا ہجو لکھی ہے؟"

اس نے ہجو سنانی شروع کی۔ نواب صاحب مچھلیوں سے شغل بھی فرمارہے تھے اور اشعار بھی ملاحظہ کرتے جارہے تھے۔ یہ معلوم کرنا دشوار تھا کہ دلچسپی کس کام میں زیادہ لے رہے ہیں۔

سودا کی عزتِ نفس مجروح ضرور ہوئی لیکن کیا کرتا نوکری تھی۔ جوانی ہوتی تو اس لڑکی کو چھوڑ کر خود ان کی ہجو کہنا شروع کردیتا لیکن بڑھاپے نے خون سرد کردیا تھا۔

○☆○

سرکارِ آصف الدولہ میں اس کے معاش کا انتظام ہو تو گیا تھا لیکن رقم کے حصول کے لیے درباری کارکنوں اور عاملوں کی بڑی منت سماجت کرنی پڑتی تھی۔ عطا کرنے والا ایک تھا لیکن اس عطا کو، قبولیت تک پہنچنے میں کئی ہاتھوں سے گزرنا پڑتا تھا۔ اس بڑھاپے میں دردر کی خاک چھاننا، عاملین کی خوشامدیں کرنا اس کے لیے تکلیف دہ تھا۔

کئی تجربہ کار درباریوں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ نقد رقم کے عوض نواب سے جاگیر طلب کرلے۔ اس جاگیر کی آمدنی اس کی اپنی ہوگی۔ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانا نہیں پڑے گا۔

اس نے شکایتوں کے دفتر منظوم کرنے شروع کردیے۔

اس نظم سے غرض ہے مجھے عرضِ مدّعا
مقصد مرا قلیل ہے پہنچے بانصرام
اپنی تری جناب میں اتنی ہی عرض ہے
کس کس کا ملتجی ہوں کہا کر ترا غلام
انصاف ہے کہ ہو وہ عطا اس جناب کی
اور ان کی میں سماجت و منت کروں مدام
دیہات جو ہیں مصرفِ مطبخ کے اس میں سے
اس نقدی کے عوض ہو مجھے صحنک طعام

پھرا کروں میں لیے مشتِ استخواں اپنے
میانے میں پئے عمال زیر کہنہ رواق
سو اب تو اس سے بھی نوبت گزر گئی ہے مگر
گلے میں کرتا، پا کفش، ہاتھ میں چماق
سپرد تجھ کو ہے سررشتہ سب کی حرمت کا
کیا ہے اتنی وہ مخلوق کا ہے جو خلاق
سو طالب اتنی میں حرمت کا اب نہیں جس سے
کروں معاش بسر اپنا میں یہ تم وطراق
عوض، میں دے مجھے اس نقدی کے تو ایسا گاؤں
بسر ہو عمر مری جس سے زیرِ کہنہ رواق
نہ شکل نور علی خاں ہوں کھا کے میں فربہ
نہ سوکھ کر ہوں طرح میرزا رفیع کے قاق
بہ نان و دال میں سازش کر ایک گوشے میں
مدام مدح میں تیری لکھا کروں اوراق

فکرِ معاش سے یوں دوچار ہونا پڑا تو وطن یاد آیا۔ شروع میں وطن میں رہنے کو بے مزہ سمجھتا رہا۔ ترکِ وطن اس کے نزدیک انگور سے رس نکلنا اور باہر آکر پُرکیف شراب بننا تھا لیکن جب غریب الوطنی کے مصائب کا سامنا ہوا تو بے اختیار وطن یاد آگیا۔

بلبل کو کیا تڑپتے میں دیکھا چمن سے دور
یارب نہ کیجیو تو کسی کو وطن سے دور

کس حسرت سے جہان آباد کے احباب کو یاد کیا۔

فراموش ان دنوں ہم شہریوں کے دل سے سودا ہے
خبر اس کی جہان آباد کے یاروں سے مت پوچھو

سودا وطن کو تج کر گردش سے آسماں کی
آوارۂ غریبی ہے اتنی مدتوں سے
شوقِ زباں تک اپنے ہم شہریوں کو بھولا
نامہ جو اس کو پہنچا ان بے مروتوں سے
کھولا اسے تو ہرگز اک لفظ بھی نہ سمجھا

قاصد سے پوچھے معنی رو رو اشارتوں سے

ضعیفی کے ساتھ ساتھ موت کا خیال بڑھتا جا رہا تھا۔ اپنے بعد اپنے عیال کی فکر کھائے جاتی تھی۔

وہ فضول خرچ آدمی تھا۔ جو کمایا، احباب پر لٹا دیا۔ نہ باپ کے ترکے کی حفاظت کر سکا نہ اپنی کمائی سنبھال کر رکھ سکا۔ جو آیا، پھونک دیا۔ سوچتا تھا اس کے بعد اس کے بیٹے غلام حیدر مجذوب کا کیا ہوگا۔ اسی لیے چاہتا تھا کہ کوئی گاؤں، کوئی جاگیر مل جائے۔ اپنی عظیم الشان شاعری اور خدمات پر غور کرتا تھا تو یہ سخت ناانصافی معلوم ہوتی تھی کہ وہ یوں دربدر مارا مارا پھر رہا لیکن مطلب ہاتھ نہیں آتا۔ میں نے ریختہ کو ریختہ بنایا۔ اردو میں قصیدے کو فارسی کا ہم پلہ بنایا۔ جس کا قصیدہ لکھا، اسے تاریخ میں زندہ کر دیا۔ اپنی ہجویہ نظموں اور شہر آشوبیوں کے ذریعے اپنے عہد کی سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی حالتوں کی عبرت ناک تصویریں کھینچیں۔ اردو زبان ابتدائی حالت میں تھی، میں نے اسے ترقی دی۔ ہزاروں نئے الفاظ بنائے۔ ایسے کہ ہر لفظ پر مجھے ایک گاؤں ملے۔ شاگردوں کی ایسی تربیت کی کہ میرے بعد وہ اس چراغ کو روشن رکھیں گے۔ میں نے کم و بیش پچاس سال تک اپنی شاعرانہ قوتوں سے کام لیا۔ اور کم از کم چالیس شاگرد ایسے بنا دیے جو صاحبِ دیوان ہیں۔ ان کا شمار معمولی شعرا میں نہیں ہوتا۔ مجھے کیا ملا؟ دربدری! ایک مرتبہ ۱۱۶۷ھ میں وطن سے نکلا اور اب ۱۱۹۵ھ ہے۔ اب تک دہلی کا قیام نصیب نہ ہو سکا۔

معاش کی فکر اور بڑھتی ہوئی عمر نے اسے بہت کمزور کر دیا تھا۔ قیافہ شناسی اس میں غضب کی تھی۔ اپنا چہرہ خود دیکھ کر کہنے لگا تھا کہ بس اب رحلت قریب ہے۔

بالآخر اس کا کہا سچ ہوا۔ اسی سال ۱۱۹۵ھ ۴ رجب کو رحلت کی۔

زبس رنگینیٔ معنی مری عالم میں پھیلی ہے
سخن جس رنگ کا دیکھو گے میں بھی اس میں شامل ہوں

سودا کی رحلت کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ لکھنؤ کی رنگینیاں سوگ کے پردے میں چھپ گئیں۔ کون تھا جو اس جنازے میں شریک نہیں تھا لیکن سب کے ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ آج اسے کوئی نواب طلب نہیں کر سکتا تھا۔ آج وہ کسی کے بلاوے پر نہیں آسکتا تھا۔

آغا باقر کے امام باڑہ میں سب اسے اکیلا چھوڑ کر واپس چلے آئے۔

ہستی سے عدم تک نفسِ چند کی ہے راہ
دنیا سے گزرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

اس کا بوڑھا استاد شاہ حاتم ابھی زندہ تھا۔ یہ خبر دہلی پہنچی تو اس کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ بے اختیار ہو کر کہا "ہائے ہمارا پہلوانِ سخن مر گیا۔"

اس کے ہم دم و ہم نشیں شاگرد میر فخرالدین ماہر نے قطعۂ تاریخ لکھا جو اس کے مزار کی زینت بنا۔

خلد کو جب حضرت سودا گئے
فکر میں تاریخ کے ماہر ہوا
بولے منصف دور کرپائے عناد
شاعرانِ ہند کا سرور گیا

اس کے شاگرد قائم نے بھی قطعۂ تاریخ کہا۔

آہ مرزا رفیع دنیا سے
جا کے جنت میں جب مقیم ہوا
دردِ فرقت سے اس کے مثلِ قلم
اہلِ معنی کا دل دو نیم ہوا
گل سے تا خار اس چمن میں جو تھا
خاک برسر وہ جوں نسیم ہوا
سالِ تاریخ کی تھی مجھ کو تلاش
کیونکہ بس حادثہ عظیم ہوا
اس میں پیر خرد نے از سرِ یاس
یہ کہا اب سخن یتیم ہوا

اس کے بعد اس کا بیٹا مرزا غلام حیدر مجذوب لکھنؤ میں تنگ دستی کے دن گزارتا رہا۔ باپ کی چھوڑی ہوئی دولت کے دن چلتی۔ وہ سودا کا بیٹا ضرور تھا لیکن سودا نہیں تھا۔ اس کا کلام کون خاطر میں لاتا۔

خاطر میں کون لاوے میرا سخن کہ مجھ کو
سودا کا سن کے بیٹا مجذوب جانتے ہیں

اٹھہتر سال بعد مولانا محمد حسین آزاد لکھنؤ گئے تو انہیں ایک صاحب ملے جو اپنے آپ کو سودا کا نواسہ بتلاتے تھے اور نہایت عسرت میں زندگی گزار رہے تھے۔

دنیا تمام گردشِ افلاک سے بنی
مٹی ہزار رنگ کی اس چاک سے بنی

استاد دامن

شاعرِ عوام

تحریر و تحقیق: اختر حسین شیخ

چراغ دین المعروف اُستاد دامنؔ کی داستانِ حیات

پنجابی شعر و ادب کی آبرو، دانشورِ وقت، مجموعۂ اضداد شخصیت، جبر و استبداد کے آگے سینہ سپر ہو جانے والا۔ اُردو، عربی، فارسی، انگریزی، بنگالی، ہندی، سنسکرت، گورمکھی، روسی، پنجابی دس زبانوں کا ماہر، حافظِ قرآن، شدید قوم پرست، ذہن سیکولر اور دوستی صوفیائے کرام سے، محترمہ فاطمہ جناح کا پرستار، عطاء اللہ شاہ بُخاری، حُسین شہید سُہروردی کا چہیتا، زیڈ۔اے بُخاری کا پیر۔ لیاقت علی خان سے لے کر ضیاء الحق تک ہر صاحبِ اقتدار سے ٹکرانے والا۔ کوئی عذاب، کوئی عتاب اُس کے پائے استقلال میں لرزش پیدا نہ کر سکا۔ غنڈوں کے حملے، تھانوں کا تشدّد، قید و بند کی صعوبتیں، کوئی ستم اُسے اپنے مؤقف سے نہ ہٹا سکا۔ عُمر بھر تنہائی کا شکار رہ کر دوسروں کے دُکھ اُجاگر کرنے والا، اپنے سینے میں دہکتے لاوے کے ساتھ ہی رزقِ خاک ہو گیا۔ محنت کشوں، مزدوروں، بے سرو سامانوں کا شاعر۔

لاہور، دیوسماج ہائی اسکول میں تفریح کی گھنٹی بجی۔ پرائمری سیکشن کے بچے شوروغل مچاتے کلاسوں سے باہر آگئے۔ اسکول کے صحن میں ایک "چوبچہ" سا بنا تھا جو پانی سے بھرا رہتا۔ بچے اپنی تختیاں اس میں ڈبو ڈبو کر دھونے لگے۔ دھکم پیل، دھینگا مشتی، ہر بچہ دوسروں پر سبقت لے جانے کی کوشش میں تھا۔ ایک مضبوط قد کاٹھ کا سرخ وسپید گول مٹول سا لڑکا راستے کی ہر رکاوٹ دور کرتا ہوا "چوبچے" پر پہنچا۔ دائیں بائیں کھڑے لڑکوں کو دھکا دے کر تختی دھونے لگا۔ تقریباً اسی قدبُت کے ایک دوسرے لڑکے نے پیچھے سے آکر اس کی تختی پر اپنی تختی دے ماری۔

"اوئے پیچھے ہٹا اپنی "دیاری" (دیودار کی) تختی کو" پہلے نے ڈانٹ کر کہا۔

"بچُو" "دیاری" نہیں خالص ٹاہلی (شیشم) کی ہے" دوسرے نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"ونگے لڑاؤ گے؟" پہلے نے چیلنج کیا۔

"گڑّو! بے ایمانی تو نہیں کرو گے؟" دوسرے کی آنکھوں میں چمک سی آگئی۔

"نہیں یار کریمے، میں کوئی بے ایمان ہوں، پھر تم سے کیا دھوکا کرنا" گڑّو (پہلے لڑکے) نے یقین دلایا "لے! میری تختی کھڑی ہے، مار ونگا" گڑّو لڑکوں کے ہجوم سے پیچھے ہٹ کر کھڑا ہوگیا، تختی اس نے طے شدہ شرائط کے مطابق پکڑلی۔ کریما اس کے دام میں آگیا۔ جونہی اس نے اپنی تختی گھما کر حریف کی تختی کے عین درمیان میں مارنے کی کوشش کی گڑّو نے تصادم سے پیشتر اپنی تختی کا زاویہ بدل دیا۔ چوڑائی زمین کے متوازی ہوئی تو تختیوں کے کنارے آپس میں ٹکرائے۔ کریمے کی تختی ٹوٹ گئی۔

"اوئے، بیڑا غرق، بے ایماناں، یہ تختی بھی میری اپنی نہیں تھی۔ تیسری جماعت کے ایک لڑکے کی تھی.... بچُو، ادھر لا اس کی قیمت" کریمے نے صورتِ حال کی وضاحت کی۔

"میری کون سی اپنی تھی" گڑّو نے "تھی" کو لمبا کھینچ کر تمسخر اُڑایا.... "چل پُھٹّا کھا (شکل گم کر) پیسوں کا گھوڑا" کریما گڑّو کے پیچھے بھاگ رہا تھا اور گڑّو "یہ ٹپّا" گنگناتا۔ ہجوم میں راستہ بناتا غائب ہوگیا۔

چُپ کر کے گڈی دے وچ بہہ جا
جے روئیں گی چپیڑ کھائیں گی

(خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ جاؤ، روئے گی تو چانٹا رسید کروں گا)

یہ گول مٹول، سرخ وسفید لڑکا جسے ہمجولی گڑّو کے نام سے پکارتے تھے، چراغ دین تھا جو برصغیر میں اُستاد دامن کے نام سے مشہور ہوا اور کریما شعلہ بیاں مقرر، بے باک صحافی، بے بدل ادیب، آغا عبدالکریم تھا جس نے اپنی شعلہ نوائی سے ایوانِ افرنگ میں زلزلے بپا کیے۔ مرزا ادیب نے اس کا تخلص الفت تجویز کیا مگر برصغیر کی سیاست میں وہ شورش کاشمیری کے نام سے زندہ جاوید ہوگیا۔

استاد دامن، لاہور اندرون لوہاری گیٹ، بازار ڈوگراں، چوک متی، اپنے ننھیال کے غریب گھرانے میں پیدا ہوئے۔ مولا بخش کشتہ نے اپنی کتاب "پنجابی شاعراں دا تذکرہ" میں دامن کا سن ولادت ۱۹۰۶ء لکھا ہے جبکہ خاندان کے واقفِ حال لوگوں کے مطابق وہ ۱۹۰۹ء میں پیدا ہوئے لیکن روزنامہ جنگ ۴ مئی ۱۹۸۳ء میں شائع ہونے والے انٹرویو میں جو حسن رضوی، سعادت سعید اور تنویر ظہور کی متحدہ کوشش کا نتیجہ تھا، بقول استاد دامن ان کی تاریخ پیدائش ۹ جنوری ۱۹۱۱ء ہے۔ والدِ بزرگوار کا نام میراں بخش ہے جن کا پیشہ خیاطی تھا اور والدہ کریم بی بی دھوبی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ عمر بھر استاد، اپنے والدین کے پیشوں پر فخر کرتے رہے۔ ان کے بقول "میرا والد ایک ماہر درزی تھا۔ لہٰذا ٹکڑے ٹکڑے دلوں کو محبت کے دھاگے سے رفو کرنے اور لیرلیر اجسام کی تشکیلِ نو کا فن، مجھے وراثت میں ملا ہے، والدہ چونکہ دھوبن تھیں لہٰذا اندر باہر کی صفائی ستھرائی کا ہنر بھی میرے خون میں پیدائشی طور پر موجود ہے۔"

میراں بخش درزی کی چھوٹی سی دکان لوہاری دروازے کے باہر واقع تھی جہاں پنجابی شعروادب کی محفلیں جمتیں کیوں کہ وہ خود "حافظِ ہیر" مشہور تھے۔ استاد دامن نے جب شعور کی آنکھ کھولی تو ہیر وارث شاہ جیسی بلند پایہ کتاب کے اشعار سننے کو ملے جو ذہن کے کورے کاغذ پر ثبت ہوکر رہ گئے اور میلانِ طبع کا فیصلہ ہوگیا۔

چراغ دین، گول مٹول موٹا تازہ، سرخ وسفید بچہ تھا جو گلی محلے کے ہر فرد کو پیارا لگتا۔ شکل وشباہت کی بنا پر اپنے بیگانے سب لوگ اسے "گڑّو" کہتے۔ یہ لفظ صوتی اعتبار سے اندر کے پیار کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے۔ بچے کی چستی چالاکی کی وجہ سے لوگ اسے "کھدّو" بھی کہتے (کھدّو پنجابی میں کپڑے کی گیند کو کہتے ہیں۔)

گڑّو کو آرام تحمل سے چلنا تو آتا ہی نہ تھا۔ بازار سے سودا سلف لانا ہوتا یا ویسے گلی محلے سے گزرنا، وہ بس گیند کی طرح لڑھکتا، اُچھلتا کُودتا گزر جاتا۔ اس زمانے میں بھی "گڑّو" بولیاں، بگڑو (ٹپے) وغیرہ گنگناتا رہتا اور اکثر ان میں اپنی

طرف سے اضافے کرکے لوگوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتا۔

میراں بخش کثیر الاولاد نہ تھا۔ صرف ایک لڑکی اور دو لڑکے تھے' بڑے لڑکے کا نام فیروز تھا۔ فیروز' اپنے گتّو کا دیوانہ تھا تو گتّو بھائی کا پرستار۔۔۔ وہ اگر شفقت کا سمندر تھا تو چراغ نے بھی بڑے بھائی کو باپ سے زیادہ احترام دیا۔ یہی احترام رفتہ رفتہ انسیت و محبت کے مقامات طے کرکے عشق کی حدود چھُونے لگا۔ چنانچہ بھائی کی وفات پر استاد دامن کا بلکنا' عمر بھر اس کی یاد میں آنسو بہانا' نوحے تخلیق کرنا اسی جذبے کا ثبوت ہے۔

چراغ نے نو سے گیارہ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کیے۔ کم و بیش ہر شاعر کی طرح اس دور کی شاعری کا موضوع حُسن و عشق' ہجر و وصال۔ خوش نما چہروں کی تعریف' رنگ و بو کے قصے وغیرہ تھے مثلاً اس دور کے یہ شعر ملاحظہ ہوں۔

○☆○

موڑ گلی دا مُڑدیاں واز آئی' اے باؤ جی! ذرا کھلو جانا
اوہناں گھنڈ دوپٹے دا مار لینا' وعدہ اکھیاں دے وچ ہو جانا

(گلی کا موڑ مڑتے ہی آواز آئی۔ اے باؤ' ذرا ٹھہر جا پھر چہرے کو گھونگھٹ میں چھُپا لینا مگر اس سے پیشتر آنکھوں ہی آنکھوں میں عہد و پیماں ہو جاتے)

چراغ کو بچپن میں پڑھنے لکھنے کا شوق تو بہت تھا مگر مفلسی تھی کہ دیوارِ چین بن کر راستہ روکے کھڑی تھی۔ مجبوراً اسے آبائی پیشہ' خیاطی' سیکھنا پڑا۔ عوام سے تعلق پیدا ہوا۔ دکان پر ہر مزاج کا گاہک آتا تھا۔ مہذب گفتگو' رکھ رکھاؤ' مخلوق کی نفسیات کو سمجھنا۔ تمام باتیں گویا کاروباری تقاضا تھیں۔ یوں ذہنی تربیت ہوئی' اندازِ فکر وسیع ہوا۔ خیاطی کے ساتھ چراغ کا تعلیمی سلسلہ بھی جاری تھا۔

اس دور کے جگری یار استاد نِکّا پہلوان کے بقول "چراغ نے بچپن میں بہت کم دوست بنائے۔ دوستی ہوئی بھی تو بات میل ملاپ سے آگے نہ بڑھی۔ دکان سے اسکول اور اسکول سے دکان' یہی اس کا وظیفہ تھا۔ وہ بڑا چالاک' سلجھا ہوا' لباس سادہ مگر صاف ستھرا پہننے والا۔ اس کے مقابلے میں ہم لوگ جنگلی قسم کے اُجڈ گنوار تھے۔ البتہ ایک بات ضرور ہے کہ وہ سارے محلے کی آنکھ کا تارا تھا۔ میرا گہرا دوست تھا۔ ہم اکٹھے دور دور کی منزلیں مارتے۔ شالا مار' راوی کی سیر' انار کلی کی مٹر گشتی ہم اکٹھے ہی کرتے۔۔۔"

نِکّا پہلوان کے بیان سے استاد دامن کا بچپن کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ بچپن کا ایک واقعہ جو اپنے بھائی فیروز سے تعلقات کی بھرپور وضاحت کرتا ہے' کچھ اس طرح پیش آیا۔

محلے کے ایک اوباش لڑکے سے چراغ دین کا جھگڑا ہوگیا۔ وہ قد کاٹھ کا مضبوط اور پھرتیلا تو تھا ہی' شائستگی اور بزدلی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ چنانچہ چراغ نے منٹوں میں حریف کا بھرکس نکال کے رکھ دیا' مضروب کا خاندان شکایت لے کر آیا اور فیروز سے انصاف کا طلب گار ہوا۔ وہ اگرچہ بھائی پہ جان چھڑکتا تھا مگر انصاف کا ترازو ہاتھ میں آیا تو سوچ میں پڑگیا پھر بڑی فراست سے اس نے' اس گتھی کو سلجھایا۔ پہلے تو اس نے مضروب کا لہو لہان چہرہ صاف کیا' خود اس کی مرہم پٹی کروائی۔ دودھ گھی کے لیے کچھ پیسے بھی دیے۔ مدعیان اس شفقت بھرے سلوک سے بڑے متاثر ہوئے۔ خصوصاً جب فیروز نے بھائی کی عدم موجودگی میں اسے بے نقط سنانی شروع کیں تو شکایت کنندگان کا غصہ ٹھنڈا پڑگیا۔

"بس یار! غصہ تھوک دو' بچے ہیں پھر "اِکو مِک" ہوجائیں گے' اب چراغ کو کچھ نہ کہنا' وہ بھی اپنا بچہ ہے" زخمی لڑکے کے والد نے فیروز کو سمجھایا۔

"نہیں چاچا! آج آتو لے' اس بدمعاش کی ہڈی پسلی ایک نہ کردوں تو۔۔۔" فیروز نے غصے سے کہا۔

معاملہ رفع دفع ہوگیا۔ تھوڑی دیر بعد چراغ گھر پہنچا تو فیروز نے اسے سر سے پاؤں تک گھور کر دیکھا۔ جھگڑے کی تفصیل سنی' زیادتی سراسر حریف کی نکلی۔

"دیکھو چراغ! میرے نزدیک تو کوئی غلط کام کر ہی نہیں سکتا" اس نے بڑی رسان سے کہا "اور جو کام تو کرے وہ غلط ہو نہیں سکتا۔"

"مگر بھا! میرا غلط کام' صحیح کیسے ہوسکتا ہے؟" چراغ نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیا۔ وہ جانتا تھا کہ فیروز کی نظر میں وہ سب کچھ ہے۔

"اس لیے پگلے' کہ تُو میرا "گتو" ہے۔۔۔ اور اپنے گتو کی بُری بات بھی مجھے اچھی لگتی ہے۔ اب جا' جاکر بازار سے دودھ پی۔ مجھے بہت زیادہ کام کرنا ہے۔"

شام کو فیروز نے دیگ پکا کر تقسیم کی۔ اس کا دل مسرور اور چہرہ مطمئن تھا۔

"فیروز یار۔۔۔ یہ دیگ "کھڑکانے" کی وجہ کیا ہے؟" ایک بے تکلف دوست نے پوچھا۔

"خدا کے فضل سے بھائی جوان ہوگیا ہے' اس سے بڑی خوشی کی اور کیا بات ہوسکتی ہے۔" فیروز نے مسکرا کر جواب دیا۔ شفقت کا یہ جان قربان کردینے والا انداز تھا' جسے استاد دامن بڑھاپے میں بھی فراموش نہ کرسکا۔

میراں بخش کا والد اور چچا' دونوں جھگڑالو قسم کے واقع

ہوئے تھے۔ استاد کا دادا تو بڑا ہی ڈکٹیٹر قسم کا انسان تھا روزانہ گھر میں دانتا کل کل رہتی۔ اس پر غضب یہ ہوا کہ فیروز نے عالم شباب ہی میں' اس دنیا سے رشتہ توڑ کر دوسری دنیا سے رشتہ جوڑ لیا۔ باپ کی کمرِ ہمت ٹوٹ گئی مگر چراغ کی ساری دنیا اندھیر ہوگئی۔ وہ شجر سایہ دار ہی نہیں اس کے لیے مقامِ محبوبیت پر فائز تھا جس انداز میں چراغ نے اپنے بھائی کی بے وقت موت کا سوگ منایا' اسے الفاظ کا لبادہ اوڑھانا دشوار ہے۔ اس کے اندر کا دیا ہی بجھ گیا۔ بعد میں جو نوحہ استاد دامن نے اپنے بھائی کے غم میں تخلیق کیا وہ پنجابی ادب میں سنگ میل کی حیثیت اختیار کر گیا۔ ویسے تو استاد کا حلقہ بڑا وسیع تھا مگر علاؤالدین (فلم اسٹار) ان کا منہ بولا بیٹا تھا اور شاگردوں میں سائیں اختر کی حیثیت ان کے نظام شمسی میں عطارد کی سی تھی۔ ان کا شاگرد ہمیشہ اپنے استاد کی کیفیت بیان کرتے وقت اشک بار ہو جاتا تھا۔

گھر میں نت نئے جھگڑے اور فیروز کی بے وقت موت سے' میراں بخش کا آبائی گھر سے دل اچاٹ ہوگیا۔ وہ چوک متی کی سکونت ترک کر کے اپنے کنبہ کے ہمراہ شالامار کے قریب بستی باغبان پورہ میں جا بسے۔ یہاں چراغ کی خالہ یعنی میراں بخش کی سالی کا گھر تھا۔ بھائی کی موت کے بعد' چراغ کا جی ہر چیز سے ایسا اچاٹ ہوا کہ عارضی طور پر تعلیم کا سلسلہ بھی منقطع ہوگیا۔ اس وقت استاد دامن کی عمر کوئی تیرہ برس تھی۔ باغبان پورہ میں وہاب نامی درزی کی دکان پر چراغ نے ڈیرا جمایا۔ ادھر وقت نے اپنا کام کر دکھایا اور وہ جان لیوا غم کو چھپانے میں کامیاب ہوگیا۔ زندگی از سرِ نو رواں دواں ہوئی۔ اسی جگہ چراغ کی ذہنی نشو و نما ہوئی۔ اسی جگہ اس نے دیو سماج ہائی اسکول سے میٹرک پاس کیا' اسی جگہ سر سے باپ کا مہربان سایہ اٹھا اور اسی جگہ چراغ نے دامن تخلص اختیار کیا۔ بعد میں جب اس کے کلام کو شہرت ملی تو چراغ دامن' استاد دامن ہوگیا اور پھر "چراغ دین" پس منظر میں چلا گیا' برصغیر خصوصاً پنجاب میں "استاد دامن" رہ گیا۔ اس نے اسلامیہ کالج میں بھی داخلہ لیا۔ گیارھویں درجے سے بخیر و خوبی گزر گیا مگر ایف اے کا امتحان نہ دے سکا۔ اس کی وجہ ذہانت کی کمی نہ تھی۔ بلکہ ہنگامہ خیز زندگی اور برصغیر کے زیر و زبر کر دینے والے حالات تھے اور سب سے بڑی بات اس کی نئے اور پسندیدہ نہج پر چل نکلنے والی شاعری تھی۔

اگر تعلیم ڈگریوں کا نام ہے تو استاد دامن کا دامن ان سے خالی تھا۔ جہاں تک علم کا تعلق ہے تو وہ بہت کچھ جانتے تھے انہیں "ودیا ساگر" علم کا سمندر کہا جائے تو مناسب معلوم ہوتا ہے۔ استاد نے پنجابی زبان کے علاوہ اردو' انگریزی' عربی' فارسی' روسی' بنگالی' ہندی' سنسکرت' گورمکھی دس زبانوں پر عبور حاصل کیا۔ مختلف زبانوں میں مہارت حاصل کرنے کی ہوس کا یہ عالم کہ گورمکھی سیکھنے کے لیے انہوں نے ایک "دبھنگی" کی دو تین برس خدمت کی اور گوہرِ مقصود حاصل کر کے رہے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ لاہور عجائب گھر کے ڈائریکٹر جناب رحمانی کے بقول' سنسکرت کے پرانے مخطوطے جن کو سارے پاکستان میں پڑھنے والے ڈھونڈے سے نہ ملتے تھے استاد کی خدمت میں پیش کر دیے جاتے اور وہ منٹوں میں ان کے تراجم سلیس اردو میں کر دیتے۔ انہوں نے مذہب کا گہرا مطالعہ کیا پھر دوسرے مذاہب عیسائیت' بدھ مت' سکھ مذہب' ہندومت (بطور خاص) کے گہرے مطالعے نے اس شخص کو عالمِ بے بدل بنا دیا۔ مذاہب کے تقابلی جائزے نے ذہن کو ایک منفرد نہج پر لا ڈالا جسے کسی نے دہریت کا نام دیا کسی نے سیکولرازم کا مگر دامن نے کبھی کسی سے الجھنے کی کوشش نہ کی۔ کیونکہ جو جانتا ہے کہ وہ کیا جانتا ہے' وہ خاموش ہو جاتا ہے۔

کہہ رہا ہے شورِ دریا سے سمندر کا سکوت
جس کا جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے

وہاب درزی جس سے چراغ دامن کا گہرا تعلق استوار ہو چکا تھا دہریت کی حد تک سیکولر ذہن کا مالک تھا۔ ڈگریوں کے لحاظ سے وہ بھی "کورا" ہی تھا' خالص پنجابی انداز میں حقہ نوشی کرنے والا مگر دانش کا شوریدہ سر دریا تھا۔ یہی وہ ماحول تھا جس نے چراغ کے ذہن کو سیکولر بنایا۔ وہاب کی دکان پر کانگریسی رہنماؤں کا آنا جانا رہتا تھا۔ میاں افتخار الدین سے لے کر پنڈت جواہر لعل نہرو تک ہر ذہنی سطح کے لوگ آتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ چراغ دامن' مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح تقسیم ہند کا مخالف ہوگیا اور کانگریسی پلیٹ فارم سے اشعار کے تیر چلانے لگا لیکن دو باتیں کوئی ایک فرد بھی ثابت نہیں کر سکتا۔ پہلی یہ کہ استاد نے کانگریس یا کسی سیاسی جماعت کی باقاعدہ رکنیت اختیار کی ہو' دوسری پاکستان کے معرضِ وجود میں آجانے کے بعد' وطن عزیز کی کسی موقع مقام پر مخالفت کی ہو۔ اس لحاظ سے دامن کا نظریہ بھی وہی تھا جو سید عطاءاللہ شاہ بخاری اور مولانا ابوالکلام آزاد کا تھا۔ یعنی ارضِ پاکستان کا مقام' مسجد جیسا ہے۔ اس کے بنانے میں اختلاف تو ہو سکتا ہے لیکن مسجد تعمیر ہو چکنے کے بعد اس کے وجود پر اعتراض' اس کی حرمت سے انکار اور کسی قسم کی بدخواہی گناہ کبیرہ ہے۔ ایسا گناہ جس سے دنیا تباہ اور عاقبت

نوحہ (بھائی کی یاد میں)

سائیں اختر' اُستاد دامن کے شاگردِ خاص تھے۔ وہ اپنے استاد کی کیفیت بیان کرتے ہوئے اشک بار ہوجایا کرتے۔ بڑے بھائی فیروز کی بے وقت موت نے اُستاد کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اپنے بھائی کے غم میں اُستاد دامن نے جو نوحہ تخلیق کیا' وہ پنجابی ادب میں سنگ میل کی حیثیت کا حامل ہے۔ بہ قول سائیں اختر کے' اُستاد اس نوحے کو ہمیشہ ترنم سے پڑھتے حالانکہ وہ تحت اللفظ دبنگ لہجے میں پڑھنے کے عادی تھے۔ نوحے کے آخری شعر تک پہنچتے پہنچتے آبدیدہ ہوجاتے۔ ملاحظہ فرمایئے۔

مینوں دس او ربّا میرا
میں ڈُبدا ڈُبدا جاں

میں اوتھے ڈھونڈاں پیار نوں
جتھے بچیاں کھانی ماں

ایتھے قیدی ہویاں بُلبلاں
تے باگیں بولن کاں

ایتھے پھل پے لیراں جاپدے
کجھ کلیاں کھلیاں ناں

ایتھے شہریں پین ویرانیاں
ایتھے اجّڑے پنڈ گراں

میں پنچھی بے پرا ہاں
مینوں پر دے میں اُڈ جاں

ایتھے ڈُب ڈُب مویاں سوہنیاں
ایتھے لہو دی وگے چناں

ا۔ اے میرے پروردگار! مجھے بتا میں کیا کروں۔ میں غم کے سمندر میں باربار ڈوبتا ہوں۔ (۲) میں پیار کو وہاں تلاش کررہا ہوں جہاں بچوں کو ماں کھاجاتی ہے۔ (ماں سے مُراد دھرتی لیا جائے تو شعر کا مفہوم زیادہ وسیع اور گہرا ہوجاتا ہے یعنی ایسی دھرتی پر پیار کا متلاشی ہوں جو خود اپنے بچوں کو کھاجاتی ہے) (۳) یہاں عنادل' قفس میں قید ہیں اور گلستانوں میں کوّے کائیں کائیں کرتے پھرتے ہیں۔ (۴) ہر گُل کی پتّیاں منتشر ہوتی دکھائی دیتی ہیں اور نئی کلیوں کے کھلنے کی اُمید نہیں۔ (۵) شہر ویران ہوچکے ہیں تو گاؤں اُداس وبرباد' تنہائیوں کا شکار۔ (٦) ان ویرانیوں سے کہیں دور اُڑ جانے کو جی چاہتا ہے اور میں بال وپر سے محروم ہوں لہٰذا مجھے پنکھ عطا کرکہ میں فوراً یہاں سے پرواز کرجاؤں۔ (۷) یہ ایسی خانہ خراب قسم کی جگہ ہے جہاں لہو کا چناب بہہ رہا ہے اور سوہنیاں اس میں باربار ڈوبتی ہیں۔ (بظاہر' ضلع گجرات کی "وسنیک" سوہنی کمہارن کی طرف اشارہ ہے جو مہینوال کے عشق میں مبتلا ہوکر دریائے چناب کی لہروں میں ڈوبی تھی.... مہینوال دریا کے اس پار بیٹھا اپنی محبوبہ کا انتظار کیا کرتا تھا اور سوہنی گھڑے کی مدد سے دریا عبور کرکے اپنے محبوب سے ملنے جایا کرتی تھی۔ ایک بار اس کی نند نے پکے گھڑے کی جگہ کچا گھڑا رکھ دیا مگر سوہنی کچے پکے کا خیال کئے بغیر محبوب کی کشش سے مجبور ہوکر چناب میں کود گئی اور دریا کے درمیان گھڑے نے ساتھ چھوڑ دیا۔ یوں وہ اقلیم عشق میں اپنی جان کا نذرانہ دے کر کامیاب وکامران ہوگئی۔ "سوہنی" وفا کا استعارہ ہے یعنی ہر محبت کرنے والے کا انجام اس جہانِ فانی میں' خونی لہروں میں ڈوبنا ہے.... تو ایسی دنیا سے مجھے فوراً پرواز کرجانے کے لئے پنکھ درکار ہیں لہٰذا اے ربِ کائنات! مجھے پر عطا کر)

برباد ہوگی۔

استاد دامن کی وطنِ عزیز کے معرضِ وجود میں آجانے کے بعد والی شاعری' اس بات کی گواہ ہے کہ وہ وطن کی محبت میں' ان نعرے بازوں سے کوسوں آگے تھا جنھوں نے چلاّ چلاّ کر ہمارا ناک میں دم کیے رکھا اور پھر۔

نیرنگئ سیاستِ دوراں تو دیکھیے
منزل انہیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے

کے مصداق جب استاد نے یہ دیکھا کہ حصولِ آزادی کے بعد حکمران طبقے کے وہی لچھن ہیں اور پاکستان کے ماے چاچے وہی لوگ بن بیٹھے ہیں جو انگریزوں کے مستند پٹھو تھے تو اس نے پوری شدت سے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو صاحبانِ اختیار و اقتدار کے خلاف استعمال کیا۔ لیاقت علی خان سے ضیاء الحق تک کوئی صاحبِ اقتدار اس کے تیروں کی بوچھار سے محفوظ نہ رہ سکا۔ فیروز خان نون' ایوب خان' یحیٰی خان' ذوالفقار علی بھٹو' غلام مصطفیٰ کھر' نواب آف کالا باغ' ضیاء الحق سب کے سب ہدف بنے۔ البتہ سہروردی کے لیے اس کے سینے میں نرم گوشہ ضرور تھا اور یہ وزیرِاعظم پاکستان بھی اپنے سارے طمطراق کو بھلا کر درویش کے حجرے میں حاضری دیتا تھا۔ دوسری شخصیت جس کا استاد نے نہ صرف احترام کیا بلکہ حمایت کا اعلان بابانگِ دہل کیا' وہ تھیں مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح۔ داستانِ دامن تحریر کرنے کا ایک مقصد ان تمام پہلوؤں کو اجاگر کرنا بھی ہے تاکہ آج کی مضطرب نسل اس عظیم انسان کے مقام سے کماحقہ' آگاہ ہوسکے اور نظریاتی اختلاف سے قطع نظر اس کی صفات کو صحیح رنگ میں جانچا اور پرکھا جاسکے۔ استاد کی سیاسی شاعری پڑھنے سے پیشتر ہمیں مملکت اور حکومت کے فرق کو ایک لمحہ بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔ حکومت میں موقع پرستوں سے لے کر پُرخلوص انسان' آتے اور جاتے رہیں گے لیکن مملکت پاکستان انشاء اللہ قائم و دائم رہے گی۔ یہ ہمارا ایمان ہے اور ہونا چاہیے۔

قائدِ اعظم ؒ کے جھنڈے تلے مسلمانوں کا اجتماع ایک رحمتِ خداوندی سے کم نہ تھا۔ مختلف مکاتیبِ فکر کے لوگوں نے مسلم لیگ کے مطمعِ نظر سے مخالفت کی۔ کچھ لوگ مخالفت برائے مخالفت کے مرتکب ہوئے جو آج بھی ہمارے آپ کے سامنے دندناتے پھر رہے ہیں اور بعض کا نظریہ' مذکورہ بالا تشریح یعنی قیامِ مسجد اور تعمیرِ مسجد والا تھا۔ قوم پرستوں کی کثیر تعداد اسی نظریے کی حامل تھی۔

۱۹۳۰ء میں استاد دامن کی ایک نظم کا بڑا چرچا ہوا' یہی نظم کانگریس کے پلیٹ فارم تک رسائی کی وجہ بنی۔

ساہڈیئے کمیٹئے' سیلٹئے ولیٹئے نی
لاہور دی کمیٹی نال اکھیاں لڑائی جا
اوہنے چپے چپے اُتے پُلیاں بنائیاں نیں
تو وی ذرا بھیڑیئے نی موریاں بنائی جا

اے ہماری کمیٹی! ہر چیز لپیٹ لے جانے والی کمیٹی' تو لاہور کی کمیٹی سے آنکھیں لڑاتی جا۔ اس نے جگہ جگہ پُل' پُلیاں تعمیر کرائی ہیں تو گلیوں میں نالیاں ہی بنا دے۔

یہ مقامی بلدیہ کمیٹی کی شاخ پر طنز تھا جو وہاب درزی کی دکان پر تخلیق ہوئی۔ وہاں میاں افتخار نے سنی اور وہی چراغ دامن کو کانگریس کے جلسے میں لے گئے۔ چنانچہ کانگریس کے اس جلسے میں جواہر لعل نہرو کی موجودگی میں چراغ دامن نے یہ نظم کچھ انداز میں پڑھی کہ پنڈت جی' بس اسیر ہوگئے۔ نوجوان شاعر کو میاں افتخار نے مبلغ دس روپے بطور انعام پیش کیے جو اس زمانے میں ایک معقول رقم تھی مگر پنڈت جی نے انعامی رقم دس گنا کردی۔ نہ صرف یہ بلکہ پنجاب میں منعقد ہونے والے کانگریس کے ہر جلسے میں چراغ دامن کی حاضری' ضروری قرار دی۔ چنانچہ پنڈت جی اپنی تقریر کے آغاز سے پیشتر بذاتِ خود اس نوجوان شاعر سے کلام عطا کرنے کی درخواست کرتے۔ عہدِ تخلیق اور وجۂ شہرت کے اعتبار سے استاد دامن کی سیاسی شاعری چونکہ سرِفہرست ہے لہٰذا اس کا مفصّل جائزہ پہلے پیشِ خدمت کیا جاتا ہے۔ قوم پرستی کے لحاظ سے آزادی کا یہ متوالا انگریز دشمنی میں پیش پیش تھا۔ لہٰذا شاعری کا ہدف سب سے پہلے فرنگی ہوا۔ نظم کا عنوان ہے۔ "فرنگی دی چال"

چالباز نے اپنی چال اندر
جھڑی چال چلّی گول مول چلی

چلدی رہی جے چال تے خوب چلّی
چلی چال تے چال اُڈول چلی

ایہہ فرنگی وی چلیا جاندا اے
گورمنٹ انگریز دی ڈول چلی

پِٹھو پے گئے تے طوطے اُڑ گئے نیں
پینجا پیا تے فیر بمبو چال چلی

(۱) مکّار فرنگی نے اپنی (بصیرت مطابق) گول مول ناقابلِ فہم چال چلی۔ (۲) کیوں کہ یہ چال بڑی رازداری اور دھیمے انداز میں چلی گئی ہے لہٰذا وہ جب تک چلتی رہی' خوب چلی۔ (۳) اب یہ

فرنگی بھی بوریا بستر گول کرتا دکھائی دیتا ہے کیوں کہ اس کی حکومت کے پائے لرزتے دکھائی دے رہے ہیں۔ (۴) فکرِ دامن گیر ہے، ہاتھوں کے طوطے اُڑ چکے ہیں۔ اب پٹائی ہوئی ہے تو ریل کے انجن کی طرح دوڑ لگانے کو ہے۔

اب ملاحظہ ہوں مزاحمتی ادب کے بہترین اشعار۔

پنجرے وچ اِک طوطے تھیں پچھیا میں
تیری زندگی وچ زندان بند اے
طوطا ہسیا، ہس کے کہن لگا
اچھا! تیرا وی کدھرے دھیان بندا اے
خود غلام تے آکھیں غلام مینو
سارے ہندی تے ایہہ ہندوستان بندا اے
میں تاں پنجرے دے وچ آزاد بولاں
توں آزاد ایں، تیری زبان بندا اے
دامن مرنے لئی وچ میدان آجا
کردے ظاہر جو دلی ارمان بندا اے

سارے اشعار سادہ زبان میں قابلِ فہم قسم کے ہیں۔ یہی استاد کا کمال ہے کہ وہ الفاظ کے جاہ و جلال سے انکار کر کے معانی کا طوفان بپا کر دیتا تھا۔ آج ان اشعار کا مفہوم خطرناک نظر نہیں آرہا مگر جب فرنگی دہشتوں کا راج تھا۔ آزادی کی ہر سُلگنے والی چنگاری خطرناک سے زیادہ خطرناک سمجھی جاتی تھی اور اسے بجھا دینا ہی اقتدار کا مزاج تھا۔ یہ تخلیق جو کسی طور علامتی نہیں، اگر ہے بھی تو ایک تانگے والا بھی اسے سمجھ سکتا تھا۔ ایسی شاعری یقیناً دل گُردے کا کام تھا۔ جس دور میں سیاسی "حبس" کا دور دورہ ہو تو شعرا عموماً علامتوں، اشاروں میں بات کر جاتے ہیں مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ دو ٹوک، صاف بات کرنے والے لوگ بھی موجود ہوتے ہیں۔ اسی دور کی ایک نظم ہے۔

"آزادی"

توں شکاری میں پنچھی آں
وچ پنجرے بولن نہیں دیندا
پھڑکن تے دے
جیہڑے تیر توں مارے نیں
سینے چوں نکلن نہیں دیندا
رڑکن تے دے

ہیت اور فن کے اعتبار سے بھی یہ ایک منفرد نظم ہے۔ الفاظ بھی اردو مزاج کے ہیں، یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس دور کے دامن کے پیشِ نظر صرف مفہوم کا ابلاغ تھا۔ الفاظ کی حیثیت ثانوی تھی اگرچہ اس نظم کی "بُنت" بڑی پُرکشش ہے لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ عمر بھر دامن نے مفہوم کو الفاظ پر قربان نہیں کیا۔

(تو صیّاد، میں قفس میں بند پرندہ، بولنے کی اجازت نہیں تو تڑپنے تو دے۔ جتنے تیر تُو میرے سینے میں اتار چکا ہے انہیں نکالنے نہیں دیتا تو محسوس کرنے کی اجازت تو دے۔)

پاکستان معرضِ وجود میں آگیا۔ وہ صبحِ آزادی جس کا نسلوں نے انتظار کیا تھا آخر کار نمودار ہوئی۔ پہلے گورنر جنرل بابائے قوم قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ کے بعد ملک کی گورنری خواجہ ناظم الدین اور ملک غلام محمد سے ہوتی ہوئی میجر جنرل سکندر مرزا تک آئی۔ اکتوبر ۱۹۵۵ء سے مارچ ۵۶ء تک اس نے بڑی شان و شوکت سے حکومت کی پھر ملک کو اسلامی جمہوریہ قرار دے کر پہلا صدر بنا، پانچ عدد وزرائے اعظم استعمال کرنے کے بعد خود "استعمال" ہوا۔ چوہدری محمد علی، حسین شہید سہروردی، آئی آئی چندریگر، ملک فیروز خان نون اور جنرل محمد ایوب خان اکتوبر ۱۹۵۸ء کے چند روز وزیر اعظم رہے۔ یہی پانچویں وزیر اعظم تھے جنھوں نے خود اسکندر مرزا کو "استعمال" کر ڈالا۔

پاکستان کے پہلے صدر نے تھوک کے حساب سے وزرائے اعظم استعمال کیے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ۵۸ء سے لے کر ۷۳ء تک اسلامی جمہوریہ پاکستان کو کسی وزیر اعظم کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔ ملک میں جو اتھل پتھل ہوئی وہ ہمارا موضوع نہیں۔ ہمارا موضوع استاد دامن ہے لہٰذا آمدن بر سر مطلب جس انداز سے اس شاعر نے ہر دور میں تخلیقات پیش کیں، ہم پیشِ خدمت کیے دیتے ہیں۔ معروضی حالات سے قطع نظر استاد دامن کی دُور رس نگاہیں آنے والے حالات کا جائزہ بھی لے رہی تھیں مگر ابتدا قائدِ ملت لیاقت علی خان کے دور سے ہوئی۔ اس زمانے میں دامن کی یہ نظم بڑی مشہور ہوئی۔

دورہ وی پیندا امریکا دا پیندا
بیگم کیہ کہندی غرارہ کیہ کہندا

یہ نظم علامتی تو تھی مگر علامت ضرورت سے زیادہ واضح تھی۔ اس دور کے کوچبان بھی اسے گنگنایا کرتے تھے۔

قارئین اس بات سے اندازہ لگا سکتے ہیں جو شخص قائدِ ملت کو معاف نہ کر سکا وہ ان کے بعد والوں کی پہاڑ ایسی غلطیوں سے درگزر کیسے کر سکتا تھا۔ یہاں دامن نے "دورے پر جانا" کو "دورہ پڑنا" بنایا اور قائدِ ملت کے دورۂ امریکا کی مذمت کی۔ ملک فیروز خان نون کا دورِ وزارت تھا جو دسمبر ۵۷ء سے اکتوبر سن ۵۸ء تک رہا۔ ذرا چشمِ تصور سے ملاحظہ فرمائیے۔ اسٹیج پر

ملک صاحب بنفسِ نفیس کرسیٔ صدارت پر تشریف فرما ہیں۔ نون کی برداشت اور دامن کی جرأت ملاحظہ ہو۔

پاکستانیئے ! واہ سبحان اللہ
لیاقت علی توں نون تک پہنچ گئے نیں

یہ کھلے بندوں ملک صاحب کی توہین تھی مگر استاد کو اندر کرنے کے بجائے فیروز خان نون نے ماہوار وظیفے کی پیش کش کی جسے درویش شاعر نے معذرت کے ساتھ قبول کرنے سے انکار کردیا۔ نہ صرف انکار بلکہ اس سے زیادہ تلخ اشعار کہے‘ نظم انقلاب کے چند اشعار۔

ٹوانے بدلے جان گے تے نون بدلے جان گے
غداراں دیاں رگاں وچوں خون بدلے جان گے
کتاب بدلی جائے گی مضمون بدلے جان گے
عدالت بدلی جائے گی قانون بدلے جان گے
آپو وچ ونڈیاں دے گھیرے بدلے جان گے
کالکاں دے بھرے ہوئے چہرے بدلے جان گے

اس نظم کے سارے الفاظ عام فہم اور سادہ ہیں۔ اسی زمانے میں یہ نظم بھی سارے پاکستان میں مشہور ہوئی عنوان تھا ”وچوں وچوں“

وچوں وچوں (اندر ہی اندر)

وچوں وچوں کھائی جاؤ تے اُتوں رولا پائی جاؤ
چاچا دے بھتیجے نوں
بھتیجا دیوے چاچے نوں
آپو وچ ونڈی جاؤ تے آپو وچ کھائی جاؤ
چھٹیاں گزار کے
کوہ مری دیاں چوٹیاں تے
غریباں نوں کشمیر والی سڑکو سڑکی پائی جاؤ
لُنڈھا مارے انھے نوں
گھسن وجے تھمے نوں
جنّے تھاتھوں انھی پوے اونی انھی پائی جاؤ

یہ نظم اس دور سے زیادہ بعد کے یعنی آج تک کے حالات کی مکمل تصویر کشی ہے۔ اندر اندر کھاتے جاؤ۔ اوپر اوپر سے شور مچاتے جاؤ۔ چاچا بھتیجے کو عطا کرے اور بھتیجا چاچے کو۔ آپس میں بانٹتے رہو آپس میں کھاتے رہو۔ خود عیش وعشرت کے لیے کوہ مری وغیرہ جاؤ اور غریبوں کو کشمیر کی مصیبت بھری سڑک پر ڈال دو۔ اندھا‘ اندھی کو مار رہا ہے تو گھونسا جاکر اس ستون کو لگتا ہے جس پر عمارت کھڑی ہے۔ جتنا اندھیر مچاسکتے ہو مچالو۔

پھر یوں ہوا کہ دورِ ایوبی آیا مارشل لا جو لا (قانون) کے منہ پر طمانچہ تھا اور ہے ملک کا دستور قرار دیا گیا۔ نواب آف کالا باغ اس دور کا اہم ستون اور ڈکٹیٹر صفت گورنر تھا۔ اس کے متعلق استاد دامن کے خیالات۔

مچھ کسے دی میری تقدیر تے نہیں
تیغ سمجھ کے ایس نال پیار کرناں
اُچے شملے تے انہاں گدیاں نوں
سجدے کرن توں میں انکار کرناں

نواب آف کالا باغ کی مونچھ اور طرہ دار پگڑی دونوں مشہور چیزیں تھیں۔ ان کا تمسخر اڑایا گیا۔ کسی کی مونچھ کیا میری تقدیر ہے کہ وہ اونچی رہے تو بخت جاگتے رہیں‘ نیچی ہوجائے تو میں بدبخت قرار دیا جاؤں۔ اس سے میں پیار کروں تو یوں سمجھو تلوار سے پیار کررہا ہوں جو میرے سینے پر بھی چل سکتی ہے۔ گدی ہو یا کسی کی دستارِ فضیلت‘ میں ان جھوٹے خداؤں کو سجدہ کرنے سے انکار کرتا ہوں۔

ایوب خان گیا تو عنانِ حکومت یحییٰ خان کے ہاتھ آئی۔ یہ نہلے پہ دہلے والی بات تھی۔ استاد نے دریا کو کوزے میں بند کیا۔

بند کرو کم ”گاؤ ماہیا“ جی او میریا ڈھول سپاہیا
سُن جا جاندیا جاندیا راہیا گیا ایوب تے پھس گیا یحییٰ

قوم کو لازم ہے کہ سارے کام بند کرکے اس قسم کے گیت گائے ”اے میرے بانکے سپاہی تو سدا سلامت رہے‘ اے جانے والے مسافر ذرا سنتے جانا۔ ایوب خان کا بوریا بستر گول ہوا اور حالات کی دلدل میں یحییٰ پھنس گیا۔“

ملکی حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے‘ لوگوں کے خواب پریشان ہوتے گئے۔ استاد ایک حساس شاعر ہونے کے ناتے معروضی حالات کی سلوٹوں کو شاعرانہ انداز میں اجاگر کررہا تھا تاکہ خرابی کے خدوخال‘ ہر سطح کے انسان کو دکھائی دے سکیں۔ ایک مزدور خطرناک دیوار کو مسمار کرتا ہے تو بظاہر یہ ”تخریب کاری“ نظر آتی ہے مگر کون نہیں جانتا کہ ”تخریب کا مزدور ہے تعمیر کا معمار“ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو استاد کا ہر تلخ شعر‘ شیریں دکھائی دیتا ہے اور پھر اقتدار کے منہ زور گھوڑے کو کوئی نہ کوئی تو لگام دینے والا ہو۔

عوام‘ معاشرہ اور صاحبانِ اقتدار۔ اس تکون سے کاروبارِ حیات چلتا ہے۔ اس گاڑی کو رواں رکھنے والی چابی اوپر والے لوگوں کے پاس ہوتی ہے اور گاڑی کا رخ موڑنے کا اختیار بھی۔ اگر احتساب کی لگام نہ ہو تو یہی گاڑی فیل بے زنجیر کی طرح معاشرے کی قدروں کو پامال کردیتی ہے۔ اسی

مقام پر سچے شاعر اور قلم کار میدان میں اترتے ہیں۔ ذاتی مفاد جتنا کم ہو گا بات اتنی پُر تاثیر ہو گی۔ مفاد سے فساد ضرور پیدا ہوتا ہے اور یہ فساد بین الاقوامی بھی ہو سکتا ہے۔ عالمی جنگیں اس کی گواہ ہیں۔

حالات کا نوحہ ملاحظہ ہو۔ کیا استاد کی نظم "پاکستان" آج کی تخلیق دکھائی نہیں دیتی۔

پاکستان

پاکستان مکان اِک بن گیا اے
وِچ سادھ اُتے تے چور بیٹھاں
ایتھے نواں حساب اِک کھل گیا اے
وِچ لکھ اُتے تے کروڑ بیٹھاں
لوکاں پہاڑاں دے پہاڑ پلٹ دِتے
اسی آئے وٹوانی دے روڑ بیٹھاں
لوکی چھن چ پہنچدے جاپدے نیں
اسی پہنچے زمین چ توڑ بیٹھاں
بھج بھج کے وکھیاں چُور ہوئیاں
مُڑ کے ویکھیا تے کھوتی بوہڑ بیٹھاں

مزاحمتی شاعری میں پیش قدمی سے پیشتر استاد دامن سے متعلقہ چند ضروری حقائق کا بیان، اس مقام پر بے حد ضروری ہے۔ ۱۹۴۷ء میں تاریخی نوعیت کی ہجرت ہوئی۔ ڈیڑھ کروڑ عوام بے گھر ہوئے۔ پندرہ لاکھ تہِ تیغ، اَن گنت آبرو ریزیاں، ایک لاکھ بیس ہزار کے قریب اغوا۔ برصغیر کا ہر باشندہ کسی نہ کسی صورت متاثر ضرور ہوا، معاشرے کی تطہیر ہوئی یا نہیں۔ یہ ہمارا موضوع نہیں مگر جو کچھ ہوا، یہ ہونا تھا اگر نہ ہوتا تو اُمتِ مُسلمہ کا شیرازہ بکھر جاتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ انسانی اندازے اس خونی سیلاب میں غلط ثابت ہوئے اور اگر نقصان کم ہوتا تو خوب ہوتا مگر یہ سودا ہر قیمت پر ہمیں منظور تھا۔ "سارا دھن جاتا دیکھیے تو آدھا دیجئے بانٹ" کے عین مطابق ۳ جون ۱۹۴۷ء والے دن قائدِ اعظم کے سر کی ایک جنبش سے ہندو و فرنگ کو سیاسی مات ہو گئی۔

باغبان پورہ والی استاد دامن کی دکان نذرِ آتش ہو گئی۔ ادبی نقصان یہ ہوا کہ "ہیر" کا مسودہ جل گیا۔ قصہ "ہیر رانجھا" متفقہ طور پر، پنجابی ادب کی بہترین کتاب تسلیم کی گئی ہے۔ وارث شاہ کے علاوہ بہت سے قدیم و جدید شعرا نے اسے موضوعِ سخن بنایا مگر جو شہرت و مقبولیت ہیر وارث شاہ کو ہوئی اور کسی کو نصیب نہ ہو سکی۔ چنانچہ ہیر کا ذکر آتے ہی ہمارے ذہن میں "ہیر وارث شاہ" ہی کا خیال آتا ہے حالانکہ

سب سے پہلے مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر کے دور میں، دمودر داس نامی شاعر نے اس قصے کو منظوم کیا پھر ۱۱۲۰ھ میں میاں چراغ، ۱۱۳۰ھ میں احمد کوی نے، ۱۱۴۰ھ میں ہیر مقبول منظرِ عام پر آئی اور وارث شاہ نے ۱۱۸۰ھ میں اسے قلمبند کیا۔ اس کے بعد بہبل نے ۱۱۹۰ھ میں، حامد شاہ نے ۱۲۴۰ھ میں، پھر

اوہ فرنگی دا کوئی نہ پتا لگدا
خورے کیہڑے مضمون تک پہنچ گے نیں

ویلے لد گئے تھوک لدان والے
چھوٹی موٹی پرچون تک پہنچ گئے نیں

روسی اُڈدے سیّارے نوں ویکھ کے تے
امریکی جنون تک پہنچ گئے نیں

کنکا ہوندیاں وی روٹی لبھدی نہیں
آٹے پھڑک کے لون تک پہنچ گئے نیں

ہندوستانی ریاستاں صاف کر کے
برما چھڈ رنگون تک پہنچ گئے نیں

پاکستانئے! واہ سبحان اللہ
لیاقت علی توں نُون تک پہنچ گئے نیں

(۱) فرنگی کی تو کوئی خبر نہیں کہ وہ کس مضمون تک پہنچ چکے ہیں البتہ یہ ضرور ہے کہ (۲) اب ان کے لئے تھوک کاروبار کا وقت گزر گیا ہے اور اب وہ پرچون فروشی تک آ گئے ہیں۔ (کبھی ان کی سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا پھر یہ حال کہ طلوعِ آفتاب کو ترسنے لگے۔ رفتہ رفتہ ہتھیائے ہوئے علاقے ہاتھوں سے نکل گئے تو چھوٹی موٹی ہیرا پھیریاں کرنے لگے)۔ (۳) خلا میں چھوڑے روسی سیارے کو دیکھ کر امریکی بھی اسی جنون میں مبتلا ہوئے۔ (روس نے پہلا خلائی جہاز سپوتنک نمبرا ۱۹۵۷ء میں زمینی مدار میں پہنچایا تھا)۔ (۴) ہمارا ملک زراعتی ہے مگر اناج کی حالت آٹے میں نمک والی ہونے لگی ہے۔ (۵) ہندوستان ساری ریاستوں کو ہڑپ کر کے برما کیا، رنگون تک جا پہنچا۔ (۶) ہم پاکستانیوں کے کیا کہنے۔ ہم (ترقی معکوس کی بدولت) لیاقت علی خان سے فیروز خان نُون تک آ پہنچے۔

ہاشم شاہ' احمد یار' محمد شاہ' شاہ شرف' علی حیدر' مولا بخش کشتہ' سائیں مولا بخش' سوختہ امرتسری' ارن سنگھ' جھوک سنگھ بھگوان سنگھ' لہورا سنگھ (استاد دامن کے دادا استاد) نے اس قصے کو تحریر کیا۔ اب اتنے قدیم وجدید شعرا کی قلمی کاوشوں کے ہوتے ہوئے' استاد دامن نے اس قصے کو موضوعِ سخن کیوں بنایا۔ اس کے متعلق یاد رکھنے والی پہلی بات تو یہ ہے کہ استاد دامن صرف اور صرف ہیر وارث شاہ ہی کو بہترین تخلیق کا درجہ دیتے ہیں۔ ان کے بقول "ہر زبان کی ادبی کتب میں' ہیر وارث شاہ جیسی کوئی کتاب نہ میں نے پڑھی' دیکھی' نہ سنی۔ یہ ادب کی معراج ہے" اب اس کے باوجود اس قصے کو دُہرانے کی وجہ ان ہی کی زبانی' پیشِ خدمت ہے "وارث شاہ کا رانجھا' پنجاب کا "گبھرو" جوان نہیں' لکھنؤ کا بانکا نظر آتا ہے' میں رانجھے کو اس کا اصل مقام دینا چاہتا ہوں۔" بہرحال یہ مسوّدہ جل گیا اور وہی کلام محفوظ رہا جو دامنِ دامن میں تھا یا لوگوں کے سینوں میں محفوظ رہ گیا تھا۔ دوسرا ناقابلِ تلافی نقصان جس سے استاد کو واسطہ پڑا وہ ان کی بیوی اور بیٹے کا داغِ مفارقت دینا تھا۔ یہ بات ذرا تفصیل طلب ہے۔

عام خیال یہی ہے کہ استاد دامن' نہ کسی کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہوا' نہ اس نے کسی صنفِ نازک کو شریکِ حیات بنایا۔ خصوصًا حجرہ شاہ حسین میں گزاری ہوئی ساری زندگی لوگوں کے سامنے تھی۔ اس میں شک و شبہے کی کوئی گنجائش نہیں کہ وہ زندگی تجرّد میں گزری مگر معدودے چند' واقفِ حال لوگوں کے کان' استاد کی زبانی شریکِ حیات کے ذکر سے آشنا ضرور ہوئے۔ ان کے قریب ترین شاگرد سائیں اختر کے بقول "ان کی بیوی کے وجود پر ان کی وفات کے بعد ہمیں یقین آیا۔ وہ سامان جو دامنِ بے سروسامان نے چھوڑا۔ اس میں ایک پرانا اٹیچی کیس تھا جس میں سے ایک ساری اور ایک بلاؤز برآمد ہوا۔ یہ لباس پرانا ضرور تھا مگر بحفاظت رکھے ہونے کی بنا پر صحیح سلامت تھا۔ ایک بار کریم بی بی (استاد کی والدہ) نے اپنے بیٹے کو شادی کی تلقین کی تو انہوں نے اعتراف کیا کہ وہ نہ صرف شادی شدہ بلکہ ایک بیٹے کے باپ بھی ہیں۔"

کچھ لوگ استاد کی بیوی کا نام "کیتھرائن" بیان کرتے ہیں مگر اکثریت کا اتفاق اس بات پر ہے کہ استاد کی شریکِ حیات کا تعلق سکھ مذہب سے تھا لیکن ایک واقفِ حال دیرینہ دوست عبدالرحمٰن کناری والے کا بیان' راقم کی تحقیق کے عین مطابق ہے۔

استادِ مکرّم حضرت احسان دانش کی زبانی پہلی بار انکشاف ہوا کہ چراغ دامن ایک بار بُری طرح گرفتارِ محبت ہوا تھا۔ اس نے شادی بھی کی مگر شریکِ حیات داغِ مفارقت دے گئی پھر اس نے دل کے سارے دروازے ہی بند کر لیے اور قرار کی چند گھڑیوں نے اسے عمر بھر بے قرار رکھا۔ حضرت دانش کا حلقۂ احباب ویسے تو بڑا وسیع تھا مگر شورش کاشمیری' حکیم نیّر واسطی' خواجہ دل محمد ایم اے سے حضرت دانش کو ایک خاص تعلقِ خاطر تھا۔ یہ بات بھی کسی سے پوشیدہ نہیں کہ دانش و دامن میں ایک قدرِ مشترک ضرور تھی یعنی معاشرے کے ستائے ہوئے لوگوں کے دکھ۔ ایک شاعر مزدور مشہور ہوا تو دوسرا ظلم وستم کے آگے سینہ سپر ہونے والا دلیر جواں مرد۔ شاید یہی وجہ تھی کہ دامن نے کسی کمزور لمحے میں زخمِ دل کی ٹیسوں کا حال اپنے ہم مسلک سے کہہ دیا ہو ورنہ عمر بھر اس نے کسی کو اپنے زخموں کی ہوا تک نہ لگنے دی۔ راقم نے ایک بار کریدنے کی کوشش کی' خیال یہی تھا کہ استادِ مکرم حضرت دانش کے بیان کی تصدیق ہو سکے مگر وہ جو دل دروازے ہی بند کر چکا تھا۔ بڑی فراست سے طرح دے گیا۔ اتنا ضرور ہے کہ "کیتھرائن" کے نام پر پہلے استاد دامن کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی' چہرہ خوش گوار انبساط سے دہکنے لگا مگر رفتہ رفتہ وہی چہرہ یاس و حسرت کی تصویر بن گیا۔ ایسی سوگوار آنکھیں تو نقد جاں ہار جانے والوں کی بھی نہیں ہوتیں۔ استاد دامن نے برمے کی طرح آرپار ہو جانے والی نگاہوں سے راقم کو دیکھا اور زیرِ لب کہا "انسانی ارادوں کی شکست' بندے کا مجبورِ محض ہونا ہی خدا کے وجود کی سب سے بڑی دلیل ہے۔" (یہ حیدرِ کرّار علی المرتضیٰؓ کا قول ہے)

مٹ چکے ہیں ذہن سے سب یادِ گزشتہ کے نقوش
پھر بھی اِک چیز ہے ایسی کہ فراموش نہیں

استاد دامن نے زبانِ حال سے اعتراف کر لیا تھا' زخموں کو کریدنا مقصود نہ تھا۔ "طرزِ اعتراف" کافی تھا۔ شاید اتنا بھی راقم کی شدّتِ طلب کا اعجاز تھا کہ "کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے" ورنہ ان سے خلافِ منشا بات کا اُگلوانا' جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ بہرحال احوال واقعی پیشِ خدمت ہے۔

"اسی زمانے میں چراغ دامن کا پنجاب میں طوطی بول رہا تھا۔ لہجے کی کاٹ دل و دماغ میں زلزلے بپا کر دینے والی تھی جب خالصہ کالج امرتسر کی طالبہ "کیتھرائن" سے چراغ دامن کی ملاقات ہوئی۔ اس نوخیز کلی کا تعلق اٹاری شام سنگھ

سے تھا جس کی وجہ سے احباب، دامن، غلط فہمی کا شکار ہوئے۔ (اٹاری شام سنگھ سکھوں کی بستی تھی)۔ امرتسر سے لاہور آئیں تو تین میل کے فاصلے پر پہلا ریلوے اسٹیشن "چھہ ہیٹہ" آتا ہے۔ ریلوے لائن اس بستی کے بیچ سے گزرتی تھی۔ (دربار صاحب امرتسر کے بعد سکھوں کا سب سے بڑا گوردوارہ اسی بستی میں واقع ہے) بستی کے جنوبی حصے کی طرف آئیں تو ریلوے لائن پر پھاٹک عبور کرنا پڑتا تھا جو اسٹیشن سے کوئی ایک فرلانگ پہلے آتا تھا۔ نوجوان چراغ دامن اپنے ایک سکھ دوست مہندر سنگھ کے ہاں مقیم تھا جب یہ واقعہ پیش آیا۔

دونوں دوست بستی کے واحد بازار سے مہندر سنگھ کی حویلی آنے لگے تو پھاٹک بند تھا۔ ادھر لاہور سے امرتسر جانے والی ٹرین چل چکی تھی۔ لوگ دونوں اطراف کھڑے پھاٹک کھلنے اور گاڑی گزر جانے کے منتظر تھے اچانک دخانی انجن کی کان پھاڑ دینے والی سیٹی سنائی دی اور دو رویہ کھڑے لوگ یہی سمجھے کہ یہ چیخ" ان کو تنبیہہ کرنے کی غرض سے ہے۔ مگر سیٹی کی مسلسل آواز نے ان کے اندازے غلط ثابت کر دیے۔ لوگ یہ دیکھ کر دھک سے رہ گئے کہ ایک سات آٹھ برس کا بچہ عین پٹری کے درمیان کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اتنی مہیب، سیاہ کالی موت کو وہ اپنی طرف آتے دیکھ کر خوف و دہشت سے منجمد ہو چکا تھا۔ حادثہ یقینی تھا، لوگ شور مچانے لگے۔ اچانک شور مچانے والوں میں سے ایک مضبوط قد کاٹھ کا پہلوان نما آدمی تیر کی طرح نکلا اور انجن کے آگے پٹری پر کود گیا اور ریلوے لائن کے سہاروں "چوبی تختے" پر سرپٹ بھاگنے لگا۔ انجن سے اس کا فاصلہ بمشکل چار گز کا ہوگا۔ اب بچے اور موت کے درمیان، یہی بھاگنے والی دو ٹانگیں حائل تھیں جن کو کسی بھی وقت، دیوہیکل انجن کچل سکتا تھا۔ ہنگامی بریکوں کی آواز، انجن کی مسلسل سنائی دینے والی چیخ میں دب چکی تھی، مہندر سنگھ نے شدت کرب سے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ بھاگتے ہوئے نوجوان نے چیل کی طرح جھپٹ کر بچے کو دبوچا اور ساتھ ہی پٹری سے باہر چھلانگ لگا دی۔ موت دونوں کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ چھلانگ لگاتے وقت وہ جوان پتھروں پر گرا مگر وہ زمین سے چپک گیا اور پائیدان اس کے اوپر سے گزرتے گئے۔ بچہ اس کے نیچے یوں دبکا پڑا تھا جیسے مرغی کے نرم و ملائم پروں تلے چوزہ۔ گاڑی تھوڑی دور جا کر رک گئی۔ سب کا یہی خیال تھا کہ بچے کے ساتھ نوجوان کے بھی پرخچے اڑ گئے ہوں گے۔ مہندر سنگھ بھاگتا ہوا آیا "اوئے چراغ، بد نصیبا! پرائی اگ وچ کُد پیاں اے" (چراغ بد نصیب! پرائی آگ میں کود پڑے ہو) اس کی چیخ بھی انجن کی چیخ سے کم نہ تھی مگر دوست کو صحیح سلامت دیکھ کر اس پر شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی۔

لوگ ٹرین کے ڈبوں سے اتر اتر کر ان کے گرد اکٹھے ہو گئے، پل بھر میں ہر مسافر صورت حال سے مکمل طور پر آگاہ ہو چکا تھا۔ لوگ چراغ دامن کو بلند حوصلگی کی داد و تحسین کے ساتھ موت کے منہ سے بچ نکلنے پہ مبارک باد بھی دے رہے تھے۔ پرائی آگ میں کودنے والا یہ طرفہ تماشا دیکھ کر ہر شخص ورطۂ حیرت میں ڈوب رہا تھا۔ انسانی جذبوں میں، طاقت ور ترین جذبہ، جذبۂ بقا (SURVIVAL INSTINCT) ہے۔ اسے صرف کوئی بلند مقصد ہی شکست دے سکتا ہے۔ خونی اور روحانی رشتوں سے باہر ایسے اعلیٰ و ارفع عمل کی مثال ذرا مشکل ہی سے ملتی ہے۔

چراغ جب پتھروں پہ گرا تو اسے چوٹیں بھی آئیں، پیشانی سے لہو بہہ رہا تھا، مہندر سنگھ رہ رہ کر اس سے بغلگیر ہو رہا تھا۔ اتنے میں ایک سترہ اٹھارہ برس کی حسین و جمیل لڑکی ہجوم میں سے راستہ بناتی ہوئی آئی اور بڑے غور سے خون آلود پیشانی والے کو دیکھنے لگی پھر بڑی بے باکی سے اس نے رومال نکالا اور آگے بڑھ کر چراغ کی پیشانی صاف کرنے لگی۔

مہندر سنگھ نے حیران ہو کر اسے دیکھا اور صرف اس قدر کہا "چھکے بھئی" "بلے بلے" اور قہقہہ لگا کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"محترمہ آپ کا رومال خراب ہو گیا" چراغ نے مسکرا کر اس نوخیز کلی سے کہا۔

"خراب نہیں، رنگین پھولوں سے سج گیا" لڑکی نے بڑی جرأت سے جواب دیا "ویسے کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتی ہوں؟"

"پوچھو، پوچھو ضرور پوچھو" مہندر سنگھ نے مداخلت کی "یہ ہمارے دیس کا گنا مشہور شاعر، چراغ دامن ہے" چراغ کے بجائے جواب مہندر سنگھ نے دیا۔

"چراغ دامن!" لڑکی نے زیرِ لب دُہرایا "آپ واقعی روشنی دینے والے چراغ ہیں، میرا نام کیتھرائن ہے اور میں خالصہ کالج امرتسر میں پڑھتی ہوں۔"

گاڑی سیٹی بجا کر چل چکی تھی۔ ریلوے لائن کے قریب کوارٹروں میں سے بچے کا والد آ کر چراغ کے ہاتھوں کو بوسے دے رہا تھا۔ کیتھرائن نے سفر ملتوی کر دیا تھا۔ لڑکی کا نام سن کر لوگوں کو اس کی جرأت و بے باکی والا عمل بھی سمجھ میں آ چکا تھا۔ اس طرح چراغ دامن اور کیتھرائن ایک منزل کے مسافر بن گئے۔

مہندر سنگھ، حضرت ناصح کے بجائے، دہکتی چنگاری کو ہوا دینے والا ثابت ہوا۔ چراغ دامن ان دنوں لاہور سے امرتسر بکثرت جانے لگا مگر عجیب بات یہ تھی کہ اس نے اپنے تعلق کو احباب سے پوشیدہ رکھا۔ ویسے بھی انسانی فطرت کے متعلق دعوے سے کچھ کہنا، حماقت کے زمرے میں آتا ہے اور معاملاتِ دل کے متعلق کچھ کہنا تو حماقت ہی نہیں پرلے درجے کی حماقت ہے۔ انسان تو اپنے دل کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا، اگلے قدم پہ جانے یہ کیا گُل کھلا بیٹھے۔

کیتھرائن نے دامن کو اس قدر ٹوٹ کر چاہا کہ ساری دنیا تیاگ دی۔ امرتسر میں دونوں کی خفیہ شادی ہوئی، ایک بیٹا بھی ہوا پھر برصغیر تقسیم ہوا۔ دامن لاہور میں تھا اور کیتھرائن امرتسر میں۔ مہندر سنگھ کی مدد سے چراغ، اپنی بیوی اور بچے کو آگ کے اس دریا سے صحیح سلامت نکال لانے میں کامیاب ہوا۔ لاہور میں عبدالرحمٰن کناری والے کو سب سے پہلے، چراغ دامن نے اس راز میں شریک کیا۔ سارا زمانہ زیروزبر کر دینے والے حالات کا شکار ہو چکا تھا۔ چراغ دامن تو بس ایک غریب شاعر تھا۔ درزیوں والا ہنر بھی شاعری کی نذر ہو چکا تھا، افلاس کی چکی میں پس کر رہ گیا۔ حساس دل بے گناہوں کے قتل، اغوا، آبروریزی، فساد اور بلووں پر خون کے آنسو رو رہا تھا۔ ادھر ایک زہریلا تیر، دلِ دامن میں ترازو ہوا۔ شیر خوار بچہ داغِ مفارقت دے گیا۔ کیتھرائن تو گویا غم کے سمندر میں ڈوب گئی۔ بچے کی وفات کے بعد وہ نفس نفس پگھلنے لگی حتیٰ کہ صدقِ دل سے موت کی دعائیں کرنے لگی۔

جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں
ہم نہیں جلتے، نفس ہر چند آتش بار ہے

ہر سانس کے ساتھ جلنے سے کہیں بہتر ہے کہ انسان ایک ہی بار بھک سے اڑ جائے۔ نامساعد حالات میں ایسا وقت ضرور آتا ہے جب انسان، زیرِ زمین سو جانے کی تمنا کرتا ہے اور اگر کوئی تسلی و تشفی دینے والا نہ ہو تو پھر خدا ہی حافظ۔

دنوں مہینوں میں کیتھرائن کی فصیلِ جاں میں جلنے والے چراغ کی لو مدھم ہونے لگی۔ وہ ہر سانس کے ساتھ پیٹ میں شدید درد کی شکایت کرنے لگی۔ شاعر کی جیب میں پھوٹی کوڑی تک نہ تھی۔ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کے فن سے وہ قطعاً نا آشنا تھا یا شاید وہ اپنے آپ کو عذاب میں مبتلا کرنا چاہتا تھا۔ جب شریکِ حیات کی زندگی کے لالے پڑ گئے تو چند روپوں کا بندوبست کر کے چراغ دامن اپنی محبت کو درِ مسیحا تک لے گیا جہاں گویا بم کا دھماکا ہوا۔ کیتھرائن کے پیٹ میں رسولی تھی اور آپریشن فوراً ہونا چاہیے تھا۔

اگر دامن کو فن بیچنے کا سلیقہ ہوتا تو ہر چیز حسبِ منشا ہو سکتی تھی۔ ان دنوں تو اس کی رسائی بہت اوپر تک تھی۔ شاید ساری بلندیاں، پستیوں میں تبدیل ہو چکی تھیں یا اس کا اپنا دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔ وہ اپنے سامنے دیے کی لو کو، آہستہ آہستہ مدھم پڑتے دیکھتا رہا۔ کہانی انوکھی تھی نہ کردار نئے تھے، ہر سمت افراتفری کا دور دورہ تھا۔ آخر ایک صبح کیتھرائن چراغِ سحری کی طرح بجھ گئی۔ اب مسئلہ اس کے کفن دفن کا تھا۔ بے کار شے کی طرح لاش کو کوڑے کرکٹ پہ پھینکا نہیں جا سکتا تھا اگرچہ ان دنوں ایسا ہی ہو رہا تھا۔

زندگی میں پہلی بار استاد دامن اپنے دیرینہ دوست عبدالرحمٰن کناری والے کے پاس گیا اور اپنا مسئلہ اس کے سامنے رکھا۔ ستم ظریفی کی حد ہو گئی، دوست بھی قلاش نکلا۔ ادھر کیتھرائن کا بے جان جسم اپنے آخری قرض کا مطالبہ کر رہا تھا۔ اچانک دوست کو کچھ یاد آیا۔

"یار چراغ! کام بن گیا" عبدالرحمٰن اٹھ کھڑا ہوا "یہ دیکھ میری انگلی میں شادی کی انگوٹھی ہے، یہ کس دن کام آئے

گی؟" اس طرح "وصل" کی نشانی "ہجر" کے کام آئی۔ دوست نے شادی خانہ آبادی والی انگوٹھی بیچ دی اور کیتھرائن کو کفن مہیا کیا گیا۔ بقول عبدالرحمٰن کناری والا "ہم نے چار مزدور اکٹھے کیے اور ان کی مدد سے چراغ کی محبوبہ کو سپردِ خاک کیا۔"

شاید یہی حالات تھے جن کی وجہ سے استاد دامن اپنی شادی کے ذکر کو جان لیوا عذاب سمجھتا رہا اور اس نے اپنی بے بسی کی تشہیر کو ناپسند کرتے ہوئے 'شریکِ حیات والے باب ہی کو کتابِ زندگی سے منہا کر دیا۔ لوگ جو چاہیں سمجھیں ایسے دکھ دینے والے ذکر کو گہری تربت میں دفن کر دینا ہی بہتر ہوتا ہے۔ ہمارے نزدیک استاد دامن کی تلخ بیانی میں اس حادثے کا بھی ہاتھ ہے۔

باغبان پورہ سے نقلِ مکانی کر کے چراغ دامن نے بادشاہی مسجد کے شمالی حجروں میں آبسیرا کیا۔ سائیں اختر جب اپنے والد کے ہمراہ خدمتِ دامن میں حاضر ہوا تو یہ حجرے ازسرِ نو تعمیر کیے جا رہے تھے۔ نانک شاہی اینٹوں کی جگہ سنگِ سرخ استعمال ہو رہا تھا۔ یہ تعمیر سر سکندر حیات کروا رہے تھے۔ (شاید یہی تعمیر اس کے لیے توشۂ آخرت بن جائے) اس ملاقات کا حال سائیں اختر ہی کی زبانی ملاحظہ ہو۔

"جب میں اپنے والد کے ہمراہ استاد دامن کی خدمت میں حاضر ہوا تو شاہی مسجد کے حجرے تعمیر ہو رہے تھے۔ چاروں طرف بڑے بڑے سرخ پتھر تھے جن میں سے راستہ بناتے ہوئے ہم گزر رہے تھے۔ اچانک میری نگاہ ایک پہلوان نما شخص پر پڑی۔ پہلے تو میں اس کی سرخ و سفید رنگت کی وجہ سے اسے بھی ایک پتھر ہی سمجھا۔ استاد ایک بوریے پر بیٹھے تھے' سامنے ایک لوٹا رکھا تھا جس پر ایک کتاب پڑی تھی' منڈے ہوئے سر پر مفلر لپیٹ رکھا تھا۔ میں خوف زدہ بھی تھا اور مرعوب بھی۔ استاد کی باتوں میں جانے کیسا جادو تھا کہ پل بھر میں میرا سارا خوف دور ہو گیا بلکہ میں عمر بھر کے لیے ان کا گرویدہ ہو گیا۔"

۱۹۴۹ء کے لگ بھگ استاد دامن مستقل طور پر مسجد ابوبکرؓ کے نیچے ایک حجرے میں منتقل ہو گئے اور تادمِ آخر وہیں مقیم رہے۔

راوی روڈ سے ٹکسالی گیٹ کی طرف جائیں تو ہیرا منڈی کی ابتدا ایک چھوٹی سی مسجد سے ہوتی ہے گویا ہر تماش بین کو مسجد کے راستے سے خرابات تک جانا پڑتا ہے۔ ویسے تو اس بازار کو بادشاہی مسجد' قلعہ لاہور اور مزارِ اقبالؒ کی قربت بھی حاصل ہے مگر قربت کا کیا ہے' اصل بات تو تعلق کی ہوا کرتی

محقق نقاد' مجنوں گورکھپوری

"داستان' کہانی یا ناول کسی دور میں بھی محض تفریح نہیں رہے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ پڑھتے وقت ہم نے ان میں تفریح کے سوا کچھ نہ پایا ہو۔ اور تو اور' الف لیلہ کی ایک ہزار ایک راتیں' طلسم ہوش رُبا کی آٹھ جلدیں اور حاتم طائی کے کارنامے وغیرہ محض تفریح نہیں' ان میں اپنے زمانے کی زندگی کا عکس صاف جھلکتا ہے اور یہ عکس تخلیقی اور معاون و مددگار ہوتا ہے یعنی تیسری سمت یعنی مستقبل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ہمیں ان کہانیوں سے یہ بصیرت ملتی ہے کہ اس وقت زندگی کیا ہے' اس کو کیا ہونا چاہیے' یہ کیا ہو سکتی ہے۔"

ہے نا۔۔۔ عمر بھر کے ساتھ میں دلی تعلق نہ ہو تو یہ قربت سو دُوریوں پر بھاری' ایک پل میں روحیں پہچان لیں تو ساری دُوریاں ختم۔ قریب تو دو متوازی خطوط بھی ہو سکتے ہیں خیر! اس تاریخی مسجد (مسجد ابوبکرؓ) کے تاریخی حجرے میں سکونت کی وجہ سے استاد کے احباب بعض اوقات چوٹ کر جاتے "استاد! آپ اس بازار میں داخل ہونے والوں سے محصول چنگی وصول کرنے پر مامور ہیں۔"

یہی وہ حجرہ ہے جس میں شاہ حسین جیسے صوفی شاعر اور درویش نے چلہ کشی کی اور اسی مسجد میں قرآن پاک کی تعلیم حاصل کی۔ بقول استاد دامن "ہم نے شاہ حسین سے یاری گانٹھ لی' اب وفا کا تقاضا یہی ہے کہ ہم اسی کے ہو رہیں۔"

دنیا جانتی ہے کہ استاد نے اس قول کو خوب نبھایا۔ مرنے کے بعد یار کے قریب دفن ہونے کی وصیت کی اور اسی جگہ ان کو دفن کیا گیا۔ گویا دوستی کو دوام حاصل ہو گیا۔ اسی حجرے میں عمرِ عزیز کے پینتیس برس گزار دیے۔ بجز یادوں کے میلوں اور مونس و غم خوار کتابوں کے' کوئی شریکِ سفر نہ تھا۔ اس حجرے میں نیا مکیں آیا تو ان گنت کبوتروں کا بسیرا تھا گویا شاہ حسین کی تجلی والا سلسلہ' ان مہر و محبت کے نمائندوں نے منقطع نہ ہونے دیا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ محبت کے یہ ہرکارے' قیام کے حقوق' نئے مسافر کے نام کر کے' خود ہی ہجرت کر گئے۔ استاد یا ان کے پرستاروں نے جانے والوں کا راستہ روکا نہ انہیں گزند پہنچایا۔ اس زمانے میں مسجد ابوبکرؓ

کے خطیب، مولانا مظفر (موجودہ خطیب) کے والد تھے جو دینی علوم پر مکمل عبور رکھتے تھے۔ استاد دامن نے حفظِ قرآن کے لیے اگرچہ باقاعدہ کسی استاد کے آگے زانوئے تلمذ طے نہیں کیا تھا، پھر بھی وہ حافظِ قرآن تھے۔ بقول استاد "میں نے کائنات کی اس، سب سے بڑی کتاب کا مطالعہ اتنی بار کیا ہے کہ اب یہ میرے سینے میں محفوظ ہو چکی ہے۔"

اکثر یوں ہوتا کہ استاد ترنگ میں آکر خوش الحانی سے تلاوتِ قرآن میں مصروف ہو جاتے (ان کا لہجہ عطا اللہ شاہ بخاری جیسا تھا) اور خطیبِ مسجد کو درِ حجرہ تک آنا پڑتا۔۔۔

"میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا"

استاد کی زندگی کا یہ تابناک پہلو اُن کے لادینی حواریوں کے لیے حیرت کا باعث تھا۔ اکثر لوگ تو آج بھی اس پر یقین کرنے کو تیار نہیں مگر ہم پوری ذمے داری سے اسے قلم بند کر رہے ہیں۔ اس حجرے میں کیسے کیسے لوگ "زیارتِ چراغ" کو آتے رہے۔ زیڈ اے بخاری، قلم اسٹار علاؤالدین، وزیرِاعظم پاکستان حسین شہید سہروردی، تنویر نقوی، لطیف ملک، وحید قاطمی... اس "دریا ساگر" کے دریادان سے کون مستفید نہ ہوا۔ استاد، خوش خوراک خوش لباس (سادہ کم قیمت مگر ستھرا) اور کھلی طبیعت کے مالک تھے۔ بڑے سے بڑے غم کو قہقہے میں اڑا دینے کے عادی۔ اس حجرے کی مشرقی جانب مولانا ابوالکلام آزاد بھی آکر ٹھہرا کرتے تھے۔ (اس جگہ محکمۂ اوقاف نے آج کل ایک تختی آویزاں کر رکھی ہے جو قیامِ آزاد کی نشان دہی کرتی ہے) پنجابی دیہاتی لباس زیبِ تن کرنے والا خود کوٹ پتلون سینے کا ماہر تھا۔ رین کن اینڈ کمپنی سے باقاعدہ سند یافتہ ماہر خیاط۔

محنت کشوں کے شاعر کا چونکہ کسی سیاسی جماعت سے رُکنیت والا رشتہ نہ تھا۔ لہٰذا ایک بار لاہور کے سابق میئر چوہدری محمد حسین (بارہ کبوتر فیم) نے مسلم لیگ میں شمولیت پہ اصرار کیا مگر اس کی دال نہ گلی۔ اس دور کے بڑے بڑے پنجابی شعرا استاد ہمدم، استاد عشق لہر، دھنی رام چاترک، ہیرا سنگھ درد، چوہدری شہاب الدین، استاد کرم وغیرہ تھے۔ مگر پورے پنجاب میں استاد عشق لہر اور محمد رمضان ہمدم کا طوطی بول رہا تھا۔ یہ شعروادب کے گویا دو اکھاڑے تھے جن میں شاعرانہ چشمک، ادبی نوک جھونک اسی انداز میں ہوا کرتی تھی جیسے اردو شعرا حیدر علی آتش اور امام بخش ناسخ کے درمیان مشہور ہے۔ اندر کی کدورت اگر حدِ اعتدال میں رہے تو یہ ادبی مُناقشے، شعروادب کی ترویج و ترقی کے لیے بڑے ضروری ہوتے ہیں۔ ہماری ذاتی رائے میں اس دور کا سب سے بڑا پنجابی شاعر نند لال نُور پوری تھا۔ اس جیسے گیت پھر کوئی تخلیق نہ کر سکا مثلاً

"گوری دیاں جھانجراں بلاوندیاں گیّاں"

(گوری کی پازیب مسلسل بلاتی گئی)

استاد ہمدم، دامن کے ہم خیال تھے لہٰذا چراغ دامن نے ہمدم کی شاگردی اختیار کی۔ ہمدم کے دوسرے مشہور شاگرد کرتار سنگھ بلگن، موہن سنگھ مہر، جسونت رائے، سندر داس زر اور فیروزدین شرف تھے گویا دو سکھ، دو ہندو اور دو مسلمان۔ ان میں سندر داس زر کا تعلق ہندوؤں کی بھابھڑا گوت سے تھا اور "بھابھڑے" مچھلی گوشت کو ہاتھ لگانا بھی مہاپاپ سمجھتے ہیں مگر اس کا کیا علاج کہ استاد ہمدم مچھلی ہی کے شوقین تھے چنانچہ۔

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

بھابھڑا مسلک ہار گیا، لگن کی جیت ہوئی۔ چوک متی میں سندر داس زر کی مچھلی کی دکان مشہور ہوئی اور وہ روزانہ استاد کی کام و دہن سے خدمت کرتا رہا۔

استاد کا حلقۂ احباب، ویسے تو بڑا وسیع تھا مگر شاگرد، سائیں اختر، وارث لُدھیانوی، حیات پسروری اور فرزند شیخوپوری مشہور ہوئے۔ قلم اسٹار علاؤالدین، استاد دامن کا منہ بولا بیٹا تھا۔ وہ ہر روز، گلبرگ کی کوٹھی سے، اس تنگ و تاریک کوٹھری میں آکر حاضری دیتا۔ بقول علاؤالدین "مجھے یہاں وہ سچائی ملتی ہے جو آج کے دور میں نعمت سے کم نہیں"

جنرل ایوب خان کا دورِ حکومت آیا جو ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۹ء تک رہا۔ فیلڈ مارشل کا رینک، پلیٹ میں سجا کر پیش کیا گیا۔ حالانکہ وسائل و مسائل، آبادی، رقبے ہر لحاظ سے ہم میجر جنرل تک کے مجاز تھے۔ وسائل کا کیا ہے اس لحاظ سے تو ہمیں سواری کے لیے صرف سائیکلیں استعمال میں لانی چاہئیں مگر کاروں کی ریل پیل میں ہمارے پڑوسی ممالک، ہم سے کوسوں پیچھے ہیں۔ آج کے دور کا، دورِ ایوبی سے موازنہ کریں تو وہ رحمت نظر آتا ہے مگر اس وقت کی زیادتیاں، پہاڑوں سے بڑی دکھائی دیتی تھیں۔ قوم کو مروّجہ جمہوریت کا نااہل قرار دیا گیا۔ صدارتی انتخاب کا ڈھونگ رچایا گیا۔ جو "بلٹ" سے آیا تھا۔ "بیلٹ" سے کیسے جا سکتا تھا۔ کسی میں مقابل آنے کی جرأت تھی نہ حوصلہ۔ یہ فریضہ مادرِ ملت نے ادا کیا۔ استاد دامن اپنی بصارت و بصیرت کے طفیل مارشل لا کو ملک کے لیے زہرِ قاتل سمجھتے تھے۔ لہٰذا مارشل لا نافذ کرنے والوں کو وہ کیسے پسند کر سکتے تھے پھر جس انداز میں

”چراغِ قوم“ نے مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح کی حمایت کا اعلان کیا اس سے ثابت ہوگیا کہ ”ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں“ ملاحظہ ہو اس دور کی تخلیق نظم عنوان ہے ”ماں“

ناانصافی کے خلاف آواز بلند کرنا استاد کے لیے کوئی نئی بات نہ تھی۔ مزدور لیڈر ابراہیم اور احمد سعید کرمانی کے درمیان مقابلہ ہوا۔ گنتی ہوئی تو سارے ووٹ مزدور لیڈر لے گیا۔ کرمانی صاحب کے حصے میں خالی صندوقچیاں آئیں یاروں نے ”بیلٹ باکس“ ہی غائب کردیے اور کرمانی صاحب کی جیت کا اعلان کردیا۔ اس روز استاد کی حالت زخمی چیتے جیسی تھی۔

عطا اللہ شاہ بخاری، دامن کے بہت بڑے قدر دان تھے۔ تقریر کا آغاز اکثر کلامِ دامن سے ہوتا۔ برصغیر کا یہ مایۂ ناز مقرر متفقہ طور پر خطابت کا شہنشاہ جب سفرِ آخرت پر رخصت ہوا تو استاد نے یہ اشعار کہے۔

باپو سہک مویا سُکّے ٹکڑیاں نُوں
پُتّر پُوڑیاں دان کر اوندے نیں
جیوندی جان نہ رہن نوں تھاں دِتی
مویاں بعد مقبرے بناوندے نیں

۱۔ باپ خشک ٹکڑوں کو ترستا مرگیا بیٹے صدقے میں پوڑیاں اور مرغن غذائیں خیرات کررہے ہیں۔
۲۔ زندہ تھا تو رہنے کو جگہ نہ تھی پس از مرگ اس کا مقبرہ بنایا جارہا ہے۔

اسی موضوع کو بعد میں دوسرے شعرا نے بھی منظوم کیا۔ یہ حرکت اگرچہ دوسرے کا ”اُگال چرنے“ کے مترادف ہے مگر کیا کیا جائے کہ یہاں ایسا ہوتا ہے اور ڈنکے کی چوٹ پر ہوتا ہے۔ ہم میاں محمد بخش سیف الملوک والے کا ایک شعر مع ترجمہ نقل کررہے ہیں۔ تبصرہ اور فیصلہ آپ خود کریں۔ غزل کا شعر ہے۔

دلبر دے وچھوڑے اندر، ازے رہیا میں زندہ
ایس گناہ تھیں آخر توڑی، سدا رہواں شرمندہ

محبوب کے ہجر میں میں ابھی تک زندہ ہوں، اس گناہ پر ہمیشہ شرمندہ رہا۔

ایک دلچسپ واقعہ ملاحظہ ہو۔ جس زمانے میں راجا غضنفر علی، ہندوستان میں بطور سفیر اپنے فرائض سرانجام دے رہے تھے، ان کی مساعیٔ جمیلہ سے دوستانہ کرکٹ میچ کھیلنے ہماری کرکٹ ٹیم، ہندوستان کے دورے پر گئی۔ دوسرے شعبوں سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی کثیر تعداد میں اس

ماں

پُتّر نال مقابلہ ماں دا اے
پُتّر اسی وی ہاں، اپنی ماں ول آں

ساہنوں صدر دے سائے دی لوڑ نائیں
اسی ٹھنڈی بہشتاں دی چھاں ول آں

پتا لگے گا ساریاں پُتّراں دا
بولاں، بولیاں دا کیہڑا بھا پاندا

لاج رکھدا کون چٹے جھاٹیاں دی
کون ماں دے سر چ سواہ پاندا

کل نُوں ایہہ نہ کہن جہان والے
پُتّر اے کاہدے اپنی ماں کھاگئے

ایہناں کولوں بچالو بچیاں نُوں
ککڑ کھان لگے سارے کاں کھاگئے

(۱) یہ ماں بیٹے کے درمیان مقابلہ ہے۔ ہم بھی بیٹے ہیں مگر ماں کا ساتھ دینے والے۔ (۲) ہمیں اس صدر کے سائے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہم جنّت کی ٹھنڈی چھاؤں کا انتخاب کرچکے ہیں۔ (۳) اب معلوم ہوگا، کون پوت ہے اور کون کپوت۔ کون اپنی زبان پر قائم رہتا ہے؟ (۴) کون ماں کے سفید بالوں کی لاج رکھتا ہے اور کون ماں کے سر میں راکھ ڈالتا ہے؟ (۵) ہمیں تو یہی خیال ستارہا ہے کہ کل کلاں لوگ یہ نہ کہنے لگیں کہ یہ کیسے بیٹے ہیں جو اپنی ماں کو کھاگئے۔ (۶) مقابلے میں آنے والے لوگوں سے اپنی اولاد کو بچالو۔ یہ مرغ اور کوّے میں تمیز نہیں کرسکتے، حرام حلال سب ہڑپ کرجانے والے لوگ ہیں۔

کے ہمراہ تھے۔ امرتسر کے شعرا نے ایک مشاعرے کا اہتمام کیا۔ استاد دامن بھی مدعو تھے۔ استقبالیہ کمیٹی کے ایک صاحب نے استاد کو دیکھ کر سرگوشی کی۔ ”ہم نے مشاعرے کا انعقاد کیا ہے، یہ پہلوان کیا لینے آگیا ہے۔“

استاد نے یہ سرگوشی سن لی۔ اسٹیج پر کلام عطا کرنے سے پہلے انہوں نے امرتسریوں سے کہا ”حضرات! ابھی ابھی ایک صاحب میرے متعلق فرمارہے تھے کہ مشاعرہ گاہ میں پہلوان کیا کرنے آگیا ہے تو عرض ہے، میں پنجاب کا شاعر ہوں، یوپی کا قلمدان نہیں ہوں۔“

لال قلعہ دہلی والے مشاعرے کا ذکر بطورِ خاص پیش کیا جارہا ہے۔ پاک و ہند میں یہ واقعہ بڑا مشہور ہوا۔

خصوصی دعوت پر استاد دامن اس مشاعرے میں شریک ہوئے۔ پنڈت جواہر لعل نہرو وزیر اعظم تھے۔ ان کو استاد کی آمد کا پتا چلا تو وہ بھاگم بھاگ مشاعرہ گاہ پہنچے۔ ایک روایت کے مطابق وہ اسٹیج پر براجمان تھے مگر حقیقت یہ ہے کہ وزیر اعظم ہند نے 'اپنی شرکت کو مخفی رکھا اور شعرا کی نظروں سے او جھل ایک کونے میں بیٹھ گئے۔۔۔۔ خیر! یہ بحث غیر متعلقہ ہے۔ اس مشاعرے کی صدارت بھارت کے صدر' راجندر پرشاد کررہے تھے۔ استاد نے اپنی نظم "ونڈ" (تقسیم) شروع کی اور جب اس شعر پر پہنچے۔

لالی اکھیاں دی پئی دسدی اے
روئے تسی وی او' روئے اسی وی آں

تو نہرو کے ہاتھ سے صبر کا دامن چھوٹ گیا۔ وہ بھاگتا ہوا اسٹیج پر پہنچا اور استاد دامن سے بغلگیر ہوگیا۔ گریہ سے اس کی چیخیں نکل رہی تھیں۔ کافی دیر وہ اشک بہاتا رہا' حالت ذرا پر قابو پایا تو اس نے استاد سے درخواست کی "استاد! میری اور سارے ہند کی پرجا کی التجا ہے کہ آپ ہندوستان' آجائیں ہر ممکن سہولت مہیا کرنے کا میں وعدہ کرتا ہوں" پنڈت جی کے ہونٹ اس وقت لرز رہے تھے۔

"پنڈت جی!" استاد نے اپنے آپ کو ان کی بانہوں کے حلقے سے آزاد کراتے ہوئے کہا "یہ ناممکن ہے' اب پاکستان بن گیا ہے اور میرا مرنا جینا اب اسی ملک کے ساتھ ہے۔ آپ کی پیش کش کا شکریہ مگر میں رہوں گا اپنے پاکستان میں' خواہ مجھے جیل میں رہنا پڑے۔" استاد نے اپنے جذبات کو ان الفاظ میں ظاہر کیا۔

میرے ہنجواں دا پانی پی پی کے
ہری بھری ایہہ بنجر زمین ہووے
ایہدے چہرے اُتے سُرخی چاہیدی اے
میرے خون تھیں بھاؤیں رنگین ہووے

۱۔ میرے آنسوؤں سے سیراب ہوکر یہ بنجر زمین سرسبز ہوجائے۔

۲۔ مجھے تو اس کے چہرے کی سرخی درکار ہے خواہ وہ سرخی میرے خون سے آئے۔

ارضِ پاکستان سے اس محبت کے اظہار کے بعد استاد کی پاکستانیت کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

پنڈت نہرو کی بغلگیری والے منظر کو ایک فوٹو گرافر نے مقید کیا اور دوسرے روز یہ تصویر اخباروں کی زینت بنی۔

نہرو اشک بار تھا اور استاد دامن مسکرا رہے تھے۔ یہ اخبار حجرہ شاہ حسین میں کافی دیر محفوظ رہا۔

سن پینسٹھ کی جنگ میں استاد کی یہ نظم مشہور ہوئی۔ عنوان ہے۔ "مکّاری"

چرچے مہاتما جی دے فلسفے دے
ایس طرح وِچ سارے جہان ہوگئے
توپاں گڈ کے ڈھونڈدے شانتی نُوں
ہند منتری' جگ پردھان ہوگئے
کھوہ کھنج کے مُلکی ریاستاں نُوں
آپے ایشیا دے نگہبان ہوگئے
اپنے زعم وِچ' چڑھ پاکستان دوڑے
اگّوں پیّاں تے ڈاہڈے پریشان ہوگئے
ایدھر سُتیاں نمازیاں جاگ آئی
اُٹھے اُٹھ کے تے سوا دھان ہوگئے

یہ نظم مہاتما گاندھی کے اہنسا پر مو دھرما (کسی جاندار کو دکھ نہ دینا) کے فلسفے پر چوٹ ہے۔ ہند' آج بھی اہنسا کا پرچار کرتا رہتا ہے۔

۱۔ اہلِ ہند' مہاتما گاندھی کے فلسفے اہنسا کی سارے جہان میں اس طرح تشہیر کررہے ہیں کہ

۲۔ توپوں کی مدد سے امن کے متلاشی ہیں' ہندی وزیر جہان کے چوہدری بننا چاہتے ہیں۔

۳۔ ہندی ریاستوں کے وجود کو لوٹ کھسوٹ کر پورے ایشیا کے رکھوالے بن بیٹھے۔

۴۔ (کمزور ریاستوں کو ملیامیٹ کرنے کے بعد) اسی گھمنڈ میں پاکستان پر چڑھ دوڑے۔ آگے سے ملا مُنہ توڑ جواب' اب پریشان ہورہے ہیں۔

۵۔ سوئے ہوئے نمازیوں کو جاگ آگئی۔ وہ اُٹھے اور اُٹھ کر حریف پر حاوی ہوگئے۔

نظم "مان" کے چند شعر

"مان" (فخر' غرور)

لہور شہر تھیں دلّی کجھ دُور تے نہیں
اسی غزنی توں چل کے آوندے رہے
گنگا جمنا وی ویکھے نیں ترتر کے
اسی تارُو ہاں ساریاں پانیاں دے
سومنات نہ بچے گا نمازیاں تھیں
اچن چیت حملے کرنا جانتے آں
بھاؤیں لہودی وگدی نہر ہووے

سرخرو ہوکے ترنا جانن آں

۱۔ لاہور سے دلی کا فاصلہ کوئی زیادہ نہیں ہم تو غزنی جیسے علاقے سے آتے رہے ہیں۔

۲۔ ہم گنگا جمنا جیسے دریاؤں کی طغیانیوں میں تیرتے رہے ہیں۔ ہم ہر قسم کے پانیوں کے تیراک ہیں۔

۳۔ سومنات اب بھی نمازیوں کی زد سے نہ بچ سکے گا کیونکہ ہمیں اچانک حملہ کرنے کا طریقہ آتا ہے۔

۴۔ خواہ راستے میں خون کی ندی بہہ رہی ہو، ہم کامیابی سے اسے عبور کرنے کا فن جانتے ہیں۔

یہ سارا کلام سن پینسٹھ کے دور کا ہے۔ وہ وقت ہی ایسا تھا جس نے سارے گھریلو اختلافات دلوں سے بھلا دینے کا موقع فراہم کیا اور پوری قوم نے ایک بار پھر یکجہتی کا سنہرا نمونہ پیش کیا۔ استاد دامن کا کسی سے اختلاف تھا تو وہ ذاتی نوعیت کا نہ تھا۔ قومی مفاد اسے اختلاف پہ مجبور کرتا اور وہ امیدِ بہار میں شجر سے پیوستہ رہنے پہ مجبور تھا لیکن وہ اپنے حساس دل کا کیا کرتا، ذرا سی ناانصافی اسے بے چین کر دیتی۔

دورِ ایوبی گیا۔ ملک دولخت ہوا۔ ذوالفقار علی بھٹو، عوامی طاقت بن کر سیاستِ پاکستان کے اُفق پر طلوع ہوا۔ سب نے سکھ کا سانس لیا۔ روٹی، کپڑا اور مکان کا نعرہ بڑا ہی خوشگوار، بڑا سکون بخش تھا مگر ایک بار پھر عوام مایوسیوں کا شکار ہوئے۔ یہ ایک ایسا دھچکا تھا کہ لوگ اندر باہر سے ہل گئے۔ استاد نے معرکہ آرا نظم تخلیق کی۔ انداز اس جھنجلائے ہوئے انسان کا تھا جیسے کوئی کہہ رہا ہو۔ تم سے یہ اُمید نہ تھی۔ عنوان بھی اسی قسم کا تھا یعنی کیہ کری جانا ایں (کیا کرتے جا رہے ہو)

کیہ کری جانا ایں

ایہہ کیہ کری جانا ایں۔ ایہہ کیہ کری جانا ایں
کدے چین جانا ایں۔ کدے روس جانا ایں
بن امریکا دا جاسوس جانا ایں
کدے شملے جانا ایں۔ کدے مری جانا ایں
ایہہ کیہ کری جانا ایں۔ ایہہ کیہ کری جانا ایں
کدے امریکا کدے روس جانا ایں
ہر پاسے بن کے جلوس جانا ایں
اُڑائی ساری قوم دا فلوس جانا ایں
لاہی کھیس جانا ایں تے بُکّی وری جانا ایں
ایہہ کیہ کری جانا ایں۔ ایہہ کیہ کری جانا ایں

ساری نظم سادہ عام فہم الفاظ میں لکھی گئی ہے مگر مفہوم گہرا، چوٹیں شدید ہیں۔ یہاں استاد سے ایک اندازے کی غلطی ہو گئی۔ وہ یہ بھول گیا کہ قوم پے در پے مشکلات کا سامنا کرتے کرتے، جھنجلاہٹ میں مبتلا ہو چکی ہے تو صاحبانِ اقتدار کا ظرف بھی، وہ نہیں رہا۔ چنانچہ لینے کے دینے پڑ گئے۔ محترم بھٹو کے دستِ راست غلام مصطفیٰ کھر، پنجاب کے حکمران تھے۔ اقتدار کی جبیں پر شکنیں نمودار ہوئیں تو کھر تک آتے آتے ہر شکن، غیظ و غضب میں بدل گئی۔ گرجتی توپوں کے منہ درویش شاعر کے حجرے کی طرف ہو گئے۔ شاعر صرف الفاظ کے ہتھیاروں سے مسلح تھا۔ البتہ ملک کا ہر بے سروسامان اس کے ساتھ تھا۔

غنڈوں سے حجرے کا تقدس پامال کرایا گیا۔ دامن کی باسٹھ سالہ ضعیفی کا بھی خیال نہ رکھا گیا۔ شاید یہ ناپاک نوالوں کا اثر تھا کہ نشۂ اقتدار میں کسی کو خوفِ خدا بھی نہ رہا۔

صاحبانِ اقتدار سے بھی بہت بڑی غلطی سرزد ہو گئی۔ اس شخص کو مُہر بہ لب کرنا چاہا، گویائی جس کا ایمان تھی۔ استاد نے خاموش ہونے کے بجائے بے نیازی سے کہا۔

اِک بندہ ہے پاکستان اندر
ہور سبھے ای رام کہانیاں نیں
بھاوٗیں بھٹو ہووے بھاوٗیں وٹو ہووے
صدر ایوب دیاں، وٹوانیاں نیں

۱۔ پاکستان میں صرف ایک انسان بستا ہے۔ باقی سب کہانیاں جھوٹی ہیں۔

۲۔ یہ بھٹو ہوا یا وٹو ہوا (ان کی اوقات ہی کیا ہے) یہ سب صدر ایوب کے استنجے کے ڈھیلے ہیں۔

اس طرح حجرہ شاہ حسین کی تاریخ دُہرائی گئی۔ مشہور و معروف "بم کیس" میں استاد کو اندر کر دیا گیا۔ پہلی بار جب "چراغ حجرہ" کو گرفتار کیا گیا تو مختلف تھانوں میں رکھا گیا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ کہیں اس کے چاہنے والے استاد کے ٹھکانے سے باخبر نہ ہو جائیں۔ سائیں اختر دو تین روز کی غیر حاضری کے بعد استاد سے ملنے پہنچے تو ہر پل، کھلا رہنے والے دروازے کے کواڑ بند تھے۔ زنجیر و قفل اس کا منہ چڑانے لگے۔ اس نے حیران ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا، لوگوں سے پوچھا۔

"استاد کو پولیس پکڑ کر لے گئی ہے" قطب چائے والے نے کہا۔ سائیں بوکھلا کر رہ گیا۔ وہ تو صرف شاعر تھا، ان معاملات سے اتنا ہی دور تھا جتنا، صاحبانِ اقتدار خوفِ خدا سے۔ علاؤالدین سے رابطہ قائم کیا گیا۔

وہ استاد کی ضمانت دے کر یا جانے کس طرح رہائی دلا چکا تھا اور استاد گلبرگ میں اپنے منہ بولے بیٹے کے پاس ہی تھا کیونکہ وہ حجرے تک آنے کے قابل ہی نہ رہا تھا۔ سائیں

اختر جب گلبرگ پہنچا تو حجرہ نشین' لحاف اوڑھے لیٹا تھا۔ سارا جسم اقتدار سے ٹکرانے کی منہ بولتی تصویر بنا ہوا تھا۔ ہماری پولیس تشدد میں واقعی فنکارانہ صلاحیتوں کی مالک ہے۔

رفتہ رفتہ لاہور کے اکثر تھانوں سے "مجرم" کا تعارف ہوگیا۔ وہ "مہمان نوازی" سے کترانے لگے اور الٹا "استاد دامن' استاد دامن" کہہ کر عزت سے پیش آنے لگے۔ مقدمہ معمولی نوعیت کا نہ تھا "بم کیس" تھا۔ دہشت گردی کا خوفناک وخطرناک معاملہ تھا۔ لہٰذا مجبوراً مجرم کو جیل میں ٹھونسنا پڑا۔ یہ شاید مجبوری تھی۔

"مجرم" کی طرف سے اس مقدمے کی پیروی مشہورو معروف ایڈووکیٹ اکبر لاہوری نے کی اور پیروی کا حق ادا کردیا۔ جس روز استاد دامن پولیس کے نرغے میں حاضرِ عدالت ہوا تو گویا ساکن جھیل میں طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ شعرا' وکلا' محنت کش' دانشور' ادیب ایک ہجوم تھا جو عدالت پر ٹوٹ پڑا۔ کرسیٔ عدالت پر بیٹھا منصف کن انکھیوں سے "دہشت گرد مجرم" کو دیکھتا اور پھر مقدمے کی فائل سے کھیلنے لگتا۔ اکبر لاہوری نے ملزم کے تعارف کے بعد ضمانت کی درخواست پیش کی جو رُد ہوئی پھر اس ایڈووکیٹ نے حریفوں کے بخیے ادھیڑ ڈالے۔ "می لارڈ" اس نے کہا "یہ بم کا مقدمہ شاید حجرے کی پیمائش کو مدِ نظر رکھ کر تشکیل دیا گیا ہے ورنہ ملزم استاد دامن کے سیاق وسباق کے پیشِ نظر' مقدمہ توپ یا ٹینک کا ہونا چاہیے تھا۔ کیا شاہ کی شان میں گستاخی واقعی ناقابلِ معافی جرم ہے؟"

"میں اپنے آپ کو استاد دامن کی جگہ گرفتاری کے لیے پیش کرتا ہوں۔ یہ درویش ہماری آبرو ہے' اسے چھوڑ دو اور مجھے گرفتار کرلو۔" برصغیر کا معروف شاعر حبیب جالب خاموش نہ رہ سکا۔

اس جگہ مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے' استاد دامن نے تاریخی الفاظ کہے۔ "یاد رکھو' جس کے ایما پر مجھے آج اس کٹہرے میں کھڑا کیا گیا ہے۔ میرا خدا کل یہی سلوک اس سے کرنے والا ہے" پھر استاد نے بڑی عجیب وغریب مسکراہٹ سے اوپر دیکھا "اس لیے کہ میرے اپنے یار سے بڑے خوش گوار تعلقات ہیں۔ اس کا جو حشر ہوگا دنیا دیکھے گی" یہ استاد نے زیرِ لب کہا۔

اکبر لاہوری نے منصف کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "می لارڈ! تاریخ میں یہ ضرور لکھا جائے گا کہ کس وقت' کس حکومت نے کس شخص کے متعلق کس عدالت میں کیا فیصلہ کیا۔"

مسجد ابوبکرؓ کے اس حجرے کے ایک مکین کے ساتھ بہت پہلے تقریباً ایسا ہی سلوک کیا گیا تھا۔ عجیب اتفاق ہے کہ ماضی بعید میں حجرہ نشین سے زیادتی کرنے والے کا وہی حشر ہوا جو استاد دامن کو پابندِ سلاسل کرنے والوں کا ہوا۔

"حقیقت الفقرا" میں مرقوم ہے کہ مغلِ اعظم اکبر کے دورِ حکومت میں' ملکی استقامت کے پیشِ نظر' جاسوسوں اور مخبروں کا جال سلطنت کے کونے کونے میں پھیلا ہوا تھا۔ لاہور کے مخبروں نے دربارِ اکبری میں رپورٹ پیش کی کہ "شاہ حسین نامی ایک شخص' فقیروں کے بھیس میں' مشتبہ حالت کا مرتکب پایا گیا ہے' وہ سرخ لباس زیب تن کیے شراب کے نشے میں مست' گلی کوچوں میں رقص کرتا پھرتا ہے۔ اس کی داڑھی مونچھ بھی نہیں۔" شہنشاہ جانے کس حال میں بیٹھا تھا جب یہ رپورٹ اسے پڑھ کر سنائی گئی۔ اس نے فوراً کوتوال' ملک علی خان کو شاہی فرمان بھیجا "ملزم شاہ حسین کو پابجولاں' دربارِ اکبری میں حاضر کیا جائے۔"

ملک علی خان نے سرتوڑ کوشش کی مگر ملزم گرفتار نہ ہوسکا۔ اسی زمانے میں دُلا بھٹی' ساندل بار کے فرید بھٹی کا قابلِ صد فخر فرزند' گرفتار کرکے لاہور لایا گیا۔ اسے سرِعام پھانسی کا حکم ہوا۔ جس روز حکمِ شاہی کی تعمیل ہونا تھی۔ اِک ہجومِ بیکراں اکٹھا ہوگیا' شاہ حسین بھی فقیری لباس میں وہاں موجود تھا۔ (اس کی وہاں موجودگی کی ایک الگ داستان ہے) اسے بھی گرفتار کرلیا گیا۔

کوتوال جب شاہ حسین کو ہتھ کڑی پہنانے لگا تو وہ کمزور کانچ کی طرح "چھن" سے ٹوٹ گئی۔ کوتوال نے پھر کوشش کی' وہی نتیجہ نکلا۔ حاکمِ لاہور غضبناک ہوگیا۔ "سُن او جادوگر!" اس نے قہر آلود نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا "اس چمتکار سے میں مرعوب ہونے والا نہیں' میں تیرے سر میں لوہے کی میخ ٹھونک دوں گا۔"

"تو نے اپنی سزا کا خود اعلان کردیا' فرعون نے بھی ایسا ہی کیا تھا" شاہ حسین نے سوگوار لہجے میں کہا۔

اسی وقت حاکمِ شہر کو نیا فرمان موصول ہوا "دُلا بھٹی ولد فرید بھٹی کو فوراً دار پر لٹکا دیا جائے اور ساری کارروائی دربارِ اکبری میں لکھ کر بھیج دی جائے۔"

عبداللہ بھٹی کو دار پر کھینچ دیا گیا مگر سزائے موت سے پیشتر عبداللہ بھٹی نے شانِ اکبری اور حاکمِ شہر کو بے نقط سنائیں' ملک علی خان نے بصیرت سے کام نہ لیتے ہوئے' ساری کارروائی یعنی جو کچھ پیش آیا اور جس طرح پیش آیا

لفظ بہ لفظ لکھ کر شاہی دربار میں بھیج دیا۔

بھرے دربار میں جب یہ اخلاق سوز تحریر پڑھ کر سنائی گئی تو جلالِ اکبری، قہر میں بدل گیا "کوتوال کی یہ جرأت؟" شہنشاہ اکبر نے گرج کے کہا "آدابِ شاہی کی یہ توہین؟ اس ناہنجار، ملک علی خان کی کمر میں آہنی میخ ٹھونک دی جائے" مغلِ اعظم نے اسی وقت سزا کا اعلان کردیا۔

کیا یہ تاریخی اتفاق نہیں! بصیرت والوں کے لیے مقامِ عبرت ہے۔ شاہ حسین کی طرح استاد دامن کا بھی کچھ نہ بگڑا، پسِ دیوارِ زنداں سے کیا ہوتا ہے۔ حق بات کہنے کی پاداش میں "جیل یاترا" تو شیوائے مردانگی ہے۔ صاحبانِ اقتدار کے بس میں بہت کچھ ہوتا ہے مگر اس کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ بے شک سروں کی فصل کاٹ دی جائے، زباں بندی کا اعلان ہو، شعلے تو دماغوں کے اندر بھی فروزاں ہوجاتے ہیں۔ ہوائیں سرگوشیاں کرنے لگتی ہیں۔ ان کو پابندِ سلاسل کون کرسکتا ہے۔

قفس ہے بس میں تمہارے، تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتشِ گل کے نکھار کا موسم
صبا کی مست خرامی تہِ کمند نہیں
اسیرِ دام نہیں ہے بہار کا موسم

نام نہاد بم کیس میں کچھ بھی ثابت نہ ہوسکا۔ استاد دامن کو "تھانہ بتی" میں رکھا گیا۔ ادھر فلم اسٹار علاؤالدین اور دیگر پرستار حرکت میں آگئے۔ جہانگیر بدر کا بھائی جمیل بھی حجرہ نشین کا حلقہ بگوش تھا۔ کوٹھری میں اکثر حاضری دیا کرتا تھا، اس سے رابطہ ہوا۔ پاکستان ویٹ لفٹنگ ایسوسی ایشن کے سیکریٹری یوسف بٹ سے رابطہ قائم کیا گیا۔ طے یہ پایا کہ کسی ایسے کارکن کی خدمات حاصل کی جائیں جو اقتدار میں بے شک نہ ہو مگر پاکستان پیپلز پارٹی میں اس کا وزن بہت زیادہ ہو۔ ایسا کارکن جس کی بات رد ہونے کا امکان ہی نہ ہو۔ ایک ویٹ لفٹر نے موہنی روڈ پر رہائش پذیر، پاکستان چیمپئن مظفر علی بٹ کا نام تجویز کیا۔ (موصوف کی رہائش آج کل ندیم شہید روڈ لاہور کے محلے میں ہے۔ پنجاب ایگزیکٹیو کونسل کا ممبر اور پارٹی اسپورٹس سیکریٹری بھی ہے) یہ تمام لوگ اوپر تک جا پہنچے۔ ادھر اکبر لاہوری نے فریقِ مخالف کے گویا بخیے ادھیڑ دیے تھے۔ مقدمے میں جان ہی نہ رہی۔ آخر مجبور ہو کر حکومتِ وقت نے یہ بم کیس والا مقدمہ واپس لے لیا اور استاد دامن کی حب الوطنی بحال ہوگئی۔ حوالات سے باہر آکر دامن نے دل کا غبار ان الفاظ میں نکالا۔

غلام مصطفیٰ کھراہی چلّے اپنے گھر
تُو جو چاہے سو کر نہیں ساہنوں کسے دا ڈر

آخری مصرع غم وغصے اور دلی نفرت کے اظہار سے بھرپور ہے۔ یہ الفاظ بصارت کے لیے نہیں ہوتے ان کو صرف سماعتیں ہی برداشت کرسکتی ہیں، لہٰذا ہم بھی قلم روکتے ہیں۔

ذوالفقار علی بھٹو کا طوفانی دور ختم ہوا "مارشل لا" نے پھر اسلامی جمہوریہ پاکستان کے در پر آ دستک دی۔ نام نہاد دانشوروں نے یہ بھی کہا کہ ملک خانہ جنگی سے بچ گیا۔ نوّے دن میں انتخابات کا وعدہ ہوا مگر وہ وعدہ ہی کیا جو ایفا ہو۔ یہ نوّے دن محبوب کی زلفِ دراز سے بڑھ کر "طولِ شبِ فراق" تک جا پہنچے۔ استاد دامن کا تبصرہ ملاحظہ ہو۔

خانہ جنگی توں ساہنوں بچاگئی اے
صدقے جاناں میں اپنی "آرمی" دے
وانگ عینک دے نک تے بیٹھ کے تے
دونویں کن پھڑلیے ہر آدمی دے

(میں قربان جاؤں اپنی فوج کی اس ادا پر، ہمیں خانہ جنگی سے تو بچالیا مگر عینک کی طرح ناک پر براجمان ہوکر ہر آدمی کے دونوں کان پکڑ لیے)

مارشل لا پہ ایسا طنز ایسی لطیف چوٹ ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ مارشل لا ہی کے متعلق استاد کی صرف ایک نظم مزاحمتی ادب تخلیق کرنے والے شعرا کے دیوانوں پر بھاری ہے۔ اس دور میں اکثر شعرا اشارے کنائے میں بات کرتے ہوئے بھی، اندر باہر سے لرزتے تھے۔ خصوصاً ذوالفقار علی بھٹو کے انجام کے بعد تو ہوائیں دم بخود تھیں اور فضاؤں پہ سکوتِ مرگ طاری ہوچکا تھا۔

ملاحظہ ہو اس دور کی تخلیق۔ نظم کا عنوان تھا "مارشل لا"

اس نظم کا یہ شعر۔

ساہڈے ملک دیاں موجاں ای موجاں
جدھر ویکھو فوجاں ای فوجاں

(ہمارے ملک کے تو عیش ہوگئے جدھر نظر دوڑائیں فوج ہی فوج نظر آئے گی)

ملک کے کونے کونے میں مشہور ہوا اور ضرب المثل کیا "کلاسک" کا مقام حاصل کرگیا۔

مزاحمتی ادب میں استاد دامن کے پیشِ نظر صرف اور صرف ابلاغ تھا۔ ایک تو پنجابی زبان جغرافیائی لحاظ سے محدود

تھی۔ اگر مفہوم قربان کر کے "الفاظ" کو ترجیح دی جاتی تو مقصد ہی فوت ہو جاتا۔ اس لئے استاد نے سادہ الفاظ کا استعمال شروع کیا پھر یہ عادتِ ثانیہ بن گئی۔ مگر استاد کی دوسری شاعری میں الفاظ کے نگینوں اور نکتہ آفرینیوں کے میلے لگے نظر آتے ہیں۔ استاد کی سوچ پر عمر اور تجربے کا اثر ضرور ہوا اور سیکولر ذہن کے مالک نے آخر کار یہ کہا۔ (غیر مزاحمتی شاعری کا آغاز اس شعر سے ہم کرتے ہیں)

وَدھ ایس تھیں معجزہ کیہ ہونا
دامن جئے دِلوں مسلمان ہوگئے

(اس سے بڑا معجزہ کیا ہوگا کہ دامن جیسا انسان دل سے مسلمان ہوگیا)

دنیا جانتی اور مانتی ہے کہ "دل" مسلمان ہو جائے تو "خیر" گھر کی کنیز بن جاتی ہے۔ حکیم الامت بھی تمام عمر "دل ونگاہ" کی مسلمانی پر زور دیتے رہے۔ اصل میں استاد دامن کی ذہنی کشادگی، دیگر مذاہب کے احترام سے اکثر لوگ غلط فہمی کا شکار ہوئے۔ غلطی کرنا یا ہونا قابلِ تلافی و معافی جرم ہے مگر اس پر قائم رہنا قابلِ تلافی و معافی نہیں۔۔۔ ملاحظہ ہوں نظم "رحمت" کے چند اشعار۔

اَن گنت بدفعلیاں کیتیاں نیں
جی کرداا ے ہور گناہ کراں
متاں بکتے سفیدی وی بھاہ مارے
عمل نامے نوں ہور سیاہ کراں
پچھ پچھ دی رہوے نہ لوڑ کوئی
اوگن اپنا آپ گواہ کراں
دامن فیر اُمید اے رب بخشے
اوہدی رحمت تے جدوں نگاہ کراں

۱۔ لاتعداد گناہ کرنے کے باوجود مزید گناہ کرنے کو جی چاہتا ہے۔

۲۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ نامۂ اعمال میں سفیدی کی جھلک دکھائی دے جائے۔ لہٰذا مناسب ہے کہ میں اپنے نامۂ اعمال کو اور سیاہ کرلوں۔

۳۔ تاکہ "اسے" تحقیق کی ضرورت ہی محسوس نہ ہو۔ میرا مجسم گناہوں کا پیکر خود میرے خلاف گواہی دے۔

۴۔ دامن پھر بھی مجھے اُمید ہے کہ جب اس کی رحمتِ بیکراں پہ نگاہ ہوگی تو بیڑا پار ہو جائے گا۔

گناہ و ثواب کا خلاصہ یہی ہے کہ بندے کی نجات صرف اور صرف رحمتِ ربی کی وجہ سے ہوگی نہ کہ نیک اعمال پہ غرور و گھمنڈ کی وجہ سے۔

بڑے سے بڑے نیک عمل کی بھی یہی حقیقت ہے کہ اس کی کوئی حقیقت نہیں۔

جے میں ویکھاں عملاں وَلے۔ کُکھ نہیں میرے پلّے
جے میں ویکھاں رحمت تیری۔ بَلّے بَلّے بَلّے

(اگر میں اعمال کی طرف دیکھتا ہوں تو دامن میں تنکا تک نہیں جب تیری رحمت پہ نظر جاتی ہے تو بے اختیار پکار اٹھتا ہوں واہ بھئی کمال ہے، کمال ہے)

اب دامن کی شاعری کا شباب ملاحظہ ہو۔

ہنجو، رات دے، تبکے تریل دے نیں
ہنجو، ہنجواں تے سٹ کے گزر چلے
ایہہ جندڑی نین سیاپیاں دی
رونڈے آئے ساں، پٹ کے گزر چلے

یہ اشعار سیاسی شاعری کے برعکس "آمد" کے ہیں۔ ہر لفظ کیفیت میں ڈوبا ہوا۔

۱۔ یہ شبنم کے قطرے اصل میں گریۂ شب کے نتیجے میں آنسوؤں کی بوندیں ہیں۔ ہم بھی اس کی تقلید میں آنسوؤں پر آنسو گرا کر زندگی سے جانے والے ہیں۔

۲۔ یہ زندگی مصیبتوں کا پیغام لانے والی "نین" ہے۔ (نین۔ نائی (حجام) کی تانیث۔ پنجابی ثقافت میں نائی اور نین دونوں سے پیغام رسانی کا کام لیا جاتا تھا۔ اب یہ رسم دیہاتوں سے بھی اٹھتی جا رہی ہے۔ نین دی اکھ "آنکھ" خوب صورتی کا استعارہ ہے) جب دنیا میں آئے تھے تو بطور احتجاج رو رہے تھے، اب جا رہے ہیں تو اس کے دکھوں پر ماتم کرتے جا رہے ہیں۔

اب ایک حقیقت کا خوب صورت انداز میں اظہار ملاحظہ ہو۔

خورے کیوں نہیں زمی دی گل کردے
بندے ایہہ جیہڑے پتلے خاک دے نیں
روٹی کھاندیاں نوں گلاں آندیاں نیں
لگے آٹا تے طبلے پٹاکدے نیں

۱۔ یہ انسان جانے کیوں زمین کی بات نہیں کرتے حالانکہ ان کا خمیر خاکِ زمین سے اٹھایا گیا ہے۔

۲۔ پیٹ بھرا ہوا ہو تو بندے کو باتیں کرنا آجاتی ہیں جیسے طبلے جیسی بے جان چیز پر بھی آٹا چپکا دیا جائے تو آواز میں کھنک پیدا ہو جاتی ہے۔

اب قارئین کی خدمت میں غزلِ مسلسل کے اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

آمو ساہمنے دو دو ہو گیاں

جیکر حشر دیہاڑے حساب ہویا
کُجھ نہ کُجھ تے ہونا ای چاہیدا اے
کیہ گناہ ہویا کیہ ثواب ہویا
تیری جنّت تے ہُن نہیں دل آندا
جِتھوں پہلاں سی کدے جواب ہویا
کہندے، زندگی رب ای کرم بخشی
میرے واسطے ایہو عذاب ہویا
دولت خانے دی میرے کیہ پُچھدے او
دولت لُٹ گئی خانہ خراب ہویا

غزل میں بالکل سادہ الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ ہر شعر میں فن بول رہا ہے۔

آخر استاد دامن کو سراغ مل ہی گیا لیکن کب؟ جب یہ کہا "میں نہیں چھڈنا کھہڑا تیرا" (میں تیرا پیچھا چھوڑنے والا نہیں) پھر مانگنے کا سلیقہ بھی آگیا۔ ملاحظہ ہو۔

مینوں کفر اسلام دا پتا لگے
اپنے نُور تھیں روشن نگاہ کردے
میں منگتا ہاں کردے کرم مولا
اپنی دین وچ شاہاں داشاہ کردے
تیرے دل ہُن آون نُوں جی کردا
بانہوں پھڑکے اپنی راہ کردے
میں مقام توحید نُوں چاہناہاں
باخبر کردے تے آگاہ کردے

ان اشعار کے سارے الفاظ عام فہم ہیں۔ بندہ پکار پکار کے کہہ رہا ہے "بانہوں پھڑکے اپنی راہ کردے" (دست گیری کرکے مجھے اپنے راستے کا مسافر بنالے) تو وہ جو اپنی طرف، ایک قدم پیش رفت کرنے والے کی جانب، ستر قدموں کا فاصلہ طے کرتا ہے کس طرح بندے کو نظرانداز کرسکتا ہے۔ چنانچہ دامنِ دامن مالا مال ہوا۔ ملاحظہ ہو۔

میرے مولا نے اپنے منگتیاں نُوں
جو کُجھ وی دِتا وکھو وکھ دِتا
اوہدی ونڈ نُوں سمجھنا بہت مشکل
کِتے ککھ دِتا تے کِتے لکھ دِتا
بڑا چاء سی شوق وچ سجدیاں دا
خورے کِتھے کِتھے متھا رکھ دِتا
اوڑک دل محبتاں نال بھریا
مینوں لکھ دا وی سوا لکھ دِتا

یہ ہے وہ مقام جہاں وہ بے نیاز جب دستِ کرم کشادہ کرتا ہے تو منگتا اپنے نصیب پر ناز کرتا ہے اس کا لاکھ بھی سوا لاکھ ہو جاتا ہے۔ ترجمہ ملاحظہ ہو۔

۱۔ مولا نے ہر گداگر کو الگ الگ دیا۔
۲۔ اس کی تقسیم کو سمجھنا مشکل ہے۔ کسی کو ایک تنکا عطا کیا کسی کو لاکھ۔
۳۔ مجھے سجدۂ شوق کی بڑی آرزو تھی اسی شوق میں جانے کس کس در پر جبینِ نیاز جھکادی۔
۴۔ آخر کار مجھے دولت عشق نصیب ہوئی، مجھے دوسروں سے "سوایا" ملا۔ آخر کار استاد دامن نے اعلان کیا۔

وِدھ ایس تھیں معجزہ کیہ ہونا
دامن جِتّے دِلوں مسلمان ہوگئے

اب ملاحظہ ہوں "ہیر" استاد دامن کے چند اشعار۔

ہیر رانجھے سے مخاطب ہوئی

زُلف مُکھڑے تے پئی کھیڈدی اے
سُرمہ نیناں دی دھار وچ تِھسیاوے
لُس لُس کردا پِنڈا چیکنا اے
نکّو نک گھیو دیا چھنّیاوے
بدّل وانگ کیہ سرے تے گجناایں
کیہ روڑیا، توڑیا، بھنّیاوے
دامنؔ ذمی اساں اِک ویلنا اے
تیرا رس نچوڑسی گنّیاوے

جس اہلِ دل، صاحبِ ہوش نے "ہیر" کا ایک بار مطالعہ کیا وہ اس کا اسیر ہوا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر دامن "ہیر" نہ لکھتے تو اپنی خوشبو کو مقید کرنے والی بات ہوتی اور یہ اس سے بڑی حقیقت ہے کہ اگر وہ صرف درج بالا چار اشعار کے علاوہ اور کچھ نہ لکھتے تو پھر بھی صفِ اوّل کے شعرا میں ہوتے..... ہم ان اشعار کا ترجمہ تو پیش خدمت کر ہی دیں گے مگر بربطِ دل کے تاروں کی اس "ہلور" اس ارتعاش کو الفاظ کا لبادہ اوڑھانا، ناممکن ہے جو ان اشعار سے پیدا ہوتا ہے۔

پنجابی اشعار کا ترجمہ ویسے بھی ذرا مشکل کام ہے مثلاً ان بولیوں کا ترجمہ کیا ہو سکتا ہے!

(ا) سارے پنڈ وچ چانن تیرا نی ماں دیئے موں بتیئے
(ب) مُنڈا موہ لیا تویتاں والا تے دمڑی دا سک مَل کے
(ج) رن نہا کے چھپڑ وچوں نکلی تے سلفے دی لاٹ ورگی

۱۔ سیاہ لمبے بالوں کی لٹ، چہرے پر کھیل رہی ہے۔ سُرمے کی دھار آنکھوں کے کونوں سے نکل کر بہار دکھا رہی ہے۔
۲۔ تابدار جسم ایسا نرم وملائم جیسے گھی سے لبالب بھرا پیالہ۔
۳۔ بادل کی طرح سر پر کیوں گرج رہے ہو۔ میں نے تمہارا

کیا بگاڑا کیا توڑا پھوڑا یا بہایا ہے۔

۴۔ اے دامن یہ زمین آسمان ایک بیلنا ہے اور تُو گنا۔ اب تو سارا رس نچوڑا جائے گا۔

چند ازلی سچائیوں کا اظہار ملاحظہ ہو۔

جنہاں رنادے مرد کماؤ ہوندے
وچ کھل شریکیاں بہندیاں نیں
جیویں الہڑجوانی دے سے اندر
چُنیاں سراں تو لہہ لہہ پیندیاں نیں
جنہاں ماواں دے پُت کپوت ہوندے
وچ باہر شریکیوں رہندیاں نیں
جنہاں ٹہنیاں پھُل نصیب نائیں
کدوں بُلبلاں آکے بہندیاں نیں
جدوں آن مکان نوں کیر لگے
کندھاں اپنے آپ ہی ڈھہندیاں نیں

۱۔ جن بیویوں کے مرد کمانے والے ہوں وہ رشتے داروں میں آپے سے باہر ہو کر بیٹھتی ہیں۔

۲۔ جیسے عالم شباب میں دوپٹا سر سے سرک سرک جاتا ہے۔

۳۔ جن ماؤں کے بیٹے ناخلف ہوں وہ "برادری" میں بیٹھنے کے قابل نہیں ہوتیں۔

۴۔ جن شاخوں پہ پھول نہیں کھلتے، ان پر بلبلیں بسیرے نہیں کرتیں۔

۵۔ جب مکان کرم خوردہ ہو جائے تو دیواریں زمیں بوس ہو جاتی ہیں۔ (کیر۔ بھربھری مٹی کا خود بخود گرنا۔ جیسے چوہے کیر۔ یعنی چوہے کی بل سے نکلنے والی بھربھری سی مٹی)

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ استاد دامن کا مستقل بسیرا تو حجرہ شاہ حسین میں تھا مگر ہیرا منڈی، ناولٹی سنیما کے سامنے اپل ہوٹل میں بھی محفل جمتی جس کے روح رواں استاد دامن ہوتے۔ اس کے علاوہ برکت علی خان کی بیٹھک بھی مل بیٹھنے کی جگہ تھی جہاں استاد بڑے غلام علی خاں اکثر آتے۔ پھر استاد بڑے غلام علی خاں ہندوستان نقلِ مکانی کر گئے۔ فنِ موسیقی کے وہ استاد تھے اور ہندوستان میں ان کے فن کی بڑی مانگ تھی۔ رقص و موسیقی کا شمار، ہندوؤں کے مذہبی مناسک میں ہوتا ہے۔ کچھ عرصہ شاہ نور اسٹوڈیو میں بھی قیام رہا فلم "چن وے" کی گیت نگاری استاد کے ذمے تھی۔ گیتوں کے مکھڑے لکھ چکے تھے کہ ناگزیر وجوہات کی بنا پر وہاں سے اُٹھ آئے۔ اس فلم کے گانے، بعد میں فیروز دین شرف نے مکمل کیے۔

آخر میں حیاتِ دامن کے چند دلچسپ واقعات پیشِ خدمت ہیں۔

دہلی لال قلعے والے مشاعرے سے واپس ہوئے تو سرحدی محافظوں نے دھرلیا۔ نہرو سے بغلگیری والا واقعہ اخباروں کی زینت بن چکا تھا۔ ہونا ہوانا کیا تھا۔ استاد کے دامن میں کتابوں کے سوا تھا ہی کیا۔ یہی سامان سرحد کے چوکس محافظوں نے رکھوالیا پھر سی آئی ڈی کی مسلسل نظرِ کرم سے استفادے کا دور شروع ہوا۔ ایک انسپکٹر عقیدت مندوں کے روپ میں اکثر حاضری دیتا۔ درویش کا ڈیرا تھا کوئی روک ٹوک تو تھی نہیں۔ استاد پہلے روز ہی تاڑ گئے مگر اظہار سے گریز کیا۔ وہ انسپکٹر اکثر کہتا "استاد! آپ کی زیارت کے بعد نماز میں بڑا لطف آتا ہے اور پھر بادشاہی مسجد میں نماز کا لطف ہی کچھ اور ہے۔"

کچھ عرصہ بعد انسپکٹر موصوف کی ڈیوٹی بدل گئی اور آنے جانے والا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ایک روز اتفاقاً بھاٹی گیٹ میں اسی انسپکٹر سے مڈبھیڑ ہو گئی تو استاد نے "قانون" کو کلائی سے جکڑ لیا۔ وہ کترا کے نکلنے کی کوشش میں تھا مگر استاد نے مسکرا کر پوچھا "برخوردار! صرف اتنا بتا دو کہ آج کل نمازوں میں لطف آرہا ہے کہ نہیں؟"

استاد کی نگاہ واقعی بندے کے اندر تک پہنچ جایا کرتی تھی۔ ایک روز حجرے میں ایک اجنبی آیا اور لچھے دار باتیں کرنے لگا۔ استاد نے اس کے متحرک ہاتھوں کو بغور دیکھا اور زیرِلب مسکرانے لگے۔ تھوڑی دیر وہ رنگ جما کر چلا گیا۔ استاد مسلسل مسکرائے جا رہے تھے۔

"جانتے ہو، یہ شخص کون تھا؟" استاد نے قریب بیٹھے سائیں اختر سے پوچھا۔

"استاد! پہلے کبھی نظر نہیں آیا، جانے کون تھا۔"

"سائیں! بندے پڑھنے کی عادت اپناؤ۔ میری بھی اس سے پہلی ملاقات تھی مگر وہ زبردست جواری تھا۔ اس کے ہاتھوں کی ہر حرکت چیخ چیخ کر اعلان کر رہی تھی۔"

دوسرے روز سائیں اختر نے پوچھ گچھ کی تو وہ واقعی بہت بڑا جوئے باز نکلا۔ جس حجرے میں زیڈ اے بخاری جیسے صاحب کمال، حسین شہید سہروردی جیسے سیاست دان، علاؤالدین جیسے فن کار حاضری دینا فخر سمجھتے تھے۔ وہاں لچھے دار گفتگو کرنے والا حکیم سلطان جالندھری، قطب چائے والا، حضوری باغ میں صفائی کرنے والا خاکروب اور مالی بھی، فرشِ خاک پر آبیٹھتے تھے۔ تنگ حجرے میں ایک ہی تو چارپائی تھی۔ باقی جگہ پر تو کتابوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ (راقم کی طرح یقیناً ہر شخص استاد دامن سے پہلی ملاقات پر ضرور حیرت میں ڈوب

جاتا ہوگا) بر سبیلِ تذکرہ سفرِ آخرت سے پیشتر استاد نے چالیس ہزار نایاب کتب 'دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری کو بطورِ تحفہ عطا کیں۔ یہی ان کی عمر بھر کی کمائی تھی اور یہی اثاثہ' محبت' گویا انہوں نے محبت کا بوجھ سر سے اتارا اور ہلکے پھلکے ہو کر سفرِ آخرت اختیار کیا۔

اب مجھ پہ نزع کا عالم ہے تم اپنی محبت واپس لو
جب کشتی ڈوبنے لگتی ہے تو بوجھ اتارا کرتے ہیں '

حکیم اصغر نامی ایک عقیدت مند او کاڑے سے حاضری دینے آیا کرتا تھا اور سلام دعا کے بعد ہمیشہ ان الفاظ سے گفتگو کا آغاز کرتا "حضور! مجھے تو بس چار چیزیں لاہور کھینچ لاتی ہیں۔ داتا صاحب کا مزار' بھاٹی دروازے کا پلاؤ' آپ کا دیدار اور قطب کی چائے۔"

استاد فوراً کسی کو حکم دیتے "اوئے' جا قطب سے ایک درجن چائے لے آ" پھر ایک فلک شگاف قہقہہ بلند کرتے "حکیم صاحب گزارا ہو جائے گا نا" حکیم صاحب بلا کے چائے نوش تھے۔

حکیم سلطان جالندھری کا مطب بھی حجرے کے قریب ہی تھا۔ استاد اس کی باتوں سے خوب لطف اندوز ہوتے۔ وہ ناغہ کرتا تو خود بلوا بھیجتے۔ "حکیم صاحب' کبھی غریب کی 'اریا' میں بھی جھانک لیا کرو۔ دوری محبت کی قینچی اور بدگمانی اُلفت کا 'استرا' ہوتی ہے" استاد مخصوص انداز میں شکوہ کرتے۔

"استاد! حاضر کیا خاک ہوں' آستانے کے سامنے دو من کیلوں کے چھلکے بکھرائے رکھتے ہو۔ ہڈی پسلی کے عزیز نہیں"

حکیم صاحب اپنی باغ و بہار طبیعت کے اظہار کا آغاز کرتے۔

"حکیم صاحب! آپ کو ہڈی پسلی کی فکر ہے' وہ آپ کے مرزا غالب تو دل ٹوٹنے کو بھی معمولی واقعہ سمجھتے تھے اور بازار سے نیا دل خرید لانے کی دھمکی دے دیا کرتے تھے۔"

"استاد! دلی میں لُنڈا بازار نہیں تھا۔ اس خریداری کے لیے غالب کو لاہور آنا پڑتا۔ اس لیے ہم غالب کی دھمکی میں آنے والے نہیں۔ دوسرے یہ اس دور کا واقعہ ہے جب "کافر' غالب ہوئے" اشارہ بہادر شاہ ظفر کے دور کی طرف ہے۔ استاد اس ذومعنی فقرے پہ قہقہہ بلند کرتے۔

استاد دامن کا یہ عقیدت مند سب سے منفرد نوع سے تعلق رکھتا تھا۔ اپنی طلسمی پٹاری سے 'ایسے ایسے واقعات نکالتا کہ "طلسم ہوشربا" کی حکایات کا رنگ پھیکا پڑ جائے۔ گفتگو کا انداز بھی غضب کا تھا۔ جسم کا ہر عضو زبان کا ساتھ دیتا جیسے طبلچی' گویّے کی سنگت کرتا ہے۔ ہاتھ' چہرہ' آنکھیں' بدن کا انگ انگ فصاحت و بلاغت کا سمندر تھا۔

"جالندھر میں ایک بار ہم میٹھے چاول پکا بیٹھے" حکیم صاحب' استاد کی طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھتے۔ گویا میٹھے چاول پکانا بھی ایک کارنامہ تھا۔ "بس کیا بتائیں استاد! سارا جالندھر مہک اٹھا' جس گلی سے ہم گزرتے' خواتین سرگوشیوں میں مصروف ہو جاتیں۔ ہر خاتون چق کی اوٹ سے اشارے کرتی "وہ رہے حکیم سلطان" وہ جا رہے ہیں مسیحائے زماں۔۔۔ بس استاد' آتش پہ شباب کا یہی عالم تھا۔ ایک روز تو حد ہو گئی۔ اِدھر مال روڈ کا واقعہ ہے۔ ہم اپنے بیٹے کے ہمراہ

سیر کر رہے تھے ایک فوجی جیپ عین سر پر آکر رُکی۔ ٹائروں کی بلند و بالا چیخ سے ہم تو بس سن ہو کر رہ گئے۔ کیا ہوا کہ ایک قد آور کرنیل پوری وردی میں ملبوس اُچھل کر باہر آیا، خم ٹھونک کر ہمارے سامنے کھڑا ہو گیا" حکیم صاحب نے اپنی تقریر دل پذیر کا تاثر حاضرین کے چہروں سے پڑھا اور پھر گاڑی برق رفتاری سے چل پڑی۔

"تمہیں سزائے موت دی جائے، عمر قید بامشقت یا کوڑے لگوائے جائیں، جوان؟" کرنیل نے ہم سے کڑک دار آواز میں پوچھا۔ ہم حیران کہ یہ کس ناکردہ گناہ کی سزا ہے۔

"جناب ہمارا قصور؟" ہم نے پوچھا۔

"قصور؟ کیا یہ چھوٹا موٹا جرم ہے کہ تم نے ابھی تک اتنے خوب صورت جوان کو فوج میں بھرتی نہیں کرایا" کرنل صاحب نے ہمارے قریب کھڑے ہمارے بیٹے کی طرف اشارہ کیا اور استاد! آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ہمارا بیٹا ہو بہو ہماری تصویر ہے۔"

حاضرین زیرِ لب مسکرا رہے ہیں اور استاد دامن نگاہوں سے ہلاشیری دے رہے ہیں۔ اب ایسے سامعین میسر ہوں تو کیوں نہ انسان کلیجا نکال کر سامنے رکھ دے۔

"استاد! ایک روز ہمارا لمبی دوڑ کو جی چاہا" حکیم صاحب نے گفتگو کا تسلسل مجروح کیے بغیر پٹاری سے ایک اور واقعہ نکالا "ہم ٹکسالی گیٹ سے شروع ہوئے تو شیخوپورہ کے کھیتوں میں جا کر دم لیا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک پری تمثال، مہ جبین بے مثال، چہرہ دہکتے انگارے سے زیادہ لال، خرامِ ناز بکھیرتی چلی آرہی ہے۔ لباس دیہاتی مگر سج دھج، وارداتی، صراحی دار گردن۔ سر پہ لسّی سے بھرا برتن اوپر کانسی کا کٹورا۔ ہم سدا کے تشنہ لب۔ وہ ہمیں دیکھ کر ٹھٹکی، جھجکی، سہمی، لرزی، کپکپائی پھر حیا سے جگمگائی۔ ہم نے تسلی تشفی سے ڈھارس بندھائی۔ اے فردوس کی حُور، اندر سبھا کی پری۔ نہ گھبرا، شرما، لجا۔ ہم "سُنت" ہیں بے انت ہیں، بس ذرا پانی پلا..."

"میں تو اپنے محبوب کو غیر کا جوٹھا مشروب پلانا گناہ سمجھتی ہوں" وہ شرمائی ہچکچائی تو ہم فوراً نیچے جھکے۔

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

یوں ہم نے اوک سے تشنہ لبی دور کی۔ اور...." حکیم صاحب یہاں تک پہنچے تو استاد نے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔ یہ گویا سرخ جھنڈی تھی جس کا فوری اثر ہوا اور حکیم صاحب کو ایمرجنسی بریک لگے۔

ایک دلچسپ واقعہ دامن کے شاگرد سائیں اختر کی زبانی ملاحظہ ہو۔

"ایک بار ہم منڈی بورے والا، میلہ مویشیاں کے سلسلے میں منعقد ہونے والے مشاعرے میں گئے۔ استاد کو چائے کی طلب ہوئی لبِ سڑک ایک "کیفے ڈی پھونس" قسم کی چائے کی دکان ملی۔ سارے برتن دھوئیں سے کلونسے ہوئے۔ دکان دار کے حقّے سے لے کر، خود صاحبِ دکان تک، وہاں کی ہر شے پراگندہ تھی صرف حُقّہ نوش کا لہجہ دبنگ تھا جو شکستہ پیالیوں سے پہلے ہم تک پہنچا۔ "اوئے لمڈے، شہری بابوؤں سے پوچھ چینی کتنی چاہیے، ایک چمچ، دو چمچ یا کھڑا چمچ۔"

استاد نے حیران ہو کر مجھے یہ "کھڑے چمچ" والا عقدہ حل کرنے کو کہا۔ میں نے دکاندار سے بصد احترام یہ اُلجھن حل کرنے کو کہا۔

"بابو صاحب! یہاں لوگ، دودھ چینی کے لیے چائے پیتے ہیں، اکثر پیالے میں چمچ کھڑا کر کے چینی بھرواتے ہیں پھر اسے دودھ اور قہوے میں گھول کر پی جاتے ہیں۔ آپ بھی چاہیں تو کپ میں چمچ کھڑا کریں۔"

رات کو جب مشاعرہ ہوا تو صدارت شہر کا مجسٹریٹ کر رہا تھا۔ استاد نے "بخیے ادھیڑ" قسم کا کلام پیش کیا۔ مجسٹریٹ نے اسی وقت زبان بندی کا حکم سنا دیا۔ ادھر سامعین نے اس حکم کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا اور کرسیاں اٹھا کر للکارنے لگے۔ "استاد دامن کو سنیں گے، استاد دامن، استاد دامن" ہونے لگی چنانچہ یہ حکم "زباں بندی" دس منٹ سے زیادہ عرصہ نہ ٹھہر سکا۔

راقم کا رزق چونکہ دیارِ غیر میں لکھ دیا گیا تھا لہٰذا جیب کی راحت اور دل کے سکون کے لیے دیس اور پردیس کے درمیان ہم "مکو" بن کر رہ گئے تھے۔ (پنجابی زبان کا "مکو" جسے جولاہے کپڑا بُننے میں استعمال کرتے ہیں عربی لفظ "ماکوک" بہ معنی شٹل سے نکلا ہے) ایک بار امجد اسلام امجد ہمیں دیکھ کر بے اختیار پکار اٹھا، اوئے "توں فیر آگیا ایں" (ارے تو پھر آگیا ہے) خدا امجد کے فقروں سے دشمن کو بھی محفوظ رکھے خیر! یہ المیہ تو اکثر پاکستانی ہُنر مندوں کا ہے کہ ان کا رزق ممالکِ غیر کے بے ہُنروں کے ذمے ہے۔

بے ہُنر بندوں کے ذمّے رزق کی ترسیل تھی
اے خدا تیری زمیں پر امتحانوں میں رہے

لیکن جب بھی وطن آنا ہوتا، ادبی حلیفوں اور حریفوں سے جی بھر کے ملاقاتیں ہوتیں۔ فروری ۱۹۸۱ء کے ایک روز

لاہور کی ادبی شخصیات' غریب خانے پر تشریف فرما تھیں۔ محترم قتیل شفائی' اظہر جاوید (مدیر تخلیق) سرفراز سید (ان دنوں روزنامہ مشرق سے وابستہ تھے) خالد احمد' نجیب احمد' شہزاد احمد' قائم نقوی' شفیق سلیمی' اسیر عابد (کلامِ غالب کا منظوم پنجابی مترجم) اسرار زیدی' اقبال زخمی' مشتاق کنول اور دیگر شعروادب کی آبرو۔ محفل رنگ پہ تھی کہ مشتاق کنول اٹھ کر کھسک لیا۔ ہمیں ناگوار تو گزرا مگر "رنگ میں بھنگ" کے پیشِ نظر خاموش ہوجانا پڑا۔ دوسرے روز علی الصباح مشتاق کنول نے گھنٹی بجائی۔

"اوئے' لفنگے! کل کی رنگین محفل سے زیادہ کیا ضروری کام تھا تجھے؟" ہم نے بلا سوچے سمجھے' ادھر اُدھر دیکھے بغیر دل کی بھڑاس نکالنی شروع کی۔ اس نے پنجابی انداز میں چھنگلی کی مدد سے سگریٹ کا "سُوٹا" لگایا اور آدھی سے زیادہ بند آنکھوں سے مسکرا کر گیٹ کی اوٹ میں کھڑی شخصیت کی طرف اشارہ کیا۔

"میں استاد کو لینے گیا تھا جناب شیخ!" کنول کا یہ کارنامہ اسے "ساتوں خون" معاف کرانے والا تھا۔ یہ ایک خوش گوار حیرت کا مقام تھا۔ استاد! سفید تہبند اور پنجابی کرتہ پہنے تھے۔ ہاتھ میں دو گزی لٹھ بھی تھا۔ (دامن کا بھاری بھرکم وجود ان کی ٹانگیں' ستر برس سے اٹھاتے اٹھاتے تھک چکی تھیں۔ گھٹنوں میں اکثر درد رہتا اس لیے لٹھ کا سہارا ضروری تھا)

اس روز کی طویل مجلس کا ایک ایک پل راقم کی زندگی کا روشن ترین باب ہے۔ ہر موضوع پر بات ہوئی' شاعری سے لے کر نظریۂ زمان ومکان اور اضافیت تک۔

"شیخ! بھگوت گیتا پڑھی ہے؟" اچانک استاد نے سوال کیا اور راقم کو خاموش پاکر خود ہی جواب بھی دے دیا۔ "مجھے معلوم تھا شیخ و برہمن میں "لٹھ کُٹے" کا بیر ہے مگر تم نے اپنے آپ کو ایک بہت بڑی کتاب سے محروم رکھ کر ظلم کیا ہے۔ پہلی فرصت میں اسے پڑھو۔"

استاد کی گفتگو سے زیادہ مشتاق کنول کی مسکراہٹ تکلیف دہ تھی۔ جیسے "بچو آیا نا اونٹ پہاڑ تلے۔"

"استاد! گیتا کہاں سے ملے گی؟" ہم نے عذرِ لنگ پیش کیا۔

"جو کتاب کہیں سے نہ ملے وہ درویش کے حجرے میں ہوتی ہے" استاد نے کمال مہربانی سے کہا۔

چنانچہ ہم اسی وقت ہیرا منڈی' استاد کے حجرے میں پہنچے۔ انہوں نے اپنے ہاتھ سے دستخط کرکے "بھگوت گیتا" عطا کی۔ ہاتھ میں ہلکا سا رعشہ تھا۔ آخر بارِ زندگی کوئی کب تک صحیح سلامت اٹھا سکتا ہے۔ کسی نہ کسی مقام پر یہ پیکرِ خاک بغاوت کر ہی دیتا ہے۔ استاد دامن کی عطا کردہ "گیتا" ہندو مذہب کا خلاصہ جب بھی نظر آتی ہے درویش کی یادوں کا میلہ لگ جاتا ہے۔

دامن کی زندگی کا ایک پہلو بڑا عجیب تھا مثلاً جہاں بھی مشاعرے میں جاتے اپنی رہائش کا انتظام دوسروں سے الگ اپنی حسبِ منشا کرتے۔ مزاج شناس ہونے کی بنا پر عموماً سائیں اختر ساتھ ہوتا۔ ایک بار مری کے سالانہ مشاعرے میں گئے۔ قیام راولپنڈی میں ہوا۔ یہ مشاعرہ ہر سال شدید گرمی کے موسم میں ہوا کرتا تھا۔ بھاری بھرکم وجود کی بنا پر استاد کو گرمی بھی کچھ زیادہ محسوس ہوتی۔ چنانچہ ہوٹل میں اترتے ہی گرمی کے خلاف اقدام ہوئے۔ سائیں اختر برف کا نصف بلاک اٹھالایا پھر ایک ٹب کا انتظام ہوا۔ جب ہوٹل کا بیرا خدمت وغیرہ کے لیے کمرے میں داخل ہوا تو الٹے پاؤں یوں بھاگا جیسے کوئی خوفناک چیز دیکھ لی ہو۔ استاد ایسی ہی ہیئتِ کذائی میں تشریف فرما تھے۔ تہبند کو لنگوٹ کی صورت باندھے کرسی پر بیٹھے تھے۔ دونوں پاؤں برف بھرے ٹب میں تھے اور میز پوش میں برف باندھ کر سر پر رکھ رکھی تھی' جسم کو دونوں اطراف سے ٹھنڈا کرنے کا یہ طریقہ جائز تو تھا مگر کچھ رواج کے خلاف تھا۔

مری پہنچے تو سائیں کو فلو کی شکایت ہوگئی۔ استاد نے نوٹوں سے بھرا بٹوا اپنے شاگرد کے حوالے کیا "سائیں! جاؤ جا کر کچھ کھالی آؤ۔ میں تو آرام کروں گا" استاد کی زندگی کا یہ پہلو بھی تابناک تھا کہ جسے اپنا کہا' دل سے کہا۔

اردو کے ایک پرانے معتبر شاعر اور فلمی گیت نگار خمار بارہ بنکوی کو شکاگو (امریکا) شہر کے لوگوں نے بلایا۔ وہاں ان کے استقبال کے لئے صحافیوں کی ایک ٹیم بھی آئی ہوئی تھی۔

ان سے امریکا کے بارے میں ایک صحافی نے دریافت کیا اور کہا "جناب آپ امریکا آئے ہیں۔ یہ بتایئے آپ نے اس ملک اور یہاں کے شہروں کو کیسا پایا؟"

خمار نے کہا "بھائی یہاں پہنچ کر زندگی میں پہلی بار احساس ہوا ہے کہ میں بالکل صحیح جگہ آیا ہوں مگر افسوس اس کا ہے کہ بالکل غلط عمر میں۔"

تھوڑی دیر بعد سائیں اختر ہانپتا ہوا واپس آیا اور استاد کو پھولا ہوا بٹوا تھما کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ "سائیں! کیا بات ہے؟ کچھ پریشان دکھائی دیتے ہو؟"

"استاد! اتنے نوٹ مجھے تھما دیئے۔ توبہ توبہ' اتنی گرمی تھی نوٹوں کی کہ کوئی بندہ قتل کرنے کو جی چاہتا تھا۔ میں تو اس "مصیبت بیگم" کو لے کر بغیر کچھ کھائے پیئے بھاگ آیا ہوں"

استاد نے قہقہہ بلند کیا۔

آخر میں ایک مشاعرے کا حال خود استاد کی زبانی۔

"ایک بار ہم ایک سرحدی گاؤں میں مشاعرہ پڑھنے گئے۔ دیہات کا چوہدری ہمارا میزبان تھا۔ دیہات کیا چھوٹا سا قصبہ تھا۔ چوہدری صاحب نے عزت افزائی یوں کی کہ ہر شاعر کے گلے میں ایک ایک ہار پہنایا اور ایک ایک گلدستہ ہاتھ میں تھمادیا۔ یوں بستی کے واحد بازار میں ہمارا "جلوس نکالا"۔ ہمارے آگے آگے اسکول کا بینڈ بج رہا تھا۔ بازار میں ایک شیر فروش کی دُکان تھی۔ وہ ہمیں دیکھ کر فوراً اٹھا اور میرے قریب آکر' سر سے پاؤں تک مجھے گھورنے لگا۔

"پہلوان جی! یہ لوگ تو ہوئے شاعر' آپ کون ہیں؟" اس نے سرگوشی کی۔

"دراصل میں ان کا حجام ہوں' جہاں یہ لوگ قیام کرتے ہیں میں ان کا کھانا وغیرہ پکاتا ہوں۔" میں نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔ اتفاقاً وہ شیر فروش بھی شاعری میں "منہ ماری" کا عادی تھا۔ لہٰذا شام' پنڈال میں وہ سب سے آگے بیٹھا نظر آیا۔ مجھے پڑھنے کی دعوت دی گئی تو اس کی حیرانی دیکھنے لائق تھی۔ خیر! میں نے ایک دو نظمیں سنائیں' سامعین کے اصرار پر مجھے کافی کچھ سنانا پڑا۔ دوسرے روز ہم واپس ہونے لگے تو وہی شیر فروش مجھ سے بطور خاص ملنے آیا۔ کاندھے پر اس نے یہ بڑا سا مرتبان اٹھا رکھا تھا جو کوزہ مصری' الائچی' لونگ' کالی مرچ اور دوسرے سرحدی تحائف سے لبالب بھرا تھا۔

"استاد! تُو نے اپنے آپ کو کل حجام کہا تھا تو لے' آج ایک شاگرد کا "مونڈن" کرجا۔" اس نے مرتبان میرے حوالے کرتے ہوئے کہا"

داستان دامن یوں تو بڑی طویل ہے۔ پون صدی کی ہنگامہ خیزیوں کو قلم بند کرنے کے لیے سرگزشت کے صفحات ناکافی ہیں مگر طویل یا مختصر ہر داستان کا اختتام کسی نہ کسی مقام پر تو ہونا ہی ہوتا ہے۔

مگر شکاری کرے تیاری باغ چرینداں ہرنا
جو چڑھیا اوس ڈہنا اوڑک جو جمیا اُس مرنا

(جو طلوع ہوا' غروب ضرور ہوگا' جو پیدا ہوا آخر کار موت کا شکار ہوگا)

۱۹۸۴ء کا سال ویسے بھی شعروادب پر بھاری تھا۔ پروفیسر یونس طلعت گئے' یوسف کامران گئے' دائم اقبال دائم' غلام اعظم جہلمی' فیض احمد فیض۔ بھارتی ادیبوں میں ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ' سادھو سنگھ ہمدرد! اپنے اپنے کردار ادا کرکے دنیا کے اسٹیج سے رخصت ہوگئے۔ اس سفر پر' جہاں سے نہ کوئی واپس آیا ہے نہ آئے گا۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۸۴ء کا سورج طلوع ہوا۔ اُدھر سروسز اسپتال کے ایک کمرے میں پنجابی ادب کا آفتاب غروب ہونے کی تیاری کرنے لگا۔ وہ جو ادب کے اُفق پر' ابھرتے وقت شدید سیکولر ذہن کا مالک تھا' مائلِ تصوف ہوا۔ اس نے شاہ حسین سے روحانی رشتہ جوڑا پھر "یقین" سے ہوتا ہوا عین الیقین کے کوچے تک آیا۔ ریاض احمد راجا' طلعت محمود' سائیں اختر تینوں نے آفتاب ادب کی مدھم پڑتی شعاعوں کو دیکھا' سانسوں کے تسلسل ٹوٹنے کا منظر بڑا بے درد تھا۔ شام پانچ بجے بیگم مہر شوکت علی نے آخری سانسوں کو تلاوتِ کلام پاک کے سُرور سے رخصت کیا' حرفوں کے شوقین کو زادِ راہ بھی حرفوں ہی کا ملا۔ وہ حروف جو نطق کی معراج ہیں۔

بھلا ہویا میرا چرخہ ٹُٹا
میری جند عذابوں چھٹی
(شاہ حسین)

(اچھا ہوا خوب ہوا... میرا چرخہ ٹوٹا... عذاب سے جان تو چھوٹی)۔

میرے ویندیاں ویندیاں کئی "ہو" گئے
تے میں کتیاں وے ویندیاں "ہو" جانا
دامن شال دوشالے لیراں والیاں نیں
سبھناں خاک دے وِچ سمو جانا

ترجمہ: میرے دیکھتے دیکھتے کئی رخصت ہوگئے۔ اسی طرح دوسروں کے دیکھتے دیکھتے میں بھی رخصت ہوجاؤں گا۔ دامن' یہ سمور سنجاب یہ قاقم واطلس کی شالیں اوڑھنے والے ہوں یا پھٹے پرانے کپڑے زیب تن کرنے والے' سب کو رزقِ خاک ہونا ہے۔

استاد دامن کو اُن کی وصیت کے مطابق قبرستان باغبان پورہ لاہور' تربتِ شاہ حسین کے پڑوس میں دفن کیا گیا۔ دوستی ہو تو ایسی ہو۔